

شہ زور



اسماء قادری

نشہ زور

اساتادری

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تند و تیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنونِ حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابلِ شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پُر عزم نوجوان کو حرفِ غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جا رہے تھے... اس کی زندگی جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قراریوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تار عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ وارداتِ قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہو سکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تحیر انگیز داستان

گئے۔ ان کے جانے کے بعد معاذ بھی حرکت میں آگیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنی بایک پر سوار سڑک پر اڑا جا رہا تھا۔ اس کا موڈ خاصا خوشگوار تھا اس لیے ہونٹ ایک شوخ سی دھن پر دستک کر رہے تھے۔ آگے ٹریفک جام دیکھ کر مزاج کی شوخی اور خوشگواری ماند پڑ گئی۔ اسے ایک جگہ پہنچنے کی جلدی تھی اور آگے راستہ ہی بند پڑا ہوا تھا۔

”کیا مسئلہ ہے؟“ اس نے کسی نہ کسی طرح پلٹ کر واپس آتے ایک موٹر سائیکل سوار سے پوچھا۔

”بجلی کی مسلسل بندش پر احتجاج کے لیے لوگوں نے سڑک بلاک کی ہوئی ہے اور ٹائر وغیرہ جلا کر حکومت اور بجلی کے محکمے کے خلاف نعرے بازی کر رہے ہیں۔“ اس شخص نے جواب دیا اور اپنی موٹر سائیکل نکال کر لے گیا۔ معاذ نے بھی واپس پلٹ جانے میں ہی عافیت جانی۔ کچھ پیچھے جانے کے بعد اس نے موٹر سائیکل ایک ذیلی سڑک پر موڑ لی۔ یہ ایک رہائشی علاقے سے گزرنے والی سڑک تھی جس پر سفر کر کے اپنی منزل پر پہنچنے میں اس کا زیادہ وقت خرچ ہوتا لیکن موجودہ صورت حال میں اس کے پاس کوئی دوسرا آپشن موجود نہیں تھا۔ اس سڑک پر سفر کرنے میں ایک مثبت پہلو یہ تھا کہ ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا اس لیے بہت تیزی سے سفر کر سکتا تھا اور وہ بھی کر رہا تھا کہ راستے میں اچانک ہی ایک رکاوٹ حائل ہو گئی۔ وہ دو موٹر سائیکل سوار تھے جو پہلے اسے اور ٹیک کرتے ہوئے آگے نکلے اور پھر اس کی راہ میں حائل ہو گئے۔ معاذ کی نظروں نے فوراً ہی پچھلے سوار کے ہاتھ میں موجود قاتل ٹائن ایم ایم کی جھلک دیکھ لی۔ یہ اسٹریٹ کرملو اور ٹارگٹ کلرز کا من پسند ہتھیار تھا جسے وہ کسی کھلونے کی طرح استعمال کرتے تھے اور انسانی زندگیوں کو کیڑے مکوڑوں سے بھی زیادہ حقیر گردانتے تھے۔

معاذ کو طوعاً و کرہاً اپنی بایک کو بریک لگانے پڑے۔ اس کے رکتے ہی راستہ روکنے والی بایک کا پچھلا سوار اپنا پٹل لہراتا ہوا نیچے اتر اور بھاگ کر اس کے سر پر آسوار ہوا۔

”بایک کھڑی کر کے نیچے اتر جا۔“ وہ لڑکا جس کی عمر مشکل اٹھارہ انیس سال تھی، نہایت بدتمیزی سے دھاڑا لیکن اس کی حرکات و سکنات میں موجود اضطراب اس امر کا غماز تھا کہ اسے اس ”فیلڈ“ میں آئے زیادہ وقت نہیں گزرا اور ابھی وہ تجربے کے اعتبار سے ”کچا“ ہے۔ ایسے ”کچے“ بندے ”زیادہ چپکے“ ہوتے ہیں اور ان کے ہاتھ میں ہتھیار زیادہ خطرناک ثابت ہوتا ہے اس لیے معاذ نے کسی بحث مباحثے میں پڑنے کی کوشش نہیں کی اور خاموشی سے بایک

دھامکیں، دھامکیں، دھامکیں..... ایک تسلسل سے ہونے والی فائرنگ کی کان پھاڑ آوازوں کے درمیان فائر کرنے والا کامل سکون کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کا پورا جسم ساکت تھا اور گن کی بلبلی پر موجود انگلی اس کے جسم کا وہ واحد عضو تھا جسے اس وقت متحرک دیکھا جاسکتا تھا۔ اس انگلی کی ہر حرکت کے ساتھ نکلنے والی کسی گولی نے اپنا نشانہ خطائیں کیا تھا اور مشین کا دھکیل کر سامنے لایا جانے والا ہر تازہ پٹا نشانہ بٹا جا رہا تھا۔ پورے آٹھ پتلوں کو نشانہ بنانے کے بعد اس کی انگلی غیر متحرک ہوئی اور باقی جسم میں متحرک پیدا ہوا۔ ہاتھ میں موجود آٹھ گولیوں والی گن کو ایک اسٹینڈ پر رکھ کر وہ کانوں پر موجود ہیڈ فون نمائیز پر ڈیکشن اتارنے لگا۔

”ویری ویل ڈن معاذ!“ ایئر پروفیکشن اتار کر وہ دو قدم ہی چلا تھا کہ سر صفات اس کے سامنے آن کھڑے ہوئے اور اسے ساکشی نظروں سے دیکھتے ہوئے اس کے لیے تعریفی کلمات ادا کیے۔

”تحنیک یو سوچ سارا آپ کی تربیت کا کمال ہے۔“ اس نے سر کو ہلکا سا خم دیتے ہوئے انکساری سے جواب دیا۔

”تربیت اپنی جگہ لیکن جب تک شاگرد ہونہار نہ ہو، استاد کے لیے اپنے ہنر کی منتقلی آسان نہیں ہوتی۔ تم نے جتنے کم وقت میں عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔“ سر صفات نے کھل کر اس کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا۔

”شاگرد کے اندر پورے خلوص اور دیانت داری سے اپنا ہنر منتقل کرنے والے اساتذہ بھی شاذ شاذ ہی ہوتے ہیں سر اور میں خوش قسمت ہوں کہ مجھے ایک مخلص شخص کی سرپرستی میسر آئی ہے۔“ معاذ نے اس بار بھی انکساری کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ تعریف وہ شے تھی جس سے اس کا قدم قدم پر واسطہ پڑتا تھا اور اب وہ اس کا اتنا عادی ہو چکا تھا کہ کسی نئی تعریف کو سن کر پھول کر تپا بننے کی گوبت نہیں آتی تھی۔

”باصلاحیت ہو اور باظرف بھی اس لیے امید رکھی جاسکتی ہے کہ زندگی میں بہت ترقی کرو گے۔“ ڈش یو بیسٹ آف لک معاذ!“ سر صفات جو اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل رہے تھے، برآمدے کے آخری سرے پر پہنچ کر رک گئے۔ معاذ نے بھی احتراماً اپنے قدم روک لیے اور انگلی سی مسکراہٹ کے ساتھ ان کی بات سن رہا۔ بات کے اختتام پر سر صفات نے اس کا شانہ دھیرے سے تھپکا اور ایڈمنسٹریشن سائڈ پر جانے والے راستے کی طرف بڑھ

چھوڑ کر اتر گیا۔

”اپنا موبائل اور والٹ بھی نکال..... جلدی کر۔“
لڑکے نے ایک اور حکم صادر کیا۔ معاذ نے فرمانبرداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے پیٹھ کی بائیں جیب میں ہاتھ ڈال کر پہلے والٹ برآمد کیا اور پھر دائیں جیب سے موبائل باہر نکالا۔ دونوں چیزیں نکال کر اس نے یوں بیک وقت دونوں ہاتھ آگے بڑھائے جیسے لڑکے کو موبائل اور والٹ تھماتا چاہ رہا ہو۔ ٹائیپ بھر کے لیے لڑکے کی توجہ اس کے ہاتھوں کی طرف مبذول ہوگئی اور یہی وہ وقت تھا جب معاذ کی ٹانگ حرکت میں آئی۔ لڑکے کا پھل والا ہاتھ اس کی ٹانگ کا نشانہ تھا۔ ایک بھر پور ضرب نے اس کے ہاتھ سے پھل نکال دیا اور وہ ذرا سا لڑکھڑایا۔ پھل زور میں پتا نہیں کہاں جا کر اٹھا۔ معاذ نے فوراً ہی موبائل اور والٹ ہاتھ سے چھوڑ دیے اور لڑکے کے سنبھلنے سے پہلے اس کے منہ پر ایک عدد گھونسا رسید کر دیا۔ اپنے ساتھی کی درگت بنتے دیکھ کر ابھی تک موٹر سائیکل پر براجمان ہیلیمٹ پوش کے لیے اپنی جگہ ٹھہرا رہنا ممکن نہ رہا اور وہ پشت پر سے تیزی سے معاذ کی طرف جھپٹا۔ معاذ اس کے ردعمل کی طرف سے غافل نہیں تھا اس لیے پھرتی سے ایڑی کے بل گھوما اور ایک عدد گھونسا ہیلیمٹ پوش کے پیٹ میں رسید کیا۔ اس اثناء میں پہلے والے کو سنبھلنے کا موقع مل چکا تھا۔ وہ حرکت میں آیا اور کسی چونک کی طرح پیچھے سے معاذ کے ساتھ چٹ گیا۔ اس کے تربوز جیسے سر کی ضرب گردن پر کھا کر لمبے بھر کے لیے معاذ کی آنکھوں کے آگے تارے سے ناچ گئے لیکن پھر اس نے بڑی تیزی سے خود کو سنبھال لیا اور یہ سنبھلنا بڑا بروقت تھا۔ پیٹ میں گھونسا کھا کر دہرا ہو جانے والا ہیلیمٹ پوش موقع کا فائدہ اٹھا کر اپنی ٹانگ کے ساتھ بندھا خنجر نکال چکا تھا اور ایک وحشیانہ دھاڑ کے ساتھ اس پر حملہ آور ہو رہا تھا۔

خون نکل کر سڑک پر بہہ رہا ہے۔ معاذ کے گھوم جانے کی وجہ سے وہ اپنے ہی ساتھی کے چلائے گئے خنجر کے نشانے پر آ گیا تھا۔ اس کی اس حالت پر پہلے تو ہیلیمٹ پوش ششدر سا کھڑا رہ گیا پھر اسے احساس ہوا کہ بازی مکمل طور پر پلٹ چکی ہے اور کھڑا رہنے کے مقابلے میں فرار ہو جانا زیادہ بہتر حکمت عملی ہے۔ اس نے اپنی موٹر سائیکل کی طرف دوڑ لگائی۔ معاذ نے بھی اپنی جگہ سے جست بھری اور اس کی ٹانگ میں ٹانگ اڑانے میں کامیاب رہا۔ ہیلیمٹ پوش خود کو سنبھال نہیں سکا اور منہ کے بل سڑک پر گر پڑا۔ ہیلیمٹ کی موجودگی نے اس کا منہ تو محفوظ رکھا لیکن فوراً ہی دوسری مشکل میں گرفتار ہو گیا۔ سڑک پر سے گزرنے والے ایک ڈاکٹر راہ گیروں اور سواروں نے صورت حال کو قابو میں دیکھ کر اس معاملے میں مداخلت کی جرأت کر ڈالی تھی اور وہ ہیلیمٹ پوش کو گھیر چکے تھے۔ اس منظر کو دیکھ کر معاذ پیچھے ہٹ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ ”چندے کی مار“ ہیلیمٹ پوش کا نصیب بن چکی ہے اور اس مار کے بعد اس کا وہ حشر ہونے والا ہے کہ اس کی ماں بھی مشکل ہی سے اسے شناخت کر سکے گی۔

عوام کو اس ”کار خیز“ میں مصروف چھوڑ کر اس نے سڑک پر گرا اپنا والٹ اور موبائل اٹھایا۔ موبائل کی چٹنی ہوئی اسکرین دیکھ کر اسے تھوڑا سا تاسف ہوا لیکن یہ نقصان اس نقصان کے مقابلے میں بہت کم تھا جو ان اسٹریٹ کرملز کے ہاتھوں خاموشی سے لٹ جانے کی صورت میں اس کے حصے میں آتا۔ اس نے دل ہی دل میں شکر کا کلمہ ادا کرتے ہوئے دونوں چیزیں دوبارہ جیبوں میں منتقل کیں اور بائیک پر جا بیٹھا۔ وہاں اب تک ہنگامہ جاری تھا۔ ہیلیمٹ پوش کی جوش و خروش سے تو موقع کرتے لوگوں کی آوازیں کے ساتھ زخمی لڑکے کی چیخوں کے شامل ہو جانے سے منظر خاصا دہشت ناک ہو گیا تھا۔ معاذ نے بائیں جانب موجود کار سوار کو موبائل فون پر کسی سے بات کرتے دیکھا اور موٹر سائیکل اشارت کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اسے معلوم تھا کہ اسے جس جگہ پہنچنے کی جلدی تھی، اب وہاں پہنچنے کے بجائے پولیس کی کارروائی کا سامنا کرنا ہے۔ اس کارروائی میں اسے کوئی نقصان پہنچنے کا تو اندیشہ نہیں تھا لیکن اس کا طے شدہ شیڈول بہر حال برباد ہو چکا تھا۔

توقع کے مطابق تھوڑی دیر میں پولیس وہاں پہنچ گئی۔ اتنی دیر میں وہاں جھوم میں کافی اضافہ ہو چکا تھا۔ دو چار بزرگ حضرات کی مداخلت پر ہیلیمٹ پوش کے ساتھ مار پیٹ کا سلسلہ بھی روکا جا چکا تھا اور اب وہ بندھے ہوئے

ہاتھ پیروں کے ساتھ ابتر حالت میں اپنے زخمی ساتھی سے کچھ فاصلے پر پڑا ہوا تھا۔ پولیس اور ایسویٹس کی آمد ایک وقت ہوئی۔ زخمی نوجوان کو تھوڑی احتیاط سے ایسویٹس میں منتقل کر کے اسپتال روانہ کر دیا گیا۔ اس کے بعد پولیس والے ہجوم سے دانتے کی تفصیل معلوم کرنے لگے۔ ایک تیس پینتیس سالہ شخص جس کے کپڑوں پر کتے چونے کے دھبے لگے ہوئے تھے، رُرجوش انداز میں دانتے کی تفصیلات بیان کرنے لگا۔ تفصیل سنتے ہوئے پولیس والے مسلسل معاذ کو گھورتے رہے۔

”خبیث ایسے گھور رہے ہیں جیسے خود کو لٹنے سے بچا کر میں نے کوئی جرم کر ڈالا ہے۔“ ان کے انداز کو محسوس کر کے معاذ دل ہی دل میں بڑبڑایا۔

”تو تم نے اس لڑکے کو خنجر سے اتنا مہلک زخم لگایا ہے۔ کچھ اندازہ ہے تمہیں کہ اگر لڑکا زیادہ خون بہنے کی وجہ سے مر مرا گیا تو تم پر قتل کا کیس بن سکتا ہے۔“ اس پولیس پارٹی کو لیز کرنے والے اے ایس آئی نے یہ جملہ بول کر معاذ کا فیوز ہی اڑا دیا۔ وہ کٹم تھا اور یہاں اسے ہی ڈرایا دھمکایا جا رہا تھا۔

”میں نے اس لڑکے کو زخمی نہیں کیا۔ وہ اپنے ساتھی کے خنجر سے زخمی ہوا ہے۔“ غصہ آنے کے باوجود اس نے ضبط سے کام لیا اور صورت حال کی وضاحت کی۔

”ابھی اس آدمی نے بتایا کہ لڑکے کو تم سے مقابلے کے دوران زخم لگا ہے۔ تم اتنی آسانی سے گواہ کو کیسے جھٹلا سکتے ہو؟“ پولیس والا اس کی وضاحت کو کسی خاطر میں نہیں لایا۔

”ان بھائی صاحب نے یہ بتایا ہے کہ لڑکا مجھ سے لڑنے کے دوران زخمی ہوا ہے، یہ نہیں کہا کہ اس پر خنجر سے وار کرنے والا میں تھا۔“ پولیس والوں کو خواہ مخواہ اپنے گلے پڑتے دیکھ کر اس کے غصے میں اضافہ ہو گیا جس کے باعث آواز بھی معمول سے کافی بلند ہو گئی۔

”یہ ٹھیک کہہ رہا ہے سر! خنجر اس کے پاس نہیں بلکہ.....“ اس موقع پر پولیس کو بیان دینے والے شخص نے بھی مداخلت کر کے صورت حال کو واضح کرنے کی کوشش کی لیکن اسے ڈپٹ دیا گیا۔

”چپ کر اوئے! جب تجھ سے بولنے کو کہا جائے تب بولنا۔“

”اگر آپ کو میری بات پر یقین نہیں تو خنجر پر سے فنگر پرنٹس اٹھا کر تصدیق کر لیجئے گا۔ فنگر پرنٹس کی رپورٹ سے ثابت ہو جائے گا کہ اس لڑکے پر خنجر چلانے والا میں

نہیں بلکہ یہ شخص تھا۔“ معاذ نے ایک بار پھر اپنے غصے کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے ایک عقلی دلیل پیش کی اور ہیلمٹ پوش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ لوگوں نے مار پیٹ کے دوران اس کا ہیلمٹ اتار کر چھینک دیا تھا اور اس تیس بائیس سالہ لڑکے کے چہرے پر بھی عوام کی ”شفقت“ کی نشانیاں چند منٹ کے نشانات اور دھبے ہوئے ہونٹ کی صورت میں دکھائی دے رہی تھیں لیکن اب وہ زیادہ سراپہ محسوس نہیں ہو رہا تھا اور یوں لگتا تھا کہ پولیس کی موجودگی اسے تقویت پہنچا رہی ہو۔ معاذ کا ماتھا ٹھنکا۔ پولیس اور جرائم پیشہ افراد کے گٹھ جوڑ کی داستانوں سے تو وہ بھی خوب واقف تھا۔

”اب تیرے جیسا کل کا لونڈا تمہیں بتائے گا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں۔ ہم تو وہ ہیں بچو کہ بغیر کسی ماہر کے رپورٹ پیش کیے صرف ہاتھ دیکھ کر بتا سکتے ہیں کہ کس کے فنگر پرنٹس کہاں موجود ہو سکتے ہیں۔“ نہایت استہزاء سے لہجے میں یہ جملے کہتے ہوئے ایک پولیس والے نے جھپٹ کر معاذ کا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنے چہرے کے نزدیک لے گیا۔ یکدم ہی اس کے ہاتھ پھڑکنے لگے۔

”اوئے..... تیرے ہاتھ سے تو بارود کی بو آرہی ہے۔ کہاں واردات کر کے آ رہا ہے؟“ وہ یوں چیخا جیسے ارشیدس پہلی بار ”اچھال“ کی قوت دریافت کرنے پر چیخا ہوگا۔

”میں ایک شوٹنگ کلب کا ممبر ہوں اور سیدھا وہیں سے آ رہا ہوں، اسی لیے آپ کو میرے ہاتھ سے بارود کی بو آرہی ہے۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی معاذ کو ان پولیس والوں کے سامنے صفائی دینی پڑی جن کے رویے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اس سے زیادہ مجرموں کے حمایتی ہیں۔

”یہ ساری کہانیاں تمہانے چل کر سنا چکا! وہاں ہمارے پاس کہانیوں کی حقیقت تک پہنچنے کا پورا پورا انتظام ہے۔“ اے ایس آئی کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی تھی اور وہ معاذ کو ان نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے قصائی بکرے کو دیکھتا ہے۔

”میں نہیں جاؤں گا تمہانے۔ میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں کہ تم ان لٹیروں کے سر پرست ہو اور اپنے شاگردوں کی ناکامی کا بدلہ لینے کے لیے مجھے تمہانے لے جانا چاہتے ہو۔“ معاذ ہر طرح کی مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر حلق کے بل دھاڑا تو پولیس والوں کے چہروں کے زاویے پہلے سے بھی زیادہ بگڑ گئے۔

”سرعام پولیس پر جمونے الزامات لگاتا ہے۔ تلاشی

”ابھی فانیو اسٹار رہائش کے مزے لوٹ پھر تیری فانیو اسٹار خاطر تو واضح بھی کریں گے۔“ لاک اپ بند کرتے ہوئے گہری سائولی رنگت والے پولیس والے نے اسے کہا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے اطلاع دینی ضروری سمجھی۔ معاذ جواتی دیر میں اٹھ کر بیٹھ چکا تھا، خاموش رہا۔ جائے وقوعہ سے تھانے تک کے مختصر فاصلے میں اس کی اچھی خاصی گت بنائی جا چکی تھی۔ اس کی شرٹ کا کارپسٹ چکا تھا اور ٹھوڑی پرنٹل کا ایک نشان نظر آرہا تھا۔

”اس چڑے کو کہاں سے اٹھائے ہو بادشاہو! کہیں کسی لڑکی کو آنکھ مار رہا تھا یا غلطی سے تمہاری موتیل (موبائل) کے آگے سے گزر گیا تھا؟“ لاک اپ میں بند افراد میں سے بڑی بڑی مونچھوں والے ایک شخص نے معاذ پر تسخرانہ نگاہ ڈالی اور اسے بند کرنے والے سپاہی سے بے تکلفی سے پوچھنے لگا۔

”اسے معمولی نہ جانو استاد۔ یہ بڑا پھنے خان ہے۔ تمہارے دو بندوں کو اکیلے لہا لٹایا ہے اس نے اور پولیس والوں پر ہاتھ اٹھانے کا کارنامہ بھی انجام دیا ہے۔ اسے تو اس کی جراتوں پر بھی تمہنوں سے نوازا جائے گا۔“ سپاہی نے جواباً جس بے تکلفی کا مظاہرہ کیا، اس سے اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ سرراہ معاذ کو لوٹنے کی کوشش کرنے والوں اور پولیس میں گہرا گھٹ جوڑ موجود ہے۔

”بلے بھئی بلے۔ پھر تو یہ سچ بچ بڑی اونچی چیز ہے۔“ اس بار بڑی مونچھوں والے استاد نے معاذ کو جانچنے والی نظروں سے دیکھا۔ معاذ نے ناپسندیدگی کے اظہار کے لیے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔

”ذرا ادھر تو دیکھ کا! اتنی بھی بری شکل نہیں ہماری کہ تو نظر بھر کر دیکھنا بھی گوارا نہ کرے۔“ استاد کو اس کا منہ موڑنا گراں گزرا اور اس کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ بھا کر زبردستی اس کا رخ اپنی طرف موڑا۔ اس کی گرفت میں اتنی سختی تھی کہ معاذ کو اس کی انگلیاں گڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

”دور ہٹ کر ٹھہرو۔“ اسے استاد کی حرکت پر طیش آ گیا اور ایک جھٹکا دے کر اس کا ہاتھ اپنے چہرے سے دور ہٹا دیا۔ استاد کو شاید اس جھٹکے کی توقع نہیں تھی، سو اس کا توازن بگڑ گیا۔

”تیری تو ماں.....“ استاد کی یہ بے عزتی اس کے چیلوں سے برداشت نہیں ہوئی اور وہ مغلقات بکتے ہوئے اس پر جھپٹے۔ معاذ کے لیے اس صورت حال میں اپنی جگہ بیٹھے رہنا ممکن نہیں تھا۔ وہ کسی اسپرنگ کی طرح اچھل کر اپنی

لو اس کی اور ہٹھکڑی لگا کر موبائل میں ڈالو۔ تھانے جا کر اس پھنے خان کو خود پتا چل جائے گا کہ یہ کتنے پانی میں ہے۔“ معاذ کے حساب سے جس کا ردوائی میں اسے نقصان کا کوئی اندیشہ نہیں تھا، وہ کارروائی اس کے گلے بڑ گئی تھی۔

”تمہیں اس پولیس گردی کا نتیجہ سمجھنا پڑے گا۔ تم پبلک کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اس طرح مجھے ایک غلط الزام میں اٹھا کر نہیں لے جا سکتے۔“ معاذ نے شور مچانا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی ہاتھ پیر بھی چلانا شروع کر دیے۔ اس کا پہلا مٹکا اس پولیس والے کی ناک پر پڑا جو ہٹھکڑی اس کے ہاتھ میں ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دوسرے کتے نے اپنے ساتھی کی معاونت کے لیے آگے بڑھ کر آنے والے کے جڑے کا مزاج پوچھا لیکن اس سے آگے اس کی کوئی پیش نہ چلی کہ یکدم ہی دور آنکلوں کی نالیں اس کے جسم سے آگئی تھیں اور وہ کتنا ہی جوشیلا سبھی، اس بات کو اچھی طرح سمجھتا تھا کہ چند چھٹانک کا بارود جسم میں داخل ہو گیا تو اس کے پاس کسی جدوجہد کی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔ پولیس گردی کے متعدد واقعات اس کے بھی علم میں تھے اور وہ جانتا تھا کہ یہ پولیس والے چاہیں تو ابھی اسے چھلنی کر کے واقعے کو پولیس مقابلے کا رنگ دے دیں گے۔ اس نے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ ”بھٹاؤ اس رسم کو گاڑی میں۔ ابھی تھانے جا کر اس کی طرم خانی..... کے راستے باہر نکالتے ہیں۔“ وہ لوگ اسے رانکلوں کے بٹھ مارتے ہوئے موبائل کی طرف لے جانے لگے۔ ازراہ تکلف ہیلمٹ والے لڑکے کو بھی ساتھ بٹھالیا گیا اور سیکنڈوں میں پولیس موبائل دھول اڑاتی چھ میگوئیاں کرنی عوام کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ گئی۔

”یہ صاف غنڈا گردی ہے۔“ مڑک کنارے موجود پان کے کھوکھے کا مالک جو ابتدا سے پورے واقعے کا چشم دید گواہ تھا، بلند آواز میں بولا اور اپنے موبائل پر بتائی جانے والی ویڈیو وہاں موجود افراد کو دکھانے لگا۔ ذرا دیر میں وہ ویڈیو بہت سے افراد کے ساتھ شیئر کی جا چکی تھی۔

☆☆☆

”چل کا کے اندر جا اور فانیو اسٹار ہوٹل کے مزے اڑا۔“ لاک اپ کا دروازہ کھول کر اس سے طنزیہ لہجے میں کہنے کے ساتھ ہی اس کی پشت پر اتنی زوردار لات رسید کی گئی کہ وہ اپنے قدموں کو حرکت کی زحمت دیے بغیر ہی کھلے دروازے سے لاک اپ کے اندر جا گرا۔ وہاں پہلے ہی چار پانچ افراد موجود تھے۔ ان افراد نے اس کے اس طرح اندر آکر نے پر ایک استہزائیہ قہقہہ لگایا۔

اس حکم پر عملدرآمد کرتا اس سے قبل ہی ”صاحب“ کی آمد کا غلط فہم لگ گیا۔

”پہلے ایس ایچ او صاحب سے ملاقات کر لوں پھر تیرے کس بل نکالوں ہوں۔“ اے ایس آئی نے دانت کچکپکپاتے ہوئے معاذ کو دھکی دی اور وہاں سے ہٹ گیا۔ مضطرب سامعہ بھی جس جگہ دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا، وہیں بیٹھ گیا۔ وہ اپنے آپ کو ایک جھیلے میں پھنسا چکا تھا اور کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ لاک اب میں استاد اور اس کے گرگے اس کے مقابل بیٹھے ہوئے تھے گرگے مسلسل اسے کینہ تو ز نظروں سے دیکھ رہے تھے البتہ استاد کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔ اچانک ہی لاک اب کھولے جانے کی آواز سن کر دونوں فریقین اس طرف متوجہ ہوئے۔ وہی ہیلمٹ والا لڑکا جس نے اپنے ساتھی کے ساتھ مل کر معاذ کو لوٹنے کی کوشش کی تھی، اندر داخل کیا جا رہا تھا۔ لڑکے کی مرہم پٹی کی جاچکی تھی اور وہ خاصی بہتر حالت میں نظر آ رہا تھا۔ لاک اب میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر معاذ پر پڑی تو وہ پیش سے چپٹا ہوا اس کی طرف لپکا۔

”اوائے بس رہنے دے۔ تیری مردانگی کی مزید نشانیاں نہیں دیکھنی ہیں میں نے۔“ استاد کی دھاڑ نے اس کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روک لیا اور وہ استاد کی طرف رخ کر کے ایسے تاثرات سے اسے دیکھنے لگا جیسے اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتا ہو لیکن پھر شاید استاد کے رعب کے آگے اسے زبان کھولنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ استاد نے اسے قریب بیٹھنے کا اشارہ کیا اور واقعے کی تفصیلات پوچھنے لگا۔

”راجو ابھی کچا ہے۔ اسے ساتھ نہیں لینا چاہیے تھا تجھے۔ ہے بھی سالانہ چھ بہنوں کا اکٹوتا بھائی۔ کچھ ہو گیا تو قیامت ٹوٹ پڑے گی اس کے گھر والوں پر۔“ پہلی نظر میں سخت گیر نظر آنے والے استاد کی نظروں میں اپنے ساتھی کے لیے ٹھکر تھا۔ اسی عالم ٹھکر میں اس نے معاذ پر ایک اچھتی سی نظر ڈالی اور لاک اب سے کچھ فاصلے پر بیٹھے سپاہی کو آواز دینے لگا۔

”کیا بات ہے استاد۔“ سپاہی گویا کچے دھاگے سے بندھا چلا آیا۔

”فون کرنا ہے۔“ استاد نے اپنی فرمائش بیان کی۔ سپاہی نے بلا تردد اپنی جیب سے موبائل نکال کر اس کے حوالے کر دیا۔ استاد کوئی نمبر ڈائل کر کے بات کرنے لگا۔

”ہاں شو کے! یہ میں ہوں گلو استاد پتا تو تجھے لگ گیا

جگہ سے کھڑا ہوا اور خود کو مٹا رسید کرنے کی کوشش کرنے والے کی کھائی پر ہاتھ ڈال کر اسے ناکامی سے ہٹکار کرنے کے ساتھ ساتھ دوسری جانب سے حملہ آور ہونے والے کو ایک لات بھی رسید کی تاہم اس دوران تیسرے کو موقع مل گیا اور اس نے معاذ کی کمر پر ایک لات دے ماری۔ اس کے بعد تو جیسے لاک اب میں بھونچال ہی آ گیا۔ ایک طرف معاذ تھا اور دوسری طرف استاد کے تینوں گرگے۔ وہ بڑھ بڑھ کر اس پر حملے کر رہے تھے اور وہ اپنا دفاع کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں ٹھیک ٹھاک ضربیں بھی لگا رہا تھا لیکن بہر حال وہ تین تھے اور اسے بھی ان کے ہاتھوں چوٹیں کھانی پڑ رہی تھیں۔ بڑی بڑی مونچھوں والے استاد نے اس ہنگامے میں حصہ نہیں لیا تھا اور دیوار سے ٹیک لگائے دیکھی سے اپنے ساتھیوں اور اسے لڑتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

”او جین..... ماں کے..... یہ تھانہ ہے کوئی اکھاڑا نہیں جو تم حرام کے جے سائڈوں کی طرح ایک دوسرے کو ٹکریں مار رہے ہو۔“ لاک اب کے باہر کھڑا سپاہی چند ثانیوں کے لیے تو دم بخود کھڑا یہ منظر دیکھتا رہا پھر مغلظات بکتے ہوئے سلاخوں پر ڈنڈا مار کر چلانے لگا۔ شور شرابا سن کر دو تین مزید پولیس والے وہاں دوڑے چلے آئے۔

”اوائے استاد! بند کر دو ایہ ٹوشکی۔ ایک آدھ کھسک گیا تو خواہوا پولیس کے گلے میں مصیبت آ جائے گی کہ ہم نے تشدد سے حوالاتی کو مار ڈالا۔“ بھاگ کر آنے والوں میں وہ اے ایس آئی بھی شامل تھا جس نے معاذ کو تھانے لانے میں وہم کردار ادا کیا تھا۔ اسی نے برہم لہجے میں استاد کو مخاطب کر کے یہ حکم صادر کیا تھا۔

”بس کرو اوائے۔ ختم کرو تماشا۔“ استاد نے اے ایس آئی کی فرمائش پر اپنے ٹرگوں کو ڈپٹ کر حکم دیا تو وہ پیچھے ہٹ گئے۔ معاذ بھی ایک بانچھ سے نکلنے والا خون آشبن سے صاف کرتا ہوا ایک دیوار سے جالگا۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کے لیے صورت حال کبھی سے کبھی ہوتی چلی جا رہی ہے۔ ذرا سی دیر میں اس نے پولیس والوں کے ساتھ ساتھ ان غنڈوں سے بھی دشمنی مولی لے لی تھی اور اب اسے اپنا مستقبل خاصا خدوش نظر آ رہا تھا۔

”ذرا باہر تو نکالو اس طرم خان کو۔ ذرا ہم بھی تو آزما لیں کہ اس کے اندر کتنا زور ہے۔ ذرا تنگ روم میں الٹا لٹکا کر ایسی چھتر دل کریں گے سالے کی کہ چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔“ صورت حال معمول پر آئی دیکھ کر اسے ایس آئی نے غضب ناک لہجے میں سپاہی کو حکم دیا۔ سپاہی

کسی بچے کو اس کی غلطی پر سرزنش کر رہا ہو۔
 "میں نے کچھ غلط نہیں کیا۔ تمہارے آدمی میری حق
 حلال کی کمائی لوٹ کر لے جانا چاہتے تھے اور میں اتنا کمزور
 نہیں ہوں کہ انہیں ایسا کرنے دیتا۔ پولیس والوں کو بھی میں
 نے صرف آئینہ دکھایا تھا۔ وہ قانون کی وردی پہن کر حق کا
 ساتھ دینے کے بجائے لیروں سے ہمدردی جتا رہے
 تھے۔" معاذ نے تنک کر جواب دیتے ہوئے استاد کے
 قریب بیٹھے زخمی آنسو کو گھورا۔

"حق واقعی کچھ نہیں ہوتا میرے لالو..... یہاں بس اس
 کی سنی جاتی ہے جس کے پاس حق اور سچ کو خریدنے کی
 طاقت ہو۔"

"میں نہیں مانتا۔ میرا ماننا ہے کہ معاشرہ کتنا ہی
 کرپٹ ہو جائے لیکن حق اور سچ کی اپنی ایک طاقت ہوتی
 ہے اور بندہ اگر ثابت قدمی سے حق پر ڈٹتا رہے تو بالآخر
 حق کی ہی ہوتی ہے۔" اس نے جذباتی لہجے میں استاد کی
 بات کا جواب دیا۔

"سچ سچ..... آئیڈیلٹ ہو۔ پھر تو یقین کر لو کہ بڑی
 ٹھوکریں کھاؤ گے اس معاشرے میں۔" استاد نے اس پر
 افسوس کا اظہار کیا۔

"معاشرے کے بگاڑ میں حصے دار بننے سے بہتر ہے کہ
 بندہ سدھار کی کوشش کرتے ہوئے تھوڑی ٹھوکریں کھالے۔"
 "ابھی تلخ تجربوں کی بجائی سے نہیں گزرے اس لیے
 اتنے جذباتی اور جو شیلے ہو۔" استاد نے اس کا جواب سن کر
 ایک قہقہہ لگا یا پھر دوستانہ لہجے میں پوچھنے لگا۔
 "کیا کرتے ہو؟"

"یونیورسٹی اسٹوڈنٹ ہوں۔" معاذ اپنے دل میں
 استاد کے لیے پہلے لمحے جیسی ناگواری محسوس نہیں کر رہا تھا اس
 لیے آرام سے اس کے سوال کا جواب دیا۔
 "باپ کیا کرتا ہے؟"

"ایک سرکاری محکمے میں چیف انجینئر ہیں۔"
 "پھر تو خاصے تعلقات والا بندہ ہوگا۔ اسے اپنی مدد
 کے لیے کیوں نہیں بلاتے؟" استاد حیران ہوا۔

"ایک تو وہ زیادہ سوشل نہیں ہیں، دوسرے میری
 حوالات میں موجودگی ان کے لیے تکلیف دہ ثابت ہوگی
 اس لیے انہیں فون کرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔" اس نے
 سچائی سے کام لیا۔

"خورات گھر نہیں پہنچے گا تو بھی تو تیرا باپ پریشان
 ہوگا اور شہر بھر میں تجھے ڈھونڈتا پھرے گا..... تو اس سے

ہوگا کہ راجو اور اتو کے ساتھ کیا لفظا ہوا ہے۔ وہ سالہ راجو
 اب اسپتال میں پڑا ہے۔ اس کے علاج و لاج کا خیال رکھنا
 اور اس کے گھر والوں کو کبھی خرچے کے لیے تھوڑے پیسے بھجوا
 دینا۔" شوکا شاید اس کا نائب تھا جسے ہدایات دینے کے بعد
 اب وہ دوسری طرف کی بات سن رہا تھا۔

"اور ہاں دیکھ تھانے والوں کے خرچے پانی میں کمی
 نہیں کرنا۔ ادھر اپنی بڑی اچھی خاطر تواضع ہو رہی ہے، تو
 بھی ان کو خوش رکھنا۔" گلو استاد کی دی گئی اس دوسری ہدایت
 نے سلاخوں کے قریب ہی کھڑے کن سوئیاں لپٹے سپاہی
 کے چہرے کو روشن کر دیا۔ ظاہر ہے تھانے میں پہنچنے والے
 خرچے پانی میں اس کا بھی حصہ تھا۔

"یہ یو جی سنتری بادشاہ تمہارا فون۔ تم ہمیں خوش
 رکھتے ہو تو یقین رکھو تمہیں بھی ہم سے خوشی ہی ملے گی۔"
 کال نمٹا کر استاد نے موبائل سپاہی کو واپس کر دیا اور چپ
 چاپ بیٹھے یہ تماشا دیکھتے معاذ کی طرف متوجہ ہوا۔

"تجھے کسی کو مدد کے لیے کال کرنی ہے تو بتا..... ابھی
 تیری بات کروادیتا ہوں۔" چند ثانیے یونہی اسے گھورتے
 رہنے کے بعد اس نے جو پیشکش کی وہ معاذ کو چونکا گئی۔
 "ایسے کیا دیکھ رہا ہے؟ مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ کسی کو بلانا
 چاہے تو بلا لے ابھی۔ وقت گزر گیا تو تیرا حشر نشر کر دیں گے
 یہ یقین کے....." اس نے بلا خوف و خطر پولیس والوں کے
 لیے گالی کا استعمال کیا۔ معاذ اس کی پیشکش سن کر سوچ میں
 پڑ گیا۔ وہ دوستانہ مزاج رکھنے والا ایک وسیع حلقہ احباب کا
 مالک تھا لیکن اس کے یہ دوست اسی کی طرح طالب علم اور
 عام سے لوگ تھے۔ ان میں سے کوئی بھی پولیس سے منسنے کا
 تجربہ نہیں رکھتا تھا۔ لے دے کر وہ اس موقع پر ابو کو ہی اپنی
 مدد کے لیے بلا سکتا تھا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ
 اسے اس وقت ابو کو زحمت دینی چاہیے یا نہیں۔ اپنے تینوں
 بچوں میں انہیں ہی سے سب سے زیادہ شکایات رات ہی تھیں
 اور اس وقت وہ جس صورت حال میں پھنسا ہوا تھا وہ تو خاصی
 سنگین تھی۔

"آگے پیچھے کوئی سپورٹ کرنے والا نہیں ہے تو خون
 کو اتنا ابال کیوں آنے دیتا ہے۔ ٹھیک ہے جوانی دیوانی
 ہوتی ہے پر ایسا بھی کیا دیوانہ پن کہ بندہ اپنا آپ داؤ پر لگا
 دے۔ پہلے تو نے لیروں سے پھنڈا ڈالا پھر پولیس سے بھی
 پنکا لے لیا۔ ایک طرف سے بچ گیا تھا تو شکر کا کلمہ پڑھتا اور
 سیدھا گھر کی راہ لیتا۔" استاد نے اس کے تاثرات سے سب
 بھانپ لیا اور ایسے اسے لتاڑنے لگا جیسے کوئی خیر خواہ بزرگ

بہتر یہ نہیں ہے کہ تو خود اسے اطلاع دے دے۔“ استاد کی بات میں وزن تھا پھر بھی معاذ ابو کو اطلاع دینے کے معاملے میں تذبذب کا شکار رہا۔ وہ اپنے والدین کی بڑی اولاد تھا اور یقینی طور پر وہ اس سے بہت محبت کرتے تھے لیکن ابو کو اس کے طرز زندگی سے سخت اختلاف تھا اور وہ ہمیشہ اس سے شاکہ رہتے تھے کہ وہ اپنی ذہانت کا درست استعمال کرتے ہوئے اپنی تعلیم کو بھرپور توجہ دینے کے بجائے ادھر ادھر کے مشاغل میں کیوں ٹانگ اڑائے رکھتا ہے۔ وہ اس کے مشاغل سے نالاں رہتے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ان ”مشاغل“ کے بل پر ہی اس میں اتنی جرأت پیدا ہوگئی تھی کہ وہ کسی بھی خطرناک معاملے میں اپنی ٹانگ اڑانے میں جبکہ محسوس نہیں کرتا تھا۔

”تو بول تو اپنی تیری سفارش کر دیتے ہیں بڑے تمنا دار سے.....؟“ اسے تذبذب میں ڈوبا دیکھ کر استاد نے اسے ایک نئی پیشکش کی۔

”آپ..... آپ میری سفارش کیوں کریں گے؟“ معاذ اس پیشکش پر بھونچکا رہ گیا۔

”بس تیری جوانی پر رحم آگیا ہے اور جی چاہتا ہے کہ تجھے اپنے خوش نما نظریات کے ساتھ جینے کا کچھ موقع اور مل جائے۔“ استاد کی آنکھوں میں کچھ کھویا کھویا سا تاثر تھا۔ اس کے گرمے بھی خاموش لیکن حیرت زدہ چہروں کے ساتھ یہ گفتگو سن رہے تھے۔

”تمہاری سفارش پر میرا یہاں سے نکلنا اتنا آسان ہے تو تم خود کیوں یہاں بیٹھے ہوئے ہو؟“ معاذ کو لگا کہ وہ اس سے مذاق کر رہا ہے اس لیے اپنی دانست میں ایک چبھتا ہوا سوال کیا۔

”یہ اور معاملات ہیں کا کا! تو ہمارے رہنے نکلنے کی فکر چھوڑ۔ تمہارا اپنا دوسرا گھر ہے۔ جب جی چاہتا ہے یہاں آ جاتے ہیں جب جی چاہتا ہے نکل جاتے ہیں۔ ہمارے سر پر لالہ عیسیٰ کا ہاتھ ہے اور لالہ کی سرپرستی میں رہنے والا جہاں رہے عیش میں رہتا ہے۔“ استاد نے بڑی بے نیازی سے اس کی بات کا جواب دیا اور جیب سے سگریٹ نکال کر سلگانے کے بعد بے فکری سے اس کے کش لینے لگا۔ معاذ کو تسلیم کرنا پڑا کہ وہ اپنی بات میں سچا ہے۔ ذرا سی دیر میں وہ خود دیکھ چکا تھا کہ تھانے میں استاد اور اس کے ساتھی کتنے آرام سے رہ رہے ہیں۔

”بھل، ابھی اچھی طرح سوچ لے۔ لگتا ہے اے ایس آئی کسی دوسرے لغزے میں پھنس گیا ہے اور اب فرصت

سے رات کو ہی تیری خبر لے گا۔“ استاد کے تھانے میں اختیار کو تو معاذ نے تسلیم کر لیا تھا لیکن ایک غنڈے سے فون لینا دل کو گوارا نہیں ہو رہا تھا اس لیے چپ سادھ لی تھی۔ استاد نے اس کے اس گریز کو محسوس کیا اور فراخ دلی سے سوچ کر فیصلہ کرنے کی پیشکش کر ڈالی۔ معاذ اس کی پیشکش پر غور کرنے سے زیادہ گھر والوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ اسے سب سے زیادہ فکر اپنی والدہ سعیدہ بیگم کی تھی۔ وہ خواتین کی اس قسم میں سے تھیں جن کی ذات کا محور و مرکز بس اپنا گھر اور بچے ہوتے ہیں۔ گھر اور اولاد کے معمولات میں سے کسی بھی شے میں بے ترتیبی ان کے لیے ناقابل برداشت ہوتی تھی اور معاذ سمیت وہ تینوں بہن بھائی اس بات کے پابند تھے کہ طے شدہ وقت پر گھر واپس پہنچ جائیں۔ کسی غیر متوقع صورت حال میں انہیں گھر فون کر کے لازماً امی کو مطلع کرنا ہوتا تھا لیکن آج معاذ ایسا کرنے سے قاصر تھا کہ وہ تمام اشیاء بشمول موبائل کے جنہیں لائبروں سے بچانے کے لیے وہ اپنی جان کی بازی لگا گیا تھا، اب پولیس والوں کے قبضے میں تھیں۔

وہ بہت دیر تک حوالات کے ٹھنڈے فرش پر گھنٹوں میں سر دیے بیٹھا رہا اور ان امکانات کے بارے میں غور کرتا رہا جو اسے یہاں سے نکالنے میں معاون ثابت ہو سکتے تھے۔ گلو استاد کی پیشکش قبول کرنے میں عار محسوس کرنے کے باوجود اس کی پیشکش بھی بار بار ذہن میں آرہی تھی۔ ابھی پولیس والوں نے باقاعدہ اس پر اپنا ہنر نہیں آزمایا تھا پھر بھی وہ اپنے جسم کے کئی حصوں سے درد کی ٹیسیں اٹھتی ہوئی محسوس کر رہا تھا۔ خصوصاً جن مقامات پر رائٹکلوں کے ہٹ مارے گئے تھے، وہاں خاصا درد ہو رہا تھا اور وہ سوچنے پر مجبور تھا کہ جب اسے ”ڈرائنگ روم“ میں لٹا لٹکا یا جائے گا تو اس کا کیا حشر ہوگا۔ اس کے لیے تو ان پچھروں کو برداشت کرنا بھی مشکل ہو رہا تھا جو دن کی روشنی ختم ہوتے ہی اچانک حملہ آور ہو گئے تھے اور جسم کے کچلے حصوں کے علاوہ لباس کے اوپر سے بھی کاٹنے کا فریضہ بخوبی انجام دے رہے تھے۔ اس کے مقابلے میں استاد اور اس کے ساتھی ان پچھروں کو ذرا بھی خاطر میں نہیں لارہے تھے اور مزے سے آپس میں گپ شپ لگانے میں مصروف تھے۔

آٹھ بجے کے قریب ایک آدمی دو بڑے بڑے ناشتا دانوں میں کھانا بھر کر استاد اور اس کے ساتھیوں کے لیے لے آیا۔

”آ جا کا کے! کھانا کھا لے۔“ حوالات کے گندے

لتے ہیں، وہ بھی میری طرح اپنے خون پسینے کی کمائی سے ہی یہ چیزیں خریدتے ہوں گے تو پھر میں کیسے یہ کھانا کھالوں جس میں.....“ اس نے اس بار بھی اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ بات ادھوری تھی لیکن اس کا مفہوم مکمل ہو چکا تھا۔ استاد اور اس کے ساتھیوں کے چہروں کی رنگت متغیر ہو گئی لیکن پھر استاد نے فوراً خود پر قابو پالیا اور ہنس کر بولا۔

”تو مانے گا نہیں لیکن ہم بھی خون پسینا بہا کر ہی اپنا رزق حاصل کرتے ہیں۔“

”لیکن عام طور پر خون دوسروں کا ہوتا ہے۔“ اس نے ترنت کہا۔

”موڈ خراب نہ کر یار۔ نہیں کھاتا تو نہ کھا، ہمیں کھانے دے۔“ اس بار استاد کا لہجہ بگڑ گیا۔ معاذ نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔ کھانے کے بعد استاد اور اس کے ساتھی بہت دیر تک سگریٹ سے شغف کرتے رہے۔ لاک اپ میں پھیل جانے والی ناگوار بونے یہ حقیقت بھی عیاں کر دی کہ یہ عام سادہ سگریٹ نہیں ہیں لیکن کوئی اندھیر سا اندھیر تھا کہ استاد اور اس کے گرگے کھانے میں بیٹھ کر یہ بھرے ہوئے سگریٹ پی رہے تھے۔ سگریٹ پینے کے کچھ دیر بعد استاد اور اس کے گرگے ننگے فرش پر لیٹ کر خراٹے لینے لگے۔ معاذ کا تو چہروں نے ہی جینا دو بھر کیا ہوا تھا۔ خالی پیٹ بھی دہائیاں دینے لگا پھر یہ خوف الگ تھا کہ جانے کب ”ڈرائنگ روم“ کی سیر کا سندس آجائے۔ ہر آہٹ پر اس کا دل سینے میں بری طرح دھڑکنے لگتا تھا۔ نیند کی دیوی مہربان ہوتی بھی تو کیسے۔ اس جہنم میں کتنے کھٹے اور کتنے منٹ گزرے اس کے پاس انہیں کتنے کا کوئی پیمانہ نہیں تھا۔ وہ بس گھنٹوں میں سردیے کسی جسمے کی طرح ساکت بیٹھا ہوا تھا۔ ایک سپاہی نے ڈنڈے سے سناخیں بجا کر اس کا نام پکارا تو اس نے ہڑبڑا کر سر اوپر اٹھایا۔

”اٹھ اوئے نکل باہر۔ تیرے والی وارث آئے ہیں تجھے لینے۔“ سپاہی نے گویا اسے زندگی کا پیغام دیا۔ ناقابل یقین خوشی کی خبر سن کر اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”آ جا لاٹ صاحب! تیرے چاہنے والوں نے سوشل میڈیا پر طوفان تو برپا کیا ہوا ہے، اب تو کیا چاہتا ہے کہ تجھے ڈھول تاشوں کے ساتھ باہر نکالا جائے۔“ اس کی بے یقینی نے سپاہی کو چراغ پا کیا تو اس نے اپنی جذباتی کیفیت پر قابو پا کر قدم آگے بڑھائے۔

”باپ سے پوچھ لینا کہ تجھے یہاں سے نکلنے کے لیے اپنی حق حلال کی کمائی میں سے کتنے لاکھ وردی والوں کو

فرش پر پلاسٹک کا دسترخوان بچھا کر کھانا چن دیا گیا تو استاد نے اسے آواز لگائی۔

”کیا امی تصور بھی کر سکتی ہیں کہ میں اتنے گندے ماحول میں ایسے میلے کھیلے لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاؤں؟ اسے فوراً گھر والوں کی صحت کے لیے ہر دم متفکر رہنے والی اپنی ماں کا خیال آ گیا۔ امی تو اس معاملے میں اتنی حساس تھیں کہ ان لوگوں کو ہوٹلنگ کی بھی اجازت نہیں دیتی تھیں اور خود کو اس حد تک کاموں میں کھپائے رکھتی تھیں کہ ان کے گھر اچار، مرتبے اور چٹنیاں تک شاذ و نادر ہی بازار سے آتی تھیں۔

”کیا سوچتا ہے میرا..... آ جا کھانا کھالے۔“ استاد نے اسے خاموش خیالوں میں کم بیٹھا دیکھا تو دوبارہ آواز دی۔

”مجھے نہیں کھانا۔“ اس نے انکار میں گردن ہلائی۔

”کھالے یار! یہاں کوئی اور تجھے کھانے کا نہیں پوچھے گا۔“ استاد نے اصرار کیا تو وہ پہلے سنجیدگی سے اس کی شکل دیکھتا رہا پھر آہستہ سے بولا۔

”جسہیں ایک بات بتاؤں استاد!“

استاد نے زبان سے کچھ نہیں کہا اور منتظر نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”میرے والد ایک اچھی پوسٹ پر ہیں اور اختیار رکھتے ہیں کہ اپنی اصل کمائی سے بہت زیادہ ”اوپر“ کی کمائی کر سکیں لیکن میری امی نے انہیں پابند کیا ہوا ہے کہ جیسے وہ ہمیں سہولیات و تعیشات کی فراہمی میں کمی کر دیں لیکن گھر میں حرام کا ایک دھیلا نہ لے کر آئیں۔ میرے والد بڑی مشکل سے کچھ میں دامن بچا بچا کر چلتے ہیں اور الحمد للہ ہمارے گھر کے تمام اخراجات بخوبی پورے ہو رہے ہیں۔ میں اپنے بھائی اور بہن کے مقابلے میں ذرا ایسے شوق رکھنے والا بندہ ہوں جن کی تکمیل کے لیے ابو کی چادر تنگ پڑتی ہے تو میں ان پر برڈن نہیں ڈالتا اور اپنی ٹف روٹین میں سے وقت نکال کر ایک اچھے گھرانے کے بچوں کو ٹیوشن دیتا ہوں۔“ معاذ اتنا کہہ کر ذرا دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔

”میں کچھ کچھ تیری بات کا مطلب سمجھ رہا ہوں۔ خاموش مت ہو، پوری بات بول۔“ استاد نے گھیر لہجے میں اس سے کہا۔

”زیادہ کیا بولوں۔ تم خود سوچو کہ جس بایک، سو بایک اور والد کو بچانے کے لیے میں اپنی جان کی بازی لگا کر مسلح افراد سے بھڑ گیا تھا، وہ میں نے کتنی مشقت سے خریدے ہوں گے اور وہ سارے لوگ جو ہر روز اس شہر کی سڑکوں پر

رشوت میں نذر کیے ہیں۔" وہ لاک اپ کے کھلے دروازے سے قدم باہر رکھ رہا تھا کہ اپنے عقب سے استاد کی طنزیہ آواز سن کر ٹھٹکا۔

"چل جیسے بھی سہی، پر مجھے خوشی ہے کہ تجھے تھانے میں وہ رواجی رات نہیں گزارنی پڑی جسے گزارنے کے بعد حق حلال کی کمائی کو بھول کر بندہ گلو استاد بننے کی راہ پر قدم رکھ دیتا ہے۔" اب استاد کے لہجے میں غلوں کا مذاق تھا۔ معاذ نے پلٹ کر لمبی روشنی میں عجیب و غریب شخصیت کے حامل گلو استاد کا چہرہ دیکھا اور بے ساختہ ہی ہاتھ کو الوداعی انداز میں حرکت دے کر باہر نکل گیا۔

☆☆☆

ایس ایچ او کے کمرے میں ابو کے ساتھ سرصفات کو دیکھ کر وہ دنگ رہ گیا۔ سرصفات خوش اخلاقی سے ایس ایچ او کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھے جبکہ ابو کے سنجیدہ چہرے پر بے تحاشا پریشانی درج تھی۔ اسے دیکھ کر پل بھر کے لیے ان کی آنکھوں سے جذباتی کیفیت چھلکی پھر فوراً ہی انہوں نے چہرے پر بے رخی اور ناراضی کے تاثرات سجالیے۔

"یہ کیس جناب! آگیا آپ کا بندہ۔ آپ ایس پی صاحب کی سفارش ساتھ لائے تھے اس لیے آپ کا کام بن گیا ورنہ اس تیس مارخان کارواں رواں دہائی دیتا کہ آئندہ پولیس والوں سے متنازع نہیں لگائے گا۔" اس کی شکل دیکھتے ہی ایس ایچ او نے بڑک ماری۔

"بچہ ہے جناب! گرم خون ہے۔ جذبات میں حماقت کر گیا۔ آئندہ کے لیے ہم اسے سمجھا دیں گے۔" سر صفات نے ایس ایچ او کی سچ بات کا بھی خوش خلقی سے مسکرا کر جواب دیا پھر ان کے درمیان اسی قسم کے مزید دو تین جملوں کا تبادلہ ہوا اور اللہ اللہ کر کے تھانے سے رواجی عمل میں آئی۔

"اگر آپ کی اجازت ہو خاور صاحب تو میں چند منٹ معاذ سے بات کر لوں۔" باہر نکل کر سرصفات نے اس کے ابو سے درخواست کی تو وہ سر کو اثبات میں جنبش دیتے ہوئے اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔

"اس وقت تم صرف اور صرف اپنی خوش قسمتی کے باعث تھانے سے باہر ہو۔ یہ اتفاق ہے کہ اس تھانے کے ایس ایچ او کے خلاف پہلے سے ہی ایک کیس میں خلیہ انکوائری چل رہی تھی اور انکوائری کروانے والا ایس پی میرا اچھا دوست تھا۔ سوشل میڈیا پر تمہاری ویڈیو وائرل ہونے سے لے کر اپنے ایس پی دوست سے رابطے اور ایس ایچ او

سے معاملات طے پانے تک کتنے مراحل طے کیے گئے، ان کی تفصیل میں جانا بیکار ہے۔ اصل میں، میں تم سے صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ان چند گھنٹوں میں تمہارے والد بے پناہ پریشانی سے گزر رہے ہیں اور رد عمل میں تم سے سخت رویہ اپناتے تھے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ تم ان کی ہر طرح و ترس بات کو خاموشی سے سہہ لینا۔" اس کے والد کے دور چلے جانے کے بعد سرصفات نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے نرم لہجے میں اسے نصیحت کی۔

"میں خیال رکھوں گا سر! تھینک یو سوچ کر آپ نے میرے لیے اتنا کچھ کیا۔" معاذ نے ممنونیت کا اظہار کیا۔ تھانے میں گزر رہے پچھلے چند گھنٹے کسی بھیانک خواب کی طرح تھے اور وہ واقعی دلی طور پر ان کا شکر گزار تھا۔

"تم میرے اچھے شاگرد ہو اور میں جانتا ہوں کہ تم ایک اچھے کردار کے لڑکے ہو اس لیے مجھے لگا کہ تمہیں کسی ظلم کا شکار ہو کر ضائع نہیں ہونے دینا چاہیے۔ اس لیے میں نے وہ کیا جو میں کر سکتا تھا لیکن تمہارے والد نے بھی پتہ کم نہیں کیا ہے۔ حق حلال کی کمائی سے رشوت خوروں کی جبینیں بھرنے میں کتنی تکلیف ہوتی ہے، یہ میں جانتا ہوں لیکن اولاد کے لیے انسان بہت کچھ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔"

"میں سب سمجھتا ہوں سر اور یہ بھی جانتا ہوں کہ مجھ سے لاکھ اخلاقات کے باوجود میرے ابو مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔" معاذ دھیرے سے مسکرایا۔

"اچھا تو اب ایک بات اور جان لو۔ میں اگلے ہفتے بیرون ملک منتقل ہو رہا ہوں اس لیے آئندہ اس قسم کی حماقت کرتے ہوئے یاد رکھنا کہ کم از کم میں تو تمہاری۔ مدد کے لیے کچھ نہیں کر سکیوں گا۔" انہوں نے ہلکے پھلکے انداز میں اسے تنبیہ کی۔

"اللہ بڑا سبب الاسباب ہے سر۔ وہ کوئی اور انتظام کر دے گا۔" اس کی مسکراہٹ میں شرارت تھی۔

"سنجیدگی کر لڑکے ورنہ مجھے یقین ہے کہ تمہارے والد صاحب تمہیں نہیں بخشیں گے۔" انہوں نے مزید کوئی نصیحت کرنے کے بجائے خود بھی ہلکا پھلکا انداز اپنایا اور اس کا شانہ تھپکتے ہوئے اشارہ کیا کہ اب وہ وہاں سے روانہ ہو جائے۔ ذرا دیر میں وہ ابو کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھا گھر کی طرف جا رہا تھا۔ راستے بھر ابو نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ جوان کی طرف سے سخت غصے کے اظہار کا خنجر تھا، ان کی خاموشی کو غنیمت جان کر چپکا بیٹھا رہا۔ گھر پہنچے ہی سعیدہ بیگم اور علیہ نے اسے گھیر لیا۔

ہتھیلی کا وار کر کے معاذ کے مضروب شانے کا مزید بھروسہ نکالنے کی کوشش کی۔ وہ خاصی حد تک کامیاب بھی رہا اور اس کی ہتھیلی نے معاذ کے شانے کو چھو لیا لیکن اس بار معاذ نے بھی پھرتی کا مظاہرہ کیا اور اس کی کلائی پر ہاتھ ڈال دیا۔ مقابل کی کلائی پر اس کی گرفت آہنی تھی اور اسی آہنی گرفت کا کمال تھا کہ اس کے وار کی شدت اور زور درمیان میں ہی ٹوٹ گیا اور ہتھیلی کے شانے کو چھو لینے کے باوجود وہ معاذ کو خاص زک پہنچانے میں کامیاب نہیں رہا اور معاذ نے اس کی ٹی ہونی توجہ کا فائدہ اٹھا کر دائیں پاؤں سے اس کے گھٹنے پر زوردار ضرب لگائی۔ اس ضرب نے اس کے مقابل کو تڑپا کر رکھ دیا اور اس نے جھنجھلا کر اپنے سر سے معاذ کے چہرے پر زوردار ضرب لگانے کی کوشش کی۔ مگر معاذ نے بروقت اپنا بچاؤ نہ کر لیا ہوتا تو اس کی ناک کی ہڈی ٹوٹ جاتی۔ اب بھی اس کو سر پر بائیں جانب چوٹ لگی جو تکلیف دہ ہونے کے باوجود قابل برداشت تھی۔

اس نے اپنے مقابل کی کلائی ابھی تک نہیں چھوڑی تھی۔ چوٹ کھا کر اس نے مقابل کی کلائی کو زوردار جھٹکا دینے کے ساتھ ہی اس کے پیٹ میں اپنے گھٹنے کی ضرب لگائی۔ مقابل کے منہ سے اوغ کی آواز نکل گئی۔ بیک وقت جسم کے دو مختلف حصوں کو پہنچنے والی تکلیف نے اس کی مہارت کو ساتھ چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا تھا پھر بھی اس نے کوشش کی کہ اپنا آزاد ہاتھ استعمال کر کے معاذ کو نشانہ بنا سکے۔ اس بار اس نے معاذ کے اس ہاتھ پر کھڑی ہتھیلی کا وار کرنے کی کوشش کی تھی جس سے معاذ نے اس کی کلائی اپنی گرفت میں لے رکھی تھی۔ وہ اتنے غصے میں تھا کہ اگر اس کا بھرپور وار معاذ کے بازو پر لگ جاتا تو بازو کی ہڈی میں فریکچر ہو سکتا تھا۔ معاذ نے مقابل کی آنکھوں کی وحشت سے اس کے ارادے کو بھانپ لیا تھا چنانچہ بالکل اچانک اس کی کلائی پر اپنی گرفت ختم کر دی اور اس کے سینے پر ایک گھونسا رسید کر دیا۔ اچانک کلائی چھوڑ دیے جانے کی وجہ سے اس کا توازن پہلے ہی بگڑ چکا تھا۔ گھونسا کھا کر تو وہ خود کو سنبھال ہی نہیں سکا اور لڑکھڑا کر زمین پر جا گرا۔ معاذ اپنی جگہ سے اسے ہرنگ کی طرح اچھلا اور اس طرح اپنے مقابل کے نزدیک پہنچا کہ اس کا ایک ہمدرد زمین پر اور دوسرا زمین پر پڑے اپنے مقابل کے سینے پر تھا۔ یکدم ہی وہ جگہ بے تحاشا تالیوں کی آواز سے گونج اٹھی۔ اس نے جوش و خروش سے داد دینے والوں پر ایک اچھتی ہوئی نظر ڈالی اور اپنے مقابل کے سینے پر سے ہمدرد دوستانہ انداز میں اسے سہارا دینے

”معاذ..... میری جان اتم ٹھیک تو ہوتا؟ تمہارے ساتھ کچھ ہوا تو نہیں؟“ سعیدہ بیگم اسے ٹٹول ٹٹول کر دیکھنے کے ساتھ ساتھ آنسو بھی بہاتی رہیں۔ پولیس والوں کی تھوڑی بہت مار کے جو آثار اس کے وجود پر موجود تھے، وہی ان کو دکھ دینے کے لیے کافی تھے اس لیے معاذ نے ان کے سامنے کسی تکلیف کا اظہار نہیں کیا۔ ان کی اور علیہ کی آنکھوں سے ظاہر تھا کہ وہ دونوں مسلسل روتی رہی ہیں۔ سعد کا چہرہ بھی ستا ہوا تھا۔ وہ کچھ دیر ان لوگوں کی تسلی و تسفی کرواتا رہا۔ امی کے حکم پر سعد جو میڈیکل کاسٹوڈنٹ تھا، اس سے مرہم پٹی بھی کروالی اور پین کلرز بھی حلق سے نیچے اتار لیں لیکن ابو کے روتے پر جودل میں کھد بدمی، وہ اپنی جگہ تھی۔ وہ کسی بھی رد عمل کا اظہار کیے بغیر بالکل خاموشی سے ایک کرسی پر آنکھیں موندے بیٹھے ہوئے تھے۔

”ابو.....“ بالآخر اس سے برداشت نہیں ہوا اور ان کے قریب جا کر انہیں پکارا۔ اس کی پکار پر انہوں نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔ اس نے چاہا کہ ان سے کچھ کہے لیکن الفاظ نے ساتھ نہیں دیا۔

”اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو۔ میں اور تم دونوں جانتے ہیں کہ کچھ کہنا مستنابیکار ہے۔ نہ میں تمہیں سمجھ سکتا ہوں نہ تم اپنی روش چھوڑ کر میری بتائی راہ پر چل سکتے ہو تو پھر گفتگو کا فائدہ ہی کیا۔ ہاں جو باپ ہونے کے فرائض ہیں، وہ میں ادا کرتا رہوں گا۔“ ابو نے اس کی مشکل آسان کر دی اور وہ کچھ کہتے چلے گئے جو جی بر حقیقت تھا۔ اس پل معاذ کا دل چاہا کہ ان سے وعدہ کر لے کہ جو کچھ وہ اس سے چاہتے ہیں، وہ کرنے کو تیار ہے لیکن پھر رک گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی افتاد طبع ایسے کسی وعدے کی تحمل نہیں ہو سکتی۔

☆☆☆

وہ تقریباً اڑتا ہوا اس کی طرف آیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے دیکھنے والوں کو لگا کہ معاذ اس کو خود پر چھانے سے نہیں روک سکے گا لیکن معاذ کی پھرتی بے مثال تھی۔ وہ پھلی کی طرح تڑپ کر اپنی جگہ سے ہٹا اور برق کی سی رفتار سے اپنے بائیں ہاتھ کو گھما کر اس کے پہلو میں ضرب لگانے میں کامیاب ہو گیا۔ ضرب کھا کر اس کا مقابل ہلکا سا ڈگایا لیکن اس نے بھی بہت خوبصورتی سے خود کو سنبھالا اور پوری قوت کے ساتھ معاذ کے شانے پر اپنی کہنی کی ضرب لگانے میں کامیاب رہا۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ معاذ کا شانہ جھنجھٹا اٹھا اور لمحہ بھر کے لیے اس کا دھیان اپنے مقابل کی طرف سے ہٹ گیا۔ مقابل نے اس موقع کا پورا فائدہ اٹھایا اور کھڑی

کے لیے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ زمین پر پڑا اس کا مقابل جو شکست کی شرمندگی کی وجہ سے نظریں چرا رہا تھا، اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھامنے سے ہچکچایا تو اس نے خود ہی مزید جھک کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور ہلکا سا زور لگا کر اسے اٹھاتے ہوئے بولا۔

”کم آن یارا! اس جسٹ آگیم اور گیم میں ہار جیت تو چلتی رہتی ہے۔ تم نیکسٹ ٹائم مجھے ہرا دینا، حساب برابر ہو جائے گا۔“ اس بار اس شخص کو بھی اخلاقیات کا مظاہرہ کرنا پڑا اور وہ اپنے ہونٹوں پر ایک جھپٹی ہوئی سی مسکراہٹ لاتے ہوئے بولا۔

”نیکسٹ ٹائم کی نیکسٹ ٹائم دیکھی جائے گی۔ ابھی تو تم دیر ہو اور میں دل سے تمہیں کاگر چیلینج کہتا ہوں۔“ ممب وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو چکا تھا اور معاذ کے مقابل کھڑا ہوا تھا۔ قد کاٹھ میں وہ معاذ کے مقابلے میں زیادہ اچھا تھا۔ اس کا قد معاذ سے ایک انچ کے قریب زیادہ تھا اور جسم بھی زیادہ بھاری اور مضبوط محسوس ہو رہا تھا۔ شاید اپنی اس شاندار جسامت کی بنیاد پر ہی اس نے معاذ کو مقابلے کے لیے چیلنج کیا تھا اور اب اس کے سامنے شکست خوردہ کھڑا ہوا تھا۔

”میں نے تم سے کہا تھا نا عالم کہ معاذ بہت شاندار فائٹر ہے۔ تمہارے لیے اس سے جیتنا مشکل ہو گا لیکن تم مقابلے پر بند تھے۔“ ارد گرد کھڑے ہوئے افراد میں سے حنین آگے بڑھ کر آیا اور معاذ سے مقابلہ کرنے والے سے مخاطب ہو کر بولا۔ دوست کی فتح کی خوشی میں اس کا اپنا چہرہ جوش سے سرخ ہو رہا تھا اور صاف نظر آ رہا تھا کہ معاذ کی جیت نے اسے بے حد خوشی دی ہے۔

”جیتنا تو عالم سے بھی آسان نہیں تھا حنین۔ اسے شکست دینے میں مجھے دانتوں پینا آ گیا۔ یہ سچ سچ ایک زبردست فائٹر ہے اور اس طرح کے فائٹر سے جیتنے میں مہارت کے علاوہ لگ بھگ کام کرتی ہے۔ آج میری لگ اچھی تھی جو عالم آخری لمحات میں مجھ سے مار کھا گیا ورنہ اس کی جگہ میں بھی تمہیں زمین پر لینا دکھائی دے سکتا تھا۔“ معاذ نے کل کر عالم نامی اس لڑکے کی تعریف کی جس کو اس نے ابھی ابھی شکست سے دو چار کیا تھا۔ اس کے ان جملوں سے عالم کے چہرے کے جھپٹنے ہوئے تاثرات میں قدرے بہتری آئی لیکن حنین زبان سے کچھ کہے بغیر زیر لب اس طرح مسکرایا جیسے کہہ رہا ہو کہ دوست..... ہمیں سب حقیقت معلوم ہے، تم چاہے جتنی کبر نفسی سے کام لو لیکن تمہارے جوہر ہم سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ معاذ نے اس کی مسکراہٹ

میں جیسے اس مفہوم کو اچھی طرح سمجھا لیکن نظرا انداز کر کے عالم شاہ کی طرف متوجہ ہو گیا اور دوستانہ لہجے میں بولا۔ ”ایسا کرتے ہیں چل کر فریش ہو جاتے ہیں پھر لیج کریں گے۔ تم نے میری اچھی خاصی ورزش کروادی ہے اور مجھے بہت زوردار بھوک لگ رہی ہے۔ کیوں حنین! کھانا تو ریڑی ہے نا؟“ آخر میں وہ اپنے دوست سے مخاطب ہوا تھا۔ ”کھانا تو کب سے آیا رکھا ہے معاذ بھائی! بس مقابلہ ختم ہونے کا انتظار تھا۔ آپ لوگ فریش ہو کر آجائیں، اس دوران ہم کھانا لگواتے ہیں۔“ وہاں موجود افراد میں سے چار چھ لڑکے ان کے قریب آ کھڑے ہوئے تھے اور ان میں ہی سے ایک نے معاذ کے سوال کا جواب دیا تھا۔ ”ٹھیک ہے۔ ہمیں بس دس منٹ لگیں گے، تم لوگوں کو جوائن کرنے میں۔“ اس نے مطمئن ہو کر سر ہلایا اور عالم شاہ کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

”آ جاؤ یارا! ہم دونوں بھی ذرا انسانوں والے حلیے میں آجائیں۔“ عالم شاہ فوراً اس کے ساتھ چل پڑا۔ وہ دونوں اس وقت سیاہ ٹراؤزر اور سیاہ ہی چست بنیائیں ملبوس کیے ہوئے تھے اور اس لباس میں ان کے مضبوط ورزشی جسم نمایاں ہو رہے تھے۔ وہاں موجود لڑکوں میں سے بیشتر فنس کلب وغیرہ کے ممبر تھے اور اچھی شخصیت کے مالک تھے پھر بھی انہوں نے ان دونوں افراد کو رشک بھری نظروں سے دیکھا۔ وہ دونوں وہاں موجود افراد میں سے سب سے زیادہ خوبصورت اور مضبوط جسامت کے مالک تھے اور انہیں رشک بھری نظروں سے دیکھے جانے کا حق حاصل تھا۔ وہ دونوں نظروں سے اوجھل ہو گئے تو لڑکے بھی اپنے کام میں مصروف ہو گئے اور اسی کھل جگہ پر جہاں معاذ اور عالم کے درمیان مقابلہ منعقد ہوا تھا، دریاں اور چاندنیاں بچھا کر دسترخوان لگانے کا انتظام کرنے لگے۔ یہ جگہ ماضی کے ایک اچھے پہلوان بدر کو قائم کردہ اکھاڑا تھا لیکن ایسا اکھاڑا جہاں اب کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ پہلوان بدر کو ایک زمانے سے اپنی شغلی اور بیماری کی وجہ سے اکھاڑا چلانے کے لائق نہیں رہا تھا لیکن اپنے بیٹے سے بے پناہ محبت کی وجہ سے اس نے اکھاڑے سے مکمل دستبرداری بھی قبول نہیں کی تھی۔ یہاں اب بھی چند بھولے بھگے نوجوان آتے تھے اور پہلوان سے کچھ نہ کچھ سیکھ کر جاتے تھے لیکن ان نوجوانوں میں سے بھی بہت کم ہی ایسے تھے جو باقاعدہ پہلوان بننے کی خواہش رکھتے تھے۔ ان میں سے اکثریت ایسی تھی جو اپنی شخصیت کو ذرا زوردار اور قابل دیدیکھنا

بارد کے بارے میں علم ہوا تھا اور اس کی افتاد طبع اسے یہاں تک پہنچ لائی تھی۔ جوڈو کرانے وغیرہ اپنی جگہ تھے اور یہ روایتی فن اپنی جگہ جسے سیکھنے کے لیے اس کے پاس باقاعدہ وقت تو نہیں تھا لیکن وہ وقتاً فوقتاً بارد کے اکھاڑے کا چکر لگا رہتا تھا۔ عالم شاہ بھی تقریباً اسی جیسا بندہ تھا جو شوقیہ وہاں آتا رہتا تھا۔ معاذ تو پھر بھی اپنے نت نئے شوق پورے کرنے کے چکر میں اس طرف متوجہ ہوا تھا لیکن عالم شاہ کو تو لڑائی بھڑائی سے خصوصی دلچسپی تھی اور اس کا خیال تھا کہ وہ اس کام میں بے حد ماہر ہے۔ اس کا خیال ایسا کچھ غلط بھی نہیں تھا اور واقعی وہ بہت اچھا فائٹر تھا۔ معاذ اور اس کی آپس میں بہت زیادہ شناسائی نہیں تھی، بس کبھی کبھار ایک دوسرے سے سامنا ہو جاتا تھا اور دونوں کو ہی دوسرے لڑکوں کی زبانی ایک دوسرے کی تعریفیں سننے کو ملتی رہتی تھیں۔ معاذ تو اپنی بے نیاز طبیعت کی وجہ سے زیادہ توجہ نہیں دیتا تھا لیکن عالم کے لیے اس کی تعریفیں گویا چیلنج کی حیثیت اختیار کرتی جا رہی تھیں۔ اس نے وہ ایک بار بارد کی زبان سے بھی معاذ کی تعریف سنی تھی اور وہ جو خود کو بارد کا سب سے اچھا شاگرد سمجھتا تھا، اندر ہی اندر جزبہ ہو کر رہ جاتا تھا۔ اپنے اندر کی اس کیفیت کی وجہ سے ہی ایک دن وہ معاذ کو چیلنج دینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ معاذ کو مقابلے وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن سادھی لڑکے جوش میں آ گئے۔ ان لڑکوں میں معاذ کا ایک یونیورسٹی فیلو حسن بھی شامل تھا جس نے نہایت ہوشیاری سے اس مقابلے کے لیے ایک ایسا دن مقرر کیا جب پہلوان بارد کسی شادی میں شرکت کی غرض سے تین چار دنوں کے لیے گوجرانوالہ گیا ہوا تھا اور اپنے بھائی کو ہدایت کر کے گیا تھا کہ لڑکوں کو اس کی غیر موجودگی میں بھی وہاں آنے دیا جائے۔ معاذ اور عالم کے درمیان ہونے والے مقابلے میں طریقہ کار کی کوئی شرط نہیں تھی اور انہیں اجازت دی گئی تھی کہ وہ لڑتے ہوئے کوئی بھی تکنیک استعمال کر سکتے ہیں۔ بس انہیں ایک دوسرے کو زیر کرنا تھا اور معاذ عالم شاہ کو زیر کر کے یہ تابلہ جیت چکا تھا۔ لڑکوں نے آپس میں چندہ کر کے مقابلے کے بعد پُر تکلف کھانے کا انتظام کر رکھا تھا اور اب وہی کھانا دسترخوان پر لگایا جا رہا تھا۔ گرم گرم کھانا دسترخوان پر آتا شروع ہوا تو معاذ اور عالم شاہ بھی تازہ دم ہو کر واپس آ گئے۔

”واہ بھئی واہ! کیا زبردست خوشبو ہے۔ خوشبو سے بھوک اور بھی کھل گئی ہے۔“ عالم شاہ نے دسترخوان پر بیٹھتے ہوئے تبصرہ کیا۔

جانتی تھی اور ساتھ ہی یہ شوق بھی تھا کہ دو چار ایسے گراں اور داؤد سیکھ لیے جائیں کہ کسی سے مقابلے کی نوبت آنے پر اسے ٹھکست دینے میں آسانی رہے۔ بارد ان باتوں کو سمجھتا تھا لیکن پھر بھی اپنے پاس آنے والے کسی شخص کو مایوس نہیں کرتا تھا کہ شاید ان میں سے ہی فن کا کوئی سچا قدر دان نکل آئے۔ اسے اپنے فن سے بے پناہ محبت تھی اور وہ اسے نوجوان نسل میں منتقل کرنے کا شدید خواہش مند تھا۔ اللہ نے اسے زینہ اولاد سے محروم رکھا تھا ورنہ یقیناً وہ اپنے بیٹے کو اپنے سے بھی اونچا پہلوان بنانے کی کوشش کرتا، فی الحال اس نے ان شوقین لڑکوں پر ہی قناعت کی ہوئی تھی۔ کراچی جیسے شہر میں یہ آدمے ادھورے سے شاگرد بھی غنیمت تھے۔

بنیادی طور پر بارد گوجرانوالہ کا رہنے والا تھا اور اس نے ساری زندگی وہیں گزاری تھی۔ زندگی کے باقی سال بھی اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ وہیں گزارتا لیکن حالات کے آگے مجبور ہو گیا۔ بیٹیاں اس نے کم عمری میں بیاہ دی تھیں۔ کچھ سال قبل اس کی بیوی کا بھی انتقال ہو گیا اور تنہائی کا عذاب اکیلے سہتے سہتے مختلف بیماریوں نے گھیرنا شروع کر دیا۔ روزگار کے لیے اس کی دودھ دہی کی دکان بھی وہ دکان چلانا بھی اس کے لیے مشکل ہونے لگا تھا۔ ایسے میں اس کے چھوٹے بھائی قمر کی محبت نے جوش مارا اور وہ بڑے بھائی کو زبردستی اپنے ساتھ کراچی لے آیا۔ نوجوانی میں قمر کو بھی پہلوانی کا شوق تھا لیکن وہ ذرا ہوشیار نکلا۔ اس نے دیکھا کہ اس کام میں جان بہت کھپانی پڑتی ہے اور پیسا وغیرہ کچھ خاص نہیں ہے تو اس نے ہاتھ اٹھالیا اور ایک دوست کے پاس کراچی جا پہنچا۔ وہ دوست پیشے کے اعتبار سے باورچی تھا۔ اس کے ساتھ رہ کر قمر نے کام سیکھا اور اپنی ہوشیاری کے باعث بہت جلد الگ سے کام شروع کر دیا۔ آج اس کا اپنا بڑا پکوان ہاؤس تھا جہاں روزانہ آرڈر پر درجنوں کے حساب سے بریانی تھوڑے اور نہ جانے کن کن کھانوں کی دیکھیں تیار ہوتی تھیں۔ پکوان ہاؤس کے پیچھے ہی اس نے خالی پلاٹ کا ایک حصہ بڑے بھائی کے شوق کی تکمیل کے لیے مختص کر دیا تھا۔ یہ اور بات کہ اس حصے میں بھی اکثر خالی دیکیں، برتن دھونے کے شب اور کھانا پکانے سے متعلق دیگر سامان رکھا ہوا نظر آتا رہتا تھا لیکن بارد نے کبھی اس سلسلے میں چھوٹے بھائی سے شکایت نہیں کی تھی۔ اس کے برے حالات، میں چھوٹے بھائی نے اس کا جتنا خیال رکھا تھا اور رکھ رہا تھا فی زمانہ یہ بھی بہت تھا۔

معاذ کو اپنے کسی جاننے والے کے توسط سے پہلوان

”خوشبو ہی نہیں، ذائقہ بھی زبردست ہے عالم بھائی! آپ کھا کر تو دیکھیں۔“ کھانے کا انتظام کرنے والے لڑکوں میں سے ایک نے قدرے جوش سے گویا اطلاع دی۔

”اپنے قمر و پہلوان کے پکوان ہاؤس سے ہی تیار کروایا ہوگا کھانا؟“ قمر و نے پہلوانی ابتداء ہی میں چھوڑ دی تھی لیکن اپنے جے سے وہ اب بھی پہلوان ہی لگتا تھا اس لیے بدر و کے ساتھ ساتھ اسے بھی پہلوان ہی کہہ کر پکارا جاتا تھا۔

”کہیں اور سے کھانا پکوا کر اپنی شامت بلوانی تھی کیا۔ کھانا بھی دروازے پر ہی ضبط ہو جاتا اور ہم سب کے یہاں داخلے پر بھی پابندی لگ جاتی۔“ ایک لڑکے کے بے ساختگی سے کیے گئے اس تبصرے پر زوردار قہقہہ لگا۔ آج وہاں لڑکوں کی تعداد معمول سے زیادہ تھی۔ اکھاڑے میں آنے والے لڑکوں کی زبانی ان کے بار دوستوں کو بھی آج کے مقابلے کے بارے میں اطلاع مل گئی تھی اس لیے وہ بھی شوق شوق میں مقابلہ دیکھنے وہاں چلے آئے تھے۔ مقابلہ واقعی بہت زبردست اور خوبصورت ثابت ہوا تھا۔ تقریباً بیس منٹ تک جاری رہنے والے اس مقابلے میں دونوں فریقین نے جوڈو کے علاوہ پہلوانی کی بھی کئی تکنیکس کا مظاہرہ کیا تھا اور کافی مشکل سے مقابلہ اپنے انجام کو پہنچا تھا۔

مقابلے سے پہلے طے ہو چکا تھا کہ دونوں فریقین ایک دوسرے کو کوئی جان لیوا ضرب نہیں لگائیں گے اور نہ ہی چہرے کو نشانہ بنایا جائے گا۔ دونوں نے حتی الامکان ان باتوں کا خیال رکھا تھا، صرف آخری لمحات میں جھجلاہٹ کی کیفیت میں عالم شاہ نے معاذ کے چہرے پر اپنے سر سے ٹکر مارنے کی کوشش کی تھی لیکن معاذ خود کو بچانے میں کامیاب رہا تھا اور بعد میں بھی اس نے عالم شاہ کو اس کا یہ قاتل جتانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ خوشگوار اعزاز میں یوں ساتھ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے جیسے بہت گہرے دوست ہوں۔ اصل میں اس سے قبل ان کی ایک دوسرے سے کبھی سرسری سلام دعا سے زیادہ بات چیت نہیں ہوئی تھی اور آج جب وہ ایک دوسرے کے ساتھ تھے تو دونوں ہی کو محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے لیے اچھے دوست ثابت ہو سکتے تھے۔

”تم کیا کرتے ہو عالم! تمہاری عمر تو زیادہ معلوم نہیں ہوتی۔ میرے خیال میں ابھی تمہاری اسٹڈیز ہی چل رہی ہوگی۔“ کھانے کے دوران سب لوگ بہت معروف ہو گئے تھے تو معاذ نے عالم شاہ سے دریافت کیا۔

”نہیں یار! پڑھنا پڑھنا جتنا اپنے بس میں تھا پڑھ

لیا۔ اب تو بس باپ کے مال پر عیش کرتے پھرتے ہیں اور ایسے ہی کوئی نیا شغل پال لیتے ہیں۔“ اس نے ہاتھ سے اکھاڑے کے در و دیوار کی طرف اشارہ کیا۔

”باپ کے پاس تمہیں عیش کروانے کے لیے مال ہے، اس کا مطلب ہے کہ وہ کوئی ٹھیک ٹھاک قسم کی چیز ہوں گے۔“ معاذ نے فوراً ہی اعزاز دے لگایا۔

”زمیندار ہیں اور اتنی زمینوں کے مالک ہیں کہ میں نے بھی آج تک ڈھنگ سے ان زمینوں کو نہیں دیکھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ ہو کہ میرا زمینداری کی طرف زیادہ رجحان نہیں ہے اور یہ واحد چیز ہے جس کی وجہ سے اباجی مجھ سے ناراض رہتے ہیں لیکن ناراضی میں بھی ان کی عنایت و کرم میں کوئی کمی نہیں آتی۔ اب بھی میری فرمائش پر انہوں نے سال بھر سے مجھے کراچی بھیجا ہوا ہے۔ یہاں میرا ایک ٹیکسٹائل مل لگانے کا ارادہ ہے بلکہ سمجھوٹ لگ چکی ہے اور بس افتتاح باقی ہے۔ میں نے اباجی کو بڑی مشکل سے قائل کیا ہے کہ اب ہمیں زمینداری کے ساتھ ساتھ صنعت کاری میں بھی قسمت آزمائی چاہیے۔ وہ اپنی زمینوں کی آمدنی اور صوبائی سیٹ پر ہر بار کامیابی سے ہی کافی خوش رہتے ہیں لیکن میں نے انہیں سمجھایا کہ اتنی قاعدت پسندی اچھی نہیں، ذرا آمدنی کے دوسرے ذرائع پر بھی توجہ دینی چاہیے۔ انہیں شاید اپنا سرمایہ ڈوبنے کا ڈر ہو لیکن اٹکوتے بیٹے کی فرمائش بھی رد نہیں کر سکتے تھے اس لیے راضی ہو گئے۔ انہوں نے میرے لیے ایک تجربہ کار ٹیم کا بھی انتظام کر دیا ہے جس نے مل لگانے کا سارا بوجھ خود سنبھال رکھا ہے، میں بس بھی بھی اپنے مالکانہ حقوق جتانے کے لیے چکر لگاتا ہوں۔ اتنا تو مجھے بھی معلوم ہے کہ ملازمین پر تھوڑی نظر بھی رکھنی پڑتی ہے ورنہ جو سب سے زیادہ بھروسے کا بندہ ہو، وہی سب سے بڑا دھوکا بھی دیتا ہے۔“ عالم شاہ نے اس کے سوال کا بڑا تفصیلی جواب دیا۔

”مطلب تم خاصی ادھی شے ہو۔ اس صورت میں تو تمہاری اس معمولی اکھاڑے پر موجودگی پر مجھے حیرت کا اظہار کرنا چاہیے۔“ معاذ نے مرغی کی ٹانگ کو اس کے انجام تک پہنچانے کے بعد پلیٹ میں رکھتے ہوئے تبصرہ کیا۔

”میں موڈی بندہ ہوں یار! قادیانہ اسٹار ہوٹل میں لچ اور ڈنر کرنے کی حیثیت رکھنے کے باوجود میرے جی میں آئے تو کسی تھرڈ کلاس ہوٹل یا ریڑھی والے سے بھی کھانا لے کر کھا سکتا ہوں۔“ عالم شاہ نے بے نیازی سے اسے اپنے بارے میں بتایا۔

اسٹینڈ سے لٹکے ہوئے تو لیے سے خشک کرتے ہوئے عالم شاہ نے بالکل سچائی سے اسے اپنے جذبات سے آگاہ کیا۔
 ”بس تو تم یقین رکھو کہ تمہارا دل تمہیں دھوکا نہیں دے رہا۔ دنیا میں دل کی گواہی سب سے مستحکم ہوتی ہے۔“ معاذ نے اس سے کہا اور اپنا دایاں ہاتھ مصافحے کے لیے اس کی طرف بڑھا دیا۔ عالم شاہ نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ سرعت سے تھام لیا اور پھر اس سے بھی زیادہ تیزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ معاذ نے بھی جواباً گرم جوشی کا مظاہرہ کیا۔ ان دونوں ہی کو نہیں معلوم تھا کہ آگے اس دوستی کو کہاں تک جانا ہے لیکن اس بات کو دونوں ہی نے محسوس کر لیا تھا کہ یہ دوستی بہت مضبوط بنیادوں پر قائم ہوئی ہے اور اس کے سچا ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔

☆☆☆

شوخ سی دھن پر سیٹی بجاتا ہوا وہ بہت مگن انداز میں اپنی بانٹیک دوڑا رہا تھا۔ آج چھٹی کا دن تھا اور حسین نے اس سمیت کچھ دوستوں کو اپنے گھر کھانے پر بلا رکھا تھا۔ حسین کا گھر شہر سے کچھ ہٹ کر آباد کی جانے والی ایک اچھی سوسائٹی میں تھا۔ یہ گھر ان لوگوں نے کچھ عرصہ قبل ہی خریدا تھا اور اصل میں آج کی دعوت اس گھر کی خوشی میں ہی تھی۔ شہر کے ہنگاموں سے ہٹ کر قائم کی گئی صاف ستھری اور پرسکون جگہ پر بنایا گیا گھر سب ہی کو بہت پسند آیا تھا۔ ساتھ ہی سب، پُر تکلف دعوت اور بے تکلف دوستوں کی کہانی سے بھی خوب لطف اندوز ہوئے تھے لہذا کھانے کے بعد بھی کافی دیر تک محفل جی رہی تھی۔ گھر کی دور دراز لوکیشن کی وجہ سے حسین نے جان کر انہیں دوپہر کے کھانے پر بلایا تھا تا کہ سب اطمینان سے انجوائے کر سکیں۔ وہ سب ہی اپنی اپنی سواریوں پر وہاں آئے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر کے پاس بانٹیکس تھیں اور صرف سردنامی ایک لڑکا اپنی سوڑو کی ایف ایکس میں آیا تھا۔ وہی اپنے ساتھ دو ایسے دوستوں کو بھی لے کر آگیا تھا جن کے پاس اپنی کوئی ذاتی سواری موجود نہیں تھی۔ جگہ اچھی اور پرسکون ہونے کے باوجود بہر حال اس علاقے میں کنوئیں کا مسئلہ تھا اور بہت کم پبلک ٹرانسپورٹ مل پاتی تھی۔ وہ سب شام کی چائے پینے کے بعد ایک ایک کر کے وہاں سے رخصت ہوئے تھے۔ معاذ سب سے آخر میں روانہ ہوا تھا۔ حسین نے بہت مشکل سے اسے اجازت دی تھی اور وہ اس تاخیر کی تلافی کے لیے شارٹ کٹ کا استعمال کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس وقت وہ جس زیر تعمیر ہاؤسنگ سوسائٹی کے قریب سے گزر رہا تھا، وہ بھی

”تم تو کافی حد تک اپنی کیٹگری کے بندے ہی لگتے ہو۔ یہ میں صرف مزاج کے اعتبار سے کہہ رہا ہوں ورنہ حیثیت میں تو خیر ہمارے درمیان زمین آسمان کا فرق ہے۔“ معاذ نے نہایت صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔
 ”دوستی میں ان باتوں کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ فائدے کے لیے بنائے گئے تعلقات اور دوستی میں یہی فرق ہوتا ہے کہ دوستوں میں ایک دوسرے کی حیثیت وغیرہ نہیں بلکہ خلوص دیکھا جاتا ہے اور مجھے تم مخلص آدمی دکھائی دیتے ہو اسی لیے میں تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا رہا ہوں۔“ عالم شاہ نے نہایت سادگی سے اسے دوستی کی پیشکش کر دی۔
 ”دوستی تو سمجھو اپنی ہو ہی چکی۔ میں تو ویسے بھی ذرا جلدی دوست بنالینے والا بندہ ہوں۔“ معاذ نے مسکراتے ہوئے اسے جواب دیا۔

”کمال ہے، اس دور میں بھی تم ایسا مزاج رکھتے ہو۔ یہ اتنی جلدی کسی پر اعتبار کر لینے کا دور تو نہیں ہے۔“ عالم نے حیرت کا اظہار کیا۔
 ”اعتبار میں دوسروں پر نہیں، خود پر کرتا ہوں۔ میں اپنی جانب سے بالکل مخلص ہوتا ہوں اس لیے مجھے یقین ہوتا ہے کہ جواب میں دوسرا بھی مجھ سے خلوص کا ہی مظاہرہ کرے گا۔ وہ نیوٹن کا تھرو لاء ہے ناکہ ہر عمل کا رد عمل تسو میں مخالف لیکن شدت میں برابر ہوتا ہے تو سمجھو میرے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔ میں جتنے خلوص سے کسی کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہوں، دوسری طرف سے بھی مجھے اتنا ہی خلوص ملتا ہے۔ کم از کم ابھی تک تو میں دوستی کے معاملے میں خوش قسمت ہی ثابت ہوا ہوں۔“ وہ دونوں باتوں کے دوران کھانے سے فارغ ہو چکے تھے اور اب ہاتھ دھونے کے لیے اس جانب جا رہے تھے جہاں واش بیسن لگے ہوئے تھے۔ کھانا عمدہ ہونے کے باوجود دونوں ہی نے ذرا ہاتھ زوٹ کر کھایا تھا۔

”سچ پوچھو تو یار میری تربیت مجھے تمہاری طرح کے نظریات رکھنے کی اجازت نہیں دیتی۔ میں جس بیک گراؤنڈ سے تعلق رکھتا ہوں وہاں آدمی کو جن کے روپ میں بھی دشمن کا سامنا ہو جاتا ہے۔ دولت اور جاگیر کے لیے سکے بھائیوں تک کا ایک دوسرے کی جان لے لینا معمول کی بات ہے، اس لیے مجھے سکھایا گیا ہے کہ کسی پر آسانی سے اعتبار نہ کرو لیکن تم میں کوئی ایسی بات ضرور ہے کہ دل خود بخود ہی تمہاری طرف مچ رہا ہے اور میرے اپنے اندر سے آواز آرہی ہے کہ تم بہت اچھے دوست ثابت ہو گے۔“ ہاتھ دھونے کے بعد

عام راستوں سے ذرا ہٹ کر قائم کی جا رہی تھی اور اس کا اندازہ تھا کہ اس راستے سے اس کا سفر جلدی طے ہو جائے گا۔ وہ ویسے ہی خوش باش رہنے والا لڑکا تھا اور دوستوں کی محفل میں شرکت نے مزاج پر مزید اچھا اثر ڈالا تھا اس لیے اس وقت بہت خوشگوار موڈ میں بائیک دوڑا رہا تھا۔ اس کے سامنے پھیلی قدرے ناہموار سڑک دور تک خالی پڑی ہوئی تھی اس لیے اس کی بائیک کی رفتار بہت تیز تھی۔ اس رفتار پر بائیک چلاتے ہوئے اس نے سڑک کے کنارے لگے درختوں کے جھنڈ سے براہِ آمد ہونے والے اس گلابی بگولے کو بالکل اچانک سڑک پر وارد ہوتے دیکھا تو ایک ثانیے کے لیے ذرا سا گڑبڑا گیا لیکن پھر بہت مہارت و مستعدی سے بائیک کو بریک لگانے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ رکتے ہوئے اس نے اپنے بہت قریب سے دہشت زدہ سی چیخ سنی۔ چیخ یقینی طور پر نسوانی تھی اور اب وہ خود بھی دیکھ سکتا تھا کہ گلابی رنگ کا وہ بگولا درحقیقت گلابی کپڑوں میں ملبوس ایک لڑکی تھی۔ لڑکی کے چہرے پر خوف زدہ سے تاثرات تھے جنہیں اول تو اس نے حادثے کے اندیشے کا ردِ عمل محسوس کیا اور خاصے خراب موڈ میں بولا۔

”محترمہ آپ کیا یہاں سو میٹر کی ریس کی مشق کرنے نکلی تھیں۔ آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ آپ کتنے معجزانہ طور پر حادثے سے بچتی ہیں۔ حادثہ ہو جاتا تو آپ کا تو جو ہوتا سو ہوتا، میں غریب بھی بیکار میں مارا جاتا اور تھانے کچہری کے چکر میں میری زندگی برباد.....“ وہ اپنی اس تقریر کو شاید مزید جاری رکھتا لیکن واحد سامع نے ہی میدان چھوڑ دیا۔ وہ لڑکی جو گھبراہٹ کے عالم میں سڑک پر گر چکی تھی، تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھی اور سڑک کی دوسری طرف درختوں کے جھنڈ کی طرف بھاگنے لگی۔ معاذ کی تیز حیات نے اسے غیر معمولی پن کا احساس دلایا اور اس نے رخ موڑ کر اس طرف دیکھا جہاں سے لڑکی نمودار ہوئی تھی۔ وہاں درختوں کے جھنڈ سے اب دو لڑکے نمودار ہو رہے تھے۔ ان کے چہروں پر وحشت تھی اور سانس پھولا ہوا تھا۔ معاذ نے ان لڑکوں کو شناخت کر لیا۔ وہ یونیورسٹی میں ہی پڑھتے تھے اور ان کا شمار ان لڑکوں میں ہوتا تھا جو پڑھتے کم اور تفریح و غنڈا گردی زیادہ کرتے تھے۔ ان کا تعلق تو پتا نہیں کس ڈیپارٹمنٹ سے تھا لیکن وقتاً فوقتاً ہر ڈیپارٹمنٹ کے چکر لگانا ان کے پسندیدہ مشاغل میں شامل تھا۔ اصل میں وہ دولت مند باپوں کی اولاد تھے اور سمجھتے تھے کہ باپ کی دولت کی صورت میں ان کا مستقبل محفوظ ہے اس لیے پڑھنے

بڑھانے میں جان کھانے کے بجائے موج میلے میں زیادہ دلچسپی لیتے تھے۔ دولت سے متاثر ہونے والی اور ان ہی جیسا مزاج رکھنے والی لڑکیوں کی ایک بڑی تعداد ان کے دوستوں کے حلقے میں شامل تھی البتہ شریف اور سنجیدہ مزاج لڑکیاں ان سے پہلو بچا کر نکلتی تھیں۔ اپنی ان صفات کی وجہ سے وہ لڑکے پوری یونیورسٹی میں مشہور اور جانے پہچانے تھے اس لیے معاذ نے بھی انہیں فوراً ہی پہچان لیا اور یہ بھی سمجھ گیا کہ ابھی جو لڑکی بگولے کی طرح سڑک پر نمودار ہوئی تھی اور اس کی بائیک سے نکلنے سے بال بال ہنسی تھی اس کے پیچھے بھی دونوں بلائیں لگی ہوئی تھیں۔ اسے حیرت اور تشویش دونوں نے بیک وقت گھیر لیا۔ اس ویرانے میں وہ لڑکی نہ جانے کیوں نکل آئی تھی اور اس کی خیریت سخت مشکوک نظر آرہی تھی۔ وہ دونوں جھنڈ سے نکلنے کے بعد اب سڑک پر پہنچ گئے تھے اور یقیناً انہیں بھی اندازہ تھا کہ لڑکی سڑک پار درختوں کے دوسرے جھنڈ میں گھس چکی ہے۔ معاذ کو بائیک سمیت سڑک پر رکے دیکھ کر وہ بھی ذرا سا ٹھٹھے تھے لیکن پھر گویا انہوں نے اسے نظر انداز کر دینے کا فیصلہ کر لیا اور بھاگتے ہوئے اس کے سامنے سے گزرنے لگے۔ معاذ نے بے اختیار ہی بائیک کا ہارن بجا کر انہیں اپنی طرف متوجہ کیا اور بہ آواز بلند بولا۔

”ایک بات سنیں بھائی جان! مجھے آپ لوگوں سے کچھ کہنا ہے۔“

”لیکن ہمیں کچھ نہیں سننا۔ خیریت چاہتے ہو تو یہاں سے دفعان ہو جاؤ۔“ بھاگتے ہوئے ان میں سے ایک نے پلٹ کر اسے جواب دینے کی مہلت نکالی اور اسی وجہ سے وہ اپنے ساتھی سے کچھ پیچھے رہ گیا۔

”بات تو آپ کو میری سنی پڑے گی کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ آپ کے ہاتھوں کسی معصوم لڑکی کی زندگی خراب ہو۔“ وہ بہت اطمینان سے اپنی بائیک اسٹینڈ پر کھڑی کر چکا تھا اور اب خود بھی اسی سمت بڑھ رہا تھا جہاں اس کا مخاطب موجود تھا۔

”تم ہوش میں تو ہو۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ یہاں سے دفع ہو جاؤ ورنہ بعد میں تمہارے گھر والوں کو تمہاری لاش بھی مشکل سے ملے گی۔“ وہ بری طرح غرایا۔

”میں ایسی دھمکیوں کے رعب میں نہیں آتا لیکن تمہیں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگر تم لوگ باز نہیں آئے تو تمہارے ہاتھ چیلروں کی ہڈیاں کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو سکتی ہیں۔“ معاذ نے خوف زدہ ہوئے بغیر اسے جواب دیا اور

چند فٹ کے فاصلے سے اس کے عین سامنے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑا ہو گیا۔ بے خوفی اور بے جگری اس کی فطرت کا حصہ تھی۔

”ابے او پھر کی اولاد تو مجھے یعنی سلطان کو دھکی دیتا ہے۔“ اس کے الفاظ نے مقابل کا دماغ گھما دیا اور وہ غصے سے کف اڑانے لگا۔ شدید غصے ہی کی کیفیت میں اس نے اپنا ہاتھ پیچھے کی طرف لے جا کر پینٹ میں اڑسا ہوا پسل باہر نکالنے کی کوشش کی، معاذ بھگتے ہوئے اس کے پاس پسل کی موجودگی سے پہلے ہی واقف ہو چکا تھا اور جانتا تھا کہ کسی بھی مرحلے پر وہ پسل نکال سکتا ہے اس لیے اس طرف سے پوری طرح ہوشیار تھا۔ جیسے ہی سلطان ہاتھ پیچھے کی طرف لے گیا، معاذ نے اپنی ٹانگ کو حرکت دی اور نیم دائرے میں گھومتی ہوئی اس کی ٹانگ اتنی زور سے سلطان کے پیلو میں لگی کہ وہ اپنے قدموں پر کھڑا نہیں رہ سکا اور اچھل کر کچھ دور جا گرا۔ اس کی انگلیوں کی گرفت میں صحیح طور پر نہ آنے والا پسل بھی اچھل کر دوسری طرف جا گرا۔

”تو تو حرام..... تیری یہ ہمت کہ تو نے سلطان پر ہاتھ اٹھایا۔ تیری تو میں نکال بونی کر دوں گا سالے۔“ وہ گرنے کے بعد پھرتی سے اٹھا اور کسی فلمی ولن کی طرح بڑکیں مارنے لگا اور مغلظات کا ایک طوفان اس کے منہ سے ابل پڑا۔ ہر وقت غنڈا گردی کے بل پر اپنی برتری قائم رکھنے والے کو یہ کیسے برداشت ہو سکتا تھا کہ کوئی اس کے کام میں دخل دے۔ وہ اور اس کے ساتھی تو خود کو کوئی بہت اونچی شے سمجھتے تھے جن کا خیال تھا کہ کسی میں ان کے مقابلے پر آنے کی ہمت ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ معاذ کو یاد آ گیا تھا کہ اس کے دوسرے ساتھی کا نام کامران تھا اور وہ کامی کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ تو وہ جو کامی تھا وہ بھی یقیناً معاذ کی دخل اندازی سے واقف تھا لیکن وہ اپنے دوست کی مدد کے لیے رکا نہیں تھا۔ یقیناً اسے اعتماد تھا کہ اس کا دوست اس صورت حال سے بخوبی نمٹ لے گا اس لیے اس نے لڑکی کے پیچھے جانا ہی مناسب سمجھا تھا۔ غیظ و غضب سے بھرا سلطان مغلظات بکنا ہوا کسی سائڈ کی طرح معاذ پر چڑھا آ رہا تھا۔ اس کی اتنی بکواس پر بھی معاذ کے چہرے پر اشتعال کی کوئی علامت نہیں ابھری تھی اور وہ بہت سکون سے سلطان پر نظریں مرکوز کیے کھڑا تھا۔

سائڈ کی طرح ذکر انا سلطان شاید پوری قوت سے اسے اپنے تربوز جیسے سر کی ٹکڑی مارنا چاہتا تھا۔ معاذ آخری لمحے تک اپنی جگہ جم رہا اور جب اس کے..... دور سلطان کے

درمیان صرف چند انچ کا فاصلہ رہ گیا تو وہ نہایت تیزی اور خوبصورتی سے اس کے سامنے سے ہٹ کر ایک سائڈ میں ہو گیا۔ سلطان اپنے ہی زور میں آگے لکھتا چلا گیا۔ اس موقع پر معاذ نے محاورے نہیں بلکہ حقیقتاً اپنی ٹانگ اڑادی، نتیجتاً سلطان کے متحرک جسم کو ایک زوردار جھکنا لگا اور وہ توازن کھو کر اس طرح چاروں شانے چٹ ہوا کہ اس کا منہ زمین سے جا لگا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے حلق سے ایک زوردار چیخ بلند ہوئی۔ معاذ نے اس چیخ کو خاطر میں لائے بغیر اسے ٹھوکروں میں رکھ لیا۔ جتنی بکواس سلطان نے کی تھی، ایسا نہیں تھا کہ وہ اس پر اثر انداز نہیں ہوئی تھی۔ اسے سلطان کی گندی زبان پر اندر سے بہت تپ چڑھی تھی لیکن بظاہر اس نے خود کو پرسکون رکھا تھا۔ وہ اس نکتے کو سمجھتا تھا کہ جذبات اور اشتعال میں آ کر فوری رد عمل کا اظہار کرنا اکثر نقصان کا سبب بنتا ہے اور صورت حال انسان کے قابو سے باہر ہو جاتی ہے۔ اب جبکہ صورت حال کافی حد تک اس کے قابو میں آچکی تھی۔ وہ اچھی طرح اپنی بھڑاس نکالنے کی کوشش کر رہا تھا اور سلطان کو اپنی ٹھوکروں پر رکھ لیا تھا۔

ہر ٹھوک پر بلبلاتے سلطان نے جب خود کو اس کے مقابلے میں کھڑے ہونے کے لائق نہ پایا تو بچوں کی طرح زور زور سے ”کامی، کامی“ پکارنے لگا۔ شاید اسے امید تھی کہ کامی آ کر اسے اس عذاب سے نجات دلا دے گا۔ معاذ پہلے ہی کامی کی آمد کی طرف سے بالکل بے فکر نہیں تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ اپنی ”مہم“ میں کامیاب یا ناکام ہو کر کامی بہر صورت اس طرف واپس آئے گا۔ اس لیے سلطان کی ”تواضع“ کرتے ہوئے اپنے گرد و پیش پر بھی نظر رکھے ہوئے تھا۔ سلطان نے یہ آواز بلند کامی کو پکارنا شروع کیا تو وہ مزید چوکنہ ہو گیا اور سب سے پہلے اس شور مچانے والے ڈبے کو خاموش کرنے کے لیے اس کی پیشانی پر پیر سے ایک نیلی تلی ٹھوک لگائی۔ ٹھوک کھاتے ہی سلطان کی آوازیوں بند ہوئی جیسے کسی سی ڈی پیئر کا ٹین آف کر دیا گیا ہو۔ وہ اپنی ساری جدوجہد اور مزاحمت سے نجات پا کر ایک لمحے میں ہی اٹھا غفلت ہو گیا۔ بے ہوشی کی حالت میں زمین پر پڑا وہ خاصا بھیا تک لگ رہا تھا۔ اس کے لمبے بال اور چوڑا چمکا چہرہ مٹی سے اٹ گئے تھے اور منہ سے خون نکل کر دونوں طرف کی بائچھوں سے بہہ رہا تھا۔ اس حلیے میں وہ کوئی آدم خور لگ رہا تھا لیکن ایسا آدم خور جس کے باہر کو نکلے ہوئے کھیلے اور لمبے دانت تو کجا عام اصلی دانت بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ زمین سے منہ ٹکرائے کے باعث اس کے آگے کے دو دانت ٹوٹ

ایک دردناک مردانہ آواز گونجی۔ معاذ نے آواز کی سمت دیکھا تو اسے کامران اپنی ٹانگ پکڑ کر زمین پر بیٹھا ہوا دکھائی دیا۔ وہ اتنا گھبرا گیا تھا کہ اس کے ہاتھ سے اس کا پتل بھی گر گیا تھا۔ فائر کس نے کیا وہ ابھی سوچ بھی نہیں پایا تھا کہ وہی گلابی بگولا ایک بار پھر درختوں کے جھنڈے سے برآمد ہوا۔

”وقت ضائع مت کرو اور جلدی یہاں سے نکلو۔“ معاذ کے قریب پہنچ کر اس نے بیجانی لہجے میں اس سے کہا تو وہ بھی تیزی سے حرکت میں آ گیا اور سڑک پر کھڑی اپنی بانیک تک پہنچ کر پھرتی سے اسے لگ لگائی۔ وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ بانیک اسٹارٹ ہوتے ہی اچک کر اس کے پیچھے بیٹھ گئی۔ وہ نازک سی، نرم و گداز جسامت رکھنے والی خوش شکل لڑکی تھی جس کے بھورے بال چھوٹی سی پونی ٹیل کی شکل میں بندھے ہوئے تھے لیکن اس وقت معاذ کو وہ کچھ خطرناک لڑکی لگ رہی تھی کیونکہ اس کے نرم، گلابی ہاتھوں میں ایک چھوٹا سا چھٹی نال والا پتل دبا ہوا تھا اور معاذ سمجھ سکتا تھا کہ کامران کی ٹانگ میں لگنے والی گولی اسی پتل سے چلائی گئی ہوگی۔ بہر حال وہ جس صورت حال میں پھنس گیا تھا، اس کا اب یہاں سے نکل جانا ہی مناسب تھا۔ لڑکی سے وہ آگے جا کر اپنی جان چھڑا سکتا تھا۔ لڑکی کے بیٹھتے ہی اس نے ایک جھٹکے سے بانیک آگے بڑھائی۔ اسی وقت اس نے اپنے بہت قریب سے فائر کی آواز سنی اور سمجھ گیا کہ یہ گولی بھی اس کے پیچھے بیٹھی ہوئی لڑکی نے چلائی ہے۔ تیز رفتاری سے بانیک چلانے کے باوجود اس نے پیچھے مڑ کر لڑکی کی طرف دیکھا۔

”کچھ نہیں، بس ایسے ہی ڈرانے کے لیے ہوائی فائر کیا تھا۔ اس خبیث کامی کو اپنا پتل مل گیا تھا اور زخمی ہونے کے باوجود وہ ہم پر فائر کرنے کی فکر میں تھا۔ میرے گولی چلانے پر ڈر کر ایک بار پھر کسی درخت کے تنے کے پیچھے دیک گیا ہے۔“ وہ جو پہلے اسے خاصی خوف زدہ محسوس ہوئی تھی، اب کافی پرسکون محسوس ہو رہی تھی البتہ اس کے لہجے کا ہلکا سا ارتعاش بتا رہا تھا کہ ابھی وہ مکمل طور پر خوف کے حصار سے باہر نہیں آئی ہے۔ اس کا پتل بھی ہنوز اس کے ہاتھ میں تھا حالانکہ اب وہ لوگ جائے حادثہ سے کافی آگے نکل آئے تھے اور کوئی امکان نہیں تھا کہ اگر کامی اور سلطان کے پاس گاڑی بھی ہوئی تو وہ ان کے تعاقب میں آجائیں گے۔ سلطان بے ہوش پڑا تھا اور کامی کی ٹانگ میں گولی لگی تھی، ایسے میں تو انہیں اپنی مدد کے لیے بھی کسی کو بلانا پڑتا۔ وہ بھلا تعاقب کے چکر میں کیسے پڑ سکتے تھے۔

چکے تھے اور ہان ٹوٹے ہوئے دانتوں کی وجہ سے ہی اس کے منہ سے خون بہتا نظر آ رہا تھا۔

سلطان کی بے ہوشی کے بعد معاذ نے تیزی سے اپنے ارد گرد نظریں دوڑانا شروع کر دیں۔ سڑک اب بھی دور تک خالی پڑی ہوئی تھی۔ اس نے اپنی پوری توجہ درختوں کے اس جھنڈ کی طرف مبذول کر لی جس میں پہلے وہ لڑکی اور پھر کامران جا کر غائب ہو گئے تھے۔ سلطان کی پکار پر اگر کامران واپس پلٹ کر آتا تو یقیناً اسے اسی طرف سے آنا پڑتا لیکن کامران اس کی توقع کے برخلاف کچھ ہوشیار ثابت ہوا اور اندھا دھند بھاگتے ہوئے آنے کے بجائے درختوں کے جھنڈ میں ہی کہیں رک گیا۔ اس جگہ کے سناٹے اور اپنی حسیات کی تیزی کی وجہ سے ہی معاذ اس کے بھاگتے قدموں کی چاپ سینے میں کامیاب ہو سکا تھا اور اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ کامران کسی درخت کی آڑ میں رک چکا ہے۔ آخر ایک معمولی سے تحریک کے باعث اس نے کامران کو پالیا۔ خوفناک بات یہ تھی کہ اس کے ہاتھ میں لمبی نال والا ایک خاصا مہلک ہتھول موجود تھا اور وہ خود کو آڑ میں رکھتے ہوئے معاذ کو نشانہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ معاذ جس جگہ کھڑا تھا، وہاں اسے کوئی آڑ میسر نہیں تھی۔ نہ ہی اس کے پاس کوئی ہتھیار تھا۔ سلطان کا گر جانے والا پتل بھی خاصے فاصلے پر پڑا ہوا تھا اور وہ اتنی دور سے خالی ہاتھ کامران کا کچھ نہیں لگاؤ سکتا تھا۔ بس اس نے کچھ نہ کرنے کے مقابلے میں کچھ کرنا بہتر سمجھتے ہوئے اس جانب چھلانگ لگائی جہاں سلطان کا پتل گرا ہوا تھا۔ اس کی یہ حرکت اس کے لیے بابرکت ثابت ہوئی۔ وہ جس لمحے قلابازی کھا کر پتل تک رسائی کی کوشش کر رہا تھا، فضا میں یکے بعد دیگرے دو دھماکے گونجنے اور گولیاں شاخیں شاخیں کرتی ہوئی عین اس جگہ سے گزریں جہاں کچھ دیر قبل وہ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے سلطان کا پتل اپنے قبضے میں لے کر خود بھی اس طرف ایک فائر جھونک دیا جس جگہ اس نے کامران کو چھپا ہوا دیکھا تھا لیکن اس کا فائر بھی بے سود ثابت ہوا۔ کامران کو موٹے تنے کے درخت کی آڑ میسر تھی اس لیے کوئی اس تک رسائی حاصل نہیں کر سکی۔ معاذ مکمل جگہ پر مستقل ایک جگہ ٹکے رہنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا چنانچہ ایک بار پھر اس نے تیزی سے اپنی جگہ بدلنے کے لیے خود کو حرکت دی۔ اسی وقت اس کے کانوں نے ایک اور دھماکے کی آواز سنی لیکن یہ دھماکا پہلے دھماکوں کی بہ نسبت کچھ ہلکا تھا۔ لگتا تھا جھوٹے کیلیبر کا ہتھیار استعمال ہوا ہے۔ اس دھماکے کے ساتھ ہی فضا میں

ہیں۔“ لڑکی کے گفتہ انداز پر معاذ کی حس ظرافت بھی پھڑک اٹھی اور اس نے شوخ سے کچھ میں تبصرہ کیا۔ اس تبصرے کو سن کر لڑکی ہنس پڑی پھر یکدم سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔

”بات کچھ ایسی ہی ہے معاذ صاحب! ہمارے معاشرے سے بہادر، جرأت مند اور اعلیٰ اخلاقی اقدار رکھنے والے لوگ معدوم ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اب کوئی کسی کو مصیبت میں دیکھتا ہے تو اس کی مدد کے لیے نہیں رکتا مگر آپ رکے تھے تو میرے حساب سے آپ واقعی ایک قابلِ قدر رشتہ ہیں۔“

”میں کیا ہوں اور کیا نہیں اس بات کو چھوڑیے لیکن میں اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ لوگوں کا عمومی رویہ ایک ایسے ہی سببی، بہر حال غیر فطری نہیں ہے۔ دن بدن بگڑتے حالات نے لوگوں کو دہشت زدہ کر دیا ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ کسی کے معاملے میں دخل دینے سے ان کی اپنی جان کے لالے بڑھ سکتے ہیں اس لیے ہر شریف آدمی کی کوشش ہوتی ہے کہ آنکھ کان لپیٹ کر رکھے اور خود کو محدود کر کے بیوی بچوں کے ساتھ باعزت اور پرسکون زندگی گزار سکے۔“

”شاید آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔“ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے معاذ کے ساتھ اتفاق کیا۔

”آپ میرا نام کیسے جانتی ہیں؟“ معاذ کو یاد تھا کہ اس نے ابھی اسے اس کے نام سے مخاطب کیا تھا، اس لیے موقع ملتے ہی اس سے دریافت کیا۔

”آپ یونیورسٹی کے ان نمایاں اسٹوڈنٹس میں سے ہیں جنہیں مجھ سمیت بہت سے لوگ ویسے ہی اچھی طرح جانتے ہیں۔ جو نہیں بھی جانتے ہوں گے، وہ پولیس سے ہونے والے آپ کے ٹاکرے کی ویڈیو وائرل ہونے کے بعد اچھی طرح آپ کو جان چکے ہوں گے، اس لیے میرے خیال میں آپ کا یہ سوال بالکل بے مقصد ہے۔“ اس نے ایسے انداز میں جواب دیا کہ معاذ جھینپ سا گیا۔ اس کی وہ ویڈیو تو واقعی بہت مقبول ہوئی تھی اور لوگ اسے اکثر اس کا حوالہ دیتے رہتے تھے حالانکہ وہ خود اس واقعے کو بھول جانا چاہتا تھا۔ تھانے میں گزری اس تکلیف دہ رات میں لالہ عیسیٰ کے خاص آدمی گلو استاد اور اس کے چیلوں سے ہونے والی ملاقات، ابو کی دی ہوئی رشوت اور سرصفات کی سفارش کے نتیجے میں ملنے والی رہائی میں سے کچھ بھی ایسا خوشگوار نہیں تھا جسے وہ یاد رکھنا چاہتا ہو۔

”ویسے میرا تعلق آپ ہی کے ڈیپارٹمنٹ سے ہے بس میں آپ سے جونیئر اور کچھ غیر نمایاں سی لڑکی ہوں اس لیے

”محترمہ! بہتر ہوگا کہ آپ اپنے اس مسئلے کی نمائش بند کر کے اسے کہیں چھپالیں ورنہ اگر کسی پولیس موبائل سے ٹاکرا ہو گیا تو سرعام اسلحے کی نمائش پر ہم دھڑلے جائیں گے۔“

”وہ جو بڑی بڑی خطرناک کہیں لے کر سرعام شہر میں دہماتے پھرتے ہیں، انہیں تو پولیس کچھ نہیں کہتی اور میرے اس چھوٹے سے معصوم مسئلے پر جس کا میرے پاس لائسنس بھی موجود ہے، اس کے لیے پولیس ہمیں دھڑلے گی؟ یہ تو کوئی بات نہیں ہے۔“ معاذ کی ہدایت پر اس نے گویا برا ماننے ہوئے کچھ میں کہا لیکن مسئلے بہر حال اس نے اپنی گلابی قمیص کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر کہیں ”چھپر“ کر دیا تھا۔

”ان بڑی بڑی گتوں والوں کو پولیس اس لیے کچھ نہیں کہتی کہ جن کے ہاتھ میں وہ گتیں ہوتی ہیں، انہیں بڑے بڑے لوگوں کی آشریاد حاصل ہوتی ہے اور ان بڑے لوگوں کے خلاف منہ سے بھاپ نکالنے میں بھی پولیس والوں کے پر جلتے ہیں لیکن آپ اپنے چھوٹے سے مسئلے کو اتنا معصوم اور بے ضرر بھی قرار نہ دیں۔ اس مسئلے سے نکلنے والی چندالچ کی گولی نے اچھے بھلے چھٹ کے آدمی کو ناکارہ بنایا ہے اور وہ بے چارہ اب بھی اس ویرانے میں پڑا ہائے دائے کر رہا ہوگا۔“ وہ کافی آگے آگے تھے اس لیے معاذ نے بانیٹ کی رفتار کم کر دی تھی اور بہت سادہ سے انداز میں اس کے اعتراض کا جواب دے رہا تھا۔ خود وہ سلطان کا مسئلے ایک گڑھے میں اچھال چکا تھا۔

”گولی تو مجھے آپ کی وجہ سے چلانی پڑی تھی۔ اگر میں اس کی ٹانگ میں گولی نہیں مارتی تو وہ آپ کو گولی مار چکا ہوتا اور ظاہر ہے میں آپ کو خاموشی سے گولی کا نشانہ بننے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ میرے خیال میں آج کے دور میں بھی دل میں جذبہ ہمدردی رکھنے اور مشکل وقت میں کسی کے کام آنے والے شخص کے ساتھ اتنا برا نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ آج کل ایسے لوگ کیا ہو گئے ہیں اور جتنے بچے ہیں، انہیں اتنی آسانی سے ضائع نہیں ہونے دینا چاہیے۔“ وہ اب مکمل طور پر خوف کے حصار سے نکل آئی تھی اور بڑی شکستگی سے معاذ کو اپنے گولی چلانے کی وجہ سے آگاہ کر رہی تھی۔

”آپ جس انداز میں میرے بارے میں بات کر رہی ہیں، اس سے مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ میں کوئی کالا غزال یا سرخ زریں وغیرہ کے قبیلے کا فرد ہوں جس کی نسل معدوم کے خطرے سے دوچار ہے اور جس کے تحفظ کے لیے حکمران جنگی حیات کو خصوصی اقدامات کرنے پڑ رہے

اسے خیال آیا تھا کہ شاید اس نے یہ چہرہ یونیورسٹی میں ہی دیکھا تھا لیکن بہر حال وہ ان شناسا چہروں میں سے نہیں تھی جنہیں وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ وہیں رک کر اس کا انتظار کرے گا۔ اس لڑکی کے لیے اس کے دل میں تجسس پیدا ہو گیا تھا۔ کمال کی بات یہ تھی کہ وہ اسے اتنی خطرناک صورت حال سے نکال کر لایا تھا اور وہ اتنی دیر تک اس کے پیچھے بائیک پر بیٹھ کر اس سے اچھی خاصی گفتگو کرتی رہی تھی اور ابھی تک اسے اس لڑکی کا نام بھی معلوم نہیں تھا۔ تجسس نے اسے لڑکی کے انتظار میں وہاں رکے رہنے پر مجبور کر دیا۔ انتظار کے اس عرصے میں اس نے گھرنوں کر کے اطلاع دے دی کہ وہ حسین کے گھر سے واپس آ چکا ہے اور ایک دوست کے ساتھ ہے، اس لیے ممکن ہے کہ اسے گھر پہنچنے میں کچھ تاخیر ہو جائے۔ روایتی ماؤں کی طرح سحیدہ بیگم بھی اپنی اولاد کی طرف سے از حد فکر مند رہا کرتی تھیں اور ان کی خواہش ہوتی تھی کہ ان کے تینوں بچے وقت مقررہ پر گھر واپس آجائیں اور یہ ممکن نہ ہو سکے تو کم از کم انہیں اطلاع ضرور دے دیں کہ وہ کہاں مصروف ہیں اور کتنی دیر سے واپس آئیں گے۔

اسے پولیس اسٹیشن کے باہر اپنے اندازے سے کچھ کم وقت انتظار کی زحمت اٹھانا پڑی اور وہ لڑکی باہر آتی دکھائی دی۔ پولیس اسٹیشن کے گیٹ سے خود تک کا درمیانی فاصلہ طے کرنے کے دوران اسے لڑکی کا بھرپور جائزہ لینے کا موقع مل گیا۔ اس نے ہلکی اور گہری گلابی لائٹوں والی گھٹنوں سے ذرا اونچی اوپن شرٹ اسٹائل کی ٹیٹس پہنی ہوئی تھی جس کے ساتھ قدرے چست ہلکے گلابی رنگ کا ٹراؤزر تھا۔ باقاعدہ دوپٹے کی جگہ اس نے گلے میں گلابی منظر سا پہن رکھا تھا جس کو گرہ لگی ہوئی تھی اور شاید اسی وجہ سے وہ بھاگ دوڑ کے دوران کہیں گرا نہیں تھا۔ پیروں میں اس نے کیونس شوز پہن رکھے تھے جن کی وجہ سے یقیناً اسے تیز رفتاری سے بھاگنے میں آسانی رہی ہوگی، اس وقت بہر حال وہ بہت اطمینان سے اپنے تلمے قدم اٹھاتی ہوئی اس کی طرف آرہی تھی۔ طے کے دوران اس کے بھورے بالوں کی پونی ٹیل ایک روٹم سے دائیں بائیں جھول رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بھی بھوری تھیں اور بہت گوری رنگت کے ساتھ چمکے نقوش اسے خاصی خوبصورت لڑکیوں میں شمار کروانے کے لیے کافی تھے لیکن معاذ کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے حسن میں مشرقیت سے زیادہ مغربیت ہے۔ وہ مکمل طور پر بھی مغربی حسن کی مالک نہیں تھی۔ خصوصاً اس کی رنگت میں جو

آپ مجھے نہیں جانتے ہوں گے۔“ معاذ کے احساسات سے بے خبر وہ برجستہ لہجے میں اپنی گفتگو جاری رکھے ہوئے تھی۔

”اودہ تو آپ یونیورسٹی میں پڑھتی ہیں یعنی ان دونوں کو بھی جانتی ہوں گی۔“ معاذ کا اشارہ کامی اور سلطان کی طرف تھا۔

”جانتی تو ہوں لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ ان دونوں سے اس جگہ بڑبھڑ ہو جائے گی۔“ اس نے ماتھے پر آجانے والی ایک لٹ کو چٹکی میں پکڑ کر کان کے پیچھے اڑتے ہوئے جواب دیا۔ اب وہ شہر کی بارونق سڑکوں پر آچکے تھے اس لیے خوف کا معمولی سا بھی اثر باقی نہیں رہا تھا اور وہ بہت اطمینان سے گفتگو کر رہے تھے۔

”بائی دادے۔ آپ وہاں اس ویران سی جگہ پر کیا کر رہی تھیں؟“ اس بار معاذ نے بیک دیوڑھی میں اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی لیکن اسے کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ لڑکی اس کی اپنی پشت کے پیچھے تقریباً چھپی ہوئی تھی۔

”ذرا یہاں تھانے کے سامنے روک لیں۔ میں ایف آئی آر کٹوا کر ابھی آتی ہوں۔ اگر آپ اتنی دیر میرا انتظار کر سکیں تو میں آپ کے تمام سوالوں کے اطمینان بخش جواب دیے دوں گی۔“ پولیس اسٹیشن کی عمارت سامنے ہی نظر آرہی تھی جسے دیکھ کر اس نے معاذ سے فرمائش کی تھی۔

”آپ اس واقعے کی پولیس میں رپورٹ بھی کریں گی؟“ معاذ نے بائیک روک دی لیکن حیرت کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکا۔ وہ ایک بندے کی ٹانگ میں گولی مار کر آرہی تھی اور ایف آئی آر کٹوانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ یہ کوئی کم حیرت کی بات نہیں تھی۔

”میں صرف اپنا پرس اور موبائل چھینے جانے کی ایف آئی آر کٹوانا چاہتی ہوں تاکہ بعد میں میرے لیے کوئی مسئلہ کھڑا نہ ہو سکے۔“ اس نے سنجیدگی سے معاذ کو جواب دیا اور خود اعتمادی سے قدم اٹھاتی ہوئی پولیس اسٹیشن کے گیٹ کی طرف بڑھنے لگی۔ معاذ کو اعتراف کرنا پڑا کہ وہ کوئی عام لڑکی نہیں ہے۔ وہ جانتا تھا کہ ہمارے ہاں کی عام خواتین تو اشد مجبوری کی حالت میں ہی تھانوں وغیرہ کی چار دیواری میں قدم رکھتی ہیں اور وہ بھی اکیلی بہت ہی کم اس طرف کا رخ کرتی ہیں۔ عموماً ان کے ساتھ کوئی مرد ضرور موجود ہوتا ہے لیکن وہ نہایت بے خونئی سے تنہا ایف آئی آر کٹوانے چلی گئی تھی۔ وہ اس کے قریب سے ہی گزر کر گئی تھی اس لیے اس نے اس کا چہرہ اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔ اس چہرے کے لیے اسے ہلکی سی شناسائی محسوس ہوئی تھی اور

کشش تھی، وہ مغربی عورتوں میں بہت کم پائی جاتی ہے۔
گو یا وہ جیسے مغرب اور مشرق کا ملاپ تھی۔

”میرے خیال میں ہم کچھ دیر کسی پارک وغیرہ میں بیٹھ کر بات کر لیتے ہیں۔ بایک پر بیٹھ کر چیخ کر باتیں کرنا مجھے زیادہ اچھا نہیں لگتا۔ ویسے بھی اب ہم بارونقی شہر میں موجود ہیں اور مجھے آپ کو زیادہ زحمت نہیں دینا چاہیے۔ یہاں سے اپنے گھر جانے کے لیے مجھے کوئی رکشا نیکی وغیرہ آرام سے مل جائے گی لیکن میں نہیں چاہتی کہ آپ کے ذہن میں کوئی الجھن رہ جائے اس لیے آپ کو یہ پیشکش کر رہی ہوں۔ یہاں قریب ہی ایک پارک ہے، آئیے وہاں چلتے ہیں۔“ اس نے کہا تو معاذ نے انکار نہیں کیا اور خاموشی سے بایک اشارت کر دی۔ وہ ایک بار پھر اچک کر اس کے پیچھے سوار ہو گئی۔ دو تین منٹ میں وہ لڑکی ہی کی راہنمائی میں اس قریبی پارک تک پہنچ چکے تھے۔ ابھی شام ڈھل چکی تھی لیکن پارک کی روشنیاں جل چکی تھیں۔ وہاں کافی رونق تھی اور بڑی تعداد میں بیچ پر بیٹھے ہوئے جوڑوں کے علاوہ بچے بھی نظر آ رہے تھے۔ انہیں ایک دور افتادہ گوشے میں خالی بیچ میسر آ سکی۔ وہ اسی پر ٹک گئے۔

”میرے خیال میں سب سے پہلے آپ مجھے اپنے نام سے آگاہ کر دیں۔ بڑا عجیب سا لگ رہا ہے کہ ہم اتنی دیر سے ایک دوسرے کے ساتھ ہیں لیکن مجھے ابھی تک آپ کا نام ہی معلوم نہیں ہے۔“ بیچ پر بیٹھے ہی معاذ نے اس سے فرمائش کی تو وہ ہنس دی۔ پھر بولی۔

”جس سچویشن میں ہماری ملاقات ہوئی اس میں تعارف کی گنجائش ہی کہاں تھی، بہر حال اب میں آپ کو بتا دیتی ہوں کہ میرا نام بشری گلزار ہے اور میرے والد گلزار عاصم ایک ممتاز صحافی ہیں۔“

”اوہ! انہیں تو میں نے کئی ٹاک شوز میں تبصرے اور تجزیے کرتے ہوئے دیکھا ہے۔“

”ضرور دیکھا ہوگا۔ وہ ایسے آدمی ہیں جو گھر پر کم اور چینلز پر زیادہ زیادہ نظر آتے ہیں۔ ان کے تجزیوں کو بہت مستند تصور کیا جاتا ہے اس لیے ہر اینکر کی خواہش ہوتی ہے کہ انہیں اپنے پروگرام میں ضرور شامل کرے۔ اب آپ کو معلوم ہی ہے کہ ہمارے ملک میں کتنے تھوک کے بھاؤئی وی چینلز کھل گئے ہیں اور ہر چینل سے ہفتے میں دسیوں ٹاک شوز پیش کیے جاتے ہیں۔ میرے والد صاحب ذرا بامروت قسم کے انسان ہیں اس لیے چھوٹے سے چھوٹے چینل کے عام سے اینکر تک کو انکار نہیں کرتے اور براہ راست پروگرام

میں شرکت کے لیے نہ بھی چاہئیں تو ٹیلی فون لائن پر ضرور ایسے لوگوں کو دستیاب ہو جاتے ہیں حالانکہ اس طرح خود ان کا بہت وقت ضائع ہوتا ہے اور انہیں اپنے کام انجام دینے کے لیے اکثر اپنی راتوں کی نیند بھی قربان کرنی پڑتی ہے لیکن ستم یہ ہے کہ لوگ اس پر بھی انہیں نہیں بخشتے اور نجی محفلوں میں ان پر یہ تبصرہ کیا جاتا ہے کہ گلزار عاصم صاحب کو شہرت کی چاٹ لگ گئی ہے اس لیے وہ ہر وقت ٹی وی کی اسکرین پر موجود رہتے ہیں۔“ اپنی بات کے اختتام پر اس نے ایک استہزائیہ قہقہہ لگایا لیکن اس قہقہے میں بھی بڑا ترنم اور دلکشی تھی۔ فوراً ہی قریب سے گزرتے لڑکوں میں سے ایک کی حس ظرافت پھڑکی اور وہ اپنی بھونڈی آواز میں گنگناٹے لگا۔

کوئی لڑکی ہے جب وہ ہنسی ہے
بارش ہوتی ہے چم چم چم چم
لڑکے کی اس حرکت پر معاذ نے غصے سے اس کی طرف گھور کر دیکھا۔

”رہنے دیجیے، اس پارک میں ذرا اس طرح کے جوڑوں کی آمد و رفت زیادہ ہے جو لوگوں سے چھپ چھپا کر گوشہ تنہائی میں ایک دوسرے سے ملنے آتے ہیں اور اس طرح کے منہلے ایسے جوڑوں کے ساتھ ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ کر کے اپنی تفریح کا بندوبست کر لیتے ہیں۔ یہ ایک بے ضرر سی ایکٹیوٹی ہے جس پر کوئی رد عمل دینا فضول ہے۔ ہمیں اس الگ تھلک بیچ پر بیٹھے دیکھ کر ان لڑکوں کو ہم پر ایسے ہی کسی جوڑے کا گمان ہوا ہوگا۔ بہر حال جانے دیں۔ میرے پاس میرا پرس نہیں تھا اس لیے میں نے مجبوراً کسی ریٹورنٹ کے بجائے آپ سے اس پارک میں چلنے کو کہا تھا ورنہ میں آپ کو ہرگز یہاں نہ لاتی۔“ معاذ کے رد عمل پر بشری نے اسے نرمی سے سمجھایا اور یہاں آنے کی وجہ بیان کی۔ اس دوران وہ لڑکے قہقہے لگاتے ہوئے آگے چلے گئے تھے۔

”مجھے اندازہ نہیں تھا ورنہ میں خود آپ کو ریٹورنٹ چلنے کی پیشکش کرتا۔ اپنے پرس کی غیر موجودگی پر آپ نے ایک غلط فیصلہ کر لیا۔ ہمارے معاشرے میں مرد کی موجودگی میں خواتین کے مل پے کرنے کو کچھ بدتہذیبی شمار کیا جاتا ہے اور میں اتنا بدتہذیب نہیں ہوں۔ خیر، اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ ہم یہاں سے اٹھ کر کسی ڈھنگ کی جگہ پر جا سکتے ہیں بلکہ چلے ہی ہیں۔“ وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

”پلیز بیٹھے معاذ! میں اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کی زیادہ پروا نہیں کرتی۔ وہ لڑکے کم عمر اور نا سمجھ تھے جو ایسی

چھیڑ چھاڑ کر گئے۔ دو مہینہ پور لوگوں کو ایسی باتوں پر رد عمل ظاہر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔“ اس کے سنجیدگی سے کہنے پر معاذ کو فسی آگئی اور وہ بغور اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

”باتیں تو تم ایسے کر رہی ہو جیسے خود ثانی اماں ہو حالانکہ میرے اندازے کے مطابق تمہاری اپنی عمر بھی بائیس سال کے آس پاس بلکہ شاید کچھ کم ہی ہوگی۔“ اس نے بالکل اچانک ہی آپ جناب کا تکلف چھوڑ دیا تھا۔

”میں طبعی نہیں، ذہنی عمر کی بات کر رہی تھی۔ مجھے معلوم ہے کہ ہم دونوں ہی ابھی نو جوانوں میں شمار ہوتے ہیں لیکن ہماری ذہنی پختگی اپنی عمر کے نو جوانوں سے کہیں زیادہ ہے اس لیے ہم ان کے مقابلے میں اپنے آپ کو بجا طور پر زیادہ مہجور تصور کر سکتے ہیں۔“ اس کی سنجیدگی میں ذرا فرق نہیں آیا اور معاذ کو تسلیم کرنا پڑا کہ واقعی وہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔

”اوکے۔ جو تم مناسب سمجھو۔ ہم یہیں بیٹھ کر بات کر لیتے ہیں۔“ وہ دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

”ہاں تو میں بتا رہی تھی کہ میرے والد گلزار عاصم صاحب ایک صحافی ہیں اور مجھ میں بھی اپنے والد کے صحافیانہ جراثیم پائے جاتے ہیں اس لیے ابھی اسٹوڈنٹ ہونے کے باوجود میں نے اس پر خار میدان میں قدم رکھ دیے ہیں۔ میں عام صحافی خواتین کی طرح اخبارات و رسائل کے خوبصورت پنے، آج کے فیشن، دسترخوان یا سچی آب و ہوا جیسے صفحات کے لیے تو لکھ نہیں سکتی تھی چنانچہ میں نے ان گنی جتنی صحافی خواتین کے نقش قدم پر چلنے کا فیصلہ کیا جو اہم مسائل پر لکھتی ہیں اور یہ لکھنا محض ٹیبل پر بیٹھ کر لکھنا نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے باقاعدہ فیلڈ ورک کیا جاتا ہے۔ جس ہاؤسنگ سوسائٹی کے قریب میرا آپ سے ٹکراؤ ہوا، اس کے بارے میں کچھ مشکوک سی افواہیں سننے میں آرہی تھیں۔ دو نمبر کام تو اس فیلڈ میں ویسے ہی ہوتا ہے لیکن اس زیر تعمیر ہاؤسنگ سوسائٹی کے بارے میں دس نمبری کی خبریں مل رہی تھیں۔ میں نے کچھ معلومات ادھر ادھر سے جمع کیں اور باقی کی تلاش میں خود اس جگہ جانے کا فیصلہ کیا۔ مجھے معلوم ہے کہ اس طرف ذرا کنوینس کا مسئلہ ہوتا ہے اس لیے میں نے اپنی ایک دوست کو اپنے پروگرام میں شامل کر لیا۔ میری اس دوست کو صحافت اور اس سے متعلق کاموں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور اس کی شمولیت بس اس حد تک تھی کہ وہ مجھے سوسائٹی کے سائٹ آفس کے قریب ڈراپ کر کے کچھ دور واقع ایک دوسری ہاؤسنگ سوسائٹی میں موجود اپنی خالہ کے

گھر چلی جائے گی اور جب میں اپنے کام سے فارغ ہو جاؤں گی تو وہ میرے کال کرنے پر مجھے پک کرنے آجائے گی۔ ہاؤسنگ سوسائٹی کے سائٹ آفس کے قریب میں اپنی دوست کی سلی کے لیے اتری تھی ورنہ میرا فوری طور پر وہاں جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں اپنا کام نمٹا کر آخر میں کسی سے ملاقات کرنا چاہتی تھی اس لیے سائٹ آفس سے کئی کترا کر آگے نکل گئی۔ میرے علم میں یہ بات تھی کہ اگرچہ تعمیر کا کام بہت تیزی سے ہو رہا ہے لیکن چھٹی کے دن وہاں کام نہیں ہوتا اس لیے مزدوروں وغیرہ سے سامنے کا کوئی خدشہ نہیں تھا۔ وہاں صرف چوکیدار کی موجودگی کی اطلاع تھی اور چوکیدار کے بارے میں بھی یہ معلوم ہوا تھا کہ وہ زیادہ تر گیٹ کے سامنے ہی کرسی ڈالے بیٹھا رہتا ہے۔ شاید باؤنڈری وال کی وجہ سے اطمینان ہوگا کہ کوئی اندر نہیں آئے گا لیکن میرے لیے دیواریں وغیرہ پھلانگ لینا کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ بچپن سے درختوں، چھتوں اور دیواروں پر چڑھنے کی بہت زیادہ پریکٹس ہے اس لیے وہاں بھی میں آرام سے دیوار پر چڑھ کر اندر کود گئی۔ پہلے میں نے لوگوں کے معائنے کے لیے تیار کردہ ماڈل بنگوز کا جائزہ لیا۔ وہ واقعی بہت شاندار تھا اور اس پر پینٹ وغیرہ بھی بہت عمدہ کوالٹی کا کیا گیا تھا۔ اس کے بعد میں نے دوسرے زیر تعمیر بنگوز کا رخ کیا اور کافی دیر وہاں مشرگشت کرنے کے بعد یہ جاننے میں کامیاب رہی کہ واقعی وہاں گڑبڑ ہے۔ عام سی نظر ڈالنے والے شخص کو اگرچہ زیر تعمیر بنگوز کو دیکھ کر بھی یہ گمان نہیں ہو سکتا کہ وہاں کیسا گھنٹا میٹر مل استعمال کیا جا رہا ہے لیکن بہر حال میں کھوج لگانے میں کامیاب رہی کہ وہاں تعمیر میں استعمال ہونے والا سریہ، سینٹ، لکڑی کچھ بھی اس اعلیٰ کوالٹی کا تو کیا جس کا اشتہارات میں شور کیا جا رہا ہے، درمیانے درجے کی کوالٹی کا بھی نہیں ہے اور بس یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ جن حصوں میں ماربل وغیرہ کا استعمال کیا جانا ہے، ان حصوں کو ماربل کے ذریعے اور باقی حصوں کو عمدہ پینٹ کی مدد سے چھپانے کا انتظام کر لیا جائے گا۔

”میں نے اپنے موبائل کی مدد سے ان سارے نقائص کی ویڈیو اور تصویریں وغیرہ تیار کر لی تھیں۔ میں اس کام میں اتنی مصروف تھی کہ مجھے وہاں کسی کی آمد کی خبر نہیں ہو سکی اور میں نے اتنی دیر میں آنے والوں کی آوازیں سنیں کہ میرے لیے ان کی نظروں میں آئے بغیر راہ فرار اختیار کرنا ممکن نہیں رہا۔ مجھے بس اتنی ہی مہلت ملی کہ میں نے اپنا موبائل سینٹ کی بور یوں کے پیچھے احتیاط سے چھپا دیا۔

”سلطان کا اس نے اپنے دوست کی حیثیت سے تعارف کروایا۔ میں ان کے ساتھ سائٹ آفس تک پہنچی تو میں نے دیکھا کہ اسے تالا لگا ہوا تھا۔ چھٹی کی وجہ سے وہاں بیٹھنے والا اسٹاف بھی نہیں آیا ہوگا۔ میں، کامی اور سلطان کو یونیورسٹی کے حوالے سے بھی جانتی تھی اور ایک لڑکی کی حیثیت سے بھی ان کی آنکھوں میں موجود شیطانی ارادوں کو پہچان سکتی تھی اس لیے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ ان کے ساتھ سائٹ آفس میں جا کر بیکار کی مشکل میں نہ پڑوں۔ میں نے ان سے کہا کہ فی الحال میں ان کی میزبانی کا لطف نہیں اٹھا سکتی کیونکہ میری دوست آنے والی ہوگی اور اس نے مجھ سے سڑک کے کنارے ہی کھڑے ہو کر انتظار کرنے کو کہا تھا۔ میں اگر وہاں نہیں پہنچی تو مجھے اور میری سہیلی دونوں کو پریشانی ہو جائے گی۔ میرے پاس موبائل بھی نہیں ہے کہ ہم ایک دوسرے سے رابطہ کر سکیں۔ میرا یہ بہانہ سن کر سلطان عجیب سے انداز میں بولا کہ یہ تو اور بھی اچھی بات ہے کہ میرا میری سہیلی سے رابطہ نہیں ہوگا۔ کامی جو آفس کا لاک کھول رہا تھا، وہ بھی ہنسنے لگا لیکن پھر اس نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے مجھے بہلانے کی کوشش کی اور بولا کہ اگر میں اپنی سہیلی کے ساتھ نہ بھی جاسکی تو وہ خود اپنی گاڑی میں مجھے میرے گھر چھوڑ دے گا۔ میں جانتی تھی کہ یہ سب مجھے دھوکا دینے والی باتیں ہیں اس لیے میں نے ایک بار پھر انکار کر دیا۔ میرے اس بار کے انکار پر سلطان فوراً اپنی اصلیت پر اتر آیا اور کامی سے بولا کہ فضول میں اس لڑکی سے مغز ماری کر کے وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں ہے جو کرتا ہے کر گزرتے ہیں۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی لیکن میں ہوشیار تھی اس لیے اسے غا دے کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ اسکول کے زمانے میں، میں گیمز میں پابندی سے حصہ لیتی تھی اس لیے بہت تیز رفتاری سے دوڑ سکتی ہوں۔ میری والدہ کو اپنے سخت مذہبی رجحان کی وجہ سے میرے اس طرح کے گیمز میں حصہ لینے پر شدید اعتراض نہ ہوتا تو شاید میں کھیلوں کی دنیا میں خاصا نام کمالتی۔ بہر حال عرصہ پہلے کی وہ ٹریننگ کام آئی اور میں بہت تیزی سے وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔

”پہلے ان دونوں نے مجھے آواز دے کر دھمکی دینے کی کوشش کی کہ اگر میں نہ رکی تو وہ مجھے گولی مار دیں گے۔ مجھے ان جیسے لڑکوں کے پاس ہتھیار کی موجودگی پر تو شک نہیں تھا لیکن یہ اندازہ تھا کہ جس مقصد کے لیے وہ مجھے روکنا چاہتے ہیں، گولی مارنے کی صورت میں وہ پورا نہیں ہو سکتا اس لیے

میں نے اسے اپنے پرس میں جان کر نہیں رکھا تھا۔ میری احتیاط میرے کام آئی۔ میں نے جن لوگوں کی آوازیں سنی تھیں، وہ کامی اور سلطان تھے۔ وہ مجھے وہاں دیکھ کر حیران رہ گئے اور سختی سے مجھ سے پوچھنے لگے کہ میں وہاں کیا کر رہی ہوں۔ میں نے انہیں یہی بتایا کہ میں کہیں اور جانے کے لیے اپنی ایک سہیلی کے ساتھ اس علاقے سے گزر رہی تھی۔ اس ہاؤسنگ سوسائٹی کا بورڈ نظر آیا تو اسے دیکھنے کے لیے بے قرار ہو گئی کیونکہ ٹی وی کمرشلز میں اسے دیکھ دیکھ کر مجھے ویسے ہی اسے دیکھنے کا بہت شوق ہو چکا تھا۔ میں نے اپنی سہیلی سے کہا کہ وہ مجھے یہیں اتار کر اپنی خالہ کے گھر چلی جائے اور مجھے بعد میں یہاں سے پک کر لے۔ میرے شوق کو دیکھتے ہوئے اسے مجبوراً مجھے یہاں اتارنا پڑا۔ میں نے یہ بھی بتایا کہ میری سہیلی کی خالہ بیمار ہیں اس لیے اس کا ان کے گھر جانا بہت ضروری تھا ورنہ وہ بھی میرے ساتھ ہی یہاں رک جاتی۔ میری اس کہانی پر شاید وہ بہت زیادہ مطمئن نہیں ہوئے اور سلطان نے میرے ہاتھ سے میرا پرس لے کر اس کی اچھی طرح تلاشی لی۔ پرس میں عام استعمال کی کچھ چیزیں اور پیسوں کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ موبائل میں چھپا چکی تھی اور پائل ہمیشہ اپنے گریبان کے اندر چھپا کر رکھتی ہوں تاکہ میری رسائی میں رہے۔ بابا کو معلوم ہے کہ میں کس انداز میں کام کرتی ہوں اس لیے انہوں نے خود حفاظتی کے لیے مجھے یہ پائل دے رکھا ہے۔ میرا نشانہ بھی کافی اچھا ہے لیکن پہلی بار یہ نوبت آئی ہے کہ میں نے اس پائل سے گولی چلائی ہو۔ بہر حال میں آپ کو بتا رہی تھی کہ سلطان نے میرے پرس کی تلاشی لی اور مجھ سے موبائل کے بارے میں پوچھنے لگا۔ میں نے اسے بتایا کہ میرے والدین بہت کنجوس ہیں اس لیے میں اس دور میں بھی ایک عدد موبائل سے محروم ہوں۔ میں نے ان کے سامنے دو چار مزید ایسی باتیں کیں کہ انہیں یقین ہو گیا کہ میں انتہائی کنجوس والدین کی ایسی بیٹی ہوں جو معمولی معمولی خواہشات کے لیے بھی ترستی رہتی ہے۔ وہ مجھ سے یہ بھی پوچھنا بھول گئے کہ گیٹ پر چوکیدار موجود ہونے کے باوجود میں اندر کیسے داخل ہوئی۔ انہوں نے نہایت خوش خلقی سے مجھے اپنے ساتھ آفس میں چل کر بیٹھنے کی پیشکش کی۔ میرے پاس ان کی بات ماننے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ اس لیے ان کے ساتھ چل پڑی۔ راستے میں کامی نے مجھے بتایا کہ یہ اس کے والد کا پروجیکٹ ہے اور وہ بھی کھار وہاں کا چکر لگاتا ہے۔

ہوسکتی ہوں اس لیے وہ مجھے نیچے ہی ڈھونڈتا رہا۔ میں اوپر بیٹھ کر سب دیکھ رہی تھی۔ آپ نے جس طرح سلطان کی درگت بنائی، یہ دیکھ کر مجھے بڑا حزرہ آیا لیکن جب اس گدھے نے ننھے بچوں کی طرح کامی کو پکارنا شروع کیا تو میں ہلرٹ ہو گئی۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ آپ نہتے تھے جبکہ ان دونوں کے ہی پاس ہتھیار موجود تھے۔ سلطان کو تو آپ نے اس کا پٹل استعمال کرنے کا موقع نہیں دیا تھا لیکن مجھے خدشہ تھا کہ آپ کی ریش میں نہ ہونے کی وجہ سے کامی آپ کو نشانہ بنا سکتا ہے۔ میں چپکے سے درخت سے نیچے اتر کر اس کے تنے کے پیچھے چھپ گئی۔ اس وقت کامی کا میری طرف بالکل بھی دھیان نہیں تھا اور وہ جوش میں سلطان کی پکار پر دوڑا جا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اس کا پٹل تھا اور میرے اندیشوں کے مطابق اس نے آپ کو نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی۔ آپ کے بچاؤ کے لیے مجبوراً مجھے اس کی ٹانگ پر گولی چلائی پڑی۔“ اس نے جیسے گولی چلانے کے سلسلے میں اپنی صفائی پیش کی۔

”اب تم اپنے موبائل فون کا کیا کرو گی، تمہاری اس مہم کا ”حاصل“ تو اسی موبائل میں موجود ہے۔ ہو سکتا ہے وہاں وہ مزدوروں یا پھر کسی دوسرے شخص کے ہاتھ لگ جائے۔ اس طرح تو تمہاری ساری محنت ضائع ہو جائے گی۔“ معاذ نے اس سے دریافت کیا۔

”موبائل میں نے سائیلنٹ پر رکھا ہوا تھا اور سینٹ کی بوریوں کے پیچھے بہت احتیاط سے چھپایا تھا اس لیے کسی کو اس کی وہاں موجودگی کا صرف اسی صورت میں علم ہو سکتا ہے کہ بوریوں کو وہاں سے ہٹایا جائے۔ موبائل جیسے بھی ملے وہ اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکے گا کیونکہ اس کا سکیورٹی لاک صرف میرے فنگر پرنٹ پر ہی کھل سکتا ہے۔ ویسے میں جلد از جلد اسے خود حاصل کرنے کی کوشش کروں گی۔ اس پروجیکٹ کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں میں نے کافی محنت کی ہے۔ موبائل میں موجود تصاویر اور ویڈیوز میری سابقہ معلومات کے ساتھ مل کر تھلکہ بجانے میں خاصا کردار ادا کر سکتی ہیں اس لیے میری اپنے موبائل تک رسائی ضروری ہے۔“ اس کے سوال کا جواب دینے کے ساتھ وہ اطمینان سے اپنے ارادے کا اظہار کر رہی تھی۔ معاذ کو اس پر رشک آیا لیکن چھیڑنے والے اعزاز میں بولا۔ ”تم لڑکی ہو یا کوئی بلا؟ وہاں تم نے اتنی مصیبت اٹھائی اور باقاعدہ ایک بندے کو گولی مار کر وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو سکی ہو پھر بھی دوبارہ وہاں جانے کا ارادہ

وہ حتیٰ لامکان مجھے گولی مارنے سے گریز کریں گے۔ میرا یہ اندازہ ٹھیک نکلا۔ انہوں نے مجھ پر فائر نہیں کیا اور مجھے پکڑنے کے لیے میرے پیچھے بھاگ کھڑے ہوئے۔ آپ کو شاید معلوم ہو کہ وہ ہاؤسنگ سوسائٹی سڑک سے بھی کچھ اندر کی طرف موجود ہے اور سڑک پر بس اس کے بینرز اور بورڈ وغیرہ ہی لگے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ میں بس اس امید پر بھاگی تھی کہ شاید کبھی کبھی وہاں سے گزرنے والی گاڑیوں میں سے کسی میں لفٹ لینے میں کامیاب ہو جاؤں دوسری صورت میں، میں اپنے لیے کوئی پتہ گاہ یا مورچا تلاش کرتی اور انہیں اپنے پاس پٹل کی موجودگی سے آگاہ کرتے ہوئے انہیں خود سے دور رہنے پر مجبور کر دیتی۔ ایک موبہوم سی امید تھی کہ اگر میں اپنی سہیلی کو فون نہیں کروں گی تو وہ خود آخر کار پریشان ہو کر مجھے ڈھونڈتی ہوئی وہاں آجائے گی۔ اس طرح کی صورت حال میں کچھ بھی یقینی تو ہوتا نہیں ہے، بس آدمی کو قسمت پر ہی انحصار کرنا پڑتا ہے۔ میں نے بس ایک بات طے کر لی تھی کہ مجھے ان کے گھناؤنے ارادوں کی تکمیل کے لیے ان کے ہاتھ کسی صورت نہیں لگنا ہے اور اپنے اس ارادے میں، میں اتنی پختہ تھی کہ مرنے اور مار دینے کے لیے بھی بالکل تیار تھی۔ وہ تو صورت حال ہی بالکل اچانک بدل گئی اور آپ وہاں آگئے اس لیے کامی کے گولی کھالینے کے باوجود ان دونوں کی جان پھر بھی بچ گئی۔“ اس نے اتنی روانی سے ساری تفصیل سنائی کہ معاذ کو درمیان میں کہیں دخل تک دینے کا موقع نہیں مل سکا۔ جب وہ چپ ہو گئی تب پوچھا۔

”تم نے اپنا مورچا کہاں بنایا تھا؟ میرے خیال میں تو کامی درختوں کے جھنڈ میں کافی آگے تک جا کر جھپس تلاش کرتا رہا تھا اور تم نے اسے اس وقت گولی ماری تھی جب وہ سلطان کی پکار پر واپس لوٹ کر آیا تھا۔“

”آپ کو یاد ہوگا کہ وہ مجھ سے خاصے پیچھے تھے۔ پھر آپ آگئے تو ذرا دیر وہ آپ سے الجھ گئے۔ میرے لیے اتنی مہلت کافی تھی۔ میں درختوں کے جھنڈ میں گھستے ہی پھرتی سے ایک گھنے درخت پر چڑھ گئی اور خود کو درخت کی گھنی شاخوں میں چھپا لیا۔ کامی سلطان سے زیادہ چالاک ہے اس لیے وہ زیادہ دیر آپ کے چکر میں نہیں پڑا تھا اور سلطان کو آپ کے ساتھ الجھا چھوڑ کر میرے پیچھے آنے کی کوشش کی تھی لیکن میں اس سے زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کرنے میں کامیاب رہی تھی۔ اچھی بات یہ ہوئی کہ اس کا اس طرف دھیان ہی نہیں گیا کہ میں درخت کے اوپر بھی

رکھتی ہو۔“

اپنی خالہ کے گھر سے کئی بار میرے موبائل پر کال کی لیکن بل جانے کے باوجود جب میں نے کال ریسیو نہیں کی تو وہ تھوڑی سی پریشان ہو گئی۔ اسے معلوم ہے کہ میرا موبائل اکثر سائیلنٹ پر رہتا ہے لیکن میں اس کی طرف سے اتنی غافل نہیں رہتی کہ کئی کالز آنے کے باوجود مجھے علم نہ ہو سکے۔ پھر بھی اس نے کچھ دیر انتظار کیا اور اس فکر میں رہی کہ یا تو میں اس کی کال ریسیو کر لوں یا از خود اس سے رابطہ کر لوں۔ جب دونوں ہی باتیں نہیں ہوئیں تو وہ اپنی خالہ کے گھر سے روانہ ہو گئی۔ وہ خود سیدھی سادی لڑکی ہے لیکن میرے بارے میں جانتی ہے کہ میں خاصی گڑبگڑا ہوں اس لیے میری تلاش میں نکلنے کے باوجود وہ خاصی محتاط تھی۔ ہاؤسنگ سوسائٹی والی سڑک پر اس نے ایسیو لینس اور پولیس کی ایک موبائل دیکھی تو ٹھٹک گئی اور گاڑی روک کر وہاں موجود ایک بندے سے پوچھا کہ کیا کوئی حادثہ ہو گیا ہے۔ اس بندے کو خود صحیح سے کچھ معلوم نہیں تھا، اس نے راحیلہ کو بتایا کہ شاید راہزنی کی کوئی واردات ہوئی ہے اور لٹیرے ایک لڑکے کو مار پیٹ کر اور ایک کو گولی مار کر بھاگ گئے ہیں۔ راحیلہ نے وہاں مزید رکنے میں خطرہ محسوس کیا اور گاڑی آگے نکال کر لے گئی۔ ایسے حالات میں وہ کچھ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی اس لیے خواخواہ خود کو مشکل میں نہیں ڈالا اور میرے والد صاحب کو فون کر کے انہیں حالات سے آگاہ کر دیا۔ اس وقت وہ حسب معمول ایک ٹاک شو میں حصہ لینے کے لیے ایک چینل کے اسٹوڈیو میں موجود تھے۔ راحیلہ کی کال ملنے کے بعد یقیناً پریشان ہوں گے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں ایک کال انہیں بھی کر لوں!“ ساری تفصیل سنانے کے بعد اس نے معاذ سے درخواست کی تو وہ انکار نہیں کر سکا اور اپنے ٹیلنس پر فاتحہ پڑھتے ہوئے موبائل اسے تھما دیا۔ اس کے خدشات کے برخلاف اس بار اس نے بہت مختصر گفتگو کی اور صرف اپنے والد کو اپنی خیریت کی اطلاع دینے پر ہی اکتفا کیا۔

”بابا بہت بال کی کھال نکالتے ہیں اس لیے میں نے خود ہی لائن کاٹ دی۔ ورنہ راحیلہ کی طرح ان کی بھی تفصیلی باتیں سننے میں آپ کا سارا ٹیلنس ہی ختم ہو جاتا۔“ اس نے موبائل واپس کرتے ہوئے بڑی سادگی سے کال کے اختصار کی وجہ بتائی تو اس بار معاذ اپنی ہنسی کو نہیں روک پایا۔ محترمہ کو اپنے باتونی پن کا کوئی احساس نہیں تھا اور ان کے خیال میں دوسرے لوگ ان سے طویل گفتگو کیا کرتے تھے۔

”آپ کیا میرے بابا پر فخر رہے ہیں؟“ اس نے

”ایک اچھے صحافی کو کسی بلا کی طرح ہی ہونا چاہیے جو اپنے اسائنمنٹ کے ساتھ بلا کی طرح چٹ جائے اور اسے مکمل کر کے ہی چھوڑے۔ صرف اسی صورت میں سچی اور بے باک صحافت کا حق ادا ہو سکتا ہے۔“ وہ حد درجے سنجیدہ تھی۔ معاذ کو ہنسی آنے لگی لیکن اس نے ہنسی کو ظاہر نہیں ہونے دیا اور سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے ایک اور نکتہ اٹھایا۔

”اگر کامی اور سلطان نے تمہارے خلاف ایف آئی آر کٹوا دی کہ تم مجرمانہ عزائم کے تحت ان کے زیرِ تعمیر پروجیکٹ پر پانی کٹی تھیں اور پکڑے جانے پر کامی کو گولی مار کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئیں تو تم کیا کرو گی؟“

”اسی لیے میں نے پہلے ہی اپنے پرس اور موبائل کے چھینے جانے کی ایف آئی آر کٹوا دی ہے۔ میری سبیلی راحیلہ کو اتنی دے دے گی کہ آج سارا دن میں اسی کے ساتھ تھی اس لیے میرے لیے زیادہ مسئلہ نہیں بنے گا۔“ اس نے مزے سے بتایا اور پھر بری طرح چوکی۔

”ادہ..... میں راحیلہ کو تو بھول ہی گئی۔ پتا نہیں وہ اپنی خالہ کے گھر بیٹھی ابھی تک میری کال کا انتظار کر رہی ہے یا میری تلاش میں نکل پڑی ہے۔ کہیں وہ کسی مصیبت میں نہ پھنس جائے۔ مجھے اسے فوری طور پر فون کر کے اطلاع دینی ہوگی۔ آپ نے یہاں کہیں کوئی پلی سی او دیکھا تھا کیا؟“ اتنی دیر میں معاذ کو وہ سبیلی بار پریشان اور بے چین دکھائی دی۔

”نمبر یاد ہے تو تم میرے سیل سے اپنی سبیلی کو فون کر سکتی ہو۔“ معاذ نے اسے پیشکش کی۔

”تھینک یو۔ نمبر مجھے یاد ہے۔ راحیلہ میری سب سے بیسٹ فرینڈ ہے، اس کا نمبر مجھے کیسے یاد نہیں ہوگا۔“ اس کے چہرے پر اطمینان کے رنگ آ گئے اور اس نے بڑی بے تکلفی سے معاذ کا موبائل لینے کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ معاذ نے اسے موبائل دے دیا اور وہ فوراً ہی نمبر ملا کر اپنی سبیلی سے باتوں میں مصروف ہو گئی۔ معاذ کو اتنی دیر میں اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ اچھی خاصی باتونی ہے اور مشکل سے ہی کوئی بات اختصار کے ساتھ کرتی ہے اس لیے اس کی یکطرفہ گفتگو سننے ہوئے بہت مبر سے اپنا موبائل واپس ملنے کا انتظار کرنے لگا۔ اللہ اللہ کر کے اس کی گفتگو ختم ہوئی اور اس نے معاذ کو اس کا موبائل واپس کر کے رسی سا شکر یہ کہنے کے بعد از خود اسے سبیلی سے ہونے والی گفتگو سے آگاہ کرنا شروع کر دیا۔

”راحیلہ میرے لیے بہت پریشان تھی۔ اس نے

مخلوک سے انداز میں معاذ کو گھورا۔

”میری ایسی مجال کہاں؟ میں تو بس یہ سوچ رہا تھا کہ میری وجہ سے تمہارا خاصا قیمتی وقت ضائع ہو گیا ہے۔“ معاذ نے خود پر مصنوعی سنجیدگی طاری کی۔

”آپ نے میری اتنی مدد کی اور مشکل وقت میں میرے کام آئے، ایسے میں اگر مجھے آپ کے سوالات کے جوابات دینے کے لیے آپ کو وقت دینا پڑا تو یہ میرا فرض بنتا تھا ورنہ آپ ابھن ہی میں رہتے کہ کس ڈرامے میں جا رہی تھی اور پوری پوری دے بیٹھے تھے۔“ وہ اب بھی پوری طرح سنجیدہ تھی اور معاذ کو بڑی بردباری سے جواب دے رہی تھی۔ اس وقت معاذ کو وہ خاصی دلچسپ لڑکی لگی۔ ایک طرف تو وہ اتنی بہادر، جرأت مند اور پھر تلی تھی کہ اتنی کم عمری میں سچائیاں ڈھونڈنے اور انہیں بے نقاب کرنے کے مشن میں جت لگاتی تھی اور دوسری طرف سادگی کا یہ عالم تھا کہ اسے معاذ کے اپنی گفتگو سے لطف لینے کا بھی اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا اور اس کی مذاق میں کبھی گئی باتوں کا بھی نہایت سنجیدگی سے جواب دے رہی تھی۔

”کامی اور سلطان بڑی قیمتی فطرت کے لوگ ہیں۔ وہ اتنی آسانی سے تمہارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ کہیں تم کسی مشکل میں نہ پڑ جاؤ۔“ اس بار معاذ پوری طرح سنجیدہ تھا۔ ”میں مشکلات سے ٹھہرانے والی لڑکی نہیں ہوں۔ ان دونوں کو جو کرنا ہے کرنے دیں، میں انہیں ہینڈل کر لوں گی لیکن ایک بات ذہن میں رکھیں کہ مشکل میں صرف میں ہی نہیں، آپ بھی پڑ سکتے ہیں۔ ان کے خیال میں تو آپ کی دخل اندازی سے ہی معاملہ بگڑا اور شکاران کے ہاتھوں سے نکل گیا اس لیے وہ آپ سے بدلہ لینے کی پوری پوری کوشش کریں گے۔“ اس نے اپنی بات کہتے ہوئے معاذ کا چہرہ غور سے دیکھا جیسے اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی ہو کہ وہ خوف زدہ ہے یا نہیں۔

”میرے خیال میں تمہاری طرح میں بھی انہیں ہینڈل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔ ویسے جہاں تک میرا اندازہ ہے کامی کو دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑا ہونے میں کم از کم مہینا تو لگ جائے گا اور ظاہر ہے سلطان بھی یہ عرصہ اپنے دوست کی چار داری میں گزارے گا اسے اپنے ٹوٹ جانے والے دانتوں کا بھی کچھ نہ کچھ بندوبست کرنا ہوگا۔ اس لیے فوری طور پر کوئی رد عمل آنا مشکل ہے۔ ویسے بھی اب ڈرنے سے کیا ہوگا۔ اوکلی میں سروے کر موصول سے ڈرنا تو نری حماقت ہے۔“ معاذ نے بے پردائی سے

شانے اچکائے تو وہ مسکرا دی۔ معاذ نے نوٹ کیا اس کی مسکراہٹ بہت جامعہ اور چمکیلی تھی اور ذرا سا مسکراتے پر اس کا چہرہ جگمگا اٹھتا تھا۔

”تو پھر اجازت..... اب میں چلتی ہوں۔“ وہ یکدم ہی کھڑی ہو گئی۔

”میں تمہیں گھرنیک چھوڑ دیتا ہوں۔“ معاذ بھی اس کے ساتھ ہی کھڑا ہوا۔

”ویسے تو یہاں سے میں رکشا یا ٹیکسی کر کے گھر جاسکتی ہوں۔ گھرنیک کر سوار کا کرنا یہ دینا کوئی مسئلہ نہیں ہے لیکن جب آپ نے مجھے اتنی لفٹ دی ہے تو گھرنیک بھی آپ سے لفٹ لینے میں حرج نہیں ہے۔ چلیں چلتے ہیں۔“ اس نے بہت آسانی سے معاذ کی پیشکش قبول کر لی۔ پارک سے اس کے گھرنیک کا راستہ میں بائیس منٹ سے زیادہ کا نہیں تھا۔ متوسط طبقے کی آبادی میں تعمیر دو سو گز کے مکان کو دیکھ کر اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ گھزار عام صاحب واقعی ایک ایمان دار صحافی ہیں جو میڈیا کی چمک دمک میں تو ضرور گھرے ہوئے ہیں لیکن صحافت سے نوٹ کمانے کا دھندا انہوں نے اختیار نہیں کیا ہے۔

”ایک کپ چائے یا کافی کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ اپنے گھر کے دروازے کے سامنے اترتے ہوئے بشریٰ نے اسے دعوت دینے کے انداز میں کہا۔

”نہیں، بس اب میں گھر جاؤں گا۔ میری امی میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔“ اس نے انکار کر دیا۔

”اوکے ایز یو ویش لیکن میری یہ پیشکش محدود مدت کے لیے نہیں ہے۔ آپ جب چاہیں تشریف لاسکتے ہیں۔ بابا یقیناً آپ سے مل کر خوش محسوس کریں گے۔“ اس نے معاذ کو اندر بلانے پر اصرار نہیں کیا لیکن یہ اشارہ بھی دے دیا کہ اس کی یہاں آمد کو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔

”تمہارے بابا جیسی شخصیت سے ملنے کا تو مجھے خود بھی بہت شوق ہے اور اپنے اس شوق کی تکمیل کے لیے میں جلد یہاں کا رخ کروں گا۔ فی الحال مجھے اجازت دو۔“ معاذ نے بائیک کو لگ لگائی۔ دوسری طرف اس کے لیے بھی گھر کا بند دروازہ کھل چکا تھا اور وہ ایک حیران دہن اور دوسرا بابا ہر رکھے گویا صرف معاذ کے رخصت ہونے کی منتظر تھی۔ معاذ خود بھی روانہ ہونا چاہتا تھا لیکن پھر یکدم ہی اس کی طرف رخ کر کے اس سے بولا۔

”تم وہاں مت جانا بشریٰ! یہ تمہارے لیے ٹھیک نہیں ہوگا۔ اگر تم مجھ پر بھروسہ کرو تو میں تمہارے موبائل کی

واپسی کے لیے کوشش کر سکتا ہوں۔ بس تم مجھے اچھی طرح اس جگہ کے بارے میں سمجھا دو جہاں تم نے اپنا موبائل چھپایا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ بابا کے موبائل پر آپ کا موبائل نمبر آگیا ہوگا۔ میں خود آپ کو کال کر کے تفصیل سے سمجھا دوں گی۔“ معاذ کی توقع کے برخلاف اس نے ایک بار بھی انکار نہیں کیا اور بہت آسانی سے اس کی مدد لینے پر تیار ہو گئی۔ اس کے اس رد عمل پر معاذ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اسے کوئی اپنی طرح ہی کی چیز نکرا گئی ہے اور یہ فکر اُسے اچھا لگا تھا چنانچہ اپنی مسکراہٹ کو چھپانے کے بجائے کچھ اور کشادہ کرتے ہوئے پہلے ہی سے اسٹارٹ بائیک کو ریس دی اور وہاں سے ہوا ہو گیا۔ اگر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا ہوتا تو اسے معلوم ہوتا کہ خود بشری کے ہونٹوں پر بھی بڑی جاندار سی مسکراہٹ تھی اور وہ اس وقت تک گیٹ پر ہی کھڑی رہی تھی جب تک وہ اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا تھا۔

☆☆☆

”میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ تمہیں کسی ہاؤسنگ سوسائٹی سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ میرے خیال میں تو تمہیں فی الحال کسی گھر وغیرہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تعلیم مکمل ہونے کے بعد جاب کی تلاش پھر شادی اور آخر میں ساس بہو کے پھنڈوں کے بعد الگ گھر کی تلاش کا مرحلہ آنے میں تو میرے حساب سے ابھی خاصا وقت لگتا ہے تو پھر تم ابھی سے کیوں اس طرح کی چیزوں میں دلچسپی لے رہے ہو؟“ اپنی شاندار سی لینڈ کروزر کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے عالم شاہ نے چھیڑنے والے انداز میں معاذ سے دریافت کیا۔ معاذ سے اس کی دوستی کو بہت کم عرصہ گزرا تھا لیکن ان کی دوستی بہت مضبوط ہو چکی تھی چنانچہ جب معاذ نے اسے فون کیا کہ وہ اس کے ساتھ کہیں جانا چاہتا ہے تو اس نے مصروفیت کے باوجود انکار نہیں کیا اور اب وہ دونوں یزدانی ہاؤسنگ سوسائٹی کی طرف گامزن تھے۔ عالم شاہ کو اس نے صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ وہاں متوقع گا ہک کی حیثیت سے جائیں گے اور پروجیکٹ کے مختلف حصوں کا جائزہ لے کر وہاں بنگلوں کی بنگ کے حوالے سے بات چیت کریں گے۔ اس مبہم صورت حال پر عالم شاہ کے دماغ میں کھدبھد ہونے لگی تھی اس لیے وہ اس سے وہاں جانے کی اصل وجہ جاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

”میں بہت دور اندیش آدمی ہوں یاں اور اندازہ لگا

چکا ہوں کہ تمہارے بیان کردہ مراحل سے گزر کر آخر کار مجھے ایک گھر کی تلاش میں روانہ ہونا ہی پڑے گا اس لیے ابھی سے ایک گھر تک کروالینا چاہتا ہوں تاکہ میری ہونے والی بیوی کو ساس سے لڑنے جھگڑنے میں کوئی پریشانی پیش نہ آئے اور وہ اس اطمینان کے ساتھ طبل جنگ بجائے کہ ساس صاحبہ اس جنگ کے نتیجے میں اسے اپنی سلطنت سے در بدر کریں گی تو وہ سچ سچ در بدر نہیں ہوگی اور ایک پیارا سا گھر اس کا منتظر ہوگا۔ تمہارا کیا خیال ہے وہ وقت آنے تک یزدانی بلڈرز والے اس پروجیکٹ کو مکمل تو کر لیں گے نا؟“ اس نے اس سنجیدگی سے جواب دیا جیسے واقعی وہ اسی مقصد کے تحت یزدانی ہاؤسنگ سوسائٹی کے دورے پر جا رہا ہو۔

”ٹھیک ہے بھائی جیسی تیری مرضی پر اب میں تجھ سے کچھ نہیں پوچھوں گا۔“ عالم شاہ نے سمجھ لیا کہ وہ اسے اصل وجہ نہیں بتانا چاہتا۔

”یہ بہت اچھا فیصلہ ہے۔ فضول کی پوچھ گچھ کرنا صرف بیوی اور تھانیدار کا کام ہوتا ہے اور تم ان دونوں میں سے کوئی بھی نہیں ہو۔“ معاذ نے اس کے فیصلے کو سراہا۔ عالم شاہ جواب میں کچھ نہیں بولا اور خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ یزدانی ہاؤسنگ سوسائٹی کے سائٹ آفس تک پہنچ گئے۔

”بیوی اور تھانیدار بننے سے تو تم بچ گئے یاں لیکن یہ روٹھی محبوبہ کیوں بنے ہوئے ہو؟“ گاڑی سے اترنے سے پہلے معاذ نے آہستہ سے کہا تو عالم شاہ بے ساختہ ہنس دیا اور بولا۔

”بہت خبیث آدمی ہوں۔ چلو اب نیچے اتر دو۔ میں خود ہی دیکھ لوں گا کہ تم یہاں کیوں آئے ہو۔“ اس بار معاذ نے خاموشی اختیار کر لی۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ اسٹاف کے ایک آدمی کے ساتھ پروجیکٹ کے مختلف حصوں کا جائزہ لے رہے تھے۔ وہ محض انہیں محض ماڈل بنگلوں دیکھنے تک ہی محدود رکھنا چاہتا تھا لیکن معاذ نے اسے بتایا کہ اس کے پاس زیر تعمیر حصوں کا بھی جائزہ لینا چاہتے ہیں۔ اس نے عالم شاہ کو باس اور خود کو اس کے سیکرٹری کی حیثیت سے ہی متعارف کروایا تھا۔ وہ اپنے ساتھ عالم کو لایا ہی اس لیے تھا کہ اس کی شاندار شخصیت اور گاڑی سے سامنے والوں کو مرعوب کر کے اپنا مقصد حاصل کر سکے۔ اسے اندازہ تھا کہ وہاں ہر ایرے غیرے کو اس کی فرمائش پر پورے پروجیکٹ کی سیر نہیں کروائی جاتی ہوگی۔ یوں بھی اس ہاؤسنگ سوسائٹی کے زیادہ تر بنگلوں کی ایڈولس۔۔۔ بنگلے کی

”بس وہی اسٹریٹ کرائم کا چکر ہے۔ کل کسی نے کامران صاحب کی گاڑی چھیننے کی کوشش کی۔ وہ نو جوان اور جذباتی آدمی ہیں۔ گاڑی دینے پر راضی نہیں ہوئے اور وہ لوگ غصے میں انہیں ٹانگ میں گولی مار کر بھاگ گئے۔“

فیجر نے اداس شکل بنا کر وجہ بتائی۔

”اوہو کہاں پیش آیا یہ واقعہ..... کیا یہیں اسی علاقے میں؟“ معاذ نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اسے بڑی ہوشیاری سے پن چھوٹی۔

”ارے نہیں جناب! یہ جگہ تو بہت پرسکون ہے اور یہاں اس طرح کی وارداتیں نہیں ہوتیں۔ کامران صاحب کو تو شہر ہی میں کہیں یہ واقعہ پیش آیا تھا۔“ فیجر نے جلدی سے تردید کی۔ ظاہر ہے وہ نہیں چاہتا تھا کہ سیکورٹی رسک کی بنیاد پر ایک اچھا کسٹمر اس کے ہاتھ سے نکل جائے۔ اس کے بعد کولڈ ڈرنکس ختم ہونے تک ان کے درمیان روز بروز گزرتے حالات کے متعلق ہی گفتگو ہوتی رہی اور آخر کار وہ دونوں آنے والے کل کے وعدے پر وہاں سے روانہ ہو گئے۔

”تو تم وہاں سے وہ موبائل لینے گئے تھے۔“ واپسی کے سفر میں عالم شاہ نے آہستہ سے کہا تو معاذ ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ عالم شاہ جیسے ہوشیار آدمی سے اس کی کارروائی چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔

”میرے خیال میں تو وہ موبائل تمہارا نہیں ہے۔“ اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر عالم شاہ نے دوسرا سوال داغا۔

”نہیں۔ وہ موبائل میرا نہیں ہے۔ فی الحال میں تمہیں موبائل کے مالک کا نام نہیں بتا سکتا لیکن اتنا بتا سکتا ہوں کہ کامران یزدانی کو گولی اسی موبائل کے مالک نے ماری تھی اور آج وہ اپنا موبائل لینے یہاں آنے کا رسک لیتا چاہتا تھا لیکن میں نے مناسب سمجھا کہ میں خود یہ کام کروں۔ تم نے اس سلسلے میں جو تعاون کیا اس کا شکریہ۔ میرے خیال میں یزدانی بلڈرز والوں کی طرف سے کوئی کال آئی تو تم آسانی سے منٹ لو گے۔“

”وہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں کوئی بھی بہانہ بنا کر انہیں انکار کر سکتا ہوں لیکن اگر تم مجھے جو پیشین بتا کر بھی تعاون کے لیے کہتے تو بھی میں انکار نہیں کرتا۔ مجھے معلوم ہے کہ تم کسی غلط کام کے لیے مجھے استعمال نہیں کر سکتے۔“ عالم شاہ کے لہجے میں بے حد سنجیدگی تھی۔

”سوری یارا! بس میں نے ایسے ہی تمہیں نہیں بتایا۔ مجھے تم پر پورا اعتماد ہے اور اگر یہ میرا کوئی ذاتی

چال چکی تھی اور اب صرف چند گننے چنے بنگلوز کی بنگ کے لیے ہی اشتہار دیا جا رہا تھا۔ اشتہار دینے والوں کا کم از کم یہی دعویٰ تھا۔

وہ اور عالم شاہ پوری سنجیدگی سے مکمل اور نامکمل بنگلوز کا معائنہ کرتے ہوئے اس شخص کی باتوں کو بھی دلچسپی اور توجہ سے سننے کا تاثر دے رہے تھے جو ان کے ساتھ وہاں آیا تھا اور مسلسل پروجیکٹ کی تعریف میں رطب اللسان تھا۔ اپنے مطلوبہ حصے تک پہنچنے میں معاذ نے کوئی جلدی نہیں دکھائی اور بڑی مہارت سے ایک سمجھدار و فرمانبردار سیکریٹری کا کردار ادا کرتا رہا۔ عالم شاہ بھی اس کا بھرپور ساتھ دے رہا تھا۔ بشری کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں جب وہ لوگ مطلوبہ حصے میں پہنچے تو معاذ نے نہایت مہارت سے عالم شاہ اور ساتھ آئے آدمی کی توجہ بھٹکا دی اور بتانے لگا کہ اس بنگلوز کے ٹیرس سے ارد گرد کے مناظر کا بہت زبردست نظارہ کیا جاسکتا ہے۔ اس کا کہا ہوا ایک جملہ ہی کافی ثابت ہوا اور ساتھ آیا ہوا شخص اس کی تائید میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے لگا۔ اتنی تعریفوں پر عالم شاہ نے خصوصی دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور چند منٹ خاص طور پر ٹیرس پر رک کر ارد گرد کے نظارے کو دیکھنے لگا۔ اس موقع پر معاذ غیر محسوس انداز میں پیچھے ہی رک گیا اور پھر نہایت مشاطی سے بشری کا سینٹ کی بور یوں کے پیچھے چھپایا ہوا موبائل نکال کر اپنی جیب میں منتقل کر لیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر انہوں نے مزید چند منٹ وہاں گزارے اور اس کے اشارے پر عالم شاہ نے عندیہ دیا کہ کل کسی وقت اس کا سیکریٹری یعنی معاذ وہاں آ کر بنگ کی کارروائی منٹالے گا۔ اس نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ وہ دیگر افراد کی طرح قسطوں میں ادائیگی کے بجائے یکمشت ادائیگی کو ترجیح دے گا۔ اس کی گاڑی اور شخصیت نے پہلے ہی اچھا تاثر ڈالا تھا اس فیصلے پر وہ لوگ مزید مرعوب ہو گئے اور سائٹ آفس میں کولڈ ڈرنکس سے ان کی تواضع کرتے ہوئے فیجر نے افسوس کا اظہار کیا کہ وہ خواہش کے باوجود ان کے اپنے پاس یزدانی سے ملاقات نہیں کروا سکے گا۔ اس نے بتایا کہ پاس اس وقت اکثر یہاں کا چکر لگاتے ہیں لیکن آج اپنے بیٹے کے آپریشن کی وجہ سے نہیں آ سکے۔

”خیریت! کس چیز کا آپریشن ہوتا ہے یزدانی صاحب کے بیٹے کا؟“ عالم شاہ نے بہت اخلاق سے دریافت کیا۔

میرے پاس ان ڈائریکٹریں دھکی آمیز پیغامات پہنچنے شروع ہو گئے ہیں لیکن میں ان سب باتوں سے نہیں ڈرتی۔“ اس چھوٹی سی لڑکی کی جرأت مندی بڑے کمال کی تھی۔ معاذ اسے دیکھتا رہ گیا۔

”اتنے حیران مت ہوں۔ مجھے ڈرنا ہی ہوتا تو اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ کامی اور سلطان میرے دشمن بن چکے ہیں اور کامی کی صحت یابی کے بعد وہ دونوں جلد یونیورسٹی آنے والے ہوں گے۔ میری فکر چھوڑ کر آپ اپنے بارے میں سوچیے۔ ہو سکتا ہے ان لوگوں نے آپ کو پہچان لیا ہو اور کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کریں۔“ بشری نے جیسے اسے ہوشیار کیا۔

”میرے خیال میں ایسا نہیں ہے ورنہ ان کی طرف سے اب تک کوئی نہ کوئی کارروائی ہو چکی ہوتی۔“ معاذ نے جواب دیا۔

”آپ کا خیال ٹھیک بھی ہو سکتا ہے لیکن میرا مشورہ یہی ہے کہ آپ بالکل بے فکر نہ رہیں، خطرہ ہو بھی سکتا ہے۔“ اس نے اپنی بات پر اصرار کیا۔

”اور تم..... تم تو مجھ سے زیادہ خطرے میں ہونا؟ پھر تمہیں کوئی فکر کیوں نہیں ہے؟“ معاذ نے اسے گھورا۔

”میں اپنے پاس وہ رکھتی ہوں نا جس نے کامران کی ایک ٹانگ کو ناکارہ کر دیا ہے۔ آئندہ بھی مجھ سے پیچھے لگے گا تو نقصان اٹھائے گا۔“ بشری کا اشارہ اپنے پٹیل کی طرف تھا۔

”اتنی بھی جرأت مندی ٹھیک نہیں لڑکی! تم اپنی عمر سے بہت تیز دوڑ رہی ہو۔“ معاذ نے اسے سمجھایا۔

”میں اس دنیا میں بہت کچھ کرنا چاہتی ہوں اس لیے تیز دوڑتی ہوں۔ مجھ پر آپ کی ہمتیں بے کار جائیں گی۔“ اس نے مسکرا کر معاذ کو جواب دیا تو وہ اس کی شکل دیکھتا رہ گیا اور وہ اسے خدا حافظ کہتی ہوئی ایک دوست کے پکارنے پر اس کی طرف بڑھ گئی۔ اس روز معاذ کلاسز کے بعد یونیورسٹی سے روانگی کے لیے پارکنگ میں کھڑی اپنی بائیک تک پہنچا تو سن رہ گیا۔ وہاں بیک دیو مرر پر سیاہ مارکر سے ایک تحریر درج تھی اور وہ اس تحریر کو پڑھ کر ہی سن ہوا تھا۔

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نو جوان

کی داستان جو غلط کاروں کے لیے

غضب ناک تھا باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیے

معاذ ہوتا تو میں کھل کر تمہیں سب بتا دیتا لیکن جس شخص کا یہ معاملہ ہے، وہ شاید اسے پوشیدہ رکھنا چاہے اس لیے میں تمہیں تفصیلات بتانے سے قاصر ہوں۔“ معاذ کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔

”اب اتنے بھی شرمندہ نہ ہو۔ عالم شاہ یاروں کا یار ہے۔ آئندہ بھی تمہیں میری مدد کی ضرورت پڑے تو بلا تکلف میرے پاس آ سکتے ہو۔“ عالم شاہ نے بات ختم کر دی۔ اس کی رہائش گاہ پر پہنچ کر معاذ اس کے اصرار کے باوجود وہاں رکا نہیں اور اپنی بائیک لے کر سیدھا بشری کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ کل فون پر گفتگو کے دوران ان کے درمیان طے ہو گیا تھا کہ معاذ آج ہی اس کے موبائل کے حصول کے لیے جائے گا اور موبائل گھر پر ہی اس کے حوالے کر دے گا چنانچہ وہ سارا دن گھر پر رہ کر اس کا انتظار کرے گی۔

وہ بشری کے گھر پہنچا تو خود بشری ہی نے دروازہ کھولا۔ معاذ نے دروازے ہی سے اسے موبائل پکڑا لیا اور اندر آنے کی پیشکش کو ایک بار پھر رد کر دیا کہ اسے اپنے کرائے کلب جانا تھا۔ اس دن کے بعد اس کی بشری سے یونیورسٹی میں سرسری سلام دعا کے علاوہ بات نہیں ہو سکی البتہ اتوار کے اخبار میں اس کا انکشافات سے بھرپور کالم چھپ گیا جو خاصا تھمکے خیز ثابت ہوا۔ اس کالم میں یہ انکشاف بھی کیا گیا کہ جس زمین پر یہ ہاؤسنگ سوسائٹی قائم کی گئی ہے، وہ ایک ایسے شخص کی ملکیت ہے جو بیرون ملک مقیم ہے اور یزدانی بلڈرز والوں نے جعل سازی کے ذریعے اس زمین پر قبضہ کر رکھا ہے۔ کالم کی اشاعت کے بعد فی وی شو ز وغیرہ میں بھی اس موضوع پر بات ہوتی رہی۔ یزدانی بلڈرز والوں نے جواب میں یہی کہا کہ یہ ان کے مخالفین کی طرف سے پروپیگنڈا ہے۔ بشری نے تمام اہم چینلز پر ثبوت کی نقول بھجوا دی تھیں جنہیں لہرا لہرا کر اینکرز یزدانی بلڈرز والوں سے سوالات کرتے رہے اور وہ ہر ثبوت کو جعلی قرار دیتے رہے۔ سب کو معلوم تھا کہ کچھ دنوں بعد یہ ایثوڈب جائے گا لیکن یزدانی بلڈرز والوں کی ساکھ کو بہر حال نقصان پہنچا تھا اور خیال کیا جاسکتا تھا کہ وہ غصے میں ذمے دار کو نقصان پہنچانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ معاذ کی بشری سے ملاقات ہوئی تو اس نے بشری کے سامنے اس اندیشے کا اظہار کر دیا۔

”وہ جتنے گھٹیا لوگ ہیں ان سے کوئی نیک امید رکھی بھی نہیں جاسکتی۔ آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ

معاذ بیک دیر مرد پر درج تحریر دیکھ کر سن رہا گیا۔
 "اپنی سائیس گنتا شروع کر دو۔ بہت جلد تم خود کو
 زمین کے نیچے پاؤ گے۔" سیاہ رنگ کے باریک مارکر سے
 آئینے پر لکھی یہ تحریر یقیناً دھمکی تھی اور وہ سمجھ سکتا تھا کہ یہ
 دھمکی کس کی طرف سے دی گئی ہے۔ اس دھمکی نے اس کی یہ
 خوش فہمی بھی دور کر دی تھی کہ اس روز بشری کی مدد کرتے
 ہوئے کامران اور سلطان نے اسے نہیں پہچانا تھا۔ وہ
 دونوں اسے پہچان گئے تھے لیکن فوری طور پر کوئی رد عمل
 شاید اس لیے ظاہر نہیں ہو سکا تھا کہ دونوں ہی زخمی تھے۔
 کامران جہر میں لگنے والی گولی کی وجہ سے کافی دنوں کے
 لیے بستر کا محتاج ہو گیا تھا اور سلطان اس سے اپنے دانت
 تڑوانے کے بعد فوری طور پر کسی کو شکل دکھانے کے لائق
 نہیں رہا تھا۔ کامران کے بارے میں تو اسے اندازہ تھا کہ
 وہ ابھی کچھ اور عرصہ بے ندرستی نہیں آسکے گا لیکن شاید سلطان
 آگیا تھا یا پھر اس نے اپنے کسی دوست کی مدد سے یہ کام
 کر دیا تھا۔

کچھ دیر اس بات پر غور کرنے کے بعد اس نے اپنے
 شانے اچکائے اور لاک کھول کر بائیک اسٹارٹ کرنے لگا۔
 اس کی فطری بے یارزی اور بے خوفی نے اسے چند لمحوں سے
 زیادہ اس دھمکی پر توجہ دینے کی زحمت نہیں دی تھی اور وہ خود
 سے جو ہوگا دیکھا جائے گا، کہتا ہوا بائیک پارکنگ سے نکال
 لے گیا تھا۔ ابھی وہ مین گیٹ سے کافی فاصلے پر تھا کہ اس
 نے ایک کھلی جیب کو بالکل اچانک ہی راستے کے درمیان
 ترچھا ہو کر کھڑا ہوتا ہوا دیکھا۔ دھمکی آمیز الفاظ ابھی تک اس
 کی بائیک کے مٹنی آئینے پر درج تھے۔ ایسے میں اس کے
 لیے اندازہ لگانا کیا مشکل ہو سکتا تھا کہ اس طرح اس کے
 راستے میں حائل ہونے والے لوگ کون ہو سکتے ہیں۔
 خطرے کا احساس ہونے کے باوجود اس نے اپنی بائیک
 نہیں روکی۔ وہ فطری طور پر بڑھ رہا تھا اور یہ گوارا نہیں کر سکتا تھا
 کہ اسے دھمکانے والے ہوں کھلم کھلا اور اس کا راستہ روکے
 کھڑے ہوں اور وہ راستہ بدل جائے۔ وہ ایسی بزدلی
 دکھاتا تو وہ لوگ مزید شیر ہو جاتے اور یہ خود اس کے حق میں
 اچھا نہیں ہوتا۔ خطرے سے بھاگنے کے بجائے سامنے آ کر
 اس کا مقابلہ کر لینا ہی بہتر تھا چنانچہ وہ اپنی بائیک کو اسی رفتار
 سے چلاتا رہا۔

اب جیب میں سوار افراد کے چہرے واضح ہو گئے
 تھے۔ ارا نیوٹک سیٹ پر سلطان خود بیٹھا ہوا تھا اور دانت
 گو سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے منہ میں پورے

دانت دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ کسی ماہر دندان ساز نے اس میں
 پیدا ہونے والے عیب کو دور کر دیا ہے۔ آدی کے پاس جیسا
 ہو تو ایسے ہی اپنے عیبوں پر پردہ ڈالنے کا انتظام کر لیا کرتا
 ہے لیکن بہر حال کوئی بھی شے ہمیشہ پردوں کے پیچھے چھپی
 نہیں رہتی۔ سچ کو بھی نہ کبھی سامنے آتا ہوتا ہے لیکن کافی اور
 سلطان جیسے قبیل کے لوگوں کو یہ بات کبھی سمجھ نہیں آ سکتی تھی۔
 سلطان کے سامنے پمپٹر سیٹ پر ان ہی کے گردپ کا ایک لڑکا
 بیٹھا ہوا تھا۔ معاذ کو اس کا نام معلوم نہیں تھا لیکن وہ اسے کئی
 بار کافی اور سلطان کے ساتھ دیکھ چکا تھا۔ وہ سلطان سے بھی
 زیادہ کینہ تو ز نظروں سے اسے دیکھتا ہوا شاہ کا وقار ہونے
 کا حق ادا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

فاصلے سے ان ساری باتوں کو نوٹ کر لینے کے
 باوجود معاذ نے اپنی بائیک کی رفتار کم نہیں کی۔ اس کے لیے
 اچھی بات یہ تھی کہ اسے ان دونوں ہی کے ہاتھوں میں کوئی
 ہتھیار نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس جگہ شاید وہ ہتھیار استعمال
 کرنے کے متحمل بھی نہیں ہو سکتے تھے۔ مین گیٹ سے
 زیادہ دور نہیں تھا اور گیٹ پر سیکورٹی اہلکاروں کے ساتھ
 ساتھ ریگزرز کے جہاز بھی موجود ہوتے تھے۔ ان کی
 موجودگی میں کھلم کھلا ہتھیار استعمال کر کے بھاگنا آسان
 نہیں تھا اور اسی گتے نے معاذ کے ادا کو آخری لمبے ٹیک
 حیران نہ ہونے دیا تھا۔ اب وہ جیب سے اتنے کم فاصلے پر
 تھا کہ حقیقت میں وہ لوگ ایک دوسرے کی آنکھوں میں
 آنکھیں ڈالے ہوئے تھے۔ معاذ نے یہ بھی نوٹ کر لیا تھا
 کہ جیب دکی ہوئی ضرور ہے لیکن اس کا انجن اسٹارٹ ہے۔
 جیب اور اس کی بائیک کے درمیان فاصلہ مشکل سے ایک گز
 رہ گیا تھا جب جیب اچانک حرکت میں آئی اور اس کے
 راستے سے ہٹ گئی۔ معاذ اپنی بائیک آگے نکال چلا گیا۔

"باگل کے بچے۔ خواتموا اپنی دولت اور طاقت
 کی نمائش کرتے رہتے ہیں۔" معاذ کے کانوں نے یہ جملہ
 سنا اور اس نے ہلکی بار نوٹ کیا کہ ایک دوسری بائیک بھی اس
 سے ذرا سی پیچھے چلی آ رہی تھی۔ اس بائیک پر دو لڑکے سوار
 تھے اور ان میں سے ایک نے بلند آواز میں اپنے ساتھی سے
 اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ معاذ نے یہ نہیں سنا کہ ان
 لڑکوں کی وجہ سے سلطان اس کے راستے سے ہٹ گیا تھا۔
 وہ پہلے ہی یہ بات سمجھ چکا تھا کہ اس جگہ سلطان اس پر حملہ
 نہیں کر سکتا۔ وہ اس کے ساتھ صرف یہ ہے جلی کا کھیل کھیلنے
 کی کوشش کر رہا تھا اور شاید یہ سمجھ رہا تھا کہ اس طرح وہ معاذ
 کے اعصاب پر دباؤ ڈال سکے گا لیکن اسے نہیں معلوم تھا کہ

اس نے اپنی اس حرکت سے معاذ کے اندر کے سرکش اور ضدی فطرت کو جگا دیا ہے جو اپنی ضد اور سرکشی میں کچھ اور بھی زیادہ مضبوطی سے ان کے مقابل ڈٹ جائے گا۔

☆☆☆

”تمہیں بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے بشری اگامی اور سلطان جس قبیل کے لوگ ہیں، ان کے لیے اپنی بے عزتی برداشت کرنا ممکن نہیں ہوتا اور ہم نے تو انہیں اچھا خاصا نقصان پہنچایا ہے۔“ اگلے دن پھر وہ یونیورسٹی میں بشری کے مقابل بیٹھا اسے سمجھا رہا تھا۔ وہ دونوں اس وقت کہنے پھر یا میں بیٹھے تھے اور ان کے سامنے کولڈ ڈرنکس رکھی ہوئی تھیں۔ معاذ نے پہلے بشری کو کل ملنے والی دھمکی اور سلطان کی حرکت کے بارے میں آگاہ کیا پھر اسے مشورہ دینے لگا۔

”کیا آپ کل کے واقعات سے ڈر گئے ہیں؟“ اس کے مشورے کے جواب میں بشری نے اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔

”ار۔۔۔ ہائی فٹ۔ میں ایسے اوتھے لوگوں سے نہیں ڈرتا ہوں۔ میں صرف تمہارے لیے فکر مند ہوں۔“ اس کے سوال پر معاذ نے گویا پرمان کر اسے کھودا۔

”آپ کی فکر مندی کے لیے فکر یہ معاذ صاحب لیکن میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں نہ تو اس قسم کے لوگوں سے ڈرتی ہوں اور نہ ہی ان کی پروا کرتی ہوں۔ اگر مجھے اس طرح کے لوگوں سے ڈرنا ہے تو پھر مجھے اس لیلہ میں ہی نہیں جانا چاہیے جو میں نے اپنے لیے منتخب کی ہے۔ ابھی تو صرف آغاز ہے۔ ابھی میری تعلیم احموری ہے اور میں نے باقاعدہ طور پر اس لیلہ کو جوائن نہیں کیا ہے۔ جب میں فل ٹائم جاب کے طور پر اس لیلہ میں آؤں گی تو مسائل اور بھی بڑھ جائیں گے۔ مجھے ان سارے مسائل کو جو یقیناً اس سے بہت بڑے بڑے ہوں گے، نہیں کرنا ہوگا اور آپ ابتداء ہی میں مجھے ڈرا رہے ہیں۔ میں تو اس معاملے کو اپنی لڑائی کے ایک حصے کے طور پر دیکھ رہی ہوں۔ بڑے لوگوں کا دباؤ، موت کی دھمکیاں اور اسی طرح کی دوسری چیزیں ہماری لیلہ کا ایک لازمی حصہ ہیں۔ اگر ہم ان چیزوں سے ڈر لے لیں تو کام کیسے کریں گے۔ ابھی آپ نے خود کہا ہے کہ یہ اوتھے لوگ ہیں اور آپ ان سے نہیں ڈرتے ہیں تو پھر مجھے کیوں ان سے ڈرانا چاہیے؟ کیا اس لیے کہ میں ایک لڑکی ہوں؟ لیکن آپ مجھے کوئی مام لڑکی نہیں سمجھیں۔ میں محترم مام جیسے سماج کی بنی ہوں جن کی دیانت داری اور بہادری کی دنیا میں دینی ہے۔ میں

اپنے بابا کے نقش قدم پر چلتے ہوئے بہت آگے تک جانا چاہتی ہوں اور آپ مجھے آغاز میں ہی ڈرانے پر تکتے ہوئے ہیں۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے معاذ صاحب کہ جن لوگوں سے آپ خود نہیں ڈرتے، ان سے مجھے ڈرنا ہے ہیں اور یقیناً اس لیے ڈرنا ہے ہیں کہ میں ایک لڑکی ہوں لیکن اب زمانہ بدل رہا ہے۔ اب لڑکیاں پہلے کی طرح ڈر چک اور بے عمل نہیں رہی ہیں۔ آج کی عورت ہر میدان میں خود کو مرد کے مقابلے میں سنواری رہی ہے اور۔۔۔“

”میں تمہیں ڈرا نہیں رہا، صرف محتاط رہنے کا مشورہ دے رہا ہوں۔“ وہ شاید عورت اور مرد کے حوالے سے لمبی تقریر کرنے کا ارادہ رکھتی تھی لیکن معاذ نے درمیان میں اس کی بات کاٹ کر اسے تقریر کو مزید طول دینے سے روکا۔

”محتاط رہنے سے آپ کی کیا مراد ہے؟ کیا آپ چاہتے ہیں کہ احتیاط ہی احتیاط میں، میں گھر میں چھپ کر بندہ جاؤں؟ یونیورسٹی آنا اور اپنے دیگر کاموں سے باہر نکلتا چھوڑ دوں یا پھر اپنے لیے ہلٹ پروف جیکٹ اور چادر چھ گاڑاؤں کا بندہ بہت کرلوں؟ تو عرض ہے میرے مزید خیر خواہ کہ میرے لیے ان میں سے کچھ بھی ممکن نہیں ہے۔ اپنی تعلیم اور دیگر کاموں کے لیے میرا گھر سے باہر نکلتا ناگزیر ہے۔ ویسے بھی میرے اندر ایک سیلابی روح ہے اور باہر کوئی کام نہ بھی ہو تو میں دو تین دن بھی گھر میں بند ہو کر کس بندہ بنتی۔ ایک جگہ بند ہو کر بیٹھنے سے میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ رہی دوسری احتیاطی تدبیر کی بات تو آپ بتائیں کہ ہمارے جیسے عام سے لوگوں کو کون ہلٹ پروف جیکٹیں، گاڑیاں اور گاڑاؤں فراہم کرتا ہے۔ خود ہماری تو یہ سارا انتظام کرنے کی اوقات نہیں ہے اور جو صاحب اختیار ہیں، ان کے لیے ہماری جانیں اتنی قیمتی نہیں ہیں۔ فرض کریں بابا کی ناسوری اور شہرت کچھ کام دکھا دے تو تب بھی زیادہ سے زیادہ ایک عدد ہلٹ پروف جیکٹ کا انتظام ہو سکتا ہے اور اس کی کوئی بھی گارنٹی نہیں دے گا۔ آپ کو شاید علم ہو کہ ہمارے پولیس اسپارٹمنٹ میں اس قسم کی ناکارہ ہلٹ پروف جیکٹوں کا اصرار کیا ہوا ہے جن کی فراہمی پر پانچویں کس کس لے کتنا مالی ہتایا ہے اور بے چارہ غریب سپاہی بہ دستور اپنی جان اٹھلی پر کیسے بھر رہا ہے۔“ اس بار معاذ کو تسلیم کرنا پڑا کہ وہ ایک پیدائشی مشر رہے اور ہر صورت میں تقریر کر سکتی ہے اس لیے اسے اس کام سے روکنا سوائے محنت کے کچھ نہیں چنانچہ اس بار اس نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔

”تو آپ کہہ رہے تھے کہ مجھے عطا رہنا چاہیے۔ اگر اس احتیاط پسندی کے ذیل میں آپ کے پاس کوئی تدبیر و ترکیب ہو تو مجھے ضرور بتائیں۔ میں اس پر عمل کرنے کی کوشش کروں گی۔“ معاذ کو خاموش پا کر وہ فائنڈ انڈاز میں مسکرائی اور ترجیح کرنے والے انداز میں اس سے پوچھنے لگی۔ مسکراتے ہوئے بلاشبہ وہ بہت خوبصورت لگتی تھی۔ پہلی ملاقات میں ہی معاذ نے یہ بات نوٹ کر لی تھی کہ مسکراہٹ اس کے سارے وجود کو جگمگا دیتی تھی۔ بالکل ویسے ہی جیسے شیشے کے شوکیس میں رکھے ہوئے جڑاؤ زپورات روشنی سے جگمگا جاتے ہیں۔ اس کی مسکراہٹ گویا کوئی بڑی سی مرکزی نیوب لائٹ تھی جو اس کی خوبصورتی کو کچھ اور اجاگر کر دیتی تھی لیکن اس وقت وہ بشری کی مسکراہٹ سے تھوڑا سا جھنجھلا گیا اور دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑتے ہوئے بولا۔

”معاذ کر دو بی بی! میرے اگلے پچھلوں کی توبہ جو آئندہ میں نے تمہیں ایسا کوئی امتحان مشورہ دینے کی کوشش کی۔“

”یہ تو فلفلی بات ہے۔ کوشش تو انسان کو کرتے رہنا چاہیے۔ جو لوگ کوشش نہیں کرتے، وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔“ نامعاذ نے لہجے میں اس سے یہ بات کہتے ہوئے وہ بظاہر بالکل سنجیدہ تھی لیکن مسکراہٹ اس کی آنکھوں سے چھلکی پڑ رہی تھی اور وہ قہقہے سے تھے جو اس کی آنکھوں میں روشن ہو گئے تھے۔ معاذ بس اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ اس نے بشری سے کہیں زیادہ خوبصورت لڑکیاں دیکھی ہوئی تھیں اور وہ کوئی غیر معمولی خوبصورت لڑکی نہیں تھی لیکن اس کی مسکراہٹ غیر معمولی تھی اور اس مسکراہٹ کے لیے معاذ کے ذہن میں صرف ”روشنی“ کا لفظ آتا تھا۔

”خاموش کیوں ہو گئے؟ شاید میری باتوں کا بُرا مان گئے۔ میں تو بس ایسے ہی مذاق کر رہی تھی ورنہ مجھے معلوم ہے کہ آپ بہت غلوں سے احتیاط کرنے کا مشورہ دے رہے تھے۔ اپنے طور پر میں ممکنہ حد تک احتیاط کرتی بھی ہوں۔ آپ نے میرے پاس ہٹل تو دیکھا ہی ہے، اس کے علاوہ میں نے تھوڑا بہت ہاتھ بھر چلانا بھی سیکھا ہوا ہے اور ضرورت پڑنے پر اچھے خاصے آدمی کو بھی اعانتیل کر سکتی ہوں اس لیے آپ سے یہی کہوں گی کہ میرے لیے ہتے زیادہ پریشان نہ ہوں۔“ اب وہ سچ سچ سنجیدہ ہو چکی تھی۔ معاذ نے ایک گہری سانس لی اور کوئلڈ ریک کا آخری گھونٹ پی کر اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

”میں آپ کی بات سمجھ گیا ہوں، اب مجھے اجازت

دیجیے۔“ وہ واقعی سمجھ گیا تھا کہ جن باتوں کو بشری نے ابھی مذاق قرار دیا تھا، وہ ہی حقیقت تھیں۔ بھلا وہ کس قسم کی احتیاط کر سکتی تھی؟ یہاں تو ہر وہ شخص جو معاشرے میں پھیلی گندگی کی طرف اشارہ کرتا تھا، خطرے میں تھا اور ستم بہ تھا۔ کدایسے ہی جتنی لوگوں کے تحفظ کا خیال رکھنے کے بجائے ان کی حفاظت کے لیے سخت اقدامات کیے جاتے تھے جن کی وجہ سے ہر طرف یہ گندگی پھیلی ہوئی تھی۔

”ارے، ارے۔۔۔۔۔ آپ تو کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہو گئے۔ حالانکہ ابھی ابھی میں نے احتیاطی تدبیر کے طور پر یہ فیصلہ کیا ہے کہ اکیلے جانے کے بجائے آپ سے لفٹ لے لوں۔ مجھے ذرا سہراب گولھ کی طرف جانا ہے۔ پبلک ٹرانسپورٹ سے جانے میں خاصا وقت لگ جائے گا۔ آپ بائیک پر شارٹ کٹ ماہر کر ذرا جلدی پہنچا سکتے ہیں۔ اگر زیادہ زحمت نہ ہو تو اس غریب بندی کے لیے یہ تکلیف اٹھائیں۔“ معاذ کو جانے کے لیے پرتوتے دیکھ کر وہ جلدی جلدی اس سے درخواست کرتے ہوئے لگی۔

”غریب بندی کی وہ ایف ایکس کہاں ہے جس پر وہ اکثر اپنی سہیلیوں کو بھی لادلا دیکر آتی جاتی دکھائی دیتی ہے؟“ معاذ نے اسے گھورا۔ وہ بشری سے شامالی کے بعد کی بار اسے اس کی ذاتی گاڑی میں آتا جاتا دیکھ چکا تھا۔

”وہ بے چاری سینڈ وچ ڈائف ایکس اکثر بارہوکر بغرض علاج و درکشاپ پر کھڑی رہتی ہے اور مجھے دوستوں کو لفٹ کی زحمت دینی پڑتی ہے۔ اب جبکہ آپ میرے دوستوں کے حلقے میں شامل ہو گئے ہیں تو آپ کو اس طرح کی زحمتیں اٹھانے کے لیے تیار رہنا ہی پڑے گا۔“

اس نے حرے سے معاذ کو جواب دیا تو اس کو ہتھیار ڈالنے ہی پڑے۔ دوستوں کو مایوس کرنا اس کی فطرت نہیں تھی اور وہ اس سے دوستی کی دعوے دار تھی۔ ذرا دیر بعد وہ دونوں یونیورسٹی سے روانہ ہو چکے تھے۔ پبلک ٹرانسپورٹ سے جانے کی صورت میں یونیورسٹی سے چھپا چوری پھینچ کر راشد منہاس روڈ پر سڑک کرتے ہوئے سہراب گولھ جانا پڑا تھا اور راستہ طویل ہونے کی وجہ سے زیادہ وقت لگتا تھا۔ بشری کی فرمائش پر معاذ نے ایک شارٹ کٹ استعمال کرنے کا فیصلہ کیا اور وہ لوگ پُردوق علاقے کو چھوڑتے ہوئے بتدریج دیروانے کی طرف جانے لگے۔

”بائی داوے، یہ تمہیں سہراب گولھ کی سمت جانے کی کیا سہجھی؟ اس علاقے میں تو ایسی خواتین بہت کم نظر آتی ہیں۔ تمہیں وہاں کیا کام ہے؟“ وہ ٹریفک کے شور سے دور

ہوئے تو معاذ کو اس سے پوچھنے کا خیال آیا۔

"ایک اسائنمنٹ کے سلسلے میں ہی جاری ہوں۔ آپ تو جان ہی چکے ہیں کہ میں جو بھی لکھوں، پہلے اس کے بارے میں اچھی طرح تحقیق کرتی ہوں پھر لکھتی ہوں۔" اس نے چہرے پر آجانے والی ایک لٹ کو کان کے پیچھے اڑتے ہوئے جواب دیا۔

"اب وہاں کس نے قبضے کی زمین پر جلسہ بازی سے ہاؤسنگ پروجیکٹ شروع کر دیا جو تم وہاں دوڑ پڑیں۔" معاذ کے لہجے میں خفیف سا طنز تھا۔ وہ کھٹکھٹا کر فیس پڑی اور بڑا سناٹے بغیر بولی۔

"میں کوئی ہر وقت بلڈرز کے پیچھے تھوڑی پڑی رہتی ہوں۔ اس وقت تو میں ایک نئے اسائنمنٹ پر کام کر رہی ہوں۔ لوگوں میں بڑھتے ہوئے نشیات کے استعمال پر تحقیق کر رہی ہوں میں آج کل۔ مجھے کسی نے سہراب گٹھ کی قریبی آبادی میں کسی بندے کا ریفرنس دیا تھا کہ وہ اس سلسلے میں مجھے کافی معلومات فراہم کر سکتا ہے تو میں اس وقت اس بندے سے ملنے جا رہی ہوں۔"

"تم بھی بڑی عجیب لڑکی ہو۔ کوئی سیدھا سادہ کام تمہیں بھائی نہیں دیتا۔ خطرناک موضوعات کا انتخاب کرتی ہو پھر اس پر کام کرنے کے لیے خطرناک جگہوں پر خطرناک لوگوں سے ملنے بھی چل پڑتی ہو۔ تم اسی طرح سینک اٹھا کر بھائی کو لوگوں کو کمریں مارتی پھر وہی تو نو جوانی میں ہی شہید صحافی کا ٹائٹل حاصل ہو جائے گا۔ ابھی تو تمہاری تعلیم مکمل نہیں ہوئی اور تم پارٹ ٹائم صحافی ہو۔ مکمل صحافی بننے کے بعد جانے کیا گل کھلاتی پھر وہی۔ اتنے خطرناک صحافی تو گلزار عام صاحب بھی نہیں ہوں گے۔" اس کا مقصد جان کر معاذ اس کے بارے میں تبصرہ کرنے لگا۔

"خطرناک تو وہ بھی ہیں لیکن ان کا میدان ذرا مجھ سے مختلف ہے۔ وہ زیادہ تر سیاسی تبصرے اور تجزیے کرتے ہیں اور بڑے لوگوں کی پول پٹیاں کھولتے ہیں۔ میں عوامی مسائل اور پریشانیوں میں زیادہ دلچسپی لیتی ہوں۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا کہ کوئی دھوکے سے کسی کی زمین اٹھالے، کسی کو گھر کے نام پر متنازعہ جگہ پر ایسا مکان بنا کر دے دے کہ جس کے چمن جانے اور اپنی عمر بھر کی کمائی ڈوب جانے کا ڈر انسان کی سانسوں کو تنگ کرنے لگے، کسی کا بچہ نشتے کا عادی بن کر ماں باپ کے سارے خواب چکنا چور کر دے یا کسی کو صرف اس لیے گولی مار دی جائے کہ اس نے بہت چاہت سے خریدی گیتھی موبائل فون یا اپنی

بیماری یا تنگ کسی لٹیرے کے حوالے کرنے میں مزاحمت کی تھی۔ ہمارے لوگوں پر بہت ظلم ہو رہا ہے معاذ اور میں قلم ہاتھ میں پکڑتی ہوں تو خود کو اس ظلم کے خلاف لکھنے سے باز نہیں رکھ پاتی۔ میں اپنے ہم وطنوں کے لیے، مسلم امہ کے لیے، انسانیت کے لیے اپنے دل میں بہت درد اور فکر رکھتی ہوں اس لیے جب کسی نازک موضوع پر کام کر رہی ہوتی ہوں تو اپنے لیے ڈرنا اور فکر مند ہونا بھول جاتی ہوں۔ فطری طور پر مجھے بھی زندگی سے پیار ہے۔ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ ڈر ڈر کر جیتا تو زندگی کو ضائع کر دینے کے مترادف ہے اور مجھے اپنی زندگی کو ایسے ضائع کرنا اچھا نہیں لگتا۔ مرنا تو آدمی کو ایک دن ہے ہی تو شہید صحافت کا ٹائٹل حاصل کر لینے میں کیا حرج ہے؟ ہماری بھی داستان تو ہوگی داستانوں میں۔"

اس نے معاذ کے تبصرے کے جواب میں اتنے جوش سے دلائل دیے کہ وہ خاموش ہو گیا۔ اسے اندازہ تھا کہ یہ سب کہتے ہوئے پٹری کا چہرہ تیار ہوا گا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اس کے ختماتے ہوئے سرخ چہرے کو دیکھے۔ پیچھے مڑ کر دیکھنا مشکل تھا۔ اس نے تھپی آٹھنے کی مدد لینے کی کوشش کی لیکن اس سے پہلے ہی اس کی نظر ایک سرخ شیراڑ پر پڑ گئی۔ اس گاڑی کو اس نے یونیورسٹی روڈ پر بھی دیکھا تھا لیکن ٹریفک کے رش میں توجہ نہیں دی تھی۔ پھر وہ شارٹ کٹ کے لیے یونیورسٹی روڈ سے دائیں جانب مڑے تھے تب بھی اس گاڑی کی جھلک نظر آئی تھی لیکن اس کے دل میں یہی خیال آیا تھا کہ وہ گاڑی نزدیکی آبادی میں کہیں جا رہی ہوگی لیکن وہ یہاں اس دیر ان راستے پر بھی ان کے پیچھے تھی۔ گمان کیا جاسکتا تھا کہ شیراڑ والے یا والوں نے بھی شارٹ کٹ کے لیے اس دیر ان اور کچے کچے راستے کا انتخاب کیا تھا لیکن جانے کیوں معاذ کھٹک سا گیا اور اسے خطرے کی بو سی محسوس ہونے لگی۔ شاید یہ گزشتہ یوم ملنے والی دھمکی کا اثر تھا کہ اسے وہ گاڑی مشکوک نظر آ رہی تھی۔ کھٹک کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ شیراڑ نے ایک بار بھی ان سے آگے نکلنے کی کوشش نہیں کی تھی حالانکہ باتوں کا آغاز ہو جانے پر معاذ نے خراب راستے پر اپنا دھیان بٹ جانے کے ڈر سے رفتار تھوڑی سی ہلکی کر دی تھی اور شیراڑ کے ڈرائیور کے پاس موقع تھا کہ وہ ان سے آگے نکل جاتا۔ اس نے ایسا نہیں کیا تھا تو معاذ کا کھٹک کرنا بجا تھا کہ شیراڑ ان کے تعاقب میں ہے۔ اس کھٹک کی تصدیق کے لیے معاذ نے بائیک کی رفتار کافی کم کر لی۔ روٹل میں شیراڑ کی رفتار بھی کم ہو گئی۔

"اس رفتار پر جانے سے بہتر ہے کہ ہم پیدل چلتا

شروع کر دیں۔" اتنی کم رفتار ہو جانے پر بشری نے جل کر رائے دی لیکن اس کی توجہ بشری پر نہیں شیراؤ پر تھی۔ اس کے گلاسز نکلنے لگے اس لیے وہ یہ جانتے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا کہ شیراؤ اس کیسے لوگ سوار ہیں؟ البتہ یہ بات اس نے فوراً ہی نوٹ کر لی تھی کہ شیراؤ کا اگلا، بائیں جانب کی کھڑکی کا شیشہ بتدریج نیچے ہو رہا ہے پھر اس نے اس کھلی کھڑکی سے ایک ہاتھ میں دبا پمپل برآمد ہوتے دیکھا۔ فوری رد عمل کے طور پر اس نے بائیک کی رفتار بڑھائی اور زور سے چیخا۔

"بشری سنبھل کر بیٹھو۔" اگلے ہی لمحے ایک گولی سنائی ہوئی ان کے قریب سے گزری۔ اس دوران میں معاذ رفتار مزید بڑھا چکا تھا اور اس کی بائیک گولی ہی کی رفتار سے اس کے کچے کچے راستے پر دوڑی چلی جا رہی تھی۔ راستہ ناہموار ہونے کی وجہ سے اس رفتار پر بائیک بری طرح اچھل رہی تھی۔ خود کو گرنے سے بچانے کے لیے بشری نے دونوں ہاتھوں سے معاذ کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ اس سے پہلے وہ ذرا تلف سے اس کے اور اپنے درمیان فاصلہ رکھتے ہوئے بائیں ہاتھ سے کھیر بڑھ کر بیٹھی ہوئی تھی لیکن جب جان پر مبنی ہو تو انسان ان ساری باتوں کو بھول جاتا ہے۔ وہ پہلوں کی یہ سواری ویسے ہی خطرناک سمجھی جاتی ہے کہ دوسری سواریوں کے مقابلے میں اس کے حادثے سے وہ چار ہونے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں اور اس وقت تو وہ جس رفتار سے، جس طرح کے راستے پر دوڑ رہی تھی اس نے صورت حال کو اور بھی نازک بنا دیا تھا۔ یہ معاذ کی مہارت تھی کہ اس نے ایسی صورت حال میں بھی بائیک کو بہت اچھی طرح سنبھالا ہوا تھا اور وہ کسی حادثے سے بچے ہوئے تھے۔

رفتار بڑھنے کے بعد بھی ان پر پیچھے سے مزید دو قاتر ہو چکے تھے اور گولیاں ان کے دائیں بائیں سے سنائی ہوئی گزر گئی تھیں۔ معاذ کے رفتار بڑھانے کے بعد شیراؤ کی رفتار میں بھی اضافہ ہو گیا تھا اور دونوں گاڑیوں کا درمیانی فاصلہ مسلسل کم ہوتا جا رہا تھا۔ اچھی بات یہ تھی کہ ان پر شیراؤ سے مسلسل اور کسی بڑے ہتھیار سے قاتر نہیں کیے جا رہے تھے ورنہ اس کھلی جگہ پر بچ لکنا بہت مشکل ہو جاتا۔ ابھی تک ان پر صرف تین قاتر ہوئے تھے اور تینوں ہی سے وہ محفوظ رہے تھے۔ شیراؤ والوں کے پاس جینی طور پر پمپل ہی واحد ہتھیار تھا اور گولیوں کی محدود تعداد کی وجہ سے وہ مسلسل قاتر کرنے سے گریز کر رہے

تھے اب ان کا زور درمیانی فاصلہ کم کرنے پر تھا اور معاذ کی پوری کوشش کے باوجود یہ فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ اسے مظلوم تھا کہ وہ لوگ نزدیک سے زیادہ بہتر نشانہ لے کر قاتر کرنے کی پوزیشن میں ہوں گے اس لیے اسے اپنے اور بشری کے بچاؤ کے لیے کوئی نہ کوئی تدبیر کرنی پڑے گی۔ ہاتھ چیر کر لڑائی کی بات ہوتی تو وہ تین چار بندوں سے بھی آسانی سے نمٹ سکتا تھا لیکن یہاں معاملہ آتشیں ہتھیار کا تھا جس کی بے رحمی کے آگے بڑے بڑے جی دار کی پیش نہیں چلتی اور چند انچ کی گولی چھ ساڑھے چھ فٹ کے ش زور کو بھی سبالتا دیتی ہے۔

راستے کی ناہمواری کے باعث معاذ کو راستے پر توجہ مرکوز رکھنی پڑ رہی تھی کہ کہیں کسی بڑے پتھر وغیرہ سے ٹکرا کر بائیک اپنا توازن ہی نہ کھو بیٹھے۔ اس کے باوجود وہ اپنے بچاؤ کے لیے اطراف کا بھی جائزہ لے رہا تھا۔ آگے دو در دو بنے چند مکانات کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ انہیں ان مکانات میں سے کسی میں پناہ سیرا جاتی تو خیر ادا والوں سے بچا جاسکتا تھا لیکن ان کے پاس اتنی سہلت نہیں تھی کہ وہ کسی مکان کے سامنے رک کر اس کا دروازہ کھولتے اور پھر کمینوں سے پناہ کے لیے درخواست کرتے۔ اتنی دیر میں تو شیراؤ ان کے سر پر پہنچ جاتی اور ان کے لیے اپنا بچاؤ ناممکن ہو جاتا، چنانچہ پہلے دو مکانات کے سامنے سے وہ بائیک آگے نکلا چلا گیا۔ خیر امکان بہت بڑا اور عاقلانہ تھا۔ مکان کی دیوار میں بہت اونچی جگہ جن پر کچا گیار سن رکھ کر مظلوم نے شیراؤ کی یاد دلایا تھا۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ تقریباً تین فٹ چوڑی کچا گیار یاں بنی ہوئی تھیں جن میں مختلف اقسام کے پردے اور پیلے تھے۔ بیسیا دیوار پر چڑھی ہوئی تھیں اور ان پر گنگے مختلف رنگوں کے پھولوں کی وجہ سے مکان کی خوبصورتی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ لی الحال معاذ کو مکان کی خوبصورتی سے کوئی بھلا بچا نہیں تھا۔ وہ مکان صرف اس وجہ سے اس کی توجہ کا مرکز بنا تھا کہ اس نے اس کے بڑے سے سیاہ آٹلی گینت کے دائروں میں کھینچے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ گینت کے دائروں میں ایک وقت کل رہے تھے اور درمیان میں اتنا غلط پھیرا ہوا تھا کہ اس میں سے بائیک آسانی سے گزرتی تھی۔

معاذ کے پاس مزید سوچنے کی گنجائش نہیں تھی اس لیے وہ طوقائی رفتار میں بھاگتی اپنی بائیک کو اس خط سے گزرا کر اندر کھینچ چلا گیا۔ اسی لمحے شیراؤ سے چھ قاتر ہوا اور گولی آٹلی گینت سے ٹکرا کر اپٹ گئی۔ گینت جینی طور پر

دینے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اسے معلوم تھا کہ اس طرح کی صورت حال میں کسی خاتون کا بات کرنا زیادہ سودمند ثابت ہوتا ہے۔ محاسب اگر مرد ہو تو خاتون انہیں کسی بھی بات پر قائل یا متاثر کرنے میں خاصی کامیاب رہتی ہیں۔ بشری کی وضاحت کے رد عمل میں اس نے خود کو گھبرے میں لینے والے افراد کے تنازع میں واضح کی آئی ہوئی محسوس کی، ساتھ ہی اس نے یہ بھی نوٹ کر لیا کہ پراڈ سے اتر کر آنے والے گارڈ نے بانی گارڈز کو ہاتھ کی خفیف سی جنبش سے اشارہ کیا تھا اور خود تیزی سے مرکز دوبارہ پراڈ کی طرف چلا گیا تھا۔

معاذ نے خود بھی بالکل سی گردن موڑ کر اس طرف دیکھا۔ رنگین شیشوں کی وجہ سے وہ اندر سواہر افراد میں سے کسی کو واضح طور پر نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن اسے اس بات کا احساس تھا کہ اندر سے انہیں دیکھا جا رہا ہے۔ یہ احساس اسے ابھی نہیں ہوا تھا۔ بانگ روکنے کے بعد سے ہی وہ اس بات کو محسوس کر رہا تھا لیکن یہ کوئی ایسی انوکھی بات بھی نہیں تھی۔ وہ جس اعزاز میں اس مکان میں داخل ہوئے تھے، اندر والوں کو ان کی طرف سے بخش اور مشکوک نظروں سے دیکھنے کا پورا پورا حق تھا لیکن پھر بھی جانے کیوں اسے لگ رہا تھا کہ کوئی اسے بہت خاص نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ کون۔۔۔ اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے اسے بہت زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اس نے دیکھا کہ پراڈ کی طرف جانے والا گارڈ بجیلے دروازے کے پاس جا کر رکنا تو کھڑکی کا شیشہ نصف سے بھی کچھ کم نیچے کھسک گیا۔ گارڈ بعد احرام اندر موجود ہستی سے بات کرنے لگا۔ یقیناً وہ اندر موجود ہستی کو ان دونوں کی یہاں موجودگی کے سبب سے آگاہ کر رہا تھا۔ بات مکمل کر کے وہ خاموش ہوا تو اس کے اعزاز سے ظاہر ہونے لگا کہ اب وہ توجہ سے کسی کی بات سن رہا ہے۔ آدھا منٹ سے بھی کم عرصے میں اس نے اپنے سر کو مودبانہ جنبش دی اور دوبارہ ان کی طرف آنے لگا۔

”آپ لوگوں کو میرے ساتھ ڈرائنگ روم تک چلنے کی دعوت کرنی پڑی گی۔ مجھے علم ملا ہے کہ آپ کو احترام سے اندر بٹھاؤں۔“ ان کے قریب پہنچ کر اس نے مہذبانہ لہجے میں ان تک پیغام پہنچایا۔ طے سے وہ گارڈ ہی لگتا تھا لیکن اس کی چال و حال اور بات چیت میں جو قرینہ تھا، وہ اسے اچھا تسلیم یافتہ شخص ظاہر کر رہا تھا۔

”ہمیں یہیں سے اجازت مل جاتی تو اچھا ہوتا۔ میری ساتھی کو ایک ضروری کام سے کسی جگہ پہنچانا تھا اور ہم نے وقت کی بچت کے خیال سے ہی اس شارٹ کٹ کو

بہت مضبوط تھا چنانچہ زوردار آواز اور فضا میں چند چنگاریاں کی چھوٹنے کے سوا کچھ نہیں ہوا تھا۔ اس چوتھے فائر کے بعد شیراڈ والے رکنے نہیں تھے اور گاڑی آگے بھاگ کر لیتے چلے گئے تھے۔ معاذ نے مکان کے طویل ڈرائیو سے پرائنگ کوروک کر پیچھے مڑ کر دیکھا تو بڑا سا گیٹ دوبارہ تیزی سے بند ہو رہا تھا۔ بند ہوتے ہوئے گیٹ سے وہ بھاگتی ہوئی شیراڈ کی صرف ایک جھلک ہی دیکھ سکا۔ اگلے ہی لمحے اسے ان دو کلاشکوف بردار افراد کی طرف متوجہ ہونا پڑا جن کی آنکھوں اور چہروں کے تاثرات خوفناک تھے اور انہوں نے اپنی کلاشکوفیں اس پر اور بشری پر تان رکھی تھیں۔ معاذ کی تیز نظروں نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ گیٹ کھولنے اور بند کرنے کے لیے اس کے دونوں اطراف میں کوئی موجود نہیں تھا اور یقیناً گیٹ کے ساتھ ہی پہنچے ہوئے گارڈ روم سے اسے کھولنے کا کوئی خود کار انتظام موجود تھا۔ ان کو گھبرے میں لینے والے دونوں گارڈز بھی اسی گارڈ روم سے نکل کر بھاگتے ہوئے ان کے قریب پہنچے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کی تعداد چار ہو گئی۔ سنے آنے والے دو میں سے ایک اس پراڈ سے اترتا تھا جس کا انجن ابھی تک اسارت تھا اور یقیناً جس کے باہر نکلنے ہی کے لیے گیٹ کھولا جا رہا تھا۔ دوسرا گارڈ مکان کی مرکزی عمارت کے بائیں پہلو سے سودا رہا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی ایک عدد کلاشکوف موجود تھی۔ پراڈ سے برآمد ہونے والا گارڈ البتہ خالی ہاتھ تھا لیکن اس نے بظنی ہولسٹر پگن رکھا تھا جس میں یقینی طور پر ایک خطرناک مشین پستل موجود تھا۔

”خوش قسم کون اسے اور اندر کیا کرنے کے واسطے آیا اسے؟“ گارڈ روم سے برآمد ہونے والے گارڈز میں سے ایک نے ان سے سوال کرنے میں پہل کی جبکہ باقی تینوں اس اعزاز میں ان کی طرف دیکھتے رہے جیسے ان کی اس حرکت پر ابھی انہیں ثابت لگ جا رہی ہے۔

”سوری خان صاحب! ہم کسی فلاحیت سے اس مکان میں نہیں گئے ہیں۔ انجیل لی مسئلہ یہ تھا کہ ہمارے پیچھے کچھ فٹو لگ گئے تھے اور ان سے بچنے کے لیے اسے مجبوراً اس مکان میں پناہ لینا پڑی۔ آپ نے دیکھ ہی لیا ہو گا کہ وہ ہم پر فائرنگ کر رہے تھے۔ اگر میرا ساگی اپنی بانگ اس مکان کے اندر لالے میں کامیاب نہ ہو پاتا تو ہم ان فٹو لگ کی گولیوں کا نشانہ بن چکے ہوتے۔“

بشری جو بانگ سے نیچے اتر کر کھڑی ہو چکی تھی، ہلکی ہلکی وضاحت دینے لگی۔ معاذ نے اس کا ساتھ

”آئیے، اندر تشریف لے چلیں۔“ انہیں ڈرائنگ روم میں چل کر بیٹھنے کی دعوت دینے والے گارڈ نے بشری کی رائے سنی تو ایک بار پھر مہذبانہ لہجے میں بولا۔ بالی گارڈز اس کے اشارے پر پہلے ہی وہاں سے ہٹ گئے تھے۔ وہ معاذ اور بشری کو اپنی راہنمائی میں مرکزی عمارت کے اندر، ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ ڈرائنگ روم کی وسعت اور آرائش خیرہ کن تھی۔ فرش پر بچے غالیچوں اور دیواروں پر موجود مینا کاری دیہی کاری کے نمونوں سے لے کر فرنیچر، شو چیمز اور پینٹنگز تک ہر شے گواہی دے رہی تھی کہ اس ڈرائنگ روم کی آرائش دزیشائش میں لاکھوں روپے خرچ کیے گئے ہوں گے۔ باہر سے دیکھنے پر بھی انہیں یہ مکان عالی شان ہی لگا تھا لیکن اب اندازہ ہو رہا تھا کہ باہر سے جتنا نظر آ رہا تھا، وہ اندر کے مقابلے میں کچھ نہیں تھا۔ اتنے قیمتی ساز و سامان کے ساتھ ایسے علاقے میں رہنے والے اگر محافل کی فوج کے ساتھ رہ رہے تھے تو ٹھیک ہی رہ رہے تھے۔

ڈرائنگ روم کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی اپنی جگہ یہ ساری باتیں سوچے ہوئے وہ دونوں ایک مہلک جھوٹے کا احساس ہونے پر چو گئے۔ ڈرائنگ روم اگرچہ پہلے ہی اور فریشنر سے مہک رہا تھا لیکن تازہ خوشبو کا یہ احساس بالکل ہی جدا تھا۔ خوشبو کی سست کا تعین کرتے ہوئے دونوں نے بیک وقت اپنے دائیں جانب دیکھا تو انہیں فوراً ہی وہ ہستی نظر آگئی جس کے وجود سے وہ انوکھی خوشبو پھوٹ رہی تھی۔ وہ ایک بچہ بیس سالہ عورت تھی جس کے بے تحاشا حسن نے ڈرائنگ روم کی خوبصورتی کو ماند کر دیا تھا اور اب وہاں اس کے سوا کوئی دوسری شے قابلِ دید محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ عورت نے اسکن ٹائٹ پینٹ کے اوپر نہایت چست آدمے بازوؤں کی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی اور اتنے مناسب جسم کی مالک تھی کہ کہیں ایک انچ بھی فاضل گوشت کی موجودگی کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ وہ دبلا ہونے کے خبط میں مبتلا ڈرائنگ کی ماری خواتین کی طرح سوکھی سڑی بھی نہیں تھی۔ اس کا جسم مخصوص مقامات پر مناسب حد تک بھرا ہوا تھا اور سانسوں کی آمد و رفت سے پیدا ہونے والا زبردست کسی کی بھی سانسیں جھل پھل کر دینے کا سبب بن سکتا تھا۔ اس کی آنکھیں اور بال شہر رنگ کے تھے اور چمکی رنگت میں کچھ ایسا سنہرا پن تھا کہ اس پر کسی سونے کی گڑیا کا گمان ہوتا تھا۔ ترشے ہوئے ہونٹ، ستواں ناک اور بڑی بڑی غزالی آنکھوں کے ساتھ وہ بے داغ حسن کی مالک تھی۔ اس

اختیار کیا تھا کہ اس مصیبت میں پڑ گئے۔ ”معاذ کو اب یہاں کچھ عجیب سی بے چینی ہو رہی تھی اس لیے وہ مزید یہاں رکنے سے گریز کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اپنے آپ پر کسی کی نظروں کے ارتکاز کا احساس اب بھی اسے ہو رہا تھا جس سے وہ کچھ بے اطمینانی محسوس کر رہا تھا۔

”کوشش ہوگی کہ آپ کا زیادہ وقت ضائع نہ ہو۔ اصل میں خان پیلس کی اپنی کچھ روایات ہیں اور یہاں اس بات کو گوارا نہیں کیا جاتا کہ گھر آئے مہمانوں کو بغیر خاطر مدارت کے رخصت کر دیا جائے۔“ اس کے لہجے میں اصرار تھا۔ معاذ اس کی بات سن کر دھیرے سے ہنس دیا اور بولا۔

”مہمان کہاں کے جناب! ہم تو یوں ہی بلائے ناگہانی کی طرح یہاں فک پڑے ہیں۔ ہماری خاطر مدارت تو کسی طور آپ کے لیے لازم نہیں ہے۔“

”مہمان نہ سہی، خود کو پناہ گزین ہی سمجھ لیجئے۔ خان پیلس کی چار دیواری نے آپ کو پناہ دی ہے تو اب کسی طور یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ کے حفظ کا اطمینان کیے بغیر آپ کو یہاں سے روانہ کر دیا جائے۔ فی الوقت تو خدشہ ہے کہ کہیں وہ غنڈے آگے کسی جگہ آپ لوگوں کے منتظر ہوں اور فوراً باہر نکلنے کی صورت میں آپ لوگ دوبارہ مصیبت میں پھنس جائیں۔ بہتر یہی ہوگا کہ آپ لوگ کچھ وقت یہاں گزار کر روانہ ہوں۔ یہاں سے ہمارے گارڈز بھی آپ کو کسی محفوظ مقام تک چھوڑ کر آسکتے ہیں۔ اصل میں یہ علاقہ عام آبادی سے کچھ ہٹ کر ہے اس لیے گزرنے والے لوگوں کو بعض اوقات پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہاں موجود چند گھروں کے افراد بہادر بھی ہیں اور سب نے گھروں پر حفاظت کا مناسب انتظام بھی کر رکھا ہے اس لیے کراچی جیسے بڑے اور پُر شور شہر میں مزے سے پُر سکون زندگی گزار رہے ہیں۔“ نرم لہجے میں بولتے ہوئے اس کا ہیتم اصرار جاری تھا۔ لگتا تھا اوپر سے پُر زور حکم ملا ہے۔ معاذ نے کچھ بے بسی کے عالم میں مشورہ کرنے کے انداز میں بشری کی طرف دیکھا تو اس نے بے پروائی سے شانے اچکائے اور بولی۔

”اگر یہ ہم جیسے بن بلائے مہمان کی میزبانی پر اتنے مصر ہیں تو ہمیں انکار کر کے ان کا دل نہیں توڑنا چاہیے۔ ویسے بھی ان کے دلائل میں دم ہے۔ میں خود بھی مناسب نہیں سمجھتی کہ ہم فوری طور پر باہر نکلیں اور دھر لیے جائیں۔ ہمیں اتنی دیر تو یہاں رکنا چاہیے کہ وہ لوگ ہماری طرف سے مایوس ہو جائیں۔“

کی ٹھوڑی پر بائیں جانب موجود قدرے موٹا سا فل دولہا حسن پر دربان کے فرائض انجام دے رہا تھا یا حسن کی تعجبوں کو مزید نمایاں کر رہا تھا، اس بات کا فیصلہ کرنا ذرا مشکل تھا۔

ان دونوں سے نظریں چار ہونے پر وہ اخلاقاً مسکرائی تو اس کے حسن کو مزید چار چاند لگ گئے پھر وہ سچ سچ چلتی ان کی طرف بڑھنے لگی تو گویا اس کے ہر قدم پر بجلیاں سی کرنے لگیں۔ حقیقت میں وہ ان عورتوں میں سے تھی جو سراپا قیامت ہوتی ہیں۔ وہ دونوں اس کے استقبال کے لیے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اس نے ان کے مقابل پہنچ کر ہاتھ سے انہیں ہٹانے کا اشارہ کیا اور خود بھی پھولوں سے لدی کسی چمکیلی شاخ کی طرح لہراتی ہوئی نرم و دبیر صوفے پر بیٹھ گئی۔ ان سے گفتگو کرنے والا گارڈ بھی تیزی سے اس صوفے کی پشت پر آکھڑا ہوا جس پر وہ بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ ان دونوں کو ذرا تنگ روم میں بٹھا کر باہر نکل گیا تھا اور اب اپنی مالکین کے پیچھے پیچھے دوبارہ اندر آیا تھا۔ معاذ اور بشری اس حسین جسم کے نظارے میں اتنے محو تھے کہ پہلے گارڈ کی اس کے پیچھے موجودگی کو محسوس نہیں کر سکے تھے۔

”میرا نام سونیا خان ہے۔ میں اپنے شوہر داؤد اب خان کے ساتھ یہاں رہتی ہوں۔ میں اس وقت کہیں باہر جانے کے ارادے سے نکل ہی رہی تھی کہ آپ دونوں آندھی طوفان کی طرح وارد ہو گئے۔ میرے سیکریٹری کم گارڈ حامد نے مجھے بتایا کہ آپ چند غنڈوں سے بچنے کے لیے ایسا کرنے پر مجبور ہو گئے تھے تو میں نے سوچا کہ مجھے آپ شریف لوگوں سے ملاقات کر کے معلوم کرنا چاہیے کہ آپ کو کسی مدد کی ضرورت تو نہیں ہے..... لیکن میرے خیال میں تمہاری اور بات سے پہلے تعارف کا مرحلہ مکمل ہو جانا چاہیے۔ کیا میں اپنے خوبصورت مہمانوں سے ان کے نام پوچھ سکتی ہوں؟“ اپنی بات کے اختتام پر اس نے دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ باری باری ان دونوں کو دیکھا۔ معاذ نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے سونیا کی نظریں کچھ دیر کے لیے ساکت ہو گئی ہوں۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ یہی وہ آنکھیں تھیں جو پراڈ میں سے بھی اسے مستقل دیکھ رہی تھیں۔ اب درمیان میں رہنمائی شیشوں کی آڑ نہیں تھی تو وہ اسے مستقل اور یک ٹک نہیں دیکھ رہی تھی لیکن اس کے دیکھنے میں کوئی ایسی بات تھی کہ معاذ کو مرد ہوتے ہوئے بھی الجھن سی ہو رہی تھی۔

”میرا نام بشری گھڑا ہے اور یہ میرے پانچویں بیٹے

معاذ ہیں۔ ہم دونوں آپ کے شکر گزار ہیں کہ نہ صرف ہمیں آپ کے گھر میں پناہ ملی بلکہ آپ نے ہمیں معزز مہمانوں کی طرح عزت بھی دی۔ بہر حال ہم آپ سے معذرت خواہ ہیں کہ ایک تو ہم کسی نئی طرح منہ اٹھائے آپ کے گھر میں آ گئے، دوسرے ہماری وجہ سے آپ کا پروگرام خراب ہوا۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں آپ کا مزید وقت خراب نہیں کرنا چاہیے اور جلد سے جلد یہاں سے رخصت ہو جانا چاہیے۔ اصل میں تو ہم باہر سے ہی رخصت ہو جانا چاہتے تھے لیکن آپ کے سیکریٹری کم گارڈ کے بے حد اصرار پر ہمیں رکنا پڑا۔“ معاذ کو خاموش دیکھ کر بشری نے قرینے سے اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے رخصت ہونے کا ارادہ ظاہر کیا۔

”اوہ نو..... آپ لوگوں کو اتنے تکلف سے سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں کسی خاص کام سے باہر نہیں جا رہی تھی بلکہ اصل میں تو میں یورپ سے گھبرا کر باہر نکل رہی تھی کہ کچھ دیر کی شاؤنک سینٹر میں ٹائم کٹ جائے گا اور پھر موڈ ہوا تو وہاں ہی میں کسی فرینڈ کے گھر چلی جاؤں گی۔ دارا اب آج کل آڈٹ آف کنٹری ہیں تو میں بہت بوری ہو رہی ہوں حالانکہ انہوں نے مجھے بھی اپنے ساتھ چلنے کو کہا تھا لیکن میں اس لیے نہیں گئی کہ وہ اپنی پرنس سیٹھز میں بڑی ہو جائیں گے تو میں پور ہوتی رہوں گی لیکن اب سوچ رہی ہوں کہ یہاں رہ کر پور ہونے سے بہتر تھا کہ میں ان کے ساتھ جا کر ہی پور ہو لیتی۔“

اپنی بات کے اختتام پر وہ دھیمے سروں میں فہمی۔ وہ صورت کے ساتھ ساتھ بڑی خوبصورت اور کھٹک دار آواز کی بھی مالک تھی اور اس کی فہمی بھی بہت سترنم تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ قدرت نے اسے بے پناہ نواز کر اس دنیا میں بھیجا ہے۔ حسن کے ساتھ ساتھ اس کے پاس ثروت بھی تھی اور کسی ایک شخص کے پاس اتنی بہت سی نعمتیں ایک ساتھ کم ہی ہوتی ہیں۔ مگر اخلاق سے ہوں تو عموماً ایسے لوگ مفرد اور نچر لیے ہوتے ہیں لیکن وہ بڑی خوش اخلاق اور خوش گفتار بھی تھی جو اجنبیوں سے بھی اتنی اچھی طرح پیش آ رہی تھی۔ اس کی خوش اخلاقی کا ایک اور ثبوت بھی ان کے سامنے آ گیا۔ ڈرائنگ روم کے جس اندرونی دروازے سے وہ اور اس کا سیکریٹری حامد اندر داخل ہوئے تھے، اسی دروازے سے ایک تقریباً پینتیس چالیس سالہ عورت ٹرائی ویکلیٹی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ ٹرائی خورد و نوش کی اشیاء سے بھری ہوئی تھی۔ بے شمار اسٹیکس کے ساتھ ساتھ ٹھنڈے اور گرم دونوں طرح کے مشروبات بھی موجود تھے کہ مہمانوں کو ان کی پسند کے مطابق

پیش کیے جاسکیں۔ ملازمہ سردی کے لیے وہی موجود رہی اور سونیا بے حد اصرار کے ساتھ انہیں ایک ایک چیز کھانے کی ترغیب دیتی رہی۔ نہ نہ کرتے بھی انہیں بہت کچھ کھانا پڑا کہ جہاں میزبان اتنے اخلاق سے اتنا زیادہ اصرار کر رہا ہو وہاں مہمان کے لیے انکار کی گنجائش کم ہی رہ جاتی ہے۔

کھانے پینے کے سلسلے کے دوران وہ ان دونوں سے ان کے بارے میں چھوٹے چھوٹے سوالیے بھی کرتی رہی۔ بشری کے والد مزار عامم کے حوالے پر وہ بہت خوش ہوئی کہ اسے اتنے بڑے سہانی کی بیٹی سے ملاقات کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔ گفتگو میں اس نے معاذ اور بشری دونوں کو یکساں توجہ سے نوازا لیکن معاذ عموں کو تارہا کہ وہ اس کی طرف خاص اعزاز سے دیکھ رہی ہے۔ بہر حال سونیا کی خوش اخلاقی کو دیکھتے ہوئے اسے اپنے لیے دے اعزاز کو ترک کرنا پڑا تھا اور بشری کے ساتھ ساتھ وہ بھی گفتگو میں برابر سے حصہ لیتا رہا تھا۔ سونیا نے اپنے بارے میں بتا دیا تھا کہ اس کا شوہر دھاب خان اسپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس کرتا ہے اور ان کی شادی کو صرف دو سال کا ہی عرصہ گزرا ہے۔ فی الحال ان کی کوئی اولاد نہیں تھی اور سونیا کے سسرالی رشتے دار بھی گاؤں میں رہتے تھے اس لیے داراب کی غیر موجودگی میں وہ شدید بھائی اور بھوریت کا شکار ہو جاتی تھی۔ اتفاق سے سونیا کا میکا بھی ایک دوسرے شہر میں تھا اس لیے یہاں اس کے زیادہ وسیع تعلقات نہیں تھے۔

آدھے یون گھنٹے کی اس ملاقات میں ان کے درمیان اتنی بے تکلفی ہو چکی تھی کہ آپس میں سلی نمبرز کے تبادلے بھی ہو چکے تھے اور سونیا ان سے یہ وعدہ بھی لے چکی تھی کہ فرصت ملنے پر وہ پھر کسی دن خان پتیس کا چکر ضرور لگائیں گے۔ دوران گفتگو سرسری طور پر ان غنڈوں کے بارے میں بھی بات ہوئی تھی جن سے بچ کر معاذ اور بشری نے خان پتیس میں پناہ لی تھی اور جنہوں نے ان پر ایک فائر بھی کیا تھا۔ معاذ نے سونیا کے سامنے ان غنڈوں سے متعلق مکمل لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے یہ رائے دی تھی کہ یہ اسٹریٹ کرائم کی ایک کوشش تھی اور وہ لوگ اسے اور بشری کو روک کر انہیں لوٹنا چاہتے تھے لیکن اس نے بانٹک نہیں روکی اور خان پتیس کے کھلے دروازے سے اندر گھس گیا تو جھوٹا ہت میں وہ لوگ گیٹ پر ہی ایک فائر مار کر بھاگ گئے۔ پچھلے تین فائرز کا اس نے سونیا سے ذکر ہی نہیں کیا تھا، اسے امید نہیں تھی کہ ان بلند بالا مضبوط دیواروں کے اندر کافی فاصلے پر ہونے والے وہ فائرز سن گئے ہوں گے۔

اگر کسی نے گولیاں چلنے کی آواز سنی بھی تھی تو کراہی جیسے ہنگامہ خیز اور امن وامان کی خراب صورت حال سے دوچار شہر میں دو تین فائروں کی طرف کوئی توجہ ہی کہاں دیتا تھا۔ لوگوں کے لیے یہ ایک روٹین کی بات ہو گئی تھی۔ اسٹریٹ کرائمز کا بھی یہ حال تھا کہ ہر خاندان کا کوئی نہ کوئی فرد ضرور متاثر ہو چکا تھا اس لیے کوئی بھی نیا پیش آنے والا واقعہ لوگوں کے لیے نیا پن نہیں رکھتا تھا۔ سونیا نے بھی اس حوالے سے لگے بندھے دو تین جملے ادا کیے اور پھر موضوع بدل دیا۔ ایک گھنٹے کے قریب وقت گزرا کہ وہ لوگ وہاں سے روانہ ہونے لگے تو ان کے منع کرنے کے باوجود ایک مکمل جیب میں دو گاڑیوں کے پیچھے پیچھے آرہے تھے۔ ان گاڑیوں نے کافی دور تک انہیں چھوڑا اور اس دوران اس بات کا اطمینان کر لینے کے بعد کہ کوئی مشکوک گاڑی ان کا پیچھا نہیں کر رہی ہے پھر واپس پلٹ گئے۔

”میں بھی یہیں اتر کر دین سے گھر چلی جاتی ہوں۔ پہلے ہی آپ کا خاما وقت ضائع ہو گیا ہے۔“ بشری نے معاذ سے کہا۔

”اب تو وقت ضائع ہو ہی گیا ہے تو بہتر ہے میں جہیں تمہارے گھر تک پہنچا دوں۔“ معاذ نے بانٹک روک کے بغیر اسے جواب دیا۔ بشری نے بھی اپنی بات پر دوبارہ اصرار نہیں کیا اور کچھ دیر کے توقف کے بعد بولی۔

”کیا خیال ہے، ہم پر یہ حملہ کامی اور سلطان کی طرف سے ہوا تھا؟“

”حال میں تو ان ہی لوگوں سے دشمنی پالی ہے۔“ اس نے جیسے بشری کے شک کی تائید کی۔

”لیکن وہ گاڑی ان کی نہیں تھی۔ میں نے بھی ان میں سے کسی کو سرخ شیراڈ استعمال کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔“ بشری نے نکمہ اٹھایا۔

”ان کے باپوں کے پاس حرام کا بہت مال ہے۔ گاڑی بدل کر لے آتا ان کے لیے کون سا مسئلہ ہے۔“ معاذ نے زہرے لہجے میں جواب دیا۔

”ہاں کا ایک مطلب یہ بھی لیا جاسکتا ہے کہ وہ آج ہم پر حملہ کرنے کی پلاننگ سے ہی آئے تھے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اصل میں ہم میں سے کون ان کا نشانہ تھا۔ یہ تو اتفاق ہی تھا کہ آج ہم ایک ساتھ یونیورسٹی سے نکلے ورنہ یہ ہمارا معمول تو نہیں ہے۔“ بشری اب بالکل کسی لمحے ہوئے سہانی کی طرح باریک بینی سے سوالات اٹھا رہی تھی۔

”کل ملنے والی دھمکی کی روشنی میں تو میں بھی سوچ

ہے۔ عام آدمی کو تو یہاں اپنا شناختی کارڈ کم ہو جانے کی ایف آئی آر کٹوانے کے لیے بھی پہلے رشوت دینی پڑتی ہے۔ تم بھی یہی صحافی ہونے اور ایک بڑے صحافی کی بیٹی ہونے کے ناتے ایف آئی آر آسانی سے کٹوانے میں کامیاب ہو جاؤ گی لیکن اس کی حیثیت رکھی کارروائی سے زیادہ نہیں ہوگی پھر کیا ضرورت ہے اپنا وقت ضائع کرنے کی۔" یہ شاید پہلا موقع تھا کہ معاذ کو بشری کے سامنے اپنی طویل بات کرنے کا موقع ملا تھا وہ تو عموماً وہی بولتی چلی جاتی تھی۔

"یہ سب باتیں بھی جانتی ہوں لیکن یہ تو نہیں ہو سکتا کہ حالات کو دیکھتے ہوئے بندہ سچ بولتا اور حق کا اظہار کرنا ہی چھوڑ دے۔ اس معاشرے میں کم از کم چند لوگوں کو تو اپنے حصے کی ذمہ داری ادا کرتے رہنا چاہیے۔" وہ بولی تو اس کے لیے جس ادا کی تھی۔

"میں تمہیں سچ اور حق کے اظہار سے نہیں روک رہا ہوں۔ میں خود اس بات کا تاکل ہوں کہ انسان کو اپنے دائرے میں رہتے ہوئے جدوجہد جاری رکھنا چاہیے بلکہ ہر ایسا ماننا بھی ہے کہ کبھی ہر ایمان دار لوگوں کی وجہ سے ہی یہ ملک اب تک سلامت بھی ہے ورنہ بد عنوان اور سازشی نولے نے تو اس ملک کا بیڑا خرق کرنے میں کوئی کسر ہی نہیں چھوڑی ہے۔ میں تو تمہیں صرف یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ ان لوگوں سے امید لگانے کی کوشش نہ کرو جن کا کچھ نہ کرنا ملے ہے۔ یہاں حالات ایسے ہیں کہ جو کچھ کرنا ہے ہمیں خود کرنا ہے۔" اس نے بشری پر اپنا نقطہ نظر واضح کیا۔ باتوں کے دوران میں وہ لوگ راشد منہاس روڈ سے گزر کر شارع قیصل پر بائیں جانب مڑ چکے تھے۔

"معاذ ہمارے پیچھے ریڈ شیراز آرہی ہے۔" اچانک ہی بشری نے اسے اطلاع دی تو وہ چونک کر بیک دیوڑ میں دیکھنے لگا۔ واقعی سیاہ شیشوں والی سرخ شیراز کچھ قافلے سے ان کے پیچھے تھی۔ خان پطیس سے روانہ ہونے کے بعد نیچا چوڑی تک ان کے ساتھ سونیا خان کے گاؤڑ کی گاڑی تھی پھر بھی وہ اپنے اطراف سے چوکنارہا تھا اور اس بات کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتا رہا تھا کہ سرخ شیراز یا کوئی دوسری مشکوک گاڑی تو ان کے پیچھے نہیں آرہی ہے۔ پھر راشد منہاس روڈ پر بھی اس نے اپنے تعاقب کی طرف سے ہوشیار رہنے کی کوشش کی مگر اور مطمئن ہو گیا تھا کہ کوئی گاڑی خاص طور پر ان کے پیچھے نہیں ہے۔ کچھ بشری سے باتوں میں مصروف ہو جانے کے باعث بھی اس کی توجہ بٹ

سکتا ہوں کہ ان کا نشانہ میں تھا۔" معاذ نے جواب دیتے ہوئے بھی آنکھیں پر نظر ڈالی۔ کل گھر جانے سے قبل اس نے بڑی محنت سے آنکھیں پر لکھیں اس تحریر کو سنایا تھا کہ گھروالوں خصوصاً ای کی نظر اس تحریر پر پڑی تو وہ بہت پریشان ہو جائیں گی۔

"جب سے یزدانی بلڈرز والوں کا بھانڈا پھوٹا ہے، دھمکیاں مجھے بھی مسلسل مل رہی ہیں۔ بس میں نے آپ سے ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔" بشری نے گویا اس کے سامنے اعتراف کیا۔

"خیر اس بات سے زیادہ فرق بھی نہیں پڑتا کہ آج کا حملہ کس کے لیے پلان کیا گیا تھا۔ ہم دونوں ہی ان کی ہٹ لسٹ پر آچکے ہیں اور وہ ہم دونوں ہی کے خلاف انتقامی کارروائی کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے ہمیں ایک ساتھ دیکھ کر وہ خوش ہوئے ہوں کہ ایک ساتھ ہی دونوں سے نمٹ لیں گے۔ یہ تو ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہمیں خان پطیس میں ہٹا لینے کا موقع مل گیا ورنہ شاید وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے ہوتے۔" معاذ نے اپنی رائے کا اظہار کیا جس سے بشری کو بھی اختلاف نہیں تھا۔

"کاش ہم شیراز کا نمبر نوٹ کر پاتے تو اس واقعے کی ایف آئی آر ہی کٹوا دیتے۔ یزدانی بلڈرز والوں پر اپنے کالم کے حوالے سے شک کا اظہار تو میں اب بھی کر سکتی ہوں۔"

"رہنے دو یا راجہ ایف آئی آر وغیرہ۔ مجھے یقین ہے کہ ہم نمبر نوٹ بھی کر لیتے تو وہ جعلی ہی نکلتا۔ حملے کے حوالے سے بھی ہمارے پاس سوائے اپنے الزام کے کوئی ثبوت نہیں ہے سونیا خان کو ہم نے اصل بات بتادی ہوتی تو شاید وہ گواہی دے دیتی لیکن یہ ضروری نہیں ہے۔ لوگ عام طور پر اس قسم کے معاملات سے الگ رہنا ہی پسند کرتے ہیں۔ جن لوگوں سے ہمارا واسطہ پڑا ہے، وہ خاصی اونچی پارتی ہیں اور پولیس ایسے لوگوں کے خلاف کچھ نہیں کرتی۔ تم نے جو اتنی محنت کر کے اور اپنی جان خطرے میں ڈال کر یزدانی بلڈرز والوں کے خلاف اتنی تحقیق کی ہے، اس کا کیا نتیجہ نکلا ہے؟ بس تاک شوڑ کے لیے میڈیا والوں کو ایک موضوع مل گیا ہے جو جلد فضا پر جائے گا۔ ہماری پولیس یا کسی دوسرے متعلقہ محکمے کے تو کان پر جوں تک نہیں رہے گی کہ خود اس معاملے کی تحقیق کر کے یزدانی بلڈرز کے خلاف کوئی قدم اٹھائیں۔ یہ پاکستان ہے بشری صاحبہ اور ہم پاکستان کے جس سب سے بڑے شہر میں رہ رہے ہیں یہاں عوام کی شکایات پر کان دھرنے کا کوئی رواج نہیں

گئی تھی اس لیے اسے پتا نہیں چل سکا تھا کہ سرخ شیراؤ کب دوبارہ ان کے قہاقب شروع کر چکی ہے۔ اتنا اندازہ بہر حال اسے تھا کہ یونیورسٹی روڈ اور راشد منہاس روڈ پر ان کا قہاقب نہیں کیا گیا تھا اور شارع فیصل پر آنے کے بعد ہی سرخ شیراؤ دوبارہ ان کے پیچھے لگی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ لوگ وہیں کبھی موجود ان کا انتظار کر رہے تھے۔ گویا انہیں یقین تھا کہ وہ لوگ یہاں سے ضرور گزریں گے۔

معاذ کی اپنی رہائش گاہ کے علاقے میں تھی اور سرخ شیراؤ کے سیان انتظار کرنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ اصل میں وہ لوگ بشری کے پیچھے تھے۔ معاذ نے اندازہ لگایا کہ آج کے قہاقب کا تعلق کامی اور سلطان سے ہونے والی ان کی جھڑپ سے نہیں ہے۔ یہ شاید بشری کے یزدانی بلڈرز والوں کے خلاف لکھنے کا رد عمل تھا۔ ان جیسے لوگوں کے لیے یہ معلوم کرنا کتنا مشکل تھا کہ بی۔ گزار کے نام سے لکھنے والی اصل میں یونیورسٹی کی ایک طالبہ بشری گزراو ہے۔ انہیں اس کی رہائش گاہ کے بارے میں علم ہونا بھی بعید از امکان نہیں تھا اسی لیے وہ ایک بار ناکام ہونے کے بعد یہاں گھات لگا کر بے رحمی سے قتل کر دیے گئے تھے۔

بشری کی جان خطرے میں محسوس کر کے معاذ کے اعصاب تن گئے اور وہ کوشش کرنے لگا کہ سرخ شیراؤ اور ان کے درمیان فاصلہ رہے۔ بایک جیسی چھوٹی سوارسی کا قاعدہ اٹھاتے ہوئے وہ آرام سے ٹریفک میں اپنے لیے راستہ بنا رہا تھا اور کوشش کر رہا تھا کہ انہیں بڑی گاڑیوں کی آڑ میں رہے تاکہ شیراؤ والوں کے لیے انہیں نشانہ بنانا آسان نہ ہو۔ ویسے بھی شارع فیصل جیسی مصروف شاہراہ پر کسی گاڑی سے فائر کر کے فرار ہو جانا آسان نہیں تھا۔ معاذ بہر حال رسک نہیں لے سکتا تھا اس لیے ناکھان کا پل پار کر کے کالونی گیٹ کی طرف جاتے ہوئے بھی اس نے اپنی حکمت عملی کو برقرار رکھا۔ ڈرگ روڈ کی طرف سے آنے ہوئے یہاں بہت سے قدرے تنگ گلیوں والے رہائشی مکانات کے علاوہ کچھ کشادہ محلے بھی موجود تھے۔ بشری کا گھر دو سو گز کے پلاٹ پر بنا ہوا تھا لیکن گلی خاصی کشادہ تھی اور معاذ جب پہلی بار اسے اس کے گھر چھوڑنے گیا تھا تو اس نے یہ بات نوٹ کی تھی کہ علاقے کے دوسرے حصوں کی نسبت اس کا محلہ زیادہ صاف ستھرا تھا۔ شاید وہاں رہنے والے گھرانے عام صاحبہ کی طرح سفید پوش لیکن تعلیم یافتہ اور باشعور لوگ تھے۔

شاہ فیصل کالونی کے داخلی راستے کے ساتھ ساتھ چلتی

طویل ریلوے لائن کی وجہ سے علاقے میں داخلہ ایک عجیبہ مسئلہ تھا اس لیے چند سال پہلے ایک اور ہیڈ برج تعمیر کر دیا گیا تھا۔ کالونی گیٹ سے آگے جا کر ہائیکو ہاؤس پر یہ برج شروع ہوتا تھا اور گھومتا ہوا شارع فیصل کو پار کر کے ایک شاہنگ سینٹر کے قریب اترتا تھا۔ معاذ اس پل کے قریب پہنچا تو اس نے اپنی بایک کی رفتار کچھ اور بھی بڑھا دی اور تیزی سے بایک کو پل پر لے گیا۔

"شیراؤ ہمارے پیچھے نہیں آ رہی، وہ سیدھی نکل گئی ہے۔" بشری نے اسے اطلاع دی اور ساتھ ہی تہجرہ کیا۔ "ہوسکتا ہے یہ کوئی دوسری گاڑی ہو۔ اتنے بڑے شہر میں کوئی ایک ہی تو سرخ شیراؤ نہیں ہوگی۔"

"میرے اندازے کے مطابق یہ وہی گاڑی تھی۔" مصروف شاہراہ کی وجہ سے انہوں نے فائر کرنے سے گریز کیا ہوگا۔ ویسے بھی جہاں تک میرا اندازہ ہے، وہ ہمیں ہلاک کرنے سے زیادہ محفوظ کرنے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ جب ہم پر فائرنگ کی جا رہی تھی تب بھی انہوں نے ہمیں براہ راست نشانہ بنانے کی کوشش نہیں کی تھی ورنہ اس عملی اور ویران جگہ پر یہ کوئی ہتھاملا مشکل کام بھی نہیں تھا۔ اب بھی ہمارے پیچھے آنے کے بعد یوں اچانک پیچھا چھوڑ کر قتل کر کے لے جانے کا مقصد یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ ہمیں بلکہ تمہیں یہ جانا چاہتے ہیں کہ وہ بہت بااختیار ہیں اور جب جو چاہے کر سکتے ہیں لیکن فی الحال ڈھیل دے رہے ہیں۔ مجھے یہ یزدانی بلڈرز والا معاملہ ہی معلوم ہوتا ہے۔ سنا ہے انہوں نے جس بندے کی زمین پر قبضہ کیا ہے تمہارے برپا کیے گئے ہنگے کی وجہ سے اسے بھی اطلاع مل گئی ہے اور وہ معاملے کی حقیقت کے لیے خود پاکستان واپس آ رہا ہے۔ یزدانی بلڈرز والے پہلے ہی تم پر خدارکھائے بیٹھے ہوں گے، اس اطلاع کے بعد انہوں نے رد عمل میں تمہیں ڈرانے دھمکانے کی کوشش کی ہوگی، تمہارے پاس ان کی جلسہ بازی کے تمام ثبوت موجود ہیں اور بہت ممکن ہے کہ اصل مالک عدالت میں ان کے خلاف مقدمہ دائر کرنے سے پہلے تم سے مدد مانگے۔ اس لیے وہ تمہیں دھمکانے کی کوشش کر رہے ہوں کہ تم اس معاملے میں مزید اپنی ٹانگ نہ اڑاؤ اور خاموش ہو کر ایک طرف بیٹھ جاؤ۔" معاذ کے حیرت زدہ ہونے بڑی پھرتی سے حالات کا تجزیہ کر لیا تھا۔

"مجھے بھی اسی طرح کا شک ہو رہا ہے، بہر حال دیکھتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے۔ لی آخر کار تھیلے سے باہر آئی

صرف عورت ہی نہیں مرد کا بھی ہوتا ہے اور مردار کی حفاظت
برود فریق پر لازم ہے۔

☆☆☆

”کیسے ہو معاذ؟“

”ویری ڈسک اینڈ ونڈسم۔“ اس نے خاص انداز
میں بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے شوخی سے جواب دیا تو
ٹوبیہ ہنس دی۔ اس کی خوبصورت ہنسی پر معاذ کو بے ساختہ ہی
بشری کا خیال آیا۔ وہ بھی بے پناہ خوبصورت ہنسی کی مالک
شخصیت تھی اور ٹوبیہ سے بات کرتے ہوئے معاذ کو احساس
ہوا تھا کہ دو بالکل مختلف شخصیت کی مالک لڑکیوں میں ان کی
ہنسی مشترکہ خصوصیت ہے۔ بشری کے نقش و نگار اور رنگت
سے ذرا مغربیت جھلکتی تھی۔ اس کے بال چھوٹے تھے اور
لباس کے معاملے میں وہ قدرے بے پروا ہی تھی جبکہ اس
کے مقابلے میں ٹوبیہ مکمل طور پر بشری حسن کی مالک تھی۔
گہرے سیاہ چمکتے بالوں اور آنکھوں والی ٹوبیہ کے کمر سے
بھی نیچے جاتے ہوئے کھینے بالوں پر ایک عالم فدا تھا۔ اس
کی بڑی بڑی آنکھوں پر موجود لمبی اور گھنی پلکوں کی جھلک
کتھنوں کے دلوں کو مسخر کر لینے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ اس کی
رنگت گلابی اور جلد شیر خوار بچوں کی طرح نرم و نازک سی تھی۔
وہ اپنی بے حد خوبصورت کھڑی ناک میں بیرے کی لوہنگ
پیٹا کرتی تھی اور سمجھ نہیں آتا تھا کہ لوہنگ اس کی ناک کی
خوبصورتی میں اضافہ کر رہی ہے یا اس کی ناک میں آکر
لوہنگ کی قسمت جا گی ہے۔ اس کے بھرے بھرے گلابی
ہونٹوں پر شبنم میں گلاب کی ادھ کھلی کلی کا گمان ہوتا تھا۔ وہ
اپنی راج ہنس جیسی گردن میں سونے کی ایک باریک سی
زنجیر پہنا کرتی تھی جس کی لمبائی اتنی تھی کہ پس کالر یون تک
ہی آ پاتی تھی اور زنجیر میں موجود موتی کی شکل کا چھوٹے
چھوٹے تک جڑالا کٹ کالر یون کے پاس بننے والے ہلکے
گڑھے میں پڑا اپنی چھب دکھاتا رہتا تھا۔

ٹوبیہ کو پہننے اوڑھنے کا بڑا سلیقہ تھا۔ وہ ایک حد میں
رہتے ہوئے فیشن کے مطابق لباس پہنتی تھی اور اس کے
لباس میں مشرقیت کا رنگ نمایاں ہوتا تھا، خصوصاً وہ دوپٹے
بہت بڑے اور سلینے کے ساتھ اوڑھتی تھی۔ ٹوبیہ معاذ تھا جس
نے اتنے بے تحاشا حسن کی مالک ٹوبیہ اور بشری کے درمیان
ایک قدر مشترک ڈھونڈ نکالی تھی، پس فرق تھا تو یہ کہ ٹوبیہ اتنی
خوبصورت تھی کہ اس کی خوبصورت ہنسی اور مسکراہٹ بھی اس
کے بے تحاشا حسن میں مدغم ہو جاتی تھی جبکہ بشری خوبصورت
ضرور تھی لیکن یہ خوبصورتی بے تحاشا نہیں تھی مگر جب وہ ہنستی

جائے گی۔ ”بشری نے حیرت انگیز طور پر اس کے تجویز پر
بہت اختصار سے تبصرہ کیا۔ شاید وہ کسی سوچی میں ڈوبی ہوئی
تھی۔ معاذ نے بھی اس موضوع پر مزید گفتگو کرنا مناسب
نہیں سمجھا۔ ملی ختم ہونے کے بعد وہ بایک کو بشری کے گھر
کی طرف جانے والے راستے پر ڈال چکا تھا۔ چند منٹ کا یہ
راستہ خاموشی سے طے ہوا۔

”اندر آ جاؤ معاذ۔ اپنی پسند کے مطابق ٹھنڈا،
گرم جو چاہیں پی کر جائیے گا۔“ ڈورنگل کی طرف ہاتھ
بڑھاتے ہوئے بشری نے اسے دعوت دی۔

”نہیں بابا! پہلے ہی میں لیٹ ہو گیا ہوں، ویسے بھی
سونیا خان کی خاطر مدارت کے بعد مزید کسی چیز کی گنجائش ہی
کہاں رہ گئی ہے۔ مجھے آج تجربہ ہوا ہے کہ زبردستی کے
مہمانوں کی طرح بھی کسی زبردستی کے میزبان بھی گلے
پڑ جاتے ہیں۔“ معاذ نے کانوں کو ہاتھ لگائے تو بشری ہنس
دی اور شوخی سے بولی۔

”زبردستی کی کسی، میزبان اگر سونیا خان جیسی ہستی ہو
تو بھلا پور نہیں ہوتا اور آپ پر تو وہ اور زیادہ ہی مہربان نظر
آ رہی تھی۔ آپ کے لیے بڑی مٹاس تھی اس کی نظروں
میں۔ مگر جا کر سات لالہ مرحلوں سے اپنی ہی سے نظر اترا
لیجیے گا، کہیں نظریہ زنگ گئی ہو آپ کو سونیا خان کی۔“

”میری فکر چھوڑو اور جا کر اپنی جان کا صدقہ دو۔
بال بال خچ کر نکلی ہو آج۔“ معاذ نے جواباً اسے گھورتے
ہوئے مشورہ دیا اور تیزی سے بایک نکال کر لے گیا۔ اس
نے بشری کے گھر کا گیٹ کھٹکا ہوا دیکھ لیا تھا۔ اب اس کا
ذہن خود بخود سونیا خان کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ غضب
کی دگش خاتون تھی اور جتنی طور پر ایک پرنسز زعمی گزار
رہی تھی۔ شادی شدہ بھی تھی لیکن جانے کیوں اس کی نظروں
میں ایک دعوت ہی تھی۔ معاذ نے اس چیز کو اپنا وہم بھی سمجھتا
چاہا تھا لیکن بشری کے الفاظ نے ثابت کر دیا تھا کہ جو کچھ
اس نے محسوس کیا تھا، وہ وہم نہیں تھا۔ سونیا خان اس سے
خصوصی التفات برت رہی تھی۔ اس نے اسی وقت اپنے دل
میں فیصلہ کر لیا کہ وہ سونیا خان کی پرنزور دعوت کے باوجود
دوبارہ بھی اس کے گھر کا رخ نہیں کرے گا اور وہ فون پر بھی
رابطہ کرے گی تو اس سے جان چھڑانے کی کوشش کرے گا۔
اسے اعتراف تھا کہ سونیا خان زہد شکن حسن واداک کی مالک تھی
اور ایسی خطرناک عورت سے میل ملاقات رکھنا اپنے ایمان کو
خطرے میں ڈالنے والی بات تھی۔ اسے بہت زیادہ نیک یا
پارسا ہونے کا دعویٰ نہیں تھا لیکن اس کا یہ ماننا تھا کہ کردار

کر لیا کرتا تھا جو اس کے دل کے تاروں میں ارتعاش پیدا کر دیتی تھیں۔

”یہ تو بتاؤ کہ آج صہیں میری طرف سے کیا تشریف لاتی ہو گئی تھی کہ تم نے اپنا قیمتی وقت خرچ کرتے ہوئے مجھ غریب کو فون کر ڈالا اور نہ تو سننے میں یہی آتا ہے کہ موصوف سے زیادہ مصروف خاتون پورے پاکستان میں کوئی اور نہیں ہے۔“ اس نے ثوبیہ کے شرمانے کو محسوس کر کے فوراً ہی موضوع بدل دیا۔ ثوبیہ کے حوالے سے اپنے جذبات کے بارے میں وہ خود بھی کلیئر نہیں تھا۔ وہ جتنی ذہین اور حسین لڑکی تھی، اس سے تو ہر شخص ہی متاثر ہو سکتا تھا۔ اسے بھی وہ اچھی لگتی تھی لیکن اسے جیون سا بھی بنانے کے معاملے میں وہ کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اصل میں ابھی اس حوالے سے اس نے کچھ سوچا ہی نہیں تھا۔ اس کی بے چمن روح اسے اکساتی تھی کہ وہ عام لوگوں سے ہٹ کر کچھ کر کے دکھائے۔ تعلیم، نوکری اور پھر شادی والی سیدھی ڈگر پر چلتے چلے جانے پر اس کا دل آمادہ نہیں ہوتا تھا اس لیے وہ ثوبیہ سمیت ٹھکی کو بھی اپنا پابند نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ثوبیہ بھی ایک منجیدہ اور پروہار لڑکی تھی اور اس نے کبھی مکمل کر معاذ کے سامنے اپنے دلی جذبات کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن کہتے ہیں نا کہ عشق اور محبت چھپائے نہیں جیسے تو ثوبیہ کی بھی کسی نہ کسی ادا سے اس کے جذبات کا اظہار ہو ہی جاتا تھا جیسے وہ ابھی اس کے پیچھے پر شرابی تھی اور معاذ نے خود پر ایک بوجھ سا پڑتا ہوا محسوس کیا۔ اسے فوراً ہی احساس ہو گیا تھا کہ جب وہ اپنے جذبات کے معاملے میں کلیئر نہیں ہے تو اسے ثوبیہ سے اس قسم کی پیچھے چھاڑ کر کے اس کے جذبات میں الجھل مچانے کی غلطی بھی نہیں کرنی چاہیے۔ اسی لیے اس نے موضوع گفتگو بدل دیا تھا اور اس سے اس کے فون کرنے کا سبب پوچھ رہا تھا۔

”ایسی کوئی خاص بات تو نہیں تھی۔ بس رات کچھ عجیب و غریب خواب آتے رہے تھے اور مجھے ایسا لگا تھا کہ شاید تم کسی پریشانی یا تکلیف میں ہو تو میں نے سوچا کہ چلو فون کر کے خیریت معلوم کر لوں۔“ اس کے پوچھنے پر ثوبیہ نے کچھ جھپکتے ہوئے بتایا تو معاذ اپنی جگہ دنگ رہ گیا۔ دور بیٹھے کسی شخص کو کچھ بھی بتائے بغیر اگر پر علم ہو جائے کہ آپ کسی مشکل یا تکلیف میں ہیں تو اس شخص کے جذبے کی شدت واضح ہو جاتی ہے۔ یہ تو دل کا دل سے بہت ہی خاص رابطہ ہوتا ہے جو ماد کی اسباب کے بغیر بھی دوسرے کے بارے میں الہام سا ہونے لگتا ہے۔ ثوبیہ اس سے اس حد

تھی تو ایک دم سے جھک اٹھی تھی۔
”نا ہوا؟ کیا خود ہی اپنی سحر انگیز شخصیت کے سحر میں ڈوب کر رہ گئے؟“ ثوبیہ اور بشری کا آپس میں تھاپل کرتا وہ سوچوں میں گم سا ہو گیا تھا۔ ثوبیہ نے پیچھے والے انداز میں اسے نوکارتوں کی طرف دوبارہ متوجہ ہوا۔ وہ آنکھوں میں شریری مسکراہٹ لیے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ آپس میں دیکھ بھال کے ذریعے بات کر رہے تھے اس لیے ایک دوسرے کا ہر تاثر اچھی طرح جان سکتے تھے۔

”میری شخصیت کی سحر انگیزی کا ذکر چھوڑو۔ میں نے اس حوالے سے قصے سنا شروع کیے تو وہ آج کی تاریخ میں ختم نہیں ہوں گے، بس اتنا جان لو کہ دس بیس تو روزانہ یونہی پٹ سے راہ میں کر کر جان دے دیتی ہیں، باقی کتنی اپنی جگہ ہی تڑپ کر رہ جاتی ہیں اس کا میں نے بھی حساب رکھنے کی کوشش نہیں کی۔“ اس نے بڑے بے نیازانہ انداز میں ثوبیہ کو جواب دیا۔

”اولی اللہ! اس کا مطلب ہے کراچی میں تو لڑکیوں کا قتل پڑتا جا رہا ہوگا۔ تم چاہو تو تھوڑی لاپرواہی سے درآمد کرالو۔“ جان بوجھ کر آنکھیں پھیلاتے ہوئے اس نے حیرت اور ہمدردی کا اظہار کیا۔

”لاہور سے ایک لڑکی درآمد کروانے پر غور تو ہوتا رہتا ہے لیکن میں ہی ڈرتا ہوں کہ کہیں ساری زندگی کڑوی گولیاں نکلنے اور بازوؤں میں سونیاں چبھواتے نہ گزارنی پڑے۔“

اس نے شوقی سے ثوبیہ کو پیچھا تو اس کے گلابی رخساروں کا گلابی پن کچھ اور بھی بڑھ گیا اور گھٹی پلکیں فوراً ہی جھپک کر گلابی رخساروں پر سایہ نکلن ہو گئیں۔ وہ میڈیکل کی طالبہ تھی اور علینہ کی وجہ سے جانتی تھی کہ علینہ سمیت گھر کے دیگر افراد بھی اسے معاذ کی دہن بنانے کی خواہش رکھتے ہیں لیکن باقاعدہ رشتہ ڈالنے کے لیے معاذ کے برسرِ روزگار ہو جانے کے منتظر ہیں۔ خود اس کی تعلیم بھی ابھی جاری تھی اس لیے اس سلسلے میں کسی غلط کامظاہرہ نہیں کیا جا رہا تھا۔ رشتے اس کے بہت آتے تھے لیکن اس نے صاف الفاظ میں گھر والوں سے کہہ رکھا تھا کہ تعلیم مکمل ہونے تک وہ ایسے کسی جھنجٹ میں پڑنا پسند نہیں کرے گی۔ اصل میں خود اس کے دل میں معاذ کے لیے پسندیدگی کے جذبات تھے اور وہ اتنی مہلت حاصل کرنا چاہتی تھی کہ معاذ بھی تعلیم مکمل کر کے پیش ہو جائے۔ معاذ سے اس کی ابھی دوستی ضرور تھی لیکن معاذ نے کبھی مکمل کر اپنی پسندیدگی کا اظہار نہیں کیا تھا، بس بھی کبھار ایسے ہی ہنس مذاق اور پیچھے چھاڑ کی باتیں

وہ آپس میں کزرتے تھے اور مختلف شہروں میں رہنے کے باوجود ان کے درمیان اچھی دوستی تھی لیکن وہ اس حد تک اسے سمجھتی تھی، اس بات کا اسے اندازہ نہیں تھا۔

”میں دل برداشتہ نہیں ہوتا اور اپنے حساب سے ایو کو پینڈل کر ہی لیتا ہوں لیکن اس بات کا مجھے بھی بہت اچھی طرح اندازہ ہے کہ مجھ جیسے لوگ اکیلے خود مشکل کا شکار نہیں ہوتے، ان کے ساتھ رہنے والے بھی مشکل میں مبتلا رہتے ہیں۔۔۔۔۔ اس لیے ہم جیسوں سے دور رہنا ہی اچھا ہوتا ہے۔“

اس نے باتوں باتوں میں ٹوبہ کو کچھ سمجھانے کی کوشش کی۔

”دنیا میں کچھ لوگ مشکل پسند بھی ہوتے ہیں۔“

ٹوبہ نے برجستہ اسے جواب دیا۔ اس جیسی ذہین لڑکی معاذ کی بات کا مطلب نہ سمجھتی، یہ کیسے ممکن تھا۔ اس بار معاذ نے

خاصی اختیار کر لی۔ وہ اس موضوع کو طول نہیں دینا چاہتا تھا۔ ٹوبہ نے بھی مزید بات نہیں بڑھائی اور دو چار دھڑ دھڑ کی باتیں کرنے کے بعد سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس کے سلسلہ

منقطع کروینے کے بعد بھی معاذ لا شعوری طور پر اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ ٹوبہ جیسی ہمدرد لڑکی زندگی کے سفر

میں اس کے ساتھ شریک ہونے کی خواہاں تھی تو یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ ایک طرح سے وہ اسے اپنی خوش نصیبی بھی

قراردے سکتا تھا لیکن وہ کیا کرتا کہ ابھی اس کا اپنا مستقبل دھند میں لپٹا ہوا تھا اور اس غیر یقینی صورت حال میں وہ ٹوبہ

کو اس کی ذور نہیں تھما سکتا تھا۔

☆☆☆

”مٹی تھیلے سے باہر آگئی ہے۔“

”مطلب؟“

”مطلب یہ کہ میرے پاس یزدانی بلڈرز والوں کی طرف سے فون آیا تھا۔ بات کرنے والے نے اپنا تعارف

تو نہیں کروایا لیکن اس کے الفاظ ہی اس کا تعارف تھے۔“

”کیا کہہ رہا تھا وہ شخص؟“ بشری کی اطلاع پر معاذ

کے کان کھڑے ہوئے۔ اتفاق سے یہ دونوں ہی کافری پیر تھے اس لیے انہیں ملاقات کا موقع مل گیا تھا اور وہ سرسبز

قلعہ گھاس پر بیٹھے ایک دوسرے سے گفتگو کر رہے تھے۔

”کہنا کیا ہے، بس بڑے فحشے لہجے میں دھمکی دے رہا تھا کہ شیراڈ والوں کا نشانہ اتنا خراب نہیں تھا کہ کوئی

کل کالوڈا موٹر بائیک کے کرتب دکھا کر بچ لگتا نہ ہی ہمارے پاس اسلحے کی کوئی کمی ہے کہ کسی کو ختم کرنے کا فیصلہ

کر لیتے تو صرف ایک بدلے کا ہی استعمال کافی سمجھتے۔ ہم تو سرعام تمہیں بھون ڈالتے اور کوئی ہمیں روکنے والا نہیں ہوتا

نک دلی دانتلی رکھتی ہے اس کا تو اسے اندازہ بھی نہیں تھا۔

”کیا ہوا، چپ کیوں ہو گئے؟“ معاذ کو خاموش پا کر ٹوبہ نے اسے ٹوکا۔

”تم نے خواب میں کیا دیکھا تھا جو پریشان ہو گئیں؟“ معاذ نے اس سے پوچھا۔

”یہ میں نہیں بتاؤں گی۔ کہتے ہیں برے خواب کسی کو نہیں ستاتے چاہئیں ورنہ ان کی تعبیر سامنے آ جاتی ہے۔“

اس نے سختی سے انکار کر دیا۔

”آف! میڈیکل کی اسٹوڈنٹ اور اتنی غیر سائنسی باتیں۔ میں تمہیں اتنی قدامت پسند لڑکی نہیں سمجھتا تھا۔“

معاذ نے جان بوجھ کر اس کی بات سے اختلاف کیا۔

”تم مجھے قدامت پسند کہہ سکتے ہو لیکن میں بعض معاملات میں عقلی اور سائنسی دلائل کے مقابلے میں دل کی

گواہی ماننے کی قائل ہوں۔ عقل اور سائنس دھوکا بھی دے جاتے ہیں لیکن دل کی گواہی ہمیشہ سچ نکلتی ہے۔“ اس نے برا

سمائے بغیر معاذ کو جواب دیا۔

”سبہر حال۔۔۔۔۔ تم میری طرف سے اطمینان رکھو۔ میں بالکل ٹھیک ہوں اور حرے سے اپنی سوچ سستی میں لگا

ہوا ہوں۔ تصدیق کے لیے چاہتا ہوں کہ ناموں جان سے رابطہ کر سکتی ہو، وہ تمہیں بتائیں گے کہ تمہارا یہ کھانکڑن ان

کے لیے کتنا بڑا اور دیر ہے جسے وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے حساب سے ”مدھانے“ میں ناکام ہیں۔“ وہ جان بوجھ کر

لاابالی پن کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ ٹوبہ سمیت وہ کسی کو بھی اپنے حوالے سے تشویش میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے کامی

اور سلطان والے چکر میں جو گڑبڑ چل رہی تھی، کسی کو اس کی ہوا بھی نہیں کھنے دی تھی۔

”ناموں جان اپنے حساب سے ٹھیک ناراض ہوتے ہیں کیونکہ انہیں لگتا ہے کہ تم اپنی ذہانت اور صلاحیت کو ضائع

کر رہے ہو۔ تمام والدین کی طرح ان کی بھی یہ فطری خواہش ہے کہ تم کسی اعلیٰ مقام پر پہنچو لیکن کیا کیا جاسکتا ہے

کہ تمہارے اندر جو بے چین روح ہے، وہ تمہیں ان کی اس خواہش کی تکمیل نہیں کرنے دیتی۔ جس دن انہوں نے اس

حقیقت کو تسلیم کر لیا کہ تم ذرا مختلف شخصیت کے مالک ہو اور تم سے اس قسم کی توقع رکھنا تم پر ظلم کرنے کے مترادف ہے تو وہ

خود اپنی خواہش سے دستبردار ہو جائیں گے۔ تمہیں ان کی باتوں پر زیادہ دل برداشتہ نہیں ہونا چاہیے کیونکہ یہ تو طے

ہے کہ مختلف لوگوں کو عموماً اسی قسم کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔“ آج تو ٹوبہ اسے حیران کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

دغیرہ۔ میں نے اس سے کہا کہ اس رقم دلی کا شکر یہ اب ذرا یہ بھی بتا دو کہ اتنی مہربانی کیوں کی کہ صرف گولیاں ہی چلائیں اور جان بخشی کر دی؟ تو وہ ہنسنے لگا پھر بولا کہ ہم خواتین کی خون ریزی پسند نہیں کرتے اور کوشش کرتے ہیں کہ اس کے بغیر ہی کام چل جائے، اب یہ دوسری پارٹی پر ہوتا ہے کہ ہمارے سمجھانے پر سمجھ جائے۔ میں نے پوچھا کہ جناب مجھ غریب کو کیا سمجھانا چاہتے ہیں تو بولا کہ بات بالکل سیدھی ہے۔ تم یزدانی بلڈرز والے معاملے میں جتنی ٹانگ اڑا چکی ہو، اسے کافی سمجھو اور اپنی ٹانگ واپس سمجھ لو۔ آگے کے معاملات میں تم چپ رہو گی تو ہم بھی جو کچھ ہو چکا بھول جائیں گے لیکن اگر تم نے ہماری بات نہیں مانی تو ہم بھی سود سیت سارا وصول کر لیں گے۔" بشری نے اسے تفصیل سے آگاہ کیا۔

"یعنی میرا اندازہ ٹھیک نکلا۔ یہ یزدانی بلڈرز والوں کی بد سحاشی تھی۔ کامی اور سلطان نے تو شاید اپنے بڑوں کو کچھ بتایا ہی نہیں ہوگا۔ کم از کم اپنی بد سحاشی کے بارے میں تو بالکل بھی نہیں بتایا ہوگا۔ ان کی جو بے عزتی ہوئی اور گت بنی اس کی اصل وجہ تو وہ بتانے کے لائق نہیں ہوں گے۔ وہ اپنے طور پر ہمارے خلاف کوئی کارروائی کریں گے تو بھی اپنی ٹھٹھک کھا جائیں اسی لیے مجھے شک تھا کہ یہ یزدانی بلڈرز والوں کی طرف سے تمہیں ڈرانے دھمکانے کی ایک کوشش ہے۔" سن کر معاذ نے تیرہ کیا۔

"آپ کا دوسرا اندازہ بھی ٹھیک تھا۔ وہ لوگ زمین کے اصل مالک قیوم صدیقی کے وطن واپس آنے سے گھبرا گئے ہیں۔ اتفاق دیکھیں کہ دھمکی والے فون کے فوراً بعد میرے پاس قیوم صدیقی کی کال آگئی۔ اتفاق سے وہ پہلے ہی پاکستان آنے کا پروگرام بنائے بیٹھے تھے اسی لیے کسی کے طبی اندازوں سے بہت پہلے وہ پاکستان پہنچ چکے ہیں اور انہوں نے یہاں ایک قابل وکیل کی خدمات بھی حاصل کر لی ہیں۔ زمین کی ملکیت کے حوالے سے ان کے پاس جو ثبوت ہیں، اس کے ساتھ ہی وہ یزدانی بلڈرز والوں کی جلسہ سازی کے ثبوت بھی شامل کرنا چاہتے ہیں اسی لیے انہوں نے مجھ سے رابطہ کیا تھا اور پوچھ رہے تھے کہ کیا میں ان کی مدد کرنا پسند کروں گی؟"

"پھر تم نے کیا جواب دیا؟" معاذ نے دلچسپی سے پوچھا۔
 "آف کورس میں نے ہاں کر دی۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں حق کا ساتھ دینے کی کتنی زیادہ قائل ہوں۔" بشری نے جھٹ سے جواب دیا اور مزید بتانے لگی۔

"کل میں قیوم صاحب کی خواہش پر ان کے ساتھ ان کے وکیل سے ملنے جا رہی ہوں۔ انہوں نے مجھ سے کہا ہے کہ وہ خود مجھے گھر سے پک کر لیں گے۔"

"تم نے انہیں بھی بتا دیا ہوگا کہ تمہاری گاڑی ورکشاپ میں کھڑی ہے۔" معاذ شوخی سے ہنسا۔

"وہ تو بتانا ہی تھا۔ میرے کسی بھی شناسا سے یہ بات زیادہ عرصے سے مخفی نہیں رہتی کہ کار کے نام پر میرے پاس جو ایک عدد چار پہیوں والا ڈبا ہے، وہ چلا کم اور ورکشاپ پر زیادہ کھڑا رہتا ہے۔ اس لیے میں اکثر دوستوں سے لفٹ کی محتاج رہتی ہوں۔" معاذ کی بات کا بڑا مٹائے بغیر اس نے فیس کر جواب دیا۔

"اس کا مطلب ہے مجھے آج بھی تمہیں لفٹ دینی پڑے گی۔" معاذ نے اسے ٹھہرا۔

"دے دیں تو مہربانی ہوگی۔ ایک "بے کار" بندی کی دعا نہیں مل جائیں گی۔" اس نے مظلوم شکل بنائی۔
 "نکلیں آج بھی تمہارا اپنے فیچر وغیرہ کے چکر میں سہراب گوشت کی طرف جانے کا پروگرام تو نہیں ہے؟" معاذ نے جان بوجھ کر تشویش کا اظہار کیا۔

"نہیں، وہاں نہیں جانا۔ لی والال اس بات کا انتظام کر لیا گیا ہے کہ وہ بندہ خود ہی آکر مجھ سے ملاقات کر لے گا اور بعد میں اگر میں ضرورت محسوس کروں گی تو خود وہاں کا وزٹ کر لوں گی۔"

"مجھے یقین ہے کہ تم ایسی ضرورت محسوس کرو گی۔ میں تمہاری ٹائپ پہچان گیا ہوں۔ تم ان لڑکیوں میں سے ہو جن کے دماغ کے کچھ پڑے ڈھیلے ہوتے ہیں۔" معاذ اس چھوٹی سی لڑکی کے اخلاص سے مختصر عرصے میں ہی متاثر ہو چکا تھا لیکن جان بوجھ کر اس سے ایسی باتیں کر رہا تھا۔

"آپ نے میری ٹائپ بالکل ٹھیک پہچانی ہے معاذ صاحب! مجھے واقعی وہاں جانے بغیر چمن نہیں آئے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ میں ایک بار بھرا سی راستے سے آپ کو اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دوں جس پر سونیا خان کا گھر ہے۔ اچھا ہے اسی بہانے آپ اس کے در دولت پر حاضری دے دیجیے گا۔ ورنہ وہ دیر دیر فری رائے کیے بیٹھی ہوگی۔"

اس نے شوخ لہجے میں جتنے ہوئے جواب دیا تو اس کی شخصیت حسب معمول جھکا گئی۔ اس جھکا ہٹ نے ایک ہل کے لیے معاذ کی توجہ مبذول لی لیکن فوراً ہی اس نے توجہ ہٹا لی اور منہ بنا کر بولا۔

”شٹ اپ! میں کسی کی بچی پر نظر رکھنا پسند نہیں کرتا۔“
 ”لیکن کسی کی بچی کی نظریں تو آپ پر ہیں؟“ وہ
 اب بھی باز نہیں آئی۔

”فصلوں باتیں چھوڑ دو اور یہ بتاؤ کہ تمہاری کلاسز کب
 آف ہوں گی۔ میں تو آج دو بجے تک فارغ ہو جاؤں گا۔“
 معاذ موضوع بدل کر بالکل سنجیدہ ہو گیا۔

”آپ نے شاید میری لفٹ والی بات کو سنجیدہ سمجھ
 لیا۔ تحریک یو سوج! آج یہ کار خیر راجیلہ کے ذمے ہے۔
 آپ آرام سے اپنے پردرگام کے مطابق آنا جانا کرتے
 رہیں۔“ وہ بھی اس بار قدرے سنجیدہ ہوئی۔

”اوکے، اب میں چلتا ہوں۔ کلاس کا ٹائم ہونے
 والا ہے اور اس سے پہلے مجھے لائبریری سے ایک بک بھی
 ایشور کو دانی ہے۔“ معاذ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”اوکے بائے۔“ وہ اپنے بک کی زب کھول کر اندر
 جھانکتے گئے۔ معاذ نے چند قدم آگے بڑھائے لیکن پھر اس
 کے پکارنے پر پلٹ کر دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔

”اپنا خیال رکھیے گا معاذ۔“ اس نے آہستہ سے کہا
 اور فوراً ہی نظریں پلٹا کر دوبارہ اپنے بک کے اندر جھانکتے
 میں مصروف ہو گئی لیکن اس کے اس ایک پل کے دیکھنے ہی
 نے معاذ کو شکار دیا تھا۔ اس ایک نظر میں جو تحریر روح میں
 وہ اسے ستائے میں لے آئی تھی۔ پہلے تو یہ اور اب یہ.....
 اسے اپنا دماغ سن ہوتا ہوا محسوس ہوا اور بڑی مشکل سے خود
 کو حرکت میں لاتے ہوئے پوچھل قدمیوں سے لائبریری کی
 طرف بڑھنے لگا۔ اس کے بدن میں تو کسی آزاد چیمپی کی سی
 روح تھی اور وہ آزاد چیمپی حیدروں میں بیڑیاں پڑنے کے ڈر
 سے بڑی الجھن میں مبتلا ہو گیا تھا۔

☆☆☆

”تو تم نے طے کر لیا ہے کہ تم ہر صورت قیوم صدیقی کا
 ساتھ دو گی؟“ گلزار عامم نے گہری نظروں سے بشری کو
 دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”آف کورس بابا! اس معاملے میں سوال کرنے کی تو
 کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ قیوم صدیقی کے ساتھ زیادتی
 ہوئی ہے اور میرے پاس اس بات کا ثبوت موجود ہے تو
 مجھے لازمی ان کا ساتھ دینا چاہیے۔“ بشری کے سامنے کوئی
 فائل کھلی ہوئی تھی جس کا جائزہ لیتے ہوئے اس نے گلزار
 عامم کی بات کا جواب دیا۔

”کیا یہ بہت ضروری ہے بیٹا! میرا مطلب ہے تم نے
 اپنا فرض ادا کر دیا۔ تمہارے لیے کئے گئے انکشافات کے نتیجے

میں قیوم صدیقی اور حکومت دونوں کو خبر ہو گئی کہ یزدانی
 بلڈرز والے کیا کر رہے ہیں۔ اب تم ان لوگوں کو یزدانی
 والوں سے منسنے دو اور خود ایک طرف ہو جاؤ۔ تمہارا مستقل
 اس معاملے سے جڑا رہنا ضروری تو نہیں ہے۔“ گلزار عامم
 کافی مضطرب محسوس ہو رہے تھے۔ اس بار بشری نے فائل
 پر سے سر اٹھایا اور حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

”کیا بات ہے بابا! کوئی پرابلم ہے کیا؟“ اس کے
 دیکھنے پر وہ اس سے نظریں چرانے لگے تھے۔ اس لیے اس
 کی حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا اور وہ ان سے پوچھنے لگی۔

”پرابلم تو کچھ نہیں ہے بیٹا لیکن اپنی اگلی مینی کے
 لیے پریشان ہونا تو ایک فطری سی بات ہے۔ یزدانی بلڈرز
 والے خطرناک لوگ ہیں۔ ان کے حوالے سے دہلی زبان
 میں ہی سبکی پہلے بھی کچھ قصے سننے میں آ رہے ہیں۔ اس
 قسم کے خطرناک لوگوں سے تمہارا انکراؤ مجھے مضطرب کر رہا
 ہے۔“ گلزار عامم کا لہجہ ان کی بے بسی کی جھلک کھارہا تھا۔

”یہ آپ کہہ رہے ہیں بابا! آپ جو کہ ایک غروہ ہے
 پاک و در راست گو سمجھائی کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔“
 بشری کی حیرت دو چہرہ ہو گئی۔

”میں صرف سچائی ہی تو کہتا ہوں۔ میں ایک باپ بھی
 تو ہوں۔“ ان کی نظریں قدرے شرمندہ مشرعوں کی تھیں۔
 ”مگر آپ ایسے کم ہمت باپ تھے تو آپ کو مجھے اس
 فیلڈ میں آنے کی اجازت ہی نہیں دینی چاہیے تھی۔ آپ کو
 چاہیے تھا کہ میری پرورش ایسے خطوط پر کرتے کہ میں
 صحافت کے بجائے ہوم اکنامکس، ایجوکیشن یا اسی قسم کے کسی
 دوسرے سیدھے سادے سبیکٹ میں ماسٹرڈ کرتی اور کسی
 تعلیمی ادارے میں بھرتی ہو کر گلی بندھی زندگی گزارتی
 راتی۔ آپ کیوں بچپن سے مجھے راست گوئی، حق گوئی اور
 وطن پرستی وغیرہ کے اسباق پڑھاتے رہے؟“

اس کے انداز میں بیک وقت دکھ، غصے اور غلگی کے
 جذبات جھلک رہے تھے۔

”میری بات سمجھنے کی کوشش کرو بیٹا! ابھی تم نا تجربے
 کار ہو۔ اتنے بڑے بڑے مگر چھوٹے سے منسنے کے لیے
 تمہاری عمر اور تجربہ دونوں بہت کم ہیں پھر بھی میں نے تمہیں
 اس کیس پر کام کرنے سے نہیں روکا تھا لیکن اب تمہیں
 آؤٹ آف دسے جا کر قیوم صدیقی کی مدد کر لے کی
 ضرورت نہیں ہے۔ خود اس کے پاس بھی اپنی ملکیت کے
 حوالے سے قیمت وغیرہ موجود ہوں گے تو وہ خود اس معاملے
 سے منسلک لے گا۔“

جیسے چل چڑھے۔ حسب توقع دروازے پر قیوم صدیقی ہی موجود تھا۔ وہ پچاس پچپن سال کا ایک گورا ہٹا آدمی تھا اور تھری فیس سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس نے گھڑا عام سے مصافحہ کیا اور بشری کو جلد واپس گھر پہنچانے کی تحین دہانی کروانے کے بعد اسے اپنے ساتھ لے کر روانہ ہو گیا۔

”تھینک یو سوچ لکل گرل کہ تم میرے ساتھ۔ کوآپرٹ کرنے کے لیے راضی ہو گئیں۔ ویسے تم میرے اندازے سے بہت زیادہ کم عمر ہو۔ میں نہیں سوچ سکتا تھا کہ اتنا زبردست کام کرنے والی لڑکی اتنی کم عمر ہوگی۔“ راستے میں اس نے بشری سے کہا۔

”اصل میں میں نے ہوش سنبھالتے ہی طے کر لیا تھا کہ جھوٹی سی ایک لڑکی ہوں پر کام کروں گی بڑے بڑے۔۔۔۔۔ اس لیے جھوٹی عمر میں بڑے کام کرنے لگی ہوں۔“ بشری نے اپنی فطری بے ساختگی سے جواب دیا تو وہ ہنسنے لگا پھر تلخ ہوئے ہوئے بولا۔

”تم نے صرف بڑا کام نہیں کیا ہے بلکہ ایک بڑے کام میں آنے والی رکاوٹ کا بھی جودت بھاڑا پھوڑ دیا ہے۔ یہ دانی بلڈرز والوں نے جس زمین پر قبضہ کر رکھا ہے، وہ میں نے ہاسٹل کی تعمیر کے لیے خرید کر ڈالی ہوئی تھی۔ میں ایک ہارٹ مرچن ہوں اور اپنے کیریئر کے بالکل اسٹارٹ میں ہی امریکا چلا گیا تھا۔ وہاں میں نے اپنی قابلیت میں بھی اضافہ کیا اور چوسا بھی بہت کمایا۔ یہ سب میں یہاں رہ کر نہیں کر سکتا تھا لیکن یہ بات میرے دماغ میں رہی کہ مجھ پر اپنے وطن کا قرض ہے اور مجھے یہ قرض اتارنے والی آنا ہے۔ یہاں ایک اچھے ہاسٹل کی تعمیر کا منصوبہ برسوں سے میرے دل میں چل رہا ہے اور اس بار میں اسی لیے پاکستان آرہا تھا کہ ہاسٹل کی تعمیر کے لیے ابتدائی کارروائی کا آغاز کر سکوں۔ نیٹ پر تمہاری تیار کردہ رپورٹ پڑی تو معلوم ہوا کہ کوئی میرے خواب پر شب خون مار چکا ہے۔ میں تو پہلے ہی آرہا تھا، اس خبر کے بعد فوراً ہی آ گیا۔ یہاں ایک دوست کے توسط سے ایک اچھے وکیل سے رابطہ ہو گیا ہے اور اس نے بہت امید دلائی ہے کہ فیصلہ میرے حق میں ہی ہوگا۔“ قیوم صدیقی بتا رہا تھا اور وہ ذرا سا اس کی طرف رخ کے توجہ سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ کھڑکی سے اطراف سے گزرتا ہوا ٹریک بھی اسے دکھائی دے رہا تھا۔

پچھلے دنوں پیش آنے والے واقعات اور ملنے والی دھمکیوں کے بعد گھر سے باہر وہ اپنے اطراف سے باخبر اور چونکا رہنے کی کوشش کرتی تھی اور اس وقت بھی لاشعوری طور

”پلیز بابا خاموش ہو جائیں۔ مجھے تحین نہیں آرہا کہ یہ سب آپ کہہ رہے ہیں۔“ وہ سچی تو پڑی۔

”بشری بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے گھڑا! آپ جیسا آدمی ایسی بات کہے کہ سکتا ہے۔ ہم نے اپنی بیٹی کی تربیت جن خطوط پر کی ہے ہمارے پاس اس سے ایسی ڈیمانڈ کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔“ عائشہ جو گھڑا عام کی فرمائش چائے لے کر آئی تھیں اور بہت خاموشی سے باپ بیٹی کے درمیان ہونے والی گفتگو سن رہی تھیں، بول چڑیں۔

”تم ویسے تو اس پر اتنی روک ٹوک کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہو اور آج میں نے ایک بات سے رد کا تو تم اس کی حمایت میں بیٹھیں؟“ انہوں نے بھی سے شکوہ کیا۔

”میں اسے جن معاملات میں روک ٹوکتی ہوں، وہ بالکل مختلف ہیں۔ میں اسے ان حدود و قیود میں رکھنے کی کوشش کرتی ہوں جو ایک مسلمان عورت پر لاگو ہوتی ہیں لیکن سچ اور حق کا ساتھ دینا تو ہمارے دین کے اولین اسباق میں سے ہے، میں اپنی بیٹی کو اس سے کیسے روک سکتی ہوں؟“ عائشہ کے الفاظ نے بشری کو خوش کر دیا اور وہ فوراً ان سے لپٹ گئی۔

”سو سوئیٹ می! آپ نے تو میرا دل خوش کر دیا۔“

”میری رائے اپنی جگہ ہے لیکن تم بہر حال اپنے بابا کی اجازت ضرور لے لیتا۔“ عائشہ نے نرمی سے اسے سمجھایا تو اس نے سوالیہ نظروں سے گھڑا عام کی طرف دیکھا۔

”تمہاری مٹی کی بات کے بعد میرے پاس انکار کی گنجائش ہی کہاں ہے۔“ گھڑا عام نے ہتھیار ڈال دیے۔

”میرے اتنے بہادر بابا کو کرنا بھی ایسا ہی چاہیے تھا۔“ اس نے فوراً ان کے گلے میں ہاتھیں ڈال دیں۔

”اچھا بس زیادہ بڑبگ مت کرو اور ریڈی ہو جاؤ۔ میرے خیال میں قیوم صدیقی تمہیں لینے کے لیے آتا ہی ہوگا۔“ انہوں نے شفقت سے کہا لیکن ان کی آنکھوں میں اب بھی تشویش کے رنگ تھے۔ بشری نے یہ رنگ نہیں دیکھے اور زیر مطالعہ فائل کے صفحات ترتیب سے رکھنے کے بعد اپنا ونڈ بیگ چیک کرنے لگی کہ آیا اس میں تمام ضروری چیزیں موجود ہیں یا نہیں۔ گھڑا عام اس دوران خاموشی سے چٹے چائے کی چسکیاں لیتے رہے جبکہ عائشہ واپس کچن میں چلی گئی تھیں۔ گاڑی کے بارن کے فوراً بعد ہی ڈور بیل کی آواز سنائی دی تو وہ لوگ سمجھ گئے کہ قیوم صدیقی آچکا ہے۔ بشری اپنے پاس موجود فائل اور اپنا ونڈ بیگ لے کر باہر کی طرف بڑھی۔ گھڑا عام بھی بے ساختہ ہی اس کے

پر ہی اس کی نگرانی اور دھڑکنے کی جگہ پر ہی تھیں تاہم سنگھ پر توجہ مرکوز ہونے کی وجہ سے وہ چاروں طرف سے کٹا کر رہ گئی تھی۔ اسی لیے ان دو سوڑا رنگی سواروں پر ہانکے آخری لمحات میں اس کی نگرانی جو دائیں طرف سے آچانک ہی نمودار ہوئے تھے اور ان کی گاڑی کے بالکل ساتھ ساتھ چلنے لگے تھے۔ سوڑا رنگی چلانے والے لڑکے نے سر پر ہیلمٹ پہن رکھا تھا جس کی وجہ سے اس کی شکل بالکل نظر نہیں آ رہی تھی جبکہ اس کے پیچھے پہنے ہوئے لڑکے کا چہرہ بھی بڑے بڑے سن گلاسز اور ٹھنی ڈائری میں خاصا چھپا ہوا تھا۔ پیچھے والے لڑکے کے ہاتھ میں بشری نے ٹائٹ ایم ایم اسلحہ کی جھلک دیکھی اور اضطراری طور پر جھپٹتے ہوئے چلتی۔

"جنگ جانیوں قیوم صاحب۔" اس کے الفاظ تازگی کے شور میں دب گئے اور اس نے اپنے بائیں بازو میں لوہے کی گرم سلاخ سی ٹھہرنے کی تکلیف کے علاوہ کچھ قسم کے حلقہ خصوصوں پر ایک قیامت سی نوٹی ہوئی محسوس کی لیکن پھر جلد ہی اس کے محسوسات نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ تاریکی کی دیر بھی جو اسے ہر احساس سے بے گانہ کر چکی تھی۔

☆☆☆

معاذ عالم شاہ اور دو تین مزید لڑکے ایک قطار میں موجود تھیں گھر سے تھے۔ ان کے بالکل سامنے چار پائی پر گاؤں کے سہارے نیم دروازہ بدرو پہلوان جا رہی ہوئی تھیں۔ ان کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس جائزے کے دوران ہی اس نے اسی کا ایک ٹل ساڑ گھاس خالی کیا تھا اور وہ گھاس چار پائی کے نیچے ہی لٹکا کھینچ کے جھوم میں چھپا ہوا تھا۔ کھینچوں کی جھنجھٹا ہٹ بدرو کے استغراق میں غلطی عمل نہیں ہو رہی تھی اور وہ پوری توجہ سے لڑکوں کے متحرک جسموں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے حکم پر ان سب نے ایک ایک لنگوٹ کٹنے کے علاوہ کچھ نہیں پہنا ہوا تھا اور مشقت کے پینے سے ان کے جسم چمک رہے تھے۔ اپنے اپنے طور پر وہ سب ہی کڑی محنت کر رہے تھے۔ لیکن بدرو کی تجربہ کار نگاہیں دیکھ سکتی تھیں کہ معاذ اور عالم شاہ کے علاوہ باقی لڑکوں کا سانس اب بری طرح پھولنے لگا تھا اور وہ جلد ڈھنسنے والے تھے۔ اپنے شاگردوں میں اسے معاذ اور عالم شاہ بہت پسند تھے لیکن ان دونوں میں سے بھی وہ معاذ کو زیادہ پسند کرتا تھا کیونکہ اس نے محسوس کیا تھا کہ معاذ ٹھنکی ہونے کے علاوہ قدرتی طور پر بھی زیادہ باصلاحیت ہے۔ اسے اپنی غیر موجودگی میں ہونے والے معاذ اور عالم شاہ کے مقابلے کے بارے میں بھی علم ہو چکا تھا اور اس مقابلے کو دیکھ کر بھی وہ بتا سکتا تھا کہ مقابلہ

بہت شاندار رہا ہوگا۔ معاذ کی برتری بھی اس کے نزدیک حیرت کی بات نہیں تھی۔ وہ اس لڑکے میں کوئی الگ جذبہ، جنون اور شعلہ سا محسوس کرتا تھا اور جانتا تھا کہ ایسے لوگ دوسروں سے ہمیشہ بہت لے جاتے ہیں۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ معاذ کو ایک مکمل پہلوان، ایک پیشہ ور پہلوان کے روپ میں ڈھال دے لیکن وہ جانتا تھا کہ ایسا ممکن نہیں ہے کہ شہری ماحول کا پڑھنے لکھنے والا یہ لڑکا اور بھی بہت سے شوق رکھتا تھا اور پہلوانی کے ٹریننگ اس کے بہت سے مشاغل میں سے ایک مشغلہ تھا۔

"معاذ..... معاذ! بہت بری خبر ہے۔ بشری گلزار کو کسی نے ٹارگٹ کلنگ کا شکار بنایا ہے۔ ٹی وی پر نیوز چل رہی ہے۔" بدرو کی تحویتی اور استغراق کو ایک تیز آواز نے توڑا۔ بہت جوش سے معاذ کو یہ اطلاع دینے والا نہیں تھا۔ اس خبر کو سنتے ہی معاذ کا متحرک جسم ایک لمحوں میں ساکن ہوا اور پھر وہ تیزی سے بھاگتا ہوا بائیں طرف لپکا۔ قمر کے کچان ہال اس پر ایک نیلی دیرین صیٹ مسلسل چلتا رہتا تھا اور معاذ اپنے چپے کی پروا کیے بغیر اس طرف دوڑا تھا۔ اسے یہ خیال بھی نہیں آیا تھا کہ وہ اپنے اسٹارٹ فون پر بھی یہ خبر دیکھ سکتا ہے۔ وہ پینے سے شرابور، صرف ایک لنگوٹ پہنے چلے ہوئے ٹی وی کے سامنے کھڑا تھا۔ کچھ اور لوگ بھی اسکرین پر دکھائے جانے والے مناظر کی طرف متوجہ تھے لیکن ان کے لیے یہ ایک معمول کی خبر تھی۔ ان میں سے کوئی بھی معاذ جیسی کیفیت سے نہیں گزر رہا تھا۔ ٹی وی اسکرین پر ایک تباہ شدہ گاڑی، خون کے دھبے اور چند پولیس والے کارروائی کرتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ ساتھ ہی نیوز اینکر بیجانی لہجہ میں بتا رہا تھا۔

"شارع فیصل پر اسٹارٹ کیٹ کے قریب ٹارگٹ کلنگ کا ایک واقعہ پیش آیا ہے۔ واقعے میں امریکا ریٹرن ہارٹ سرجن قیوم صدیقی اور مشہور صحافی گلزار عاصم کی بیٹی بشری گلزار کو نشانہ بنایا گیا ہے۔ اطلاعات کے مطابق قیوم صدیقی کو ایک گولی سر اور دوسری گردن میں لگی اور وہ موقع پر ہی ہلاک ہو گئے جبکہ بشری گلزار کے بازو میں ایک گولی لگی ہے لیکن ان کی حالت بھی سخت تشویش ناک ہے۔ واقعے کے وقت قیوم صدیقی گاڑی چلا رہے تھے۔ ان کو گولی لگنے کی وجہ سے گاڑی قابو سے باہر ہو گئی اور ایک ٹرک سے ٹکرا کر بری طرح تباہ ہو گئی۔ بشری گلزار کو زیادہ چوٹیں اسی حادثے میں لگی ہیں۔ انہیں فوری طور پر جناح اسپتال منتقل کیا جا چکا ہے جہاں ان کی حالت تشویش ناک بتائی

میں معروف تھیں۔ شاید کوئی ایسا عقیدہ، ایسا کوئی رسم، ایسی کوئی دعا جو انہیں ان کی بیٹی لوٹا دے۔ ان کے ساتھ ہی ایک لڑکی ان کا بازو تھام کر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ سسٹیں کے ساتھ زار و تظار رو رہی تھی۔ معاذ اسے یونورٹنی میں بشری کے ساتھ دیکھ چکا تھا اس لیے اسے پہچاننے میں مشکل نہیں ہوئی کہ وہ بشری کی قریبی کھلی راجیلہ ہے۔ ان تینوں چہروں کے علاوہ بھی وہاں ارد گرد جھٹنے چہرے موجود تھے، ان پر تشویش اور دکھ کے تاثرات درج تھے اور کسی کے بتائے بغیر بھی وہ جان سکتے تھے کہ بشری کی حالت خراب ہے۔

"بشری گزار کی حالت اب کیسی ہے؟" سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی عالم شاہ نے وہاں کھڑے لوگوں میں سے ایک شخص سے پوچھا۔ معاذ میں تو یہ سوال کرنے کی بھی جرأت نہیں تھی۔ وہ بے بسی کی کیفیت میں ایک ستون سے ٹک لگا کر خاموش کھڑا ہو گیا تھا۔

"ڈاکٹر ز اپنی پوری کوشش کر رہے ہیں لیکن کوئی واضح بات بتانے سے قاصر ہیں۔ بہت زیادہ زخم آئے ہیں۔ کئی فریکچر ہیں، سر پر بھی چرٹ لگی ہے جس کی طرف سے ڈاکٹر ز تشویش کا اظہار کیا ہے۔ خون بہت زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے بھی مسئلہ ہے۔ جان بچان والے چند لوگ خون کا عطیہ دے رہے ہیں لیکن ڈاکٹر ز کا خیال ہے کہ ابھی مزید خون کی ضرورت پڑے گی۔" اس شخص نے مختصراً ساری تفصیل بتادی۔

"چلو ہم بھی چل کر خون دیتے ہیں۔" حسین جوان کے پیچھے پیچھے بانگ پر آیا تھا اور معاذ کے قریب ہی کھڑا ہوا تھا، اس گفتگو کو سن کر معاذ کے دل کی بات بوللا۔ ان تینوں نے وہاں سے ہٹتے ہوئے دیکھا کہ میڈیا کے لوگوں نے گزار عام کو گھیر لیا ہے اور ان سے اس حادثے کے بارے میں جاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ شاید کوئی ایسی بات، کوئی ایسا جملہ جو ان کے سینے سے نکلے ہوئے والی خبروں کو مزید چھپا اور سالے دار بنا سکے، حالانکہ جانتے اور سمجھتے وہ بھی تھے کہ اس سب کے پیچھے کون ہو سکتا ہے لیکن کون ایسا بچ بول کر اپنے سر مصیبت مولیٰ لیتا؟ وہ گزار عام کی زبان سے ہی کوئی ایسا جملہ اگواٹا جاتے تھے جس کو بنیاد بنا کر اپنی مرضی کے راگ چیمز سکس لیکن انہوں نے تم اور پریشانی کے لٹن جان لینا لحاظ میں بھی بردباری سے کام لیا اور صرف اتنا بولے۔

"نی الحال میں اس حادثے کے پس منظر سے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں اپنی بیٹی کی طرف سے تشویش میں جھکا ہوں اور سب لوگوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس کی زندگی

جاری ہے۔" نونہ انگریزوں جا رہا تھا اور معاذ کی ساتھیوں میں جیسے کوئی کھول ہوا لاڈ اٹھتا جا رہا تھا۔ رو رہ کر جوش اور جذبے سے ہماری من موہنی بشری کی شکل اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہی تھی۔ اس کی عمر کم تھی لیکن خواب بڑے بڑے تھے۔ اس کے اندر جب انوکھی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ جہاد باہم کرنے کا عزم دل میں لے کر میدان میں اتری تھی اور شہید صحافت بننے کو بھی تیار تھی لیکن اتنی جلدی۔۔۔ ابھی تو اس نے باقاعدہ اپنے کیریئر کا آغاز بھی نہیں کیا تھا، ابھی تو اس کی تعلیم بھی نامکمل تھی۔۔۔ ابھی تو وہ زمین سے نازک کوئیل کی صورت چھوٹی تھی، ابھی تو اس کوئیل کی پوری طرح نمود بھی نہیں ہوئی تھی اور عالموں نے اسے بری طرح روند ڈالا تھا۔ وہ جو گزار عام جیسے دیانت دار صحافی کی اکلوتی بیٹی تھی اور جس کے حوالے سے انہوں نے جاننے کتنے خواب دیکھے تھے، کسی کی فرعونیت کا نشانہ بن کر موت و زیست کے درمیان لگی ہوئی تھی۔ معاذ جوں جوں اس کے بارے میں سوچ رہا تھا، اس کا دل اس کے سینے میں ڈوبتا جا رہا تھا۔

"معاذ!" کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے ہکا تو وہ جیسے کسی گہری کھائی سے باہر آیا اور پکارنے والے کی طرف دیکھا۔ وہ عالم شاہ تھا۔

"چلو، ہم ہاسپٹل چلتے ہیں۔" عالم شاہ کے نہایت ہمدردی سے کہنے پر اسے احساس ہوا کہ واقعی اسے اس وقت ہاسپٹل جانا چاہیے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ لوگ لباس وغیرہ کی تبدیلی کے مرحلے سے گزر کر عالم شاہ کی گاڑی میں ہاسپٹل جا رہے تھے۔ وہاں انہوں نے لوگوں کے ایک چھوٹے سے ہجوم کے درمیان گزار عام کو دیکھا۔ ان کا چہرہ زرد تھا اتنا زرد کہ لٹکا تھا خون کا ایک قطرہ بھی ان کے جسم میں باقی نہ رہا ہو۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے اور ایک آدمی قتل دینے والے انداز میں ان کے شانے پر ہاتھ رکھے ہوئے تھا۔ ان کے ساتھ والی کرسی پر سادہ سے شلوار قمیص میں ایک خاتون بیٹھی ہوئی تھیں۔ خاتون نے بڑی سی سفید چادر اس انداز میں اوڑھی ہوئی تھی کہ ان کی پیشانی مکمل طور پر چھپ گئی تھی اور صرف آنکھیں، ناک اور ہونٹ ہی نظر آرہے تھے۔ ان چہرے نقوش اور رنگت کو دیکھ کر اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ اعلیٰ مغرب میں سے ہیں۔ بشری کی بھوری آنکھیں یقیناً ان ہی سے مشابہ تھیں۔ اس وقت ان بھوری آنکھوں سے لڑکی کی صورت آنسو بہہ رہے تھے لیکن یہ آنسو بے آواز تھے اور وہ سر کو ڈرا سا جھکائے زیر لب کچھ پڑھنے

اور صحت کے لیے دعا کریں۔" ان کے لہجے سے ظاہر تھا کہ وہ بہت مشکل سے اپنے آنسوؤں کو قابو میں رکھے ہوئے ہیں۔ شاید وہ اپنا ایک بہادر روحانی کابج برقرار رکھنا چاہتے تھے لیکن وہ ایک باپ بھی تھے جن کی اکلوتی اولاد موت اور زندگی کے درمیان لٹکی ہوئی تھی۔ دل میں گہرا دکھ محسوس کرتا ہوا معاذ اپنے دوستوں کے ساتھ وہاں سے ہٹ گیا۔ فون کا حلیہ دینے کے مراحل سے گزر کر دوبارہ وہاں آنے میں انہیں خاصا وقت لگا تھا لیکن واپس آکر بھی انہیں یوں ہی محسوس ہوا کہ جیسے اس جگہ کا سحر اپنی جگہ ٹھہر سا گیا ہو۔ شاید کچھ چہروں کی کمی اور زیادتی کی تہذیبی پیش آئی تھی لیکن چہروں کا تاثر ہنوز وہی تھا جو دل کو تشویش میں مبتلا کر رہا تھا۔ پوچھنے پر یہی معلوم ہوا کہ بشری گزرا ہنوز آپریشن تھیمز میں ہے اور ڈاکٹرز اس کی طرف سے کوئی حتمی فیصلہ دہانی نہیں کر رہے ہیں۔ وہاں جینے کے لیے خالی کرسیاں موجود نہیں تھیں اس لیے وہ تینوں ایک دہوار سے ٹک لگا کر کھڑے ہو گئے۔ لب میں خون دینے کے بعد انہیں جوں جوں کے لیے دیا گیا تھا لیکن بجلی بجی سی تھامت سہر حال قسویں ہوتی گئی۔ وہاں کھڑے کھڑے کچھ اور لمحات چہرئی کی رفتار سے آگے بڑھے پھر عالم شاہ جیسے لہجے میں حضرت خراما نامہ از میں بولا۔

"سوری معاذ! میں یہاں جہیں چھوڑ کر جانا تو نہیں چاہتا لیکن مجبوری ہے کہ مجھے جانا ہوگا۔ آج اباجی کو گاؤں سے آتا ہے اور مجھے ہر حال میں ان کے استقبال کے لیے گھر پر موجود ہونا چاہیے۔ میں کوشش کروں گا کہ فون پر تم سے رابطے میں رہوں۔"

"ٹھیک ہے تم جاؤ۔ میرے ساتھ حسین ہے لیکن نہیں، حسین کو بھی اپنے گھر واپس جانا ہوگا۔ اس کا گھر کافی دور ہے، بہتر ہے یہ بھی ابھی روانہ ہو جائے۔ بس کسی طرح میری بایک یہاں پہنچانے کا انتظام کر دیتا۔ وہ وہیں بدرد استاد کے اکھاڑے پر کھڑی ہوگی۔" عالم شاہ سے بات کرتے کرتے وہ حسین کی طرف رخ موڑ گیا تھا اور اب اس سے بات کر رہا تھا۔ جس وقت وہ لوگ ہسپتال کے لیے لگے اس کی کیفیت کے پیش نظر عالم شاہ نے اسے اپنی گاڑی میں ہی بٹھالیا تھا کہ سہارا وہ خود بایک چلانے کی صورت میں کوئی حادثہ نہ کر پڑے۔

"میں کہیں نہیں جا رہا۔ میں تمہارے ساتھ یہیں دوں گا۔ گھر پر فون کر کے اطلاع دے دوں گا کہ آج معاذ کے گھر پر رکھا ہوں تو کسی کو تشویش نہیں ہوگی۔" حسین نے

اپنا فیصلہ سنایا تو عالم شاہ نے اطمینان کا اظہار کیا اور بولا۔
"یہ بالکل ٹھیک فیصلہ ہے تم یہیں رہو۔ معاذ کی بایک پہنچانے کا مسئلہ نہیں ہے لیکن بہتر ہے کہ یہ خود بایک نہ چلائے اور جب بھی گھر واپس جانا چاہے، تم اپنی بایک پر ہی اسے ساتھ لے چلو۔"

"میں اب ٹھیک ہوں یا! بشری کے ساتھ پیش آنے والے حادثے پر فوری رد عمل کے طور پر کچھ ڈسٹرب ہو گیا تھا لیکن اب میں منجمل چکا ہوں۔ تم لوگ میرے لیے اتنا پریشان نہ ہو۔" معاذ نے دخل دے کر انہیں لوکا۔

"ٹھیک ہے، تم منجمل چکے ہو لیکن کوئی فرق نہیں پڑے گا کہ اگر میں بھی تمہارے ساتھ یہاں رک جاؤں۔" حسین نے اپنا حتمی فیصلہ سنایا تو وہ خاموش ہو گیا۔ عالم شاہ ان دونوں سے مصافحہ کر کے وہاں سے روانہ ہو گیا۔ وہاں بہت آوازیں تھیں اور ایک بڑے اسپتال کی مخصوص گہما گہمی نظر آرہی تھی لیکن پھر بھی آس پاس منڈلاتی موت کی آہٹ سے دل گھبرا رہا تھا اور ہر شخص اپنی اپنی جگہ دعا مانگ رہا تھا کہ کسی طرح وہاں منڈلاتی موت واپس لوٹ جائے۔ معاذ کی نگرانی کی بارگزار عمامہ سے ملی تھیں لیکن تو وہ ان کے قریب گیا تھا اور شہی انہوں نے اسے مخاطب کیا تھا۔ بشری کی زندگی کی لویدیل جانے کی امید کے سوا کچھ یا ہر شے بے معنی ہو گئی تھی۔ ایک سناٹا اور خوف سا تھا جو دونوں پر حاوی تھا۔ اس سناٹے میں وہاں وارد ہونے والے ایک شخص کے چہرے نے ہلچل مچائی۔ وہ سلطان تھا جو اپنے دو چہروں کے ساتھ چلا آ رہا تھا۔ اس کی شکل دیکھتے ہی معاذ کے اعصاب تن گئے اور منھیاں بھیج گئیں۔ وہ دوستوں کے معاملے میں جذباتی لڑکا تھا اور بشری اس کی دوست تھی۔ اس کے قتل کی سازش میں ملوث ٹولے کے ایک فرد کو وہاں دیکھ کر وہ اپنے جذبات پر قابو نہ پاسکا اور عقاب کی طرح جھپٹ کر سلطان کا گریبان پکڑ لیا۔

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی یہاں قدم رکھنے کی؟ تماشا دیکھنے آئے ہو؟" خون آشام نظروں سے سلطان کو گھورتے ہوئے وہ بری طرح غرایا۔ سلطان کو اس سے ایسی حرکت کی امید نہیں ہوگی اس لیے وہ چند لمحوں کے لیے بالکل ساکت رہ گیا پھر اس کے ہاتھ سے اپنا گریبان چھڑوانے کی کوشش کرتے ہوئے غصے سے بولا۔

"چھوڑو میرا گریبان۔ یہ کیا ہے ہودہ حرکت ہے۔ بشری تمہاری طرح میری بھی یونیورسٹی فیلو ہے اور میں اس کی خیریت معلوم کرنے آیا ہوں۔"

مت کرو

- (1) غریبوں کے سامنے اپنی دولت کی باتیں مت کرو۔
- (2) کمزور کے سامنے اپنی طاقت کا اظہار مت کرو۔
- (3) بیمار کے سامنے اپنی صحت و تندرستی کا اظہار مت کرو۔
- (4) قیدی کے سامنے اپنی آزادی پر فخر کا اظہار مت کرو۔
- (5) رنجیدہ و افسردہ کے سامنے اپنی خوشیوں کا ڈھنڈورا مت بٹو۔
- (6) بے اولاد کے سامنے اپنی اولاد کی کامیابیوں اور فخر و جبر و دیویوں کے قصے مت بیان کرو۔
- (7) یتیم کے سامنے اپنے ماں باپ کے قصے مت سناؤ۔

نصیحت

ہم آج مفت کی نصیحت قبول نہیں کرے گا۔ کل اسے اچھوس بہت پیگے داموں خریدنا پڑے گا۔ (الفاظ طویل)

مرسلہ۔ جاوید اختر وانا، حیدر آباد

اس سے بولیں۔

”آؤ معاذ! ہم باہر چل کر بیٹھتے ہیں۔“ معاذ نے ایک معمول کی طرح ان کی بات پر عمل کیا اور ان کے پیچھے چل پڑا۔ باقی لوگ وہیں کھڑے رہ گئے۔ بہت کم لوگ تھے جو اس صورت حال کو سمجھ سکتے تھے لیکن یہ کھوج لگانے کا موقع بھی نہیں تھا اس لیے انہیں میں چھپ گئیاں کرنے سے آگے بات نہیں بڑھی۔ اور معاذ اور بشری کی والدہ عائشہ باہر لان میں ایک بیچ پر بیٹھے ہوئے تھے اور عائشہ اس سے کہہ رہی تھیں۔

”میں تم سے ملنا چاہتی تھی معاذ لیکن اعزازہ نہیں تھا کہ ان حالات میں تم سے ملاقات ہوگی۔ بشری ذہنی طور پر اپنے باپا سے زیادہ قریب ہے اور اکثر ان کی شہ پر اپنی بات سنوا لیتی ہے لیکن اپنے خاص خاص دوستوں کے بارے میں مجھے بتائے بغیر اسے جین نہیں آتا۔ تم اس کے نئے دوست ہو لیکن میں نے اس کی زبان سے سب سے

”خیریت نہیں، تم یہ معلوم کرنے آئے ہو کہ اس کے مرنے میں اور کتنی دیر لگے گی؟“ معاذ جیسی آواز میں پھنکارا۔ جذبات میں ہونے کے باوجود اس نے محسوس کر لیا تھا کہ ان کے اطراف لوگوں کا جھوم جمع ہونے لگا ہے اور وہ بہر حال لوگوں کے ہاتھ کوئی موضوع نہیں آنے دینا چاہتا تھا۔

”لگتا ہے تمہارا دماغ الٹ گیا ہے جو ایسی فضول باتیں کر رہے ہو۔“ سلطان نے اس کی گرفت سے اپنا گریبان چھڑوانے کی ایک اور ناکام کوشش کی اور اسی کے انداز میں پھنکارا۔ اس کے لیے یہ شرمندگی کی بات تھی کہ وہ معاذ سے اپنا گریبان چھڑانے میں کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا اس لیے اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا لیکن عوامی جگہ ہونے کی وجہ سے وہ زیادہ ہنگامہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ورنہ وہ اور اس کے ساتھی جس قماش کے لوگ تھے، ایسی صورت حال میں انہیں ہتھیار نکالتے ہوئے دیر نہیں لگتی تھی۔ حقیقتاً عام لوگوں سے بھی زیادہ اسے وہاں موجود میڈیا کے افراد کی فکر تھی اس لیے اپنے ساتھیوں کو بھی اشارہ کر رہا تھا کہ وہ محل سے کام لیں۔

”یہ کیا کر رہے ہو معاذ! چھوڑو! خواتین کو ہتھیار نکالنا پھانسی کا۔“ خنسی جو اس ہچانک صورت حال پر کچھ ٹھنکا گیا تھا، معاذ کے قریب آکر اسے سرگوشی میں سمجھانے لگا۔

”میں یہاں اس شخص کی شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔“ معاذ کے لہجے میں اب بھی خنسی تھی۔

”اسے چھوڑو معاذ! اللہ نے چاہا تو وہ ٹھیک ہو جائے گی۔“ اچانک ہی ایک ہاتھ اس کے دائیں شانے پر آکر لگا اور اس نے اپنی پشت پر ایک نرم سی آواز سنی۔ اس آواز میں جانے کیسی تاثیر تھی کہ معاذ کا ہاتھ خود بخود سلطان کے گریبان سے ہٹ گیا اور اس نے رخ موڑ کر اپنی مخاطب ہستی کو دیکھا۔ وہ بشری کی والدہ تھیں جن کی آنکھیں رو رو کر متورم ہو چلی تھیں لیکن وہ اسے نہیں دہانی کر داری تھیں کہ بشری ٹھیک ہو جائے گی۔

”ہیلو آئی! میں سلطان ہوں، بشری کا یونیورسٹی فیلو۔ میں اس کی خیریت معلوم کرنے آیا تھا۔“ سلطان بھی یقیناً سمجھ گیا تھا کہ وہ بشری کی والدہ ہیں اس لیے بہت سعادت مند بنان سے مخاطب تھا۔

”آپ کی آمد کا شکریہ ادا کر رہی ہوں بشری ابھی سیر میں کھڑی ہیں میں ہے اور ڈاکٹر کوئی واضح بات نہیں بتا رہے۔“ آپ اس کی بہتری کے لیے دعا کر رہے۔ انہوں نے نہایت رمان سے سلطان کو جواب دیا اور معاذ کی طرف متوجہ ہو کر

زیادہ تمہارا ذکر سنا ہے۔ یہ اتفاق ہے کہ تم کئی بار گھر تک آئے بھی لیکن دروازے سے ہی واپس چلے گئے اس لیے میں خواہش کے باوجود تم سے نہیں مل سکی۔ بہر حال میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ تم بشری کے دوستوں میں ایک بہترین اضافہ ہو۔“

”بشری اتنی اچھی لڑکی ہے کہ اچھے دوست ملنا اس کا حق ہے۔ اس سے سینئر ہونے کے باوجود میں اس سے بہت متاثر ہوا ہوں اور اسے قابل تقلید سمجھتا ہوں۔ دنیا میں اس جیسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں اور ان کم لیکن خاص لوگوں کی اس دنیا کو ابھی بہت ضرورت ہے اس لیے مجھے امید ہے کہ اللہ اسے ضرور ہمیں لوٹا دے گا۔“ معاذ کو خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ بولتے ہوئے اس کی آواز جھگٹنے لگی ہے۔ زیادہ پرانی بات تو نہیں تھی کہ وہ بشری کی آنکھوں میں تحریر جذبے پڑھ کر گھبرا سا گیا تھا اور اب خود اسے لگ رہا تھا کہ کسی نے اس کے دل کو ٹپکی میں سمجھ کر رکھا ہو۔ وہ اس کے لیے اپنے جذبوں کا تعین بے شک نہیں کر سکا تھا لیکن یہ بہر حال طے ہو گیا تھا کہ وہ اتنی غیر اہم نہیں ہے کہ اس کے ہونے یا نہ ہونے سے اسے کوئی فرق ہی نہ پڑے۔“

”السلام اللہ وہ زندہ رہے گی۔ میں تمہیں یہی بات سمجھانا چاہ رہی تھی۔ مجھ سے اور گلزار سے اس کے معاملات جیسے ہوئے نہیں ہیں۔ کچھ باتوں کا وہ ہماری پریشانی کے خیال سے ذکر نہیں کرتی لیکن موجودہ معاملے کی سنگینی کا اندازہ لگا یا چکا تھا۔ دھمکیاں براہ راست بشری کو بھی ملی ہوں گی۔ مجھے گلزار نے اس حادثے کے بعد بتایا کہ ان کے پاس بھی ایک فون کال آئی تھی اور ان سے کہا گیا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو روکیں۔ اپنے اصولوں کے برخلاف ایک باپ کی محبت سے مجبور ہو کر گلزار نے اسے روکنے کی تھوڑی سی کوشش بھی کی تھی لیکن میں نے اس کی سفارش کی۔ ہم نے بھی اسے حق پر ہوتے ہوئے خاموش رہنا سکھایا ہی نہیں تو اب کیسے اسے روک سکتے تھے۔ یہ اندازہ بھی نہیں تھا کہ ظالم اتنی جلدی اور ... ادھی حرکت کریں گے۔ بہر حال ابھی ہماری امید زندہ ہے کہ ہماری بشری ایک بار پھر بچ بولنے کے لیے اٹھے گی، البتہ وہ بے جاہ آدی قیوم صدیقی ظالموں کے ظلم کا نشانہ بن گیا جس کے قتل پر دہائی دینے کے لیے بھی شاید کوئی پاکستان میں موجود نہیں ہے۔“ ان کے لہجے میں ایک اجنبی گے لیے جس کا ساتھ دینے کے چکر میں ان کی بیٹی موت کے منہ میں چلی گئی تھی، تاسف اور آتا تو معاذ حیرت و رشک سے اس عورت کو دیکھنے لگا جس کے نقوش میں مغربیت کی واضح

جھلک تھی لیکن جو سر تا پا شرق کے رنگوں میں رنگی ہوئی تھی اور جو اردو بھی اتنی روانی سے بولتی تھی کہ اس پر اہل زبان ہونے کا گمان ہوتا تھا۔

”تمہارا موبائل بچ رہا ہے معاذ!“ انہوں نے اسے احساس دلایا تو وہ اپنے فون کی طرف متوجہ ہوا اور اسے جیب سے نکالا۔ اس کی امی کی کال آرہی تھی۔

”کہاں ہو معاذ! ابھی تک گھر کیوں نہیں پہنچے؟“ وہ فکر مندی سے اس سے پوچھ رہی تھیں۔

”سوری امی! مجھے آپ کو فون کرنے کا خیال نہیں رہا۔ اصل میں ایک دوست کا ایکسٹنٹ ہو گیا ہے اور میں اسی کے چکر میں ہاسپٹل میں ہوں۔“ اس نے اپنی آواز کو نارمل رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے انہیں جواب دیا۔

”یا اللہ خیر! کس دوست کا ایکسٹنٹ ہوا ہے اور کیسے؟ تم خود تو ہیک ہوتا؟“ سعیدہ بیگم فوراً گھبرا گئیں۔

”جی امی! میں ہائلک ہیک ہوں۔ گھر آؤں گا تو آپ کو اپنی تفصیلات سے آگاہ کر دوں گا۔ فی الحال مجھے اجازت دیجیے۔“ اس نے امی کو تسل دے کر فون بند کر دیا۔

”معاذ، اب گھر جاؤ بیٹا! ماں کو پریشان کرنا ٹھیک نہیں ہے۔“ عائشہ اس کی گفتگو سن چکی تھیں اس لیے اسے نرمی سے نصیحت کی۔

”گھر تو جانا ہی ہے، بس بشری کی طرف سے کوئی تسلی بخش خبر مل جائے۔“ اس نے نظریں جھکا کر انہیں جواب دیا۔

”تم مجھ سے رابطے میں رہنا، میں تمہیں اس کے بارے میں بتاتی رہوں گی۔ اسے اس وقت یہاں کسی بھی فرد کی موجودگی سے زیادہ دعاؤں کی ضرورت ہے۔ تم بس اسے دعا میں یاد رکھنا۔“ ان کی آنکھوں کی نمی گواہی دے رہی تھی کہ اندر سے شدید ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں لیکن پھر بھی بڑے حوصلے سے کام لے رہی تھیں۔

”دعا تو میں مسلسل کر رہا ہوں لیکن یہاں سے جانے کو میرا دل نہیں مان رہا۔“ اس نے بے بسی سے جواب دیا۔

”میرے کہنے پر گھر چلے جاؤ۔ میں ایک ماں ہوں اور ایک ماں ہی یہ بات جانتی ہے کہ اولاد صحیح سلامت گھر

واپس لوٹ آئے تو دل میں کیسی ٹھنڈک پڑ جاتی ہے۔ یہ گھڑیاں، یہ لمبے مجھ پر بہت سخت ہیں معاذ لیکن میں چاہتی

ہوں کہ تمہاری ماں کے دل میں ٹھنڈک پڑ جائے اس لیے میں تم سے کہہ رہی ہوں کہ تم گھر واپس چلے جاؤ۔“ بولتے

ہوئے ان کی آواز معمولی سی رندہ گئی تھی، اس بار معاذ انکار نہیں کر سکا۔ آپس میں موبائل نمبرز کے تھادلے کے بعد،

کچھ دیر میں ہی وہ حنین کے ساتھ گھر کی طرف جا رہا تھا۔

☆☆☆

مغز سے اس دنیا میں ہی رونما ہوتے ہیں۔ بشری کی زندگی بچنے کا مغز بھی رونما ہو گیا تھا۔ وہ بہت مشکل سے زندگی کی طرف لوٹ کر آئی تھی لیکن آگئی تھی۔ زندگی بچ جانے کے باوجود وہ ایک لمبے عرصے کے لیے بستر کی محتاج تھی۔ اس کے ایک ہاتھ اور ایک پیروں میں فریکچر تھے۔ دائیں جانب کی دو ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ جسم کے مختلف حصوں پر کئی گہرے زخم آئے تھے جن سے بے تحاشا خون بہا تھا اور جن کے منہل ہونے میں ابھی خاصا وقت لگتا تھا۔ گولی کے زخم نے دائیں بازو کو جو نقصان پہنچایا تھا، اس کے اثرات زائل ہونے میں بھی خاصا وقت درکار تھا۔ ڈاکٹرز کو سب سے زیادہ تشویش اس کے سر کی چوٹ کی طرف سے تھی۔ قیوم صدیقی کی گاڑی قابو سے باہر ہونے کے بعد بائیں جانب سے گزرتے ہوئے ایک ٹرک سے گھرا گئی تھی۔ اسی تصادم کے نتیجے میں اس کا سر کسی چیز سے گھرا کر بھٹ گیا تھا اور بے تحاشا خون بہنے کے ساتھ ساتھ وہ بے ہوش بھی ہو گئی تھی۔ ڈاکٹرز اس چوٹ کی طرف سے شدید تشویش کا اظہار دے رہے تھے اور ایم آر آئی اور سی ٹی اسکین سمیت متعدد ٹیسٹ کروا کر انہوں نے یہ اطمینان کیا تھا کہ چوٹ شدید ہونے کے باوجود نہ تو اس کے دماغ کو کوئی نقصان پہنچا تھا اور نہ ہی کوئی کھانگہ وغیرہ ہوئی تھی۔ اس کی زندگی بچ گئی تھی اور امید تھی کہ ہر ہونے والے نقصان کا مداوا ہو جائے گا اور وہ جلد یا بدیر ایک بار پھر زندگی کی دوڑ میں شامل ہو جائے گی۔ معاذ ہر روز اس کی عیادت کے لیے اسپتال جاتا تھا۔ شروع شروع میں تو عیادت کے لیے آنے والوں کا ایک ٹانٹا سا باندھا رہتا تھا لیکن دیر سے دیر سے آنے والوں کی تعداد کم ہونے لگی تھی۔ صرف معاذ تھا جو اپنی ڈھیروں مصروفیات کے باوجود روزانہ اسپتال میں حاضری دیتا فرما رہا تھا۔ اس روز بھی وہ معمول کے مطابق اسپتال پہنچا ہوا تھا اور بشری اور اس کی والدہ سے کئی پگلی گفتگو میں مصروف تھا کہ ایک جوڑے کی آمد نے اسے حیران کر دیا۔ وہ سونیا خاں اور اس کا شوہر ڈاکٹر خان تھے۔ داراب خان بالکل ہی سونیا کا الٹ تھا۔ وہ جتنی حسین اور نازک تھی، وہ اتنا ہی موٹا اور بھرا تھا۔ اس کی چوڑائی اتنی زیادہ تھی کہ لمبے قد کے باوجود وہ کچھ فٹ بال نما انسان دکھائی دیتا تھا۔ ٹاک مونی اور پھیلی ہوئی تھی، ہونٹ بھی سونے تھے اور ان پر ان سے بھاری بھر کم موٹھیں چکی ہوئی تھیں۔ آنکھیں نہ جانے بہت

چھوٹی تھیں یا پھر بے حد بڑا گوشت چمڑے کی وجہ سے اندر دھنسی ہونے کے باعث چھوٹی محسوس ہو رہی تھیں۔ شکر تھا کہ اس کی رنگت صاف تھی ورنہ شاید بچے اسے کوئی جن جنم سمجھ کر اس سے ڈر جاتے۔ اب بھی اپنے پہلو میں موجود حسن و جمال کا پیکر سونیا خان کے ساتھ چلا وہ کوئی دیو سی محسوس ہو رہا تھا۔

”ہم بہت پہلے عیادت کے لیے آتے لیکن اتفاقاً حادثے والی بجائی میں اور داراب دعویٰ چلے گئے تھے اور کل ہی واپس آئے ہیں۔“ سلام دعا اور خیر خیریت پوچھنے کے مراحل سے گزرنے کے بعد سونیا خان نے معذرت خواہانہ انداز میں تاخیر سے عیادت کے لیے آنے کا سبب بتایا۔

”کوئی بات نہیں۔ آپ سب کی دعاؤں سے بشری موت کے منہ سے واپس آگئی ہے، ہمارے لیے یہی کافی ہے۔ باقی دنیا داری کے تقاضے تو انسان نبھاتا ہی رہتا ہے۔“ عائشہ نے اخلاق سے اسے جواب دیا۔

”آئی! یہ سونیا خان دعویٰ خاتون ہیں جن کے گھر ایک بار ہم نے فنڈوز کی فائونڈیشن سے بچنے کے لیے پتہ دیا تھا۔“ رولانڈ آدورنٹ کے باعث سنا کی عائشہ سے بہت دور تھی ہو گئی تھی اور وہ تقریباً تمام واقعات ہی ان کے ساتھ دیکھ کر چکا تھا اس لیے اس واقعے کا بھی حوالہ دے کر سونیا خان کے تعارف کو مکمل کیا۔

”بشری کی اس حالت کو دیکھنے کے بعد مجھے اعزاز ہو رہا ہے کہ اس روز تم لوگوں نے جو مجھے اسٹریٹ کرائم وغیرہ کی کہانی سنائی تھی، وہ بس ایک بہانہ تھا اور اس روز بھی تم لوگ ایک قاتلانہ حملے سے بچے تھے۔“ سونیا خان نے معاذ کو گھورتے ہوئے اپنا خیال ظاہر کیا۔ اس کا شوہر داراب اس کے برابر میں خاموشی سے بیٹھا ہوا تھا اور یقیناً صرف بیوی کی فرمائش پر وہاں آیا تھا۔

”ارے نہیں۔ انکی کوئی بات نہیں ہے۔ اب بھی بشری جس حادثے کا شکار ہوئی ہے، اس میں اصل نشانہ یہ نہیں تھی۔ اصل نشانہ وہ صاحب تھے جو اس روز موقع پر ہی ہلاک ہو گئے تھے۔ بشری تو صرف ان کے ساتھ ہونے کی وجہ سے زد میں آگئی۔“ معاذ نے تیزی سے اس کے خیال کی تردید کی۔ ان کے درمیان یہی طے ہوا تھا کہ فی الحال اس موضوع پر کچھ نہیں کہا جائے گا۔ بشری کے خطرے سے باہر آنے تک تو کسی کو کسی بات کا ہوش ہی نہیں رہتا تھا لیکن بعد میں جب خیال آیا اور معلومات حاصل کی گئیں تو پتا چلا کہ حادثے کا شکار ہونے والی گاڑی سے کوئی تاق، کوئی

ویسے تم جاہلو اس سے پہلے، اکٹھے بھی آ سکتے ہو۔ تمہاری میزبانی کر کے ہمیں خوشی محسوس ہوگی۔ کیوں داراب؟“ اپنی سکرانٹ کی بجلیاں معاذ پر گراتے ہوئے سونیا نے آخر میں شوہر سے تائید چاہی۔

”وائے ناٹ آئی؟ تمہارے دوستوں کے لیے خان ٹیلس کے دروازے ہمیشہ کھلے ہیں۔“ اس نے شاید مسکرا کر لاڈلی بیوی کی تائید کرنے کی کوشش کی تھی لیکن محسوس ایسا ہوا تھا کہ دیو نے دانت نکوسے ہوں۔ وہ دونوں چند منٹ مزید وہاں بیٹھ کر رخصت ہوئے تو معاذ نے جیسے سکون کی سانس لی۔ سونیا خان کی دعوت دینی نظریں اس کے اعصاب کے لیے بڑا امتحان ثابت ہوتی رہی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد عائشہ تو ایک طرف بیٹھ کر تلاوت کرنے لگیں جبکہ معاذ، بشری کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

”بھڑکب جا رہے ہیں آپ خان ٹیلس سونیا خان کی میزبانی کا لطف اٹھانے؟“ بشری نے اسے ادھر ادھر نہیں ہونے دیا اور شرارت بھری سکرانٹ ہونٹوں پر سجا کر اس سے دریافت کیا۔

”لا حول ولا قوۃ۔ مجھے کیا ضرورت پڑی ہے خواجہاں وہاں جانے کی۔“ معاذ چلا۔

”وہ بے چاری اسے غلوں سے دعوت دے کر غمی ہے ہو آپ لا حول پڑھ رہے ہیں۔ سچ کہوں تو مجھے لگتا ہے وہ یہاں میری عیادت کے لیے نہیں بلکہ آپ سے ملاقات کے لیے ہی آئی تھی۔ وہ کہتے ہیں تاکہ تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے تو یہ ایسا ہی کوئی سلسلہ تھا۔“ غیوں اور پلاستر میں لپٹے جسم کے ساتھ بستر پر لیٹے ہوئے کے باوجود اس کی شوخی قائم تھی۔

”اسے الہام ہوا تھا تاکہ اس وقت میں ہسپتال میں پایا جاؤں گا۔“ معاذ نے اس کے خیال کی تردید کے لیے دھمکی دی۔

”الہام بھی ہو سکتا ہے۔ آدمی کے دل میں سچی گمن ہو تو الہام بھی خود بخود ہی ہونے لگتے ہیں۔“ وہ اپنی بات پر اڑی رہی۔

”دیکھو لڑکی! تمہارے اندر عزیز ٹوٹ پھوٹ کی گنجائش نہیں ہے اس لیے بہتر ہوگا کہ تم اس قسم کی گھنگوڑک کر دو جس پر اشتعال میں آ کر میں کرانے کا کوئی وار یا بدرو پہلوان سے سیکھا گیا کوئی داؤ لگا کر تمہارے خاموش رہنے کا بندوبست کرنے پر مجبور ہو جاؤں۔“ معاذ نے اسے حمیہ کی تو وہ کلکھٹا کر غصہ دی اور پھر خود ہی موضوع بدلے ہوئے ہوئی۔

ڈاکٹمنٹ یہاں تک کہ قیوم صدیقی اور بشری کے سوا ہلڑ تک نہیں ملے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ لمبے ہاتھوں والوں نے اپنے اثر و رسوخ سے یہ ساری چیزیں غائب کر دادی تھیں۔ اس پر غضب یہ ہوا تھا کہ گھر پر کسی کے موجود نہ ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بشری کے لیپ ٹاپ سمیت کھینے پڑنے سے متعلق کئی اہم چیزیں چرائی گئی تھیں اور حقیقتاً اس وقت وہ لوگ بالکل خالی ہاتھ تھے۔ ان کے پاس کوئی ایک چیز یا اثوت ایسا نہیں تھا جس کی بنیاد پر کوئی دعویٰ کیا جاسکتا۔

قیوم صدیقی کی بیوہ اپنے نو جوان بیٹے کے ساتھ کچھ دنوں کے لیے پاکستان آئی تھی اور شوہر کی تدفین کروا کر خاموشی سے واپس لوٹ گئی تھی۔ اس نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اس چکر میں پڑ کر شوہر کے بعد بیٹے کو کھونے کی قطعی ہمت نہیں رکھتی ہے۔ میڈیا میں دیے الفاظ میں قیوم صدیقی کے قتل اور بڑی بلیڈرز والے کیس کے درمیان ربط کا ذکر چھیڑا گیا تھا لیکن زیادہ گہرائی میں جانے کی کسی نے زحمت نہیں کی تھی۔ قیوم صدیقی کی بیوہ، نئے تو سیڈ پادالوں سے ملاقات سے صاف انکار کر دیا تھا، وہ بشری کو دیکھنے اسپتال بھی نہیں آئی تھی اور گھڑا عاصم سے صرف فون پر غیریت معلوم کر لی تھی۔ اچھا لگتا تھا کہ وہ کسی دباؤ کے زیر اثر ہے۔ شاید اسے دھمکی دی گئی تھی اس لیے وہ شوہر کی تدفین کے بعد خاموشی سے واپس امریکا لوٹ گئی تھی۔ ان حالات میں اگر گھڑا عاصم یا ان کی بیٹی کی طرف سے کچھ کہا بھی جاتا تو اس کی حیثیت الزام تراشی سے زیادہ نہیں ہوتی۔ پولیس کو بھی انہوں نے اپنے بیان میں صرف یہ بتایا تھا کہ بشری قیوم صدیقی کے ساتھ کیوں ہو کر کسی مقصد کے لیے جا رہی تھی۔ باقی پولیس کا فرض بنا تھا کہ وہ تحقیق کرتی لیکن ان کی طرف سے ایسا کچھ ہوتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کچھ نہیں ہاتھ تھے جو اپنی مرضی سے ڈوریاں ہلا رہے تھے اور ان ساری زبانوں کو خاموش کر دیا تھا جو اس سلسلے میں کچھ کہہ سکتے تھے۔ گھڑا عاصم نے بھی بشری کی صحت یابی تک مصلحت خاموش رہنے کا فیصلہ کیا تھا جبکہ بشری مکمل طور پر ہوش میں آنے کے بعد اس عزم کا اظہار کر چکی تھی کہ وہ صحت یاب ہو کر دوبارہ اس کیس پر کام کرے گی۔ معاذ نے موجودہ حالات کے پیش نظر ہی سونیا خان کے خیال کی سختی سے تردید کر دی تھی۔

”چلو جو بھی بات ہے، ہمارے لیے یہ اہم ہے کہ بشری کی جان بچ گئی ہے۔ یہ مکمل طور پر صحت یاب ہو جائے تو میں خان ٹیلس میں تم لوگوں کی شاندار دعوت کروں گی۔“

میں حصہ لینے کے لائق ہو جائے گی پھر مناسب وقت دیکھ کر تم دوست مل کر کوئی پروگرام ارچ کر لیا۔" مائیکہ ملاوت سے فارغ ہو کر ان کے قریب چلی آئی تھیں اور ان کی آنکھوں کی گفتگو سن کر انہوں نے معاذ کو تسلی دی تھی۔ معاذ کو لگا کہ اب اگر وہ ٹرپ پر جانے میں کسی تردد کا اظہار کرے گا تو بشری اپنے دل پر بوجھ محسوس کرے گی اس لیے فوراً ہی پامی بھر لی لیکن اسے احساس تھا کہ اس ٹرپ پر اسے بشری کی کی بہت محسوس ہوگی۔

☆☆☆

"ہم نوری آباد سے آگے موٹر وے M-9 پر سفر کر رہے ہیں اور میں اس سفر میں تمہیں بہت مس کر رہا ہوں۔" یہ پہلا بیچ تھا جو اپنی روادگی کے بعد اس نے بشری کو بھیجا تھا۔ توقع کے مطابق اسے اس سفر میں بشری کی یاد آ رہی تھی اس لیے نہیں سمجھا کہ اس کے ہنجرانے نہیں کر سکتا تھا بلکہ اس لیے کہ اسے اندازہ تھا کہ اگر بشری اس سفر پر ان کے ساتھ ہوتی تو کتنی خوش ہوتی۔ وہ تھریل اور ایڈونچر کو پسند کرنے والی لڑکی تھی اور یہ سفر اس کی فطرت کے عین مطابق تھا۔ نور پر ان کے ساتھ کتنی کی چند لڑکیاں ہی جا رہی تھیں۔ کچھ نے تو خود ہی دشواریوں کا سن کر کانوں کو ہاتھ لگا لیے تھے اور کچھ کو گھروں سے اجازت نہیں ملی تھی۔ بشری کے ساتھ یہ دونوں مسئلے نہیں تھے لیکن فی الحال تو وہ بے چاری بستر سے بھی اٹھنے سے قاصر تھی۔ دو دن پہلے اسے اسپتال سے گھر منتقل کر دیا گیا تھا اور معاذ اس دھڑے کے ساتھ اس سے الوداعی ملاقات کر کے آیا تھا کہ جہاں جہاں سے ممکن ہو گا وہ اسے پیغامات اور تصویریں وغیرہ بھیجتا رہے گا۔ اپنے اس بیچ کے ساتھ بھی اس نے موٹر وے (جسے عرف عام میں سپر ہائی وے کہا جاتا ہے) کی ایک تصویر سینڈ کر دی تھی۔ وہ گروہیں کی شکل میں نور و جیل گاڑیوں پر سفر کر رہے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ اس سفر میں سلطان بھی اپنے گروپ کے ساتھ موجود ہے۔ کای البتہ ان کے ساتھ نہیں تھا۔ وہ یونیورسٹی آنا بے فکر شروع کر چکا تھا لیکن اپنی ٹانگ کے مسئلے کی وجہ سے اس نور کے لیے بہر حال مس فٹ تھا۔ اسے کای اور سلطان کے جانے نہ جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ ان کی طرف سے مکمل غاسوشی تھی تو وہ بھی غاسوش رہ کر انتظار کرنے کی حکمت عملی اختیار کیے ہوئے تھا۔ بشری نے البتہ نور کے دوران بھی اسے محتاط رہنے کی نصیحت کی تھی جو سفر شروع ہونے ہی اس کے ذہن سے نکل چکی تھی اور وہ پوری طرح راستے کے تقارروں میں مصروف تھا۔ ان کی

"چلیں چھوڑیں اس بات کو یہ بتائیں یونیورسٹی میں کیا حالات ہیں؟ سلطان یا کای میں سے کسی سے دوبارہ آپ کا ٹکراؤ تو نہیں ہوا؟"

"سب ٹھیک چل رہا ہے یار! وہ لوگ بھی آج کل حیرت انگیز طور پر غاسوش ہیں اور سامنا ہو بھی جائے تو میری راہ نہیں روکتے۔ دو دن سے کای بھی یونیورسٹی آنا شروع ہو چکا ہے۔ بہترین علاج کی بدولت اسے ہیروں پر کھڑا ہو گیا ہے لیکن سننے میں آیا ہے کہ ابھی ڈاکٹروں نے کچھ عرصے احتیاط کی ہدایت کر رکھی ہے۔ خیر چھوڑو اس پر موضوع کو اور ایک اطلاع سنو! اگلے ہفتے ہمارا ڈیپارٹمنٹ کیرئیر تھریٹل پارک کی سیر کے لیے جا رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کچھ ادھر ادھر کے لوگ بھی شامل ہوں بہر حال امید ہے کہ ہم ایک اچھا ٹرپ کر کے آئیں گے۔ مجھے اس طرح کی جگہوں پر جانے کا بہت شوق ہے جہاں انسانوں کی دخل اندازی کم سے کم ہو اور فطرت کی حکمرانی نظر آئے۔ پچھلے سال میں دوستوں کے ایک گروپ کے ساتھ لال سوہانہ تھریٹل پارک گیا تھا کئی شالی علاقوں میں بھی جا چکا ہوں لیکن کما ہمتی سے اتنا قریب ہونے کے باوجود کیرئیر تھریٹل پارک جانے کا موقع اب مل رہا ہے اور میں اس ٹرپ کے حوالے سے کای ایک اہمیت مل کر رہا ہوں۔"

"میری طرف سے اس ٹرپ کے لیے نیک خواہشات ہیں۔ مجھے تو ابھی بے عرصے کے لیے بستر پر رہنا ہے، آپ گھومنے جائیں اور وہاں سے ڈیجیٹل فوٹوز اور ویڈیوز بنا کر لا لیں تاکہ میں بستر پر لیٹے لیٹے اس ٹرپ کو انجوائے کر لوں۔" بشری کی بات پر وہ ملی بھگت کے لیے غاسوش ہو گیا پھر اس کی دلجوئی کے لیے بولا۔

"انشاء اللہ کچھ عرصے بعد تم اس لائق ہو جاؤ گی کہ اپنی مرضی سے کہیں بھی آ جا سکو۔ اس وقت ہم ایک بار پھر دوستوں کے ساتھ مل کر ٹرپ ارچ کر لیں گے۔ اگر تم کبوتو میں بھی ابھی نہیں جاتا۔ ہم ساتھ ہی چلیں گے۔"

"میرا یہ مقصد نہیں تھا معاذ! آپ جائیں۔ آپ وہاں جا کر انجوائے کریں گے تو بھی مجھے خوشی ملے گی۔ میں نے تو ایسے ہی ایک بات کہہ دی تھی۔ میرا مقصد آپ کو روکنا نہیں تھا۔ اللہ نے چاہا تو ہم پھر بھی ساتھ چلیں گے۔"

"بشری ٹھیک کہہ رہی ہے بیٹا! تم دلی پر کوئی بوجھ لیے بغیر گھومنے جاؤ۔ یہ بہت تیزی سے امپروو کر رہی ہے۔ ایک دو دن میں اسے گھر شفٹ کر دیا جائے گا۔ انشاء اللہ جلد یہ دوبارہ اپنا تعلیمی سلسلہ شروع کرنے اور دیگر سرگرمیوں

ہجیر و ہجر ہالی دے کے سوز سے کراچٹ (Karchat) سینئر جانے والے راستے پر آئی تو وہ مزید سنبھل کر بند گیا۔ اس کی معلومات کے مطابق اس سوز سے کراچٹ سینئر تک 80 کھوینز کا فاصلہ تھا جس کے درمیان چھوٹے چھوٹے گاؤں بھی پڑتے تھے۔ یہ بہت ہی نامور اور مشکل راستہ تھا جسے فور و ہیل کے بغیر طے نہیں کیا جاسکتا تھا۔

”ہم کراچٹ سینئر کی طرف بڑھ رہے ہیں اور میں نہیں بتا سکتا کہ یہ میرے لیے کتنا ایکساٹنگ ہے۔“ یہاں سے اس نے بشری کو دوسرا سبک کیا تھا اور پھر دوسرے آٹھوں سے لگا کر ارد گرد کا منظر دیکھنے میں مصروف ہو گیا تھا۔ راستہ واقعی سخت نامور تھا اور فور و ہیل کے باوجود جھٹکے لگ رہے تھے لیکن اسے پروا نہیں تھی۔ وہ تو ہجیر و میں اپنے ساتھ موجود اپنے ساتھیوں کی طرف سے بھی بے نیاز تھا اور ایک ایک منظر کو اپنی آنکھوں کے راستے دماغ میں نقش کر لینا چاہتا تھا۔ کیرتھر جیشل پارک جانے والوں کے لیے وہاں چھپسی کی کئی چیزیں تھیں۔ سب سے مشہور تو رنی کوٹ کا تاریخی قلعہ تھا جو پارک کے شمال مشرق میں موجود تھا اور کہا جاتا تھا کہ یہ دنیا کا سب سے بڑا تاریخی قلعہ ہے جو تعمیراتی فن کا ایک نمونہ ہے۔ اس کی بلند اور چوڑی دیواروں کو دیوار چٹان سے بھی تھمبہ دی جاتی تھی۔ لڑکیوں کا زور اس قلعے تک جانے پر تھا۔ قلعے تک جانے کے لیے سن (Sunn) سے انڈس ہالی دے پر بغیر فور و ہیل کے بھی سفر ممکن تھا لیکن لڑکوں کو اس میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی۔ رنی کوٹ کے قلعے کی تاریخی اہمیت اپنی جگہ تھی اور یہ طے ہوا تھا کہ وہ لوگ آخر میں وہاں ضرور جائیں گے لیکن لڑکوں کی اصل دلچسپی ان راستوں پر ہی سفر میں تھی جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس قسم کی ڈرائیو کا مزہ یہاں کے علاوہ پورے سندھ میں کہیں نہیں مل سکتا۔ لڑکے ایک تھرلنگ سفر میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ انہیں عددی برتری بھی حاصل تھی اس لیے کراچٹ سینئر جانے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔

کیرتھر جیشل پارک جانے والوں کے قیام کے لیے ایک دوسرا سینئر کھار (Khar) بھی تھا جو پارک کی حدود میں ہی موجود جب ایم کے قریب تھا۔ جب ڈیم کی وجہ سے تقریباً 32 مربع میل کے علاقے میں ایک جمیل جمیل ہوئی تھی اور اس سینئر پر پردوں سے دلچسپی رکھنے والے افراد کثرت سے آتے تھے لیکن کہا جاتا تھا کہ کراچٹ سینئر پہنچ کر پارک کی سیر کرنے کا بالکل الگ مزہ ہے۔ یہاں زیادہ وسیع لینڈ اسکیپ، پہاڑوں اور جنگلی حیات کے علاوہ

آرکیالوجیکل اریکشن بھی تھی۔ سینئر سے آگے ٹوٹکے کے مقبرے تھے جو تعمیراتی فن کے اعتبار سے منگی کے مقبروں سے مشابہ قرار دیے جاتے تھے۔ معاذ کو سب سے زیادہ دلچسپی پہاڑی بکرے کی نسل آئی تھیں۔ اس بکرے کی نسل کا تحفظ کیرتھر جیشل پارک کے قیام کا بنیادی مقصد تھا کیونکہ کہا جاتا تھا کہ کیرتھر کا آئی ٹیکس اس نسل کا جد امجد ہے۔ معاذ نے تصویروں میں اس شاندار بکرے کو دیکھا تھا لیکن وہ اپنی آنکھوں سے اسے دیکھنے میں دلچسپی رکھتا تھا۔ سنا تھا کہ بہت مشکل سے اس کی دیدہ ہوتی ہے اور معاذ مشکل پسند تھا۔

کراچٹ سینئر جانے والے راستے میں پڑنے والے ایک گاؤں سے ان لوگوں نے انڈس اور تارہ بھمن خریدا۔ باقی کھانے پینے کا سامان اور پانی کی وافر مقدار ان کے ساتھ تھی۔ کیرتھر کے خشک اور گرم ماحول میں پانی کی بڑی مقدار ساتھ رکھنے پر زور دیا جاتا تھا اس لیے اس کا خصوصی اہتمام کیا گیا تھا۔ وہ اکتوبر کے پہلے ہفتے میں یہاں آئے تھے۔ اکتوبر سے مارچ تک کا موسم ساحلوں کے لیے بہترین قرار دیا جاتا تھا اس لیے امید تھی کہ انہیں سخت موسم کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا لیکن اعلیٰ نمائندہ اپنی جگہ تھیں۔

وہ جوں جوں آگے بڑھ رہے تھے نباتات کی خوشبو بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ شہر کے ہنگاموں سے دور بالکل الگ جگہ پر وہ سب ہی جیسے اپنے آپ میں گم ہو گئے تھے۔ جب منظر بول رہے ہوں تو کسی اور کا بولنا بھلا نہیں لگتا۔ معاذ کے گروپ کے سارے لڑکے کھجدار اور باشعور تھے اور اس بات کو اچھی طرح سمجھ رہے تھے اس لیے کوئی کچھ نہیں بول رہا تھا۔ البتہ انہوں نے اپنے قریب سے گزرنے والی ہجیر و سے بلند ہوتے موسیقی کے شور اور بے ڈھنگے قہقہوں کو خوب دلچسپی طرح سنا۔ ایک ناگوار سی نظر اس ہجیر و پر ڈالنے پر معاذ کو پتا چلا کہ اس ہجیر و میں سلطان اور اس کے ساتھی سوار ہیں۔ ہجیر و خراب اور نامور راستے کے باوجود ان کی گاڑی کو اور ٹیک کرتی ہوئی آگے نکل گئی تھی اور یقیناً اس میں ڈرائیور کی مرضی سے زیادہ سلطان اور اس کے دوستوں کا دخل رہا ہوگا۔ ایسی بے ہودہ حرکات کرنے اور دوسروں پر اپنا زور چلانے میں وہ لوگ ماہر تھے۔ خیر گزری کہ اس واحد بد مزگی کے علاوہ وہ آرام سے سینئر تک پہنچ گئے۔ یہاں سیاحوں کے لیے ریست ہاؤس اور کالجور بنے ہوئے تھے۔ وہ NOC لے کر آئے تھے اور سینئر پر ان کی آمد کی اطلاع کے ساتھ ساتھ ریست ہاؤس میں بنگلہ ہو چکی تھی۔ انتظامیہ

دیکھو بتاتے رہے اور یوں جب ایک معروف اور خوشگوار دن کے اختتام پر وہ سب سوئے کے لیے لیٹے تو بہت جلدی ہوئے تھے۔ ان میں سے بہت سوں کے لیے کسی خیمے میں رات گزارنے کا یہ پہلا تجربہ تھا اور شاید کچھ بے چینی بھی محسوس ہو رہی تھی لیکن پھر صبح نے نیند کو غالب آنے کا موقع دے دیا۔ معاذ بھی جلد ہی سو گیا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو بہت سویرا تھا اور ابھی سورج نہیں نکلا تھا۔ حنین سمیت اس کے باقی ساتھی ابھی تک سوئے ہوئے تھے۔ اس کا مزید سونے کا موڈ نہیں بنا تو خاموشی سے جوتے پہن کر باہر نکل گیا۔ یہ لاگ بوٹ تھے اور اس علاقے میں ان کا استقبال ضروری تھا کیونکہ یہاں سانپوں کی بڑی تعداد پائی جاتی تھی اور غلطی سے کسی سانپ پر پیر پڑنے کی صورت میں وہ ڈس بھی سکتا تھا۔ وہ ٹراؤڈر اور ڈی ٹرٹ پہن کر سویا تھا اور انہیں بدلنے کے پتھر میں نہیں پڑا تھا۔ یوں بھی اس کا زیادہ دور تک جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اور وہ یہیں آس پاس رہ کر کیرتھر کی صبح کا استقبال کرنا چاہتا تھا۔

خیمے سے باہر نکلے ہی فرحت بخش ہوا کا ایک جھوٹا اس سے آکر ٹکرایا تو اندر تک سرشاری پھیل گئی۔ وہ ایک خوشگوار سے احساس کے ساتھ دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگا۔ صبح ہی بہت جلدی ہوئے تھے اس لیے بے خبری کی نیند سو رہے تھے اور کہیں، کسی بھی خیمے میں کسی کے جانے کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ اسے شہری ہوئی تازہ ہوا میں سانس لینا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ بہت صبح کا وقت تو شہر کی آلودہ فضا میں بھی باقی دن کے مقابلے میں خاصا فرحت بخش لگتا تھا اور کیرتھر کی کھلی فضاؤں میں تو اس وقت کی بات ہی الگ تھی۔ ہوا میں بسی جاباتی کی خوشبو کے ساتھ مٹی کی جھک مل کر جو احساس پیدا کر رہی تھی، اس کا تجربہ ہر ایک کو نہیں ہو سکتا۔ اس تجربے سے وہی لطف اندوز ہوتے ہیں جو اپنی گلی بندی زندگی کے معمولات سے نکل کر کچھ عرصے ایسے کسی مقام پر گزارنے کی جرأت کر پاتے ہوں جہاں فطرت کی سرگوشیوں نے سحرزدہ کر دیا تھا اور وہ جو خیموں کے آس پاس ہی رہنے کا ارادہ رکھتا تھا، بے خودی کے عالم میں آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ جوں جوں وہ آگے بڑھ رہا تھا، روشنی بھی بتدریج بڑھ رہی تھی اور مناظر واضح ہوتے جا رہے تھے لیکن یہ ابھی بہت واضح نہیں تھے اور ہلکی سی دھند میں لیٹے ہوئے تھے۔ دور سے آتی پرندوں کی آوازیں ہوا کی سرسراہٹ سے ہم آہنگ ہو کر عجب شرمچھڑے ہوئے

کے کچھ لوگوں نے ان کا استقبال کیا۔ ان میں ڈائلڈ لائف کے جگمگے کا ایک انسر بھی تھا جو ان کے ساتھ آئے ہوئے اساتذہ و غیرہ کو اپنے ساتھ لے گیا جبکہ طلبہ کی بھی کڑوں تک راہنمائی کر دی گئی۔

وہ اچھا خاصا طویل سفر کر کے آئے تھے اس لیے سب ہی فریش ہونے لگے۔ اس کے بعد کھانا کھا یا گیا اور کھانے کے بعد کچھ دیر کے لیے آرام کا وقت دیا گیا۔ اپنے ٹور کو زیادہ سے زیادہ چرلطف بنانے کے لیے انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ ریسٹ ہاؤس میں قیام رکھنے کے بجائے آگے جا کر کیمپنگ کریں گے۔ اس مقصد کے لیے وہ اپنے ساتھ خیمے لے کر آئے تھے۔ آرام کے وقفے کے بعد وہ لوگ روانہ ہو گئے۔ سرفاب بھی جیپوں میں ہی کیا جا رہا تھا۔ جیپوں کے ڈرائیورز ہی گائیڈ کا فریضہ بھی انجام دے رہے تھے۔ ان کا ٹیلر سے انہیں بہت سی معلومات حاصل ہو رہی تھیں اور وہ سحرزدہ سے اپنے سامنے پھیلے وسیع لش گرین لینڈ اسکیپ کو دیکھ رہے تھے۔ وہ مومن سون کا سیزن گزرنے کے بعد یہاں آئے تھے اس لیے پورا علاقہ سبزے سے لہلہا رہا تھا اور نہایت حسین منظر تھا۔ ان ہی سحرزوں کے درمیان انہوں نے کیمپنگ کا فیصلہ کیا اور خیمے لگائے جانے لگے۔ معاذ اور حنین اس سے پہلے لال سوہاترا میٹل پارک بھی جا چکے تھے اس لیے انہیں ایسے کاموں کا تجربہ تھا لیکن ان میں سے زیادہ تر لڑکے نا تجربہ کار تھے۔ ان کے گائیڈ کم ڈرائیور اس سلسلے میں ان کی مدد اور راہنمائی کرتے رہے اور کچھ دیر میں ہی رنگ برنگے خیموں کا ایک چھوٹا سا گاؤں آباد ہو گیا۔ وہ سب ہی اپنی اپنی جگہ، اپنے اپنے طور پر لطف اندوز ہو رہے تھے۔ شروعاتی طور پر سلسلہ بھی چل رہا تھا لیکن سخت ہدایت تھی کہ کہیں بھی معمولی سی گندگی نہ ہونے پائے۔ سورج ڈھلنے تک وہ لوگ اپنے گائیڈز کی راہنمائی میں گھومتے رہے۔ سب نے ہی دل بھر کر تصویریں اور سیلفیز بنائیں۔ زیادہ تر طلبہ اپنے اساتذہ فون ہی استعمال کر رہے تھے البتہ کچھ کے پاس کیمرے وغیرہ بھی نظر آ رہے تھے۔

وہ لوگ داپس خیموں میں لوٹ کر آئے اور رات کے کھانے کا انتظام کیا جانے لگا تو جنگل میں منگل کا ساں ہو گیا۔ ایک سندی گائیڈ نے سندی لوک گیت چھیڑا تو سہاں سا بندھ گیا۔ سلطان اور اس کے دوست تو باقاعدہ رقص کرنے لگے۔ کچھ اور لوگوں نے بھی ان کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔ کچھ لوگ اپنی جگہ بیٹھے تالیاں بجاتے اور

لڑھکھا چلا گیا۔ ہاتھوں سے کسی پتھر یا چٹان، وغیرہ کو پکڑنے کی کوشش میں اس نے اپنا سوا بال ہاتھ سے چھوڑ دیا لیکن وہ اتنی تیزی سے لڑھک رہا تھا کہ کسی بھی شے کو پکڑنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ ویسے بھی اس کی یہ کوشش بچاؤ کی ایک فطری سی خواہش کے تحت تھی ورنہ اس کے سر پر اپنی زوردار ضرب لگائی گئی تھی کہ رمارغ چکرا کر رہ گیا تھا اور حواس ساتھ چھوڑتے جا رہے تھے۔ ساتھ چھوڑتے ان حواس کے باوجود وہ اپنے جسم پر آنے والے ان زخموں کو محسوس کر سکتا تھا جن کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ نیچے لڑھکتے ہوئے نکیلے پتھر، کانٹے دار جھاڑیاں اور نہ جانے کیا کیا اس کی راہ میں آکر اسے زخمی کر رہے تھے۔

لڑھکنے کا عمل ختم ہوا تو وہ دھب سے پتھر ملی زمین پر گرا اور اس کے زخموں میں مزید اضافہ ہو گیا۔ وہ پہلو کے بل گر گیا تھا اور سر سمیت اپنے جسم کے مختلف حصوں سے بہتے سیال مادے کو محسوس کر سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ اس کا خون ہے جو رگوں میں دوڑتا پھرے تو زندگی بچتا ہے اور باہر نکل آئے تو زندگی روکنے لگتی ہے لیکن وہ اپنی روحنی زندگی کو مٹانے کے لیے ذرا بھی جدوجہد کرنے سے قاصر تھا۔ اس کی آنکھیں کوشش کے باوجود بند ہوتی جا رہی تھیں۔ ایسے میں اس نے اپنے بہت قریب سرسراہٹ سی محسوس کی اور پھر ایک پھنکار سنائی دی۔ اس پھنکار کو سن کر خود کی میں جاتے اس کے ذہن کو ایک زوردار جھٹکا لگا اور سارے جسم میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔ اس کے اندر کسی نے سرگوشی کی کہ اسے اپنی جان بچانے کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔ شاید اس نے حرکت کرنے کی کوشش بھی کی لیکن اس کوشش کے نتیجے میں غارت ہونے سے قبل ہی دو سونیاں ہی اس کی کلائی میں گڑ گئیں اور کلائی سے اٹھنے والی درد کی لہر سارے جسم میں سرایت کرتی ہوئی اس سے اس کے ہوش و حواس چھین کر لے گئی۔ وہ جس کی آنکھوں میں بے شمار خواب تھے اور ذہل کچھ کر دکھانے کی اسنگ سے بھرا ہوا تھا کیر پھر کی چھری ملی زمین پر اپنے سارے خوابوں اور انگوں سے دور جانے لگا۔ جانے کتنی دور..... اس دوری سے وہ کسی کی کوئی راہ تو فی الحال وہاں دکھائی نہیں دیتی تھی۔ شاید وہ اپنی زندگی کی آخری سانس لینے لگا۔

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر ہو جوان
کسی دستان جو غلط کاروں کے لیے
غضب ناک تھا باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھے

تھیں۔ ایسے میں اس کا سر زدہ ہو جانا حیران کن نہیں تھا۔ وہ یوں آگے بڑھ رہا تھا جیسے کوئی اسے پکار رہا ہو۔ تاہم اس راستے پر اوپر کی طرف چڑھنا ایک مشکل عمل ہوتا ہے لیکن اسے اپنے جسم کو مشقت میں ڈالنے کی عادت تھی اس لیے ابھی تک معمولی سا بھی سانس نہیں پھولا تھا۔ مناظر ذرا دور واضح ہوئے تو اس نے اپنے نراؤ زر کی جیب میں پڑا اسارٹ فون نکال لیا اور مختلف قابل توجہ مقامات پر رک کر فوٹو گرائس اور ویڈیوز لینے لگا ذرا سا اور آگے بڑھا تو افق سے طلوع ہوتے سورج نے اپنی طرف توجہ مبذول

ابھی سورج اس حد تک بلند نہیں ہوا تھا کہ اس کی کرنوں کی تنازات بدن میں اتر کر گرمی کا احساس پیدا کرتی۔ ابھی تو اس کی کرنیں نہایت نرمی سے پھیل کر مناظر کو سنہرا پن عطا کر رہی تھیں۔ بلند ہوتے سورج کے ذرا دایمیں سمت نظر بڑی تودہ بہوت رہ گیا۔ وہاں وہ موجود تھا ترچھے زاویے پر جسے بڑے سے پہاڑی پتھر پر نہایت عمدگی سے توازن قائم کیے سورج کی اولین کرنوں میں نہایت تودہ سنہرا سا محسوس ہو رہا تھا لیکن معاذ کی تیز نظریں اس کی بھوری پشت، سفید شکم اور پیلوؤں پر موجود سیاہ بالوں کی پٹی کو دیکھ سکتی تھیں۔ وہ سدھی پیٹری بکرا تھا جس کے خوبصورت اور بڑے بڑے سینگوں کے سرے کسی گھوڑ کی دھار کی طرح نیچے تھے اور ٹھوڑی پر ڈاڑھی تھا بال نظر آ رہے تھے۔ وہ یقیناً صبح سویرے غذا کے حصول کے لیے نکلا تھا لیکن حیرت انگیز طور پر اکیلا نظر آ رہا تھا حالانکہ اس کا شمار ریوڑ پسند حیوانوں میں ہوتا ہے۔ اس کے تنہا ہونے کی وجوہات پر غور کرنے کے بجائے معاذ مختلف زاویوں سے اس کی تصویریں بنانے لگا۔ وہ بہت تیز حیات کا مالک تھا اور اپنے اطراف میں ہونے والی کسی بھی تبدیلی کو فوراً محسوس کر لیتا تھا لیکن اس وقت وہ اتنا محو تھا کہ اپنے آس پاس کچھ آئینیں سن کر بھی ان کی طرف متوجہ نہیں ہوا اور اپنے کام میں مشغول رہا۔ جس وقت وہ آئی ٹیکس کے خوبصورت سینگوں اور گولڈن براؤن آنکھوں کو فوکس کر کے اس کے چہرے کا کلوز اپ لے رہا تھا، اسے اپنے قریب کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ چونک کر پلٹا، اس سے قبل ہی اس کے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ بہترین زاویے سے تصویریں بنانے کے چکر میں وہ ایک ایسے پتھر پر جا کھڑا ہوا تھا جس کا سائز اتنا چھوٹا تھا کہ اسے بس قدم جمانے ہی کی جگہ مل سکتی تھی۔ سر پر دار ہونے سے اس کا توازن بگڑا تو پتھر بھی اپنا توازن کو ہینٹا اور اپنی جگہ سے لڑھک گیا۔ قدرتی طور پر معاذ بھی اپنی جگہ سے

مضین کی آنکھ کھل کر اس کے معاذ کو لایا۔ یہ کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں تھی کہ وہ تو جہاد سے باہر آ گیا۔ وہ بھیجے سے باہر آ گیا۔ وہ ہر ایک خاص روٹی تھی اور شاہی خدام لوگ بھی جاگ چکے تھے۔ جہاں سے کچھ بڑے آدمی سے بیٹھے آکر کمرے کی طرف لگائے تھے صرف اتنے جگہ کھڑے تھے جیسے کے بعد کے مصالحت و ضروریات انجام دینے کی تھیں۔ وہ اس کے ہونے سے نہیں تھی اس دور سے گزرا۔ اس مثال پر گیا۔ پھر وہ جس منہ ہندو بھی تھی کہ نہ وہ اس کے دو سالوں میں جو رہا۔ کچھ ماحول میں کچھ اس کے چہرے پر تیار کر رہا تھا۔ وہ قلعہ کا ڈنکا کرنے کا مہم تھا کہ اور قلعہ اعلیٰ دکن میں تیار کیا گیا تھا اس لیے خاصا غلبہ کسوتوں پر رہا تھا۔ جس نے خوب ڈنکا کرنا چاہا اور آخر میں کانگریسی کپ اس کے چاہنے لگے۔ یہ ایک کڑی حکمت کے ساتھ ہے۔

معاذ کھرچیں آ رہا تھا بھی ایک خوفناک ہے۔ اس کی دکان کے منہ پر سب سے پہلے لایا گیا۔

انہیں خوف نہیں۔ ۹۔ خیر نے خیال میں خود کو کافی دیکھا تھا۔ اس نے دیکھا تھا۔ ابھی تک نہیں آیا۔ ہوگا کہیں مصروف۔" ختمیہ زمینوں سے مل کے سوالی کا جواب اسے ہونے سے پہلے بھی نہیں سکتا تھا کہ معاذ اس وقت زخمی اور صحت کی نگاہ میں جتنا کس مقام پر موجود ہے۔ جانے ہی کر بھی وہ اسی اطمینان کے ساتھ ساتھیوں کے ساتھ گپ شپ لگتا رہا۔ سب لوگ اٹھتے سے قارم ہو چکے تھے اور اسے تاج کے دن کی پانچ گروپ تھے۔ اتنا کہ یہ گروپ میں صرف ایک رات کا قیام تھا اس لیے آج ہی انہیں اپنا وٹ کھل کر کے انہیں شہر لایا تھا۔ کنکری منٹ کے بعد یہ گروپ کھل کر ہوئی۔ یہ ایک منہ میں تو پروگرام پہلے ہی سے طے تھا اور وہ لوگ فصول میں اپنی اپنی رائے سے چلے گئے تھے۔ ان کے ساتھ آتے پر دھیر لگنے لے لئے شہر شہر دلی کے بارے میں بتا کر جلدی چار ہو جانے کا حکم دیا۔ وہ سب پھر تین دن کے لئے تھے۔ تیاری کے دور میں جس کو معاذ کے طرف سے تھوڑی سی گھر لائی ہوئی۔ وہ پانچ نہیں کہیں تھا اور یہاں اگلے منزل کی طرف روٹی کا سطر خرباقہ پہنچا تھا۔

تیار ہونے کے بعد وہ باہر آیا تو اس کے ساتھیوں سے معاذ کے بارے میں پوچھا شروع کیا۔ ہر ایک کی طرف سے لایا گیا تھا کہ کیا گیا۔ صحیح دھننے کے بعد سے کسی کی معاذ سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ہر دن ہی کسی سے اسے دیکھا تھا۔ مضین نے وہ ساتھیوں کے ساتھ و سلطان اور اس کے

ساتھیوں سے اس کے معاذ کے بارے میں دریافت کر ڈالا۔ اس کی طرف سے بھی لایا گیا تھا کہ کیا تو نہیں کی شہر میں سبزہ مصافحہ ہو گیا۔ اس لیے انہماک لگایا تھا کہ صبح بہت جلدی اٹھ گیا ہوگا اور اس کے بعد بارش کی پکار پر ایک گھنٹہ کے لیے ہی میر کے لیے لگے تھے۔ لیکن اسے اب تک وہ نہیں آ رہا ہے۔ یہ جگہ اس کی نہیں تھی کہ کیا آوی بہت دور تک تھا میر کے لیے جلا دینے کا معاذ تو کچھ خاص تیاری کے ساتھ ہی لگے لگے تھا۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ معاذ کا جگہ نیچے میں ہی رکھا ہوا ہے اور اس سے ڈیڑھ گھنٹہ پہلے اسے معاذ کی لے لے۔ اس ملائے میں بیٹھ کر گاڑ کے اور بھی پانی کے بغیر نہیں رہے۔ اب تک وہ اس حالت میں ہے۔ اسے سمجھ کر سچا یہ حافق کر چکا ہے۔ ناچار سے ہر دھیر لگتا تھا کہ اسے یہ سننا آ گا کہ لگا پڑا۔ ان کا پہلا مدخلیہ ہے۔

معاذ اپنے چودھالہ علم تھا اور زیادہ تر لوگوں کو اس کی طرف سے تشویش تھی لیکن کچھ افراد اسے بھی تھے جن کا خیال تھا کہ معاذ کی سب سے پہلی طرف کی خبر تیار ہے۔ کہ وہی ہے کسی سبک دہا ایک بھی تھی جو خود حالات میں جبکہ ایک انسانی زندگی کی طرف سے غمگین ہو چکی تھی۔ ایسی بات کہے جانا سب معلوم نہیں اور اٹھا۔ سب نے دیکھ کر اس کے سامنے میں انکسار سے درخواست کی تھی تو فوراً اس کے ہر دلی شروع کر دی تھی۔ یہ سب پارک میں تعینات رہنے والے انکاروں کو بھی مطلع کیا گیا۔ یہ دھیر لگنے سمیت طلب کے ساتھ اس رات پر آئے۔ یہ دیکھ کر اس کا دل اس دانتے پر لپکا کھرمہ تھے کہ انہوں نے تمام ظہا و غلبت کو ریست ہا اس تک کہ بعد وہ اپنے کا حکم صادر کر دیا تھا۔ وقت ابھر رہا تھا۔ آگے بڑھ رہا تھا اور کسی گھنٹے گزر چکے تھے۔ ابھی تک کہیں سے کوئی جوشہہ اخرا نہیں آئی تھی۔ یہ ہی نہیں

[illegible]

سیدہ بیگم جن کا روزِ صفا بہم ڈالنے کا گھر تھا جو گھر کا ایک ایک کونہ اپنے ہاتھوں سے چمکانی تھیں۔ جنہیں اپنے بچوں اور شوہر کو موت کے ڈانہ اور موت گنتی بھانے بھانے کا شوق تھا اور جو اچلے پھلے پناہ مسرہ لیتے تھے یا وجود بھی بڑی کھسک سے رفتی تھیں جو جو حواظِ شوہر و طرف سے بچا کر اٹھاتی تھیں۔ انہیں معاش کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔ ان کے لیے آنسو بہاتے ہوئے دو ہر دم میں کی ماں تھی راجی تھیں۔ انہیں ملتا رہے تھے بھی ان کو کہ نہ ملتا تھا پھر تھیں۔ گھر میں مسلسل اور دردِ قاتل کا سلسلہ جاری تھا اور عزیز و اقارب کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ایسے میں تو یہ اور ہی کی دھند تھی کہ گھر کا سارا انتظام سنبھال دیکھا تھا اور کوشش کر رہی تھیں کہ سیدہ بیگم کا بہت سنبھال کر رکھا گیا گھر ان کے پاس چلا جائے اور نہ ہی انہیں کسی حالت میں ملے جس حالت میں وہ آئے۔

Scanned with CamScanner

[illegible][illegible]

وہ کہہ کر دیا! جب کبھی کوئی دانت کھڑا ہو جائے تو وہ دانت
 کی حالت سے بہت کچھ بدلی جا سکتا ہے۔ دانت کوئی معمولی چیز
 نہیں ہے۔ جب کوئی کھڑا ہو رہے ہو تو اس کے جسم کے ساتھ
 اپنے دانت کو بچا رہا ہے تو اس کے دانت خور و پھوس دونوں
 اور اس کے لب بھی ہے۔ مگر یہاں کوئی دانت کوئی دانت کوئی
 سہنا نظر نہ آ رہا ہو۔ اس کی وہ آواز اس کی جگہ پر ہے۔
 جسے سمجھنا ہے کہ وہاں کے دانت میں بھی دانت کوئی دانت
 سے کہہ گیا۔ جس دانت کو دانت نہیں دانت ہے۔ اس
 دانت ہم سب کو اور دانت کو اس دانت کو دانت ہے۔

نوبل سے ملے تھے، دولتِ فائدہ سے بچھڑا گیا اور پے پچھڑا
 دیا۔ لیکن خود ان کا بہت ہوش تھا۔ جیسے سحر سے
 کھڑا ہو، شاکہ، اطمینان، غافل ہو کر ان کی نگاہوں پر
 آئی تھی تو ان کے کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ لیکن ان کی ہر بات سے
 وہ بڑھتا رہتا رہتا ان کے غریبوں کی زندگی پر غور سے
 سوچنے لگتا۔ ان کی سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ دنیا میں
 نہ بھٹکتے تھے۔ ان کی زندگی، ان کی زندگی کے مستقبل سے بھی
 زیادہ سادہ کے لیے غور تھی۔ وہ دنیا کی سادگی کے لیے
 دعا بھی کرتے تھے۔ ان کی زندگی، ان کی زندگی کے بہت سادہ
 کے لیے غور تھی۔ ان کی زندگی، ان کی زندگی کے بہت سادہ
 ان کے کمرے میں، ان کی زندگی، ان کی زندگی کے بہت سادہ
 "تمہاری زندگی، ان کی زندگی، ان کی زندگی کے بہت سادہ"

۱۰۰
 ۱۰۱
 ۱۰۲
 ۱۰۳
 ۱۰۴
 ۱۰۵
 ۱۰۶
 ۱۰۷
 ۱۰۸
 ۱۰۹
 ۱۱۰
 ۱۱۱
 ۱۱۲
 ۱۱۳
 ۱۱۴
 ۱۱۵
 ۱۱۶
 ۱۱۷
 ۱۱۸
 ۱۱۹
 ۱۲۰
 ۱۲۱
 ۱۲۲
 ۱۲۳
 ۱۲۴
 ۱۲۵
 ۱۲۶
 ۱۲۷
 ۱۲۸
 ۱۲۹
 ۱۳۰
 ۱۳۱
 ۱۳۲
 ۱۳۳
 ۱۳۴
 ۱۳۵
 ۱۳۶
 ۱۳۷
 ۱۳۸
 ۱۳۹
 ۱۴۰
 ۱۴۱
 ۱۴۲
 ۱۴۳
 ۱۴۴
 ۱۴۵
 ۱۴۶
 ۱۴۷
 ۱۴۸
 ۱۴۹
 ۱۵۰
 ۱۵۱
 ۱۵۲
 ۱۵۳
 ۱۵۴
 ۱۵۵
 ۱۵۶
 ۱۵۷
 ۱۵۸
 ۱۵۹
 ۱۶۰
 ۱۶۱
 ۱۶۲
 ۱۶۳
 ۱۶۴
 ۱۶۵
 ۱۶۶
 ۱۶۷
 ۱۶۸
 ۱۶۹
 ۱۷۰
 ۱۷۱
 ۱۷۲
 ۱۷۳
 ۱۷۴
 ۱۷۵
 ۱۷۶
 ۱۷۷
 ۱۷۸
 ۱۷۹
 ۱۸۰
 ۱۸۱
 ۱۸۲
 ۱۸۳
 ۱۸۴
 ۱۸۵
 ۱۸۶
 ۱۸۷
 ۱۸۸
 ۱۸۹
 ۱۹۰
 ۱۹۱
 ۱۹۲
 ۱۹۳
 ۱۹۴
 ۱۹۵
 ۱۹۶
 ۱۹۷
 ۱۹۸
 ۱۹۹
 ۲۰۰

۱۱۔ میں نے یہ سنا ہے کہ ایک شخص دو مچالہ کھانے پر
 قوی بن کر آیا ہے جس میں وہاں کی کثیر شہر میں ہی ہوئی
 تصویر بنی ہے۔ کوئی نے سنا ہے کہ وہاں کوئی یہ تصویر بنا کر
 نہیں بیچتا ہے بلکہ کوئی کوئی طریقہ جو حق ہے کہ اس سے
 تصویر بن کر اظہار و بیان ہوئی ہے۔ نہ ہی یہ دعویٰ ہے
 حجاز کے کچھ شخصوں کے بارے میں کہ وہاں کے لیے اس
 پر اس قدر اثر ہو گیا ہے کہ اس نے ان کو کھانا سے بچا ہے۔
 ۱۲۔ کوئی خاص بات ہے کہ تصویر بن کر اس کے
 بارے میں ہے۔

”اسب سے خالص باعد تو ہو گیا ہے کہ وہ جھوٹ پر کیا
مجاز سننے کی گنجہ اور اس کی بجائے وہ تصویر پر ہی مبنی مثال پیدا ہو
اس لئے ظاہر ہو گئے سے پہلے کی تصویر۔ مگر مگر آج کے
بتایا تھا کہ صبار نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ جہاں تک ممکن
ہو وہ وہ کیرتھر سے مجھے تصویر پر کیا اور وہ بڑے بڑے دلیرا مینڈ کرنا
ہو چکا اور جو وہ چاہیں گی وہ وہ انہی آنے کے بعد مجھے
دکھانے کا چکا کہ ان کو گونا گے ساتھ دیکھانے کے پر اور دیکھی
ٹھنی خود کو وہ ہیں مگر اس کر سکوں۔ اس لئے اپنا وعدہ ہو، وہ بھی کیا
تھا۔ میرے پاس اس کی بھی ہوئی چند تصویر پر کیا کہ اس کی
و کہ چکل اور وہ اسب میرا دل ہائی تصویر پر کیا دیکھنے کی کیا
خود اس کر کہ ہے تو میں نے اس کا حیا کمال منگو لیا ہے۔“
اب اس نے ہر پر وضاحت کی۔

ایک آبی آرائش کے لیے میری تہ کو گولی چرب سے
مکمل ہے۔ وہ میری سوجھوسا کو مکمل صورت آویختہ
جس کا جسم ہم پر لیس، اور اس کی طرح ہے جیسا کہ اس
لیجے اس پر چلیس کی دھڑکی دے گی۔ عید سے اس کے اعتبار
سے وہ اس کے اوپر اور غور کیا چاہیے سال معلوم ہوتی
تھی۔ اس کے خیر، حاسبہ کو کسی پر بٹھالے کے ہر لہجہ
سے زنی سے لکھو گا آواز کیا اور اس کے کچھ دھڑکیں
میں ہوں اور چلیس کی دھڑکی دے گی۔ اس کے چلیس دے گی
سائے اور چلیس کی دھڑکی دے گی۔ اس کے چلیس دے گی
تار پر۔ لکھو کے طور پر اس کے دھڑکیں دے گی۔
معارفے موہن میں سوچو، تصویر بھی، دھڑکیں دے گی۔
نہید کی اور سات سے اس کی بات، مہاراجہ، تصویر بھی،
خود سے دھڑکیں دے گی۔ اس کے چلیس دے گی۔
تار صاحب، تصویر بھی، دھڑکیں دے گی۔

[illegible]

گا۔ آپ میرے بچے کا مرنے والا دے دیں۔ میں نکلیں اور
وہاں بچے ساتھ لے آؤں گا۔" انہوں نے مرنے والی لڑکی کے
گھر والے آگے بڑھ جائے۔

”اے تمہیں جناب! آج مولیٰ کی آپ بھرے
 پاؤں بچھ دیں۔ میں سیدہ الطہرہ کو ثبوت دلکھا کہ یہی تو میں
 سے ہلیدہ آئی کہ آپ کا بیٹے کی عوازلت طلب ہوئی گا۔“ اس
 نے مولیٰ کی رہنے سے انکار کرتے ہوئے مصلحتی وجہ پیش کی
 تو خواہ رہا جب گواہ کی بات باغی پڑی۔ لہٰذا تھانے سے
 باہر نکل کر حیرت میں آکھڑ تھا۔

۱۲۷۱ھ تک "اگر کسی دیکھتے یا سنے ہو تو مجھ سے ہار پافتہ کیا جا۔" میں اٹھواڑھ سو سال کی تھیں۔

[illegible]

”ابن ابی اسحق اور علامہ معلوم ہے؟“ بشرقی لے
صورتِ حالِ دنیا کر تشریف سے یحییٰ۔

”شعیت شہداء سمجھا رہے تھے کلک میں کیا۔“

[illegible]

”ابہ کیجئے جو سکتا ہے۔“ کسی تک استفادہ کر کے دیکھ لیتے ہیں بھر کوئی لاکھ لکھن مو جیسا کہ ”مستحق“ نے جو یہ لڑی۔ دوسرے دن غادر صاحب وہ پارہ تھکنے گئے تو بشری کے ایک بیٹے ہاتھ دو دست چاہتے ہوئے۔ ”بڑا شہ روز و ایک“ اچانک سے کسی جیسا اہلکار سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بتی کن سے یہ دور رکھائی سے پیش آیا۔ دلچسپ آئی اور کے پارہ سے

نوائی عشا۔ اب وہ گئی ہے۔ تو سوری سے پوچھتے ہوئے تھے۔
اجھا ہوا کہ وہاں سے نہ۔ تے ہو۔ نہ یہ کھ پائی۔ میں
بایک کے پاس ہسپتال چلا ہوا تھا۔ "اس نے دیکھا تو کتنی تھک
گر خاور صاحبہ کو پستہ لگا۔ سو یہ دیکھنے سے کھینچ گیا
نیں۔ وہ بھی گواہ کرنا ہے۔ لیکن لی آغا نے وہ کہنے کا ارادہ
فرما کر یکے لہذا کی طرف متوجہ کیا۔

"پہلی طبیعت ہے اب تمہارے بایا کی؟ لکھو عامی
میں خاکہ ایک بار کے بعد دوبارہ ان کی خدمت معلوم
کر لے اپنے آپ آئیں۔"

"ابا ٹھیک ہو رہے تھے۔ اب اسے کھانا کھا رہا ہے۔
آج کے ناول میں لکھا ہے کہ وہ ہے۔ لکھو صاحبہ کے کہہ
کی وجہ سے تمہارے مسو لپٹا ہو گیا۔ زول سے۔ مگر اب
ایک کلمہ بھی سنائی تو میں گئی تھا۔ ساتھ دیکھ رہا ہوں۔
عالم شاہ نے مجھے خبر دیا۔"

"محم دیکھو۔ نو بدلی۔ میں ٹھیک ہوں۔ کھانے کا
جاری ہا نہیں کرتے رہو گئے۔" خاور صاحبہ ہر گالہ لیتے
نیچے اتر آئے۔ تھے۔ اب اس کو کچھ ہو رہا ہے۔

"نہیں ابلی میں تو لہاں اور نہیں آسکیں گی۔
مورہ بچے تھے تو میں اپنی تل سے لکھتے تھے۔ اب وہ ساگ بچے
ہوں گے اور لکھتے نہ پا کر پریشان ہو جائیں گے اب سلیج میرا
ہسپتال پہنچا ضروری ہے۔" عالم شاہ نے خود مسند پر کھڑے
"ٹھیک ہے بچا، تم جلد تمہاری بیوی لے لیا ہے کہ
میں تم سے حیران بھی نہیں کر سکتا۔ بڑا تعالیٰ تم کو بخیر و برکت کرے۔
خاور صاحبہ سے ملاؤ اور ہر ایک کو کہو۔" خاور صاحبہ نے

اسے دعا دی اور ہن دلوں سے مصافحہ کر کے وہ وہیں سے
ہوا تہ ہو گیا۔ چھوٹا جس کو پہلے بڑا صلا کے قریب صحت کی
حیثیت سے سب ابھی طرح مہاتے تھے۔ اب چھ دنوں میں
تھرو ڈالوں سے ہر گئی قریب ہو گیا تھا اور بالکل صحت کے اندر
کی طرف رہاں آتا جا تا رہتا تھا۔ اس وقت بھی وہ خاور صاحبہ

کو سہارا دے کر گھر کے اندر لے گیا۔ گھنٹوں پر آئے وہ اہل
پہن پر کی اب سے انکس چلتے میں دشمنی کا ہے۔ غرض کہ
کے علم میں تھا کہ میں دلوں صلا کے گھر میں سبھی کی بہاری
ذہن ہے پہلے ناکی کی خاطر ہے چنانچہ گھر میں رہنے کے لیے
کر خاور صاحبہ کے زخموں کو دیکھنے کی جگہ کی۔ غرض کہ یہ

مکمل نہیں تھیں۔ شوہر نے سنائی کہ کے ایک مریض لگا دیا۔
اسے بھی لکھا تھا گیا کہ بکرا کر گھر لے سے لڑائیں۔ کئی ہیں۔
میں کہ اس نے بچن گھر کے ساتھ زبردستی انکس ایک گھاس رواد
پہننے پر مجبور کر دیا۔ وہ اور اس کی والدہ ہی نہیں مین کے دم سے

نوائی عشا۔ اب وہ گئی ہے۔ تو سوری سے پوچھتے ہوئے تھے۔
اجھا ہوا کہ وہاں سے نہ۔ تے ہو۔ نہ یہ کھ پائی۔ میں
بایک کے پاس ہسپتال چلا ہوا تھا۔ "اس نے دیکھا تو کتنی تھک
گر خاور صاحبہ کو پستہ لگا۔ سو یہ دیکھنے سے کھینچ گیا
نیں۔ وہ بھی گواہ کرنا ہے۔ لیکن لی آغا نے وہ کہنے کا ارادہ
فرما کر یکے لہذا کی طرف متوجہ کیا۔

"پہلی طبیعت ہے اب تمہارے بایا کی؟ لکھو عامی
میں خاکہ ایک بار کے بعد دوبارہ ان کی خدمت معلوم
کر لے اپنے آپ آئیں۔"

"ابا ٹھیک ہو رہے تھے۔ اب اسے کھانا کھا رہا ہے۔
آج کے ناول میں لکھا ہے کہ وہ ہے۔ لکھو صاحبہ کے کہہ
کی وجہ سے تمہارے مسو لپٹا ہو گیا۔ زول سے۔ مگر اب
ایک کلمہ بھی سنائی تو میں گئی تھا۔ ساتھ دیکھ رہا ہوں۔
عالم شاہ نے مجھے خبر دیا۔"

نوائی عشا۔ اب وہ گئی ہے۔ تو سوری سے پوچھتے ہوئے تھے۔
اجھا ہوا کہ وہاں سے نہ۔ تے ہو۔ نہ یہ کھ پائی۔ میں
بایک کے پاس ہسپتال چلا ہوا تھا۔ "اس نے دیکھا تو کتنی تھک
گر خاور صاحبہ کو پستہ لگا۔ سو یہ دیکھنے سے کھینچ گیا
نیں۔ وہ بھی گواہ کرنا ہے۔ لیکن لی آغا نے وہ کہنے کا ارادہ
فرما کر یکے لہذا کی طرف متوجہ کیا۔

"پہلی طبیعت ہے اب تمہارے بایا کی؟ لکھو عامی
میں خاکہ ایک بار کے بعد دوبارہ ان کی خدمت معلوم
کر لے اپنے آپ آئیں۔"

"ابا ٹھیک ہو رہے تھے۔ اب اسے کھانا کھا رہا ہے۔
آج کے ناول میں لکھا ہے کہ وہ ہے۔ لکھو صاحبہ کے کہہ
کی وجہ سے تمہارے مسو لپٹا ہو گیا۔ زول سے۔ مگر اب
ایک کلمہ بھی سنائی تو میں گئی تھا۔ ساتھ دیکھ رہا ہوں۔
عالم شاہ نے مجھے خبر دیا۔"

"نہیں ابلی میں تو لہاں اور نہیں آسکیں گی۔
مورہ بچے تھے تو میں اپنی تل سے لکھتے تھے۔ اب وہ ساگ بچے
ہوں گے اور لکھتے نہ پا کر پریشان ہو جائیں گے اب سلیج میرا
ہسپتال پہنچا ضروری ہے۔" عالم شاہ نے خود مسند پر کھڑے
"ٹھیک ہے بچا، تم جلد تمہاری بیوی لے لیا ہے کہ
میں تم سے حیران بھی نہیں کر سکتا۔ بڑا تعالیٰ تم کو بخیر و برکت کرے۔
خاور صاحبہ سے ملاؤ اور ہر ایک کو کہو۔" خاور صاحبہ نے

اسے دعا دی اور ہن دلوں سے مصافحہ کر کے وہ وہیں سے
ہوا تہ ہو گیا۔ چھوٹا جس کو پہلے بڑا صلا کے قریب صحت کی
حیثیت سے سب ابھی طرح مہاتے تھے۔ اب چھ دنوں میں
تھرو ڈالوں سے ہر گئی قریب ہو گیا تھا اور بالکل صحت کے اندر
کی طرف رہاں آتا جا تا رہتا تھا۔ اس وقت بھی وہ خاور صاحبہ

کو سہارا دے کر گھر کے اندر لے گیا۔ گھنٹوں پر آئے وہ اہل
پہن پر کی اب سے انکس چلتے میں دشمنی کا ہے۔ غرض کہ
کے علم میں تھا کہ میں دلوں صلا کے گھر میں سبھی کی بہاری
ذہن ہے پہلے ناکی کی خاطر ہے چنانچہ گھر میں رہنے کے لیے
کر خاور صاحبہ کے زخموں کو دیکھنے کی جگہ کی۔ غرض کہ یہ

مکمل نہیں تھیں۔ شوہر نے سنائی کہ کے ایک مریض لگا دیا۔
اسے بھی لکھا تھا گیا کہ بکرا کر گھر لے سے لڑائیں۔ کئی ہیں۔
میں کہ اس نے بچن گھر کے ساتھ زبردستی انکس ایک گھاس رواد
پہننے پر مجبور کر دیا۔ وہ اور اس کی والدہ ہی نہیں مین کے دم سے

نوائی عشا۔ اب وہ گئی ہے۔ تو سوری سے پوچھتے ہوئے تھے۔
اجھا ہوا کہ وہاں سے نہ۔ تے ہو۔ نہ یہ کھ پائی۔ میں
بایک کے پاس ہسپتال چلا ہوا تھا۔ "اس نے دیکھا تو کتنی تھک
گر خاور صاحبہ کو پستہ لگا۔ سو یہ دیکھنے سے کھینچ گیا
نیں۔ وہ بھی گواہ کرنا ہے۔ لیکن لی آغا نے وہ کہنے کا ارادہ
فرما کر یکے لہذا کی طرف متوجہ کیا۔

"پہلی طبیعت ہے اب تمہارے بایا کی؟ لکھو عامی
میں خاکہ ایک بار کے بعد دوبارہ ان کی خدمت معلوم
کر لے اپنے آپ آئیں۔"

"ابا ٹھیک ہو رہے تھے۔ اب اسے کھانا کھا رہا ہے۔
آج کے ناول میں لکھا ہے کہ وہ ہے۔ لکھو صاحبہ کے کہہ
کی وجہ سے تمہارے مسو لپٹا ہو گیا۔ زول سے۔ مگر اب
ایک کلمہ بھی سنائی تو میں گئی تھا۔ ساتھ دیکھ رہا ہوں۔
عالم شاہ نے مجھے خبر دیا۔"

"نہیں ابلی میں تو لہاں اور نہیں آسکیں گی۔
مورہ بچے تھے تو میں اپنی تل سے لکھتے تھے۔ اب وہ ساگ بچے
ہوں گے اور لکھتے نہ پا کر پریشان ہو جائیں گے اب سلیج میرا
ہسپتال پہنچا ضروری ہے۔" عالم شاہ نے خود مسند پر کھڑے
"ٹھیک ہے بچا، تم جلد تمہاری بیوی لے لیا ہے کہ
میں تم سے حیران بھی نہیں کر سکتا۔ بڑا تعالیٰ تم کو بخیر و برکت کرے۔
خاور صاحبہ سے ملاؤ اور ہر ایک کو کہو۔" خاور صاحبہ نے

اسے دعا دی اور ہن دلوں سے مصافحہ کر کے وہ وہیں سے
ہوا تہ ہو گیا۔ چھوٹا جس کو پہلے بڑا صلا کے قریب صحت کی
حیثیت سے سب ابھی طرح مہاتے تھے۔ اب چھ دنوں میں
تھرو ڈالوں سے ہر گئی قریب ہو گیا تھا اور بالکل صحت کے اندر
کی طرف رہاں آتا جا تا رہتا تھا۔ اس وقت بھی وہ خاور صاحبہ

نیز واری سے ملتی ہوئی اس گاڑی نے جلد اٹھک لایا
 کی منزل پر پہنچا۔ ایک بڑی سی کوئی کتے گیت کے سامنے
 پہنچا دیتے ہی گیت گئی کیا۔ اور تہر گاڑی اٹھ لے گیا۔
 گاڑی اٹھ کر کتے ہی پہلی نشست پر سوہرا غرار بکھڑے
 ہوئے اور یہاں پہنچاں میں بے ہوش پڑے۔ سلطان کو کھنکھ
 کر چنے لگا۔ اس کے بلند دھڑوں اسے زحرا زلی کرتے
 ہوئے اٹھوئی جسے کی طرف سے جانے لگے۔ لایا کے
 چرواں پر اٹھیاں تھیں۔ اپنے خواب انہوں نے سامنے میں ہی
 اتار دیا۔ یہ سچا اور اب سلطان کو اٹھاتا ہے کہ سامنے کی
 طرف چار سے تھیں۔ ان کے اٹھارے تھوڑے کہ وہ ہر نام
 بے حد دلچسپ ہے کے سلطان کو۔ ہے ایک۔ دکانے میں دیکھا
 کہ انہوں نے سلطان کو ایک حوت کے منہ میں ڈال دیا۔
 دکانے کے بھائی دور۔ اسے سمجھا دیا تھا کہ اس کا
 ہو گیا ہے۔ اسے لایا ہے۔ خود اسے اس کے ہوتے ہوئے
 کا دیکھا، لیکن کچھ دکانے سے لے کر اسے اس کا کمال
 پر اور چار تھوڑے چار۔ تھوڑے گھنٹے ہی اس نے پٹ سے
 آنکھیں کھولی دیں۔ وہ دکانے کی طرف دیکھ کر
 دھڑک اٹھا۔ خود ہی اس کے وہ نہیں جانتے کہ وہ اسے
 کو دیا گیا۔ اس تھوڑے گھنٹے میں اس کے ہوا میں ہر کام
 کرنے لگے۔ وہ اسے پتہ لگا گیا کہ اس کے سامنے کیا ہوا تھا۔
 "کہوں ہوں تم لوگ اور مجھے انکار کرنے کا کیا مقصد
 ہے؟" سلطان نے ظلمت میں پوچھا۔

"سنا گیا ہے؟" تم نے اس کے ساتھ کیا کیا تھا؟"
 جس شخص نے اسے تھوڑے سیچ کے ساتھ اس نے اسے
 گھمڑے ہوئے تو خود اس کے لیے کیا تھا۔

"اور وہ چوڑی مارو پڑا شریک۔ زادہ بنا بکھڑا تھا میر
 اس کا تم جیسے بد موافق سے کیا رہتا تھا؟" تم اس کے لیے
 میں پہچان رہا ہے؟" سلطان نے طنز کے تیر چنے۔ وہ
 تھوڑے گھنٹے کے باوجود طرف اردہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

"تیر کی بات خود سے سنا کی ارادہ۔ ہمیں غم کا
 ہے کہ ہمیں تم سے سنا کے بارے میں معلوم کرتا ہے اور وہ
 ہم معلوم کر کے، جی کے چاہے اس کے لیے ہمیں تھوڑی
 کمال ہی کہیں تہہ زلی پڑے۔" صرف ایک شخص تھا جو
 سلطان سے صاحب تھا۔ وہ ارادہ پورا کیا تھا لیکن اس کا
 ارادہ عملی تھا۔ وہ سچا ہے۔

"میں سناؤ کے بارے میں تمہیں بتاتا تھا۔
 میں اپنی مشورہ کی طرف اسے لے گیا تھا۔ پتا نہیں، وہ
 کہاں گیا اور کس علاقے کا حکم ہوا۔ اس کی وجہ سے تو ہم

سب کی چمک بھی خراب ہو گئی۔" سلطان نے مدینا کر رہی
 کی بات کا جواب دیا۔

"یہ ایسے کچھ نہیں بتائے گا جہاں تم پیچھے ہٹ جاؤ
 میں خود اس سے کچھ دیکھواؤں گا۔" وہ آدلی جانب تک پیچھے
 ہٹ کر حاشوش کھڑا ہوا تھا۔ آگے بڑھنے ہوئے بھلا۔ اس کا
 لہجہ بھی اس کے سناؤ ہوئے کی اپنی کھار تھا۔

"میں غریب نہیں کر رہا۔ میں باپ اس ملک کا
 ایک بار سوچا کرتی ہے۔ اسے میرے اخوان کی جوتے کی جوتہ
 مار رہا ہے۔ اس کی امانت سے امانت چاہا ہے گا۔" اس کے کہیں
 وہ ان کو کھوس کر تو ہوئے سلطان نے اسے دھکی دیا۔

"تہہ دیکھو پتہ کچھ۔" اس نے اس کے ہم جہاز سے
 کہہ کر میرے پوتے کو پیچھے ہٹ گئے۔ "انکھیں سلطان کی دھکی
 سے حیرت میں ہو کر رہ گئیں۔ تھوڑے گھنٹے میں اس کا
 جوتہ پتہ لگا۔ جیسے تھا اس کا رنگ۔ اس نے اس کا جوتہ
 سنا دیا۔ اس کی طرف پتہ لگا۔ اسے پتہ چلے جہاز سے اس
 بلایا۔ اس نے اس کی طرف لے کر دیا۔

"یار بچہ۔" اسے کھڑے کھڑے نوچے ہوئے اور
 حلقہ دے گا۔ اس کے لیے میرے گھر کا انتظام کرنا کہ اس
 حلقہ سے اس کی خاطر ہو سکیں۔" اس نے خود اس کی
 بات پر عمل کیا اور چار مٹھوں کے ساتھ اس کے گھر آئے
 گئے۔ سلطان کو کرسی پر بٹھا کر باغ دیا گیا۔ پھر میرے ایک
 چوڑے کی نوچے لگا کر دیا گیا۔ اس نے اس کے بارے میں ایک بار
 برش اور شیشے کے چھوٹے سے چادر کے ساتھ اس کے نظر میں آ
 تھا۔ چادر کا ڈھکنا تھا اس کا خود اس سے دھوئی ہوئی۔
 تھا۔ سلطان حیرت سے اس چیز کی کو دیکھتا رہا۔

"تم بڑی قدور و دلوت والا کر آ رہے ہو۔ وہاں
 تھوڑی بڑی خاطر ہوئی ہوگی لیکن جو خاطر ہم نہیں دیکھ سکتے
 کے۔ اس کا کہیں کچھ خبر نہیں ہوا ہو گا۔" اس نے اس سے
 میں سے جان دھولی اور سلطان کے حلقہ میں جا کھڑا اور
 اگلے ہی لمحے سلطان کے منہ سے ایک ہزار اور چار لے لیا۔
 اس نے اس کے بارے میں کچھ جاننے کی حد سے گدی کے اس سے اس
 کا ایک انسا کھا لیا تھا۔

"یہ بھی بات ہے کہ تم نے آج کل کے چھوٹے لوگوں کی
 طرح بے لے والی نہیں رکھے ہوئے۔ جہاں ان کا اس کا
 سب سے بہت کر رہا ہے اور اب اس سے اسے اس کا ہر کھ
 دے دیا گا۔" اس نے سلطان کے شخصیات پر تہرہ
 کرتے ہوئے اسے اپنے ارادے سے آگاہ کرتے ہوئے
 اس کی چٹا کو اس کے نظر انداز کر دیا تھا اور بے لے ہوتے ہی

ہمارے سر اس نے مجھے میں بڑی اہمیت بختری نکل
سوئے ہوئے حلقوں سے فکروں میں۔

[illegible]

”شک ہے، تم دیکھا ہا ہے، تو فیسہ شامی ہو گا۔
 سوچ کر دیکھا کہ جس سے یہ سوال کا جواب دیا جا گا۔
 جوابی۔ ہاں، لیکن تو میرا ہاتھ پٹے کا جواب دے گا۔
 جوابی۔ ہاں، لیکن تو میرا ہاتھ پٹے کا جواب دے گا۔
 پھر تم نے اس کا جواب دے گا۔ پھر تم نے اس کا جواب دے گا۔
 پھر تم نے اس کا جواب دے گا۔ پھر تم نے اس کا جواب دے گا۔

[illegible]

”میں تمہاری رہیں تمہارا رہا ہوں“

”میں جیسا کہ درج ہے۔“ سلطان نے چیمبرداری کر لی۔
 پہلے آگ سرد کیجئے گا تھا کہاں گئے تھو جب نے اپنی جیب سے
 ایک سطر نکالی کہ اس کا دور اس کی طرف گردش ہے۔

”ایسا! اب بتاؤ کہ تم نے معاف کیے ساتھ کمال کیا تھا
دروہ کہاں ہے؟“ نگارہ اسطفاں کی دریاں کھول چکا تو اس
پر پہلا سر اٹھ رہا تھا۔

اُدھ لپٹاں ہے، اسی سواہر کا جواہر تو مجھ سے پامی
 بھی نہیں ہے۔ لیکن میں نہیں چاہتا سنا کہ اس دن کو کھا
 تھا۔ سچ کی روشنی پہنچنے سے کچھ ویسے لپٹا تھا حاجت محسوس
 ہونے پر اسہٹے غصے سے باہر نکل کر کچھ قافلے پر چلا گیا تھا اور
 قاری ہو کر وہاں آئی رہا تھا کہ میں نے سنا ان کو رکھا۔ ۱۰
 یوں کہیں کی کیفیت میں آگے کی طرف چاہا تھا۔ میرے ہاتھ
 میں ہے کہ لیے غور تھی کہ اس کی راقیہ ایسا تو کی گئی وجہ
 ہے ایک تو جس کی مادے ہاتھ سے لپٹا گئی تھی دوسرے کامی
 کو کاٹک پر گولی کھا نے کے علاوہ مجھے بھی پہنچے دانتوں سے
 عمر ہم جو پانچ تھا۔ بطریقی کے معاملے میں کامی کے کاہر نے
 جس کا کچھ بھی کر رہے سے روک رکھا تھا اسی لیے اسی کے
 عکاس ہم نے کوئی پلاٹھ نہیں کی۔ لیکن سواہر کو ہم میں
 کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اسی روز انکی سچ کے وقت

اس کا دوسرا بال بھی کھینچ چکا تھا۔ اس بار سلطانہ ذاتی طور پر
تیار تھا۔ اس لیے اس کے منہ سے کچھ نہیں نکل سکا اور وہ بس نکلنے لگا
سنا رہی تھی کہ گورو بھگت۔

اسکی ذرا منگوا دیا اور اسے فلسفہ اور اس لیے پائل
 ایک طرف لے کر باغوں کی سیڑھی پر لے گیا۔ اسی چٹائی سے
 تنہا اسے اہل اکھاڑت ہوا میں کھڑی ہے۔ وہ بیٹائی ایک
 گلیز کی مانند ہوں گا اور اس سے پر مشفق کر رہے کے لیے اس پر
 تیرا پہنکاؤں گا۔ جو سامنے بارش غول مکر ہے۔ اسے یہ
 گدھ جک کا تیرا ہے۔ یہ یہ بہت ہے کہ تو تیرا ہے۔ یہ ہے۔
 رشتے سے نہایت معافی سے مشق مشافہہ پر جو قہر اب
 کاڑھ کر پھر گی وہ بارہ اس جہ پار کھینچ لکھی گئے۔ وہ
 سلطان کو تھمتی سے تگوا کرنے کے ساتھ ساتھ چلی ہے
 تھوڑی سی عداوت کے ساتھ بھی تھوڑا بار با قتلہ اپنے ساتھ گیا
 تھوڑے کے ساتھ وہ تھوڑے یا حاکم تھوڑے تھوڑے تھوڑے
 کے ساتھ ہیں۔ وہ تھوڑا تھوڑا تھوڑا تھوڑا تھوڑا
 تھوڑا تھوڑا تھوڑا تھوڑا تھوڑا تھوڑا تھوڑا
 تھوڑا تھوڑا تھوڑا تھوڑا تھوڑا تھوڑا تھوڑا

”میرے خیال میں دیکھو۔ ۲۱۔ چٹکی مارتے ہوئے
چمچے تھکے اس عذاب کا نصیب کرنا، یا اس کا تارہ تو میرے
کام کی گواہی کا اندازہ لگا سکتے۔“ اس نے ایسا تک کی گنجی
رہے جبکہ فاجیکہ دیکھ کر ایسی مٹی پڑا اور اس کا سہارہ لے لیا اور
اس کا صراحتاً جواب بھی (بے فکر سطح کے سر پر اس مقام پر
تعمیر اجاڑا۔ سے بائیں اکھڑے تھے۔ والی اکھڑے کی وجہ
سے وہ پہلے ہی تکلیف محسوس کر رہا تھا۔ عذاب کا تو قلعہ لگن
گئی۔ عذاب اتنا بڑا تو رہا کہ کھاتے ہی گوشہ سے پہلے کی
محسوس ہوتے گی۔

”اسٹریٹ میں پہنچا۔“ سلطان ابرار ملکر رہ بٹلا کر چلا۔
 ”ابھی تو پہنچا ہوا تھا۔ سچ۔ سر کے بالوں کے بعد میں
 جھانک کر آئی ہر روز کو تیرا لکھ دلا۔ اور مزید خبر دے رہی تھی
 ہوئی تو جسم کے دوسرے حصوں پر بھی گفتگو اٹھانے لگا۔
 لیکن یاد رکھنا کہ میں مندرجہ ذیل دستاویز ہونے کے ساتھ
 ساتھ مندرجہ ذیل بھی ہوں اور یہ ہے۔ کے لیے مقرر کے ہوتے
 تھے اسبہ استعمال کرتا ہوں۔“ سلطان کے تڑپنے کی پردہ کی
 بغیر وہ ایک بار پھر بائیں کے سر کے بالوں کو چتا شروع کر چکا تھا
 اور اسے اپنے بالوں پر دھرا رہا تھا۔

”تم مجھے تاشکر سے باور پہاڑی آدمی اور پارہی
 جیسی ایک لڑکا دے دینا ہوں اور تم ہو گے خود بخود

Scanned with CamScanner

جا کر اپنے سرکاری کے دوست احمدیہ۔ "اس فی نظریہ
بشری کے دھرم میں گزرا بارہی میں اس کے ہر ہر اس نے
بھرت کر کے یہ لفظی کا اظہار کیا۔

"نیک سے عبادی سرطانی۔ اپنی طرف سے میں
بے خصمیت بہت ہوئے دیا تھا کہ تم سید کی طرف سے بچا اگلے
۱۰ لیکن تم شانہ خود کو کوئی اور اپنی چیز تھیں وہ اس لیے مجھے
ایک طرح سے مجھے نہیں پا کر۔ اب دیکھو کہ جہاں کیا
ہوتا ہے۔ جہاں پر رگہ پڑی اس جو خود کو بڑا ڈھانک کر
اور چپ کر رہی ہے اس کے ساتھ کہا ہوتا ہے۔ سلطان کی
افتخاری دینے کی کھیل پر چلے سے پہلے تھا دل دل کی
دعائیں کوئل سید پر اور اسے مر جائے گا۔ اس کے بعد اس کی
برو کے مسرت ایک جاپانہ کی دینے کا کوئل سید کا
بہت سی ہے ایک۔ چاہے وہ ایک اور ہوا اس سے کوئی ہے
کی اس پر صرف یہ نہیں کہ اس کے ہاں ہے۔ اس کے ہاں ہے۔

نیک: "تم کوئی دیکھو کہ وہ خود
میں دیکھو کہ وہ خود کہ اس سے ہر وقت کے ساتھ ساتھ
بھرت کر کے یہ لفظی کا اظہار کیا۔

"وہ میں کا بند کر دے اس کی ایک۔ کہ
میں ہر طرف ابد کر دے گی۔ اس نے علم دیا تو اس کے ایک
سہاگنی نے مجھ کو مام کی قیامت حراست کے ہاں ہوا ان کے
عد پر کچھ ہے کہ ایک گلوں میں۔

"تم ایک نہیں کر رہے ہو یہ مت بھوکو یہ سب کر
کے تم کو جاؤ گے۔" بھرت کر کے یہ لفظی کا اظہار کیا۔

نے اگلے اظہار کر دیا کہ وہ اپنے لے اظہار کیا ہے۔
"تم تم سے میں تم کو تھا جب سے یہ سب تم آ رہا
ہو اور میں نہیں بکھڑا گیا اس لیے تم میرے بچے کی گھر
مگر نے کے بنائے اپنی ماں کی گھر کر دیا وہ سوچ کر گیا اس ہے
چہری نے اس لیے اظہار کیا ہے کہ کو چھوڑ کر تھا یہ آپ
کو اپنا تھا وہ پاکستان کی کسی گ ایک وار ہوتا تھا کی وجہ
سے سب بکھڑا ہوئے گی۔ مجھے تو خود اس ہے چاہی یہ رحم آ رہا
ہے جس کی تم نے میں اپنی ہر کا ذرا نہیں۔ جس میں
نہیں ہے۔" معصومی تا سب سے پرانا وہ ایک ایک کر کے
اپنی میں کے میں کھول رہا تھا۔ کھلے کر یا اس سے اس کی
چراغی چھاتی اور چھاتی پر موجود کسی دیکھ جیسے کھلے والی جھک
دیکھاتے اس کے ہاں ایک اور وہی کی طرف کی کو کچھ اور اس
دیکھ کر ہے۔

تو یہی معلوم نہیں ہے کہ سلطان خود ہو چکا ہے۔ "اسے
معلوم تھا کہ حضور کے علم تھا لیکن اسے مستقل جرح نہیں
کہاں پڑ رہی تھی۔ اس میں کوئی اور اس کی کسی کسی کو
کہاں کے بعد وہ دیا وہ ہر جگہ جاگ نہیں پاتی تھی وہ
"ج کی دیکھائی ہو تھا۔ عاقل بنے اپنی گھرائی میں اسے دوا
گھائی میں اور وہ کھری بنے ہو گئی تھی۔ اسے کچھ نہیں تھی کہ
معلوم تھا کہ منصور کہ یہ تک پہنچا ہے۔ اسے صرف اس بات
کا علم تھا کہ اس کی صورت میں کھانا کچھ کچھ دینے سے
کہ اس کے پاس آئے گا اور اس کو یہ دیکھ کر مگر اس کا تھا کہ
اب جانے اسے ایک جہاں سے اسے سب کچھ دینے کے لیے
اس دیکھ کو سب سے ہر نے اسے نہیں تھیں سے پہلے ہی
تو آدھار تھے۔

بھرت کر کے یہ لفظی کا اظہار کیا۔
"تم کوئی دیکھو کہ وہ خود کہ اس سے ہر وقت کے ساتھ ساتھ
بھرت کر کے یہ لفظی کا اظہار کیا۔

"اب کہ اس کا کوئی ہو نہیں پڑی بات کا جواب
تھیں سے تھا کہ اسے پاس؟" بھرت کر کے یہ لفظی کا اظہار کیا۔

"دیکھو مسٹر یہ ایک مہل کی گھر ہے۔ ہم صرف
خوبی تلاش کرتے ہیں۔ فتنے سے موانیوں کی صورت کو کول
انہو نہیں کرتے پھر تے۔" اس پر گوارا مام اسے تو کئے
سے ہر دیکھ۔

"یہ جوئی اسل ہے یہ تم جیسے پرانی میں نے مہال میں
سے ایک ایک ہے۔ یہ رشتہ چاہئے پر شرکاک اور جگہ اس
جہاں ہے ہر وقت سے موانی میں اس لیے بھرت کر کے یہ لفظی کا اظہار کیا۔

"ابا سنے نیک کہا ہے۔ مجھے سلطان کے دوا اور
ایڈیٹر کے ہاں سے کچھ معلوم نہیں ہے۔ تم کچھ اور

[illegible][illegible]

”استاذہ! پانچ سو روپے! تم میری ماں کو چور
کہا۔ میں تم کو کھڑکی سے اڑاؤں۔“

چاہے بچہ کچھ ہی تو بھائی تو کھلے سے بچھا۔ انہیں ملے
سلوک کے ساتھ اس کا ہاتھ دیا۔

”کیا چاہتے تھے کچھ کی خواہش تو نہیں کر سکتے تھے؟“
بشرقیہ مائیں۔ بھئی چاہتی تھی کہ اس پر رحم اعلیٰ کے
عذاب بھی نہ ملے۔ ”اس نے جان کر شرم سے
انہیں بچھا کر۔

”لنوسل باقی مرث کر۔“ بھئی تھیں وہ بھی کھائی اور
چل کر گیا کسی کے ہاتھ بھر کر اس پر غم کر رہا تھا۔ وہیں نے
نگاہ اٹھا کر دیکھا۔

”تھیں تو ہیں ایسے ہی آپ کو بچھا رہا تھا۔ مجھے معلوم
ہے کہ میری مائیں بھی خاتون تھیں۔“ اس نے غور سے
دھندلے کی طرف بھر دیا۔

”تھیں تو ہیں۔“ اس نے غور سے دیکھا۔

”تھیں تو ہیں۔“ اس نے غور سے دیکھا۔

”تھیں تو ہیں۔“ اس نے غور سے دیکھا۔

”تھیں تو ہیں۔“ اس نے غور سے دیکھا۔

”تھیں تو ہیں۔“ اس نے غور سے دیکھا۔

”تھیں تو ہیں۔“ اس نے غور سے دیکھا۔

”تھیں تو ہیں۔“ اس نے غور سے دیکھا۔

”تھیں تو ہیں۔“ اس نے غور سے دیکھا۔

”تھیں تو ہیں۔“ اس نے غور سے دیکھا۔

”تھیں تو ہیں۔“ اس نے غور سے دیکھا۔

”تھیں تو ہیں۔“ اس نے غور سے دیکھا۔

”تھیں تو ہیں۔“ اس نے غور سے دیکھا۔

”تھیں تو ہیں۔“ اس نے غور سے دیکھا۔

”تھیں تو ہیں۔“ اس نے غور سے دیکھا۔

”تھیں تو ہیں۔“ اس نے غور سے دیکھا۔

”تھیں تو ہیں۔“ اس نے غور سے دیکھا۔

”تھیں تو ہیں۔“ اس نے غور سے دیکھا۔

”تھیں تو ہیں۔“ اس نے غور سے دیکھا۔

[illegible]

پٹنوں کے جلد جب مل چے ہوں گے اپنے چہرے
چھونے کیلئے اور نیکلے لافٹ اسی حکم کو جو مل گا نا شروع
کے کہ تو وہ دوسرا بھی زور دے گا اسی کی حرکتوں سے گزرنے والے
ایک وقت میں ساتھ چکے سے چہرہ کی حرکتوں کی تکلیف
وہی معلوم نہیں ہوگی کہ اصل میں جسم اسے تسلی سے
پروشت کرے گا۔ وہ بھی بروشت نہیں کرے پارہ ہوا اور
وشت اور تکلیف سے مسئلہ پختا جاوے گا۔ اسی طرح کہ
تقدیر سے کاتو اس لیے بھی تصور بھی نہیں کیا جاوے گا کہ اس پر تھا
کہ اس پر پھر اس کی فکر نہ کرنے والا وہ الہی الہی الہی
میں نے یہ نصیب کیا کہ میں نے یہ نصیب کیا۔ اس لیے کہ وہ
میں نے یہ نصیب کیا کہ میں نے یہ نصیب کیا۔ اس لیے کہ وہ
میں نے یہ نصیب کیا کہ میں نے یہ نصیب کیا۔ اس لیے کہ وہ

[illegible]

ہلائی نے اس امر میں کچھ جیسے اسے نہیں کے ہوتی
جلدی ہتھیار لائی وہ پہلے پر غصوں میں ہوا ہوا گنا سے رہا اور وہ
یہ پڑ لطف تھا شاد کھینچنے کا سبب قلع نہیں تھا۔ نصرت سے تھا کہ اس
نے اس قمارے کو حویہ جاری نہیں رکھا تھا اور چہ بہن کی
خوشوں سے بدعین ہوا چک۔ بائیلوں کی طرف سے کچھ گھبراہٹ شروع
کروا رہا تھا۔ چہ ہے بلکہ نا بہت بھی کچھ شے جو پھر وہ نے کے
ہو جو وہ اپنے ہاتھ کے ذریعہ پائی کھینچنے پر اپنی کاسٹل سے زمین
کے جسم سے ہٹ کر وہ نے کے لیے راستہ نہیں تھے۔ کچھ
جانے سے ان کی اپنی دھول پر تائیوں کی ڈوڈ پھر نہ نے
کی تکلیف پہنچانے ہوئی تو شاہد وہ اس شادی اور عیادت کو کچھ نہ
چھوڑے۔ وہ بہت جلدی کچھ اور ہیں کے ساتھ کھینچ
ہوئے کچھ آئے تھے اور ہلائی نے ایک بار پھر بڑی
صہارت سے انہیں دھاتی پتھر کی زانو کمر میں بٹ کر دیا تھا۔
اس دھاتی دہر میں ہی زمین کا جسم خوب نکلاں ہو چکا تھا اور وہ
جگ سے چھت ہانے رکھا ہاں سرخ ہو گیا تھا۔ ایک چہ سے
نے اس کے کان پر عرصہ کیا تھا اور کان کی کو حویہ لائی تھی۔ پہن
سے قطرہ قطرہ خون نکلتا اس کی گردن سے بہہ رہا تھا۔

”میں نے یہ سب سنا ہے۔ اب تم بولنا شروع کرو۔“

واپس چلے جانا تھا۔“ چانڈیو کا لہجہ بڑا دوستانہ تھا، اس بار صداقت شاہ نے محض مسکراتے پر ہی اکتفا کیا۔ چانڈیو نے بھی شکایت کے سلسلے کو مزید آگے نہیں بڑھایا اور عرفان اللہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”یہ اپنے عرفان اللہ صاحب سے تو آپ واقف ہی ہوں گے۔ بڑے انسان دوست آدمی ہیں۔ پارٹی میں ان کی شمولیت سے پارٹی کو نیک نامی بھی ملی ہے اور مالی فائدہ بھی ہوا ہے۔ ان کی وجہ سے اس بار ہمیں بہت زیادہ فنڈز ملے ہیں۔ یوں سمجھیں کہ تھوڑے ہی عرصے میں عرفان اللہ صاحب ہماری پارٹی کا اہم ستون بن گئے ہیں۔“ چانڈیو، عرفان اللہ کی تعریف میں رطب اللسان تھا اور عالم شاہ شدید بوریت محسوس کر رہا تھا۔ ان لوگوں کی آمد کی وجہ سے اسے حسنین کو فون کرنے کا بھی موقع نہیں ملا تھا۔ وہ رات گئے اسپتال واپس آ کر سویا تھا اس لیے کچھ دیر قبل ہی جاگا تھا۔ ضروریات سے فارغ ہو کر حسنین سے رابطہ کرنے کا موقع ملا، اس سے پہلے ہی وہ لوگ آ گئے۔ وہ کچھ دیر تو اخلافاؤں رک گیا لیکن سلطان جیسے شخص کے باپ کی مسلسل تعریفیں سننا ممکن نہیں تھا اس لیے باہر آ گیا۔ باہر آ کر اس نے پہلے روم سروس کو کمرے میں مہمانوں کی خاطر مہارت کا آرڈر دیا پھر حسنین کا نمبر ڈائل کیا۔ اس کا موبائل آف چارہا تھا۔ اس نے کچھ فون کر کے معلوم کیا تو پتا چلا کہ حسنین صبح وہاں سے روانہ ہو گیا تھا۔ اس نے ٹائم دیکھا تو خیال آیا کہ حسنین یونیورسٹی میں کلاس لے رہا ہوگا۔ تازہ صورت حال جاننے کے لیے اس نے بشریٰ کا نمبر ڈائل کیا۔ اس کے نمبر پر بیل بج رہی تھی لیکن وہ کال ریسپونڈ نہیں کر رہی تھی۔ عالم شاہ نے سوچا کہ وہ نہیں مصروف ہوگی اس لیے موبائل بند کر دیا۔ پندرہ منٹ کے وقفے کے بعد وہ اسے پھر کال کر رہا تھا لیکن وہ اب بھی کال ریسپونڈ نہیں کر رہی تھی۔ عالم شاہ کو کچھ عجیب لگا۔ اس نے تھوڑے تھوڑے وقفے سے مزید دو بار اس کا نمبر ڈائل کیا لیکن اب بھی صورت حال وہی تھی۔ اس نے پریشان ہو کر ایک بار پھر حسنین کا نمبر ملا یا لیکن اس کا نمبر ہنوز بند تھا۔ اس نے سوچا کہ سرمد کو فون کرے اور اس کی ڈیوٹی لگائے کہ وہ معلوم کرے کہ کیا گڑبڑ ہے لیکن اس سے پہلے ہی کمرے کا دروازہ کھلا اور عرفان اللہ اور چانڈیو باہر نکلے۔ دونوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اسے ان کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ وہ دونوں اس کے قریب آ کر رے کے۔ عرفان اللہ نے مسکراتے ہوئے اس کے شانے پر ہچکی دی اور بولے۔

”تمہیں دیکھ کر خوشی ہوئی بیٹا! جوان اولاد باپ کا

اس روز صبح سویرے ڈاکٹر کے راولنڈ سے بھی پہلے عالم شاہ کے والد، صداقت شاہ کی عیادت کے لیے عرفان اللہ کی آمد حیران کن تھی۔ صداقت شاہ صوبائی اسمبلی کے رکن ضرور تھے لیکن ان کا شمار ان افراد میں نہیں ہوتا تھا جن کا چہرہ ٹیلی ویژن کی اسکرین پر تو اترے نظر آتا رہتا ہے اور عوام کی اکثریت جن سے واقف ہوتی ہے۔ بااثر جاگیردار ہوتے ہوئے بھی وہ خود کو محدود رکھنا پسند کرتے تھے اور اب بھی خاموشی سے اسپتال میں اپنا علاج کروا رہے تھے۔ ایسے میں عرفان اللہ کا ان کی عیادت کے لیے چلے آنا واقعی ایک حیران کن بات تھی۔ سماجی کارکن کی حیثیت سے خاصی شہرت رکھنے والے عرفان اللہ بھی اسی پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑنے کی تیاری کر رہے تھے جس پارٹی کے ساتھ صداقت شاہ منسلک تھے۔ بنیادی طور پر بزنس میں عرفان اللہ نے چند سال قبل ہی سماجی خدمت کے میدان میں قدم رکھا تھا لیکن اس پہلے میں بہت تیزی سے ان کا نام اوپر آ گیا تھا۔ سماجی خدمت سے وہ سیاست کی طرف آئے تو لوگوں کی سمجھ میں آنا شروع ہو گیا کہ ایک بزنس مین کے سماجی خدمت کے شعبے میں آنے کی کیا وجہ تھی۔ بزنس مین کبھی گھانے کا سودا نہیں کرتا۔ عرفان اللہ بھی سیاست کے میدان میں آنے کے لیے اب تک سماجی خدمت کے شعبے میں سرمایہ کاری کرتے تھے۔ بظاہر وہ بالکل سادہ اور ”عوامی اصرا“ پر سیاست میں آئے تھے لیکن جیسے جیسے سب سمجھتے تھے۔ عالم شاہ بہر حال انہیں اسپتال میں دیکھ کر ابھن میں پڑ گیا تھا۔ ان کے ساتھ ان ہی کی پارٹی کے ایک جانے مانے وزیر صاحب بھی موجود تھے۔

”یہ کیا صداقت شاہ سائیں! آپ ادھر بیمار ہو اور ہم کو خبر ہی نہیں ہے۔ یہ تو بڑی زیادتی ہے سائیں کہ آپ ہم کو غیر سمجھتے ہو۔“ آتے کے ساتھ ہی وہ وزیر صاحب، صداقت شاہ سے شکوہ کرنے لگے۔

”ایسی بات نہیں چانڈیو صاحب! بس میری عادت نہیں ہے اپنی خاطر کسی کو تکلیف میں ڈالنے کی۔ گھروالوں کو بھی بے خبر ہی رکھا ہوا ہے، بس یہ میرا بیٹا عالم شاہ ہے نا، اسے دن رات اپنے ساتھ رکھا ہوا ہے اور مزے سے اپنا علاج کروا رہا ہوں بلکہ اب تو ٹھیک ہی ہو گیا ہوں اور آج کل میں واپس گاؤں بھی جانے والا ہوں۔“ صداقت شاہ نے مسکرا کر اپنی صفائی پیش کی۔

”پھر تو ہم نے آپ کو ٹھیک وقت پر ہی پکڑ لیا نا۔ ہمیں خبر ملنے میں مزید دیر ہو جاتی تو آپ نے تو ملے بغیر ہی

صورت میں کس اذیت سے گزر سکتے ہیں۔“ وہ اسے سمجھا رہے تھے اور اس کا چہرہ غصے سے سرخ پڑتا جا رہا تھا لیکن باپ کے سامنے بولا تو لہجہ دھیمہ اور نرم ہی تھا۔

”اذیت سے تو میں بھی گزر رہا ہوں بابا سائیں! میرا دوست غائب ہے۔ کیا ایک دوست کا دوست پر اتنا حق نہیں کہ مصیبت کے وقت اس کے کام آئے؟“

”دوست کے حق سے انکار نہیں پر یہ تو دیکھنا پڑتا ہے کہ کس کا حق زیادہ ہے۔ پال پوس کر امیدوں سے بڑا کرنے والے ماں باپ کا یا چار دن کے دوست کا۔ یہ جو ابھی یہاں سے گئے ہیں تاہم بڑی گھٹیا نسل کے لوگ ہیں۔ انہوں نے ایک بار میری خاطر تجھ سے رعایت کر دی ہے، پر اب بتا گئے ہیں کہ یہ آخری بار تھا۔“

”وہ یہاں دھمکیاں دینے آئے تھے اور آپ نے ان کی دھمکیاں سن لیں؟ ہم کیا چوڑیاں پہن کر بیٹھے ہوئے ہیں؟“ عالم شاہ ان کی بات سن کر غصے کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکا۔

”میں بیکار کی لڑائیاں مول لینے کا قائل نہیں ہوں اور یہ معاملہ ہے بھی میری پارٹی کے لوگوں سے متعلق۔ اصول و قواعد کے مطابق مجھے ان ہی لوگوں کا ساتھ دینا ہے، اس لیے فی الحال تم سب بھول جاؤ۔ الیکشن کے بعد دیکھیں گے کہ تمہارے دوست کے لیے کیا کیا جاسکتا ہے؟“ انہوں نے جیسے ہی یہ ختم کر دی۔

”نیکوئی کا شک تو بہت دیر ہو جائے گی بابا سائیں۔ اس معاملے میں تو معاملہ کا ہر سراغ مٹ جائے گا۔“ اس نے ان کے لیے احتجاج کیا۔

”سراغ اب بھی کون کون سے ہیں؟ تم صرف لکیر پیٹ رہے ہو۔“ انہوں نے اسے ٹھیکہ کیا۔

”معاذ کا سراغ یہ ہے لیکن اس کے مجرموں کا سراغ تو ہے بابا سائیں!“

”کیا بگاڑ لو گے تم ان لوگوں کا؟ اور کیا ثبوت ہے تمہارے پاس ان کے خلاف۔ صرف ایک ویڈیو..... جسے وہ عدالت کے سامنے چیلنج کر دیں گے کہ تم نے زبردستی تشدد کے ذریعے اس لڑکے سلطان سے وہ بیان لیا تھا۔ اتنی معمولی چیزوں سے قابو میں آنے والے لوگ نہیں ہیں یہ۔“

”لیکن بابا سائیں.....“ اس نے کچھ اور کہنا چاہا۔

”کوئی لیکن ویکن نہیں۔ تم بس آج ہی میرے ساتھ گاؤں چل رہے ہو اور وہاں اس وقت تک رہو گے جب تک میں تمہیں شہر آنے کی اجازت نہیں دے دیتا۔ ڈاکٹروں سے میں خود بات کر لوں گا کہ مجھے آج اور اسی

بازو ہوتی ہے۔ تمہارے والد بوڑھے اور کمزور ہو رہے ہیں، اب تم نے ہی ان کی جگہ سنبھالنی ہے۔ بے کار تجربات میں وقت گزارنے کے بجائے ان کے تجربے سے فائدہ اٹھانا سیکھو۔“ اتنی بات کہہ کر وہ دونوں کچھ فاصلے پر کھڑے اپنے باڈی گارڈز کے جلو میں آگے بڑھ گئے اور وہ حیران سا انہیں دیکھتا رہ گیا کہ پہلی ملاقات میں اسے ایسی نصیحت سے نوازا نا بے معنی نہیں تھا۔ کم از کم وہ اپنے والد سے یہ.... امید نہیں کر سکتا تھا کہ انہوں نے اس کے متعلق کوئی ایسی بات کہی ہوگی کہ عرفان اللہ نے ان سے ہمدردی میں اسے نصیحت کرنا ضروری سمجھا ہو۔ سرمد کو فون کرنے کا ارادہ ملتوی کر کے وہ دوبارہ کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ بستر پر لیٹے صداقت شاہ سوچوں میں گم تھے۔

”خیریت تو ہے بابا سائیں! آپ کچھ فکر مند نظر آرہے ہیں؟“ اس نے فوراً ہی ان کے چہرے کے تاثرات سے بھانپ لیا۔

”جب اولاد اتنے پر خطر کا کام کرنے لگے کہ اس کی سلامتی مشکوک ہو جائے تو پھر آدمی کی اس فکر کے سوا کچھ نہیں بچتا۔“ انہوں نے نہایت سمجھ بھرا لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا۔ عالم شاہ کا ماتھا ٹھنکا۔

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں بابا سائیں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا ضرور لیکن خود اس کا ذہن بہت سے حساب کتاب لگا رہا تھا۔ رات کی کارروائی کے بعد عرفان اللہ کی صبح صبح آمد اور اس کے بعد بابا کی پریشانی بے معنی نہیں تھی۔

”کل رات جب میں سو رہا تھا تو تم کہاں تھے؟“ صداقت شاہ نے اس سے سوال کیا۔ جواب میں وہ ان سے جھوٹ نہیں بول سکتا تھا اس لیے خاموشی سے نظریں جھکا لیں۔ صداقت شاہ نے ایک گہری سانس لی اور بولے۔

”تم میرے اکلوتے بیٹے ہو عالم شاہ اور میں تمہیں کسی فضول چکر میں گوانا نہیں چاہتا۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں روایتی زمیندار نہیں ہوں اور سیاست میں بھی صرف اس لیے آیا ہوں کہ اپنے علاقے کے لوگوں کے لیے کچھ کر سکوں۔

میری جگہ کوئی اور شخص ہوتا تو وہ صرف اپنے مفادات دیکھتا اور میں ایسا نہیں چاہتا تھا اس لیے خود اس گندگی میں اترنے پر مجبور ہو گیا۔ میں تم سے زیادہ اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ کیسے لوگ ہیں اور اپنے مفادات کے لیے کس حد تک جاسکتے ہیں اس لیے میں تمہیں ان لوگوں سے دور رکھنا چاہتا ہوں۔

ان لوگوں سے نگر لینے سے پہلے تمہیں سوچنا چاہیے تھا کہ میں، تمہاری ماں اور تمہاری بہنیں تمہیں کوئی نقصان پہنچنے کی

وقت چھٹی چاہیے۔“ انہوں نے حتیٰ فیصلہ سنا کر عالم شاہ کے پاس کچھ کہنے کی گنجائش نہیں چھوڑی۔ جب وہ اس لہجے میں بات کرتے تھے تو اس کا مطلب ہوتا تھا کہ بہت لاڈلا ہونے کے باوجود اب عالم شاہ ان سے اپنی بات نہیں منوا سکتا اور اب اسے ہر حال میں ان کی ممانی ہے۔

☆☆☆

بشری کو بہت دیر بعد ہوش آیا تھا اور ہوش میں آتے ہی اس نے اپنے ماں باپ کی لاشیں دیکھی تھیں۔ کرسی پر بندھے بیٹھے گلزار عاصم کا سر ایک طرف ڈھلک چکا تھا اور چہرے پر موت کی اذیت ثبت ہو گئی تھی۔ عائشہ کی لاش اس کے بیڈ پر پڑی تھی اور بالکل ایسا لگ رہا تھا کہ کسی درندے نے اس نازک سی عورت کو توڑ مروڑ کر رکھ دیا ہو۔ چند لمحوں کے لیے وہ ساکت بیٹھی یہ سب دیکھتی رہی۔ غم اس انتہا کا تھا کہ اس کی آنکھیں آنسو بہانے سے بھی قاصر تھیں۔ وہ آنسو جو آنکھوں سے پہنچے سے قاصر تھے، انگارے بن کر اس کے دل پر گر رہے تھے۔ اس انگاروں نے اس کے پورے وجود میں ایک ان دیکھی آگ بھڑکادی تھی۔ اس آگ کی ہر لپٹ بس ایک لفظ کو تخلیق کر رہی تھی، انتقام اور انتقام۔ اسی ایک لفظ نے اس کے دل کی دھڑکنیں بند نہیں ہوئے۔ سانسوں کے سلسلے کو جاری رکھا اور اسے اپنا حوصلہ دیا کہ اپنے بے بس جسم کو جیتی ہوئی اپنے موبائل پر لے کر وہ مقامی تھانے فون کر کے اپنے گھر واردات کی اطلاع دی۔ پولیس آئی اور معمول کی کارروائیاں کرتی رہی۔ اس سے پہلے تو سوالات کیے گئے۔ مجرموں کے بارے میں پوچھا جاتا رہا لیکن اس کے پاس ان کے ہر سوال کے جواب میں بس یہ مختصر بیان تھا کہ آنے والوں نے خود کو ڈاکو ظاہر کیا تھا لیکن پھر عائشہ کو دیکھ کر ان کی نیت بدل گئی تھی۔

وہ خود چل پھر کر پورے گھر کا جائزہ نہیں لے سکتی تھی۔ پولیس والوں کی زبانی ہی اسے معلوم ہوا تھا کہ پورا گھر جبری طرح تتر بتر تھا۔ کمپیوٹر اور پڑھنے لکھنے کے سامان کو خصوصیت سے نقصان پہنچایا گیا تھا۔ ساری الماریاں اور درازیں کھلی ہوئی تھیں جیسے ان کی تلاشی لی گئی ہو۔ زیور اور نقدی کے غائب ہونے کی اطلاع دی گئی تھی اور اسے نہیں معلوم تھا کہ یہ رات کے آخری پہر گھر میں گھسنے والوں کا کارنامہ تھا یا وردی والے چوروں نے موقعے کا فائدہ اٹھا کر ہاتھ کی صفائی دکھائی تھی۔ اس کا اتنا بڑا اور ناقابلِ تلافی نقصان ہو چکا تھا کہ اس معمولی سے مالی نقصان کا احساس بھی نہیں ہو سکا تھا۔ اس نے تو پولیس کی آمد کے بعد احوال

معلوم کرنے آنے والے پڑوسیوں سے بھی کوئی شکوہ نہیں کیا تھا کہ کیسے دیوار سے دیوار ملی ہونے کے باوجود وہ ان پر بیٹنے والی قیامت سے بے خبر رہے تھے۔ وہ گلزار عاصم کی بیٹی تھی اور خود بھی صحافت کی دنیا سے وابستہ تھی اس لیے اسے دنیا کے رنگ ڈھنگ اچھی طرح معلوم تھے۔ اسے معلوم تھا کہ ہمارے نظام میں اتنی گڑبڑ تھی کہ لوگ اس قسم کے واقعات کی بھٹک پڑ جانے پر بھی آنکھیں اور کان بند رکھتا ہی مناسب سمجھتے تھے۔ ان کے بارے میں تو پہلے ہی سب کو پتا تھا کہ وہ بہت طاقتور اور خطرناک لوگوں سے پنچے لڑائے بیٹھے ہیں، ایسے میں کون خود کو مصیبت میں ڈالتا۔

پولیس کی پوچھ گچھ کے جواب میں بھی ایک پڑوسی نے بس اتنا اعتراف کیا تھا کہ صبح وہ اپنے بچوں کو اسکول چھوڑنے جا رہا تھا تو اس نے گھر کے دروازے کے ساتھ ایسبولینس کھڑی دیکھی تھی لیکن توجہ اس لیے نہیں دے سکا تھا کہ ایک تو بچے اسکول سے لیٹ ہو رہے تھے اور دوسرے اس نے فرض کر لیا تھا کہ بشری کو چیک اپ کے لیے اسپتال لے جایا جا رہا ہوگا۔ ایسبولینس میں حسین کو وہاں سے لے جایا گیا تھا۔ پڑوسی کے اس بیان سے پولیس والوں نے نتیجہ اخذ کیا کہ ڈاکوؤں نے خود کو کوڑا پ کرنے کے لیے ایسبولینس استعمال کی تھی اور گھر کی قیمتی اشیاء اسی ایسبولینس میں رکھ کر فرار ہو گئے تھے۔ اصل میں پولیس والے بھی اتنے بھولے نہیں تھے۔ انہیں بھی معلوم تھا کہ آج کل بشری گلزار کا گن لوگوں سے ٹاکرا چل رہا ہے اور ایسے لوگوں کے خلاف کارروائی کرنے میں ان کا اپنا دم لگتا ہے اس لیے انہوں نے بشری کی ڈاکوؤں والی کہانی پر یقین کرنے میں ذرا ہلکا نہیں کیا تھا۔ بشری کو ان سے کوئی امید ہوتی تو سچ کو کیوں چھپاتی۔ سچ صرف اسے معلوم تھا اور اس سچ کی روشنی میں اسے خود اپنا لائحہ عمل طے کرنا تھا۔

☆☆☆

”اب کیسی حالت ہے تیری پٹ۔ پہلے سے تو چنگا ہے نا؟“ وہ کھانے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ اس کا ادھیڑ عمر میزبان اس کے پاس چلا آیا اور اس سے اس کی خیریت دریافت کرنے لگا۔

”ٹھیک ہو رہا ہوں چاچا جی! آپ کی جادو اثر دوائیں مجھے موت کے منہ سے واپس کھینچ لاتی ہیں۔ ورنہ جب میں پہاڑ سے نیچے گر کر زخمی ہوا تھا اور پھر مجھے سانپ نے ڈس لیا تھا تو مجھے لگا تھا میرا آخری وقت آ گیا ہے اور اب عالم برزخ میں ہی میری آنکھ کھلے گی۔“ مسکرا کر ادھیڑ

”تو خاص نہ ہوتا تو تجھ پر حملہ ہی نہ ہوتا۔ یہ جو لوگ ہوتے ہیں نا، یہ خاص بندوں سے ہی حسد کرتے ہیں اور ان کے دشمن بن جاتے ہیں، پر تجھے اپنے خاص ہونے کا اس لیے پتا نہیں چلتا کہ ابھی تو نے خود کو کھوجا نہیں ہے، پر میری پہچان غلط نہیں ہو سکتی۔ تیری جیسی آنکھیں ہر ایک کی نہیں ہوتیں۔ تو ان آنکھوں کے بل پر حکمرانی کر سکتا ہے۔“ فیضو نے دعویٰ کیا تو وہ ہنس دیا اور اداسی سے بولا۔

”حکمرانی تو دور کی بات ہے، ابھی تو میں اپنے گھر جانے سے بھی قاصر ہوں۔ پتا نہیں میرے گھر والوں کا کیا حال ہوگا۔ میری امی نے تو میری گمشدگی پر رور و کر پنا حال برا کر لیا ہوگا۔“

”میں اس بات کو سمجھتا ہوں پٹ لیکن ابھی تیری حالت ایسی نہیں ہے کہ سفر کر سکے۔ میری مجبوری نہ ہوتی تو میں اپنے کسی آدمی کو تیرے گھر والوں کو چھٹی ڈالنے ہی بھیج دیتا۔“

فیضو نے وہی پرانا جواب دیا۔ اس کے مطابق ان پہاڑوں میں بسنے والے ایک ذہنیت گروہ سے ان کی ٹھن گئی تھی۔ وجہ تنازعہ لیلیٰ کی ذات تھی۔ گروہ کے سردار کا لیلیٰ پر دل آ گیا تھا اور وہ اس سے شادی کا خواہشمند تھا لیکن لیلیٰ نے صاف انکار کر دیا تھا کہ وہ کسی ڈاکو سے شادی نہیں کرے گی۔

لوگ ان پہاڑیوں میں بہت مشکل اور غربت زدہ زندگی گزارتے تھے لیکن لوٹ مار اور ڈاکا زنی نہیں کرتے تھے۔

ان میں کچھ پیپرے تھے، کچھ شکاری اور کچھ دوسرے ہنرمند جو اپنے ہنر سے تھوڑا رزق کماتے تھے لیکن دوسروں کے نواں ہونے کا بھی نہیں سوچتے تھے۔ تو لیلیٰ نے سردار کا رشتہ نظر انداز کیا اور جواب میں وہ سارے کے سارے عتاب میں آ گئے تھے۔

ان کا ان پہاڑوں میں رہ کر وہ نایاب سانپوں کے زہر، کچھ اسیوٹی جڑی بوٹیاں، جانوروں کی کھالیں اور سینگ وغیرہ حاصل کرتے تھے۔ ان کی عورتیں کچھ دستکاری کے نمونے تیار کرتی تھیں اور وہ یہ سب لے جا کر شہروں میں بیچ آتے تھے۔ ان کے پاس کھیت کھلیان نہیں تھے کہ ان سے اپنا رزق حاصل کر لیتے۔ وہ بہت محدود ذرائع آمدنی رکھتے تھے اور دشوار گزار پہاڑی راستوں پر سفر کر کے عام آبادیوں تک پہنچنے میں کامیاب ہوتے تھے۔

اس سخت زندگی کے عادی، وہ اپنی زندگی سے شکوہ کناں نہیں تھے لیکن جب سے ان پر عام آبادیوں تک جانے کے راستے تنگ ہوئے تھے، وہ بڑی مصیبت میں آ گئے تھے۔ سب سے بڑا مسئلہ اناج کے حصول کا تھا۔ گنے چنے مویشیوں کے

عمر شخص کو جواب دیتا یہ لڑکا معاذ تھا۔ وہ بیچ گیا تھا۔ وہ سلطان کی سرپر لگائی گئی ضرب کھا کر بیچ گیا تھا۔ وہ کیر تھری سنگلاخ چٹانوں سے گر کر بیچ گیا تھا اور وہ اس خطرناک سانپ کا زہر اپنے جسم میں اترنے کے باوجود بیچ گیا تھا جس کی ہلاکت خیر کی مشہور تھی۔ اس کا بیچ جانا ایک معجزہ تھا اور ایسے معجزے ان کے ساتھ رونما ہوتے ہیں جو کسی دعا کے حصار میں ہوں یا پھر ان کے ساتھ رونما ہوتے ہیں جو بہت سے امتحانات اور آزمائشوں کے حصار میں بھی زندگی کو چھینے کی صلاحیت سے مالا مال ہوں۔ معاذ کا شمار شاید دونوں ہی گروہوں کے افراد میں ہوتا تھا لیکن ابھی اس نے خود کو دریافت نہیں کیا تھا۔ ابھی وہ اپنی بے چین روح کو پوری طرح پہچان نہیں پایا تھا۔

”تو نے غلط سوچا تھا پٹ! تو ان لوگوں میں سے نہیں ہے جو ایسے آسانی سے مر جاتے ہیں۔ تو بہت خاص ہے اور اپنے خاص بندوں کی وہ سہنرا رب خود حفاظت کرتا ہے۔

مجھ جیسے تو بس اس کی مرضی چلے گی۔ نے کا ایک بہانہ بن جاتے ہیں۔“ چہرے پر مسکراہٹ ہے وہ دھیرے دھیرے اسے بہت گہری اور اندر تک اتر جانے والی نظر سے دیکھ رہا تھا۔

ادھیرے دھیرے فیضو تھا۔ بے ہوشی کے مراحل طے کرتے ہوئے معاذ نے کئی بار اس شخص کو قریب دیکھا تھا۔ وہ اس کی زندگی بچانے کے لیے پتا نہیں لگا

جتن کر رہا تھا۔ ابھی اس کے زخموں پر کسی مرہم کا لپ

تھا تو بھی زبردستی اس کا منہ کھول کر کڑوی زہر دوائی حلق سے اتارنے پر مجبور کرتا تھا۔ شروع کے تین چار دن تو فیضو

گویا سائے کی طرح نیم بے ہوش نماز کے ساتھ چمٹا رہا تھا۔ اس کی بیٹی لیلیٰ بھی اس کی مددگار بنی رہتی تھی پھر جیسے جیسے معاذ کی حالت سنبھلنا شروع ہوئی، فیضو پیچھے ہٹا گیا اور

لیلیٰ کی خدمت گزار بنی جلتی گئی۔ فیضو بظاہر ایک نکلا اور

پیکار آدمی تھا جو سارا سارا دن جھوپڑی کے باہر پلنگ پر پڑا اپنا حقہ گڑا کرتا رہتا تھا لیکن جب اس کی نظریں جسم میں

اترتی تھیں تو معاذ پورے جسم میں عجیب سی لہریں دوڑتی محسوس کرتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ فیضو میں کچھ خاص ہے لیکن

وہی فیضو اس سے کہتا تھا کہ تجھ میں کچھ خاص بات ہے پٹ! اور اسے سمجھ نہیں آتا تھا کہ بھلا اس میں کیا خاص بات ہے۔

اب بھی وہ الجھ گیا اور بولا۔

”مجھ میں بھلا کہاں کچھ خاص ہے چاچا جی! کچھ خاص ہوتا تو وہ دو ٹکے کا آدمی سلطان اتنی آسانی سے پیچھے

سے آ کر میرے اوپر حملہ نہ کر پاتا۔“

تمہارے جسم میں موت سے لڑنے کی اتنی طاقت نہیں ہوتی تو تمہاری جان بچنی بہت مشکل تھی۔ جس بندے کے جسم سے اتنا خون بہا ہوا اور اوپر سے اسے سانپ نے بھی ڈس لیا ہو، اس کی جان بچنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ جب ہی تو میں کہتا ہوں کہ تجھ میں کچھ خاص ہے۔“ فیضو نے ایک بار پھر اسے اس کا خاص ہونا بتایا۔

”یابا کی یہ بات تو بالکل ٹھیک ہے۔ میں جب مراد کے ساتھ نہیں اٹھا کر یہاں لائی تھی تو مجھے بھی امید نہیں تھی کہ تمہاری زندگی بچ سکے گی۔“ لیلیٰ نے اس کی اس وقت کی حالت کو یاد کر کے ایک جھرجھری سی لی۔ اس روز وہ صبح پہاڑی بکرے کا شکار کرنے نکلی تھی۔ راستے میں مراد بھی اس کے ساتھ ہوا تھا لیکن بہت دیر تک انہیں اپنے مقصد میں کامیابی نہیں مل سکی تھی اور وہ شکار کی تلاش میں اپنے علاقے سے کافی دور نکل آئے تھے پھر انہوں نے ایک چٹان پر پہاڑی بکرہ اکھڑا دیکھا۔ جوش اور غلٹ میں ان سے تھوڑی بے احتیاطی سرزد ہو گئی اور وہ قلائچیں بھرتا ہوا اپنی جگہ سے بھاگ نکلا۔ وہ اس کے تعاقب میں جانا چاہتے تھے لیکن اچانک ہی لیلیٰ کی نظر نیچے گرے ہوئے معاذ پر پڑ گئی اور اس نے مراد کو اس طرف متوجہ کیا۔ مراد اپنے بھاری تن و توش کے باوجود بہت پھرتیلا تھا۔ وہ لپک کر نیچے اتر گیا اور بے ہوش ہو کر مراد کے پاس آ کر گر پڑا۔ لیلیٰ نے اس کے پاس ضروری سامان موجود تھا۔ مراد کی ہدایت پر لیلیٰ نے موٹی سی رسی کا سرا ایک بڑے اور چھوٹے پتھر سے باندھ کر نیچے پھینکا اور مراد، معاذ کو نیچے سے اوپر لہانے میں کامیاب ہو گیا۔ اوپر موجود لیلیٰ نے بھی اس کی مدد کی۔ معاذ کے ہاتھ پر کھانچ کے کانٹے کا نشان بھی اتفاقاً اس کی نظروں میں آ گیا اور اس نے بازو پر تھوڑے تھوڑے فاصلے سے تین مضبوط پٹیاں باندھ کر زہر کو پھیلنے سے روکنے کا انتظام کیا۔ اس کا باپ فیضو ایک سپیرا تھا اس لیے اسے اس طرح کے معاملات سے نمٹنے کا تجربہ تھا۔ اچھی بات یہ تھی کہ اس کے اور مراد کے گھوڑے اس جگہ سے بہت زیادہ دور نہیں بندھے ہوئے تھے۔ چنانچہ اسے لیلیٰ والے گھوڑے پر لا کر وہ بہت تیزی سے اپنے ڈپرے کی طرف روانہ ہو گئے۔

معاذ اتنا زیادہ زخمی تھا کہ انہیں اس کی جان بچنا مشکل محسوس ہو رہا تھا لیکن اس کی سانسوں کے جاری سلسلے نے انہیں جدوجہد پر اکسایا تھا۔ ان کی یہ جدوجہد رانگاں نہیں مگنی تھی اور فیضو کے تجربے کے ساتھ معاذ کے اندر کی زبردست قوت مزاحمت نے مل کر اسے ایک نئی زندگی دے

دودھ، مرغیوں کے انڈوں اور شکار کیے گئے جانوروں کے گوشت سے گزارہ ہونا ممکن نہیں تھا اس لیے جان جو کھم میں ڈال کر وہ ان راستوں پر سفر کرنے پر مجبور ہوتے تھے۔ ابتدا میں کوششیں بار آور بھی ہو جاتی تھیں لیکن اب لگتا تھا کہ ڈاکوؤں نے ہر راستے پر گھات لگا لی ہے۔ دو بار شہر جانے والی ٹولیوں سے ان کا سارا مال و اسباب چھین لیا گیا تھا۔ ایک بار مزاحمت پر ایک جوان آدمی قتل ہو گیا تھا اور اس کے بعد سے ہی سفر کا سلسلہ رکا ہوا تھا۔

”مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہیں ہے چاچا جی، آپ تو میرے محسن ہیں۔ میں تو بس یونہی اپنے گھر والوں کی پریشانی کے خیال سے فکر مند ہو رہا تھا۔“ معاذ کو بھی ان کی مجبوری کا احساس تھا اس لیے خود ہی ان کی دلجوئی کرنے لگا۔ اسی وقت لیلیٰ اندر آئی۔ اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں تھیں اور خاک کی قمیص بھی پسینے سے بھیک رہی تھی۔

”تم کہاں مصروف تھیں جو اتنے پسینے میں ہو رہی ہو؟“ معاذ نے اسے دیکھ کر بے تکلفی سے پوچھا۔ لیلیٰ ایسے مزاج کی لڑکی تھی جس پر لڑکی سے کراہ لڑکے کا گمان ہوتا تھا اس لیے معاذ کو یہاں رہتے ہوئے اس سے بے تکلف ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔

”یہ میری دھی رانی بڑے ضدی مزاج کی چھوٹری ہے۔ ادھر زمین بہت سخت ہے، کچھ اگانا آسان نہیں ہوتا لیکن یہ کہتی ہے کہ کیرتھر کی زمین بانجھ تو نہیں ہے۔ ہم نے تھوڑی دور اس زمین پر سبزہ اگتا ہے تو ادھر ہمارے علاقے میں بھی اگ سکتا ہے، بس محنت تھوڑی زیادہ کرنی ہوگی۔ دیوانی زرخیز حصوں سے مٹی ڈھو ڈھو کر لائی ہے اور ادھر کھیا ریاں بنا کر وہ مٹی اس میں ڈالی ہے۔ اس مٹی میں یہ شہر سے منگوائے ہوئے بیج بو کر جانے کیا کیا گاتی رہتی ہے۔ اس کے جنون کی وجہ سے ہمیں تازہ سبزیاں کھانے کو مل جاتی ہیں۔ اب تو اس کی دیکھا دیکھی دوسرے لوگ بھی ایسا کرنے لگے ہیں۔ پر میری دھی رانی جتنا محنت کوئی اور نہیں ہے۔ یہ زمین کو جتنی محنت اور محبت سے پہنچتی ہے، زمین بھی اس کو اتنا ہی صلہ دیتی ہے۔“ فیضو نے بیٹی کو محبت سے دیکھتے ہوئے خود معاذ کی بات کا جواب دیا۔

”اوہو..... جب ہی تو مجھے یہاں اتنے مزے کا کھانا ملتا ہے۔ شہروں میں تو تازہ سے تازہ بھی سبزی و ترکاری کم سے کم دودن پرانی ملتی ہے اور ہم اسے ہی صبر شکر کر کے کھا لیتے ہیں۔“ معاذ نے سن کر تبصرہ کیا۔

”ہاں، پر تم عام شہری چھوٹوں جتنے نازک نہیں ہو۔“

کرنی ہوگی۔“ بیٹی میں منہ دیے دیے ہی لپٹی نے مذاق اڑانے والے انداز میں مراد پر تبصرہ کیا۔
”بڑی گل ہے دھی رانی! کسی کو ایسا نہیں بولتے۔ سب اپنے نصیب کا کھاتے ہیں اور مراد تو بڑا سوہنرا چھوکر ہے، پر تو اسے دیکھتی ہے، اس کے اچلے من کو نہیں دیکھتی۔“ فیضو نے فوراً اسے ٹوکا۔

”تمہاری شہ پر ہی وہ اتنا پھیلتا ہے بابا! اگر تم اس کی طرف داری نہ کرو تو میں دو دن میں اس کا دماغ ٹھیک کر دوں۔“ اب وہ سیدھی کھڑی ہو گئی تھی اور اس کے سانولے چہرے پر غصے کی ہلکی سی سرخی نظر آرہی تھی۔

”لے بھی معاذ پٹ! سمجھ جا مراد کے نہ آنے کا سبب۔ یہ جو میری دھی رانی ہے نا، اس نے اس نمائے کو کچھ ایسی سیدھی سنائی ہوگی اور وہ دل تھوڑا کر کے بیٹھ گیا ہوگا، پر فکر کی کوئی گل نہیں ہے۔ دو ایک دن میں سب بھول کر آجائے گا۔ میں نے بتایا نا کہ چھوکر ادل کا بڑا اجلا ہے۔“ لیلیٰ کے انداز سے فیضو نے نتیجہ اخذ کر لیا اور ہنس کر معاذ کو تسلی دی۔ لیلیٰ کے چہرے کے تاثرات چغلی کھا رہے تھے کہ فیضو کا اندازہ ٹھیک ہے۔ معاذ لیلیٰ کی طرف دیکھ کر شریرانہ انداز میں ہنس دیا۔ مراد کے دل کی بات اور لیلیٰ کا گریز دونوں اس کے سامنے تھے اس لیے اسے لیلیٰ کو چھیڑنا اچھا لگا تھا۔ لیلیٰ کے اس طرح ہنسنے پر لیلیٰ نے غصے سے منہ موڑ لیا۔ وہ زیر لب ملامت کر دیا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ چٹانوں کی طرح غصے سے نظر آنے والی لیلیٰ کے دل کی سرزمین سے اس کی محبت کا جتن بھٹ پڑا ہے۔

”تم بڑے کمال کی لڑکی ہو! میں نے کبھی اپنی زندگی میں اتنی پھرتیلی اور جھنجھلائی لڑکی نہیں دیکھی۔ میں بھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ان پہاڑوں میں ایسی ہر فن مولا قسم کی لڑکی سے ملاقات ہو جائے گی۔“ وہ لیلیٰ کو گوڈی کرتے ہوئے دیکھ کر اس سے کہہ رہا تھا۔ وہ اس کے لگائے ہوئے پودے دیکھنے آیا تھا اور دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کہ اس نے اچھا خاصا باغیچہ سا بنایا ہوا ہے۔ کسی کیاری میں ہرا دھنیا، پودینہ اور ہری مرچیں لگی تھیں تو کسی میں سرخ سرخ ٹماٹروں سے لدے پودے بہار دکھا رہے تھے۔ کریلے کی خوب پھیلی ہوئی تیل پر لدے کھلتے سبز رنگ کے کریلے کچھ ایسی چمک لیے ہوئے تھے کہ دل چاہتا تھا یونہی کچا ہی توڑ کر چبانا شروع کر دو۔ ان کی کڑواہٹ کے ڈرنے معاذ کو ایسی کسی حرکت سے باز رکھا۔ کریلے کے ساتھ ہی توری کی تیل بھی

دی تھی لیکن یہ سب یکا یک نہیں ہوا تھا۔ بے ہوشی سے ہوش کی دنیا میں آنے کے لیے اسے کئی دن لگ گئے تھے۔ ایک طرف اس کے سر پر لگائی جانے والی ضرب بے حد مہلک تھی تو دوسری طرف اسے جس سانپ نے کاٹا تھا، اس کا زہر بھی بہت زود اثر تھا۔ فیضو کو اپنے تمام تر تجربے کے باوجود اسے بچانے کی جدوجہد میں دانتوں پسینا آ گیا تھا۔ گرنے کے دوران معاذ کے جسم پر جو ڈھیروں زخم آئے تھے، ان کی تو فیضو گنتی بھی نہیں کر سکا تھا اور اس نے بس اتنی بات پر اللہ کا شکر ادا کیا تھا کہ لڑکے کی کوئی ہڈی نہیں ٹوٹی تھی۔ باپ کے ساتھ لپٹی بھی اس کی تیمارداری میں جتی رہی تھی اور تیمارداری کے اس عمل کے دوران ہی اس کے دل میں معاذ کی محبت کی کوئیل پھولی تھی۔ وہ تھا ہی ایسا کہ صنف مخالف کے لیے خود کو اس کی کشش کے حصار میں آنے سے روکنا ممکن نہیں رہتا تھا۔ لیلیٰ نے سنگناخ پہاڑوں کے بیچ پرورش پائی تھی اور بظاہر مردانہ صفت کی حامل لڑکی تھی لیکن بھی تو لڑکی ہی جس کے اندر محبت کا چھوٹا دھیرے دھیرے بہتا رہتا ہے۔ معاذ نے اس کے دل کو اپنے ساتھ باندھ لیا تھا اور جب وہ حالت نیند میں ہوتا تھا تو وہ خاموشی سے اسے میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھتی رہتی تھی لیکن ایسا صرف تنہائی میں ہوتا تھا۔ کسی اور کے سامنے تو وہ معاذ کو نظر بھر دیکھتی تک نہیں تھی جیسے اس وقت وہ بیل بھر کو بیٹھ کر اپنا پیٹکا سکھانے کے بعد کونے میں ایک دوسرے کے اوپر رکھی ٹین کی پیٹیوں میں سے سب سے اوپری پیٹی کا ڈھکن کھولے پتا نہیں کیا تلاش کر رہی تھی۔

”مراد دو تین دن سے ملنے نہیں آیا۔ کہیں مصروف ہے کیا؟“ اس کی ابتدائی حالت کا ذکر چھڑا تھا تو مراد کی یاد آنا لازمی تھا۔ وہ بھی تو اس کے محسنوں میں سے ایک تھا۔ احسان کے علاوہ اس کی طبیعت کی سادگی اور خلوص کی وجہ سے بھی معاذ اسے پسند کرنے لگا تھا۔ معاذ کی تنہائی اور بوریت کا خیال کر کے وہ کافی یر تنگ اس کے پاس بیٹھا اس سے ڈھیروں باتیں کرتا رہتا تھا اور جب بھی اسے لگتا تھا کہ معاذ اداس ہے تو پتا نہیں کہاں کہاں سے گھڑ کر اسے لطیفے سناتا رہتا تھا۔ یہاں تک کہ معاذ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ جاتی تھی اور چہرے سے اداسی کے بادل چھٹنے لگتے تھے۔

”مصروف کدھر ہو گا وہ موٹو! اس کے کون سے کاروبار چل رہے ہیں جس میں الجھ کر اسے فرصت نہ ملے۔ زیادہ سے زیادہ اس غم میں کھل رہا ہو گا کہ کچھ دن اور اگر علاقے میں اتناج نہ آسکا تو اسے اپنی روٹیوں کی تعداد کم

تھی اور اس بیل پر چھوٹی بڑی مختلف ساز کی توریاں جھول رہی تھیں۔ ہوا سے لہلہاتی پالک کی تازگی آنکھوں کو تراوٹ بخش رہی تھی اور یہ سب ایک ایسی جگہ موجود تھا جہاں پانی اتنی آسانی سے دستیاب نہیں تھا۔ استعمال کا پانی لانے کے لیے ڈیرے کے باسیوں کو کافی دور چل کر جانا پڑتا تھا، ایسے میں لیلیٰ کا یہاں یہ سب اگالینا ایک کوشش ہی تھا۔ وہ اپنے اور فیضو کے استعمال کے پانی کے علاوہ ان پودوں کے لیے بھی پانی ڈھو کر لاتی تھی اور یہ کسی عام لڑکی کے بس کی بات تو نہیں تھی۔ اسی لیے سدا بہار کے پودے سے ایک پھول توڑتے ہوئے معاذ نے یہ تعریفی کلمات ادا کیے تھے۔ وہاں پھولوں کا صرف یہی ایک پودا تھا جس پر لگے گلابی اور سفید پھول بہت پیارے لگ رہے تھے۔

”سوچتا تو آدی بہت کچھ ہے پر زندگی پل پل اپنے انوکھے رنگ دکھاتی رہتی ہے۔ میں جب پانچ سال کی چھوٹی سی بچی تھی اور اپنے گاؤں کی گلیوں میں بھاگتی پھرتی تھی تو مجھے بھولے سے بھی کبھی خیال نہ آیا تھا کہ میں ان پہاڑوں میں آبسوں کی جہاں میرا بابا سا پتلا بچہ تلاش میں جاتا ہے اور جو مجھے بڑے پر اسرار لگتے ہیں۔“ لیلیٰ نے گودی میں عمل جاری رکھتے ہوئے لیلیٰ نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا تو معاذ اس کی بات سن کر حیران رہ گیا۔

”کیا مطلب؟ تم لوگ شروع سے ہی ان پہاڑوں کے رہنے والے نہیں ہو۔ تمہیں دیکھ کر تو ایسا لگتا ہے کہ تم یہیں کی پیداوار ہو۔“

”ایسا اس لیے لگتا ہے کہ ہم نے پور پور خود کو یہاں کے رنگ میں ڈھالا ہے۔ آدی کو جہاں رہنا ہو، وہیں کے رنگ میں رنگ جائے تو ہی کامیاب رہتا ہے۔“ اس نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا اور دونوں ہاتھ جھاڑ کر کھڑی ہو گئی۔

”لیکن تم لوگ اپنا گاؤں چھوڑ کر یہاں ایسی جگہ کیوں چلے آئے جہاں زندگی اتنی مشکل ہے۔ گاؤں میں تو پھر بھی اتنی سخت زندگی نہیں ہوگی۔“ معاذ نے اس کے سانولے ہاتھوں پر لگی مٹی کو دیکھا۔ اس کے ہاتھ خوب صورت تھے لیکن سخت محنت نے ان ہاتھوں کو بھی ایک طرح کی سختی عطا کر دی تھی۔

”گاؤں میں زندگی یہاں سے بھی زیادہ مشکل تھی بلکہ ہمارے لیے بنادی گئی تھی۔ جرم صرف اتنا تھا کہ ایک غریب آدی کی بیوی بہت خوب صورت تھی اور گاؤں کے وڈیرے زمین، فصلوں اور ڈھور ڈنگروں کے ساتھ ساتھ گاؤں کے لوگوں کو بھی اپنی جاگیر سمجھتے تھے۔ ان سے

برداشت نہیں ہوا کہ اتنی خوب صورت عورت ان کے بجائے ایک غریب آدی کے گھر میں ہو۔ میری ماں کو اس کی خوب صورتی کے جرم میں اٹھالیا گیا اور پورے تین دن بعد اس کی کٹی پھٹی، چچی ہوئی لاش کھیتوں میں پڑی ہوئی ملی۔ تین دن تک میں ماں کو پکارتی ہوئی گاؤں کی گلیوں میں پھرتی رہی۔ بابا ان دنوں سانپوں کی تلاش میں پہاڑوں پر گیا ہوا تھا اور عین اس دن واپس آیا جس دن میری ماں کی لاش ملی۔ ماں کی لاش دیکھ کر وہ پتھر بن گیا اور بنا ایک آنسو بہائے اسے قبر میں اتار دیا۔ مجھے اور لیلیٰ دلا سے دینے والوں میں سے کسی کو نہیں معلوم تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ اس رات میں سو رہی تھی تو وہ چپکے سے اٹھ کر باہر چلا گیا اور صبح سے کچھ دیر پہلے واپس آ کر مجھے نیند سے جگایا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ اتنی اچانک، سورج نکلنے سے بھی پہلے ہم کہاں جا رہے ہیں۔ بابا کے کندھے پر سوار حیرت سے انجان راستوں کو دیکھتی ایک لمبا سفر طے کرنے کے بعد میں یہاں پہنچ گئی اور تب سے یہیں ہوں۔ بہت بعد میں مجھے پتا چلا کہ اس رات بابا کہاں گیا تھا۔ اس رات وڈیرے کے دونوں بیٹے اپنے شہری دوستوں کے ساتھ ڈیرے پر ٹھہرے ہوئے تھے اور رات گئے تک موجد مستی کرنے کے بعد شراب کے نشے میں مبتلا ہو کر ڈیرے پر سو رہے تھے اس لیے انہیں پتا ہی نہیں چلا کہ موجد کی جگہ پر کتنے سانپوں کی صورت نازل ہو چکی ہے۔ وہ جو بابا کی دوسرے کے بل پر لوگوں کی خوشیوں کو ڈستے پھرتے تھے سوئے ہوئے بابا کے ڈسنے سے مارے گئے۔ بابا اپنا انقباض لینے کے بعد یہاں لے آیا اور پھر میری اس انداز سے پروردگار نے ان کی زندگی میں علامتیں نہ رکھیں۔ شاید اسی لیے تمہیں مجھے کچھ حیرت ہوئی ہے۔“ ساٹھ سے انداز میں اپنی ساری کہانیاں سن کر اس نے معاذ کی طرف دیکھا۔ پھر وہ چند قدم چل کر اس کے مقابل آ کر کھڑی ہوئی اور اس کے ہاتھ میں موجود پھول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

”پھولوں کو مت توڑا کرو معاذ سائیں! یہ اپنی شانوں پر ہی خوش رہتے ہیں اور توڑنے پر بڑی جلدی مرجھا جاتے ہیں۔ مجھے پھول بہت اچھے لگتے ہیں لیکن پانی کی کمی کی وجہ سے میں نے پھولوں کا صرف ایک پودا لگایا ہے اور وہ بھی ایسا جس پر سارا سال پھول آتے رہتے ہیں۔“

”سوری! میں انجانے میں تمہیں تکلیف دے بیٹھا۔“ معاذ نے فوراً اس سے معذرت کی لیکن وہ اس کے معافی مانگنے سے پہلے ہی مڑ کر لوہے کے باریک جال سے بنے اس چھ بانی چھ کے احاطے میں گھس گئی تھی جس کی چھت

”خطرہ تو مول لیتا پڑے گا معاذ سائیں..... ہم نے ہمت نہیں کی تو تھوڑے دنوں میں فاقے کی نوبت آجائے گی۔“ اس نے مجبوری بیان کی اور مجبوری ایسی تھی کہ معاذ اسے روکنے کے لیے مزید اصرار بھی نہیں کر سکتا تھا۔

”احتیاط کرنا مراد! میں تم لوگوں کی کامیابی کے لیے دعا کروں گا۔“ وہ صرف اتنا ہی کہہ سکا، جواب میں مراد نے اثبات میں سر ہلا دیا پھر جیسے یاد آنے پر بولا۔

”آپ کو اپنے گھر والوں کے نام چٹھی بھیجی تھی نا۔ آپ مجھے دے دو۔ میں ادھر ڈاکخانے سے ٹکٹ لگوا کر آپ کے گھر بھجوا دوں گا۔“

”ٹھیک ہے، تم تھوڑی دیر کو میں لے کر آتا ہوں۔ لکھ کر تو کئی دن سے رکھا ہوا ہے۔“ معاذ اپنے لیے مخصوص جھونپڑے کی طرف چلا گیا۔ خط لے کر واپس آیا تو مراد اور لیلیٰ ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ مراد کے چہرے پر محظوظ ہونے والے تاثرات تھے جبکہ لیلیٰ برہم سی نظر آرہی تھی۔ معاذ سمجھ گیا کہ مراد نے لیلیٰ کے ساتھ چیئر خانی کی ہے۔ مراد نے اسے دیکھ کر اشارہ کیا کہ وہ لیلیٰ کے سامنے خط نہ دے۔ یقیناً وہ اپنی روانگی کو لیلیٰ سے پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا۔ اس کی بات سمجھ کر معاذ نے خط جیب کے اندر رکھ لیا۔ اس کے جسم پر موجود لباس اسے فیضو نے فراہم کیا تھا، مراد اس کے اپنے کپڑے تو گرنے کے عمل کے دوران ہی بری طرح پھٹ گئے تھے۔

میرے منہ پر ہنسنے لگا۔ میرا دل بھوم گیا تو میں بھول جاؤں گی کہ تو سجاد کا چاچا کا بیٹا ہے اور سجاد کا چاچا میرے بابا کے وہ محسن ہیں جنہوں نے مشکل وقت میں ہمیں یہاں پناہ دی تھی۔“ معاذ نے سنا، لالچ کا چہرے کے ساتھ لیلیٰ، مراد کو وارننگ دے رہی تھی۔

”تو سب بھول جائیے پروا نہیں ہے لیکن بس یہ مت بھولنا کہ مراد تجھ پر مرتا ہے۔“ اس کے غصے کو خاطر میں لائے بغیر مراد عاشقانہ لہجے میں بولا تو لیلیٰ کا ضبط جواب دے گیا اور اس نے مکا بنا کر مراد کے جڑے پر رسید کرنا چاہا۔ مکا مارنے کے اس کے عمل میں جتنی پھرتی تھی، مراد نے بھی اتنی ہی تیزی سے ایک طرف جھکائی دے کر خود کو اس کے وار سے بچا لیا تھا۔ اتنے بھاری تن و توش کے ساتھ ایسی پھرتی قابل تعریف تھی۔ معاذ اسے داد دیتے دیتے رہ گیا۔ اسے بروقت احساس ہو گیا تھا کہ اس کی داد لیلیٰ کے غصے کا گراف اور بھی بلند کر دے گی۔ اب بھی وہ خطرناک موڈ

بھی اسی جال کی تھی لیکن اوپر ایک پلاسٹک شیٹ ڈال کر دھوپ اور بارش سے بچنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ یہاں اس نے ڈھیروں مرغیاں پالی ہوئی تھیں اور اب بڑی جانفشانی سے مرغیوں کی پھیلائی ہوئی گندگی صاف کر رہی تھی۔ معاذ مسکرا دیا۔ وہ لڑکی تصادفات کا مجموعہ تھی۔

”کیا حال ہے معاذ سائیں، خیر آہے؟“ وہ وہاں سے ہٹنے ہی والا تھا کہ مراد چلا آیا اور ہمیشہ کی طرح مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ اس سے پوچھنے لگا۔

”اب تو بہت بہتر ہوں مراد، زخم بھر گئے ہیں اور کمزوری بھی اتنی زیادہ نہیں رہی ہے۔ تم سناؤ تم کہاں تھے؟ میں تمہیں یاد ہی کر رہا تھا۔“

”ہاں سائیں، مجھے خبر ہے۔ فیضو چاچا نے پیغام بھیجا تھا اس لیے میں وقت نکال کر آپ سے ملنے آ گیا ہوں۔“ مراد کے ہنسنے مسکراتے چہرے پر تھوڑی سی سنجیدگی آگئی۔

”خیریت، کہاں مصروف تھے؟“ معاذ کو اس کے بارے میں لیلیٰ کا تبصرہ یاد آیا اس نے نظر مرغیوں والے احاطے کی صفائی کرتی لیلیٰ پر ڈالی اور مراد سے پوچھنے لگا۔

”آپ کے پوچھنے پر میں آپ کو بتاؤں لیکن آپ کسی سے ذکر نہ کرنا سائیں۔“ مراد نے ادھر اُدھر نظر دوڑا لیں اور آواز نیچی کر کے بولا۔

”کوئی خاص بات ہے کیا؟“ اس کے انداز پر معاذ کا تجسس جاگا۔

”میں اور دو دوسرے بندے آج رات ادھر سے نکل کر جانے والے ہیں۔ ہم اسی کی تیاری میں لگے ہوئے تھے۔ میرے پاس ایک دور بین ہے، اس کی مدد سے اور علاقے میں ادھر ادھر گھوم پھر کر ہم نے دیکھ لیا ہے کہ کس راستے پر پہرا کم ہے۔ ہم ادھر سے نکلنے کی کوشش کریں گے۔ ضرورت پڑی تو مار دھاڑ بھی کر لیں گے۔“ مراد نے اپنے شانے سے لنگی رانفل کو پھکی دی۔ وہ پُر امن لوگ تھے لیکن معاذ نے دیکھا تھا کہ وہ اپنے ساتھ ہتھیار ضرور رکھتے تھے۔ اس جگہ ہتھیاروں کے بغیر رہنا آسان بھی نہیں تھا۔ شکار اور دشمن سے بچاؤ کے لیے ہتھیار لازمی تھے لیکن عورتوں میں اس نے صرف لیلیٰ کو ہی ہر وقت ہتھیار ساتھ لے کر گھومتے دیکھا تھا۔

”یہ خطرناک بھی ہو سکتا ہے مراد! فرض کر دو تم لوگ نکلنے میں کامیاب ہو گے تو واپس آنا مشکل ہو جائے گا۔ تمہاری واپسی تک وہ اپنے پہرے کا نظام اور بھی سخت کر دیں گے۔“ معاذ نے تشویش کا اظہار کیا۔

میں نظر آرہی تھی اور صاف لگ رہا تھا کہ ایک کوشش میں ناکام ہونے کے بعد مراد پر دوسرا وار کرنے والی ہے۔
”پلیز سیز فار۔“ آپس میں اس طرح لڑنا گندے بچوں کی نشانی ہے۔“ معاذ نے انہیں ٹوکا۔

”میں بچی نہیں ہوں۔“ اس کے کہنے پر لیلیٰ رک تو گئی لیکن منہ بنا کر بولی۔

”بچی نہ سہی لیکن مجھ سے بہت چھوٹی ہو اس لیے میری بات ماننا تم پر فرض ہے۔“ معاذ نے اس پر رعب ڈالا۔

”آپ کی تو میں ہر بات مان سکتی ہوں معاذ سائیں۔“ وہ اچانک ٹھنڈی پڑ گئی اور عجیب سے لہجے میں کہہ کر وہاں سے ہٹ گئی۔ اس کے اس انداز پر معاذ ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ مراد کے چہرے پر بھی ایک تاریک سایہ لہرایا ہے۔

”بڑی ٹیڑھی بچی ہے۔ اب بھی وقت ہے، سوچ لو مراد کہ اتنی خونخوار لڑکی کے ساتھ کیسے گزارہ کرو گے۔“ لیلیٰ کے جملے کا تاثر ماند کرنے کے لیے معاذ نے قصداً مراد کو چھیڑا اور لیلیٰ کے لیے خصوصیت سے ”بچی“ کا لفظ استعمال کیا تاکہ مراد سمجھ لے کہ وہ لیلیٰ کو کس نظر سے دیکھتا ہے۔

”میں سنبھال لوں گا معاذ سائیں..... مجھے بچپن سے

اسے سہنے کی عادت ہے۔ لائیں، آپ اپنی چٹھی جلدی سے دے دیں۔ مجھے والہس جا کر ابھی بہت کچھ دیکھنا ہے۔“ مراد

نے خود کو سنبھال لیا تھا اور اب عام سے لہجے میں اس نے مخاطب تھا۔ معاذ نے جیب میں موجود کاغذ نکال کر اسے

دیا۔ یہاں اسے کوئی لفافہ میسر نہیں آیا تھا بلکہ وہ تو کاغذ قلم ملنے پر بھی حیران ہی تھا۔ مراد نے البتہ اسے سلی دے دی تھی کہ ڈاک خانے سے لفافہ لے کر اس کا خط پوسٹ کر دیا جائے گا۔

”اجازت سائیں۔“ مراد نے اس سے لفافہ اور

پتے والی چٹ لے کر احتیاط سے اپنی جیب میں رکھی اور معافے کے لیے بازو پھیلانے۔ معاذ فوراً اس کے گلے سے لگ گیا اور دل ہی دل میں دعا کرنے لگا کہ لیلیٰ کے رویے سے جو احساس ہوا ہے، اللہ کرے وہ ایک غلط فہمی ہی ہو اور اس پیارے لڑکے کا دل کبھی دکھی نہ ہو۔

☆☆☆

کیرتھر پر رات اتر آئی تھی۔ کامل رات۔ اس رات سے مختلف جو شہروں پر اترتی ہے۔ شہروں کی رات کو مصنوعی روشنیاں کامل نہیں ہونے دیتیں اس لیے شہر والے رات کے اس حسن کو بھی دیکھنے سے محروم رہتے ہیں جو کیرتھر اور اس جیسے دوسرے ویرانوں میں جگمگاتا ہے۔ ان ویرانوں کی راتیں

بظاہر بڑی بھیا نک اور پراسرار محسوس ہوتی ہیں لیکن اسی ہیبت اور اسرار کے پردے میں سے ہی حسن بھی جھانکتا ہے۔ معاذ ان لوگوں میں سے تھا جو اپنے حسن کو دریافت کرنے، اس سے لطف اندوز ہونے اور اسے سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس نے پورے چاند کی رات میں پہاڑوں پر چاندنی کا رقص بھی دیکھا تھا اور اب چاند کی آخری راتوں کا حسن بھی دیکھ رہا تھا۔ چاند پورا ہو تو اس کا حسن نظروں کو باندھ لیتا ہے اور دوسری خوب صورتیوں کو محسوس نہیں کرنے دیتا لیکن اب چاند سے خالی آسمان پر وہ ستاروں کا راج دیکھ رہا تھا۔ سیاہ آسمان پر موجود ستاروں کی ناقابل شمار تعداد نے اسے مبہوت کر دیا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ کیا ستارے بھی اتنے روشن ہوتے ہیں یا پھر کیرتھر کے ماحول کا اثر ہے کہ وہ ستاروں کو اتنا روشن محسوس کر رہا ہے۔ یہ شاید ماحول کا ہی اثر تھا ورنہ قدرت کہاں اپنی تقسیم میں غیر انصافی سے کام لیتی ہے۔

”کیا دیکھ رہے ہو پٹ؟“ وہ جانے کتنی دیر تک ستاروں کی اس انوکھی دنیا میں گم رہتا کہ فیضو کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ اس کے قریب ہی آ بیٹھا تھا اور اپنے حقے کی درست کر رہا تھا۔

”دیکھ رہا ہوں کہ یہاں سے آسمان کتنا قریب ہے۔

مجھے یقین ہے کہ میں وہ سامنے والے پہاڑ پر چڑھ جاؤں تو پہاڑ بڑھا کر آسمان سے تارے توڑ سکتا ہوں۔“ معاذ نے

کالی دو نظر آتے ایک پہاڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شجر زدہ سے لہجے میں جواب دیا تو فیضو ہنسنے لگا۔

”آپ کی بات بچکانہ لگ رہی ہے نا چاچا جی؟“

اس کے ہنسنے پر معاذ نے ذرا جھینپ کر در یافت کیا۔

”بچوں کی سی باتیں کرنے میں کیا برائی ہے پٹ! ہم

میں سے ہر ایک کچھ اندر ایک بچہ چھپا ہوتا ہے اور یہ بچہ اتنا

شریر ہوتا ہے کہ وقت بے وقت شرارت کرنے پر تل جاتا

ہے۔ اس بچے کے ہونے پر شرمندہ ہونے کے بجائے بھی

کبھی اس کے لاڈ اٹھانے میں کچھ نہیں جاتا۔ میں تو اپنے

اندر کے بچے کو بڑا خوش رکھتا ہوں اور اکثر اس کی پسند کے

کھیل کھیلتا رہتا ہوں۔ تم کھیلو گے میرے ساتھ وہ

کھیل.....؟“ بتاتے بتاتے فیضو نے اچانک اس سے پوچھا

تو وہ حیران رہ گیا کہ اس وقت اتنے اندھیرے میں فیضو

کون سا کھیل کھیلتا چاہتا ہے۔ یہاں راتوں کو کسی شغل میلے کا

رواج نہیں تھا۔ لوگ اندھیرا ہونے سے پہلے پہلے ہی اپنے

کام نمٹا کر سو جاتے تھے اور صبح منہ اندھیرے ہی ان کے

دن کا آغاز ہو جاتا تھا۔ ایسے میں فیضو کا پوچھا گیا سوال

”آج کے لیے اتنا ہی کھیل کافی ہے پٹ! نیا کھلاڑی اتنا بھی کھیل لیا تو سمجھو کمال کر دیا۔“ سرگوشی میں اس سے کہتے ہوئے فیضو نے اس کے شانے پر ایسے پھکی دی جیسے فٹ بال، ہاکی یا کرکٹ کی ٹیم کا کوچ کسی نئے کھلاڑی کو اس کی بہتر کارکردگی پر پھکی دیتا ہے۔

”رات بہت ہو گئی ہے۔ جا اب جا کر سو جا۔“

دھیرے سے ایک اور پھکی دیتے ہوئے اس نے معاذ کو نصیحت کی تو وہ کسی سحر زدہ شخص کی طرح اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ بستر پر لیٹ کر اسے خیال آیا کہ آج مراد اور اس کے دوست کیا کرنے والے ہیں لیکن دماغ پر اچانک ہی ایسی تھکن طاری ہو گئی تھی کہ کچھ سوچنے کی بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ شدید تھکن کے احساس سے مغلوب وہ جلد ہی نیند کی گہری وادیوں میں اتر گیا۔ پتا نہیں وہ کتنی دیر سویا تھا کہ بے در پے ہونے والے دھماکوں نے اسے جاگنے پر مجبور کر دیا۔ گہری نیند سے جاگنے کے باعث کچھ دیر تو وہ اصل صورت حال کو سمجھ ہی نہیں سکا پھر اسے سمجھ آنے لگی کہ یہ فائرنگ کی آوازیں ہیں۔ رائفل، شاٹ گن اور پستلو ہر طرح کے ہتھیار کی آواز سنائی دے رہی تھی اور ایسا لگ رہا تھا کہ دو گروہ آپس میں برسریا کر رہے ہیں۔ اسے فوراً مراد اور اس کے ساتھیوں کا خیال آیا۔ آج رات وہ لوگ اپنے ڈیرے سے نکل کر لڑائی کی طرف جانے والے تھے۔ اس نے سوچا کہ میں ان لوگوں کا ڈاکوؤں سے تصادم تو نہیں ہو گیا ہے لیکن اگلے لمحے اس نے اپنے خیال کو رد کر دیا۔ اس کی معلومات کے مطابق ڈاکوؤں کا ٹھکانا یہاں سے کافی دور تھا اور نکاسی کے راستوں پر جہتی مقامات پر انہوں نے پہرا بٹھا رکھا تھا، وہ مقامات بھی کافی آگے تھے جبکہ یہاں جو فائرنگ کی آوازیں آرہی تھیں، وہ اتنی قریب نہیں کہ صاف پتا چل رہا تھا کہ یہ فائرنگ ہمیں ڈیرے پر ہی ہو رہی ہے۔ وہ اپنے بستر سے اٹھا اور صورت حال جاننے کے لیے احتیاط کے ساتھ باہر نکلا۔ باہر اب پہلے حبیب اندھیرا نہیں تھا۔ ایک جھونپڑی میں آگ لگ گئی تھی اور اس جلتی جھونپڑی کی روشنی میں چند متحرک سائے نظر آرہے تھے۔ غیر معمولی تن و توش کے باعث اس نے مراد کے سائے کو پہچان لیا اور جھکا جھکا اس کی طرف بڑھا۔ وہ اپنی رائفل سنبھالے ایک بڑے پتھر کی آڑ میں چھپا ہوا تھا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ اس کے قریب پہنچ کر معاذ نے اس سے سوال کیا۔

”خمیسوڈا کو کے گروہ نے ڈیرے پر حملہ کر دیا ہے۔“

اس نے بغیر پلٹے جواب دیا اور ایک فائر کیا۔ اسی کی طرح

اسے حیران نہ کرتا تو کیا کرتا۔ آج کل تو ویسے ہی وہ لوگ رسد کی کمی کی وجہ سے ہر شے بہت سوچ سمجھ کر خرچ کر رہے تھے اور انتہائی ضرورت کے علاوہ کہیں کوئی چراغ روشن نہ کیا جاتا تھا ایسے میں فیضو کوئی کھیل کھیلتا بھی تو کیسے۔

”مجھے اندھیری راتوں میں تاروں سے کھیلتا بہت اچھا لگتا ہے۔ یہ تارے میرے سب سے من پسند کھلونے ہیں۔“ اس کی حیرانی سے بے نیاز فیضو اسے بتا رہا تھا۔

”تاروں سے کیسے کھیلتے ہیں چاچا؟“ معاذ نے تجسس سے پوچھا۔

”مجھے بھی سکھا دیتا ہوں یہ کھیل پٹ۔ ادھر آسمان کی طرف دیکھ اور جو تار اچھے سب سے زیادہ روشن اور سو ہنرا لگے، اسے اپنے لیے چن لے۔“ فیضو بول رہا تھا اور معاذ کی آسمان پر بھٹکتی نظروں نے خود ہی ایک تار چن لیا تھا۔

”جو تار تو چنے گا، وہ تیرا کھلونا ہوگا۔ انوکھا کھلونا جسے تو ہاتھ نہیں لگا سکے گا لیکن نظروں کی ڈور سے باندھ کر اس کی روشنیوں سے کھیل سکے گا۔ تو دیکھے گا کہ روشنیاں تیرے لیے ناچ رہی ہیں، تیرے ملائے آنکھ مچولی کھیل رہی ہیں اور تیرے اندر اتر کر تیری روح کو زندہ کر رہی ہیں۔“

فیضو بولتا جا رہا تھا لیکن اب اسے فیضو کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کے منتخب کردہ ستارے نے اس کے ساتھ کھیلتا شروع کر دیا تھا۔ وہ مبہوت سا بظاہر خفے نظر آنے لگا۔ اسے اس تارے کی بے پناہ روشنیوں کا رقص دیکھ رہا تھا۔

ان روشنیوں کے بے شمار رنگ تھے پر کوئی رنگ نہیں تھا۔ کم از کم وہ ان میں سے کسی رنگ کو دوسرے سے جدا کر کے کوئی نام نہیں دے پا رہا تھا۔ وہ دیکھتا رہا۔ روشنیاں رقص کرتی رہیں پھر دھیرے دھیرے ان روشنیوں نے نیچے اترنا شروع کر دیا اور نظروں سے اس کے اندر اترنے لگیں۔ اس کا وجود ان روشنیوں سے بھرنے لگا اور پھر وہی ہوا جو بہت زیادہ روشنی میں ہوتا ہے۔ اس کی آنکھیں چندھیا نے لگیں

اور اسے نظر آنا بند ہو گیا۔ وہ گھبرا گیا کہ کہیں بھٹک کر راستہ نہ بھول جائے لیکن اسی وقت کسی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ روشنیوں کی چکا چوند کم ہونے لگی۔ اس کا دل گھبراہٹ سے آزاد ہونے لگا اور پھر جیسے وہ آسمان پر اڑتے اڑتے ہوئے سے زمین پر آ اتر۔ وہاں وہی اندھیرا تھا اور فیضو

اس کے قریب اس کا ہاتھ تھامے بیٹھا تھا۔ اندھیرے میں اس کی پر اسرار آنکھیں کسی سانپ کی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ اندھیرے کے باوجود معاذ کو ایسا لگا کہ وہ مسکرا رہا ہو۔ پر اسرار سی مسکراہٹ۔

دوسرے لوگ بھی مختلف مقامات پر چھپے فائرنگ کر رہے تھے لیکن معاذ نے یہ بات فوراً محسوس کرتی تھی کہ ڈاکوؤں کی طرف سے تازہ فائرنگ کے جواب میں یہاں سے بہت مختار فائرنگ کی جا رہی تھی۔ وجہ صاف ظاہر تھی۔ ڈاکوؤں کے پاس ایمنیشن کی کوئی کمی نہیں تھی اور ڈیرے والوں کے پاس اسلحے کا محدود ذخیرہ تھا۔

”کیا مجھے کوئی ہتھیار مل سکتا ہے؟“ صورت حال کو سمجھ کر معاذ کا خون بھی جوش مارنے لگا۔ اپنی افتاد طبع کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے باقاعدہ شوٹنگ سیکھی تھی اور کئی طرح کے ہتھیار چلانے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

”یہ دوسری رائفل لے لو معاذ سائیں، پر خیال سے۔“ مراد نے پتھر کی جڑ میں پڑی رائفل اس کی طرف کھسکائی اور بولا۔ جواب میں معاذ بھی کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن مراد ایک طرف سے مسلسل ہونے والی فائرنگ کی طرف متوجہ ہو گیا اور سمت کا تعین کرتے ہوئے اس طرف فائر مارنے لگا۔ معاذ خاموشی سے پیچھے کھسک گیا اور درمیان ہوا قوس کی صورت گھوم کر آگے کی طرف جانے لگا۔ اس کی ٹانگوں نے آگے ایک ابھری ہوئی چٹان کو تازہ لیا تھا اور اسے امید کی دامن چٹان کی آڑ سے حملہ آوروں کو زیادہ بہتر طور پر نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔ چٹان کی

آڑ سے جھانکنے پر اس کا یہ اندازہ درست ثابت ہوا اور ایک لمحے کے جائزے سے ہی اس نے تین ایسے افراد کو لکھ لیا جن کے ہتھیار مسلسل آگ اگل رہے تھے۔ وہ تینوں اسلحے اندھیرے میں تھے لیکن ان کے ہتھیاروں سے نکلنے والے شعلے ان کی نشاندہی کر رہے تھے۔ معاذ نے ایسے ہی ایک شعلے کو اپنا ہدف بنا کر فائر کیا تو اسے احساس ہوا کہ وہاں سے اگلے شعلے یکدم ہی رک گئے ہیں۔ اس نے دل ہی دل میں ”وہ مارا“ کا نعرہ لگایا۔ اس کا نشانہ خطا نہیں گیا تھا لیکن دوسری طرف سے دیکھ لیا گیا تھا کہ فائر کہاں سے آیا ہے چنانچہ اپنے نقصان کے جواب میں اسے ہدف بنانے کے لیے بے تحاشا فائرنگ کی جانے لگی۔ گولیوں نے چٹان کے سامنے کے رخ کو ادھیڑ کر رکھ دیا لیکن معاذ اس کی آڑ میں محفوظ دامون رہا۔ چند لمحوں کے اس سلسلے کے بعد دونوں ہتھیار یکے بعد دیگرے خاموش ہو گئے تو معاذ نے ذرا سے توقف سے سر نکال کر آڑ میں سے باہر جھانکا۔ اسے خدشہ تھا کہ ہتھیاروں کا خاموش ہو جانا چال بھی ہو سکتی ہے تاکہ وہ آڑ سے باہر آجائے لیکن اس کے جھانکنے پر بھی کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا۔

اندھیرے میں اسے اپنے دیکھ لیے جانے کا اتنا اندیشہ بھی نہیں تھا لیکن نہ خدشہ تو بہر حال تھا کہ ذرا سے

توقف کے بعد دوبارہ فائرنگ شروع ہو سکتی ہے۔ آڑ میں سے احتیاط سے جھانکتے ہوئے اس نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے ایک آڑ میں سے شعلہ کوندا اور آگے ڈاکوؤں کی صفوں میں شعلے اگلنے ایک ہتھیار کو خاموش ہونا پڑا۔ معاذ کو اندازہ ہو گیا کہ ڈیرے والوں میں سے کوئی ہے جو اس سے بھی آگے موجود ہے۔ اس نے آگے موجود شخص کو ایک خیالی پھکی دی اور خود بھی ریگتا ہوا آگے کی طرف بڑھنے لگا۔ ڈاکوؤں کو آگے بڑھنے سے روکنے کے لیے یہاں والوں کا آگے بڑھ کر انہیں جواب دینا بہت ضروری تھا۔ ویسے یہ بات بھی قابلِ داد تھی کہ بے خبری میں شب خون مارے جانے کے باوجود ڈیرے والوں نے اپنے سے کئی گنا بہتر ہتھیاروں سے لیس ڈاکوؤں کو ابھی تک ڈیرے پر گھسنے سے روک رکھا تھا۔ اگر ڈاکو یہاں گھسنے میں کامیاب ہو جاتے تو ناقابلِ تلافی نقصان ہو سکتا تھا۔ یہ سب سوچتا رہتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ اس کے کانوں نے ایک نسوانی چیخ سنی۔ چیخ درمیان ڈوبی ہوئی تھی پھر بھی وہ اسے شاجت کرنے میں کامیاب رہا۔ بلاشبہ وہ لیلیٰ کی چیخ تھی اور اس آڑ میں سے سنائی دی تھی جہاں سے اس نے ایک شعلہ نکل کر ڈاکوؤں کی صفوں کی طرف جاتا ہوا دیکھا تھا۔ لیلیٰ کے علاوہ پورے ڈیرے پر اتنی نذر دوسری کوئی ہمت ہو بھی کون سکتی تھی جو ڈاکوؤں سے یوں سب سے آگے

اس کی چیخ سن کر وہ پھرتی سے آگے کی طرف لپکا لیکن اس کا جھانکنا اس کے ایک گولا سا آیا اور معاذ سے آگے لپکا۔ لیلیٰ معاذ سے چٹان لپکا کہ وہ مراد ہے۔ وہ اس چٹانی آڑ تک پہنچا اور مراد ایک چوڑے سائے سے لپٹا ہوا تھا وہ یقیناً کوئی ڈاکو ہی تھا جو ہاتھ میں رائفل ہونے کے باوجود مراد کے اس طرح لپٹ جانے کے باعث اپنی رائفل کو استعمال کرنے سے قاصر تھا اور اپنی جسمانی طاقت کی مدد سے ہی جونک کی طرح چپے ہوئے مراد سے جان چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ قریب ہی اس کا گھوڑا کھڑا تھا اور گھوڑے کی پیٹھ پر لیلیٰ لدی ہوئی تھی اور یقینی طور پر بے ہوش تھی۔ معاذ دیکھ رہا تھا کہ مراد طاقتور اور پھرتیلا ہونے کے باوجود اس گرائنڈیل شخص پر قابو پانے میں ناکام ہے اور وہ شخص رائفل چھوڑ کر بے درپے مراد کے سر اور گردن پر کئے برسا رہا ہے۔ یہ کئی سیٹیوں پر بہت قوت سے مارے جا رہے تھے اور مراد کی قوت عمل کو کمزور کر رہے تھے لیکن پھر بھی وہ اپنے مقابل کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ مراد

رفتار سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے بہت زیادہ شدید چوٹ نہیں آئی ہے۔ اس نے لیلیٰ کو گھوڑے سے اتار کر نیچے ڈالا اور مراد کو اشارہ کیا کہ وہ لیلیٰ کو ہوش میں لانے کی کوشش کرے۔ مراد پتھر کی زمین پر لیلیٰ کے قریب بیٹھ کر اس کے گال تھپتھپانے کے ساتھ ساتھ اسے آوازیں لگا رہا تھا جبکہ معاذ کی توجہ گھوڑے کی طرف تھی۔ اپنے مالک کے بے ہوش ہو کر گرنے سے وہ خاصا مضطرب نظر آ رہا تھا۔ معاذ دھیرے دھیرے اس کی پیٹھ اور سر کو سہلا کر اسے پرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اپنے شوق کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے کئی برس پہلے گھڑ سواری سیکھی تھی اور اسی عرصے میں اس پر یہ انکشاف ہوا تھا کہ گھوڑا چاہے کیسا ہی اڑیل ہو اس سے بہت جلد مانوس ہو جاتا تھا۔ اس گھوڑے نے بھی بتدریج پرسکون ہونا شروع کر دیا۔ دوسری طرف مراد بھی لیلیٰ کو ہوش میں لانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اسے سوال و جواب کا موقع دیے بغیر معاذ نے بولنا شروع کر دیا۔

”لیلیٰ! تم خمیسو کو اس کے گھوڑے پر ڈال کر ڈیرے تک لے جاؤ اور کسی طرح یہ بات ڈاکوؤں تک پہنچانے کی کوشش کرو کہ ان کا سردار خمیسو خان ہمارے قبضے میں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اپنے سردار کی سلامتی کے لیے وہ پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو جائیں گے۔“

معاذ نے اس کے ہاتھ سے بھاری بھر کم خمیسو خان کو گھوڑے کی پشت پر اٹھا کر لیلیٰ کو گھوڑے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ اچک کر قابو خان کی طرف پھر گھوڑے کی پشت پر سوار ہو گئی۔ فائرنگ کا جھلسا اب بھی جاری تھا اور اس میں پہلے سے زیادہ تیزی آئی تھی۔ یقیناً لیلیٰ نے معاذ کے ہاتھوں شکار ہونے والے اپنے ساتھیوں کی لاشوں نے ڈاکوؤں کو برا فروختہ کر دیا تھا اور وہ ڈیرے والوں کو بھون کر رکھ دینا چاہتے تھے۔ اچھی بات یہ تھی کہ وہ لوگ جس چٹان کی آڑ میں تھے، وہاں تک کسی گولی کی رسائی نہیں تھی لیکن لیلیٰ گھوڑے سمیت ڈیرے کی طرف جاتی تو اس کا نظروں میں آ جانا لازمی تھا۔ اس مسئلے کا حل معاذ نے یوں نکالا کہ دوسرے رخ سے ڈاکوؤں کی طرف فائرنگ شروع کر دی۔ فوراً ہی ڈاکوؤں کے ہتھیاروں کا رخ بھی اسی طرف ہو گیا۔ معاذ، لیلیٰ کو پہلے ہی مختصر آسمان چکا تھا اس لیے وہ فوراً ہی حرکت میں آ گئی اور خمیسو خان کے گھوڑے کو ایڑ لگا کر بجلی کی رفتار سے ڈیرے کی طرف لپکی۔ مختصر سے کھلے علاقے کو پار کر کے ڈیرے کی طرف جانے میں اسے زیادہ وقت نہیں

کی مدد کے خیال سے معاذ اپنی جگہ سے حرکت میں آنے ہی لگا تھا کہ اسے وہاں ایک اور شخص کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ پستہ قامت کا ایک سیاہ پوش تھا جس نے اپنی رائفل کو نال کی طرف سے پکڑ رکھا تھا اور یقیناً اس کا ہٹ مراد کے سر پر مارنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ گولی اس نے اس لیے نہیں چلائی ہو گی کہ وہ مراد کے بجائے اس کے اپنے ساتھی کو بھی لگنے کا احتمال تھا۔ اس کا رائفل والا ہاتھ نیچے آتا، اس سے قبل ہی معاذ حرکت میں آیا اور رائفل کا رخ اس سیاہ پوش سائے کی طرف کرتے ہوئے گولی چلا دی۔ نشانہ بے پناہ سچا تھا۔ پستہ قد سیاہ پوش کی کھوپڑی اڑ گئی۔ اسی وقت مراد کو موقع ملا تو اس نے اپنے مقابل کے منہ پر سر کی ٹکڑ دے ماری۔ اس کا تربوز جیسا بھاری سر یقیناً اس کے مقابل کے ناک منہ کا کباڑا کر گیا ہوگا جب ہی وہ بری طرح ڈکرایا اور منہ پر ہاتھ رکھ کر جھٹکا چلا گیا۔ اس کے جھٹکتے ہی ایک گولی آئی اور مراد کے شانے کو ادھیڑتی ہوئی نکل گئی۔ معاذ گولی کی سمت کا اندازہ لگا چکا تھا، ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر اس نے جوابی فائر کیا۔ نتیجے میں کسی کی دردناک چیخ سنائی دی اور ساتھ ہی ایسا محسوس ہوا کہ کوئی گر کر خچے چلا گیا ہو۔ معاذ ہر خطرے سے بے نیاز لپک کر مراد کے سر پر پھینکا لیکن اس کا احوال معلوم کرنے سے پہلے ابھی تک وہ مراد کو ہاتھوں سے ڈھانپنے شخص کے سر پر رائفل کے ہٹ سے ایک نئی تلی ضرب لگا کر اسے بے ہوش کر دینا مناسب سمجھا۔

”یہ خمیسو خان ہے ڈاکوؤں کا سردار۔“ مراد ایک ہاتھ سے اپنے زخمی بازو کو دبائے خون روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اذیت کو برداشت کرتے ہوئے کھٹی کھٹی آواز میں بولا تو معاذ چونک گیا اور ایک نظر اب بھی گھوڑے کی پشت پر لدی بے ہوش لیلیٰ پر ڈالی۔ اسے فوراً سمجھ آ گئی کہ کسی طرح خمیسو خان کو لیلیٰ کی یہاں موجودگی کا پتا چل گیا ہوگا اور اس نے اپنے دو حواریوں کے ساتھ اسے گھیر کر اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کی ہوگی لیکن اس کی اور مراد کی بروقت مداخلت نے بازی الٹ دی اور الٹا خمیسو بے ہوشی کی حالت میں ان کے ہاتھ لگ گیا۔ اس نے سب سے پہلا کام تو یہ کیا کہ خمیسو کا پکڑ کھول کر اسے مراد کے بازو پر باندھنے کے ساتھ ساتھ اس کے ایک حصے کی پٹی بنا کر مراد کے گلے میں ڈال دی اور اس پٹی میں اس کا زخمی بازو لٹکا دیا۔ ان تراکیب سے خون کے بہنے کی رفتار کم ہونے میں خاطر خواہ مدد مل سکتی تھی۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے لیلیٰ کی طرف توجہ دی۔ وہ بے ہوش تھی لیکن نبض اور سانسوں کی

لگا۔ معاذ کی فائرنگ کا جواب دیتے ڈاکو اس کی طرف متوجہ ہوتے، اس سے قبل ہی وہ چٹانوں کی آڑ میں پہنچ چکی تھی۔ اس کے محفوظ ہونے کا اندازہ ہوتے ہی معاذ نے فائرنگ کا سلسلہ ترک کر دیا اور چٹان سے ٹیک لگا کر بیٹھے مراد کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اب غیر ضروری فائرنگ کر کے گولیاں ضائع کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

”تھوڑی دیر میں انشا اللہ یہ سارا سلسلہ رک جائے گا تو میں تمہیں ڈیرے پر بھجوا دوں گا۔ میں نے لیلیٰ سے کہا تھا کہ وہاں پہنچتے ہی پہلی فرصت میں گھوڑوں سمیت یہاں آجائے۔“ مراد کو تسلی دیتے ہوئے بھی اس کی نظریں گرد و پیش کا جائزہ لے رہی تھیں کہ کہیں معمولی سی غفلت بنا ہوا کھیل نہ بگاڑ دے۔ احتیاطاً اس نے ڈاکوؤں کی طرف ایک دو فائر بھی کیے کہ انہیں اس کی اسلحہ سمیت وہاں موجودگی کا اندازہ رہے اور وہ اس جگہ پر جڑھے نہ چلے آئیں۔ انتظار کا یہ وقفہ زیادہ طویل ثابت نہ ہوا اور فائرنگ کی آوازوں کے درمیان ایک مختلف آواز سنائی دی۔ معاذ نے اس آواز کو شناخت کر لیا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ بھونپو کی آواز تھی جس پر ڈاکوؤں کو مخاطب کر کے انہیں خمیسو خان کے اپنے قبضے میں ہونے کی اطلاع دی جا رہی تھی۔ پہلی بار تو شاید کسی نے توجہ نہیں دی لیکن جب اعلان بار بار دہرایا جانے لگا تو اس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا اور فائرنگ کا سلسلہ آہستہ آہستہ ٹھمنے لگا۔ ڈیرے والوں کی طرف سے یہ سلسلہ پہلے ہی رک چکا تھا۔ ان کی طرف سے ایک بار پھر اعلان دہرایا گیا۔

”تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ سردار تمہارے قبضے میں ہے۔“ آخر کار ڈاکوؤں کی طرف سے بھی بھونپو کے ذریعے ہی پوچھا گیا۔ معاذ کو بعد میں معلوم ہوا کہ ڈاکو اس طرح کے بھونپو اپنی ہر واردات کے دوران اپنے ساتھ رکھتے تھے تاکہ لوگوں کو خبردار کر دیا جائے کہ ان کے سامنے کسی مزاحمت کا کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔

”ثبوت کے لیے تمہارے سردار کا گھوڑا کافی ہے۔“ بھونپو پر جو آواز گونجی، اسے معاذ نے اس بار شناخت کر لیا۔ وہ فیضو کی آواز تھی۔ اس کا جملہ مکمل ہوتے ہی ڈیرے کی طرف سے خمیسو خان کا گھوڑا برآمد ہوا اور ڈاکوؤں کی جانب دوڑتا چلا گیا۔

”سردار کی آزادی کے بدلے میں کیا چاہتے ہو؟“ پل بھر کے لیے ڈاکوؤں کو سانپ سوگھ گیا تھا لیکن پھر ادھر سے بات آگے بڑھائی گئی۔

”سردار کی آزادی کی قیمت ہم سردار سے ہی طے کریں گے۔ ابھی بس تم واپس لوٹ جاؤ اور اپنے سردار کی واپسی کا انتظار کرو۔ اگر تم میں سے کوئی ڈیرے کے قریب بھی بھٹکا تو ہماری طرف سے سردار کی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں ہو گی۔“ فیضو نے گونجی آواز میں اس کے سوال کا جواب دیا۔

”تم نے کچھ انسایدہ کیا تو یاد رکھنا کہ جواب میں ڈیرے پر ایک بھی شخص زندہ نہیں بچے گا۔“ وہ ڈاکو تھے اور انہیں لوگوں کو دہشت زدہ کر کے اپنا مطلب نکالنے کی عادت تھی اس لیے اتنی آسانی سے دھمکی میں آنے کے لیے تیار نہ ہوئے۔

”دھمکی مت دو۔ ہماری طرف سے خمیسو خان کی زندگی کی ضمانت ہے لیکن شرط وہی ہے کہ تم لوگ ڈیرے سے دور رہو گے اور کوئی الٹی سیدھی حرکت نہیں کرو گے۔“ فیضو ان سے بڑے مضبوط لہجے میں بات کر رہا تھا۔ آخر ان کی طرف سے پسپائی اختیار کر لی گئی اور خمیسو کی ہدایت کے مطابق وہ لوگ واپس پلٹنے لگے۔ اسی دوران، مراد کا گھوڑا لے کر آگئی تھی۔ معاذ نے مراد کو گھوڑے پر بیٹھنے میں مدد دی اور وہ دونوں ڈیرے کی طرف روانہ ہو گئے۔ معاذ کے لیے لیلیٰ اپنا گھوڑا اچھوڑ گئی تھی۔ معاذ گھوڑے پر سوار ہو کر دوڑا پر پہنچا تو وہاں اچھی خاصی روشنی ہو رہی تھی۔ جھونپڑی میں آگ بجھالی گئی تھی لیکن صاف نظر آ رہا تھا کہ وہاں مشکل ہے ہی کچھ بچا ہوگا۔ اچھی بات یہ تھی کہ کمین ٹکا گئے تھے۔ معلوم کرنے پر پتا چلا کہ چھوٹے بچے کی کسی ضرورت کے لیے ہل نے ذرا دیر کو لائٹیں جلائی تھی۔ ڈاکوؤں کی طرف سے اس روشنی پر فائر کیا گیا اور لائٹیں پھٹنے سے آگ بھڑک اٹھی۔ عورت نے شور مچا کر اپنے چھوہر کو جگایا اور وہ لوگ بچوں کو لے کر باہر بھاگے لیکن انہیں اتنی مہلت نہیں ملی کہ جلتی ہوئی جھونپڑی میں سے اپنا اسباب نکال سکیں۔ وہ کوئی لاکھوں کا سامان نہیں تھا لیکن جو بھی تھا ان کی زندگی کی لازمی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے بہت اہم تھا اس لیے وہ اس سے محروم ہونے پر آنسو بہا رہے تھے اور دیگر لوگ ان کو تسلی دینے کی کوشش کر رہے تھے۔

دوسری افسوسناک خبر مراد کے ایک ساتھی کے یارے میں ملی۔ اس لڑکے کی کمر میں بائیں جانب گولی لگی تھی اور اس کی حالت بہت تشویشناک تھی۔ فیضو، مراد کا باپ سجاد اور مزید ایک دو لوگ اس لڑکے کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ مراد کی بھی مرہم پٹی کر دی گئی تھی۔ خون اچھا خاصا بہہ جانے کی وجہ سے مراد کمزوری محسوس کر رہا تھا لیکن

اس کی جان کو بہر حال خطرہ نہیں تھا۔ تشویش اس دوسرے لڑکے کی طرف سے ہی تھی۔ گولی اس کے جسم کے اندر ہی تھی اور بہت گہرائی میں چلی گئی تھی۔ فیضو جو کالی حد تک علاج معالجے میں ماہر تھا، اس کے زخم کو ٹٹول کر دیکھ چکا تھا لیکن اسے گولی نہیں ملی تھی۔ فیضو بہر حال سرجن نہیں تھا اس لیے بے بس ہو گیا تھا۔ اس کی زیادہ توجہ اب اس بات پر تھی کہ لڑکا کم سے کم تکلیف محسوس کرے اور خون کے بہاؤ میں کمی آجائے۔ اسے علاج کے لیے شہر لے جانے پر بھی غور ہو رہا تھا اور اس کے لیے اسٹریچر سا تیار کیا جا رہا تھا لیکن معاذ دیکھ رہا تھا کہ فیضو کے چہرے پر مایوسی کے سائے تھے۔ یقیناً وہ اندازہ لگا چکا تھا کہ لڑکے کے پاس اتنی مہلت نہیں ہے کہ وہ شہر پہنچ سکے۔ اصل میں تمام تر کوشش کے باوجود زخم سے خون کا بہاؤ نہیں رک رہا تھا اور لمحہ لمحہ وہ زندگی سے دور جاتا جا رہا تھا۔ آخر سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی اس کی زندگی کا چراغ بجھ گیا اور اس کی ماں کے بین کلیجا پھاڑنے لگے۔ تھکا ہوا نڈھال معاذ ایک طرف چھوٹی سے سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

مرنے والے کی ماں کے بینوں کے کنارے سے اپنی ماں کی یاد اور بھی شدت سے دلا دی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی امی کی زندگی کا محور و مرکز ان کا گھر اور بچے ہیں اور ان کی اولاد ہونے کی وجہ سے وہ اس سے کچھ زیادہ ہی شدید جڑ رکھتی ہیں، ایسے میں اس کی گمشدگی پر ان کا کیا حال ہو گا۔

☆☆☆

بشری نے شہر رنگ آنکھوں اور بالوں والی سونیا خان کو اسپتال کے اپنے اس کمرے میں دیکھا تو حیران رہ گئی۔ سونیا پہلے بھی ایک بار اس کی عیادت کے لیے آئی تھی لیکن اب موجودہ حالات میں جبکہ اپنا سایہ بھی ساتھ چھوڑنے پر تلا ہوا تھا، ایک معمولی شناسا کی آمد حیران کن تھی۔ لوگ تو عائشہ اور گلزار عاصم کی میت پر بھی بس دنیا داری نبھانے آئے تھے اور اسے انوس کے چند جملے پکڑا کر چلے گئے تھے۔ کسی رشتے دار، پڑوسی، دوست اور آشنا نے یہ نہیں کہا تھا کہ یہ لڑکی جو ماں باپ کے سائے سے محروم ہو چکی ہے اور جس کی اپنی حالت ایسی ہے کہ بستر سے اتر کر اپنی اہم ضروریات بھی پوری نہیں کر سکتی، ہم اس کڑے وقت میں اس کا ساتھ دیں گے۔ اصل میں سب خوف زدہ تھے۔ واقعے کو ڈکیتی کی واردات قرار دیے جانے کے باوجود ہر ایک کو اندازہ تھا کہ یہ اندوہناک حادثہ با اختیار لوگوں سے فکر لینے کا نتیجہ تھا اور کوئی ایسے حالات میں بشری کی مدد کر

بشری نے اپنے اس کمرے میں دو دنوں واقعات کا آپس میں تعلق جوڑنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ عام لوگوں کے علم و پولیس کے لیے کسی کوئی کوشش نہیں کی تھی اور ایسا یقیناً جان بوجھ کر کیا گیا تھا۔ پولیس کی طرف سے اس معاملے میں کچھ جرمانہ غفلت برتی جا رہی تھی۔

ایسے حالات میں وہ سونیا خان کو اسپتال میں اپنے سامنے دیکھ کر حیران نہ ہوتی تو کیا کرتی۔

”کیسی ہو تم بہادر لڑکی؟“ سونیا نے اس کی حیرت کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کے سامنے کرسی پر براجمان ہوتے ہوئے پوچھا۔

”تیزی سے امپروو کر رہی ہوں اور امید ہے کہ جلد اس بستر سے جان چھوٹ جائے گی۔“ بشری نے اسے جواب دیا۔ حقیقتاً وہ پہلے سے زیادہ رفتار سے صحت مند ہو رہی تھی۔

عموماً دیکھا گیا ہے کہ غم انسان کو ڈھا دیتے ہیں اور وہ بالکل ہی ہمت ہار بیٹھتا ہے لیکن بشری کا معاملہ اس کے برعکس تھا۔

وہ دواؤں اور علاج کے دیگر طریقوں سے زیادہ اپنی قوت ارادی کے بل پر ٹھیک ہو رہی تھی اور اب اس نے بستر سے اتر کر خود سے تھوڑا چلنا پھرنا شروع کر دیا تھا۔

”دش گڈ! میں یہی سننا چاہتی تھی۔ تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا وہ بہت افسوسناک ہے لیکن میں یہاں تم سے افسوس کرنے سے زیادہ تمہاری ہمت بڑھانے کے لیے آئی ہوں اور یہی کہنا چاہتی ہوں کہ ہمت سے کام لو کیونکہ اس دنیا میں صرف وہی سرائٹھا کر جی سکتے ہیں جن کے اندر ہمت ہو۔“ بشریٰ کی اس سے پہلے جو دو ملاقاتیں ہوئی تھیں، ان میں اس نے سونیا کا تاثر ایک امیر اور فیشن ایبل عورت سے زیادہ نہیں لیا تھا لیکن آج وہ اسے خاصی مختلف لگی تھی۔

”تھینک یو سوچ میم! آپ کے الفاظ نے میرا حوصلہ بڑھا دیا۔ آپ واحد فرد ہیں جو اس طرح کی بات کہہ رہی ہیں ورنہ میرے جاننے والوں میں سے جو ملتا ہے، وہ مجھے یہی سمجھانے کی کوشش کرتا ہے کہ کیونکہ میں اپنی جراتوں کا انجام دیکھ چکی ہوں اس لیے مجھے سنبھل جانا چاہیے اور خاموشی سے سرجھکا کر جینے کی کوشش کرنی چاہیے۔“

”وہ لوگ ایسی باتیں اس لیے کرتے ہیں کہ یا تو وہ خالوں کے پتھو ہوتے ہیں یا پھر وہ اتنے بزدل ہوتے ہیں کہ ان کے اندر کسی ظلم کے خلاف احتجاج کرنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی۔ میرا تعلق چونکہ ان دونوں قبیل کے لوگوں سے نہیں ہے اس لیے میں تم سے وہی کہہ رہی ہوں جو حق ہے۔“ سونیا نے ایک ادا سے شانے جھٹکتے ہوئے اس کی بات کا جواب دیا۔ بلاشبہ وہ بہت حسین عورت تھی اور اس کی ہر ادا دلکش تھی۔

”مجھے آپ کے خیالات جان کر خوشی ہوئی ورنہ ہمارے ہاں کے لوگ خصوصاً خواتین تو بالکل بھی اس انداز میں نہیں سوچتیں۔“ بشریٰ نے اس کی تعریف کی۔

”میرے خیال میں سوچتی تو ہیں لیکن اپنی سوچ کے مطابق عمل کرنے کے لیے ان کے پاس وسائل اور مواقع نہیں ہوتے۔ اتفاق سے میرے پاس یہ دونوں چیزیں ہیں اس لیے مجھے اظہار میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ بہر حال اس بحث کو جانے دو۔ فی الحال تو میں تمہارے پاس یہ آفر لے کر آئی ہوں کہ اسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد اگر تم چاہو تو میرے گھر میں رہ سکتی ہو۔ وہاں تمہیں تحفظ کا کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔“ اس نے پیشکش کی تو بشریٰ حیران رہ گئی اور حیرت سے بولی۔

”آپ مجھے اپنے گھر میں رہنے کی آفر کر رہی ہیں؟“ بالکل..... اس سلسلے میں، میری داراب سے بھی بات ہو گئی ہے۔ اسے بھی تم سے ہمدردی ہے اور ہم دونوں ہی یہ سمجھتے ہیں کہ اگر اتنے بڑے گھر میں ایک فرد کا اضافہ ہو جائے گا تو اس سے ہمیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ سونیا نے اسے بتایا۔

”تھینک یو سوچ میم! میں آپ کی اس آفر پر غور کروں گی۔“ بشریٰ اپنے بارے میں بہت سے فیصلے پہلے ہی کر چکی تھی لیکن سونیا کی پُر خلوص پیشکش کے جواب میں فوری انکار مناسب نہیں لگا اور اس نے بات بنا دی۔

”جیسی تمہاری مرضی..... میری طرف سے کوئی زبردستی نہیں ہے، البتہ یہ ضرور کہنا چاہتی ہوں کہ اگر تم میری آفر قبول نہ کرو تب بھی مجھ سے کوششیں میں رہنا۔ مجھے تم ہمیشہ اپنی مدد کے لیے تیار یاد آؤ گی اور میرے گھر کے دروازے ہمیشہ تمہارے لیے کھلے رہیں گے۔ تم میری بات سمجھ رہی ہونا..... میں تم سے کہہ رہی ہوں کہ میں ہر طرح کے حالات میں تمہارا ساتھ دوں گی، چاہے بظاہر تم کتنا ہی غلط کام کیوں نہ کر رہی ہو۔“ سونیا خان کا لہجہ بہت خاص تھا اور نظریں یوں بشریٰ کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں جیسے وہ اسے اندر تک پڑھ رہی ہو۔

”کیوں.....؟“ بشریٰ کے لبوں سے بے ساختہ ہی سوال پھسل گیا۔

”معاذ کے لیے۔ معاذ جیسے شاندار لڑکے کو ضائع کر دینے والوں کے لیے معافی کی کوئی گنجائش نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ تمہاری جنگ ان ہی لوگوں سے ہے جو معاذ کی گمشدگی کے ذمے دار ہیں اور میں چاہتی ہوں کہ ان لوگوں کو اپنے کیسے کی سزا ضرور ملے۔“ سونیا کے اتنے صاف جواب نے ایک بار پھر بشریٰ کو حیران کر دیا۔ یہ بات تو پہلی ملاقات میں محسوس ہو گئی تھی کہ سونیا، معاذ میں دلچسپی لے رہی ہے لیکن یہ دلچسپی اتنی گہری ہو گئی، اسے اس کا اندازہ نہیں تھا۔ سونیا ایک شادی شدہ عورت تھی اور ہمارے معاشرے میں شادی شدہ خواتین اپنی وفاداریاں اپنے شوہر سے ہی وابستہ رکھتی ہیں۔

”حیران ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس دنیا میں سب کچھ ممکن ہے۔ میں جانتی ہوں کہ میں داراب کی بیوی ہوں لیکن یہ ایک غیر جذباتی رشتہ ہے۔ کم از کم میری جانب سے ایسا ہی ہے۔ میں نے غربت سے جان چھڑانے کے لیے داراب کا ہاتھ تھامنا تھا اور اب تک اس ساتھ کے بدلے

اسے وہ سب دیتی رہی ہوں جس کی اس نے مجھ سے خواہش کی۔ میں اس سے بے وفائی کا ارادہ بھی نہیں رکھتی لیکن دل کے معاملات میں انسان بے اختیار ہوتا ہے۔ معاذ کو تم میرے دل کی بے اختیاری سمجھ لو۔“ سونیا جیسے اس کی ہر سوچ پڑ رہی تھی اور صاف گوئی سے اسے ہر آن کے سوال کا جواب دیتی جا رہی تھی۔ بشری کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ معاذ کے معاملے میں بے اختیار تو اس کا بھی دل تھا لیکن وہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لیے کچھ نہیں کر سکی تھی، لہذا اس چکر میں اتنا کچھ گنوا دیا تھا۔

”مجھے معاذ کے دوست حنین کے بارے میں بھی اطلاع ملی تھی کہ جس دن تمہارے پیرنس کی ڈیوٹی تھی، اس سے اگلے دن اس کی ایک دن پرانی تشدد شدہ لاش کہیں پڑی ملی تھی۔ مجھے لگتا ہے کہ حنین بھی معاذ والے چکر میں اپنی جان سے گیا ہے۔“ سونیا نے یکدم ہی موضوع گفتگو بدلا اور حنین کا معاملہ بھیر دیا۔ دونوں واقعات کا جو ربط پولیس نے نہیں جوڑا تھا، وہ اس نے آرام سے جوڑ لیا تھا۔

”مجھے معلوم ہے کہ میں تمہارے لیے ایک آؤٹ سائڈر جیسی حیثیت رکھتی ہوں اور تم اتنی آسانی سے مجھ پر اعتبار نہیں کر سکتیں لیکن میں پھر بھی تم جیسے یہ کہوں گی کہ مجھ پر اعتبار کر کے تم نقصان میں نہیں رہو گی۔ تم نے اب تک بھی اتنا نقصان اس لیے اٹھایا ہے کہ تمہارے پاس وسائل اور تجربے کی کمی ہے۔ میں اس کی کوپور کر سکتی ہوں لیکن یہ بات وہی ہے کہ تم مجھ پر اعتبار کرو۔“ حنین کے معاملے میں اس کے اندازے کی تصدیق کرنے کے سلسلے میں بشری تذبذب کا شکار ہوئی تو اس نے مزید کہا اور اس پل بشری کو عالم شاہ یاد آیا۔ وہ بھی وسائل والا بندہ تھا اور اسی نے انہیں سلطان کو اغوا کر کے اس سے معاذ کے سلسلے میں معلومات حاصل کرنے کی تجویز دی تھی لیکن سب الٹا ہو گیا تھا۔ وہ سلطان کا تو کچھ نہیں بگاڑ پائے تھے، لہذا انہیں ہی ناقابل حلافی نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ اس پر تم یہ تھا کہ اس دن کے بعد عالم شاہ بھی منظر سے غائب تھا۔ حواس بحال ہونے کے بعد اس نے بعد میں اپنا موبائل چیک کیا تھا تو اسے علم ہو گیا تھا کہ اس روز صبح عالم شاہ نے کئی بار اسے کال کی تھی لیکن وہ بے ہوش ہونے کی وجہ سے اس کی کوئی کال ریسیو نہیں کر سکی تھی۔ بعد میں اس نے کئی بار عالم شاہ کے نمبر پر رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن ہر بار اس کا موبائل بند ملا۔ گوشی کے لینڈ لائن نمبر پر رابطہ کرنے پر صرف اتنا معلوم ہوا کہ وہ اپنے والد کے ساتھ گاؤں گیا ہوا ہے۔ گاؤں کا رابطہ نمبر دینے

سے ملازم نے یہ کہہ کر معذرت کر لی تھی کہ انہیں ایسے اجازت کسی کو نمبر دینے کی اجازت نہیں ہے۔ بشری اتنی نا سمجھ نہیں تھی کہ اندازہ نہ لگا سکے کہ عالم شاہ کو اس سارے سلسلے سے الگ کر لیا گیا ہے۔ عالم شاہ کے والد ایک جاگیردار اور سیاست دان تھے، انہوں نے دیکھا ہوگا کہ بیٹا جذبات میں آکر پرانی آگ میں ہاتھ ڈال رہا ہے تو انہوں نے کسی بھی ترکیب سے اسے روک لیا ہوگا لیکن یہ سونیا خان عجیب عورت تھی کہ خود جان بوجھ کر اس پرانی آگ میں کودنے کے لیے تیار تھی..... وہ بھی اس لیے کہ ایک لڑکا جس سے اس کی کل دو ملاقاتیں ہوئی تھیں، اسے اچھا لگا تھا۔ وہ اپنے شوہر سے وفادار رہنے کی دعوے دار بھی تھی، ایسی صورت میں بشری کے لیے مشکل تھا کہ ایک دم سے اس پر بھروسہ کر لیتی۔

”اب میں چلتی ہوں۔ دوبارہ کسی دن چکر لگاؤں گی۔ تمہارے پاس میرا موبائل نمبر تو موجود ہے ہی، تم جب چاہو اور ضرورت محسوس کرو تو مجھے کال کر سکتی ہو۔ میں تمہارے اسپتال کے اب تک کے ڈیویڈ کلیر کروا چکی ہوں اور آئندہ کے لیے بھی میں نے ہدایت کر دی ہے کہ جب تم اسپتال سے ریلیز ہو تو بل مجھے بھجوا دیا جائے۔“ سونیا نے اس سے اپنی کسی بھی بات کے فوری جواب کے لیے اصرار نہیں کیا اور رخصت ہونے کے لیے کھڑی ہوتے ہوئے بولی۔

”آپ کو ڈیویڈ پے کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں فوراً کر سکتی ہوں۔“ اس کی دی اطلاع پر بشری نے فوراً احتجاج کیا۔

”مجھے معلوم ہے کہ تم فوراً کر سکتی ہو لیکن مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ آگے میں بہت رقم کی ضرورت پڑنے والی ہے اس لیے جو کچھ تمہارے پاس ہے، اسے محفوظ رکھنے دو۔ میری بات الگ ہے۔ اللہ نے مجھے ضرورت سے زیادہ ہی نواز رکھا ہے اور اتنے بہت میں سے ڈیڑھ دو لاکھ کی رقم نکالنا بھرے برتن میں سے پانی کی ایک بوند نکالنے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ تم میرے اس عمل کو اپنے اوپر کوئی احسان بھی نہیں سمجھنا کیونکہ اصل میں یہ مجھ پر تمہارا احسان ہوگا کہ تم میرے اس تحفے کو قبول کر لو۔ تم معاذ کی اچھی دوست ہو اور میں اپنے آپ کو یہ اطمینان دلانا چاہتی ہوں کہ میں معاذ کے لیے کچھ نہیں کر سکتی لیکن اس کی دوست کے لیے وہ کچھ کر رہی ہوں جو میرے اختیار میں ہے۔“ اس نے کہا اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ دروازہ کھلنے اور بند ہونے کے مختصر وقفے میں بشری نے دیکھ لیا تھا کہ باہر اس

والوں نے مل کر مجید کی جلی ہوئی جھونپڑی کی جگہ دوسری جھونپڑی کی تعمیر بھی شروع کر دی تھی۔ فی الحال اس کے بیوی بچے سجاد کی جھونپڑی میں ٹھہرے ہوئے تھے اور وہ خود ڈیرے والوں کے ساتھ مل کر اپنی جھونپڑی کی تعمیر میں مدد دے رہا تھا۔ مجموعی طور پر ڈیرے کی فضا عم آلودھی اور اس غم زدہ ماحول میں مراد، لیلیٰ کے لگائے باغیچے کے پاس اس کے ساتھ بیٹھا اسے رات کے واقعات سے آگاہ کر رہا تھا۔ وہ باہمت لڑکا تھا اور یہ اس کی جرأت مندی ہی تھی کہ اس نے ڈاکوؤں کے پہرے کے باوجود اپنے ساتھیوں کے ساتھ بستی والوں کی خاطر یہاں سے نکلنے کی منصوبہ بندی کی تھی۔ اس منصوبہ بندی کے وقت یقیناً ان کے ذہنوں میں یہ بات بھی ہوگی کہ ان کی جان جاسکتی ہے لیکن اپنے ایک ساتھی کی موت نے مراد کو بہت رنجیدہ کر دیا تھا۔

”ہمت سے کام لو مراد! تم ایک بہادر لڑکے ہو اور تمہارا دوست بھی ایک بہادر لڑکا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اس کی یہ قربانی رائگاں نہیں جائے گی اور تم لوگوں کے لیے حالات بہتر ہو جائیں گے۔ جو چلا گیا اس کے لیے اب کچھ نہیں کیا جاسکتا لیکن تم ایک دوسرا کام کر سکتے ہو۔ تم اپنے دوست کے ماں باپ کا خیال رکھا کرو، اس سے تمہارے دل کو بھی سکون ملے گا اور ان کا غم بھی ہلکا ہوگا۔ اولاد کا بدلہ تو کوئی نہیں ہو سکتا لیکن انہیں پر مرہم رکھنے کی ایک کوشش تو کی جاسکتی ہے۔“ وہ مراد کو نصیحت کر رہا تھا اور وہ اتنی توجہ سے اس کی بات سن رہا تھا کہ اسے یقین تھا کہ وہ اس کی نصیحت پر ضرور عمل کرے گا۔

”تم لوگ ادھر بیٹھے ہو؟ میں سارے میں تمہیں ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔“ اچانک ہی لیلیٰ وہاں آگئی اور ان دونوں کو وہاں بیٹھا دیکھ کر بولی۔

”کیوں کوئی کام تھا کیا؟“ مراد نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ لیلیٰ کو چھیڑتا، کوئی شرارتی فقرہ ایسا بولتا کہ وہ سچ پا ہو جاتی لیکن ابھی وہ بہت بچھا ہوا اور اس تھا۔

”سجاد چاچا تیرے لیے پریشان ہو رہا ہے۔ تو پرسوں رات کا سویا ہوا ہے اور زخمی بھی ہے لیکن آرام کرنے کے بجائے ادھر ادھر گھوم رہا ہے تو ان کو پریشان تو ہونا ہے۔“ لیلیٰ کے لہجے میں ہمدردی تھی۔

”میرے دل کو چین ہی نہیں ہے تو آرام کیسے کروں گا۔ بدر کا چہرہ مسلسل میری نظروں کے سامنے گھوم رہا ہے۔“ مراد نے اپنی مجبوری بیان کی۔

”دل کو چین آتے آتے ہی آئے گا۔ غم کتنا ہی بڑا ہو،

کا خاص باڈی گارڈ موجود ہے۔ اس کا یہ زبردست سا باڈی گارڈ اس بات کو جتانے کے لیے کافی تھا کہ وہ خاصی اونچی حیثیت کی عورت ہے۔ بشریٰ نے بے ساختہ ہی ایک گہری سانس لی تو اس کے منتھوں نے اس خوشبو کو محسوس کیا جو سویا خان اپنے پیچھے چھوڑ گئی تھی۔ آج کی اس ملاقات میں بھی وہ پوری نیک سگ سے تیار تھی اور کہیں سے نہیں لگ رہا تھا کہ وہ افسردہ و غم زدہ ہے اور اپنے دعوے کے مطابق جس شخص کے معاملے میں اس کا دل بے اختیار ہے، اس کے لیے اسے کوئی پریشانی لاحق ہے۔ شاید اس ”تیاری“ کا حلق دار اب خان کی ”وفاداری“ سے تھا۔

☆☆☆

”میں اور میرے دوست روانہ ہونے کے لیے بالکل تیار تھے۔ ہم نے سارا ضروری سامان اور اسلحہ ساتھ لے لیا تھا اور نکلنے ہی والے تھے کہ وہ پہلا فائر ہوا جس نے بھاؤ مجید کی جھونپڑی میں آگ بھڑکا دی۔ جواب میں یہاں سے بھی کسی نے فائر کیا۔ اس وقت ہم نہیں جانتے تھے کہ ہماری طرف سے فائر کرنے والا کون ہے لیکن یہ بات سمجھ گئے تھے کہ ڈیرے پر حملہ ہو گیا ہے۔ اسلحہ ہلکا ہوتا ہی تھا اس لیے ہم نے بھی پوزیشن سنبھال لی۔ ڈاکوؤں کے ہاتھ ہم سے زیادہ اچھے ہتھیار ہوں گے لیکن انہیں اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ ہماری طرف سے انہیں فوری جواب ملے گا۔ ان کے ہاتھ ایلے میں ہم نسبتاً پلندی پر ہونے کی وجہ سے بھی بہتر پوزیشن میں تھے اس لیے ان کا حملہ کامیابی سے جھیل گئے۔ اصل کامیابی لیلیٰ کی وجہ سے حاصل ہوئی۔ وہ بڑی ضدی اور تیز لڑکی ہے۔ میں نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا اس کے باوجود اس نے ہمارے پروگرام کا کھوج لگایا تھا اور ہمارے ساتھ جانے کے ارادے سے ہم سے پہلے ہی آگے جا کر چھپ گئی تھی لیکن معاملہ ہی دوسرا ہو گیا۔ اب معلوم نہیں خمیسو خان کو کیسے پتا چلا کہ لیلیٰ اس چٹان کے پیچھے ہے۔ اس نے خاموشی سے اسے گھیر کر بے ہوش کیا اور ساتھ لے جانے کی کوشش کی۔ اگر آپ اور میں وقت پر نہ پہنچے ہوتے تو حالات بالکل الٹ ہوتے۔ شکر ہے لیلیٰ سچ مچی اور خمیسو کے ہمارے ہاتھ آ جانے سے ہمیں ڈاکوؤں کو قابو میں رکھنے کا موقع مل گیا لیکن بدر میرا پیارا دوست اس لڑائی میں اپنی جان سے چلا گیا۔ سنا ہے تین ڈاکو بھی مرے ہیں لیکن ان کی موت میرے پیارے دوست ن موت کا صدمہ دور نہیں کر سکتی۔“

بولتے ہوئے مراد کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے تھے۔ مرنے والے لڑکے کی تدفین کی جا چکی تھی۔ ڈیرے

کہے کو بھی اچھی طرح سمجھ لے گی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے معاملے میں لیلیٰ بہت آگے تک جائے اور دکھ اٹھائے۔ وہ ان پہاڑوں پر کھلا پھول تھی اور اس کے لیے یہیں کی آب و ہوا موافق تھی۔ کہیں اور کسی اور ماحول میں یہ پھول اپنی خوشبو، رعنائی اور فطری خوب صورتی کھو بیٹھتا اور اسے تو ابھی خود اپنا ہی پتا نہیں تھا۔ ٹوپیہ اور بشری کی مثال اس کے سامنے تھی۔ دونوں لڑکیاں خوب صورتی اور ذہانت میں لا جواب تھیں اور دونوں ہی اس کی طرف مائل تھیں لیکن اس نے عام سی پسندیدگی کے علاوہ اپنے دل میں ان کے لیے کوئی خاص جذبہ محسوس نہیں کیا تھا اور لیلیٰ کے متعلق تو وہ بالکل بھی اس انداز میں نہیں سوچ سکتا تھا۔ وہ اس سے عمر میں بہت چھوٹی اور بالکل مختلف مزاج کی لڑکی تھی۔ اپنی بے شمار صلاحیتوں کے باوجود وہ ایسی نہیں تھی کہ اسے اپنی طرف متوجہ کر پاتی اس لیے پہلے ہی قدم پر اسے روک دینا مناسب تھا۔ لیلیٰ کے متعلق سوچتا ہوا وہ اپنے لیے مخصوص جھونپڑے کے قریب پہنچا تو فیضو سے سامنا ہو گیا۔

”کہاں تھے سائیں؟ میں تم ہی کو دیکھ رہا تھا۔“ اسے دیکھتے ہی فیضو بولا۔

”بس یہیں قریب میں لیلیٰ کے باغیچے کے پاس بیٹھا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

”آپ بالکل ٹھیک سوچ رہے ہیں چاچا جی لیکن آپ اس طرح خمیسو خان کو کب تک اپنے پاس قید رکھ سکتے ہیں۔ زیادہ دن گزر گئے تب بھی اس کے ساتھیوں کی برداشت جواب دے جائے گی اور وہ اپنے سردار کو چھڑانے کے لیے یہاں دھاوا بول دیں گے۔ ایک حل یہ ہو سکتا ہے کہ آپ باقاعدہ معاہدہ کر کے خمیسو خان کو رہا کریں لیکن مجھے یاد ہے کہ معاہدہ کرنے کا بھی زیادہ فائدہ نہیں ہو

آدی کو اس پر کبھی نہ کبھی صبر آ ہی جاتا ہے لیکن دکھی ہونے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اپنے پیاروں کو پریشان کیا جائے۔ چاکھر جا کر تھوڑی دیر آرام کر لے ورنہ تیرے ماں بیو کے دل کو چین نہیں آئے گا۔“ اس بار لیلیٰ کے لہجے میں قدرے رعب تھا۔ معاذ نے بھی مراد کی پیٹھ پر ہتھکی دے کر لیلیٰ کی خاموش تائید کی تو اسے اپنی جگہ سے اٹھنا پڑا اور وہ بادل نا خواستہ وہاں سے روانہ ہو گیا۔

”ہاتھی جیسے بدن میں چڑیا کا دل رکھا ہوا ہے۔ مرد کو اتنا کمزور دل کا نہیں ہونا چاہیے۔“ لیلیٰ نے اس کی ڈھیلی ڈھالی چال دیکھتے ہوئے معاذ کو مخاطب کیے بغیر تبصرہ کیا۔ وہ ابھی بہت کم عمر تھی لیکن اس کی عادت و اطوار دیکھ کر اس پر کسی پختہ کار عورت کا گمان ہونے لگتا تھا۔ فیضو نے اپنی بیوی کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کے باعث لیلیٰ کی پرورش کچھ ایسے ڈھب سے کی تھی کہ وہ اپنی عمر سے بہت آگے نکل گئی تھی اور اس کے اندر سے وہ نرمی و نزاکت نکل گئی تھی جو اس کی عمر کی لڑکیوں کا خاصہ ہوتی ہے۔ مزاج کی یہ سختی اسے مراد کی محبت سے نکلی جا رہی تھی۔

”تم مراد کے لیے غلط الفاظ کا استعمال کر رہی ہو۔ وہ کمزور دل کا نہیں حساس اور نرم دل کا مالک ہے اور یہ خصوصیات کسی کی خامی نہیں، خوبی ہوتی ہیں۔ کمزور دل کا مالک ہوتا تو یوں اپنے دوستوں کے ساتھ خطرہ میں لے کر ڈیرے سے باہر جانے کا منصوبہ نہ بناتا اور یوں ڈاکوؤں کا مقابلہ نہ کرتا۔ یہ اس کی بہادری اور پھرتی ہی تھی کہ تم ڈاکوؤں کے قبضے میں جانے سے بچ سکیں ورنہ اس وقت صورت حال بہت مختلف ہوتی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ وہ کتنی بے جگری سے گولیوں کی بوچھاڑ میں تمہیں بچانے کے لیے اس چٹان کی طرف لپکا تھا جہاں تم خمیسو خان کے زرنے میں پھنس گئی تھیں۔ مراد کی یہ حرکت اس کی بہادری کے علاوہ تم سے بے حد محبت کی بھی نشانی ہے۔ ایسا شخص جو آپ کے لیے اپنی جان تک کی پروا نہ کرے، بہت قیمتی ہوتا ہے لیلیٰ! ایسے شخص کی ناقدری کرنے والے بے وقوف ہوتے ہیں۔ تم مراد کے ظاہر پر نہیں اس کے دل پر توجہ دیا کرو، وہ بے حد محبت کرنے والے دل کا مالک ہے۔“ معاذ نے اس کا تبصرہ سنا تو بے حد نرم لہجے میں اسے سمجھانے لگا۔ لیلیٰ ہونٹ کاٹتی ہوئی خاموشی سے اس کی بات سنتی رہی۔ معاذ نے بھی مزید کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا اور دھیرے سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر وہاں سے ہٹ گیا۔ لیلیٰ سمجھدار لڑکی تھی اور اسے امید تھی کہ وہ اس کے تھوڑے

”ٹھیک ہے، تم آرام کرو۔ تھوڑی دیر میں کھانا آجائے گا، تم کھا کر سو جانا۔“ فیضو نے یہ بات خمیسو خان کی آنکھوں میں جھانک کر کہی تھی اور اس نے کسی رو بوٹ کی طرح اس ہدایت پر عمل کیا تھا۔

”یہ سب کیا ہے فیضو چاچا؟“ فیضو، معاذ کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے باہر لایا تو اس نے حیرت سے اس کا یا پلٹ کے بارے میں دریافت کیا۔ ادھر ادھر سے چلتے پھرتے اس نے خمیسو خان کے متعلق جو باتیں سنی تھیں، ان کے مطابق تو وہ بڑا خونخوار اور سفاک آدمی تھا جس سے رحم دلی کی امید نہیں رکھی جاسکتی تھی۔ اچھی خاصی بچی عمر کا آدمی ہو کر اس نے جس طرح لیلیٰ جیسی کم سن لڑکی پر نظر رکھی ہوئی تھی، اس سے بھی اس کا کردار واضح ہو جاتا تھا۔

”کچھ نہیں ہے پٹ! میں نے بس کھیل ہی کھیل میں اسے تھوڑا سا سبق پڑھایا ہوا ہے اور اس نے میرا پڑھایا سبق یاد کر لیا ہے۔“ فیضو اس کی حیرت پر ہنس دیا۔

”آپ کچھ چھپا رہے ہیں چاچا جی!“ معاذ نے مشکوک نظروں سے اسے گھورا۔

”چھپانا ہوتا تو مجھے یہ سب دکھانا ہی نہیں پٹ! پوری زندگی میں ایک تو ہی تو ملتا ہے جسے یہ سب بتانے اور سکھانے کو دیا جاتا ہے۔“ فیضو نے اسے جواب دیا اور مزید وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

”کل رات مجھے تاروں سے کھیلنا سکھایا تھا، بس سا کھیل اسی کھیل کا ہے۔ میں برسوں سے یہ کھیل کھیل رہا ہوں۔ میری نظر اس روٹھی کے ساتھ سفر کرنا اور اسے اپنے اندر اتارنا اچھی طرح جانتی ہیں۔ اپنے اندر بھری اس روشنی کی طاقت سے میں کسی بھی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کے دماغ کو اپنے قابو میں کر سکتا ہوں۔ آدمی زیادہ مضبوط دماغ کا ہو تو اسے تھوڑا سا نشہ دے کر اس کا دماغ قابو کیا جاسکتا ہے۔ خمیسو کے ساتھ مجھے ایسا ہی کرنا پڑا تھا۔ اب اس کا دماغ میرے قابو میں ہے اور وہ وہی کرے گا جو میں اس سے کہوں گا لیکن میرے اس عمل کا اثر صرف ایک ہفتہ دس دن تک ہی اس کے دماغ پر رہ سکتا ہے اس لیے میں نے اسے پابند کر دیا ہے کہ وہ ہر ہفتے لازماً مجھ سے ملے یہاں آئے گا۔“ فیضو اسے بتا رہا تھا اور حیرت سے سنتے ہوئے اس کے ذہن میں ایک لفظ ابھر رہا تھا ”پنٹاٹرم.....“

پنٹاٹرم کے بارے میں اسے زیادہ تو نہیں معلوم تھا لیکن اس نے سن رکھا تھا کہ اس علم کے ذریعے دوسروں کے دماغ کو قابو میں کیا جاسکتا ہے۔ پنٹاٹرم جاننے والوں کے بارے

گا۔ جو لوگ اپنے مفاد کے لیے دوسروں کی جان و مال کے دشمن بن جاتے ہیں، وہ کسی معاہدے کی پابندی کیسے کریں گے اور ان سے یہ پابندی کروائے گا کون.....؟“ معاذ نے اپنے اندیشے ظاہر کیے۔

”خود خمیسو خان یہ پابندی کروائے گا۔ آؤ میں تمہیں اس سے ملواتا ہوں۔“ فیضو نے اسے جواب دیا تو اس کے ہونٹوں پر بہت مبہم اور پراسراری مسکراہٹ تھی۔

معاذ کچھ الجھا ہوا سا اس کے ساتھ چل پڑا۔ فیضو اسے اپنے ساتھ لے کر اس جھوپڑی میں پہنچا جہاں خمیسو خان کو رکھا گیا تھا۔ جھوپڑی کے اندر داخل ہو کر معاذ کو حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ خمیسو ایک چار پائی پر آرام سے لیٹا ہوا چھت کو گھور رہا تھا۔ معاذ کے حساب سے اتنے خطرناک ڈاکو کو تو ہاتھ پیر باندھ کر بہت سخت پہرے میں رکھنا چاہیے تھا لیکن خمیسو وہاں ایسے مزے سے لیٹا ہوا تھا جیسے قیدی نہیں مہمان ہو۔ ان کی جھوپڑی میں آمد کو محسوس کر کے وہ اٹھ بیٹھا۔

”کیسے ہو خمیسو خان! کوئی الجھن تو نہیں ہے؟“ فیضو نے اس سے دریافت کیا۔

”بہت مزے میں ہوں فیضو چاچا! لیکن آرام تو پہلے کبھی نہیں ملا۔“ خمیسو نے نہایت احترام سے اسے جواب دیا۔ دیکھنے میں وہ خود چالیس سال سے اوپر کا لگتا لیکن فیضو سے ایسے مخاطب تھا جیسے خود کو کوئی نو عمر لڑکا ہو۔ اس کے اس انداز گفتگو سے بھی زیادہ معاذ کو اس کی فرمانبرداری پر حیرت تھی۔ اسے تو کسی پھرے ہوئے سانڈ کی طرح ہونا چاہیے تھا جو یوں قید کیے جانے پر سخت طیش کا اظہار کرتا لیکن وہ جس رویے کا مظاہرہ کر رہا تھا، وہ غیر فطری سا تھا۔ ایک نامی گرامی ڈاکو اور ایسی فرمانبرداری.....

”تمہارے ڈیرے سے ایک آدمی تمہارا پوچھنے آیا تھا کہ تم کب تک واپس آ رہے ہو۔ میں نے کل صبح کا وقت دے دیا۔ ادھر سے تمہارے تین چار خاص بندے آئیں گے اور ان کے سامنے معاہدہ ہوگا کہ نہ تو آئندہ وہ ہمارے لوگوں کا راستہ روکیں گے اور نہ ہی ہمارے ڈیرے کی کسی عورت، بیٹی پر نظر رکھیں گے۔“ فیضو نے اسے بتایا۔

”اس کی ضرورت نہیں تھی فیضو چاچا! میں نے تم سے وعدہ کر لیا تھا تو سمجھو کہ میرا ہر آدمی اس کا پابند ہے۔“

”مجھے معلوم ہے خمیسو خان لیکن چار لوگوں میں بھی بات ہو جائے تو ٹھیک رہتا ہے۔“

”جیسی تمہاری مرضی فیضو چاچا!“ خمیسو خان کی فرمانبرداری عروج پر تھی۔

میں اس نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ ارتکا زوچہ کے لیے یہ لوگ شمع بینی کی مشق کرتے ہیں۔ اسے فوراً ہی فیضو کا رات کو خود پر کروایا تجربہ یاد آیا۔ اس نے مروجہ طریقے سے ہٹ کر شمع بینی کے بجائے نجم بینی کی مشق کر دئی تھی اور واقعی اسے لگا تھا کہ اس کے اندر روشنیاں بھر گئی ہوں۔ اس کی سوچوں سے بے نیاز فیضو اپنی کہے جا رہا تھا اور اسے بتا رہا تھا۔

”مجھے یہ علم میرے چو نے سکھایا تھا۔ گرمیوں کی راتوں میں جب ہم کھلے آسمان تلے لیٹے ہوتے تھے تو وہ مجھے یہ سب سکھاتا تھا لیکن میرا چو بہت جلدی مر گیا تھا اور اس کے بعد میں فطرت کو اپنا استاد بنا کر سیکھتا رہا تھا۔ تاروں کے بعد میں نے چاند اور تھوڑی بہت سورج پر بھی یہ مشق کی لیکن سورج پر تجربہ ناکام رہا۔ ایک تو سورج کی بے تحاشا روشنی کو سہنا آسان نہیں، دوسرے اس مشق کے لیے اندھیرا ضروری ہے۔ آس پاس کی روشنی اس روشنی سے توجہ ہٹا دیتی ہے جس پر بندہ نظر گاڑ کر بیٹھا ہوتا ہے۔ چاند سے خالی آسمان پر اندھیری راتوں میں ستاروں پر یہ مشق سب سے زیادہ کامیاب رہی اور میں چاہتا ہوں کہ تم بھی یہ علم سیکھو۔ میں اپنے بارے میں زیادہ بڑے دعوے نہیں کرتا پٹ، پر ساری عمر میں جو کچھ سیکھا ہے اس کے حساب سے میں نے تجھے پہچاننے میں غلطی نہیں کی ہے۔ تو ان لوگوں میں سے ہے جنہیں سونہر ارب آپ ہی بہت کچھ نواز کر بھیجتا ہے۔ تجھے پہلا تجربہ کروا کر میں اپنے اندازے کی سچائی بھی پرکھ چکا ہوں۔ تو پہلی بار میں ہی بہت آگے چلا گیا تھا۔ مجھے یاد ہے جب میرا چو شروع شروع میں مجھے سکھاتا تھا تو میرے پلے کچھ نہیں پڑتا تھا۔ میں ایک سے دوسرے ستارے کی طرف بھاگتا رہتا تھا۔ ایک ستارے پر نظر جمانا سیکھا تو اس کی روشنی دنوں اپنے اندر اتارنا نہ آئی، بس یوں سمجھ لے کہ چوٹی کی طرح رینگتے رینگتے میں یہاں تک پہنچا ہوں کہ آج ضیو خان جیسے بندے کا دماغ بھی اپنے قبضے میں کر لیا ہے، پر مجھے یقین ہے کہ تو اس میدان میں گھوڑے کی طرح سرپٹ بھاگے گا۔ میں تجھے یہ سب اس لیے سکھانا چاہتا ہوں کہ ایک تو تجھ میں سیکھنے کی بہت زیادہ صلاحیت ہے، دوسرے تیرے اندر ایک روح ہے۔ یہ دو چیزیں ایک ساتھ ہوں تب ہی کسی علم کا حق ادا ہو سکتا ہے۔ خاص طور پر آدمی کی روح کا نیک ہونا بڑا ضروری ہے۔ ذہن تو کوئی بھی ہو سکتا ہے لیکن ذہن آدمی کی روح نیک نہ ہو تو دنیا میں اس کا علم تباہی اور بربادی لے کر آتا ہے۔ تجھ پر مجھے بھروسہ ہے کہ تو میرے سکھائے ہوئے علم کو اللہ سائیں کی مخلوق کی

بھلائی کے لیے استعمال کرے گا۔“ اپنی بات کے اختتام پر فیضو نے اسے بڑی پُر اعتماد نظروں سے دیکھا جیسے اسے اپنے کہے ہر الفاظ پر بھروسہ ہو۔

”میں آپ کے اس یقین کو قائم رکھنا چاہتا ہوں چا چاجی! آپ سے یہ علم سیکھنا میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے لیکن مجھے اپنے گھر والوں، خصوصاً ماں کی بہت فکر ہے۔ اب جبکہ میری صحت بھی ٹھیک ہے اور ڈاکوؤں کے ساتھ آپ لوگوں کا جھگڑا بھی ختم ہونے کو ہے تو میرا یہاں مزید ٹھہرنا مناسب نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ ہرگز رنے والا دن میری ماں پر کتنا بھاری ہوتا ہوگا۔ ان کی اور اپنے گھر کے دوسرے افراد کی تکلیف کا خیال مجھے یہاں ٹھہرنے اور کچھ سیکھنے نہیں دے گا۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ ابھی آپ مجھے اجازت دے دیں۔ زندگی نے پھر بھی مہلت دی تو میں دوبارہ آپ کے پاس یہ علم سیکھنے آ جاؤں گا۔“ معاذ نے نہایت عاجزی سے درخواست کی۔ اس کے کہے ہر لفظ میں سچائی تھی۔ وہ سچ مچ فیضو سے یہ علم سیکھنا چاہتا تھا لیکن ماں باپ اور بھائی بہن کی پریشانی کے خیال سے یہاں رکنے میں ہچکچاہٹ کا شکار تھا۔

”زندگی کا کچھ پتا نہیں پٹ! یہ بڑی بے وفا چیز ہے اور کبھی بھی ساتھ چھوڑ جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے تو دوبارہ یہاں آئے تو میں ہی موجود نہ ہوں پر تیری فکر بھی غلط نہیں ہے اور اچھی بات ہے کہ تجھے اپنی ماں کی بے چینی اور تکلیف کا احساس ہے۔ مجھے بھی معلوم تھا کہ تو ٹھیک ہونے کے بعد زیادہ دن ادھر رکنے والا نہیں ہے لیکن تیری حالت بھی تو ایسی نہیں تھی کہ میں تجھ پر پہلے یہ بوجھ ڈال پاتا۔ سر کا گہرا گھاؤ سب سے بڑی رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ تیری جگہ کوئی عام چھوکر ہوتا تو اس کے گھاؤ بھی اتنی جلدی نہیں بھرتے، پر میں نے تجھ سے کہا نا کہ تجھ میں کچھ خاص بات ہے۔“ فیضو خود کلامی کے انداز میں اس سے بات کر رہا تھا۔ یہ سن کر معاذ ہنس دیا اور بولا۔

”آپ کیوں مجھے اتنا خاص بنانے پر تلے ہوئے ہیں چا چاجی..... میں بس عام سا انسان ہوں۔ ہو سکتا ہے مجھ میں تھوڑی بہت صلاحیتیں دوسروں سے زیادہ ہوں لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ میں کوئی سپر ہیرو ہوں۔“

”سپر ہیرو کیا ہوتا ہے یہ تو مجھے خبر نہیں ہے پٹ اور نہ میں تجھ سے کسی بحث میں پڑنا چاہتا ہوں، ہاں میری تجھ سے اتنی درخواست ضرور ہے کہ تو صرف دو تین دن اور ٹھہر جا۔ ان دو تین دنوں میں، میں تجھ کو اتنی باتیں تو سکھایا دوں گا

کے چار جز تھوڑے زیادہ تھے اور شہرت بھی کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ بشری نے جان بوجھ کر اس ہاسٹل کا انتخاب کیا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اس طرح کے ہاسٹلز میں نظم و ضبط کی اتنی پابندی نہیں کی جاتی اور وہاں رہنے والی خواتین کو اپنی آمدورفت کے سلسلے میں کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہونا پڑتا۔ آج کل اس کے ذہن میں جو خیالات اور منصوبے پل رہے تھے، ان کی روشنی میں اسے ایسی ہی رہائش گاہ کی ضرورت تھی۔ ہونے کو یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ کوئی چھوٹا سا فلیٹ کرائے پر لے کر وہاں رہنے لگتی لیکن اسے معلوم تھا کہ اکیلی رہنے والی لڑکی کے معمولات پر آس پاس رہنے والے ذرا زیادہ ہی نظر رکھتے ہیں۔ حفاظتی نقطہ نظر سے بھی ہاسٹل ہی زیادہ مناسب تھا اور وہ خود کو یہاں محفوظ محسوس کر رہی تھی۔ کل وہ سونیا خان کے ساتھ یہاں آئی تھی۔ سونیا کو معلوم تھا کہ اسے کب ہاسٹل سے ڈسچارج کیا جا رہا ہے اس لیے وہ اپنی گاڑی لے کر آگئی تھی۔ بشری نے ہاسٹل میں رہائش کے لیے آن لائن کمرہ حاصل کیا تھا اور اسپتال سے سیدھی وہاں پہنچی تھی۔ ہاسٹل کے معاملے میں اس کے انتخاب پر سونیا خان نے اسے گہری نظروں سے دیکھا ضرور تھا لیکن کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا اور اسے ہاسٹل چھوڑ کر رخصت ہوتے وقت ایک بار پھر اپنی پیشکش دہرائی تھی کہ وہ جب چاہے اس کے گھر میں منتقل ہو جائے اور کسی بھی ضرورت کے لیے بلا تکلف اسے بلا سکتی ہے۔ بشری نے سونیا خان کے سامنے زیادہ واضح لائحہ عمل پیش کیا کہ وہ طے کر چکی تھی کہ اسے مجرموں کو معاف نہیں کرنا ہے۔ یہ طے کرنے کے لیے اسے جسمانی طور پر مکمل فٹ ہونا بہت ضروری تھا اس لیے اس نے اس طرف توجہ دینے کا فیصلہ کرتے ہوئے ایک ایک مسئلہ طے کر لیا تھا۔ صبح صبح جاگنگ کے لیے جانا اس سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ وہ ہاسٹل کے قریب ہی واقع ایک چمک پارک تک جانے کا ارادہ لے کر نکلتی تھی کہ میڈم نازلی کی ”گڈ مارنگ“ نے اسے رکنے پر مجبور کر دیا۔

”جاگنگ کے لیے جارہی ہو۔ یہ تو بہت اچھی عادت ہے۔ لڑکیوں کو اپنی اسمارٹنس کا خیال رکھنا چاہیے“ اس کے جاگنگ سوٹ کو دیکھ کر انہوں نے تبصرہ کیا۔ یہ سوٹ اور ضرورت کی چند چیزیں اس کے کہنے پر راحیلہ اس کے لیے خرید کر لائی تھی۔ اپنے والدین کی طرف سے بشری سے زیادہ میل ملاپ پر پابندی عائد کیے جانے کے باوجود وہ حق دوستی نبھانے کے لیے بھی بھی اسپتال کا چکر لگاتی تھی جبکہ فون پر تو پابندی سے اس کی خیریت معلوم کرتی رہتی تھی۔

کہ تو داپس جا کر اکیلے بھی مشق کرے گا تو کچھ نہ کچھ پانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ دیکھ اب انکار نہ کرنا پٹ! مجھے لگتا ہے کہ یہ موقع دوبارہ ملنے والا نہیں ہے اور مجھ پر علم کو اپنے سینے سے دوسرے سینے میں اتارنے کا بوجھ ہے۔ ہر علم کا حق ہوتا ہے کہ اسے دوسروں تک بھی پہنچایا جائے لیکن ہر علم ایسا نہیں ہوتا کہ اسے کسی کو بھی سکھا دیا جائے۔ خاص علم سکھنے کے حق دار وہی لوگ ہوتے ہیں جو اہل بھی ہوں اور مجھے اب جا کر ایک ایسا شخص ملا ہے جو اہل بھی ہے اور حق دار بھی..... تو میں بڑا بے چین ہو گیا ہوں اپنا قرض اتارنے کے لیے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں میں یہ قرض اتارے بغیر خود قبر میں نہ اتر جاؤں۔“ فیضو جس انکساری سے درخواست کر رہا تھا، اس پر معاذ کا دل تڑپ گیا۔ وہ شخص اس سے کچھ لینا نہیں بلکہ اسے کچھ دینا چاہتا تھا اور اس سے یوں درخواست کر رہا تھا جیسے وہ حاجت مند ہو۔ ایک ایسا شخص جو علم والا بھی تھا اور اس کا محسن بھی، اس طرح حاجت سے پیش آئے، یہ معاذ سے برداشت نہ ہو سکتا اور وہ فیضو کے دونوں ہاتھ تھام کر بولا۔

”مجھے اتنا بھی شرمندہ نہ کریں چاچا جی! آپ کے علم پر میں دو تین دن اور یہاں رک جاتا ہوں۔ میرا بھائی ہے کہ ان تین دنوں میں ایک اچھے شاگرد کی طرح آپ سے بات مانوں گا اور جو کچھ آپ سکھائیں گے، اسے جی جان سے سیکھنے کی کوشش کروں گا بلکہ ہو سکا تو اپنے گھر واپس پہنچنے کے بعد جب بھی موقع ملا اپنی امی کی اجازت سے بہت سارے دنوں کے لیے آپ کے پاس آ کر رک جاؤں گا۔“ اس کے الفاظ فیضو کے چہرے پر خوشی کے رنگ بکھیر رہے تھے اور وہ یہ رنگ دیکھ کر اپنے دل میں عجیب سی خوشی محسوس کر رہا تھا۔

☆☆☆

”گڈ مارنگ۔“ جاگنگ سوٹ میں ملبوس وہ سیزھیان اتر کر نیچے آئی تو استقبال پر بیٹھی میڈم نازلی نے اسے دیکھ کر کہا۔ میڈم نازلی پچاس سال کے قریب ایک خوش شکل اور پست قامت عورت تھی جس نے چھوٹی سی چست فیص کے ساتھ اس سے بھی زیادہ چست پاجامہ پہن رکھا تھا اور اس کا قرب جسم اتنی چستی پر جاوے سے باہر ہوا جا رہا تھا۔ اتنی صبح صبح بھی وہ فل میک اپ میں تھی اور مسکارے اور آئی لائنر سے بھی اپنی آنکھیں بشری کے چہرے پر جمائے گویا اس کا ایکسرے کر رہی تھی۔ بشری رات ہی اس ویمن ہاسٹل میں شفٹ ہوئی تھی۔ شہر کے اچھے علاقے میں واقع اس ہاسٹل

”خوب صورت تو آپ بھی بہت ہیں پھر اپنی اسمارٹنس کا خیال رکھنا کیوں چھوڑ دیا؟“

میڈم نازلی کے تبصرے پر اس نے جوابی تبصرہ مع سوال داغ دیا جسے سن کر پہلے تو میڈم نے قہقہہ لگایا پھر بولی۔

”اب میری گاڑی بہت آگے نکل چکی ہے۔ عمر کی اس منزل پر اسمارٹ رہنے پر بھی عورت کسی کے لیے زیادہ قابل توجہ نہیں رہتی۔ ویسے بھی اگر میں اسمارٹ رہنے کے چکر میں تمہاری طرح صبح صبح جاگنگ کے لیے نکل جاؤں گی تو اس ہاسٹل میں رہنے والی پیاری پیاری لڑکیوں کا خیال کون رکھے گا۔ میں یہاں رہنے والی خواتین کی ضروریات کا خیال رکھتی ہوں تو بدلے میں میری زندگی بھی خوش حال گزر رہی ہے۔ تمہیں بھی اگر کبھی میری کسی خدمت کی ضرورت پڑے تو بلا تکلف کہہ دینا۔“ اپنی بات کے اختتام پر میڈم نازلی نے معنی خیز انداز میں آنکھ ماری تو بشری سمجھ گئی کہ خدمت سے ان کی کیا مراد ہے۔ وہ جس جگہ موجود تھی، وہاں اس قسم کی پیشکش زیادہ عجیب خیز نہیں تھی۔ اس لیے ذرا سا مسکرائی اور بولی۔

”میں آپ کی اس آنکھ پر ہاتھ رکھوں گی۔ فی الحال مجھے اجازت دیجیے، میں لیٹ ہو رہی ہوں۔ واپس آ کر مجھے یونیورسٹی بھی جانا ہے۔“

”او کے ڈارلنگ! دس یو بیسٹ آف!“ میڈم نازلی نے ایک ادا سے ہاتھ ہلا کر اسے رخصت کر دیا۔

اس کے بعد اس کا سارا دن بہت مصروف یونیورسٹی میں اس کے کلاس فیلوز اور جاننے والے اس کے والدین کی موت پر تعزیت کرتے رہے۔ راحیلہ سمیت کچھ نے جانا چاہا کہ اب وہ کہاں رہ رہی ہے۔ اس نے انہیں اپنی ہاسٹل میں رہائش کے متعلق نہیں بتایا اور کہہ دیا کہ وہ اپنے ایک دور کے عزیز کے گھر رہ رہی ہے اور ان کی درخواست پر اپنا پتا کسی کو بتانے سے قاصر ہے۔ وہ جن حالات سے گزری تھی ان کے بعد اس طرح کی شرط ایسی عجیب بھی نہیں تھی اس لیے کسی نے اس پر اپنا پتا بتانے پر زور بھی نہیں دیا۔ یونیورسٹی میں اس کا کامی اور سلطان سے بھی سامنا ہوا تھا لیکن دونوں فریقین نے ہی ایک دوسرے کو نظر انداز کر دیا۔ یونیورسٹی میں اس نے بہت زیادہ وقت نہیں گزارا تھا۔ وہاں سے نکل کر وہ ایک مارشل آرٹ کلب گئی اور وہاں اپنے داخلے کا انتظام کرنے کے بعد حنین کے گھر کے لیے روانہ ہو گئی۔ فی الحال اس کی گاڑی اس کے پاس نہیں تھی اس لیے وہ پبلک ٹرانسپورٹ ہی استعمال کر رہی

تھی۔ حنین کے گھر اس کے والدین اور بہنوں سے مل کر اس کا دل مزید دکھ سے بھر گیا۔ اپنے ہونہار بیٹے اور بھائی کے اس بے دردی سے قتل کر دیے جانے پر وہ پانچ افراد گویا چلتی پھرتی لاشیں بن چکے تھے۔ حنین کی جدائی کے بے تحاشا دکھ سے گزرتے ہوئے بھی انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ وہ انہیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ انہیں پتا چلا کہ بشری وہ لڑکی ہے جس کے والدین ڈکیتی کی واردات کے دوران بیک وقت ہلاک ہو گئے تھے تو وہ اپنے ساتھ اس کے دکھ پر بھی آنسو بہاتے رہے۔ انہوں نے اس کا شکریہ بھی ادا کیا کہ وہ خود بیماری سے اٹھنے کے باوجود اتنا سفر طے کر کے تعزیت کے لیے ان کے گھر آئی ہے۔ وہ وضع دار لوگ تھے۔ بشری کے انکار کے باوجود انہوں نے دوپہر کا کھانا کھائے بغیر اسے وہاں سے رخصت نہیں ہونے دیا۔

بشری بوجھل دل کے ساتھ وہاں سے رخصت ہو کر اپنے گھر پہنچی۔ وہ گھر جہاں اس نے اپنی زندگی کے کئی ماہ و سال گزارے تھے اور جسے عائشہ نے بڑے سلیقے سے سنبھال کر رکھا ہوا تھا، دھول مٹی میں اٹا بالکل ویران پڑا تھا۔ سامان سے بھرا گھر دو افراد کے نہ ہونے سے بالکل خالی لگ رہا تھا۔ وہ وحشت زدہ سی ایک ایک کمرے میں گھومتی رہی۔ یہ گھر اب سامان سمیت ہی فروخت کیا جانا تھا۔ اس نے عائشہ اور گلزار عاصم کے ملبوسات، دیگر ذاتی استعمال کی اشیاء سمیت ایک جگہ اکٹھے کر کے رکھ دیے تاکہ بعد میں انہیں ضرورت مند کے حوالے کر دیا جائے۔ اپنا ذاتی سامان اور تصویروں کے البم ایک الگ سوٹ کیس میں جمع کر کے گھر کی زین پر رکھ کر پورے گھر کا دورہ کر کے غائب کر لی۔ اس نے اپنے گھر کی چیز اسے نہیں ملی۔ گلزار عاصم نے اپنی گاڑی عرصے تک فروخت کی تھی اور اس کی جگہ کوئی دوسری مناسب قیمت کی سیکنڈ ہینڈ گاڑی لینے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن اس ارادے کی تکمیل سے قبل ہی اجل انہیں اچک کر لے گئی، سو گھر میں اس وقت کوئی گاڑی موجود نہیں تھی۔ بشری کی اپنی گاڑی اس پر ٹوٹنے والی قیامت سے پہلے کی ورکشاپ پر کھڑی تھی۔ ممکن تھا ملکینک نے ٹھیک بھی کر دی ہو لیکن کون تھا جو گاڑی ورکشاپ سے لے کر آتا۔ اس نے سوچا کہ ملکینک کو کال کر کے اس سے معلوم کر لے اور اگر گاڑی ٹھیک ہو چکی ہو تو اسے کہہ کہ گھر پر بھجوا دے۔

ملکینک کو فون کرنے کے ارادے سے اس نے اپنا موبائل بیگ سے نکالا تو اس پر سونیائی متعدد مسڈ کالز موجود تھیں۔ یونیورسٹی میں کلاسز کے دوران اس نے موبائل

سائیلٹ پر کر دیا تھا اور دوبارہ موبائل دیکھنے کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ اب دیکھا تو ملکیٹک سے پہلے سونیا کو کال کر بیٹھی، وہ اس کے لیے پریشان تھی اور پوچھ رہی تھی کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔ اس نے سونیا کو اپنی اپنے گھر پر موجودگی کے بارے میں آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ وہ اپنے سامان کا بھاری سوٹ کیس یہاں سے ہاسٹل شفٹ کرنے کے خیال سے ملکیٹک کو اپنی گاڑی کے لیے کال کرنے جا رہی تھی تو اس کی اتنی مسد کا نزدیکہ کر پہلے اسے فون کر بیٹھی۔

”تم مجھے ایڈریس بتاؤ۔ میں خود تمہارے گھر آ جاتی ہوں۔ میری گاڑی میں تم آرام سے سوٹ کیس ہاسٹل لے جا سکتی ہو۔“ سن کر سونیا نے فوراً پیشکش کی۔ بشری اسے زحمت دینے کے خیال سے متامل تھی لیکن اس کے اصرار پر اسے ایڈریس بتانا پڑا۔ فون بند کر کے سونیا کے انتظار میں وقت گزارتے ہوئے اس کا ذہن بہت سی الجھنوں کے ساتھ اس الجھن میں بھی گھرا ہوا تھا کہ کیا سونیا سچ معاذ سے اتنی محبت کرتی ہے کہ صرف معاذ کے واسطے اس کا اتنا خیال رکھ رہی ہے؟ اس مطلب پرست دل میں کیا اب بھی ایسے دیوانے موجود ہیں؟ جواب تھا ”شاید ہاں“۔

☆☆☆

”تم جا رہے ہو معاذ سامیں؟“ اپنے لگائے ہوئے موبائل میں موجود واحد پھول دار پودے پر نظریں جمائے معاذ نے یہ سوال کرتی لیلیٰ کا لہجہ بجھا ہوا تھا اور آنکھوں میں اداسی بکھورے لے رہی تھی۔

”ہاں، اللہ کا شکر ہے کہ اب میں سفر کے لائق ہوں اور یہاں کے مسائل بھی حل ہو گئے ہیں تو اب میں یہاں سے جا سکتا ہوں۔“ معاذ نے بے ساختگی سے جواب دیا۔ حقیقتاً وہ گھر واپس جانے کے خیال سے بہت خوش تھا اس لیے لیلیٰ کی اداسی کی طرف دھیان نہیں دے سکا تھا۔ فیضو خان اپنے ساتھیوں کی موجودگی میں طے پانے والے معاہدے کے بعد ان کے ساتھ واپس جا چکا تھا اور خود اس نے فیضو کے ساتھ اس کے علم کا اکتساب کرتے ہوئے شب و روز گزارے تھے۔ فیضو واقعی حیرت انگیز آدمی تھا اور اسے اس مختصر عرصے میں بھی اس سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا تھا۔ فیضو نے اسے بہت سی ایسی چیزیں ذہن نشین کروائی تھیں جن کی اسے بعد میں بھی مشق کرتے رہنا تھا۔ کچھ خاص تحائف بھی دیے تھے جن کے بارے میں وہ پُر یقین تھا کہ معاذ کو ان کی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔ معاذ کے لیے یہ سب عجیب ہونے کے باوجود دلچسپ تھا۔ پچھلے دو دن اس

نے عجیب سحر انگیزی کے حصار میں گزارے تھے اور اپنی بے چین طبیعت کو خاصے سرور میں پایا تھا۔ اس کی افتاد طبع اسے نت نئی چیزیں سیکھنے پر ہمیشہ ہی اکساتی رہتی تھی اور جو کچھ اس نے یہاں سیکھا تھا، وہ بہت ہی انوکھا تھا اس لیے ذرا زیادہ ہی خوش محسوس ہو رہی تھی۔ اس خوشی میں گھر واپس لوٹنے کی خوشی شامل ہونے کے باعث وہ اتنا کن تھا کہ لیلیٰ کے احساسات کو نظر انداز کر گیا تھا۔

”تم یہاں ہمارے ساتھ خوش نہیں تھے معاذ سامیں!“ لیلیٰ اداسی سے بولی تو اسے احساس ہوا کہ وہ اپنی خوشی میں اس کی اداسی کو فراموش کر گیا ہے۔ جلدی سے بولا۔ ”یہ بات نہیں ہے لیلیٰ! تم لوگوں کے ساتھ میں نے اچھا وقت گزارا۔ تم لوگوں نے جس طرح میری خدمت کی اور مجھے زندگی کی طرف واپس لائے، اس احسان کی تو کوئی قیمت ہی نہیں ہے لیکن اس حقیقت کو تو تم بھی سمجھ سکتی ہو کہ گھر ہر انسان کے لیے بے پناہ اہمیت رکھتا ہے اور ماں باپ سے بڑھ کر کسی تعلق کی اہمیت نہیں ہوتی۔ مجھے بھی اپنے والدین اور بھائی بہن کی پریشانی کا خیال ہے۔ میری گمشدگی پر ان کا ایک ایک دن کس عذاب میں گزر رہا ہوگا، یہ صرف میں ہی سمجھ سکتا ہوں اسی لیے تم لوگوں کی بے حد محبت اور خلوص کے باوجود میں یہاں رککنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ مزید رکنا بھی تو کتنے دن رکنا پڑے گا۔ آخر ایک نہ ایک دن تو مجھے یہاں سے جانا پڑے گا۔ میری سونیا، تمہاری دنیا سے بہت مختلف ہے۔ میں دنیا میں رہنا نہیں چاہتا اور تم میری دنیا میں خوش نہیں رہ سکتے۔“ لیلیٰ نے اچھا ہم چند دنوں کے اس ساتھ کو ایک خوش گوار یاد دلانے کے لیے اسے حوصلے میں سنبھال کر رکھ لیں اور بھی زندگی موقع دے تو اپنا بادل لٹا دے گا۔ لیلیٰ نے اسے ایک دوسرے سے ملاقات کا خیال نکال لیا۔ ”مجھے موقع ملا تو میں پھر بھی دوبارہ تم لوگوں سے ملنے یہاں آؤں گا۔ تمہیں موقع ملے تو تم چا چاہی اور مراد کے ساتھ مجھ سے ملنے شہر آ جانا۔ میں نے اپنا پتا لکھ کر مراد کو دے دیا ہے۔ کراچی آ کر اس پتے کی مدد سے تم لوگ مجھ تک پہنچ سکتے ہو۔“ لیلیٰ کے چھوٹے سے جملے میں کتنے شکوے چھپے ہوئے تھے، وہ سمجھ رہا تھا اس لیے اسے بہت کچھ سمجھانے کی اپنی سی کوشش کر رہا تھا۔ لیلیٰ بھی کوئی نا سمجھ لڑکی نہیں تھی۔ اپنی کم عمری کے باوجود اسے زندگی کا بہت تجربہ تھا اس لیے اس کی بات کے جواب میں کچھ دیر سپاٹ چہرہ لیے بیٹھی رہی پھر عجیب سے انداز میں بولی۔

”تم یہ میرے لگائے پودے دیکھ رہے ہو نا معاذ سامیں! یہ بڑی ترکاری کے پودے کتنے فائدہ مند ہیں۔ یہ

”تمہاری بہت یاد آئے گی معاذ سائیں۔“ وقت رخصت وہ سب سے گلے مل رہا تھا تو مراد نے اس کے گلے لگ کر بڑی محبت سے کہا۔
”میں بھی تم لوگوں کو کبھی نہیں بھول سکتا۔“ معاذ نے مسکراتے ہوئے اس کا شانہ تھپکا۔ ڈیرے کے تقریباً سب ہی لوگ اسے رخصت کرنے آئے تھے۔ وہ سب سے گلے مل کر ان کی محبتوں کا شکریہ ادا کرتا رہا۔ سب سے آخر میں وہ فیضو سے ملا اور بولا۔

”مجھے یقین ہے آپ کی کشش مجھے دوبارہ ضرور یہاں لائے گی چاچا جی!“ فیضو نے کوئی جواب نہیں دیا اور کھڑا مسکراتا رہا۔ اس کے پہلو میں ہی لیلیٰ بھی کھڑی تھی۔ بالکل سپاٹ چہرے اور بے تاثر آنکھوں کے ساتھ لیکن معاذ جانتا تھا کہ بظاہر سخت اور سرد نظر آنے والی اس لڑکی کے اندر بھی بڑی نرمی اور حساسیت ہے۔ اس نے دھیرے سے لیلیٰ کے سر پر ہاتھ رکھا اور اپنے ساتھ جانے والے لڑکے کے پیچھے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ اس کے بیٹھنے ہی لڑکے نے گھوڑے کو ایڑھ لگائی۔ اس نے فضا میں ہاتھ لہرا کر سب کو خدا حافظ کہا۔ جواب میں بیک وقت بہت سے ہاتھ فضا میں لہرائے اور گھوڑا آگے بڑھ گیا۔ اسے رخصت کرنے کے لیے آنے والے اپنی جگہ کھڑے دور جاتے گھوڑے اور اس کے سواروں کو دیکھتے رہے۔ معاذ بھی بار بار گردن موڑ کر دیکھتا رہا۔ آخر وہ سب اسے نظر آنا بند ہو گئے۔ اب وہ راستے کی طرف متوجہ تھا۔

معاذ نے ہمارے جانوروں کو خوراک ملتی ہے اور ان کی ہریالی آنکھوں کو بھلی لگتی ہے۔ ان سب کے بیچ ایک اکیلا پھول دار پودا ہے جس کا دیکھو تو کوئی فائدہ نہیں ہے۔ یہ میرا پیٹ نہیں بھر سکتا لیکن یہ میرے دل، میری روح کو خوشی دیتا ہے اس لیے یہ پودا مجھے سب سے بڑھ کر پیارا لگتا ہے اور جب میں بہت دور سے پانی ڈھو کر لاتی ہوں تو سب سے پہلے اس پودے کو پانی ڈالتی ہوں۔ میں اس پودے کو سوکتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتی معاذ سائیں۔“ وہ اُن پڑھ اور مہذب دنیا سے دور رہنے والی لڑکی اتنی گہری بات کر جائے گی، معاذ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے اپنی مثال سے واضح کر دیا تھا کہ معاذ کی محبت کتنی ہی لا حاصل تھی، وہ اس محبت سے دستبردار نہیں ہو سکتی۔ اس کا دل دکھ سے بھرنے لگا اور وہ افسوس سے صبح کی ابتدائی روشنی میں نہائی اس لڑکی کو دیکھنے لگا جس کی زندگی ان پہاڑوں کے بیچ پہلے ہی بہت سخت تھی اور اس نے ایک اور سختی کو اپنے لیے چن لیا تھا۔ بہت دیر بعد وہ بولنے لگا۔

”میرا تم پر کوئی دعوہ نہیں ہے لیلیٰ لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم ایک اچھی زندگی گزارو۔ اچھی زندگی گزارنے کے لیے سب سے زیادہ محبت کرنے والے ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے اور مجھے یقین ہے کہ مراد تم سے زیادہ محبت کرتا ہے۔ اگر ہو سکے تو تم اس پیارے لڑکے کا ہاتھ مل لیتا۔“
”جو آپ کا حکم سائیں! چلو اب چل کر لیلیٰ (روٹی) کھا لو پھر تم کو سفر کے لیے لکھتا ہے۔“ بغیر کسی بحث یا اعتراض کے اس کی خواہش پر ہامی بھر کر وہ یوں کھڑی ہو کر اس سے بولنے لگی جیسے ان دونوں کے درمیان کسی حساس موضوع کے بجائے موسم کی صورت حال پر گفتگو ہوتی رہی ہو۔ معاذ بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔ کچھ دیر میں ناشتے سے فارغ ہو کر وہ وہاں سے روانگی کے لیے تیار تھا۔ زاہد راہ کے طور پر لیلیٰ نے کھانے پینے کا سامان باندھ کر دے دیا تھا۔ راہنمائی کے لیے ڈیرے سے ایک لڑکا اس کے ساتھ جا رہا تھا۔ ان دونوں کو ایک ہی گھوڑے پر سفر کرنا تھا کیونکہ وہاں سواری کے لیے زیادہ گھوڑے موجود نہیں تھے اور پرسوں ہی چند لوگ عام آبادی کی طرف روانہ ہوئے تھے تا کہ یہاں سے اپنا مال لے جا کر فروخت کرنے اور ضرورت کی اجناس واپس لانے کا کام انجام پاسکے۔ مراد کی خواہش تھی کہ وہ معاذ کو پہاڑوں سے نیچے چھوڑنے جائے لیکن اس کے بازو کا زخم ابھی پوری طرح مندمل نہیں ہوا تھا اس لیے معاذ نے خود سختی سے اسے ساتھ لے جانے سے انکار کر دیا تھا۔

معاذ نے ہمارے جانوروں کو خوراک ملتی ہے اور ان کی ہریالی آنکھوں کو بھلی لگتی ہے۔ ان سب کے بیچ ایک اکیلا پھول دار پودا ہے جس کا دیکھو تو کوئی فائدہ نہیں ہے۔ یہ میرا پیٹ نہیں بھر سکتا لیکن یہ میرے دل، میری روح کو خوشی دیتا ہے اس لیے یہ پودا مجھے سب سے بڑھ کر پیارا لگتا ہے اور جب میں بہت دور سے پانی ڈھو کر لاتی ہوں تو سب سے پہلے اس پودے کو پانی ڈالتی ہوں۔ میں اس پودے کو سوکتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتی معاذ سائیں۔“ وہ اُن پڑھ اور مہذب دنیا سے دور رہنے والی لڑکی اتنی گہری بات کر جائے گی، معاذ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے اپنی مثال سے واضح کر دیا تھا کہ معاذ کی محبت کتنی ہی لا حاصل تھی، وہ اس محبت سے دستبردار نہیں ہو سکتی۔ اس کا دل دکھ سے بھرنے لگا اور وہ افسوس سے صبح کی ابتدائی روشنی میں نہائی اس لڑکی کو دیکھنے لگا جس کی زندگی ان پہاڑوں کے بیچ پہلے ہی بہت سخت تھی اور اس نے ایک اور سختی کو اپنے لیے چن لیا تھا۔ بہت دیر بعد وہ بولنے لگا۔

واپس نہیں جانا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ پہاڑ انہیں اس آچکے ہیں اور یہاں جیسا سکون انہیں کہیں نہیں مل سکتا۔ شاید وہ اپنے اس خیال میں درست بھی تھے اسی لیے انہوں نے اپنے آپ کو عام لوگوں سے تقریباً کاٹ کر رکھا ہوا تھا اور اتنے برسوں بعد بھی مخصوص لوگوں کے علاوہ کسی کی ان تک رسائی نہیں تھی۔ وہ خود کو لوگوں کی نظروں میں لانا بھی نہیں چاہتے تھے اس لیے معاذ کو روانگی سے قبل اس سلسلے میں خصوصی ہدایات دی گئی تھیں اور اس سے وعدہ لیا گیا تھا کہ وہ شہر پہنچنے کے بعد ان کے بارے میں کسی کو ایسی کوئی بات نہیں بتائے گا جو کسی کو ان تک رسائی دے سکے۔

معاذ نے بخوشی ان سے وعدہ کر لیا تھا۔ اس نے ان لوگوں کا طرز زندگی دیکھا تھا۔ وہ بہت سخت زندگی گزار رہے تھے اور اس زندگی میں کسی جرم کا شائبہ تک نہیں تھا تو اسے کیا ضرورت پڑی تھی کہ ان کی پرسکون زندگیوں میں خلل ڈالتا۔ وہ اس کے محسن تھے اور وہ اپنے محسنوں کو کوئی نقصان پہنچانے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے ان سے یہ اصرار بھی نہیں کیا تھا کہ وہ اسے کراچٹ سینٹر پہنچائیں۔ وہ اس پر راضی ہو گیا تھا کہ وہ اسے سندھ کے کسی گاؤں تک پہنچا دیں تو آگے وہ خود اپنے لیے راہ تلاش کر لے گا چنانچہ اس نے اپنے بے رحم پہاڑوں میں ایک طویل سفر کرنا تھا۔ سفر کی ابتدا اس نے بتا دیا تھا کہ یہ سفر آسان نہیں ہوگا۔ تھوڑی تھوڑی دیر میں ہی حلق میں کانٹے پڑنے لگتے تھے اور وہ چٹانوں سے منہ لگا کر چند گھنٹے پانی پینے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ان سختیوں کا عادی تھا اور اس نے ایک آدھ ہفتہ پانی پیا تھا۔

”ہم ان علاقے سے کاٹ کر نکل گئے ہیں جہاں ڈاکوؤں کا خطرہ رہتا ہے۔“ دوپہر کے بعد اس کے ہمسفر و راہنما نے اسے آگاہ کیا۔ روٹی کے وقت ہی ان کے درمیان یہ طے ہو گیا تھا کہ وہ دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے نہیں رکھیں گے تاکہ دن کی روشنی میں زیادہ سے زیادہ سفر طے ہو جائے۔ بھوک محسوس ہوتی تو وہ چلتے چلتے ہی اپنے پاس موجود چنے یا بھنی مکئی کھا کر گزارہ کر سکتے تھے لیکن دونوں ہی نے ابھی تک کچھ کھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی اور ان کا سفر مستقل جاری تھا۔ ڈاکوؤں والے علاقے سے آگے نکل کر اس کے ساتھی نے پیاسے گھوڑے کو پانی پلانے کے لیے گھوڑا روکا تو اسے اکڑی ہوئی پیٹھ کو سیدھا کرنے کا موقع ملا۔ گھڑسواری سے واقفیت الگ بات تھی لیکن گھوڑے کی پیٹھ پر اتنا لمبا سفر طے کرنے کا اس کا یہ پہلا موقع تھا۔ پھر وہ ابھی حال ہی میں

ان پہاڑیوں کے باسی تھے۔ کیرتھر کے آس پاس آباد گاؤں دیہاتوں کی بات الگ تھی لیکن پہاڑوں پر ان کی سختیوں کے درمیان تو وہ رہ سکتے تھے جو سر پھرے تھے یا پھر جن کو سیاری دنیا سے چھپ کر رہنے کے لیے محفوظ ٹھکانوں کی حاجت تھی۔ ڈاکوؤں نے ایسے ہی کیرتھر کی ناقابل رسائی پہاڑیوں میں اپنی کمین گاہیں نہیں بنائیں تھیں۔ معاذ کو یاد آیا کہ فیضو نے ایک گاؤں کا نام بتا کر اسے وہاں ایک بندے کا نام بتایا تھا اور کہا تھا کہ اگر کبھی یہاں آنے کی ضرورت پڑے تو اس بندے کے پاس چلے جانا۔ وہ تمہیں یہاں پہنچا دے گا۔ یقیناً فیضو جانتا ہوگا کہ خود معاذ اپنی یادداشت کے سہارے وہاں نہیں پہنچ سکتا تھا یہاں کے راستے ہی ایسے تھے کہ ایک آدھ بار میں کسی کو یاد ہو جاتے۔ بھٹکنے کی صورت میں زندگی بھی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔ وہ اپنے کم گوراہر کے ساتھ آگے بڑھتا رہا اور سوچتا رہا۔

سفر کے آغاز سے پہلے ہی اسے بتا دیا گیا تھا کہ سفر طویل اور دشوار ثابت ہوگا۔ اس نے اسے کراچٹ سینٹر سے بہت دور کیرتھر کے اس حصے میں تھے جو پاکستان کی حدود میں آتا تھا۔ دو دن پہلے فیضو نے اس پر ایک انگلی بھی کیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ ڈیرے پر موجود اس سمیت کسی نہ کسی وجہ سے عام لوگوں سے ہٹ کر وہاں چھپ کر رہنا تھا۔ کسی کو خاندانی دشمنیوں نے اپنا گھر چھوڑنے پر مجبور کیا تھا، کسی جرم کا مرتکب ہونے کے بعد اپنی جان بچانے کے لیے وہاں چھپا بیٹھا تھا، کسی نے قرض کے بوجھ سے جان چھڑانے میں ناکام ہو کر یہاں پناہ لے لی تھی۔ خود مراد کا باپ سجادوں کسی زمانے میں نامی گرامی ڈکیت ہوتا تھا۔ اس کے ڈاکوں کی سب سے زیادہ شہرت تھی اس لیے جب وہ ڈکیتی سے تائب ہوا تو اس کے پاس عام لوگوں میں جانے کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ اپنے ساتھ ہی تائب ہونے والے دو تین ڈاکوؤں کے ساتھ ان ہی پہاڑوں میں بس گیا۔ ان کے خاندان بھی ان کے ساتھ تھے اور آبادیوں میں ان کے چند بہت قریبی اور با اعتماد عزیز ہی ایسے تھے جن سے ان کے خفیہ رابطے تھے۔ ان عزیزوں اور فیضو کی طرح پہاڑوں پر آنے والے چند لوگوں کے ذریعے وہ اپنی روزی روٹی کا بندوبست کرتے تھے۔ فیضو اور اس جیسے دوسرے مصیبت زدہ لوگوں کو سجادوں نے ہمدردی میں پناہ دی تھی اور اب وہ سب وہاں ایک خاندان اور قبیلے کی طرح مل جل کر رہتے تھے۔ وہاں رہتے رہتے ان کی نسل جوان ہو گئی تھی اور اب شاید جیسے اندیشے اور خطرات باقی نہیں رہے تھے لیکن اب وہ عام آبادیوں میں

ان کے قریب آ کر رک چکے تھے اور خونخوار نظروں سے ان دونوں کو گھور رہے تھے۔

”یہ سب کیا ہے سنگرام! تمہارے سردار سے ہمارا معاہدہ طے ہو گیا تھا کہ تم لوگ ہمیں پہاڑوں میں سفر کرتے ہوئے تنگ نہیں کرو گے پھر یہ تم لوگ کیا کر رہے ہو؟“ معاذ کے ساتھی نے ایک ڈاکو کو شناخت کرتے ہوئے اس سے غصے سے پوچھا۔

”سردار کی تو.....“ سنگرام نامی ڈاکو نے خمیسو خان کو ایک گندی سی گالی دی اور بولا۔ ”سردار پہلے تو زانیوں کی طرح تم لوگوں کے قبضے میں چلا گیا اور پھر بزدلوں کی طرح اپنی جان بچانے کے لیے تم سے معاہدہ بھی کر بیٹھا لیکن میں ایسے کسی وعدے کو نہیں مانتا۔ اس جھگڑے میں میرا بھائی اور بھانجا اپنی جان سے گئے ہیں۔ میرے اس ساتھی کا جوان بیٹا مارا گیا ہے۔ ہمارے سینوں میں آگ لگی ہے۔ ہم سردار کی خاطر تمہیں شام نہیں کر سکتے۔ ہم سردار اور اس کے پٹھوؤں کو چھوڑ آئے ہیں اور اب ہم چار کا اپنا گروہ ہے۔ ہم دیکھیں گے کہ تمہارے لوگ کیسے اس راستے پر سفر کرتے ہیں۔ ہمارے تین ساتھیوں کے بدلے تم سب اپنی جان سے جاؤ گے۔ ابھی تمہاری باری ہے۔ تمہارے بعد ان کا نمبر آئے گا جو یہاں سے نکل تو گئے ہیں لیکن کبھی واپس نہیں آئے۔“ بولتے بولتے سنگرام نے اپنی ناک سے معاذ کے سر کا نشانہ باندھ لیا۔

”تھک ہے تمہاری دشمنی ہم سے ہے۔ تم چاہو تو مجھے گولی مار دے۔ لیکن اس لڑکے کو جانے دو۔ اس کا تعلق دہلی سے ہے۔ یہ ہمارا مہمان ہے اور میں اسے چھوڑنے کے لیے جا رہا ہوں۔“ معاذ کے ساتھی نے بچی لہجے میں سنگرام کو درخواست کی تو وہ زور زور سے قہقہے لگانے لگا پھر وحشت زدہ لہجے میں بولا۔

”تم، تمہارا گھوڑا اور یہ چھوکر کوئی نہیں بچے گا۔ ہمارے ساتھیوں کی موت کا حساب ڈیرے سے سمبندھ رکھنے والے ہر جاندار کو دینا ہوگا۔“

”لیکن.....“ معاذ کے ساتھی نے کچھ اور کہنا چاہا لیکن سنگرام لہلی دبا چکا تھا۔ گولی چلنے کے دھماکے میں اس کے الفاظ ان سے رہ گئے تھے۔

صحت یاب ہوا تھا۔ فیضو کے کئی بہترین علاج کے باوجود اس کے جسم میں ہونے والی خون کی کمی ایک دم ہی تو پوری نہیں ہو سکتی تھی چنانچہ کمزوری نے بھی اسے تھکانے میں اپنا کردار ادا کیا تھا۔ گھوڑے کے پانی پینے تک اس کے ساتھی نے اسے کچھ کھالینے کا مشورہ دیا لیکن اس نے ٹھٹھی بھر مٹی کے علاوہ کچھ نہیں کھایا۔ دوبارہ سفر شروع ہوا تو وہ خود کو کافی بہتر محسوس کر رہا تھا۔ بغیر رکے سفر کرنے کا مشورہ انہیں فیضو نے دیا تھا۔ خمیسو خان کو قابو میں کر لینے اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ معاہدہ طے پا جانے کے باوجود وہ بہت زیادہ مطمئن نہیں تھا اور اسے خدشہ تھا کہ ڈاکوؤں کا کوئی گروہ خمیسو خان سے بغاوت کر کے بھی انہیں نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اپنے ایک گروپ کے کامیابی سے نکل جانے کے باوجود اندیشے مکمل طور پر ختم نہیں ہوئے تھے، اس لیے اپنے طور پر احتیاط کرنا ہی بہتر سمجھا جا رہا تھا۔ دوسرے حصے میں شروع ہونے والا ان کا یہ سفر اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ قمر پر اندھیرے نہیں اترنے لگے۔ ویسے بھی اب موسم بدلتا جا رہا تھا اور دن چھوٹے ہونے لگے تھے اس لیے رات ڈرا جلدی تر آتی تھی۔ شام گہری ہوئی تو وہ ایک مناسب جگہ دیکھ کر رک کر آگ جلائی۔ ذرا دیر سنانے کے بعد کھانا کھانا شروع کر دیا۔ اس کا راہبہ اسے بتانے لگا کہ اگر انہوں نے علی الصباح سفر کا آغاز کر دیا تو کل دوپہر تک اپنی منزل پر پہنچ جائیں گے۔ کھانے کے بعد ان کے پاس روٹیاں، پیاز اور گڑ کی ڈلیاں موجود تھیں۔ کھانا ایسا تھا جو گرمی کے باوجود خراب نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ سفر میں اسی طرح کا کھانا کھاتے تھے۔ معاذ کو یہ سب کھانے کا تجربہ نہیں تھا لیکن پھر بھی وہ بڑے مزے سے اس کھانے کو کھا رہا تھا۔ پورے دن کی بھوک اور تھکن کے بعد شاید ہر چیز نعمت لگتی ہے۔ وہ بھی مزے سے اس فقیرانہ کھانے کو کھا رہا تھا کہ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز نے چونکا دیا۔ اس نے اور اس کے ساتھی نے بیک وقت کھانے سے ہاتھ روک کر اطراف میں نظریں دوڑائیں۔ چار گھڑ سوار آندھی طوفان کی طرح ان کی طرف چلے آ رہے تھے۔ اپنے حلیے سے وہ ڈاکو لگتے تھے۔ معاذ نے بے ساختہ ہی تینیں بور کے اس ریوالور کی طرف ہاتھ بڑھایا جو اسے لٹکی نے روانگی کے وقت اپنی حفاظت کے لیے دیا تھا۔ اس کے ہاتھ بڑھاتے ہی ایک گولی سنسناتی ہوئی اس کے قریب سے گزری اور کوئی چیخ کر بولا۔

”خبردار! ہتھیاروں کو ہاتھ نہ لگانا ورنہ اگلی گولی تمہارے پیچھے کے اندر ہوگی۔“

معاذ کو اپنا ہاتھ پیچھے کرنا پڑا۔ اس اثنا میں وہ چاروں

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر ہو جوان
کی داستان جو غلط کاروں کے لیے
غضب ناک تھا باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیے

بشری اپنے سامنے موجود رپورت توجہ سے پڑھ رہی تھی۔ اس رپورت میں عرفان اللہ کے خاص آدمی باؤل کے بارے میں معلومات درج تھیں۔ رپورت کے مندرجات کے مطابق باؤل کی ماں ہازہ حسن کی ایک بای گرامی طوائف تھی جس کا اپنے دور عروج میں شوکت عرف شوکانی ایک فنڈے سے پکڑ چلا گیا تھا۔ شوکت خوبرو بھی تھا اور جی وار بھی نظر آتا تھا اس لیے تاج بائی اس پر اتنی بری طرح فریفتہ ہوئی کہ سب کی مخالفت کے باوجود اس سے شادی کے لیے اڑ گئی۔ سونے کی چڑیا ہاتھوں سے اڑتے دیکھ کر اس کے دلی وارثوں نے بہت ہاتھ دھارے، یہاں تک کہ شوکت کو فنڈوں سے ڈرانے کی کوشش بھی کی گئی لیکن شوکانی زیادہ بڑا فنڈا تھا۔ اسے دھمکی دینے کے لیے جانے والے فنڈے اپنی ناگہوں پر داہیں نہا سکے اور یوں تاج بائی کے بچپن کو ہار ماننا پڑی۔ شوکت کے سے نکاح پڑھا کر تاج بائی کو غصے سے توٹنے میں کامیاب ہو گئی لیکن بچے سے اس کی جان نہیں بھوٹ سکی۔ فرق پڑا تو صرف اتنا کہ پہلے باپ بھائی اس کی دلائی کرتے تھے، اب شوہر دلائی کرنے لگا۔ تاج بائی کوئی شریف عورت نہیں تھی کہ اس پر رخصتا کرنا گراں گزرتا لیکن وہ اپنے ساتھ ہونے والے اس دھوکے پر بہت تھلائی۔ شوکت کی گرفت سے نکلنا بھی آسان نہیں تھا۔ وہ بہت تیز آدمی تھا اور تاج بائی کے لیے گاہک خود منتخب کرتا تھا۔ تاج بائی اس کے لیے دولت کے حصول کے علاوہ اہم مصلحتوں میں تعلقات پیدا کرنے کا بھی ایک ذریعہ تھی۔ شوکانی بہت اونچی اڑان اڑنے کی فکر میں تھا اور مطمئن تھا کہ بالکل صحیح سمت میں پیش قدمی کر رہا ہے۔ تاج بائی کے ذریعے اس نے جن بااثر لوگوں سے تعلقات قائم کر لیے تھے، ان میں سے ایک صنعت کار کا بیٹا عرفان اللہ بھی شامل تھا۔ وہی عرفان اللہ جو سلطان کا باپ تھا۔ عرفان اللہ نے شوکت سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے اپنے باپ کے خاص آدمیوں میں شامل کروادے گا لیکن اس سے پہلے کہ یہ وعدہ وفا ہوتا شوکانی مارا گیا۔ شوکت کی موت کے چار ماہ بعد باؤل پیدا ہوا۔ تاج بائی نے شوہر کے مرنے کے بعد میکے والوں کے پیغامات ملنے کے باوجود کوٹھے پر وہاں لوٹنا قبول نہیں کیا اور شوکت کے گھر پر بیٹھ کر ہی دھندا کرتی رہی۔ کہنے والے کہتے تھے کہ شوکت کی موت میں تاج بائی کا ہاتھ تھا لیکن بھی کوئی ثبوت سامنے نہ آ سکا۔ اب تاج بائی ایک کوشی میں رہتی تھی اور کچھ لڑکیوں کی مدد سے اپنا کاروبار چاری رکھے ہوئے تھی۔ پرانے گاؤں میں سے عرفان اللہ سے آج بھی اس کے مراسم تھے اور عرفان اللہ اس پر اتنا مہربان

تھا کہ اس کے بیٹے باؤل کو اپنے خاص بندوں میں شامل کر رکھا تھا بلکہ عملاً باؤل ہی اس کے سارے آدمیوں کو وٹل کرتا تھا اور خود اس طرح عرفان اللہ کی ناک کا ہال بنا ہوا تھا کہ وہ مشکل سے ہی اس کی کوئی بات رد کرتا تھا اور زیادہ تر اسے اپنے ساتھ رکھتا پسند کرتا تھا۔

آگے باؤل کے کردار پر بھی روشنی ڈالی گئی تھی۔ پوری رپورت پڑھنے کے بعد بشری کی پیشانی پر دوپٹ پڑ گئے اور بے ساختہ ہی اسے باؤل کی آنکھیں یاد آئیں۔ لہذا، ہولناک اور سخاک آنکھیں جو اس کی اچھی بھلی شکل و صورت کے باوجود اس کی شخصیت کو کراہیت آمیز بنا دیتی تھیں۔ شاید اس کی رگوں میں بہتے گندے خون کی ساری گندگی تھی جو اس کی آنکھوں میں اتر آئی تھی یا پھر وہ آنکھیں اس کے کردار کا آئینہ تھیں۔ وجہ جو بھی تھی، وہ بشری کے لیے ایک قابل غرت شخص تھا جسے اس کے انجام تک پہنچانے کے لیے وہ بے حد بے چین تھی۔ اس کے بارے میں یہ معلومات بھی اس نے اسی لیے حاصل کی تھیں کہ اندازہ لگا سکے، باؤل پر کس طرح ہاتھ ڈالا جاسکتا ہے۔ رپورت نے اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا لیکن وہ دھمکوس کر رہی تھی کہ رپورت کا ایک پیلو اب بھی تکتا ہے۔ اس تنگی کو دور کرنے کے لیے اس نے اپنا سوبال نکالا اور ایک نمبر ڈال کر کہا۔

”ہائے بشری! کیسی ہو؟“ دوسری کھنی کھل ہونے سے قفل اس کی کال ریسیو کر گئی اور جوش سے پوچھا گیا۔ بولنے والے کی آواز سے ظاہر تھا کہ وہ ذرا سا ہانپ رہا ہے۔

”کیا جاگنگ کر رہے تھے؟“ بشری نے ایک نظر گھڑی پر ڈالی اور قدرے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں یار! آج آٹھ دیر سے کھلی لیکن میں نے سوچا کہ جاگنگ کا فائدہ نہ کروں۔ ویسے لڑکیاں مجھ بے چارے کو گھاس نہیں ڈالتیں۔ سوچا اور بھڑا ہو گیا تو بالکل ہی گولی نہ نہیں لگائے گی۔“ شوخ لہجے میں بولتا ہوا وہ کس جانب اشارہ کر رہا ہے، بشری جانتی تھی۔ اعجاز یونیورسٹی میں اس سے سینئر تھا اور معاذ والے سچ سے پہلے پاس آؤت ہوا تھا۔ کچھ یونیورسٹی کے حوالے سے اور کچھ اپنے والد گزراہ عامم کے حوالے سے اس کی اعجاز سے اچھی جان پہچان تھی اور اسے اندازہ تھا کہ اعجاز اس کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتا ہے لیکن خود اس کے دل میں اعجاز کے لیے ایسا کوئی جذبہ پیدا نہیں ہو سکا تھا اس لیے اس نے بھی اس کی پڑیرائی نہیں کی تھی اور اپنی دوستی کو اپنے پروفیشن تک ہی محدود رکھا ہوا تھا۔ اعجاز نوجوان صحافی تھا اور تازہ تازہ

سپینسر ڈائجسٹ جون، جولائی 2020ء
مہربانی فرما کر بلیئر زنی حوصلہ کے لیے خرید کر پڑھیے۔

تھا۔ اس جیسے آدمی کے جواری، بشری اور عیاش ہونے پر کسی کو حیرت نہیں ہو سکتی۔ میں نے تمہارا رپورٹ کیا ہوا ہر واقعہ بہت توجہ سے پڑھا ہے، ممکن ہے ان میں سے کوئی بات میرے لیے مفید بھی ثابت ہو لیکن میں اس کے حوالے سے کچھ بھی کہ نہیں کرنا چاہتی اس لیے پلیز تم مجھے شوکت کی موت کے بارے میں بھی ممکنہ معلومات حاصل کر کے بھیجو۔" بشری نے اس سے درخواست کی۔

"میں یہ کر دوں گا بشری لیکن تم بتاؤ کہ تم یہ سب کیوں کر رہی ہو؟ اتنی بات تو میری سمجھ میں آ رہی ہے کہ عرفان اللہ اور یزدانی سے تمہاری دشمنی چل رہی ہے اور باؤل عرفان اللہ کا خاص آدمی ہے شاید اس لیے تم اس کے ذریعے عرفان اللہ کو کوئی نقصان پہنچانا چاہتی ہو لیکن میرا مشورہ ہے کہ تم خود کو دشمنی کے اس چکر سے نکال لو۔ وہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔ ان کی وجہ سے پہلے ہی تم کا قابلِ حوالی نقصانات اٹھا چکی ہو، اب مزید خود کو تباہ کرنے والے کام نہ کرو۔" اعجاز ہمدردی سے اسے سمجھانے لگا۔

"مگر تم یہ کام نہیں کر سکتے تو بتا دو اعجاز، میں کسی اور سے مدد لے لوں گی۔" اس کی نصیحت کے جواب میں بشری سپاٹ لہجے میں بولی تو اس بار اس نے حقیقتاً ایک آہ بھری اور جواب میں ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔

"میں تمہارا کام کر دوں گا لیکن تم دہرہ کرو کہ اس سلسلے میں کسی سے رابطہ نہیں کرو گی۔ کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ ہمارے شعبے میں بھی اتنی کالی بھیڑیں بھری ہوئی ہیں۔ ہوسکتا ہے تم کسی کو قابلِ بھروسہ جان کر اس سے اس سلسلے میں بات کرو اور وہ عرفان اللہ کا ٹھک خوار نکلے۔ یہاں کسی کا کچھ پتا نہیں ہے کہ اس نے اپنے پیسے کا وقار اور قلم کی سچائی کس کے ہاتھوں میں بیچ رکھی ہے۔ اس لیے تمہیں وعدہ کرنا ہوگا کہ تم میرے سوا کسی سے اس سلسلے میں مدد نہیں مانگو گی۔" اعجاز کے انداز میں اس کے لیے گہری فکر مند ہی تھی۔

"تو تم کتنے دنوں تک میری مطلوبہ معلومات فراہم کر دو گے؟" اعجاز کی باتوں کے جواب میں اس نے جو سوال کیا، اس میں ایک واضح احساسِ فتح مندی تھا۔

"آج کل میں اپنے ایک اسائنمنٹ کے سلسلے میں سخت بڑی ہوں لیکن کوشش کروں گا کہ جلد از جلد تمہارا کام کر دوں۔" اعجاز نے اسے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے، کوشش کرنا کہ جلد اپنا یہ وعدہ ایفا کر دو، دوسری صورت میں میرے ہر نقصان کا پورا جوہر تمہیں اپنے شائقوں پر اٹھانا پڑے گا۔" اس نے اپنے الفاظ سے واضح

ڈگری لے کر میدان میں اتر اٹھا اس لیے بھرپور جوش اور محنت سے کام کر رہا تھا اور مختصر عرصے میں اس نے اپنی اچھی ساکھ بنا لی تھی۔ باؤل کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے اس نے اعجاز سے ہی مدد لی تھی اور اب اس کی سبیل کی ہوئی رپورٹ پڑھ کر اس سے رابطہ کیا تھا۔

"پستوں کی طرح دن چڑھے تک سونے والوں کو مونا بھدا ہونے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ بے وقت کی گئی جا چنگ اور ایکسپس سائیکل بھی نہیں۔"

"ہا۔۔۔ یہ ہوتی ہے احسان فراموشی۔ میں رات کے آخری پہر تک محترمہ کی فرمائش پوری کرنے کے لیے جاگتا رہا اور یہاں بجائے تھیک یو یو لے کے بددعا میں دی جا رہی ہیں۔" ایک گہری سانس لیتے ہوئے اس نے معنوی غفلت کا اعجاز کیا۔

"بددعاؤں سے کچھ نہیں ہوتا، اصل میں آدمی کے اعمال ہی اسے لے ڈوبتے ہیں۔ بہر حال میں نے تمہیں تھیک یو یو لے کے لیے ہی فون کیا تھا لیکن تمہاری باتوں میں موٹج نہیں مل سکا۔" اس کے ماتھے کے تل ابھی تک برقرار تھے اور نگریں رپورٹ کے الفاظ پر جمی ہوئی تھیں اس کے باوجود وہ اعجاز سے بہت پُر سکون لہجے میں بات کر رہی تھی۔

"تو اب بول دو تھیک یو۔ دیر سے پوچھنے پر میں سرچارج تھوڑی لگا دوں گا۔" اعجاز نے اپنے غصے کی بجائے برقرار رکھا۔

جواب میں بشری ٹھنکھاری اور بولی۔ "وہ کیا ہے کہ میں نے تھیک یو یو لے کا پروگرام ڈرا ڈیلے کر دیا ہے۔ اب میں تمہیں اس وقت تھیک یو بولوں گی جب تم اس رپورٹ کو مکمل کرو گے۔ ابھی اس میں ذرا سی غلطی ہے۔"

"وہ کیا؟" اعجاز نے بے ساختہ ہی پوچھا۔

"رپورٹ میں تم نے یہ واضح نہیں کیا کہ شوکت کی موت کن حالات میں ہوئی۔ تاج پانی پر اس کی موت کے سلسلے میں کیوں ٹھک کیا گیا اور وہ اس ٹھک کے باوجود کیسے نکلتی وغیرہ وغیرہ۔"

"اوہ۔۔۔ آئی سی۔ اصل میں تم نے مجھے باؤل کے بارے میں معلومات دینے کا کہا تھا تو اس لیے میں نے اس کی ذات پر ہی زیادہ نوٹس رکھا اور بس مختصر ٹیکل ایک گراؤنڈ بتانے پر ہی اکتفا کیا۔"

"باؤل کے بارے میں تمہاری رپورٹ اچھی ہے۔ میں نے سب پڑھ لیا ہے کہ وہ دو برطانیہ ملیں ہی سے کیا

کر دیا کہ اسے ٹالنے کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوگی، اس بار اٹھارہ جواب میں کچھ نہ کہہ سکا اور اپنی جگہ کراہ کر رہ گیا۔

☆☆☆

معاذ اپنے ساتھی اور سنگرام کے درمیان جاری مکالمے کو سننے سے زیادہ سنگرام اور اس کے ساتھیوں کی حرکات و سکنات پر توجہ مرکوز کیے ہوئے تھا۔ ایسے تناؤ زدہ ماحول میں مقابل کی حرکات و سکنات کا فرصت سے مطالعہ و تجزیہ صورت حال سے سنسنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ سنگرام کی آنکھوں کے تاثرات اور لمبی پر جی انگلی کے تناؤ نے معاذ کو بتا دیا تھا کہ وہ گولی چلانے میں کسی تامل سے کام نہیں لے گا اس لیے وہ گولی کے دھماکے کی آواز پیدا ہونے کے ساتھ ہی حرکت میں آ گیا تھا۔ کم و بیش یہی حرکت اس کے ساتھی نے بھی کی تھی لیکن ان دونوں کے رد عمل میں واضح فرق تھا۔ اس کا ساتھی اسے بچانے کے لیے چپٹا ہوا خود گولی کے سامنے آ گیا تھا اور اس کے حصے کی گولی اپنے سینے پر کھاکر زمین پر گر چکا تھا جبکہ وہ کسی اسپرنگ کی طرح اچھل کر ذرا دوا میں جانب گرا تھا اور اسی جگہ پر ساکت رہنے کے بجائے رول کرتا ہوا وہاں سے پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اس کے اس اقدام نے اس کی جان بچانے میں اہم کردار ادا کیا۔ سنگرام کے ایک ساتھی نے میں اسی جگہ فائر کیا تھا جس جگہ وہ گرا تھا۔ اگر وہ رول کر کے وہاں سے بہت نہ جاتا تو گولی اس کے جسم کو چھید ڈالتی۔ وہ نہ صرف گولی کی زد میں آنے سے بچا بلکہ حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے پاس موجود بطل کو بھی استعمال میں لے آیا۔ اس کا نشانہ سنگرام کا وہ ساتھی تھا جو گولی کھا کر تھرجانے والے اس کے محسن لڑکے پر ایک بار پھر فائر کرنے چلا رہا تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ اس کی چلائی ہوئی گولی اس شخص کی کھوپڑی میں بائیں جانب سے داخل ہوئی اور اس کی کھوپڑی کو پاش پاش کر ڈالا۔ اپنے ساتھی کے اس انجام پر سنگرام اور اس کے باقی بچے رہنے والے دو ساتھی لمحہ بھر کے لیے دم بخود رہ گئے اور لمحے بھر کی یہ تاخیر معاذ کے لیے بہت کافی تھی۔ اس نے کچے بعد دیگرے سنگرام کے ساتھیوں پر دو گولیاں چلائیں اور وہ چھپکلیوں کی طرح پٹ سے زمین پر گر گئے۔ اب صرف سنگرام باقی بچا تھا جو اپنے ساتھیوں کا انجام دیکھ کر بخوننا نہ انداز میں چٹکھٹا اور رائل کا رخ معاذ کی طرف کر کے لمبی دبا دی۔

اپنی جدید رائل یقیناً وہ برست پر سیٹ کر چکا تھا اس لیے معاذ نے ایک ساتھ کئی گولیاں چلنے کی آواز سنی اور چینی

موت کو محسوس کرنے کے باوجود زخمی رہنے کی جیلی خواہش کے تحت اپنی جگہ سے اچھل کر خود کو گولیوں کی زد میں آنے سے بچانے کی کوشش کی۔ اپنی اس کوشش کے نتیجے میں کامیاب ہونے پر وہ خوش سے زیادہ حیران ہوا۔ مکمل جگہ پر کسی رائل کے برست سے اس عام سی اچھل کود کی مدد سے بچ نکلتا ایک معجزہ ہی تو تھا اور دوسری حیران کن بات یہ تھی کہ ایک کے بعد دوسرا برست نہیں مارا گیا تھا۔ اپنی حیرت کو دور کرنے کے لیے اس نے سنگرام پر نظر ڈالی تو دنگ رہ گیا۔ اس کے ہاتھ سے رائل چھوٹ چکی تھی اور وہ دونوں ہاتھ اپنے پیٹ پر رکھے الیت سے دہرا ہوتا ٹکٹوں کے تل زمین پر گرا ہوا تھا۔ معاذ دیکھ سکتا تھا کہ اس کے دونوں ہاتھ اپنے پیٹ پر جس جگہ جھے ہوئے تھے، وہاں ایک ٹختر دسے تک کھسا ہوا ہے اور خون اس کی انگلیوں کے درمیان سے بہتا ہوا نیچے گر رہا ہے۔ چلنے والاؤ کی روشنی میں دکھائی دیتا یہ منظر خامیا بھانک تھا۔ معاذ کو کچھ کچھ بھگتے ہوئے معاذ نے اپنے ساتھی پر نظر ڈالی۔ وہ اسی کی جانب دیکھ رہا تھا۔ نظریں ملنے پر شاید اس نے مسکراتے کی کوشش کی لیکن شدید الیت کے باعث اس کے ہونٹ بس کچھ کراہ گئے۔ معاذ دوڑتا ہوا اس کے قریب پہنچا۔ وہ اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ ان کا گھوڑا بھی گولیوں کا نشانہ بنا کر گر چکا تھا اور زمین پر ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔ معاذ نے یہ مشکل اس کی زمین کے ساتھ بندھی پانی کی چھانگ نکالی اور لب دم لڑکے کے سینے پر پانی کی دھار گرائی۔ پانی کے چند قطرے اس کے منہ کے اندر گئے اور باقی پانی یوں ہی بہ گیا۔

معاذ کے دیکھتے ہی دیکھتے اس کے جسم نے ایک آخری جھٹکا لیا اور روح نفس غصری سے پرواز کر گئی۔ معاذ نے پانی پلانے کے لیے اس کے سر کو بائیں بازو کی مدد سے اوپر اٹھایا ہوا تھا۔ وہ زندگی کی بازی ہار گیا تو اس نے بھی ہارے ہوئے انداز میں اس کا سر آٹھنٹکی سے زمین پر رکھ دیا۔ اس جوان لڑکے کی موت نے اس کے اندر سکوت سا طاری کر دیا تھا۔ وہ لڑکا اس کا کوئی بھی تو نہیں تھا پھر بھی اس پر اپنی جان دار گیا تھا۔ صرف اس لیے کہ اس نے اسے بھفاعت یہاں سے نکال لے جانے کا فریضہ اپنے ذمے لیا تھا۔ فرض کی انجام دہی کے لیے بے مثل قربانی دینے والے اس لڑکے سے کیا کوئی سبق سیکھ سکتا تھا؟ کوئی سیاست دان، کوئی وزیر، کوئی قانون کا رکھوالا کوئی بیوروکریٹ۔ کون تھا ان میں سے جو اپنے مفاد کے حصول کے لیے عوام کے سامنے جھوٹے مہد اور قسمیں اٹھاتا ہو اس لڑکے کی طرح اپنا فرض پورا کرنے کی نیت رکھتا

مہربانی فرما کر بیسیں بلجیٹ کی جو 2020 کے لیے مزید کر پڑھی۔

چہ عادتیں

خلیفہ ہارون رشید نے لوگوں سے کہا کہ "نیک بننا چاہتے ہو تو بچوں جیسی عادتیں بنالو۔"
خلیفہ ہارون نے کہا کہ بچوں میں 6 ایسی عادتیں ہوتی ہیں اگر بڑے انہیں اپنائے تو سب دلی بن سکتے ہیں۔

- (1) رزق کا غم نہیں کرتے۔
- (2) مل کر کھاتے ہیں۔
- (3) لڑتے ہیں تو دل میں کینہ نہیں رکھتے۔
- (4) اپنے بڑوں سے ڈرتے ہیں۔
- (5) ذرا سی دھمکی ملے تو رو دیتے ہیں۔
- (6) مستقل دشمنی نہیں کرتے۔

مرسلہ: ڈی جادو شیخ - سکر

باتوں سے خوشبو آئے

☆ جب کوئی کام کریں تو اس کے لیے سوزوں دن یا وقت کا انتظام نہ کریں کیونکہ کام کرنے کے لیے ہر دن، ہر وقت سوزوں ہوتا ہے۔ (ترک ماہر تعلیم پروفیسر علی نقوی)

☆ تمہیں جس سے نفرت ہے اس سے ضرور ڈرتے رہو۔ (عرب ادیب عبداللہ سنبل)

☆ سرمائے کی منتقلی کا ایک طریقہ یہاں بھی ہے جو ایک کسٹرانک بینکاری سے بھی زیادہ تیز رفتور ہے۔ اسے شادی کہتے ہیں۔ (امریکی نقیاتی دان جیمز ہولٹ)

زاویہ نگاہ

☆ محبت کی عمارت میں قلب کی دروازہ بڑ جائے تو وہ معذرت کے گارے سے بھر تو سکتی ہے مگر نشان باقی رہتا ہے۔

☆ افراد اور اقوام، واقعات سے ہمیشہ اپنے مزاج کے مطابق سبق حاصل کرتے ہیں۔

☆ جو مخلوق سے فاصلے پر رہے وہ خالق سے کیونکر قریب رہ سکتا ہے۔

☆ غم کتنا ہی سنگین کیوں نہ ہو مگر غم سے پہلے نیک ہے۔

☆ اندھیرا آئے تو اندھیرے کو نہ سوچو، بلکہ چراغ جلاؤ، اس کے بعد اندھیرا خود بخود ختم ہو جائے گا۔
مرسلہ: محمد انور، ندیم، حویلی لکھا (ادکار ڈو)

تھا۔ پوری، بچی اور بچی نیت نہ سہی تھوڑی سی بچی بچی نیت ہی سہی۔ تو ایسے بے مثال کردار رکھنے والے لڑکے کی لاش کے کنارے معاذ سناکت بیٹھا تھا تو یہ کچھ ہیسا لڑکھا نہیں تھا۔ اسے تو یوں لگ رہا تھا کہ وہ اپنے ننگے بھائی کی لاش کے پاس بیٹھا ہوا لاکھ حقیقت یہ تھی کہ اسے اس لڑکے کا نام بھی ڈھنگ سے یاد نہیں تھا۔ فیضو چاچا اسے کچھ ایسے انداز میں پکارتے تھے کہ کبھی اسے جلال سٹائی دیتا تھا اور کبھی بداول۔ جانے دونوں میں سے کون سا جام ٹھیک تھا، اب کوئی معاذ کو بتانے والا نہیں تھا۔ معاذ کو ایسی کسی معلومات کے حصول میں دلچسپی بھی نہیں تھی۔ اس وقت تو وہ زخمی سنگرام سے بھی بے نیاز ہو گیا تھا اور اسے پروا نہیں تھی کہ سنگرام موقع کا فائدہ اٹھا کر قریب گری رائفل اپنے قبضے میں لے کر اس پر فائر کھول سکتا ہے۔ سنگرام زمین پر گر تو وہ وحشت زدہ سا اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اس کے لیے ایک منٹ بھی اس جگہ ٹھہرنا دو بھر ہو گیا تھا۔ اور گرد بکھری لاشیں، تازہ بہتے خون کی بواہر سسک سسک کر دم توڑتے سنگرام کی کراہیں..... سب چیزیں مل کر ایک دم اس کے حواس پر اثر انداز ہوئی تھیں اور ان سب سے دور چلے جانے کی خواہش میں وہ کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر اپنی جگہ سے حرکت میں آ گیا تھا۔ یہ وہی تھا جو ابھی چند روز پہلے ڈیرے پر لڑاکوؤں کے حملے کے وقت بے جگری سے لڑا تھا اور بعد میں بھی سٹائرین کو قتل و قتل دیتا رہا تھا۔ جیسا وہ تھا اس سے اس طرح کے رد عمل کی امید ہی نہیں کی جاسکتی تھی لیکن انسان سے زیادہ عجیب و غریب ذہن رکھنے والی کوئی دوسری مخلوق ہے بھی نہیں۔ انسان اتنی عجیب و غریب شے کا نام ہے کہ خود بھی اپنے آپ کو پوری طرح سمجھ نہیں سکتا۔ وہ کیرتھری رات کی تنہائی تھی، اور گرد بکھری لاشیں، خون کی بو بھی یا پھر سنگرام کی اذیت ناک کراہیں جنہوں نے معاذ کے قدم آگے بڑھائے۔ معاذ خود بھی کبھی اس بات کا فیصلہ نہیں کر سکا۔ بس وہ یہ جانتا تھا کہ اس کے اندر کسی وحشت نے جنم لیا تھا اور وہ رات کے اندھیرے میں کیرتھری کی ٹھوکریں کھانے تھا چل پڑا تھا۔

☆☆☆

بشری نے گاڑی روک کر سامنے لگے بورڈ کی طرف دیکھا۔ بورڈ پر انگریزی میں لکھے تاج بلی سیلون کے القاء جگہ رہے تھے۔ ابھی شام گہری نہیں ہوئی تھی اس کے باوجود بیلی سیلون کے اندر اور باہر کی ساری روشنیاں جل رہی تھیں۔ کھلی کے بڑھتے ہوئے زخموں سے غریب عوام کا خون خشک ہوتا ہے۔ تاج بلی سے میڈم تاج کا سطر ملے کرنے والوں کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ایسی ہستیاں اپنے

مہر بانی فرما کر سٹائٹسٹریٹسکی 2020ء جولائی کے لیے کر پڑھے۔

مہربانوں کے غفلت پر طرح کی زحمت سے بچی رہتی ہیں اور انہیں اس بات کی کوئی پروا نہیں ہوتی کہ ان کے حصے کاٹل کوئی رئیس اپنی جیب سے ادا کرتا ہے یا کسی صاحب اختیار اطہر کی کارنگری سے دوسرے صارفین کے حصے میں لگا دیا جاتا ہے۔ سو یوں تھا کہ سرشام میڈیم تاج کے بیوی سیلون کی ساری روشنیاں جلتی تھیں۔ بھروسے ٹھکرا لے بالوں والی بشری بالوں کی اوپننگ کی پانی ٹیل بنائے جدید تراش غراش کے ٹراؤز اور اوپننگ ٹیبلٹ میں بیوی سیلون کے پرس نکائے اپنی چھوٹی سی آٹو سے اتر کر اس بیوی سیلون میں جاری تھی۔ یہ آٹو اس نے کل ہی اپنے ملکیت کے ذریعے خریدی تھی۔ سیکنڈ ہینڈ تھی لیکن حفاظت سے استعمال کی گئی تھی اس لیے دیکھنے میں نئی محسوس ہوتی تھی۔ اپنی پرانی ایف ایکس کو اس نے سٹیک کے ہاتھوں ہی فروخت کر دیا تھا۔ زندگی بدل گئی تھی اس لیے کچھ دوسری چیزوں کا بدلنا بھی ضروری ہو گیا تھا۔ اچانک نے اسے شوکت کے محل کے بارے میں تو نہیں البتہ تاج اور باڈل کے بارے میں چند دوسری اہم معلومات فراہم کی تھیں اور ان معلومات سے کوئی فائدہ اٹھانے کا سوچ کر وہ یہاں چلی آئی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ سیلون کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ خواتین کے لیے مخصوص ہے اور دوسرے حصے میں حضرات کو خدمات فراہم کی جاتی ہیں۔

سیلون کا مرکزی دروازہ ایک ہی تھا لیکن اندر جا کر وہ دو ایس بائیں دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا تھا۔ بائیں حصہ مردوں کے لیے مخصوص تھا۔ بشری نے اپنے کالوں پر چند فری چمکائے ہوئے تھے اور موبائل کی اسکرین پر نظریں جمائے ہوں آگے بڑھتی جا رہی تھی جیسے اسے ارد گرد کے ماحول کی کوئی خبر ہی نہ ہو۔ وہ مردوں کے حصے میں جانے والے دھندلے گھاس ڈور کو کھول کر اندر داخل ہوئی تو پیچھے گیت پر موجود گارڈ نے اسے نگار کر اسے اس کی غلطی سے آگاہ کیا لیکن وہ خود کو کھنکھار کر گرتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ دروازہ کھلنے پر استقبال پر موجود سوجھ بوجھ ہونے والی لڑکی کو بھی اس نے اس انداز میں نظر انداز کر دیا اور کسی بے تحاشے تمل کی طرح اندرونی حصے میں گھسٹی چل گئی۔ استقبال پر موجود لڑکی بڑبڑا کر اپنی سیٹ سے اٹھتی اور اسے روک پانی، اس سے تمل ہی وہ ایک دروازے سے اندر داخل ہو چکی تھی اور یوں آنکھیں پٹیٹاتے ہوئے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی جیسے پہلی بار اپنے اطراف کے ماحول سے باخبر ہوئی ہو حالانکہ وہ پہلے ہی سے پوری طرح باخبر اور چمکی تھی اور اندر داخل ہوتے

ہی صرف شارٹ میں لمبوس آرام وہ کاؤچ پر لیٹے اس شخص کی تصویر کھینچی تھی جس کے بالوں بھرے ہاتھ پر ایک حسینہ کی انگلیاں متحرک تھیں اور خود وہ دوسرے ہاتھ کی انگلیوں پر اس حسینہ کی ترشی ہوئی زلفوں کو لپیٹ رہا تھا۔ بشری نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔ وہ ایک مشہور ڈراما آرٹسٹ تھا اور مختلف چینلز پر تو اتر سے چلنے والے ہر دوسرے ڈرامے میں ہیرو کے رول میں نظر آتا تھا۔ بشری نے تصویر بغیر غلطیش کے اور اتنی پھرتی سے کھینچی تھی کہ ہیرو صاحب اور اس کے ساتھ موجود لڑکی کو اندازہ بھی نہیں ہو سکا تھا۔

”سوری سوری۔ میں شاید بے خیالی میں غلط جگہ پر آ گئی ہوں۔“ اپنی آمد پر ان دونوں کے چہ کھنکے پر اس نے بولکھائے اور بیٹائے ہوئے لہجے میں معذرت طلب کی۔

”اے ملک سوجھ زنی ہم اس نے آپ کو اتنی آواز میں دیں پھر بھی آپ نے میری آواز نہیں سنی۔“ اسی وقت استقبال پر موجود لڑکی بھی اس کے پیچھے چلی آئی اور دبی دبی تنگی کا اظہار کرنے لگی۔ اس بیوی سیلون میں عموماً اوپننگ حیثیت کے لوگ ہی آیا کرتے تھے اس لیے بشری سے ٹھکانے کے باوجود وہ اس سے آواز بچی رکھ کر ہی بات کر رہی تھی۔

”سوری..... اچھے کلی میں اپنے فنانسی سے بات کر رہی تھی اس لیے مجھے اپنے آس پاس کا بانگل بھی دھیان نہیں تھا۔“ پھر سے پر شرمندہ سے تاثرات لاتے ہوئے اس نے نہایت معصومیت سے معذرت کی۔

”اے اس اوکے۔ آپ میرے ساتھ آئیں۔“ استقبال لڑکی نے اس بار بھی بس اخلاقیات ہی نبھائی ورنہ اس کا پس نہیں چل رہا تھا کہ بالوں سے کپڑا اسے باہر نکالتی۔ بشری کھسپائی فنی ہنستی ہوئی اس کے پیچھے چل پڑی۔

”سنو پو وہ تھے نا..... وہ مشہور ہیرو جو کسی کو کھٹ نہیں کرواتے۔ تم مجھے ایک چانس دو تو میں جلدی سے ان سے آؤ گراف لے کر آ جاتی ہوں۔“ وہ یوں اپنا پرس کھول کر اسے ٹوٹے لگی جیسے آؤ گراف لینے کے لیے کوئی معقول شے تلاش کر رہی ہو۔

”سوری ہم! وہ یہاں سکون سے ہماری سرومز لینے آتے ہیں، لوگوں کو آؤ گراف دیتے نہیں۔ آپ پہلے ہی انہیں ڈسٹرب نہ کیجیے، پینز اب اور نہیں۔“ بہتر ہو گا کہ آپ جس کام سے یہاں آئی ہیں اسے فوکس کریں۔“ لڑکی کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ بالکل اپنا غصہ ضبط کر رہی ہے۔ بشری نے اسے مزید زنج کرنا مناسب نہیں سمجھا اور جھنجھکی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

مہربانی فرما کر بیسیئر رکی ٹیویسٹ 2020 کے لیے خرید کر پڑھیے۔

ہزار ہا رہتا تھا جو کام کروانے کے دوران بے تحاشا منگھو کرتی تھیں۔ بشری کو بھی اس نے ان خواتین میں شمار کیا تھا لیکن بشری جب وہاں سے روانہ ہوئی تو اپنے بالوں کی سنہری رنگت سمیت حاصل شدہ معلومات سے بھی مطمئن تھی۔ باتوں باتوں میں وہ مہناز سے انجمنی خاصی دوستی کھانت چکی تھی۔ یہاں تک کہ اس کا موبائل نمبر بھی اس کے موبائل میں محفوظ ہو چکا تھا اور یہ نمبر اس کے بہت کام آسکتا تھا۔

☆☆☆

سورج کی روشنی منہ پر پڑی تو وہ آنکھیں کھولنے پر مجبور ہو گیا۔ وہ نیند نہیں تھی جس نے اسے آنکھیں بند کرنے پر مجبور کیا تھا، وہ تو انسان کی فطرت کے آگے ہار تھی جس نے اس کی آنکھیں بند کر دی تھیں۔ لاشوں اور کراہوں کے سچ سے عالم وحشت میں نکلنے کے بعد وہ بہت دیر تک کیرتھر کے اندر میروں میں بھٹکتا رہا تھا۔ کیرتھر کے دن کی طرح رات بھی بے رحم تھی۔ دن بھر آگ برساتے سورج نے جسم کو بھونا تھا تو رات ہڈیوں میں ٹھنڈک اتار رہی تھی۔ وہ دن بھر کے سفر سے تھکا ہوا تھا اور ڈاکوؤں کی اچانک آمد کی وجہ سے کھانا بھی پورا نہیں کھا سکا تھا، اس پر سے بارود اور خون کے کھیل نے بھی طبیعت کھل کر دی تھی، سو شکتہ جان اور شکتہ جسم کے ساتھ بہت دیر تک ٹھوکریں نہ کھا سکا اور ایک بار گر کر اتو ایسا گرا کہ اٹھنے کی سکت ہی نہیں رہی۔ یہ اصل میں قدرت کی اس پر مہربانی تھی کہ ان لمحوں میں اس سے قوت عمل چھین لی گئی تھی اور اپنی ٹوٹی پھوٹی حالت کے ساتھ وہ غنودگی میں چلا گیا تھا۔ نعمت کی طرح طاری ہونے والی اس غنودگی نے اس کے ذہن و جسم کو آرام کا موقع فراہم کر دیا اور جب وہ سورج کی قہارت سے جاگا تو اگرچہ بھوک اور پیاس کا احساس تھا لیکن جسمانی اور ذہنی حالت پہلے کے مقابلے میں بہت بہتر تھی۔ اس بہتر ذہنی حالت نے اسے فرار کے بجائے ہٹا کے بارے میں سوچنے پر مجبور کیا۔ اسے اچانک ہی ایک شب دیکھا گیا اپنا خواب یاد آیا۔ اپنے خواب میں وہ کسی بے رحم معرہ میں بھٹکتا رہا تھا اور اب غمزدہ بیابان پہاڑوں میں بھٹکنے کے لیے تنہا تھا۔

اسے یکدم ہی احساس ہوا کہ وہ جن حالات کے حصار میں پھنس گیا ہے وہ اس کا مقصود تھا اور وہ ان حالات سے کسی فرار کے ذریعے نجات حاصل نہیں کر سکتا۔ ان حالات سے نکلنے کے لیے اسے اپنی بقا کی جگہ لڑنی ہوگی۔ یہ جگہ اتنی طویل تھی فی الحال اسے اندازہ نہیں تھا لیکن یہ ضرور جانتا تھا کہ جگہ کے پہلے مرحلے میں اسے یہاں سے

اچانک ملی مجھے ہیئر ڈائی کروانا ہے۔ میری ایک فریڈ سز سونیا خان نے مجھے دیکھ کر کہا تھا۔“

”اس کے لیے آپ کو گیٹ سے اندر آکر رایت سائنڈ پر جانا پڑے گا۔ وہاں گھاس ڈور پر ریڈ کمر سے بڑا بڑا لیڈر لٹکا ہوا بھی ہے۔“ اس نے بشری کو اطلاع دی۔

”ہاں، وہ میں نے بتایا کہ میں اپنے فلیکس سے بات کر رہی تھی اور اس کی بات سننے کے چکر میں کسی طرف دھیان ہی نہیں دے سکی۔“ اس نے ایک بار پھر شرمندگی کا اظہار کیا اور باہر لکھ کر لیڈر کے لیے مخصوص حصے کی طرف بڑھ گئی۔ مردانہ حصے میں اسے کوئی خاص کام نہیں تھا اور وہ بس یہاں کے بارے میں سنی داستانوں کی تصدیق کے لیے اس طرف آنکھی تھی۔ اسے یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس نے جو تصویر کھینچی ہے، اس کا کوئی فائدہ بھی ہوگا یا نہیں۔ اس نے اپنی مٹھالیانہ دگ پھڑک جانے کے باعث یہ حرکت کر ڈالی تھی اور اب اس کام کو کرنے جا رہی تھی جس کے لیے یہاں آئی تھی۔

زمانہ حصے کے استقبالیہ پر اس نے اپنی آمد کا مقصد بتاتے ہوئے فرمائش کی کہ یہ سروس وہ صرف مہناز سے لینا پسند کرے گی، یہاں بھی اس نے بلا تکلف سونیا کا حوالہ استعمال کیا۔ یہاں آنے سے پہلے وہ سونیا سے بات کر کے آئی تھی اور اسے معلوم ہوا تھا کہ سونیا بھی اس بیوٹی سیلون سے استفادہ کرتی ہے اس لیے اس کا حوالہ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ اعجاز نے اسے جو معلومات فراہم کی تھیں، ان کے مطابق بیوٹی سیلون میں کام کرنے والی لڑکیوں میں سے کئی لڑکیاں وہ تھیں جن کے ذریعے میڈم تاج اپنا دھندا چلاتی تھی اور لڑکیوں کے ذریعے کسٹمرز کو ٹھہرا جاتا تھا۔ ایک نظارہ ابھی وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آ رہی تھی۔ اس دھندے سے تو اسے اتنی دلچسپی نہیں تھی لیکن مہناز میں دلچسپی لینے پر وہ اس لیے مجبور تھی کہ اعجاز نے اسے بتایا تھا کہ باڈل اس لڑکی میں دلچسپی رکھتا ہے اور باڈل کے حکم پر مہناز ہر اس جگہ پہنچنے کی پابند ہوتی تھی جہاں وہ اسے بلاتا تھا، یعنی مہناز کے ذریعے وہ باڈل تک پہنچ سکتی تھی چنانچہ مہناز سے تعلقی قائم کرنا ضروری تھا۔

کچھ دیر کے انتظار کے بعد حسب فرمائش مہناز اسے سروس فراہم کر رہی تھی۔ وہاں ایسے بہت سے کسٹمرز آتے تھے جو کسی مخصوص ایکسپریٹ سے ہی کام کروانا پسند کرتے تھے اس لیے اس کی فرمائش کسی کے لیے غیر معمولی نہیں تھی، نہ ہی مہناز نے اس کے خود سے کیے گئے ڈیروں سوالات پر کوئی تشویش محسوس کی تھی۔ اس کا ایسی خواتین سے واسطہ

مہربانی فرمائشیں بلایسٹرز کی حوصلہ کے لیے خرید کر پڑھیے۔ جولائی 2020ء

”اوہ... وہ... وہ پارا مل میں، میں ہاتھ روم منکر ہوں۔ تو میں ذرا سا متکنا رہا تھا۔“ اس نے بے ڈھنگے انداز میں ہنستے ہوئے وضاحت دی تو محاذ خاموش ہو گیا لیکن کچھ تھا جو اس کے ذہن میں آنکھ گیا تھا۔ اپنے اس شک پر اسے مزید سوچنے کا موقع نہیں ملا۔ تو یہ نے اس کا شانہ ہلاتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔

”وہ دیکھو، روشنیاں نظر آرہی ہیں۔ یقیناً کوئی گاڑی ہے، چلو جلدی سے سڑک کے بچ میں جا کر کھڑے ہو جاؤ۔“ محاذ اس کی ہدایت پر فوراً حرکت میں آ گیا۔ کوئی بھی کھنکھانے سے زیادہ اہم مسئلہ اس علاقے سے نکلنے کا تھا۔ وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ سڑک کی موجودگی کے باوجود یہاں سے بہت کم گاڑیاں گزرتی ہوں گی خصوصاً اندھیرا ہو جانے کے بعد، اس لیے اس آنے والی گاڑی کو روکنا بہت ضروری تھا۔ سڑک زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ دو عین درمیان میں کھڑا ہو کر زور و شور سے ہاتھ ہلانے لگا۔ روشنیاں قریب آئی گئیں۔ پتلی سی سڑک پر اتنی منجائش نہیں تھی کہ گاڑی چلانے والا اس سے پہلو کھڑا کر گزر جاتا۔ گاڑی کی رفتار دھیمی ہوئی اور زور زور سے ہاون بھا کر اسے سڑک سے ہٹ جانے کا اشارہ دیا گیا لیکن وہ نہیں ہٹا۔ اس کے ذہن میں دو ہی نکات تھے، اول یہاں سے نکلنے کے لیے اس گاڑی میں نفٹ لینا لازمی ہے، دوم کوئی شریف آدمی اسے نکر مار کر گاڑی آگے نہیں لے جاسکتا۔ وہ واقعی شریف آدمی تھا جس نے قریب پہنچ کر گاڑی روک لی لیکن اس دیرانے میں روکے جانے کے باعث وہ بدکا ہوا بھی تھا اور محاذ اس کے ہاتھ میں موجود گلوک گن دیکھ سکتا تھا۔ بے حد شائد ار گاڑی اور ضروری پیشانی سے وہ جس حیثیت کا آدمی ظاہر ہو رہا تھا، اس کے پاس گلوک بھی ہتھی گن کی موجودگی کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔

”کیا بات ہے؟ کون ہو تم اور کیوں ہمارا راستہ روکا ہے؟“ اکھڑ سے لہجے میں سوال کرتے ہوئے وہ کچھ پریٹن بھی لگتا تھا اور بہت چوکی نظروں سے ارد گرد کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے برابر میں فرنٹ سیٹ پر ایک نسوانی وجود بھی موجود تھا۔ اس نے گہرے عنائی رنگ کی کڑھائی والی جادر کچھ اس انداز میں اپنے گرد لپیٹ رکھی تھی کہ آنکھوں کے علاوہ کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا اور فی الحال تو محاذ کی اس کی طرف توجہ ہی نہیں تھی۔ وہ مرد کے پوچھے گئے سوالوں کے جواب دینا چاہتا تھا اور ابھی اس نے اس مقصد کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ تو یہ اندھیرے سے نکل کر

نہیں۔ بہر حال اندر مسرت کا ایک احساس ضرور تھا کہ زندگی بچنے کی ایک امید پیدا ہو گئی ہے۔

”تم میری بات سمجھ گئے ہو؟ چلو سڑک پر چلتے ہیں۔“ اس شخص نے محاذ کا کندھا پکڑ کر اسے ہلایا۔

”مجھے تو زور سا پانی اور پلا دو۔“ محاذ نے اس سے درخواست کی۔

”بس دو گھنٹ پینا۔ ایک دم سے بہت سا پانی پینا تمہارے لیے نقصان دہ ہو سکتا ہے۔“ اس نے نصیحت کرتے ہوئے پلٹ کر اسے تھمائی اور اس کے دو گھنٹ پیتے ہی اس کے ہاتھ سے پگھن لی۔ محاذ نے برا نہیں منایا۔ وہ اس کی بھلائی کے لیے ہی کہہ رہا تھا۔ چند گھنٹ پانی نے اس کی حالت کافی بہتر کر دی تھی۔ وہ اس شخص کی راہنمائی میں سڑک کی طرف چل پڑا۔ چلتے ہوئے اس کے قدم بری طرح ڈنگا رہے تھے لیکن تو یہ نامی اس شخص نے اسے سہارا دینے کی زحمت نہیں کی۔ اس جگہ سے سڑک دور نہیں تھی اس لیے وہ فوراً ہی وہاں تک پہنچ گئے۔

”تم دو منٹ یہاں ٹھہرو۔ میں ابھی آتا ہوں۔“ اپنی چھوٹی انگلی اٹھا کر مخصوص اشارہ کرتے ہوئے تو یہ ایک بڑے سے پتھر کی آڑ میں چلا گیا اور محاذ ایک نہبٹا چھوٹے پتھر پر تک کر ارد گرد کا جائزہ لینے کی کوشش کرنے لگا۔ اندھیرے کی وجہ سے منظر واضح نہیں تھا۔ تاروں کی مدھم روشنی میں سڑک اور آس پاس کا منظر بس ہیولوں کی صورت نظر آ رہا تھا۔ یہاں پہنچ کر تو یہ نے اپنی تارچ بھی بجھا دی تھی ورنہ اس کی روشنی میں ہی وہ کچھ دیکھنے میں کامیاب ہو جاتا۔ تارکی میں ادھر ادھر کا جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہوئے اسے ایسا لگا کہ کوئی دھیمی آواز میں باتیں کر رہا ہے۔ آواز اسی سمت سے آرہی تھی جہاں تو یہ گیا تھا لیکن اتنی واضح نہیں تھی کہ کوئی لفظ اس کی گرفت میں آ سکتا۔ تو یہ کس سے بات کر رہا ہے؟ اسے حیرت سی ہوئی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر دیکھنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ آواز آنا بند ہو گئی اور تو یہ تیز تیز چلتا اس کے قریب آ گیا۔

”تم کس سے بات کر رہے تھے؟“ محاذ نے اسے اکیلا پا کر سوال کیا۔ اس کے سوال پر تو یہ ذرا سا چوٹا پھر بولا۔

”میں کس سے بات کروں گا۔ یہاں بات کرنے کو ہے ہی کون؟“

”مجھے ایسا لگا کہ تم کسی سے بات کر رہے ہو۔ مجھے آواز سنائی دی تھی۔“ محاذ کو اپنی توجہ سماعت پر کوئی شک نہیں تھا۔

مہربانی فرمائیں بلیسرز کی حوصلہ کے لیے خرید کر پڑھیے۔ جون جولائی 2020ء

سڑک پر آگیا اور مرد سے مخاطب ہو کر نہایت شستہ انگریزی میں بولا۔

”زحمت کے لیے معذرت چاہتا ہوں! اصل میں میں جیولوجی کا اسٹوڈنٹ ہوں اور مطالعاتی دورے پر اپنے اس ملازم کے ساتھ اوپر پہاڑوں پر گیا تھا۔ وہاں ہمیں دیر ہوگئی اور ایک چھوٹا سا حادثہ بھی پیش آگیا جس میں میرا ملازم زخمی ہو گیا۔ راستہ بھول جانے کی وجہ سے ہم اپنے ریست ہاؤس واپس نہیں پہنچ سکے اور اس طرف آ گئے۔ اگر آپ ہمیں لفٹ دے کر کسی مناسب جگہ تک پہنچا دیں تو میں متعلقہ لوگوں سے رابطہ کر کے اپنے لیے مدد سٹکوا لوں گا۔ آپ خود بھی اندازہ کر سکتے ہیں کہ رات بھر جبکہ ٹھنڈک بھی اچھی خاصی ہو رہی ہے، ہم اس دیر آنے میں نہیں رہ سکتے۔ آپ کی یہ مدد ہمارے لیے ایک بہت بڑا احسان ہوگی۔“

تھوڑے کے مہذب لہجہ اور انگریزی زبان کے استعمال نے کام دکھایا اور مرد کے چہرے کا تناؤ کم ہو گیا۔ اس بار وہ بولا تو اس کے لہجہ میں نرمی تھی۔

”ٹھیک ہے، میں تم لوگوں کو لفٹ دے دیتا ہوں۔ تم میرے ساتھ میری حویلی چلو، وہاں آرام سے رات گزارو۔ صبح میں تمہاری واپسی کا انتظام کروں گا یا جس کا تم مناسب سمجھو۔“ اس نے بھی انگریزی زبان کا استعمال کیا تھا اور بااخلاق لہجے میں بولتے ہوئے گاڑی کے پچھلے دروازے ان لاگ کر دیے تھے تاکہ وہ دونوں پچھلی نشستوں پر بیٹھ جائیں۔ ان دونوں نے بیٹھنے میں ذرا تامل نہیں کیا۔ معاذ تو نشست پر ڈھیر سی ہو گیا۔ اس کی حالت بہت خراب ہو رہی تھی۔ بھوک، پیاس، تھکن، اعصابی تناؤ سب نے مل کر اسے بے حد شکستہ کر دیا تھا۔ ایک ٹکڑی گاڑی میں اپنی دنیا کے آدمیوں کے درمیان بیٹھا وہ پہلی بار یہ اطمینان محسوس کر رہا تھا کہ اب اسے زیادہ دیر اپنے گھر والوں کی جدائی نہیں سہتا پڑے گی اور جلد وہ اپنوں کے درمیان موجود ہوگا۔ اطمینان کی یہ کیفیت اسے آرام پر اکسا رہی تھی اور وہ آنکھیں بند کر کے پشت گاہ سے اپنے سر ٹکا چکا تھا۔ گاڑی دوبارہ حرکت میں آ چکی تھی اور نہایت سبک رفتاری سے سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ گاڑی چلانے والا مرد اب بھی انگریزی زبان میں ہی تھوڑے سے مخاطب اس سے کہہ رہا تھا۔

”آپ خوش قسمت ہیں کہ رات کے وقت اس جگہ آپ کو لفٹ مل گئی۔ رات کے وقت اول تو یہاں سے بہت کم گاڑیاں گزرتی ہیں، دوسرے کوئی کسی کو لفٹ دینے کا

نہیں سوچ سکتا۔ ان راستوں پر ڈاکوؤں کا بہت زیادہ خطرہ رہتا ہے اس لیے سفر کرنے والوں کو بے حد احتیاط کرنی پڑتی ہے۔ میں بھی بس اتفاقاً قافلی اس وقت سفر کر رہا ہوں۔“

”اتفاق اور مجبور یاں انسان سے بہت کچھ غلاف معمول کروا لیتی ہیں۔“ تھوڑے نے فلسفیانہ لہجے میں اس کی بات پر تبصرہ کیا۔ جواب میں مرد وہی آواز میں ہنسا اور ہنستے ہوئے ہی بولا۔

”جی ہاں، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اب اس اتفاق کو ہی دیکھیے کہ ہم ایک دوسرے سے اتنی باتیں کر رہے ہیں اور میں ایک دوسرے کا نام تک معلوم نہیں۔“

”کوئی بات نہیں۔ جب ہم لمبے عرصے کے لیے ساتھ رہیں گے تو ایک دوسرے کے بارے میں بہت کچھ جان جائیں گے۔“ تھوڑے کے لہجے میں عجیب سی بات تھی۔ گاڑی چلاتے ہوئے مرد چونکا۔

”کیا مطلب؟“ حیرت سے پوچھتے ہوئے اس نے تھوڑے کی طرف دیکھنے کی کوشش بھی کی تھی۔ آنکھیں بند کیے خاموشی سے ان کے درمیان جاری گفتگو کو سنتے ہوئے معاذ نے مگن چہرہ کر آنکھیں کھول دی تھیں اور پھر ان دونوں ہی نے ایک وقت دیکھا تھا کہ تھوڑے کے ہاتھ میں ایک لمبی نال والا پتیل ہے جو اس نے آگے ٹھٹھی عورت کے سر سے لگا دیا ہے۔ وہ پچھلی نشستوں پر اس ترتیب سے بیٹھے تھے کہ معاذ ڈرائیونگ سیٹ کے پیچھے تھا اور تھوڑے عورت والی سیٹ کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔

”یہ کیا بے ہودگی ہے؟“ پتیل دیکھ کر مرد فرمایا۔

”بے ہودگی نہیں اسے ممدہ پلاننگ کہتے ہیں معتمد شاہ! اب تم گاڑی میری ہدایت کے مطابق چلاؤ گے اور میرے ساتھ ہمارے ٹھکانے پر چل کر اس وقت تک اپنی بیوی کے ساتھ ہمارے مہمان رہو گے جب تک تمہارا باپ تمہارے بدلے ہمیں من مانگا تالا ان نہیں دے گا۔“ تھوڑے کا لہجہ مکمل طور پر بدل چکا تھا۔

”یہ سب کیا ہے مسٹر اقم نے تو کہا تھا کہ تم اسٹوڈنٹ ہو اور اب تم کڈ پیپرینا گئے ہو۔“ اس صورت حال میں معاذ خود کو بولنے سے نہ روک سکا۔

”منہ بند کر کے بیٹھو ورنہ ابھی چلتی گاڑی سے دھکا دے دوں گا۔ میں نے تمہاری مدد اس لیے کی تھی کہ تم میرے کام آ سکو۔ میرے کام میں رکاوٹ بنے تو پہلے تمہارا ہی دی اینڈ کروں گا۔“ اب تھوڑے اردو میں بات کر رہا تھا اور اس کا لہجہ بہت خوفناک ہو چکا تھا۔ معاذ خوف زدہ تو نہیں ہوا

مہربانی فرمائیے بلینسرز کی خواہش کے لیے خرید کر پڑھیے۔ جون جولائی 2020ء

انداز اور دھیمے لہجے میں کھنگو کر اس کی مجبوری تھی۔

”ٹھیک ہے، تمہارے دونوں میں چلے جانا۔ ہم بھی اس سلسلے میں بہت کچھ سوچ رہے تھے، ارادہ ہے کہ اپنی پارٹی کے کسی بڑے وزیر سے اوپننگ کروائیں گے تاکہ مارکیٹ میں شروع ہی سے لوگوں کو تمہاری اہمیت کا اندازہ ہو جائے۔ صداقت شاہ کا خاندان زمین داری سے صنعت کاری کی طرف جا رہا ہے تو ذرا دھوم دھام سے یہ کام ہونا چاہیے۔“ خرم دو بیجھ موٹے پردھنے بیٹھے، دو اب بھی ٹی وی کی اسکرین پر ہی نظر میں جمائے ہوئے تھے لیکن عالم شاہ سے کھنگو کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ عالم شاہ نے ایک کینہ تو نظر ٹی وی کی اسکرین پر ڈالی جہاں ایک سوئٹ بونڈ اینکر پرسن ٹاک پر ٹیس سی ٹیک لگائے ڈرامائی سے انداز میں جانے کون کون سے انکشافات، تبصرے اور تجزیے کرنے میں مصروف تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ یہ اینکر پرسن اس کے باپ کی پارٹی کا کوئی ٹمک خوار ہوگا اور اپنے پروگرام میں ان کی پارٹی کے مافکین میں سے کسی کی اس خوبی کے ساتھ گفتگو سے پھینکی لگا رہا ہوگا کہ دیکھنے اور سننے والوں کو اس کی جانب داری کا ذرا بھی اندازہ نہیں ہو سکے گا۔ نشر ہونے والے اس قسم کے ٹاک شو میں ایسے داری کی ڈنگ کی پرماتے عوام کو بے وقوف بناتے رہتے تھے۔

”مجھے آپ کے کسی پروگرام سے اختلاف نہیں ہے لیکن اب آپ مجھے کراچی جانے کی اجازت دے دیں۔ آپ کی خواہش پر میں اتنے دنوں سے یہاں ہوں لیکن اب میں یور ہو چکا ہوں اور میرے لیے وقت کا ناقصا مشکل ہو گیا ہے۔ اگر آپ کو یہ ڈر ہے کہ میں وہاں دلچسپ جا کر دوبارہ اپنے دوستوں سے رابطہ کروں گا تو بے فکر رہیے، میں ایسا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ جو کچھ ہو چکا ہے، اس کے بعد میں اس لائق ہی نہیں رہا ہوں کہ اپنے دوستوں کے سامنے جا کر ان سے فخر میں ملا سکوں۔ یوں بھی اب بچا ہی کون ہے؟“ یہ سب بولتے ہوئے عالم شاہ کی آنکھوں میں سرخی سی آگئی تھی۔ اسے لاکھ بے خبر رکھنے کی کوشش کی جاتی، ٹیلی ویژن اور اخبارات کے ذریعے خبریں اس تک پہنچتی ہی گئی تھیں۔ جن میں کی موت اور بشری پر پتی قیام میں سب اس کے علم میں آچکا تھا لیکن باپ کے حکم کی تعمیل میں وہ گاؤں میں ہی رہنے پر مجبور تھا۔

”کب جانے کا ارادہ رکھتے ہو؟“ صداقت شاہ نے اس سے پوچھا۔

”میں جی راناہ ہو جاؤں گا۔“ اس نے انہیں آگاہ کیا۔

لیکن خاموش ہو گیا۔ اس وقت کوئی حرکت کرنا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ خاتون کے سر سے ٹکی پٹل کی ٹال سے گولی نکل جاتی تو نقصان لازمی تھا۔

”تم بہت غلط بندے پر ہاتھ ڈال رہے ہو۔ تمہاری یہ حرکت تمہیں بہت مہنگی پڑے گی۔“ معتمد شاہ نے سرد لہجے میں خور کو مخاطب کیا۔

”سنئے کام کرنا ہمیں پسند بھی نہیں ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تم دونوں کی زندگیوں بہت مہنگی ہیں اس لیے ہم نے تمہارا انتخاب کیا ہے۔“ خور آسودہ سے انداز میں ہنسا اور معتمد شاہ کو حکم دینے کے انداز میں بولا۔

”آگے جا کر بائیں جانب ایک موڑ آ رہا ہے، گاڑی وہاں سے موڑ لیجا۔“

”اگر میں ایسا نہ کروں تو؟“ معتمد شاہ نے ہٹ دھرمی دکھانے کی کوشش کی۔

”میرا نہیں خیال کہ تم اپنی بیوی اور ہونے والے بچے کی زندگیوں کو اتنا پسند کر دو گے۔“ خور کا لہجہ مکارانہ تھا۔ معتمد شاہ دانت بھینچ کر رہ گیا۔ خور کی مصلحت نے اس پر ثابت کر دیا تھا کہ وہ واقعی بہترین پلاننگ کے ساتھ کام کر رہا ہے۔ ادھر خور کے ساتھ بیٹھے سدا کا بھی سارا اطمینان اڑن چھو ہو چکا تھا۔ وہ جو سوچ رہا تھا کہ جلد انہوں کے درمیان پہنچ جائے گا، اب یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ آسمان سے گر کر مجبور میں انک چکا ہے۔

☆☆☆

”میں کروہی جانا چاہتا ہوں بابا! میں۔“ عالم شاہ نے باپ کے سامنے اپنی خواہش بیان کی۔

”کیوں بابا! کیوں جانا ہے کراچی۔ کوئی کام ہے ادھر؟“ صداقت شاہ نے بے نیازی سے سوال کیا۔

”آپ جانتے تو ہیں کہ میرا ادھر کیا کام چل رہا ہے۔“ عالم شاہ کا لہجہ شکایتی سا ہو گیا۔

”اس کی کیا فکر ہے بابا! بہت بندے ہیں کام دیکھنے کو۔ تم نہیں بھی گئے تو کام ہوتا رہے گا۔“ صداقت شاہ کی بے نیازی میں کوئی فرق نہیں پڑا اور نظر میں یوں ٹی وی کی اسکرین پر مرکوز کر لیں جیسے عالم شاہ سے کسی غیر ضروری موضوع پر کھنگو ہو رہی ہو۔

”آپ خود ہی تو کہتے ہیں کہ کام کرنے کو لاکھ بندے ہوں لیکن آدمی کو نظر خود رکھنی چاہیے۔ میں ان اختتامی مراحل میں خود وہاں رہنا چاہتا ہوں۔“ وہ مزاح کا قدرے تیز تھا لیکن اس وقت مخاطب اس کا باپ تھا اس لیے خرم

مہربانی فرما کر پبلیشر کی خوش آمدید 2020ء جولائی کے لیے کرپڑھیے۔

"ٹھیک ہے، چلے جانا لیکن یاد رکھنا کہ تمہیں صرف اپنے کام سے کام رکھنا ہے۔ ہم کسی پرانی جنگ میں اپنے اکھوتے بیٹے کو نہیں جھونک سکتے۔" اسے اجازت دیتے ہوئے انہوں نے تسخیر کرنا ضروری سمجھا۔

"جی بہتر۔" دورو کے سے لہجے میں جواب دے کر کھڑا ہو گیا۔ سونے کے لیے اپنے کمرے میں جانے سے قبل وہ ڈرائیج ر کے لیے ملی الصباح روٹنگی کی تیاری کے احکامات جاری کرنا نہیں بھولا تھا۔ اس رات اپنی آمد کے بعد سے شاید پہلی بار اسے ڈھنگ کی نیند آئی۔ وہ بہت گہری نیند میں تھا جب دروازے پر ہونے والی زوردار دھچک نے اسے جاگنے پر مجبور کر دیا۔ ہنسنے آٹھنکس کھول کر اس نے دھچک دینے والے کو اندر آنے کی اجازت دی۔ وہ ایک ملازم تھا جس کے چہرے پر ہوائیاں اندر ہی تھیں۔

"کیا بات ہے؟" اس نے اکھڑ لہجے میں دریافت کیا۔ "معافی چاہتا ہوں سائیں، پر مجبوری تھی۔ وڈی سائفرن نے آپ کو بلوایا ہے۔" ملازم نے ہاتھ جوڑ کر معذرت کرتے ہوئے اسے پیغام دیا تو وہ حیران رہ گیا کہ اتنی رات گئے اماں سائیں نے اسے کیوں بلوایا ہے۔ ملازم کے چہرے پر اڑتی ہوائیاں بھی اسے کئی لمحہ معمولی بات کا پتا دے رہی تھیں لیکن اس نے ملازم سے تحقیق و تفتیش میں وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور اماں کا پیغام ملتے ہی فوراً بستر چھوڑ کر ان کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ اس طرف جاتے ہوئے اس نے ماں کی تیز سسکیاں سنی اور دیکھا کہ وہ مسہری کی پشت کا دے کے ساتھ رکے ٹکیوں کے سہارے نیم دراز بری طرح آنسو بہا رہی ہیں اور ان کی خاص ملازمہ کے ساتھ ساتھ اس کی چھوٹی بہن مول بھی انہیں سنبھالنے اور دلا سے دینے میں مصروف ہے۔ یکدم ہی اس کا ذہن صداقت شاہ کی طرف گیا۔ جب سے وہ دل کی تکلیف میں مبتلا ہوئے تھے، ان کی طرف سے دل کو دھڑکا سا لگ گیا تھا۔ وہ اس پر بھی کبھار بہت زیادہ اپنی مرضی چلاتے تھے لیکن دو روپے لیے ان کی بے پناہ محبت سے بھی واقف تھا اس لیے بھی ان کی طرف سے دل میلا ہوا تھا، نہ ان سے محبت میں کمی آئی تھی۔ اب بھی ان کے حوالے سے دل میں اندیشہ جاگتا تو دل کو کسی نے تسکین میں بھیج دیا ہے۔

"عالم! ہم برباد ہو گئے پُت! ہم لٹ گئے۔" وڈیرن نے اسے دیکھتے ہی دہائی دی اور مسہری سے اتر کر اس کی طرف بڑھنے کی کوشش کرنے لگی۔ عالم شاہ ماں کا مقصد سمجھ گیا اور خود لپک کر ان کے قریب پہنچ کر دونوں

ہاتھوں سے ان کے شانوں کو تھاما۔ وہ فوراً ہی اس سے لپٹ کر بلند آواز میں رونے لگیں۔ ان کے قریب کھڑی مول کی آنکھوں سے بھی آنسو گرنے لگے۔

"بابا سائیں..... بابا سائیں کہاں؟" متوحش سا عالم شاہ اپنا جملہ مکمل نہیں کر سکا تھا کہ اس نے صداقت شاہ کی آواز سنی۔ وہ کسی سے سو بائیں پر بات کرتے ہوئے اندر آ رہے تھے۔ انہیں صبح سلامت دیکھ کر جہاں عالم شاہ کے رہنے سے ایک اطمینان بھری سانس خارج ہوئی، وہاں انہیں میں بھی اضافہ ہو گیا کہ پھر آخر ایسا کیا ہوا ہے جو ماں اتنی بری طرح رو رہی ہے اور سب گھبرائے ہوئے اور پریشان ہیں۔ یہاں تک کہ اسے صداقت شاہ کے چہرے پر بھی بے پناہ پریشانی کے تاثرات نظر آ رہے تھے اور یوں لگتا تھا کہ کسی نے ان کے چہرے کا سارا خون نچوڑ لیا ہو۔

"خیریت تو ہے بابا سائیں! مجھے بھی تو بتائیں کہ کیا ہوا ہے؟" اس نے ان سے دریافت کیا۔ "بہت بری خبر ہے پُت۔ بہت بری خبر۔" اسے جواب دیتے ہوئے ان کا لہجہ بے حد قہر تھا۔ بے حد پریشانی کے عالم میں انہوں نے اسے جو اطلاع دی، اسے سن کر وہ بھی سانس رو گیا۔ بھلا ایسا کیسے ہو سکتا تھا؟ وہ خبر سن کر بھی بے چین تھا۔

☆☆☆

معظم شاہ نے غور کے حسب ہدایت گاڑی آنے والے موڑ سے بائیں طرف لے لی تھی۔ یہاں باقاعدہ سڑک نہیں تھی، بس کچا کچا سا ایک راستہ تھا جو وہ معظم شاہ کی شاندار گاڑی میں آسانی سے طے کرتے چلے جا رہے تھے۔ ابھی انہوں نے اس راستے پر چند گز کا قافلہ ہی طے کیا تھا کہ سامنے جتنو سے چپکتے دکھائی دیے۔ لمحے بھر میں ہی اندازہ ہو گیا کہ اصل میں وہ دو عدد گاڑیاں ہیں جنہیں دھتے دھتے سے جلا یا بجھا یا جا رہا ہے۔

"گاڑی روک لو۔" ان جلتی جھپتی روشنیوں کو دیکھتے ہی غور نے حکم صادر کیا۔ معظم شاہ کے پاس اس حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ غصے اور بے بسی سے دانت چپکتے ہوئے اس نے گاڑی روک لی۔ فوراً ہی چار نقاب پوش گاڑی کے قریب چلے آئے۔ ان چاروں کے ہاتھوں میں جدید ساخت کی رائفلیں موجود تھیں جن کا رخ ان لوگوں کی طرف ہی تھا۔

"ڈیویری لے لو یا ر! بڑا تھک گیا ہوں۔ صبح پھر مجھے روانہ ہونا ہے۔" نقاب پوشوں سے مخاطب غور کا انداز

مہربانی فرما کر بلشیئر کی سروس، جون، کچھ لائی 2020 کے لیے خرید کر پڑھیے۔

مٹنگو ایسا تھا جیسے وہ انسانوں کے بجائے کسی تجارتی سامان کی بات مٹنگو کر رہا ہو۔

”یہ تیسرا بندہ کون اٹھالائے ہو؟“ نقاب پوشوں میں سے ایک نے پچھلی نشست پر براجمان معاذ کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”یہ بس ایسے ہی ہاتھ آگیا اور بڑے کام آیا۔ اسے بھی اپنے ساتھ ڈیرے پر لے چلو اور دیکھ لو کہ کام کا بندہ ہے یا نہیں۔“ خور نے معنی خیز لہجے میں پوچھتے جانے والے سوال کا جواب دیا اور خود گاڑی سے نیچے اتر گیا۔

”تم تینوں بھی نیچے اترو۔“ خور سے سوال کرنے والے نقاب پوش نے اکھڑ لہجے میں انہیں حکم دیا جس کی انہیں تعمیل کرنی پڑی۔

”آنکھوں پر پٹیاں باندھ دے چاچے۔“ نقاب پوش نے اپنے ایک ساتھی کو حکم دیا تو وہ محل کے لیے آگے بڑھا۔ ”میری بیوی کو کوئی ہاتھ نہیں لگائے گا۔“ معظم شاہ اپنی جانب تکی ہوئی رانٹلوں کے باوجود غرانے کے انداز میں بولا۔

”سامیہ کی غیرت جوش مار رہی ہے۔ چنگ ہے، مرد میں غیرت ہوتی بھی چاہیے۔ اپنے انگوں کو بھی دھیان دلا دینا کہ ان کی عزت ہمارے ہاتھ میں ہے اس لیے ہماری بات مانتے میں کوئی چوں چہ اس نہ کریں۔“ وہی نقاب پوش قہقہہ لگا کر بولا جو اب تک ان سے مٹنگو کر رہا تھا۔ معظم شاہ اس کی بات کے جواب میں کچھ نہیں بولا اور صرف ہونٹ ہچکچا کر رہ گیا۔

”یہ لو۔ تم خود اپنے ہاتھ سے اپنی زال کو اپنی باندھ دو۔“ چاچے کے نام سے مخاطب کیے گئے بندے کے ہاتھ سے ایک پٹی لے کر اس نے معظم شاہ کی طرف بڑھائی تو معظم شاہ نے اسے سخت نظروں سے گھورا مگر وہ لیکن پٹی لے لی اور اپنی بیوی کی آنکھوں پر باندھنے لگا۔ بڑی سی چادر کے حصار میں لیٹی وہ بالکل خاموش تھی۔ خور کے پسٹل کی ٹال اپنے سر پر نکلے ہونے کے دوران بھی اس نے اسی خاموشی اور سکون کا اظہار کیا تھا۔ مگر وہ خوف زدہ تھی بھی تو اس کے کسی رویتے سے اس بات کا اظہار نہیں ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں پر پٹی باندھنے جانے کے دوران معاذ کی آنکھوں پر بھی پٹی باندھ دی گئی تھی۔ یہی مثل معظم شاہ کے ساتھ بھی دہرایا گیا۔

”آگے بڑھو۔“ نقاب پوشوں کو لپڑ کرنے والے نے اپنی رانٹل سے معاذ کے پہلو میں قبضہ کا دیا تو وہ لڑکھڑاتا ہوا

آگے بڑھا۔ بھوک و پیاس نے جو حالت خراب کی تھی وہ اپنی جگہ تھی لیکن اب وہ چلنے میں بھی خاصی تکلیف محسوس کر رہا تھا۔ پیازوں پر فوکر میں کھاتے ہوئے اس کے جوتے جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے اور نڈھی ہو جانے والے پیروں پر سو جن چڑھ گئی تھی جس کی وجہ سے جوتا پیروں میں جھک ہو کر مزید تکلیف کا باعث بن رہا تھا۔ اچھی بات یہ ہوئی کہ اسے چند قدم سے زیادہ نہیں چلنا پڑا اور ایک دوسری گاڑی میں بخار یا گیا۔ آدازوں سے اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ معظم شاہ اور اس کی بیوی کو بھی اسی گاڑی میں سوار کروایا گیا ہے۔ معظم شاہ کا موہاٹل اور کن خور راہیتے میں ہی لے چکا تھا۔ اس دوسری گاڑی میں بٹھانے سے قبل ہاتھ دھوا بھی لی گئی جس پر معظم شاہ نے ہلکا سا احتجاج کیا اور ساتھ ہی تھپتھپ بھی کی کہ اس کی بیوی کی تلاشی نہ لی جائے۔ اس کا یہ مطالبہ مان لیا گیا۔ ایک عورت کی طرف سے انہیں کسی ہتھیار وغیرہ کی موجودگی کا غرضہ بھی نہیں ہوگا۔ معاذ کی محنت حالی دیکھ کر اس کی بھی زیادہ اچھی طرح تلاشی نہیں لی گئی تھی اور جسم کے مختلف حصوں پر ہاتھ مار کر صرف اس بات کا اطمینان کیا گیا تھا کہ اس کے پاس کوئی ہتھیار تو موجود نہیں ہے۔ اس کے پاس ہتھیار نہیں تھا۔ یعنی کا بائیس بور کا ریل اور وہ اسی مقام پر ٹرا آیا تھا جہاں اس کی اپنے ساتھی کے ساتھ ڈاکوؤں سے ٹکرائی ہوئی تھی۔ وہ بالکل خالی ہاتھ تھا اور اس کے پاس اپنی گھیر دار شلوار کی جیب میں موجود فیضو کے وہیے چند تھانف کے سوا کچھ بھی موجود نہیں تھا۔ چند چھوٹی پڑیوں میں موجود سطوف وغیرہ دیکھنے میں ایسی چیزیں تھیں کہ اگر ان لوگوں کو اس کے پاس ان چیزوں کی موجودگی کا علم ہو جاتا، تب بھی مسترض نہ ہوتے۔ بہر حال تلاشی میں وہ چیزیں سامنے ہی نہیں آئی تھیں اور انہیں گاڑی میں بٹھانے کے بعد ایک بار پھر سفر کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

منفرطوں تھا اور بیٹھے بیٹھے ہاتھیں شل ہونے لگی تھیں۔ معاذ کو معظم شاہ کی بیوی کا خیال آیا۔ خور نے اس کے حاملہ ہونے کا ذکر کیا تھا۔ ایسی حالت میں اعصابی تناؤ اور یہ طویل سفر اس کے لیے باعث تکلیف ہوتا لیکن اس کی طرف سے کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ عجیب ہی عورت تھی جو ان حالات میں عام عورتوں کی طرح کوئی رد عمل ظاہر ہی نہیں کر رہی تھی۔ خوف، تکلیف، غصہ کچھ بھی تو اس کی طرف سے ظاہر نہیں کیا گیا تھا۔ کسی عورت کی طرف سے اتنی مکمل خاموشی کا مظاہرہ وہ پہلی دفعہ دیکھ رہا تھا اور اب تو اسے شک ہونے لگا تھا کہ کہیں وہ عورت کوئی ہی نہ ہو۔ ویسے اس

مہر بانی فرما کر بیسی روز کی خوشی کے لیے کرید کر پڑھیے۔ جولائی 2020ء

صورت حال میں کچھ بولنے کا فائدہ بھی نہیں تھا۔ معظم شاہ نے کئی بار یہ کوشش کر کے دیکھ لی تھی۔ وہ جانتا چاہتا تھا کہ وہ لوگ اس کے باپ سے کیا مطالبہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس نے انہیں پشیمانی کی بھی کراہی دے دی کہ اگر وہ اس کی اس کے باپ سے بات کروادیں تو وہ ابھی انہیں ان کی مطلوبہ رقم بھیجے پر راضی کر لے گا لیکن اسے کوئی جواب نہیں دیا گیا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے جھٹلا کر طیش میں دو چار گالیاں بھی دے ڈالی تھیں۔ تب بھی انہیں لے جانے والے خاموش رہے تھے۔

تھک ہار کر معظم شاہ کو بھی خاموشی اختیار کرنا پڑی تھی۔ خاموشی اتنی کامل تھی کہ باہر کی بھی کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی تھی کہ وہ ۱۰۰ یوانوں میں سفر کر رہے تھے یا پھر یہ تھا کہ گاڑی گیس پور پر بند ہو کر پورے ہوئی تھی۔ معاذ کو اپنا یہ دوسرا خیال ہی زیادہ درست لگ رہا تھا۔ وہ پرانے میں بھی کوئی نہ کوئی آواز تو سنائی دے جاتی ہے، چاہے کسی جانور کی ہی آواز ہو لیکن وہاں کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ اس جگہ نے طبیعت میں بیزاری سی پیدا کر دی تھی۔ بوریٹ اور بیزاری جسمانی نقصان کے ساتھ طیش تو معاذ آہستہ آہستہ غمزدگی میں چلا گیا۔ کتنی دیر سو یا اسے خود بھی اندازہ نہ ہو سکا۔ کندھا زور سے جھنجھوڑے جانے پر اس کی آنکھ کھلی لیکن آنکھ کھلنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا۔ آنکھوں پر اب بھی پٹی بندھی ہوئی تھی اور وہ کچھ بھی دیکھنے سے قاصر تھا۔

”باہر نکلو۔“ کسی نے سخت لہجے میں کہتے ہوئے اسے ٹھوکا دیا تو اسے احساس ہوا کہ گاڑی رکی ہوئی ہے یعنی وہ اپنی منزل تک پہنچ چکے تھے۔ اپنی اکڑی ہوئی ٹانگوں کو حرکت میں لا کر گاڑی سے اترنے میں اسے تھوڑی سی دقت ہوئی اور جب زمین پر قدم جما کر سیدھا کھڑا ہوا تو پورے جسم میں درد کی لہری دوڑ گئی۔ غصہ اور تکلیف کے آپس میں ملنے سے اسے جگر سا آگیا لیکن اپنی مضبوط قوت و ارادی کے باعث وہ خود کو سنبھالنے میں کامیاب ہو گیا۔ آنکھوں پر بدستور بندھی پٹی اسے سمیت انہیں اس جگہ سے آگے بڑھایا جانے لگا۔ کچھ نظر نہ آنے کے باوجود محسوس ہو رہا تھا کہ اب وہ کسی عمارت میں ہیں۔ تھوڑا سا چلنے کے بعد انہیں سیزمیاں اترنے کے سلسلے میں ہدایت دی گئی، یعنی اب وہ کسی تہ خانے میں لے جائے جا رہے تھے۔ سیزمیاں اترنے کے بعد وہ تہ خانے کے کسی کمرے میں لے جائے گئے اور ان کی آنکھوں سے پٹیاں اتار دی گئیں۔ وہاں روشنی تھی۔ بہت دیر آنکھوں پر پٹی بندھی

رہنے کے باعث آنکھیں چندھیا گئیں۔

”اُدھر ہاتھ روم موجود ہے۔ تم میں سے جس کو ضرورت ہو اسے استعمال کر سکتا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں تم لوگوں کے لیے ناشا آجائے گا۔“ نقاب پوش رائل برادر تعداد میں اب دوسری رو گئے تھے۔ ان میں سے ایک نے ان تینوں کو اطلاع دی اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کا ساتھی دروازے کے قریب ہی رائل تانے بالکل چوکتا کھڑا تھا۔

”میری کسی سے بات کرواؤ۔ میں یہاں تمہارے ناشتے کھانے کی دعوتیں اینڈ کرنے کے لیے نہیں رہ سکتا۔ مجھے اپنی جہی کے ساتھ یہاں سے واپس جانا ہے۔“ معظم شاہ نے غصیلے لہجے میں پکار کر اس شخص سے کہا۔

”صبر سنا میں صبر... ایسے معاملات اتنی جلدی میں طے نہیں ہوتے۔ ابھی آپ کو ادھر ہی رہنا پڑے گا اس لیے بہتر ہے کہ میری بات مانو اور تھوڑا کھاپی کر آرام کرو۔“ اس شخص نے مڑ کر زری سے معظم شاہ کو جواب دیا اور باہر نکل گیا۔ دروازے کے قریب کھڑا اس کا ساتھی بھی اگلے قدموں باہر نکل گیا اور باہر نکل کر پھرتی سے دروازہ بند کر دیا۔ دروازہ دہر سے لاک کر دیا گیا ہوگا۔ یہ بات وہ تینوں ہی سمجھتے تھے۔ معظم شاہ نے ایک غصیلی نظر بند دروازے پر ڈالی اور دوسری سزا پر ڈالتے ہوئے تند لہجے میں پوچھنے لگا۔

”تم کون ہو؟“

”میں معاذ ہوں۔“ اس نے سادگی سے جواب دیا۔

”کون معاذ... امریکا کے صدر؟ جسے ساری دنیا جانتی ہے۔“ معظم شاہ کو اس کا مختصر جواب پسند نہیں آیا اور مزید تندگی اور سختی سے بولا۔

”میرے خیال میں ہمیں کافی عرصے ساتھ رہنا پڑے گا۔ میں ذرا غصہ کر آپ سے اپنا تفصیلی تعارف کروادوں گا۔ فی الحال مجھے فریض ہونے کی سخت ضرورت ہے۔“ اس نے دھیمے لہجے میں معظم شاہ کی بات کا جواب دیا اور نیچے چل کر اپنے جوتے اتارنے لگا۔ زخموں سے خون نکلنے کے باعث پیر جوتوں سے چپک گئے تھے، سوجن الگ تھی سو جوتے اتارنے میں اسے خاصی تکلیف کا سامنا کرنا پڑا۔ راتوں کو سختی سے سمجھ کر وہ اس اذیت سے گزر گیا۔

معظم شاہ اب بھی اسے شک بھری کینے تو زخموں سے دیکھ رہا تھا لیکن اس کی خاموش کردار بھائی نے اس کا ہاتھ اپنے نرم دناؤک ہاتھ میں اس طرح پکڑ رکھا تھا جیسے

مہر بابا کی ضرورتیں اور خواہشات

دل بھی اداس اور بے چین ہو گیا اور بھوکا ہونے کے باوجود کھانے کی خواہش کرنے لگی۔ آہستہ روی سے دودھ کا گلاس خالی کرنے کے بعد اس نے ایک توس اٹھایا اور دھیرے دھیرے دانتوں سے کترنے لگا۔ اپنی ذاتی کیفیت کی وجہ سے وہ ان دونوں میاں بیوی کی طرف سے بھی غافل ہو گیا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ روم سے فریش ہو کر نکلنے کے بعد اس کے سامنے آ کر بیٹھے تو وہ ان کی طرف متوجہ ہوا اور ذرا بھیچنی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

”سوری۔ میں دودھ کا بھوکا تھا اس لیے اپنی کنکیش کا خیال نہیں رکھ سکا اور آپ دونوں کا انتظار کیے بغیر ہی ناشتا شروع کر دیا۔“

”ہم یہاں کسی دعوت پر نہیں آئے ہوئے کہ اس طرح کی کارمیلٹیو کی پروا کریں۔ ہماری طرف سے تم جو دل چاہے کرو، ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ ابھی تو میں قہقہے سے یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ تم ہماری طرح ان لوگوں کے قیدی ہی ہو یا پھر کسی منصوبے کے تحت انہوں نے اپنے ایک ساتھی کو ہمارے ساتھ رکھا ہوا ہے۔“ معظم شاہ جی لہجہ میں اسے جواب دیتے ہوئے تھمراس میں سے کافی نکالنے لگا۔ اس کی بیوی اب بھی وہی طرح محتاجی کڑھائی دار چادر میں لپٹی ہوئی تھی کہ چادر میں سے اس کی جھگی ہوئی آنکھوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔

”میں آپ سے اپنے بے قصور ہونے پر اصرار نہیں کروں گا۔ واقعات جس طرح پیش آئے ہیں، ان کی روشنی میں میری ذات آپ کی نظروں میں مشکوک ہی قرار پا سکتی ہے۔ اب وقت ہی آپ پر میری بے گناہی ثابت کرے گا۔ بہر حال، آپ خاتون سے کہیں کہ وہ ریٹیکس ہو کر ناشتا کر لیں، میں دوسری طرف جا رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور اندر کمرے کے دوسرے سرے پر رخ موڑ کر بیٹھ گیا۔ اپنی ذات سے کسی کو تکلیف دینا اسے کبھی بھی اچھا نہ لگا تھا۔

☆☆☆

”مجھے تمہارے ارادے خطرناک لگتے ہیں لڑکی! آخر تم مجھے بتاتی کیوں نہیں ہو کہ تم کیا کرنا چاہتی ہو؟“ علی درجے کے چھوٹے سے ریستوران کے ایک گوشے میں بشری کے مقابل بیٹھا ہوا اچاز شکر سا اس سے مخاطب تھا۔

”میں تم سے ایک چھوٹی سی ذیل کر رہی ہوں۔ دیکھو، یہ ستنی زبردست تصویر ہے۔ تم سحالی تو اس طرح کی چیزوں کی تلاش میں رہتے ہو۔ کیا اس تصویر کے حصول کے

اسے کسی بھی حرکت سے باز رکھنا چاہتی ہو اور وہ واقعی رکا ہوا تھا۔ اس منظر کو دیکھ کر معاذ ذریعہ لب مسکرایا۔ یہ نازک سی عورت کا ہی کمال ہوتا ہے جو بڑے بڑے پھرے ہوئے سمندروں کو سنبھال لیتی ہے۔ وہ اٹھ کر ہاتھ روم میں چلا گیا۔ ہاتھ روم زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن ضروری لوازمات موجود تھے۔ یہاں تک کہ گرم پانی کی لائن بھی تھی۔ گرم پانی سے شاور لے کر اس کے پھوڑے کی طرح دیکھتے ہوئے جسم کو خاصا سکون ملا۔ عیروں کی تکلیف میں بھی اس نے خاصا اتفاق پایا۔ باہر موجود جوڑے کا خیال نہ ہوتا تو شاید وہ کچھ دیر اور شاور کے نیچے کھڑا رہتا۔ ان لوگوں کا حلیہ اس کی طرح خراب تو نہیں تھا لیکن قطری حاجات کے لیے تو بہر حال انہیں ہاتھ روم کے استعمال کی ضرورت تھی، سو خلاف خواہش اپنے غسل کو مختصر کرتے ہوئے وہ لباس پہن کر باہر آ گیا۔ لباس کی حالت بھی بے حد خراب تھی لیکن مجبوری تھی کہ اس کے سوا کوئی دوسرا لباس میسر نہیں تھا۔

وہ باہر نکلا تو سامنے سچا ناشتا نظر آ گیا۔ وہ بے حد بھوکا تھا اس لیے فوراً ناشتے کی طرف لپکا۔ یہ انگریزی طرز کا ناشتا تھا۔ نیگے ہوئے توس، مارجرین، نیم، ابلے ہوئے اٹھ، نیم گرم دودھ اور گرم کرکام کافی۔ وہ اتنا شدید بھوکا تھا کہ شاید ان چیزوں پر نوٹ ہی پڑتا لیکن عین وقت پر غسل نے ساتھ دیا اور اسے یاد آ گیا کہ اتنے وقفے کے بعد معدے پر اچانک بہت سا بوجھ ڈال دینا خود اپنے اوپر ظلم ہوگا۔ بہت سا کھانے کی خواہش کو مضبوط قوت ارادی کے تل پر دباتے ہوئے اس نے گلاس میں تین چمچ تھائی نیم گرم دودھ نکالا اور چھوٹے چھوٹے ٹھونٹ لینے لگا۔ دودھ پیتے ہوئے یکدم اسے اپنے گھر کے ڈائننگ روم کا منظر یاد آیا۔ اس کی امی بہت اہتمام سے اور خاصا بھاری بھر کم ناشتا تیار کرتی تھیں۔ ویٹ کانسٹنس علیہ پر انھوں وغیرہ پر مشتمل اس ناشتے کو کھانے سے اجتناب کرتی تھی لیکن امی کو اس کا صرف سوکھے سلائس کھا کر کالج جانا گوارا نہیں ہوتا تھا، چنانچہ وہ زبردستی علیہ کو دودھ پینے پر مجبور کرتی تھیں۔ اس وقت جہاں اسے بڑے بڑے منہ بنا کر دودھ یعنی علیہ کی شکل یاد آئی، وہاں یہ بھی خیال آیا کہ ہر دم اپنے بچوں کے کھانے پینے کے لیے بے حد فہم مند رہنے والی امی کو اگر یہ پتا چل جائے کہ ان کا بے حد لاؤ لاؤ اور چھوٹا چھوٹا وقتوں کے قے سے ہے تو ان پر کیا گزرے گی۔ فہم مند تو خیر وہ اب بھی ہوں گی اور اس کی جدائی میں جانے کس حال میں اپنے رات دن بتاتی ہوں گی۔ ماں کی تکلیف کا خیال آیا تو اس کا اپنا

مہربانی فرما کر لکھا۔ سسٹینا فنانجسٹن۔ جولائی 2020ء کرپڑھیے۔

لے تم میرا ایک چھوٹا سا کام نہیں کر سکتے؟" اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے بشری نے ایک بار پھر اپنے سواہل کی اسکرین اجازت کے سامنے کی اسکرین پر وہی تصویر نظر آ رہی تھی جو اس نے تاج پونی سیلون میں مشہور اداکار کو قاتل اعتراض حالت میں دیکھ کر لی تھی۔

"میں اس قسم کے لوگوں میں دلچسپی نہیں رکھتا۔ میرا میدان مختلف ہے۔" اجازت نے ناک چڑھا کر اسے جواب دیا۔
 "مجھے معلوم ہے کہ تم سیاست دانوں اور بیوروکریٹس جیسے لوگوں پر ہاتھ ڈالتے ہو لیکن میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم اپنے صحافی بھائی بندوں سے اچھے تعلقات کے لیے ان سے ایسی چیزیں شیئر کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے کیونکہ کبھی کبھی ان سے بھی ان سے کام کی کوئی چیز مل جاتی ہے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم دولت کے بھوکے اور کرپٹ صحافی نہیں ہو لیکن اس کرپٹ سسٹم کے ساتھ کام کرنے کے لیے وہ سارے جسٹس استعمال کرتے ہو جو دوسروں کو نہیں تر نوالہ کچھ کر لگنے سے محفوظ رکھتے ہیں اس لیے تم مجھ سے یہ مت کہو کہ تمہارے نزدیک اس تصویر کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ تمہارا کوئی صحافی اس تصویر کے ذریعے اچھا مال بنائے گا تو احسان کا بدلہ اتارنے کے لیے کبھی نہ کبھی تمہارے کام بھی آئے گا۔ اس لیے اچھا ہو گا کہ تم بغیر غرے دکھائے میرے ساتھ یہ ڈیل کرو اور اس تصویر کے بدلے میرا وہ کام کرو جو میں چاہتی ہوں۔" اپنے سنہری بالوں کی ایک لٹ انگلی میں لپیٹے ہوئے بشری نے اجازت سے کہا تو وہ ہنسنے لگا اور تھے ہوئے انداز میں بولا۔

"ٹھیک ہے، میں مان لیتا ہوں کہ میرے لیے اس تصویر کی اہمیت ہے لیکن تمہیں یہ ملنا بھی کیوں ہے کہ میں تمہیں مہناز کے فون تک رسائی دے سکتا ہوں؟"

"مجھے کوئی ملنا نہیں بلکہ جین ہے کہ تم ایسا کر سکتے ہو۔ تم شروع سے کپیوٹر میں بہت اچھے ہو اور ایک بار تم نے ہی مجھے بتایا تھا کہ تم بہت اچھے ٹیکر بھی ہو اور تمہاری کامیاب صحافت کے پیچھے ایک اہم راز تمہارا ہیکر ہونا بھی ہے۔ اپنی اس صلاحیت کی بنا پر تم نے بڑے بڑوں کی شرک پر اپنا ہیکر رکھا ہوا ہے تو پھر مہناز جیسی عام لڑکی کے سواہل فون تک رسائی تمہارے لیے کیا مشکل کام ہے۔" اس کی ہنسنے لگا اور غصے کو خاطر میں لائے بغیر بشری نے اسے اطمینان سے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے میں یہ کام کر سکتا ہوں لیکن میں کرنا نہیں چاہتا۔ میں جانتا ہوں کہ تم اپنے آپ کو کسی نئی مصیبت میں

ڈالنے جا رہی ہو اور میں تمہیں کسی مصیبت میں گرفتار نہیں دیکھنا چاہتا۔" اجازت دھیمے پڑ گیا اور بہت غلوں سے اسے سمجھانے لگا۔

"میں جس تکلیف اور مصیبت میں آں ریڈی گرفتار ہوں اسے تم نہیں سمجھ سکتے اجازت کیونکہ تم نے اپنی ذات پر وہ سب نہیں سہا ہے جو میں نے سہا ہے۔ مجھ پر جو کچھ نڈر رہا ہے، وہ میں نے کسی کو نہیں بتایا۔ بتا بھی نہیں سکتی تھی۔ اس رات کی ہر اذیت میرے دل پر رقم ہے اور سوال یہ پیدا نہیں ہوتا کہ میں اس سب کو بھول کر ایک نئی زندگی شروع کر سکوں۔ میں نے اپنے دل میں جو فحاشی ہے، وہ ہر حال میں پورا کروں گی اس کے لیے مجھے تم جیسے شخص اور بااقتدار دوستوں کی مدد ملے یا خطرناک لوگوں سے رابطہ کرنا پڑے، اس پر زیادہ سوچنے کی گنجائش نہیں ہے میرے پاس۔ اپنے مقصد کے حصول کے لیے میں ہر آپشن استعمال کرنے کے لیے تیار ہوں اس لیے فیصلہ تمہیں کرنا ہے کہ میرے لیے رسک ٹیکر کا کتاب کتنا ہونا چاہیے۔" اس نے ایک بار پھر وہ دھمکی ذرا مختلف الفاظ میں دہرائی جو کچھ دن قبل بھی اجازت کو دے کر اس سے بازل کے فیلنگ بیگ گراؤنڈ وغیرہ کے بارے میں معلومات حاصل کی تھیں۔

"ٹھیک ہے، مجھے تھوڑی مہلت دو۔ میں کوشش کروں گا کہ تمہیں کم از کم مہناز کے دائرہ رسائی تک رسائی دے دوں۔" اجازت جانتا تھا کہ وہ سر پھری ہے اس لیے ایک بار پھر بے بس ہو گیا۔ جو لوگ دل کے زیادہ قریب ہوں وہ زیادہ آسانی سے انسان کو بے بس کر دیتے ہیں۔ اجازت دھیمے چلا پڑا وہ بھی بشری ہیکر کے سامنے بے بس تھا۔

☆ ☆ ☆

عالم شاہ جیلے جیل کی ٹی کی طرح ادھر سے ادھر ٹپک رہا تھا۔ ایک صوفے پر بیٹھ کر سگار کے کش لپتے ہوئے صداقت شاہ کے چہرے سے بھی پریشانی اور اضطراب مترشح تھا۔ اندر خواب گاہ میں وڈیرن خواب آور انجکشن کے زیر اثر سو رہی تھی۔ منتقلی روٹنے سے وڈیرن کی طبیعت بگڑ گئی تھی اور ایمر جنسی میں ڈاکٹر کو حوصلی ملتا پڑا تھا۔ ڈاکٹر کے مطابق بی بی بہت بڑھ گیا تھا۔ بی بی کنٹرول کرنے والی دواؤں کے ساتھ ڈاکٹر نے عالم شاہ کی درخواست پر وڈیرن کو خواب آور انجکشن لگا دیا تھا۔ اب وڈیرن تو سو رہی تھی لیکن باقی سب کی نیند تو کیا ہوش بھی اڑے ہوئے تھے۔ کوئی معمولی واقعہ جن میں نہیں آیا تھا۔ وڈیرے صداقت شاہ کی بیٹی اور داماد کو اغوا کر لیا گیا تھا۔

مہربانی فرما کر بلیئر زنی حوصلہ کے لیے خرید کر پڑھیے۔
 سسٹمز ڈائریکشن 78 جون، جولائی 2020

صد اقت شاہ کی اولاد میں عالم شاہ سب سے بڑا تھا۔ اس کے بعد دو بیٹیں تھیں۔ بڑی بھل اور چھوٹی مول۔ بھل شاہ سال بھر بھل اپنے ماموں زاد معظم شاہ سے بیای گئی تھی۔ معظم تعلیم یافتہ اور بھل کے جوڑ کا تھا اس لیے بہت خوشی سے یہ رشتہ جوڑا گیا تھا۔ سال بھر کے عرصے میں بھل نے معظم شاہ یا ماموں کی بھلی کے کسی فرد کی کوئی شکایت نہیں کی تھی اس لیے سب اپنی جگہ مطمئن تھے کہ وہ اپنے گھر میں خوش ہے۔ جب سے اس کے ہاں خوشخبری کی اطلاع ملی تھی، اطمینان مزید بڑھ گیا تھا۔ بہت کلاما حول نہ ہونے کے باعث اس موضوع پر آپس میں گفتگو تو نہیں کی جاتی تھی لیکن اپنی اپنی جگہ سب غصے مہمان کی آمد کے منتظر تھے۔ وڈیرن نے تو ابھی سے اپنے آنے والے نواسے یا نواسی کے لیے تیاری شروع کر دی تھی۔ موقع ملنے پر بیٹی کو مشوروں، نصیحتوں اور ہدایتوں سے نوازنے کا فریضہ بھی پابندی سے ادا کیا جاتا تھا۔ ان ہدایات میں طویل سفر سے گریز کرنے کی ہدایت بھی شامل تھی لیکن اس ہدایت پر عمل یوں ممکن نہیں تھا کہ بھل شاہ کو چیک اپ کے لیے باقاعدگی سے حیدر آباد تک کا سفر کرنا پڑتا تھا۔

معظم شاہ گاؤں میں دستاب لمبی سہتوں سے مطمئن نہیں تھا اس لیے حیدر آباد کے ایک بڑے اسپتال میں بھل کا نام نکھو ادا یا تھا اور ہر روزٹ پر اپنی تمام تر مصروفیات ترک کر کے اس کے ساتھ اسپتال جاتا تھا۔ کل بھی وہ لوگ معمول کے چیک اپ کے لیے اسپتال گئے تھے اور پروگرام کے مطابق واپسی میں صد اقت شاہ کی مزاج پرسی کے لیے یہاں آ گئے تھے۔ دو پہر کا کھانا انہوں نے یہیں کھایا تھا اور پروگرام کے مطابق شام سے بھل ہی واپسی کے لیے تیار ہو گئے تھے لیکن عین وقت پر پتا چلا کہ گاڑی میں کچھ مسئلہ ہے، اس مسئلے کو دور کرنے کے لیے فوراً ہی ایک حکیم تک کو بھی بلوایا گیا پھر بھی ایک ڈیڑھ گھنٹے کا وقت لگ گیا اور شام گہری ہو گئی۔ وڈیرن نے کوشش کی کہ بیٹی اور داماد کو آج رات یہیں رک جانے پر راضی کر لیں لیکن معظم شاہ نہ مانا، اسے کچھ اہم معاملات درپیش تھے۔ وڈیرن کی صرف بیٹی کو روک لینے کی کوشش بھی ناکام ہو گئی۔ بھل خود رکتے پر راضی نہیں ہوئی۔ رواج کے مطابق اسے ساتویں مہینے سے لے کر بچے کے عقیقے تک جیکے میں رہنے کے لیے آتا تھا اس لیے وہ یہ درمیانی عرصہ سسرال میں ہی گزارنا چاہتی تھی۔ طوعاً و کرہاً وڈیرن کو انھیں رواج کی اجازت دینی پڑی۔ ان کے روانہ ہونے کے بعد بھی وہ خاصی دیر تک اس بات پر

معارض ہوئی رہیں کہ ان کے داماد کو گاڑی سا ساتھ لے کر چلنے کی عادت نہیں ہے اور وہ گاڑی کی موجودگی کو اپنی پرائیوٹسی میں دخل اندازی تصور کرتا ہے۔

عالم شاہ بھی یہی مزاج رکھتا تھا اس لیے اس نے ماں کو سمجھا بھلا کر ٹھنڈا کر دیا اور ان کا دھیان بٹانے میں کامیاب رہا۔ کچھ دیر بعد سب اپنے اپنے مشاغل اور مصروفیات میں مگن ہو گئے اور یہ بات ذہن سے نکل گئی کہ فون پر رابطہ کر کے بھل اور معظم شاہ کے خیریت سے پہنچ جانے کی خبر لے لی جائے۔ بے خبری میں سو جانے والوں کو معظم شاہ کے باب قربان شاہ کے فون نے جھٹکا لگا یا۔ اس نے انھیں بتایا کہ معظم شاہ کے نمبر سے کسی انجینی نے انھیں یہ پیغام بھیجا ہے کہ ان کے بیٹے اور بہو کو اغوا کر لیا گیا ہے، اب دو نوپس اور قانون نافذ کرنے والے کسی ادارے سے رابطہ قائم کرنے کی غلطی کیے بغیر ان کا مطلوبہ تادان ادا کرنے کے لیے تیار رہیں۔ قربان شاہ نے انھیں یہ بھی بتایا کہ شام کے وقت ان کی معظم سے بات ہوئی تھی اور معظم نے گاڑی میں کسی خرابی کا ذکر کرتے ہوئے اس امکان کا اظہار کیا تھا کہ خرابی دور نہ ہونے کی صورت میں وہ اور بھل رات و دھن رک جائیں گے اور علی الصبح روانہ ہوں گے اس لیے اس کے نہ چنچنے پر یہی سمجھا گیا تھا کہ وہ لوگ رات کو وہیں رک گئے ہیں لیکن اب صورت حال بالکل مختلف ہو گئی تھی اور اطلاع ملی تھی کہ وہ دونوں اغوا ہو گئے ہیں۔

اطلاع دونوں خاندانوں کے لیے تکلیف دہ اور پریشان کن تھی۔ اغوا کار کون تھے، اس بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا۔ زمین داروں اور وڈیروں کے بے شمار دشمن ہوتے ہیں لیکن عموماً یہ دشمنیاں دو بدو مقابلے کے ذریعے نبھائی جاتی ہیں اور یوں اغوا ہرائے تادان نہیں کیا جاتا۔ وہ سب ششدر تھے کہ یوں بھل اور معظم کو اغوا کرنے والے لوگ کون تھے۔ اپنے اپنے طور پر ہر ایک معلوم کرنے کی بھی کوشش کر رہا تھا لیکن ساری بھاگ دوڑ بیکار تھی۔ کہیں سے کوئی سرا ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ احتیاط کے پیش نظر وہ لوگ کسی سے مدد بھی طلب نہیں کر سکتے تھے۔ تادان بھی بہت زیادہ طلب کیا گیا تھا اور ایک بار کے بعد دوبارہ رابطہ نہیں کیا گیا تھا کہ اس سلسلے میں کسی قسم کی بارکٹنگ کی جاسکے۔

معظم شاہ کا نمبر پیغام بھیجے جانے کے بعد سے مسلسل بند تھا۔ قربان شاہ بیٹے اور بہو کی زندگی بچانے کے لیے ذہنی طور پر تادان کی اداسگی کے لیے تیار ہو چکے تھے لیکن مسئلہ

مہر بانی فرما کر بیسیروز کی خوشخبری جولائی 2020ء کے لیے کرید کر پڑھی۔

سائیں..... "عالم شاہ نے ٹھہلنا موقوف کر دیا اور تذبذب کی کیفیت میں پڑا۔

"ان کی پریشانی اپنی جگہ ہے۔ عورتوں کو پریشانی میں ہاتھ بھر چھوڑ کر بیٹھ جانے کی عادت ہوئی ہے لیکن مردوں کو اپنے کام کرتے رہنا پڑتا ہے۔ تم میرے ساتھ چلو۔ یہاں موٹوں اور ملازمین ہیں تمہاری ماں کا خیال رکھنے کے لیے۔" اس بار صداقت شاہ کا انداز دونوں کو تھا۔ عالم شاہ کو بھی ان سے اتفاق کرنا پڑا۔

☆☆☆

"چلو بی بی! آپ کو اپنے ساتھ اوپر چلنا ہے۔" دوپہر کے کھانے کے بعد کھن برادر آدمی نے کھانے کی طرف رخ کر کے یہ حکم سنایا تو وہ تینوں ہی اپنی اپنی جگہ ٹھٹھک گئے اور ایک کونے میں دونوں میاں بیوی سے لاشعق بنا بیٹھا معاذ دلی خدشات کے ساتھ معطم شاہ اور اس کی بیوی کو دیکھنے لگا۔ اسے احساس تھا کہ اس کی وجہ سے خاتون پریشانی کا شکار ہے اور ڈھٹنگ سے کھانے پینے اور آرام کرنے سے محذور ہے اس لیے حتی الامکان اس کو سہولت دینے کے لیے خود کو ایک کونے تک محدود کر لیا تھا اور صرف کھانا کھانے کے لیے ہی اپنی جگہ سے اٹھا تھا۔ کھانے میں انھیں بکرے کا شور بے والا سالن اور سروس کا ساگ کھن کے بیڑے کے ساتھ دیا گیا تھا۔ صبح ہاتھ روک کر ناشا کرنے والے معاذ نے اس وقت انھی طرح پیٹ بھر کر کھانا کھایا تھا اس لیے طبیعت میں ذرا سستی محسوس کر رہا تھا اور پیٹھے پیٹھے اسے ہلکی سی ادھم آگئی تھی لیکن بہر حال اس نے خاتون کو خشن والا حکم سن لیا تھا۔

"کیوں بی بی کیوں اوپر جائے گی۔ کیا کام ہے بی بی سے؟" فطری طور پر اس حکم کو سن کر معطم شاہ بھڑک گیا اور تھوڑے لمحے میں پوچھنے لگا۔

"صاحب کو کچھ بات کرنی ہے بی بی سے۔" اس شخص نے روکھے لہجے میں جواب دیا۔

"کیا بات کرنی ہے؟ جو بات کرنی ہے مجھ سے کرو۔ تمہاری ہر بات مان تو رہے ہیں ہم۔ تمہارے کہنے پر ڈیڑھ بوا کر بابا سائیں کو تادان کے لیے پیغام بھی دے دیا ہے پھر کیا بات باقی رہ جاتی ہے؟" معطم شاہ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ چہرے پر موجود غصیلے تاثرات میں کہیں کہیں اندیشے بھی جھلک رہے تھے۔ لازمی بات تھی کہ وہ ان بھرماتہ ذہن رکھنے والے لوگوں کے درمیان اپنی جوانی اور بیوی کو غیر محفوظ محسوس کر رہا تھا اور اس حوالے سے اسے

پر تھا کہ ان کے پاس اتنی بڑی رقم کیش میں موجود نہیں تھی۔ پچھلی فصل پر انھیں خاصا نقصان اٹھانا پڑا تھا اس لیے وہ مالی بحران میں مبتلا تھے اور ان کے پاس واحد حل یہ رہ گیا تھا کہ وہ اپنی اس زمین کو فوری طور پر فروخت کرنے کے لیے راضی ہو جائیں جس کے لیے ایک ہم پلہ زمین دار کی ماہ سے انھیں پرکشش پیشکش کر رہا تھا لیکن ایک رواجی زمیندار کی سوچی سمجھی کے مقابلے میں زمین بیکار ہونے کے باوجود اسے فروخت کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اپنے ان حالات کے حلقہ قربان شاہ نے اپنے بیٹوں کی اور سمدھی صداقت شاہ کو بھی خبر نہیں ہونے دی تھی اس لیے وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کے حالات کیسے ہیں۔ اپنے طور پر صداقت شاہ نے تادان کی رقم کی اور ان کی کے سلسلے میں تعاون کی پیشکش کی تھی لیکن قربان شاہ اس پیشکش کو رد کر چکے تھے۔ ان کی غیرت کو یہ بات گوارا نہیں تھی کہ وہ اپنے بیٹے اور بیوی کی رہائی کے لیے صداقت شاہ سے رقم لیں۔ مشکل حالات میں بھی وہ اپنی وضع داری اور اونچی پگ کی حفاظت کرنے کے خواہش مند تھے۔

ایک طرف قربان شاہ کی یہ روایت پسندی تھی تو دوسری طرف عالم شاہ کا جوان خون جوش مار رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ کسی طرح ان کا کار سامنے آجائیں اور وہ انھیں چیر پھاڑ کر رکھ دے۔ اپنے ہاں ہونے والی معطم شاہ کی گاڑی کی خرابی میں بھی اسے سازش کی بو محسوس ہو رہی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ اس طرح معطم شاہ کو لٹ کر داکر رات کا اندھیرا پھیلنے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ غصے میں اس نے حویلی کے تمام ملازمین کو لان حاضر کروا کر ان سے سخت پوچھ گچھ کی تھی لیکن ہر ملازم نے ہی ہاتھ جوڑ کر اپنے بے قصور ہونے کی وہابی دی تھی۔ وہ سارے نہایت وقار اور نسل در نسل۔ حویلی کی خدمت کرنے والے ملازمین تھے۔ صداقت شاہ نے دخل اندازی کر کے انھیں عالم شاہ کے خطاب سے بچایا تھا۔ صداقت شاہ ان مشکل حالات میں بھی رکھ رکھاؤ کا مظاہرہ کر رہے تھے لیکن عالم شاہ بری طرح پیچ دناپ کھا رہا تھا۔ وہ باپ سے بھی خفا تھا کہ وہ اپنے بیٹی داماد کے انوکھے برائے سکون سے کیوں بیٹھے ہیں لیکن صداقت شاہ کی طرف سے مسلسل حمل کا مظاہرہ کیا جا رہا تھا۔ اب بھی انہوں نے ادھر سے ادھر مٹھتے عالم شاہ کو ایک نظر دیکھا اور دھیمے لہجے میں بولے۔

"میں نے ڈرائیو سے گاڑی تیار کرنے کا کہہ دیا ہے۔ ان حالات میں مجھے قربان شاہ کے ساتھ موجود ہونا چاہیے۔ تم بتاؤ کہ تم میرے ساتھ چلو گے یا نہیں رکو گے؟" "جیس بھی آپ کے ساتھ چلنا چاہتا ہوں لیکن اماں

مہر بانی فرما کر پالیسٹر کی

خدا شات تھے۔ شاید بیوی کی وجہ سے ہی اس نے اپنے باپ کے لیے بے چون و چرا پیچھا سام رکھا رکھ دیا تھا۔ یہ پیغام دوپہر کے کھانے سے قبل ایک موبائل فون کے ذریعے دیا گیا تھا۔ اس وقت معظم شاہ نے پیشکش کی تھی کہ اگر اس کی براہ راست اس کے والد قربان شاہ سے بات کروا دی جائے تو وہ زیادہ آسانی سے انہیں تاوان کے لیے قائل کر لے گا۔ جواب میں اسے بتایا گیا تھا کہ وہ جس جگہ موجود ہیں، وہاں موبائل کے سگنل نہیں آتے اس لیے ان کی کسی سے براہ راست بات کروانا ممکن نہیں ہے۔ اس جواب کے بعد معظم شاہ تنہا یہ تقدیر ہو کر بیٹھ گیا تھا لیکن اب جو نیا حکم ملا تھا، اس نے اسے تیسے سے اکھاڑ دیا تھا۔

”ہر بات مان رہے ہو تو اپنے لیے اچھا کر رہے ہو۔ یہ کوئی تمہاری جائیداد نہیں ہے جہاں تمہارا حکم چلے گا۔ یہاں تم قیدی ہو اور ہمیں ہمارے مالک کا حکم ماننا ہوگا۔“ اس شخص نے پہلے سے زیادہ اکھڑ لہجے میں معظم شاہ کو جواب دیا اور اس کی بیوی کی طرف رخ کر کے اسی لہجے میں بولا۔

”چلو بی بی اجلدی کرو۔ مالک کو اپنا حکم ماننے میں اتنی دیر پسند نہیں ہے۔“ جواب میں اس نے مدد طلب نظروں سے شوہر کی طرف دیکھا۔

”میں نے کہہ دیا تاکہ یہ کہیں نہیں جائے گی۔ جاؤ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“ معظم شاہ بلند آواز میں بولتا ہوا اپنی بیوی کے سامنے آکھڑا ہوا۔

”تم خود اپنے لیے مصیبت پیدا کر رہے ہو۔“ وہ شخص خوشخوار لہجے میں غرایا اور گن کو لاٹھی کی طرح سونت کر معظم شاہ کی طرف بڑھا۔ اس کا دوسرا ساگی حسب معمول دروازے کے قریب چوکنٹا کھڑا تھا۔ اس نے ابھی تک کسی بات میں دخل نہیں دیا تھا لیکن اس کے جسم کا تاؤ ہمارا تھا کہ وہ ضرورت پڑنے پر اپنے ساگی کی مدد کے لیے میدان میں کودنے کے لیے تیار ہے۔

”میں نے کہا تاکہ تم میری بیوی کو یہاں سے کہیں نہیں لے جا سکتے۔“ معظم شاہ نے بے خوفی سے اعلان کیا۔

”اور اپنے کو ہر حال میں حکم پورا کرنا ہے۔“ اس شخص نے جواب دیا اور گن کے دستے سے معظم شاہ کی کینٹی پر ضرب لگانے کی کوشش کی۔ معظم شاہ نے جھکا لی دے کر خود کو پھرتی سے اس وار سے بچایا لیکن پھر بھی اس کا شانہ زوہ میں آگیا۔ شانے پر تھنے والی بھرپور ضرب نے اسے ہلکا سا کراہنے پر مجبور کر دیا پھر بھی اس نے کوشش کی کہ گن بردار کو ایک مٹکا رسید کرے۔ اپنی اس کوشش میں اسے کامیابی

حاصل نہ ہو سکی اور گن بردار نے اس کے ہاتھ پر گن سے زوردار ضرب لگائی۔ ضرب بہت شدید تھی۔ معظم شاہ کے حلق سے ایک زوردار چیخ نکلی، یقیناً اس کی انگلیاں پھینچ گئی تھیں۔ اب معاذ کے لیے مزید خاموش تماشائی بن کر کھڑا رہتا ممکن نہیں رہا اور وہ تیزی سے ان دونوں کی طرف چھپا۔

”خبردار! آرام سے کھڑے رہو ورنہ کھوپڑی اڑا دوں گا۔“ ابھی اس نے کوئی وار کیا بھی نہیں تھا کہ رائل کی ٹال اس کی پچھلی سے آگئی اور ایک سرد آواز سنائی دی۔

معاذ اپنی جگہ ٹھٹھک کر رہ گیا۔ وہ دروازے کے پاس کھڑے رائل پر دربار کو فراموش کر چکا تھا اور اب وہی اس کو بے بس کرنے کا سبب بن گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ ان

افواکاروں کے لیے معظم شاہ اور اس کی بیوی کی طرح قیمتی نہیں ہے اس لیے وہ اسے ٹھکانے لگانے میں کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کریں گے اس لیے مجبوراً اپنی جگہ سہکتا ہوتا پڑا۔ دوسری طرف معظم شاہ زخمی ہو جانے کے باوجود پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ ایک بار پھر گن بردار پر چھپنا۔

وہ تیار تھا اس لیے نہ صرف وار بچا گیا بلکہ اس بار معظم شاہ کی کینٹی پر گن کا دستہ رسید کرنے میں بھی کامیاب ہو گیا۔ وار سخت تھا، معظم شاہ تھوڑا کر گر پڑا۔ اسے گرتے دیکھ کر اس کی بیوی اس کی طرف لپکی۔ معظم شاہ بے ہوش ہو چکا تھا اور اس کی کینٹی سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ اس کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اپنی چادر سے اس کا خون صاف کرنے لگی۔

بڑے مضبوط اعصاب کی عورت تھی۔ اس صورت حال میں بھی چپٹی چلائی نہیں تھی بس ایک حزنیدہ کیفیت تھی جو اس کی سیاہ آنکھوں سے جھلکنے لگی تھی۔

”کچھ نہیں ہوا ہے بی بی ابھی مرہم پٹی کر دیں گے تو گھٹنے سوا گھٹنے میں ہوش میں آجائے گا۔ تم اس کو چھوڑو اور میرے ساتھ چلو۔ مالک اتنی دیر انتظار کرنے کا عادی نہیں ہے۔“ گن بردار نے اپنے مخصوص اکھڑ لہجے میں اسے حکم دیا اور بازو سے پکڑ کر اسے کھینچا۔

”خاتون کے ساتھ تیز سے پیش آؤ۔“ ایک پردہ دار خاتون کو اس طرح کھینچے جانے پر معاذ خاموش نہیں رہ سکا اور اسے ٹوک بیٹھا۔

”تو اپنا منہ بند رکھ۔ ورنہ تیرا تو ابھی فیصلہ کر دیتا ہوں۔“ گن بردار غراتا ہوا معاذ کی طرف پلٹا اور اپنی گن کی ٹال اس کے منہ میں گھسا دی۔

”میں چل رہی ہوں تمہارے ساتھ، تم اسے چھوڑ دو۔“ یکدم ہی وہ مدھم اور باوقار لہجے میں بولی تو معاذ ٹھٹھک

مہربانی فرمائی کہ ایک شیشہ زکریا جیلن، جو کہ 2020ء خرید کر پڑھیے۔

ضرب الامثال

تین بلائے تیرو آئے دیکھو یہاں کی ریت
باہر والے کھا گئے اور گھر کے گا دیں گیت
(تعداد سے زیادہ مہمانوں کے آنے اور مہربان کے
بھوکا رہ جانے والوں کے لیے کہا جاتا ہے)

۵۰ : ۵۰

ٹوٹا ٹالے نہ ملے جب تک مٹے نہ لکھ
سادہ کھنک دے ہالکے لاکھ جتن کر دیکھ
(جب تک مقدار یا دوری نہ کرے نقصان ہو کر رہتا ہے)

۵۰ : ۵۰

جاٹ کہے سن جانی یا ہی گاؤں میں رہتا
اونٹ بلیا لے گئی تو ہاں جی ہاں جی کہتا
(جن لوگوں میں رہتا ہوں کی ہاں میں ہاں ملا ضروری ہے)

مراسلہ نگار..... راحیل ثواب ملان

طالب توجہ

ایک صاحب کی خیرات و سخاوت کی بڑی شہرت
تھی۔ ایک روز ایک انجمنی ان کے پاس پہنچا اور گویا
آواز میں بولا "میں آپ کی توجہ ایک انتہائی غریب اور
معصیت زدہ کنبے کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ کنبے
کا سربراہ و قاتل پانچا ہے۔ اس کی بیوی اور ۹ بچے انتہائی
کسمپرسی کی حالت میں دن گزار رہے ہیں۔ چھ ماہ سے
انہوں نے مکان کا کرایہ بھی نہیں ادا کیا۔ اگر وہ چاروں
کے اندر اندر انہوں نے کرایہ نہ دیا تو اس کو کڑا پیروی
میں انہیں مکان سے نکال دیا جائے گا۔ کرائے کی رقم چھ
ہزار روپے بنتی ہے۔"

"یو اٹھو سو جواہر سب سن کر۔" وہ صاحب بولے
"میں ضرور ان کی مدد کروں گا۔۔۔ ویسے ہائی واد نے
آپ کون ہیں؟"

"میں ان کا مالک مکان ہوں۔" انجمنی نے جواب
دیا۔

سامگیا۔ کئی گھنٹوں سے ان لوگوں کے ساتھ موجود ہونے کے
باوجود اس نے اس پر وہ ہوش خاتون کی آواز نہیں سنی تھی اور
دل ہی دل میں قیاس کر رہا تھا کہ شاید وہ کوئی سے لیکن وہ
کوئی نہیں تھی۔ وہ تو نہایت شیریں اور سرلی آواز کی مالک
تھی اور اس کے بولنے سے ان حالات میں بھی معاذ کو ایسا
لگا تھا کہ کسی نے کانوں میں رس گھول دیا ہو۔ عجیب بے بسی
کی کیفیت میں وہ اسے کن پردار کے ساتھ باہر کی طرف
جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ وہ دونوں دروازے سے باہر نکل گئے تو
پردہ پر دروازے نے معاذ کو ایک طرف دھکیلا اور خود تیزی سے
باہر نکل گیا۔

اس کے نکلنے ہی معاذ معظم شاہ کی طرف لپکا اور اس
کی کپڑی کی چوٹ کا جائزہ لینے لگا۔ ذرا سی کھال پھٹی تھی اور
تھوڑا سا خون پسینے کے بعد حریہ خون بہتا رک چکا تھا اس
لپچے زیادہ تشویش کی بات نظر نہیں آتی تھی۔ بغض چپک کر نے
پر اسے کنبہ بردار کی بات درست محسوس ہوئی کہ کنبے سوا کنبے
میں وہ ہوش میں آ جائے گا لیکن ہوش میں آنے کے بعد اس
کا رد عمل کیا ہوگا۔ یہ سوچ کر معاذ پریشان تھا۔ ایک اونچی
ٹاک والا ذرا مغرور سادو پر از لڑوہ جس نے نفوت کے باعث
ابھی تک معاذ سے زیادہ بات کرنا بھی گوارا نہیں کی تھی، اپنی
بیوی کو... یوں لے جائے جانے پر پتا نہیں کیا رد عمل ظاہر
کرتا۔ کنبے کو تو ان لوگوں نے بھی کہا تھا کہ مالک بی بی سے
کوئی بات کرنا چاہتے ہیں لیکن ایسے لوگوں کی زبان اور نیت
پر بھروسہ کرنا بھی آسان نہیں ہوتا۔ معظم شاہ کی بیوی سے
کوئی رشتہ نہ ہوتے ہوئے بھی وہ اپنے اندر دکھ اور بے بسی
کی کیفیت محسوس کرنے لگا۔ اسی کیفیت میں تقریباً میں
پچیس منٹ کا عرصہ گزر گیا۔ معظم شاہ کے زخم کی ڈیرینگ بھی
کروڑی گئی۔ مزید دس منٹ آگے سر کے توبہ خانے کا دروازہ
کھلا۔ اس نے بے چینی سے کھلنے والے دروازے کی جانب
دیکھا۔ اس کی امید کے برخلاف وہاں وہ موجود نہیں تھی۔

"چلو اب تمہارا لدا وا ہے۔" کنبے دروازے سے میں کھڑا
کنبہ بردار اپنی کنبہ لہراتے ہوئے اسے حکم سن رہا تھا۔ وہ
اپنی جگہ سے اٹھ کر باہر کی طرف بڑھا۔ جس وقت ان لوگوں
کو یہاں لایا گیا، ان کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں
اس لیے کوئی بھی کچھ نہیں دیکھ سکا تھا۔ اب وہ باہر نکلتا تو دیکھا
کہ وہ زیادہ بڑا اتھ خانہ نہیں ہے۔ یہاں صرف وہی ایک کمرہ
تھا جہاں انہیں رکھا گیا تھا۔ کمرے کے آگے ایک پتلی سی
کیلری نما جگہ تھی جس کے دونوں سرے بند تھے اور اوپر
چوٹ میں ایک شگاف نظر آ رہا تھا جس سے میز صباں منسلک

تھیں۔ اسے ان سیزھیوں کی طرف جانے کا حکم دیا گیا۔ ابھی اس نے پہلی سیزھی پر ہی قدم رکھا تھا کہ شگاف میں سے دوسرے میں جا کر سیزھی پر گئے۔ اس نے کپڑوں کی رنگت سے بچان لیا کہ وہ معظم شاہ کی بیوی ہے۔ وہ اپنی جگہ پر رک گیا، وہ ایک ایک کر کے سیزھیاں اترنے لگی۔ معاذ نے محسوس کیا کہ اس کے قدموں میں ہلکی سی لرزش ہے۔ مختصر جگہ پر کم داخلوان کے ساتھ بنایا گیا یہ پتلا سا زینہ ایک حاملہ خاتون کے لیے خطرناک ہوسکتا ہے، معاذ کے دل میں یہ خدشہ ابھرا ہی تھا کہ سیزھیاں اترتی خاتون کا پیر رہنا اور وہ اپنا توازن کھو بیٹھی۔

معاذ بے ساختہ ہی حرکت میں آیا اور اسے نیچے مگرنے سے قبل ہی اپنی ہانہوں میں قیام لیا۔ وہ جو بہت مضبوط اعصاب کی مالک محسوس ہوتی تھی، اپنے گرنے کا نتیجہ سوچ کر یقیناً بری طرح گھبرا گئی تھی اس لیے معاذ کی ہانہوں کے حصار میں قمر قمر کا تب رہی تھی۔ معاذ اس کے تیزی سے دھڑکتے دل کی دھڑکن سن اور محسوس کر سکتا تھا لیکن خود اس کے اپنے دل کی دھڑکن کہاں تھی؟ اذیت کے اس لمحے میں وہ اپنے دل کی دھڑکن کھو چکا تھا۔ گرنے کے عمل کے دوران اس کی چادر کا پلو اس کے چہرے سے ہٹ چکا تھا اور گہرے معانی رنگ کی چادر کے اندر سے گویا کوئی چاند جھانک رہا تھا۔ عورت سناؤ انگلیں، ستواں سی ناگ، دھکتے رخسار، گلابی ہاتھکڑیوں سے ہوٹ سب ہی کچھ بے حد متوجہ کر لینے والا تھا لیکن معاذ کی اصل توجہ اس سونے سے سیاہ گل نے تھی جو اس کے نچلے لب کے قریب بائیں کونے پر کسی دربان کی طرح استادہ تھا۔ معاذ کا دل بے ساختہ ہی اس گل کو چھونے کے لیے چھا، ممکن تھا کہ عالم خود فراموشی میں وہ یہ جسارت کر بھی گزرتا لیکن وہ اس کی ہانہوں کے حصار میں کسمپاسی تو اسے ہوش میں آنا پڑا اور نہایت نرمی اور احتیاط سے یوں اسے زمین پر کھڑا کیا جیسے وہ کوئی کالج کی گڑیا ہو۔ زمین پر کھڑے ہوتے ہی اس نے سب سے پہلے چادر کے پلو سے اپنا چہرہ ڈھانپا اور پھر تیزی سے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ دروازہ کھول کر وہ اندر غائب ہو گئی لیکن معاذ کے آئینہ دل پر تو اس کی صورت مستقل طور پر نقش ہو گئی تھی۔ ہاں، وہ جانتا تھا کہ وہ جو مشکل سے دس سیکنڈ کے لیے اس کی ہانہوں کے حصار میں رہی تھی، ہمیشہ کے لیے اس کے دل کو اپنے حسن کے حصار میں قید کر چکی تھی۔ اس کے ساتھ واردات تھی عجیب طرح سے پیش آئی تھی۔ وہ جس کے لیے بے شمار کنواری حسینا تھیں

پلکیں بچھائے رکھتی تھیں، اس پر ہوا بھی تھا تو ایک ایسی عورت کے حسن کا جو کسی اور کی ہی تھی اور مقرب اس کے بچے کی اس بننے والی تھی۔ ایسی عورت کی محبت میں نارسائی کے دکھ کے سوا بھلا کیا حاصل ہوتا تھا لیکن ایسے تو یہی ہے کہ انسان کبھی سوچتی سمجھ کر محبت میں جھلا نہیں ہوتا۔ عموماً محبت کسی طوفان کی طرح انسان کی زندگی میں وارد ہوتی ہے اور اس کی پوری ہستی کو خوں و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتی ہے۔ محبت کی یہ بے اختیار دی دکھ لے کر آتی ہے اور معاذ کی زندگی میں یہ دکھ داخل ہو چکا تھا۔

”اوپر چل چھو کر ہے! کیا ادھر ہی کھڑے کھڑے سو گیا ہے۔“ گن برادر نے اپنی کراخت آواز میں اسے ٹوکا تو وہ جیسے کسی ٹرانس سے باہر آیا اور پوچھل قدموں کے ساتھ سیزھیاں چڑھنے لگا۔ سیزھیوں کا اختتام ایک مستطیل کمرے میں ہوا۔ کمرے کی دیواروں پر آسمانی رنگ کیا گیا تھا۔ ایک دیوار پر کسی قد رتی منظر کی پینٹنگ لگی ہوئی تھی جبکہ دوسری پر بڑا سا الارم کلاک آویزاں تھا۔ باقی دیواریں بالکل خالی تھیں۔ دیواروں میں کوئی کھنکری یا روشن دان نظر نہیں آ رہا تھا اور آمد و رفت کے لیے صرف ایک دروازہ موجود تھا۔ فرش پر ہاتھ سے بنا ہوا کاٹن بچھا تھا جس کا ایک حصہ خانے کا راستہ کھولنے کے لیے ایک طرف سے ہٹا ہوا تھا۔ معاذ کو اندازہ ہو گیا کہ یہ خانہ صرف اسی کمرے کی دست تک محدود ہے اور عین اس کے نیچے بنا ہوا ہے۔ وہ جس کمرے میں داخل ہوا تھا، اس کی جنوبی دیوار کے ساتھ اس طرح کرسیاں اور میز لگائی گئی تھیں کہ کسی دفتر کا سامنٹر بن گیا تھا لیکن میز کے بائیں جانب کھڑا ڈھانچہ پوش اور راجا لونگ چیئر پر بیٹھا ماسک منڈھا آدمی اس منٹر سے نکل نہیں کھارے تھے۔ ڈھانچہ پوش اپنے قد کا ٹھہ اور سیاہ لباس کی وجہ سے کوئی روایتی ڈاکو محسوس ہو رہا تھا جبکہ کرسی پر بیٹھے شخص نے جو ماسک اور چست لباس پہن رکھا تھا، وہ اسے بچوں کے لیے بنائی گئی سیریز اسپانڈر مین سے مشابہت دے رہا تھا لیکن یہ مشابہت ذرا مضحکہ خیز سی تھی کیونکہ جس شخص نے یہ گیسٹ اپ اختیار کر رکھا تھا وہ اسپانڈر مین کی طرح اسمارٹ نہیں بلکہ موٹا، بھرا اور پست قامت تھا۔ معاذ کو اس شخص کے مقابلے لے جا کر کھڑا کر دیا گیا۔ میز کے اطراف خالی کرسیاں موجود ہونے کے باوجود معاذ کو کسی کرسی پر بیٹھنے کی پیشکش نہیں کی گئی تھی۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“ اسپانڈر مین کی بھونڈی نقل نے ماسک کے گول گول سوراخوں سے اپنی آنکھیں معاذ پر

سیسٹمس ڈائن جسنل 84 جون، جولائی 2020ء

مہربانی فرما کر بلیشرز کی حوصلہ کے لیے خرید کر پڑھیے۔

مرکوز کردیں اور لہجے کو ہارمب بنانے کی کوشش کرتے ہوئے دریافت کیا۔

”معاذ احمد۔“ اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”خویر نے بتایا ہے کہ تم اسے کیرتھر کی پہاڑیوں پر بھوکے پیاسے بیٹھتے ہوئے ملے تھے۔ جیسے اور لباس سے تم کوئی دیہاتی معلوم ہوتے ہو لیکن بول چال کا انداز تمہیں شہری بندہ ظاہر کرتا ہے۔ اب تم ایسا کرو کہ ذرا تفصیل سے اپنا مکمل تعارف کرواؤ تاکہ میرے لیے تمہارا کوئی فیصلہ کرنا آسان ہو جائے۔“ اس نے حکم دیا تو معاذ اختصار سے اپنے بارے میں بتانے لگا۔ کیرتھر پر اپنے زخمی ہو جانے اور ایک دیہاتی بستی میں پناہ پانے جانے کا واقعہ بھی اس نے بہت سرسری طور پر سنایا اور اس ذکر سے گریز کیا کہ اسے کسی نے پیچھے سے چتر مار کر زخمی کیا تھا۔ فیضو وغیرہ کے بارے میں بھی اس نے کوئی تفصیل نہیں بتائی اور صرف اتنا کہا کہ دیہاتی بستی میں کچھ دن رہنے کے بعد وہ اپنا دیہاتیوں سے راستہ سمجھ کر واپسی کے لیے روانہ ہوا تھا لیکن بد قسمتی سے راستے کی نشانیاں بھول گیا اور پہاڑوں میں بھٹک کر خویر تک جا پہنچا۔ اس شخص نے خاموشی سے اس کی ساری داستان سنی مگر پُرخیال نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ آہستہ آہستہ معاذ نے گول سوراخوں سے جھانکتی اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوتے دیکھی۔

”تو تم وہ معاذ احمد ہو جس کی بزدلی بلند رز والوں اور عرفان اللہ سے ملی ہوئی ہے؟“ اس نے تصدیق چاہنے والے انداز میں سوال کیا تو معاذ کو اثبات میں سر ہلانا پڑا۔ اس کے پاس جھوٹ بولنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔

”شادابھی شادا۔ یہ اپنا خویر تو وڈی کام کی چیز ہے۔ ایک تیرے دو شکار کر لایا ہے۔“ معاذ کی طرف سے تصدیق ہوتے ہی وہ شخص بچوں کے سے انداز میں سرت کے اظہار کے لیے تعفاری مار کر ہنسا۔ معاذ نے ابھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔ اس کے اندر کہیں خطرے کی گھنٹی بج گئی تھی اور احساس ہو رہا تھا کہ شاید وہ ایسے لوگوں کے درمیان پھنس گیا ہے جن کا بزدلی بلند رز اور عرفان اللہ سے کوئی تعلق ہے۔

”تمہارے پیچھے تو بڑی اٹھا پٹھ ہوئی ہے بھی۔“

تمہارے دوستوں نے تمہاری گمشدگی پر بڑا ہنگامہ مچایا تھا۔ انہیں تمہارے موبائل سے کوئی سٹیٹی ٹی ٹی جس کے بہک گراؤ میں عرفان اللہ کے چھوکرے سلطان کی جھٹک تھی۔ تمہارا باپ اس سٹیٹی کی بنیاد پر ایف۔ آئی آر کنوا نے تھانے

گھمٹا تھا لیکن سنا ہے وہ ایسا ایچ او شفقت شاہ کلند لکھا اور اس نے سوچا کہ تمہارے باپ جیسے پھوکت بندے کا ساتھ دے کر خواری کے سوا کیا ملے گا۔ اس لیے اس سٹیٹی کا عرفان اللہ سے اچھی قیمت پر سودا کر لیا۔ عرفان اللہ نے سوشل ورکر کے طور پر بڑا نام کمایا ہے اور اب سیاست کے میدان میں قسمت آزمایا رہا ہے۔ انکیشن سے اتنے قریب وہ ایسا کوئی اسکینڈل انورڈ نہیں کر سکتا جس میں ثبوت بھی موجود ہوں اس لیے وہ اپنے راستے کی ہر رکاوٹ کو بلا درہنہ دور کر رہا ہے۔ تمہارے لیے بڑھ چڑھ کر بولنے والی صحافی لڑکی کو چپ کروانے کے لیے بھی بڑا سخت وار کیا گیا ہے۔ مطلب عرفان اللہ تمہارے معاملے کو ہر حال میں چھپانا چاہتا ہے اور کسی گواہ اور ثبوت کو برداشت نہیں کر سکتا اور تم تو اس کے بیٹے کے خلاف سب سے بڑے گواہ اور مجسم ثبوت ہو۔ تمہاری تو اس سے منہ مٹا گئی قیمت لی جاسکتی ہے۔“ وہ یوں چخارے لے رہا تھا جیسے کوئی مزیدار شے کھانے کے لیے اس کے سامنے رکھی ہوئی ہو۔ دولت کے پھاریوں کے لیے دولت کی خوشبو سے بڑھ کر کسی شے میں حرم ہوتا بھی نہیں ہے، چاہے وہ دولت کسی بھی ذریعے سے آ رہی ہو۔

”اس صحافی لڑکی کے ساتھ کیا ہوا ہے؟“ معاذ بھگہ گیا تھا کہ اس سے بشری کا ذکر کیا گیا ہے اس لیے اسپانڈر میں کی نقل کی باقی باتوں پر توجہ دے بغیر ۲۰ بی سے اس سے بشری کے بارے میں دریافت کیا۔

”خبر تو یہی آئی ہے کہ اس کے گھر میں ڈاکو کھس گئے تھے جنہوں نے مال و دولت کے ساتھ ساتھ اس کی انگریز ماں کی عزت بھی لوٹ لی۔ اس دردنگی پر وہ عورت اپنی جان سے چلی گئی اور اس کے شوہر کا ہارٹ فل ہو گیا۔ لڑکی نے خود اپنے بیان میں پولیس کو یہ سب بتایا تھا لیکن انوا انہیں گردش کرتی رہیں کہ یہ ان لوگوں سے دشمنی کا شاخسانہ ہے جن کے خلاف وہ تمہارے لیے بول رہی تھی۔“ اس نے چخارے لیتے ہوئے معاذ کو اطلاعات فراہم کیں جنہیں سن کر وہ شدید صدمے میں مبتلا ہو گیا۔ مگر اور عامم جیسے ذہین اور قابل انسان کا ہمیشہ کے لیے بچھڑ جانا اور عاقل مگر اور بھی با کردار و شفیق خاتون کا اتنے دردناک انجام سے دوچار ہو جانا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ اس کے ذہن میں ان سے ہونے والی ملاقاتیں ایک پلی میں گھوم کر رہ گئیں۔ وہ متاثر کن شخصیت کی مالک تھیں اور اس سے بہت شفقت سے پیش آتی تھیں۔ ایسا چاری ہستی کی ایسی موت ہر صاحب دل انسان کے لیے صدمے

کا موجب ہوتی ہے، وہ بھی گہرے صدمے سے دوچار ہوا اور بشکل پسنی پسنی آواز میں بولا۔

”اور بشری گھڑ میرا مطلب ہے میری اس صحافی دوست کا کیا ہوا؟ وہ کس حال میں ہے؟ وہ تو پہلے ہی بہت زخمی تھی اور اسے دیکھ بھال کی ضرورت تھی۔“ اسے بشری کے بے سہارا ہوجانے کی خبر سن کر اس کی فکر دامن گیر ہوگئی۔

”مجھے کیا خبر۔۔۔ وہ کوئی میری کچھ کی دمی تو ہے نہیں کہ میں اس کی فکر میں رہنا ہوتا پھر دوں۔“ اسپانڈرمن کی نقل نے بے نیازی سے کندھے اچکاتے ہوئے جواب دیا تو معاذ اپنے ہونٹ کاٹ کر رہ گیا۔ ایسا شخص جو انسانوں کو خواہ کر کے ان کی زندگی کے دام وصول کرتا ہو، اس سے بھلا انسانیت کی کیا امید کی جاسکتی تھی۔ وہ تو اسے اس کے دشمنوں کے حوالے کر کے اس کے بھی دام کھرے کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

”چلو بھی بہت مذاکرات ہو گئے اس کے ساتھ۔۔۔ اب اسے لے جا کر دوبارہ بند کر دو۔ کرتے ہیں اس کے دام دینے والوں سے رابطہ۔ امید ہے ابھی بولی لگ جائے گی۔“ وہ سوتا ٹھکت اسپانڈرمن اپنے آدمیوں کی طرف رخ کر کے بولا تو اسے یہاں لانے والے نقاب پوش نے واپس کے اشارے کے طور پر اسے اپنی گمن سے ٹھوکا دیا۔

”ایک منٹ۔۔۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“ معاذ اشارے پر مڑنے کے بجائے کرسی پر بیٹھے شخص سے بولا۔

”بولو۔“ اس نے کسی شہنشاہ کی سی رعوت سے اجازت دی۔

”معتظم شاد کی بیوی باپردہ عورت ہے اور کمرے میں میری موجودگی اس کے لیے تکلیف کا باعث بن رہی ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے ان میاں بیوی سے الگ کسی جگہ ٹھہرا دو۔“ اس نے نرمی سے درخواست کی۔

”ہاں بھئی۔ ڈی ملانی ہے معتظم شاد کی زال۔ نہ کسی کو آنکھ بھر کے دیکھتی ہے اور نہ کسی کو اپنی طرف دل بھر کے دیکھنے دیتی ہے۔ پر کیا کریں، اسے بے آرام کرنے کو دل راضی بھی نہیں ہوتا۔ کرتے جتنا خیر کچھ اور انتظام۔“ اسپانڈرمن کی نقل کے لہجے میں معتظم شاد کی بیوی کا ذکر کرتے ہوئے عجیب سی جھجھکی جیسے معاذ نے محسوس تو کیا لیکن زیادہ غور نہیں کر سکا۔ اس کا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ وہ جو انہوں سے ہٹنے کی امید دل میں لے کر سفر کے لیے نکلا تھا، عجیب حال میں پھنس گیا تھا اور ایسے لوگوں کے درمیان تھا جو اسے بھاری قیمت پر اس کے دشمنوں کے حوالے کرنا چاہتے تھے۔ وہ جواب تک اس فکر میں جھلا رہتا

تھا کہ اس کے غیاب پر اس کے گھر والوں پر کڑی مگر نرمی ہوگی۔ یہ جان کر بھاری بوجھ تھکے دب گیا تھا کہ اس کی خاطر ایک ہفتہ کھینٹا گھرانہ ٹوٹ کر بکھر گیا تھا۔ یہ خانے کی سیز جہاں ملے کر کے اس شخص سے ٹھنک کر رہنے کے دوران چند مشنوں میں اس کے دل و دماغ پر تین بڑے حادثے بیت گئے تھے۔ وہ کیویڈ کے تیر کا شکار ہوا تھا، اسے معلوم ہوا تھا کہ وہ قیتا اپنے دشمنوں کے حوالے کیا جانے والا ہے اور تیسرا حادثہ بشری گھڑار سے متعلق خبریں سن کر پہنچا تھا۔ یہ تینوں ہی معمولی باتیں نہیں تھیں اس لیے اس کے دل و دماغ کا الجھ جانا لازمی تھا۔

”چاہتے۔۔۔“ وہ اپنی سوچوں میں الجھا ہوا تھا کہ اسپانڈرمن نے اپنے نقاب پوش ساتھی کو مخاطب کر کے کوئی اشارہ کیا۔ فوراً ہی معاذ کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی اور اسے بندوق کی نال سے آگے کی طرف دھکیلا گیا۔

آنکھوں پر پٹی کی وجہ سے وہ کچھ دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن اتنا بھر جان اسے سمجھ آ رہا تھا کہ اب اسے واپس یہ خانے میں نہیں لے جایا جا رہا ہے اور وہ اسی منزل پر چل رہا ہے۔ چند دھن قدم چنے کے بعد اسے رکنے کا حکم دیا گیا۔ بندوق کی نال ایک ٹل کے لیے ٹٹی اور کوئی دروازہ کھولے جانے کی آواز سنائی دی۔ وہ سمجھ گیا کہ اٹھا علم اسے کسی کمرے میں داخل ہونے کے سلسلے میں دیا جائے گا لیکن اس کی توقع کے برخلاف کوئی حکم دینے کے بجائے اسے زور کا دھکا دیا گیا۔ دھکے سے وہ لڑکھڑا کر کمرے کے کھلے دروازے سے اندر جاگرا۔ گرنے سے اس کی کہنیوں پر چوٹ آئی۔ ٹیش میں آکر وہ دھکا دینے والے کو کچھ سخت ستا دیا، اس سے مل ہی دروازہ زور سے بند ہوا اور نقل میں کئی گھومتے کی آواز سنائی دی۔ معاذ آنکھوں پر بندھی پٹی کو نوجی کر اتار کر پٹی اپنے لیے کا اٹھار کرنے پر اکتفا کر سکا اور اس اٹھار کو دیکھنے کے لیے بھی وہاں سپاٹ دیواروں کے علاوہ کوئی موجودگی نہیں تھا۔

☆☆☆

وہ بہت تیز دوڑ رہی تھی، اتنی تیز کہ موسم ٹھنڈا ہونے کے باوجود اس کے جسم پر پہنے کی دھاریں بہہ رہی تھیں اور سانس دھونکی کی طرح چل رہی تھی۔ وہ ننگے چھٹکی اور اس کا ہوا راتے پر بھاگتے ہوئے اس کے پیچڑ بھی ہو چکے تھے لیکن وہ اپنی اجر حالت کے باوجود رک نہیں سکتی تھی۔ اسے اپنے تعاقب میں دوڑتے ان افراد کے قدموں کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں جو شکاری کتوں کی طرح اس کے

مہربانی فرمائیں ڈائلنگ 86 جون، جولائی 2020ء خرید کر پڑھیے۔

کہ اس کے لیے انہیں برداشت کرنا ممکن نہیں رہا اور وہ دونوں ہاتھ ہر پر رکھ کر زور سے جھٹی۔ اپنی ہی جھٹی سے اس کی آنکھیں کھل گئیں اور اس نے دیکھا کہ اس کے سر ہانے رکھے سو بائل کا الارم مسلسل بج رہا ہے۔ ایک گہری سانس لیتے ہوئے اس نے الارم بند کر دیا۔

وہ جس ذہنی کیفیت کا شکار تھی اس میں اس قسم کے خواب دکھائی دینا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ وہ پچھلی پوری رات جاگتی رہی تھی اس لیے خود کو تازہ دم کرنے کے لیے دن کے وقت الارم لگا کر سو گئی تھی لیکن حقیقت یہ تھی کہ منتشر خیالی اور اگلے سیدھے خوابوں کے ساتھ لی جانے والی نیند نے اسے اتنا زیادہ قانکہ نہیں پہنچایا تھا اور وہ اب بھی خود کو مکان زدہ محسوس کر رہی تھی۔ اپنی اس کیفیت کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے بستر چھوڑا اور ہاتھ روم میں کھس گئی۔ شاور لینے سے اس کی طبیعت پر اچھا اثر پڑا۔ بال خشک کرنے کے بعد اس نے اپنی تیاری شروع کر دی۔ اسنے اجتام سے وہ زندگی میں بھی تیار نہیں ہوئی تھی اس لیے جب تیاری مکمل ہونے کے بعد خود کو آئینے میں دیکھا تو کوئی اجنبی سی لڑکی سامنے کھڑی دکھائی دی۔ اس نے دیکھا ہوا سرخ میکس فمالباد پہن رکھا تھا۔ اس لبادے کا گلا قدرے کشادہ اور آستینیں بہت چھوٹی چھوٹی تھیں۔ مناسب میک اپ، نازک سی جیولری اور سنہری بالوں کے ساتھ اس وقت تکنی طور پر وہ غضب ڈھا رہی تھی۔ اس نے آنکھوں میں نیلے کاشٹک لینس لگا رکھے تھے۔ ماں سے گوری رنگت اور مغربی عورتوں کے سے نعوش اسے ورٹے میں ملے تھے اس لیے سنہری بالوں اور نئی آنکھوں کے ساتھ اس وقت وہ مکمل طور پر کوئی غیر ملکی حسینہ لگ رہی تھی۔ اپنی تیاری سے مطمئن ہونے کے بعد اس نے سو بائل فون اٹھا لیا اور اعجاز کا نمبر دیا۔

”تم کہاں ہو اعجاز؟“ کال ریسیو ہوتے ہی کسی ری مکھکو کے بغیر اس نے دریافت کیا۔

”تمہارے کام سے ہی نکل رہا تھا۔“

”دش گڈ! میں بھی نکلنے والی ہوں۔ کام ہو جائے تو مجھے کفرم کر دیتا۔“ اعجاز کا جواب سن کر اس نے اطمینان کا اظہار کیا۔

”مجھے پتا نہیں کیوں پہ لگ رہا ہے کہ تم کوئی بہت ہی خطرناک کام کرنے جا رہی ہو۔ میرا مشورہ ہے کہ تم خود کو خطرے میں مت ڈالو اور مجھے بتاؤ کہ تمہارا اصل مقصد کیا ہے بھریم آپس میں ڈسکس کر کے کوئی بہتر پلاننگ کر لیں گے۔“ آخری لمحات میں بھی اعجاز نے اسے سمجھانے کی

کوشش کی تھی اور کسی بھی لمحے اسے دریغ نہ تھے۔ بھانسنے بھانسنے اسے درختوں کا ایک جھنڈ نظر آیا تو وہ اندھا دھند اس جھنڈ میں کھس گئی۔ اب وہ اپنے تعاقب کاروں کی نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی لیکن جانتی تھی کہ زیادہ دیر بھی نہیں رہ سکتی۔ وہ پانچ تھے اور اس جھنڈ میں کھس کر پہ آسانی اسے ڈھونڈ سکتے تھے۔ اسے اگر اپنی جان بچانی تھی تو ان کے اس جھنڈ میں گھسنے سے پہلے ہی کچھ کرنا تھا۔ چا کی اس جنگ کو لڑنے کے لیے اس نے اپنی ابتر حالت کو بچس پشت ڈالا اور جسم و جان کی ساری توانائیاں نکجا کر کے ایک بلند درخت پر چڑھ گئی۔ درخت اتنا بلند تھا کہ وہ درخت کے کچھ سکتی تھی۔ ان پانچوں کو بھی اس نے صاف دیکھا۔ ان میں سب سے آگے باؤل تھا۔ اس کے پیچھے کوی، سلطان، عرفان اللہ اور بڑا والی تھے۔ وہ پانچوں بھی ہاتھ پیرے تھے اور اسے ان کی ہاتھ پیرے ہوئے سکتوں کی طرح ٹکی سرخ سرخ زبانیں صاف نظر آ رہی تھیں۔

وہ انسانوں کے شکاری تھے اور اسے بھی شکار کر کے ہیٹ ہیٹ کے لیے خاموش کر دینا چاہتے تھے لیکن اس نے بھی حیر کر لیا تھا کہ وہ ان کا شکار نہیں بنے گی اور جنگ کے سے اس طرز زندگی میں شکار ہونے سے بچنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ وہ خود شکاری بن جائے۔ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی شکاری بننا قبول کر لیا اور اپنے گریبان میں اڑ سے اس چھوٹے سے ہٹل کو نکالا جس میں پانچ گولیاں تھیں۔ پانچ گولیاں، پانچ شکار۔ اس نے ان پانچوں پر فکرس جمادیں اور اپنی سانس کو ہوار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے ہاتھ کی لڑش پر قابو پایا۔ اب وہ پانچوں اتنا نزدیک آچکے تھے کہ اسے ان کے پیچھے بالکل صاف نظر آرہے تھے۔ ان میں سب سے واضح باؤل کا چہرہ تھا۔ اس نے غصے اور غرت سے دانت کچکچائے اور غار کر دیا۔ کوئی سیدھی باؤل کی پیشانی پر جا کر لگی اور وہ پٹ سے نیچے گر گیا۔ اس نے اپنی انگلی کی جھبٹیں کو رد کیا اور اس کا چھوٹا سا ہٹل بچے کے بعد دیگرے گولیاں اکٹھا چلا گیا۔ ہر گولی کے ساتھ ایک فرد گر تا گیا اور چند سیکنڈوں میں ہی وہ پانچوں اپنے خون میں ات پت زمین پر پڑے نظر آنے لگے۔ وہ بہت سکون سے ان کے جسموں سے پتہ خون کو دیکھنے لگی لیکن یکدم ہی فضا میں گونجتے سائرن کی آوازوں نے اس کا سکون ختم کر دیا اور وہ ہراساں سی اپنے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ اسے لگ رہا تھا کہ سائرن کی آوازیں چاروں طرف سے آ رہی ہیں۔ قریب آتی ہوئی یہ آوازیں دیر دیر سے اتنی تیز ہوئی جلی گئیں

کوشش کی۔

”پلیز اعجاز ادمیان سے میرا بتایا ہوا کام کر دینا۔ میری کامیابی کے لیے تمہاری اچھی کارکردگی ضروری ہے۔“ اس نے جیسے اعجاز کی بات قطعی ان سنی کر دی۔

”اوکے۔ ایڑ بوش۔“ اس کے انداز سے اعجاز نے سمجھ لیا کہ وہ اس موضوع پر اس کی ایک نہیں سننے کی چاہت اپنی طرف سے اسے یقین دہانی کروائی اور سلسلہ منقطع کر دیا۔ بشری نے موبائل اپنے خوبصورت گلی میں ڈالا اور آئینے پر ایک آخری نظر ڈال کر باہر نکل گئی۔ رات کا وقت تھا۔ اس وقت بائٹل میں تقیم خواتین یا تو اپنے اپنے کمروں تک محدود رہتی تھیں یا پھر اسی جیسی زبردست تیاری کے ساتھ کبھی باہر نکلتی ہوتی تھیں۔ میڈم نازی بھی اس وقت استقبالیہ کاؤنٹر چھوڑ کر اپنے کمرے میں رہتا پسند کرتی تھی اس لیے اسے چوکیدار کے علاوہ کسی سے سامنا کرنے کی امید نہیں تھی لیکن قسمت کا چکر ہی تھا کہ وہ جیسے ہی میز صوفوں سے نیچے بیٹھی، میڈم نازی سے سامنا ہو گیا۔

”ہیلو سوٹ ہارٹ! کسی پارٹی میں جا رہی ہو؟“ اس کی تیاری کو دیکھ کر میڈم نازی نے معنی خیز لہجہ میں پوچھا۔ ساتھ ہی ایک آنکھ کا کونا بھی دبایا۔ بشری کو اس کا پوچھا نہ انداز برا لگا لیکن اعتراض کی گنجائش اس لیے نہیں تھی کہ وہ جن لوگوں کے درمیان تھی اور اس نے اپنے بارے میں جو تاثر دیا تھا، وہ وہی انداز میں سوچ سکتے تھے جیسے میڈم نازی سوچ رہی تھی۔

”ایک فرینڈ کی برتھ ڈے پارٹی ہے، وہاں جا رہی ہوں۔ والہی میں شاید لیٹ ہو جاؤں۔“ بدقت مسکراتے ہوئے اس نے انہیں جواب دیا۔

”ڈانٹ وری ڈارنگ! فرینڈ کی برتھ ڈے اچھے سے سلیمینٹ کرنے کے لیے تم چاہو تو رات اس کے ساتھ رک بھی سکتی ہو۔ میں ایسی باتوں پر اعتراض نہیں کیا کرتی۔“ میڈم نازی کا لہجہ اس بار بھی معنی خیز اور عامیانہ تھا۔

”بھٹکس!“ اس نے بمشکل مسکراہٹ لبوں پر سہائی اور اپنے فٹ ہو جانے کا بیان بتاتی ہوئی تیزی سے باہر نکل گئی۔ باہر وہ گاڑی سوچو دھگی جو اس نے آج صبح ہی اپنے ملکیت سے حاصل کی تھی۔ وہ ملکیت گاڑیوں کی خرید و فروخت کا کام بھی کرتا تھا۔ بشری نے اپنی گاڑی میں کچھ کام ہٹا کر گاڑی درکشاپ پر کھڑی کر دی تھی اور فروخت کے لیے آئی ہوئی گاڑیوں میں سے ایک گاڑی عاریتاً حاصل کر کے اس کی نمبر پلیٹ تبدیل کر دی تھی۔ اس طرح اس

نے گاڑی کے ذریعے خود تک پہنچنے کا راستہ مسدود کر دیا تھا۔ اعجاز کی مدد سے مہناز کے وائس ایپ تک رسائی حاصل کرنے کا اسے خاطر خواہ تاخیر حاصل ہوا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ آج رات مہناز ایک ہوٹل میں باؤل کے بلاؤے پر اس سے ملنے جانے والی ہے۔ باؤل نے مہناز کو ہوٹل کا نام اور اپنا کمر نمبر بھی وائس ایپ کیا تھا اور ایسے ہی کسی موقع کی منتظر بشری فوراً حرکت میں آ گئی تھی۔ اس نے اعجاز کو یہ ذمے داری سونپی تھی کہ مہناز باؤل سے ملنے نہ پہنچ سکے۔ اس کے لیے اعجاز کو دو کام کرنے تھے۔ پہلا کام اپنی ہینک کی صلاحیت کی مدد سے مہناز کے موبائل میں کوئی ایسی گزبڑ کرنے کا تھا کہ کم از کم آدھے گھنٹے کے لیے وہ موبائل استعمال نہ کر سکے۔ دوسرا اسے مہناز کے اپارٹمنٹ کے دروازے کے لاک میں چند قطرے پانی پکانے کا کام کرنا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ان دو کاموں کے بعد مہناز اعتراض کے ذریعے بلڈنگ کے چوکیدار سے رابطہ کرے گی اور لاک توڑا کر اپنے باہر نکلنے کا انتظام کرے گی لیکن اس سارے چکر میں اس کا آدھا پون گھنٹا ضائع ہو جاتا اور وہ بدقت نہ تو باؤل کے پاس پہنچ پاتی اور نہ ہی اسے اطلاع دے پاتی۔ بشری کے لیے اتنی مہلت بھی بہت تھی۔ اپنے ڈاکن میں پلٹے منصوبے کی طرف سے مطمئن وہ گاڑی میں بیٹھی اور متعلقہ ہوٹل تک جا پہنچی۔ ہوٹل کی پارکنگ میں گاڑی روک کر وہ اعجاز کی طرف سے اوکے کی کال کا انتظار کرنے لگی۔ خود کو کسی کی نظروں میں آنے سے بچانے کے لیے وہ باؤل اور مہناز کے درمیان طے ہونے والے وقت سے دو چار منٹ پہلے ہی وہاں پہنچی تھی اور اب بے چینی سے اعجاز کی کال کی منتظر تھی۔ کھڑی کی سونیوں کے طے ہوتے سفر کے ساتھ ساتھ اس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ چند منٹوں کا یہ سفر طے ہو گیا تو اسے انتظار کا یار نہ رہا اور ڈش بورڈ پر پڑے گلی سے اپنا موبائل نکال کر اعجاز کو فون کرنے کی نیت سے اسے آن لاک کیا۔ نمبر ڈائل کرنے کے لیے ابھی اس کی انگلیوں نے جنبش کی ہی تھی کہ ایک گاڑی اس کی گاڑی کے قریب آ کر رکی اور اس میں سے ایک شعلہ جوالہ برآمد ہوا۔ بشری کی انگلیاں اور نظریں دونوں ساکت ہو گئیں۔ اسی وقت کسی نے اسے بائیں جانب سے پکارا۔ ”بشری!“

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر ہو جوان
کی داستان جو غلط کاروں کے لیے
غضب ناک تھا باقی واقعات ایندھاہ پڑھیے

مہر بانی فرسٹ ناکر ڈیپلیٹسٹر 98 جولائی 2020ء خرید کر پڑھیے۔

وہ بہت محویت اور بے یقینی کے عالم میں گاڑی سے برآمد ہونے والی اس شعلہ جوالہ سی لڑکی کو دیکھ رہی تھی کہ بائیں جانب سے کسی نے اسے اس کے نام سے پکارا۔ اس نے تڑپ کر آواز کی سمت دیکھا اور اچانک چہرہ دلچسپ کر رہے۔ راستہ ہی اس کے لبوں سے ایک گہری سانس برآمد ہوئی۔ وہ آواز اس کے کچھ کہنے سے گس گس ہی دروازہ کھول کر اس کے برابر والی نشست پر بیٹھ گیا۔

”یہ سب کیا ہے؟“ اس نے ایک ہار پھر لڑکی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے ٹیلی لکھ میں اچانک سے دریافت کیا۔ لڑکی اب ہونٹوں کے اندر داخل ہو رہی تھی۔ ہونٹوں کا دربان جب تک کمر اسے مساس کرنے کے بعد مودبانہ انداز میں اس کے لیے دروازہ کھول رہا تھا۔ شاہانہ انداز سے چل کر ہونٹوں کے اندر داخل ہوئی ہوئی وہ لڑکی کوئی اور نہیں مہناز تھی۔ وہی مہناز جو باڈل کی داشتہ تھی اور جسے بشری نے تاج ہوئی سیلون میں پارلر کی بیفٹارم میں فارل سی تیوری کے ساتھ دیکھا تھا۔ وہی مہناز اس وقت اسے اہتمام سے تیار تھی کہ اس پر کسی عام درکنگ گرل کے بجائے کسی امیر زادی کا گمان ہو رہا تھا۔ بشری کو معلوم تھا کہ اس نے یہ اہتمام باڈل سے ملاقات کے لیے کیا تھا لیکن وہ اس وقت مہناز کو یہاں اس جگہ دیکھنے کی خواہش مند نہیں تھی۔ مہناز کی یہاں موجودگی نے اس کی اپنی تیاری برہادر کر دی تھی اور وہ نہ باڈل کو شکار کرنے لگی تھی، شکار مہناز سے باز پرس کر رہی تھی۔

”پہلے یہاں سے نکلو۔ کسی ہونٹ کے سامنے ہون گاڑی لے کر گھر سے رہنا ہمیں مشکوک ظاہر کر سکتا ہے۔“ اس کے لہجے کی کات کو نظر انداز کر کے وہ اچانک نے ریمان سے اسے سمجھایا تو اس نے ہونٹ پیچھے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کی اور آگے بڑھنے لگی۔

”اب بولو! آخر مہناز یہاں کیسے پہنچی؟“ تھوڑا سا آگے جھپٹنے کے بعد اس نے اچانک سے دریافت کیا تو اس کے لہجے میں محسوس کی جانے والی سختی تھی۔

”مہناز یہاں اس لیے پہنچی تھی کہ میں نے اسے روکنے کی کوشش ہی نہیں کی۔“ اس کے برعکس اچانک کا لہجہ بہت نرم اور دھیمہ تھا۔

”کیا.....؟“ وہ اچانک کے الفاظ پر بشری کو جھٹکا سا لگا اور ہونٹوں پر پھر پھڑپھڑائے جیسے وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتی ہو لیکن زوردار ”کیا“ کے بعد اس کے ہونٹوں سے ایک لفظ بھی نہیں نکل سکا تھا۔ اُبتہ چہرے پر شدید اذیت اور

جھنجھلاہٹ کے تاثرات نکلی ہو گئے تھے۔

”تمہیں کسی تھنڈے خطرے سے بچانے کے لیے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ تم خود مہناز کی جگہ لینے کے چکر میں اسے یہاں سے دور رکھنا چاہتی ہو لیکن یہ بہت خطرناک ارادہ تھا۔“

باڈل جیسے آدمی کے پاس ایسے جانا ایک خوبصورت اور جوان لڑکی کے لیے بہت خطرناک عمل ہے اور میں تمہیں کسی خطرے میں نہیں دیکھ سکتا۔“ اچانک نے اسے وہ سے آگاہ کر دیا جسے سن کر وہ واقعی جھنجھلائی کہ گاڑی ایک سائڈ پر پارک کر روک دی اور اچانک زور سے لڑکیوں کے گھروں سے گھومتے ہوئے بولی۔

”تم مرد ہمیشہ ہم لڑکیوں کو انڈر اسٹیمٹ کیوں کرتے ہو؟ میں نے مان لیا کہ باڈل ایک خطرناک آدمی ہے لیکن یہ بات تو میں پہلے ہی اچھی طرح جانتی ہوں اس لیے اس سے ٹھنڈے کا انتظام کر کے چاہ رہی تھی۔“ اس نے سر بیان میں ہاتھ ڈال کر نچھایا۔ باڈل باہر نکلا تو اچانک یوں مستکرا کر جیسے کسی بچے کی نادانی پر مستکرا رہا ہو۔

”میرا مذاق اڑا رہے ہو؟“ اس کی مستکراہٹ پر بشری کو غصہ آیا۔

”ہاں، اڑا رہا ہوں مذاق۔“ اچانک پر اس کے غصے کا کوئی اثر نہیں ہوا اور وہی انداز میں مستکراتے ہوئے بولا۔ ”باڈل جیسے آدمی سے ٹھنڈے کے لیے تمہارا یہ نچھایا بہت عمل کسی کھلونے سے زیادہ اہمیت رکھتا۔“ باڈل ایک بڑا کامیاب آدمی تھا۔ وہ اپنے ہونٹوں سے لہجے نہیں ڈرتا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ گولیوں کی برسات میں بھی اس صفائی سے جھجکتا ہے کہ دشمن ہاتھ ملتے رہ جاتے ہیں۔

”بے پرکی مت اڑا اور مجھے میرے ارادوں سے باز رکھنے کے لیے باڈل کو سپر مین ظاہر کرنے کی کوشش مت کرو۔“ بشری نے اس کی بات پر یقین کرنے سے انکار کر دیا۔ ”میں نے تمہیں وہی بتایا ہے جو سچ ہے۔ باقی تمہاری مرضی ہے کہ تم یقین کرو یا نہیں۔“ اچانک نے بے نیازی کے اظہار کے لیے شانے اچکائے۔

”ٹھیک ہے۔ اترو میری گاڑی ہے۔ آج سے ہم ایک جیم نہیں ہیں۔“ اس نے فوراً ہی آنکھیں مالتے پر رکھ دیں۔

”پلیز بشری امیری بات کو سمجھو۔ باڈل ایک نہایت خطرناک۔“

”میں نے کہا ہے نیچے اترو۔“ بشری نے اچانک کا جملہ مکمل نہیں ہونے دیا اور پہلے سے بھی زیادہ سختی سے بولی۔ اچانک اچانک کو گاڑی سے اترنا پڑا۔ اس کے اترتے ہی بشری

”تم غلط سوچ رہے ہو پٹ! اور اسے کوئی بھری کرنے والا نہیں ہے۔ میں نے یہ بات صرف اپنے منہ سے کہی تھی اور وہ بڑا وفادار آدمی ہے۔ پشتوں سے اس کا خاندان ہر رات تک کھا رہا ہے اور اس کے خون میں تمک خرابی نہیں ہے۔“

”ممنی نہ سنی کوئی اور بھر ہوگا۔ خبر اپنے آپ تو اور اسے نکال کر ڈاکوؤں تک نہیں پہنچا سکتی ہے۔“ عالم شاہ نے انہیں جواب دیا تو وہ پہلے سے زیادہ ہلکے ہوئے اور نہ حال نظر آنے لگے۔ وہاں بہت سے ملازمین تھے اور ان کے حساب سے سب آتی وفادار اور تک خوار تھے لیکن عالم کی دلیل بھی رد نہیں کی جا سکتی تھی اس لیے چپ سے ہو گئے تھے۔

”آپ ایسا کریں کہ ملازمین میں سے جس جس کے پاس موبائل فون ہے، سب کے موبائلز یہاں جمع کرالیں۔ شاید اس طرح ہم مجرم تک پہنچ سکیں۔“ ان کی خاموشی نے عالم شاہ کا جوش بڑھا دیا اور نورا انہیں مشورہ دے ڈالا۔

”صبر پٹ۔۔۔ صبر۔۔۔“ صداقت شاہ جواب تک خاموش تھے، ہاتھ کے اشارے کے ساتھ اسے ٹوک بیٹھے۔

”اور پھر قربان شاہ کی طرف متوجہ ہو کر بولے۔“

”بھرا آپ نے کیا سوچا ہے ادا قربان؟ تاوان دے کر بچوں کو واپس گھر لانے کی راہی بالکل سیدھی ہے۔

”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ اب انہوں نے رابطہ کیا تو تاوان دینے پر رضامندی دے دوں گا۔“ قربان شاہ نے جواب دیا لیکن صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کسی الجھن میں مبتلا ہیں۔

”براستہ ماننا ادا قربان! یہ مشکل گھڑی ہے اور مشکل میں اپنے ہی انہوں کے کام آتے ہیں اور یہ تو ہماری سادھی آزمائش ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ رقم کے انتظام میں اگر کوئی مسئلہ ہے یا کچھ کی پیشی ہے تو آپ مجھ سے چھپیں نہیں۔ سبکل اور مختصر کی سلامتی اس وقت پر بات سے بڑھ کر ہے۔ آپ بلا جھجک مجھے بتائیں کہ میں کتنی رقم آپ کی خدمت میں پیش کروں۔“ عالم شاہ کے جوش کے مقابلے میں صداقت شاہ اپنی ہوش مندی کا ثبوت دے رہے تھے اور ان کی تمام تر توجہ اس امر کی طرف تھی کہ کسی طرح سبکل اور معظم شاہ کی یہ سلامت راہی کو ممکن بنایا جاسکے۔ پریٹن ہونے کے باوجود انہوں نے قربان شاہ کو یہ تک نہیں بتایا تھا کہ انہوں نے پولیس سے رابطے کا

نے تیزی سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ وہ جو اپنے تئیں آج باڈل سے حساب ہے باقی کر دیے والی تھی، سیاری منصوبہ بندی غارت ہو جانے پر سخت خراب موڑ میں تھی اور اپنے ایک خیر خواہ کی خیر خواہی اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

بلا جھجکا

عالم شاہ اور صداقت شاہ، معظم شاہ کے گاڑی پہنچے تو معظم کے باپ قربان شاہ نے پریٹن میں مبتلا ہونے کے باوجود روایت کے مطابق ان کا پر تپ تک استقبالی کیا۔

”کوئی خبر نہیں۔“ سادھی اکھاڑا کوڑوں کی طرف سے وہ بارہ کوئی رابطہ ہوا ہے؟“ عالم شاہ کا جوان خون اس وقت روایت و رسوم میں الجھنے کے بجائے فیصلہ کن صورت حال کے لیے جوش رہا تھا اس لیے باپ سے پہلے سوال کرنے کی جسارت کر بیٹھا۔

”ہاں پٹ! ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک فونو اور پیغام بھیجے گئے ہیں۔“ قربان شاہ نے افسردہ لہجے میں کہتے ہوئے اپنا موبائل نکال کر ڈس کی اسکرین ان دونوں باپ بیٹے کے سامنے کی۔ اسکرین پر نظر آنے والی تصویر نے ان دونوں کو دبا کر رکھ دیا۔ تصویر میں معظم شہنشاہ آنکھوں کے ساتھ اس عالم میں فرش پر پڑا نظر آ رہا تھا کہ اس کی کپٹی سے خون بہہ رہا تھا۔ تصویر کے نیچے ایک پیغام درج تھا۔

”تم نے پولیس سے رابطہ کرنے کا سوچا ہے تو ہم نے تمہارے بیٹے کا یہ جان کیا ہے۔ اگر سچ ہے تو ہم نے ہمیشہ کے لیے اپنے اکلوتے بیٹے کو کھو بیٹھو گے۔“

پیغام کے الفاظ پڑھنے کے بعد ان دونوں کی سوالیہ نظریں ایک وقت قربان شاہ کے چہرے کی طرف اٹھیں۔

”معتصم کا ایک دوست نہیں لی ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس سے رابطہ کر کے صورت حال پر مشورہ مانگوں مگر میرے فون کرنے سے پہلے ہی یہ پیغام آ گیا۔“ قربان شاہ کے کسی اعتراف جرم کی طرح انہیں حقیقت سے آگاہ کیا۔

”یہ کیا ہے؟“ کوئی طنزیہ یا حاسی جملہ ادا کرنے کے بجائے

آگاہ سردے لیکن پھر اس ارادے کو ملتوی کر دیا۔ وہ کوئی تنہا بچہ نہیں تھا کہ ہر بات کے لیے باپ کے پاس روزا جاتا۔ وہ اپنے صوبہ پر ہی معاملات کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ لطیف سومرو انہیں چلا جائے تو قربان شاہ کے فشی کو اس سلسلے میں تولے گا۔ اس فیصلے کے بعد بھی وہ کسی جگہ بیٹھ نہ سکا اور کمرے میں ٹھہرا رہا۔ ٹیبلٹ کے اس سلسلے کو دروازے پر بوسے والی دستک نے موقوف کیا۔

"ایس ایم ایم۔" وہ بے ساختہ ہی انگریزی میں بول گیا۔ روٹن میں دروازہ کھلا اور تقریباً بیس سالہ فیصل شلوہر میں بیس سوئی کی لڑکی اندر داخل ہوئی۔ لڑکی نے اپنے ہاتھ میں شیٹے کی ٹارک سی ہسٹری اٹھا رکھی تھی جس پر خوبصورت ڈیزائن کا کرسٹل کا گلاس رکھا ہوا تھا۔ گلاس خوبصورت نہیں جانی سے ڈھکا ہوا تھا اور اس کے اندر گلابی سی رنگت کا کوئی مخلول نظر آ رہا تھا۔

"آئی ایم سوری سر کہ میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا لیکن میں خود کو یہاں آنے سے روک نہیں سکی۔" لڑکی کے انداز گفتگو نے عالم شاہ کو چوڑا دیا اور ایک بار پھر اس نے لڑکی کا جائزہ لیا۔ وہ بھی تراشی خوش اور خوبصورت پرنٹ کا اسٹری شدہ جوتا پہنے ہوئے تھی اور سر پر جوڑے کا ہار رنگ شیٹون کا دوہرا پڑے انداز سے بچا ہوا تھا۔ کانوں میں بہت چھوٹے چھوٹے ٹاپس پہنے ہوئے تھے اور یہی اس کا واحد اضافہ تھا۔ وہ لڑکیوں کی باتوں کا مکمل خالی تھی۔ وہ ہاتھ میں جوس کا گلاس لیے مودیاناہ انداز میں کھڑی تھی لیکن اس کی بول چال اور پہناؤ اندازوں سے مختلف تھا۔ سب سے بڑھ کر اس کے چہرے پر موجود خود اعتمادی تھی جو اسے ملازمہ ماننے میں رکاوٹ پیدا کر رہی تھی لیکن عالم شاہ متذبذب تھا کہ ملازمہ کے علاوہ اسے اور کسی کی ٹیکری میں رکھ کر خاندان کے جملہ افراد کو تو وہ پیچھا تھا اور حویلی سے باہر سے آئی ہوئی کسی مہمان لڑکی کی اپنے کمرے میں آمد سمجھ سے باز نہ رہی۔

"تم کون ہو؟" بلاخر اس کی انجھن سوائل بین کرلیوں سے پھسل ہی گئی۔

"میں آسیہ ہوں۔ فشی مہمان کی بیٹی۔ میں آپ کے لیے یہ اسٹریپر شیک بنا کر لائی ہوں۔ کھانے کے کمرے میں ڈیرٹی دینے والی ملازمہ دن نے بتایا تھا کہ آپ سمیت کسی نے بھی ڈھنگ سے کھانا نہیں کھایا تو میں نے سوچا شیک بنا دیتی ہوں۔ آپ لوگ جس پریشانی سے گزر رہے ہیں، اس میں بھوک اڑ جانا فطری بات تھی لیکن اس حقیقت

معاملات سنبھال لیے ورنہ وہ اپنی پستی نشست چھو بیٹھے۔ فانی بہر حال پھر بھی پڑا تھا اور من کے اور لطیف سومرو کے درمیان بہت زیادہ مارچن سے فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ صداقت شاہ کے کتب خواروں نے انہیں خبردار کر دیا تھا کہ اگر آنے والے انکیشن میں انہوں نے ذرا بھی کوتاہی دکھائی تو لطیف سومرو ان کی نشست لئے اڑے گا۔

سیکلی حریف ہونے کے علاوہ بھی لطیف سومرو کے ان کے خاندان سے زیادہ خوشگوار تعلقات نہیں تھے۔ وہ مختلف مزاج کا بندہ تھا اور اس میں وہ رکھ رکھاؤ نہیں تھا جو صداقت شاہ کے خاندان میں پایا جاتا تھا اس لیے ایک بے سقے سے رہائی ہونے کے سبب ان کے درمیان رگی تعلقات تو تھے لیکن دوستی یا بے تکلفی نہیں تھی۔ عالم شاہ اس شخص کو یہاں دیکھ کر ہی لیے چونک گیا تھا کہ قربان شاہ کوئی ان کے خاندان سے الگ نہیں تھے اور لطیف سومرو سے ان کے بھی ان ہی لوگوں جیسے تعلقات تھے۔ ابھی وہ لطیف سومرو کی اس طرح آمد کے بھٹکے سے ہی نہیں سنبھلا تھا کہ دوسرا جہاز اسے قربان شاہ کو دیکھ کر آگیا۔ وہ لطیف سومرو کے انتہائی کے لیے غصہ نہیں خود باہر آئے تھے اور بڑے چڑچڑاہٹ انداز میں اس کا استقبال کر رہے تھے۔

عالم شاہ کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ لطیف سومرو کا ہاتھ تھام کر اسے اندر لے گئے۔ ان لوگوں کے نظروں سے وہ مکمل ہو جانے کے باوجود عالم شاہ تموزی ہو گیا۔ وہ بڑی سادہ سا کت کھڑا رہا جیسے ابھی کسی طور یہ بھی کچھ جانے کی بات نہ کیجیے بھی نہیں ہو، اور نہ ہی منہ میں کوئی تبدیلی آئی۔ لطیف سومرو کی یہاں موجودگی کا سبب جاننے کی اسے ایسی بات نہیں تھی کہ اس میں چل رہا تھا کہ کسی طرح خود بھی اس جگہ پہنچ جائے جہاں وہ اور قربان شاہ ملاقات کر رہے تھے لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ ایسے نہیں کر سکتا۔ اس کی تربیت کی خدو خد تہذیب حرکت کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ دوسرے اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اگر اس ملاقات کی کوئی بات سمجھ دج ہے تو اس کے سامنے اس نوعیت کی کوئی بات چیت نہیں کی جائے گی جو اسے معاہدے سے آگاہ کر دے۔ اگر بے اس ملاقات کی وجہ جانتی تھی تو کسی ذریعے سے سیندھ دانی پڑتی۔ وہ اس سلسلے میں غور و فکر کرتا ہوا ایک بار پھر کمرے میں داخل ہوا اور چہرے پر لگا ہر خصوصی دید بعد کھڑکی کے پاس جا کر جمنا تک بھی لیتا تھا کہ آیا لطیف سومرو وہاں نہیں آئے۔ وہ یا نہیں۔ ملاقات کا دورانیہ طویل ہوتا جا رہا تھا۔ ایک بار اس کا دل چاہا کہ جا کر صداقت شاہ کو اس بات سے

سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ خوراک کے بغیر جسمانی کمزوری ہو جاتی ہے اور جسمانی کمزوری دماغ کو بھی کمزور کر دیتی ہے۔ کمزور دماغ کے ساتھ اس مشکل وقت سے گزرنا اور بھی مشکل ہو جائے گا اس لیے آپ یہ شیک لی لیں۔ میں نے بڑے شاہ صاحب کے لیے بھی شوگر فرمی جوں ان کے کمرے میں بگوا دیا ہے۔ وہ بہت غمگین تھے اور دھیمے لہجے میں بول رہی تھی۔ عالم شاہ کو اس کے اندر تشنگی نے متاثر کیا اور وہ بھی اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”پلیز سر لیجے گا۔ ابھی یہ شیک بالکل فریش ہے اس لیے اصل لطف دے گا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بات نہیں رہے گی۔“ اپنی تفصیل کے جواب میں عالم شاہ کے خاموش جائزے نے اسے تھوڑا سا نروس کیا اس لیے ذرا شرمائے ہوئے سے لہجے میں اصرار کرتے ہوئے بولی۔ عالم شاہ خاموشی سے گلاس تھم کر ایک سری پر تھک گیا اور گلاس میں سے شیک کا ایک گھونٹ بھرا۔

”ویری ٹیسی۔ تم نے تو بڑے کمال کا شیک بنایا ہے۔“ پہلا گھونٹ پیتے ہی اس کے لبوں سے تعریفی کلمات پھلے۔

”شیک یو سوچے آج آپ کو پینا یا نہ ہے پھر نہ کر میرے لیے خوشی کی کیا بات ہو سکتی ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے۔

”کہاں تک پڑھی ہوئی ہو؟“ عالم شاہ نے اس سے دریافت کیا۔ آئیہ نامی یہ بڑی اچھی لڑکی ہے۔

”جی ایف ایس بنانا ہے۔“ انہی کی اسی سجاوٹ ہی میں پر بات مانے۔ مانتے بھی کیسے۔ انہی کی اسی سجاوٹ ہی میں ہے۔ کہنے لگے تیری ضد پر جتنا بڑھا سکتا تھا پڑھا دیا۔ اب واپس آ جاتا کہ حیرے چھوٹے بہن بھائیوں کو بھی پڑھا سکوں۔ تو ڈاکٹری پڑھنے بیٹھ گئی تو ان کی تعلیم کا خرچہ سے اٹھان کا۔ اب میں یہاں رہتی ہوں اور میرا چھوٹا بھائی شہر میں رہ کر پڑھ رہا ہے۔“ وہ بتاتے ہی تو دس کے چہرے پر اتنی گہری اداسی تھی کہ عالم شاہ خود دھکی ہونے لگا۔ ایک حلیم کی شوہن بڑی صرف وسائل کی کمی کی وجہ سے گھر بیٹھے پر مجبور ہو گئی تھی اور حویلی میں خدمات انجام دے رہی تھی۔

”تم نے ایف ایس سی کہاں سے کیا ہے؟ یہاں مکاؤں میں تو کوئی گریز کاٹ نہیں ہے۔“ اس کی سمجھ نہیں آیا کہ آئیہ کا دکھ کیسے ہائے تو بونکی ایک سوال کر بیٹھا۔

”حیدر آباد سے۔ وہاں میں ہاسٹل میں رہتی تھی۔ اب چھوٹا بھائی ہاسٹل میں رہ رہا ہے۔ اب کا کہنا ہے کہ ان کی اتنی گھٹیا کس نہیں ہے کہ سب بچوں کو ہاسٹل میں داخل کر داکر پڑھا سکیں۔“ وہ ہر سوال کا جواب ذرا اضافی تفصیل کے

ساتھ دیتی تھی۔

”مٹی کو چاہیے تھا کہ ماما سائیں سے بات کرتے۔ ماما سائیں اتنے گھومیں تو نہیں ہیں کہ دو تین بچوں کی بڑھائی کا خرچ برداشت نہ کر سکیں۔“ عالم شاہ کو حیرت تھی کہ مٹی عبدالحق نے یہ سادہ سادہ کلام کیوں نہیں سوجھا۔

”اب جی کی افاداری اور نمک ملانی نے انہیں ویسا نہیں کرنے دیا۔ سچے جیس سائیں قربان شاہ کے وہ پہلے والے حالات تھیں کہ میں ان سے تنخواہ کے علاوہ بھی کچھ مانگوں حالانکہ یہاں حویلی میں سب کچھ وہی پہلے والی شان و شوکت سے چل رہا ہے۔ کہتے ہیں ماما کہ مرا ہوا بھی کچھ سوا لاکھ کا ہوتا ہے تو کوئی ایسے یقین کر سکتا ہے کہ سائیں قربان شاہ کے پاس اتنا نہیں ہوگا کہ وہ ہم بہن بھائیوں کے تعلیمی اخراجات نہ اٹھا سکیں لیکن اب جی کو کوئی یہ بات نہیں سمجھا سکتا۔ وہ اپنی وفاداری میں سب کچھ قربان کر دینے والے بندے ہیں۔“ وہ دھم کے ساتھ ساتھ جھنجھلاہٹ کا بھی شکار دکھائی دے رہی تھی۔

”تم مٹی عبدالحق کو تھوڑی دیر میں میرے پاس بھیج دینا۔ مجھے ان سے کچھ بات کرنی ہے۔“ شیک مزیدار ہونے کے باوجود عالم شاہ چور نہیں لی۔ کا تھا۔ ذاتی پریشانی کے ساتھ آہستہ کی آہستہ اور قربان شاہ کے غراب حالات کی خبر نے طبیعت کا پھل پن بڑھا دیا تھا۔ ایسے میں بھلا مٹی کی

”اگر وہ سر ایف ایس بنائی ہیں۔“ اس کے سر ایف ایس بنائی ہیں۔ بڑے شاہ سائیں کے ساتھ ڈرائنگ روم میں ہیں۔ بڑے شاہ سائیں کے مہمان واپس چلے جائیں تو میں اب جی کو آپ کا پیکیج پہنچا دوں گی۔“ اس نے صند پر نہ مودو نہ لہجے میں جواب دیا اور عالم شاہ سے گھاس لئے کروا لیا چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد عالم شاہ دوبارہ اپنے سر قد شغل میں مصروف ہو گیا۔ تقریباً دس منٹ بعد اس نے لطیف سومرو کو حویلی سے روانہ ہوتے ہوئے دیکھا۔ اتنی دور سے دیکھنے پر بھی اسے لطیف سومرو کے چہرے پر خوشی سے بھرپور تاثرات دکھائی دیے۔ وہ خود کرنے لگا۔ لطیف سومرو کی خوشی کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ ابھی یہ غور و خوض جاری ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی اور مٹی عبدالحق ہجارت لے کر اندر داخل ہوا۔

”غیر سائیں۔“ اس کے سامنے مؤدب کھڑے ہوتے ہوئے مٹی نے اپنے بلائے ج نے کی وجہ جانی چاہی۔

”لطیف سومرو یہاں کیوں آیا تھا؟“ اس نے مٹی کی آنکھوں میں جھپٹتے ہوئے بے حد سنجیدہ اور سرد لہجے میں

وہی پریشانی سے نکل جائیں۔ "منشی کو اس کی جھٹ بازی پوچھا ہٹ میں چلا کر رہی تھی۔

"کیسے نکلیں گے وہ اس پریشانی سے۔ تم اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے ان سے چند لاکھ روپے مانگتے ہو اور یہاں معاملہ کروڑوں کے تاوان کا ہے۔ کہاں سے دین گے ماما سائیں اتنا بھاری تاوان۔۔۔۔۔؟"

"آپ غم نہ کریں سائیں۔ وڈے شاہ سائیں نے انتظام کر لیا ہے۔ آجائے گی تاوان کی ادائیگی کے لیے رقم۔" اس کے جارحانہ لہجے کے جواب میں منشی نے عاجزی سے کہا۔ "کہہنا سے آجائے گی رقم۔۔۔۔۔ لطیف سومرو کے پاس سے؟" ہم انہوں کے لیے غیریت برت کے ماما سائیں لطیف سومرو سے قرض لینے رہے ہیں؟ "اپنا تہ انداز برقرار رکھتے ہوئے اس نے منشی پر چڑھائی کی تو اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ عالم شاہ لطیف سومرو کی یہاں آمد کا مقصد بھانپ چکا ہے۔

"کس شرط پر رقم دے رہا ہے لطیف سومرو؟ کتنے سود کا مطالبہ کیا ہے اس نے؟" منشی کے چہرے کی اڑی رنگت سے عالم شاہ نے بھی اندازہ کر لیا کہ اس کا چلا یا ہوا تیر لکھانے پر نلک گیا ہے اس لیے مزید پیش کرنے لگا۔ "سود کی بات نہیں ہے سائیں۔ سود پر رقم مل جاتی تو بھی خیر تھی۔ لطیف سومرو اس کے لیے راضی نہیں ہوا۔ اس کی اس کی بات ماننا پڑتی ہے۔ منشی نے دھیمی آواز میں اسے منع کیا تو اسے جھٹکا لگا۔

"کیا۔۔۔۔۔ ماما سائیں نے زمین بیچ دی؟ ان جیسا آدمی ایسا کیسے کر سکتا ہے؟" "ادوار کے ہے آدمی سب کچھ کر جاتا ہے۔" منشی کا لہجہ بھیک گیا۔ یقیناً اسے اپنے مالک کی اس تکلیف کا احساس تھا جو انہوں نے زمین بیچنے کا فیصلہ کرتے ہوئے محسوس کی تھی۔ "ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں ابھی ماما سائیں سے بات کرتا ہوں۔" عالم شاہ جذباتی ہوئے لگا۔

"آپ کو اللہ کا واسطہ ہے سائیں، ایسا نہ کریں۔ میری زبان آپ کے سامنے کھلی جانے کا سن کر انہیں بہت رنج ہوگا۔ اب تو جو ہونا تھا ہو چکا۔ وڈے شاہ سائیں نے سچے کاغذ پر لکھ کر دے دیا ہے اور لطیف سومرو بچہ بھی دے گیا ہے۔ اب کچھ بدل نہیں سکتا ہے۔" اس بار منشی کی آنکھوں سے آنسو نکل کر اس کے رخساروں پر لڑھک گئے۔ وہ کچھ بڑا دودھ مار ملازم تھا۔ سن کر عالم شاہ کے منہ

پوچھا تو منشی مڑ بڑا گیا لیکن پھر فوراً ہی سنبھل کر بولا۔ "میں معمولی ملازم کیا بنا سکتا ہوں سائیں۔ وہ وڈے شاہ سائیں کے جہان تھے۔ وڈے شاہ سائیں ہی آپ کو؟ آپ کے سوان کا جواب دے سکتے ہیں۔" "کیوں، رقم ملاقات کے دوران وہاں موجود نہیں تھے کیا؟" عالم شاہ کا لہجہ تند تھا۔

"وڈے شاہ سائیں جانتے ہیں کہ ان کے حکم کے بغیر میری زبان نہیں کھلتی اس لیے وہ مجھ پر اتنا بھروسہ کرتے ہیں۔" منشی کا لہجہ اب بھی مؤدبانہ تھا لیکن انداز میں وہ خود اعتمادی تھی جو صرف و نادار روپے آدمی کے لہجے میں ہی ہو سکتی ہے۔

"ٹھیک ہے۔ تم چھوڑ دو اس بات کو اور یہ بتاؤ کہ اپنے بچوں کی اچھی تعلیم کا انتظام کیوں نہیں کرتے؟ مالی مسئلہ ہے تو اس کے لیے ماما سائیں سے کہہ سکتے ہو وہ تمہاری بات ماننے سے انکار تو نہیں کریں گے۔"

"آپ سے آسہ نے کچھ کہا ہے؟" منشی جھٹکا۔ "مجھ سے کسی نے بھی کہا ہے، تم مجھے میرے سوال کا جواب دو۔" عالم شاہ نے رعب بھنایا۔

"الٹنی ذات کو ز یادہ پڑھا نکلتا کر اس کا دماغ نہیں خراب کرتا تھا مجھے اس لیے جتنا پڑھا تھا، پڑھا کر گھر بٹھا یا۔ ایک بیٹا حیدر آباد میں پڑھ رہا ہے۔ دوسرے کو بھی جب بڑا ہوگا بھجوادوں گا۔ ابھی تو ادھم گایں کہ اسکول میں ہی پڑھ رہا ہے۔"

"کیوں۔۔۔۔۔ یہاں کچھ دن کے اسکول میں کیوں پڑھو رہے ہو اسے؟ یہاں کا تعلیمی معیار کتنا کھٹا ہے، تمہیں تو وہ معلوم نہیں ہے۔ ایسے معمولی اسکول میں پڑھ کر تمہارے بچے کا خاک مستقبل بنے گا؟" عالم شاہ نے اس کا جواب من کر اسے ٹوکا۔

"اللہ مالک ہے سائیں، وہ بہتر کرے گا۔" منشی نے عاجزی سے جواب دیا۔

"جب تک تم خوش نہیں کرو گے اللہ بھی کچھ بہتر نہیں کرے گا۔ ماما سائیں سے بات کر کے اپنے بیٹوں کا کسی اچھے اسکول میں داخلہ کروادو بلکہ میری مانو تو انہیں کراچی کے کسی بڑے اسکول میں بھجوادو۔ ماما سائیں اتنے گئے نزد سے تو نہیں ہیں کہ اپنے وفادار ملازم کے بچوں پر چند لاکھ روپے خرچ نہیں کر سکیں۔"

"ابھی جو ہے، جیسا ہے ٹھیک ہے سائیں۔ ابھی تو مجھے بس اتنی رقم ہے کہ سائیں، چھوٹے سائیں اور سائیں

سے کراہی نکل گئی اور اس نے اپنا سر تھام لیا۔ قربان شاہ کی اتنی غیرت مندی نے اسے تکلیف پہنچائی تھی سین فٹنگ کا کہنا بھی ٹھیک تھا کہ اب کچھ کہنے سے کوئی حاصل وصول نہیں تھا، جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

معاذ بے بسی کے عالم میں اپنے قید خانے میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک طرف اپنے دوستوں اور گھر والوں پر غور کرنے والی پریشانوں کا دیکھتا تھا تو دوسری طرف کل شاہ اور معظم شاہ کی بھی فکر ہو رہی تھی۔ کہنے کو ان دو لوگوں سے اس کا کوئی رشتہ نہیں تھا لیکن کل شاہ سے اپنا کچھ ہی جو تعلق قائم ہو گیا تھا، اس نے خود بخود ہی اسے اس کی اور اس سے وابستہ لوگوں کی فکر میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس نے ہمیشہ بہت صاف ستھری زندگی گزاری تھی اور صنفِ مخالف کے بارے میں اپنے جذبات کی نوعیت سے بھی خوب واقف تھا۔ اپنی حسین و جمیل کزن ثوبہ، ذہین و حق گو بشری سے لے کر دیکش و بے باک سونیا جان تک کسی کی نگاہ التفات نے اس کے جذبات میں وہ ہلچل نہیں مچائی تھی جو کل شاہ کی ایک جھٹک نے مچا کر رکھ دی تھی اور وہ اس معاملے میں بالکل بلیئر تھا کہ وہ کل شاہ سے پہلی نظر کی محبت کے بعد جس جس بندہ گیا ہے وہ اب جو محبت کتنی لامہصل تھی، اس بحث میں پڑنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ محبت تھی تو بس تھی اور محبت کا کتنا تھا کہ اپنے محبوب کے لیے کچھ کیا جائے۔ ہوا اس کا ذہن مسلسل اس نکتے پر سوچ رہا تھا کہ ان دو ہی میاں بیکار ہو گئے۔ آزادی دلانے کے لیے کیا کیا جائے۔ آزادی کی خود اسے بھی شدید ضرورت تھی کہ اسپانیا یڈرین کی غل عرقان اللہ ایڈمٹیشن سے اس کا سودا کرنے کا ارادہ باندھ چکا تھا اور وہ لوگ تو اس کے خون کے پیاسے تھے۔

آزادی کے لیے تدبیریں سوچتے ہوئے اسے اچانک ایک بات یاد آئی تو اپنی جیبیں ٹٹول کر دیکھنے لگا۔ وہ ابھی تک فیضو کا فرام کر دہ لباس ہی پہنے ہوئے تھا۔ یہ لباس بہت میلا اور پھنا پھنا ہو چکا تھا لیکن اس کی اندرونی جیبوں میں ابھی تک وہ سوغا میں محفوظ تھیں جو فیضو نے وقتِ رخصت اسے عنایت کی تھیں۔ ڈاکوؤں نے اس کی بہت زیادہ تفصیلی سرچشمی نہیں کی تھی اور بس اتنی یچین دہالی کر لی تھی کہ اس کے پاس کوئی اسلحہ وغیرہ تو موجود نہیں ہے اس لیے وہ فیضو کے تحائف سے محروم نہیں ہوا تھا۔ چھوٹی چھوٹی پڑیوں میں محفوظ ان تحائف میں سے ایک کے استعمال کا وقت آ پہنچا تھا۔ جیب سے پلاسٹک کے شاپر میں محفوظ پڑیاں

نکال کر اس نے ان میں سے چن کر ایک پڑیا نکالی اور اسے کھول کر اس میں موجود سفوف کو دیکھنے لگا۔ سفوف رنگ کا یہ سفوف اسے یہاں سے آزادی دلانے میں مدد دے سکتا تھا لیکن ایک جھجک سی تھی کہ نہ جانے اس کی وہ تھیر ہو بھی یا نہیں جو فیضو نے بتائی تھی اور کتنا کراہتا ہے دینے کے دینے پڑ جائیں لیکن پھر اس نے رسک لینے کا فیصلہ کر لیا۔ فیضو دینا بند نہیں تھا جس پر وہ اتماد نہ کرتا۔ فیضو کی عمر اگلی شخصیت کی کرشمہ سازیاں اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں چنانچہ اس کی دی ہوئی جادو کی پڑیا کو آزمائے میں خطرے کا تناسب بہت کم تھا۔ اس نے اللہ کا نام لیا اور پڑیا میں موجود سفوف سفوف کی ایک اچھی اپنی زبان پر رکھ دی۔ سفوف بے حد کڑوا تھا سین زبان پر رکھتے ہی منہ میں چل گیا تھا اس لیے فوراً ہی اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا۔ سفوف کھاتے ہی چند سیکنڈوں میں اس نے اپنے جسم کا درجہ حرارت بڑھت ہوا محسوس کیا۔ نتیجتاً اس کے جسم سے پسینا پھوٹنے لگا۔ پسینا بننے کی رفتار خاصی تیز تھی۔ چند منٹوں کے اندر وہ پسینے سے تر ہو گیا تو حرکت میں آیا اور زور زور سے دروازے پر دستک دینے لگا۔ اس کے دستک دینے میں اتنی شدت تھی کہ کسی کو

وہاں پہنچا ہی نہ پڑا۔

”کیا بات ہے، کیوں دروازہ توڑ رہے ہو؟“ آنے والے نے غصے سے پوچھا۔ بولے لیجے میں دروازہ کھٹک رہا ہے۔

”میرے کدے طبعیت بہت خراب ہو رہی ہے بھائی کچھ دھڑام سے فرش پر گر گیا۔ اس کے اس عمل میں اوکاڑی کا زیادہ دخل نہیں تھا۔ سفوف نے اپنا کام دکھانا شروع کر دیا تھا۔ جسم جس کا درجہ حرارت پہلے بہت بڑھ گیا تھا، وافر مقدار میں پسینہ آنے کی وجہ سے اب ٹھنڈا ہو چکا تھا اور آہستہ آہستہ اثرِ شروع ہو گیا تھا۔ پہلے فرش پر گرنے سے زوردار آواز پیدا ہوئی تھی اور معاذ کو خاموشی چوٹ بھی لگی تھی لیکن باہر کی آوازوں کو سننا وہ غفلت تھا کہ خاطر خواہ دیکھیں ظاہر ہو رہا ہے۔ اس کے دروازہ پہنچنے پر آنے والا اگرچہ اندر نہیں آیا تھا لیکن اپنے کسی ساتھی کو آواز میں دے کر بنا ضرور رہا تھا۔ معاذ نے اس کی پکار پر کسی سے آتے ہوئے قدموں کی چاپ سنی۔ پھر شاید وہ دھیمی آواز میں ایک دوسرے سے مشورہ کرنے لگے۔ آخر کار بند دروازہ آہستہ سے کھلا۔ وہ دونوں بے حد محتاط تھے اور ایک دوسرے کو گور دے اس انداز میں اٹھارہا تھے ہوئے تھے کہ معاذ کی ذرا بھی غلط حرکت پر اسے گولی مار سکتے تھے۔ چائناک اور پیشہ ور

چاچہ خود جھک کر اس کا معائنہ کر رہا تھا۔ پہلے اس نے اس کی نبض دیکھی تھی پھر سینے پر ہاتھ رکھ کر دل کی دھڑکن محسوس کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ معاذ کو معلوم تھا کہ اس کے یہ داخلہ سانسز اسے دھیمے پڑ چکے ہیں کہ آفات کے بغیر محسوس نہیں کیے جاسکتے گئے۔ اسے صرف اپنی سانس کی آمد و رفت کے سلسلے کا احساس ہو رہا تھا اور وہ اتنی احتیاط سے سانس لے رہا تھا کہ کسی کو اس کے سانس لینے کا احساس بھی نہ ہو سکے۔ چاچہ نے اس کے ہاتھوں کے آگے انگلیاں رکھ کر غلط محسوس کرنے کی کوشش کی تو اس نے اپنی سانس بھی روک لی۔

”یہ تو ایسا لگتا ہے مر چکا ہے۔“ اس کے جسم میں زندگی کی کوئی علامت نہ پا کر چاچہ نے تشویش زدہ لہجے میں خیال ظاہر کیا۔

”بہت شدید دل کا دورہ پڑا تھا ہے چارے کو۔ پانی بھی نہیں مانگ سکا۔“ پہلے معاذ کا معائنہ کرنے والے ڈاکٹر نے بھی گویا اپنی طرف سے تائید کی۔

”اتنا جوان آدمی اور دل کا دورہ... تو زیادہ اپنی ڈاکٹری مت جھاڑ۔“ چاچہ کو اپنے ساتھی کی خیال آرائی پسند نہیں آئی اور چوتھے کرے سے ڈاکٹر دیا پھر خود کلائی کے انداز میں بڑبڑایا۔

”بڑا قیمتی بندہ تھا یہ۔“ سائیکس کو اس کے بارے میں خبر کرنی پڑے گی۔ تم میں سے ایک سائیکس رکوہ میں سائیکس کو دھکیلتے ہوئے، چاچہ نے کہا تو ڈاکٹر کو بلا کر اسے دھکیلیں گے۔ چاچہ نے معاذ کی نظروں کے فریم سے نکل گیا۔ اس کی آنکھیں نیم دائیں اور وہ اپنی مرضی سے آنکھوں کو حرکت نہیں دے سکتا تھا۔ جسم کے اتنے ملل سکوت ہی کی وجہ سے چاچہ دور اس کے ساتھیوں کو اس کی موت کا یقین دہا رہا تھا اور وہ خود بھی ایک عجیب و غریب تجربے سے گزر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہاں دوبارہ قدموں کی چاپ بھری اور آوازوں سے اندازہ ہوا کہ اسپائیڈر میں کی نقل چاچہ کے ساتھ وہاں آیا ہے۔ وہ سمجھا ایسے ذراویے سے مڑا تھا کہ معاذ اسے دیکھ نہیں سکتا تھا اور صرف اس کی آواز ہی سن پاتا تھا۔

”یہ اچھا نہیں ہوا چچا! بندہ قیمتی تھا۔ میں نے تو تویر سے بول بھی دیا تھا کہ عرفان اللہ سے اس کے سودے کی بات کرلو۔“ اس نے شاید اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد معاذ کی موت کا یقین کر کے یہ تبصرہ کیا تھا۔

”آپ کہو سائیکس تو آبادی سے ڈاکٹر لاکر ایک نظر اسے دکھالیں، ویسے اپنے چارے کا تو خیال ہے کہ دل کا دورہ پڑنے سے مر رہا ہے بندہ۔“ چاچہ کا لہجہ موزون رہا تھا۔

... ڈاکٹروں سے معاذ کو ایسی ہی امید تھی اس لیے دروازہ کھلوانے کی کوئی سادہ ترکیب نہیں آزمائی تھی۔

”اس کا تو بچ بچ برا حال ہے۔“ معاذ کی طرف سے کوئی ملکہ حرمت نہ ہونے کا یقین ہو جانے پر وہ دونوں اندر آ گئے اور اس کا بازو لینے لگے۔ ایک نے ہتھکڑی اس کی کلائی تھامی اور نبض چیک کرنے کے بعد دل پر ہاتھ رکھ کر دھڑکن چیک کرنے لگا۔

”اس کی تو نبض ڈوب رہی ہے یا ر! مجھے دینا لگ رہا ہے کہ اسے دل کا دورہ پڑا ہے۔ میرے چاچا کو بھی دل کا دورہ پڑا تھا تو ایسے ہی ٹھنڈے پینے آ رہے تھے۔“ اپنے طور پر معائنہ کرنے کے بعد اس نے قدرے تشویش سے خیال آرائی کی۔

”تم اسے دیکھو، میں چاچہ کو بلاتا ہوں۔“ دوسرا شخص بھی کھڑا ہوا ہر نکل گیا جبکہ پہلا اپنا ہتھیار ایک طرف رکھ کر معاذ کے سینے کی مالش کرنے لگا۔ معاذ نے اپنے ہاتھ کی پتلی میں موجود من کو دیکھا اور دل سسوس کر رہ گیا۔ اس کے جسم میں پیرا تو نے والا اثر اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ آئندہ کوشش کر کے من کو اپنے ہاتھ میں پکڑ بھی لیتا تو اسے استعمال کرنے کے لائق نہیں تھا۔ اب اسے کسی بھی فوری آمیزش کے بجائے

اچھی ہوئی صحت عملی کے مطابق ہی عمل کرنا تھا۔

سرف اس کے جسم پر اپنے اثرات پوری طرح مرتب کر چکا تھا اور وہ خود محسوس کر رہا تھا کہ اس کے جسمی سے حرمت کرنے کے لائق نہیں رہا ہے۔ اس کی بات یہ تھی کہ زبان کی ٹرواہٹ اور تھوڑی سی ثقاہت کے علاوہ

وہ کوئی تکلیف محسوس نہیں ہو رہی تھی لیکن وہ جان بوجھ کر حق سے اس کی آوازیں نکال رہا تھا جس سے سینے والے کو

مجھے کہ وہ شدید تکلیف میں ہے۔ چاچہ وہاں آیا، اس وقت تک وہ حق سے آوازیں نکالنے کے لائق بھی نہیں رہا تھا۔

بالی جسم کے ساتھ ساتھ اس کی زبان بھی اڑ چکی تھی۔ سرف نے ان سارے اثرات سے فیض اے آگاہ کر چکا تھا لیکن

پھر بھی وہ اپنے جسم میں عجیب سی سنبھل محسوس کر رہا تھا۔ اپنے جسم کے بالکل غیر متحرک اور لاچار ہو جانے کا تجربہ

انہوں نے پہلے ہی خوف زدہ کر دینے والا تھا اور نہ چاہتے ہوئے

میں دل میں اندیشہ ابھر رہا تھا کہ اگر جسم دوبارہ اپنی اصل حالت میں واپس نہ آیا تو کیا ہوگا؟ ایک ڈر یہ بھی تھا کہ اسے

بے بسی کی حالت میں پائے نہ جانے وہ لوگ اس کے ساتھ کیا لوگ کریں لیکن ان کے تاثرات اور گفتگو سے پتا چل رہا تھا کہ فی الحال تو وہ جی ان و پریشان ہیں۔

”اچھے کو کون سا اس کے پھپھلوں کو جواب دیتا ہے جو موت کی وجہ یا تعین کرتے پھر میں۔ اصل بات یہ ہے کہ بندہ مر گیا ہے اور ہمارے ہاتھ سے مفت کی دولت اٹھ گئی ہے۔“ اسپا ہیڈر مین کی نقل سچ کچ بڑا گھٹیا آدمی تھا جسے ایک جوان لڑکے کی موت سے زیادہ مال کا افسوس تھا۔ اس کا یہ فیسوس زیادہ دیر برقرار نہیں رہا اور معاوضے میں پائل فون کی گھنٹی بجنے کی آواز سنی۔ اس آواز کو سن کر وہ چونکا کیونکہ معظم شاہ سے کہا گیا تھا کہ وہ لوگ جس جگہ موجود ہیں وہاں موبائیل کے گھنٹے نہیں آتے لیکن ایسی کوئی بات نہیں تھی اور اس بات کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ وہ لوگ آپادی سے بہت زیادہ دور و دراز ہو گئے ہیں۔

”اچھا ہوا تو یہ تو نے فون کر لیا۔ میں خود تجھے کالی کرنے والا تھا۔ یہاں ایک بڑی بڑی بندوق ہے۔“ اسپا ہیڈر مین کی نقل کال ریسیو کر کے بات کرنا شروع کر چکا تھا اور تو یہ کہہ گاڑ کی موت سے آگاہ کر رہا تھا۔ اسخود وہی شخص تھا جو معاوضہ کو کیر جہ کی پہاڑیوں پر ملتا تھا اور جس نے نقشب لیتے کے یہاں معظم شاہ اور اس کی بیوی کو اغوا کر لیا تھا۔ پوری بات بتانے کے بعد وہ دوسری طرف سے تصویر کی بات سننے لگا اور ذرا سے توقف کے بعد اس کی چٹکی دلی آواز سنائی دی۔

”یہ تو تو نے بڑے پوچھت کی بات کی ہے پورا دانی عرفان اللہ اینڈ مینی کو زندہ اور بے ہوش کر کے اس کے پاس آئے اور اس کا اچھا بڑا لالچ لے لیا۔ میں تو انہیں یہ ہی دیکھتی ہے تو دے دیتے ہیں لاش نہیں ابھی تو انہیں یہ مت بتانا کہ بندہ مر چکا ہے۔“ اسے آخر وہ نکتہ سوچا ہی گیا تھا جو خود معاوضہ کے ذمہ میں بھی موجود تھا۔ اس کے دشمنوں کو بھلا اس کے زندہ وجود سے کیا غرض تھی۔ ان کی بھلائی تو اسی میں تھی کہ معاوضہ نیست و نابود ہو جاتا اور ان کے سر پر ننگی خنجر سے کی لکڑی بٹ جاتی۔

”ہیں پھر تو ادھر کے معاملات دیکھ، میں ادھر کے دیکھتا ہوں۔ جلی شاہ کو توڑے بغیر میرا کام ادا ہو رہا رہ جائے گا۔ وہ مانا گئی تو میرے دل کی مراد پوری ہو جائے گی لیکن اس سے پہلے ذرا اس لاش کا کچھ بندوبست کرتا ہوں۔ تو عرفان اللہ سے جدی معاملات سیٹ کر لے۔“ اپنی بات پوری کر کے اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ معاوضہ اس کی گفتگو سے الجھن میں پڑ گیا کہ آخر یہ شخص معظم شاہ کی بیوی سے کیا بات منواتا چاہتا ہے؟ اگر معاملہ اس کے حصول کا تھا تو اس میں ایسی کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ وہ ان لوگوں کے قبضے میں تھی

اور وہ اس کے ساتھ جو چاہتے سونک کر سکتے تھے۔ یقیناً ان کا کوئی خاص مقصد تھا جس کی خاطر انہوں نے اسے معدنی میں بلا کر اس سے ہاتھ پیٹ کی گھی اور جب وہ مذاقیت کر کے واپس آ رہی تھی تو بڑی بڑا حال اور پریٹن نظر آ رہی تھی۔

”چائے! کسی بڑے ڈیپ فریڈر کا ہونچا مکر جس میں یہ لاش ٹھیک سے آ جائے۔ پتا نہیں کتنے دن اس میں معاوضہ ملے ہوں۔ لاش مز سزا گئی تو اپنے کو مشکل ہو جائے گی۔“ معاوضہ کے مرنے پر افسردہ ہوجانے والے اسپا ہیڈر مین کی نقل اب دوبارہ پرجوش ہو گئی تھی اور احکامات جاری کر رہا تھا۔

”آپ فہرست کر رہے ہیں! میں سنبھال لیتی گا۔“ چاچا نے اسے تسلی دی تو وہ باہر نکلا گیا۔

”اچھا جارے! شیدائے ساتھ جا کر ڈیپ فریڈر خرید لے۔ ادھر اس کمرے میں سی ن کمریٹ کر دیتا۔ پتہ نہ دینے میں تو ہمانوں کو ہی رکھنا پڑے گا۔“ چاچا نے صدمہ جاری کیا۔

”میرے اور شیدائے جاننے کے بعد پیچھے بندے رہ جائیں گے۔“ چاچا نے دلی زبان میں چاچا سے کہا۔

”کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ادھر کس کا تہ ہے۔ آیا ابھی تو ہم لاٹین سی ڈس جہ مار رہے ہیں۔“ چاچا نے سچے سچے اپنی شہ زوری کا زعم تھا۔ اس گفتگو کے بعد وہ ڈب آئیٹ ایک کمرے کے کمرے سے باہر نکلا۔ معاوضہ نے محسوس کیا کہ

یہ شخص اپنے ہاتھوں نے دروازہ ضرور بند کیا تھا لیکن باہر سے کچھ نہ سنا۔ معاوضہ نے کی آواز نہیں آئی تھی۔ ظاہر ہے انہیں ایک ”لاش“ کے بھگ جانے کا کوئی ڈر نہیں تھا۔ منقطع صاف ہو جانے کے بعد معاوضہ نے آگے کے ناخن عمل پر چڑھا شروع کر دیا۔ سب سے پہلے تو اسے کسی ٹھوڑے کی طرف سے اٹھ جانے والے جسم کو متحرک کرتا تھا۔ اس مقصد کے لیے سفوف کے استعمال کے ساتھ ہی اس نے ایک ننھا سا کپسول اپنی ڈاڑھ میں رکھ لیا تھا۔ یہ کپسول اس سفوف کا توڑ تھا اور فیضو کے دلوے کے مطابق پانچ منٹ کے اندر اندر جسم کو واپس پہلے والی حالت میں لے آتا تھا۔ اس چھوٹے سے کپسول کو چبانے کے لیے معاوضہ کو تھیں جدوجہد کرنی پڑی کہ جسم کے دیگر عضلات کی طرح منہ کے عضلات بھی اکڑ گئے تھے۔

سفوف کے مقابلے میں کپسول بے ذائقہ تھا جس پر معاوضہ نے شکر ادا کیا۔ سفوف کی کڑواہٹ کو تو وہ اب بھی نہپنے مند اور طلق میں محسوس کر سکتا تھا۔ کپسول چبانے کے بعد وہ بے تابی سے اس کے اثرات کا تجربہ کرنے کا انتظار کرنے لگا۔

زمین پر گھاس موجود تھی لیکن سوکھی ہوئی اور بے جان محسوس ہو رہی تھی۔ یہ لگتا تھا کہ عرصے سے کسی نے اس کی طرف توجہ نہ دی ہو۔ معاذ کی بھی زیادہ توجہ اس گاڑی کی طرف تھی جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر کوئی بیٹھا ہوا تھا لیکن درمیان میں چاچا کے کھڑے ہونے کی وجہ سے وہ اس شخص کی شکل نہیں دیکھ پا رہا تھا اور صرف کپڑوں کی بجلی ہی جھلک ہی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے دبے قدموں چلی کر درمیانی فاصلہ کم کیا کہ زیادہ بہتر طریقے سے دیکھ سکے لیکن اسی اثنا میں وہ سنوڈ گرے ٹکنس اسٹارٹ ہوئی اور آگے بڑھتی چلی گئی۔ معاذ جھپٹ کر دروازے کی آڑ میں ہو گیا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ اب چاچا واپس اندر آئے گا۔ اپنی سماعت کو پوری طرح اس طرف مرکوز کیے۔ اس کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔

بھاری قدموں کی چاپ اسے بتا رہی تھی کہ چاچا عمارت کے بلند فرش تک آنے والے چار عدد قدم چلے کرنے کے بعد اب مرکزی دروازے کے ساتھ بنے کھسے والان سے گزرتا ہوا اس طرف آرہا ہے۔ جیسے ہی اس نے اندر داخل ہونے کے لیے نیم دار دروازے کو مزید دھکیلا، معاذ کے جسم کا تھوڑا بڑھ گیا۔ بے خبری میں ڈانٹا چاچا اندر داخل ہوا تو معاذ کسی چپتے کی طرح اس پر جھپٹ پڑا۔ وہ چاچا کی گردن کو اپنے بازو کی گرفت میں لیا چاہتا تھا لیکن چاچا بھی ایک سکہ بند ڈاکو تھا۔ ایسے لوگ عام انسانوں کے خلاف جتنی بھی جھپٹ چکے مانتے ہوتے ہیں اور یہ جہالت اس شخص کے لیے آگاہ کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ چاچا نے بھی ہی جیت کے تحت زمین معاذ کے حملہ کرتے وقت اس کی وہاں موجودگی کو محسوس کر لیا تھا اور اپنے بھاری سنے کے باوجود انہماک تیزی سے اس کی طرف گھوما تھا۔ اس کے حوص نے معاذ کا سر تا کام کر دیا اور بجائے اس کے کہ وہ چاچا کی گردن اپنی گرفت میں لے پاتا، دونوں کی زبردست ٹکر ہوئی۔ دونوں ہی کی آنکھوں کے آگے تارے تاج گئے لیکن دونوں سخت چٹا تھے اس لیے فوراً خود کو سنبھال لیا۔ چاچا کے مقابلے میں معاذ اہل اس اعتبار سے کمزور تھا کہ اس نے نہ ہی میں کیرتھر کی بے رحمی کا سامنا کیا تھا اور تھکنے ماندے زخمی جسم کو ابھی تک مہل علاج اور آرام میسر نہیں آتا تھا۔ اس کی اصل طاقت جذبے کی وہ شدت تھی جس کے تحت وہ اپنی اور دوسروں کی بقا کی لڑائی لڑنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اب بھی اس نے چاچا سے زیادہ پھرتی دکھائی اور گمن ٹالنے کے لیے ہولناکیوں کی طرف بڑھتے چاچا کے ہاتھ پر گھما کر پھینکی اتنی زوردار ضرب لگائی

پہلا منٹ گزرا تو اسے احساس ہوا کہ وہ اپنی آنکھوں کی پٹیوں اور پلکیوں کو حرکت دے سکتا ہے۔ زبان کی اکڑان بھی دھیرے دھیرے قسم قسم ہونے لگی۔ اس کے بعد ایک ایک کر کے سارے اعضا متحرک ہونا شروع ہو گئے۔ معاذ جس نے سٹوف چھانک کر بہر حال ایک بڑا رسک لیا تھا، اپنے جسم کو پہلے والی حالت میں آتا دیکھ کر خوش ہو گیا۔ پہلے اس نے لیٹے لیٹے ہی اپنے ہاتھ پیروں کو حرکت دی پھر اٹھ کھڑا ہوا اور بجلی پھسی ورزش کے انداز میں پیچوں کے بل ایٹنے لگا۔ اس عمل نے اس کے جسم پر اچھے اثرات مرتب کیے اور عضلات کی رہی سہی اکڑان بھی ختم ہو گئی لیکن ہلکی سی نقابست اور شدت کی پیاس کا احساس اپنی جگہ تھا۔ جسم سے نکلنے والے بے تحاشا پسینے نے پانی اور خشکیات کی کمی کر دی تھی اور زمین کی کووہ محسوس کر رہا تھا لیکن پھر اس نے اپنے دماغ سے اس احساس کو جھٹک دیا۔ آزادی کے لیے فوری حرکت میں آنا ضروری تھا۔ ڈاکوؤں کے دو ساتھی ڈیپ فریزر کی خریداری کے لیے باہر گئے ہوئے تھے اور اس نے ان کی جو انگلیسکی تھی، اس کے مطابق وہاں دو تین پندے ہی موجود تھے اس لیے کچھ گزرتے سے اس کے لیے یہ موقع اچھا تھا۔

کمرے سے باہر نکلنے سے قبل اس نے دروازے کو دھکیلتی سے محول کر احتیاط سے باہر بھاگا۔ پورا ایراء خالی پڑا ہوا تھا۔ وہ دبے پوئیں آگے بڑھنے لگا۔ برآمدے میں مزید کئی گردن کے دروازے موجود تھے لیکن وہ ان سے پر تالا لگا ہوا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کی ڈیوڑھی اور دروازے پر لانے ہونے کے باوجود ان کی معیار کے میٹر میں سے بٹن ہوئے ہیں۔ برآمدہ اچھا خاصا طویل تھا جس سے عمارت کے وسیع وغریب ہونے کا اندازہ جودا تھا اور نہ پہلے اسے معطر شاد اور اس کی سیاہی کے ساتھ جس تہ خانے میں رکھا گیا تھا، وہ تو خاصا مختصر تھا اور اسے دیکھ کر قدامت کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ وہ اندازے سے اس سمت بڑھتا چلا گیا جہاں اس کی اسپائیڈر میں کپڑوں سے خاقتا ہوتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ پہلے وہ اس شخص کو قابو میں کرے گا تاکہ پانی قرار خود بخود ہی اس کے قبو میں آجائیں لیکن اسے اپنے اس ارادے پر عمل کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ برآمدہ پارکر کے وہ جس جگہ پہنچا وہاں سے مرکزی دروازہ بہت قریب تھا اور وہ ادھ کھلے دروازے سے باہر کا منظر دیکھ سکتا تھا۔

باہر خاصا وسیع زمین کا رقبہ نظر آ رہا تھا اور اس رقبے پر ذیلے قاصے سے مختلف اقسام کے درخت لگے ہوئے تھے۔

کہ بڑی جھنجھٹے جیسی آواز اس نے یا قاعدہ خود اپنے کانوں سے سنی۔ اس ضرب کو کھا کر چاچڑھن کی طرح ڈکرایا اور من نکالنے کا ارادہ ستوی کر کے جنگلی بھینسے کی طرح موڈ کے پیٹ میں اپنے سر سے ضرب لگانے کی کوشش کی۔ معاذ بن جبل سے بچنے کے لیے تڑپ کر دو بھینس طرف پھٹا لیکن چاچڑھن کی پٹنگ اس سے زیادہ بہتر تھی۔ معاذ پوری طرح تو ہمنے کی زد میں نہیں آیا لیکن دائیں جانب کمر پر اس ضرب کو سہنا پڑا۔ تکلیف پر توجہ دینے کی مہلت نہیں تھی چنانچہ بغیر کسی توقف کے اس نے ایک بار پھر اپنی ٹانگ کو حرکت دی اور چاچڑھن کے منہ پر گھٹا دے مارا۔ یہ ضرب بھی کاری ثابت ہوئی اور چاچڑھن کے منہ سے خون بہہ نکلا۔ اس بار معاذ نے اپنے منہ کے استخوان کیا اور چاچڑھن کی موٹی ٹانگ کو نشانہ بنایا۔ اس ضرب کو کھا کر چاچڑھن نے اتنی بھینس جی ماری کہ معاذ کو یقین ہو گیا کہ اب اس کا کوئی نہ کوئی سانگی مد کے لیے ضرور چلا آئے گا۔

خطرے کا تمام بڑھتے دیکھ کر اس کے ہاتھ شکنی انداز میں حرکت کرنے لگے اور چاچڑھن کو کچھ بھی کرنے کا موقع دینے بغیر وہ اس کی گتھوں اور چہرے پر طوفانی کے پر سنا چڑھ گیا۔ لڑائی بھڑائی کے فن سے آگاہ ہونے کی وجہ سے وہ ان کون کے تھانے سے آگاہ تھا۔ مام بندہ تو ایسے کے کھا کر دوسری دنیا میں بھی بھیج سکتا تھا۔ چاچڑھن جیسا سخت جان البتہ صرف بے ہوش ہو کر ہی جیت سکتا تھا۔ اپنے اندیشے کے مطابق معاذ بھگتے ہوئے لکڑیوں کے اس جانب آنے کی آوازیں سن چکا تھا۔ اس نے نہایت پھرتی سے چاچڑھن کے بولسٹر میں پھنسی گن گنکھی اور پھانگ لگا کر ایک ستون کی آڑ میں چلا گیا۔ اس کی اس حرکت نے اس کی جان بچا لی اور ایک گولی نے عین اس جگہ پر دیوار کا پلاسٹر اکھاڑا جہاں نچر بھر پہلے وہ موجود تھا۔ اس کے ستون کے پیچھے ہو جانے پر بھی پہلے بعد دیگرے کئی گولیاں چرائی گئیں جو ساری کی ساری مضبوط ستون سے ٹکرا کر اچھٹ گئیں۔ معاذ نے اندازہ لگایا کہ اس پر گولیاں چلانے والوں کی تعداد دو ہے اور وہ اس کی دائیں جانب موجود ہیں۔ اپنی من کا رخ اس جانب کر کے اس نے کئی بعد دیگرے دو گولیاں داغیں اور بے پناہ دستک لیتے ہوئے اس ستون کی آڑ سے نکل کر دوسرے ستون کی طرف جھٹک رہا تھا۔ گولیاں اس کے تعاقب میں آئیں لیکن اپنی اذلی خوش قسمتی کی وجہ سے وہ محفوظ رہا۔

اب وہ پہلے سے زیادہ بہتر پوزیشن پر موجود تھا اور

اسے ہائیں جانب کا دو براہِ مدِ نظر قرار تھا جہاں اس کے مقابل پیچھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک نے اپنی پوزیشن بدلی تو معاذ کی نظروں میں آ گیا۔ اس سے فوراً ہی گولی چلا دی جو اس شخص کے زوہر میں گئی۔ وہ زوردار آواز میں چیخا۔ دوسرا اپنے سانگی کی چیخ پر ہلکا کر یا پھر اس قدر جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بے تحاشا فائرنگ کرتا ہوا باہر نکل آیا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں ہتھیار موجود تھے اور وہ دونوں سے ایک وقت فائر کر رہا تھا۔ معاذ نے سنبھالی ہوئی گولیوں کو اپنے دائیں بائیں سے مڑتا محسوس کیا۔ اتنی بے تحاشا فائرنگ میں وہ نہ تو ستون کی آڑ سے نکل سکتا تھا اور نہ ہی ہاتھ باہر نکال کر فائر کرنے کی سطحی ترسکتا تھا لیکن پھر اسے ایک ترکیب سوچ گئی۔ ستون سے چپے چپے سے دو نیچے بیٹھے اور نیچے سے ہاتھ نکال کر اس شخص کی سمت وار کیا۔ وہ اس زوہر سے فائر آنے کی امید نہیں کر رہا ہوگا چنانچہ جب اس کی ٹانگ پر گولی لگی تو دھڑکی اور فائرنگ کے سلسلے کو بدتر انداز میں رکھ رکھا۔ معاذ کے لیے یہ موقع بہترین تھا۔ اس نے ایک اور فائر کیا۔ یہ بھی بغیر نشانہ لگائے کیا گیا فائر تھا جو اتنا قاسم شخص کے پیٹ میں جا لگا اور وہ اچانک پٹ پٹ کر رہا ہو گیا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں موجود ہتھیار نیچے گر پڑے تھے۔

معاذ ستون کی آڑ سے نکل کر جھکا جھکا آگے کی طرف بھاگا اور برآمدے کی طرف ایک فائر جھونکا جہاں زمی بازو پٹ میں اس کی گولی روٹھ گیا۔ وہ ٹانگ اور پیٹ میں اس کی گولی کے دانے بھی دیکھ کر مارنے کے لائق نہیں تھا اور بے تحاشا جیتے ہوئے خون کے ساتھ فرش پر گر پڑا تھا۔ معاذ کے لیے یہ گولی خوشگوار مضر نہیں تھا اس لیے اس منظر سے نظر چھانک کر برآمدے کی طرف بڑھا۔ زخمی شخص وہاں موجود نہیں تھا لیکن فرش پر سرے خون کے قطرے دھانی دے رہے تھے۔ معاذ خون کے ان قطروں کے تعاقب میں چوتھے انداز میں آگے بڑھا۔ قطرے ایک کمرے کے دروازے تک جا رہے تھے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور معاذ دیکھ سکتا تھا کہ یہ وہی کمرہ ہے جہاں اس کی اسپینڈر مین کے بہروپ سے حاقات ہوئی تھی۔ کمرے کا قاتلین اب بھی ایک جگہ سے اٹھا ہوا تھا اور وہ چوکور خذا نظر آ رہا تھا جس سے سبز حیاں نیچے نیچے سے ملتی تھیں۔ معاذ نیچے اترنے کا فیصلہ کرتا اس سے قبل ہی خدا سے ایک سربراہ ہوا۔ معاذ کا فائر کے لیے سیدھا ہونے والا ہاتھ یہ دیکھ کر مڑا ہوا پڑ گیا کہ باہر نکلنے والا شخص معطر شاد ہے۔ اس کے ہاتھ میں بھی ہتھیار موجود تھا اور وہ بھی معاذ کو اپنے سامنے سے گھڑا دیکھ کر

لیا بھی اس کی شان میں گستاخی کا باعث نہ بن جائے۔
 ”ٹھیک ہے، پہلے ہم یہاں سے چلتے ہیں باقی
 معاملات بعد میں دیکھیں گے۔“ معتمد شاہ نے بیوی کی
 بات ماننے سے انکار نہیں کیا اور شاہانہ بے نیازی سے
 بولا۔ دو تینوں ایک دوسرے کے پیچھے چلتے ہوئے باہر کی
 طرف جانے والے راستے کی طرف بڑھ گئے۔ باہر نکلنے
 کے لیے انہیں اس جگہ سے گزرنا پڑا جہاں معاذ کا چاچا اور
 اس کے ساتھیوں سے معرکہ ہوا تھا۔ چاچا ہنوز اپنی جگہ پر
 بے ہوش پڑا ہوا تھا جبکہ اس کا وہ ساتھی جس کے پیٹ میں
 گولی لگی تھی، اپنی زخموں کی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ اس
 شخص کو دیکھ کر معاذ کا دل عجیب انداز میں دھڑکا۔ اپنے
 دفاع میں تھی سبھی، اس کے ہاتھوں ایک شخص کا گناہ ہوا تھا۔
 اس نے وزویدہ نظروں سے نکلنا کی طرف دیکھا اور
 سوچنے لگا کہ کیا وہ اسے ایک قاتل کے طور پر دیکھ رہی ہے
 لیکن کوئی اندازہ نہیں لگا سکا۔ نکلنا کا چہرہ حسب معمولی
 چادر کے نقاب میں چھپا ہوا تھا اور اس کے اندر سے جھانکتی
 اس کی آنکھوں میں عجیب سی بے نیازی تھی۔ وہ بڑی مختلف
 طبیعت کی عورت تھی۔ جن باتوں پر عام عورتوں کی چٹکیاں
 لگ جاتی ہیں، ان پر بھی وہ بے حد پرسکون رہتی تھی۔ اس
 وقت بھی وہ نہایت بے نیازی سے اس جگہ سے گزر کر ان
 دونوں کے ساتھ باہر آگئی تھی۔ ماجر نکل کر ان تینوں نے ہی
 دیکھ لیا۔ وہ ایک پرانا لیگن پر شکوہ حویلی نما مکان
 تھا۔ معاذ نے حویلی کے فرنٹ پر لکھے ”کاشانہ آزادی“
 کے الفاظ پڑھے اور چونک گیا۔ کئی سال قبل اس نے اس
 عمارت کو دیکھا تھا۔ یہ عمارت ایک نواب صاحب کی ملکیت
 تھی۔ پارٹیشن کے وقت ہجرت کر کے پاکستان آ جانے
 والے نواب صاحب کو اپنی ریاست کے بدلے کلیم میں
 کراچی کے ایک دور اندازہ علاقے میں ایک حویلی اور
 زرعی زمین عطا کی گئی تھی۔ نواب صاحب کے پاس اسپتے
 چھوٹے سے خاندان، چند نوادار ملا زمین اور کسی طرح پھپھا
 کر لائی گئی تھوڑی نقدی اور قیمتی خاندانی زیورات کے سوا
 کچھ نہیں تھا لیکن آزاد وطن کی خوشی نے ان کے اندر ایسی
 توانائی بھری دی تھی کہ انہیں اس ویرانے میں رہنے پر بھی
 کوئی اعتراض نہ ہوا اور نوئی پھوٹی حویلی کی مرمت و ترمیم و
 آرائش کے ساتھ ساتھ زمینوں کو آباد کرنے میں پورے
 حوصلے سے جت لگے۔ انہوں نے اس زمین پر پھلوں کے
 باغات لگوائے اور ثابت کر دیا کہ انسان کا حوصلہ ویرانے

چونک رہا تھا۔
 ”وہ زخمی ڈاکو کہاں ہے؟“ معاذ نے جھٹ اس
 سے پوچھا۔

”اسے تم نے گولی مار دی تھی؟“ معتمد شاہ نے جواب
 دینے کے بجائے سوال کیا۔

”ہاں لیکن وہ سہہ کہاں؟“ معاذ نے بے تابی سے
 اپنا سوال دہرایا۔ یہاں موجود افراد میں سے وہی اس لائق
 رہ گیا تھا جو اب بھی مزاحمت کر سکتا تھا اس لیے اسے اس کی
 فکرت تھی۔

”نیچے بے ہوش پڑا ہے۔ ہم نے کھانے کے برتنوں
 کی پلیٹیں اس کے سر پر ٹوڑ ڈالی تھیں۔ فائرنگ کی
 آواز پر نیچے تک آ رہی تھیں اس لیے ہمیں اندازہ ہو گیا تھا
 کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ وہ شخص نیچے آیا اور ہمارے کمرے کا
 دروازہ کھول کر اندر گھسنے کی کوشش کی تو ہم نے اس کے ساتھ
 نوئی رعایت نہیں کی۔ شاید وہ ہمیں پریشان بنا کر وہاں چھپنے
 کی کوشش کر رہا تھا۔ تم بتاؤ یہ سارا ہنگامہ کیا ہے؟ کیا تم ان
 ڈاکو سے متاثر ہو رہے تھے؟“ معتمد شاہ نے بے نیازی
 سے اسے بتایا اور اس سے پوچھنے لگا۔

”یہ وقت باتیں کرنے کا نہیں ہے۔ ہمیں جلد از جلد
 یہاں سے نکلنا ہوگا۔ ان کے دو ساتھی باہر گئے ہوئے ہیں اور
 کبھی وقت واپس آ سکتے ہیں۔ ہمارے لیے بہتر ہے کہ مزید
 خون خرابے میں پڑنے کے بجائے یہاں سے نکل جائیں۔“
 ”لیکن یہ تو معلوم کرنا ہوگا کہ یہ کون کون تھے جنہوں
 نے ہمارے اغوا کی جرات کی۔ مجھے تو تم بھی مشکوک بندے
 ہی لگتے ہو۔“ معتمد شاہ نے اسے ٹھوڑا۔

”یہاں سے نکل کر آپ سیدھے کسی چھانے چلیں گے۔
 وہاں سے پولیس کی ٹیم آ کر ان نوگوں کے بارے میں بھی
 تحقیق کر لے گی اور میری بھی جانچ پڑتال ہو جائے گی لیکن
 فہمرا ہے یہاں سے تو نکلے۔“ معاذ نے جھجھکا کر کہا۔
 یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں شاہ جی! سب سے پہلے ہمیں
 اس جگہ سے نکلنا ہوگا۔“

وہ بالکل اچانک سے نیچے سے اوپر آئی تھی اور سنجیدگی سے
 معاذ کی بات میں غور کر رہی تھی۔ معاذ کو چپ لگ گئی۔ وہ اس
 شخص تھی تو پھر بیٹھا کچھ بولنے کی ضرورت بھی کہاں تھی۔
 اس کی تو صرف موجودگی بھی چوہو کی اثر رکھتی تھی۔ وہ وہ بھی
 اس نے ایک جگہ میں معاذ کو پورا کا پورا مسخر کر لیا تھا۔ وہ خود
 فنا اور کی تھی لیکن معاذ کو پورا پورا اپنا پتایا تھا۔ وہ اس کی
 موجودگی میں سانس بھی آہستہ لے رہا تھا کہ کہیں کھل کر سانس

سے درخت کے اوپر اپنا توازن برقرار رکھنے ماریل توڑ توڑ کر چنے چھیننے میں مصروف تھا۔ ان لوگوں نے اپنی آواز میں دھیمی دھیمی ہونے لگی تھی اور درختوں کی آڑ میں تھے اس لیے اسے ان کی یہاں موجودگی کی خبر نہیں ہو سکی تھی اور وہ پورے اٹھناک سے اپنا کام کر رہا تھا۔

”ہمیں یہاں سے چھٹا ہوگا معظم۔“ اس پیکر دعا نے ایک بار پھر لب کشائی کی اور معاذ کی تائید میں بول پڑی۔ وہ بہت تنجیدگی سے اور قدرے سپاٹ لہجے میں بولتی تھی لیکن قدرتی طور پر اس کی آواز میں ایسا رس اور لہجہ تھا کہ سواذ اپنے دل میں ٹھنسی سی چھین محسوس کرنے لگتا تھا۔ معظم شاہ بھی یقیناً بانی کی شخصیت کی سحر انگیزی میں جکڑا ہوا تھا جو اس کی کسی بات سے اختلاف نہیں کرتا تھا۔ اب بھی اس نے بیوی کا مشورہ قبول کر لیا اور معاذ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”موثر سائیکل کی چابی لگی ہوئی ہے۔ آپ جا کر اسے اسٹارٹ کریں اور بی بی کو لے کر فوراً یہاں سے نکل جائیں۔ میں بندے کو سنبھال لوں گا۔“ اس نے اپنے ہاتھ میں موجود مگن معظم شاہ کو دکھائی چاڑ سے حاصل کی ہوئی اس کی کن ابھرتک اس کے پاس گئی۔ معظم شاہ اس کی بات سمجھ گیا اور جمل کا ہاتھ تمام کر موثر سائیکل کی سمت بڑھا۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا، انہوں نے احتیاط سے دبے قدموں سے نکل کر لیا۔ معاذ بھی ان کے پیچھے ہی تھا۔ معظم شاہ کے موٹر سائیکل پر چڑھ کر وہ جبراً ان طرف سے چلتا۔

”اے کون ہو تم؟ میری موٹر سائیکل کہاں لے جا رہے ہو؟“ معظم شاہ نے اسے جواب دینے کے بجائے چلی تھما کی اور تک دگا کر موثر سائیکل اسٹارٹ کی۔ اتنی دیر میں کل شاہ بھی نکلے پھرتی سے کام لے کر اس کے پیچھے بیٹھ چکی تھی۔

”رک اے، رک۔ کہاں لے جا رہا ہے میری بائیک۔“ وہ شخص اوپر سے ہی چلا یا اور کچھ نہیں سوچا تو ہاتھ میں موجود ماریل ہی ان لوگوں کی طرف اچھل دیا۔ موٹر سائیکل چل پڑی تھی چنانچہ کل شاہ تاریز کی تردید میں آنے سے بال بال بچ گئی پھر بھی معاذ کے وجود میں ٹیشن کی ایک لہر سی اٹھی اور ایک فائر کر ڈینا۔ یہ ہوئی فائر تھا اور اس شخص کو نشانہ بنانا مقصد نہیں تھا پھر بھی دو برقی طرح سہم گیا اور معاذ کی طرف خوف زدہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

”نیچے اترو۔“ معاذ ابھی تک اس کے ماریل مارنے والی حرکت کے اثر میں تھا اس لیے غصیلے جھجھ میں اسے حکم

ماریل دیکھنے لگا۔ وہ سیاہ باؤں والا خوبصورت اور جوان العر شخص تھا۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے اپنے بیروں سے جوتے مونڈے اتار کر ایک طرف رکھے اور بندر کی سی پھرتی سے درخت پر چڑھنے لگا۔ اس منظر کو دیکھ کر معاذ کو کھنسی سی آگئی۔ وہ جس شخص کو ڈاکوؤں کا ساتھی سمجھ رہے تھے، وہ شاید کوئی رہ گیر تھا جو یقیناً شرت کٹ مارنے کے چکر میں آبادی سے بہت سر اس علاقے سے گزر رہا تھا اور ماریل دیکھ کر اس کے منہ میں پانی بھرا آیا تھا چنانچہ اپنی ہنرمندی کا فائدہ اٹھا کر یہاں سے چند ماریل توڑنے چلا آیا تھا۔ اس کی آڈ کو معاذ نے امداد نہیں جانا اور معظم شاہ کی خوف رخ کر کے سرگوشی میں پوچھنے لگا۔

”آپ کو موثر سائیکل چالی آتی ہے؟“

”ہاں۔ اسٹوڈنٹ لائف میں کافی چٹائی ہے۔“

”عظم شاہ نے اسے جواب دیا۔“

”بس تو پھر آپ کے لیے سواری کا انتظام ہو گیا۔“

آپ بی بی کو لے کر اس موثر سائیکل پر روانہ ہو جائیں، میں اس بندے کو دیکھتا ہوں۔“

”لیکن تم...؟“ معظم شاہ نے شاید کھٹا بار اسے

تک کے بغیر دیکھا اور اس کے لیے متذبذب ہو۔

”اس چائنس کو مس مت کریں سر بی بی سواری کے

بغیر یہاں سے زیادہ دور تک نہیں جائیں گی۔ میں اکیلا بندہ

ہوں، ہاتھ نہ کھڑکائی کر لوں گا۔ آپ

چاہتے ہیں تو بس اتنا کہیں کہ کسی قریبی گھرانے جا کر یہاں

کی سچویشن کی رپورٹ کر دیجیے گا۔ پولیس پارٹی بھی تو

مشغول ہو جائے گا۔“

”ہاں نہیں... یہاں سے پولیس اسٹیشن کتنی دور ہو۔“

پولیس کے آنے سے پہلے تم کسی مشکل میں پھنس گئے تو۔“

عظم شاہ کا متذبذب برہنہ تھا۔

”زیادہ دور نہیں ہوگا پولیس اسٹیشن۔ میں آپ کو

قریبی آبادی کا راستہ سمجھ دیتا ہوں۔ آپ وہاں پہنچ کر

پولیس اسٹیشن کا معہوم کر لیجیے گا۔“ معاذ نے اسے سمجھانے کی

کوشش کی۔

”جیسے ہیں یہاں کے رہائشیوں کے بارے میں جیسے چاہیے۔“

عظم شاہ نے ایک بار پھر اسے خشک بھری نظروں سے گھورا۔

”مجھے اس لیے پتا ہے کہ ہم اس وقت کراچی شہر میں

ایں دور میں کراچی کا رہنے والا ہوں۔“ معاذ نے بڑے ضیلا سے جواب دیا اور ایک نظر اس شخص پر ڈالی جہ بڑی مہارت

خاموشی سے اس کا جائزہ لینے لگا۔ اس نے اپنی چیٹ کے جیب میں ہاتھ ڈال کر چھوٹا سا فولڈ جوئے والا چاقو نکال لیا۔

9 اگست 2020ء

بار ہے تھے پھر بھی ایک محسوس ہونے والی اداسی چھائی ہوئی تھی۔ تالان کی رلم کا انتظام ہو چکا تھا اور اس رقم کو ایک سوٹ کیس میں رکھ کر بس ہنس بات کا انتظار کیا جا رہا تھا کہ ڈاکوؤں کا قون آئے اور انہیں ان کی بتائی ہوئی جگہ پر مطلوبہ رقم پہنچ کر مظلوم شاہ و سجن شاہ کو واپس حویلی لایا جائے۔

ماز میں سے شش کے عداوہ ایک آدمی کو اس معاملے کی خبر بھی اور منسل رازداری برتی جا رہی تھی۔ عالم شاہ نے اپنے والد کے علم میں زمین کی فروخت والی بات نہیں آنے دی تھی اور نہ ہی قربان شاہ سے اس موضوع پر کوئی بات کی تھی لیکن کسی چوٹ کھائے ہوئے سانپ کی طرح وہ اندر سے بے حد مضطرب تھا اور اس کی نظر بے مسلسل حویلی میں کسی ایسے فرد کو کھوج رہی تھیں جسے انوکھا مردوں کا خبر قرار دیا جاسکتا۔ وہ اپنی دس سوچی میں پختہ ہو چکا تھا کہ کوئی ہے جو یہاں کی خبریں انوکھا کاروں تک پہنچا رہا ہے۔ اس سے قبل وہ اپنی حویلی میں بھی سازش کے تانے بانے کچھ جتا رہا تھا لیکن صداقت شاہ کی مداخلت اور وقت کی کمی کی وجہ سے کام اچھوڑا رہ گیا تھا۔ وہاں اچھوڑا رہ جانے والا کام وہ یہاں انجام دینے کی کوشش کر رہا تھا لیکن ابھی تک کوئی کامیاباں مخلوک فرد اس کی نظروں میں نہیں آ رہا تھا جس پر وہ کوئی الزام دھریاں سکتا۔ یہاں کے معاملات کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ اسے اپنی حویلی کی بھی نظر تھی اور چھوٹی بہن مول سے رابطہ کر کے وقفے وقفے سے لے رہی تھیں سون اور ادویات پر رہا ہوا تھا اس لیے ان کا زیادہ وقت سوتے میں گزار رہا تھا اور طبیعت مزید بڑھنے سے بچت ہوئی تھی۔ بہن اور بہنوئی کی طرف سے متفرمول خود بھی وقفے وقفے سے اسے فون کر کے یہاں کے بارے میں معلومات حاصل کرتی جا رہی تھی۔ اس وقت بھی جبکہ انتظار کی حویلی گھنٹیوں کو گزارنے کے لیے وہ سب ایک جگہ بیٹھے چائے سے گفتگو کرنے کی کوشش کر رہے تھے، عالم شاہ کے موبائل پر مومن کی کال آ گئی۔ اس نے کال ریسپونڈ کی لیکن آواز صاف سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس نے لائن کاٹ کر دوبارہ رابطہ کیا تو ابھی یہی صورت حال رہی۔ دو تین بار کوشش کرنے کے باوجود ونا کام رہا۔

”تم لینڈ لائن پر بات کر لو پٹ۔“ بوھر بھی کبھی رشتہ کا مسئلہ ہو جاتا ہے تو موبائل پر بات نہیں ہو پاتی۔“ قربان شاہ نے صورت حال دیکھ کر اس کو مشورہ دیا۔

”میں اوپر چھت پر جا کر ٹرائی کرتا ہوں۔ کھلے میں منتظر کا اتنا مسئلہ نہیں ہوتا۔“ اس نے کہا اور اپنی جگہ سے کھڑا

ٹرائی کا یہ سلسلہ مشکل سے دو منٹ جاری رہا اور اس کی ٹکٹ کھا کر دور جانے والا وقاص اچھوڑ کر دوبارہ اس پر تامل آور ہونے کے ہیے پہلے اسپرٹ کی طرح اچھل کر کھڑا ہوا اور پھر سر پٹ داکو کا جانب بھاگ کھڑا ہوا۔ معاہدے سائنٹ اس کے پیچھے دوڑا لیکن وقاص کی رفتار بے حد تیز تھی اور اس کے رنگ پاؤں دوڑنے کی راہ میں مزاحم تھے اس لیے اس کے دیکھتے ہی دیکھتے وقاص بہت آگے نکل گیا اور داکو کا جانب کی بند دیوار کے قریب درخت پر اپنی بندوبس وانی پھرنے سے چڑھنے کے بعد اچھل کر دیوار پر چڑھا پھر دوسری طرف کو گیا۔ معاہدہ اسے درخت پر چڑھنے کی کوشش ہی اپنے قدموں کو روک چکا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اس نامی اس نوجوان کے پیچھے جانا سانپ نکلنے کے بعد کلیئر پینے کے مترادف تھا۔ اب اسے سب سے پہلی فکر یہاں سے نکلنے کی کرنی چاہیے تھی کیونکہ اس پلٹر میں اچھوڑ کر وہ پہلے ہی ۲۰ فیصد کا شکار ہو چکا تھا۔

سر جھٹک کر وقاص کے خیال کو ذہن سے نکالتے ہوئے وہ تین بار پھر رخ موڑ کر پیرولی پھاٹک کی طرف بڑھا۔ پھاٹک سے اس کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا اور درختوں کا سلسلہ ختم ہو جانے کے بعد اسے یہ تصور اساقہ صندھ کے ملے کرنا تھا۔ لیکن منت ہی کی بات تھی لیکن دو تین منٹ کے اس دورانیے نے ہی اسے دھوکا دے دیا۔ کھلے پھاٹک سے تیزی سے ایک آدمی کی پک اب اندر داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے دو آدمی اور ڈیپ فریز رکھا ہوا تھا اور ڈیپ فریز کے اوپر ایک آدمی پڑے کر بیٹھا ہوا تھا۔ معاہدہ نے چاہا کہ پٹ کر دوبارہ درختوں سے درمیان جا گئے لیکن پک اب ڈیپ فریز اور ڈیپ فریز پر چڑھ کر بیٹھا آدمی دونوں ہی سمت دیکھ پھرتے تھے۔ ڈیپ فریز وہ پڑے کے پیچھے آدمی نے نہ صرف دھاڑ مارتے رہنے کا حکم دیا بلکہ اپنی من گھڑی کی طرف دو تین فار بھی داغ دیے۔ کوئی ان سنسناتی ہوئی معاہدہ کے داکو بائیں سے گزریں تو اچھوڑا اسے اپنے قدموں سے پڑے۔ پک اب ڈیپ فریز سے تین اس کے سر پر تھپتھپ کر بریک لگائے۔ پہلے پیچھے والے پھاٹک لگا کر اس تک پہنچا پھر ڈیپ فریز بھی بائیں آ گیا۔ ایک بار پھر وہاں خود بخود ڈاکوؤں کے حیرے میں ان کے اچھوڑا رہے۔ نشے پر تھا اور اس کے پاس کوئی جائے فرار نہیں رہی تھی۔ اپنی قسمت کی اس ستم ظریفی پر آہ بھرتے ہوئے اس نے اپنا جسم ڈھیرا چھوڑ دیا۔

جیو جیو

قربان شاہ کی حویلی میں مہول کے سارے کام انجام

ہو گیا۔ اصل میں اس وقت اسے سگریٹ کی طلب ہو رہی تھی اور بڑی رگوں کی موجودگی میں وہ سگریٹ پینے کی جرات نہیں کر سکتا تھا اس لیے کان کا بہانہ غیبت محسوس ہوا اور اٹھ کر اوپر کی طرف جانے والے زینے کی طرف بڑھ گیا۔ حویلی اچھی خاصی وسیع تھی اور ساتھ ہی سرسبز لان بھی موجود تھا اس لیے مینیوی کو چھت پر جانے کی کوئی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ وہ پر صرف دو کمرے بنے ہوئے تھے جہاں اضافی سنان وغیرہ رکھا جاتا تھا اور اس سنان میں سے کسی چیز کی ضرورت پڑنے یا صفائی ستھرائی کے لیے صرف ملازمین ہی بھی کبھارا پر جایا کرتے تھے۔

عالم شاہ اوپر پہنچا اور موٹوں کو کال ملائے سے پہلے جب سے سگریٹ پیس اور لائٹر نکالا۔ اس سے قبل کہ وہ سگریٹ سٹکا، کسی شے کے زمین پر گر نے کی آواز پر چونکا۔ آواز کمروں کی سمت سے آئی تھی۔ وہ پونہی جیسے کے تخت اس طرف چل پڑا۔ ایک کمرے کے دروازے پر باہر سے تالا لگا ہوا تھا جبکہ دوسرا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اسے تعجب ہوا کہ اندر کون ہے۔ وہ چھپن سے اس حویلی میں آ رہا تھا اور جانتا تھا کہ اسٹور کے طور پر استعمال ہونے والے ان کمروں میں ملازمین کے سوا کوئی نہیں آ سکتا لیکن ملازمین میں سے کسی کو اندر سے دروازہ بند کر کے بیٹھنے کی بھلا کیا ضرورت پڑی تھی۔ یہ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی اس لیے وہ بے قدموں دروازے کے قریب کھنکھار کر دیکھا تو ایک سوراخ سے اندر جھانکنے لگا۔ اندر جھلک رہا تھا اس لیے منظر واضح تھا۔ اس نے فوراً اپنی منٹھی کی بیٹی آسیہ کو پہچان لیا۔ وہ کچھ پریشان محسوس ہو رہی تھی اور نیچے گرا ہوا ایک ڈبا اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کسی سے موبائل پر بات کر رہی تھی۔

”تم نے یہ بہت بری خبر سنائی ہے ٹوٹی! میری تو سمجھ سمجھ نہیں آ رہا کہ اب کیا ہوگا؟“

عالم شاہ کے لیے اس کے پاس موبائل کی موجودگی تو زیادہ حیرت کی بات نہیں تھی کہ اب گاؤں دیہاتوں میں بھی موبائل کا استعمال عام ہوتا جا رہا تھا اور آسیہ تو شہر میں رہ کر پڑھ کر آئی ہوئی لڑکی تھی لیکن وہ اس کے یہاں چھپ کر بات کرنے پر تجسس کا شکار ہو گیا تھا۔

”تم کہہ رہے ہو وہ لوگ وہاں سے نکل گئے ہیں۔ میری کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ ایسا کیسے ہو گیا۔ تم تو کہہ رہے تھے کہ وہ بے حد خطرناک لوگوں کی قید میں ہیں پھر کیسے وہاں سے نکل گئے؟“ آسیہ جو پہلے دھیمی آواز میں بات کر رہی تھی

جھنجھلاہٹ کے باعث اس کی آواز قدر سے بلند ہو گئی اور عالم شاہ کو اس کے الفاظ زیادہ بہتر طور پر سمجھ آنے لگے۔ اس کی جھنجھلاہٹ میں کیے ہوئے سوال کا یقیناً دوسری طرف سے جواب دیا جا رہا تھا اس لیے کچھ دیر خاموشی سے سختی رہی پھر مایوسی سے بولی۔

”اب کچھ نہیں ہو سکتا ٹوٹی! رقم آتے آتے ہمارے ہاتھ سے نکل گئی ہے۔ یہی بھی وقت حویلی میں اس بات کی اطلاع آ جائے گی۔ اب تم خاموش ہو کر بیٹھ جاؤ ورنہ ہم بھی پکڑے جاسکتے ہیں۔ پتا نہیں تم کن ہٹازیوں کے چکر میں پڑ گئے تھے جو وہ بندوں کو نہیں سنبھال سکے۔ فی الحالی تو ہمیں اپنی بد قسمتی پر تسوہا کر خاموش ہی بیٹھنا پڑے گا۔“ وہ مکمل کر بات نہیں کر رہی تھی لیکن الفاظ اتنے مبہم بھی نہیں تھے کہ عالم شاہ کو کچھ سمجھ نہیں آتا۔ اس کا ضبط جواب دے گیا اور اس نے دروازے پر زور دہر دسک دی۔ دسک پر پہلے تو اندر سکوت سا چھا گیا پھر آسیہ نے بھی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”کون؟“

”دروازہ کھولو۔“ عالم شاہ فرمایا۔ جواب میں وہ کمرے کے دروازے پر قدموں سے دروازے تک آئی اور اندر سے کھلی گولی دی۔ اس کے دروازہ کھولنے سے قبل ہی عالم شاہ نے لات مار کر دروازہ کھول دیا۔ دروازے کا پت آسیہ کے منہ پر جا کر لگا اور وہ ٹوٹ پھوٹ کر فوراً جا گری۔ عالم شاہ

شہر پہنچا تو عالم شاہ کے اندر داخل ہوا۔

”سمجھنا نہیں۔“ فرش پر پڑی آسیہ نے اس کے آگے دونوں ہاتھ جڑ دیے۔ عالم شاہ کے اندر نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ کالی بچہ سن اور سمجھ چکا ہے۔

”حرام خور! جس تھال میں کھاتی ہے اسی میں صیید کرتی ہے۔“ عالم شاہ اتنے شدید غصے میں تھا کہ اس کی ہانچوں سے کف اڑ رہا تھا۔

”معافی! اے دو سائیں۔“ لرزتی کانپتی ہاتھ جوڑے ابھی تک فرش پر پڑی آسیہ اپنے انجانب کا سوچ کر روئے لگی۔

”معافی۔۔۔ میں تو تیرے کھڑے کر کے چیل کوؤں کو تھلاؤں کا لیکن پہلے تو بتا کہ یہ پتھر کیا ہے۔ کیا تیرا بپ بھی اس پتھر میں تیرے ساتھ شامل ہے؟“ عالم شاہ کی آنکھوں میں اس وقت خون اتر رہا تھا۔ اس نے آسیہ کے لڑکی ہونے کا غلط کئے بغیر اس کے پہلو میں ایک ٹھوکر ماری اور پھر اس کی چٹیا کو پکڑ کر اسے ایک زوردار ہٹکا دیا۔ تکلیف سے آسیہ کے ہونٹوں سے سسکاری نکلی تھی اور وہ سر کوٹنی میں

جنہیں دینے کی کوشش کرتے ہوئے رو کر بولی۔

”اب تو کچھ خبر نہیں ہے۔ انہیں خبر ہوئی تو آپ سے پہلے وہ مجھے زندہ دفن کر دیں گے۔“

”تو نے کام ہی ایسا کیا ہے کہ تجھے زمین میں گاڑ کر تیرے اوپر کتے چھوڑ دیئے جائیں۔“ انہی لہجہ خراپا۔

”مہم۔۔۔ رقم کریں سائیکس۔ میں بس لاجی میں آگئی تھی۔ میرے چھوٹے سائیکس اور بی بی کو نقصان پہنچانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔“ آہستہ کے رونے میں مزید تیزی آگئی۔

”اب سب دے کہ اپنے کمن یار کے ساتھ مل کر اور یہاں یہ ذلیل حرکت کی ہے تو نے؟“ ان لہجہ خراپا نے ایک بار پھر اس کے سر کو جھکا دیا لیکن یہ بات وہ بھی سمجھ رہا تھا کہ یہ اسے کو سزا دینے سے زیادہ اصل بات اٹھانے کا وقت ہے۔ آہستہ روشنی کا پتلی اسے بتاتے تھے۔

”میں جب پڑھنے کے لیے حیدرآباد گئی تھی تو وہاں میری ٹوٹی تار کے ایک لڑکے سے دوستی ہوئی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند بھی کرنے لگے۔ تجھے ٹیلیفون وہی نہیں تو وہ شادی کی پہلے پڑھ لکھ کر کسی اچھی پوزیشن پر پہنچ جائیں گے۔“

”میں پڑھنے میں بہت اچھی تھی اور۔۔۔“

”نیکے چورہ تھیں تو کہ میرا سید بکلی کے لیے میرٹ بن جائے گا لیکن ایک ایسے ہی کا رزلٹ آنے سے پہلے ہی اپنے

میری پر اعلیٰ چھڑوانے کا اعلان کر دیا اور میرے رونے پینے کے باوجود اپنی بات پر قائم رہا۔“

”لیکن آنا پڑا۔ ٹوٹی جوبلی ایس کی سر چکا تھا، آگے پڑھنے

راہ کی چٹ گیا۔ جدا ہونے سے پہلے وہ مجھے ایک سو بائیس

فون دلا کہ کا تھا جس کی حد سے جو ایک دوسرے سے کونٹینٹ

میں رہتے تھے۔ ابھی بھی ٹوٹی چپے سے مجھ سے منہ بھی آجاتا

تھا۔ ایک بار مجھ سے منہ آتا تو یوں کہ اس کے پاس ایک

پاؤں ہے۔ پھر میں اس کا ساتھ دوں اور ہمت کروں تو

وہ میرے سارے مسئلے حل ہو سکتے ہیں۔ تم اپنی مرضی سے

پارہ نہیں آتی ہو اور ہم اپنا ایک گھر بھی بنا سکتے ہیں۔ میں نے

اس سے اس کے چان کے بارے میں پوچھا تو اس نے

مجھ سے چھوٹے شادی اور بی بی کے اغوا برائے تادان کو

منموہ بنایا۔ میں سن کر فوراً ہی اور اسے سمجھا یا کہ میں

اپنا ایک بوت سوچنا بھی مت۔ تاکہ پہنچنے والے لوگ ہیں،

میں پکڑے گئے تو ہماری کھان میں بھیجا بھر داریں گے۔

میرے انکار پر وہ اس وقت تو خاموش ہو گیا لیکن پھر بار بار

ان مسئلے میں مجھے سمجھا رہا تھا اس نے مجھ سے کہا کہ تمہارا

ایسے چاند

عام طور پر یہ خیالی کیا جاتا ہے اور عقل بھی یہی کہتی ہے کہ پورے چاند کی روشنی آدھے چاند کی روشنی سے دوگنی ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ پورے چاند کی روشنی آدھے چاند کی روشنی سے نو گنا زیادہ ہوتی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ آدھے چاند کے وقت ہمیں صرف اس کا وہ حصہ نظر آتا ہے جو بڑا ناہوار اور پہاڑی ہے، جو حصہ سورج کی بہت کم روشنی منعکس کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں جب چاند پورا ہو جاتا ہے تو اس کا ہموار حصہ بھی ہمارے سامنے آ جاتا ہے جو سورج کی تمام روشنی ہر طرف منعکس کرتا ہے اور یہ روشنی آدھے چاند کی روشنی سے نو گنا زیادہ ہوتی ہے۔

سچی بات

ایک چور دو بار پھانسی پر ایک گھر میں داخل ہوا۔ مالک مکان کی آنکھ کھل گئی۔ انہوں نے کمال ہوشیاری سے سر اٹھانے کو نیچے پہلا ہوا پستول چور کی کٹھنی پر رکھتے ہوئے کہا۔

”ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔ اگر تم نے ہٹنے جلنے کی کوشش کی تو میں تمہارا کام تمام کر دوں گا۔“

”سائیک آؤ اور میرے ہاتھ دھو دے۔“

”اب پستول میں پانی تو بھر لیں۔ یہ پستول پانی سے چلتی ہے۔“

مرسلہ: ریاضیات۔ حسن ابدال

کہیں : نہیں آئے گا، نہ ہی تمہیں کچھ کرنا ہوگا۔ تم جس اتنی مدد کرو گی کہ یہاں کے معاملات پر نظر رکھو اور مجھے ہر بات کی اطلاع دیتی رہو۔ دو اپنے منصوبے کے بارے میں بہت پر اعتماد تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کے کچھ بہت بھادر اور پہنچ والے دوست اس کام میں اس کا ساتھ دیں گے اس لیے اس بات سے قطعی نہیں ڈرتا چاہیے کہ ہم پکڑے جائیں گے۔ ہماری حیثیت انکار سے زیادہ نہیں تھی۔ اصل رقم بھی ٹوٹی کے دوستوں نے وصول کرنی تھی۔ ہمیں صرف ہمارا حصہ ملے اور وہ اتنا ہوتا کہ ہمارے مسائل حل ہو جاتے۔ میں اتنا سب کچھ سن کر اور اس کام کو آسان

بتائے جانے پر بھی شاید راضی نہ ہو پاتی لیکن ایک نئی مڑبڑ شروع ہوئی۔ میری خالہ اپنے پانچویں پاس بیٹے کے لیے میرا رشتہ لے کر آگئی۔ میری خالہ کا بیٹا اور مردی میں کسی بڑے صلے کے محل میں کام کرتا ہے۔ میری ماں بھانجے کا رشتہ میرے لیے آنے پر ایسے خوش ہوئی جیسے کسی ڈاکٹر یا انجینئر کا رشتہ آگیا ہو۔ میں نے اس رشتے سے بہت انکار کیا اور سمجھا یا کہ تیرا بھانجا میرے جوڑ کا نہیں ہے۔ لیکن ماں کو میری بات سمجھ نہیں آئی۔ اس کے نزدیک لڑکے کی سب سے بڑی گواہی شہنشاہی تھی کہ وہ اس کا بھانجا تھا۔ میں نے نوئی کو اس رشتے کا بتا کر اس سے مطالبہ کیا کہ میرے لیے اپنا رشتہ بھیجیو۔ وہ بولا کہ ابھی میں اسٹوڈنٹ ہوں۔ لیویشن پڑھا کر اپنی تعلیم کا خرچہ پورا کرتا ہوں۔ میرے تو اپنے گھر والے ہی رشتے لے کر تمہارے گھر آنے پر راضی نہیں ہوں گے اور بالفرض وہ راضی ہو بھی گئے تو تمہارے ماں باپ ایسے لڑکے کو تمہارا رشتہ کیسے دیں گے جو کچھ کھاتا ہی نہیں ہو۔ تمہارا کزن کہ پڑھا لکھا ہے لیکن وہی میں نوکری کرتا ہے اور اس کا اپنا گھر بھی ہے۔ وہ اس پر مجھے کیسے فوقیت دیں گے۔ اگر تم میری بات مان لیتیں تو میں کھر بھی بناتا اور کوئی چھوٹا موٹا کاروبار بھی بھانجتا۔ اس باجی نوئی کی بات میرے دل کو قوی بنا دے پاس ایک ہونے کے لیے بس ایک ہی راہ تھی کہ میں نوئی کے منصوبے میں شامل ہونے کے لیے تیار ہو جاؤں۔ مجھے خود روپے پیسے کا لائق نہیں ہے۔ اگر نوئی مجھ سے کہتا کہ کورٹ میریج کر لو تو اس کی محنت میں اس کی کچھ بھی ہو جاتی اور تنگی ترشی میں گزارہ کر سکتی لیکن نوئی نے مجھ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ بات سوچنا بھی نہیں کہ میں تمہیں گھر سے بھگا کر شادی کر لوں گا۔ میں ایسی شادیوں کا انجیم بناتا ہوں۔ جو لوگ منگنی میں ایسا قدم اٹھاتے ہیں ان کے حصے میں تکلیف اور پریشانیوں کے سوا کچھ نہیں آتا اور محبت بھی کھو جاتی ہے۔ میں بھی قائل ہوئی کہ واقعی محبت بھی بھرے پیٹ کے ساتھ ہی کی جا سکتی ہے۔ بس پھر جو اس نے کہا میں کرتی چلی گئی۔ مجھے کراتا بھی کیا تھا۔ چھوٹے شاہی اور بی بی کے معمول پر نظر رکھی اور نوئی کو بتا دیا کہ وہ لوگ کس دن اور کب بی بی کے چیک اپ کے لیے جانے والے ہیں۔ اس کے بعد جو کچھ کیا نوئی اور اس کے ساتھیوں نے خود کیا۔ انورا کے بعد میری ڈیوٹی صرف اتنی تھی کہ نوئی کو بتاتی رہوں کہ بڑے سائیکس قربان شاہ کیا کر رہے ہیں۔ پولیس سے رابطہ تو نہیں کیا جا رہا اور رقم کا بندوبست ہو گیا ہے یا نہیں۔

”وہ تیری عیسیٰ کی اطلاع بھی نہ جس کے بعد معظم

شاہ کو زخمی کر کے ان کی تصویر بنائی کو بھیجی تھی؟“ خالہ شاہ نے آسیدہ کی چوٹی کو غصے سے جھٹکا دیتے ہوئے پوچھا۔ جواب میں وہ کچھ بولنے بغیر شرم سے ٹھہریں جھکا گئی۔

”ابھی کیا بات کر رہی تھی تو اپنے پیار سے۔ کیا بتا رہی تھی؟“ خالہ شاہ حراج کا حیر ضرور تھا اور زمینداروں والی آواز بھی سمجھنے پر تھی اس کے اندر پائی جاتی تھی لیکن اس سب دلچسپی میں اس سے قبل اس نے کسی عورت یا لڑکی سے بات نہیں کی تھی جس انداز میں آسیدہ سے بات کر رہا تھا۔ اس کا جرم ہی اتنا بڑا تھا کہ وہ اس کے لیے اپنے دل میں غصے اور نفرت کے سوا کچھ محسوس نہیں کر سکتا تھا۔

”نوئی بتا رہا تھا کہ چھوٹے شاہی اور بی بی اس کے دوستوں کی قید سے نکل بھاگے تھے۔ سائیکس اور بی بی کے ساتھ انہوں نے ایک لڑکے کو بھی پکڑا تھا۔ اس لڑکے کا وہ کراچی کے کسی بزنس مین سے سودا کرنے والے تھے لیکن وہ لڑکا بہت تیز نکلا۔ اس نے کچھ ایسی مڑبڑ کی کہ بی بی اور چھوٹے شاہی کو وہاں سے فرار کا موقع مل گیا۔ میں نے تو نوئی کو یہ بتانے کے لیے فون کیا تھا کہ بڑے شاہی نے رقم کا انتظام کر لیا ہے۔ تم ان سے رابطہ کر کے رقم منگو اور بی بی چھوٹے شاہی کو واپس کر دینا چاہیے۔ دو۔ اللہ کی قسم سائیکس! میں ان دونوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتی تھی۔ اور بڑی بی بی سائیکس کی حالت دیکھ کر میرا دل رورہا تھا لیکن میں کبھی بھی قوی نہ ہو سکتی۔“ اپنے ان جملوں سے آسیدہ بھی یاد دہانی کی بول رہی تھی، اس بات پر غور کرنے کی خالہ شاہ کے پاس فرصت نہیں تھی۔ وہ تو اس بات پر غور کر رہا تھا کہ اگر معظم شاہ اور کھل انورا کا رویہ کی قید سے بھاگے ہیں تو انہوں نے ابھی تک حویلی میں رابطہ کیوں نہیں کیا ہے۔ رابطہ نہ کرنے کا ایک ہی مطلب سمجھ میں آتا تھا کہ ابھی وہ کسی محفوظ جگہ پر نہیں پہنچ سکے تھے اور یہ ایک تشویشناک بات تھی۔

”مفتی دیر تیزی ہے ادا اور کھل کو قید سے بھرے ہوئے؟“ اس نے آسیدہ سے پوچھا۔

”آدھا پونا گھنٹہ ہی ہوا ہوگا۔ نوئی سے میری زیادہ بات نہیں ہوئی۔ بتا رہا تھا کہ اس کے ساتھیوں نے وہ جگہ چھوڑ دی ہے جہاں سائیکس اور بی بی کھڑا تھا۔ مجھے بھی اس نے فون کرنے سے منع کر دیا ہے۔“ آسیدہ خوف اور احساس جرم کی وجہ سے تیری طرح سیدھی ہو چکی تھی اور وہ اس پوچھنے پر بہت کچھ بتاتی جا رہی تھی۔

کوئی الٹی سیدھی حرکت نہیں کر سکتی۔ کچھ کرتی بھی تو عالم شاہ کے دو ہاتھ کی تھی وہ لڑکی۔

”اس کا پتا مجھے نہیں معلوم سائیں۔ میں ہمیشہ کالج میں اور بعد میں باہر ہی اس سے ملتی رہی۔ میں نے بھی اس سے اس کا پتا نہیں پوچھا۔ اگر مجھے معلوم بھی ہوتا تو نہ بتاتی۔ یہ گستاخی کی نہیں محبت کی بات ہے اور محبت میں جان دینے کا حوصلہ ہے آسیہ عبدالحق میں۔“ وہ جواب تک روٹی رہی تھی۔ اچانک ہی اس کی ٹون بدل گئی۔ عالم شاہ جس کی نظریں ٹونی کے بجائے ٹینا کے نام سے فید کیے نمبر پر جمی ہوئی تھیں، ٹھنکا۔ نمبر کو غلط نام کے باوجود وہ صرف اس وجہ سے پوچھنے میں کامیاب ہو چکا تھا کہ اس نمبر پر ہی آخری بار چند منٹ قبل بات کی گئی تھی۔ آسیہ کے بچے کی تبدیلی کو محسوس کر کے وہ اس کی طرف متوجہ ہوا تو یہ دیکھ کر چونک گیا کہ وہ کھلی کھڑکی کے قریب کھڑی ہے۔ اس کے اگلے اقدام کے بارے میں اندازہ لگانے میں اس سے ذرا سی کوتاہی ہو گئی اور اس کے دیکھتے ہی دیکھتے آسیہ کھڑکی پر چڑھ کر نیچے کود گئی۔ عالم شاہ بے ساختہ بھاگ کر کھڑکی تک گیا اور نیچے جھانکا۔ نیچے چکے فرش پر آسیہ خونخون پڑی ہوئی تھی۔ ادھر ادھر کام کرتے ملازمین اس کے گرتے پر متوجہ ہو کر اس کی طرف بھاگے آرہے تھے۔ ان میں سے چند نے نظریں اٹھا کر اوپر کھڑکی کی طرف بھی دیکھا تھا اور یقیناً عالم شاہ کو وہاں دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔ ہم شاہ خیر داپنی جگہ سشدر کھڑا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آسیہ کی حرکت کر جائے گی۔ وہ اس پر کتنی ہی غصہ تھا لیکن اس کی اس حرمت سے اسے دھچکا لگا تھا۔ اسی دھچکے کے زیر اثر وہ کمرے سے نکل کر بیڑھیوں کی طرف لپکا۔ بھاگتے ہوئے بیڑھیوں اترنے کے بعد اس نے باہر کا رخ کیا۔ باہر کافی شور ہو رہا تھا اور آوازیں اندر تک آ رہی تھیں۔ قربان شاہ اور صداقت شاہ بھی ان آوازوں کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔ عالم شاہ بھگتا ہوا باہر پہنچا تو دیکھا ملازمین آسیہ کو ایک مولی چادر پر ڈال کر چادر کو چاروں طرف سے تھامے اس طرف بھاگے جا رہے ہیں جہاں گاڑیاں کھڑی ہوتی تھیں (آسیہ حویلی کی مرکزی عمارت کے دائیں جانب گری گئی۔ راستے میں ہرے بھرے ٹان اور بے شمار پودوں کی وجہ سے گاڑی کو اس طرف نہیں لے جایا جاسکتا تھا) وہ بھگتا ہوا آسیہ کو اٹھا کر لے جانے والوں کے پیچھے لپکا اور بالآخر اسے زخمی آسیہ کا چہرہ نظر آ گیا۔

”یہ تم نے کیا کیا؟“ اس کی نظریں زخمی آسیہ کی نظروں

”ذرا اس ٹونی کا پتا تو بتاؤ۔ دیکھتے ہیں شاہوں کے خاندان پر ایسی فحش ڈالنے والے اس سورا کو۔“

”رحم سائیں رحم، معافی دے دیں سائیں۔ اسے کچھ ہوا تو میں مر جاؤں گی۔“ وہ جو چند گھنٹے قبل اسے بڑی آواز سے انگریزی اسٹیشن میں سرگرمی کر رہی تھی اب عام کی کمیونٹی کی طرح سائیں سائیں کی گردان کرتی اس کے قدموں میں گری جا رہی تھی۔ اپنے لیے تو شاید پھر بھی اسے امید ہو کہ اپنے باپ کی ساری زندگی خدمت کے بدلے میں کچھ رعایت پا جائے گی لیکن یہ بات ابھی طرح سمجھتی تھی کہ اگر اس کا محبوب ٹونی ان لوگوں کے ہاتھ لگ گیا تو وہ اس کی ٹکا بونی کر ڈالیں گے، اس لیے پیسے سے بھی زیادہ حاجت سے رحم کی بھیک مانگ رہی تھی۔

”جو تو نے کیا ہے اب کے بعد رحم کی درخواست کرنے کا حق نہیں رہا ہے تیرے پاس۔ سیدھی طرح اس ٹونی کا پتا دور نہ میں تیرے ساتھ وہ گردوں کا کہ تو اپنے منہ سے اپنے لیے موت مانگے گی۔“ عالم شاہ نے اٹھنے ہاتھ کا ٹیچر اس زور سے اس کے منہ پر رسید کیا کہ اس کا منہ ہی پھر مبرا اور وہ لڑکھڑا کر پیچھے رہی بڑی سی جستی مٹی سے ٹکرائی۔ یہ جینی انسانی ہست رکھنے کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔ کچھ ہست مٹی کے اوپر بھی قدرے بے ترتیب رکھے ہوئے تھے۔ آسیہ کے ٹکرائے سے وہ بچکے اور ایک رنگین دلی نیچے گر گئی۔ عالم شاہ کو ہستوں کے رہنے کی پروا نہیں تھی لیکن ہستوں کے ساتھ کسی ٹھوس شے کے گرنے کی آواز پر وہ متوجہ ہوا۔ وہ ایک پرانے ماڈل کابینوں والا موبائل تھا۔ عالم شاہ نے بجٹ کر موبائل اٹھا لیا۔ گرنے سے باوجود موبائل کو نقصان نہیں پہنچا تھا اور وہ کام کر رہا تھا۔ آسیہ کو گھورتے ہوئے وہ موبائل کا کال ریکارڈ چیک کرنے لگا۔ اس موبائل پر آخری کال ٹونی کو کی گئی تھی۔ آسیہ اس کا پتا نہ بھی بتاتی تو ٹون نمبر کے ذریعے اس تک پہنچ جاسکتا تھا۔ آسیہ پر مٹی بھی لڑکی تھی اس لیے خود بھی اس بات کو نہ سمجھتی تھی۔

”بھول ہوئی سائیں! نادانی ہوئی۔ مجھے مولی مار دیں لیکن اسے کچھ نہ کہیں۔“ اس کی طرف سے مزید منتوں اور آوازوں کی مسلسل جارحی ہو گئی۔

”ابھی تو تو اپنی اس گستاخی کو ذہن میں رکھ کہ میرے قسم پر بھی تو نے مجھے اس بدعاش کا پتا نہیں بتایا ہے۔“ عالم شاہ کے لکھے میں درد سے کی سی غراہٹ تھی۔ ساتھ ہی وہ موبائل کی اسکرین پر بھی توجہ رکھے ہوئے تھا۔ آسیہ کی اسے زیادہ پروا نہیں تھی۔ معلوم تھا کہ اتنے بڑے جرم کے بعد وہ

سے میں تو بے ساختہ ہی اس کے لبوں سے سوال پھسا۔

”آپ نے میری رحم کی درخواست قبول نہیں کی اس لیے میں نے بھی آپ پر رحم نہیں کیا۔“

اس کے جسم سے بہتا خون، چہرے پر کھنڈی زردی اور ڈھلتی آواز بتا رہی تھی کہ وہ بے حد تکلیف میں ہے، اس کے ہاؤ جود اپنے جیلے کے اختتام پر اس نے مسکرائے کی کوشش کی۔ یہ ادھوری لیکن بڑی پراسرار سی مسکراہٹ تھی۔ عالم شاہ اس کے جیلے کا پورا مفہوم سمجھنے کے چکر میں وہیں الجھا ہوا کھڑا رہ گیا اور ملازمین اسے اٹھائے آگے بڑھ گئے۔

”آپ کو بڑے شاہ اندر بلا رہے ہیں سائیکس۔“ اپنی جگہ کھڑے کھڑے وہ آسید کو گاڑی میں بٹھانے کے جانے والا مسطرہ کچھ رہا تھا کہ ایک ملازم نے آکر اسے پیغام پہنچایا۔ ملازم کا لہجہ سب معمول مودب ہی تھا لیکن اسے محسوس ہوا کہ اس لہجے میں کوئی بات معمول سے ہٹ کر بھی ہے۔ زیادہ غور اس لیے نہیں کر۔ کا کہ ذہن دوسرے معاملات میں زیادہ الجھا ہوا تھا۔ اسے آسید سے حاصل ہونے والی معلومات سے قربان شاہ اور صداقت شاہ کو بھی آگاہ کرنا تھا۔ سو ملازم کے پیغام دیتے ہی مڑا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا دوبارہ حویلی کے اندر واپس چلے کی طرف جانے لگا۔ قربان شاہ اور صداقت شاہ کی ڈرائنگ روم میں موجودگی اس کے علم میں تھی اس لیے سیدھا وہیں پہنچا۔ وہاں اس نے صداقت شاہ کو بے حد بے چینی اور غیظ کے عالم میں ادھر ادھر ٹپکتے پایا اور خود کچھ ٹپکتے چلے جانے کی ہدایت کے لیے ادب سے ہوا۔

”حکم بابا سائیکس۔“ اس کی آواز پر اس کی طرف متوجہ ہونے والے صداقت شاہ ٹھنٹا بند کر کے اس کے سینے کے مقابلے آکھڑے ہوئے۔ پہلے اس پر ایک سرد نگاہ ڈالی اور پھر اچانک ہی دایاں ہاتھ قوت سے مٹھا کر اس کے دائیں رخسار پر ایک زوردار طمانچہ دے مارا۔ ایسا طمانچہ جس کی گونج حویلی سمیت عالم شاہ کے پورے وجود میں پھیل گئی۔

”بابا سائیکس!.....! حیرت اور صدمے کی زیادتی سے شل وہ ٹوٹنے لہجے میں فقط یہ دو الفاظ ہی ادا کر سکا۔“

”مت بول اپنی گندی زبان سے مجھے بابا سائیکس! آج تو نے میرا سر جھکا دیا۔ ہمارے باپ دادا سے لے کر آج تک کسی نے ایسی حرکت نہیں کی۔ خاندان کے نام پر کالک مل دی ہے تو نے۔“ صداقت شاہ کے لہجے میں غصے اور رنج کی کیفیت تھی۔ قربان شاہ ان کے برابر میں آکھڑے ہوئے اور ملنے کے شانے پر ہاتھ رکھ کر انہیں دھیمے

رہنے کی نصیحت کرنے لگے۔

”کیسے بابا! کیسے برداشت کروں میں۔ میری بیٹی اور دامادی زندگی داؤ پر لگی ہے اور یہ جو بڑا بھائی بن کر تنگنا پھر رہا تھا، اب سب بھلا بیٹھا ہے اور لوگوں کی عزت پر ہاتھ ڈال رہا ہے۔“ صداقت شاہ مذہال سے بولے تو عالم شاہ کا رخ چکر گیا۔

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں بابا سائیکس! مجھ پر یہ صدمہ الزام کس نے لگایا ہے؟“ رخسار پر گئے چھپر کی جگہ اس الزام کے سامنے ماند پڑ گئی تھی۔

”اسی نے جو ابھی اپنی عزت بچانے کے لیے جان کی بازی لگا گئی ہے۔ بتائیں بھتیجی بھی ہے یا نہیں لیکن تنوں کے بیچ تیرے بارے میں جو بول گئی ہے، اس کی سیاسی ساری زندگی تیرے دامن پر لگی رہے گی۔“ صداقت شاہ بولے تو وہ گنگ رہ گیا اور اسے آسید کے الفاظ یاد آئے۔ اس نے کہا تھا۔

”آپ نے میری رحم کی درخواست قبول نہیں کی اس لیے میں نے بھی آپ پر رحم نہیں کیا۔“ وہ جو آسید کے ان الفاظ کا مفہوم نہیں سمجھ سکا تھا اب اس پر واضح ہو گیا۔ اس وقت کی چھکڑ دھنک اس کے ساتھ کیا گیا تھا۔ وہ اس پر الزام لگائی تھی کہ اس نے اس کی عزت پر فتنہ ڈالا تھا اور وہ اپنی عزت بچانے کے لیے جان کی بازی لگا گئی تھی۔ ملازمین میں سے کسی کی زبانی تو رانی بڑوں تک بات پہنچ گئی تھی مورخانہ شاہ کو مجرم ثابت کرنا اب دہی کے لیے غلبہ کر لیا گیا تھا۔

”آپ نے اس سچائی کی بات پر یقین کر کے مجھ پر ہاتھ اٹھا بابا سائیکس!“ اس کا صدمہ کچھ اور بڑھ گیا۔

”عورت کی عزت کے معاملے میں اونچی نیچی نہیں دیکھی جاتی۔ ہم نے ہمیشہ اپنے ملازمین کی عزت کو بھی اپنی عزت سمجھا ہے۔“ صداقت شاہ نے ترنت جواب دیا۔

”جھوٹ بولا ہے اس عکار لڑکی نے۔ اپنا جرم چھپانے کے لیے مجھ پر الزام لگاتی ہے۔“ عالم شاہ غصے سے چیخا۔ پل ہن کے کہ صداقت شاہ جواب میں ہنستے۔ قربان شاہ کے سوہنل کی کھنٹی بھٹنے لگی۔ قربان شاہ نے فوراً کال کر سوسوکی۔ صداقت شاہ بھی ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ والوگ بہت دیر سے انگوٹھ کی طرف سے کال کا انتظار کر رہے تھے۔ اسکرین پر ابھی مجبور کچھ کر قربان شاہ والوگ کہ یہ کال ان ہی کی طرف سے ہوگی اس لیے بذاتہ خیر کال ریسپو کر لی۔ اپنی ”ہیلو“ کے جواب میں انہیں دوسری طرف سے جو آواز سننے کو ملی، اسے سن کر ان کا چہرہ جذبات کی شدت

سے سرخ ہو گئے۔

”معتظم بہت! ٹھو..... ٹھو کہاں سے بول رہا ہے؟“ انہوں نے لرزتی آواز میں جو الفاظ سیکے، انہیں سن کر صدقت شاہ بھی چونک گئے اور قربان شاہ کے مزید قریب ہو کر خود بھی دوسری طرف کی آواز سننے کی کوشش کرنے لگے۔ عالم شاہ اپنے اپنی جگہ پر ہی کھڑا رہا۔ اس کے لیے یہ کال غیر متوقع نہیں تھی بلکہ آسید سے حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں وہ منتظر تھا کہ سب محکم شاہ رابطہ کرتا ہے۔ رابطہ سرنیا گیا تھا اور اسے کسی ہو گئی تھی کہ اس کی بہن اور بہنوئی محفوظ مقام تک پہنچ گئے ہیں۔ اب اس کے نزدیک یہاں کھڑا رہنا فضول تھا۔ جو انرا اس پر لگا تھا، اس کی تردید بھی وقت کے ساتھ ہو جاتی لیکن اصل مسئلہ اس صدمے کا تھا جو باپ کی طرف سے بے اعتباری کی وجہ سے اسے پہنچا تھا۔

اس نے صدقت شاہ اور قربان شاہ کو سوا بالکل پر سمروف پھوڑا اور ایک جھٹکے سے مزے کے بعد لمبے لمبے آگ بھرتا ہوا باہر نکلا تو پھر بغیر رکے چتا ہی چلا گیا۔ حویلی سے باہر نکل کر بھی اس کے قدم نہیں ٹھہرے۔ جو انرا اس پر لگا یا گیا تھا، وہ معمولی نہیں تھا اور اسے یوں لگ رہا تھا کہ۔ تو بلی کے ملازمین بھی اسے ایک مجرم کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ احسان تو کہیں سے جلتا سلگن وہ کن راستوں پر چل رہا تھا، اسے خود بھی خبر نہیں تھی۔ آدمی کے اندر بہت شور ہو تو وہ ایسے ہی ارد گرد سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ **پہنچا تھا** ہو گیا تھا۔ اسے نہیں پتا چلا تھا کہ کب ایک سایہ اس کے پیچھے ہو گیا ہے۔ خبر اس وقت ہوئی جب ایک دیکھتا ہوا گارہ سا اس کی پشت میں اترا۔ دو اتنا دان نہیں تھا کہ جان نہ پاتا کہ اس کے ساتھ لیا ہوا ہے۔ وہ کوئی بہت تیز دھار آ رہا تھا جو نیچے سے اس کی پشت میں اتار دیا گیا تھا۔ اس نے مارنے والے کو دیکھنے کی خواہش میں رخ پھرنے کی کوشش کی تو دردمرے وجود میں پھیل گیا اور اس کے لیے اپنے قدموں پہ کھڑا رہنا دشوار ہو گیا۔ پھر بھی وہ کسی دے پتلے لڑکے کے ان بیوے کو دیکھنے میں کامیاب ہو گیا جو بھگتا ہوا اس سے اور جا رہا تھا۔ دیکھ کر بھی وہ اسے شناخت کرنے سے قاصر تھا۔ اصل میں تو وہ اس وقت کچھ ہی کرنے سے قاصر تھا اور نشان پڑی پٹنڈی پر اپنے ہی نبو کے تالاب میں پڑا ہو کر وہ جتنی موت کی آہیں محسوس کر رہا تھا۔

ہنہ ہنہ ہنہ

بشری کی ہفتا بہت ان دنوں عروج پر تھی۔ اعجاز کی جرات کے باعث دو باؤل تک پہنچے پہنچے رہ گئی تھی۔ اس کا

منصوبہ سادہ تھا۔ وہ مہنا ڈی جگہ خود باؤل کے پاس جانا چاہتی تھی۔ ایک بار اس کے کمرے تک پہنچ جاتی تو اس کا باؤل اس سے اپنا انتقام لے لیتا لیکن اعجاز نے اس کے وہاں پہنچنے کی راہ کھولی کر دی تھی اور اس کی باؤل تک پہنچنے کی تدبیر و ناکارہ کر دیا تھا۔ اس دن کے بعد سے وہ اعجاز سے بھی بے حد ناراض تھی اور اس کی کوئی کال ریسیو نہیں کر رہی تھی۔ یونیورسٹی جانا بھی اس نے چھوڑا ہوا تھا اور صرف کرائے اور شوٹنگ کلب چارے تھی۔ اس وقت بھی وہ وہیں سے نکلتی تھی۔ اپنی سہولت کے حساب سے اس نے جری کا قدر سے چست ٹراؤڈر اور ٹی شرٹ زیب تن کر رکھی تھی بور اس لباس میں اس کی جسمانی خوبصورتی نمایاں ہو رہی تھی۔ خود کو فٹ رکھنے کے لیے آج کل اس نے سخت ورزش وغیرہ کا جو معمول اپنا رکھا تھا، اس نے اس کی دستاویز میں اضافہ کیا تھا۔ اپنے مغربی خدو خال کی وجہ سے وہ ویسے ہی دوسری لڑکیوں سے مختلف لگتی تھی اور بالوں کو سنہرا کر دوانے کے بعد تو بالکل ہی مغربی حسن کا نمونہ لگنے لگی تھی۔

اس وقت بھی وہ کلب سے نکل کر دوپہن پارکنگ ایریا میں کھڑی اپنی گاڑی کی طرف بڑھی تو کئی نگاہیں اس کی طرف اٹھی رہ گئیں۔ وہ اپنے ہر درد سے بے نیاز تھی اور اس کے قدموں کی جنبش کے ساتھ ساتھ اس کے سنہری بالوں کی ہونی ٹھٹھکی کے چنڈا لہر کی طرح ایک روح سے دائیں بائیں **پہنچا تھا** گزرتی تھی۔ گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہوتے وقت بھی اس کی ماحول سے بے نیازی قائم تھی۔ اصل میں وہ خود گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اعجاز کی مدد کے بغیر کیسے باؤل تک رسائی حاصل کرے۔ اس کے سامنے باؤل تک پہنچنے کا ایک ہی راستہ تھا، مہنا ڈ۔ وہ غور کر رہی تھی کہ کیسے مہنا ڈ تک پہنچ کر باؤل تک پہنچنے کا راستہ تلاش کرے۔ ایک منصوبے کے پلکے سے خدو خال اس کے ذہن میں تھے اور اسی پر غور کر رہی تھی وہ گاڑی ڈرائیو کر رہی تھی۔ گاڑی کا رخ میڈرناولی کے ہاسٹل کی طرف نہیں تھا بلکہ وہ اس کی پارکنگ بلڈنگ کی طرف جا رہی تھی جہاں مہنا ڈ پارکس پڑی تھی۔ سمجھ دیر قبل اس نے تاج بیوی سلوان فون کر کے مہنا ڈ کے بارے میں معلوم کیا تھا تو اسے اطلاع ملی تھی کہ مہنا ڈ آج یحییٰ پر ہے اور اپنے گھر پر آرام کر رہی ہے۔

اس نے مہنا ڈ سے ملاقات کے لیے دل میں مہنا ڈ سوچ لیا۔ وہ اس سے کہہ سکتی تھی کہ اپنے بالوں کی رجحمت سے پوری طرح مطمئن نہیں ہے اور ایک تقریب میں شرکت کے

کی وجہ سے تھانے والوں کو ناچ رکا روائی کرنی پڑے گی۔ قریبی دو تھانوں میں ان کے وہ خفیہ خوار پیٹھے ہوئے تھے جن کو صرف اتنا کرتا تھا کہ اس غیر آباد حویلی میں گھس بیٹھنے والوں کی وہاں موجودگی سے صرف نظر کیا جائے۔ ہماری پونیس جو بڑے بڑے جرائم سے ویسے ہی مزے سے صوبہ نظر کر جاتی ہے، روپے لے کر یہ کام کیسے نہ کرتی جبکہ مالکان بھی بیدار نہ تھے اور حویلی اور اس سے متصل باغ کا کوئی پرسان حال نہیں تھا۔

ان لوگوں نے تھانے فون کر کے وہاں کے ایس ایچ ہو کو سمجھایا کہ اگر کوئی ان کے پاس آتا ہے اور کارروائی کے لیے دباؤ ڈالا جاتا ہے تو مناسب تیاری کے ساتھ ریڈ کرنے کے بہانے اتنا وقت نکال لیا جائے کہ ان لوگوں کو یہاں کا سیٹ اپ ختم کرنے اور اپنی موجودگی کے ثبوت منانے کا موقع مل جائے۔ معاذ کو ان ساری باتوں کا علم تشدد کے مراحل سے گزرتے ہوئے کچھ خود سے کی جانے والی باتوں اور کچھ ان کی آپس کی گفتگو کے ذریعے ہوا تھا۔ انہوں نے سب سے پہلا کام تو معاذ، اپنے ساتھی کی لاش اور زخمیوں کی وہاں سے منتقلی کا کیا تھا۔ بعد میں یقیناً صفائی ستھرائی کا کام ختم کر خود بھی وہاں سے نکل گئے ہوں گے۔ کچھ باتوں کو معاذ کسی کے کچھ بتائے بغیر بھی سمجھ رہا تھا۔ اسے جس طرح ہتھکڑوں پر پٹا باندھ کر اس حویلی میں لے جایا گیا تھا، ویسے ہی آنکھوں پر پٹا باندھ کر وہ صرف کچھ گھر گیا تھا۔ راستے میں سنائی دینے والے ٹریفک کے شور سے اس نے اندازہ لگایا تھا کہ اس بار اسے کسی معافیاتی علاقے کے بجائے شہر کے درمیان کسی جگہ منتقل کیا گیا ہے۔ ایک قید خانے سے نکل کر وہ دوسرے قید خانے میں پہنچا تو غصے اور تنہائیت سے بھرے وہ ڈاکو بھوکے بھیڑیوں کی طرح اس پر ہلک پڑے۔ ان کے تشدد کا نشانہ بننے ہوئے ایک بات البتہ معاذ نے ضرور محسوس کی کہ وہ اسے ایسی کوئی چوٹ لگانے سے گریز کر رہے ہیں جس کی وجہ سے اس کی جان بلی جائے۔ ماریٹ کے مرحلے سے گزرنے کے بعد اس کی اسٹیمیز رومن کی نقوش سے خاقت ہوئی تو اس نے معاذ کے اندازے کی تصدیق کر دی اور بولا۔

”تیری اتنی سی خاطر کر کے میرا من شانت نہیں ہوا ہے۔ تیری وجہ سے میرے ہاتھ سے بہت بڑی دولت کے ساتھ ساتھ کھل شا بھی نکل گئی ہے۔ تیرا یہ جرم بڑا بڑا ہے کہ میرا دل چاہتا ہے تیرا ایک ایک ریشہ ادھیڑ کر اپنے دل کی آگ کو ٹھنڈا کر لوں لیکن میں بندہ ہوں دمار سے کام لینے

والا۔ تیری جان لے کر مجھے کچھ حاصل ہونے والا نہیں ہے۔ ہاں، تیرا سودا کر کے کافی کچھ مل جائے گا۔ تو نے عرفان اللہ سے بات کر لی ہے اور اسے ابھی طرح سمجھا دیا ہے کہ اگر وہ ہمیں تیرے اچھے دام نہیں دیتا تو ہم سیدھا تجھے میڈیا کے سامنے لے آئیں گے۔ عرفان اللہ کو انکسشن کی وجہ سے پینک میں اپنے اچھے ایجن کی بڑی فکر ہے۔ اس کا دوست یزدانی بھی ٹھہرایا ہوا ہے اس لیے مجھے پورا یقین ہے کہ وہ ہماری ڈیمانڈ مان لیں گے۔ اپنی بات ٹھکانے کر کے اس نے ایک ہند آہنگ قبضہ نگا یا تھا اور پھر اس کی طرف ذرا جھک کر معنی خیز لہجے میں بولا تھا۔

”اگر عرفان اللہ سے سودا نہ بھی بنا تو میں تیرے ساتھ تیری زندگی کے لیے ڈیلنگ کر لوں گا۔ تو نے اپنی حرکت سے ثابت کر دیا ہے کہ تو بڑا جی ویر اور کمال کا آدمی ہے۔ ویسے یہ تو بتا کہ تو نے اتنے نکال کا موت کا ٹانگ کیسے کیا تھا کہ دن رات موت کا کھیل کھیلنے والے میرے بندے بھی دھمکا کھا گئے تھے؟“ معاذ اس کی اتنی باتوں کے جواب میں کچھ نہیں بولا تھا جس پر اس نے کہا تھا۔

”تیرا عرفان اللہ سے سودا ہونا چاہیے تو اچھا ہے۔ مجھے تیری ٹاپ کا اندازہ ہوتا ہے۔ تو بندہ ہے اڑیل ٹوک لیل کا۔ تجھے اپنی راہ پر چننا ہو ہے کے پتے چبانے کے برابر ہے۔ چل تو پھر ٹھیک ہے، چارہ یہاں۔ دیکھتے ہیں کیا دام ملے گا۔“ اس نے کہا۔ اس گفتگو کے بعد وہ چلا گیا تھا اور پھر شاید عرفان اللہ اس کے من پسند دام دینے پر تیار ہو گیا تھا جو اسے اسی روز ایک دوسری جگہ منتقل کر دیا گیا تھا۔ اس جگہ سے جس تشدد کا سامنا کرنا پڑا تھا، وہ ڈاکوؤں کے کے گئے تشدد سے بہت مختلف اور اذیت ناک تھا۔ اسے اس تشدد کا نشانہ بنانے والا بندہ بڑا عجیب و غریب اور کچھ ایسا تھا کہ معاذ کو اس سے کراہیت سی محسوس ہو رہی تھی۔ جب وہ معاذ پر تشدد کر رہا تھا تو معاذ کو صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اذیت رسانی کے اس عمل سے کسی پسندیدہ مشغلے کی طرح لطف اندوز ہو رہا ہے۔

اس کے تشدد کا طریقہ بھی انوکھا تھا۔ اس نے ہاتھ میں لوہے کا ایک پنجہ سا پہن رکھا تھا اور اس پنجے پر لمبی لمبی باریک سوئیاں ابھری ہوئی تھیں۔ وہ اس پنجے کو ہن کر سوڈ کے جسم پر پھینک رہا تھا۔ پورے قوت سے مارے گئے ان تھپڑوں کے نتیجے میں سوئیاں معاذ کے جسم میں گھر گھر اسے تکلیف پہنچاتی تھیں اور جب وہ پنجے کو کھینچ کر باہر نکالتا تھا تو معاذ تکلیف سے بلباہ جاتا تھا۔ لوہے کے اس پنجے سے

معاذ کا جسم چھید ڈالنے کے بعد اس نے اس کے پورے جسم پر نمک پھڑکوا دیا تھا اور - معاذ کی چیخوں اور کراہیوں سے لطف اندوز ہوتا رہا تھا۔

تیسرے مہرے میں اس نے - معاذ کو برف کی سل پر بربنٹا کر اس کے جسم پر بھاری وزن رکھوا دیا تھا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ وہ اس سارے تشدد کی کوئی وجہ بھی بیان نہیں کر سکتا تھا۔ معاذ چیخ چیخ کر اس سے پوچھتا رہا تھا کہ آخر وہ اس سے کیا چاہتا ہے لیکن اسے اپنے سوال کا کوئی جواب نہیں ملا تھا اور - معاذ کو یہی لگا تھا کہ وہ اسے اذیتیں دے دے کر ہلاک کر دینے کے سوا کچھ نہیں چاہتا۔ مختصر عرصے میں اتنے شدید تشدد سے گزرنے کے باعث معاذ کی حالت خراب ہو گئی تھی۔ کیرتھر کی خفیاں سننے سے لے کر اب تک اسے اپنے جسم پر اتنا کچھ - پہنا پڑا تھا کہ وہ خود حیران تھا کہ اس کی روح جسم میں کیسے ٹھہری ہوگی ہے اور کچھ نہیں تو اسے اپنے حواس ہی کھو دینے چاہیے تھے لیکن ایسا کچھ نہیں ہو سکتا تھا اور اسے خود پہلی بار اپنی سخت جانی کا اور اک ہو رہا تھا۔ وہ اس حالت میں بھی مسلسل اپنے فرار کی تدابیر سوچتا رہا تھا لیکن اسے اتنی مہلت ہی نہیں دی جا رہی تھی کہ وہ کسی تدبیر پر ذہن تک سے غور کر پاتا۔ اسے مسلسل تشدد کے عمل سے گزرتے اب کہیں جا کر اتنی رعایت دی گئی تھی کہ وہ نیم عریاں حالت میں اس کمرے کے فرش پر پڑا تھا اور ایک بار پھر اس کے دل میں پہلی بار یہ خیال آیا تھا کہ وہ ان لوگوں کی طرح لوگ بھی اسے ہلاک نہیں کرنا چاہتے۔ انہوں نے اسے اذیت بے حد دی تھی لیکن کوئی جان لیوا وار بہر حال نہیں کیا تھا حالانکہ عرفان اللہ اینڈ کمپنی کے مفاد میں تو یہی بات سب سے بہتر تھی کہ وہ اسے فوری طور پر ہلاک کر دیں تاکہ آگے وہ ان کے لیے کوئی مصیبت نہ کھڑی کر سکے۔

اپنے زندہ رکھے جانے کی وجہ پر غور کرتا ہوا وہ نیم وا آنکھوں سے سامنے والی دیوار پر نصب اس مختصر سے ہوا دان کو دیکھ رہا تھا جس میں سے وہ خود تو کیا کوئی چھوٹا بچہ بھی نہیں گزر سکتا تھا۔ پھر بھی ہوا دان لوہے کی سلاخوں کی مدد سے مزید محفوظ بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ مختصر ہوا دان سے اسے تاریک آسمان کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ آسمان کا یہ مختصر اور تاریک ٹکڑا بھی اسے آزادی کی طرف پکار رہا تھا۔ اس کی روح باہر آرزو فضا میں سانس مینے کے لیے تڑپ رہی تھی۔ وہ خاموش بیٹا آسمان کے اس ٹکڑے کو دیکھتا رہا۔ بالک ایک اس ٹکڑے پر ایک تار اچکا اور گویا آسمان کا وہ ٹکڑا اچک گیا۔ لاکھوں کروڑوں میل کے فاصلے پر موجود وہ تارا

شرارت سے - معاذ کو آنکھ مارنے لگا۔ اس تارے کو دیکھ کر معاذ کے ہونٹوں پر انکی مسکراہٹ ابھری جیسے رو رو کر نڈھال پڑ جانے والے بچے کے ہونٹوں پر اپنا پسندیدہ کھلونا دیکھ کر ابھرتی ہے۔

وہ اپنی ساری تکالیف بھلا کر اس تارے کی طرف متوجہ ہو گیا اور بے ساختہ ہی اسے کیرتھر پر فیض کی معیت میں گزری وہ چند راتیں یاد آئیں جب اس نے تاروں سے کھیلنا سیکھا تھا۔ اتنے پہلے اور انوکھے کھلونے سے وہ زندگی میں کبھی کھیلنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ یہ فیض کی مہربانی تھی جس نے اسے ایسے کھلونوں سے کھیلنا سکھایا تھا۔ کیرتھر کی راتوں کے بعد آج اسے یہ پیرا سا کھلونا میسر آیا تو وہ سب کچھ بھول کر اس میں گمن ہو گیا۔ آہستہ آہستہ تارے کی ساری روشنی اس کے اندر اترنے لگی اور وہ خود کو بے حد ہکا بھکا ہواؤں میں اڑتا محسوس کرنے لگا۔ یہ احساس اتنا قوی تھا کہ اس کی جسمانی تکلیف کبھی گم ہو گئی اور اسے ایسا لگا کہ آسمان پر اڑتا وہ غریح طرح کے ستہری کھلونوں سے کھیلنا پھر رہا ہے۔ ستہری پھول، ستہری کبوتر، ستہری چھتری، ستہری پاول۔ کیا کیا نہیں تھا اس عجیب دنیا میں۔ پھر وہ ستہری بادلوں کے پیچھے سے نمودار ہوئی۔ ستہری پری کو دیکھ کر وہ دم بخود ہو گیا۔ پری کا چہرہ اسے بے نظریں آ رہا تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ اس نے اسے پر کوئی ستہری نقاب سہاگین رکھا ہے۔

”معاذ... معاذ...“ ایک نسوانی آواز تھی جو اسے مسلسل پکار رہی تھی اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی واپس وہاں پہنچ گیا تھا جہاں آنکھیں چاہتا تھا۔ سیٹ دیواروں والا وہ مستطیل کمرہ جہاں وحشت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ کمرے کے دروازے پر کوئی خالی نظروں سے گھورتے ہوئے اس نے پھر سنا۔ ”معاذ...“ وہ واقعی ایک نرم نسوانی آواز تھی جو وقتے وقتے اسے پکار رہی تھی۔

ظلم و ستم کے سامنے سیرتِ نوجوان
کی داستان جو غلط کاروں کے لیے
غضب ناک تھا باتیں واقعات اینڈ مادیر ہے

”تم..... تم میرا چہا نہیں چھوڑ سکتے؟“ کھڑکی میں نظر آتے چہرے کو دیکھ کر بشری غصے سے چینی۔
 ”جب تک تم حماقتیں کرنا نہیں چھوڑو گی، میں تمہارا چہا نہیں چھوڑوں گا، کیونکہ تم نادان ہو اور اگر کوئی نادانی میں کنوئیں میں چھلانگ لگانے جا رہا ہو تو اس کے دوست اور یہی خواہر خاموشی سے اسے ایسا کرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے۔“ وہ شخص جو کہ اعجاز تھا، پُرسکون لہجے میں بولا۔
 ”تم مجھے نادان نہیں کہہ سکتے۔ میں ایک عاقل و بالغ اور باشعور لڑکی ہوں۔ مجھے ابھی طرح پتا ہے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں۔“ بشری نے نروٹھے پن سے اسے جواب دیا۔

”تم اپنے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہو اور نہ یوں منہ اٹھا کر مہناز کے اپارٹمنٹ کی طرف نہ چل پڑتیں۔ تم کیا سمجھتی ہو کہ تم بھانے سے باڈل کو وہاں بلاؤ گی اور پھر اسے قابو کر لو گی۔ اتنا آسان نہیں ہے یہ سب کرنا۔ باڈل بہت خطرناک آدمی ہے۔ تم ایک ننھے سے بطل کے سہارے اسے کچھ نہیں کر سکتیں۔ فرض کرو کامیاب بھی ہو جاتی ہو تو خود کو کیسے بچاؤ گی؟ مہناز جس بلڈنگ میں رہتی ہے، اس میں جگہ جگہ سکیورٹی کے لیے سی سی ٹی وی کیمرے لگے ہوئے ہیں۔ تم فوراً ہی پکڑی جاؤ گی۔“ اعجاز نے یوں اس کے سامنے اس کا منصوبہ دہرایا جیسے اس کا ذہن پڑھ رہا ہو۔ یہ سن کر بشری ہکا بکا رہ گئی۔

”ایسے ہونٹوں کی طرح میری شکل کیا دیکھ رہی ہو؟ تم سے سینئر ہوں اور ابھی طرح سمجھ سکتا ہوں کہ تم کیا سوچ رہی ہو۔ چلو شاہاش! اب اچھے بچوں کی طرح گاڑی موزو اور ہاسٹل واپس جاؤ۔ ابھی مجھے ایک کام سے جانا ہے۔ شام میں، میں تم سے آکر ملتا ہوں، پھر سوچیں گے کہ تمہارے مسئلے کا کیا حل نکل سکتا ہے۔“ اعجاز اسے کسی بچے کی ٹریٹ کر رہا تھا۔ وہ بری طرح جھنجھلائی اور جھنجھلاہٹ میں اسے جواب دیے بغیر ہی گاڑی اسٹارٹ کر کے بہت تیزی سے اسے موزو۔ اعجاز کو خود کو بچانے کے لیے تیزی سے اچھل کر ایک طرف ہوتا پڑا تھا۔ بہر حال اس نے برانہ مانا اور بشری کی گاڑی کو خاموشی سے واپسی کے راستے پر جاتا دیکھتا رہا۔ اور بشری دانت پر دانت جمائے شدید غصے کے عالم میں ڈرائیو کر رہی تھی۔ یہ ایسا فصرہ تھا جس کے بارے میں اسے خود اندازہ نہیں تھا کہ حقیقتاً اس کا ہدف کون ہے۔ یہ بے بسی کی کوکھ سے جنم لینے والا فصرہ تھا۔ وہ کچھ نہیں کر پار ہی تھی اس لیے بس فصرہ ہی کرتی رہتی تھی۔ غصے کی اس

کیفیت میں اس نے سرخ جی پلٹے پر بھی ایسے گاڑی روکی جیسے ٹریفک کا یہ اشارہ بھی اس کا دشمن ہو۔
 ”بشری!“ دانت پر دانت جمائے وہ سامنے دیکھ رہی تھی کہ دائیں طرف سے کسی کے پکارنے پر رخ موزو کر اس طرف دیکھا۔ وہ سونیا خان تھی جو حسب معمول اپنی شاندار گاڑی کی پچھلی نشست پر براجمان اپنی طرف کا شیشہ نیچے کیے اسے پکار رہی تھی۔

”آگے“ میری“ پڑھتے ہیں۔“ اس نے اسی روڈ پر آگے موجود ایک فاسٹ فوڈ سینٹر کا نام لے کر بشری سے کہا اور گاڑی کا شیشہ دوبارہ اوپر کر لیا۔ ننگڑ گلاس کے پیچھے اس کا حسین چہرہ اب نظر نہیں آ رہا تھا۔ بشری کا دل چاہا کہ اس کی بات ماننے سے انکار کر دے لیکن سنٹل کھلنے پر اس نے گاڑی آگے بڑھائی تو خود بخود اس ریسنورٹ پر لے جا کر روک دی جس کے لیے سونیا نے کہا تھا۔ سونیا کی گاڑی اس سے پہلے ہی وہاں پہنچ چکی تھی اور اس سے پہلے اس کا ڈرائیور اور سیکرٹری کم باڈی گاڑی باہر نکل کر موزو بانہ کھڑے ہوئے تھے۔ بشری کی گاڑی رکتے ہی سونیا خان بھی گاڑی سے باہر نکل آئی۔ اس نے چست چنٹ کے ساتھ کسی ڈھکنے والے کپڑے کی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی اور اس جلیے میں بھی خوبصورت لگ رہی تھی۔

”کتنے دنوں سے تم سے ملنا چاہ رہی ہوں لیکن تمہاری مصروفیت ہی ختم نہیں ہوتی۔ آج سنٹل پر تمہیں دیکھا تو سوچا کہ اب نکلنے نہیں دیتا ہے۔ آؤ! اندر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“

بشری یہاں تک آجانے کے باوجود موزو کی کیفیت میں تھی۔ سونیا نے پُر جوش لہجے میں کہتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا اور اپنے ساتھ چنچتی ہوئی اندر لے جانے لگی۔ بشری کو ناچار اس کا ساتھ دینا پڑا۔

”کیا بات ہے، تم بہت اب سیٹ لگ رہی ہو؟“ آخر سونیا نے اس کی کیفیت کو محسوس کر لیا اور اس کے مقابلے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”کوئی نئی پریشانی اور غم نہیں ہے۔ بس اپنے بچروں کو کھلے عام آزادی سے مھوسا دیکھ کر میرا خون کھولنے لگتا ہے اور بس نہیں چھتا کہ ان کے ساتھ کیا کر گزروں۔“ سونیا خان سے کچھ چھپا ہوا نہیں تھا اور وہ ذہنی طور پر اپ سیٹ بھی تھی، اس لیے اس کے سامنے اظہار کر گئی۔

”تمہارا ان پر بس چل بھی نہیں سکتا۔ تمہیں اس حقیقت کو قبول کرنا ہوگا کہ تم ان کے مقابلے میں بہت کمزور ہو۔“ اس

کی بات سن کر سونیا خان نے بے نیازی سے تبصرہ کیا۔
”کمزور ہوں تو کیا ان کا ظلم بھول جائوں؟“ بشری کو نصرا آ گیا۔

”میں نے تم سے یہ نہیں کہا۔ میں تمہیں یہ سمجھانا چاہتی ہوں کہ طاقتور سے مقابلہ کرنا ہے تو خود کو بھی طاقتور بنانا ہوگا وہ راستہ ڈھونڈنا ہوگا جو تمہیں ان تک پہنچا سکے۔ تم نے سنا ہوگا نا کہ کبھی کبھی چوٹی بھی ہانگی کو گر ادیتی ہے لیکن شرط یہی ہے کہ چوٹی کو ہانگی کی سونڈ تک پہنچنے کا موقع مل جائے۔ تم بھی اپنے لیے ایسا موقع تلاش کرو۔ ایسا راستہ ڈھونڈو جو تمہیں کامیابی تک لے جائے۔“

”مگر کیسے؟“ بشری نے نا سمجھی کے عالم میں سوال کیا۔

”یہ بھی پتا چل جائے گا۔ فی الحال تم ہاشل جاؤ۔“

جا کر فریش ہوا اور خود سے پوچھو کہ تمہارے اندر انتقام کی جتنی تڑپ ہے۔ اگر یہ تڑپ اتنی ہو کہ تم اس کی خاطر کوئی بھی قیمت ادا کرنے کے لیے خود کو آدہ پاؤ تو پھر مجھ سے رابطہ کرنا۔ میں تمہاری راہنمائی کروں گی۔“

”ابھی..... ابھی کیوں نہیں بتاتیں آپ مجھے وہ راستہ؟“ سونیا خان کی بات سن کر وہ بے چین ہوئی۔

”نہیں، ابھی نہیں۔ میں نے کہا ہے نا کہ ابھی تم ابھی طرح سوچو، پھر مجھ سے رابطہ کرنا۔“ سونیا نے دھیرے سے

اس کا ہاتھ تھپکا۔ اسی وقت دیگر مشروب کے دو گلاس میز پر رکھ گیا جن کا دوران گفتگو سونیا نے آرڈر دیا تھا۔ سونیا نے

بشری کو مشروب پینے کا اشارہ کیا اور خود بھی گلاس سے نزاکت کے ساتھ ایک ایک گھونٹ لیتی ادھر ادھر کی باتیں

کرتی رہی۔ بشری کی ان باتوں میں دلچسپی نہیں تھی اور نہ ہی مشروب پینے کا دل چاہ رہا تھا۔ اس نے مشکل سے ایک

تہائی گلاس ہی خالی کیا۔

”میں نے تم سے جو کہا ہے، اس پر غور کرنا پھر ہم دوبارہ ملیں گے۔“ سونیا نے اپنا گلاس خالی کیا اور ٹپ

سمیت مل میز پر ڈال کر اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ اس کے کھڑے ہوتے ہی ایک دوسری میز پر بیٹھا اس کا سیکریٹری

کم پاؤی گاڑ بھی کھڑا ہو گیا۔ بشری کے بے بسی حریف وہاں رکتا ہے جو اڑتا چٹا نچوہ بھی وہاں سے اٹھ گئی۔ ہاشل کٹنگ کر

وہ فریش ہونے کے ساتھ ساتھ اعجاز اور سونیا دونوں کے بارے میں سوچتی رہی۔ اعجاز نے بھی اس سے مل بیٹھنے اور

کوئی حل تلاش کرنے کی بات کی تھی اور سونیا بھی اسی قسم کی پیشکش کر گئی تھی لیکن فرق یہ تھا کہ سونیا کا لہجہ زہادہ پڑا تھا اور اس کے انداز سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اس کے پاس

کوئی واضح پلان موجود ہے لیکن اپنے تعاون کے بدلے میں وہ بشری سے بھی کچھ چاہتی ہے۔ سونیا خان شروع سے اسے

کچھ عجیب لگی تھی اور وہ اسے کبھی محض ایک بے حد امیر آدمی کی حسنین بیوی کے طور پر نہیں لے سکی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ

سونیا خان میں کچھ الگ، کچھ مختلف بات ہے اور وہ تھوڑی پر اسرار ہے۔ اب اس کا سونیا سے متعلق ٹک ٹھین میں

بدلنے لگا تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ سونیا تعاون کے بدلے اس سے کیا قیمت وصول کرنا چاہتی ہے۔ دولت اور سماجی

مرتبے کے اعتبار سے سونیا اس سے بہت بلند تھی اور اس کے پاس ایسا کچھ نہیں تھا جس کی سونیا کو ضرورت ہوتی۔ اس نے

سونیا کے مشورے کے مطابق کوئی بھی قیمت ادا کرنے پر غور کرنا شروع کر دیا لیکن وہ یہ اندازہ لگانے سے قاصر تھی کہ

اسے کیا قیمت ادا کرنی ہوگی۔ سوچتے سوچتے وہ اسی نتیجے پر پہنچی کہ سونیا کو اثبات یا انکار میں جواب دینے سے مل اسے

اعجاز سے مل لینا چاہیے۔ اعجاز کے معاملے میں ایک بات بہر حال طے تھی کہ وہ اسے کبھی بھی کوئی نقصان پہنچانے والا

مشورہ نہیں دے گا۔ اس فیصلے پر پہنچتے ہی اس نے انتر کام کا ریسورٹ اٹھایا اور میڈم نازلی کو کال کرنے لگی۔

”نیں ڈارلنگ! کچھ چاہیے ہے کیا؟“ میڈم نے اپنی لوج دار آواز میں اس سے پوچھا۔

”نہیں، کچھ نہیں چاہیے۔ آپ سے بس اتنا کہنا تھا کہ میرا ایک دوست کام کے سلسلے میں مجھ سے ملنے آئے گا۔ آپ

اسے دیننگ روم میں بٹھانے کے بجائے سیدھا اوپر میرے کمرے میں بھیج دیجیے گا۔“ اس نے میڈم کو ہدایت دی۔

”اوکے! ایڈیووش۔ میں تو تم لوگوں کی خدمت کے لیے ہی یہ ہاشل کھول کر بیٹھی ہوں۔ میرے ہاں تمہیں کسی

پریشانی یا پابندی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔“ میڈم کے لہجے میں معنی خیزی تھی۔ بشری کا دل چاہا کہ وضاحت دے

دے کہ اعجاز محض اس کا دوست ہے۔ وہ اسے اس کا سیکریٹری کی فطرت نہ کرے لیکن پھر اس نے ارادہ بدل دیا۔ یہاں اسی

ٹائپ کی خواتین رہتی تھیں۔ اگر وہ وضاحت دے بھی دیتی تو میڈم نازلی اس کی بات پر چین نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے

خاموشی سے ریسورٹ کھدایا اور اعصابی تناؤ سے بچنے کے لیے اعجاز کی آمد تک کچھ دیر آرام کا فیصلہ کرتے ہوئے ایک گولی

پانی کے ساتھ طلق سے پیچھے اتار لی۔ ذہنی تناؤ کم کرنے کے لیے اب وہ کبھی کبھار ایسی گولیوں کا استعمال کرنے لگی تھی۔

گولی نے جلد اثر دکھایا اور اس کے تپتے ہوئے اعصاب نے ڈھیلا پڑ کے اسے سونے کی اجازت دے دی۔ وہ کتنی دیر

سوئی، اسے اندازہ نہیں ہو سکا۔ دروازے پر ہونے والی مسلسل دنگ نے اسے آنکھ کھولنے پر مجبور کیا تو اس کے ذہن میں سب سے پہلا خیال اعجاز کا ہی آیا۔ یقیناً وہ طے شدہ وقت پر اس سے ملاقات کے لیے پہنچ چکا تھا۔ منہ پر ہاتھ رکھ کر اس نے پہلے بجائی کوروکا اور پھر بکار کر دنگ دینے والے کو سلی کروائی کہ دروازہ کھولنے آ رہی ہے۔

سونے کے دوران بکھر جانے والے سنہری بالوں کو دونوں ہاتھوں سے سنبھتی ہوئی وہ بستر سے اتر کر دروازے کی طرف بڑھی تو اس کا انداز ڈھیلا ڈھالا تھا اور ذہن پوری طرح دوا کے اثر سے آزاد نہیں ہوا تھا۔ ایک ہاتھ بنوز بالوں پر رکھتے ہوئے اس نے دروازے کی چوکی گرائی ہی تھی کہ دوسری طرف سے دروازے کو دھکیل کر کھول دیا گیا۔ یہ عمل اتنی تیزی سے ہوا تھا کہ بشری کو ایک طرف ہٹنے کا موقع بھی نہیں مل سکا اور دروازہ آ کر سیدھا اس کی پیشانی سے ٹکرایا۔ بے ساختہ ہی اس کے حلق سے ایک ہلکی سی چیخ نکل اور بالوں پر سے ہاتھ ہٹ گیا۔ سنہری زلفیں اس کے چہرے پر یوں بکھریں کہ سارے منظر چھپ گئے اور وہ اندر آنے والے کو نہ دیکھ سکی۔ آنے والا آتے کے ساتھ ہی اس پر جھپٹا اور حرکت کرنے کا موقع دے بغیر ہی اس طرح دبوچا کہ اس کا ایک ہاتھ بشری کے منہ پر تھا تو دوسرے نے اس کے بالائی جسم کو کسی آنکھوں کی طرح اپنے قلمبے میں جکڑ لیا۔ اس کی مضبوط گرفت میں جکڑی بشری نے فطری طور پر ہاتھ چڑ مارنے کی کوشش کی لیکن اس کا دماغ تیزی سے خود کی میں ڈوبتا چلا گیا۔ اسے دیر سے اس بات کا ادراک ہوا تھا کہ نو وارد کے اس کے منہ پر جتنے ہاتھ ہیں ایک نم رومال موجود ہے۔ ایسے نم رومال جب کسی لڑکی کے منہ اور ناک پر رکھ کر اسے ہوش و خرد سے بیگانہ کیا جاتا ہے تو پھر ہوش میں آنے کے بعد اس کی دنیا ٹپک جاتی ہے۔ بشری کو بھی کسی بزدل نے نہایت مکاری سے اس کی متاع عزیز سے محروم کر دیا۔

وہ دوبارہ ہوش میں آئی تو ہاسٹل کے بجائے ہاسپٹل کے کمرے میں تھی۔ اس کے بازو میں ڈرپ لگی ہوئی تھی اور جسم پر جا بجا میڈیکل بینڈیج چپکے ہوئے تھے۔ وہ ایسی نقابت اور تعریف محسوس کر رہی تھی جیسے اس کے جسم پر سے کوئی بھاری گاڑی گزاردی گئی ہو۔ ہوش میں آتے ہی اس نے کیونلا میں کوئی دوا انجیکٹ کرتی ہوئی نرس کو دیکھا اور لاشعوری طور پر اسے اپنا ذہن سمجھتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اسے نشانہ بنانے کی کوشش کی۔ نقابت نے اسے ہاتھ کو پوری قوت سے حرکت نہیں کرنے دی تھی اس لیے نرس کے

منہ پر اوچھائی وار پڑ سکا تھا، پھر بھی انہماک سے اپنا کام انجام دیتی نرس بری طرح اچھل پڑی اور بوکھلا کر ایک زوردار چیخ ماری۔ جواب میں بشری کے منہ سے بھی بے تحاشا اور گرجا رچھیں بلند ہونے لگیں۔ چیخنے کے ساتھ وہ کچھ بول بھی رہی تھی لیکن آواز بری طرح چھٹ جانے کے باعث اس کی کوئی بات سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

چیتوں کی آواز سن کر جو پہلا شخص کمرے میں داخل ہوا، وہ اعجاز تھا۔ اعجاز نے تیزی سے آگے بڑھ کر بشری کو اپنے بازوؤں کے حصار میں لے لیا اور نرمی اور پیار سے اسے ہچکارتا ہوا ریٹیکس ہونے کی درخواست کرنے لگا، لیکن بشری پر جیسے کوئی جنون طاری ہو گیا تھا۔ اس نے اعجاز کی بات پر ذرا کان نہ دھرے اور مسلسل چیختی رہی۔ اعجاز کے پیچھے اندر داخل ہونے والے ڈاکٹر نے اسے اشارہ کیا کہ وہ بشری کو مضبوطی سے پکڑ لے۔ ابتدائی طور پر خوف کا شکار ہو جانے والی نرس بھی اب اپنے حواس میں آ چکی تھی اور اپنی ڈیوٹی انجام دینے کے لیے تیار تھی۔ اس نے جلدی سے ایک انجکشن تیار کر کے ڈاکٹر کے حوالے کیا اور قابو سے باہر ہوتی بشری کو سنبھالنے میں اعجاز کا ساتھ دینے لگی۔ ڈاکٹر نے پھر ہی سے انجکشن کو کیونلا میں انجیکٹ کر دیا۔ دھیرے دھیرے بشری ڈھیلی پڑ گئی اور اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اعجاز نے نرمی سے اسے دوبارہ نیچے پر لٹا دیا اور ایک کرب بھری نظر اس کے چہرے پر ڈالنا ہوا وہاں سے ہٹ گیا لیکن اس کے ہونٹ اب بھی سختی سے بچھنے ہوئے تھے اور بار بار کھلتی بند ہوتی مٹھیاں گواہی دے رہی تھیں کہ وہ سخت طیش کی کیفیت میں ہے۔

”ریٹیکس اعجاز صاحب! اس قسم کے کیسوں میں وٹم کی عموماً یہی بلکہ اس سے بھی زیادہ خراب کنڈیشن ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کو بہت احتیاط اور تدبیر سے زندگی کی طرف واپس لانا پڑتا ہے۔ مس بشری ایک پڑھی لکھی اور باشعور لڑکی ہیں اور انہوں نے گوارا عام صاحب جیسی بے باک اور باشعور ہستی کے زیر سایہ تربیت پائی ہے۔ سو آئی ہوپ کہ جلد وہ اس فرما سے نکل کر حالات کو فیس کرنے کے لائق ہو جائیں گی۔“ اس کے ساتھ چلتے ڈاکٹر نے اس کے اعصابی تیزاؤ کو محسوس کر لیا اور اس کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے تسلی دینے لگا۔ ڈاکٹر، اعجاز کا ایک مدح تھا جو اس کا پروگرام بہت شوق سے دیکھتا تھا اور باقاعدگی سے اپنی رائے بھی دیتا تھا۔ بقول اس کے بیک جزییشن میں اس نے اعجاز جیسا پینشنل کسی اور صحافی یا ایڈیٹر میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ اعجاز کے

”انہیں میں اپنے آفس میں بلواتا ہوں۔ وہاں آپ پر ایسی سی بات سے سکون سے بات کر لیجئے گا۔“ ڈاکٹر نے تجویز پیش کی جو ظاہر ہے اعجاز کو قبول کرنی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ پولیس والوں کے روبرو بیٹھا ہوا تھا۔ وہ چھوٹے رینک کے اور کم تجربہ کار بندے معلوم ہوتے تھے لیکن اتنا بہر حال انہوں نے بھانپ لیا تھا کہ یہ کوئی ہائی پرو فائل کیس ہے جس میں ان کا واسطہ عام عوام سے نہیں پڑا ہے اس لیے گردن میں وہ کلف اور لہجے میں وہ درشتی غائب تھی جسے عوام سے گفتگو کے لیے پولیس والے لازم سمجھتے تھے۔

”ابتدائی معلومات تو ہم حاصل کر چکے ہیں اور ہمیں معلوم ہوا ہے کہ زیادتی کا نشانہ بننے والی لڑکی مشہور مرحوم صفائی گزار عامم کی بیٹی ہے۔ گھڑا عامم اور ان کی اہلیہ کی اموات جن حالات میں ہوئیں، اس کے بعد ان کی بیٹی کے ساتھ ہونے والے حادثے کو عام نظر سے نہیں دیکھا جاسکتا۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا ہے کہ فی الحال مریضہ خود بیان نہیں دے سکتی اس لیے ہم آپ سے اس واقعے کے بارے میں معلومات حاصل کر کے اپنی کارروائی کو آگے بڑھانا چاہتے ہیں۔“ ان میں سے ایک نے جو اے ایس آئی تھا، مہذب انداز میں گفتگو کا آغاز کیا۔

”میرے پاس آپ کو بتانے کے لیے بہت زیادہ نہیں ہے۔ مس بشری گھڑا میری یونیورسٹی فیلو رہی ہیں۔ انہیں مجھ سے کوئی مشورہ کرنا تھا اس لیے ہمارے درمیان یہ ملے ہوا تھا کہ ہم آج شام مس بشری کے ہاسٹل میں ملاقات کریں گے۔ اتفاق سے شام کے وقت میں کچھ کاموں میں پھنس گیا اور میں نے بشری کو فیسٹ کر دیا کہ میں رات آٹھ بجے تک اس سے ملاقات کے لیے پہنچوں گا۔ تبدیل شدہ پروگرام کے مطابق جب میں وہاں پہنچا تو ہاسٹل کی مالکہ میڈم نازلی نے انعام کے ذریعے بشری کو اطلاع دینے کی کوشش کی لیکن جب کئی بار کی کوشش کے بعد بھی بشری نے کوئی رسپانس نہیں دیا تو میڈم نے ایک ملازمہ کو اس کے کمرے میں بھیجا۔ تھوڑی دیر بعد ہی ہمیں ملازمہ کی چیخیں سنائی دیں۔ میں اور میڈم نازلی دونوں گھبرا کر بشری کے کمرے کی طرف بھاگے اور وہاں ہم نے جو منظر دیکھا، اس نے ہمیں دہلا کر رکھ دیا۔ بشری کی حالت اتنی خراب تھی کہ اس وقت میں اسے ہاسٹل لانے کے سوا کچھ سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ میڈم اور اس کی ملازمہ کی مدد سے میں نے بشری کو اپنی گاڑی میں منتقل کیا اور ان لوگوں کو کسی چیز کو نہ چھونے اور

بے لاگ تبصروں اور تحقیق و ذمے دہی کے ساتھ ناظرین سے کسی خبر کو ڈسکس کرنے کی عادت کا شیدائی تھا، اس لیے عمر میں اعجاز سے بڑا ہونے کے باوجود اس سے بہت عزت و احترام سے پیش آ رہا تھا۔

”تھینک یو ڈاکٹر صاحب! آپ نے اس مشکل وقت میں میرا بڑا ساتھ دیا۔ میں کہیں اور بشری کو لے کر جاتا تو خبر لیک ہو جاتی اور جانے اسے مزید کتنی ذہنی اذیت کا سامنا کرنا پڑتا۔ انفیکٹ میں اس کی رضامندی حاصل کیے بغیر اس معاملے کو پبلک نہیں کرنا چاہتا۔ وہ اپنے ساتھ ہونے والے اس حادثے کو کس طرح جیتی ہے اور اس کا کیا ری ایکشن ہونا چاہیے، میں یہ فیصلہ اسی پر چھوڑنا چاہتا ہوں۔“ ڈاکٹر سے ممنونیت کا اظہار کرتے ہوئے اس نے اس سے اپنے خیالات کا بھی اظہار کیا۔ ڈاکٹر اس کی بات سن کر پہلے تو مل بھر کے لیے چپ ہو گیا اور پھر گھٹکھٹکھٹاتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا۔

”اچھو کلی بات یہ ہے اعجاز صاحب کہ میں ایک قانون پسند شہری ہوں اور اس بات کا شدت سے حامی ہوں کہ جو بات قانون کے دائرہ کار میں آتی ہو، اس سے قانون کے رکھوالوں کو ضرور آگاہ کیا جائے۔ آپ کی وجہ سے میں نے آپ کی پیشنت کو فوری طور پر اینڈ منٹ کر کے انہیں ٹریسٹ دینا شروع کر دی تھی اور یہ شرط نہیں رکھی تھی کہ پہلے پولیس کو اس معاملے سے آگاہ کیا جائے لیکن میرا اسٹاف میرے اصولوں کو جانتا ہے۔ ہمارے اسپتال کی طرف سے پولیس کو انفارم کر دیا گیا تھا اور میرے پاس اطلاع آئی ہے کہ پولیس کے دو اہلکار واقعے کی تفتیش کے لیے یہاں آچکے ہیں۔ فی الحال پیشنت تو اس کنڈیشن میں نہیں ہے کہ کوئی بیان دے سکے، نہ ہی میں پیشنت کی حالت اطمینان بخش ہونے سے قبل پولیس کو بیان لینے کی اجازت دوں گا لیکن ابتدائی کارروائی کے لیے وہ آپ کا بیان ضرور لیتا چاہیں گے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ اس واقعے کی خبر میڈیا پر نہ آئے تو اس سلسلے میں پولیس والوں سے بات کر سکتے ہیں۔ اپنے اسپتال کی طرف سے میں آپ کو شیورنی دے سکتا ہوں کہ یہاں سے کوئی خبر باہر نہیں نکلے گی اور مس بشری اپنے مکمل علاج تک یہاں پورے سکون اور اطمینان سے رہ سکیں گی۔“

”اوکے تو پھر چلیں، میں پولیس والوں سے مل لیتا ہوں۔ ہو سکتا ہے وہ میری بات سمجھ سکیں۔“ ڈاکٹر کی طویل وضاحت سن کر اعجاز نے ایک گہری سانس خارج کی اور پولیس والوں سے ملاقات کے لیے ہائی بھری۔

برسوں کی جان پہچان ہو، لیکن معاذ اس آواز کو پہچاننے سے قاصر تھا۔ آواز کی نرمی کے باوجود وہ آواز اسے مہربان معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اسے جواب دینے کی زحمت نہیں کی اور یونہی بیٹھا خالی خالی نظروں سے دیواروں کو گھورتا رہا۔ اتنی بات وہ سمجھ سکتا تھا کہ اس کمرے میں کہیں کوئی کیمرہ لگا ہوا ہے جس کی مدد سے اسے دیکھا جا رہا ہے اور بولنے والی کی آواز کسی خفیہ اسپیکر کے ذریعے اس تک پہنچ رہی ہے۔

”ایسی بھی کیا بے رحمی معاذ کہ تم میری بات کا جواب دینا بھی پسند نہیں کر رہے، حالانکہ تمہیں تو میرا احسان مند ہونا چاہیے کہ میری وجہ سے تم ابھی تک اس دنیا میں سانس لے رہے ہو۔ تم جانتے ہو نا کہ یزدانی اور عرفان اللہ تمہارے خون کے پیاسے ہیں اور اسی میں اپنی بھلائی سمجھتے ہیں کہ تم اس دنیا میں نہ رہو لیکن میں نے ان سے تمہاری زندگی کا سودا کر کے تمہارے زندہ رہنے کا انتظام کیا ہے۔ میں نے تمہاری زندگی خریدی ہے معاذ! اس لیے اب تم اور تمہاری یہ زندگی میری ملکیت ہے۔“

”میں نے تم سے ایسا کرنے کو نہیں کہا تھا، اس لیے مجھ پر احسان جتانے کی کوشش مت کرو۔ یہاں کوئی کسی کے لیے کچھ نہیں کرتا۔ تم نے بھی اگر میری قیمت چکائی ہے تو اس کے پیچھے تمہاری اپنی کوئی غرض ہوگی۔“ اس کے اتر اتر کر احسان جتانے پر معاذ خاموش نہ رہ سکا اور نروٹھے پن سے اسے جواب دیا۔

”ہاں... تمہاری یہی تو ادا ہے جو تمہیں دوسروں سے مختلف بناتی ہے۔ بہر حال یہ اچھی بات ہے کہ تم سمجھتے ہو کہ یہ دنیا گیوانڈ فک کے اصول پر چل رہی ہے اور اگر میں نے تمہاری زندگی بچانے کے لیے کچھ خرچ کیا ہے تو مجھے تم سے کچھ لینے کا بھی حق حاصل ہے۔“

”اس قید خانے میں بند، زخموں سے چھڑ، بے بس آدمی سے تم کیا حاصل کر سکتی ہو؟ میں تو خود اپنے لیے کچھ کرنے سے قاصر ہوں پھر بھلا تمہارے کس کام آ سکتا ہوں؟“ معاذ اس کی باتوں پر اظہارِ بیزاری کرتے ہوئے بولا۔

”تم ہمیشہ قید میں نہیں رہو گے۔ تم اس قید سے آزاد ہو سکتے ہو اور دنیا کی بے شمار نعمتوں سے لطف اندوز ہو سکتے ہو، بس اس کے لیے تمہیں صرف اتنا کرنا ہوگا کہ مجھ سے وقاداری کا عہد کر لو۔“ وہ اسے ترغیب دے رہی تھی۔

”یہ تو ایک قید سے نکل کر دوسری قید میں جانے کا معاملہ ہے۔“ معاذ کا ذہن اب پوری طرح بیدار ہو چکا تھا

بشری کا کمر بند کر دینے کی ہدایت کر کے بشری کو اسپتال لے آیا۔ ہاں ایک بات اور..... جب میں بشری کو اسپتال لارہا تھا تو میڈم نازلی نے مجھے بتایا تھا کہ شام کے وقت کوئی شخص بشری سے ملنے آیا تھا۔ بشری نے میڈم کو ہدایت کر رکھی تھی کہ شام کے وقت اس سے ملنے جو شخص آئے اسے اوپر اس کے کمرے میں بھیج دیا جائے، سو میڈم نے ایسا ہی کیا۔ وہ شخص کون تھا اور باقی کی تفصیلات تو بشری ہی ہوش میں آنے کے بعد ہمیں بتا سکتی ہے۔ ابتدائی میڈیکل رپورٹ کے مطابق بشری نے اعصاب کو سکون دینے والی ایک میڈیسن لی ہوئی تھی اور اس کے علاوہ بھی اسے کوئی بے ہوشی کی دوا سونگھائی گئی تھی۔ بشری کی ہاڈی سے ڈی این اے کے نمونے بھی ڈاکٹر صاحب نے اٹھا کر محفوظ کر لیے ہیں۔ اب باقی آپ پر ہے کہ آپ اس کیس کو کیسے آگے چلاتے ہیں۔ میری فی الحال آپ سے اتنی درخواست ہے کہ اس خبر کو میڈیا پر نہ جانے دیں اور مس بشری کے بیان کا انتظار کریں۔“

اعجاز نے اس کے سوال جواب کے سلسلے سے بچنے کے لیے خود ہی تفصیل سے ہر بات بتادی، پھر بھی اس نے اس سے چند سوال کیے اور ڈاکٹر سے بھی کچھ معلومات حاصل کیں۔ اعجاز نے اس دوران ایک اہم کام یہ کیا کہ پولیس کے ایک اعلیٰ عہدے دار سے رابطہ کر کے آنے والے پولیس والوں کو یہ احکامات دلوادے کہ فی الحال اس کیس کو پبلک کے سامنے نہ لایا جائے اور باقی کی کارروائی خاموشی اور مستعدی سے انجام دی جائے۔ اوپر سے ملنے والے ان احکامات کے بعد پولیس والے پوری طرح تعاون کے لیے آمادہ نظر آنے لگے اور بہت مودب انداز میں اعجاز اور ڈاکٹر سے ہاتھ ملا کر وہاں سے رخصت ہو گئے۔

☆☆☆

ستاروں کی حسین دنیا کے چادوئی سفر سے لوٹنے کے بعد وہ اجنبی نظروں سے اس مستطیل کمرے کو دیکھ رہا تھا جہاں ایک نسوانی آواز اسے واپس سمجھنے لائی تھی لیکن کمرے میں اس پکارنے والی کا کوئی نام و نشان موجود نہیں تھا۔

”پریشان مت ہو معاذ! بے شک تم مجھے نہیں دیکھ سکتے ہو لیکن میں تمہارے بہت قریب ہوں اور تمہیں اچھی طرح دیکھ رہی ہوں۔ مجھے تمہاری حالت دیکھ کر شدید افسوس ہو رہا ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اتنے بے وقوف اور جذباتی انسان ہو گے کہ چند سوالوں کے جواب دینے کے بجائے خود کو اس حال تک پہنچا لو گے۔“ وہ یوں بے تکلفی سے معاذ سے مخاطب تھی جیسے ان کے درمیان

جاسوس ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ،
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

پاکستان

میں کچھ عرصے سے

مختلف مقامات سے یہ شکایت موصول ہو
رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں
قارئین کو اس سال پہ پرچہ نہیں ملتا اس
سلسلے میں ادارے کے پاس دو تجاویز ہیں۔

آپ اپنے قریبی دکان دار کو ایڈوانس

100 روپے

ادا کر کے اپنا پرچہ بک کروائیں۔

یا

ادارے کو 1500 روپے

بھیج کر سالانہ خریدار اور

750 روپے ادا کر کے 6 ماہ

کے لیے بھی خریدار بن سکتے ہیں

اور گھر بیٹھے پورے سال اپنے

پسندیدہ ڈائجسٹ وصول کر سکتے ہیں

جاسوس ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ،
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ستمبر 2020ء

73

سسپنس ڈائجسٹ

اور وہ اس سودے بازی کا مقصد سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے
کہہ رہا تھا۔ ”میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ایک اجنبی خاتون کو
میری زندگی سے اتنی دلچسپی کیوں ہے۔ میں ایک عام سا
انسان ہوں جس کے پاس کوئی بھی ایسی غیر معمولی چیز موجود
نہیں ہے جس کے لیے کوئی اس پر اس حد تک مہربان
ہو جائے۔“

”تم خود غیر معمولی ہو معاذ! اور پلیز تم میرے اس
دعوے کو جھٹلاتا نہیں۔ میں انسانوں کی پرکھ بھی رہتی ہوں
اور تمہارے بارے میں بہت سی باتوں کا مجھے علم بھی ہے،
اس لیے مجھے اپنے دعوے میں کوئی شک نہیں ہے۔ مجھے اپنی
پرکھ پر اتنا بھروسہ ہے کہ جب تمہارے گھر والے اور قریبی
دوست بھی تمہاری زندگی کی طرف سے شک و شبہ میں مبتلا
تھے تو مجھے یقین تھا کہ تم اس دنیا میں کہیں زندہ سلامت
موجود ہو اور دیکھو میرا یقین سچ ثابت ہوا۔“ وہ پتا نہیں کون
تھی جسے معاذ اس کی آواز سے قطعی شناخت نہیں کر پا رہا تھا۔
اسے اپنی یادداشت پر بھروسہ تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ اگر اس
نے بھی اس آواز کو سنا ہوتا تو ضرور اسے پہچان لیتا لیکن وہ
قطعی اسے پہچاننے سے قاصر تھا۔

”تم مجھ سے کیا کام لینا چاہتی ہو؟“ اس بار معاذ نے
باجرہ اور کمری باتوں میں الجھنے کے بجائے اس سے اس کی
غرض جاننے کی کوشش کی۔

”کام بھی پتا چل جائے گا۔ پہلے تمہاری حالت تو
بہتر ہو جائے۔ عرفان اللہ نے جو ایک وحشی درندہ پال رکھا
ہے، وہ تم جیسوں کا بھی لحاظ نہیں کرتا۔ بہر حال اب یہ عرفان
اللہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ تمہارا علاج کروائے۔ علاج
کے بعد میں تمہیں اپنے پاس شفٹ کروالوں گی اور یہ یقین
ہو جانے کے بعد کہ تم مجھے دھوکا نہیں دو گے، تمہیں تمہارا کام
بھی بتا دوں گی۔“ وہ یوں اس سے مخاطب تھی جیسے ہر بات
پہلے سے طے کر چکی ہو اور اسے یقین ہو کہ سب کچھ ویسے ہی
ہوگا، جیسا وہ چاہتی ہے۔

”تم کون ہو؟“ وہ سوال جو شاید سب سے پہلے کیا
جانا چاہیے تھا، اب معاذ کے ہونٹوں سے پھسلا لیکن جواب
میں دوسری طرف خاموشی چھائی رہی۔

”ہیلو..... کہاں ہو تم؟ میری بات کا جواب کیوں
نہیں دے رہی ہو؟“ معاذ نے بے چینی سے اسے پکارا لیکن
اب بھی اسے خاموشی سے واسطہ پڑا۔ شاید وہ اپنی کہنے کے
بعد جا چکی تھی اور اسے معاذ کے کسی سوال سے کوئی دلچسپی نہیں
تھی۔ معاذ نے دو تین بار مزید اسے پکارنے کی کوشش کی

مہربانی فرما کر بلیشرز کی حوصلہ کے لیے خرید کر پڑھیے۔

لیکن مسلسل ناکامی کے بعد ہار مان کر چپ ہو گیا۔ خاموش ہو کر لیٹے اسے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ کمرے کا واحد دروازہ کھلا اور دو افراد اندر داخل ہوئے۔ ان دونوں میں سے ایک کے ہاتھ میں بڑی سی ٹرے اور دوسرے کے ہاتھ میں خطرناک گن نظر آرہی تھی۔ گن والے نے دروازہ بند کیا اور کمرے کے ایک گوشے میں اس زاویے سے کھڑا ہو گیا کہ معاذ پر پوری طرح نگاہ رکھ سکے۔ ٹرے والا البتہ معاذ کے قریب آگیا اور ٹرے زمین پر رکھ دی۔ معاذ نے دیکھا کہ ٹرے میں میڈیکل باکس، گرم پانی اور مرہم پٹی سے متعلق دوسرا سامان رکھا ہوا ہے۔

”میں تمہارے زخموں کے علاج کے لیے آیا ہوں۔ اگر تم نے تعاون کیا تو فائدہ میں رہو گے ورنہ اپنی جان سے چلے جاؤ گے۔ بولو تم کیا چاہتے ہو؟“ ٹرے والا بظاہر نہتا نظر آ رہا تھا لیکن معاذ کو یقین تھا کہ اس نے اپنے لباس میں ہتھیار چھپا رکھا ہے جسے وہ بوقت ضرورت فوراً نکال سکتا ہے۔ ادھر خود اس کا یہ حال تھا کہ زخم زخم جسم کو حرکت دینے میں بھی مشکل پیش آرہی تھی۔ ایسے میں اگر وہ اس شخص پر ہاتھ ڈالنا تو کامیابی کے بجائے موت سے ہلکنار ہونے کے زیادہ امکانات تھے، اس لیے آہستہ سے اثبات میں سر ہلا کر اس شخص کو اس کی بات سمجھ جانے کا عندیہ دیا اور یوں سر جھکا لیا جیسے مکمل طور پر اپنی ہار تسلیم کر چکا ہو۔ اس کے اس طرز عمل کے جواب میں وہ شخص حرکت میں آگیا اور بڑی مہارت سے اس کے زخموں کو صاف کر کے ان پر مرہم لگانے لگا۔ کچھ گہرے زخموں پر میڈیکل شیپ لگانے کے بعد اس نے زیادہ تر زخموں کو یوگی کھلا چھوڑ دیا اور بتایا کہ کھلا رکھنے سے یہ زخم زیادہ جلدی ٹھیک ہو جائیں گے۔ مرہم پٹی کے کام سے فارغ ہو کر وہ ٹرے سمیت کمرے سے باہر چلا گیا لیکن اس شخص ہنوز اسی حالت میں اس پر گن تانے اپنی جگہ موجود رہا۔ چند منٹ کے وقفے کے بعد باہر جانے والا واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک اور ٹرے موجود تھی جو سائر میں نسبتاً چھوٹی تھی۔

”اسے کھالو۔“ ٹرے معاذ کے سامنے رکھتے ہوئے اس نے اسے حکم دیا۔ ٹرے میں ایک درمیانے سائز کے پیالے میں کوئی سوپ نما شے موجود تھی جس میں یونیوں اور سبز یوں کے ٹکڑے تیرتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ خالی پیٹ، نقابہ زدہ معاذ کے نتھنوں سے اشتہا انگیز خوشبو کھراکی تو وہ اپنے ہاتھوں کو نہ روک سکا اور پیچھے کی مدد سے اس سوپ نما ڈش کو کھانے لگا۔ کھانے میں بھی وہ ڈش خوش

ذائقہ تھی۔ معاذ منٹوں میں پورا پیالا خالی کر گیا لیکن ابھی بھوک باقی تھی۔

”فی الحال تمہارے لیے اتنی غذا کافی ہے۔ تم یہ دوا میں کھاؤ اور سو جاؤ۔ صبح تک تمہاری حالت کافی بہتر ہو جائے گی پھر میں تمہارے لیے بھرپور ناشائے کراؤں گا۔“ اس شخص نے معاذ کی کیفیت سے بھانپ لیا کہ اسے مزید غذا کی طلب ہے اس لیے نرمی سے سمجھانے والے انداز میں بولا اور سوپ کے پیالے کے ساتھ ہی رکھی ہوئی گولیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ان گولیوں میں زخم خشک کرنے والے اینٹی بائیوٹک کپسول بھی شامل تھے۔ معاذ نے پانی کی مدد سے وہ گولیاں حلق سے نیچے اتار لیں تو وہ شخص ٹرے اٹھا کر باہر چلا گیا۔ اس کا گن بردار سامی بھی اس کے پیچھے ہی تھا۔ معاذ کچھ دیر اپنی جگہ چپ چاپ لیٹا اس کا یا پلٹ پر غور کرتا رہا، پھر اسے نیند آنے لگی تو ہر سوچ کو ذہن سے جھٹک کر سونے کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ ذرا دیر میں ہی اسے نیند آگئی۔ سوتے ہوئے ڈھالی تین گھنٹے ہی گزرے ہوں گے کہ ایک عجیب سے احساس نے اسے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا اور وہ گھبرا کر اپنی جگہ سے اٹھ بیٹھا۔ اسے نیند میں ایسا لگا تھا کہ کوئی اس پر سنگ باری کر رہا ہے۔ وہ اٹھ کر بیٹھا تھا کہ اس کے شانے پر ایک اور پتھر آکر لگا۔ اس بار اس نے سمت کا تعین کر لیا اور سر اٹھا کر اس چھوٹے سے روشن دان کی طرف دیکھا جو اس قید خانے میں باہر کی دنیا سے اس کا واحد رابطہ تھا۔ کمرے میں جلتی مدھم روشنی روشن دان تک پہنچنے سے قاصر تھی اور اسے وہاں صرف ایک سیاہ ہولناکی نظر آ رہا تھا۔

”کیا قیامت کے یار بے سمیت کر سوتے تھے۔ ذرا ہوش میں آ جاؤ۔ میں مین سوچ آف کر رہا ہوں، پھر تمہیں یہاں سے نکالنے اندر آؤں گا۔ تم تیار رہو۔“ روشن دان سے جھانکتے شخص نے سرگوشی نما آواز میں اس سے کہا اور غائب ہو گیا۔ معاذ حیران تھا کہ یہ شخص یہاں پر کیسے آگیا؟ لیکن اس سوال کے جواب سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ وہ اسے یہاں سے نکالنے کی بات کر رہا تھا۔ معاذ کے اندر یکا یک ایک نیا جوش اور جذبہ پیدا ہو گیا اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے کے قریب پہنچ گیا۔ مزید تیاری اسے کیا کرنی تھی۔ اس کے پاس تو لباس بھی موجود نہیں تھا اور وہ جسم پر موجود واحد جاکیٹے میں ہی وہاں سے نکلنے کے لیے تیار تھا۔ ایک ڈیڑھ منٹ کے اندر ہی کمرے میں جلتی واحد روشنی بھی بند ہو گئی اور اسے باہر سے مدھم آوازیں سنائی

ستمبر 2020ء

سینسپنس ڈائجسٹ

مہر بانی فرما کر بلیشرز کی حوصلہ کے لیے خرید کر پڑھیے۔

بچے پہنچا۔ کوٹھی کے پورٹیکو میں گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ اس شخص نے معاذ کو گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود دوڑ کر گیٹ تک گیا۔ گیٹ کے دونوں پٹ وا کرنے کے بعد وہ دوڑتا ہوا واپس گاڑی تک آیا اور دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ معاذ نے دیکھ لیا کہ گاڑی اسٹارٹ کرنے کے لیے اس نے چابی کے استعمال کے بجائے اپنی کارگری سے کام لیا تھا۔ گاڑی اسٹارٹ ہوئی اور تیر کی طرح کھلے گیٹ سے باہر نکلتی چلی گئی۔ گاڑی کی رفتار بہت زیادہ تھی اور انہوں نے بہت جلد اس علاقے کو پیچھے چھوڑ دیا تھا، جہاں سے فرار ہوئے تھے۔

”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“ آخر کار معاذ نے اس سے سوال کر ڈالا۔

”آپ بتائیں کہ آپ کہاں جانا چاہتے ہیں؟ میں آپ کو وہیں چھوڑ دیتا ہوں۔“ اس نے کسی جگہ کا نام لینے کے بجائے الٹا معاذ سے استفسار کیا تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔ وہ اپنے شہر میں تھا۔ یہاں سے اس کا گھر بہت دور نہیں تھا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ کیا اس کا اپنے گھر جانا مناسب ہوتا؟ اسے قید کرنے والے اس کے گھر سے ناواقف تو نہیں تھے۔ اس کے فرار کا علم ہوتے ہی شاید وہ سب سے پہلے اس کے گھر پر دھاوا بولتے۔ گھر کے علاوہ جو دوسری جگہ اس کے ذہن میں آئی، وہ پولیس اسٹیشن تھی۔ وہ وہاں جا کر وہاں دے سکتا تھا اور جو خود پر گزری، اسے بتا سکتا تھا لیکن ایسی دنیا میں جہاں طاقت اور دولت کی حکمرانی تھی، اس جیسے عام شہری کو تحفظ اور انصاف دلوانے کے لیے پولیس کے چھے میں کتنے لوگ بیٹھے تھے۔ ذہن میں آتے یہ خیالات اسے احساس دلارہے تھے کہ وہ آزاد ہو جانے کے باوجود مکمل طور پر آزاد نہیں ہے اور اس احساس کی وجہ سے وہ کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر تھا۔

”فی الحال میں آپ کو اپنے ساتھ اپنے ٹھکانے پر لے چلتا ہوں۔ رات بہت ہو گئی ہے، آپ وہاں کچھ دیر آرام کر کے صبح اطمینان سے فیصلہ کیجیے گا کہ آپ کو کہاں جانا ہے۔“ اس کی مسلسل خاموشی نے اس کے ہمدرد کو بتا دیا کہ وہ تشویش کا شکار ہے اس لیے خود ہی فیصلہ سنا دیا۔ معاذ اس کے فیصلے سے اختلاف نہ کر سکا۔ کچھ دیر بعد وہ لوگ ایک ایسی بلڈنگ کے احاطے میں موجود تھے جس میں بے شمار برسوں پرانے چھوٹے بڑے فلینس موجود تھے۔ بڑے سے احاطے میں صرف ایک بلب روشن تھا جس کی روشنی پورے احاطے کو روشن کرنے میں بری طرح ناکام تھی، بس

دیسے لگیں۔ یہ اچانک بجلی غائب ہو جانے کا رد عمل تھا۔ معاذ دھڑکتے دل کے ساتھ آگے کی پیش رفت کا انتظار کرنے لگا۔ وہ اپنے طور پر دروازے کو کھولنے کی کوشش کر کے دیکھ چکا تھا لیکن دروازہ مقفل تھا اور اپنی جگہ سے اس سے مس بھی نہیں ہوا تھا۔ اس نے دروازے کے قفل میں چابی گھومنے کی آواز سنی تو پوری طرح چو کتا ہو گیا۔

”باہر آ جاؤ دوست!“ ایک لمحے کے بعد ہی دروازہ کھلا اور کسی نے اسے سرگوشی میں پکارا۔ وہ فوراً ہی باہر نکل گیا۔ آنے والے نے اس کا ہاتھ تھاما اور دروازے کو دوبارہ بند کر کے ایک طرف بھاگنے لگا۔ اس نے شاید ہیروں میں برسوں کے جوتے پہن رکھے تھے جو اس کے بھاگنے سے بالکل بھی آواز پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ معاذ تو تھا ہی نیچے جبر، اس لیے اس کے قدم بھی بے آواز تھے لیکن زخموں کی وجہ سے وہ بھاگنے میں مشکل محسوس کر رہا تھا۔ آنے والے نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے نہ تھام رکھا ہوتا اور آزادی کی شدید خواہش اس کے اندر نہ جاگ رہی ہوتی تو شاید یوں بھاگنا ممکن بھی نہ ہوتا۔ بھاگتے ہوئے اسے کچھ آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ وہ یقیناً عرفان اللہ کے ہمک خوار تھے جو پہلے اچانک بجلی بند ہونے کی وجہ سے الجھن میں مبتلا ہوئے تھے اور اب اس بات پر جھنجھلا رہے تھے کہ جزیئر کیوں نہیں آن ہو رہا۔ ان میں سے کچھ نے اپنے موبائلوں وغیرہ کی ٹارپس بھی روشن کر لی تھیں لیکن معاذ اور اس کا ہمدرد ان کی روشنی کے دائرے میں آنے سے محفوظ رہے تھے۔ یوں بھی وہ ہمدردی راستے کی طرف جانے کے بجائے بالائی منزل پر جانے والے زینے کی طرف جا رہے تھے۔ اوپر چھت پر پہنچ کر اس کے ہمدرد نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

”بائیں طرف کی کوٹھی کی چھت پر کودنا ہے۔“ اور معاذ کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ کود بھی گیا۔ معاذ کو بھی اس کی تقلید کرنا پڑی۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا لیکن زخموں کی وجہ سے کودنے کے نتیجے میں اسے تکلیف محسوس ہوئی۔

”رکتا نہیں ہے۔ یہاں سے نیچے جا کر ہم گاڑی میں باہر نکلیں گے۔“ اس شخص نے ایک بار پھر اس کے کان میں سرگوشی کی۔ اس وقت ہر جگہ اندھیرا پھیلا ہوا تھا اور لگ رہا تھا کہ پھر سے علاقے کی بجلی غائب ہے۔ معاذ تاروں کی روشنی میں اپنے ہمدرد کا صرب ہولا ہی دیکھ پارہا تھا لیکن اسے شناخت بہ حال کر چکا تھا۔ اس بار بھی اس نے خاموشی سے اس ہمدرد کی ہدایت پر عمل کیا اور اس کے ساتھ چلتا ہوا

ہیولوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہاں کئی سوڑ سائیکلیں اور چند کاریں پارک ہیں۔ معاذ جس نامناسب جگہ میں تھا، اسے احاطے کی ناکافی روشنی اپنے حق میں مناسب معلوم ہوئی اور وہ اپنے ہمدرد کی راہنمائی میں چلتا ہوا دوسرے بلاک کی سیزھیاں چڑھنے لگا۔ سیزھیوں پر احاطے سے بھی کم روشنی تھی اور بصارت سے زیادہ اندازے سے کام لے کر ان سیزھیوں کو طے کرنا پڑ رہا تھا۔ تیسری منزل پر پہنچ کر سیزھیاں چڑھنے کا عمل رک سکا۔ زخم زخم وجود کے ساتھ اتنی سیزھیاں چڑھتا معمولی بات نہیں تھی لیکن معاذ اپنی قوت ارادی کے سہارے چڑھ ہی گیا۔ اس کے صحن نے اپنی جیب سے چابی نکال کر ایک فلیٹ کا تالا کھولا اور وہ دونوں اندر داخل ہو گئے۔ اندر پہنچ کر جیسے ہی روشنی ہوئی، معاذ لاونچ میں رکھے ایک صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔

”پانی پی لیں۔“ ایک منٹ بعد ہی اس نے معاذ کو پکار کر اس سے کہا تو اس نے اس کے ہاتھ سے پانی کا گلاس جھپٹ لیا اور ایک ہی سانس میں غٹاٹ خالی کر گیا۔ اپنی خراب جسمانی حالت کے ساتھ اس نے جتنی محنت کی تھی، اس نے اس کی ساری طاقت ٹھوڑ ڈالی تھی اور اب وہ بری طرح نڈھال ہو رہا تھا۔ اس کو پانی کا گلاس پیش کرنے والے نے اسے تاسف سے دیکھا اور بغیر کچھ کہے خاموشی سے مڑ گیا۔ دوبارہ وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ہلدی طے نیم گرم دودھ کا گلاس تھا۔

”یہ دودھ پی لیں۔ آپ کی طبیعت تھوڑی بہتر ہو جائے گی۔“ اس کے دل میں پیدا ہونے والی ہمدردی اس کے بچے سے بھی جھلک رہی تھی۔

”کیوں کر رہے ہو تم میرے لیے اتنی تکلیف؟“ معاذ نے اس کے ہاتھ سے دودھ کا گلاس لے کر ایک ہی سانس میں خالی کر دیا اور پھر بوجھل لہجے میں اس سے دریافت کرنے لگا۔

”انسانی ہمدردی کے ناتے۔“ اس نے مختصر جواب دیا اور معاذ کو مزید کچھ بولنے کے لیے لب کھولتے دیکھ کر ہاتھ کے اشارے سے اسے روکتے ہوئے بولا۔

”رات کا بہت تھوڑا حصہ باقی رہ گیا ہے۔ بہتر ہے آپ کچھ دیر سو جائیں۔ مجھے ابھی اس کار سے نجات حاصل کرنی ہے، جس میں ہم یہاں تک آئے ہیں۔ باتیں ہم صبح آرام سے کر سکتے ہیں۔“ معاذ کو اس کی بات ماننا پڑی کہ اس کی طبیعت کا بوجھل پن بڑھتا جا رہا تھا اور پلکیں نیند کے دباؤ کی وجہ سے خود بہ خود بند ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ جس

صوفے پر بیٹھا تھا، وہ خاصا آرام دہ تھا چنانچہ اسی پر لڑھک گیا اور لمحوں میں خراٹے لینے لگا۔ دوبارہ اس کی آنکھ کھلی تو دن خاصا چڑھا آیا تھا اور اپنی طبیعت کی بشارت سے اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس نے اچھی خاصی نیند لے لی ہے۔ طبیعت کی بہتری کے ساتھ ہی اسے بیک وقت بھوک اور مٹانے پر دباؤ کا احساس بھی ستا رہا تھا۔ اس سے قبل کہ وہ ہاتھ روم کی تلاش میں کھڑا ہوتا، لاونچ کے ایک کونے پر موجود دروازہ کھلا اور اس سے وہ نکھر نکھر اس بار آمد ہوا۔

”آپ اٹھ گئے۔ ایسا کریں جلدی سے فریش ہو جائیں۔ اتنے میں، میں آپ کے اور اپنے لیے ناشتا بناتا ہوں۔“ معاذ کو جاگتے دیکھ کر اس نے اس کی طرف ایک دوستانہ مسکراہٹ اچھالی اور ایسے لہجے میں بولا جیسے وہ ایک دوسرے کے برسوں کے شناسا ہوں۔ معاذ کے پاس اس کی ہدایات پر عمل کرنے کے علاوہ کوئی چوائس نہیں تھی، چنانچہ خاموشی سے اٹھ کر اس اٹیچڈ ہاتھ میں داخل ہو گیا جہاں سے وہ شخص برآمد ہوا تھا۔ غسل کرنے سے اس کی طبیعت پر اچھا اثر پڑا تھا لیکن ساتھ ہی زخموں کی فکر ہو گئی تھی کہ کہیں پانی کی وجہ سے خراب نہ ہو جائیں۔ دوسرا مسئلہ لباس کا تھا۔ نہ تو وہ لیا تھا لیکن اس کے پاس پہننے کے لیے لباس نہیں تھا۔ یہ مسئلہ اس طرح حل ہوا کہ دروازے پر دستک دے کر اسے ایک دوسرا جاگتیا تھما دیا گیا۔ وہ جاگتیا پہن کر باہر آیا تو وہ اسی دوستانہ انداز میں اس کے استقبال کے لیے تیار کھڑا تھا۔

”مجھے اندازہ ہے کہ آپ کو بھوک لگ رہی ہوگی لیکن پہلے آپ کے زخموں کی ڈریسنگ ضروری ہے۔ یہ کام ہو جائے تو ہم اطمینان سے ناشتا کریں گے۔“ اس نے معاذ سے کہا اور اسے صوفے پر لیٹنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود حرکت میں آ گیا۔ مرہم پٹی سے متعلق سارا ضروری سامان اس کے پاس موجود تھا اور وہ بڑی مہارت سے معاذ کے ہر زخم کی ڈریسنگ کر رہا تھا۔

”یہ کام تو ہو گیا۔ اب ناشتا کرتے ہیں، پھر میں آپ کو دوایں دوں گا۔“ اپنے کام سے فارغ ہو کر اس نے سارا سامان سمیٹا اور ہاتھ دھو کر ناشتا صوفے کے ساتھ رکھی میز پر سجانے لگا۔ ہاٹ پاٹ میں رکھے گرم پراٹھے، مہارت سے تیار کردہ آلیٹ اور چائے کی بھری کیتلی پر مشتمل ناشتا معاذ کو اپنے گھر کی یاد دلا گیا۔ کتنے سارے دن گزر گئے تھے اسے اپنے پیاروں کی صورت دیکھے اور اپنی ماں کے ہاتھ کا بنانا یاد آ گیا۔

”ایسا ناشتا صرف مائیں بناتی ہیں یا مجھ جیسے باہت

سنہریے اقوال

- ☆ انسان علم کو دیکھتا ہے جب کہ علم انسان کو سکھاتا ہے۔
- ☆ علم اور عمل کا رشتہ ایسا ہے جیسے جسم اور روح کا۔
- ☆ اللہ تعالیٰ انسان کو اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں دیتا۔
- ☆ نہ کسی کا حق کھاؤ نہ کسی کو اپنا حق کھانے دو۔
- ☆ اولاد کی والدین سے محبت کا امتحان والدین کی بیماری، بڑھاپے اور اولاد کی شادی کے بعد ہوتا ہے۔
- ☆ کسی کے ساتھ اچھائی یا برائی کرنا دراصل اپنے ساتھ اچھائی یا برائی کرنا ہے۔
- ☆ اگر بیٹے ہوئے وقت کے تاثرات سدا ذہن پر روز اول کی طرح ثبت رہیں تو دوست بھی دشمن نہ بننے اور دشمن بھی دوست نہ بننے۔
- ☆ دیکھنی والی نگاہ حسین ہے تو ہر چہرہ حسین نظر آتا ہے۔
- ☆ انسان کے دو شیر اس کے دل اور دماغ ہیں۔
- ☆ دوست کی محبت کی پرکھ اس کے غصے کے وقت ہوتی ہے۔
- ☆ ہر شہر پر گاؤں میں ایک نہ ایک قلعہ ضرور موجود ہوتا ہے۔
- ☆ گالی تو جاہلوں کی زبان ہے۔
- ☆ شیطان کے بعد انسان کا دوسرا بڑا دشمن اس کا نفس ہے۔
- ☆ ضرورت سے زیادہ کھانا بھی نفس کی سرکشی کی دلیل ہے۔
- ☆ جس کا کوئی نہ ہو اس کا اللہ تعالیٰ ہوتا ہے۔

مرسلہ: ریحان فاروق، اوکاڑہ

جو ماں کے بغیر زندگی گزارنے کا ہنر سیکھ لیتے ہیں۔" معاذ کو رغبت سے کھانا دیکھ کر اس نے مسکرا کر خود ہی اپنی تعریف کی۔ معاذ جواب میں خاموش رہا۔ وہ جاگنے کے بعد سے مسلسل خاموش ہی تھا اور انتظار کر رہا تھا کہ یہ بندہ خود اسے کچھ بتا دے لیکن بندے کے پاس بھی جیسے اس کی خدمت گاری کے علاوہ کوئی کام نہیں تھا۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد اس نے معاذ کو چند گولیاں کھانے کے لیے دیں اور پھر اپنے اور اس کے لیے مزید ایک ایک کپ چائے نکال کر اس کے مقابلے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"سواب ہم آپس میں بات کرتے ہیں اور میں آپ کو آپ کے ذہن میں موجود سارے سوالوں کے جواب دینے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس کے بعد آپ مجھے اپنا پروگرام بتائیے گا۔ میں دیکھوں گا کہ میں کس حد تک آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔" حسب توقع اس نے خود ہی گفتگو کا سلسلہ شروع کر دیا اور ہونٹوں پر ایک شریری مسکراہٹ لاتے ہوئے بولا۔

"نام سے تو آپ میرے واقف ہی ہیں کہ مجھے دقاس کہتے ہیں لیکن دوستوں اور چاہنے والوں کے حلقے میں، میں عام طور پر وہی کہلاتا ہوں۔ میرے قریبی لوگوں کا خیال ہے کہ میں ایک سر پھراڑ کا ہوں جو کبھی بھی کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اس آسب زدہ سی حویلی کے باغ سے ناریل توڑ کر لے جانے کی عادت کو بھی آپ میری اس فطرت کا نتیجہ ہی سمجھیے۔ اپنی اس عادت کی وجہ سے مجھے اچھا خاصا نقصان اٹھانا پڑا ہے اور ہنوز میں اپنی موٹر سائیکل سے محروم ہوں۔ خیر! موٹر سائیکل تو واپس آ جائے گی لیکن پہلے میں آپ کو آپ تک پہنچنے کی داستان سنا دوں۔ میں اپنی پھرتی کی وجہ سے آپ کو جمل دے کر نکلنے میں تو کامیاب ہو گیا تھا لیکن مسئلہ سواری کا تھا، میں اتنا لمبا راستہ پیدل چل کر آبادی تک پہنچنے کے موڑ میں نہیں تھا۔ چنانچہ وہیں ایک درخت پر چڑھ کر چھپ گیا اور مناسب موقع کا انتظار کرنے لگا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے آپ کے ان لوگوں کے ہاتھوں پکڑے جانے کا منظر دیکھا اور اپنی طبیعت کے جھجس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اصل مسئلہ جاننے کے چکر میں پڑ گیا۔ اب یہ الگ داستان ہے کہ میں کیسے آپ کے ساتھ ساتھ حرکت کرتا رہا اور ہر اس ٹھکانے کو دیکھ لیا جہاں انہوں نے آپ کو منتقل کیا۔ ایک بات میں آپ کو بتا دوں کہ میں ابتدا ہی میں آپ کی شکل دیکھ کر چونک گیا تھا اور مجھے ایسا لگا تھا کہ میں آپ کو جانتا ہوں لیکن کیونکہ آپ کی شکل کافی

اسے پبلک کے سامنے لانا ہے۔" وہ مشکل حالات سے گزر کر آیا تھا اور بدترین جسمانی تشدد سہا تھا، اس لیے پوری طرح خود کو کمپوز نہیں کر سکا تھا اور اس لڑکے سے مشورہ مانگ رہا تھا جو عمر میں اس سے بھی چھوٹا تھا اور جیسے وہ صحت سے جانتا بھی نہیں تھا۔

"مجھے ان باتوں کا اندازہ تھا اس لیے آپ کے سونے کے دوران میں نے تھوڑی سی کوشش کی تھی کچھ معلومات حاصل کرنے کی۔" وقاص عرف دکی اس کی بات کے جواب میں بولا اور پھر کچھ دیر کے لیے ایسے انداز میں توقف کیا جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔ آخر اس نے اپنی بات کہہ دینے کا فیصلہ کر ڈالا اور بولا۔

"میری معلومات کے مطابق یہاں رہتے ہوئے آپ کی فیملی دباؤ کا شکار تھی اور آپ کے والد کو آپ کے سننے میں آواز اٹھانے پر دھمکیاں دی جا رہی تھیں۔ اس صورت حال کی وجہ سے آپ کے کچھ عزیز اسرار کر کے آپ کی فیملی کو اپنے ساتھ لاہور لے گئے ہیں اور آپ کا رہائشی مکان فی الحال خالی پڑا ہے۔ رہی پبلک تک بات پہنچانے کی بات تو اس کے لیے ہمیں ذرا احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ یہاں پولیس والوں سے لے کر صحافیوں تک کسی پر بھی حمل بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ میں کوشش کروں گا کہ کچھ ایسے لوگوں تک رسائی حاصل کر سکوں جو آپ کے معاملے کو دیانت داری سے اٹھا سکیں۔ اتنے عرصے تک آپ یہاں رہیں۔ اپنے کھانے پینے اور علاج پر توجہ دیں۔ میں نے اپنے طور پر آپ کو اچھی میڈیکل ایڈ دے دی ہے پھر بھی کوشش کروں گا کہ کسی پروفیشنل سے بھی اس سلسلے میں مشورہ ہو جائے۔"

معاذ کو حالات سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ وہ ایسی باتیں بھی کر رہا تھا جو اس کی نسلی و قسطنطنیہ کا سبب بن سکیں۔ معاذ کی نسلی ہو سکی یا نہیں، بہر حال اس نے خاموشی اختیار کر لی اور دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر بیٹھ گیا۔

☆☆☆

وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں جلا تھا اور اس کے ساتھ اس کے سارے پیارے بھی اسی کشمکش سے گزر رہے تھے۔ صداقت شاہ کی ہستی طوفانوں کی زد میں تھی۔ ان کا اکلوتا جوان لختہ جگر اسپتال کے بستر پر لیٹا تھا تو خود ان کے لیے اپنے پیروں پر کچھ اربنا مشکل ہو رہا تھا۔ انہیں روہ روہ کر اس کی آنکھوں کی وہ ٹھنکی اور شکایت یاد آتی تھی جو ان کے چہرے مارنے پر پیدا ہوتی تھی۔ وہ ان کی بے اعتنائی پر ان

تہدیل ہو گئی ہے، تو میں فوری طور پر آپ کو پہچان نہیں سکا تھا۔ بعد میں یاد آیا کہ آپ تو وہی یونیورسٹی اسٹوڈنٹ معاذ ہیں جو کیرتھر کے ٹرپ پر پر اسرار طور پر غائب ہو گئے تھے اور آپ کے دوستوں نے کافی دنوں تک آپ کی بازیابی کے لیے مہم چلائی تھی۔ اس مہم کے دوران ہی آپ کی تصویریں میری نظروں میں آئی تھیں اور ذرا دیر سے ہی سہی، میں آپ کو پہچان گیا تھا۔ پہچاننے کے بعد میرے دماغ کا کیڑا اگلایا اور میں نے خدائی فوجدار بن کر اس معاملے میں ٹانگ اڑانے کا فیصلہ کر لیا۔ اللہ نے مجھے کچھ صلاحیتیں دے رکھی ہیں اور میں چند ہنر جانتا ہوں اس لیے میرے لیے اس عمارت تک رسائی زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوئی جہاں سے میں آپ کو فرار کرا لایا۔ اس کام میں، میرے ایک ساتھی نے بھی میری مدد کی تھی اور میری ہدایت پر اس پورے علاقے کی لائنٹ اڑا دی گئی تھی۔ آپ کو قید میں رکھنے والوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ کوئی آپ کو ان کی قید سے چھڑوانے کے لیے آسکتا ہے، اس لیے انہوں نے زیادہ مضبوط حفاظتی اقدامات نہیں کیے تھے۔ پڑوس کی کوٹھی میں رہنے والے ادویہ عمر جوڑے کو البتہ ذرا سی تکلیف اٹھانی پڑی ہے۔ مجھے انہیں بے ہوش کرنا پڑا تھا اور ان کی گاڑی بھی استعمال کی۔ گاڑی بہر حال انہیں مل جائے گی، بس ذرا پولیس والوں کے ہاتھوں خوراک اٹھانی پڑے گی۔" اس نے اختصار کے ساتھ معاذ کو اس کے آزاد کروانے کی داستان سنا ڈالی۔

معاذ خاموشی سے سنا رہا اور حیرت سے وقاص عرف دکی کو دیکھتا رہا۔ اس جیسے ایس سال کے لڑکے سے اسے ایسی کارکردگی کی امید نہیں تھی اور یہ بات وہ بھی سمجھتا تھا کہ اسے جتنی سادہ داستان سنائی گئی ہے، بات اتنی سادہ نہیں رہی ہوگی۔ وقاص کو اسے آزاد کروانے کے لیے سرتوڑ کوشش کرنی پڑی ہوگی۔ بقول اس کے اس نے یہ کوشش اپنے دماغ کا کیڑا اگلانے پر کی تھی لیکن اس بات کو ماننا آسان نہیں تھا کہ کوئی کسی اجنبی کے لیے اتنی زیادہ زحمت اٹھائے کہ اپنی جان کو خطرے میں ڈال دے۔

"مان لیں کہ ابھی اس دنیا میں مجھ جیسے لوگ موجود ہیں جو بغیر غرض کے بھی کسی کے کام آسکتے ہیں۔" اس نے معاذ کی بے چینی بھانپ لی اور چین دلانے والے انداز میں بولا۔

"اوکے! تم کہتے ہو تو مان لیتا ہوں لیکن اب اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ اس سلسلے میں کوئی مشورہ دو۔ مجھے اپنے گھر والوں سے ملنا ہے اور جو کچھ مجھ پر گزری ہے،

سسپینس ڈائجسٹ 78 ستمبر 2020ء

مہربانی فرما کر بلیشرز کی حوصلہ کے لیے خرید کر پڑھیے۔

رہے تو عالم شاہ کے خلاف نفرت کی آگ مزید بھڑکتی۔ کچھ بھی سہی، عالم شاہ میرا بھائی ہے اور مجھے اسے سپورٹ کرنا ہے۔“ قربان شاہ نے بیٹے کو نفسی جواب دیا۔

”مجھے اس واقعے پر حیرت ہے۔ عالم کو میں ایک جذباتی اور لاپرواہی انسان کے طور پر تو جانتا ہوں لیکن اس سے ایسی اخلاقی گراؤٹ کی امید کم از کم مجھے نہیں تھی۔“ معظّم شاہ نے اس واقعے پر اپنی رائے دی۔

”جوان خون ہے ہٹ اور جوانی میں اچھوں اچھوں کے قدم بہک جاتے ہیں۔ اللہ اسے زندگی دے اور میری بہن کی آنکھوں کو خنڈا رکھے۔ بعد میں ہم اس مسئلے کو حل کر لیں گے۔“ قربان شاہ کے لہجے میں ٹھنکن اور اسی تھی۔

”آپ فشی عبدالحق سے رابطہ کر کے آسیہ کے بارے میں دریافت کریں۔ آپ کی خصوصی توجہ اس کا دل موم کرنے میں اہم کردار ادا کرے گی اور آپ کے احسانات کے بدلے وہ عالم شاہ کو معاف کرنے کے لیے تیار ہو جائے گا۔ یہ ہمارے خاندان کی ساکھ ہی نہیں، پچھاسا سکیں کی سیاسی ساکھ کا بھی معاملہ ہے۔“ معظّم شاہ کے ماتھے پر فکر مندی کی لکیریں تھیں۔ ابھی وہ اپنے اور سب کے افواہ کی گھسی کو ہی نہیں سلجھا سکا تھا کہ یہ نئی الجھن سامنے آگئی تھی۔

آشیہ آزادی سے نکل کے ساتھ فرار ہونے کے بعد اس نے معاذ کی ہدایت کے مطابق کسی قریبی تھانے کے بجائے اپنے دوست ایس پی کے پاس جانا مناسب سمجھا تھا۔ وہ اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ مقامی تھانوں کی ملی جملت کے بغیر کسی جگہ جرائم پیشہ افراد کا چھپنا بہت مشکل ہوتا ہے، اس لیے سیدھا اپنے دوست کے پاس گیا تھا۔ اس کے دوست نے اس سے ساری بات سننے کے بعد خاطر خواہ کارروائی کا آغاز کر دیا تھا لیکن بہر حال خاصا وقت لگ گیا تھا اور جب پولیس پارٹی آشیہ آزادی پہنچی تھی تو انہیں وہاں کچھ نہیں ملا تھا۔ تھوڑی بہت شہادتیں ضرور تھیں جن سے یہ تو پتا چل رہا تھا کہ وہاں کچھ لوگ رہ رہے تھے لیکن کوئی ذی فکس یا ایسا کوئی ثبوت نہیں ملا تھا جو ان لوگوں کی نشاندہی کر سکا۔ معظّم شاہ کو سب سے زیادہ فکر معاذ کی تھی۔ روشن آنکھوں والا وہ زخمی لڑکا ان کے بہت کام آیا تھا اور حقیقتاً وہ اسی کی وجہ سے وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوئے تھے لیکن معاذ کے بارے میں کوئی خبر نہیں تھی کہ وہ وہاں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو سکا تھا یا نہیں۔ اس کے ایس پی دوست نے اسے یقین دہانی کروائی تھی کہ وہ یہ جاننے کی پوری کوشش کرے گا کہ وہاں کون لوگ رہ رہے تھے اور انہوں نے اس

سے ناراض ہو کر قربان شاہ کی حویلی سے نکلا تھا اور چند گھنٹے بعد یہ اطلاع آئی تھی کہ وہ حویلی سے دور کھیتوں کے قریب شدید زخمی حالت میں بے ہوش پایا گیا ہے۔ ابتدائی طبی امداد دے کر اسے فوری طور پر گاؤں سے منتقل کر کے شہر کے ایک بڑے اسپتال میں پہنچا دیا گیا تھا۔ اسپتال کے قائل ڈاکٹر جدید طبی سہولتوں کے سہارے اس کی روغتی سانسوں کو مٹانے کی کوشش کر رہے تھے اور اس کے پیارے اس کے لیے رب کے حضور زندگی کی فریاد کرنے میں مصروف تھے۔ وہ جو بڑی اونچی شان والے تھے، چند گھنٹوں میں ایسی کڑی آزمائشوں سے گزر رہے تھے کہ اپنی جگہ مل کر رہ گئے تھے۔ معظّم شاہ اور سب کا انخواہ، آسیہ کی خودکشی کی کوشش اور عالم شاہ پر سنگین الزام، پھر عالم شاہ پر ہونے والا قاتلانہ حملہ، کوئی بھی تو معمولی بات نہیں تھی۔ ایسا لگتا تھا مصیبتوں نے ان کے گرد مضبوط حصار باندھ دیا ہو اور انہیں اس حصار سے نکلنے کے لیے راستہ دینے کو تیار نہ ہوں۔ معظّم شاہ اور سب کی خیریت کی خوشخبری بھی ان حالات میں ماند پڑ چکی تھی۔ معظّم شاہ فون پر اطلاع دینے کے بعد فوری طور پر گاؤں کے لیے روانہ نہیں ہوئے تھے بلکہ شہر میں ہی رک کر پہلے کل کا طبی معائنہ کروایا تھا اور پھر دونوں اس کو بھی میں منتقل ہو گئے تھے جہاں عالم شاہ کا قیام رہتا تھا۔ اسی کو بھی میں معظّم شاہ کو عالم شاہ سے متعلق خبر ملی تھی اور وہ سب کو کچھ بھی بتائے بغیر خود اسپتال پہنچ گیا تھا۔ اسپتال میں قربان شاہ، صداقت شاہ اور ان کے نمک خواروں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ عالم شاہ کے لیے خون کا عطیہ دینے والوں کی قطار لگی ہوئی تھی اور ہر ایک خواہش مند تھا کہ اس کا خون مالک کے اندر زندگی بن کر دوڑے۔ زندگی جو کسی کے اختیار میں نہیں اور جس کے لیے بے حد صاحب اختیار لوگوں کو بھی تڑپنا بلکنا پڑتا ہے۔

”آسیہ اب کہاں ہے؟“ انتظار گاہ میں باپ سے سرگوشیوں میں ساری داستان سننے والے معظّم شاہ نے دھیمے لہجے میں ان سے دریافت کیا۔

”میرے حکم پر ایسے پہلے ہی شہر بھجوا دیا گیا تھا۔ ویسے گاؤں کے ڈاکٹر نے تسلی کروائی تھی کہ اس کی چوٹیں زیادہ خطرناک نہیں ہیں اور ہاتھ اور پیر کے فریکچر ٹھیک ہونے کے بعد وہ نارمل ہو جائے گی لیکن میں نے اس لیے اسے وہاں سے بھجوا دیا تھا کہ اس نے عالم شاہ پر جو الزام لگایا تھا اس پر زیادہ بات نہ ہو سکے۔ فشی عبدالحق میرا نمک خوار ہے لیکن بیٹی کی عزت کے معاملے پر تو کوئی باپ بھی صبر سے کاٹے نہیں۔“ لڑکا۔ وہ اور اس کا خاندان گاؤں میں

کے اور اس کی بیوی کے اخوا برائے تاوان کا منصوبہ کیونکر بنایا تھا لیکن فی الحال وہ بالکل اندھیرے میں تھا۔ اسے کھل کی زبانی یہ حیرت انگیز بات بھی سننے کو ملی تھی کہ اسے اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ وہ معظّم شاہ سے علیحدگی اختیار کر کے وہیں رہ جائے تو معظّم شاہ کو بغیر تاوان کے بھی رہا کیا جاسکتا ہے۔ یہ بہت عجیب و غریب بات تھی اور ڈاکوؤں کے طریقہ کار کے بالکل خلاف تھی۔ ڈاکو اگر کبھی عورت کے چکر میں پڑ بھی جائیں تو سیدھے سیدھے مطلب برآری سے غرض رکھتے ہیں اور اتنا پیچیدہ طریقہ اختیار نہیں کرتے۔ کھل وہاں ان کی دسترس میں تھی لیکن اس کے ساتھ زبردستی کرنے کے بجائے اسے اس کی رضامندی سے وہاں روکنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ایسا کیوں تھا؟ وہ اس سوال کا جواب بھی تلاش نہیں کر پایا تھا اور اب ایک نئی الجھن کے ساتھ اپنے خاندان کے درمیان کھڑا اپنے باپ کو تجاویز دے رہا تھا۔

”منشی سے رابطہ کرنے کی تو میں خود کب سے کوشش کر رہا ہوں لیکن اس کا فون بند جا رہا ہے۔“ قربان شاہ نے پریشانی کے عالم میں اسے بتایا۔

”ہوسکتا ہے فون کی چارجنگ یا سکتز وغیرہ کا مسئلہ ہو۔ پریشانی میں انسان ان چیزوں پر دھیان نہیں دے پاتا۔ آپ اس کا احوال لینے کے لیے کسی بندے کو بھجواتے۔“ معظّم شاہ نے انہیں مشورہ دیا۔

”میں ایسا کر چکا ہوں پتہ اور اصل پریشانی یہ ہے کہ منشی کی دمی کو جس اسپتال میں داخل کروایا تھا، وہ وہاں نہیں ہے۔ اسپتال والوں نے بتایا ہے کہ وہ لوگ کسی دوسرے اسپتال جانے کا بول کر خود وہاں سے چلے گئے تھے۔ ادھر کوٹھ میں بھی منشی کے گھر پر تالا لگا ہوا ہے۔ اس کی زال اور پتہ دونوں کا کچھ پتا نہیں ہے۔“ قربان شاہ نے پریشان کن لہجے میں اسے حقائق سے آگاہ کیا۔

”یہ تو بہت عجیب بات ہے۔ منشی عبدالحق تو کبھی آپ کی اجازت کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاتا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمارے کسی مخالف نے موقع کا فائدہ اٹھا کر منشی کو بہکا دیا ہو اور آنے والے چند گھنٹوں میں ہمیں کسی میڈیا ٹرائل کا سامنا کرنا پڑے۔ آج کل یہی ہو رہا ہے۔ کسی کی ذرا سی کوئی کمزوری ہاتھ آجائے تو مخالفین معاملے کو بڑھا چڑھا کر میڈیا پر لے آتے ہیں اور اگلے کی عزت اتار کر رکھ دیتے ہیں۔“ معظّم شاہ کو منشی پریشانی لاحق ہوئی۔

”ہمارا اتنا بڑا مخالف کوئی نہیں ہے۔“ قربان شاہ

نے اس بات کو ٹالنا چاہا۔
”ڈائریکٹ نہ سہی لیکن پچھاسا میں کی وجہ سے تو ہمارے ایسے مخالفین موجود ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ آپ خود سیاست میں سرگرم نہیں ہیں لیکن آپ کی پوری سپورٹ پچھاسا میں کے ساتھ ہوتی ہے۔ پچھاسا میں کا سب سے بڑا سیاسی حریف لطیف سومرو تو ہر وقت ایسے موقع کی تلاش میں رہتا ہے کہ کسی طرح ان کا سرنگھا کر سکے۔“ معظّم شاہ نے باپ کی مخالفت کی۔

”وہ الگ بات ہے لیکن ضروری نہیں کہ ہر بندہ اتنا ہی برا ہو، جتنا ہم اسے سمجھ رہے ہوں۔ لطیف سومرو بھی ان نازک حالات میں میرے بہت کام آیا ہے اور میری ایک پکار پر اس نے میری بڑی مدد کی ہے۔“

”کیا مطلب؟ کیسی مدد؟“ معظّم شاہ چونکا۔
”مجھے سارے حالات معلوم ہیں پتہ اتنا جانتا ہے کہ میں اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ اتنے کم وقت میں ایک دم اتنی بڑی رقم کا انتظام کر سکوں۔ اس بڑے وقت میں مجھے لطیف سومرو کی زمین والی پیشکش یاد آئی۔ میں نے پیغام بھیج کر اسے بلایا اور اس نے ہاتھوں ہاتھ وہ زمین خرید لی، وہ بھی اس قیمت پر جس کی پہلے اس نے آخر کی تھی، ورنہ وہ چاہتا تو میری مجبوری دیکھ کر موقع کا فائدہ اٹھاتا اور زمین کے کم دام لگانے کی کوشش کرتا۔“ قربان شاہ نے ساری بات بتاتے ہوئے ایک بار پھر لطیف سومرو کی تعریف کی۔ معظّم شاہ سن کر ہونٹ سمجھتی ہوئی رہ گیا۔ زمین کی فروخت اس کے لیے بھی صدے کا باعث تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ قربان شاہ کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

”معم نہ کر پتہ! رقم تو میرے پاس محفوظ پڑی ہے۔ لطیف سومرو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر میں اس کی رقم جلد واپس کر دوں گا تو وہ مجھے زمین واپس کر دے گا۔ یہاں سے نمٹ جائیں تو پھر دوسرے معاملات کو دیکھیں گے۔“ قربان شاہ بیٹے کو تسلیاں دے رہے تھے اور ادھر آئی سی یو کے دروازے کے بالکل سامنے کھڑے صدقت شاہ کو سننا پڑ رہا تھا۔

”آپ کے پشنت کی حالت بہت نازک ہے۔ ڈاکٹر اپنی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ آپ اللہ سے دعا کریں۔“

☆☆☆

ڈاکٹر طلعت کا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ ابتدائی شدید رد عمل کے بعد بشری کی حالت آہستہ آہستہ سنبھلنے لگی تھی۔ اس نے چھٹا چلانا اور اسٹاف پر حملے کرنا چھوڑ دیا تھا

ستمبر 2020ء

سسپنس ڈائجسٹ 60

مہربانی فرما کر بلیشرز کی حوصلہ کے لیے خرید کر پڑھیے۔

ضرور انصاف دلانے گا۔ اس سلسلے میں وہ دن رات کام کر رہا تھا اور جانے کون کون لوگ تھے جنہیں اپروچ کر کے اپنی مدد کے لیے راضی کرنے میں لگا ہوا تھا۔ کافی کچھ کرنے کے بعد آج پرائم ٹائم میں وہ بشری کو اپنے پروگرام میں پیش کرنے والا تھا۔ اس نے بشری کو راضی کر لیا تھا کہ اس شو میں وہ ان باتوں کو بھی عیاں کرے گی جو اس نے پہلے چھپائی تھیں۔ اس نے بشری کو مکمل کر یزدانی اور عرفان اللہ کے خلاف بولنے پر رضامند کر لیا تھا اور اس بات پر بھی قائل کر لیا تھا کہ وہ عائشہ گھزار کے کیس میں مکمل کر باؤل کا نام لے گی۔ وہ بشری کو قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ وہ ان لوگوں کے خلاف خاموش اور تنہا انتقامی کارروائی کرنے کے مقابلے میں قانونی جنگ لڑ کر زیادہ کامیاب رہے گی۔ بشری کے پاس اپنے مجرم کا نام نہیں تھا لیکن شک تو بہر حال یہی تھا کہ اس بار بھی دشمن وہی ہے جس نے اب تک اسے ناقابل حلفی نقصان پہنچائے ہیں۔ اس شک کو اسی روز موصول ہونے والی ڈی این اے رپورٹ نے یقین میں بدل دیا۔ عائشہ گھزار اور بشری کی باڈی پر ملنے والے ڈی این اے کے نمونے آپس میں میچ کر گئے تھے۔ یعنی ماں اور بیٹی دونوں کا مجرم ایک ہی تھا اور اب صرف اس مجرم کو قانون کی گرفت میں لانا تھا۔ پروگرام سے پہلے ہی باؤل کی گرفتاری یقینی بنانے کے لیے اعجاز نے پولیس میں اپنے تعلقات کی ذوریایاں ہلائی شروع کر دی تھیں لیکن مخالف اس سے زیادہ چالاک اور رسائی والے تھے اور شام تک متعدد مقامات پر چھاپے مارنے کے باوجود باؤل پولیس کے ہاتھ نہیں آسکا تھا۔ اعجاز اس سارے کھیل کو جانتا تھا اور اسے معلوم تھا کہ پولیس میں کتنی کالی بھیڑیں ایسی ہیں جو یزدانی اور عرفان اللہ جیسے لوگوں کے مفادات کا تحفظ کرتی ہیں۔ وہ بہت خفیہ اور جوش کے ساتھ پولیس کے اس کردار کو بھی عوام کے سامنے لانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس کا آج کا پروادہ بہت معروف گزرا تھا۔ سپر ورک، ٹیلی فون کالز، سماجی و سیاسی شخصیات سے رابطے، جانے کیا کیا تھا جو وہ کر رہا تھا کہ شام پانچ بجے اسے کسی ملاقاتی کی آمد کی اطلاع دی گئی۔ اطلاع دینے والے نے اسے بتایا کہ ملاقاتی کسی بہت اہم اور خفیہ معاملے میں اس سے ملنا چاہتا ہے۔ اعجاز کے پاس ایسے ملاقاتی آتے رہتے تھے اس لیے اس نے اس وقت اس شخص کو ٹالنے کی ہدایت کر دی لیکن پھر ملاقاتی کی طرف سے ملنے والی ایک چٹ نے اسے فیصلہ بدلنے پر مجبور کر دیا۔ چٹ پر لکھا تھا۔

اور چپ چاپ اپنے بستر پر پڑی رہتی تھی۔ اس کے جسمانی زخم بھرنے شروع ہو گئے تھے۔ اس پر ظلم کا پہاڑ توڑنے والے نے بربریت کی انتہا کر دی تھی۔ اس کے پورے جسم پر نوچنے، کانٹے اور کسی تیز دھار آلے سے جھکے کٹ لگائے جانے کے نشان موجود تھے۔ ڈاکٹر کی رائے کے مطابق وہ کوئی جنسی جنونی تھا جس نے اسے اس حال تک پہنچا دیا تھا۔ بشری نے پولیس کو اپنا بیان دے دیا تھا۔ وہ نہیں بتا سکتی تھی کہ اسے اس طرح نشانہ بنانے والا کون تھا۔ اس نے تو اعجاز کے دھوکے میں کمرے کا دروازہ کھولا تھا اور پھر فوراً ہی زیر کر لی گئی تھی۔ پولیس کی میڈم نازلی سے تفتیش بھی بے کار گئی تھی۔ یہ اتفاق تھا کہ اس روز ہاسٹل کے استقبالیہ کمرے کی نیو بل لائٹ خراب ہو گئی تھی اور وہاں ایک کم پاور کا بلب جل رہا تھا جس کی روشنی میں میڈم آنے والے کو صحیح طور پر نہیں دیکھ سکتی تھی۔ یوں بھی اس وقت وہ کسی سے فون پر بات کر رہی تھی اس لیے اس کا دھیان بٹا ہوا تھا۔ بشری اور میڈم کے بیانات کے بعد پولیس دیگر شواہد کی مدد سے اپنی کارروائی آگے بڑھا رہی تھی۔ اعجاز کی مداخلت کی وجہ سے ابھی تک کیس میڈم یا پرنسپل آیا تھا۔ اسپتال کی طرف سے بھی مکمل تعاون کیا جا رہا تھا لیکن بہر حال کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا کہ مجرم کو کیفر کردار تک پہنچایا جاسکے اور اب بشری نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ خاموش نہیں رہے گی۔ اس نے اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کے خلاف بولنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اسے پولیس کی کارکردگی پر بھی مکمل بھروسہ نہیں تھا چنانچہ اعجاز نے اس کے ساتھ مل کر ایک پروگرام ترتیب دیا تھا۔ اس پروگرام کے مطابق وہ پہلے مرسلے میں بشری کے ساتھ ہونے والے ظلم کی داستان پبلک کے سامنے لاتے، پھر پولیس اور انتظامیہ پر دباؤ ڈالنے کے لیے صحافی برادری اور طلبہ کی طرف سے احتجاج اور مظاہرے کئے جاتے۔ اعجاز کا دعویٰ تھا کہ وہ اس معاملے میں اتنی مضبوط کہنیں چلائے گا کہ صدر اور وزیر اعظم خود اس کیس کا نوٹس لینے پر مجبور ہو جائیں گے۔ بشری جانتی تھی کہ وہ اس کو انصاف دلانے کے لیے انتہائی حد پر جائے گا کہ اس کے لیے بشری کوئی عام لڑکی نہیں تھی۔ وہ اس کے دل میں بستی تھی اور اس کے درد کو وہ اسی طرح محسوس کرتا تھا، پھر بھی اندر کہیں یہ بات اسے مایوس کرتی تھی کہ اس طرح کے کیسز میں عورت کو بھی انصاف ملنا نہیں دیکھا گیا۔ تو کیا وہ انصاف پالے گی؟

اس کے برخلاف اعجاز بہت مہر مزم تھا اور اسے یقین دلاتا رہتا تھا کہ کسی کو انصاف ملا ہو یا نہ ملا ہو، بشری کو وہ

”میں معاذ کیس کے سلسلے میں کچھ بہت اہم انکشافات کرنا چاہتا ہوں۔“ اعجاز کے لیے اس چٹ کو نظر انداز کر دینا ممکن نہیں تھا۔ بشری کے کیس میں اصل بنیادی معاذ کیس تھا۔ بشری کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کی اصل وجہ ہی معاذ سے ہمدردی تھی۔ چنانچہ اس نے ملاقاتی کو فوراً اپنے دفتر میں بلوایا۔ آنے والا ایک دہلا پتلا، باریش اور کم عمر نوجوان تھا جس کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔

”میرا نام وقاص ہے اور میں صحافیوں کی ایک لمبی فہرست کی چھان بین کرنے کے بعد آپ تک پہنچا ہوں۔“ نوجوان نے اس سے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

”جب آپ اپنا پورا اطمینان کرنے کے بعد مجھ تک آئے ہیں تو جلدی سے بلا جبکہ سب کچھ کہہ ڈالیں۔ میں آج بہت زیادہ بڑی ہوں اور بہت اہم پروگرام کرنے والا ہوں۔“ اعجاز نے گہری نظروں سے اس نوجوان کو دیکھتے ہوئے اس سے دو ٹوک بات کی۔

”میں آپ کو معاذ سے ملوا سکتا ہوں۔“ وقاص نے دمکی آواز میں ایسی بات کہی جو اعجاز کے لیے دھماکا خیز ثابت ہوئی۔

”کیا کہا تم نے.....؟ تم مجھے معاذ سے ملوا سکتے ہو؟“ اس نے بے یقینی سے وقاص کی بات دہرائی۔

”ہاں! اس وقت وہ میرے مہمان ہیں اور آپ ان سے ان کے غائب کی پوری داستان سن سکتے ہیں لیکن شرط رازداری اور سیکورٹی کی ہے۔ معاذ کی زندگی سخت خطرے میں ہے اور کوئی بھی غیر محتاط قدم ان کے لیے بہت مہلک ثابت ہوگا۔“

”میں سمجھتا ہوں۔ میری طرف سے کوئی بات لیک نہیں ہوگی لیکن تم مجھے بتاؤ تو سہی کہ معاذ کہاں ہے؟ کیا وہ یہاں اسٹوڈیو آکر اپنا بیان ریکارڈ نہیں کر داسکتا؟ آج میں جس ایڈیو پر پروگرام کرنے جا رہا ہوں، اس سے معاذ کا گہرا تعلق ہے۔“ اعجاز اس اطلاع پر بہت زیادہ پرجوش ہو گیا تھا۔

”وہ اچھے خاصے زخمی ہیں اور میرے خیال میں انہیں کسی تکلیف میں ڈالنا مناسب نہ ہوگا۔ اسٹوڈیو آنے جانے کے چکر میں وہ کسی کی نظر میں آگئے تو اور زیادہ مسئلہ ہو جائے گا اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ اس جگہ جا کر ان سے ملاقات کر لیں جہاں وہ موجود ہیں۔“

”ٹھیک ہے، میں تیار ہوں۔ تم مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔“ اعجاز نے اپنے چڑے کا بیگ اپنی طرف کھسکایا اور اس میں اس طرح ضروری سامان رکھنے لگا جیسے فوری طور پر

چل پڑنے کے لیے تیار ہو۔

”ایک منٹ صبر کریں اعجاز صاحب! میں یہاں سے آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ آپ کو خود اس جگہ تک جانا ہوگا۔ میں دور رہ کر نظر رکھوں گا کہ کہیں آپ کے پیچھے لگ کر کوئی شخص وہاں نہ پہنچ جائے۔“ وقاص نے اسے ٹوک کر اپنے پروگرام سے آگاہ کیا۔

”اوکے! ایڈیو ش..... لیکن مجھے کم از کم اتنا تو بتا دو کہ معاذ تم تک کیسے پہنچا؟“ اعجاز سمانی تھا اور کوئی سمانی سوال کیے بغیر بھلا کیسے رہ سکتا تھا۔

”یہ سب باتیں آپ معاذ سے پوچھیں گے۔ میں بس اپنے حصے کا کام کر رہا ہوں۔ آپ پتا نوٹ کر لیں۔“ وقاص نے اس کے سوال کو ٹال دیا اور اسے پتا لکھوانے لگا۔

”ٹھیک ہے۔ میں اپنے کیرئیر میں کو بلواتا ہوں اور ابھی معاذ سے ملنے کے لیے لکھا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ ملاقات میرے آج کے پروگرام کو مزید کامیابی سے ہمکنار کرے گی۔“ اعجاز بہت زیادہ پرجوش ہو چکا تھا۔

”کوشش کریں کہ سب کچھ بہت خاموشی سے ہو اور اگر کیرئیر کو ساتھ لے جانا مجبوری نہ ہو تو اسے بھی رہنے دیں۔ اس کے پاس کیرے کی موجودگی لوگوں کو متوجہ کرے گی۔“ وقاص بہت زیادہ احتیاط سے کام لے رہا تھا۔

”تم فکر نہیں کرو۔ کیرئیر میں میرے اعتماد کا بندہ ہے اور بہت چھوٹا سا ڈیجیٹل کیرئیر استعمال کرتا ہے اس لیے کسی کو خبر بھی نہیں ہو سکے گی کہ ہم فی وی والے ہیں۔ میں اگر انڈیو کے دور ان خود سے ویڈیو بنانے کی کوشش کروں گا تو میرا کام متاثر ہوگا۔“ اعجاز نے کیرئیر کی اہمیت پر زور دیا۔

”ٹھیک ہے، جیسا آپ مناسب سمجھیں۔ اب میں چلتا ہوں۔“ وقاص اس سے مصافحہ کر کے اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ پرجوش سے اعجاز نے فوراً اپنے اس قابل اعتماد کیرئیر میں کو کال کیا جسے وہ ہر آڈٹ ڈور پر اپنے ساتھ رکھتا تھا۔

”سر! آپ کب تک واپس آ جائیں گے؟ آپ کے پروگرام میں اب چند ہی گھنٹے باقی ہیں۔ میک اپ وغیرہ کے لیے بھی ٹائم چاہیے ہوگا۔ آپ نے ٹیسٹ کے بارے میں بھی کچھ نہیں بتایا ہے کہ انہوں نے کب تک پہنچا ہے۔“ اعجاز کو کہیں جانے کے لیے پرتوتا دیکھ کر اس کے اسسٹنٹ نے اسے ٹوکا۔

”سب ہو جائے گا یار! ابھی میں جس کام سے جا رہا ہوں وہ ہمارے پروگرام کو اور بھی زیادہ کامیابی عطا کرے گا۔ بس تم دعا کرو کہ مجھے جو ٹپ ملی ہے، وہ بالکل صحیح

والی تھی لیکن کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے اس خبر کو سن کر ایک نشاط آفریں قہقہہ لگایا تھا اور اپنی ری ڈھلی ہو جانے پر خوشی سے جھومنے لگے تھے۔

☆☆☆

دقاس کے چھوٹے سے قلیٹ میں معاذ بہت آرام سے رہ رہا تھا لیکن تنہائی اور نقل و حرکت کی آزادی نہ ہونے کی وجہ سے شدید ذہنی کوفت کا شکار تھا۔ دقاس نے اسے گھر والوں سے رابطہ کرنے سے بھی روک دیا تھا۔ یہ بات تو وہ پہلے ہی بتا چکا تھا کہ اس کے گھر والے کچھ لوگوں کے دباؤ کی وجہ سے کراچی سے لاہور منتقل ہو گئے ہیں، اس لیے گھر جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن دقاس نے اسے موبائل یا سوشل میڈیا کے ذریعے بھی ان لوگوں سے رابطہ کرنے سے روک دیا تھا کہ اگر ان ذرائع پر چیک لگا ہو تو معاذ کے دشمن اسے ٹریس نہ کر لیں۔ یوں وہ آزاد ہو کر بھی خود کو قید میں محسوس کرتا تھا۔ بس فرق یہ تھا کہ اس قید میں اسے اذیتیں نہیں دی جاتی تھیں، کھانے پینے اور علاج کی سہولت حاصل تھی۔ دقاس نے ایک ڈاکٹر کا بھی انتظام کر دیا تھا جس نے دواؤں اور خوراک کا پورا شیڈول بنا کر دے دیا تھا اور دقاس نے اسے ہر چیز فراہم کر دی تھی۔ معاذ، دقاس کی ان مہربانیوں کا مقصد سمجھنے سے قاصر تھا۔ دقاس ایک تو بہت کم وقت کے لیے قلیٹ پر آتا تھا، دوسرے اس موضوع پر اس سے بات کرنے سے گریز کرتا تھا، اس لیے معاذ ابھی تک اس سے کچھ انکوائری نہیں سکا تھا۔ بس ایک اندرونی احساس تھا جو دقاس کے خلوص پر یقین کرنے پر مجبور کرتا تھا اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی یہاں رکا ہوا تھا۔ یہاں رکنے کا ایک فائدہ یہ تھا کہ اسے اپنے زخموں کے ٹھیک ہونے اور صحت کو بحال کرنے کا موقع مل رہا تھا۔

دقاس اسے جو تھوڑی بہت باتیں بتاتا تھا اس سے ظاہر تھا کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہیں بیٹھا ہوا۔ اپنے قول کے مطابق وہ کسی ایماء اور صحافی کی تلاش میں تھا اور آج جانے سے پہلے اسے یہ خوشخبری سنا کر گیا تھا کہ کافی چھان پھنک کے بعد وہ ایک ایسے صحافی کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے جس کے بارے میں اسے یقین ہے کہ وہ اس کے ٹریس کو بالکل دیانت داری سے میڈیا پر پیش کرے گا۔ معاذ اس کی روائی کے بعد سے ہی انتظار کی کیفیت میں تھا اور وقت گزری کے لیے ٹیلی ویژن کھول کر بیٹھا ہوا تھا۔ معمول کی خبروں کے درمیان اچانک ہی بریکنگ نیوز دی جانے لگی۔ خبر کے مطابق معروف نوجوان صحافی اعجاز احمد اپنے دفتر کے

ہو۔" اعجاز نے اس کے شانے کو تھپکا اور اپنا ہیک اٹھا کر باہر نکل گیا۔ معاذ کی بازیابی اس کے نزدیک بشری کے کیس کو مضبوط بنانے کے لیے ایک غیر امدادی تھی۔ اس کیس میں اب تک بہت کچھ اس کی حمایت میں ہی ہو رہا تھا۔ ڈی این اے ٹیسٹ بھی سب سے بڑی کامیابی تھی اور ایک خوش قسمتی یہ بھی تھی کہ وہ جس چینل کے لیے کام کرتا تھا، وہ عرفان اللہ کی مخالف سیاسی پارٹی کو سپورٹ کرتا تھا اس لیے اسے یہ پروگرام کرنے کی اجازت مل گئی تھی۔ آج کے پروگرام کے بارے میں چینل کے مالک، ایم ڈی اور اعجاز کے ایک آدھ قریبی شخص کے علاوہ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ وہ کس موضوع پر پروگرام کرنے جا رہا ہے، البتہ عوام کو متوجہ کرنے اور رینٹنگ بڑھانے کے لیے بار بار آج شو کے خصوصی ہونے کا اعلان کیا جا رہا تھا۔ خصوصی پروگرام کا میزبان پروگرام سے محض چند منٹ پہلے اپنے کیمرا مین کے ساتھ دفتر سے نکل کر کہیں جا رہا تھا اور اسے علم نہیں تھا کہ کامیابی کے علاوہ بھی ایک چیز ہے جو اس کے تعاقب میں ہے۔ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد اس نے حسب عادت سیٹ سیٹ بیلٹ باندھی اور ایک بار پھر اس کاغذ پر نظر ڈالی جس پر دقاس کا دیا ہوا ایڈریس لکھا تھا۔

"میرے خیال میں نمائش چورنگی کی طرف سے جانا ٹھیک رہے گا۔" ایڈریس والا کاغذ اپنے ساتھ پنجر سیٹ پر بیٹھے کیمرا مین کی طرف بڑھاتے ہوئے اس نے اس سے رائے لی اور خود گاڑی اسٹارٹ کر کے پارکنگ سے باہر نکالی۔ "اس ایڈریس پر جانے کے لیے نمائش چورنگی کے بجائے اگر....." کیمرا مین اس کے دپے کاغذ پر نظر جمائے اپنی کوئی رائے دے رہا تھا کہ اچانک فضا گولیوں کی ترتر اہٹ سے گونج اٹھی۔ گولیاں ڈرائیونگ سیٹ والے رخ سے چلائی گئی تھیں اس لیے اعجاز تو فوراً ہی زد میں آ گیا۔ گولیوں نے اس کے بالائی جسم کو شہد کے چھتے میں بدل ڈالا تھا لیکن موت کا اصل سبب وہ گولی بنی جو دائیں ہتھیلی سے سیدھی اس کے دماغ میں داخل ہوئی تھی۔ اتنی شدید قاتلنگ میں کیمرا مین کو بھی کوئی راہ فرار نہ ملی اور اس کے ہاتھ میں موجود کاغذ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گاڑی کے فرش پر جا گر ا جہاں اعجاز اور کیمرا مین کے غلط ملط ہوتے خون نے اس سفید کاغذ کے ٹکڑے کو احمریں رنگ میں رنگ ڈالا۔ وہ جو بڑی بڑی خبروں پر تبصرے کرتا تھا، جس کے تجزیے اونچے اونچوں میں پھیل چلا دیتے تھے، جس کی بات کو حق کی آواز سمجھا جاتا تھا، لمحوں میں خود ایک خبر بن گیا۔ ایسی خبر جو مظلوموں اور اس کے چاہنے والوں کو خون کے آنسو دلانے

باہر قتل کر دیے گئے تھے۔ معاذ، اعجاز احمد سے واقف تھا۔ اعجاز یونیورسٹی میں اس سے سینئر اور بہت سرگرم طالب علم رہا تھا، اس لیے باقاعدہ ملاقات نہ ہونے کے باوجود وہ اعجاز کو اچھی طرح جانتا تھا۔ بعد میں اس کا پروگرام اس کی شناخت بنا اور دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح وہ بھی اعجاز کو پسند کرنے والوں میں شامل ہو گیا۔ اسے حیرت تھی کہ جب وقاص کسی ایماندار صحافی کی تلاش میں تھا تو اس کے ذہن میں اعجاز کا نام کیوں نہیں آیا اور اب اعجاز کا نام اس صورت اس کے سامنے تھا کہ وہ بے چارہ زندگی کی بازی ہار چکا تھا۔

خبر میں ہار ہار اس کی گولیوں سے پھلتی گاڑی اور گاڑی میں گرا ہوا خون دکھایا جا رہا تھا۔ ساتھ ہی اس بات کو بھی مسلسل ہائی لائٹ کیا جا رہا تھا کہ آج اعجاز احمد کسی خاص موضوع پر پروگرام پیش کرنے والے تھے۔ اعجاز کے ساتھی کیرامین کے بارے میں خبر تھی کہ اسے نہایت تشویش ناک حالت میں اسپتال منتقل کر دیا گیا ہے جہاں ڈاکٹرز اس کی زندگی بچانے کی سرتوڑ کوشش کر رہے ہیں۔ معاذ افسردہ سا ان خبروں کو دیکھتا رہا۔ خبر سے صاف ظاہر تھا کہ اعجاز آج کوئی بہت بڑی حقیقت عیاں کرنے جا رہا تھا اور اسے اس کی مہلت نہیں دی گئی تھی۔ معاذ نے وہی چینل لگا یا ہوا تھا جس سے اعجاز وابستہ تھا اس لیے مسلسل اس سے متعلق خبریں دی جا رہی تھیں۔ صحافی برادری، سیاست دانوں، سماجی کارکنوں اور شوہز کے مختلف شعبہ جات سے تعلق رکھتے والے لوگوں کی طرف سے مسلسل اس واقعے کی مذمت کی جا رہی تھی۔ دکھ اور افسوس کے اظہار کے ساتھ ساتھ مطالبہ کیا جا رہا تھا کہ اعجاز کے قاتلوں کو تلاش کر کے جلد از جلد انہیں کیفر کردار تک پہنچایا جائے۔ خبر سے متعلق مختلف تجزیے اور تحقیقاتی رپورٹیں پیش کرنے کا سلسلہ بھی جلد شروع ہو گیا۔ اس سلسلے میں اعجاز کے اسسٹنٹ کا بھی ایک مختصر سا انٹرویو چلایا گیا۔ اس کے مطابق اعجاز آج بہت پرجوش تھا اور بہت بڑے لوگوں کے خلاف ٹیوٹوں کے ساتھ پروگرام پیش کرنے والا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اعجاز کا پروگرام سے قبل کچھ دیر کے لیے دفتر سے جانا طے تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ پروگرام میں جس مہمان کو پیش کرنے والا ہے، اسے خود جا کر اپنے ساتھ اسٹوڈیو لائے گا لیکن وہ اپنے پروگرام سے ہٹ کر کچھ دیر پہلے ہی دفتر سے نکل گیا تھا اور اس اچانک روانگی کی وجہ ایک اچھی ملاقاتی تھا۔ ملاقاتی سے اعجاز کی کیا بات ہوئی تھی اور اس ملاقاتی کے جاتے ہی اعجاز کیوں اپنے دفتر سے روانہ ہو گیا تھا؟ اس بارے میں

کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ ایک اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اعجاز اپنے دفتر سے اپنا بیگ لے کر نکلا تھا لیکن پولیس کی طرف سے گاڑی میں کسی بیگ کی موجودگی سے لاطی کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ چینل والے مسلسل وہ کلپ دکھا رہے تھے جس میں اعجاز اپنا بیگ تھامے گاڑی کی طرف جاتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کلپ کے ساتھ ساتھ ایک دوسرا کلپ بھی دکھایا جا رہا تھا جس میں دیگر لوگوں کے ساتھ ساتھ اس شخص کی ویڈیو بھی دکھائی جا رہی تھی جو آخری بار اعجاز سے ملنے آیا تھا اور جس سے ملاقات کے بعد اعجاز نے دفتر سے باہر جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ معاذ سرسری دلچسپی کے ساتھ اس شخص کی ویڈیو دیکھنے لگا۔ جیز اور لی ٹرٹ میں پلیس وہ ایک دبلا پتلا شخص تھا جس کے چہرے پر مضمی ڈاڑھی موجود تھی اور سر پر گلی کیپ کی وجہ سے اس کا چہرہ واضح نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اپنے سر کو قدرے جھکا کر چل رہا تھا اور غور کرنے پر یہ بات سمجھ آ رہی تھی کہ وہ ایسا دانستہ کر رہا تھا تا کہ اس کا چہرہ جگہ جگہ گئے کسروں کی زد میں آنے سے محفوظ رہے۔ اس شخص کا یہ انداز اسے مشکوک ظاہر کرنے کے لیے کافی تھا، لیکن معاذ کو کوئی اور بات تھی جو بری طرح کھٹک رہی تھی اور وہ جو سرسری نظروں سے فوج کو دیکھ رہا تھا، یہ نظر غائر دیکھنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

غور سے دیکھنے پر چند منٹ میں ہی اس کی الجھن دور ہو گئی اور وہ اس انکشاف پر چونک گیا کہ فوج میں نظر آنے والا شخص وقاص تھا۔ وقاص نے وہی کپڑے پہنے ہوئے تھے جو فلیٹ سے روانہ ہوتے وقت اس کے جسم پر موجود تھے لیکن ڈاڑھی، لی کیپ اور جھکے ہوئے سر کی وجہ سے معاذ فوری طور پر اسے شناخت نہیں کر سکا تھا۔ وقاص نے اسے بتایا تھا کہ وہ ایک صحافی سے ملنے جا رہا ہے اس لیے یہ امر تعجب کا باعث نہیں تھا کہ اعجاز کا آخری ملاقاتی وقاص تھا، لیکن یہ بات تعجب اور شکوک کا باعث تھی کہ وقاص نے اس ملاقات سے قبل خود کو ناقابل شناخت بنانے کی کوشش کی تھی۔ آخر ایسا کیوں تھا؟ معاذ اس سوال کا جواب ڈھونڈ ہی رہا تھا کہ ڈورنیل کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وقاص نے اسے سختی سے ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ کسی کی آمد پر کوئی رسپانس نہیں دے۔ اس کے قیام کے عرصے میں وہاں سرف بنانے والی ایک کمپنی کی سیلر گرلز کے سوا کوئی آیا بھی نہیں تھا اور وہ لڑکیاں بار بار مضمی بجانے کے باوجود کوئی رد عمل ظاہر نہ ہونے پر خاموشی سے واپس چلی گئی تھیں۔ وقاص اکیلا یا ڈاکٹر کے ساتھ جب بھی یہاں آتا تھا، اپنی

لیکن اپنی سخت کو چھپاتا ہوا قدرے ناراض انداز میں اس کی طرف میڈیکل ٹیپ کے کھڑے بڑھاتے ہوئے بولا۔
”انہیں اپنے چہرے پر دو تین جگہ چپکا لو تا کہ تمہارا چہرہ چھپ جائے۔“ معاذ نے اس بار خاموشی سے اس کی بات پر عمل کیا۔ اگلے ہی لمحے وہ اس پناہ گاہ سے نکل کر ڈاکٹر کے ساتھ کسی دوسرے مکان کے کی طرف جا رہا تھا اور ساتھ ہی حیران بھی تھا کہ کیسے وہ ایک اجنبی اور نو عمر لڑکے کی ہدایات پر خاموشی سے عمل کرتا جا رہا ہے۔

☆☆☆

بشری کے لیے آج کا دن بہت اہم تھا کیونکہ وہ ایک بار پھر صحیح راستے سے اپنی لڑائی لڑنے جا رہی تھی۔ عائشہ گھڑار اور گھڑار عام کی اموات کے بعد اس نے ہر طرف سے مایوس ہو کر یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ کسی پرستار نہیں کرے گی اور خود اپنے بھروسے سے انتقام لے گی لیکن وہ ابھی تک کچھ نہیں کر سکی تھی۔ وہ ایک تنہا لڑکی تھی جس کے پاس اتنی بڑی لڑائی لڑنے کے لیے وسائل موجود نہیں تھے۔ واحد اعجاز تھا جس سے اسے کچھ مدد ملی تھی لیکن اعجاز کو اس کے طریقہ کار پر اختلاف تھا اور ہر بار وہ اسے کوئی قدم اٹھانے سے روک لیتا تھا۔ اسی اعجاز نے اسے قائل کر لیا تھا کہ وہ حرد پر اپر چھیل یہ جنگ لڑے اور اس پل اسے لگا تھا کہ اعجاز کے لہجے میں اس کے والد گھڑار عام بول رہے ہیں۔ وہ بھی ہمیشہ سیدھے طریقوں سے کام کرنے کے قائل رہے تھے۔ گھڑار عام کا خیال آجانے پر ہی وہ اعجاز کی بات ماننے پر راضی ہوئی تھی اور اب بے چینی سے پتھر تھی کہ اعجاز اسے اسٹوڈیو لے جانے کے لیے آجائے۔ ڈی این اے نیسٹ کی رپورٹ نے اسے خاص طور پر انصاف کے حصول کے لیے بہت پُر امید کر دیا تھا اور یقین تھا کہ اب باذل نہیں بچ سکے گا۔ باذل پر جرم ثابت ہو جاتا تو پھر یہ ثابت کرنا بھی مشکل نہیں رہتا کہ وہ اپنے آقاؤں کے حکم پر یہ سب کرتا پھر رہا تھا۔ اعجاز کی زبانی اسے معلوم ہو چکا تھا کہ فی الحال پولیس باذل کو گرفتار کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی ہے لیکن باذل کا خیاب اپنی جگہ خود ایک ثبوت تھا کہ وہ مجرم ہے اور سزا سے بچنے کے لیے قانون سے چھپتا پھر رہا ہے۔ اسے یقین تھا کہ باذل ایک بار گرفت میں آگیا تو پھر بھیا تک سزا سے نہیں بچ سکے گا۔ اپنے دشمنوں کے کیفر کردار تک پہنچ جانے کی امید نے اس کے اندر نئی روح پھونک دی تھی۔ جسم و جاں پر گزرنے والے تازہ جادے کے باوجود آج وہ بہت چرخ و گوش اور فضاں نظر آرہی تھی۔ ڈاکٹر طلعت نے بھی

ستمبر 2020ء

چابی سے لاک کھول کر آتا تھا، اس لیے کھنی نہتے پر اس کی آمد کا کوئی امکان نہیں تھا۔ کھنی بہت محنت میں اور بار بار بجائی جا رہی تھی اس لیے یہ سوچنا مشکل تھا کہ کوئی سلاٹر گرل وغیرہ آئی ہوگی۔ قدرے تشویش میں جھلا معاذ دے قدموں دروازے تک گیا اور ڈور آئی سے جھانک کر دیکھا تو وہاں اسے وہ ڈاکٹر کھنر آیا جیسے وقاص ایک دو بار اس کے چیک اپ کے لیے لایا تھا۔ ڈاکٹر نے اپنا چہرہ ڈور آئی کے مقابل اس طرح رکھا ہوا تھا کہ معاذ اسے ابھی طرح دیکھ لے۔ معاذ کی دروازے کے قریب موجودگی کو اس نے محسوس کر لیا اور سرگوشی نما آواز میں بولا۔

”پلیز! دروازہ کھولو۔ یہ ایک ایمر جنسی ہے۔“ معاذ نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ ڈاکٹر سے اسے کسی گڑبڑ کی امید نہیں تھی۔ اگر وہ گڑبڑ کرتا بھی تو معاذ کے اندر اتنا دم تو تھا کہ زخمی ہونے کے باوجود اسے قابو میں کر سکتا۔

”میرے پاس وہی بھائی کا فون آیا تھا۔ انہوں نے کہا ہے کوئی بہت بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے اور تمہیں فوراً یہاں سے شفٹ کرنا ضروری ہے۔“ ڈاکٹر نے پھولی ہوئی سانس کے باوجود ایک سانس میں اپنا جملہ مکمل کیا اور یوں اس کی طرف دیکھنے لگا جیسے وہ فوراً ہی اس کے ساتھ چل پڑے گا۔ معاذ نے ایک نظر پختہ عمر ڈاکٹر اور دوسری ابھی تک فی دی اسکرین پر دکھائی جانے والی وقاص کی فونج پر ڈالی۔ بڑی عجیب بات تھی کہ یہ پختہ عمر کا ڈاکٹر نو جوان وقاص کو بڑے ادب سے وہی بھائی کہہ کر پکار رہا تھا۔

”کیا تم میری بات نہیں سن رہے ہو؟ اگر تمہیں اپنے ساتھ اپنی کوئی بہت ضروری شے لینی ہو تو لے لو اور فوراً میرے ساتھ چلو۔ یہاں تمہارے لیے خطرہ ہے۔“ ڈاکٹر نے اسے یوں ٹیلی ویژن کی طرف متوجہ ہوتے دیکھ کر جھنجھلائے ہوئے لہجے میں ٹوکا۔

”وقاص خود کہاں ہے؟“ معاذ نے اس سے سوال کیا۔

”مجھے نہیں معلوم۔ میرے پاس ان کا فون آیا تھا اور

وہ بہت جلدی میں لگ رہے تھے۔ مجھے تمہارے متعلق ہدایت دے کر انہوں نے فوراً ہی فون بند کر دیا تھا۔ اب تم یہاں سے چلو۔“ ڈاکٹر نے باذل ناخواستہ اس کے سوال کا جواب دیا اور اس کا ہاتھ تمام کر اسے باقاعدہ باہر کی طرف کھینچ لے جانے کی کوشش کرنے لگا۔

”میں خود چلتا ہوں۔“ معاذ نے اپنا ہاتھ ایک جھٹکے سے اس کی گرفت سے چھڑوا لیا تو وہ قدرے خفیف ہو گیا

آج اس کی طرف سے خاصے اطمینان کا اظہار کیا تھا۔ دل میں ڈھیروں امیدیں لیے وہ وقت گزاری کے لیے دن کا بیشتر حصہ ٹیلی ویژن دیکھتی رہی تھی اور اس کا زیادہ تر فوکس اعجاز کے چینل پر رہا تھا۔ مصر کے بعد جبکہ اعجاز کی اس کے پاس کسی بھی لمحے آمد متوقع تھی، اس نے ٹیلی ویژن پر ایک بالکل ناقابل یقین خبر دیکھی۔ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ خون میں تر ہزاروں افراد کا اعجاز ہے۔ زندگی سے بھرپور اعجاز، جو اسے جینے کی آس دلاتا تھا۔ جو حق کی، انصاف کی اور قانون کی باتیں کرتا تھا، کھلی لاقانونیت کا شکار ہو کر مارا گیا تھا اور اس کے مرنے پر ہر طرف شور مچا ہوا تھا۔ بشری کو لگا کہ ایک شور اس کے اندر بھی بلند ہو رہا ہے۔ قل اس کے شورا تباہ ہو جاتا کہ اس کے احصاب اس کا ساتھ چھوڑ دیتے، کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی اور ڈاکٹر طلعت اندر داخل ہوئے۔ ان کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ ان تک بھی خبر پہنچ چکی ہے اور وہ بشری کے رومل کی طرف سے فکر مند ہو کر اس کے کمرے میں آئے ہیں۔ ان کی آمد پر بشری نے لہو رنگ آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا اور پھر دوبارہ ٹیلی ویژن کی طرف دیکھنے لگی۔ وہاں اب کیرامین کی زخمی حالت میں اسپتال منتقلی کا عمل دکھایا جا رہا تھا اور سنسنی خیز لہجے میں قیاس آرائیاں کی جا رہی تھیں کہ اعجاز کے قتل کا اس کے آج کے پروگرام سے شہر اعلیٰ تھا۔

”سسز! ٹی وی بند کر دیں۔ مس بشری کو اس وقت آرام کی ضرورت ہے۔“ ڈاکٹر نے اپنے ساتھ اندر آنے والی نرس کو حکم دیا۔ بشری نرس کو ڈاکٹر کے حکم کی تعمیل کرتا ہوا خاموشی سے دیکھتی رہی۔

”آپ آرام سے بستر پر لیٹ جائیں، مس بشری! اس وقت آپ کے لیے آرام بہت ضروری ہے۔“ ڈاکٹر نے نرم لہجے میں اسے ہدایت کی تو اس نے ایک نظر ڈاکٹر اور دوسری ڈاکٹر کے اشارے پر انجکشن تیار کرنی نرس پر ڈالی اور آہنی لہجے میں بولی۔

”نہیں ڈاکٹر! یہ آرام کا نہیں مل کا وقت ہے۔ اعجاز کے جانے سے اس کا کام اوجھڑا نہیں رہتا جیسے۔ اعجاز کو جس پروگرام سے روکنے کے لیے موت کے لکھا اتارا گیا ہے، وہ پروگرام آج ضرور ہوگا۔“

”لیکن.....“ ڈاکٹر نے کچھ کہنا چاہا۔

”لیکن ویکن کچھ نہیں، ڈاکٹر صاحب! آپ اعجاز کے چینل والوں سے میرا رابطہ کروائیں۔ میں خود انہیں اس

پروگرام کے لیے قائل کروں گی۔“ وہ چٹائی لہجے میں بولی تو ڈاکٹر طلعت نے محسوس کیا کہ ان کے پاس اس کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے اور اس رات بشری نے پاکستانی عوام کے روبرو اول تا آخر اپنی پوری داستان کہہ سائی۔ اس پروگرام نے ہر طرف ایک لہجہ چلا کر رکھ دی۔ مختلف چینلز کے نمائندوں نے عرفان اللہ اور یزدانی کو اپروچ کر کے ان سے بشری کے الزامات کے بارے میں سوال جواب کرنا شروع کر دیے۔ دونوں ہی اس بات سے صاف کمر گئے کہ بشری کی سائی داستان میں کوئی سچائی ہے۔ انہوں نے اسے حلقوں کی چال کے ساتھ ساتھ بشری کی طرف سے انتقامی کارروائی قرار دیتے ہوئے اس پر الزام لگایا کہ اصل میں بشری ایک لالچی لڑکی ہے جس نے پہلے یزدانی ہاؤسنگ اسکیم کے حوالے سے اٹنی سیدھی کہانیاں بنا کر انہیں بلیک میل کرنے کی کوشش کی اور جب وہ اس بلیک میلنگ سے نہیں ڈرے تو آئے روز نئے نئے ڈرامے کرنے لگی۔ عرفان اللہ نے مکمل کر الزام لگایا کہ بشری کو ان کے سیاسی مخالفین کی پشت پناہی حاصل ہے۔ اس ضمن میں اس نے اس امر کی طرف بھی خفیہ سا اشارہ کیا کہ اس کے خلاف پروگرام خاص اس چینل سے پیش کیا جا رہا تھا جو ان کے سیاسی مخالفین کو سپورٹ کرتا ہے۔

اعجاز کی موت کے بعد اس پروگرام نے ایک بھونچال سا پیدا کر دیا تھا۔ ہر طرف تبصرے، تجزیے، قیاس آرائیاں تھیں اور بشری سے ٹیوتوں کا مطالبہ کیا جا رہا تھا۔ بشری کا استدلال تھا کہ سارے ثبوت اعجاز کے پاس تھے اور اگر ثبوت درکار ہیں تو پولیس کو اعجاز کا وہ بیگ حلاش کرنا ہوگا جو دفتر سے روانہ ہوتے وقت اعجاز کے پاس تھا لیکن بعد میں اس بیگ کا کوئی نام و نشان نہیں ملا تھا۔ بیگ کی بازیابی کے ساتھ ساتھ اس نے اس مشکوک شخص کی گرفتاری کا بھی مطالبہ کیا تھا جو اعجاز کے قتل سے پہلے اس سے ملاقات کے لیے آیا تھا اور اس سے ملاقات کے بعد ہی اعجاز اپنے طے شدہ پروگرام سے ہٹ کر دفتر سے باہر نکل گیا تھا۔ اعجاز کے اسسٹنٹ کے مطابق اس شخص نے کوئی ایسی ٹپ دی تھی جسے اعجاز اپنے آج کے پروگرام کے حوالے سے بہت اہم سمجھ رہا تھا لیکن اعجاز کے قتل کے بعد قیاس کیا جا رہا تھا کہ اس شخص کی آمد اصل میں ایک سازش تھی اور بہانے سے اعجاز کو باہر نکلا کر اسے قتل کر دیا گیا تھا۔ بے شمار باتیں تھیں لیکن ان سب باتوں کا حتمی نتیجہ یہ تھا کہ آج ایک بار پھر بشری سچ بول رہی تھی لیکن بغیر ٹیوتوں کے اس کے سچ کو کوئی گھاس ڈالنے

والا نہیں تھا۔ ایسا صرف اس لیے نہیں تھا کہ قانون اندھا تھا، بلکہ اس لیے تھا کہ قانون کی بالادستی کا عہد اٹھانے والے قانون کے رکھوالے کرنسی نوٹوں کی خوشبو سے محبت کرتے تھے اور یہ خوشبو انہیں یزدانی اور عرفان اللہ جیسے لوگوں کے پاس سے ہی آتی تھی۔

☆☆☆

”دکی بھائی کی حاضر دماغی نے تمہیں بچا لیا۔ اگر ان کے کہنے پر میں نے تمہیں یہاں شفٹ نہ کیا ہوتا تو تم گئے تھے کام سے۔“ معاذ اب ایک نئے ٹھکانے پر تھا اور یہاں بھی سابقہ مشغلے یعنی ٹیلی ویژن دیکھ کر حالات سے باخبر رہنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ اس کا یہ ٹھکانا بھی ایک فلیٹ ہی تھا لیکن یہ عمارت پہلی عمارت کے مقابلے میں نئی، صاف ستھری اور کشادہ تھی۔ اس فلیٹ میں ڈاکٹر بھی اس کے ساتھ ہی ٹھہرا ہوا تھا اور بڑی دیر سے کچن میں گھسا کھٹ پٹ کر رہا تھا۔ اب وہ کچن سے برآمد ہوا تھا تو اس کے ہاتھ میں کالج کا ایک بڑا سا پیالہ تھا اور وہ معاذ کو خبر سنا رہا تھا۔

”کیوں، کیا ہوا؟“ معاذ نے ایک نظر اس پر اور دوسری اس کے ہاتھ میں موجود کالج کے شفاف پیالے پر ڈالی۔ پیالے میں نہایت نفاست سے کائے گئے پھلوں کی چاٹ موجود تھی۔

”مجھے ابھی فون پر اطلاع ملی ہے کہ کچھ لوگ اس فلیٹ کا تالا توڑ کر اندر گئے اور وہاں کا سارا سامان الٹ پلٹ ڈالا۔ انہوں نے آس پاس کے لوگوں سے پوچھ گچھ بھی کی کہ اس فلیٹ میں کون رہتا ہے؟“ ڈاکٹر نے اس کے سوال کے جواب میں بتایا اور فروٹ چاٹ سے بھرا بڑا سا پیالہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

”یہ کھالو۔ فی الحال یہاں فروٹ میں صرف فروٹ ہی تھے، اس لیے میں تمہارے ڈزنگ کا بھی انتظام کر سکا ہوں۔ تھوڑی دیر میں یہاں سے ٹکڑوں کا تو تمہارے کھانے پینے کا معقول انتظام کر دوں گا۔“

”ٹھکر یہ..... لیکن اس زحمت کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔“ معاذ نے اس سے پیالہ لے کر بے دلی سے ایک طرف رکھ دیا۔

”تمہارے لیے کھانے پینے میں بے پروائی بالکل بھی مناسب نہیں ہے۔ اگر تم خود کو فٹ اور صحت یاب دیکھنا چاہتے ہو تو اس طرف خصوصی توجہ دینی ہوگی۔ دوا کے ساتھ اچھی خوراک انسان کو روری کرنے میں بہت مدد دیتی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں خیال رکھوں گا۔“ معاذ نے بے دلی

سے جواب دیا اور ڈاکٹر کو فور سے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”وقاص..... میرا مطلب ہے آپ کا دکی بھائی کہاں ہے؟ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”مجھے نہیں معلوم۔ دکی بھائی نے تمہیں یہاں شفٹ کرنے کی ہدایت کے بعد دوبارہ کال نہیں کی ہے۔ کیا تمہیں ان سے کوئی کام ہے؟“ ڈاکٹر نے اس کا خطریہ انداز نظر انداز کر دیا اور سنجیدگی سے پوچھنے لگا۔

”کام تو ہے، لیکن خیر..... جب وقاص آئے گا تو میں خود اس سے بات کر لوں گا۔“

معاذ ابھمن کا شکار تھا اور بار بار اس کے ذہن میں ٹی وی پر دکھائی جانے والی فوج گھوم رہی تھی۔ اسے ننانوے فیصد یقین تھا کہ فوج میں دکھائی دیے والا شخص وقاص ہی ہے اور یہ ایک بڑی ابھمن بھی کیونکہ فوج والے شخص اور اعجاز کے قتل میں گہرا ربط جوڑا جا رہا تھا اور ہر طرف ہی آوازیں بلند ہو رہی تھیں کہ اس شخص نے یہاں سے اعجاز کو باہر نکال کر اس کے قتل کا انتقام کیا تھا۔

”مجھے یقین ہے کہ دکی بھائی یہاں ضرور آئے گا۔ اسے تمہاری بہت فکر ہے۔“ ڈاکٹر نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔

”ایک بات تو بتائیں، ڈاکٹر صاحب! یہ آپ وقاص کو دکی بھائی کیوں کہتے ہیں؟ میرا مطلب ہے وہ آپ کے مقابلے میں اتنا کم عمر لڑکا ہے، پھر اسے اس طرح مخاطب کرنا.....؟“ معاذ نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ ڈاکٹر اس کی بات سن کر پہلے مسکرایا اور پھر رسائیت سے بولا۔

”اکیلا میں ہی نہیں ہوں جو اس نوجوان کو دکی بھائی کہتا ہوں۔ یہاں بہت لوگ ہیں جو انہیں اس انداز میں مخاطب کرتے ہیں اور اس کی کچھ وجوہات ہیں جن میں سے ایک وجہ تو یہ ہے کہ دکی بھائی اپنی عمر سے بہت زیادہ بڑے انسان ہیں اور ایسے انسان کو احترام سے مخاطب کرنے کو سب کا ہی دل چاہتا ہے۔“

”میں سمجھا نہیں۔“ معاذ واقعی اس کی بات کا مطلب نہیں سمجھا تھا۔

”دکی بھائی دیکھنے میں ایک کھلنڈرے اور لاابالی سے نوجوان دکھائی دیتے ہیں لیکن حقیقت میں بہت ہمدرد، باہمت اور کچھ دار انسان ہیں۔ شہر میں کئی گھرانے ایسے ہیں جن کا چولہا دکی بھائی کے دم سے جلتا ہے۔ کئی لوگوں کے مسائل ان کے دم سے حل ہوئے ہیں اور کئی کو انہوں نے ایسے وقت سہارا دیا ہے کہ جب کہیں کوئی سہارا نظر نہیں آتا

ستمبر 2020ء

سسٹیننس ڈائجسٹ 87

مہربانی فرما کر بلیشرز کی حوصلہ کے لیے خرید کر پڑھیے۔

تھا۔ میں خود اس کی ایک مثال ہوں۔ میں چھوٹا سا ایک پرائیویٹ کلینک چلاتا ہوں۔ تم اپنے منہ میاں مٹھو والی بات نہ سمجھو تو کچ یہ ہے کہ اللہ نے میرے ہاتھ میں بہت شفا دی ہے اور میرے چھوٹے سے کلینک پر مریضوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ اکثر مجھے اپنے کلینک سے فارغ ہونے میں آدمی رات ہو جاتی ہے اور کبھی کبھی اس سے بھی زیادہ وقت لگ جاتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا۔ آخری مریض کو فارغ کر کے کلینک بند کرنے میں ایک بجے سے اوپر کا وقت ہو گیا تھا۔ اتفاق سے اس روز میرا کپا ڈنڈ راہنی بیوی کی طبیعت کی خرابی کے باعث جلدی چھٹی لے کر چلا گیا تھا اور اس کی جگہ میں نے اپنے نوجوان بیٹے کو بلوایا تھا۔ ہم باپ بیٹا کلینک بند کر کے گاڑی میں بیٹھ ہی رہے تھے کہ ٹین سٹراڈ نے ہمیں گھیر لیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ کوئی لیرے ہیں، اس لیے میں نے ان سے کہا کہ انہیں جو لہتا ہے لے لیں اور بدلے میں ہمیں خاموشی سے جانے دیں لیکن پتا چلا کہ وہ مال و دولت کے بجائے مجھے لے جانے آئے ہیں۔ ان کا کوئی ساتھی شدید زخمی تھا اور وہ اس کے علاج کے لیے مجھے لے جانا چاہتے تھے۔ اسلئے کی زد پر کوئی انکار نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے بھی نہیں کیا لیکن میں چاہتا تھا کہ وہ میرے بیٹے کو جانے دیں لیکن انہوں نے کہا کہ وہ میرے بیٹے کو بھی ساتھ لے کر جائیں گے تاکہ پیچھے وہ پولیس کو اطلاع نہ دے سکے۔ ہمارے درمیان اس بات پر بحث و تکرار ہونے لگی۔ مجھے ان کے ارادے ٹھیک نہیں لگ رہے تھے اور شک تھا کہ اپنا کام نکل جانے کے بعد وہ ہم باپ بیٹے کو مار ڈالیں گے، اس لیے میں بیٹے کو کسی صورت اپنے ساتھ نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ میری ضد پر ان میں سے ایک نے میرے بیٹے پر گن تان لی اور کہا کہ وہ ابھی اسے مار ڈالے گا۔ اس کے تہوار سے خطرناک تھے کہ لگتا تھا وہ واقعی گولی چلا دے گا اور پھر بچ بچ گولی چل گئی۔ مجھے لگا کہ میرا دل بند ہونے لگا ہے لیکن پھر میں نے عجیب منہ دیکھا۔ گولی چلنے کے بعد میرا بیٹا نہیں بلکہ وہ شخص گرا تھا جو میرے بیٹے پر گولی چلانے والا تھا۔ پہلی گولی چلنے کے بعد تو مجھے وہاں قیامت آگئی۔ مسلح افراد نے اندازے سے ہی قاتر کی سمت گولیاں چلانا شروع کر دیں۔ میں اور میرا بیٹا اس صورت حال پر اتنا ہلکا گئے تھے کہ ہمیں اس بات کا بھی ہوش نہیں تھا کہ خود کو بچنے گرا کر گولیوں کی زد میں آنے سے بچا لیتے۔ اس موقع پر ہمارے اس بھروسے نے ہی عقل مندی اور مہارت سے کام لیا اور ہے تھا شا قاتر تک کے جواب میں خود اندھا دھند قاتر تک کرنے

سے گریز کیا۔ اس نے بہت تاک کر مزید صرف دو گولیاں چلائیں اور باقی دونوں افراد کو بھی گرا دیا۔ ہم باپ بیٹا بچ جانے کے باوجود بھی خوف زدہ تھے۔ اسی شخص نے ساری صورت حال سنجالی۔ ان تین میں سے ایک مر گیا تھا، جو وہ زندہ تھے، ان سے پوچھ چکھ کر کے پولیس نے ان کے ٹھکانے پر چھاپا مارا تو ایک زخمی کے علاوہ ان کے مزید دو ساتھی گرفتار ہوئے اور پتا چلا کہ وہ اسی روز صبح ہونے والی بینک ڈکیتی کی واردات کرنے والا گروہ تھا۔ اس ڈکیتی کی واردات میں بینک سے ڈھائی کروڑ سے زیادہ رقم لوٹنے کے علاوہ ڈاکوؤں نے دو سیکورٹی گارڈز کو بھی موت کے گھاٹ اتارا تھا اور اپنے ایک ساتھی کو زخمی حالت میں لے کر فرار ہوئے تھے۔ ڈاکوؤں کا اتنا بڑا گروہ پکڑوانے پر اس شخص نے خود کو کی کرپٹ نہیں لیا اور سارا کارنامہ پولیس کے کھاتے میں ڈال دیا کہ پولیس کی تحقیقی ٹیم نے ڈاکو کو زبردستی لے جانے کی کوشش کو ناکام بنا دیا اور کارروائی کر کے ڈاکوؤں کو پکڑ لیا۔ اس ساری کارروائی کے دوران میں نے دیکھا کہ پولیس والے بھی اس نوجوان سے نرمی اور احترام سے پیش آرہے ہیں اور اسے وہی بھائی کہہ کر مخاطب کر رہے ہیں تو میں میں بھی اسے وہی بھائی کہنے لگا۔ بعد میں میری اس نوجوان سے دوستی گہری ہوئی تو مجھے احساس ہوا کہ وہ اسی عزت کے لائق ہے۔ ایسے لوگ جو دوسروں کے دکھ اور پریشانی کو اپنا سمجھیں اور اپنے فائدے کی فکر کے بغیر کسی بھی معاملے میں اس لیے کود پڑیں کہ کسی کمزور پر ظلم ہو تا دیکھنا ان کے لیے ممکن نہیں ہوتا، آئے میں تنک کے برابر ہوتے ہیں۔ تم اپنا ہی معاملہ دیکھ لو۔ تمہاری اسٹوری کافی حد تک مجھے معلوم ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ جو لوگ تمہارے خون کے پیاسے بنے ہوئے ہیں وہ کوئی معمولی لوگ نہیں ہیں لیکن پھر بھی دیکھ لو، وہی بھائی بغیر کسی لالچ کے تمہاری مدد کے لیے کھڑے ہو گئے ہیں اور تمہارا ہر طرح سے خیال رکھ رہے ہیں۔“

اس نے ایک چھوٹا سا سوال کیا تھا، جواب میں ڈاکٹر نے پوری داستان سنا ڈالی۔ اپنی بات کے آخر میں ڈاکٹر نے اس کے حوالے سے جو دلیل دی، وہ بالکل نہیں تھی۔ واقعی کوئی تعلق، کوئی واسطہ نہ ہوتے ہوئے بھی وقاص اس کی اس قدر مدد کر رہا تھا تو یہ ایک حیرت انگیز بات تھی اور یہی بات حیرت کو مزید بڑھاتی تھی کہ آخر اعجاز کے کل سے وقاص کا کیا تعلق تھا؟ وہ ابھی اس تعلق کا کوئی سرا ڈھونڈ ہی رہا تھا کہ کہانی وہاں پہنچا دی کہ وہاں کوئی اور ایسا بکر چل کر نہ گئے گا۔ پر وگرام کے

تھا لیکن یہاں مظلوم کی دادری کا نظام ہی کہاں تھا؟ مظلوم کے بچ کے نتیجے میں اس پر شک کے اتنے تیر چلائے جاتے تھے، الزامات کی ایسی بوچھاڑ کی جاتی تھی، سوالوں کے اتنے نشتر چلائے جاتے تھے کہ وہ جو پہلے ہی خود پر جتنی پرہیزگار ہوتا تھا، اتنے سارے حملوں پر بوکھلا کر بالکل ہی اودھ موا ہو جاتا تھا۔ بشری کے ساتھ بھی یہی سب کچھ ہو رہا تھا۔ اس سے پوچھا جا رہا تھا کہ وہ پہلے کیوں خاموش رہی؟ اس نے اپنے ماں باپ کی موت کے وقت باذل کا نام کیوں نہیں لیا؟ معاذ سے اس کا کیا تعلق ہے؟ وہ اپنا گھر بچ کر میڈم نازلی کے بدنام زمانہ ہاسٹل میں کیوں رہ رہی تھی؟ معاذ سے اس کی دوستی کی نوعیت کیا ہے؟ کیا اس نے دیکھا تھا کہ میڈم نازلی کے ہاسٹل میں اسے زیادتی کا نشانہ بنانے والا شخص باذل ہی تھا؟ وہ جس ڈی این اسے رپورٹ کا ذکر کر رہی ہے، وہ رپورٹ کہاں ہے؟ ایسے اور اس جیسے کئی دوسرے سوالات تھے جو اس سے لگے جا رہے تھے۔ وہ ان سوالوں کے جواب دینے کی کوشش کرتی تھی تو اس کی بات پوری طرح سننے بغیر اس پر مزید سوالوں کی پلکار کر دی جاتی تھی۔

وہ ماضی میں ایک نہایت پُر اعتماد اور بولڈ لڑکی ہوا کرتی تھی لیکن اب اتنے بڑے بڑے حادثات سے گزر کر آنے کے بعد ظاہر ہے اس کی خود اعتمادی اور بولڈنیس کا گراف نیچے چلا گیا تھا۔ معاذ کو اس کا بوکھلانا، گھبرانا، بار بار چپ ہو جانا تکلیف دے رہا تھا اور یاد آ رہا تھا کہ وہ کتنا بے تحاشا اور بے ٹکان بولا کرتی تھی۔ اس پیاری لڑکی کا یہ بدلا ہوا روپ اس کے لیے اس لیے بھی زیادہ تکلیف کا باعث تھا کہ اسے معلوم تھا کہ اس نے جو دکھ اٹھائے ہیں ان دکھوں کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ وہ معاذ سے محبت کرتی تھی اور اس محبت میں اپنی طاقت سے زیادہ جدوجہد کرتی رہی تھی یا پھر یہ تھا کہ اس کے دشمن ہی بہت ٹھنڈا اور بچے تھے جنہوں نے خود کو بچانے کے لیے سامنے والے پر اس کی استعداد سے زیادہ ظلم ڈھایا تھا۔ حسنین کی دردناک موت بھی ان کے ظلم کا ایک ثبوت تھی لیکن یہ سارے ثبوت بے کار تھے کہ انہیں کسی عدالت میں پیش نہیں کیا جاسکتا تھا اور عالم بڑی مکاری سے کہہ رہے تھے کہ یہ سارے الزام جھوٹے ہیں۔ ان کے خلاف کارروباری اور سیاسی جھگڑے ہیں، میڈیا وار ہے۔ ان کے پاس ہر دعوے والے روز باذل کی کہیں اور موجودگی کے ثبوت اور یحییٰ شاہدین موجود تھے۔ ایسے میں بچ کون سنا اور اس پر کتنوں کو یقین آتا۔

☆☆☆

ستمبر 2020ء

آغاز میں اس نے اعجاز کے قتل پر افسوس اور اٹکھار بند مت کیا، پھر اس بات کو واضح کرتے ہوئے کہ وہ نہیں جانتا کہ آج کے پروگرام میں اعجاز کس حقیقت سے پردہ اٹھانے والا تھا، بتایا کہ مشہور صحافی گزار عامم کی بیٹی، بشری گزار کے اس دعوے کے بعد کہ وہ اعجاز کے پروگرام کی نوعیت سے اچھی طرح واقف ہیں، انہیں اس پروگرام میں پیش کر رہا ہے۔ بشری گزار اس پروگرام میں جو کچھ کہیں گی اس سے میزبان کا یا ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ میزبان کی اس ساری وضاحت کے بعد کیرا بشری پر ڈالا گیا اور جانے کتنے دنوں بعد معاذ نے بشری کا چہرہ دیکھا اور دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ جب کیرا بشری کے لیے گیا تھا تو تب بھی بشری کچھ اچھے حال میں نہیں تھی اور کار کے حادثے کے بعد بستر پر پڑی ہوئی تھی لیکن اب... اب تو وہ کوئی مُردہ لگ رہی تھی، جسے قبر سے اٹھا کر بولنے کی صلاحیت دے دی گئی تھی۔ رنگت کا پیلا پن سنہری بالوں کی وجہ سے کچھ اور نمایاں ہو رہا تھا۔ جسم کے کھلے حصوں پر پاتو جا بجا میڈیکل ٹیپ چسکی ہوئی تھی یا مندل ہوتے زخموں کی گھرنڈ نظر آرہی تھی۔ بدلیسی ماں سے ورثے میں ملی خوبصورت آنکھوں سے ان کی مخصوص چمک غائب تھی اور اس چمک کی جگہ غم، غصے اور بے بسی نے لے لی تھی۔ خوبصورت سانچے میں ڈھلا بازک سا بدن ہڈیوں کا بھجور بن کر رہ گیا تھا۔ کہنے کو وہ بشری تھی لیکن اس میں سے بشری کی جملہ صفات غائب ہو چکی تھیں اور وہ بشری کے بجائے اس کی پرچھائیں محسوس ہوتی تھی۔

معاذ دکھ اور حیرت کے عالم میں اسے بولتا ہوا دیکھتا رہا۔ وہ شروخ سے اب تک خود پر جتنی ظلم و زیادتی کی داستان سناری تھی اور معاذ کے سارے وجود میں تیر سے اترتے جا رہے تھے۔ کیا جرم تھا اس پیاری لڑکی کا؟ صرف یہی تا کہ اس نے کچھ لوگوں کا فراڈ کھول کر لوگوں کو بچ سے آگاہ کرنا چاہا تھا۔ انہیں بتانا چاہا تھا کہ یزدانی ہاؤسنگ اسکیم میں وہ جو اپنے خوابوں کا آشیانہ بنانے جا رہے ہیں، اس آشیانے کی بنیادیں دھوکے پر رچی گئی ہیں۔ دوسرا بچ اس نے معاذ کی تشدد کی کے حوالے سے بولا تھا اور ان لوگوں کی نشاندہی کی تھی جن کا معاذ کے غیاب میں ہاتھ تھا، جس پر وہ طاقت میں بدست ہاتھی مزید چراغ پا ہو گئے تھے اور اس کمزوری لڑکی کا آشیانہ ہی اجاڑ ڈالا تھا۔ اتنے ظلم کے بعد بھی شاید انہیں اس لڑکی سے کوئی خطرہ تھا جو انہوں نے دکھوں سے نڈھال اس کے وجود کو ایک بار پھر بری طرح روند ڈالا تھا۔ وہ اپنے لب نہ بھی کھولتی تو اس کا حال اس پر جتنی ساری داستان ستارہا

سر پر ہیلمٹ لگائے وقاص، اعجاز کے چمیل والے روڈ کے اگلے چوراہے پر اپنی بائیک سمیت موجود تھا۔ وہ معاذ کے معاملے میں بہت محتاط تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ کوئی شخص اعجاز کا تعاقب کر کے معاذ تک پہنچ جائے، اس لیے اپنی طرف سے اس امر کو یقینی بنانے کا پلان بنایا تھا کہ کوئی اعجاز کا تعاقب کرے۔ اسے اعجاز کے تعاقب کا اس لیے اندیشہ تھا کہ آج اعجاز کوئی بہت اہم پروگرام کرنے والا تھا اور اسے معلوم تھا کہ اس کی اپنی صحافی برادری کے لوگ اس کی بوسہ گھسیٹے پھر رہے ہوں گے۔ اس کا ایک آدمی چمیل کے دفتر کے سامنے متعین تھا جو اعجاز کے روانہ ہوتے ہی اسے اطلاع دے دیتا۔ حسب توقع اسے اعجاز کی روانگی کی اطلاع ملنے میں زیادہ دیر نہیں لگی اور اسے اس کے ساتھی نے اطلاع دی کہ اعجاز اپنے ایک ساتھی کے ساتھ اپنی گاڑی میں دفتر سے باہر آ رہا ہے۔ اس اطلاع کو سن کر وقاص نے اپنی موٹر سائیکل اسٹارٹ کرنے کے لیے کلک لگائی اور اپنے ساتھی کو کوئی ہدایت دینے لگا لیکن پھر فائرنگ کی جیز آواز میں اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ فائرنگ کی یہ آواز اسے ایسے بھی سنائی دے رہی تھی اور سوائل کے آہٹکے سے بھی بلند ہو رہی تھی جس کا مطلب تھا کہ فائرنگ اسی جگہ ہوئی ہے جہاں اس کا ساتھی موجود تھا۔

”کیا ہوا موسیٰ؟“ اس نے چیخ کر اپنے ساتھی سے پوچھا۔
”اعجاز کی گاڑی پر کسی نے فائرنگ کی ہے وہ کی اور میرے خیال میں اعجاز نہیں بچا۔ اس کے سر میں گولی لگتے میں نے خود دیکھی ہے۔“ دوسری طرف سے اس کے ساتھی نے بھائی لہجے میں جواب دیا۔

”وہاں! کس نے کی ہے یہ فائرنگ؟“ وقاص دہاڑا۔
”میں نہیں دیکھ سکا لیکن ایک سپاہ لینڈ کروزر فائرنگ کے فوراً بعد بہت تیزی سے وہاں سے نکلے۔“ موسیٰ اسے بتا رہا تھا کہ وقاص نے اپنے قریب سے ایک لینڈ کروزر کو طوفانی رفتار سے گزرتے ہوئے دیکھا۔

”میں نے اس لینڈ کروزر کو دیکھ لیا ہے۔ تم میرے پیچھے آؤ، ہم اس کا تعاقب کریں گے۔“ وقاص نے اپنے ساتھی کو حکم دیا اور خود لینڈ کروزر کے پیچھے لگ گیا۔ لینڈ کروزر آس پاس کی گاڑیوں کا خیال کیے بغیر کسی سائڈ کی طرح سڑک پر دوڑتی جا رہی تھی۔ حادثے سے بچنے کے لیے دوسرے گاڑی والوں کو خود ہی اسے راستہ دینا پڑ رہا تھا۔ وقاص ماہر بانیکر نہیں ہوتا تو اس کا تعاقب نہ کر پاتا اور بالآخر حادثے کا شکار ہو جاتا لیکن اس کی مہارت کام آئی اور

ٹریفک کے ازدحام میں وہ کامیابی سے لینڈ کروزر کے تعاقب میں لگا رہا۔ لینڈ کروزر راہی رفتار سے بھاگتی ہوئی ایسی سڑکوں پر مڑنے لگی کہ وقاص کو شک ہوا کہ وہ شہر سے باہر جانے والے راستے کی طرف جا رہی ہے۔ وہ موسیٰ کو بھی اپنی لوکیشن سے آگاہ کرتا رہا۔ ونڈ فری کے استعمال کی وجہ سے اسے موسیٰ سے بات کرنے میں آسانی تھی۔ موسیٰ بھی اسی کی طرح بہت ماہر بانیکر تھا اس لیے زیادہ وقت لگائے بغیر خود بھی اس کے قریب پہنچ گیا تھا۔

”اب میں تھوڑا پیچھے رہ جاؤں گا اور تم لینڈ کروزر کا تعاقب کرنا۔ میں نہیں چاہتا کہ مجھے مسلسل اپنے پیچھے دیکھ کر انہیں تعاقب کا اندازہ ہو جائے۔“ وقاص نے موسیٰ کو اپنے پروگرام سے آگاہ کیا اور اپنی بائیک کی رفتار تھوڑی سی کم کر لی۔ تھوڑی دیر میں موسیٰ اور لینڈ کروزر دونوں اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئے لیکن موسیٰ سے مسلسل رابطے کی وجہ سے وہ ان کی لوکیشن سے آگاہ تھا اور اس کے اس اندازے کی تصدیق ہو گئی تھی کہ لینڈ کروزر شہر سے باہر جانے والے راستے کی طرف جا رہی ہے۔

”میں اپنی بائیک لینڈ کروزر سے آگے لے جا رہا ہوں وہی، تاکہ انہیں لگے کہ میں اپنے راستے پر جانے والا عام سامان سفر ہوں۔ یہ سڑک بالکل سیدھی جا رہی ہے اس لیے یہ ڈر نہیں ہے کہ لینڈ کروزر درمیان میں کہیں مڑ جائے گی۔“ کچھ دیر بعد موسیٰ نے اسے اطلاع دی۔

”ٹھیک ہے۔ تم سیدھے نکلتے چلے جاؤ۔ اب میں ان لوگوں کو چیز کروں گا۔“ وہی نے اسے ہدایت دی اور خود اپنی بائیک کی رفتار بڑھادی۔ ونڈ فری پر اسے موسیٰ کی بائیک کے علاوہ ایک آدھ دوسری گاڑیوں کے انجنوں کی بھی ہلکی ہلکی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ان آوازوں کے درمیان اس نے اچانک ہی ایک ہلکے سے دھماکے کی آواز سنی۔

”کیا ہوا ہے موسیٰ، سب ٹھیک تو ہے؟“ بے ساختہ ہی اس نے چیخ کر پوچھا لیکن پھر احساس ہوا کہ اس کا موسیٰ سے رابطہ منقطع ہو گیا ہے۔ کسی انہونی کے خیال سے اس کے ہونٹ بھیچ گئے اور بائیک کی رفتار انتہائی حد تک بڑھادی۔ چند منٹ میں وہ اس سڑک پر پہنچ چکا تھا۔ سڑک پر پہنچتے ہی اس نے دیکھ لیا کہ ایک مقام پر حادثے کا منظر ہے۔ گری ہوئی بائیک، پولیس موبائل اور ایک نوجوان کرولا اس منظر کا اہم حصہ تھے۔ نوجوان کرولا کے ڈرائیور اور پولیس والوں نے مل کر ایک جگہ جھوم کر رکھا تھا۔ وقاص نے اپنی بائیک سیدھی اس جھوم کے پاس لے جا کر روکی اور بھاگتا ہوا ان لوگوں

کے درمیان سے راستہ بنا کر نیچے پڑے موی تک پہنچا۔ وہ بے ہوش تھا اور اس کی دائیں ٹانگہ غیر فطری انداز میں مڑی ہوئی تھی۔

”کیا ہوا؟ کیا ہوا ہے اسے؟“ وہ دیکھ چکا تھا کہ موی کے جسم کے کسی حصے سے خون نہیں بہہ رہا ہے لیکن وہ بے ہوش تھا تو یہ ایک تشویش ناک بات تھی اس لیے چیخ کر پوچھنے لگا۔ ”تو کون ہے اوئے، اس لڑکے کو جانتا ہے کیا؟“ پولیس والوں نے اس کی موی سے وابستگی بھانپ لی اور گھر درے لہجے میں پوچھا۔

”میں وقاص ہوں اور یہ میرا دوست معمر ہے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے؟“ اس بار اس نے خود پر قابو پا کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ موی کے حادثے نے فی الحال اسے لینڈ کروزر والوں کی فکر سے آزاد کر دیا تھا اور وہ جانتا چاہتا تھا کہ موی کے ساتھ کیا ہوا ہے؟

”یہ ایک بڑی گڈی کو اور ٹیک کر رہا تھا کہ گڈی نے اسے سائڈ ماری اور تیزی سے آگے نکل گئی۔ ہم پیچھے آ رہے تھے لیکن فاصلہ زیادہ تھا اس لیے گڈی کو نکلنے کا موقع مل گیا۔ یہ بے ہوش ہو کر سڑک پر پڑا تھا اس لیے ہمارا اس کے پاس رکنا ضروری تھا۔“ ایک پولیس والے نے اسے بتایا۔

”اور یہاں رک کر آپ کیا کر رہے ہیں؟ اسے اسپتال کیوں شفٹ نہیں کرتے؟“ وقاص نے جھنجھلا کر کہا۔ ساتھ ہی وہ موی کے چہرے کو حقیقتاً کرا سے ہوش میں لانے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔

”ایمبولینس کو کال کر دی ہے، آئی ری ہوگی۔“ پولیس والے نے منہ بنا کر جواب دیا۔ ابھی اس کا جملہ مکمل ہی ہوا تھا کہ فضا میں ایمبولینس کا سائرن گونجنے لگا۔ موی کو فوری طور پر ایمبولینس میں منتقل کر کے اسے اسپتال روانہ کر دیا گیا۔ وقاص کی بائیک اور پولیس والوں کی موبائل ساتھ ساتھ تھی۔ وقاص نے پہلے ہی موی کو شہر کے ایک بہت بڑے ٹی اسپتال لے جانے کا کہہ دیا تھا اس لیے ایمبولینس کا رخ اسی طرف تھا۔ اعجاز کے دفتر سے نکلنے کے بعد وہ اپنے چہرے پر چٹکی ڈاڑھی اور سر پر پہتانی کیپ اتار کر پیچک چکا تھا۔ یہی سلوک اس نے اپنی شرٹ کے ساتھ بھی کیا تھا اور اب اس کے جسم پر اندر پہنی ہوئی ہلکی پھلکی ٹی شرٹ موجود تھی۔ اس صبح میں وہ اس وقاص سے بالکل مختلف لگ رہا تھا جس نے اسنوڈیو میں اعجاز سے ملاقات کی تھی، اس لیے فی الحال اسے اپنے پہچان لے جانے کا کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن مختصر وقت میں ہونے والے

دو حادثوں نے اسے پہلے سے زیادہ چمکنا کر دیا تھا۔ اسپتال کی طرف جاتے ہوئے راستے میں ہی اس نے ڈاکٹر کو کال کی اور معاذ کو دوسری جگہ منتقل کرنے کی تاکید کر دی۔ اسپتال پہنچ کر وہ موی کے سلسلے میں بھاگ دوڑ کرنے لگا۔ ٹی اسپتال تھا، سومریض کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور وقاص کو سلی دی گئی کہ اس کے مریض کو ہر ممکن بہترین طبی امداد دی جائے گی۔ ادھر پولیس والوں نے تازہ لیا تھا کہ اس کی جیب میں مال ہے اور وہ اچھی پارٹی ہے، سو وہ بھی اپنی جیبیں بھرنے کے چکر میں اس کے پیچھے پڑے ہوئے تھے اور اس سے اگلے سیدھے سوالات کر رہے تھے۔ وہ جانتا چاہتے تھے کہ لینڈ کروزر نے موی کی بائیک کو کیوں ٹکرایا؟ وقاص نے اسے کہانی سنائی۔

”میں اور میرا دوست معمر یونہی تفریح کے لیے نکلے ہوئے تھے۔ راستے میں ہمیں ریس لگانے کی سوجھ بوجھ نہیں لگاتے ہوئے موی مجھ سے آگے نکل گیا اور پھر اس کے ساتھ وہ حادثہ پیش آ گیا۔ میرے خیال میں گاڑی والوں نے اسے ٹکرائیں ماری ہوگی بلکہ تیز رفتاری کے باعث وہ اور ٹیک کرتے ہوئے خود ہی زد میں آ گیا ہوگا۔“ اس کے اس بیان میں پولیس والوں کے لیے آسانی تھی اور انہیں ہاتھ بچر بلانے بغیر حادثے کی ذمہ داری لڑکے کی ہے پر وائی پر ڈال کر آرام سے بیٹھ جانا تھا۔ وقاص کے بیان کو قبول کرنے میں انہیں کوئی تامل اس لیے بھی نہیں تھا کہ وقاص نے چائے پانی کے خرچے کے نام پر انہیں اچھی خاصی رقم سے نوازا دیا تھا۔ پولیس والوں سے جان چھوٹ جانے پر اسے آزادی نصیب ہوئی تو ادھر ادھر کے حالات معلوم کرنا شروع کیے۔ اعجاز کی موت کی تصدیق ہو گئی، معاذ کے محفوظ ٹھکانے پر منتقلی کا بھی پتا چل گیا۔ اپنی مشکوک سی سی ٹی وی فوٹیج کے بارے میں بھی علم ہو گیا اور ایسے ہی آہستہ آہستہ ہر خبر علم میں آتی رہی۔ خبروں کے حصول کے ساتھ ساتھ وہ موی کی خیریت بھی معلوم کرتا جا رہا تھا۔ موی اس کا کوئی عام ساتھی نہیں تھا۔ وہ اس کا بہت پرانا دوست تھا اور اس کے لیے وہ اتنا فکر مند تھا کہ ایک ہل کے لیے اسپتال سے کہیں جانا گوارا نہیں کیا تھا، حالانکہ وہ چاہتا تو اس کے ایک اشارے پر دس بندے یہاں اس کی جگہ آکھڑے ہوتے۔ اپنے کسی بھی ساتھی کو کال کرنے کے بجائے اس نے صرف ایک ہستی کو کال کی تھی۔ وہ ہستی موی کی غیر اعلانیہ منجیتر نیلو فر عرف نیلی تھی۔ نیلی اس کی کال پر دوڑی چلی آئی تھی۔

”کیا ہوا ہے وہی بھائی! کسے ایکسٹنٹ ہو گیا ہے مومی کا؟“ خود کو سنبھالتے سنبھالتے تھی نیلی کی سسکیاں نکل گئی تھیں۔

”اتنی بہادر ہو کر روتی ہے۔ رونا دھونا گھر میں بیٹھ کر برتن مانجنے والی لڑکیوں کا کام ہے۔ تیرے بھی تیس فٹ اونچی رسی پر سے پلک جھپکتے ہی گزر جانے والی لڑکی روتی اچھی نہیں لگتی۔“ وقاص نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے سمجھایا۔

”وہ دوسری بات ہے وہی بھائی! پر مومی کی بات الگ ہے۔ مومی کے معاملے میں، میں بہت بزدل ہوں۔“ نیلی نے جذباتی لہجے میں اسے جواب دیا لیکن فیرا اختیاری طور پر وہ اپنے آنسو صاف کرتی جا رہی تھی۔

”کوئی دوسری بات نہیں ہوتی نیلی! تو مومی کے پیچھے موٹر سائیکل پر بیٹھ کر موت کے کنوئیں کا چکر لگاتی ہے تو کیا تجھے معلوم نہیں ہوتا کہ کبھی بھی، کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ تو نے ساری زندگی سرکس میں کام کرتے گزاری ہے، تجھ سے زیادہ کون جان سکتا ہے کہ بڑے بڑے بازی گروں کی بازی ایک ہل میں ہلٹ جاتی ہے۔ اس دنیا کو بھی ایک سرکس یا موت کا کنواں ہی سمجھ جہاں کس کی بازی کب پٹ جاتے، کچھ پتا نہیں ہوتا۔“ وقاص کے لہجے میں زندگی کی تنخیاں بول رہی تھیں۔

”کیا مومی کی حالت بہت خراب ہے؟“ نیلی اس کی منگھلو سے مزید دہلی گئی۔

”اچھی حالت میں اسپتال کے بستر پر آ کر لیٹ جانے والے وزیر، سفیر، بیوروکریٹس وغیرہ ہوتے ہیں۔ ہم جیسے تو بڑے حالوں میں ہی یہاں آتے ہیں، پر تو گھر نہ کر، اپنا مومی اچھا ہو جائے گا۔ میری ڈاکٹر سے بات ہوئی ہے، سارے ٹیسٹ وغیرہ لے لیے ہیں اس کے۔ نوٹی ٹائیک کا پلاسٹر بھی کر دیا ہے۔ اللہ نے چاہا تو وہ ٹھیک ہو جائے گا۔“ سچ لہجے میں بولتے بولتے اسے احساس ہوا کہ وہ نیلوفر کو مزید پریشانی میں مبتلا کر رہا ہے تو اپنی ٹون بدلی اور اسے تسلیم دینے لگا۔ اس کے بعد ان میں زیادہ بات چیت نہیں ہوئی اور دونوں ہی اپنی اپنی جگہ بیٹھے انتظار کرنے لگے کہ دیکھو مومی کے متعلق کب کیا اطلاع ملتی ہے۔ نیلی کے ہلتے لب ظاہر کر رہے تھے کہ وہ زیر لب کچھ پڑھنے میں مصروف ہے۔ یقیناً مومی کی سلامتی کے لیے دعا کی ہی مانگ رہی تھی۔ عام سے قمیص شلوار اور دوپٹے میں ملبوس انہیں بیس سال کی اس دہلی پتل، سلونی سی بوئے قد کی لڑکی کو دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں

کر سکتا تھا کہ وہ کیسی ماہر فن اور جی دار ہے۔ تنی ہوئی رسی کو بغیر سہارے کے مہارت سے پار کر جانا، موت کے کنوئیں میں موٹر سائیکل چلاتے سوار کے پیچھے بیٹھ کر کر تپ دکھانا، آگ کے دائرے میں سے ہوا کی طرح گزر جانا، سر پر سیب رکھ کر بندوق تانے نٹانے باز کے سامنے بغیر جنبش کیے کھڑے رہنا سب آتا تھا اس لڑکی کو۔ وہ اپنے سرکس کی جان تھی اور خود اس کی جان مومی میں تھی، اس لیے اس وقت اس کا حال بُرا تھا۔ وقاص اس کے حال سے بے خبر نہیں تھا۔ خود اس کے اندر بھی بے چینی پھیلی ہوئی تھی لیکن وہ خود کو نارمل ظاہر کرنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ موبائل پر اپ ڈیٹس لینے اور ہدایتیں دینے کا سلسلہ بھی جاری رکھا ہوا تھا لیکن دھیان بہر حال مومی کی طرف ہی تھا۔ اللہ اللہ کر کے انتظار کی مشکل گھڑیاں گزریں اور انہیں مومی کی طرف سے یہ مثبت خبر ملی کہ کوئی بہت زیادہ تشویش ناک بات نہیں ہے۔ سر پر گرنے سے اندر روتی چوٹ ضرور آئی ہے لیکن معمولی نوعیت کی ہے اور دواؤں کے استعمال سے علاج ہو جائے گا۔ اس خبر کے ساتھ ہی دوسری اچھی خبر یہ ملی کہ مومی ہوش میں آچکا ہے لیکن فی الحال اس سے کسی کو ملنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ وقاص اور نیلی نے اصرار کیا تو انہیں بس اتنی اجازت ملی کہ وہ باہر شیشے میں سے اس کی ایک جھلک دیکھ سکتے ہیں۔ دونوں اسی پر راضی ہو گئے۔ شیشے کے پار مومی بستر پر اسپتال کے مخصوص کپڑوں میں لیٹا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں ملٹی ہوئی تھیں لیکن وہ دواؤں کے زیر اثر معلوم ہوتا تھا اور نظریں ایک تک چپٹ پر تکی ہوئی تھیں۔

”مومی ٹھیک ہو جائے گا نیلی! وہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینے والا بندہ ہے۔ اسے زندگی کی بازی جیتنے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔“ وہ خود جواتی دیر سے امید و نیم کے درمیان اٹکا ہوا تھا، مومی کی کھلی آنکھیں دیکھ کر جی اٹھا اور نیلوفر کو یقین دلانے لگا۔ نیلوفر نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا اور دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ کر آنسو بہاتی آنکھوں سے اپنے رب کا شکر ادا کرنے لگی جس نے اسے اس کے مومی کی زندگی کی امید دلادی تھی۔

☆☆☆

کافی رات ہو چکی تھی لیکن نیند معاذ کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ڈاکٹر اسے آرام کرنے کی ہدایت دے کر اپنے کلینک کے لیے روانہ ہو چکا تھا۔ روائی سے قبل اس نے کھانے پینے کا کچھ سامان بھی فلیٹ میں لا کر رکھ دیا تھا اور بتایا تھا کہ کلینک سے وہ اپنے گھر چلا جائے گا اور صبح کسی وقت

ہیں یا گھور کو تھوڑی سی زحمت کرنی پڑے گی۔" لفٹ میں کا نرمی سے دیا ہوا جواب بھی اسے اپنے منہ پر ملانے کی طرح لگا تھا۔ وہ بہت مہذب لہجے میں اسے دھمکا رہا تھا اور وہ مجبور تھا کہ اپنی حالت اور حالات دلوں کی وجہ سے کسی سے جھگڑا نہیں مول لے سکتا تھا۔

لفٹ اوپر جا کر رہی تو کسی کے کچھ کہے بغیر ہی وہ اپنے لیے مخصوص فلیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ سیکورٹی گارڈ فلیٹ کے دروازے تک اس کے پیچھے آیا۔ معاذ نے اندر جانے کے بعد بیرونی دروازہ اس زور سے بند کیا جیسے سیکورٹی گارڈ کے منہ پر مار دینے کی خواہش رکھتا ہو لیکن ظاہر ہے اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہو سکی۔ اندر آنے کے بعد بھی وہ بڑی دیر تک فیسے سے مل کھاتا رہا۔ فلیٹ کا دروازہ ان لاک جھوڑ کر وہ لوگ مسلسل اسے اس دھوکے میں رکھے ہوئے تھے کہ وہ اپنے ہر عمل کے لیے آزاد ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ ڈاکٹر نے بھی اسے بڑی کامیابی سے بے وقوف بنایا تھا اور ڈر میں فروٹ چاٹ کھانے کے بعد ضرورت کا تھوڑا سا سامان تھا کر چلا گیا تھا حالانکہ وہ چاہتا تو اپنے زر خرید غلاموں سے بیٹھے بیٹھے بھی سب کچھ منگو سکتا تھا لیکن پھر معاذ کو اس کی آزادی کا دھوکا کیسے دیا جاتا۔ اس پر اپنی نام نہاد آزادی کا بھانڈا اچھوتا تو یہ بات بھی سمجھ میں آئی تھی کہ پچھلے فلیٹ میں بھی اس کی نگرانی کے لیے ایسا انتظام کیا گیا ہوگا لیکن اس نے وہاں پر باہر نکلنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی اس لیے بے خبر رہا تھا۔ اپنے آپ کو یوں بے وقوف بنائے جانے پر وہ بیضا تار کا کھاتا رہا۔ ساتھ ہی یہ فکر بھی لگ گئی کہ جانے وقاص اور اس کے ساتھیوں کی حقیقت کیا ہے اور ہمدردی کی آڑ میں وہ اس کے ساتھ کیا کرنے والے ہیں۔ بظاہر تو ابھی تک اس کے ساتھ کچھ غلط نہیں ہوا تھا لیکن کون کیا چال چل رہا تھا اس کا بھی تو علم نہیں تھا اور کچھ نہیں تو رہ کر وقاص کی فی دی پر دکھائی جانے والی فوج ہی یاد آ جاتی تھی اور یوں لگتا تھا کہ وہ کسی خطرناک گینگ کا بندہ ہو۔ انہی سوچوں میں کم اس نے کی ہول میں چھائی گھونسنے کی آواز سنی اور وقاص کو دروازہ کھولتے اندر داخل ہوتے دیکھا تو اسے ذرا توتلی نظروں سے دیکھنے لگا۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟ کہیں میرے سینک تو نہیں نکل آئے ہیں؟" اسے خود کو یوں گھورتا ہوا کہ اس نے ہلکے ہلکے لہجے میں پوچھا اور ذہن پر پڑے کشتور پڑا حیر ہو گیا۔ اس نے ابھی تک وہی کپڑے پہنے ہوئے تھے جو معاذ نے فوج میں دیکھے تھے البتہ شرٹ ٹھیک تھی۔

ستمبر 2020ء

وہاں کا چکر لگائے گا۔ اس نے توقع ظاہر کی تھی کہ شاید رات میں کسی وقت دکی بھائی فلیٹ پر آجائے لیکن یہ کوئی پکی بات نہیں تھی، پھر بھی معاذ ایک سوہوم سی امید کے سہارے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ نیند اسے یوں بھی نہیں آرہی تھی۔ بے بسی کے احساس نے طبیعت پر بیزاری طاری کر رکھی تھی اور اسے یوں لگ رہا تھا کہ وہ اپنے شہر میں واپس آ کر بھی کیرتھر کی پیاز یوں میں ہی اس بستی میں رہ رہا ہے جہاں رہ کر وہ ساری دنیا سے کٹ گیا تھا، بلکہ وہاں رہنا بھی کسی حد تک آسان تھا کہ کھلی فضا میں سانس لینے اور انسانوں سے رہا ضبط کی تو سہولت تھی۔ یہاں تو وہ ان سہولیات سے بھی محروم تھا۔ وہاں اسے کسی کے متعلق کوئی تکلیف دہ خبر بھی نہیں ملتی تھی لیکن یہاں وہ سب خبریں سن رہا تھا اور بے بس تھا کہ کسی کے لیے کچھ کر بھی نہیں سکتا ہے۔ بے بسی کی اسی شدید کیفیت کے تحت اس نے وقاص اور ڈاکٹر کی ہدایات کے برخلاف یہاں سے نکلنے کی بھی کوشش کی تھی لیکن اس کوشش میں اس پر ایک نیا انکشاف ہوا تھا۔ وہ فلیٹ سے نکل کر نیچے اترنے کے لیے لفٹ میں سواری ہوا تھا کہ لفٹ میں نے اسے گھورنا شروع کر دیا اور پھر مرد لہجے میں پوچھا۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں سر؟"

"نہیں نہیں بھی جاؤں، نہیں اس سے مطلب؟" معاذ اس کے سوال پر بگڑ گیا۔

"مطلب ہے سر! یہ ہماری ڈیوٹی ہے کہ آپ کو یہاں سے کہیں نہیں جانے دیں۔ ہاں، اگر آپ کو کوئی ضرورت ہے تو ہمیں بتا سکتے ہیں۔" لفٹ میں نے مہذب لہجے میں اسے آگاہ کیا۔ اس دور ان لفٹ گراؤنڈ فلور پر پہنچ چکی تھی۔ لفٹ کا دروازہ کھلا اور سیکورٹی گارڈ کی یونیفارم میں ملیوں ایک شخص اندر داخل ہوا۔ ہماری تن و توش کے اس آدمی کے بائیں ہاتھ میں ایک جدید گن بھی موجود تھی۔

"صاحب کو اوپر ان کے فلیٹ پر واپس چھوڑ دو گھور اور ان سے پوچھ لو کہ انہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟" لفٹ میں نے سیکورٹی گارڈ سے کہا تو معاذ سمجھ گیا کہ اسی نے اس سیکورٹی گارڈ کو لفٹ میں بلا یا ہے۔

"تم میرے بارے میں فیصلہ کرنے والے کون ہوتے ہو؟" لفٹ دوبارہ اوپر کا سفر شروع کر چکی تھی۔ معاذ نے پیش اور بے بسی کی نئی جلی کیفیت میں ان سے پوچھا۔

"ہم اپنی ڈیوٹی کر رہے ہیں سر! ہمیں جو آؤں گے ملنا ہے ہمیں اسے ہر حال میں پورا کرنا ہے۔ اب آگے آپ کچھ دیکھیں کہ بغیر شور مچائے خاموشی سے اپنی جگہ واپس چلے جائیں گے۔"

سسپنس ڈائجسٹ

”کون ہو تم؟“ معاذ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سرسراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”میں قاص احمد عرف دکی... تعارف کروایا تو تھا اپنا۔“ اس نے بے پروا لہجے میں جواب دیا لیکن معاذ کو اندازہ ہو گیا کہ وہ اتنا بھی انجان نہیں ہے جتنا بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہاں آتے ہوئے لازماً اسے بتا دیا گیا ہوگا کہ معاذ نے وہاں سے باہر جانے کی کوشش کی تھی۔

”میں تم سے تمہارا نام نہیں، کھل تعارف جانا چاہتا ہوں۔ سب سے بڑھ کر یہ جانا چاہتا ہوں کہ مجھے یہاں اس طرح قید میں رکھنے کا کیا مقصد ہے؟“ آخر کار معاذ پھٹ پڑا۔

”پلیز! بدگمان نہ ہوں۔ آپ یہاں قیدی نہیں، میرے مہمان ہیں۔ جن لوگوں سے آپ کا واسطہ پڑا ہے، وہ آپ کی نگرانی نہیں، حفاظت پر مامور ہیں اور یہ ان کی ذمہ داری ہے کہ آپ کسی وقت جذبات میں آکر یہاں سے نکلنے کا غلط قدم نہ اٹھا بیٹھیں۔ میں آپ کے معاملے کو بہت اچھے طریقے سے وینڈل کرنا چاہتا ہوں۔“ اس بار اس نے کوئی اداکاری نہیں کی اور بہت رسائیت سے اسے سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔

”اسی طریقے سے جس طریقے سے آج وینڈل کیا ہے؟ کیا تصور تھا اس صحافی اعجاز کا کہ اسے جان سے مار دیا گیا؟“ اس نے جیسے وقاص پر الزام لگایا اور وہ اس الزام کو سمجھ بھی گیا اس لیے چہرے پر اداس سی مسکراہٹ سما کر بولا۔ ”یقیناً آپ نے میری ٹی وی پر دکھائی جانے والی فوجی پہچان لی ہے لیکن یقین کریں کہ میرا اعجاز کے قتل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں مانتا ہوں کہ میں علیہ بدل کر اس سے ملنے گیا تھا لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ باہر پہلے ہی اس کے لیے جال بچھایا جا چکا ہے۔ میں تو اس سے صرف آپ کے سلسلے میں ملنے گیا تھا کیونکہ مجھے پتا چلا تھا کہ اعجاز ان گنے چنے صحافیوں میں سے ایک ہے جس نے بھی اپنے ظلم کی آبرو پر حرف نہیں آنے دیا۔ اعجاز کے قتل کو تو میں خود ایک نقصان گردان رہا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

”نہیں۔“ معاذ نے سرگودر سے نفی میں جنبش دی۔ ”بات اتنی سادہ نہیں ہے جتنی تم ظاہر کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ میں تمہاری اس بات کو بچ مان سکتا ہوں کہ اعجاز کے قتل سے تمہارا کوئی تعلق نہیں لیکن ایسا بہت کچھ ہے جو تم نے مجھے نہیں بتایا ہے۔ تمہیں ابھی اور اسی وقت فیصلہ کرنا ہوگا کہ تم مجھے اپنے بارے میں سب کچھ سچ بتاتے ہو یا نہیں۔ اگر تم

سچ نہیں بولنا چاہتے تو مجھے یہاں سے جانے کی اجازت دے دو اور دیکھو یہ مت سمجھنا کہ میں تم یا تمہارے آدمیوں سے ڈر کر چپ بیٹھ جاؤں گا۔ میں نے یہاں سے جانے کا فیصلہ کر لیا تو کچھ اور ہونہ ہو، اچھا خاصا ہنگامہ ضرور ہو جائے گا اور شاید یہ تمہارے مفاد میں نہ ہو۔“

”ہنگامہ تو آپ کے اپنے مفاد میں بھی نہیں ہے۔ ایسا کر کے آپ اپنے دشمنوں کو اپنی طرف متوجہ کریں گے لیکن خیر میرے خیال میں آپ کو فی الحال میری یہ بات سمجھ نہیں آئے گی اس لیے میں آپ کا مطالبہ پورا کر دیتا ہوں اور آپ کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیتا ہوں پھر اس کے بعد آپ فیصلہ کر لیجیے گا کہ آپ مجھ پر اعتماد کر سکتے ہیں یا نہیں۔“ وقاص نے اس کے سامنے اٹھیا رڈال دیے اور تھوڑی دیر یوں خاموش بیٹھا رہا جیسے جو کچھ کہنا چاہتا ہو اس کے لیے اپنے الفاظ کو ترتیب دے رہا ہو۔ آخر کہنا شروع کر دیا۔

”میں نے سرکس کی دنیا میں آنکھ کھولی۔ میں، میری ماں اور میری جڑواں بہن، بس ہم تین لوگ تھے ہمارے خاندان میں۔ باپ کے بارے میں جب بھی پوچھا، ماں نے بس اتنا بتایا کہ وہ بہت امیر اور طاقتور آدمی تھا۔ ہم اس کے ساتھ کیوں نہیں رہتے یا وہ ماں کو کیوں چھوڑ کر چلا گیا، اس بارے میں ماں نے کبھی کچھ نہیں بتایا۔ اس نے ہمیشہ یہی کہا کہ بھول جاؤ کہ باپ بھی کوئی رشتہ ہے۔ بس یہ یاد رکھو کہ میں تمہاری ماں ہوں اور یہ سرکس ہماری دنیا۔ میں یا میری بہن اس سے کبھی زیادہ اصرار اس لیے نہیں کر سکتے کہ وہ ہمارے اصرار پر روئے لگتی تھی اور ہمیں ماں کا رونا اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ تو ہنستی، مسکراتی، ناچتی، گاتی ہی اچھی لگتی تھی۔ میری ماں سرکس کی سب سے خوبصورت عورت تھی اور لوگ اس کا آگ کے شعلوں کے درمیان کرتب نما رقص دیکھنے بہت شوق سے آتے تھے۔ میں نے چونکہ اسی ماحول میں آنکھ کھولی تھی اس لیے مجھے بھی محسوس نہیں ہوا کہ یہ کوئی معیوب کام ہے۔ میں خود سرکس کا حصہ تھا اور کم عمری ہی میں میرے ماہر بازی گر ہونے کی پیش گوئیاں ہونے لگی تھیں۔ پندرہ سال کی عمر میں، میں نے موت کے کوٹھیں میں مونڈ سائیکل کے علاوہ کارٹک چلانے میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ میں ہلک جھپکتے میں رسی پر لٹک کر بلند مقام تک پہنچ جاتا تھا۔ آگ کے شعلوں کو پھلانگ جاتا تھا۔ میں منہ سے جلتا ہوا آگ کا گولہ نکال کر دکھا دیتا تھا۔ میری طرح میری بہن بھی سرکس کا ایک اہم حصہ تھی۔ وہ شل و صورت میں بالکل ماں پر مگر ہی اور ماں ہی کی طرح خوبصورت آواز اور رقص کی صلاحیت پائی تھی، اس

طرح کی بدنگی کا سامنا ہوئی جاتا تھا۔ وہ تو جب میں موت کے کوئیں سے باہر نکلتا تو پتا چلا کہ میری زندگی اندھیر ہو چکی ہے۔ رانی کو اٹھا لے جانے والے کون تھے اور کس نے میری ماں کو گولی ماری، کوئی نہیں بتا سکا۔ پولیس آئی، کارروائیاں ہوتی رہیں لیکن نہ تو میری ماں کا قاتل گرفتار ہوا اور نہ ہی میری بہن رانی بازیاب ہوئی۔ ان دنوں میری حالت دیوانوں کی سی تھی اور میں چوبیس گھنٹے پولیس اسٹیشن کے باہر ڈیرا ڈالے رہتا تھا کہ مجھے انصاف دلاؤ۔ پولیس میرے مطالبے پر اور تو کچھ نہ کر سکی لیکن ایک دن میری بہن کی کٹی پھٹی، پٹی ہوئی لاش میرے حوالے کر دی۔ میں ماں کو قبر میں اتارتے ہوئے اتنا نہیں تڑپا تھا جتنا اس کی لاش دیکھ کر تڑپ اٹھا تھا۔ وہ میری ماں جاتی تھی، ہم ماں کی کوکھ سے ایک دوسرے کے ساتھ تھے۔ ہم نے زندگی کا ہر دکھ سکھ ایک دوسرے سے بانٹا تھا تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ میں اس کی لاش اس حال میں دیکھ کر نہ تڑپتا۔ میں تڑپا اور ایسا تڑپا کہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ میں نے پولیس والوں کو گالیاں دیں، ان کے گریبان پکڑے، ان پر پتھر برسائے اور چیخ چیخ کر کہتا رہا کہ وہ مجرموں کے ساتھی ہیں اسی لیے مجرموں کو نہیں پکڑتے۔ میرے اس پاگل پن کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں اپنی بہن کے جنازے میں بھی شریک نہیں ہوسکا اور لاک اپ سے اپنا سر ٹکرا کر چنٹا رہا کہ مجھے تھوڑی دیر کے لیے باہر جانے دو کہ میں اپنی رانی کو اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتار سکوں لیکن ان ظالموں پر میری کسی اتھا کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس ظلم نے میرے اندر اتنا غصہ بھر دیا کہ جب کھانا دینے کے لیے ایک ساتھی میرے لاک اپ میں آیا تو میں نے اس پر حملہ کر دیا۔ ممکن تھا کہ میں اسے گلا حوت کر ماری ڈالتا لیکن ساتھی قیدیوں اور دوسرے سپاہیوں نے مل کر اسے مجھ سے چھڑا لیا۔ اس سنگین جرم کے الزام میں مجھ پر بڑا سخت پرچہ بنوایا گیا۔ اگر سرکس کا مالک بھاگ دوڑ نہ کرتا اور میرے لیے اچھے وکیل کا انتظام نہ کرتا تو میں بے عرصے کے لیے جیل چلا جاتا۔ وکیل نے اپنی مہارت اور قابلیت سے عدالت پر ثابت کیا کہ اپنے ساتھ بیٹنے والے حادثات کی وجہ سے میں ذہنی عدم توازن کا شکار تھا اور چونکہ پولیس کی جانب سے مجھے بہن کے جنازے میں شرکت نہ کرنے دینے کی زیادتی ہوئی تھی، اس لیے مجھ سے وہ سنگین حرکت سرزد ہو گئی۔ عدالت نے میرے ساتھ ہمدردی کا سلوک کیا اور میرا ذہنی علاج کروانے کے بعد مجھے صرف تین سال کی سزا سنائی۔ جیل کے تین سالوں نے جہاں مجھے بہت سے زخم

لے پندرہ سال کی عمر میں وہ سرکس میں ماں کی جگہ لے چکی تھی۔ ماں نے اپنا فن اس میں منتقل کرنے کے بعد خود ریٹائرمنٹ لے لی۔ میری ماں بیمار رہنے لگی تھی اور اس کی کام کرنے کی ہمت ختم ہو گئی تھی اس لیے وہ خود شوق نہیں کرتی تھی لیکن میری بہن کو شو کرنے کے دوران خود سارا وقت وہاں موجود رہتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی بیٹی حسین ہے اور حسین صورتیں لوگوں کو بد نظری پر اکساتی ہیں۔ اپنے تئیں وہ بیٹی کے آس پاس رہ کر اس کی حفاظت کرتی تھی لیکن جب بری گھڑی آئی تو اس کے ناتواں بازو بیٹی کی حفاظت میں ناکام ہو گئے۔ "معاذ نے دیکھا کہ داستان کے اس موڑ پر آکر وقاص کی آنکھیں پھوٹ گئیں اور وہ بولنے ہوئے یوں بار بار تھوک نکل رہا تھا جیسے کوئی چیز اس کے طلق میں اٹک رہی ہو۔

"یہ جن دنوں کی بات ہے، ان دنوں ہماری سرکس کمپنی فیصل آباد میں رکھی ہوئی تھی۔ میرا موت کے کوئیں میں کار چلانے والا شو بہت ہٹ جا رہا تھا اور لوگوں کا اتارنا ہوتا تھا کہ ہر تھوڑی دیر بعد مجھے کتب دکھانے کے لیے موت کے کوئیں میں کار چلانے کا مظاہرہ کرنا پڑتا تھا۔ لوگ میری مہارت پر خوش ہو کر تالیاں اور سیٹیاں بجا کر داد دینے کے ساتھ ساتھ سکوت اور ٹوٹوں کی برسات بھی کر دیتے تھے۔ اس روز بھی میں لوگوں کے دل خوش کر کے اپنی روزی کمانے میں مصروف تھا کہ میری دنیا لٹ گئی۔ میری طرح اپنے فن کا مظاہرہ کر کے اپنی روزی کمانے والی میری مصوم بہن کچھ بد نظروں کی نظر میں آ گئی۔ انہوں نے جھوم کی پروا کیے بغیر اسے اٹھا لے جانے کی کوشش کی۔ سرکس کی انتظامیہ اور میری ماں نے انہیں روکنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے ہتھیار نکال لیے اور اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ ہر طرف جھگڑا مچ گئی۔ لوگوں نے خوف زدہ ہو کر ان خنڈوں کا راستہ چھوڑ دیا لیکن مٹا کی ماری ماں کیسے کسی کو اپنی بیٹی یوں اٹھا کر لے جاتے دیکھ سکتی تھی۔ اس نے بھرپور مزاحمت کی۔ یہاں تک کہ حفاظت کے خیال سے ہر دم اپنے پاس رہنے والی چھری نکال کر ایک خنڈے کے بازو میں بھی ٹھونپ ڈالی لیکن اس کی مٹا چند انچ کی سیسے کی گولی سے ہار گئی۔ ظالموں نے اسے مین سینے میں گولی ماری تھی اور گولی اس کے دل میں اتر کر اسی وقت اسے ہمیشہ کی نیند سلا گئی تھی۔ جس وقت یہ سب ہو رہا تھا، میں موت کے کوئیں میں گاڑی چلا رہا تھا۔ فائرنگ اور شور کی آوازیں مجھ تک بھی پہنچی تھیں لیکن مجھے بہت زیادہ تشویش اس لیے نہیں ہوئی تھی کہ کبھی بھی میں اس

دیے، وہیں بہت کچھ سکھایا بھی اور کچھ دوست بھی عطا کیے۔ ان دوستوں میں لالہ عیسیٰ اس وقت شامل ہوا جب مجھے بچہ جیل سے بڑوں کی جیل میں منتقل کیا گیا۔ لالہ عیسیٰ مجھے اپنے ساتھ کراچی لے آیا۔ وہ انڈر ورلڈ کا ایک بہت بڑا نام ہے لیکن مجھ سے بالکل بچوں کی طرح پیار کرتا ہے۔ کچھ میری صلاحیتوں کا کمال ہے اور کچھ لالہ عیسیٰ کی نظر کرم کے میں چند سالوں میں ہی گینگ میں خاص مقام حاصل کر گیا ہوں اور مجھ سے بڑی عمر کے لوگ بھی مجھے عزت سے دیکھتے ہیں۔ یہ بات میں خود بھی نہیں جانتا لیکن اپنی ماں اور بہن کی موت اور اپنی بے بسی کا زخم اب بھی میرے سینے پر بالکل تازہ ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ جب میں کسی بے بس اور شریف انسان کو علم کا شکار ہوتے دیکھتا ہوں تو خود کو اس کی مدد سے روک نہیں پاتا۔ امید ہے کہ اب آپ مجھ گئے ہوں گے کہ مجھے آپ سے اتنی ہمدردی کیوں ہے۔ اپنی داستان محل کر کے اس نے معاذ کی طرف زخمی نظروں سے دیکھا تو وہ شرمندہ ہو گیا اور آہستہ سے بولا۔

”سوری یار! مجھ سے تمہیں بھیجے میں تھوڑی سی غلطی ہو گئی لیکن امید ہے کہ یہ سمجھ کر نظر انداز کر دو گے کہ میں جن حالات کا شکار ہوں، اس میں بندے سے ایسی غلطی ہو جاتی ہے۔“ معاذ نے دوستانہ لہجے میں اس سے معذرت کی۔

”ساری غلط فہمیاں دور ہو گئی ہیں تو پلیز، اب مجھے سونے کی اجازت دے دیں۔ باقی سوالوں کے مجھ اب میں آپ کو پھر بھی دے سکوں گا۔ فی الحال میں تھوڑی دیر خند لے کر فریٹس ہوتا چاہتا ہوں۔ صبح مجھے اسپتال جانا ہے۔ وہاں میرا ایک جگری دوست ایڈمٹ ہے۔“

”ٹھیک ہے، سو جاؤ۔ میں بھی اب سوؤں گا۔“ معاذ نے اس کے مصحوم انداز میں درخواست کرنے پر فیس کر کہا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ ذہن پر موجود یو جھ کی حد تک کم ہو جانے کی وجہ سے اس بار اسے نیند آئے میں زیادہ دیر نہیں لگی اور تھوڑی سی دیر میں نیند کی وادی میں اتر گیا۔ صبح آٹھ بجے کھلی تو قاص جاچکا تھا۔ وہ فریٹس ہو کر مین میں آتا تو وہاں ناشتے کے لوازمات موجود تھے۔ اس نے دیگر چیزوں کو نظر انداز کر کے دودھ میں کارن فلکس ڈالا اور پیالے میں چمچ کھاتا ہوا لاؤنج میں آ بیٹھا۔ بیٹنے کے ساتھ ہی اس نے ریسیٹ کی مدد سے ٹی وی آن کیا اور دیرے دیرے کارن فلکس کھاتا ہوا خبریں دیکھنے لگا۔ زیادہ تر گزشتہ روز کی ہی خبریں تھیں لیکن وہ بے سرے سے تکلیف

محسوس کر رہا تھا اور اس کے کارن فلکس کھانے کی رفتار کم ہو گئی تھی۔ خود کو اس تکلیف سے نکالنے کے لیے اس نے ٹی وی بند کرنے کا فیصلہ کیا۔ اپنے اس فیصلے پر عمل کے لیے ابھی اس نے ریسیٹ اٹھایا ہی تھا کہ بریکنگ نیوز کا اعلان کیا جانے لگا۔ اس کی انگلی پاور آف کا بٹن دباتے دباتے رک گئی۔ نوک پلک سے تیار طرح دار نیوز کا سٹر سنسنی خیز لہجے میں خبر ساری تھی۔

”میڈیکل کالج کے طالب علم کا کھلے عام اغوا۔ تحقیقات کے مطابق طالب علم سعد ہاسٹل سے کالج جانے کے لیے نکلا تھا کہ راستے میں اسے روک لیا گیا اور اغوا کار اسے اسٹے کے زور پر جیٹلی ٹیبلٹ والی گاڑی میں بٹھا کر اپنے ساتھ لے گئے۔ واضح رہے کہ طالب علم سعد، یونیورسٹی کے اس طالب علم معاذ کا بھائی ہے جو کچھ عرصہ قبل کیرتھر کی پہاڑیوں پر غائب ہو گیا تھا اور جس کی بازیابی کے سلسلے میں صحافی گھزار عاصم کی بیٹی بشری گھزار نے بھرپور کیمین چلاتے ہوئے معاذ کے قیاب کا الزام مشہور بلڈر یزدانی اور صنعت کار سیاست دان عرفان اللہ کے بیٹوں پر لگایا تھا۔“ نیوز کا سٹر خبر نہیں ساری تھی، معاذ کے وجود پر برجھیاں چلا رہی تھی۔ سعد... اس کا پیارا بھائی سعد دن ڈھاڑے اغوا کیا جاچکا تھا۔ یہ کوئی معمولی خبر نہیں تھی۔ اس خبر کو سن کر اس کا پورا وجود ساکت ہوتا تھا اور وہ پھٹی پھٹی نظروں سے اسکرین کو دیکھ رہا تھا۔ اسکرین پر اب وہ مقام دکھایا جا رہا تھا جہاں سے سعد کو اغوا کیا گیا تھا۔ نیوز چینل کا نمائندہ ہاتھ کے اشارے سے وہ بانیک دکھا رہا تھا جس پر سعد سوار تھا۔ معاذ اس موٹر سائیکل کو اچھی طرح پہچانتا تھا کیونکہ یہ اس کی اپنی موٹر سائیکل تھی۔ اس موٹر سائیکل کے حرر پر ایک بار ماضی میں اسے بشری کا ساتھ دینے پر دمکی آمیز پیغام ملا تھا۔ اس نے وہ مرد تہلیل کر دیا تھا لیکن آج پھر مرر پر پرمعت مار کر سے اس کے نام ایک مختصر پیغام لکھا تھا۔ چینل کا نمائندہ اس مختصر پیغام کو پڑھتے ہوئے حیرت کا اظہار کر رہا تھا کہ یہ پیغام کس نے اور کیوں دیا ہے؟ کیرا مرد کو زوم کر کے پیغام کے الفاظ دکھا رہا تھا۔ سرخ رنگ سے لکھا وہ تین لفظی پیغام معاذ خود اپنی آنکھوں سے پڑھ سکتا تھا۔ وہاں لکھا تھا۔ ”معاذ! کم بیک۔“

ظلم و جبر کے سامنے سپنہ سپر نوجوان
کسی دامنستان جو غلط کاروں کے لیے
نصیب ناک تھا باقی واقعات آپنا سادہ ہر

Scanned with CamScanner

شہ زور

جھیلنے کی ہمت دے سکتا ہے۔ ویسے بھی مجھے قہقہے ہر
موسیٰ ہمیشہ کے لیے اپنے کام سے دور نہیں رہے گا۔ میں اس
کا بہترین علاج کرواؤں گا اور انشاء اللہ تیرے ساتھ اور
اپنی ہمت کے ملے ہوئے پر یہ جلد اپنی جگہ پر موجود ہوگا۔
دقاس نیلی کے ساتھ ساتھ خود کو بھی قہقہے دلا رہا تھا۔
"اللہ تعالیٰ آپ کی زبان مبارک کرے۔" نیلی نے
فوراً کہا۔

"تو نے کچھ کھایا پیابھی ہے یا ایسے ہی بھوک پیاسی
بیٹھی فکر میں کل رہی ہے؟" دقاس نے یک دم اس سے
پوچھا تو وہ شیشا گئی اور کھپا کر بولی۔
"بھوک ہی نہیں گئی۔"

"بھوک تو کونے فکر کر کے خود ہی ازا دی ہے۔ چل
میں تجھے ناشا کرواتا ہوں۔" دقاس نے پیار بھرے رعب
سے کہا۔
"لیکن موسیٰ....." نیلی وہاں سے ہنسنے میں حذب
تھی۔

"موسیٰ کا خیال رکھنے کو اسپتال کا اسٹاف موجود ہے۔
تیرے بھوکے پیاسے یہاں بیٹھ کر اس کو بچتے رہنے سے یہ تو
فک کر نہیں ہوگا۔ تو سارے دن سناں گے۔ موسیٰ کو سناں لانا ہے تو
تو اپنے کونے کھانا کھا کر آ کر بیٹھ جائے۔" دقاس نے
اپنے راز میں کہا۔ اس نے اس کی طرف سے اس کی طرف سے

ساتھ اسپتال کی کینٹین میں پہنچ گئی۔ دقاس نے اس کے
لیے بھرپور ناشا منگوایا لیکن چونکہ خود ناشا کر کے چلا تھا اس
لیے اپنے لیے صرف چائے کے ایک کپ پر اکتفا کیا۔ نیلی
جو پہلے بالکل بھی بھوک محسوس نہیں کر رہی تھی، اس کے بے
حد اصرار پر کھانا شروع ہوئی تو آہستہ آہستہ کافی کچھ کھاتی
چلی گئی۔ ذیل روٹی کے سلاکس اور آٹلیٹ ختم کرنے کے بعد
اس نے چائے کا کپ ہونٹوں سے لگایا تو کچھ یاد آ جانے
کے انداز میں چوٹکتے ہوئے بولی۔

"میں آپ کو ایک بات بتانا تو بھول ہی گئی وہی
بھائی!"

"وہ کیا؟" دقاس فوراً اس کی طرف متوجہ ہوا۔
"رات ڈاکٹر کے وزٹ کے وقت جب مجھے موسیٰ
کے کمرے سے باہر بھیج دیا گیا تھا، میں ایسے ہی ٹپٹنے کے
لیے ریسپشن ایریا کی طرف چلی گئی تھی، وہاں میں نے
ریسپنڈنٹ لڑکی سے ایک آدمی کو بات کرتے ہوئے سنا۔ وہ
موسیٰ کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ اس نے پوچھا تھا کہ کل

وہ جاتا تھا کہ اس کے دامن پر تہمت لگی ہے اور تہمت کا داغ
اتنی آسانی سے نہیں نٹا۔

☆☆☆

دقاس صبح کلیٹ سے جلد روانہ ہو گیا تھا۔ روائگی کے
وقت معاذ سوراہا تھا اس لیے اس سے کوئی بات نہیں ہو سکی
تھی۔ اسے موسیٰ کے پاس اسپتال پہنچنے کی جلدی تھی اس
لیے معاذ کے جاننے کا انتظار کیے بغیر ہی نکل پڑا تھا اور اب
اسپتال کے کمرے میں نیلی کے روبرو موجود تھا۔

"کیسا ہے اپنا میرا؟" اس نے بستر پر سوئے ہوئے
موسیٰ پر ایک نظر ڈالی اور ہلکے ہلکے انداز میں نیلی سے اس
کے بارے میں دریافت کیا۔

"بس ٹھیک ہے۔ درد سے بچانے کے لیے ڈاکٹرز
ایسی دوائیں دے رہے ہیں کہ سارا ناٹم سوتا ہی رہا ہے۔"
نیلی نے تجھے ہوئے لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا۔

"وہ سوتا رہا ہے اور تو رات بھر جاگ کر اپنی جان
آدمی کرتی رہی ہے۔" دقاس نے نیلی کی سرخ آنکھوں اور
ستے ہوئے چہرے کو دیکھ کر اندازہ لگایا۔

"موسیٰ کو اس حال میں دیکھ کر بھلا مجھے کیسے خند آ سکتی
تھی؟" نیلی نے گویا اعتراض کیا۔

"مجھے لگتا ہے کہ موسیٰ کے لیے دوبارہ سرکس میں کام
کرنا بہت مشکل ہوگا۔" نیلی کی نظریں موسیٰ کی پلاسٹر چڑھی
ٹانج پر جمی تھیں۔

"ابھی اس بات کو چھوڑ دے۔ ابھی تو اس کی جان
بچ جاتی کافی ہے۔ بندہ سرکس میں کام کرے بغیر بھی جی
سکتا ہے۔"

"موسیٰ کے لیے جتنا مشکل ہوگا۔ موسیٰ کے لیے اپنا
پروفیشن صرف پیٹ پالنے کا ایک ذریعہ نہیں ہے۔ وہ اپنے
کام سے محبت کرتا ہے۔ موت کے کنوئیں میں موٹر سائیکل
چلانا اسے کیسی خوشی دیتا ہے، یہ میں جانتی ہوں۔ پتا ہے مجھ
سے کیا کہتا تھا۔ کہتا تھا، نیلی! تجھے اپنے پیچھے بٹھا کر موت کے
کنوئیں میں موٹر سائیکل چلانا ہوں تو لگتا ہے ہواؤں میں اڑتا
پھر رہا ہوں۔ میرا کام اور تیرا ساتھ میرے لیے میری زندگی
کی سب سے بڑی خوشیاں ہیں۔" نیلی کی چمکیں بھینکنے لگیں۔

"حوصلے سے کام لے نیلی۔ تو ہمت چھوڑ دے گی تو
اسے کون سنبھالے گا۔ تیرا حوصلہ اور ساتھ ہی اسے اس دکھ کو

سنبھالنے کا۔ تیرا حوصلہ اور ساتھ ہی اسے اس دکھ کو

سنبھالنے کا۔ تیرا حوصلہ اور ساتھ ہی اسے اس دکھ کو

سنبھالنے کا۔ تیرا حوصلہ اور ساتھ ہی اسے اس دکھ کو

شہ زور

ملا جیتوں اور لالہ بھٹی کی خصوصی توجہ کی وجہ سے سب پر حکمرانی کرتا تھا اور سب اسے چھوڑتے ہوئے بھی اپنا بڑا ماننے پر مجبور تھے۔

”آپ کو اب کوئی شکایت نہیں ہوگی وکی بھائی! وہ فوراً ہی جین دہانی کروانے لگا لیکن وقاص اب اس کے بجائے اپنے سیل فون پر آنے والی کال کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ سیل پر اسے جو اطلاع دی گئی اسے سن کر وہ چیخ پڑا۔

”یہ کیا بکواس کر رہے ہو۔ ایسا کیسے ہو گیا؟“ جواب میں دوسری طرف سے کچھ کہا گیا۔

”میں خود وہاں آ رہا ہوں۔“ اس نے کہا اور سرور کی طرف توجہ دے بغیر تیزی سے باہر کی طرف بڑھ گیا۔ بانٹک برق رفتاری سے چلاتے ہوئے اس کا رخ اس بلڈنگ کی طرف تھا جس کے ایک اپارٹمنٹ میں وہ معاذ کو سویا ہوا چھوڑ کر رخصت ہوا تھا۔ اپارٹمنٹ میں قدم رکھتے ہی اس کے پیچھے وہ گارڈ بھی چلا آیا جس کی کال پر وہ یہاں آیا تھا۔

”کیسے ہوا یہ سب کچھ؟“ اس نے سخت لہجے میں گارڈ سے دریافت کیا۔

”میں اپنی ڈیوٹی پر تھا سر! گیٹ نے انٹرکام پر مجھے کال کیا کہ کسی کو اس کے لیے اوپر آنا ہے۔“

”اگر وہاں سے آگے نہ بڑھتا تو اس کے لیے اس کی جان بچا دیتا۔“

”میں سنبھل چکا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”کتنی پررید کیا اور میں بے ہوش ہو گیا۔ اس کے بعد وہ چپکے سے یہاں سے نکل گئے۔ نیچے والا گارڈ کافی دیر تک میرے واپس نہ آنے پر اوپر آیا اور مجھے ہوش میں لا کر ساری بات پوچھی۔ ہم نے کمرے کی ریکارڈنگ دیکھی تو پتا چلا کہ گیٹ لفٹ کے بجائے سیز میوں کے ذریعے یہاں سے گیا ہے۔ انہوں نے سر پر پی کیپ جھکا کر چھپی ہوئی تھی اس لیے نیچے والا گارڈ پہچان نہیں سکا اور وہ آسانی سے یہاں سے نکل گئے۔“ گارڈ نے ایک سی سانس میں پوری کتھا سنا ڈالی۔ وقاص دیکھ سکتا تھا کہ اس کی ٹاک سرخ اور سوختی ہوئی ہے اور کتنی پر بھی نکل کا نشان نظر آ رہا ہے۔ معاذ کے بہترین فائزر ہونے کا اندازہ اسے پہلی ملاقات میں ہی ہو گیا تھا اس لیے گارڈ کے بیان پر تو کوئی بے اعتباری نہیں تھی لیکن حیرت ضرور ہو رہی تھی کہ معاذ نے ایسا کیوں کیا؟ اس کے حساب سے تو معاذ اس کے بارے میں سب کچھ جان لینے کے بعد مطمئن ہو چکا تھا اور اس کا یہاں سے جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا پھر یہ اچانک کیا ہو گیا تھا۔

ہائی وے کے قریب ایکسپریس ٹھہرنے پر جولا کا اسپتال میں لایا گیا ہے، اس کا کیا حال ہے اور وہ کس روم میں ہے؟ میں سمجھی کہ وہ آپ کا کوئی ساتھی ہے اور موسیٰ کی خیریت معلوم کرنے آیا ہے لیکن پھر بہت عجیب بات ہوئی۔ بجائے یہ کہ وہ موسیٰ کو دیکھنے جانے کی بات کرتا، اس نے ٹرکی سے کہا کہ وہ ریکارڈ میں سے موسیٰ کا ایڈریس وغیرہ نکال کر دے دے۔ اس کام کے لیے اس نے ٹرکی کو پیسے بھی دیے۔ میری کچھ میں کچھ نہیں آیا کہ یہ کیا چکر تھا۔“ نیلی نے اس سے اپنی الجھن بیان کی تو وہ چونک گیا اور دھیان فوراً ان پیچیدہ والوں کی طرف چلا گیا جنہوں نے اعجاز کو قتل کیا تھا اور جنہوں نے موسیٰ کو اپنے تعاقب میں پا کر اسے ساؤنڈ مار کر حادثے سے دو چار کر دیا تھا۔ یقیناً اب وہ جانتا چلا جتے تھے کہ جائے واردات سے ان کا تعاقب کرنے والا شخص کون تھا۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو موسیٰ بھی خطرے میں تھا۔

”جیسے مجھے اسی وقت بتانا چاہیے تھا نیلی! میں نے تجھے بتایا تو تھا کہ کسی بھی ضرورت کا خیال رکھنے کے لیے ایک بندہ باہر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ تو مجھے بتاتی تو میں اپنے بندے کو بولا کہ اس آدی کو چپک کرے۔“

”اس خیال سے نہیں آیا۔“ اس نے آدی واپس بھی بلا کر کہا۔

”جیسے مجھے اسی وقت بتانا چاہیے تھا نیلی! میں نے تجھے بتایا تو تھا کہ کسی بھی ضرورت کا خیال رکھنے کے لیے ایک بندہ باہر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ تو مجھے بتاتی تو میں اپنے بندے کو بولا کہ اس آدی کو چپک کرے۔“

”آپ نے میری بس یہ ڈیوٹی لگائی تھی کہ موسیٰ بھائی کے لیے کوئی بھی ضرورت پڑے، اس کا خیال رکھوں۔ کسی خطرے کا ذکر ہوتا تو میں اور طرح سے ادھر کا دھیان رکھتا۔“

”ہمارے جیسوں کو ہمیشہ ہر جگہ اور ہر حالت میں اپنی آنکھیں کھلی رکھنی ہوتی ہیں سرور! دھیان سچو کا اور مات ہوئی۔ بہر حال ابھی جو ہوا سو ہوا۔ اپنے ساتھ ایک بندہ اور لگالو اور پوری طرح آنکھیں کھول کر ادھر کا دھیان رکھو۔ موسیٰ کا بال بھی بیکا ہوا نا تو میں تم لوگوں کی کھال گرا دوں گا۔“ اس کے لہجے میں در آنے والی سختی نے مقابل کی ریزہ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑا دی۔ وہ کم عمر تھا لیکن اپنی

”پیکار کردگی ہے تم لوگوں کی۔ ایک زخمی بندے نے دو ٹوکوں میں تمہیں لہا لہا دیا اور تمہاری ناک کے نیچے سے اتنی آرام سے نکل کر چلا گیا۔“ جھنجھلاہٹ اور الجھن کے عالم میں اس نے گھر ڈکھن دیا تو اس کی سرخ ناک مزید سرخ ہو گئی اور شرمندہ سے انداز میں بولا۔

”میں اعتبار میں دھوکا کھا گیا، ورنہ آپ جانتے ہیں کہ میں اتنا تر نوالہ نہیں ہوں کہ کوئی بھی مجھے آسانی سے خاک چٹا جائے۔“

”بات یہی ہے کہ وہ کوئی بھی نہیں ہے۔ میں اپنے تجربے کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ اگر تم ہوشیار بھی ہوتے تو تمہارے لیے انہیں سنزور لی کرنا مشکل ہوتا۔ بہر حال جو ہوا سو ہوا۔ میرے لیے اصل پر اہم یہ ہے کہ وہ اس طرح سے اچانک کہاں اور کیوں چلے گئے؟“ وقاص واقعی بہت زیادہ الجھن کا شکار تھا۔

”وہ آپ کے لیے ایک نوٹ چھوڑ کر گئے ہیں۔“ گارڈ نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کاغذ کا ایک پرچہ باہر نکالا۔ وقاص نے پرچے کی تھکول کر اس پر لکھی تحریر پڑھی، لکھا تھا۔

”وقاص! تمہارے خلوص پر شک نہیں لیکن میں اپنے بھائی کی خاطر یہاں سے جانے پر مجبور ہوں۔“ اس مختصر سے نوٹ نے وقاص کو دبا دبا ہوا محسوس کیا۔ اس کے اندر کچھ عجیب سا بھانپا ہوا تھا۔ اس نے مولانا اقبال کی ایک شاعری یاد آ کر دہرائی۔

”معلوم کرو معاذ کی فیملی اس وقت چھوٹے بھائی کے ساتھ کیا ہوا ہے؟“

”میرے لیے کیا ختم ہے، وہی بھائی؟“ اس کے کال ختم کرتے ہی گارڈ نے اس سے دریافت کیا۔

”فی الحال کوئی نہیں۔ تم جا کر آرام کرو۔“ وقاص نے اسے فارغ کر دیا اور خود پارکمنٹ میں ادھر ادھر گھومنے لگا۔ معاذ یہاں بغیر سامان کے آیا تھا اس لیے اس کا کوئی ذاتی سامان تو تھا نہیں جسے وہ ساتھ لے جاتا۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق وہ جو دوا میں استعمال کر رہا تھا، وہ بھی وہیں موجود تھیں۔ دواؤں کی موجودگی وقاص کے دل میں اندیشہ پیدا کر رہی تھی کہ وہ کسی ایسی جگہ گیا ہے جہاں اسے ان دواؤں کے استعمال کی امید نہیں ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ کسی ایسی جگہ نہیں گیا تھا جہاں اس کا اپنا اور دوستوں سے واسطہ پڑتا۔ وہ کسی خطرے کی سمت گیا تھا۔ کچھ دیر قبل کی جانے والی کال کا جواب آیا تو اس کے اندیشے کی تصدیق ہو گئی۔

”معاذ کے بھائی سعد کو آج صبح اسپتال سے میڈیکل کالج جاتے ہوئے اغوا کر لیا گیا ہے۔ واقعے کی خبر صبح ہی نیلی ویشن پر آگئی تھی۔ اب بھی ہر نیوز چینل میں اس خبر کو پیش کیا جا رہا ہے۔ لاہور میں مقیم معاذ کی فیملی کاری ایکشن بھی سامنے آ گیا ہے۔ وہ لوگ صاحب اقتدار و اختیار سے اہل کر رہے ہیں کہ معاذ اور سعد دونوں کی بازیابی کے سلسلے میں اقدامات کیے جائیں۔“

اسے جو رپورٹ پیش کی گئی، وہ تشویش ناک تھی۔ وہ صبح اسپتال میں مصروف ہونے کی وجہ سے خبروں پر توجہ نہیں دے سکا تھا اور اس کے آدھیوں نے بھی شاید دھیان نہیں دیا تھا، اس لیے اتنی دیر سے خبر ہوئی تھی۔ اپنے آدمی کی رپورٹ سننے کے بعد اس نے اپنے اسمارٹ فون پر اس خبر کو تلاش کیا اور غور سے دیکھنے لگا۔ جلد ہی سعد کی موٹر سائیکل کے آئینے پر لکھی تحریر والی خبر اس کے سامنے آ گئی۔ اس نے توجہ سے وہ تین لفظی تحریر پڑھی۔ ”معاذ! کہ بیک!“..... اور گویا بہت کچھ اس کی سمجھ میں آ گیا۔ کوئی اور اس تحریر کو سمجھے یا نہ سمجھے لیکن وہ سمجھ سکتا تھا کہ یہ معاذ کے لیے ایک پیغام تھا اور ان ہی لوگوں نے دیا تھا جن کی قید سے وہ معاذ کو نکالا۔ اس وقت اس کی تلاش میں ناکامی کے ساتھ ساتھ اس کے دل میں کچھ عجیب سا بھانپا ہوا تھا۔ اس نے انہیں یاد آ کر دہرائی۔

اس وقت اس کو افسوس ہونے لگا کہ صبح سے اس نے خبروں کی طرف توجہ کیوں نہیں دی۔ اگر وہ خبریں دیکھ لیتا تو لازماً ایسا بندوبست کر دیتا کہ معاذ یہاں سے نکل نہیں پاتا لیکن اب سب کچھ اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا اور اسے اندازہ تھا کہ معاذ کے گھر والوں کی طرح یہ جاننے کے باوجود کہ اس سب کے پیچھے کون اوگ ہیں، وہ قانونی طور پر ان کے خلاف کوئی موثر کارروائی نہیں کر سکے گا۔ خبروں کے اسی سلسلے کے آگے بڑھنے پر اس نے معاذ کے فیملی ممبرز کو تازہ پیش آنے والے واقعے پر احتجاج اور اہل کرتے ہوئے دیکھا۔ ان افراد میں معاذ کے والد، پھوپھو، میڈیکل کی طالبہ حسینہ جمیل کزن اور چھوٹی بہن شامل تھے۔ وہ سب بے حد افسردہ تھے اور ایک اور نہایت افسوسناک خبر سامنے آئی تھی کہ معاذ کی والدہ جو پہلے ہی اس کے غیاب پر صدمے کے باعث مستقل بیمار رہ رہی تھیں، اس تازہ واقعے کے بعد ہارٹ ایک کا شکار ہو گئی تھیں۔ نیوز چینل اس اسپتال سے ہی فیملی ممبرز کے تاثرات ریکارڈ کر کے نشر کر رہا تھا جہاں

شہ زور

معاذ کی والدہ سعیدہ بیگم کو بغرض علاج لایا گیا تھا۔ سعیدہ بیگم کی حالت ہنوز تشویشناک بتائی جا رہی تھی۔ ان کی حالت کے بارے میں بتاتے ہوئے معاذ کی چھوٹی بہن علیہ بیگم کیوں سے رو پڑی تھی اور اس کے رونے سے وقاص کے دل کو تکلیف ہو رہی تھی۔ وقاص نے معاذ کو اس کا ساتھ دینے اور اس سے بہرہ رومی کرنے کی جو بھی وجوہات بتائی تھیں، وہ اپنی جگہ درست تھیں لیکن جو سب سے بڑی اور مضبوط وجہ تھی اسے وہ معاذ کے سامنے بیان کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔

معاذ کی تلاش کے سلسلے میں چلائی جانے والی کمپین کے دوران اس نے معاذ کی چھوٹی بہن علیہ کو دیکھا تھا اور پہلی نظر میں ہی اس کے آگے دل ہار گیا تھا۔ دل ہارنے کا یہ قصہ بھی عجیب تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ جن لوگوں کے ساتھ رہتا ہے اور جن کا ایک حصہ بن چکا ہے، اس کے بعد وہ کسی شریف گھرانے کی لڑکی کے لیے ڈیز رو نہیں کرتا لیکن دل کی اپنی بے اختیاری تھی اور اس بے اختیاری نے ہی اسے مجبور کر رکھا تھا کہ وہ معاذ کی فیملی کے معاملات سے باخبر رہے۔ صرف آج ہی وہ اپنے عزیز از جان دوست موی کی وجہ سے

ان کے گھر کی طرف توجہ دے گا۔ اس نے اپنی بات سن کر ان کے لیے بہت سی آزمائشیں کیں تھیں۔ لیون چون گیا۔ موی عجیب بات کی کہ وہ لڑکی اس سے واقف بھی نہیں تھی اور نہ ہی کبھی ان کی روبرو ملاقات ہوئی تھی۔ پھر بھی اس نے اپنے دل میں اس کے نام کا ایک جہان آباد کر لیا تھا اور خود ہی اپنے آپ کو اس کے سامنے جوابدہ محسوس کرتا تھا۔ اب بھی وہ افسردہ تھا کہ وہ چاہنے کے باوجود علیہ کو اس کا بھائی واپس نہیں لوٹا سکا تھا اور وہ دوسرے بھائی کے انخوا کے ساتھ ساتھ ماں کی بیماری کا صدمہ بھی سہنے پر مجبور تھی۔ علیہ کا دکھ اس کا دکھ تھا اور وہ اپنے طور پر اس دکھ کے مداوے کی ترکیب سوچنے میں لگا ہوا تھا۔

☆☆☆

دکھ قدرت کی طرف سے ملیں تو انسان مشیت ایزدی جان کر ان پر صبر کر لیتا ہے لیکن جب دکھ کسی کے ظلم کا نتیجہ ہوں تو انسان کے لیے صبر کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے اور اس کے دل میں ہر لمحے انصاف کی خواہش سر اٹھاتی رہتی ہے۔ بشری بھی اپنے ساتھ ہونے والے تمام مظالم کے لیے انصاف چاہتی تھی لیکن یہاں مظلوم کو انصاف دینے کا نظام

ہی کہاں قائم تھا۔ وہ مظلوم ہوتے ہوئے بھی تنقید اور تنہیک کا نشانہ بنائی جا رہی تھی۔ اس سے مطالبہ کیا جا رہا تھا کہ وہ اپنے لگائے گئے الزامات کا ثبوت پیش کرے اور مسئلہ یہ تھا کہ سارے ثبوت غائب تھے۔ اعجاز کا بچہ ہنوز غائب تھا۔ لب کے ریکارڈ سے بھی ڈی این اے کی رپورٹیں غائب کر دی گئی تھیں۔ اعجاز کے ساتھ زخمی ہونے والا اس کا ساتھی کیمرا میں بھی دو دن اسپتال میں رہنے کے بعد دم توڑ چکا تھا اور بشری دوبارہ اسی مقام پر آکھڑی ہوئی جہاں اس نے اپنے ماں باپ کے مرنے کے بعد خود کو پایا تھا۔ یہ اعجاز کی پُرصوص دوستی تھی جو وہ اندھے انتقام کا خیال دل سے نکال کر قانونی جنگ لڑنے کے لیے تیار ہو گئی تھی لیکن اب اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے پاس یہ جنگ لڑنے کے لیے کوئی ہتھیار موجود نہیں ہے۔ ثبوت، گواہ، شہادتیں۔ کچھ بھی تو نہیں تھا اس کے پاس۔ مایوسی اور ناامیدی کی کیفیت میں جو واحد شے اس کے پاس بچی تھی وہ سونیا خان کی آفرمیں اور وہ خود کو اس آفر کو ماننے کے لیے مجبور پارہی تھی۔ سونیا نے اسے سمجھایا تھا کہ طاقتور دشمن سے مقابلے کے لیے اسے کسی دوسرے طاقتور کا ہاتھ تھمنا ہوگا اور آج یہ بات بشری تسلیم کر رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ تم ابھی طرح سوچنے بجھنے کے

بعد مجھ سے رابطہ ضرور کرو گی۔ میں تمہارے سارے حالات سے واقف ہوں لیکن خود سے تمہیں اس لیے کونٹیکٹ نہیں کیا کہ تم اچھی طرح سوچ بچار کر کے خود فیصلہ کرو۔ میرے خیال میں تم فیصلہ کر چکی ہو؟" سونیا اس کی آواز سنتے ہی بولنا شروع ہوئی۔

"میرے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں بچا ہے۔" بشری نے اعتراف کیا۔

"خوب ہے لیکن پھر یاد رکھنا کہ تمہیں اس کی قیمت ادا کرنی ہوگی۔" سونیا نے اسے یاد دہانی کروائی۔

"مجھے یاد ہے اور میں ہر قیمت ادا کرنے کے لیے تیار ہوں۔" بشری نے اسے جواب دیا۔

"گڈ! تو پھر ایسا کرو کہ کسی کو بھی کچھ بتائے بغیر خاموشی سے میرے پاس آ جاؤ۔ باقی باتیں ہم آئیں سائے بیٹہ کر کریں گے۔" سونیا خان چٹکی اور اسے اپنے پاس آنے کی دعوت دینے لگی۔

"کیا ابھی؟"

شعزور

میں دھوٹے دیکھا تھا۔ اس کے کپڑوں پر بھی خون کے چند چھینٹے موجود تھے۔ لڑکے کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ دین محمد کی بکریاں آج ایک بار پھر گھیتوں میں گھس کر چرنے لگی تھیں اور اس نے غصے میں ایک بکری پر کلہاڑی سے وار کر دیا لیکن معلومات کرنے پر یہ بیان غلط ثابت ہوا ہے اور اس شک کو تقویت مل رہی ہے کہ تم پر پیچھے سے وار کرنے والا آسیہ کا چھوٹا بھائی تھا۔ آسیہ نے گھڑکی سے کود کر تم پر تہمت لگانے کا جو ذرا مار چایا تھا، شاید اس کی وجہ سے وہ جذباتی ہو گیا ہو۔ گمان ہے کہ منشی کے سامنے اس نے اپنی حرکت کا اعتراف کر لیا ہوگا اور منشی نے اس کی جان بچانے کے لیے آٹا فانا غائب ہو جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اولاد کی محبت کسی سے وفاداری نبھانے کے مقابلے میں بہر حال زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔" معتمد شاہ نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔ ہوش میں آنے کے اگلے دن عالم شاہ نے آسیہ کے متعلق ہر بات بتادی تھی اور اسے یہ دیکھ کر خوش ہوئی تھی کہ سب ہی نے اس کی بات کو سچ تسلیم کیا تھا اور کسی ایک فرد کی طرف سے بھی یہ شک ظاہر نہیں کیا گیا تھا کہ وہ خود پر سے الزام ہٹانے کے لیے کوئی کہانی گھڑ رہا ہے۔ انہوں

نے اسے مدد مل سکتی تھی۔" "نہیں۔ موبائل کا بھی کچھ پتا نہیں چلا۔ بہر حال تم فکر نہ کرو، ہماری کوششیں جاری ہیں۔ جلد یا بدیر ہم آسیہ اور دیگر لوگوں تک پہنچ جائیں گے۔" معتمد شاہ نے اسے تسلی دی۔ "بستر پر پڑا ہوا بندہ فکر کرنے کے سوا کر بھی کیا سکتا ہے؟ حقیقت میں مجھے اپنے معاملات سے بھی زیادہ معاذ کی فکر ہے۔ اس کا سراغ ملا بھی تو ایسے کہ وہ ایک بار پھر غائب ہو چکا ہے اور وہ بھی ایسے حالات میں کہ مجھے اس کی خیریت کی طرف سے سخت تشویش ہے۔ آپ بتائیں آشیانہ آزادی کے مانکان نے کیا بتایا کہ انہوں نے حویلی اور زمین کس کی گمرانی میں دی گئی؟ گمران کو اس بات کا علم ہونا چاہیے کہ حویلی میں کون لوگ رہ رہے تھے۔" وہ ایک بار پھر معاذ کی فکر میں جتا ہونے لگا۔

"ان لوگوں سے رابطہ ہوا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ حویلی کو ایک پرانے اور وفادار ملازم کی گمرانی میں چھوڑا گیا تھا۔ وہ ملازم دنیا میں بالکل تنہا تھا اور اس نے خود درخواست

"معاذ کا کچھ پتا چلا، ادا معتمد؟" عالم شاہ نے اپنی مزاج پر سی کے لیے آئے ہوئے معتمد شاہ سے دریافت کیا۔ "نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "کسی بھی بارے میں معلوم نہیں چل رہا ہے۔ تم نے شک ظاہر کیا تھا کہ اس روز ہماری مدد کرنے والا لڑکا تمہارا دوست معاذ تھا۔ تم نے اپنے موبائل پر اس کی جو تصویریں دکھائی تھیں، اسے دیکھ کر مجھے بھی یہی لگا تھا لیکن ہم اس کے بارے میں کچھ بھی معلوم کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ دو اپنے گھر بھی واپس نہیں پہنچا ہے بلکہ اس کی فیملی کے حوالے سے ایک اور بری خبر یہ ہے کہ اس کے چھوٹے بھائی کو بھی اغوا کر لیا گیا ہے۔" "یہ کب اور کیسے ہوا؟" معتمد شاہ کا جواب سن کر عالم شاہ چونکا۔

"صبح کے وقت اس لڑکے کو اسپتال سے کالچ جاتے وقت اغوا کیا گیا ہے۔ اس کی فیملی سخت کراسس میں ہے اور معلوم ہوا ہے کہ والدہ کو صدمے سے ہارت ایک ہو گیا ہے۔" معتمد شاہ نے اسے معلومات فراہم کیں۔

"ویری سیڈ۔۔۔ کاش میں ان لوگوں کے لیے کچھ کر پاتا لیکن میں تو خود یہاں معذوروں کی طرح پڑا ہوا

عالم شاہ نے اسے حاندان کے بارے میں ابھی تک کچھ پتا نہیں چل سکا ہے۔ آسیہ حیدر آباد میں جس کالچ میں پڑھتی تھی، وہاں سے اس لڑکے نوٹی کے بارے میں بھی معلوم کرنے کی کوشش کی ہے جس سے دوستی کا اس نے تمہارے سامنے اعتراف کیا تھا لیکن اس نام کے کسی لڑکے کو اس کی کوئی سہیلی یا کالچ فیلو نہیں جانتی ہے۔ آسیہ کے افسر کے بارے میں بھی کسی کو خبر نہیں ہے۔ اب معلوم نہیں کہ آسیہ نے بی بڑی ہوشیاری سے یہ معاملہ چھپایا ہوا تھا یا اس کی قریبی سہیلیاں دوستی نبھانے کے لیے زبان نہیں کھول رہی ہیں۔ ویسے تو جس طرح وہ لڑکی ہماری ٹاک کے نیچے ہمیں دھوکا دیتی رہی ہے، اس سے یہی لگتا ہے کہ اس نے اس معاملے میں بھی ہوشیاری سے کام لیا ہوگا۔ منشی عبدالحق کے بیٹی کے ساتھ ملوث ہونے کا تو شک نہیں ہے مجھے لیکن ایک ہکا سا کلیو ملا ہے جس سے اس کے فرار کی وجہ سمجھ آ رہی ہے۔"

"وہ کیا؟" عالم شاہ نے دلچسپی لی۔ "کھیتوں میں کام کرنے والے ایک لڑکے نے بتایا ہے کہ اس نے منشی کے چھوٹے بیٹے کو خون آلود کلہاڑی نہم

کو ٹیکٹ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن آپ کال ہی ریسیو نہیں کر رہے۔“ وہ سوچوں میں گم جانے لگی دیر تک یونہی ہلکا رہتا کہ ایک لڑکے نے آکر اسے اطلاع دی۔

”اوہ! میرا فون شاید سائلٹ پر ہے۔“ اس نے ایک تپائی پر پڑے اپنے موبائل پر نظر ڈالی اور تیزی سے آگے بڑھ کر موبائل اٹھا لیا۔ اس پر لالہ عیسیٰ کی تین مسد کالز موجود تھیں۔ اس نے فوراً کال بیک کی۔

”کدھر ہے دکی! میں کب سے تجھے کال کر رہا ہوں۔ تیرے کو فوراً دھر میرے پاس آنے کا ہے۔“

”ٹھیک ہے لالہ!“ لالہ عیسیٰ کا حکم ملتے ہی اس نے بنا کوئی سوال کیے صادر کیا اور اسی وقت لالہ سے ملاقات کے لیے روانہ ہو گیا۔ آدھ گھنٹے کے اندر ہی وہ لالہ کے روبرو بیٹھا تھا۔

”تیرا سب سامان ادھر ہی پڑا ہے نا؟ مراد سے بول کر اپنی پینٹنگ کروالے۔ تیرے کو آج رات ہی دینی جانے کا ہے۔ ادھر کچھ لٹخا پڑ گیا ہے۔ تیرے کو ہی جا کر سنبھالنے کا ہے۔“ لالہ کے حکم نے اسے شیشا کر رکھ دیا۔

”آج..... آج رات ہی جانا ہے؟“

”ہاں، بلا تا کہ اپنے سامان کو اپنے گھر لے آؤ۔“ لالہ نے اپنی بات کو مزید واضح کیا۔ ”میرا فون سائلٹ پر ہے۔“ اس نے اپنے موبائل کو نکال کر دکھایا۔

”آج رات ہی جانا ہے؟“ اس نے اپنے موبائل کو نکال کر دکھایا۔ ”میرا فون سائلٹ پر ہے۔“ اس نے اپنے موبائل کو نکال کر دکھایا۔

”جانے میں کوئی مسئلہ نہیں ہے پر ادھر تھوڑا سا مسئلہ چل رہا ہے۔ میرا یار موی اسپتال میں ایڈمٹ ہے۔ تھوڑا سا اس کی سیکورٹی کا پرالیم ہے۔“

”تیرا یار ہے تو اپنا بھی بچہ ہے۔ جتنے آدمی چاہے لگا دے اس کی سیکورٹی پر۔ علاج وغیرہ کا بھی جو تو بولے گا سب بندوبست ہوتا رہے گا۔ اس کے علاوہ کوئی بات ہے تو بول۔“

لالہ عیسیٰ نے ایک طرح سے بات ہی ختم کر دی۔ لالہ سے معاذ والا مسئلہ اس نے خود ہی نہیں بیان کیا کہ لالہ اس کے خدائی فوجدار بننے کی عادت سے بیزار رہتا تھا اور اسے سمجھاتا رہتا تھا کہ ہم لوگوں کی زندگیاں ویسے ہی

بردقت خطرے میں رہتی ہیں اور تو اپنی عادت کی وجہ سے اپنے لیے خطرے کو کئی گنا بڑھائے رکھتا ہے۔

”ٹھیک ہے، تو پھر میں تیاری کرتا ہوں لیکن پہلے مجھے یہ تو بتا دو کہ مسئلہ کیا ہے؟“ چاروٹا چار اس نے ہائی بھر لی۔ معاذ والے معاملے میں اس نے خود کو یہ کہہ کر تسلی دے لی تھی کہ فوری طور پر معاذ کی جان کو کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا کیونکہ اگر ان لوگوں کو معاذ کی جان ہی ملتی ہوتی تو اتنے دن اسے اپنے پاس قید میں رکھنے کا رسک نہیں لیتے اور فوری طور پر اس کا کام تمام کر دیتے۔ وہ براہ راست چڑھائی کر کے ان سے معاذ کو نہیں چھڑوا سکتا تھا۔ ان کے پاس لاتعداد ظاہر اور خفیہ ٹھکانے تھے اور وہ نہیں جانتا تھا کہ معاذ کہاں ہوگا۔ اسے معاذ کا پتا معلوم کرنے کے لیے کوئی ترکیب لڑانی تھی اور ظاہر ہے اس کے لیے وقت درکار تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ معاذ کی کھوج کا کام کسی کے سپرد کر جائے گا اور دینی والا کام جلد از جلد نمٹا کر معاذ کے معاملے کو پوری توجہ سے دیکھے گا۔ ادھر لالہ عیسیٰ اسے اس کی بات کا جواب دے رہا تھا۔

”مسئلہ بڑا ہے، پر تیرے لیے مشکل نہیں۔ اپنے کو

معلوم تو بنائی کہ اس مسئلے کا تار ہا تھا۔“ اس نے اپنے موبائل کو نکال کر دکھایا۔

”آج رات ہی جانا ہے؟“ اس نے اپنے موبائل کو نکال کر دکھایا۔

بستر پر لیٹے معاذ نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں اور کچھ دیر اپنی جگہ لیٹے لیٹے ہی خالی خالی نظروں سے ارد گرد کا جائزہ لیتا رہا۔ یہ ایک عام سی سجاوٹ والا کمر تھا جس میں ایک طرف سیاہ رنگ کا ریگزیں کا ٹیبلٹ صوف پڑا تھا۔ صوفے کے سامنے چھوٹی سی کافی میبل تھی اور مقابل دیوار پر تیس انچ کا ایل ای ڈی ٹی وی نصب تھا۔ مختصر سے

ساز و سامان والے بارہ بالی بارہ کے اس کمرے میں وہ ایک سنگل بینڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ آنکھ کھلنے کے کچھ دیر بعد اس کی یادداشت نے کام کرنا شروع کیا تو اسے یاد آیا کہ وہ یہاں تک کیسے پہنچا تھا۔ اس نے نیلی ویشن پرسد کے اغوا کی خبر دیکھی تھی اور مونٹر سائیکل کے مرر پر کھسے ”معاذ! کم بیک“ کے الفاظ سے جان لیا تھا کہ سعد کا اغوا صرف اور صرف اس کی

واپسی کے لیے کیا گیا ہے۔ جب تک وہ اپنے صیاد کے پاس واپس نہیں جائے گا، سعد کی آزادی ممکن نہیں ہوگی اور پھر اس نے اپنے نفس میں واپس لوٹنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اپنے

شہ زور

تک اس نے مبر سے کام لیا، پھر غصے سے چل کر بولا۔
 ”میرے ساتھ گیم نہیں کھیلو، یزدانی! میں صرف
 اپنے بھائی کی خاطر یہاں آیا ہوں۔ مجھے میرا بھائی نہیں ملا تو
 تم اور تمہارے بیٹے سمیت میں اس پورے دفتر کو آگ
 لگا دوں گا۔“

”ابھی تو تو اپنی خیر متا سالے۔ تو اپنے ڈرائنگ روم
 میں نہیں، ہمارے دفتر میں کھڑا ہے اور ہمیں ہی دھمکی دے
 رہا ہے۔“ ہتھیاروں اور گارڈ کی موجودگی کے باعث
 کامران یزدانی کو طاقت کا توازن اپنے حق میں محسوس ہو رہا
 تھا اس لیے اس نے بھڑکنے میں دیر نہیں لگائی۔

”باپ کے چیلوں کے زعم میں اتنا نہ پھڑکو۔ میں دو
 منٹ کے اندر اندر تمہیں خاک جانے پر مجبور کر سکتا ہوں
 لیکن میں تم جیسے بندے کے منہ لگنا ہی نہیں چاہتا۔ میں
 تمہارے باپ سے بات کرنے آیا ہوں۔“ اس نے
 کامران کی طرف حقارت اور حسد کی نظر ڈال کر کہا اور پھر اپنا
 رخ یزدانی کی طرف کر لیا۔ اس کے الفاظ اور انداز پر
 کامران کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا لیکن یزدانی کی
 نظروں میں دھمکی تھی۔ اس نے زبان کھولی تو لہجے میں

آپ کو بچانے کے لیے وہ اپنے بھائی کی زندگی داؤ پر نہیں
 لگا سکتا تھا۔ واپسی کے علاوہ کوئی بھی دوسری راہ اختیار کرنے
 میں سعد کے لیے بہت زیادہ ریسک تھا۔ اگر وہ وقاص سے
 مدد طلب کرتا اور اس کی مدد سے سعد کی بازیابی کے لیے
 کوشش کرتا تو ضروری نہیں تھا کہ اس کوشش میں کامیابی
 حاصل ہو جاتی۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں سے مدد
 طلب کرنا اس سے بھی بڑی حماقت تھی، چنانچہ اس نے قربانی
 دینے کا فیصلہ کر لیا اور وقاص کے گارڈز کو چمکا دے کر اس
 کے اپارٹمنٹ سے نکل گیا۔ باہر نکلتے ہی اس نے ایک ٹیکسی
 رکوائی اور اس میں بیٹھ کر یزدانی بلڈرز کے ایک آفس تک
 جا پہنچا۔ اس وقت آفس میں یزدانی خود اپنے بیٹے کامران
 عرف کامی کے ساتھ موجود تھا۔ معاذ کو دیکھ کر باپ بیٹے
 دونوں کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ کامی نے تو فوراً مکمل نکال
 کر اس کے اوپر تان لیا۔ اسے دیکھ کر آفس میں موجود گارڈ
 نے بھی اپنی گن سے اس کا نشانہ لے لیا لیکن اس نے کسی
 خوف کا مظاہرہ نہیں کیا اور اطمینان سے بولا۔

”میرے پاس رقم موجود نہیں ہے۔ بہتر ہوگا کہ پہلے
 آپ لوگ باہر کھڑے ٹیکسی ڈرائیور کو کرایہ ادا کر کے فارغ
 ہو جائیں۔ میں خود ملے گا۔ یہاں تو اس کا مطلب ہے
 کہ وہ اس کے پاس آجائے۔“ اس کی بات سن کر
 یزدانی نے بھائی اور گارڈ کے ساتھ ٹیکسی والے
 کو اشارہ کر دیا۔

”میرا بھائی کہاں ہے؟ تم لوگوں کا پیغام سننے ہی
 میں واپس آ گیا ہوں۔ اب تم میرے بھائی کو آزاد کر دو۔“
 گارڈ کے باہر جاتے ہی معاذ نے یزدانی کی آنکھوں میں
 آنکھیں ڈال کر اس سے یہ بات کہی تھی۔

”تمہارے بھائی کو میں نے انخوا نہیں کر دیا ہے اور
 نہ ہی میں نے تم کو کوئی دھمکی آمیز پیغام دیا تھا۔“ یزدانی نے
 اس کی بات کے جواب میں کہا اور معاذ کے پیچھے کھڑے
 گارڈ کو کوئی اشارہ کیا۔ اس کا اشارہ پا کر گارڈ نے معاذ کی،
 جو کہ ابھی تک کھڑا ہوا ہی تھا، جامہ تلاشی لینا شروع کر دی۔
 معاذ کی جیبیں بالکل خالی تھیں۔ گارڈ کو کچھ نہیں ملا تو اس نے
 یزدانی کو اس کے کلیئر ہونے کی اطلاع دے دی۔ شاید وہ
 لوگ ڈر رہے تھے کہ معاذ کے پاس کوئی ہتھیار یا خفیہ آلہ تو
 موجود نہیں تھا جس کی مدد سے وہ یہاں ہونے والی منگٹو کہیں
 پہنچا رہا ہو لیکن کچھ ہوتا تو ملتا۔ وہ تو اپنا آپ داؤ پر لگا کر
 اپنے بھائی کے لیے آزادی لینے آیا تھا اور یہاں یزدانی
 سرے سے ہر بات سے انکاری تھا۔ جامہ تلاشی مکمل ہونے

پاگل ہوئی جا رہی ہے۔“ اس نے اپنی میز کے گرد گردی کر سیوں
 میں سے ایک کی طرف اشارہ کیا اور خود اپنے سل فون پر کسی کا
 نمبر ملانے لگا۔ کال ریسو ہوتے ہی چپک کر بولا۔
 ”آپ کی ترکیب کامیاب رہی میڈم۔ پچیس لوٹ کر
 منجرے میں واپس آ گیا ہے۔“ اس کی اس اطلاع کے
 جواب میں دوسری طرف سے کچھ کہا جانے لگا جسے اس نے
 غور سے سنا اور پھر فون بند کر کے معاذ سے مخاطب ہوا۔
 ”تھوڑی دیر میں تمہارے اصل میزبان یہاں پہنچ
 جائیں گے۔ اس وقت تک ہمیں خدمت کا موقع دو۔ ایک
 پیالی چائے پینے میں زیادہ وقت تو نہیں لگتا۔“

”ٹھیک ہے۔“ معاذ اعصابی کشیدگی کا شکار تھا چنانچہ
 یزدانی کی طنزیہ اور منافقانہ منگٹو کے باوجود اس کی پیشکش
 قبول کر لی۔ تھوڑی دیر میں ہی چائے آ گئی۔ چائے سب
 کے لیے ہی تھی لیکن تین چوتھائی کپ خالی کرنے کے بعد
 اسے چکر آنا شروع ہوئے تو اسے اندازہ ہو گیا کہ اس کے
 لیے کوئی ایکسل چائے لائی گئی تھی۔ ایکسل چائے نے اپنا اثر

دکھایا اور تھوڑی دیر میں ہی وہ آنکھیں بند کر کے ہر طرف سے غافل ہو گیا۔ غفلت کی حالت میں کتنی دیر گزری، اسے اندازہ نہیں تھا۔ آٹھ دوبارہ کھلنے کے بعد اس نے خود کو یزدانی کے دفتر کے بجائے اس کمرے میں پایا اور ہر بات یاد آ جانے پر اپنی جگہ سے فوراً کھڑا ہو گیا۔ کمرے کے فرش پر قالین بچھا ہوا تھا۔ دیہیز قالین پر ننگے پیر چلا ہوا وہ دروازے تک گیا اور اس کے ونڈل پر دباؤ ڈالا۔ حیرت انگیز طور پر بالکل خلاف توقع دباؤ ڈالنے سے دروازہ کھل گیا۔ دروازے کے پوں کھل جانے سے وہ شش و پنج میں پڑ گیا کہ آیا باہر جائے یا نہیں۔ ایک ہل کے تذبذب کے بعد وہ دروازہ بند کر کے واپس پلٹ گیا اور صوفے پر جا بیٹھا۔ باہر نکلنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ اپنی مرضی سے قید میں آیا تھا اور اسے یہاں سے کہیں نہیں جانا تھا۔ یہ بات اس کا صیاد بھی سمجھتا تھا اس لیے اس کے کمرے کا دروازہ لاک نہیں کیا گیا تھا۔

”گنڈ مارنگ معاذ! اٹھ گئے ہو تو فریش ہو جاؤ اور ناشتا وغیرہ کر کے فارغ ہو لو پھر میں تم سے تفصیلی بات کرتی ہوں۔“ اسے صوفے پر بیٹھے ہوئے ایک منٹ ہی گزرا ہوگا کہ کمرے کی دروازہ کھلی گئی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو اس کے سامنے ایک عورت کھڑی تھی۔ اس نے اس کے پاس جا کر اس کے ہاتھ میں سے ایک چیز لے لی۔

”مکھ ماننے کی عادت ڈالو معاذ! جتنا اچھا گھوڑا ہو، اسے سدھانے کے لیے اتنی ہی مار لگانی پڑتی ہے۔ مجھے تمہیں تکلیف دیتے ہوئے اچھا نہیں لگتا۔“ نرم لہجہ دار نسوانی آواز میں عجیب سی سرد مہری عمل پیرا گئی۔ معاذ کو مجبوراً خاموشی اختیار کرنی پڑی۔ حسب ہدایت ملحقہ ہاتھ روم سے فریش ہو کر آیا تو پانچ منٹ میں ہی ایک ملازم صورت شخص ناشتے کے لوازمات سے بھری ٹرالی دھکیلتا ہوا اندر لے آیا۔ معاذ نے پچھلی صبح بلکا سا ناشتا لیا تھا اور اس وقت سے اب تک اس کے پیٹ میں کچھ نہیں گیا تھا۔ بادل ناخواستہ اس نے ناشتے کا آغاز کیا تو آہستہ آہستہ کافی کچھ اس کے پیٹ میں منتقل ہو گیا۔ آخر میں اس نے چائے کی پیالی ہونٹوں سے لگائی ہی تھی کہ اپنے حلیے ہی سے ڈاکٹر نظر آنے والا ایک شخص اندر داخل ہوا۔

”ہیلو مسٹر معاذ! آپ کیسے لگ رہے ہیں؟“ ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔ معاذ کوئی جواب دے بغیر اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

”آپ کی صحت کا خیال رکھنے کی رسپانسیٹی اب میرے پاس ہے۔ آپ کی بے ہوشی کے دوران بھی میں آپ کو نریشنس دیتا رہا ہوں۔ رنخوں کو سکھانے والی اسٹری بائیوٹکس کے علاوہ میں نے آپ کو ایسے انجکشن بھی لگائے تھے جو خوراک کی کمی کو کور کر سکیں۔ امید ہے کہ ہوش میں آنے کے بعد آپ کو ویکس نیس مل نہیں ہوئی ہوگی۔“ ڈاکٹر نے دوستانہ انداز میں بتایا تو اسے کچھ آئی کہ تقریباً تین بائیس گھنٹے بے ہوش رہنے کے باوجود اسے نقابہ کیوں محسوس نہیں ہو رہی تھی اور پیٹ کے خالی پن کے باوجود وہ خود کو چست محسوس کر رہا تھا۔ زخم بھی پہلے سے بہت اچھی حالت میں تھے۔ یعنی دوران بے ہوشی اس کا بھرپور خیال رکھا گیا تھا۔ (قربانی کے اس جانور کی طرح جسے ذبح کرنے سے پہلے مالک پیار سے خوب کھلاتا پلاتا اور خدمت کرتا ہے۔)

”آپ چائے ختم کر لیں تو میں آپ کا چیک اپ کر لیتا ہوں۔“ ڈاکٹر بولتے ہوئے سنگل بیڈ پر ٹک چکا تھا۔ معاذ نے چائے ختم کر کے کپ رکھا تو ملازم ٹرالی لے کر باہر نکل گیا۔ ملازم کے نکلنے ہی ڈاکٹر نے اپنی ڈیوٹی سنبھال لی اس کے زخم پر دیکھ کر اس نے ایک کپڑے سے اس کے زخم پر دباؤ ڈالا۔

”آپ اب بہت بہتر لگ رہے ہیں۔“ اس نے اپنے میڈیکل باکس میں سے کچھ دواؤں کے پتے نکال کر اس کے حوالے کیے اور ہدایات دینے کے بعد مصافحہ کر کے کمرے سے باہر نکل گیا۔ معاذ نے اس کی حسب ہدایات دواؤں بھی حلق سے اتار لیں تو کمرے کے کسی حصے میں موجود اسپیکر جاگ اٹھا۔

”دش لائیک آگنڈ ہوائے۔ تم اسی طرح ہماری ہر بات مانتے رہے تو کوئی نقصان نہیں اٹھاؤ گے۔“

”میرا بھائی کہاں ہے؟ میں تم لوگوں کے پاس آ گیا ہوں اس لیے تمہیں چاہیے کہ فوری طور پر اسے چھوڑ دو۔“ معاذ کے صبر کا پیمانہ نہریز ہونے لگا اور اس نے ترش بھج میں مطالبہ کیا۔

”صبر ڈیر! تھوڑا سا صبر کرو۔ تمہیں یہاں تک لانا ہماری پہلی کامیابی ضرور ہے۔ لیکن ابھی ہمیں تم سے بہت سے کام لینے ہیں اور ان کاموں کے لیے ہمیں تمہاری فرمانبرداری کا تعین ہونا چاہیے۔“ بولنے والی کا انداز سختی

شہ زور

خیز تھا۔ ”جہیں یہ یقین دلانے کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟“
 ”اپنے آپ کو مکمل طور پر ہماری غلامی میں دینا ہوگا۔“ اس کے سوال کے جواب میں بغیر کسی گلی پٹی کے کہا گیا۔

”اگر میں زبان سے ہاں کہہ دوں تو کیا تمہیں یقین آجائے گا؟“ معاذ نے دریافت کیا۔
 ”ہمیں یقین دلانے کے لیے تمہیں آزمائش سے گزرنا ہوگا۔“

”کیسی آزمائش؟“ اس نے جاننا چاہا۔
 ”فی الحال تو تم مجھے میرے چند سوالوں کے جوابات دو۔ نمبر ایک، کیرتھر پر تمہاری جان کیسے بچی؟ نمبر دو، ڈاکوؤں کی قید سے نکلنے کے لیے تم نے جو تدبیر اختیار کی اس کے پیچھے کیا راز تھا؟ نمبر تین، تمہیں ہمارے دوستوں کی قید سے فرار کروانے والا کون تھا؟ تم وہاں سے نکلنے کے بعد کہاں اور کس کی پناہ میں رہے؟“ سوالات کرتے ہوئے اس کے لہجے میں حد درجہ سنجیدگی تھی۔ وہ بھی سنجیدگی سے اس کے سوالات کے جواب دیتے ہوئے بولا۔

”کیرتھر پر مجھے میری خوش قسمتی نے بچایا اور میں اپنے گھر واپس آ گیا۔“ اس نے مجھے بتایا۔
 ”اور وہاں سے تم نے فرار کیسے کیا؟“ اس نے پوچھا۔
 ”میں نے اپنے گھر کے پچھلے دروازے سے نکل کر فرار کیا۔“ اس نے بتایا۔
 ”اس کے بعد تم نے کہاں پناہ لی؟“ اس نے پوچھا۔
 ”میں نے ایک دوست کے گھر میں پناہ لی۔“ اس نے بتایا۔
 ”وہ دوست کون تھا؟“ اس نے پوچھا۔
 ”اس کا نام سید علی تھا۔“ اس نے بتایا۔
 ”اس کے بعد تم نے کہاں پناہ لی؟“ اس نے پوچھا۔
 ”میں نے ایک دوست کے گھر میں پناہ لی۔“ اس نے بتایا۔
 ”وہ دوست کون تھا؟“ اس نے پوچھا۔
 ”اس کا نام سید علی تھا۔“ اس نے بتایا۔
 ”اس کے بعد تم نے کہاں پناہ لی؟“ اس نے پوچھا۔
 ”میں نے ایک دوست کے گھر میں پناہ لی۔“ اس نے بتایا۔
 ”وہ دوست کون تھا؟“ اس نے پوچھا۔
 ”اس کا نام سید علی تھا۔“ اس نے بتایا۔

”تم ہمارے ساتھ تعاون نہیں کر رہے ہو معاذ! اور“ اس نے کہا۔
 ”میں نے اپنے گھر واپس آ گیا۔“ اس نے بتایا۔
 ”اور وہاں سے تم نے فرار کیسے کیا؟“ اس نے پوچھا۔
 ”میں نے اپنے گھر کے پچھلے دروازے سے نکل کر فرار کیا۔“ اس نے بتایا۔
 ”اس کے بعد تم نے کہاں پناہ لی؟“ اس نے پوچھا۔
 ”میں نے ایک دوست کے گھر میں پناہ لی۔“ اس نے بتایا۔
 ”وہ دوست کون تھا؟“ اس نے پوچھا۔
 ”اس کا نام سید علی تھا۔“ اس نے بتایا۔
 ”اس کے بعد تم نے کہاں پناہ لی؟“ اس نے پوچھا۔
 ”میں نے ایک دوست کے گھر میں پناہ لی۔“ اس نے بتایا۔
 ”وہ دوست کون تھا؟“ اس نے پوچھا۔
 ”اس کا نام سید علی تھا۔“ اس نے بتایا۔

”یقیناً ایسا ہی ہوگا لیکن میں بتا چکا ہوں کہ اس نے مجھ سے اپنا تعارف نہیں کروایا تھا، نہ ہی وہ کوئی مشہور و معروف شخصیت تھا کہ میں پہلے ہی سے اس سے واقف ہوتا۔“ وقاص کا نام لے کر وہ محسن کشی کا مرکب نہیں ہو سکتا تھا اس لیے اپنی بات پر قائم رہا۔
 ”ٹھیک ہے معاذ! یہ تمہاری اپنی چوائس ہے کہ ہم تمہاری وفاداری خریدنے کے لیے وہ طریقہ کار اختیار کریں جو یقیناً تمہارے لیے تکلیف دہ ہوگا۔“ نہایت حکمتیں لہجے میں کہہ کر وہ خاموش ہو گئی تو معاذ نے اپنے اندر بے چینی کی محسوس کی۔

”وہ لا“ کون تھا؟ میں اس لڑکے کے بارے میں تفصیل سے جاننا چاہتی ہوں۔“ اس سے گھبر لہجے میں سوال کیا گیا۔

Scanned with CamScanner

جاربہ تھا۔ ذرا سی دیر میں اس قصائی نما سرجن نے پیٹ کے شکاف میں سے خون میں بھرا ایک لوتھڑا سا برآمد کر لیا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ سارا منظر دیکھتے محاذ کو شاخت کرنے میں دیر نہیں لگی کہ پیٹ چیر کر نکالا گیا وہ عضو ایک انسانی گردہ تھا۔ گردہ کیوں نکالا گیا تھا؟ یہ سوال تو اپنی جگہ تھا لیکن اسے حیرت اس بات پر تھی کہ گردے کے آپریشن کے لیے یہ کون سا طریقہ اختیار کیا گیا تھا اور اتنے نازک آپریشن کو صرف دو افراد کیوں سنڈل کر رہے تھے؟ سب سے بڑی بات اسے یہ آپریشن کیوں دکھایا جارہا تھا؟ اپنے اس آخری کیوں کا جواب حاصل کرنے کے لیے اسے انتظار کی زحمت نہیں اٹھانی پڑی۔ گردہ نکالے جاتے ہی کیمرا حرکت میں آیا اور پیٹ پر سے ہٹ کر اوپر کی طرف رینگنے لگا۔ اب اسے بے ہوش شخص کے سینے کے علاوہ دونوں ہاتھ بھی دکھائی دے رہے تھے۔ ایک ہاتھ پر بلڈ پریشر وغیرہ کی مانیٹرنگ کرنے والے آلات نصب تھے جبکہ دوسرے ہاتھ میں بہت سی کیونولا سے ڈرپ منسک تھی۔ کیونولا والے ہاتھ کو کیمرے نے ذرا قریب سے فوکس کیا تو کھائی سے ذرا اوپر موجود کر اس کا گہرا نشان دیکھ کر محاذ بے ساختہ ہی اپنی جگہ سے کھڑکھڑا اٹھا۔ اسے اچھے طرح یاد تھا کہ بچھن میں ایک بار جب اسے کیمرا دکھایا گیا تھا اور اس کے کھون روکنے کے لیے اسے پڑے ہوئے تھا۔

بن گیا تھا اور اب وہ اسکرین پر نظر آتے تھے مشق بنے انسان کے ہاتھ پر بھی وہی نشان دکھ رہا تھا۔

”سعد“ اس کے ہونٹوں نے بے یقینی کے عالم میں سرگوشی سی کی ہی تھی کہ گیمراہاتھ پر سے ہٹ کر یکدم چہرے پر پہنچ گیا۔ منہ پر آکسیجن ماسک لگا تھا اور بالوں کو کور کرنے کے لیے لگائی گئی مخصوص کیپ نے ماتھے کا بھی ایک بڑا حصہ ڈھانپ رکھا تھا، اس کے باوجود یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اپنے پیارے بھائی سعد کو شناخت نہیں کر پاتا۔ آنکھیں بند کیے دنیا و مافیہا سے بے خبر آخر پریشن نیمل پر لیٹا ہوا وہ شخص اس کا عزیز از جان بھائی سعد تھا۔ یہ جان کر اس کے سینے میں کوئی تیر سا بھوست ہو گیا تھا اور وہ اتنی بری طرح تڑپا تھا کہ اسے لگا تھا اس کے جسم سے جان ہی نکل جائے گی۔

”آرام سے اپنی جگہ بیٹھ جاؤ معاذ! ابھی تم نے جو کچھ دیکھا وہ صرف ایک نرملہ تھا۔ اس کے آگے تم جو کچھ دیکھو گے، وہ جیسا تمہارے قدموں پر کھڑا نہیں رہنے دے گا۔“ احابک ہی اس بیکر سے سرد مہر آواز ابھری اور اسے

ہدایت دی۔

”یو..... فح..... یہ تم میرے بھائی کے ساتھ کیا کر رہی ہو؟ یاد رکھو کہ تمہیں اس کا شدید خیا زہ جھگٹنا پڑے گا۔“ آواز سن کر معاذ آجے سے باہر ہو گیا اور زندگی میں پہلی بار کسی عورت کے لیے کھلی استعمال کرتے ہوئے بلند آواز میں دہڑا۔

”زبان کو قابو میں رکھو معاذ! تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ میں تمہاری پہنچ سے بہت دور ہوں لیکن تمہارا بھائی میرے رحم و کرم پر ہے۔ میرے ایک اشارے پر اس کا ایک ایک عضو اس کے جسم سے الگ کر دیا جائے گا۔ صحت مند جوان جسم سے نکلے اعضا کی مارکیٹ میں بڑی مانگ ہے۔ ہم کلاؤں میں تمہارا پورا بھائی بیچ ڈالیں گے اور تم ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے۔ اس لیے دھمکیاں دینے کے بجائے یہ سوچو کہ تم ہم سے اپنا بھائی بیع سالم حالت میں کیسے واپس لے سکتے ہو۔ ایک گردے کی کوئی بات نہیں ہے۔ ایک گردہ تمہاری اس صحت کی مزا ہے جو تم نے مجھ سے مسلسل جھوٹ بول کر رکھی ہے اور یہ ایسی کوئی سخت سزا نہیں ہے۔ ایک گردے کے سہارے بھی تمہارا بھائی زندگی گزار سکتا ہے لیکن یاد رکھو کہ جس کی ہر حالت میں سرکشی کی سزا موت ہے۔“

جیسا۔ تم پر ہم نے جو انویسٹمنٹ کی ہے، وہ تمہارے بھائی کے اعضا بیچ کر ہی وصول کر لیں گے اور تمہارے اعضا کی فروخت ہمارا پرافٹ ہوگا لیکن اس سب کی نوبت ہی کیوں آئے۔ تم سیدھی طرح ہماری بات مان لو تو سارا مسئلہ ہی حل ہو جائے گا۔ تم اور تمہارا بھائی اپنیوں کے درمیان واپس جاسکو گے اور وہ سب چارے مسلسل اذیت سے آزاد ہو جائیں گے۔ تمہاری ماں جو زندگی و موت کی کشمکش میں جلا اسپتال میں پڑی ہے، اپنے بیٹوں کو یا کر دوبارہ جی طے گی اور تم لوگ ایک بار پھر خوش باش فیملی کی طرح رہنے لگو گے۔“ اب وہ ایسے نرم لہجہ میں اسے سمجھا رہی تھی جیسے اس سے بڑھ کر کوئی بہتر دور و مہربان ہی نہ ہو۔

”میری ماں کو کیا ہوا ہے؟“ معاذ ماں کے اسپتال میں ہونے کی خبر سن کر بے چین ہوا۔

”ہمارے ایک۔ سعد کے انہماکی خبر ان کے لیے ناقابل برداشت ثابت ہوئی تھی۔“ اس نے سنجیدگی سے بتایا۔

شہ زور

درخت کی شاخیں کاٹنا۔ جسے شاخیں نہیں، جڑیں کاٹی ہیں اور جڑوں تک تم جب ہی پہنچ سکو گی جب ہمارے کبے پر عمل کرو گی کیونکہ جتنا ہم تمہارے دشمنوں سے واقف ہیں، تم اس کا چند فیصد بھی نہیں جانتیں۔" کئی بار کا پڑھایا سبق ایک بار پھر اسے پڑھایا جانے لگا۔

"میں ان سب باتوں کو سمجھتی ہوں میڈم! آپ اطمینان رکھیں، میں آپ کے مشورے کے بغیر کچھ نہیں کروں گی۔" اس نے اپنے تئیں لہجے میں جواب دیا اور مسکرا کر بولی۔ "اب مجھے اجازت دیں۔ مجھے ابھی کچھ مزید تیاریاں کرنی ہیں۔"

"اوکے۔ ڈس پوزیٹ آف لک۔" اسے مسکرا کر خوشی سے اجازت دے دی گئی۔ اجازت ملتے ہی باری ڈول بائیں ایڑی پر گھومی اور دلربا ہوش رہا چال چلتی ہوئی اپنے پیچھے موجود دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ جب تک وہ دروازے کے پیچھے غائب نہیں ہو گئی، عورت کے پیچھے کھڑا اس کا شوہر ایک ٹک اسے دیکھتا رہا۔ وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تو نچلے ہونٹ پر زبان پھیر کر چنخارا لینے کے انداز میں بولا۔

"یہ تو اوپر والے کی دین ہے کہ ایسی بیوی دی جو حسین بھی ہے اور براڈ اسٹنڈ ڈبھی۔" سرد نے قہقہہ لگایا۔ "اسے کہتے ہیں پانچوں انگلیاں مٹی میں اور سر نرالی میں۔" عورت نے بھی اس کے قہقہے کا ساتھ دیا اور دونوں میان بیوی بانہوں میں بانہیں ڈال کر اس وسیع ہال نما کمرے کے دوسرے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ وہ ایک اوڈیکل تھا اس کے باوجود وہ ایک تھے تو اس کے پیچھے کچھ راز تھے اور ان رازوں سے ایک فریق قطعی بے خبر تھا۔

☆☆☆

لاہور اتر پورٹ پر اتر کردو قس نے ایک جیسی ہائڑ کی اور نیکی والے کو اپنا مطلوبہ پتا بتا کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گزشتہ رات شہر میں ہلکی بارش ہوئی تھی اور اب بھی آسمان پر سرخی بادل تیرتے پھرتے تھے اس لیے مجموعی طور پر فضا بہت ٹھہری ہوئی اور خوش گوار محسوس ہو رہی تھی۔ بارش کے باعث درخت، پودے اور عمارتیں دھل کر صاف ہو گئی تھیں اور ان کے رنگ پہلے سے زیادہ شوخ اور ٹھہرے ہوئے

کے ساتھ حرکت کرتی جا رہی تھی۔ دیکھنے والوں کے لیے فیصلہ کرنا مشکل تھا۔ دیکھنے والے بھی کہتے..... فقط دو لیکن دونوں ہی کی آنکھوں میں اس کے لیے زبردست سٹائش تھی۔ جب وہ ایک ایک زاویے سے اسے جانچ چکے تو عورت نے اپنے ہاتھ کو جنبش دی اور فوراً ہی وہاں جتا میوزک بند ہو گیا۔ میوزک بند ہوتے ہی رقصاں سینہ یوں ساکت ہو گئی جیسے کسی چابی کی گڑیا کی چابی ختم ہو گئی ہو۔

"ویری ویلڈن! تم نے تو کمال ہی کر دیا باری!" عورت اٹھ کر اس کے قریب گئی اور تعریف کرنے میں پہل کی۔ جواب میں باری ڈول پلکیں جھپکا کر دھیرے سے مسکرا دی۔

"مجھے پورا یقین ہے کہ مون لائٹ والوں کے لیے تمہارے سلیکشن کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوگا۔ تم آج ہی انٹرویو اور ٹرائل کے لیے وہاں پہنچ جاؤ۔ آگے کے سفر میں تمہارے لیے کامیابی ہی کامیابی نکلی ہے۔" عورت نے پرجوش انداز میں اس کو مشورہ دیا تو تب بھی وہ زبان سے کچھ نہیں بولی اور محض سر کو اٹھاتی جنبش دے کر رہ گئی۔

"انتاکم بولنے والی اتنی خوبصورت عورت میں نے پہلی بار دیکھا ہے۔" اس نے استغناء سے نظریں ڈالیں۔ "میں نے اسے دیکھا ہے ہی خاموشی سے مسکراتی ہے۔" عورت نے اسے دیکھا تھا۔ "تمہارے لیے یہ سب کچھ ہے۔" عورت نے اسے دیکھا تھا۔ "تمہارے لیے یہ سب کچھ ہے۔" عورت نے اسے دیکھا تھا۔

"دیکھ لو مجھے جیسی حسین عورت کا شوہر بھی تم پر لٹو ہو گیا ہے تو پھر باقیوں کا کیا حال ہوگا؟ تم تو اس شہر میں آگ لگ دو گی آگ!"

"مجھے آگ ہی لگانی ہے۔ جلا کر بھسم کر دینے والی آگ۔" باری نے پہلی بار زبان کھولی اور ان دونوں کو اندازہ ہو گیا کہ اس کے اندر بھڑکتے ہوئے شعلے جوں کے توں ہیں اور سخت ترقیتی مراحل سے گزرتے ہوئے بھی اس نے کچھ نہیں بھلا یا ہے۔

"جو چاہے کرو لیکن ذرا سمجھ داری، صبر اور پلاننگ کے ساتھ ورنہ ہماری اور تمہاری اتنے عرصے کی محنت ضائع ہو جائے گی۔" عورت نے فوراً اسے سمجھایا تو اس نے سر کو تنہائی جنبش دی۔

"تمہارے دشمن اب پہلے سے بھی زیادہ طاقتور اور مضبوط ہو چکے ہیں۔ بغیر پلاننگ کے کیا تمہارا کوئی بھی وار دشمن سے زیادہ تمہیں نقصان پہنچائے گا۔ دشمن کے چند مہروں کو شکار کر لیتا ایسا ہی ہوگا جیسے کسی مضبوط اور تیار

محسوس ہو رہے تھے۔ آبی بخارات سے بوجھل ہوا کے نم جھونکے جسم سے گراتے تھے تو ایک سکون کا سا احساس ہوتا تھا لیکن وقاص موسم کی اس خوبصورتی اور خوش گواریت کو محسوس کرنے سے قاصر تھا۔ اس کی طبیعت پر ایک بوجھل پن سا طاری تھا اور بار بار دل میں ایک لہری اٹھتی تھی۔ کل شام ڈھلے طے والی دو بڑی خبروں نے اسے اس کیفیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ پہلی خبر معاذ کی والدہ سعیدہ بیگم کے حوالے سے ملی تھی۔ وہ سعد کے اغوا کے بعد ہونے والے ہارٹ ایٹک کے بعد سے مسلسل اسپتال میں زیر علاج تھیں اور تمام تر طبی سہولتوں کے باوجود ان کی حالت سنبھلنے میں نہیں آ رہی تھی۔ ڈاکٹرز کے مطابق ان کی صحت یابی کی راہ میں ان کی جذباتی کیفیت سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ وہ جینے کی امنگ کو بچکی تھیں اور جو خود سے نہ جینا چاہتا ہو اسے دوا کی اور مشینیں کب تک زندہ رکھ سکتی ہیں۔ سعیدہ بیگم کی زندگی کی کہانی بھی کل شام ختم ہو گئی تھی۔ انہیں اسپتال میں ہی ایک اور زبردست ہارٹ ایٹک پڑا تھا جو جان لیوا ثابت ہوا تھا اور وہ خود غموں سے نجات پا کر پیچھے والوں کو روتا ہوا چھوڑ گئی تھیں۔

سہارا لیا جاتا رہا تھا۔ ان دو خبروں کے ملنے کے بعد وقاص کے لیے خود کو لاہور آنے سے روکنا ممکن نہیں رہا تھا۔ حقیقتاً وہ سعیدہ بیگم کی موت کی خبر سن کر ہی لاہور جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس کے دل میں خواہش تھی کہ بے شک وہ علیحدہ کا دکھ بانٹ نہیں سکتا لیکن اس کے غم میں شریک تو ہو جائے۔ وہ سعیدہ بیگم کے جنازے میں شرکت کے لیے لاہور جانے کا فیصلہ پہلے ہی کر چکا تھا۔ سعد کی اس طرح اچانک آمد کی وجہ سے درشاہ کو ان کی تدفین میں قدرے تاخیر کرنا پڑی تھی اور انتقال کے دوسرے دن جنازہ اٹھانے کا اعلان کیا گیا تھا۔

وقاص اسی حساب سے بذریعہ ہوائی جہاز لاہور پہنچا تھا۔ وہ پندرہ دن دینی میں رہ کر آیا تھا اور واپس آنے کے بعد بھی اچھا خاصا مصروف رہا تھا۔ اس عرصے میں اس نے اپنے لوگوں کے ذریعے معاذ کا کھوج لگانے کی کافی کوشش کی تھی لیکن اس تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ اسے جو واحد غیر مصدقہ لیکن اہم اطلاع معاذ کے حوالے سے ملی تھی، وہ یہ تھی کہ معاذ کو ایک دن یزدانی کے آفس میں دیکھا گیا تھا۔ یہ وہی دن تھا جب معاذ اس کے گاڑو کو بے ہوش کر کے اپارٹمنٹ سے غائب ہو گیا تھا۔ اس کے بعد سے

میں بھی تلاش کرتے رہے۔ اسے پتہ تھا کہ صرف اس کے پاس ہی اس کی رہائشی علاقے میں داخلہ ہو سکتا تھا۔ وہ غائب دہائی کی طبیعت میں اپنی پھولی کے رہائشی علاقے میں داخلہ ہو کر بھٹکتا پھر رہا تھا کہ ایک گزن نے اسے دیکھ کر پہچان لیا اور اپنے ساتھ گھر لے آیا۔ اس کی اس طرح گھر آمد گھر والوں کے لیے ایک جذباتی جھٹکا تھا۔ وہ سعد کے بھائے گو یا سعد کے سائے کو دیکھ رہے تھے۔ صحت مند اور گورا چٹا سعد تقریباً ایک ماہ کے عرصے میں سوکھ کر کاٹنا ہو چکا تھا اور اس کی گوری رنگت جل کر سیاہی مائل ہو گئی تھی۔ وہ گھر والوں کو ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے کسی کو پہچانتا ہی نہ ہو۔ اعزاء کے مشورے پر اسے فوری طور پر قریبی اسپتال لے جایا گیا جہاں اس کے مکمل معائنے کے بعد یہ تکلیف دہ خبر سامنے آئی کہ وہ اپنے ایک گردے سے محروم ہو چکا ہے۔ اسے اپنے اغوا کے بعد کی کوئی بات یاد نہیں تھی اور وہ بالکل بھی نہیں بتا سکا تھا کہ وہ اتنے عرصے کہاں اور کن لوگوں کے پاس رہا تھا۔ اس کا معائنہ کرنے والے ڈاکٹروں نے انکشاف کیا تھا کہ اسے اس عرصے میں زیادہ تر بے ہوش اور نیند کی حالت میں رکھا گیا تھا اور زندہ رکھنے کے لیے یقیناً ڈرپس اور غذا کی نگہی کا

میں بھی تلاش کرتے رہے۔ اسے پتہ تھا کہ صرف اس کے پاس ہی اس کی رہائشی علاقے میں داخلہ ہو سکتا تھا۔ وہ غائب دہائی کی طبیعت میں اپنی پھولی کے رہائشی علاقے میں داخلہ ہو کر بھٹکتا پھر رہا تھا کہ ایک گزن نے اسے دیکھ کر پہچان لیا اور اپنے ساتھ گھر لے آیا۔ اس کی اس طرح گھر آمد گھر والوں کے لیے ایک جذباتی جھٹکا تھا۔ وہ سعد کے بھائے گو یا سعد کے سائے کو دیکھ رہے تھے۔ صحت مند اور گورا چٹا سعد تقریباً ایک ماہ کے عرصے میں سوکھ کر کاٹنا ہو چکا تھا اور اس کی گوری رنگت جل کر سیاہی مائل ہو گئی تھی۔ وہ گھر والوں کو ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے کسی کو پہچانتا ہی نہ ہو۔ اعزاء کے مشورے پر اسے فوری طور پر قریبی اسپتال لے جایا گیا جہاں اس کے مکمل معائنے کے بعد یہ تکلیف دہ خبر سامنے آئی کہ وہ اپنے ایک گردے سے محروم ہو چکا ہے۔ اسے اپنے اغوا کے بعد کی کوئی بات یاد نہیں تھی اور وہ بالکل بھی نہیں بتا سکا تھا کہ وہ اتنے عرصے کہاں اور کن لوگوں کے پاس رہا تھا۔ اس کا معائنہ کرنے والے ڈاکٹروں نے انکشاف کیا تھا کہ اسے اس عرصے میں زیادہ تر بے ہوش اور نیند کی حالت میں رکھا گیا تھا اور زندہ رکھنے کے لیے یقیناً ڈرپس اور غذا کی نگہی کا

Scanned with CamScanner

ایسی دلخراش تھی کہ وقاص کو اچانک دل چڑتا ہوا محسوس ہوا۔
خواتین نے منہ میں دوپٹے ٹھونس کر اپنی سسکیوں کو روکا۔
معاذ کے والد خاور صاحب جو دائیں جانب سرہانے سے
جنازے کو کندھا دیے ہوئے تھے، پہلے سے زیادہ نڈھال
اور زرد پڑ گئے اور مردوں میں سے بھی کئی کی آنکھیں نم
ہو گئیں۔ اس موقع پر ایک ادیبز عمر خاتون اور حسین و جمیل
لڑکی نے آگے بڑھ کر علیحدہ کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔
بانہوں کا سہارا پاتے ہی وہ ہوش و خرد سے بیگانہ ہوئی۔ اسی
وقت ایک لڑکے نے کھلے ہوئے گیٹ کو بند کر دیا تو منظر
وقاص کی آنکھوں سے پوشیدہ ہو گیا۔ جنازہ اب شامیانے
سے باہر لے جایا جا رہا تھا۔ دیگر مرد حضرات کی طرح وقاص
بھی جنازے کے پیچھے چل پڑا۔ سحاب بھی کرسی پر بیٹھا
ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر تکلیف اور پریشانی کے تاثرات
ضرور تھے لیکن آنکھوں میں ایک خالی پن سا تھا جس سے
ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ صورت حال کو پوری طرح سمجھنے سے
قاصر ہے۔ وہ جتنے طویل عرصے بے ہوشی اور نیند کی حالت
میں رکھا گیا تھا، اس کی یہ حالت قابل فہم تھی۔ اسے مکمل
حواسوں میں آنے کے لیے چند وقت اور طبی امداد اور کارنگھی۔

جنازے کے ساتھ۔
میں کے۔
ساتھ چلتے
ساتھ سے

”بڑا تو ہوا لیکن جانے کیا چہرے جس میں یہ لوگ
پھنس گئے ہیں۔ مجھے لگتا ہے معاذ بھائی کسی غلط معاملے میں
لوٹ ہو گئے تھے جس کی سزا سارا خاندان بھگت رہا ہے۔“
کہتے ہیں تاکہ جتنے منہ اتنی باتیں۔ وہاں بھی یہی سب کچھ
ہو رہا تھا۔ وقاص کو اس نر کے کا یہ تہرہ بہت بُرا لگا لیکن وہ
خون کے مہونہ پی کر رہ گیا۔ زندگی نے اسے اپنے بڑے
بچ روپ دکھائے تھے اس لیے وہ ایسی باتوں کو برداشت
کرنے کا ہنر جانتا تھا۔ اب بھی ان لڑکوں سے الجھنے کے
بجائے قدموں کی رفتار بڑھا کر ان سے آگے نکل گیا۔ کچھ
دیر جنازے کو کندھا دیا تو اپنی ماں یاد آگئی۔ باپ کی تو بھی
اس نے صورت ہی نہیں دیکھی تھی، بس ماں بھی جس کے
سائے سے بھی وہ کم عمری میں ہی محروم ہو گیا تھا۔ ماں کی
جدائی کا غم کیا ہوتا ہے، وہ اس بات سے آگاہ تھا اور علیحدہ
کے دکھ کو بہت اچھی طرح سمجھ سکتا تھا۔ دکھی دل سے قریبی
قبرستان تک کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ باقی لوگوں سے
تدرے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ تدفین کا مرحلہ مکمل ہونے کے

بعد جنازے کے ساتھ آنے والے لوگ واپس پلٹنے لگے۔
وہ ان لوگوں کے ساتھ شامل نہیں ہوا اور قبرستان میں ہی رکا
رہا۔ سب لوگ واپس چلے گئے تو اس نے گورکن کی جھونپڑی
کا رخ کیا اور چند نوٹ اس کے حوالے کر کے بولا۔
”ابھی جس قبر میں تدفین ہوئی ہے، اس کا خیال رکھنا
بابا!“

”میرا تو کام ہی یہی ہے پتا! اپنی طاقت کے مطابق
اپنی ذیوائی پوری کرتا ہوں۔“ بوڑھے گورکن نے اسے
جواب دیا، پھر افسردہ لہجے میں بولا۔

”میری ان بوڑھی آنکھوں نے بڑی دنیا دیکھی ہے۔
یہاں لائے جانے والوں کے والی وارث کچھ دن تو روتے
ترپتے یہاں آتے ہیں لیکن پھر آہستہ آہستہ یہاں کا راستہ
بھولنے لگتا ہے۔ کچھ عید برات پر چکر لگاتے ہیں اور کچھ کو
اس کی بھی توفیق نہیں ہوتی۔ ایسی قبروں کا پھر نام و نشان ہی
مٹ جاتا ہے۔ میں جھوٹ نہیں بولوں گا، یہ سچ ہے کہ ایسی
قبروں کو ہم خود مسمار کر کے نئے آنے والے مردوں کے لیے
جگہ بناتے ہیں۔“ اپنی رو میں بولتا ہوا بوڑھا کچھ خیال آنے
پر چونکا اور اس سے پوچھا۔

”کیا تم نے اسے
دیکھا ہے؟“
جواب دیا۔

ایک بار پھر اسے اسی مقام سے سر رہا تھا جہاں سعیدہ بیگم کی
قبر پتائی گئی تھی۔ ابھی وہ قبر سے کچھ فاصلے پر تھا کہ اس نے
ایک شخص کو وہاں دیکھا۔ وہ موبائل فون ہاتھ میں لیے مختلف
زاویوں سے قبر کی تصویریں کھینچ رہا تھا۔ وقاص نے سعیدہ
بیگم کی آخری رسومات میں شرکت کے دوران پہلے گھر پر اور
بعد میں قبرستان میں دو تین نوجوان چیمیز کے نمائندوں کو دیکھا تھا
لیکن یہ شخص ان لوگوں سے قطعی مختلف تھا۔ ان کا انداز
پروہنشل تھا اور انہوں نے اپنے گھون میں اپنے چیمیز کے
کارڈ لٹکا رکھے تھے جبکہ یہ شخص کچھ مشکوک سا لگ رہا تھا جو
سب لوگوں کے جانے کے بعد تصویریں بنا رہا تھا۔

”اے! کون ہو تم؟“ وقاص نے دور ہی سے اسے
پکارا تو اس نے پہلے خشک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر پلٹ
کر قبرستان سے باہر جانے والے راستے کی طرف بھاگ
کھڑا ہوا۔

”خبردار! رگ جاؤ۔“ وقاص چلتا ہوا اور خود بھی اس
کے پیچھے بھاگا۔ بھاگنے میں اس کی رفتار جتنی تیز تھی، یہ ممکن
نہیں تھا کہ وہ شخص اس سے بچ لگتا لیکن قسمت کی خرابی سے

شہ زور

ان کا نصیب ٹھہری تھی۔ باپ کی شکست پر عالم شاہ نے فطری طور پر دکھ محسوس کیا تھا اور اسے اس بات کا احساس تھا کہ ہر سال کی طرح اس سال وہ الیکشن کی مصروفیات میں ان کا ساتھ نہیں دے سکا تھا۔ ان کی شکست کے علاوہ اس کے لیے دوسری تکلیف وہ شے معاذ اور اس کی فیملی کے معاملات تھے۔ معاذ ہنوز غائب تھا۔ اس کا چھوٹا بھائی سعد اغوا کے بعد اپنا ایک گروہ گنوا کر واپس آچکا تھا لیکن اس کے پاس کسی کو بتانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ معاذ کی والدہ کی وفات نے اسی کی شدت کو مزید بڑھا دیا تھا۔ صاحب فراش ہونے کی وجہ سے وہ ان کے جنازے میں شرکت کے لیے لاہور نہیں جاسکا تھا اور معاذ کے والد سے محض ٹیلی فون پر ہی تعزیت کر کے رہ گیا تھا۔ غم اور پریشانیوں کے مارے اس کے والد نے کسی سے کوئی شکوہ نہیں کیا تھا لیکن عالم شاہ اپنی جگہ شرمسار تھا کہ وہ دوستی کے علق کو اس طرح نہیں نبھاسکا تھا جیسا کہ اس رشتے کا حق تھا اور معاذ انجانے میں ہی اس پر ایک احسان کر گیا تھا۔ سچل اور معظم شاہ کی اغوا کاروں سے نجات معاذ ہی کی مرہون منت تھی لیکن معاذ خود کہاں تھا؟ اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔

”فون کون نہیں اٹھا رہے پتہ؟ کب سے تمہارا فون چل رہا ہے؟“

”السلام علیکم ادا!“

”وعلیکم السلام۔ کیا حال ہے؟“ معظم شاہ نے اس سے دریافت کیا۔

”اماں سامیں کے رحم و کرم پر ہوں۔“ اس نے سامنے صوفے پر براجمان ہو جانے والی اپنی والدہ کی طرف دیکھتے ہوئے جان بوجھ کر بے چارگی کا اظہار کیا جس پر انہوں نے اسے محبت بھری نگلی سے گھورا۔

”یہ تو اچھی بات ہے۔ یہ مائیں ہی ہوتی ہیں جو سرکش گھوڑے جیسے بیٹوں کو نگاہیں ڈال کر رکھتی ہیں۔“ معظم شاہ نے ہنس کر کہا لیکن اس کی ہنسی میں وہ تازگی نہیں تھی جو ایک خوش باش اور مطمئن آدمی کی ہنسی میں ہوتی ہے۔

”آپ شہر کب پہنچ رہے ہیں ادا! اماں سامیں کا خیال ہے کہ اب آپ کو یہاں موجود ہونا چاہیے۔“ ماں کی طرف سے اشارہ ملنے پر اس نے بہنوئی سے پوچھا۔

”مجھے خود بھی اس بات کا احساس ہے لیکن یہاں کے

اس کا بھر کسی چیز میں الجھا اور وہ بُری طرح گر گیا۔ اس نے کوشش کی کہ پھرتی سے اٹھ کر اس شخص کے تعاقب میں دوبارہ دوڑ سکے لیکن اس کا پیر بری طرح الجھا ہوا تھا۔ وہ ایک خود رو جنگی ٹیل بھی جو اس کے پاؤں میں لپٹ گئی تھی۔ اس نے جھکا دے کر پاؤں کو تیل کی ٹرفت سے آزاد کروایا اور ایک بار پھر اس شخص کے پیچھے لپکا لیکن اس دوران وہ شخص کافی آگے نکل چکا تھا۔ وقاص نے درمیانی فاصلہ کم کرنے کے لیے اپنی جان لڑا دی لیکن ایک بار پھر قسمت نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ قبرستان سے نکلتے ہی وہ شخص اچھل کر ایک بانیک پر سوار ہوا اور گنگ لگا کر وہاں سے ہوا ہو گیا۔ اس کے پاس سواری ہوتی تو وہ بھی اس کے پیچھے جاسکتا تھا۔ فی الحال ہاتھ ملتا رہ گیا۔ وہ مشکوک شخص کون تھا اور یوں قبر کی تصویریں کھینچنے کے پیچھے اس کا کیا مقصد تھا؟ یہ سوالات ایک جھمن کی طرح اس کے ذہن ہی میں رہ گئے۔

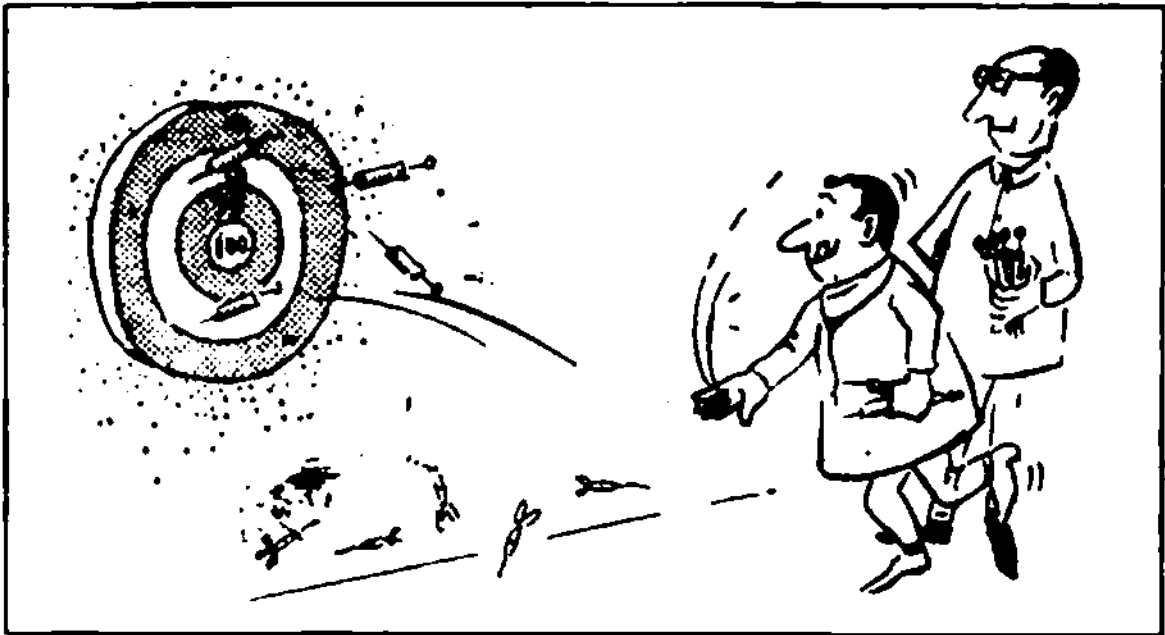
☆☆☆

ایک کے بعد ایک چینل بدلتے عالم شاہ کا جب کسی بھی پروگرام میں دل نہ لگا تو اس نے بیزارگی کے عالم میں ٹیلی ویژن بند کر کے ریوٹ ایک طرف پھینک دیا۔ پتا نہیں کوئی ذہن کا پروگرام نہیں آ رہا تھا اس کی اپنی ذہنی

جہنمیں شہر آنے کے بعد ہی ساری صورت حال کے بارے میں صحیح طرح سے علم ہوا تھا، اسے مستقل طور پر بستر پر لٹائے رکھنے پر مصر تھیں اور ہر وقت اس کو ایسی چیزیں کھلانے پلانے پر کمر بستہ رہتی تھیں جن کے استعمال سے خون بڑا اور جسم کو طاقت ملتی۔ ان کی اتنی توجہ کا اس کی صحت پر مثبت اثر بڑھ بھی رہا تھا لیکن ذہنی کوفت اور جذباتی الجھنیں اپنی جگہ تھیں۔ آسید کا کوئی کھوج نہ لگ سکنے کی وجہ سے وہ ابھی تک بہت سے لوگوں کی نظروں میں مشکوک تھا اور اس کا اثر براہ راست صداقت شاہ کے ووٹ بینک پر پڑا تھا۔ مخالف گروپ نے اس معاملے میں بہت پروپیگنڈا کیا تھا اور لوگوں کو بدعنوان کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ نتیجتاً صداقت شاہ پہلی بار اپنی سیٹ پار گئے تھے۔ ان کی ہار کی وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اپنی الیکشن مین ٹیم کی طرح سے نہیں چلا سکے تھے۔ بے در پے پیش آنے والے واقعات نے انہیں غمزدار کر دیا تھا پھر وہ مخالفین کی طرح اوجھے جھکنڈے استعمال کرنے کے بھی عادی نہیں تھے، سو شکست

اکتوبر 2020ء

سینسٹرس ڈائجسٹ 93



میں موجودگی کی اطلاع دے دینی چاہیے۔ اطلاع دینے کے لیے اس نے موبائل باہر نکالا ہی تھا کہ موبل کی کال آگئی۔ وہ خاصی پرجوش اور جذباتی لگ رہی تھی۔ اس کی ہیلو سننے ہی پر مے ہوئے سانس کے ساتھ بولی۔

”مبارک ہو ادا! اللہ سائیکس نے ہم دونوں کو بھانجے۔“

”جی۔ مجھے زیادہ نہیں پتا ہے۔ وہ اندر ہی ہیں اور اماں سائیکس انہیں دیکھنے گئی ہیں۔“ موبل نے جھپکتے ہوئے اس کے سوال کا جواب دیا۔

”اچھا ٹھیک ہے، میں باہر ہی ہوں۔ خدا نخواستہ کوئی مسئلہ ہو تو مجھے کال کر دینا، میں ذرا گاؤں فون کر کے ادا معتم اور دوسرے لوگوں کو خوشخبری سناتا ہوں۔“ اس نے موبل کی کال کالی اور معتم کا نمبر ملایا۔ کچھ دیر تک جاتی رہی پھر کال ریسیو کی گئی۔

”مبارک ہو ادا معتم! اللہ نے اپنا کرم کیا ہے اور آپ کو بیٹے کی نعمت سے نوازا ہے۔“ اس نے دوسری طرف سے ہیلو بولے جانے کا بھی انتظار نہیں کیا اور پرجوش لہجے میں خوشخبری سنائی۔ جواب میں پہلے کسی کے کراہنے کی آواز سنائی دی اور پھر کوئی روٹی ہوئی آواز میں بولا۔

”غضب ہو گیا سائیکس! سائیکس معتم شاہ کو گولی لگ گئی ہے۔“ اطلاع مٹی کہ اس کے کانوں میں صور پھونکا گیا تھا۔

اگلی نشست پر بیٹھا اور اسے گاڑی چلانے کا اشارہ کیا۔ ڈرائیور کوئی اور نہیں، اس کا سب سے وفادار ملازم سرد تھا جس نے صورت حال کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے گاڑی تیز رفتاری سے دوڑادی۔ لگھوڑی کار تیز رفتاری کے باوجود سڑک پر اتنی سبک دوڑ رہی تھی کہ اس کے سواروں کو جھپکنے

پسینا دکھائی دے گیا۔ تکلیف برداشت کرنے کی کوشش میں اس نے اماں سائیکس کا ہاتھ مضبوطی سے اپنے دونوں ہاتھوں کی گرفت میں لیا ہوا تھا جبکہ موبل دھیرے دھیرے اس کی پیٹھ سہلا رہی تھی۔ عالم شاہ نے ایک نظر دیکھنے کے بعد اپنی نظروں کا زاویہ بدل لیا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی بہن اتنی شرم و حیا اور برداشت والی ہے کہ جس تکلیف پر عورتیں

داویلا شروع کر دیتی ہیں اسے بھی بغیر آواز نکالے خاموشی سے سہ جائے گی۔ اسپتال تک کا فاصلہ طے کرنے میں سچ سچ اسے سبیل کی معمولی سی سسکی بھی سنائی نہیں دی۔ اسپتال پہنچ کر اسے معاملات وہاں کے عملے نے سنبھال لیے۔ سبیل کو لیبر روم میں لے جایا گیا جبکہ اماں سائیکس اور موبل کو خواتین کے لیے مخصوص وینک روم میں بھیج دیا گیا۔ وہ کسی بھی ضرورت کے وقت موبل کو موبائل پر کال کرنے کی ہدایت دے کر خود کوریڈر میں رکھی بیچنچر میں سے ایک بیچ پر

آبیٹھا۔ تھوڑی دیر بے چینی اور خالی الذہنی کی کیفیت میں بیٹھنے کے بعد اسے خیال آیا کہ اسے معتم شاہ کو سبیل کی اسپتال

آدی کو دیکھنے میں مصروف ہو تو یہ تو سیدھی سیدھی حق تلفی ہوئی
تا۔ اس نے گویا شکایت کی۔

”آپ چاہیں تو اسے بدذوقی کا نام بھی دے سکتی
ہیں۔“ وقاص نے ترنت جواب دیا۔

”لوگوں کا ذوق بدلنا ہم خوب جانتے ہیں۔ بس ایک
منٹ انتظار فرمائیے۔“ وہ بد مزہ ہوئے بغیر شوخی سے بولی
اور اس کی طرف لطف لینے والے انداز میں دیکھنے لگی۔
خوبصورت ہونے کے باوجود وہ اس عورت سے انجھن
محسوس کر رہا تھا لیکن اظہار اس لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ
میزبان تھی اور اسے آداب مہمانی نبھانے تھے۔ ایک منٹ
کا عرصہ گزرا تو ہال کی روشنیاں مدھم بڑکتیں اور ڈاننگ فلور
جگمگانے لگا۔ ساتھ ہی میوزک کی لے بھی بدل گئی۔

”کم آن۔“ وہ اس کا ہاتھ تمام کر اسے ڈاننگ فلور
پر لے گئی اور اپنا ایک ہاتھ اس کے سینے پر رکھ کر دوسرا کمر
میں جمائل کر دیا۔ وقاص کو بھی مجبوراً اس کا ساتھ دینا پڑا۔
شروع میں میوزک ہلکا تھا اور جوڑے دھیرے دھیرے
رقص کر رہے تھے لیکن آہستہ آہستہ میوزک کا انداز بدلنا چلا
گیا اور رقص کرنے والوں کے انداز میں بھی جوش بڑھ گیا۔

سونیا خان بھی بہت مثر جوش رقص کر رہی تھی اور وقاص کو اس
کا پڑاؤ تھا۔ وہ ان دنوں کی عورت نہیں
تھے۔ سوچا تو اس نے اپنا دامن
میں بانٹیں ڈالے وقاص کی بھی دھڑکنیں اٹھل پھٹل تھیں اور
رگوں میں دوڑتا خون گرم سے گرم ہوتا جا رہا تھا۔ میوزک
رکنے تک ہال کے تنگ ماحول کے باوجود اس کی پیشانی پر
پسینے کی بوندیں چپکنے لگی تھیں اور سانس غیر متوازن ہو چکی
تھی۔ سونیا خان کا چہرہ بھی ہلکا سا سرخ ہو رہا تھا۔

”ابھی بہت جگ ہو۔ جوانی کو انجوائے کرو۔ جوانی
اور زندگانی دونوں لوٹ کر آنے والی چیزیں نہیں ہیں۔“
ڈاننگ فلور سے اترتے ہوئے سونیا خان نے اس کے کان
میں سرگوشی کی اور ہوا کے جھونکے کی طرح اس سے الگ ہو کر
آگے بڑھ گئی۔ اس کے بعد رقص کے دور مزید ہوئے۔ سونیا
خان تقریباً ہر بار کسی نہ کسی کی بانہوں میں نظر آئی البتہ اس کا
موتا شوہر سستی سے ایک طرف بیٹھا جام لٹھ کاٹتا رہا۔
یزدانی، عرفان اللہ اور لالہ بیسی سمیت ہر اہم شخص سونیا خان
کی قربت سے لطف اندوز ہوا۔ پھر رقص کا سلسلہ ختم ہونے
کے بعد درمیان میں تھوڑا سا وقفہ دیا گیا۔ اس کے بعد اعلان
ہوا کہ حاضرین کے ذوق کی تسکین کے لیے ایک زبردست

آسٹم پیش کیا جا رہا ہے۔ پورے ہال کی روشنیاں بجھا کر آسٹم
پیش کرنے کے لیے جس شعلہ جوا لا کو سامنے لایا گیا، اس نے
سب کے ہوش اڑا کر رکھ دیے۔ دیکھی لوگ ویسے بھی بدلی
حسن کے دیوانے ہوتے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ حسن بے
جواب اور پارے کی طرح متحرک تھا۔ لوگوں نے اپنی اپنی
عینیتیں بھلا کر غل جھا کر رکھ دیا۔ وقاص کو اس سارے
ہنگامے سے جیزاری ہونے لگی لیکن وہ لالہ بیسی کی مرضی کے
بغیر وہاں سے جا بھی نہیں سکتا تھا۔ ادھر دیگر لوگ تھے کہ بڑھ
چڑھ کر دس سو کے نعرے لگائے جا رہے تھے۔ وقاص
ناچتے ناچتے نڈھال ہو کر گرنے کے قریب ہو گئی لیکن لوگوں
کا جوش و خروش ماند نہ پڑا۔ دو چار تو مست ہو کر سڑک
چھاب فٹنڈوں کی طرح اپنی جگہ چھوڑ کر وقاص تک پہنچنے کی
کوشش کرنے لگے۔ اس موقع پر نامعلوم مقامات پر پوشیدہ
سیکیورٹی گارڈز حرکت میں آئے اور وقاص کو اس طرح اپنے
حصار میں لیا کہ کسی بھی فرد کی اس تک رسائی ممکن نہیں رہی۔
وہ لوگ وقاص کو اپنے حفاظتی حصار میں لیے خارجی راستے کی
طرف بڑھ رہے تھے کہ ایک گارڈ کے چہرے نے وقاص کو
چونکا دیا۔ اس شخص کو کچھ دن قبل ہی اس نے سعیدہ بیگم کی قبر
کی تصویریں دیکھتے ہوئے دیکھا تھا اور اب وہ سیکیورٹی گارڈ
دے رہا تھا۔ وہ کوہاں سے
آگے بڑھ کر
پہنچے خود بھی
روشنیاں ابھی تک گل تھیں اس لیے اسے امید تھی کہ کسی کو اس
کے اٹھ کر جانے کی خبر نہیں ہوگی۔ جب تک وہ باہر آیا، وہ
لوگ لفٹ میں سوار ہو چکے تھے۔ اس نے پانچ کا روشن
ہندسہ دیکھا اور دوسری لفٹ میں ٹھس کر خود بھی پانچویں
منزل کے لیے بزن دبا دیا۔ چند سیکنڈوں کے فرق سے وہ بھی
پانچویں منزل پر موجود تھا۔ وہ لوگ اس سے چند قدم آگے
بائیں جانب کے کوریڈور میں مڑ رہے تھے۔ وہ بھی ان کے
پیچھے لگا۔ اس سے قبل کہ وہ ان لوگوں کے پیچھے کوریڈور میں
قدم رکھا، اس کی گردن پر لوہے کا ٹھنڈا کس جاگا اور ایک
سخت اور سرد آواز نے تیشی لہجے میں کہا۔

”اسٹاپ۔“

وہ اپنی جگہ پر ساکت ہونے پر مجبور ہو گیا۔

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نہو جوان
کی داستان جو غلط کاروں کے لیے
غضب ناک تھا باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیے

معاذ ایک ذہین لیکن متلون مزاج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پالی رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے ہاتھ دھ ایک ادارہ جو ان کو کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ انسٹیٹیوٹ سے واپس آ رہا تھا تو وہ چار لوگوں کو سڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لوگوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی نظر فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشری نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بشری ماس کمیونی کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم و غیرہ لکھتی ہے۔ اس ویران جگہ بھی وہ ایک زیر تعمیر رہائشی منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی آئی تھی۔ معاذ بشری کو پہچانتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کر دیتا ہے لیکن جن ریکس زادوں سے اس نے ان کا شمار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ یہ موقع انہیں یونیورسٹی ٹرسٹ کی صورت میں مل جاتا ہے اور ایک جنگل کی سیر کے دوران وہ فوٹو گرافی کے شوق میں سب سے الگ تھلک ہو جانے والے معاذ کو بے خبری میں گھیر کر بری طرح زد و کوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس نہ آنے پر انتظامیہ کے افراد، پولیس اور ریسکیو ڈرائیج کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جگہ کی جھوپڑی میں پاتا ہے۔ اپنی حالت سے اسے اپنے شدید زخمی ہونے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ جوگی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ معاذ کا سوا ہاں جنگل میں ہی کہیں گر جاتا ہے اور جوگی کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا جس سے باہر کی دنیا سے رابطہ کیا جاسکے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے۔ جوگی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نوازا کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے پراسرار علم سکھانے کی ہامی بھر لیتا ہے اور معاذ واقعی اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ادھر جائے وقوعہ سے ملنے والے معاذ کے کمرے سے جب رول نکلا کر تصویریں وصول کی جاتی ہیں تو بہت سے قدرتی مناظر کی تصویروں میں سے ایک ایسی تصویر بشری کی نظر میں آ جاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانک رہا نظر آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کارمان اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پردیجٹ کے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشری تحقیق کر رہی تھی۔ بشری کے اپنے والد جرنلسٹ ہیں اور حق گوئی ان کے خون میں شامل ہے۔ اس انکشاف کے بعد وہ خاموش بیٹھنے کے بجائے فوراً کہیں کے انویسٹیگیٹیشن افسر سے رابطہ کر کے اپنے فلک کا اظہار کرتی ہے اور اس واقعے سے بھی آگاہ کرتی ہے جو معاذ اور کارمان کے درمیان دشمنی کا باعث بنا۔ اس کی پاداش میں بشری کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ مدد سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں ہاڈل نامی شخص نے کاٹھ ہوتا ہے۔ بشری انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ بشری کو بہت مایوسی ہوتی ہے لیکن وہ اپنے طور پر جدوجہد جاری رکھنے کا عزم کرتی ہے۔ ان تکلیف دہ دنوں میں ہی معاذ واپسی کا ارادہ کرتا ہے تاہم دوسرے ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا عرفان اللہ اور یزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو وقاص نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر ہاڈل اچانک بشری کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر دیتا ہے۔ ڈی این اے رپورٹ سے ہاڈل کی نشاندہی ہو جاتی ہے۔ ادھر معاذ کو واپس لانے کے لیے اوجھے جھکڑے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اسے واپس آنے کا پیغام دیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کر کے اسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات لی جاتی ہیں، دہشتانے پر اس کے بھائی کا ایک گروہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشری بھی انتقام کی آگ میں جلتی ہوئی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی فریڈنگ شروع ہو جاتی ہے۔ معاذ کو بچانے والا لڑکا وقاص اپنے گروہ کے ساتھ ایک پارٹی میں جاتا ہے۔ وہاں اسے معاذ کے حوالے سے مشکوک ایک شخص نظر آتا ہے۔ وہ اس کے پیچھے جاتا ہے مگر اسے گھیر لیا جاتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

سسپنس ڈائجسٹ 73 نومبر 2020ء

مہربانی فرما کر بلیشرز کی حوصلہ کے لیے خرید کر پڑھیے۔

سہارا بنائے۔ "ان کا بچھا ہوا اور عجیب رک رک سا انداز عالم شاہ کے اندر گہرا اضطراب پیدا کر رہا تھا۔ دل میں واہے سر اٹھا رہے تھے اور اس کا بس نہ چلتا تھا کہ کسی طرح شہر سے گاؤں تک کا فاصلہ ہلک جھپکتے میں طے ہو جائے۔ اس کا وقادار ملازم سرد اس کی اس کیفیت کو محسوس کر رہا تھا اور حتی الامکان تیز رفتاری سے گاڑی چلا رہا تھا لیکن بہر حال طویل فاصلے کو طے ہونے میں وقت تو لگتا ہی تھا۔ ان کی گاڑی گاؤں کی حدود میں داخل ہوئی تو پو پھنسنے کا وقت تھا۔ گاؤں کے لوگوں کی سحر خیزی کوئی تعجب کی بات نہیں تھی لیکن مخصوص راستوں سے گزر کر قربان شاہ کی حویلی کی طرف جاتے ہوئے اسے ایسا لگا کہ آج رات شاید سارا گاؤں ہی جا بھٹا رہا ہے اور ہر شخص اپنے گھر سے باہر ہے۔ گاڑی حویلی تک پہنچی تو اسے لوگوں کا ایک جم غفیر نظر آیا۔ وہ سب لوگ کیا معطم شاہ کے زخمی ہونے کی اطلاع سن کر جمع ہوئے تھے؟ اس نے قدرے حیرت سے سوچا اور جواب میں اس کے اندر سے جو سوچ ابھری اس نے ہلکا کر رکھ دیا۔

"نہیں..... مجھے ایسا نہیں سوچنا چاہیے۔ ادا معطم صرف زخمی ہیں۔ میں ڈاکٹر سے بات کر کے انہیں فوراً شہر لے جاؤں گا۔" اس نے خود ہی اپنے آپ کو ڈھٹ دیا لیکن گاڑی حویلی کے بھانک سے اندر داخل ہوتے ہی اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ بین کی آوازیں محسوس نہیں نے اس کے دل کو بری طرح بھیج لیا تھا۔ گاڑی رکی تو اس کے استقبال کے لیے دوڑ کر آنے والا ملازم اس کی شکل دیکھتے ہی دھاڑیں مار کر رونے لگا۔

"کیا محنت پھیلا رکھی ہے۔ خاموش ہو جاؤ۔ کچھ نہیں ہونے والا ادا معطم کو... ٹھیک ہو جائیں گے وہ۔" وہ ملازم پراتنی زور سے چلایا کہ اس کی آواز پھٹ گئی۔ "سامیں!" سب کچھ سمجھ جانے والے سرد نے اسے ایک نقلی دلاسا دینے کی کوشش کی اور پھر فوراً ہی اندر سے برآمد ہوئے صداقت شاہ کی طرف اس کی توجہ مبذول کروائی۔

"بابا سامیں۔" وہ یوں ان کی طرف لپکا جیسے خوفزدہ بچہ باپ کی پناہ لینا چاہتا ہو۔

"میرے عالم شاہ..... حوصلے سے کام لو۔ یہ وقت اپنے دکھ رونے کا نہیں، ادا قربان شاہ کی ہمت بندھانے کا ہے۔" صداقت شاہ کی اپنی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور چہرے پر زلزلے کے سے اثرات تھے پھر بھی انہوں نے غم سے ہوئے کبیر لہجے میں بچے کو نصیحت کی۔ اس نصیحت

گاڑی آمدی اور طوفان کی طرح دوڑ رہی تھی پھر بھی پچھلی سیٹ پر براجمان عالم شاہ کو لگ رہا تھا کہ سفر کسی طور کتنے کا نام نہیں لے رہا۔ معطم شاہ کو گولی لگنے کی خبر معمولی نہیں تھی۔ معطم کے فون پر اس کی کال ریسیو کرنے والا اسے زیادہ کچھ بتا بھی نہیں پایا تھا۔ وہ شخص خود زخمی تھا اور اس کے سوالات کے جواب میں ڈوبتی ہوئی آواز میں صرف اتنا بتا سکا تھا کہ لطیف سومرو کے ہاں سے واپسی میں اچانک انہیں گھیر کر ان پر فائرنگ کر دی گئی تھی۔ اس اچانک حملے میں معطم شاہ سمیت گارڈ بھی زخمی ہو گئے تھے اس لیے حملہ آوروں کو کامیابی سے فرار ہونے کا موقع مل گیا تھا۔ اتنی بات بتانے کے بعد وہ شخص شاید بے ہوش ہو گیا تھا کیونکہ اس کے بعد عالم شاہ کو اپنی کسی پکار کا جواب نہیں ملا تھا۔ اس نے عالم وحشت میں اپنے ساتھ اسپتال جانے والے سرد کو فوری طور پر گاؤں چلنے کا حکم دیا تھا اور پھر خود فون پر مصروف ہو گیا تھا۔ صداقت شاہ اور قربان شاہ سمیت اس نے ہر قابل ذکر شخص کو صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے معطم شاہ کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کی اطلاع دینے کے ساتھ ساتھ اس کی تلاش کا کام شروع کر دیا تھا۔ اس کام میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی اور صداقت شاہ نے خود اسے فون کر کے اطلاع دی تھی کہ معطم اور اس کے گارڈ کو زخمی حالت میں تلاش کر لیا گیا ہے اور تمام زخمی اس وقت اسپتال میں موجود ہیں۔ عالم شاہ نے ان سے تفصیل جاننا چاہی تھی کہ معطم کو کتنی گولیاں اور کہاں کہاں لگی ہیں، نیز یہ کہ اس کی حالت کیسی ہے لیکن صداقت شاہ نے اسے کوئی واضح جواب نہیں دیا تھا اور یہی کہا تھا کہ معطم اسپتال میں ہے۔ ڈاکٹر ابھی اسے دیکھ رہے ہیں اور حتی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ عالم شاہ نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ معطم شاہ کو ضروری طبی امداد دلوا کر شہر منتقل کر دیا جائے تاکہ وہاں اس کا زیادہ بہتر علاج ہو سکے لیکن صداقت شاہ نے یہ بات بھی ٹال دی تھی اور کہا تھا کہ وہ پہلے خود گاؤں پہنچ جائے پھر یہ سارے معاملات بھی طے کر لے جائیں گے۔ انہوں نے اپنے بارے میں بتایا تھا کہ وہ خود بھی قربان شاہ کی حویلی پہنچ چکے ہیں اور کوشش کر رہے ہیں کہ قربان شاہ کو حوصلہ و ہمت دلا سکیں۔ اس گفتگو کے دوران ہی انہیں عالم شاہ نے انہیں سب کے ہاں بیٹے کی پیدائش کی اطلاع بھی دے دی تھی۔ اس اطلاع کو سن کر وہ ہل بھر کے لیے چپ ہو گئے تھے اور پھر آہستہ سے بولے تھے۔

"اللہ سامیں نصیب اچھے کرے اور میری بیٹی کا

کے بعد اس کے دل میں جو سوہم سی امید باقی رہ گئی تھی، اس نے بھی دم توڑ دیا اور بے ساختہ ہی لاڈلی بہن کا چہرہ زمین میں ابھرا۔ ابھی چند گھنٹے قبل ہی تو اس نے شدید تکلیف سے گزر کر دنیا کی سب سے بڑی نعمت پانے کی خوشی حاصل کی تھی اور ستم تھا کہ اس خوشی کے فوراً بعد وہ بیوگی کے صدمے میں مبتلا کر دی گئی تھی۔

”کچھ معلوم ہوا کہ یہ سب کیسے ہوا؟“ فلم کے ساتھ ہی قصے نے پورش کی تو اس نے دیکھے ہوئے لہجے میں صداقت شاہ سے دریافت کیا۔

”ابھی کچھ معلوم نہیں ہے۔ تمہاری کال ملتے ہی ان لوگوں کی تلاش شروع کر دی گئی تھی۔ گاؤں سے بہت دور راستے کے ویران حصے میں گاڑی اور سوار مل گئے۔ چوری گاڑی چھٹی ہو چکی تھی اور اندر موجود افراد میں سے صرف جمن تھا جس کے سینے میں سانس باقی تھی۔ جمن اور لاشوں کو فوراً اسپتال پہنچایا گیا۔ وہاں ڈاکٹر نے معلوم کیا کہ دو گارڈز کی موت کی تصدیق کر دی اور جمن کے ہارے میں بتایا کہ یوں تو گولیاں زیادہ نازک مقامات پر نہیں لگی ہیں لیکن خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے اس کی حالت نازک ہے۔ جمن اب بھی اسپتال میں ہے۔ اس کے جسم میں گتے والی گولیاں نکالی جا چکی ہیں اور اسے خون وغیرہ لگا گیا ہے۔ اب آگے دیکھو کہ ڈاکٹر کیا بولتا ہے۔ جمن کی زندگی بچ گئی تو وہ ہمیں قاتلوں کے ہارے میں کچھ بتا سکے گا۔ فی الحال تو مقامی پولیس اپنے حساب سے کارروائی کر رہی ہے۔“ صداقت شاہ نے اسے اپنے ساتھ اندر لے جاتے ہوئے تفصیلات سے آگاہ کیا۔ اندر پہنچتے ہی اس کا قربان شاہ سے سامنا ہو گیا۔ ایک رات میں ہی وہ کیا سے کیا ہو گئے تھے۔ جوان بیٹے کی موت نے انہیں بالکل بے حال کر دیا تھا اور یوں لگ رہا تھا کہ ایک رات میں ہی وہ عمر کے دس بیس سال طے کر چکے ہیں۔ عالم شاہ نے انہیں سینے سے لگا پا تو وہ کسی بچے کی طرح بھیڑوں سے رونے لگے۔ وہ جو اپنی خاندانی آن بان کا بہت خیال رکھتے تھے، اس وقت سب کچھ بھول چکے تھے اور کچھ یاد تھا تو جوان بیٹے کی جدائی کا غم۔

”میرا سب کچھ لٹ گیا عالم پت! میرے دونوں ہاتھ خالی ہو گئے۔“ بھٹیوں کے درمیان ہی انہوں نے جس انداز میں یہ الفاظ ادا کیے، عالم کو لگا کہ اس کا دل کٹ رہا ہو۔ ایک باپ کے لیے بھلا اس سے بڑا غم ہو بھی کیا سکتا تھا کہ اس کا جوان ہنسا کھیتا بیٹا موت نے بھٹ لیا تھا۔

”حوصلے سے کام لیں ماموں! ہم حوصلے سے کام لیں گے تب ہی تو ادا معظم کے قاتلوں کو ان کے انجام تک پہنچا سکیں گے۔ اور ہاں..... اب آپ بالکل بھی خالی ہاتھ نہیں رہے ہیں۔ ادا معظم کا بیٹا آپ کا بازو بننے کے لیے دنیا میں آچکا ہے۔“ اس نے انہیں حوصلہ دینے کے ساتھ ساتھ اطلاع بھی دی اور پھر خود ہی طول ہو گیا۔ اتنی بڑی خوشخبری اس طرح سنانے کا بھی اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اگر یہ عام حالات ہوتے تو اس وقت حویلی بھٹہ نورینی ہوتی۔ وہ ڈھول تاشوں اور منجائی کے ٹوکروں کے ساتھ یہاں آتا۔ حویلی کے اندر باہر پر سہ دینے کے لیے آنے والوں کے بجائے بدحائیاں دینے آنے والوں کا جھوم لگا ہوتا۔ کڑوی روٹی کے بھانے دعوت اور نظر کا انتظام ہو رہا ہوتا۔

”معلم کا بیٹا.....؟“ قربان شاہ اس اطلاع پر متحک ہو گئے۔

”جی ادا معظم کا بیٹا..... آپ کا بازو۔“ عالم شاہ نے خود پر کڑا ضبط کرتے ہوئے اس اطلاع کے ذریعے گویا ان کے اندر ایک نئی روح پھونکنے کی کوشش کی۔

”کتنا بد نصیب تھا میرا پت کہ اپنے بیٹے کی قتل بھی نہیں دیکھ سکا۔“ قربان شاہ ایک بار پھر زار زار رونے لگے۔

”بس کرو قربان شاہ۔ بیٹے کا سارا غم آنسوؤں میں بہا دو گے تو اس کے قاتلوں کو انجام تک پہنچانے کی آگ سینے میں سرد پڑ جائے گی۔“ اب تک ان کے قریب خاموشی سے کھڑے صداقت شاہ نے پرنش لہجے میں انہیں ٹوکا تو ان کے ساتھ ساتھ عالم بھی چمک گیا۔

”انتقام..... انتقام تو لیتا ہوگا لیکن کس سے؟ کون ہے ادا معظم کا قاتل؟“

”قاتل جو بھی ہے وہ بچ نہیں سکے گا۔ ہم اسے پاتال سے بھی ڈھونڈ لائیں گے۔“ صداقت شاہ کی آواز کی گونج اتنی بلند تھی کہ تعویذ کے لیے آنے والے لطیف سومرو نے بھی ان کا ایک ایک لفظ سنا۔ پل بھر کے لیے اس کے چہرے پر سایہ سادو ڈگیا لیکن پھر اس نے خود پر قابو پالیا اور سنجیدہ تاثرات کے ساتھ اندر داخل ہوا۔

”بہت دکھ ہوا ماموں، معلم شاہ کے ہارے میں سن کر۔ مجھے صبح اٹھتے ہی یہ خبر سننے کو ملی تو میں ناشا کے بغیر سیدھا اندر دوڑا آیا۔ رات ہی تو میری ملاقات ہوئی تھی معلم شاہ سے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنے بڑے

دیر اپنے کمرے میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔" وہ واقعی ٹھیک نہیں لگ رہے تھے۔ کمرے ہوتے ہی ان کے قدم بری طرح ڈگمگانے لگے تھے۔ عالم شاہ انہیں سہارا نہ دیتا تو وہ زمین پر گر جاتے۔

"عالم ہٹ اپنے ماموں کو ان کے کمرے تک لے جاؤ اور ڈاکٹر سے کہو کہ انہیں دیکھے۔ ڈاکٹر نہیں حویلی میں موجود ہوگا۔ میں نے واقعے کے فوراً بعد حیدر آباد سے ایمر جی میں چار ڈاکٹر کو بلا لیا تھا۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر اور لیڈی ڈاکٹر مسلسل حویلی میں ڈیوٹی پر ہیں۔" صداقت شاہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بیٹے کو ہدایات جاری کیں۔ وہ اس کا لمحہ بہ لمحہ غصے سے سرخ پڑتا چہرہ دیکھ رہے تھے اور اب انہیں اسے یہاں سے ہٹانے کا مناسب موقع مل گیا تھا۔

"ان حالات میں آپ جیسے تجربہ کار شخص کی یہاں موجودگی قیمت ہے۔ آپ کے آگے میری کچھ کہنے کی بساط کہاں، پھر بھی اتنا ضرور کہوں گا کہ ہمارا آپس میں مسابقت کا بھی رشتہ ہے اور میں اس علاقے کا نمائندہ بھی ہوں تو اس حق سے آپ جب اور جس معاملے میں چاہیں مجھ سے مدد طلب کر سکتے ہیں۔ میں آپ کی ایک نگار پر آدمی رات کو بھی خدمت کے لیے تیار رہوں گا۔" بظاہر بہت نرم لہجے میں بولتے ہوئے اپنے علاقے کا نمائندہ ہونے کی بات چتا کر اس نے صداقت شاہ کو چرکا لگانے کی کوشش کی تھی لیکن ان کی محنت میں کوئی فرق نہیں آیا اور سنجیدگی سے بولے۔

"آپ کی پیشکش کا شکریہ سوسرد صاحب! میں اس پیشکش کو یاد رکھوں گا۔ ویسے تو ان حالات میں آپ کی آمد ہی بہت بڑی بات ہے۔ آج کل یقیناً آپ بہت مصروف ہوں گے۔ آپ کی سرخ آنکھوں کو دیکھ کر مجھے لگ رہا ہے کہ آپ رات پوری خیند نہیں لے سکے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ اب آپ گھر جا کر آرام کریں۔ ہمیں اگر ضرورت محسوس ہوئی تو آپ کو ضرور زحمت دیں گے۔"

صداقت شاہ کے الفاظ پر لطیف سوسرد کا سیاہ چہرہ مزید سیاہ پڑ گیا۔ انہوں نے بہت مہذب لہجے میں اسے وہاں سے دفع ہو جانے کا حکم دے دیا تھا اور وہ اپنی جگہ تل کھانے کے سوا کچھ نہیں کر سکا تھا۔ صداقت شاہ کی بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے اپنی بات کہہ کر اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا اور اسی وقت اندر داخل ہونے والے علاقے کے ایک دوسرے معزز زمیندار کی

لکھے اور مہذب نوجوان سے یہ میری پہلی اور آخری ملاقات ہے۔" ان تینوں سے باری باری معافہ کرتے ہوئے وہ مسلسل بولتا جا رہا تھا۔ اسے ان تینوں ہی کے لیے دیے انداز سے کوئی غرض نہیں تھی اور یوں لگ رہا تھا کہ وہ یہاں بس اپنی ستانے آیا ہے اور سنا کر ہی واپس جائے گا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"کل میں پہلی بار معظم شاہ سے ملا اور مل کر مجھے انہیں ہوا کہ اتنے شاعر نوجوان سے میری پہلے کیوں ملاقات نہیں ہو سکی۔ وہ بہت سمجھ داری کی باتیں کر رہا تھا۔ جس معاملے پر آپ میری بات نہیں سمجھ رہے تھے، اس نے فوراً سمجھ لی تھی اور مان لیا تھا کہ قانوناً میں درست ہوں اور میرا موقف ایک اصولی موقف ہے۔ معظم شاہ کی اسی کشادہ دلی نے مجھے اتنا متاثر کیا تھا کہ میں نے اس سے وعدہ کر لیا تھا کہ صرف اس کی خاطر میں اس معاملے پر سنے سرے سے غور کروں گا اور امید ہے کہ ایسا کوئی حل نکل آئے گا جس سے دونوں فریقین ہی مکمل طور پر مطمئن ہو جائیں گے۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ ذرا مجھے فرصت مل جائے تو میں جلد اس کے بعد آپ کے ساتھ ایک میٹنگ رکھوں گا لیکن انہیں اس کی نوبت ہی نہیں آ سکی اور میں اتنے شاعر نوجوان سے دوسری ملاقات کرنے سے ہمیشہ کے لیے محروم رہ گیا۔"

وہ بڑے نرم اور پیٹھے لہجے میں بول رہا تھا لیکن اس کے لہجے میں کبھی منافقت ان میں سے کسی سے پوشیدہ نہیں تھی۔ وہ ایک مانا ہوا مکار شخص تھا اور قربان شاہ کی مجبوری سے قائم ہوا تھا کہ اس نے بہت چالاکی سے ان کی قیمتی زمین ہتھیالی تھی۔ زمین ہتھیانے کے بعد وہ معظم شاہ کی مسلسل کوششوں کے باوجود اس سے ملاقات کے لیے راضی نہیں ہو رہا تھا اور کل بڑی مشکل سے ملاقات کا وقت دیا تھا اور اس ملاقات سے واپسی میں ہی معظم شاہ کو گل کر دیا گیا تھا۔ اس وقت ہی ان کی نظروں میں سب سے مشکوک شخص تھا جو ان کا بڑا خیر خواہ اور ہمدرد بننا باتیں بنا رہا تھا۔ قربان شاہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس شخص کو دھکے دے کر اپنی حویلی سے باہر نکال دیں لیکن ابھی حتی طور پر یہ طے نہیں ہوا تھا کہ معظم شاہ کے گل میں اسی کا ہاتھ ہے۔ خاندانی وضع داری بھی انہیں گھر آئے شخص سے بدسلوکی کی اجازت نہیں دے رہی تھی چنانچہ کچھ اور بس نہ چلا تو یہ کہتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"میری طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے۔ میں تھوڑی

طرف متوجہ ہو کر اس کے استقبال کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اپنی بے عزتی پر دل ہی دل میں بلبلاتا لطیف سومرو ایک جھٹکے سے اٹھ کر باہر کی طرف بڑھ گیا حالانکہ اصولاً اسے خود بھی آنے والے شخص سے ملنا چاہیے تھا۔ اسے یوں وہاں سے جاتا دیکھ کر جہاں آنے والے زمیندار کے چہرے پر حیرت کے رنگ دوڑے، وہیں صداقت شاہ کے جلتے جلتے دل پر بھی اطمینان کے چند پھینٹے پڑ گئے۔ انہوں نے لطیف سومرو سے وہی سلوک کیا تھا جس کا وہ حقدار تھا۔

☆☆☆

”مڑ جاؤ۔“ وقاص کو رکنے کا حکم دینے والی آواز نے اسے دوسرا حکم دیا تو وہ اس حکم کی تعمیل میں آہستہ سے آواز کی سمت مڑ گیا۔ اس دوران اس کی گردن پر رکھا گیا ہتھیار ہٹا لیا گیا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ ہتھیار کا رخ اب بھی اسی کی طرف ہوگا اس لیے مڑتے ہوئے کوئی غلط حرکت کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ مڑنے کے بعد اس نے جس شخص کو اپنے اوپر مشین پھل تانے کھڑا دیکھا، اس کی عمر تقریباً پینتیس سال تھی اور اس نے بھی سکیورٹی گارڈز والی ویسی ہی یونیفارم پہن رکھی تھی جیسی یونیفارم اس نے پارلی نامی رقبہ کو اپنے حفاظتی حصار میں لے جانے والے گارڈز کے جسموں پر دیکھی تھی۔

”آپ یہاں کیا کر رہے ہیں مسٹر؟“ گارڈ نے اس کے عمدہ لباس، قیمتی جوتوں، مہنگی رسٹ واچ اور اسٹائلش میجرکٹ کا ایک نظر میں جائزہ لیا اور ہاتھ میں مشین پھل کی موجودگی کے باوجود خامے مہذبانہ لہجے میں دریافت کیا۔

”کیا اس طرف آنا منع ہے؟“ وقاص کو کوئی جواب نہ سوجھا تو منہ بتاتے ہوئے الٹا خود ہی بے پروائی سے سوال کر ڈالا۔

”جی ہاں۔ اس طور پر بہت خاص خاص لوگوں کو کمرے الاٹ کیے جاتے ہیں اور ان افراد کے علاوہ ان کے صرف ان مہمانوں کو یہاں آنے کی اجازت دی جاتی ہے جنہیں خود انہوں نے بلایا ہو۔ ایسے افراد کو نیچے سے ہی کلیئرٹس دی جاتی ہے اور ان کی آمد سے قبل یہاں اطلاع کر دی جاتی ہے۔ آپ کے سلسلے میں مجھے کوئی اطلاع نہیں دی گئی جس کا مطلب ہے کہ آپ ایک غیر متعلقہ شخص ہیں اور سکیورٹی کے حوالے سے یہ ایک رسک ہے۔ اس لیے میری ڈیوٹی ہے کہ میں آپ کو روکوں اور آپ کی یہاں آمد کی وجہ معلوم کروں۔“ اس کے امیرانہ طبعے کی وجہ سے

گارڈ اس سے مہذب لب و لہجے میں بات ضرور کر رہا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں شک کی پرچھائیاں بھی تھیں۔

”اوہ نو۔ اگر تم مجھ پر شک کر رہے ہو تو یہ تمہارے اپنے ہوٹل کی رپوٹیشن کے لیے کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ ہوٹل کے نفعہ طور پر کسی مشکوک شخص کا پایا جانا ہوٹل کے سکیورٹی سسٹم پر بہت بڑا سوالیہ نشان ڈال دے گا۔“

”کیا تم کوئی جرنلسٹ ہو؟“ سکیورٹی گارڈ الجھا۔

”میرے خیال میں ہم تمہارے آفس میں بیٹھ کر بات کر لیتے ہیں۔“ وہ کن آنکھوں سے دیکھ چکا تھا کہ طویل کورڈز کے اختتام پر آخری کمرے کے دروازے پر باربی کو چھوڑنے کے بعد دونوں گارڈز وہاں پلٹ چکے ہیں۔ وہ ان کا اور خصوصاً اس شخص کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا جس کے پیچھے یہاں تک آیا تھا اس لیے فوراً ایک پیشکش کی جسے ذرا سے تذبذب کے بعد گارڈ نے منظور کر لیا اور اسے لے کر ایک دروازے کی طرف بڑھا۔ اس کا پھل اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ اب بھی وقاص کی طرف سے محتاط دکھائی دے رہا تھا۔ وقاص نے اسے ریمیکس کرنے کے لیے اپنے انداز میں حریف بے پروائی اور بے فکری نمایاں کر دی اور یوں نظر آنے لگا جیسے وہ باقاعدہ دعوت ملنے پر وہاں کے جائزے کے لیے آیا ہو۔ گارڈ اسے جس چھوٹے سے سکیورٹی روم میں لے کر آیا وہاں پہلے ہی سے ایک اور شخص گارڈ ہی کی یونیفارم میں موجود تھا اور ایک کرسی پر بیٹھا دیوار پر نصب اسکرین پر توجہ مبذول کیے ہوئے تھا۔ اسکرین پر ایک نظر ڈالتے ہی وقاص کو اندازہ ہو گیا کہ یہ سکیورٹی روم صرف نفعہ طور کی سکیورٹی کے لیے ہی کام کر رہا ہے اور اسکرین پر نظر آنے والے مختلف مناظر اسی طور کے مختلف حصوں کے ہیں۔ اس نے اپنے مطلوبہ گارڈ اور اس کے ساتھی کو لفٹ میں سوار ہو کر وہاں سے جاتے ہوئے دیکھا تو اپنی جگہ ہاتھ سل کر رہ گیا۔

”جی تو اب آپ بتائیے کہ آپ کون ہیں اور آپ کی یہاں موجودگی کا کیا سبب ہے؟“ وہ جائزے میں ہی مصروف تھا کہ اسے ساتھ لانے والے گارڈ نے اس کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

”اوہ..... سوری امیں ذرا آپ کے سکیورٹی سسٹم کا جائزہ لے رہا تھا۔ یہ تو بہت اچھا اور جدید سیٹ اپ ہے۔ آپ یہاں بیٹھے بیٹھے آرام سے پورے طور پر نظر رکھ سکتے ہیں۔ جدید سسٹم کے ساتھ کام کرنے کا یہ فائدہ ہے کہ زیادہ لوگوں کی ضرورت نہیں پڑتی۔ میرے خیال میں اس طور

سسپنس ڈائجسٹ 76 نومبر 2020ء

مہربانی فرما کر بلیشرز کی حوصلہ کے لیے خرید کر پڑھیے۔

”نہیں..... اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہمارے ہاں اور پچھلے این آئی سی چیک کیے بغیر کسی کو کرا نہیں دیا جاتا۔ بہتر ہوگا کہ آپ مجھے اپنی یہاں موجودگی کا کوئی مقبول جواز بتائیں ورنہ میں اپنے ہیڈ کو یہ معاملہ ٹرانسفر کر دوں گا۔“ سکیورٹی گارڈ نے اس کی ساری داستان کو یکسر مسترد کر دیا اور سر دلچھے میں اس سے بولا۔

”تمہارا مطلب ہے کہ میں جموٹ پول رہا ہوں۔“ وقاص نے اپنا لہجہ تیز کر کے اس میں غصے کی آمیزش کی اور بات کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”مجھے ایک سو ایک فیصد یقین ہے کہ وہ خان صاحب ہی تھے جو شاید کسی اور نام سے یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ایک منٹ رکو۔۔۔ میں تمہیں کاغذ پر ان کی ناک بنا کر دکھاتا ہوں۔ ان کی ناک بہت عجیب وضع کی ہے۔ تم دیکھتے ہی پہچان لو گے کہ میں کن صاحب کی بات کر رہا ہوں۔“ بولتے بولتے اس نے ایک جھکے سے اپنی جیب میں اٹکا ہوا قلم باہر نکالا۔ یہ عام قلم نہیں تھا۔ اسے جیب سے باہر نکالتے ہی اس نے سکیورٹی گارڈ کی طرف اس کا رخ کر کے ایک ٹپن دبا یا تو بٹن والی ساڈ سے سرعت سے ایک سوئی نکل اور سیدھی جا کر گارڈ کی گردن میں پھوس ہو گئی۔ ردمل میں اس کے ہونٹوں سے ہلکی سی سسکی نکلی اور وہ جموٹا ہوا اپنی جگہ سے گر گیا۔ اس دوران اسکرین پر نظر رکھا گارڈ ان کی طرف متوجہ ہو چکا تھا لیکن وقاص نے پھرتی کا مظاہرہ کیا اور قلم کا رخ اس کی طرف کر کے دوبارہ اس کا ٹپن دبا دیا۔ ایک بار پھر قلم میں سے سوئی برآمد ہوئی اور اڑتی ہوئی دوسرے گارڈ کی پیشی سے ٹکرائی۔ اسے بے ہوش ہونے میں اپنے ساتھی سے بھی کم وقت لگا۔ وقاص نے ان دونوں کو ان کے حال پر چھوڑا اور خود پھرتی سے باہر کی طرف لپکا۔ اس وقت اسے اپنے مطلوبہ شخص کی تلاش سے زیادہ اس بات کی فکر تھی کہ اس سب سے اپنی جان چھڑا کر واپس پارٹی میں پہنچ جائے۔ وہاں سے کسی رکاوٹ کے بغیر واپسی اس لیے مشکل نہیں تھی کہ وہ لالہ بیٹی کے ساتھ ہوتا اور لالہ بیٹی کے کسی ساتھی پر ہاتھ ڈالنا آسان بات نہیں تھی لیکن اس بار بھی قسمت نے اس کا ساتھ نہیں دیا اور جیسے ہی وہ سکیورٹی روم سے باہر نکلا، لفٹ سے دو گارڈز برآمد ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں بھی مشین پستول تھے۔ اس سے ٹکل کہ وہ اس کی طرف متوجہ ہوتے، وہ تیز قدم اٹھاتا ہوا بائیں جانب کے کوریڈور کی طرف مڑ گیا۔ یہ وہی کوریڈور تھا جس کے آخری کمرے میں باربی کو لے جایا گیا تھا۔

کی سکیورٹی کے لیے تو آپ دو افراد ہی کافی ہوتے ہوں گے؟“ اس نے اپنے لہجے میں سائنس کو نمایاں کیا۔ ”ایسا ہی ہے۔ ایک وقت میں یہاں صرف دو گارڈ ہی موجود ہوتے ہیں۔ دو کے علاوہ یہاں بھی تیسرے کی ضرورت پیش نہیں آتی لیکن کبھی ضرورت ہو تو ایمر جنسی میں ہم مزید گارڈز کو بھی کال کر سکتے ہیں۔“

”گڈ! اچھا سسٹم ہے۔“ اس نے یوں تعریف کی جیسے اس کی یہاں موجودگی کا یہی مقصد ہو۔ ”پلیز اب آپ بھی اپنے بارے میں کچھ بتادیں ورنہ میں آپ کے ساتھ سختی پر مجبور ہو جاؤں گا۔“ گارڈ کا لہجہ ایک بار پھر بدلتے لگا۔ اس کا ساتھی ان مذاکرات میں ان کے ساتھ شامل نہیں ہوا تھا اور بظاہر مسلسل اسکرین کی طرف ہی متوجہ تھا لیکن وقاص کو اندازہ تھا کہ وہ ان کی گفتگو پر کان دھر رہے بیٹھا ہے۔

”میں یہاں اپنے ایک انکل کے ساتھ دعوت میں آیا ہوں۔ ڈنر کے دوران میں ایک کال سننے کے لیے ڈائٹنگ ہال سے باہر آیا تو میری نظر اپنے ایک ایسے شناسا پر پڑی جن سے میں بہت دنوں سے ملنا چاہ رہا تھا لیکن میرا ان سے رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ دوسری طرف میں جس کال پر مصروف تھا، وہ بھی بہت اہم تھی اور میں اسے ڈراپ نہیں کر سکتا تھا۔ جلد از جلد بات سننے کی کوشش کے باوجود وہ صاحب مجھ سے خاصی دور چلے گئے اور جب میں کال منشا کر انہیں آواز دینے ہی والا تھا تو وہ عین اسی وقت لفٹ میں سوار ہو کر اوپر چلے گئے۔ میں نے نوٹ کر لیا تھا کہ لفٹ پانچویں منزل پر ٹپنی ہے اسی لیے میں خود بھی ان کی تلاش میں اس منزل پر آ پہنچا اور یہاں آپ نے مجھے دھر لیا۔“ وہ فوری طور پر جو کہانی گھڑ سکا تھا، گھڑ کر سنادی۔ ”آپ کے ان شناسا کا نام کیا ہے؟“ سکیورٹی گارڈ نے جھل سے پوچھا۔

”داؤد..... داؤد خان۔“ اس نے ایک نام لیا۔ ”اس طور پر اس نام کے کوئی صاحب نہیں ٹھہرے ہوئے۔“ گارڈ نے سپاٹ لہجے میں اسے آگاہ کیا۔ ”ممکن ہے مجھ سے غلطی کا نمبر دیکھنے میں غلطی ہوئی ہو یا خان صاحب کسی اور نام سے یہاں ٹھہرے ہوئے ہوں۔ وہ ذرا شوخین مزاج آدمی ہیں اور اپنے شوق کو بیوی بچوں سے پوشیدہ رکھنے کے لیے نام بدل کر بھی ہوٹلوں میں قیام کر لیتے ہیں۔“ اس نے آنکھ کا ایک کونہ دبا دیا اور لہجے کو معنی خیز بنا کر گارڈ کو ایک اور جھانسا دینے کی کوشش کی۔

ہے اور اپنی ابتدائی حیرت پر قابو پالینے کے بعد اب اسے دلچسپی سے دیکھ رہی ہے۔

”مس باربی کو کوئی نقصان پہنچا کر تم اپنے بچاؤ کا ہر راستہ کھودو گے۔“ باہر موجود گارڈ نے شاید دانت کچکا کر یہ جملہ ادا کیا تھا۔

”تم لوگ مجھے یہاں سے نکلنے کا صاف راستہ دے دو۔ میں مس باربی کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ بس انہیں ہوٹل سے باہر کچھ دور تک میرے ساتھ چلنا ہوگا، پھر میں انہیں چھوڑ دوں گا۔“ اس نے اپنا مطالبہ پیش کیا۔

”میں اس سلسلے میں تھوڑی دیر میں تمہیں جواب دیتا ہوں۔“ باہر سے گارڈ کی پریشان آواز سنائی دی اور محسوس ہوا کہ وہ وہاں سے جا رہا ہے لیکن وقاص کو معلوم تھا کہ اس کا دوسرا ساتھی بھی باہر موجود ہے۔

”انتظامیہ کے پاس ہوٹل کے ہر تالے کی چابی ہوتی ہے۔ تھوڑی دیر میں وہ چابی سے لاک کھول کر اندر آجائیں گے۔“ باربی نے ایک صوفے پر جگہ سنبھال لی اور مسکراتے ہوئے اس سے بولی تو وقاص چونک گیا اور جھٹ دروازے کی چٹھی چڑھا دی۔

”دروازہ توڑ کر اندر آنا بھی کوئی ایسی زیادہ مشکل بات نہیں ہے۔“ اس نے جیسے حظ اٹھایا۔

”نہیں۔ وہ ایسا نہیں کریں گے۔ ایسا کر کے وہ تمہاری زندگی کے لیے خطرہ نہیں مول لے سکتے۔“ وقاص نے بھرائی ہوئی آواز میں اس سے زیادہ خود کو یقین دلایا۔

”ضروری نہیں کہ وہ ایک رقاہ کو اتنی اہمیت دیں۔ تم اگر انہیں بہت زیادہ مطلوب ہو تو وہ میری زندگی پر رسک لے سکتے ہیں۔ ویسے بانی دادے۔۔۔ مجھے ابھی تک یہ پتا نہیں چل سکا کہ میری زندگی کو تم سے کس طرح کا خطرہ درپیش ہے۔ تمہارے پاس کوئی ہتھیار تو دور کی بات، معمولی سا ناخن تراش بھی نظر نہیں آ رہا جس سے تم میری جان لے سکو۔“ وہ گویا اس کا مسکراہٹ اڑا رہی تھی۔

”تم میرے ہاتھ میں یہ قلم دیکھ رہی ہو نا؟ یہ بہت کام کی چیز ہے۔ اس سے نکل ہوئی دوسویں نے دو بٹے کٹے سکھائی گارڈ کو لبا لٹا دیا ہے تو تم کس کمیٹ کی مولی ہو اور میرے خیال میں مجھے تمہارے لیے اس ہتھیار کو استعمال کرنے کی زحمت نہیں کرنا پڑے گی۔ میرے دو چار ہاتھ ہی تمہاری ٹانگ جان کے لیے کافی ہوں گے۔“ وقاص نے چڑکرا سے جواب دیا۔

”واقعی۔۔۔۔۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرائی

”اسٹاپ۔“ اس کی بھرتی کے باوجود گارڈ نے اسے دیکھ لیا تھا اور ان میں سے ایک اسے روکنے کے لیے چلایا تھا۔ وہ رکنے کے بجائے دوڑ پڑا لیکن دوڑ کر کہاں جاتا۔ آگے سے کور پڑور بند تھا۔ اس نے خطرہ راہی طور پر باربی کے کمرے کے دروازے کی ٹاب پر ہاتھ رکھ کر اسے کھمایا۔ حیرت انگیز طور پر دروازہ لاک نہیں تھا۔ وہ جھپٹ کر کمرے میں داخل ہوا اور لاک و ہا دیا۔ لاک دبا کر وہ پلٹا تو اس نے باربی کو اپنے سامنے کھڑے حیرت سے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے دیکھا۔ وہ ابھی تک اسی لباس میں تھی جس لباس میں اس نے اسے رقص کرتے ہوئے دیکھا تھا لیکن اب اس کے چہرے کا میک اپ کافی حد تک صاف ہو چکا تھا اور جیولری بھی غائب تھی۔ یعنی ابھی وہ پہنچ کرنے کے ابتدائی مراحل میں تھی کہ نازل ہونے والی ناگہانی نے اسے اپنا کام ادا چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ وہ جس کمرے میں داخل ہوا تھا، وہ اصل میں ایک پورا سوئٹ تھا اور باربی اس کے بیڈ روم والے حصے سے نکل کر سامنے آئی تھی۔

”ہو آر پو؟“ حیرت سے سنبھلنے کے بعد اس نے وقاص سے سوال کیا لیکن اس کے کوئی جواب دینے سے نکل دروازے پر تیز دسک کی آواز ابھری۔ دسک دپنے والے سیکورٹی گارڈز کے علاوہ بھلا کون ہو سکتے تھے۔

”دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ مس باربی میرے قبضے میں ہے۔ اگر کسی نے بھی کوئی اپنی سیدھی حرکت کی تو مس باربی اپنی جان سے چلی جائے گی۔“ اس نے بلند آواز میں بولتے ہوئے گارڈز کو دھمکایا۔

”تم اپنے حق میں اچھا نہیں کر رہے مسٹر! بہتر ہوگا کہ تم فوراً باہر آ جاؤ دوسری صورت میں ہم سخت کارروائی کرنے پر مجبور ہوں گے۔“ گارڈ نے جوابی دھمکی دی لیکن اس کی آواز بہت زیادہ بلند نہیں تھی۔ یقیناً ان کی کوشش تھی کہ یہ معاملہ خاموشی سے ختم جائے اور دیگر کمروں میں مقیم افراد کو اس تماشے کی خبر نہ ہوتا کہ ہوٹل کی ساکھ پر کوئی حرف نہ آ سکے۔

”تم جو چاہے کرو مگر یہ بات یاد رکھنا کہ میری مرضی کے خلاف کچھ بھی کر کے تم مس باربی کی زندگی داد پر لگا دو گے۔“ اس نے گارڈ کی دھمکی کو خاطر میں لائے بغیر اطمینان سے جواب دیا۔ اس گفتگو کے دوران اس کی نظریں البتہ باربی پر ہی مرکوز رہی تھیں اور اس نے یہ بات نوٹ کر لی تھی کہ وہ اس صورت حال پر قطعی ہراساں نہیں

جاسوسی ڈائجسٹ

گزرے لمحوں کا حساب بہ ماہ و سال
آنے والے جاسوسی کا انتخاب بے مثال
روپ بہ روپ

ان شیشہ مزاج لوگوں کی داستان حیات جو ذرا
سی طیس لگنے پر بکھرے کو تیار تھے **زویا اعجاز**
کی تحریر کردہ کہانی کے مزید واقعات
انا گبر

شہری ریت کے سراپوں میں بہکتے خوابوں کے
سوداگر کی دل نگار داستان **امجد جاوید**
کے زور آور قلم کا امتحان

الاؤ
سیاؤں کے بھیس میں شاعر بھروسوں کا کھیل...
زندہ انسانوں کے لیے دیکھتے آواز کی صورت موت تیز
کی جاری تھی **ذاکٹر عبدالرب بھٹو**
کے قلم سے نیا سنی خیر سلسلہ

سورق کے رنگ

پہلارنگ

زمین کو اپنی سفاک فطرت سے رقصیں
کر رہے والے خالوں کا انجام

دوسرا رنگ

دل کو زخمی کر دینے والے تحوں کی
آغوش میں بسنے والی لڑکی کی کہانی

چینی لکھ چینی

آپ کے تھرے... شورے... خبیث...
شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کھائیں

اور اسی لمحے کارنر پر رکھا ہوا شیشے کا ایک ڈیکوریٹیشن جیس اڑتا
ہوا وقاص کی طرف آیا۔ وقاص عین وقت پر جھکا کی نہ دے
دیتا تو اس کا سر پھٹ گیا ہوتا۔ اب بھی دائیں شانے پر
خاصی زور دار ضرب لگی۔ ضرب کھاتے ہی وہ اپنی جگہ سے
اچھل کر دوسری جگہ پر چلا گیا۔ اس دوران باربی بھی
صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور اس کے چہرے کے کھم
تاثرات تبدیل ہو کر سختی میں ڈھل چکے تھے۔

”ہماری اس سوسائٹی میں مرد، عورت کو کمزور جان
کر کسی نہ کسی طرح اس کا استحصال کرنے کی کوشش کرتے
ہیں۔ تم نے بھی اس وقت یہی گھٹیا حرکت کی ہے اور سمجھتے ہو
کہ ایک کمزور عورت کو ڈھال بنا کر یہاں سے فرار ہونے
میں کامیاب ہو جاؤ گے لیکن میں تمہیں بتاؤں گی کہ تم کتنی
شدید غلطی پر ہو۔“ وہ پھنکارنے کے انداز میں بولی اور کسی
شیرنی کی سی بھرتی سے اس پر چھلانگ لگائی۔ وہ ایک بار
پھر بھرتی کا مظاہرہ کرتا ہوا ایک طرف ہٹ گیا لیکن اس
چکر میں ایک سائز بھیل الٹ گئی۔

”میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ نہ ہی میں تمہیں
کوئی نقصان پہنچانا چاہتا ہوں۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم مجھ
سے مقابلے کی کوشش مت کرو۔“ اس نے تیز تیز بولتے
ہوئے باربی کو سمجھانا چاہا لیکن وہ سمجھنے کے سوڈ میں نہیں تھی
اور شرطہ ہار تھروں سے اسے گھورتی ہوئی ایک بار پھر حملے
کے لیے پرتول رہی تھی۔ وقاص نے اپنی پوری توجہ اس پر
مرکوز کر دی۔ نتیجتاً جب وہ ایک بار پھر اس پر حملہ آور ہوئی تو
وہ اتنی آسانی سے ایک طرف ہو گیا جیسے پھل قدی کر رہا
ہو۔ باربی نے بھی ہار نہیں مانی اور فوراً ہی پلٹ کر اس پر
کھڑی پھیل کا وار کیا۔ وقاص نے اس وار کو اپنے بازو پر
روکا اور اسے تسلیم کرنا پڑا کہ اس بظاہر نرم و نازک نظر آنے
والی لڑکی کے وار میں آجی طاقت ہے۔ اس کے دوسرا وار
کرنے سے لگی وہ ایک بار پھر اچک کر اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا
چنانچہ باربی کی چلائی جانے والی ٹانگہ ہوا میں ہی مستقر رہ
گئی۔

”ہیلز! میری بات کو سمجھو۔ میں تم سے لڑنا نہیں
چاہتا۔ میں نے صرف اس کمرے میں پناہ لی ہے اور میں تم
سے چہار اٹھوڑا سا تعاون چاہتا ہوں۔“ وہ بڑے صوفے
کے پیچھے کھڑا ہوا تھا اور باربی کو اس تک پہنچنے کے لیے تھوڑا
وقت لگا۔ اس نے اس مہلت کا فائدہ اٹھایا اور اسے
سمجھانے کی کوشش کی۔

”کیوں... تم میری بھی کے پتر لگتے ہو جو میں تم

سے تعاون کروں؟“ وہ ابھی تک اسے کوئی قابل ذکر ضرب نہیں لگا سکی تھی اس لیے تھوڑی سی جھنجھلائی ہوئی تھی۔ وقاص اس کی بات پر بے ساختہ ہنس پڑا۔ شکل و صورت اور چلنے سے بالکل بدیہی دکھائی دینے والی وہ سینہ ایسے دیسی انداز میں بات کرے گی، اسے امید نہیں تھی۔ اسے بھی اپنی حرکت کا اندازہ ہو گیا اس لیے پہلے کھلی پھر اسے انگریزی میں دو چار گالیاں دے ڈالیں۔

”گالی مت دوس۔ یہ نہ ہو کہ میں تمہیں لڑکی ہونے کی رعایت دیتا بھول جاؤں۔“ وقاص کے چہرے کا رنگ سرخ ہوا اور اس نے انگلی اٹھا کر باربی کو تنبیہ کی۔ اس سے قبل کہ باربی جواب میں کچھ کہتی، دروازے پر زوردار دنگ دی گئی۔ وہ دونوں ہی دنگ کی آواز پر اس طرف متوجہ ہو گئے۔

”دروازہ کھولو کی!“ دنگ کے ساتھ ہی جو آواز سنائی دی، اس نے وقاص کے ہوش اڑا دیے۔ اب چاہے اس پر توپ ہی کیوں نہ داغ دی جاتی، وہ دروازہ کھولنے میں ایک سیکنڈ کی تاخیر نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے فوری طور پر دروازہ کھول دیا۔ سامنے لالہ میٹی کھڑا اپنی سرخ آنکھوں سے اسے گھور رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی طرح دار وحشیں سونا خان بھی کھڑی ہوئی تھی۔ وہ بے ساختہ ہی دو قدم پیچھے ہٹا لیکن لالہ میٹی نے اندر آنے کے لیے قدم نہیں اٹھائے اور اپنی جگہ کھڑا اسے گھورتا رہا۔

”یہ سب کیا تھا مسٹر وقاص؟“ لالہ میٹی کے بھائے سونا خان نے ذرا درشت لہجے میں اس سے دریافت کیا۔ ”ہں ایسے ہی، ذرا میں مس باربی کے پیچھے اوپر آ گیا تھا تو گارڈز میرے گلے پڑ گئے اور مجھ سے خواہواہ اپنی سیدھی حرکتیں ہوتی چلی گئیں۔“ اس نے یوں جھپٹی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا جیسے واقعی وہ کوئی پوری یو آئے ہو اور اب اپنی حرکت پر پکڑے جانے پر شرمندہ ہو رہا ہو۔

”یہ ذرا سی بات نہیں ہے مسٹر وقاص! آپ نے دو سکیمیں رٹی گارڈز کو بے ہوش کر دیا ہے جنہیں اسپتال لے جانا پڑا ہے۔ دوسری طرف آپ پر مس باربی کو یہ خیال بتانے کا بھی الزام ہے۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ اس صورت حال پر ہٹل انتظامیہ کتنا سخت ایکشن لے سکتی تھی۔ وہ تو خیر نے سی سی ٹی وی فوج دیکھ کر لوٹ کر لیا کہ آپ میری پارٹی کے مہمانوں میں شامل ہیں۔ اس نے مجھ سے رابطہ کیا اور مجھے فوج دکھائی تو میں لالہ میٹی کو اپنے ساتھ لے کر اپنی

ذمہ داری پر آپ سے بات کرنے یہاں آ گئی۔ اب آپ بتائیں کہ آپ کے ساتھ کیا کیا جائے؟“ سونا خان کے لہجے کی درخشندگی قائم رہی۔

”میرے خیال میں ہمیں یہاں سے چلتا چاہیے مسز خان! وہی سے جو بھی بات کرنی ہوگی، میں خود کر لوں گا۔“ لالہ میٹی جواب تک خاموش کھڑا تھا، یکدم پاٹ لہجے میں بولا تو سونا خان نے اپنے خوبصورت بالوں والے سر کو دھیرے سے جھٹک دیا اور بولی۔

”یہ صرف آپ کی خاطر ہے مسز میٹی ورنہ اس سچویشن میں ہوئی انتظامیہ جتنی خفا ہے، اس لڑکے کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔“

”تھینکس فار دس۔“ لالہ میٹی نے پاٹ لہجے میں جواب دیا اور وقاص کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے پلٹ گیا۔ سونا خان اس سے بھی پہلے مڑ چکی تھی اور کوریڈور میں ان سے کافی آگے اپنی ٹیکس کی تک تک کرتے ہوئے چل رہی تھی۔ وقاص کان دبائے لالہ میٹی کے پیچھے چلا رہا۔ وہ لوگ سونا خان کے ساتھ واپس پارٹی میں نہیں گئے اور سیدھے باہر کا رخ کیا۔

”اب بول، یہ کیا لفظ تھا؟ لوٹو یا کے پیچھے جانے والی بات اپن نہیں مان سکتا۔“ وہ لوگ گاڑی میں بیٹھ کر ہوٹل سے روانہ ہوئے تو لالہ میٹی نے سنجیدہ لہجے میں اس سے دریافت کیا۔ اس کا انداز اتنا دو ٹوک تھا کہ وقاص کے لیے جھوٹ بولنا ممکن نہیں رہا۔ علیحدہ سے اپنی جذباتی وابستگی کے علاوہ وہ لالہ کو ہر بات بالکل سچ بتاتا چلا گیا۔

”تیری دوسروں کے لفظوں میں اپنی ٹانگ اڑانے کی عادت بہت بری ہے۔“ سن کر لالہ نے تبصرہ کیا۔ وقاص خاموش رہا۔ لالہ نے بھی پھر کوئی دوسری بات نہیں کی۔ وقاص کے لیے لالہ کی یہ خاموشی قیامت تھی لیکن وہ یہ نہیں جان سکا تھا کہ اس خاموشی کے پیچھے کیا چھپا ہے۔ لالہ اسے کچھ بھی بتائے بغیر خود کو نلے والے ایک پیغام پر غور کر رہا تھا۔ پیغام کے الفاظ تھے۔

”وکی کو ہمارے معاملات سے الگ رکھو ورنہ تم اسے کھودو گے۔“ لالہ اسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔

☆☆☆

کھانے سے بھری ٹرے خالی کر کے اس نے گھنٹی کا بجن دیا یا تو حسب معمول مخصوص ملازم اندر آ کر خالی ٹرے واپس لے گیا۔ کھانے کے بعد وہ کچھ دیر کے لیے قاریغ تھا۔ فراغت کے اس وقفے میں قیلو لے کے لیے پلٹنے کے

نومبر 2020ء

80

سسپنس ڈائجسٹ

مہربانی فرما کر بلیشرز کی حوصلہ کے لیے خرید کر پڑھیے۔

بھائے وہ دیر دیر سے کمرے میں بیٹھے لگا۔ بیٹھے بیٹھے وہ ہر آدم آئینے کے سامنے جا کر رکا اور اپنا جائزہ لینے لگا۔ اس وقت اس نے گہرے نیلے رنگ کے سینڈو کے ساتھ سیاہ ڈھیلا ڈھالا ڈھالا زربین رکھا تھا۔ اس کی صحت واضح طور پر بہت اچھی ہو چکی تھی اور عریاں بازوؤں کی مچھلیاں ترقیتی صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ ماضی میں بھی فزیکل ایکٹیوٹیز میں حصہ لیتا رہا تھا لیکن یہاں اس پر بے حد وحساب توجہ دی جا رہی تھی۔ اس عرصے میں اس کی خوراک میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا اور یہ اچھی خوراک اور پابندی سے کی جانے والی مختلف ورزشوں کا ہی نتیجہ تھا کہ اس کی جسمات میں اتنی واضح تبدیلی آگئی تھی ورنہ کیرئیر سے لوٹنے کے بعد تو وہ بالکل ہڈیوں کا ڈھانچا بن کر رہ گیا تھا۔

یہاں رہ کر اس کی صرف صحت ہی اچھی نہیں ہوئی تھی بلکہ وہ دوسرے کئی فنون میں بھی مہارت حاصل کر چکا تھا۔ یہاں اسے جدید ہتھیاروں کے استعمال سے لے کر گوار بازی، مخفی زنی اور تیر اندازی تک ہر کام سکھایا گیا تھا۔ ہاتھ پیروں سے لانے کے فن میں اسے پہلے ہی کافی مہارت تھی۔ یہاں اس مہارت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ اسے کئی جدید آلات کا استعمال بھی سکھایا جا رہا تھا اور یہ سب اس کے لیے باعث حیرت تھا۔ وہ لوگ اسے کچھ ایسی تربیت دے رہے تھے جیسے وہ کوئی کمانڈر یا جاسوس وغیرہ بننے جا رہا ہو۔ یہ سارے کام سیکھنا اس کے لیے ایک دلچسپ عمل تھا اس لیے وہ تیزی سے ہر چیز سیکھ رہا تھا لیکن ساتھ ہی اسے ابھمن اور ٹکر بھی تھی کہ اس ساری تربیت کا کیا مقصد ہے۔ اپنے قیدی ہونے کے احساس نے بھی اسے اندر سے بھنبولا کر رکھا ہوا تھا لیکن اپنے پیاروں کی خاطر وہ یہ سب برداشت کرنے پر مجبور تھا۔ سجد کے جسم سے اس کا گردہ نکالے جانے کا منظر اسے ایک بار بھی نہیں بھولا تھا۔ سجد جتنے عرصے یہاں رہا تھا، ویڈیو ٹنگ کے ذریعے دن میں ایک بار اسے سجد کو دکھایا جاتا تھا۔ ہر بار وہ اسے بے ہوشی یا نیم بے ہوشی کی کیفیت میں ہی نظر آیا تھا لیکن یہی قیمت تھا کہ وہ زندہ تھا اور اسے مزید کوئی نقصان نہیں پہنچایا جا رہا تھا۔ اپنے مکمل تعاون کے ساتھ وہ مسلسل سجد کو رہائی دینے کی استدعا کرتا رہا تھا۔ ایک دن اسے ایک اس کی درخواست قبول کر لی گئی اور اسے مختلف نیوز کے مجلس دکھا کر قہقہے دلا گیا کہ سجد کو کچ بچ رہا کر دیا گیا ہے۔ سجد کی رہائی اس کے لیے ایک بہت اچھی خبر تھی لیکن

دو تین دن سے وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کے ساتھ کچھ عجیب کیا جا رہا ہے۔ ان دو تین دنوں میں اس کے معمولات میں یہ معمولی سی تبدیلی آئی تھی کہ رات کے کھانے کے بعد ایک سفید بالوں والا بوڑھا اس سے ملاقات کے لیے آنے لگا تھا۔ بوڑھے نے اسے اپنا نام وکٹر بتایا تھا۔ وکٹر دیکھنے میں نہایت نفیس شخصیت کا مالک تھا اور دھیمی آواز میں بہت ٹھہر ٹھہر کر گفتگو کرتا تھا۔ اس کی گفتگو معاذ کی ذات کے ارد گرد ہی گھومتی رہتی تھی۔ حیرت انگیز طور پر وہ معاذ کی زندگی کے کئی واقعات سے آگاہ تھا پھر بھی کرید کرید کر اس سے اس کے متعلق معلومات حاصل کرتا رہتا تھا۔ معاذ اسے غلط انداز میں لیکن اپنے بارے میں بالکل سچ باتیں بتاتا تھا کیونکہ اس کا اندازہ تھا کہ اس کی سہیلی ہانچنے کے لیے ہی اس سے یہ سب پوچھا جاتا ہے۔ بوڑھے کی اپنی زندگی سے متعلق معلومات کے باعث اسے غدشہ تھا کہ کہیں اس کا کوئی لفظ جواب اس کے لیے مسئلہ نہ بن جائے۔ اب تک ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی کہ بوڑھا اس پر اپنے عدم اعتماد کا اظہار کرتا لیکن اس کی اپنی ابھمن بڑھتی جا رہی تھی۔

بوڑھے وکٹر سے ملاقاتوں کے دوران اس نے دو خاص باتیں نوٹ کی تھیں۔ نمبر ایک یہ کہ گفتگو کے دوران وکٹر اپنی متناہسی آنکھیں مسلسل اس کی آنکھوں پر جمائے رکھتا تھا۔ دوسرے یہ کہ اسے وکٹر کے اپنے کمرے سے واپس جانے کا بھی اندازہ نہیں ہو سکا تھا۔ اسے یوں لگتا تھا کہ وہ وکٹر سے باتیں کرتے کرتے ہی نیند میں ڈوب جاتا ہے۔ وکٹر سے گفتگو کے دوران وہ ہمیشہ کرسی پر بیٹھا کرتا تھا لیکن صبح آنکھ کھلنے پر وہ خود کو بستر پر پاتا تھا۔ اس صورت حال نے اسے ابھمن میں جلا کر دیا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا کیا جا رہا ہے۔ کسی سے گفتگو کرتے کرتے اپنے یوں سو جانے کی بات اسے ہمہ نہیں ہو رہی تھی اور وہ ٹنگ میں جلا ہو گیا تھا کہ اسے کھانے میں کوئی خواب آور وادائی جا رہی ہے لیکن سوال یہی پیدا ہوتا تھا کہ اس کے پیچھے کیا مقصد ہے؟ آئینے کے سامنے کھڑا خود کو دیکھتا ہوا وہ اس مقصد کو تلاش کر رہا تھا۔ اس کے سامنے اپنی صورت میں ایک ایسا مضبوط توانا شخص کھڑا تھا جو بیک وقت کئی لوگوں سے مقابلہ کر سکتا تھا۔ جس کے اندر مشکل حالات سے نمٹنے کی بے پناہ صلاحیت تھی، جو بند راستوں پر بھی سرگ بٹا سکتا تھا، جس میں سختیاں جھیلنے کی طاقت تھی اور جو کئی اعتبار سے ایک عام آدمی سے بہت آگے تھا۔ اس کی فطری صلاحیتوں اور رجحانات سے فائدہ اٹھا کر اسے

ایسا بتانے والے یقیناً اس سے کچھ امیدیں رکھتے تھے۔ اپنی ان امیدوں اور خواہشات کے بارے میں یقیناً انہیں معلوم ہوگا کہ محاذ جیسا نوجوان دلی رضا مندی سے انہیں پورا نہیں کر سکا اس لیے کافی حد تک انہوں نے اسے بلیک میٹنگ کے ذریعے قابو میں کیا ہوا تھا لیکن بلیک میٹنگ کا حربہ ہمیشہ کارگر ثابت نہیں ہو سکتا، اس بات کا بھی انہیں اندازہ ہوگا اسی لیے وہ اس کے ساتھ کچھ اور بھی کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کیا.....؟

سوچتے سوچتے محاذ چونکا اور اسے کیرتھر کی پہاڑیوں میں آباد فیمو کا ڈیرا یاد آیا۔ فیمو نے غیر روایتی طریقوں سے چٹا ٹرم کی بے پناہ صلاحیت حاصل کر رکھی تھی اور اپنی اس صلاحیت کا قادمہ اٹھا کر اس نے فیمو جیسے خطرناک ڈاکو کا ذہن ایسے مسخر کیا تھا کہ وہ اس کے اشاروں پر چلنے لگا تھا۔ وکٹرنائی وہ بوڑھا بھی شاید اس کے ساتھ ایسی ہی کوئی کارروائی کر رہا تھا۔ خواب آور دوا اور اپنی مقناطیسی آنکھوں کی کشش سے کام لے کر وہ اس کے دماغ میں نہ جانے کہاں کہاں تک رسائی حاصل کر چکا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کوئی ہینالٹ جب کسی کو اپنا معمول بتاتا ہے تو معمولی نوعی حالت میں ایسی باتیں بھی بتا دیتا ہے جو اس کے تحت الشعور میں ہوتی ہیں۔ وکٹر اسے اس کی زندگی کے جو قصے سناتا تھا، وہ جتنی طور پر اس نے خود نوعی حالت میں اسے سنائے تھے۔ یہ ایک خوفناک بات تھی لیکن اس سے بھی کہیں زیادہ خوفناک بات اس کے لیے یہ تھی کہ اسی کیفیت میں اس کے دماغ میں کچھ ایسی باتیں فیڈ کر دی جائیں جو درحقیقت اس کے مزاج، عقائد اور حب الوطنی سے متصادم ہوں لیکن وہ ذہنی طور پر مسخر ہونے کے باعث ان پر عمل کرتا چلا جائے۔ یہ خیال اتنا پریشان کن تھا کہ اس کے رگ و پے میں اضطراب کی لہریں دوڑنے لگیں اور اس نے بے چینی کی کیفیت میں ایک بار پھر ٹھٹھا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ایک بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اسے جس جگہ رکھا گیا تھا، وہاں وہ کھلے آسمان کے دیدار کے لیے ترس گیا تھا اور اس عروسی کے باعث فیمو کی سکھائی ستارہ بینی کی مشقیں بھی نہیں کر پارہا تھا۔ فیمو نے اسے بتایا تھا کہ جو لوگ یہ مشقیں کرتے ہیں وہ نہ صرف یہ کہ دوسروں کے ذہن کو مسخر کر لینے کی صلاحیت حاصل کر لیتے ہیں بلکہ دوسروں کے لیے بھی ان کے ذہن تک رسائی ممکن نہیں ہو پاتی۔ وہ ان مشقوں سے محروم ہو گیا تھا جب ہی وکٹر اس کے دماغ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ یہ رسائی کس حد تک تھی، اسے

اندازہ نہیں تھا لیکن جس حد تک بھی تھی اس کے لیے ہامی توشیش تھی۔

”ہیلو محاذ.....!“ ابھی وہ ادھر ادھر ٹھٹھا ہوا اس مسئلے کا حل سوچ ہی رہا تھا کہ اس کے کانوں میں وہی آواز گونجی جس سے شاید اسے دنیا میں سب سے زیادہ نفرت تھی۔

”آج بہت دنوں بعد تم سے بات ہو رہی ہے۔ یقیناً تم خوش ہو گے کہ سدھ گھر واپس چلا گیا ہے۔“

”ہاں۔ میں مطمئن ہوں کہ اب وہ یہاں تم لوگوں کی گرفت میں نہیں ہے۔“ اس نے سنجیدگی سے جواب دیا تو جواب میں اس نے ہلکا سا ہتھ لگایا اور بولی۔

”سدھ کو اپنی گرفت سے آزاد کر دیجے گا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ ہمارے لیے ناقابل رسائی ہو چکا ہے۔ ہم نے اسے تمہارے تعاون کے انعام کے طور پر آزاد کیا ہے لیکن ہم جب چاہیں اسے یا تمہاری جیل کے کسی بھی محبس کو اپنی گرفت میں لے سکتے ہیں۔“ اس کے انداز میں محسوس کیا جانے والا غرور تھا۔

”اتنا غرور مت کرو۔ اس کائنات میں سب سے سخت پکڑ اللہ کی ہے۔ جب تم اور تمہارے ساتھی اس پکڑ میں آؤ گے تو تمہیں بچانے والا کوئی نہیں ہوگا۔“ محاذ نے اسے جواب دیا تو وہ یوں ہنسی جیسے اس کی بات سے لطف لے رہی ہو، پھر بولی۔

”اب تم مولوی بن کرو عطا تو نہ کرو ڈارنگ!“

”اللہ کسی پر اس وقت تک پکڑ نہیں کرتا جب تک اس کے پاس کوئی ڈرانے والا نہ بھیج دے۔ اللہ کے نبی اور رسول یہ کام بہت پہلے ہی انجام دے کر جا چکے ہیں لیکن اعادہ کروانے کے لیے بھی بھی اللہ مجھ جیسے حقیر بندوں سے بھی کام لے لیتا ہے۔“ محاذ نے اس کے مذاق اڑانے کی پروانہ کرتے ہوئے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”تم اس وقت کسی اور موڑ میں ہو اور میں بحث میں نہیں پڑنا چاہتی اس لیے بہتر ہے کہ موضوع بدل دیا جائے۔ تمہارے لیے ایک اور اچھی اطلاع یہ ہے کہ وہ لڑکا وکی، جس نے تمہیں یزدانی کے ہاں سے فرار کروایا تھا، ملک سے باہر بھیج دیا گیا ہے۔ ہم نے تو یوں بھی اسے نظر انداز کر دیا تھا لیکن وہ ذرا اور اسرارٹ ہے۔ ہمارے نظر انداز کر دینے کے باوجود ابھی تک پیچھے پڑا ہوا تھا۔ ہم نے اس کے گاؤں قار کو پیغام بھجو کر اسے زندہ رہنے کا ایک چانس اور دے دیا ہے۔ اب آگے اس پر ڈھونڈ کرتا ہے

نہیں ہیں۔" وہ پتا نہیں کیا کیا بول رہی تھی۔ محاذ کا دماغ تو اس اطلاع پر ہی اٹک گیا تھا کہ اس کی امی..... اس کی پیاری امی اب اس دنیا میں نہیں رہی ہیں۔ اس سے بہتر یہ بات کون جانتا تھا کہ اس کی امی سعیدہ بیگم اپنی اولاد پر جان چڑھتی تھیں اور ان کا دم اپنے بچوں میں ہی اٹکا رہتا تھا۔ ان تینوں بہن بھائیوں میں سے کسی کی معمولی سی تکلیف بھی ان کے لیے شدید پریشانی کا باعث ہوتی تھی۔ ایسے میں پہلے اس کا اور پھر سعد کا خیاب ان کے لیے کیسا قیامت خیز تجربہ ثابت ہوا ہوگا، یہ سمجھنا اس کے لیے دشوار نہیں تھا۔ وہ اپنی امی کی فطرت سے اچھی طرح واقف تھا جب ہی تو اس عمر سے ہی سب سے زیادہ ان کی طرف سے ہی ٹکڑے جھٹکا رہتا تھا۔ وقت نے ثابت کر دیا تھا کہ اس کی یہ فکر غلط نہیں تھی۔ اس کی امی..... اس کی بے پناہ محبت کرنے والی امی..... اپنے بیٹوں کی جدائی کا دکھ نہیں سہہ سکی تھیں اور اس دار فانی سے کوچ کر گئی تھیں اور وہ ایسا بد نصیب بیٹا تھا کہ وقیع رخصت اپنی ماں کا آخری دیدار بھی نہیں کر سکا تھا۔ اس نے ان کے جنازے کو کاندھا دیا تھا نہ ہی انہیں اپنے ہاتھوں سے لحد میں اتار سکا تھا۔ یہ غم معمولی غم نہیں تھا کہ وہ آسانی سے سہہ جاتا۔ اس کا یہ ایمان اپنی جگہ کہ ہر ذی روح کے دنیا سے جانے کا ایک وقت مقرر ہے لیکن وہ اس حقیقت کو کیسے فراموش کر سکتا تھا کہ امی کے آخری دنوں کو تکلیف دہ بنانے اور انہیں بستر مرگ پر پہنچانے میں ان لوگوں کا ہاتھ ہے جو جانے اپنے گن مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے اسے کسی پالتو جانور کی طرح تربیت دینے میں مصروف تھے۔ امی کے آخری دنوں کی تکلیف اور اپنی عمر دیویوں کا سوچ کر اس کے وجود میں پیش کی اتنی زبردست لہر اٹھی کہ وہ خود پر قابو نہیں پاسکا اور سامنے کیا ہے یہ دیکھے اور سوچے بغیر اپنا آہنی مکا چلا ڈالا۔ یہ اتفاق تھا کہ مکا مارنے وقت وہ قد آدم آئینے کے سامنے گھڑا ہوا تھا۔ مکا اپنی پوری قوت سے آئینے سے ٹکرا ہوا تو آئینے کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ کئی ٹکڑے اس کے ہاتھ کی پشت میں بھی بچست ہو گئے اور تیزی سے خون بہنے لگا۔

"خود پر کنٹرول رکھو محاذ یہ سب کر کے تم کچھ حاصل نہیں کر سکو گے۔" اسپیکر سے اسے غراتی ہوئی آواز میں لوکا گیا۔

"میں کچھ حاصل نہیں کر سکا تو تم لوگ بھی مجھ سے کچھ حاصل نہیں کر سکو گے۔ میں خود اپنے آپ کو ہی غم کڑاؤں

کہ وہ مزید زندہ رہتا چاہتا ہے یا نہیں۔"

"تم لوگ واقعی بہت بگڑی ہوئی قوم ہو جب ہی تو خود فانی انسان ہونے کے باوجود دوسروں کی زندگی اور موت کے فیصلے یوں صادر کرتے ہو جیسے نعوذ باللہ تم ہی خدا ہو۔" وقاص کے ملک سے باہر جانے کی خبر سن کر محاذ نے دل میں ایک اطمینان سا محسوس کیا۔ حاضرت مجبوری میں اس نے ان لوگوں کو وقاص کا نام تو بتا دیا تھا لیکن اپنے دل پر مسلسل بوجھ سا محسوس کرتا تھا۔ اس اطلاع پر جہاں اس کے دل کا بوجھ کم ہوا، وہیں وہ ایک بار پھر اپنی نادیدہ حاضرت کو اس کی فرعونیت پر ٹوکے بنانہ رہ سکا۔

"ہم جو بھی کرتے اور سمجھتے ہیں، تم ہمارے اعمال کو ہم پر چھوڑ دو۔ میرے لیے فی الحال یہ بات قابل اطمینان ہے کہ تم زندگی اور موت کا اختیار اللہ کے ہاتھ میں ہی سمجھتے ہو اس لیے اپنے کسی نقصان کا ذمے دار ہمیں نہیں ٹھہراؤ گے۔" محاذ کے ٹوکے کا برا ماننے کے بجائے اس نے تعبیر لہجے میں جو الفاظ ادا کیے، انہوں نے محاذ کو چوٹا دیا۔

"کیا مطلب..... کیا کہنا چاہتی ہو تم؟"

"تمہارے لیے ایک بری اطلاع ہے۔ آئی ایم سوری کہ میں ذرا لیت سمجھیں یہ اطلاع دے رہی ہوں لیکن تمہارے لیے یہی بہتر تھا۔ وقت پر اطلاع ملنے کی صورت میں تم خود بھی پریشان ہوتے اور ہمیں بھی پریشان کرتے۔ اس لیے میرے خیال میں اطلاع دینے کے لیے یہی وقت مناسب ہے۔"

"ہائیں بنانے سے بہتر ہے کہ تم مجھے اصل بات بتا دو۔" اس کے لہجے میں بے پناہ تنجید کی در آئی، ساتھ ہی اپنے وہ پریشان خواب بھی یاد آئے جو وہ سہ کی رہائی کے روز سے مسلسل دیکھ رہا تھا۔ خواب بہت واضح نہیں ہوتے تھے لیکن ان میں ایسی کوئی بات ضرور ہوتی تھی جس سے اسے لگتا تھا کہ وہ کسی بڑے نقصان سے دو چار ہو چکا ہے۔

"مجھے تمہیں یہ بتاتے ہوئے انہوس ہورہا ہے کہ تمہاری امی سعیدہ بیگم اب اس دنیا میں نہیں رہی ہیں۔ وہ ہارٹ اٹک کے نتیجے میں بہت دنوں سے اسپتال میں ایڈمٹ تھیں اور ٹھیک اسی دن ان کی ڈیڑھ ہوئی جس دن سعد کو یہاں سے رہائی دی گئی۔ اچھے بھائی ان کی ڈیڑھ کی وجہ سے ہی سعد کو اچانک رہائی دینے کا فیصلہ کیا گیا تھا کہ کم از کم ایک بیٹا تو ان کے جنازے میں شریک ہو جائے۔ تم بے شک ہمیں برا سمجھتے ہو لیکن ہم اتنے بھی برے لوگ

گا۔" اس نے عالم جنوں میں آہٹے کا ٹوٹ کر بچے کر جانے والا ایک کھلا کھڑا جبکہ کر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔
 "ہماری مرضی کے بغیر مرنا بھی تمہارے لیے آسان ثابت نہیں ہوگا۔" اس نے دعویٰ کیا اور یکدم ہی جانے کن نادیدہ سوراخوں سے کمرے میں ہلکی نیلی کیس بھرتی شروع ہوگئی۔ معاذ شعی بھی تھا اور شدید جذباتی کیفیت میں بھی اس لیے اسے بردت اپنی سانس روکنے کا خیال نہ آسکا۔ کیس نے فوراً ہی اس کے پیچھے پڑوں تک رسائی حاصل کر لی اور وہ بے ہوش ہو کر بچے کر گیا۔

☆☆☆

بڑی سی سفید چادر میں خود کو مکمل طور پر ڈھانپنے نکل شاہ نے گاڑی سے بچے قدم رکھا تو اس کی ٹانگیں واضح طور پر کانپ رہی تھیں۔ عالم شاہ نے تیزی سے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا۔ بڑے بھائی کا سہارا پاتے ہی اس کے ہونٹوں سے ایک تیز سسکی نکل۔ عالم شاہ کے سینے پر گویا کسی نے گھونسا دے مارا۔ نکل شاہ کی چادر کا پلو جسے اس نے نقاب کے طور پر چہرے کے آگے لپیٹا ہوا تھا، آنسوؤں سے تر تھا۔ چینی طور پر وہ پورے راستے روتی ہوئی آئی تھی۔ حورت کتنے ہی مضبوط اعصاب کی مالک ہو، شوہر کی موت کا غم اسے نڈھال کر دیتا ہے۔ نکل شاہ جیسی نوجوان بیوہ کو دیکھ کر تو اوروں کا کلیجہ منہ کو آتا تھا پھر وہ کیسے اپنے سر کے سامنے کو نہ روتی جو اپنے پہلے پہلے بچے کا منہ دیکھے بغیر ہی اس دنیا سے چلا گیا تھا۔ وہ جو بچے کو جنم دینے کے بعد اس کے باپ کی اسپتال آمد کی شدت سے خنجر تھی، اپنا سہاگ اجڑنے کی خبر سن کر صدمے سے ساکت ہوگئی تھی۔ وہ بچہ جس کے لیے اس کے باپ نے نہ جانے کتنے خواب دیکھے تھے، پیدا ہوتے ہی غیم کر دیا گیا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آتی تھی کہ وہ اپنی بیوی کے غم کو روئے یا اپنے بچے کی تیشی کا ماتم کرے۔

معظم شاہ کے قتل کی اطلاع لینے کے بعد بہت دیر تک تو وہ کتے کی سی کیفیت میں رہی تھی۔ اس کیفیت سے نکلنے کے بعد اس نے فیصلہ سنا یا تھا کہ وہ معظم شاہ کے آخری دیدار کے لیے گاڑی جائے گی۔ زچگی کے چند گھنٹے بعد اتنے طویل سفر کے فیصلے پر سب ہی نے اختلاف کیا تھا لیکن وہ کسی کی بات ماننے کے لیے راضی نہیں تھی۔ اس کے اٹل فیصلے کو دیکھ کر سب کو ہار ماننا پڑی تھی اور جنازہ اگلے دن اٹھانے کا فیصلہ کر کے اسے سفر کی اجازت دے دی گئی تھی۔ وہ ایک دن اس نے اسپتال میں ڈاکٹروں کی زیر

نگرانی گزارا تھا۔ ایک امیر زادی کی حیثیت سے پہلے ہی اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جا رہا تھا۔ معظم کی موت کی خبر کے بعد انسانی ہمدردی کی بنیاد پر بھی اس کا خصوصی خیال رکھا گیا۔ اگلے دن وہ علی الصباح گاڑی کے لیے روانہ ہوئی تو ڈاکٹر کی دی ہوئی ہدایات کی روشنی میں ساری ضروری احتیاطی تدابیر اختیار کی گئیں۔ اچھی بات یہ تھی کہ بچہ نارمل ڈیلیوری کے ذریعے دنیا میں آیا تھا اس لیے اس کے لیے گاڑی تک کا طویل سفر بہت زیادہ تکلیف دہ ثابت نہ ہوا۔ سفر میں چھوٹی بہن مول اور اس کی والدہ بھی اس کے ساتھ تھیں۔ وہ دونوں راستے میں اس کا بھرپور خیال رکھنے کے ساتھ ساتھ اس کو تسلی دلا سے بھی دیتی رہی تھیں۔ اس سے زیادہ وہ کر بھی کیا سکتی تھیں کہ ان کے اپنے دل غم سے بھر رہے تھے۔

خصوصاً نکل شاہ کی ماں سکینہ شاہ کا بہت برا حال تھا کہ انہوں نے صرف داماد ہی نہیں، بچے بچے کو بھی کھو لیا تھا۔ وہ ایک طرف بیٹی کا سہاگ لٹ جانے پر ماتم کتاں تھیں تو دوسری طرف بھائی کا بازو کٹ جانے پر ان کا کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ ماں کی حالت کے پیش نظر نکل نے خود کو کافی حد تک سنبھالے رکھا تھا اور راستے بھر صرف خاموش آنسو بہاتی رہی تھی لیکن اب جبکہ اپنے بھائی کے چوڑے سینے سے لگی ہوئی تھی اس کے لیے خود پر قابو پانا مشکل ہو گیا تھا اور خود بخود ہی ہونٹوں سے سسکیاں نکلنے لگی تھیں۔

اسے سہارا دینے والے عالم شاہ کو فوراً ہی دوسرا بازو ماں کے گرد لپیٹنا پڑا تھا کہ بچے کو دیکھ کر ان کا ضبط بالکل ہی جواب دے گیا تھا اور وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں۔ ماں اور بہن کے آنسو عالم شاہ کے سینے پر کسی آتشیں سیال کے مانند گر رہے تھے اور سینے میں انعام کی آگ تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ کس طرح ان دونوں کو اپنے ساتھ لگائے لگائے حویلی کے زنان خانے کی طرف بڑھا، یہ کچھ اس کا دل ہی جانتا تھا۔ بچے سسکیاں لیتی مول بھی تھی جس نے ایک دن کے بچے کو گود میں اٹھایا ہوا تھا۔ زنان خانے کے دروازے پر ملازماؤں اور رشتے دار خواتین نے ان غزدہ عورتوں کو سنبھال لیا۔ جوان بچے کے جنازے کے پاس بیٹھی معظم شاہ کی ماں کے بین ان تینوں کو دیکھ کر مزید تیز ہو گئے۔ وہ ایک دوسرے سے گلے مل کر روتی رہیں اور باہر کھڑا ان آوازوں کو سننا عالم شاہ ٹوٹا بکھرتا رہا۔ معظم شاہ کا جنازہ بالکل تیار صرف نکل شاہ کی آمد کے انتظار میں ہی رکھا ہوا تھا۔ اس نے اپنے سر کے سامنے کا آخری دیدار کر لیا تو آہوں اور سسکیوں کے

نومبر 2020ء

84

سبسپنس ڈائجسٹ

مہربانی فرما کر بلیشرز کی حوصلہ کے لیے خرید کر پڑھیے۔

درمیان جنازہ اٹھایا گیا۔ صداقت شاہ اور قربان شاہ یوزھے تھے اس لیے عالم شاہ ہی کو زیادہ تر دے داریاں نبھانی تھیں۔ اس وقت وہ بھول چکا تھا کہ وہ خود موت کے منہ سے نکل کر آیا ہے اور ابھی کچھ دن حریہ اسے احتیاط کرنے کی ہدایت دی گئی ہے۔ خاندان کے چند دوسرے نوجوانوں کے ساتھ مل کر معظم شاہ کو قبر میں اتارنے کا فریضہ بھی اس نے اپنے ہاتھ سے انجام دیا لیکن پھر اس کی ہمت جواب دے گئی اور قبر پر مٹی ڈالنے کا کام دوسروں پر چھوڑ کر وہ پیچھے ہٹ گیا۔

”مظلوم کی آہ بھی خالی نہیں جاتی۔ منشی عبدالحق کی دمی کے ساتھ جب سے حویلی میں ظلم ہوا ہے، تب سے حویلی والوں کو سکھ نصیب نہیں۔ پہلے ساکس عالم شاہ اتنی بری طرح زخمی ہوا کہ جان کے لالے پڑ گئے اور اب اس کی اپنی بہن بیوہ ہو گئی۔ بچ ہے بھی دوسروں کی ماں بہن کی طرف بری نظر ڈالنے والے کو خود بھی سکھ نصیب نہیں ہوتا۔“ معظم شاہ کے جنازے میں پورا گاؤں ہی شریک تھا۔ جنازے کے شرکاء میں سے ہی کسی نے بہت دھیمی آواز میں یہ تبصرہ کیا تھا جو عالم شاہ کے کانوں میں پڑ گیا تھا۔ یقیناً تبصرہ کرنے والے کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ قریب ہی موجود ہے۔ سن کر اس کی مٹھیاں ٹھسے سے پہنچ گئی تھیں لیکن اس نے پلٹ کر تبصرہ کرنے والے کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ آہ نے بڑی چالاکی سے اس کے سر پر ایک سنگین الزام ٹھوپ دیا تھا جس پر یقیناً بہت سے لوگ حقیقت کا گمان کرتے تھے۔ وہ کس کس کا گریبان پکڑ کر اسے جھٹلاتا لیکن اسے یہ بھی گوارا نہیں تھا کہ اس کی بہن کا سہاگ اجڑ جانے کا سبب اس کی بد اعمالیوں کو قرار دیا جائے اور قاتل آزاد گھومتے رہیں۔ وہ جو پہلے ہی غم اور غصے کی آگ میں جھلس رہا تھا اس تبصرے کو سننے کے بعد وہاں کھڑا نہ رہ سکا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا قبرستان سے باہر کی طرف بڑھنے لگا۔ سرد سائے کی طرح اس کے ساتھ تھا۔

”عظم کریں ساکس! کیا حویلی چلتا ہے؟“ وہ اپنی گاڑی کے قریب پہنچا تو سرد نے ادب سے اس سے پوچھا۔

”نہیں۔ اسپتال چلو۔“ اس نے عظم دیا اور سرد کے کھولے ہوئے دروازے سے گزر کر گاڑی کی پچھلی نشست پر جا بیٹھا۔ سرد نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر فوراً ہی گاڑی آگے بڑھادی۔ جلد ہی وہ گاؤں کے چھوٹے سے اسپتال کے باہر موجود تھے۔ اسپتال کی عمارت خاصی

پرانی اور محنت تھی البتہ صفائی کا انتظام رکھنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ عجلہ بھی محدود تھا اور سارا عملہ عالم شاہ سے واقف تھا۔ کل سے وہ کئی بار وہاں کا چکر لگا چکا تھا۔ معظم شاہ سمیت دیگر متقویٰ لیں کی لاشوں کی دسولی کے ساتھ ساتھ اسے جن کی بھی فکر تھی۔ جن ہی وہ واحد شخص تھا جو حملہ آوروں کے بارے میں کوئی معلومات فراہم کر سکتا تھا کہ وہ کون تھے؟ لیکن جن کی حالت ایسی نہیں تھی کہ اس سے کچھ پوچھا جاسکے۔ جسم سے بے تماشا خون بہہ جانے کی وجہ سے اس کی اپنی جان خطرے میں تھی اور ڈاکٹر اس کی جان بچانے کی اپنی ہی کوشش کر رہے تھے۔ رات ڈاکٹر نے اس کے بارے میں حوصلہ افزا رپورٹ دی تھی اور خیال ظاہر کیا تھا کہ آج وہ ہوش میں آسکتا ہے۔ کم سہولیات کے باوجود وہ جن کے جسم میں بیست گولیاں نکالنے میں کامیاب رہے تھے اور اس کے بارے میں یہ اچھی اطلاع دی تھی کہ کسی بھی گولی نے اس کے اندرونی اعضا کو نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ عالم شاہ اس وقت جن سے ملنے کے لیے ہی وہاں آیا تھا اور سیدھا اس کمرے کی طرف بڑھتا جا رہا تھا جہاں جن کو رکھا گیا تھا۔ ابھی وہ اس کمرے سے دور ہی تھا کہ اس نے دو ڈاکٹروں کو وہاں سے باہر نکلے دیکھا۔ ان میں سے ایک اسپتال کا مستقل ملازم تھا جبکہ دوسرا ڈاکٹروں کی اس ٹیم کا حصہ تھا جسے صداقت شاہ نے حیدر آباد سے بلوایا تھا۔ عالم شاہ نے ایک نظر میں ہی بھانپ لیا کہ دونوں ڈاکٹروں کے چہروں پر پریشانی کے تاثرات ہیں۔ ڈاکٹروں کی نظر اس پر پڑی تو ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

”خیریت؟“ اس نے ان کے قریب پہنچ کر سوالیہ نظروں سے انہیں گھورتے ہوئے پوچھا۔

”خیریت نہیں ہے شاہ صاحب! جن مر گیا ہے۔“ اسپتال کے مستقل ڈاکٹر نے اسے جواب دینے میں ہلکی کی۔

”مگر کیسے؟ آپ لوگوں کا تو یہی کہنا تھا کہ اس کی حالت کافی بہتر ہے اور آج وہ ہوش میں آجائے گا۔ آپ تو اتنے پُر اعتماد تھے کہ آپ نے میری جن کو شہر بھوانے کی آفر بھی رد کر دی تھی۔“ عالم شاہ کے لیے جن کی موت کی خبر ایک اور صدمہ تھا چنانچہ اس کی آواز خود بخود ہی بلند ہو گئی اور اس نے حیرت لہجے میں ڈاکٹر سے پوچھا۔

”ہم نے اپنے طور پر ایک بالکل درست فیصلہ کیا تھا۔ ہمیں اپنے ٹریٹمنٹ پر بھروسہ تھا اور اس خدشے کی وجہ

سانپ کا لٹنا وہاں ایک عام سی بات تھی اور جن کے ساتھ چس آنے والے حادثے کو اتفاق سمجھا جاسکتا تھا لیکن اس کا دل اس حادثے کو اتفاق ماننے کے لیے راضی نہیں ہو رہا تھا اور دل میں یہی شک تھا کہ جن کی زبان بند رکھنے کے لیے اسے کل کیا گیا ہے۔

”کسی سے کہہ کر جن کی تدفین وغیرہ کے انتظامات کرواؤ سرمد!“ کچھ دیر خاموش کھڑے رہنے کے بعد اس نے اپنے پیچھے آکھڑے ہونے والے سرمد کو حکم دیا۔ معتم شاہ کے موقع پر ہی مر جانے والے دونوں گارڈز کی تدفین کل ہو چکی تھی اور ان کی آخری رسومات کی ساری ذمہ داری بھی حویلی کی طرف سے اٹھائی گئی تھی۔ جن بے چارہ تو دلپسے بھی دیا میں تھا اور اس کا جیتا مرنا حویلی میں ہی تھا اس لیے اس کی آخری رسومات تو ہر حال میں حویلی والوں ہی کی ذمہ داری بنتی تھی۔

”سوری شاہ صاحب! اس کیس کے تفتیشی افسر کو اطلاع دے بغیر لاش کو اسپتال سے نہیں لے جایا جائے گا۔“ ڈاکٹر نے اسے ٹوکا۔

”دے دو اسے بھی اطلاع۔ اس نے پہلے کون سا تیر مارا ہے جواب مارے گا۔“ عالم شاہ نے تلخ لہجے میں اسے جواب دیا اور واپسی کے لیے پلیٹ گیا۔ جن کی موت کے بعد اب وہاں اس کے لیے کچھ باقی بھی نہیں رہ گیا تھا۔

☆☆☆

”سعیدہ بیگم زوجہ خاور احمد۔“ معاذ نے گلاب کے تازہ پھولوں سے ڈھکی قبر پر گلے کتے پر یہ الفاظ پڑھے تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کی پیاری امی کتنی جلدی اس دنیا سے چلی گئی تھیں اور وہ مٹی کے اس ڈھیر کے نیچے چھپے ان کے وجود کو اب بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ انہیں دیکھنا تو دور کی بات، اس کی رسائی میں تو مٹی کا یہ ڈھیر بھی نہیں تھا جسے قبر کہا جاتا ہے۔ وہ ان کی قبر پر چلا جاتا اور اس سے لپٹ کر رو لیتا تو بھی شاید اسے تھوڑا سا فرار آ جاتا لیکن اس کے نصیب میں تو یہ بھی نہیں تھا اور وہ اپنے کسی ناکرہہ گناہ کے بدلے اس نفس میں پھنس کر رہ گیا تھا جہاں اسے اپنی مرضی سے کچھ بھی کرنے کی اجازت نہیں تھی اور وہ ایسا بندر بن کر رہ گیا تھا جس کے پاس مداری کی ڈگڈگی پر ناچے رہنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہو۔ اب بھی وہ اپنی مرضی پا خواہش کے بغیر اسکرین پر وہ تصویریں اور چند سیکنڈ پر مشتمل ایک ویڈیو دیکھ رہا تھا جس میں اس کی امی کی قبر کو مختلف زاویوں سے دکھایا جا رہا تھا۔

نومبر 2020ء

سے پیشنت کو شہر لے جانے کی مخالفت کی تھی کہ راستے میں دھچکے وغیرہ لگنے سے اس کے زخموں سے دوبارہ خون کا رسا دشروع ہو جاتا جو اس کے لیے جان لیوا ثابت ہو سکتا تھا۔“ ڈاکٹر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا۔

”جان سے تو وہ اب بھی چلا گیا نا“ عالم شاہ نے غصے میں اپنی ہی آغوش پر گھونسا مارا۔

”وہ زخموں کی وجہ سے جان سے نہیں گیا ہے۔ اس کی جان جانے کا سبب ایک حادثہ ہے۔“ ڈاکٹر نے اس پر انکشاف کرنے کی کوشش کی۔

”کیسا حادثہ.....؟“ عالم شاہ چونکا۔

”جن کو سانپ نے کاٹا ہے۔ آج صبح ہی اسے ہوش آ گیا تھا لیکن شدید تکلیف کے باعث ہمیں اسے ایسی میڈیسن دینی پڑی تھی کہ وہ تکلیف کو محسوس نہ کرے اور سکون سے سوتا رہے۔ نرس مسلسل اس کے کمرے میں ڈیوٹی دے رہی تھی۔ ابھی آدھا گھنٹا قبل نرس کی چچہ دیکارن کرہم اور دوسرا اسٹاف اس طرف گئے تو پتا چلا کہ کمرے میں ایک خطرناک سانپ موجود ہے۔ نرس تو بھاگ کر باہر آ گئی لیکن بستر پر سوائے ہوئے جن کو سانپ نے کاٹ لیا۔ دو آدمیوں نے مل کر سانپ کو ختم کیا تو میں اور ڈاکٹر صاحب کمرے میں جا کر جن کو دیکھنے میں کامیاب ہو سکے لیکن ہمیں دیر ہو گئی تھی۔ سانپ بے حد زہریلا تھا اور جن کے اندر قوت مدافعت نہ ہونے کے برابر ہی رہ گئی تھی اس لیے ہماری کوششوں کے باوجود وہ جانبر نہیں ہو سکا۔“ ڈاکٹر نے اسے تفصیلی جواب دیا۔ حیدر آباد سے آنے والا ڈاکٹر خاموش کھڑا تائیدی انداز میں سر ہلاتا رہا۔

”اسپتال میں سانپ کہاں سے آیا؟ کیا کسی نے جن کو قتل کرنے کے لیے یہ چال چلی ہے؟“ عالم شاہ کے ٹھوک اس کی زبان پر آ گئے۔

”ہم کچھ نہیں کہہ سکتے شاہ صاحب! اسپتال میں سانپ آ جانے کے واقعات اس سے پہلے بھی ہو چکے ہیں لیکن کبھی کوئی موت واقع نہیں ہوئی۔ اکثر مریضوں یا ان کے ساتھ آنے والوں نے خود ہی سانپ کو مار ڈالا۔ آپ جانتے ہیں کہ اس علاقے کے لوگوں کے لیے سانپ ایک عام چیز ہے اور وہ بہ آسانی اس سے نمٹ لیتے ہیں۔ نرس مقامی نہ ہونے کی وجہ سے سانپ کو دیکھ کر زیادہ گھبرا گئی تھی۔“ ڈاکٹر نے شانے اچکا کر جواب دیا تو عالم شاہ کو خاموشی اختیار کرنی پڑی۔ یہ بات بالکل درست تھی کہ

سسپنس ڈائجسٹ 87

مہربانی فرما کر بلیشرز کی حوصلہ کے لیے خرید کر پڑھیے۔

”ہیلو معاذ، کیسے ہو؟ تمہاری طبیعت ٹھیک ہوئی یا نہیں؟“ اسے امی کی قبر کی تصویریں اور ویڈیو دیکھنے سے تکلیف ہو رہی تھی لیکن وہ انہیں دیکھنے سے بھی باز نہیں رہ سکتا تھا چنانچہ بار بار پلٹ کر دیکھنے میں یوں مگن تھا کہ اب تک سے ابھرنے والی جالی پچھانی آواز نے بھی اسے چوکا دیا تھا۔

”میں تم سے تمہاری طبیعت پوچھ رہی ہوں معاذ! تمہارے ہاتھ کا زخم اب کیسا ہے؟“

”تم لوگوں نے میرے دل پر جو زخم لگایا ہے اس کے مقابلے میں یہ معمولی زخم کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔“ معاذ نے اپنے ہاتھ کی پشت کو دیکھتے ہوئے مٹی سے اس کی بات کا جواب دیا۔ مکا مار کر آئینہ توڑنے کے نتیجے میں اس کے ہاتھ پر اچھا خاصا زخم آ گیا تھا۔ دوران بے ہوشی اس کے زخم کی ڈریسنگ کر دی گئی تھی لیکن اسے زخم کا ہوش ہی کہاں تھا۔ ابھی تو وہ اپنی ماں کی حسرت ناک موت کو ہی بیٹھا رہا تھا۔

”تمہاری تم سے یا تمہاری فیملی سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ نہ ہی ہم خواہواہ کسی کو کوئی تکلیف پہنچانا چاہتے ہیں۔ تمہاری امی کی موت پر مجھے ذاتی طور پر افسوس ہے لیکن اس کے لیے تم ہمیں الزام نہیں دے سکتے۔ وہ طبیعت موت مری ہیں۔“

”میں تم سے کسی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ تم جو چاہتی ہو وہ بولو۔“ معاذ کو اس کے مصنوعی انسوس کی ضرورت نہیں تھی چنانچہ بیزاری سے جواب دیا۔

”ہمیں تم سے تمہارے تعاون کے سوا کچھ نہیں چاہیے۔ تم اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کر رہے ہو۔ تمہارا انٹرنل ٹیم سے مطمئن ہے اور اب تمہیں پروفیسر وکٹر کو مطمئن کرنا ہے۔ وکٹر کئی علوم پر مہارت رکھتا ہے اور میں چاہتی ہوں کہ تم اس کی قابلیت سے فائدہ اٹھاؤ۔ میرا ذاتی اندازہ بھی تھا اور وکٹر نے بھی تمہارا تجویز کر کے پیچھلکی کی ہے کہ تم ہپناٹزم کا علم سیکھنے کی فطری صلاحیت رکھتے ہو۔ میں اس ہپناٹزم کی بات نہیں کر رہی جو کلینیکل سائنس کے پڑھنے والے ڈاکٹرز جانتے ہیں۔ ہپناٹزم کی وہ قسم اتنی اہم نہیں ہے کیونکہ اس کے لیے ڈاکٹر کو اپنے معمول کی اجازت درکار ہوتی ہے اور اس کی مدد سے وہ محدود کامایاں ہی حاصل کر سکتا ہے۔ میں تمہیں جو ہپناٹزم سکھانا چاہتی ہوں وہ بہت کم لوگ ہی سیکھ پاتے ہیں بلکہ یوں سمجھ لو کہ چند خاص لوگ جنہیں قدرت کی طرف سے خاص صلاحیتیں ملی ہوتی

ہیں، وہی اس قسم کا ہپناٹزم سیکھ سکتے ہیں اور اتفاق سے تم ان خاص لوگوں میں سے ایک ہو۔ تم اگر ہپناٹزم کی اس صلاحیت میں مہارت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو سمجھو دنیا کا تقریباً ہر شخص تمہارا فرمانبردار بن جائے گا۔ تم جسے چاہے مسخر کر سکو گے اور جس کو چاہو گے اپنا غلام بنا کر اس سے اپنی مرضی کا کام لے سکو گے۔“

”اللہ نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے اور مجھے دوسرے انسانوں کو اپنا غلام بنانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔“ ہپناٹزم کے ذکر نے معاذ کو چوکا دیا تھا اور ایک بار پھر اسے یہ خیال آیا تھا کہ وکٹر اس پر اپنی یہ صلاحیت استعمال کرتا رہا ہے لیکن کچھ بھی ظاہر کیے بغیر اس طرف سے اپنی بیزاری کا اظہار کیا۔

”یہاں ہم تمہیں اس لیے نہیں لائے ہیں کہ تم سے تمہارے شوق، مرضی، پسند اور ناپسند پوچھتے رہیں۔ یہاں رہ کر تمہیں وہ کرنا ہوگا جو ہم تم سے چاہتے ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ تم پروفیسر وکٹر سے ہپناٹزم سیکھو تو تمہیں سیکھنا پڑے گا۔“ معاذ کا جواب اسے پسند نہیں آیا چنانچہ تنک کر بولی۔

”میں نے تمہیں انکار تو نہیں کیا ہے۔ جیسے باقی سب کچھ سیکھ رہا ہوں، یہ بھی سیکھ لوں گا۔“ معاذ کے لہجے کی بیزاری برقرار رہی۔

”باقی چیزوں اور اس علم میں فرق ہے۔ اب تک تم نے جو کچھ سیکھا اس کے لیے تمہیں فزیکل کوآپریشن کرنا تھا لیکن اب تمہیں ذہنی تعاون کرنا ہے۔ تم پروفیسر وکٹر کو اپنے ذہن تک رسائی دو گے تو وہ تمہیں اس علم سے متعلق ضروری مشقیں کروانے کے ساتھ ساتھ تمہارے ذہن میں بھی سب کچھ فیڈ کرتے جائیں گے۔ اس طرح تم بہت جلد سب کچھ سیکھ جاؤ گے۔“ اس نے معاذ کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ اکٹڑ گیا اور ناراضگی سے بولا۔

”یہ کیا بکواس ہے۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ شخص میرے ذہن تک رسائی حاصل کرنے کے بعد میرے بارے میں جو کچھ چاہے گا، جان لے گا اور جو چاہے میرے دماغ میں فیڈ کر دے گا۔ اس طرح تو میں ایک کھنکھاتی بن کر رہ جاؤں گا۔“

”تمہیں اجازت دینی ہوگی معاذ! تم نہ مانے تو ہم کسی بھی حد تک جاسکتے ہیں۔ ہم اپنی مرضی پوری کرنے کے معاملے میں بڑے عالم لوگ ہیں۔ اپنے ٹارگٹ تک پہنچنے کے لیے ہم زندوں کو تو کیا مردوں کو بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ اب تم خود ہی سوچ کر بتاؤ کہ تمہیں کیسا لگے گا

نہیں کر سکتا۔ مزید بات کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ جو چاہتا تھا اس سے کہہ چکا تھا۔ وکٹر کے عمل کا توڑ کرنے کے لیے اسے فیضو کے علم کو حاصل کرنا تھا۔ اپنے بچاؤ کے لیے اس کے پاس بس یہی ایک راہ تھی۔

☆☆☆

عالم شاہ عالم اضطراب میں ادھر سے ادھر ہلکا پھر رہا تھا۔ جن کی موت کے بعد منظم شاہ کے قاتلوں تک پہنچنے کے سارے راستے بند ہو گئے تھے لیکن اچانک ہی ایک راہ نکل آئی تھی۔ یہ راہ اسے اس کے جاں نثار ملازم سرمد نے دکھائی تھی۔ سرمد نے اس پر انکشاف کیا تھا کہ وہ خدیجہ نامی ایک ایسی لڑکی کو جانتا ہے جو لطیف سومرو کے ہاں ملازمت

کرتی ہے اور اس کے کہنے پر وہاں کی بہت سی معلومات فراہم کر سکتی ہے۔ عالم شاہ کو ایک راہ دکھائی دی تو وہ خدیجہ سے ملنے کے لیے بے چین ہو گیا اور سرمد سے مطالبہ کیا کہ کسی طرح جلد از جلد خدیجہ کو یہاں بلوایا جائے۔ سرمد اس کا حکم بجالایا تھا اور اس کی دی اطلاع کے مطابق آج خدیجہ ان کے گاؤں عالم شاہ میں موجود تھی۔ عالم شاہ کے گاؤں کا نام عالم شاہ ہی تھا۔ اصل میں گاؤں کا یہ نام اس کے پردادا کے نام پر رکھا گیا تھا۔ وہ نہایت نیک اور پرہیزگار بزرگ تھے جو زمینداری کی جمہتوں سے بچ جانے والا وقت عبادت اور حقوق خدا کی خدمت میں گزارتے تھے۔ بچوں کے بالغ ہونے کے بعد انہوں نے دنیاوی جھمیوں سے مکمل کنارہ کشی اختیار کر کے خود کو اللہ اور اس کی حقوق کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ان کی نیک نیتی کا اثر تھا کہ ان کی خدمت میں حاضر ہونے والے ہر حاجت مند کا مسئلہ حل ہو جاتا تھا، یوں لوگوں کو ان سے خاص عقیدت تھی اور اس عقیدت کے باعث ہی گاؤں کا نام عالم شاہ پڑ گیا تھا۔ صداقت شاہ نے اپنے اکلوتے بیٹے کا نام اپنے ان ہی بزرگ کے نام پر رکھا تھا۔ یوں گاؤں اور بیٹے کا نام ایک ہی ہو گیا تھا۔

سرمد نے عالم شاہ کو اطلاع دی تھی کہ خدیجہ یہاں اپنی خالہ سے ملنے کے یہاں آئی ہوئی ہے۔ خدیجہ کے ساتھ اس کی ماں بھی آئی تھی اور خدیجہ ماں پر یہ بات ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ وہ سرمد کے کہنے پر عالم شاہ سے ملنے جا رہی ہے۔ اس لیے منصوبہ یہ بنایا گیا تھا کہ خدیجہ اپنی ہم عمر خالہ زاد بہن کے ساتھ کسی بہانے گھر سے نکلے گی اور سرمد کچھ دیر کے لیے اسے حویلی لے آئے گا۔ خدیجہ نے کچھ دیر قبل موبائل فون پر سرمد کو اطلاع دی تھی کہ وہ خالہ

اگر تمہاری بھاری امی کی قبر کھود کر اس میں سے ان کی لاش نکال لی جائے اور اس لاش کو کتے بلیاں سڑکوں پر نوچنے کھسوٹنے پھریں یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لاش کسی ہوس کے مارے جانور نما انسان کے حوالے کر دی جائے۔ تم نے میڈیا پر ایسی رپورٹس تو دیکھی ہوں گی کہ کیسے بعض لوگ مردہ عورتوں کو بھی نہیں چھوڑتے اور انہیں بھی زیادتی.....

”اسٹاپ..... اسٹاپ اٹ۔ میں تمہاری اتنی بے ہودہ باتیں نہیں سننا چاہتا۔“ معاذ نے چیخ کر بولتے ہوئے اس کی بات درمیان سے ہی کاٹ دی۔

”ہم صرف باتیں کرنے والے لوگ نہیں ہیں معاذ! ہم عملی طور پر بھی یہ سب کچھ کر دیتے ہیں۔“ معاذ کے غصے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تو اس نے اپنا سر تھام لیا۔

”تمہارے پاس ہماری بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے معاذ!“ وہ اس کی حالت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولی۔

”ٹھیک ہے، میں تمہاری بات مان لوں گا لیکن تمہیں بھی میری ایک چھوٹی سی خواہش پوری کرنی ہوگی۔“ معاذ نے بالآخر اس کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔

”کیا تم کوئی شرط عائد کرنا چاہتے ہو؟“ وہ اس کی بات پر چونکی۔

”شرط نہیں بس ایک چھوٹی سی خواہش ہے۔ میں مسلسل بند کمروں میں رہتے ہوئے بیزار آ گیا ہوں۔ تم میرے لیے کسی ایسے کمرے کا انتظام کر دو جہاں سے میں تھوڑا سا سی سکی، آسمان دیکھ سکوں۔“ اس نے اپنی خواہش بیان کی۔

”کیا یہاں سے فرار کی ترکیب سوچ رہے ہو؟“ وہ ہنسی۔

”میری ساری کمزوریاں تمہارے ہاتھ میں ہیں۔ فرار کی تو گنجائش ہی نہیں ہے میرے پاس۔ پھر بھی اگر تمہیں مجھ سے کوئی ڈر ہے تو اتنا کرنا کہ میرے لیے کسی ایسی جگہ کا انتظام کر دینا جہاں کوئی بہت ہی چھوٹی سی کھڑکی یا ہوادان وغیرہ موجود ہو جس میں سے میں نکل سکوں۔ چاہو تو اپنی تسلی کے لیے اس میں مضبوط سلاخیں وغیرہ لگوا لیں۔“ اس نے اپنے لہجہ کو عاجزانہ رکھا۔

”ٹھیک ہے۔ اس بارے میں غور کیا جاسکتا ہے۔ ہمارے لیے یہ کوئی اتنی بڑی فرمائش نہیں ہے۔“ اس نے نیم رضامندی کا اظہار کیا اور خاموشی اختیار کر لی۔ اس کی مستقل خاموشی پر معاذ سمجھ گیا کہ اب وہ اس سے مزید بات

کے گھر سے نکل چکی ہے چنانچہ سرد اسے لینے چلا گیا تھا اور عالم شاہ اس کی خدیجہ سمیت واپسی کے انتظار میں ٹھہل رہا تھا۔ انتظار کا یہ دورانیہ زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا اور جلد ہی سرد خدیجہ کو لے کر اس کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

خدیجہ بیس بائیس سال کی قبول صورت لڑکی تھی جو اس وقت ذرا گھبراہٹ ہوئی محسوس ہونے کے باوجود خود کو پُر اعتماد ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ عالم شاہ سے سامنا ہوتے ہی اس نے اسے ادب سے سلام کیا اور سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔

”زیادہ لمبی بات کرنا بے کار ہے۔ میں تم سے صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم مجھے بتاؤ کہ جس روز ادا معظم لطیف سومرو سے ملنے اس کی حویلی گئے تھے، وہاں کیا ہوا تھا؟ کیا کوئی ایسی بات ہوئی تھی جس کی وجہ سے دونوں فریقین کے درمیان کئی پیدا ہو گئی ہو؟“ عالم شاہ نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔

”میں سرد کے کہنے پر آپ کو سب کچھ بتانے پر تیار تو ہوں سا میں، پر چاہتی ہوں کہ کسی کو پتا نہیں چلے کہ میں نے آپ کو کچھ بتایا ہے۔ اگر کسی کو پتا چل گیا اور بات سامیں لطیف سومرو تک پہنچ گئی تو وہ میری کھال میں بھس بھر وادیں گے۔“

”تم بے فکر ہو۔ یہاں سے بات باہر نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم رازداری کا بھی خیال رکھیں گے اور تمہیں انعام بھی دیں گے۔“ عالم شاہ ایک صوفے پر پھیل کر بیٹھ گیا اور پورے کروڑوں سے اسے یقین دلایا۔

”مجھے انعام کا لالچ نہیں ہے سامیں۔ میں صرف سرد کی خاطر آپ کو سب کچھ بتانے کے لیے راضی ہوئی ہوں۔“ اس نے بڑی بے ساختگی سے جواب دیا تو عالم شاہ کی نظریں خود بخود سرد کی طرف اٹھ گئیں۔ اس کے یوں دیکھنے پر سرد ہڈیوں پر سا جھینپ گیا اور عالم شاہ کو اعزازہ ہوا کہ اس کے اور خدیجہ کے درمیان خاص تعلق خاطر ہے۔

احصاب زدہ ہونے کے باوجود اس کے ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ پھیل گئی جس پر سرد مزید جھینپا ہوا نظر آنے لگا۔ عالم شاہ نے اس پر سے اپنی نظریں ہٹا کر خدیجہ پر مرکوز کر لیں۔ عام سے سوتی لباس میں لمبوس وہ قبول صورت لڑکی سرد کے لیے ایک خاص اہمیت رکھتی ہے، یہ جان کر اسے اچھا لگا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ اب تم مجھے بتاؤ کہ جس روز ادا معظم، لطیف سومرو سے ملنے اس کی حویلی گئے تھے تو وہاں کیا ہوا تھا؟“

خدیجہ سے بات کرتے ہوئے اس کا لہجہ سنجیدہ تھا اور ہونٹوں کی مسکراہٹ ختم ہو گئی تھی۔

”سامیں معظم شاہ حویلی آئے تو میں ہی ان کی خاطر مدارات کے لیے ٹرائی سجا کر لے گئی تھی۔ انہیں کافی دیر تک انتظار میں بٹھانے کے بعد سامیں لطیف سومرو ان سے ملاقات کے لیے گئے تھے۔ ان کے ساتھ چھوٹے سامیں کھیل سومرو بھی موجود تھے۔ ٹرائی اندر پہنچانے کے بعد میں باہر آ گئی تھی اس لیے اندر کیا باتیں ہوئیں، یہ تو میں نے اپنے کانوں سے نہیں سنی لیکن بعد میں سامیں کے ایک خاص کارندے کی زبانی پتا چلا کہ سامیں نے سامیں معظم شاہ کی بات ماننے سے انکار کرتے ہوئے صاف کہہ دیا تھا کہ انہوں نے وہ زمین سامیں قربان شاہ سے قیستالی ہے اور اب وہ قانونی طور پر اس زمین کے مالک ہیں اس لیے انہیں اس زمین کی واپسی کے سلسلے میں ٹھک نہ کیا جائے۔ اس موقع پر جبکہ سامیں معظم شاہ ناکام ہو کر واپس جانے والے تھے، چھوٹے سامیں کھیل سومرو نے انہیں چرکا لگا لیا اور طعنے کرتے ہوئے بولے کہ ستا ہے زمین ماں سنان ہوئی ہے اور تمہارے باپ نے ضرورت پڑنے پر اسے ہی جع ڈالا۔ اس کا مطلب ہے کہ کبھی تم لوگوں کے پاس بیچنے کے لیے کچھ نہیں ہوگا تو تم اپنی عورتوں کو بھی جع کھتے ہو۔ اگر ایسا ہو تو سیدھے میرے پاس آ جانا۔ ستا ہے تمہاری ذال بہت خوبصورت ہے۔ میں اس کے اچھے دام دے دوں گا۔ ایسی بات سن کر ظاہر ہے کوئی بھی مرد برداشت نہیں کر سکتا۔ سامیں معظم شاہ بھی پھر گئے۔ انہوں نے چھوٹے سامیں کا گریبان پکڑ لیا اور دو چار ہاتھ بھی مارنے میں کامیاب ہو گئے لیکن فوراً ہی ہمارے ہاں کے کارندوں نے انہیں جکڑ لیا اور پھر دونوں طرف سے اسلحہ کل آیا۔ ایسے میں اگر بڑے سامیں لطیف سومرو دخل نہ دیتے تو جانے کیا ہوتا۔ انہوں نے چھوٹے سامیں کو ڈانٹا کہ انہیں ایسی بات نہیں کرنا چاہیے تھی۔ ساتھ ہی سامیں معظم شاہ کو حکم دیا کہ وہ فوراً وہاں سے چلے جائیں۔ سامیں معظم شاہ نے ان کی بات مان لی اور حویلی سے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد جیسے ہی بڑے سامیں اپنے کمرے میں گئے، چھوٹے سامیں بھی حویلی سے روانہ ہو گئے۔ بڑے سامیں کو ان کے جانے کے کافی دیر بعد پتا چلا۔ انہوں نے کچھ لوگوں کو دوڑایا کہ چھوٹے سامیں کا مظلوم کریں۔ خود بھی فون پر ان سے بات کرنے کی کوشش کرتے رہے لیکن بات نہ ہوئی اور گھنٹا بھر بعد چھوٹے

میں ہی واپس آگیا۔ یقیناً وہ خدیجہ کو حویلی کے دروازے پر ہی چھوڑ کر واپس آ گیا تھا۔
 ”شہر میں گھیل سومرو کا اتنا پتا معلوم کر دوسرہ! اس سے پہلے کہ وہ اڑ جائے، مجھے اس سے حساب کرنا ہے۔ لگتا ہے اس کی طرف ہمارا بہت لمبا چوڑا حساب کتاب نکلے والا ہے جسے بے باقی کرنا ضروری ہے اور وہ بھی جلدی۔“ سرد کے آتے ہی اس نے اسے غم دیا اور اس کا جواب سنے بغیر وہاں سے اٹھ کر باہر نکل گیا۔ جواب کی اسے ضرورت نہیں تھی کہ جانتا تھا سرد ہر حال میں اس کے حکم کی تعمیل کرے گا۔

☆☆☆

”ہیلو ڈارلنگ! کیسی ہو؟“ وہ آہستہ کے آہستہ کے سامنے کھڑی اپنی تیاری کا آخری جائزہ لے رہی تھی کہ سوباس کی گھنٹی پر اس کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ اسکرین پر سونیا خان کا نمبر جگمگا رہا تھا۔ اس نے کال ریسیو کر کے ہیلو کا لفظ کہا تھا، دوسری طرف سے سونیا نے بے تکلف انداز میں اس سے گفتگو کا آغاز کیا۔

”کول..... آپ سنا میں۔ آپ نے کیسے مجھے یاد کیا؟“ اس نے سپاٹ سے لہجے میں جواب دے کر فون کرنے کا سبب پوچھا۔

”تمہارے لیے ایک اچھا موقع کل آیا ہے۔ میری معلومات کے مطابق آج کارمان یزدانی کو مال کی ڈیلیوری لینے کے لیے کہیں بھیجا جا رہا ہے۔ یزدانی خود بتا رہا ہے اس لیے کوئی بھیج رہا ہے۔ تم نے بتایا تھا کہ کارمان تمہارے ہر شو میں شرکت کر رہا ہے اور تم سے مسلسل تنہائی میں ملاقات کا وقت مانگ رہا ہے تو آج کسی طرح اس کے ساتھ تھی ہو جاؤ بلکہ ایسا کرو کہ اسے فون کر کے آج کے شو کے لیے خصوصی دعوت دو اور ساتھ ہی اشارہ بھی دے دو کہ آج تم فری ہو۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہاری دعوت کو نظر انداز نہیں کر سکے گا اور وقت کی کمی کے باعث تمہیں اپنے ساتھ ہی لے جانے پر مجبور ہو جائے گا۔ وہ راضی ہو گیا تو آگے تم اپنے اور ہمارے لیے موقع کی مناسبت سے بہت کچھ کر سکتی ہو۔“ سونیا خان نے اپنے فون کرنے کا مقصد بتایا تو اس کی آنکھوں میں عجیب سی ہنک پیدا ہو گئی اور اپنے ساتھ لہجے میں بولی۔

”آپ فکر نہ کریں میڈم! میں سب وینل کر لوں گی۔“

”اوکے..... وٹش پو بیٹ آف لک۔“ سونیا خان

سامیں خود ہی واپس آ گئے۔ اس وقت ان کی صورت عجیب سی ہو رہی تھی۔ بڑے سامیں انہیں اپنے ساتھ کمرے میں لے گئے۔ وہاں دونوں کے بیچ کیا بات ہوئی، کسی کو نہیں معلوم۔ کمرے کا دروازہ دوبارہ کھلا تو ہم نے دیکھا کہ چھوٹے اور بڑے سامیں دونوں کا موڈ خراب تھا۔ بڑے سامیں نے ڈرائیو کو حکم دیا کہ وہ اسی وقت چھوٹے سامیں کو لے کر شہر روانہ ہو جائے۔ رونا لگی کے وقت میں نے خود دیکھا تھا کہ چھوٹے سامیں کے قدم نشے سے لڑکھڑاہے تھے اور وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہے تھے کہ وہ اپنے باپ کی طرح بزدل نہیں ہیں اور سب سے مقابلہ کر سکتے ہیں۔ چھوٹے سامیں کا نشہ میں ہونا اور انٹی سیدھی باتیں کرنا میرے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی لیکن صبح سامیں معظم شاہ کے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل ہو جانے کی اطلاع حویلی پہنچی تو میرا ہاتھ ٹھک گیا، پر میں اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کر سکتی سامیں۔ میں نے جتنا دیکھا اور سنا، وہ آپ کو سچ بتا دیا۔ آگے آپ جو چاہیں سمجھ لیں۔“

خدیجہ نے ایک سالس میں پوری داستان کہہ سنا لی تھی جسے سن کر عالم شاہ کے چہرے پر غصے کی سرخی چھا گئی تھی۔ گھیل سومرو کی بدزبانی نے اسے سب سے زیادہ پیش دلایا تھا اور وہ سمجھ گیا تھا کہ اپنے گھر کی خواتین کے بارے میں اٹنے سیدھے رہنما کس پر معظم کس کیفیت سے دوچار ہوا ہوگا۔ خود اس کا یہ حال تھا کہ معظم کے قتل کا جرم گھیل پر ثابت ہوتا یا نہیں، وہ اسے اس کی بدزبانی کے جرم میں ہی زندہ گاڑ ڈالا۔

”میں نے سب بتا دیا سامیں! اب مجھے اجازت دیں کہ میں جاؤں۔“ وہ بالکل خاموش بیٹھا ہوا تھا لیکن اس کا غصہ اس کے چہرے پر واضح تھا اس لیے خدیجہ نے بھی ہوئی آواز میں اس سے اجازت طلب کی۔

”جاؤ لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ کیا اس دن کے بعد سے گھیل سومرو دوبارہ گاؤں واپس آیا ہے؟“

”نہیں سامیں! وہ نہیں آئے۔ میں نے سنا تھا کہ بڑے سامیں ان پر ملک سے باہر جانے کے لیے زور ڈال رہے ہیں۔ شاید وہ چلے جائیں۔“ خدیجہ نے جواب دیا اور ایک بار پھر اس کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھنے لگی۔

”جاؤ سرد، اسے چھوڑ کر واپس آؤ۔“ اس بار عالم شاہ، خدیجہ کے بھائے براہ راست سرد سے مخاطب ہوا۔ سرد نے خاموشی سے اس کے حکم کی تعمیل کی اور چند منٹوں

نے کہہ کر فون بند کر دیا تو اس نے فوراً اپنے موبائل میں فیڈ کامران یزدانی کا نمبر نکال کر ڈائل کیا۔ دوسری کھنٹی پر ہی کال ریسیو کر لی گئی۔

”مائی لک، مس ہاربی نے مجھے یاد کیا ہے۔“ دوسری طرف سے کامران کی چپکٹی ہوئی آواز سنائی دی۔

”میں نے کنفرم کرنے کے لیے کال کی تھی کہ آپ آج آرہے ہیں یا نہیں۔ آج آپ کے لیے ایک سرپرائز ہے۔“

”میں آ رہا ہوں۔ آئے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔ تم نے مجھے اپنا دیوانہ جو بنالیا ہے۔“ اپنی بات پر وہ خود ہی ہنسا، پھر بولا۔ ”سرپرائز والی بات کر کے تم نے میرا شوق حریہ بھڑکا دیا ہے۔ اب تو میں از کر تم تک پہنچوں گا۔“

”از کر ہی آئے۔ شو شروع ہونے میں زیادہ وقت نہیں رہ گیا ہے۔ شو سے پہلے تو ملاقات کا موقع مل نہیں سکتا لیکن شو کے بعد آپ ضرور مجھ سے ملے گا۔ بھولیں گے تو نہیں نا؟“ اس نے لوچ دار آواز میں ہنستے ہوئے آخر میں ایسے ناز سے پوچھا کہ کامران یزدانی پھڑک اٹھا اور عاشقانہ لہجے میں بولا۔

”تم سے ملنا کون بھول سکتا ہے، مائی ہاربی ڈول! تم تو وہ ہو جو بندے کو اس کا اپنا آپ بھلا دو لیکن بندہ تمہیں نہ بھول سکے۔“ جواب میں اس نے کھٹکنا ہوا قبضہ لگایا اور بولی۔

”آپ کا شدت سے انتظار رہے گا۔“ ساتھ ہی رابطہ منقطع کر دیا۔ اسے معلوم تھا کہ کامران کے لیے اتنا ہی بہت ہے۔ وہ اس کی اتنی لگاؤ کے مظاہرے پر ہی ایسا دوڑا ہوا آئے گا جیسے کہیاں شیرے پر لپکتی ہیں۔ فون بند کرنے کے بعد وہ کامران یزدانی سے ملاقات کی تیاری کرنے لگی اور الماری کھول کر اس کی ایک خفیہ دراز میں رکھی شیشے کی چھوٹی سی ٹیوب نکالی۔ اس ٹیوب میں موجود نمی شے ایسا خطرناک ہتھیار ثابت ہو سکتی تھی کہ وہ بغیر کسی اسلئے کو استعمال کیے کامران یزدانی کو زیر کر سکتی تھی۔ ٹیوب کو اپنے خوبصورت سے گج میں رکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں ایک فکاری کی سی چمک تھی۔ ابھی وہ اس کام سے فارغ ہوئی ہی تھی کہ اعتر کامران بچ اٹھا۔ دوسری طرف حسب توقع انتظامیہ کا آدمی تھا جو اسے اطلاع دے رہا تھا کہ شو کا وقت ہو چکا ہے اور اسے لینے کے لیے دو سکیورٹی گارڈز اس کے سوئٹ کے دروازے پر پہنچ چکے ہیں۔ اعتر کامران ریسیور رکھ کر اس نے آئینے پر ایک آخری نظر ڈالی اور اپنی

تیاری سے مکمل طور پر مطمئن ہو کر دروازے کی طرف بڑھی۔

یو نیٹارم میں ملیوس گارڈز حسب اطلاع اس کے منتظر تھے۔ وہ ایک شان بے نیازی سے ان کے جلو میں آگے بڑھنے لگی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اس ہوٹل کی انتظامیہ کی ناک کا بال بنی ہوئی ہے کیونکہ اس کی وجہ سے وہ بے تحاشا کمار ہے تھے۔ وہ جس شو میں پر قارم کرتی تھی وہ کوئی عام شو نہیں ہوتا تھا جہاں ہر ایرافیر امن اٹھا کر چلا آئے۔ ایروں غیروں کو تو اس شو کی اطلاع بھی نہیں تھی اور صرف ہائی کلاس کے لوگوں کو بہت مہنگے ٹکٹ کے عوض وہاں مدعو کیا جاتا تھا۔ اس کی اطلاع کے مطابق اس شو میں مقامی

پر قارمر کو بہت کم موقع دیا جاتا تھا۔ کتنی کی چند ایک نامی گرامی ہیروئنیں جو فلم انڈسٹری کے ڈوبنے کے بعد گھروں میں بے کار بیٹھی تھیں اور کمانے کے لیے ایسے مواقعوں کی مستاشی رہتی تھیں، اس شو تک رسائی حاصل کر سکی تھیں ورنہ زیادہ تر غیر ملکی فنکاروں ہی سے کام لیا جاتا تھا۔ اس کا تعارف بھی غیر ملکی فنکارہ کے طور پر ہی کروایا گیا تھا اور اس کے بارے میں یہ گپ بازی کی گئی تھی کہ فی الحال وہ جمیز کی دنیا سے وابستہ ہے لیکن ہالی وڈ کی ایک فلم سائن کر چکی ہے جس کی شوٹنگ جلد شروع ہونے والی ہے۔ لوگوں کو اس گپ پر یقین تھا یا نہیں لیکن وہ اس کے حسن اور پر قارمنس کی کشش میں وہاں کھینچے چلے آتے تھے۔ آج بھی وہ اس سچ پر پہنچی تو اس کے مداحوں کی ایک بڑی تعداد وہاں موجود تھی۔ ان میں سے کچھ نئے چہرے تھے جبکہ کئی ایسے تھے جو کئی بار اس کے شو میں شرکت کر چکے تھے۔ پھر بھی ہر نئے شو میں دوبارہ کھینچے چلے آتے تھے۔ کامران یزدانی عرف کامی بھی اس کے ایسے ہی متوالوں میں شامل تھا۔ اس نے حسب معمول دیوانوں کو حریہ دیوانہ بنا ڈالنے والی پر قارمنس کا مظاہرہ کیا اور جب وہ بے قابو ہونے لگے تو اس سچ سے غائب ہو گئی۔ اسے معلوم تھا کہ ان دولت مندوں کے ہوش اڑانے میں اس کے حسن اور پر قارمنس کے علاوہ کچھ حصہ اس شراب کا بھی تھا جو ہوٹل کا اپنا خصوصی برانڈ تھی اور جسے لوگ بہت شوق سے نوش کرتے تھے۔ اپنے کمرے کی طرف جاتے جاتے اس نے سکیورٹی کو آگاہ کر دیا تھا کہ کامران یزدانی اس سے ملنے کے لیے آئے تو اسے روکنا نہ جائے۔ ایسا ہی ہوا اور اس کے چند منٹ بعد ہی کامران بھی اس کے کمرے میں پہنچ گیا۔

”میرے پاس نام کم تھا لیکن تمہارے سرپرائز نے

سسپنس ڈائجسٹ 92 نومبر 2020ء

مہربانی فرما کر بلیشرز کی حوصلہ کے لیے خرید کر پڑھیے۔

مجھے یہاں سے جانے نہیں دیا۔" اس کے سوی ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر مصافحہ کرتے ہوئے وہ فدیہ دینا نہ لہجے میں بولا۔

مصافحہ کرنے کے بعد بھی اس نے اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا اور مسلسل اپنے ہاتھ سے دہاتا گیا اس کے ہاتھ کے گداز سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس نے کامی کی یہ حرکت نظر انداز کر دی اور ہونٹوں پر قاتلانہ مسکراہٹ سمجھاتے ہوئے بولی۔

"میرے سر پر اثر سے پہلے ہی آپ نے وقت کی کمی کی بری خبر سنادی ورنہ سر پر اثر تو یہی تھا کہ آج میرے پاس آپ کے لیے وقت ہی وقت تھا اور میں اپنی پوری رات بھی آپ کے نام کر سکتی تھی۔"

"رنی....." اس کی بات سن کر کامران کے منہ سے رال نکلنے لگی۔

"میں آپ سے مذاق نہیں کر رہی ہوں۔ مجھے خود افسوس تھا کہ ایک پُرکشش اور وینڈم لوجوان مسلسل مجھ سے وقت مانگ رہا ہے لیکن میں اسے مایوس کیے جا رہی ہوں اسی لیے آج جب ڈھنگ سے فرصت ملی تو آپ سے رابطہ کر لیا۔" وہ بڑے ناز سے اور لوج دار آواز میں اس سے مخاطب تھی۔

"یہ میری بیڈلک ہے کہ مجھے آج ایک اہم بزنس ڈیل کے لیے شہر سے باہر جانا ہے۔" کامران واقعی شدید مایوسی کا شکار نظر آ رہا تھا۔

"آج کے بعد میرا آپ کو ٹائم دینا مشکل ہوگا۔ جلد میں پاکستان سے واپس جانے والی ہوں۔ میرے پروڈیوسر کی کال آئی تھی۔ وہ میرے یہاں رہنے سے خوش نہیں ہے۔ دمکلی دے رہا تھا کہ اگر میں فوراً واپس نہیں آئی تو وہ قسم سے میرا نام ڈراپ کر دے گا۔ میں اتنا بڑا رسک نہیں لے سکتی اس لیے میں نے واپسی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ویسے بھی کچھ عرصے بعد شوٹنگ کے لیے مجھے واپس جانا ہی تھا۔" اس نے بھی اپنے چہرے پر افسردہ تاثرات سما لیے۔

"اوہ لو..... اتنی جلدی تم کیسے واپس جاسکتی ہو۔"

کامران کو اس کی اطلاع سے جھٹکا لگا۔

"میں نے کہا تھا کہ مجھے ہر حال میں جانا ہے۔ تم آج کے لیے کچھ رینج کر سکتے ہو تو کر لو۔ میں تمہارے لیے اتنا کر سکتی ہوں کہ اگر تم جاؤ تو تمہارے ساتھ چل لوں۔ تم اپنی بزنس ڈیل بھی دیکھ لینا، ساتھ ہم تفریح بھی کر لیں

تنبیہ

تین بچیوں اور دو بچوں کی بیوہ ماں چوتھی شادی کر رہی تھی۔ عین نکاح کے وقت بچے زور زور سے رونے لگے تو ماں نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "چپ ہو جاؤ..... ورنہ آئندہ تمہیں ساتھ نہیں لاؤں گی۔"

قابل دید

ایک صاحب نے مصور سے پوچھا۔ "آپ میری بیوی کی ہو یا کسی تصویر بنادیں گے جس میں وہ اصل نظر آتی ہو؟"

"ہرے جناب! آپ فکر ہی نہ کریں۔" مصور نے انہیں تسلی دی۔ "میں ان کی جو پورٹریٹ بناؤں گا، وہ اصل سے اتنی قریب ہوگی کہ جب بھی آپ کی نظر اس پر پڑے گی، آپ ڈر کے مارے اچھل پڑیں گے۔"

مرسلہ: محمد انور عظیم، اداکارہ

گے۔" اس نے بہت چالاکی سے کامران کے آگے چارہ ڈالا۔

"یہ تو بڑی زبردست آفر ہے لیکن سوچ لو کہ میں ابھی کچھ دیر میں ہی نکلتا ہے اور سفر بھی تھوڑا طویل ہے، کہیں بعد میں تم شکایت نہ کرنا۔" اس کی پیشکش پر کامران کی باجھیں کھل گئیں۔

"نو پرا بلم۔ مجھے لاٹک ڈرائیو پسند ہے، بس گاڑی آرام دہ ہونا چاہیے تاکہ ہم سفر کو انجمائے کر سکیں۔" اس نے ایک ادا سے سر کو جھٹکتے ہوئے جواب دیا تو کامران خوش ہو گیا اور باجھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔

"گاڑی کی فکر نہ کرو۔ گاڑی اتنی زبردست ہے کہ پاکستان میں گنتی کے چند لوگ ہی ایسی گاڑی استعمال کرتے ہیں۔"

"بس تو پھر ٹھیک ہے۔ میں تمہارے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوں۔ بس ہوٹل مینجمنٹ کو اپنی روادگی کی اطلاع دے دوں۔" اس نے کہا اور اپنا موبائل نکال کر سونیا کا نمبر ڈائل کیا۔

"میں کامران بزدلی کے ساتھ باہر جا رہی ہوں۔ واپسی شاید کل تک ہو۔" کال ریسو ہوتے ہی اس نے یہ اطلاع دی اور رابطہ منقطع کر دیا۔ ہوٹل انتظامیہ کو وہ ایسی

موجود ہیں۔ جیسے ہی ہماری طرف سے اشارہ ملے گا وہ ایکشن میں آجائیں گے۔" حسب عادت سرد نے اسے مؤدبانہ لہجے میں جواب دیا۔ یہ وہی تھا جس نے عالم شاہ کے حکم پر نہ صرف گھیل سومرو کا گھر ڈھونڈ نکالا تھا بلکہ گھر کی سیکورٹی کے بارے میں بھی ساری معلومات حاصل کر لی تھیں۔ اس کے بندے مسلسل گھیل سومرو کے گھر کی گمرانی کر رہے تھے اور اب رات گئے وہ لوگ گھیل سومرو کی گھر میں موجودگی کے یقین کے ساتھ اس سے دودھ ہاتھ کرنے جا رہے تھے۔ مزید چند منٹ کی ڈرائیو کے بعد وہ اس کے گھر تک پہنچ گئے۔ یہ بہت بڑا اور عالی شان گھر تھا۔ گاڑی میں بھی سومرو خاندان بہت بڑے حویلی نما گھر میں رہتا تھا۔ حالانکہ چند سال قبل لطیف سومرو اتنا بڑا زمیندار نہیں تھا۔ گزشتہ چند سالوں میں ہی اس نے سازشوں اور چالوں کی مدد سے اپنی زمینوں میں اضافہ کیا تھا، پھر بھی وہ اتنا بڑا زمیندار نہیں تھا جتنا اس کے پاس روپیہ نظر آنے لگا تھا۔ اس کی رہائش گاہیں، زیر استعمال گاڑیاں اور انتہائی ہم میں فیاضی سب کچھ اس کی حیثیت سے بڑھ کر ہی نظر آتے تھے اور یہ ایک نہ سمجھ آنے والی بات تھی۔

"ہمارے آدمی لائن کلیر کر کے اندر آنے کا اشارہ دیں گے۔" سرد گاڑی گھر کے سامنے روکے بغیر آگے نکال کر لیتا چلا گیا اور اسے وجہ سے آگاہ کیا۔ وہ لوگ گھروں کی قطار سے تھوڑا آگے نکل گئے تو اس نے گاڑی روک لی۔

"یہاں سے ہم پیدل گھیل سومرو کے گھر تک جائیں گے۔ ہماری گاڑی کا اس کے گھر کے قریب موجود ہونا بعد میں ہمارے لیے پریشانی کا باعث بن سکتا ہے۔" گاڑی روک کر باہر نکلتے ہوئے سرد نے اسے اپنے آگے لائحہ عمل سے آگاہ کیا تو وہ سر کو کھینچی جنبش دے کر خود بھی باہر آگیا۔

"میری مائیں سائیں تو آپ اس معاملے سے الگ رہیں۔ میں اور میرے ساتھی مل کر گھیل سومرو کو دیکھ لیں گے۔" گاڑی لاک کرتے ہوئے سرد نے مؤدبانہ لہجے میں ایک بار پھر اس سے وہی درخواست کی جو وہ پہلے بھی کر چکا تھا۔

"نہیں سرد! یہ میری جنگ ہے۔ میں اس معاملے کو دوسروں پر چھوڑ کر خود الگ نہیں ہو سکتا۔ میں گھیل سومرو کی جان نکالنے سے پہلے اس کے حلق سے سارے سچ اگواٹا چاہتا ہوں۔" عالم شاہ نے بھی حسب سابق اس کی بات

کوئی اطلاع دینے کی پابند نہیں تھی۔ اسے صرف شو کے وقت وہاں موجود ہونا ہوتا تھا۔ انتظامیہ بھی اسے صرف ہوٹل کے اندر سیکورٹی دینے کی پابند تھی، باہر یہ ڈسے داری سونپنا نے اٹھارہ گئی تھی اس لیے اس نے اسے اطلاع دی تھی۔ اطلاع دینے کے بعد اس نے موبائل کو بھی اپنے کچھ میں رکھا اور کامران کو ایک منٹ رکھنے کا کہہ کر سوئٹ کے دوسرے حصے میں چلی گئی۔ واپس آئی تو اس نے ایک لمبا گاڈن پکین رکھا تھا اور سر پر ایک جالی دار ہیٹ تھا۔ جالی اس نے اپنے چہرے پر گرالی اور ہولی۔

"لوگوں کی نظروں سے بچنے کے لیے یہ انتظام ضروری تھا۔" کامران نے اس کی بات سن کر کھینچی انداز میں سر ہلایا اور پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔ چلتے ہوئے اس کی چال میں بھی سی ٹنگز ایٹ محسوس ہوتی تھی۔ یہ ٹنگز ایٹ اس گولی کا نتیجہ تھی جو یزدانی ہاؤسنگ اسکیم کے قریب بشری کو اس سے محفوظ رکھنے کے لیے معاذ نے اس پر چلائی تھی۔ اچھے علاج معالجے کے باعث اس کی ٹانگ ٹھیک تو ہو گئی تھی لیکن چال میں بہت معمولی سی ٹنگز ایٹ باقی تھی۔ باربی نے اس کی چال کی یہ معمولی سی ٹنگز ایٹ بھی محسوس کر لی تھی اور جانے کیا کچھ یاد آنے کے باعث اس کے ماتھے پر ایک ٹل سا پڑ گیا تھا۔ کامران یزدانی اس ٹل سے بے خبر اس خوشی میں گن تھا کہ باربی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا اور آگے وہ اس کے پورے وجود پر تصرف حاصل کرنے جا رہا تھا۔ باربی کے روپ میں اس کے اتنے قریب کون تھا، وہ قطعی نہیں پہچان سکا تھا کہ ایک تو وہ مکمل بدلے ہوئے روپ میں تھی، دوسرے اس کا تعارف ایک غیر ملکی رقاصہ کا تھا جو صرف انگریزی زبان بولتی تھی۔ ایسے میں کامران کا ذہن اس کے اصل کی طرف جاتا تو کیسے؟ لیکن وہ اپنے اصل کو نہیں بھول سکتی تھی کہ اس نے بہت کرب اور اذیت سہہ کر اپنے اصل کو چھوڑا تھا اور وہ بین گئی تھی جس کا اس نے بھی سوچا تک نہیں تھا۔

☆☆☆

"سب ٹھیک ہے؟ گھیل سومرو کی اندر موجودگی کنفرم ہے؟" سرد نے کسی سے بات کر کے اپنا موبائل بند کیا تو گاڑی کی پچھلی نشست پر موجود عالم شاہ نے اس سے دریافت کیا۔

"جی سائیں! میں نے کنفرم کر لیا ہے۔ ہمارے پیسے اس وقت گھیل سومرو کے گھر کے آس پاس ہی

ہاتھ مارتے پر رکھا۔ عالم شاہ نے اسے اشارہ کیا کہ وہ روشن دان سے ہٹ جائے۔ اس کا مقصد سمجھتے ہوئے وہ آدمی پیچھے ہٹ گیا تو عالم شاہ روشن دان سے اندر بھاگنے لگا۔ اندر کا منظر وہی تھا جس کے بارے میں کل اسے بتا چکا تھا۔ بس واحد فرق یہ آیا تھا کہ گھٹیل سومرو بیٹہ کرپنے کے بجائے بستر پر نیم دراز لیٹ کر لی رہا تھا اور اس کا اساترٹ فون اس کی ابھری ہوئی توند پر دھرا تھا۔ دیکھنے دکھانے کے معاملے میں وہ بالکل اپنے باپ کی کاپی تھا۔ وہی گہری سیاہ رنگت، ٹھٹھا قد اور بے ڈھب و بے ڈول جسم جو شب خوابی کے لباس میں کچھ اور بھی نمایاں ہو رہا تھا۔ اس شخص کو اتنے اطمینان سے لیٹ کر میٹھ کرتے ہوئے دیکھ کر عالم شاہ کے پورے وجود میں طیش کی لہر اٹھی اور دل چاہا کہ اس کی گتے کے ابھی اس شخص پر اپنا پورا باطل خالی کر دے لیکن مصلحت نے روک لیا۔ گھٹیل سومرو پر شک کتنا ہی مضبوط سی، اس کا فیصلہ کرنے سے پہلے اس سے اس کا جرم قبول کرنا ضروری تھا۔ وہ سرمد کو گھٹیل سومرو کے کمرے میں داخل ہونے کے سلسلے میں گرین سٹل دینے کے لیے پلٹنے ہی لگا تھا کہ موبائل فون کی دھیمی سی گھنٹی سن کر رک گیا۔ گھٹیل سومرو کی توند پر دھرا اس کا موبائل یقیناً بہت بلند آواز میں بج رہا تھا جو ٹی وی کے شور میں بھی اس کی آواز عالم شاہ کے کانوں تک پہنچ گئی تھی۔ اس کال کے دوران کوئی کارروائی کرنا مناسب نہیں تھا چنانچہ وہ اپنی جگہ پر رک گیا اور محض جس کے تحت کان لگا دیے کہ رات کے اس پہر اسے کون کال کر رہا ہے۔ گھٹیل سومرو نے موبائل اٹھا کر پہلے اسکرین پر کال کرنے والے کا نام دیکھا، پھر منہ بنا کر ٹی وی کا دایوم بند کرتے ہوئے کال ریسیو کی۔

”ہیلو ڈیڈ! اتنی رات کو بھی آپ نے میرا چیخا نہیں چھوڑا۔“ اس کے لہجے میں شراب کی وجہ سے پیدا ہونے والی ہلکی سی لڑکھٹاہٹ کے علاوہ بیزاری بھی موجود تھی۔ دوسری طرف سے لطیف سومرو نے شاید اس کے الفاظ پر غصے کا اظہار کیا جو وہ مزید بیزاری سے بولا۔

”میں نے دن بھر اس لیے آپ کی کال ریسیو نہیں کی کہ میں جانتا تھا آپ مجھ سے کیا بات کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کی ایک ہی ڈیمانڈ سن کر تھک چکا ہوں میں۔ جب میں آپ سے کہہ چکا ہوں کہ میرے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے تو آپ کیوں مجھے ملک سے باہر بھیجنے کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ یہاں میرے بہت سے کام ہیں، انہیں چھوڑ کر میں کہیں نہیں جانا چاہتا۔“

نومبر 2020ء

ماننے سے انکار کر دیا تو سرمد کو بالآخر بات ماننا پڑی اور جیسے ہی اس کے موبائل پر لائن کلیئر ہونے کا اشارہ ملا، وہ دونوں پیدل گھٹیل سومرو کے گھر کی... طرف چل پڑے۔ پوش علاقوں میں یوں بھی لوگوں کی زیادہ چہل پہل نظر نہیں آتی اور یہ تو تھا بھی آدمی رات کے بعد کا وقت اس لیے راستے میں ان کا کسی سے سامنا نہیں ہوا۔

”اس علاقے میں رات بھر دو واج میں یا سکیورٹی گارڈ جو رات بھر گردش کرتے رہتے ہیں، ہمارے ساتھیوں نے سب سے پہلے انہیں ہی خاموش کیا ہے۔ چار پانچ گھنٹوں سے پہلے انہیں ہوش نہیں آئے گا۔ ان آدمیوں کی اتنی زیادہ اہمیت بھی نہیں ہے کیونکہ یہاں کے ہر کیمین نے اپنے ذاتی سکیورٹی گارڈز رکھے ہوئے ہیں، اور وہ ان ہی پر زیادہ انحصار کرتے ہیں۔“ سرمد نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے اسے دھیمی آواز میں آگاہ کیا۔ تین چار منٹ کے بعد ہی وہ دوبارہ اس عالی شان مکان کے سامنے پہنچ گئے جس پر نمایاں طور پر نہایت خوب صورتی سے سومرو ہاؤس لکھا ہوا تھا۔ مکان کی بیرونی روشنیاں جل رہی تھیں اس لیے سارا منظر بالکل نمایاں تھا۔ انہوں نے چند قدم کے فاصلے سے ہی دیکھ لیا تھا کہ مکان کا ڈیلی گیٹ نیم وا ہے۔ ان کے قریب پہنچتے ہی گیٹ پورا کھل گیا اور عالم شاہ کو اپنے کل نائی کارندے کی شکل دکھائی دی۔ وہ سرمد کی معیت میں اندر داخل ہوا تو کچل نے گیٹ بند کر دیا۔

”کیا رپورٹ ہے؟“ سرمد نے اس سے دریافت کیا۔

”دو گارڈز اور دو ملازم تھے۔ چاروں پر نہایت خاموشی سے قابو پا کر بے بس کر دیا گیا ہے۔ چاروں ایک کمرے میں بندھے پڑے ہیں۔“

”وہ اپنے کمرے میں ہی ہے اور وہاں بیٹھا پینے پلانے میں مصروف ہے۔ ٹی وی پر کوئی بے ہودہ سی انگریزی فلم بھی تیز آواز میں لگا رکھی ہے اس لیے ہر طرف سے بے خبر ہے۔ میں نے ایک آدمی اوپر اس کے کمرے کے روشن دان پر بٹھا دیا ہے جو اس پر پوری نظر رکھے ہوئے ہے۔“ کچل نے مکمل رپورٹ دی۔

”میں بھی پہلے اوپر جا کر اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔“ عالم شاہ نے خواہش ظاہر کی تو کچل اپنی راہنمائی میں انہیں چھت پر جانے والے زینے کی طرف لے گیا۔ اوپر ڈیوٹی دینے والے بندے نے عالم شاہ کو دیکھ کر میکانیکی انداز میں

”آپ مجھے ایک الحق بچہ سمجھنا کب چھوڑیں گے آخر.....“ اس کے جواب پر لطیف سومرو نے یقیناً اسے مزید کچھ اور کہا تھا جو اس نے جھنجھلاہٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی آواز کو مزید بلند کر دیا اور اس ٹون کو برقرار رکھتے ہوئے مزید بولا۔

”میں آپ پر ثابت کر چکا ہوں کہ میں آپ سے بہتر پلاننگ کر سکتا ہوں۔ میری وجہ سے قربان شاہ کی کروڑوں کی زمین آپ کے ہاتھ لگی ہے۔ یہ میں تھا جس نے ہر حربہ آزما کر آپ کو ایکشن میں کامیاب کر دیا پھر بھی آپ اپنے آگے مجھے کچھ نہیں سمجھتے۔ حالانکہ آپ کو مجھ پر بھروسہ کرنا چاہیے اور اس بات کو سمجھنا چاہیے کہ جب میں کہہ رہا ہوں کہ سرے لے لے یہاں کوئی خطرہ نہیں ہے تو اس کا مطلب ہے میں بالکل محفوظ ہوں اور مجھے ملک سے بھاگنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

”اگر میں کوئی غلطی کر رہا ہوں تو کرنے دیں۔ نتیجہ بھی میں ہی سمجھوں گا۔“ اپنی بات کہنے کے بعد اس نے ایک منٹ تک لطیف سومرو کی بات سنی، پھر نہایت بدھیزی سے کہتے ہوئے سلسلہ منقطع کر کے سو بائیں بستر پر ہی ایک طرف اچھال کر دوبارہ سے ٹی وی کی آواز تیز کر لی۔ عالم شاہ، جس کا چہرہ اس گفتگو کو سن کر مزید تن گیا تھا، روشن دان سے پیچھے ہٹا اور جو آدی پہلے وہاں گن لے موجود تھا، اسے دوبارہ اپنی جگہ سنبھالنے کا اشارہ کر کے سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ سرد اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ عالم شاہ نے سیدھا گھٹیل سومرو کی خواب گاہ کا رخ کیا اور ہاتھ سے دباؤ ڈال کر دروازے کا ہینڈل نیچے کرنے کے بعد ٹانگ کی ایک زوردار ضرب سے دروازہ کھولا۔ گھٹیل سومرو کو اپنی راجدھانی میں کسی کی آمد کا اندیشہ نہیں ہوگا اس لیے وہ دروازے کو اندر سے لاک کیے بغیر ہی وہاں موجود تھا۔ دروازہ اس انداز سے کھلا تو اسے نشے میں ہونے کے باوجود خطرے کا احساس ہو گیا اور اس نے ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے تجھے کے نیچے سے اپنا ہینڈل نکالنا چاہا لیکن اتنے سے وقفے میں ہی سرد اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے اپنی گن گھٹیل سومرو کے سر پر رکھی اور فرمایا۔

”بالکل سیدھا بیٹہ جا در نہ کھوپڑی اڑاؤں گا۔“ گھٹیل سومرو اپنی جگہ ساکت ہو گیا اور خوف زدہ نظروں سے عالم شاہ کو دیکھنے لگا۔ وہ جوابی کچھ دیر پہلے باپ کے ساتھ اکر رہا تھا، اس قدر ہراساں ہو چکا تھا کہ اس کا سارا نشہ ہرن ہو گیا تھا۔

”ایسے کیا دیکھ رہا ہے، سو رکی اولاد! میں تیری موت ہوں۔ تیرا باپ تجھے مجھ سے ہی ڈرارہا تھا۔ تو باپ کی بات مان لیتا تو شاید کچھ دن اور جی لیتا لیکن تو خود کو زیادہ ہی مشکل مند سمجھ رہا تھا۔ اب بھگت اپنی کرنی کا نتیجہ۔“ عالم شاہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے نفرت آمیز لہجے میں کہا اور ایک زوردار مٹکا اس کے منہ پر دے مارا۔ کئے کی شدت انہی تھی کہ گھٹیل سومرو کے سامنے کے دو دانت ٹوٹ گئے اور منہ سے بھل بھل خون بہنے لگا۔ اگر سرد اس کے بال منہی میں نہ جکڑ لیتا تو وہ مٹکا کھا کر بستر پر پیچھے الٹ جاتا۔ اب بھی اس کے منہ سے بھیا بک جی نکلی اور پھر وہ چیخا چلا گیا۔ سرد نے تجھے کا غلاف کھینچ کر اتارا اور اس کے منہ میں ٹھونس دیا۔

”چپخنے چلانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا گھٹیل سومرو! تیرے گارڈز اور ملازم بے ہوش پڑے ہیں اور اس گھر سے آواز باہر نکل کر کسی دوسرے گھر تک جانا بہت مشکل ہے۔“ عالم شاہ نے مسخراڑانے والے انداز میں اسے اس کی پوزیشن کا احساس دلایا اور سرد کو اشارہ کیا۔ اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے سرد نے گھٹیل سومرو کے ہاتھ پیر ہاندھ ڈالے اور اس کے منہ میں ٹھنسا تجھے کا غلاف باہر نکالا۔ غلاف پر بھی خون کے دھبے لگ گئے تھے لیکن اب اس کے منہ سے خون نکل کر بہنا بند ہو گیا تھا۔

”کیا چاہتے ہو تم اور یہ سب کیوں کر رہے ہو؟“ وہ سمجھ رہا تھا کہ اگر کام نہیں چل سکتا اس لیے کسی صورت بنا کر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”میرے بیٹوں کو گل کر کے پوچھتا ہے کہ میں تیرے ساتھ یہ سب کیوں کر رہا ہوں؟ میں تو تیرے جسم کا ریشہ ریشہ بھی الگ کر دوں تو تیرے جرم کا حساب پورا نہ ہو۔“ عالم شاہ نے نفرت سے اس کے منہ پر تھوکا۔

”تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ تمہارے بیٹوں کی موت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔“ وہ فوراً انجان اور محسوس بن گیا۔

”تیرا ہاتھ نہیں تو تیرا باپ کیوں تجھے ملک سے باہر بھگانے پر مٹھا ہوا ہے۔ باپ کے آگے تو تو بڑی شیڈیاں مار رہا تھا۔ اب تمہ میں اتنا بھی دم نہیں کہ اپنا جرم قبول کر لے۔ اب اس بات سے بھی انکار کر دے کہ تو نے ماما سامی کی زمین ہتھیانے کے لیے ادا مہم اور میری بہن کو اغوا کر دیا تھا اور یہ تو تھا جس نے دھاندلی کے ذریعے میرے بابا کو ایکشن میں شکست دی تھی۔“ عالم شاہ اس کے جیزے پر ایک اور مٹکا سیدھ کرتے ہوئے بولا لیکن اس کے

پیار کی حقیقت

ایک لڑکی ایک بزرگ کے پاس گئی اور پوچھا۔ "پیار کی حقیقت کیا ہے؟" بزرگ نے کہا۔ "بائچ میں جاؤ اور جو پھول سب سے خوبصورت ہو، لے آؤ۔" لڑکی ایک دن بعد واپس آئی اور کہا۔ "میں پھول دیکھتی رہی۔ ایک پھول سب سے خوبصورت تھا مگر میں اس سے بہتر کی تلاش میں چل پڑی مگر کوئی اور پیارا نہ لگا۔ جب لوٹ کر آئی تو دیکھا کہ اسے کوئی اور توڑ چکا تھا۔"

بزرگ نے کہا۔ "یہی پیار کی حقیقت ہے۔ جو سامنے ہو اس کی قدر نہیں کی جاتی اور جب واپس لوٹو تو وہ بھی ہاتھ نہیں آتا۔"

☆☆☆

آہستہ آہستہ

ایک نوجوان اپنے والد کے ساتھ کار میں کہیں جا رہا تھا۔ والد ڈرائیو کر رہے تھے اس لیے کار بالکل آہستہ چل رہی تھی۔ والد اپنے بیٹے کو آج کل کے نوجوانوں کی خاموشیوں اور بے پرواہیوں سے آگاہ کر رہے تھے کہ وہ کس قدر تیز رفتاری سے موٹر سائیکل اور کار میں چلاتے ہیں۔ اتنے میں اچانک ایک بچہ سائیکل چلاتے ہوئے کار کے سامنے آ گیا۔ کار چونکہ آہستہ، کم رفتار تھی اس لیے والد نے آسانی سے بریک لگا دیے اور بچہ کار کی زد میں آنے سے بچ گیا۔

والد نے اپنی نصیحتوں کے ثبوت میں بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "دیکھا تم نے؟ سب تو میں کار چلا رہا تھا اور وہ آہستہ تھی لہذا حادثہ نہیں ہوا۔ اگر میری جگہ تم کار چلا رہے ہوتے تو یقیناً بچے کو روندتے ہوئے گزر جاتے۔"

"ڈیڈی! اگر میں گاڑی چلا رہا ہوتا تو ایک گھنٹا پہلے اس جگہ سے گزر چکا ہوتا۔" بیٹے نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

مرسلہ: محمد انور عظیم، حوالی لکھا، اداکارہ

کی شدت پہلے کے سے تھوڑی کم تھی اس لیے گھیل سومرد کا جڑا سلامت رہا البتہ چہرے پر ایک رنگ سا دوڑ گیا۔ وہ چہرہ ایک ایسے مجرم کا چہرہ تھا جو جانتا تھا کہ سامنے والے پر اس کا ہر جرم مکمل چکا ہے اور وہ لاکھ لاکھ انکار کرے اس کی بات پر یقین نہیں کیا جائے گا۔

"جیسے اور تیرے باپ کو ماما سامیں کی زمین اور بابا سامیں کی سیٹ چاہیے تھی نا اور اس لیے تم لوگ ہر حد سے گزر گئے۔ بتا کیسے کیا تو نے یہ سب اور کون کون تیرے ساتھ اس جرم میں شامل تھا؟" عالم شاہ نے قہر بار لہجے میں اس سے دریافت کیا اور جواب کا انتظار کیے بغیر اس پر ہل پڑا۔ وہ مضبوط ہاتھ پیروں کا مالک تھا اور شوق ہی شوق میں لڑائی جھڑائی کا فن سیکھنے کے ساتھ ساتھ بدرد پھلون کے اکھاڑے پر بھی مشقیں کرتا رہا تھا اس لیے اس کی ہر ضرب نپٹی تھی اور قوت سے بھر پور تھی۔ چند منٹوں میں ہی اس نے خالی ہاتھ سے گھیل سومرد کا بھر کس نکال کر رکھ دیا۔ سرد نے پہلے سے ہی تیز آواز میں چلنے کی وی کا دایوم مزید تیز کر دیا تھا اس لیے گھیل سومرد کے حلق سے نکلنے والی چیخیں نیوی کی آوازوں میں مدغم ہوتی رہیں۔ یہ حقیقت اپنی جگہ بھی کہ ان بڑے بڑے گھروں سے کسی آواز کا باہر جانا اور اس کے بعد کسی دوسرے گھر تک پہنچنا ایک مشکل امر تھا۔ اوپر موجود آدمی نے سرد کا اشارہ پا کر روشن دان کا شیشہ تک بند کر دیا تھا اس لیے آواز کے اخراج کا راستہ بھی بند ہو گیا تھا اور گھیل سومرد مکمل طور پر عالم شاہ کے رحم و کرم پر تھا۔ عالم شاہ اسے غصے اور جنون کی حالت میں ضرور مار رہا تھا لیکن اس کی مہارت اس کی حرکات پر حاوی تھی اور وہ گھیل سومرد کو مخصوص پوائنٹس پر ایسی چوٹیں لگا رہا تھا کہ وہ تڑپے تو ضرور لیکن جان سے نہ جائے۔

بیش و عشرت میں پلے گھیل سومرد کا شراب سے کھوکھلا ہو جانے والا جسم بہت دیر تک اس مار کو برداشت نہیں کر سکا اور آخر کار اس نے ہار مان کر زبان کھولنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ عالم شاہ کے سوالات کے جواب میں اس نے جو کچھ بتایا اس کے مطابق اس کا باپ لطیف سومرد بڑے عرصے سے اپنی زمینوں سے ملحق قربان شاہ کی زمینیں ہتھیانے کی فکر میں تھا لیکن قربان شاہ اور صداقت شاہ ایک طرف اس سے بڑے زمیندار تھے تو دوسری طرف صداقت شاہ کی اسمبلی میں رکنیت اس کے راستے کی رکاوٹ بنی ہوئی تھی اس لیے وہ طاقت کے بل پر ان زمینوں کو نہیں ہتھیاسکتا تھا۔ اتنا ضرور ہوا تھا کہ کہیں سے

اڑتی پڑتی یہ خبر اس کے کانوں میں پہنچ گئی تھی کہ قربان شاہ آج کل خسارے میں جا رہے ہیں اور پہلے کی طرح مالی طور پر مستحکم نہیں رہے ہیں اس لیے اس نے زمین خریدنے کی اپنی سی کوشش کر کے دیکھ لی تھی لیکن قربان شاہ اس پر راضی نہیں ہوئے تھے۔ گھلیل سومرو جو باپ کا شریک راز تھا، اس موقع پر میدان میں اتر ا اور بہت چالاک سے اپنا جال بچھایا۔ اس نے اپنے شاسا غور نامی ایک چلتا پرزہ ٹائپ کے بندے کو منشی عبدالحق کی حیدر آباد شہر میں زیر تعلیم بیٹی آسیہ کے پیچھے لگا دیا۔ غور اپنی چرب زبانی کی مدد سے جلد آسیہ کو شیشے میں اتارنے میں کامیاب ہو گیا اور اس کے ذریعے قربان شاہ کی حویلی کے راز حاصل کرنے لگا۔ آسیہ کے ورے لے گئے انہیں پتا چلا کہ قربان شاہ کے مالی معاملات ان کو حاصل شدہ معلومات کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ خراب ہیں۔ گھلیل سومرو کو ایک طرف زمین اتھیلانے کا لالچ تھا تو دوسری طرف وہ بھل شاہ کے لیے دیوانہ تھا۔ ایک زمیندار کے گھر شادی کے موقع پر اس نے اتفاقاً بھل شاہ کو دیکھ لیا تھا اور اس سے اپنی پسندیدگی کا اظہار بھی کر بیٹھا تھا لیکن بھل شاہ نے اسے لفٹ نہیں کروائی اور وہیں جھاڑ کر رکھ دیا۔ اپنی اس بے عزتی کے بعد وہ بھل شاہ کے حصول کے لیے کوئی ترکیب لڑاتا اس سے نکل ہی اس کی شادی معظم شاہ سے ہو گئی اور گھلیل سومرو کے بیٹے پر سانپ لونٹے رہے۔ آخر کار اس کے شاطر ذہن نے ایک ایسا منصوبہ سوچ لیا کہ زمین اتھیلانے کا موقع بھی مل جائے اور بھل شاہ کو بھی حاصل کیا جائے۔

اس کے باپ کے علاقے کے ڈاکوؤں کے ساتھ مراسم تھے۔ اس نے ان مراسم سے فائدہ اٹھایا اور معظم شاہ اور بھل کے اغوا برائے تادان کی واردات کر ڈالی۔ اس واردات میں ایک طرف انہیں آسیہ کا تعاون حاصل رہا تو دوسری طرف انہوں نے صداقت شاہ کی حویلی میں کام کرنے والے مالی کے بھانجے کو استیصال کیا۔ وہ لڑکا ماموں سے ملنے کے بھانے حویلی آیا اور موقع دیکھ کر معظم شاہ کے گارڈز کی گاڑی میں ایسی خرابی پیدا کر دی کہ وہ حفاظت کے لیے پیچھے نہ آ سکے۔ آگے سب کچھ ان کے منصوبے کے مطابق ہوا۔ مالی طور پر تلاش قربان شاہ کو تادان کی بھاری رقم کی ادائیگی کے لیے منطقی طور پر زمین بیچنے کا خیال آیا۔ لطیف سومرو کی صورت میں گاہک پہلے ہی سامنے موجود تھا، سو اسی سے رابطہ کیا گیا اور مجبوراً مارکیٹ دلیو سے کم زمین کی قیمت وصول کر لی گئی۔ رقم کی باپ بیٹے کو فکر نہیں تھی کہ

تادان کی صورت رقم نہ صرف دوبارہ ان کے پاس واپس آ جاتی بلکہ وہ اس رقم سے زیادہ ہی ہوتی جو انہوں نے زمین کے لیے ادا کی تھی۔

سب کچھ ان کے منصوبے کے عین مطابق چل رہا تھا۔ گھلیل سومرو اپنی اصل شخصیت کو ظاہر کیے بغیر بھل شاہ کو قید میں حاصل کرنے کی ایک کوشش بھی کر چکا تھا اور اس کا ارادہ تھا کہ دونوں میاں بیوی کو رہائی دینے سے پہلے ایک بار تو ضرور اپنے دل کے ارمان نکالے گا لیکن یہاں ان کا منصوبہ ٹکپٹ ہو گیا اور معظم اور بھل ان کی قید سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس صورت میں بھی ان لوگوں کو بہر حال نقصان نہیں ہوا کہ ادا کی گئی قیمت کے مقابلے میں کئی گنا قیمتی زمین جو ہاتھ لگ ہی چکی تھی۔ معظم اور بھل کے فرار کا ذکر آیا تو عالم شاہ نے اس سے معاذ کے بارے میں دریافت کیا کہ اس کا کیا ہوا؟ اس سوال کے جواب میں گھلیل سومرو نے بتایا کہ وہ معاذ کو پہچان گیا تھا اور اسے معلوم تھا کہ وہ بڑی دولت مند شخصیات حیات یزدانی اور عرقان اللہ معاذ کے پیچھے ہیں اس لیے اس نے اس کا ان لوگوں کے ساتھ بھاری رقم کے عوض سودا کر لیا۔ معاذ کو ان لوگوں کی تحویل میں دینے کے بعد وہ نہیں جانتا تھا کہ انہوں نے معاذ کا کیا کیا۔ وہ اس کام میں اپنا ساتھ دینے والے ڈاکوؤں کو ان کا حصہ دینے کے بعد واپس گاؤں آ گیا تھا جہاں اس نے انتہائی مہم میں اپنے باپ کا بھرپور ساتھ دے کر اسے سیٹ جوائی۔ عالم شاہ نے اس سے آسیہ اور منشی عبدالحق کے خاندان کے بارے میں دریافت کیا تو پتا چلا کہ عالم شاہ پر حملہ کرنے والا منشی کا عمر بیٹا ہی تھا جسے بچانے کے لیے منشی کو خاندان سمیت فرار ہونا پڑا اور آسیہ کو بھی اسپتال سے نکال کر منظر سے ہٹا لیا گیا۔ اس سارے کام میں غور نے ان لوگوں کا ساتھ دیا تھا اور وہی جانتا تھا کہ وہ لوگ کہاں چھپے ہوئے ہیں۔

عالم شاہ نے غور کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی اور معظم شاہ کے قتل کے معاملے کے بارے میں جانکاری کرنے لگا۔ اس موقع پر گھلیل سومرو کی زبان پھر کھل گئی سے رک گئی اور اس نے اگلے سیدھے بھانے بنانے کی کوشش کی تو عالم شاہ کو دوبارہ اپنے ہاتھوں کو حرکت دینی پڑی۔ تھوڑی سی مزید ٹھکانی کے بعد اس نے اعتراف کر لیا کہ زمین کے سلسلے میں بات چیت کرنے کے لیے آنے والے معظم شاہ کے ساتھ اس کی خال کھائی ہوئی تھی۔ بھل شاہ کے حوالے سے وہ یوں بھی

سنا نہیں تھا جتنی تو اس کی قیمت لگا رہا ہے اور تمہ پر تو اس کے علاوہ بھی بہت قرض ہیں۔ میری بہن پر بری نظر ڈالنے اور میرے پیارے دوست کو موت کے منہ میں دینے کے جرائم کو معمولی سمجھتا ہے تو..... حیران تو ہر جرم اتنا سنگین ہے کہ اس کے بدلے میں تجھے ایک بار نہیں، دس بار قتل کرنا چاہتا ہوں۔“

”مجھے قتل کر کے تم بھی سکون سے نہیں رہ سکو گے۔ میرا باپ سمجھ جائے گا کہ یہ تم لوگوں کی حرکت ہے۔ میرے خون کا بدلہ وہ تمہارے خاندان کے بچے بچے سے لے گا۔ میرے باپ کو معمولی آدمی نہیں سمجھتا۔ وہ جہاں جہاں کی اینٹ سے اینٹ بھا کر رکھ دے گا۔“ کھیل سومرو نے دیکھا کہ منت ساجت سے بات نہیں بن رہی تو دھمکیوں پر اتر آیا۔

”تمہ کو جہنم میں پہنچا دوں، پھر تیرے باپ کو بھی دیکھ لوں گا۔“ عالم شاہ طیش کے عالم میں بولا اور خاموش کھڑے سرد کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس کا مقصد سمجھتے ہوئے سرد نے اپنی گن اسے حمادی۔ ایک دوسری گن اس کے بٹل ہولسٹر میں اب بھی لگی ہوئی تھی۔ عالم شاہ کو گن تھامتے دیکھ کر کھیل سومرو پر جنونی کیفیت طاری ہو گئی اور وہ اسے گندی گندی گالیاں دینے لگا۔

”مرتے ہوئے گالیاں نہیں دیتے، کلمہ پڑھتے ہیں لیکن ٹوکتے کا تم اس بات کو کیسے سمجھے گا۔ حیرتی تو فطرت میں ہی بھونکتا اور بھونکتے رہتا ہے۔“ عالم شاہ نے اس کی گالیوں کے جواب میں استہزاء سے لہجے میں کہا اور ٹنگ پر انگلی کا دھاڑ ڈالا۔ ابھی پورا دھاڑ نہیں پڑا تھا کہ باہر سے بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی اور ایک شخص تیزی سے اندر داخل ہوا۔ وہ ان ہی کا بندہ تھا۔ عالم شاہ نے اس کی طرف حوجہ ہو کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”پولیس کی گاڑی سائرن بجاتی ہوئی اسی طرف آرہی ہے۔ لگتا ہے کوئی گڑبڑ ہے۔“ اس شخص نے اطلاع دی تو عالم شاہ کو بھی تشویش ہوئی اور خیال آیا کہ شاید اس کے اندازوں کے برعکس کھیل سومرو کے چپنے چلانے کی آوازیں آس پڑوس کے کسی گھر میں سن لی گئی ہے اور انہوں نے پولیس کو اطلاع دے دی ہے اس لیے پولیس کی گاڑی اس طرف آرہی ہے لیکن حقیقت اس سے ذرا مختلف تھی۔ علاقے کی گمرانی پر مامور ٹائٹ ڈیوٹی کرنے والے سکیم رٹی کمپنی کے افراد کمپنی کی طرف سے اس بات کے پابند تھے کہ ہر دو گھنٹے بعد رپورٹ کریں۔ بے ہوش پڑے

معظم شاہ کو اپنا رقیب تصور کرتا تھا اس لیے اس موقع پر برداشت نہیں کر سکا اور اپنے باپ کو آگاہ کیے بغیر ڈاکوؤں سے رابطہ کر کے انہیں ہدایت کر دی کہ راستے میں ہی معظم شاہ اور اس کے ساتھیوں کو قتل کر دیا جائے۔ وہ خود بھی معظم شاہ کے پیچھے ہی گھر سے نکل پڑا تھا اور اس نے ڈاکوؤں کے معظم شاہ کی گاڑی کو گھیر کر اسے اور اس کے گارڈ کو ہلاک کرنے کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنی رہائش گاہ پر واپس آ گیا تھا اور لطیف سومرو کی باز پرس پر اس کے سامنے معظم شاہ کے قتل کا اعتراف کر لیا تھا۔ اس کے باپ کو اس کی یہ حرکت پسند نہیں آئی تھی اور اس نے اسے سخت سرزنش کی تھی کہ اس نے معظم شاہ کا قتل کر کے ایک بڑی حماقت کی ہے اور اس کے لیے مسائل پیدا کر دیے ہیں۔ اسے یہ بھی اندیشہ تھا کہ معظم شاہ کا خاندان اس کے قتل کا حکم سومرو کو شہر روانہ کر دیا تھا اور اس پر مسلسل زور دے رہا تھا کہ وہ فوری طور پر بیرون ملک نکل ہو جائے، بعد میں وہ حالات کا رخ دیکھ کر اسے واپس بلا لے گا لیکن کھیل سومرو نے اس کی بات نہیں مانی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کا باپ غیر ضروری احتیاط پسندی کا مظاہرہ کر رہا ہے ورنہ معظم شاہ کے خاندان کے پاس ایسا کوئی گواہ یا ثبوت نہیں تھا جس کی بنیاد پر وہ انہیں قاتل قرار دے سکتے۔

اس نے اس بات کا بھی اعتراف کر لیا کہ حملے میں بچ جانے والے معظم شاہ کے گارڈ جن کو بھی لطیف سومرو نے قتل کر دیا تھا اور اس مقصد کے لیے زہر پلے ناگ کو اس لیے استعمال کیا گیا تھا کہ جن کا قتل محض ایک حادثہ محسوس ہو۔ اتنے سارے اعتراضات کے بعد عالم شاہ کے پاس اسے سزائے موت دینے کے سوا کوئی معجزانہ نہیں رہ گئی تھی۔ کھیل سومرو بھی اس بات کو بھانپ گیا تھا چنانچہ آہ و زاری کرتے ہوئے اس کی منت ساجت کرنے لگا کہ وہ اس کی جان بخش دے، بدلے میں وہ قربان شاہ کی زمینیں واپس کرنے کے علاوہ معظم شاہ کے قتل کی منہ مانگی دیت بھی ادا کر دے گا اور اپنے باپ کو اس بات پر بھی راضی کر لے گا کہ وہ اسٹیبل کی نشست سے دستبردار ہو جائے۔ عالم شاہ نے اس کی یہ ساری باتیں سنیں اور غرت سے اسے ٹھوکر لگاتے ہوئے بولا۔

”تو اور حیران باپ اپنے آپ کو بچ کر بھی ادا معظم کے قتل کی دیت ادا نہیں کر سکتے۔ میری بہن کا سہاگ اتنا

لے لے کپڑوں اور جوتوں سے لے کر زیر استعمال گاڑیوں، اسٹے اور سوبائل فونز کی طرف سے بھی پوری احتیاط برتی گئی تھی۔ اسلحہ غیر قانونی تھا، گاڑیوں پر جعلی نمبر پلائس لگی تھیں اور سوبائل فونز اور ان کی سمیں ان میں سے کسی کے نام پر رجسٹرڈ نہیں تھیں۔ ان میں سے ہر شخص ربر کے دستانے استعمال کر رہا تھا اس لیے کہیں فنگر پرنٹس رو جانے کا بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا..... لیکن کہتے ہیں تاکہ نہایت چالاکی سے کی گئی منصوبہ بندی میں بھی کہیں نہ کہیں کوئی سقم رہ جاتا ہے تو سرمد کی منصوبہ بندی میں بھی یہ سقم رہ گیا تھا کہ وہ سکپورٹی مینی کے ہر دو گھنٹے بعد اپنے آدمیوں سے رپورٹ حاصل کرنے کے اصول کو نہیں جان سکا تھا اور نتیجہاً وہ پولیس کے خطرے سے دو چار ہو گئے تھے۔ اس خطرے سے بچ کر نکلنے کے لیے وہ پوری مستعدی سے برسرِ پیکار تھے۔ ان کے پیروں میں موجود ربر رسول کے جوتے فرار کو خفیہ رکھنے میں اہم کردار ادا کر رہے تھے۔ گاڑی تک کا فاصلہ تھا بھی کتنا۔ قدموں کی تیزی کے باعث چند ثانیوں میں طے ہو گیا۔ سرمد جانثاری اور فرض شناسی کے جذبے سے پُور عالم شاہ سے چند قدم آگے نکل کر خود گاڑی تک پہنچ پہنچ گیا اور گاڑی کے دروازے پر لاک کرنے لگا تو عالم شاہ نے دیکھا کہ گاڑی کی دوسری طرف سے ایک پولیس والا نکل کر سرمد کی طرف آ رہا ہے اور اس کی رائفل کا رخ سرمد ہی کی طرف ہے۔ اس نے اپنے قدموں کو روک لیا اور اپنی گن کو پولیس والے کی طرف سیدھا کیا لیکن فوری طور پر گولی نہیں چلا سکا۔ وہ کوئی عادی قاتل نہیں تھا جو ہر شخص پر بے رحمی سے گولی چلا سکتا۔ اس وقت اس کے سامنے گھیل سومر دھیمیا خبیث شخص نہیں بلکہ ایک بے گناہ شخص کھڑا تھا جو اپنے فرض کی بجا آوری کے لیے اپنی جان ہتھیلی پر رکھے آدمی رات کو اپنے گھر کا سکون چھوڑ کر یہاں موجود تھا۔ ایسے شخص پر گولی چلانے سے اس کا ہاتھ رک گیا تھا تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی لیکن اس کے رکنے سے کیا ہوتا تھا۔ یکدم ہی اس کے عقب سے ایک گولی چلی اور وہ بری طرح تڑپ کر رہ گیا۔ اس کے مقل سے چیخ بھی بلند ہوئی لیکن پہلی گولی چلنے کے فوراً بعد ہی شروع ہو جانے والی بے تحاشا فائرنگ نے اس کی چیخ کی آواز کو اپنے شور میں دبا لیا۔

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر ہو جان
کس دستان جو غلط کاروں کے لیے
غضب ناک تھا باقی واقعات ایندھا پڑھیں

ہونے کی وجہ سے وہ افراد اس معمول پر عمل نہیں کر سکے تو کچھنی والوں نے پہلے خود ان سے رابطہ کرنے کی کوشش کی اور جب ناکام رہے تو علاقے کے تھانے کو صورت حال سے آگاہ کر کے کسی گڑبڑ کا اندیشہ ظاہر کر دیا۔ کچھنی ابھی ساکھ کی مالک تھی اور اس کا مالک پہنچ والا بندہ تھا اس لیے پولیس والوں کو حرکت میں آنا پڑا اور صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے ایک گاڑی روانہ کر دی گئی۔

”سب لوگ فوراً یہاں سے نکلنے کی کرو۔ ہم بھی نکلتے ہیں۔“ عالم شاہ خود یا اپنے ساتھیوں کا پولیس کی گرفت میں جانا قطعی انور نہیں کر سکتا تھا چنانچہ تیز لہجے میں حکم دیا اور ایک بار پھر گھیل سومر کی طرف متوجہ ہوا۔ پولیس کی آمد کی اطلاع سن کر اس کے چہرے پر امید کی ایک کرن سی روشن ہو گئی تھی۔

”تجھے میں کسی صورت نہیں چھوڑ سکتا۔“ عالم شاہ بڑبڑایا اور ہونٹ بچھتے ہوئے لگا تار کئی فائر اس کی طرف جھونک دیے۔ اس کی چلائی ہوئی گولیوں میں سے ایک گھیل سومر کی آنکھ میں لگی، دوسری جہزے میں اور تیسری شانے میں گھس گئی۔ بندی ہوئی حالت میں پڑا گھیل سومر دو گولیاں کھا کر ٹھیک سے تڑپ بھی نہ سکا۔ ان لوگوں کے پاس بھی اس کو تڑپتے دیکھنے کا وقت نہیں تھا چنانچہ دروازہ کھول کر تیزی سے باہر کی طرف بھاگے۔ سرمد بھٹی ہو لستر سے گن نکال کر اپنے ہاتھ میں لے چکا تھا اور ساتھ ہی اپنے بندوں کے ساتھ بھی رابطے میں تھا۔ پولیس سوبائل کے سائرن کی آوازیں اب خود انہیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

”پولیس علاقے کو گھیر رہی ہے۔ اگر ہمیں ذرا سی بھی دیر ہوئی تو بری طرح پھنس جائیں گے۔ سامیں کو لے کر فوراً یہاں سے نکلو۔ ہم لوگ کور دینے کے لیے آس پاس رہیں گے۔“ سرمد نے اپنے کان کے ساتھ لگے امڑھیں میں پھل کی گھیر آواز سنی۔

”ٹھیک ہے، ہم نکل رہے ہیں لیکن تم میں سے بھی کسی کو پولیس کے ہاتھ نہیں آنا چاہیے۔ جیسے بھی ہو سکے ہر حال میں یہاں سے نکل بھاگو۔“ سرمد نے تیز لہجے میں اسے ہدایت دی اور عالم شاہ کو لے کر گھر سے باہر نکل گیا۔ اس بار انہوں نے عقبی دروازے کا استعمال کیا تھا کیونکہ سامنے تو اطلاع کے مطابق پولیس پہنچ ہی چکی تھی۔ باہر نکل کر وہ لوگ جتنا انداز میں لیکن تیزی سے اس سمت بڑھنے لگے جہاں ان کی گاڑی کھڑی تھی۔ سرمد نے بڑی ذہانت سے اور ہر بات کا خیال رکھ کر اس مہم کی تیاری کی تھی اس

نومبر 2020ء

سسپنس ڈائجسٹ

مہربانی فرما کر بلیشرز کی حوصلہ کے لیے خرید کر پڑھیے۔

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تندو تیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابل شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پُر عزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جا رہے تھے... اس کی زندگی جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو سے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قرار یوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مار بیٹا... اگرچہ ہر عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ پروار کا توڑ کرنا حق و باطل کی اڑلی جنگ یوں ہوتا رہا کہ وہاں اب قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہو سکی...

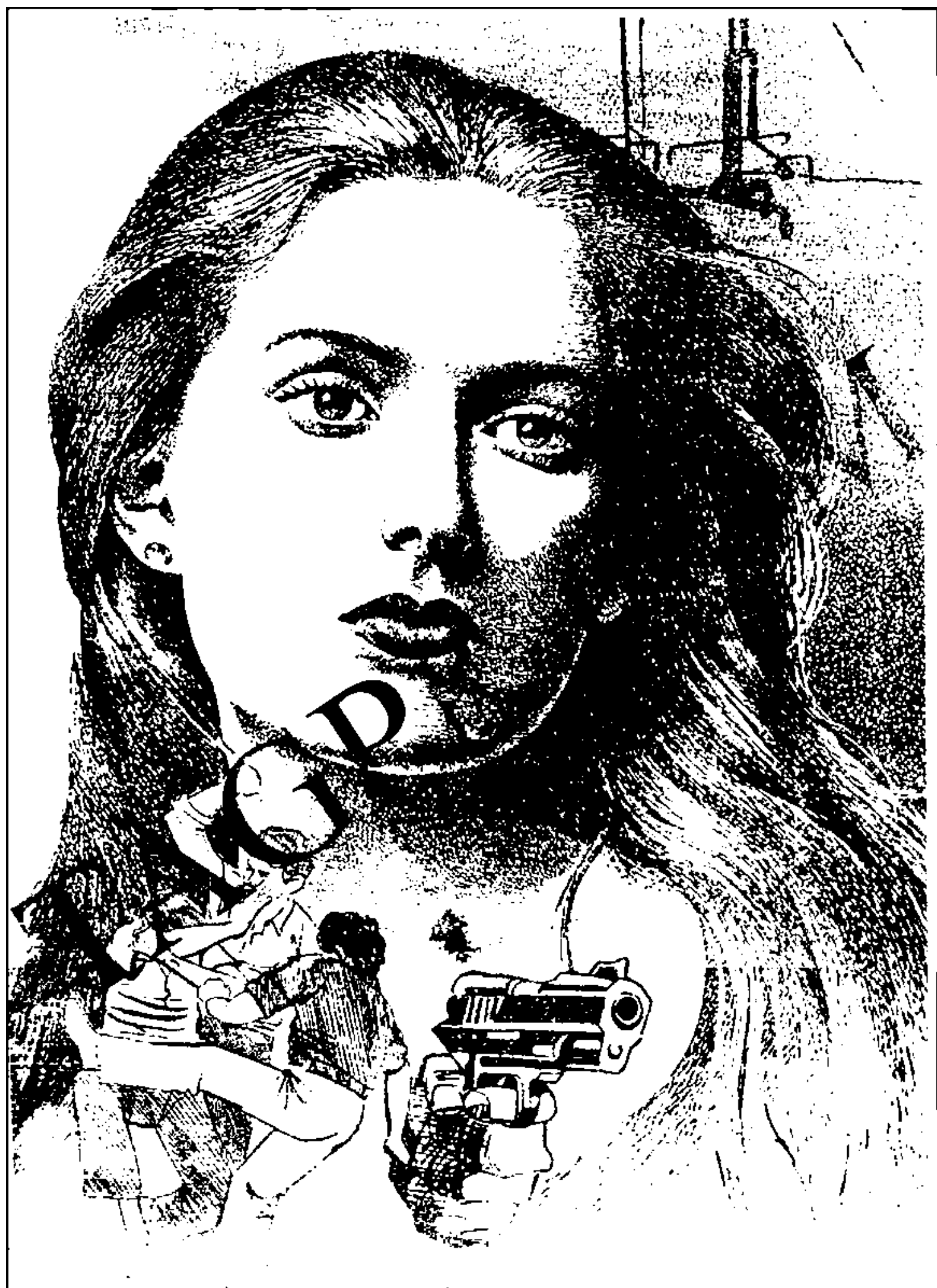
اپنے حریفوں پر قہر بن کر مار مارنے والے ایک سراپا انتقام خن جو ان کی تحیر انگیز داستان

تقسیم: 10

شہزاد

کے تار





گزشتہ اقساط کا خلاصہ

معاذ ایک ذہین لیکن متلون مزاج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جو آئن کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ انسٹی ٹیوٹ سے واپس آ رہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو سڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی نڈر فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشری نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بشری اس کیس کی تفتیش کی طالب ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم وغیرہ لکھتی ہے۔ اس ویران جگہ بھی وہ ایک زیرِ تعمیر رہائشی منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے آئی تھی۔ معاذ بشری کو یہ طاقت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کر دیتا ہے لیکن جن رئیس زادوں سے اس نے ان کا شکار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ یہ موقع انہیں یونیورسٹی ٹرپ کی صورت میں مل جاتا ہے اور ایک جنگل کی سیر کے دوران وہ فوٹو گرافی کے شوق میں سب سے الگ تھلک ہو جاتے والے معاذ کو بے خبری میں گھیر کر بری طرح زدوکوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس نہ آنے پر انتہائی خوفزدہ پولیس اور ریسکیو ڈرائنگ کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے وہ خود کو ایک جنگل کی جھوپڑی میں پاتا ہے۔ اپنی حالت سے اسے اپنے شدید زخمی ہونے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ جوگی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ معاذ کا موبائل جنگل میں ہی کہیں گم ہو جاتا ہے اور جوگی کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا جس سے باہر کی دنیا سے رابطہ کر سکے۔ وہاں پہنچنے کے لیے جوگی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے۔ جوگی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے کہتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ رہے۔ اس سے پہلے انہیں قدرت کے کچھ خاص صلاحیتوں سے نوازا کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے نہ صرف بات چیت کے بعد وہ اسے پرانا اور عجیب عالم دکھاتا ہے اور معاذ کو اپنی ہی بھرپور صلاحیتوں سے نوازا دیتی ہے۔ اس سے یہ سمجھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ باہر جانے کے بعد اسے معاذ کے گھر سے تھپ تھپ کر پھر کر آتی ہے۔ یہ تو بہت سے قدرتی مناظر کی تصویروں میں سے ایک ایسی تصویر بشری کی نظر میں آ جاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے نیچے ایک چہرہ جمائے ہوئے لگتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والے میں شامل تھا۔ اس میں اس کا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس نے پردیسیٹ کے لیے قانونی ہونے کے سلسلے میں بشری تحقیق کر رہی تھی۔ بشری کے لیے اس واقعے میں اس کے خون میں شامل ہے۔ اس انکشاف کے بعد وہ نہ موش بیٹھنے کے بجائے فوراً انکس کے الویشن کیس میں افسر سے رپورٹ کر کے اپنے کمانڈر کی ہے اور اس واقعے سے بھی آگاہ کرتی ہے جو معاذ کو کامران کے درمیان دشمنی کا باعث بنا۔ اس کی پاراش میں جوگی کو کافی نقصان پہنچا دیتا ہے۔ اس کی موت کو بے اثر کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ صدمے سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باؤل نامی غنڈے کے گھر ہوتا ہے۔ بشری انتقام لےنے کی نیت لیتی ہے۔ بشری کو بہت مایوسی ہوتی ہے لیکن وہ اپنے صدمہ پر جلد جہد جاری رکھنے کا عزم کرتی ہے۔ ان تکلیف دہ دنوں میں ہی وہ واپس کا ارادہ کرتا ہے تاہم دوسرے ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا عرفان اللہ اور یزدانی کے گروہ میں کر دیتا ہے۔ معاذ کو بتائی گئی ایک لڑکا وہاں سے نکل لے جاتا ہے۔ ادھر باؤل اچانک بشری کو چھپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر دیتا ہے۔ ڈاکو اسے گروہ سے باؤل کی نشاندہی ہو جاتی ہے۔ ادھر معاذ کو وہاں لانے کے لیے اوجھے جھکنڈے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو مار دیا جاتا ہے اور اسے واپس آنے کا پتہ دیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود بخود سر ہوجاتا ہے۔ دو گم کی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کرنے کے لیے ان کے حوالہ کر دیتے ہیں۔ تین دنوں میں معاذ سے معلومات لی جاتی ہیں، نہ بتائے پر اس کے بھائی کا ایک گروہ نکل لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتا دیا جاتا ہے۔ ادھر بشری بھی انتہائی آگ میں جمتی ہوئی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہو جاتی ہے۔ معاذ کو بچانے والا لڑکا وہاں اپنے گروہ کے ساتھ ایک پارٹی میں جاتا ہے۔ وہاں اسے معاذ کے حوالے سے مشکوک ایک شخص نظر آتا ہے۔ وہ اس کے پیچھے جاتا ہے مگر اسے گھیر لیا جاتا ہے۔ بہرحال وہ قاصد کو تحییر کے ساتھ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ادھر معاذ کے دوست عالم شاہ کے بیڑی کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ کو فون میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے چننا تا کر کے اس کے دامخ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ فیصلہ سے حاصل انوکھے علم کی بدولت ان کا معمول نہیں جاتا۔ بشری کامران کو چھاپنے کا پروگرام بناتی ہے۔ ادھر عالم شاہ و سرانگ لگ لیتا ہے کہ اس کے بیڑی کا قتل کس نے کیا۔ وہ قاتل کو گھیرتا ہے اور اپنے تئیں اسے گولیاں مار کر قتل کر دیتا ہے تاہم اچانک وہاں پولیس پہنچ جاتی ہے اور قاتل کو گرفتار کر لیا جاتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

اتنی دل جی سے مصروف عمل تھا کہ اپنی اندرونی کیفیات پر بھی دھیان دینے کی فرصت نہیں تھی۔ اس نے غور کرنا چھوڑ دیا تھا کہ اس کا دل کیوں پہلے سے بھی زیادہ مضطرب رہنے لگا ہے۔ کیوں جل شہ بار بار اس کے خوابوں میں آتی ہے؟ کیوں وہ اسے اس کی خوبصورت کڑھائی دار حجابی چادر کے بجائے سفید خون آلود روپے کے حصار میں دیکھتا ہے۔ ہر پریشانی اور فکر کو جھٹک کر وہ اپنی توجہ ذہنی مشقوں پر مرکوز رکھ رہا تھا اور یہ اس کی بے حد محنت کا ہی نتیجہ تھا کہ جب آٹھ دن کے وقفے کے بعد دکنر واپس آیا تو وہ اس لائق تھا کہ اس کے مقابل ڈٹ سکے۔ وکٹرنے اسے اپنے غیاب کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا کہ وہ اتنے دنوں سے کہاں تھا اور کیوں اس سے ملنے نہیں آیا تھا لیکن معاذ محسوس کر رہا تھا کہ وہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ کمزور، عمر رسیدہ اور رنجیدہ دکھائی دے رہا ہے۔ معاذ سے ملاقات کے وقت بھی وہ قدرے کھویا کھویا سا نظر آیا اور صاف محسوس ہوا کہ وہ صرف اپنے فرائض کی انجام دہی کے لیے وہاں آیا ہے۔ معاذ نے اسے ٹولنے کی کوشش کی لیکن وہ طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر اسے نال گیا اور اس سے پوچھنے لگا کہ کیا وہ میڈم کی ہدایات کے مطابق اس کے ساتھ تعاون کے لیے تیار ہے۔ معاذ نے اسے اشارت میں جواب دیا تو اس نے اپنی کارروائی شروع کر دی اور کمرے میں محسوس رکھوا اور زادیوں کی روشنیوں کی مدد سے ایک ایسا حوال بنا دیا کہ ماسٹل میں موجود افراد خود کو پُر سکون محسوس کر سکیں۔ معاذ کا ماسٹل الٹ تھا۔ اسے خود کو پُر سکون ظاہر کر کے کے لیے خاص طور پر جہد کرنا پڑی تھی۔ اسے آرام دہ کاؤنٹاپ لانا پڑا۔ ہوائے سردی نے بھی محسوس کر لی اور نرم لہجے میں اس نے کہا: ”اپنے اعصاب کو بالکل دھچلا چھو دو۔ میں تمہارے ساتھ کچھ برا نہیں کرنے والا۔ بس سب کو سمجھو کہ جیسے تمہیں دوسرے کاموں کی تربیت دی گئی ہے، ویسے ہی یہ بھی تمہاری تربیت کا ایک حصہ ہے۔“ اپنی بات کہنے کے بعد اس نے معاذ کی نظروں کے عین سامنے ایک شمع روشن کر کے اسے اس پر توجہ مرکوز رکھنے کی ہدایت دی۔ معاذ نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ پروفیسر وکٹرنے دھیمے دھیمے لہجے میں مزید ہدایات بھی دیتا رہا جس پر عمل کرتے ہوئے معاذ کو محسوس ہوا کہ وہ غنودگی کی کیفیت میں جا رہا ہے۔ اس نے اس کیفیت کو خود پر حاوی نہیں ہونے دیا اور روشن شمع سے اپنی توجہ ہٹا کر اس کی جگہ روشن تارے کو اپنے تصور میں لے

ایک فنٹ لیے اور آدھا فنٹ چوڑے اس ہوادان میں لوہے کی منبھوط سلاخیں لگا کر اس کے صیاد نے اس بات کا ثبوت دیا تھا کہ وہ اپنی تمام تر احتیاطی تدابیر کے باوجود اس کے فرار سے خوف زدہ ہے حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ معاذ اپنے پیاروں کی محبت کی زنجیروں سے اتنی بری طرح بندھا ہوا تھا کہ وہ یہاں سے فرار کا سوچ کر ان لوگوں کو خطرے میں ڈالنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا کہ حالات خود ہی ایک نہ ایک دن اسے بقا کا راستہ دکھادیں گے۔ چھوٹے سے ہوادان والا یہ ناپید خانہ بھی اس کے لیے بہت بڑی نعمت تھا۔ رات کی تاریکی میں جب وہ اپنے کمرے میں بالکل تنہا ہوتا تھا تو کمرے کا تمام روشنیاں بجھا کر ایسے زاویے سے بیٹھ جاتا تھا کہ اسے ہوادان کے باہر آسمان کا چھوٹا سا ٹکڑا نظر آتا رہتا تھا۔ اس جگہ سے ٹکڑے پر چمکتے تارے اس کی توجہ کا مرکز ہوتے تھے۔ پروفیسر وکٹرنے کمال میں پھنسنے سے بچنے کے لیے اس نے ستاروں کی مشق نہایت سنجیدگی سے کرنا شروع کر دی تھی اور محسوس کے سکھائے اسے اس بات پر توجہ دینی سے عمل کر رہا تھا۔ اپنی ان مشقوں کا مثبت نتیجہ بھی اسے ملنا شروع ہو گیا تھا اور وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کے اندر ایک نئی توانائی اور تہذیبی رونما ہونے لگی ہے۔ اس کے لیے اچھی بات یہ ہوئی تھی کہ وکٹرنے آج کل منظر سے ہٹا دیا تھا اور اسے اس بات کا موقع مل رہا تھا کہ وہ اس کے دوبارہ منظر پر آنے تک اپنے بچاؤ کے لیے زیادہ سے زیادہ اقدامات کر لے۔ جس قید اور جبر سے وہ گزر رہا تھا وہ تو اپنی جگہ اذیت ناک تھے ہی لیکن یہ احساس اس کی اذیت کو دو چند کر دیتا تھا کہ کوئی اس کے دماغ پر اس طرح قابض ہو جائے گا کہ اس کا ہر عمل اس کے حکم کے تابع ہوا کرے گا۔ یہ لوگ کون تھے اور ان کے مقاصد کیا تھے؟ یہ تو وہ ابھی تک نہیں جان سکا تھا لیکن یہ بات اپنی جگہ طے شدہ تھی کہ وہ ایسے خطرناک لوگوں کے ہتھے لگ چکا ہے جو معمولی جرائم پیشہ نہیں بلکہ کسی نہایت منظم تنظیم سے تعلق رکھتے تھے اور جن کے کچھ ایسے خطرناک عزائم تھے جو اس کے جذبہ حب الوطنی اور جذبہ دینی سے لازماً متصادم ہوتے۔ وہ خود کو ایسے لوگوں کا کھلونا بنانے سے بچنا چاہتا تھا کیونکہ اسے جو تربیت دی گئی تھی اس کے نتیجے میں وہ خود ایک خطرناک ہتھیار بن چکا تھا اور اسے معلوم تھا کہ اگر اس کا ذہن مسخر ہو گیا تو وہ اپنے قوم و مذہب کے لیے ہی ماسور بن جائے گا۔ اپنے آپ کو دشمن کا ہتھیار بننے سے بچانے کے لیے وہ

آیا۔ اس تصور کے ساتھ ہی اس نے اپنے ذہن کو جاگسا ہوا محسوس کیا لیکن ضروری تھا کہ وکٹر کو اس بات کا احساس نہ ہو سکے، اس لیے اس نے ظاہر آخود کو اس کا معمول ظاہر کرنا شروع کر دیا۔ وکٹر نے ابتدا چھوٹی چھوٹی باتوں سے کی۔ بچپن کی چند باتوں کو دہرانے کے بعد وہ آہستہ آہستہ یزدانی بلند زوالے معاملے پر آ گیا۔ دوسری ساری باتوں کا سرسری ذکر کرنے کے بعد اس نے اس واقعے کو چھیڑا جب معاذ کے والد سلطان کے خلاف ایک ثبوت لے کر تھانے گئے تھے اور وہاں نہ صرف انہیں دھوکا دیا گیا تھا بلکہ بعد میں بدسلوکی بھی کی گئی تھی۔ اس بدسلوکی کو وکٹر نے کچھ ایسے پیرائے میں بیان کیا کہ معاذ اپنے اندر پیش کی لہر سے سی انتہی محسوس کرنے لگا۔

حق پر ہوتے ہوئے بھی اس رشوت خور پولیس افسر نے قریباً والد کے ساتھ بڑی زیادتی کی تھی معاذ! میں وہ اس پٹ سسٹم کا حصہ ہے جو اس ملک میں ہر طرف پھیلا ہوا ہے۔ حق میں اب یہ ملک شریف اور ایماندار لوگوں کے رہنے کے لائق ہی نہیں رہا ہے۔ یہاں رہنے سے بہتر ہے کہ بندہ کہیں چلا جائے یا پھر کچھ ایسا کرے کہ یہاں سب کچھ تبدیل ہو جائے۔ سب کچھ ایسے ہی تبدیل نہیں ہو سکتا۔ اس تبدیلی کے لیے ضروری ہے کہ ان لوگوں کا سہارا لیا جائے جو اسے سسٹم کے اچھے طریقے سے چلا رہے ہیں۔ تم جن لوگوں کے درمیان موجود ہو، وہ ایسے ہی لوگ ہیں۔ اگر تم ان لوگوں کی ہدایات اور احکامات پر عمل کرو تو تنہا بھی بہت کچھ کر سکتے ہو۔ کیا تم ان لوگوں کا ساتھ دو گے معاذ...؟" اپنی بات کہہ کر اس نے آخر میں سوال کیا تو معاذ نے اثبات میں جواب دیا اور غنودہ کی آواز میں بولا۔

"ہاں! میں ان لوگوں کا ساتھ دوں گا۔"

"ممتاز! اب تمہیں یاد رکھنا ہوگا کہ ساتھ دینے کا مطلب ہے ہر حکم پر بے چون و چرا عمل کرنا، چاہے وہ حکم تمہیں کتنا ہی غلط محسوس ہو رہا ہو۔ کیا تم ایسا کر سکو گے؟"

"ہاں! میں ایسا ہی کروں گا۔" معاذ نے ایک بار پھر اسے اثبات میں جواب دیا لیکن اندر ہی اندر وہ اپنے دماغ کو ہدایت دے رہا تھا کہ اسے ان لوگوں کی کسی ہدایت یا حکم پر عمل نہیں کرنا ہے۔ یہ ایک نہایت محنت طلب کام تھا۔ اسے وکٹر کی ہر پیشکش کو یاد بھی رکھنا تھا اور دماغ کو باور بھی کروانا تھا کہ وہ ان میں سے کسی بات پر عمل نہیں کرے گا۔ اس تکلیف نے اسے اتنا تھکا دیا تھا کہ اس کو ٹھنڈے پینے آنا

شروع ہو گئے تھے۔

"اب تم تھک گئے ہو۔ تمہارے لیے بہتر ہے کہ تم گہری اور پرسکون نیند سو جاؤ۔" وکٹر نے اس کی حالت دیکھی تو اسے غنی پیشکش دی۔ اس ہدایت کے ملنے ہی معاذ نے خود کو پرسکون کرنا شروع کر دیا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کا ذہن آہستہ آہستہ غنودگی کی طرف جا رہا ہے لیکن اس نے کوشش کی کہ وہ آنکھیں تو بے شک بند رکھے لیکن سونے نہ پائے۔ وہ کسی دوسرے کی ہدایت پر نہیں بلکہ اپنی مرضی سے سونے جا گئے کا خواہاں تھا۔ اپنی اس کوشش میں اسے جزوی کامیابی حاصل ہوئی اور وہ نیم غنودگی کی ہی کیفیت کا شکار ہو گیا۔ اسی کیفیت میں اس نے محسوس کیا کہ کمرے میں کوئی دوسرا فرد داخل ہوا ہے۔ اونچی ایڑی کی ٹک ٹک نے یہ بھی باور کروا دیا کہ وہ کوئی نسوانی وجود ہے۔ اس نے کوشش کی کہ آنکھوں کو نیم وا کر کے آنے والی نودیکھ سکے لیکن اسے اپنی اس کوشش میں کامیابی نہیں ہوئی اور ایسا لگا کہ پونے بھاری بوجھ تلے دے کھٹنے سے قاصر ہوں۔ مجبوراً وہ یونہی بے سدھ کی کیفیت میں پڑا رہا۔

"کیسے ہو پروفیسر؟" اس نے نسوانی آواز کو پروفیسر سے ہی طلب ہوتے سنا۔

"جو کچھ کہو کر آیا ہوں، اس کے بعد کیسا ہو سکتا ہوں؟" جواب میں پروفیسر وکٹر کی افسردہ اور تھکی تھکی سی آواز سنائی دی۔

"تم بہت افسوس ہے۔ ایک باب کے لیے اپنی اکلوتی جائیداد سے بڑا رقم کوٹ نہیں ہو سکتا۔"

"تم تصدیق نہیں کر سکتے کہ میں کس کرب سے گزرا ہوں۔ میری ان لائق فائقہ زوجین میں سے ایک بہتر سے مرعی۔ وہ ایک زلی۔ میرا آپریشن کے اسٹال جلدوں سے لٹھی کہ راستے میں جتنے لوگوں سے پھراؤں میں گئی۔ وہ ڈاکٹر تھی لیکن زخمی ہوئی تو خود اسے ڈاکٹر میسر نہیں آیا۔ جگہ جگہ ہونے والے احتجاج کی وجہ سے اسے وقت پر اسپتال میں نہیں پہنچایا جاسکا۔" معاذ کو اندازہ نہیں تھا کہ اس کا دماغ بار بار ڈوب ابھر رہا ہے یا پروفیسر کی آواز جو وہ گتھکو کو پوری طرح سننے میں ناکام ہے لیکن مفہوم بہر حال کافی حد تک سمجھ آ رہا تھا۔

"مجھے کچھ مت بتاؤ پروفیسر۔ میں سب جانتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ اس روز ہمارا بہادر میجر کئی مخالف کتوں کو موت کی نیند سلانے کے بعد اتفاق سے خود بھی زخمی ہو گیا تھا اور قوم کی بہادر بیٹی ریکا خراب حالات کے باوجود اسپتال

پہلے سے کچھ لوگ موجود تھے۔ باربی نے راستے میں اتار دیا جانے والا اپنا جالی دار ہیٹ ایک بار پھر پہن لیا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ یہاں ان کا استقبال کرنے والے لوگ کون ہیں لیکن وہ خود کو زیادہ لوگوں کی نظروں میں آنے سے بچانا چاہتی تھی اس لیے یہ تکلف کیا تھا۔

”خوش آمدید۔ خوش آمدید سائیکس کامران! جیہیں یہاں دیکھ کر اچھا لگا۔ سائیکس حیات یزدانی ہمارے دوست ہیں اور دوست کے پُت کو اس کا بازو بٹنے دیکھنا اچھا لگا ہے۔“ وہ لوگ گاڑی سے نیچے اترے تو ایک پستہ قامت اور فریب شخص نے پُر جوش انداز میں ان کا استقبال کیا اور کامران سے گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے خوشامداندہ لہجے میں بولنا چلا گیا۔

”شکریہ سومرہ صاحب! ڈیڈی نے مجھے آپ کے متعلق بتایا تھا کہ آپ میرے ساتھ تعاون کرنے کے لیے یہاں موجود ہوں گے اور میں یہ دیکھ کر خوش ہوں کہ آپ رات کے اس پہر بھی پوری طرح چاق و چوبند میرے استقبال کے لیے موجود ہیں۔“ کامران نے بھی جواباً اخلاق سے کام لیا اور سومرہ کی تعریف کی جس پر اس کی ہاتھیں کھل گئیں اور خوش ہوتے ہوئے بولا۔

”مہمان کے لیے اپنی جان بھی نچھاور کر دینا ہماری روایت ہے۔ سائیکس کامران! اور آپ کے ساتھ تو بڑی سزا کا معاملہ ہے۔ کسی آپس میں ساجھے داری ہے۔ ہمارا نفع نقصان کیا ہے تو بچا کیسے ممکن ہے کہ میں آپ کے لیے اپنی خیر بآں نہ کروں۔“ وہ کامران سے مخاطب تھا لیکن دُور دیکھ کر نظروں سے ہار ہار سا کھڑی باربی کو بھی دیکھ رہا تھا کہ یہ کون ہے اور یہاں کیا ہوا ہے؟ کامران نے اس کی نظروں کو محسوس کر لیا اور دُور دیکھ کر تعارف کے لیے بولے۔

”یہ میری دوست مس سوزی ہیں۔ ان کے ساتھ ملاقات طے بھی تو میں نے سوچا دونوں کام ایک سہولت فرمائوں۔“ بات کے اختتام پر اس نے بائیں آنکھ کا کھسکا خیر انداز میں دبایا تو لطیف سومرہ ہنس دیا اور بولا۔

”تم تو اپنے جج سے بھی اوپر کی چیز دکھائی پڑتے ہو کامران سائیکس!“ کامران جواباً زبان سے کچھ نہیں بولا اور ہنسا ہوا اس کے ساتھ اندر پہنچ گیا۔ باربی اس کے ساتھ بھی اور یوں اپنے پیڑ سے کو سپاٹ کر دکھا تھا جیسے اسے وہاں ہونے والی منگلو طس بجھ نہیں آ رہی ہو۔

”سب ٹھیک ہے نا، کہیں کوئی خطرہ وغیرہ تو نہیں ہے؟“ اندر پہنچ کر ایک آرام دہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے

سے فون آنے پر میجر کی خاطر گھر سے نکل کھڑی ہوئی تھی۔ ربیکا کی حیثیت ہمارے نزدیک شہید سپاہی کی سی ہے اور ہم اپنی قوم کے شہیدوں کو کبھی نہیں بھلاتے۔ ربیکا کے خون کے ایک قطرے کا حساب لینا ہم پر لازم ہے اور حساب لینے والوں میں تم بھی شامل ہو۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی ہے کہ شدید غم کے باوجود تم اپنے فرض سے غافل نہیں ہوئے اور ربیکا کی آخری رسومات سے فارغ ہوتے ہی اپنی ڈیوٹی پر واپس آ گئے ہو۔ کہو کیسا جمل رہا ہے تمہارا کام۔ کچھ کامیابی ملی؟“ معاذ کے کانوں میں پڑنے والی نسوانی آواز اسے شناسائی محسوس ہو رہی تھی لیکن فی الوقت دماغ تجزیہ کرنے سے قاصر تھا کہ یہ آواز کس کی ہے اور اس نے پہلے کہا اس کی ہے؟

”کام چل پڑا ہے۔ آج اس نے میری دی سیٹھن ایک سیٹھن کے لیے۔ بہت جلد یہ اپنے ملک و قوم کے لیے ایک چلنا چلنا بن جائے گا۔“ بریفنگ کے بعد جو جواب دیا اسے سن کر معاذ کے دل میں ”بھئی نہیں“ کا نعرہ لگا یا لیکن دماغ اب بہت تھک چکا اور وہ چاہنے کے باوجود مزید جانتے رہنے سے قاصر تھا۔ ایک دھند سی کھجور بارحواں پر حملہ آور ہو رہی تھی۔ آخر کامران نے اس کی اور وہاں جا کر منگلو سے بے نیاز گہری نیند میں ڈوبنا چلا گیا۔

☆☆☆

کامران یزدانی کے ساتھ اس کی شاندار گاڑی میں کیا جانے والا طویل سفر باربی کے لیے کسی طور خوش گوار نہیں تھا لیکن اس نے اپنے چہرے سے اپنی ناگواری کا احساس نہیں ہونے دیا اور ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ سجائے سب کچھ نہایت حوصلے سے برداشت کرتی رہی۔ کامران اس کے ساتھ کی وجہ سے اتنے خوش گوار موڈ میں تھا کہ اس نے راستے میں بھی شغل جاری رکھا تھا۔ اس کے ساتھ پچھلی سیٹ پر براہجان باربی اس کے منہ سے اٹھتے شراب کے بھبکوں کو کیسے برداشت کر رہی تھی، یہ اس کا دل ہی جانتا تھا۔ اڑکنڈیشنڈ گاڑی کی وجہ سے سارے شیشے بھی بند تھے اور اسے کہیں کھل کر سانس لینے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ اس پر اسے کامران یزدانی کی بے ہودہ حرکات برداشت کرنے کے جبر سے بھی گزرنا پڑ رہا تھا۔ اپنے تئیں وہ اس کے ساتھ عشق بگھار رہا تھا لیکن یہ تو وہ ہی جانتی تھی کہ وہ کس اذیت سے گزر رہی ہے۔ خدا خدا کر کے طویل سفر اپنے اختتام کو پہنچا اور وہ لوگ خاصی حد تک ویران پڑے ایک علاقے میں تعمیر شدہ ریٹ ہاؤس نما عمارت میں پہنچے۔ عمارت میں

”خطرہ کیسا؟ سب جگہ معاملات طے ہیں۔ پارٹی خود یہاں تک آکر ڈیپجوری دے گی اور آگے ہم مال کو طے شدہ طریقے کے مطابق سپلائی کر دیں گے۔ میں نے تو سائیکس حیات یزدانی سے کہا تھا کہ اگر وہ نہیں آسکتے تو کوئی کھل نہیں ہے، میں سب سنبھال لوں گا لیکن پھر بھی انہوں نے آپ کو بھجوا دیا۔“

”ڈیڑی چاہ رہے تھے کہ مجھے بھی کام کا تجربہ ہو جائے، اس لیے اس بار انہوں نے مجھے بھجوا دیا۔“ کامران یزدانی نے اس سے بہانہ بنایا۔ حقیقت وہ جانتا تھا کہ اس کے باپ نے اسے آنے والے مال کی وصولی کے لیے بلکہ اس چیز کی وصولی کے لیے بھیجا ہے جو اس مال کی آمد میں تاخیر ہو چکی ہے اور جس کی ہوا سو مرو کو بھی نہیں لگے دیتی ہے۔

کریں۔ کوئی ایسی نیک سوز یا بوس شوق "سومرو ایک بار پھر میزبانی کے فرائض انجام دینے لگا۔

”کھانا دانا تو ہم نے کھالیا تھا، یہی ہے لو اگر دلائی علی
تو چل جائے گی۔“ کامران نے اسے جواب دیا۔

”اس کی عمر نہ کرو۔ ادھر ایک سے بڑھ کر کچھ ملتی ہے۔ دیکھی کو تو ہم منہ ہی نہیں لگاتے۔“ سوہر نے فخر سے جواب دیا اور ملازم کو آواز دے لگا۔

”سپلائی ملنے میں کتنی دیر ہے؟“ کامران نے ملازم کے آؤر ڈرے جانے کے بعد دریافت کیا۔

”بس پون گھنٹا لگے گا۔ میرے آدمی علاقے میں پہلے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں کے جانچنے سے پہلے میں اطلاع دے دیں گے۔“ سوہرو نے جواب دیا۔ اسی وقت اس کا ملازم شراب نوشی کے جملہ لوازمات سے سچی ٹرائی دھکیلا ہوا وہاں لے آیا۔ یقیناً ٹرائی پہلے سے تیار تھی اور محض برف کے کیوبز کے اضافے کے ساتھ پیش کر دی گئی تھی۔ شہر سے اتنی دور آبادی سے بالکل الگ تھلک جگہ پر اتنی سہولیات کی موجودگی محض میرے کا کھیل تھا۔ بجلی نہ ہونے کے باوجود وہاں جزیئر سے بلا فصل بجلی کی فراہمی جاری تھی اور آرام سے جگمگ میں منگل مٹا پایا جاسکتا تھا۔

”بھی کسی طرف سے یہاں موجود افراد کو چیک کرنے یا ان کی موجودگی پر اعتراض کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی کیا؟“ کامران نے اپنے لیے ایک چیک تار کیا اور

”بتایا تاکہ ہر طرف سینک ہے۔ کبھی کسی طرف سے پینٹنگ ہو بھی تو کہہ دیتے ہیں کہ شکاری ہیں اور شکار کرنے آئے ہیں۔ ادھر آس پاس چھوٹا شکار اچھا مل جاتا ہے اس لیے کوئی زیادہ خشک نہیں کرتا۔ کسی سر پھرے سے واسطہ پڑ جائے تو اسے بھی راستے میں تھوڑا بہت مال پکڑوا کر مطمئن کر دیتے ہیں۔ اس جگہ پر کبھی کسی کو خشک نہیں پڑنے دیا اور سارا دھندلا بڑی کامیابی سے چل رہا ہے۔“ کامران کے سوال پر پوچھنے پر وہ جواب تو دے رہا تھا لیکن گا ہے بگا ہے باری پر کبھی یوں نظر ڈال لیتا تھا کہ جیسے کنفیوژ ہو کہ اس کی موجودگی میں یہ ساری باتیں کرنی بھی چاہئیں یا نہیں۔

تو یہ انگریزی کے سوا کوئی زبان سمجھتی نہیں ہے، دوسرے میری دوست ہے اس لیے اس سے کسی نقصان کا ڈر نہیں ہے۔" کامران نے اس کی بے چینی بھانپ کر اسے تسلی دی۔

اسی وقت سومرو کے موبائل کی بیل بجی۔ اس نے کال ریسیو کی اور دوسری طرف کی بات سننے لگا۔ جوں جوں وہ سنتا جا رہا تھا، اس کے چہرے کی رنگت بدلتی جا رہی تھی اور وہ پہلے سے بھی زیادہ سیاہ محسوس ہو رہا تھا۔ بات سننے کے دوران اس نے اندازاً تیز لہجے میں دو تین سوالات بھی کیے۔ گنگو کے پاس پہنچنے کے بعد اس نے پوچھا کہ کیا تو اس کے ماتھے پر پسینے کی دوندیں نہیں آ رہی مگر بے مضطرب محسوس ہو رہا تھا۔

”خجندیہ تو ہے سومرو صاحب؟“ کاروان، جس نے کیلنہر کے علاقے سے زیادہ بہت اندازاً کاظم کر لیا تھا، ہمدردی سے دریافت کرنے لگا۔

”خیریت نہیں ہے۔ کہہ رہا میں یہ۔“ جیسے کسی کو بھی
میں کہیں کہ کچھ لوگوں نے اس پر قہقہہ مارا ہے۔ ”اروہ بے
حد زخمی حالت میں اسپتال پہنچایا گیا ہے۔“ ”مرد نے
بھرا کی ہوئی آواز میں اسے جواب دیا۔

”یہ کیسے ہوا، کیا وہاں گارڈ نہیں تھے؟“ کاروان
نے حیرت سے دریافت کیا۔

”سب تھے، لیکن حملہ آوروں نے سب کو بے بس کر دیا۔ ابھی یہاں آنے کے بعد تو میری اس سے بات ہوئی تھی۔ وہ بالکل ٹھیک تھا اور کہیں کوئی گزربز محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ پھر نہ جانے اچانک کیسے یہ سب ہو گیا۔“ سومرو نے اپنا سر تمام لیا۔

”حوصلے سے کام لیں سومر صاحب اور چاہیں تو ابھی یہاں سے روانہ ہو جائیں۔ یہاں میں سب سنبھال لوں گا۔“

جگہ بھی کسی کی نظروں میں آئے۔

”میں پہلے بھی تمہاری یہ بات سن چکا ہوں پارا اور تمہیں بتا بھی دیا ہے کہ مال اتروانے کے پیچھے کوئی وجہ ہے۔ ویسے بھی ضروری نہیں کہ جو کچھ تمہارا سامان کرے وہی میں بھی کروں۔ میرا کام کرنے کا اپنا طریقہ ہے اور میں اسی طریقے کے مطابق کام کروں گا۔ اب تم یہاں سے جاؤ اور دس منٹ بعد ان گاڑیوں کو منگوا لو جن پر مال آگے جانا ہے۔“ کامران نے اس شخص کو درشت لہجے میں جواب دے کر حکم صادر کیا تو وہ ایک ٹپ کی ٹپکا ہٹ کے بعد وہاں سے ہٹ گیا۔ اس کے باہر نکلتے ہی کامران اپنی جگہ سے اٹھا اور دروازہ بند کرنے کے بعد ایک قطار میں رکھے کارٹن کی طرف بڑھا۔ وہ جس طرح ایک ایک کارٹن کو بغور دیکھ رہا تھا، اس سے صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے کسی مخصوص کارٹن کی تلاش ہے۔ پھر شاید اسے وہ کارٹن مل گیا۔ اس نے فوراً جیب میں ہاتھ ڈال کر تاجن تراش کے ساتھ خشک ننھا چاقو نکالا اور احتیاط سے کارٹن پر چڑھا کاغذ اتارنے لگا۔ کاغذ کا ایک حصہ اتارتے ہی اس نے اندر سے ایک مٹی سیاح چیز نکالی اور نکال کر اپنے پیس میں رکھ دی۔ پھر نہایت غایت سے پورا کاغذ اتارنے کے بعد اس کاغذ کو کوئی ٹکڑوں میں تقسیم کر کے اسے وہیں رکھے ایک بڑے سے آرائشی گال دان میں محفوظ دیا۔ کارٹن پر اندر مٹی سیاحی کاغذ چڑھا ہوا تھا۔ کامران نے ابھی اتارا تھا اور اس کاغذ کو پورا نکال کر اندر نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ کوئی کارروائی کی گئی ہے۔ اس نے اس کارروائی سے متعلق ہو کر کامران نے دروازہ کھولا دیا اور یہاں سے ایک سوٹے پر بیٹھ گیا۔ چند منٹ کے انتظار کے بعد وہی شخص بارہ اندر آئے۔ بارہ نے کامران سے بات کر کے ہوئے۔

”گاڑیاں آگئی ہیں۔“ اس نے آکر اس نے کامران کو اطلاع دی۔

”ٹھیک ہے تم مال لوڈ کروادو، میں اب کچھ دیر آرام کر دوں گا۔ تھوڑی سی رات باقی رہ گئی ہے۔ صبح بچھے دوسری بھی جانا ہے۔“ اس نے بے نیازی سے اس شخص کو حکم دیا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے کھڑے ہوتے ہی بارہ نے بھی اپنی جگہ سے حرکت میں آئی اور بیلی کی چال چلتی ہوئی واپس اس کمرے میں پہنچ گئی جہاں اسے ٹھہرایا گیا تھا۔ یہاں اس نے آرام کے بہانے آکر کچھ انتظامات پہلے ہی کر لیے تھے۔ کامران کمرے میں آیا تو وہ اسے ایک چوتھائی سنہری مشروب سے بھرا جام ہاتھ میں لیے بیٹھی دکھائی دی۔ اس

آپ کافی الحال اپنے بیٹے کے پاس پہنچنا بہت ضروری ہے۔“ کامران نے اس سے ہمدردی کا مظاہرہ کیا۔

”یہی ٹھیک رہے گا۔ میرے بندے یہاں موجود ہیں اور جانتے ہیں کہ انہیں کب کیا کرنا ہے۔ وہ سب سنبھال لیں گے۔ تم چاہو تو اندر بیڈروم میں آرام بھی کر سکتے ہو۔“ سومرونے اسے جواب دیا اور جلدی جلدی مزید ایک دو باتیں کہہ کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد کامران نے خود کو زیادہ ریٹیکس محسوس کیا اور انگریزی میں بارہ کی وساری تفصیل بتانے کے بعد شوخ لہجے میں بولا۔

”اچھا ہوا، بڑھا چلا گیا۔ خواجہ وہاں کہاں میں ہڈی بن کر بیٹھا ہوا تھا۔ اب ہم صبح تک آرام سے بیٹھ کر رہیں گے۔“ پہلے جس کام سے آئے ہو، اسے منالو۔ میں بھی یہی کر رہی ہوں۔“ بیٹھے بیٹھے کمرے کی اکثر مٹی کے اوکے اوکے جاؤ ایزی ہو جاتا ہے۔ یہ نہا گاؤں اور چرسے پر پڑی جاتی ہے۔ دیکھ کر وہ بھی یور ہو گیا ہوں۔“ کامران نے اسے جواب دینے کے ساتھ وہاں موجود ملازم کو حکم دیا کہ اسے بیڈروم میں پہنچا دے۔ آدھے گھنٹے بعد ہی وہاں وہ لپٹ کر گئی جو کہ کمرے کی انجام دی ہوئی دوران خود بخود ہی پیدا ہو جاتی ہے۔ فریش ہونے کے بعد بھانے بیڈروم میں جانے والی بارہ نے بھی اسے منالو محسوس کر لیا اور چپکے سے باہر نکل آئی۔ بیڈروم کے کمرے میں کوئی موجود نہیں تھا اور باہر کی جانب سے مددگار آوازیں آرہی تھیں۔ اس نے ایک کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا تو اسے ایک گاڑی اور چند متحرک انسانی چہرے نظر آئے۔ وہ بیولے نہایت خاموشی سے دیکھتا تھا اس گاڑی سے کوئی سامان اتار کر اندر لارہے تھے۔ وہ سامان کیا تھا، اسے اندھیرے میں قطعی اندازہ نہیں ہوا اور اس کے دیکھتے ہی دیکھتے خالی ہو جانے والی گاڑی اسے رٹ ہو کر وہاں سے روانہ ہو گئی۔ وہ تجسس سی ڈرائنگ روم کی طرف چل پڑی لیکن دروازے سے سیدھا اندر داخل ہونے کے بجائے کھڑکی سے اندر جھانکا۔ حسب توقع کامران بیڈروم میں وہیں موجود تھا اور کمرے میں موجود ایک دوسرے شخص کی طرف متوجہ تھا۔ وہ شخص کہہ رہا تھا۔

”میں آپ سے پھر کہوں گا سائیکس کہ آپ نے یہاں مال اترا کر ٹھیک نہیں کیا۔ سائیکس سومرون بھی ایسا رسک نہیں لیتے اور باہر ہی سے دوسری گاڑیوں میں مال لوڈ کروا کر جہاں بھجوانا ہو فوراً بھجوا دیتے ہیں کیونکہ وہ نہیں چاہتے کہ یہ

وقت اس کے جسم پر لہا گاؤں تھا اور نہ ہی سر پر چالی دھ
ہیٹ۔ اسے دیکھ کر کامران یزدانی کی رال کھینچنے لگی لیکن
ہٹا ہر محنت سے مسکرایا اور خوشوار لہجے میں بولا۔

”اسکیلا کیلے شغل چل رہا ہے۔“

”اور کیا کروں؟ تم نے تو یہاں لا کر مجھے اکیلا چھوڑ
دیا ہے اور خود نہ جانے کہاں مصروف ہو؟“ اس نے ایک ادا
سے شکایت کی۔

”ساری مصروفیت ختم ہو گئی ہے۔ اب سارا ٹائم
تمہارا ہے۔“ کامران مسکرا کر جواب دیتے ہوئے اس کے
مقابلہ بیٹھ گیا۔

”تمہارے لیے جام بناتی ہوں۔“ باربی نے ایسی
مسکری ہوئی کی طرح کہا جو ملازمت سے جھکے ہارے آنے
والے شخص کے لیے چائے تیار کرنے جارہی ہو۔

”بنادو، میرے اسٹریچ بہت زیادہ پی لی ہے۔“

”نہ تو پی کر بھی تمہارا کیا بڑا ہے۔ اتنے آرام سے
ہو بیسے شراب کی جگہ سو فٹ ڈرنک پیسے ہو۔“ باربی کا
یہ تبصرہ سن کر کامران ایک قہقہہ لگا یا اور بولا۔

”میرے لیے شراب سو فٹ ڈرنک بھی ہے۔ سولہ
سال کی عمر سے پی رہا ہوں اس لیے عادی بن گیا ہوں۔“

”پی کر بہک جانے والے تم طرف ہوتے ہیں۔“
باربی نے تبصرہ کیا اور ایک ڈبل پیگ پیوکر کے اس کی
طرف بڑھایا۔ کامران جو ہلکے ہلکے سرور میں تھا، اس کا
جام کے ساتھ ساتھ اس کا ہاتھ بھی تھام لیا۔

”ترتیب سے چلو مسٹر! پہلے شراب اور پھر شراب۔“
باربی نے اسے ٹوکا اور آہستہ سے اپنا ہاتھ چھڑوا لیا۔

”اب صبر نہیں ہوتا۔“ کامران نے کہا اور ایک
سانس میں پورا جام چڑھا گیا۔ ایسا کرنے سے اس کا سینہ
یقیناً جل اٹھا ہوگا لیکن اس نے پروا نہیں کی اور پہلے سے کئی
گنا زیادہ سرخ ہو جانے والی آنکھوں سے باربی کے جسم کو
ٹٹوتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھا اور اسے ایک جھٹکے سے اپنے
بازوؤں میں اٹھا لیا۔

”یہ کیا کر رہے ہو؟“ اس نے ہکا سا احتجاج کیا لیکن
کامران نے پروا نہیں کی اور اسے لے جا کر بیڈ پر ڈالنے
کے بعد خود اس کے اوپر گر گیا۔ اس کے منہ سے خارج
ہوتے بدبو کے بھبھکوں سے باربی کا منہ تلاتے لگا لیکن وہ
برداشت کر گئی کہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے اکثر ناگوار
باتوں کو برداشت کرتا ہی پڑتا ہے۔ وہ بھی کامران یزدانی
کے کریسمہ جود کو اپنے قریب برداشت کر رہی تھی۔ وہ اپنے

ہاتھوں اور ہونٹوں سے اس کے خوبصورت و نازک بدن کو
ٹٹوتا اس کے شاب کا سرور اپنے وجود میں منتقل کرنے کی
کوشش کر رہا تھا لیکن وہ جانتی تھی کہ اسے اپنے اس مقصد
میں کامیابی حاصل نہیں ہوگی۔ ذرا دیر میں وہی ہوا جو ہونا
تھا۔ کامران یزدانی کی حرکات و سکنات سست پڑنے لگیں
اور دھیرے دھیرے وہ مکمل مدہوش ہو گیا۔ باربی نے ابھی
تک خود پر نکلا اس کا بازو نفرت سے جھٹکا اور بستر سے اتر کر
سب سے پہلے اس کا والٹ اپنے قبضے میں لیا۔ والٹ کی
حفاظتی لینے پر وہ ننھی سی سیاہ شے اس کے ہاتھ میں آگئی جسے
اس نے کامران یزدانی کو کارڈن کی پینٹنگ سے نکالنے
ہوئے دیکھا تھا۔ وہ اصل میں ایک میموری کارڈ تھا جو اسے
اپنی مددگار ہستی کے تعاون کے بدلے اس تک پہنچاتا تھا۔
اس میموری کارڈ کو اپنے پاس محفوظ کرنے کے بعد اس نے
اپنے کچھ میں سے وہ ننھی سی ٹیوب نکالی جس میں کامران
یزدانی کی موت کا سامان موجود تھا۔ دھاتی باریک سوئی نے
وہ موت اس کے جسم میں منتقل کی، تب بھی وہ حیرے سے سوتا
رہا اور کسمایا تک نہیں۔ شراب میں شامل بے ہوشی کی دوا
نے اس کی سدھ بدھ ہی ختم کر دی تھی۔ اپنے کام سے فارغ
ہونے کے بعد باربی نے اٹیچڈ ہاتھ کارڈ نکال کر اور خوب رگڑ
رگڑ کر غسل کرنے لگی۔ اس طرح وہ اپنے جسم سے اس ناویدہ
موت کو اپنے بدن کی کوشش کر رہی تھی جو کامران یزدانی کے
اس کا جسمی۔ طبعی غسل لے کر نکلنے کے بعد وہ خود کو کافی
تازہ دم اور صحت مند محسوس کر رہی تھی۔ سورج طلوع ہو کر ہر
طرف اپنی اپنی پوری طرح پھیلا چکا تھا، تب اس نے کامران
کو جگہ کے کئی کوشش شروع کی لیکن کچھ نہ ہونے جانے پر بھی وہ
مدہوشی کی کیفیت میں تھا۔ اس نے کہاں موجود اس کو بلایا
اور تھکانہ لہجے میں بولی۔

”تمہیں پی کر مدہوش ہو چکا ہو والوں کی ہوش میں
لانے کا تجربہ ہوگا۔ اسے بھی کوئی لینس جوس، ہلکے کافی وغیرہ
دیا کر ہوش میں لانے کی کوشش کرو تا کہ ہم واپس جا سکیں۔
دیکھو جب تک یہ ہوش میں آئے، میرے لیے ناشا کے
آؤ۔ میں ڈائننگ روم میں انتظار کر رہی ہوں۔“ ملازم
انگریزی دان نہیں تھا لیکن اکثر بڑے لوگوں کی خدمت
کرتے رہنے کی وجہ سے انگریزی کے چند الفاظ ضرور سمجھ
لیتا تھا۔ کچھ بات اس نے لینس جوس اور بریک فاسٹ کے
الفاظ سے سمجھی اور زیادہ اندازہ صورت حال کو سمجھ کر لگا یا کہ
وہ اس سے کیا چاہتی ہے چنانچہ تیزی سے حرکت میں آ گیا۔
پندرہ منٹ کے اندر ڈائننگ روم میں بیٹھی باربی کو ناشا بھی

شہ زور

”خامسے نازک مزاج نکلتے ہو۔ خیر گھر پہنچ کر بخار کے لیے کوئی میڈیسن لے کر سو جانا۔ ایک دو دن آرام کرو گے تو طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔“ باربی نے طنزیہ لہجے میں اسے مشورہ دیا تو وہ پہلو بدل کر رہ گیا لیکن زبان سے کچھ نہ بولا۔ اس کی یہ خاموشی باقی ماندہ سفر کے دوران بھی قائم رہی بلکہ آخر میں تو اس نے پشت گاہ سے سرٹکا کر آنکھیں ہی بند کر لیں۔

”اگر آپ کہیں سر تو پہلے کسی اسپتال چلتے ہیں!“ گاڑی شہر کی حدود میں داخل ہوئی تو ڈرائیور نے اس کی حالت دیکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”نہیں! پہلے میڈم کو ان کے ہوٹل ڈراپ کر دو۔ میں گھر جا کر شاہد اور لوں گا اور ٹھوڑی دیر آرام کروں گا تو طبیعت سیٹ ہو جائے گی۔“ کامران نے انکار کرتے ہوئے سخت لہجے میں ڈرائیور کو ہدایت دی تو وہ مزید اصرار کی ہمت نہیں کر سکا۔ باربی جیسے لمبے گاؤں اور جالی دار ہیٹ میں کافی حد تک خود کو چھپائے کامران کے ساتھ ہوٹل سے روانہ ہوئی تھی، ویسے ہی اس کی واپسی بھی ہوئی اور کامران اس پر حسرت زدہ سی نظر ڈال کر رہ گیا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر باربی نے ہیٹ اور گاؤں اتار کر پھینکا اور جلدی سے اپنے کمرے میں ٹھونسا سیوری کارڈ باہر لٹالا۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اس سیوری کارڈ میں کیا ہے جو موٹا پاؤ کی سرحد سے آسٹل ہو کر آئے ہوئے مال کے ساتھ اسے خفیہ طور پر یہاں بھیجا گیا ہے۔ اس کے حصول کے لیے سو نیا خان بھی بے چین ہے۔ وہ سیوری کارڈ نکال کر اسے لپ ٹاپ میں لگانے ہی جا رہی تھی کہ اس کا موبائل بجنے لگا۔ سکرین پر سو نیا خان کا نام چمکا رہا تھا۔ وہ چاہ کر بھی اس کا کال کوئلہ انداز نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ طبیعت ٹھیک رہا ہی نہ اس کال کو ”ہیں“ کرنا پڑا۔

”کیسی ہو ڈارلنگ! کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی سفر میں؟“ تم آرام سے واپس آگئی ہو نا؟“ سو نیا خان کے جملوں نے اس پر واضح کر دیا کہ وہ اس کی واپسی سے آگاہ ہے اور وہ کسی بہانے اسے ٹال نہیں سکتی۔

”اپوری تھک ازاو کے۔“ اسے جواب دینا پڑا۔ ”گڈ! اس کا مطلب ہے کہ تم اپنے اور ہمارے مشن میں کامیاب لوٹی ہو۔ ابھی سفر کی ٹھکن اتارنے کے لیے آرام کرو، پھر کامیابی کا جشن منانا۔ تمہارا آج کا شو میں نے کیٹل کر دیا تھا اس لیے آج تم فری ہو گی۔“ سو نیا خان کے الفاظ نے اسے اطمینان دلایا کہ آج وہ فارغ ہے اور

مل گیا اور کامران یزدانی کو ہوش میں لانے کی تدبیریں بھی شروع ہو گئیں۔ ان تدبیروں کے نتیجے میں وہ ایک گھنٹے بعد اس لائق ہو چکا تھا کہ سفر کر سکے لیکن ٹھکن اور سستی کی شکایت ابھی جگہ تھی۔

”تم ضرورت سے زیادہ پی گئے تھے اس لیے اپنے حواس قائم نہیں رکھ سکے۔ گھر جا کر آرام کرنا تو سستی اور ٹھکن دور ہو جائے گی۔ میں اب مزید اس جگہ رک کر بور نہیں ہونا چاہتی۔“ باربی نے نروٹھے لہجے میں اس سے یہ سب کہا تو وہ شرمندہ ہو گیا اور وضاحت دینے والے انداز میں بولا۔

”شاید میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور سفر کی ٹھکن بھی ہو گئی ہے جب ہی ایسا ہو اور نہ میں ان لوگوں میں سے تو نہیں ہوں۔“ اس نے اپنے حواس کو دہیٹے ہیں۔

”سفر کے تجربے نے تمہارے دعوے کو جھٹلا دیا ہے۔“ کامران نے یزدانی ابھی حال نقصان تو تمہارا ہی ہوا کہ تم نے اپنے پائس مس کر دیا۔ اب کسی میں تمہیں دستیاب نہیں ہوں گی۔“ کامران کے یہ الفاظ کہتے ہوئے باربی کے ہونٹوں پر ایک غیر محسوس ہٹاک مسکراہٹ ابھری تھی۔

”ہاں! اس کا تو مجھے بھی افسوس ہے لیکن کہتے ہیں کہ یار زندہ محبت باقی۔ ہوسنا ہے کہ زندگی میں پھر بھی ہماری ایک دوسرے سے ملاقات ہو جائے۔“ کامران نے گویا خود ہی کو دلاسا دیا۔

”اب تو شاید ہمارا سامنا روزِ حشر ہی ہو سکے۔“ باربی نے زیر لب بڑبڑائی پھر بلند آواز میں بولی۔ ”میرے خیال میں یہاں مزید وقت ضائع کرنے کے بجائے ہمیں روانہ ہو جانا چاہیے۔ سفر لمبا ہے اور مجھے ہوٹل پہنچ کر آرام کرنے کے بعد ٹائٹ شو کے لیے تیار بھی ہونا ہے۔“ اس کی اس بات کے بعد بعد وہ لوگ فوراً ہی روانہ ہو گئے۔ گاڑی حسب سابق ڈرائیور ہی چلا رہا تھا اور کامران یزدانی اس کے ساتھ پچھلی نشست پر بیٹھا ہوا تھا لیکن اب اس کی طبیعت میں وہ پہلے سی چونچالی باقی نہیں رہی تھی۔ وہ سست اور نڈھال سا محسوس ہو رہا تھا۔ آدھا سفر گزرا تو قریب بیٹھی باربی نے اس میں آنے والی تبدیلی کو محسوس کیا۔ اس کا جسم گرم ہو رہا تھا اور چہرے اور آنکھوں کی سرخی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔

”تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے مسٹر کامران؟“ اس نے دریافت کیا۔

”نہیں۔ میں بہتر محسوس نہیں کر رہا ہوں۔ ایسا لگ رہا ہے کہ مجھے بخار چڑھ گیا ہے۔“ کامران نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

چاہے تو آرام سے بھی اس میوڑی کارڈ میں موجود مواد کو دیکھ سکتی ہے لیکن اس کا اگلا ہی جنم اس کے لیے دھماکا ثابت ہوا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

”او کے! اب میں فون بند کرتی ہوں۔ ابھی تمہارے کمرے کے دروازے پر دستک ہوگی۔ تم کامران سے حاصل ہونے والا میموری کارڈ باہر موجود شخص کے حوالے کر کے خود ریلیکس ہو جانا۔“

سونیا خان کے جیلے کے اختتام کے ساتھ ہی کال منقطع ہوئی اور دروازے پر زوردار دستک دی گئی۔ وہ اپنے پیروں کو مٹکتی ہوئی دروازے تک گئی۔ میموری کارڈ اس کے ہاتھ میں ہی تھا جو اس نے میکا کی انداز میں باہر کھڑے شخص کے انتظار میں صاف دیا اور خود بوجھل دل کے ساتھ بستر پر آکر لیٹ گئی۔ سونیا خان کی ہمتی پھرتی نے اسے مایوس سا کر دیا تھا۔ وہ گویہ سنی کر اس کی مدد لینے کے لیے تیار ہوئی تھی کہ اپنا کام مکمل کر لیتی رہے گی اور ایسا معاملہ حل کر کے قانون نافذ کرنے والے ادارے تک بھی پہنچائی رہے گی جو سونیا خان اور داراب جیسے لوگوں کی سچائی میں کار ثابت ہو لیکن سونیا خان نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ سچی پر پوری طرح رکتے ہوئے ہے اور اس کے لیے اس کی مرضی کے خلاف کچھ کر کر رہا آسان نہیں ہوگا۔ اس معاملے میں اپنی رہے ہوئے احساس اپنی جگہ تھا اور کارمان بزدانی کے ساتھ ہرچہ کرانی

تھی اس کی خوشی اپنی جگہ۔ سو متفاد کیفیات میں گھر سے کسی نہ کسی طور اسے نیند آئی تھی۔ صبح اور شب بیداری نے اس نیند کو گہرا بھی کر دیا۔ اس کی آنکھ کھلی تو شام کے سائے لمبے ہو رہے تھے۔ اس نے روم سروں کو چائے کے ساتھ سینڈوچز کا آرڈر دیا اور خود فریش ہونے باتھ روم میں چلی گئی۔ اس کی واپسی تک دونوں چیزیں آچکی تھیں۔ ریوٹ سے ایل ای ڈی کھول کر وہ مختلف نیوز چینلز سرچ کرنے لگی۔ زیادہ تر چینلز سے ایک جیسی ہی خبریں پیش کی جا رہی تھیں۔ ایک چھوٹے چینل پر آکر اس کی آنکھوں کی حرکت رک گئی۔ اسکرین پر حیات یزدانی کی شکل دکھائی دے رہی تھی اور نیوز ریڈر بتا رہی تھی۔

کمرے میں سونے چلے گئے۔ چار پانچ گھنٹے بعد ان کی والدہ خبر گیری کے لیے ان کے کمرے میں گئیں تو انہوں نے دیکھا کہ کامران یزدانی کے منہ، ناک اور کانوں سے خون بہہ رہا ہے۔ فوری طور پر انہیں اسپتال منتقل کیا گیا جہاں ڈاکٹروں نے طبی امداد دے کر ان کی جان بچانے کی سرکوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے اور کامران یزدانی انتقال فرما گئے۔ اسپتال ذرائع کے مطابق خون کے نمونوں کے تجزیے سے پتا چلا ہے کہ کامران یزدانی کانگو وائرس یا اس سے ملتے جلتے وائرس کا شکار ہوئے تھے۔ وائرس کا حملہ اتنا شدید تھا کہ انہیں مہلت ہی نہیں مل سکی۔ کامران یزدانی کی موت نے محکمہ صحت کی کارکردگی پر کئی سوالیہ نشان لگا دیے ہیں..... "نیوز ریڈر پولیسی جاری تھی لیکن اسے مزید کچھ سننے سے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ ساکت بیٹھی اسکرین پر نظر آنے والے مناظر دیکھ رہی تھی۔ وہ حیات یزدانی جو فرعون کی طرح گردن اٹھائے گھومتا تھا اور جس نے کبھی اس بات کی پروا نہیں کی تھی کہ اس کے مفادات کے حصول کے لیے کتنی انسانی جانیں داؤ پر لگائی جاتی ہیں، سفید چادر کے نیچے موجود اپنے جوان بیٹے کی لاش کے ساتھ غمزہ سا کھڑا تھا۔ کبھی ایسی سخت دل نہیں رہی تھی لیکن آج حیات یزدانی کے مرنے سے خوشی بخشی اور ہلکی سی "ہونہہ" کے ساتھ پیتل بدل گئی اور اگلے لمحہ چڑ سے لطف اندوز ہونے لگی۔

☆ ☆ ☆
شاہ کا جواب پونہمی میں تھی۔ جانے کہاں سے
ایک گول اس فن شاس شخص کا تھی۔ عالم شاہ وہاں سے
نکل آیا تھا اور اب اپنے بڑے سے سوال جواب میں
مصروف تھا۔

”کیا پتا چلا سرمد؟“ قصہ کے بے چین سے عالم شام نے سرمد کی صورت دکھائی دیتے ہی اس سے سوال کیا۔
”خبر ٹھیک تھی سائیکل! وہ غبیث بھی تھا ہے۔ بے نو
ابھی آئی سی یو میں ہی لیکن ڈاکٹر زاس کی زندگی کے لیے
بہت پُر امید ہیں۔“ سرمد نے نیچے ہوئے لہجے میں اس کی
بات کا جواب دیا۔

”کمال ہے۔ میں نے اسے اتنے نازک مقامات پر
گولیاں ماری تھیں پھر بھی وہ بچ گیا۔ بڑی ہی ڈھٹ
ہے۔“ جواب سن کر عالم شاہ بڑبڑایا۔

”آپ کہیں تو اسپتال میں ہی اسے خاموشی سے ختم کروانے کی کوشش کروں۔ ہوش میں آنے کے بعد تو وہ سب اگل دے گا اور ہمارے لیے مشکل ہو جائے گی۔“

سرد نے پریشانی سے پوچھا۔

”نہیں۔ جب قدرت نے اسے زندہ رہنے کا ایک موقع دیا ہے تو یوں اسے بستر پر مروانا ٹھیک نہیں ہے۔ اسے پوری طرح ہوش میں آنے دو، پھر جو حالات ہوں گے، ان کے مطابق ایکشن لیں گے۔ ابھی تو ہمیں اور دوسرے اہم کام بھی انجام دینے ہیں۔“

”کون سے کام سائیں؟“ سرد چونکا۔

”بھروسوں کی لسٹ تکمیل سومرو پر تو ختم نہیں ہوئی تھی۔ ابھی مجھے اور دوسرے لوگوں سے بھی حساب لینا ہے۔ شکی کی جیٹی کو درغلانے والا بندہ تویر، ادا معظم کے اغوا اور قتل میں تکمیل سومرو کا ساتھ دینے والے ڈاکو چاچا کا گروہ اور تکمیل سومرو کے میرے یار معاذ کا سودا کرنے والے یزدانی اور سلطان اللہ صاحب کتاب کرنا ہے ابھی۔“ عالم شاہ نے اسے جواب دیا۔

”آپ خود کو خالص میں جھک رہے ہیں سائیں۔ بڑے سائیں کو خیر میں تو مجھ پر سخت دھکے ہوں گے۔“ سرد اس کے ارادے جان کر پریشان ہوا۔

”تم چاہو تو خود ان محظروں سے الگ کر سکتے ہو۔“ عالم شاہ نے ساٹ لہجے میں جواب دیا۔

”ایسے تو مت بولیں سائیں۔ مہری جان آپ سے قربان۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ خود درگاہ سے دور رہیں۔ باقی جو کچھ کرنا ہے اس کے لیے میں سلاہ ہوں۔“ سرد اس کی بات پر تڑپ ہی گیا اور اہٹا کرنے والے انداز میں بولا۔

”بندے کی جان جانی ہو تو بیٹھے بٹھائے بھی مرجاتا ہے اور زندگی بچنی ہو تو جنگ کے میدان سے بھی زندہ سلامت لوٹ آتا ہے۔ بات صرف اتنی ہوتی ہے کہ اللہ نے بندے کی کتنی زندگی لکھ رکھی ہے۔ اب یہی دیکھ لو کہ تکمیل سومرو تین تین گولیاں کھا کر بھی بچ گیا کہ نہیں۔“ اس نے اپنی دلیل سے سرد کے لیے بحث کی راہ بند کر دی۔ ویسے بھی سرد زیادہ بحث نکرار کرنے والا بندہ نہیں تھا اور اس کے حکم کی تعمیل کو اپنا سب سے اہم فرض سمجھتا تھا۔

”بھڑکیا چاہتے ہیں آپ؟ لسٹ میں موجود کس نام پر سب سے پہلے کام کرنا ہے؟“ حسب امید وہ فوراً ہی قائل ہو گیا۔

”خویر تو صرف ایک مہرہ تھا، اس لسٹ میں اس کی اہمیت سب سے کم ہے اس لیے اسے توفی الحال رہنے ہی دو۔ ابھی ہمیں چاچا، یزدانی اور عرفان اللہ وغیرہ میں سے کسی کی سلیکشن کرنی ہے کہ کس سے پہلے نمٹا جائے۔ میں تو سب سے

پہلے یزدانی اور عرفان اللہ سے دو دو ہاتھ کرنا چاہتا ہوں۔ تکمیل سومرو نے معاذ کا سودا ان لوگوں سے کیا تھا اور مجھے ان سے معلوم کرنا ہے کہ اب معاذ کہاں ہے۔ دوستی کا فرض اپنی جگہ میں تو اپنی جگہ مقرر و مقرر بھی ہو گیا ہوں کہ معاذ نے کل اور ادا معظم کو ڈاکوؤں کے چنگل سے نکالنے کے لیے خود اپنے آپ کو داؤ پر لگا دیا تھا۔“ عالم شاہ کا دل معاذ کا ذکر کرتے ہوئے بوجھل سا ہو گیا تھا۔ ان کی دوستی کا دورانیہ زیادہ نہیں تھا لیکن معاذ کے لیے اس نے ہمیشہ اپنے دل میں خاص جگہ محسوس کی تھی اور ہمیشہ اس بات پر افسردہ رہتا تھا کہ وہ معاذ کے لیے اتنا کچھ نہیں کر سکا تھا جتنا اسے کرنا چاہیے تھا۔

”یزدانی اور عرفان اللہ معمولی لوگ نہیں ہیں سائیں! باہر نکلتے ہیں تو ان کے ساتھ ان کی سکیورٹی بھی ہوتی ہے۔ ان میں سے کسی پر ہاتھ ڈالنے کے لیے ہمیں فول پروف پلان بنانا ہوگا۔ کل ہی یزدانی کا بیٹا مرا ہے۔ اس کے ارد گرد تو ویسے ہی لوگوں کا ہجوم لگا ہوگا۔ عرفان اللہ کی میں ریکی شروع کروا دیتا ہوں، پھر دیکھتے ہیں کہ کیا راہ نکلتی ہے۔ چاچا کے لیے بھی خبر لگانے ہوں گے۔ وہ جنگل اور شہر میں سے کسی بھی جگہ پایا جاسکتا ہے۔“

”جو کرنا ہے کرو۔ مجھے صرف نتائج سے مطلب ہے۔ کچھ نہیں معلوم کہ تکمیل سومرو نے ہوش میں آنے کے بعد کس صورت میں رہ رہی ہوئی ہے اس لیے ہمیں جو بھی کرنا ہے، جلدی کرنا ہے۔“ عالم اللہ نے اسے ہدایت دی۔

”بھڑکیا چاہتے ہیں آپ؟ لسٹ میں موجود کس نام پر سب سے پہلے کام کرنا ہے؟“ حسب امید وہ فوراً ہی قائل ہو گیا۔

”خویر تو صرف ایک مہرہ تھا، اس لسٹ میں اس کی اہمیت سب سے کم ہے اس لیے اسے توفی الحال رہنے ہی دو۔ ابھی ہمیں چاچا، یزدانی اور عرفان اللہ وغیرہ میں سے کسی کی سلیکشن کرنی ہے کہ کس سے پہلے نمٹا جائے۔ میں تو سب سے

نے اس شاہک سینئر پردھاوا بول رکھا ہو۔ ہنستے مسکراتے، خوش باش اور چپکے ہوئے جوڑے اور خاندان مسلسل عمارت کے اندر باہر آ جا رہے تھے۔ زیادہ تعداد اندر جانے والوں کی تھی۔ باہر بہت کم لوگ بکھل رہے تھے اور اسے اس بات سے مزید گمراہت ہو رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ کسی اونچی جگہ کھڑا ہو جائے اور چچی چچی کر لوگوں سے کہے کہ خدا ار اپنے گھروں کی محفوظ پناہ گاہ میں لوٹ جاؤ۔ یہ جگہ جہاں تم اپنے تئیں خوشیاں خریدنے آئے ہو موت نے اپنے رقص کے لیے منتخب کر لی ہے اور میں موت کا وہ ہرکارہ ہوں جو اپنی مرضی کے بغیر تم لوگوں میں موت بانٹنے آیا ہوں۔ ہاں اسے اسی لیے یہاں بھیجا گیا تھا۔ یہ اس کا ٹیسٹ کیس تھا کہ اپنے تئیں اس کے دماغ میں ملک، قوم اور مذہب کے خلاف نہ کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا اس لیے میڈم لوگ اسے یہ ذمہ داری سونپی تھی کہ وہ اس بڑے شاہک مال میں ناظم برآمدگی بن سکے۔ اسے آنکھوں پر پٹی باندھ کر اس کے سے نکالا گیا تھا جہاں وہ اتنے عرصے سے قید تھا۔ شہری ایک مصروف شاہراہ پر سے اتارنے سے قبل اس کی آنکھوں کی پٹی اتار دی گئی اور اسے کچھ دیر کے ساتھ بذریعہ جیسی شاہک مال پہنچنے کی ہدایت دے کر وہ لوگ وہاں سے رخصت ہو گئے تھے۔ شاہک مال میں اعتماد تھا کہ وہ ڈاکٹر وکٹر کے عمل کے زیر اثر کسی حکم سے مر جائے گا۔ یہ سچا کرے گا اور نہ ہی کہیں بھاگنے کی کوشش کرے گا۔ یہ بات کہ وہ اس مصروف شاہراہ پر کھڑا شدت سے ان دونوں کاموں کی خواہش کر رہا تھا لیکن ایک طرف اپنے پیادوں کی محبت نے ہاتھ بندھ کر رکھے تھے تو دوسری طرف اسے یقین تھا کہ اسے یوں آزاد چھوڑ دینے کا محض ڈراما کیا گیا ہے اور اصل میں نگرانی کا پورا انتظام موجود ہوگا۔ ایسے میں اسے جو بھی کرنا تھا، بہت سوچ سمجھ کر کرنا تھا اور ان لوگوں کو یقین دلانا تھا کہ وہ پوری طرح ڈاکٹر وکٹر کے اثر میں ہے۔

ڈاکٹر وکٹر ملک، قوم اور مذہب کے حوالے سے اس کے ذہن میں جو زہر بھرنے کی کوشش کرتا رہا تھا، اس نے اس پر ان لوگوں کے عزائم پہلے ہی واضح کر دیے تھے اور وہ کیرتھر کی انوکھی دنیا میں بننے والے فیضو کا احسان مند تھا کہ اس نے اسے ایک ایسا غم سونپ دیا تھا جس نے اسے وکٹر کے جال میں پھنسنے سے بچالیا تھا۔ وکٹر کی کوششوں کے دوران اس پر یہ انکشاف بھی ہو گیا تھا کہ وہ لوگ اسے ہٹائزم سکھانے کا محض جھانسا دے رہے تھے تاکہ وہ اس لالچ میں ان کے ساتھ عمل تعاون کرے۔ حقیقت میں وہ

اسے ایسا کوئی علم سکھا کر اپنے پیروں پر کھڑی نہیں مار سکتے تھے۔ وکٹر ایک رواجی پٹائٹ تھا جسے اپنے عمل کے بہترین نتائج کے لیے معمول کا تعاون درکار ہوتا ہے۔ وہ کیرتھر کے پہاڑوں میں بسنے والا غیر معمولی فیضو نہیں تھا جو ماں کے بطن سے ہی غیر معمولی صلاحیتیں لے کر پیدا ہوتے ہیں اور جن کی صلاحیتوں کی نمونفطرت کرتی ہے۔ اس غیر معمولی فیضو کا فیض تھا کہ وہ وکٹر کو جھانسا دینے میں کامیاب رہا تھا لیکن اب ایک امتحان سے دوچار تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے جو کام سونپا گیا ہے وہ کروانے والوں کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ ایسا کام کسی بھی عام سے تربیت یافتہ شخص سے بھی کروایا جاسکتا تھا۔ انہوں نے اسے یہ کام سونپا تھا تو صرف اس کی آزمائش کے لیے اور وہ اس آزمائش سے بہت خوبی سے گزر جانا چاہتا تھا۔

ذہنی کشش سے گزرتے ہوئے ہی اس نے جیسی سے اس شاہک مال تک کا سفر طے کیا تھا اور چند لمبے باہر کھڑے رہنے کے بعد میڑھیاں چڑھ کر اندر داخل ہو گیا تھا۔ اندر رنگ، خوشبوؤں اور چمکتی آوازوں کا ایک سیلاب سا اندر رہا تھا۔ اس نے مسرت سے چپکتے، زندگی کی رحمتیوں سے پُر آنسو چہروں کو دیکھا اور سوچا کہ کیا میں ان افراد کو اپنے ہاتھوں میں لے کر ان کی آغوش میں دھکیل سکتا ہوں؟ جو اب یقیناً غمی میں تھا لیکن اس کام کے لیے بھیجا گیا تھا اس کی تکمیل سے انکار بھی ممکن نہیں تھا۔ خود کار بند نے کے ذریعے شاہک مال کی دوسری منزل پر پہنچ کر بھی وہ اس سیلے میں غور کرتا رہا اور آخر کار اس نے سچے پرکھ کر اسے یہ ناظم وہاں چھوڑ دیا ہوگا۔ اس شاہک مال کو تباہی سے بچانے کے بس میں نہیں تھا۔ اس فیصلے پر پہنچنے سے پہلے ہی عقلانی نقطہ نظر سے اسے ارد گرد کا جائزہ لیا اور بچوں کے آنکھوں سے ایک سرک کے سائڈ میں اس خلا کو تازہ کیا جہاں اس کا بریف کیس بچہ سانی سانس لے رہا تھا۔ اس ریک کے پاس رک کر اس نے بریف کیس اٹھایا۔ بچروں کے پاس رکھا اور ریک میں سبھی اشیاء ایک ایک کے یوں اٹھا کر دیکھنے لگا جیسے ان میں سے کسی شے کو خریدنا چاہتا ہو۔ میز مین اس وقت کچھ بھی سنواری خواتین اور ان کے ساتھ موجود نٹ کھٹ بچوں کے ساتھ بری طرح الجھا ہوا تھا اس لیے اس کی طرف اس کی توجہ نہیں گئی۔ اس نے چیزیں اٹھا اٹھا کر دیکھتے ہوئے ہی نہایت ہوشیاری سے بریف کیس کو پیر سے اس خلا میں دھکیل دیا اور ہلکا ہوا اس جگہ سے دور ہٹ گیا۔ اب اس کا رخ بینک وائش روڈ کی طرف تھا۔ یہ بہت مہنگا شاہک مال تھا اس لیے وائش روڈ صاف

ڈسٹ بن میں اپنے پاس موجود موبائل کو اس پھرتی اور صفائی سے پھینکا کہ کسی کو اندازہ بھی نہیں ہو سکا ہوگا کہ ہزاروں کا قیمتی موبائل ایسی ناقدری کا شکار ہوا ہے۔ اس موبائل سے جو کام لیا جاتا تھا، وہ لے چکا تھا اور اسے اپنے ساتھ باہر لے جانے کا رسک نہیں لے سکتا تھا اس لیے ایسا کرنے پر مجبور تھا۔ باہر نکلتے ہی اس نے اپنے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ فوراً ہی ایک نیکیس ریٹلی ہوئی اس کے قریب آئی۔

”بھٹو صاحب! کدھر جانا ہے، ہم مناسب کرائے میں چھوڑ دے گا۔“ نیکیس ڈرائیور نے بہ اصرار اس سے کہا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اسے خود بھی اندازہ تھا کہ اس کے ارد گرد پہرے ہیں۔ وہ خاموشی سے نیکیس میں بیٹھ گیا اور اس مکان کا نام لیا جہاں اسے پہنچے گا کہا گیا تھا۔ نیکیس ڈرائیور نے دس منٹ کے اندر اسے مطلوبہ مقام تک پہنچا دیا۔ وہاں مخصوص گاڑی اس کی منتظر تھی۔ وہ گاڑی میں بیٹھ گیا۔

”تم نے ہمارے اندازے سے کچھ زیادہ تاخیر لے لیا۔“ گاڑی ڈرائیور نے والے شخص نے سرسری لہجے میں اس سے پوچھا۔

”ہاں۔ وہ مجھے واش روم جانے کی ضرورت پڑ گئی تھی۔“

ڈرائیور نے مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

”سہاری گاڑی پر تمہاری گھڑی بھی موجود نہیں ہے۔“ سرسری لہجے میں اس کی تیز نظروں سے چھپی ہوئی نیکیس تھی۔

”گھڑی؟“ اس نے چپ کر اپنی کلائی کی طرف دیکھا اور تیز لہجے میں بولا۔ ”اوہ!۔۔۔ یہ کیسے گھٹی؟“

اس آدمی نے ہنسنا شروع کیا۔ ”یہ تو بڑی پڑا موبائل اٹھا کر اسکرین پر چند سیکنڈ کی ٹیمپلٹا ہوا تھا اس لیے معاوضے کا نوٹ تک ہی ملنے والے خیر بلیشن کی آواز پہنچے گی۔ یہ معمول کی خبریں تھیں۔ میں سناتا رہتا ہوں۔“ اس نے ڈرائیور کو وقف کیا اور بریکنگ پوز کے اعلان کے ساتھ بتاتے گئی کہ شہر کے معروف ترین شاہنگ مال میں بہت زبردست بم دھماکا ہوا ہے۔ دھماکے کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ تقریباً پوری عمارت ہی زمین بوس ہو گئی لیکن کسی جانی نقصان کا اندیشہ اس لیے نہیں ہے کہ انتظامیہ نے دھماکے سے چند منٹ قبل ہنگامی صورت حال کا اعلان کر کے شاہنگ مال کو خالی کر دیا تھا۔ اس خبر کے ساتھ ساتھ ایک اور بھی بہت کچھ بتا رہی تھی لیکن معاوضے کے لیے صرف ایک اطمینان کافی تھا۔ حادثے میں جانی نقصان

سفرے تھے۔ اس نے ایک واش روم میں گھس کر اندر سے کنڈی بند کی اور پھرتی سے اپنے کپڑے اتار کر ایک ایک چیز کا جائزہ لینے لگا۔ کپڑوں کی تہوں اور جیبوں میں اسے کوئی مشکوک شے نہیں ملی۔ جب میں پڑے چند کرنسی نوٹوں کے سوا اس کے پاس اگر کوئی شے موجود تھی تو وہ ایک عدد کلائی پر بندھی گھڑی تھی۔ اس نے وہ گھڑی اتار کر فلیش ٹینک پر رکھ دی اور ہاتھوں سے اپنے پورے جسم کو ٹوٹل کر دیکھنے لگا۔ یہ کام وہ قید کے دوران بھی کئی بار کر چکا تھا لیکن ایک بار پھر اس عمل کو دہرا کر اپنی تسلی کرنا چاہتا تھا کہ ان لوگوں نے اس کے جسم میں کوئی چپ وغیرہ تو نہیں لگا رکھی۔ تسلی ہونے کے بعد اس نے ایک بار پھر اپنے کپڑے اور جیبوں کا جائزہ لیا۔ اس نے اس کے کپڑوں کی فٹ میں لے لیا۔ لڑکا شے ہو۔ اس کو موبائل کے گڈ بائے کہہ رہا تھا۔ گڈ بائے کہہ کر اس نے موبائل اپنی جیب میں رکھا تو اس کے دل کی کل گھڑی اٹھی۔ وہ تیز چلتا ہوا اس کے قریب پہنچا۔ لڑکا اب ایک جگہ کئی چمڑے کی خوبصورت سیٹوں کی طرف متوجہ تھا۔ وہ معمولی سا اس لڑکے کے گھراتا ہوا آگے نکل گیا۔ اب لڑکے کا جدید اسمارٹ فون اس کے ہاتھ میں موجود تھا۔ اسمارٹ فون کو تیزی سے اس کی جیب میں منتقل کر کے وہ فرسٹ فلور پر واپس پہنچا اور وہاں اس کے سردار کے کپڑوں کے سیکشن میں جا کر ایک شرٹ منتخب کرنے کے لیے اسے لے کر ٹرائل روم میں چلا گیا۔ چھوٹے سے ٹرائل روم میں پہنچ کر اس نے شرٹ ایک طرف رکھی اور کوٹ کی جیب سے موبائل فون نکالا۔ خوش قسمتی سے فون پر سیکورٹی لاک نہیں لگا ہوا تھا۔ اس نے فوراً ہی ایمرجنسی کا نمبر ڈائل کیا اور بتانے لگا کہ شہر کے فلاں شاہنگ مال کے سیکنڈ فلور پر ایک بم نصب کیا گیا ہے جو شہر کے پندرہ منٹ بعد پھٹ جائے گا۔ اس لیے شاہنگ مال کو فوری طور پر خالی کر دیا جائے۔ دوسری طرف موجود شخص اس سے سوال جواب کرنے لگا لیکن اس نے ہر سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف اتنا کہا۔

”پلیز! سوال جواب میں تاخیر ویسٹ مت کریں اور فوری طور پر کوئی ایکشن لیں ورنہ سیکڑوں انسانی زندگیاں ضائع ہونے کا بوجھ آپ پر ہوگا۔“ یہ جملہ ادا کرنے کے بعد اس نے فون ہی بند کر دیا اور شرٹ اٹھا کر باہر نکل آیا۔ شرٹ خرید کر اسے کیا کرنا تھا چنانچہ پسند نہ آنے کا بہانہ کر کے وہاں سے نکل گیا۔ اب اس کا رخ خارجی راستے کی طرف تھا۔ باہر نکلتے نکلے اس نے ایک طرف رکھے بڑے سے

نہیں ہوا تھا اور وہ بہت بڑے بوجھ سے بچ گیا تھا۔

☆☆☆

”میں معاذ کی کارکردگی سے مطمئن نہیں ہوں وکنز!“
بڑی سی ایل ای ڈی اسکرین کے سامنے ٹھہری طرح دار
عورت نے اپنے پیچھے کھڑے پروفیسر وکنز سے یہ جملہ کہا تو
وہ حیرت زدہ نظر آنے لگا اور ایک بار پھر اسکرین کی طرف
دیکھا۔ وہاں تباہ شدہ شاپنگ مال کی فوجی دکھائی دے رہی
تھیں اور یہ فوجی اس بات کا ثبوت تھیں کہ معاذ نے اپنا کام
بہترین طریقے سے انجام دیا ہے۔

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا میڈم! میرے خیال
میں تو معاذ نے خود کو سونپا گیا کام بہت اچھے طریقے سے
انجام دیا ہے۔“ اس نے اپنی حیرت کو زبان دی۔

”مجھے یقین ہے کہ یہ کیا ہوا تھا کہ دھماکے سے صرف چند
منٹ قبل ہی صورت حال کا اعلان کر کے منٹوں میں مال
خالی کر لیا گیا۔ میرے رائے کے مطابق یہ پولیس کو ملنے
والی گناہ مال کا نتیجہ ہے۔ مجھے شک ہے کہ یہ گناہ مال معاذ
نے ہی ہو گیا۔“ میڈم نے اپنا شک ظاہر کیا۔
”مگر کیسے میڈم؟ معاذ کے پاس تو کوئی موبائل نہیں

اور شاپنگ سینٹر میں بھی کنٹرول روم میں بیٹھا ہمارا آدمی اس
کی ہر حرکت کو مانیٹر کر رہا تھا۔ معاذ برف کیس بہت
مناسب مقام پر چھپایا تھا۔ اس کے شاپنگ مال میں اس
ہونے کے بعد صرف دو مقامات پر اسے نہیں دیکھا جاسکتا
ایک واش روم اور دوسرا ٹرائل روم کیونکہ ان دونوں جگہوں
پر گیمرے نہیں لگائے جاتے۔“

”اور مجھے خدشہ ہے کہ ان دونوں میں سے کسی ایک
مقام پر اس نے اپنا کام دکھایا ہے۔“ اس کے ماتھے کے بل
اپنی جگہ قائم رہے اور سوچتی ہوئی نظریں اسکرین پر جمی رہیں۔
”تم جانتے ہو نا کہ ہم نے اسے جو تربیت دی ہے،
اس کے بعد اس کے لیے کسی موبائل فون تک رسائی ناممکن
نہیں تھی۔ وہ مال میں گھومتے سیکڑوں لوگوں میں سے کسی
سے بھی موبائل حاصل کر سکتا تھا اور شاید اس نے ایسا ہی کیا۔
مجھے تمہیں یہ بتاتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے کہ کنٹرول روم
میں ڈیوٹی دینے والا لڑکا مانیٹر سے زیادہ وہاں موجود آپریٹر
لڑکی کی طرف متوجہ تھا۔ اس لڑکے سے اس کی اس کوتاہی کا
اعتراف کروالیا گیا ہے۔“

”ایسی صورت میں، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ اپنے
طور پر تو میں اپنے کام سے پوری طرح مطمئن ہوں۔“ وکنز
نے اپنے ہاتھ آپس میں میلے۔

”میں تمہاری کارکردگی کو پہنچ نہیں کر رہی ہوں لیکن
میری چھٹی حس مجھے کسی گڑبڑ کا احساس دلا رہی ہے۔ جس نمبر
سے پولیس کو ہم کے سلسلے میں اطلاع دی گئی تھی اس نمبر کو
استمالی کرنے والے لڑکے تک بھی پولیس نے رسائی حاصل
کر لی ہے۔ لڑکے نے ایسی کسی کال سے انکار کرتے ہوئے
پولیس کو بیان دیا ہے کہ اس کا موبائل اس کے پاس نہیں ہے
اور اس کا خیال ہے کہ موبائل شاپنگ مال میں ہی کہیں گر گیا
تھا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ دھماکے میں کنٹرول روم بھی
پوری طرح تباہ ہو گیا ہے اور ہم وہ فوجی حاصل نہیں کر سکتے
ہیں جو معاذ کی حرکات و سکنات کا مکمل ثبوت ہمیں فراہم
کر سکتیں۔“ وہ بے چینی سے ہاتھ ملتے لگی۔

”ہونے کو تو یہ بھی ہو سکتا ہے میڈم کہ کسی نے معاذ کو
وہاں ہم رکھتے ہوئے دیکھ لیا ہو۔ شاید اس فون والے لڑکے
نے ہی اور پھر وہ لڑکا پولیس کو کال کرنے کے بعد جان بوجھ
کر اپنا موبائل وہیں مال میں پیٹک گیا ہو۔ آپ کو معلوم
ہے کہ یہاں لوگ پولیس سے کتنا ڈرتے ہیں اور کوشش
کرتے ہیں کہ پولیس سے دور رہیں۔“ وکنز نے قیاس آرائی
کی تو وہ ٹھیک انداز میں اپنا سر ہلانے لگی، پھر بولی۔

”تمہاری دلیل میں دم ہے وکنز! لیکن تم یہ بھی جانتے
ہو کہ میں کسی معاملے میں شک میں مبتلا ہو جاؤں تو اتنی آسانی
سے شک نہیں ہوتا میرے حساب سے یہ معاملہ ابھی ففٹی ففٹی
ہے۔ اس فون میں بھروسہ کرنے سے پہلے میں اسے ایک اور
ٹیسٹ کیسے سونپتا رہی ہوں۔ یہ اتنی اہم کیس ہے اس لیے تم
اس کیس سے پولیس کی مزید برکت و واشنگ کر دینا۔“

”آپ کے حکم کی تعمیل دلی میڈم! آج بس مجھے
اس کیس کے بارے میں برف کیس پر توجہ دینی ہے۔ وکنز نے
تا بعد امدی کا مظاہرہ کیا۔

”ہمارے دوستوں کا ایک ساتھی یہاں جا سوسی کے
الزام میں گرفتار ہو گیا ہے۔ گرفتاری کے بعد اس کے
اعتراف جرم بھی کر لیا ہے جس کے نتیجے میں ایک طرف اس
فحش کو سزائے موت دینے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے تو دوسری
طرف ہمارے دوست ملک کی بدنامی ہو رہی ہے۔ ویسے تو
وہ لوگ مسلسل داویلا کر رہے ہیں کہ ان کے شہری روشن
ماہر کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے اور اسے غلط الزام میں
پکڑ کر ناحق سزا دی جا رہی ہے لیکن دنیا جانتی ہے کہ ان کا
داویلا جھوٹا ہے۔ اب وہ لوگ ہم سے چاہتے ہیں کہ ہم ان
کے ساتھی کی رہائی کے لیے کوشش کریں۔ میرے حساب
سے معاذ کی صلاحیتوں کو جانچنے کے لیے یہ ایک بہترین

بہترین تحریریں، ملا جواب رو داد اور
اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

کراچی
بہترین سرگزشت

2020

نئی دیکھیوں سے بھرپور سال کا آخری شمارہ
دو انعامی سلسلے بھی شامل ہیں
نئے شمارے کی جھلکیاں:

مجاہد قلم

تا مسر جس ادا القلم کرنے والے
مصرف و فائدہ کا کارکن زندگی نامہ

بوت باؤں

مار بیٹے و کہانیاں سناتے سناتے
مسرت از دست کار بن گیا

بے چارے

ہمارے پاس پاس کے کیسے نفسیاتی
مسروریں یہ دلفروز

المنیہ علیہ السلام

ایک شوریدہ سرنو جوان کی جنوں خیزی "روسیا و
محبت کی مینھی مینھی لودیتی داستان پہ شکل سفر نامہ

"سفر پہلا پہنا" اور بھی بہت سی جگہ بیانیاں ہیں
قلم، دلچسپ واقعات، معلوماتی تحریریں۔

وہ سب کچھ جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں،
آپ کو پڑھنا پائے۔

ایک ہی جگہ ایک سال پر کیا شمارہ سرائیں

کیس ہوگا۔
"بالکل میڈم! آپ بے فکر رہیں۔ میں معاذ کو سمجھی
اس کام کے لیے اچھی طرح تیار کر دوں گا۔ باقی ذمہ داری
آپ کی فیلڈ ورک کرنے والی ٹیم کی ہوگی۔"
"میری ٹیم اپنی بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کرے
گی۔ بس اصل کام معاذ کو سنبھالنا ہے۔ معاذ پوری ذہنی
تیاری کے ساتھ اس کام میں ہاتھ ڈالے گا تو کوئی اس کی راہ
نہیں روک پائے گا۔" وہ اپنی جگہ پُر اعتماد تھی لیکن جب لمبے
کاڈ میر بنے شاپنگ مال پر نظر پڑی تو جبین حکن آلود ہو گئی۔
کہیں کچھ غلط تھا جو گرفت میں نہیں آ رہا تھا لیکن اس کی چھٹی
حس بہر حال سنبل دے رہی تھی۔

☆☆☆

وہ سو کر پشیمانی خود کو بہت ہلکا پھلکا اور تازہ دم محسوس
کر رہی تھی۔ مگر سب سے بعد اسے ایسی گہری اور پُر سکون نیند
سبب ہوئی تھی اور اس نیند کے شعلہ اثرات وہ اپنی طبیعت
پر محسوس کر رہی تھی۔ مگر وہیں منبے بعد ناشا پہنچانے
کا آرڈر دیئے گئے بعد وہ منسل خانے میں گئی۔ منسل سے
پانی سے شاور لینے پر اس نے خود کو کچھ ایسی زیادہ تازہ دم
محسوس کیا اور ٹھیک وقت پر نکل جانے والے ناشتے سے
انصاف کرتے ہوئے ایک بار پھر اپنے من پر دو گرام کے
بارے میں سوچنے لگی جو اس نے رات کو سو کے سوچا تھا
تھا۔ کامران یزدانی کی موت کے بعد اس کا حوصلہ مزید متلاطم
ہو گیا تھا۔ کامران کی موت طبعی قرار پائی تھی اس لیے نہیں
کوئی پنگامہ کھڑا نہیں ہوا تھا اور وہ بھی اپنی جگہ سکون سے بیٹھی
ہوئی تھی۔ میموری کارڈ کے غیاب کے حوالے سے اسے
اندیشہ تھا کہ کامران کے ساتھ ہونے کی وجہ سے شاید اس
سے پوچھ بچھ کی جائے لیکن ابھی تک اسے کسی نے نہیں چھیڑا
تھا۔ شاید بیٹے کی موت کے غم سے نڈھال حیات یزدانی کو
ابھی اس میموری کارڈ کا خیال آیا ہی نہیں تھا۔ بات جو بھی تھی
وہ فی الحال فرصت میں تھی اور اپنی اس فرصت سے فائدہ اٹھا
کر ایک کام نمٹانے کا فیصلہ کیا تھا۔

ناشتے سے فارغ ہوتے ہی وہ اپنی تیاری میں
مصرف ہو گئی۔ گھنٹے بھر کی محنت کے بعد اس نے آئینے میں
اپنا جائزہ لیا تو وہاں اس بار بی سے بہت مختلف لڑکی کھڑی
ہوئی تھی جو اس فانیو اسٹار ہوٹل کے ٹائٹ شو میں ڈانسیک فلور
پر حرکت کرتے ہوئے کعبوں کے دلوں کی دھڑکنیں محسوس جانے
کا سبب بنتی تھی۔ اس کے سامنے موجود آئینے میں نظر آنے
والی لڑکی کے سنہری ڈیا کٹ بال تھے۔ اس نے کمشوں

پر جانے والیاں صبح روانہ ہو چکی ہوتی تھیں اور کہیں ڈیٹ مار کر آنے والیاں چھٹی لے کر لمبی تان کر سوری ہوتی تھیں۔ میڈم کی اصل مصروفیت تو شام ڈھلے شروع ہوتی تھی کہ اس وقت یا تو کوئی چھمک چھوٹتی باہر جا رہی ہوتی تھی یا کسی کا پیارا... دلدار تشریف لارہا ہوتا تھا۔ میڈم ہر دو طرح کے گروپ کی خواتین سے چوڑھائی کرتی انہیں اپنے قیمتی مشوروں سے نوازنے کے ساتھ ساتھ اپنے براہ راست یا خاموش تعاون کا کمیشن وصول کرتی رہتی تھی۔

اس نے اس سارے ماحول کو بہت قریب سے دیکھا اور سمجھا تھا اس لیے ایسے وقت میں وہاں آئی تھی جب میڈم کے اکیلے اور فارغ مل جانے کا بھرپور امکان تھا۔ اس کی یہ توقع غلط ثابت نہیں ہوئی اور اس نے دروازے پر سے ہی دیکھ لیا کہ میڈم نازلی دونوں ٹانگیں ایک تپائی پر لٹائے آرام دہ... کرسی کی پشت سے سر لٹائے مزے سے خرانے لے رہی ہے۔ اس کے بھاری بھرکم وجود سے برآمد ہونے والے خرانے بھی خامسے بھاری بھرکم تھے۔ اس نے پہلے دروازے پر دستک دے کر مہذبانہ طریقے سے اسے جگانے کی کوشش کی لیکن اس موٹی بھینس پر اس مہذب دستک کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ مجبوراً وہ اندر داخل ہوئی اور اس دروازے سے اس کی میز بھاکی۔ قریب سے آنے والی دروازے پر اس کے خرانوں کا سلسلہ رک گیا اور اس نے ہڑبڑ کر آ کر بولی۔

”ہی! میں نے آپ کی خراب کردی لیکن میں مجبور تھی اس لیے اس کا سب سے معذرت کی۔“

”کوئی بات نہیں۔ میں سمجھتی تھی اس لیے ذرا آنکھ لگ گئی۔ آپ بسائیں جس آپ کی خدمت کر سکتے ہوں؟“ میڈم نے اس کے چلیے سے اس کے درکنگ لپیڑی ہونے کا اندازہ کر لیا ہوگا اس لیے اسے اپنے متوقع مسئلہ سمجھ کر اخلاق سے پیش آئی۔

”میں یہاں ایک قریبی دفتر میں ملازمت کرتی ہوں۔ میری جس ہاسٹل میں رہائش ہے، وہ دفتر سے بہت دور پڑتا ہے اور روزانہ لیٹ ہونے کی وجہ سے باس سے ڈانٹ کھاتی پڑتی ہے اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ دفتر سے نزدیک کسی ہاسٹل میں رہائش اختیار کی جائے۔ ہاسٹل کی تلاش مجھے آپ تک لے آئی ہے۔“

”آپ بالکل ٹھیک جگہ پہنچی ہیں۔ اس علاقے میں آپ کو میرے ہاسٹل جتنا اچھا دوسرا کوئی ہاسٹل نہیں ملے گا۔ رہائش کی تمام سہولیات کے ساتھ ساتھ میرے ہاں لوگوں

تک آتا سرمئی اسکرٹ اور سرمئی ہی مٹی کوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ مٹی کوٹ سے جھانکتی سفید قمیص اور ہونٹوں پر لگی میٹ ڈارک براؤن لپ اسٹک اس کے ورکنگ لیڈی ہونے کے تاثر کو مضبوط کر رہے تھے۔ پیروں میں موجود لمبے موزوں کی وجہ سے ان کی عریانی تقریباً چھپ گئی تھی اور کم ہیل کے سیاہ پیپ شوز میں وہ خاصی باوقار لگ رہی تھی۔ اپنی شخصیت کے اس تاثر سے مطمئن اس نے فلاپی ٹراکول ہیٹ اپنے سر پر رکھا اور ہاتھوں پر خوبصورت سفید دستاں چڑھا کر شولڈر ہیک ٹانگ کر اپنے سوٹ سے باہر نکل گئی۔ سابقہ تجربے کی بنیاد پر اسے شک تھا کہ اس کی مشغول نگرانی کی جاتی ہے اس لیے لفٹ کا رخ کرنے کے بجائے ہنگامی زینے کا استعمال کیا۔ لیڈی فور نیچے پہنچ گئی۔ اتنی ڈیڑھ ساری سیڑھیاں چڑھنا ہی نہیں، اتنی سیڑھیاں صحت طلب کام ہوتا ہے لیکن وہ بالکل خستہ دل تھی اور اس کی سانس ذرا بھی غیر متوازن نہیں ہوئی تھی۔ وہیں بھی تو کھینچ لیا کہ اس نے عرصہ ہوا زندگی کے آرام و آسائش سے تھک اندوز ہونا چھوڑ کر اس کی سختیوں سے مطابقت پیدا کرنے کی جدوجہد اختیار کر لی تھی اور اس جدوجہد نے اسے سخت جان کا خفہ دلایا۔

گراؤنڈ فلور پر پہنچنے کے بعد بھی اس نے احتیاطاً بارکنگ میں کھڑی اپنی گاڑی کی طرف رخ نہ کیا اور سیدھا چلتی ہوئی ہوٹل سے باہر نکلتی چلی گئی۔ باہر نکلنے کے بعد بھی اس کو کچھ فاصلہ پیدل ملے کرنا پڑا جب کہیں جا کر ایک ٹیکسہ دکھائی دی۔ ہاتھ کے اشارے سے ٹیکسی رکوانے کے بعد وہ اس میں بیٹھی اور ڈرائیور کو اپنا مطلوبہ پتہ بتایا۔ ٹیکسی اس کے جانے پہچانے راستوں پر دوڑنے لگی۔ وہ خاموشی اور توجہ سے اپنے آس پاس کا جائزہ لینے لگی۔ جیسے ہی ڈرائیور نے ٹیکسی کو اس کے مطلوبہ پتے والی گلی کی طرف موڑا، اس نے ٹیکسی رکوا دی اور کرایہ ادا کر کے پیدل ہی اس کو بھی نما عمارت کے بڑے سے گیٹ کے سامنے پہنچ گئی جسے نام نہاد وین ہاسٹل کا نام دیا گیا تھا۔ ہاسٹل کے گیٹ پر موجود نمائش چوکیدار نے اس کی آمد کا مقصد جان کر اس کے اندر داخل ہونے پر ذرا تعرض نہیں کیا اور اس کمرے کی نشاندہی کر دی جسے میڈم نازلی اپنے آفس کے طور پر استعمال کرتی تھی۔ اسے اس ہاسٹل کے بارے میں کسی کی راہنمائی کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ خود اس کے چتے چتے سے پوری طرح واقف تھی۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس وقت میڈم ذرا ریٹیکس موڈ میں ہوتی ہے کیونکہ یہ وہ اوقات تھے جن میں لڑکیوں کی آمد و رفت کا سلسلہ نہ ہونے کے برابر ہوتا تھا۔ ملازمت

کی پراسٹیوٹی کا پورا خیال رکھا جاتا ہے اور کوشش ہوتی ہے کہ کسی قسم کی دخل اندازی کے بغیر یہاں رہنے والی خواتین مکمل آزادی کے ساتھ رہ سکیں۔

میڈم نے اس کا مدعا جان کر فوراً اپنے ہاسٹل کی تعریفیں شروع کر دیں۔ وہ گھاگ عورت ہونے کے باوجود اسے شاخت نہیں کر سکی تھی۔ وہ بدل بھی تو بہت گئی تھی۔ آنکھوں اور بالوں کی رنگت کے ساتھ ساتھ نقوش میں کی گئی ہلکی پھلکی تبدیلیوں نے اس کی پوری شخصیت کا تاثر بدل دیا۔ ”میں چاہتی ہوں کہ آپ مجھے رہائش کے لیے اوپری منزل کا کوئی کمراعتیہ کر دیں۔ کیا آپ کے لیے یہ ممکن ہو سکے گا؟“

”کیوں نہیں۔ کمراموجود ہے۔ چلیں میں آپ کو وہاں لے جاتی ہوں۔“ میڈم کی ساری نیند بھاگ چکی تھی اور وہ حالے درباری مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے اخلاق کا پیکر بنی ہوئی تھی۔ اس کی فیشن پسندی اسے کمرادکھانے کے لیے انکڑی ہوئی بیڑھیاں چڑھ کر اسے لے جاتے ہوئے بھی وہ مسلسل اپنے ہاسٹل کی تعریف خصوصاً اس حاصل آزادی کا ذکر کرتی رہی۔ کورڈور میں ایک عمارت میں سے ہوئے کمروں میں سے ایک کمرے سے سامنے رک کر میڈم ٹائفل اس کمرے کا دروازہ کھولنے لگی تو اسے اندازہ نہیں ہوا کہ اس کے ساتھ آنے والی کسٹمر کارنگ تھی جیڑی سے بدلا ہے۔ وہ بھلا کیسے بھول سکتی تھی کہ اس کمرے میں اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ اپنی اذیت کے اس احساس پر قابو پانے کے لیے اسے خود پر کڑا ضبط کرنا پڑا اور خاموشی سے میڈم کے پیچھے کمرے میں داخل ہو گئی۔

”یہ میرے ہاسٹل کا سب سے صاف سٹرا کمرہ ہے کیونکہ حال ہی میں اس کمرے میں نیا کمرہ کرانے کے ساتھ ساتھ اس کا فرنیچر بھی بدلا گیا ہے۔“ میڈم نازلی دونوں ہاتھ پھیلا کر اسے کمرے کی ان خصوصیات سے آگاہ کر رہی تھی جنہیں اس نے اندر قدم رکھتے ہی نوٹ کر لیا تھا۔

”یہ ساری تبدیلیاں کیوں کی گئیں میڈم؟“ سوال عام سا تھا لیکن ایسے لہجے میں کیا گیا تھا کہ میڈم کو لگا کسی نے اس کی پیٹھ پر چابک رسید کر دیا ہو۔ وہ چونک کر پیچھے ہٹ گئی۔ وہ خوبصورت اور نازک سی لڑکی مین اس کی پشت پر اس طرح سے کھڑی ہوئی تھی کہ اس کے پیچھے موجود دروازہ لاک تھا اور اس نے دروازے کے ساتھ اپنی کمر کا کرنا نہیں اس کی ذات پر مرکوز کر رکھی تھیں۔ میڈم نازلی نہ تو بند دروازے سے خوف زدہ تھی نہ ہی اس کی نگاہوں سے ہلکے

اقوال خلیل جبران

سات مرتبہ میں نے اپنے نفس کو تغیر سمجھا۔
1- جب میں نے اسے عظمت و اقتدار کے لیے امارت و ریاست کا لباس پہنتے دیکھا۔
2- جب میں نے اسے فطرت کے سامنے شتر غزے کرتے پایا۔

3- جب اسے آسان اور دھواں میں سے کسی ایک کو انتخاب کرنے کا اختیار دیا گیا تو اس نے آسان کو پسند کیا۔

4- جب اس نے کسی گناہ کا ارتکاب کیا اور یہ کہہ کر خود کو تسلی دے لی کہ اس طرح دوسرے بھی گناہ کرتے ہیں۔

5- جب اس نے اپنی کمزوری کی بنا پر ہر اس مصیبت کو برداشت کیا جو اس پر نازل ہوئی اور کہا یہ کہ وہ قوت کے مقابلے میں صبر سے کام لے رہا ہے۔

6- جب اس نے کڑکھائی صورت سے ذلت کا برتاؤ کیا جو حقیقت آتش کا ہوں میں اس کا ایک نقاب ہے۔

جب اللہ نے اپنی مدح و ثنا کے راگ کا اور انہیں غنیمت سمجھا۔
☆☆☆

مجھے اس قدر تجسس ہے جب میں دو کو اس رنج و الم کی شکایت کرتے دیکھتا ہوں جو میرے لیے سرمایہ لذت ہے۔
☆☆☆

لوگ جاتے ہیں کہتے ہیں۔
”تو اس دنیا میں جو تیری کارگاہ حیات ہے،
لافتاحی سمندر کے لافتاحی ساحل کا ایک ذرہ ریک ہے اور بس۔“

اور میں سوتے میں کہتا ہوں۔
”میں لافتاحی سمندر ہوں اور سارے عالم،
میرے ساحل کے ذرہ ہائے ریک ہیں اور بس!“

مرسلہ: حمیرا اقبال، کوثری

اس کے خوف کی وجہ وہ سائلینس کا پہل تھا جس کے نشانے پر یقیناً اس کی اپنی ذات تھی۔

”کون ہو تم اور کیا چاہتی ہو؟“ خود کو ذرا سنبھال کر اس نے سوال کیا۔

”میرے سوال کا جواب! بتاؤ اس کمرے میں کیوں اتنی تہیلیاں کی گئیں؟“ وہ اس طرح غرائی کہ اس کے ہانک نعوش سے بھی درد نگاہ جھلکنے لگی۔

”عجیب سوال کر رہی ہو تم۔ یہ میرا ہاسٹل ہے۔ میں اس کی مالکین ہوں اور یہ میری مرضی ہے کہ میں اس کے جس حصے میں جب چاہے جو بھی تبدیلی کروالوں۔“ میڈم نے اس بار منہ بٹا کر بیزار اور بے خوف نظر آنے کی اداکاری کرنے کی کوشش کی۔

”میں جانتی ہوں کہ یہ ہاسٹل تمہاری ملکیت ہے اور یہاں جو کچھ چاہے تمہاری مرضی سے ہوتا ہے، تو پھر کیا تم لاؤں کہ اس شام بشری گھڑا کے ساتھ جو بریت کا میل کھلا گیا تھا تم بھی اس کا ٹکڑا کرو اور میں اور بھی بریت کی نشانیں کو مکمل طور پر مٹانے کے لیے اس کمرے سے سب کچھ ہٹا کر اسے بالکل تہہ بیل کر دیا گیا۔“ میڈم نازلی سے یہ سوال کرتے ہوئے اس کے منہ میں ایسی آغج تھی جس کی بنیاد میں کرب بھی اپنی موجودگی کا پتہ نہ رہا تھا۔

”تت..... تم..... کون ہو؟“ میڈم نازلی کے سر پر خوف سے کانپ گئی۔

”نہیں میڈم نازلی۔۔۔ سوال اب تم نہیں، صرف میں کروں گی۔ بتاؤ کیا تم بھی بشری گھڑا کے ساتھ ہونے والے اس ظلم میں شامل نہیں؟“ اس نے سانپ کی طرح پھنکارتے ہوئے میڈم نازلی سے پوچھا۔ جواب میں اس نے ایک بالکل غیر متوقع حرکت کی اور اپنے دائیں جانب موجود سائڈ ٹیبل پر رکھا بڑا سا آرائش گلدان نہایت پھرتی سے اٹھا کر اس کی طرف اچھال دیا۔ نشانہ یقیناً اس کا پہل تھا لیکن اس نے میڈم سے بھی زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کیا اور گلدان کو دوسرے ہاتھ سے نہایت خوبصورتی سے ہوا میں ہی کیچ کر لیا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ آس پاس کے کتنے کمرے آباد ہیں اور اس وقت کن کن کمروں میں لڑکیاں موجود ہیں اس لیے یہ احتیاط ضروری تھی کہ شور شرابا نہ ہونے پائے۔ دوسری طرف میڈم نازلی جا رہا نہ موڈ میں آگئی تھی اور گلدان پھینکنے کے بعد خود بھی کسی تیز رفتار گیند کی طرح لڑھکتی ہوئی اس کی طرف چلی آ رہی تھی۔ اس جیسے جیسے کی عورت سے اتنی پھرتی کی امید نہیں کی جاسکتی تھی لیکن یہ بھی

تھا کہ وہ کوئی عام عورت نہیں تھی۔ اس کا ہاسٹل کافی حد تک عیاشی کے اڈے کے طور پر استعمال ہوتا تھا اور ایسا بزنس چلانے والی عورت کے پاس لازماً کچھ خصوصیات ہونا چاہئیں تھیں تاکہ وہ بھانت بھانت کے لوگوں سے نمٹ سکے۔ تعلقات کا بہترین استعمال بزنس کو چلانے کے لیے ایک اہم گرہی لیکن موقع پر بھی تو کچھ لوگوں سے نمٹنا ہی پڑتا تھا اس لیے اگر یہ عورت مرد ماری کا مظاہرہ کر رہی تھی تو یہ ایسی تعجب کی بات نہیں تھی۔ تعجب کی بات تو یہ ہوتی کہ وہ اس عورت سے مات کھا جاتی لیکن ایسا نہیں ہوا اور اس نے میڈم نازلی کو اپنے صرف اتنے قریب آنے کی مہلت دی کہ وہ اس کی ٹانگ کی ”حد“ میں آجائے۔ جیسے ہی ایسا ہوا اس نے بہت سکون سے اپنی بائیں ٹانگ کو حرکت دی اور اگلے ہی لمحے اس کی ہچکی میڈم کے مونے پیٹ میں یوں دھنستی چلی گئی جیسے اس نے کسی نوم کے گدے پر طبع آزمائی کی ہو۔ میڈم کے گلے سے نکلنے والی ”اوغ“ کی آواز نے ثبوت دیا کہ ضرب گدے پر نہیں، اس کے پیٹ میں لگی تھی۔ اس سے قبل کہ میڈم پیٹ پکڑ کر حریف واد پلا کرتی، اس نے ایک بار پھر اپنی جگہ سے حرکت کی اور دائیں ہیر کا استعمال کرتے ہوئے اس کی کچنی پر ضرب لگائی۔ یہ ضرب کھا کر میڈم نازلی دھڑکتے ہوئے زمین پر گر گئی اور اس کی آنکھیں اوپر چڑھ گئیں۔ اس نے اپنے جسم پر منڈھی ساڑی سمجھ کر اتاری اور اس کے پاس سے دو اس ساڑی میں اس طرح لپیٹ دیا کہ اب وہ اس مرضی سے معمولی سی بھی حرکت نہیں کر سکتی تھی۔ سائلینس کے اس اچھال کے بعد اس نے نیچے پر چڑھا غلاف اتار کر اسے میڈم نازلی کے سر میں ٹھونس دیا اور پھر اسے ہوش میں لانے کے لیے اس کے چہرے پر تھپتھپ کر برسانے لگی۔ چوتھے تھپتھپ پر اس کو ہوش آ گیا۔ ہوش میں آ کر جیسے ہی اسے اپنی ہیبت کنڈائی کا احساس ہوا، وہ مدید بے چین اور خوف زدہ نظر آنے لگی۔ اس خوف کو شدید مضبوط کرنے کے لیے اس نے میڈم کے سینے پر دائیں ٹانگ سے دھڑک کر اس پر دباؤ ڈالا اور اپنا چہرہ اس کے چہرے پر جھکا لیا۔ میڈم کے چہرے کی تیزی سے بڑھتی ہوئی سرخی نے اسے بتایا کہ وہ شدید تکلیف میں ہے اور شاید اس کا فشار خون بلند ہونا شروع ہو گیا ہے۔

”یہاں اس حال میں، میں تمہارے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گی اور کسی کو کالوں کان خبر نہیں ہوگی کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے اس شام بشری گھڑا پر گزرنے والی قیامت کا کسی کو ظلم نہیں ہوا تھا،

سوائے تمہارے.....“

نے مجھے صاف بتا دیا تھا کہ اس کے مالک بہت بڑے لوگ ہیں اور ان کے کاموں میں مالک اڑانے کا مطلب اپنی جان گنونا ہوگا۔ جان کوئی بھی گنونا نہیں چاہتا اس لیے میں اس کی بات ماننے پر مجبور ہو گئی اور میں نے پولیس کو وہ بیان دیا جس سے اس کی نشاندہی نہیں ہو سکتی تھی۔ ”میڈم نازلی روتے سکتے ہوئے اس کے سامنے اپنا جرم تسلیم کرنے لگی۔ رونے کے باوجود اس نے اس بات کا دھیان رکھا کہ اس کی آواز زیادہ بلند ہو کر اسے اشتعال نہ دلانے پائے۔

”تھیں وہمکنی دینے والے اس بندے کا حلیہ کیسا تھا؟“ اس نے اپنے غم کو اپنے اندر ہی دبایا اور متوازن لہجہ میں میڈم سے یہ سوال کیا۔

”وہ درمیانے قد کا ٹھکانا سا آدمی تھا جس کی عمر تیس سال سے زیادہ نہیں لگتی تھی۔ اس کی خاص بات یہ تھی کہ وہ مسکراتا تھا تو اس کے ہتھکڑیوں پر سفاکی کی دوڑتی محسوس ہوتی تھی اور اس کی آنکھیں..... اف خدا..... اس کی آنکھیں ایسی تھیں کہ مجھ جیسی ساری عمر مردوں سے سودے بازی کرنے والی عورت بھی بوکھلا گئی۔ میں سچ کہتی ہوں، وہ آنکھیں کسی انسان کی نہیں عفریت کی آنکھیں لگتی تھیں اور ان آنکھوں کی وجہ سے ہی اس پر کسی گندی حیوان کا گمان ہوتا تھا۔“ میڈم نازلی جو حلیہ بتا رہی تھی اس کے بعد اس بات پر کہ اس نے اسے دیکھا تھا کہ وہاں آنے والا شخص باؤل تھا۔

”میں نے لوگوں کے ساتھ آیا تھا؟“

”ہاں، گڑبڑ میں اس کا کوئی آدمی بیٹھا ہوا تھا لیکن اس نے اکیلا ہی آیا تھا۔“ نازلی بہت شرافت سے اس کے سوالوں کے جواب دے رہی تھی۔

”پھر کیوں تم نے اس کے خلاف شکایت کی؟ تم اتنی کمزور عورت تو نہیں ہو۔ جس وقت وہ اس پر حمل کرے گا بشری گھزار کی زندگی بر باد کر رہا تھا، تم اسے جانے کے بہت کچھ کر سکتی تھیں۔“ وہ ایک بار پھر کمر کاٹتے ہوئے کہنے لگی۔

”میں..... ڈر گئی تھی۔ میری بہت نہیں ہوئی۔ نازلی نے اس سے نظر چراتے ہوئے اپنی صفائی پیش کی۔

”جھوٹ مت بولو خبیث عورت۔ تم ڈر نہیں مہنی تھیں، تم بیک مہنی تھیں۔ تم نے بشری گھزار کی عزت کا سودا کر لیا تھا۔“ وہ اتنے غصے سے بولی کہ میڈم نازلی کا خون خشک ہو گیا اور اس کی ہمت نہیں ہو سکی کہ وہ اپنی صفائی میں کوئی جھوٹ بول سکے۔

”تم جیسی عورتیں، عورت کے نام پر دھبا ہوتی ہیں۔ تمہاری ہوس کا خانہ کبھی نہیں بھرتا اور تم اپنے گندے وجود

آخری دو الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کے لہجہ میں ایک بار پھر سانپ کی سی پھنکار دوڑ آئی تھی۔ میڈم نے اس کی بات سن کر یوں زور زور سے دائیں بائیں سر ہلچا جیسے خود پر لگائے جانے والے الزام سے انکار کر رہی ہو۔ اس انکار نے اسے مزید مشتعل کر دیا اور اس نے بغیر کسی تکلف کے نہایت بے دردی سے میڈم کے منہ پر دو گھونٹے رسید کر دیے۔ ایک گھونٹا میڈم کے دائیں جڑے پر لگا جبکہ دوسرے نے اس کی موٹی ناک کا مزاج پوچھا۔ فوراً ہی ناک سے خون پھوٹ پڑا۔ میڈم کے چہرے پر ابھرنے والے پراڈت تاثرات نے بتایا کہ اگر اس کے منہ میں نیچے کا غلاف نہ ٹھسا ہوا ہوتا تو یہ کسی ذبح کیے جانے والے بکرے جیسی آواز طبع سے نکلتی۔

میں تمہارے جسم کی ایک ایک ہڈی توڑ دوں گی اور تمہارا سارا وجود تمہارے اپنے خون میں نہلا دوں گی، اگر تم اسی میرے مال کا جواب دینے سے انکار کرتی رہیں۔“ میڈم اپنی اذیت نے اس کے گھٹے کو کم کرنے کے بجائے جنون میں مزید اضافہ کر دیا۔ اس نے کسی درخت کی طرح غرا کر ایسے دم کی کہ میڈم جیسی دجنگ عورت کا بھی پتا پانی ہو گیا اور وہ لٹکے ہوئے ہے اور آنکھوں سے تاثرات سے کام لے کر اسے یہ سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہ اپنی زبان کھولنے کے لیے تیار ہے۔

”یاد رکھنا کہ تمہاری آواز اس کمرے سے باہر نہ جانے پائے۔ اگر آواز بلند ہوئی تو تمہاری روح بھی آسمانوں کی طرف پرواز کر جائے گی۔“ میڈم نازلی کے منہ میں ٹھسا نیچے کا غلاف نکالنے سے پہلے اس نے اسے وہمکنی دی اور پھر ایک جھٹکے سے غلاف باہر کھینچ لیا۔ نازلی یوں کھانسی اور گہرے گہرے سانس لینے لگی جیسے اتنی دیر سے سانس کی آمد و رفت کا سلسلہ منقطع رہا ہو۔

”میرے پاس تمہارے یہ ڈرامے دیکھنے کی فرصت نہیں ہے۔ جلدی سے بتاؤ کہ اس شام بشری گھزار کے ساتھ جو ہوا تم اس سے باخبر تھیں یا نہیں؟“ وہ ایک بار پھر اپنا باطل ہاتھ میں لے چکی تھی اور نازلی کے سینے سے پھر بنا کر اس کے دائیں جانب گھٹنوں کے بل بیٹھی ہوئی تھی۔

”میرا یقین کرو، جو ہوا اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ شخص بالکل اچانک ہی یہاں آیا تھا اور جانے سے پہلے مجھے وہمکنی دے کر گیا تھا کہ اگر میں نے اس کے بارے میں کسی کے سامنے زبان کھولی تو میری خیر نہیں ہوگی۔ اس

سے دوسروں کو بھی گندا کرتی چلی جاتی ہو۔ تم جیسی عورتوں کے شر سے نجات کا صرف ایک طریقہ ہے۔ صرف ایک طریقہ....."

وہ نازلی کے خوفزدہ تاثرات سے بے نیاز و میرے دھیرے بڑبڑاتی تھی۔ نازلی نے کچھ بولنے کی کوشش میں اپنا منہ کھولا تو اس نے پستول کی نال جو سائیکسٹر کی موجودگی کی وجہ سے خاصی لمبی لنگ رہی تھی، اس کے منہ میں گھسا دی اور چٹوٹی لہجے میں بولی۔

"جب یہ منہ حق اور سچ بولنے کے لیے نہیں کھلا تو اب اسے کھولنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر لو اسے۔" جملہ میل کرتے ہی اس نے لہلی دبا دی۔ میڈم نازلی کے جسم کے ایک زوردار جھٹکا اور لمبے بھر میں زندگی کی سانس لیتی۔ اس نے میڈم کی ساڑھی سے ہی پستول صاف کیا اور سولڈ ایک میں ڈالنے کے بعد کھڑی ہو گئی۔ اس کے ہاتھوں پر موجود خوبصورت سفید ستانے بھی خون کے چھینٹوں سے آلودہ ہو گئے تھے۔ اس نے سے باہر نکل کر دو پارہ در دو پارہ بدل لیا اور پھر دستانے کی اتار کر اپنے بیگ میں ڈال لیے۔ آج اس نے اپنے ہاتھوں میں سے ایک اور مجرم کو کیفر کر دیا تھا۔ پتلا اور مسکین بھی کہ اپنے پیچھے کوئی ثبوت یا نشانی نہیں چھوڑ کر جا رہی۔

☆☆☆

"تس نہ جاؤ جی!" سانولی سلونی معمولی نقوش کی لڑکی نے سفر کے لیے تیار کھڑے سیسن سے کچھ اس ادا سے کہا کہ اس کا دل چاہا اس پر غار ہو جائے۔ نئی نئی شادی کا نشہ ہی اور ہوتا ہے۔ معمولی عورت بھی حود سے کم نہیں دکھائی دیتی اور سیسن کی بیوی تو اس کی بچپن کی محبوبہ تھی جسے پانے کے بعد اسے اس کے ساتھ رہنے کے لیے فقط ایک ہفتہ ملا تھا۔ ایک ہفتے میں ان دو چاہنے والوں کی پیاس تو کیا بجھتی، الٹا مزید آتش بھڑک اٹھی تھی۔ سیسن خود بھی اسے چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا لیکن مجبوری تھی کہ اسے بس اتنی ہی چھنیاں ملی تھیں اور اب اسے ڈیوٹی پر حاضر ہونا تھا۔

"ایسے کرے گی تو میرا جانا سچ مچ مشکل ہو جائے گا اور تجھے معلوم ہے کہ میرا جانا ضروری ہے۔ خوشی نال رخصت کر مجھے۔ کوشش کروں گا کہ وہ افسر سے سفارش لگو کر جلد ہو چھنیاں لے لوں، فیہر تجھے اپنے ساتھ ہی لے جاؤں گا، ہو خوب سیریں کرواؤں گا۔" اس نے بیوی کو الوداع کہنے کے لیے گلے لگا یا تھا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور وہ بے چارگی سے اسے سمجھانے لگا۔

"میںوں خالی خولی سیریں کرنے کے لیے تیرے ساتھ نہیں جانا ہے۔ میںوں تیرے نال رہنا ہے۔ اب آئے تو ادھر میرے رہنے کا ٹھکانا کر کے آنا۔" نئی ٹولی دہن نے فوراً اپنی فرمائش بیان کر دی۔

"وہ بھی ہو جائے گا، پہلے تو مجھے چٹکی طرح رخصت تو کر دے۔ تیری یہ رونی صورت آنکھوں میں بسا کر جاؤں گا تو سارا نیم اداس ہی رہوں گا۔" اسے ہر حال میں بیوی کا مزاج خوشگوار کرنے کی فکر تھی۔ اسے بھی بات سمجھ آگئی اور اپنی چٹکی اور دھن سے آنسو صاف کر کے مسکرانے لگی۔

"چل تے فیہر اجازت۔" اس نے بیوی کا الوداعی بوسہ لیا اور اس کی شرمیلی سی مسکراہٹ آنکھوں میں بسائے کرے سے باہر نکلا۔ کچے کھن میں ماں چار پائی پر بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ ماں کے ساتھ بھی الوداعی کلمات کا تبادلہ ہوا اور وہ اپنے چھوٹے سے گھر سے نکل کر پیدل گاؤں سے باہر جانے والے راستے کی سمت بڑھ گیا۔ اس کا گاؤں بہت پسماندہ تھا اور یہاں تک ایسی کوئی سڑک تعمیر نہیں ہوئی تھی جس پر سواریاں چلتیں، اس لیے گاؤں سے باہر کہیں جانے کے لیے یہاں کے رہائشیوں کو چک پینڈی میں تک پیدل سفر کرنا پڑتا تھا۔ اتفاق سے کسی نکل گاؤں کی دیکھو میں لفٹ مل جاتی تو سفر تھوڑا آسان ہو جاتا تھا۔

مشقت یہ تھی کہ گاؤں سے باہر کا سفر کرنے والے اس سیسن کے لیے کے اعتبار سے سنا کر وہ تھا اور اقلیتوں کے اس گھر سے نکلتا تھا جو پاکستان میں پیدا ہوئے تھے اور ان کا جینا بڑا سب سے کمزور کی وفادار اور غیر مشروط طور پر پاکستان کے باشندے ہیں اور جو کسی کو چھوڑ کر کہیں بھی جانے کا تصور نہیں رکھتے۔ یہاں تک کہ سیسن نے محبت سیسن کو پاک فوج تک لے لی تھی اور وہ نہایت چلی سطح پر بھی خدمات انجام دے کر خوش تھا۔ بچپن سے گزرا کہ گئی سخت کوش زندگی نے اسے اپنی موجودہ ملازمت سے آہٹک ہونے میں بڑی مدد دی تھی اور وہ نہایت خوش اسلوبی سے اپنے ملازمتی فرائض ادا کرتا تھا۔ ماں نے بھی اکلوتے بیٹے کی دوری کو اس لیے قبول کر لیا تھا کہ اسے امید تھی سیسن ان کی آئندہ نسل کے لیے اوپر کی جانب سفر کی راہیں نکال لے گا اور اس کے بچے ایک پسماندہ گاؤں کے بجائے کسی اچھی جگہ پرورش پا کر بہتر ملازمتیں حاصل کر سکیں گے۔ وہ غریب لوگ تھے اور ان کے بس یہی چھوٹے چھوٹے خواب تھے جن کو پورا کرنے کا واحد ذریعہ سیسن کی ذات

ہو رہی ہے۔ میں نے تو بس ہمدردی میں گاڑی روک لی تھی کہ اتنی گرمی میں بندہ پیدل جا رہا ہے تو میں لفت دے دتا ہوں اور تم ایسے مجھے گھوڑ رہے ہو جیسے میں نہیں انخوا کرنے لگا ہوں۔“ اس کی بے یقینی پر امیر زادے کی جیسے سلوٹ زدہ ہو گئی اور تیز لہجے میں بولا تو کڑ بڑاتے ہوئے سیمن نے گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھنے میں ڈرا دی نہیں لگائی۔ اتنی اچھی پیشکش کو ٹھکراتا کفرانِ نعمت کے برابر تھا۔ وہ بے خبر سیٹ پر بیٹھا اور گاڑی آگے بڑھی تو اسے اندازہ ہوا کہ پچھلی نشست پر بھی کوئی موجود ہے۔ اس شخص کو دیکھنے کی خواہش میں وہ اپنی گردن موڑنے ہی لگا تھا کہ ایک باریک سوئی اس کی گردن میں داخل ہو گئی اور یک دم ہی سارے منظر نظروں کے سامنے سے غائب ہو گئے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ صرف منظر ہی نہیں، وہ بھی ہمیشہ کے لیے غائب ہونے والا ہے۔ بڑی بساط پر چھونے پیادے اسی طرح غائب ہوتے ہیں۔

☆☆☆

اس نے وائس اپ کے ذریعے اپنے سیل فون پر موصول ہونے والی تصویروں کو ایک ایک کر کے دیکھا اور ہونٹ بجھتے پر مجبور ہو گئی۔ ان ساری تصویروں میں وہ گرے اسکرٹ اور مٹی کوٹ کے ساتھ سفید موزے اور رستائے پہنے مختلف مقامات پر نظر آ رہی تھی۔ پہلی تصویر اس کے منہ سے دروازے پر لی گئی تھی۔ دوسری ہوٹل کے سامنے، تیسری سیٹ سے اترتے ہوئے، چوتھی میڈیم نازلی کے ہاتھ کے گرت میں داخل ہوتے ہوئے اور پانچویں ہاسٹل سے نکلتے وقت کی تھی۔ ہر تصویر پر وقت واضح نظر آ رہا تھا اور واضح کہ چھپ کر ٹھیک کوشش کے باوجود وہ تمام وقت کسی کی نظروں میں رہا ہے۔ اس شخص کے بارے میں اسے زیادہ غور و خوض کرنے کا سہرا نہیں تھا۔ اس نے انتقام کی آگ میں جلتے ہوئے خود اپنے لیے یہ جگہ منتخب کیا تھا جس میں اب بری طرح بھڑکی جا چکی تھی۔ تصویروں کو ایک کے بعد ایک دوبارہ دیکھتے ہوئے وہ ان کے پیچھے جانے کے مقصد پر غور کر رہی تھی کہ اس کے فون کی تھنی بجنے لگی۔ جانا پچانا نمبر دیکھ کر اس نے کال وصول کر لی اور سپاٹ لہجے میں واحد لفظ ”یس“ بولی۔

”اوہ مائی ڈارلنگ بے بی! تم اتنی سیریس کیوں لگ رہی ہو۔ میرا تو خیال تھا کہ تم آج اپنی ایک اور اچیونٹ پر بہت خوش ہو گی اور میں نے تمہارے ساتھ تمہاری خوشی شیئر کرنے کے لیے ہی کال کی تھی۔“ دوسری طرف وہی ہلکا سا ٹھکناٹا اور سر ہلا لہجہ تھا جس کی مکاری سے وہ بدترج بہت

تھی۔ پچیس سالہ صحت مند اور توانا سیمن ان خوابوں کو شرمندہ تعبیر کرنے کا عزم دل میں لیے زمین پر مضبوطی سے قدم جماتا آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کا آج کا پورا دن اور رات کا کچھ حصہ سفر میں گزارتا تب کہیں جا کر وہ اپنی منزل پر پہنچ پاتا۔ کل کا دن سفر کی تھکاوٹ اتارنے کے بعد پرسوں صبح سے اسے اپنی ملازمت پر حاضر ہونا تھا۔ پیدل کچے کچے راستے پر چلتا ہوا وہ دل ہی دل میں ان کاموں کو بھی ترتیب دے رہا تھا جو کل تھکاوٹ اتارنے کے بعد اسے انجام دینے تھے۔ اپنے آپ میں گمن پونہی سفر طے کرتے ہوئے اسے پیچھے سے ہارن کی زوردار آواز سنائی دی تو بری طرح اچھل گیا اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔ بڑی سی لینڈ کروزر کو دیکھ کر اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ ایسی گاڑیاں سال چھ سے گزریں تو ان کے علاقے میں دکھائی دیتی تھیں۔ ان گاڑیوں میں اس علاقے کے ان وانا سوار ہوتے تھے جو کسی بھی طرف توجہ دینے کی بجائے اپنی گاڑیوں میں گزر رہے ہوتے تھے۔ وہ لوگ تھے جن میں اس علاقے سے صرف اسی واپسی کی کہ یہاں ان کی زمینیں تھیں اور وہ زمینوں کی نگرانی کے لیے مقرر افراد اپنے ساتھ کوئی بھی بے ایمانی کرنے سے روکے رکھنے کے لیے بھی بکھار اپنی موجودگی کا احساس دلاتے رہتے تھے۔ سیمن یا اس جیسے دوسروں سے ان کا کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ لینڈ کروزر کا ہارن بجتے اور پھر اس کی کھڑکی سے ہاتھ کے اشارے سے بلائے جانے پر حیران رہ گیا۔

”کہاں جا رہے ہو؟“ وہ حیران سا کھڑکی کے کھلے شیشے کے قریب پہنچا تو اندر بیٹھے شخص نے اس سے دریافت کیا۔ ”جی چک پینٹالس۔“ اس نے آہستہ سے جواب دیتے ہوئے مخاطب کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ وہ اس کے لیے اجنبی تھا۔ علاقے کے بڑے زمیندار سے واسطہ نہ پڑنے کے باوجود وہ اس کا صورت شناس تھا اور اس کے دو تین بیٹوں کو بھی دور سے دیکھ رکھا تھا لیکن سنا تھا کہ زمیندار کے چھ بیٹے ہیں جو شہر میں رہ کر تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ شاید یہ زمیندار کا کوئی ایسا بیٹا تھا جس نے اسے بھی نہیں دیکھا تھا۔

”گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ میں چھوڑ دیتا ہوں۔“ سیمن کو زیادہ غور و خوض کرنے کا موقع دینے بغیر اس شخص نے پیشکش کی تو وہ مزید حیران رہ گیا۔

”ایسے منہ کھولے کیوں کھڑے ہو یا ر! اندر بیٹھو تو میں بھی یہ کھڑکی بند کروں۔ خواہوا اسے سی کی کوٹنگ ضائع

ملاقاتی سے ملاقات کے لیے تیار ہونا۔ اس ہفتے تمہارا صرف ایک شو ہے جسے احتیاط سے نمٹنا کر اپنے سوئٹ تک محدود رہنا۔ وہ اسے ہدایات دے رہی تھی جن پر باربی کو نہ چاہتے ہوئے بھی عمل کرنا تھا۔ اس نے جن پانیوں میں چھلانگ لگائی تھی، وہ پانی اس کے آشنا نہیں تھے اور اسے اپنی بقا کے لیے بُرے بھلے جیسے بھی راہنما ملے تھے، ان کی ہدایات پر عمل کرنا ہی تھا اس لیے آخر کار اپنی ہار تسلیم کر لی اور دھیسے لہجے میں بولی۔

”او کے میڈم! میں آپ کی ہدایات پر عمل کروں گی۔ اب آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔“
”گنڈا ہمیں تم سے اسی روپے کی امید ہے۔ آئندہ کے لیے بی کیئر فل۔“ ہلکی سی تنبیہ کے بعد سلسلہ منقطع کر دیا گیا تو اس نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے موبائل ہاتھ سے رکھ دیا۔ ابھی انتقام کی لسٹ میں بہت سے نام باقی تھے اور وہ ان لوگوں کو خود سے ناراض نہیں کر سکتی تھی جن کے سہارے نے بقا کے مسئلے کو حل کر کے انتقام کے مراحل کو آسان بنا دیا تھا۔ اس نے اپنے ماضی سے ناتا توڑ کر اپنے لیے باربی کا کردار قبول کیا تھا تو اب اسے کچھ پس کی طرح دوسروں کی انگلیوں کے اشارے پر ناچنے کے لیے بھی تیار تھی۔

☆☆☆

میں نے کہا تھا انا صاحب! میں کسی اگلے سیدھے معاملے میں نہیں الجھا ہوا ہوں اور بالکل سیدھا سیدھا چل رہا ہوں۔ اب اس منہ بھر سے اس بات کی تصدیق کر سکتے ہیں کہ میں روزانہ پابندی سے فیکٹری جا رہا ہوں اور شام تک وہیں وقت گزار رہا ہوں۔ فیکٹری میں کام شروع ہو گیا ہے اور اب میری پوری توجہ کام پر ہے۔
عالم شاہ آرام دہ صوفے پر ناٹک پھیلائے بیٹھا فون پر صداقت شاہ سے بات کر رہا تھا۔ صداقت شاہ، کل سال سو مرد کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کو لے کر پریکٹس تھے اور ڈھکے چھپے لفظوں میں پہلے بھی شک ظاہر کیا تھا کہ کہیں اس معاملے میں عالم شاہ کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ عالم شاہ پہلے بھی کمر گیا تھا اور اب بھی اپنے ملوث ہونے کا اقرار کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ صداقت شاہ اس کے جذباتی پن سے ڈرتے تھے اور انہیں اندیشہ تھا کہ وہ جذبات میں کوئی ایسا قدم نہ اٹھا بیٹھے جو ناقابلِ حلانی نقصان کا سبب بن جائے۔ اسے ایسی کسی حرکت سے روکنے کے لیے وہ اس پر گاؤں والوں کو منسنے کے سلسلے میں زور دینے لگے تھے۔

ابھی طرح واقف ہوتی جا رہی تھی۔
”اتنا خیال رکھنے کے لیے شکریہ۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

”خیال تو ہم تمہارا رکھتے ہیں۔ اب یہی دیکھو کہ اگر ہم تمہارے ہاسٹل میں داخلے اور اخراج کی تصویریں تمہارے بجائے کہیں اور بھیج دیتے تو میڈم نازلی کے پوسٹ مارٹم کے بعد متعین ہونے والے قتل کے وقت کے ساتھ ساتھ قاتل کا تعین بھی پولیس کے لیے آسان ہو جاتا۔“
”آپ چاہتے تو پولیس کو اس بات کی بھی نشاندہی کر سکتی ہیں کہ کامران یزدانی کی موت طبعی نہیں تھی لیکن اس صورت میں میرے ساتھ ساتھ آپ کا بھی نقصان ہوگا اور مجھے آپ کی سرمایہ کاری ضائع چلی جائے گی۔“
جائے کو تو وہ نہ سمجھتا کہ اس نے ترکی پر ترکی جواب دیا۔

”سرمایہ کاری کا ہمیں بھرپور احساس ہے اور پولیس بھی بتانے کی کوشش کر رہی ہے کہ ہم سے الگ ہو کر کچھ کرنے کی حوصلہ دے کر وہ نہ نقصان اٹھا سکتی ہو۔ نازلی کے ہاسٹل کا پولیڈ امیجر اہل کار جیٹھا ہوا تھا اس لیے پولیس کو ڈھنگ سے تمہارا احاطہ نہ پتا چلا اور ہاسٹل کے گیٹ پر لگے کیمرے کی کوشش ہم نے بروقت غائب کر دادی ورنہ تمہارا کیا کیا گیٹ اب اتنی اچھا نہیں تھا کہ پولیس ڈھونڈنے کی کوشش کرتی تو ڈھونڈ نہ پاتا۔ نازلی کے بڑے چاہنے والے ہیں پولیس میں جنہیں اس کی موت سے تکلیف ہوئی ہے۔ اگر ہم تمہارے پیچھے کیوز مٹانے کا انتظام نہیں کرتے تو پولیس والے تم تک پہنچ چکے ہوتے۔“
اب مخاطب کے لہجے کی شوخی غائب ہو گئی تھی اور نہایت سپاٹ لہجے میں اسے اس کی غلطیوں کا احساس دلایا جا رہا تھا۔ بات ایسی تھی کہ وہ جواب میں کچھ سخت کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ اس کی اپنی غلطی پکڑی گئی تھی چنانچہ خاموشی ہی بہتر تھی۔

”اس غلطی کو بھی دل سے نکال دو کہ کامران یزدانی کی موت پر اس کے باپ کے دل میں شکوک و شبہات موجود نہیں ہیں۔ وہ تم کے شدید جھٹکے سے نکلنے کے بعد اس میموری کارڈ کی تلاش میں معروف ہو چکا ہے جسے لانے کے لیے اس نے کامران کو بھیجا تھا۔ میموری کارڈ کا غیاب کامران کی اچانک موت اور اتنے اہم سفر میں تمہاری اس کے ساتھ موجودگی بہت جلد اسے تمہاری طرف متوجہ کر دے گی لہذا اب تمہیں بہت سنبھل کر رہنے کی ضرورت ہے۔“
بلاوجہ ہرگز بھی ہو کہ باہر نہیں نکلتا اور نہ ہی کسی انجینی

سگھڑایا

☆ صابن جب ختم ہونے لگتا ہے تو اسے نئے صابن کے ساتھ لگا دیا جاتا ہے۔

☆ ٹوٹھ پیسٹ ٹیوب کو رول کر کے آخری قطرے تک استعمال کیا جاتا ہے۔

☆ گھر میں رکھی اچھی اور خوبصورت کراکری صرف مہمانوں کے لیے استعمال میں ہوتی ہے۔

☆ ٹی وی ریموٹ کے سیل تبدیل کرنے کے بجائے اس کو مار مار کر استعمال کرنے مجبور کرتا ہے۔

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، پٹل ہزارہ

نہیں۔" اس بار صداقت شاہ کے لہجے میں تھم تھا۔ عالم شاہ نے ان سے اختلاف کی قطعی ضرورت نہیں سمجھی اور فرمانبرداری سے بولا۔

"جو آپ کا حکم بابا سائیں۔ آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔"

"جیسارہ میرا پٹ! تو میری آنکھوں کا نور اور دل کا سرور ہے۔ میں تیرا نقصان نہیں سہہ سکتا۔ لطیف سومرو کے پاس دو روپے اور ہیں جو چند سال میں جو ان ہو کر اس کا بازو بن چکے ہیں اور وہ گلیل کا غم بھول جائے گا لیکن ہمارے لیے تو ان کے ایک ایک روپے کی تلاش ہے۔" وہ بار بار اس کی آہیں کا احساس دلاتا تھا اسے پانچ روپے کی تلقین کر رہے تھے۔ "میں بوری کو شش کرنا چاہتا ہوں کہ میری ذات سے آپ کو کوئی دکھ نہ پہنچے۔ اس نے خوش چین دہائی کر دیا کہ فون بند ہی کیا تھا کہ سرور نے اسے چاہنے کے ساتھ اس کے سامنے حاضر ہوا۔

"بڑی خبر ہے سائیں! چاچا کو یہاں گھر میں دیکھا گیا ہے۔ دیکھنے والے نے اس کا پیچھا کر کے اس کی تلاش کا بھی معلوم کر لیا ہے اور دو بندے اس جگہ کی نگرانی کر رہے ہیں۔ آگے آپ جو حکم دیں وہی ہوگا۔"

"خبر تو واقعی زبردست لائے ہو سرور! بس اب کسی انتہاء کی ضرورت نہیں ہے۔ ڈائریکٹ ایکشن کر کے چاچا اور اس کے ساتھیوں کو ان کے کیے کی سزا دینی ہے۔ جو کچھ معلوم کرنا تھا ہم نے گلیل سومرو سے معلوم کر لیا تھا۔ چاچا کے لیے تو ڈائریکٹ سزا ہی ٹھیک رہے گی۔" وہ خبر سن کر خوش ہو گیا۔

اسے پہلے ہی اس بات کا خدشہ تھا اس لیے عرصے سے نظر انداز کی ہوئی فیکٹری کی طرف توجہ دینا شروع کر دی تھی اور اپنے اس کام کا شہر میں رکنے کا جواز بنا لیا تھا۔

"یاد رکھنا عالم شاہ کہ تم ہماری آخری پونجی ہو جسے ہم کسی صورت نہیں گنوا سکتے۔ ہمارے بوڑھے اور کمزور دل کے لیے معظّم شاہ کی موت اور جوان بیٹی کی بیوگی کا بوجھ ہی کافی ہے۔ تم ہمیں کسی اور آزمائش میں مت ڈالتا۔" صداقت شاہ نے گویا اس سے التجا کی۔

"آپ اتنے کمزور کیوں پڑ گئے ہیں بابا سائیں! آپ اتنے کم حوصلہ تو نہیں تھے۔ کیا کوئی بات ہوئی ہے؟" اس نے ان کے لہجے کی کمزوری کو محسوس کر کے سوال کیا۔

طیبر نے پاس خبریں آ رہی ہیں کہ لطیف سومرو اپنے بچے کی حالت کا کافی دباؤ میں ہے۔ دار نہیں ہی ٹھہرا رہا ہے اور اس کی طرف سے انتقامی کارروائی کا اندیشہ ہے۔" انہوں نے آہستہ سے بتایا۔

"اس کو ہم نہیں کہ پہلے اپنے کے علاج معالجے کی فکر کرے۔ جیسا شک ہو گیا تو خود اپنے ہاتھ سے لے گا کہ اسے اس حال تک کس سے پہنچایا۔" عالم شاہ نے زہر پلے لہجے میں شورہ دیا۔ گلیل سومرو نے بچے اس کے دل میں کچھ ایسی ہی نفرت تھی کہ کسی صورت اسے صاف نہیں کر سکتا تھا۔ اسے گلیل سومرو کے بارے میں جو آنکھوں سے محسوس ہو رہی تھیں وہ باعث سکون تھیں۔ گلیل سومرو زندہ ضرور رہے گا لیکن اس کی حالت مُردے سے بھی بدتر تھی۔ اس کی ایک آنکھ ضائع ہو گئی تھی اور ایک جڑا بھی ٹھیک طور پر تباہ ہو گیا تھا جس کی وجہ سے وہ منہ سے خوراک لینے سے محروم ہونے کے علاوہ بولنے سے بھی معذور ہو گیا تھا۔ اس کے اعصابی نظام کو بھی شدید نقصان پہنچا تھا جس کے باعث وہ اپنے جسم کو حرکت دینے سے بھی قاصر تھا اور ایسا لگتا تھا کہ قدرت نے اسے صرف نشانِ عبرت بنانے کے لیے زندہ رکھا ہوا ہے۔ سنا تھا لطیف سومرو علاج کے لیے اسے باہر بھجوانے والا ہے۔

"ہمیں کسی کو کوئی پیغام بھجوانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس تم یہ یاد رکھو کہ ہمیں کوئی جذباتی قدم نہیں اٹھانا ہے اور ہر حال میں اپنی سلامتی کا خیال رکھنا ہے۔ دیکھا جائے تو سومرو خاندان کے ساتھ قدرت نے خود ہی انصاف کر دیا ہے اور ہمیں انتقام کے لیے کوئی قدم اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر انتقام کا فیصلہ ہوا بھی تو اسے ہم بڑے پلان کریں گے۔ تم اس بارے میں کچھ کرنے کا سوچنا بھی

گاڑیاں اشارت ہونے کی آوازیں آرہی ہیں۔" ایک دم ہی قدرے بیچانی لہجے میں یہ دوسری اطلاع دی گئی۔

"گاڑیوں کو باہر آنے دو اور پھر سب کو بھون ڈالو۔ کوئی ایک بھی نہیں بچنا چاہیے۔" سرد کے کچھ بولنے سے قبل ہی اس نے حکم جاری کیا۔ اب ان کی گاڑی ہنگلے کے اتنے قریب پہنچ چکی تھی کہ انہیں ہنگلے کا گیت دکھائی دے رہا تھا۔ بڑا سا سرمی گیت دھیرے دھیرے کل رہا تھا۔ گیت کھلاتو اس میں سے یکے بعد دیگرے دو گاڑیاں برآمد ہوئیں۔ گاڑیوں کے برآمد ہوتے ہی نامعلوم ستوں سے ان پر گولیاں برسنا شروع ہو گئیں۔ چاچا اور اس کے ساتھی جو شاید کسی نئے ڈاکے کے لیے جا رہے تھے، لمحہ بھر کے لیے تو بوکھلائے لیکن پھر انہوں نے جوابی کارروائی شروع کر دی۔ اندر ہنگلے میں موجود وہ جانے والے ساتھیوں نے بھی انہیں کمک پہنچائی۔ یوں سارا علاقہ گولیوں کی آواز سے گونج اٹھا۔ ہنگلے میں موجود ڈاکو اپنے ساتھیوں کو اچھا کور دے رہے تھے اور ان میں سے کئی گاڑیوں سے اتر کر ادھر ادھر پناہ لینے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ابھی تک کوئی گولی نہ چلانے والے سرد اور عالم شاہ دور اپنی گاڑی میں بیٹھے یہ تماطلہ کھ رہے تھے۔

"ان میں چاچا کون ہے سرد؟" عالم شاہ نے پناہ لینے والے ایک آؤ سرد دوسری آؤ کی طرف بھاگتے ہوئے ڈاکوؤں کو کھنکھاتا ہوا کہا۔

"وہ نیچے والی گاڑی کے نیچے لیٹ کر فائرنگ کر رہا ہے ساتھی۔" سرد نے اسے آگاہ کیا تو وہ ایک ہنگلے سے گاڑی کا دروازہ کھل کر باہر نکلا۔ سرد اس کے ساتھ ساتھ اسے آوازیں ہی دینا روک دیا۔ پہلے جھکا کر دروازے کے بعد ایک دم زمین پر لیٹ گیا اور ہنگلے کی طرف دیکھتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ اس کی نظریں چند اس مقام پر پڑیں جہاں چاچا چھپا ہوا تھا اور وہ اس بات سے بالکل بے نیاز ہو گیا تھا کہ اس کے آس پاس سے گولیاں سائیں سائیں کرتی ہیں۔ گزر رہی ہیں۔ پوری توجہ چاچا پر مرکوز رکھے وہ ایک خاص فاصلے پر رکا اور مخصوص زاویہ بناتے ہوئے اپنی گن سیدھی کی۔ لگا تار کیے جانے والے تین فائر بہت تباہ کن تھے۔ گاڑی کے نیچے موجود چاچا نے بوکھلا کر باہر نکلنے کی کوشش کی لیکن دیر ہو چکی تھی۔ گولیوں نے اپنا کام دکھا دیا تھا۔ گاڑی کے فیول ٹینک میں سوراخ ہو گیا تھا اور بہتے ہوئے پیٹرول نے آگ پکڑ لی تھی۔ پیٹرول کی آگ سے زیادہ خوفناک آگ شاید ہی کوئی ہو۔ آٹا فانا چاچا بھی اس آگ کی زد میں

"آپ حکم دیں سائیں، کب کارروائی کرنی ہے؟" سرد اس کے کسی فیصلے سے کہاں اختلاف کر سکتا تھا، فوراً حکم کی بجا آوری کے لیے تیار ہو گیا۔

"اس موڈی کو مہلت دینا ٹھیک نہیں ہے۔ ہم آج رات ہی کارروائی کریں گے۔" عالم شاہ نے دونوں فیصلہ سنایا۔ "میں اور میرے ساتھی سب نمٹائیں گے سائیں! آپ دور رہ کر تماشا دیکھیں، آپ کے لیے یہی مناسب رہے گا۔" سرد کی وفاداری نے اس کی زبان سے یہ مشورہ ادا کروا دیا۔

"نہیں سرد! میں اس معاملے سے دور نہیں رہ سکتا۔ اپنی بہن کے ساتھ ظلم کرنے والے ایک ایک فرد کو اپنے ہاتھ سے اپنے آپ بچانے بغیر مجھے سکون نہیں ملے گا۔" عالم شاہ نے اعلان فیصلہ کر دیا۔

"حکم سائیں! میں تیار کرواتا ہوں۔" اپنے حکم کے روئے کے چلتے ہی سرد باپوس ہو گیا لیکن فرمانبرداری میں کوئی تکیہ نہیں آئی۔ اسی رات وہ لوگ رات کو تقریباً دو بجے اپنے ٹارگٹ کی طرف روانہ ہوئے۔ اس بار پیشہ ور ڈاکوؤں سے مقابلہ تھا اس لیے سرد نے پہلے سے زیادہ نفری کا انتظام کیا تھا۔ اس سے آدی پہلے ہی انگلے گاڑیوں میں اس ہنگلے کے قریب پہنچ گئے تھے جہاں چاچا اپنے ساتھیوں کے ساتھ موجود تھا۔ وہ حسب معمول تمام ساتھیوں کو خود اپنے ساتھ لے کر لٹکا تھا اور اپنے آدمیوں سے رپورٹ لیتا جا رہا تھا۔

"ہنگلے میں ابھی تک چہل پہل ہے اور صاف پتا چل رہا ہے کہ زیادہ تر افراد جاگ رہے ہیں۔" ملنے والی یہ اطلاع اچھی نہیں تھی۔ انہیں صبح کی روشنی پھیلنے سے قبل اپنا کام نمٹا کر واپس لوٹ جانا تھا اور یہ خبیث ڈاکو ابھی تک جاگ رہے تھے۔ ان کے جاگتے ہوئے ہنگلے میں داخل ہونے کا مطلب تھا زبردست مزاحمت کا سامنا کرنا اور اپنے لوگوں کو نقصان سے دو چار کرنا۔

"ہم کچھ دیر مزید انتظار کر کے دیکھ لیتے ہیں۔ ہنگلے میں چہل پہل کم ہونے کے آثار نظر آئے تو ٹھیک ہے ورنہ کل دیکھیں گے۔ مجھے اپنے انتقام کی پیاس بجھانے کے لیے اپنے لوگوں کی جان داؤ پر لگانا منظور نہیں ہے۔" سرد کو ابھمن میں دیکھ کر عالم شاہ نے فیصلہ سنایا۔ اب وہ چاچا والے ہنگلے کے کافی قریب پہنچ چکے تھے اور انہیں ہنگلا دکھائی دینے لگا تھا۔

"وہ لوگ کہیں باہر جا رہے ہیں سائیں۔ اندر سے

ڈسے لے چکے تھے۔ روشن ماتھر کا پڑوسی ملک کا جاسوس ہونا اور ملک دشمن سرگرمیوں میں لوث ہونا پوری طرح ثابت ہو چکا تھا اور حکومت پاکستان اس کے ملک اور اہل خانہ کی طرف سے دائر کردہ رحم کی اپیلیں مسترد کر کے اسے سزائے موت دینے کا حتمی فیصلہ کر چکی تھی۔

روشن ماتھر کی اس کے اہل خانہ سے الوداعی ملاقات کروائی جا چکی تھی اور چند دنوں میں اس کی سزا پر عمل درآمد ہونے والا تھا۔ روشن ماتھر کی خدمات کے معترف اس کے آقاؤں نے اس کی جان بچانے کی کوششیں تیز کیں تو ان لوگوں تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے جو آج کل معاذ کے جسم و جان کے مانگ بنے بیٹھے تھے۔ معاملات طے ہو گئے تو بے چارے سیمسن کو گاؤں سے واپسی میں چالاکی سے اغوا کر لیا گیا اور وہاں پہنچا دیا گیا جہاں معاذ کو اس سے بھی پہلے پہنچایا جا چکا تھا۔ معاذ کو ٹھیک طرح سے نہیں معلوم تھا کہ وہ ملک کے کون سے حصے میں ہے لیکن اتنا ضرور اندازہ تھا کہ اسے یہاں تک پہنچنے کے لیے اچھا خاصا طویل سفر طے کرنا پڑا ہے۔ اس کے ساتھ یہاں آنے والوں میں ڈاکٹر وکٹر بھی شامل تھا اور معاذ کے ساتھ سیشن کرتے ہوئے اس کے دماغ میں بہت کچھ اند پلنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ اس نے اسے باور کروایا تھا کہ کچھ عرصے کے لیے اسے سیمسن کا کردار ادا کرتے ہوئے وہ کام کرنا ہے جو اس نے کہا جاتے۔ سیمسن کا کردار ادا کرنے کے لیے اسے سیمسن کے طے میں بہت سی معلومات بھی ذہن نشین کروانی گئی تھیں۔ اسے سیمسن کی آڈیو ویڈیو کا نثر بھی سنوایا گئی تھیں تاکہ وہ سیمسن کا کردار بہتر طریقے سے ادا کر سکے۔ معاذ قدرتی طور پر ایک بہت اچھا ناول تھا اس لیے اس کی سیمسن کے بعد وہ سیمسن کے لب و لہجہ کی بہت اچھی نقل اتارنے پر قادر ہو گیا تھا اور اپنی چال و حال کو بھی اسی کی شخصیت کے سانچے میں ڈھالنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس سلسلے میں تربیت کے دوران ڈاکٹر وکٹر خصوصی سیشنوں کے دوران اسے یہ باور کرواتا رہا تھا کہ روشن ماتھر ایک بے گناہ شخص ہے جسے پاکستانی اداروں نے محض پڑوسی ملک کا شہری ہونے کے جرم میں گھیر لیا ہے اور اس پر بے جا الزامات عائد کر کے بے قصور ہی سزائے موت دی جا رہی ہے۔ اسے روشن ماتھر کی یوڑمی بیوہ ماں اور جوان بیوی کے دکھوں کا بھی نہایت دلخراش نقشہ پیش کر دکھانے کے بعد یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی تھی کہ اگر وہ روشن ماتھر کو قید سے نکال کر آزاد کروانے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو یہ نہ صرف ایک مظلوم کی مدد ہوگی

آگیا اور گولیوں کے شور کے باوجود اس کی دلہ وز جنہیں واضح سنائی دینے لگیں۔ عالم شاہ کا مقصد پورا ہو چکا تھا اس لیے مزید وہاں رکنے کے بجائے پیچھے ہٹنے کا فیصلہ کیا لیکن شاید فیصلے میں تاخیر ہو گئی تھی۔ کہیں سے ایک گولی سنسنائی ہوئی آئی اور اسے اپنی پیٹھ میں اتنی زور کا جھکا لگا کہ خود کو سنبھال نہ سکا اور زمین پر اوندھے منہ گر گیا۔ اسی وقت ایک کان بھاڑ دھماکا ہوا۔ پہلے صرف بہتے ہوئے بیٹرول میں آگ لگی تھی لیکن اب فیول ٹینک پھٹ گیا تھا اور گاڑی کئی پر خچوں میں تبدیل ہونے کے بعد اس کے کئی جلتے ہوئے ٹکڑے ادھر ادھر پھیل گئے تھے۔ ایک جلتا ہوا ٹکڑا اس کے قریب بھی آ کر گر اور اس نے اس کی حدت اپنے جسم پر محسوس کی لیکن اس احساس کے اور سے سنائی دیتی پوئیس کی گاڑیوں کے سائرن کی آوازیں حاوی رہنے لگیں۔ سائیں صداقت شاہ جیسے معزز آدمی کا پوئیس کو اس جگہ زخمی حالت میں ملتا تو ان کے

☆☆☆

اس نے جیادام آئینے کے سامنے مڑے ہو کر خود کو دیکھا اور ششدر رہ گیا۔ آئینے میں نظر آنے والا عکس اس کا نہیں تھا۔ وہ اپنے سامنے ایک عکس کی شکل دیکھ رہا تھا جو قد کاٹھ کے حساب سے تو اس جیسا ہی تھا لیکن رنگ روپ و نقش و نگار اور بالوں کے انداز کے حوالے سے بالکل مختلف تھا۔ اس نے اس اجنبی عکس میں اپنی اصل شخصیت کیوجہ سے چاہی لیکن کہیں بھی تو اس اصل شخصیت کا عکس موجود نہیں تھا۔ یہاں تک کہ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ اپنے نشان انگشت کہیں ثبت کرے گا تو وہ بھی اس کی شخصیت کا کھوج نہیں دیں گے اور نہ ہی گواہی ملے گی کہ وہ سیمسن ڈیلاٹ ہے۔ پنجاب کے ایک دور دراز اور پسماندہ گاؤں میں اپنی شادی کی چھٹیاں گزار کر واپس آنے والا سیمسن ڈیلاٹ جو اپنے ملازمتی فرائض انجام دینے کے لیے واپس لوٹا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ بے چارے سیمسن کی واپسی اس کے لیے قید حیات سے پر دانہ آزادی ثابت ہوئی تھی۔ ملک کے چپے چپے پر اپنے پچھے گاڑے بیٹھے دشمن سے سیمسن جیسا عام اور بے ضرر آدمی بھی پوشیدہ نہیں رہا تھا۔ سیمسن کی بد قسمتی تھی کہ وہ اپنے قد کاٹھ اور ملازمت کی نوعیت کے سبب ان شکاریوں کی نظر میں آگیا تھا جو اپنے مطلب کے حصول کے لیے کسی بھی حد سے گزر جاتے ہیں۔ سیمسن کی بد قسمتی تھی کہ اس نے شادی کی چھٹیاں ایسے موقع پر لی تھیں جب کچھ خاص لوگ روشن ماتھر کو آزاد کروانے کا مشن اپنے

بلکہ دو بے سہارا خواتین پر بھی اس کا احسان ہوگا۔

روشن ماتھر کا قصہ غیا نہیں تھا۔ معاذ اس جال میں پھنسنے سے پہلے ہی اس شخص کے بارے میں خبروں و فیروہ کے ذریعے بہت کچھ سن چکا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ کوئی بے قصور شخص نہیں بلکہ مبینہ غیر ملکی جاسوس ہے جس پر ایسے کئی دھماکوں کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے جن میں درجنوں افراد بے گناہ اجل بنے تھے اور ان درجنوں افراد سے وابستہ سیکڑوں افراد نے دکھ کی فصل کاٹی تھی۔ وہ ڈاکٹر وکٹر کی دی ہوئی حیثیت پر اس شخص کے لیے کوئی بھرپور بھلا کیسے محسوس کر سکتا تھا۔ اس نے اس معاملے میں بھرپور مزاحمت کی تھی اور وکٹر کے مقابلے میں خود اپنے دماغ کو خصوصی ہدایات دیتا رہا تھا۔ روشن ماتھر کے لیے اس کے دل میں نفرت کے جذبات اس قدر بڑھ چکے تھے کہ جب سیمسن کو یہاں لایا گیا تو اسے سیمسن کے دونوں اعترافوں کی کمال نہایت مہارت سے غور کر کے ان کے دونوں اعترافوں پر اس طرح منہ مٹی گئی تھی کہ عام نظر سے دیکھنے پر اسے اندازہ ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ یہاں کسی کاروباری دکان کا بیڑا ہے۔ اس محل کے بعد سے سر کے بالوں سے لے کر پیر کی انگلی تک سیمسن کے رویے میں ڈھال دیا گیا تھا اور وہ بھی اس مہارت سے کہ وہ خود اپنی جگہ حیران کھڑا تھا کہ وہ معاذ احمد ہے یا سچ بچ سیمسن ڈیلا ہے۔ وہ جن لوگوں کے درمیان تھا، ان کی خصوصیات ہر روز سے اس کے سامنے کھل کر آتی تھیں اور وہ حیران رہ جاتا تھا کہ یہ کوئی لوگ ہیں جو برہن میں اتنے یمناء ہیں اور جن کے اتنے بے شمار دسائے ہیں کہ جو چاہے کر گزرتے ہیں پھر بھی انہوں نے اس جیسے ایک عام پو نیورسٹی کے طالب علم کو اپنے ہجوم خاص مقاصد کے لیے چن لیا ہے۔

”ہیلو سیمسن! کیسے ہو تم اور کیسا فیل کر رہے ہو؟“
ابھی وہ آئینے کے سامنے سے ہٹا نہیں تھا کہ ڈاکٹر وکٹر کمرے میں داخل ہوا اور اسے مخاطب کیا۔

”آئی ایم فائن سر! میں اپنی جانب پر جانے کے لیے بیٹھ چکا ہوں۔“ معاذ نے اسے جواب دیا تو اس کی آواز قطعی بدلی ہوئی تھی اور بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے سیمسن بات کر رہا ہو۔

”گڈ! تم سے اسی کارکردگی کی امید تھی۔“ وکٹر نے بے ساختہ اسے سراہا اور ہاتھ کے اشارے سے ایک کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ اس دوران ویل چیئر پر چھراکی ہوئی حالت میں بیٹھے سیمسن اور اس ٹرائی کو وہاں سے لے جایا جا چکا تھا جس پر میک اپ کے نہ جانے کون کون سے لوازمات بچے ہوئے

تھے۔ سفید کوٹ میں لمبے وہ شخص اور اس کا اسٹنٹ بھی ڈاکٹر وکٹر کی آمد کے بعد وہاں سے روانہ ہو گئے تھے جنہوں نے معاذ کے وجود کو اس تبدیلی سے گزارا تھا۔

”ہمارے ایکسپرت نے تمہیں اس مہارت سے سیمسن کا روپ دیا ہے کہ اسے پیدا کرنے والی ماں بھی اصل سیمسن اور تم میں فرق تلاش نہیں کر سکے گی۔ چلیے کی اس کامیاب تبدیلی کے بعد سارا دار و مدار تمہاری صلاحیتوں پر ہے کہ تم کسی کو اپنی شخصیت پر شک نہ ہونے دو۔ اس گیٹ اپ سے متعلق تمام ضروری معلومات تمہیں ذہن نشین کرنا ہونی چاہی ہیں پھر بھی اگر تمہارے ذہن میں کوئی سوال ہو تو پوچھ سکتے ہو۔“ وکٹر نے اس سے گفتگو کرتے ہوئے پیشکش کی۔

”نوسر! آل از کلیئر۔ میں بس یہ جانتا چاہتا ہوں کہ پلان کیا ہے؟“ اس نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

”پلان سے پہلے ایک ویڈیو دیکھ لو۔ یہ ویڈیو تمہارے بہت کام آئے گی۔“ ڈاکٹر وکٹر نے اسے جواب دیا اور ریویو کی مدد سے ویڈیو پر لگا ایل ای ڈی آن کیا۔ ڈاکٹر وکٹر ہمیشہ سب افراد کی غیر موجودگی میں اس سے ملاقات کرنا کرتا تھا۔ یقیناً وہ بہت بُرا اعتماد تھا کہ معاذ محل طور پر اس کے گرائس میں ہے اور کسی صورت اسے نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اس نے معاذ کا دل چاہتا تھا کہ اس کی گردن مروڑ کر اس کی سینے کی دھڑکنیں دور کر دے لیکن پھر مصیبت ہاتھ روک لیتی تھی۔ بہت شاطر اور طاقتور لوگ تھے اور ان سے نمٹنے کے لیے بہت بات کہ بجائے عقل اور مصلحت سے کام لینے کی ضرورت تھی۔

”یہاں جلدی سیمسن کے جہاں روشن ماتھر کا رہنا ہے۔ تم اس ویڈیو کو ذہن نشین کرنا چاہو گے۔“ اس نے آسانی سے کہا۔ ”وکٹر نے اسے مشورہ دیا کہ وہ فوراً سے ویڈیو دیکھنے لگا۔ یہ کسی عمارت کے اندرونی پُرچے راستے سے تھیں جن پر لگتا تھا کہ کوئی شخص گیمرا ہاتھ میں لیے آگے بڑھ رہا ہے۔ اس پُرچے راستے کا اختتام ایک کمرے پر ہوا جس کی ایک شیخ پر روشن ماتھر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اگرچہ ان ویڈیوز اور تصویروں کے مقابلے میں بہت مختلف لگ رہا تھا جو معاذ اس سے قبل ٹیلی ویژن اور اخباروں میں دیکھتا رہا تھا لیکن پھر بھی اس نے اسے شناخت کر لیا تھا۔ معاذ نے صاف محسوس کیا کہ قدرے بیمار اور مایوس محسوس ہونے والے روشن ماتھر پر گیمرا فوکس ہوتے ہی اس کے چہرے کے تاثرات تبدیل ہو گئے اور وہ یوں اپنی جگہ سے کھڑا ہوا جیسے

ماہر کو بخفاخت سرحد پار کروادیں گے بلکہ تمہیں بھی ہمارے پاس واپس لے آئیں گے۔" اسے آگاہ کیا گیا۔

"او کے! آئی ایم ریڈی۔" اس نے اپنے اعصاب کو ڈھیلے چھوڑ دیا۔ اب جو کچھ ہونا تھا، وہ ہونا تھا اس لیے بہتر یہی تھا کہ خود کو حالات کے حوالے سے چھوڑ دیا جائے۔ اس روز سیکسن کی جگہ وہ ملازمت پر پہنچا تو سیکسن کے ساتھ رہنے والے دو ساتھیوں نے اسے گھیر لیا۔

"اؤئے یہ کیا، تو تو ہمیشہ چھٹی ختم ہونے سے ایک دن پہلے واپس آ جایا کرتا تھا، اب کے اتنی لیٹ کیسے ہو گیا؟" ایک ساتھی نے فوراً اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

"لیٹ تو نہیں ہوا، ڈیوٹی سے پہلے پہنچ گیا ہوں۔" اس نے سیکسن کے لب و لہجہ میں جواب دیا اور اپنے کام کے کپڑے تبدیل کرنے لگا۔

"اب اسے اُدھر کی ڈیوٹیاں بھی تو بھگتانی ہیں۔ اب تو ایسا ہی ہوا کرے گا۔" دوسرے ساتھی نے شوخ لہجے میں اسے چھیڑا تو وہ مسکرا دیا۔ بے چارہ سیکسن اپنی ڈیوٹی پر پہنچا ہوتا تو اپنے ساتھیوں کی شرارت بھری چھیڑ چھاڑ کے جواب میں ایسے ہی رد عمل کا مظاہرہ کرتا۔

"دیا تو کر کے آ گیا۔ اب ہم دوستوں کو کب دعوت دے گا؟" پہلے والے نے اس سے سوال کیا۔

"جب ملو تب۔" یہ جواب دیتے ہوئے اس کے دل میں سیکسن کے لیے اپنے دل میں خاص درد محسوس کیا۔ وہ امنگوں اور خواہشوں سے بھرپور جوان ایک مجرم، قاتل اور دہشت گرد کی زندگی بچانے کے لیے اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا اور اس کے چاہنے والوں کو علم ہی نہیں تھا کہ اس پر کیا گزر گئی ہے۔

"یہ بات ہوئی نا۔ چل تو میں سے فارغ ہو کر آ جا پھر شام میں پروگرام بناتے ہیں۔ ہم یاروں نے مل کر تیرے لیے شادی کا تحفہ بھی لیا ہے۔ اگلی دوپہر چھٹیوں پر گھر جائے گا تو بھر جانی کے لیے ہماری طرف سے جھونپڑا لے کر جانا۔" کہنے والا پورے غلوں سے کہہ رہا تھا، یہ جانے بغیر کہ سیکسن اب بھی اپنے گھر واپس نہیں لوٹ سکے گا اور اس کی بوڑھی بیوہ ماں اور ایک بیٹے کی بیہوشی اس کی راہ ہی سختی رہ جائیں گی۔ اس صورت حال پر دل میں ابھرتے درد کو دبا کر وہ یہ مشکل مسکرایا اور اپنی ڈیوٹی کے لیے روانہ ہو گیا۔ اسے جس جگہ ڈیوٹی کرنا تھی، وہ اصل میں ایک سیف ہاؤس جیسی جگہ تھی جسے ہائی لائٹ کے بغیر خطرناک مجرموں یا اہم گواہوں کو خفیہ طور پر بخفاخت رکھنے

کسی کا استقبال کر رہا ہو۔ ویڈیو بین سیم تک تھی، اس کے بعد اسکرین تاریک ہو گئی۔

"شاندار! تم لوگوں نے یہ ویڈیو کیسے حاصل کی؟" معاذ خود کو سوال کرنے سے باز نہ رکھ سکا۔

"اتفاق اور اچھی چلانگ سے۔ اتفاق یہ تھا کہ روشن ماہر کی ماں کی ایک آنکھ مصنوعی ہے۔ ہم سے اس کی آزادی کے سلسلے میں تعاون مانگا گیا تو ہم نے ایک خاص پلان پر کام شروع کر دیا۔ روشن ماہر کی فیملی کی طرف سے ملاقات کی درخواست بھجوانے سے قبل اس کی ماں کی مصنوعی آنکھ تبدیل کر کے اس کی جگہ ایک ایسی مصنوعی آنکھ لگھس کی تھی جو ایک کمرے کی طرح بھی کام کر سکتی تھی۔ بے چارے یا کتھن نے اپنی طرف سے ہر ممکن احتیاط برتی۔ ساس پھوپھوں پر مبنی مانند کمر اس عمارت تک لے گئے جہاں ماہر کو رکھا ہے۔ عمارت میں داخلے سے قبل ساس بھو کے لباس پر جو توں سیت کی کے جنم بر سے ہر شے اتروالی گئی اور انہی اپنے فراہم کردہ لباس اور جوتوں میں ماہر تک لے جایا گیا۔ وہ جاسوسی کا کوئی آلہ اپنے ساتھ نہ لے جاسکیں لیکن ماہر کی ماں کی مصنوعی آنکھ کی صورت کمر احمر چلا گیا اور انہیں کوئی خبر ہی نہیں ہوئی۔ ماہر بہت ذہین ایجنٹ ہے۔ اسے اندازہ ہو گا کہ ماں اور بیوی کے ساتھ لازماً جاسوسی کا کوئی آلہ موجود ہو گا اس لیے وہ سیکسن اس نے بہت سے ایسے ہنٹ دے جن سے اس تک پہنچنے میں مدد ملی۔ گھنگو کا وہ حصہ چھپا کر لے لے بے معرف تھا اس لیے تمہیں صرف اتنی ویڈیو دکھائی گئی ہے جو تمہارے کام میں معاون ثابت ہو سکے۔" وکٹر نے تفصیل سے اس کے سوال کا جواب دیا تو وہ دل میں ایک ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گیا۔ انسانی ہمدردی کے جذبات کا مظاہرہ انسانوں تک ہی محدود رہے تو ٹھیک رہتا ہے۔ روشن ماہر جیسے خونی بھیڑیے جو ملک و قوم کی تباہی میں براہ راست کردار ادا کرتے رہے ہوں، کسی ہمدردی کے لائق نہیں ہوتے۔

"میرے لیے کیا حکم ہے؟" اس نے اگلا سوال کیا۔

"تمہیں فوری طور پر روانہ ہونا ہے۔ سیکسن اپنے پلان پر عمل کر رہا تھا تو ڈیوٹی جو ان کرنے سے ایک دن قبل ہی پہنچ چکا ہوتا۔ تم صبح سویرے اپنی ڈیوٹی شروع ہونے سے ذرا دیر پہلے وہاں پہنچو گے۔ اس لیے کسی کو تم سے زیادہ بات چیت کا موقع نہیں ملے گا۔ اندر تم اکیلے ہو گے اور اکیلے ہی تمہیں روشن ماہر کو باہر نکالنے کا کام انجام دینا ہو گا۔ باہر نکلتے ہی تمہیں مددگار میسر آ جائیں گے جو نہ صرف

کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ سیکسن ایک نچلے درجے کا ملازم تھا جو یہاں صفائی ستھرائی وغیرہ کے کام انجام دیتا تھا اور مخصوص اوقات میں اپنی ڈیوٹی پوری کر کے اصل عمارت سے ہٹ کر اس جگہ واپس آ جاتا تھا جہاں اسی کی طرح کے دوسرے ملازمین رہائش پذیر تھے۔ اصل عمارت کے اندر جانے والوں میں صرف سیکسن اور ایک بوڑھا کنگ شامل تھے۔ کنگ ریٹائرمنٹ کے قریب تھا اور سیکسن کے مقابلے میں اندر زیادہ وقت گزارتا تھا لیکن ایک تو وہ قدمیں سیکسن کے مقابلے میں چھوٹا تھا دوسرے سیکسن کی شادی کی چھٹیاں اسے جال میں پھنسانے کا بہترین موقع ثابت ہوئی تھیں اس لیے وہ بے چارہ کام آگیا تھا اور اب معاذ اس کی جگہ ڈیوٹی پر ہوتا تھا۔

انگریز عیسائیوں اور معمول کی تلاشی لینے کے بعد اسے اندر جانے کی اجازت دے دی گئی۔ اسے یہاں ایک بڑی گلی پر دو آگے بڑھنا پڑا۔ اس نے اپنے ہاتھ کو کی اسلحہ یا بارودی مواد نہیں لایا تھا۔ اس کی جیب میں صرف ایک لائٹر اور سگریٹ کا پیکٹ پڑا ہوا تھا جس سے کسی نے تعرض نہیں کیا تھا۔ سیکسن سگریٹ نوشی کی عادی تھا اور اس نے یہ چیزیں اپنے ساتھ رکھنے کی اجازت تھی۔ چارٹرڈ گھڑی کا سبائی سے ملے کرنے کے بعد وہ اندر داخل ہوا اور مخصوص جگہ سے صفائی کا سامان اٹھا کر اپنا کام شروع کر دیا۔ سیکسن وہ شخص تھا جس نے جرنیات کے ساتھ اس سے ایک بات کی تھی اس لیے اسے اس جگہ کے اجنبی ہونے کے باوجود کچھ اجنبی نہیں لگ رہا تھا۔ صفائی کا کام انجام دیتے ہوئے وہ ایک ہال نما کمرے میں پہنچا۔ سیکسن نے بتایا تھا کہ اسے اس کمرے سے آگے جانے کی اجازت نہیں ہے اور کبھی کبھار مسلح افراد کی موجودگی میں ہی اندر کے حصوں کی صفائی کے لیے بھیجا جاتا ہے وہ بھی اس طرح کہ اس کی وہاں کبھی کسی فرد سے ملاقات نہیں ہوتی اور نہ ہی وہ بتا سکتا ہے کہ وہاں کتنے افراد موجود ہوتے ہیں۔ سیکسن نے اس جگہ کمرے کی موجودگی کا بھی انکشاف کیا تھا۔ کیمرا ایک آرٹسٹ بلب کے شیڈ کی آڑ میں چھپایا گیا تھا جسے دوران صفائی دریافت کر لینے کے باوجود سیکسن نے خود کو انجان ہی ظاہر کیا تھا۔ اسے اپنی ملازمتی ذمہ داریوں کا احساس تھا اور وہ زبان بند کر کے رہنے میں ہی اپنے لیے بھلائی محسوس کرتا تھا۔

معاذ نے بھی اس کمرے کو تار لیا اور اس سے نجات کے لیے حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے دیواروں اور چھتوں

سے جالے صاف کرنے کا کام کرنے لگا۔ اس کام کے لیے اس کے پاس پلاسٹک کا ایک برش موجود تھا۔ برش ڈنڈے پر لگا ہوا تھا اور ڈنڈے کی لمبائی ضرورت کے مطابق کم یا زیادہ کی جاسکتی تھی۔ اس نے ڈنڈے کی لمبائی میں اضافہ کیا اور چھت کے جالے صاف کرنے لگا۔ یہ کام کرنے کے دوران وہ تیز تیز ہاتھ چلاتے ہوئے یہ تاثر دے رہا تھا کہ اسے بہت سا کام کرنا ہے اس لیے وہ ذرا جلدت کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ اس تیزی کو برقرار رکھتے ہوئے جب وہ اس آرٹسٹ بلب والی دیوار تک پہنچا جس میں کیمرا چھپایا گیا تھا تو بلب کے قریب کا حصہ صاف کرتے ہوئے ڈنڈے کو یوں حرکت دی جیسے اچانک ہی ڈنڈا اس کی گرفت سے نکل گیا ہو۔ ڈنڈا جو بلب کے شیڈ کے عین اوپر حرکت کر رہا تھا، پوری قوت سے شیڈ سے ٹکرایا اور شیڈ کا رنگین شیشہ ٹوٹ کر ٹکڑوں کے ساتھ ہی کمرے کا تار بھی نکل گیا۔ مائیکرو کیمرا لمبے میں ہی نیچے فرش پر آن گرا۔ وہ یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ٹوٹ کر گرنے والی اشیاء کو دیکھنے لگا جیسے اس صورت حال پر گھبرا گیا ہو۔ توقع کے مطابق فوراً ہی رد عمل ظاہر ہوا اور ایک مسلح شخص اندر داخل ہوا۔ وہ سادہ پوش تھا لیکن اس کا قد کافی بڑا تھا اور چلنے کا مخصوص انداز اس کے آری میں

لپٹنے کی چٹائی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے سپاٹ لیجھ میں اس سے دریافت کر لیا۔

”جائے صاف کر رہے ہوئے ڈنڈا اس بلب پر لگے۔“ اس نے جملہ اور اچھوڑا اور ہاتھ سے نیچے مڑی ہوئی اس کی طرف اشارہ کیا۔

”اس اوپر تو ہاتھ لگاؤ۔“ اس نے نرمی سے کہا اور نیچے سر اٹھانے کے لیے جھکا۔ معاذ کے لیے یہ ایک اچھا موقع تھا۔ اس نے ہاتھ میں موجود ڈنڈا اپنے تلے انداز میں اس طرح اس کے سر پر رسید کیا کہ وہ ایک ہی وار میں بے ہوش ہو کر گر گیا۔ معاذ نے سب سے پہلے اس کی گن پر قبضہ کیا اور پھر محتاط انداز میں پلٹ کر باہر نکلا۔ سیکسن سے حاصل شدہ معلومات کے مطابق اس برآمدے میں کوئی کیمرا نصب نہیں تھا پھر بھی اس نے گن اپنے لباس کے اندر چھپائی اور صفائی کا سامان اپنے ہاتھ میں رکھا۔ اب وہ ہال سے دور برآمدے کے آخری سرے پر موجود کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ کمرہ دفتر کے انداز میں سجایا ہوا تھا لیکن ابھی وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔ اس نے ایک کھڑکی کا پردہ کھینچ کر اتارا اور میز کے اوپر چڑھ

شکرے کی طرح ان کی طرف جھپٹا۔ نال کی طرف سے پکڑی ہوئی گن اس کے دائیں ہاتھ اور صفائی کے برش والا ڈنڈا بائیں ہاتھ میں تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے بیک وقت دونوں کے سروں کو نشانہ بنایا۔ جس کے سر پر گن کا دستہ لگا، وہ تو فوراً ہی لہراتا ہوا نیچے آگرا لیکن ڈنڈے کا نشانہ پہنچنے والے کوشا پر اس کی چھٹی حس نے خبردار کر دیا تھا جو وہ عین وقت پر جھٹک گیا اور ڈنڈا اس کے سر کے بجائے پیٹھ پر لگا۔ اس نے جھکی جھکی حالت میں ہی اپنی گن پھرتی سے نکالی اور معاذ کی طرف پلٹا۔ معاذ نہیں چاہتا تھا کہ گولی چلے اور کوئی اس طرف متوجہ ہو۔ اس نے ایک بار پھر اپنے ہاتھ میں موجود ڈنڈے کو حرکت دی اور گولی چلنے سے قبل ہی اس شخص کے ہاتھ سے گن نکل کر فرش پر گر گئی۔ معاذ نے کوئی مہلت دیے بغیر ڈنڈے کو ایک بار پھر حرکت دی اور اس کی گردن کو نشانہ بنایا۔ اس بار وہ شخص بے ہوش تو نہیں ہوا لیکن بری طرح لہرانے لگا۔ معاذ ڈنڈا چھوڑ کر تیزی سے اس کی طرف لپکا اور اس کا منہ اور ناک دبا کر اتنی دیر تک اس کا سانس بند کر دیا کہ وہ مرے نہ لیکن بے ہوش ہو جائے۔ اس کا دروازی کو نشانہ کر اس نے تینوں بے ہوش افراد کو باری باری دروازے کے اندر کی طرف دھکیلا اور اپنا صفائی کا سامان ہی اندر لے گیا۔ اب کوئی اس ہال میں آتا بھی تو اسے یہاں پھانسی دے دیتا۔ دروازے کی آواز نہ تھی۔ وہ جس وقت اپنے بچے دروازہ کھول کر کے برآمدے میں آگے بڑھ رہا تھا اس نے فائر الارم بجنے کی آواز سنی جس کا مطلب تھا کہ کھانے کے تارکے آگے آگے چکی ہوئے۔ اب اسے تیزی سے اپنا کام کرنا تھا۔ دیکھی کہ کوئی بونے کھانا راستے پر آگے بڑھنے میں اس کی مدد کرے۔ وہ اب کھانا کھانے سے ہٹا ہی دور تھا کہ ایک زوردار ہالند کے دروازے سے اسے اپنے قدم روکنے پر مجبور کر دیا اور حکم ملنے پر وہ آواز کی سمت پلٹا۔ "تم یہاں کس کی پریشانی سے آگے ہو؟" بلادی شخص کے لیے یقیناً سیمن کا چہرہ شناختا تھا اس لیے اس نے قدرے تعجب سے لیکن حکمانہ لہجہ میں دریافت کیا۔ "مجھے بھیجا گیا ہے سرائیکین صاحب نے بولا ہے کہ اندر بہت دن سے صفائی نہیں ہوئی، جا کر صفائی کرو۔ ان کا آرڈر نہ ہوتا تو میں یہاں کیسے آسکتا تھا؟" اس نے اپنے اندر آنے کا جواز تراشنے کے ساتھ ساتھ دلیل بھی دی جس نے سامنے والے کو متاثر کیا کہ واقعی ہمہ وقت مقفل رہنے والے دروازے کو کھول کر وہ اپنی مرضی سے کیسے آسکتا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ خود اس کے پاس ایسی کوئی اطلاع نہیں تھی

کیا۔ اس میز کے عین اوپر سیٹنگ فین لگا ہوا تھا۔ اس نے سیٹنگ فین کو بجلی فراہم کرنے والے تار کو کھینچ کر اس طرح نکالا کہ اب وہ چھکے کی پکھڑی پر لٹکا ہوا تھا۔ اس نے کھڑکی سے اتار لیا اور پردہ اس پکھڑی پر رکھ کر اور لائٹ کی مدد سے سگریٹ جلانے کے بعد وہ جلتا ہوا سگریٹ پردے پر رکھ دیا۔ فوراً ہی کپڑا جلنے کی بجلی سی یو اس کے نکتوں سے ٹکرائی۔ وہ جھٹک لگا کر میز سے نیچے اتر آیا اور سوکچ بورڈ پر لگے تمام بٹن آن کر دیے۔ اسے معلوم تھا کہ جب پردہ باقاعدہ آگ پکڑے گا تو اوپر لٹکا ہوا تار فوراً اس آگ کو پکڑ لے گا۔ اس کے بعد بات کتنی آگے تک جاتی، وہ صرف اندازہ ہی لگا سکتا تھا۔ اس کام کو نشانہ کر وہ کمرے سے باہر نکلا تو اس کا بورڈ سے ملنے کے سامنا ہو گیا۔ وہ فل یونیفارم میں ملبوس ایک ٹرائی کو دھکیلا ہوا ڈنڈا ہال کی طرف لے جا رہا تھا۔ اس پر نظر پڑنے پر وہ سکرایا اور جیسی آواز میں بولا۔

"گنڈ مارنگ سیمن؟" کے مزاج بخیر ہیں؟ آج مجھے بہت کام مشنا ہے۔ میری غیر موجودگی میں یہاں ٹھیک سے صفائی نہیں ہوئی ہے اور سب کچھ پہلے کی حالت میں لانے کے لیے بے چین ہوں۔" اس نے خود بہت زیادہ معروف ظاہر کیا۔

"اوکے بوائے۔ جاؤ جا کر اپنا کام کرو۔" انعام میں، میں تمہیں اپنے ہاتھ سے تیار کردہ گرم چائے کے ساتھ سو سے کھانے کے لیے دوں گا۔" شیف ٹرائی دھکیلا ہوا آگے بڑھ گیا تو وہ اطمینان کا سانس لیتا ہوا وہیں اس جگہ آیا جہاں ایک شخص بے ہوش حالت میں پڑا ہوا تھا۔ اندر آ کر اس نے وقت دیکھا، سات بجنے میں چھ منٹ باقی تھے اور سیمن کی اطلاع کے مطابق سات بجنے میں ٹھیک پانچ منٹ پر اندرونی حصے سے دو پہرے دار باہر نکلتے تھے اور آدھے گھنٹے میں ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر ٹھیک سات بجیں پر واپس اندر چلے جاتے تھے۔ ساڑھے سات بجے پھر دوسرے دو افراد باہر آتے تھے اور وہ بھی آدھے گھنٹے میں فارغ ہو کر اپنی ڈیوٹی پر واپس چلے جاتے تھے۔ اسے جو کچھ کرنا تھا وہ اسی آدھے گھنٹے میں کرنا تھا۔

وہ بھول بھلیوں کی طرف جانے والے لاکھ دروازے کے ایک طرف کھڑا ہو گیا اور دم سادھے دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ ٹھیک سات بجنے میں پانچ منٹ کم پرتالے میں چابی گھومنے کی آواز آئی اور پھر دروازہ کھول کر بیک وقت دو درودی پوش افراد باہر برآمد ہوئے۔ معاذ کسی

کہ سسین کو اندر بھیجا جا رہا ہے۔ اندر مقیم افراد کو سسین کے سامنے بھی نہیں لایا جاتا تھا اور ان کے بیکروں کی صفائی سے قبل انہیں دوسرے کمرے میں منتقل کر دیا جاتا تھا۔ ایسے میں سسین کی اچانک آمد قابل قبول بھی نہیں تھی۔

”تم یہیں ٹھہرو۔ پہلے میں معصوم کرتا ہوں۔“ آخر اس نے درمیانی حل نکالا۔ وہ دیوار پر نصب انٹرکام کی طرف بڑھا۔ ابھی اس نے انٹرکام کو چھوا ہی تھا کہ معاذ تیزی سے حرکت میں آیا اور پھرئی سے اس کی گردن دبوچ لی۔ گردن پکڑے جانے پر وہ بری طرح بھڑکا اور اپنی دائیں کہنی معاذ کی پسلیوں پر سید کی۔ ضرب کافی شدید تھی لیکن معاذ نے برداشت کر لی اور ایک جھپٹا گھونسا اس کی کپٹھی پر مار دیا۔ ان مخصوص ضربات میں اسے خاصی تکلیف پہنچ گئی۔ اسے اس سلسلے میں بہت زیادہ مشق کروانی پڑی تھی۔ درحقیقت اس طرح سمجھا یا گیا تھا کہ انسانی جسم کے کمرے پر کتنی قوت سے ضرب لگائی جائے تو وہ بے بس، بے ہوش یا مقتول ہو سکتا ہے۔ اس سیف ہاؤس میں موجود افراد کو اسے جانظلوں میں سے لے کر اور معاذ ان میں سے کسی کو بھی شدید نقصان نہیں پہنچاتا تھا اس لیے اس کی کوشش تھی کہ صرف انہیں سبک دوس کر کے اپنا کام چلا لے۔ انٹرکام پر رابطہ کرنے کی خواہش کرنے والا اس کے بازوؤں میں جھولا تو فوراً ہی اسے دوسرے کمرے کا اشارہ کر دیا۔ وہ شاید واش روم گیا ہوا تھا جب ہی ساری صورت حال سے بے خبر بہت گمن سا اس کی طرف چلا آیا۔ صفائی کرنے والے سسین کی بنا اطلاع آمد اور اپنے ساتھی کی بے ہوش حالت میں اس کے بازوؤں میں موجودگی نے اسے بری طرح ششکادیا اور اس نے تیزی سے اپنے ہولسٹر میں سے ریوالمور نکال کر اس کی طرف فائر جھونک دیا۔ معاذ بھی اس دوران حرکت میں آچکا تھا۔ اس نے پلچ لٹے پانی سے بھری بالٹی کو اپنے پیروں سے اتنی زوردار ٹھوکر ماری کہ بالٹی اڑتی ہوئی اس اہلکار کی طرف گئی۔ بالٹی سے پہلے بالٹی میں موجود پانی اس کے وجود سے ٹکرایا۔ پلچ ملا پانی آنکھوں، ناک اور منہ میں داخل ہوا تو یقیناً شدید جلن کا سبب بنا۔ یہ عین وہ موقع تھا جب وہ لیلیٰ پر اپنی انگلی کا پورا دباؤ ڈال چکا تھا چنانچہ فائر ہوا لیکن نشانہ بھگ گیا۔

اگلا لمحہ معاذ کے لیے تکلیف دہ تھا۔ گولی بے ہوش اہلکار کے بازو میں گھس گئی تھی اور اس کے جسم سے خون بہنا شروع ہو چکا تھا۔ اس نے نمکنا احتیاط سے اس شخص کو نیچے لٹا دیا اور اس کے ساتھی کی طرف لپکا جو جلن کے باعث اپنی آنکھیں تو نہیں

کھول پاتا تھا لیکن مسلسل فائر کرتا چلا جا رہا تھا۔ اس کی چلائی ہوئی اندھی گولیاں ادھر ادھر دیواروں سے ٹکرا رہی تھیں اور بند جگہ کی وجہ سے ہر ذرہ ایک دھماکے کے مانند محسوس ہو رہا تھا۔ خود کو فائر کی زد میں آنے سے بچانے کے لیے معاذ فرش پر لڑختا ہوا اس تک پہنچا اور اس کی ٹانگ بازوؤں کی پٹنی میں جکڑ کر اسے زمین پر بوس ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد اس کے لیے اسے بے ہوش کرنا بالکل مشکل نہیں تھا۔ اس آخری بندے سے نمٹ کر وہ تیزی سے حرکت میں آ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ باہر آگ لگنے کی وجہ سے کافی ابتری پھیلی ہوئی ہوگی۔ افزائری کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا تھا کہ اس بند جگہ پر جو کہ باہر سے بالکل کٹی ہوئی تھی، جگہ جگہ شور کی آوازیں پہنچنا شروع ہوئی تھیں۔ وہ تیزی سے حرکت میں آیا اور کپٹھیوں والی ست بھاگا۔ روشن ماحول نے جو اشارے دیے تھے ان سے یہ اندازہ لگایا گیا تھا کہ وہ تین نمبر کپٹھی میں قید ہے۔ اس نے اپنی گن سے سب سے پہلے اسی کپٹھی کے تالے کو نشانہ بنایا۔ تالا ٹوٹنے ہی لات مار کر دروازہ کھولا۔ روشن ماحول فائر کی آواز پر ہی چونک گیا تھا اور اپنی تربیت کے تحت خود کو بچانے کے لیے دروازے کی ایک سائڈ پر چھپ گیا تھا لیکن دیوار میں نصب تھی نہ پھر نے معاذ کی اس تک راہنمائی کر دی۔

ماہر! سامنے آؤ۔ میں تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آیا ہوں۔“ بلند آواز میں یہ جملہ ادا کرنے کے بعد اس نے ایک کوڈ نمبر بھی ادا کیا۔ یہ کوڈ نمبر ماحول کے لیے اشارہ تھا کہ اس نے والا دہائی اس کا ہمدرد اور نجات دہندہ ہے۔ وہ فائر آڑ سے باہر نکل آیا۔ اس کے ایک پیروں میں بیڑی پڑی ہوئی تھی جسے کھولنے کے لیے چابی درکار تھی۔

”کیا میں اس کو کھول دیتا ہوں؟“ اس نے اپنے ساتھی سے اس کے پیروں میں بیڑی کھولوں میں سے سامنے سے اڑنے سے روشن ماحول کا چہرہ آزادی پالنے کے یقین کے ساتھ ہزار واٹ کے بلب کی طرح چمکنے لگا تھا اور معاذ کا دل بے حد سے سوال کرتے ہوئے تاریکی میں ڈوبا جا رہا تھا۔ آخر اس فیصلہ کر لیا اور اپنے ہاتھ میں موجود گن کا رخ روشن ماحول کی طرف کر کے لیلیٰ دبا دی۔

دہشت سے اس کا چہرہ فق ہو گیا اور منہ چبھ مارنے کے انداز میں کھلا کا کھلا رہ گیا۔

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نوجوان
کی داستان جو غلط کاروں کے لیے
غضب ناک تھا باقی واقعات اپنے ماہ پڑھیے



شہزاد

احسان علی

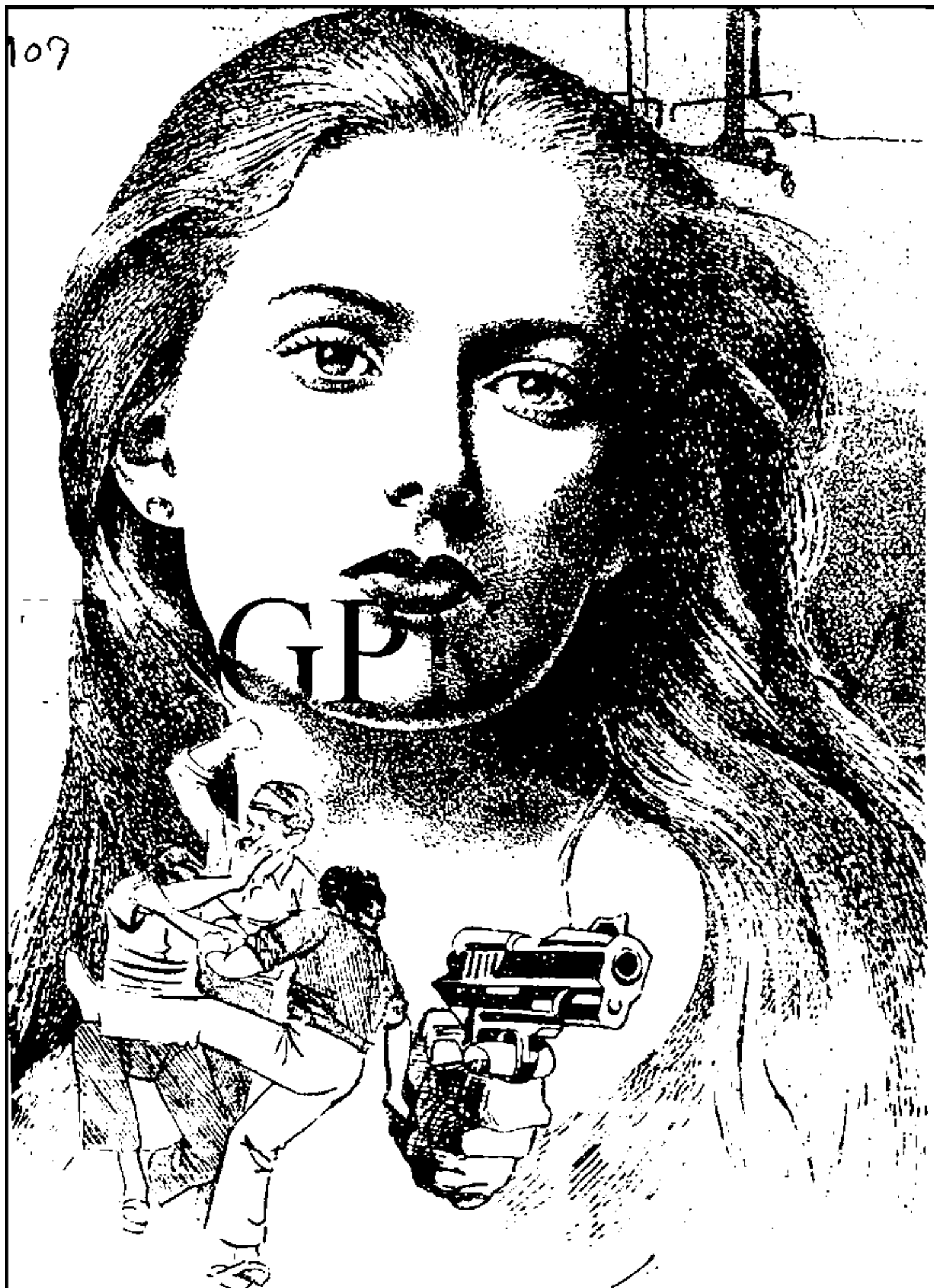
قسط: 11

TAGPK.COM

زندگی پیار آگیت ہے مگر... صبر و ضبط جہاں عاشق رہنا ہے اریور
کا نگار نہ ہو... جہاں انصاف اور حق و انصاف ہو اور بد قسمت
میں وہ جس معاشرے میں رہتا ہے وہاں نا انصافیوں کی بدولت
اندھیوں نے اسے محض سرایا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون
حرب و ضرب کے ماہر باتھور نے اسے ناقابل شکست بنایا تو دوسری
طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پر عزم
نوجوان کو حرف غلط کے مانند منانے جانے کے منصوبے بناتے جا رہے
تھے... اس کی زندگی جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور
روشنی سے دور تھی لیکن... یہ خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو
اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے
طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک
تھی... اس کی یہ قرار یوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار
اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار
مان لیتا... اگرچہ تاریک بھوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چور
لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا توڑ کرتا حق و باطل کی
ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ وارداتِ قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں
حائل نہ ہو سکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تحیر انگیز داستان

سپنس ڈائجسٹ 103 جنوری 2021ء



گزشتہ اقساط کا خلاصہ

معاذ ایک ذہین لیکن مستون مزاج لڑکا جو نیرشی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جوائن کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور انھیں عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ انسٹی ٹیوٹ سے واپس آ رہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو سڑک پر گھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یو نیرشی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہاں سے ہے۔ اپنی نذر فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشری نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بشری اس کی بولی کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم و خیرہ لکھتی ہے۔ اس دوران جبکہ وہ ایک زیر تعمیر ہاشمی منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی آئی تھی۔ معاذ بشری کو چہ چٹاقت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کر دیتا ہے لیکن جن رئیس زادوں سے اس نے ان کا شکار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ یہ موقع انہیں یو نیرشی ٹرپ کی صورت میں مل جاتا ہے اور ایک جنگل کی سیر کے دوران وہ فوٹوگرافی کے شوق میں سب سے الگ تھلک ہو جانے والے معاذ کو بے خبری میں پھیر کر بری طرح زد و کوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس نہ آنے پر انتقامیہ کے افراد پولیس اور ریسٹورنٹ کے ذرائع کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جگہ کی جھونپڑی میں پاتا ہے۔ اپنی حالت سے اسے اپنے شدید زخمی ہونے کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ جوگی اپنی خام جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ معاذ کا سوا بال جنگل میں ہی کہیں گر جاتا ہے اور جوگی کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا جس سے باہر کی دنیا سے رابطہ کیا جاسکے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے۔ جوگی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کو خاص صلاحیتوں سے نوازا کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے پراسرار علم سکھانے کی ہامی بھر لیتا ہے اور معاذ واقعی اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ادھر جاتے وقت سے ملنے والے ایک شخص کے گھر سے جب قسم قسم کی نکل آتی جاتی ہیں تو بہت سے قدرتی مظاہر کی تہہ پہن میں سے ایک ایسی تصویر بشری کی نظر میں آ جاتی ہے۔ اس میں بہت دور ایک سخت کے پیچھے ایک چہرہ جھانک رہا تھا۔ اس کا کاش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتا ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوا ہے اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اس کو لڑکا کا سر اسی گھر کا بیٹا ہے جس کے لیے اس نے خیر کا ٹوٹی ہوئے کے سلاخیں بشری شخص کو دی تھیں۔ بشری کے لیے یہ خبر جڑیں ہیں اور حق کو ان کے انہی میں سے ہے۔ ان کا نام کے بعد پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشری کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ مدد سے سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باؤل نامی فنڈے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشری انتقام لینے کی ٹھان پتی ہے۔ ان تکلیف دہ دلوں میں ہی معاذ واپس کا ارادہ کرتا ہے تاہم دوسرے ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا عرفان اللہ اور بزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو دھمکاواں نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باؤل اچانک بشری کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر دیتا ہے۔ ذی این اسے رپورٹ سے باؤل کی نشاندہی ہو جاتی ہے۔ ادھر سودا کو واپس لانے کے لیے اوجھے جھکنڈے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اسے واپس آنے کا پیغام دیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود بخود حاضر ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کر کے اسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات لی جاتی ہیں، نہ بتانے پر اس کے بھائی کا ایک گروہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشری بھی انتقام کی آگ میں جلتی ہوئی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہو جاتی ہے۔ معاذ کو بچانے والا لڑکا وہی ہے اسے گروہ کے ساتھ ایک پارٹی میں جاتا ہے۔ وہاں اسے معاذ کے حوالے سے مشکوک ایک شخص نظر آتا ہے۔ وہ اس کے پیچھے جاتا ہے مگر اسے گھیر لیا جاتا ہے۔ بہر حال وہ قاضی کو سمجھنے کے ساتھ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ادھر معاذ کے دوست عالم شاہ کے بیٹوئی کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ کئی خون میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے چنانچہ کر کے اس کے دماغ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ انھوں سے حاصل انوکھے علم کی بدولت ان کا معمول نہیں جتا۔ بشری، کامران کو چھاپنے کا پروگرام بناتی ہے۔ ادھر عالم شاہ میراٹ لگ لیتا ہے کہ اس کے بیٹوئی کا قتل کس نے کیا۔ وہ قاتل کو گھیرتا ہے اور اپنے تئیں اسے گولیاں مار کر قتل کر دیتا ہے تاہم وہ قتل جاتا ہے۔ عالم شاہ اس کے بعد ڈاکوؤں کے سردار چاچا کو چھاپتا ہے اور اسے کیفر کردار تک پہنچاتا ہے تاہم اس کے پیچھے پولیس لگ جاتی ہے۔ ادھر معاذ کو یٹ کرنے کے لیے فیرنگی جاسوس کی طرف کر کے فریگر دیا جاتا ہے۔ معاذ سہ پتے ہے کہ کیا وہ وطن کے دشمن کو آؤ کر آئے گا۔ اسی دوران وہ گمن کارخ جاسوس کی طرف کر کے فریگر دیا جاتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

نے اسے مشورہ دیا تو وہ چوٹ کا اور پھر کچھ گیا کہ یہی مناسب فیصلہ ہے۔ فیصلے پر عمل کے لیے وہ جگہ بھی خاصی مناسب تھی۔ انہوں نے گاڑی چھوڑی اور اتر کر تیزی سے ریلوے پل کی طرف بھاگتے چلے گئے۔ پتا نہیں کس زمانے میں بنائے گئے اس پل کے نیچے سے گزرنے کے لیے موجود راستے کی اونچائی اتنی کم تھی کہ کسی بڑی گاڑی کا اس کے نیچے سے گزرنے ممکن ہی نہیں تھا۔ راستے کی چوڑائی بھی قابل رشک نہیں تھی اور ایک وقت میں ایک چھوٹی گاڑی ہی وہاں سے گزر سکتی تھی۔ وہ بھی اس صورت میں کہ وہ ارد گرد کے ٹوٹے راستے اور جمع شدہ پانی کو پار کرنے کی سکت رکھتی ہو۔ ان دونوں کی جان پر بنی تھی اس لیے وہ چھوٹے چھوٹے گڑھوں اور گندے پانی کی پروا نہ کرتے ہوئے وہاں سے گزرتے چلے گئے اور پل کی دوسری طرف پہنچنے کے بعد بھی رکنے کے بجائے دوڑتے ہی چلے گئے۔ آگے سڑک کی حالت کافی بہتر تھی لیکن فی الحال ابھی سڑک سے اتنی دلچسپی نہیں تھی اور توجہ کا اصل مرکز سڑک کے اطراف میں گئے گئے درخت تھے جو ان کے لیے اچھی پناہ گاہ ثابت ہو سکتے تھے۔ وہ ان درختوں کی آڑ لے کر بھاگتے ہوئے محسوس کر رہے تھے کہ پولیس سڑاب بھی ان کا چھان نہیں چھوڑا ہے۔ خفا کے اس احساس نے انہیں درختوں کے درمیان میں سے گزرنے دیا اور وہ ان کے نیچے سے چلے گئے۔ رات کے وقت انہیں نے سڑک کا حصہ کے بغیر راہ فرار اختیار کی تھی اس لیے صحیح طور پر اندازہ لگانے سے قاصر تھے کہ وہ اس وقت کہاں ہیں۔

بھاگتے بھاگتے وہ دونوں ایک وسیع چار دیواری تک پہنچے تو عالم شاہ کو پہلی بار ادراک ہوا کہ وہ یزدانی بندر والوں کے اس زیر تعمیر پروجیکٹ تک پہنچ گئے ہیں جس کے کھیلے ظاہر کرنے کے چکر میں بشری گلزار مشکل میں پھنس گئی تھی۔ بشری کے موبائل کے حصول کے لیے وہ ایک بار محاذ کے ساتھ یہاں آچکا تھا اور جانتا تھا کہ یہاں کے مالکان ہر گز بھی اس کے ہمراہ اور دوست ثابت نہیں ہو سکتے لیکن فی الحال پناہ کے لیے کوئی اور بہتر جگہ موجود بھی نہیں تھی۔ ایک نسل یہ بھی تھی کہ اس وقت کون سا مالکان سے سامنا ہو سکتا ہے۔ رات کے اس پہر وہاں زیادہ سے زیادہ چند چوکیدار ہی موجود ہو سکتے تھے اور اسے اعتماد تھا کہ وہ اور سرد مل کر انہیں سنبھال سکتے ہیں اس لیے سرد سمیت دیوار پھلانگ کر اندر جانے میں زیادہ تاہل سے کام نہیں لیا۔ وہ لوگ جس جگہ سے اندر کودے تھے، پروجیکٹ کا سائٹ آفس وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا اور اندر

گھاڑی کے چیلنے کھڑے کی حدت کو محسوس کرتا ہوا عالم شاہ دیکھ رہا تھا کہ چاچے کے سامنے راہ فرار اختیار کر رہے ہیں۔ خود اس کے ساتھیوں نے بھی پسپائی اختیار کرنا شروع کر دی تھی۔ ڈاکوؤں کی طرح وہ بھی پولیس کے ہاتھ تنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ وہ خود بھی ایسا نہیں چاہتا تھا اس لیے خود کو سنبھالتے ہوئے حرکت میں آیا۔ پلٹ پر دھک کے باوجود پیٹھ پر لگنے والی گولی نے اسے دھچکا لگایا تھا اور کچھ لمحوں کے لیے اس کی قوت عمل کمزور پڑ گئی تھی۔ چند لمحوں کے اس فرق نے اس کے فرار کی راہیں مسدود کر دیں اور پولیس موبائل قریب آتی چلی گئی۔ اس مایوس کن صورت حال میں یکدم ہی ایک کرشمہ سا ہوا اور اس نے اپنے بالکل قریب گاڑی کے انجن کی آواز سنی۔ اس آواز پر وہ پلٹنا ہی تھا کہ سرد کی تیز آواز سنائی دی۔

”جلدی سے گاڑی میں آجائیں سائیں!“ اس کا جملہ عمل ہونے سے قبل وہ گاڑی کے کھلے دروازے سے اندر چھلانگ لگا چکا تھا۔ سرد نے ایک تیز چڑچڑاہٹ کے ساتھ گاڑی کو آگے بڑھایا لیکن یہ دیکھ کر اس کے ہونٹ بھیج گئے کہ پولیس موبائل ان کے تعاقب میں لگ چکی ہے۔ رات پر رات بجے اس نے گاڑی کی رفتار کو خطرہ تک محدود رکھ کر گاڑی کو آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ اس کے ہاتھوں کی سرکشی کا پورا ساتھ دیا۔ پھر لہجہ ان کے اپنے موبائل کے درمیان مفاصلہ بڑھنے لگا۔ دھیرے دھیرے موبائل نظروں سے اوجھل ہوئی تو ان دونوں ہی نے سکھ کا سانس لیا اور گاڑی کی رفتار قدرے کم کر دی لیکن جلد ہی ان کا یہ سکون نارت ہو گیا۔ وہ جس سڑک پر سے گزر رہے تھے اس پر آگے ناک لگا ہوا تھا۔ ان کے پاس غیر قانونی اسلحہ اور چند دیگر مشکوک چیزیں موجود تھیں اس لیے وہ اس ناکے سے گزرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ ان کی گاڑی بھی چوری کی تھی۔ رات کے سناٹے کا فائدہ اٹھا کر سرد نے وہیں سے گاڑی موڑ لی اور راتگ سائڈ پر گاڑی دوڑانے لگا۔ اتنی زیادہ رات کو سڑک پر ان کی گاڑی کے علاوہ اکا دکا گاڑیاں ہی موجود تھیں اس لیے کسی حادثے کے امکانات تو بہت کم تھے لیکن پھنس جانے کا اندیشہ شدید ہو گیا تھا۔ ناکے سے ایک پولیس موبائل ان کے پیچھے لگ چکی تھی اور خدشہ تھا کہ جسے وہ پہلے چل دے چکے ہیں وہ بھی اسی طرف چلی آ رہی ہوگی۔

”گاڑی چھوڑ دو سرد! ہم پیدل نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔“ اچانک ہی اب تک خاموش بیٹھے عالم شاہ

جتنی بھی روشنی دھندلے شیشے سے باہر جھلک رہی تھی۔ وہ دونوں آہستگی سے اسی طرف حرکت کرنے لگے۔ ابھی کچھ فاصلے پر ہی تھے کہ سائرن کی مخصوص آواز نے اعلان کر دیا کہ پولیس وہاں پہنچ چکی ہے۔ سائرن کی آواز کے ساتھ ہی آفس کے اندر بھی زندگی جاگ اٹھی اور یوں محسوس ہوا کہ دو یا دو سے زیادہ افراد آپس میں بات کر رہے ہوں۔ ایک دو عانیے کے دھنسنے سے کال بیل کی آواز سنائی دی اور ایک بلند آواز نے پولیس کی آمد کا اعلان کیا۔ فوراً ہی آفس کا باہر کی طرف دھڑا دھڑا دوڑا ہوا کھلا اور کوئی شخص باہر نکلا۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا اور گفتگو بلند آواز میں ہو رہی تھی اس لیے سرد اور عالم شاہ کو ہچکچاہٹ چلی گئی کہ پولیس ان ہی کی تلاش میں یہاں تک پہنچی ہے اور آفس میں سے نکلنے والے بندے سے ان ہی کے متعلق استفسار کیا جا رہا ہے۔

”یہاں کوئی نہیں آیا سر جی! آیا ہوتا تو ہم سے چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔“ اس بندے نے بڑی سی جھانکی لیتے ہوئے پولیس والے کو بیزاری سے جواب دیا۔

”تمہیں کیا پتا اوئے! تم تو پڑے سو رہے تھے۔“ اس کے جواب پر پولیس والے کو جب جڑھی۔

”م سونے میں بھی آنکھیں کھلی رکھتے ہیں تم۔“ وہ بے چارے یہاں چوکیدہ موجود ہیں جو رات دن مارے رہتے ہیں۔ اگر کوئی اندر گھسنا ہوتا تو اب تک چوکیدہ ان میں سے کسی کے ہاتھ چڑھ چکا ہوتا۔ اگر پھر بھی آپ سن نہیں ہیں تو یہاں کی تلاشی لے لیں۔“ پولیس سے منسنے والے کے لہجے میں بیزاری در آئی۔

”تلاشی تو ہم ضرور لیں گے کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ وہ دونوں اسی طرف آئے ہیں۔“ پولیس والوں کی طرف سے کیے گئے اس اعلان نے ان دونوں کو قدرے پریشان کر دیا اور وہ ادھر ادھر نظریں دوڑا کر اپنے لیے کوئی جائے پناہ تلاش کرنے لگے۔

”شوق سے لیں جی تلاشی لیکن سوچ لیں کہ اتنی تھوڑی سی نفری کے ساتھ آپ اتنے بڑے پردجیکٹ کی تلاشی لیں گے کیسے؟“ اس شخص کے لہجے میں استہزاء تھا۔

”یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔“ اس کے بحث مباحثے پر پولیس والوں کو بھی جیسے ضد ہو گئی تھی کہ تلاشی ضرور لینی ہے۔ اس ساری گفتگو کو سنتے سرد اور عالم شاہ اس دوران فیصلہ کر چکے تھے کہ انہیں کس جگہ پناہ لینی ہے۔ ڈھیروں زیر تعمیر گھروں کے درمیان چھپنے کی جگہوں کی کمی نہیں تھی۔ تعمیراتی سامان بھی جگہ جگہ ڈھیر لگا ہوا تھا جو انہیں اچھی آڑ مہیا کر سکتا

تھا لیکن ان دونوں نے زیر تعمیر مکانات اور تعمیراتی سامان کو چھوڑ کر ایک منبھوٹے گئے اونچے درخت کا انتخاب کیا اور بندروں کی سی پھرتی سے درخت پر چڑھتے چلے گئے۔ جس وقت بڑا گیٹ کھلوا کر پولیس اندر داخل ہوئی، وہ دونوں درخت کی بلند ترین شاخوں پر پہنچ چکے تھے۔ سیاہ اور چست لباسوں میں درخت کی شاخوں سے لپٹے وہ گویا ان ہی کا ایک حصہ بن گئے تھے۔ پولیس والے سوبائل سے اتر کر اب ادھر ادھر پھیل رہے تھے۔ ان کی تعداد چھ سات سے زیادہ تھی۔ اس تعداد کے ساتھ اتنے اونچے درخت پر جہاں چھپنے کے لیے بے شمار جگہیں موجود تھیں، رات کے اندھیرے میں کسی کو تلاش کرنا آسان بات نہیں تھی۔ پولیس والوں نے اپنی ضد میں یہ کام شروع کیا لیکن جلد ہی انہیں اندازہ ہو گیا کہ یہ بھوسے کے ڈھیر میں سوئی تلاش کرنے والی بات ہے۔ آدمی گھسنے کی جدوجہد کے بعد ہی انہوں نے ہار مان لی اور خیال ظاہر کیا جانے لگا۔

”لگتا ہے وہ کسی اور طرف نکلے ہیں۔“

”ہم نے تو پہلے ہی کہا تھا سر جی کہ یہاں کوئی نہیں آسکتا۔ ادھر ہمارے آدمی جو کس رہتے ہیں۔ اگر کوئی آئے تو ہمارے گھر والے سے پہلے انہیں روک لیتا۔“ رد عمل کی وی آواز سنائی دے کر جو کس سے شک بھی وہ گئے۔ رے کے تھوڑی دیر میں پولیس والے وہاں سے رخصت ہو گئے۔ پولیس والوں کے جانے کے بعد وہاں ایک بار پھر ساکا جھا گیا۔ موقع غنیمت جان کر وہ دونوں بہ آہستگی نیچے اتر آئے۔ ارادہ تھا کہ جس طرح دیوار پھلانگ کر اندر آئے ہیں اسی طرح واپس بھی نکل جائیں گے۔ ارادے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ابھی دو قدم ہی چلے تھے کہ یکدم روشنی میں نہا گئے۔ فطری رد عمل کے تحت دونوں نے اپنے ہتھیاروں کا رخ اس سمت کر لیا جہاں سے روشنی ڈالی جا رہی تھی لیکن اگلا ہی لمحہ ان کے لیے حیران کن تھا۔ ان کے ہتھیار یوں ان کے ہاتھوں سے نکلے جیسے کسی ناویدہ طاقت نے انہیں اچک لیا ہو۔ لیکن حقیقت میں یہ کوئی ناویدہ طاقت نہیں بلکہ ہوشیاری و مہارت سے چھپکے گئے پھندے تھے جو ان کے ہاتھوں سے ہتھیار اچک کر لے گئے تھے۔ ہتھیاروں کے یوں ہاتھ سے نکل جانے پر وہ سنبھل پاتے، اس سے قبل ہی دو پھندے ان کی گردنوں میں آ پڑے۔ بے ساختہ ہی ان کے ہاتھ گردن میں پڑتے پھندوں کو ڈھیلا کرنے کے لیے اٹھے لیکن پھندوں کو اتنی زور سے جھٹکے دیے گئے کہ گردنیں پھل گئیں اور زخموں پر دباؤ پڑنے سے دم ٹھننے لگا۔ اسی حالت میں وہ

لگام ڈالوائی تھی ورنہ ہمارا اتھارہا ناگرا بہت پہلے ہی ہونچکا ہوتا۔ خیر دیر آید درست آید۔ اب تمہاری آزمائش ہو جائے گی کہ کتنے پانی میں ہو۔" باذل کے جواب نے ظاہر کر دیا کہ نہ صرف وہ خود حالات سے مکمل طور پر آگاہ ہے بلکہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ عالم شاہ اس سے انجان نہیں ہے۔

"جب میں اپنے والد کے کہنے پر سب معاملات سے الگ ہو گیا تھا تو اب ہمارے تمہارے درمیان دشمنی کی کیا تک بنی ہے۔" عالم شاہ اسے گنگو میں الجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ شاید کوئی موقع مل جائے لیکن موقع دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ان کی گردنوں میں پڑے پھندے اتنے کسے ہوئے تھے کہ وہ بولنے میں بھی تھوڑی سی دشواری محسوس کر رہا تھا اور سونے پر سہاگہ وہ جدید ہتھیاروں سے لیس اس کے چیلوں کے نرغے میں بھی پھنسے ہوئے تھے۔

"تمہاری یہاں موجودگی اس بات کا ثبوت ہے کہ تم ان معاملات سے الگ نہیں ہوئے ہو۔" باذل اس کی دلیل سے قطعی متاثر نہیں ہوا۔

"ہمارا یہاں آنا صرف اتفاق ہے۔ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ جاؤ پھر میں تم کہاں آگئے ہیں۔"

"رات کے اس پھر یہاں اتفاقاً ہی آتا ہے لیکن اسے بھی یہاں سے لے کر لگاتار نہیں ہوتا۔ تم جانتے ہو کہ زیادہ تر لوگ اس وقت اس ویرانے میں پیدل کہاں خوار ہوتے پھر وگے۔ پولیس والوں کے ساتھ آرام سے ان کی موٹر میں چلے جاتا۔" باذل کا لہجہ استہزاء تھا۔ اس بار عالم شاہ نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ اسے اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ شخص ہر حال میں اس سے دشمنی نبھانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

"لے بھی جاؤ یا رانہیں۔ اب کیا میں باقی کی رات یہاں کھڑا ان بھٹوؤں سے مذاکرات ہی کرتا رہوں گا۔ لے جا کر آرام سے ٹھہراؤ ہمارے مہمانوں کو۔ پہلے معلوم کر لو کہ پولیس کیوں ان کو اپنا مہمان بنانے کے چکر میں پڑی ہوئی تھی پھر آرام سے ان کی میزبانی کے فرائض ادا کروں گا۔" باذل کی طرف سے حکم جاری ہوتے ہی ہتھیار بردار افراد انہیں اپنے ہتھیاروں سے ٹھوکے دینے لگے۔ گلے میں پھندا نہ پڑا ہوتا تو عالم شاہ میں اتنی جرأت تھی کہ وہ ہتھیاروں کی موجودگی کے باوجود ان سے بھڑنے کی کوشش کر بیٹھا لیکن پھندے نے اسے اپنی مرضی کے مطابق

زمین پر مہمیت لیے گئے۔ اس ناگہانی آفت پر بدحواس وہ اپنے بچاؤ کے لیے اندھا دھند ہاتھ پیر چلا رہے تھے کہ ایک سماعت شکن قہقہے نے اپنی طرف توجہ مرکوز کر لی۔ اس موقع پر ان کی گردنوں میں پڑے پھندوں کی رسیدیں کا تناؤ ذرا کم کر دیا گیا تھا اور ایسا شاید اس لیے تھا کہ وہ اس شخص کو دیکھ سکیں جو ان کی بے بسی سے لطف اندوز ہوتا ہوا اب بھی مسلسل قہقہے لگا رہا تھا۔ ان کے ہتھیار اٹھنے اور گلوں میں پھندے ڈالنے والے اب بھی پوشیدہ تھے لیکن وہ شخص روشنی میں آکھڑا ہوا تھا۔ درمیانی قامت اور معمولی شکل و صورت والے اس شخص کو شناخت کرنے میں عالم شاہ کو ایک لمبائی لگا۔ وہ غلیظ مکار آنکھوں والا عرفان اللہ کا چہیتا باذل تھا جس طرح باذل کا سامنا اس کے لیے غیر متوقع تھا، اسی طرح باذل نے اسے پہچانا تو وہ بھی چونک گیا۔

"تم صداقت شاہ کے بیٹے ہوتا؟" اس نے تعجب سے کرنے والے انداز میں پوچھا۔ عالم شاہ نے جواب دینے کے بجائے نفرت بھری نظروں سے اسے گھورا۔

"واہ میرے شیروں.....! آج تو تم نے بڑا ہی زبردست شکار کیا ہے۔ شکار..... وہ بھی دشمن کا..... واہ،

..... کہ بات ہے۔ یہ طاقت ہی سالا ہو گیا ہے۔" باذل نے خوشی سے براہ حال کہا۔

"بلے بھی ہے۔ پہنچاؤ انہیں انجیل پونٹ میں۔" مختص خاص مہمانوں سے تو تحریک کے ملاقات میں اس نے

آئے گا۔" باذل کی طرف سے حکم جاری ہوتے ہی وہ ہتھیار بردار افراد سامنے آگئے جنہوں نے عالم شاہ اور سرمد کو اٹھ کر اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔

"تم ہم سے کیا چاہتے ہو؟ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ہماری کبھی آپس میں ملاقات بھی نہیں ہوئی اور تم ہم سے دشمنی کا ناتا جوڑ رہے ہو۔" معاذ کے معاملات میں جہاں تک عالم شاہ کا تعلق رہا تھا، اس کا باذل سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ باذل یا قاعدہ طور پر بشری کی، اللہ عائدہ گزار کی بے حرمتی اور مل والے معاملے کے بعد ہی سامنے آیا تھا اور یہ وہ دور تھا جب عالم شاہ اپنے والد صداقت شاہ کے جذباتی دباؤ میں آکر خود کو معاذ کے مسئلے سے الگ رکھنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس لیے اس نے باذل سے یہ جملے کہے تھے۔

"تو زیادہ بھولے بادشاہ نہ بنو یا ر! اس لوٹے معاذ سے دوستی نبھانے کے لیے تم نے بھی اتنے ہی ہاتھ پیر مارے تھے جتنے میں اپنے پاس سے وقاداری نبھانے کے لیے مارتا رہا ہوں۔ وہ تو پاس نے تمہارے! باجی کو ڈرا، حکم کر تمہیں

حسرت کرنے سے لاق بی نہیں چھوڑا تھا۔ کچھ ایسا ہی حال سرمد کا تھا اسی لیے وہ مکمل خاموشی اختیار کیے محض عالم شاہ کی پیروی ہی کر سکتا تھا، سودہ اس نے کی اور دونوں دھیرے دھیرے اس سمت بڑھنے لگے جس طرف بڑھنے کا کمن برداروں نے اشارہ کیا تھا۔ آگے بڑھتے ہوئے دونوں کے ذہنوں میں ایک ہی بات تھی کہ وہ آسمان سے گر کر کعبور میں اٹک چکے ہیں۔

☆☆☆

معاذ کے فائر کھولنے پر ہکا بکار ہو جانے والا روشن ماحضر اس وقت گہری سانس لے کر رہ گیا جب اس نے دیکھا کہ گولی نے اس کے پاؤں میں پڑی بیڑی کا تالا توڑ دیا ہے اور اب وہ آزاد ہے۔
”ویری ٹائٹس۔“ اسنے سچے نشتانے پر وہ معاذ کو داد دیے بغیر نہیں رہ سکا۔

”جلدی باہر نکلو۔“ اس کی داد پر کوئی رد عمل دیے بغیر معاذ نے اس سے کہا اور باہر کا رخ کیا۔ روشن ماحضر اس کے ساتھ تھا۔ بھاگتے ہوئے وہ دونوں اس ہال نما کمرے تک پہنچ گئے جہاں سے اس قید خانے کے لیے راست بنایا گیا تھا۔ ہال میں کافی انہیں باہر کی آوازیں زیادہ بہتر محسوس ہونے لگی تھیں اور ان آوازوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ آگ بہت بڑی شرح پھیل چکی ہے۔ وہ دونوں ہال سے باہر نکلے تو براہ راست دروازے میں دھواں پھرا رہا تھا۔ انہوں نے اپنی سانسیں روکیں اور بائیں طرف بھاگتے چلے گئے۔ کھانے کا کمرہ اور دفاتر وغیرہ دائیں جانب تھے اور اسی طرف آگ کے شعلے بھی بھڑک رہے تھے۔

ناشتے کا وقت ہونے کی وجہ سے پہلے ہی لوگوں کی زیادہ تعداد اسی حصے میں تھی اور باقی صورت حال جاننے اور آگ بجھانے کے چکر میں اس طرف کا رخ کر چکے تھے اس لیے ان دونوں کا کسی سے واسطہ نہیں پڑا۔ ایک آدھ بندہ کھرایا بھی تو دھوئیں کی وجہ سے ان کی شناخت کا اندازہ نہیں کر سکا اور وہ تیزی سے چھت کی طرف جانے والے زینے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ زینہ چڑھتے ہوئے یکدم ایک اہلکار ان کے سامنے آ گیا۔ وہ اوپر سے نیچے آ رہا تھا۔

”ہالٹ۔۔۔۔“ ان دونوں کو سامنے پا کر وہ لٹکرا رہا تھا۔
”یہ میں ہوں سر، یسین۔“ زینوں پر دھواں نہیں تھا اس لیے معاذ نے کوشش کی کہ ماحضر کو اپنی آڑ میں چھپالے۔ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب رہا۔

”سب لوگ باہر نکل چکے ہیں۔ تم یہاں کیا کر رہے

ہو؟ میں تو خود یہ چیک کرنے آیا ہوں کہ قیدیوں والے حصے سے رابطہ کیوں نہیں ہو رہا۔“ وہ بولتا ہوا دو قدم مزید نیچے آ گیا۔ اس کے انداز سے یہ لگ رہا تھا کہ وہ معاذ کے پیچھے اس کی آڑ میں کھڑے ماحضر کو چیک کرنا چاہ رہا ہے۔ معاذ کے پاس اب مزید مہلت نہیں تھی۔ اس نے دھبہ سے ایک جست لگائی اور اہلکار پر جا پڑا۔ اس کے ہاتھ میں موجود گن نے بے ساختہ ہی گولیاں اٹکیں۔ اگر ماحضر عین وقت پر اپنی جگہ سے ہٹ نہ گیا ہوتا تو گولیاں اسے چاٹ بیگی ہوتیں۔ ماحضر کے دو پارہ کھنڈ ہونے سے نکل معاذ نے اہلکار کی کھوپڑی گن کے دھتے سے بھادی۔ وہ بے چارہ بے ہوش ہو کر وہیں بیڑیوں پر لٹک رہا تھا۔

”گولی کیوں نہیں ماری سارے کو؟“ ماحضر نے اس سے شکوہ کیا۔

”جلدی چلو۔“ اس کی بات کو خاطر میں لائے بغیر معاذ نے اس سے کہا۔ اہلکار کے ہاتھ سے چھوٹنے والی گن ماحضر کے ہاتھ نہ لگے اس لیے وہ پہلے ہی نہایت ہوشیاری سے ہیر کی ٹھوکر مار کر گن نیچے برآمدے میں لٹک چکا تھا۔ اندر اس نے جن اہلکاروں کو بے ہوش کیا تھا ان کی گتیں بھی ماحضر کی دستوں سے بدور رہی تھیں۔ وہ اسے بھی اس بات کا محسوس نہیں ہوتا چاہتا تھا کہ وہ یہاں کسی کی ہلاکت کا باعث بنے اور اس کی نہایت احتیاط سے کی گئی کارروائی پر کسی اہلکار کے خون کا دھبا لگے۔ وہ اپنی جگہ پر امید تھا کہ آگ نے کسی کو جانی نقصان نہیں پہنچایا ہوگا اور سب لوگ محفوظ باہر نکل گئے ہوں گے۔ قیدیوں والا حصہ بالکل الگ تھلک ہونے کی وجہ سے وہاں آگ یا دھواں پہنچنے کا امکان دیر سے بھی بہت کم تھا اور امید کی جاسکتی تھی کہ آگ کے اس حد تک پھیلنے سے قبل ہی اس پر قابو پایا جائے گا۔ فائر بریگیڈ کی گاڑیوں کے مسلسل پہنچتے ہوئے اس بات کا اعلان تھے کہ آگ پر قابو پانے کے لیے بڑے پیمانے پر کارروائی شروع ہو چکی ہے۔ یہ ہوئے اس کے لیے بھی ایک اشارہ تھے۔ اسے اور ماحضر کو ان ہی گاڑیوں میں سے ایک گاڑی کے ذریعے فرار ہونا تھا لیکن وہ اس سے قبل ایک کام کرنا چاہتا تھا۔ وہ کام اس سے احسن طریقے سے ہو سکے گا یا نہیں یہ اس کے لیے ایک آزمائش تھی اور اس آزمائش میں پورا اترنے کے لیے وہ اپنی اہلیت سے زیادہ جذبے کی صداقت اور اللہ کی نصرت پر انحصار کر رہا تھا۔

”ہم یہاں سے کیسے نکلیں گے؟“ کھلی چھت پر پہنچنے ہی ماحضر نے اس سے سوال کیا اور یوں آسمان کی طرف دیکھنے

لگا جیسے اسے اپنے فرار کے لیے کسی پہلی کا پٹر کی آمد کی امید ہو۔ اس کی اس حرکت کا معاذ نے فائدہ اٹھایا اور اس کی کٹھنی پر ایک چھاپا لگا کر ڈالا۔ اس کی طرف سے بے خبر ماحر ایک ہی وار میں تھوڑا کر نیچے گر پڑا۔ معاذ نے اس کے آڑے نیز سے پڑے جسم کو سیدھا کیا اور اسے ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگا۔ جلد ہی ماحر نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ یہی معاذ کے لیے عمل کا دست تھا۔ اس سے قبل کہ ماحر پوری طرح ہوش میں آکر صورت حال کو سمجھتا، اس نے اپنا چہرہ اس کے چہرے پر جمکا کر لہنی آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑ دیں اور خاص لب و لہجے میں پکارا۔

”روشن ماحر! کیا تم میری آواز سن رہے ہو؟“

”ہاں، میں سن رہا ہوں۔“ خوابیدہ سے لہجے میں دیا گیا ماحر کا جواب اس کے لیے کامیابی کی نوید تھا۔ ایک جلتی ہوئی عمارت کی چھت پر، فائر بریگیڈ کی گاڑیوں کے ہوڑز کے شور میں، ایک خطرناک جاسوس پر عملی حویم کا تجربہ نہ تو پروفیسر و کٹر جیسا کوئی باہر کر سکتا تھا نہ ہی ٹھیکے کل سائیکلوجی میں ڈگری یافتہ کوئی اور شخص۔ یہ صرف معاذ کر سکتا تھا جس نے کیرئیر کی پہاڑیوں میں فیضو جیسے پراسرار شخص سے،

قطرے کے مقابلے کے لیے اس کا اسباب کیا تھا۔ وہ اپنے آس پاس والوں میں ہمیشہ ایک غیر معمولی لڑاکا تصور کیا جاتا تھا۔ اس وقت اسے اپنے غیر معمولی ہونے کا ثبوت دے رہا تھا۔ اس نے اپنے وجود کی ساری توانائیاں اپنی آنکھوں میں سودی تھیں اور آنکھوں سے خارج ہوتی توانائی کی یہ غیر معمولی لہریں اس کی آواز کے سنگ میل کر ماحر جیسے شخص کا دماغ کنٹرول کر رہی تھیں۔ ماحر جیسا جاسوس کوئی معمولی آدمی نہیں ہوتا۔ ایسے لوگ بہت خوفناک بھا کر منتخب کیے جاتے ہیں اور خصوصی تربیت سے لیس کر کے میدانِ عمل میں بھیجے جاتے ہیں لیکن ایسوں کا واسطہ جب معاذ جیسے دیوانوں کے جذبات سے پڑتا ہے تو انہیں ہار ماننا پڑتی ہے۔ روشن ماحر نے بھی سپر ڈال دی تھی کہ اس کا واسطہ ایک ایسے دیوانے سے پڑا تھا جو خود کسی کا منتخب کردہ تھا۔ جس کی غیر معمولی خصوصیات نے اسے کچھ طاقتور لوگوں کے ہتھے چڑھا دیا تھا۔ جو اپنے پیاروں کے تحفظ کے لیے ان طاقتور لوگوں کے ہاتھوں کھیلنے پر مجبور ہو گیا تھا لیکن کیا وہ سچ بچ مجبور تھا؟ پھرتی لہریں بھی کیا بھی کسی کے قابو میں آئی تھیں اور پانی کو اپنا راستہ بنانے سے کوئی روک سکا تھا جو معاذ اپنا راستہ بنانے سے رک جاتا۔ اس نے ان مشکل حالات میں بھی اپنا راستہ ڈھونڈ نکالا اور ڈیڑھ دو منٹ کے کھیل میں وہ

کر ڈالا جو بازی اٹھنے کے لیے کافی تھا۔

”آؤ اب چلیں ماحر۔“ اپنا کام مکمل کر کے وہ کھڑا ہوا تو ماحر اس کا بے دام ختام بن چکا تھا۔ ماحر کو اپنے ساتھ لیے وہ چھت کے جنوبی حصے میں پہنچا۔ طے شدہ منصوبے کے مطابق فائر بریگیڈ کی وہ مخصوص گاڑی وہاں موجود تھی جس پر لہراتا چھوٹا سا سفید جینڈا اس کے لیے اشارہ تھا۔ اس سنگین اسٹوری کی عمارت کی چھت اتنی بلند نہیں تھی کہ اس گاڑی تک پہنچنے کے لیے انہیں کسی ذریعے کی ضرورت ہوتی۔ مددوں ہی تربیت یافتہ افراد سے چٹا چٹا آسمان سے چھت سے سیدھے گاڑی پر کود گئے۔ ان کے کودتے ہی گاڑی حرکت میں آگئی۔ وہاں بے حد افراتفری تھی۔ کچھ لوگ زخمی بھی ہوئے تھے جنہیں باقی لوگ ایسوکینسوں میں منتقل کرنے کے لیے محلے کے ساتھ بھاگ دوڑ میں مصروف تھے۔ یہ کوئی فوجی چھاؤنی، جیل یا ہیڈ کوارٹر وغیرہ نہیں تھا جہاں اہلکاروں کی بڑی تعداد موجود ہوتی۔ یہاں اہلکاروں کی بس ایک مخصوص تعداد ہی موجود تھی جن میں سے کچھ اندر رہ گئے تھے، کچھ زخمی تھے اور کچھ اپنے ساتھیوں کی بقا کے لیے جدوجہد کر رہے تھے اس لیے مسلسل آتی جاتی گاڑیوں کے درمیان کسی نے توجہ نہیں دی کہ ایک گاڑی جدا گانہ کر رہی ہے۔

”یہ گاڑی آگے بڑھ کر معاذ کے دیکھا کہ کچھ افراد چھت پر چڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بیٹھا وہ لوگ سیز میوں کے راستے اندر جا کر اندر والوں کا حال جاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان لوگوں کے لیے بہتری کی دعا کرتا ہوا وہ اپنے ماحول میں واپس آگیا۔ گاڑی میں اس کے اور ماحر کے علاوہ چار افراد مزید موجود تھے جنہوں نے فائر مین کی مخصوص وردیاں پہن رکھی تھیں۔ پانچواں فرد ڈرائیور تھا۔ جو چار افراد اس کے سامنے تھے ان کے پاس اسلحے کی موجودگی ظاہر ہو رہی تھی۔ ڈرائیور بھی یقیناً مسلح ہوگا۔ یہ شخص خوش قسمتی تھی کہ وہ کسی سے ڈبھیسڑ کے بغیر ہی وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اگر ان کے فرار کی راہ میں کہیں سے مزاحمت کی جاتی تو فائر مین کے روپ میں موجود یہ افراد اس کا بھرپور جواب دینے کی اہلیت رکھتے تھے۔ ایسی صورت میں نقصان کی شرح کافی بڑھ سکتی تھی اس لیے معاذ کے حساب سے کامیابی سے فرار سب کے حق میں بہتر ثابت ہوا تھا اور اب وہ مزید بہتری کے لیے ماحر کے حرکت میں آنے کا خطر، کن انہیوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ماحر بظاہر ہر طرف سے بے نیاز خاموشی سے سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا

نہ معاذ۔ نے وجود میں ایسا تھا و محسوس کر رہا تھا بیٹے وہ شکاریوں کے نرنے میں پھنس جانے والا کوئی درندہ ہو۔ اس کے تیزی سے پھولنے پھٹنے سے اس کے اندرونی انتشار کا ثبوت دے رہے تھے۔ اس کی یہ کیفیت معاذ کے لیے باعث اطمینان تھی اور وہ اپنی گمن بے پروائی سے زانو پر رکھے ڈیمیلڈ حائل انداز میں بیٹھا ہوا تھا۔

پوری رفتار سے چلتی گاڑی تیزی سے فاصلہ طے کرتی ہوئی اپنی منزل کی طرف گامزن تھی۔ چار میں سے دو فائر مین ان کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے جبکہ دو کھڑے ہوئے چوکنے پن سے گرد و پیش کا جائزہ لے رہے تھے کہ کسی بھی غیر موافق صورت حال سے نمٹ سکیں۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ جو نقشہ اٹھنا ہے اندر سے اٹھنا ہے اور اس شخص نے اٹھنا ہے جس کے لیے انہوں نے اتنا کھڑا کیا ہے۔ سر جھکا کر بیٹھے ماحتر نے اپنا سر اٹھایا تو معاذ کو اندازہ ہو گیا کہ وہ لمحہ آگیا ہے جس کا اسے انتظار تھا۔ وہ خود کو ماحتر کی طرف سے مزید بے پروا تھا ہر کرنے لگا لیکن جتنی وہ اس پر پورا دھیان رکھے ہوئے تھا جب ہی تو جیسے ہی ماحتر نے اس کے زانوؤں پر رکھی گمن پر ہاتھ ڈالی کر پیلا فائر اسی پر کیا تو وہ

پچھلے سے چپ کر رہا تھا اس کی روش آنے سے بچا جانے کا سیاق ہو گیا۔ فائر نے آواز نے فائر مین کے روپ میں سوچو چاہیں افراد کو نکال لیکن اس سے قبل کہ وہ صور حال کو سمجھ کر کوئی رد عمل ظاہر کر پائے، ماحتر سامنے بے دونوں افراد کو نشانہ بنانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ وہ تجربے کا رآدی تھا اور اس بات کو سمجھتا تھا کہ ان لوگوں نے سر پر موجود حفاظتی ہیلٹ کے علاوہ ہلٹ پروف جیکٹ بھی پہن رکھی ہوں گی اس لیے سارے فائر چہروں اور گردن پر کیے تھے۔ ان مہنگ گولیوں نے ان دونوں کو ہل بھر کی بھی مہلت نہیں دی اور وہ فوراً ہی ڈیمر ہو گئے۔ کھڑے ہوئے افراد میں سے ایک نے ماحتر کے گمن والے ہاتھ کو نشانہ بنانے کی کوشش کی لیکن ماحتر کسی پیتے کی طرح جست لگا کر اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا۔ جگہ چھوڑتے چھوڑتے بھی اس کی گمن نے گولیاں اگلی نہیں جن میں سے بیشتر تو ضائع ہو گئیں لیکن ایک ان میں سے ایک کی ٹانگ میں مس گئی۔ گولی کھا کر وہ شخص مگر لیکن اپنے ہاتھ سے گمن نہ مرنے دی اور ماحتر کی طرف فائر چھوڑا لیکن ماحتر چلتی ہوئی گاڑی اور محدود جگہ کے باوجود کمال کارکردگی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ گولی کا نشانہ بننے کے بجائے اس نے اپنی جگہ چھوڑی اور کسی پھل کی طرح پھسلتا ہوا مر جانے والے افراد تک پہنچا۔ ان میں سے ایک

کی گمن کٹتے کر اس نے دوسرے ہاتھ میں لی اور بیک وقت دونوں ہاتھوں سے فائر کرنے لگا۔ ڈرائیور کو صورت حال کا درست اندازہ نہیں تھا اور شاید وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ ان پر حملہ کیا گیا ہے اس لیے اس نے گاڑی کی رفتار مزید بڑھا دی تھی۔

اندھا دھند چلتی ان گولیوں کے باعث معاذ کا اپنا وجود بھی خطرے کی زد میں تھا لیکن اسے اپنی پروا نہیں تھی۔

وہ صرف اتنا چاہتا تھا کہ ماحتر فرار ہونے میں کامیاب نہ ہو سکے لیکن فی الحال ماحتر کا پلہ بھاری تھا۔ وہ اس کی دی گئی تحش کے تحت اس سمیت گاڑی میں موجود ہر فرد کو اپنا دشمن تصور کرتے ہوئے بے دریغ فائرنگ کر رہا تھا۔ اس کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو چکی تھی کہ اگر اسے خود کو بچانا ہے تو ان لوگوں کو ہلاک کرنا ہو گا۔ دوسری طرف مقابلے ذرا سی جبکہ کا شکار تھے۔ وہ جس شخص کو فرار کروانے کے مشن پر کام کر رہے تھے، اسے ہلاک کرنے کا فیصلہ کرنا مشکل تھا اس لیے ان کی کوشش تھی کہ جان لیوا فائر کرنے کے بجائے ماحتر کے جسم کے ایسے حصوں کو نشانہ بنائیں کہ اس کی جان محفوظ رہے لیکن ماحتر کی جارحیت نے فوراً ہی انہیں فیصلہ بدلنے پر مجبور کر دیا۔ جس شخص کی ٹانگ پر گولی لگی تھی، ایک

گولی ان کے بڑے ہاتھ میں جا گئی۔ چوتھے شخص کے پاؤں پر گولی لگی لیکن اس نے گمن نہیں تھی۔ اس نے بغلی کی گولیاں کے ذریعے گمن کا رخ ماحتر کی طرف کیا اور نشانہ بنایا۔ اس پر گولیوں کی بوچھڑا کر دی۔ یہ وہی تھا جب اس میں چھپے معاذ نے "ڈونٹ کل ہم" کا نعرہ لگایا تھا لیکن وہ خود بھی جاننا تھا کہ اس کی بات نہیں سنی جائے گی۔ ایسا ہی ہوا اور متحدہ گولیاں ماحتر کے سر، چہرے اور سینے میں بیست ہو گئیں۔ وہ ایسی جگہ پر موجود تھا کہ گولیاں کھا کر بے جان ہوا تو سیدھا گاڑی سے نیچے گرنا چاہیگا۔ معاذ نے اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر دیکھا، ماحتر کی لاش ذرا سی دیر میں بہت پیچھے رہ گئی تھی اور ان کی گاڑی پانی کی موٹی دھاریں گرائی ہوئی آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ انہی گولیوں نے پانی کے ذخیرے والی ٹنکی میں بہت سے سوراخ کر دیے تھے۔

"اوہ مائی گاڈ! یہ کیا ہو گیا۔ ہمیں تو اسے محفوظ طور پر یہاں سے نکالنا تھا۔" اس نے بلند آواز میں صورت حال پر افسوس کا اظہار کیا۔

"وہ محفوظ رہتا تو اب تک اس گاڑی پر موجود ایک شخص بھی محفوظ نہ رہ پاتا۔" ماحتر کو گولی مارنے والا تہرناک لہجے میں بولا۔ اس کی آنکھوں میں معاذ کے لیے بھی قہقہ کی چھائیاں تھیں۔ ساتھ ہی وہ ڈرائیور کو گاڑی روکنے کا پیغام

سیف ہاؤس سے فرار کروا کر لائے تھے، وہ روشن ماتھری تھا۔" اس نے مطالبہ کیا۔

"اب کیا تم ماتھری کی لاش اٹھا کر لے جانے کا ارادہ رکھتے ہو؟" ڈرائیور جھنجھلا یا۔

"لاش نہیں، صرف دونوں ہاتھوں کے انگوٹھے کافی ہوں گے۔" اس نے جواب دیا۔

"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہمیں اس کی بات ماننا ہوگی۔" اس بار ڈرائیور کے سامنے اس کے موقف کی تائید کی۔

فیصلہ ہو چکے کے بعد وہ تینوں گاڑی سے نیچے اتر آئے۔ اتنی دیر میں پانی کا سارا ذخیرہ بہہ چکا تھا۔ وہ لوگ گاڑی سے

کچھ فاصلے پر جا کھڑے ہوئے اور ایک مینڈ گریڈ کی پن نکال کر اسے گاڑی کی طرف اچھال دیا۔ مینڈ گریڈ پھٹنے

سے کل ہی تینوں اپنے کانوں پر ہاتھ رکھے بچوں کے بل وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ خاصا فاصلہ پیدا

کر لینے کے باوجود انہوں نے گریڈ پھٹنے کی آواز اور زمین کی لرزش کو محسوس کیا لیکن رکے نہیں اور مسلسل آگے بڑھتے

چلے گئے۔ دوسرا کان پھاڑ دھماکا سنائی دینے میں بھی زیادہ وقت نہیں لگا۔ یہ پٹرول ٹینک پھٹنے کا دھماکا تھا۔ معاذ نے

کہتے تھے ایک ہل۔ لیے بیچے ہوئے ایک آگ۔ آگ نے

جسٹس کی گاڑی میں آگ لگنے کو لے کر میں تہمت ہو چکی تھی۔ آج کے دن آگ لگی ہی نہ تھی۔

آگ نے ایک سیف ہاؤس کو لٹکا تھا اور اب اس گاڑی کو خاک کر رہی تھی۔ اپنے وطن کی ان اٹھاک کے ضائع ہونے

کا معاذ کو افسوس تھا لیکن اس نقصان کے بدلے میں روشن ماتھری جیسا عفریت ختم ہوا تھا۔ اگر وہ زندہ بچ نکلنے میں

کامیاب ہو جاتا تو جانے وطن کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دینے والی اور کن کن کارروائیوں میں حصہ لیتا۔ آگ اور خون کے

اور کتنے کھیلے جاتے جن میں سیکڑوں زندگیاں داؤ پر لگتی ہیں اور سازشوں کے کون کون سے تانے بٹنے جاتے جن

کے باعث ملک عالمی سطح پر بدنام ہوتا۔ جن نقصانات کے بدلے روشن ماتھری کی زندگی کا خاتمہ ہوا تھا، وہ اس کے زندہ

بچ نکلنے کے مقابلے میں بہت معمولی تھی اور کہا جاسکتا تھا کہ معاذ نے زیادہ مہنگا سودا نہیں کیا تھا۔

بھاگتے ہوئے انہوں نے اس بات کا دھیان رکھا تھا کہ وہ ماتھری کی لاش تک پہنچ سکیں چنانچہ جلد ہی انہوں نے اسے پالیا۔ تیز رفتار چلتی گاڑی سے گرنے کے باعث اس کی

باڈی متاثر ہوئی تھی اور قیمتی طور پر کئی ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں لیکن اس سے کل ہی وہ ہر تکلیف سے آزاد ہو چکا تھا۔

بھی دے رہا تھا۔ وہ جن راستوں سے گزر رہے تھے، وہ عام گزرگاہ نہیں تھی اور نہ ہی اس کے قرب و جوار میں کوئی

باقاعدہ آبادی موجود تھی اس لیے فائرنگ کی آواز سن کر کوئی فوری طور پر اس طرف رخ کرتا یہ تو ممکن نہیں تھا لیکن وہ خود

ایسی صورت حال سے دوچار ہو چکے تھے کہ ان کے لیے اپنا آگے کا انجمن ملے کر ناوشوار ہو گیا تھا۔

"مجھے نہیں معلوم کہ اچانک اس شخص کا دماغ کیوں الٹ گیا تھا۔ میں اپنی جان داؤ پر لگا کر اسے وہاں سے نکال

کر لایا تھا اور اس نے چہلا کڑھی مجھ پر کیا تھا۔ میں صرف اپنی خوش قسمتی سے بچ سکا ہوں۔" معاذ جس وقت اپنی

صفا کی میں یہ جملے ادا کر رہا تھا، ڈرائیور بھی ان کے درمیان پہنچ گیا۔ ماتھری کو ہلاک کرنے والے نے اسے مختصر اصور ستو

حال سے آگاہ کیا۔ "ہمیں سب سے پہلے اس گاڑی کو چھوڑنے کے

ساتھ ساتھ مرنے والوں کی لاشیں تلف کرنا ہوں گی اور اس کا ایک ہی راستہ ہے کہ ہم لاشوں سمیت گاڑی کو آگ لگا دیں۔

جلد یا دیر کوئی نہ کوئی یہاں ضرور پہنچے گا اور ہمیں اپنے بیچے کوئی نشان نہیں چھوڑنا ہے۔" ڈرائیور نے فیصلہ سنا دیا۔

"یہاں سیف ہاؤس نہیں ایک عروذ بھی ہے۔ زخمی کو اٹھا کر آگے دیرانے میں پیدل سفر کرنا ہوگا۔ اتنا زیادہ زخمی ہے کہ فوسل طبی امداد پہنچنے کی

صورت میں زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکے گا۔" جس شخص کی ہانگ اور جڑے میں گولیاں لگی تھیں اس کی طرف اشارہ

کرتے ہوئے معاذ نے اس فیصلے پر اعتراض کیا۔ "ہم اپنے ساتھ کسی زخمی کو نہیں لے جا رہے ہیں۔"

ڈرائیور غرانے کے انداز میں بولا اور ایک نظر کھینچ کر سانس لیتے زخمی شخص پر ڈالی۔ وہ جوان لڑکا تھا جس کا ہیلمٹ

سر سے اتر کر دور جا کر اٹھا اور سیاہ چمک دار ریشمی بالوں کو ہوا بکھوڑے سے دے رہی تھی۔ ڈرائیور نے صرف ایک ہل کے

لیے اس کی طرف دیکھا پھر گمن کارخ اس کی طرف کر کے گولی چلا دی۔ اس کی پیشانی میں بننے والے روشن دان نے اس

کے خوب صورت چہرے کو بھیا تک بنا ڈالا۔ "اوکے! اب یہاں کوئی زخمی نہیں ہے۔ اب تم

جلدی سے نیچے اترو ورنہ ہم تم سمیت بھی اس گاڑی کو آگ لگا سکتے ہیں۔" ڈرائیور شاید سینئر تھا جس نے سارے

معاملات اپنے ہاتھ میں لیے لیے تھے۔ "مجھے تمہارے فیصلے سے کوئی اختلاف نہیں ہے لیکن

میں اپنے ساتھ ثبوت لے جانا چاہتا ہوں کہ ہم جس شخص کو

ذرا دیر سے اپنی پنڈی سے بندھا بھنگ لال کر نہایت صفائی سے اس کے دونوں انگوٹھے جڑ سے کاٹے اور ایک چھوٹے سے پوٹی تھیں بیگ میں محفوظ کر لیے۔ معاذ کو اس وقت بے اختیار یکسو یاد آیا۔ روشن ماحول کی زندگی بچانے کے لیے اس غریب کی جان لی گئی تھی اور اس کے انگوٹھوں کی کھال نہایت کارآمدی سے معاذ کے انگوٹھوں پر منڈھی گئی تھی کہ وہ سیف ہاؤس کی سیکورٹی سے گزر سکے۔ سیکورٹی سے گزرنے کے لیے ہی معاذ کو بغیر کسی ہتھیار کے خطرے میں کودنا پڑا تھا۔ وہاں سے نکلے ہوئے اس کے پاس ایک اداکار کی ٹمن تھی جس سے روشن ماحول نے اس کے حسبِ مشا خوب کام لیا تھا۔ ماحول کی اس کارروائی نے باقی دو بچ جانے والے افراد کو اتنا ہراساں کر دیا تھا کہ وہ رسی کو بھی سانپ سمجھ سکتے تھے اسی لیے انہوں نے احتیاط کا مظاہرہ کرتے ہوئے معاذ کو کوئی ہتھیار نہیں دیا تھا۔ معاذ کو ہتھیاروں کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ فرار کی اس کے پاس گنجائش نہیں تھی اور ان دونوں کو وہ گواہ کی حیثیت سے زندہ رکھنا چاہتا تھا۔ یہی تو تھے جو گواہی دیتے کہ وہ اپنے مشن میں کامیاب رہا تھا اور جو بھی گریز ہوئی وہ ماحول کی اپنی وجہ سے ہوئی۔ ماحول کا داغ اجاگر کیوں نہ تھا، اس لیے معاذ کے سوا کوئی شخص سمجھتا تھا کہ چنانچہ وہ بڑا اچھا لگا سا انسان تھا جس کے ساتھ چلا چلا جا رہا تھا اس کے ساتھ ہوتے ہوئے ہی حقیقت اس کے سامنے نہیں آئے۔ اسے معلوم تھا کہ وہ رانا پور کے تھیں چھپا سمجھ کر اپنے لیے مدد طلب کر لی ہے۔ چنانچہ پیدل چلنے کی یہ مشقت بھی زیادہ دیر نہیں سہی تھی۔ یوں بھی ایک موڈی دشمن کو انجام تک پہنچانے پر اس کا دل اتنا شاد تھا کہ فی الحال کوئی تکلیف، تکلیف محسوس نہیں ہو سکتی تھی۔

☆☆☆

عالم شاہ اور سرد ایک دیوار سے ٹک لگائے اس تاریک کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے جو یقینی طور پر کسی خانے کا حصہ تھا۔ انہیں اس حال میں یہاں پہنچایا گیا تھا کہ ان کے جملہ سامان کے ساتھ ساتھ ان کے کپڑے اور جوتے بھی اتروا لیے گئے تھے اور ان کے جسم پر صرف ایک ایک اندر ویر ہی باقی رہ گئی تھی۔ ان چیزوں سے محروم ہوتے ہوئے عالم شاہ نے ایک بار پھر بات چیت سے معاملہ حل کرنے کی اپنی ہی کوشش کی تھی لیکن باؤل کے چلے اس کی کسی پیشکش کو خاطر میں نہیں لائے تھے اور انہوں نے صاف بتا دیا تھا کہ ان سے جو بھی بات ہوگی وہ باؤل خود کرے گا۔ کب؟ یہ بھی باؤل ہی سننے سے طے کرنا تھا، سو وہ بے

بس سے بیٹھے چوٹی کی رفتار سے پلٹے وقت کے گزرنے کا انتظار کر رہے تھے۔ اندھیرا اتنا گہرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ بھانکی نہیں دے رہا تھا۔ ایسے میں وہ اس قید خانے کا جائزہ کیسے لیتے اور فرار کی کوشش کیونکر کر پاتے۔ ویسے بھی اندازہ تھا کہ انہیں یہاں تک پہنچا کر باؤل کے گرد گئے بے خبر نہیں بیٹھ گئے ہوں گے۔ باؤل نے انہیں ہدایت کر رکھی ہوگی کہ قیدیوں کی کڑی نگرانی کی جائے اس لیے فی الحال کچھ نہ کرنا اور مناسب وقت کا انتظار کرنا ہی بہتر تھا۔

”مجھے حیرت ہے کہ اس رہائشی اسکیم میں باؤل کیا کر رہا ہے؟ یہ یزدانی کا پردیگٹ ہے اور باؤل، عرفان اللہ کا باؤلی مین سمجھا جاتا ہے۔ اگر دوستی میں یزدانی نے اسے یہاں چھپا بھی رکھا ہے تو یہ چھپنے کے لیے اتنی مناسب جگہ نہیں ہے۔ یہاں تو بہت لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا ہوگا اور کوئی نہ سب سے تھیراتی عملے تو روزانہ آتا ہوگا۔ کسی کے ذریعے بھی بات باہر نکل سکتی ہے کہ باؤل یہاں چھپا ہوا ہے۔“ کافی دیر خاموش بیٹھنے کے بعد عالم شاہ نے یہ تبصرہ کیا۔

”میرے خیال میں یزدانی نے صرف دوستی میں باؤل کو یہاں چھپنے کی اجازت نہیں دی ہے۔ درون خانہ عرفان اللہ کے پاس ہی ہے۔ اس پر دیگٹ میں رقم لگا رہی ہے۔ وہ بہت دانا ہے۔ پہلے دن اس نے اس کی اور یزدانی کی دوستی کی بنیاد بنائی ہی ہے۔ عرفان اللہ کے پاس شینے کی وجہ سے یزدانی، باؤل کو یہاں رکھنے کے لیے ماضی ہو رہا ہے۔ یہ بات یہ کہ تعمیراتی عملے کے ذریعے باؤل کی یہاں موجودگی ظاہر ہو سکتی ہے تو اس کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میری اطلاعات کے مطابق فی الحال یہاں تعمیراتی کام رکا ہوا ہے۔ یزدانی اور اس کے جیسے دوسرے بلڈرز کا طریقہ ہے کہ بنگ کا آغاز کرنے کے بعد شروع میں کچھ عرصہ تو تعمیراتی کام میں خوب تیزی دکھاتے ہیں اور اس کی تشہیر بھی بڑھ چڑھ کر کرتے ہیں لیکن جب ان کا ایک خاص ہدف پورا ہو جاتا ہے تو تعمیراتی کام میں بڑے بڑے وقفے ڈال کر بیٹھے کے وقت کو آگے بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ اس صورت حال پر بہت سے لوگ بددل ہو کر یا تو قسطنطین بھرنا بند کر دیتے ہیں یا پھر اپنی بنگ کینسل کر دیتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں بلڈر کو ہی فائدہ ہوتا ہے۔ قسطنطین نہ بھرنے والوں کی بنگ پہلے سے طے شدہ شرائط کے مطابق خود بخود کینسل ہو جاتی ہے اور جو لوگ بنگ کینسل کر دیتے ہیں انہیں بیماری کٹوتی کے بعد بڑا دلہا کران کی باقی رقم ادا کی جاتی ہے۔ اس وقت بلڈر ایک نیا کام کرتا ہے۔ وہ ان دائیں آ جانے والے پائس اور گھروں وغیرہ کو

جا پڑا ہے۔ وہ شخص بے انتہا تیز بخار کی حد سے جل رہا تھا۔ عالم شاہ انداز سے سے اپنا ہاتھ اس شخص کے چہرے تک لے گیا اور دھیرے سے اس کے دہکتے ہوئے رخساروں کو تھپتھا کر اسے پکارا۔

”کون ہو بھائی تم اور یہاں اس حال میں کیوں پڑے ہوئے ہو؟“ اپنی اس پکار کے جواب میں اسے سسکیاں سی سنائی دیں لیکن یہ سسکیاں بھی ایسی تھیں جیسے اس شخص کے اندر ڈھنگ سے رونے کی بھی ہمت نہ ہو۔ بس ایک شدید کرب تھا جس کا اندازہ لگا یا جاسکتا تھا۔

”یہاں کہیں پانی نہیں ہے سائیں۔ میں چاروں دیواروں کے ساتھ نول کر گھوم کے دیکھ چکا ہوں۔“ عالم شاہ سسکیاں لیتے ہوئے شخص کے ساتھ بھر روئی کا اٹکھار کر پاتا یا کسی قسم کی تسلی دولا سادے پاتا اس سے گل اندھیرے میں سرمد کی آواز گونجی۔

”دروازے کو زور سے بجاؤ اور کسی کو پکار کر دیکھو۔ شاید کوئی آجائے۔ اس شخص کی حالت بہت خراب ہے اور اسے طبی امداد کی ضرورت ہے۔“

”جو حکم سائیں۔“ سرمد نے اپنی ازلی تابعداری سے

جب وہ دروازے کے قریب جا رہا تھا تو اس کے پیچھے سے دو دونوں ہاتھ اس سے لپکتے ہوئے عالم شاہ زور زور سے آواز میں بھی دے لگا۔ اسے پانی منٹ یہ انجام دیے ہوئے جب اسے لگا کہ اس کے ہاتھ دروازہ بجاتے بجاتے شل ہو گئے ہیں اور حلق میں خراشیں سی پڑنے لگی ہیں تب کہیں جا کر ردھل قاہر ہوا اور کھٹ پٹ کی ہلکی آوازوں کے بعد روشنی کا چھوٹا سا دائرہ نمودار ہوا۔ روشنی کسی چھوٹی نارنج کی ٹمبی لیکن اتنے شدید اندھیرے میں رہنے کے باعث کافی تیز محسوس ہو رہی تھی۔ وہ جب اس قید خانے میں لائے گئے تھے تب بھی لانے والوں میں سے ایک نے یہ نارنج پکڑ رکھی تھی لیکن وہ شخص میز میوں پر ہی رکا رہا تھا اور باقیوں نے اسے کے زور پر ان دونوں کو قید خانے میں دھکیل کر دروازہ باہر سے مقفل کر دیا تھا۔ اس مختصر عرصے میں وہ صرف یہ دیکھ سکے تھے کہ جس دروازے سے گزار کر انہیں قید خانے میں دھکیلا گیا ہے، وہ بھاری لوہے کا بنا ہوا ہے اور اس دروازے میں ایک چھوٹا سا چوکور خلا ہے جس میں ایک ہاتھ باہر نکالنے سے زیادہ گنجائش موجود نہیں ہے۔ آنے والا اسی خلا کے سامنے آکھڑا ہوا اور اکھڑ لہجے میں بولا۔

”کیا بات ہے، کیوں شور مچا رکھا ہے؟“

”پانی چاہیے۔ یہاں جو دوسرا آدمی موجود ہے اس

دوبارہ فروخت کے لیے پیش کرتا ہے اور پروجیکٹ کی ابتدائی قیمت کے مقابلے میں کئی گنا مہنگا بیچتا ہے کہ اس کے پاس لوگوں کو لپکانے کے لیے ایک فیڈرالی پاپ آجاتا ہے۔ اب اس کا پروجیکٹ زیر تعمیر نہیں بلکہ مکمل کے قریب قاہر کیا جا رہا ہوتا ہے چنانچہ لوگ زیادہ قیمت کے باوجود قبضہ ملنے کی امید پر جھانسنے میں آجاتے ہیں۔ اب یہ الگ بات کہ یہ جلد قبضہ بھی سال دو سال سے کم کی مدت میں مشعل سے ہی مل پاتا ہے۔“

عالم شاہ کے تبصرے پر سرمد نے اپنا بھرپور تجزیہ پیش کیا۔

”ہاں یار ایہ لوگ خواہوں کے سوداگر ہیں۔ اپنا گھر ایک عام آدمی کا سب سے بڑا خواب ہوتا ہے اور اس خواب کی تعبیر کا جہان سادے کر یہ لوگ اس عام آدمی کو کائناتوں پر مٹھیٹ لیتے ہیں۔ آس سے بندھا آدمی اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ کاٹ کر طے شدہ قسطوں کے علاوہ دیگر معلوم اور نامعلوم اخراجات کی مد میں بھی رقم بھرتا رہتا ہے لیکن اسے اپنا گھر مراد آسانی سے نہیں ملتا۔ اس عرصے میں ہنڈر کے البتہ دارے بنارے ہو جاتے ہیں اور اس کے اکاؤنٹس بھرتے چلے جاتے ہیں۔“ عالم شاہ نے بھی ہمدرد لہجے میں اس کی بات کی تائید کی لیکن پھر ایک آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ کسی کے اپنے لی آواز کی جواسی قید خانے کے کسی کونے سے ابھر رہی تھی۔ اس کی طرح سرمد نے بھی سن رکھی لیکن وہی اس کی طرح قہری طور پر سرمد کا آواز نہیں لگا سکا تھا۔ دوسری بار آواز دوبارہ آئی اور کراہنے والا ذرا تسلسل سے کراہنے لگا تو انہیں اندازہ ہو گیا کہ وہ دائیں طرف موجود ہے۔ گھانا ٹوپ اندھیرے کی وجہ سے وہ اسے دیکھنے سے تو قاصر تھے لیکن یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ جو کوئی بھی تھا اب تک بے ہوش پڑا رہا تھا اور اب ہوش میں آ رہا تھا۔ دونوں نے بیک وقت آہستہ سے آواز کے ماتخذ کی طرف پیش قدمی کی۔

”پپ..... پپ..... پانی..... پانی.....“ اب وہ بڑے کرب سے پکار رہا تھا۔ عالم شاہ اور سرمد دونوں ٹھنک گئے۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ اس قید خانے میں پانی کا کوئی انتظام ہے بھی یا نہیں۔ اندھیرے کی وجہ سے کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔

”تم پانی دیکھو، میں اس شخص کو دیکھتا ہوں۔“ عالم شاہ نے سرمد سے کہا اور آواز کی سمت بڑھ گیا۔ وہ شخص پکارنا چھوڑ کر اب پھر دھیرے دھیرے کراہنے لگا تھا۔ عالم شاہ آواز کے سہارے اس کے قریب پہنچا اور ٹول کر اس کے جسم کو چھوا۔ چوتے ہی اسے لگا کہ اس کا ہاتھ انگاروں پر

”بہ بھئی بے..... فرمائیں تو دیکھو سائیں سرکار
کی۔ ایسے آرڈر دے رہے ہیں جیسے قید خانے کے بجائے
اپنی جاگیر پر موجود ہیں۔“ اس شخص نے مذاق اڑایا۔
”آرڈر نہیں، درخواست سمجھو۔ وہ شخص سچ بچ بہت
تکلیف میں ہے اور میں کسی کو اتنی تکلیف میں نہیں دیکھ
سکتا۔“ عالم شاہ نے رسالہ سے کہا۔

”یہ جہنم ہے شاہ ساجیں اور جہنم میں آنے والوں کو اذیتیں دی سکتی ہوتی ہیں۔ جہنم میں علاج معالجہ نہیں کیا جاتا۔“ اس شخص نے سرمد کے الفاظ کو کچھ لمبے تھے اور اسی حوالے سے لہز کر رہا تھا۔

”پلیز! ان باتوں کو رہنے دو اور انسان کی حیثیت سے اس شخص کے لیے تھوڑی بہدردی سے سوچو۔ اگر تم اس کا تسلی بخش علاج نہیں کروا سکتے تو اتنا تو کرو کہ کچھ ضروری دواؤں اور صاف پتیاں ہی لا کر دو۔ ایسے تو وہ مر ہی جائے گا۔“ ”الم شاہ کو اس وقت قطعی یاد نہیں تھا کہ وہ کتنے بڑے باپ کا بیٹا تھا اور اپنی حویلی میں اس کی کیا شان تھی۔ اس وقت وہ ایک انسان کے لیے انسانیت کے ماتے کچھ کرنا چاہتا تھا اس لیے اس معمولی آدمی سے بھی انکساری سے جواب نہ دے سکتا۔“

میں سمجھتی رہی یہ ہاں۔ لیکن جلد تم کو
 لوگے تمہارے بھروسے اور انہیں اس لیے زیادہ بری نظر
 ہے۔ اور انہیں کہہ کر وہ اس پر ہنس گیا۔ وہ ایک بار پھر اس
 کا انتظار کرنے لگا۔ اس دوران سرحد، عالم شاہ کے مشورے
 پر بڑوں سے چلو چلو پانی کی کھال کر اس شخص کے ماتھے پر دوسرے
 پتھر پھرنے لگا کہ کچھ تو بخار کی شدت کم ہو۔ اس بار وہ شخص دس
 منٹ کے وقفے سے واپس لوٹا اور دروازے کے خلا میں
 سے کچھ چیزیں عالم شاہ کو تھامیں۔ ان اشیاء میں کپڑے کے
 ٹکڑے، ایک زخم پر لگانے والا ٹیوب اور دودھ کی گولیاں
 تھیں۔ اتنے شدید زخمی شخص کے لیے یہ سامان نہایت ناکافی
 تھا لیکن اس وقت اس نے اسے بھی غنیمت جانا۔ سب سے
 پہلے اس نے سرحد کے ساتھ مل کر کسی نہ کسی طرح اس شخص کو
 دونوں گولیاں لگنے پر مجبور کیا پھر ممکنہ حد تک زخموں کو صاف
 کر کے ان پر مرہم لگانے کے بعد دوسری پٹی باندھ دی۔
 آپس میں مشورہ کر کے انہوں نے زخم میں بھرا ہوا مادہ باہر
 نہیں نکالا تھا۔ وہ جو بھی شے تھی اس نے خون کے بہاؤ کو روکا
 ہوا تھا اور وہ اسے نکال کر صورت حال کو مزید خراب نہیں
 کر سکتے تھے۔ اس شخص کے دوسرے ہاتھ کا بھی پہلے ہاتھ
 جیسا ہی حال تھا۔ انہوں نے اس کے دوسرے ہاتھ کی بھی ممکنہ

سناست نہیں تھی۔ انگوٹھا، شہادت کی انگلی اور چھوٹی انگلی تو جڑ سے ہی اکٹھے ہوئے تھے جبکہ درمیانی دو انگلیوں کی ایک ایک پور باقی رہ گئی تھی۔ زخموں کا جائزہ لینے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ان پر کوئی باقاعدہ دوا وغیرہ نہیں لگائی گئی ہے بلکہ خون کا رساؤ روکنے کے لیے زخموں پر اندر تک کوئی مادہ بھردیا گیا ہے۔ وہ کوئی پھٹا سا محسوس مادہ تھا جو خود بھی خون میں گھسٹا ہوا ہونے کے باعث پچان میں تو نہیں آ رہا تھا لیکن چھوٹے پر سرخ کو ایسا لگتا تھا کہ وہ موم یا اس سے ملتی جلتی کوئی شے ہے۔ اس شے کی موجودگی کے باوجود زخموں سے ہلکا ہلکا خون رس رہا تھا۔ شاید پٹی کھولنے کا بھی اثر پڑا تھا۔

”اب کیا کروں سائیکس؟“ زخموں کی تشویش ناک حالت دیکھتے ہوئے سرمد نے فکر مندی سے عالم شاہ کی طرف دیکھا۔

”میں کوشش کرتا ہوں کہ یہ لوگ اس بے چارے کو طبی امداد پہنچانے پر راضی ہو جائیں یا کم از کم انہیں ہی فرسٹ ایڈ کا کچھ سامان مہیا کر دیں کہ کم از کم اس سے زخموں کی دھنگ سے چٹی تو ہو جائے۔“ عالم شاہ خود اس کے زخموں کی نوعیت دیکھ کر تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا اور اس اجنبی کے لیے اپنے دل میں مٹھری محسوس کر رہا تھا اس نے فوراً ہی اپنی خواہش سے کھڑا ہو کر دو دروازے کی طرف بڑھا۔ حیوانی کمارچ نے اس المیہ سے قید خانے کا کالی دوشیعہ کر دیا تھا۔ وہ ایک اچھا خاصہ بڑے کمرہ تھا جس میں فرش دھول مٹی سے اتنا ہوا تھا۔ کمرے میں مسلسل ایک ناگوار سی بو محسوس ہو رہی تھی جو عقبی طرف سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ مارچ کی محدور دشنی میں عالم شاہ نے دیکھا کہ اس جانب ایک تنگ سارا ستہ ہے۔ اس طرف کیا ہے، یہ جاننے کی خواہش اس نے پس پشت ڈالی اور دروازے کے چوکور خلا سے منہ لگا کر اس قید خانے کے عمرانوں کو دیکھنے لگا۔ اس بار زیادہ آوازیں نہیں لگانی پڑیں اور ردعمل فوراً ہی ظاہر ہو گیا۔

”تم لوگوں کو چین کیوں نہیں ہے۔ یہ نہیں کہ آج کی رات آرام سے سو جاتے اس کے بعد تمہاری زندگی میں ایسی کوئی رات آنا بہت مشکل ہے جب تم سکون سے سو سکو۔“ آنے والا بڑا لڑکا لیکن عالم شاہ نے توجہ نہیں دی اور سنجیدہ لہجے میں بولا۔

”اس دوسرے قصے کی حالت بہت خراب ہے۔ اگر اسے مناسب طبی امداد نہیں ملی تو وہ مر جائے گا۔ بہتر ہے کہ اسے کسی اسپتال لے جاؤ۔“

حادثہ سر ہم پنی کی چمر سرہ ایپ پڑے کو پانی میں بھگو کر اس کے ماتھے پر پٹیاں رکھنے لگا۔ اس ساری کارروائی کے دوران وہ شخص کرب ناک انداز میں کراہتا رہا تھا لیکن اس میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ ان دونوں کو کچھ کرنے سے روک پاتا۔ ایک دودھ اس نے درد ناک لہجے میں چھوڑ دیا، معاف کر دو جیسے جملے ضرور ادا کیے لیکن یہ کوئی باقاعدہ گفتگو نہیں تھی اور بخار کی شدت میں طاری ہونے والی ہڈیانی کیفیت سے مشابہ بھی جاسکتی تھی۔

عالم شاہ نے سرہ کو اس شخص کے ساتھ مصروف چھوڑا اور تاراج ہاتھ میں لیے کمرے کے عقبی حصے میں نظر آنے والے مختصر راستے کی طرف بڑھا۔ یہ راستہ ایک تنگ گیلری نما جگہ میں مکمل رہا تھا جہاں ایک اور بغیر کواڑ کا دروازہ نظر آ رہا تھا۔ اس جگہ پہنچ کر بدبو کی شدت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا پھر بھی عالم شاہ نے ہمت کر کے قدم آگے بڑھائے اور دروازے سے جھانکا۔ جھانکتے ہی اسے زور سے ابکاکی آئی اور وہ تیزی سے واپس پلٹا۔ وہ ایک چھوٹا سا ہاتھ روم تھا جہاں پانی کا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے بے حد غلاطت پھیلی ہوئی تھی۔ ان کا سامنی قیدی اور شاہد اس سے پہلے کچھ اور لوگ بھی دیکھ چکے تھے جن ضرورت کے لیے بھرتی ہوئے تھے۔ پوری استہلال کر کے رہے تھے اس لیے وہاں اتنی بری حالت تھی۔

”اے ہوا ساکن؟“ سرہ نے اسے اتنی بری طرح ابکائیاں لیتے ہوئے آتے دیکھا تو ڈی کو چھوڑ کر بے تابانی سے کھڑا ہو گیا۔

”کچھ نہیں یار! بس مہنگی سے طبیعت متاگئی تھی۔“ عالم شاہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے تسلی دی اور خود کو ذرا سنبھال کر بتانے لگا کہ پیچھے موجود ہاتھ روم کتنی بری حالت میں ہے۔

”جو لوگ بندے کو پینے کا پانی ایسا دیں وہ ہاتھ روم میں کوئی سہولت کیسے دے سکتے ہیں۔“ سرہ نے اپنے ہاتھ میں موجود پانی کی بوتل کی طرف اشارہ کیا۔ بوتل میں اب چند کھونٹ ہی باقی رہ گیا تھا۔ اس وقت وہ دنیا لا سا پانی ہی اس نیم جان شخص کے لیے آسپ حیات تھا جس کو سرہ بھی قطرہ قطرہ کر کے اس کے منہ میں پکاتا تھا تو کبھی کبڑے میں جذب کر کے اس کے بخار کی شدت کم کرنے کے لیے کبڑے کو پنی کی صورت اس کے ماتھے پر رکھتا تھا۔

”ہمارے لیے اس جگہ رہنا بہت دشمن ثابت ہوگا سرہ! ہمیں جلد از جلد یہاں سے نکلنے کی تدبیر کرنا ہوگی۔“ عالم شاہ یوں تو سخت جان تھا لیکن معاشرے کے اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھنے کے باعث اس کی جس ناز و نعم اور نفاست

کے ساتھ پردوش ہوئی تھی اس کے لیے ایسی جگہ رہنا کسی دوسری تکلیف کے مقابلے میں زیادہ اذیت ناک تھا۔

”تدبیر تو میں مسلسل سوچ رہا ہوں سامیں! لیکن فی الحال کچھ بھانکی نہیں دے رہا۔ اگر آپ کے ذہن میں کوئی بات ہو تو سمجھ کریں۔ میں اپنی جان آپ کی راحت کے لیے قربان کرنے کو تیار ہوں۔“ سرہ کے انداز میں وہی اس کی ازلی جانشاری تھی۔

”میں جانتا ہوں سرہ کہ تم میرے پسینے پر اپنا خون بہا سکتے ہو۔ مجھے تمہاری وفاداری کا امتحان لینے کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے لیکن مسئلہ یہی ہے کہ مجھے بھی فی الحال کوئی تدبیر نہیں سوچھ رہی ہے جسے ہم اپنی فوری رہائی کے لیے آزما سکیں۔“ عالم شاہ اس جگہ کچھ بے چین سا ہو گیا تھا۔

”میرے خیال میں ہمیں سکون سے باؤل کا انتظار کرنا چاہیے۔ وہ آئے گا تو ہم پر صورت حال واضح ہو پائے گی کہ آخر وہ چاہتا کیا ہے؟“ سرہ نے مشورہ دیا جس کے جواب میں عالم شاہ کچھ نہیں بولا اور خاموشی سے ایک دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ چاچا جیسے بدنام ڈاکو کے خلاف انتقامی کارروائی کے لیے نکلنے ہوئے اس نے بدترین حالات کوئی بھی نہیں دیکھا تھا۔ پنے زخمی، مہمور یا بھارتیوں کے کاناٹے بھی اس کے ذہن میں نہ تھے لیکن یہ تو اس کے ذہن میں بھی نہیں تھا کہ چاچا جیسا غلام انتہائی تھک چکا ہو اور اس کے بعد وہ کی چو ہے کی طرح ہوں گی۔

مہنگی جگہ پر پھنس کر رہ جائے گا۔

”آپ تھوڑی دیر آکھ لگانے کی کوشش کریں سامیں۔ میرے اندازے کے مطابق صبح ہونے میں بہت زیادہ وقت باقی نہیں ہے۔ صبح تک اللہ نے چاہا تو صورت حال میں کوئی نہ کوئی تبدیلی ضرور آجائے گی۔“ سرہ اس کے استے قریب رہا تھا کہ اس وقت اس کی کیفیات کو سمجھنا اس کے لیے فکری مشکل نہیں تھا۔ اسے اس کیفیت سے نکالنے کے لیے ہی اس نے ایک امید ہی دلا کر تباہی کی کیفیت سے نکالنے کا لٹنے کی کوشش کی۔ بات عالم شاہ کی سمجھ میں آگئی اور ہاتھ جبر ڈھیلے چھوڑ کے بیٹھنے کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے دماغ کو بھی ڈھیلا چھوڑ دیا۔ لڑنے بھڑنے کی تربیت حاصل کرنے والوں کو ایسے استاد اعصاب پُرسکون رکھنے کی مشقیں بھی کراتے ہیں۔ عالم شاہ نے یہ مشقیں بدرو پہلوان کے اکھاڑے میں کی تھیں۔ بدرو کا وہ تربیتی اکھاڑا اس کی اور معاذ کی دوستی کا نقطہ آغاز تھا۔ مختصر عرصے میں وہ بہترین دوست بنے تھے اور بہت جلد ہی معاذ اس سے جدا

تھی، اب سرد کے قریب بھی ہوئی رکھی تھی۔ یقیناً قدرتی روشنی اندر آنے کے بعد اس نے تارچ کو بجھا دیا تھا کہ اس کی توانائی محفوظ رہے۔ دوبارہ ان کے ساتھ ایسی کوئی مہربانی کی جاتی یا نہیں، اس کے بارے میں کچھ کہنا مشکل تھا۔

”اس کی حالت اب کیسی ہے؟“ عالم شاہ نے سوائے ہوئے قیدی کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

”رات کے مقابلے میں بہتر ہے۔ بخار خاصاً کم ہوا ہے اور اس وقت معمولی سی حرارت ہی باقی ہے۔ تکلیف میں بھی شاید کمی آئی ہے اسی لیے پہلے کی طرح مسلسل کراہ نہیں رہا اور سانس بھی خاصی بھوار ہے۔“ سرد نے اسے اس شخص کی حالت کے بارے میں آگاہ کیا۔ روشنی اب بھی اتنی زیادہ نہیں تھی کہ وہ اس شخص کو واضح طور پر دیکھ سکتے لیکن اتنا اندازہ بہر حال ہو رہا تھا کہ وہ کافی دنوں سے اس قید خانے میں موجود ہے۔ اس کے جسم پر میل کی تہ چڑھی ہوئی تھی، سر کے بال بری طرح الجھے ہوئے اور چمکتے تھے اور ڈاڑھی مونچھیں بھی کسی خود رو جنگل کی طرح بے ترتیبی سے بڑھی ہوئی تھیں۔ اس کے جسم سے ایک ہلکی سی ناگوار یو بھی پھوٹ رہی تھی جس سے اس قید خانے میں قیام کا حقد تھا۔

”والوں میں سے کونسا دوبارہ تارچ نہیں آیا؟“

بھی کر دیا گیا تھا۔ معاذ کہاں تھا، وہ نہیں جانتا تھا لیکن یہ حالات کا عجیب الٹ پھیر تھا کہ اس وقت وہ معاذ کے ایک دشمن کے جال میں پھنس گیا تھا۔ معاذ کے ساتھ گزار سے اچھے وقت کے بارے میں سوچتے ہوئے بالآخر سولی پر بھی آ جانے والی نیند اس پر مہربان ہوئی۔ وہ کئی دیر سویا رہا، اسے اندازہ نہیں ہوا۔ دوبارہ اس کی آنکھ کھلی تو وہاں رات جیسی تاریکی نہیں تھی اور بہت معمولی سی ہی سہی، روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس روشنی کا کچھ حصہ دروازے کے چوکور خلا میں سے اندر آ رہا تھا اور کچھ اس تنگ راستے کی طرف سے جس کے دوسری طرف وہ غلیظ ہاتھ روم موجود تھا جس کی ایک جھلک نے ہی اس کی طبیعت کدھر کر دی تھی۔ گھمب اندھیرے کے مقابلے میں یہ روشنی امید کا پیغام تھی۔ اس روشنی نے ایک آس سی جگائی تھی کہ اس قید خانے سے فرار کا کوئی راستہ مل سکتا ہے۔

”صبح بخیر۔“ اسے آنکھ کھولتے دیکھ کر سرد بولا تو وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔ سرد اب بھی زنجی قیدی کے قریب بیٹھا ہوا تھا اور اس کی حالت سے ظاہر تھا کہ اس نے ایک ہل کے لیے بھی آنکھ نہیں جھپکائی ہے۔ وہ چھوٹی سی تارچ جو عالم شاہ نے بھیجی ہوئی حالت میں پوار سے نکال کر رکھ دی

قارئین بیرون ملک متوجہ ہوں!

محکمہ ڈاک نے دوسری مرتبہ بیرون ملک ڈاک خرچ پر تقریباً 200 سے 250 فیصد اضافہ کر دیا ہے جس کی وجہ سے ہم بحالت مجبوری بیرون ملک ڈاک خرچ میں اضافہ کر رہے ہیں۔

جو کہ اس ماہ نومبر 2020 سے لاگو ہو گا جس کی تفصیل تمام رسائل میں فراہم کر دی گئی ہے۔

سرکولیشن منیجر
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

”نہیں، کوئی نہیں آیا۔ میں نے ہی ذرا چل پھر کر جائزہ لیا ہے۔ سیرھیوں والا راستہ شاید اس وقت کھلا ہوا ہے اور وہیں سے روشنی یہاں بھی آرہی ہے۔ ہاتھ روم والی گیلری میں بھی اوپر چست پر چھوٹا سا ایک فلا ہے جس پر لوہے کی مضبوط جالی لگی ہوئی ہے۔ وہ فلا اتنا اونچا ہے کہ بغیر کسی اونچی چیز پر چڑھے وہاں تک ہاتھ نہیں جاسکتا۔ ہاتھ چلا بھی جائے اندر آدمی کسی طرح لوہے کے جال کو توڑ بھی دے تو فلا اتنا چھوٹا ہے کہ اس میں سے زیادہ سے زیادہ دھڑکی ہی گزر سکتی ہے۔ کسی آدمی کے لیے اس خلا میں سے گزرنا ممکن نہیں ہے۔“ سرمد کی دی اطلاعات حوصلہ افزا نہیں تھیں۔ عالم شاہ اس پر کوئی تبصرہ کرتا اس سے قبل ہی دروازے پر آہٹ ہوئی اور چوکھٹے میں سے ایک فصیلی اندر لڑکی لائی۔ ساتھ ہی ہکا را گیا۔

”جہنم کا آئینہ ناشائے لو۔“ ان دونوں کی بھوک پیاس اڑی ہوئی تھی لیکن زخمی شخص کا خیال آنے پر عالم شاہ نے سرمد کو اشارہ کیا کہ ناشائے لے۔

”دن والی بوتل وہاں کدوؤں میں چھپی پانی کی دھری میں دے دیجیوں۔“ سرمد نے پٹائی کی جھلی تھامی تو ایک گھبراہٹ کی گئی سرمد نے غلطی سے بوتل اس کے پاس جا کر واہیں کر دی۔ جواب میں اسے رات جیسے من پانی کی بوتل تھما دی گئی۔

”خیال رکھنا یہ پانی تم تینوں کے لیے ہے اور اب کل صبح ہی دوبارہ پانی ملے گا۔“

”یہ پانی تم کسی آئینہ پلانٹ سے لاتے ہو؟“ شفاف بوتل میں موجود گدلا پانی ہی دل جلانے کو بہت تھا اس پر سے خصوصی ہدایت بھی دی گئی تو سرمد سے برداشت نہیں ہوا اور زبان سے طنز پھسل گیا۔

”جہنم کے آئینہ پلانٹ سے۔“ اس نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ رات سرمد کی زبان سے نکلنے والے جہنم کے لفظ کو اس شخص نے پکڑ لیا تھا اور ہر موقع پر اسی لفظ کو استعمال کر رہا تھا۔

”بازل سے کہو میں اس سے مننا چاہتا ہوں۔“ وہ شخص واہیں پلٹ جاتا اس سے قبل عالم شاہ نے اس سے بلند آواز میں مطالبہ کیا۔

”ان سے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہاں صرف وہ کہتے ہیں اور جو کچھ وہ کہتے ہیں اس پر عمل کیا جاتا ہے۔ اگر انہوں نے تم لوگوں کو یا د کیا تو ملاقات ہو جائے گی۔“ اس کے

مقابلے کو خاطر میں نہ لاکر صاف جواب دیا گیا۔

”اے میرا پیغام پہنچاؤ۔ میں اس گھنڈی اور بدبودار جگہ پر نہیں رہ سکتا۔ اس سے کہو وہ جو چاہتا ہے فوراً بتا دے۔ روپیا، چسپا، تشدد یا جان لیوا، جو بھی اس کا مقصد ہے وہ پورا کر لے۔“ اس کا انکار سننے کے باوجود عالم شاہ نے اپنی بات پر اصرار کیا۔

”یہ جہنم ہے شاہ جی! جہنم میں کوئی بھی نہیں رہتا چاہتا لیکن اپنے کرتوتوں کے سبب پہنچا دیا جاتا ہے۔ آپ نے بھی جو کچھ کیا ہے اس کو جہنم کے لیے یہاں رہنا تو پڑے گا۔ یہاں رہ کر سزا کیلا ملتی ہے اس کا فیصلہ دار وہ جہنم باذل صاحب کریں گے۔“ وہ شخص ایسے انداز میں گفتگو کرتا تھا جیسے دوسرے کی بے بسی سے لطف اٹھا رہا ہو۔ عالم شاہ کو احساس ہو گیا کہ اس سے بات کرنا بے کار ہے، سو خاموشی اختیار کر لی۔ انہیں خاموشی پا کر وہ شخص بھی واہیں پلٹ گیا۔ رات سے یہی شخص تھا جو مسلسل ان سے ملاقات کے لیے آ رہا تھا یعنی ان پر اس کی ڈیوٹی لگی ہوئی تھی۔ وہ چلا گیا تو سرمد نے فصیلی کھول کر اندر کا جائزہ لیا۔ پلاسٹک کی اس فصیلی

میں کل تین جگہ جگہ بودھے یعنی فی بندہ ایک رسک۔ رسک دیکھتے ہیں ہی پانی اور سلاخیں تھیں ان لوگوں کا بلے ہی کچھ ملنے سے کھانا اور وہ بھی کھانا، اس شخص کے کدو کے کدو مستحق ہیں کی بھرتی ہوئی تھی لیکن یہ کدو سال وہاں موجود تیسرے شخص کو تو اس ناشتے کی ضرورت تھی جو چتا نہیں کتے عرصے سے ناشتے میں ایک رسک کھا کر جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھے ہوئے تھا۔ یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس شامی ناشتے کے بعد دوپہر اور رات کے کھانے میں کچھ دیا جاتا تھا یا نہیں۔ جس طرح اس شخص کی کھال ہڈیوں سے لگی ہوئی تھی اور چپہ، پیٹ ایک ہور ہے تھے اس سے تو یہی لگتا تھا کہ وہ مسلسل قاتلشی سے گزر رہا ہے۔

”یہ ناشتا اس بے چارے کو کروا دو سرمد۔ جیسی بھی سہمی یہ غذا ہے اور اسے غذا کی ضرورت ہے۔“ عالم شاہ نے بھی رسک دیکھ لیے تھے چنانچہ سرمد کو مشورہ دیا۔ اس اجنبی کی حالت اتنی قاتل رحم تھی کہ اگر وہ شدید بھوکا بھی ہوتا تو اپنے جیسے کی خوراک اسے دے دیتا اور اس وقت تو سرمد سے خواہش ہی نہیں تھی۔ خواہش نہ ہونے کے پیچھے ایک سبب وہ گنہگار تھا روم بھی تھا جسے استعمال کرنے کے خیال سے ہی دم اٹنے لگتا تھا اس لیے معدے پر کوئی بوجھ نہ ڈالنا ہی مناسب تھا۔

سرمد پانی کی بوتل اور رسک لے کر اس شخص کے

کلام: فنا فی اللہ کا پیوری

ڈوبنے والے کی میت پر لاکھوں رونے والے ہیں
پھوٹ پھوٹ کر جو روتے ہیں وہی ڈوبنے والے ہیں

کس کس کو تم بھول گئے ہو غور سے دیکھو بادہ کشو
شیش محل کے رہنے والے پتھر ڈھونڈنے والے ہیں

سونے کا یہ وقت نہیں ہے جاگ بھی جاؤ بے خبر
ورنہ ہم تو تم سے زیادہ چین سے سونے والے ہیں

آج سنا کر اپنا فسانہ ہم یہ کریں گے اندازہ
کتنے دوست ہیں ہنسنے والے کتنے رونے والے ہیں

میں بھی انہیں پہچان رہا ہوں غور سے دیکھو بادہ کشو
شاید سب حرم بیٹھے ہیں وہ جو کونے والے ہیں

☆☆☆

اہل دیر سے حرم
میں آئے
مٹ گئے
صرف نقشبند
قدم رکھتے

ہم نے ہر شے سنواری مگر
ان کی زلفوں کے خم رہ گئے

بے تکلف وہ اوروں سے ہیں
ناز اٹھانے کو ہم رہ گئے

رند جنت میں جا بھی سکتے
واعظ محترم رہ گئے

دیکھ کر تیری تصویر کو
آئینہ بین کے ہم رہ گئے

اے قاتل تیری تقدیر میں
ساری دنیا کے غم رہ گئے

قریب چلا گیا اور دیر سے دیر سے اس کے گل تپتپا کر
اسے نیند سے جگانے لگا۔ ذرا سی کوشش کے نتیجے میں وہ
جاگ گیا اور کچھ دیر اجنبی اور خوف زدہ نظروں سے ان
دونوں کو دیکھتا رہا لیکن جب ان کے حلیوں پر توجہ دی اور
انہیں بھی اپنے جیسی "ڈریسنگ" میں پایا تو آنکھوں سے
خوف نہ بھگیا۔

"آپ لوگ کون ہیں اور یہاں کیسے آئے؟" حلیہ جو
بھی تھا ان دونوں کے بشروں سے بہر حال ان کی حیثیت
چمک رہی تھی چنانچہ سوال کرتے ہوئے اس شخص کا انداز
مؤدبانہ تھا۔

"ہم کون ہیں اور تم کون ہو، یہ تعارف بعد میں آرام
سے ہوتا رہے گا۔ پہلے تمہارا سا کچھ کھانی لو تاکہ تمہارے جسم
میں ذرا جان آئے۔ پوری رات تم بخار سے تپتے رہے ہو۔
بیماری کو شکست دینے کے لیے غذا ضروری ہے۔" سرد نے
اس کا سوال نال کر اسے ناشتے کی طرف متوجہ کیا اور رسک
والی چھٹی کھول کر اس کے سامنے کی۔

"پورے تین رسک....." وہ چھٹی میں موجود رسک
کی تعداد کو دیکھ کر قدرے حیران اور خوش ہوا لیکن پھر شاید
اس کے کچھ میں باور آگیا اور بولا۔
"ان میں سے ایک ایک آپ لوگوں کے لیے ہے۔"

یہ تینوں تمہارے ہیں۔ ہم انہیں کھا لو۔ اس بار
عالم شاہ نے گفتگو میں حصہ لیا اور غری سے اس سے بولا۔

"آج آپ کا پہلا دن ہے نا اس لیے مجھ سے
بہر دہی جتا رہے ہیں۔ کچھ دن یہاں رکنا پڑ گیا تو خوراک
کے ایک ایک ذرے کے لیے لڑنے مرنے پر تیار ہو جائیں
گے۔" اس کے لہجے میں کرب، حسرت، بے چارگی اور نہ
جاننے مزید کون کون سے جذبے ترپ رہے تھے جو ان
دونوں نے اپنا دل گداز ہوتا ہوا محسوس کیا۔

"جب وہ وقت آئے گا تب دیکھا جائے گا۔ ابھی تو
تم یہ کھا لو۔" سرد نے اسے سہارا دے کر دیوار کے ساتھ
ٹیک لگا کر بٹھا دیا اور اپنے ہاتھ سے اسے رسک کھلانے لگا۔
سوکھے رسک حلق سے نیچے اتارنے کے لیے پیچ پیچ میں پانی
کے گھونٹ بھی پلانے پڑ رہے تھے۔ دو رسک کھانے کے
بعد اس نے مزید کھانے سے انکار کر دیا۔

"کیوں دوست اور کیوں نہیں کھا رہے؟" سرد نے
اسے ٹوکا۔

"طبیعت عجیب سی ہو رہی ہے اور بھوک کے باوجود

گولڈن جوبلی نمبر

مزید جاننے کی امت نہیں نورجی۔ اس نے دیر سے سے جواب دیا اور بیٹھے بیٹھے ہی آنکھیں موند لیں۔

”تمہیں بخار دوبارہ تو تیز نہیں ہونے لگا۔ میں کوشش کر کے دیکھتا ہوں کہ دوبارہ تمہارے لیے کوئی دوا منگواسکوں۔“ سرد نے اس کا ہاتھ چھوا۔ کم ہو جانے والا بخار واقعی ایک بار پھر تیز ہونا شروع ہو گیا تھا۔

”رہنے دو بھائی۔ یہ لوگ انسان نہیں، درندے ہیں۔ ان کی قید میں رہنے سے بہتر ہے کہ آدمی مر ہی جائے۔ رات آپ لوگ یہاں نہ آتے تو شاید موت مجھ پر مہربان ہو ہی جاتی۔ مجھے اب یاد آ رہا ہے کہ رات میری منشی کے دوران کوئی میری دیکھ بھال کرتا رہا ہے۔ وہ یقیناً آپ لوگ ہی تھے۔ آپ کی اس مہربانی کے لیے شکر یہ لیکن مجھے خود اب جینے کی کوئی امید نہیں ہے۔ یہ لوگ قطرہ قطرہ کر کے میرے بدن سے زندگی کو کھینچ رہے ہیں اور اب کسی بھی لمحے میری زندگی کا چراغ گل ہو سکتا ہے۔“ اس کے لہجے میں شدید تکان اور تکلیف تھی۔

”تم کون ہو اور یہ لوگ تمہیں کس جرم میں قید کر کے

تین چار رہے ہیں؟“ سوال پر متوقف کر دیا گیا تھا، علم شکار زبان پر نہ آتا تھا۔

”میں کون ہوں اس سے شاید کوئی فرق نہیں پڑے۔“ اس نے بات یہ کہ یہ لوگ درندے بلکہ درندہ جی

بدتر ہیں کیونکہ درندہ تو پھر بھی ضرور بنا شکار کرتا ہے لیکن یہ لوگ اپنی اذیت پسندی کی حس کو تسکین پہنچانے کے لیے لوگوں کو شکار کرتے ہیں۔ درندہ اپنے شکار کو تڑپاتا نہیں بلکہ ایک جھنجکے میں ہلاک کر دیتا ہے لیکن یہ لوگ کوشش کرتے ہیں کہ ان کا شکار ہلاک نہ ہونے پائے اور یہ آخری لمحے تک اس کے ترپنے کا لطف اٹھا سکیں۔ میں شاید پندرہ دن سے

یہاں ہوں اور اپنے سامنے یہاں ایک بندے کو اس طرح مارتا ہوا دیکھ چکا ہوں کہ وہ روزانہ خود اپنے منہ سے اللہ سے اپنے لیے موت مانگا کرتا تھا۔ ان لوگوں نے اسے قسطوں میں مارا تھا۔ ناک، کان، زبان، انگلیاں ہر روز اس کے جسم سے ایک عضو کاٹ کر پیچیدہ دیا جاتا تھا اور اس کے زخم کی ایسی ہی مرہم بنی کر دی جاتی تھی جیسی آپ نے میرے ہاتھوں پر دیکھی ہوگی۔ جب تک وہ بے چارہ زندہ تھا، مجھے بھوک، پیاس اور گندگی کی اذیت کے علاوہ کوئی تکلیف نہیں برداشت کرنا پڑتی تھی۔ اس کے مرتے ہی مجھے مشق ستم بنانا شروع کر دیا گیا۔ وہ جو عجیب سی شخصیت والا ان کا سربراہ ہے، اس نے کئی بار میری پیٹھ پر فنجر سے کٹ لگا کر ان میں

تک مر چیں بھروانے کے بعد درمیک پیٹھ کر میرے ترپنے کا نگارہ کیا ہے۔ وہ شخص ذہنی مرلیض ہے جو لوگوں کو کسی اور وجہ سے نہیں صرف اس لیے تکلیف دیتا ہے کہ تشدد کے نئے نئے طریقوں کا تجربہ کر سکے۔ اپنے اس شوق کی تسکین کے لیے وہ انسانوں کو ایسے شکار کرتا ہے جیسے سائنس دان اپنے تجربات کے لیے چوہوں سے کام لیتے ہیں۔ میرے سامنے جو شخص یہاں مرا تھا وہ ایک پیشہ ور ہیکاری تھا اور یہ لوگ اسے لالچ دے کر کھیر لائے تھے۔ وہ مجھ سے صرف ایک دن پہلے یہاں لایا گیا تھا جبکہ میں اپنی قسمت کی قربانی سے بچس گیا۔ میں بھینگ وغیرہ کا کام کرتا ہوں اور روزگار کی تلاش میں دوسرے شہر سے آیا تھا۔ اس پروجیکٹ میں مجھے کام کرنے کا موقع ملا تو میں بہت خوش ہوا کہ چلو ایک بڑا کام مل گیا ہے جس سے اچھے خاصے عرصے تک مجھے روٹی اور روزی ملتی رہے گی۔ کام صحیح چل رہا تھا۔ تھوڑی بہت ناچار کتو جیوں کے بعد تنخواہ بھی مل ہی جاتی تھی۔ پندرہ دن پہلے اعلان کیا گیا کہ کچھ مسائل کی وجہ سے فی الحال کام بند کیا

چار رہا ہے اس لیے سب مزدوروں کی چھٹی ہے جو جہاں کام کرتا ہے۔ یہاں بھی دوبارہ کام شروع ہوا تو دوبارہ ہولناکیاں کر لی گئیں۔ میں یہاں کام کرنے والے ان چند لوگوں میں سے ہوں جو شروع سے ہی کام کر رہے تھے اور دوسرے شہر سے آنے کی وجہ سے مجھے یہاں رکھنے کی اجازت تھی۔ میں اور میرے تین چار ساتھی ایک ادھورے تعمیر شدہ گھر کے اندر ٹھکانا بنا کر رہ رہے تھے۔ کام رکھنے کا اعلان ہوا تو ہمیں بھی یہاں سے پوریا بستر گول کر لینے کا حکم دے دیا گیا۔

”میرے ساتھی تو حکم ملتے ہی روانہ ہو گئے کہ چند دن

... جا کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ وقت گزاریں گے لیکن میں اپنے گھر اس لیے نہیں گیا کہ میں کہیں اور کام تلاش کر کے ٹھوڑے پیسے مزید جوڑ لوں تو پھر گھر جاؤں گا۔ اصل میں اگلے مہینے میری بہن کی شادی ہونے والی ہے اس لیے میں زیادہ سے زیادہ پیسے جوڑنے کے چکر میں لگا رہتا تھا۔ اسی چکر میں، میں نے حکم کے باوجود یہ جگہ نہیں چھوڑی کہ پہلے کہیں اور کام تلاش کر لوں تو وہاں چلا جاؤں گا۔ فوراً یہاں سے نکل کر کرا وغیرہ کرائے پر لینے کے چکر میں رقم ملتی جو میں خرچ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ایک آدھ دن کی بات ہے، میں چھپ کر رہ لوں گا تو کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ پتا بھی چلا تو چوکیدار وغیرہ ہی کو پتا چلے گا اور یہاں

شاہ کے دل کو شدید تکلیف پہنچائی تھی اور وہ کوشش کر رہا تھا کہ اپنے الفاظ سے اس کے زخموں پر مرہم رکھ سکے۔

”یہاں سے نکلنا دلوالے کا خواب ہے۔ شروع میں، میں بھی یہ خواب دیکھتا تھا لیکن اب اس خواب سے دستبردار ہو چکا ہوں۔“ اس نے حسرت سے اپنے بچوں میں لپٹے ہوئے ہاتھوں کو دیکھا۔

”تمہارے ہاتھوں کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ ہم نے زخم دیکھے ہیں۔ انگلیاں بے شک غائب ہیں لیکن انہیں دیکھ کر یہ نہیں لگ رہا کہ انہیں کاٹا گیا ہے۔ کچھ عجیب نوعیت کے زخم ہیں۔“ وہ جن مایوس کن حالات سے گزرا تھا اس کے لیے یقیناً کوئی اچھی امید قائم کرنا ممکن نہیں رہا تھا اس لیے عالم شاہ نے مزید ایسی کوشش نہیں کی اور اس سے اس کے زخموں کے بارے میں پوچھا۔

”میری انگلیاں کافی نہیں گئیں بلکہ گولیوں سے اڑائی گئی ہیں۔“ اس نے انکشاف کیا۔

”گولیوں سے.....؟“ وہ لوگ سچ جحیران رہ گئے۔

”میں نے آپ کو بتایا ہے تاکہ یہ لوگ تشدد کے نئے

تجربوں کے لیے انسانوں کو پکڑتے ہیں۔ میرے ساتھ بے انصافی کی گئی تھی۔ میں نے اپنے ہمارے ساتھ کھڑا کر کے میرے گردن اور کراہنے والی ہاتھ دیا تاکہ میں اپنی جگہ سے حرکت نہ کر سکوں۔ میرے ہاتھوں

دونوں جانب منیہ کی طرح پھیلا کر کلاہیاں دیوار میں لگے کلپس میں قید کر دی گئی تھیں اور پانچوں انگلیوں کو خوب پھیلا کر ہر دو انگلیوں کے درمیان اس طرح میخیں ٹھونک کر گیپ بنادیا گیا تھا کہ میں چاہوں بھی تو انگلیوں کو سیکڑ کر آپس میں قریب نہ کر سکوں۔ میرے ساتھ یہ سب کرنے کے بعد مجھے بتایا گیا تھا کہ باس اپنے نشانے بازی کی مہارت کا امتحان لیتا چاہتا ہے۔ اس ظالم نے اپنی مہارت کا ثبوت اس طرح دیا تھا کہ میری ایک ایک انگلی میں الگ الگ گولی ماری تھی۔ میں کتنا چیخا تھا اور کتنی انگلیاں اڑنے تک ہوش میں رہ سکا تھا، مجھے یاد نہیں۔ میں بس اتنا جانتا ہوں کہ تین دن سے میں اتنی شدید تکلیف میں ہوں کہ ہر سانس کے ساتھ خود ہی اپنے مرنے کی دعا کرتا ہوں۔ موت کے علاوہ مجھے اس تکلیف سے نجات کا کوئی ذریعہ نظر ہی نہیں آتا۔“ اس کی ویران آنکھوں سے نکل کر خشک جلد والے سانولے رخساروں پر بہتے آنسو کی کسی انسان کے دل کو لرزادینے کے لیے کافی تھے۔ ان آنسوؤں کے پیچھے موجود دردناک کہانی نے تو ایسا تڑپایا کہ عالم شاہ نے اپنے دل میں دھواں

کے چوکیداروں سے میری اتنے عرصے میں اچھی سلام دعا ہو گئی تھی۔ وہ مجھے بلا اجازت یہاں رہنے پر پکڑ بھی لیتے تو رعایت کر دیتے لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ ذرا سی بچت کی خواہش مجھے تباہی کے گڑھے میں گرانے جارہی ہے۔ میں نے کوشش کر کے ایک دوسرے پروجیکٹ میں اپنے نئے کام تلاش کر لیا تھا اور ہائش کی بات بھی کر لی تھی۔ بس ایک رات گزرا کہ اگلی صبح مجھے یہاں سے بے جانا تھا کہ سب کچھ تباہ ہو گیا۔ میں چپکے سے باؤنڈری پھیلائی کہ اندر آنے کے بعد اپنے ٹھکانے پر سو رہا تھا کہ مجھے لگا کوئی شخص بلبلہ کر چلا رہا ہے۔ آواز بہت بلند نہیں تھی اور کھٹی کھٹی ہی مجھ تک آرہی تھی لیکن میں چونک گیا کہ یہاں اس طرح کون چل رہا ہے۔ جس نے مجھے اپنی جگہ سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ باہر نکلتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ آوازیں اس مکان کی طرف سے آرہی ہیں جو مکمل تعمیر شدہ ہونے کے باوجود برائے فردخت نہیں تھا اور جس کے پیچھے خانہ بھی بنایا گیا تھا۔ آپ لوگوں نے شاید ہاتھ روم والی ٹیلری کی چھت پر لگی جالی دیکھی ہوگی۔ آوازیں وہیں سے باہر آرہی تھیں۔ میں یہ دیکھنے کے لیے

کہ کوئی آدمی سے جوتہ اٹانے کے اندر تکلیف سے نکل رہا ہے۔ مکان کے اندر گیا۔ مجھے یہ خانہ تک کا راستہ معلوم ہوا اس لیے میں۔ کوئی جھک محسوس نہیں کی تھی۔ نہ مجھے اندازہ تھا کہ میں اپنی کھجک کی کھجک سے

جار ہا ہوں۔ مکان میں داخل ہوتے ہی میں پھنس گیا اور ایسا پھنسا کر لگتا ہے اب بس میری روح ہی یہاں سے نکل سکے گی۔ جسم کو تو دیسے بھی یہ لوگ مکمل تباہ کر چکے ہیں۔ اس تباہی کے ساتھ باہر جا کر میں کروں گا بھی کیا۔“

اس طویل تفصیل کے دوران وہ کئی بار سانس لینے کے لیے رکا تھا۔ ایک بار سرہ نے اسے تھوڑا سا پانی بھی پلایا تھا لیکن غل دونوں میں سے کسی نے نہیں دیا تھا کہ کہیں اس کا تسلسل نہ ٹوٹ جائے۔ وہ کچھ حیران سے یہ سب سنتے رہے تھے۔ باؤل کے بارے میں کوئی اچھی بات تو پہلے بھی انہیں نہیں معلوم تھی لیکن یہ گمان بھی نہیں تھا کہ وہ اپنی تفریح طبع کے لیے اس طرح بے قصور اور غیر متعلق لوگوں کو بھی نشانہ بنا ڈالے ہوگا۔

”مایوس مت ہو دوست! اللہ نے چاہا تو یہاں سے نکلنے کا انتظام بھی ہو جائے گا اور تمہارا بہترین علاج معالجہ بھی ہو سکے گا۔ بہن کی شادی کے لیے بھی تم فکر مند نہ ہو، ہم تمہارے ساتھ کھڑے ہو کر خود تمہاری بہن کو عزت اور شان سے رخصت کریں گے۔“ اس شخص کی بے کسی اور زندگی سے مایوسی نے عالم

سا برہہ ہوا سوسن یہ اور شدت سے یہ خواہش ابھری کہ کسی طرح باذل ہاتھ لگ جائے تو اس کا ایک ایک ریشہ اوچیز کر اس سے ان مظالم کا حساب لیا جائے لیکن ابھی تو ظلم کی داستان بھی پوری مستجاباتی تھی سو اس سے ایک سوال اور کیا۔

”تمہارا خون روکنے اور زخموں کا منہ بند کرنے کے لیے انہوں نے کیا کاریگری دکھائی ہے؟“

”اندر راکھ بھر کر ساتھ ہی گرم پکھڑا ہوا موسم ڈالا گیا ہے جس نے زخموں کو خاصی حد تک بند کر دیا ہے لیکن پھر بھی کبھی کبھی خون رسنے لگتا ہے۔“ اس کے جواب نے تصدیق کر دی کہ وہ جو اس کی پٹی تہہ لیں کرتے وقت انہوں نے موسم جیسا مادہ محسوس کیا تھا، وہ سچ سچ موسم ہی تھا۔ ایک انسان کے ساتھ اس قدر انسانیت سوز سلوک نے ان کی زبانوں کو ہی گنگ کر دیا اور مزید کوئی سوال کرنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔

”آپ لوگ یہاں کیسے آجئے؟“ ان کے سوالات ختم ہو گئے تو اس نے ان سے سوال کیا۔

”شائبہ اعمال سے۔ اپنی طرف سے تو ہم یہاں پناہ لینے آئے تھے لیکن الٹا اس مصیبت میں پھنس گئے۔“

عالم شاہ نے زیادہ تفصیل میں بیان سے انہیں مختصر جواب دیا۔ ”تمہارے آگے آگے لوگوں کو اس مشکل سے نکالنے میری مشکل تو ابھی لگتی ہے کہ اب آسمان ہونے والا ہے۔“ اس نے بھی زیادہ کرچہ نہ کہ کوشش کبھی نہ کی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

”مجھے لگتا ہے کہ تمہارا بخار تیز ہوتا جا رہا ہے۔“ سرد نے اس کے چہرے کے تاثرات سے اس کی حالت کا اندازہ لگایا، ساتھ ہی اسے چھو کر بھی دیکھا۔ بخار واقعی تیز ہو چکا تھا۔

”میں تمہارے لیے دوا منگوانے کی کوشش کرتا ہوں۔“ وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور دروازے کے خلا سے منہ لگا کر پہرے دار کو پکارنے لگا۔ وقفے وقفے سے کافی دیر تک پکارنے کے باوجود کوئی رد عمل ظاہر نہ ہوا۔

”آپ زحمت نہیں کریں بھائی۔ وہ نہیں سنے گا۔ کوئی کوئی دن ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ ایک بار بھی چکر نہیں لگاتا۔ میں نے یہاں ایک رسک اور تیس ایم ایل (30ml) پانی کے ساتھ چوبیس گھنٹوں سے بھی زیادہ وقت گزارا ہے۔ اس وقت بھی میں سانس اٹھا نہیں گھٹنے سے زیادہ کا بھوکا پیاسا تھا۔ میرے ہاتھوں کو ناکارہ بنا دینے والوں کو شاید مجھے اپنے ہاتھ سے کھلانے پلانے کی ڈوبی انجام دینا گوارا نہیں۔“ وہ مسلسل باتیں تو کر رہا تھا لیکن بولنے کے انداز

سے ظاہر تھا کہ وہ جو طبیعت میں سنبھلاؤ آیا تھا، وہ ایک بار پھر بگاڑ کی طرف جا رہا ہے۔

”تموڑی دیر بعد دوبارہ پکار کر دیکھوں گا۔“ مایوس سا سرد واپس اپنی جگہ آ بیٹھا۔

”کہا میں اپنے ہمدردوں کے نام جان سکتا ہوں؟“

”کیوں نہیں۔ میرا نام عالم شاہ ہے اور میرے ساتھی کا نام سرد ہے۔ ہم بنیادی طور پر گڈس کے رہائشی ہیں لیکن کاروبار کی وجہ سے یہاں شہر میں زیادہ وقت گزارتا ہے۔“ سوال کرتے وقت وہ عالم شاہ کی طرف متوجہ تھا اس لیے جواب دینے کی ذمہ داری بھی اسی نے نبھائی۔ ویسے بھی یہ عجیب بات تھی کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ اتنا سارا وقت گزار چکے تھے لیکن ابھی تک باقاعدہ ایک دوسرے سے متعارف نہیں ہو سکے تھے۔

”میں نقیب لاشاری ہوں۔“ اس نے بھی اپنا نام بتایا۔

”میں نے اخبارات اور رسائل میں کبھی کبھی اس نام کے ایک شاعر کا کلام پڑھا ہے۔“ سرد کو اس کا نام سن کر یاد آیا۔

”وہ نقیب لاشاری میں ہی ہوں۔ والد کی وفات کے بعد مویشی بنگلے میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس بنگلے کے بوجہ عید تعلیم حاصل نہیں کر سکا۔ شادی کی طرف درنی میلان اس کے موقع ملنے لگی۔ کبھی کبھی گھنٹہ گزرتا تو وہ لکھ کر قلم کاغذ اور سائل میں بیٹھتا تھا جو خوش قسمتی سے شائع بھی ہو جاتی تھیں۔ دل میں ایک خواہش ہی تھی کہ کبھی زندگی میں موقع ملا تو اپنی شاعری پر مشتمل ایک کتاب چھپواؤں گا لیکن اب تو لگتا ہے کہ کتاب زندگی کا ہی آخری باب پڑھا جا رہا ہے۔“ اس کی اداس آنکھیں اپنے پٹیوں میں جھڑے ہاتھوں پر جا کر جم گئیں۔ ایک شاعر، ایک قلم کار سے وہ اٹھیاں ہی چھین لی گئی تھیں جن سے وہ قلم تھا کرتا ہے۔

اس سے بڑا بھلا کیا ظلم ہو سکتا تھا۔ عالم شاہ اور سرد دونوں اپنی اپنی جگہ چپ بیٹھے رہ گئے۔ نقیب لاشاری بھی سرد کے سہارے سے اپنی پہلے والی جگہ پر لیٹ گیا۔ خاموشی اور بیکاری میں وقت کی رفتار بہت سست ہو گئی تھی لیکن بہر حال وقت گزر رہا تھا اور اس گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ نقیب کے بخار اور تکلیف کی شدت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ سرد نے دوبارہ بھی کئی بار آوازیں دے کر دیکھ لیا تھا لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات رہا تھا اور کسی نے اس کی پکار پر کان نہیں دھرے تھے۔ وہ ماتھے اور ہتھیلیوں پر پانی سے تر پٹیاں رکھ رکھ کر نقیب کا بخار کم کرنے کی اپنی ہی کوشش کر رہے تھے لیکن بغیر دوا کے یہ تدبیر بھی بے کار ہی تھی۔ اس کا بخار اس کے

مایوسی تو گناہ ہے

صرف بے اولاد

گھرانے متوجہ ہوں۔

انسان کو کسی بھی صورت رب تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے کیونکہ مایوسی تو گناہ ہے۔ اکثر گھرانوں میں صرف اولاد نہ ہونے کی وجہ سے اداسی، پریشانی، ہر وقت کے گھریلو جھگڑے اور پھر علیحدگی تک بات پہنچ جاتی ہے۔ آپ مایوس نہ ہوں انشاء اللہ آپ کے آئینے میں بھی خوشیوں کے پھول مل سکتے ہیں ہم نے کتنی عورتوں کو دیکھا کہ بے اولاد ہونے کی وجہ سے ایک ایسا خاص قسم کا بے اولادی کورس تیار کیا ہے کہ جس کے استعمال سے انشاء اللہ آپ کے ہاں بھی ایک صحت مند خوبصورت بیٹا پیدا ہو سکتا ہے۔ آپ آج ہی فون کریں اپنی تمام علامات سے آگاہ کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک دی پی پی VP بے اولادی کورس منگوالیں۔

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)

ضلع حافظ آباد پاکستان

0300-6526061

0301-6690383

10 بجے سے رات 8 بجے تک

دلوں میں ہو جانے والے انکیشن کا شائبہ تھا اور حقیقتاً اسے باقاعدہ علاج کی ضرورت تھی۔ نقیب کے ساتھ ساتھ وہ دونوں اپنی ذات کے لیے بھی نگر مند تھے۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا ان کی جسمانی ضروریات نے بھی سرانجام شروع کر دیا تھا۔ بھوک اور پیاس کو اگرچہ وہ ابھی زیادہ خاطر میں نہیں لارہے تھے لیکن دیگر فطری حوائج بھی تو تھے جن پر ایک حد سے زیادہ قابو نہیں رکھا جاسکتا تھا لیکن دوسری طرف اس غیظ و کد کو استعمال کرنے کا تصور بھی محال تھا۔ یہ فکریں بھی ہمارے سر پر دروازے کے شکر چوکھٹے سے منہ لگا کر پکارنے پر مجبور کر رہی تھیں لیکن پیاس سے خشک حلق میں خراشیں پڑنے کے سوا کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہو رہا تھا۔

☆☆☆

”یہ سب کیا ہے وکٹر؟“ میڈم ایکس کے چہرے پر برہمی کے تاثرات تھے اور وہ یوں وکٹر کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے سارا قصور اسی کا ہو۔

”میں آپ کے سوال کا مقصد نہیں سمجھا میڈم اردو میں ہاتھ کی موت پر مجھے بھی انوس ہے لیکن اگر آپ یہ سمجھتی ہیں کہ جو کچھ عوام میں میری کہانی شامل ہے تو کتنی اہم سوچوں میں اسے تسلیم نہیں کر سکتا۔ پھر اکام معاذ کی محنت سناؤ اور معاذ نے اپنے جیسے کام پوری خوبی سے کیا اس میں خیر و خیر و محسوس کرتے ہیں۔ معنی شہزاد کی گواہی معاذ کو ہر طرح سے گھیر کر ظاہر کرتی ہے اور اصل معاذ صرف یہ ہے کہ روشن ماحول نے جو کچھ کیا وہ کیوں کیا؟“ وکٹر کا انداز بڑا ماننے والا تھا۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو پروفیسر۔ جو کچھ ہوا اس میں بظاہر معاذ کا کوئی ہاتھ نظر نہیں آتا، اس کے ساتھ مشن میں شامل دونوں افراد نے تسلیم کیا ہے کہ ہاتھ کو انہوں نے گولیاں ماری تھیں اور معاذ نے انہیں روکنے کی کوشش کی تھی لیکن پتا نہیں کیوں میری چھٹی حس مجھے معاذ کی طرف سے مطمئن نہیں ہونے دیتی۔ میں جانتی ہوں وہ غیر معمولی ہے اور کچھ بھی ایسا کر سکتا ہے جسے ہم پکڑ نہ سکیں۔ تم اس نکتے پر غور کرو کہ ہم نے اس سے دو کام لیے۔ دونوں کاموں میں اس کی کارکردگی میں کوئی جھول نظر نہیں آتا لیکن دونوں ہی میں ہمیں اپنے مقاصد حاصل نہیں ہو سکے۔“ وکٹر کے جواب نے اسے مطمئن نہیں کیا اور وہ دلیل سے اپنے ٹھک کو درست ثابت کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

”یہ کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں ہے میڈم! پہلے بھی کئی بار ایسا ہوا ہے کہ ہم اپنی سولہ کارکردگی کے باوجود

مقررہ اجلاس کا نہیں کر سکتے۔ بعض اوقات اتفاقات بے داغ منسوبہ بندی کو تباہ کر دیتے ہیں۔ معاذ کے معاملے میں بھی مجھے ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔ موجودہ واقعے میں مانتھر کی حرکت کو ہم اس تناظر میں بھی دیکھ سکتے ہیں کہ وہ طویل عرصے سے قید میں رہ رہا تھا۔ میرے خیال سے ایک قیدی جو محسوس ہو اس سے زیادہ کسی پر سختی نہیں برتی جاتی۔ انتہائی تشدد انسان کا ذہنی توازن بھی پلٹ دیتا ہے۔ ایک دوسرا امکان یہ بھی ہے کہ قید کے دوران مانتھر کی پرین واشنگ کی گئی ہو جس کے نتیجے میں اس کے لیے دوست دشمن اور دشمن دوست بن گئے ہوں۔ "معاذ کی کارکردگی پر شک و کفر کی کارکردگی میں سقم نکالنے کے برابر تھا اس لیے وہ مسلسل معاذ کو درست ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن میں اپنی چمچی حس کے دیے گئے سنسز کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتی اس لیے چاہتی ہوں کہ تم معاذ پر مزید کام کرو اور اس کے ذہن کو زیادہ سے زیادہ اپنے کنٹرول میں لے لو۔ اس کا دماغ اپنے کنٹرول میں مکمل طور پر لینے کے بعد ہی ہم اس سے اپنے مطلوبہ مقصد حاصل کر سکتے ہیں۔" وہ فیصلے سے اتفاق کر لیے۔

جسٹس اس خوب صورت آکھوں میں تھک اور تشویش کے ساتھ لہر رہے تھے۔

"اوکے میڈم، میں جا چکا ہوں کہ اس کے لیے اس کے مزید کیا اقدامات کیے جاسکتے ہیں۔ کیا اب مجھے اجازت ہے؟" پروفیسر کو اپنے علم اور مہارت پر ناز تھا اس لیے میڈم کی تشویش اسے تکلیف دے رہی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ اب یہ بحث ختم کر دی جائے۔

"اوکے۔ یوے گوناڈ۔" میڈم نے اس کے مزید رکنے پر اصرار نہیں کیا لیکن خود ہنوز سوچ میں ڈوبی رہی۔ سوچنے کے ساتھ ساتھ وہ ہاتھ میں موجود جام سے سنہری مخلول بھی اپنے حلق میں اندیشی جاری تھی۔ سنہری سی عورت کے حلق سے نیچے اترنے والا وہ سنہرا مخلول بھی معاذ کا معما حل کرنے میں اس کی معاونت نہیں کر رہا تھا۔

☆☆☆

نیکل شاہ نے آئینے میں نظر آتے اپنے عکس کو دیکھا۔ اس کے سامنے ایک ایسی لڑکی کھڑی تھی جس کی عمر ابھی پورے اکیس برس بھی نہیں ہوئی تھی اور اتنی سی عمر میں وہ ایک بیٹے کی ماں بننے کے ساتھ ساتھ بیوی کی سفید چادر بھی اوڑھ بیٹھی تھی۔ یہ گویا کل ہی کی تو بات تھی کہ وہ پور پور سچا کر معتمد شاہ کی بیوی کی حیثیت سے اس حویلی میں لائی گئی تھی۔

یہاں اس کے ناز اٹھائے گئے تھے۔ معتمد نے ایک اچھے شوہر کی طرح اس کا پورا خیال رکھنے کی کوشش کی تھی اور اب جب کہ وہ ماں بننے کا اعزاز حاصل کر کے خود کو مکمل تصور کر لینے کی منزل پر پہنچ چکی تھی، اس کی ہستی کو اتنا بڑا دھچکا لگ گیا تھا کہ وہ خود بھی کبھی کبھی اپنے آپ کو قابل رحم محسوس کرنے لگتی تھی۔ وہ فطرتاً نہایت بردبار، معاملہ فہم اور متین لڑکی تھی لیکن اکیس سال سے بھی کم عمر میں بیوہ ہو جانا اتنی معمولی بات ہے نہیں ہوتی کہ اندر کوئی دراز ہی نہ پڑے۔ وہ بھی ٹوٹی تھی لیکن اپنے پیاروں اور خصوصاً اس نئی جان کے لیے خود کو سنبھال لیا تھا جو دنیا میں آنکھ کھولنے سے کل ہی باپ کے سائے سے محروم ہو چکا تھا۔ اپنے چھوٹے سے بیٹے میں اس کی جان تھی اور ملازماؤں کے ہوتے ہوئے بھی وہ خود اسے سنبھالنے کو ترجیح دیتی تھی۔ اب بھی اس نے بڑے جتن کر کے اسے نہلانے اور فیڈ کروانے کے بعد سلا کر کات میں لٹایا تھا اور یونہی بے خیالی میں آئینے کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔ آئینہ اسے خود ترسی میں جکڑا کر لگا تو اس نے خود کو ٹوکا اور اس کے سامنے سے ہٹ کر باہر سے گزرتی ایک

لڑکی کو دیکھا۔

"بھائی نامی وہ لڑکی تو بڑی خدمت میں سر ہو گئی۔"

"دیکھو وہ تو بڑی عورت ہے۔ لے چلائے شاہ کے پاس بیٹھ جاؤ۔ ظہر کی نماز کا وقت ہونے والا ہے۔ اسے نہلانے کے چکر میں میرے کپڑوں پر بیٹھنے آگئے ہیں اس لیے میں غسل کرنا چاہتی ہوں۔" اس نے ملازمہ کو بلانے کا مقصد بتایا۔

"آپ نے چھوٹے شاہ صاحب کو خود کیوں نہلایا سائو۔ مجھے علم دیتیں اس خدمت کے لیے۔" بھائی نے اپنی نمک خورانی کا اظہار کیا۔

"کوئی مسئلہ نہیں ہے بھائی! مجھے معلوم ہے کہ تم سمیت یہاں سب بہت خدمت گزار ہیں لیکن مجھے اپنے بچے کے چھوٹے چھوٹے کام کر کے سکون ملا ہے۔" نیکل نے مسکرا کر اسے جواب دیا۔

"اللہ لمبی زندگی دے ہمارے چھوٹے شاہ جی کو اور اس کے دم سے سائیں قربان شاہ کا خاندان خوب پھولے پھلے۔ ہم تو سلوں سے اس خاندان کے نمک خوار ہیں۔ آج اس حویلی میں دکھ اور ماتم کی فضا دیکھتے ہیں تو کیجا کھنچنے لگتا ہے۔" بچے کو دعا دیتے دیتے بھائی نے اپنے جذبات کا بھی اظہار کیا۔

بر دل عزیز

سپنس ڈائجسٹ

کچھ لوگ دنیا میں بڑے کام کرنے کے لیے ہی آتے ہیں۔ محترم
مہراج رسول صاحب بھی ان ہی لوگوں میں سے ایک تھے۔ ڈائجسٹ
کی دنیا میں ان کا نام بھی فراموش نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی ان کے
ہاتھوں تلے اس چودے کو جو آج ایک ستارہ درخش بن چکا ہے اور دنیا
میں ڈائجسٹ کی تاریخ لکھتے ہوئے ماہنامہ سسٹمز کو بھی فخر اعزاز
کرنے کی جرات نہ کی جاسکے گی۔ نصف صدی قبل جاری ہونے والے
ماہنامہ سسٹمز نے چند سو ہزار بالا کہ نہیں بلکہ کئی لاکھوں کے دلوں پر
عکراتی کی ہے۔ ہمیں بھی ڈائجسٹ پڑھنے کا شوق اپنے والدین سے
منقل ہوا اور سسٹمز کے اسلوب نے ہمیں اس طرح جکڑا کہ آج
الیکٹرانک میڈیا کی پلغار میں بھی اس کا ساتھ نہیں چھوٹ سکا۔ ابتدائی
صفحات پر موجود تاریخی کہانیوں سے لے کر مختصر تراجم و طبع زاد اور آخری
صفحات کی خصوصی کہانیوں تک اس رسالے کی ہر تحریر شاندار اور شاہکار
رہی۔ میں ان خوش نصیبوں میں سے ایک ہوں جنہوں نے اپنے
پسندیدہ ڈائجسٹ کے قاری سے لکھاری بننے تک کا سفر طے کیا اور اپنی
پہچان ملنے سے سفر میں اسلوب کے طرف سے دیا گیا گمان اور
قادرانہ تحریف نے جس لمحہ ذرا ستا ہے اور کچھ گھبراہٹ کی
گھبراہٹ ہوئی لیکن وہ اس سے کہیں زیادہ ہے کہ اس نے اپنی کمال
ہے کہ وہ مجھ کو کچھ نہ لکھوا ہی ہے۔ جس طرح اسلوب اور زبان
لکھنے کے چھوڑے ہوئے ان سادہ اور سادہ لکھنے کی روشنی میں
اور کرتی رہی ہیں۔ جاسوسی کے طویل سلسلے کے ادب سے لے کر سسٹمز
کے شیش ٹیبل اور ادب شہ زور تک میں اپنے مدبران کے تعاون کی فکر
تیار ہوں۔ ممکن ہے کہ ہماری تحریریں اپنے پیش روؤں جیسے سٹارٹ
نہ ہوں لیکن کیا یہ ممکن کہ ہم نے اس دور میں جس قارئین کی ایک بڑی
تعداد کو ڈائجسٹ سے باندھا ہوا ہے اور ہمارا پیارا سسٹمز آج بھی
اپنے پڑے وقار سے شائع ہو رہا ہے۔ گولڈن جوبلی نمبر کے اعلان کے
بعد سے قارئین کی طرف سے جس جوش و خروش اور اشتیاق کے
مظاہرے دیکھنے کو ملے وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ سسٹمز آج بھی
قارئین کے دلوں پر عکراتی کرتا ہے اور اس نے پوری شان سے اپنی
انفرادیت کو برقرار رکھا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ مہراج صاحب کے ہاتھوں
جاری ہونے والے اس خوبصورت رسالے کو جو اپنے منفرد اسلوب،
اخلاقی اقدار اور معاشرتی تقاضوں کے ساتھ ساتھ دیگر بے شمار
خصوصیات کی بنا پر قارئین کے دلوں پر راج کرتا ہے، محترمہ ہندو رسول
صاحبہ کے زیر سایہ دن دوئی رات چوٹی ترقی دے کہ جس سے ڈائجسٹ
ہی ہیں جو آج بھی ایک عام قاری کی طبیعت یاں بھانسنے کے ساتھ ساتھ
اخلاقی کردار کی تعمیر میں اپنا بہترین حصہ ڈال رہے ہیں۔

آخر میں محترمہ ہندو رسول صاحب، سسٹمز، مدبران، مصنفین
اور جاریہ قارئین کو سسٹمز کی گولڈن جوبلی کی دلی مبارکباد۔

۱۲۱ قاری

”جو نصیب میں لکھا تھا وہ ہو گیا۔ اب رب سامعیں ہی
سب کو میرے گا۔ بس اب تم باتیں بند کرو اور تھوڑی دیر
کے لیے یہاں بیٹھ جاؤ۔“ بھاگی کے پاتوئی پن سے واقف
نکلنے سے اسے زیادہ باتیں کرنے کا موقع نہ دینے کے لیے
تھکنا نہ انداز اختیار کیا تو بھاگی نے جھٹ اپنی زبان بند کر لی۔
اس کی موجودگی کے باعث بچے کی طرف سے مشکین شکل نے
کاٹ کی طرف ایک نظر ڈالی اور غسل خانے میں کھسکی۔
اسے معلوم تھا کہ نہانے اور پیٹ بھر کر سونے کی وجہ سے بچے
طویل وقت تک نہیں جاگے گا اس لیے خوب اطمینان سے
غسل کیا۔ غسل کے بعد وہ تالے سے بال خشک کرتے
ہوئے کمرے میں واپس آئی تو بھاگی اپنی جگہ پر موجود تھی۔
”آپ کے بال بہت خوب صورت ہیں ساکھو۔“

بھاگی نے بے ساختہ ہی اس کے بالوں کی تعریف کی تو وہ
اداسی سے مسکرا دی۔ معتم شاہ بھی اس کے بالوں کی تعریف
کرتا تھا بلکہ ہر وہ شخص جو اس کے بال دیکھتا تھا، تعریف
کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ وہ خود بھی اپنے بالوں کی خوب
صورتی سے واقف تھی لیکن کبھی انہیں نمایاں کرنے کی کوشش
نہیں کی تھی۔ سلا اس کی فحاشی ہوتی تھی کہ انہیں سبھا کر
کئے بغیر وقت سر ہاتھ رکھنے کی ادا کی وجہ سے
اس کو کمرے میں کامیاب بھی رہتی تھی اس لیے کم ہی کسی کو
کے بال لکھ کر ان پر ہر کرنے کا کوشش ملتا تھا۔

”تم ابھی کچھ دیر اور بیٹھیں بیٹھی رہو بھاگی! میں نماز
بھی ادا کر لوں تو پھر چلی جاتا۔“ بال سکھانے اور پھر انہیں
سنوارنے میں وقت لگتا اس لیے سبیل نے یہ کام نماز کے بعد
موقوف کر کے بھاگی کو کچھ دیر مزید وہاں بیٹھے رہنے کا حکم دیا
اور خود نماز کے لیے چادر لپیٹنے لگی۔ خشوع و خضوع سے نماز
ادا کرنے کے بعد وہ قاری ہوئی تو بھاگی کی جان چھوٹی۔
بھاگی کے جانے کے بعد وہ ایک نظر بچے کو دیکھنے کے خیال
سے اس کی کاٹ کی طرف بڑھی۔ یہ دیکھ کر اسے تھوڑا سا
غصہ آیا کہ بچہ سر تک چادر میں ڈھکا ہوا سو رہا تھا حالانکہ اس
نے سانس کی آمد و رفت کو تسلی بخش رکھنے کے لیے اس کا چہرہ
کھلا رکھا تھا۔ بھاگی کو اس غیر ضروری کارکردگی پر تنبیہ
کرنے کا سوچتے ہوئے اس نے پہلے کاٹ پر فکس ٹیٹ ایک
طرف سے ہٹائی پھر بچے کے چہرے سے چادر ہٹانے کی
کوشش کی لیکن وہاں بچے کا چہرہ تھا ہی کہاں۔ وہاں تو بس سر
کے نیچے رکھنے والا ایک کول تکیہ رکھا ہوا تھا۔ اس نے بے
تابی سے پوری چادر ہی سمجھ لی۔ چادر کے نیچے سرے سے
بچے کا وجود ہی نہیں تھا۔ ہمیشہ ویسی آواز میں بات کرنے

والی بردبار مل شاہ کی چیخوں نے قربان شاہ کی حویلی کے دروازے پر گونج کر رکھ دیا۔ لہجوں میں بات پوری حویلی میں پھیلی گئی۔ خاندان کا اکلوتا وارث دن دہاڑے حویلی کے ایک محفوظ کمرے سے غائب ہو گیا تھا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ بھاگی کی شامت سب سے پہلے آئی۔

”اللہ سائیں کی قسم، میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں تو چھوٹے شاہ سائیں کے قریب بھی نہیں گئی اور سائیں جہاں بٹھا کر کئی تھیں، وہیں بیٹھی رہی۔“ بھاگی خاندانی ملازمہ تھی اور اس کا خاندان نسلوں سے حویلی سے اپنی وفاداری بھار رہا تھا۔ اس پر شک کرنا آسان نہیں تھا لیکن یہاں درپیش مسئلہ بھی معمولی نہ تھا۔ قربان شاہ کا اکلوتا پوتا، معظم شاہ کی آخری نشانی اور بکل شاہ کے دل کا قرار چب چاتے غائب کر دیا گیا تھا۔ اس سانحے پر جتنی آنت چٹتی کلم تھی۔ زیرِ عتاب بھاگی کو بھی اپنی کوتاہی کا اعتراف کرنا پڑا۔

”میں چوہے پر ہانڈی رکھ کر آئی تھی۔ سائیں کے کمرے میں بیٹھے مجھے خیال آیا کہ ہانڈی جل نہ جائے۔ میں ہانڈی دیکھنے کے لیے بس پانچ دس منٹ کے لیے باہر گئی تھی اور پھر واپس آئی تھی۔“ بھاگی کا بیان سنا سنا چلا جھوٹا لگتا تھا۔ کافی الحاح وقت نہیں تھا۔ اسے ایک کٹھنری میں بنا کر رکھ دیا اور دوڑے زراہوں کے معاملے کی حقیقت جاننے کی راہیں کھولیں۔ اس نے آگے بڑھ کر کہا، ”ساری پوچھتاچھ ہو گئی اور جو اہم بات سانسے آئی وہ یہ تھی کہ ہفتے بھر سے ملازمہ سکھی سے ملنے کے لیے اس کے پاس آکر ٹھہری ہوئی اس کی خالہ زاد بہن کریمہ اس دوران اپنے ساز و سامان سمیت اچانک ہی رخصت ہو گئی تھی۔ کریمہ کے بارے میں خاص بات یہ تھی کہ وہ لطیف سومرو کے گاؤں کی رہنے والی تھی۔ عام حالات میں یہ اتنی خاص بات نہیں تھی۔ حویلی کے ملازموں سمیت گاؤں کے بیشتر گھرانوں کے رشتے دار اس پاس کے گاؤں دیہاتوں میں رہتے تھے اور ان کا ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ سکھی کا شمار ان ملازماؤں میں ہوتا تھا جو دن رات حویلی میں رہتی تھیں اور جن کی رہائش کے لیے ہتھیواڑے چھوٹے چھوٹے کوارٹرز بنے ہوئے تھے۔ ایسے ملازمین کے رشتے داروں کا ملاقات کے لیے حویلی آنا ایک معمول تھا۔ کریمہ کی آمد کو بھی ایک معمول سمجھا گیا کہ وہ اس سے پہلے بھی کئی بار آچکی تھی۔ سکھی کے علاوہ دیگر ملازماؤں سے بھی اس کی گاڑی چھینٹی تھی اور ساری حویلی میں بے تکلفی سے گھومنے پھرنے پر بھی کسی نے توجہ نہیں لگائی تھی۔“

صاف پتا چل رہا تھا کہ اس نے اسی آزادی کا فائدہ اٹھایا تھا۔ چھوٹے سے بچے کو سامان میں چھپا کر لے جانا مشکل بھی نہیں تھا۔ وہ حویلی سے اچھوٹا نئے والے کے ہاتھ میں گئی تھی۔ اس کی تلاش میں بندے دوڑے تو اچھوٹے گاؤں کی ہی ایک سواری کولتے ہوئے راستے میں مل گیا۔

اس سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ کریمہ اس کے ساتھ اپنے گاؤں تک نہیں گئی تھی اور راستے میں ہی اتر گئی تھی جہاں سے وہ ایک موٹر کار میں بیٹھی تھی۔ موٹر کار کس کی تھی؟ یہ اچھوٹے نہیں بتا سکا تھا، نہ وہ ڈرائیور اور اس کے ساتھ بیٹھے بندے کو جانتا تھا۔ اس بات پر اسے خود بھی حیرت تھی۔ جیسے وہ لوگ اس پاس کے دیہاتوں کے رہائشیوں کو جانتے تھے، ویسے ہی انہیں ان دیہاتوں کے بڑے زمینداروں کی گاڑیوں اور کارندوں سے بھی واقفیت تھی۔ کریمہ کو یوں ایک گاڑی میں بیٹھ کر جاتا دیکھ کر وہ کھٹکا بھی تھا لیکن دخل اندازی کی ہمت اس لیے نہیں کر سکا تھا کہ وہ لوگ مسلح تھے۔ اس کا ارادہ تھا کہ یہ بات گاؤں کے کسی اہم آدمی کو بتائے گا لیکن پھر اسے سواری مل گئی۔ اس سواری کو بس اڑے تک چھوڑ کر وہ واپس اپنے گھر کو لوٹ گیا۔

آج صبح اس نے قربان شاہ کے ملازمین کے سامنے اسے روک لیا اور سواری چھوڑ کر گئی۔ اس نے اس کے گھر تک پہنچے لیکن وہاں دروازے پر بڑا سا کالا بھول رہا تھا۔ اس پر دس والوں سے پوچھنے پر پتا چلا کہ کریمہ تو ہفتے بھر سے ہی اپنے شوہر اور بچوں سمیت غائب ہے۔ کسی شک کی گنجائش نہیں رہی کہ بچہ کریمہ نے ہی افواہ کیا ہے اور یہ سب ایک طے شدہ منصوبے کے تحت ہوا ہے۔ ہفتے بھر سے حویلی میں ٹھہری وہ بچے کی تاک میں تھی۔ جیسے ہی اسے موقع ملا وہ بچے کے غائب ہوئی۔ اس نے یہ سب کس کے حکم پر کیا تھا؟ اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کے لیے کسی کو سوچ بچار کی ضرورت نہیں تھی لیکن براہِ راست لطیف سومرو کی حویلی پہنچ کر اس سے بچے کا مطالبہ بھی نہیں جاسکتا تھا۔

تھانے تک بات پہنچی۔ صداقت شاہ کو فون کیا گیا اور عالم شاہ سے رابطے کی کوششیں کی جاتی رہیں۔ صداقت شاہ تو فوراً پہنچ گئے لیکن عالم شاہ کی کوئی خبر نہیں تھی۔ اس کا ذاتی سواہل نمبر بند جا رہا تھا اور کوشی پر ملازمین نے اس کی غیر موجودگی کی اطلاع دی تھی۔ یہ اطلاع سارا دن ملتی رہی۔ بے حد پریشان قربان شاہ اور صداقت شاہ خود ہی دوڑ دھوپ کرتے رہے۔ تھانے میں پرچہ کھواتے ہوئے قربان شاہ نے پہلے



پھول پھول کا رس مرحبا شہر میں گیا پس



[/Marhabalaboratoriespk](https://www.marhaba.com.pk) | www.marhaba.com.pk | UAN. 111-152-152

ہی: لطف سومرو پر شک نہ کر دیا تھا۔ لطف سومرو اس وقت ایم پی اے تھا اس لیے تھانے دار اس کے خلاف قدم اٹھاتے ہوئے ننگی پھاٹ محسوس کر رہا تھا لیکن دوسری طرف قربان شاہ اور صداقت شاہ کا بھی ایک اثر رسوخ تھا جس سے مجبور ہو کر وہ لطف سومرو سے ملاقات کے لیے جا پہنچا۔

”ہاں بھئی تھانے دار! کیسے آنا ہوا؟ سنا ہے جہاں پولیس آئے وہاں سے ہراٹھ جاتی ہے۔ یہاں سے کسی کو پھنسی لگا کر لے جانے کا تو ارادہ نہیں۔“ سلام دعا کا مرحلہ طے ہو جانے کے بعد لطف سومرو نے جیسے لہجے میں دریافت کیا۔

”ایسی تو کوئی بات نہیں سائیں! پولیس تو لوگوں کی حفاظت کے لیے ہوتی ہے اور لوگوں کی خیر سی چاہتی ہے بس کچھ کالی بھیڑوں نے ہمارے منگے کو بدنام کیا ہوا ہے۔“ تھانے دار نے جھینپ کر اسے جواب دیا۔ وہ جانتا تھا کہ صداقت شاہ کے دور میں ان کے ساتھ اچھے تعلقات کے باعث لطف سومرو اس سے خا رکھتا ہے۔

”ہمیں کیا خبر ہمارے لیے کون کالی بھیڑ ثابت ہو سکتا ہے۔“ لطف سومرو نے بظاہر سرسری لہجے میں بولتے ہوئے اس کے چہرے کو تو کالی نظروں سے دیکھا تو تھانے دار کے چہرے پر غمت چھائی ہوئی۔ اسی وقت ایک ملازمہ لوہاٹات سے کٹی ٹرائی دے سکتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

”باتیں تو ہوتی رہیں گی، پہلے کچھ کھانا پینا ہو جائے۔“ لطف سومرو نے اپنا لہجہ یکدم بدل لیا اور نہایت خوش اخلاقی سے بولا۔ اس کے اشارے پر ملازمہ بڑھ چڑھ کر تھانے دار کی خاطر داری کرنے لگی۔

”سائیں کھیل سومرو کی حالت اب کیسی ہے؟ طبیعت میں کچھ بہتری آئی یا نہیں۔ میں نے سنا تھا کہ آپ انہیں علاج کے لیے ملک سے باہر لے جانے والے ہیں۔“ یہ خاطر داری بھی عجیب شے ہے۔ آدمی کے حلق سے تر توالہ یہ نچ اترتے ہی اس کا مزاج بدل جاتا ہے۔ تھانے دار جو پہلے محتاط تھا اب خوش اخلاق اور بے تکلف ہو چلا۔

”حالت تو ابھی ٹھیک نہیں ہے بابا! باہر کے ڈاکٹروں سے بات چیت چل رہی ہے جہاں سے زیادہ امید دلائی گئی وہاں بھیج دیں گے۔“

”کچھ پتا چلا کہ اس حرکت کے پیچھے کس کا ہاتھ تھا؟“ تھانے دار نے ایک چمٹری حلق سے نیچے اتارتے ہوئے دوسرا سوال کیا۔

”ایک دن پتا لگ ہی جائے گا ہمیں بھی اور ان لوگوں کو بھی جو اس حرکت کے پیچھے ہیں۔“ لطف سومرو کے لہجے میں سانس کی سی پینا رچی۔ تھانے دار کا ڈھٹری چباتا منہ ذرا سی دیر کے لیے ساکت ہو گیا۔ وہ جیسے لطف سومرو کی بات کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر اسے ایک سی بات سمجھ آئی کہ دریا میں رہ کر مگر مجھ سے بیر مناسبت نہیں اس لیے چہرے پر خوشامداندہ مسکراہٹ سجائی اور مونچھوں پر لگ جانے والی کریم کو انگلی کی پوروں سے صاف کرتے ہوئے بولا۔

”آپ پہنچ والے لوگ ہیں سائیں! آپ کے لیے اپنے مجرم تک پہنچنا کیا مشکل ہے۔ گردن تو ہم جیسے چند ہزار کی نوکری کرنے والوں کی پھنسی رہتی ہے۔ ہر اختیار والا بندہ ہم کو اپنی لانگھی سے ہانکنا چاہتا ہے۔ اب بھی سائیں صداقت شاہ اور سائیں قربان شاہ کے ہاتھنے پر آپ کی حویلی کی طرف آ تو ٹکلا ہوں پر کچھ نہیں آتا کہ اپنے جھوٹے منہ سے وہ بڑی بات کیسے نکالوں جسے کرنے کے لیے یہاں بھیجا گیا ہوں۔“

”جب آئی گئے ہو تو بات بھی نکال دو۔ مجھے خبر ہے کہ صداقت شاہ اپنے عرصے آخر ار کی کر رہے ہیں۔“ تھانے دار نے اب کچھ سمجھ جاتا تھا۔ وہ بھی اسے سن نہیں سکتا اور پہلے ہی کی طرح حکم چلانے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ تھانے دار موقع دیکھ کر لیکن ڈرتے ڈرتے ہی اپنے مدسے کی طرف آیا تھا لیکن خلاف توقع لطف سومرو کا انداز دوستانہ تھا اس لیے اس کی ہمت بڑھ گئی اور وہ اصل بات زبان پر لے آیا۔

”سائیں قربان شاہ کی حویلی سے آج ان کے پوتے کو اغوا کر لیا گیا ہے۔ اغوا کا الزام حویلی کی ہی ایک ملازمہ سکھ کی خالہ زاد بہن کریمہ پر لگا یا جا رہا ہے۔“ تھانے دار نے بتانا شروع کیا تو پھر ساری تفصیل بتاتا چلا گیا۔ لطف سومرو سنجیدگی سے سن رہا۔ جب بات یہاں تک پہنچی کہ اغوا کار عورت کریمہ کا تعلق لطف سومرو کے گاؤں سے ہے تو سومرو گویا تھانے دار کی آمد کا مقصد سمجھ گیا اور بولا۔

”اس کا مطلب ہے کہ قربان شاہ اور صداقت شاہ سمجھتے ہیں کہ بچے کو میں نے اغوا کر دیا ہے اور اب انہوں نے جہیں منتقلی کے لیے یہاں بھیجا ہے؟“

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نوجوان
کسی دستان جو غلط کاروں کے لیے
غضب ناک تھا باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیں



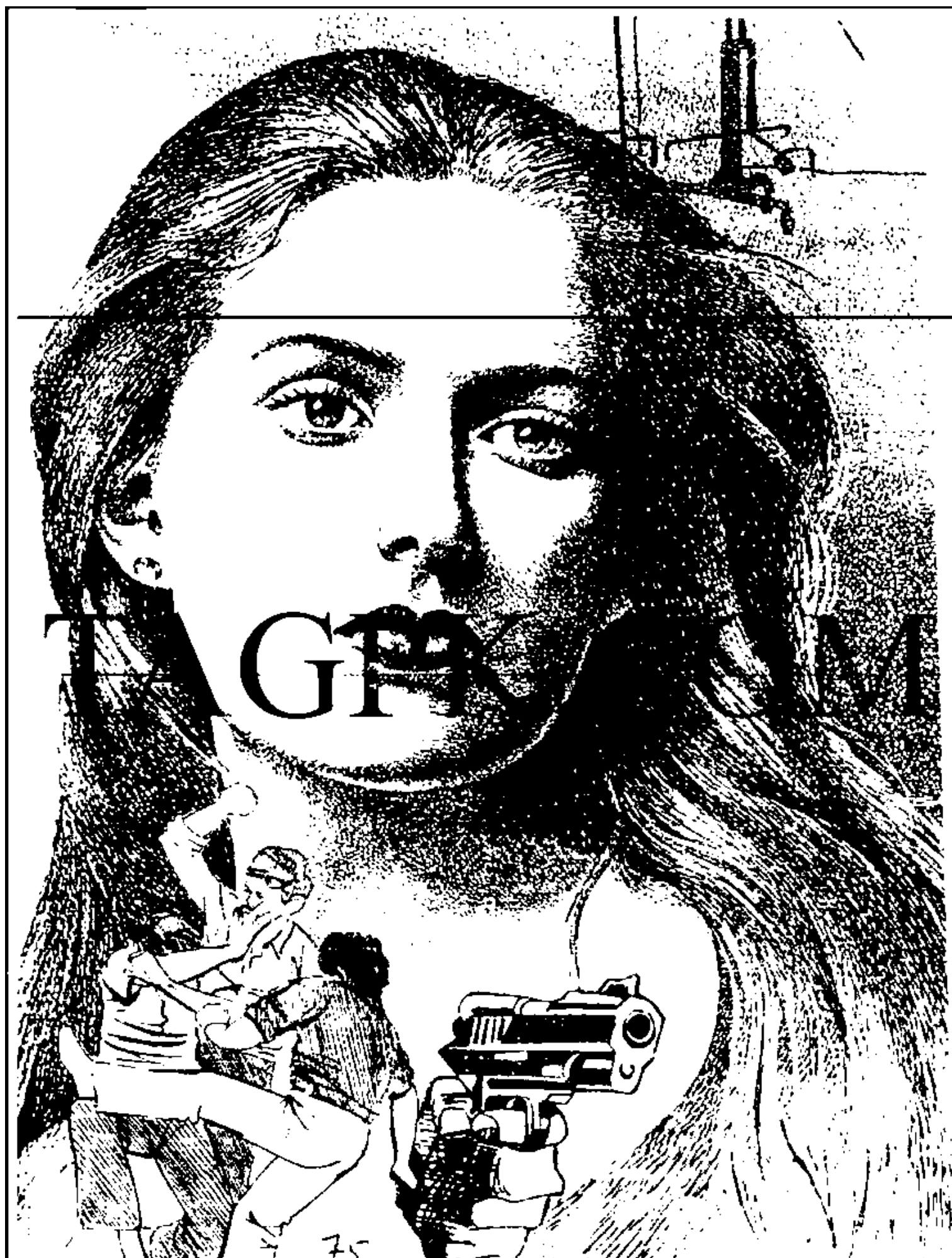
قسط: 12

شہزادہ کا گیت

TAPK.COM

زندگی میں کتنی کتنی باتیں ہوتی ہیں۔ مگر وہ صرف وہی ہیں جو ہمارے دل میں اچھوٹے ہیں۔
 وہ شکر ہے کہ وہ... جہاں انصاف اور ترقی کا رنگ ہے۔ وہ انصاف اور ترقی کا رنگ ہے۔ وہ انصاف اور ترقی کا رنگ ہے۔
 سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں نا انصافیوں کی تندو تیز
 آندھیوں نے اسے محض سر اپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون
 حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابل شکست بنایا تو دوسری
 طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پُر عزم
 نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جا رہے
 تھے... اس کی زندگی جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور
 روشنی سے دور تھی لیکن... یہ خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو
 اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے
 طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک
 تھی... اس کی یہ قرار یوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار
 اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار
 مان لیتا... اگرچہ تار عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چور
 لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا توڑ کرتا حق و باطل کی
 ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ وارداتِ قلب بھی اس کے غرض کی راہ میں
 حائل نہ ہو سکی...

ایسے حریفوں پر تہ بن کر نازل ہونے والے ایک سرایا انتقام نوجوان کی تحیر انگیز داستان



گزشتہ اقساط کا خلاصہ

[illegible]

شہ زور

کہ اس کے بہنوئی کا قتل کس نے کیا۔ وہ قاتل کو گھیرتا ہے اور اپنے تئیں اسے گولیاں مار کر قتل کر دیتا ہے تاہم وہ بچ جاتا ہے۔ عالم شاہ اس کے بعد ڈاکوؤں کے سردار چاچ کو بچاتا ہے اور اسے کیفر کردار تک پہنچاتا ہے تاہم اس کے پیچھے پولیس لگ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور اس کا نوکر سرد باؤل کے اتھے چڑھ جاتے ہیں۔ ادھر معاذ جاسوس ماحر کو پتہ پڑتا ہے کہ اس کے ذریعے اسے نکالنے والوں پر حملہ کروا دیتا ہے تاہم ان کی فائرنگ سے ماحر مارا جاتا ہے اور الزام معاذ پر نہیں آتا مگر معاذ سے کام لینے والوں کو اس پر شک گزرتا ہے۔ ادھر کل شاہ کے نو مولود بیٹے کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اغوا کا الزام لطیف سومر پر آتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

گوشت کے ہیں۔" اس کی نظروں کا زاویہ دیکھ کر خدمت پر کمر بستہ ملازم نے جھٹ پشکش کی۔

"رہنے دے چھو کرمی اور بس دو گھونٹ چائے پلا دے۔" تھانے دار نے دل پر جبر کر کے انکار کر دیا۔ بات اس نکتے پر آگئی تھی کہ صداقت شاہ کو رپورٹ دینی ضروری تھی اور وہ اس کام میں کوتاہی کر کے خود کو مصیبت میں نہیں ڈال سکتا تھا چنانچہ تیزی سے فارغ ہو کر وہاں سے بھاگا۔

"اسے پہلے ہی سے اندازہ ہوگا کہ ہم اس پر شک کریں گے اس لیے اس نے بچے کو یہاں رکھا ہی نہیں ہوگا

اور۔۔۔" اور بھی دیا ہوگا۔" چھو بتا رہا تھا کہ کوئی بچہ لے جا کر قتل کر دیا ہوگا۔ اس نے اپنے لڑکے کو بچانے بچانے میں نہیں تھے۔" بیٹا اس نے باہر سے بندہ اسے کام کیا ہے۔

تھانے دار کی زبانی ساری بات سن کر صداقت شاہ نے ہنسرہ کیا تو قربان شاہ کا رنگ مزید زرد پڑ گیا۔ انکو تے بیٹے کو کھو کر جینے کا ایک سہارا ملا تھا وہ بھی ان سے چھین لیا گیا تھا۔ وہ خود کو سنبھالتے بھی تو کیسے۔

"میرے لیے کیا حکم ہے شاہ سائیں؟" تھانے دار نے یہاں بھی عاجزی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

"تم جاؤ۔ یہ تمہارے بس کا معاملہ نہیں ہے۔" صداقت شاہ نے بیزارگی سے جواب دیا۔

"خیال رکھیے گا سائیں۔ علاقے میں خون خرابا ہوا تو سب سے پہلے میری ہی چینی اترے گی۔" تھانے دار کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ وہ دیکھتا ہوا آیا تھا کہ شاہ خاندان کے کارندے اور کئی سخت غیظ و غضب میں تھے۔ انہوں نے اپنے ہتھیار اپنے ہاتھوں میں تمام رکھے تھے اور سخت طیش کے عالم میں اعلان کرتے پھر رہے تھے کہ اپنے مالکوں کے دل پر ہاتھ ڈالنے والوں کو بھون کر رکھ دیں گے۔ وہ بس ایک اشارے کے منتظر تھے اور تھانے دار اس اشارے کو روکنے کے لیے ہی پیش بندی کر رہا تھا۔

"میری کیا مجال ہے سائیں کہ میں آپ سے تفتیش کروں پر ان لوگوں نے رپٹ لکھواتے ہوئے صاف آپ پر شک ظاہر کیا ہے تو ضابطے کی کارروائی کے لیے مجبوراً مجھے ادھر آنا پڑا۔" تھانے دار کے لہجے کی عاجزی مزید بڑھ گئی۔ "قربان شاہ اور صداقت شاہ جیسے مجھے ہوئے لوگوں سے ایسی ہلکی بات کی امید نہیں تھی۔ کوئی ان سے پوچھے بابا کہ میں کیا کوئی خراکار کیس چلاتا ہوں یا دعویٰ میں شیخوں کے ساتھ اونٹوں کی ریس لگاتا ہوں جو مجھے بچے اغوا کرنے کی ضرورت پڑے۔" لطیف سومر کا لہجہ استہزاء سے تھا۔

"آپ بڑے شک ہیں سائیں۔ آپ کے آپس میں کیا اسکاقت ہے اور اس نے کیوں آپ پر شک ظاہر کیا ہے۔" آپس میں کچھ دیکھ کر میں تو بس اپنی نوکری سمجھاؤں گے لیے یہاں آیا ہوں۔" تھانے دار نے باقاعدہ اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

"ٹھیک ہے تم کرو اپنی نوکری۔ مجھے اس پر بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ اگر سرچ وارنٹ ساتھ لائے ہو تو تلاشی بھی لے ڈالو کہ پورا اطمینان ہو جائے۔" لطیف سومر سے اس حد تک تعاون کی تھانے دار کو قطعی امید نہیں تھی اس لیے حیرت سے اس کا منہ کھل گیا پھر خود کو سنبھال کر انکساری سے بولا۔

"میری اتنی اوقات کہاں ہے سائیں کہ میں آپ کی حویلی کی تلاشی لینے کا سوچوں۔ میں آپ کے تعاون کی خبر اوپر پہنچا دیتا ہوں پھر وہاں سے جو فیصلہ ہو میں اس پر عمل کرنے کا پابند ہوں گا۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔ میں اب کچھ دیر آرام کروں گا۔ تم یہاں بیٹھ کر آرام سے کھاؤ پیو اور جس سے چاہے بات کرو۔ میری طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی۔" لطیف سومر نے دوستانہ لہجے میں کہا اور وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ تھانے دار نے اس کے جانے کے بعد ایک نظر شرابی پر ڈالی۔ وہ اب بھی خاصی بھری ہوئی تھی۔

رہنا ضروری نہیں تھا لیکن وہ لالہ کا حکم بھی نہیں ٹال سکتا تھا۔ لالہ کی محبتوں اور مہربانیوں کا قرض اتنا بھاری تھا کہ اس کی حکم عدولی کا تصور بھی محال تھا۔ لالہ نے اسے ایسے وقت میں سہارا دیا تھا جب وہ بھری دنیا میں تنہا رہ گیا تھا۔ ایسے شخص کے کسی حکم کو ماننے سے وہ انکار کرتا بھی تو کیسے؟ ہاں اتنا تھا کہ وہ یہاں رہ کر پاکستان میں موجود اپنے ساتھیوں کو سہارا کی تلاش کے سلسلے میں ہدایات دیتا رہتا تھا لیکن ابھی تک کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا۔ اسے شک تھا کہ اس کے ساتھی پوری سرگرمی نہیں دکھا رہے ہیں لیکن اس شک کی بنیاد پر وہ کسی سے حساب کتاب نہیں لیتا تھا۔ اصل میں اسے صرف موسیٰ (معر) پر بھروسہ تھا اور وہ زخمی ہو کر بستر پر پڑا ہوا تھا۔ ان حالات میں اس کے پاس کرنے کے لیے یہی کام رہ گیا تھا کہ لالہ جیسی کے احکامات کی تعمیل کرے اور اسی فرض کو نبھاتے ہوئے وہ آج کل پاکستان سے آئے عرفان اللہ کے بیٹے سلطان کی میزبانی انجام دے رہا تھا۔

”بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔ مرنے والوں کے ساتھ کوئی نہیں مر سکتا۔ بس کامی سے لپٹن کی دوستی تھی اور ہمیشہ ساتھ رہے۔“

”ساتھ رہے تھے۔ اب لے لے۔ اسے مس کر ہوں۔“

”چاہو تو تم بھی اونٹ کی سواری کا لطف لے سکتے ہو۔“

”وکی نے اس کی توجہ کا مرکز دیکھ کر اسے چھیڑا۔

”نہیں یار! ابھی تو تھکن ہو رہی ہے۔ توڑا ریلکس کرتے ہیں۔“ وہ مزید پھیل کر بیٹھ گیا اور کولڈ ڈرنک اور قبوے کے ساتھ پیش کی جانے والی کجوروں اور عربی مٹھائیوں سے لطف اندوز ہونے لگا۔ وکی نے بھی قبوے کی ایک پیالی اٹھائی اور دوسروں کو لطف اندوز ہوتا دیکھنے لگا۔

تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد وہ دونوں بھی میدان میں اتر آئے۔ اونٹوں کی سواری سے زیادہ انہیں ریت پر اسکیٹنگ کا مشغلہ دلچسپ لگا چنانچہ اس سے لطف اندوز ہونے لگے۔ دیر تک یہ شغل جاری رہا پھر سیاہوں نے مل کر گائے اور قےس کرنے کا شغل شروع کر دیا۔ خیموں کے اندر اور باہر مشعلیں روشن کر دی گئیں پھر ہر طرف کھانے کی خوشبو پھیل گئی۔ باربی کیونے کھانے کا لطف دوہلا کر دیا۔ اس تفریحی نور کا نقطہ عروج اس وقت آیا جب ان دونوں سمیت

ریت میں بھی بڑی مشاقی سے بڑھاتا چلا جا رہا تھا۔ جگہ جگہ آنے والے ریت کے اونچے نیچے گاڑی کی عمدگی اور اس کی مہارت کے سہارے تیزی سے سر ہوتے چلے جا رہے تھے۔ آخر کار وہ اپنی منزل پر پہنچ گئے اور ایک بڑے سے خیمے کے سامنے گاڑی رکھنے پر اس سے باہر نکلے۔ ان کے پیچھے آنے والی گاڑی کے مسافر بھی اترنے لگے۔ دو تین گاڑیاں ان سے پہلے بھی وہاں موجود تھیں اور مختلف ملکوں کے سیاح وہاں نظر آ رہے تھے۔

”ڈیڈی نے مجھے شاک سے نکالنے کے لیے یہاں بھیجا ہے لیکن میں یہاں آ کر کامی کو بہت مس کر رہا ہوں۔ ہم دونوں کئی بار ایک ساتھ دعائیے لیکن ابھی ڈیزرٹ سفاری کا سوچا ہی نہیں۔ آئی ایم شیور کہ اگر کامی میرے ساتھ ہوتا تو وہ بھی اس سفر کو بہت انجوائے کرتا۔“ یہ سانولی رنگت والا لڑکا سلطان تھا جس کے لیے بال اس مخصوص رومال میں چھپے ہوئے تھے جو صحرائیں سفر کرنے والوں کو ریت اور گرمی سے محفوظ رہنے کے لیے لازمی پہننا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر افراد نے بھی یہ رومال باندھ رکھا تھا جبکہ مشرق و مغرب دونوں طرف سے آنے والے مسافروں کے سروں پر چھتری اور آٹھوں پر سن گھاسڑ تھے۔ لباس کی ان کوئی قید نہیں تھی اور جینز، ٹی شرٹ اور لکڑی سمیت سب نے ہر طرح کے لباس پہن رکھے تھے۔

”زندگی اسی چیز کا نام ہے دوست! کہیں کوئی بچھڑ جاتا ہے اور کہیں کوئی مل جاتا ہے۔ کسی کے ملنے اور بچھڑنے سے بس ذرا سی پہچل مچلتی ہے لیکن زندگی اپنی رفتار سے آگے بڑھتی رہتی ہے۔ جو زندگی کی اس رفتار کا ساتھ دیتا ہے وہ بہت کچھ پالیتا ہے۔“ سلطان کو یہ نصیحت کرنے والا وقاص عرف وکی تھا جو کبھی ماضی سے اپنا دامن نہیں چھڑا پایا تھا۔ ماضی بعید و قریب کی وہ ساری صورتیں اس کے دل پر نقش تھیں جن سے اسے محبت تھی اور جن کے لیے ہمیشہ اس نے کچھ کرنا چاہا تھا۔ ان صورتوں میں اس کی ماں اور بہن بھی شامل تھیں جن کی حسرت ناک اموات کا بوجھ اب بھی وہ لاوے پھرتا تھا اور ان صورتوں میں ایک صورت معاذ کی بہن علیہ کی بھی تھی جس سے اس نے پہلی نظر میں محبت کی تھی اور اس ایک نظر کی محبت کی خاطر اس کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا۔ وہ ایک نظر کی محبت ہی اسے معاذ کے لیے بھی کچھ کرنے پر اکساتی تھی لیکن اسے پورا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔ لالہ جیسی نے بالکل اچانک اسے دعائیہ بھیج دیا تھا۔ اس کے

چپک کر رہا تھا جب اس نے بہت دیر سے بند اپنی آنکھیں
 کھولیں اور خیف سی آواز میں بولا۔

”ضرور بتا دو دوست! اس قید خانے میں ایسے بھی ہم
 باتیں کرنے کے سوا اور کچھ کر بھی نہیں سکتے ہیں۔“ عالم شاہ
 نے پھٹی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی بات کا جواب دیا۔
 بار بار آواز میں دینے کے باوجود کوئی ان کا حال دریافت
 کرنے نیچے نہیں آیا تھا اور ہرگز رتے ٹپ کے ساتھ ان کا
 ذہنی تذبذب تھا۔ جب اس نے غیب شادی کی جڑنی طبعیت اس
 تباہی مزید اضافہ کر رہی تھی۔ ایک انسان ان کے سامنے
 شدید تکلیف اور اذیت میں مبتلا لمحہ پہنچے موت سے قریب
 ہوتا جا رہا تھا اور وہ اس کے لیے کچھ نہیں کر پار رہے تھے۔ یہ
 احساس بہت اذیت ناک تھا۔

”میں نہیں کر سکتا لیکن آپ لوگ اب بھی بہت کچھ
 کر سکتے ہیں۔“ غیب کی آواز مزوری کی وجہ سے مزید دھیمی
 ہو گئی تھی یاد اور اذاری کے خیال سے آہستہ بول رہا تھا۔ عالم
 شاہ سمجھ نہیں سکا اور قدرے حیرت سے بولا۔

”بہر حال کیا کر سکتے ہیں۔ ہر کوئی قسمی کردار تو ہیں
 میں نے یہاں سے مارا تو مارنے کی دیکھ لیا۔“
 وہ سب سے پہلے اس کی بات پر غور کیا۔ اس نے کہا کہ
 وہ سخت اعصاب زدہ ہو رہا ہے۔ کھل کر باتھو جو چاہے گا
 موقع ملے تو میں سے دو دوست بد رہنا پڑتا تو اس کے لیے کوئی
 مسئلہ نہیں تھا لیکن اس تاریک اور بد دور قید خانے کی قید نے
 واقعی اس کے اعصاب کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔
 ”فلکی بیرو اپنے بغیر بھی آپ تھوڑی سی کوشش کر کے
 یہاں سے نکل سکتے ہیں۔“ اس کی بات پر مسکرا کر ان کی کوشش
 میں غیب نے ہونٹ ذرا مساج کر رکھے لیکن وہ اپنی بات
 پر قائم رہا۔

”بہر تھوڑی سی کوشش کر کے نکل سکتے ہیں تو مرنے خود
 تھوڑی سی کوشش کیوں نہیں کی؟“ عالم شاہ تھوڑا سا چوڑا ہوا۔
 ”میں تھوڑی نہیں، بہت ساری کوشش کر چکا ہوں
 لیکن قسمت کی قسم طرغی کیسے کہ جب کامیابی ہے حد قریب
 تھی تو قوت عمل چھین لی تھی۔“ اس کی خام و آنکھیں غریب
 میں جھڑے اپنے زخمی ہاتھوں پر جھانکیں۔

”کیا مطلب؟“ عالم شاہ چونکا اور قریب ہی بیٹھ ہوا
 سر بھی متوجہ ہوا۔

قالینوں پر گامیں نکلیں کے سہارے بٹھانے کا انتظام کرنے
 کے بعد ایک رقامہ کو ان کے سامنے پیش کیا گیا۔ رقامہ نے
 سیاہ رنگ کا مہین چھ رانہاں پہن رکھا تھا جس میں سے اس
 کا حسن چھڈکا پڑتا تھا۔ سر پر رکھے دوپٹے سے بھانکتے اس
 کے سنہری بال سونے کے تاروں کی طرح چمک رہے تھے۔
 اس نے چہرے کے نصف حصے پر باریک جالی کا سیاہ نقاب
 لگا رکھا تھا۔ نقاب میں سے بھٹکتے اس کے سر پر ایسے ہونٹ
 کا طرین کے دلوں کو کھینچ رہے تھے۔ دو مخالف پہچت بھی
 نہیں اور سامنے آتے بھی نہیں کی عملی تفسیر تھی۔ اس کی ہر
 جنبش دیکھنے والوں کے ہوش ازاری تھی ورنہ ایک اور
 مہینے کے جذب کو ہمیز کر رہی تھی۔ اس نے ماتھے اور گلے
 میں سونے کے سکوں سے مشبذ زیور سجھا رکھا تھا۔ یہ زیور اس
 کی ہر حرکت کے ساتھ جنبش کرتا تھا اور دیکھنے والوں کی
 دھوکھیں رکھنے لگتی تھیں۔ کتنے ہی مرد و زن نے خود ہو کر اس کا
 ساتھ دینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ کھٹے والوں میں
 سلطان بھی شامل تھا اور اس بات پر نازاں تھا کہ رقامہ باقی
 افراد کے مقابلے میں اسے زیادہ الفت سے نوازی رہی
 ہے۔

جسے جہاں شکل و صورت کے بندے پر لیں اتنی باتیں ہر
 نگہ کر رہی ہے۔ سلطان رقامہ کی اس عنایت پر خوش تھا لیکن
 اسے پوچھا جنھن ہی محسوس ہو رہی تھی۔ میں جنھن کو دور کرنے
 کے لیے وہ رقامہ کی ایک ایک جنبش و غور سے دیکھنے لگا۔
 اس کی شکل و صورت اس کے لیے اجنبی تھی لیکن شکل و صورت
 سے زیادہ حرکت و انداز پر غور کرتا تو اس عرف و نیک
 عجیب سی شائستگی سے آگاہ ہوا۔ رقامہ اس وقت اپنے گھٹ
 کر رہی تھی۔ رقص کا یہ انداز بے شک جداگانہ تھا لیکن کچھ
 چیزیں انسان کی فطرت کا حصہ ہوتی ہیں جن کی بسا اوقات
 اسے خود بھی خبر نہیں ہوتی۔ جیسے رقص کرتی رقامہ کو بھی خبر نہیں
 تھی کہ وہ اس وقت اپنے ہاتھوں کو بالکل ہی انداز میں
 حرکت دے رہی ہے جیسے ڈسکو ڈانس کر رہی ہے۔
 یہ یکسانیت گرفت میں آتے ہی وہی بری طرح چونک گیا اور
 اسے لگا کہ وہ کسی حد تک یہ سمجھنے میں کامیاب ہو چکا ہے کہ
 رقامہ سلطان پر اپنی ”مہربان“ کیوں ہو رہی ہے؟

☆☆☆

”میں آپ لوگوں کو ایسا بات بتانا چاہتا ہوں۔“

میں مسلسل دیوار میں نقب لگانے کی کوشش کرتا رہا۔ میں کافی کام کر چکا تھا اور امید تھی کہ دو تین دن میں کامیاب ہو جاؤں گا لیکن اس سے پہلے ہی عالم کے ظلم کا شکار ہو گیا۔ اب میرا تو یہاں سے نکلنا مشکل ہے لیکن آپ لوگ چاہیں تو تھوڑے سے حوصلے سے کام لے کر یہاں سے نکل سکتے ہیں۔" نقیب کا وہ انکشاف معمولی نہیں تھا۔ عالم شاہ اور سرد بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ باذل کے سامنے کی عنایت کر وہ تاریق لان کے پاس موجود تھی۔ وہ اس بد بودار ہاتھ روم تک پہنچے اور تاریق کی روشنی میں اچھی طرح ہاتھ روم کا جائزہ لیا۔ پہلی بار عالم شاہ یہاں آیا تھا تو اس نے ہاتھ روم کے ایک کونے میں پڑا مٹی کا چھوٹا سا ڈھیر ضرور دیکھا تھا لیکن گندگی اور بد بو نے اسے وہاں اتنی دیر ٹھہرنے نہیں دیا تھا کہ اچھی طرح جائزہ لے سکتا۔ اب دل پر جبر کیے غور سے جائزہ لیا تو دیوار پر کھودے جانے کے نشان بھی نظر آ گئے اور مٹی کے ڈھیر کے ساتھ رکھی چینی، پانا اور چھوٹا سا کتر بھی دکھائی دینے لگا۔

"یہ تو بڑا زبردست کام کر رکھا ہے نقیب نے۔ بس تمہاری شہادت ہو گئی تو یہ انہیں کفایت نہیں ملے گی۔ اس کے بعد یہ سب سبھی لائن کی شکاف بنانے کا کام ہو جائے گا۔" سرد بے اس سے کہے گا جائزہ لے رہا تھا جوش سے بولا۔

"ہاں یار! بڑا دل گردہ ہے اس بندے کا جو اس نے اس جگہ یہ مشکل کام کر دکھایا۔" عالم شاہ اپنی ابکائی روکتے ہوئے بولا۔

"آپ جائیں! یہ کام میں نہ سنا ہوں۔" سرد کی جاں نثاری فوراً عود کر آئی اور اسے گوارا نہیں ہوا کہ تازوں پلا مالک اس گندی جگہ مزید کھڑا رہے۔ عالم شاہ کے لیے بھی یہ ایک دشوار عمل تھا اس لیے وہ خاموشی سے واپس پلٹ گیا اور اندھیرے میں اندازے سے نقیب کے قریب جا بیٹھا۔

"تم نے واقعی بڑا کام کیا ہے دوست! افسوس کہ تم اپنا کام پایہ تکمیل تک نہیں پہنچا سکے لیکن فکر نہیں کرو، میرا سامنے تمہارا دھورا کام مکمل کر رہا ہے۔ جیسے ہی یہ کام مکمل ہو جاتا ہے، ہم تمہیں لے کر یہاں سے نکل جائیں گے۔ تمہارا کسی اپنے سے اسپتال میں علاج ہوگا اور تم اپنی بہن کو خود اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر رخصت کر دے گے۔" اندھیرے میں اسے نقیب کا چہرہ تو نظر نہیں آ رہا تھا لیکن اپنے طور پر اس کے دل میں ایک آس اور امید جگانے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس پروجیکٹ میں کام کر رہا ہوں، وہ بھی پلمٹنگ سے متعلق، اس لیے مجھے یہاں کے متعلق کچھ خاص باتیں معلوم ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ یہاں سیوریج کے لیے جو بڑی بڑی لائنیں ڈالی جا رہی ہیں وہ کہاں کہاں سے گزر رہی ہیں اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ان لائنوں میں سے ایک لائن ایسی بھی ہے جو پتھر سیوریج کی لائن ہے لیکن اس کا کسی ندی نالے وغیرہ سے کنکشن نہیں کیا گیا ہے اور میرے اندازے کے مطابق یہ لوگ اسے سرنگ کے طور پر استعمال کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ کیوں اور کس مقصد کے لیے، یہ مجھے نہیں معلوم۔"

نقیب لاشاری اپنی نحیف آواز میں بولتا جا رہا تھا اور وہ دونوں حیرت سے اس کے کیے گئے انکشافات سن رہے تھے۔ بولتے بولتے وہ نڈھال ہو کر خاموش ہوا تو بے تابی سی ہونے لگی لیکن اس بات کا احساس تھا کہ نقیب کی حالت نازک ہے اور اس حالت میں وہ جتنی بات کر رہا تھا، وہ بھی معمولی بات نہیں تھی۔ سرد نے اس کا نڈھال ہونا محسوس کیا تو پانی کی بوتل اٹھا کر اس کے منہ سے لگا دی۔ بوتل میں چند گھونٹ ہی پانی باقی بچا تھا اور وہ بھی اس صورت میں کہ ان میں سے کسی ایک کو ایک گھونٹ بھی نہیں چاہتا تھا۔ ایک اور پانی کے گلاس لایا، دھیرے سے اسے احساس ہوا کہ اس پانی کی اور سے زیادہ اس شخص کو زبردست ہے جس کی حالت کو یہ لے کر ہوتی جا رہی ہے، پیاس محسوس ہونے کے باوجود انہیں پانی پینے سے روکے ہوئے تھا۔ اس قید خانے میں وہ اس شخص کے لیے اس کے سوا کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے کہ چند گھونٹ پانی کی قربانی دے دیں چنانچہ وہ ایسا ہی کر رہے تھے۔

"بس۔" یہ مشکل ایک گھونٹ پانی حلق سے نیچے اترتا ہوگا کہ نقیب نے سرد کو مزید پانی پلانے سے روک دیا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ جیسے جیسے وقت گزر رہا ہے، نقیب کے لیے کھانا پینا دشوار ہوتا جا رہا ہے۔ انہوں نے تاشتے کے لیے ملنے والے تینوں رسک اس کے لیے رکھ چھوڑے تھے لیکن ان میں سے بھی ابھی ڈیڑھ رسک باقی بچا ہوا تھا۔

"تم کیا بتا رہے تھے؟" نقیب پانی پی کر بھی کچھ دیر نڈھال لیٹا رہا تو عالم شاہ کی بے تابی نے اسے سوال کرنے پر مجبور کر دیا۔

"میں آپ کو یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ ہاتھ روم کی دیوار اس سرنگ کے ساتھ ہی ہے۔ میں جب یہاں پہنچا تو میری جیبوں میں میرے کام کے دو چار اوزار پڑے ہوئے تھے۔ کپڑوں سے محروم کیے جانے سے پہلے میں نے

کاماتھنکا۔

”کیا بات ہے دوست! کیا سوچتے؟“ اس نے قدرے بے چینی سے سوال کیا اور ٹھوڑا سا اس پر ہنکا۔ جواب اب بھی نہیں ملا لیکن اس نے محسوس کیا کہ نتیجہ فی شخص ہموار نہیں ہے۔

”سہمہ سہمہ“ مارچ لے کر جلدی سے یہاں آگیا۔ وہ ہاتھ روم کی طرف جانے والے ٹکڑے پر کھڑا ہو کر سہمہ کو پکارنے لگا۔ سہمہ نے قریب کی طرف چلنا اور اس کے قریب بیٹھ کر اس کے سینے پر ہاتھ رکھا۔ اسی وقت اس کی پشت پر سے قریب کے چہرے پر روشنی پڑی۔ سہمہ اس کی پکار پر مارچ سمیت وہاں آگیا تھا۔ مہانت والی مارچ کی روشنی میں بھی انہیں قریب کے چہرے پر کھینچی زردی صاف نظر آ رہی تھی۔ اس کا منہ پورا کھلا ہوا تھا اور وہ بڑی جدوجہد سے کھینچ کھینچ کر اس سے رہا تھا۔

کسی کو باغیہ سرحدہ انڈیا سے فوری ملشی امداد کی ضرورت ہے۔ گاندھی صاحبہ نے پچھلی پچھلی آواز میں بولا تو سرحدہ ہند کی قبل و محبت کے ورور کے لئے جو تھے سے مزید گاندھی صاحبہ نے

نہ انہیں پڑھیں لیکن سچا اپنی احوال کے سن پات تھا۔
موجودہ سردار عالم شاہ کے پاس وہی پٹ گیا۔ وہ مضبوط
سناٹھی نقیب کا سینہ مل رہا تھا تو یہی ہاتھ پاؤں لیکن نقیب کی
حالت سے ظاہر تھا کہ زندگی بہت دیر سے دور ہوئی تھی
جاری ہے۔ سردار بھی عالم شاہ کی طرح اس کے قریب بیٹھ کر
اس کی ذہنی سانسوں کو بحال کرنے کے لیے اپنی کوشش
کرتا رہا۔ ایسی کوشش جس کا انجام بالکل واضح تھا۔ آخر وہی
ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ نقیب نے اپنے جسم کی آخری سانس
اور مات ہوئی۔ اس کے ساتھ ہونے کو محسوس کر کے
عالم شاہ نے اپنے دونوں ہاتھ پیچھے بنا لیے جبکہ سردار
دھیرے دھیرے اس کے ہاتھ چر سیدھے کرنے لگا۔ دیوار
کے ساتھ کھڑی کر کے رکھی گئی تاریخ کی روشنی اس کے زندگی
سے جاری چہرے پر ترچھے زاویے سے پڑ رہی تھی اور اس
روشنی میں دیکھ جاسکتا تھا کہ وہ زندگی کی قید سے آزاد ہو کر
پُر سکون ہو گیا ہے۔ بے پروا تھا بھی تو بہت تکلیف میں اور
عالم شاہ کو ایسا لگ رہا تھا کہ نقیب کی تکلیف اس کے سینے میں
منتقل ہو گئی ہے۔ کیا تصور تھا اس نوجوان کا جو اپنے گھر اور شہر پر

کی بیوہ ماں اور چھوٹی بہن تک رہی تھیں، جو اپنے حالات کا شکوہ کرنے کے بجائے فرصت کے چند پہلوں پر محبت کی مچھلی چھوٹی اٹھیں اور غزلیں سمیت تھیں۔ ایک اتنا بے ضرر انسان صرف اس وجہ سے درگیا تھا کہ فی اپنی بھڑی بولی انقیاس کی تکمیل کے لیے انہوں پر تشدد کا شوق رکھتا تھا اور اپنے اس شوق کی تکمیل کی راہ میں اسے کسی رکاوٹ کا سامنا نہیں تھا۔ یہ تیز دلی در عرفان اللہ جیسے لوگوں کا ہاتھ نہ تھکتا تھا۔

☆☆☆

”کیا خوب کہا ہے کسی نے، جیسا ویس دیا
بھیس۔ آپ کو حجاز میں عربی رقاصہ سٹی کے روپ میں
دیکھنا اچھا لگا؟“ وہ ابھی تک اسی طبعے میں غصہ چہرے و
سمجھان سے عجب کے پیچھے چھپائے بیٹھی تھی جس طبعے میں اس
نے آتے ٹور قلعے دیکھا تھا۔ وہ اپنے رقص سے مکمل میں آنک
لگا کر رخصت ہوئی تھی تو وقاس نے چلا سے مطمئن میں
سے یہ نواس بات پر راضی کر لی تھی کہ ”ووس سٹی سے پاس
ن کے دروازے دوست سلطان کی طرف سے ملاقات کا
دست نام ہے۔“ سلطان ہی نے کرائی میں اسے لے کر ان کے مکان
پر لایا تھا۔ سلطان نے اسے مل جلنے اور چاہنے سے اس کا نام
اس حال میں تھا کہ اسے ایک قبول کرنے سے پہلے یہ جواب دیا
کہ ”روز بروز میری فحش بے بسیوں رہا جاؤ گئے وہ یوں
میں جس چیز کی ہوتی اسے دیکھ رہی تھی جیسے اس کی بات سمجھنے
سے قاصر تھی۔“

”اوپر جو کہ نہیں بچھیں بدلے کے ساتھ ساتھ آپ نے زبان تو نہیں جس کی اور اب چاقو تیار ہے۔ میں آپ سے حرفی میں بات کریں لیکن معاف کیجیے گا کہ میں عربی میں گفتگو کرنے کی قطعی اہلیت نہیں رکھتا۔“ اس نے سٹی کے انداز و طرز پر کمرے پہلے سے زیادہ سخت طنز یہ انداز اختیار کیا جس کا صرف اتنا اثر ہوا کہ وہ پہلے ہی کی طرح آنکھیں پٹی پٹاتی ہوئی انگریزی میں ہوئی۔

آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں آپ کی بات سمجھ نہیں پاری۔ براۓ مہربانی انگریزی زبان کا استعمال کریں۔

وہ تو پھر آپ اردو نہیں جانتیں، پھر تو آپ اس بات سے بھی انکار کر دیں گی کہ آپ پاکستان میں پیدا ہوئیں، وہیں اپنی بڑھیں اور اب سے کچھ عرصہ پہلے تک وہیں موجود تھیں۔ وقاص اس کی طرف سے انگریزی بولنے کے مطالبے پر سخت جزیب ہوا تاہم اس بار اس نے

گزار خواہی کی لپیٹ میں آئی۔ "بولتے بولتے وہ اچھا خاصا جھپٹا ہوا گیا۔ حیرت انگیز طور پر اس بار اس کی طرف سے بھی فوری طور پر تردید نہیں ہوئی اور وہ اپنی جگہ بیٹھی یک دم اسے دیکھتی رہی۔

"مجھے آپ کو پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں ہوئی ہے۔ آپ چاہیں تو اب بھی سچ ماننے سے انکار کر دیں لیکن اس بات کا یقین کر لیں کہ میرا شمار دشمنوں میں نہیں، دوستوں میں ہوتا ہے۔ میں بھی معاذ احمد کے ساتھ اتنا ہی قلمبند ہوں جتنی کہ آپ۔"

"تمہارا معاذ سے کیا تعلق ہے؟" اس نے دھیرے سے پوچھا۔

"تعلق بہت عجیب ہے۔ شاید آپ سمجھ نہ پا سکیں۔"

"وہ میرا استاد ہے، تم صرف میرے سوال کا جواب دو۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"کیا آپ پہلی نظر کی محبت کی قائل ہیں؟"

"میں محبت کی قائل ہوں اور جانتی ہوں کہ یہ انسان کی زندگی میں کسی بھی دروازے سے داخل ہوسکتی ہے۔ اس کا نہ تو کوئی خاص طریقہ ہے اور نہ ہی اصول کسی خاص ہوئی اور اس طرح نہیں۔" اس نے سادگی سے جواب دیا۔

"میرا آپ سے کیا تعلق ہے؟"

"میرا معاذ بھائی کے ساتھ ہمدردی کی پہلی وجہ ان کی بہن

ملینہ ہے۔ میں نے اس کو ایک بار دیکھا اور میرا دل اس طرح اس کا اسیر ہو گیا کہ اب میری ساری خوشیاں اور غم اس سے وابستہ ہو چکے ہیں اور میں اسے خوش، بہت خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔" وہ بات جو وہ بھی اپنے مربی لال بیہنی کے سامنے نہیں کہہ سکا تھا، اپنے عزیز دوستوں موی اور نیو کے سامنے نہیں کہی تھی، ایک دم ہی اس اجنبی لڑکی سے کہہ گیا جس سے آج اس کی دوسری ملاقات تھی، وہ بھی اتفاقاً۔

"یہ تو ہوئی پہلی وجہ معاذ کے ساتھ ہمدردی کی۔

دوسری وجہ کیا ہے؟" وقاص کو لگا کہ وہ ہمیں نقاب کے پیچھے بہم ماسٹر لائی ہو۔

"دوسری وجہ ان کا سچا اور حق پر ہونا ہے۔ انہوں نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا تھا لیکن اپنی طاقت اور اختیار کا دھم رکھنے والوں نے ان سے ہیر بانہ دھل۔ میں اس جنگ میں معاذ بھائی کا ساتھ دینا چاہتا تھا لیکن انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی سعد کی محبت میں مجھے بتائے بغیر ہی خود کو بھیڑیوں کے زمرے میں پھنسا لیا اور اب کچھ خبر نہیں ہے کہ وہ

"آپ مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہیں اور اس طرح کی گفتگو کیوں کر رہے ہیں؟ میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔ مجھ سے خیبر نے کہا تھا کہ دو پاکستانی افراد آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں تو میں نے اجازت دے دی تھی لیکن ایک تو آپ ایسے ہیں، دوسرے جب سے ناقابل فہم گفتگو کیے جا رہے ہیں۔ ایسے میں شاید مجھے اس ملاقات کو ختم کرنے کا اعلان کرنا پڑے گا۔" اس بار اس نے سخت لہجہ اختیار کیا جس کا وقاص نے اثر نہیں لیا اور سابقہ ٹون میں بولا۔

"میرا خیال ہے کہ آپ نے میرے بجائے میرے ساتھی سلطان کا نام نہ کر ہمیں ملاقات کی اجازت دی تھی اور اب سلطان کو میرے ساتھ نہ پا کر مایوس ہوئی ہیں تو میں آپ کو بتا دوں کہ وہ گھاسڑ سلطان ٹاک تک بھر کر پینے کے بعد "ٹن" پڑا ہوا ہے ورنہ آپ سے ملنے کے لیے سر کے تل چڑا آتا۔"

"آپ مجھ سے کیوں ملنے آئے ہیں؟" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر سرد لہجہ میں پوچھنے لگی۔

"آپ کے فن کی داد دینے آیا ہوں۔ چھو عرصہ قبل

آپ نے بارہلی کے روپ میں جوڈو سکواڈ انس کیا تھا، آج پہلی

کے کیمپ میں میرے سے کئی روز پہلے پر فارم میں دیکھا ہے۔

اس نے دیکھا ہو گیا ہوگا آپ کا۔" وہ گھاسڑ کی تعریف کے

سے کہنے لگی۔

"وہ بارہلی میں کبھی دیکھا گیا ہے؟"

لہجہ مزید سخت ہو گیا۔

"آپ ج نہیں نہ جانیں، میں جانتا ہوں اور آپ کو

بھی بتا سکتا ہوں کہ میں نے سب سے پہلی کے اندر بارہلی کوڈ موڈ

نکا۔" اس نے اس کے سب کے سب کی سختی کو خاطر میں نہ لاتے

ہوئے مزے سے کہا اور پھر بتانے لگا کہ کس بنیاد پر اس نے

اسے بطور بارہلی شناخت کیا۔

"یہ صرف اتفاق ہے۔" اس نے وقاص کی بات

سے اختلاف کیا۔

"میں مان لیتا ہوں لیکن کیا یہ بھی اتفاق ہے کہ

میں بارہلی کو اپنے سیکڑوں فینز میں سے صرف کامران

یزدانی اس حد تک بھایا تھا کہ وہ اسے وقت دینے اور اس

کے ساتھ سفر کرنے کے لیے راضی ہوئی تھی اور اب میں سبلی

کامران کے دوست سلطان پر بھری محفل میں فریفتہ نظر آئی

اور یہ بھی بڑا عجیب اتفاق ہے کہ کامران اور سلطان اس

معاذ احمد کے دشمنوں کی فہرست میں نہایت نمایاں ہیں جو

گھزار عاصم کی بیٹی بشری گھزار کا یونیورسٹی فینو اور اچھا دوست

تھا۔ اتنا اچھا دوست کہ اس سے دوستی نہاتے نہاتے بشری

کہ وہ کسی خاص مقصد کے تحت قبر کی تصویریں کھینچ رہا تھا۔ وہ مقصد جاننے کے لیے ہی میں اس تک پہنچنا چاہتا تھا لیکن اس روز ہوٹل میں حالات کچھ ایسے ہو گئے کہ مجھے کامیابی نہیں مل سکی۔ اس کے بعد میرے پاس لالہ بیٹی نے مجھے موقع نہیں دیا اور..... دعویٰ بھجوا کر یہاں کے معاملات میں الجھا دیا۔ اگر میں پاکستان میں ہوتا تو شاید معاذ بھائی کی تلاش میں کوئی نہ کوئی پیش رفت ہو سکتی تھی۔“ اس کی خاموشی کی پروا کیے بغیر وقاص اپنی بولتا جاری رکھا۔

”میرے گارڈز میں مشکوک شخص..... کون ہو سکتا ہے وہ شخص؟“ وقاص کی ساری باتوں میں سے اس کے ذہن نے اس ایک نکتے کو پکڑا اور وہ خود سے الجھنے لگی۔

”جب آپ کو ڈانٹک طور سے آپ کے کمرے میں واپس لے جایا جا رہا تھا تو جن گارڈز نے آپ کو گھیرے میں لے رکھا تھا ان میں ایک سختی نوازمی اور لمبے بالوں والا گارڈ بھی شامل تھا۔ میں اس کی بات کر رہا ہوں۔“

”وہ گارڈز تو ہوٹل انتظامیہ کی طرف سے تھے۔“ اس نے بتایا۔

”وہ بندہ میرے ہاتھ لگا رہا تھا تو شاید اس کی کہیں ہیرا لہو تو سنا نہ نکل جائے۔“ اس نے میرے سینے والی بات کی۔ آپ نے اسے کہا کہ آپ اس کے پاس لڑ رہی ہیں؟

”جیسے ڈر ہے کہ آپ کا مران لے بعد سلطان پر نظر رکھے ہوئے ہیں لیکن یہ بڑا رکی کام ہے۔ آپ ان انتقامی کارروائیوں کے نتیجے میں پھنس بھی سکتی ہیں۔ ویسے بھی ان جو نگروں سے انتقام لینے کا کیا فائدہ؟ میرے خیال میں تو آپ کو اصل مجرموں تک رسائی حاصل کرنا چاہیے۔“ وہ اتنی خطرناک باتیں اتنی آسانی سے کر جاتا تھا کہ وہ اپنی جگہ سن بیٹھی رہ جاتی تھی۔ کامی کی سوت جو طبی قرار دی گئی، اس نے کتنے مزے سے اس کے کھاتے میں ڈال دی تھی اور اب سلطان کے حوالے سے اپنے شک کا اظہار کر رہا تھا۔

”ایسے بھی نئے بلوگڑے نہیں ہیں یہ دونوں دوست۔ میرے ساتھ سب سے پہلے تو ان دونوں ہی نے بدتمیزی کرنے کی کوشش کی تھی۔ اگر معاذ عین وقت پر اتفاقاً وہاں نہ آ جاتا تو تمہارے ان جو نگروں نے آفت ڈھا دی تھی۔ بعد میں بھی ان دونوں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ سارا کھیل کھیلا ہی ان کی خاطر گیا تھا۔ دوسرے مسئلے تو بعد میں سامنے آئے اس لیے میرے حساب سے تو یہ قطعی قابلِ معافی نہیں ہیں۔“ اس کی آنکھوں میں نفرت اتر آئی۔

کہاں اور کس حال میں ہیں؟“

”تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ تم کیرتھر پر معاذ کے غائب ہونے کے بعد اس سے ملے ہو؟“ وقاص کے جملوں نے اسے چونکایا اور وہ خود کو بے تابانہ سوال کرنے سے نہ روک سکی۔

”میں ان سے واقف ہی اس واقعے کے بعد ہوا ہوں۔ علیہ کو میں نے پہلی بار ان کی گمشدگی کے حوالے سے کیے جانے والے ایک احتجاج میں ہی دیکھا تھا۔“ اس نے بتایا۔

”تم کب اور کہاں ملے تھے اس سے؟“ اس کی بے تاب مزید بڑھ گئی۔ جواب میں وقاص نے کاشانیہ آزادی میں ہونے والی معاذ سے پہلی ملاقات سے لے کر اسے عراق انتہی قید سے چھڑا کر اپنے پاس رکھنے اور پھر سعد کی خاطر چپکے سے چھوڑ جانے کی پوری داستان سنا دی۔ وہ سانس روکے اس طرح یہ داستان سنتی رہی کہ اس کی آنکھوں سے آنسو روانی سے بہہ رہے تھے لیکن اسے جیسے ہوش ہی نہیں تھا۔

معاذ زندہ ہے، اس سے بڑھ کر دنیا میں جیسے کوئی خوشخبری ہو سکتی۔

”میں نے ان کے ساتھ جو معلومات حاصل کی تھیں ان کے مطابق انہیں آخری بار یزدانی کے گھر میں دیکھا گیا تھا لیکن وہاں سے اسے وہ کہاں اور کن لوگوں کی پہچانی میں چلے گئے، مجھے کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ اب اس نے پاکستان میں کچھ لوگوں کو ان کے متعلق سن گئی۔ یہ کی ڈیوٹی سوچ رہی ہے لیکن کوئی خاص نتیجہ نہیں نکال رہا ہے۔“

وہ نہیں جانتی تھی کہ وقاص سے اسے اس قدر کام کی باتیں معلوم ہو سکیں گی۔ اس نوجوان لڑکے کو تو وہ مکمل طور پر نظر انداز کرنے کا فیصلہ کیے بیٹھی تھی لیکن وہ مل مل اسے چونکا رہا تھا۔ اس کی ذہانت کا سب سے بڑا ثبوت تو یہ تھا کہ اس نے اس کے چلے میں اتنی مکمل تبدیلی کے باوجود اسے اس کی چند حرکات و سکنات سے شناخت کر لیا تھا اور اپنے دعوے پر اتنی مضبوطی سے قائم رہا تھا کہ اسے اس کے یقین کے سامنے خاموش اقرار کرنا پڑا تھا۔

”آپ کو یاد ہوگا کہ میں پہلی بار آپ کے کمرے میں پناہ لینے کے چکر میں آپ سے ٹکرایا تھا۔ اس روز اصل میں، میں ایک ایسے شخص کے پیچھے تھا جسے میں نے آپ کے گارڈز میں دیکھا تھا۔ وہ شخص مجھے معاذ بھائی کی والدہ کی تدفین کے بعد قبرستان میں نظر آیا تھا۔ وہ قبر کی تصویریں لے رہا تھا۔“

و حانپ رچا تھا اور صرف اس کی بڑی بڑی خوب صورت
تکھیں ہی تھیں جو دیکھی جاسکتی تھیں۔ وہ ان آنکھوں کو مناجی
کڑ حانی دار چادر کے پیچھے سے جھانکنا دیکھتا تھا تو ان میں
قوس قزح کے رنگ بکھرے نظر آتے تھے لیکن آج وہ
تکھیں سفید آچل کے حصار میں ویران سی نظر آ رہی تھیں۔

اس ویرانی میں ایک اس کی اداسی تھی جو اس کے اپنے دل کو
بھی حیرے میں لے رہی تھی اور وہ اس سے پوچھنا چاہتا تھا
کہ تم نے اپنے خوب صورت رنگین آچل کے بجائے اس
سفید آچل کو کیوں پہنے کر و پیٹ رہا ہے بیان الفاظ تھے کہ
اس کی زبان سے اداسی نہیں ہو رہے تھے اور ابھران
آنکھوں کی ویرانی اور اداسی بڑھتی جا رہی تھی۔ اچانک ہی
اس اداسی کے بادل مزید دہیز ہو گئے اور اس نے حسوس کیا
کہ یہ بادل برسنے لگے ہیں لیکن یہ کیا ان بادلوں سے
برسنے والی بوندیں سرخ تھیں۔ گہری سرخ جو ایک کے
پیچھے ایک لڑھکتی اس کے سفید آچل کو سرخ کرتی جا رہی
تھیں۔ وہ خون کے آنسو رو رہی تھی۔ آخر کیوں؟ وہ اس
سے یہ سوال پوچھ پاتا اس سے قبل ہی اس کی آنکھ مل گئی اور
آنکھ کھلنے کے بعد بھی وہ کافی دیر تک صدمہ سنبھل رہا۔ یہ بادل
نہیں تھا جس نے اس کی شکل شاہ اس کی تیار اور صحت کے
بجائے سفید آچل کے حصار میں لکھا تھا۔ آج کا خواب
میشہ سے زیادہ پرانے ان کے۔ اس بادل کو ابھی سے

کہ کوئی انتہائی قدر اٹھانے سے قبل مجھے اتنا موقع ضرور
دیجیے گا کہ میں سلطان سے تھوڑی سی معلومات حاصل
کر سکوں۔ وہ دونوں یوں ایک دوسرے سے بات کر رہے
تھے کہ جانے کب سے دوستی ہو۔ صرف ایک معاذ کے
حوالے سے یہ بے تکلفی قائم کر دی تھی۔ سچ کہتے ہیں سجن کا
سجن بھی دوست ہوتا ہے۔

”ٹھیک ہے۔ میں تمہاری یہ بات مان سکتی ہوں
کیونکہ میرے لیے بھی یہ بات زیادہ اہم ہے کہ معاذ کا کوئی
کلیوں جائے۔ معاذ میری خاطر ہی تو اس سارے مجسمت
میں پھنسا تھا اس لیے میں اس کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہوں۔“
وقاص کو جواب دیتے ہوئے اسے اپنی زندگی کا وہ پہلا
بد نصیب دن یاد آ گیا تھا جب یزدانی بلڈرز کے پروجیکٹ
میں بے ضابطگیوں کا کھون لگانے وہ وہاں جا پہنچی تھی اور
کامران اور سلطان نے اسے اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کی
کوشش کی تھی۔ ان دونوں بھیڑیوں سے بچنے کی کوشش شاید
نا کام چلی جاتی جو اگر معاذ اس کے لیے رحمت کا فرشتہ بن کر
نہ پہنچ جاتا۔ اس روز اسے بچانے کے جرم میں ہی کامی اور
سزا دی۔ معاذ کے بھی دشمن تھے۔ تھے اور پھر دشمن کیسے
سزا دینے کی طرح در ہونا چلا گیا تھا۔ اس سمیت بہت
سے لوگ بیٹ میں آئے تھے اور اس کی یہ آگ مسلسل
پھیل رہی تھی۔

”میں وعدہ کرتا ہوں کہ سلطان کو آپ کے ہاتھ سے
پھسلنے نہیں دوں گا۔ لالہ عیسیٰ اور عرفان اللہ میں آج کل اچھے
کاروباری تعلقات چل رہے ہیں اس لیے سلطان نے دینی
آکر کامی کی کمی پوری کرنے کے لیے مجھے ارجو کیا ہے۔
لالہ کے کاروباری تعلقات کا تحفظ اپنی جگہ لیکن میں سلطان
سے معاذ بھائی کے بارے میں ضرور معلوم کروں گا۔“

وقاص اس کی بھکتی سوچوں سے بے خبر اپنی کہہ رہا
تھا۔ وہ اپنے خیالات سے چونکی اور جانچتی نظروں سے
وقاص کو دیکھنے لگی۔ عمر زیادہ نہیں تھی لیکن اتنی سی عمر میں اتنے
تجربات سے گزر چکی تھی کہ انسانوں کو پہچاننے کی
صلاحیت حاصل ہو گئی تھی۔ اس کے دل نے اسے گواہی دی
کہ وقاص پر اعتبار کرنا نقصان دہ نہ ہوگا۔ اس گواہی کے بعد
اس نے اپنے ذہن میں آنے والا آئینہ یا وقاص سے شیر
کرنے میں حرج نہ سمجھا۔

☆☆☆

اس کا سفید آچل نہ صرف پیشانی تک جھکا ہوا تھا بلکہ
اسی آچل کے ایک حصے نے اس کے نصف چہرے کو بھی

تھا کہ شکل شاہ کسی بڑی مشکل یا دکھ میں مبتلا ہے لیکن وہ اس
کے لیے کربھی کیا سکتا تھا۔ وہ تو خود قیدی تھا اور اپنے لیے بھی
کچھ نہیں کر پا رہا تھا۔ بے بسی کے اس احساس کے تحت وہ
اپنی جہد سے اٹھا اور اس دیوار کے ساتھ جا کھڑا ہوا جہاں
سے وہ روشن دان کے چوکھٹے سے نظر آنے والا تھوڑا سا
آسمان اور آسمان پر نکلے ستاروں میں سے چند ستارے دیکھ
سکتا تھا۔ ستاروں کے اس چھوٹے سے جہرمت میں تجل شاہ
کو کھونے کی لا حاصل جدوجہد میں نا کام ہونے کے بعد وہ
پست ہی رہا تھا کہ اسے لگا اس جہرمت میں سے کسی نے
اسے آنکھ ماری ہو۔ وہ ٹھنک کر رکا اور گھور کر ستاروں کے
جہرمت کو دیکھا۔ وہاں کوئی آنکھ، کوئی چہرہ موجود نہیں تھا
لیکن اس کے دماغ میں فیضو کا چہرہ روشن ہو گیا تھا جو اسے
یاد دل رہا تھا کہ اس نے آج کل ستارہ بینی کی مشق ترک
کر رکھی ہے۔ یہ مشق فیضو کا اسے عطا کیا جانے والا سب
سے قیمتی تحفہ تھا۔ وہ جب جب یہ مشق کرتا تھا، اسے لگتا تھا کہ
اس کے اندر کی روشنی بڑھتی جا رہی ہے لیکن روشن ماحر
والے واقعے کے بعد سے اس نے اس مشق کو ترک کر دیا

کیوں نامالی فائدہ اٹھا کر اپنے گھر والوں اور اپنی آنے والی نسل کی زندگیوں کو سنوار لی جائیں۔" وہ اپنے مخصوص دھیمے اور پرسکون لہجے میں وضاحت کر رہی تھی اور محاذ کا طنز یہ لہجہ ایسے پی گئی تھی جیسے اسے کچھ محسوس ہی نہ ہوا ہو۔

"میں اس آفر پر غور کروں گا۔ اس کے علاوہ اگر کوئی اور بات ہے تو بولیں، میں اب سونا چاہتا ہوں۔" اس نے سپاٹ سے انداز میں جواب دیا۔

"کام ہے اور زیادہ مشکل نہیں ہے۔ افغانستان کے

لیجے آنے والے اسٹے کے ایک کنٹینر کو یہاں کی ایک بڑی سیاسی پارٹی نے پار کرنے کی سینگ کر رکھی ہے۔ کنٹینر میں بظاہر ایک ٹیکسٹائل مل کے لیے آنے والا مال موجود ہے لیکن حقیقت میں تمہیں بتا چکی ہوں۔ سیاسی پارٹی اس اسٹے کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے شہر بھر میں اپنے خفیہ ٹھکانوں پر چھپا کر رکھنے کا ارادہ رکھتی ہے لیکن ہمیں انہیں کامیاب نہیں ہونے دینا ہے۔ ہم یہ اسلحہ خود حاصل کریں گے پھر اپنی مرضی کے رئیس پر جسے چاہے سپلائی کریں گے۔ ہمارے لیے یہ کام تم کرو گے اور ہم تمہیں اس کام کا

تمہارے راز اور یہ بھی بظاہر معاوضہ ادا کریں گے اور یہاں اس کام کو ادا کرنے کے لیے ہم تمہیں ایک تربیت یافتہ پارٹنر بھی دے دیں گے۔ اس وقت ہمیں اس پارٹنر سے ملاقات کے لیے اس وقت کی کمی ہے۔ ہم اس سے مل کر ساری تفصیلات طے کر لو۔ اس بار میں تم سے سو فیصد کامیابی کی خواہش مند ہوں۔" میڈم ایکس نے اسے نیا مشن سونپنے کے ساتھ ساتھ ایک پارٹنر کی شمولیت کی اطلاع سنائی تو وہ چونک گیا اور فوری طور پر دل میں خیال آیا کہ اس کی کارکردگی پر شک کیا جا رہا ہے اس لیے اس پر نظر رکھنے کے لیے اس کے ساتھ ایک پارٹنر بھی کیا جا رہا ہے۔ وہ اس شک کو رفع کرنے کی تدبیر سوچ رہی رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی اور پھر کوئی آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اس نے آنے والی ہستی پر ایک نظر ڈالی تو اتنا حیران ہوا کہ اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ یہ اور یہاں...؟ اس کے لیے یقین کرنا آسان نہیں تھا۔

☆☆☆

صدقت شاہ دل کے مریض تھے اور ڈاکٹرز نے انہیں ذہنی دباؤ سے دور رہنے کا مشورہ دے رکھا تھا لیکن اس وقت جو پریشانی تھی وہ خود کو اس سے کسی طور علیحدہ نہیں رکھ سکتے تھے۔ ایک طرف ان کی جوان بیوہ بیٹی کا کلیجا نہ چلا گیا تھا تو دوسری طرف ان کا آنکھوں کا نور عالم شاہ

تھا۔ عجیب بے دلی کی سی کیفیت طاری تھی اس پر لیکن اس وقت اسے بالکل ایسا لگا تھا کہ ستاروں کے پیچھے سے جھانکتا فیضو اسے یاد دہانی کروا رہا ہے کہ اسے ایک ایسے کام کو نہیں چھوڑنا چاہیے جو اس بے بسی میں اس کے لیے ایک بڑا سہارا بن سکتا ہے۔ اسے اپنی کوتاہی پر افسوس سا ہوا اور اسی وقت مشق کرنے کا فیصلہ کیا۔ ستاروں کے جھرمٹ سے اپنے لیے ایک ستارہ منتخب کر کے ابھی اس نے اس پر نظر لگائی ہی تھی کہ کسی نے اسے پکارا۔

"ہیلو محاذ.....!" ایک گہری سانس لے کر اس نے ستارے پر سے اپنے توجہ ہٹالی اور خود بھی جواب میں دھیرے سے ہیلو کہا۔

"سوری! اتنی رات مجھے تمہیں ڈسٹرب کرنا اچھا تو نہیں لگا لیکن یہ اچھا ہوا کہ تم جاگ رہے ہو اور میں کچھ دیر تم سے باتیں کر سکتی ہوں۔"

"میرے سارے اختیارات آپ کے ہاتھ میں ہیں۔ آپ جب چاہیں مجھ سے ہر خدمت لے سکتی ہیں پھر یہ معذرت کیسی؟" محاذ کے لہجے میں ادا سی تھی۔

"میں کسی سے شکایت تو اسے کر لے میں بہت کچھ کرنے کے لیے بھی تیار ہوتے ہیں۔ یہ اتفاق ہے کہ تمہارے ساتھ حالات اس طرح برپا ہو چکے ہیں کہ زبردستی کا تاثر زیادہ ملائیں اب یہی ہمارے درمیان صورت حال بہتر ہو سکتی ہے۔ تم اپنی رضا اور رغبت سے ہمارے لیے کام کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ، ہم تمہیں تمہارا منہ مانگا معاوضہ دیں گے۔" اس نے محاذ کو حیرت انگیز پیشکش کی ورنہ اب سے مل تو وہ لوگ دھونس، زبردستی اور بلیک میلنگ سے ہی کام چلاتے رہے تھے۔

"مجھے اپنا بے دام غلام بنانے کے بعد یہ مہربانی کیسی؟" محاذ طنز کے بغیر نہ رہ سکا۔

"بے دام غلام تو تم نہیں ہو۔ ہم نے بڑی بھاری قیمت دے کر تمہیں حاصل کیا ہے لیکن بہر حال اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم تمہیں کچھ دینا نہیں چاہتے۔ اصل میں ہمیں معلوم تھا کہ تم قیمت لے کر وہ کچھ کرنے کو راضی نہیں ہو گے جو ہم تم سے کروانا چاہتے ہیں اس لیے تمہیں دوسرے طریقے سے اپنے ڈھب پر لانا پڑا۔ تم ہوا صل میں حب الوطنی، ایمانداری اور حق گوئی کے جراثیم لے کر پیدا ہونے والے بندے اور ہم ایسے لوگوں کی نفسیات اچھی طرح سمجھتے ہیں اس لیے تمہیں اسی حساب سے لے کر چلے۔ اب یہ آخر اس لیے کی جارہی ہے کہ شاہ احمد صاحب کا راز... انا... تم تمہیں بک رہا... راز

تیار ہو جاتے۔ اب بھی سخت دکھ اور اشتعال میں ہونے کے باوجود وہ اپنی فطری رحم دلی کے سبب کئی بار سچنے کے باوجود قلم جاری کرنے میں ہچکچاہٹ کا شکار تھے اور ان کی یہ ہچکچاہٹ قربان شاہ کے لیے امتحان بنی ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنا اکلوتا بیٹا کھو یا تھا اور اب ہر قیمت پر اس بیٹے کی وحدانیت کی واپسی کے خواہاں تھے۔ صداقت شاہ کی ہچکچاہٹ اور قربان شاہ کے اضطراب نے مل کر ماحول کو خاصا تنگ کر دیا تھا اور اس وقت دونوں تنہا بیٹھک میں موجود ان کے پر اپنے پر پر نور نور رہتے تھے۔

ایسے میں دروازے پر دستک ہوئی اور ایک ملازم اجازت لے کر اندر داخل ہوا۔

”سائیکس ایک چھتری آئی ہے۔ بولتی ہے سائیکس صداقت یا سائیکس قربان شاہ میں سے کسی سے ملاقات کرو دو۔ بہت اہم معلومات دینا ہیں۔“ ملازم نے عاجزی سے انہیں اطلاع دی۔

”کچھ نام پتا نہیں بتایا اس ٹرکی نے اپنا؟“ قربان شاہ نے رعب سے پوچھا۔

”سائیکس سائیکس بہت پوچھا پر کچھ نہیں بتاتی کہتی ہے جان بڑی پورا کھڑکی میں اور جو ہے وہ میں بتاؤں گی۔“ ملازم نے کہا۔

”فہم کیا ہے؟“ قربان شاہ نے پوچھا۔

ان حالات میں وہ ایسی کسی پر اسرار ملاقاتی کو اہمیت دینے پر مجبور تھے۔ تربیت یافتہ ملازم نے ایک ملازمہ کے ذریعے ٹرکی کی عمل جامہ تلاشی کے بعد اسے خدمت میں حاضر کر دیا۔

”سلام سائیکس۔“ ٹرکی جس نے اپنا چہرہ اوزمنی کے پلو سے چھپا رکھا تھا، دونوں کے آگے باری باری ہاتھ جوڑتے ہوئے لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

”ہاں چھوری بول، کیا بات ہے جو تجھے صرف ہم سے کرنی ہے؟“ قربان شاہ نے اس کے سلام کو نظر انداز کرتے ہوئے سخت لہجہ میں پوچھا۔

”میں سومرو سائیکس کی حلی میں کام کرتی ہوں۔ شاہ سائیکس اور آپ کو اپنی عقل کے حساب سے ایک راہ بھگنے آئی ہوں۔“ ٹرکی کی آواز اب بھی کانپ رہی تھی لیکن وہ تو اس کا تعارف سن کر ہی حیران رہ گئے تھے۔

”کس نے بھیجا ہے تجھے ادھر؟“ صداقت شاہ کڑکے۔

”کسی نے نہیں سائیکس! اللہ پاک کی قسم میں اپنے دل کے کہنے پر آئی ہوں۔ مجھے پتا لگا تھا کہ چھوٹے شاہ

غائب تھا۔ ان حالات میں انہوں نے حوصلہ چھوڑ کر بیٹھ جانے کے بجائے اپنے آہنی اعصاب کے مالک ہونے کا ثبوت دیا تھا اور ممکنہ طور پر اپنے تعلقات کی ڈھریں ہلا کر مسائل سے نمٹنے کی سعی کر رہے تھے۔ عالم شاہ کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے انہوں نے ہاتھ بالا بہت سی باتیں معصوم کر لی تھیں۔ چارچ اور اس کے گرد سے ہونے والے ٹکرائے کے بارے میں جو معلومات ان کے پاس آئی تھیں، ان کے مطابق چارچ اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ اس پہلے میں ہلاک ہو گیا تھا۔ اس کے دو تین ساتھی رخصی

حالات میں گرفتار ہوئے تھے اور چند ایک فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ چلنے کے جس گاڑی میں سرمد اور عالم شاہ کی موجودگی کا ذکر کیا تھا، اس کے بارے میں بھی انہیں سب خبریں مل گئی تھیں۔ گاڑی چوری کی تھی اور اس کے سواروں نے پولیس کے تعاقب سے بچنے کے لیے گاڑی پھوڑ کر پیدل فرار ہونے کو ترجیح دی تھی۔ پولیس والوں نے اس صورت میں بھی ان کا تعاقب کرنے کی کوشش کی تھی اور ان کا اندازہ تھا کہ انہوں نے یزدانی یا اسٹیک اسٹیمر کے آس پاس مقبوضہ فرار کیا ہے۔ ان کے پاس یہ بھی تھا کہ وہ لوگ اسٹیک اسٹیمر میں پناہ لینے کے لیے کامیاب ہوئے تھے۔ ہمیں انہیں اس تلاش کر۔ میں تاکہ سرمد بھی پولیس کے ماتحت ہو کر اس وقت شاہ کے ساتھ رہا

تھا اور کچھ مشق کے دوستوں کے ذریعے یزدانی کو پھانسی بکھوایا تھا کہ اگر ان کا بیٹا اس کی قید میں ہے تو وہ اس کی واپسی کے لیے معقول رقم ادا کرنے کے لیے تیار ہیں لیکن یزدانی نے عالم شاہ اور سرمد کی اپنے پاس موجودی سے قطعی انکار کر دیا تھا جس کے بعد وہ بالکل بندگلی میں آکھڑے ہوئے تھے۔

دوسری طرف نواسے کی بازیابی بھی ممکن نہیں ہوئی تھی حالانکہ اس کے لیے بھی وہ بڑے بڑے ذرائع سے لطیف سومرو پر دباؤ ڈال رہے تھے۔ اس تاکہی نے انہیں اس سچ پر سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ اپنے مشغول معتمدین اور مزاحموں کو لطیف سومرو پر چڑھائی کی اجازت دے دیں۔

اس سے لطیف سومرو کا تو ظاہر ہے براہ راست کچھ نہ بگڑتا لیکن خوزریزی ہوتی تو کچھ ایسے لوگ ضرور درمیان میں کود پڑتے جو لطیف سومرو کو بچنے کی واپسی کے لیے قائل کر کے چھوڑتے۔ وہ کوئی بہت زیادہ پارسا شخص نہیں تھے اور ماضی میں روحانی اور سیاسی ساکھ بنائے رکھنے کے لیے چھوٹے موٹے کھیل کھیلتے رہے تھے لیکن اس حد تک کبھی نہیں گئے تھے کہ انسانی جانوں کا بے دریغ زیاں کروانے کے لیے



ماہنامہ جاسوسی

فروری 2021

کے شمارے کی

ایک جھلک

■ اولین صفحات ■

محبت کی شمع روشن ہو تو کسی دوسری روشنی کی ضرورت باقی نہیں رہتی شہر کی محبت میں وہ خود کو فراموش کر بیٹھی تھی گھانک اور نڈھال کر دینے والی داستان کے سنسنی خیز واقعات، امجد رییس کی تحریر کے کمالات

■ انا گھر ■

شہر کی ریت کے سارے دن میں جھٹکتے ہیں۔

امجد جاوید

ماہنامہ جاسوسی فروری 2021

مردانہ دل سے یہ اکتا ایوان موت تو
یہ پرائی تو فاکٹر عبد الرب سمنی
قلم سے یہ سائنسی نیا سار

■ سینورق کیے رنگ ■

■ پہلارنگ ■

مہدی ضرے مسلم و سب چھڑا جائے تو بات دور
نکاح چل جاتی ہے پرانی باتیں، نئے تجربات
■ دوسرا رنگ ■

فریب کھسارے والوں کی دلتا اور

بغا کاروں سے جگہ کا قصہ حبار

■ جیلنیکہ جیلنیکہ ■

آپ کے پھرے... مشورے... مکتبہ
شکایتیں اور نئی نئی دلچسپ باتیں... سنیں

لیے فرار کی راہ بنانے میں مصروف تھے۔ ہاتھ روم کی دروازہ پر توفیق نے اپنا کام تقریباً مکمل کر لیا تھا اس لیے وہ دونوں تھوڑی سی کوشش کے بعد انٹینس اکھاڑ کر دیوار میں اچھا خاصا شکاف بنانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اب سیوریج کے پائپ میں خلا بنانے کا مرحلہ تھا۔ اتنے موٹے اور مضبوط پائپ کو توڑنا آسان بات نہیں تھی، وہ بھی ایسی صورت میں کہ ان کے پاس کوئی بھاری اور مضبوط شے نہیں تھی جس سے وہ پائپ پر ضرب لگا سکتے۔ ہوتی بھی تو وہ یہاں ہونے والے کام کی بہت اور پر والوں کو ملنے کی کوشش کرتے کرتے ممکن نہیں ہو سکتے تھے۔ انہیں احتیاط اور تیزی سے یہ کام فرمنا تھا اسی لیے سرمد کے بہت منع کرنے کے باوجود بھی عالم شاہ اس کے ساتھ اس کام میں شریک ہو گیا تھا۔ حیرت انگیز طور پر اب اسے اس گندے اور بدبودار واش روم میں ایکایک بھی نہیں آ رہی تھیں۔ نقیب کی موت نے اس کے لیے سب بدل کر رکھ دیا تھا۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ اگر اسے خود کو نقیب جیسے دردناک انجام سے بچانا ہے تو جدوجہد کرتا ہوگی۔ طبیعت کی لذت پسندی اپنی جگہ لیکن حقیقت یہ تھی کہ اسے کسی استغناء کے عالم میں مرنے کا احساس نہیں تھا۔ اس روم کی دروازے کی آڑوی کی جدوجہد کرنے سے اسے بتا رہا تھا کہ وہ تھکا ہوا تھا۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ اسے اس روم میں ہی رہنا تھا۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ اسے گندے واش روم کو استعمال کرنے پر بھی مجبور ہو گا اور اس غذا اور پانی کو بھی قبول کرتا ہو گا جو تھیں صاف پرانے لوں کے باقی نہیں تھے۔ مزاج کی نزاکت سے بہت ترچہ نکلنے اپنے مشاغل کی وجہ سے وہ جسمانی طور پر خاصا مضبوط تھا اس لیے سرمد کا بھرپور ساتھ دینے میں اسے کوئی مشکل پیش نہیں آ رہی تھی۔ اپنے اس کام کو انجام دینے کے ساتھ ساتھ وہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے رخسار کے دروازے کے چوکھٹے سے بھی جھانک کر دیکھ آتے تھے کہ کہیں کوئی نیچے تو نہیں آ رہا ہے لیکن کسی کی کوئی سن سن نہیں تھی۔ شاید ان پر باقاعدہ ستر ڈھانے سے قبل انہیں تنہائی، بھوک اور پیاس کے ذریعے توڑنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ کافی حد تک وہ اس عذاب میں جتا ہو بھی چکے تھے لیکن ابھی ایسی نوبت نہیں آئی تھی کہ ان کے قومی کمزور پڑ جاتے۔

نقیب مرتے مرتے انہیں فرار کی راہ بتا کر ان پر بڑا احسان کر گیا تھا۔ وہ اس احسان کے بدلے نقیب کے لیے تو اتنا بھی نہیں کر سکتے تھے کہ اس کی بے گور و گفن پڑی لاش کو کھانے دفن کرنے کا انتظام کر دیتے لیکن یہ طے تھا کہ اگر وہ

یہاں سے صحیح سلامت نکل جانے میں کامیاب ہو جاتے تو نقیب کی بیوہ ماں اور بہن کے لیے اتنا کچھ ضرور کر ڈالتے کہ نقیب کی روح پُر سکون ہو جاتی۔ اپنے پاس موجود نقیب کے معمولی اوزاروں سے پوری رات انہوں نے اتنی جانفشانی سے جدوجہد کی کہ بظاہر ناممکن محسوس ہونے کے مضبوط پائپ میں بھی شکاف ڈالنے میں کامیاب ہو گئے۔ دیوار کے مقابلے میں یہ شکاف چھوٹا بنا تھا لیکن دونوں کسی نہ کسی طرح اپنے جسم کو سیکڑ کر اس شکاف سے گزرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کوشش میں ان کے جسموں پر کافی خراشیں بھی آئیں لیکن یہ وقت خراشوں پر توجہ دینے کا نہیں تھا۔ وہ دونوں عجیب جوش کی سی کیفیت میں سیدرتج لائن کی شکل میں بتائی گئی اس سربنگ میں آگے بڑھنے لگے۔ اپنے لیے قدم کی وجہ سے انہیں قدرے سرجھکا کر چلنا پڑ رہا تھا ورنہ سربنگ ایسی تھی کہ درمیانے قدم کا کوئی فرد آسانی سے اس میں چل سکتا تھا۔ سربنگ میں داخل ہوتے وقت انہوں نے نقیب کے اوزاروں سمیت نارچ بھی ساتھ لے لی تھی لیکن اس چھوٹی نارچ کی روشنی اب بہت کم ہو چکی تھی۔ خوش قسمتی سے سربنگ میں اتنا زیادہ اندھیرا بھی نہیں تھا کہ انہیں نارچ چلا کر اندھیرے میں پیش آتی وہ محسوس کر رہے تھے کہ اس سربنگ میں ایسے خفیہ سوراخ اور درزیں و طے رگھی گئی ہیں جن کے دوسرے رشتے اور ہوا کی قدرتی مقدار محدود رہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو انہیں وہاں گھپ اندھیرے اور محض کا سامنا کرنا پڑتا لیکن ایسا کچھ نہیں تھا اور وہ آسانی سے آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔

سربنگ ان کے اندازے سے کہیں زیادہ طویل ثابت ہوئی تھی اور وہ کافی دیر میں اس کے دوسرے سرے تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ دوسرا سرا بند تھا اور نقیب نے انہیں نہیں بتایا تھا کہ اس بند سربنگ سے نکلنے کا کیا طریقہ ہوگا؟ شاید وہ خود بھی نہیں جانتا ہوگا۔ عالم شاہ اور سرمد اپنے اپنے طور پر سربنگ کی دیواروں اور چھتوں کو ٹھونک بجا کر باہر نکلنے کا راستہ تلاش کرنے لگے۔ کہیں کوئی ثمن یا ابھار ایسا نہیں تھا جس سے راستہ کھولا جاسکتا اور یہ ایک تشویشناک بات تھی۔ اگر وہ سربنگ سے نکلنے کا راستہ نہیں ڈھونڈ پاتے تو حقیر چوہوں کی طرح وہاں پھنس کر رہ جاتے اور باڈل اور اس کے ساتھیوں کے لیے انہیں پکڑ لینا مشکل ثابت نہ ہوتا۔ خود کو اس انجام سے بچانے کے لیے وہ دیوانوں کی طرح ادھر ادھر ہاتھ مار رہے تھے کہ اس مقام پر حصارِ صحت کا سربنگ کا اندھیرا اور سراسر اندھارہ تھا۔

سرمد کا ہاتھ ایک ہینڈل سے ٹکرایا۔ اس نے ہینڈل کو پکڑ کر کھینچا تو چھت کا ایک حصہ ایسے نیچے آنے لگا جیسے وہ کسی دروازہ کو کھینچ رہا ہو۔ وہ حصہ پوری طرح نیچے آ گیا تو وہ دونوں یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ ان کے سامنے ایک بغیر پٹ کی کھلے شلیف والی الماری موجود تھی جس میں لکڑی کے مضبوط تختوں کو اس طرح جوڑا گیا تھا کہ نیچے والا شلیف سب سے چوڑا تھا اور اوپر کی طرف جاتے ہوئے تختوں کی چوڑائی اس طرح بتدریج کم ہوتی چلی جا رہی تھی کہ ایک سیزمی سی بن گئی تھی۔ وہ دونوں پھونک پھونک کر قدم رکھتے اس سیزمی کے ذریعے اوپر پہنچے۔

اونچائی زیادہ نہیں تھی۔ سرمد جو آگے تھا، اس نے باہر نکلنے سے قبل پہلے ادھر ادھر کا جائزہ لیا۔ وہ بہت زیادہ سامان سے بھرا ہوا ایک خاصا بڑا کمرہ تھا۔ یہاں فی الوقت کوئی ذی روح موجود نہ تھا۔ اس نے عالم شاہ کو لائن کلیئر ہونے کا اشارہ دیا اور وہ دونوں آگے پیچھے باہر نکل آئے۔ اوپر پہنچ کر اسے وہ ہینڈل ڈھونڈنے میں دشواری پیش نہیں آئی جس کو کھینچنے پر وہ شلیف والی الماری نمایاں تیزیاں تیزی سے اوپر آئیں۔ اب بائیں بھی پٹ نہیں چلی رہا تھا کہ اس الماری کے نیچے ایک خفیہ سربنگ موجود ہے۔ وہ دونوں مدھم مدھم دھڑکے والے اس کمرے میں آ گئے۔ انہیں یہ پٹ چھاننے دیکھے گئے۔ کمرے میں ایک طرف درزی کا کوٹا پھندا سرخیر ڈھیر تھا تو دوسری طرف ان سے کپڑوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ ایک حصے میں انہیں لوہے اور ٹن پر مشتمل کپڑا بھی نظر آیا۔ اسی نوعیت کی چند ایک چیزیں مزید موجود تھیں اور صاف محسوس ہو رہا تھا کہ یہ کمرہ اسٹور روم کے طور پر استعمال ہو رہا ہے لیکن ابھی یہ طے نہیں تھا کہ وہ کس جگہ موجود ہیں۔ جس جگہ بھی موجود تھے، خطرے کی حد سے بہر حال باہر نہیں تھے۔ یزدانی باؤسنگ انکیم سے شروع ہونے والی سربنگ اگر یہاں آ کر مکمل رہی تھی تو اس کا مطلب تھا کہ اس جگہ کے مالک بھی دی لوگ ہیں اور مخالفین کی جگہ پر موجود ہونے کا مطلب تھا، بدستور خطرے میں ہونا۔

”میں دروازے کے پاس جا کر جائزہ لیتا ہوں کہ ہم کس جگہ ہیں اور یہاں سے نکلنے کے کیا امکانات ہیں؟“ سرمد نے سرگوشی میں عالم شاہ سے کہا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ ابھی اس نے ایک قدم ہی آگے بڑھایا تھا کہ دروازے کی طرف سے ایسی کھٹ پٹ سنائی دی جیسے کوئی دروازہ کھول رہا ہو۔ وہ دونوں تیزی سے بھاگ کر کپڑوں کے

TAGPK.COM

برآمدے میں بائیں جانب آگے بڑھا اور سب سے آخری دروازے میں غائب ہو گیا۔ اس کے اوجھل ہونے کے بعد وہ دونوں حرکت میں آئے اور گاڑیوں کے دروازے سے چیک کرنے لگے۔ پہلی دو گاڑیوں کے دروازے انہیں لاک پڑے۔ تیسری گاڑی کا دروازہ چیک کرتے ہوئے قسمت نے ان کا ساتھ دیا۔ اس گاڑی کے آگے اور پیچھے دونوں جانب کے دروازے بند نہ تھے۔ وہ پھپھلا دروازہ کھول کر اندر رینگ گئے۔ گاڑی کشادہ تھی اس لیے دونوں ہی نشستوں کی درمیان میں جگہ سامنے میں کامیاب ہو گئے۔

”اگر خاموشی سے یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے تو اچھی بات ہے، دوسری صورت میں سواروں کو یرغمال بنا کر لھٹ پڑے تو بھی جھپٹا نہیں ہے۔“ عالم شاہ نے سرگوشی میں سرمد کو ہدایت دی جس کی اس نے شد و مد سے تائید کی۔ وہ بھی سمجھتا تھا کہ اتنی جدوجہد کے بعد بھی دوبارہ چھس جانے کا مطلب ہوگا وہ خود کو قیاب اور شادی جیسے انجام کے سپرد کر دیں۔ فی الحال تو انہیں انتظار جیسے صبر آزمائی کے طے سے گزارنا تھا۔ گاڑی جانے لگی تھی اور کب اس شخص کو

قیص شنوار عالم شاہ کے حوالے کر دی اور خود بنیان اور پا جاسے سے کام چلایا۔ یہاں انہوں نے واش روم کی سہولت سے بھی استفادہ کیا اور خود کو خاصا بہتر محسوس کیا۔ خالی پیٹ کا مسئلہ حل کرنے کے لیے فی الحال کوئی تدبیر نہیں تھی لیکن واش روم کے قریب سے چلو بھر کر انہوں نے اپنی یہ اس ضرورت بجھائی تھی۔ یہ پانی اس پانی سے بہر حال بہت بہتر تھا جو نہ خانے میں انہیں فراہم کیا گیا تھا۔ اب ان کے سامنے سہارا سے نکلنے کا مسئلہ تھا۔ دو وقفے وقفے سے کمرے کے دروازے سے جھانک کر دیکھتے رہے۔ بالآخر مزدوروں نے وہاں سے ہٹا شروع کر دیا۔ تمام مزدور ہٹ گئے تو وہ دونوں احتیاط سے باہر نکلے۔ یہ ایک کھلا برآمدہ سا تھا جس میں قطار سے کئی کمرے بنے نظر آ رہے تھے۔ یہ شاید آفس ایر یا تھا کیونکہ برآمدے کے آگے کچھ خاصی کھلی جگہ کے بعد کافی بڑی سی عمارت نظر آ رہی تھی اور عمارت کی ساخت و بناوٹ سے ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ صنعتی مقاصد کے لیے استعمال ہونے والی عمارت ہے۔ دونوں عمارت کو ایک مشترکہ بلند چار دیواری نے گھیر رکھا

تھا۔ چار دیواری پر مٹی کی دیواریں بنائی ہوئی تھیں اور آدھار کھدائی کے طور پر بنی ہوئی تھیں۔ یہ ایک مضبوط اور پختہ بناوٹ تھا جس پر مٹی کی دیواروں کا ایک سطح چار دیواری میں رات کا وقت ہوا تو ان کے لیے کچھ خادار تاروں سے لٹکی ہوئی چار دیواری مسئلہ بنی، اندھی سچ پوکیدار لیکن ان کی روشنی میں تو یہ صورت حال تھی کہ وہ کچھ کرنے سے پہلے ہی نظروں میں آ جاتے۔

”ان گاڑیوں کو چیک کرتے ہیں۔“ ایک ستون کے پیچھے کھڑے وہ دونوں امکانات کا جائزہ لے رہے تھے کہ سرمد نے سرگوشی میں برآمدے کے سامنے کھڑی تین چار گاڑیوں کی طرف اشارہ کیا۔ چاروں گاڑیوں میں مٹی اور ہدیہ تھیں لیکن کسی کے بھی اندر یا باہر رانیور دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

”ٹرائی کر لیتے ہیں۔“ عالم شاہ اس سے اتفاق کرتے ہوئے بولے اور پھر دونوں نے نہایت احتیاط سے گاڑیوں تک کا دس پندرہ قدموں کا فاصلہ طے کر لیا۔ ابھی وہ وہاں پہنچے ہی تھے کہ اپنے عقب میں ایک کمرے کا دروازہ کھٹکا محسوس کیا۔ دونوں چیزوں سے ایک گاڑی کی آڑ میں دھک گئے۔ باہر نکلنے والا شخص اپنے حلیے سے کوئی چیز اسی وغیرہ محسوس ہو رہا تھا جس نے ہاتھوں میں ایک ٹرے اٹھائی تھی۔

”اگر خاموشی سے یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے تو اچھی بات ہے، دوسری صورت میں سواروں کو یرغمال بنا کر لھٹ پڑے تو بھی جھپٹا نہیں ہے۔“ عالم شاہ نے سرگوشی میں سرمد کو ہدایت دی جس کی اس نے شد و مد سے تائید کی۔ وہ بھی سمجھتا تھا کہ اتنی جدوجہد کے بعد بھی دوبارہ چھس جانے کا مطلب ہوگا وہ خود کو قیاب اور شادی جیسے انجام کے سپرد کر دیں۔ فی الحال تو انہیں انتظار جیسے صبر آزمائی کے طے سے گزارنا تھا۔ گاڑی جانے لگی تھی اور کب اس شخص کو

”تمہاری کچھنی میں مزہ آیا، مس سبکی۔ اگر مجھے کام سے نہ جانا ہوتا تو میں تمہارے ساتھ چلا اور وقت گزارنا پسند کرتا۔“ دروازہ کھول کر اندر بیٹھنے کے بجائے وہ فی الحال باہر ہی کھڑا اپنے ساتھ یہاں تک آنے والی ٹرکی سے مخاطب تھا۔ آواز سن کر عالم شاہ اور سرمد دونوں ہی گنگ رہ گئے۔ وہ سو فیصد باذل تھا۔ یعنی وہ جس گاڑی میں یہاں سے نکلنا چاہتا تھا وہ وہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔

TAGPK.COM

”انہیں ہر حال میں تلاش کر کے دوبارہ قبضے میں لو۔“
میں مل میں بھی ہاکی ارٹ کرتا ہوں۔ انہیں کسی حال میں
نکلنے میں کامیاب نہیں ہونا چاہیے۔“ وہ بھیڑیے کی طرح
غرار ہاتھ۔ وہ سمجھ گئے کہ یہ خانے سے ان کا غیاب ظاہر
ہو گیا ہے اور باؤل کو اس کی اطلاع دی گئی ہے۔

”ہیلو میرا! ہاں دیکھو خفیہ راستے سے دو افراد کی مل
میں داخلے کی اطلاع ہے۔ تم سکیورٹی کو ہاکی ارٹ کر دو کہ
چڑیا کا بچہ بھی کھل اطمینان کے بغیر باہر نہیں نکلتا
چاہیے۔ اپنے دو چار خاص بندے ساتھ لے کر انہیں چپے
چپے پر تلاش کرو۔“ اب وہ دوسری کال پر معروف تھا۔

”خیال رکھنا..... انہیں ہلکا نہیں لیتا ہے۔ وہ لڑنے
بھڑنے میں ماہر لوگ ہیں اور خالی ہاتھ بھی کم نہیں ہیں۔“ وہ
جس طرح فون پر ہدایات دے رہا تھا اس سے ظاہر تھا کہ
شدید غصے میں بھی اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت برقرار
رہتی ہے۔ اس کال کے بعد بھی اس نے مزید ایک اور کال
کی اور مزید ہدایات جاری کیں لیکن اس کی گاڑی کی رفتار
میں قطعی کمی نہیں آئی۔ فون کالز کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد

رہتی بھی رہا وہ جا ہی ہوگی تقریباً پندرہ منٹ میں منہ منہ
جاری رہنے لگا۔ بعد اس نے گاڑی روک لی۔
”میں کبھی ہوں پوچھا۔“ اس نے کبھی نہ

”اب ایک بار پھر اس پر معروف تھا۔“
”مطلب آدھا گھنٹا لگ جائے گا۔“ دوسری طرف
سے جو جواب دیا گیا اسے سن کر اس نے اندازہ قائم کیا اور
فون کان سے لگائے لگائے گاڑی سے نیچے اتر گیا۔ اس کی
آواز معدوم ہوئی تو سرمد نے رسک لیتے ہوئے سر اٹھا کر
باہر جھانکا۔ وہ فون کان سے لگائے سڑک پار جاتا دکھائی
دے رہا تھا۔

”نکل چلیں سامیں! موقع اچھا ہے۔“ اس نے عالم
شاہ کو بھی بتی سبز ہونے کا اشارہ کیا۔ اگلے ہی لمحے دونوں
گاڑی سے باہر تھے۔ بہت دیر بعد جبکہ پردے کے رہنے
سے جسم کچھ اکڑ گیا تھا لیکن چند قدم چلنے کے بعد ہاتھ پیر کھلتا
شروع ہو گئے۔

”اب کیا ارادہ ہے سامیں؟“ وہ آہستہ قدموں سے
بائیں جانب حرکت کر رہے تھے لیکن نظریں سڑک پار موجود
باؤل پر جمی تھیں جو اب موبائل کان سے ہٹا کر ایک پان کی
دکان پر کھڑا نظر آ رہا تھا۔

”ایک عدد موبائل اور تھوڑی رقم حاصل کرنا ہے۔“
عالم شاہ نے نہایت سنجیدگی سے جو جواب دیا اسے سن کر سرمد

”آپ اپنی فرصت میں دوبارہ مجھ سے رابطہ کر سکتے
ہیں سر! میں تو روزانہ ہی یہاں موجود ہوتی ہوں۔“ نیکی نے
جواب میں فراخ دلی سے اسے پیشکش کی۔ وہ پچھلے
دروازے سے ایک لگائے ایک خاص ادا سے کھڑی تھی۔
اچھی بات یہ تھی کہ گاڑی کے شیشے رنگین تھے اور باہر سے
دیکھنے پر اندر کا جائزہ نہیں لیا جاسکتا تھا۔

”اوکے! تو پھر جلد ہی تم سے ایک بھر پور ملاقات
ہوگی۔“ باؤل کا انداز معنی خیز تھا۔ اپنی بات کہنے کے بعد
اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔
گاڑی گولی کی طرح وہاں سے نکلی۔ گیٹ کر اس کرتے ہی
اس نے موبائل پر کسی سے رابطہ کیا۔

”میں نکل گیا ہوں۔ تم لوگ مجھے جوائن کر لینا۔ بس
دو گاڑیاں اور چار پانچ بندے کافی ہوں گے۔ زیادہ رش
لگانے کا مطلب ہوگا لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کروانا۔ ہم
جتنی خاموشی اور بے نیازی سے کام لیں گے، اتنی ہی آسانی
سے مال شفٹ ہو جائے گا لیکن خیال رکھنا کہ تم لوگوں کی
تیاری بھرپور ہونا چاہیے تاکہ کوئی اپ سیٹ ہونے پر بھرپور
جوا دے سکے۔ کوئی سوال نہیں ہے ہو تو تم مجھ سے مل سکتی
ہو۔“ وہ اس سرور اور سخت آواز پر اچھی طرح سن
تے تھے۔

”اوکے! اتنے کھاتے ہیں۔“ دوسری طرف کی بات
سننے کے لیے اس نے ذرا سا توقف کیا پھر مختصر سا جملہ کہہ کر
فون بند کر دیا۔ فون بند ہوتے ہی گاڑی میں پُرشور موسیقی
بجنے لگی۔ پُرشور و بجان خیز موسیقی کے ساتھ ساتھ بے حد تیز
رفتاری سے دوڑتی گاڑی باؤل کی شخصیت کی عکاسی کر رہی
تھی۔ گاڑی کی رفتار اتنی تیز تھی کہ وہ دروازہ کھول کر چلتی
گاڑی سے چھلانگ لگانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔
سرمد نے اشارے سے عالم شاہ سے دریافت کیا کہ آیا
باؤل کو قابو میں کر لیا جائے لیکن اس نے نفی میں گردن
پلا دی۔ اس نے باؤل کی گفتگو کا جو حصہ سنا تھا اس نے اسے
تجسس میں مبتلا کر دیا تھا اور وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ باؤل کہاں
اور کس مال کی ڈیلیوری لینے جا رہا ہے۔ اچانک ہی گاڑی
میں چلنے والی موسیقی بند ہو گئی اور باؤل کی آواز سن کر انہیں
اس کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ وہ ایک بار پھر کسی سے فون پر بات
کر رہا تھا۔

”کیا بکو اس کر رہے ہو؟ کیسے بھاگ سکتے ہیں وہ
دونوں؟“ وہ بولنے سے زیادہ وہاڑا لیکن پھر خاموش ہو کر
دوسری طرف کی بات سننے لگا۔

پہلے تو حیران ہوا پھر شاید بات سمجھ آگئی اور بغور اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ یہ علاقہ ماحول کے اعتبار سے باقی شہر سے ذرا مختلف محسوس ہو رہا تھا۔ سڑک بہت اچھی حالت میں تھیں تھی لیکن اس پر سے مسلسل ہیوی ٹریفک گزر رہا تھا۔ سڑک کے دونوں اطراف دکانیں اور چائے خانے وغیرہ موجود تھے لیکن ان کی تزئین و آرائش پر توجہ نہیں دی گئی تھی اور خاصی میلی میلی سی دکھائی دے رہی تھیں۔ اطراف میں چلتے پھرتے لوگوں کے درمیان خواتین کا وجود دیکھ نہیں تھا البتہ بچے ضرور دکھائی دے رہے تھے جو یقیناً دکانوں کے پیچھے باہر گلیوں میں موجود کچے پکے مکانوں کے کھین تھے۔ ہوا میں مٹی اور مٹیسی کا بڑھا ہوا تناسب سمندر کی قربت کا اندازہ نہ کر رہا تھا۔

”اگر اس گلی میں چلتے ہیں۔“ سرمد نے ایک پتلی سی گلی کی طرف اشارہ کیا تو عالم شاہ نے قدم اس جانب بڑھا دیے۔ اپنے اجازتوں اور معمولی لباس میں وہ اس جگہ نمایاں نہیں ہو رہے تھے کہ ارد گرد کم و بیش ان ہی جیسے طبقے والے مزدور پیشہ افراد کی بہتات تھی۔ گلی میں داخل ہو کر سرمد نے سرسبز رنگ کی ایک چھوٹی سی گلی میں چند مکانوں کے ہی دروازے موجود تھے اور زیادہ تر گلیوں پر اور ان کے اداکاروں کی گلی میں دے رہے تھے جس کا مطلب تھا کہ وہ مقامات کی عقیبتی میں جگہ دوسری جانب موجود سپاٹ دیوار اس فیکٹری کی گلی جس کی چینی سے نکلتا تھا اس انہوں نے سڑک سے ہی دیکھ لیا تھا۔ وہ فیکٹری کی سپاٹ دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔ اب انہیں شکار کا انتظار تھا۔ یہ انتظار طویل نہیں تھا لیکن وقت کی گلی کی وجہ سے طویل محسوس ہوا۔ تقریباً پانچ چھ منٹ کے وقفے سے انہوں نے ایک نوجوان لڑکے کو گلی میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ وہ موٹر گاڑی پر بات کرتا ہوا آ رہا تھا اور اتنا مگن تھا کہ ان دونوں کی موجودگی پر توجہ بھی نہیں دی تھی۔ انہوں نے اسے اپنے قریب سے گزر کر دو قدم آگے نکلنے دیا پھر ایسی پھرتی سے اس پر حملہ آور ہوئے کہ بے چارے کو آواز نہ نکالنے کا بھی موقع نہیں ملا۔ عالم شاہ نے موٹر گاڑی کے ہاتھ سے گرنے سے قبل ہی بچھٹ لیا۔ سلسلہ منقطع نہیں ہوا تھا اور دوسری طرف سے ایک نسوانی آواز آرہی تھی۔

”اچھی طرح کان کھول کر سن لے انیس! اس بار میں اماں کے ساتھ آؤں تو تو مجھے گھر پر ہی ملتا۔ اماں کی مامی سے جتنی نہیں ہے اور وہ میرے بڑے مٹیس تر لے کر نے پر نہ رکھ آؤں۔“ انہوں نے کہا۔

آؤں اور آگے سے ٹوٹی غائب ہو تو پھر آنے کا فائدہ ”یہاں بدل جانے والی صورت حال سے بے خبر وہ اپنی بولے جا رہی تھی۔ عالم شاہ نے دل ہی دل میں اس سے معذرت کرتے ہوئے لائن کاٹ دی اور تیزی سے اپنا مطلوبہ نمبر ڈائل کیا۔ دو منٹوں کے بعد کال ریسپونڈ کی گئی اور کچل کی آواز سنائی دی۔

”سوال جواب کا وقت نہیں ہے کچل۔ فوراً کال کر اور بند سے لے کر میرے پاس پہنچو۔“ اس نے کچل کو ہدایت دیتے ہوئے اس علاقے کے بارے میں بتایا جہاں وہ اس وقت موجود تھے۔

”جو ختم سماجیں!“ اس کے لہجے نے کچل کو حیرت کا اظہار کرنے کا بھی موقع نہیں دیا۔

”نی الحال ہمارا اسی نمبر پر رابطہ رہے گا جس سے میں تمہیں کال کر رہا ہوں۔ اپنے فون پر دھیان رکھنا۔“ اس نے کچل کو تاکید کر کے سلسلہ منقطع کر دیا۔ اتنی دیر میں سرمد لڑکے سے فارغ ہو چکا تھا۔ لڑکے کو بے ہوشی کی حالت میں فیکٹری کی دیوار کے ساتھ لٹا دیا تھا اور اس کے پاس موجود

”میں نے کچل سے آنے کا کہہ دیا ہے لیکن وقت کم ہے۔ اتنی جلدی وہ پہنچ نہیں سکے گا۔ ہم ٹیکسی آرہے کر لیتے ہیں۔“ بولنے کے ساتھ ہی وہ ایک ٹیکسی کی طرف بڑھ گیا۔ سرمد نے اس کی تقلید کی۔

”ہاں بھائی چلو گے؟“ ٹیکسی کے قریب پہنچ کر اس نے میسے کپڑے سے دندا اسکرین چکانے کی کوشش میں مصروف تھیں پینتیس سالہ ذرا نیور سے پوچھا۔

”ضرور۔“ لیکن اس کے جواب دینے سے قبل ہی وہ ہچکلی نشست پر بیٹھ چکے تھے۔

”کہاں جانا ہے؟“ ذرا نیور نے کپڑا جھٹک کر کندھے پر ڈالا اور ان کی جسارت پر انہیں گھورتے ہوئے قدرے ناراض لہجہ میں بولا۔

”ناراض نہ ہو بھائی۔ منہ مانگا کرایہ دیں گے۔ یہ لو پانچ سو ایڈوانس رکھ لو۔“ سرمد نے اسے منانے والے انداز میں کہا اور سزاوٹ انداز کے ہاتھ سرکھ دیا۔ نوٹ دیکھ

TAGPK.COM

کر کے اسے اپنی روانگی سے آگاہ کیا۔ اس کے بعد وہ وقفے وقفے سے میسج کے ذریعے اسے اپنی لوکیشن سے آگاہ کرتا رہا۔ اچھی بات یہ تھی کہ ناز و اپنی ناراضگی کا اعلان کرنے والا میسج کرنے کے بعد اب چین سے بیٹھ گئی تھی اور اس کی کالز آنے کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔ تقریباً پچیس منٹ کا سفر طے ہوا تھا کہ چلنے نے اپنے نزدیک پہنچ جانے کی اطلاع دی۔ عالم شاہ نے اس ٹیکسی کی نشاندہی کی جس میں وہ سفر کر رہے تھے۔ ابھی وہ رش والی سڑک سے گزر رہے تھے اس لیے ٹیکسی چھوڑنے کے بجائے اس نے چل کر اپنے پیچھے آنے کا حکم دیا۔ سفر اپنی مخصوص رفتار سے جاری رہا۔ آخر وہ پرجھوم سڑک کو چھوڑ کر ایک ایسی سڑک پر آگئے جہاں ٹریفک کم تھا اور بہت دور تک سڑک سیدھی چلی جا رہی تھی۔

”ٹیکسی روک لو۔“ عالم شاہ نے ٹیکسی ڈرائیور کو حکم دیا۔ اس ٹیکسی کے ایک سائڈ پر رکستے ہی چل کی گاڑی ان کے قریب آکھڑی ہوئی۔ اس گاڑی میں چل اکیلا تھا جبکہ اس کے پیچھے رکنے والی گاڑی میں چار مسلح بندے دکھائی دے رہے تھے۔ عالم شاہ کے حکم پر چل نے چند نیلے نوٹ

پیش کر دیے۔ ڈرائیور نے ان نوٹوں کو دیکھا اور یہ سوچا کہ اس علاقے میں جہاں بے رحمی ہے وہاں بھی اسے ہراساں کیا جائے گا۔ اس نے نوٹوں کو واپس لے لیا اور گاڑی کو روک دیا۔ اسے ہم نے بے ہوش کر کے بسکٹ فٹبلی کی پچھلی گلی میں ڈالا تھا۔ اس حوالے سے تلاش کرو گے تو جلد مل جائے گا۔“ عالم شاہ جو ٹیکسی میں بیٹھے بیٹھے ہی سارا کال ریکارڈ اور میسجز ڈیلیٹ کر چکا تھا، موبائل ڈرائیور کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا تو اس نے جلدی سے اثبات میں گردن ہلا دی۔ قیمتی گاڑیوں اور مسلح افراد نے اسے باور کروا دیا تھا کہ عام سے چلیے میں ملنے والے یہ لوگ ”عام“ بہر حال نہیں ہیں۔

”دھوکے کا مت سوچنا۔ یہ موبائل نمبر ہمارے پاس ہے۔ ہم خود چیک کر لیں گے کہ رقم اور موبائل انہیں تک پہنچے یا نہیں۔“ اس نے ڈرائیور کو دھمکانا ضروری سمجھا۔

”دھوکے کا سوال ہی نہیں ہے مائی باپ۔“ ڈرائیور نے یقین دہانی کروائی تو وہ سرمد کے ساتھ چل والی گاڑی میں جا بیٹھا۔ باؤل اور کنشیز والے قافلے کو کھودینے کا کوئی ڈر نہیں تھا۔ ان کی رفتار زیادہ نہیں تھی جبکہ ان کے پاس بہترین گاڑیاں موجود تھیں۔ یہ گاڑیاں ایک بار پھر اشارت

کر وہ نرم پڑ گیا لیکن مصنوعی سختی سے بولا۔

”اپنے کو کسی پھنے میں پڑنے کا نہیں ہے۔ کوئی گڑبڑ والی بات ہے تو پھوٹ لو یہاں سے۔“

”کوئی گڑبڑ نہیں ہے یار! تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ بس تھوڑی دیر کا کام ہے۔ تھوڑی دیر میں ہی تم دن بھر کی دہاڑی سے زیادہ کمالو گے۔“ سرمد نے اسے لالچ دیا تو وہ ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ہو گیا۔ اس دوران عالم شاہ نے کوئی بانجوس بار بجتے والا فون جھنجھلا کر بند کیا۔ فون کی اسکرین پر ناز و کا نام آ رہا تھا اور یقیناً یہ وہی تھی جو فون کے مالک انہیں کو اپنی آمد کی اطلاع دے رہی تھی کہ اچانک عالم شاہ نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

”کہاں چلتا ہے؟“ ڈرائیور نے انکیشن میں چابی کھماتے ہوئے دریافت کیا۔

”تھوڑا دُور پھر بتاتے ہیں۔“ عالم شاہ نے اسے جواب دیتے ہوئے باؤل کی گاڑی کی طرف نگاہ ڈالی۔ باؤل گاڑی سے ٹیک لگائے سگریٹ پی رہا تھا اور اس کے قریب ہی ایک دوسرا بندہ کھڑا ہوا تھا۔ ڈرائیور اس کے نظروں سے گزرا۔ پھر دوسری گاڑی میں نظر اٹکایا جس کے بارے میں اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اس میں باؤل کے آدمی موجود ہوں گے۔ وہ تین منٹ کے بعد گزرتے تو باؤل نے ہونٹوں میں دبا سگریٹ کھال کر سڑک پر پھینکا اور اپنی گاڑی میں سوار ہو گیا۔ اس کے قریب کھڑا بندہ بھی بھاگ کر دوسری طرف سے فرنٹ سیٹ پر سوار ہو گیا۔

”تیار رہو۔“ عالم شاہ نے سرگوشی میں ڈرائیور کو ہدایت دی۔ اس نے انجن اسٹارٹ کر دیا۔ سڑک پر رواں ہوئی ٹریفک کے درمیان جیسے ہی ایک کنشیز بردار ٹرانسموڈار ہوا، باؤل کی گاڑی نے حرکت کی۔ ساتھ ہی ایک دوسری گاڑی بھی حرکت میں آئی۔ ایک گاڑی کنشیز بردار ٹرانس سے آگے نکل گئی جبکہ باؤل کی اور دوسری گاڑی نے کنشیز کے پیچھے چلنا شروع کر دیا۔

”چلو۔“ اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو ہدایت دی۔

”میں ایک بار پھر بتا رہا ہوں کہ کوئی ٹھوٹا نہیں ہونا چاہیے۔“ ڈرائیور رقم کے لالچ میں تو آگیا تھا لیکن ڈرا ہوا بھی تھا۔

”کہہ دیا نا کہ کچھ نہیں ہوگا۔ بس تمہیں ڈرا ہوشیاری سے اس گاڑی کے پیچھے چلنا ہے۔ درمیان میں ہو سکتا ہے ہمارے ساتھ ہی جو انجن کر لیں تو ہم تمہیں فارغ کر دیں گے۔“ عالم شاہ ڈرائیور کو دھمکانا سنا۔

کہ نض و صحوں اور گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی۔
 حما کے اتنے شدید تھے کہ گنتا تھا کسی دشمن کی فوج نے حملہ
 کر دیا ہو۔ گاڑیاں چلانے والوں کے ہاتھ اسٹیرنگ و ہیل
 پر جکٹنے لگے اور یہ مشکل انہیں قابو کر کے وہ بریک لگانے پر
 مجبور ہو گئے۔ سواروں نے جھکوں سے شعل کر حواس قابو
 میں آنے پر اپنے سامنے دیکھا تو منظر پر دھوئیں اور آگ
 کے شعلوں کی صحرانی تھی۔

☆☆☆

معاذ نے اپنے برابر میں ڈرائیونگ سیٹ پر براہیمان
 ہستی کو دیکھا۔ اس نے بے حد جست چنٹ ثرٹ ہمکن رچی
 تھی جس نے اس کے دلغریب شیب و فراز کو مزید واضح
 کر دیا تھا۔ اسے شہد آگس بالوں کو پونی ٹیل کی شکل میں
 جکڑے، سر پر بھی لی کیپ اور آنکھوں پر چڑھے براؤن
 سن گلاسز کے ساتھ وہ کوئی اسپورٹ رلنگ رسی تھی لیکن وہ
 اس ہستی کو ایک خاتون خانہ کی حیثیت سے جانتا تھا۔

”ریڈی؟“ اس نے اپنے لپ اسٹک سے بے
 نیاز گلابی ہونٹوں پر مسکراہٹ سجا کر دریاخت کیا تو معاذ جنھن
 سر ہلا کر دیکھا۔ اس کی اصل شکل کتنی ہی خطرناک تھی
 کے جانے کی۔ پر جاری۔
 ”گنڈ“ اس نے کہا اور گاڑی حرکت میں لے
 لی۔ معاذ اسے دیکھتا رہ گیا۔ بالی ہارور اس سے ملتا تھا وہ
 اسے ایلٹ کلاس کی روائتی ”جیم صاحبہ“ کے روپ میں ملی
 تھی۔ ہاروری ڈرائیور اور پرسنل سیکریٹری کی ”چھاؤں“ میں
 گاڑی کی پچھلی نشست پر آرام سے سفر کرنے والی۔

کروفر سے شاہانہ زندگی گزارنے والی مسز سونیا
 ورا ب خان اور اس مہم جوئی کے درمیان کیا نکل تھا، وہ
 رات سے اب تک تلاش نہیں کر سکا تھا۔ وہ اپنے کمرے
 کے دروازے پر اسے دیکھ کر ہی انگشت بدنداں رہ گیا اور
 جب اسے پتا چلا تھا کہ نئے سوئے گئے مشن میں سونیا خان
 اس کی پارٹنر ہوئی تو اس کی حیرت سوا ہو گئی تھی۔

”جیسے تمہاری مجبوری نے تمہیں ان لوگوں کے ساتھ
 کام کرنے پر مجبور کر دیا ہے، میں بھی اپنی مجبوری کی
 زنجیروں سے جکڑی ہوئی ہوں۔“ اس کے استغراق کا پس اتنا
 ہی جواب دیا گیا تھا اور ہر طرح کی وضاحت آئندہ بھی کے
 لیے اٹھا کر رکھ دی گئی تھی۔

”موقع ملنے پر میں خود جہیں اپنے بارے میں سب
 کچھ بتاؤں گی لیکن ابھی وقت کم ہے اور ہمیں اپنے مشن پر
 توجہ دینا ہے۔“ معاذ نے کہا اور کمر جملہ کر دیا۔

کے سوالوں کا راستہ مسدود کر دیا تھا اور پھر وہ من کر اس
 منصوبے کو ڈسٹس کرتے رہے تھے جس پر انہیں کام کرنا
 تھا۔ پورا منصوبہ قائل کرنے کے بعد آرام کے ایک من سب
 وقفے کے بعد اب وہ اپنے مشن پر روانہ ہو چکے تھے۔
 مہارت سے گاڑی چلاتے ہوئے سونیا مسلسل اپنے
 ساتھیوں سے رابطے میں تھی۔ اسے ہل چل کی خبریں رسی تھی
 اور وہ معاذ کو بھی ان سے آگاہ کرتی جا رہی تھی۔

”ہمیں اس سڑک پر گھات لگانا ہے۔“ اس نے
 گاڑی تعمیرانی سامان کے ایک ڈھیر کے قریب روکتے
 ہوئے کہا تو معاذ سر ہلا کر رہ گیا۔ اس طویل اور اہتر حال والی
 سڑک کا انتخاب قابل فہم تھا۔ زمانے سے اس سڑک پر
 تعمیراتی کام جاری تھا اور حمل ہونے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔
 حکمرانوں کا دعویٰ تھا کہ اس منصوبے کے مکمل ہونے کے بعد
 دوسری متعل سڑکوں پر ٹریفک کا دباؤ کم ہو جائے گا لیکن فی
 الحال تو یہ صورت حال تھی کہ اس راستے سے گزرنے والوں
 کو شدید دشواری کا سامنا کرنا پڑتا تھا اس لیے لوگ کم ہی
 اس راستے کا رخ کرتے تھے۔

”یہاں سے پتا چلتا ہے۔“ اس نے ایک تھلا اور
 رسی سے لپکتی تھی۔ معاذ نے بھی اس کی تھلیدی۔
 اس کی پشت پر لپکیٹ ایک تھلا موجود تھا۔ دوروں ہی
 تھلا چھتے میں دیت اور کٹھنٹ کے لیے ڈھیر کے نیچے
 چھپ گئے۔ کام کا سلسلہ رکا ہوا تھا اس لیے وہاں مزدور
 وغیرہ موجود نہیں تھے اور آٹا ڈکا گزرتی گاڑیاں ہی دکھائی
 دے رہی تھیں۔ اپنی جگہ پر دیکھا ان گاڑیوں کو دیکھا ہوا وہ
 اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ آج کے اس مشن میں
 عام شہریوں کو کتنا نقصان اٹھانا پڑے گا۔

”ریڈی؟“ وہ لوگ پہنچنے والے ہیں۔“ سونیا نے
 سر جوشی کی تو اس کا جسم تن گیا۔ گلے میں لنگی دور بین آنکھوں
 سے لگا کر اس نے سڑک کے اس جانب دیکھا جہاں سے
 مظلوم گاڑیوں کو آتا تھا۔ سب سے پہلے اسے ایک شدید زور
 ٹرک دکھائی دیا۔ ٹرک پر لکڑی کا کچھ فرنچیز لوڈ تھا اور اگلے
 حصے میں ڈرائیور کے ساتھ صرف ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس
 سے چند گز کے فاصلے پر ہی ایک لینڈ کروزر چلی آ رہی تھی اور
 اس کے پیچھے وہ کنفیٹ تھا جس پر انہیں قبضہ کرنا تھا۔

”ایک۔“ سونیا خان کسی کمانڈو کی طرح پھنکاری
 اور وہاں گویا قیامت برپا ہو گئی۔ معاذ کا اپنا ہاتھ بھی مشینی
 انداز میں حرکت میں آیا۔ اس نے کوشش کی تھی کہ براہ
 راست لینڈ کروزر کو نشانہ بنائے اور اس کے آگے چلنے والا

TAGPK.COM

یہاں آئے تھے اس کے بارے میں سوال کرنے کی چند اس ضرورت نہیں تھی۔ معلوم تھا کہ انہیں بھرپور رکوردینے والے پیچھے سارے معاملات سنبھال لیں گے۔ ان کا کام بس مہارت سے فرار ہونا تھا اور وہ یہ کر سکتے تھے کہ فضا میں جتنی دہشت پھیل چکی تھی اس کے بعد کسی کا اس طرف رخ کرنا ممکن نہیں تھا۔ ان کا سفر بھی زیادہ طویل نہیں تھا۔ اس سڑک سے نکل کر انہیں ایک ذیلی سڑک پر مڑنا تھا جس کے بعد شہر سے گندے پانی کی نکاسی کے لیے استعمال کی جانے والی ایک ندی تھی۔ خاصے چوڑے پاٹ کی اس ندی پر مضبوط پل بنایا گیا تھا۔ پل کے پار دائیں جانب مڑنے پر صنعتی علاقہ تھا اور انہیں ”مال“ وہیں ایک بڑے گودام تک پہنچانا تھا۔

مہارت سے اسٹیزنگ سنبھالے معاذ طے شدہ روٹ پر چلتا چلا جا رہا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس مہم میں اس کی حیثیت ایک پرزے سے زیادہ نہیں تھی اور پوری مہم اس کے حوالے کرنے کے بجائے بس محدود کام لیا جا رہا تھا۔ سابقہ تجربات کے بعد اس سے کام لینے والے ہوشیار ہو گئے

تھے اس لیے انہوں نے نقصان سے بچنے کا حکم کر لیا تھا لیکن وہ طے کر چکا تھا کہ اس بار کسی انہیں رُک نہ پھرانے کا ارادہ نہ ہو گا۔ اس لیے اسے اس کنٹینر سے معمول تک دور رہنے سے منع کیا گیا تھا کہ وہ بھی دل کے نہیں چاہتا تھا کہ اتنے بہت سے ہتھیار کسی سیاسی جماعت کے ہاتھ آئیں اور وہ ان کے زور پر ملک میں غنڈا گردی چاکر رکھے لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ وہ اس اسلحے کو لے جا کر ملک دشمن عناصر کے سپرد کر دیتا۔ اس نے اس کنٹینر کو ٹھکانے لگانے کا محکم ارادہ کر لیا تھا اور اس کے لیے اسے زیادہ محنت نہیں کرتا تھی۔ جیسے ہی وہ پل پر پہنچے تو ٹرالر کا رخ موڑ دیتا اور اسلحے سے بھرا کنٹینر ٹرالر کے ساتھ ندی میں جا گرتا۔ وہ جانتا تھا کہ اس صورت حال میں اس کے بچنے کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں لیکن اپنے وطن کی خاطر اسے یہ قربانی دینی ہی تھی۔

”بس یہاں روک لو۔“ ابھی وہ پل پر چڑھے نہیں تھے کہ سونیا خان نے حکم صادر کیا۔ وہ ہاتھ میں کلاشنکوف تھامے پورے راستے نہایت چوکنی بیٹھی رہی تھی اور اچانک ہی اسے حکم دے کر حیران کر دیا تھا۔

”یہاں...؟“ اس نے حیرت کا اظہار کیا کیونکہ ابھی تو منزل دور تھی۔

”...؟“ اس نے حیرت کا اظہار کیا کیونکہ

شہ زور سلامت نکلنے میں کامیاب ہو جائے لیکن وقت کے اس لمحے میں اس پر انکشاف ہوا کہ وہاں وہ صرف دو حملہ آور نہیں ہیں۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے کسی سمت سے ایک وینڈ گرینیڈ آیا اور سیدھا شہ زور سے ٹکرایا۔ اپنی رفتار سے جاتا شہ زور یوں اچھلا جیسے پلاسٹک کا کوئی کھلونا ہو۔ یہ کھلونا دیکھتے ہی دیکھتے اپنے سواروں اور سامان سمیت ٹکڑوں میں بکھر گیا۔ وہاں وینڈ گرینیڈ کے علاوہ راکٹ لانچر بھی چل رہے تھے اور بھاری ہتھیاروں سے فائرنگ بھی کی جا رہی تھی۔ لینڈ کروزر اچھا خاصا نقصان اٹھانے کے بعد دائیں جانب گھوم گئی تھی اور سڑک سے ذرا ہٹ کر ترچھی کھڑی تھی۔ اس کے سواروں میں سے چند ایک کو بھاگ نکلنے اور ان ہی کی طرح پناہ۔۔۔ لینے میں کامیابی حاصل ہو گئی تھی اور اب وہ آڑ میں چھپے جوابی وار کر رہے تھے۔ وہ بھی بھاری ہتھیاروں اور بارود سے لیس تھے اس لیے ان کا دفاع اتنا کمزور نہیں تھا۔ دو وینڈ گرینیڈ تو ان کے خاصے قریب آ کر گرے اور روڑی اور پتھروں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی ان پر برسات سی ہو گئی۔

سونیا خان بھی تو وہ وقت میں آیا۔ اس کی ہڈیوں پر روک جانے والا کنٹینر بردار ٹرالر تھا جس کا راکٹ اور اسے چلا کر بھاگ نکلے تھے اور سارا ہتھیار میدان کارزار میں کھپا ہوا تھا۔ ٹرالر نے مستحکم بھی قیامت مچائی ہوئی تھی اور پیچھے آنے والی گاڑی مکمل طور پر تباہ کر دی گئی تھی۔ جتنی ہوئی گاڑی سے شعلے بلند ہو رہے تھے اور پیچھے آنے والا ٹریفک رُک گیا تھا۔ بہت ممکن تھا کہ بد قسمت شہ زور کی طرح پیچھے بھی کسی گاڑی کو نقصان پہنچا ہو لیکن معاذ کے پاس دیکھنے کی فرصت نہیں تھی، اسے احکامات پر عمل کرنا تھا اور طے شدہ منصوبے کے مطابق وہ چیتے کی سی پھرتی اور ہوشیاری سے کنٹینر بردار ٹرالر کی طرف بھاگ رہا تھا۔ سونیا خان اسے بھرپور رکوردیتی ہوئی اس کے پیچھے تھی۔ چند گولیاں سنسناتی ہوئی اس کے قریب سے گزریں لیکن فوراً ہی MG3 کا قبضہ گولیاں اور مقابلہ واضح طور پر پسپا ہوتے محسوس ہوئے۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کی لائسنس میں ان کا ساتھ دینے کے لیے آنے والوں کی کسی گاڑی پر یہ ہلاکت خیز ہتھیار نصب ہے جس نے مزاحمت کرنے والوں کا زور توڑ دیا ہے۔ وہ لپک کر ڈرائیونگ سیٹ پر پہنچ گیا۔ دوسری طرف سے سونیا خان بھی اوپر چڑھا آئی۔

”سہیل۔“ اس کی آواز پر وہ کسی مشین کی طرح حرکت

م آواز کی مشین... ہمارے ساتھ... جیسے...

”بس کیوں رہے ہو؟“ سلطان نے بھی اس کی فہمی میں طنز کی آمیزش کو محسوس کر لیا تھا اس لیے پست کر مشکوک نظروں سے گھورتا ہوا پوچھنے لگا۔

”اپنی بے وقوفی پر فہمی آگئی تھی۔ وہ ادھر لیدرز کپڑوں کے سیشن میں ریڈنی شرٹ والی ٹوکی کو دیکھو۔ اسے دیکھ کر مجھے ایسا لگا کہ رقامہ لیلیٰ ہے۔ سچ ایسی زبردست چیز تھی کہ حواسوں پر طاری ہوگئی اور اب ہر ٹوکی پر اس کا گمان ہوتا ہے۔“ وقاص نے اس کی توجہ ایک طرح دار حسینہ کی طرف مبذول کروائی تو سلطان سب بھول کر اس طرف متوجہ ہو گیا پھر دبے دبے جوش سے بولا۔

”کوئی غلط فہمی نہیں ہے ادے۔ وہ سچ کچ لیلیٰ ہی ہے۔“
 ”نہیں بھائی، وہ کیسے ہو سکتی ہے؟“ وقاص نے بھرپور بے یقینی کے اظہار کے لیے ہونق سی شکل بنالی۔
 ”مجھے یقین نہیں تو آ، ابھی چیک کر لیتے ہیں۔“ لیلیٰ کو سامنے پا کر سلطان کے لیے خود پر قابو پانا مشکل تھا۔ اس رات تو وہ نئے کی زیادتی کی وجہ سے کسی لائق نہیں رہا تھا لیکن کئی بار وقاص کے سامنے لیلیٰ سے دوبارہ ملاقات کی

بریک لگا تا پڑے۔
 ”نیچے اترو۔“ سونیا خان نے نیا حکم دیا تو اسے اس پر بھی عمل کرنا پڑا کیونکہ اس کا انداز ایسا تھا جیسے حکم عدوی کی صورت میں کوئی بھی مار سکتی ہے۔ وہ اترا تو اس کے پیچھے وہ بھی چھا، ایک مار گزرتی۔ اسی وقت وہاں وہ گاڑی آکر رک گئی جس میں وہ قبل ازیں سفر کرتے رہے تھے۔

”آؤ ہم اپنی گاڑی میں چلتے ہیں۔ آگے کا کام یہ لوگ پورا کر لیں گے۔“ گاڑی سے مضبوط کاٹھی کے دو سرج بندے برآمد ہوئے اور سونیا نے سسکراتے ہوئے اس سے کہہ کر گاڑی کی طرف قدم بڑھائے۔ چارونا پورا اسے چروٹی کرنا پڑی۔

واپسی کے سفر میں وہ خود سے پوچھ رہا تھا۔ ”میرا اس مہم میں کیا کردار تھا؟“
 ”کچھ نہیں۔ بس تمہیں بتایا گیا ہے کہ تم ان کے لیے ایک کٹھ پتلی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے اور تمہاری تمام تر عزائم کے باوجود یہ لوگ تمہیں اپنے اشاروں پر چل سکتے ہیں۔“ اس کے اندر سے آنے والا جواب بڑا مایوس کن اور

”جسٹس“ کا جو منہ دیتی میں آتا۔ وہ دنیا میں کسی نہیں تھا۔ میں تو بہت پرانی شاپنگ لریٹا وہاں کی کسی چار مہینے آرام سے نگل جاتے ہیں۔“ اپنے سے لی ٹرنس منتخب کرتا سلطان بڑے شاہانہ لہجے میں اسے بتا رہا تھا۔

”اپنی اسکی کوئی بھنٹیل نہیں ہے یار! جہاں جو ملے، پہن کر گزارہ کر لیتے ہیں۔“ جو اب اس کا انداز بے نیازانہ تھا۔
 ”یہ سارا کلاس کا چکر ہوتا ہے۔ مجھے محسوس ہے تمہیں پیسے کی کوئی کمی نہیں ہے لیکن تم لالہ بیسی کے سے کام کر رہے ہو اور وہ بندہ بہت اچھا کھانے، پہننے اور انگریزی بولنے کے باوجود کہلاتا ایک دادا ہی ہے۔ میرا معاملہ تم سے مختلف ہے۔ میرے ذہن کی ملک میں ایک بچپن اور حیثیت ہے اور ان کے حوالے سے مجھے بھی جانا جاتا ہے اس لیے مجھے اپنی ڈریسنگ کی فکر کرنا پڑتی ہے۔“ سلطان کا جوابی تبصرہ اچھا خاصا ہنک آمیز تھا لیکن وہی ہنس پڑا۔ ہنسنے کی وجہ سلطان کا انتخاب تھا۔ اس کی منتخب کردہ لی ٹرنس پر یا تو عریاں عورتوں کی تصویریں پرنٹ تھیں یا نئے سیدھے جانور بنے ہوئے تھے۔ ایک لی ٹرنٹ پر تو اتنے رنگوں کی پستی رہزنگی تھیں کہ ان کا شمار مشکل ہو گیا تھا اور ایسی بے ڈھنگا اشاعت سے سلطان اسے ”کافر“ کا فرقہ قرار دیتا تھا۔

”بے یقینی نہ کرو ادیتا۔“ اس نے جواب دیا۔
 ”چلو اس ہر بار مجھے کون سے مسئلے کی بات ہے۔“
 ”میں ہوتی تو یہی کہہ سکتا کہ تم کو یہاں کے مسئلے کی پوری طرح ترنگ میں آچکا تھا، سو بڑے اعتماد سے اس بڑی کی طرف بڑھا جو ان سے بے خبر مختلف ملبوسات نکال نکال کر دیکھ رہی تھی۔

”بیو! اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو یقیناً آپ مس لیلیٰ ہیں۔“ ٹوکی کے قریب جا کر سلطان نے بڑے اسٹائل سے اسے مخاطب کیا تو وہ چونک کر ان کی طرف متوجہ ہوئی اور خشکیوں لگا ہوں سے گھورنے لگی۔

”سوری! ہمیں شاید غلط فہمی ہوئی ہے۔ اصل میں آپ مس لیلیٰ سے بے حد مشابہ ہیں اس لیے ہم ڈرا ایکساٹنڈ ہو گئے تھے۔“ اس کے انداز پر وہی نے معذرت کرنے میں پہل کی۔

”اُس او کے نہیں یقین جانے مجھے خود آپ کی مس لیلیٰ سے ملنے کی شدید خواہش ہوئی ہے۔ جب سے دہائی آئی ہوں یہ تیسرا واقعہ ہے کہ کسی کو مجھ پر مس لیلیٰ کا گمان ہوا ہے۔“ ٹوکی نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا تو اس کے چہرے کے تاثرات نرم پڑ چکے تھے اور انداز دوستانہ تھا۔
 ”آ۔۔۔ اور مس لیلیٰ، میڈم، انیس، میں کا ہی فرق

TAGPK.COM

دینے میں پہل کر رہا تھا۔ شاپنگ مال سے نکل کر وہ لڑکی کے بتائے ہوئے ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں تعارف کے مراحل بھی طے کر لیے گئے۔ لڑکی نے اپنا تعارف میری کے نام سے کروایا جو اس کے مطابق مریم کی مختصر شکل تھی۔

”پہلے کچھ بتیے ہیں پھر مزید باتیں کریں گے۔“ ہوٹل کے کمرے میں پہنچ کر میری نے کہا اور ایک کونے میں بنے بار کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے نہایت مشاقی سے جام تیار کیے اور دونوں کے سامنے رکھ دیے۔ سے نوشی کے ساتھ کپ شپ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ خود اس نے سوفٹ ڈرنک لی تھی۔

”میں رات سونے سے پہلے بس ایک پیگ لیتی ہوں۔“ اپنے بارے میں اس نے پہلے ہی اطلاع دے دی لیکن خود حساب کتاب سے بچنے والی پلانے کے معاملے میں بڑی فراخ دل تھی۔ وہ تو بہت آہستہ آہستہ چسکیاں لے رہا تھا لیکن سلطان شوقین تھا اور ساقی کمری کے فرائض بھی ایک حینہ انجام دے رہی تھی اس لیے اس کے بار بار جام بھر دینے پر انکار کرنے کے بجائے پتا چلا جا رہا تھا۔ ہر سے نوشی کی طرح اس کا خیال تھا کہ وہ لی کر بیٹھنے والوں میں سے نہیں ہے لیکن اس کی حالت۔۔۔ پیدا ہوئے بغیر نے بتا دیا تھا کہ وہ آہستہ آہستہ اس کھور ہے۔ اس کی سرخ آنکھیں اور زبان نے دور آ کر لڑکھا۔ اس نے بڑھ جانے والا نئے کا ثبوت تھے۔ اپنی حالت سے بے خبر وہ خوب چپک رہا تھا۔ اسے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ گنگوکار خ جان بوجھ کر ایک خاص ڈھب پر موز دیا گیا ہے۔

”مرد کو بہادر اور مضبوط ہونا چاہیے۔ مجھے تو وہی مرد پسند ہیں جو کسی کو خاطر میں نہ لائیں اور اپنے مخالفین کے پر نچے اڑا کر رکھ دیں۔“ میری کے بے نیازی سے بال جھٹک کر میری ہوئی بات پر وہ ایسے پھول سا گیا اور قہقہہ لگا کر بولا۔

”اس کا مطلب ہے میں تمہارا آئینہ دل مرد ہوں کیونکہ میرے اندر یہ خوبیاں موجود ہیں۔“ اس جملے کو مکمل کرتے ہوئے اسے درمیان میں دو ہچکیاں آئی تھیں۔

”واقعی..... اپنی بہادری کا کوئی واقعہ سناؤ۔“ میری نے اشتیاق کا اظہار کیا۔

”کوئی ایک واقعہ ہو تو سناؤں۔ میں تو وہ بندہ ہوں جس نے کلاس ففٹھ میں ہی اپنے ایک کلاس فیلو کے دو دانٹ صرف اس وجہ سے توڑ دیے تھے کہ ایک دن وہ اس لڑکی کے ساتھ بیٹھ گیا تھا جو ہمیشہ میرے ساتھ بیٹھتی تھی۔“ اس کے لہجے میں اپنے لیے فخر تھا۔

ہوگا اس لیے کسی کا بھی غلط فہمی میں مبتلا ہو جانا میں ممکن ہے۔“ وہی نے ایک بار پھر وضاحت دی۔

”مشاعرہ ایسا ہی ہے۔ کل میں نے اپنی می کو کال کر کے پوچھا بھی تھا کہ کہیں میری کوئی جڑواں بہن تو نہیں تھی جو بچپن میں لم ہو گئی ہو۔ یہ سن کر مجھے بہت غصہ اور بولیں ہم اتنے کیر لیس پیرنٹس نہیں ہیں جو اپنے گنتی کے بچوں کو بھی گم کرتے پھر۔“ یہ بات بتاتے ہوئے اس کے انداز میں اتنی بے ساختگی تھی کہ وہی اور سلطان دونوں قہقہہ مار کر قہقہہ پڑے۔ پھر سلطان نے گنگوکار کے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

”آپ کہاں سے ہیں؟“

”جسٹسکی میرے پیرنٹس پاکستان کے رہنے والے ہیں لیکن ان کے پاس کینیڈا کی سٹیزن شپ ہے اور پچیس سال سے وہ وہیں رہ رہے ہیں۔ میں کینیڈا میں ہی پیدا ہوئی اور پٹی بڑھی تو آپ مجھے کینیڈین کہہ سکتے ہیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”گنڈ! کینیڈا بڑا خوب صورت ملک ہے۔ دو سال پہلے میرا وہاں جانا ہوا تھا تو میں نے بہت انجوائے کیا تھا۔“

”کینیڈا میں کس جگہ رہ گئے تھے آپ؟“ سلطان کے

پرانی نے اشتیاق سے پوچھا۔

”میرے خیال میں ہم نہیں۔“ اس نے بات کر لیتے ہیں اتفاق سے جس نے اپنی من گھڑیوں کو بے گناہ کر کے بات چیت کرنے کے بجائے اطمینان سے انجوائے کرنا چاہیے۔“ وہی نے درمیان میں دخل دیتے ہوئے تجویز پیش کی جس سے ان دونوں نے بھی اتفاق کیا۔

”یہاں قریب ہی ہوٹل میں میری رہائش ہے۔ کہیں اور بیٹھنے کے بجائے وہیں چلتے ہیں۔ ویسے بھی اب میرا شاپنگ کا موڈ ختم ہو گیا ہے۔“ وہ صرف صبیحہ ہی سے ماڈرن نظر نہیں آ رہی تھی، مزاجاً بھی بڑی ماڈرن تھی جو ایسے دو اجنبیوں کو جن کے ساتھ اس کا باقاعدہ تعارف بھی نہیں ہوا تھا، اپنے ساتھ اپنے ہوٹل لے جانے کے لیے تیار تھی۔

”کیوں نہیں۔ یہ تو ہمارے لیے ایک اعزاز ہوگا۔“ اس کی تجویز پر سلطان کی باجھیں کھل گئیں۔ اسے تو ایسی ہی بے تکلف خواہشیں بھاتی تھیں۔

”میں کیب منگواؤں یا آپ لوگوں کے پاس اپنی گاڑی ہے؟“ ان لوگوں کے ساتھ قدم آگے بڑھاتے ہوئے لڑکی نے دریافت کیا۔

”ہمارے پاس گاڑی ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔“ سلطان ہواؤں میں اڑ رہا تھا اور اس کی بات کا جواب

ہلاک کر کے آپ بہت بڑی مصیبت میں پڑ جائیں گی۔“
وقاص فوراً ہی اس کی راہ میں رکاوٹ بن گیا۔
”عرفان اللہ کو سبق ملنا چاہیے کہ جو دوسروں کو زخم
دیے ہیں خود انہیں بھی زخم پہنچے پڑتے ہیں۔“ وہ جذباتی
لہجہ میں بولی۔

”اس زخم کو ابھی آپ ادھار رکھیں۔ یہ دغی ہے۔
یہاں بندہ مار کر آپ خود بھی نہیں بچ سکیں گی اور ایسے غیر اہم
بندے کے پیچھے خود کو ضائع کرنا حماقت ہے۔ آپ نے خود
اس کی زبان سے سنا ہے کہ اپنے اہم معاملات کے بارے
میں اس کا باپ اس سے زیادہ باڈل کو اہمیت دیتا ہے اس
لیے بہتر ہے کہ اسے چھوڑ کر باڈل کی فکر کی جائے۔“ وہ کی نے
اسے عقل سمجھائی تو پمپل پر اس کے ہاتھ کی گرفت کمزور
پڑ گئی۔

باڈل..... باڈل کو تو وہ قبر تک نہیں بھول سکتی تھی۔ وہ
بندہ زہر بن کر اس کی رگ رگ میں دوڑتا تھا اور وہ یہ سارا
زہر اس کے وجود میں اتار کر ہی پُر سکون ہو سکتی تھی۔

☆☆☆

میں نے کہا کہ اسے ہی عالم شاہ نے چھٹا کر
دیا۔ اس کی لاش کا ساتھ دینے والے کو مارا اور اس کی لاشوں کا
سہارا جاری تھا ان تجسّس نے خطے سے بے نیاز کر کے
عالم شاہ کو آگے بڑھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ اور سرحد ملنے
احتیاط سے کام لیتے ہوئے جھجے جھجے سے آگے کی طرف
بڑھ رہے تھے۔ جاں نثار مسلح ساتھی بھی ان کے پیچھے تھے۔
”آپ پیچھے ہٹ جائیں سائیکل، ہم دیکھتے ہیں۔“
عالم شاہ نے اپنے جاں نثاروں میں سے کسی کی آواز سنی لیکن
اپنے قدموں کو نہ روک سکا۔ اتنا تو وہ سمجھ گیا تھا کہ باڈل
والے قافلے پر حملہ ہوا ہے اور باڈل کے ساتھی حملہ آوروں
کے خلاف مزاحمت کر رہے ہیں لیکن پھر بھی پتا نہیں کیا چیز بھی
جو اسے آگے بڑھنے پر مجبور کر رہی تھی۔ ان کی گاڑیوں کے
سوا جو گاڑیاں سڑک پر موجود تھیں، ان کے سوار حیرت سے
یہ دیوانگی دیکھ رہے تھے اور اپنی گاڑیوں کو واپس پلٹا کر اس
جگہ سے ہٹنے کی فکر میں تھے۔

”اس سے آگے جانا خطرناک ہو گا سائیکل۔“ وہ کافی
آگے نکل گئے تو سرحد نے عالم شاہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے روک
لیا۔ اس بار اسے رکنا پڑا۔ اس جگہ سے منظر کافی حد تک
واضح نظر آ رہا تھا اور وہ چند افراد کو متحرک دیکھ سکتے تھے۔ وہ
دو سیاہ پوش بھی فوراً ہی ان کی نظروں میں آ گئے۔ وہ ایک
دوسرے کے ساتھ تھے۔

”اتنی چھوٹی عمر میں ایسے تھے تو اب بندے کے
ساتھ کیا کرتے ہو گے؟“ میری نے ایسے سکاری لے کر
کہا جیسے وہ سلطان کی بتائی ہوئی بات سے بہت لطف اندوز
ہوئی ہو۔

”اب تو ہم سالم بندہ ہی غائب کر دیتے ہیں۔“ وہ
قبیلہ لگا کر بولا۔

”مس میری کو معاذ دانا قصہ سناؤ نا۔“ گفتگو میں
بہت ہی کم دخل دینے والے وہ کی نے اسے بڑھا دیا۔

”معاذ.....“ وہ ذرا سا چوکنا نظر آیا۔

”پلیز! بتاؤ نا، کیا قصہ تھا معاذ کا؟“ میری اس کے
برابر میں آئینشی اور اس کا بازو پکڑ کر کچھ ایسے لاڈ سے بولی
کہ اس کے سوچنے سمجھنے کی باقی ماندہ صلاحیتیں بھی جواب
دے گئیں اور وہ اپنے ذہن میں آنے والے اس سوال کو
بھول گیا کہ وہ کی کو معاذ کے بارے میں کیسے معلوم ہوا۔
ترنگ میں آ کر بتانے لگا۔

”وہ تھا سالہ..... ہمارا ایک یونیورسٹی فیلو۔ اس سے

ہمارا کچھ پھڑا پھڑا رہا تھا۔ سالے کو ایسے سبق دیے کہ تانی یاد

آگئی۔“ اس نے کہا۔ ”اب..... اپنی.....“

”اس کا نام.....“ اس نے کہا۔ ”اس کی زبان کی

”میرا.....“ اس نے کہا۔ ”اس کا بازو جھنجھوڑ ڈالا۔“

”م..... مجھے ٹھیک.....“ اس نے کہا۔ ”اس کا سودا کر لیا تھا۔“ اب اس کی آنکھیں بند
ہونے لگی تھیں۔

”کس سے سودا کر لیا تھا؟“ اس نے سلطان کے

رخسار پر ہلکے ہلکے ٹھانچے مارتے ہوئے اسے بے ہوش
ہونے سے روکا۔

”کہا نا..... نہیں..... معلوم..... ڈیڈ..... مجھے

سب..... نہیں بتا..... تے۔ اس کم..... م..... مینے باڈل کو

پتا.....“ وہ اپنا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی ڈھمکیا اور

میری پر آ کر گرا جس نے ایک ناگوار بوجھ کی طرح اسے خود

پر سے جھٹک دیا اور ہونٹ کانٹے ہوئے یوں کینے تو زلفروں

سے بے ہوش سلطان کو دیکھنے لگی جیسے ابھی کچا چنا جائے گی۔
چند پہل اسے صوفیوں کے بعد وہ تیزی سے مڑی اور ڈیسر
کی دراز کھول کر اس میں سے چھوٹا سا لینڈریز پمپل باہر نکالا۔
”نہیں مس بشری!..... میں آپ کو اس حماقت کی
احازت نہیں دوں گا۔ اسے بھول کر رکھیں۔“

Wide Range Of More
Than 100 Products

آفتاب قرشی

JOSHANDA

خالص اور قدرتی اجزاء سے تیار شدہ

TAGPK.COM



A Unani Product

Aftab Qasbi Dewakhana

Mariam Road, Jinnah 20250, Malindi Road, Dhaka, Bangladesh

Phone: 011-26281111, 011-26281112, 011-26281113, 011-26281114

اس وقت اس کی کیفیت عجیب سی تھی۔ معاذ کو اپنی نظروں سے زندہ سلامت دیکھ کر بھی جیسے یقین نہیں آ رہا تھا اور جو کچھ اسے کرتے ہوئے دیکھا تھا، وہ تو بالکل ہی ناقابلِ فہم تھا۔

”تھوڑی گڑبڑ ہے سائیں! بڑے شاہ سائیں یہاں پہنچنے والے ہیں۔“ سچل نے اسے مختصر جواب دیا۔

”کیا بابا سائیں کو میرے اور سرمد کے غائب ہونے کی خبر مل چکی ہے؟“ اس نے اندازہ لگایا۔

”وہ بار بار آپ سے بات کرنے کے لیے فون کر رہے تھے۔ میں بھی آپ کو تلاش کرنے میں ناکام ہو کر پریشان ہو گیا تھا اس لیے بڑے شاہ سائیں کے حکم پر زبان بند نہ رکھ سکا اور انہیں سب بتانے پر مجبور ہو گیا۔“ سچل نے شرمندہ سے انداز میں جواب دیا اسے سن کر عالم شاہ کے ہونٹ ہنسنے لگے لیکن سچل کو کچھ نہیں کہا۔ وہ سچل کی پوزیشن کا اندازہ کر سکتا تھا۔

”بابا سائیں کو فون کر کے اطلاع دے دو کہ ہم لوگ واپس آ گئے ہیں۔ اگر وہ ابھی روانہ نہیں ہوئے ہوں گے تو زحمت سے بچ جائیں گے۔“ کچھ دیر کے توقف کے بعد اس نے کہا۔

”مختصر جواب دے کر اٹھ گیا۔ اسے اس شاہ نے بیٹے کی خواہش کی خبر دینا وہ فی الحال مناسب نہیں سمجھ رہا تھا۔ اس کی اور سرمد کی حالت سے وہ اندازہ لگا چکا تھا کہ غیاب کے عرصے میں وہ کافی مشکل حالات سے گزر رہے ہیں اس لیے بہتر یہی تھا کہ پہلے انہیں کوئی پہنچ کر تازہ دم ہونے کا موقع دیا جائے پھر یہ بری خبر سنائی جائے۔ اچھا ہوا کہ عالم شاہ نے بھی اس کے بعد مزید کوئی سوال نہیں کیا اور وہ واپس کوئی پہنچ گئے۔

کوئی کے سہولیات سے لیس تاحہ روم میں بھرپور غسل کرتے ہوئے اس نے پہلی بار محسوس کیا کہ اللہ اس پر کتنا مہربان ہے جو اسے اتنی ڈھیروں نعمتوں سے نواز رکھا ہے۔ غسل کے بعد صاف ستھرا لباس پہن کر خود پر قیمتی پرفیوم چھڑکتے ہوئے وہ لاشعوری طور پر تید خانے کی اس بدبو سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا جو ابھی تک اعصاب پر بوجھ بنی ہوئی تھی۔ کراہیت کا یہ احساس ہی تھا کہ اتنے طویل قاتے کے باوجود اس نے کھانے پینے کے لیے بے تابی دکھانے کے بجائے غسل کو ترجیح دی تھی۔

تیار ہو کر وہ ڈائننگ ٹیبل پر آیا تو کھانا اس کا منتظر تھا۔ اس نے پہلے سے وہاں موجود سرمد کو بھی حکمانہ اسے ساتھ

ہوئے تھے۔ ان کا رخ کمنیہ بردار ڈرائر کی طرف تھا۔ پچھلا سیاہ پوش جس کی لہراتی پونی ٹیل اسے لڑکی ثابت کر رہی تھی، آگے والے کو بھرپور کور دے رہی تھی۔ آگے والا بھی جس انداز میں بھاگ رہا تھا، وہ اس کے نہایت تربیت یافتہ ہونے کا غماز تھا۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ ڈرائیور والے دروازے کے قریب پہنچ گیا۔ ان کے اور اس شخص کے درمیان دھوکے کی ہلکی سی چادر اب بھی موجود تھی لیکن عالم شاہ نے سائنل پوز کے باوجود اسے پہچان لیا۔

”معاذ...“ اس کے منہ سے نکلنے والی آواز کافی بلند تھی لیکن یہ ممکن نہیں تھا کہ قازمک کے شور میں معاذ کے کانوں تک بھی رسائی حاصل کر لیتی۔

”معاذ... وہ معاذ ہے سرمد!“ عالم شاہ جذباتی انداز میں چیخا لیکن وہ ڈرائیور تک سیٹ پر بیٹھ کر نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ اس کی ساتھی بھی اس کے ساتھ دوسری سیٹ پر بیٹھ چکی تھی۔

”معاذ صاحب یہاں کیسے ہو سکتے ہیں سائیں؟“ سرمد کو لگا اسے دھوکا ہوا ہے۔

”جیسے نہیں چاہیں مجھے بار بار پوچھ رہے ہیں کہ میں نے معاذ کو کہا۔ میں غلطی نہیں کی۔“ عالم شاہ اپنے موقف پر

اگر وہ معاذ صاحب بھی ہیں تو فی الحال ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ وہ لوگ روانہ ہو چکے ہیں اور ہمارے پاس ان کے پیچھے جانے کی گنجائش نہیں ہے۔“ سرمد نے اسے سمجھایا۔ اس کی بات غلط نہیں تھی۔ گریڈز کے استعمال کی وجہ سے ٹرار کے عقب میں سڑک پر بڑے بڑے گڑھے پڑ چکے تھے۔ اس کے علاوہ باؤل کے قافلے کی دو گاڑیاں بھی دھوا دھڑھل رہی تھیں۔ قازمک کا سلسلہ الگ ابھی مکمل طور پر ختم نہیں ہوا تھا۔ ایسے میں وہ کوئی عملی قدم کیسے اٹھا سکتے تھے۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ بدلنے لگا۔ حد آوروں نے راؤ فرا اختیار کی اور ٹرار اپنی عمومی رفتار کے مقابلے میں کہیں تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

”ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے سائیں! تھوڑی دیر میں پولیس یہاں پہنچ سکتی ہے۔ ہمیں خواخواہ کے جھنڈ میں نہیں پھنسا چاہیے۔“ سرمد کا مشورہ صائب تھا۔ عالم شاہ کو اس پر عمل کرنا پڑا۔

”ہمارے پیچھے سب ٹھیک رہا سچل! کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟“ عالم شاہ نے معاذ کی طرف سے دھیان

کرنے کے باوجود ”وہ اپنے عمل کی وضاحت دینا چاہتا تھا لیکن صداقت شاہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا اور بولے۔

”جو ہو چکا اس پر بات کرنا بے کار ہے۔ بہتر ہے کہ ہم موجودہ درجن سسٹم پر بات کریں۔“

”خیریت بابا سائیں؟“ وہ ان کی بات پر چونکا۔

”خیریت نہیں ہے۔“ انہوں نے یاسیت سے کہا اور پھر اس کے پیچھے گزری قیامت کی اطلاع دینے لگے۔

”میں سومرو کا پورا خاندان تباہ کر کے رکھ دوں گا۔“ یہ سن کر وہ سب توقع طیش میں آگیا۔

”یہ جوش نہیں، ہوش سے کام لینے کا وقت ہے پٹ۔“ صداقت شاہ نے اسے کھنایا اور سرمد کو اشارہ کیا کہ وہ اسے باقی تفصیل سے آگاہ کرے۔ اس نے قربان شاہ کی حویلی میں خدیجہ کی آمد، مشورے اور اس پر عمل تک کی ساری داستان سنا دی۔ (سرمد سمجھ گیا تھا کہ اپنی شناخت خاں بندہ کر کے اس کے حوالے سے ملنے والی نوکی خدیجہ تھی)۔ عالم شاہ نے جان کر تو حیران ہی رہ گیا کہ سومرو کی خفیہ

کے کا خیال کیا تھا۔

سومرو کی اور کارروائیوں کے بارے میں ہم نے اسے پیغام بھیجا ہے۔ اسے اسے خبر دے دیں۔

”صداقت شاہ کی والدہ ایڈمنسٹریٹو ہیں اور اس وقت تک سکون نہیں پاسکتا تھا جب تک بھیل کا بچہ اس کی واد میں واپس نہ پہنچ جاتا۔ اپنی پہلے ہی سے دہی بین کے س نئے دھک کو سوچ کر اس کے وجود میں طیش کی ہریر سی ابھر رہی تھیں جسے صداقت شاہ نے محسوس کر لیا اور تنبیہ کرنے والے انداز میں بولے۔

”ہم تم سے زیادہ تجربہ کار ہیں اس لیے بہتر ہے کہ اس معاملے کو ہمیں ہی دیکھنے دو۔ اس بار تمہارا خلاف ہدایت کچھ کرنا ہمارے نزدیک ناقابل معافی ہوگا۔“

انہوں نے ایک عرصہ سیاست کے میدان میں گزرا تھا سو حالات پر قابو رکھنا بھی جانتے تھے۔ عالم شاہ ان کے حتمی حکم کے آگے سر جھکانے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بس جینا ان کی حکمت عملی دیکھتا رہا۔ ناشتے کے گھنٹے بھر بعد ہی ایک مشہور سیاست دان کا صداقت شاہ کے پاس فون آ گیا۔

”لطیف سومرو کے بیٹے کو اغوا کر لیا گیا ہے، آپ کو اس بات کی خبر ہوگی؟“ ابتدائی رسمی کلمات کے بعد اس سیاست دان نے۔ مضامین چھیڑا جو اس وقت ان کے لیے

تھی قدر کرنا تو جانی تھا۔

کھانا تقریباً خاموشی سے کھایا گیا۔ سرمد شاید اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانے کی وجہ سے کچھ نفیوض تھا جو حد سے زیادہ سنجیدہ نظر آیا اور کھانا بھی اس نے نسبتاً کم کھایا تھا۔ خود عالم شاہ نے تو بہر حال بھرپور انصاف کیا اور اس سچم سیری نے اب تنگ کی تھکاوٹ اور بے آرامی کے ساتھ مل کر ایب کام دکھایا کہ وہیں بیٹھے بیٹھے اس کی پیٹیں جڑ سے لگیں۔

”آپ آرام کر لیں سائیں! بڑے شاہ سائیں کے پہنچ جانے کے بعد میں آپ کو اطلاع دے دوں گا۔“ سرمد نے اس کی حالت دیکھ کر مشورہ دیا۔

”تم بھی آرام کرو سرمد! تم بھی میرے جتنے ہی تھکے ہوئے ہو۔ مجھ سے نا، یہ سب دیکھ لے گا۔“ عالم شاہ نے اسے تاکید کی اور بھیل کی طرف دیکھا۔

”باکل سائیں! حاضر سائیں۔“ بھیل نے فوراً تاکید کی۔ عالم شاہ میں مزید جاننے کی ہمت نہیں تھی اس لیے فوراً ہی اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ٹوٹ کر آنے والی فینڈ نے اسے ایسا نفل کیا کہ پھر صبح ہی آنکھ کھلی۔ اس نے کچھ بڑبڑا کر ابا پر کھل کر اپنے کمرے میں آگئے کا کہ۔ وہ فوراً

حاضر ہو گیا۔

بابا سائیں! میں رات پہنچے ان کے آنے پر چونکا یا۔ یوں نہیں؟“ اس نے اس کی شکل دیکھ کر فحش کا اظہار کیا۔

”معافی سائیں! بڑے شاہ سائیں نے خود قسم دیا تھا کہ آپ کی فینڈ خراب نہ کی جائے۔ وہ ناشتے پر آپ سے مذاقات کر لیں گے۔“ بھیل نے ہاتھ جوڑ کر ناجوزی سے بتایا۔

”ٹھیک ہے۔ میں آتا ہوں۔“ اس نے ایک نظر گھونٹا اور بڑی اور جلدی بعدی سارے مراحل طے کرتے : کھانے میں پہنچ گیا۔ صداقت شاہ پہلے سے وہاں اس سے منتظر تھے۔ سرمد بھی حاضر تھا۔ اس نے اب سے صداقت شاہ کو سلام کیا اور ان کے دونوں ہاتھ چومے۔

”پہلے ناشتا کر لو پھر اطمینان سے بات کرتے ہیں۔“

صداقت شاہ نے سنجیدگی سے قسم دیا جس سے سر تابی کی اس میں جرأت نہیں تھی۔ ناشتے کے دوران بھی وہ دفتے دفتے سے ان کے چہرے پر نظر ڈالتا رہا۔ وہ بے حد سنجیدہ دکھائی دے رہے تھے اور اس کے حساب سے یہ سنجیدگی اس کی حکم بدولی کی وجہ سے تھی۔ وہ جم کر ناشتا نہ کر سکا اور جلد ہی ہاتھ کھینچ لیا۔ صداقت شاہ بھی مختصر ناشتا کر کے فارغ ہو گئے۔

”میں معذرت چاہتا ہوں بابا سائیں کہ آپ کے منع

کرنے کے باوجود ”وہ اپنے عمل کی وضاحت دینا چاہتا تھا لیکن صداقت شاہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا اور بولے۔

”جو ہو چکا اس پر بات کرنا بے کار ہے۔ بہتر ہے کہ ہم موجودہ درجن سسٹم پر بات کریں۔“

”خیریت بابا سائیں؟“ وہ ان کی بات پر چونکا۔

”خیریت نہیں ہے۔“ انہوں نے یاسیت سے کہا اور پھر اس کے پیچھے گزری قیامت کی اطلاع دینے لگے۔

”میں سومرو کا پورا خاندان تباہ کر کے رکھ دوں گا۔“ یہ سن کر وہ سب توقع طیش میں آگیا۔

”یہ جوش نہیں، ہوش سے کام لینے کا وقت ہے پٹ۔“ صداقت شاہ نے اسے کھنایا اور سرمد کو اشارہ کیا کہ وہ اسے باقی تفصیل سے آگاہ کرے۔ اس نے قربان شاہ کی حویلی میں خدیجہ کی آمد، مشورے اور اس پر عمل تک کی ساری داستان سنا دی۔ (سرمد سمجھ گیا تھا کہ اپنی شناخت خاں بندہ کر کے اس کے حوالے سے ملنے والی نوکی خدیجہ تھی)۔ عالم شاہ نے جان کر تو حیران ہی رہ گیا کہ سومرو کی خفیہ

کے کا خیال کیا تھا۔

سومرو کی اور کارروائیوں کے بارے میں ہم نے اسے پیغام بھیجا ہے۔ اسے اسے خبر دے دیں۔

”صداقت شاہ کی والدہ ایڈمنسٹریٹو ہیں اور اس وقت تک سکون نہیں پاسکتا تھا جب تک بھیل کا بچہ اس کی واد میں واپس نہ پہنچ جاتا۔ اپنی پہلے ہی سے دہی بین کے س نئے دھک کو سوچ کر اس کے وجود میں طیش کی ہریر سی ابھر رہی تھیں جسے صداقت شاہ نے محسوس کر لیا اور تنبیہ کرنے والے انداز میں بولے۔

”ہم تم سے زیادہ تجربہ کار ہیں اس لیے بہتر ہے کہ اس معاملے کو ہمیں ہی دیکھنے دو۔ اس بار تمہارا خلاف ہدایت کچھ کرنا ہمارے نزدیک ناقابل معافی ہوگا۔“

انہوں نے ایک عرصہ سیاست کے میدان میں گزرا تھا سو حالات پر قابو رکھنا بھی جانتے تھے۔ عالم شاہ ان کے حتمی حکم کے آگے سر جھکانے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بس جینا ان کی حکمت عملی دیکھتا رہا۔ ناشتے کے گھنٹے بھر بعد ہی ایک مشہور سیاست دان کا صداقت شاہ کے پاس فون آ گیا۔

”لطیف سومرو کے بیٹے کو اغوا کر لیا گیا ہے، آپ کو اس بات کی خبر ہوگی؟“ ابتدائی رسمی کلمات کے بعد اس سیاست دان نے۔ مضامین چھیڑا جو اس وقت ان کے لیے

تھی قدر کرنا تو جانی تھا۔

کھانا تقریباً خاموشی سے کھایا گیا۔ سرمد شاید اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانے کی وجہ سے کچھ نفیوض تھا جو حد سے زیادہ سنجیدہ نظر آیا اور کھانا بھی اس نے نسبتاً کم کھایا تھا۔ خود عالم شاہ نے تو بہر حال بھرپور انصاف کیا اور اس سچم سیری نے اب تنگ کی تھکاوٹ اور بے آرامی کے ساتھ مل کر ایب کام دکھایا کہ وہیں بیٹھے بیٹھے اس کی پیٹیں جڑ سے لگیں۔

”آپ آرام کر لیں سائیں! بڑے شاہ سائیں کے پہنچ جانے کے بعد میں آپ کو اطلاع دے دوں گا۔“ سرمد نے اس کی حالت دیکھ کر مشورہ دیا۔

”تم بھی آرام کرو سرمد! تم بھی میرے جتنے ہی تھکے ہوئے ہو۔ مجھ سے نا، یہ سب دیکھ لے گا۔“ عالم شاہ نے اسے تاکید کی اور بھیل کی طرف دیکھا۔

”باکل سائیں! حاضر سائیں۔“ بھیل نے فوراً تاکید کی۔ عالم شاہ میں مزید جاننے کی ہمت نہیں تھی اس لیے فوراً ہی اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ٹوٹ کر آنے والی فینڈ نے اسے ایسا نفل کیا کہ پھر صبح ہی آنکھ کھلی۔ اس نے کچھ بڑبڑا کر ابا پر کھل کر اپنے کمرے میں آگئے کا کہ۔ وہ فوراً

حاضر ہو گیا۔

بابا سائیں! میں رات پہنچے ان کے آنے پر چونکا یا۔ یوں نہیں؟“ اس نے اس کی شکل دیکھ کر فحش کا اظہار کیا۔

”معافی سائیں! بڑے شاہ سائیں نے خود قسم دیا تھا کہ آپ کی فینڈ خراب نہ کی جائے۔ وہ ناشتے پر آپ سے مذاقات کر لیں گے۔“ بھیل نے ہاتھ جوڑ کر ناجوزی سے بتایا۔

”ٹھیک ہے۔ میں آتا ہوں۔“ اس نے ایک نظر گھونٹا اور بڑی اور جلدی بعدی سارے مراحل طے کرتے : کھانے میں پہنچ گیا۔ صداقت شاہ پہلے سے وہاں اس سے منتظر تھے۔ سرمد بھی حاضر تھا۔ اس نے اب سے صداقت شاہ کو سلام کیا اور ان کے دونوں ہاتھ چومے۔

”پہلے ناشتا کر لو پھر اطمینان سے بات کرتے ہیں۔“

صداقت شاہ نے سنجیدگی سے قسم دیا جس سے سر تابی کی اس میں جرأت نہیں تھی۔ ناشتے کے دوران بھی وہ دفتے دفتے سے ان کے چہرے پر نظر ڈالتا رہا۔ وہ بے حد سنجیدہ دکھائی دے رہے تھے اور اس کے حساب سے یہ سنجیدگی اس کی حکم بدولی کی وجہ سے تھی۔ وہ جم کر ناشتا نہ کر سکا اور جلد ہی ہاتھ کھینچ لیا۔ صداقت شاہ بھی مختصر ناشتا کر کے فارغ ہو گئے۔

”میں معذرت چاہتا ہوں بابا سائیں کہ آپ کے منع

واپس لانے والے کے لیے بہت بھاری انعام کا اعلان کر رکھا ہے تو شاید کسی نے اس انعام کے لالچ میں یہ قدم اٹھالیا ہو۔ وہ خوب صورتی سے بات بنا گئے۔

”میں آپ کے اور سومرو کے درمیان ثالث کا کردار ادا کرنے کے لیے تیار ہوں شاہ صاحب!“ ان کے طرح دینے پر وہ کھل کر بات کرنے پر مجبور ہو گیا۔

”سومرو کو چاہیے کہ مجھے پیغامات بھجوانے کے بجائے انوکھا کار سے اپنے معاملات طے کر لے۔ مجھے سومرو کے بیٹے سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ مجھے بس اپنا نواسا واپس چاہیے اور جو شخص بھی میرے نواسے کو مجھ تک پہنچائے گا، میں اس سے کوئی سوال جواب کیے بغیر بھاری رقم اس کے حوالے کر دوں گا۔“ انہوں نے دونوں کو لہجے میں اپنا فیصلہ سنایا تو اگلے بندے کے پاس مزید بات چیت کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔

”آپ نے اس کی مثال کی پیشکش کیوں قبول نہیں کی بابا سائیں؟“ عالم شاہ جو اسپیکر آن ہونے کی وجہ سے گفتگو کا ہر لفظ سن چکا تھا، کال ختم ہونے کے بعد بے چینی سے پوچھنے لگا۔

”اے عالم شاہ! ہم معاملات سومرو کی نہیں اپنی مرضی سے طے کرتے ہیں۔ ہم کو یہ کہنے کا موقع نہیں ملتا چاہتے اور سومرو کے لیے اس کے واسطے ہر ملوث ہیں۔“ انہوں نے اطمینان سے جواب دیا۔ اس کے بعد عالم شاہ نے دیکھا کہ وقفے وقفے سے آنے والی مزید دو سفارشی کالز کو بھی صداقت شاہ نے اسی طرح ٹال دیا۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ عالم شاہ بے چین سے بے چین ہوتا گیا لیکن صداقت شاہ کے اطمینان میں سرسوفرق نہ آیا۔ ان کی ہدایت پر بس ایک کام ہوتا رہا۔ ان کے آدمی انوکھا کاروں کی حیثیت سے سومرو کی بیوی رانی پر دباؤ بڑھاتے گئے اور لازماً رانی نے بھی سومرو پر دباؤ بڑھا دیا۔ ایک طرف رانی، سومرو کی لاڈلی بیوی تھی تو دوسری طرف اپنے خون کا بھی معاملہ تھا۔ سومرو کو آخر کار ہار تسلیم کرنا پڑی۔ وہ ایسا نہیں کرتا تو رانی پر پریس کانفرنس کر کے اپنی اور اس کی شادی کا راز بھی کھول دیں اور بچوں کے انوکھا معاملہ بھی اعلیٰ حکام تک چلا جاتا۔ اس کی خفیہ شادی کا راز بھی راز نہ رہتا۔

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نوجوان
کی داستان جو غلط کاروں کے لیے
غضب ناک تھا باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیے

بہت اہمیت کا حامل تھا۔

”سن کر بہت افسوس ہوا۔ کون سا بیٹا انوکھا ہوا ہے اس کا؟ بڑا تو بے چارہ ویسے ہی بستر پر ہے۔ دوسرے یا تیسرے نمبر والے میں سے کسی کو انوکھا کیا گیا ہوگا؟ ہم اصل میں گاؤں میں نہیں ہیں اس لیے ہمیں ابھی تک اطلاع نہیں ملی۔“ مدغم لہجے میں جواب دیتے ہوئے صداقت شاہ کا انداز بالکل ایسا تھا جیسے واقعی انہیں کچھ معلوم نہ ہو۔

”سومرو کی شہزادی بیوی کا بیٹا انوکھا ہوا ہے اور بیوی نے اس کا ناقدہ بند کر رکھا ہے کہ ہر حال میں میرا بیٹا واپس لا کر دو ورنہ میں ابھی پریس کانفرنس کر کے سب کو بتاتی ہوں کہ تمہاری اولاد تمہاری دشمنیوں کی بھیئت چڑھ رہی ہے۔“ دوسری طرف بھی ایک سیاست دان ہی تھا اس لیے صداقت شاہ کی اداکاری کا برا ماننے کے بجائے کھل سے جواب دیا۔

”اچھا تو سومرو نے شہر میں بھی کوئی شادی کر رکھی ہے؟ گاؤں میں تو شاید کسی کو اس بارے میں خبر نہیں ہے۔“ صداقت شاہ نے اصل موضوع سے ہٹ کر سومرو کی شادی پر تبصرہ کیا۔

”میں ان کی زندگی میں عورتوں کو آنا جانا لگا ہی رہا ہوں۔ اس بات کو جاننے دیجیے۔ میں آپ کو خاص طور پر اطلاع دے رہا ہوں کہ انوکھا کاروں نے نہ صرف رانی کے بدلے بہت عجیب شرط رکھی ہے۔“

”کیسی شرط؟“

”ان کا مطالبہ ہے کہ اگر سومرو اپنے بچے کی زندگی چاہتا ہے تو صداقت شاہ کے نواسے کو بدلے میں ان کے حوالے کیا جائے۔“ اس نے بتایا۔

”بڑی عجیب بات ہے۔ کہنے کو ہم اور سومرو ایک دوسرے کے مخالف ہیں لیکن دونوں بیک وقت ایک ہی امتحان سے گزر رہے ہیں۔“ صداقت شاہ نے شرط سن کر اس پر تبصرہ کرنے کے بجائے عجیب سے لہجے میں اپنی رائے دی۔

”ذرا سوچے سائیں کہ انوکھا کاروں نے سومرو سے ایسا مطالبہ کیوں کیا؟ سنا ہے آپ کے ہاں کے لوگ آپ کے نواسے کے انوکھا الزام سومرو پر لگا رہے ہیں تو یہ بھی تو سوچا جاسکتا ہے کہ آپ کے کسی ہمدرد نے آپ کے نواسے کی واپسی کے لیے یہ ترکیب لڑائی ہو؟“ وہ براہ راست صداقت شاہ پر بچے کے انوکھا الزام نہیں لگا سکتا تھا اس لیے گھما پھرا کر بات کی۔

”یہاں کوئی کسی کی ہمدردی میں سمجھ نہیں کرتا۔ ہاں، ایک بات ہماری سمجھ میں آ رہی ہے کہ ہم نے اپنے نواسے کو

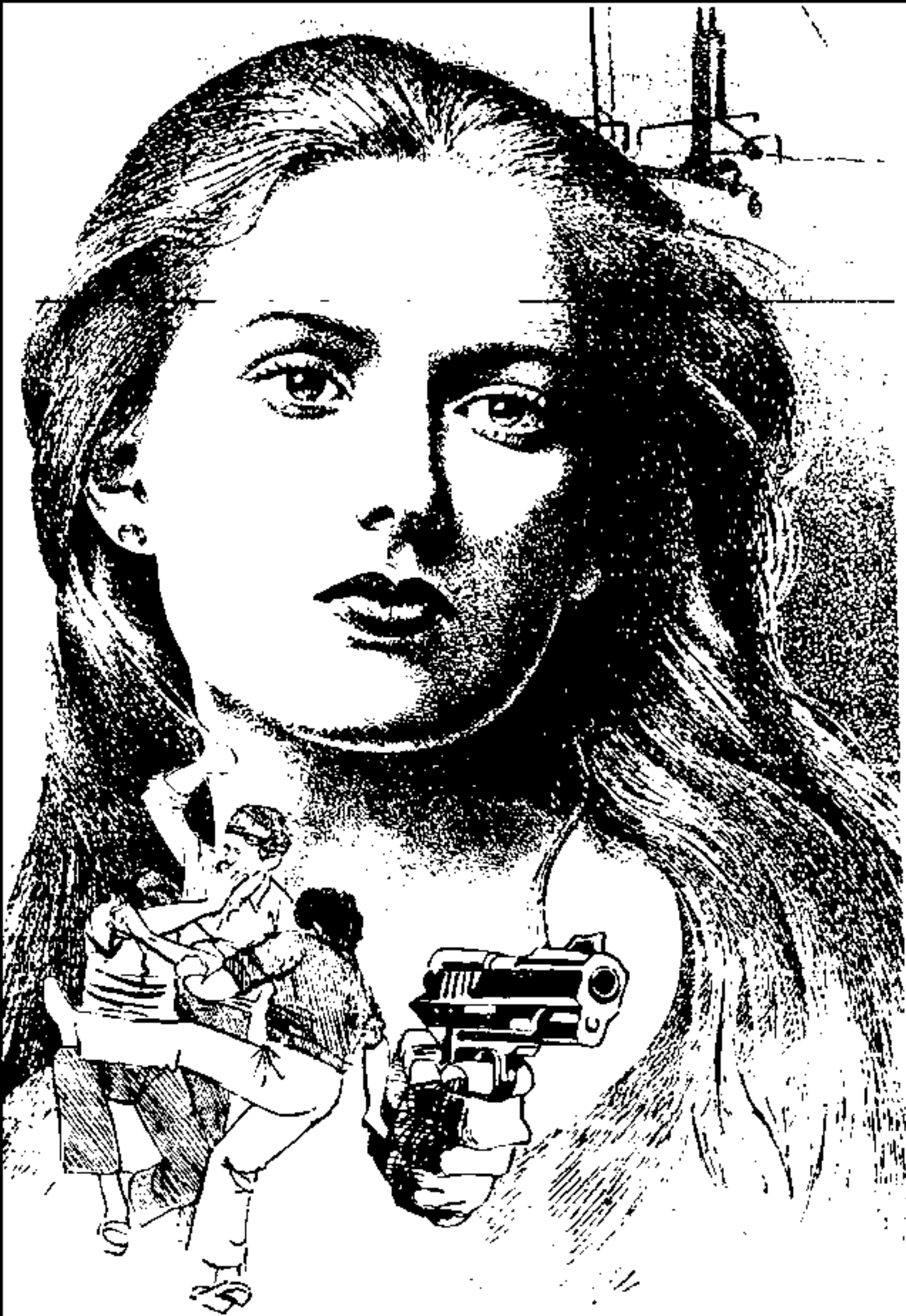
قسط: 13

شہزادہ و شہزادی

اساتذہ

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمز ریور کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تند و تیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابل شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پُر عزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند منائے جانے کے منصوبے بنائے جارہے تھے... اس کی زندگی جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قرار یوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تاری عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ وارداتِ قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہو سکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تعمیر انگیز داستان



معاذ ایک ذہین لیکن متکون مزاج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جوائن کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور ایسے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ انسٹیٹیوٹ سے واپس آرہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو سڑک پر گھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی خد و غطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشری نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بشری ماس کمیونی کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم لکھ رہی تھی۔ اس وجہ سے اس کے لیے وہ ایک غیر متعارف نام بن گیا ہے۔ اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی بتی تھی۔ معاذ بشری کو یہ حفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کر دیتا ہے لیکن جن رئیس زادوں سے اس نے ان کا فکار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ یہ موقع انکی یونیورسٹی ٹرپ کی صورت میں مل جاتا ہے اور ایک جنگل کی سیر کے دوران وہ لوگوں کو گرائی کے شوق میں سب سے الگ تھلک ہو جانے والے معاذ کو بے خبری میں گھر کر بری طرح زد و کوب کرتے ہیں اور ہندی سے اسے دھمکا دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس نہ آنے پر انتقامیہ کے افراد، پولیس اور ریسلنگ ڈرائیو کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جوگی کی جھونپڑی میں پاتا ہے۔ اپنی حالت سے اسے اپنے شدید زخمی ہونے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ جوگی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ معاذ کا سوا بالکل جنگل میں ہی گھبراہٹ ہو جاتا ہے اور جوگی کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا جس سے باہر کی دنیا سے رابطہ کیا جاسکے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے۔ جوگی بھی اسے پندہ کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت نے کچھ خاص صلاحیتوں سے نوازا کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے پر اسرار علم سکھانے کی ہائی بھر لیتا ہے اور معاذ واقعی اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ادھر جانے وقوع سے ملنے والے معاذ کے کمرے سے جب تصویریں نکالوائی جاتی ہیں تو بہت سے قدرتی مناظر کی تصویریں اس میں سے ایک ایسی تصویر بشری کی نظر میں آ جاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پرنسپل کے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشری تھیں کر رہی تھی۔ بشری کے اپنے والد جرنلست ہیں اور جن کوئی ان کے خون میں شامل ہے۔ اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشری کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ صدمے سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باؤل نامی شخص نے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشری انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دنوں میں ہی معاذ واپسی کا ارادہ کرتا ہے تاہم دوسرے ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا عرقان اللہ اور یزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو دقاس نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باؤل اچانک بشری کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر دیتا ہے۔ ڈی این اے رپورٹ سے باؤل کی نشاندہی ہو جاتی ہے۔ ادھر معاذ کو واپس لانے کے لیے اچھے جھکٹے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اسے واپس آنے کا پیغام دیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کر کے اسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات لی جاتی ہیں، نہ بتانے پر اس کے بھائی کا ایک گروہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشری بھی انتقام کی آگ میں جلتی ہوئی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہو جاتی ہے۔ معاذ کو بچانے والا لڑکا دقاس اپنے گرد کے ساتھ ایک پارٹی میں جاتا ہے۔ وہاں اسے معاذ کے حوالے سے مشکوک ایک شخص نظر آتا ہے۔ وہ اس کے پیچھے جاتا ہے مگر اسے گھیر لیا جاتا ہے۔ بہر حال دقاس کو بھیجہ کے ساتھ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ادھر معاذ کے دوست عالم شاہ کے بہنوئی کا قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ کئی فنون میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے پہنا کر کر کے اس کے دامان پر سنبھال کر اسے لڑائی کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ فیضو سے حاصل انوکھے علم کی بدولت ان کا معمول نہیں جتا۔ بشری، کامران کو چھاپنے کا پروگرام بناتی ہے۔ ادھر عالم شاہ سراغ نکال لیتا ہے کہ اس کے بہنوئی کا قتل کس نے کیا۔ وہ قاتل کو گھیرتا ہے اور اپنے تئیں اسے گولیاں مار کر قتل کر دیتا ہے تاہم وہ بچ جاتا ہے۔ عالم شاہ اس کے بعد ڈاکوؤں کے سردار چاچو کو چھاپتا ہے اور اسے کیڑا کر دیتا ہے۔ پہنچا تاہم اس کے پیچھے پوچھیں لگ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور اس کا نوکر سرد باؤل کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ ادھر معاذ جاسوس ماحر کو پہنا کر کر کے اس کے ذریعے اسے نکالنے والوں پر حملہ کر دیتا ہے تاہم ان کی فائرنگ سے ماحر مارا جاتا ہے اور لازم معاذ پر نہیں آتا مگر معاذ سے

کام لینے والوں کو اس پر شک موزر رہا ہے۔ اور کھل شاہ نے نو سو لوہے کو آٹوا کر لیا جاتا ہے اور انہو کا الزام لطیف سومرو پر آتا ہے۔ عالم شاہ وہاں موجود ایک زخمی شخص کی مدد سے ہادل کی قید سے چھٹکارا پالتا ہے۔ اور بھرتی دہی پہنچ جاتی ہے۔ وہاں وقاص اسے باربی کے روپ میں پہچان لیتا ہے اور ان دونوں کے درمیان اعتماد کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ وہ سلطان کو مارنا چاہتی ہے تاہم وقاص اسے ایسا کرنے سے روکتا ہے۔ اور عالم شاہ باذل کی قید سے نکل کر اس کا پیچھا کرتا ہے تاہم وہاں اچانک فائرنگ اور دھماکے ہونے لگتے ہیں۔ وہ وہاں محاذ کو دیکھتا ہے۔ صداقت شاہ، لطیف سومرو کو گھیرنے کے لیے اس کی خلیہ بھری اور بچے کا کھوج لگاتے ہیں اور بچے کو انہو کر لیتے ہیں۔ لطیف سومرو مجبور ہو جاتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

”ٹھیک چار بجے گاڑی آپ کو لینے آجائے گی۔“
پچھو کے جانے پہچانے گھر کے آگے گاڑی رکھ کر تواتر سے
نکل اسے اطلاع دی گئی۔ وہ کوئی بھی رد عمل دے بغیر تیزی
سے آگے بڑھ گیا اور عالم اضطراب میں یوں اطلاعی گھنٹی کا
ہن دبا یا کہ انکی اٹھانا بھول گیا۔

”کون بد تمیز ہے؟ کیا کہتے پیچھے لگ گئے ہیں جو مبر
نہیں ہو رہا؟“ اندر سے غصے میں بند آواز سے بولنے والی
یہ ہستی ٹوہی گئی۔ اسے پہچاننے میں کوئی وقت نہیں ہوئی لیکن
پھر بھی اس نے اپنی انگلی ہن پر سے نہیں ہٹائی۔

”بد تمیزی کی بھی کوئی حد“ اس نے زور سے
بولتے ہوئے اچانک دروازہ کھولا اور رنگ رو گئی۔

”اندر آنے کا راستہ تو دو۔“ اس نے ٹوہی کا بازو پکڑ
کر اسے اندر کی طرف دھکیلا اور خود بھی کھلے دروازے سے
اندر داخل ہو گیا۔

”معاذ بھائی...“ اندر داخل ہوتے ہی اسے علیہ
کی بلند چیخ سنائی دی۔ اگلے ہی لمحے وہ کسی گولے کی طرح
اڑتی اس تک پہنچی اور اس کے بازوؤں میں ساتے ہی بے
ہوش ہوئی۔

”علیہ... علیہ گڑیا۔“ وہ گھبرا کر اسے سنبھالنے
لگا تو اسے احساس ہوا کہ وہاں اور لوگ بھی موجود ہیں۔ اس
کا گھنٹی بجانے کا انداز ہی ایسا تھا کہ ہر شخص متوجہ ہو گیا تھا اور
صورت حال جاننے کے لیے وہاں پہنچ گیا تھا اور اب ہر
ایک کے منہ سے ہی کچھ نہ کچھ نکل رہا تھا۔ وہ اس کے گرد گھیرا
بنائے اسے چھو چھو کر دیکھ رہے تھے کہ کبیں وہ کوئی خواب تو
نہیں ہے۔ اس نے اپنی ہانہوں میں بے ہوش علیہ کو نہ تمام
رکھا ہوتا تو شاید سب کے سب وہیں اس سے لپٹ جاتے۔
وہ ان کے جلو میں بے ہوش علیہ کو اٹھائے اندر لاؤنج میں
داخل ہوا اور اسے ایک کاؤچ پر لٹا کر دھیرے دھیرے اس
کے رخسار چھتھانے لگا۔

”میں دیکھتی ہوں۔“ اب تک ٹھگ سی کیفیت میں

صداقت شاہ نے ایسا کھیل کھیلا تھا کہ سومرو جوان
بیٹوں اور خاندان کے سامنے خفیہ شادی کی وضاحت
دے سکتا تھا نہ اپنے خلاف کسی آفتیش کا آغاز کروانے کی
حاجت کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے گھنٹے ٹیک دیے۔

”جنگ صرف ہاتھ بیروں سے لڑی جائے یہ
ضروری نہیں ہوتا پٹ! دماغ سے کام لینے والوں کے
پاس کامیابی کے زیادہ امکانات ہوتے ہیں۔“ جب وہ
نکل کے بیٹے کو اس تک پہنچانے کے لیے روانہ ہو رہا تھا تو
صداقت شاہ نے اس سے کہا۔ وہ چہرے پر ایک کسمپرسی
سی مسکراہٹ سجائے تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا کہ باپ
بہر حال باپ ہی ہوتا ہے۔

☆☆☆

گاڑی جانے پہچانے راستوں پر دوڑ رہی تھی اور
وہ دل میں ایک ہلکی سی مسرت بھری بے یقینی لیے ان
شمار راستوں کو دیکھ رہا تھا جن پر کبھی وہ آزادانہ سفر کیا
کرتا تھا۔ کراچی جائے پیدائش اور رہائش شہر ہونے کی
وجہ سے عزیز تھا تو لاہور سے تھیالی نسبت کے باعث
یہاں بہت آنا جانا رہا تھا اس لیے لاہور بھی اسے کراچی
ہی کی طرح بہت اپنا اپنا سا لگتا تھا۔ جوں جوں منزل
قریب آتی جا رہی تھی، اس کی مسرت اور بے یقینی میں بھی
اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اتنے دنوں بعد وہ انہوں کے
درمیان ہوگا۔ انہیں دیکھ سکے گا، چھو سکے گا اور ان سے
باتیں کر سکے گا۔ یہ احساس ہی بڑا عجیب تھا۔ اس نے تو
اپنے طور پر تسلیم کر لیا تھا کہ اب شاید جیتے جی اسے انہوں
سے ملنا نصیب نہیں ہوگا اور وہ دوسروں کے ہاتھوں میں
کچھ پتلی کی طرح تاجتا ایک دن اس طرح موت سے
ہمکنار ہو جائے گا کہ اس کے کسی اپنے کو اس کے مرنے کی
خبر بھی نہ ہوگی لیکن بالکل اچانک ہی اسے یہ خوشخبری سنائی
گئی تھی کہ وہ چند گھنٹوں کے لیے اپنے گھر والوں سے
ملنے جاسکتا ہے اور اب وہ سچ سچ وہاں جا رہا تھا۔

موجودہ رویے نے اسے روکا اور علیہ کو ہوش میں لانے کی تدبیر کرنے لگی۔

”ابو.....“ وہ مڑ کر خاور صاحب کے گلے لگا اور بچوں کی طرح رو دیا۔ یہ شاید زندگی میں پہلی بار تھا کہ وہ ان سے اپنی محبت کی شدت کو پوری طرح محسوس کر رہا تھا۔ اب سے پہلے تو اس کے مزاج کی وجہ سے اکثر وہ بیشتر دونوں کے درمیان سرد جنگ سی رہا کرتی تھی اور وہ خود کو ان کی نسبت امی سے زیادہ قریب محسوس کرتا تھا لیکن آج ایسا لگ رہا تھا کہ ابو کے وجود میں امی کی خوشبو بھی سما گئی ہو۔ وہ بھی اپنا سارا عجب داب بھلائے اسے گلے لگائے رو رہے تھے۔ وہ اتنے عرصے کہاں رہا، کیسے رہا اور کیونکر واپس آیا؟ ان سارے سوالوں کا تو ابھی کوئی ذکر ہی نہیں تھا۔ وہ جدائی کے غموں کو رو رہے تھے، ملنے کی خوشی کو آنسوؤں میں بہا رہے تھے، گھر کی سب سے مضبوط اکائی سعیدہ بیگم کے پھمڑ جانے کا گریہ کر رہے تھے اور وہ لمحے گویا دوبارہ زندہ ہو گئے تھے جب سعیدہ بیگم کا جنازہ اس گھر میں رکھا تھا۔ حالات کی سختی سے مرجھا جانے والا سعیدہ غموں کی دھوپ سے تجلس جانے والی علیہ، اپنے بزرگ ہونے کا بھرم قائم رکھنے میں نڈھالی خاور صاحب، سب اس سے لپٹ کر رو رہے تھے اور وہ سب کے ساتھ مل کر اسے دونوں کے جمع آنسو بہا رہا تھا۔ پچھو، ٹوبیہ اور دیگر اہل خاندانل کر انہیں سنبھال نہ لیتے تو جانے وہ کیسے اس جذباتی کیفیت سے نکل پاتے۔ جذبات میں ٹھہراؤ آیا تو سوال و جواب کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔

”میرے پاس آپ لوگوں کے کسی سوال کا جواب موجود نہیں ہے۔ بس آپ لوگ میرے لیے دعا کریں کہ میں جس آزمائش میں مبتلا ہوں، اس سے کسی طرح نکل آؤں۔“ اس نے ہر سوال کے جواب میں بس یہ دو جملے کہے اور خاموش ہو گیا۔

”اب آپ ہمارے ساتھ ہی رہیں گے نا بھائی؟“ اس کے جواب نے سب ہی کو عجیب سی تشویش میں مبتلا کر دیا اور علیہ نے اس کا بازو دو بوج کر بے چینی سے پوچھا۔

”مجھے واپس جانا ہو گا گڑیا۔“ وہ بدلت جواب دے گا۔

”نہیں۔ میں آپ کو کہیں نہیں جانے دوں گی۔“ وہ

مزید شدت سے اس کے ساتھ لپٹ گئی۔ سعیدہ نے بھی بے اختیار اس کا دسر اچھو تمام لیا جبکہ خاور صاحب بس ویران نظروں سے اسے دیکھتے رہے۔

”میں رک نہیں سکتا۔ میں بس آپ سب لوگوں کو یہ اطمینان دلانے کے لیے یہاں آیا تھا کہ میں زندہ اور... یہ خیریت ہوں۔ آپ لوگ میری طرف سے اطمینان رکھیں اور زندگی کے معمولات میں پہلے کی طرح سرگرمی سے شامل ہو جائیں۔ نصیب میں ہوا تو کسی نہ کسی موڑ پر میں بھی آپ لوگوں سے آملوں گا۔“ اسے ان سب کی خاطر بہت برداشت سے کام لینا پڑ رہا تھا۔

”ای علی گیس اللہ آپ جیتے جی ہمیں جھوٹکے جانے کی بات کر رہے ہیں۔ ایسے جینے سے تو مر جانا اچھا ہے۔“ علیہ جذباتی ہو کر چٹنی۔

”بڑی بات گڑیا! اس طرح نہیں سوچتے۔ ایسی بات کہتے ہوئے تمہیں ابو اور سعد کے بارے میں سوچنا چاہیے تھا۔ کیا یہ دونوں تم سے محبت نہیں کرتے اور انہیں تمہاری ضرورت نہیں ہے؟“ معاذ نے اسے سمجھایا۔

”لیکن مجھے آپ بھی اپنی زندگی میں چاہئیں بھائی!“ وہ ایک بار پھر رونے لگی۔

”اس کے لیے تم اللہ سے دعا کرو۔ دعاؤں میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔“ اس نے آہستہ سے کہا اور جان بوجھ کر اس پر سے توجہ ہٹا کر سعد کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”تمہاری بڑھائی کیسی چل رہی ہے ہیرو! اب تو تم مونو سے پتلون بن گئے ہو۔“

”بس بھائی! طبیعت کی خرابی کی وجہ سے سیمسٹر زرد اپ کرنا پڑا۔ اب دوبارہ جوائن کرنے والا ہوں۔“ سعد نے مختصر جواب دیا تو اسے وہ لہجہ یاد آ گیا جب اس نے سعد کو آپریشن ٹیبل پر کھلے پیٹ کے ساتھ پڑا دیکھا تھا اور اسے دشمنی دی جا رہی تھی کہ سعد کا ایک ایک عضو نکال کر فرداخت کر دیا جائے گا۔

”ایک سیمسٹر کا فم نہ کرو یا راجا جان۔ ہے تو جہان ہے۔“ وہ سعد سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ تم پر جو کچھ جتنا میری وجہ سے اور میں بے بس ہوا تو تمہاری خاطر، اس لیے بس الکی سی سکراہٹ کے ساتھ اس کے شانے پر ہلکی دے کر رہ گیا۔

”بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے معاذ۔ آدمی زندہ سلامت ہو تو زندگی کے خواب اور امیدیں سب باقی رہتی ہیں۔ تم لوگ پہلے تو اس بات پر اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں اپنے بھائی کی صورت دیکھنا نصیب کی بھر دے گا مگر جیسے اس رب نے یہ خوشی دکھائی ہے، ویسے ہی ہمیشہ کے لیے بھائی کی واپسی کا سکھ بھی نصیب کرے۔“ ہمیشہ کی بردبار اور معاملہ فہم

پھپھو نے یہ جملے ادا کر کے اسے بڑا سہارا دیا اور وہ ہنکری نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔

”اپنی اولاد سے کم پیارے نہیں ہوتے مجھے۔ ہل پل تمہاری سلامتی کی دعا میں مانگتی رہی ہوں۔“ اسے اپنی طرف ہنس دیکھتا پا کر پھپھو نم سے لہجے میں بولیں تو اس کی آنکھیں ایک بار پھر بجلیک نکلیں۔ بے اختیار ہی اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے قدموں میں جا بیٹھا اور اپنا سر ان کی گود میں رکھ دیا۔ پھپھو اس کے بالوں میں اگلیاں پھیرنے لگیں۔ اسے بالکل ایسا لگا کہ اس کا سر ان کی گود میں رکھا ہوا ہے اور اسی اس کے بالوں کو سہارا دیتی ہیں۔

”ارے بھئی ٹوپیہ امیرے بیٹے کے لیے کوئی اچھی سی ڈش تو تیار کرو۔ اتنے دنوں بند گھر آیا ہے۔ اس کی تو باقاعدہ دعوت ہونا چاہیے۔“ ماحول کا بوجھل پن دور کرنے کے لیے پھپھو نے جان بوجھ کر ہلکا بھلا انداز اختیار کیا۔

”کھانے کی فکر نہیں کریں۔ موصوف کی پسند کا کھانا تیار ہو جائے گا لیکن اس سے پہلے ذرا آپ لوٹ منہ ہاتھ دھو کر فریش جوس لے لیں تاکہ یہ جو رو رو کر آپ لوگوں نے اپنی جانیں پاک کر لی ہیں، اس میں ذرا بہتری آئے۔“ وہ پھپھو کی بات کے جواب میں بولی تو معاذ نے بے ساختہ ہی سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ کھنی پلکیں ہلکی ہلکی نم ہو رہی تھیں لیکن کمال ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے آنسوؤں پر بند باندھ رکھا تھا۔ ضبط کی اس کوشش میں اس کی نگاہی رنگت سرخ پڑ گئی تھی اور راج ہنس سی گردن میں ذرا سا تھکاؤ آ گیا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح باوقار اور حسین تھی اور اس کے حسن کے گرد لپٹی محسوس کی جانے والی اداسی نے حسن کو گہٹانے کے بجائے زیادہ پرکشش بنا دیا تھا۔

”میں جوس لے کر آتی ہوں۔“ معاذ کو مسلسل اپنی طرف دیکھتا پا کر وہ جھپٹتی اور منظر سے ہٹ گئی۔ معاذ بھی علیحدہ کی طرف متوجہ ہو گیا جو اس سے کچھ پوچھ رہی تھی۔ انہوں نے درمیان گزارنے کے لیے طے والے چند کھٹے کیسے منٹوں کی طرح گزرتے چلے گئے، اسے اندازہ بھی نہیں ہوا اور جوں جوں داپٹی کا وقت قریب آتا گیا، خود اس کے دل کی کیفیت عجیب ہوتی چلی گئی۔ انہوں نے درمیان آ کر ایک بار پھر انہیں چھوڑ کر چلے جانا آسان کام نہیں تھا۔

”میری بات سنو معاذ!“ وہ لوگ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر گرین ٹی سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ پھوپھی زاد بھائی فراز نے اسے اپنے کمرے میں بلوایا۔

”جی فراز بھائی!“ وہ فوراً ان کے پیچھے ان کے کمرے میں جا پہنچا۔

”میرے ایک کلوز فرینڈ کے بڑے بھائی کرل ہیں۔ اگر تم چاہو تو تمہارے مسئلے کے حل کے لیے ان سے مدد کی درخواست کرتے ہیں۔“ اسے پٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے بلا حسیہ گفتگو کا آغاز کیا۔

”میرے پاس وقت نہیں ہے فراز بھائی! ابھی چار بجے گاڑی مجھے لے آ جائے گی۔ اتنی دیر میں تو شاہد آپ کا کرل صاحب سے رابطہ بھی نہ ہو سکے۔“ اس نے اداسی سے جواب دیا۔

”کوشش تو کی جاسکتی ہے۔“ انہوں نے اسے امید دلائی۔

”میں کوئی رسک نہیں لینا چاہتا۔ مجھے ڈر ہے کہ اس کوشش میں آپ میں سے کسی کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔“ اس نے غمی میں سر ہلایا۔

”تو پہلے ہم اپنی حفاظت کا انتظام کر لیتے ہیں۔ میرے پاس ایک جگہ ہے جہاں ہم سب فوری طور پر شفٹ ہو سکتے ہیں۔“ انہوں نے تجویز دی۔

”کرل صاحب کے بارے میں آپ کو یقین ہے کہ وہ ہماری مدد کریں گے؟“ اس کے دل میں بھی اس سارے چکر سے نکلنے کی خواہش تھی اس لیے ہلکی سی آس سے پوچھا۔

”وہ ایک انسان دوست اور محب وطن آدمی ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ تم جن لوگوں کے چنگل میں پھنس گئے ہو وہ ہمارے وطن کے خیر خواہ تو ہو نہیں سکتے اس لیے کرل صاحب لازماً ہماری مدد کے لیے تیار ہو جائیں گے۔“ فراز نے اسے امید دلائی۔

”وہ بہت طاقتور لوگ ہیں فراز بھائی! اور ان کے خلاف جانے کے لیے مجھے آپ لوگوں کی سلامتی کی یقین دہانی درکار ہے۔“ وہ اپنی جگہ تذبذب کا شکار تھا۔

”میں نے کہا تھا کہ میرے پاس ایک محفوظ ٹھکانا ہے جہاں ہم فوری طور پر پوری ٹھکی سمیت شفٹ ہو سکتے ہیں۔“ فراز نے اسے ایک بار پھر یقین دہانی کروائی اور محبت سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔

”تم میرے چھوٹے بھائی ہو معاذ! مجھے اندازہ ہے کہ تمہیں مشکل سے نکالنے کی کوشش میں ہمیں تکلیف سے گزرنا پڑے گا لیکن تم پریشانی میں ہو، یہ بھی تو ایک تکلیف دہ بات ہی ہے۔ اپنے ایک قریبی ممبر کو بچانے کے لیے ہم تھوڑی سی تکلیف برداشت کر لیں گے تو یہ کوئی بہت بڑی بات نہیں ہوگی۔“ اس کے لہجے میں بے تحاشا

غلوں تھا۔

”تھیک یو سوچو فراز بھائی!“ اپنے پھوپھی زاد کی اتنی محبت پر معاذ جذباتی سا ہو گیا۔ فراز جواب میں کچھ کہتا اس سے نکل ہی میز پر دھرا اس کا موبائل بجنے لگا۔ اس نے موبائل اٹھا کر اسکرین پر نظر ڈالی۔ کسی اجنبی نمبر سے کال آرہی تھی۔ اس نے کال رد کی۔ دوسری طرف سے جو مطالبہ کیا گیا اسے سن کر اس کے چہرے پر حیرت دوڑ گئی۔

”آپ کون ہیں اور کیوں اس سے بات کرنا چاہتے ہیں؟“ بے ساختہ پھسلنے والے اس سوال کا نہایت سرد مہری سے جواب دیا گیا۔ فراز نے بے چینی سی محسوس کی اور موبائل سیٹ معاذ کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

”پتا نہیں کون ہے۔ بہت روڈ لی بات کر رہا ہے اور صرف تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔“

فراز کی بات پر معاذ کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجی اور اس نے موبائل کان سے لگا کر فوراً ”ہیلو“ کہا۔ دوسری طرف سے جو کچھ کہا گیا اسے سن کر اس کا چہرہ فحش پڑ گیا اور اسے یوں لگا کہ موبائل اس کے ہاتھ سے پھسل کر نیچے گر جائے گا۔

”دھمکیاں مت دو۔ یہاں کچھ بھی تم لوگوں کی مرضی کے خلاف نہیں ہوگا۔“ اس نے ہاتھوں سے پھسلتے موبائل کو مضبوطی سے تھاما اور دوسری طرف موجود شخص کو قدرے چار حاشہ لہجے میں یقین دہانی کر دئی۔ اس کی اس یقین دہانی کے بعد دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

”کیا بات ہے معاذ! کون تھا فون پر؟“ فراز نے اس کی پیشانی پر پھیلے شکنوں کے جال کو دیکھتے ہوئے تشویش سے پوچھا۔

”یہ گھر بگڑ رہا ہے فراز بھائی اور یہاں ہونے والی ہر منتگاہ کہیں اور سنی جا رہی ہے۔ فون کرنے والے نے مجھے دھمکی دی ہے کہ میں نے آپ کی تجویز پر عمل کرنے کی کوشش کی تو پورا گھر دھماکے سے اڑا دیا جائے گا۔“ اس نے سستے ہوئے چہرے کے ساتھ فراز کو صورت حال سے آگاہ کیا تو فراز کی آنکھیں پھیل گئیں۔

”آخر کون ہیں یہ لوگ جو اس قدر بارسوخ ہیں؟“ گھر بگڑ ہونے کی اطلاع اور معاذ سے رابطے کے لیے اپنے موبائل کے انتخاب پر فراز کو شدید حیرت تھی۔

”کون ہیں یہ تو ابھی تک میں بھی نہیں جان سکا لیکن اتنا جانتا ہوں کہ یہ بہت خطرناک اور بارسوخ لوگ ہیں اور

میں ان کے ہر حکم کی تعمیل کرنے پر مجبور ہوں۔“

”اللہ تمہاری حفاظت کرے میرے بھائی!“ فراز نے اس کی بے بسی کو محسوس کیا اور بے ساختہ ہی اپنی جگہ سے اٹھ کر اسے محلے سے لگایا۔ معاذ کی آنکھیں نم ہونے لگیں لیکن اس نے فوراً ہی اپنی جذباتی کیفیت پر قابو پالیا اور ہموار لہجے میں بولا۔

”مجھے جانا ہوگا فراز بھائی! موجودہ صورت حال میں آپ میرے لیے صرف یہ کر سکتے ہیں کہ انہیں علیحدہ اور سدا کا خیال رکھیں اور انہیں حوصلہ دیتے رہیں۔ مجھے اپنے بارے میں کچھ نہیں معلوم کہ کل میرے ساتھ کیا ہوگا لیکن میں چاہتا ہوں کہ علیحدہ اور سدا ایک نارل زندگی گزاریں اور اپنا کیریئر بنا لیں۔ وہ دونوں کامیاب انسان بن گئے تو ابو کے بہت سے دکھوں کا داوا ہو جائے گا۔“

”تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے معاذ! سدا اور علیحدہ میری ذمہ داری ہیں۔ تمہیں ان کے سلسلے میں کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ بس تم اپنا خیال رکھنا اور پوری کوشش کرنا کہ کسی طرح اس حال سے نکل آؤ۔“

”آپ لوگوں کی دعاؤں کا حصار میرے گرد رہا تو ایک دن ایسا بھی آئے گا۔“ معاذ نے کہہ کر مسکراتے کی کوشش کی پھر فوراً ہی دروازے پر ہونے والی آہٹ پر پلٹ کر دیکھا۔ دروازے پر علیحدہ کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ سنا ہوا تھا اور آنکھوں کی وہ چمک ماند پڑنے لگی تھی جو اس کی آمد نے جگائی تھی۔ معاذ نے بے ساختہ ہی دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھا۔ چار بجنے میں کچھ وقت ہی باقی رہ گیا تھا اور یہ تیزی سے گزرتا وقت ہی تھا جس نے علیحدہ کی آنکھوں کی چمک بجھا دی تھی۔

”وقت بھی ایک سانس نہیں رہتا گڑیا! ہماری زندگی کے اچھے دن چھن گئے ہیں تو یقین رکھو یہ بڑے دن بھی ہمیشہ نہیں رہیں گے۔ ان بڑے دنوں کو بھی جانا ہوگا۔ اگر ہم نے اپنے حوصلوں کو بلند رکھا اور مشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے تو کم سے کم نقصان اٹھائیں گے۔ مجھے امید ہے کہ میری بہادر بہن اس بات کو سمجھے گی اور اپنے ساتھ ساتھ ابو اور سدا کا بھی خیال رکھے گی۔“ وہ علیحدہ کی کیفیت سمجھتا اس کے قریب گیا اور اسے اپنے بازو کے حصار میں لے کر محبت سے سمجھانے لگا۔

”کہا آپ ہمارے پاس رک نہیں سکتے بھائی؟“ علیحدہ کی آنکھوں سے آنسو نکلے۔

”رک سکتا تو نہیں مجھ سے کہنے کی ضرورت ہی نہیں

پڑتی۔ اس کے آنسو آنکھوں سے ٹپکنے کے بجائے دل پر جا کر گرے تھے اور سینے میں ایک آگ سے بھردی تھی۔ اپنی اس کیفیت کو چھپا کر وہ علیہ کو اپنے ساتھ لگائے لاؤنج میں سب کے درمیان پہنچا اور باری باری سب سے ملنے لگا۔ وہ سب ہی دل گرفتہ تھے لیکن کوشش کر رہے تھے کہ اس کے سامنے اپنے غم کا اظہار نہ کریں۔

ٹھیک چار بجے اطلاعی ٹھنی بھی تو اس کے پیاروں کے چہروں کا رنگ فنی ہو گیا۔ قریب کھڑی علیہ نے بے ساختہ ہی اس کا بازو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

”چلا ہوں۔ امید ہے کہ ہم پھر ملیں گے۔“ اس نے سب کے چہروں پر ایک نظر دوڑائی اور اپنے بازو کو تھامے علیہ کے ہاتھ کو دھیرے سے تھکا۔

”فی امان اللہ۔“ اس نازک وقت میں خاور صاحب نے بے پناہ ضبط کا مظاہرہ کیا اور علیہ کے ہاتھ سے اس کا بازو نرمی سے چھڑاتے ہوئے سرگوشی کے سے انداز میں بولے۔ اس نے ایک نظر اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ ان کا چہرہ زرد پڑ رہا تھا لیکن وہ خاندان کے سربراہ کی حیثیت سے اپنا فرض انجام دینے کے لیے پُر عزم دکھائی دے رہے تھے۔ اس ٹپلی اس نے اپنے باپ کی محبت اور شفقت کو جس شدت سے محسوس کیا، اس کا احساس زندگی میں پہلے کبھی نہیں ہوسکا تھا۔

”اللہ حافظ!“ اس کے لبوں نے بھی دھیرے سے یہ دو لفظ ادا کیے اور وہ ایک جھٹکنے سے مڑ کر بیرونی گیٹ کی طرف جانے والے راستے کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

خوب صورت و برقعش کمرے میں بستر پر نیم دراز بشری سخت بوریت کا شکار تھی۔ وہ کل ہی دعویٰ سے واپس آئی تھی اور سونیا کے اس شاندار گھر میں مقیم تھی جہاں وہ کھلی بار معاذ کے ساتھ اتفاقی طور پر آئی تھی۔ اس روز معاذ اس کی فرمائش پر شارٹ کٹ کا استعمال کرتے ہوئے اسے اپنی بائیک پر سہارا بگڑھ کے علاقے میں لے جا رہا تھا جہاں اسے اپنے کام کے لیے معلومات کے حصول کے لیے ایک شخص سے ملنا تھا لیکن راستے میں ہی چند کار سوار خنڈوں سے واسطہ پڑ گیا اور ان خنڈوں نے سبیلہ طور پر ان پر گولیاں چلائیں۔ ان گولیوں کی زد سے بچنے کے لیے معاذ خان ہاؤس کے کھلے گیٹ سے بائیک اندر لے گیا تھا۔ یہ ان کی سونیا خان سے شہزادی کا پہلا موقع تھا۔ بشری سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ کھلی ملاقات اس ٹپچ ٹپچ جانے کی

کہ وہ سونیا خان کا سہارا لینے اور اس کے احکامات پر عمل کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔ اب بھی وہ نہیں جانتی تھی کہ دعویٰ سے واپس آتے ہوئے وہ اپنے لکچر میں سونیا کے لیے کیا لے کر آئی ہے۔ بس اندازہ تھا کہ جو کچھ بھی تھا، کوئی غیر قانونی شے ہی تھی اور یہ صورت حال اس کے لیے اعصابی تناؤ کا باعث تھی۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ سونیا سے وابستہ ہو کر اس نے اسے فوائد حاصل نہیں کیے جتنا وہ دلدل میں پھنس گئی ہے۔ انتظام کی آگ میں جتنی وہ جن دشمنوں کو ٹھکانے لگانے کے لیے سونیا کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنی تھی، ان دشمنوں میں سے صرف میڈم ہارلی اور کامران یزدانی ہی اپنے انجام کو پہنچ سکے تھے اور ابھی ایک لمبی فہرست باقی تھی۔ وہ اپنے دشمنوں میں سے باؤل کو نشانہ بنانے کے لیے سب سے زیادہ بے چین تھی لیکن اس تک رسائی کی کوئی راہ ہی نہیں مل رہی تھی اور یہاں سونیا بھی اسے دستیاب نہیں تھی۔ اسے صرف سونیا کا پیغام ملا تھا کہ فی الحال وہ خان ہاؤس میں ہی قیام کرے۔ وہ جلد خود اس سے رابطہ کرے گی اور اب وہ سونیا کے رابطے کے انتظار میں بور ہو رہی تھی۔ بوریت اور بیزاری کی اس کیفیت میں اس نے سامنے چلا ایل ای ڈی ٹی وی بند کیا اور بستر سے نیچے اتری۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

”نہیں کم ان۔“ اس نے اسی بیزار کیفیت میں دستک کا جواب دیا کہ اندازہ تھا آنے والا کوئی ملازم ہی ہوگا۔ اس کا یہ اندازہ درست ثابت ہوا۔

”مر آپ کو اپنے روم میں کال کر رہے ہیں میم!“ آنے والے ملازم نے مؤدبانہ سے پیغام پہنچایا تو اسے قدرے حیرت ہوئی۔ داراب خان سے اس کا بھی براہ راست واسطہ نہیں پڑا تھا۔ بعض مواقع پر وہ سونیا کے شوہر کی حیثیت سے اس کے ساتھ موجود تو ہوتا تھا لیکن ہر طرح کے احکامات اور ہدایات سونیا خود ہی جاری کرتی تھی۔ حیرانی کے باوجود وہ داراب کے بلاوے کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی اس لیے پیغام ملنے پر اس کے کمرے کی طرف چل پڑی۔ ایک خیال یہ بھی تھا کہ شاید سونیا نے داراب کے ذریعے اسے کوئی پیغام بھجوایا ہو۔

دستک کے جواب میں اندر سے اجازت ملنے پر وہ کمرے میں داخل ہوئی تو لمحہ بھر کے لیے سر ہی پکرا گیا۔ سارے کمرے میں ناگوار یو لادھواں پکرا رہا تھا۔ اس نے خود کو سنبھال کر کمرے کا جائزہ لیا تو ایک دبیز جھاری ساڑھ صوفے پر داراب خان نیم دراز نظر آیا۔ گوشت کا یہ پھاڑ سونیا

جیسی نازک اور حسین بیوی کا مالک تھا یہ سوچ کر ہی عجیب لگتا تھا۔ اسے کمرے میں دیکھ کر گوشت کے اس پہاڑ نے اللہ کر بیٹھنے کی کوشش کی تو اچھا بھلا مضبوط صوفہ بھی مل کر رہ گیا۔

”آؤ باری دار لنگ..... آؤ یہاں بیٹھو۔“ اس نے اپنے سامنے بیٹھنے کی دعوت دی تو اس کے لہجے میں واضح لڑکھڑاہٹ تھی۔ لڑکھڑاہٹ کی وجہ بھی سامنے میز پر ہی دھری تھی۔ بہت انگور کی آدمی سے زیادہ خالی بوتل گواہی دے رہی تھی کہ اس کا بڑا حصہ گوشت کے اس پہاڑ کے

معدے میں منتقل ہو چکا ہے۔ اللہ کر سیدھا بیٹھنے کے بعد اس نے اپنے ہاتھ میں موجود جلتا ہوا سگریٹ شیشے کی خوب صورت الٹش نرے میں ڈال دیا۔ الٹش نرے میں پہلے ہی بے شمار سگریٹ کے ٹوٹے موجود تھے۔ بشری کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ سگریٹ سادہ نہیں ہیں اور ان میں جو کچھ بھرا گیا ہے اس کی پوکری کے نفا میں چکرار ہی ہے۔ یعنی اس وقت داراب خان دہریے نشے کی لپیٹ میں تھا۔ اسے اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ داراب کون کون سے نشے استعمال کرتا ہے۔ وہ صرف اپنے بلاوے کا مقصد جاننا چاہتی تھی اس لیے اس کے طرزِ خطاب کو نظر انداز کر کے ایک سنگل صوفے پر بیٹھ گئی۔

”تم کتنی خوب صورت ہو باری اور ڈانس بھی لا جواب کرتی ہو۔ سونیا نے تمہاری صورت ایک ہیرا ڈھونڈ نکالا ہے۔“ اس پر اپنی نظریں گاڑتے ہوئے داراب خان نے تعریفی کلمات ادا کیے۔

”میں سونیا کہاں ہیں؟ کیا انہوں نے میرے سلسلے میں کوئی ہدایت دی ہے؟“ داراب کی نظریں اس کے نیچے انجمن کا باعث تھیں۔ کوئی عام شخص ہوتا تو وہ اس کی طبیعت ہری کر دیتی لیکن مصحفی اس کے الفاظ کو نظر انداز کر گئی اور سونیا کے بارے میں دریافت کیا۔ ایک خیال یہ بھی تھا کہ یہ شخص جو نشے کے باعث کچھ بہکا ہوا ہے اس کا ذہن مطلب کی بات پر مرکوز رکھ سکے۔

”اس سالی کو تو اپنے شوہر کا ہوش نہیں ہے، تمہارے بارے میں کیا ہدایت دے گی۔ پتا نہیں کہاں آؤ اور گردی کے لیے نکل ہوئی ہے۔“ داراب خان نے منہ میناتے ہوئے جو جواب دیا وہ بشری کے لیے باعثِ حیرت تھا۔ اس نے ہمیشہ داراب کو سونیا پر فریفت، ایک محبت کرنے والا شوہر پایا تھا لیکن اس وقت وہ اپنی حسین و جمیل بیوی کو گالیاں دے رہا تھا۔

”وہ سمجھتی ہے کہ میں اس کے بارے میں کچھ نہیں

جاننا لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ حسین نام کی کتنی خطرناک ہے۔ وہ لائف پارٹنر سے بزنس پارٹنر بننے کے بعد اب میرے بزنس پر قبضہ کرنے کا سوچ رہی ہے لیکن میں اسے ایسا نہیں کرنے دوں گا۔ میں اسے دھکے دے کر یہاں سے نکال دوں گا اور اس کی جگہ کسی اور کو دے دوں گا۔“ اس نے اپنے عزم کا اظہار کرتے ہوئے غور سے بشری کا جائزہ لیا اور یکدم ہی اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

”کیا تم سونیا کی جگہ کوئی باری؟“ اس کے سوال نے

بشری کو بوکھلا دیا۔ وہ سمجھ گئی کہ داراب اس کے انداز سے سے بھی نہیں زیادہ نشے میں ہے اور اس وقت اس سے کسی کارآمد بات کی امید نہیں کی جاسکتی۔ وہ اس کے کمرے سے نکلنے کے خیال سے کھڑی ہو گئی۔

”میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ تم ہی سونیا کی جگہ لو گی۔“ داراب کو یا اپنے فیصلے پر مسرور تھا۔ بشری نے باہر جانے کے لیے رخ موڑا۔ اگلا لمحہ اس کے لیے حیران کن تھا۔ بھاری بھر کم داراب نہایت پھرتی سے اپنی جگہ سے اچھل کر سینٹرل ٹیلی پار کرتا ہوا اس تک پہنچ گیا تھا اور اس کا ہانڈ اپنے آہنی ہاتھ میں جکڑے اس کی راہ میں مزاحم تھا۔

”ہلیئر مسٹر داراب! مجھے جانے دیں۔ اس وقت آپ اپنے ہوش میں نہیں ہیں اس لیے میرا یہاں سے چلا جانا ہی بہتر ہوگا۔“ بے پناہ ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے داراب سے درخواست کی ورنہ دلی تو یہی چاہ رہا تھا کہ اس صوفے کی تولد میں کوئی نکلی شے گھسا کر اس کا پیٹ پھاڑ دے۔

”ہوش تو تم نے کچھ میسرے اڑا دیے ہیں سوئی اور میں فیصلہ کر چکا ہوں کہ تم ابھی اور اسی وقت سونیا کی جگہ لو گی۔“ اس نے اپنی بے پناہ طاقت کا استعمال کرتے ہوئے بشری کو کسی ریر کی مڑیا کی طرح اپنی بائیں میں اٹھالیا اور جھومتا ہوا چھتری سائز خوب صورت بیڈ کی طرف بڑھا۔

”مجھے چھوڑ دو باسٹرڈ، ورنہ میں تمہارا خون پی جاؤں گی۔“ اس کی یہ جسارت بشری کے لیے ناقابلِ برداشت تھی، سو خلق کے بل چیخ کر بولنے کے ساتھ ساتھ خود کو اس کی گرفت سے چھڑانے کے لیے ہاتھ بھر چلائے لگی لیکن داراب کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ غیر معمولی جیسے کا مالک ہونے کے ساتھ ساتھ وہ گویا حیوانی طاقت کا بھی مالک تھا اور بشری کے لیے خود کو اس کی گرفت سے چھڑانا ناممکن ثابت ہو رہا تھا۔ داراب نے اسے بیڈ پر اچھالا تو اس کی مشکل آسان ہوئی اور تڑپ کر کر وٹیں بدلتی ہوئی بیڈ کے دوسرے کنارے پر پہنچ کر بستر سے نیچے چھلانگ لگا دی۔

اور پے در پے کھڑی پھیلی کے کئی وار اس کی گردن اور شانوں پر کیے۔ اس کے جسم پر داراب کا بوجھ اب بھی موجود تھا اور اب بھی وہ آزادانہ حرکت نہیں کر سکتی تھی لیکن جو کر سکتی تھی، وہ کر رہی تھی۔

”میں تیری ہڈیوں کا سرمہ بنا دوں گا۔“ وار پر وار سہتا داراب اب بری طرح غرایا۔

”مجھے سرمہ بننا منظور ہے لیکن تجھے تیرے ناپاک

امدادوں میں کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔“ بشری نے ہانپتی ہوئی آواز میں اسے جواب دیا۔ اس پر فحش اور ٹھنڈے کمرے میں بھی وہ داراب سے مقابلہ کرتے ہوئے پسینا پسینا ہو چکی تھی لیکن یہ طے تھا کہ اسے داراب کو اس کے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دینا ہے۔

”میں تو تجھے ادنیٰ مقام دے رہا تھا لیکن تجھے منظور نہیں تو اب تو اپنی کرنی کی سزا بھی بھگتے گی۔“ ناک اور کینٹی سے بہتے خون نے داراب کا چہرہ بے پناہ خوفناک بنا دیا تھا۔ اس خوفناک چہرے کے ساتھ اس کا خوفناک لبہ لکڑی کر صورت حال کو مزید سنگین بنا رہا تھا۔ صورت حال کی یہ سنگینی فوراً ہی سامنے بھی آگئی۔ نیسے اور پیش میں بھرے ہوئے داراب نے پوری قوت سے اس کے منہ پر چھڑ دے مارا۔ چھڑ اتنا زوردار تھا کہ بشری نے اپنے منہ میں خون کی ٹھیکنی کھلتی ہوئی محسوس کی۔ داراب کی ڈانٹنی رداب مثل طور پر پلٹ چکی تھی اور وہ بشری کی قربت سے لطف اندوز ہونے کے بجائے اس کی ہڈی پٹلی ایک کرنے پر عمل کیا تھا۔ اپنے اس ارادے پر عمل پیرا ہونے کے لیے وہ بشری کو چھوڑ کر کھڑا ہوا اور اس کے پہلو میں ایک زوردار ٹھوکر ماری۔ بشری کے لبوں سے سسکاری نکل گئی لیکن اس نے اپنے حواس گم نہ ہونے دیے اور داراب کی دوسری ٹھوکر لگنے سے قبل ہی قالیں پر دوڑ تک لوٹ گئی۔ داراب بدست ہاتھی کی طرح دندنا رہا تھا اس کی طرف بڑھا۔ بشری کو اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ جسمانی قوت سے اس سانڈ کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس نے ایک نظر میں کمرے کا جائزہ لیا اور میز پر دھری شراب کی بوتل جھپٹ کر اٹھالی۔ اس دوران میں داراب اس پر حملہ آور ہو چکا تھا۔ اس نے عین دقت پر جگہ چھوڑ کر خود کو داراب کے حملے سے بچایا پھر فوراً ہی بوتل سمیت اس پر حملہ آور ہوئی۔

پوری قوت سے کیے گئے دار نے کام دکھایا۔ شیشے کی بوتل داراب کے ہاتھ جیسے سر سے ٹکرا کر ٹوٹی تو اس میں موجود باقی ماندہ شراب نے داراب کے بالوں کو بھگو ڈالا۔

داراب جو اسے بستر پر پھینکنے کے ساتھ ہی اس پر چھپتا تھا، ذرا سا توازن بگڑنے پر لڑکھڑا کر بستر پر گر گیا لیکن پھر فوراً ہی حیرت انگیز پھرتی سے خود کو سنبھال کر کھڑا ہو گیا اور دوبارہ بشری پر چھپا۔ بشری نے شدید پیش کے عالم میں ناک کھائی اور اس کی داہمیں پسلیوں پر بھر پور ضرب لگانے کی کوشش کی۔ اس کی ضرب زوردار ہی تھی لیکن داراب کے جسم پر چڑھی چرلی اور گوشت کی تہ نے ضرب کا بھر پور اثر پسلیوں تک نہ پہنچنے دیا، سو خاطر خواہ نتیجہ بھی نہیں نکل سکا۔

داراب بدست ہاتھی کی طرح جھومتا ہوا ایک بار پھر اس پر چھپا۔ بشری نے عین وقت پر جھکائی دے کر خود کو دائیں طرف نہ پھسلایا ہوتا تو داراب کی گرفت میں آ چکی ہوتی۔

ناکامی نے داراب کو جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر دیا اور وہ کسی درد سے کی طرح دھاڑتا ہوا اس کی طرف لپکا۔ بشری کو کچھ بھائی نہ دیا تو کارنس پر دھراؤ تو فریم اٹھا کر اسے دے مارا۔ نوٹو فریم کا ایک کونا داراب کی کینٹی پر لگا اور کینٹی سے خون کی پتلی سی دھار بہہ نکلی۔ اس چوٹ نے داراب کو بے پناہ غضب ناک کر دیا اور وہ منہ سے حیوانی آوازیں نکالتا ہوا کسی وحشی جانور کی طرح ہی اس پر چڑھ دوڑا۔ اس کی پیش قدمی میں اتنی تیزی تھی کہ بشری بروقت کوئی تدبیر نہ کر سکی اور داراب اسے دبیز قالیں پر گرا کر کسی بلا کی طرح اس سے چٹ گیا۔ اس کے بھاری جسم تلے بشری کا ناک پدن کپٹنے لگا اور اسے یوں لگا کہ وہ دم گھٹنے سے ہی مر جائے لی لیکن اپنی تمام تر قوت ارادی کو بروئے کار لا کر اس نے خود کو اس صورت حال سے نکلانے کی کوشش کی اور اپنے واحد آزاد ہاتھ سے داراب کی گردن اور منہ کو نشانہ بنانے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کے ناخنوں نے داراب کے چہرے اور گردن پر چند کھردرے لگائے لیکن وہ جس وحشت میں مبتلا تھا، یہ چند معمولی زخم اس پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتے تھے۔ وہ لمحہ بہ لمحہ اس پر چھاتا چلا جا رہا تھا اور بشری کے لیے یہ ناقابل برداشت تھا کہ وہ ایک بار پھر کسی مرد کی بربریت کا نشانہ بن جاتی۔ اس کے پورے وجود میں ایک وحشت نے زور مارا اور اس نے حلق سے ایک وحشیانہ آواز نکالتے ہوئے اپنا سر پوری قوت سے داراب کی ناک پر دے مارا۔ ایک مطلوب ہو چکی لڑکی سے ایسی شدید ضرب کی امید نہیں کی جاسکتی تھی۔ بس یہ وحشت ہی تھی جس نے اس سے یہ کارنامہ انجام دلوایا۔ ضرب نے خاطر خواہ کام دکھایا اور داراب کی ناک سے خون کا فوارہ بہہ نکلا۔ وہ بے ساختہ ہی اپنی ناک پر ہاتھ رکھ کر چیخا۔ بشری نے اسے مہلت نہیں دی

بچانے کی ایک کوشش کروں۔“ اس نے داراب کی بہت ناگ لاش پر ایک نظر ڈالی اور فیصلہ کرتے ہوئے اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی۔ عین اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا اور اس نے سونیا کو اندر آتے ہوئے دیکھا۔ وہ اپنی جگہ برف ہو گئی۔ سکتہ امینی دھن میں اندر آتی سونیا کو بھی ہوا۔
 ”یہ کیا ہوا؟“ اس نے حیرت انگیز طور پر خود کو سنبھال لیا اور بشری کے قریب آکر اس سے پوچھا۔ اس کے پیچھے کمرے کا دروازہ پہلے ہی خود کار طریقے سے بند ہو چکا تھا۔

”یہ میرے لیے دوسرا مائل بن رہا تھا اور میں یہ کسی قیمت پر برداشت نہیں کر سکتی تھی۔“ بشری نے سپاٹ لہجے میں اسے جواب دیا۔

”باسٹرڈ“ دنیا کی بے شمار حسین عورتوں کے ساتھ وقت گزارنے کے باوجود اس کی بھوک بھی یوں نہیں مٹی، میرے پاس اس سوال کا جواب نہیں۔“ سونیا خان نے ایک قبر آلود نگاہ داراب کی لاش پر ڈالی اور اپنے موبائل پر کوئی فہرڈائل کرنے لگی۔ بشری کے لیے اس کا رد عمل بے حد عجیب تھا۔ اتنا تو وہ بھی سمجھتی تھی کہ سونیا کو شوہر کی موت کا کوئی خاص صدمہ نہیں ہو گا لیکن وہ اتنی پرسکون رہے گی، یہ تو سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ اپنی حیرت میں ڈوبی وہ سونیا کی آواز سنتی رہی۔ وہ اپنے میکس میٹریم گارڈ حامد کو خواب گاہ میں طلب کر رہی تھی۔ اس کے کال منقطع کرنے کے اگلے ہی لمحے دروازے پر دستک ہوئی اور سونیا کے ”کم ان“ کے جواب میں حامد اندر داخل ہوا۔ اندر آتے ہی اس کی نظر داراب کی لاش پر پڑی۔ وہ ایک لمحے کے لیے چونکا پھر سوالیہ نظروں سے سونیا کی طرف دیکھنے لگا۔

”اس مسئلے کو دیکھو۔ مجھے سب کچھ یمن اینڈ کلیئر چاہیے۔“ اس نے حامد کو حکم دیا اور بشری کی طرف گھومی۔

”کچھ نہیں ہوا ہے۔ تمہیں بس اتنا بیان دینا ہے کہ داراب کے بلاوے پر تم اس سے ملنے آئیں تو وہ سخت نشے میں تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ تمہیں بلاوے کا مقصد بتاتا، اسے دل کا شدید دورہ پڑا اور وہ خود کو سنبھالنے میں ناکام ہو کر گلاس ٹیبل پر گر گیا۔ آگے کے معاملات میں خود سنبھال لوں گی۔ بوڈونٹ وری۔“ سونیا خان نے چٹکیوں میں سارا مسئلہ ہی حل کر دیا تھا۔

”حامد یہاں سب ٹھیک کر دے گا۔ تم میرے ساتھ آؤ۔“ اس نے حکم دیا تو بشری کے لیے ممکن نہیں تھا کہ اس حکم کی خلاف ورزی کرتی۔ وہ اس کے پیچھے کمرے سے باہر نکلتی

اس بستی ہوئی شراب میں داراب کے سر سے نکلنے والا خون بھی شامل ہو گیا اور اس کے لبوں سے ایک پراڈہیت چٹکی نکلی۔ اب بشری اسے ذرا بھی مہلت دینے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس کے سارے وجود میں چنگار پاں سی پھوٹ رہی تھیں اور وہ شدید ملیش کے عالم میں ٹوٹی ہوئی بوتل سے داراب پر یکے بعد دیگرے وار کرتی چلی جا رہی تھی۔ اسے اس وقت داراب صرف داراب نظر نہیں آ رہا تھا۔ اسے داراب کے وجود میں باؤل کا مکروہ وجود بھی دکھائی دے رہا تھا۔ وہ مکروہ وجود جس نے اس سے اس کے ہاں باپ بکھر اور ذات کا غرور چھین لیا تھا۔ اس کا بوتل والا ہاتھ ایسے مستحکم انداز میں حرکت کر رہا تھا کہ داراب جیسے طاقتور مرد کو بھی بچاؤ کی مہلت نہیں مل سکی اور وہ اپنے ہی خون میں نہا گیا۔ بالآخر وہ کسی کئے ہوئے شہتیر کی طرح گر گیا۔ یہ اس کی بد قسمتی تھی کہ وہ گلاس ٹیبل پر گرنا اور ٹیبل کا شیشہ اس کے وزن سے کچھ اس طرح ٹوٹا کہ ٹوٹے ہوئے شیشے کا ایک ٹکڑا اس کی شہ رگ میں اتر گیا۔ داراب ذبح کیے جانے والے جانور کی طرح بھڑکا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس نے دم توڑ دیا۔ اس کے دم توڑتے ہی بشری کی وحشت نے بھی دم توڑ دیا اور وہ خود بھی تالین پر چلتی چلی گئی۔

اسے معلوم تھا کہ یہ کمرہ ساؤنڈ پروف ہے اور اس کمرے میں ہونے والے ہنگامے کی باہر ذرا بھی بھٹک نہیں پڑی ہوئی۔

”کیا میں خاموشی سے یہاں سے فرار ہو جاؤں؟“ اس نے خود سے سوال کیا۔ فرار ہونا بالکل بھی مشکل نہیں تھا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ فرار ہو کر وہ جائے گی کہاں؟ فوری طور پر اس کے ذہن میں ایسی کوئی جگہ نہیں آرہی تھی جہاں وہ ان پہنچنے والے لوگوں کی رسائی سے محفوظ رہ سکے۔

”سونیا خان کا اپنے شوہر کی موت پر کیا رد عمل ہو گا؟“ پہلے سوال کا کوئی جواب نہ پا کر اس نے خود سے دوسرا سوال کیا۔ وہ خود اس بات کو سمجھ سکتی تھی کہ سونیا اور داراب کی بے جوڑ شادی میں محبت کا جذبہ قطعی کارفرما نہیں ہے۔ اب داراب کے نشے میں ادا کیے جملوں سے یہ بھی ثابت ہو گیا تھا کہ سونیا کسی نہ کسی طرح اسے دھوکا دے رہی تھی۔ ایک دھوکے باز بیوی کو شوہر کے مرنے کا نیا غم ہو گا لیکن اس شاعر عورت کا کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ شوہر کی موت کو کس طرح کیش کرتی۔

”مجھے فی الحال یہاں سے چلے ہی جانا چاہیے۔ سونیا خان کے کسی نئے جال میں پھنسنے سے بہتر ہے میں خود کو

جلی گئی۔ ایک عورت کے لیے شوہر کی موت اتنی غیر اہم تھی، یہ واقعہ زندگی میں پہلی بار ہی دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

معاذ نے اپنے سامنے موجود کھانے کی ٹرالی پر نظر ڈالا۔ خوش رنگ و اشتہا انگیز خوشبودار بریانی، خوب صورت سجاوٹ والا فروٹ ٹرائفل، نفاست سے تلے ہوئے شامی کباب، رائیس اور سلا د نہایت سلیقے سے شیٹے کی نازک اور دیدہ زیب کراکری میں موجود اسے اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس قسم کا کھانا اسے بھی کبھی ہی فراہم کیا جاتا تھا۔ مشرق کے پُر تکلف کھانوں کے بجائے اسے فراہم کیے جانے والے کھانوں کی غذایت کو زیادہ مد نظر رکھا جاتا تھا اور کیلوریز کے حساب کتاب سے غذا کے استعمال کی ہدایت دی جاتی تھی لیکن شاذ و نادر اس معمول میں تبدیلی بھی ہو جاتی تھی اور آج کے سینو سے ملتا جلتا سینو اس کے سامنے آ جاتا تھا۔ معمول سے ہٹ کر پیش کیا جانے والا خالص مشرقی کھانا وہ بڑے شوق سے کھاتا تھا لیکن آج اس کھانے نے بھی اس کے دل پر چھائی اداسی دور نہیں کی۔ وہ جب سے گھر والوں سے مل کر آیا تھا، عجیب سے موڈ میں تھا۔ کبھی ابو کا زرد چہرہ نگاہوں میں گھومتا تھا تو کبھی سعد کی آنکھوں کی اداسی یاد آ جاتی تھی اور علیہ کے آنسو تو گویا اس کے دل میں جمع ہو گئے تھے۔ وہ سب سے چھوٹی تھی اور والدین کے علاوہ دونوں بھائیوں کی بھی لاڈلی تھی۔ اس لاڈلی بچی کے لیے پے در پے پیش آنے والے حادثات کو سہتا سب سے مشکل ثابت ہو رہا تھا اور وہ اس کو بے حد تسلی اور دلا سے دینے کے باوجود مطمئن نہیں تھا کہ وہ ان حالات میں خود کو پوری طرح سنبھالنے میں کامیاب رہے گی۔

"آپ امی کے ہاتھ کی بریانی کتنے شوق سے کھاتے تھے نا بھائی؟" یہ جملہ علیہ نے اس روز اس سے کہا تھا جب وہ خود کو ملنے والی مہلت کے نتیجے میں پھپھو کے گھر موجود تھا اور ثوبیہ نے پھپھو کو پُر تکلف کھانا تیار کر کے ان کے سامنے ڈانٹنگ بیکل پر سجا رکھا تھا۔

علیہ کے اس جملے کو سننے کے بعد ثوبیہ کی تیار کردہ لذیذ بریانی کے لقمے اس کے حلق میں اٹکنے لگے تھے۔ اسے خود بھی یہ بات کہاں بھولی تھی کہ وہ اپنی امی سعیدہ بیگم کی تیار کردہ بریانی کو Ammi's Special کہا کرتا تھا اور اس کی فرمائش پر اس کی امی اس کے دوستوں کے لیے بھی یہ ڈش بڑے اہتمام اور شوق سے تیار کرتی تھیں۔

حقیقت یہ تھی کہ اس کی والدہ سعیدہ بیگم ایک ایسی

گھریلو خاتون تھیں جنہیں امور خانداری پر مکمل عبور حاصل تھا۔ کھانا پکانے سے لے کر سینے پرولنے اور گھر کو سجانے ستوارنے تک ہر کام میں انہیں کمال حاصل تھا۔ گھریلو امور کی تندرہی سے انہوں نے اپنی ذاتی کے علاوہ وہ اپنی شخصیت پر بھی خصوصی توجہ دیتی تھیں۔ معاذ کو یاد نہیں تھا کہ اس نے اپنی امی کو کبھی گھر سے بالوں اور ہلکے لباس کے ساتھ دیکھا ہو۔ وہ ہمیشہ خود کو بنا ستوار کر رکھتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ ان سے ملنے والے راجینی لوگ مشکل ہی سے انہیں نہ پاتے تھے کہ وہ

جوان بچوں کی ماں ہیں۔ معاذ کو اچھی طرح یاد تھا کہ جس صبح وہ کیر گھر کے ٹرپ پر جانے کے لیے گھر سے روانہ ہوا تھا، امی نے کاہی رنگ کا نفیس قمیض شلوار پہن رکھا تھا۔ اس جوڑے کے ہم رنگ دوپٹے پر کریشیا کی نکل مٹی ہوئی تھی اور یہ نکل امی نے اپنے ہاتھوں سے بنائی تھی۔ ان کے گلے اور کانوں میں سونے کے ہلکے پھلکے زیورات موجود تھے اور بائیں کلائی پر وہ نازک سی رسٹ وایج موجود تھی جو صبح جاگنے سے لے کر رات سونے تک ان کی کلائی پر ہی موجود رہتی تھی۔ وہ وقت کی بے حد پابند خاتون تھیں اور اس صبح بھی انہوں نے اپنی رسٹ وایج میں وقت دیکھتے ہوئے معاذ کو تنبیہ کی تھی کہ وہ لیٹ ہو رہا ہے۔ اس صبح اس کی امی سے آخری ملاقات ہوئی تھی۔ اگر انہیں معلوم ہوتا کہ اس صبح کے بعد وہ اپنے پیارے بیٹے کو کھودیں گی تو ہرگز بھی اسے گھر سے باہر نہیں نکلنے دیتیں اور اگر وہ جانتا کہ وہ آخری پارای کی صورت دیکھ رہا ہے تو شاید کسی طرح وقت کو روک لیتا۔ وہ تو بہت خوش، شاداب و فرحان اپنے پسندیدہ مقامات کی سیر کو نکلا تھا اور اسے خبر نہیں تھی کہ اسے اس سفر سے واپسی کی راہ ملے گی اور نہ ہی امی کے تروتازہ چہرے کی دید۔

وہ ایک ایسا بد نصیب بیٹا تھا جسے اپنی ماں کی آخری دید نصیب ہوئی تھی اور نہ ہی وہ ان کے جنازے کو کا ندھا دے سکا تھا۔ اپنی یہ محرومی اس پر قمیض قید خانے میں کئی بار اسے خون کے آنسو رلا چکی تھی۔ آج پھر یہ خوش آنسو اس کی آنکھوں میں اتر آئے تھے لیکن آنکھوں سے بہنے کے بجائے دل پر انگارے بن کر گر رہے تھے۔ ان انگاروں کی تپش نے اس کے سینے کو دہکا رکھا تھا لیکن وہ مجبور تھا کہ کہیں اس کا کوئی قدم اس کے پیادوں پر مصیبت نہ ملے آئے۔ اس کے دشمن اتنے چوکنا تھے کہ انہوں نے اسے گھر والوں سے ملاقات کی اجازت دیتے ہوئے بھی اس بات کا انتظام کر رکھا تھا کہ وہاں ہونے والی گفتگو کا ایک ایک لفظ سن سکیں۔ ایسے میں وہ اپنے حالات سے فرار کی کوئی راہ

ڈھونڈتا بھی تو کیسے۔ اسے تو غیر ممکن حد تک ان حالات کے حصار میں ہی رہنا تھا۔

”تم نے ابھی تک سچ نہیں سنا۔“ کہانے کی ٹرائی پر نظر جمائے وہ اپنی سوچوں میں رہنے کہاں کہاں بھٹکتا پھر رہا تھا کہ سونیا خان کی حیرت زدہ آواز نے اسے متوجہ کیا۔ آج اس نے خلاف معمول سیاہ رنگ کا سیدھا سادہ لباس پہن رکھا تھا اور مزید بھی کوئی اہتمام نہیں تھا لیکن اس بات میں کوئی دیر رائے نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ اس سادہ سے طے میں بھی غضب ڈھا رہی تھی۔ درحقیقت وہ ان عورتوں میں سے تھی جنہیں خوب صورت نظر آنے کے لیے اہتمام کی ضرورت نہیں ہوتی اور بنانے والے نے بھی انہیں بے حد اہتمام سے بنایا ہوتا ہے۔

”کہاں چھوٹے ہوئے ہو۔ میں نے اندر آنے سے پہلے دروازہ بھی ٹاک کیا تھا لیکن تم نے کوئی رسپانس نہیں دیا تو مجبوراً میں خود ہی اندر آگئی اور اب بھی میں محسوس کر رہی ہوں کہ تم کچھ غائب دماغ سے ہو؟“ کھانے کے سلسلے میں اپنے سوال کا جواب نہ پا کر سونیا نے قدرے ٹھکر سے اس سے دریافت کیا۔

”کچھ نہیں۔ بس ایسے ہی فارغ بیٹھا بیٹھا کچھ قنوطی سا ہو گیا ہوں۔“ وہ سونیا جیسی مشکوک ہستی کے سامنے اپنی طبی کیفیات کا اظہار کیوں کرتا سو بات ٹال گیا۔

”فراغت کہاں ہے تمہارے پاس؟ میری معلومات کے مطابق تو تمہارا پورا دن کسی مصروفیت میں ہی گزرتا ہے۔“ ”میں اس روٹین کی مصروفیت کی بات نہیں کر رہا۔ میں اس مصروفیت کا منتظر ہوں جس کے بارے میں مجھے یقین دہانی کروائی گئی تھی کہ میں اسے پسند کروں گا۔“ اس نے گویا سونیا کو یاد دلایا۔

”اس بات کو بھلایا نہیں کیا ہے لیکن مسئلہ میری فرصت کا ہے۔ تمہیں جس مشن پر بھیجا جاتا ہے، اس میں، میں تمہارے ساتھ ہوں گی اور میرے لیے فوری طور پر کسی سفر پر روانہ ہونا ممکن نہیں ہے۔“

”کیوں! کیا تمہارا وہ گوشت کا پھاڑ شوہر تمہیں اجازت دینے کے لیے تیار نہیں ہے؟ لیکن تم عورتوں کی اس قسم سے گنتی تو نہیں ہو جو شوہر کے احکامات پر عمل کرے۔“ سونیا کا جواب سن کر اس نے طنز کا تیر چلایا۔

”واقعی میں عورتوں کی اس قسم میں سے نہیں ہوں اور اب تو میں ہر معاملے میں بالکل ہی آزاد ہو چکی ہوں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ داراب کی بیوہ کی حیثیت سے فی الحال مجھے ہی

کچھ اہم امور منٹانے ہیں، اس لیے میرا کچھ عرصہ یہاں رکنا ضروری ہے۔“

”تو تمہارا مطلب ہے کہ داراب خان مرچکا ہے؟“ سونیا کے سپاٹ لہجے میں دینے گئے جواب نے اسے بری طرح ہنسا دیا۔

”ظاہر ہے داراب کے مرے بغیر تو میں خود کو اس کی بیوہ ڈیکھ نہیں کر سکتی۔“ اس حسن کے مجھے نے شانے اچکا کر نہایت بے نیازی سے جواب دیا۔

”داراب خان کیسے مرا؟“ اس نے سونیا خان کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اسے اب سمجھ آرہی تھی کہ یہ سیاہ لباس میک اپ سے مہرا چہرہ اور آرائش سے عاری وجود اصل میں داراب خان کی موت پر سوگ کا اظہار ہے لیکن طے سے ہٹ کر اس کے پورے وجود میں کہیں اس سوگ کی رتق نظر نہیں آرہی تھی۔

”شراب کے نشے میں ایک لڑکی پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ لڑکی نہیں، چوٹ کھائی ہوئی ناگن ہے۔ بس ناگن کے زہر کا شکار ہو گیا۔“ اس نے معاذ کا اپنا چارہ لینا محسوس کیا تھا۔ اس کے باوجود اس کی بے نیازی قائم رہی اور اسی بے نیازی سے داراب خان کی موت کی وجہ بتائی۔

”اورے دادا! کون تھی وہ بہادر لڑکی؟“ معاذ نے بیک وقت خوشی اور حیرت کا اظہار کیا۔

”اس قیسے کو جانے دو۔ میں بس تمہاری قسلی کے لیے تم سے ملتے آئی تھی۔ ہمارا پروگرام کچھ دن آگے ضرور بڑھا رہا ہے لیکن ختم نہیں ہوا ہے۔ تم دی جانے والی ہدایات پر عمل کرتے رہو۔ میرے خیال میں تاخیر ہمارے لیے مفید ہی ثابت ہوگی اور تم میک اپ کے بغیر ہی ہمارا مطلوبہ روپ دھارنے کے لیے تیار ہو جاؤ گے۔“ سونیا نے کبھی اڑانے والے انداز میں ہاتھ بلایا اور اس کی تھوٹی سیا ڈاڑھی بین جانے والی شیو کو دھچکی سے دیکھا۔ گھروالوں سے ملاقات کر کے آنے کے بعد اسے شیو بنانے کے ساتھ ساتھ مر کے بال ترشوانے سے بھی مدد دیا گیا تھا، نتیجتاً اس کا حلیہ اچھا خاصا تبدیل ہو گیا تھا۔

”اس قدر خیال رکھنے کا شکریہ۔“ معاذ کے لہجے میں ایک بار پھر طنز در آیا۔

”ہم تو تمہارا خیال رکھتے ہی ہیں لیکن تم بھی اپنا خیال رکھو۔ یہ پڑمردگی اور خوراک پر سے بے توجہی تمہاری جسمانی نفس پر بھی اثر انداز ہو سکتی ہے اور یہ بات ناقابل

قبول ہے۔" سونیا نے ان چھوٹے کھانے پر ایک نظر ڈالتے ہوئے سنجیدگی سے کہا تو اسے اندازہ ہوا کہ اصل میں وہ اس وقت اسی وجہ سے وہاں موجود ہے کہ اس تک اس کے بارے میں کوئی رپورٹ پہنچی ہے۔

"کس کے لیے ناقابل قبول ہے؟" اس نے سونیا کی آنکھوں میں جھانکا۔

"تم اس سوال پر غور کرنے کے بجائے اس بات پر غور کرو کہ تم پر اتنی بالواسطہ کرنے والوں کو مطلوب نتائج حاصل نہیں ہوئے تو ان کا رد عمل کیا ہوگا۔" سونیا کی سنجیدگی مزید گہری ہو گئی۔ اس گہری سنجیدگی میں کچھ ایسا تھا جس نے معاذ کو اندر سے ہلا ڈالا۔ داخلی جنموں نے اس پر انو-سلوٹ کی تھی، انہوں نے اس سے مطلوب نتائج بھی تو حاصل کرنا تھے، بصورت دیگر وہ کسی بھی انتہا پر جاسکتے تھے۔

☆☆☆

"آپ نے یاد کیا تھا بابا سائیں؟" عالم شاہ نے صداقت شاہ کی اجازت سے ان کے مقابل بیٹھتے ہوئے دریافت کیا۔

"ہاں پٹ! ہمیں تم سے کچھ اہم باتیں کرنا تھیں۔" انہوں نے پُرسوج نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"عظم بابا سائیں۔" عالم شاہ ہر تن گوش ہو گیا۔

"کراچی میں تمہارا کام کیسا چل رہا ہے؟"

"سب ٹھیک ہے بابا سائیں! اللہ سائیں نے چاہا تو ہمیں بہت اچھا آؤٹ پٹ ملے گا اور جلد ہم اپنی ٹیم پر پہچان بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔" عالم شاہ نے جواب دیتے ہوئے ان کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ صداقت شاہ کسی اور موضوع پر بات کرنا چاہتے ہیں اور یہ موضوع بس تمہید باندھنے کے لیے چھیڑ دیا ہے۔

"اللہ سائیں تمہیں تمہارے ارادوں میں کامیاب کرے۔ اگر کامیابی نہ بھی ملی تو تمہیں دلبرداشتہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم نے تمہارے رجحان کو مد نظر رکھتے ہوئے صنعتی میدان میں اترنے کا فیصلہ کیا تھا ورنہ اللہ سائیں کے کرم سے ہماری زمینوں کی آمدن ہی اتنی ہے کہ تمہیں ہاتھ پیر ہلائے بغیر بھی دنیا کی ہر نعمت مل سکتی ہے۔"

"ہاتھ پیر تو اب بھی مجھے زیادہ نہیں ہلانا پڑتے۔ سارا کام تو ماہرین کی اس ٹیم نے سنبھال رکھا ہے جسے میں نے آپ کے مشورے پر ہانک دیا ہے۔" عالم شاہ کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑی۔

"یہی ہم بھی سوچ رہے تھے کہ کام دیکھنے کے لیے تو بہت نوگ موجود ہیں اس لیے اگر تم تھوڑے عرصے کے لیے غیر موجود رہو تو کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔"

"کیا آپ مجھے کہیں بھجوانا چاہ رہے ہیں؟" عالم شاہ نے ان کے جملے سے فوراً ہی نتیجہ اخذ کر لیا جس کا جواب انہوں نے محض اپنے سر کی اثباتی جنبش سے دیا۔

"شاید آپ مجھے ان دشمنیوں کے چکر سے نکال کر منظر سے غائب کرنے کا سوچ رہے ہیں۔" اس نے دوسرا اندازہ قائم کرنے میں بھی تاخیر نہیں کی اور انہیں جواب کا موقع دینے بغیر جذباتی انداز میں بولا۔

"یہ کوئی حل نہیں ہے بابا سائیں۔ آپ آخر کتنے عرصے کے لیے مجھے منظر سے غائب رکھیں گے۔ میں خود بھی اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ بزدلوں کی طرح کہیں منہ چھپا کر بیٹھ جاؤں۔ ویسے بھی خاندان کے وارث کی حیثیت سے میرا فرض بنتا ہے کہ اب میں یہاں کے معاملات دیکھوں۔ آپ اور ماما سائیں دونوں بوڑھے ہو گئے ہیں۔ میں یہاں کے اتنے کچھ سمجھ معاملات آپ دونوں پر چھوڑ کر خود فرار کی راہ کیسے اختیار کر سکتا ہوں۔"

"تم غلط سمجھ رہے ہو پٹ! ہم تمہیں یہاں سے فرار کروا کر کہیں چھپنے کے لیے نہیں بھیج رہے ہیں بلکہ ایک فرض کی ادائیگی کے لیے ہی کہیں بھجوانا چاہتے ہیں۔ خاندان کے وارث کی حیثیت سے خاندان کے افراد کو جذباتی سہارا دینا اور مشکل حالات سے نکالنا بھی تمہارا فرض بنتا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں بابا سائیں! وہ ان کی بات پر الجھ گیا۔" آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟

"سبکل کی۔" تم نے دیکھ ہی رکھا ہے کہ معظم شاہ کی ناگہانی موت کے بعد وہ کتنی اداس اور پُشمرودہ رہنے لگی ہے۔ بچے کے اغوا والے واقعے نے اسے مزید سہا دیا ہے اور اس کے ہر انداز سے ظاہر ہے کہ وہ خود کو اور اپنے بچے کو غیر محفوظ سمجھنے لگی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اسے اس ماحول سے نکال کر کہیں دور بھیج دیں تاکہ اس کے ذہن سے یہاں پیش آنے والے برے واقعات کے اثرات دور ہو جائیں اور وہ پہلے ہی کی طرح پُر اعتماد ہو کر زندگی گزار سکے۔"

"آپ سبکل کو کہاں بھجوانے کا ارادہ رکھتے ہیں؟" وہ اپنی دونوں بیٹیوں سے بہت محبت کرتا تھا۔ خصوصاً سبکل اس کے زیادہ ہی قریب تھی اور اس کے نو جوانی میں بچہ ہو جانے کے سانچے پر وہ خود شدت سے تسلیم کر رہا کرتا تھا۔ غم کی اس شدت نے اسے سومرو خاندان اور ان کے پالتو ڈاکوؤں

کے خلاف انتقامی کارروائیاں کرنے پر بھی مجبور کیا تھا اور اب تک وہ ان لوگوں کو خاطر خواہ نقصان بھی پہنچا دکا تھا لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ تھی کہ محل کے غم کا کوئی عداوتیں ہوا تھا اور اس کی خوب صورت آنکھوں میں اداسی کا موسم ٹھہر گیا تھا۔ غم کے سمندر میں ڈوبی لاڈلی بہن کا دل بہلانے اور دھیان بنانے کے پروگرام کا سن کر وہ پوری جان سے صداقت شاہ کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

”جانے کو تو تم لوگ دنیا کے کسی بھی حصے میں جا سکتے ہو لیکن محل کے ساتھ چھوٹے بچے کا بھی مسئلہ ہے۔ کسی بالکل مختلف ماحول میں جا کر بچے کے لیے صحت کے مسائل پیدا ہو سکتے ہیں جو یقیناً محل کے لیے ایک ناپسندیدہ قابل قبول بات ہوگی اس لیے ہم نے بہت سوچ بچھ کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ تم محل کو لے کر بھارت چلے جاؤ۔“

”بھارت؟“ وہ سن کر قدروں سے حیران ہوا۔
 ”ہاں بھارت تمہارے فلم میں ہے کہ وہاں ہمارے کچھ عزیز واقارب مقیم ہیں اور ان سے ہمارا رابطہ بھی رہتا ہے۔ کچھ دن قبل وہاں سے ہمارے ایک چچیرے بھائی کا فون آیا تھا۔ اس نے اطلاع دی ہے کہ اس کے بیٹے کی شادی کی تاریخ طے پائی ہے اور وہ اس شادی میں ہمارے خاندان کی شمولیت کا خواہاں ہے۔“

”پھر تو آپ کو چاہیے کہ آپ، اماں سائیں، محل اور مول کے ساتھ خود شرکت کے لیے تشریف لے جائیں۔ یہاں کے معاملات میں دیکھ لوں گا۔“ بھارت جا کر رشتہ دار یاں نبھانے کے خیال سے وہ تھوڑا سا ٹھہرا گیا۔

”مول کے امتحان ہونے والے ہیں اس لیے وہ کہیں نہیں جاسکتی۔ تمہاری اماں سائیں بھی اپنے بی بی اور شوگر کی بگڑتی بنتی صورت حال کی وجہ سے سفر کرنے سے گریزاں ہیں اور خود ہم بھی اپنے لیے مناسب نہیں سمجھتے کہ شادی والے گھر کی مصروفیت اور گھبراہٹ میں جا کر خود کو بے آرام کریں۔ تمہاری بات البتہ الگ ہے۔ تم جوان خون ہو۔ تھوڑی بہت بے آرامی بھی برداشت کر لو گے اور رونق میسے کو بھی انجوائے کر دو گے۔ ویسے بھی محل تمہارے ساتھ جانے میں جتنا کنفرمیشنل کرے گی، ہم میں سے کسی کے ساتھ نہیں کرے گی بلکہ مجھے تو خدشہ ہے کہ تمہارے علاوہ کسی اور کے ساتھ جانے کی بات پردہ جانے سے انکار ہی نہ کر دے۔ صرف تم ہو جو اسے اس اداس اور قنوطیت زدہ ماحول سے نکال کر اپنے ساتھ جانے پر راضی کر سکتے ہو۔“

حقیقت یہ تھی کہ صداقت شاہ وقتی طور پر سکنا اسے

ماحول سے نکالنا چاہتے تھے اور اس سلسلے میں محل کے معاملے کو انہوں نے بڑے سینے سے استعمال کیا تھا سو ہر وہ دلیل دے رہے تھے جو اسے متوقع سفر پر جانے کے لیے آمادہ کر سکے۔ ان کا خیال تھا کہ اس عرصے میں وہ معاملات کو اپنے طور پر بہتر طور پر منبھال لیں گے اور عالم شاہ کا کوئی جذباتی قدم ان کے لیے مسائل میں اضافہ نہیں کر سکے گا۔

”ٹھیک ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ اس طریقے سے محل کی حالت پر کوئی مثبت اثرات پڑ سکتے ہیں تو میرے لیے انکار کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ آپ یہ بتائیں کہ ہمیں کب یہاں سے جانا ہوگا؟“ حسب توقع بالآخر اس نے آمادگی ظاہر کر لی دی۔

”ہم روانگی کے سارے انتظامات کر کے تمہیں آگاہ کر دیں گے۔ تم اس عرصے میں کراچی میں رہ کر اپنے کام کو بھرپور توجہ دو تا کہ تمہاری غیر موجودگی کے عرصے میں تمہاری کمی زیادہ محسوس نہ کی جائے۔“ انہوں نے سفر کی ضروری کارروائیاں مکمل ہونے کے عرصے میں بھی اسے آزاد اور فارغ چھوڑنا من سب نہ سمجھا اور ایک سوچا ہوا مشورہ عنایت کیا۔

”جو آپ کا حکم بابا سائیں۔“ صداقت شاہ کے یقین کے مین مطابق ان کے مشورے کو حکم کا درجہ دیا گیا تھا۔ پہلی بار ان کے چہرے پر ایک آسودہ سی مسکراہٹ چھلی اور عالم شاہ کی طرف دیکھتے ہوئے دوستانہ لہجہ میں بولے۔

”یہاں تو تمہیں کوئی چھوکری جیون ساتھی بنانے کے لیے اب تک بھائی نہیں۔ وہاں جا کر غور کرنا۔ شاید وہاں کوئی بڑی تمہارے دل کو بھا جائے اور ہماری پوتا پوتی کھلانے کی خواہش پوری ہو سکے۔“

”آپ کا بھی جواب نہیں بابا سائیں! ہر موقع پر اپنی یہ خواہش بیان کرنے کا موقع نکال ہی لیتے ہیں۔“ عالم شاہ ان کی بات سن کر ہنسا۔

”تم ہماری جگہ ہوتے تو اس خواہش کی شدت کا اندازہ ہوتا پتہ اتم تو بس اس بات سے ہی اندازہ لگا لو کہ ہم نے تم پر خاندان میں ہی سے چھوکری پسند کرنے کی پابندی عائد نہیں کی اور اس معاملے میں بالکل غری بیحد دے رکھا ہے۔“ عالم شاہ کے بھارت جانے کے معاملے میں ہائی بھر لینے پر صداقت شاہ کا مزاج خوشگوار ہو گیا تھا اس لیے مصنوعی آہ بھرتے ہوئے دوستانہ لہجہ میں جواب دیا۔

”اس کے لیے میں دل سے شکر گزار ہوں اور آپ کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کرتے ہوئے بس اتنا ہی کہہ سکتا ہوں

میں اس میں بھی نمایاں ہی نظر آتی۔ "لڑکی نے اس کی بات کا جواب تپا دینے والے انداز میں بڑی بے نیازی سے دیا۔ اس کی بات میں ایسا کوئی مبالغہ بھی نہیں تھا۔ وہ جس حسن کی مالک تھی، وہ واقعی ہر روپ میں نمایاں ہونے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

"وہیے بھی میں خدا کی دی ہوئی نعمتوں کو چھپا چھپا کر رکھنے کی قائل نہیں ہوں۔" لڑکا برسے برسے منہ بنا کر اس کے پہلے جملے کو کسی کنوے گھونٹ کی طرح حلق سے اتارنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے دوسرا جملہ بھی داغ دیا۔ اس طنزیہ گفتگو کے باوجود اس کے چہرے کے تاثرات خوشگوار ہی تھے اور انہیں وہی آواز میں سرگوشیوں میں بات کرتے دیکھ کر کسی کو اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ آپس میں کس قسم کی گفتگو کر رہے ہیں۔ بس لڑکا ہی کچھ ناراض ناراض سا نظر آتا تھا اور ایک نوجوان جوڑے کے درمیان روٹھنے مرنے کا سلسلہ تو فطری عمل کی طرح محسوس ہوتا ہے۔ لوگ اس سلسلے کو بھی دلچسپ نظروں سے دیکھ کر خود ہی ان کے مابین ہونے والی گفتگو کے بارے میں اندازے قائم کر رہے تھے۔ صورت حال پر ہالاں لڑکے نے تھلا کر لڑکی کو کوئی جواب دینا ہی چاہا تھا کہ بس کو گتے والے زبردست جھٹکے نے اس کا توازن بگاڑ دیا اور اس کا جسم لڑکی کے گداز جسم پر جا گرا۔ لڑکی نے ایک سریلی سی چیخ مار کر اس کے گرد اپنی بانہیں کھینچنے کی کوشش کی لیکن وہ فوری طور پر خود کو سنبھال کر ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس دوران ڈگمگاتی ہوئی بس بھی ڈرائیور کی مہارت سے سنبھل کر رک چکی تھی۔ بس کے ڈمک نے اور توازن کھونے کی وجہ قابل فہم تھی کہ ڈرائیور پھینٹنے کا کان بھاڑ دھا کا سب ہی نے سنا تھا لیکن رکی ہوئی بس میں اچانک ہی بھرا باد کر جو سب افراد داخل ہوئے، انہیں دیکھ کر سب کی سٹی گم ہو گئی۔ لڑکی کی گداز بانہوں کو جھٹک کر کھڑا ہو جانے والا لڑکا بھی اپنی جگہ کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔

"بیٹھ جاؤ۔ سب اپنی اپنی جگہ پر خاموشی سے بیٹھ جاؤ ورنہ ابھی بھیجا اڑا دیں گے۔" گہری سانسوں کی دھت والی پختہ عمر کا مرد جس نے جینز کی بد رنگ پینٹ پر بغیر استیوں کی کھیلے بنوں والی جیکٹ پہن رکھی تھی، اپنے ہاتھ میں موجود اسے کے 47 لبر اے ہوئے چھاپا تو سب کی نگاہیں بندھ گئی۔ اپنی نشست سے صورت حال جاننے کے لیے اٹھ کھڑا ہونے والا جوان لڑکا جو دراصل معاذ تھا، بھی ایک گہری سانس لیتا ہوا اپنی جگہ پر واپس بیٹھ گیا۔ اسے ذاتی طور پر بھی اسلئے کے بارے میں جاننے سے دلچسپی تھی اور پچھلے عرصے میں جس تربیت سے گزرا

کہ بیوستہ وہ شجر سے امید بہا رہا تھا۔ "عالم شاہ نے ان کے دوستانہ موڈ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ترست جواب دیا تو ان کے ہونٹوں پر بے ساختہ ہی ہنسی بکھر گئی۔ غم اور مسائل میں گھرے ان کے خاندان کے لیے یہ ہنسی بھی ایک نعمت تھی۔

☆☆☆

کچھ یاتریوں سے بھری اس بس میں موجود وہ جوان جوڑا بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔ لڑکی نے گہرے نیلے رنگ کی خوب گھیردار شلوار اور گھٹنوں سے اوپر کی کشادہ گریبان والی بے حد تنگ کی قمیض پہن رکھی تھی جس میں اس کے ترشے ہوئے جسم کا ایک ایک انگ نمایاں ہو رہا تھا لیکن غنیمت تھا کہ سر سے اوڑھے گئے ست رنگی دوپٹے نے کسی نہ کسی حد تک بالائی جسم کو چھپا لیا تھا۔ حقیقتاً وہ صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں کی عملی تفسیر دکھائی دے رہی تھی۔ گہرا نیلا رنگ اس کی سنہری رنگت پر خوب چمک رہا تھا اور کانوں میں پڑے نیلے عینوں والے بڑے بڑے جھمکوں کی توقست پر درشک کیا جاسکتا تھا جو ہر ہنگوڑے کے ساتھ بھی اس کی سرکاری واد گردن تو کبھی گاؤں کی رخساروں کو چومنے کا اعزاز حاصل کر رہے تھے۔ اس نے اپنے سیاہ بالوں کو جھج کی مانگ نکال کر ایک رنگین پراندے میں گوندھ رکھا تھا۔ ہاتھ میں بھری افشاں دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ نئی فوٹی دلہن ہے جو بیاہ کے فوراً بعد ہی اپنے بچے کے ساتھ یا ترستے ہو کر واپس آرہی ہے۔

اس کا جوان سال بچی رنگ و روپ میں اس سے کم نہیں تھا۔ اس نے گہرے عنابی رنگ کا گھیردار قمیض شلوار پہن رکھا تھا۔ سر پر سکھوں کی مخصوص چوڑی قمیض جس کے اندر اس کے دراز سیاہ ٹیسوٹے ہوئے تھے اور چہرے پر سینے و چھوٹی گھنی سیاہ ڈاڑھی بہا رکھا رہی تھی۔ گھنی ڈاڑھی اور مونچھوں کی وجہ سے اس کے چہرے کا بیشتر حصہ چھپ گیا تھا۔ دائیں آنکھ کے نیچے موجود موٹے سے سے نے بھی کچھ جگہ گھیری تھی لیکن یہ طے تھا کہ وہ اس سب کے باوجود بھی خوب صورت ہے۔ دراز قامت اور چوڑے شانوں نے اس کی وجاہت میں خاطر خواہ اضافہ کر رکھا تھا اور اس کے چہرے پر موجود بیزاری کے باوجود لوگوں کی نگاہیں بار بار اس جوڑے پر اٹھ جاتی تھیں۔

"تم کوئی ایسا لباس نہیں پہن سکتی تھیں جو تمہیں نمایاں نہ کرے؟" اپنی طرف بار بار اٹھتی نگاہوں سے بیزار وہ اپنی ساتھی لڑکی کی طرف جھک کر دھیمی آواز میں بڑبڑایا۔ "تم اگر مجھے کسی بھگوان کا لباس بھی پہنا دیتے تو

تھا اس کے بعد تو اس کی اسلحہ شناسی میں کوئی کلام ہی نہیں رہا تھا اس لیے اس خطرناک مگن کو اپنے روبرو پا کر اس نے کسی قسم کے ایڈوانس میں پڑنے کی حثیت نہیں کی۔ ویسے بھی اس کے سامنے کوئی واحد مسلح شخص موجود نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ بس میں چڑھنے والے باقی چار افراد بھی شیک فٹاک مسلح تھے اور ان کے چہروں کے تاثرات ان کے ہتھیاروں سے بھی زیادہ خوفناک تھے۔

ہتھیار لہرا کر لیٹے افراد پر سیکنڈوں میں اپنی دہشت کا سکہ جمالینے کے بعد ان لوگوں نے تیزی سے دو کام انجام دیے۔ ایک بس میں موجود تمام سوار یوں کے ہاتھ پشت پر باندھتے ہوئے ان کے موبائل فونز اور نقدی وغیرہ قبضے میں لی جانے لگی، دوم ان میں سے ایک کی زیر نگرانی ڈرائیور اور اس کا میپلر لڑکا بس کا پھٹ جانے والا ٹائر بدلنے لگے۔ اس ٹائر کو یقیناً راستے میں گھات لگائے بیٹھے ان افراد نے کسی بے آواز ہتھیار سے نشانہ بنایا تھا اور اب آرام سے لوٹ مار کر رہے تھے۔ ہادی انظر میں ایسا ہی لگ رہا تھا کہ وہ کوئی لٹیرے ہیں جو یا تریوں کی اس بس میں مہس کر اپنی کارروائی انجام دے رہے ہیں لیکن معاذ کا اندازہ تھا کہ وہ لٹیروں سے ہٹ کر بھی کچھ ہیں اور لوٹ مار کے علاوہ بھی ان کا کوئی اور پروگرام ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ بس میں موجود سوار یوں کے ہاتھ باندھنے اور بس کا ٹائر ہوجانے والا ٹائر تبدیل کروانے کی زحمت نہیں کرتے۔

”یہ تو سرمنڈواتے ہی اگلے پڑ گئے۔“ صورت حال کو ملاحظہ کر کے اس کی سامھی لڑکی جو کہ بلا شک و شبہ سونیا خان تھی، ہرگوشتی میں بڑبڑائی۔

”اوکھلی میں سر دیا تو موسلوں سے کیا ڈرتا۔“ اس نے بھی جواباً ایک محاورہ دے مارا۔

”اے۔۔۔ کیا باتیں کر رہے ہو تم دونوں۔ چپ چاپ بیٹھو ورنہ ابھی سو رگ ہاشی ہو جاؤ گے میرے ہاتھوں۔“ ان کے قریب موجود انڈے کی طرح پختے سردالاس مسلح فرد سے دہاڑا اور اپنے بریٹا کی ٹال معاذ کی کپٹی پر رکھ دی۔ وہ ہتھیاروں سے کھلوں کی طرح کھیلنے کا ہنر سکھ گیا تھا لیکن یہ بات بہر حال سمجھتا تھا کہ جب یہ کھلونا انسان کی کپٹی پر رکھا ہو تو زندگی سے موت کا فاصلہ چند سینٹی میٹر کے برابر ہی رہ جاتا ہے۔ وہ موت سے نہیں ڈرتا تھا لیکن بے وجہ اور بے مقصد مارا جانا بھی قبول نہیں تھا، سو خاموشی سے نظریں اور سر جھکا گیا۔ گنجہ چہرے والوں تک اسے سخت نظروں سے گھورتا رہا پھر اپنا ہاتھ پتھر اس کی کپٹی سے ہٹا لیا اور بس میں سوار دیگر مسافروں پر اسکی

نظر ڈالی جیسے نہیں باور کروا رہا ہو کہ ذرا سی بھی گستاخی پر انہیں برے انجام سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اس کی اس خاموش دھمکی کو ہر مسافر نے وصول کیا اور ان کے اڑی ہوئی رنگت والے چہرے مزید زور نظر آنے لگے۔ مسافروں سے کچھ کے ساتھ ان کے بچے بھی موجود تھے۔ مختلف عمروں کے یہ بچے بھی صورت حال پر گھبرا گئے تھے اور ان میں سے بیشتر نے گھبرا کر روٹا شروع کر دیا تھا۔ والدین جو خود سہمے ہوئے تھے، دھیمے دھیمے انہیں پکارتے، ہٹاتے اور خاموش کروانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اچھی بات یہ تھی کہ مسلح افراد نے بچوں کے رونے دھونے پر کوئی تعرض نہیں کیا تھا اور محض خشکیں لگا ہوں سے دیکھنے پر ہی اکتفا کر رہے تھے۔

جلدی ہی بس کا ٹائر ہوجانے والا ٹائر تبدیل کر دیا گیا اور ڈرائیور اور اس کے میپلر نے مسلح افراد کی ہدایت پر اپنی اپنی جگہ سنبھال لی۔ ڈرائیور نے ہدایت کے مطابق انجن اسٹارٹ کیا تو اس کی کپٹی سے ایک ہتھیار کی ٹال آگئی۔ یہاں بات کا اشارہ تھا کہ بے شک وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہے لیکن منزل کا قہقین وہی کریں گے جو اس وقت زبردست ہے ان کے سروں پر سوار ہیں۔ دوطرفہ ہر پالی سے گھری سڑک پر دوڑتی بس کچھ دیر تو سڑک پر ہی دوڑتی رہی پھر اچانک ہی اسے دائیں جانب ایک کچھ راستے پر مڑا لیا گیا۔

بس کے سڑک چھوڑتے ہی اس میں سوار مسافروں کے چہروں کی رونق مزید ماند پڑ گئی۔ جو اندازہ معاذ پہلے ہی قائم کر چکا تھا، اب وہ انہیں بھی ہو گیا تھا۔ بس میں آٹھننے والے مسلح افراد کا مقصد محض لوٹ مار نہیں تھا۔ لوٹ مار میں انہوں نے بہت زیادہ سرگرمی دکھائی بھی نہیں تھی اور محض موبائل فونز، نقدی اور عورتوں کے پرس وغیرہ اپنے قبضے میں لینے کے ساتھ ساتھ اس بات کا اطمینان کیا تھا کہ مردوں میں سے کسی کے پاس ہتھیار تو موجود نہیں ہیں۔ تلاشی کے اس عمل میں انہیں ایک آدھ ہسٹول اور کرپان وغیرہ ملے بھی تھے لیکن مزاحمت بہر حال کسی طرف سے نہیں ہوئی تھی۔ معاذ اور سونیا اس وقت سکھ یا تریوں کے بہرہ پر ہیں تھے اور انڈین پاسپورٹ پر سفر کرتے ہوئے پاترا سے واپس جا رہے تھے اس لیے اعتیاداً انہیں ہتھیار ساتھ نہ رکھنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ آگے جا کر ان کے سہولت کار انہیں ان کی ضرورت کے مطابق سب کچھ فراہم کر دیتے لیکن ان کے اپنے سہولت کاروں تک پہنچنے کی نوبت ہی نہیں آئی تھی اور معاذ میں اس پارلی نے پھنڈا ڈال دیا تھا جس کے بارے میں ان کی شکل و صورت اور آپس میں ہونے والی اجنبی زبان کی

گھنٹوں کے باعث انہیں کچھ کچھ اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ کون لوگ ہیں۔ ان لوگوں کی اس علاقے میں موجودگی ذرا حیران کن تھی۔ وہ عموماً ان علاقوں میں اپنی کارروائیاں نہیں کرتے تھے اور پتا نہیں کیا وجہ بھی جو انہیں یہاں لے آئی تھی۔ اپنے اغوا کاروں کے مقاصد سے دلچسپی نہ ہونے کے باوجود ان کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ ان کی راہ کھوٹی کر چکے تھے اور اب نہ جانے کس اجنبی منزل کی طرف بھگائے لے جا رہے تھے۔ جس سڑک پر ان کی بس کو روک کر اغوا کیا گیا تھا اس پر بہت کم ٹریفک گزرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ چند منٹوں کی وہ کارروائی کسی کے بھی علم میں آئے بغیر تیزی سے انجام پا گئی تھی اور بعد میں بس کی تلاش میں نکلنے والوں کو اس کی سمت کا اندازہ لگانے میں خاصی دقت اٹھانی تھی۔

اوپر نیچے اور کچے کچے راستوں پر چلتی بس بھی ہموار چلتی تھی تو بھی اچھلتے کودنے لگتی تھی۔ سرحدی چوکی پار کرنے کے کچھ دیر بعد ہی بس کا اغوا عمل میں آیا تھا اس لیے راستہ پہلے ہی زیادہ آمد و رفت والا نہیں تھا اور اب تو وہ بالکل ویرانوں میں سے گزر رہے تھے۔ اغوا کاروں نے مسافروں کو ان ویرانوں کی دید کی بھی اجازت نہیں دی تھی اور ان کے حکم کے مطابق کھڑکیوں پر پڑے پردے کھینچ دیے گئے تھے۔ بس نے کچھ فاصلہ مزید طے کیا تو ڈرائیور کو اس کی نشست سے ہٹا کر انڈے کی طرح پکٹنے مروالے نے اس کی جگہ لے لی۔ ڈرائیور کو عام مسافروں کے ساتھ بھٹا دیا گیا اور سب کو مشرکہ طور پر اس بات کا حکم دیا گیا کہ وہ گھنٹوں کی طرف جھک کر بیٹھتے ہوئے اپنے سر بھی نیچے جھکا لیں۔ پشت پر بندھے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ اس زاویے سے بیٹھنا تکلیف دہ تھا لیکن حکم جاری کرنے والوں کے تصور بتا رہے تھے کہ شکایت یا حکم عدولی کی منجائش نہیں اور جس نے فیمل میں کوتاہی کی وہ پھر زندگی کی ہر تکلیف سے آزادی پا جائے گا۔ زندگی تکلیف دہ بھی ہو تو آنے والے وقت میں راحت کی امید پر آدمی اس کے ساتھ چٹا رہتا ہے۔ اس بس کے مسافروں نے بھی تکلیف کو گوارا کر لیا۔ معاذ اور سونیا بھی ان ہی مسافروں میں شامل تھے۔ اس حکم سے انہوں نے اندازہ لگایا تھا کہ اب وہ منزل سے زیادہ دور نہیں ہیں اور اغوا کاروں نے اپنے ٹھکانے کا راستہ پوشیدہ رکھنے کے لیے یہ حکم صادر کیا ہے۔ وہ دونوں اپنی تربیت کے مطابق بس کے موڑ مڑنے اور سمتوں وغیرہ پر توجہ مرکوز رکھ کر راستے کا اندازہ کرنے کی کوشش کرتے رہے لیکن بس نے اتنے موڑ کاٹنے کہ گنتی محال ہو گئی اور سارا

حساب کتاب گڑبڑا گیا۔

تقریباً پندرہ بیس منٹ کے سفر کے بعد بس رک گئی اور مسافروں کو سرائے اٹھانے کی اجازت دی گئی۔ بس جس جگہ رکی تھی وہ کوئی ویرانہ تھا جہاں دور تک اڑتی دھول اور چند خود روکاٹے دار جھاڑیوں کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

”سب خاموشی سے لائن بنا کر نیچے اترو۔ اگر کسی نے کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو میدان ترک میں جائے گا۔“ گہری دھمکتے والے پختہ عمر کے مرد نے نیچے اترنے کا

حکم صادر کرتے ہوئے اپنی اس کے 47 لبراکر دھمکی دیتا بھی ضروری سمجھا۔ بس میں سوچ و تمام مسافر اترے ہوئے چہروں کے ساتھ اس کے حکم کی تعمیل کرنے لگے۔ آٹھ دس مسافروں کے بعد بس کے درمیانی حصے میں موجود معاذ اور سونیا کی بھی باری آ گئی۔ باہر بس کو اغوا کر کے لانے والوں کے سوا کچھ مزید لوگ بھی موجود تھے۔ نیچے اترنے کے بعد انہیں بس کی پشت پر موجود کھنڈر نما وسیع عمارت دکھائی دی۔ بس کے مسافروں کو ایک قطار کی صورت اسی عمارت کی طرف ہانکا جا رہا تھا۔ تھوڑی سی دیر میں تمام مسافر کھنڈر میں پہنچا دیے گئے۔ وقت کی مسافت میں اپنے خال و خمل کھود دینے والی اس عمارت کی باقیات سے ظاہر تھا کہ کسی زمانے میں یہ نارت بڑی شاندار رہی ہوگی۔ انہیں جس فونی چھت والے ہال نما کمرے میں جمع کیا گیا تھا اس کے سونے سونے ستونوں پر بڑی خوب صورتی اور مہارت سے دیوی اور دیوتاؤں کی تصویریں نقش کی گئی تھیں۔ اگرچہ یہ نقش کچھ دھندلا گئے تھے اور کہیں کہیں سے میٹرل جھڑ جانے کے باعث بالکل ہی غائب تھے لیکن جتنا کچھ نظر آتا تھا، وہ بتانے والوں کی مہارت اور محنت کا گواہ تھا۔ چھت کا بچا کچھا حصہ بھی ماضی میں عمارت کے پُر شکوہ ہونے کا گواہ تھا۔ چھت کے اندرونی حصے میں استعمال کیا جانے والا شیلا سنگ مرمر آج بھی قابل دید تھا۔

”ایک بار پھر سب کی تلاشی لو اور پھر انہیں نیچے پہنچاؤ۔“ کسی نے حکم صادر کیا تو مسافروں کو ایک بار پھر قطار میں کھڑا کر کے ان کی تلاشی لی جانے لگی۔ تلاشی کے مرحلے سے گزر جانے والے افراد کو ہال سے ملحقہ دوسرے کمرے میں منتقل کیا جا رہا تھا۔ معاذ اور سونیا کا بھی جلد نمبر آ گیا۔ وہ جس ملحقہ کمرے میں پہنچے، اس کی چھت سلامت تھی۔

”نیچے اترو۔“ انہیں کمرے کا جائزہ لینے کی زیادہ مہلت نہیں دی گئی اور جنوبی دیوار کے قریب موجود خلا کی طرف اشارہ کیا گیا۔ حکم کی تعمیل میں وہ اس خلا کے قریب پہنچ

کر بیڑھیاں اترنے لگے۔ ہندو ایتنوں سے غنا ان میز میوں کے قد بچے کہیں کہیں سے اکٹڑ گئے تھے۔ وہ دونوں احتیاط سے بیڑھیاں اترتے بیچے پہنچ گئے۔ وہاں روشنی کا بندوبست نہ ہونے کے باوجود مکمل تاریکی نہیں تھی اور نامعلوم درزوں میں سے سورج کی روشنی اندر آکر ماحول کو نیم روشن کر رہی تھی۔ اوپر کے دھول مٹی اور جالوں میں اسے جسے کے مقابلے میں نہ خانہ قدرے صاف تھا۔ معاذ اور سونیا کو بھی دیگر افراد کے ساتھ فرش پر بٹھا دیا گیا۔ جلد بس کے تمام مسافر نہ خانے میں منتقل ہو گئے۔ یہ بات سب ہی سمجھ رہے تھے کہ انہیں یہ خیال بنالیا گیا ہے۔ کیوں اور کس مقصد کے تحت؟ اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے انہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ وہ درمیانے قد اور چھریرے بدن کا مالک جوان العزیز شخص تھا جس کی نہ خانے میں آمد کے ساتھ ہی چوکنے کھڑے مسافر افراد مزید مستعد نظر آنے لگے تھے۔ گرے ڈریس چنٹ پر چپک دار قمیض پہنے اس شخص نے آڑی مانگ نکال کر نہایت سلیقے سے بال سنوار رکھے تھے۔ آنکھوں پر موجود ریم لیس چشمہ اس کی شخصیت کو پُرکشش بنا رہا تھا۔ اپنے ساتھیوں کی نسبت اس کی رنگت نسبتاً صاف تھی اور جمہولی طور پر اس کی شخصیت کا تاثر ایسا بن رہا تھا جیسے وہ کوئی ٹیچر یا کمپیوٹر آپریٹر وغیرہ ہو۔ نہ خانے میں پہنچ کر اس نے قطار میں بیٹھے مرد و زن اور بچوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور پھر یوں کھٹکھٹا رہا جیسے کوئی ٹیچر اراپنا ٹیچر شروع کرنے جا رہا ہو۔

”ذیر فرینڈز.....!“ اس نے نرمی سے اپنی گفتگو کا آغاز کیا۔ اس کی آواز بھی اس کی شخصیت کی طرح پُرکشش تھی۔ ”آئی ہوپ کہ آپ کو یہاں پہنچنے میں زیادہ مشقت نہیں اٹھانا پڑا ہوگا۔ نیچرلی آپ فکر مند تو ہوں گے کہ آپ کو اس طرح یہاں کیوں لایا گیا ہے، پر دشواری سمجھیے کہ آپ کو ہم سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ کم از کم اس سے تک تو بالکل بھی نہیں جب تک آپ کی طرف سے ہمارے لیے کوئی پرالیم کھڑی نہیں کی جائے گی۔“ وہ شکل و صورت سے پڑھا لکھا اور مہذب دکھائی دیتا تھا تو اس کی گفتگو اس کے تہذیب یافتہ ہونے کی آئینہ دار تھی۔

”آپ کو یہاں لانا ہماری مجبوری تھی۔ انڈین گورنمنٹ نے ہمارے چند بہت اہم ساتھیوں کو اریسٹ کر کے آٹک داوی ڈکلیئر کر دیا ہے اور ان کے ساتھ جیل میں بہت برا برتاؤ کیا جا رہا ہے۔ اپنے ان ساتھیوں کو چھڑوانے کے لیے ہم نے آپ کو بندی (یرغمال) بنایا ہے۔ آپ لوگ یہاں امن اور شانتی سے رہیں۔ جیسے ہی انڈین گورنمنٹ

ہماری ڈیمانڈ پوری کرے گی، ہم آپ کو آزاد کر دیں گے۔“ وہ یوں بول رہا تھا جیسے یہ کوئی بہت بڑا بچکا معاملہ ہو لیکن ہر ذی عقل سمجھ سکتا تھا کہ صورت حال کتنی کج ہے۔ عرصے سے غلط فہمی کی تحریک چلانے والے یہ تامل گوریلے انڈین حکومت کے لیے درد سر بنے ہوئے تھے اور ان کا سر کپٹنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی تھی۔ یقیناً اسی کوشش میں ان کے چند سرکردہ افراد کو گرفتار کر لیا گیا تھا اور اب یہ سر پھرے اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے برسوں سے رائج ایک ترکیب آزمانے بیٹھ گئے تھے۔ یا تو اسے واپس آنے والے سکھوں سے بھری بس کو یرغمال بنا کر وہ اپنے مقصد میں کس حد تک کامیاب ہو سکتے تھے، اس کا اندازہ لگانا تو آسان نہیں تھا لیکن اس بات کا بہر حال اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ یہ سکھ یرغمالی بڑی مشکل میں پڑنے والے ہیں۔

”اگر گورنمنٹ سے کوئی ڈیمانڈ پوری کروانا ہی تھی تو بندی بنانے کے لیے ان کا چننا کرتے جن کی جان کی سرکار کو پروا ہوتی ہے۔ ہم خالصے تو پہلے ہی سرکار کی نظروں میں کھٹکتے ہیں اور وہ ہم کو دوش دیتی ہے کہ ہم دھرتی ماں سے غداری کر کے خالصتان بنانے کے چکروں میں پڑے ہوئے ہیں۔“ انہیں یرغمال بنانے کا مقصد بتانے والے کا لہجہ اپنے مسلح ساتھیوں کی نسبت خاصا دوستانہ تھا اس لیے پہلی بار کسی کی ہمت ہوئی کہ کچھ بول سکے۔ بولنے والا ایک لمبا چوڑا اور مسانی عمر کا سکھ تھا۔ ان سے گفتگو کرنے والے شخص نے ایک مبینہ سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا اور نرمی سے بولا۔

”آپ کی بات ٹھیک ہے سردار جی! لیکن ہم نے بھی کچھ سوچ سمجھ کر یہ کام کیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ آپ کا ایک ایم پی، چیف منسٹر کی ناک کا بال بنا ہوا ہے اور ناک کا وہ بال چیف منسٹر کو مجبور کرے گا کہ وہ پردھان منسٹر (پرائم منسٹر) کو ہماری ڈیمانڈ زمانے پر مجبور کرے۔ اگر چیف منسٹر ایسا نہیں کر سکا تو اس صوبے میں اپنی گورنمنٹ بھی نہیں چلا سکے گا۔ خالصے اپنی برادری کی خاطر اسے اس کی کرسی سے اتار پھینکیں گے۔“ اپنی بات کہہ کر وہ ذرا سا مسکرایا اور سلسلہ لکھ دو بارہ جوڑتے ہوئے بولا۔

”سکھ یا تریوں کو بندی بنانے کے پیچھے ایک کارن اور بھی ہے۔ اگر انڈین گورنمنٹ نے ہماری ڈیمانڈ پوری کرنے میں زیادہ جھٹ کی تو خالصے یہ شور مچائیں گے کہ چونکہ معاملہ ان کی برادری کے لوگوں کا ہے اس لیے سرکار بے پروائی کر رہی ہے۔ یوں سرکار ڈبل پریشر میں آجائے گی۔“ ان لوگوں نے واقعی سوچ سمجھ کر کام کیا تھا۔

”اب آپ لوگ بتائیںشن لیے اور دیے آرام کریں۔ کھانے کا ٹائم ہونے پر آپ کو کھانا مل جائے گا۔ باقی چیزوں کا بھی خیال رکھا جائے گا۔ آپ کو بدلے میں کیوں اتنا کرنا ہوگا کہ میرے اور میرے لوگوں کے لیے کوئی پرالیم کری ایٹ نہ کریں۔“ اپنی بات کہہ کر وہ ر کے بغیر خانے کی میز صیوں کی طرف بڑھ گیا۔ جو لوگ اس سے کچھ کہنا چاہتے تھے، ان کے لب حرکت کر کے بند ہو گئے۔ سب افراد کے گھیرے میں موجود لگ بھگ پچاس بچپن ان پر غالیوں کے دل و دماغ میں وحیروں اور پیٹے شے لیکن انتظار کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

”اگر کسی کو پیاس لگی ہو تو وہ اس گھرے سے پانی پی سکتا ہے۔“ اٹھے جیسے چلتے سر والے نے بلند آواز میں اعلان کیا تو ان میں سے کئی کو احساس ہوا کہ ان کے حلق خشک پڑے ہوئے ہیں۔ ان کے ہاتھوں کی بندشیں کھول دی گئیں اور پانی کے خواہش مند پانی پینے لگے۔ کچھ حسب ہدایت سچ سچ آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے جبکہ کچھ یونہی گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گئے۔ معاذ بھی ان ہی لوگوں میں شامل تھا اور غور کر رہا تھا کہ اس صورت حال میں کیا کیا جاسکتا ہے؟

☆☆☆

”مجھے افسوس ہے کہ ہمیں ایک اہم کام انجام دینے میں تاخیر ہو گئی۔ اگر نقیب کی بہن کی شادی کی ڈیٹ گزر گئی ہوگی تو میں خود کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گا۔“ ڈرائیو تک سیٹ پر موجود سرد سے یہ بات کہتے ہوئے عالم شاہ کے لہجے میں حقیقی ندامت تھی۔

”آپ کا قصور نہیں ہے سائیں! آزاد ہوتے ہی ہم ایسے حالات میں گھر گئے تھے کہ ذہن الجھ کر رہ گیا۔“ سرد کا اشارہ سب کے بیٹے کے اغوا سے پیدا ہونے والی صورت حال کی طرف تھا۔

”واقعی وہ حالات بہت سمجھیر تھے لیکن ہمیں اپنے محسن کے اہل خانہ کی احوال پر ہی میں اتنی تاخیر نہیں کرنا چاہیے تھی۔ ہم نے نقیب سے وعدہ کیا تھا کہ اس کی بہن کو بھائی بہن کر رخصت کریں گے۔“ عالم شاہ کا افسوس کم نہیں ہو رہا تھا اور وہ ر کہ باڈل کی قید میں ہٹنے والا اپنا خانے کا سا بھی نقیب لاشاری یاد آ رہا تھا۔ سینے میں خوب صورت دل رکھنے والا وہ لڑکا جو شاعرانہ ذوق رکھتا تھا لیکن خاندان کا واحد کفیل ہونے کا حق ادا کرنے کے لیے محنت و مشقت کی بجلی میں بس رہا تھا، ان کے سامنے بے بسی کی موت مرا تھا۔

مرتے مرتے وہ ان پر یہ احسان کر گیا تھا کہ انہیں نہ خانے سے فرار کی راہ بھا گیا تھا۔ اس کے اس احسان کا بدلہ وہ نقیب کی ماں اور بہن کی احوال پر ہی کر کے کسی حد تک ادا کر سکتے تھے لیکن حالات و معروضات نے یہ اہم معاملہ ذہن سے نکال دیا۔ وہ تو بھارت جانے کا سلسلہ چلا تو اسے اچانک یاد آیا کہ یہاں اس کے حصے کا ایک اہم کام باقی ہے۔ اس کام کو مٹانے کے لیے ہی آج وہ اور سرد نقیب کے گھر جانے والے راستے کی طرف گامزن تھے۔ سندھ کے چھوٹے سے شہر میں واقع اسے گھر کا چنانچہ نقیب نے مرنے سے پہلے انہیں بتا دیا تھا۔ ریلوے اسٹیشن کے قریب ہی واقع کالونی میں نقیب کا گھر تلاش کرنے میں انہیں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ گھر ایک ایسی گلی میں تھا جس میں عالم شاہ کی بڑی سی گاڑی داخل نہیں ہو سکتی تھی چنانچہ انہوں نے گاڑی گلی کے گھڑ پر ہی چھوڑ دی اور پیدل مکان کی طرف بڑھے۔ سبکی سی گلی میں راستہ ہموار نہیں تھا اور گٹر اٹل جانے کے باعث گندا پانی بھی بہ رہا تھا۔ میسے کھینچے کپڑوں میں نبیوں مختلف میر کے سچے، جن میں سے بعض کے چہروں میں چہل بھی نہیں تھی، بدبو اور گندگی سے بے نیاز اپنے میل میں نکلن تھے۔ ان دونوں نے گند سے پانی سے بچتے بچاتے نقیب کے مکان تک کا فاصلہ طے کیا۔

گلی کا سال خوردہ دروازہ جس کے قبضے شاید ایک دو دھنوں میں ہی اکٹڑ جاتے، بند تھا۔ دروازے کے آزد بازو اطلالی گھنٹی کا کوئی نام و نشان موجود نہ پا کر سرد نے لوہے کی گندھی کی مدد سے دروازے کو زور سے بجا یا۔

”کون۔“ فوراً ہی رد عمل ظاہر ہوا اور کسی نے دروازے کو ذرا سا کھول کر جھری سے جھانکا۔ جھانکنے والی نظر نہیں آ رہی تھی لیکن اس کی آواز نے بتا دیا تھا کہ وہ نوجوان لڑکی ہے۔

”ہم کراچی سے آئے ہیں بہن۔ نقیب لاشاری کے دوست ہیں اور آپ کی والدہ سے ملنا چاہتے ہیں۔“ سرد نے سہجاء سے لڑکی کو اپنے متعلق آگاہ کیا تو اس کی بات مکمل ہونے سے قبل ہی دروازہ کھٹک سے کھل گیا۔ دروازے میں اٹھارہ انہیں برس کی ایک گندھی رنگت اور بڑی بڑی آنکھوں والی لڑکی کھڑی تھی۔ اگرچہ انہوں نے یہ خانے کی قید میں نقیب کو خاصی ابتر حالت میں دیکھا تھا پھر بھی لڑکی کے چہرے میں نقیب کی مشابہت دکھائی دے گئی۔

”بھیا کہاں ہیں؟ وہ خود کیوں نہیں آئے؟“ سوال پوچھتے ہوئے لڑکی کے لہجے میں شدید بے قراری تھی اور وہ

یوں متلاشی نظروں سے ان کی پشت پر دیکھ رہی تھی جیسے اچانک ہی نقیب ہنستا ہوا وہاں سے نکل آئے گا۔

”بہتر ہوگا کہ آپ اپنی والدہ کو ہماری آمد سے مطلع کر دیں۔ ہم اندر آ کر ذرا سکون سے ان سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ گلی میں مسلسل لوگ آ جا رہے ہیں۔ یوں دروازے پر کھڑے کھڑے گفتگو کرنا مناسب نہیں ہے۔“ سرد نوٹ کر چکا تھا کہ گلی سے گزرنے والے راہ گیر تجسس نگاہوں سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے اس لیے وہ بھی آواز میں لڑکی کو بھی اس بات کا احساس دلایا۔

”آپ..... آپ لوگ اندر آ جائیں۔“ لڑکی نے کپکپاتے لہجے میں بولتے ہوئے انہیں اندر آنے کا راستہ دیا۔ دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی چھوٹا سا کچا مکن تھا جسے شاید صبح ہی لپٹا گیا تھا۔ مکن میں ہی ایک چھپرے سے باورچی خانے کا انتظام تھا جہاں رکھا مختصر سامان مکینوں کی مالی حالت کا اعلان کر رہا تھا۔ مکن کے پار مکن کی پچی پھتوں والے دو چھوٹے کمرے دکھائی دے رہے تھے۔

”اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے وہ اندر آرام کر رہی ہیں۔“ ایک کمرے کی طرف راہنمائی کرتے ہوئے اس نے انہیں آگاہ کیا اور خود آگے بڑھ کر پہلے کمرے میں داخل ہو گئی۔

”اماں! اماں..... دیکھیں بھیا کے دوست آپ سے ملنے آئے ہیں۔“ اندر جاتے ہی اس نے ماں کو آواز دے کر آگاہ کیا۔ سرد اور عالم شاہ کمرے کے دروازے سے اندر داخل ہوئے تو دیکھا وہ سہارا دے کر بچا رہاں کو بٹھانے کی کوشش کر رہی ہے۔

”لیلیٰ رہیں ماں جی! ہم آپ کو تکلیف دینے نہیں آئے۔ بس آپ کو نقیب کا پیغام دینا تھا اور اس کی ایک امانت آپ تک پہنچانی تھی۔“ عالم شاہ نے ٹیپٹ اور لاغر عورت کو زحمت سے روکنے کی کوشش کی۔

”مجھے سربانے سے ٹیک لگا کر بٹھا دے عاصمہ!“ عورت نے کمزوری آواز میں بیٹی سے کہا تو اس نے حسب ہدایت اسے ٹیکوں کے سہارے ٹیک لگا کر بٹھا دیا۔ عورت، جس کا چہرہ بخار کی شدت سے دھک رہا تھا، چار پائی کے قریب رکھے موز جوتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

”بیٹھو ہٹ! نقیب کے دوست ہو تو میرے لیے بیٹوں جیسے ہی ہو۔“ پھر وہ لڑکی کی طرف رخ کر کے بولی۔

”جا عاصمہ! بھائیوں کے لیے کوئی لسی پانی لے کر آ۔ بے چارے اتنی گرمی میں آئے ہیں۔“

”نہیں ماں جی! کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم نے کچھ دیر پہلے ہی راستے میں جوس پیا ہے اور اب بالکل بھی کچھ پینے کی خواہش نہیں ہو رہی۔“ عالم شاہ نے ماں کی بات پر لڑکی کے چہرے کی بدلتی ہوئی رنگت دیکھی اور جلدی سے بول پڑا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کے میزبان اس خاطر داری کے تحمل نہیں ہو سکتے۔ اپنے انکار پر لڑکی کے چہرے پر پھیل جانے والے سکون نے اس کے اندازے کی تصدیق بھی کر دی۔

”نقیب کیسا ہے؟ وہ خود کیوں نہیں آیا۔ اس کی بہن کی شادی سر پر آگئی ہے۔ اب تک تو اسے آ جانا چاہیے تھا۔“ عورت کے لہجے میں بیٹے کے بارے میں پوچھتے ہوئے تھوڑی تشویش اور تھوڑی غفلت کے رنگ تھے۔

”وہ آنا چاہتا تھا ماں جی! لیکن بہن کی شادی اچھی طرح کرنے کے شوق نے اس کا راستہ روک لیا۔ اللہ کے کرم سے کراچی میں اس کا کام بہت اچھا چل رہا ہے اور اسے ایک بڑی عمارت میں پمپنگ کا ٹھیکہ مل گیا ہے۔ سیٹھ نے نقیب کی فرمائش پر اسے ایڈوائس میں رٹم دے کر اس سے وعدہ لیا ہے کہ وہ جلد از جلد اپنا کام مکمل کر کے دے گا۔ وعدہ نبھانے کے لیے کام کے چکر میں پھنسا نقیب بے چارہ گھر آنے کی فرصت تو نہیں نکال سکا لیکن اس نے شادی کے خرچے کے لیے رقم بھجوائی ہے۔“ اس بار سرد نے جواب دینے کی ذمہ داری نبھائی اور عالم شاہ کا اسی مقصد کے لیے رکھوایا ہوا رقم کا لغانہ جیب سے نکال کر احترام سے عورت کے ہاتھ میں چھمایا۔

”لیکن..... لیکن نقیب کو خود بھی تو آنا چاہیے۔ کیا بہن کی شادی اس کے بغیر ہی ہو جائے گی؟“ کپکپاتی انگلیوں سے لغانہ قحطی عورت کے چہرے پر اطمینان کے رنگ اتر آئے تھے لیکن بیٹے کا نہ آنا ہنوز اسے ٹھنک رہا تھا۔

”ہو سکتا ہے عین شادی والے روز پہنچ جائے۔ آپ اللہ کا نام لے کر شادی کے انتظامات کیجیے۔ نقیب بتا رہا تھا کہ اس پڑوس والے ملنسار لوگ ہیں اور ضرورت پڑنے پر بہت کام آتے ہیں۔ آپ اپنے اعتبار کے لوگوں سے انتظامات کے سلسلے میں مدد کیجیے اور پھر بھی اگر کوئی مشکل پیش آئے تو اس نمبر پر رابطہ کر کے نقیب کے حوالے سے بتا دیجیے۔ انشاء اللہ آپ کا مسئلہ فوری طور پر حل ہو جائے گا۔“

سرد نے ایک رابطہ نمبر لکھا کاغذ عورت کے ہاتھ میں چھمایا۔

”بھیا خود ہم سے رابطہ کیوں نہیں کر رہے ہیں؟ ان کا جو موبائل نمبر میرے پاس ہے، اس پر میں روزانہ فون کرتی

خیال ظاہر کیا تو عالم شاہ نے اس کی پُر زور تائید کی لیکن عورت گھبرا کر نہیں نہیں کرنے لگی۔

”رہنے دو پٹ! یہ گلی کے کونے پر ہی بڑا اچھا ڈاکٹر بیٹھا ہے۔ رات میں وہ اپنا دوا خانہ کھولے گا تو میں اس سے دوا لے لوں گی۔“

”رات ہونے میں تو ابھی دیر پڑی ہے۔ ابھی دوا مل جائے گی تو رات تک آپ کافی بہتر ہو جائیں گی۔ ضد مت کریں اور بیمار سے ساتھ اسپتال چلیں۔ ہم بھی آپ کے بیٹے

بیسے ہی ہیں۔“ عالم شاہ نے اصرار کیا۔ اس کے عہم اصرار کے سامنے عورت زیادہ دیر انکار پر قائم نہیں رہ سکی اور اسپتال چلنے کے لیے راضی ہو گئی۔ ماں کو رضامند پا کر عاصمہ نے اسے چادر نکال کر دی اور خود بھی بڑی سی چادر اوڑھ کر ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ وہ چاروں آگے پیچھے چلتے ہوئے گلی سے باہر نکلے تو دیکھا عالم شاہ کی شاندار گاڑی پچوں کے نرے میں ہے۔ کچھ بچے گاڑی کی پھت کی رسائی حاصل کر چکے تھے۔ کچھ بونٹ پر اچھل کود کر رہے تھے اور کچھ بیٹل کھینچ کھینچ کر گاڑی کے دروازے کھولنے کی جگہ دو میں مصروف تھے۔ سرد نے قریب جا کر انہیں ہلکی سی ڈانٹ پلائی تو وہ تیزی سے منتشر ہو گئے۔

”یہ آپ کی گاڑی ہے؟“ عاصمہ نے حیرت سے پوچھا۔ اتنی شاندار گاڑی دیکھ کر ماں بیٹی کی آنکھیں حیرت سے پھٹی جا رہی تھیں۔

”سوال جواب بعد میں کر لینا، پہلے ماں جی کو اندر بٹھاؤ۔ دیکھ نہیں رہیں کہ ان سے کمزوری کے باعث کھڑا نہیں ہوا جا رہا۔“ عالم شاہ نے جان بوجھ کر بارعب انداز اختیار کیا تو عاصمہ نے شیشا کر ماں کو سرد کے کھولے ہوئے دروازے سے گاڑی کے اندر بٹھا دیا۔ سرد نے عالم شاہ کے لیے بھی فرنیٹ ڈور کھول دیا تھا۔ عالم شاہ اندر بیٹھ گیا تو اس نے مؤدبانہ دروازہ بند کر کے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔

”یہاں جو سب سے اچھا اسپتال ہو اس کا پتا بتاؤ۔“ عالم شاہ نے ایک بار پھر بارعب لہجے میں عاصمہ سے پوچھا تو وہ مرغوب سی پتا بتانے لگی۔ دونوں ماں بیٹی بہت جھجکے ہوئے انداز میں گاڑی میں بیٹھی ہوئی تھیں اور خاصی الجھن میں مبتلا دکھائی دیتی تھیں۔ عالم شاہ جان بوجھ کر ان کی کیفیت سے بے نیاز بنا رہا۔ جلد ہی گاڑی عاصمہ کی راہنمائی میں ایک اسپتال تک پہنچ گئی۔ اس چھوٹے سے شہر کا سب سے اچھا اسپتال بس واجبی سائی تھا لیکن وہ اس سے بہتر کی امید بھی نہیں کر سکتے تھے۔

ہوں لیکن نمبر بند ہوتا ہے۔“ لڑکی نے پہلی بار گفتگو میں دخل دیتے ہوئے تفتیش کرنے والے انداز میں در یافت کیا۔

”اس کا موبائل خراب ہو گیا ہے، اس لیے آپ سے رابطہ نہیں ہو رہا۔ انشاء اللہ جلد وہ خود آپ سے رابطہ کرے گا۔ آپ ساری پریشانی اور فکروں کو ذہن سے نکال دیں اور خوشی خوشی شادی کی تیاری کریں۔ آپ کی خوشی کے لیے آپ کا بھائی دن رات محنت مزدوری کر رہا ہے، اس لیے یہ ضروری ہے کہ آپ اس موقع پر خوش ہوں۔“ سرد نے تادمی لہجے میں اسے باور کروایا تو وہ تھوڑا سا ہنسپ گئی۔

”اللہ سائیں میرے نقیب کو سلامت رکھے۔ میرے بچے نے چھوٹی سی عمر سے ہی بڑی ذمے داریاں سنبھال رکھی ہیں۔ تم اس سے کہنا پٹ کہ ماں اور بہن تمہاری راہ دیکھتی ہیں۔ وہ آئے گا تو ہی ہماری خوشی مکمل ہوگی۔“ بولتے ہوئے نقیب کی ماں کی سانس کمزوری کے باعث پھول رہی تھی لیکن لہجے بٹنے کی محبت سے سرشار تھا۔

”آپ فکر نہ کریں ماں جی! ہم نقیب تک آپ کا پیغام پہنچا دیں گے۔“ نقیب کی بیمار ماں کو یہ چھوٹی تسلی دیتے ہوئے عالم شاہ کا دل دکھ سے کٹ رہا تھا لیکن فی الحال اس نے ان لوگوں سے نقیب کی موت کی دردناک خبر چھپائے رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ خبر اس گھر پر کتنی بن کر گرے گی۔ وہ چاہتا تھا کہ پہلے نقیب کی بہن عاصمہ اپنے گھر کی ہو جائے۔ اس کی شادی ہو جاتی تو اس گھرانے کو داما کی صورت ایک دوسرا بیٹا مل جاتا جو انہیں جذباتی سہارا بھی فراہم کر سکتا تھا۔

”تمہارا بہت شکریہ پٹ! تم نے ہمارے لیے اتنی تکلیف اٹھائی اور ہم تمہاری کوئی خاطر داری بھی نہیں کر سکے۔“ ”خاطر داری پھر بھی ماں جی! ابھی تو آپ اپنی صحت اور ہماری چھوٹی بہن کے بیاہ کی فکر کیجیے۔ ہماری بہن کی شادی بڑے اچھے طریقے سے ہونا چاہیے۔“ عالم شاہ نے قنق میں جلا عورت کا دھیان پٹانے کی کوشش کرتے ہوئے ایک نظر عاصمہ پر ڈالی۔ اس کے کم سن چہرے پر اس کی بات سن کر حیا کے جو رنگ پھیلے تھے، وہ اسے بہت دلکش بنا رہے تھے۔ عالم شاہ نے بے ساختہ ہی اپنے دل میں اس کی خوشی کے دانگی ہونے کی دعا کی۔ وہ معصوم سی لڑکی اسے کھل اور موہل ہی کی طرح لگی تھی۔

”میرے خیال میں ہم ماں جی کو اسپتال لے چلتے ہیں۔ یہ محنت مند ہوں گی تب ہی تو شادی کی تیاری طریقے سے کر سکیں گی۔“ سرد نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے اپنا

اس پرائیویٹ اسپتال میں اپنے لباس اور چہروں سے ہی غریب معلوم ہوتی تھیں نقیب کی ماں بہن کو اکیلے آنے پر شاید کوئی نفٹ بھی نہ کروا تا لیکن عالم شاہ نے استقبالیہ پر جا کر انگریزی میں گٹ پٹ کی تو اندازہ کر لیا گیا کہ پارٹی منسبوت ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں نقیب کی ماں کو معائنے کے لیے ڈاکٹر کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ عاصمہ بھی ماں کے ساتھ ہی گئی۔ عالم شاہ اور سردار انتظار گاہ میں بیٹھ گئے۔

”بچل سے کہہ دیتا کہ ہماری غیر موجودگی میں ان ماں بیٹی کی پوری خبر گیری کرتا رہے۔ بابا سائیں کا اپنے کزن کے ہاں شادی میں شرکت پر اصرار نہ ہوتا تو میں بھارت جانے کا پروگرام آگے بڑھا دیتا اور عاصمہ کی شادی میں شرکت کر کے ہی یہاں سے جاتا۔“

”آپ فکر نہ کریں سائیں! میں بچل کو ہر بات اچھی طرح سمجھا دوں گا۔“ سردار نے اسے تسلی دی۔ وہ عالم شاہ کا اتنا خاص ملازم تھا کہ عالم اسے دوستوں ہی کی طرح اپنے ساتھ رکھتا تھا اور اس کے بغیر اس کا گزارہ مشکل سے ہوتا تھا۔ بھارت کے پروگرام میں بھی اس نے سردار کو اپنے ساتھ رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ سردار کی غیر موجودگی میں بچل کو یہاں اس کی ذمے داریاں سنبھالنا تھیں۔

”بھارت جا کر واپس آجائیں تو پھر خدیجہ کے گھر دونوں سے بات کر کے قہاری شادی کا بھی کوئی سلسلہ چلاتے ہیں۔ خدیجہ اچھی لڑکی ہے۔ کوئی اور اس کا دعویدار بن کر آ جائے، بہتر ہے اس سے پہلے ہی تم اسے اپنے گھر کی رونق بنالو۔“ انتظار گاہ میں بیٹھ کر انہیں کچھ کرنا تو تھا نہیں اس لیے عالم شاہ نے ایک دلچسپ موضوع چھیڑ دیا۔ خدیجہ کے ذکر پر سردار کے چہرے پر ایک نرم سا تاثر ابھرا اور ہونٹ بھی دھیرے سے سکرائے لیکن جان بوجھ کر سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولا۔

”آپ سے پہلے میں اپنے سر پر سہرا سجانا بھلا کیا اچھا لگوں گا سائیں! میں تو چاہتا ہوں کہ پہلے آپ وڈے سائیں کی خواہش پوری کریں تو پھر میں بھی اپنے بارے میں کچھ سوچوں۔“

”سوچ لو بھائی کہیں میرے چکر میں پڑ کر تمہارا سر ہی سفید نہ ہو جائے۔“ عالم شاہ نے اسے ڈرایا۔ اس سے قبل کہ سردار جواب میں کچھ بولتا، انہیں سامنے سے عاصمہ آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس کے ہاتھ میں ایک پرچہ تھا اور صورت سے وہ کچھ پریشان دکھائی دیتی تھی۔

”کیا بات ہے، کوئی مسئلہ ہے کیا؟“ سردار نے

کھڑے ہو کر اس سے سوال کرنے میں پہل کی۔

”ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ ماں کو بہت تیز بخار ہے اور کمزوری بھی بہت ہو گئی ہے اس لیے بہتر ہے کہ انہیں ایک دو دن اسپتال میں داخل کر دیا جائے۔“

”ٹھیک ہے، تو کرنے دو انہیں داخل۔ اچھا ہے کہ یہاں رہ کر علاج طریقے سے ہو جائے گا۔“ سردار نے اسے تسلی دینے والے انداز میں جواب دیا۔

”یہ بہت مہنگا اسپتال ہے جی!“ عاصمہ نے اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔

”تمہیں اس سلسلے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم صرف اپنی ماں کا خیال رکھو اور مجھے یہ پرچہ دکھاؤ۔“

سردار نے اس کے ہاتھ میں موجود پرچہ لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

”ڈاکٹر نے گلوکوز کی قندیل اور دو اچھیں وغیرہ لکھ کر دی ہیں۔“ اس نے آہستہ سے کہتے ہوئے نسخے والا پرچہ سردار کی طرف بڑھادیا۔

”ٹھیک ہے، تم تھوڑی دیر انتظار کرو۔ میں ابھی سب کچھ لے کر آتا ہوں۔“ سردار اس سے کہہ کر باہر کی طرف بڑھ گیا۔ عالم شاہ نے اسے اتنا اعتماد اور اختیار دے رکھا تھا کہ وہ بہت سے معاملات اپنی صوابدید پر بھی نمٹا لیتا تھا۔ اس کے نظروں سے اوچھل ہو جانے پر عاصمہ، عالم شاہ کی طرف بڑھی اور جھپٹتی ہوئی اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

”تم پریشان مت ہو۔ تمہاری اماں جلد ٹھیک ہو جائیں گی۔“

”کون ہیں آپ لوگ؟ بھیا کے دوست تو نہیں ہو سکتے۔ میرے بھیا ایک حامی سے محنت مزدوری کرنے والے شخص ہیں۔ آپ جیسے امیر کبیر لوگ ان کے دوست کیسے ہو سکتے ہیں؟“ اس نے عالم شاہ کا جملہ شاید سنا بھی نہیں اور خشک بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس سے پوچھنے لگی۔

”دوستوں میں امیری غریبی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ نقیب ہمیں ایسے حالات میں ملا تھا کہ ہمارے درمیان حیثیتوں کا فرق مٹ گیا تھا۔ سچ کہوں تو نقیب دوست سے زیادہ ہمارا محسن ہے۔“ عالم شاہ نے پوری سچائی سے اسے جواب دیا۔ وہ باؤل کی قید میں گزرا وہ شخص وقت کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ اگر نقیب کی بدولت انہیں نہ خانے سے فرار کا موقع نہیں ملتا تو جانے باؤل جیسا جنونی اور قہقہہ و طبیعت کا مالک شخص ان کا کیا حشر کرتا۔ لی الحال تو اس جنونی کے خود شدید زخمی ہونے کی اطلاع تھی، اسی لیے وہ اس کے خلاف

کسی کارروائی کا منصوبہ بھی نہیں بنا سکے تھے۔
 ”آپ کیا کہہ رہے ہیں، مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔“
 عالم شاہ کے جواب نے اس کی انجھن دور نہیں کی۔
 ”کبھی فرصت میں، میں تمہیں سب بتا دوں گا۔ ابھی
 مجھ سے کچھ بھی جاننے پر اصرار مت کرو اور بس اتنا یاد رکھو
 کہ میں بھی تمہارے بھائی جیسا ہی ہوں اور تم اپنا ہر مسئلہ
 بالکل اسی طرح مجھے بتا سکتی ہو جیسے غیب کو۔“

”بھائی! کیا تو جیسا؟“ پتا نہیں کہ کون میرے دل
 میں عجیب عجیب سے واسطے آ رہے ہیں۔“ عالم شاہ کے انداز
 اور الفاظ میں کچھ ایسا تھا جو عاصمہ کو کھٹکا گیا اور وہ آنسو بھری
 آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بول پڑی۔ عالم
 شاہ سے جواب میں کچھ نہ کہا گیا اور وہ بس عاصمہ کے سر پر
 ہاتھ رکھ کر رہ گیا۔ عاصمہ کی آنکھوں میں ڈولتے آنسو اس
 کے رخساروں پر لڑھک گئے۔

”میں یہ دوا تمیں لے آیا ہوں۔“ مرد جو ابھی وہاں
 لوٹا تھا، پریشان نظروں سے اس منظر کو دیکھتا ہوا بولا۔
 ”جاؤ۔ یہ دوا تمیں لے کر اندر اماں کے پاس چلی
 جاؤ۔ اللہ نے چاہا تو سب اچھا ہو جائے گا۔“ عالم شاہ نے
 خود کو مشکل گھڑی سے نکالا۔ عاصمہ نے ہاتھ کی پشت سے
 رخسار پر بہتے آنسو صاف کیے اور مرد کی بڑھائی ہوئی
 دواؤں کی چٹائی تمام کر وہاں سے چلی گئی۔

”بھین ہے یا ر اور بھائی کی خیریت کی طرف سے
 مشکوک ہو گئی ہے۔“ عالم شاہ نے سرد کی نظروں میں موجود
 سوال پڑھ کر پڑ مردگی سے جواب دیا۔

”غیب کی موت کی اطلاع ان ماں بیٹی کے لیے
 بہت بڑا صدمہ ثابت ہوگی۔“ سرد نے بھی آنسوؤں سے تہرہ
 کیا پھر سر جھپکتے ہوئے ذرا چڑچوش انداز میں بولا۔ ”میں
 آپ کے لیے ایک حیرت ناک اطلاع لے کر آیا ہوں۔“
 عالم شاہ نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں نے ابھی ابھی باہر مٹی عبدالحق کی بیٹی آسیہ کو
 دیکھا ہے۔ وہ اتنے برے حال میں ہے کہ مشکل سے ہی
 پہچانی جا رہی ہے۔ اس کی ٹانگ ٹوٹی ہوئی ہے اور زخم سڑ
 رہے ہیں۔ میں نے میڈیکل اسٹور والے سے اس کے
 بارے میں جو معلومات حاصل کی ہیں، ان کے مطابق وہ
 کچھ عرصے سے اس علاقے میں بھیک مانگ رہی ہے اور
 لوگ اسے ننگری فقیرنی کے نام سے جانتے ہیں۔ میڈیکل
 اسٹور والے کا کہنا ہے کہ روز صبح سویرے کوئی اسے یہاں
 چھوڑ جاتا ہے اور سورج ڈھلنے کے بعد لے کر جاتا ہے۔“

سرد کی لائی ہوئی اطلاع واقعی حیرت انگیز تھی۔ آسیہ کے ذکر
 کے ساتھ ہی عالم شاہ کے بہت سے ذمہ ہرے ہو گئے۔ آسیہ
 نے نکل اور معظم شاہ کے انوار میں کلیدی کردار ادا کیا تھا اور
 جب وہ اتفاقاً اس کی حقیقت جان کر اس سے باز پرس کر رہا
 تھا تو اس نے اس پر اپنی عزت پر ہاتھ ڈالنے کا بیانیہ
 الزام عائد کر دیا تھا۔ اپنے جھوٹ کو حقیقت کا رنگ دینے
 کے لیے وہ اس حد تک چلی گئی تھی کہ اوہری منزل سے
 چھلانگ لگا کر اپنی ہڈیاں تڑپا چکی تھی۔ آسیہ کے اس
 ڈرامے نے اسے اپنے باپ اور ماموں کی نظروں سے
 گرا دیا تھا۔ بعد ازاں اس پر پشت سے قاتلانہ حملہ بھی کیا
 گیا تھا جس کے بارے میں شواہد بتاتے تھے کہ حملہ آور
 آسیہ کا چھوٹا بھائی تھا۔ اس واقعے کے بعد مٹی عبدالحق اپنے
 پورے خاندان کے ساتھ غائب ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ
 اسپتال میں داخل آسیہ بھی غائب ہو گئی تھی اور تلاش کے
 باوجود ان لوگوں کا کچھ پتا نہیں چلا تھا۔ اب اچانک ایک
 چھوٹے شہر میں آسیہ کی بطور فقیرنی موجودگی کی اطلاع ملنا
 واقعی حیرت انگیز تھا۔

”تمہیں یقین ہے کہ وہ سچ سچ آسیہ ہی ہے؟“
 ”بالکل سائیں! اگر آپ چاہیں تو اپنی آنکھوں سے
 دیکھ کر تصدیق کر سکتے ہیں۔“ سرد کے لہجے میں اعتماد تھا۔
 ”ہاں! میں دیکھنا چاہتا ہوں۔“ عالم شاہ اپنی جگہ
 سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”ہائیں، میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔“
 ”نہیں۔ تم یہیں رکو۔ میں بہت خاموشی سے اسے
 چیک کرنا چاہتا ہوں۔ بس تم مجھے یہ بتا دو کہ وہ کس طرف
 موجود ہے۔“ اس نے سرد کو روک دیا۔

”اسپتال کے دروازے سے نکلنے کے بعد دائیں
 طرف اسپتال سے ہی متصل میڈیکل اسٹور ہے۔ اس
 میڈیکل اسٹور کے سامنے والے فٹ پاتھ پر بیٹھی ہے وہ۔“
 سرد نے نشاندہی کی تو وہ سر ہلا کر خارجی راستے کی طرف
 بڑھ گیا۔ اس کا رخ میڈیکل اسٹور کی طرف تھا۔ اس طرف
 بڑھتے ہوئے اس نے فٹ پاتھ پر چادر بچھا کر بیٹھی اس
 فقیرنی کو دیکھا جیسے کوئی سایہ بھی میسر نہیں تھا۔ پچھلے پرانے
 اور سیلے کچیلے لباس میں یوں تیز دھوپ میں ایک کھجے کے
 سہارے بیٹھی وہ بڑی قابلِ رحم لگ رہی تھی۔ وہ میڈیکل
 اسٹور تک پہنچا تو اس کے اور فقیرنی کے درمیان فاصلہ اتنا
 سمٹ گیا کہ اب وہ اس کی شکل بھی اچھی طرح دیکھ سکتا تھا
 لیکن براہِ راست اس کی طرف متوجہ ہونے سے پہلے وہ

استور پر موجود شخص سے مخاطب ہوا اور اسے دودھ کے اپورنڈ ڈبے سمیت چار پانچ آنٹلوں کے نام گنوا کر مصروف کر دیا۔ اب وہ اطمینان سے فقیرنی کا جائزہ لے سکتا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور ایسا لگتا تھا کہ نقاہت اور تکلیف کے باعث اس میں آنکھیں کھول کر ارد گرد دیکھنے کی ہمت ہی باقی نہیں رہی ہے۔ سر کے بال بے حد اچھے ہوئے اور نیلے تھے۔ رنگت چمک چمک کر سیاہ پڑ گئی تھی، سیاہی مائل پیڑی زدہ ہونٹوں اور میل بھرے لمبے ناخنوں والے سونگے ہاتھوں کو دیکھ کر یقین کرنا مشکل تھا کہ یہ وہی آسیہ عبدالحق ہے جسے اس نے اپنے ماموں قربان شاہ کی حویلی میں دیکھا تھا۔ سانولی سلونی سی وہ آسیہ تو بڑی صاف ستھری اور پُر اعتماد لڑکی تھی۔ اس نے انٹرنیٹ تعلیم بھی حاصل کر رکھی تھی اور بڑی اونچی اڑان اڑنے کے ارادے رکھتی تھی۔ اس آسیہ کے بارے میں بھلا کون سوچ سکتا تھا کہ وہ یوں ایک نٹ پاتھ پر پڑی ہوگی اور آتے جاتے راہ گیر جم کھا کر اس کی جھولی میں چند سکے ڈالتے ہوئے گزر جاتے ہوں گے۔

سب سے قابلِ رحم حالت اس کے پیر کی تھی۔ اس کا دایاں پیر جس انداز میں پڑا ہوا تھا، اس سے ظاہر تھا کہ وہ اسے حرکت دینے سے معذور ہے۔ اس پیر پر سے شلوار کا پانچا پنڈلی سے ذرا اوپر تک کھسکا ہوا تھا اور اس جگہ پر نازخم دکھائی دے رہا تھا۔ زخم پر کھیاں بھنک رہی تھیں جنہیں اڑانے کی کوشش کیے بغیر وہ مکمل بے حسی کے عالم میں بیٹھی ہوئی تھی۔ آسیہ کی وجہ سے اگرچہ وہ اور اس کا خاندان شدید تکلیف سے گزر رہے تھے مگر بھی اسے اس حالت میں دیکھ کر اس کا دل کانپ گیا۔

”یہ لیجئے سر آپ کا سامان۔“ میڈیکل استور والے نے اسے پکارتا وہ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا اور بیٹنے والے ٹل کا معلوم کر کے اسے رقم ادا کر کے سامان کا تھیلا اٹھا کر واپس اسپتال کی طرف چل پڑا۔

”سامعین!“ مستعد اور وقادار سرمد اس کے گیسٹ سے اندر داخل ہوتے ہی دوڑا ہوا آیا اور اس کے ہاتھ سے سامان کا تھیلا لے لیا۔

”اس میں دودھ کے ڈبے، دلیا اور فردٹ کا ک ٹیل وغیرہ ہے۔ تم یہ سامان عاصمہ کے حوالے کر دو۔“ اس نے سرمد کو ہدایت کی تو وہ باوجود خواہش کے اس سے سوال کرنے کی جرأت نہ کر سکا اور خاموشی سے اسپتال کے اس حصے کی طرف بڑھ گیا جہاں اسپتال میں داخل ہونے والے مریضوں کے لیے کمرے بنائے گئے تھے۔ سرمد کے جانے

کے بعد وہ خود استقبالیہ پر پہنچا اور نقیب کی والدہ کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کرنے کے ساتھ ایک بڑی رقم ایڈوانس کے طور پر ڈیپازٹ کروادی۔ ڈاکٹر نے عورت کو ایک دو دن داخل رکھنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا لیکن اس نے احتیاطاً اتنی رقم جمع کروادی تھی کہ اگر ہفتہ دس دن بھی انہیں داخل رہنا پڑے تو مسئلہ نہ ہو۔ اس کے اس کام کو نمٹانے تک سرمد بھی واپس آ چکا تھا۔

”آسیہ کی گمرانی کرنا ہے سرمد! اس کی گمرانی کرو اور دیکھو کہ اس سے بھیک منگوانے والا اسے کہاں لے جاتا ہے؟“ ”ٹھیک ہے سامعین، جو آپ کا حکم۔“ وقادار سرمد سے اس کے سوا اور کس جواب کی امید رکھی جاسکتی تھی۔

”میرے خیال میں سامعین یہاں قریب کسی ہوٹل میں کمرالے لیتے ہیں۔ اس معاملے کو نمٹانے کے لیے ہمیں رات گئے تک یہاں رکتا ہوگا۔ اتنی ویر آپ کہاں خوار ہوتے رہیں گے۔ آپ ہوٹل میں آرام کیجیے گا۔ یہ گمرانی وغیرہ کا کام میں خود نمٹالوں گا۔“ سرمد نے مشورہ دیا جسے قبول کرنا اس نے مناسب سمجھا۔ عاصمہ اور اس کی ماں سے مل کر اور انہیں تسلی بخشی دے کر وہ لوگ اسپتال سے روانہ ہو گئے۔ سرمد موہاگل پرائمریٹ کی سہولت کا فائدہ اٹھا کر اس شہر میں موجود ہوٹلوں کے بارے میں معلومات حاصل کر چکا تھا۔ چھوٹا سا شہر تھا جہاں ایک ہی مناسب ہوٹل کے بارے میں معلوم ہوا تھا۔ ہوٹل پہنچ کر انہوں نے ایک دن کے لیے کمر ایک کر دیا۔ اپنے ساز و سامان اور سہولیات کے اعتبار سے وہ کمر ایس گوارا ہی تھا لیکن انہیں بھی کون سا وہاں ڈیرے ڈال کر بیٹھنا تھا، سو برداشت کر لیا۔ عالم شاہ کے اصرار پر تھوڑا بہت کھانے پینے اور آرام کرنے کے بعد سرمد سوہنی مٹی ذمے داری پوری کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

”گاڑی لے جاؤ۔“ اسے چابیاں میز پر ہی چھوڑ کر اٹھتے دیکھ کر عالم شاہ نے اسے ٹوکا۔

”نہیں سامعین! گاڑی نہیں لے جاؤں گا۔ گاڑی یہاں کے ماحول میں جلدی نمایاں ہو جاتی ہے۔ میں نے اس ہوٹل کے قریب ہی ایک جگہ بورڈ لگا دیکھا تھا کہ وہاں کرائے پر موٹر سائیکلیں دستیاب ہیں۔ میں موٹر سائیکل لے لوں گا۔“ سرمد نے اسے جواب دیا تو اس کی بات مناسب جان کر اس نے مزید اصرار نہیں کیا اور بولا۔

”ٹھیک ہے، جو تم مناسب سمجھو کرو۔ مجھے بس حالات سے باخبر رکھنا۔“

”جو حکم سامعین!“ سرمد نے حسبِ عادت فرمانبرداری

سے کہا اور باہر نکل گیا۔

آسیہ کے بارے میں کوئی نئی اطلاع رات کو ہی ملنے کی توقع تھی چنانچہ سرحد کے جانے کے بعد وہ بھی آرام کرنے لیٹ گیا۔

☆☆☆

”کیا پڑ پڑ لگا رکھی ہے؟ تم لوگوں سے چپ نہیں بیٹھا جاتا؟ یہاں کیا اپنے مامے کے بچے کے بچہ میں آئے ہوئے ہو جو سارا نام مزے سے بیٹھے ہیں ہاتھتے رہتے ہو۔“ تہ خانے کی جس زدہ قید میں وقت گزارنا آسان کام نہیں تھا۔ اندیشوں اور وسوسوں میں ڈوبے قیدی اس مشکل کو آسان کرنے کے لیے ایک دوسرے سے گفت و شنید کر کے وقت گزارنے کی کوشش کرتے تھے۔ پچھلے دو دن میں ان کے اس عمل پر کوئی تعرض نہیں کیا گیا تھا لیکن اس وقت بالوں سے قاریغ، چمکتی چند یاد آوا، جسے وہ لوگ اب امیت کے نام سے جاننے لگے تھے، یکدم ہی قہقہہ پڑا۔ اس کے یوں چلانے پر تمام یرغمالی خاموش ہو کر اس کا منہ دیکھنے لگے۔ قید خانے میں موجود امیت کا ساگی شتر بھی یرغالیوں کو سخت نظروں سے گھورنے لگا پھر امیت کی طرف مڑ کر اس سے تامل زبان میں کوئی بات کی۔ اس کی بات سن کر امیت نے شانوں کو جھٹکا اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑا اٹا ہوا ایک طرف جا کر کھڑا ہو گیا۔ ”یہ لوگ اعصاب زدہ نظر آتے ہیں۔“ مسیح افراد کے سنے ہوئے چہروں کو دیکھ کر معاذ نے ساتھ بیٹھی سونیا سے سرگوشی میں تبصرہ کیا۔

”ہوں۔“ سونیا محض تائیدی ہٹکارا بھر کر رہ گئی۔ جو معاذ نے محسوس کیا تھا اسے وہ بھی محسوس کر چکی تھی۔ شروع میں ان لوگوں کا رویہ اچھا تھا۔ وہ انہیں کڑی نگرانی میں رکھ رہے تھے لیکن رویتہ ٹھیک تھا۔ کھانا پینا بھی وقت پر مل رہا تھا اور پچھلے جسے میں موجود بیت الخلا کو استعمال کرنے کی بھی آزادی تھی۔ آپس میں تامل زبان میں بات چیت اور فہمی مذاق کرنے کے ساتھ ساتھ وہ یرغالیوں سے بھی خوشگوار لہجے میں بات کر لیتے تھے لیکن کل شام سے ان کا انداز بگھا بگھا تھا۔ رات کے کھانے میں یرغالیوں کو پانی جیسی پتلی دال کے ساتھ فی کس ایک روٹی کھانے کے لیے دی گئی تھی۔ صبح ناشتے میں محض کالی چائے اور شاید رات کی پکی ہوئی باکی روٹیاں تھیں۔ کھانے کے معیار کے ساتھ ساتھ اب ان کے رویے کی خرابی بھی سامنے آگئی تھی جو اس بات کا ثبوت تھا کہ حالات ان کی توقع کے مطابق نہیں ہیں اور وہ مشکل سے گزر رہے ہیں۔ ان کے رویوں کو محسوس کر کے پہلے سے

صبر

صبر کرنے اور صبر آنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اپنے دل پر جبر کر کے اپنا حوصلہ آزما کر چپ سادہ لیٹا اول الذکر جب کہ رد و نحو کر اپنا فہم منا کر آنکھوں میں آنسوؤں کی قلت ہو جانے کے بعد خاموشی اختیار کر لینا موطر الذکر کے دوسرے میں آتا ہے۔ صبر کوئی کوئی کرتا ہے۔ صبر ہر ایک کو آ جاتا ہے۔

عصر

ایک صاحب اپنے چھ سالہ بچے کو داخلہ دلوانے کے لیے اسکول لے جا رہے تھے۔ انہوں نے بچے کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو بیٹا! جب میڈم آپ سے عمر پوچھیں تو آپ اپنی عمر چار سال بتانا۔ اگر آپ نے اپنی عمر چھ سال بتائی تو آپ کو داخلہ نہیں ملے گا۔“

وہ صاحب بچے کو لے کر اسکول پہنچے تو میڈم نے بچے سے پوچھا۔ ”بیٹے! آپ کی عمر کیا ہے؟“ بچے نے مصحوبیت سے جواب دیا۔ ”میڈم! میری عمر گھر میں چھ سال، اسکول میں چار سال اور ریل کے سفر میں تین سال ہوتی ہے۔“

مرسلہ: محمد انور ندیم، حوالی لکھا

پریشان یرغمالی کچھ اور بھی سہم گئے اور آپس میں ہونے والی گفتگو کا سلسلہ بھی موقوف کر دیا لیکن چھوٹے بچے مصلحتوں کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔

دوپہر کو پچھلے دو یوم کے معمول کے مطابق مقررہ وقت پر کھانا نہیں آیا تو سب نے سمجھ لیا کہ اب انہیں قاتل کی کا سامنا بھی کرنا پڑے گا لیکن بچے اس بات کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ کھانے کے مقررہ وقت سے ایک گھنٹا اوپر ہوا تو بچوں نے باؤں سے کھانے کا مطالبہ شروع کر دیا۔ بے بس مائیں جھوٹی تسلیاں دے دے کر ایک حد تک انہیں بہلاتی رہیں لیکن بھوکے پیٹ کب تک محض تسلیوں سے بچھتے۔ تقریباً سات سالہ ایک گول گلابو سا بچہ ہاں کو ذرا زیادہ ہی تنگ کر رہا تھا۔ بچے کی صحت دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ خاصا خوش خوراک رہا ہوگا۔ دوران سفر بھی وہ اکثر چپیں، نمکو اور چاکلیٹ جیسی چیزیں کھاتا ہوا نظر آیا تھا اور ایسے بسیار خور

بچے کے لیے یقیناً ناقہ نشی ایک بڑی مصیبت تھی۔ پہلے دھیمے سروں میں ماں سے مطالبہ کرنے کے بعد وہ بلند آواز سے بھوں بھوں کر کے رونے لگا۔ ان کی نگرانی کرنے والے مسخ افراد بچے کے رونے کی وجہ جانتے تھے لیکن جان کر بے نیاز بنے رہے۔ آخر ممتا سے مجبور ہو کر بچے کی ماں نے ہی اہمیت کی اور ہلچل بچے میں بولی۔

”بھرا! کم سے کم بچوں کو تو کھانا دے دو۔ بے چارے بچے کیسے کھائے۔ بے بنارہہ سکتے ہیں؟“

”کسی کو کھانا نہیں ملے گا۔ کوئی کھانا دانا نہیں ہے۔“ عورت کی درخواست سن کر امیت نے زور سے دہاڑ کر جواب دیا۔ اس کا جواب سن کر عورت کی تو مزید بات کرنے کی ہمت نہیں ہوئی لیکن بھوک کا ستا یا بچہ چپ نہیں رہا۔ وہ تھا بچی والدین کا اکلوتا بچہ اور ذرا زیادہ ہی لالچ پیار میں پالا ہوا محسوس ہوتا تھا اس لیے قدرے بدتمیزی سے اونچی آواز میں بولا۔

”اگر تمہارے پاس کھانا نہیں ہے تو ہمیں یہاں کیوں رکھا ہوا ہے؟ ہمیں جانے دو، ہم اپنے گھر جا کر خود کھانا کھالیں گے۔“

”بہت بھوک لگی ہے سارے چھ لے کھالے کھانا۔ ہمارے پاس تو کھانے کے لیے بس یہ گولیاں ہی ہیں۔“ شدید غیظ میں بھرا ہوا امیت بچے پر جھپٹا اور اپنی گن کی نال بچے کے منہ میں ڈھیر ڈی۔ اس کی اس حرکت پر بچے کی ماں سمیت کئی عورتوں کی چیخیں نکل نکلیں۔ مرد بھی مضطرب سے ہو کر اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے لیکن شتر کی ایک دھاڑ نے انہیں کوئی حرکت کرنے سے روک دیا۔ وہ اپنا خطرناک ششین پستول اہرا تا ہوا کہہ رہا تھا۔

”خبردار! اپنی جگہ سے ہٹنا نہیں۔ اگر کسی نے حرکت کی تو اس کا جسم چمکنی کر کے رکھ دوں گا۔“

ان کا تیسرا ساتھی اچھے اس ساری پھوٹیشن میں بالکل خاموش تھا لیکن اس نے بھی اپنے کندھے سے لٹکی راٹکل اتار کر رفلٹیوں کی طرف تان لی تھی۔ بچے کی وجہ سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہونے والے مردوں میں معاذ بھی شامل تھا لیکن ایک طرف مسخ افراد کے تیروں تو دوسری طرف اپنے ہاتھ پر سونیا کے ہاتھ کے دباؤ نے اسے کسی حرکت سے باز رکھا اور اس نے بس ذرا کی ذرا نظریں موڑ کر سونیا کی طرف دیکھا۔ اس نے اسے آنکھوں سے اشارہ کیا کہ وہ سکون سے رہے۔ معاذ کو نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا مشورہ ماننا پڑا۔ موجودہ صورت حال میں ذرا سی بے

احتیاطی بچے سمیت کئی لوگوں کی جان لے سکتی تھی۔ بچے تو بہت ہی ہانی ریسک پر تھا۔ امیت کی گن کی نال اس کے منہ میں رکھی ہوئی تھی اور وہ رونا بھول کر بالکل ساکت ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے وہ جدید دور کا سات سالہ بچہ یہ بات تو سمجھتا تھا کہ گن ایک خطرناک شے ہے۔ اس خوفناک شے کی وہ شہت سے بچے کی آنکھیں حلقوں سے باہر نکل آئی تھیں اور چہرہ بالکل زرد پڑ گیا تھا۔

”گرو کا واسطہ، بھگوان کا واسطہ، جس کو بھی تم مانتے ہو

اس کا واسطہ، پلیز! میرے بچے کو چھوڑ دو۔ چھوڑ دو اس معصوم کو۔ اب یہ کچھ نہیں بولے گا۔ کچھ بولنے تو تم پہلے مجھے گولی مار دینا۔“ بچے کی ماں جو چند لمحوں کے لیے خود بھی خوف سے متحیر ہو گئی تھی، سکتے سے نکل کر دہائیاں دیتی ہوئی آگے بڑھی اور گھٹنوں کے بل زمین پر گر کر امیت کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ اس کا بک بک کر رونا وہاں موجود تقریباً ہر شخص کی آنکھوں کو غم کر گیا تھا لیکن امیت سرخ ٹٹا ہوں سے بچے کو گھورتا ہوا اپنی جگہ پر ایسے کھڑا رہا جیسے انسان نہیں ہوتا ہو۔

اسی وقت سیز جیوں کی طرف سے کسی کی بلند لہجہ میں بولنے کی آواز آئی اور پھر وہی مثل و لہجہ سے تین اور پروبار دکھائی دینے والا شخص تیزی سے سیز حیاں اتر کر نیچے آیا۔ آج وہ بھی پہلے دن کی نسبت خاصے رف علیے میں تھا اور لباس میں وہ پہلے سی نکاست دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ سر کے بال بھی قدرے میلے اور بے ترتیب تھے اور چشمے کے پیچھے سے جمائے ذہن آنکھوں میں سرخ ڈور سے دکھائی دے رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ یا تو وہ مسلسل جاگتا رہا ہے یا پھر مضبوط گرمی نے اس کی آنکھوں کا یہ حال کیا ہے۔ اس نے اوپر سیز جیوں پر سے امیت سے کیا کہا تھا، وہ تو حامل زبان کے استعمال کی وجہ سے کسی کی سمجھ میں نہیں آیا لیکن امیت کے رد عمل نے کافی حد تک مفہوم واضح کر دیا۔ وہ بچے کے منہ سے گن کی نال باہر نکال کر اس سے کچھ دور ہٹ گیا تھا اور اب قدرے ناراض لہجہ میں کچھ بول رہا تھا۔ اس شخص نے حمل سے امیت کی بات سنی اور پھر جواب میں خود کچھ بولا تو ایسا لگا کہ وہ امیت کو ڈانٹ رہا ہے۔ اس کی ڈانٹ سننے کے بعد امیت زبان سے کچھ نہیں بولا اور مزید دو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے انداز میں مجبوری سے زیادہ احترام کا اظہار تھا۔ امیت سے سننے کے بعد اس نے پرغالیوں کی طرف رخ کیا۔ امیت کے غصے کا نشانہ بننے والے بچے کی ماں نے بچے کو اپنی بانہوں کے حلقے میں لیا ہوا تھا اور ابھی تک سسک رہی تھی۔ اس نے ایک تاسف بھری نظر ماں اور بچے پر ڈالی

اور ڈراما ٹھکانے دار کران لوگوں سے مخاطب ہوا۔

”جو کچھ ہوا اس پر مجھے افسوس ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی آپ لوگوں کے ساتھ برابر تاق نہیں کرنا چاہتا لیکن اس سے میرے لوگ بہت دکھی اور نہیں ہیں۔ حالات بگڑ گئے ہیں۔ سرکار آپ لوگوں کی خاطر ہماری ڈیمانڈ ماننے کے بجائے ہمیں گھبرنے کے چکر میں پڑ گئی ہے۔ ہمارا ایک خاص آدمی جو ہمیں یہاں خوراک وغیرہ پہنچانے کا سروس تھا، سرکار کی نظر میں آنے کے کارکن کل ماریٹ ہو گیا تھا۔ ہمارے کارکن کو بچانے کے لیے اس نے قربانی دی اور اریٹ ہوتے ہی آتما ہتھیا کر لی۔ اپنے ساتھی کی موت نے میرے لوگوں کی ذہنی حالت بہت خراب کر دی ہے۔ انہیں فیشن بھی ہے اور شدید دکھ اور غصہ بھی.....“ اس نے بولتے بولتے یکدم سر جھکا لیا اور یوں لگا کہ وہ اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہو۔ چند ہی لمحوں کے وقفے کے بعد اس نے دوبارہ سراٹھایا اور بولنا شروع ہوا۔

”ہم آپ لوگوں کو کشت نہیں دینا چاہتے لیکن ہمارے پرائمریز بڑھنے پر آپ کو بھی کشت اٹھانا پڑے گا۔ ہمارے پاس یہاں خوراک کے نام پر صرف خشک راشن اور دودھ کے چند ٹیڑا ایک ڈبے ہیں اور کچھ طے نہیں کہ ہمیں کتنے سے تنگ یہاں رکنا پڑے گا۔ اپنے ایک ساتھی کی موت کے بعد ہم کسی اور سے کوئی ملک کرنے اور اس سے تازہ میزیاں یا دودھ منگوانے کا رسک نہیں لے سکتے اسی لیے ہم نے اپنے پاس موجود راشن کو سنبھال کر برتنے کا فیصلہ کیا ہے۔ دودھ صرف چھوٹے بچوں کے لیے ہے، اس لیے ہمیں اور آپ کو کالی چائے کے ساتھ روکی سوگی کھا کر گزارہ کرنا پڑے گا۔ آئی ہوپ کہ آپ ہمارے ساتھ کوآپریٹ کریں گے۔“ اس نے اپنی بات کے اختتام پر ان سب کے سبے ہوئے اور پریشان چہروں پر ایک نظر ڈالی اور پھر پلٹ کر شکست انداز میں چلتا ہوا میزیاں چڑھنے لگا۔ وہ انہیں اس مصیبت میں ڈالنے والوں کا سرخشا تھا لیکن اس کے انداز و اطوار کی شانسی کسی کو بھی اس سے پوری طرح متاثر نہیں ہونے دیتی تھی۔ اب بھی سب خاموشی سے یوں سر جھکا کر اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے جیسے انہوں نے اسے اپنے تعاون کا خاموش عہد دے دیا ہو۔

☆☆☆

”آسیہ کو لینے بندہ آ گیا ہے سائیں! اور اب میں اس کے پیچھے جانے لگا ہوں۔“ رات کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا لیکن عالم شاہ نے کھانا نہیں کھایا تھا اور چائے کے

ساتھ ایک دو اسٹیکس منگوا کر انہی سے گزارہ کر لیا تھا۔ وہ کسی بھی لمحے باہر نکلنے کے لیے بالکل تیار سرمد کی کالی کے انتظار میں تھا اور اب اس کی کالی آگئی تھی۔

”ٹھیک ہے، احتیاط سے پیچھا کرو اور مجھے اپنی لوکیشن سے آگاہ کرتے رہو۔ میں تمہارے پیچھے رہوں گا۔ تمہیں کوئی رسک نہیں لینا اور صرف ان کا ٹھکانا دیکھنا ہے۔“ ”جو حکم سائیں۔“ اس کی ہدایات کے جواب میں سرمد نے حسب معمول فرمانبرداری کا مظاہرہ کیا۔ وہ کالی منقطع کر کے فوراً ہوٹل سے روانہ ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد سرمد نے دوبارہ رابطہ کر کے اسے اپنی لوکیشن سے آگاہ کیا۔ اب وہ سرمد کو فائل کرنا ہوا گاڑی چلا رہا تھا۔ چھوٹا شہر ہونے کی وجہ سے رات کے دس بجے ہی روٹن مانند پڑنا شروع ہو گئی تھی اور کہیں کہیں ایک آدھ کھلی ہوئی دکانوں اور گھنے چنے موٹر سائیکل سواروں یا راہ گیروں سے واسطہ پڑ رہا تھا۔ سڑک بھی مختصر سی ثابت ہوا۔ سرمد نے اس اطلاع کے ساتھ کہ وہ آسیہ کا ٹھکانا دیکھ چکا ہے، اسے رک جانے کے لیے کہا تو اس نے ایک مناسب جگہ دیکھ کر گاڑی روک دی۔

یہ ایک مکی آبادی تھی جہاں چھوٹے چھوٹے تنگ مکانات بنے ہوئے تھے۔ اس وقت اگر وہاں تاریکی نہ پھیلی ہوئی ہوتی تو عالم شاہ کی شاندار گاڑی اور اس آبادی کی خستہ حالی کا فرق بہت نمایاں ہو کر سامنے آتا۔ پُرسوج انداز میں اپنے ارد گرد کا جائزہ لیتے عالم شاہ کی نظروں نے جلد ہی موٹر سائیکل پر آتے سرمد کو دیکھ لیا۔ وہ ایک تنگ گلی سے برآمد ہو رہا تھا۔ عالم شاہ نے ہلکا سا ہارن بجا کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا اور خود گاڑی سے نیچے اتر آیا۔

”میں نے وہ مکان دیکھ لیا ہے جہاں آسیہ کو لے جایا گیا ہے۔ اب آگے جو آپ کا حکم!“ سرمد نے قریب آ کر اسے اطلاع دی۔

”چلو ہل کر دیکھتے ہیں۔“ عالم شاہ اس کے پیچھے موٹر سائیکل پر بیٹھ گیا۔ سرمد نے موٹر سائیکل کا رخ دوبارہ اسی گلی کی طرف کر لیا جہاں سے نکلتے ہوئے عالم شاہ نے اسے دیکھا تھا۔ شیطان کی آنت کی طرح لمبی اس گلی کی چوڑائی اتنی کم تھی کہ یہاں سے کسی چار پہیوں والی سواری کا گزرتا ناممکن تھا۔ بے ترتیبی سے بنے مکانات کی وجہ سے یہ چوڑائی بھی یکساں نہیں تھی اور بعض جگہ تو راستہ اتنا تنگ ہو گیا تھا کہ اگر سامنے سے کوئی بندہ آ جاتا تو اسے موٹر سائیکل کو گزرنے کا راستہ دینے کے لیے خود دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑا ہونا پڑتا۔ گلی ختم دار تھی اور اس سے کچھ ذیلی گلیاں بھی

نکل رہی تھیں۔ مکانات کے اندر جلتی روشنیوں نے کسی حد تک گلی کی تاریکی کو بھی کم کر رکھا تھا۔ سرمد اس معمولی سی روشنی میں امداد سے موٹر سائیکل چلاتا ہوا ایک ذیلی گلی میں ٹکس گیا۔ یہ گلی آگے سے بند تھی اور اس کے سرے پر ایک چھوٹے سے مکان کا دروازہ نظر آ رہا تھا۔

”وہ آخری والا مکان ہے۔“ سرمد نے اسی مکان کی طرف اشارہ کیا جس نے گلی کو بند کیا ہوا تھا۔ موٹر سائیکل وہ روک چکا تھا۔

”دیکھتے ہیں چل کر۔“ عالم شاہ نے موٹر سائیکل سے اترتے ہوئے کہا۔ سرمد نے بھی نوراً اس کی تقلید کی اور قدر سے جھجکتے ہوئے بولا۔

”وہاں ہمارا کن لوگوں سے واسطہ پڑے، یہ کہنا مشکل ہے سائیکس! اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ یہیں رکھیں، میں اکیلا آگے جاتا ہوں۔“

”نہیں۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔“ عالم شاہ نے قطعیت سے اس کا مشورہ ماننے سے انکار کر دیا تو مزاج شاہ سا سرمد کے پاس مزید اصرار کی گنجائش نہیں رہی۔ وہ

دو لوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے مکان کے قریب پہنچے۔ لوہے کا سا کھردرہ دروازہ اندر سے بند تھا لیکن چار دیواری کی بلندی اتنی نہیں تھی کہ انہیں اندر تک رسائی حاصل کرنے میں

دشواری پیش آتی۔ وہ دونوں بندروں کی پھرتی سے دیوار پر چڑھ گئے۔ دیوار کی دوسری طرف چھوٹا سا آگن تھا جس میں نہ جانے کیا کیا کاٹھ کباڑ پھیلا ہوا تھا۔ آگن کے پار

موجود کمرے میں بہت عرصہ سی روشنی دکھائی دے رہی تھی لیکن وہ روشنی اتنی کم تھی کہ باہر نکل کر آگن کی تاریکی کو دور کرنے سے قاصر تھی۔ وہ دونوں جو اپنے اپنے ہتھیار نکال کر

ہاتھ میں لے چکے تھے، آہستگی سے پیچھے کودے۔ کودنے کی مدد ہم آوازوں پر کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا۔ وہ دونوں چند

ثانیوں کے لیے من گن لینے کے بعد کمرے کی طرف بڑھے۔ کمرے کا دروازہ پوری طرح بند نہیں تھا۔ سرمد نے اس نیم وا دروازے سے اندر جھانکا۔ نظروں کے صحن

سامنے ایک جھنگ سی چار پائی پڑی ہوئی تھی جس پر بڑھال سی لٹھی ہوئی آسید صاف دکھائی دے رہی تھی۔ آسید کو یہاں لانے والے شخص کی جستجو میں سرمد نے دروازے کے پٹ

پر ہاتھ کا دباؤ ڈال کر اسے مزید کھولا۔ اگلے لمحہ قیامت کا تھا۔ ”اپنے ہتھیار نیچے پھینک کر ہاتھ سر پر رکھ لو ورنہ میں گولی چلانے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگاؤں گا۔“ پتکار تے لہجے میں دی گئی دھمکی پر اس نے سرعت سے پلٹ کر دیکھا تو

عالم شاہ کے سر کی پشت سے ایک پستول کی ٹال گئی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ سے ہتھیار پھسل کر خود بخود نیچے گر گیا۔ تاخیر کا مظاہرہ کر کے عالم شاہ کی زندگی کے لیے معمولی سا بھی رسک لینا اس کے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔

☆☆☆

اس نیم تاریک خانے میں دونوں مزید گزر گئے۔ ان دونوں میں حالات جوں کے توں رہے۔ یرٹالیوں کو دن میں دو وقت لگ بھگ ہفتہ وار میں کھانا دیا جاتا رہا۔ کھانا

صبح میں کالی چائے اور روٹی جبکہ رات میں پتلی دال اور روٹی پر مشتمل ہوتا تھا۔ بچوں والے اپنے بچوں کی محبت سے مجبور ہو کر ناشتے میں ملنے والی روٹی کا کچھ حصہ ان کے دوپہر

کے کھانے کے لیے بھی بچا لیتے تھے۔ حالات نے معصوم بچوں کو بھی جھجھکاتا اور صبر کرنا سکھا دیا تھا۔ امیت کے چار حانہ روپے کے مظاہرے کے بعد تو سب ہی بہت سہمے ہوئے

تھے اور خمد اور مطالبات کرنا چھوڑ دیے تھے۔ بہت سے بہت اتنا ہوتا تھا کہ بے چارے ماں باپ کی گود میں سر رکھ کر سبک لیتے تھے اور پریشان حال ماں باپ کسی نہ کسی طرح

جھوٹی تسلیاں دے کر انہیں بہلا لیتے تھے۔ یہ ان کے یرٹالی بنائے جانے کا پانچواں دن تھا جب ناشتے کے فوراً بعد پتا چلا کہ ایک شیر خوار بچہ کو بخار

ہو گیا ہے۔ یہ بچہ کوئی چار ساڑھے چار ماہ کا تھا اور ماں کے دودھ پر اٹھا رہا تھا۔ کم خور کی کا شکار بچے کو فیڈ کر دینے والی ماں، جو پہلے ہی نڈھال نڈھال سی نظر آتی تھی، اس کے

بخار میں جھٹکا ہونے کے بعد بالکل ہی زرد نظر آنے لگی۔ پہلے پھل بچے کے سر پر پانی میں بھجی پٹیاں رکھ کر اس کا بخار اتارنے کی کوشش کی جاتی رہی لیکن اس کوشش کا کوئی نتیجہ

برآمد نہ ہونے پر مجبور ماں باپ بچے کے لیے دوا کا مطالبہ کرنے پر مجبور ہو گئے۔

”دوا..... دوا کہاں سے آئے گی؟ تم لوگ تو یہ پرارتھنا کرو کہ تمہاری سرکار تم پر دیا کرے اور ہمیں پکڑنے کا سودا داغ سے نکال کر تمہاری رہائی کے لیے سوچے ورنہ تو

آگے شاید تم لوگوں کو بھوکا ہی رہنا پڑے۔ دلپ بھائی کا یہ پکا فیصلہ ہے کہ نہ تو یہاں سے کوئی کہیں جائے گا اور نہ ہی باہر سے کسی کو یہاں بلوایا جائے گا۔“

مطالبے کا جواب نہایت اکمز لہجے میں دیا گیا۔ دلپ بھائی وہ اپنے سرخندہ کو پکارتے تھے۔ معاذ کا اندازہ تھا کہ وہ ایک دوسرے کو کوڑا نیم سے پکارتے تھے کیونکہ یہ محض اتفاق نہیں ہو سکتا تھا کہ ان میں سے ہر ایک کا نام بالی

وڑ کے کسی مشہور ہیرو کے نام پر تھا۔

رہسک نہیں لینا چاہیے کیونکہ امید تھی کہ جلد یا بدیر دیگر

یرغمالیوں کے ساتھ ساتھ وہ لوگ بھی رہا ہو جائیں گے۔
معاذ لوٹ کر رہا تھا کہ اسے صبر کی نصیحت کرنے والی
سونا مسلح افراد میں شامل اسکے کے نام سے پکارے جانے
والے ایک لڑکے پر خصوصی توجہ دے رہی ہے اور سب کی
نظر بچا کر اسے معنی خیز اشارے کرتی رہتی ہے۔ اسکے نامی
وہ لڑکا ان سب میں سب سے کم عمر تھا اور زبان سے کچھ کہے
بغیر اپنی ڈیوٹی دیتا رہتا تھا۔ معاذ نے نوٹ کیا تھا کہ شروع

شروع میں تو وہ سونا کے اشاروں کتابوں کو نظر انداز کرنے
کی کوشش کرتا رہتا تھا لیکن ظاہر ہے سونا جیسی غیر معمولی
حسین عورت کو نظر انداز کرنا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اب
تو گویا وہ خود سونا کے اشاروں کا منتظر رہتا تھا اور کبھی کبھی
سونا کو دیکھتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ
بھی آ جاتی تھی۔ وہ سونا کے اس کھیل کا مقصد سمجھنے کی کوشش
کر رہا تھا۔ یہ تو خیر ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ عام سا بٹل لڑکا سونا
کے دل کو بھا گیا ہو۔ وہ بڑی طرح دار عورت تھی اور یہ لڑکا
اس کے لیول سے بہت نیچے کی چیز تھا۔ محض دل لگی کا خیال
بھی دل کو نہیں لگتا تھا۔ بہر حال جو کچھ بھی تھا اسے سامنے آئی
جانا تھا۔ فی الحال جس مسئلے نے معاذ کو زیادہ مضطرب کر رکھا
تھا وہ بیمار بچے کی لمحہ بہ لمحہ بگڑتی حالت تھی۔ بچے جو پہلے کبھی
کبھی نجف سی آواز میں رو لیتا تھا، اب رونا بھی ترک کر چکا
تھا۔ اس کی ایسی حالت نے ایک بار پھر ماں کا ضبط توڑ ڈالا
اور وہ ہاتھ جوڑ کر مسلح افراد کے سامنے بکھٹے لگی۔

”تمہیں تمہارے بچوں کا واسطہ دنیا میں جو بھی نہیں
پیارا ہے اس کا واسطہ، جن کے لیے تم نے یہ سارا چکر چلا یا
ہے ان کا واسطہ، پلیز۔۔۔ پلیز میرے بچے کے لیے کہیں
سے دو لادو۔ دو انہیں لاسکتے تو مجھے میرے بچے کے ساتھ
یہاں سے جانے دو۔ میں وانگرو کی سوگند کھاتی ہوں، میں
کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔ دو لادو یا مجھے جانے دو۔“
دونوں ہاتھ جوڑے وہ ہلکے ہلکے آخری جملے کی گردان
کرتے لگی۔ یہ صورت حال ایسی تھی کہ سب ہی کے دل
تڑپ اٹھے۔ بچے کی ماں کے ساتھ دوسری عورتیں بھی رورو
کر رہی مطالبہ کرنے لگیں۔ مسلح افراد جواب تک پتھر اے
ہوئے چہروں کے ساتھ یہ سب دیکھ رہے تھے، ان کے
چہروں کے تاثرات میں بھی تبدیلی نظر آنے لگی۔

”تھوڑا صبر کرو۔ میں دیکھتا ہوں کہ کیا کیا جاسکتا
ہے۔“ آخر کار امیت نے اپنی خاموشی توڑی اور بلند آواز
میں یہ جملہ کہہ کر بیڑھیاں چڑھ گیا۔ روتی سسکتی ماں ایک

گروہ کے سرغنہ ولیپ کو ان سب نے دور دراز سے
دیکھا تھا۔ ان دونوں میں انہیں یہ بات بھی معلوم ہو گئی تھی
کہ سرکاری اداروں کے ہاتھوں گرفتار ہو کر خودکشی کرنے
والا ولیپ کا سگا بچا زاد بھائی اور بہت قریبی دوست تھا اور
اسے اس واقعے نے شدید صدمہ پہنچایا تھا۔ صدمے کے
باوجود اگرچہ ولیپ نے یرغمالیوں کے ساتھ اچھے رویے کا
مظاہرہ کیا تھا لیکن وہ اپنے لوگوں کے جذبات پوری طرح

قابو میں رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ صحن، خیند اور
خوراک کی کمی، صدماتی کیفیت اور اعصابی تناؤ نے ان کے
روتوں کو خراب کر دیا تھا۔ یہ کل ہی کی بات تھی کہ شتر و نے
ایک نوجوان لڑکے کو صرف اتنی سی غلطی پر ایک زنانے دار
تھپڑ دے مارا تھا کہ اس کے ہاتھ سے پانی سے بھرا ہوا
گلاس زمین پر گر گیا تھا۔ زنانے دار تھپڑ نے لڑکے کے گال
کا اندرونی حصہ پھاڑ دیا تھا اور کئی بار کلی کرنے پر خون بہنے کا
سلسلہ روک سکا تھا۔ لڑکے کے رخسار پر تھپڑ کے نتیجے میں
چھپ جانے والی شتر و کی انگلیوں کے نشانات ابھی تک
دکھائی دے رہے تھے اور یہ اس بات کا اعلان تھا کہ
اعصابی ٹوٹ پھوٹ کا شکار افراد اپنی تری والی روش چھوڑ
کر بے رحمی کی راہ پر چل پڑے ہیں۔ اس صورت حال میں
بیمار بچے کے لیے کیا جانے والا دوا کا مطالبہ رد ہونا کوئی ایسی
انوکھی بات نہیں تھی لیکن بچے کے ماں باپ کے لیے دوا نہ
ملنے کے باعث لمحہ بہ لمحہ اپنے بچے کی بگڑتی حالت کو دیکھنا بھی
آسان نہیں تھا۔

دوپہر تک بچے کا بخار اتنا تیز ہو گیا کہ اس پر فحشی کی سی
کیفیت طاری ہونا شروع ہو گئی اور اس نے دودھ پینا بھی
ترک کر دیا۔ جوان العمر ماں جو محمد و دغذا کے ساتھ کسی نہ
کسی طرح اپنی اور بچے کی زندگی کا سلسلہ برقرار رکھے
ہوئے تھی، بار بار بچے کو چھاتی سے لگا کر دودھ پلانے کی
کوشش کرتی اور ناکام ہونے پر ہلکے ہلکے کر روتے لگتی۔ اس
کا رونا ہر ایک کے لیے تکلیف دہ تھا۔ خود معاذ سے بھی یہ
صورت حال برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ اگر سونا نے اسے
جذباتیت کا مظاہرہ کر کے نظروں میں آنے سے سختی سے
روک نہ رکھا ہوتا تو وہ ضرور کچھ نہ کچھ بول چکا ہوتا۔ بولنا کیا،
وہ تو شاید یہاں سے رہائی کی عملی کوشش بھی کر ڈالتا لیکن سونا
اس بات کے لیے بھی راضی نہیں تھی۔ اس کا خیال تھا کہ فی
الحال انہیں جل اور جل کی دھار دیکھنے کی حکمت عملی ہی
اچھانے رکھنا چاہیے اور غیر معمولی اقدامات اٹھا کر اپنے لیے

بار پھر اپنے غشی میں جٹا بچے کو ہلا جلا کر اور اس کے چہرے اور جسم کے مختلف حصوں پر پوسے دے دے کر اسے پتھر مارنے لگی۔ اس کے اس ٹکڑے سے پتھروں ہو رہا تھا۔ جیسے وہ اپنی ممتا کی طاقت پر بچے کو ہوش میں لانے اور صحت یاب کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس بے بس اور مجبور ماں کی حالت پر افسردہ سب ہی اہمیت کی داپسی کی راہ نکلنے لگے۔ تقریباً سات آٹھ منٹ بعد اہمیت سے غائب کی سیز حیاں اترتا دکھائی دیا۔

”یہ بخار کی گولی لی ہے۔ اسے میں کر پانی میں کھول لو اور بچے کو پلا دو۔“ اس نے اپنی غشی میں دبی ایک گولی بچے کے باپ کے ہاتھ میں چھپائی۔

”لیکن یہ خطرناک ہوگا۔ اتنے چھوٹے بچے کو ایسی بے احتیاطی سے کوئی دوا کیسے استعمال کروائی جاسکتی ہے۔“ اس موقع پر معاذ خود کو بولنے سے روک نہیں سکا۔

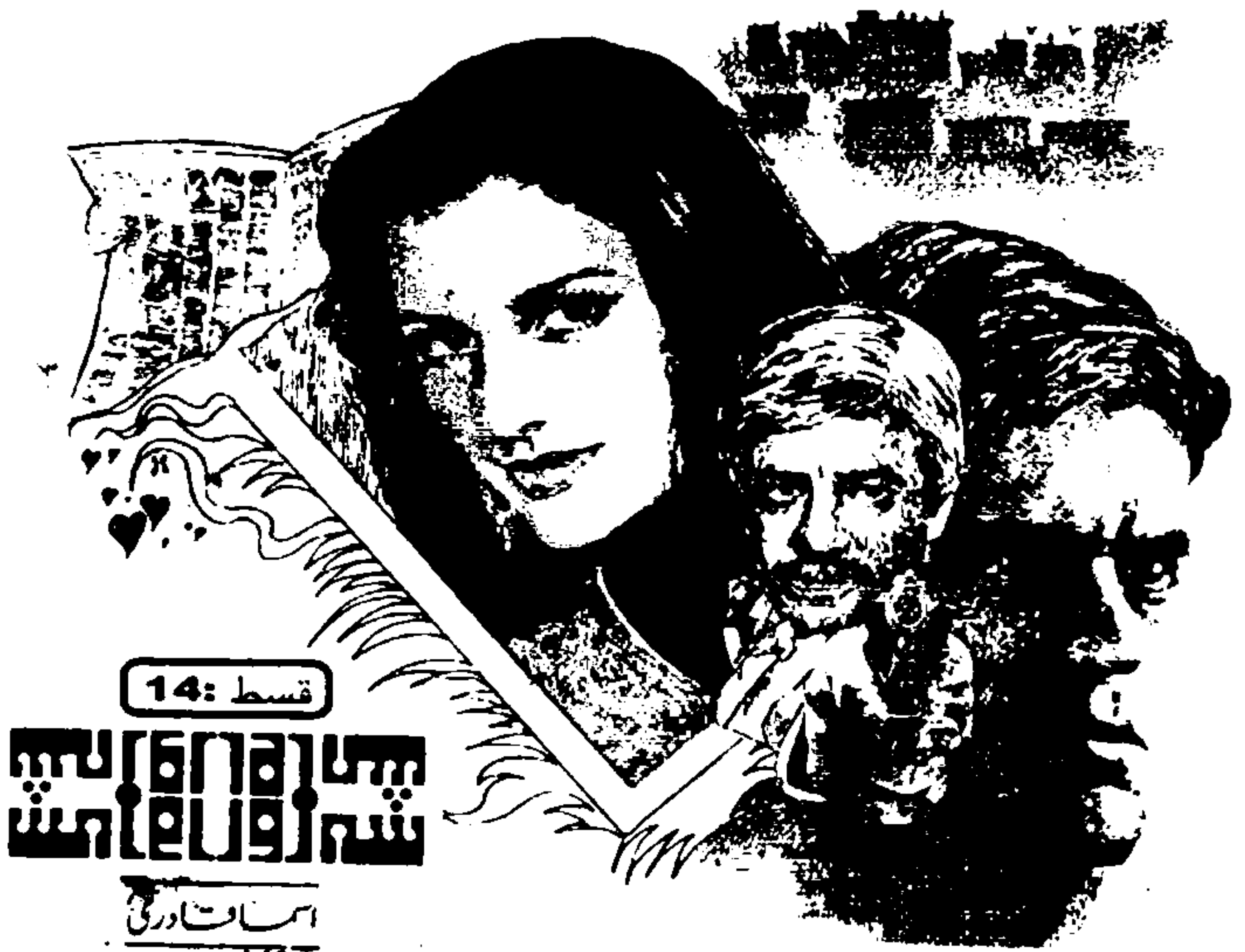
”میں کون سا پوری گولی کھلا دینے کی بات کر رہا ہوں۔ بچے کی عمر کے حساب سے آدھی پاء گولی نہیں کر کھلا دو۔ اگر نہیں کھلائی تو تم لوگوں کی مرضی۔ ہم اس کے سوا کوئی دوسرا بندوبست نہیں کر سکتے۔“ نہایت رکھائی سے جواب دے کر وہ واپس اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔ فیصلہ اب ماں باپ کے ہاتھ میں تھا۔ یہ غالیوں کی رائے منقسم تھی۔ کچھ لوگ بچے کو دوا استعمال نہ کرانے کا مشورہ دے رہے تھے اور کچھ کا خیال تھا کہ معمولی مقدار میں دوا کا استعمال کر داکر دیکھ لیا جائے۔ کچھ دیر تاہم برب میں جٹا رہنے کے بعد بالآخر ماں باپ نے دوا استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ بچے کی حالت جس چیز کی سے خراب ہو رہی تھی، اسے دیکھ کر یہی لگ رہا تھا کہ اگر اسے دوا نہیں ملی تو وہ جانبر نہیں ہو سکے گا۔ دوا دے کر اسے مرتے ہوئے دیکھنے کے مقابلے میں یہی بہتر تھا کہ ریسک لے لیا جائے۔ بالآخر گولی کا ایک حصہ توڑ کر اسے پانی میں گھولا گیا اور ماں نے جانے کیا کیا پڑھ کر پھونکتے ہوئے بچے کا منہ زبردستی کھول کر دوا اس کے حلق میں اندلی۔ دوا کا کچھ حصہ بچے کے پیٹ میں چلا گیا اور کچھ باچھوں سے بہہ گیا۔ اب سب دم سادھے دوا کا اثر ہونے کے منتظر تھے۔ بچے کو گود میں لیے بیٹھی اس کی ماں تو گویا پلکیں بھی جھپکنا بھول گئی تھی۔

”اس کی پھیلیوں اور ٹکڑوں کی مالش کرو۔“ کسی نے مشورہ دیا تو روٹی ہوئی ماں کا پتہ ہاتھوں سے، یہاں کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ اور عورتیں بھی اس عمل میں اس کے ساتھ شامل ہو کر اس کی مدد کرنے لگیں لیکن بچے کے جسم کی اینٹھن تھی کہ بڑھتی جا رہی تھی اور اب اس کے جسم کو باقاعدہ جھلکے لگ رہے تھے۔ جھکوں کا آغاز ہونے کے فوراً بعد ہی بچے کے منہ سے سفید سفید جھلک نکل کر بننے لگا۔ ہر ایک کچھ رہا تھا کہ اب بچے کا بچتا ناممکن ہے لیکن ماں چیخ چیخ کر پیدا کرنے والے سے اپنے بچے کی زندگی کی جھلک مانگ رہی تھی۔ ماں کی دعا کی تاثیر سے انکار نہیں لیکن جب کسی کام کا ہونا ٹھہر جائے تو پھر وہ ہو کر ہی رہتا ہے۔ اس غشی کی کبھی بن کھسے شاخ سے ٹوٹ جانے کا فیصلہ ہو چکا تھا، سو ماں کی ساری ترس اور پکاریں رائگاں چلی گئیں اور وہ نھا وجود ایک آخری پھلکی لے کر ہمیشہ کے لیے ساکت ہو گیا۔

بچے کی موت ہر ایک کی آنکھوں میں آنسو لے آئی لیکن اس کی ماں کا رد عمل سب سے مختلف تھا۔ جب تک بچے کے جسم میں سانس باقی تھیں، وہ مسلسل روٹی اور کر لاتی رہی تھی۔ بچے کی سانس ختم ہو گئی تو اس کا رونا بھی رک گیا۔ چند ثانیوں کے لیے وہ ساکت بیٹھی گود میں موجود بچے کے بے جان وجود کو دیکھتی رہی پھر بچا ایک ہی اس نے بچے کو گود سے اتار کر بچے لٹایا اور کسی پھری ہوئی شیرنی کی طرح اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی۔ اس کے کھڑے ہونے اور حرکت میں آنے میں فکار پر حملہ آور ہونے والی شیرنی کی سی ہی پھرتی تھی۔

”قاتل... جتھیلارے... تو نے مارا ہے میرے بچے کو... میں تیرا خون پی جاؤں گی۔“ وہ گویا جست لگا کر اہمیت تک پہنچی تھی اور اس بری طرح اس پر حملہ آور ہوئی تھی کہ پوکھلا ہٹ میں اس کے ہاتھ سے گن جھوٹ کر بچے گر گئی تھی۔ عورت کے شوہر سیت ہر ایک دم بخود سایہ منظر دیکھ رہا تھا۔ ایک زخم خوردہ ماں اس پل اپنے سے کئی گنا طاقتور اور مسلح شخص پر حاوی دکھائی دے رہی تھی۔ کسی ایکشن کے لیے مناسب موقع جان کر معاذ نے سوالیہ نظروں سے سونیا کی طرف دیکھا۔ اس سے قبل کہ سونیا کی طرف سے کوئی جواب موصول ہوتا، وہ خانہ گولی چلنے کی آواز سے گونج اٹھا اور کئی لبوں سے چپیں نکل گئیں۔

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نوجوان
کی داستان جو غلط کاروں کے لیے
غضب ناک تھا باقی واقعات اسی ماہ پڑھیں



قسط: 14

سہ ماہی

اساتاری

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تندوتیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابل شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پُر عزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند منائے جانے کے منصوبے بنائے جا رہے تھے... اس کی زندگی جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قرار یوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تار عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ وارداتِ قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہو سکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نو جوان کی تحیر انگیز داستان

معاذ ایک ذہین لیکن متلون مزاج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جوائن کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور انھیں عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ انسٹی ٹیوٹ سے واپس آ رہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو سڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی نڈر فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشری نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بشری ماس کمیونی کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم وغیرہ لکھتی ہے۔ اس ویران جگہ بھی وہ ایک زیرِ تعمیر رہائشی منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی آئی تھی۔ معاذ بشری کو بہ حفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کر دیتا ہے لیکن جن رئیس زادوں سے اس نے ان کا شمار جیتنا تھا، وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ یہ موقع انھیں یونیورسٹی ٹرپ کی صورت میں مل جاتا ہے اور ایک جنگل کی سیر کے دوران وہ فوٹو گرافی کے شوق میں سب سے الگ تھلگ ہو جانے والے معاذ کو بے خبری میں گھیر کر بری طرح زد و کوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس نہ آنے پر انتظامیہ کے افراد، پولیس اور ریسکیو ڈرائیج کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جگہ کی جھونپڑی میں پاتا ہے۔ اپنی حالت سے اسے اپنے شدید زخمی ہونے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ جوگی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ معاذ کا موبائل جنگل میں ہی کہیں گر جاتا ہے اور جوگی کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا جس سے باہر کی دنیا سے رابطہ کیا جاسکے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے۔ جوگی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نوازا کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے پراسرار علم سکھانے کی ہامی بھر لیتا ہے اور معاذ واقعی اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ادھر جائے وقوعہ سے ملنے والے معاذ کے کمرے سے جب تصویریں نکلوا لی جاتی ہیں تو بہت سے قدرتی مناظر کی تصویروں میں سے ایک ایسی تصویر بشری کی نظر میں آ جاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانک رہا نظر آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پردیجیٹ کے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشری تحقیق کر رہی تھی۔ بشری کے اپنے والد جرنلسٹ ہیں اور حق گوئی ان کے خون میں شامل ہے۔ اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشری کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ صدمے سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باذل نامی شخص کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشری انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دنوں میں ہی معاذ واقعی اس کا ارادہ کرتا ہے تاہم ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا عرفان اللہ اور یزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو دقاس نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باذل اچانک بشری کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر دیتا ہے۔ ڈی این اے رپورٹ سے باذل کی نشاندہی ہو جاتی ہے۔ ادھر معاذ کو واپس لانے کے لیے او جھے جھکٹھ سے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اسے واپس آنے کا پیغام دیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کر کے اسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات لی جاتی ہیں، نہ بتانے پر اس کے بھائی کا ایک گروہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشری بھی انتقام کی آگ میں جلتی ہوئی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہو جاتی ہے۔ معاذ کو بچانے والا لڑکا دقاس اپنے گروہ کے ساتھ ایک پارٹی میں جاتا ہے۔ وہاں اسے معاذ کے حوالے سے مشکوک ایک شخص نظر آتا ہے۔ وہ اس کے پیچھے جاتا ہے مگر اسے گھیر لیا جاتا ہے۔ بہر حال دقاس کو تہیہ کے ساتھ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ادھر معاذ کے دوست عالم شاہ کے بہنوئی کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ کئی فنون میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے پہنا کر کر کے اس کے دماغ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ لہجہ سے حاصل انوکھے علم کی بدولت ان کا معمول نہیں بنتا۔ بشری، کامران کو چھاپنے کا پروگرام بناتی ہے۔ ادھر عالم شاہ سراغ لگا لیتا ہے کہ اس کے بہنوئی کا قتل کس نے کیا۔ وہ قاتل کو گھیرتا ہے اور اپنے تئیں اسے گولیاں مار کر قتل کر دیتا ہے تاہم وہ بچ جاتا ہے۔ عالم شاہ اس کے بعد ڈاکوؤں کے سردار چاچا کو چھاپتا ہے اور اسے کیڑا کر دار تک پہنچاتا ہے تاہم اس کے پیچھے پولیس لگ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور اس کا نوکر سرد باذل کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ ادھر معاذ جاسوس ماسٹر کو پہنا کر کر کے اس کے ذریعے اسے نکالنے والوں پر حملہ کر دیتا ہے تاہم ان کی فائرنگ سے ماسٹر مارا جاتا ہے اور انعام معاذ پر نہیں آتا مگر معاذ سے کام لینے والوں کو اس پر شک گزرتا ہے۔ ادھر گل شاہ کے نو مولود بچے کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اغوا کا الزام لطیف سومرو پر آتا ہے۔ عالم شاہ وہاں موجود ایک زخمی شخص کی مدد سے باذل کی قید سے چھٹکارا پالیتا ہے۔ ادھر بشری دعویٰ پہنچ جاتی ہے۔ وہاں دقاس اسے باربی کے روپ میں پہچان لیتا ہے اور ان دونوں

کے درمیان احمد کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ وہ سلطان کو مارنا چاہتی ہے تاہم وقاص اسے ایسا کرنے سے روکتا ہے۔ ادھر عالم شاہ ہاڈل کی قید سے نکل کر اس کا چچا کرتا ہے تاہم وہاں اچانک قاترنگ اور دھماکے ہونے لگتے ہیں۔ وہ وہاں معاذ کو دیکھتا ہے۔ صداقت شاہ، لطیف سومرو کو گھیرنے کے لیے اس کی خلیہ دیوی اور بچے کا کھوج لگاتے ہیں اور بچے کو اغوا کر لیتے ہیں۔ لطیف سومرو مجبور ہو جاتا ہے۔ معاذ کو اس کے گھر والوں سے ملنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ عالم شاہ کو اس کے والدہ اطر پارواگی کا منہ دیتے ہیں۔ ادھر معاذ بھی ایک مشن پر سونپا کے ساتھ اطر پاروانہ ہوتا ہے تاہم کچھ لوگ سکھ یا تریوں سے بھری بس کو پرغمال بنا لیتے ہیں۔ عالم شاہ کو ایک جگہ آسہ نظر آ جاتی ہے جس کے پیچھے جا کر وہ اور سردھر لے جاتے ہیں۔ ادھر پرغمالیوں میں سے ایک ننھا بچہ فوت ہو جاتا ہے۔ اس کی ماں جنونی ہو کر اغوا کاروں پر حملہ کر دیتی ہے تاہم اسی دوران گولی کی گونج سنائی دیتی ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

چارپائی پر موجود آسہ پر ڈالی۔ وہ جوان کے داخلے کے وقت چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی پتا نہیں کس لمحے اٹھ کر بیٹھ گئی تھی اور وہ کارنامہ انجام دیا تھا جس کے باعث وہ زیر سے زبردست ہو گئے تھے۔ عالم شاہ کی نظر خود پر پڑتے ہی آسہ نے نظریں جھکا لیں اور اپنے دونوں ہاتھ اس کے آگے جوڑ دیے۔

”کون ہے یہ شخص؟“ عالم شاہ نے سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔

”ٹونی.....!“ آسہ نے جواب دیا اور ساتھ ہی اس کے لیوں سے ایک سسکی نکلی۔ عالم شاہ جواب میں ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ آسہ نے اپنے محبوب کا نام ٹونی بتایا تھا۔ ٹونی وہ شخص تھا جس نے سگل اور معظم شاہ کے اغوا برائے تاوان کے منصوبے میں آسہ کو سہولت کار کا کردار ادا کرنے کے لیے راضی کیا تھا اور اسے خواب دکھایا تھا کہ اس واردات سے ملنے والی بڑی رقم سے وہ دونوں اپنا مستقبل سنوار سکیں گے۔ مستقبل کے سنہری خواب انسان کو نہ جانے کیا کچھ کرنے پر راضی کر لیتے ہیں۔ آسہ بھی انہی خوابوں کا شکار ہوئی تھی اور اب اس کا حال یہ تھا کہ وہ ایک لنگڑی فقیرنی کی حیثیت سے دن بھر دھوپ میں پڑی لوگوں سے ملنے والی بھیک کی خٹھر رہی تھی اور اس کے زخموں پر کھیاں بجنسناتی تھیں۔

”اس کا چہرہ صاف کر کے منہ بند کرو، کہیں اس کا شور سن کر کوئی آنہ جائے۔“ وہ آسہ سے اس کے اس حال تک پہنچنے کی داستان سننا چاہتا تھا لیکن ٹونی کی دی جانے والی دہائیاں اور دھمکیاں اسے ڈسٹرب کر رہی تھیں۔ سالن چلے جانے سے اس کی آنکھوں اور ناک میں ابھی تک مرچیں لگ رہی تھیں اور اس کی خواہش تھی کہ اس کا منہ دھلا کر اسے اس اذیت سے نکالا جائے۔ ان کی طرف سے کان نہ دھرنے پر وہ طیش میں آ کر دھمکیاں دینے لگا تھا کہ انہیں اپنی اس جرأت کا فیازہ بھگتنا پڑے گا اور وہ آسانی

سرد کے پاس ہتھیار پیچک دینے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ عالم شاہ کے سر سے پستول لگائے کھڑے شخص کے چہرے کے تاثرات جارحانہ تھے اور اس کی ذرا سی بھی بے انتیاطی بڑے نقصان کا سبب بن سکتی تھی۔

”دونوں اپنے ہاتھ سر سے اوپر اٹھا لو۔“ اس نے خوف ناک لہجے میں حکم دیا اور ساتھ ہی عالم شاہ کو ٹھوکا دیا کہ وہ بھی کمرے میں داخل ہو جائے۔ اس کے حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا اور انہیں صبر سے اس لمحے کا انتظار کرنا تھا جب انہیں پانسا پلٹنے کا موقع مل جائے۔ موقع بالکل غیر متوقع طور پر فوراً ہی مل گیا۔ حکم کی تعمیل میں چند قدم کمرے میں عالم شاہ کے پیچھے پیچھے ہی اندر آ جانے والے پستول بردار پر اچانک ہی ایک قیامت ٹوٹی تھی۔ اس پر یہ قیامت توڑنے والی آسہ تھی۔ آسہ، جسے وہ تینوں ہی اس منظر میں موجود ہونے کے باوجود ٹیکس فراموش کر چکے تھے، اچانک حرکت میں آئی تھی اور چارپائی کے سرہانے رکھی تپائی پر موجود سالن کی پلیٹ اٹھا کر پستول بردار شخص کے منہ پر دے ماری تھی۔ تام جینی کی اس پلیٹ سے لگنے والی چوٹ اپنی جگہ لیکن پستول بردار کا اصل کباڑا آنکھوں میں چلے جانے والے سالن نے کیا تھا۔ سالن آنکھوں میں جانے سے بچنے والی مرجھوں نے اسے بے ساختہ چیخنے پر مجبور کر دیا تھا اور حقیقتاً وہ ناچ کر رہ گیا تھا۔ عالم شاہ اور سردھ اس موقع کو گتوانے کی غلطی کیونکر کرتے۔ انہوں نے فوراً ہی اسے چھاپ لیا۔ صرف ایک لمحے میں پانسا پلٹ چکا تھا اور اس شخص کا پستول عالم شاہ کے ہاتھ میں تھا جبکہ سردھ اسے سینے کے بل زمین پر گرانے کے بعد وہیں ایک کھوٹی سے نکل پلٹ اتار کر اس کے دونوں ہاتھ پشت کی طرف کر کے مضبوطی سے کس چکا تھا۔

”سہج کرو اسے۔“ عالم شاہ نے فرش پر گرے دہائیاں دیتے شخص کی بابت سردھ کو حکم دیا اور ایک نظر جھانکا

سے یہاں سے بچ کر نہیں نکل سکیں گے لیکن ان دمکیوں کے فوراً بعد ہی پھر دوبارہ اس کی مٹیں اور خوشامی شروع ہو جاتی تھیں۔ عالم شاہ فی الحال دونوں ہی پر کان دھرنے کے موڈ میں نہیں تھا اس لیے اس نے اس کی زبان بندی کا حکم دے دیا تھا۔ سرمد نے اس حکم کی مستعدی سے قیل کی اور کھونٹی پرنگی ایک بنیان اتار کر پہلے اس سے ٹوٹی کا چہرہ صاف کیا پھر وہی بنیان اس کے منہ میں ٹھونس کر اس کی ہر طرح کی بک بک کا راستہ بند کر دیا۔

”میں آپ کی مجرم ہوں! اور آپ کے سزا دے بغیر بھی مسلسل اپنے جرم کی سزا بھگت رہی ہوں۔ جو سزا مجھے ملی ہے وہ تو شاید آپ بھی نہ دیتے۔ میں بہت اذیت میں ہوں اور جانتی ہوں کہ یہ سب اس نمک حرامی کی سزا ہے جو میں نے آپ کے اور آپ کے خاندان کے ساتھ کی تھی۔“ آسیہ کی آنکھوں سے آنسو نکل کر ایک مسلسل سے اس کے سیاہ پڑ چکے بے رونق اور کھردرے رخساروں پر بہہ رہے تھے اور وہ دردناک لہجے میں بولتی چلی جا رہی تھی۔

”یہ سب کیسے ہوا اور تم اتنے عرصے کہاں رہیں؟ میں نے تمہیں اور تمہارے خاندان کو بہت تلاش کروایا تھا لیکن کسی کو تمہارے بارے میں کوئی خبر نہیں ملی۔“ عالم شاہ کمرے میں پڑی ایک خستہ حال لکڑی کی کرسی پر بیٹھ گیا اور آسیہ سے پوچھا۔

”خبر ملتی بھی کیسے سامیں! میں اور میرا خاندان میری کرنی کی سزا جو بھوگ رہے تھے۔ میں نے آپ کے دامن پر کیچڑا چھالی تھی اور جواب میں دنیا بھر کی ذلت اور اذیت میرے حصے میں لکھ دی گئی تھی۔“ آسیہ نے جواب دیا اور پھر اتنی شدت سے رونے لگی کہ ہچکیاں بندھ گئیں اور پورا وجود گویا زلزلے کی زد میں آ گیا۔ عالم شاہ کے اشارے پر سرمد نے اسے پانی پلایا تو وہ تھوڑی سی سنبھلی۔ اس کے بعد اس نے گلوگیر لہجے میں جو داستان سنائی اس کا لب لباب یہ تھا۔

آسیہ حویلی کی اوپری منزل سے چھلانگ لگا کر زخمی ہونے کے بعد اسپتال میں پڑی تھی اور ہر طرف یہ خبر پھیل چکی تھی کہ اس نے عالم شاہ کے بھرانہ حملے سے خود کو بچانے کے لیے یہ اقدام اٹھایا ہے۔ اس خبر نے اس کے چھوٹے بھائی کو اتنا مشتعل کیا کہ اس نے موقع پا کر عالم شاہ پر قاتلانہ حملہ کر دیا۔ منشی عبدالحق کو بیٹے کے اس قتل کی خبر ہوئی تو اسے آسیہ کے ساتھ ساتھ اس کی جان کے بھی لالے پڑ گئے۔ وہ جانتا تھا کہ جاگیردار جتنے بھی نرم مزاج اور اصول پسند سی، اپنے وارث کا قتل معاف نہیں کریں گے۔ ایسی بری صورت

حال میں جب اسے کسی نامعلوم شخص کی طرف سے یہ پیغام ملا کہ اگر وہ اپنے اہل خانہ کو لے کر گاؤں سے نکل آئے تو اسے پناہ مل جائے گی تو وہ اس پیغام کو پیغام زندگی سمجھا اور اسپتال میں پڑی آسیہ سمیت گاؤں سے نکل گیا۔ وہ ایک نمک خوار ملازم تھا اور زندگی میں کبھی مالکوں سے بے ایمانی نہیں کی تھی لیکن اولاد کی محبت اور وہ بھی ایسی صورت حال میں کہ ان کی زندگیاں داؤ پر لگی ہوئی تھیں، اس کی وفاداری پر حاوی ہو گئی تھی۔ گاؤں سے نکلنے کے بعد حسب وعدہ انہیں پناہ میسر آ گئی اور وہ کچھ دن ایک ڈیرے پر پڑے رہے۔ یہاں کھانے پینے کی کوئی پریشانی نہیں تھی لیکن آسیہ کو علاج کی مناسب سہولت میسر نہیں آرہی تھی۔ چند درد کش ادویات اور اسپتال میں باندھا گیا کچا پلاستر اس کا علاج نہیں تھا۔ اس کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹنے کے ساتھ ساتھ گوشت بھی پھٹ گیا تھا اور مناسب علاج نہ ہونے کے سبب وہ شدید تکلیف میں تھی۔ تکلیف سے اسے مسلسل بخار بھی رہنے لگا تھا۔ ماں باپ سے بیٹی کی ایسی حالت کیونکر برداشت ہوتی۔ وہ ڈیرے پر موجود نگران کے آگے دہائیاں دینے لگے۔ وہ ڈیرا کھیل سومرو کا تھا اور نگران اس کا وفادار ملازم۔ آسیہ کی حالت اور اس کے ماں باپ کی مسلسل دہائیوں پر اس نے کھیل سومرو کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ نتیجتاً دو دن بعد تنویر عرف ٹوٹی آ کر انہیں وہاں سے لے گیا اور شہر کے ایک چھوٹے سے گھر میں رکھا۔ وہاں ٹوٹی نے آسیہ کو ایک ڈاکٹر کو دکھایا۔ ڈاکٹر نے صاف بتا دیا کہ یہ معاملہ اسپتال جائے بغیر حل نہیں ہوگا اور ٹوٹی ہڈی کو جوڑنے کے لیے آپریشن کروانا پڑے گا۔ ٹوٹی جانتا تھا کہ آسیہ اور اس کے خاندان کو تلاش کیا جا رہا ہے اور آسیہ کی حالت کے پیش نظر اسپتالوں پر خصوصی نظر رکھی جا رہی ہے اس لیے وہ اسے اسپتال لے جانے کا خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھا اور ڈاکٹر سے اصرار کر کے کچھ دوا میں وغیرہ لکھوائی تھیں۔ ان طاقتور اینٹی بائیوٹکس اور چمن کلرز کے استعمال سے وقتی طور پر آسیہ کی حالت کچھ بہتر ہو گئی لیکن بہر حال یہ کوئی علاج نہیں تھا۔

ان مشکل حالات میں آسیہ کے خاندان پر دوسری مصیبت یہ ٹوٹی کہ کھیل سومرو کی ہدایت پر ٹوٹی، منشی عبدالحق پر زور دینے لگا کہ وہ اسے قربان شاہ کی کمزوریوں، جاہداد کی تفصیلات اور ان خفیہ راستوں وغیرہ کے بارے میں آگاہ کرے جن سے حویلی میں نقب لگائی جاسکے۔ منشی حویلی کا پشتینی ملازم تھا اور حویلی والوں کے ہر اچھے بُرے راز سے آگاہ تھا۔ اگر وہ اپنی زبان کھول دیتا تو کھیل سومرو کی چاندی ہو جاتی اور سومرو خاندان شاہوں پر حاوی ہو جاتا۔

لیکن منشی عبدالحق نے زبان نہیں کھولی۔ وہ اولاد کی زندگیاں بچانے کے لیے حویلی سے بھاگا ضرور تھا لیکن حویلی والوں کی وفاداری سے منحرف نہیں ہوا تھا۔

سیدھی اگلیوں سے گئی نہ نکلتے دیکھ کر ٹوٹی نے تشدد کی راہ اختیار کی۔ عملاً اب آسیہ اور اس کا خاندان ٹوٹی کا قیدی تھا۔ منشی پر دباؤ ڈالنے کے لیے ایک طرف تو اس نے اس پر تشدد شروع کر دیا دوسرے آسیہ کے دوا علاج کا سلسلہ بالکل موقوف کر دیا۔ دوا نہ ملنے سے آسیہ کی تکلیف میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ ان چند دنوں میں اس کی یہ خوش فہمی دور ہو چکی تھی کہ ٹوٹی اس سے محبت کرتا ہے۔ ٹوٹی نے حقیقتاً کبھی اس سے محبت نہیں کی تھی اور اسے صرف اور صرف اس لیے اپنے جال میں پھنسا یا تھا کہ اس کے ذریعے حویلی والوں کی دولت پر نقب لگا سکے۔ وہ شروع سے شکیل سومرو کا ساتھی تھا اور اس کے اشارے پر آسیہ کی طرف بڑھا تھا۔

تشدد اور ذہنی اذیت میں جلا منشی عبدالحق اولاد کی محبت میں ایک بار پھر اپنی وفاداری پر آنچ آنے کو تو قبول نہ کر سکا اور چپکے سے موت کی گود میں پناہ لے لی۔ پتا نہیں یہ جسمانی تشدد تھا یا ذہنی دباؤ کہ اس کی حرکت قلب ہی بند ہو گئی۔ ٹوٹی اس کی لاش لاوارث لاش کے طور پر دفن کرنے کے لیے کہیں چھوڑ آیا۔ ان تینوں میں سے کسی کی جرات نہیں تھی کہ وہ اس کے سامنے دم مار سکتے۔ وہ انہیں بے دریغ تشدد کا نشانہ بناتا تھا۔ ایک بار تو اس نے چھوٹے کے سر پر پستول رکھ کر اسے گولی مارنے کا اعلان کر دیا تھا اور آسیہ اور اس کی ماں سیکڑوں منتوں ترلوں کے بعد اسے اس کے اس ارادے سے باز رکھنے میں کامیاب ہو سکی تھیں۔ وہ ہمہ وقت ان تینوں کو کڑی نگرانی میں رکھتا تھا اور گھر سے صرف اسی وقت باہر جاتا تھا جب وہ تینوں گہری نیند میں ہوتے تھے۔ آسیہ کے خیال کے مطابق اس موقع پر انہیں کوئی نشہ آور دوا استعمال کروائی جاتی تھی اور ٹوٹی کی آمد سے قبل آنکھ کھل جانے کی صورت میں بھی وہ اس لائق نہیں ہوتے تھے کہ فرار کے بارے میں کوئی منصوبہ بنا سکیں۔ ویسے بھی وہ ان کے ہاتھ بندھ کر جاتا تھا۔

منشی کی موت کے بعد ایک تبدیلی یہ آئی تھی کہ اس نے آسیہ کے برے بھلے علاج کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا تھا اور اس کی حالت دوبارہ سنبھلنے لگی تھی۔ اس مہربانی کی وجہ بھی جلد سامنے آگئی۔ اس نے صاف الفاظ میں بتا دیا کہ وہ اور اس کا خاندان اس کے لیے بوجھ ہیں اور وہ اس بوجھ کو صرف اس صورت میں اٹھا سکتا ہے کہ آسیہ مالی مسائل حل کرنے

میں اس کے ساتھ تعاون کرے۔ تعاون کا یہ طریقہ نہایت شرمناک تھا۔ اگر آسیہ کی اکیلی جان کا معاملہ ہوتا تو وہ مرنا قبول کر لیتی لیکن اس کام پر راضی نہ ہوتی جو ٹوٹی اس سے کروانا چاہتا تھا۔ ٹوٹی نے اسے واضح دھمکی دی تھی کہ سب سے پہلے وہ اس کی نظروں کے سامنے اس کے کم سن بھائی کو گولی مارے گا اور اس کے بعد بھی وہ اپنی عزت محفوظ نہیں رکھ سکے گی۔ فرق صرف رضامندی دینے اور نہ دینے کا تھا۔ رضامندی ظاہر کر کے وہ اپنے بھائی اور ماں کی زندگی بچا سکتی تھی چنانچہ وہ مجبور ہو گئی اور اس کا زخمی وجود نچلے درجے کے اوباشوں کی تفریح کا ذریعہ بن گیا۔ چھوٹا جو عالم شاہ کے بہن پر مجرمانہ حملے کی جھوٹی خبر سن کر جوش میں اس پر کلہاڑی کا مہلک وار کر گیا تھا، اب بے بسی سے ہر رات بہن کو بکتے دیکھنے پر مجبور تھا۔ اپنی اس مجبوری سے وہ زیادہ عرصہ سمجھوتا نہ کر سکا اور ایک رات عین اس وقت جب آسیہ اس کی زندگی کے لیے اپنے جسم و جان پر عذاب سہہ رہی تھی، اس نے خود کو غسل خانے میں بند کر کے اسٹیل کی بالٹی کے ٹوٹے کنارے سے اپنے دونوں ہاتھوں کی رگیں کاٹ لیں۔ بیٹی کے حال پر بستر پر بٹھ حال پڑی آنسو بہاتی ماں کو خبر ہی نہ ہو سکی کہ اس کا ایک اور جگر گوشہ اس کے قریب ہی کہیں اذیت سے گزر رہا ہے۔ صبح چھوٹے کی اکڑی ہوئی لاش غسل خانے سے در پافت ہوئی تو دکھوں کی ماری ماں ذہنی توازن کھو بیٹھی۔ ٹوٹی نے چھوٹے کی لاش کے لیے وہی طریقہ اپنایا جو منشی عبدالحق کے لیے اختیار کیا تھا جبکہ ذہنی توازن کھودینے والی عورت کو ایک ایسے پاگل خانے میں چھوڑ آیا جہاں سے مشکل سے ہی کبھی کوئی مریض صحت یاب ہو کر باہر نکلتا تھا۔

اس صورت حال میں آسیہ کی کوئی مجبوری نہ رہی کہ وہ خود کو بچنے کا سلسلہ جاری رکھتی۔ حیرت انگیز طور پر ٹوٹی نے بھی کوئی ایسا مطالبہ نہیں کیا۔ وہ ان دنوں کچھ پریشان اور الجھا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ آخر آسیہ کو پتا چلا کہ ٹوٹی کا سر پرست اور مربی شکیل سومرو اپنی کوشش پر ہونے والے حملے میں شدید زخمی ہونے کے بعد اسپتال میں پڑا ہے اور اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ جلد ہی یہ بھی واضح ہو گیا کہ شکیل سومرو زندہ بچنے کے بعد بھی ایسی حالت میں ہے کہ اسے زندوں میں شمار نہیں کیا جاسکتا اور ڈاکٹر اس کی طرف سے کوئی امید نہیں دلا رہے۔

شکیل کی سرپرستی سے محروم ہونے کے بعد ٹوٹی کے لیے خطرات بڑھ گئے تھے۔ اس نے آسیہ کے دام کھرے کرنے اور اپنے لیے نئی پناہ گاہ تلاش کرنے کے لیے ہاتھ

بہر چلانا شروع کر دیے اور نتیجتاً گداگروں کے ایک گروہ تک پہنچ گیا۔ اس گروہ میں شمولیت اختیار کرنے کے بعد سے وہ آسیہ سمیت اس چھوٹے سے شہر میں موجود تھا اور آسیہ سے بھیک منگوانے کا دھندا کروایا جا رہا تھا۔ آسیہ کو مزید قابل رحم بنانے اور لوگوں کی جیب سے اس کے لیے زیادہ سے زیادہ بھیک نکلوانے کے لیے اس کے علاج معالجے کا سلسلہ ایک بار پھر موقوف کر دیا گیا تھا اور بس اس حد تک اسے غذا اور دوا فراہم کی جاتی تھی کہ وہ فوری طور پر مرنے جائے۔ یہ نیا سلسلہ آسیہ کے لیے اذیتناک تھا لیکن جسم فروشی کے مقابلے میں وہ اسے ہی بہتر سمجھتی تھی اور اس اذیت کو اپنے کیے کی سزا سمجھ کر قبول کر چکی تھی۔

”میں نے پشتوں کی وقاداری پر خاک ڈال کر آپ کے خاندان کو نقصان پہنچایا، اپنے باپ کی عزت مٹی میں ملائی اور آپ کے پاک دامن پر گھنچا اچھالی تو مجھے اس کی کڑی سزا بھی ملی سائیں..... مجھے اپنی اس حالت پر کسی سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔ میری اب بس اتنی ہی خواہش رہ گئی تھی کہ ایک بار آپ سے معافی مانگنے کا موقع مل جائے اور میں اس دھوکے باز کو اس کے بدترین انجام تک پہنچتا دیکھوں۔“ بات کے اختتام پر اس نے ایک بار پھر عالم شاہ کے آگے ہاتھ جوڑ دیے اور فرس پر پڑے ٹوٹی پر ایک نفرت انگیز نظر ڈالی۔

”معاف کرنے والی ذات اللہ کی ہے آسیہ! تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں تمہیں تمہارے جرم کی کبھی اتنی بڑی سزا نہیں دے پاتا جو اللہ سائیں نے تمہارا مقدر کی۔ تم اس سے توبہ کرو۔ رہا میں، تو سمجھو میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے۔“ آسیہ واقعی دردناک حالات سے گزری تھی اور عالم شاہ میں حوصلہ نہیں تھا کہ اسے مزید کوئی سزا سنا تا اس لیے اسے معافی کا پروانہ دے دیا۔

”بہت بہت شکریہ سائیں! اب کم سے کم میری موت آسان ہو جائے گی۔ آپ نے معافی دے کر مجھ پر سے بہت بڑا بوجھ اتار دیا۔“ اس کے نحیف و زار وجود میں جانے کتنا حکیم پانی جمع تھا کہ مسلسل آنسو بہانے کے باوجود یہ سلسلہ نہیں رک رہا تھا۔

”میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا آسیہ! ہم تمہارا بہترین علاج کروائیں گے۔ اللہ سائیں نے چاہا تو ایک دن تم اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے لائق ہو جاؤ گی۔“ عالم شاہ نے اس کی دلجوئی کی کوشش کی لیکن وہ الٹا خوفزدہ ہو گئی اور گڑگڑاتے ہوئے بولی۔

”مجھے آپ کے ساتھ کہیں نہیں جانا سائیں۔ بس آپ مجھ پر اتنا احسان کریں کہ ٹوٹی کا پستول مجھے دے جائیں۔ میں اس غبیٹ کو اپنے ہاتھ سے جہنم واصل کرنے کے بعد ہی سکون کی موت مر سکوں گی۔“

”تمہیں قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں ابھی پولیس کو کال کرتا ہوں۔ تم اپنا بیان لکھوانا۔ تمہارا بیان ہی اس کو پھانسی کے پھندے تک لے جانے کے لیے کافی ہوگا۔“ عالم شاہ نے اسے سمجھایا لیکن وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔

”آپ نہیں جانتے سائیں، یہ بھکاری کتنے طاقتور ہیں۔ پتا نہیں کون ہے جو ان کی سرپرستی کرتا ہے جو یہ مجھ جیسوں سے کھلم کھلا بھیک منگواتے ہیں اور کوئی ان کے خلاف کچھ نہیں کرتا۔ آپ اسے گرفتار کروائیں گے تو وہ لوگ کسی نہ کسی طرح اسے چھڑا لیں گے۔“

”تمہارے نزدیک بھکاریوں کے سرپرست طاقتور ہیں اور ہم کمزور اور بے بس؟“ عالم شاہ نے حیرت سے پوچھا۔

”میں یہ نہیں کہہ رہی سائیں.....!“ وہ گڑبڑاتی اور مت کرنے والے لہجے میں بولی۔ ”بس میں اس غبیٹ کو ذرا بھی موقع نہیں دینا چاہتی کہ یہ کسی طرح بچ نکلے۔ میں اس کا فوری انجام چاہتی ہوں۔“

”میں تمہاری اس خواہش پر غور کرتا ہوں۔ پہلے تم یہ بتاؤ کہ ٹوٹی کو ہماری آمد کا کیسے پتا چلا کہ اس نے مکان میں گھسنے کے ساتھ ہی میں گھیر لیا؟“ عالم شاہ نے بات کا رخ بدلا۔

”یہ صرف اتفاق تھا سائیں! مجھے میرے ٹھکانے سے یہاں لانے کے بعد ٹوٹی مجھے بازار سے لایا ہوا کھانا پلیٹوں میں نکالنے کا حکم دے کر خود ہاتھ روم چلا گیا تھا۔ ہاتھ روم کا بلب کل سے فیوز پڑا ہے اسی لیے آپ کو ٹوٹی کے وہاں ہونے کا اندازہ نہیں ہوسکا اور اسے بے خبری میں آپ پر قابو پانے کا موقع مل گیا۔“

”اگر اس نازک موقع پر تم ذہانت کا مظاہرہ نہیں کرتیں تو واقعی ہم بہت مشکل میں پڑ جاتے۔ اپنے اس تعاون سے تم نے ماضی کی غلطیوں کا خاصی حد تک ازالہ کر دیا ہے۔“ عالم شاہ نے اس کی تعریف کی۔

”میں نے پہلے ہی فیصلہ کر لیا تھا سائیں کہ اگر آپ لوگ یہاں پہنچ گئے تو میں جس قدر ممکن ہوا، آپ کا ساتھ دوں گی۔“

”کیا مطلب.....؟“ آسیہ کے الفاظ نے اسے چونکا دیا۔

”میں نے آپ کو اور سرمد کو اس میڈیکل اسٹور پر دیکھ لیا تھا اور مجھے امید تھی کہ آپ لوگ میرے پیچھے ضرور آئیں گے۔“ اس کے جواب نے عالم شاہ کو حیران کر دیا۔ اتنی اجتر حالت میں بھی وہ ذہنی طور پر خاصی چاق و چوبند تھی۔ اسے افسوس ہونے لگا کہ اس ذہن لڑکی کی ذہانت منقہ سرگرمیوں میں پڑ کر ضائع ہو گئی۔ اگر فشی عبدالحق ذرا سی جرأت سے کام لیتا اور قربان شاہ سے بات کر کے اس کا تعلیمی سلسلہ جاری رکھنے کے لیے تعاون طلب کر لیتا تو شاید آج حالات اس بچ پر نہ ہوتے۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ آسیہ نے ابتدائی ملاقات میں اس سے اس سلسلے میں بات کی تھی اور وہ اس بات پر سخت ٹالاں تھی کہ اس کے والدین اسے اعلیٰ تعلیم دلوانے سے زیادہ اس کے بھائیوں کو تعلیم دلوانے میں دلچسپی رکھتے ہیں اور اس کی شادی زبردستی اس کے ایک کزن سے کرنے کا فیصلہ کیا جا چکا ہے۔ جبر اور خصوصاً ذہین لوگوں کے ساتھ جبر، بغاوت کا سبب بنتا ہے اور بغاوت اکثر انسانی خون کی قربانی لیتی ہے۔ یہاں بھی ایسا ہی کچھ ہوا تھا۔

”مجھ پر جب سے ٹونی کی اصلیت کھل گئی، میں اسے اس کے انجام تک پہنچانے کے لیے بے چین تھی لیکن آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ میری حالت کتنی خراب ہے۔ میں تو اپنی مرضی سے ہل پھر بھی نہیں سکتی۔ ایسے میں ٹونی کا کیا باز پائی۔ آپ کا یہاں آنا میرے لیے ایک فحش مدد ہے۔ آپ مجھ پر مہربانی کریں اور یہ پستول مجھے دے دیں تاکہ میں جلد از جلد اس خبیث کو اس کے انجام تک پہنچا سکوں۔“ آسیہ کی سوئی ایک ہی جگہ انگی ہوئی تھی اور وہ ٹونی کو نفرت بھری نظروں سے گھورتے ہوئے نیچی لہجے میں عالم شاہ سے اپنی خواہش کا اظہار کر رہی تھی۔ عالم شاہ جو اس کی اس خواہش کو پورا کرنے کا قطعی کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا، اسے سمجھانے کے لیے مناسب الفاظ سوچ ہی رہا تھا کہ بیرون دروازے پر بلند دستک ہوئی اور اس دستک کے ساتھ ہی کسی نے ٹونی کا نام بھی پکارا۔

”یہ شکو کی آواز لگتی ہے۔ بڑا بد معاش اور ہتھ مچھٹ بندہ ہے۔ اکثر راتوں کو اس کے مکان پر جوئے اور شراب کی محفل جمتی ہے جس میں ٹونی سمیت آس پاس رہنے والے بھکاری گینگ کے سارے آوارہ گردوں کو جمع کر لیتا ہے۔“ عالم شاہ کی سوالیہ نظروں کے جواب میں آسیہ نے نیچی آواز میں اسے بتایا۔ وہ کچھ خوفزدہ نظر آ رہی تھی۔

”اوئے ٹونی..... آج کیا بتا ہے ہی نہیں ہو گیا ہے۔“

جلدی سے باہر آ، تجھے بابو بلارہا ہے۔“ پہلی دستک پر رد عمل ظاہر نہ ہونے پر دوبارہ اور بھی بلند آواز میں دروازہ بجایا گیا۔ ”یہ تو بڑا مسئلہ ہو گیا سائیں ابا! اس بھکاری گینگ کا سردار ہے اور کبھی کبھی یہاں آتا ہے۔ اس نے ٹونی کو بلوایا ہے تو اس کا مطلب ہے اب شکو ٹونی کو لیے بنا یہاں سے نہیں نکلے گا۔“ دروازہ بجانے کے ساتھ جو پیغام نشر کیا گیا تھا، اس نے آسیہ کو پہلے سے زیادہ خوفزدہ کر دیا۔ عین اسی لمحے کمرے میں ابھرنے والی ایک بلند آواز نے ان لوگوں کو چونکا دیا۔ یہ آواز اس تپائی کے گرنے سے پیدا ہوئی تھی جس پر سے ٹھوڑی دیر پہلے آسیہ نے سالن کی پلیٹ اٹھا کر ٹونی کے منہ پر ماری تھی۔ تپائی پر اب بھی ایک پلیٹ اور جست کا جگ گلاس رکھا ہوا تھا۔ تپائی کے ساتھ یہ سب چیزیں بھی گریں تو اچھی خاصی آواز پیدا ہو گئی۔ تپائی گرانے کا کارنامہ فرش پر بندھے پڑے ٹونی نے انجام دیا تھا۔ وہ موقع کا فائدہ اٹھا گیا تھا۔ شکو کی مسلسل پکاریں سن کر سرمد جائزہ لینے کمرے سے باہر نکل گیا تھا جبکہ عالم شاہ اور آسیہ گنگو میں الجھ گئے تھے۔ ایسے میں اس پر سے توجہ ہٹ گئی تھی اور اس چیز کا فائدہ اٹھا کر اس نے بندھی ہوئی حالت میں عیالات مار کر تپائی گرا دی تھی۔ یقیناً یہ باہر موجود شکو کو متوجہ کرنے کی ایک ترکیب تھی جو ناکام نہیں رہی تھی۔

”اوئے کیا ہو رہا ہے؟ کون ہے اعدا؟“ شکو کی بھڑکی ہوئی آواز نے ظاہر کیا کہ ٹونی کی تدبیر انگاں نہیں گئی ہے لیکن سرمد نے، جو پہلے ہی صحن میں پہنچ چکا تھا، اس موقع پر بے پناہ پھرتی کا مظاہرہ کیا اور یکدم ہی دروازہ کھول دیا۔ دروازے پر کھڑا شکو جو کہ کندھے پر لگی راکٹل اتار ہی رہا تھا، دروازہ کھلنے کی آواز پر اس طرف متوجہ ہوا۔ صحن میں پھیلے اندھیرے نے اسے فوری طور پر سرمد کو شناخت نہیں کرنے دیا اور چند ثانیوں کی اس تاخیر نے سرمد کو موقع فراہم کر دیا۔ اس نے یکدم شکو کے گریبان پر ہاتھ ڈال کر اسے دروازے سے اندر کھینچ لیا اور اپنے پستول کی ٹال اس کی کھوپڑی سے لگا کر دوبارہ دروازے کی کٹدی چڑھادی۔ ”اندھ چلو۔“ اس کی پھنکار نے شکو کو اس کے حکم کی تعمیل پر مجبور کر دیا۔ چند قدموں کا فاصلہ طے کر کے ان کے کمرے تک پہنچے تک بیرونی دروازہ بری طرح پٹا جانے لگا تھا۔ جو گلی ان کی آمد کے وقت سنسان پڑی ہوئی تھی، اب وہاں خاصی پھل محسوس ہو رہی تھی اور آوازوں سے لگتا تھا کہ کئی لوگ اس گھر کے دروازے کے سامنے جمع ہو چکے ہیں۔ ”باہر موجود لوگوں سے کہو کہ دروازے سے دور

رہیں ورنہ شکو اور ٹونی کی زندگی کی گارنٹی نہیں رہے گی۔“ عالم شاہ جو سرمہ کی کارروائی کے دوران ٹونی کو اس کی جسارت پر ٹھیک ٹھاک سبق سکھا چکا تھا، تیز لہجے میں سرمہ سے بولا۔ سرمہ اس وقت بے حد مستعد تھا۔ اس نے شکو کے کندھے سے لٹکی را نقل اپنے قبضے میں لے لی تھی اور پوری طرح اس پر غالب نظر آ رہا تھا۔ اس نے فوراً ہی عالم شاہ کے حکم کی تعمیل کی اور محن میں جا کر ہند آواز میں عالم شاہ کے الفاظ دہرائے۔ ان الفاظ کا خاطر خواہ اثر ہوا اور دروازہ پینے کا سلسلہ رک گیا۔ اتنی دیر میں عالم شاہ اندر شکو کا انتظام کر چکا تھا۔ آسیہ نے اس کے مطالبے پر اپنی اوڑھنی سے چند پٹیاں پھاڑ کر اس کے حوالے کی تھیں اور ان پٹیوں کی مدد سے اس نے شکو کے ہاتھ ہر اچھی طرح باندھ دیے تھے۔ ہاتھ پاؤں باندھے جانے کے دوران شکو مسلسل گالیوں اور دھمکیوں کا استعمال کرتا رہا تھا جس کے جواب میں عالم شاہ نے اسے ٹھیک ٹھاک قسم کی چند ضربیں لگا کر باور کروا دیا تھا کہ اگر اس کی زبان بدکلامی کے بہتر بر سائے گی تو اس کے جسم کو اس کا رد عمل برداشت کرنا پڑے گا۔ نتیجتاً اب شکو خاموش تھا اور عالم شاہ محن میں سرمہ کے قریب پہنچ چکا تھا۔ سرمہ کھلے محن میں ایسے ہی کھڑا رہنے کے بجائے ایک جانب پڑے۔ اینٹوں کے ڈمیر کے پیچھے بیٹھ گیا تھا اور وہاں سے بیرونی دروازے سمیت پورے محن پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ عالم شاہ بھی اس کے نزدیک جا بیٹھا۔

”کون ہے اندر اور کیا چاہتا ہے؟“ بیرونی دروازے کے پار کچھ دیر خاموشی چھائی رہی تھی تاہم انہیں وہاں لوگوں کی موجودگی کا احساس ہو رہا تھا۔ اب ان لوگوں نے شاید آپس میں صلاح مشورہ کر کے قدرے پرسکون انداز میں مذاکرات کا آغاز کیا تھا۔

”ہماری تم لوگوں سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ ہم بس اتنا چاہتے ہیں کہ ہمیں ٹونی اور آسیہ نامی لڑکی کے ساتھ یہاں سے نکلنے کا موقع دے دیا جائے۔ شکو کو ہم اپنی ڈھال کے طور پر ساتھ لے جائیں گے اور محفوظ فاصلے پر پہنچنے کے بعد چھوڑ دیں گے۔“ عالم شاہ نے پہلی بار میں ہی اپنے سارے مطالبات سامنے رکھ دیے۔ اس کے خیال میں ان لوگوں کے لیے ٹونی اور آسیہ کی اتنی اہمیت نہیں ہونا چاہیے تھی کہ ان کی خاطر وہ اپنے خاص آدمی شکو کی زندگی خطرے میں ڈالتے۔

”تم کون ہو اور ٹونی اور آسیہ کو اپنے ساتھ کیوں لے جانا چاہتے ہو؟“ باہر سے سوال آیا۔

”تمہیں ان باتوں سے کوئی غرض نہیں ہونا چاہیے۔ تم

بس اپنے بندے کی فکر کرو اور ہمیں یہاں سے نکلنے کا راستہ دو۔“ اس نے سختی سے جواب دیا۔

”ایسا نہیں ہو سکتا۔ بابو کی موجودگی میں ہرگز ہم اس علاقے سے بندے نکال کر نہیں لے جاسکتے۔“ باہر سے کسی نے پُر محنت لہجے میں جواب دیا۔ میں اسی وقت عالم شاہ نے اپنے بے پناہ قریب سے گولی چلنے کی آواز سنی۔ گولی چلانے والا سرمہ تھا اور اس نے اس شخص کو نشانہ بنایا تھا جو بیرونی دیوار پر چڑھ کر اندر کودنے کی کوشش کر رہا تھا۔ گولی اس شخص کے پاؤں میں لگی اور وہ الٹ کر گلی میں جا گرا۔ اس کے چیخنے کی آواز بڑی دلدور تھی۔

”یہ تم لوگ اچھا نہیں کر رہے ہو۔ ہم اس مکان کو تمہارے لیے جہنم بنا دیں گے۔“ اپنے ساتھی کو پہنچنے والے نقصان پر باہر سے دھمکی دی گئی۔

”ہم اچھا برا کچھ نہیں کر رہے۔ ہم صرف جواب دے رہے ہیں۔ اگر تم لوگوں نے ہماری بات نہیں مانی اور اس طرح کی فضول حرکتیں کرتے رہے تو بہت نقصان اٹھاؤ گے۔“ عالم شاہ نے آواز میں غصہ بھرتے ہوئے جواب دیا۔ باہر ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ ایسی خاموشی جس کے پیچھے طوفان کی آہٹیں صاف سنائی دیتی ہیں۔

”یہ لوگ ہمیں اتنی آسانی سے یہاں سے نہیں نکلنے دیں گے سائیں۔ یہ ان کا علاقہ ہے اور اس وقت ان کا اہم آدمی بابو ان کے درمیان موجود ہے۔ اگر انہوں نے ہمیں یہاں سے نکلنے دیا تو ان کی ساکھ خراب ہوگی۔“ سرمہ نے سرگوشی میں اس کے سامنے اپنا تجویز پیش کیا۔

”پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“ عالم شاہ نے اس سے مشورہ طلب کیا۔ اسے بھی اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ لوگ جوش میں بغیر حساب کتاب لگائے ایک ایسی جگہ گھس گئے ہیں جہاں کچھ خاص لوگوں کا راج ہے اور یقیناً انہیں اپنی اس راجدھانی میں دخل اندازی منظور نہیں تھی۔

”ہمیں باہر سے کمک منگوانا پڑے گی سائیں! ہم ان چند ہتھیاروں کے سہارے زیادہ دیر اس مکان میں محفوظ نہیں رہ سکیں گے۔“

”تمہارا مطلب ہے میں بابا سائیں سے رابطہ کروں؟“ عالم شاہ نے تصدیق چاہی۔

”اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔ ان کے تعلقات ہیں اور ممکن ہے کہ وہ ان تعلقات کو استعمال کر کے یہاں کی پولیس کو بروقت حرکت میں لاسکیں۔“ سرمہ کی بات کافی حد تک درست تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے صداقت

شاہ سے رابطہ کرنا پڑا۔ انہوں نے پریشانی کے باوجود بہت تحمل سے اس کی بات سنی۔ وہ بٹے کے جو شیلے پن اور ہم جو طبیعت سے خائف رہتے تھے لیکن یہ موقع ایسا نہیں تھا کہ اسے لعن طعن کرتے۔ اس سے ضروری معلومات حاصل کرنے کے بعد جلد از جلد کسی کارروائی کی یقین دہانی کرواتے ہوئے انہوں نے فون بند کر دیا۔

”تم لوگوں کو آخری بار وارننگ دی جا رہی ہے۔ ہمارے ساتھیوں کو کوئی بھی نقصان پہنچائے بغیر اسلحہ سپیک کر باہر آ جاؤ اور ہمارے سامنے بیٹھ کر ہم سے بات کرو۔ اگر تمہاری بات ہماری سمجھ میں آگئی تو بابو بھائی تمہاری بات مان بھی سکتا ہے۔“ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد باہر سے ایک بار پھر انہیں پکارا جانے لگا۔ اس بار ان کا لہجہ پہلے سے زیادہ جارحانہ تھا۔

”ہمیں تھوڑی دیر سوچنے اور آپس میں مشورہ کرنے کا وقت دو۔“ کمک پہنچنے کی امید میں عالم شاہ نے تھوڑا سا وقت گزارنے کے لیے بہانہ بنایا۔

”ہم تمہیں صرف پانچ منٹ دے سکتے ہیں۔“ وہ لوگ بھی انہیں زیادہ ڈھیل دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ عالم شاہ نے اتنی مہلت کو بھی قیمت جانا اور اپنے موبائل کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ اس دوران صداقت شاہ کو نئی صورت حال سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان سے معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن اندر کمرے سے آتی عجیب و غریب آوازوں نے اسے اپنے ارادے پر عمل نہیں کرنے دیا اور سرمد کو اپنے مورچے پر جے رہنے کا اشارہ کر کے خود تیزی لیکن احتیاط کے ساتھ کمرے کی طرف رخ کیا۔ دروازے تک پہنچ کر اس کے قدم بری طرح ٹھٹھک گئے۔ کمرے میں جلتی مدھم روشنی میں وہ اندر کا منظر دیکھ سکتا تھا۔ اب تک جھنگا چار پائی پر براجمان آسیہ نے پتا نہیں کس طرح خود کو چار پائی سے نیچے اتار لیا تھا اور تپائی سے گرنے والے جستی جگ تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ اب وہ جگ بدست ٹوٹی کے قریب بیٹھی تھی اور پوری وحشت سے اس کے منہ پر جگ سے پے در پے ضربیں لگا رہی تھی۔ جست کا یہ جگ بہت زیادہ بھاری نہیں تھا لیکن آسیہ نے بہت چالاکی اور بے رحمی سے کام لیا تھا۔ وہ جگ کے اس حصے سے ضرب لگا رہی تھی جسے گلاسوں وغیرہ میں پانی کی دھار گرانے کے لیے چونچ نما بنایا جاتا ہے۔ جست کی یہ سخت چونچ ٹوٹی کی دونوں آنکھوں کا حال خراب کر چکی تھی اور وہاں اب دو خون آلود گڑھوں سے بہتے ہوئے خون کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے

رہا تھا۔ ٹوٹی کے منہ میں اس کی اپنی بنیان نہ ٹھنسی ہوتی تو اس کے حلق سے فلک شکاف جھپٹیں برآمد ہو رہی ہوتیں۔ اب تو بس یہ تھا کہ وہ بندھے ہوئے ہاتھ پیروں کے ساتھ کسی ذبح کیے جانے والے جانور کی طرح پھڑک اور ٹڑپ رہا تھا۔ اس کے قریب بڑا ٹھکو پٹی ہوئی خوفزدہ نظروں سے یہ منظر دیکھ رہا تھا اور کوئی آواز نکالنے سے قاصر تھا کہ اس کے منہ میں آسیہ کی اوڑھنی ٹھنسی ہوئی تھی۔ یہ آسیہ کی خطرناک ذہانت کا کارنامہ تھا کہ اس نے ٹوٹی کو نشانہ بنانے سے پہلے ٹھکو کا منہ بند رکھنے کا بندوبست کر دیا تھا۔ اصل میں وہ پل پل ٹوٹی سے انتقام لینے کی آگ میں جکتی رہی تھی اور آج قسمت نے اسے یہ موقع فراہم کیا تھا تو عالم شاہ کے سمجھانے بچھانے کے باوجود اس موقع سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہوئی تھی۔ باہر عالم شاہ اور سرمد زندگی اور موت کی جگ سے دو چار تھے اور یہاں وہ اپنے انتقام کے شعلے بھڑکائے بیٹھی تھی۔ یقیناً اسے آس پاس منڈلاتی موت کا کوئی خوف نہیں تھا۔ وہ جو پہلے ہی زندہ درگور ہو چکی تھی، موت سے ڈرتی بھی تو کیونکر.....؟ وہ جو زندگی جی رہی تھی، اس کے مقابلے میں تو موت ہی زیادہ مہربان تھی۔

”بس کرو آسیہ.....! چھوڑ دوا سے۔ یہ اگر زعمہ بیچ بھی گیا تو نشانِ جبرت بن کر جیے گا۔“ چند ثانیے کے لیے سکتے زدہ کھڑے رہنے کے بعد عالم شاہ حرکت میں آیا اور آسیہ کو گھسیٹ کر ٹوٹی سے دور کیا۔ ٹوٹی دسترس سے دور ہوا تو آسیہ کے جنون کو کچھ قرار آیا۔ اس نے جگ ہاتھوں سے چھوڑ دیا اور اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔ اس کے دونوں ہاتھ ٹوٹی کے خون سے رنگے ہوئے تھے۔ اپنے خون آلود ہاتھ دیکھ کر وہ یکدم ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ عالم شاہ کا ہاتھ بے ساختہ ہی نسل دینے کے لیے اس کے سر پر آٹھمرا۔ وہ اس کے دشمنوں میں سے تھی اور اس نے اس کے خاندان کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا تھا لیکن خود جس انجام سے دو چار ہوئی تھی، وہ عالم شاہ کے دل میں اس کے لیے ہمدردی کی رمت جگا گیا تھا۔

تیس چالیس سیکنڈ کے اندر آسیہ نے کسی حد تک خود کو سنبھال لیا اور پھر نظرس جھکا کر شرمسار لہجے میں بولی۔

”میں آپ کی مجرم ہوں سائیں! لیکن آپ نے پھر بھی میرے ساتھ مہربانی کا سلوک کر کے اپنے بڑے پن کا ثبوت دیا ہے۔ میں شرمندہ ہوں کہ میری وجہ سے آج پھر آپ ایک بڑی مشکل میں پھنس گئے ہیں۔“

”جو ہوتا تھا، وہ ہو گیا۔ اب تم وعدہ کرو کہ اپنے جذبات

کو تاج میں رکھو گی۔" عالم شاہ نے تادیبی انداز اختیار کیا۔

"جو حکم سامیں! لیکن میں آپ کو ایک مشورہ دیتا چاہتی ہوں۔ آپ ان لوگوں سے مقابلے کے چکر میں نہ پڑیں۔ آپ سرد کے ساتھ یہاں سے بھاگ جائیں۔"

"وہ کیسے؟" عالم شاہ اس کا مشورہ سن کر حیران ہوا۔ "اس مکان کے پیچھے ایک گندانا لا بہہ رہا ہے اور نالے کی دوسری طرف دور تک گھنی جھاڑیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ اگر آپ چھت پر چڑھ کر نالے کے پار کودنے میں کامیاب ہو گئے تو اپنی جان بچا کر نکل سکتے ہیں۔" اب اس نے خود کو پوری طرح سنبھال لیا تھا اور فرش پر تڑپتے ٹوٹی سے نظریں چرائے بہت سنجیدگی سے عالم شاہ کو مشورہ دے رہی تھی۔

"لیکن اس طرح تم ہمارے ساتھ نہیں جاسکو گی اور ہماری ساری بھاگ دوڑ ضائع چلی جائے گی۔"

"میرے چکر میں نہ پڑیں سامیں۔ میرا یہ ناکارہ بدبودار وجود اس لائق نہیں ہے کہ آپ میری خاطر اپنی جان خطرے میں ڈالیں۔ میری زندگی اب کسی کام کی نہیں ہے لیکن آپ کے خاندان کو آپ کی ضرورت ہے۔" آسیہ اسے سمجھانے لگی۔

"تم اپنے دماغ پر زور ڈالے بغیر خاموشی سے یہاں بیٹھی رہو۔ جو کرنا ہوگا، میں اور سرد خود کر لیں گے۔" عالم شاہ نے اسے گھر کئے والے انداز میں جواب دیا اور خود کمرے سے باہر نکل گیا۔ انہیں ملنے والی مہلت میں سے چار منٹ گزر چکے تھے اور اب اس کے پاس صداقت شاہ سے بات کرنے کے لیے صرف ایک منٹ باقی رہ گیا تھا۔ اس سے قبل کہ وہ ان سے رابطہ کرنے کے لیے نمبر ڈائل کرتا، خود ان کی کال آنے لگی۔ اس نے تیزی سے کال ریسیو کی۔

"میری ڈی آئی جی صاحب سے بات ہو گئی ہے۔ انہوں نے سپریشن سمجھ کر فوراً کارروائی کی یقین دہانی کروائی ہے۔ تم کوشش کرو کہ پولیس کی آمد تک تم لوگوں کو تھوڑی سی مہلت مل جائے اور تمہیں گھرے میں لیے ہوئے لوگ مشتعل نہ ہوں۔" انہوں نے اسے ایک تسلی بخش خبر دینے کے ساتھ ساتھ ہدایات بھی جاری کیں۔

"شکر یہ بابا سامیں! آپ فکر نہ کریں۔ ہم پوری کوشش کریں گے کہ یہ لوگ بات چیت سے مان جائیں۔" وہ انہیں یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ انہیں گھرے میں لیے ہوئے لوگ پہلے ہی جارحانہ موڈ میں آچکے ہیں اور اب ان کے پاس محض چند سیکنڈ کی مہلت بچی ہے اس لیے مختصر تسلی دے کر

سلسلہ منقطع کر دیا۔

"تم لوگوں کو دی ہوئی مہلت ختم ہو گئی ہے۔ اب تم لوگ ہاتھ اٹھا کر باہر آ جاؤ ورنہ ہم تم پر جہم کا دہانہ کھول دیں گے۔" جیسے ہی دی گئی پانچ منٹ کی مہلت ختم ہوئی، باہر سے کسی نے چلا کر کہا۔

"اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ باہر آ جانے کی صورت میں تم ہم پر گولی نہیں چلاؤ گے؟" عالم شاہ نے بلند آواز میں سوال کیا۔

"تمہیں ہماری زبان پر اعتبار کرنا ہوگا ورنہ دوسری صورت میں بھی نقصان تمہارا اپنا ہوگا۔ تم اس مکان میں چوہوں کی طرح پھنسے ہوئے ہو اور زیادہ دیر تک خود کو یہاں چھپا نہیں سکو گے۔" باہر سے فوراً جواب آیا۔

"اس مکان میں تمہارے اپنے آدمی بھی موجود ہیں۔ اگر تم نے ہمیں کوئی نقصان پہنچایا تو وہ بھی زد میں آ جائیں گے۔" عالم شاہ اس بات چیت کے ذریعے صرف وقت گزارنے کی کوشش کر رہا تھا ورنہ اس حقیقت کو تو وہ بھی سمجھتا تھا کہ ان کی پوزیشن بہت کمزور ہے اور صرف ایک رائفل اور دو پستول کی مدد سے وہ تادیب اپنا دفاع نہیں کر سکیں گے۔

"آدمیوں کی ہمارے پاس کوئی کمی نہیں۔ ایک کی جگہ دس آدمی آ جائیں گے۔ تم اس بات کو بھول جاؤ کہ ہمارے آدمیوں کی آڑ لے کر یہاں سے نکل سکو گے۔ تمہارے پاس بچنے کی صرف ایک صورت ہے۔ باہر آؤ اور ہمیں اپنا آگاہ چھپاتا کر مطمئن کر دو کہ تم ہمارے دشمن نہیں ہو۔" باہر سے واضح کر دیا گیا کہ اندر موجود ٹھکو اور ٹوٹی ان کے لیے خاص اہمیت نہیں رکھتے ہیں۔

"ہماری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ ہم صرف آسیہ کو یہاں سے لے جانے آئے ہیں۔ وہ ہماری عزیزہ....." عالم شاہ کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ اس بار سرد نے کپے بعد دیگرے دو فائر کیے تھے اور یہ فائر ان دو افراد پر کیے گئے تھے جو انہیں باتوں میں مصروف جان کر دروازے کے دائیں اور بائیں جانب سے دیوار کودنے کی کوشش کر رہے تھے۔ گولی کھا کر ایک بندہ مکان کے باہر اور ایک اندر آ کر گر ا اور اس کے بعد تو گویا دہاں قیامت آ گئی۔ کئی ہتھیاروں کے دہانے ایک ساتھ کھل گئے اور گولیاں مینہ کی طرح اس چھوٹے سے گھر پر برسنے لگیں۔ گولیوں نے پتلی چادر کے لوہے کے دروازے کو دیکھتے ہی دیکھتے چھلٹی کر ڈالا۔ اگر وہ لوگ اینٹوں کی دہری قطار کے پیچھے پناہ نہ لیے ہوئے ہوتے تو

خود بھی نشانہ بن جاتے۔ فی الحال وہ محفوظ تھے اور سرمد گلہ بے بگا ہے شکوے سمجھنی گئی رائفل سے فائر کر کے مقابلین کو اس بات کا احساس دلارہا تھا کہ وہ بالکل نیتے نہیں ہیں۔ عالم شاہ نے بھی اس احساس کو قوی کرنے کے لیے پستول سے چند فائر کیے تھے لیکن اسے معلوم تھا کہ ان کی پوزیشن بہت نازک ہے۔ وہ اپنی ساری امیدیں صرف اس بات سے وابستہ کیے ہوئے تھا کہ پولیس ان کی مدد کے لیے یہاں پہنچ جائے گی۔ فائرنگ کا آغاز ہو جانے کے بعد پولیس کی جلد از جلد آمد کی امید رکھی جاسکتی تھی۔

”آسیہ سے پتا کریں سائیں! اگر یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ ہے تو آپ نکل جائیں۔ میں ان لوگوں کو روک دے رکھتا ہوں۔“ شکو کی رائفل ان کے دفاع میں اہم کردار ادا کر رہی تھی لیکن اب چند راکٹز ہی باقی رہ گئے تھے اور سرمد کی وقاداری اپنے سائیں کو خطرے سے دور بھیجے کے لیے بے چمن تھی۔

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میں تمہیں موت کے منہ میں چھوڑ کر چلا جاؤں۔ یہاں جو ہوگا، ہم دونوں کے ساتھ ہوگا۔“ سرمد جیسے جاں نثار کو داد پر لگا کر اپنی زندگی بچانا اسے منظور نہیں تھا اس لیے فیصلہ کن لہجے میں انکار کر دیا۔ اندھیرے میں سرمد اس کے چہرے کے تاثرات نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن لہجے میں جو عزم تھا، وہ اسے اپنی وقاداری کا صلہ محسوس ہوا اور اس نے پورے جوش سے ایک اور راکٹ فائر کیا۔ عین اسی وقت ان لوگوں نے محسوس کیا کہ وہاں چلتی گولیوں کی زوردار آوازوں کے پس منظر میں ایک اور آواز بھی سنائی دے رہی ہے۔ اس آواز کو پہچان کر ان کے اندر امید کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ وہ پولیس کی گاڑی کے مخصوص سائرن کی آواز تھی۔ اس آواز کے ساتھ ہی فائرنگ کی شدت میں واضح کمی محسوس ہوئی پھر مگافون پر پولیس کی جانب سے کوئی اعلان کیا جانے لگا۔ انہیں الفاظ سمجھ نہیں آ رہے تھے لیکن اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ پولیس والے فائرنگ کرنے والوں سے ہتھیار ڈالنے کا کہہ رہے ہیں۔ ہتھیار تو نہیں ڈالے گئے لیکن انہیں گھیرے میں لینے والوں کے ہتھیاروں کا رخ مڑ گیا۔ اب ایک پار پھر وہاں بے تحاشا گولیاں چل رہی تھیں لیکن وہ مکان وقتی طور پر گولیوں کی برسات سے محفوظ ہو گیا تھا۔

”میں اندر کمرے میں موجود لوگوں کی خبر لیتا ہوں۔“ عالم شاہ نے سرگوشی میں سرمد سے کہا اور تاریکی میں تیزی سے کمرے کی طرف ریگ گیا۔ کمرے کے

دروازے کے قریب پہنچے ہی اسے شدید دھچکا لگا۔ کمرے میں ابھی تک جلتی ہوئی روشنی میں وہ دروازے سے کچھ اندر کی طرف پڑی آسیہ کی خونچکاں لاش دیکھ سکتا تھا۔ گولی اس کے سینے میں لگی تھی اور وہ اپنے ہی خون سے بہنے والے چھوٹے سے تالاب میں پہلو کے مل گری ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں جو کبھی خاصی خوب صورت ہوا کرتی تھیں، موت کی تکلیف سے پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ وہ پتا نہیں کیوں کمرے کی محفوظ پناہ گاہ سے نکل کر باہر کی طرف آ رہی تھی اور دروازے کے صحن سامنے گولی کا نشانہ بن گئی تھی۔ شاید وہ باہر آ کر ایک بار پھر عالم شاہ سے یہاں سے بھاگ نکلنے کی گزارش کرنا چاہتی تھی۔ وجہ جو بھی تھی، اب وہ ان کی ہر طرح کی مدد سے بے نیاز ہو گئی تھی۔ عالم شاہ چند لمحوں کے لیے اس کی بے نور آنکھوں کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد سرمد کی طرف واپس پلٹ گیا۔ کمرے میں بندھے پڑے شکو اور ٹوٹی کی اسے پروا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ پولیس اور بھکاریوں کے گینگ میں جاری مقابلے میں جو بھی پارٹی غالب آتی وہ ان دونوں کو دیکھ لیتی۔ اس کے سامنے اصل مسئلہ یہ تھا کہ وہ اپنی طرف برسنے والی گولیوں کی برسات کے وقفے سے فائدہ اٹھا کر سرمد سمیت یہاں سے نکل جائے۔ راستہ آسیہ اسے دکھا ہی چکی تھی چنانچہ سرمد سے مختصر مشاورت کے بعد فرار کی اس کوشش کا فیصلہ کر لیا۔

گولیاں اب بھی برس رہی تھیں لیکن چونکہ ان کا رخ مکان کی طرف نہیں تھا، وہ آسانی سے اینٹوں پر چڑھ کر چھت پر پہنچ گئے۔ یہاں انہوں نے سیدھے کھڑے ہونے کے معاملے میں احتیاط سے کام لیا اور رینگتے ہوئے چھت کے عقبی حصے کی طرف بڑھنے لگے۔ کھڑے ہو کر سیدھا چلنے میں خدشہ تھا کہ کہیں کوئی آوارہ گولی ان کے جسموں تک رسائی حاصل نہ کر لے۔ چھت کے کنارے پر پہنچ کر عالم شاہ نے اپنے موبائل کی نارچ کو استعمال کرتے ہوئے گھر کے عقبی حصے کا جائزہ لیا۔ چھت زیادہ بلند نہیں تھی۔ نارچ کی روشنی نے ہر آسانی مکان کے عقب میں بہتے ہوئے گندے نالے تک رسائی حاصل کر لی۔ نالا زیادہ چوڑا نہیں تھا اور اس میں بہتے گندے پانی کی رفتار بھی زیادہ نہیں تھی۔ قوی امکان تو یہی تھا کہ وہ آسانی سے نالے کے پار چھلانگ لگانے میں کامیاب ہو جائیں گے لیکن اگر خدا نخواستہ ناکام بھی رہتے تو یہ سب رو نالا انہیں اپنے ساتھ بھا کر نہیں لے جاسکتا تھا۔ دونوں نے اللہ کا نام لیا اور درمیانی فاصلے کا حساب کتاب ذہن میں رکھتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کر تیزی سے چھلانگ

لگا دی۔ ان کے عقب میں گولیوں کی برسات اب بھی جاری تھی اور ان کے تیزی سے نیچے جاتے ہوئے جسم تالے کے اس پار تاریکی میں ڈوبی خود رو جھاڑیوں کے بیچ زندگی کی روشنی تک رسائی کے لیے بے چین تھے۔

☆☆☆

تہ خانے کی بند فضا میں گولی کی گونج نے کچھ لمحات کے لیے سب ہی کے اعصاب کو شل کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ امیت کی جان کے درپے ہو جانے والی ہلاک شدہ بچے کی ماں بھی ٹھٹھک کر ساکت ہو گئی تھی۔ امیت نے اس موقع کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور عورت کے دونوں ہاتھ ایک جھٹکے سے اپنے وجود سے الگ کرتے ہوئے یوں پھرتی سے اسے اپنے بازوؤں میں جکڑا کہ عورت بے بس ہو کر رہ گئی۔ خصوصاً اس کی گردن کے گرد لپٹے امیت کے دائیں بازو کی گرفت بہت سخت تھی۔ عورت کی مٹھوں سے ہا ہر کل آنے والی آنکھیں اور کھلے منہ سے برآمد ہونے والی عجیب و غریب آوازیں گواہی دے رہی تھیں کہ اس کی سانس کی نالی پر خطرناک حد تک دباؤ پڑ رہا ہے اور وہ پوری طرح سانس لینے میں کامیاب نہیں ہو رہی۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر باقیوں کے ساتھ ساکت ہو جانے والا اس کا شوہر حرکت میں آیا اور التجا آمیز لہجے میں کچھ بولتا ہوا دو قدم آگے بڑھا۔ ”خبردار! اپنی جگہ کھڑے رہو ورنہ گولی مار دوں گا۔“ اس نے فوراً ہی گن کارخ اس کی طرف کر کے لٹکارا۔ یہ اکٹھے ہی تھا جس نے پہلے ہوائی فائر کیا تھا اور اس فائر کے نتیجے میں امیت کو مرنے والے بچے کی جنون میں جھلا ماں کو قابو میں کرنے کا موقع مل گیا تھا۔

”دیا کردو صاحب! بے جاری پہلے ہی غم سے ادھ مری ہو گئی ہے۔ اس کے غم کو سمجھو اور اس کی غلطی کو شام کر دو۔“ عورت کا خاوند اپنی جگہ رک تو گیا تھا لیکن اب ہاتھ جوڑے امیت سے مخاطب تھا جس کی سخت گرفت میں عورت کا سانس لینا دو بھر ہو رہا تھا۔

”تم لوگوں کو کیوں اپنا دکھ، دکھ دکھائی دیتا ہے۔ اپنے چھٹانک بھر کے بلوگٹزے کی موت پر قیامت اٹھائی ہوئی ہے اور وہ جو ہمارا نگہرو جوان مارا گیا ہے اس کا کسی کو کوئی دکھ نہیں ہے۔ اس کی بھی تو کوئی ماں بھی جس نے پور پور کر کے اپنے پتر کو جوان کیا تھا۔ اس کے لیے بے شمار راتیں جاگی تھی۔ اس کے سر پر سہرا سجانے کے خواب دیکھے تھے۔ کیا اس اکلوتے بیٹے کی یوزمی ماں سے بڑھ کر اس عورت کا دکھ ہے۔ یہ عورت تو جوان ہے۔ اس کے اندر اس یوزمی

ماں سے بڑھ کر طاقت ہوگی کہ غم سہہ کر جی لے۔ اس کے پاس امید بھی ہے۔ یہ آگے چل کر اور بھی کئی بچے پیدا کر سکتی ہے۔ نئے آنے والے بچے اسے اپنے مرنے والے بچے کا غم بھلا دیں گے لیکن..... لیکن وہ ماں کیا کرے گی جس کا اپنے اکلوتے بیٹے کے سوا کوئی سہارا نہیں ہے۔“ مرد کی درخواست سن کر امیت بلند آواز میں چیخ چیخ کر بولنے لگا۔ وہ اپنے حساب کتاب سے سوچ رہا تھا اس لیے اس کا انداز جارحانہ تھا اور اس جارحانہ انداز کی وجہ سے ہی کسی کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ اس سے کچھ کہہ سکے۔ اکٹھے کے علاوہ ایک جانب خاموشی سے کھڑے شتر د کی گن کارخ بھی یرغمالیوں کی طرف تھا اس لیے سب خاموش رہنے اور یہ تماشا دیکھنے پر مجبور تھے۔ معاذ کو ایک بار پھر سونیا نے کسی جذباتی اقدام سے روک رکھا تھا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھا۔ اگلے دن کے دباؤ سے سمجھا رہی تھی کہ کچھ کر گزرنے کے لیے یہ وقت قطعی ناموزوں ہے۔

”چھوڑ دو اس عورت کو۔“ اچانک ہی تہ خانے میں دلیپ کی آواز گونجی تو سب چونک کر آواز کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ تین چار قدم بچے اتر کر سیز می پر ہی کھڑا ہوا تھا اور اس کا رخ امیت کی طرف تھا۔ اسے وہاں کھڑا یا کر یرغمالیوں کے چہروں پر رونق دوڑ گئی۔ اپنے غم رو دیتے کے باعث وہ انہیں سب سے بہتر لگتا تھا۔

”تم جانتے ہو امیت کہ ہم حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہ کام کر رہے ہیں لیکن عورتوں اور بچوں کو نقصان پہنچانا ہمارے پروگرام میں شامل نہیں ہے۔“ امیت نے پہلی بار کے حکم پر عورت کو اپنی گرفت سے آزاد نہیں کیا تھا۔ اپنی اس حکم عدولی پر چیخنے چلانے کے بجائے دلیپ نے لہجے کو مزید نرم کر لیا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی بزرگ کسی ضدی بچے کو اس کی ضد سے باز رکھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ یہ ایک غیر معمولی صبر و برداشت رکھنے والے شخص کا رویہ تھا لیکن پہلی بار معاذ کو اس کے لہجے میں کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کا یہ احساس درست ہے یا پھر صرف ایک واہمہ لیکن اسے ایسا لگا تھا کہ دلیپ کے اس نرم لہجے کے پیچھے عجیب سی سختی موجود ہے۔ شاید امیت نے بھی اس سختی کو محسوس کیا تھا جب ہی عورت کی گردن اس کے بازو کی گرفت سے آزاد ہو گئی تھی اور اب وہ زمین پر بیٹھی اپنے گلے پر ہاتھ رکھے لیے لیے سانس لے رہی تھی۔

”بچے کی لاش کو تہ خانے میں رکھنا سب کے لیے تکلیف کا کارن بنے گا۔ بہتر ہے کہ تم اپنے دھرم کے مطابق

اس کا کرپا کرم کر دو۔ قبر وغیرہ کی تیاری کے سلسلے میں تم اپنے ساتھیوں میں سے کسی کو مدد کے لیے اپنے ساتھ رکھ سکتے ہو۔“ اب دلیپ کا رخ بچے کے باپ کی طرف تھا اور وہ اس سے ایک ایسی بات کہہ رہا تھا جو اپنی جگہ ایک بڑی حقیقت تھی۔ بچے کی لاش کو تادیرتہ خانے میں نہیں رکھا جاسکتا تھا۔ قیمت تھا کہ وہ لاش لے جا کر ادھر ادھر پھینکنے کے بجائے بچے کے باپ کو یہ موقع دے رہا تھا کہ وہ اس کی باعزت طور پر تدفین کر دے۔ بچے کے باپ کو بھی یہ بات سمجھ میں آگئی اور اس نے اترے ہوئے چہرے کے ساتھ اثبات میں سر ہلا دیا۔

”تمہارا ساتھ دینے کے لیے وہ چاچا جی ٹھیک رہیں گے۔“ دلیپ نے خود ہی ایک شخص کی طرف اشارہ بھی کر دیا۔ اس نے جس شخص کی طرف اشارہ کیا تھا وہ ساٹھ باسٹھ سال کا ایک بوڑھا تھا۔ حقیقتاً وہ یاتریوں کی اس بس کا سب سے عمر رسیدہ فرد تھا لیکن اس کا چوڑا سینہ اور مضبوط شانے اعلان کر رہے تھے کہ وہ اس عمر میں بھی محنت کا عادی ہے۔

”یہ چاچا جی بوڑھے ہیں ان کے لیے یہ کام مشکل ہوگا۔ اگر تم اجازت دو تو میں اس کام کے لیے خود کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔“ اس بار سونیا کے ہاتھ کا دباؤ بھی معاذ کو بولنے سے نہ روک سکا تھا اور اس نے دلیپ کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کر ڈالا تھا۔ اسے گمان سا تھا کہ یہاں سے باہر نکلنے کے بعد وہ کوئی کارروائی کرنے کے قابل ہو جائے گا۔ دلیپ نے اس کی بات سن کر اس کی طرف دیکھا اور کچھ دیر دیکھتا ہی رہا۔ اس کی آنکھوں کا تاثر نرم تھا۔ معاذ کو لگا کہ وہ اس کی خواہش پوری کرنے کے لیے تیار ہو جائے گا۔ ”جوانوں کے ہوتے ہوئے بزرگوں سے محنت

مشقت کا کام لیا جائے، یہ کچھ اچھا نہیں لگتا دلیپ بھائی!“ معاذ نے اخلاقیات کو درمیان میں لا کر اپنی بات میں مزید وزن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس کی اس کوشش کے نتیجے میں دلیپ کی آنکھوں میں رحم کا سا تاثر ابھرا اور معاذ کی توقع کے بالکل برخلاف وہ سر کو زور سے نگی میں جنبش دے کر سیزھیاں چڑھ گیا۔ اس کے سیزھیاں چڑھ جانے کے بعد بچے کی لاش کو بھی وہاں سے لے جائے جانے کی تیاری کی جانے لگی۔ بچے کی ماں جس کے حواس امیت کی سخت گرفت میں محفل ہو گئے تھے، اس ادراک کے بعد کہ اس کے بچے کو ہمیشہ کے لیے اس سے دور لے جایا جا رہا ہے، ایک بار پھر تڑپنے اور پچھاڑیں کھانے لگی۔ عالم جنون میں اس نے بچے کو اپنی آغوش میں لے کر اس طرح چھپا لیا جیسے اسے ہر ایک کی دسترس سے دور رکھنا چاہتی ہو۔ اس کے

شوہر سمیت کئی لوگ اسے سمجھانے بجھانے کا فریضہ انجام دینے لگے۔ پہلے وہ ہر ایک کی بات کے جواب میں زور زور سے نگی میں سر ہلاتی رہی لیکن پھر آہستہ آہستہ اس کی مزاحمت نے دم توڑنا شروع کر دیا۔ مردہ بچے پر اس کی گرفت کمزور پڑی تو اس کے شوہر نے آنسو بہاتی آنکھوں کے ساتھ بچے اس کی گود سے لے لیا۔ بچے کو دے نکلنے ہی عورت کو فحش آگیا اور وہ بیٹھے بیٹھے اپنی جگہ پر لڑھک گئی۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر شوہر ٹھٹھک گیا۔ یقیناً بیوی کو اس حالت میں چھوڑ کر جانا اس کے لیے ایک مشکل امر تھا۔

”آ جا پتر! یہ زنانیاں مل کر تیری گھر والی کو سنبھال لیں گی۔ تو حوصلہ کر کے چل اور اپنا فرض پورا کر دے۔ ماں اپنے بالکے کا جانا نہ ہی دیکھے تو چنگا ہے۔“ لمبی ڈاڑھی والے اس عمر رسیدہ شخص نے جسے دلیپ نے غمزہ باپ کا ساتھ دینے کے لیے منتخب کیا تھا اس موقع پر دخل اندازی کی اور بچے کے باپ کو سمجھایا۔ بزرگ کی بات اس کے دل کو لگی اور بے ہوش بیوی پر ایک نظر ڈال کر وہ بچے کی لاش سینے سے لگائے سیزھیاں کی طرف بڑھا۔ شرد اپنی کن سنبھالے ساتھ جانے کے لیے تیار تھا۔ غمزہ باپ کے ہر قدم کے ساتھ آہیں اور سسکیاں کپیتی رہیں۔ یہ آہیں اور سسکیاں بچے کی ماں کی نہیں تھیں۔ وہ بے چاری تو اپنے جگر گوشے کے جانے کا منہ نہ دیکھنے کی سکت نہ ہونے کے باعث پہلے ہی بے ہوش ہو چکی تھی۔ یہ آہیں اور سسکیاں یرغمالیوں میں شامل ان عورتوں اور لڑکیوں کی تھیں جو تیلیوں کے دیس جانے والے ننھے پھول کی ماں تو نہیں تھیں لیکن ان کے سینوں میں ممتا بھرے دل دھڑک رہے تھے۔ یہ عورت کو اللہ کی طرف سے ودیعت کیا گیا ممتا کا جذبہ تھا جو ماں بننے کا تجربہ رکھنے والیوں کے ساتھ ساتھ کنواری دوشیزاؤں کو بھی تڑپا رہا تھا اور تڑپ تڑپ کر رونے پر مجبور کر رہا تھا۔

ننھا فرشتہ رخصت ہو گیا تو آہوں اور سسکیوں کا سلسلہ بھی بتدریج ختمنا شروع ہو گیا۔ اب عورتیں بچے کی ماں کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ کسی نے اس غریب کے منہ پر پانی کے جھینٹے مارے تو کسی نے اس کی ناک چٹکی میں لے کر دبا دی، کوئی ہتھیلیوں اور ٹکڑوں کی مالش کرنے لگی۔ آخر کار ستم رسیدہ ماں کو ہوش آ ہی گیا۔ ہوش میں آنے کے بعد کچھ دیر تو وہ خالی الذہنی کی کیفیت میں بیٹھی رہی پھر اس کے حواس نے کام کرنا شروع کر دیا اور وہ وحشت کے عالم میں یوں ادھر ادھر گردن کھما کر دیکھنے لگی جیسے کچھ تلاش کر رہی ہو۔ وہ کیا تلاش کر رہی تھی اس بات

سے سب ہی واقف تھے۔

”میرا بچہ..... میرا بچہ کہاں گیا.....؟“ تلاش میں ناکام ہو کر اس نے واویلا کرنا شروع کر دیا۔

”کون لے گیا میرے بچے کو.....؟ کہاں ہے میرا بچہ.....؟ جگہ جگہ کہاں ہو تم؟ جو جی تمہارے پاس تو نہیں ہے؟“ لہجہ لہجہ اس کی وحشت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور بچے کی بابت سوال جواب کرنے کے ساتھ ساتھ اب وہ اپنے شوہر کو بھی پکار رہی تھی۔ اس کی پکار میں اتنی تڑپ تھی کہ کئی خواتین کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

”کہاں لے گئے ہو جگہ جگہ تم میرے جو جی کو..... رک جاؤ۔ اسے تھوڑی دیر تو اور میرے پاس رہنے دو۔“ یقیناً اسے یاد آ گیا تھا کہ اس کے بے ہوش ہونے سے قبل بچے کو اس کی آخری آرام گاہ تک لے جائے جانے کی بات ہو رہی تھی چنانچہ بلند آواز میں چیخ کر بولی اور تیزی سے تہ خانے کی سیڑھیوں کی طرف لگی۔ ان کے سروں پر کھڑے ہو کر پہرا دینے والے اب تک اندھے بہرے بنے ہوئے تھے لیکن عورت کے سیڑھیوں کی طرف لپکتے ہی اکٹھے حرکت میں آیا اور اپنی گن کار رخ عورت کی طرف کر کے سرد لہجے میں بولا۔

”واپس اپنی جگہ پر جا کر بیٹھو ورنہ گولی مار دوں گا۔“ اپنے لال کے لیے تڑپتی ماں کے لیے یہ دھمکی کارگر نہیں تھی لیکن یہ غالی خواتین میں سے چند نے ہمت سے کام لیا اور اس کے قریب جا کر اسے پکڑ لیا۔ وہ اسے بہلا پھسلا کر واپس سب کے درمیان لے آئیں۔ اب عورت سب کے درمیان بیٹھی دردناک انداز میں رو رہی تھی۔ اس کے غم کو سمجھتے ہوئے سب ہی اپنے طور پر اس کی دلجوئی کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن اس ماں کے لیے صبر کرنا بہت مشکل تھا جس کا بچہ بروقت اور مناسب علاج نہ ہونے کے سبب زندگی کی بازی ہار گیا تھا۔ وہ رونے کے ساتھ ساتھ مسلسل اغوا کاروں کو کوسنے اور ہددعا میں بھی دے رہی تھی۔ اس کا یہ رویہ برحق تھا لیکن لوگوں کو ڈر تھا کہ کہیں ان کے سروں پر گھڑے مسلح افراد اشتعال میں نہ آ جائیں۔ خیر گزری کہ ان کی طرف سے ایسا کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا اور وہ چہروں پر بے حسی سجائے چوکنے کھڑے رہے۔ شاید انہیں خدشہ ہوگا کہ عورت ایک بار پھر ان پر حملہ آور ہو سکتی ہے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ حقیقتاً غم سے نڈھال اس عورت میں اب کچھ کرنے کی سکت ہی نہیں رہی تھی۔ یہاں تک کہ وہ روتے روتے تھک جاتی تھی تو کچھ دیر کے لیے نیم بے ہوش ہو جاتی تھی اور پھر تھوڑے وقفے کے بعد دوبارہ سے اس کے بین

سنائی دینے لگتے تھے۔

”ان لوگوں کو گئے ہوئے بہت زیادہ دیر نہیں ہوگئی؟“ میرے حساب سے تو اب تک جگہ جگہ اور ان چاچا جی کو فارغ ہو کر واپس آ جانا چاہیے تھا۔“ تہ خانے کی قید میں وقت پہلے ہی رینگ رینگ کر گزرتا تھا اور آج تو صورت حال ویسے بھی بہت تکلیف دہ تھی اس لیے وقت اور بھی ست روئی سے گزر رہا تھا لیکن بہر حال گزر رہا تھا اور سب ہی اس بات کو محسوس کر رہے تھے کہ بچے کی تدفین کے لیے جانے والوں کو واپس آنے میں تاخیر ہوگئی تھی۔ معاذ نے سونیا سے سرگوشی میں اپنی پریشانی کا اظہار کیا تھا۔

”ہوں.....“ سونیا نے جواب میں محض ایک ہنگام بھرا۔ وہ خاصی گہری سوچ میں مبتلا نظر آتی تھی اور اس شوخی کا کوئی نام و نشان باقی نہیں رہا تھا جس کا وہ اپنے موجودہ بہروپ میں مظاہرہ کرتی رہی تھی۔ شوخی کے ساتھ ساتھ اس تکلیف دہ قید میں اس کا ہار سنگھار بھی ملایا میٹ ہو گیا تھا۔ میلے، مسلے ہوئے کپڑے، بکھرے بے ترتیب بال، پسینے کی پودیتے جسم اور سستے ہوئے بے رونق چہرے وہاں موجود تمام یرغمالیوں کا مشترکہ حلیہ تھا۔ ان کے مطالبے کے باوجود بس میں موجود ان کا سامان انہیں سہا نہیں کیا گیا تھا ورنہ وہ کچھ تو اپنے حلیے میں بہتری لاسکتے تھے۔ سونیا بھی سب کی طرح ابتر حلیے میں تھی لیکن اس کا بے تحاشا حسن اس حلیے میں بھی نمایاں ہوتا تھا جب ہی تو اغوا کاروں کا سامنے آکٹے ان حالات میں بھی اس کی طرف متوجہ نظر آتا تھا۔

سونیا کو گھنگو پر مائل نہ دیکھ کر معاذ دوسرے افراد کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ سب تشویش میں مبتلا تھے اور سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے اپنی پریشانی کا اظہار کر رہے تھے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ ان لوگوں کی بابت معلوم کیا جائے لیکن یہ جی کے گلے میں گھنٹی باندھنے والی بات تھی۔ تجویز تو پیش کی جا رہی تھی لیکن سوال کرنے کی ہمت کسی کے اندر نہیں تھی۔ معاذ میں ہمت کی کوئی کمی نہیں تھی لیکن سونیا ہر لمحہ اسے باور کرواتا رہتی تھی کہ اسے ایسی کوئی حرکت نہیں کرنا ہے جو اسے سب کی نظروں میں لے آئے۔ اس نے جگہ جگہ کی مدد کے لیے ساتھ جانے والے چاچا جی کی جگہ خود کو پیش کرنے کی جو کوشش کی تھی اس پر بھی سونیا نے اسے سخت الفاظ میں ٹوکا تھا اور کہا تھا کہ اسے یاد رکھنا چاہیے کہ اس سفر میں سونیا کی حیثیت انچارج کی سی ہے اور اسے اختیار نہیں ہے کہ وہ اس کی مرضی کے خلاف کوئی قدم اٹھائے۔ اسی لیے اس وقت خواہش کے باوجود اس نے خود کو جگہ جگہ کے

بارے میں سوال کرنے سے باز رکھا تھا۔ تشویش کے سائے میں سفر کرتا وقت کچھ اور آگے بڑھا تو انہیں تہ خانے کی سیڑھیاں اتر کر نیچے آتا جگجیت دکھائی دیا۔ وہ چلنے سے زیادہ لڑکھڑاہا تھا اور اس کا چہرہ ایسے زرد ہو رہا تھا جیسے اس کے جسم میں خون کی ایک بوند بھی نہ ہو۔ آنکھوں میں بھی عجیب وحشت کا سا تاثر تھا۔ اس کا لباس، ہاتھ پیر، چہرہ اور ہڈی سب دھول مٹی سے اٹے ہوئے تھے۔ یہ دھول مٹی یقیناً قبر کی کھدائی میں اس کے جسم اور لباس کا حصہ بنی تھی۔

”بے چارہ تم سے اتنا نڈھال ہے کہ ڈھنگ سے چلا بھی نہیں جا رہا۔“ کسی نے اس کی حالت دیکھ کر تبصرہ کیا اور پھر دو بندوں نے مل کر اسے سنبھال لیا۔ معاذ خور سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ بے شک وہ ایک کم زدہ باپ تھا جو اپنے بچے کی تدفین کا مشکل مرحلہ اپنے ہاتھوں سے انجام دے کر آیا تھا اور ایسے میں اس کا غم سے غم حال ہو جانا قابل فہم تھا لیکن معاذ کو اس کے انداز میں غم کے سوا بھی کچھ محسوس ہو رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ وہ سخت دہشت زدہ ہے۔ وہ آیا بھی تھا اور اس کے ساتھ جانے والے چاچا جی کا کوئی اتنا پتا نہیں تھا۔

”میرا جو جی کہاں ہے جگجیت؟ تم کہاں چھوڑ آئے میرے لال کو؟“ کسی نے ابھی جگجیت سے چاچا جی کے بارے میں سوال کیا ہی تھا کہ رورو کر نڈھال پڑ جانے والی اس کی بیوی متوجہ ہو گئی اور تیر کی طرح جگجیت کے پاس پہنچ کر اس سے پوچھنے لگی۔ وہ ماں بھی اور اس کی کل کائنات وہ بچہ تھا جسے موت اچک کر لے گئی تھی۔ اسے اپنے بچے کے سوا کچھ بھٹائی دیتا بھی تو کیسے۔ اس کے سوال میں چاچا جی کے متعلق پوچھا گیا سوال کہیں گم ہو گیا۔ جو سوال اس نے پوچھا تھا اس کا جواب بھی کہاں تھا جگجیت کے پاس۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر بیوی کو اپنے قریب کھینچا اور اسے اپنے سینے سے لگا کر بلند آواز میں رونے لگا۔ گزرے سارے وقت میں وہ بیوی کے مقابلے میں بہت زیادہ صبر و برداشت کا مظاہرہ کرتا رہا تھا لیکن اب لگتا تھا کہ اس کے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے ہیں۔ وہ دھاڑیں مار کر رورہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی بیوی بھی ہچکیوں سے لرز رہی تھی۔

”کچھ دیر تو اور رک جاتے۔ مجھے جی بھر کر اپنے بچے کو دیکھنے تو دیتے۔ میں اسے تھوڑا پیار تو کر لیتی..... تمہیں اتنی جلدی کیا تھی، میرے جو جی کو لے جانے کی۔ تم بڑے ظالم ہو جگجیت۔“ عورت روتے روتے ہلکے بھی کر رہی تھی لیکن جگجیت اس کے کسی ہلکے کا جواب نہیں دے رہا تھا۔ وہ صرف رورہا تھا، بے تحاشا اور بے حساب۔ اس کے

رونے کی آواز سے پورا تہ خانہ گونج رہا تھا اور ارد گرد کھڑے لوگوں کو لگ رہا تھا کہ خود ان کے سینے غم سے پھٹ جائیں گے۔ آخر کچھ لوگوں نے آگے بڑھ کر جگجیت کو سنبھالا اور اسے تسلیاں دلا سے دینے کے ساتھ ساتھ نصیحتیں بھی کرنے لگے کہ اسے مرد ہونے کے ماتے زیادہ مضبوطی کا مظاہرہ کرنا چاہیے کیونکہ اس پر اپنے ساتھ ساتھ اپنی بیوی کو سنبھالنے کی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے۔ ان ہی لوگوں نے اصرار کر کے اسے ہاتھ روم کی طرف بھی بھیجا تا کہ وہ اپنے ہاتھ پیر اور منہ دھو لے۔ اس کی بیوی کو عورتوں نے سنبھال لیا۔ اس ویرانے میں پتا نہیں پانی کا کیا انتظام تھا لیکن محدود مقدار میں سہی، انہیں استعمال کے لیے پانی فراہم کیا جا رہا تھا۔ جگجیت تھوڑی دیر میں منہ ہاتھ دھو کر واپس آ گیا۔ اب اس کا حلیہ قدرے بہتر ہو گیا تھا لیکن آنکھوں کی وحشت میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ اپنی بیوی کے قریب بیٹھ کر غائب دماغی کی کیفیت میں اس کی پشت سہلانے لگا۔ رورو کر اس کی آنکھیں سوچ گئی تھیں لیکن آنکھوں سے آنسوؤں کا سمندر بہتا بند نہیں ہوا تھا۔ سسکیاں ایک کراہ کی صورت اس کے ہونٹوں سے برآمد ہو رہی تھیں اور صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ اندرونی طور پر کتنی شدید تکلیف میں مبتلا ہے۔ اس صورت حال نے بڑوں کے ساتھ ساتھ بچوں کو بھی متاثر کیا تھا اور وہ سبے ہوئے سے اپنی ماؤں کے ساتھ چپے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ آج کسی نے بھوک لگنے کی شکایت بھی نہیں کی تھی حالانکہ دوپہر کے فاتے کے بعد اب رات کے کھانے کا بھی وقت ہو چکا تھا۔

”تم نے چاچا جی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا جگجیت! وہ تمہارے ساتھ گئے تھے تو پھر تمہارے ساتھ واپس کیوں نہیں آئے؟“ درمیان میں وقفہ ضرور آ گیا تھا لیکن چاچا جی کے بارے میں کسی کا تجسس ختم نہیں ہوا تھا اور یہی تجسس سوال بن کر ایک شخص کی زبان پر آ گیا تھا۔

”مینو کچھ خبر نہیں۔“ سوال سن کر جگجیت کے چہرے پر کھنڈی زردی میں کچھ اور اضافہ ہوا اور اس نے بہ مشکل چند لفظی جواب دے کر یوں گھٹنوں میں سر دے لیا جیسے اب کسی کے کسی سوال کا جواب نہ دینا چاہتا ہو۔ یہ عجیب تشویش میں مبتلا کر دینے والی صورت حال تھی۔ لوگوں کا تجسس مزید بڑھ گیا اور وہ جگجیت سے تا بڑ توڑ سوالات کرنے لگے۔ جگجیت نے تو کسی سوال کا جواب نہیں دیا لیکن اس کے ساتھ ہی واپس آنے والا شتر و چیتا۔

”تم لوگ بھونکنا بند کرتے ہو یا ایک ایک گولی سب

کے سر میں اتار کر بیٹھ کے لیے زبانیں بند کر دوں۔“
اس دھمکی کے بعد کسی کی ہمت نہیں ہوئی کہ کوئی سوال کرتا۔ سب خاموشی سے اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہے۔ کچھ دیر بعد کھانا تقسیم کیا جانے لگا۔ ان کے معدے خالی تھے لیکن بھوک مرگئی تھی۔ پتلی دال اور روٹی پر مشتمل وہ کھانا سب بے مشکل سے زہر مار کیا۔ روٹیاں جو روزانہ کم پڑ جاتی تھیں، آج بچ گئیں۔ کھانے کے بعد سب خاموشی سے لیٹ گئے صرف مرنے والے بچے کی ماں تھی جو اب تک خود پر مکمل قابو نہیں پاسکتی تھی اور رہ رہ کر اس کی سسکیاں تہ خانے میں گونجنے لگتی تھیں۔ یہ سسکیاں سب کے اعصاب پر ہتھوڑوں کی طرح برس رہی تھیں۔ ننھے جو جی کی موت کے بعد چاچا جی کا غیاب انہیں اپنے مستقبل کی طرف سے مزید فکر مند کر گیا تھا اور یہ ناامیدی بڑھتی جا رہی تھی کہ وہ کبھی صحیح سلامت اپنے گھروں تک واپس نہیں پہنچ سکیں گے۔

”بات سن جگیت!“ خوف اور مایوسی سے بھری تہ خانے کی خاموش فضا میں اچے نامی مسیح شخص کی آواز ابھری۔ جگیت کے متوجہ ہونے پر اس نے اسے اپنے قریب بلایا۔ کچھ دیر بعد وہ دھیمی آواز میں جگیت سے کوئی بات کرتا رہا پھر انہوں نے جگیت کو مٹھی میں کچھ دبائے واپس آتے ہوئے دیکھا۔ واپس آ کر جگیت اپنی سسکتی ہوئی بیوی سے کھسر پھسر کرنے لگا۔ انداز ایسا تھا کہ جیسے وہ اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہو۔ آخر کار عورت اپنی جگہ سے اٹھ بیٹھی۔ جگیت گلاس میں پانی بھر کر لایا اور ایسے زاویے سے پیہ پیہ گیا کہ اس کی بیوی اس کے چوڑے چکلے وجود کے پیچھے چھپ گئی۔ وہ کہا کر رہا تھا، کسی کو نظر نہیں آ رہا تھا لیکن اندازہ تھا کہ اس نے پانی کے ساتھ بیوی کو کوئی چیز کھلائی ہے۔ ایک منٹ سے بھی کم وقت میں انجام دی جانے والی اس کارروائی کے بعد دونوں میاں بیوی دوبارہ سے لیٹ گئے۔ عورت کی سسکیاں اب بھی جاری تھیں لیکن پھر آہستہ آہستہ سسکیاں معدوم ہونے لگیں اور آخر کار تہ خانے کی فضا میں خاموشی چھا گئی۔ اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ عورت کو کوئی نشہ آور شے کھلائی گئی ہے جس کے اثر سے وہ رونا دھونا ترک کر کے سو گئی تھی۔ باقی یرغمالی بھی آخر کب تک جاگتے، لمحہ بہ لمحہ گزرتی رات کے اندھیرے میں سولی پر بھی آ جانے والی نیند نے آہستہ آہستہ انہیں دبوچنا شروع کر دیا۔ معاذ پر بھی غنودگی طاری ہو گئی۔ غنودگی کی اس کیفیت میں اس نے محسوس کیا کہ کوئی سایہ سا اس کے قریب سے گزر کر گیا ہے اور جاتے جاتے اس سائے نے اس کے پہلو میں ہلکی سی

ضرب لگائی ہے۔ بے انتہا تجسس کے باوجود اس نے خود پر قابو رکھا اور آنکھ کھل جانے کے باوجود فوری طور پر اپنی جگہ سے اٹھ بیٹھنے کے بجائے وہیں پڑا پڑا جائزہ لینے لگا۔

اس کے قریب سے گزرنے والا سایہ تہ خانے کے نیم روشن حصے سے گزر کر تاریک حصے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس لپکتی کمر والے سائے کو پہچاننے میں اسے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ سو فیصد سونپا تھی۔ وہ حیران ہوا کہ سونپا رات کے اس پہر اٹھ کر کہاں جا رہی ہے لیکن پھر یہ حیرانی دور ہو گئی۔ پورے تہ خانے میں ایک نظر دوڑا کر اسے اندازہ ہو گیا کہ اکٹھے منظر سے غائب ہے۔ اس تہ خانے میں تین مسلح افراد ہمہ وقت موجود رہتے تھے۔ دن میں تو تینوں ہی چوکس اور مستعد پہرہ دیتے رہتے تھے لیکن رات کے اوقات میں انہوں نے ڈیوٹیاں بانٹ رکھی تھیں اور ایک وقت میں صرف ایک شخص جاگ کر پہرہ دیتا تھا جبکہ باقی دو سو جاتے تھے۔ اس وقت اچے اور شتر دسور ہے تھے جبکہ اکٹھے جس کی یقیناً پہرے کی باری تھی، غائب تھا۔ تہ خانے کے تاریک حصے سے دبی دبی سرگوشیاں ابھرنا شروع ہوئیں تو یہ بھی سمجھ میں آ گیا کہ اکٹھے کہاں غائب ہے اور سونپا نے اسے کس مصروفیت میں لگا کر اپنے فرض سے غافل کر دیا تھا۔ اپنی جگہ پڑے پڑے صورت حال کا جائزہ لیتے معاذ کے ہاتھ ہیروں میں سنسناہٹ سی ہونے لگی اور وہ سمجھ گیا کہ کچھ کر گزرنے کا وقت آ گیا ہے۔ آفت کی پرکالہ سونپا جو ہر وقت اسے صبر کی تاکید اور مناسب وقت کے انتظار کی نصیحت کرتی تھی، اسے ایک سنہری موقع فراہم کر چکی تھی۔ اس موقع پر پُر جوش ہونے کے باوجود اس نے غلٹ سے کام نہیں لیا اور سونپا کو موقع دیا کہ وہ اکٹھے کو پوری طرح خود میں گن کر لے۔ اس دوران وہ ذرا سی گردن اٹھا کر جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ اپنا لائحہ عمل بھی طے کرتا رہا۔

اس وسیع تہ خانے میں یرغمالی صرف مغربی حصے تک محدود تھے۔ مشرقی گوشہ جو اس وقت تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا، وہاں تہ خانے میں آنے والی سیزھیاں اتر رہی تھیں۔ سونپا اور اکٹھے ان سیزھیوں کے پیچھے ہی غائب تھے جبکہ جنوبی دیوار کے ساتھ اچے اور شمالی دیوار کے ساتھ شتر ویک لگائے سو رہا تھا۔ دونوں نے ہی سونے کے لیے لگنا گوارا نہیں کیا تھا اور اپنی گنیں تیار حالت میں گود میں رکھے دیوار کے سہارے اس انداز سے سو رہے تھے کہ لگتا تھا ذرا سی آہٹ پر جاگ کر فوراً ایکشن میں آ جائیں گے۔ شمالی اور جنوبی دیواروں کے درمیان اچھا خاصا فاصلہ تھا اور معاذ ایک وقت میں ایک ہی

بندے کو قابو میں کر سکتا تھا۔ اگر دونوں میں سے ایک کو قابو کرنے کے دوران دوسرے کی آنکھ کھل جاتی تو وہ قہر بن کر برس پڑتا لیکن بہر حال رسک لیے بغیر بھی چارہ نہیں تھا۔ معاذ کچھ دیر آہٹ لیتا رہا۔ سیزیموں کے پیچھے تاریک گوشے میں مکمل خاموشی چھا گئی تھی جو اس بات کا ثبوت تھی کہ سونیا اکٹھے کو تعلق کے اس مقام تک لے گئی تھی جہاں زبان سے گفتگو کرنا ایک اضافی عمل ہوتا ہے۔ یہی اس کے حرکت میں آنے کے لیے مناسب ترین وقت تھا۔ وہ بہت احتیاط سے حرکت میں آیا اور سانپ کی طرح ریگستا شترو تک پہنچ گیا۔ شترو کا ہاتھ اس کی گن پر تھا۔ اگر وہ اس سے یہ گن جھیننے کی کوشش کرتا تو شترو کی آنکھ کھل جاتی اور وہ بھرپور مزاحمت کرتا جس کے نتیجے میں نہ صرف سو یا ہوا اے جے جاگ جاتا بلکہ سونیا کے ساتھ مصروف اکٹھے بھی متوجہ ہو جاتا۔ اس نے گن پر ہاتھ ڈالنے کا رسک لیے بغیر خالی ہاتھوں ہی شترو سے نمٹنے کا فیصلہ کیا۔ اگر شترو کی پشت دیوار سے نہ لگی ہوئی تو وہ پشت پر سے حملہ کر کے اسے زیادہ آسانی سے قابو میں کر لیتا۔ اب اسے دائیں جانب سے وار کرنا پڑا۔ ایک نہایت نیا سلاٹنگ شترو کی دائیں کنٹینی پر رسید کرتے ہوئے اسے امید تھی کہ شترو اس وار کی تاب نہ لا کر فوراً بے ہوش ہو جائے گا پھر بھی اس نے احتیاط سے کام لیا اور کنٹینی پر مکار رسید کرنے کے ساتھ ہی پائیں ہاتھ سے شترو کا منہ دیوچ لیا۔ اس کی یہ احتیاط کام آئی۔ شترو اس کی توقع سے زیادہ جاندار نکلا اور کنٹینی پر پڑنے والا۔ طوقانی مکا کھا کر بھی بے ہوش نہیں ہوا۔ اگر معاذ نے اس کا منہ نہ دیوچ رکھا ہوتا تو یقیناً اس کے لبوں سے بہت تیز چیخ بلند ہوتی۔ اب چیخ تو بلند نہیں ہوئی لیکن اس نے بھرپور مزاحمت کی کوشش کی۔ اگر معاذ فوراً ہی اس کے پیٹ میں گھسنے کی ضرب نہ لگا دیتا تو وہ اپنے ہاتھ کے نیچے رکھی گن استعمال کر ڈالتا اور نتیجتاً وہاں ایک قیامت برپا ہو جاتی۔ قیامت سے تو وہ بچ گیا لیکن شترو کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گرنے والی گن نے اچھی خاصی آواز پیدا کر دی۔ اس آواز نے چو کنا سوئے ہوئے اے جے کو جگا دیا۔ آنکھ کھلتے ہی وہ کسی ایسے روبوٹ کی طرح حرکت میں آیا جس میں سارا پروگرام فیڈ ہو اور جسے حرکت میں آنے کے لیے کسی سوچ بچار کی ضرورت نہ ہو۔

”چھوڑ دے شترو کو دور نہ اپنی جان سے جائے گا۔“ وہ اپنی جگہ سے اچھل کر کھڑا ہوا اور گن کا رخ معاذ کی طرف کر کے غرایا۔

”گولی چلانے کی کوشش پہلے تمہارے اپنے ساتھی کی جان لے گی۔“ معاذ جو اس دوران شترو کے جسم کو اپنی ڈھال بنانے میں کامیاب ہو چکا تھا، تیز سرگوشی میں بولا۔

”ہم سب جان بھری پر رکھ کر ہی میدان میں اترے ہیں۔ میرے ساتھی کو ڈھال بنا کر تم اپنی جان نہیں بچا سکتے۔ میں اس کی پروا کیے بغیر گولی چلا دوں گا اور 38 بور کی گولی میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ یہ شترو کے جسم کو پھاڑ کر تمہارے جسم میں گھس جائے گی۔“ اے جے کا لہجہ گواہ تھا کہ وہ جو کہہ رہا ہے اس پر عمل بھی کر گزرے گا لیکن اگلا ہی پل بے حد حیرت ناک تھا۔ اسے دھمکی دینے والا اے جے یکا یک زمین پر گر چکا تھا۔ اس کے گرنے کی وجہ پہلو میں دستے تک دھنساؤہ خنجر تھا جس کے لیے پھل نے یقیناً اس کے دل تک رسائی حاصل کر کے اسے ایک لمحے میں خاموش کر دیا تھا۔ خنجر تہ خانے کے مشرقی حصے سے پھینکا گیا تھا اور پھینکنے والی یقیناً سونیا تھی۔

”ختم کر دو اسے بھی۔“ وہ ہاتھ میں خوفناک رائفل لیے سامنے آئی اور بے رحم لہجے میں معاذ کو حکم دیا۔ معاذ نے میکا کی انداز میں اس کے حکم کی تعمیل کی اور اپنے شکنجے میں پھنسے شترو کی گردن ایک جھٹکے سے توڑ دی۔ اس منظر کو دیکھ کر ایک عورت کے حلق سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہاں ہونے والی کارروائی میں زیادہ شور تو نہیں ہوا تھا لیکن بہر حال یرغالیوں میں سے کئی کی آنکھ کھل چکی تھی اور اب وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے اپنے سامنے کے خونی مناظر دیکھ رہے تھے۔

”خاموش! کسی کی آواز نکلی تو اسے گولی مار دوں گی۔“ سونیا آنکھوں میں طیش لیے خطرناک لہجے میں غرائی لیکن اس کی آواز زیادہ بلند نہیں گئی۔ یقیناً وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی آواز تہ خانے سے باہر جائے اور باہر والے چوکنے ہو جائیں۔

معاذ بھی اس حوالے سے پوری طرح چو کنا تھا اور شترو کی اسے کے 47 ہاتھ میں سنبھالے سیزیموں کے قریب جا کھڑا ہوا تھا۔ اگر اوپر سے کوئی نیچے آتا تو اس سے بچ نہیں سکتا تھا۔

”ہم آپ میں ہی سے ہیں اور خود سمیت آپ سب کی جانیں بچانا چاہتے ہیں لیکن اس کے لیے آپ سب کو ہمارے ساتھ تعاون کرنا پڑے گا۔“ سونیا نے دیکھا کہ اس کی دھمکی کے نتیجے میں وہاں موجود ہر شخص کو سانپ سونگھ گیا ہے تو قدرے نرم لہجے میں مخاطب ہوئی اور گفتگو جاری رکھتے ہوئے بولی۔

”اب ہماری جانیں بچنے کی صرف ایک صورت ہے کہ ہم ہوشیاری سے کام لیں۔ سرکار کی طرف سے اپنی ڈیمانڈز پوری نہ کیے جانے پر یہ لوگ یرغمالیوں کو ایک ایک کر کے ہلاک کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ جنگیت کے ساتھ جانے والے چاچا کی کو ہلاک کر کے ان کی لاش کی ویڈیو دھاڑ ڈالنے کے لیے سرکار کو بھیج دی گئی ہے اور سرکار کو یہ پیغام دیا گیا ہے کہ اگر ان کی بات نہ مانی گئی تو بارہ گھنٹے بعد ایک اور یرغمالی کی جان چلی جائے گی اور پھر اس کے بعد ہر دو گھنٹے بعد ایک لاش گرائی جاتی رہے گی۔ سرکار کی طرف سے کسی مدد کی اشارہ کیا ہے؟ ہمیں خود ہی اپنے جیون بچانے کے لیے کوشش کرنا ہوگی اور اس کے لیے آپ لوگوں کو کیول اتنا کرنا ہوگا کہ بنا کوئی آواز نکالے خاموشی سے یہاں بیٹھے رہیں۔“ وہ دھیمے لیکن بہت موثر لہجے میں سمجھائی گئی۔ یہ اس کے لہجے کا ہی اثر تھا کہ خوفزدہ نگاہوں میں امید کے دیے جھلکانے لگے۔

”میں ہتھیار چلانا جانتا ہوں دیدی! میں آپ لوگوں کا ساتھ دوں گا۔“ ایک بیس بائیس سال کا لڑکا جس کی لمبی سیاہ ڈاڑھی اس کی صاف رنگت پر بہت بھلی لگ رہی تھی، اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور پُر جوش لہجے میں بولا۔

”تم یہاں رہ کر ان لوگوں کی رکھ بھال کرنا اور کسی کو تہ خانے میں گھسنے نہ دینا۔ میں اور میرا ساتھی مل کر باہر کے حالات سنباہل لیں گے۔“ سونیا نے اسے ہدایت کی اور اچے کی گن اسے حتماً کر سلی کر لی کہ آیا وہ اس گن کو چلا بھی سکتا ہے یا نہیں۔ لڑکے کو بنیادی معلومات حاصل تھیں۔ سونیا نے اسے ایک دو نکات اور سمجھائے پھر اچے کے پہلو میں دھنسا اپنا منہ پھرنے لگا۔ اچے ہی کے لباس سے صاف کرنے کے بعد اپنی پنڈلی کے ساتھ باندھ لیا۔ یہ منہ پھرنے شروع ہی سے اس کی پنڈلی کے ساتھ بندھا ہوا تھا اور گھیر دار شلوار کی وجہ سے کسی کو اس کی وہاں موجودگی کا علم نہیں ہو سکا تھا۔ خوش قسمتی سے انہو کاروں نے خواتین کی اتنی سختی سے تلاشی بھی نہیں لی تھی اس لیے اس کا منہ پھرنے جگہ محفوظ رہا تھا اور یقینی طور پر اچے کے علاوہ اس کے حسن سے مستفید ہونے کے لالچ میں مبتلا ہو جانے والے اس کے زندگی کا چراغ بھی گل کر چکا تھا۔

سونیا اور معاذ نے محتاط قدموں سے سیڑھیاں چڑھنا شروع کیں تو اچے کی گن تمام کرکڑے لڑکے نے معاذ کی جگہ سنباہل لی۔ ہاتی یرغمالی دم سادھے کسی انہونی کا انتظار کرنے لگے۔ ان میں سے کچھ کے لب بے آواز متحرک

تھے۔ شاید وہ معاذ اور سونیا کی کامیابی کے لیے دعا گو تھے۔ آخری سیڑھی پر پہنچ کر معاذ نے تہ خانے کے خارجی راستے پر رکھی پتھر کی سل بے حد احتیاط سے کھسکانا شروع کی۔ اس مقصد کے لیے اسے اپنی گن شانے سے لٹکانا پڑی تھی اور بھاری سل کو دونوں ہاتھوں کی طاقت سے ہٹا رہا تھا۔ اس سے ایک قدم نیچے کھڑی سونیا اپنی گن کی بلبی پر انگلی رکھے پوری طرح چوکنی کھڑی تھی اور راستے میں آنے والی کسی بھی رکاوٹ کو۔۔۔ اپنی انگلی کی ایک جنبش سے پرچے اڑا دینے کے لیے تیار تھی۔ خیر گزری کہ اس پہلے اور اہم ترین مرحلے پر انہیں کسی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ وہ دونوں ایک ایک کر کے تہ خانے سے باہر آ گئے اور راستہ ایک بار پھر بند کر دیا۔ تہ خانے کے راستے والا یہ کمر گھپ تار کی میں ڈوبا بالکل خالی پڑا ہوا تھا۔ انہو کاروں کو گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ نیچے یرغمالی جو کہ یا تو اپر جانے والے عام سے شہری تھے، جدید اسلحے سے لیس، ان کے تین عدد ساتھیوں کے تہ خانے میں ہوتے ہوئے کسی طرح باہر بھی نکل سکتے ہیں اس لیے انہوں نے تہ خانے کے خارجی راستے پر کسی پہریدار کو متعین کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی تھی۔ انہو کاروں کی اس غلطی کا فائدہ اٹھا کر وہ دونوں نہایت کامیابی سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس چھوٹے سے کمرے سے متصل ہال نما کمرے میں ہلکی سی روشنی محسوس ہو رہی تھی۔ روشنی کے معاملے میں وہ لوگ بہت محتاط معلوم ہوتے تھے اور گہری تاریکی چھا جانے کے بعد بہت محدود رقبے میں روشنیاں جلاتے تھے۔ اس کی ایک وجہ تو شاید یہ تھی کہ بیٹری سل سے چلنے والی ان چار جنگ لائٹس کی توانائی محفوظ رکھی جائے، دوسرے روشنی اتنی زیادہ نہ ہو کہ کوئی دیرانے میں موجود اس کنڈر کی طرف متوجہ ہو جائے۔ موجودہ حالات میں محدود روشنی ان لوگوں کے لیے بھی کارآمد تھی۔

اپنے مکمل تاریکی میں ہونے کا فائدہ اٹھا کر معاذ دروازے تک چلا گیا اور محتاط انداز میں جھانک کر ہال کا جائزہ لیا۔ روشنی ہال کے صرف ایک حصے تک محدود تھی اور اس محدود روشنی میں وہ دلیپ اور امیت کو اپنے سامنے پھیلے ایک کانڈ پر جھکا دیکھ سکتا تھا۔ دلیپ کے پاس اتنے دنوں میں انہوں نے بھی کوئی ہتھیار نہیں دیکھا تھا اور اس وقت بھی وہ نہایت ہی نظر آ رہا تھا جبکہ امیت کی گن اس سے کچھ فاصلے پر فرش پر رکھی ہوئی تھی۔ فرش پر ہی دو افراد سوئے ہوئے نظر آ رہے تھے اور ان کے ہتھیار ان کے قریب ہی دھرے

ہوئے تھے۔ صورت حال خاصی حوصلہ افزائی اور امید نہیں تھی کہ انہیں زیادہ مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

”ریڈی؟“ اس نے اپنے کندھے کے پیچھے سے جھانک کر ہال کا جائزہ لیتی سونیا سے پوچھا۔

”نہیں، ایک!“ اس نے دو لفظی جواب دیا اور وہ دونوں یوں اچانک ہال میں داخل ہوئے جیسے آسمان سے برق گری ہو۔

”خبردار! اپنے ہاتھ اوپر اٹھا لو۔ اگر ذرا بھی حرکت کی تو بھون ڈالوں گا۔“ معاذ نے بیک وقت دلیپ اور امیت کو اپنی گن کے نشانے پر لیتے ہوئے دھمکی دی۔ اس کے ہاتھ میں اس کے 47 جیسی بھیا تک گن دیکھ کر ان کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں اور ہاتھ خود بخود اوپر اٹھتے چلے گئے۔ اسی وقت ہال میں کلاشکوف کا بھیا تک قبضہ گونجا تو معاذ چونک گیا۔ یہ سونیا تھی جس نے سوئے ہوئے افراد کو نشانہ بنایا تھا۔ معاذ کو اس کی یہ نقل و غارت گری بے جا محسوس ہوئی۔ اس کے ذاتی خیال کے مطابق سوئے ہوئے افراد کو ایسے ہی قابو میں کیا جاسکتا تھا۔ وہ سونیا کو ٹوکتا، اس سے نقل ہی اس کی کلاشکوف ایک بار پھر گرجی اور معاذ کی توجہ ہٹنے کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنے والے امیت سمیت دلیپ کو بھی نشانہ بنا ڈالا۔ وہ دونوں نیچے گر کر ترچے بن گئے۔ اسی وقت باہر سے چند دوڑتے قدموں کی آواز آئی اور کسی نے دروازے سے جھانک کر جائزہ لینے کی کوشش کی لیکن معاذ کے مارے گئے برسٹ نے اس کی کھوپڑی کے پر نیچے اڑا دیے۔ اس کے بعد کسی نے دروازے کے قریب آنے کی کوشش نہیں کی لیکن بہر حال وہ باہر موجود تھے اور ان کی موجودگی میں یہ لوگ بھی باہر نہیں نکل سکتے تھے۔

بناوٹ کے اعتبار سے یہ ہال کچھ عجیب تھا۔ اس کی دیواروں میں کوئی کھڑکی یا درجہ نہیں رکھا گیا تھا۔ صرف دو دروازے تھے جس میں سے ایک آمد و رفت کے لیے تھا جبکہ دوسرا اس کمرے میں کھل رہا تھا جس میں یہ خانے تک جانے کا راستہ تھا۔ ہال سے باہر جانے والے دروازے کے باہر مسلح افراد موجود تھے اور انہیں ان کی صحیح تعداد کا علم نہیں تھا۔ ویسے اگر باہر صرف ایک فرد بھی موجود ہوتا تو انہیں یہاں محصور رکھنے کے لیے کافی تھا۔ ان میں سے کوئی بھی باہر نکلنے کی کوشش کرتا، آرام سے نشانہ بنالیا جاتا۔ جب تک وہ ہال میں تھے، محفوظ تھے۔ اسلحے کے اعتبار سے بھی ان کی پوزیشن اچھی خاصی مضبوط تھی۔ دلیپ اور اس کے ساتھیوں کے ہتھیار ان کے قبضے میں آچکے تھے اور یہ سب جدید ہتھیار

تھے۔ ان ہتھیاروں کے ہوتے ہوئے وہ درجنوں افراد کو بھی اندر آنے سے روک سکتے تھے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ وہ خود کیسے باہر نکلیں؟ اس ہال کی چھت کا ایک حصہ گرا ہوا تھا اور اس جگہ سے آسمان دیکھا جاسکتا تھا۔ چاند سے خالی آسمان کا رنگ سیاہ محسوس ہو رہا تھا اور اس پر اڑتا دکھائی دینے لگا تھا۔ تیرتے نظر آرہے تھے۔ معاذ نے چھت کے اس خلا کا جائزہ لیا۔ چھت اتنی زیادہ بلند تھی کہ کسی سیزمی وغیرہ کے استعمال کے بغیر وہاں تک رسائی ممکن نہیں تھی اور سیزمی ظاہر ہے موجود نہیں تھی۔ چھت کے اس خلا کا جائزہ لیتے ہوئے وہ بری طرح چونک گیا۔ ایک پرچھائیں سی تھی جو اس نے وہاں دیکھی تھی۔ ایک ٹاپے کی بھی تاخیر کیے بغیر اس نے اپنی گن کا رخ اس طرف کر کے ایک طویل برسٹ مارا۔ مین اسی لمحے دروازے کے باہر سے بھی برسٹ مارے گئے لیکن اس کا موثر جواب دینے کے لیے سونیا موجود تھی۔

”لائٹ آف کر دو۔“ فائرنگ کے وقفے میں اسے سونیا کی تیز سرگوشی سنائی دی۔ وہ چار جنگ لائٹ جس کی روشنی میں دلیپ اور امیت کسی کاغذ پر جھکے ہوئے تھے اب بھی روشن تھی اور ہال کو نیم روشن کیے ہوئے تھی۔ ان حالات میں روشنی سے زیادہ تاریکی ان کے لیے فائدہ مند تھی چنانچہ وہ فوراً لائٹ آف کرنے کے لیے حرکت میں آ گیا۔ لائٹ آف کرتے کرتے کسی خیال کے تحت اس نے لاشوں کی تلاشی لینا شروع کر دی۔ سوتے میں سونیا کی گولیوں کا نشانہ بننے والے دونوں افراد کی جیبیں بالکل خالی تھیں۔ امیت کی جیب سے اسے محض ایک سگریٹ کا پیکٹ ملا۔ یہ شاید کسی قسم کی احتیاطی حکمت عملی تھی کہ ان لوگوں کے پاس اسلحے کے سوا کچھ بھی موجود نہیں تھا۔ معاذ نے دلیپ اور امیت کے درمیان پڑے اس کاغذ کا جائزہ لینے کی کوشش کی جس پر وہ ان کے حملہ آور ہونے سے نقل جھکے ہوئے تھے لیکن کاغذ اس بری طرح خون میں تر ہو چکا تھا کہ اس پر موجود تحریر کو پڑھنا ممکن نہیں تھا۔ کاغذ کو ویسے ہی چھوڑ کر اس نے دلیپ کی تلاشی لینا شروع کی اور بری طرح چونک گیا۔ دلیپ مرا نہیں تھا۔ اس کے جسم میں گولیاں ضرور لگی تھیں لیکن ابھی اس کا زندگی سے ناتا نہیں ٹوٹا تھا۔ اس نے کن آنکھوں سے سونیا کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھی اور پوری چابکدستی سے دروازے اور چھت کے خلا کی نگرانی کر رہی تھی۔ اگر اسے دلیپ کے زندہ ہونے کا علم ہو جاتا تو یقیناً اس کی موت کا فیصلہ ساڈا لیتی لیکن معاذ ایسا نہیں کر سکا۔ اس شخص سے اس کی کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی اور نہ

نے سرگوشی میں سونیا سے کہا۔ ہتھیاروں کی آواز اور فائرنگ کے انداز نے اسے باہر موجود افراد کی تعداد کا قہقہہ کرنے میں مدد دی تھی۔

”تم یہاں نظر رکھو، میں ابھی آتا ہوں۔“ وہ اندھیرے میں تہ خانے کے راستے والے کمرے کی طرف ریگ گیا۔ بیرونی امداد نہ لینے کا فیصلہ ہو جانے کے بعد اس کا ذہن تیزی سے ایک حکمت عملی بنا چکا تھا اور اب وہ اس پر عمل پیرا ہونے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔

”فائر مت کرنا، یہ میں ہوں تمہارا ساتھی۔“ تہ خانے کے خلا سے سیزھیوں پر قدم رکھنے سے قبل اس نے ہتھیار بدست لڑکے کو آگاہ کرنا ضروری سمجھا۔ اسے معلوم تھا کہ باہر ہونے والی فائرنگ کی آوازیں اندر بھی جاری ہوں گی اور تمام یرغمالی پریشان اور خوفزدہ ہوں گے۔ ایسے میں لڑکا بولکھلا کر اس پر بھی فائر کھول سکتا تھا۔

”ٹھیک ہے، آجائیں۔“ لڑکے نے اسے جواب دیا تو وہ نیچے اتر آیا۔ حسب توقع تہ خانے کے اندر سارے یرغمالی پریشان صورتیں لیے کھڑے ہوئے تھے۔ صرف جگجگیت اور اس کی بیوی اس سارے ہنگامے سے بے خبر پڑے سو رہے تھے اور یقیناً یہ نیند فطری نہیں تھی۔ انہوں نے کسی نشہ آور شے کا استعمال کیا تھا اور امکان تھا کہ وہ شے انہیں اچے نے فراہم کی تھی تاکہ عورت کے مسلسل رونے کی آواز سننے سے نجات مل جائے۔ یقیناً جگجگیت نے ذہنی سکون کے لیے بیوی کے ساتھ ساتھ خود بھی وہ نشہ آور شے استعمال کر لی تھی۔

”ہم کامیابی کے قریب ہیں۔ زیادہ تر لوگوں پر قابو پالیا گیا ہے۔ صرف باہر موجود دو افراد ہیں جو ہمارے لیے پرالیم بنے ہوئے ہیں۔ ان افراد کا گھیرا توڑنے کے لیے ہمیں اس نوجوان کی مدد کی ضرورت ہے۔ جب تک ہم باہر موجود ہیں، آپ لوگوں کے لیے کوئی پرالیم نہیں ہوگی۔ آپ لوگ شانتی سے یہاں رہیں اور ہماری کامیابی کے لیے پراعتماد کریں۔“ اس نے کسی کو سوال کرنے کا موقع دے بغیر خود ہی مختصراً انہیں حالات سے آگاہ کیا اور ہتھیار تھامے کھڑے لڑکے کو اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ لڑکا ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے فوراً ہی اس کے ساتھ سیزھیوں چڑھنے لگا۔ اس دوران انہیں فائرنگ کی آواز بھی سنائی دی تھی جس کا مطلب تھا سونیا کامیابی سے دقائی مورچا سنبھالے ہوئے ہے۔

”میرے ساتھ ساتھ رہنا۔“ تہ خانے سے باہر گھپ اندھیرا تھا اور اسے اندازہ تھا کہ لڑکا فوری طور پر خود کو اس

الحال وہ انہیں کوئی نقصان پہنچانے کے لائق بھی نہیں تھا اس لیے اس کی موت اتنی ضروری بھی نہیں تھی۔ زیادہ امکان تو یہی تھا کہ طبی امداد نہ ملنے پر وہ یہاں پڑے پڑے ہی موت کا شکار ہو جائے گا۔ اس نے خاموشی سے دلیپ کی جیبوں کی تلاشی لی جس کے نتیجے میں ایک موبائل فون اس کے ہاتھ آ گیا۔ جدید ساخت کا یہ موبائل فون یقیناً باہر کی دنیا میں اپنے مددگاروں سے رابطہ رکھنے کا ان کا واحد ذریعہ تھا۔

”یہ موبائل ملا ہے۔ ہم چاہیں تو اس کے ذریعے باہر کسی سے رابطہ کر کے مدد منگو سکتے ہیں۔“ وہ موبائل ہاتھ میں لیے پرجوش سا سونیا کے پاس آ گیا۔

”نہیں۔ ہمیں اس موبائل کو ہرگز بھی استعمال نہیں کرنا ہے۔ اسے آف کر دو۔“ سونیا نے سرد لہجے میں اسے حکم دیا۔

”لیکن کیوں.....؟ یہاں ہم سمیت اتنی ساری انسانی جانیں داؤ پر لگی ہیں۔ باہر سے مدد آگئی تو ہم آسانی سے یہاں سے نکل جائیں گے۔“ اس نے فرمانبرداری سے حکم ماننے کے بجائے بحث کی۔

”کے..... کسے بلوادی گے تم اپنی مدد کے لیے؟“ سونیا نے پھنکارنے والے انداز میں اس سے سوال کیا۔

”کسی کو بھی..... ہم کسی کو بھی بلا سکتے ہیں۔ تم اپنے ساتھیوں میں سے کسی کو بلانا مناسب سمجھو تو انہیں..... ورنہ انڈین پولیس سے رابطہ کر سکتے ہیں ہم۔“

”ہم کسی کو نہیں بلا سکتے۔ اگر میں نے اس موبائل سے اپنے ساتھیوں سے رابطہ کیا تو بعد میں ان کے اور ہمارے لیے مسئلہ بن جائے گا اور اگر پولیس یہاں آگئی تو ہم مصیبت میں پڑ جائیں گے۔ اب ہماری حیثیت عام یرغالیوں کی سی نہیں رہی۔ پولیس آئے گی اور تفصیلات جانے گی تو اسے ہمارے بارے میں بھی تجسس ہوگا کہ ہم کون ہیں جنہوں نے اتنے سارے مسلح افراد کو زیر کر لیا۔ تم یہ جوشان سے اے کے 47 اٹھا کر پھر رہے ہو، پولیس کو کیا جواب دو گے کہ تمہیں اور مجھے اتنا جدید اسلحہ کیسے استعمال کرنا آتا ہے؟“ سونیا ایک ایک لفظ چبا کر بول رہی تھی۔ بات کے اختتام پر اس نے چہت کے خلا کی طرف ایک برسٹ چلایا اور تیزی سے اپنی جگہ بدلی۔ محاذ نے بھی اس کی پیروی کی اور یہ ان کے لیے بہت کارگر ثابت ہوا کیونکہ ان کے ہتھے ہی عین اس جگہ گولیوں کی بوچھاڑ آئی تھی جہاں لمحہ بھر قبل وہ موجود تھے۔

”وہ صرف دو ہیں۔ ہم انہیں قابو کر سکتے ہیں۔“ محاذ

اندھیرے سے ہم آہنگ نہیں کر سکے گا چنانچہ اسے نصیحت کی اور خود ریگتا ہوا سونیا تک پہنچا۔ اب وہ جلدی جلدی سرگوشی میں اپنے منصوبے کے متعلق ضروری تفصیلات سے آگاہ کر رہا تھا۔

”اس میں تمہارے لیے رسک ہو سکتا ہے۔“ سونیا نے فکر مندی کا مظاہرہ کیا۔

”میری زندگی ویسے بھی مسلسل رسک پر ہی ہے۔“ اس کے لہجے میں زہرا ترا۔

”اوکے! جیسا تم کہو۔“ سونیا نے اس سے مزید بحث نہیں کی۔

”تم چھت کی طرف قائر کرنا، میری ساتھی دروازے کی طرف قائر کرے گی۔“ معاذ نے ساتھ آئے لڑکے سے کہا اور خود تیزی سے اندھیرے میں ریگ گیا۔ باہر سے فی الحال قائرنگ نہیں کی جا رہی تھی۔ یہ بات واضح تھی کہ باہر والوں کی پوزیشن اسلحے کے معاملے میں ان سے کمزور تھی۔ وہ صرف دو تھے اور ان کے پاس اپنی گولیوں کے علاوہ زیادہ سے زیادہ اپنے اس ساتھی کی گن ہو سکتی تھی جو ابتدا میں ہی گولیوں کا نشانہ بن گیا تھا جبکہ خود ان کے پاس چھ عدد گنز موجود تھیں جن کے بے شمار اڈنڈا بھی باقی تھے۔

”اسٹارٹ۔“ دروازے کے قریب دیوار کی جڑ میں جگہ سنبھالنے کے بعد اس نے جیسے ہی تیز سرگوشی کی، سونیا اور ان کے مددگار لڑکے کی گنز کے دہانے کھل گئے۔ تاہم توڑ برستی ان گولیوں کا باہر سے جواب دیا جانے لگا۔ چھت کے خلا کی گمرانی کرنے والے شخص کی پوزیشن ایسی نہیں تھی کہ وہ نیچے سے گولیاں برسائے جانے پر خود نیچے موڑ قائر کر سکتا۔ خود کو محفوظ رکھنے کے لیے لازمی تھا کہ وہ اس خلا سے دور رہتا اور دور درہ کر وہ جو قائر کر رہا تھا، اس کی حیثیت ہوائی قائرنگ سے زیادہ نہیں تھی۔ دروازے سے البتہ خطرناک قائر آرہا تھا لیکن وہ لوگ اس اعتبار سے خوش قسمت تھے کہ انہیں ہال میں موجود چوڑے ستونوں کی آڑ میں تھی۔ اندھیرا بھی اہم معاون کا کردار ادا کر رہا تھا چنانچہ اندر تک رسائی حاصل کرنے والی گولیاں دیواروں اور ستونوں کا پلاسٹر اکھاڑنے سے زیادہ کچھ نہیں بگاڑ پا رہی تھیں۔

معاذ کی ہدایت کے مطابق سونیا اور ساتھی لڑکا چالیں پچاس سیکنڈ تک بہت زوردار قائرنگ کرتے رہے پھر یکدم رک گئے۔ ان کی گنیں خاموش ہو گئیں تو معاذ کے حساس کانوں نے فوراً ہی محسوس کر لیا کہ باہر سے بھی قائر کا ہوا ہے۔ یہ وہی خوش قسمت لمحہ تھا جو اسے درکار تھا اور خوش قسمتی

سے پہلی بار میں ہی میسر آ گیا تھا۔ باہر موجود شخص کو اس کے اندازے سے بہت پہلے ہی میگزین بدلنے کی ضرورت پیش آ گئی تھی۔ اس نے اس مختصر لمحے کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور سانپ کی سی تیزی سے باہر ریگ گیا۔ باہر نکل کر اس نے دیوار کے ساتھ ساتھ رینگتے ہوئے تیزی سے دروازے سے اپنا فاصلہ بڑھایا اور دل ہی دل میں گنتی بھی گنتا رہا۔ جیسے ہی وہ دس پر پہنچا، اندر سے پھر قائرنگ کا آغاز کر دیا گیا۔ سونیا کی ٹائٹنگ زبردست تھی اور وہ پوری طرح طے شدہ حکمت عملی پر عمل کر رہی تھی۔

اندر سے قائر آیا تو باہر والے پر بھی جواب دینا واجب ہو گیا۔ اندھیرے میں ہر سمت کی گمرانی کرتی معاذ کی چوکنٹا ہوں نے فوراً ہی اس شخص کو تار لیا۔ وہ برآمدے کی آدمی ٹوٹی ہوئی دیوار کے پیچھے پناہ لیے ہوئے تھا اس لیے اندر سے کی جانے والی قائرنگ اس کا کچھ بھی بگاڑنے میں ناکام تھی۔ گولیوں کی گھن گرج میں معاذ حرکت میں آیا اور ایسے مقام تک پہنچنے کی سعی کرنے لگا جہاں سے اس شخص کو نشانہ بنانے کے لیے بہترین زاویہ مل سکے۔ گولیاں چلنے کی آواز اتنی شدید تھی کہ اسے اپنی حرکت سے پیدا ہونے والی کسی آہٹ کو سن لیے جانے کا زیادہ خطرہ نہیں تھا البتہ یہ خطرہ ضرور تھا کہ کوئی اندھی گولی اسے ہی نشانہ نہ بنا ڈالے لیکن رسک لیے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اس وقت وہ صرف اپنی نہیں ان پچاس کے قریب یرغالیوں کی زندگی کی بھی جگہ لڑ رہا تھا جن کی ساری امیدیں ان کی کامیابی سے وابستہ تھیں۔ وہ اس کے ہم وطن نہیں تھے، ہم مذہب نہیں تھے لیکن انسانیت کے... رشتے سے بندھے ہوئے تھے۔ اس ازلی رشتے، ازلی بندھن کو نبھانے کے لیے اسے اپنی جان کی بازی لگانے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوا اور وہ خود کو ایک ایسے مقام تک لے گیا جہاں وہ اندر سے آتی گولیوں کی زد میں آ سکتا تھا لیکن مقابل کو نشانہ بنانے کے لیے وہ مقام بہترین تھا۔ اس جگہ پہنچ کر اس نے ایک ٹائپ کی بھی تاخیر نہیں کی۔ اس کے ہاتھ میں موجود پیسا میراگل اے کے 47 نے انسانی جسم میں انکار سے دھکا دینے والا سیسہ اگلا اور دروازے کی اوٹ میں مور جا سنبھالے بیٹھے سائے کی کھوپڑی کے پرچے اڑ گئے۔ وہ بغیر کھوپڑی کے اس جسم کے گرنے کا منظر پوری طرح نہیں دیکھ سکا کہ دو انگڑوں نے اس تک بھی رسائی حاصل کر لی تھی۔ عین خدشے کے مطابق وہ اندر سے آتی گولیوں کا نشانہ بن گیا تھا۔

☆☆☆

سبحان اللہ

ایک روز خلیفہ متوکل نے کسی پرندے کو نشانہ باندھ کر تیر مارا لیکن تیر خطا گیا۔ ایک عربی نے جب یہ منظر دیکھا تو کہا۔ ”سبحان اللہ۔“

خلیفہ نے مڑ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا تجھے نہیں معلوم کہ خدا نے ایسی جھوٹی تعریف کی ممانعت کی ہے؟“

عربی نے جواب دیا۔ ”میں نے آپ کی نہیں، بچانے والے کی تعریف کی ہے۔“

(مرسلہ: ریاض ہٹ، حسن ابدال)

انسان

خواجہ حسن بھرتی فرماتے ہیں۔ ”بھیر بکریاں انسانوں سے زیادہ باخبر ہوتی ہیں کیونکہ چرواہے کی ایک آواز پر چرنا چھوڑ دیتی ہیں اور انسان اپنی خواہش کی خاطر احکام الہی کی بھی پروا نہیں کرتا۔“

(مرسلہ: وزیر محمد خان، بھل ہزارہ)

کے گلے سے لگا دہ پوری طرح محسوس کر رہا تھا۔

”تمہاری صورت دیکھ کر تو ادا صداقت کے نہ آنے کا شکوہ بھی دل سے مٹ گیا ہے۔ انہوں سے ملنے کی خوشی کیا ہوتی ہے، یہ کوئی میری طرح سارے خاندان سے کٹ کر رہنے والے بندے سے پوچھے۔“ وہ اسے سینے سے لگائے بولتے جا رہے تھے۔

”بابا سائیں بھی آپ کو بہت یاد کرتے ہیں، چاچا سائیں! لیکن اپنی طبیعت کی خرابی اور کچھ دوسرے مسائل کی وجہ سے چاہتے ہوئے بھی نہ آ سکے۔“ اس نے اپنی طرف سے ان کی دجھوٹی کی کوشش کی۔

”وضا حیس نہ دے پٹ! میں نے کھانا کہ تمہاری صورت دیکھ کر میرے دل سے سارے شکوے ہی مٹ گئے ہیں۔“

”ہمیں بھی تو مہمان سے ملنے کا موقع دیں اہاجی! آخر ہماری بھی کوئی رشتے داری بنتی ہے ان سے۔“ آنکھوں میں خوش آمدید کہنے والے تاثرات لیے کھڑے

”ماشاء اللہ پٹ! ماشاء اللہ۔ تم تو بالکل ادا صداقت کی جوانی کی تصویر ہو۔ وہ بھی جوانی میں بالکل ہیرو لگا کرتے تھے۔“ وہ سکل، اس کے بچے اور سرمد کی معیت میں دہلی انٹرپورٹ پر اترتا تو اپنے استقبال کے لیے آئے ہوئے پورے قافلے کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس قافلے میں شامل سب سے عمر رسیدہ صاحب نے اسے گلے لگا کر یہ تعریفی کلمات ادا کیے تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ مسکراہٹ صرف اس کے لبوں پر نہیں تھی، وہ ان کے استقبال کے لیے آئے ہوئے ہجوم کے ہر فرد کے ہونٹوں پر بکھری ہوئی تھی۔ اس نے یکدم ہی خود کو بہت ہلکا پھلکا اور پرسکون محسوس کیا۔ پچھلے کئی ماہ سے وہ اپنے خاندان سمیت جن الجھنوں میں گھرا ہوا تھا، ان سے دوری کا احساس رگ و پے میں طمانیت بن کر دوڑنے لگا۔ اس خوشگوار ماحول نے جیسے چپکے سے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

”بھول جاؤ وہ دشمنی اور انتقام کے سلسلے، وہ جامد اد کے گمبیر مسائل اور وہ گدا گروں کے ساتھ ہونے والا خونیں معرکہ۔“ اس معرکے میں جس طرح وہ اچانک پھنسے تھے ویسے ہی اچانک نکلنے میں کامیاب بھی ہو گئے تھے۔ چھت سے کود کر راہ فرار اختیار کرنے پر انہیں تھوڑی سی تکلیف تو اٹھانا پڑی تھی لیکن پھر مقامی ذمے داروں سے رابطہ ہو جانے پر سب آسان ہو گیا تھا اور صداقت شاہ کے حوالے کی وجہ سے اسے اور سرمد کو کسی قسم کی زحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ اسے اس کی گاڑی بھی واپس مل گئی تھی۔ البتہ چند سرسری اخباری خبروں کے علاوہ اس واقعے سے متعلق تفصیلات کا علم نہیں ہو سکا تھا۔ صداقت شاہ نے حکماً اسے اس سارے معاملے سے الگ رہنے پر مجبور کر دیا تھا اور خود سب کچھ نمٹا لینے کا عندیہ دے کر اسے سکل سمیت انڈیا روانہ کر دیا تھا۔ پتا نہیں کیسے لیکن اس وقت خود اس کا دل بھی یہی چاہا تھا کہ خود کو اب مزید کسی الجھن میں نہ ڈالے۔ سکل کا گھر اجاڑنے کے تقریباً سارے ہی ذمے دار اپنے انجام کو پہنچ گئے تھے اور اس معاملے سے جڑے بس کچھ مسائل ہی باقی رہتے تھے جن سے بعد میں بھی نمٹا جاسکتا تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ ان کی واپسی تک صداقت شاہ خود ہی ان مسائل کو حل کر چکے ہوتے۔ بہن کی سونی زندگی اور معاذ کی معامین جانے والی گمشدگی، دو ایسی تکالیف تھیں جنہیں وہ کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتا تھا لیکن اس درد مسلسل کے باوجود بہر حال اسے اس وقت خوشگواریت کا احساس ہو رہا تھا۔ شاید یہ اس محبت اور غلوں کا اثر تھا جس کو اپنے رشتے کے چچا

بہت سے مرد و زن میں سے ایک تقریباً عالم شاہ کے ہم عمر لڑکے نے نیاز شاہ کو شوخ لہجے میں ٹوکا تو وہ قدرے جھینپ گئے لیکن سینہ تان کر بولے۔

”تیری ساری رشتے داری میرے دم سے ہے پٹا جی! میں اس کا چچا ہوں تب ہی تو رشتے داری کا دعویٰ کرنے کے لائق ہے۔ بہتر ہے کہ مجھے ٹوکنے کے بجائے تو صبر سے اپنی باری آنے کا انتظار کر۔“ بیٹے پر رعب بھانے کے باوجود وہ عالم شاہ سے الگ ہو گئے تھے اور باری باری اپنے اہل خانہ سے تعارف کروا رہے تھے۔ وہ کثیر العیال آدمی تھے۔ پانچ بیٹوں اور تین بیٹیوں پر مشتمل ان کا خاندان بچوں کی شادیوں کے بعد مزید پھیل گیا تھا اور استقبالیہ ہجوم میں بہوؤں اور دامادوں کے علاوہ نواسا، نواسی اور پوتے بھی شامل تھے۔ عالم شاہ اور سہیل خوش دلی سے ایک ایک سے ملنے لگے۔ سہیل کو بھی نیاز چچا نے بہت دیر تک سینے سے لگا کر دعائیں دیں۔ اس کے ساتھ ہونے والی ٹریجڈی کا انہیں بھی علم تھا اور انہوں نے خود صداقت شاہ کو یہ تجویز دی تھی کہ سہیل کو کچھ عرصے کے لیے اس ماحول سے نکال دیا جائے۔ انہیں امید تھی کہ شادی والے گھر کی گہما گہمی میں اسے اپنے دل کو بہلانے کا موقع مل جائے گا۔

”میرا خیال ہے اباجی، اب روانہ ہوا جائے۔ اچھا خاصا طویل سفر ہے۔ حویلی پہنچنے پہنچتے دیر ہو جائے گی۔“ نیاز شاہ کے سب سے بڑے بیٹے نے انہیں مودبانہ ٹوکا۔

”بات تو تیری بالکل ٹھیک ہے پٹ! چلو چلتے ہیں۔“ باقی کی باتیں حویلی پہنچ کر ہوتی رہیں گی۔“ انہوں نے فوراً بیٹے کی تائید کی۔

”حویلی پہنچنے تک جو عین ساڑھے تین گھنٹے کا وقت لگے گا اسے آپ کیوں بھول رہے ہیں اباجی۔ اس وقت سے بھی خوب فائدہ اٹھائیے گا۔ آخر کو آپ اپنے بیٹے کو اپنی گاڑی میں لے جانے والے ہیں۔“ نیاز شاہ کے چھوٹے بیٹے جس کا نام انہیں فیصل معلوم ہوا تھا، ایک بار پھر انہیں چھیڑنے والے انداز میں کہا۔ فیصل ہی وہ لڑکا تھا جس کی شادی میں شرکت کے بہانے وہ لوگ یہاں آئے تھے۔ وہ مزاج کا خاصا شوخ معلوم ہوتا تھا اور شاید اپنے والد کا لاڈلا بھی تھا اس لیے مزے سے ان کے ساتھ ہنسی مذاق کر رہا تھا۔

”جی بھر کر چھک لود پور جی! تمہارے پاس گنتی کے چند دن ہی ہیں یوں چپھانے کے لیے پھر دیکھنا آنے والی گیسپی بولتی بند کرتی ہے۔“ فیصل کی ایک بھانج نے شوخی

سے اسے چھیڑا۔

”یہ تو ٹھیک کہا آپ نے۔ میرا انجام بھی اپنے بھیا کا سا ہونے والا ہے۔ میں بھی جلد ان کے برابر میں اداس بلبل کی سی شکل بنائے بیٹا نظر آؤں گا۔“ اس کے چہرے پر چھائی مصنوعی مسکندہ نے سب ہی کو قہقہہ لگانے پر مجبور کر دیا۔ یہاں تک کہ معتم شاہ کی وفات کے بعد بالکل چپ اور گم صم رہنے والی سہیل بھی دھیرے سے مسکرا دی۔

”ارے وہ اجالا کی ہنسی کہاں ہے؟ اگر پورٹ پہنچنے کے بعد سے میں نے اس کی شکل نہیں دیکھی۔“ فیصل کے دوسرے نمبر کے بھائی عقل کو خیال آیا تو انہوں نے ادھر ادھر نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

”کہہ رہی تھی پیاس لگ رہی ہے، کولڈ ڈرنک پی کر آتی ہوں۔“ عقل کی بیوی نے اسے مطلع کیا۔

”بلو اڈاسے۔ دیر ہو رہی ہے۔“ عقل نے بیوی کو حکم دیا تو وہ موہائل پر مصروف ہو گئی۔

”کہہ رہی ہے ابھی پانچ منٹ میں آتی ہوں۔ کوئی سہیلی مل گئی ہے محترمہ کو، اس کے ساتھ مصروف ہیں۔“ کال سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے سب کو آگاہ کیا۔

”سہیلیوں کی پوری فوج پال رکھی ہے میڈم نے۔ ہر جگہ کوئی نہ کوئی سہیلی مل جاتی ہے اور جہاں نہ ملے وہاں وہ خود بنا لیتی ہے۔“ فیصل نے سن کر تبصرہ کیا۔

”ایسا کرو، تم سب روانہ ہو جاؤ۔ اجالا آ جاتی ہے تو ہم بھی نکل جائیں گے۔“ نیاز شاہ نے اہل خانہ کی طرف دیکھتے ہوئے تجویز پیش کی پھر عالم شاہ کی طرف رخ کرتے ہوئے بولے۔

”سہیل کو تو پہلے ہی صالہ اور صبیحہ نے اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھانے کا فیصلہ کر رکھا ہے۔ تم سفر سے ٹھکے ہوئے آئے ہو، میرے ساتھ انتظار میں خوار ہونے کے بجائے چاہو تو اپنے بھائیوں میں سے کسی کے ساتھ روانہ ہو جاؤ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میری صاحبزادی صاحبہ کے پانچ منٹ اگر جلدی بھی پورے ہو گئے تو کم سے کم آدھا گھنٹا تو لگ ہی جائے گا۔“

”کوئی مسئلہ نہیں ہے چاچا! میں آپ کے ساتھ انتظار کر لوں گا۔ سفر آرام دہ تھا اور مجھے ذرا بھی تھکن نہیں ہوئی۔“ عالم شاہ نے فرمانبرداری سے انہیں جواب دیا۔

”جیتے رہو پٹ!“ انہیں اس کا جواب پسند نہ آیا۔ آہستہ آہستہ سب وہاں سے روانہ ہو گئے۔ روانہ ہونے والوں میں سہیل اور سرد بھی شامل تھے۔ اب صرف وہ گاڑی رہ گئی تھی

جس میں عالم شاہ کو نیاز شاہ کے ساتھ جانا تھا۔ بڑی گاڑی ہونے کی وجہ سے ان لوگوں کا زیادہ تر سامان اسی گاڑی میں رکھوایا گیا تھا لیکن گاڑی کی ڈرائیور محترمہ اجالا جو کہ نیاز شاہ کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی، ہنوز منتر سے غائب تھی۔

”اجالا کی پیدائش پر اس کی ماں کا انتقال ہو گیا تھا اس لیے میں نے اسے اپنے دوسرے بچوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی لاڈ پیار اور محروں سے پالا ہے۔ سب کے خیال میں اس کے بے جالا ڈاٹھا کر میں نے اس کا دماغ خراب کر دیا ہے لیکن میں اس کے معاملے میں بے بس ہوں۔ اپنی طرف سے تو میں نے اس کی کوپورا کرنے کی کوشش کی ہے جو ماں کے نہ ہونے کی وجہ سے اس بے چاری کو سہنی بڑی ہے۔“ گاڑی کا انٹرکنڈیشنر چلا کر عالم شاہ کے ساتھ پچھلی نشست پر براجمان ہو جانے والے نیاز شاہ نے اسے آگاہ کیا۔

”آپ سمجھ دار ہیں چاچا سائیں اور مجھے یقین ہے کہ آپ نے جو کچھ کیا، مناسب ہی کیا ہوگا۔“ عالم شاہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ کچھ دلگرفتہ ہیں اس لیے اپنی طرف سے انہیں اخلاقی سہارا دینے کی کوشش کی۔

”میں اجالا کے معاملے میں بہت جذباتی ہوں۔ میں نے اپنی محبوب بیوی کو کھو کر اسے پایا ہے اور ہمیشہ اس کے وجود سے اپنے غمزدہ دل کو بہلانے کی کوشش کی ہے۔ جذبات میں انسان سے بہت سی غلطیاں بھی ہو جاتی ہیں لیکن مجھے امید ہے کہ میری بیٹی کبھی میرا سر نیچا نہیں ہونے دے گی۔“ وہ ایک طرح سے اس کے روبرو اعتراف کر رہے تھے کہ انہوں نے واقعی بیٹی کے بے جالا ڈاٹھائے ہیں۔

”اللہ سائیں آپ کے یقین کو ضرور قائم رکھے گا۔“ عالم شاہ اس کے سوا اور کچھ بھی کیا سکتا تھا۔ وہ پہلی بار اپنے ان رشتے داروں سے مل رہا تھا اور اسے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ ان کے گھر کا ماحول کیسا تھا۔ وہاں کیا غلط ہو رہا تھا اور کیا صحیح۔ اسے ان لوگوں کے بارے میں صرف اتنی معلومات تھیں کہ نیاز شاہ کے والد فیاض شاہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص تھے اور انہوں نے اپنے لیے زمینداری کے بجائے سرکاری نوکری کا انتخاب کیا تھا۔ قیام پاکستان کے وقت وہ ایک اعلیٰ انتظامی عہدے پر کام کر رہے تھے اور تقسیم کے وقت انہوں نے اپنے آبائی علاقے واپس آ جانے کے بجائے اپنی ملازمت برقرار رکھتے ہوئے تقسیم شدہ ہندوستان میں ہی رہنے کو ترجیح دی تھی۔ بعد میں انہوں نے ایک ایسی انگریز خاتون سے شادی کر لی تھی جو جنگ عظیم دوم شروع ہو جانے

پر نقل و حمل کے ذرائع بند ہو جانے کے باعث ہندوستان میں ہی رکنے پر مجبور ہو گئی تھیں۔ انگریز بیوی سے جنم لینے والی فیاض شاہ کی اولاد میں سے اب صرف نیاز شاہ ہی حیات تھے اور ان ہی کے دم سے دو الگ الگ ریاستوں میں مقیم اس خاندان کے افراد میں ابھی تک رابطے قائم تھے۔ شاید نیاز شاہ چاہتے تھے کہ یہ رابطے اگلی نسل میں بھی قائم رہیں اسی لیے عالم شاہ اور محل کے استقبال کے لیے پورے خاندان کو ان پورٹ اٹھالائے تھے۔

”سوری اباجی! تھوڑی دیر ہو گئی۔ وہ میری سہیلی شادرا ہے نا جس کا پچھلے مہینے بیاہ ہوا تھا، وہ مل گئی تھی۔ بس اس سے باتوں میں وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔“ وہ اپنے ذہن میں نیاز شاہ کے خاندان کے بارے میں معلومات کو دہرائی رہا تھا کہ ایک کھکتی ہوئی آواز سن کر چونک گیا۔ اس کے سامنے جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس ایک شوخ و چٹھل سی لڑکی موجود تھی جو اپنے شوذر کٹ پالوں کو ایک ادا سے جھٹکتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ رہی تھی۔

”یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بیٹا! ہم تو تمہاری اس روٹین کے عادی ہیں لیکن تم نے مہمان کو بھی نہیں بخشا۔ تمہیں سوری مجھ سے نہیں، عالم شاہ سے کرنا چاہیے۔“ نیاز شاہ نے بیٹی کو ٹوکا۔

”اوہ..... ہیلو کزن!“ اس نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے اپنا رخ موڑا اور یوں عالم شاہ کی طرف دیکھا جیسے ابھی ابھی اس کی گاڑی میں موجودگی سے باخبر ہوئی ہو۔

”ہیلو!“ عالم شاہ کو اس کا یہ بے نیازانہ انداز کھلا، سو محض ”ہیلو“ کہنے پر ہی اکٹفا کیا۔

”آئی ایم سوری۔ آپ کو میری وجہ سے تکلیف اٹھانا پڑی۔“ اس کے الفاظ ضرور معذرت خواہانہ تھے لیکن ناک سکڑ کر بے پردا لہجے میں الفاظ ادا کرنے کا انداز ہرگز بھی معذرت خواہانہ نہیں تھا۔

”اٹس اوکے۔“ عالم شاہ نے بھی اس کا انداز اختیار کیا اور بظاہر اس کی معذرت قبول کر لی لیکن لہجہ روکھائی تھا۔

”اب ٹھیک ہے اباجی! اب ہم چلیں؟“ اس کے نزدیک گویا عالم شاہ کے لہجے کی رکھائی کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی اور وہ باپ کو خوش کرنے کے لیے ایک رکی کارروائی نمشا کر فارغ ہو گئی تھی۔

”ہاں بیٹا چلو۔ ہم ویسے ہی سب سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔“ نیاز شاہ کے نزدیک بھی گویا اس کی یہ رکی سی معذرت ہی کافی تھی۔

”پچھے رہ گئے ہیں تو کوئی بات نہیں۔ میں ابھی گاڑی کو پلین بنا دیتی ہوں۔“ اس نے شوخی سے جواب دیتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کی۔

”نہ نہ میری سوہنڑی دھی! یہ گاڑی سڑک پر چلنے والا ڈھانسی ٹھیک ہے۔ اسے جہاز مت بنا نا ورنہ تیرا یہ ابا جی ابھی دل پکڑ لے گا۔“ نیاز شاہ نے گھبرا کر اسے ٹوکا تو اس نے لطف لینے والے انداز میں قہقہہ لگایا لیکن غیبت یہ رہی کہ گاڑی کی رفتار مارل ہی رکھی اور نیاز شاہ کے دل پکڑنے کی نوبت نہ آئی۔

”ذرا زیادہ لاڈ پیار میں پلی ہے اس لیے تھوڑی سی بگڑی ہوئی ہے۔“ نیاز شاہ نے عالم شاہ کی طرف دیکھتے ہوئے تھوڑے جھینپے ہوئے انداز میں صفائی دی۔ وہ ان کی خاطر مردانہ مسکرا دیا لیکن اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ تھوڑی سی نہیں کافی بگڑی ہوئی ہے۔ یہ بات تو اس نے اتر پورٹ پر ہی محسوس کر لی تھی کہ نیاز شاہ کے خاندان کا رہن سہن ان کے مقابلے میں بہت زیادہ ماڈرن اور کھلا ڈالا ہے۔ ان کے ہاں خواتین کو اگرچہ تمام بنیادی سہولیات اور حقوق حاصل تھے لیکن وہ ایک خاص حد میں رہتی تھیں اور پردے کی پابند تھیں۔ اس کے مقابلے میں یہاں خواتین میں سے کسی ایک کو بھی اس نے باپردہ نہیں دیکھا اور یہ اجالا نامی موصوفہ تو سب سے بڑھ کر ماڈرن دکھائی دیتی تھیں۔ حلیوں کے علاوہ وہ لوگ بات چیت میں بھی ان سے مختلف تھے۔ ان کی بول چال میں سندھ کا مخصوص رنگ نہیں بلکہ دہلی کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ یہ مستقل یہاں کی سکونت اور غیر خاندانوں میں شادی بیاہ کا نتیجہ تھا۔ حقیقتاً نیاز شاہ کے خاندان کا ان کے خاندان سے بس خون کا رشتہ باقی رہ گیا تھا۔ باقی وہ لوگ ایک دوسرے سے قطعی مختلف تھے۔

”بھوارے نے زمین ہی کو دو ٹکڑے نہیں کیا، بے شمار خاندان بھی بانٹ ڈالے۔ ہمارے جیسے کتنے خاندان ایسے ہیں جو خون کے انوٹ رشتے کے باوجود زمین کے دو ٹکڑوں پر ایک دوسرے سے بے نیاز جی رہے ہیں۔ بڑا نقصان کیا سینا کیس کے بھوارے نے۔“ سارے تاریخی اور معاشرتی حقائق کو پس پشت ڈالے نیاز شاہ ایک مخصوص طبقے کی سوچ کا اظہار کرتے ہوئے گویا قیام پاکستان کو ”مظلمی“ قرار دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ عالم شاہ کو برا لگا لیکن وہ کسی بحث میں الجھنا نہیں چاہتا تھا اس لیے خاموش ہی رہا۔

”اب یہی دیکھ لو کہ اتنے قریبی رشتے کے باوجود میری اور ادا لیاقت کی گنتی کی چند ملاقاتیں ہی ہوئی ہیں۔

میں ایک بار نو جوانی میں اماں اور ابا کے ساتھ پاکستان گیا تھا اور ایک بار ادا صداقت تایا جی کے ساتھ میری شادی میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ ملک ایک ہوتا تو ایسا تھوڑی ہوتا۔ ہم ہر خوشی کمی کے موقع پر ایک دوسرے سے ملاقات کیا کرتے لیکن.....“ انہوں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر ایک سرد آہ بھری۔

”انسان ملنے کی کوشش کرے تو قاصدوں کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے چاچا سائیں! آپ اور بابا سائیں صاحب ثروت لوگ ہیں۔ آپ تو جب چاہتے آپس میں مل سکتے تھے اور اب بھی مل سکتے ہیں۔“ خود کو روکتے روکتے بھی وہ نیاز شاہ کی باتوں پر ایک تنقیدی تبصرہ کر ہی گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان اجالا جوان کی گفتگو سے بے نیاز چہوٹم چباتی پوری توجہ سے ڈرائیونگ کر رہی تھی، بیک ویو مرر میں اسے گھورنے لگی۔ اس نے اس کے گھورنے کو محسوس کر لیا لیکن چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا۔

”تم اپنی جگہ ٹھیک کہہ رہے ہو بیٹا، لیکن دولت ہر مسئلے کا حل نہیں ہوتی۔ دو الگ الگ ملکوں کے بہت مسائل ہوتے ہیں۔ خاص طور پر ایسی صورت میں کہ دونوں ممالک ایک دوسرے کے دشمن بھی ہوں۔ شروع میں ہم ابا جی کی سرکاری ملازمت کی وجہ سے وہاں نہیں جا پاتے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ایک بار گئے پھر ابا جی بیمار رہنے لگے اور ان میں سفر کی ہمت نہیں رہی۔ ادھر تایا جی کا انتقال ہو گیا اور ادا صداقت سیاست کی بھول بھلیوں میں پھنس کر رہ گئے۔ میں بھی اپنے خاندان کے مسائل میں الجھ گیا اور چاہتے ہوئے بھی کبھی پاکستان نہیں جاسکا لیکن تم لوگ ہمیشہ میرے دل میں رہے جب ہی تو میں نے فیصل کی شادی کے موقع پر ادا صداقت اور تم لوگوں کی شرکت پر اتنا اصرار کیا تھا۔“ نیاز شاہ وضاحت دینے لگے۔

”فیصل کی شادی کہاں کر رہے ہیں آپ؟ غیر لوگ ہیں یا عزیز واقارب میں ہی کہیں رشتہ طے کیا ہے؟“ اس نے قصداً گفتگو کا موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

”ایک دوست کی بیٹی ہے۔ اچھے سلمے ہوئے لوگ ہیں اور تعلقات اتنے ہیں کہ کوئی رشتہ نہ ہو کر بھی رشتے دار ہی محسوس ہوتے ہیں۔“

”دوستی کا رشتہ بھی کوئی معمولی نہیں ہوتا چاچا سائیں! بلکہ بعض اوقات تو یہ رشتہ خونی رشتوں پر بھی بازی لے جاتا ہے۔“ نیاز شاہ کی بات پر کچے گئے اپنے اس تبصرے نے خود اس کے دل پر ہی گھونسا دے مارا۔ معاذ بھی تو اس کا

دوست تھا لیکن وہ دوستی کے اس رشتے کو پوری طرح نہیں نباہ سکا تھا۔ کبھی صداقت شاہ کی جذباتی بلیک میلنگ سے ہار گیا تھا تو کبھی خاندانی مسائل میں الجھ گیا تھا۔ ان مسائل میں سبیل اور معظم شاہ کے اغوا کا معاملہ بھی شامل تھا اور کیا ستم تھا کہ سبیل اور معظم کی رہائی میں معاذ نے ہی سب سے اہم کردار ادا کیا تھا۔ اسے آخری بار معاذ کو دیکھنا بھی یاد تھا۔ اس نے اسے بے تماشا فائرنگ اور دھماکوں کے درمیان دھواں دھواں ماحول میں دیکھا تھا اور صاف ظاہر تھا کہ وہ اس سارے ہنگامے کا حصہ ہے۔ اس دید نے جہاں اسے معاذ کے زندہ ہونے کی خوشی بخشی تھی، وہیں وہ الجھ کر بھی رہ گیا تھا کہ معاذ کن لوگوں اور کن حالات کے درمیان پھنسا ہوا تھا اور کیا کرتا پھر رہا تھا۔ اس واقعے کے بعد اسے معاذ کے بارے میں کوئی اور خبر نہیں مل سکی تھی۔

”کن خیالوں میں کھو گئے بیٹا؟“ نیاز شاہ نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر ہلکا سا دباؤ ڈالا تو وہ سبک رفتار سے دوڑتی گاڑی کے ماحول میں واپس آ گیا۔

”میں تم سے جوس پینے کا پوچھ رہا تھا۔ ابھی کافی راستہ باقی ہے۔ جوس پی لو تو خود کو فریش محسوس کرو گے۔“ اسے متوجہ پا کر نیاز شاہ نے ایک ٹن پیک اس کی طرف بڑھایا۔

”سوری امیں ذرا اپنے ایک بھڑے ہوئے دوست کے بارے میں سوچنے لگا تھا اس لیے میرا دھیان بٹ گیا تھا۔“ اس نے جوس کا ٹن تھاما اور دھیرے سے مسکرا کر اپنے غائب دماغ ہو جانے کی توجیہ پیش کی۔

”کون تھا وہ دوست اور کیسے بھڑ گیا تھا؟“ نیاز شاہ نے اپنے ہاتھ میں موجود ٹن کی سیل توڑی اور ایک ٹھونٹ لپٹے ہوئے قدرے دلچسپی سے پوچھا۔ یوں بھی راستہ لمبا تھا اور اس لیے راستے کو کاٹنے کے لیے آپس میں گفتگو ہی سب سے اچھا حل تھا۔

”معاذ نام تھا اس کا۔ بہت قابل اور اچھا لڑکا تھا۔ یونیورسٹی کے ایک ٹرپ پر دوستوں کے ساتھ گیا اور پھر ایسا غائب ہوا کہ آج تک اس کا کچھ پتا نہیں چل سکا۔ گھردلوں اور دوستوں نے اپنے اپنے طور پر کوشش کی اسے ڈھونڈنے کی لیکن کوئی بھی اس تک نہیں پہنچ سکا۔“ نیاز شاہ کو معاذ کے بارے میں بتاتے ہوئے اس کا دل بہت مغموم ہو چکا تھا۔ وہ جوابی دہلی انرپورٹ پر کھڑا زندگی کی تمام ٹھنیوں کو فراموش کر دینے کے بارے میں سوچ رہا تھا، عجیب سی ندامت میں گھرنے لگا۔ ساری مجبوریاں اپنی جگہ تھیں لیکن..... لیکن اسے دوست کو یوں فراموش نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس سے اس

قیمتی رشتے کو نبھانے میں کوتاہی ہو گئی تھی۔ وہ دوستی کا حق ادا نہیں کر سکا تھا اور اس رشتے کا مقروض ہی رہ گیا تھا۔ احساسِ ندامت نے ایک بار پھر اسے ماحول سے کاٹ ڈالا تھا اور وہ ایک کے بعد جوس کا دوسرا ٹھونٹ نہیں پی سکا تھا۔ گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ اچانک ہی رکی تو اس کے ہاتھ میں موجود ٹن میں سے جوس چھٹک پڑا۔ وہ تجربہ رکھتا تھا کہ ایسی بڑی اور لکڑی گاڑی میں بیٹھ کر یوں جھٹکا نہیں لگتا اس لیے چونک گیا اور پھر فوراً ہی وجہ بھی علم میں آ گئی۔ ایک گاڑی راستے پر ترچھی کھڑی ان کی گاڑی کا راستہ روکے ہوئے تھی اور چند مسلح نقاب پوشوں نے ان کی گاڑی کے گرد گھیرا ڈال رکھا تھا۔

”باہر آ سب، ہری اپ..... دیر نہیں ہونا چاہیے۔“ عالم شاہ کی جانب والی کھڑکی کا شیشہ توڑ کر ایک شخص نے اپنی گن کی ٹال اندر گھسائی اور چیخ کر حکم صادر کیا۔ ان کے پاس اس حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ دہلی کے مضامقات کی طرف جانے والا یہ راستہ سنسان پڑا تھا اور کہیں سے کوئی مدد ملنے کی امید نہیں تھی۔ کوئی آ بھی جاتا تو یقیناً اتنے مسلح افراد کو سامنے پا کر انجان بن کر نکل جانے میں ہی اپنا بھلا سمجھتا۔

”کون ہو تم لوگ اور کیا چاہتے ہو؟“ نیاز شاہ نے گاڑی سے اترنے میں پہل کر کے عالم شاہ اور اجالا کو بھی بیرونی پر مجبور کر دیا تھا لیکن اب غصے سے سرخ چہرہ لیے ان مسلح افراد سے مخاطب تھے۔

”جو ہم چاہتے ہیں، خود حاصل کر لیں گے۔ آپ جناب کا کام یہ ہے کہ خود بھی شانتی سے یہاں کھڑے رہیں اور ان دونوں کو بھی شانت رکھیں۔“ ان میں سے ایک نقاب پوش نے جو اپنے دراز قد اور ورزشی جسامت کی بنا پر اپنے سب ساتھیوں میں نمایاں تھا استہزاء سے لہجے میں جواب دیا اور فوراً ہی اجالا کی طرف رخ کرتے ہوئے بولا۔

”چابیاں دو لڑکی!“ اجالا جو گاڑی سے اترتے ہوئے چابیاں ہاتھ میں لے کر اتری تھی، ہونٹ کاٹتے ہوئے اس کے حکم کی بیرونی پر مجبور پائی گئی۔

”لے جگر! ذرا چیک تو کر کہ کتنا مال بھرا ہے ان بڑے لوگوں کی گاڑی میں۔“ اس نے اجالا کے ہاتھ سے چابیاں لے کر اپنے ایک ساتھی کی طرف اچھالیں۔

”یہ تم لوگ اچھا نہیں کر رہے ہو۔ میرے آ کی جی اور چیف سیکرٹری تک تعلقات ہیں۔ بہت جلد پکڑے جاؤ گے تم لوگ۔“ نیاز شاہ نے غصیلے لہجے میں اسے دھمکی دی۔ پاکستان سے آئے پیچھے کے سامنے ان حالات سے گزرنا

یقیناً ان پر بہت گراں گزر رہا تھا۔

”ہمارے دیش کی پولیس اور دوسرے لوگ اتنے باغیض ہوتے تو کیا کہنے تھے۔ آپ شوق سے جس کے پاس چاہیے جا کر رپورٹ کروائیے گا لیکن اس بات کا میں آپ کو چیلنج کرتا ہوں کہ آپ کے بڑے بڑے افسر دوست میری دھول کو بھی نہیں پہنچ سکیں گے۔“ وہ جیسے نیاز شاہ کے غصے سے لطف اندوز ہو رہا تھا جبکہ اس کے ساتھی اس دوران نہ صرف گاڑی کی ڈکی کھول کر وہاں سے عالم شاہ اور نکل کے سامان کے بڑے بڑے سوٹ کیس نکال چکے تھے بلکہ انہوں نے وہ بریف کیس بھی نکال لیا تھا جس میں رقم کے علاوہ اہم کاغذات وغیرہ بھی رکھے ہوئے تھے۔

”میں تمہیں آخری بار سمجھا رہا ہوں کہ یہ سب مت کرو۔ یہ میرے پاکستان سے آئے ہوئے بھتیجے اور بھتیجی کا سامان ہے اور میں اس سامان کی بازیابی کے لیے پورے دہلی کو ہلا ڈالوں گا۔“ نیاز شاہ کی رگوں میں دوڑتا جاگیرداروں کا خون اس وقت جوش کھا رہا تھا اور مغلوب ہونے کے باوجود وہ دھمکیوں پر دھمکیاں دے رہے تھے۔ عالم شاہ نے محسوس کر لیا تھا کہ اس غصے کے پیچھے اپنے تعلقات کے زعم سے زیادہ عالم شاہ کے سامنے اٹھائی جانے والی شرمندگی کا رفرما ہے ورنہ حقیقتاً وہ ان لوگوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ فی الحال تو بالکل بھی نہیں کیونکہ انہوں نے اس طرح ان تینوں کو اپنے خود کار ہتھیاروں کی زد میں لے رکھا تھا کہ ذرا سی غلط جنبش ان کے لیے بڑے نقصان کا سبب بن سکتی تھی۔

”پاکستان سے آئے بھتیجا بھتیجی؟ مطلب ہمارے دیش کے دشمن..... پھر تو ایسا کرتے ہیں ہم انہیں بھی اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ آشا ہے کہ آپ اپنے ان پیاروں کو چھڑانے کے لیے بھاری تاوان دینے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔“ اس نے یکدم ہی اجالا کی کلائی تمام کر اسے اپنی طرف کھینچا۔ اس کی اس حرکت پر اجالا کے لبوں سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ عالم شاہ نے عالم اضطراب میں اپنی جگہ سے حرکت کی لیکن فوراً ہی گردن سے آٹکنے والی گن کی نال نے اسے غیر متحرک ہونے پر مجبور کر دیا۔ نیاز شاہ کو البتہ کوئی مجبوری نہیں روک سکی تھی اور لاڈلی بیٹی کی کلائی ایک ڈاکو کے ہاتھ میں دیکھ کر وہ بے خطر اس پر جمپٹ پڑے تھے۔ جوش اپنی جگہ تھا لیکن ایک مسلح اور قوی شخص کے سامنے ان کے بوڑھے جوش کی کیا پیش چلنا تھی۔ اس نے اجالا کی کلائی چھوڑی اور غضب ناک انداز میں انہیں اپنے بازو کی گرفت میں لے کر گن کی نال ان کی کپٹی پر رکھ دی۔

جھمبر چڑھائے جانے کی مہیب آوازاں سب نے سنی۔

”نہیں..... پلیز نہیں!“ اجالا بے ساختہ یہی ہاتھ جوڑ کر اس شخص کے سامنے فریاد کناں ہوئی۔ وہ کچھ دیر اجالا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اسے دیکھتا رہا پھر آہستگی سے نیاز شاہ کی کپٹی پر سے گن کی نال ہٹانے کے ساتھ ساتھ انہیں اپنے بازو کی گرفت سے بھی آزاد کر دیا۔

”بریف کیس میں کیش کے علاوہ تم لوگوں کے کام کی کوئی چیز نہیں۔ بہتر ہوگا کہ تم لوگ کیش نکال کر بریف کیس میرے حوالے کر دو۔“ عالم شاہ کو اندازہ تھا کہ پاسپورٹ سمیت دیگر اہم کاغذات سے محروم ہو جانے کی صورت میں اسے بڑی خواری اٹھانا پڑے گی اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی اس ڈاکو کے سامنے لب کشا ہوا۔

”کیش سے ہم عیش کریں گے اور تمہاری خواری ہمارے من کو شافی دے گی اس لیے آئی سے نو.....“ وہ مذاق اڑانے والے لہجے میں بول کر واپس پلٹ گیا۔ عالم شاہ کی گردن پر رکھی گن کی نال بھی ہٹ گئی۔ وہ لوگ اپنی کارروائی مکمل کر کے واپس جا رہے تھے۔ عالم شاہ نے محسوس کیا کہ اس کو نشانے پر لیے کھڑے رہنے والے شخص نے غلطی کی ہے اور اس کے پیچھے سے نکل کر خاصی بے احتیاطی سے گاڑی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ شاید اپنے پاس گن کی موجودگی نے اسے اس زعم میں مبتلا کر دیا تھا کہ کوئی ان کی راہ میں آنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ اگر ان لوگوں نے بریف کیس کی واپسی کا مطالبہ پورا کر دیا ہوتا تو عالم شاہ کو جرأت کے اظہار کی ضرورت نہیں تھی لیکن اب وہ تھوڑا سا رسک لینے کو تیار تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی ایک بھر پور جست اسے اس شخص تک پہنچا سکتی ہے۔ وہ اس تک پہنچ جاتا تو اسے قابو میں بھی کر لیتا۔ ایک سیکنڈ کے اندر ہی یہ سارا حساب کتاب لگا کر اس نے خود سے چھ قدم آگے جاتے شخص پر چھلانگ لگانے کے لیے پرتو لے لیکن یکدم ہی اس کے پرکاٹ دیے گئے۔

”نو..... نیو۔“ یہ اجالا تھی جو جانے کیسے اس کے تہور بھانپ کر اس کے آگے دیوار بن کر کھڑی ہوئی تھی۔ عالم شاہ نے حیرت سے اس اسم بائسلی لڑکی کو دیکھا جو اس کے سامنے ڈٹ کر کھڑی ڈاکوؤں کو تحفظ فراہم کر رہی تھی۔

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر ہو جوان
کی داستان جو غلط کاروں کے لیے
غضب ناک تھا باقی واقعات اینڈ ماہ پڑھیے



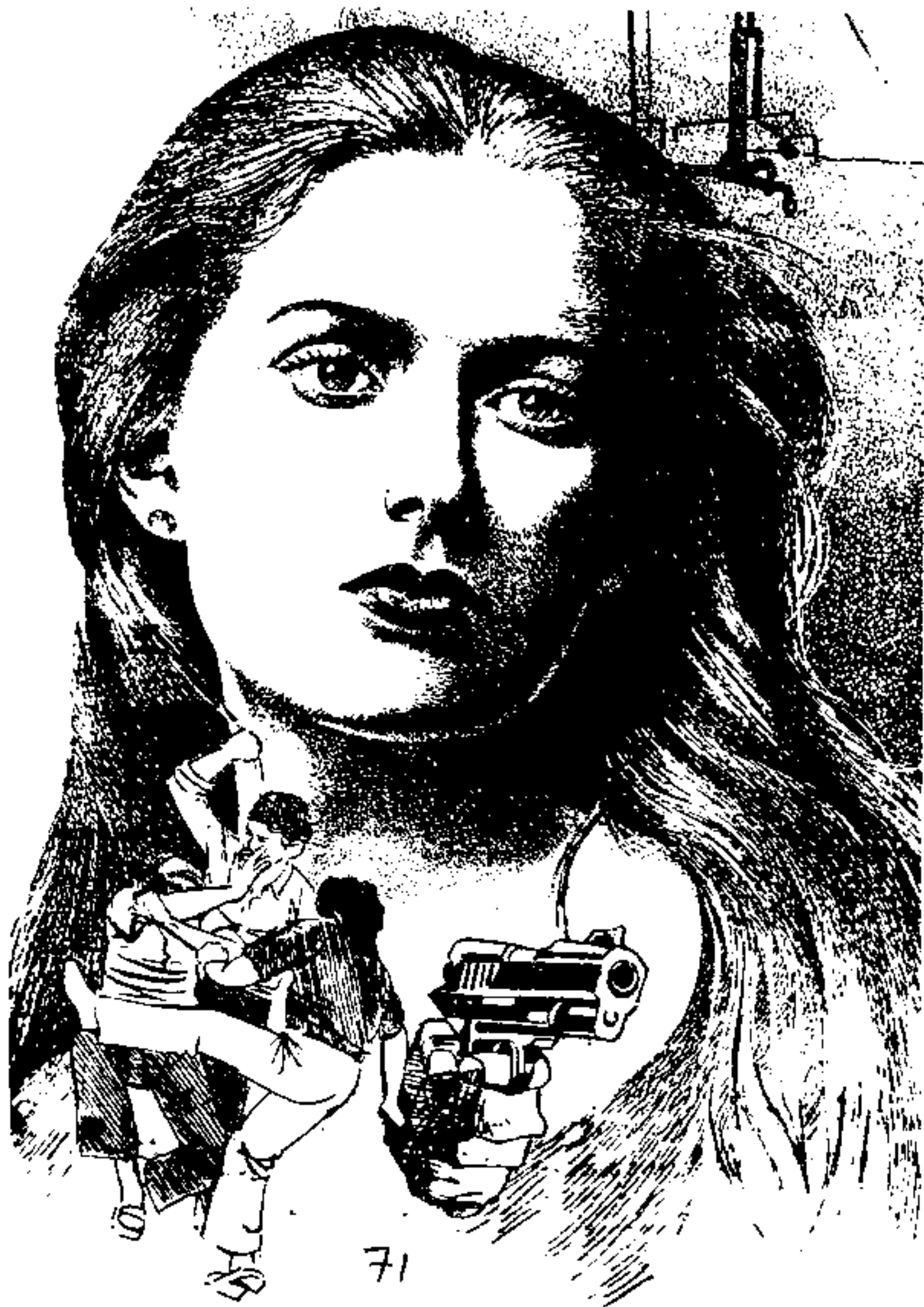
قسط: 15

پشاوروں کا

اساتذہ

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تندوتیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فتنوں حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابل شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پُر عزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جارہے تھے... اس کی زندگی جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قراریوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تاری عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ پروار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ وار ملت قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہو سکی...

اپنے کریفوں پر گہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا القام نوجوان کی تحریر انگیز داستان



معاذ ایک ذہین لیکن متلون مزاج لڑکا جو عیسیٰ علیہ السلام کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیکھ کر بھی شافل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر
بارش آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جہاں کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری مدرس ہیں اور ان کے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک
ٹائم معاذ اپنی ٹیوشن سے واپس آ رہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو مل کر پرکھ کر ایک لڑکی کو خواہ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی جو عیسیٰ علیہ السلام
میں چھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی غرور و نفرت کے باعث وہ اس معاملے میں کچھ پڑتا ہے اور بشری نامی اس لڑکی کو بچانے میں
کامیاب ہو جاتا ہے۔ بشری نامی کیسے کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم ڈیوٹر لکھتی ہے۔ اس ویران جگہ بھی وہ ایک زیر تجربہ رہائی
مخصوصہ کے ہوسے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے بھی آئی تھی۔ معاذ بشری کو یہ حفاظت اس کے گھر پہنچا رہا ہے۔ پہلے خود اس واقعے کو کفر سمجھتی
کر رہا ہے لیکن جن ریگس زادوں سے اس نے اپن کا شمار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو کفر سمجھتی نہیں کرتے اور موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ یہ موقع
انہیں جو عیسیٰ علیہ السلام کی صورت میں مل جاتا ہے اور ایک جنگل کی سیر کے دوران وہ لڑکا بشری کی کوشش میں سب سے الگ ٹھہک ہو جانے والے معاذ کو
بے خبری میں گھیر کر بری طرح زد و کوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دیتے ہیں۔ معاذ کے والدین نے اسے پانچواں طبقہ کے گھر پر پولیس اور ریگس
ڈراما کی دودھ سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ اور معاذ کو دوش پاتا ہے تو وہ خود کو ایک جوگی کی ہونڈی میں پاتا
ہے۔ اپنی حالت سے اسے اپنے شہید پرستی ہونے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ جوگی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ معاذ کا
مواہل جنگل میں ہی نہیں کر جاتا ہے اور جوگی کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہے جس سے باہر کی دنیا سے رابطہ کیا جاسکے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی
شخصیت اس کے لیے دیکھنی کا باعث بن جاتی ہے۔ جوگی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں
قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نوازا کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے پراسرار علم سکھانے کی ہائی بھر لیتا ہے اور معاذ
واقعی اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور جانے دوڑنے سے بننے والے معاذ کے کمرے سے حسب تصویریں اٹھائی جاتی ہیں تو بہت سے
قدرتی متاع کی تصویریں اس سے ایک ایسی تصویر بشری کی نظر میں آ جاتی ہے جس میں بہت دیر تک صحت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانک رہا نظر
آتا ہے۔ وہ کالی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہے جس کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں
وہ لڑکا اس میں اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پروجیکٹ کے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشری تحقیق کر رہی تھی۔ بشری کے بچنے والے جو غصے ہیں اور
حق گوئی ان کے غور میں شامل ہے اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشری کو کالی ٹھکانہ اٹھانے پاتا ہے اس
کی اس کو بے آہود کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ مدد سے سے جان بچا دیتا ہے۔ اس سب میں پاداش نامی لڑکے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشری انکلام
لینے کی کھان لگتی ہے۔ ان تکلیف دہوں میں ہی معاذ واپس کا اراہہ کرتا ہے تاہم دوسرے لڑکوں کے اتنے چھوڑ چکا ہے۔ لڑکوں سے پہچان کر اس کا
سوا مریکین اللہ اور بے وائی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو دھمکانا ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے اور ہڈیاں اچانک بشری کو چھاپ لیتا ہے
اور اسے بے آہود کر دیتا ہے۔ ڈی ایچ ایس پر رٹ سے ہڈی کی شکستہ ہی ہو جاتی ہے اور معاذ کو انہیں لانے کے لیے اور بھی جھکڑے مستقبل
کرتے ہوئے اس کے بھائی کو خواہ کر لیا جاتا ہے اور اسے انہیں آنے کا بیٹا مہیا دیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ کسی
دوسری پاداش سے اس کا سوا کر کے اسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے مطلوبت لی جاتی ہیں۔ منہ مٹانے پر اس کے بھائی کا ایک گروہ
نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتا دیتا ہے۔ اور بشری بھی انتقام کی آگ میں ملتی ہوئی سوینا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ہر رنگ شروع
ہو جاتی ہے۔ معاذ کو بچانے والے لڑکا وہاں سے اپنے گروہ کے ساتھ ایک پارلی میں جاتا ہے۔ وہاں اسے معاذ کے حوالے سے شگورک ایک شخص نظر آتا ہے۔
وہ اس کے پیچھے جاتا ہے مگر اسے گھیر لیا جاتا ہے۔ ہر حال وہ اس کو سمجھنے کے ساتھ پھوڑ دیا جاتا ہے۔ اور معاذ کے دوست عالم شاہ کے بھائی کو مل
کر دیا جاتا ہے۔ معاذ کی لڑکوں میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے چنانچہ کر کے اس کے دماغ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تاہم وہ لہو
سے حاصل ہونے والی ہدایت ان کا حصول نہیں ہوتا۔ بشری، اس میں کو بچانے کا پتہ نہ ملتا ہے۔ اور عالم شاہ مراٹھا لگتا ہے کہ اس کے بھائی کا
کل کس نے کیا۔ وہ قاتل کو گھیرتا ہے اور اپنے تئیں سے گولیاں مار کر گل کر دیتا ہے۔ تاہم وہ قاتل جاتا ہے۔ عالم شاہ اس کے بعد لڑکوں کے گروہ چاچ کو
چھاپتا ہے اور اسے کٹر کر دیکر پہنچاتا ہے تاہم اس کے پیچھے پولیس لگ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور اس کا نوکر سرد ہڈی کے اتنے چھوڑ چکا ہے۔ اور
معاذ چاروں ہاتھ کو ہٹا کر کہ اس کے ذریعے اسے نکالنے والے شخص کو چل کر دیتا ہے۔ تاہم اس کی قاتل کے ساتھ رہا جاتا ہے۔ اور معاذ
نہیں آتا مگر معاذ سے کام لینے والوں کو اس پر شک گزرتا ہے۔ اور ان کے ساتھ کھڑے ہونے کو خواہ کر لیا جاتا ہے اور ان کا الزام طیف سوری آتا
ہے۔ عالم شاہ اس میں جھانک رہی شخص کی مدد سے ہڈی کی قید سے چھٹکارا پاتا ہے۔ اور بشری دیکھ لگتی ہے۔ وہاں وہ اس سے ہار لے کے
روپ میں پہچان لیتا ہے۔ اور ان دونوں کے درمیان اتحاد کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ وہ سلطان کو مارنا چاہتی ہے۔ تاہم وہ اس سے ایسا کرنے سے روکتا
ہے۔ اور عالم شاہ ہڈی کی قید سے نکل کر اس کا پیچھا کرتا ہے۔ تاہم وہیں پہانک خنزیر گھر کے حوالے لگتے ہیں۔ وہ وہیں معاذ کو لیتا ہے۔

مداقت شاہ لطیف سحر کو گھیرنے کے لیے اس کی خیمہ بندی اور بچے کا کھوج لگاتے ہیں اور بچے کو اغوا کر لیتے ہیں۔ لطیف سحر و جادو ہوتا ہے۔ معاذ کو اس کے گھر والوں سے ملنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ عالم شاہ کو اس کے والد اظہار یاد دلائی کا سند پدے دیتے ہیں۔ دوسرے معاذ کی ایک مشین پر سونیا کے ساتھ اظہار یاد دلاتا ہے تاہم کچھ لوگ سکھ پاتریوں سے بھری بس کو روک کر لیتے ہیں۔ عالم شاہ کو ایک جگہ آکر نظر آ جاتی ہے جس کے پیچھے جا کر وہ اور سرحد دھڑلے جاتے ہیں۔ تاہم صداقت کے نقادوں سے پولیس آ جاتی ہے اور وہ خاموشی سے وہاں سے نکل جاتے ہیں۔ ساتھ ہی سونیا نے خانے کے تمام اظہار کو کھانے لگا دیتے ہیں تاہم باہر موجود دیگر اغوا کاروں سے مقابلہ ہوتا ہے اور معاذ زخمی ہو جاتا ہے۔ صداقت شاہ کے اظہار میں موجود شے دار کے پاس شادی ہوئی ہے۔ عالم شاہ نکل اور سرحد اظہار یاد دلاتے ہو جاتے ہیں۔ ان پورٹ سے گھر روائی پر راستے میں کچھ گھیرے گئے لوٹ لیتے ہیں۔ عالم شاہ انکشن میں آ جاتا ہے تاہم اظہار نامی عالم شاہ کی کزن اس کا راستہ دکھ لیتی ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیں

”اس سے دروازوں ٹھونکنا بہاؤ کم کرنے میں مدد ملے گی۔“ سونیا نے سامان میں سے ایک انکشن بھی در یافت کر لیا تھا اور اسے معاذ کے بازو میں لگاتے ہوئے بولی تھی۔ ”میرا اندازہ ہے کہ بازو پر لگنے والی گولی گوشت چھاڑ کر نکل گئی ہے۔ لیکن شائے پر لگنے والی گولی اندر ہی ہے۔“ ”میں فوراً یہاں سے نکل جانا چاہیے تاکہ بھرائی کو کسی اسپتال تک پہنچایا جاسکے۔“ کلدھپ نامی اس نوجوان نے اپنی استطاعت سے بڑھ کر اس معاملے میں ساتھ دیا تھا لیکن اس کی ہاڈی لیٹنگوٹج سے ظاہر تھا کہ وہ بیجان زدہ ہے۔ خصوصاً اپنے نبھات دہندہ معاذ کا زخمی ہونا اسے بہت تکلیف دے رہا تھا۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ جاؤ کہ خانے میں جا کر پہلے باقی لوگوں کو حالات کی جانکاری دو اور ان سے کہو کہ گھبرائے بنا شانتی سے اپنی جگہ بیٹھے رہیں۔ ہمیں پہلے اس بس کو تلاش کرنا ہوگا جس میں ہمیں یہاں لایا گیا تھا تاکہ آسانی سے شہر تک پہنچ سکیں۔“ سونیا نے اسے ہدایت دی تو اس نے چار جنگ لائٹ ایک جانب رکھی اور فرما بھر داری سے تہ خانے کی طرف جانے والے راستے کی طرف بڑھ گیا۔

”ہلو معاذ! ہری اب۔“ ہمیں فوراً یہاں سے نکلتا ہوگا۔“ سونیا جو کلدھپ سے گفتگو کے دوران ٹھیک ادا ادا لے سامان کو سمیٹ چکی تھی، اس سامان سمیت پانی سے بھری ایک بوتل اور چار جنگ لائٹ اٹھائے ہوئے معاذ سے بولی۔ معاذ کچھ گیا کہ چونکہ وہ پولیس یا کسی دوسرے قانون نافذ کرنے والے ادارے کے سامنے نہیں آ سکتے تھے اس لیے سونیا نے خاموشی کے ساتھ یہاں سے فرار کا منصوبہ بنالیا تھا۔ اس کے پاس سونیا کا ساتھ دینے کے سوا چارہ نہیں تھا چنانچہ اس کی بات پر عمل کیا۔ اگلے ہی لمحے وہ اس گھڑی کی عمارت سے باہر نکل رہے تھے۔ سونیا نے چار جنگ لائٹ بند کر دی تھی اور اب وہ دونوں باقاعدہ کسی سمت کا نہیں کہے

”معاذ!“ وہ دروازے سے پشت لگائے اس تکلیف کو برداشت کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو اس کے دائیں بازو اور شانے میں لگنے والی گولیوں کا نتیجہ تھی کہ اپنے قریب سونیا کی آواز سنائی دی۔

”میں یہاں ہوں۔“ اس نے ہکا کر سونیا کو اپنی پوزیشن سے آگاہ کیا۔

”کیا تم زخمی ہوئے ہو؟“ سونیا اس کے قریب چلی آئی اور تاریکی میں آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھنے لگی۔ یقیناً اس نے معاذ کے لہجے سے اس کے زخمی ہونے کا اندازہ لگایا تھا۔

”مجھے دائیں بازو اور شانے میں گولیاں لگی ہیں۔“ معاذ نے اسے آگاہ کیا۔

”اوہ... مائی گاڈ!“ سونیا کے منہ سے بے ساحتہ نکلا پھر اس کا بایاں بازو تمام کرا سے اٹھاتے ہوئے بولی۔

”آؤ، میرے ساتھ اندر چلو۔ میں کچھ کرتی ہوں۔“ وہ اسے اپنے ساتھ ٹوٹی چھت والے ہال میں لے آئی تھی۔

”کلڈھپ...!“ ہال میں پہنچ کر اس نے اپنا ساتھ دینے والے لڑکے کو پکارا۔

”جی دی دی!“ لڑکا فوراً سامنے آیا۔

”باہر سب ختم ہو گئے ہیں لیکن میرا ساتھی زخمی ہے۔“ رائٹ سائڈ کی دیوار کے ساتھ ایک چار جنگ لائٹ رکھی ہے، تم اسے آن کرو۔“ سونیا نے لڑکے کو ہدایت جاری کیں جس پر لڑکے نے فوراً عمل کیا۔ روشنی ہوتے ہی سونیا، ولیپ اور اس کے ساتھیوں کے سامان کا جائزہ لینے لگی۔ جلد ہی اس نے ٹھیک ادا کا سامان دریافت کر لیا۔

”فی الحال میں صرف غنم روکنے کا انتظام کر رہی ہوں۔“ اس نے کلدھپ کی مدد سے معاذ کی شرٹ اتاری اور کاشن گاڑ زخموں پر رکھ کر میڈیکل ٹیپ لگا دیا۔ کلدھپ اس دوران چار جنگ لائٹ تھا سے قریب کھڑا رہا۔

بغیر تاروں کی مدد جسم روشنی میں بھاتے چلے جا رہے تھے۔
کھدھپ اور ہاتی لوگ ان کے یوں غائب ہو جانے پر سکتے
حیران پریشان ہوتے، انہیں اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔
انہیں بس جلد از جلد وہاں سے دور نکل جانے کی فکر تھی۔ معاذ
محسوس کر رہا تھا کہ اس کے بازو کے زخم کی تو خیر تھی لیکن
شانے کا زخم اس بھاگ دوڑ سے متاثر ہو رہا تھا اور زخم سے
خون رس رس کر کاشن گاڑ کوڑ کرنا جا رہا تھا۔

”آگے درختوں کا ایک جھنڈ نظر آ رہا ہے۔ ہم تھوڑی
دیر وہاں سانس لینے کے لیے رک جاتے ہیں۔“ بھاتے
بھاتے سونپا نے تجویز دی جسے معاذ نے قبول کر لیا۔
”پانی پی لو۔“ وہ جھنڈ میں پہنچ گئے تو سونپا نے پانی کی
بوٹل کھول کر اس کے ہاتھ میں تھامی۔ معاذ نے فوراً ہی بوٹل
سے دو گھونٹ پانی پیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔
”تمہارے زخم کی کیا پوزیشن ہے؟“ سونپا نے
ہمدردی سے پوچھا۔

”خون رس رہا ہے۔“ معاذ نے مختصر بتایا۔
”ہم کسی مناسب مقام پر پہنچ جائیں تو میں تمہیں
ڈھنگ کا ٹریسٹ دینے کی کوشش کروں گی۔“ سونپا نے
گوہا سے تسلی دینے کی کوشش کی۔ معاذ نے کوئی جواب نہیں
دیا۔ وہ جانتا تھا کہ خون کا مسلسل رساؤ اس کے جسم سے
طاقت چھڑنے لے گا لیکن سونپا کی بات بھی ٹھیک تھی۔ ابھی وہ
کھڑے بہت زیادہ محفوظ قاصطے پر نہیں پہنچے تھے اس لیے
زیادہ دیر اس جگہ ٹھک رک سکتے تھے۔

”میرے خیال میں اب ہمیں چلنا چاہیے۔“ معاذ کو
اپنی حالت میں بہتری محسوس ہوئی تو اس نے سونپا سے کہا۔
درختوں کے اس جھنڈ میں ستاروں کی روشنی بھی برائے نام
ہی پہنچ رہی تھی اس لیے وہ ایک دوسرے کو ڈھنگ سے
دیکھنے سے قاصر تھے۔ چار جنگ لائٹ ساتھ ہونے کے
باوجود سونپا نے احتیاطاً اسے روشن نہیں کیا تھا۔

”ہاں چلو۔“ سونپا فوراً ہی تیار ہوئی لیکن اچانک ہی
سنائی دینے والی ایک غراہٹ نے انہیں ششکا دیا۔ وہ غراہٹ
کی سمت کاٹھیں کرتے، اس سے قبل ہی دو بھاری ہتھرے
جسم آکر ان سے ٹکرائے۔ ساتھ ہی خوفناک حیوانی بو بھی
ناتھنوں میں گھسی۔ حملہ اتنا اچانک تھا کہ دونوں ہی کے لیے
فوری طور پر خود کو سنبھالنا ممکن نہ ہو سکا اور وہ دھکا کھا کر
زمین پر گر گئے۔ اب غراہٹیں بلند ہو چکی تھیں ابھرا نہوں نے
بھی شناخت کر لیا تھا کہ کن پر حملہ آور ہونے والے وجود
دراصل دو جسم کتے تھے، معاذ پر حملہ آور ہونے والے کتے

نے اپنی اگلی ٹانگیں اس کے سینے پر رکھ کر اپنے ہرے جسم کا
بوجھ اس پر ڈال رکھا تھا اور اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح
اس کی گردن تک رسائی حاصل کر کے اس کا نرخرہ اوچیر
ڈالے۔ اس کی بدبودار تھوہنی معاذ کے چہرے کے بے حد
نزدیک تھی جسے وہ اپنے بائیں ہاتھ کی پوری طاقت استعمال
کر کے خود سے دور رکھنے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ دایاں بازو
زخمی ہونے کی وجہ سے وہ اسے استعمال کرنے سے قاصر تھا۔

دوسری طرف سونپا بھی کچھ ایسی ہی صورت حال ہے
دو چار تھی۔ اس پر سوار کتے نے اس کے بازو کی پوتی
اوچیرنے کے پھر میں بازو پر سے تھیں کی آستین نوجلی تھی
اور اب سونپا بھی معاذ ہی کی طرح ایک ہاتھ سے اس کی
تھوہنی دبوچے اپنے نرخرے کو اس کی ذو سے بچانے کی
جدوجہد میں مصروف تھی۔ اس جدوجہد کے ساتھ ساتھ وہ
دوسری جدوجہد اپنے دوسرے ہاتھ کو اپنی پنڈلی تک لے
جانے کے سلسلے میں کر رہی تھی۔ اس کی گوری پنڈلی سے اب
بھی وہ ٹختر بندھا ہوا تھا جس نے خانے میں کھیل کا پانسا
پلٹ کر انہیں آزادی کا ایک موقع فراہم کیا تھا۔ اپنے جسم پر
کتے کے وزن اور زور کی وجہ سے اس کے لیے ہاتھ پنڈلی
تک لے جانا دشوار ہو رہا تھا۔ اچانک ہی اس کے ذہن میں
ایک تدبیر آئی اور اس نے تھوڑی سی جدوجہد کر کے خود پر
سوار اس بدبودار جانور کی دم تک رسائی حاصل کر لی۔ دم
گرفت میں آتے ہی اس نے اپنی پوری قوت سے اسے
ایک جھٹکا دیا۔ تکلیف نے کتے کی خراپوں کو مزید دھشمانہ
کردیا لیکن سونپا نے بلا جھک اپنا عمل جاری رکھا۔ مسلسل دو
تین جھٹکے کھا کر کتا پیش میں آگیا اور اس نے اپنی دم کو
گرفت سے چھڑانے کے لیے اپنے جسم کو جھٹکے دینا شروع
کر دیا۔ اس کوشش میں سونپا کے جسم پر اس کے جسم کا دباؤ
کم ہو گیا۔ اس نے کتے کی دم چھوڑ دی اور اسے خود پر سے
دھکیلتے کے لیے اپنے جسم کی پوری طاقت استعمال کرالی۔
اس کی یہ کوشش خاصی حد تک کامیاب ثابت ہوئی اور کتا لمحہ
بھر کے لیے اپنا توازن کھو کر اس کے جسم پر سے کھل گیا۔
اس کے لیے اتنی سہلت کافی تھی۔ وہ تڑپ کر اپنی جگہ سے
اچلی اور پنڈلی سے بندھا ٹختر کھینچ لیا۔ کتا سنبھل کر دوبارہ
اس پر حملہ آور ہوا تو اس کی موت کے پروانے پر دخل
ہو چکے تھے۔ اٹھ بیڑے کے باوجود سونپا کا اندازہ شاندار
تھا۔ اس کا لیے کھل کا ٹختر یوں کتے کے جسم میں داخل ہوا کہ
پٹیلوں کو کافی ہوا سیدھا دل تک پہنچ گیا۔ اپنے ہی زور میں
سونپا پر حملہ کرتا اس کا جسم دھب کی زوردار آواز کے ساتھ

سامان اکٹھا کرنے کے بعد اس نے مشورہ دیا۔ اس کی حرکات و سکنات میں تھوڑا سا خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔
”کیا تم کوئی خطرہ محسوس کر رہی ہو؟“ معاذ نے اس کے خطرہ محسوس کیا۔

”میں ان کتوں کی وجہ سے پریشان ہوں۔ یہ جنگی یا آوارہ کتے نہیں ہیں۔ ایسے کتے عام طور پر شکاری یا پھر شوقین حضرات اپنے پاس رکھتے ہیں اور خاصے بچے ہوتے ہیں۔ ان کے بچاں پائے جانے کا مطلب ہے کہ ان کا مالک بھی یہیں نہیں آس پاس ہی موجود ہوگا۔“ اس نے جواب دیتے ہوئے ایک بار پھر کتوں پر نظر ڈالی۔ سیاہ رنگ کے دو کتے اچھے خاصے جسم تھے اور ان کے گلوں میں باقاعدہ پٹے پڑے ہوئے تھے۔

”اگر تم چاہو تو ہم مزید یہاں رہ کے بغیر آگے چلے ہیں۔ میرا زخم دیکھنے کے لیے آگے شاید کوئی اور جگہ مل جائے۔“ اس کی تشویش دیکھتے ہوئے معاذ نے پیشکش کی۔
”نہیں۔ خون کا زیادہ بہاؤ تمہارے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ کسی دوسری محفوظ جگہ پر پہنچنے تک اگر تم بے ہوش ہو کر گر گئے تو میں کیا کر سکوں گی؟“ سونیا نے اس کی تجویز قبول کرنے سے انکار کر دیا اور سامان سمیت مہنڈ میں مزید اندر کی طرف بڑھنے لگی۔ معاذ نے اس کی تحقیر کی۔

”تم یہاں بیٹھ جاؤ۔ میں تمہارا خون روکنے کی کوشش کرتی ہوں۔“ درخت کے ایک گروے ہوئے سنے کی طرف اشارہ کر کے اس نے سامان احتیاط سے ایک طرف رکھا اور چار جنگ لائٹ کو ایک جگہ کی شاخ پر مناسب زاویے سے سیٹ کرنے لگی۔ اس کی ایک ایک ادا اس کے اعلیٰ تربیت یافتہ ایجنٹ ہونے کی گواہی اور ان حالات میں بھی وہ ذرا سی گھبراہٹ کا شکار نظر نہیں آتی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے سامان اٹھانے کے معاملے میں بھی اپنے عورت ہونے کا فائدہ حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی اور معاذ کو زخمی ہونے کی رعایت دیتے ہوئے سارا بوجھ خود اٹھایا تھا۔

”زخم کھل جانے کی وجہ سے خون کا اخراج بڑھ گیا ہے۔ مجھے تمہاری ڈاریک تہہ مل کر پڑے گی۔“ چھ ٹائیوں کے لیے زخم کا جائزہ لینے کے بعد اس نے اعلان کیا اور معاذ کے کسی رد عمل کا انتظار کیے بغیر اپنا کام شروع کر دیا۔ زخم شانے کے پچھلے حصے میں تھا اس لیے معاذ خود اسے دیکھنے سے قاصر تھا اور ہونٹ کھینچے سونیا کی مشاق اچھیں کاٹھن محسوس کر رہا تھا۔ وہ عجیب و غریب تھی۔ بھی اپنی جھیر جھال سے اس کا حراج برہم کر دیتی تھی تو کبھی ایسی سنجیدگی اختیار کر لیتی

زمین پر گرا۔ اس کتے کے انجام تک پہنچنے ہی سونیا معاذ پر سوار کتے کی طرف متوجہ ہوئی۔

معاذ زخمی ہونے کی وجہ سے اپنا بھرپور دفاع کرنے سے قاصر تھا لیکن بہر حال ابھی تک اس نے کتے کو خود کو مزید زخمی کرنے میں کامیاب نہیں ہونے دیا تھا۔ زخمی باز کو استعمال کرنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا لیکن موقع کا کردہ کتے کے منہ پر لینے لینے ہی سر کی دو تین ضربات لگا چکا تھا۔ کتے کے کھیلے دانت بھی ہنڈ اس کی گردن تک رسائی حاصل کرنے میں ناکام تھے۔ سونیا نے ایک لمحہ رک کر صورت حال کا جائزہ لیا۔ اندھیرے کی وجہ سے وہ کسی فطری کی مرگب نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اس نے آپس میں دم ہوتے معاذ اور کتے کے بیولوں کا بھرپور تجزیہ کرنے کے بعد پورے حساب کتاب کے ساتھ اپنے ہاتھ کو حرکت دی۔ اس کا وقار بھرا اس کے اشارے پر برق کی طرح حرکت میں آیا اور کتے کے پہلو میں گھستا چلا گیا۔ زخم کھا کر کتا کسی بدروح کی طرح چیخا اور الٹ کر معاذ سے دور جا گرا۔ اس کی گریہ چیخوں سے ویرانہ گونج اٹھا۔

”تم ٹھیک تو ہو معاذ؟“ کتے نے جھپٹ کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا؟“ معاذ کو زمین پر سے اٹھنے میں مدد دیتے ہوئے اس نے قدرے تشویش سے پوچھا۔
”ڈائریکٹ تو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکا لیکن اس سے مقابلہ کرنے کے چکر میں میرے شانے کے زخم کو نقصان پہنچا ہے اور مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ خون پہلے سے زیادہ تیزی سے بہہ رہا ہے۔“ معاذ نے اسے اپنی حالت سے آگاہ کیا۔

”میرا خیال ہے مجھے لائٹ آن کرنے کا رسک لینا پڑے گا۔ ان جھپٹ کتوں کے چکر میں سارا سامان بھی ہاتھ سے نکل گیا ہے۔“ سونیا بڑبڑائی اور کتوں کے جھلے کے چیمے میں جس جگہ گری تھی اس جگہ ٹول ٹول کر دیکھنے لگی۔ پہلے ایک گن اس کے ہاتھ آئی پھر چار جنگ لائٹ بھی مل گئی۔ اس نے بلب والے حصے کا رخ نیچے زمین کی طرف کرتے ہوئے سامان اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔ اس دوران زخمی سنا حلق سے خوفناک کراہی برآمد کرتا کسی ہارڈ ٹیم کے ہیک گراؤنڈ میوزک کی کی پوری کرتا رہا۔ وہ اپنے ساتھی کے مقابلے میں زیادہ سخت جان تھا یا اسے وار بھر پور نہیں لگا تھا جو وہ فوری طور پر موت کا شکار نہیں ہوا تھا اور بڑی اذیت کے ساتھ دھیر سے دھیر سے دم توڑ رہا تھا۔

”ہم جھل میں مزید تھوڑا اندر چلے جاتے ہیں تاکہ روشنی دور سے دکھائی نہ دے سکے۔“ کھنڈوں میں سارا

تھی جیسے شوٹی و شرارت اسے چھو کر بھی نہ گزری ہو۔ اس وقت بھی وہ پوری تنہید کی سے اپنا کام انجام دے رہی تھی۔

”میں تمہیں ایک بین لکرا اور لگا رہی ہوں تاکہ آگے کے سفر میں تمہیں زیادہ تکلیف محسوس نہ ہو۔“ ڈریسنگ سے فارغ ہو کر اس نے معاذ سے کہا اور اس کی طرف سے جواب کا انتظار کیے بغیر انجکشن تیار کر کے اس کے بازو میں داخل کر دیا۔

”میں جانتی ہوں کہ اس وقت تمہیں دوا کے ساتھ ساتھ غذا کی بھی ضرورت ہے تاکہ انرجی مل سکے لیکن انسوس کہ اس تھوڑے سے پانی کے سوا ہمارے پاس کھانے پینے کی کوئی چیز موجود نہیں ہے۔“ انجکشن لگا کر فارغ ہونے کے بعد اس نے سامان سمیٹتے ہوئے قدرے انسوس سے کہا لیکن معاذ نے اس بار بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

”کیا بات ہے؟ تم کچھ بول کیوں نہیں رہے؟“ وہ اس کے انداز پر تھکی۔

”میں غور کر رہا ہوں۔“

”کس چیز پر؟“ وہ حیران ہوئی۔

”مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ وہاں کچھ ہے۔ ہوا سے جب حرکت ہوتی ہے تو وہاں کچھ چمکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔“ اس نے ان بوڑھے درختوں کی طرف اشارہ کیا جن کی لمبی لمبی ڈاڑھیاں زمین کو چھو رہی تھیں۔ سونیا نے اس کی بتائی ہوئی سمت میں غور سے دیکھا اور چونک گئی۔

”آؤ دیکھتے ہیں کہ کیا ہے؟“ سرسراہٹ آواز میں کہہ کر اس نے انہما کاروں سے حاصل کردہ کن سامان میں سے اٹھائی اور چار جنگ لائٹ سمیت عطا قدموں سے مطلوبہ سمت میں آگے بڑھنے لگی۔ معاذ نے بھی اس کی پیروی کی۔ دس بارہ قدموں کا فاصلہ طے کر کے وہ دونوں رک گئے اور درخت کی لمبی ڈاڑھی کے پیچھے سے جھلک دکھانے والی چمک کو دیکھا۔ وہ دونوں ہی یہ دیکھ کر ششدر رہ گئے کہ وہ آئینہ ہے۔ ایک نیلی کار کا مقبض نما آئینہ۔

”میں آگے جا کر دیکھتی ہوں، تم یہاں سے مجھے کور دو۔“ سونیا سرگوشی میں کہہ کر آگے بڑھی۔ اس موقع پر اس کا چہرہ ٹھنڈی ہار پھر اس کے ہاتھ میں آ گیا تھا جبکہ کن اس نے معاذ کو تھما دی تھی۔ قرآن بتاتے تھے کہ خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اگر وہاں کوئی خطرہ موجود ہوتا تو اس وقت سامنے آ جاتا جبکہ وہ معاذ کی ڈریسنگ کر رہی تھی۔ بہر حال احتیاط کرنا ہی بہتر تھا۔ اطراف سے پوری غریح چمکانا وہ گریہ جال چلتے ہوئے کار کے قریب نکلی۔ کار کے پیچھے

جسے میں کچھ سامان رکھا ہوا تھا لیکن کسی ڈی لنس کا نام و نشان نہیں تھا۔ کار کے تین دروازے بند تھے جبکہ خالی جانب موجود راتینج سیٹ والا دروازہ بول کھلا ہوا تھا جیسے کوئی جلت میں اسے کھلا چھوڑ کر ہی چلا گیا ہو۔ وہ گھوم کر دوسری جانب گئی اور یہ دیکھ کر اس کے حلق سے گہری سانس برآمد ہوئی کہ ایک شخص زمین پر اونٹ سے منہ پڑا ہوا ہے۔

”معاذ! کم ہیئر۔“ اس نے پلٹ کر معاذ کو آواز دی اور چار جنگ لائٹ کارخ اس شخص کی طرف کر کے اس کا جائزہ لینے لگی۔ وہ پچاس پچاس سال سے معاذ کے لیے قدم اور چھری بے بدن کا آدمی تھا۔

”یہ کون ہے؟“ معاذ وہاں آیا تو اس آدمی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

”جو بھی ہے، میرے خیال میں اب اس کی حیثیت ایک لاش کی ہے۔ تم یہ لائٹ بکرو۔ میں اس کا جائزہ لیتی ہوں۔“ وہ چار جنگ لائٹ معاذ کو چھما کر اس آدمی کا جائزہ لینے لگی۔ تھوڑی سی جدوجہد کے بعد اس نے اسے سیدھا بھی کر لیا۔

”میرے خیال میں اسے ہارٹ فل ہوا ہے۔“ کچھ دیر بعد سیدھے کھڑے ہوتے ہوئے اس نے موت کی وجہ جان کی اور مریض ہوئی۔

”لاش کی حالت سے اندازہ ہو رہا ہے کہ موت کو سات آٹھ گھنٹوں سے زیادہ وقت نہیں گزرا ہے۔ ایسا لگتا ہے یہ آدمی کسی وجہ سے اس طرف آیا اور پھر اچانک ہارٹ فل بنے اسے واپس جانے کی سہلت نہیں دی۔“ اب وہ گاڑی کے اندر دنی جیسے کا جائزہ لے رہی تھی۔ معاذ بھی اس کے ساتھ شامل ہو گیا لیکن وہ اپنے بازو کو زیادہ حرکت نہیں دے رہا تھا۔

”تم یہ پی لو۔“ عطا کی کے دوران انرجی ڈرنک کے ٹن برآمد ہونے پر سونیا نے ایک ٹن اس کی طرف بڑھا دیا جسے لینے سے انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

”شاید ان کتوں کو بھی کھس اپنے ساتھ لایا تھا۔ بعض لوگ آبادی سے ہٹ کر ایسے تنہا مقامات کو تفریح کے لیے پسند کرتے ہیں۔“ کینا سے چند گھنٹہ لینے کے بعد معاذ نے بھی مرنے والے کے ہارے میں قیاس آرائی کی۔ گاڑی میں موجود کھانے پینے کا سامان، فولڈنگ چیئر، ڈرنک اسٹک اور ایک ہڈی شٹ کن سمیت کئی ایسی ہی چھوٹی موٹی چیزوں کے باعث اس نے یہ اندازہ قائم کیا تھا۔

”جو بھی ہے ہمارے لیے تو نعت ہی ثابت ہوا ہے۔ اب ہم اس گاڑی پر بہ آسانی یہاں سے نکل سکتے ہیں۔“ سو نیا، جو ذرا بچہ تک سیٹ پر آ بیٹھی تھی، اکیسٹن میں موجود چابی کو کھماتے ہوئے بولی۔ گاڑی پر اسے مائل کی گئی لیکن اس کا انجن بہترین حالت میں تھا۔ پہلی کوشش میں ہی ہلکی سی غراہٹ کے ساتھ اسٹارٹ ہو گیا۔

”ہاں نہیں یہ پہلی بڑھا اس جھنڈ میں گاڑی کیسے کھسا لایا تھا؟“ ہیلڈ لائٹس کی روشنی میں وہ دیکھ سکتی تھی کہ درختوں کے درمیان سے گاڑی نکال کر لے جا آسان نہیں ہے اس لیے قدرے جھنجھلا کر بڑبڑائی۔

”بے چارے کا بھٹی پن ہی اس وقت ہمارے کام آ رہا ہے۔ اگر اس دیرانے میں ہمیں یہ گاڑی کھڑی نہیں ملتی تو ہم اس وقت پیدل بھاگنے پر مجبور ہوتے۔“ ذر تک پینے سے معاذ کی حالت میں قدرے بہتری آئی تھی اس لیے وہ سو نیا کی جھنجھلاہٹ پر مسکرا کر بولا۔

”مسکرا بعد میں لیا، پہلے جا کر سامان لے آؤ۔ میڈیکل ہاکس کو ساتھ رکھنا بہت ضروری ہے۔“ سو نیا نے اسے ہدایت دی جس پر اس نے فوراً عمل کیا اور چار بنگ لائٹ ہاتھ میں لیے اس مقام پر پہنچا جہاں انہوں نے اپنا سامان چھوڑا تھا۔ بھاری گن تو وہ لوگ پہلے ہی لے چکے تھے جو اب نیلی کار میں موجود تھی اس لیے وزن معمولی تھا جسے وہ ایک ہاتھ سے بہ آسانی اٹھا سکتا تھا۔ سامان اٹھا کر سیدھا کھڑا ہوا تو چونک گیا۔ یقیناً وہ روشنی تھی جو کہیں دور سے آ کر جھنڈ کے درختوں پر پڑ رہی تھی۔ روشنی کی زد میں کبھی ایک درخت آتا تھا تو کبھی دوسرا۔ اس متحرک روشنی کو دیکھ کر اس کے لیے اندازہ لگانا مشکل کہیں تھا کہ کوئی گاڑی اس طرف آرہی تھی۔ یقیناً جھنڈ میں روشنی کی موجودگی نے کسی کو اس طرف متوجہ کر دیا تھا۔

”کوئی گاڑی اس طرف آرہی ہے۔“ وہ فوراً سو نیا کے پاس پہنچا اور اسے اطلاع دی۔ اطلاع سن کر اس کے چہرے کا رنگ ہلکا بھر کے لیے خستہ ہوا بھر اس نے خود پر قابو پالیا اور سوار لہجے میں بولی۔

”آئے در۔ نو پر اہم۔“ ان الفاظ کی ادائیگی کے ساتھ ہی وہ اسے کے 47 ہاتھ میں لیے گاڑی سے نیچے اتر آئی اور معاذ سے چند سوالات کرنے کے بعد تھوڑا پیچھے جا کر ایک درخت منتخب کر کے گن کندھے سے لٹکائے بندھ چاکی سی بھرتی سے اس درخت پر چڑھ گئی۔ اب وہ درخت پر بالکل ساکت بیٹھی تھی اور اسے کے 47 شانے سے لگائے

پوری طرح اس متحرک روشنی کی طرف متوجہ تھی جو لمحہ بہ لمحہ قریب آتی جا رہی تھی۔ اس نے روشنی کے حریف قریب آنے کا انتظار کیا۔ یہاں تک کہ اس پر واضح ہو گیا کہ آنے والی گاڑی ایک جیب ہے جس میں تین سے چار بندے سوار ہیں۔ سائپوں کی طرح دکھائی دیتے ان سواروں کو اس نے معاندانہ نظروں سے دیکھا اور پھر سانس روک کر برست مار دیا۔ اسے کے 47 نے ایک تہقہ اگلا اور اگلے دو سائے فوراً ہی جھنڈا کھا کر لڑھکتے ہوئے نظر آئے۔ ان کے لڑھکتے ہی جیب بری طرح لہرائی۔ سو نیا نے فوراً ہی دوسرا برست مارا۔ اس برست نے جیب میں سوار باقی افراد کی موت پر مہر تصدیق نہ بھی لگائی ہو تو کم از کم ان میں سے کسی کو اس لائق نہیں چھوڑا تھا کہ وہ ان کے خلاف کچھ کر پاتا۔

”ہمیں فوری طور پر یہاں سے روانہ ہونا ہے۔“ اپنی کارروائی کی طرف سے مطمئن ہو جانے کے بعد وہ درخت سے نیچے اتری اور نہایت سنجیدہ تاثرات کے ساتھ معاذ سے بولی۔ معاذ چند گھنٹوں میں اس کا یہ بیگبوازہ انداز دوسری بار ملاحظہ کر رہا تھا۔ وہ واقعی حیرت انگیز شخصیت کی مالک تھی۔ حسن، دلربائی، ذہانت، دلیری اور مشاقی کا اتنا زبردست اختراچ اس نے صرف اور صرف سو نیا خان کی شخصیت میں پایا تھا اور اپنی ان خصوصیات کے ساتھ وہ سچ سچ لہڑ کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی چنانچہ اس وقت بھی وہی لہڑ کر رہی تھی اور معاذ اس کی ہدایات پر عمل چھڑا تھا۔

”بڑھا اتنی تیاری سے یہاں آیا تھا لیکن اس نے موبائل ساتھ رکھنے کی زحمت نہیں کی۔ موبائل ساتھ ہوتا تو اس دیرانے میں مرنے کے بجائے کسی کو اپنی مدد کے لیے بلا سکتا تھا۔ ہمیں بھی تھوڑی آسانی ہو جاتی مگر ہم لوگ سے لوکیشن سرچ کر کے یہاں سے نکل جاتے۔“ جھنڈ سے کسی نہ کسی طرح گاڑی نکال لینے کے بعد اس نے ایکسٹریٹر پر پاؤں رکھ دیا اور پوری رفتار سے گاڑی چلائے ہوئے بڑبڑائی۔

”یہ دونوں ہاتھیں ایک ساتھ نہیں ہو سکتی تھیں۔ موبائل نہ ہونے کی وجہ سے وہ بے چارہ مرا ہے تو ہمیں اس کی گاڑی مل سکی ہے۔“ معاذ کو اندازہ تھا کہ وہ صرف جھنجھلاہٹ میں ایسی بات کر گئی ہے اس لیے اسے ہائپر نے والے انداز میں بولا۔

”دو گولیاں کھا کر بیٹھے ہو اس پر بھی زبان میں اتنا دم ہے۔“ اپنی غلطی کا احساس ہونے پر وہ تھوڑا سا جھینپ کر افس دی۔

”میرا دم فہم دیکھ کر ہی تو تم لوگوں نے مجھے اپنے جال

میں بھانسا تھا۔" معاذ نے تڑپ کر جواب دیا۔ اس بار سوتیا کچھ نہیں بولی اور اپنی پوری توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز رکھی۔ معاذ نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔ وہ زخمی تھا اور اس کے زخموں سے ٹھیک ٹھاک خون بہہ چکا تھا۔ فی الحال بہترین طبی امداد کی بھی کوئی سہیل دور تک دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ایسے میں دیکھا جاتا تو صورت حال اس کے لیے بہت زیادہ تھوڑی تھی اور وہ صرف اپنی توجہ ارادی کے عمل ہوتے پر اپنے حواس قائم رکھے ہوئے تھا۔

تقریباً پون گھنٹہ ادھر ادھر بھٹکنے کے بعد وہ دیرانوں سے نکل کر ایک نیم پختہ سڑک پر پہنچے جس کا سیلاب ہو سکے۔ گاڑی کے آرام دہ ہونے کے باعث خراب راستے کے باوجود اس کے زخمی وجود کو زیادہ جھٹکنے نہیں پہنچے پڑے تھے۔ گاڑی میں موجود اترتی ڈرائیونگ، سسٹمز اور پھلوں نے بھی اسے سہارا دینے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس سامان کا مالک زندگی کی قید سے آزاد ہو کر اس سب کو استعمال کرنے کی احتیاج سے بے نیاز ہو گیا تھا اس لیے وہ بے تکلفی سے ہر شے استعمال کرتا رہا تھا۔ سونیا نے بھی ڈرائیونگ کے دوران ایک اترتی ڈریک اور چند سسٹمز لیے تھے اور کئی گھنٹوں کی مارا ماری کے باوجود تازہ دم دکھائی دیتی تھی۔ ہاں اس کا طبی مزید بگڑا ہوا تھا۔ بال، جسم اور لباس سب دھول مٹی میں اٹ گئے تھے۔ کتے کے حلقے میں پھٹ جانے والی نہیں ہے اس کے شانے اور بازو کی گوری رنگت اپنی جھٹک دکھا رہی تھی۔ معاذ کی حالت اس سے بھی بری تھی اور لباس کا بیشتر حصہ خون سے رنگ گیا تھا۔ سونیا نے جھنڈ سے روانگی سے نکل مردہ شخص کے جسم پر موجود ہلکی پھلکی پگڑا شوٹ کی جیکٹ اتار کر اسے پہنا دی تھی اور یہ جیکٹ ہی کسی حد تک اس کے تبرج لباس کی پردہ پوشی کر رہی تھی لیکن بہر حال ان دونوں کے چلنے ہی اس لائق نہیں تھے کہ وہ لوگوں کا سامنا کر پاتے۔ فرار میں کامیاب ہو جانے کے باوجود انہیں کسی ڈھنگ کے ٹھکانے کی اشد ضرورت تھی۔

"ہم اس حال میں کسی آبادی میں داخل نہیں ہو سکتے۔ ہمیں کچھ کرنا ہوگا۔" نیم پختہ سڑک پر گاڑی دوڑاتے ہوئے سونیا نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے گھر مندے سے کہا۔ ان کے دائیں بائیں کھیت پھلے ہوئے تھے لیکن فی الحال سویرا نہیں ہوا تھا اس لیے کھیتوں میں کام کرنے والے گھسان اور مزدور دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

"ان کھیتوں کے آس پاس سے ہمارا کام بن سکتا ہے۔ عموماً کھیتوں کے قریب زمینداروں کے گھر بے وسیعہ

ہوتے ہیں اور کچھ نہیں تو رکھوالے کی کوٹھری وغیرہ بنی ل جائے گی۔ لباس کے حصول اور سست کے تعین میں ہمیں ایسی کسی جگہ سے مدد مل سکتی ہے۔" معاذ نے مشورہ دیا۔ جسم میں خون کی کمی کے باوجود وہ پوری کوشش سے اپنے حواس بحال رکھے ہوئے تھا اور کمزوری کے باعث بار بار سر اٹھاتی نیند بعد اتمام کی خواہش کو گلام وال رکھی تھی۔

"گڈ آئیڈیا! میرے خیال میں رکھوالے کی کوٹھری ہمارے لیے سب سے مناسب رہے گی۔ ڈیڑوں پر تو ملا زمین کی بھیڑ بھاڑ ہوتی ہے۔" سونیا نے اس کی تائید کی پھر وہ دونوں آہیں میں ملے کر کے دائیں بائیں کا جائزہ لینے لگے۔ گاڑی کی رفتار سونیا نے بے حد کم کر دی تھی اس لیے اندھیرے کی چادر اوڑھے مناظر سست روی سے ان کے سامنے سے گزر رہے تھے۔

"وہ... اس طرف روشنی دکھائی دے رہی ہے۔" معاذ جس کا رخ بائیں جانب تھا، انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولا تو سونیا بھی توجہ ہو گئی۔ روشنی دیکھ کر اس نے گاڑی کو بریک لگا دی۔

"پہلے میں جا کر چیک کرتی ہوں۔" وہ اپنی طرف کا دروازہ کھول کر پیچھے اترتے ہوئے بولی۔

"نہیں۔ میں بھی ساتھ ہی چلتا ہوں۔ تم بس اپنا منہ بچھو دے دو۔" ایک ہاتھ سے گن چلا، لیکن نہیں تھا اس لیے اس نے یہ فرمائش کی تھی۔ سونیا نے اس کی بات سمجھتے ہوئے منہ اس کے حوالے کر دیا اور خود کپاٹھا کر آگے بڑھنے لگی۔ کھیت کے گرد کوئی حفاظتی باز نہیں تھی۔ اس لیے انہیں وہاں داخل ہونے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ اپنے اطراف پر نظر رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ دونوں دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگے۔

"اوچھ!" چلتے چلتے یکدم ہی معاذ کے ہونٹوں سے کراہ لگی۔

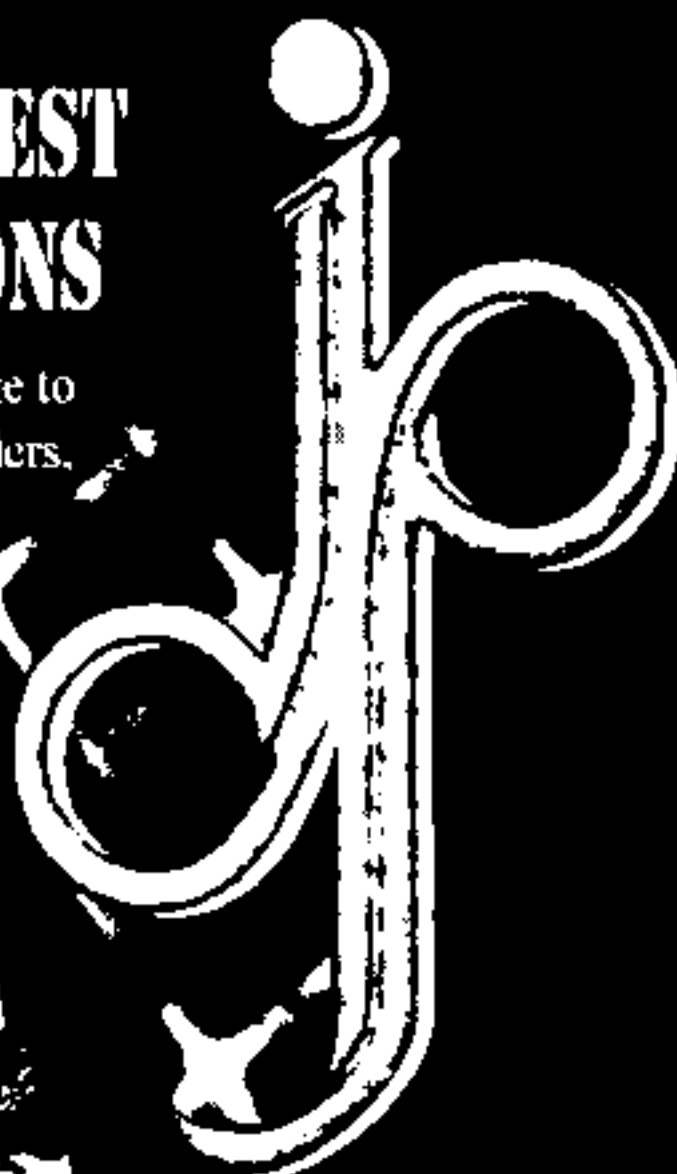
"کیا ہوا؟" اس سے چند قدم کے فاصلے پر موجود سونیا نے چونک کر پوچھا۔

"یہاں چندے لگے ہیں۔ میرا جھینڈے میں پھنس گیا ہے۔" کھٹکے کے ساتھ بند ہونے والے لوہے کے ان پھندے نے اس کے گلے پر زوردار ضرب لگائی تھی۔

"میں دیکھتی۔" سونیا کے الفاظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے اور ایک کتابی طرح بھونکا ہوا بے بس کھڑے معاذ پر جھنڈا۔ سونیا نے حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے

JASOOSI DIGEST PUBLICATIONS

Convey Your Message to
Millions of Our Readers,
World Wide
Through



جاسوسی ڈیجسٹ پبلکیشنز گروپ لمیٹڈ کارکن روڈ، کراچی 75500 پاکستان

85-C, PHASE II EXTENSION, MAIN KORANGI ROAD, KARACHI 75500-PAKISTAN.

PHONES : (02-21) 35802552-35804200-35805713 FAX : (02-21) 5802551

E mail : jdgroupp@2-mail.com

75

79

اے کے 47 کو لاشی کی طرح کھمایا اور کہنے کے سر پر ایک زرد دار ضرب لگائی۔ کتا جیب جیب میں کی سی آواز نکال کر زمین پر لڑھیر ہو گیا۔

”کون ہے اے۔ اتنے کون ہے؟“ وہ یقیناً رکھوالا تھا جو کہنے کے بھونکنے کی آواز سن کر متوجہ ہوا تھا اور اب لگاتار ہوا چلا آرہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں یقیناً کوئی نارنجی و فیرہ تھی جب ہی وہ ایک متحرک روشنی کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ سونیا تیزی سے اپنی جگہ پر نیچے بند گئی۔ اب آنے والے کا سراپا واضح ہو گیا تھا۔ اس نے گھٹنوں سے کچھ نیچے آتی دھوٹی پر آدمی آستین کی بنیان پہن رکھی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں محدود روشنی والی چھوٹی نارنجی اور دوسرے میں کپھاڑی تھی۔

”کون ہے تو اے؟“ وہ معاذ سے چند قدم کے فاصلے پر آکر رکھا اور اس کے چہرے پر روشنی ڈال کر حیرت سے پوچھنے لگا۔

”پہلے اسے اس مصیبت سے نکالو پھر بتاتے ہیں کہ ہم کون ہیں؟“ نیچے ٹپٹی سونیا نے بھرتی سے کھڑے ہوتے ہوئے کتن کی نال اس کے سر سے لگائی اور کسی شیرنی کی طرح غراتے ہوئے بولی۔

”گگ..... گگ..... کون ہو تم لوگ؟“ وہ بے چارہ جو پہلے ہی ایک اجنبی صورت کو دیکھ کر حیران تھا، اس صورت حال پر بری طرح بوکھلا گیا۔

”کہا ہے تاکہ پہلے اس کو آزاد کرو۔“ سونیا کے لہجے کی فراہٹ بڑھ گئی۔

”کھوں ہوں جی اکھوں ہوں۔“ اس نے بڑبڑا کر کپھاڑی اور نارنجی نیچے رکھی اور اپنی کمر کے ساتھ بندھے چکے میں اڑسا چابیوں کا چھوڑ سا گھٹا نکال کر ایک چابی سے نوپے کے پھندے کا تالا کھولنے لگا۔ پاؤں آزاد ہوا تو معاذ نے سکون کی سانس لی۔

”میرا متو سر گیا ہے کیا؟“ معاذ کے قدموں کے قریب ہی ڈھیر کتے کو دیکھ کر اس نے صدے سے پتھر لہجے میں پوچھا۔

”اے چھوڑو۔ ابھی تو تم اپنے جیون کی چٹا کرو۔“ سونیا پھنکاری۔

”میں گریب بندہ ہوں جی امیرے کول کچھ نی۔ اے۔“ وہ شاید انہیں کوئی ڈاکو فیرہ بکھڑا تھا۔

”کب تک بندہ کرو اور اپنی کوٹھڑی کی طرف چلو۔“ سونیا نے اسے فہوکا دیا۔ ڈرے سے رکھوالے نے خاموشی

سے اس کے حکم کی تعمیل کی اور سونیا کے اشارے پر کپھاڑی وہیں چھوڑ کر صرف نارنجی ہاتھ میں لیے آگے بڑھنے لگا۔ وہ دونوں مین اس کے پیچھے چل رہے تھے تاکہ کوئی اور چھندا لگا بھی گیا ہو تو اس سے محفوظ رہیں۔

”تمہارے علاوہ یہاں کوئی اور رکھا بھی موجود ہے کیا؟“ چلتے چلتے سونیا نے اس سے پوچھا۔

”جی نہیں، صرف میں بلکہ میرا ستوری ماسکی کرتے ہیں۔“ گھٹت میں پھندے کیوں لگا رکھے ہیں؟“

”شرکیوں نے غب کر رکھا تھا جی! ابھی چوری چکاری کرتے تھے تو کبھی ایویں فصل کھراب کر کے بھاگ جاتے تھے۔ جب سے پھندے لگائے ہیں ہور دو تین بندے بکڑے گئے ہیں، شانتی ہو گئی ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ لہجہ سہا ہوا ہی تھا۔ اس گھنگو کے دوران وہ لوگ اس کی کوٹھڑی تک پہنچ گئے۔

”میرے ساتھی کا لباس اتارنے میں اس کی مدد کرو۔“ اندر پہنچ کر سونیا نے اسے حکم دیا جس کی تعمیل کے سوا ظاہر ہے اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ جیکٹ کے بعد اس کے نیچے پہنی معاذ کی خنم خنم ٹیٹھ اتارتے ہوئے اس کی آنکھیں بری طرح پھٹ گئی تھیں۔

”کسی برتن میں پانی گرم کرو۔“ کوٹھڑی میں گیس سلینڈر والا چھوٹا اسٹنڈ نظر آ رہا تھا اس لیے سونیا نے نیا حکم صادر کیا۔ اس حکم کی بھی تعمیل کی گئی۔

”اس چار پانی پر اوندھے لیٹ جاؤ لیکن اس کا دھیان رکھنا۔“ وہی آواز میں معاذ کو ہدایت دینے کے بعد اس نے اپنے گلے میں لٹکا لٹی امداد کے سامان والا قتیلا اتارا۔ یہ قتیلا گاڑی سے اترتے ہوئے اس نے اپنے گلے میں ڈال لیا تھا اور اب اسے کھول کر اس میں موجود سامان کا بخور جائزہ لے رہی تھی۔ اے کے 47 اس نے چار پانی پر معاذ کے نزدیک رکھ دی تھی۔

”میں تمہارے جسم سے گولی نکالنے کی ایک کوشش کر کے دیکھتی ہوں۔ گولی نکل گئی تو ٹھیک ہے ورنہ ذرا ڈھنگ کی ڈرینگ کر کے یہاں سے نکل جائیں گے۔ اب صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں ہے اس لیے ہمیں پتہ چکے بھی جلد چھوڑ دینا پڑے گی۔“ تیز دھار کا ایک اسکلپر ہتھی اور چٹنی سامان میں سے نکال کر انگ رکھتے ہوئے وہ انگریزی میں معاذ سے بولی اور پھر اگلی سانس میں رکھوالے کو پکارا۔

”اے ادھر آؤ اور میری مدد کرو۔“ وہ خاموشی سے قریب چلا آیا۔

”سامان میں ایک سن کر دینے والا انجکشن موجود ہے۔ میں تمہیں یہ لگا رہی ہوں لیکن یہ بہت زیادہ کام نہیں کرے گا اور تمہیں برداشت سے کام لینا پڑے گا۔“ ایک انجکشن تیار کرتے ہوئے اس نے معاذ کو آگاہ کیا تو وہ محض ”ہوں“ کہہ کر رہ گیا۔ جن لوگوں کے پاس سے ایک بے بس ماں کے بیمار بچے کے لیے کوئی ڈھنگ کی دوا نہیں مل سکی تھی، ان کے قبضے سے مرہم پٹی کا اچھا خاصا سامان مل گیا تھا۔ شاید وہ جس قسم کی زندگی گزار رہے تھے اور جس کام کو انجام دینے کی کوشش کر رہے تھے، اس کے دوران انہیں بیمار یوں سے زیادہ زخموں کا ہی خوف تھا اسی لیے ان کے علاج کا انتظام کر رکھا تھا۔ یہ اور بات کہ اس انتظام سے انہیں کچھ حاصل نہیں ہوا تھا اور اب یہ سب کچھ معاذ کے کام آ رہا تھا۔

”کوئی صاف ستھری چادر وغیرہ ہو تو مجھے دے دو۔“ اس نے اپنی ہدایت پر جراتی کے آلات کو گرم پانی میں ڈبو کر جراثیم سے پاک کرتے ہوئے رکھوالے سے کہا تو اس نے فوراً ہی ایک چھوٹا سا صندوق کھول کر اس میں سے سفید چادر نکال دی۔ وہ جوان اشعر تھا اور ہر حکم پر پھرتی سے عمل کر رہا تھا۔

”اس کی پٹیاں چھاؤ۔“ چادر برآمد ہوتے ہی سونیا نے اسے دوسرا کام سونپا۔

”یہ کپڑا اپنے دانتوں کے درمیان دبائو۔“ ایک بڑی پٹی معاذ کے حوالے کر کے وہ اس کی پشت پر آکھڑی ہوئی۔ کوٹھڑی میں بلب روشن تھا۔ روشنی کے انتظام کو مزید بہتر بنانے کے لیے اس نے چار جگہ لائٹ کو بھی ایسے زاویے سے رکھ دیا کہ معاذ کے زخمی شانے پر براہ راست روشنی پڑتی رہے۔ اس سارے انتظام سے قاریغ ہو کر وہ سیدھی ہوئی اور رکھوالے کی آنکھوں میں براہ راست دیکھتے ہوئے سرد لہجے میں بولی۔

”میری مصروفیت کے دوران کوئی غلط حرکت کرنے کی کوشش مت کرنا ورنہ شاہی جان سے جاؤ گے۔“

”تو یہ کہیں جی! میں کیوں ایسا پاپ کرنے لگا۔ میں تو خود بھرا جاتی کا حال دیکھ کر پریشان ہو گیا ہوں۔“ اس نے فوراً کالوں کو ہاتھ لگایا، جو اب سونیا نے اسے محض تیز نظروں سے گھورا پھر اپنے کام میں لگ گئی۔ زخم پر بندھی پٹی کھولنے ہی تیزی سے خون کا اخراج ہونے لگا۔ اس موقع پر چادر سے پھاڑی گئیں پٹیاں کام آئیں۔ زخم ذرا واضح ہوا تو اس نے گولی کی تلاش میں شانے پر کٹ لگایا۔ ایک بار پھر خون کا

فوارہ سا نکلا لیکن سونیا نے پروا نہیں کی اور اسکیلپھر کی مدد سے مزید گہرائی میں گولی کی تلاش کا سلسلہ جاری رکھا۔ دانتوں کے درمیان چادر کا ٹکڑا دبا کے لینے معاذ کی دونوں مٹھلیاں تکلیف کی شدت سے بری طرح کھینچ گئیں اور جسم سے پینا پانی کی طرح پھوٹ کر بہنے لگا۔ سونیا نے ٹھیک کہا تھا۔ سن کر دینے والا انجکشن استعمال کرنے کے باوجود تکلیف بے انتہا تھی۔

”مل گئی۔ مل گئی۔“ وہ اپنے دماغ پر چھاتی دھدکی بخار سے بے ہوش ہونے لگا تھا کہ سونیا کی چپکتی ہوئی آواز کالوں میں پڑی۔

”مجھے چینی دو۔“ سونیا نے جوش سے رکھوالے کو حکم دیا۔ چینی سے کپڑا کو گولی نکالنے کے بعد اس نے پوری تندی سے خون روکنے کی کوشش شروع کر دی۔ زخم کی ہاتھ بندھ اسٹیچنگ کا انتظام نہیں تھا لیکن کالشن گاز اور میڈیکل ٹیپ سے بھی کافی حد تک کام چل گیا۔ سونیا نے سامان میں موجود آخری بین کمر بھی اسے لگا دیا پھر بازو کے زخم کی طرف حوجہ ہوئی۔ اس زخم میں گولی نہیں تھی لیکن بھاگ دوڑ اور حرکت کی وجہ سے غون کار سا کھڑا تھا۔ اس نے بازو کی پٹی بھی بدل دی۔

”گرم دودھ پلاؤں جی صاحب کو؟ اتنا کھون (خون) بہا ہے۔ دودھ پینے سے بدن میں تھوڑی فلتی آجائے گی۔“ رکھوالے نے معاذ کی زرد پڑتی رنگت کو رحم سے دیکھا اور ہمدردانہ لہجے میں ہنسنے لگی۔

”ہاں لے آؤ اور ساتھ ہی اپنا کوئی جوڑا بھی نکال دو۔“ سونیا نے اسے جواب دیا۔ اجازت لینے پر اس نے پہلے دودھ کا برتن چھ لہجے پر رکھا پھر جس صندوق سے چادر نکالی تھی، اسی سے ایک جوڑا بھی برآمد کیا۔ یہ لباس فاکسٹری سے رنگ کے کڑے اور سفید دھوئی پر مشتمل تھا۔

”میں دودھ گلاس میں نکالتی ہوں۔ تم کپڑے بدلنے میں میرے ساتھی کی مدد کرو۔“ اسے دوبارہ اسٹود کی طرف جاتے دیکھ کر سونیا نے اسے ہدایت کی۔ وہ واپس پلٹ آیا۔ سونیا نے اپنی جگہ چھوڑنے سے قبل چار پائی پر دھری اسے کے ۱۴۷ اپنے قبضے میں لے لی۔ رکھوالا سیدھا سادہ دیکھائی جوان تھا اور اب تک مکمل تھکان کر رہا تھا لیکن وہ اس کی طرف سے پوری طرح چمکتا تھا۔

لباس کی تبدیلی کے بعد معاذ دودھ پی کر قاریغ ہوا تو صبح کا ہلکا اجالا پھوٹا شروع ہو گیا تھا۔ اس حریہ بیاں ٹھہرنا خود کو خطرے میں ڈالتا تھا۔ معاذ کو ہوشیار رہنے کا اشارہ کر کے اس نے چھوٹی چھوٹی مٹ ہاتھ دھویا اور ہاتھوں

”لو اب وغیرہ کا تو ہمیں نہیں معلوم۔ ہمیں تو یہ گاڑی ایک ویرانے میں خالی کھڑی ملی تھی۔ سو نہانے اسے جواب دیا اور اشارہ کیا کہ وہ معاذ کو گاڑی کی پچھلی نشست پر بٹھا دے۔

”لو اب صاحب پتا نہیں تھیں مشکل میں ہوں گے۔ آپ لوگوں نے اپنے بارے میں بھی کچھ نہیں بتایا کہ کون ہیں اور کس جگہ میں گھر ہے ہیں؟“ وہ اپنے مالک کے دوست کے کسی دیرانے میں بے آسرا رہ جاتے پر فکر مند نظر آتا تھا۔

”گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ موقع ملا تو ہمیں اپنے بارے میں بھی بتا دیں گے۔“ سو نہانے اسے کے 47 کی ٹال چادر سے ڈرائی باہر نکالتے ہوئے اسے حکم دیا تو وہ بھٹکا گیا۔

”میں... میں کیوں جی؟“
 ”کیوں کا جواب بھی ہم نہیں راستے میں دے دیں گے۔“ سو نہانے سر دھکے اور اسے کے 47 کی دہشت نے اسے مزید جھٹ کی اجازت نہیں دی اور وہ سو نہانے کے اشارے پر اگلی ٹینجر سیٹ پر بیٹھنے پر مجبور ہو گیا۔ اسی سیٹ کی پشت گاہ پر معاذ کے خون کے دو بے موجود تھے لیکن وہ اعتراض کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

”اگر یہ کوئی غلط حرکت کرنے کی کوشش کرے تو فوراً کوئی ماردیتا۔“ ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے سے قبل اسے کے 47 کو معاذ کے گھٹنوں پر رکھتے ہوئے وہ یہ ہدایت کرنا نہیں بھولی تھی۔ معاذ کو بے اختیار اس سیدھے سادے دیہاتی لوجوان پر ترس آیا جو اس صورت حال پر اچھا خاصا ہراساں نظر آ رہا تھا لیکن وہ اس کے لیے کچھ کرنے سے قاصر تھا۔ کسی مناسب مقام تک پہنچنے کے لیے انہیں اس کی راہنمائی درکار تھی۔

☆☆☆

”سمیلا... کیا کرنے چلا تھا تو سائلے؟“ عالم شاہ کی راہ میں حائل ہونے کی جو حواقت اجالانے کی تھی، اس نے قرار ہوتے لیروں کو بھی متوجہ کر دیا تھا اور لیے قدم والا خطاب پوش جوان لیروں کا سر غنہ لگتا تھا، بھڑک کر انہیں پلٹ آ یا تھا۔

”کچھ نہیں کر رہا تھا۔ تم نے جو لینا تھا وہ لے چکے۔ اب یہاں سے دفع ہو جاؤ۔“ ناز شاہ فوراً ہی اس کے سامنے آ گئے اور حصے سے بولے لیکن ان کے حصے کے پیچھے بھی ایک خوف سا گھورے لینا صاحب محسوس ہو رہا تھا۔ ظاہر ہے انہیں غدر تھا کہ وہ لوگ عالم شاہ کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔

ہی کی مدد سے بالوں کو کسی قدر سنوار کر اپنا حلیہ بہتر بنانے کی کوشش کی۔

”میرے ساتھی کو کمزوری ہو رہی ہے۔ تمہیں اسے سہارا دینے کے لیے میرے ساتھ کھیتوں سے باہر نکل چلنا پڑے گا۔“

”نہیں میں.....“ سو نہانے رکھوالے سے کہا تو معاذ نے اس سے اختلاف کی کوشش کی لیکن سو نہانے اشارے سے اسے خاموش کر دیا۔

”چنگا جی، پر آپ کہیں تو میں آپ کے لیے اور صحتی نکال دوں؟“ جالا پھیلنے کے بعد آپ کے لیے اس طے میں سفر کا مشکل ہو جائے گا۔“ رکھوالے کی نگاہ سو نہانے کے عریاں شانے اور بازو پر تھی۔

”فہمک ہے، دے دو۔“ وہ انکار نہیں کر سکی۔ وہ فوراً ہی اپنے عمرو عیار کی زنجیل جیسے صندوق سے ایک شوخ رنگ کی کڑھائی والی چادر نکال لایا۔
 ”یہ کس کی چادر ہے؟“ زنانہ چادر دیکھ رک سو نہانے بے اختیار سوال کیا۔

”یہ میری ماں کی نکلتی ہے جی۔“ اس نے سادگی سے جواب دیا۔ سو نہانے خاموشی سے چادر اپنے شانوں پر پھیلا لی۔ اسے کے 47 بھی اس چادر کے نیچے ہی پوشیدہ ہو گئی تھی۔ اب اگر کسی سے سامنا ہو بھی جاتا تو گن کی وجہ سے فوری طور پر وہ کسی کی نظر میں نہ آتے۔ طبی امداد کے سامان والا تھیلا رکھوالے نے از خود اٹھا کر اپنے کندھے سے لٹکالیا تھا اور اب معاذ کو سہارا دے اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ سو نہانے دونوں کے پیچھے تھی۔ اس نے چادر کا پلوسر پر لے کر اسے پیشانی تک پہنچ لیا تھا اور کسی غیر متوقع صورت حال کے لیے پوری طرح ہوشیار تھی۔ ان کی خوش قسمتی رہی کہ کسی سے سامنا نہیں ہوا اور وہ سیدھے کھیت کے کنارے پر کھڑی گاڑی تک پہنچ گئے۔

”یہ تو لو اب رکن الدین کی گڈی ہے!“ رکھوالا کار کو دیکھ کر بری طرح چڑکا۔

”کون لو اب رکن الدین؟“ سو نہانے اور معاذ بھی چڑکے۔
 ”میرے مالک کے جگری دوست ہیں جی! چار دن پہلے حیدر آباد سے آئے تھے۔ انہیں پنجاب بڑا پسند ہے۔ کبھی کبھی آگے بھی اس پاس کے علاقے میں گھومنے پھرنے کے لیے نکلتے جاتے ہیں۔ کبھی میں نے انہیں اسی گڈی میں کہیں جاتے دیکھا تھا۔ آپ کو یہ گڈی کہاں سے ملی؟“ ایک مختصر سوال کے جواب میں اس نے بہت کچھ بتا دیا۔

”اگر آپ نے درمیان میں مداخلت نہ کی ہوتی تو اس وقت صورت حال کچھ اور ہوتی۔“ عالم شاہ بھی اس بار برداشت نہ کر سکا اور اسے دوبارہ جواب دیا۔

”فکر کریں کہ انہوں نے میری ریکویسٹ مان کر ہماری جان بخشی کر دی ورنہ آپ نے تو اپنے ساتھ ساتھ ہمیں بھی مروانے کا پورا انتظام کر لیا تھا۔“ وہ کسی لحاظ مراد کی کاکل معلوم نہ ہوتی تھی۔

”بہرے بات ہے وہی رانی! مہمان سے اتنا کڑوا نہیں بولتے۔“ نیاز شاہ نے نرمی سے جینی کلوکا۔

”پتا نہیں مہمان ہے یا بلائے جان!“ اس کی بڑبڑاہٹ نے عالم شاہ کا چہرہ غصے سے سرخ کر دیا۔

”تم اس کی باتوں کو دل پر نہ لو پت! مینشن میں ایسے ہی الناسیدھا بولنا شروع کر دیتی ہے۔ دو چار گھنٹوں میں خود ہی شیک ہو جائے گی۔“ نیاز شاہ جینی کے آگے مکمل طور پر بے بس معلوم ہوتے تھے اس لیے اسے ہی غصہ اکر کے معاملہ سلجھانے کی کوشش کرنے لگے۔ وہ ان کی تسلی کے لیے مسکرا دیا اور ان کے ہاتھ پر دھیرے سے اپنے ہاتھ رکھ کر دباؤ ڈالا۔ اجالا نیاز شاہ کتنی ہی بدتمیز سہی، اس کی اپنی تربیت اسے اپنے ایک بزرگ کو اپنے سامنے شرمندہ کرنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔

”میں بڑا شرمندہ ہوں پت! تمہیں یہاں آتے ہی اتنا نقصان اٹھانا پڑ گیا۔“ وہ بہر حال شرمندہ تھے۔

”نقصان کی کوئی بات نہیں چاچا سائیں! ہاں، مجھے پاسپورٹ اور دوسری شاتھی کاغذات کی فکر ہے۔ ان کی وجہ سے ہم پریشانی میں پڑ سکتے ہیں۔“ اس نے معتدل لہجے میں اپنی فکر مندی کا اظہار کیا۔

”اس کے لیے تو ہمیں ایف آئی آر کھانا پڑے گی، ذرا گھر پہنچ جائیں۔“ انہوں نے اسے جواب دیا۔ باقی کے سفر میں زیادہ تر خاموشی چھائی رہی۔ اجالا کا موڈ بھی غراب تھا۔ نیاز شاہ بچارے بھی پیش آنے والے واقعے کی وجہ سے اپنا جوش و خروش فراموش کر چکے تھے۔

”اتنی دیر لگا دی آپ لوگوں نے آنے میں؟ ہم کب سے گھر پہنچ کر انتظار میں ہکان ہو رہے ہیں۔ لازماً اس اجالا کی جینی نے دیر کروائی ہوگی۔“ ان کے چلتے ہی سب الہ خانہ باہر نکل آئے اور فیصل نے اجالا کی طرف دیکھتے ہوئے قیاس آرائی کی۔ رد عمل کے طور پر وہ زبان سے کچھ کہے بغیر بے حد غراب سوڈ میں دھپ دھپ کرتی آنکھوں کی طرف بڑھ گئی۔

”اسے کیا ہوا؟“ فیصل نے حیرت سے پوچھا۔ یہ

”ہم صرف مال نہیں بندے کی جان بھی لیتے ہیں۔ اس پاکستانی منڈے کی جان لینا تو ویسے بھی دیش بھٹی کہلائے گی۔“ اس کے لہجے میں بڑا زہر تھا۔

”یہ میرا مہمان ہے۔ اس کی جان لینے سے پہلے تمہیں میری لاش پر سے گزرنے پڑے گا۔“ نیاز شاہ اپنے یوزر سے وجود کے ساتھ عالم شاہ کے سامنے تن کر کھڑے ہو گئے۔ اجالا اب اس کے دائیں جانب تھوڑے فاصلے سے کھڑی ہوئی یہ سب دیکھ رہی تھی اور اس کے چہرے پر ہلکے وقت غصے اور پریشانی کے تاثرات تھے۔

”اگر تمہاری بچی اچھا ہے تو میں اسے پورا کر دیتا ہوں۔“ قصاب پوش بدتمیزی سے استہزاء سے لہجے میں بولا اور گن کی نال نیاز شاہ کی پیشانی پر رکھ دی۔

”ایک یوزر سے آدمی پر اسلحہ تان کر کھڑے ہو جانا کہاں کی مردانگی ہے۔ بازوؤں میں اتنا دم ہے تو گن چھوڑ کر میرا مقابلہ کرو۔“ عالم شاہ پیش سے چپا۔

”کیا فضول بکواس ہے یہ۔ ختم کرو یہ سب۔“ اجالا۔ عالم شاہ کی طرف دیکھ کر وہاڑی پھر قصاب پوش سے مخاطب ہو کر ملتجیانہ لہجے میں بولی۔

”پلیز! جس قسم سے ریکویسٹ کرتی ہوں کہ بات کو اور مست بڑھا کاؤرنا۔“ جینی سے چلے جاؤ۔“

”اتنی سندر تارنی کا کہا کیسے تالیں..... چل پار چلتے ہیں۔“ اس نے چٹکتی نگاہوں سے اجالا کو دیکھا اور اپنے ساتھیوں سمیت پیچھے ہٹ گیا۔

”چلیں اباجی، گھر چلتے ہیں۔“ ان کی گاڑی وہاں سے چلی گئی تو وہ نیاز شاہ کے بازو پر ہاتھ رکھ کر ان سے مخاطب ہوئی۔

”آ جاؤ پت!“ جینی کے کہنے پر گاڑی کی طرف قدم اٹھاتے نیاز شاہ نے عالم شاہ کو بھی پکارا۔ وہ جو اس ساری صورت حال پر عجیب سے احساسات کا شکار تھا، خاموشی سے ان کے ساتھ گاڑی میں جا بیٹھا۔

”تم فکر نہ کرو پت! گھر پہنچ کر میں کسی سے بات کرتا ہوں۔ تمہاری ایک ایک چیز برآمد کروالوں گا۔“ گاڑی چل پڑی تو عالم شاہ کی خاموشی کو محسوس کر کے انہوں نے اسے تسلی دی۔

”قار گاڑ سیک اباجی! فکرم کریں اس قصے کو اور فکر نہ کریں کہ ہم سب کی جانیں بچ گئیں ورنہ آپ کے بچے صاحب تو ہمیں مروانے ہی چلے تھے۔“ ان کا ارادہ جان کر اجالا نے انہیں بچے ہوئے لہجے میں لوکا۔

حیرت ہائی افراد کے چہروں پر بھی رقم تھی۔

”آرام سے اندر چل کر بیٹھو۔ مہمانوں کی کچھ خاطر داری کرو پھر سب بتاتا ہوں۔“ نیاز شاہ نے جھکے جھکے سے انداز میں جواب دے کر اندر کی طرف قدم بڑھائے تو اہل خانہ نے انہیں پر تشویش نگاہوں سے دیکھا۔ سب کے ساتھ ہی باہر آ جانے والی کھل تو ہاتھ کا قاعدہ حوش نگر آنے لگی اور سوائے نظروں سے عالم شاہ کو دیکھا۔ سوال خاموش کھڑے سرحد کی نگاہ میں بھی تھا۔

”سب ٹھیک ہے۔ پریشان مت ہو۔“ عالم شاہ نے کھل کے قریب جا کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی دی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی مضبوط اعصاب کی مالک بہن اپنے اوپر چھتے والے حادثے کے بعد بہت حساس ہو گئی ہے اور کسی امید کی کا خیال اسے سراسیمہ کر دیتا ہے۔

”اجالا سے گاڑی کی چابی تو منگواؤ تاکہ عالم اور کھل کا سامان ان کے کمروں میں پہنچایا جاسکے۔“ حقیل کی بیوی نے وہابی دی۔ وہ دیکھ چکی تھی کہ بگڑی منڈ گاڑی کی چابیاں نکال کر ساتھ لے گئی ہے۔

”سامان کی ایسی کوئی جلدی نہیں ہے بھابی اچھے پہلے اندر چل کر اطمینان سے بات کرتے ہیں۔“ عالم شاہ نے از خود جواب دے کر نیاز شاہ کو زحمت سے بچالیا۔ اندر جا کر وہ سب وسیع ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے۔ گزیر کا احساس سب ہی کو ہو گیا تھا اس لیے اس محفل میں نوجوانوں اور بچوں کو بیٹھنے کی اجازت نہیں دی گئی اور یہاں سے انہیں زودھر اُدھر کر دیا گیا۔

”معاذ یہ ہے کہ۔“ نیاز شاہ نے ویسی آواز میں تفصیل سے سارا قصہ سنانا شروع کر دیا۔

”یہ تو بہت سنگین معاملہ ہے اباجی اس معاملے کی فوراً ایف آئی آر کٹوانا پڑے گی۔“ معاذ جان کر حقیل نے تشویش کا اظہار کرنے میں ہلکی کی۔

”ان لوگوں کے فریش ہونے اور کھانے پینے کے بعد اپنے ساتھ پولیس اسٹیشن لے جا کر ہاتھ دھو ایف آئی آر کٹوا دینا۔ فی الحال میں ڈی ایس پی کو کال کر کے واردات کی خبر دے دیتا ہوں۔“ انہوں نے تجویز پیش کی جس سے کسی نے اعتراضات اٹھائے نہیں کیا۔

”مٹے یہاں کو مجھے دے دو کھل! انہیں میں سنبھال لوں گی۔ تم فردوس کے ساتھ جا کر فریش ہو جاؤ۔“ بڑی بھالی نے کھل سے اس کا ہچے لے لیا۔

خوش قسمتی سے ان تینوں کے کپڑوں کا ایک ایک ٹک

حقیل کی گاڑی میں رکھوایا گیا تھا اس لیے فوری طور پر استعمال کے کپڑوں کا مسئلہ پیدا نہیں ہوا۔

”میرے ملازم سرحد کو میرے پاس بھجوا دیں۔“ لیصل نے عالم شاہ کو اس کے لیے مخصوص کیے جانے والے کمرے تک پہنچایا تو اس نے اس سے فرمائش کی۔ سرحد بھی باقی لوگوں کے ساتھ اتر پورٹ سے گھر پہنچ چکا تھا لیکن احقر ہاؤس رانگ روم میں جھنے والی کھل میں شریک ہونے کی کوشش نہیں کی تھی اور باہر ہی رکا رہا تھا۔ عالم شاہ کو اس کے جھس اور تشویش کا احساس تھا اس لیے پہلی فرصت میں اسے بلوا بھیجا۔

”سب خیر تو ہے سامی؟“ وہ کوئی ٹک شاور لے کر باہر نکلا تو کمرے میں سرحد اس کا منتظر تھا۔ جو اب اس نے اسے سارا قصہ کہہ سنایا۔

”یہ تو برا ہوا سامی!“ سن کر وہ لگرمند ہو گیا۔

”برا تو ہوا۔ بابا سامی نے لیصل کی دہن اور دیگر افراد کے لیے جیتی تھانف بھجوائے تھے، وہ چلے گئے مگر کھانڈات کی وجہ سے الگ پریشانی ہے۔“ وہ جو خود کو بالکل مارل ظاہر کرتا رہا تھا، سرحد کے سامنے اظہار کیے بغیر بندہ سا۔

”آپ کے چاچا سامی کیا کہتے ہیں؟“

”ایف آئی آر کٹوانے کی بات کر رہے ہیں۔ کسی ڈی ایس پی کو کال وغیرہ بھی کی ہے لیکن مجھے کچھ بھی واہس ملنے کی امید نہیں ہے۔ ہماری اور انڈیا کی پولیس کی کارکردگی سے سب سی واقف ہیں۔“ وہ خامسا نا امید تھا۔

”اللہ بھڑ کرے گا سامی! دیکھتے ہیں یہاں والے کیا کچھ کر پاتے ہیں مگر پاکستان فون کر کے سامی سے مشورہ کریں گے۔“

”میرا تو موہاں بھی دو غیبت لے گئے۔ کیش بھی تمہارے اور کھل کے پاس رکھوائے گئے ڈالر کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔“

”کوئی بات نہیں سامی۔ اتنا بھی کافی ہے۔ ضرورت پڑی تو مزید کا انتظام ہو جائے گا۔“ سرحد نے اسے تسلی دی۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

”آ جاؤ۔“

”کھانا لگ گیا ہے اور آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔“ عالم شاہ کے اجازت دینے پر لیصل اندر آیا اور اسے اطلاع دی۔ عالم شاہ اس کے ساتھ چل پڑا۔ سرحد کے لیے الگ انتظام تھا۔ وہ لیصل کے ساتھ ڈرائنگ روم میں پہنچا تو جلد اہل خانہ کے ساتھ کھل بھی وہاں موجود تھی لیکن اجالا غائب

پاکستانی جاسوس موجود ہیں اور ہم انہیں گرفتار کرنے آئے ہیں۔" سپاٹ سے لہجے میں جواب دیا گیا۔

"آپ نے فیلڈ انفارمیشن پر یہاں آنے کی زحمت کی ہے۔" گھیل نے محل سے جواب دیا۔

"آپ اس بات سے انکار کر رہے ہیں کہ اس گھر میں کچھ پاکستانی موجود ہیں؟"

"نہیں۔ میں پاکستانی جاسوسوں کی موجودگی سے انکار کر رہا ہوں۔ یہاں پاکستانی جاسوس نہیں بلکہ پاکستان سے آئے ہوئے ہمارے معزز مہمان موجود ہیں۔"

"میں آپ کے ان مہمانوں سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"ضرور!" گھیل نے ملازم کو عالم اور سرمد کو بلانے کے لیے بھیج دیا۔

"میری کچھ سے باہر ہے کہ کس نے آپ کو اتنی بیہودہ اطلاع کے ساتھ یہاں بھیج ڈالا۔ ہم ڈسے دار شہری ہیں اور اس پورے علاقے میں ہماری بہت عزت ہے۔"

"ہم اپنا سوریس آف انفارمیشن شونہیں کرتے۔" اس نے گھیل کی حیرت کا رکھائی سے جواب دیا۔ کچھ دیر کے لیے ڈرائنگ روم میں خاموشی چھا گئی جسے قدموں کی آہٹ نے توڑا۔ عالم شاہ اور سرمد ملازم کی سمیت میں اندر آئے۔

"یہ میرے کزن عالم شاہ اور ان کے ساتھی سرمد ہیں۔" گھیل نے تعارف کروایا۔

"کیا آپ نے پولیس اسٹیشن میں ان کے اراخیل کی اعتری کروائی ہے؟" اس نے برے کی طرح چھپتی نظروں سے عالم شاہ اور سرمد کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

"یہ کچھ دیر قبل ہی پہنچے ہیں۔ ہمارا ارادہ تھا کہ کھانے سے فارغ ہو کر پولیس اسٹیشن جائیں گے۔ ہمیں ایک ایف آئی آر بھی کھانا ہے۔" گھیل کی ذمہ داری عمل طور پر گھیل نے سنبھالی ہوئی تھی۔

"میں تم لوگوں کے پاسپورٹ، ویزا اور دوسرے کاغذات دیکھنا چاہتا ہوں۔" اس نے گھیل کو نظر انداز کر کے براہ راست عالم شاہ اور سرمد کو مخاطب کیا۔ دونوں نے بے اختیار گھیل کی طرف دیکھا۔

"بات یہ ہے آفیسر کہ ان پورٹ سے گھر آتے ہوئے کچھ لیٹروں نے ہماری گاڑی کو روک لیا تھا۔ وہ لیٹروں ہمارے مہمانوں کے جیسی سلمان سمیت وہ برہنہ کیس بھی چھین کر لے گئے جس میں ان کے سفری کاغذات اور کیس وغیرہ موجود تھا۔" گھیل نے ذرا سا گھٹکتا کرتے ہوئے اسے صورت حال سے آگاہ کیا۔

حق۔ یقیناً اس تک چڑھی شہزادی کا مزاج ابھی تک بحال نہیں ہوا تھا۔ وہ خود کو پیش کی گئی ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور میز پر ایک نظر االی۔ طویل میز پر یہاں سے وہاں تک بے شمار ڈشز نظر آرہی تھیں۔ یقیناً ان کی آمد کی خوشی میں اتنا زبردست اہتمام کیا گیا تھا۔ اس کے بیٹھے ہی کھانے کا باقاعدہ آغاز ہو گیا۔ اسے اور گھل کو ایک ایک چیز اصرار سے پیش کی جانے لگی۔ درمیان میں اگلی پستکی گھٹکو کا سلسلہ جاری رہا۔ دونوں فریقین ناخوشگوار صورت حال سے ہٹ کر ادھر ادھر کے بے ضرر موضوعات پر گفتگو کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کوشش کو ایک ملازم کی آمد نے سبوتاژ کر دیا۔

"شا چاہتا ہوں سرکار کہ کھانے کے دوران آپ لوگوں کو ڈسٹرب کیا۔ اصل میں باہر کچھ پولیس والے آئے ہیں اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"اوہ! ڈی ایس پی وکرم نے انہیں بھجوا یا ہوگا۔ تم انہیں بھٹاؤ اور چائے پانی کا پوچھو۔ ہم لوگ کھانے سے فارغ ہو کر تھوڑی دیر میں آتے ہیں۔" نیاز شاہ ملازم کو اطمینان سے جواب دے کر دوبارہ کھانے کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"وہ تو کوئی دوسری انوکھی سی بات کرتے ہیں سرکار!" ملازم ان کی ہدایت پر عمل پیرا ہونے کے بجائے جھجکتے ہوئے بولا۔

"کیا مطلب؟ کیا کہتے ہیں وہ؟" بڑے گھیل نے چونک کر پوچھا۔

"ان کا کہنا ہے کہ انہیں یہاں کچھ پاکستانی جاسوسوں کی آمد کی گھوٹالی ہے اور وہ انہیں گرفتار کرنے آئے ہیں۔" ملازم نے جھجکتے ہوئے جو اطلاع دی، اسے من کر سب کے من کھلے رو گئے۔

"یہ کیسی بکواس کر رہے ہیں وہ ایڈیشن۔" سب سے پہلا رد عمل فیصل نے دیا اور غصے کی کیفیت میں اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔

"میں جا کر بات کرتا ہوں ان سے۔"

"نہیں۔ تم یہیں رکو۔ میں خود ان سے ملاقات کروں گا۔۔۔۔۔ تم میرے ساتھ آؤ۔" نیاز شاہ نے فیصل کو تھکے لہجے میں روکا اور بڑے بچے کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

"نہیں آفیسر!" ڈرائنگ روم میں پہنچ کر نیاز شاہ ایک صوفے پر خاموشی سے براجمان ہو گئے اور گھیل نے گھٹکو کا آغاز کیا۔

"ہمارے پاس انفارمیشن ہے کہ اس گھر میں کچھ

”یہ کیا بکواس ہے؟ آپ کہتا چاہتے ہیں کہ پاکستان سے آئے ہیں اور ان کے پاس شناختی کاغذات نہیں ہیں؟“ اس نے غصے کا اظہار کیا۔

”آرام سے آفیسر! میں نے آپ کو بتایا نا کہ راستے میں ٹھہروں نے۔“

”ایسی سچویشن میں آپ کو سب سے پہلے پولیس اسٹیشن جانا چاہیے تھا لیکن آپ یہاں بیٹھے ان کی خاطر داریاں کر رہے ہیں۔“ اس نے گھٹیل کی بات کاٹ کر تندہ لہجے میں اسے ٹوکا۔

”ہم تھوڑی دیر میں جانے ہی والے تھے۔ بس ان لوگوں کو ذرا فریش ہونے کا موقع دیا تھا۔“ گھٹیل کا انداز دقابی ہو گیا۔

”ان کو مزید موقع مل جاتا تو یہ ادھر ادھر سلپ ہو جاتے اور ہمارے دیٹش میں دہشت گردی کرتے بھرتے۔“ اس کے لہجے کی تبدیلی مزید بڑھ گئی۔

”آپ ایک غلط فہمی کی بنیاد پر ہمارے معزز مہمانوں کی توہین کر رہے ہیں۔“ گھٹیل کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

”اب یہ غلط فہمی پولیس اسٹیشن پہنچ کر ہی دور ہوگی۔ ہم ان دونوں کو گرفتار کر رہے ہیں۔“ اس کے منہ سے جملہ پورا ادا ہو گیا تھا کہ اس کے ساتھ آئے ہوئے پولیس اہلکار اٹھائیں سونت کر سردار عالم شاہ کے سر پر جانیچے۔

”یہ آپ بہت غلط کر رہے ہیں۔“ گھٹیل اظہارِ رویہ طور پر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

”میں صرف اپنی ڈیوٹی پوری کر رہا ہوں۔“ وہ رعونت سے بولا۔

”جسٹس! تم ایک منٹ انتظار کرو۔ میں ابھی تمہارے کسی بڑے سے بات کرتا ہوں۔“ اتنی دیر سے خاموشی سے سب سنتے اور دیکھتے نیاز شاہ کو آخر کار مدافعت کرنا پڑی۔

”آپ چاہیں تو پردھان منتری سے بات کر لیں لیکن اب میں مزید یہاں نہیں رک سکنا۔ آپ کے لیے قانون کا راستہ کھلا ہے۔ اگر یہ لوگ زندہ ہیں تو اس راستے سے آکر انہیں چھرا لیجیے گا۔“ وہ تھوڑا سا سسکی لگتا تھا۔ نیاز شاہ غصے سے کانپنے لگے۔

”مزید ایسی اہمائی! یہ جو کر رہے ہیں انہیں کرنے دینی۔ آئی ایف سی پر کہہ آدھے پانے گھٹنے سے زیادہ ان لوگوں کو نہیں روک سکیں گے۔ میں ابھی اپنے دوستوں سے رابطہ کرتا ہوں۔“ گھٹیل کو بھی اپنے تعلقات کا ڈر تھا۔

”ہلو۔“ وہ بھی رعب میں آئے بغیر تلخ لہجے میں بولا۔

”تم دونوں ان کے ساتھ چلے جاؤ، گھبراہٹ۔ ہم بھی ابھی پہنچتے ہیں۔“ گھٹیل نے تسلی دی۔ پولیس والے انہیں ہٹاتے ہوئے باہر لے گئے۔ حیرت انگیز طور پر انہوں نے گھٹیل کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ لگتا تھا انہیں گھٹیل اور اس کے بچے کے بارے میں کوئی خبر ہی نہیں تھی۔

”نور! کچھ کر گھٹیل! عالم کو خراش بھی آئی تو میں اور صداقت شاہ سے آگے نہیں ملا سکتوں گا۔“ نیاز شاہ کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگیں۔

”آپ ٹھیک رہیں! اہمائی! کچھ نہیں ہوگا۔“ گھٹیل انہیں دلاسا دے کر اپنے موبائل پر کوئی نمبر ملانے لگا۔ اسی دوران گھر کے دیگر مرد بھی وہاں آ گئے۔ انہوں نے عالم شاہ اور سردار کو پولیس کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور اب صورت حال جانا چاہتے تھے۔ گھٹیل کے فون پر مصروف ہونے کے باعث نیاز شاہ نے انہیں آگاہ کیا۔

”ہم میں سے کسی کو تھانے جانا چاہیے۔ اس طرح عالم کو ڈھارس رہے گی۔“ یہ مشورہ دینے والا ان کے چوتھے نمبر کا پتہ چل گیا تھا۔

”ٹھیک ہے، تم اور عادل وہاں چلے جاؤ۔ ہم لوگ بھی کوئی مناسب انتظام کر کے پہنچتے ہیں۔“ انہیں چلنے کی حوصلہ بخشنے لگی۔

”گھٹیل کو تو کچھ پتا نہیں چلا ہے؟“

”نہیں اہمائی! خواہ مخواہ میں صرف صبر کروں گا کہ تھوڑی سی من گھڑی ہے اور انہیں میں نے سختی سے خاموش رہنے کی ہدایت کر دی ہے۔ وہ کچھ دیر ہیں سب سنبھال لیں گی۔“ عادل نے انہیں تسلی دی اور پھر چلنے کے ساتھ پولیس اسٹیشن کے لیے روانہ ہو گیا۔

”کچھ دیر پہلے آپ کا ایک آفیسر ہمارے دو پاکستانی مہمانوں کو اریسٹ کر کے یہاں لایا ہے۔ ہم ان کے بارے میں جانا چاہتے ہیں۔“ تھوڑی سی تک دود کے بعد تھانیدار کے سامنے پہنچنے پر چلنے نے اپنی آدھ کا مقصد بیان کیا۔

”یہاں کسی پاکستانی کو اریسٹ کر کے نہیں لایا گیا۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ مشکل سے جس جگہ منٹ پہلے ہی تو ایک پولیس آفیسر اور چند سپاہی ہمارے گھر پر تھے انہیں گرفتار کر کے لے گئے تھے۔“ انہیں اچھا اذ کے جواب سننے انہیں حیران کر دیا۔

”کیا نام تھا اس پولیس آفیسر کا؟“

”نام تو مجھے نہیں معلوم۔ ایک منٹ، میں

میں شامل ہونے کا بھی امکان ہے۔" وقاص کچھ پُر جوش سا محسوس ہوتا تھا۔

"میں آجاتی ہوں۔ تم جگہ اور وقت بتاؤ۔" وہ فوراً راضی ہو گئی۔ وقاص نے اسے ایک گھنٹے بعد ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں آنے کا کہہ دیا۔

"اگر آپ کے پاس کوئی ہتھیار ہے تو اسے بھی ساتھ لے آئیے گا۔" اس کی آخری دی ہوئی ہدایت نے بشریٰ کے وجود میں سسکی دوڑا دی۔ وہ جو اتنے دنوں سے خانہ کس میں پڑی خود کو ناکارہ محسوس کر رہی تھی، خود کو یکدم پُر جوش محسوس کرنے لگی۔ جینز اور ڈھیلی ڈھالی لائیک نی شرٹ میں جلیٹ کے ساتھ پھل لٹکا کر تیار ہونے میں اس نے زیادہ دقت نہیں لیا۔ اب بالوں اور آنکھوں کی رنگت سیت اس کے چہرے میں کئی انکی تہیلیاں آچکی تھیں جنہوں نے اسے بارہا سے بالکل مختلف روپ میں ڈھال دیا تھا۔ اس لیے باہر نکلتے ہوئے اسے اس بات کا اندیشہ نہیں تھا کہ کوئی اسے بارہا کی حیثیت سے شناخت کر لے گا۔ اپنی تیاری کو قائل گچ دیتے ہوئے اس نے گلے میں سرخ اسکارف لٹکایا اور آنکھوں پر سن گلاسز چڑھائی باہر نکل آئی۔

"آپ کہیں جا رہی ہیں میم؟" سونیا کا سیکریٹری کم باڈی گارڈ حامد اچانک ہی اس کی راہ میں حائل ہو گیا۔

"آپ کو کوئی اعتراض ہے؟" وہ اس کے بچوں سوال کرنے پر جھنجھلائی۔

"نومیم! میں صرف آپ کے پروگرام کے بارے میں جانا چاہتا ہوں۔ میڈم سونیا آپ کی ذمہ داری مجھے سونپ کر گئی تھی۔" اس نے شائستگی سے جواب دیا۔

"بے کار پڑے پڑے ہو گئی ہوں۔ بس ایسے ہی ادھر ادھر گھومنے جانا چاہتی ہوں۔" اس نے جان بوجھ کر لہجہ کو بے پروا بنایا۔

"اٹھو! میں ڈرائیور سے کہہ دیتا ہوں۔ وہ آپ کو آپ کی مرضی کی جگہ پر لے جائے گا۔ اگر کچھ کیش وغیرہ چاہیے ہو تو آپ مجھے بتا سکتی ہیں۔" حامد کا لہجہ اب بھی مہذبانہ اور شائستہ تھا۔

"نوشکریس۔ میں خود ہی سب ارجح کر لوں گی۔" اس نے قدم آگے بڑھائے۔

"یہاں آپ کو کوئی ساری ملنا مشکل ہے میم؟" حامد کے الفاظ نے اس کے قدم روک دیے۔ وہ کھولے ہی تھی کہ خانہ کس شہر کے ایک ایسے محلے میں ہے جہاں سے پبلک ٹرانسپورٹ کا گزر نہیں ہوتا۔

بھائی صاحب سے فون کر کے معلوم کرتا ہوں۔" جلیل نے اپنا موبائل نکال کر گھٹیل کا نمبر ڈائل کیا۔ کچھ دیر بات کرنے کے بعد اس نے فون بند کر دیا اور مایوسانہ لہجے میں بولا۔

"نام انہیں بھی نہیں معلوم۔ پریشانی میں نام کی طرف ان کا دھیان ہی نہیں گیا۔ بس اتنا معلوم ہے کہ وہ کوئی اسے ایس پی تھا اور اس نے پولیس اسٹیشن جانے کی بات کی تھی۔" یہاں کسی کو نہیں لایا گیا۔ ویسے بھی اگر یہ پاکستانی دہشت گردوں وغیرہ کا چکر ہے تو کئی اوپر سے ڈوریاں ملنی ہوں گی اور گرفتار بندوں کو کسی خلیہ جگہ پر رکھا گیا ہوگا۔" ایس ایچ او ان کے خاندان سے واقف تھا اس لیے ذرا لحاظ مروت سے بات کر رہا تھا۔ جلیل اور عادل کو اس کی بات میں وزن محسوس ہوا۔ ایک بار پھر انہوں نے گھٹیل سے رابطہ کر کے اس موضوع پر تبادلہ خیال کیا۔ اس کے بعد تو فون کی گھنٹیاں بجنے اور ادھر ادھر بھاگ دوڑ کرنے کا ایک ختم نہ ہونے والا سلسلہ ہی شروع ہو گیا لیکن ساری کوششیں رائگاں گئیں۔ عالم شاہ اور سرمد گلہ کے سر سے ہنگ کی طرح قاصب ہو چکے تھے اور کہیں سے ان کی کوئی خبر نہیں مل رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ آج کوئی تعلق، کوئی رابطہ کام نہیں آئے گا۔ نیاز شاہ اپنے پانچ عدد بیٹوں اور دو دامادوں کے ساتھ کے باوجود کلی طور پر بے بس ہو چکے تھے۔

☆☆☆

"ہیلو۔" اس نے اسکرین پر جھنگٹا اجنبی نمبر دیکھا اور نہایت بیزارگی کے عالم میں کال ریسیو کی۔

"کس بشریٰ! میں وقاص بات کر رہا ہوں۔" دوسری طرف سے سنائی دیتی آواز نے اس کی بیزارگی کو اڑن چھو کر دیا۔

"وقاص.....! تم کب آئے دئی سے؟" اس بار اس کے لہجے میں جوش تھا۔

"کچھ دن ہی ہوئے ہیں۔ آپ سنا میں کیسی ہیں اور آج کل کیا چل رہا ہے؟"

"کچھ نہیں۔ بے کار پڑی ہوئی ہوں۔" بیزارگی ایک بار پھر اس کے لہجے میں نمودار آئی۔

"لیکن میں نے یہاں آتے ہی کافی کام کیا ہے۔ سمجھیں آپ کے لیے اچھی خبر ہے۔"

"واقعی..... مگر تو فوراً سناؤ کہ کس گزری اچھی خبر میں بیٹنے کو نہیں بیٹیں۔"

"ملاقات کے بارے میں کیا عیال ہے؟ مجھے آپ کو صرف خبر نہیں سنائی بلکہ آپ کے ایک زبردست کارروائی

”او کے! آپ ڈرائیور سے کہہ دیں۔“ وہ ڈھیلی پڑ گئی۔ ٹھیک بائچ سنٹ بعد وہ خان پتیس کی ایک شاندار گاڑی میں سفر کر رہی تھی۔

”بس یہیں روک دو۔“ گاڑی بچا چوری تک پہنچی تو اس نے ڈرائیور کو حکم دیا۔ اس کے حکم کی تعمیل کی گئی۔

”تم واپس جاؤ۔ میں خود آ جاؤں گی۔“ گاڑی سے بچھڑا کر اس نے دوسرا حکم صادر کیا اور قریب سے گزرتی ایک جیسی کو روک کر اس میں سوار ہو گئی۔ جیسی ڈرائیور کو مطلوبہ ریٹورنٹ کا پتہ جیسی کے آگے بڑھنے تک وہ مقب نما آئینے میں خان پتیس کی گاڑی کا جائزہ لیتی رہی تھی۔ ڈرائیور نے اس کے حکم سے روگردانی نہیں کی تھی اور ایک یوٹرن سے گاڑی موڑ کر واپس خان پتیس کی طرف جانے والے راستے پر جا رہا تھا۔ وہ ایک اطمینان سا محسوس کرتے ہوئے آرام سے بیٹھ گئی۔ جیسی نے جلد ہی اسے مطلوبہ ریٹورنٹ تک پہنچا دیا۔

”مس بشری! یہاں میری گاڑی میں آ جائیں۔“ جیسی ڈرائیور کو کرایہ ہوا کر کے وہ ریٹورنٹ کے اندر جانے والے راستے کی طرف قدم بڑھاتی رہی تھی کہ وہ خاص عرف وکی کی جانی پہچانی آواز سنائی دی۔ وہ ایک گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اسے پکار رہا تھا۔

”بہت سکھوس ہو۔ ایک کپ چائے بھی پلانے کی زحمت گوارا نہیں کی۔“ اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے مسکرا کر اسے پھیرا۔

”اس وقت ڈرائیور جیسی ہے اس لیے چائے ادھار رہی۔ آپ بتائیں اپنے ساتھ اٹھار تو لے کر آئی ہیں نا؟“

”ہاں، پستول لائی ہوں لیکن تم بتاؤ کہ کیا چکر ہے؟“ اس نے وقاص کو گھورا۔

”میرا ایک دوست ہے موسیٰ! ماضی میں باڈل کا بیچا کرنے کے چکر میں وہ اچھا خاصا زخمی ہو گیا تھا۔ اب بہتر ہے لیکن اسے چیک اپ کے لیے اسپتال جانا پڑتا ہے۔ دو دن پہلے بھی وہ چیک اپ کے لیے اسپتال گیا تھا۔ وہاں اس نے باڈل کو دیکھا۔ وہ اچھی خاصی زخمی حالت میں وہاں داخل ہے۔ موسیٰ کے اطلاع دینے کے بعد میں نے اس کی منگیتر تیلی کو معلومات اکٹھے کرنے پر لگا دیا تھا۔ نئی کے مطابق باڈل کی دیکھ بھال کے لیے اسپتال کے اطاف کے علاوہ کوئی موجود نہیں ہوتا۔ صرف وزینگ آؤرنڈ میں اس کی ماں تاج پائی اور گرل فرینڈ مہنا ز کو وہاں آتے چلتے دیکھا گیا ہے۔“

”اوہ.....!“ وکی کی دی گئی اطلاعات پر بشری نے ہونٹ سکپڑے۔

”اب آگے کیا کرتا ہے؟“

”سلطان کے مطابق باڈل ہی وہ شخص ہے جس سے ہم معاذ بھائی کے بارے میں کچھ معلوم کر سکتے ہیں۔ خود آپ کو بھی باڈل سے اپنا انتظام لینا ہے تو میرے خیال میں یہ موقع اچھا ہے۔ وہ سامنے بھی ہے اور اس کے آس پاس سکیورٹی بھی نہیں ہے۔ ہم اسے اغوا کر کے اپنے قہقارے پر لے جاسکتے ہیں۔“

”پلان کیا ہے؟“ باڈل اس کا سب سے بڑا مجرم تھا۔ اس کے ہاتھ آنے کے خیال سے جہاں وہ بے ہمتا پر جوش ہو گئی وہیں سارے جسم میں ایک تناؤ کی سی کیفیت پیدا ہونے سے سطحیاں اور جڑے بری طرح کھج گئے۔ وقاص ڈرائیونگ کرتے ہوئے اسے اپنے منصوبے کے بارے میں بتاتے لگے۔ وہ ایک ایک بات تفصیل سے سن رہی تھی۔

”لال پھیلی نے مجھے ان لوگوں سے دور رہنے کی نصیحت کر رکھی ہے اس لیے میں اس کام کے لیے لال کے کسی آدمی سے کام نہیں لینا چاہتا۔ یہ کام تمہیں، مجھے اور نئی کو انجام دینا ہوگا۔ اغوا کے لیے ہم ایک ایسویٹس استعمال کریں گے جس کی ڈرائیونگ سیٹ لازماً مجھے سنبھالنا ہوگی۔ اندر تم اور نئی ساری کارروائی کروگی۔ تم دونوں خرموں کی پوچھا رام میں ہوگی اور تمہیں لڑکیاں ہونے کی وجہ سے بھی کم سے کم شک کا ایڈوائس حاصل ہوگا۔ اس لیے میرے خیال میں تمہاری کامیابی کے چانسز بہت زیادہ ہیں۔“ بالآخر ان کا سفر تمام ہوا اور وہ ایک چھوٹے سے قلعے میں پہنچ گئے۔ یہاں سے نئی پہلے ہی زس کے لباس میں تیار تھی۔ بشری کو بھی ایک لباس فراہم کر دیا گیا۔ روائی سے مکمل مزید جرنیات پر تبادلہ خیال کیا گیا۔

”ہمارے ہاں خواتین ایسویٹس ڈرائیونگ نہیں کرتیں ورنہ میں تم دونوں میں سے ایک کو ڈرائیونگ سوپ کر خود اندر کی کارروائی میں حصہ لیتا۔ مجبوری یہ بھی ہے کہ اسپتال سے مریش کو نکالنے کے لیے ایسویٹس ہی سب سے موزوں گاڑی ہے۔“ وہ تھوڑا سا مضطرب تھا۔

”فونٹ وری۔ آئی ہوپ کہ میں اور نئی سب کچھ آسانی سے سنبھال لیں گے۔“ بشری نے اسے تسلی دی۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے مشن پر روانہ ہو رہے تھے۔ وقاص کسی ذریعے سے حاصل کردہ ایک ایسویٹس میں سوار تھا جبکہ نئی

اور بشری نے فیکسی استعمال کی تھی۔ وہیسی میں ان تینوں کو باؤل سمیت ایسویٹس میں آتا تھا۔

”دائیں جانب چلو۔ وہاں سے ہسپتال کی طرف راستہ جاتا ہے۔ ہمیں وہیل چیئر وہاں سے ملے گی۔“ فیکسی سے اتر کر مرکزی عمارت میں داخل ہوتے ہوئے نلی نے بشری کو سرگوشی میں بتایا۔

”تم لوگ عین وقت پر مجھے شامل کرنے کے بجائے اگر پہلے سے انفارم کرو دیتے تو میں زیادہ بہتر پوزیشن میں ہوتی۔“ اس موقع پر بشری کو شدت سے احساس ہوا کہ وہ اسپتال کے محل وقوع سے ذہنک سے واقف نہیں ہے۔

”پہلے وہی کاراردہ تھا کہ کام مکمل ہونے کے بعد آپ کو انفارم کیا جائے لیکن پھر اسے لگا کہ میرے ساتھ کوئی ہیلپ کرنے والا ہونا چاہیے تو اس نے آپ کو بلوالیا۔ ڈونٹ وری۔۔۔ میں آپ کے ساتھ ساتھ ہی رہوں گی۔ بالقرض کوئی گڑبڑ ہو جاتی ہے تو آپ کو یاد رکھنا ہے کہ عمارت کی بہک ساڈ پر بھی ایک دروازہ ہے جہاں سے فرار ہوا جاسکتا ہے۔“ نلی بہت دھیمے لہجے میں بات کر رہی تھی۔ بات کرتے کرتے وہ دونوں ہسپتال میں پہنچ چکی تھیں۔ نرسوں کے مخصوص چیلے کے باعث کسی نے بھی ان پر توجہ نہیں دی تھی۔

”آپ وہیل چیئر سنبھالیں، میں دوسرے انتظامات کرتی ہوں۔“ اسے ایک ایسی جگہ چھوڑ کر جہاں چھ سات وہیل چیئرز کھڑی تھیں، نلی آگے بڑھ گئی۔ اس نے ایک وہیل چیئر منتخب کی اور اسے دھکیلتے ہوئے ریسیپٹنک لے گئی۔ اسپتال کی عمارت اچھی خاصی وسیع تھی اور ہسپتال بھی خاصا کشادہ اور روشن بنایا گیا تھا۔ اس ہسپتال کی حیثیت ایک اسٹور کی سی تھی جہاں مختلف قسم کا سامان ایک ترتیب سے رکھا گیا تھا۔ بشری نے عملے کے چند افراد وہاں آتے جاتے دیکھے۔

”آئیں چلتے ہیں۔“ نلی اپنا کام نفاذ کر جلد ہی آگئی۔ اب اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی ٹرے نظر آ رہی تھی جس میں سرسبز، روکی کے پھائے، سنی پلاسٹ اور اسپرٹ جیسی مزید ایک دو اشیاء رکھی ہوئی تھیں۔ بشری جانتی تھی کہ ٹرے میں ایک ایسی سرخ بھی موجود ہے جو نلی اپنی جیب میں رکھ کر لائی ہے اور اس سرخ میں خواب آور دوا پر مشتمل محلول بھرا ہے۔ باؤل ڈیجی تھا اس کے باوجود اسے لاپرواہی سے دیکھتے ہوئے آگے بڑھتا ہوا گیا تھا۔

”ہمیں روم نمبر سکشن میں جانا ہے۔“ پرائیویٹ

روم کی قطار کے سامنے سے گزرتے ہوئے نلی نے اسے بتایا جس پر اس نے سر کو گھٹا اشارات میں جھپٹ دینے پر اکتفا کیا۔ اس طرح کی معلومات اسے وہی نے بھی فراہم کی تھیں لیکن نلی شاید اضطراری کیفیت میں اسے بتاتی جا رہی تھی۔ مظلومہ کمرے تک پہنچ کر دروازے پر دستک دینے کی زحمت کیے بغیر اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور دونوں دبے قدموں چلتے ہوئے آگے پیچھے اندر داخل ہو گئیں۔ سامنے ہی بستر پر باؤل آنکھیں بند کیے لیٹا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی بشری کے وجود میں طرے کی ایک تند لہر اٹھی۔ اگر محاذ کی بازیابی کا مسئلہ درپیش نہ ہوتا تو وہ اسے فوری طور پر ہلاک کرنے کو ترجیح دیتی۔

”ریلیکس۔“ نلی نے شاید اس کے تاثرات سے اس کی کیفیت کا اندازہ لگایا اور دلاسا دینے والے انداز میں سرگوشی کر کے ہاتھ میں موجود میز پر رکھ کر اس میں سے مخصوص سرخ اٹھا کر باؤل کے ہاتھ میں پہلے سے موجود کیولا میں اسے انجیکٹ کیا۔ دوائس میں داخل ہونے کی مخصوص جلن محسوس کر کے اس کی آنکھ کھل گئی۔

”کوئی پرابلم نہیں ہے سراسر! آپ کو انجکشن دینے کا وقت ہو گیا تھا اس لیے مجبوراً مجھے آپ کو ڈسٹرب کرنا پڑا۔“ ”تم کون ہو؟ سسز تانیہ کہاں ہے؟“ اس کی وہ آنکھیں جن کے تاثرات عورت ذات کو مضطرب اور سرسبز کر دیتے تھے اس وقت نیند سے جاگنے کے باعث سرخ ہو رہی تھیں۔

”آئی ڈونٹ نو سراسر! مجھے تو ڈاکٹر فیروز کی طرف سے انٹرکشن ملی تھی کہ آپ کو انجکشن لگا دیا جائے اور تھوڑی دیر کے لیے باہر سیر کر دادی جائے تاکہ آپ خود کو فریش فیل کریں۔“ نلی نے بڑے اعتماد سے اس کی بات کا جواب دیا۔

”میں سسز تانیہ کے بغیر کہیں نہیں جاؤں گا۔“ ”ٹھیک ہے، ہم انہیں بھی بلوائیں گے۔ آپ پلیز وہیل چیئر پر تو آئیں۔“ نلی نے اسے نرمی سے جواب دیا اور بشری کی طرف رخ کر کے بولی۔

”سسز صبا پلیز ہیلپ می!“ بشری کو آگے بڑھ کر باؤل کو سہارا دینا پڑا۔ اس کے لیے سب ایک تکلیف دہ عمل تھا اور اسے باؤل کو ہاتھ لگاتے ہوئے شدید محسوس ہو رہی تھی۔

”میں نے جہیں کہیں دیکھا ہے؟“ بشری کو قریب سے دیکھتے ہوئے اس نے پھل کا برکیا تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ کم بحث ڈیجی تھا، صحت کافی گرئی تھی پھر بھی

اس کے بدلے ہوئے طبقے کے باوجود اسے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”بہنیں اسی اسپتال میں دیکھا ہوگا سارا“ اپنی کیفیات پر قابو پاتے ہوئے اس نے بدلے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”نہیں۔ کہیں اور..... کسی دوسری جگہ میں تم سے ملا ہوں۔ تمہارے بدن کی خوشبو میرے لیے جالی پچانی ہے۔“ بشری اور نیلی مل کر اسے سہارے سے دھکیل چھڑ پر خنجر کر رہی تھیں اور وہ اپنی آنکھوں کی مخصوص غلیظ چمک کے ساتھ اس کے وجود کا انکسار کرنے کے ساتھ ساتھ کسی بوجھ بھرتے کی طرح اسے سوتھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ نیلی کے سامنے اس کے ان الفاظ نے بشری کے وجود میں طیش کی ایسی شدید لہر دوڑائی کہ اس کا دل ہر مصلحت کو ہلانے طاق رکھ کر اسے گولی مارنے کے لیے بھل گیا اور بے ساختہ ہی اس نے اپنا ہتھول نکالنے کے لیے گریبان کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

”اے، کون ہو تم دونوں اور یہاں کیا کر رہی ہو؟“ کمرے کا دروازہ اچانک کھلا اور نرس کے یونیفارم میں لمبوس ایک مضبوط کاٹھی کی عورت نے ان دونوں کو دیکھ کر طیش بھری حیرت سے پوچھا۔

”تم کہاں چلی گئی تھیں سسٹر؟ تمہیں تو قفل نامہ یہاں موجود ہونا چاہیے؟“ آنے والی کو دیکھ کر سختی سے بولتے ہوئے ہاذل نے اپنے سر کو زور سے جھٹکا دیا۔ یقیناً دوانے کام شروع کر دیا تھا اور اس کا سر چکرانے لگا تھا۔

”مجھے ڈاکٹر فیروز نے کال کیا تھا سارا! انہیں آپ کے سلسلے میں مجھے کچھ ہدایات دینا تھیں۔“ نرس نے وضاحت دی۔

”انہیں بھی ڈاکٹر فیروز.....“ بولتے بولتے اس نے اپنے سر کو ایک اور جھٹکا دیا اور پھر یوں چوکتا ہو گیا جیسے کوئی جنگلی جانور خطرے کی آہٹ سن کر چوٹکا ہے۔

”خبردار! ہمارے سامنے سے ہٹ جا۔“ بشری نے گریبان سے ہتھول کھینچا اور اس کا رخ دروازے میں استادہ نرس کی طرف کر کے خراسان کے ساتھ ساتھ دھکیل چھڑ کو بھی دھکا دیا۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ ان کا جھوٹا مزید نہیں چل سکا اور اب فوری ایکشن کی ضرورت ہے۔ نرس سامنے سے نہ ہٹی تو وہ اسے دھکیل چھڑ سے ہی دھکا دیتے ہوئے آگے نکل جاتی لیکن اسے جن کے اوڑھے میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔

”الوکی پھی۔“ ہاذل زور سے دھکا دیا اور دروازے کی

چوٹ پر اپنا پاؤں جھاکر پیچھے کی طرف زور لگایا۔ دھکیل چھڑ کا توازن بگڑا اور وہ الٹ گئی۔ بشری پھرتی سے ایک طرف ہٹ جانے کے باوجود زور میں آنے سے نہیں بچ سکی۔ اس کے ہاتھیں سر کے انگوٹھے پر ٹھیک ٹھاک چوٹ آئی تھی۔

”سکیچ رٹی۔“ باہر کھڑی نرس نا صرف صور پھونکنے جیسی بلند آواز میں چلائی تھی بلکہ اس نے اپنے لباس میں گھس گھس سے ایک بڑا لود بھی برآمد کر لیا تھا۔

”بھاگو یہاں سے۔“ نیلی جو لود بھر کے لیے بیٹھا مکی تھی زور سے چلائی اور جست لگا کر نرس سے جا بھاگائی۔ ریوالمور ان کی طرف سیدھی کرتی نرس کی پھرتی بہر حال اس ہانگ لڑکی کی پھرتی کے مقابلے میں معمولی تھی۔ گولی چلی ضرور لیکن کسی نامعلوم سمت میں تم ہو گئی۔ ساتھ ہی نیلی کے پاؤں کی ضرب سے اس کے ہاتھ سے ریوالمور بھی نکل گیا۔

”ماردو۔ رڈیل ہاذل کو مار دو۔“ بشری نے نیلی کی بھاگ جانے کی ہدایت سنی تھی لیکن اپنے اندر گونجتی اس آواز نے اسے بھاگتے بھاگتے بھی قائل کرنے پر مجبور کر دیا۔ دھکیل چھڑ اٹھنے سے ہاذل کا جسم اس کے نیچے آ گیا تھا اور نیلی طور پر اسے چوٹ بھی لگی تھی لیکن اس بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ بشری کی چلائی دو گولیوں میں سے کسی نے اس تک رسائی حاصل بھی کی ہے یا نہیں۔

دوسری طرف نیلی کی پھرتی قابل دید تھی۔ اس نے جسمانی طور پر خود سے کئی گنا مضبوط نرس کو کھینچنے کا موقع نہیں دیا تھا اور اس کی کٹھنی پر تا بڑ تو زور دے گھونٹے برسا کر بری طرح چکر اڑا لیا تھا۔ نرس سے ٹھٹھنے کے بعد وہ بشری کی مدد کے لیے کچھ کرنا چاہتی تھی لیکن کوریڈور میں بھاگتے قدموں کی آواز سے ظاہر تھا کہ سکیچ رٹی والے پہنچا ہی چاہتے ہیں۔ اسے پہلی بار اپنے پاس موجود ہتھول نکالنے کا خیال آیا اور قدموں کی آواز کی سمت رخ کر کے دھواں دھار تین چار گولیاں چلا ڈالیں۔ گولیوں کی ان آوازوں میں ہاذل پر بشری کی چلائی گئی گولیوں کی آوازیں غم ہو گئیں۔ آنے والوں کے قدم ذرا دیر کو ٹھٹھ گئے تھے۔ نیلی کے پاس مزید رکھنے کا موقع نہیں تھا۔ اس نے مخالف سمت میں بھاگنا شروع کر دیا۔ بشری سے اسے امید تھی کہ وہ بھی اس کی پیروی کرے گی لیکن بشری اسے نہیں دیکھ سکی تھی۔ یہ تو یاد تھا کہ نیلی گئے ہنگامی حالت میں اسے اسپتال کے پچھلے دروازے کی طرف جانے کی ہدایت کی تھی لیکن اندھا دھند بھاگتے ہوئے اسے قلعی پاؤں نہیں آ رہا تھا کہ پچھلے دروازے تک جانے کے لیے اسے کون سا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔

"لیفٹ یا رائٹ؟" کوریڈور چھاں دو سمتوں میں تقسیم ہو رہا تھا وہاں وہ ڈراما گزریا کی مگر بائیں جانب مڑ گئی۔ آگے راستہ بند تھا لیکن اوپر کی منزل پر جانی سیز حیاں صاف نظر آرہی تھیں۔ وہ سیز حیاں چڑھ گئی۔ قاترنگ کی آوازیں پورے اسپتال میں گونگی تھیں جس کے باعث ہر ایک ہی سر اسیر اور شیشا ہوا نظر آرہا تھا۔ ان گھبرائے ہوئے لوگوں میں چند نرس بھی شامل تھیں جو یو کلاہٹ میں ادھر ادھر دوڑتی صورت حال کے بارے میں جاننے کی کوشش کر رہی تھیں اس لیے کوئی بھی خاص طور پر اس کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔ اس نے بھاگتے ہوئے اوٹی کے سامنے والا حصہ پار کیا اور سیز حیاں نظر آنے پر ٹہلی منزل کی طرف دوڑ لگا دی۔ اسے اسپتال کے عقبی دروازے تک پہنچنا تھا تو یہ نچے جانا بھی ضروری تھا۔ سیز حیاں اتر کر وہ جیسے ہی ایک ہال نما حصے میں پہنچی اسے دو سکیورٹی گارڈز کے ساتھ تین چار پولیس والے کھڑے دکھائی دیے۔ وہ فوراً ہی ایک عقبی برآمدے میں مڑ گئی۔

"اس طرف چلو۔" یکدم ہی ایک آدمی اس کے سامنے آ گیا اور اس کا ہاتھ تمام کر حیر لہجے میں یوں ہوا دوڑ پڑا۔ اسے بھی مجبوراً بھاگنا پڑا۔

"آپ کون ہیں؟" اس نے نوچیں سوٹ میں ملیوس ڈاڑھی مونچھوں والے اس اوجیز عمر شخص سے پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ پوچھنے کی کوشش کی لیکن اسے اپنے سوال کا جواب نہیں ملا۔

"ہری اپ۔ رکنا نہیں ہے ورنہ پکڑی جاؤ گی۔" وہ چلتا یا تو اسے اپنے قدموں کو اس کے ساتھ ہم آہنگ کرنا پڑا۔ وہ شخص اسے بھگاتا ہوا قسمت میں لے گیا۔

"ڈریس چینج کر کے بالوں کو ابھی طرح چھپالو۔" چھنگ روم میں داخل ہو کر ایک لاکر کھولتے ہوئے اس نے ہدایت دی تو بشری نے اس پر عمل کیا۔ وہ جو بھی تھانی الحال اس کی مدد کر رہا تھا اس لیے اس کی بات ماننا مناسب تھا۔ اس نے لاکر میں رکھا لباس نکال لیا۔ وہ یقیناً ڈیوٹی پر موجود کسی نرس کا لباس تھا۔ لباس لمبائی میں تو اسے پورا آیا لیکن ڈھیلا ڈرا زیادہ تھا۔ خوش قسمتی سے لباس کے ساتھ کائٹن کا بڑا سا پھولدار دوپٹا موجود تھا جس میں اسے اپنے بالوں سمیت جسم کا بالائی حصہ چھپا لینے میں خاصی اگلائی رہی۔ "اے بھگت! اب خود کو بالکل ریلیس رکھو۔ ہمیں عام دزیز کی طرح یہاں سے نکلتا ہے۔" وہ لباس تبدیل کر کے ہائیر آئی تو اس نے اسے دیکھ کر سر اسٹچے کے ساتھ ساتھ

ہدایات دیں اور قدم آگے بڑھائے۔
"آپ کون ہیں؟" بشری نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے بے تابی سے پوچھا۔

"سوال کا جواب کے لیے یہ وقت مناسب نہیں ہے۔ محفوظ مقام پر پہنچ کر تمہیں ہر سوال کا جواب خود ہی مل جائے گا۔" اس نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔ بشری کو خاموشی اختیار کرنا پڑی۔ جیسمٹ سے باہر آنے پر انہیں پہلے کی سی پھیل کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ سلیج برلی گارڈز اور پولیس والے اب بھی دکھائی دے رہے تھے لیکن جگہ ڈھکی نمایاں کی آجکی گی۔

"وہ لوگ بچھلے گیٹ سے ایک ایسوی لینس میں بھاگ گئے ہیں۔ ایک لڑکی کو میں نے خود ایسوی لینس میں پھینٹے دیکھا تھا، دوسری بھی یقیناً ساتھ ہو گی۔" گارڈز کی ایک ٹولی کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے سنا۔ وقاص کی طرف سے اسے یہی کہا گیا تھا کہ کسی گڑبڑ کا اندازہ ہونے پر وہ ایسوی لینس پچھلی طرف لے آئے گا لیکن بہر حال فرار کی ذمہ داری کلی طور پر ہر فرد کی اپنی ہو گی۔ اسپتال کے ارد گرد جتنا جھجک علاقہ تھا، فرار ہونے والے کو ایک بار باہر نکلنے کے بعد ڈھونڈنا بھروسے کے ڈھیر سے سوئی ڈھونڈنے کے مترادف تھا اس لیے وہاں سے فرار اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ وہ سر جھکائے انجینی مہربان کے ساتھ آگے بڑھتی چلی گئی۔ ان کی طرح دیگر لوگ بھی آ جا رہے تھے اور کسی سے کوئی تعرض نہیں کیا جا رہا تھا۔ یوں بھی فرض کر لیا گیا تھا کہ "ادارہ اسے" فرار ہو چکے ہیں اس لیے آنے جانے والوں پر توجہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی جا رہی تھی۔ وہ دونوں بھی آرام سے باہر نکل گئے۔ پارکنگ میں پہنچ کر اس شخص نے اسے جس گاڑی کے پاس لے جا کر کھڑا کیا اسے دیکھ کر وہ چونک گئی اور اس شخص کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"ڈرائیور تمہیں خان عکس لے جائے گا۔ وہاں تم حامد صاحب سے اپنے ہر سوال کا جواب حاصل کر سکتی ہو۔ میری ڈیوٹی بس اتنی ہی تھی۔ گنہ گارے۔" وہ مڑ کر واپس چلا گیا۔ اس کے پاس بھی گاڑی میں بیٹھنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ جلد ہی وہ جانے پہچانے راستوں سے گزر کر واپس خان عکس پہنچ چکی تھی۔

"آپ میری گھرائی کر داسے تھے؟" حامد سے سامنا ہوتے ہی اس نے اپنی جھنجھلاہٹ کا اظہار کیا۔

"میں صرف اپنی ڈیوٹی پوری کر رہا تھا۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

”سیدھی طرح ماننے کیوں نہیں کہ میری نگرانی کی جارہی تھی۔“ اسے اصل جھنجھلاہٹ اپنی ناکامی کی تھی اس لیے حامد سے الجھ رہی تھی۔

”نگرانی اور دیکھ بھال میں فرق ہوتا ہے۔ ہم نے آپ کا خیال رکھا جب ہی آپ کو مصیبت سے نکال لانے میں کامیاب رہے ورنہ اس احمق لڑکے نے تو آج آپ کو مردانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔“ حامد سپاٹ سے لہجے میں جو کچھ بول رہا تھا اس سے ظاہر تھا کہ وہ خاصی حد تک ہلکم ہے۔

”میرا سواگل فون بھی میرے پاس نہیں رہا۔“ اس کی جھنجھلاہٹ بہانے بہانے سے ظاہر ہو رہی تھی۔

”کیا اسپتال میں رہ گیا؟“ وہ چونکا۔

”نہیں۔ وہاں تو ہم ساتھ لے کر ہی نہیں گئے تھے۔“

سواگل سمیت پر وہ شے جس سے شناخت ہو سکتی تھی، ہم نے پیچھے ہی چھوڑ دی تھی۔

”شکر ہے کوئی تو حلقہ دی کا کام کیا تھا۔ بہر حال اپنے سامان کی لسٹ بنا کر دے دیں، میں سب کچھ واپس منگوا لوں گا۔“

”میں خود بھی لا سکتی ہوں۔“ اس نے اپنی انا کو سر بلند رکھنے کی کوشش کی۔

”اب آپ اپنے اس طے کو مکمل طور پر تبدیل کیے بغیر یہاں سے قدم بھی ہمارے نہیں نکال سکتی ہیں۔ باڈل کے اخراجات کی ناکام کوشش کے نتائج معمولی نہیں ہوں گے۔ اسپتال کے کیمروں سے آپ دونوں خواتین کی فوج پھر حاصل کر کے آپ کی تلاش شروع کر دی گئی ہوگی۔ آپ تو فی الحال اس بات پر شکر ادا کریں کہ باڈل کی نرس تانیہ سے بچ کر صحیح سلامت آ گئی ہیں۔ وہ عورت صرف نرس نہیں سیکورٹی گارڈ بھی ہے اور اتنی خوفناک ہے کہ مردوں سے بھی بہ آسانی مقابلہ کر سکتی ہے۔“

”اب زیادہ تر نہیں بھی نہ کریں۔ بیٹے لک نہ ہو جاتی تو ہم اس کی ناک کے نیچے سے باڈل کو نکال لاتے۔“ اس نے ناک سکڑی۔

”میرے خیال میں تو گنڈ لک ہوئی ہے کہ آپ خود نکل آنے میں کامیاب ہو گئی ہیں۔“ حامد کی برجستگی نے اسے تیار کیا۔

”اسنے اسرار بن رہے ہیں تو خود کچھ کیوں نہیں کرتے؟ آپ کو معلوم ہے ناکہ باڈل میرا سب سے بڑا دشمن ہے اور اسے انجام تک پہنچائے بغیر مجھے یقین نہیں

آ سکتا۔“

”کسی کام کو کرنے کا ہمارا اپنا طریقہ کار ہے۔ وقت آنے پر باڈل کو دیکھ لیا جائے گا۔“

”باڈل کی زندگی کا ایک ایک دن مجھ پر بھاری ہے۔“ وہ بری طرح چٹختی۔

”ایسے معاملات میں جوش نہیں، ہوش کی ضرورت ہوتی ہے۔ جوش کا نتیجہ ابھی آپ دیکھ کر آ رہی ہیں اس لیے پلیز ہوش کے دشمن نہیں۔ میڈم کی اجازت کے بغیر میں آئندہ آپ کو باہر نکلنے کی بھی اجازت نہیں دے سکتا۔“

”کیا میں یہاں قیدی ہوں؟“ وہ اس کی بات سن کر چلائی۔ وہ کوئی بھی جواب دے بغیر اس کے سامنے سے ہٹ گیا۔

☆☆☆

”لیس جی سمجھیں شہر آ گیا۔ سچا ہی پادکر کے ہم آگے جائیں تو بازاد شروع ہو جائے گا۔“ ساج کی روشنی پوری طرح پھیل چکی تھی اور وہ لوگ کھیتوں کھلیاؤں کے سلسلے کو پیچھے چھوڑ کر ایک ایسے مقام پر پہنچ گئے تھے جہاں سے آگے بہتی ندی اور ندی کو پار کرنے کے لیے اس پر بنا پل صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس پل کو دیکھ کر ہی رکھوالے نے انہیں آگاہ کیا تھا۔

”فصیح ہے۔ تم یہاں اتر جاؤ۔ یہاں سے آگے ہم خود چلے جائیں گے۔“ سوینا نے عین ندی کے کنارے گاڑی روکتے ہوئے اس سے کہا۔

”چنگا جی۔ ادھر سے بیٹو واپسی کے لیے شہر سے آنے والی کوئی بس مل جائے گی۔“ وہ جیسے جان چھوٹنے پر خوش ہو گیا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر تیزی سے نیچے اتر آ۔ سوینا بھی اپنی سیٹ چھوڑ کر باہر نکل آئی۔

”تمہارا بہت بہت دھنیاؤ۔ تم نے ہماری بہت مدد کی۔“ اس کا اسنے اخلاقی سے شکریہ ادا کرنا معاذ کو حیران کر گیا۔

”کوئی گل نی بیچیں جی! آدمی ہی آدمی کے کام آتا ہے۔“ وہ بے چارہ جو گن پوائنٹ پر ہر خدمت کے لیے مجبور کیا گیا تھا، اتنی سی خوش اخلاقی پر ہی خوش ہو کر سادگی سے بولا۔

”یہ کچھ پیسے رکھ لو، کرائے وغیرہ کے کام آئیں گے۔“ اس نے کچھ کرپسی نوٹ رکھوالے کی طرف بڑھائے۔ سوینا اس کے نوٹ دیکھ کر حیران کی جیب میں سے نکال لے۔

”اس کی لڑائی ہے جی۔ بس میں مجھے اپنے بچہ کا کوئی بندہ مل جائے گا۔“ اس نے نوٹ پکڑنے کے لیے ہاتھ

رہا۔ دیکھتے ہی دیکھتے نواب رکن الدین کی نئی کار شوپ سے پانی میں جا گری۔ کار کے سارے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ امید تھی کہ جلد ہی ندی کا پانی اندر موجود سارے سامان کو بہالے جاتا اور کار در یافت ہونے پر کوئی ایسا سراغ نہ ملتا جو ان کی نشاندہی کر پاتا۔ بہ جانے والے سامان میں وہ جدید اسے کے 47 بھی شامل تھی جس نے اب تک ان کے تحفظ میں کلیدی کردار ادا کیا تھا۔

”چلو چلتے ہیں۔“ سونیا نے قدم آگے بڑھائے۔ چھ سات گھنٹہ تک وہ پیدل چلتے رہے پھر ایک سائیکل رکشا مل گیا۔ رکشے والے نے انکس بن کی فرمائش پر بازو میں اتار دیا۔ بازو میں ہتر کر سونیا نے ایک بار پھر پیدل مایہ شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ چلتے چلتے وہ بازو سے باہر نکل آئے۔

”ہم کہیں ٹھہریں گے بھی یا نہیں؟“ معاذ جھلایا۔ ”یہاں کہیں نہیں کون سا فائدہ ستار ہوئی نظر آرہا ہے جہاں ہم ٹھہر سکیں؟“ وہ بے رخی سے بول کر آگے بڑھتی رہی۔ اب مکانات کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ یہ کوئی بڑا شہر نہیں تھا اس لیے مکانات بھی کچھ خاص نہیں تھے۔ گلیوں میں سے گزرتے لوگ بھی اپنے حلیوں سے کم حیثیت دکھائی دیتے تھے۔ کچھ نے ان دونوں کو غور سے دیکھا ضرور لیکن سوال جواب کی ذمہ داری کسی نے گوارا نہیں کی۔

”آؤ۔“ ایک خالی گلی سے گزرتے ہوئے سونیا غراب سے ایک مکان کے کھلے دروازے میں ٹھس گئی۔ اندر داخل ہوتے ہی اس کا خوشی منہ پھٹ پڑا۔ اس کے ہاتھ میں آگیا۔ معاذ نے کسی حد تک اس کا ارادہ بچتے ہوئے اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا۔

”آواز نکالی تو جان سے جاؤ گی۔“ وہ آہستہ بن کر باورچی خانے سے برآمد ہونے والی جوان اصر عورت تھی جس کے سر پر بچھ کر سونیا پہنکاری تھی۔ عورت نے ایک نظر اس کے ہاتھ میں موجود منجھڑی والی اور بری طرح کپکپانے لگی۔

”پانی پلا دے غرلا اکب سے آواز ہی دے رہی ہوں پر حیرے کان پر جوں نہیں رہتی۔“ ایک کمرے کے اندر سے آتی پاٹ دار نسالی آواز نے غرلا کے نام سے پکاری جانے والی کی کپکپاہٹ میں مزید اضافہ کر دیا۔

”کون ہے یہ اور اس کے سوا کون کون گھر میں موجود ہے؟“ سونیا نے اس سے مدد نہیں کی بلکہ میں پوچھنے لگی۔

”بھری سانس ہے جی۔ اس کے سوا کوئی اور گھر وچ نہیں ہے۔“ اس نے سب سے پہلے میں جواب دیا۔ معاذ اس حد تک وہ کمرے کے اس مختصر گھر کا جائزہ لیتا رہا تھا

”مخد نہ کرو۔ میں کہہ رہی ہوں تو تمہیں یہ پیسے رکھنے ہی ہوں گے۔“ سونیا کے لہجے میں ہلکی سی سختی در آئی۔ پچھلی نشست پر براجمان یہ مکالمہ سننے معاذ کو سونیا کے استے ہمدردانہ رویے پر حیرت ہو رہی تھی۔ گھنگو سننے کے ساتھ ساتھ وہ اطراف کا جائزہ بھی لیتا جا رہا تھا۔ علاقہ خاصا دیر ان ہی تھا اور اب تک کے سفر میں انہوں نے صرف ایک سائیکل رکشا، ایک موٹر سائیکل سوار اور چھ پیدل راہ گیروں ہی کو دیکھا تھا۔ شاید یہ انسانوں کی عدم موجودگی ہی تھی جو سونیا ندی کنارے کھڑی اتنے اطمینان سے رکھوالے سے بات چیت کر رہی تھی۔

”آپ کا حکم ہے تو غیر میں لے ہی لیتا ہوں۔“ رکھوالا جو سونیا سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا، آگے بڑھا اور لوٹ تھانے کے لیے اپنا ہاتھ آگے کیا۔ اس سے اگلے لمحے معاذ کی آنکھوں کے آگے گویا برق سی کوئد گئی۔ سونیا کا رکھوالے کا ہاتھ تمام کر کھینچا، کبھی پر گھونسا سید کرنا اور پھر کسی کاغذی گڈے کی طرح ندی میں اٹھا بھیجتا۔۔۔ سب ایک ٹپ میں اس کی نظروں کے سامنے سے گزر گیا۔ وہ بے ساختہ ہی دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ شوپ کی آواز سے ندی میں جا گرنے والے رکھوالے کا کوئی نام و نشان نظر نہیں آرہا تھا۔ بس اس کے گرنے سے پانی میں بننے والا بسنور ہی باقی رہ گیا تھا۔ کبھی پر گتے والے گھونے نے یقیناً بے چارے کو بھوش کر دیا تھا اور وہ پتھر کی طرح پانی میں جا گرا تھا ورنہ کچھ تو ہاتھ بچہ چلاتا۔

”کیا یہ ضروری تھا؟“ اس نے شکوہ کیا۔ ”بالکل۔ میں اسے دابھی جا کر لوگوں کو داستانیں ستانے کے لیے نہیں چھوڑ سکتی تھی۔“ کامل اطمینان سے جواب دیتے ہوئے وہ دوبارہ گاڑی میں آ بیٹھی۔ معاذ بھی افسردہ سا دوبارہ اندر بیٹھ گیا۔

”میں پار کر کے ہم اس گاڑی سے بھی چھکارا حاصل کر لیں گے۔“ سونیا نے گاڑی اسٹارٹ کر کے پل پر چڑھاتے ہوئے اسے اطلاع دی۔ وہ خاموش رہا۔ چھوٹا سا پل مشوں میں پار ہو گیا۔

”یہاں سے آگے بازار تک ہمیں پیدل جانا ہوگا۔“ پل کے پار گاڑی روک کر اس نے معاذ کو مطلع کیا۔ مرتا گیا نہ کرتا کے مصداق اسے نیچے اتار پڑا۔ جسمانی کمزوری اور تکلیف، آرام و سکون کے متضاد تھے لیکن ایسا جانے کب ممکن ہو پاتا۔ وہ ایک طرف کھڑا سونیا کی کارروائی دیکھتا

چنانچہ اشارے سے اس کے بیان کی تصدیق کر دی۔

”کیدھر سگریٰ عمر لا آئے دے آج رشی کو۔ بتاؤں گی اسے کہ کیسے ٹو بچہ پانچ کو بوند بوند پانی کے لیے تر ساتی ہے۔“

”جاؤ۔ اسے پانی پلاؤ لیکن کوئی غلط حرکت نہیں کرنا۔“

بڑھیا کا دوا دیا سن کر سونیا نے عمر لا سے کہا اور مخبر معاذ کو تھما کر اسے اس کے پیچھے جانے کا اشارہ کیا۔ معاذ نے کمرے کے اندر قدم نہیں رکھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ عورت اتنی خوفزدہ ہے کہ ہدایت کے خلاف کچھ نہیں کرے گی۔

”کام چورہ بھی۔ دو گھنٹہ پانی پلانے میں اتنی دیر۔“

آج رشی آئے تو جیسے فارغ کردا کر حیرے پکے بھجواتی ہوں۔ پانچھ، نہ بچے پیدا کرتی ہے نہ گھر کا کوئی کام ڈھنگ سے کرتی ہے۔ ایسی عورت کو گھر میں رکھ کر نا بھی کیا ہے۔“

بہو کی مشکل سے انتہا جان اندر بڑھیا اپنی پاٹ دار آواز میں اس پر برسے جا رہی تھی۔ معاذ کی آدمی توجہ اس طرف تو

آدمی سونیا کی طرف تھی۔ اس نے اس کے ہاتھ میں ایک پرانے ماڈل کا موبائل دیکھ لیا تھا اور سمجھ گیا تھا کہ یہ موبائل

اس نے بازار میں سے گزرتے ہوئے کسی راہ گیر کی جیب سے اڑایا ہے۔ وہ دوسرے کمرے میں تھی اس موبائل پر

کسی سے نہایت دھمی آواز میں بات کر رہی تھی۔

”کھانا سے پر ہٹا لینا اور نہ تیری ارگھی ہی تیرے پکے جائے گی۔“ دوسری طرف بڑھیا پانی پی کر تازہ دم ہونے

کے بعد دوبارہ بہو پر برس رہی تھی۔ وہ اسے سننا ہی ہوئی آواز میں جواب دے کر باہر نکلے اور دروازہ بھیڑنے کے

بعد معاذ کی طرف یوں سوالیہ نظروں سے دیکھا جیسے اگلا حکم دریافت کر رہی ہو۔

”تم اپنے کام نہاؤ۔ ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔“

معاذ نے برصغیر کے ہر پانچویں چھٹے گھر میں دکھائی دینے والے اس کردار کے لیے اپنے دل میں ہمدردی محسوس کی۔

اس بے چاری کو شاید زیادہ سوال جواب کی عادت ہی نہیں تھی اس لیے ان دونوں کی یہاں موجودگی کے بارے میں

کوئی سوال کیے بغیر ایک بار پھر باورچی خانے میں جا گئی۔

”تم جا کر آرام کر لو۔ دوڑھائی گھنٹے میں ہمارے یہاں سے نکلنے کا انتظام ہو جائے گا۔“ سونیا فون سے فارغ

ہو کر آگئی اور اسے آرام کا مشورہ دیا۔ وہ جواب تک بے حد قوت پر ہواشت کا مظاہرہ کرتا رہا تھا فوراً اسی مشورے پر

عمل کے لیے تیار ہو گیا اور اس کمرے سے سونیا نکل گئی، اس میں جا گھسٹا۔ یہ گھرا آہیٹا عمر لا اور اس کے بچے ہی کے زیر

استعمال تھا۔ یہاں دو چار پائیاں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ ایک

چار پائی پر جا لیٹا۔ آنکھیں بند کرتے ہی نیند یوں حملہ آور

ہوئی جیسے سوخ کی تلاش میں ہی تھی۔ دوبارہ وہ سونیا کے

پکارنے پر ہی اٹھا۔

”بہت سو لیے۔ اب کچھ پیٹ پوجا کر لو۔“ اسے

آنکھیں پینچاتے دیکھ کر وہ دوستانہ لہجے میں بولی۔

عمر لا بے چاری نے آفت ناگہانی کی طرح ہزل ہوسنے والے نن بلائے مہمانوں کے لیے دسترخوان جن دیا

تھا۔ آلوی بھجیا، لوی اور دھی کا رائیو، کئی پیاز کے کچھے اور

لسوڑے کا اجارہ۔ سادہ سے اس کھانے کا سوا دھان لگ تھا۔

”تم مجھے فانیو اشار ہوئی سے بھی بہتر جگہ پر لے آئی ہو۔“ اگرچہ شانے کی تکلیف اسے یقین نہیں لینے دے رہی

تھی پھر بھی اس نے رغبت سے کھانا کھایا اور سونیا کی طرف

دیکھ کر تبصرہ کیا۔ جواباً وہ کچھ کہتی اس سے گل بیدہی

دروازے پر دستک کی زوردار آواز سنائی دی۔

”کون آیا ہو گا؟“ سونیا نے عمر لا سے پوچھا۔

”معلوم ہی نہی۔“ اس نے لاطی کا اٹکھار کیا۔

”اچھا جا کر دیکھو اور کوشش کرو کہ آنے والے کو

دروازے ہی سے ٹال دو۔“ سونیا ہدایت دینے کے ساتھ

ہی خود بھی اس کے پیچھے دروازے کی طرف چل پڑی۔ اس

دوران دستک دوبارہ دی گئی۔

”دروازہ کیوں نہیں کھولتی کھوی؟ کیا بھری ہو گئی ہے؟“ عمر لا کی ساس کی ٹانگیں فاریج کی وجہ سے ٹکا رہ ہو گئی

تھیں لیکن زبان کی دھار بڑی تیز تھی۔

”کون ہے؟“ سونیا مخبر بدست دروازے کے

دامیں جانب کھڑی تھی۔ عمر لا نے بلند آواز میں استفسار

کرتے ہوئے کنڈی کھول دی اور بالکل غیر متوجہ طور پر

لپک کر باہر نکل گئی۔

”رشی..... رشی..... بھاگو یہاں سے۔“ اس کی آواز

اتنی بلند تھی کہ اندر موجود دروازے کی طرف کان لگائے بیٹھے

معاذ تک بھی پہنچ گئی اور وہ فوراً ہی اپنی جگہ سے اٹھ کر

دروازے کی طرف بھاگا۔ اس اثنا میں سونیا باہر نکل چکی تھی۔

”خندے ہیں گھر میں خندے ہیں.....“ شوہر کا ہاتھ

تھام کر اسے اپنے ساتھ دوڑنے کے لیے پہنچتی عمر لا کی آواز

یہاں نہ رہ گئی۔ اپنے آپ تک کے تعاون کے برخلاف اس کا

عمل نہایت غیر متوجہ تھا۔ شاید وہ آپ تک خاموش ہی اس

کے لیے کسی کہانی کی محسوس حالت پر آم متوجہ تھی۔

”خو کیا کہہ رہی ہے عمر لا! میرے بچے کچھ نہیں

بڑ رہا۔“ وہ عمر لا کے ساتھ بھاگنے کے بجائے جا ٹکادی لینے

مگر گیا۔ معاذ نے فوراً ہی وہ لٹا اٹھا لیا اور موقع کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ایک اور جی دار کی کمر پر اس زور سے مارا کہ وہ ہلکا کرنا چاہا۔ اس کی اس پھرتی نے جہاں لوگوں کو کنٹرول میں رکھنے میں مدد دی وہاں خود اسے شدید تکلیف کی صورت میں نتیجہ بھگتنا پڑا اور صاف محسوس ہوا کہ شانے کے زخم سے ایک بار پھر خون کا رسا شروع ہو گیا ہے۔ ابھی بات یہ تھی کہ اب وہ گل سے باہر نکل چکے تھے۔ باہر نکلتے ہی ان کی ایک گرے مر سیڈ پر پر نظر پڑی۔ وہ اسی سٹ آر ہی تھی۔ سونیا نے ہاتھ ہلا کر ڈرائیور کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ مر سیڈ پر ان کے قریب آ کر رک گئی۔

”میں سیاہ انگوڑیوں۔“ جیسے ہی ہینریٹ پر بیٹھے آدمی نے گردن ہل کر باہر جھانکا سونیا تیسرے کوشی میں بولی۔

”ہمیں اپنی جوس ٹیکسری کے لیے سیاہ انگوڑوں کی ضرورت ہے۔“ اس آدمی نے جواب دینے کے ساتھ ہی پچھلی طرف کا دروازہ کھول دیا۔ سونیا نے رشی کی تحریک پر لات مار کر اس سٹ دھکیلا جہاں اس کی بیوی اور گلے دار گلے سے نکل کر جمع ہو گئے تھے اور کھلے دروازے سے مر سیڈ پر میں بیٹھ گئی۔ معاذ جیسی طور پر اس کے ساتھ تھا۔

”کوئی ایک اینڈ فاسٹ امیرے ساتھی کو میڈیکل اینڈ کی ضرورت ہے۔“ سونیا کے قدرے ٹھکانے لہجے میں دے دے حکم پر مر سیڈ پر کے ڈرائیور نے اسے گل اسپیل پر دوڑا دیا۔ دروازے سے بے حال معاذ نے پشت گاہ سے سرٹا کر آنکھیں موندیں تو سونیا کا ہاتھ تسلی دینے والے اعزاز میں اس کے ہاتھ پر آٹا۔

☆☆☆

”ہم غیر قانونی طور پر یہاں نہیں آئے آفسر! ٹھیک ہے ہمارے پاسپورٹ اور دیگر کاغذات غائب ہیں لیکن اپنا ریکارڈ چیک کر کے تو آپ کفرم کر سکتے ہیں کہ ہماری یہاں آمد قانونی ہے۔“ گاڑی نیاز شاہ کے گھر سے روانہ ہو کر آگے بڑھی تو عالم شاہ نے قتل سے اپنی صفائی میں بولنا شروع کیا۔

”یہ پاکستانی سینڈک تو ضرورت سے زیادہ ٹرٹر کرتا ہے بار! اس کا منہ بند کر دو۔“ مخاطب نے اس کی درخواست پر کان دھرنے کے بجائے اپنے ماتحت کو حکم دیا۔ ”لوڈنٹ درمی سرانہ کیا، ابھی سب کچھ بند کر دیتے ہیں۔“ ایک ماتحت نے اس کو جواب دیا اور یکدم ہی عالم شاہ اور سرحد کے پہلوؤں کے ساتھ دو تھیں آگئیں۔

”یہ کیا حرکت ہے؟ ہم بغیر مزاحمت کے تمہارے

کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر ہاتھ میں لیے سونیا باہر نکل تو حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ سونیا کے لیے اتنی مہلت کافی تھی۔ اس نے ٹپک کر اس کی گردن پر پھر رکھ دیا۔

”آواز نکل تو جان جائے گی۔“ وہ مسکے دینے کا انداز لیا تھا کاسے کی ٹھکی بندھ گئی لیکن شرلا کا بھونپو بند نہ ہوا۔

”بچاؤ، بچاؤ۔“ وہ ہڈ پانی اعزاز میں چلتی چلی گئی۔ رد عمل میں گھروں کے دروازے کھلنے لگے۔

”کوئی قریب آیا تو یہاں ہاں سے جائے گا۔“ سونیا نے رشی کی گردن پر پھر کی ٹپک کا دباؤ اس حد تک بڑھا دیا کہ خون کے قطرے پھٹک پڑے۔ گھروں سے نکلنے والوں کو اپنے قدیم روکنا پڑے۔ ویسے بھی ان میں مردوں کی تعداد بہت کم تھی اور زیادہ تر عورتیں اور بچے ہی تھے۔

”بچاؤ۔ کوئی میرے رشی کو بچاؤ۔“ شرلا چیخ چیخ کر دہائیاں دے رہی تھی حالانکہ اس کی حالت نے ہی اس کے بچنے کی جان پر بنائی تھی۔

”کوئی راستے میں آیا تو وہ بھی اپنی جان سے جائے گا۔“ سونیا خرائی اور رشی سمیت گلی سے نکاسی کے راستے کی طرف بڑھتے گئی۔ معاذ بھی اس کے ساتھ تھا اور گرد و پیش پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اسے کچھ لوگوں کے ہاتھوں میں موبائل فونز بھی نظر آرہے تھے۔ شاید پولیس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی جارہی تھی۔ وہ انہیں روکنے پر قادر نہیں تھا۔ ان کے پاس واحد ہتھیار سونیا کا پتھر تھا اور صرف ایک پتھر سے اتنے لوگوں کو مجبور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ رشی کی زندگی داؤ پر لگی دیکھ کر وہ نزدیک نہیں آرہے تھے لیکن باقی معاملات میں تو آزاد تھے۔ وہاں ایک ہنگامہ سابر پا ہو گیا تھا اور اس سارے ہنگامے میں شرلا کے چیخنے پھلانے کی آوازیں سب سے بلند تھیں۔ ساس کے سامنے بیٹھی بیٹی بن کر رہنے والی کا والیوم بتا رہا تھا کہ مستقبل میں وہ ساس کی جانشین ثابت ہو سکتی ہے۔

”ہمیں خاموشی سے یہاں سے نکلنے دو۔ ہم کسی کو نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ کسی نے ہماری راہ روکی تو پھر جو ہوگا اس کا دوش ہمیں نہ دینا۔“ رشی سمیت آگے بڑھتی سونیا نے ایک بار پھر دھکی دے کر کسی پیش قدمی کی راہ روکنے کی کوشش کی۔ ابھی اس کے الفاظ اس کے منہ میں ہی تھے کہ ایک گھر کا دروازہ جھٹکے سے کھلا اور ایک لوجوان لڑکا ڈنٹا لہراتا ہوا حملہ آور ہو گیا۔ معاذ کی اس لڑکے پر برداشت نظر پڑ گئی۔ اس نے گھوم کر لڑکے کی ناف پر ایسی لات ماری کہ وہ وہیں رہا ہو گیا اور اس کے ہاتھ سے ڈنڈا نکل کر زمین پر

ساتھ جا تو رہے ہیں۔" عالم شاہ جھنجھٹا یا۔

"تمہیں کسی گڑبڑ سے روکنے کے لیے یہ حرکت ضروری تھی مہاراج! ان میں سے ایک شخص کر یولا اور یکدم ہی اس کے دونوں ہاتھ تمام کر پھٹکریوں میں جکڑ دیے۔ سرمد کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔

"میں اپنی ایکسی کے ذریعے تمہارے اس بُرے سلوک پر احتجاج کروں گا۔" عالم شاہ نے دھمکی دی۔

"اگر ہم نے تمہیں ایکسی تک پہنچنے دیا تب..." اس جملے میں ایسی دھمکی چھپی تھی جس کی دہشت عالم شاہ اور سرمد دونوں نے اپنے اپنے وجود میں محسوس کی۔ اگلا لمحہ مزید تکلیف دہ تھا۔ وہ دو سیاہ پٹیاں تھیں جن سے ان کی آنکھوں کو ڈھانپ دیا گیا تھا۔

"کہاں... کہاں لے جا رہے ہو تم لوگ ہمیں؟" اس بار سرمد چلا یا۔ آنکھوں پر اپنی باندھنے کا مطلب صاف تھا کہ انہیں نشانے نہیں لے جایا جا رہا ہے۔

"وہیں جہاں کوئی آتا جاتا نہ ہو۔" یہ منگناہٹ وہ پولیس والے تھے یا کوئی بھاڑ۔

"ہم نے کوئی جرم نہیں کیا۔ ہمارے ساتھ ایک حادثہ ہوا ہے اور تم بھانے ہمارے ساتھ بد روی کرنے کے ہمیں پاکستانی ہونے کی سزا دینا چاہتے ہو۔" عالم شاہ جذباتی ہونے لگا۔

"ہمارا بس چلے تو پاکستانیوں کو پاکستان سمیت نکٹ کر دیں۔ کھر (خیر) ابھی تو تم دونوں ہی ہاتھ لگے ہو۔ جہادری ایسی سبدا کریں گے کہ یاد کرو گے کسی بھارت ماما کے سپوتوں سے پالا پڑا تھا۔" اب وہ مکمل دھمکی دے رہے تھے۔ وہ دھمکی دینے کی پوزیشن میں بھی تھے۔ ان کے ہتھیار ان کے پہلوؤں سے لگے ہوئے تھے۔ ہاتھ پھٹکری میں جکڑے تھے اور آنکھیں دیکھنے سے قاصر تھیں کہ وہ کس راستے سے گزر کر کس جہنم میں لے جائے جا رہے ہیں۔

"بھارت ماما کے سپوت..." عالم شاہ استہزائیہ جہاں۔ "تمہیں دیکھ کر تو لگتا ہے کہ بھارت ماما نے صرف بزدلوں، چالباؤوں اور دھوکے بازوں کو ختم دیا ہے۔" "اوسے میں نے کہا تھا کہ ان کی لڑائی بند کرو۔" ان کا آئینہ داڑا۔ رد عمل میں ان دونوں کے منہ پر سختی سے نیپ چپکا دی گئی۔ دونوں ہی اندر ہی اندر پیچ دتاب کھا کر رہ گئے۔ مزاحمت کا نتیجہ ان کے حق میں ہی برائیتا۔ وہ بدینیت دردی والے ان کے جسموں میں گولیاں اتار کر اعلان کر دیتے کہ انہوں نے پاکستانی دہشت گردوں کو فرار کی

کوشش میں ناکام کرنے کے لیے گولیاں چلائیں۔

وہ جان گئے کہ انہیں جہاں لے جایا جا رہا ہے وہاں انہیں کڑی آزمائش اور آؤتیوں سے گزارا جائے گا لیکن فوری موت کے مقابلے میں اس صورت میں ایک امید تو تھی کہ شاید بچت کی کوئی صورت نکل آئے۔ کچھ نہیں تو نیا شاہ ہی کسی طرح انہیں ڈھونڈ لائیں۔

"تمہارا اوجھڑا ہو گا کہ تمہارا ادھ اور تک پہنچ رکھنے والا تاؤ تمہیں بچانے آ جائے گا پر تم دیکھنا کہ ہم تمہیں ایسی جگہ لے جا کر ماریں گے کہ ہواؤں کو بھی تمہارا پتا نہیں ملے گا۔" ان کے منہ بند کر دینے کے بعد اب وہ خود اٹا سیدھا بولنے کے لیے آزاد تھا۔

"انڈیا پاکستانیوں کے ساتھ یہ کرتا ہے، انڈیا پاکستانیوں کے ساتھ وہ کرتا ہے۔ جب دیکھو یہ راگ الاپتے رہتے ہیں سالے۔ پھر بھی دیکھو تو روز روز اٹھ کر یہاں آ رہے ہوتے ہیں۔ تمہیں یوں کون ہے کہ اپنے پلیہ وجود لے کر اھر آکے ہم تو کہتے ہیں یہ جو سلسلے پیچھے چھوڑ کر گئے ہو انہیں بھی اپنے ساتھ پاکستان لے جاؤ۔ بے کار میں دھاری دھرتی ماما کا بوجھ بنے ہوئے ہیں ملک حرام۔" اس کے الفاظ کو اسی دے رہے تھے کہ وہ کس درجے کا حسب اور شدت پسند ہے۔ ایسے بندے سے کوئی اچھی امید رکھی ہی نہیں جاسکتی تھی۔

"کھانا پینا، شادی بیاہ، مرنا جینا سب یہاں ہے ملک حراموں کا اور پر ہم پاکستان اور پاکستانیوں سے کرتے ہیں۔ پاکستان اسلم ہم بنائے تو یہ کھوش، پاکستان کرکٹ کچھ جیتے تو ان کی دندیا (بٹیس) باہر، پاکستان بھارتی جاسوس پکڑ لے تو ان کے ہاں جشن... میں تو بولتا ہوں ان سارے ملک حراموں کے گھروں پر ہم مار کر ایک ہی جھکے میں ان کا کام تمام کر دو۔ پر سرکار اور عیادوں کی اپنی مجیدیاں ہیں۔ میرے جیسے دیش بگشتوں کی کوئی سزا ہی نہیں ہے۔" اس کی کوئی نہیں سنا تھا اس لیے اب وہ ان کے منہ بند کر کے اپنے اندر کا سارا زہر ان کی ساتھوں میں انڈلی رہا تھا۔ اللہ اللہ کر کے راستہ ختم ہوا تو انہیں اس کی بک بک سے نجات ملی۔

لیکن ابھی شوق کے استحاں اور بھی تھے۔ گاڑی جانے کہاں رکی لیکن پہلے مرحلے پر ہی پکڑنے والوں نے اپنی غیبت کا بھرپور اظہار کرنا شروع کر دیا۔ وہ کسی جالوس کی طرح گھسیٹ کر نیچے اتارے گئے اور پھر لائیں، ٹھٹھے اور ہتھیاروں کے پٹ مار کر ایک سمت میں دھکیلے جانے لگے۔ مزاحمت کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ دونوں بے پناہ

برداشت سے کام لیتے ہوئے اس سمت میں آگے بڑھتے رہے جس سمت میں انہیں بانٹا جا رہا تھا۔ اثر ایک جگہ انہیں رککنے کا حکم مل گیا۔

”کپڑے اتار کر الٹا لٹکا دو حرا۔۔۔ کو۔“ حکم جاری ہونے کی دیر تھی، ان کے ہر مضبوط پھندوں میں پکڑے گئے اور پل میں وہ اس طرح اٹنے لگے ہوئے تھے جیسے قصائی ذبح کیے گئے کبڑوں کی کھال اتارنے کے لیے انہیں الٹا لٹکا تا ہے۔ وہ تھانوں سے کچھ بڑھ کر بی تھے۔

”بولو کہ تم پاکستانی جاسوس ہو۔“ خادار کوڑوں سے ان کے جسموں کو تختہ مشق بناتے ہوئے حکم صادر کیا گیا۔ تم سا تم تھا۔ تہ پر فیپ چپکا کر یونٹس کا حکم دیا جا رہا تھا۔ وہ بے چارے بولتا تو دور کی بات، جسم میں انگارے بھر دینے والی اذیت کو بھی خاموشی سے سہنے پر مجبور تھے اور ان کی ہر چیخ ان کے جسم کے گنبد میں ہی دم توڑ رہی تھی۔ وہ محسوس کر سکتے تھے، ہر لگائی جانے والی ضرب کے ساتھ ان کی کھال ادھڑ رہی تھی اور بننے والے زخموں سے قطرہ قطرہ کر کے خون بہہ رہا تھا۔ تکلیف ایسی شدت کی تھی کہ ہر بار پورا جسم بن جل کی چھلی کی طرح تڑپ اٹھتا تھا۔

”دہشت گردی کا کون سا پلان لے کر بھارت آئے تھے؟ کہیں ہم دھماکے کرنے تھے یا فردوس شہریوں پر گولیاں برسانا تھیں؟“ ہر الزام کے ساتھ کوڑوں کی ایک نہ رکھنے والی برسات جاری تھی۔ الزام بھی ایسے تھے جن کے بارے میں وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ بھی ان سے ایسے بھیا تک جرائم سرزد ہوں گے۔

”تمہارے اور ساتھی کہاں ہیں؟ یہاں کہاں لوگ تمہیں ہمیں لپٹ کر رہے ہیں؟“ سوال در سوال تھا لیکن عجیب حراقت تھی کہ انہیں جواب دینے کی گنجائش ہی نہیں دی گئی تھی۔ شاید وہ جوابات چاہتے بھی نہیں تھے۔ اپنے ہر سوال کا جواب انہوں نے خود طے کر رکھا تھا اور ہر الزام کے بارے میں طے تھا کہ وہ درست ہے۔

ان حالات میں عالم شاہ سوچ رہا تھا کہ ان کا مزاحمت نہ کرنے کا فیصلہ شاید غلط تھا۔ انہیں بھرپور مزاحمت کرنا چاہیے تھی اور کسی نہ کسی طرح ان جلا وطن لوگوں کے چنگل سے نکل بھاگنا چاہیے تھا۔ بعد میں وہ اپنے سفارت خانے کا تعاون حاصل کر کے خود کو بے گناہ ثابت کر سکتے تھے۔ یہاں تو ایسا لگ رہا تھا کہ یہ لوگ انہیں مار مار کر ہی ختم کر دیں گے یا پھر اتنا باریک دیکھ کر وہ بے بس ہو کر ہر الزام کو کچلے مانتے پر راضی ہو جائیں گے۔ مگر اب یہ سب سوچ بھی لا حاصل تھا۔ بند

آنکھوں، بند منہ اور جھکریوں میں پکڑے ہاتھوں کے ساتھ الٹا لٹکا ہوا بندہ جس کے جسم پر خاردار کوڑے آگ دھکا رہے ہوں، جو بھی سوچے وہ لا حاصل ہی تھا اور پھر سوچنا بھی کون سا آسان تھا۔ مسلسل الٹا لٹکے رہنے کے باعث ایک طرف دماغ کو خون کا بے تحاشہ دباؤ برداشت کرنا پڑ رہا تھا تو دوسری طرف بندگی ہوئی تھیں پورے جسم کا وزن بھٹکتی، ٹوٹنے سی لگی تھیں۔ وہ دیکھ نہیں سکتے تھے لیکن محسوس کر سکتے تھے کہ ان کے زخموں سے لگنے والا خون دیر سے دیر سے بہتا اب زمین پر پھٹنے لگا ہے۔ اس بے پناہ اذیت سے نجات کی راہ آخر کار قدرت نے ہی عطا کی۔ پہلے مرد کی برداشت نے جواب دیا اور وہ بے ہوش ہوا پھر عالم شاہ کے حواس بھی ساتھ چھوڑ گئے۔

”اتنا سبق کافی ہے۔ اب ٹیکسٹ اسٹاپ نو۔“ جانے کتنا عرصہ بے ہوشی کے عالم میں گزرا تھا۔ عالم شاہ کو ہوش آیا تو ساتوں سے ایک شناساسی محسوس ہوئی آواز نکرائی لیکن بس لفظ احساس شناسائی تھا۔ وہ اس آواز کو شناخت نہیں کر سکا تھا۔

”بولو تو تھوڑی کھاطر (خاطر) اور کر دیں۔ اس جنم میں تو کیا، اگلے سات جنموں میں بھی پھر بھی بھارت آنے کا نہیں سوچے گا۔“ بات کہہ کر اختتام پر قہقہہ لگانے والا وہی تھا جواب تک انہیں گرفتار کر کے لانے والی پولیس پارٹی کو لپٹ کر تار پاتا تھا۔

”او نہیں یارا پہلے ہی سالوں کی حالت تھی ہے۔ مر مرا گئے تو میرے لیے پراہم ہو جائے گی۔“ یہ وہی تھا جس کی آواز شناسا لگتی تھی لیکن پہچانی نہیں جاتی تھی۔

”جیل ٹھیک ہے۔ جیسی جبری اچھا۔“ ان دونوں کے درمیان بڑی الہام و تقسیم کی فضا تھی۔

”تو اسے انجوائے کر۔ پورے بیس سال پرانی ہے۔ کل ہی ایک چاہنے والے نے بھجوائی ہے۔“ گلاس

میں مشروب انڈ پلے کی آواز سنائی دی۔

”اچھی چیز ہے۔ میں اسے ختم کرتا ہوں، تو انہیں لوڑ کر دے۔“ اس نے ایک گھونٹ لے کر چٹکارا لیتے ہوئے فرمائش کی۔ وہ کچھ جھلت میں لگتا تھا۔ عالم شاہ کے دل میں شدت سے اس کا چہرہ دیکھنے کی خواہش ابھری لیکن آنکھوں پر بندھی پٹی بے ہوشی کے دوران بھی نہیں ہٹائی گئی تھی اسلئے بدستور دیکھنے سے معذور تھا۔

”لوگے کالو بادشاہ! چل لوڑ کر انہیں گاڑی میں۔“

جانتا ہے نا کہ کدھر پہنچا تا ہے؟“ شاہانہ انداز میں حکم صادر کیا گیا۔ زرا دیر بعد ہی عالم شاہ کا زمین پر پڑا جسم دھڑلے



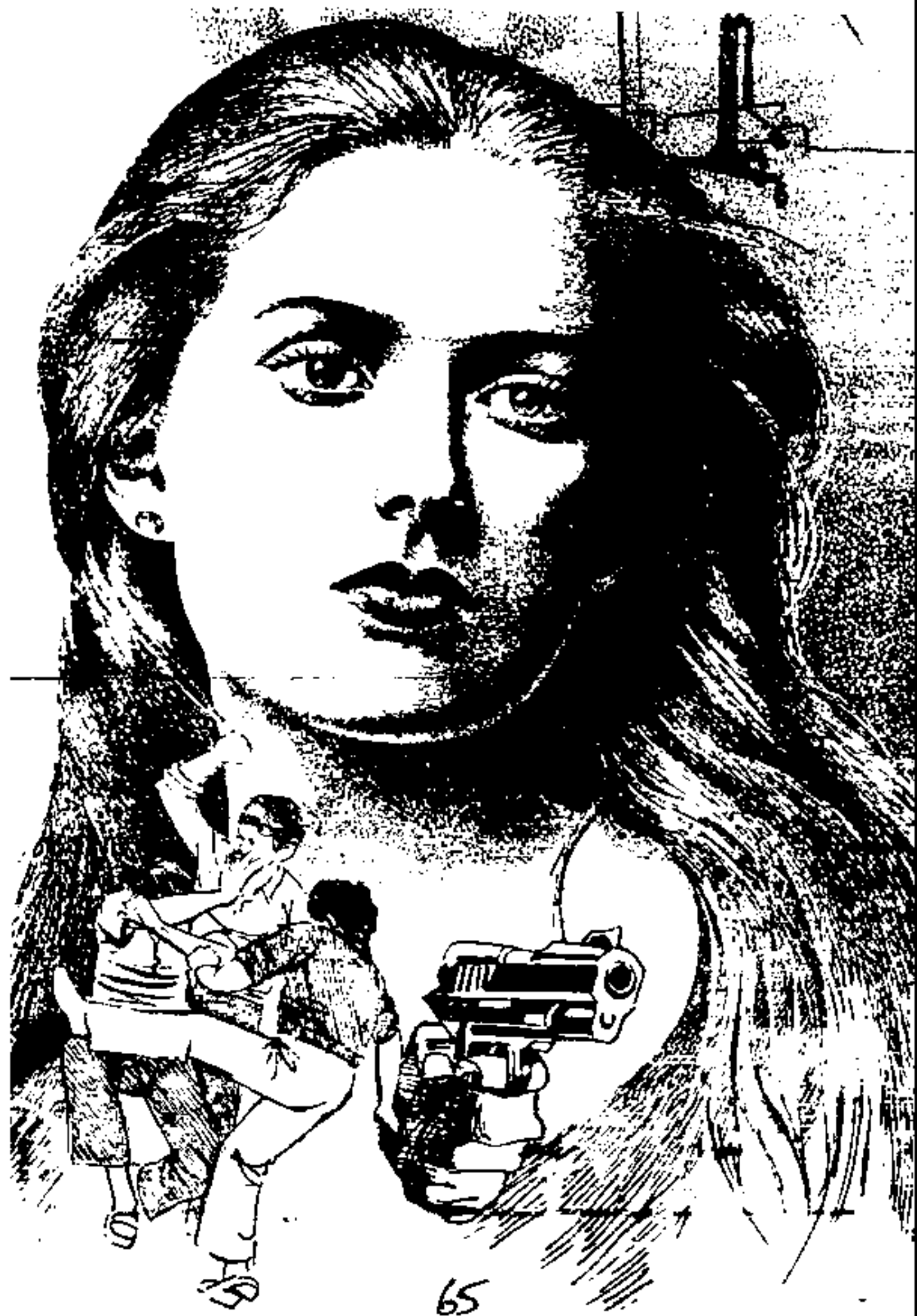
قسط: 16

شہزادہ حسن

شہزادہ حسن

... اس کی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی ہندوتیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابل شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پُر عزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جا رہے تھے... اس کی زندگی جو اعلیٰوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... یہ خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لہک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قرار یوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چہرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تاری عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ پروار کا ٹوڑ کرتا حق و باطل کی غزلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ ولایتِ قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہو سکی...

... اسے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا القام نوجوان کی مختصر انگریز داستان



معاذ ایک ذہین لیکن حنون مزاج لڑکا جو یورپی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جو ان کیبا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری انسر ہیں اور ان کے ہوتے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ اپنی لیٹ سے واپس آ رہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو مڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو مارا کرسنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی جو یورپی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہی ہے۔ اپنی نذر غمر سے اس کے باعث وہ اس معاملے میں کچھ پڑتا ہے اور بشری نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بشری نامی کی بیٹی کی تعلیم کی طالب ہے اور ایک ہتھیار کے لیے کالم وغیرہ لکھتی ہے۔ اس دوران جبکہ بھی وہ ایک مذہبی تفسیر پڑھتی ہے کہ جس سے اس میں سلطو حاصل کرنے کے لیے آئی تھی۔ معاذ بشری کو یہ دعوت اس کے گھر پہنچاتا ہے اور محمد اس واقعے کو لڑا سوشل کر دیتا ہے لیکن اس سے اس نے ان کا انکار بھی کیا تھا، وہ اس واقعے کو لڑا سوشل نہیں کرتے اور سوتے کی تلاش میں رہتے ہیں۔ یہ سوتے انھیں یورپی لڑکے کی صورت میں مل جاتا ہے اور ایک جنگل کی سیر کے دوران وہ لڑکے گرل کے شوق میں سب سے الگ تھلک ہو جانے والے معاذ کو بے خبری میں گھر کر بری طرح زبرد کو پکڑتے ہیں اور پھر ہی سے اسے دھکا دیتے ہیں۔ معاذ کے والد اس دن آنے پر انتقامیہ کے افراد، پولیس اور مسکس ذرائع کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ اور معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جوتی کی بھونڈی میں پاتا ہے۔ اپنی حالت سے اسے اپنے شدید زخمی ہونے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ جوتی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ معاذ کا سوا کچھ جنگل میں ہی کھین کر جاتا ہے اور جوتی کے پاس رہا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا جس سے باہر کی دنیا سے رابطہ کیا جاسکے۔ وہاں رہتے ہوئے جوتی کی شخصیت اس کے لیے ویکسی کا باعث بن جاتی ہے۔ جوتی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نوازا کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے چار سوا علم سکھانے کی ہائی پھر لیتا ہے اور معاذ واقعی اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اور جوتی سے ملنے والے معاذ کے گھر سے جب تصویریں لیاؤں جاتی ہیں تو بہت سے قدرتی طاقتوں کی تصویروں میں سے ایک ایسی تصویر بشری کی نظر میں آ جاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کارمن اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پرنسپل کے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشری تحقیق کر رہی تھی۔ بشری کے لیے وہ ایک جڑی بوٹی ہے اور جوتی کوئی ان کے خون میں شامل ہے۔ اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشری کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے تاب و کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ صدمے سے جان دے دیتا ہے۔ باپ سب میں باؤل نامی لڑکے کا چاہتا ہوتا ہے۔ بشری انتقام لینے کی ضمان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دلوں میں ہی معاذ واپسی کا ارادہ کرتا ہے تاہم دوسرے ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا عرفان اللہ اور یزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو داکو نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ اور بال بال اچانک بشری کو پھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر دیتا ہے۔ ڈی این اے پورٹ سے بال بال کی شناخت ہی ہو جاتی ہے۔ اور معاذ کو داکو نامی لڑکے کے لیے او بھٹے انکشاف سے مستحیل کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اسے داکو نامی لڑکے کا بیٹا مہیا دیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کر کے اس کے حوالے کر دیتے ہیں۔ لیڈ میں معاذ سے سلطو ماحولی جاتی ہے۔ نہ بتانے پر اس کے بھائی کا ایک گردہ نکال لیا جاتا ہے۔ لیڈ اور معاذ کو سب بتا دیتا ہے۔ اور بشری بھی انتقام کی آگ میں جلتی ہوئی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹرینگ شروع ہو جاتی ہے۔ معاذ کو بچانے والا لڑکا داکو نامی اپنے گرد کے ساتھ ایک پارٹی میں جاتا ہے۔ وہاں اسے معاذ کے حوالے سے مشکوک ایک شخص نظر آتا ہے۔ وہ اس کے پیچھے جاتا ہے مگر اسے گھیر لیا جاتا ہے۔ بہر حال داکو نامی کو سمجھنے کے ساتھ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اور معاذ کے دوست عالم شاہ کے بہنوئی کو گل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ کی خون میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے چنانچہ کر کے اس کے دماغ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ لفظ سے حاصل ہونے کے علم کی بدولت ان کا معمول نہیں بدلتا۔ بشری کارمن کو پھاپے کا پروگرام بتاتی ہے۔ اور عالم شاہ و مراد لگا لیتا ہے کہ اس کے بہنوئی کا گل کرنے کیا۔ وہ قاتل کو گھیرتا ہے اور اپنے تئیں اسے گولیاں مار کر گل کر دیتا ہے تاہم وہ قاتل جاتا ہے۔ عالم شاہ اس کے بعد ڈاکوؤں کے چھاپہ چاچ کو پھاپتا ہے اور اسے گل کر دے کر تک پہنچاتا ہے تاہم اس کے پیچھے پولیس لگ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور اس کا نوکر سرمد باؤل کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ اور معاذ جاسوسی ماحول کو پھانگ کر اس کے پیچھے لے آتے تھے ماحول میں مل کر مہلتا ہے تاہم ان کی فائز تک نہیں پہنچا رہا تھا ہے اور ان میں معاذ پر نہیں آتا مگر معاذ سے کام لیتے ہیں کہ وہی شک کرتا ہے۔ اور گل شاہ کے نوکر لوہور بچے کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اغوا کا الزام اعلیٰ عہد پر آتا ہے۔ عالم شاہ وہاں موجود ایک مذہبی شخص کی مدد سے باؤل کی قید سے پھانگرا لیتا ہے۔ اور بشری دینی بھی جاتی ہے۔ وہاں داکو نامی اسے باؤل کے مدد میں پہچان لیتا ہے لیکن ان دونوں

کے درمیان اس کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ وہ سلطان کو مانگتا ہے کہ اسے سدھانے سے روکا جائے۔ اصرار عالم شاہ مال کی قید سے نکل کر اس کا چچا کرتا ہے تاہم وہاں اچانک قاتل کے دروازے کے ہونے لگتے ہیں۔ وہاں سزا کو دیکھتا ہے۔ صداقت شاہ لطیف سحر و کیمیا کے گہرے کے لیے اس کی نظیر بنی اور بچے کا کھوج لگاتے ہیں اور بچے کو اٹھا کر لیتے ہیں۔ لطیف سحر و کیمیا ہو جاتا ہے۔ سزا کو اس کے گھر والوں سے لٹنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ عالم شاہ کو اس کے والد اٹھارہ سال کی عمر پر ہی لے جاتے ہیں۔ اصرار عالم شاہ کو ایک مشن پر سونپا کے ساتھ اٹھارہ سالہ لڑکا ہے تاہم کچھ لوگ سکھ لڑکیوں سے ہمراہی بس کو پریشان بنا لیتے ہیں۔ عالم شاہ کو ایک جنگ آسیر نظر آ جاتی ہے جس کے پیچھے چا کر وہ اور سرحد پر لے جاتے ہیں۔ تاہم صداقت کے تعاون سے پولیس آ جاتی ہے اور وہ خاموشی سے وہاں سے نکل جاتے ہیں۔ سزا اور سونپا خانے کے قاتل ہارن کو فکاکے لگا دیتے ہیں تاہم باہر موجود دیگر افراد کا دل سے مقابلہ ہوتا ہے اور سزا زخمی ہو جاتا ہے۔ صداقت شاہ کے اٹھارہ سالہ سحر و کیمیا کے بارے میں شادی ہوئی ہے۔ عالم شاہ، نکل اور سرحد اٹھارہ سالہ لڑکا ہو جاتے ہیں۔ ان پورٹ سے گھر رو آگئی ہے۔ سزا میں کچھ لٹیرے انہیں لوٹ لیتے ہیں۔ عالم شاہ انہیں میں آنا چاہتا ہے تاہم پہلا لڑکی عالم شاہ کی کزن اس کا ساتھ روک لیتی ہے۔ گھر پہنچنے پر پولیس کی رہی ہوئی ہے اور وہ عالم شاہ اور سرحد کو لے جاتے ہیں اور بشری اور وقاص ہاتھ میں مارنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ بھاگ جاتا ہے۔ سزا اور سونپا ہتھ کی تلاش میں ہوتے ہیں اور ہاتھ اپنے سولت کاروں سے مل جاتے ہیں۔ عالم شاہ اور سرحد کو تھکا کاٹا بنا کر ویرانے میں پھینک دیا جاتا ہے جہاں عالم شاہ کو کتوں کے بھونکنے کی آواز آتی ہے۔ کتے ان کے بے حد قریب آ جاتے ہیں اور انہیں دردناک موت کا احساس خوف میں مبتلا کر دیتا ہے۔

اب آب مزید واقعات ملاحظہ فرمائے

کہہ ہے ہیں۔ "وہ گاؤں کا پروردہ تھا۔ جاگیرداروں کے عمومی حراج کے مطابق ان کی حویلی میں بھی کتے پالے جاتے تھے اس لیے خوف کے ابتدائی جھکے سے نکل کر حقائق کو سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی اور جسمانی تناؤ آہستہ آہستہ کم ہونے لگا۔ چند ساتھیوں بعد سبیل بننے کے ساتھ ساتھ انسانی آواز میں بھی سبیل کی آوازیں سننے لگیں تو اطمینان میں اضافہ ہو گیا۔

"کون ہے؟"

"روشنی ڈالو۔"

"تو بندھے ہوئے ہیں۔"

"زخمی بھی ہیں۔"

وہ تین چار لوگ تھے جو ان کے اطراف کھڑے تبصرے کر رہے تھے۔ ان کی آمد کے ساتھ ہی کتوں کے بھونکنے کی آواز میں تبدیلی آئی ہوئی چلی گئی تھی۔ یقیناً وہ اپنی ڈیوٹی انجام دے کر مطمئن ہو چکے تھے۔

"اے! یہ تو پاکستان سے آئے مہمان ہیں۔"

کچھ ہی ان کے اطراف کھڑے لوگوں میں سے ایک نے انہیں شائستگی کر لیا اور پھر فوراً ہی صورت حال بدل گئی۔

انہیں بندشوں سے آزاد کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی آنکھوں اور لیوں کو بھی آزاد کیا گیا۔ کئی گھنٹوں سے آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اس لیے وہ فوری طور پر اپنے ارد گرد کے ماحول کو دیکھنے سے قاصر تھے۔ کچھ ہی حال مند

کا بھی تھا۔ حلق خشک پڑا ہوا تھا اور زبان گویا سوکھ کر چمڑا ہو گئی تھی۔ اچھی بات یہ تھی کہ کسی نے بھی فوری طور پر ان

شہ آب آزاد تھے، وہ آنکھیں دیکھ سکتی تھیں لیکن کان کتوں کے وحشت ناک اعزاز میں بھونکنے کی آواز میں سن رہے تھے۔ یہ آوازیں ایسی تھیں کہ اچھے بھلے دلی گردے والے آدمی کا بھی دم خشک ہو جائے۔ وہ اور سرحد بھی بزدل نہیں تھے لیکن جب آدمی بندھے ہوئے ہاتھ بندھوں کے ساتھ ایک طرف پرانے میں ایسی حالت میں پڑا ہوا کہ اپنے دشمن کو دیکھنے کا اختیار نہ ہو اور لب کسی کو اپنی مدد کے لیے پکار نہ سکیں تو بے بسی خوف کو جنم دے ہی دیتی ہے۔ ان کے بھی ہر مسام سے پھینا پھوٹ پڑا تھا۔ وہ سمجھ سکتے تھے کہ ان کتوں کی شکل میں ایک دردناک موت ان کے سامنے آنکھوں کی ہوئی ہے۔ گولی یا کسی تیز دھار آلے سے موت کا نوالہ بن جانا اتنا خوفناک نہیں تھا جتنا اپنے بدن کا بھٹی بھٹی ہو کر ان کتوں کے پیچھے میں نکل ہو جانے کا تصور۔ یہ خوفناک تصور ہی تھا جو انہیں بے بسی کی انتہا پر بھی حراست کرنے پر اکسار رہا تھا۔ وہ اپنے سروں کی گرد اور بندھے ہوئے جسموں کو ممکنہ جھکے دے کر انہیں خود سے دور رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اچھی بات یہ تھی کہ کتے ان کے نزدیک تو آ رہے تھے لیکن ابھی تک ان میں سے کسی نے ان پر جارحانہ حملہ نہیں کیا تھا۔ حملہ آور ہونے سے زیادہ ان کا زور بھونکنے پر تھا۔

"یہ جنگلی یا آوارہ کتے، پالتو کتے ہیں۔" اچانک ہی عالم شاہ بکھارا رک ہوا۔

"یہ ہم پر حملہ آور نہیں ہوتے۔ انہیں نے صرف ہمیں لٹکا رہا ہے اور اب اپنے مالک کو متوجہ کرنے کی کوشش

سے پوچھ کر کچھ کی کوشش نہیں کی اور انہیں محفوظ مقام پر پہنچانے کو پہلی ترجیح دی گئی۔ یہ محفوظ مقام نیاز شاہ کا ذبیحہ و صبح و عریض جو ملی نما گھر تھا جہاں سے قالوئی کارروائی کے نام پر انہیں مکمل کھلا خواہ کر کے لے جایا گیا تھا۔

”کہاں سے ملے یہ لوگ؟ ان کا یہ حال کیسے ہوا؟“
لوگوں میں نیاز شاہ کے بیٹے ان کے ارد گرد جمع ہو گئے۔

”یہ ساری باتیں بعد میں معلوم کرتے رہنا، پہلے فردوس کو بلاؤ۔“ انہیں فوری فرینٹ کی ضرورت تھی۔“
ٹھیکل نے ففندی سے کام لیا اور چوتھے نمبر کے بھائی جلیل کی بیوی کو بلوانے کا مشورہ دیا۔ فردوس ڈاکٹر تھی اور ایک مقامی اسپتال میں ملازمت کرتی تھی۔ فردوس کے آنے تک ملازمین نے ابتدائی کارروائی شروع کر دی تھی۔ ان کے جسموں سے چمک چائے والی سنی اور زخموں سے نکلنے والا خون صاف کیا جا رہا تھا۔

”اسکا درم کی۔ میں بتا رہا ہوں بھائی صاحب! اس غم پر میں چپ نہیں بیٹھوں گا۔“ ان کی حالت پر رنجیدہ فیصل مسبو حراج جذباتی پن سے کہہ رہا تھا۔

”لازمی بات ہے ہم خاموش نہیں رہیں گے لیکن کسی جذباتی قدم سے پہلے ہمیں عالم شاہ اور سرد سے حالات جاننے ہوں گے۔“ ٹھیکل نے رمان سے جواب دیا۔

”سیر سے خیال میں آئیں آئیں پلی صاحب کو اطلاع کر دینا چاہیے۔“ منیل نے مشورہ دیا۔

”ہاں، یہ کام فوری طور پر کر ڈالو۔“ ان کی باہمی گفتگو اور صلاح مشورے جاری تھے۔ سب کچھ سننے عالم شاہ اور سرد نے احوال مہر پر لب تھے۔ سرد کے تو عالم شاہ کی اجازت کے بغیر کچھ بولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا جبکہ عالم شاہ کچھ بولنے سے زیادہ اس بات پر غور کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ آخر ان کے ساتھ ہوا کیا ہے۔

”اف مائی گاڈ! انہیں تو بہت بری طرح مار چکا گیا ہے۔“ بلاوے پر آنے والی فردوس ان کی حالت دیکھ کر دنگ رہ گئی۔

”تم انہیں فرینٹ دو۔ ان کی حالت کچھ بہتر ہو تو اہاجی اور گل کو ان کے ملنے کی خوشخبری سنائیں گے۔“ جلیل نے سنجیدگی سے بیوی سے کہا تو وہ بھی پوری پیشہ وارانہ مہارت کے ساتھ حرکت میں آ گئی۔ دو ملازمین کے ساتھ فیصل بھی اس کی مدد کر رہا تھا۔ دونوں زخموں کی سرہمی پائی کرتے کرتے تقریباً چن گھنٹا لگ گیا۔ فردوس نے جلیل کو بھیج کر اپنے کمرے میں سے چند پینکٹس اور کپڑوں بھی منگوا لیے۔

”انہیں نیم گرم دودھ کے ساتھ کوئی بسکٹ وغیرہ کھلائیں مگر یہ دوا گئی دیں۔ زخموں کو سکھانے اور درد کم کرنے کے لیے یہ دوا بھی ضروری ہیں۔“ فردوس نے ہدایت دی، جس پر فوری عمل کیا جانے لگا۔

”آپ جا کر ذرا سلیپتے سے گل کو ان لوگوں کے ملے کی خبر سنادیں۔ دو بے چاری بہت پریشان ہے۔“ فردوس اپنے کام سے ہارخ ہو گئی تو فیصل نے اس سے کہا۔ فردوس سر ہلاتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔ آج کی رات اس گھر کے کمینوں پر بہت بھاری تھی۔ اسنے شوق کے ساتھ بلوائے گئے مہمانوں کے ساتھ جو کچھ چاہتا تھا اس نے دماغ کی چولیس ہلا دی تھیں۔ بچوں کے علاوہ صرف نیاز شاہ تھے جو سوکے تھے، وہ بھی صرف اس لیے کہ انہیں اعصابی واد سے بچانے کے لیے فردوس نے انہیں فرنگولا کر دے ہو گئی تھی۔

”عالم اکیتا تم اپنے اندر بہت پار ہے ہو کہ میں اپنے ساتھ جتی سنا سکو۔“ فردوس کی حسب ہدایت انہیں دوا گئی وغیرہ کھلائی جا چکی تھیں تو ٹھیکل نے عالم شاہ کے قریب بیٹھے ہوئے نرمی سے اس سے پوچھا۔ اس کے پاس بھی حربہ خاموش رہنے کا کوئی جواب نہیں تھا۔

”مجیب بات ہے۔ ہماری پولیس یا غریب ایجنسیز اس انداز میں کام نہیں کریں گی۔ انہیں کسی کو پھنسا ہوا تو پھر آخری حد تک جاتے ہیں۔ جوں پکڑا، بار پکڑا اور پھر چھوڑ دینا بہت ہی عجیب ہے۔“ قصبات من کر ٹھیکل نے حیرت کا اظہار کیا۔

”کمال یہ بھی ہے کہ ہم پورا دن کوشش کرتے رہتے پر بھی تم لوگوں کا کوئی کھوج نہیں لگا پائے۔ ہمارے تقریباً سارے گھروں میں ایسے خاصے تصکات ہیں لیکن ہمیں کہیں سے کوئی جانکاری نہیں مل سکی کہ تم لوگوں کو اور پست کیا گیا ہے یا کوئی سیکرٹ ایجنسی تمہارے خلاف کوئی ایویسیلی کلین کر رہی ہے۔“ حیرت کا یہ مظاہرہ کرتے والا ٹھیکل تھا۔

”میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ یہاں کے سسٹم اور لوگوں کو آپ بہتر جانتے ہیں۔“ وہ پچھلے انداز میں مسکرایا۔

”مجھے تو لگتا ہے کہ پانکٹس کی آڑ میں کسی اور نے کارروائی کی ہے۔“ فیصل نے خیال ظاہر کیا۔

”لیکن کوئی ایسا کیوں کر ہے گا؟ کسی کو ان سے کیا وضاحت ہو سکتی ہے؟“

”ہوسکتا ہے وضاحت ہم سے نہیں آپ سے ہو اور ہمارے ساتھ یہ سلوک کر کے آپ کو کوئی پیغام دینے کی کوشش کی گئی ہے۔“ عالم شاہ نے بہت ذہین انداز میں

فیصل کی شادی میں شریک ہونے آئے ہیں۔ شریک ہو کر ہی جائیں گے اور ان شاء اللہ واپسی کے سفر میں ہمارے ساتھ بہت سی خوشگوار یادیں ہوں گی۔" وہ اپنے الفاظ سے بہن کو سمجھانے کے ساتھ ساتھ میزبانوں کی دلجوئی کی بھی کوشش کر رہا تھا۔

"ایس ایس پی صاحب عکریف لائے ہیں۔" ملازم نے آکر اطلاع دی تو کل اٹھ کر باہر نکل گئی۔ وہ قریبی اعزاء اور ملازمین سے پردہ نہیں کرتی تھی لیکن ان کے ہاں غیر اور انہماک لوگوں سے پردے کا رواج تھا اور اس رواج کی پوری پاسداری کرتی تھی۔

کھل کے جانے کے بعد چوڑے چکے چہرے والا ایس ایس پی کمرے میں داخل ہوا۔ اسے بہت احترام سے بیٹھنے کے لیے کرسی پیش کی گئی اور گھٹیل نے اس تک کی ساری صورت حال دہیرے سے اس کے گوش گزار کی۔

"میں انخوا کے پردے والے کو آپ دونوں کی زبانی سننا چاہتا ہوں۔ بہت دھار کے ساتھ ڈپٹی سارا کچھ سنائیں۔ ان لوگوں کی آپس کی باتیں، آپ سے ڈائلاگ، آس پاس کا ماحول، کچھ بھی مٹیں کرنا ہے۔" ایس ایس پی نے قریباً گھنٹی کی اور روئے سخن پہلے سرمد کی طرف کیا۔ سرمد سارا قصہ سنا تا چلا گیا لیکن اس کا زیادہ وقت بے ہوشی میں گزرا تھا اس لیے اس کے پاس بتانے کو بہت زیادہ نہیں تھا۔ ایس ایس پی نے اس سے چھ ایک سوالات کیے اور پھر عالم شاہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ عالم شاہ چونکہ انخوا کاروں کی قید میں ہی ہوش میں آچکا تھا اس لیے اس کے پاس بتانے کے لیے سرمد کے مقابلے میں زیادہ باتیں تھیں۔ ایس ایس پی نے ہوش کے عالم میں اس کی سنی جانے والی گفتگو میں خاصی دلچسپی لی اور اسے کرید کرید کر سوالات کیے کہ عالم شاہ اگر کوئی بات واقعی طور پر بھول بھی گیا تھا تو اسے یاد آتی چلی گئی۔

"اس قصہ نے یہ کیوں کہا کہ وہ قہاری اتنی خاطر کر دتا ہے کہ اس جہم میں تو گنہگار اگلے سات جنموں میں بھی بھارت آنے کا نہ سوچا۔" سب سن کر ایس ایس پی نے ہنسا اٹھا۔

"پاکستان اور پاکستانیوں سے دشمنی کے علاوہ کیا بات ہو سکتی ہے۔ میں نے آپ کو بتایا کہ ریلوے بھر بھی وہ لوگ پاکستان اور پاکستانیوں کے خلاف بدراستے رہے تھے۔"

"وہ الگ بات تھی۔ اس وقت وہ جانتے تھے کہ ہم ان کی باتیں سن رہے ہو لیکن جس وقت یہ جملہ کہا گیا ان تہارے ہوش میں آنے کی جانکاری نہیں تھی۔ وہ آپس میں

پہنچا ایک خیالی گوش گزار کیا۔ بھارت کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی ان کے ساتھ جو حادثات کا سلسلہ شروع ہوا تھا اس نے اسے ایسا سوچنے پر مجبور کیا تھا۔ وہ تو یہاں اپنی تھی۔ ان کے ساتھ بھلا یہاں کسی کی کیا دشمنی ہونا سکتی۔ ہاں یہ ممکن تھا کہ وہ اپنے میزبانوں کی کسی دشمنی کی ہیجٹ چڑھ گئے ہوں۔ اسے اثر پڑا کہ اسے یہاں آتے ہوئے پیش آنے والا ڈھکی کا واقعہ بھی ایسی ہی کسی دشمنی کا سلسلہ لگ رہا تھا۔

"مجھے نہیں لگتا۔ ہم دوست بنانے والے لوگ ہیں۔ ہماری بھلائی سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔" کل نے اس کے خیال کی تردید کی۔

"ہماری دشمنیوں کے سلسلے بھی اتنے دراز نہیں کہ یہاں تک چلے آئیں۔" نہ چاہتے ہوئے بھی عالم شاہ کا لہجہ قدرے تلخ ہو گیا۔ اسی وقت کل کمرے میں چلی آئی۔ متوہم بچے اور سنا ہوا چہرہ گواہ تھا کہ وہ اس کے خیاب کے عرصے میں مستقل ردولی رہی ہے۔

"اور...؟" عالم شاہ کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں نمی اتری۔ "آپ ٹھیک تو ہیں نا اور؟" وہ قریب چلی آئی۔ کل آسمیں والے ڈھیلے ڈھالے کر یہ شلوار نے جسم کے زخموں اور غٹوں کو تو چھپایا تھا لیکن عالم شاہ اور سرمد کے چہروں پر بھی چند نشان تھے جس نے اسے یہ سوال کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"سب ٹھیک ہے کل! ایس پیس والوں کو ذرا سی غلط فہمی ہو گئی تھی۔ اب سب ٹھیک ہو گیا ہے۔" اس نے بہن کے سر پر ہاتھ رکھ کر شفقت سے اسے تسلی دی۔

"ہم واپس پاکستان چلتے ہیں اور ہم نہیں رہیں گے یہاں۔ جہاں آتے ہی ہم پر ایک کے بعد ایک مصیبت ٹوٹتی چلی جا رہی ہے۔" وہ مکمل حراج تھی لیکن بچے درپے پیش آنے والے حادثات نے اسے بہت حساس کر دیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جو کچھ اس کے بعد حیرت کچھ کچھ نے کا حوصلہ نہیں رہا ہے، اسی لیے ایسی بات کر رہی تھی۔

"انسان اپنی قسمت سے بھاگ کر نہیں جاسکتا کل انسان پر مشکل وقت بھی آئی اور کہیں بھی آسکتا ہے۔ ہم اس بات پر فکر ادا کر دو کہ ہم اس مشکل سے نکل آئے ہیں۔" عالم شاہ سے سنبھانے لگا۔ باقی حاضرین ذرا شرمندہ شرمندہ سے نظر آتے تھے۔ جو پیش آیا اس میں ان کا کوئی قصہ نہیں تھا لیکن بحیثیت میزبان وہ خود بے فائدہ داری محسوس کر رہے تھے۔

"کسی دہم کو اپنے دل میں جگہ مت دو۔ ہم یہاں

بات کر رہے تھے اور ان باتوں سے یہ بھی لگتا ہے کہ پولیس کی دردی میں تم لوگوں کو یہاں سے اریسٹ کر کے لے جانے والا آدمی اس دوسرے آدمی کے لیے کام کر رہا تھا۔ "ایسی ایسی بی نہایت ہار یک جی سے حالات کا تجزیہ کر رہا تھا۔

"کیا آپ کے خیال میں ہمیں یہاں سے گرفتار کر کے لے جانے والے پہلی پولیس والے تھے؟" عالم شاہ اس کے تجزیے پر چلا۔

"لگتا تو یکی ہے۔ میں نے نیاز شاہ صاحب کی ریکویسٹ پر اس سارے معاملے کو بہت اچھی طرح چیک کیا تھا۔ کہیں سے کوئی معمولی سی سن گن بھی نہیں لی تھی کہ پولیس یا کسی دوسری سیکرٹ ایجنسی نے تم لوگوں کو اریسٹ کیا ہو۔ پاکستان میں ہمارا بہت برا بیج سکی اور کچھ کیسوں میں ہماری سی فطلی بھی سکی لیکن اب ایسا بھی نہیں ہے کہ ہم انڈیا کی دھرتی پر قدم رکھنے والے ہر پاکستانی کی جان کے دشمن بن جاتے ہوں۔ ہاں، ہم پاکستانیوں پر سخت چیک ضرور رکھتے ہیں اور وہ ہمارا سکیورٹی اینڈو ہے۔" ایسی ایسی بی خامسے کھلے ذہن کا بندہ معلوم ہوتا تھا لیکن بہر حال اس پر اپنے ملک کا دفاع کرنے کی ذمہ داری عائد ہوتی تھی اس لیے وہ اپنے لوگوں کے غراب روپے کی تو جیمات بیان کر رہا تھا۔

"جو بھی بات سے جناب امیں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں تو یہاں آکر قرض چکر ہی بن گیا ہوں۔ مجھ پر اور میرے سامنے پر نہایت پر دیشل انداز میں تشدد کیا گیا ہے اور عموماً ایسا تشدد آپ کی اور ہمارے ہاں کی پولیس ہی کرتی ہے۔" عالم شاہ کے لہجے میں بیزاری اتری۔

"عالم شیک کہہ رہا ہے ایسی ایسی بی صاحب! فردوس نے بھی ان دونوں کے دھم کو دیکھنے کے بعد یہی کہا تھا کہ بے شک دلوں کو سخت چوٹیں لگائی گئی ہیں اور کوشش کی گئی ہے کہ یہ شدید تکلیف سے گزریں لیکن کوئی بھی چوٹ ایسی نہیں جو جان لیوا ہو۔ ایسا ہمارے عام طور پر پولیس والے ہی کرتے ہیں۔" جلیل نے بھی اس کی حمایت میں آواز اٹھائی۔

"میں اس معاملے کو مزید ڈپٹی دیکھتا ہوں۔ آپ لوگ ایسا کریں کہ ان کے سامان اور کاغذات کی رودری سے لے کر انوائسک کے سارے پراپٹی کی ایف آئی آر کھان میں تاکہ ایک لیگل پروسیس شروع ہو سکے اور آپ کے مہلک مزید کسی کھٹائی میں نہ پڑیں۔" ایسی ایسی بی چند دہائیات دے کر ہٹا ہوا گیا تو عالم شاہ اور سرہ کو بھی سہلت ملی کہ وہ آرام کر سکیں۔ فردوس کی دی گئی بین کلرز میں یقیناً کوئی ایسا جرم بھی تھا جس نے بستر پر لیٹنے کے ساتھ کام دکھایا

اور وہ خیر کی داد میں اترتے چلے گئے۔

☆☆☆

"کیسے ہو معاذ؟" وہ ایک آرام دہ بستر پر لیٹا ہوا لائینی خیالات میں غرق تھا کہ سونیا کی نرم ہکار نے اسے متوجہ کیا۔

"کچھ بیلر۔"

"کام کے لیے بیڈی ہو؟"

"کیا میرے پاس انکار کا اختیار ہے؟" اس کا لہجہ زہر ملا ہوا۔

"مگر تم بھر لیل نہیں کر رہے ہو تو ہم کچھ دن مزید انتظار کر سکتے ہیں۔"

"انجان مت جو۔ تم جانتی ہو میں اپنی جسمانی نہیں، ذہنی حالت کے بارے میں بات کر رہا ہوں۔"

"تمہیں تمہارے مطلب کا نامک دیا گیا ہے جب بھی تم ایسی بات کر رہے ہو۔ ہم تمہارے دشمن ملک کو زک پہنچانے جا رہے ہیں تب بھی تم خوش نہیں ہو۔" سونیا نے فکوحہ کیا۔

"خوشی سے مرنا جاتے جو تیرا اعتبار ہوتا۔" وہ طنزیہ سی ہنسی بٹا۔

"مطلب؟" سونیا نے اسے گھورا۔

"مطلب صاف ظاہر ہے۔ مجھے یہ مشن میرے وطن کے کسی قابل اعتبار ادارے نے نہیں بلکہ ایسے لوگوں نے سونپا ہے جن کی بے خبری کا میں خود گواہ ہوں۔ ایسے میں کوئی اچھی امید رکھنا نرمی خوش فہمی ہے۔" اس نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

"تم ایسی باتیں اس لیے کر رہے ہو کہ تم ابھی نہیں سمجھتے نہیں ہو۔ ہم کسی کے دوست یا دشمن نہیں ہیں۔ تم ہمیں فری لانسر سمجھو۔ ہم سب کے لیے کام کرتے ہیں۔ جو کام تم ہمارے لیے کرنے جا رہے ہو وہ تمہارے ملک کے مفاد میں ہے اس لیے تمہیں اس کو انجام دینے میں کوئی جھجک نہیں ہونا چاہیے۔" سونیا اسے نہایت نرمی سے قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"اس بحث کو چھوڑو۔ جو کرنا ہے اس پر بات کرتے ہیں۔" معاذ نے خود ہی بحث سمیٹ دی۔ سونیا کے کرم لہراؤں کی مساکلی گئی اس پناہ گاہ میں قیام کے گئی روز گزر چکے تھے۔ یہاں اسے بہترین طاق، طعام اور قیام کی سہولیات میسر تھیں اس لیے اس نے بہت جلدی سے دیکھ کر گیا تھا اور وہ جانتا تھا کہ ڈاکٹر کے ذریعے یہ ساری سہولیات سونیا کو بھی حاصل ہو سکی ہوں گی اس لیے بھانسنے جا کر پہل

یا ہلکا پہلکا قرٹ کہہ کر بھی نظر انداز کیا جاسکتا تھا۔ جیسا کہ اس وقت وہ اس کے ساتھ اس کے بستر پر ہی بیٹھی بظاہر "کام" کی باتیں کر رہی تھی لیکن اس کے بدن کا رویہ کسی اور بھیجی بھیجی خوشہوار بار بار معاذ کی توجہ ہٹا رہے تھے۔

"چائے تو منگواؤ یا اسر کچھ بھاری بھاری ساہو ہا ہے۔" کام کی بہت سی معلومات اسے بھٹ کر دینے کے بعد اس نے ایک توجہ شکن انگڑائی لی اور اس کے بستر پر ہی نیم دراز ہوتے ہوئے فرمائش کی۔

"چائے...؟" معاذ نے حیرت کا مظاہرہ کیا۔ "تم جیسوں کی ٹھکن تو دوسری چیزوں سے دور ہوتی ہے۔"

"سو تو ہے لیکن تمہارا ساتھ تو صرف چائے کی حد تک ہی مل سکتا ہے اس لیے چائے کی فرمائش کی ہے۔" اس نے مسکرا کر وجہ بیان کی تو معاذ نے مزید بحث مناسب نہیں سمجھی اور اعتراف کام پر دو کپ چائے بھیجے کا کہہ دیا۔

"میں ذرا دواش روم سے ہو کر آتا ہوں۔" سونیا کا دیکھتا ہوا قرب اس کے لیے آزمائش بن رہا تھا اس لیے بہانہ بنا کر اس سے دور ہٹ گیا۔ دو چار منٹ بعد واپس آیا تو چائے آچکی تھی۔

"تم بتاؤ۔" سونیا نے ایک بار پھر لیٹے لیٹے انگریزی میں لپٹے ہوئے اس سے فرمائش کی۔ انگڑائی لینے کے اس عمل میں اس کا جسم کلن کی طرح تن گیا تھا اور سانسے قہقہے و فرار پوری طرح عیاں ہو گئے تھے۔ معاذ اس حسن بلاغ سے ٹھہر کر اگر خیالوں میں چائے انڈیلنے لگا۔ اس نے پیٹنے کے لیے جان بوجھ کر ایک سنگل صوفے کا انتخاب کیا تھا تاکہ یہ حسین بلا سکی اور طرح اس کے لیے آزمائش نہ بنے۔

"بھئی تھی؟"

"نو شوگر۔ اپنا فیکر پر فیکٹ رکھنے کے لیے مجھے احتیاط کرنا پڑتی ہے۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا تو معاذ نے بغیر چٹنی کی چائے اس کی طرف بڑھادی۔ وہ اب تک بستر پر ہی قابض تھی لیکن اندھ کر چٹنے لگی تھی۔ معاذ کی نہایت احتیاط سے بڑھائی چائے کی خیالی اس نے شرافت سے تمام لی پھر اس کر بولی۔

"تم تو اس طرح بی جھو کر رہے ہو جیسے کسی سو لہ سال کی کنواری دو شیزہ کے کمرے میں کوئی مرد صوفے پر آیا ہو اور اسے صلیبی عزت تحفہ خطیرے میں محسوس ہو رہی ہو۔"

"محض مرد کی بھی خطرے میں چھو سکتی ہے بھوہ ہا کر دار مرطبی عزت کی اتنی ہی پروا کرے گا جتنی کوئی باکر دار عورت۔" معاذ نے اسے کھردرے سے کچھ میں جواب دیا

منزل سے کام لینا بے مقصدی حرکت تھی۔

"ہم عام سے مسافروں کے علیے میں سندر گھر میں داخل ہوں گے۔ یہ شام کے بعد کا وقت ہوگا اور اس وقت کا فائدہ اٹھا کر کسی نہ کسی طرح وہاں قیام کا بندوبست کرنا ہوگا۔ رات کے اس قیام میں ہی ہمیں ساری کارروائی....." سونیا بھی بحث کو طول دے رہے بغیر اس کے ساتھ آ بیٹھی تھی اور لپ ٹاپ کھولنے اسے سندر گھر کا نقشہ بھی ساتھ ساتھ دکھائی دیا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا گھر تھا جس کی آبادی بھی چند سو سے زیادہ نہیں تھی لیکن سرحد کا قریبی گاؤں ہونے کی وجہ سے اس کی اہمیت کافی زیادہ تھی۔

سونیا اسے گاؤں کے حدود داخل سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے ہمسک کے حوالے سے بھی معلومات فراہم کرتی جا رہی تھی۔ معاذ غور سے اس کی ہر بات سن رہا تھا۔ یہاں روانہ ہوتے وقت اسے صرف اتنا بتایا گیا تھا کہ بھارت میں اسے کچھ ایسے کام انجام دینا ہوں گے جو اس کے وطن کے ازلی دشمنوں کے لیے کاری ضرب ثابت ہوں گے۔ ان کام کے حوالے سے معلومات موقع پر فراہم کی جائیں اور اب ایسا ہو رہا تھا۔

"اتنی بڑی کارروائی کے بعد ری ایکشن تو زبردست آئے گا اور ہمیں فریضے کرنے کی بھرپور کوشش بھی کی جائے گی۔"

"معاذ وقت درمی۔ ہم کچھ بھی ہونے سے بہت پہلے وہاں سے نکل چکے ہوں گے اور وہ بھی اپنے قدموں کے نشان چھوڑے بغیر اس لیے ہمارے پکڑے جانے کا کوئی امکان نہیں۔" سونیا پوری طرح بے فکر تھی۔ اس کی یہ بے فکری اس کی تیاری اور باڈی لینگویج سے بھی جھٹک رہی تھی۔ آج اس نے مغربی طرز کا لباس پہنا ہوا تھا۔ تیز سرخ ٹاپ لیس شرٹس لمبا چڑ کے ساتھ گھٹنوں سے ذرا اوپر ہی ختم ہو جانے والا شارٹ اس کے قیامت خیز حسن کو بڑا نمایاں کر کے دکھا رہا تھا۔ لمبی سڈول ٹانگیں، سنہری اور گلابی کے خوبصورت استخراج والی جلد اور دل آویز نقوش والی اس عورت کو نظر انداز کر دینا کسی مرد کے لیے آسان نہیں تھا۔ معاذ کے پہلو میں بیٹھی وہ مسلسل اس کے لیے امتحان بنی ہوئی تھی۔ اس کی زلفوں اور جسم سے اچھی بھیجی جھنک بار بار اس کی توجہ کھینچ لیتی تھی لیکن وہ اپنی پوری توجہ ارادی سے کام لے کر اس حسین ختنے سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اس بات کو محسوس کر چکا تھا کہ وہ نہایت فہم عسوں طبعی اسے اپنے حسن کے تیرے گھاسل کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہے لیکن یہ کوشش اتنی محتاط نہیں کہ انہیں اس کی نظریں پے پاکی

اور اپنے لیے تیار کردہ چائے کی پیالی ہونٹوں سے لگالی۔
 ”تم مشرقیوں کی اخلاقیات نری مخالفت ہے۔“
 سونیا نے مستنایا۔

”تو تم کیا کوئی پورچین ہو؟“ معاذ نے اس کی بات پکڑی۔
 ”وہی طور پر تو کہہ سکتے ہو۔“ اس نے ناک چڑھا کر
 ایک ادا سے جواب دیا۔

”تم دیکھنے میں بھی خاصی پورچین ہی لگتی ہو۔“ معاذ
 نے چائے کا ایک اور گھونٹ لیتے ہوئے اس کی طرف دیکھا
 اور ایک بار پھر احترام کیا کہ وہ ہڈ شکن حسن کی مالک ہے۔
 ”شمالی علاقہ جات اور افغانستان وغیرہ سے تعلق
 رکھنے والے افراد میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے۔“

”تم کہاں سے ہو؟“ اس کا جیس جاگا۔

”سوات سے۔ داراب میرے گھر والوں کی غربت
 کا فائدہ اٹھا کر مجھے وہاں سے خرید لایا تھا اور پھر اسی نے
 مجھے تراش خراش کر یہ روپ دیا۔“ خلاف توقع اس نے
 جواب دے دیا۔

”کیا داراب بھی ان لوگوں کے لیے کام کرتا ہے جن
 کے لیے تم کر رہی ہو؟“

”یہ ایک لمبی کہانی ہے اور اس کہانی کو دہرا کر میں خود
 کو اذیت میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی۔“ وہ یکدم ہی اداس
 دکھائی دینے لگی۔ اداسی کی کیفیت نے اس کی حسین آنکھوں
 کی خوبصورتی کو مزید بڑھا دیا تھا اور وہ پہلے سے زیادہ
 دلکش محسوس ہو رہی تھی۔ معاذ نے بے اختیار ہی خود کو اس
 کی طرف کھینچا ہوا محسوس کیا۔

”اب تو داراب نہیں رہا ہے اور تم اس کی دولت کی
 واحد وارث ہو تو کھسکاؤ ان سارے چکروں سے اور کہیں
 دور جا کر ایک اچھی زندگی گزارو۔“ وہ اب سونیا کے لیے
 اہر دی سے سوچ رہا تھا۔

”کیوں مذاق کرتے ہو۔ تم نہیں جانتے کیا کہ ان
 لوگوں کے چنگل سے لکڑا کتنا مشکل ہے؟“ اس بار اس کی
 آنکھوں سے آنسو ہی بہہ نکلے۔ معاذ ان حسین آنکھوں سے
 بچنے آنسو دیکھ کر گویا شپ ہی اٹھا اور بے ساختہ اپنی جگہ
 سے اٹھ کر اس کے قریب جا بیٹھا۔

”آئی ام سوری سونیا میں شاید اچھانے میں تمہیں
 تکلیف دے بیٹھا ہوں۔ اصل میں تم جن لوگوں کے
 نراحمہ دے کی حیثیت سے مجھ سے ملی ہو، وہ میرے لیے
 نہایت قابلِ عزت ہیں اور تمہیں ان کا ساتھ جان کر میں
 تمہارے متعلق بھی مثلی اعزاز میں سوچتا رہا ہوں۔“ اسے خود

بھی اندازہ نہیں تھا کہ سونیا کے آنسو اتنے طاقتور ہوں گے کہ
 وہ اس کے لیے اپنے دل میں مثبت جذبات محسوس کرے گا۔
 ”تو تم صرف سینئر اور جونیئر کا ہے ورنہ حقیقت میں
 ہم تم ایک ہی شقی کے سوار ہیں۔ میں تم بول بول کر اپنا قصہ
 نکالتے رہتے ہو اور میں نے حالات سے مکمل سمجھنا کر لیا
 ہے۔“ اس نے اپنا سر معاذ کے شانے پر رکھ لیا اور اسردگی
 سے بولی تو معاذ نے بے ساختہ ہی قہقہے دے دئے انداز
 میں اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبا دیا۔ جذبات پہلے ہی
 اقل پھل کا کارہور ہے تھے۔ سونیا کے کس نے پورے
 جسم میں مستی کی دوزاوی۔

”میں اکیلی تھی اس لیے شکست تسلیم کر لی۔ اگر تم میرا
 ساتھ دو تو ہم ل کر اپنی آزادی کی کوئی راہ نکال سکتے ہیں۔“
 اس نے خود کو معاذ کے ساتھ مزید بہت مست کیا۔ معاذ جو پہلے
 ہی اپنے جذبات میں خاصی پھل محسوس کر رہا تھا، مزید اس
 کی طرف کھینچنے لگا۔

”اگر ایسی کوئی راہ نکل سکتی ہے تو میں دل و جان سے
 تمہارے ساتھ ہوں۔“ سونیا کو اثبات میں جواب دیتے
 ہوئے اس کا لہجہ بے حد یوگمل تھا۔

”سو سوئٹ۔ تم نے میرا دل خوش کر دیا معاذ۔“ اس
 نے چٹا چٹ معاذ کے کئی بوسے لے ڈالے۔ ان بوسوں نے
 یکدم ہی ہر بندہ توڑ ڈالا اور معاذ کے اندر دو معاذ کا جذبہ کا
 طوفان یکدم ہی بے قابو ہو گیا۔ ان بے قابو جذبات کی
 دوسری طرف سے خوب خوب پندیرائی کی جا رہی تھی، سو
 سوچیں بندہ سے بندہ ہوتی چلی گئیں۔ ان طوفانی موجوں کے
 ساتھ ساتھ بہتے وہ نفوس کب تک پار کر سوائے، انہیں خود بھی
 پتا نہیں چلا۔ صبح پہلے معاذ کی ہی آنکھ کھل۔

”یہ۔“ اپنے بازو پر سر رکھے سوتی سونیا کو دیکھ کر
 اسے زور کا جھٹکا لگا اور اسے دھکیل کر تیزی سے بستر سے
 اترنے کی کوشش کی لیکن سرری طرح پکڑا گیا۔

”کیا بات ہے معاذ! کیا ہوا ہے، تم اتنے پریشان
 کیوں ہو؟“ جھکے سے سونیا کی آنکھ کھل چکی تھی اور اب وہ
 اس کی طرف تشویش سے دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

معاذ نے اپنے پکڑا لے سر کو قدام کر اس کی طرف
 دیکھتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن اس کا حلیہ دیکھ کر
 لکھن پھا گیا۔ میں اچھی وقت پہلے جدا سے اپنی بیٹھ کلائی
 کا بھی احساس ہوا اور وہ جیسے بندہ میں گر گیا۔ یہ انداز کہ
 وہ اپنی پارسائی کا بھرم کھو چکا ہے، نہایت باعثِ تکلیف
 تھا۔ وہ جو صرف پارسائی کو عزت تک سمجھ رہا تھا، خود

”سب سے نہیں لیکن جو اپنے چٹے سے بدبو لگتی کرتے ہیں ان پر ضرور ہنسوس ہوتا ہے۔“ وہ فردوس کے ساتھ چلا ہوا لان چیمز پر آ بیٹھا۔ علق پودوں اور رنگ برنگے پھولوں سے سجایا لان اس گھر میں اس کا پسندیدہ مقام تھا۔ اپنی جسمانی تکلیف اور کاغذات کی ہم موجودگی کے باعث باہر جا کر گھومنا پھرنا یوں بھی ممنوع تھا اس لیے یہ لان اور بھی اچھا لگتا تھا۔

”واقعی! بدبو لگتی تو کسی بھی شے میں اچھی نہیں لگتی۔ بہر حال اس وقت اس سنجیدہ موضوع پر گفتگو کرنے کا سے بالکل بھی نہیں ہے۔ میں صرف تمہیں اپنی کاپیہ بیچ دیجے آئی تھی کہ آج فیصل کی مہندی پر تم بھی ہمارے ساتھ دھن والوں کے ہاں چلو گے۔ اباجی نے ساری ضروری کارروائی کر لی ہے اس لیے تمہارے مہندی میں شریک ہونے میں کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔“

”یہ تو اچھی خبر سنا کی آپ نے۔ ہم تو آئے ہی فیصل کی شادی میں شریک ہونے کے لیے ہیں۔ اس شادی کی کوئی تقریب مس ہو جاتی تو مجھے بڑا ہنسوس ہوتا۔“ وہ فردوس کی دی اطلاع سن کر خوش ہو گیا۔

”بس تو پھر نا تم پر تیار رہتا۔ تمہارا ذریعہ تمہارے کمرے میں پہنچ جائے گا۔ آج کا ذریعہ کوڑا بلک کر تھلوار پر تلے اور گرہن کمر کا پٹکا ہے۔“ فردوس نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا اور اسی وقت ملازم کا پہنچایا ہوا اورنج جوس بوتل سے گلاس میں انڈیل کر اسے پیش کیا۔

”حمیک بوجھالی! آپ بھی لیجئے نا“ اس نے ہمدردی کیا۔

”نہیں، بس اب میں جاؤں گی۔ شام کے لیے بہت ساری تیاریاں کرنا ہیں اور فی الحال ہشتے ہی کا دور پتل رہا ہے۔ سارے چھوٹوں کو ڈانٹ کی ڈوز دے کر ایکٹیو کرنا ہوگا تاکہ نا تم پر روانہ ہو جائیں۔ اباجی نا تم کے معاملے میں بڑے اصول پسند ہیں۔“ فردوس نے اسے آگاہ کیا اور اپنی جگہ چھوڑ کر اندر کی طرف بڑھ گئی۔ عالم شادی کی تازہ ہوا، پھول پودوں کی سبک اور اورنج جوس سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ ابھی اس کا جوس ختم نہیں ہوا تھا کہ اس نے اجالا کو لان کی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ وہ اسے وہاں پا کر ڈراما سٹیل لیکن پھر بالوں کو بے نیازی سے جھکتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ عالم شاہ نے بھی عمو کو اس کی طرف سے بے نیلہ کاہن کرنا شروع کر دیا لیکن بہر حال وہ اس کی طرف حوجہ تھا اور کئی آنکھوں سے اسے وہاں چھل تھلی کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات تھے اور یوں لگ

کے اپنے معیار سے نیچے چلا گیا۔ یہ بات کسی طور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ شدید جھجلاہٹ میں اس نے سونیا کو کینہ توڑ نظروں سے دیکھا اور کچھپا کر بولا۔

”بچہ! بچہ! تم نے مجھے ڈرپ کیا۔“

”چیز سناؤ! ایسی زبان استعمال مت کرو۔ جو کچھ ہوا اس میں تم پوری طرح انوالو تھے۔“ سونیا نے انگلی اٹھا کر اسے ٹوکا تو وہ اسے بس گھور کر رہ گیا اور پھر پتختا ہوا ہاتھ روم میں جا کھسا۔ خاصا طویل شاور لینے پر اس کے سر کا بھاری بھونکنا خاص حد تک دور ہو گیا لیکن دل پر آ جانے والے بوجھ کا کوئی علاج نہیں تھا۔ اپنے بستی میں گر جانے کا احساس اسے کسی طور چھین نہیں لینے دے رہا تھا۔ اسی احساس کے ساتھ وہ کمرے میں واپس آیا تو سونیا وہاں سے جا چکی تھی۔ کمرہ سمیٹا جا چکا تھا اور بستر پر بھی نئی بے شکن چادر کوڈ کچ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ رات اس کمرے میں مرد و زن کی ادلی کہانی دہرائی گئی ہے۔ وہ بے دم سا ہو کر صوفے پر آ بیٹھا۔ میز پر سے رات لی جانے والی چائے کے برتن بھی غائب تھے۔ چارے کمرے میں ایسی کوئی لٹانی نہیں تھی جو گزری رات کا افسانہ سنا سکے لیکن ایک وارغ خدمت تھا جو اس کے اپنے دل پر لگ گیا تھا۔

”مانا کہ سونیا بہت حسین ہے لیکن رات ایسا کیا ہوا تھا جو میں اس کے صوفے کے چال میں پھنس گیا۔ کیا اس کے حسن میں میری تربیت اور اقدار سے زیادہ طاقت تھی؟“ خود سے سوال جواب کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا جس نے اس کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ ان سوالوں کے حصار میں گھرا وہ خود کو اتنا بے بس محسوس کر رہا تھا کہ جب کچھ بھائی نہیں دیا تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ہاں، وہ رو رہا تھا۔ ایک توانا مرد ہونے کے زعم کے باوجود رو رہا تھا کہ پارسائی کے زعم کو کھودینا صرف عورت ہی نہیں پا کر وار مرد کے لیے بھی تکلیف دہ ہوتا ہے۔

☆☆☆

”کیا حال ہے دیو راجی!“ وہ لان میں ہلکی پھلکی درزش کر رہا تھا کہ چھل تھلی کرتی فردوس اس کے قریب پہنچی آئی۔

”الحمد للہ! بہت بہتر ہوں۔ گھر کا ڈاکٹر مل جانے کا یہی فائدہ ہوتا ہے کہ کسی بھی بیماری کی تکلیف کو لپٹا کر مل بڑھانے کی ترکیبیں نہیں غرائی جاتیں۔“ عالم شاہ نے خوشگوار لہجہ میں اسے جواب دیا تو وہ اس پر ڈی ”ڈاکٹروں سے بڑے بدگمان لگتے ہو۔“

رہا تھا کہ وہ عالم شاہ کی یہاں موجودگی سے بد مزہ ہو رہی ہے لیکن اس کی وجہ سے اپنا مشغلہ ترک کرنے میں بھی سکی محسوس کر رہی ہے اس لیے وقتاً فوقتاً اس کی طرف کھا جانے والی نظروں سے گھورنا نہیں بھولتی۔

اس کے اس بچکانہ انداز پر عالم شاہ کو ہنسی آگئی۔ پتا نہیں کیوں وہ ان کی یہاں آمد کے ساتھ ہی اس کی دشمنی میں آگئی تھی اور اسے دیکھتے ہی ناک بھوں چڑھا لیتی تھی، یہاں تک کہ اس نے اس کے اور سرمد کے اتنے بُرے حالات سے گزر کر داپہن آئے کے بعد بھی اس کی خیریت دریافت نہیں کی تھی۔ وہ دیکھتا تھا کہ اپنی اس لاڈلی بیٹی کے سناٹے میں نیاز شاہ بھی بے بس سے دکھائی دیتے ہیں اور انہیں اس کی شدید محبت کسی سناٹے میں اس سے اختلاف کرنے ہی نہیں دیتی۔ گھر کے سربراہ کا یہ حال تھا، اس لیے باقی افراد بھی اس کے بازو پر ہاتھ پڑھتے۔

”یہ آپ نے مجھے کس ٹیڑھی کھیر سے متا مارنے کی ذمہ داری سونپ دی بابا سا میں!“ اجالا کے بارے میں سوچتے سوچتے اس کی لاپرواہی رفتہ رفتہ شاہ کی فرمائش کی طرف چل گئی اور وہ دل ہی دل میں انہیں مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ انہوں نے اس سے کہا تھا۔

”نیاز شاہ میرا چاچا زاد ہے پتہ امارے ۱۵ دو گلوں کی سرحد ہے۔ آگنی جیہ لیکن لوگوں میں جو وہ خوب ایک ہی ہے اور اس خون کی کشش کتنی ہے کہ ہمارے درمیان راہیٹے کا سلسلہ ہماری نسل پر ہی ختم نہ ہو جائے۔ ادا نیاز شاہ کی پھوٹی دھجی کھواری ہے اور تیرا اس سے جوڑ بھی جاتا ہے۔ تو میرے کہنے پر ایک بار اسے اسی نظر سے دیکھنا ضرور۔ وہ تیری دلہن بن کر ہماری حویلی میں آجائے گی تو تعلقات اور رشتوں کے سلسلے اگلے نسلوں تک بھی جانے کی امید بندھ جائے گی۔“

اسے بابا سا میں کی اس خواہش پر غور کرنے میں عار نہیں تھا لیکن یہاں آتے ہی وہ عجیب و غریب حالات میں پھنس گیا تھا، اس پر مستزاد اجالا کا رویہ تھا۔ اس نے تو سرے سے اسے گھاس ہی نہیں ڈالی تھی مگر وہ کس بنیاد پر اس سے نئے رشتے جوڑنے کا سوچتا۔

”وہی ہے اگر یہ اپنے ان خوبصورت ہاتھوں سے مجھے گھاس ڈالے تو کیا میں گدھا بن کر اس گھاس کو چرواؤں گا؟“ ترجمانی نظروں سے ایک بچے کو سستی اجالا کو دیکھتے ہوئے اس کے دل میں عجیب سا خیال آیا تو ہونٹوں پر بے ساختہ ہی بہت گہری مسکراہٹ آگئی۔

”ایڈیٹ! ایک تو چوری چوری لڑکیوں کو دیکھتا ہے پھر ہنستا بھی ہے۔ میں ابائی سے کہہ کر ابھی ایسے گدھے کو یہاں سے نکلوائی ہوں۔“ اس کی مسکراہٹ اجالا سے پوشیدہ نہیں رہی اور وہ براہ راست اسے مخاطب کرنے کے بجائے بلند آواز میں بڑبڑاتی آغصے سے دھپ دھپ کرتی وہاں سے چلی گئی۔

”گدھا“ عالم شاہ خود کو دے گئے خطاب پر پہلے تو تھملا یا پھر یہ سوچ کر کھس دیا کہ ابھی وہ خود بھی اپنے بارے میں ایسا ہی کچھ سوچ رہا تھا۔

رات نیاز شاہ کے گھر رنگ و نور کی برسات سی اتر آئی۔ گھر کی عداوت، احوال تاشے، بلند قہقہے اور روٹا گئی سے نکل کی خصوصیات چل۔ سب کچھ دیکھ کر ایسا لگتا تھا دنیا میں تم اور پریشانی کا نام و نشان بھی نہیں ہے۔ وہ خود کو بے گتے وقت پر تیار ہونے کے بعد آگے اپنے میں اپنا تختہ کی جاکڑ لے رہا تھا کہ نکل اس کے کمرے میں چلی آئی۔ وہ سیاہ رنگ کے قمیص شلوار میں تھی اور سر پر سیاہ رنگ کا لگی سی سلور کینڈی والا دوپٹا نہایت سلیقے سے اوڑھ رکھا تھا۔ چہرے پر مسک اپ بالکل نہیں تھا البتہ کانوں میں چھوٹے چھوٹے ٹاپس اور ناک میں ایک ست رنگی ٹھپنے والی لونگ رک رک رہی تھی۔ اتنی سی تیاری نے بھی اسے گویا سجا ڈالا تھا۔

”سہما تو خود تھیں بھی ایک کھڑی پنک رہی ہیں؟“ اسے دیکھ کر عالم شاہ نے جبرہ کہا۔

”جی، لیکن وہ سب ساڑیاں پنک رہی ہیں۔ مجھے عادت نہیں ہے اس لیے میں نے انکار کر دیا۔“ اس نے بتایا۔ ”پلو فیک ہے، جہاڑی مرضی۔“ عالم شاہ نے اس کی گود میں موجود بچے کو لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ڈریس کوڈ پر اتنی سختی سے عمل کیا جا رہا تھا کہ اس نئے سے بچے کو بھی اسی رنگ کا لباس پہنا دیا گیا تھا۔

”مرضی تو میری ساتھ جانے کی بھی نہیں تھی لیکن سب کے اصرار پر تیار ہونا پڑا۔“

”اچھا کیا نا۔۔۔ یہاں اکیلی گھر میں رک کر کیا کرشمے۔ وہاں چل کر سب کے ساتھ انجوائے کرنا۔“ وہ بھانجے کے فرہمزم گالوں کو ہولے سے چھوتے ہوئے بولا۔

”چاچا صاحب کی فیملی ضرورت سے لاپرواہ ماڈرن ہے۔ ہندی کی یہ تقریب کہاں سے ہوگی اور میں وہاں کنفرنسل میں نہیں کروں گی۔“ گل نے لہجہ سست کیا۔

”ہم یہاں چند دن کے مہمان ہیں نکل اور عمار کسی کے لائف اسٹائل پر تنقید کرنا مناسب نہیں ہے۔ ہاں تم جو

کر سکتی ہو کہ تقریب میں بھی اپنی چادر اوڑھی رہو اس طرح تمہیں بے پردگی کا مسئلہ نہیں ہوگا۔" اس نے مشورہ دیا۔

"جی ہوا! میں نے بھی ایسا ہی سوچا ہے۔" اس نے جواب دیا پھر بچے کو لینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھائے۔ "آپ اسے مجھے دے دیں ادا! ایسا نہ ہو کہ یہ آپ کی اتنی شاندار تیاری کو خراب کر دے۔"

"کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ویسے بھی میں کون سا شیڈ اوہ کھام لگ رہا ہوں۔"

"لگ تو رہے ہیں۔ اگر اماں سامیہ یہاں ہوتیں تو کالے بکرے کا صندوق دیے بغیر باہر نہ نکلنے دیتیں۔" سکل دھیرے سے مسکرا کر بولی تو اس نے بھی ایک چھوٹا سا قہقہہ لگایا۔ اس کی والدہ اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے واقعی اتنی ہی جذباتی تھیں۔

"اماں سامیہ اور مول کوتم نے یہاں کے حالات کے بارے میں کچھ بتایا تو نہیں ہے؟" صبراً مطلب ہے میرے اور سرمد کی عجیب و غریب گرفتاری کے بارے میں؟" "اگر بتا دیا ہوتا تو اب تک ہم پاکستان واپس پہنچ چکے ہوتے۔"

"صحیح کہہ رہی ہو۔ اسی احتیاط میں، میں نے بابا سامیہ کو بھی کچھ زیادہ تفصیل نہیں بتائی۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔ بات کو زیادہ بھلا کر چاہا سامیہ کو شرمندہ کر لے سے کیا حاصل ہوتا۔"

"میں بھی چاہا سامیہ کی خاطر ہی خاموش ہو گئی ہوں ورنہ میں خود اتنے بڑے واقفے کے بعد یہاں نہیں رکنا چاہتی تھی۔" اس نے بچے کو عالم شاہ کی گود سے لے لیا۔

"جا کر دیکھتی ہوں کہ کیا ہو رہا ہے۔ بڑی بھالی کہہ رہی تھیں کہ بس دس پچھہ منٹ میں نکل جائیں گے۔ آپ بھی اپنی تیاری مکمل کر کے جلدی باہر آ جائیں۔" وہ کہہ کر باہر نکل گئی تو عالم شاہ نے بھی اپنے گھسے پہنے اور ہر اور چٹلا سنہرے تاروں والا پٹکا (دو پٹا) سیٹ کر کے باہر آ گیا۔ سب ہی لوگ تقریباً تیار تھے۔

"آج کئی بھارتی تار یوں کو گرانے کا ارادہ ہے دہلی جی! فردوس جو ہائی خواتین کی نسبت اس سے زیادہ بے تکلف ہو چکی تھی، اسے دیکھ کر بے ساختہ ہی ہولی۔"

"آپ اپنا میڈیکل باکس ساتھ رکھ لیں۔ گرنے والیوں کو ساتھ ساتھ ہوش میں ملاتی رہے گا۔" اس نے بھی شوخی سے جواب دیا اور باہر کی طرف جانے کے لیے پلٹا لیکن سڑک پہاڑ اترتی اچالانے اس کے قدموں کو ساکت

کر دیا۔ اس کی دراز قامت پر ساڑی بے حد چڑھ رہی تھی اور ساڑی کا سیاہ رنگ تو گویا غضب ہی ڈھارہا تھا۔ سیلو لیس بلا کوزے سے جھانکتے اس کے اٹلی رنگت والے بازو لباس کی سیاہی میں کچھ زیادہ ہی نمایاں ہو رہے تھے۔ شوگر رکٹ ہالوں کو نہایت جدوجہد کے ساتھ سمیٹ کر جوڑے کی شکل دی گئی تھی۔ بال ہنوں اور چٹل کے بے دریغ استعمال کے باوجود اس کے بال چھدی طرح قلاب میں نہیں آئے تھے اور کئی ٹپس نکل کر اس کے چہرے پر لہر رہی تھیں۔ ساڑی کی مناسبت سے میک اپ اور جیولری کا انتخاب بھی خوب تھا۔ حقیقتاً وہ پورے کیلی کا نزل سے لیس تھی اور کسی کے بھی دل پر غضب ڈھا سکتی تھی۔ عالم شاہ بھی اگر اس غضب ڈھاتے روپ کو دیکھ کر مسرور ہو گیا تھا تو یہ کوئی انہونی بات نہیں تھی۔

"سب ریڈی ہیں، ابھی تو چلو جلدی سے گاڑیوں میں بیٹھو۔ سونا کے گھر والے ہماری راہ دیکھ رہے ہیں۔ کئی بار وہاں سے فون آچکا ہے۔" بڑی بھائی نسرین نے اچالا کو آتے دیکھ کر بلند آواز میں کہا تو اپنی ہی دھن میں بیڑیاں اترتی وہ وہاں جمع جملہ افراد کی طرف حوجہ ہوئی۔ اب یہ اتفاق تھا کہ نظر سب سے پہلے سرزدہ سے کھڑے عالم شاہ سے جا ٹکرائی اور اس کی وارفتگی کو محسوس کر کے ناگواری کا تاثر دینے کے لیے فوراً ہی چھوٹی سی ناک کو سکیڑا۔ اس کی اس حرکت پر ناک میں پڑے کوکے نے لٹکڑہ مارا اور اس کے حسن کو حریف پانی بخش گیا۔ عالم شاہ، حسن کی اس ادا پر دھیرے سے مسکرایا اور قصد اس پر سے نظر ہٹا کر دیگر لوگوں کا جائزہ لینے لگا۔ سب ہی نے خوب تیاری کی تھی لیکن اچالا دالی بات بھلا کس میں تھی۔ وہ اس کے قریب سے گزر کر خارجی راستے کی طرف بڑھ گئی تو اس نے اس پر دو بارہ نگاہ بھادی لیکن سامنے آنے والے منظر نے اسے شدید ناگواری کے احساس کے تحت ہونٹ بھیجنے پر مجبور کر دیا۔ اچالا کا بلا کوزہ یک لیس تھا اور صرف دو رنگی ڈوریوں نے اس کے بلا کوز کو تھانا ہوا تھا۔ دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں نزاکت سے دبا ساڑی کا مٹھن سا پلہ بھی اس عریضیت کو چھپانے میں قفل کا کام تھا۔

"کبکشت، خود کو بالی دڑ کی میریونوں سے بھی اوچی نے سمجھتی ہے۔" بلائے گئے مہمانوں میں سے پانچوں وہ کہن تھی جس نے اچالا کے چلنے پر تبصرہ کیا تھا۔ عالم شاہ کو اچھا نہیں لگا لیکن تبصرہ کرنے والی کا کوئی قصور نہیں تھا۔ اس نے وہی کہا تھا جو ظہر آ رہا تھا۔

"چاہا سامیہ نے تو لالہ میں لڑکی کو ہانکن بر باد دی

کر دیا ہے۔" نگوارہ سے سوچتا ہوا وہ کسی کے پکارنے پر آگے بڑھا اور مختلف گاڑیوں میں بیٹھنے والوں کے ساتھ شامل ہو گیا۔

"یہاں میرے ساتھ آ جا؟ عالم!" فیصل نے اسے دیکھ کر پکارا۔ وہ پانی لوگوں کے برخلاف اچلی سفید رنگت کا کرتہ پا جامہ زیب تن کیے ہوئے تھا البتہ گلے میں سب سے کی طرح زرد اور بزرگ کا دو پٹا تھا۔

"خج رہے ہو۔" عالم شاہ نے خوش دلی سے اس کی تعریف کی۔

"خج تو تم رہے ہو۔ ہمیں تو بس دلہا ہونے کا مار جن حاصل ہے۔" فیصل نے جواباً اسے سراہا۔

"آج کا دن تمہارا ہے بھائی! ہم کوؤں کی برات میں تم اکیلے کیوٹر دکھائی دے رہے ہو۔" عالم شاہ نے ملبوسات کی رنگت کے حوالے سے فقرہ جست کیا۔

"ااااا۔ اچالا ادکھو عالم کیا کہہ رہا ہے۔ تمہارے جیسٹ کیے ہوئے ڈریس کوڈ کو اس نے کوؤں سے ملا دیا ہے۔" فیصل نے نہ صرف لطف اندوز ہوتے ہوئے قہقہہ لگایا بلکہ عقل کے ساتھ اگلی سیٹ پر براجمان اچالا کو بھی مخاطب کیا۔ اس کے مخاطب کرنے پر عالم شاہ کو ہلکی بار دہاں اچالا کی موجودگی کا طم ہوا۔ وہ اور فیصل ابھی تک گاڑی کے باہر ہی کھڑے بائیں کر رہے تھے اور اس نے توجہ نہیں دی تھی کہ اندر کون کون بیٹھا ہوا ہے۔

"پاکستان کے ایک گوشے سے نکل کر آنے والے کو کیا معلوم کہ میٹن کس چڑیا کا نام ہے ورنہ ان کی تو شو بڑ سلجھ فیئر بھی انڈین میٹن کو فالو کرتی ہیں اور انہیں دیکھ کر وہ محاورہ یاد آ جاتا ہے۔۔۔ کیا تھا وہ؟" اس نے ایک ادا سے شہادت کی انگلی سے اپنی کپٹی کو بجایا اور چپک کر بولی۔ "ہاں، وہ تھا نا..... تو اچالا اس کی چال، اپنی بھی بھول گیا۔ تو جو کوٹے ہیں ان کو کوٹے ہی یاد آئیں گے نا۔" وہ بولتے پر آئی تو بولتی چلی گئی۔ اس کے ان الفاظ پر عالم شاہ کا چہرہ سرخ پڑ گیا لیکن اس نے اپنے ضبط کو کھوئے نہیں دیا۔

"اسے کہاں بھیڑ دیا یا رقم لے؟" اچالا کی سیہ لادلی بولنے پر آئے تو بڑے بڑوں کے کان کھرجتی ہے۔" ڈرائیونگ سیٹ پر موجود عقل میں بھین کو سر دس کر کے ماحول کو بدحوہہ کرنے کی ہمت تو شاید نہیں تھی اس لیے فیصل ہی کو ہلکے پھلکے انداز میں ٹوکا اور پھر فوراً ہی موضوع بدلتے ہوئے بولا۔

"چلو اب چھ جاہ گاڑی میں ہم پہلے ہی کافی لیٹ

ہو چکے ہیں۔" اس کے ٹوکنے پر وہ دونوں گاڑیوں میں بیٹھ گئے۔ تقریباً آدھے گھنٹے کا سفر تھا۔ اس آدھے گھنٹے میں وہ بظاہر فیصل سے گفتگو میں مصروف رہا لیکن نگاہ بار بار اگلی نشست پر بیٹھی اچالا کی طرف جاتی رہی۔ ذرا کی میں ہلکی بار اسے حسن کی طاقت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ ٹھوٹ، بے باک اور بدگماخی اچالا کے کردار کے وہ پہلو تھے جن کی وجہ سے وہ بھی اسے پسند نہیں کر سکتا تھا لیکن پھر بھی آج جانے کیا ہوا تھا کہ وہ خود کو اس کی طرف متوجہ ہونے سے روک نہیں پایا تھا۔

دلہن والوں کے ہاں پہنچ کر بھی اس کی کچھ بھی کیفیت نہ تھی۔ پاکستان سے آئے ہوئے مہمان ہونے کی وجہ سے اسے یہاں خصوصی حیثیت دی جا رہی تھی اور چاچا ساگیں اور سارے کزنز اپنی اپنی جان پہچان کے لوگوں سے اس کا تعارف کروا رہے تھے لیکن ملنے ملانے کے اس سلسلے میں بھی اس کی نگاہیں ہلکے بہلک کر اچالا کی طرف جا رہی تھیں۔ وہ تو آج شعلہ جوالہ بنی ہوئی تھی اور شاید تقریب میں موجود صنمو مخالف پر اپنے حسن کی بجلیاں گرا رہی تھیں۔ دلہن والوں کے ہاں کا ماحول بھی کھلا ڈالا تھا اور مہندی کی اس جھلجھل میں مرد و زن بنا کسی تخصیص کے ایک دوسرے کے ساتھ کھل مل گئے تھے۔ اس ماحول میں کھل جیسے لوگوں کا گزارہ نہیں تھا۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ کھل اپنی چادر کے پلو میں چہرہ چھپاتے کچھ موز رنچرہ عورتیں کے ساتھ ایک طرف پڑے ہوئے صوفوں میں سے ایک صوفے پر بیٹھی ہوئی ہے۔ یقینی طور پر وہ اس ماحول کو انجوائے نہیں کر رہی تھی جبکہ وہ خود مرد ہونے کی رعایت کے ساتھ آرام سے ایڈجسٹ کر گیا تھا۔

زرد اور سبز اختراع کے لباس میں پھولوں سے بھئی دلہن نے عقل میں قدم رکھا تو گویا بھوپال ہی آگیا۔ آنکھ بازی، تیز میوزک، تالیاں، سلیاں۔۔۔ عجیب ایک فلا بازی تھی جس سے دلہن کا استقبال کیا گیا۔ دلہن بھی کوئی روایتی دلہن نہیں تھی جو شرما رہا کر ایک کونے میں بیٹھ جاتی۔ وہ سب کے ساتھ شامل ہو گئی اور فیصل کے ہاتھوں میں ہاتھ لائے اس بے تحاشے دھس میں شامل ہو گئی جو تیز میوزک پر ہر شخص اپنی اپنی بساط کے مطابق کر رہا تھا۔

"آڈیا رہا۔" کسی نے عالم شاہ کو بھی ہاتھ بچو کر دھس گھسنے والوں کے خضم میں کھینچ لیا۔ اسے دھس کا سلیقہ نہیں تھا چنانچہ اپنے ہی جیسے چند ناازیوں کی طرح اگلے سیدھے ہاتھ ہی مارنے لگا۔ دھس کرتے ہوئے بھی اس کی نظریں بار بار اچالا کی طرف جا رہی تھیں۔ وہ بڑی مہارت کا

سے نظریں نہیں ہٹا رہا تھا۔ ”وہ کھٹکھٹلائی۔
 ”نہ کرو اس کی بات۔ ایک بار نکلا گیا ہے۔ کہیں ایسا
 نہ ہو کہ آپ کے مارا ہی جائے۔“
 ”اتنے بھی جھلس نہ ہو۔ چلا جائے گا بے چارہ شادی
 کے بعد۔“

”جائے جائے تمہارا ہاتھ مانجھ گیا تو...؟
 تمہارے لمبا پی ویسے ہی اس پر فدا ہیں۔ کہیں پچھلوں کی
 محبت میں ہاں ہی نہ کہہ بیٹھیں۔“
 ”نہیں مانجھے گا ہاتھ۔ میں اس کی بھین کو جھولنے سے
 قہقہے ستا کر اتنا ڈرا رہی ہوں کہ وہ دوبارہ بھی اپنے بھائی کو
 انڈیا کا رخ نہیں کرنے دے گی۔ وہ تو شاید اس سورما کی
 زخمی حالت میں دلچسپی کے بعد ہی اسے لے کر پاکستان
 لوٹ جاتی لیکن اباجی اور بھائیوں کے اصرار کی وجہ سے
 شادی تک دکنے پر مان گئی۔ اب دیکھنا شادی کے بعد کیسے
 دونوں بہن بھائی دم دھا کر بھاگتے ہیں۔“ اجالا کے پڑا ہوا
 لہجے میں شوخی تھی۔

”شادی کے بعد اگر وہ چار چھ دن بھی اور مجھے دکھائی
 دیا تو کچھ لو کہ اس بار ایسا اسے غائب کروں گا کہ تمہاری
 سفارش پر بھی واپس نہیں آئے گا۔“

”شکر کرو ڈار تنگ اپنے رقیب کو۔ جب میں تمہاری
 آواز کو جھیں آئیے کسی بندے کی چٹا کرنے کی کیا ضرورت
 ہے۔“ اجالا کی قہقہے اس کے اعصاب پر اتھوڑا دین کر برس
 رہی تھی۔ اسے اپنے ساتھ گزرنے والے دھنچے کا سرا مل گیا
 تھا کہ دیار طبر میں اس پر ایسا غلاب آکر کیوں نازل ہوا تھا۔
 ”تم بھی بس نام کی ہی میری ہو۔ تمہارا وہ اتنا لبرل
 پر یوار شادی کے سے سارا لبرل ازم بھول جاتا ہے۔ مجھے
 سب خبر ہے کہ تمہارے اباجی نے جیل کو اس کی پسند کی ہندو
 لڑکی سے شادی کی اجازت نہیں دی تھی۔ بیٹی کے معاملے
 میں وہ کہاں راضی ہوں گے؟“

”انہیں راضی کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے جب میں
 تم سے کہہ رہی ہوں۔ بس ذرا یہ شادی ٹھننے دو
 پھر جس دن کہہ گے آجاؤں گی۔“ اجالا کے ارادے
 خطرناک تھے۔

”ٹھیک ہے، تم انجوائے کرو اپنے بھائی کی شادی۔
 میں بھی اس عرصے میں بہتر پلاننگ کر لوں گا۔ تمہارے کزن
 کے پاس سے ملنے والے مال سے شروع کا خرچہ پانی تو
 ہوی جائے گا۔ آگے کے لیے بعد میں کوئی آرینجمنٹ کریں
 گے۔“ اس بار عالم شاہ نے اس کی آواز فصاحت کر لی۔

مظاہرہ کر رہی تھی اور اس کے لچکدار جسم کی ہر حرکت میں
 دیکھنے والوں کو اپنی طرف کھینچ لینے کی تاثیر تھی۔ عالم شاہ کو
 اس کا اس بے باکی سے رقص کرنا اچھا نہیں لگ رہا تھا لیکن
 وہ اپنی نگاہ کو روک لینے پر بھی قادر نہیں تھا۔ خلافتِ توقع اجالا
 نے زیادہ دیر رقص میں حصہ نہیں لیا اور خاموشی سے پیچھے
 ہٹ گئی۔ عالم شاہ نے بھی سرک جانے میں غافیت بھی لیکن
 اس کی آنکھیں کو پلاسورج بھی کے دو پھول تھے جن کا رخ
 ہر صورت اجالا ہی کی طرف تھا۔ نگاہوں کی اس بے اختیاری
 نے ہی اسے یہ منظر دکھایا کہ اجالا بہت خاموشی سے فحش
 چھوڑ کر باہر کی طرف جا رہی ہے۔ کہاں؟ اس مجلس نے
 اسے بھی اجالا کے پیچھے جانے پر مجبور کر دیا۔ وہ جو بہت
 خاموشی سے فحش سے سرک تھی، اب تیز تیز قدموں سے چلتے
 ہوئے پارکنگ کی طرف جا رہی تھی۔ پارکنگ میں روشنی کم
 تھی لیکن اجالا کے جھللاتے آؤینے اور چوڑیوں کی ٹھنک
 اس کا سراغ بے آسانی دے رہے تھے۔ وہ محتاط بھی تھا اور
 اس کا سیاہ لباس بھی اس کا مددگار رہا ہوا تھا اس لیے اجالا اس
 کے اپنے پیچھے موجود ہونے سے قطعی لاعلم گاڑیوں کی
 قطاروں کے ساتھ آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ یکدم ہی اس کے
 جسم کو ہلکا سا جھٹکا اور وہ ایک بڑی سی گاڑی کے پیچھے یوں
 غائب ہوئی جیسے کسی نے اچانک ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی طرف
 کھینچ لیا ہو۔ عالم شاہ اظہر از یوم پر سمجھا کہ اس نسبت
 جانے ہی لگا تھا کہ خیال آگیا اجالا اپنی مرضی سے یہاں آئی
 ہے اور یقیناً کسی شہساز سے ہی ملنے آئی ہے جب ہی تو یوں
 کھینچے جانے پر بھی اس نے کوئی تھپ تھپ نہیں کی۔ وہ کون تھا؟
 یہ جاننے کا مجلس اسے دے قدموں آگے لے گیا۔

”تم باز نہیں آتے شیل... میں نے تمہیں صبح بھی
 کہا تھا یہاں آنے سے۔“ درمیانی فاصلہ سنا تو اس کی
 سماعتوں سے اجالا کی ناز اور جذبات بھری آواز نکلی۔
 ”تم نے یہ جو اپنی تھلکے خیز کپاس دامن اپنے کی
 جھیں... انہیں دیکھنے کے بعد میں رک سکتا تھا کیا؟“
 جواب میں سٹی دینے والی مردانہ آواز میں جذبات کی پیش
 تھی۔ اس کے بعد عالم شاہ کو بے چین کر دینے والا ایک
 خاموش لمحہ گزرا۔

”بس کرو نا۔ میرا سارا میک اپ خراب ہو جائے
 گا۔“ خاموش لہجے کے بعد سٹی دینے والی اجالا کی آواز
 میں خطرناک تھا۔

”کیا کروں، تم سندرہ کی اتنی لگ رہی ہو۔“
 ”سو تو ہے۔ وہ میرا پاکستانی کزن بھی آج مجھ پر“

ان پورٹ سے نیاز شاہ کے گھر آتے ہوئے انہیں جن ڈاکوؤں نے لوٹا تھا۔ یہ اس کا سر براہ تھا۔ پولیس والوں (یا جو بھی وہ تھے) کے ٹھکانے پر ہوش میں آ جانے پر بھی اس نے بھی آواز سنی تھی اور اب اس پر انکشاف ہو رہا تھا کہ یہ شخص اجالا کا عاشق تھا۔ اس کا دل چاہا کہ درمیانی فاصلہ طے کر کے ان دونوں تک جا پہنچے اور اس غیبت کیل کی گردن دو بوج لے لیکن پھر خود پر قابو پا گیا۔

"خرچے کے لیے اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں کوئی قاتی ہاتھ تو تمہارے پاس آؤں گی نہیں۔ تم بس میرے لیے کوئی اچھا سا گھر رینٹ پر لے کر اسے سیٹ کرو۔ ہم کورٹ میرج کر کے پہلے ہی مون کے لیے دہلی جا میں گے اور پھر واپس آ کر اس گھر میں سڑے سے رہیں گے۔" اسے قطعی گھر نہیں تھی کہ اس کے اس گھر سے اس پر جان چڑھنے والے باپ پر کیا بیجے گی۔ وہ بس اپنے سنہرے خوابوں میں بھڑکی ہوئی تھی۔

"مالی سویت ہارٹ میں کتنا لگی ہوں کہ مجھے تم جیسی لڑکی پر ایم کرتی ہے۔" اجالا کے جواب نے اس کے عاشق کا دل خوش کر دیا تھا اور یقیناً اب وہ اس خوشی کا عمل اظہار کرنے میں مصروف تھا۔

"بس اب مجھے جانے دو۔ زیادہ دیر گزر گئی تو مجھے کوئی بہانہ بنانا بھی مشکل ہو جائے گا۔" تھوڑی دیر بعد اجالا کی ہانپی ہوئی آواز سنائی دی۔

"سن تو نہیں کرتا لیکن تمہیں کشت میں بھی نہیں ڈال سکتا۔ جاؤ۔ لیکن یاد رکھنا کہ تمہیں میرے پاس ہی آنا ہے۔" وہ بڑی جذباتیت کا اظہار کر رہا تھا۔

"آؤں گی۔۔۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آ جاؤں گی۔" اجالا نے بھی جذباتی لہجے میں یقین دہانی کروائی اور اس گاڑی کے پیچھے سے نکل آئی جہاں وہ دونوں خود کو پوشیدہ کیے ہوئے تھے۔ عالم شاہ نے خود کو مزید سمیٹ لیا کہ اجالا کی اس نظر نہ پڑے۔ ویسے وہ اتنی مدہوش ہو رہی تھی کہ اسے ارد گرد دیکھنے کا بھی وہیان نہیں تھا۔ سنے عشق کا جادو اس کی چال تک سے چمک رہا تھا۔

وہ پارک سے نکل گئی تو عالم شاہ نے جیس قدری کا فیصلہ کیا۔ وہ کوئی جذباتی قدم اٹھا کر نیاز شاہ اور ان کے ظہران کی رسوائی کا انتقام کرنے کے بجائے جھٹ خاموشی سے اس بندے سے ملنا چاہتا تھا اس لیے اجالا کے ذہان سے نکل جانے کا انتکار کرتا رہا تھا۔ اس احتیاط اور انتظار میں اس نے تھوڑی سی چمک ہوئی جس کا فیصلہ وہ اسے آج

سر پر نوٹے والی قیامت کی صورت میں بھگتا پڑا۔

☆☆☆

وہ دونوں ایک کھٹا سا موٹر سائیکل پر سفر کر رہے تھے اور ان کے جیسوں پر دہائی طرز کے معمولی لباس تھے۔ انہیں دیہاتیوں کا روپ دینے کے لیے ان کے چہرے پر بے شمار بھی تھیلیاں کی گئی تھیں اور وہ سونیا اور معاذ کی حیثیت سے قطعی نہیں پہچانے جا رہے تھے۔

"یہ ادھر جھڑیوں میں کھسا دو موٹر سائیکل۔" پیچھے ایک بوسیدہ سا بگ تھا جسے قطعی سونیا نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"جو کرنا ہے کر لوں گا۔ تم تو پیچھے ہٹ کر بیٹھو۔" معاذ نے ناگواری سے اسے جواب دیا۔ بہت کوشش سے خود کو سنبھال لینے کے باوجود وہ سونیا کے لیے اپنے دل میں پیدا ہو جانے والی ناگواری کے احساس کو ٹھانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ اس کے ساتھ کام کرنا مجبوری نہ ہوتی تو وہ کبھی اسے اپنے پیچھے موٹر سائیکل پر نہیں بٹھاتا۔

"کیوں پیچھے ہٹ کر بیٹھوں۔ گھر والی ہوں تمہاری۔ میرا تم پر حق ہے۔" سونیا پر اس کی پھٹکار کا کوئی اثر نہیں ہوا اور شروع لہجے میں کہتے ہوئے کچھ اور بھی اس کے قریب ہو گئی۔ اس کی اس حرکت پر جھنجھلا کر معاذ نے یکدم ہی موٹر سائیکل کو جھڑیوں میں کھسا دیا۔ وہ کاتے دار جھڑیاں تھیں۔ تو قلع کے مطابق موٹر سائیکل کے دونوں بازو پھر ہو گئے۔ سونیا بھی دو چار سرلی وچوں کے ساتھ بچے گر گئی۔ معاذ موٹر سائیکل ایک طرف ڈال کر تشویش سے اس کی طرف بڑھا۔ یہ دیکھ کر اس نے اطمینان کی سانس لی کہ گرنے کے باوجود سونیا نے ہاتھ میں موجود بگ کو بہت احتیاط سے سنبھال رکھا ہے۔

"میںوں سب پتا ہے۔ تمہی دو جی وہ ہٹا لانے کے لیے پہلی کو مارنا چاہتے ہو۔" معاذ کو اپنی طرف متوجہ نہ کر اس نے بلند آواز میں خالصتاً بیویوں کے انداز میں دہائی دی اور سی سی کرتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کی۔ اس وقت معاذ نے دیکھا کہ اس کے بازو اور ایک جھلی میں کئی کانٹے چبھ گئے ہیں اور کاتوں کے چبھنے کے مقامات سے خون نکل رہا ہے۔ اسے تھوڑا سا غصوں جھٹ اپنی جھلاہٹ میں وہ سوچا کہ کتنی جلد ہی پادری کر گیا تھا۔

"اب ادھر سے کھڑے کیا تک رہے ہو۔ میرے پاؤں دھج سوچ آگئی ہے۔ پاس آ کر لڑا سہارا دو۔" اس نے اعلان کرتے ہوئے انداز میں اپنی سوچ کی غمگینی تو

بلک بھر میں جاسوسی ڈائجسٹ پیلی کیشنز کے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
ملنے میں اگر دشواری ہے تو مندرجہ ذیل نمبرز پر ہمارے نمائندوں سے رابطہ کیجیے۔

03460827027	منڈی بہاؤ الدین	03016215229	کراچی	03002680248	گجرات
0524568440	سیالکوٹ	03456892591	لاہور	03004009578	وزیر آباد
03460397119	میرپور AK	03216203640	ملتان	03006301461	لالہ سہی
057210003	ایک ٹی	03337472654	حیدر آباد	03213060477	خان پور
03004059957	دیپالپور	03325465062	سرگودھا	03447475344	کوہاٹ
03002373988	لیہ	03446804050	پشاور	03005930230	ساہیوال
03083360600	قصبہ ڈنگ	03006946782	گوبی	03337805247	پاک پتن
03008758799	عارف والا	03469616224	لیعل آباد	03006698022	منظرق آباد
03023844266	لورالائی	03347193958	راولپنڈی	03335205014	پیر والہ
03016299433	کوئٹہ ارباب علی خان	03136844650	نواب شاہ	03003223414	دہاڑی
03338303131	جٹا پور دیوالا	03346712400	سکر	03009313528	تونسٹریف
03321905703	ہری پور	03336481953	رحیم یار خان	03009672096	ذریعہ غازی خان
03348761952	چکوال	03336320766	بہاولپور	0622730455	بہاولنگر
03346383400	دھوا	03329776400	گوجرانوالہ	03316667828	غول شہر
03006885976	حافظ آباد	03004719056	جہلم	03235777931	رائے وٹ
03325465062	کوہاٹ	03317400678	سیالکوٹ	03008711949	ہڑپ
0992335847	ایبٹ آباد	03349738040	جنگ	0477626420	ذریعہ اسماعیل خان
03454678832	چوکی	03348761952	بکر	03337979701	چستیاں
0333-5021421	مانسہرہ	0301-7681279	منڈی بہاؤ الدین	0331-7619788	نمن آباد
03004992290	کوٹ رادھاشن	0333-8604306	ڈسکہ	0300-9463975	سمو یاں
0300-6575020	نصیر	0315-6565459	مجرہ شاہ قیم	03006969881	نوبل ٹک سکر

جاسوسی ڈائجسٹ پیلی کیشنز

35698313 فون 35698313

E-mail: jdpgroup@hotmail.com

معاذ کو بادل ناخواست اس کی مدد کے لیے آگے بڑھتا ہوا۔ اس نے راستے کے اطراف میں پھیلے کھیتوں میں کام کرنے والے کسانوں کو پہلے ہی دیکھ لیا تھا اور قوی امید تھی کہ ان میں سے کسی نہ کسی نے یہ "حادثہ" ہوتے ہوئے ضرور دیکھا ہوگا اور احوال پرسی کے لیے دوڑا آئے گا اس لیے ضروری تھا کہ سونیا جس ڈرامے کا آغاز کر چکی ہے، وہ خود بھی اس میں اپنا کردار ادا کرنا شروع کر دے۔

"ڈراما کی دلچسپی ہنگامہ نہ کیا کر۔ ڈراما کی گری ہے، کوئی حیران کن منہ مٹی ٹٹ گیا جو اتنا شور مچا رہی ہے۔" اب وہ ایک شوہر تھا۔ ایسا شوہر جسے بیوی کی بڑی سے بڑی تکلیف بھی ڈراما لگتی ہے۔

"کی گل اسے بھرا۔۔۔ سب کچھ تو ہے؟" اسی وقت کسی نے آواز لگا کر اس سے دریافت کیا تو وہ سونیا کو سہارا دینے کے بجائے آواز کی سست متوجہ ہو گیا۔ گدلی کی دھوٹی اور بنیان میں لمبوں ایک دیہاتی اس کے سامنے کھڑا تھا۔ دیہاتی کے چہرے پر خوب بڑھی ہوئی ڈاڑھی موٹھیں اور گلے میں گرہیں لگی سیاہ ڈوری سو جوڑھی۔

"کچھ نہیں بھرا۔ بس سالی سوڑ سائیکل دھوکا دے گئی۔ ہور یہ میری گھر والی ادھر گر گئی۔ اب سوڑ سائیکل اور گھر والی دونوں کا حال کھراب ہے۔" اس نے کسی سی صورت بنا کر جواب دیا۔

"تس مینو کوئی اناڑی ڈر پور لگدے ہو۔ چٹکے پھلے راستے دلچ سوڑ سائیکل ڈنگا دی ہور دی چاری بھر جاتی سمیت جھاڑیوں میں جا کرے۔" اس شخص نے مسکھ اڑانے والے انداز میں تبصرہ کیا تو معاذ نے یوں کھیپائی فہمی چہرے پر سہالی جیسے وہ ان ریمارکس کا صحیح حقدار ہو۔

"تس دلوں پیٹھے کھڑے پاتس اکی بنا تے رہتا۔ اپنا بھی کھیال تھی کہ سچاری نوں اٹھا لیو۔" مرد کے پیچھے سے جنک دکھائی وہ نیلے کپڑوں والی عورت سامنے آ کر تیز لہجے میں بولی تو سوٹھوں کو تاؤ دیتے مرد کے چہرے کے تاثرات تیزی سے بدل گئے اور وہ معاذ سے بھی زیادہ کسی شکل بنا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات نے معاذ کو بتادیا کہ نیلے لباس والی وہ کیم کیم عورت اس کی بیوی ہے۔

"آؤ مین۔ میرے سہارے دلچ ہست کر کے تھوڑا چلو۔ پھر ساوی تیل گاڑی کھڑی ہے۔ اس پر بٹھا کر میں تس ساڈے گھر دل لے جاؤں گی۔" معاذ فوراً اپنے شوہر کو ایک مشترکہ ہنسا کر چلانے کے بعد وہ سونیا کی طرف متوجہ ہو گئی اور اسے سہارا دے کر اس کی جگہ سے اٹھایا۔ کھڑے

ہوتے ہوئے سونیا نے کئی درد بھری سسکیاں ادا کر لی ہیں نہ سے نکالیں اور اپنا تقریباً تمام بوجھ اس عورت پر ڈال دیا لیکن ہنگ کو سنبھالنا نہیں بھولی۔

"میں دے دو۔" عورت نے ہزردی سے کہا۔ "تس، ایسے ہی ٹھیک ہے۔" سونیا نے ہنگ کو یوں دبا چاہیے اس میں میرے جماعت بھرے ہوں۔ اس کے اس انداز پر عورت نے مزید اصرار نہیں کیا اور شوہر کو معاذ اور موڑ سائیکل سیٹ گھر پہنچنے کی ہدایت کر کے سونیا کو یوں سنبھال کر آگے بڑھی کہ سونیا کا تقریباً تمام وزن اس نے اپنے مضبوط بازوؤں میں سنبھال رکھا تھا۔

"آؤ بھرا۔ اسیں ان زمانیاں تال مقابلہ تھی کر سیکدے۔" سونیا اور اس عورت کی روانگی کے بعد مرد نے جھینپے ہوئے انداز میں معاذ کو مخاطب کیا۔ معاذ نے جواباً چہرے پر کھیپائی سی مسکراہٹ سمائی اور نیچے گری موڑ سائیکل کو اٹھا کر کھڑا کیا۔

"تو دونوں ہی پیسے پاس ہو گئے ہیں۔" بچہ تاروں کو دلچ کر تبصرہ کیا گیا۔

"تو دوڑی مشکل پڑ گئی۔" معاذ نے اپنا چہرہ دکھایا۔ "کوئی گل تھی اسے پار۔ ادھر اک بندہ ہے، وہ ٹھیک کر دے گا پر اس کا تھوڑا انتظار کرنا ہوگا۔ جب تک تس میرے تال میرے گھر چلو۔ کوئی روٹی شولی کھاؤ فیرو دیکھیں گے۔" اس نے نہایت دوستانہ انداز میں پیشکش کی جسے معاذ کو قبول کرنا ہی تھا۔ اب وہ دونوں مل کر سوڑ سائیکل کو گھینٹتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے اور ساتھ ساتھ کھٹکوں کا سلسلہ جاری تھا۔ معاذ نے اسے اپنا نام امرجیت لکھ کر اور سونیا کا رجسٹری بتایا تھا اور جواب میں اسے معلوم ہوا کہ ان کے لیے اتنی کشادہ دلی کا مظاہرہ کرنے والا وہ شخص مسلمان ہے جس کا نام تو رشید ہے لیکن کہلاتا شیدا ہے۔ شیدے کی بیوی کا نام عیاری بی بی تھا۔ گاؤں دیہاتوں کے عمومی رواج کے خلاف ان کا صرف ایک ہی بیٹا تھا جسے انہوں نے اسکول کے بعد آگے پڑھنے کے لیے کسی قریبی شہر بھیجا ہوا تھا۔

"پتر کو پڑھا لکھا کر دوا افسر بتاتا ہے۔" شیدے کی آنکھوں میں بھی دلی عام سے خواب تھے جو شاید سارے ہاں باپ دیکھتے تھے۔ شیدے کی نہانی اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ گاؤں میں اکثر بچہ ہندوؤں اور سکھوں کی بچہ پلار مسلمانوں کے چند خاندان ہی وہاں رہتے تھے۔ مذہب کے فرق کے باوجود ان لوگوں کے آپس کے تعلقات بڑے نہیں تھے اور عام حالات میں کوئی کسی کے مذہبی معاملات

میں دخل نہیں دیتا تھا لیکن بعض اوقات اختلافات بھی ہو جاتے تھے جن کے نتیجے میں زیادہ تر مسلمانوں ہی کو نقصان اٹھانا پڑتا تھا۔

کچے کے راستوں پر موٹر سائیکل کو کھینچتے محاذ، شیدے سے منگھو بھی کر رہا تھا اور اطراف کا جاکڑ بھی لیتا جا رہا تھا۔ ذہنی شام کا منظر ہی تھا جو چند بار پاکستان کے کسی گاؤں دیہات جانے کا موقع ملے پر وہ دیکھ رہا تھا۔ معمولی لباس والے بے گھرے بچے، دن بھر کی محنت کا پھینٹا اور تھکن سا چھ لیے گھروں کو لوٹتے مرد و زن، ہوا کا شہروں کے برخلاف سحر اپن، کچے کچے گھر۔۔۔ سب کچھ ویسا ہی تھا لیکن وہ یہ حقیقت فراموش نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اس وقت دیس کے بھائے پر دیس میں ہے، وہ بھی جبراً اور ایک ایسے مشن پر جسے اس کے دل و ذہن نے عمل طور پر قبول نہیں کیا تھا لیکن دیس میں بیٹھے اپنے گھروالوں کے تحفظ کے لیے وہ اس مشن میں حصہ لینے پر مجبور تھا۔

”آؤ آؤ۔ آرام نال بیٹھو۔ پروہنے تو رب دی نعمت ہوندے ہیں ہور تھی تو مسافر دی ہو۔ مسافر دا تو ہور بھی حق ہوندے۔“ ایک کچے کچے سے گھر کے سامنے موٹر سائیکل کھڑی کروا کر شیدا اسے اپنے ساتھ اندر لے گیا اور گھن میں رنگی چار پائیوں میں سے ایک اسے بیٹھنے کے لیے پیش کی۔ دوسری چار پائی پر سوتا سرے سے گاؤں کے سہارے پر پھیلائے بیٹھی تھی۔ اس کے ایک پاؤں پر کس کر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ پٹی کی پٹلی ہوتی رنگت سے اعزازہ ہو رہا تھا کہ پھر پر ہندی وغیرہ کا لپ کیا گیا ہے۔ گھر کی مالکن عتار بی بی ایک چمچر تلے بیٹے چھوٹے سے باورچی خانے میں مصروف تھی۔

”تمہی روٹی شونی کھا لو غیر تھادی موٹر سائیکل کو ڈاکٹر کو دکھانے لے چلو سے ہیں۔“ محاذ کا ہاتھ مت دھلو کر شیدے نے اس سے کہا۔

”دیر نہ ہو جائے بھرا۔ رات میں سفر کرنا مشکل ہو جائے گا۔“ محاذ نے تشویش کا اظہار کیا۔ ملے شدہ منصوبے کے مطابق اس نے شیدے کو بتایا تھا کہ وہ اور رجنی (سونیا) پیچھے ایک گاؤں میں رجنی کے چار چاہے کو دیکھنے آئے تھے۔ حال احوال لینے اور اِدھر اُدھر کی باتیں کر لے میں انہیں تھوڑی دیر ہو گئی پھر بھی وہ اپنے میزبانوں کے اصرار کے باوجود وہاں ٹھہرنے پر رضی نہیں ہوئے۔ خیال تھا کہ رات پڑنے پڑتے اپنے گاؤں پہنچ ہی جائیں گے لیکن محاذ سائیکل کے ساتھ ہونے والے حادثے نے

سارے انداز سے غلط ثابت کر دیے۔

”تساں نور رات وچ سفر کرنے ہی کونا دے گا۔ آرام نال اتھے ہی رات گزارد۔ سویرے کسی روٹی کھا کر نکل جانا۔“ شیدے نے بڑے حق سے فیصلہ سنایا۔

”تھاڈی روٹی مہربانی بھرا پر تساں تو تکلیف نہ ہو۔“ محاذ نے ٹکڑی ٹکلف دکھایا۔

”اوتے ہی ہوتی کوئی تکلیف فکیف۔۔۔ کیوں عتار ہیں؟“ اس نے محاذ کو جواب دینے کے ساتھ ساتھ رسوئی سے باہر آتی عتار بی بی سے بھی تائید چاہی۔

”رب دی نعمت تو کسے تکلیف ہوندی ہے۔“

عتاراں نے جواب دیا اور سونیا کے قریب بیٹھ کر اس سے دھیمی آواز میں باتیں کرنے لگی۔ ہاتھ توئی شیدا بھی کم نہیں تھا۔

اس نے محاذ کو بتایا کہ دو گھر چھوڑ کر بڑا اچھا سکیک رہتا ہے جسے اس کی مہارت کی وجہ سے لوگ ”گڈ یوں دا ڈاکٹر“ کہہ کر پکارتے ہیں لیکن وہ دن کے اوقات میں گاؤں میں نہیں

ملتا تھا۔ گاؤں میں اتنی گاڑیاں ہی نہیں تھیں کہ اس کی روزی روٹی بیل پاتی اس لیے اس نے شہر میں اپنی ورکشاپ کھول رکھی تھی اور روزانہ وہاں آتا جاتا تھا۔ اخلاق کا اچھا آدمی تھا

اس لیے گاؤں میں کسی کی موٹر سائیکل یا دوسری کوئی سواری خراب ہونے پر اپنی تھکن کا پر داکے بغیر بنگالی بنالوں پر

اس کی پریشانی دور کر دیتا تھا۔ شیدے نے محاذ کو تسلی دی کہ ”ڈاکٹر“ سے وہ اس کی موٹر سائیکل کا ٹیگر بنوانے کے ساتھ

ساتھ کوئی چھوٹی سونی خرابی ہوئی تو وہ بھی دور کر دے گا۔ محاذ نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ پھر تیلی ہی عتاراں نے جلد ہی

دستر خوان چن دیا۔ دیسی مٹی کے گھارے سے تیار کی گئی ماش کی دال، پنجاب کے پیٹھے پائیوں کا ڈاکٹہ سموئے اودے

پٹیکوں کا بھرتا، بسوڑے کا اچار اور گھر کے گھن میں ہی موجود تندور پر پکائی گئی گرم گرم روٹیوں پر مکھنل وہ سادہ سا کھانا

شاید غلوں کی فراوانی کے باعث اتنا لذیذ تھا کہ نہ نہ کرتے بھی ان دونوں نے اپنے میزبانوں کے ساتھ خوب

سیر ہو کر کھایا۔ کھانے کے بعد شیدا اسے موٹر ملکیک کلدھپ عرف ڈاکٹر کے پاس لے گیا جس نے انہیں جھین دہانی

کروائی کہ ایک گھنٹے میں موٹر سائیکل بالکل ٹھیک حالت میں مل جائے گی۔ یہ ایک گھنٹہ محاذ اود سونیا نے دونوں میاں

بیوی کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے گزارا۔ وہ دونوں دن بھر کی مشقت سے تھکے ہوئے تھے پھر بھی ذرا احساس نہیں

ہونے دیا کہ انہیں کوئی زحمت ہو رہی ہے۔ موٹر سائیکل ٹھیک ہو کر آنے کے بعد ہی وہ سب سوتے کے لیے لیٹے۔

موسم خوشگوار تھا اور گاؤں میں بکلی کی سہولت بھی موجود تھی اس لیے سونے کا انتظام اندر کروں میں کیا گیا تھا۔ کمرے کی تنہائی میں وہ دونوں کچھ دیر چپ چاپ بستر پر لیٹے رہے۔ بند کمرے کے اندر کی یہ تنہائی سناؤ کے لیے اوصالی کشیدگی کا باعث تھی۔ سونیا اور اس کے درمیان جو کچھ ہو چکا تھا اس کے بعد وہ اس خطرناک عورت کے ساتھ اسکی کسی خلوت سے خائف رہنے لگا تھا لیکن خیر گزری کہ سوچ کا فائدہ اٹھا کر سونیا نے اس کے ساتھ کوئی چھپڑ چھپڑ نہیں کی اور خاموش پڑی رہی۔

”لگتا ہے دونوں سو گئے ہیں۔“ آہستہ آہستہ آواز میں مدھم مدھم ہوئیں تو سونیا نے سرگوشی میں کہا۔

”ہوں۔۔۔“ سناؤ شخص ایک ہنگارا بھر کر دیا۔

”تم چارہ لے کر آؤ۔ اسنے میں، میں دوسرے کام لگائی ہوں۔“ سونیا نے اسے ہدایت کی تو وہ خاموشی سے باہر نکل گیا۔ بخاری لپی اور شیدا قطار سے پہنچے عین کمرے میں سے تیسرے کمرے میں سونے کے لیے لیٹے تھے۔ وہ دے قدموں چلتا ہوا تیسرے کمرے کے دروازے تک پہنچا۔ دروازہ اندر سے بند تھا لیکن بند دروازے کے پیچھے گونچے خزانوں کی آواز باہر تک آرہی تھی۔ یہ آوازیں بڑے ردھم اور ترتیب میں تھیں۔ پہلے ایک بڑا اور بھاری بھرکم خراج گونچا تھا پھر دوسرا ہلکا چھوٹا اور نیچے سروں والا خراج سنا کی دیتا تھا۔ یعنی دونوں میاں بیدی نے مل کر خزانوں کا یہ سر تال سلا یا ہوا تھا۔

”کیا رپورٹ ہے؟“ وہ کمرے میں داخل ہونچا تو سونیا نے شہید کی سے دریافت کیا۔

”دونوں گہری نیند سوئے ہوئے ہیں۔“ اس نے سونیا کی مصروفیت پر نظر ڈالتے ہوئے جواب دیا۔ اسے اس کام کے حوالے سے بہت اطمینان دلایا گیا تھا پھر بھی وہ اپنے اندر ایک بے چینی ہی محسوس کر رہا تھا۔

”آدھا گھنٹہ اور گزر جائے تو پھر ٹلے ہیں۔“ سونیا نے ہنگ سے نکالے ہوئے سامان کی ایک پوٹلی ہی بتائی تھی۔ ان کی اپنے ٹھکانے سے روانگی سے لے کر یہاں تک پہنچے تک ہنگ مسلسل سونیا کی تحویل میں ہی رہا تھا اور وہی جانتی تھی کہ اس ہنگ میں کیا کچھ موجود ہے۔ سناؤ تو صرف اتنا جانتا تھا کہ اس ہنگ میں ہلاکت خیزی کا جو سامان بند ہے، اسے اس کو اپنی بہری مہارت اور ملا جیلہ کے ساتھ استعمال کرنا ہے۔

”اب چلنا چاہیے۔“ ست روئی سے گزرتا وہ پوچھل سا آدھا گھنٹہ ختم ہوا تو سونیا اٹھ کھڑی ہوئی۔ سناؤ نے بھی

اس کی پیروی کی۔ دونوں دے پاؤں باہر نکلے۔ دن بھر کے تھکے ہارے مکین بے خبری کی نیند سوئے ہوئے تھے۔ صحن میں کوئی بلب روشن نہیں تھا اور ستاروں کی مدھم روشنی میں چیزیں جیلوں کی شکل میں نظر آرہی تھیں۔ ان جیلوں میں ایک بھولا موٹر سائیکل کا بھی تھا لیکن وہ اسے استعمال کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ احتیاط سے جرونی دوا دوا کھول کر باہر نکلنے کے بعد اسے چھپا ہوا بند کر دیا گیا اور پیدل سفر شروع ہوا۔ گاؤں کی گلیاں خاموش تھیں اور راستے نیم تاریک پڑے تھے۔ وہ دونوں ہی ہنگی ہار اس گاؤں میں آئے تھے لیکن پھر بھی ہرے اتحاد سے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ جی پٹی اس کے ہوتے انہیں اپنی سمت کا تعین کرنے میں کوئی دشواری نہیں تھی۔ جلد ہی وہ ایک چوڑے پاٹ کی نہر کے کنارے کھڑے تھے۔

”لیٹس اسٹارٹ!“ سونیا نے کہا اور اپنے جسم پر موجود دیہاتی طرز کے لباس کو جلدی جلدی اتارنے لگی۔ نیچے اس نے تیراکی کا مختصر اور واٹر پروف سوٹ پہن رکھا تھا۔ سناؤ نے بھی اس کی تقلید کی۔ دونوں نے اپنے اتارے ہوئے لباس ایک خشک جگہ پر بڑے سے پتھر کے چھوٹا کر رکھ دیے اور سونیا نے ساتھ لائی جانے والی پوٹلی کی گرو کھولی۔ اندر دو واٹر پروف ہنگ موجود تھے۔

ایک ہنگ میں سے کچھ سامان نکال کر سونیا نے اسے اپنے اور سناؤ کے درمیان تقسیم کیا اور تیاری کے آخری سرے سے گزر کر ایک ایک ہنگ اپنی اپنی پشت پر باندھ لیا۔

”کام ہو جانے کے بعد سب کچھ نہر میں بہا دینا ہے۔“ سونیا نے اسے یاد دہانی کروائی۔

”اوکے!“ اس کا جواب مختصر تھا۔ ذرا دیر بعد ہی وہ دونوں نہر میں چلا گیا لگا چکے تھے اور تیرتے ہوئے اس چوڑے سے ستون کی طرف جا رہے تھے جس نے نہر پر سے گزرنے والے پل کا خاصا بوجھ اٹھا رکھا تھا۔ کسی آبی حقوق کی طرح تیرتے ہوئے انہوں نے ستون تک کا قاصل بہت تیزی سے طے کر لیا۔ اس جگہ پانی خاصا گہرا تھا۔ دونوں نے پہلے اپنے سروں پر موجود ہلکے فائش کو روشن کیا پھر اپنی اپنی کمر کے ساتھ بندھے دی کے پھوں کے سرے کھول کر ایک دوسرے کو تھامے۔

سونیا کی کمر سے ہندھی رسی کا ایک سرا سناؤ نے ہنگ سناؤ والی رسی کا سرا سونیا نے لے لیا اور دونوں نے ایک دوسرے کے مخالف سمت میں تیرتے ہوئے ستون کے گرد ایک چکر کاٹنے کے بعد رسیوں کو گرو دے دی۔ اب وہ پانی

سے گھر آنے کے لیے نکلا تھا۔ بیڈلک کہ بس راستے میں ہی غراب ہو گئی۔ فالت بڑا تھا۔ ڈرائیور نے کہا ٹھیک ہوتے ہوئے صبح ہو جائے گی۔ میں نے سوچا بس ٹھیک ہونے کا انتظار کرنے کے بجائے پیدل چل پڑتا ہوں۔ صبح ہونے سے پہلے گھر پہنچ ہی جاؤں گا۔ اپنی بات کے اختتام پر لاٹا دھیرے سے چسائیوں اس کی یہ ہنسی ادھوری ہی رہ گئی۔ معاذ نے اس کی پشت سے ایک برقی سی کوئرتی دیکھی اور اگلے ہی لمبائی ہنسی ادھوری چھوڑ کر وہ زمین پر گر چکا تھا۔

”جلدی کرو۔ اسے فوری طور پر اٹھا کر نہر میں پھینکا ہوگا۔“ یوسف کے پیچھے سے نمودار ہونے والی سونیا نے اسے پکارا تو وہ غائب دماغی کی کیفیت میں کسی معمول کی طرح حرکت میں آ گیا۔ اس نے یہ تو محسوس کر لیا تھا کہ اس پر روشنی پڑتے ہی سونیا نے خود کو نیچے گر لیا تھا اور اندھیرے میں کسی سانپ کی طرح سرک گئی تھی لیکن وہ یہ کر گزرے گی، اس کا تو اسے کمان بھی نہیں تھا۔

”دو تین ہماری پتھر اٹھا کر اس کے ہیگ میں ڈال دو تاکہ لاش فوری طور پر اوپر نہ آ سکے۔“ نہر کنارے پہنچ کر سونیا نے نیا حکم صادر کیا جس پر معاذ نے ایک بار پھر خاموشی سے نکل در آمد کیا۔ اس طرف سے مطمئن ہو کر سونیا نے لڑکے کے پیلو میں دھنسا اپنا بھڑور لگا کر کھینچا۔ لاش ابھی گرم تھی۔ یوسف کا حیران خون اچھل کر اس کے بے جان جسم سے باہر آیا۔ اگلے ہی لمبے وہ نہر کے پانیوں میں نیچے ہی نیچے جا رہا تھا۔ وہ لاٹا جو اپنے ماں باپ کی انگلیوں اور امیدوں کا مرکز تھا، دل میں بے سوت ہونے والے بے رحم بھڑکی دھار نے اسے اتنی تیزی سے سوت سے اٹکنار کیا تھا کہ مرتے دم اسے اپنی بے جرم سزائے سوت پر حیران ہونے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔

یوسف کی لاش کو ٹھکانے لگا کر اپنے لباس پہننے کے بعد وہ دونوں واپس لوٹے تو ان کے دونوں میزبان ابھی تک بے خبر سوئے ہوئے تھے۔ ان بے چاروں کو کیا معلوم تھا کہ انہوں نے جن دوسرا فرد کو اپنی مچھت تلے پناہ دی ہے، وہ ان کی دنیا ہی اجازت بیٹھے ہیں۔ معاذ دل پر ڈھیروں بوجھ لیے خاموشی سے کمرے کے ایک کونے میں بیٹھ گیا۔

”اتنا گھٹی لیل نہ کرو۔ جو کچھ ہوا، بھوری کے تحت ہوا۔ بڑے مقاصد کے حصول کے لیے کبھی بھی ایسی قربانیاں دینا پڑتی ہیں۔“ سونیا نے اس کی کیفیت سمجھتے ہوئے ہنس لگی دینے کی کوشش کی۔

”کرائے کے قاتلوں کے کوئی بڑے مقاصد نہیں

میں خود کو آسانی سے قائم رکھ سکتے تھے اور انہیں پانی کے بہاؤ کے ساتھ بہ جانے کا کوئی خدشہ نہیں رہا تھا۔ اس کام سے قاریخ ہونے کے بعد معاذ نے اپنی پشت پر بندھانہ بنا بڑا ہیگ اتارا اور اسے کھول کر وہ فتنہ نکالا جو اپنے اندر ایک قیامت پر پا کر دینے کی پوری صلاحیت رکھتا تھا۔ ابھی خاصی طاقت کے اس ہاتھ بم کو ہاتھوں میں تھا اسے ایک بار تو اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ ہی دوڑ گئی۔ وہ جس موت کو دوسروں کا حقد بنانے کے لیے لایا تھا، وہ اسے بھی اپنے سپرد جسم بچوں میں دینا ہی چاہتی تھی۔

”ہری اپ معاذ!“ قریب سے سٹکی دیتی سونیا کی سرکوشی نے اسے زیادہ سوچنے نہیں دیا۔ اگلے ہی لمحے وہ چوڑے ستون کے ساتھ اس ہاتھ بم کو ٹکس کر رہا تھا۔ سونیا اس کام میں اس کی بھرپور معاونت کر رہی تھی۔ اس کی انگلیوں نے صبح گیارہ بجے کا وقت سیٹ کیا تو تک تک چلتی سوئی نے موت کی طرف سفر شروع کر دیا۔ ہم ایسے زاویے سے ٹکس کیا گیا تھا کہ کسی کی نظر نہ پڑ سکے۔

”گو ہیگ۔“ کام ہو جانے کا اطمینان ہونے کے بعد سونیا نے کہا اور اپنے پاس موجود اپنے چہیتے بھڑ سے دونوں کے جسموں کے ساتھ بندھی رسیدوں کو کاٹ ڈالا۔ حسب پروگرام وہ کچھ بھی اپنے ساتھ لے کر نہیں جا رہے تھے۔ سب سے پہلے ہیڈ لائٹس اتار کر پانی میں بھینگی ٹکس پھر باری باری پشت پر موجود قہیلوں اور کمرے بندھی بیٹلوں سے بھی نجات حاصل کر لی گئی۔ اب وہ پہلے ہی کی طرح مہارت سے تھرتے ہوئے کنارے کی طرف واپس چلے اور اس جگہ کی طرف بڑھے جہاں انہوں نے اپنے لباس پتھر تلے دبا رکھے تھے۔ ابھی معاذ اپنا لباس اٹھا کر سیدھا نہیں ہوا تھا کہ اس کے چہرے پر روشنی پڑی۔ اس نے شینا کر روشنی کے منبع کی طرف دیکھا۔ وہ ایک تاریک جگہ جس کو تھا تا ہوا شخص واضح نظر نہیں آ رہا تھا البتہ اتنا اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ پینٹ شرٹ میں ملیں، لمبی قامت کا دبلا پٹکا آدمی ہے۔

”کون ہو بھائی تم؟ اس پنڈے کے تو نہیں ہو؟“ حیرت میں ڈوبی آواز بتا رہی تھی کہ وہ کوئی نوجوان لڑکا ہے۔

”میں یہاں مہمان ہوں۔ تم بتاؤ، تم کون ہو؟“ معاذ نے بہت تیزی سے خود کو سنبھال لیا تھا اور اب بھرپور راہدہ کے ساتھ ہی چورہا تھا۔ لڑکے کے پنجابی نہ بولنے سے اسے لگا تھا کہ وہ بھی اس گاؤں کا کہیں نہیں ہے۔ اب اسے لڑکے کی پشت پر موجود مٹری ہیگ بھی دکھائی دے رہا تھا۔

”میں یوسف ہوں، رشید آرائیں کا بیٹا۔ آخری بس

ہوتے اور رہتی قربانی کی بات، تو تم کیا جا لو کہ قربانی کیا ہوتی ہے۔ دوسروں کے گھر دیران کرنے والوں کے منہ سے تو یہ لفظ سننا بھی اچھا نہیں لگتا۔" اس کا موڈ خراب تھا۔ سونیا نے دوبارہ اسے نہیں چھیڑا۔ رات کا بقیہ حصہ دونوں نے خاموشی سے گزارا۔ سورج کی چمکی کرن کے ساتھ باہر چل چل کا آغاز ہوا تو وہ دونوں بھی باہر نکل آئے۔ شہدے اور عمار بی بی نے حسب سابق نراٹھی میز پائی ادا کرنا شروع کر دیے۔ ان کے منہ ہاتھ دھو کر فارغ ہونے تک فضا میں دہکی مٹی کے پراٹھے پھینکے جانے کی خوشبو پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔ ذرا دیر میں عمار بی بی نے دسترخوان چن دیے۔ پراٹھے، دہکی انڈوں کا آلیٹ، دی کی ٹیلی لسی۔۔۔۔۔ سب کچھ دسترخوان پر سج گئے لیکن یہ خوشبو بھی مٹا کر افسوس کرنے میں ناکام تھیں۔ دکھ اور شرمندگی کا گہرا احساس تھا جو اسے اپنے میزبانوں کے سامنے نظر میں بھی نہیں اٹھانے دے رہا تھا۔

"آج بھرا۔" شہدے نے اسے پکارا لیکن اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"کی کل ہے سو بیچ اسوے سے چپ چپ ہو۔ بھر جاتی ہے پھڑ پھڑا ہو گیا ہے کیا؟" شہدے نے بے تکلفی سے پوچھا۔

"ایسی کوئی کل ہی اسے بھائی اتنی جگہ نمی اس لیے مٹا دینا چاہیے۔" عمار بی بی نے جواب دیا۔

"سونیا نے منگائی دینے کے انداز میں مٹا دینے کی وضاحت کی۔ محرومہ کل کی نظر اتنی، دسترخوان پر آٹھنی تھی۔ عمار بی بی کی پانچویں ہونٹ پٹی جو رات مشن پر جاتے ہوئے کھول دی گئی تھی، اب دوبارہ اس کے چہرے پر بندھی دکھائی دے رہی تھی۔

"تھاؤ کی حال ہے بھر جاتی؟" شہدے نے اسے نگڑاتے دیکھ کر پوچھا۔

"کل سے کم درد ہے۔" اس نے جواب دیا اور زور شور سے دونوں سیان بیوی کا شکر یہ ادا کرنے لگی کہ انہوں نے ان کی اس قدر مدد کی۔ وہ صرف دیکھنے میں خوبصورت نہیں تھی۔ خوبصورتی سے ہاتھ بنانے کا ہنر بھی جانتی تھی۔ ان دونوں کو اپنی باتوں میں الجھا کر اس نے انہیں مٹا دینے کا نام پر ان لوگوں کے بے حد اصرار پر مشکل سے لٹی کے چہرے کو من لے لیے تھے اور سونیا نے انہیں قائل کر لیا تھا کہ وہ واقعی اس وقت پیسہ بھر کر کھانے پینے کے لائق نہیں ہے۔ ناشتے کے فوراً بعد وہ لوگ روانگی کے لیے تیار ہو گئے۔

"موقع لگے تھیر آنا بھینا" دروازے پر انہیں رخصت کرتے ہوئے عمار بی بی نے سونیا کو گلے لگاتے ہوئے بڑے غلوں سے کہا۔

"یہ ڈائن ایک پارٹی آکر تمہارا دل اچاڑ گئی ہے۔ اسے دوبارہ جگہ کر کیا کرو گی۔" مٹا دینے اپنے دل میں سوچا اور سوٹر سائیکل کو کنگ لگائی۔ وہ اس لمحے کو نہیں بھول سکتا تھا جب سونیا نے جیتے جاتے جیسف کے پھلوں میں خجراتا کر اس سے اس کی زمینی عی نہیں شہدے اور عمار سے ان کے خراب بھی چھین لیے تھے۔ سونیا الوداعی الفاظ ادا کرتی اپنے بچہ سمیت اس کے پیچھے کر ٹیلی تو اس نے جیڑی سے موٹر سائیکل دوڑا دی۔ شہدے اور عمار بی بی کے سامنے حریر کے کدے کا حوصلہ نہیں تھا اس میں۔

☆☆☆

"لالہ کا موڈ کیسا ہے؟"

"یہ کون بتا سکتا ہے۔" وقاس کے سوال کا جواب شانے اچکا کر دیا گیا تو اس نے بھی جواب میں سر جھکا۔ بڑے دنوں بعد لالہ نے اسے اپنے روبرو طلب کیا تھا اور اسے لگ رہا تھا کہ اس کا دے کی وجہ کاروبار سے ہٹ کر ہے اس لیے باہر موجود شخص سے من گن لینے کی کوشش کی تھی لیکن وہ شخص واقعی ٹھیک کہہ رہا تھا کہ لالہ بیسی جیسے گھر سے آدمی کے ہونے کا اندازہ نہ لگا سکتا تھا۔ ہر کس و نا کس کے پس کی بات نہیں تھی۔

"کوئی اور بھی ہے لالہ کے ساتھ؟" لالہ کے کمرے کی طرف قدم بڑھاتے بڑھاتے وہ ایک سوال اور کر گیا۔

"گوارا ہے۔" اطلاع دی گئی جو اس کے لیے حوصلہ افزا تھی۔ گوارا کی موجودگی کا مطلب تھا کہ کوئی کاروباری معاملہ ہی درپیش ہے۔ وہ قدمے رہیں جو کر کمرے کی طرف بڑھا اور دروازے پر دستک دے کر اندر داخل ہوا۔ حسب معمول لالہ کے سامنے بے لوثی کے لوازمات سجے تھے اور وہ ایک جام تھا سے چمکیاں لے رہا تھا۔ اس کے مقابل بیٹھے گوارا کے ہاتھ میں بھی جام تھا۔ اس نے دونوں کو سلام کیا۔

"آج کل کیا مصروفیت ہے لاڈلے؟" گوارا نے اس کے ایک نشست سنبھل لینے کے بعد غور سے اسے پوچھا۔

"کچھ خاص نہیں۔ ملائگی کی طرف سے جو چھوٹا سا کام ملتا ہے، کر لیتا ہوں۔ درنہا عام کام بھی کچھ کر سکتا ہوں۔ لیکن اس کے سوا کوئی خاص مصروفیت نہیں ہے۔" اس نے غلط انداز میں جواب دیتے ہوئے لالہ کی طرف کن انہیں سے دیکھا۔

وہ اس سے بے نیاز شغل سے نوشی میں مصروف تھا۔
 "مصرفیت تو ہے گا کے۔۔۔ ابھی پچھلے دنوں تو نے
 اسپتال سے باڈل کو خواہ کرنے کی کوشش کی ہے، وہ بھی دو
 کمرور لڑکیوں کے سہارے۔ وہ تو ان دونوں کی قسمت ابھی
 تھی کہ بچ گئیں ورنہ تو نے تو انہیں مروادیا تھا۔" گلو کے
 الفاظ نے اس کے چہرے کا رنگ اڑا دیا۔ تمام تر احتیاط
 کے باوجود لالہ تک خبر پہنچ گئی تھی اور اب گلو استاد کے ذریعے
 اس کی گوشلی کردائی جا رہی تھی۔

"اچھا مانتے ہیں پارک کو بڑا اسٹارٹ ہے۔ اپنے ایسے
 بہت سے کام ہیں جو تو جلی بجاتے ہیں کرا لالہ ہے لیکن لالہ
 نے تجھ پر ان لوگوں سے دور رہنے کا بولا تھا تو اس کا کوئی ریزن
 تھا یا راجے لالہ کی بات سمجھنے کی تھی۔" گلو بڑے نرم لہجے میں
 اس سے قہقہہ تھا لیکن پھر بھی وہ اپنی پیشانی سے پھینکا پھوٹا
 ہوا محسوس کر رہا تھا۔ اس کے لیے یہ احساس ہی کافی تھا کہ لالہ
 اس کی حرکت سے نالاں ہے، وہ بھی اس حد تک کہ خود بات
 کرنے کے بجائے گلو کو بڑے مداری سوچ رہا ہے۔
 "آئی ایم سوری! میں لالہ کی نافرمانی نہیں کرنا چاہتا
 تھا لیکن میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔" اس نے بھی
 نظروں کے ساتھ جواب دیا۔

"کیا مطلب۔۔۔؟ کیا تیرا اس لڑکی بشری گلزار سے
 کوئی معاملہ چل رہا ہے؟" گلو استاد چٹکا۔

"ایسا کچھ نہیں ہے استاد! وہ کی شہنشاہ۔" وہ مظلوم
 لڑکی ہے اور میں صرف اس کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ باڈل
 کے ہاتھوں اس بے چاری کا بہت نقصان ہوا ہے۔" ساتھ
 ہی وضاحت دی۔

"باڈل، عرفان اللہ اور یزدانی کا پٹو ہے اور اس کے
 ہاتھوں درجنوں لوگوں پر ظلم ہوا ہے تو کیا خدا کی توجہ اربابین کر
 ان سارے لوگوں پر ہونے والے ظلم کا حساب لینا چاہتا
 ہے؟" گلو نے چہمے لہجے میں پوچھا۔

"ایسا تو نہیں ہے۔ بس میں صرف اس لڑکی کا ساتھ
 دے رہا ہوں۔" اس نے اپنے ہونٹ کاٹے۔

"بشری گلزار سے پہلے تو اس لڑکے سہاؤ کا بھی ساتھ
 دینا رہا تھا۔ تو نے نہ صرف اسے یزدانی کی قید سے چھڑوا دیا
 تھا بلکہ اسے کئی روز تک اپنے پاس پناہ دینے کے ساتھ ساتھ
 اس کا علاج معالجہ بھی کر دیا تھا۔ بعد میں معالجہ ختم ہوا
 گلو نے کہا تو بھی تو یزدانی اور عرفان اللہ کے پاس
 اس کی فوہ لگانے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ وہاں ساری خبریں
 تھیں۔ وہ کسی بات کی تردید نہیں کر سکتا تھا۔

"تیرا ان لوگوں سے کیا تعلق ہے، ابھی اپنے کو یہ سمجھنے
 کا ہے۔ تعلق سمجھ آ جائے گا تو باقی سب بھی سمجھ میں آ جائے
 گا۔" گلو استاد نے اس سے سب سے نازک سوال کیا۔ وہ کی
 جانتا تھا کہ گل نواز عرف گلو استاد پڑھا لکھا بندہ ہے جو حادثاتی
 طور پر جرم کی دنیا میں آنے کے بعد یہاں کالاب و لہجہ پناہ بیٹھا
 ہے لیکن اس کی ذہانت اپنی جگہ قائم و دائم ہے۔

"کچھ خاص وجہ نہیں ہے۔ معاملہ بھالی سے بس اتفاقاً
 ہی ملاقات ہو گئی تھی پھر ان کے حالات نے ان سے
 ہمدردی کرنے پر مجبور کر دیا۔ بشری گلزار بھی ان ہی کی ساتھی
 تھی تو میں اس کا بھی ساتھ دینا چلا گیا۔"

"بات اتنی سادہ نہیں ہو سکتی شہزادے! ابھی تو نے
 خود اعتراف کیا تھا کہ تو اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہے۔" گلو
 ایسے ہنسنے والا نہیں تھا۔ وہ کی خود کو عجیب بے بس محسوس
 کرتے تھا۔

"اگر ہم پر اعتبار نہیں ہے تو ہمارا ساتھ چھوڑ کر
 جاسکتا ہے۔" خاموشی کے اس چھوٹے سے لمحے پر لالہ بیٹنی
 کی آواز نے ضرب لگائی۔ وہ کی نے بے پناہ حیرت اور بے
 یقینی سے لالہ بیٹنی کی طرف دیکھا۔

"شاک لگا ہے نا گا کے! ایسے ہی لالہ کو بھی تیرے
 رویتے سے شاک لگتا ہے۔ لالہ نے تجھے ہمیشہ اولاد کی طرح
 سینے سے لگا کر رکھا ہے۔ لیکن اب تو ان سے ہاتھ چھپانے لگا
 ہے تو ان کو دکھ تو ہوگا۔ لالہ تیرے سامنے بیٹھے ہیں۔ آج تو
 ان کے سامنے اپنے دل کی ساری مجبوری کھول دے اور اگر
 انہیں اس لائق نہیں سمجھتا تو انہیں چھوڑ کر چلا جا۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہو استاد! وہاں سن کر بڑپا۔

"لالہ کے دل کی باتیں کر رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں
 کہ لالہ تیرے لیے کتنے پریشان ہیں۔ تو نہیں جانتا کہ تو ان
 سے چھپ چھپ کر جن لوگوں کے چکر میں پڑا ہے وہ کتنے
 خطرناک ہیں۔ جس لڑکی بشری گلزار کے غم کا مداوا کرنے
 کے لیے تو باڈل کو اغوا کرنے کی کوشش کر رہا تھا، جانتا ہے وہ آج
 کل خان ہاؤس میں رہ رہی ہے اور خان ہاؤس والے خود
 بڑی پہنچ والے لوگ ہیں۔ جب وہ اسے پناہ دے سکتے ہیں
 تو اس کے انتظام میں ساتھ کیوں نہیں دے سکتے۔ تو ان
 باتوں کو سوچ ورنہ وہ بات بتا جس نے میری شکل مار دی
 ہے۔" گلو استاد دھوکہ تھا۔ وہ کی نے اپنا سر جھکا لیا۔

"لالہ سے تیار وہ دنیا میں کوئی تیار ہی نہیں ہو سکتا۔
 جس کی تیرے دل میں ہے، لالہ کو بھول دے اور پھر
 دیکھ لالہ تیرے لیے کیا کرتے ہیں۔" گلو نے ہمدردانہ لہجے

میں اسے مشورہ دیا اور دھیرے سے اس کا شانہ چمک کر باہر نکل گیا۔ اس کے باہر جانے کے بعد بھی وقاص کچھ دیر تک ویسے ہی صبر جمکانے بیٹھا رہا۔ لالہ نے بھی ایک لفظ کہے بغیر اپنا تھکن چاری رکھا لیکن اس کی گہری اور پُر سوچ نظریں وقاص پر لگی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر کے مذہب کے بعد بالآخر دکن نے اپنی خاموشی توڑ دی اور کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

”وہ ایک لڑکی ہے۔ چھوٹی سی، نازک سی۔ بہت زیادہ خوبصورت نہیں لیکن میرے دل کو ابھی لگتی ہے۔ اتنی اچھی کہ میں اس سے ملے بغیر اس سے کوئی بات کہے بغیر بھی بس اسے خوش دیکھتا چاہتا ہوں۔ مجھے اس کی آنکھوں میں آنسو اچھے نہیں لگتے۔ لیکن اس کے حالات اسے مسلسل رلاتے رہتے ہیں۔“ وہ آہستہ آہستہ لالہ کو سب بتاتا گیا کہ کب، کیسے اسے معاذ کی چھوٹی بہن ملیکہ ابھی ملی اور اس کی خاطر وہ معاذ اور پھر بعد میں بشری کا ساتھ دیتا چلا گیا۔ لالہ میسٹی نے اس کی پوری بات نہایت توجہ سے سنی۔ وہ اپنی کہہ کر خاموش ہو گیا تو بھی لالہ کچھ دیر خاموش بیٹھا سوچوں میں مستغرق رہا۔ وقاص نہیں جانتا تھا کہ لالہ کیا سوچ رہا ہے لیکن ہمیشہ کی طرح لالہ سے دل کی بات کہہ کر وہ خود کو پُر سکون محسوس کر رہا تھا۔ یوں جیسے اس کا بوجھ لالہ کے شانوں پر منتقل ہو گیا ہو۔

”اس لڑکی کے باپ کے پاس طے ارشد نے کر جاتے ہیں۔“ خاموشی کے ایک وقفے کے بعد لالہ نے جو کہا اسے سن کر وقاص ایسے چونکا جیسے برقی جھٹکا لگا ہو۔

”نہیں۔ نہیں لالہ۔ میں اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔“ اس سے عشق کا راگ الاپتا بیٹھا ہے تو پھر شادی کیوں نہیں کرنا چاہتا؟“ لالہ نے ڈپٹے والے انداز میں پوچھا لیکن اس کی اندر تک اتر جانے والی نگاہیں بڑی سنجیدگی سے وقاص کو نثرول رہی تھیں۔

”وہ عزت دار گھر کی لڑکی ہے لالہ! میں نے معاذ بھائی کے ساتھ جو وقت گزارا ہے، اس میں مجھے اندازہ ہوا ہے کہ ان کا گھر اتنا صرف نام نہاد عزت دار نہیں ہے، خصوصاً ان کے ہاں رزقی حلال پر بے حد زور دیا جاتا ہے۔ ایسے میں وہ لوگ میرا رشتہ کیسے قبول کر سکتے ہیں۔ کسی دھوکے میں کر بھی لیں تو وہ میرے ساتھ گزارہ کیسے کرے گی۔“ اس نے نظریں جمکا کر جو جواب دیا اسے سن کر پہلے تو لالہ کے چہرے کی رنگت خیر ہوئی لیکن پھر وہ خود کو سنہال کر دھیرے سے مسکرایا اور بولا۔

”تو اس کو چھوڑ دینے کا آپشن کیوں اختیار کر رہا

ہے۔ تجھے اس سے محبت ہے تو اس کے لیے رزقی حلال کمانے کی جہد مجھ کیوں نہیں کرتا؟“

”جی۔۔۔؟“ لالہ کی بات سن کر وہ حیران ہوا۔

”اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے؟ میری طرف سے تجھ پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ تو جو چاہے وہ کام کر سکتا ہے۔“

”آپ مجھ سے خفا ہو گئے ہیں لالہ۔؟“ وہ پریشان ہوا۔

”بالکل نہیں۔ میں بالکل کھلے دل سے تجھے آفر کر رہا ہوں اور یہ نہ سمجھ کہ تیرے ساتھ چھوڑ کر چلے جانے کے بعد میں تیرے سر پر سے اپنا ہاتھ اٹھاؤں گا۔ میں تجھے بھی سپورٹ کروں گا اور اس لڑکی اور اس کے گھر والوں کو بھی کیونکہ مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ وہ لاکھ معاذ کی بہت بڑے گھر میں پھنس گیا ہے اور اس کے گھر والے بھی اس کی وجہ سے مصیبت میں پھنسے ہوئے ہیں۔ بعض مصیبتیں ایسی ہوتی ہیں جن میں ہم جیسے بڑے لوگ زیادہ اچھا سہارا ثابت ہوتے ہیں۔ میں ملوں گا اس لڑکی کے باپ سے اور بات کروں گا۔ تو اس معاملے میں اب بالکل بے فکر ہوجا۔ اب یہ معاملہ میرے ہاتھ میں ہے۔“ لالہ میسٹی کے الفاظ نے وقاص پر شادی مرگ کی سی کیفیت طاری کر دی۔ اس نے لالہ کی اس مصیبتی کے جواب میں کچھ کہنا چاہا لیکن جذبات کی شدت کے باعث ہونٹ پھڑک کر رہ گئے اور وہ منہ سے ایک لفظ ادا نہ کر سکا۔

”جا۔ اب جا کر آرام سے لائف انجوائے کر۔ میں اس معاملے کو خود سنہال لوں گا۔“ لالہ نے اس کی جذباتی کیفیت کو محسوس کیا لیکن اس حوالے سے اسے مزید میٹرنے کے بجائے اپنی کہہ کر بے نیازی سے نیا جام تیار کرنے لگا۔ لالہ کی طرف سے چلے جانے کا حکم ملنے کے بعد وقاص میں ہمت نہیں گئی کہ وہاں مزید رکتا چنانچہ اپنی جذباتی کیفیت کو قابو میں کرنا ہوا باہر جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

”کاش! میں تجھے بتا سکتا کہ تو مجھے کتنا عزیز ہے۔“ لالہ نے اس کی پشت کو گھورتے ہوئے غمزہ سے انداز میں سوچا اور پھر سر جھٹک کر جام ہونٹوں سے لگا لیا۔

☆☆☆

عالم شاہ کی آنکھ فٹک کے احساس سے ٹپکی تھی۔ یہ فٹک اس نچ پانی کی تھی جو اسے ہوش میں لانے کے لیے اس کے سر اور چہرے پر انڈیا لگایا تھا۔ آنکھ کھلتے ہی روشنی سے واسطہ پڑنے پر اس نے فطری رد عمل کے طور پر دوبارہ

بہنوں کو بند کر لیا۔

”اللہ جا اور ڈھکے اور تیری سیدہ کے لیے رات بھر کے رہنے کا سے نہیں ہے میرے پاس۔“ جانی بھائی آواز ساتوں سے گرائی تو اس نے ایک ہار پھر آنکھوں کو کھولا اور آواز کی سمت دیکھا۔ اس کے سامنے تقریباً اس کا ہم عمر ایک اسمارٹ سا جوان کھڑا ہوا تھا۔ کھلی ہوئی رنگت والے اس دراز قد جوان نے جینز کی چنٹ کے ساتھ آدھی آسٹیوں کی سیاہی شرٹ پہن رکھی تھی۔ آستین سے جھانکتے اس کے مضبوط بازوؤں پر ٹیٹوز بنے ہوئے تھے جبکہ ہینر اسٹائل کھلی ہیر ویسا خوبصورت تھا۔

”اے بھائی بھائی کیا دیکھ رہا ہے۔ رقیب ہوں تیرا اور میرے ہوتے ہوئے وہ تجھے چلی بھر گھاس بھی نہیں ڈالنے والی۔“ وہ تعارف نہ بھی کر داتا تو عالم شاہ اسے اس کی آواز کے ذریعے شناخت کر چکا تھا۔

”وہ کیا ہے ناک بھگوان نے اپنے کو پرستائی ہی کچھ ایسی دی ہے کہ جو لڑکی دیکھتی ہے، سالی مرنے ہے۔ پر ان مرنے والیوں میں اجالا نیاز شاہ جیسی کوئی کوئی ہی ہوتی ہے۔ اس لیے میں نے سوچا کہ اسے ہاتھ سے نہ جانے دوں۔ سالی نہ بچی ہے اور روپے پیسے والی بھی۔ آدھی کیا

ہی راجا اندر ہو، کسی نہ کسی کے ساتھ پھیرے لگوا ہی لیتا ہے تو اچھا ہے اس لڑکی کے ساتھ لگوائے جو آپ کا لائق اسٹائل بدل دے۔ میں بھی بچی کرنے جا رہا تھا کہ تم بچ میں اجالا کے امیدوار بن کر کود پڑے۔ ٹھیک ہے یہ تمہارے انجانے کی گھٹی (گھٹی) تھی اس لیے میں نے اپنے طریقے سے تمہیں واپس پلٹنے کا چانس دیا لیکن تم ایسے کھالی (خالی) کھوپڑی کے بندے تھے کہ چپ چاپ واپس لوٹ جانے کے بجائے اجالا کی چاسوی کرتے ہوئے اس کے پیچھے پارنگنگ تک پہنچ گئے۔ آئی ایم شیور کہ تم نے وہاں تھار کی گھاسی (خامسی) ہاتھیں بھی سن لی تھیں اس لیے جب وٹا نے تمہیں پکڑا تو میں نے سوچا کہ تمہارے واپس جانے میں میرے فیوچر کو بہت گھرو (خطرہ) ہے اس لیے میں اور وٹا تمہیں یہاں لے کر آ گئے۔“ وہ عالم شاہ کو کوئی سوال کرنے کا سوچ دینے بغیر خود ہی اسے ساری تفصیل بتاتا چلا گیا۔

”یہ دشا کون ہے؟“ وہ خاموش ہوا تو عالم شاہ کے منہ سے سوال پھسلا۔

”وہی جس نے تمہیں اور تمہارے ساتھی کو الٹا دکھا کر تم دونوں کی کھوپ (خوب) کھاتر (خاطر) کی تھی۔ اس نے شاید اجالا کے گھر میں اپنا کوئی جعلی نام بتایا تھا لیکن بس

قارئین بیرون ملک متوجہ ہوں!

محکمہ ڈاک نے دوسری مرتبہ بیرون ملک ڈاک خرچ پر تقریباً 200 سے 250 فیصد اضافہ کر دیا ہے جس کی وجہ سے ہم بحالت مجبوری بیرون ملک ڈاک خرچ میں اضافہ کر رہے ہیں۔

جو کہ اس ماہ نومبر 2020 سے لاگو ہو گا جس کی تفصیل تمام رسائل میں فراہم کر دی گئی ہے۔

سرکولیشن مینجر
چاسوی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

نام ہی جمل تھا، پولیس والا پکا اصلی تھا۔ اس کی مار کھا کر پتا تو لگ گیا ہوگا تمہیں؟“ اس کے چہرے پر ایک لطف اٹھانے والی مسکراہٹ چمکی۔

”مطلب، وہ بھی تمہارے جیسا کوئی جھڑ بندہ ہے۔“
تم اجالا کی مصمصیت کا قہقہہ اٹھا کر اسے محبت کا دھوکا دے رہے ہو اور وہ سرکاری وردی پہن کر غیر سرکاری کام کرتا پھر رہا ہے۔“ عالم شاہ کو اس سے اس گفت و شنید کی کوئی خواہش نہیں تھی لیکن تاہم حاصل کرنے کے لیے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھنا بھی ضروری تھا۔ بے ہوشی کی حالت میں اس کے ہاتھ پیروں کو رسیوں سے باندھ دیا گیا تھا اور وہ کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح ان بندشوں سے خود کو آزاد کروالے۔ پہلی بار کے برخلاف سنیل کا یوں کل کر سامنے آ جانا اور اطمینان سے سارے اعتراضات کر لیتا اسے شدید خطرے کا احساس دلا رہا تھا۔ سنیل کی اتنی بے خوفی اور بے پروائی کا مطلب تھا کہ اسے اس سے کوئی خطرہ نہیں محسوس ہو رہا۔ کیوں؟ یہ سوال اہم تھا اور اس سوال کا ایک ہی جواب تھا کہ سنیل کو یہ خطرہ نہیں رہا ہے کہ وہ واپس جا کر کسی کو اس کے اور اجالا کے تعلق سمیت کوئی بات بتا سکے گا۔ یعنی اس بار اس نے اسے بھی واپس نہ بھیجنے کے لیے خواہ کیا تھا اور۔ بالکل سادہ سی بات تھی کہ وہ اسے ہمیشہ اپنے پاس نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس کے پاس جس سے جان چھڑانے کا آسان ترین طریقہ تھا تھا کہ اسے ہلاک کر دے اور اپنا یہ انجام بہر حال اس کے لیے قابل قبول نہیں تھا۔

”وہی سید۔“ سنیل اس کا طعن کر رہا مانتے کے بجائے ہنسنے لگا کہ ہنسنا بھرا ہوا۔

”ایسا کوئی کھاس (خاص) غیر سرکاری کام نہیں کر رہا میرا یا مل تم ہمارے دشمن ویش کے شہری ہو اور وردی والے دشمنوں کو حکم (ختم) کرنے کا ہی دھن دیتے ہیں۔“

”میرے خیال میں اصل بات یہ ہے کہ تم لوگ ہوشی مکنیا نسل اور اسکی حرکتیں کر کے اپنے گھٹیا پن کا ثبوت دیتے ہو۔“ وہ کوشش کے باوجود اپنی بندشوں کو ڈھیلا کرنے نہیں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں کر سکا تھا اس لیے جھنجھلاہٹ کا شکار ہونے لگا تھا۔

”جتنا بولا ہے بول لو۔ آج تمہارے بیک بیک کرنے کا آخری دن ہے اس لیے میں تمہیں چھوٹ دے دے ہا ہوں ورنہ خود سے ایسے لکچ میں ہاتھ کرنے والوں کی زبان کھینچ لیتے ہیں میں اور دشا۔“

”کیا بات ہے بھائی میرا نام کیوں لیا جا رہا ہے؟“

اسی وقت دروازہ کھول کر ایک سافولی رنگت کا شخص اندر داخل ہوا اور سنیل سے پوچھنے لگا۔

”ہیں، میں اس کو پتہ رہا تھا کہ اپنا پاروشادہ ہے جس کا نام لے کر مائیں اپنے بچے بچوں کو ڈراتی ہیں۔“
سنیل کے جواب دہنے کے دوران عالم شاہ، دشا کا جائزہ لیتا رہا تھا اور اس کے دماغ نے اس بات کی تائید کر دی تھی کہ دشا ہی پولیس افسر تھا جو نیاز شاہ کے گھر سے اسے اور سرد کو گرفتار کر کے لے گیا تھا۔ اس وقت بھی اس نے اپنی شناخت کو چھپانے کے لیے میک اپ کا سہارا لیا تھا اس لیے اس کی شخصیت قدرے عجب نظر آ رہی تھی۔

”یہ بھی بتاؤ تھا کہ مائیں ایسے ہی نہیں ڈراتیں۔ دشا اس بندے کا نام ہے جس کے آگے بڑے بڑے مائی کے لالوں کا موت نکل جاتا ہے۔“ اس نے اپنی موہیں مروڑیں۔
”صرف موت کیوں، دن سے آتما بھی نکل جاتی ہے۔“

میراج کا رائٹ وٹھ رہا تھا دشا۔ ”سنیل نے قہقہہ لگا دیا۔“
”ایسے طرم خان ہو تو میرے ہاتھ پاؤں کھول کر مجھ سے مقابلہ کرو۔“ چھٹی کا دورہ یاد نہ دلا دیا تو میرا نام بدل دیتا۔ ”عالم شاہ نے دشمن کو جوش دلا کر ہوش بھڑکانے کی پرانی ترکیب لڑائی۔“

”کیوں اپنا قہقہہ دینا ہے کا سوچ رہا ہے سالے! تو اپنی مصروفی کا کون ہے اس کی کھڑ (خاطر) تجھے آستیا سوت دینے کو سوچ رکھا ہے۔ ایک گولی کھوڑی یا سینے میں مار دو تو بندے کا آسانی سے دم نکل جاتا ہے۔ دشا سے مقابلہ کر کے سرے گا تو یہ حیرت ایک ایک ہڈی توڑ کر تجھے قسطوں میں مارے گا اور یہ بڑی دردناک سوت ہوگی۔ اس لیے میں تو کہتا ہوں باز آ جا۔“ اس کے چیلنج کا جواب دشا کے بھائے سنیل نے دیا۔

”لگتا ہے مجھے ڈرا کر اپنے پار کی ہڈیاں ٹوٹنے سے بچانے کی کوشش کر رہے ہو۔“ عالم شاہ نے مسخر اڑانے والے لہجے میں کہا اور دشا پر ایک حکارت بھری نظر ڈالی۔

”کھول دے اسے سنیل! میرے ہاتھوں اس کا قہر بننے کے بعد تجھے لاش جھکانے لگانے میں آسانی رہے گی۔“
”مگر پار۔“ سنیل نے اس کے فیصلے پر اعتراض کرنا چاہا۔

”تمہارا دوست اچھا بھلا مرد ہے تم اگر فکر کر سکتے ہو تو اسے بچاؤ بنانے کی کوشش کیجی کہ اسے بچاؤ۔“ سنیل کی بات سن کر بھل ہونے سے پہلے ہی عالم شاہ نے زبان سے ایسا کاری دار کیا کہ دشا کے رخساروں کے عضلات ہلکے گئے۔

”میں نے تجھ سے کہا ہے نا سخیل کہ اسے کھول دے۔“
ابھی پانچ منٹ میں اس کی چتا تیار کر دیتا ہوں۔“ وشا کے
سرد اعمار نے سخیل کو حریف بناتے ہوئے دیکھ کر دیکھ کر
طوہار کرنا عالم شاہ کی بندھنیں کھولنے کے لیے آگے بڑھا۔
”مجھے تجھ پر ترس آ رہا ہے۔ تو قسمت والا تھا جو اچالا
کی سفارش کی وجہ سے ایک بار وشا کے چنگ سے نکل کر چلا
گیا تھا لیکن اب تو حیرانناک حال ہونے والا ہے کہ میری
آقا بھی کئی جنموں تک بلبلاتی رہے گی۔“ بظاہر سخیل اس
سے ہمدردی کا اظہار کر رہا تھا لیکن حقیقت میں اس کا انداز
چمکا لینے والا تھا۔ عالم شاہ نے اس کو کوئی جواب نہیں دیا اور
خاموشی سے اسے اپنی بندھنیں کاٹتے ہوئے دیکھا رہا۔ اس
کے ہاتھ میں چھوٹے پھل کا چاقو تھا جس سے اس نے پہلے
اس کے پیروں کی بندھنیں کاٹیں پھر اسے الٹا لیٹنے کا حکم دیتے
ہوئے اس کے پشت کی جانب بندھے ہوئے ہاتھوں کی
بندھنیں کاٹنے لگا۔ عالم شاہ ہاتھ کی بندھنیں کٹتے ہوئے نہیں
دیکھ سکتا تھا لیکن اس کی ساری حسیات اسی طرف مبذول
تھیں چنانچہ جیسے ہی اس کے آہن میں جوڑ کر باندھے گئے
ہاتھوں کو ایک خلیفہ سا جھکا لگا، اس نے کسی سانپ کی سی
پھرتی سے حرکت کی اور زمین کو چھوڑ کر یوں سخیل سے ٹکرایا
کہ وہ لمحہ بھر کے لیے ہکا بکا ہی رہ گیا اور پھر اس کے منہ سے
ایک غلیظ گالی نکل گئی۔ اس گالی کا جواب عالم شاہ نے اس کے
جڑے پر مکار سید کر کے دیا لیکن خود اس کی آنکھوں کے
آگے بھی تارے ناچ گئے۔ یہ وشا تھا جس نے ہری قوت
سے لات گھما کر اس کے پہلو میں ضرب لگائی تھی۔

اس کے بعد تو گویا اس کمرے میں بھونپال ہی آ گیا۔
وہ دو تھے اور عالم شاہ اکیلا لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ زندگی موت
کی جنگ ہے جس میں ایک لمحے کی غفلت کا مطلب تھا ہمیشہ
کی نیند سو جانا۔ وہ ان دو پھرے ہوئے سانپوں کی
وحشت کا جواب اسی وحشت سے دے رہا تھا اور اس ذرا سی
دیر کی لڑائی میں ان تینوں ہی کے چلے بگڑ کر رہ گئے تھے۔
خصوصاً سخیل کو خاصی سخت چوٹیں لگی تھیں۔ اس کا ٹھٹھا ہونٹ
پھٹ چکا تھا اور دائیں آنکھ بھی ایک گتے والے بچ کے نیچے
میں لہو رنگ نظر آرہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں موجود چھوٹے
پھل کا چاقو عالم شاہ کے پہلے ہی چلے میں اس کے ہاتھ سے
نکل گیا تھا اس لیے وہ خالی ہاتھ لڑ رہا تھا لیکن اس کے منہ
سے گالیاں اس طرح اعلیٰ رہی تھیں جیسے کوئی بھری ہوئی
بندوق کار جو اس اگل رہی ہو۔ اس کے مقابلے میں وشا
خاموشی سے ہاتھ بڑھاتا تھا اور زیادہ بھرپور چلے کر رہا

تھا۔ جیسا کہ عالم شاہ کو جتنی کاری خبر میں لگی تھی، وہ وشا ہی نے
اسے لگائی تھی۔ وہ سخیل کی طرح یونیورسٹی میں فٹنگ کر دی
کرنے والا عام سائونڈ انٹھیں بلکہ تربیت یافتہ پولیس والا
تھا۔ وہ بھی یقیناً ایسا پولیس والا جو اپنی تھک داز فطرت کے
باعث خاصی شہرت رکھتا تھا۔

وشا کی صلاحیتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے عالم شاہ کا
زیادہ فوکس اسی پر تھا اسی لیے جب سخیل پیچھے ہٹا تو اس نے
زیادہ دھیان نہیں دیا۔ اس کی اس بے دھیانی کا سخیل نے
فائدہ اٹھایا اور گر کر کمرے کے ایک کونے میں چلا جانے
والا اپنا چاقو اٹھالایا۔ وشا کے ایک دھڑکا جھاب دیتے عالم
شاہ کا برج ایسا ہو گیا تھا کہ سخیل کی طرف اس کی پشت ہو گئی
تھی۔ سخیل نے موقع کا فائدہ اٹھایا اور چاقو پوری قوت سے
اس کی پشت میں گھونپنے کی کوشش کی۔ اس نازک لمحے میں
عالم شاہ کی خوش نصیبی نے ساتھ دیا۔ وشا سے برسر پیکار اس
کارخ میں وقت پر ذرا سا بدلا اور سخیل کا چلا یا ہوا چاقو اس
کی پشت کے بجائے بازو میں اتر گیا۔ عالم شاہ کے منہ سے
بے ساختہ ہی ایک کراہ نکل جبکہ وشا نے طق کے بل
دھاڑتے ہوئے اس کے بازو میں گھسے چاقو پر ہاتھ ڈال
دیا۔ اس کے حرکت میں آنے، چاقو بازو سے نکالنے اور اس
چاقو سے دوبارہ عالم شاہ پر حملہ کرنے میں اتنی پھرتی اور
مستعدی تھی کہ عالم شاہ کو بالکل آخری لمحے میں اپنے آپ کو
بچنے کے لیے اس کے سوا کوئی حل سمجھائی نہیں دیا۔ بچے گر کر دوبارہ
سکھنے کے ٹکڑے دور اپنے میں اس نے ایک تیز خراہٹ
سنی۔ ایسی خراہٹ جیسے کسی جانور کو ذبح کرتے وقت سنا
دیتی ہے۔ اگلے ہی لمحے سخیل کسی ذبح کچے جانے والے
جانور کی طرح زمین پر گر کر ابری طرح تڑپ رہا تھا۔

عالم شاہ نے ایک ٹھٹھ میں پر تڑپتے سخیل اور دوسری
دشا پر ڈالی۔ وشا، عالم شاہ کے کچے گتے دار کی رو میں اس
کے بجائے سخیل کے آجانے کی وجہ سے سکتہ زدہ سا رہ گیا
تھا۔ عالم شاہ نے اس کی اس کیفیت کا فائدہ اٹھایا اور اس کی
کھٹی پر پوری قوت سے ایک جھٹکا مکار سید کر دیا۔ سخت
جان ہونے کے باوجود وشا اس کے گتے کو نہیں جھیل سکا اور تھوڑا
کر بچے گرا۔ اس کی بے ہوشی کو چھیننے بنانے کے لیے عالم شاہ
نے اس کے سر پر پاؤں سے ٹھوکر لگائی اور ایک بار پھر سخیل
کی طرف دیکھا۔ اس کے جسم کو چلے چلے جھٹکے لگ رہے تھے
اور یہ بات واضح تھی کہ وہ اپنی بچی بچی آخری سانسیں چوری
کر رہا ہے۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ کر عالم شاہ کمرے
سے باہر جانے والے راستے کی طرف بڑھا۔ اتنے ہنگامے

کے باوجود ابھی تک کسی نے بداعلیت نہیں کی تھی اور ایسا لگ رہا تھا کہ وہاں کوئی اور ڈی ٹکس موجود نہیں ہے۔ عالم شاہ محتاط قدموں سے چلتا ہوا اندازے سے اخراجی راستے کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کا ایک ہاتھ اپنے زخمی بازو پر جما ہوا تھا۔ چاقو چھوٹے پھل کا تھا لیکن دھار خاصی تیز تھی اس لیے ٹھیک ٹھاک زخم آیا تھا اور زخم سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ خون کے ہاتھ کو روکنے کے لیے ہی اس نے زخمی بازو کو مضبوطی سے تھاما ہوا تھا اور جلد از جلد یہاں سے نکل جانے کی فکر میں تھا۔ ابھی وہ بیرونی دروازے سے چھوٹ کے قافلے پر تھا کہ دروازہ ایک جگہ سے کھلا اور ایک شخص تیزی سے اندر داخل ہوا۔ روشنی کم تھی لیکن عالم شاہ نے فوراً ہی آنے والے کو پہچان لیا اور اس کے مختصر دورانیے کے لیے تن جانے والے احصاء ڈھیلے پڑ گئے۔

”سائیں!“ آنے والا اسے شناخت نہ کرتا، یہ کیسے ممکن تھا۔

”آپ ٹھیک تو ہیں سائیں!“ وہ بے تابی سے اس کی طرف بڑھا۔

”میں زخمی ہوں سرمد لیکن تم... تم یہاں کیسے پہنچے؟“ اس نے حیرت کا اظہار کیا۔

”آپ کا تو بہت خون بہہ رہا ہے سائیں!“ روشنی کی کسی اور عالم شاہ کے ساتھ کہاں کی وجہ سے سرمد پہلی نظر میں اس کا بہتا ہوا خون نہیں دیکھ سکا تھا لیکن اب قریب سے دیکھا تو تشویش میں مبتلا ہو گیا اور اپنی جیب سے بڑا سا رومال نکال کر اس کے زخمی بازو پر باندھنے ہوئے بتانے لگا۔

”میں ایک ملازم کے ساتھ گھیل سائیں کی گاڑی سے کچھ سامان نکالنے مارنگ کی طرف گیا تھا کہ وہاں سے لٹکی ایک گاڑی کی پچھلی سیٹ پر آپ کو بند آنکھوں کے ساتھ بیٹھا دیکھا۔ مجھے فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ آپ بے ہوش ہیں۔ میں نے کچھ بھی سوچے کچھ بغیر ایک موٹر سائیکل چینی اور اس گاڑی کے پیچھے دوڑادی۔ گاڑی دور نکل گئی تھی پھر بھی میں اسے پانے میں کامیاب ہو گیا لیکن بد قسمتی سے اس علاقے میں داخل ہوتے وقت موٹر سائیکل کا تازہ پتھر ہو گیا اور آخری لمحوں میں، میں تعاقب جاری نہ رکھ سکا جس کی وجہ سے مجھے اس ہات کا اندازہ نہیں ہو سکا کہ آپ کو کس جگہ میں لے جایا گیا ہے۔ میں کافی دیر سے پورے علاقے میں پھرتا اس گاڑی کو ڈھونڈنے میں لگا ہوا تھا جس میں آپ کو لایا گیا تھا۔ اس جگہ میں جمائے پڑے گاڑی دکھائی دی لیکن جگہ کا چوکیدار ماہ میں آگیا۔ اس سے نصت کر اعدا آور ہاتھا

کہ آپ سے سامنا ہو گیا۔“

”ہمیں یہاں سے جلد از جلد نکلتا ہوگا سرمد! اندر ایک لاش پڑی ہے اور ساتھ ہی ایک پولیس والا بھی ہے ہوش پڑا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہاں تک کہ ہم کسی مزید بڑی مصیبت میں پھنس جائیں۔“ سرمد کے بازو پر دوا مل باندھ دینے سے خون کا بہاؤ تقریباً رک گیا تھا۔ اس طرف سے مطمئن ہو کر اس نے سرمد کو کسی قدر حالات بتا گاہ کیا۔

”میں کی لاش سائیں! یہاں آخر کیا ہوا ہے؟“ سرمد کی تشویش میں اضافہ ہوا۔

”ساری تفصیل میں قصہ بعد میں بتاؤں گا، پہلے یہاں سے نکلنے کی کرو۔“

”ہمیں سواری کی ضرورت پڑے گی۔“

”نی الحال تو ان ہی کی گاڑی استعمال کرنا پڑے گی۔“

تم اندر جا کر دونوں کی جبین چیک کرلو۔ دونوں میں سے کسی ایک کے پاس گاڑی کی چابی ہونا چاہیے۔“ عالم شاہ اس سے کہہ کر باہر نکل گیا۔ باہر نکلے جسے میں گاڑی کھڑی تھی اور اس گاڑی کے قریب ہی ایک بندہ بے ہوش پڑا تھا۔ وہ گاڑی سے ٹک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ سرمد نے باہر آنے میں اس کی توجہ سے زیادہ وقت لگا لیا۔

”اندروالے بندے کو باندھ کر آ یا ہوں۔ اس کے ساتھ بھی سچی کرتا ہوں۔“ اس نے عالم شاہ کو اطلاع دی اور چونکہ اس کی مشکلیں کہنے کے ساتھ ساتھ اس کے منہ میں بھی کپڑا ٹھونس دیا۔ اس مقصد کے لیے اس نے یقیناً کسی بستر کی چادر اتار کر پھاڑی تھی۔ اس کام سے قاریغ ہونے کے بعد وہ دونوں وہاں سے روانہ ہو گئے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر سرمد تھا۔ عالم شاہ نے اسے راستے میں سارے حالات سے آگاہ کر دیا۔

”یہ بہت خطرناک جوبیشن ہے سائیں۔ دشنا انتہائی کارروائی پر اثر آتا تو بہت مشکل ہو جائے گی۔ وہ سٹیل کے قتل کے کیس میں ہمیں پھنسا بھی سکتا ہے۔ اس جگہ میں فکر پر خوں اور خون کے نمونوں سمیت بہت سے ایسے شواہد ہیں جو ہماری وہاں موجودگی کا ثبوت ہوں گے۔ ان ثبوتوں کی مدد سے دشنا کوئی بھی کہانی بنا سکتا ہے اور ہمارا سب سے دیک پوائنٹ یہ ہے کہ ہم پاکستانی ہیں۔ ہماری حکومت اور ادارے کسی بھی مرتلے پر ہم سے ہمدردی کا سلوک نہیں کریں گے۔“ سارے حالات سن کر جرحہ مضطرب ہو گیا۔

”تمہاری بات غلط نہیں ہے لیکن میری کچھ میں نہیں آ رہا کہ ہمارا ٹکسٹ اسٹیپ کیا ہونا چاہیے؟“ عالم شاہ نے

اپنی پیشانی رگڑی۔

”ہمیں فوری طور پر پاکستان واپس جانا ہوگا لیکن ظاہر ہے اس سے پہلے یہاں کسی کو اعتماد میں لے کر تعاون حاصل کرنا ہوگا۔ اب یہ فیصلہ آپ کو کرنا ہوگا کہ اس مقصد کے لیے کسے منتخب کرتے ہیں۔“ حسد معمول سرمد اس کا بھرپور ساتھ دے رہا تھا۔

”چاچا سامعین سے بات کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان کی عمر ایسی نہیں ہے کہ وہ اس قسم کے مسائل کا سامنا کریں۔“ عالم شاہ نے ارد گرد دوڑتے متاع کو دیکھتے ہوئے کہا۔ جیسے جیسے گاڑی آگے بڑھ رہی تھی شوکی روشتیاں اور روٹیاں کم ہوتی جا رہی تھیں جو اس بات کی علامت تھی کہ وہ سفر کرتے ہوئے مضافات کی طرف جا رہے ہیں۔ نیاز شاہ کی رہائش گاہ مضافات میں ہی تھی اور وہ اس کے سوا کہیں نہیں جاسکتے تھے۔

”گھیل سامعین کے بارے میں کیا خیال ہے۔ وہ مجھے خاصے سلجھے ہوئے اور سمجھدار انسان معلوم ہوتے ہیں۔“ میرے خیال میں گھیل بھائی سے بات کرنا ہی مناسب رہے گا۔“ عالم شاہ نے اس سے اتفاق کیا۔ باقی کا راستہ خاموشی سے نکلا۔ منزل پر پہنچنے سے قبل انہوں نے ایک جگہ گاڑی چھوڑ دی اور پیدل نیاز شاہ کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

”یہ کیا ہوا جناب؟“ وہ دونوں گھر کے گیٹ پر پہنچے تو گیٹ پر موجود گارڈ عالم شاہ کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

”ایک چھوٹا سا انکسڈنٹ ہو گیا ہے۔ میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔ تم آخر کو ہاں بھیج دو۔ اور ہاں دیکھو، کسی کو کچھ بتا کر پریشان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ گارڈ کو ہدایات دیتے آخر میں اس کا لہجہ سخت ہو گیا۔

”آخر سے کہنا اپنے ساتھ فرسٹ ایڈ ہاکس بھی لے کر آئے۔“ عالم شاہ آگے بڑھ گیا تو سرمد نے گارڈ کو یہ ضروری ہدایت دی اور خود بھی عالم شاہ کے پیچھے چل پڑا۔ دست و عریض گھر کی خاموشی سے ظاہر تھا کہ مہندی کی تقریب کے لیے جلسے جلسے انگی تک لوٹ کر نہیں آئے ہیں۔ ان کی جگہ آج جو قحط بھی نہیں تھی کیونکہ یہ پہلے ہی طے ہو چکا تھا کہ فلکشن رات بھر جاری رہے گا۔

”آپ اپنی مجلس اتار دیں سامعین! فرسٹ ایڈ ہاکس آنے تک میں آپ کا زخم دھو کر صاف کر دیتا ہوں۔“

سرمد کو اس کے زخمی باز کی گھر تھی۔ عالم شاہ نے بتائیں وہ پیش کے اس کی بات مان لی۔ چند منٹوں میں ہی ملازمین کے انچارج کی حیثیت رکھنے والا آخر فرسٹ ایڈ ہاکس سمیت وہاں آ گیا۔ اس کے چہرے پر تشویش کھڑی تھی۔

”گھیل بھائی کو اطلاع دو کہ میں اور سرمد گھر پہنچ چکے ہیں۔ وہ کسی بھانے سے فوری طور پر یہاں پہنچ جائیں۔“ آخر کو کسی سوال جواب کا موع دے بغیر اس نے اسے حکم دیا۔ اس دوران سرمد، آخر سے فرسٹ ایڈ ہاکس لے کر اپنا کام شروع کر چکا تھا۔

”زخم گہرا ہے سامعین! میں بیڈنچ کر رہا ہوں لیکن میرے خیال میں ناکے لگانا پڑیں گے۔“ زخم کی ڈریسنگ کرتے ہوئے سرمد نے اپنی رائے دی۔

”بعد میں دیکھ لیں گے۔ ابھی تم ڈریسنگ کر کے مجھے کوئی چین کمرہ دو۔“ عالم شاہ نے کرسی کی پشت سے ہٹک لگاتے ہوئے اسے جواہد دیا۔

”گھیل صاحب کو اطلاع دے دی ہے، وہ گھر واپس آ رہے ہیں۔ میرے لیے کوئی اور حکم؟“ تھوڑی دیر میں آخر نے آکر اطلاع دی۔

”بس ایک گھاس نیم گرم دودھ لا دو۔“ عجب سرمد نے دیا۔ آخر کے دودھ لانے تک وہ ڈریسنگ کا کام مکمل کر چکا تھا۔ نیم گرم دودھ کے ساتھ چین کرتے کر عالم شاہ سرمد کی درخواست پر بستر پر راز ہوا تو اس پر خود گی سی طاری ہو گئی۔ گفتگو کی آواز سن کر آنکھیں کھولیں تو پتا چلا گھیل آچکا ہے۔

”یہ سب کیا ہے عالم! تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ میں اتنی دیر سے کتنا پریشان ہوں۔ مجھے واسو (ملازم) نے بتایا تھا کہ سرمد اچانک ہی ایک بندے کی موٹر سائیکل چھین کر نکلتا چلا گیا ہے۔ واسو نے بڑی مشکل سے اس بندے کو شور مٹا کر روکے سے روکا اور مجھے اطلاع دی۔ اس بندے کو تو میں نے کسی نہ کسی طرح ڈیل کر لیا لیکن سرمد کے ساتھ ساتھ تمہیں بھی غائب پا کر مجھے جتنی پریشانی ہوئی اسے میں بیان نہیں کر سکتا۔ فیصل کی سسرال میں، میں کوئی سین بھی کیری ایٹ نہیں کر سکتا تھا اس لیے خود پر جبر کر کے بیٹھنا پڑا اور اب میں آخر کی کال پر بھانے سے غفل چھوڑ کر آیا ہوں۔ تم کیا تم مجھے بتاؤ گے کہ یہ سب کیا ہے؟“ گھیل کے چہرے پر افسوس تھی۔

”بتانے کے لیے ہی آپ کو زحمت دی ہے گھیل بھائی! لیکن میری آپ سے درخواست ہے کہ کچھ دیکھیں میں

آپ کو بتاؤں، اسے بہت قتل اور غلطیوں سے دل و دماغ سے
بچنے گا۔" عالم شاہ جو بستر پر اٹھ بیٹھا تھا، سنجیدگی سے بولا۔

"ٹھیک ہے، میں پورے قتل سے تمہاری بات سنوں
گا لیکن اس سے قتل تمہارے زخم کا معائنہ ضروری ہے۔ آخر
کی زہانی تمہارے زخمی ہونے کی اطلاع سن کر میں فردوس کو
بھی اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ فردوس کے علاوہ کبھی بھی
میرے ساتھ ہی آئی ہے۔ وہ وہاں ان گنتر بجیل تھی اس لیے
میں نے اسے واپس لے آنا مناسب سمجھا لیکن اسے
تمہارے بارے میں کچھ علم نہیں۔"

"ابھی اسے کچھ بتا دیجے گا بھی نہیں۔ بہت حساس
ہے، پریشان ہو جائے گی۔"

"مجھے اندازہ ہے۔ بہر حال میں فردوس کو بلواتا
ہوں۔ وہ تمہارے زخم کو دیکھ لے تو پھر تفصیل سے بات
کرتے ہیں۔" گھیل کمرے سے باہر نکل گئے اور فردوس
وہاں آگئی۔ زخم کا معائنہ کر کے اس نے سرمد کے اس خیال
کی توثیق کر دی کہ اس کے لگائے پڑیں گے۔ سرمد کی مدد سے
اس نے تیزی اور مہارت سے یہ کام نمونہ دیا۔ شاید اسے
گھیل کی طرف سے کوئی ہدایت ملی تھی جو خلافِ حراج
خاموشی اور زخم کے بارے میں کوئی باز پرس نہیں کی تھی۔
اس کے فارغ ہونے تک گھیل لباس تبدیل کر کے آیا۔
فردوس اور سرمد خاموشی سے باہر نکل گئے۔ سرمد اگرچہ
واقف حال تھا لیکن گھیل کی نزاکت کے پیش نظر اس نے
اس موقع پر موجود نہ رہا ہی مناسب سمجھا تھا۔

"بات بہت نازک ہے گھیل بھائی اور یقیناً آپ
کے حراج پر گراں گزرے گی لیکن میرے پاس بھی آپ کو
آگاہ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔" جو کچھ بتانا تھا،
اسے ایک بھائی کے سامنے بیان کرنا مشکل تھا اس لیے اسے
حمید بانہ صاف پڑی تھی۔

"تم کہو عالم امیر اودھ ہے کہ میں پورے قتل سے
سب سنوں گا۔" گھیل نے اسے حوصلہ دیا۔ اس حوصلے کے
سہارے اس نے اول تا آخر سب کچھ بتانا شروع کر دیا۔ وہ
حسب وعدہ قتل سے بچتے رہے لیکن چہرے کے تاثرات
سے ظاہر تھا کہ اس داستان میں اجالا کے کردار پر انہیں
حیرت اور دکھ ہے۔ داستان سننے کی سوت والے جیسے تک
بچتے تو ان کے چہرے پر گہری تشویش کے مادل چھا گئے۔

"سرمد کا خیال ہے کہ ان حالات میں مزید کسی
پریشانی سے بچنے کے لیے انہیں فوری طور پر پاکستان واپس
چلے جانا چاہیے۔ فیصل کی شادی میں شرکت نہ کر سکتے پر مجھے

بھی افسوس رہے گا لیکن میرا بھی یہی خیال ہے کہ سرمد کی
رائے درست ہے۔" سب کچھ کہنے کے بعد اس نے آخر
میں اٹھیں اپنے فیصلے سے بھی آگاہ کر دیا۔

"شاید تم ٹھیک سوچ رہے ہو لیکن اتنی جلدی بھی نہ
کرو۔ میں پہلے اس سلسلے میں کسی سے مشورہ کر لیتا ہوں۔"
گھیل نے تجویز دی۔ اس موقع پر ان کی بددیاری قابلِ
حسین تھی۔ انہوں نے اپنا ہر رد عمل گویا اپنے ہی اندر روک
لیا تھا اور عالم شاہ سے صرف اس کے مسئلے کے متعلق بات
کر رہے تھے۔

"آپ کس سے مشورہ کریں گے؟"
"ایس ایس پی صاحب اس موقع پر ہمارے کام
آ سکتے ہیں۔" گھیل نے رائے دی۔ اسی وقت پھر سکون فضا
میں ایک ہنگامہ سا جاگ اٹھا۔ پو پھٹنے کا وقت ہو چلا تھا اور
مہندی کے فنکشن کے لیے جانے والوں کی واپسی ہوئی تھی۔
بہتے سکر اتے واپس آنے والوں کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ اس
گھر میں کچھ ٹوگ کتنے پریشان ہیں۔ عالم شاہ بے اختیار ہی
کمرے کی کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ خوش گپیاں کرتے ہوئے
احمد داخل ہونے والے افراد میں اجالا بھی شامل تھی۔ رات
بھر کی چگاہ نے اس کے چہرے پر تھوڑی سی ٹھکان طاری
کر دی تھی لیکن حسن کا بائین جوں کا توں تھا۔ وہ کسی کی بات
پر ٹھٹھکیلا کر نہیں رہی تھی۔

"اگر یہ جان جائے کہ اس کا غیوب سبیل اب اس دنیا
میں نہیں رہا ہے تو یہ کیا کرے گی؟" عالم شاہ کے ذہن میں
سوال ابھرا۔ اس سے قبل کہ وہ اپنے سوال کا ممکنہ جواب
سوچتا، سو بائیں کی گھنٹی نے اس کی توجہ اجالا پر سے
ہٹا دی۔ اس نے جیسے مڑ کر دیکھا۔ گھیل اپنے سو بائیں پر آنے
والی کال ریسیور چکا تھا۔ کال کرنے والے نے جانے انہیں
کیا اطلاع دی کہ ان کے چہرے کی رنگت حقیر ہوگئی۔ عالم
شاہ نے ان کے چہرے کے تاثرات کو تشویش سے دیکھا۔

"آپ کسی طرح اسے تھوڑی دیر کے لیے روکے
رہیں ایس ایس پی صاحب! مجھے اپنے مہمانوں کو محفوظ
کرنے کے لیے تھوڑی سی مہلت درکار ہے۔" گھیل کے
منہ سے ادا ہونے والے الفاظ نے گواہی دی کہ بچنے والی
بری اطلاع ان ہی کے لیے تھی۔

ظلم و جبر کیے سامنے سینہ سپر نو جوان
کسی داستان جو فطرت کاروں کی ہے
غضب ناک تھا باتیں واقعات اپنا ماہ پڑھیے



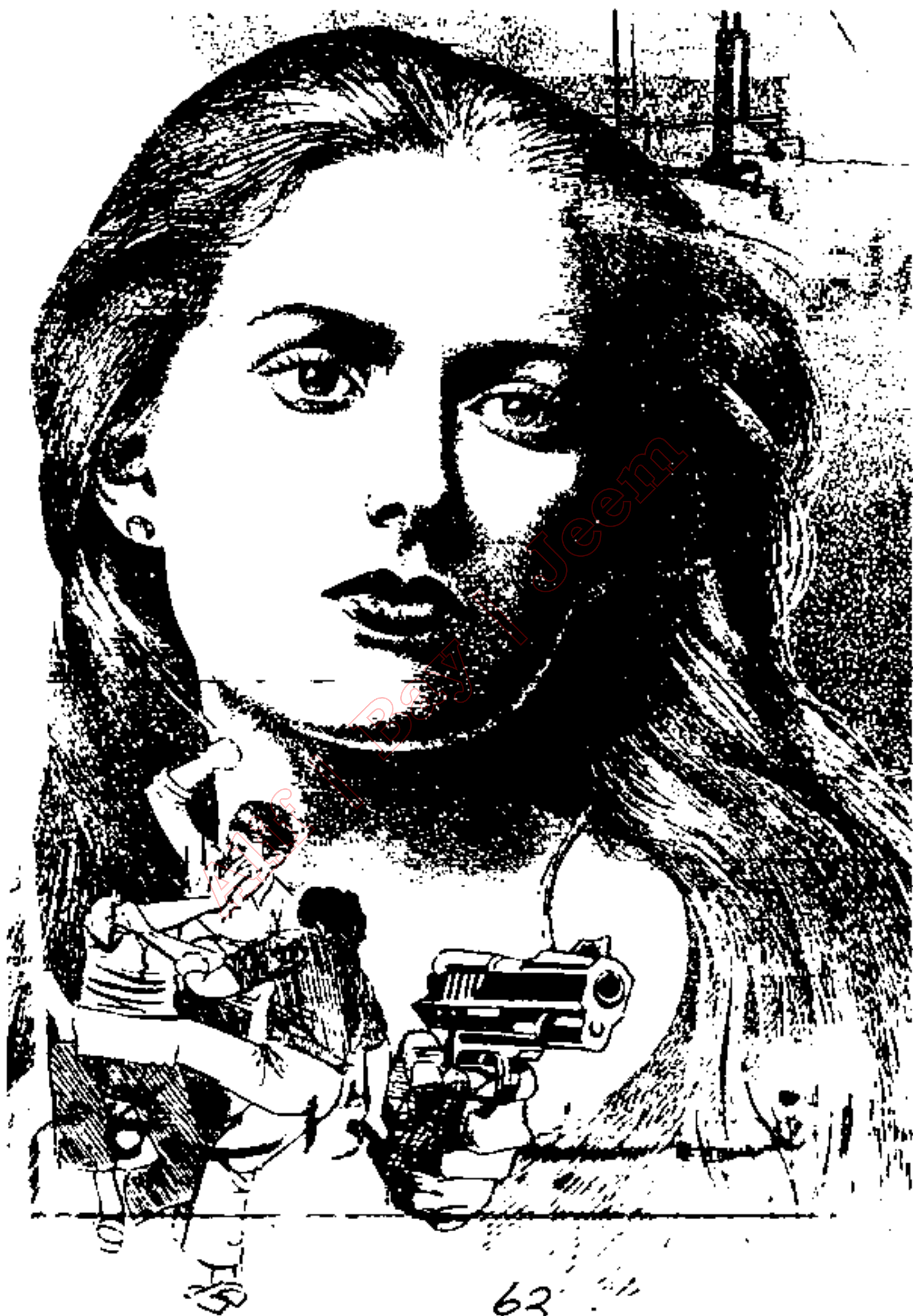
قسط: 17

سہولتیں

امماتاری

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عقائد ہو اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تند و تیز آندھیوں نے اسے محض سرپا انتقام بنادیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابل شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پُر عزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جا رہے تھے... اس کی زندگی جو العیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... یہ خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لہک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قراریوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تاری عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہموار کا تھوڑا سا حق و باطل کی اولی جنگ ہوں لڑتا رہا اور ادب و ادب کی لڑائی اس کی مرض کی راہ میں حاصل ہو چکی...

ایچ 7 نون، قمر بن کرمانڈل نے دل لک ایک سرپا انتقامی ناول کی تحریر داہان



معاذ ایک ذہن لیکن ستون حراج لڑکا جو نور مٹی کا طالب ہم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس کے دل میں بھی پناہ ہے۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے ہاتھ و پاؤں ایک ادارہ جو ان کی پالیسی معاذ نے والد سرکاری فیس میں اور اچھے مہرے پر قائم ہیں۔ ایک شام معاذ اسٹی ٹیوٹ سے واپس آ رہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو سڑک پر بھڑی ایک لڑکی کو اٹھا کر لے کر کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی جو نور مٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی بڑی فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشری نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بشری ماں کی بھین کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم وغیرہ لکھتی ہے۔ اس دن ان جگہ بھی وہ ایک مذہبی قہر رہا تھا منسوب ہے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی آئی تھی۔ معاذ بشری کو بہ حفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کر دیتا ہے لیکن جن رکھن رادوں سے اس نے ان کا نکال دیا تھا وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور سوتے کی تلاش میں رہتے ہیں۔ یہ موقع انہیں جو نور مٹی ٹرپ کی صورت میں مل جاتا ہے اور ایک جنگل کی سیر کے دوران وہ فوٹو گرافی کے شوق میں سب سے الگ تھلک ہو جانے والے معاذ کو جب خبری میں گھیر کر بری طرح زد و کوب کرتے ہیں اور پتہ ہی سے اسے دھکا دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس نہ آنے پر انتظامیہ کے افسر اور پولیس اور انسپیکٹر ذرا کج کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جگہ کی جھونپڑی میں پاتا ہے۔ اپنی حالت سے اسے اپنے شدید زخمی ہونے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ جوگی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ معاذ کا سوا بالکل جنگل میں ہی نہیں گر جاتا ہے اور جوگی کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا جس سے باہر کی دنیا سے رابطہ کیا جاسکے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی غصبت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے۔ جوگی بھی اسے ہندو کرانے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت نے کچھ خاص صلاحیتوں سے نوازا کر دنیا میں بھیجی ہے۔ معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے پراسرار علم سکھانے کی ہامی بھر لیتا ہے اور معاذ واقعی اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ادھر جاتے وقت وہ سے ملنے والے معاذ کے کمرے سے جب تصویریں ٹھکرائی جاتی ہیں تو بہت سے قدرتی مناظر کی تصویریں اس سے ایک ایسی تصویر بشری کی نظر میں آ جاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانک رہا تھا۔ آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اٹھا کر لے کر کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پردیسی کے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشری تحقیق کر رہی تھی۔ بشری کے اپنے والد جرنلسٹ ہیں اور حق گوئی ان کے خون میں شامل ہے۔ اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشری کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ مدد سے بے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باڈل نامی قتلے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشری انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دنوں میں ہی معاذ واپس کا ارادہ کرتا ہے تاہم۔۔۔۔۔ ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا مرغان اللہ اور پردالی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو وقاص نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باڈل اچانک بشری کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر دیتا ہے۔ ڈی این اے رپورٹ سے باڈل کی نشاندہی ہو جاتی ہے۔ ادھر معاذ کو داپس لانے کے لیے اور اچھے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اٹھا کر لیا جاتا ہے اور اسے واپس آنے کا پیغام دیا جاتا ہے۔ معاذ و قتلوں کے پاس خود حاضر ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کر کے اسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات لی جاتی ہیں وہ بتاتے ہیں اس کے بھائی کا ایک گروہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشری بھی انتقام کی آگ میں جلتی ہوئی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی لڑائی شروع ہو جاتی ہے۔ معاذ کو بچانے والا لڑکا وقاص اپنے گروہ کے ساتھ ایک پارٹی میں جاتا ہے۔ وہاں اسے معاذ کے حوالے سے مشکوک ایک شخص نظر آتا ہے۔ وہ اس کے پیچھے جاتا ہے مگر اسے گھیر لیا جاتا ہے۔ بہر حال وقاص کو تنہا کے ساتھ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ادھر معاذ کے دوست عالم شاہ کے بہنوئی کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ کی ٹھون میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے چھانڑ کر کے اس کے درمیان پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ محضو سے حاصل انوکھے علم کی بدولت ان کا مسلحانہ نہیں جاتا۔ بشری، کامران کو چھاپنے کا پروگرام بناتی ہے۔ ادھر عالم شاہ مرغان لگاتار ہے کہ اس کے بہنوئی کا قتل کس نے کیا۔ وہ قاتل کو گھیرتا ہے اور اسے قتل کر دیتا ہے۔ تاہم وہ لگا جاتا ہے۔ عالم شاہ اس کے بعد ڈاکوؤں کے سردار چاچو کو چھاپتا ہے اور اسے قتل کر دیتا ہے۔ تاہم اس کے پیچھے پولیس لگ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور اس کا نوکر سرہ باڈل کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ ادھر معاذ جاسوسی مافکر کو چھانڑ کر کے اس کے ذریعے اسے نکالنے والوں پر حملہ کر دیتا ہے تاہم ان کی فائرنگ سے

ماہر مارا جاتا ہے اور انعام معاذ پر نہیں آتا مگر معاذ سے کام لینے والوں کو اس پر فک کرنا ہے۔ ادھر کل شاہ کے لوسو لوہے کو خوا کر لیا جاتا ہے اور انہو کا انعام لطیف سومر پر آتا ہے۔ عالم شاہ وہاں موجود ایک دشمنی شخص کی مدد سے باڈل کی قید سے چھٹکارا پالینا ہے۔ ادھر بشری دینی کھینچ جاتی ہے۔ وہاں دکان اسے ہار لی کے روپ میں بچان لیتا ہے اور ان دونوں کے درمیان ۱۵ روپے کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ وہ سلطان کو مارنا چاہتی ہے تاہم دکان اسے ایسا کرنے سے روکتا ہے۔ ادھر عالم شاہ باڈل کی قید سے نکل کر اس کا بچپا کرتا ہے تاہم وہاں اچانک قاتلنگ اور دھماکے ہونے لگتے ہیں۔ وہ وہاں معاذ کو دیکھتا ہے۔ صداقت شاہ، لطیف سومر کو گھیرنے کے لیے اس کی ٹھیکہ بچی اور بچے کا کھوج لگاتے ہیں اور بچے کو اغوا کر لیتے ہیں۔ لطیف سومر و مجبور ہو جاتا ہے۔ معاذ کو اس کے گھر والوں سے ملنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ عالم شاہ کھانسی کے والدین کا بیٹا یاد دلائی کا قصد یہ دیتے ہیں۔ ادھر معاذ بھی ایک دشمن پر سولہ کے ساتھ اغوا کر دیا جاتا ہے تاہم کچھ لوگ سکھ یا تریوں سے بھری بس کو یرغمال بنا لیتے ہیں۔ عالم شاہ کو ایک جگہ آسہ نظر آ جاتی ہے جس کے پیچھے جا کر وہ اور سرمد دھڑ لے جاتے ہیں۔ تاہم صداقت کے تھکان سے پولیس آ جاتی ہے اور وہ خاموشی سے وہاں سے نکل جاتے ہیں۔ معاذ اور سولہ خانے کے قدام افراد کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں تاہم باہر موجود دیگر اغوا کاروں سے متاثر ہوتا ہے اور معاذ دشمن ہو جاتا ہے۔ صداقت شاہ کے اغوا میں موجود رشتے دار کے ہاں شادی ہوتی ہے۔ عالم شاہ نکل اور سرمد اغوا کر دیا جاتا ہے۔ ان پورٹ سے گھر روانگی پر راستے میں کچھ ٹھیرے انہیں لوٹ لیتے ہیں۔ عالم شاہ انکشن میں آتا چاہتا ہے تاہم اجالا نامی عالم شاہ کی کن اس کا راستہ روک دیتی ہے۔ گھر پہنچنے پر پولیس کی ریڈ ہوتی ہے اور وہ عالم شاہ اور سرمد کو لے جاتے ہیں ادھر بشری اور دکان باڈل کو اسپتال میں مارنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ ناک جا جاتا ہے۔ معاذ اور سولہ خانہ کی تلاش میں ہوتے ہیں اور بالآخر اپنے سہولت کاروں سے مل جاتے ہیں۔ عالم شاہ اور سرمد کو تشدد کا نشانہ بنا کر واپس لے لیے جاتے ہیں جہاں عالم شاہ کو کتوں کے بھونکنے کی آواز آتی ہے۔ کتے ان کے بے حد ترپ آ جاتے ہیں اور انہیں دردناک موت کا احساس خوف میں مبتلا کر دیتا ہے۔ وہ لوگ واپس اپنے میزبانوں کے ہاں پہنچ جاتے ہیں۔ شادی کے دوران انہیں پتا لگتا ہے کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں اجالا اور اس کا عاشق شامل ہوتے ہیں۔ وہ چھپ کر ان کی باتیں سن رہا ہوتا ہے کہ اسے چھاپ لیا جاتا ہے۔ تاہم وہاں مارا ماری ہوتی ہے اور اجالا کا عاشق مارا جاتا ہے۔ پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

پولیس گی۔ "وہ ان سے اپنی انجینس ہانٹ رہی تھی۔
"تم ٹھیک کہہ رہی ہو بیٹا میں خود بھی واپس لوٹا چاہتا ہوں لیکن تمہارے خیال سے لوٹ نہیں پاتا۔ تم وہاں بالکل اکیلی ہو جاؤ گی۔ یہاں پھر بھی تمہارا دل بھلا رہتا ہے اور مجھے بھی تسلی رہتی ہے کہ تم سب کے درمیان محفوظ ہو۔"
"آخر ہم کب تک ایسے رہ سکتے ہیں؟" علیہ تھوڑی سی چڑچڑی ہوئی۔

"اللہ بھتری کا کوئی سبب پیدا کرے گا۔ فی الحال تو میں یہ سوچ رہا ہوں کہ واپس جا کر آفس جوائن کر لوں۔ مگر بیٹے تو قارون کا عزائم بھی خالی ہو جاتا ہے۔ ہم جیسے سفید پوش لوگ تو کسی گنتی شمار میں ہی نہیں ہیں۔"

"اگر آپ واپس جائیں گے تو میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گی۔" ان کا ارادہ جان کر علیہ نے اپنا غصہ مٹا دیا۔
"بات کو سمجھا کر دینا؟" خاور احمد نے اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس نے ان کی بات کاٹ دی اور بولی۔
"اس بحث کو بھر بھی کے لیے اٹھار گئیں اور چائے پئیں۔ غلطی ہو کر بے کار ہو جائے گی۔"

"یہ لیجئے ابو چائے۔" علیہ نے چائے کا بھاپ اڑاتا ہوا کپ میز پر رکھتے ہوئے کہا تو اپنے خیالات میں کھوئے خاور صاحب متوجہ ہوئے۔

"جیتی رہو بیٹی! اللہ ہمیشہ خوش رکھے۔"
"معاذ بھائی لوٹ آئیں تو زندگی میں خوشیاں بھی لوٹ آئیں گی۔" علیہ کی زبان سے بے ساختہ ہی پھسلا۔

"دعا کیا کرو بیٹا! ہمارے اختیار میں دعا کے سوا ہے ہی کیا۔ مجھے امید ہے کہ جس روپ نے ہمیں اتنے دنوں کی پریشانی کے بعد معاذ کی زندگی کی نوید دی، وہ ہمیں اس پریشانی سے بھی نکال لے گا۔" خاور احمد کا انداز دلا سادہ سچے والا تھا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ابو لیکن کبھی بھی دل بہت افس ہو جاتا ہے۔ اپنے گھر کی یاد بھی ستاتی ہے۔ بے شک کچھ بہت خیال رکھتی ہیں لیکن اپنا گھر تو اپنا ہی ہوتا ہے نا۔ سرمد بھائی تو چلو اسپتال پہلے گئے ہیں تو ان کی رہنمائی دوبارہ شروع ہو گئی ہے لیکن آپ کے آفس اور میرے کالج کا مسئلہ اپنی جگہ ہے۔ آپ کو وہ آڈٹ ہے ابھی آخر کب تک پھریں

”تمہاری پچھ کہاں ہیں؟“ خاور صاحب نے بھی اس کی بات مانتے ہوئے چائے کا کپ اٹھایا اور اس سے پوچھنے لگے۔

”اپنے نماز کے بعد کے وظائف پڑھ رہی ہیں۔ میں نے چائے کا پچھا تھا لیکن منع کر دیا۔“

”تمہاری پچھ شروع ہی سے کم چائے پیتی ہیں اور جب سے ٹوبہ سیڈیل میں مگنی ہے اس نے پچھرز دے دے کر ان سمیت سب ہی کو چائے اور گولڈ ڈرنگس کے بہانے دوسرے صحت بخش مشروبات کی طرف راغب کر دیا ہے۔“ خاور صاحب نے فس کرتیرہ کیا۔

”چائے تو بہر حال چائے ہے۔ چائے کے بغیر انسان دن نہیں گزار سکتا۔“ علینہ نے منہ بتایا۔

”ٹوبہ تو گزار لیتی ہے۔ وہ بھی سیڈیل جیسی نفیلہ میں۔“

”ٹوبہ آپ کی تو بات ہی الگ ہے۔ ان جیسی لڑکی پورے خاندان میں کوئی اور نہیں ہے۔ محاذ بھائی واپس آ جائیں گے تو ہم انہیں اپنے گھر لے جانے میں بالکل ویر نہیں کریں گے۔ آپ اس سلسلے میں پچھ سے پہلے ہی بات کر لیں۔“ وہ جو شروع سے اپنی بیٹی زاد ٹوبہ کو محاذ کی دہن بنانے کے خواب دکھاتی تھی، موقع ملنے ہی اپنی خواہش نہان پر لے آئی۔

”اللہ تعالیٰ وہ دن بھی لائے، فی الحال تو تم بس سب سے زیادہ اپنے بھائی کی خیر و عافیت سے واپسی کے لیے دعا کیا کرو۔“ خاور احمد کے لہجے میں ایک کرب سا تھا۔ وہ سب کچھ نہیں جانتے تھے لیکن انہیں اندازہ تھا کہ ان کا بیٹا جن لوگوں کے چنگل میں پھنس گیا ہے اس کی واپسی کوئی آسان بات ثابت نہیں ہوگی۔

”میں تو دن رات بھائی کی واپسی کے لیے ہی دعا میں.....“ علینہ کا جملہ ابھی مکمل نہیں ہوا تھا کہ ڈور بیل بجنے کی آواز گونجی۔

”میں دیکھتا ہوں۔“ علینہ کو رکنے کا اشارہ کر کے خاور احمد نے ہاتھ میں پکڑا کپ واپس میز پر رکھا اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ پیپ ہول میں سے جھانکنے پر انہیں وہاں فاسٹ سے استری شدہ پینٹ شرٹ میں لمبوس ایک لڑکا کھڑا کھائی رہا۔

”کون ہے بھائی؟“ دروازہ کھولنے سے قبل انہوں نے احتیاطاً دریافت کیا۔

”جی، مجھے خاور احمد صاحب سے ملنا ہے۔ میرے

پاس ان کے لیے ایک اہم پیغام ہے۔“ لڑکے نے شائستگی سے جواب دیا۔ وہ حیران ہوئے کہ یہاں ان کے لیے کس نے پیغام بھیجا ہے۔ اس حیرت بھری الجھن میں ہی انہوں نے دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی لڑکے نے ان کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھما دیا۔ سفید رنگ کے اس لفافے پر بیجے والے کے نام کے بجائے ایک جملہ تحریر تھا۔

”اندور جا کر خاموشی سے لفافے کے اندر موجود تحریر پڑھیں۔ باقی ہدایات اندر درج ہیں۔“ خاور صاحب نے اس تحریر کو پڑھ کر حیرت سے لفافہ پہنچانے والے نوجوان کو دیکھا۔ ان کی الجھن شاید سوال بن کر ان کے لبوں پر آ جاتی لیکن لڑکے نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انہیں خاموش رکھنے کا اشارہ کیا اور پلٹ کر دروازے سے کچھ قاصلے پر کھڑی گاڑی میں جا بیٹھا۔ خاور احمد واپس روتہ کیفیت میں اندور کی طرف واپس پلٹ گئے۔

”کون تھا ایو؟“ علینہ نے انہیں دیکھ کر سوال کیا۔

”کوریر والا تھا۔“ انہوں نے فکڑ جواب دے کر اپنے لیے مخصوص کمرے کا رخ کیا۔

”چائے تو پوری پی لیں ایو؟“ علینہ نے انہیں پکارا۔

”بس بیٹا اب سوڈ نہیں رہا۔ ویسے بھی اب ٹھنڈی ہو جی ہوگی۔“

”میں دوسری بیٹا جی ہوں۔“ وہ جھٹ بولی۔ خاور احمد نے اسے منع نہیں کیا۔ اچھا تھا کہ وہ مصروف رہے تاکہ وہ لفافے کے اندر موجود تحریر اطمینان سے پڑھ سکیں۔

کمرے میں جا کر انہوں نے احتیاط سے لفافہ کھولا اور کاغذ پر لکھی تحریر پڑھنے لگے۔ لکھا تھا۔

”خاور صاحب! بہت لمبی چوڑی باتیں کہنے کا وقت نہیں ہے۔ میں آپ سے جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اس کے لیے ہمیں تفصیلی ملاقات کرنا ہوگی لیکن یہ ملاقات آپ کی موجودہ رہائش گاہ پر ممکن نہیں۔ مجھے شک ہے کہ وہاں ہونے والی گفتگو کسی ایسی جگہ پہنچ سکتی ہے جہاں پہنچنا آپ کے اور میرے بدولوں کے مفاد میں نہ ہوگا۔ رابطے کے دیگر جدید ذرائع بھی اسی احتیاط کے پیش نظر استعمال نہیں کیے جا رہے۔ مختصر آمد عام ہے کہ میں آپ سے اور آپ کی بیٹی سے ایک ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ اس ملاقات میں، میں آپ کے تمام مسائل کی کمی لیکن کچھ مسائل کے حل کے لیے تھلہ ج پیش کر سکتا ہوں۔ آپ اگر اعتماد کر سکیں تو باہر موجود نوجوان کے ساتھ ملاقات کے لیے تشریف لے آئیں۔ اس ملاقات

اسٹاکل فریڈ کا خط پڑھتی ہوں۔" علیحدہ جو پہلے ہی آنے والے خط کو پڑھتی تھی مگھو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے بولی۔

"تم خط پڑھ لو تو تھوڑی دیر داک کے لیے چلتے ہیں۔ گھر میں پڑے پڑے طبیعت ہیزار ہوگئی ہے۔" خاور احمد نے علیحدہ کی لائی چائے پینا شروع کر دی۔

"میں بھی بور ہو رہی ہوں۔ آپ چائے ختم کریں، میں بچہ کو بتا کر آتی ہوں پھر چلتے ہیں۔" وہ کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔ تھوڑی دیر میں وہ سر کو اسٹاکل سے اٹھا جانے ان کے ساتھ باہر جانے کے لیے تیار ہوئی تھی۔

دلوں باپ بیٹی گھر سے باہر نکل گئے۔ مدد دیدہ نظروں سے ارد گرد دیکھا۔ خط لانے والے لاکے اور اس کی گاڑی کا کوئی اٹاپا نہیں تھا۔ دلوں چلتے ہوئے قریبی پارک تک پہنچ گئے۔

"تمہاری کیا رائے ہے اس خط کے بارے میں؟" خاور احمد نے مگھو کا آغاز کیا۔

"عجیب مبہم اور مشکوک سا خط ہے۔" علیحدہ نے رائے دی۔

"میرے خیال میں ہمیں اسے نظر انداز کر دینا چاہیے۔ میں اس طرح کسی انجینی کے بلاوے پر وہ بھی نہیں ساتھ لے کر گئیں نہیں جاسکتا۔"

"مگر آپ یہ بھی تو سوچیں کہ وہ جو کوئی بھی ہے، اس نے ہمیں ہمارے مسائل سے نکالنے کی پیکش کی ہے اور موجودہ حالات میں ہم ایسی شاعر اور پیکش کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔" خاور احمد کے قدموں سے قدم ملا کر پارک میں چلتے ہوئے ان سے بحث کرتی لڑکی اس علیحدہ سے گفتگو کرتی تھی جو کچھ عرصے پہلے تک گھر بھر کی لالائی اور ایک ناسمجھ بچی تھی جاتی تھی۔

"یہ کوئی ٹریپ بھی ہو سکتا ہے۔" خاور احمد نے تشویش کا اظہار کیا۔

"کوئی ہمیں کیوں ٹریپ کرے گا۔ ہم صرف محاذ بھائی کی کمزوری ہیں اور ان نامعلوم دشمنوں نے ہماری وجہ سے انہیں مجبور کر رکھا ہے۔ اگر ہم کسی طرح محفوظ ہو جائیں تو محاذ بھائی کے لیے واقعی کاراستہ آسان ہو جائے گا۔" اس کے لیے میں ایک آس کی تھی۔

"یعنی تم چاہتی ہو کہ ہم اس ملاقات کے لیے ماضی ہو جائیں؟"

"جی ہاں! اس شخص نے ٹھیک لکھا ہے کہ ہمیں رسک لینا پڑے گا۔ آپ خود سوچیں کہ ہماری زندگی کیا ہے۔ ہم جس گھر میں رہتے ہیں وہاں کل کر مگھو تک نہیں کر سکتے کہ

کے حوالے سے یقیناً آپ کے دل و دماغ میں بہت سے اندیشے پیدا ہو گئے ہوں گے۔ لیکن زندگی میں کبھی بھی آدمی کو رسک لینا پڑتا ہے۔ آپ جیسے شخص کو جس کی فیملی کے لیے پہلے ہی بہت رسک ہیں، ایک خیر اندیش سے ملاقات کرنے سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ اگر آپ فوری طور پر اپنے ذہن کو ملاقات کے لیے تیار نہ کر پا سکیں تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ آج آپ کو پیغام پہنچانے والا یہ لڑکا نین دن تک مسلسل اسی وقت پر آپ کے گھر کے قریبی پارک میں موجود رہے گا۔ آپ جس دن چاہیں مگر ٹریف لاسکتے ہیں۔

والسلام

آپ کا ایک خیر خواہ"

اس عجیب و غریب تحریر نے خاور احمد کو الجھن میں ڈال دیا۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ یہ کون ہے جو ان کے مسائل سے آگاہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس بات سے بھی آگاہ تھا کہ اس گھر میں ہونے والی مگھو محفوظ نہیں ہو سکتی۔ انہیں خود یہ بات محاذ کے ملاقات کر کے جاننے کے بعد اپنے بھائی فراد کی زبانی معلوم ہوئی تھی اور فراد نے انہیں بتایا تھا کہ محاذ نے اسے سب کچھ جوں کا توں رہنے دینے کا مشورہ دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس صورت میں کوئی متبادل انتظام کر لیا جائے گا جس کی ان لوگوں کو خبر بھی نہیں ہو سکے گی اور اپنے اطمینان میں کوئی غلطی کرتے نہیں گے۔ اس لیے بھر تھا کہ جو جیسا ہے وہی رہا رہے یا جائے اور خود احتیاط برتی جائے۔ "یہ کیا ہے ایو؟ یہ لاف کس نے بھیجا ہے آپ کو؟" وہ ابھی غور و خوض کر رہی تھی کہ علیحدہ تازہ چائے کے ساتھ حاضر ہو گئی۔

"گراہمی سے ایک دوست کا خط ہے۔ غیر خیریت کے علاوہ یہ دریافت کرنے کے لیے لکھا ہے کہ میں کب تک دوبارہ آفس جوائن کر رہا ہوں۔" ذرا بے پروا سے انداز میں جواب دے کر انہوں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور لافانے سمیت کاغذ اس کی سمت بڑھا دیا۔

"آپ کے دوست بڑے پرانے اسٹاکل کے بندے ہیں جو اس دور میں بھی خط لکھتے ہیں۔" حالات کے باعث وقت سے پہلے کچھ دار ہو جانے والی علیحدہ نے حاضر دماغی کا مظاہرہ کیا اور جلدی جلدی تحریر پر نظر دوڑانے لگی۔ "صحیح کہا تم نے۔ وہ ایسا ہی بندہ ہے۔" خاور

صاحب زبردستی ہنسے۔

"آپ چائے پیئیں، تب تک میں آپ کے اوتار

ہمیں ڈر ہے یہ گفتگو کہیں اور سنی جا رہی ہوگی۔ خود کو ان حالات سے نکالنے کے لیے ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔“

”فراز نے اپنے کسی دوست کے بھائی کا ذکر کیا تھا کہ وہ کرل ہیں اور ہماری عدد۔“

”اس آپشن پر سوچنا بیکار ہے، ابو! کرل صاحب کے ہارے میں دشمن جان چکے ہیں۔“ علینہ نے ان کی بات کاٹ دی۔

”یعنی تم ہر حال میں غلط والے اجنبی سے ملاقات کرنا چاہتی ہو؟“

”آپ ٹھیک سمجھے ہیں۔ ہمارے پاس رسک لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔“

”ایسا کرتا ہوں کہ میں اکیلا چلا جاتا ہوں۔ تم گھر پر اپنی بچہ کے پاس ہی رہنا۔“ وہ ظاہر ہے بیٹی کے لیے کوئی رسک نہیں لینا چاہتے تھے۔

”نہیں، میں آپ کو اکیلے نہیں جانے دوں گی۔ ویسے بھی ہم دونوں کو بلایا گیا ہے تو مطلب ہے کہ ملاقات میں میری موجودگی کی اہمیت ہے۔“

”سات کو سمجھا کر دینا! تمہارے ساتھ جانے سے کوئی مسئلہ بھی ہو سکتا ہے۔“ خاور احمد نے اسے باز رکھنے کی کوشش کی۔

”مسئلہ تو ہر جگہ ہے ابو! آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں بچہ کے گھر میں محفوظ ہوں۔ ہمارا بیباں رہتا صرف دل کی تسلی ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارے دشمن اسنے طاقتور ہیں کہ وہ گھر میں گھس کر بھی ہمارے ساتھ جو چاہے وہ سلوک کر سکتے ہیں۔“ اس نے تھوڑے سے تیز لہجے میں جو بات کہی وہ ان کی زندگی کی ایک سچ حقیقت تھی۔ خاور احمد کو ہتھیار ڈالنا پڑے۔

☆☆☆

”یہ... یہ دیکھیے دیورڈ انہر سے یہ جو بیگ ملا ہے، یہ میڈل ان پاکستان ہے اور یہ میڈل لائٹ۔۔۔۔۔ یہ بھی پاکستان میں عام استعمال کی جاتی ہے۔ یہ چیزیں ثبوت ہیں کہ کافر دشمن نے ایک بار پھر بھارت ماما پر اوچھا دار کیا ہے۔ دنیا کے سامنے مظلومیت کا ڈھونگ رچانے والا پاکستان مسلسل اپنے انجینئرس میس (بارڈر) کے اس پار بھیج رہا ہے اور یہ انجینئرس ہمارے دشمن، دشمن کے رکھالوں اور دشمن واسیوں کو نقصان پہنچانے کی پوری پوری کوشش کرتے ہیں۔“ منہ سے مانگ لگائے انگریز زمین پر رکے ایک بیگ اور کچھ دوسری اشیاء کی طرف اٹلی سے اشارہ کرتا ہوا چڑچوش اور نفرت انگیز

لہجے میں بولتا چارہا تھا اور لی وی کے سامنے بیٹھا محاذ ہونٹ کھینچے سندھ گھر میں ہونے والے بم بلاسٹ سے متعلق وہ رپورٹ دیکھ رہا تھا۔

”وہ دیکھیں... آپ دیکھ سکتے ہیں کہ بلاسٹ کتنا زوردار تھا کہ اس نے پل کا ایک بڑا حصہ اڑا کر رکھ دیا۔“ انگریز کی آواز کے ساتھ ہی کمرے نے اپنا رخ بدل لیا تھا اور اب تباہ شدہ پل کو دکھایا تھا۔

”ایک سپرٹس کا اندازہ ہے کہ پل کو سپورٹ دینے والے پلر کے ساتھ ٹائم بم باندھا گیا تھا۔ حملہ آور نہر میں حیرتے ہوئے اس مرکزی پلر تک پہنچے، بم گھس گیا اور اپنا پورا جھٹکا کرنے کے لیے اپنا سامان نہر میں ہی پھینک کر چلے گئے۔ ہمارے بہادر جوانوں نے بلاسٹ کا شکار ہونے والے مظلوموں کی پاؤں نہر سے نکالنے کے دوران ان چیزوں کو بھی نہر سے نکالا ہے اور امید ہے کہ ابھی ایسا بہت کچھ سامنے آنے والا ہے جو ثابت کر دے گا کہ حملہ آور پاکستانی ہی تھے۔“ کیرا ایک بار پھر اس بیگ پر آٹکا تھا۔ محاذ اس بیگ کو بچان سکتا تھا۔ یہ بیگ اور ایسا ہی دوسرا بیگ اس نے اور سونیا نے کارروائی کے دوران اپنے اپنے مثالوں پر لٹکا رکھا تھا اور طے شدہ پروگرام کے مطابق کارروائی کے بعد اس فضول پوچھ سے آزادی حاصل کر لی تھی۔ یہ تو اسے اب سمجھ آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ اصل میں پاکستان کو بھرم بھرانے کے لیے کیا گیا تھا۔ اس کارروائی کے لیے سامان کی فراہمی سونیا کے مقامی مددگاروں نے کی تھی اور سونیا نے یہ سب کچھ بین وقت پر اسے سونپا تھا اس لیے اسے کسی بھی شے پر غور کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

”میں اپنے دیورڈ کو ایک بار پھر بتاتا چلوں کہ بلاسٹ کے سے انڈین آرمی کا ایک چھوٹا قافلہ سیما کے قریب ڈیوٹی دیتے ہمارے بہادر جوانوں کے لیے رسد لے کر چارہا تھا مگر اتفاق سے ایک گزرتی برات کی وجہ سے تاخیر ہوئی اور براہیوں کی بس گزری اور نشانہ بن گئی۔ ہمیں اپنے ان مظلوم شہریوں کی موت پر شدید دکھ ہے اور ہم دشمن کو بتا دینا چاہتے ہیں کہ انھیں اینٹ کا جواب پتھر سے ملے گا۔“ سپاٹ لہجے میں بولنے والے نے سخت لہجے میں کہا۔

”بالکل ادرشمن کو یہ بات جان لینا چاہیے کہ بھارت ماما کے بہادر سپوت اپنے مظلوموں کے کھون (خون) کو ہرگز صاف نہیں کر سکیں گے۔“ انگریز چڑچوش لہجے میں تیز بولتا چلا چلا تھا لیکن محاذ کے اندر حرید کچھ سننے اور دیکھنے کا حوصلہ ختم ہو چکا تھا۔ اس نے شدید غصے اور

جسٹ بلا ہٹ کی کیفیت میں ریموٹ افٹا کر ٹی وی پر دے مارا۔ ٹی وی کی اسکرین ٹوٹنے سے محفوظ رہی۔ یہ شخص ایک اتفاق ہی تھا۔

”ایلی پر اہلم؟“ اسی وقت دروازہ کھول کر اندر داخل ہونے والی سونیا نے یہ منظر دیکھا اور اسے فور سے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

”تم لوگوں نے میرے ساتھ دھوکا کیا؟“ سناڈ اس کی طرف نفرت سے دیکھتے ہوئے فرمایا۔

”کوئی سادھوکا۔؟“ اس نے یوں حیرت کا اظہار کیا جیسے کچھ بھی ہی نہ ہو۔

”میرے ہی ہاتھوں میرے وطن کی بدنامی کا انتقام کروا کر اب اتنی بھولی مت بنو۔“ اس نے چلتے ہوئے ٹی وی کی اسکرین کی طرف اشارہ کر کے ٹیش کے عالم میں جواب دیا۔

”یہ صرف اتفاق تھا۔“ اس نے بے نیازی سے سر ہٹا کر ایک سنگل سونے پر برا بھلاں ہو گئی۔

”مجھے بے وقوف مت سمجھو سونیا میں کچھ نہیں ہوں جو یہ بات نہ سمجھ سکوں کہ اس اتفاق کو پلان کیا گیا ہے۔

پاکستان کو بدنام کرنے کے لیے اس سے پہلے بھی بہت سی ایسی بھونڈی کوششیں کی جاتی رہی ہیں۔ ہر صاحب محل ان بھونڈی کوششوں کی حقیقت جانتا ہے۔“ اس کا غصہ کم نہیں ہو رہا تھا۔

”اگر میں تمہاری اس بات کو تسلیم بھی کر لوں تو کیا فرق پڑتا ہے۔ تمہیں تو ہر حال میں ہمارے لیے کام کرنا ہے۔ تم اس پوزیشن میں نہیں ہو کہ خواتین کی حب الوطنی کے مظاہرے کرتے پھرو۔“ سونیا کا جواب سناڈ کے لیے ایک ٹھانپے جیسا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے بالکل چپ بیٹھا رہ گیا۔ بات تو سونیا نے بالکل درست بھی مٹی۔ اپنے گھر والوں کے تحفظ کی خاطر وہ ان لوگوں کے ہاتھوں کھینچتی بنا ہوا تھا۔ وہ ان کی بات نہ مانتا تو اپنے پیاروں کو گھونبھتا لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ اپنے وطن اور بے گناہ انسانوں کے خلاف کچھ کرنا اس کے دل پر بھاری بوجھ ڈال دیتا تھا اور اب تک وہ کسی نہ کسی طرح ان لوگوں کو جل دینے میں کامیاب ہو رہا تھا۔ یہاں تک کہ پروفیسر وکٹر کی وی ہوئی جو مشورہ بھی اس نے اپنے دامغ پر حاوی نہیں ہونے دیا تھا لیکن شاید وہ لوگ اس کا طریقہ کار سمجھ گئے تھے اس لیے اب اسے کسی اور طریقے سے وینڈل کیا جا رہا تھا۔

”دیکھو سناڈ..... میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا کہ ہم کوئی خاص طور پر تمہارے ملک کے دشمن نہیں ہیں۔ ہم قری لائن کام کرنے والے لوگ ہیں اور جو بھی رقم کے عوض ہم سے کام لینا چاہتا ہے ہم اس کا کام کر دیتے ہیں۔ اب بھی ایسا ہی ہوا ہے اور یقین جانو اس میں پاکستان کو بدنام کرنے کی کوئی بھونڈی کوشش شامل نہیں ہے۔“ اسے خاموش پا کر سونیا نے اپنے لہجے میں نری سوسلی اور ایک بالکل دوسرے زواہیہ سے اپنی صفائی پیش کرنے لگی۔

”تم لوگوں کو یہ کام پاکستان کے کسی ادارے نے سونپا تھا؟“ اس کی وضاحت نے سناڈ کو الجھا دیا اور شک زدہ لہجے میں پوچھنے لگا۔

”یہ تو مجھے خود بھی نہیں معلوم۔ میڈم ایکس مجھ سمیت ہر ایک کو بس اتنا ہی بتاتی ہیں جتنا انہیں مناسب لگے۔“ سونیا کے جواب نے اسے پہلے سناڈ آپس کے ذریعے خود سے ہم کلام ہونے والی میڈم ایکس کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا اور اچانک ہی ذہن میں اٹکا ایک سوال ہونٹوں پر چلا آیا۔

”تمہاری اور میڈم ایکس کی آواز میں بہت ملتی جلتی ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟“

”وجہ تو کوئی نہیں، بس اتفاق ہی کہہ سکتے ہو۔“ سونیا کے چہرے کی رنگت بدل کر اسے اس کے لیے حیرت ہوئی لیکن پھر اس نے خود کو سنبھال کر بچنے ہوئے جواب دیا۔

”کیسں تم یہ تو نہیں سوچ رہے کہ میں ہی میڈم ایکس ہوں؟“ جواب کے ساتھ ہی اس نے ہلکے پھلکے انداز میں سوال بھی داغا۔

”ایسا سمجھنے کی بھی محاجش نہیں ہے۔ میڈم ایکس مئی بار تمہاری موجودگی میں بھی مجھ سے بات کر چکی ہے۔“ سناڈ نے اسے جواب دیا اور ایک بار پھر ٹی وی اسکرین کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ اس نمبر سے نکالی جانے والی ایک لاش دکھائی جا رہی تھی اور ایک تیز تیز لہجے میں بول رہا تھا۔

”یہ دیکھیے ناظرین..... یہ نمبر سے ایک اور لاش نکالی گئی ہے لیکن اس لاش کی حالت سے ظاہر ہے کہ یہ شخص ہم بلاسٹ میں ہلاک نہیں ہوا۔ اسے کسی نے گھر سے وار کر کے ہلاک کیا اور اس کے لباس اور بیگ میں ہاتھ بھر کر لاش کو گھر میں ڈھنڈا دیا۔ لاش کی حالت سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ زیادہ پرانی نہیں ہے۔ شاید اسے گزشتہ شب ہی ہلاک کر کے گھر میں پھینکا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے اس کو جو ان نے ہلاک کر کے گھر میں پھینکا تھا اسے کسی اور طریقے سے وینڈل کیا جا رہا تھا۔

کی زبان بند کرنے کے لیے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہو۔" بلاشبہ سکرین پر لاش کی صورت دکھائی دینے والا وہ چہرہ ان کے ایک رات کے میزبان رشید آراکھ کے بیٹے یوسف کا تھا جس کی موت کا بوجھ محاذ اب تک اپنے دل پر محسوس کر رہا تھا۔

"یہ ایٹکر ضرورت سے کچھ زیادہ ذہین نہیں ہے؟ کسی ڈاکٹری رپورٹ کے بغیر اس نے نہ صرف موت کے وقت اور وجہ کا تعین کھڑے کھڑے کر لیا بلکہ یہ بھی اندازہ لگا لیا کہ اسے کن لوگوں نے لاد کیوں ہلاک کیا۔" محاذ کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ اور لہجے میں طنز کی گہری کات تھی۔ سونیا جیسی گھاگ عورت بھی جھینپ گئی۔

"آئی ہوپ کہ اب تم مجھے یہ باور کروانے کی کوشش نہیں کرو گی کہ جو آپ سیٹ ہوا وہ ایک اتفاق تھا۔ میں جان چکا ہوں کہ بے شک تم لوگ کرائے کے ٹو ہو لیکن کام بہر حال دشمنوں کے لیے کر رہے ہو اور جس گدھے ایٹکر کو ایسی ساری معلومات کھل کی گئی ہیں جن کی مدد سے پاکستان کے خلاف زہر اگھا جاسکے۔"

"تم اپنی مرضی سے جو چاہے کہنے کے لیے آزاد ہو لیکن یہ تو طے ہے کہ تمہیں ہمارے لیے کام کرنا ہے۔ تمہارے پاس انکار کی گنجائش نہیں ہے۔"

"خیر لہجے میں اسے جواب دے کر سونیا اس کے کمرے سے باہر نکل گئی۔

"انکار کی گنجائش بے شک نہ ہو لیکن اب تم مجھ سے اپنی مرضی کا کام بھی آسانی سے نہیں لے سکو گی۔" وہ سونیا کے پیچھے بند ہو جانے والے دروازے کو دیکھتے ہوئے پورے عزم سے سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

"خیریت ہے، گھیل بھائی؟ آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں۔" گھیل کے فون بند کرتے ہی عالم شاہ نے ان سے پوچھا۔

"خیریت نہیں ہے۔ ایس ایس پی صاحب نے مجھے اطلاع دی ہے کہ ایک پولیس پارٹی تمہاری اور سرحد کی حفاظت میں یہاں پھاپا مارنے کے لیے روانہ ہونے والی ہے۔" گھیل نے سستے ہوئے چہرے کے ساتھ اسے آگاہ کیا۔

"اس کا مطلب ہے کہ کسی طرح دشنا کو دھل گئی ہے اور وہ پولیس میں اپنے تعلقات کا فائدہ اٹھا کر ہمارے خلاف کارروائی کا آغاز کر دینے میں کامیاب ہو گیا ہے۔" عالم شاہ نے خیالی تامل کی۔

"وہ سب اپنی جگہ ہے۔ ابھی ان سب باتوں کو وٹکس کرنے کا نام نہیں ہے۔ اس وقت تو سب سے اہم بات یہ ہے کہ تم لوگوں کو پولیس کے آنے سے پہلے پہلے کسی اور جگہ شفٹ کر دیا جائے۔ اگر اس وقت تم لوگ پولیس والوں کے ہاتھ آ گئے تو بہت مشکل میں پڑ جاؤ گے۔ دشنا نے تم پر شیل کے قتل کا الزام لگا دیا ہے اور وہ اتنا طاقتور ہے کہ کسی نہ کسی طرح تم پر یہ الزام ثابت بھی کر دے گا۔" گھیل بہت زیادہ پریشان تھے۔

"ہم کہاں جاسکتے ہیں؟ کسی ہوٹل وغیرہ کا رخ کریں گے تب بھی پولیس ہمیں ڈھونڈ لے گی۔" عالم شاہ کو بھی تشویش محسوس ہوئی۔

"جگہ کا مسئلہ نہیں ہے۔ میرے پاس ایک مناسب جگہ موجود ہے۔ تم اور سرحد اپنا ضروری سامان لے کر فوری طور پر وہاں شفٹ ہو جاؤ۔ میں جیل سے کھد دیتا ہوں، وہ تمہیں وہاں چھوڑ آئے گا۔"

"اور نکل۔۔۔"

"کہا تم نکل کو بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہو؟" مجھے خدشہ ہے کہ مجھے اور سرحد کو موجود نہ پا کر نکل کو تک کرنے کی کوشش کی جائے گی۔"

"اب ہم اتنے گئے گزرے لوگ بھی نہیں ہیں کہ لوگ ہمارے گھر کی عورتوں کو ہماری موجودگی میں تک کر سکیں۔ فی الحال تم نکل کو ہمیں رہنے دو۔ وہ یہاں زیادہ آرام سے رہ پائے گی۔" گھیل نے کہا تو اسے ان کی بات ٹھیک لگی۔ یہاں نکل انہوں کے درمیان تمام تر سہولیات کے ساتھ رہ سکتی تھی۔ گھیل انہیں جس جگہ بھیج رہے تھے اس کے بارے میں انہیں کوئی اندازہ نہیں تھا کہ وہاں کیا صورت حال ہے۔ کسی کم سہولیات والی جگہ پر نکل کو چھوٹے بچے کے ساتھ پریشان ہو سکتی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ جو آپ مناسب سمجھیں۔" اس نے گھیل سے اتفاق کر لیا۔

"تم اور سرحد دو چار منٹ میں ریڈی ہو جاؤ۔ میں جیل سے بات کرتا ہوں۔" گھیل کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئے۔ ان کے ہاتھ ہی اس نے سرحد کو بلا کر حالات سے آگاہ کیا۔ سرحد فوراً ہی حرکت میں آیا۔ تھوڑی ہی دیر میں ان کا ضروری سامان دھڑلے بیکر میں بھیل ہو چکا تھا اور وہاں سے جانے کے لیے بالکل چہرے۔

"جیل میں گیت پر گاڑی لے کر تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ آؤ میں تم لوگوں کو وہاں تک چھوڑ آؤں۔" گھیل انہیں

کے ایک فرد پر ماتم ہوتی ہے۔ ہم تم سے شرمندہ ہیں اور کوشش کریں گے کہ براہ بھرہ ادا بھی کر سکیں۔" کھیل کے لمحے میں ایک المردگی سی تھی۔

"اس طرح نہ کہیں کھیل بھائی! آپ میرے بڑے ہیں اور میں ہرگز پسند نہیں کروں گا کہ آپ خود کو میرے سامنے شرمندہ محسوس کریں۔" اس نے ان کی دلجوئی کی کوشش کی۔

"اچھا! پس اسب جاؤ۔ یہ نہ ہو کہ تم لوگوں کی رداگی سے قتل ہی پولیس والے آؤ سکیں۔" کھیل نے خود پر کاہو پا کر اس سے کہا تو وہ ان سے الگ ہو کر گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ اس دوران سرد دونوں بگ گاڑی کی ڈکی میں رکھ چکا تھا اور پچھلی نشست کے ساتھ والا دروازہ کھولے کھڑا اس کے اندر بیٹھنے کا منتظر تھا۔ اس کے بیٹھنے کے بعد وہ خود بھی بیٹھ گیا تو کھیل نے گاڑی آگے بڑھادی۔

"سوری بھائی! آپ کو ہم لوگوں کی وجہ سے زحمت ہوئی۔" کھیل اور فردوس کے سنجیدہ تاثرات کو دیکھتے ہوئے عالم شاہ نے مطررت کی۔

"اس اوسکے تمہیں ایک سیکڑ زکرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" فردوس کے بجائے کھیل کی طرف سے سنجیدہ لمحے میں جواب آیا۔ عالم شاہ کچھ اور کہنے کا سوچتا اس سے کل ہی پولیس کا مخصوص سائرن سنائی دینے لگا۔

"تھیک گاڈا ہم کج وقت پر نکل گئے۔" فردوس کے منہ سے بے سائنس ہی پھسلا۔ کھیل البتہ ماتھے پر کھٹکیں لے سنجیدگی سے ڈرائیونگ کرتا رہا۔ اس نے گاڑی کی رفتار کچھ اور بھی بڑھادی تھی۔ عالم شاہ نے اندازہ لگا لیا کہ وہ اس راستے سے ہٹ کر سڑک پر ہے جس پر سے پولیس سوبائل کا سائرن سنائی دے رہا تھا۔ جلد ہی سائرن کی آواز میں مہدوم ہو گئیں جس کا مطلب تھا کہ وہ ان سے کافی دور ہو چکے ہیں۔ اپنے بچ نکلنے کا اطمینان اپنی جگہ تھا لیکن اس بات کی بہر حال فکر تھی کہ پولیس والے پتا نہیں کس طرح پیش آئیں۔ کھیل کے حوالے سے خاص طور پر پریشانی تھی۔ کھیل نے تھیں دہائی تو کروائی تھی کہ وہ کھل سے کسی بدتمیزی کی نوبت نہیں آنے دیں گے مگر بھی وہ خود کو اس کے لیے پریشان ہونے سے روکنے میں ناکام تھا۔ کھل بے شک کچھ دادر اور منضبط اعصاب کی مالک تھی لیکن اسے اس قسم کے لوگوں سے غصے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ معظم شاہ کی موت کے مدے نے بھی اسے کزرد کر دیا تھا۔ ایسے میں خدشہ تھا کہ وہ اپنے عزیز بھائی کو مشکل میں دیکھ کر بہت زیادہ پریشان نہ

اپنی راہنمائی میں لے کر چل پڑے۔ تقریب سے تھک ہار کر واپس آنے والے اب اپنے اپنے کمروں میں تھے اور جینی طور پر سونے کی تیاری کر رہے تھے اس لیے ان کا کسی سے سامنا نہیں ہوا۔ عالم شاہ کے دل میں خیال آیا کہ رداگی سے قتل نکل سے ملاقات کر لے لیکن پھر اس نے خود ہی اپنے اس خیال کو رد کر دیا۔ کھیل کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ وہ ان لوگوں کو جلد از جلد وہاں سے روانہ کرنا چاہتے ہیں اور کھل سے ملاقات کی صورت میں یقیناً انہیں وقت لگ جانا تھا۔ وہ اس اچانک رداگی کے سلسلے میں سوبل جواب کرتی اور یہ بھی ممکن تھا کہ جذباتی ہو کر خود بھی ان کے ساتھ جانے کے لیے ضد کرتی اس لیے ہجر تھا کہ ابھی وہ اس کی بے خبری میں وہاں سے روانہ ہو جائیں اور بعد میں کھیل خود اسے آگاہ کر دیں۔

"پولیس والوں سے نمٹ کر میں خود تم لوگوں سے رابطہ کروں گا۔ وہاں جا کر آرام سے سو جانا، بعد میں ملے کریں گے کہ ہمارا آئندہ کا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے۔" اپنے ہاتھ سے جینی دروازے پر لگا تالا کھولتے ہوئے کھیل نے انہیں ہدایات دیں۔

"مئی ٹھیک ہے، جیسا آپ کہیں۔" اس نے فرمانبرداری کا مظاہرہ کیا اور کھیل کے پیچھے کھلے گیٹ سے باہر نکلا۔ باہر نکلتے ہی اس کی نظر وہاں کھڑی گاڑی پر پڑی اور وہ یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ گاڑی میں کھیل کے ساتھ فردوس بھی موجود ہے۔

"بھائی کو اس وقت زحمت کیوں دی؟" اسے احساس تھا کہ دن بھر کی مصروفیت اور پھر تقریب میں شرکت کے بعد فردوس بھی تھکی ہوئی ہے۔

"کھیل کے اس وقت گھر سے نکلنے کا جواز پیدا کرنے کے لیے فردوس کا ساتھ جانا ضروری تھا۔ کھیل یہ کہہ کر نکلا ہے کہ اسپتال سے فردوس کے لیے ایمر جنسی کال آئی ہے۔ چوکیدار سمیت کسی کو بھی علم نہیں ہے کہ اس وقت کھیل تم لوگوں کے انتظار میں یہاں کھڑا ہے۔" کھیل نے اسے فردوس کی گاڑی میں موجودگی کی وجہ سے آگاہ کیا۔

"تھیک ہو کھیل بھائی۔ آپ لوگوں کا یہ غلوں میں بیٹھ یاد رکھوں گا۔" عالم شاہ نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھ کر مثنویت سے کہا تو انہوں نے محبت سے اسے گلے لگا لیا اور پوئے۔

"تم ہمارے بھائی ہو عالم اور ساتھ ہی مہمان بھی۔ تمہارا خیال رکھنا تو ویسے بھی ہمارا فرض تھا اور یہاں تو ویسے ہی تم پر آنے والی مصحتوں کی ذمہ داری ہمارے گھر

ہو جائے۔

”کیا خیال ہے، کسی بیکری وغیرہ پر رک کر ان لوگوں کے ہاتھ سے لے لے کچھ سامان نہ لے لیں؟“

سوچوں میں غلطاں بہت سا سفر خاموشی سے گزر گیا تو فردوس نے تجویز پیش کی۔ اب صبح کا اجالا ہر طرف پھیل چکا تھا اور گاڑی ایک ایسی سڑک سے گزر رہی تھی جس کے اطراف میں مختلف نوعیت کی دکانیں موجود تھیں۔ پشتر دکانیں ابھی بند تھیں لیکن دودھ، دہی، حلوا پوری اور بیکری جیسی دکانیں، جن پر لوگوں کے ہاتھ سے کاٹھنڈے کا انحصار ہوتا ہے، کھل چکی تھیں۔

”کوٹھی پر گل خان موجود ہے۔ انہیں جس بھی شے کی ضرورت ہوگی وہ خود لادے گا۔ ہمیں راستے میں نہیں رکنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ اسی رفتار سے گاڑی چلاتے ہوئے جلیل نے سیٹ سے انداز میں جواب دیا تو فردوس جیسے نہپ کر خاموش ہو گئی۔ باقی کا راستہ بھی اسی خاموشی سے گزرا۔ آخر کار جلیل نے ایک کوٹھی کے گیٹ کے سامنے گاڑی روکی اور ہارن دیا۔ گیٹ میں بے چہرے سے خانے کو کھول کر کسی نے باہر جھانکا اور جلیل کو دیکھ کر جلدی سے پورا گیٹ کھول دیا۔ جلیل گاڑی اندر لے گیا۔ گیٹ کھولنے والا گیٹ بند کر کے تیزی سے ان کی طرف لپکا۔

”سلام صیب۔ ام کو کھیل صیب کا خون آیا تھا، جب سے ام آپ کا واسطے گیٹ کھولنے کے لیے ریڑھی کھڑا ہے۔“ دواچی گھیر دار لباس میں لمبوس سر پر ٹوپی لگائے وہ اپنے چھان ہونے کا منہ بولا اشتہار تھا۔

”وہیکم السلام گل خان! ذرا اس طرف آؤ اور میری بات دھیان سے سنو۔“ چہ کیدار کے سلام کا جواب جلیل کے بھائے فردوس نے دیا اور اسے اپنے پاس بلا دیا۔ جلیل کی طرح وہ بھی گاڑی سے نہیں اتری تھی اور اسی وجہ سے عالم شاہ اور سرہ بھی تہذیب کا شکار ابھی تک گاڑی میں ہی براجمان تھے۔

”ام کو باجی (مٹائی) دو ڈاکٹر صیب۔ ام نے دیکھا نئی کہ آپ بھی صیب کے ساتھ ہو۔“ گل خان لپک کر فردوس والی سائیڈ پر پہنچا اور زور و شور سے معذرت کرنے لگا۔

”نو پر اہم گل خان! میں نے برا نہیں مانا۔“ فردوس نے مسکرا کر اسے جواب دیا۔

”پر اہم کیا نئی اسے بی بی صیب! اماں گھر والی کو پتا لگے گا کہ آپ ادھر آیا تھا اور ام نے آپ سے اس کا پیاری کا دواچی نکھوایا تو وہ اماں جینا حرام کہے گا۔“

”تمہاری گھر والیوں کی بیماریاں سن کر دوا میں کھینے کا وقت نہیں ہے بی بی کے پاس۔ تم خاموشی سے وہ سنو جو بی بی تم سے کہہ رہی ہیں۔“ گل خان یقیناً کوئی لمبی کہانی چھیڑنے کے سوا میں تھا لیکن جلیل نے ڈپٹے والے اعجاز میں اسے حکم دیا تو بالکل بھیگی بی بی بن کر کھڑا ہو گیا اور دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر یوں ساکت کھڑا ہو گیا جیسے اب فردوس کی بات سننے سے قتل سانس لینا بھی اس پر حرام ہو۔ اپنے گول منہل چہرے پر اس قسم کی سنجیدگی طاری کیے کھڑا وہ کچھ ایسا مستحکم فیزک رکھتا تھا کہ ماحول کی کشیدگی کے باوجود دیکھنے والوں کو نفسی آری نہ تھی۔

”تمہارے ساتھ کھیل بھائی کے مہمان ہیں۔ یہ دونوں کچھ عرصہ یہیں رہیں گے۔ تمہیں ان کا ہر طرح سے خیال رکھنا ہے لیکن خیر دار! ان کی یہاں موجودگی کا کسی کو پتا نہیں چلنا چاہیے ورنہ کھیل بھائی تمہارے کان بھینچیں گے۔“ فردوس نے ہونٹ دبا کر اپنی مسکراہٹ روکی اور خود پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے گل خان کو ہدایات دیں۔

”کھیل صیب سے آپ اماں سپارش (سٹارش) کرنا کرام سے کوئی کٹی لٹی (گٹلی) ہو جائے تو اماں کے کان کو چھوڑ کر کچھ اور کھینچ لیتا۔ اماں کان پہلے ہی پیدائشی طور پر بہت بڑا ہے۔ صیب نے کھینچا تو اور بڑا ہو جائے گا۔ ادھر ویسے بھی جب سے عاشر خان کا وہ پھلم (فلم) لی کے آیا ہے بچہ لوگ نے اماں نام گل خان کے بھائے بی کے رکھ چھوڑا ہے۔ اب اگر کان اور لہا ہو گیا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ ام کو دوسرے گولے کا حقوق بول کر راکٹ میں بٹھائے اور اوپر خلا میں پھینک دے۔“ اس نے جلدی سے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ کر اس طرح بولنا شروع کر دیا جیسے کوئی بچہ کچھ اس کے کان بھینچ کر لپے کرنے لگا ہو۔ اس بار فردوس اپنی ہنسی کو نہیں روک سکی۔ عالم شاہ اور سرہ کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آگئی۔ گل خان کے کان واقعی معمول سے ذرا بڑے تھے اور بالکل نظر میں ہی ٹولس میں آگئے تھے۔

”یہ ہنسی مذاق کا وقت نہیں ہے۔“ جلیل نے پہلے ہنسی ہوئی جی کو گھور کر گل خان کو غضب ناک نظروں سے دیکھتے ہوئے سخت لہجے میں بولا۔

”ڈکی سے مہمانوں کا سامان نکالو اور بی بی نے مہمانوں کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اسے اپنے دماغ میں اچھی طرح بٹھالو۔ اگر کوئی گھوڑ ہو تو تمہاری خیر نہیں ہوگی۔“ اس کے سخت لہجے نے اثر دکھایا اور گل خان کسی جمعیت میں پڑے بغیر اس سے ڈکی کی چابی لے کر پیچھے کی

”ایں... وہ کیا صیب؟“ گل خان کا منہ کھل گیا۔ ”آپ امارے ساتھ کھول کر رہا ہے صیب۔“
”ایسے ہی منہ سے ایک بات نکل گئی یا راہ لیکن اب میں بالکل سیریس ہوں اور تمہیں صاف بتا رہا ہوں کہ اگر آدمے گھنٹے کے اندر اندر مجھے ڈھنگ کا ہاتھ نہیں ملا تو میں فوت ہو جاؤں گا۔“

”پھوٹ ہو آپ کا دھمن۔ امارا ہوتے ہوئے آپ کم سے کم بھوک سے پھوٹ نہیں ہو سکتا۔“ گل خان فوراً ہی نہایت خلوص سے بولا اور ناٹا تیار کرنے کے لیے بکن کا رخ کیا۔ اس کے جانے کے بعد عالم شاہ نے لفافہ کھول کر دیکھا۔ اس میں ابھی خاصی بھاری مالیت کی انڈین کرنسی موجود تھی۔ گھیل نے انہیں محفوظ پتہ گاہ فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی خیال رکھا تھا کہ کسی آڑے وقت میں رقم نہ ہونے کی صورت میں انہیں پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ عالم شاہ نے دو رقم سرمد کو تھما دی۔

”آپ نے آگے کا کیا سوچا ہے سائیں؟“ رقم والا غار مناسب جگہ پر رکھ کر سرمد نے اس سے پوچھا۔

”میرے ذاتی خیال میں تو ہمیں اپنے سفارت خانے سے رابطہ کر کے مدد مانگنا چاہیے لیکن خود سے کوئی قدم اٹھانے سے پہلے گھیل بھائی سے مشورہ کرنا ضروری ہے۔ وہ ہمارے ساتھ ٹھہر رہے ہیں اور یہاں کے حالات کو بھی زیادہ بہتر طور پر جانتے ہیں۔ تو بیتر ہو گا کہ ہم ان کے مشورے کے مطابق ہی عمل کریں۔ دیکھو، انہوں نے کہا تو ہے کہ موقع دیکھ کر ہمارے پاس چکر لگائیں گے۔ میرے خیال میں تو وہ دہرے پہلے ان کا آنا مشکل ہو گا اس لیے بھر ہے کہ ہم اس عرصے میں اپنی خیمہ پوری کر لیں۔“ عالم شاہ نے اسے طعنی جواہد دیا۔

”تکلی بی بی کو اس سارے چکر کا پتا چلتا تو بہت پریشان ہوں گی۔“ سرمد نے تشویش کا اظہار کیا۔

”پتا تو چل گیا ہو گا۔ پولیس جتنے جارحانہ فیروں سے وہاں پہنچی تھی یہ ممکن ہی نہیں کہ وہاں کسی سے حالات چھپے رہ سکیں۔“ وہ خود اپنی جگہ پریشان تھا۔ نیاز شاہ کے ہاں سے نکلتے ہوئے پولیس کی گاڑی کے جو سائرن بنے تھے، ان کی آوازیں اب بھی کانوں میں گونج رہی تھیں۔ پولیس والے جس اٹھارے آئے تھے اس سے بھی لگ رہا تھا کہ یہاں نہیں کتنے خطرناک مجرموں کو پکڑنے آئے ہیں۔

”مجھے تو پولیس کے اتنی جلدی اکیٹھ ہونے پر حیرت ہے۔ میں چہ کہہ رہا ہوں اس دشنام کے بندے کو جتنی مضبوطی

طرف لپکا۔ عالم شاہ اور سرمد بھی دروازے کھول کر گاڑی سے بچھا تر گئے۔

”سوری! ہم لوگ جلدی میں ہیں۔ جھوٹ کو نبھانے کے لیے اب مجھے سچ سچ اسپتال جانا ہو گا۔ جلیل مجھے ڈراپ کر کے واپس چلے جائیں گے۔ تم لوگ یہاں آرام سے رہو۔ گل خان تھوڑا سا ہاتھ لیکن بہت فرض شناس بندہ ہے۔ یہ تم لوگوں کا پورا پورا خیال رکھے گا۔“ گل خان کے لڑکی کھول کر بیگ لٹا لٹے کے دوران فردوس نے جلدی جلدی وضاحت کی۔ وہ جلیل کے رویے کے انداز پر کچھ نفرت زدہ نظر آتی تھی۔

”تو پراہم بھائی! آپ جائیں، ہم ایڈ جسٹ کر لیں گے۔“ عالم شاہ کو فردوس کا شرمندہ ہونا اچھا نہیں لگا اس لیے جلیل کے رویے کو محسوس کرنے کے باوجود مسکرا کر اسے تسلی دی۔

”یہ گھیل بھائی نے جھپٹے کو کہا تھا۔“ جلیل نے گاڑی اسٹارٹ کر لی مگر جب فردوس نے اپنے پرس میں سے ایک پھولا ہوا لفافہ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ عالم شاہ اس لفافے کے پارے میں کوئی استدراج اس سے قبل ہی جلیل کی گاڑی حرکت میں آ چکی تھی۔ گل خان جو گاڑی اسٹارٹ ہوتے ہی گیٹ کی طرف دوڑ لگا چکا تھا، جلیل کے گیٹ تک پہنچنے سے گلی گیٹ کھولنے میں کامیاب رہا۔ دلیے اسے بھاگتے ہوئے دیکھنا بھی ایک دلچسپ تجربہ تھا۔ بالکل یوں محسوس ہوا تھا جیسے ایک بڑے سے فٹ بال کو زوردار لگ لگا کر حرکت کر دیا گیا ہو۔ نہایت پھولے قد کے ساتھ بھاری بدن کا ہونے کے باعث وہ کسی فٹ بال ہی کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ اس پر اس کے بڑے بڑے کان اسے مزید منفرد بناتے تھے۔

”آکا صیب! ام آپ لوگوں کو آپ کا کمراد دکھا دیتا ہے۔“ گیٹ بند کر کے آنے کے بعد وہ مستعدی سے ان کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ اس نے انہیں ان کے کمرے دکھائے۔ عالم شاہ کے لیے بڑا گیٹ روم تھا جس میں ہر آسائش مہیا کی گئی تھی۔ سرمد کے لیے نہایت چھوٹا لیکن صاف ستھرا اور بہ سہولت کمرہ قریب ہی تھا۔

”ام سارا کوٹھی کو ایک دم چکا چک آئیے کے ماکھ صاف ستھرا کر کے رکھتا ہے۔ آپ کو فیر بھی کوئی شکایت ہو تو ام کو بتاؤ۔ ہم سب ٹھیک کر دے گا۔“

”کیوں...؟ کیا تم براعت ہو؟“ عالم شاہ کے منہ سے بے ساختہ ہی پھسلا۔

سے ہاتھ کر آیا تھا، مجھے امید نہیں ہے کہ وہ دونوں خود سے آزاد ہو سکے ہوں گے۔

”ہوسکتا ہے انہیں باہر سے مدد مل گئی ہو۔ ان کا کوئی ساتھی وغیرہ وہاں آگیا ہو۔“ عالم شاہ نے سرمد کی بات پر جوابی تبصرہ کیا۔ سرمد اس موضوع کو مزید آگے بڑھاتا اس سے گل گل خان ناشتے پہنچے مگر ٹرائی لے آدھکا۔

”آپ لوگ تنکا ہوا تھا اس لیے ام ادھر میز پر بیٹھا لگانے کے بجائے ادھر ہی لے کر آگیا۔ اب آپ جلدی سے ناشا کرو اور پھر موت موت ہونے کا بات بھول جاؤ۔“ گل گل خان عالم شاہ کی فوت ہونے والی بات اس نے دل سے لگا لی تھی اور اب نہایت ٹھڑے ناشتے کے ساتھ خدمت میں حاضر تھا۔ ناشتے کے لوازمات میں پرائیوٹ، آلیٹ، اپنے ہوئے اڑے، جیم، ڈبل روٹی، مارجرین، دودھ اور جس سے بھرے ہوئے جگن کے علاوہ ایک ڈوگے میں تھامی اور ایک میں سری پائے تنک دکھائی دے رہے تھے۔ حقیقتاً وہ تین منزلہ بڑی میٹرائی کو بیوں لبالب بھر کر لایا تھا کہ ٹرائی میں مل دھرنے کی جگہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

”یہ دو افراد کا ناشا ہے بلکہ رے لکڑ کا؟“ عالم شاہ نے اسے پھینکا۔ اسے سادہ حراج گل خان اچھا لگا تھا اور طبعا زیادہ خوش نہ ہونے کے باوجود اسے پھینکا اچھا لگ رہا تھا۔ ”ٹھیک صیب نے ام کو فون کر کے بولا تھا کہ کوئی پر ان کا مہمان آ رہا ہے تو ام نے سوچا اتنی صبح آنے والا ناشا تو کرے گا۔ آنے والا کتنا لوگ اسے اور ناشتے میں کیا پسند کرتا اسے، یہ تو ام کو بھی پتا تھا اس لیے ام نے ویسی اور انگریزی دونوں طرح کے ناشتے کا انتظام کر لیا۔ آپ کھا کر دیکھو، آپ کا طبیعت خوش ہو جائے گا۔“ گل خان کے جواب نے ظاہر کر دیا کہ بے شک وہ سادہ طبیعت کا ہے لیکن انتظامی صلاحیت رکھتا ہے۔ کوئی کو بھی اس نے بہت اچھی حالت میں رکھا ہوا تھا۔

”یہ سارا ناشا تم نے خود تیار کیا ہے؟“ عالم شاہ نے حیرت سے پوچھا۔

”نئی صیب! ابھی ام نے صرف آلیٹ، پرائیوٹ، پرائیوٹ تازہ جس بتایا اسے۔ باقی سب باہر سے خرید کر لایا اسے لیکن آپ بھکر مت کرو۔ ام کو بہت اچھا کھانا پتا آتا اسے۔ ابھی لیم (ٹائم) کم تھا اس لیے باہر سے سامان خرید کر لے آیا۔ دوپہر میں ام خود آپ کے لیے کھانا تیار کرے گا۔“ اس نے گویا انہیں تسلی دی۔

”اس بیماری بھر کم ناشتے کے بعد دوپہر کے کھانے

کی کھانکشی ہی کہاں رہے گی۔“ عالم شاہ ہنسا۔

”نئی صیب! کھانا تو آپ کو امارے ہاتھ کا لازمی کھانا ہوگا۔ ادھر دلی کا پتھر سے والا بریانی یا امارا افغانی پلاؤ، جو آپ یو لوام سب بنا دے گا۔“

”ٹھیک ہے بھائی! اپنا افغانی پلاؤ بنا لیتا۔ اب تو خوش؟“ عالم شاہ اس سے ادھر ادھر کی باتیں کر کے مسائل کی طرف سے اپنا دھیان ہٹانے کی شعوری کوشش بھی کر رہا تھا۔ مسائل کے ساتھ ساتھ وہ رہ کر اجالا کا بھی خیال آرہا تھا۔ نیکل کے مرنے کی خبر یقیناً اس کے لیے ایک بڑا صدمہ ثابت ہوئی اور وہ جس قدر جذباتی اور خود مر لڑکی تھی، اس سے معمولی رد عمل کی امید نہیں کی جاسکتی تھی۔

”ام افغانی پلاؤ کے ساتھ چٹنی کہاں بھی بنائے گا۔ کھا کر آپ کا دل خوش نہ ہو تو بے شک اپنا چٹل امارے سر پر برسا دیتا۔“ گل خان کو یقیناً اپنے بنائے کھانوں پر غضب کا اچھا دھماکا ایسی پینکشن کر رہا تھا۔ عالم شاہ ایک بار پھر فیس پڑا اور بولا۔

”ٹھیک ہے خان۔۔۔ دوپہر کو تمہیں آزمائیں گے۔ ابھی تو ناشتے کے ساتھ کوئی چائے شائے کا انتظام کرو۔ ناشتے میں چاہے ہزار لوازمات ہوں، چائے کے بغیر ناشا ادھورا لگتا ہے۔“ وہ جو سرمد کی معائنات سے ناشا شروع کر چکا تھا، ناشتے کے لوازمات میں چائے موجود نہ پا کر گل خان کو لوگ بیٹھا۔

”اوسے امارا خانہ خراب۔ ام بھی تو پوچھنے آئی تھی کہ آپ ناشتے کے بعد چائے پیے گا یا کافی، پر باتوں میں دماغ سے نکل گیا۔“ اس بار گل خان نے تذکیر و تانیث کی غلطی کر کے بہت کر دیا کہ وہ بہر حال پشیمان ہے جس کی اس معاملے میں بھی نہ بھی زبان کھل جاتی ہے۔

”بس تو جاؤ، ٹکٹ چائے تیار کر کے لے آؤ۔ ناشا کر کے ہم لوگوں کو سونا بھی ہے۔“ عالم شاہ نے اسے چٹا کیا پھر سرمد سے غائب ہو کر بولا۔

”تم نے کیوں ابھی تک ناشا شروع نہیں کیا؟“ ”آپ آرام سے کھا لیں، سائیں! میں بعد میں کروں گا۔“ سرمد نے حسب معمول تکلف سے کام لیا۔ وہ مراحب کا خیال رکھتے والا انسان تھا۔

”تکلف چھوڑو یاد امیر سے ساتھ تم بھی رات بھر خوار ہوتے رہے ہو۔ جلدی سے کھاؤ اور آرام کرو۔ آگے نہ جانے میں کن حالات کا سامنا کرنا پڑے۔“ عالم شاہ نے اسے نصیحت کی۔

جولائی 2021ء

”ہمیں اس سلسلے میں ایک بار پھر سوچ لینا چاہیے۔“
گیٹ سے باہر نکلنے کے بعد انہوں نے پُر فکر تاثرات کے
ساتھ گفتگو کا آغاز کیا۔

”فیصلہ کرنے کے بعد بار بار سوچنا انسان کے
ارادوں کو کمزور کر دیتا ہے۔“ علیہ نے انہیں سمجھایا۔

”مجھے تمہاری وجہ سے زیادہ فکر ہے۔ مجھے اب بھی
لگتا ہے کہ مجھے تمہیں ساتھ لے کر ایک اچھی سے ملاقات
کے لیے نہیں جانا چاہیے۔“ وہ گھر سے کل تو کمرے ہوئے
تھے لیکن اب بھی کوٹھڑی کی کیفیت کا آثار تھے۔

”اور میں آپ کو اکیلا کہیں نہیں جانے دوں گی۔“
علیہ کا لہجہ اس کے اہل ارادے کا مظہر تھا۔

”پتا نہیں مجھے ابھی اور کون کون سے دھوکے دیکھنے ہیں۔
اولاد بھی سہ بات نہیں سمجھ سکتی کہ انہیں پہنچنے والی ہر تکلیف
ماں باپ کا جگر چھلی کر دیتی ہے۔“ خاور صاحبہ یک وقت
دکھ اور بے بسی کا شکار نظر آ رہے تھے۔ علیہ نے جان بوجھ
کر ان کی حالت سے نظریں چرائیں۔ اندیشے اس کے دل
میں بھی تھے لیکن وہ خاور احمد کی بات مان کر انہیں اکیلے کہیں
بجینے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اسی کے بعد ابو کو کھونٹے کا حوصلہ
نہیں تھا اس میں اس لیے بھی سوچا تھا کہ ابو کے ساتھ وہ کر
بھلا یا برا جو بھی ہونے والا ہے، اس کا سامنا خود بھی کرے
گی۔ البتہ نوعمری کے باوجود اسے عورت کی عزت کے
حوالے سے شعور تھا اور وہ اپنے لباس میں بچہ کی نیند کی
گولیاں چھپا کر لائی تھی۔ کسی کے اپنی عزت کی طرف ہاتھ
بڑھانے سے پہلے ہی اس میں اپنی جان پر کھیل جانے کا
حوصلہ تھا۔

”مجھے پارک کے گیٹ کے قریب گاڑی کھڑی دکھائی
دے رہی ہے۔ یہ وہی کل والی گاڑی ہے۔“ خاور احمد نے
دور سے گہری نکل ڈالیں کو شناخت کر لیا۔

”کیا خط لانے والا لڑکا بھی موجود ہے؟“ علیہ
پُر جوش ہوئی اور گاڑی کے آس پاس نظریں دوڑائیں۔ فی
الحال گاڑی کے بعد باہر کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔

”لگتا ہے وہ گاڑی کھڑی کر کے خود ادھر ادھر کہیں گیا
ہوا ہے۔“ خاور صاحب نے اندازہ لگایا۔ اب الگ پارک
سے بہت کم فاصلہ رہ گیا تھا ابھی ڈالیں تو بس وہیں قدم کی
دور کی پر ہی کھڑی تھی۔ ایسے میں ابو کے کا سر جوڑ ہونا انہیں
ابھس میں جتا کر رہا تھا۔ درمیانی فاصلہ مزید سمٹ کر محض
چار قدم رہ گیا تو ڈالیں کا بچھلا وہ اندر چاٹک ہی نکلا اور
وہی لڑکا چہرے پر مسکراہٹ سمجاسے باہر نکلا۔ وہ یقیناً سیٹ پر

”اللہ سامیں بہتر کرے گا سامیں! ان شاء اللہ ہم
جلد اس پکڑ سے نکل کر اپنے وطن میں ہوں گے۔“

”اللہ تمہاری زبان مبارک کرے لیکن پتا نہیں کیوں
بار بار میرے دل میں یہ وہم آ رہا ہے کہ یہ معاملہ طول
پکڑے گا۔“ اس نے اپنی اندرونی کیفیت سرمد کے ساتھ
شیئر کی۔

”اللہ سامیں سب خیر کرے۔“ سرمد نے ایک بار
پھر دعائے انداز اختیار کیا اور عالم شاہ کے دوبارہ کہنے پر
ناشتے میں شامل ہو گیا۔ دونوں ہی رات مہندی کی تقریب
سے کھانا کھائے بغیر غائب ہو گئے تھے لیکن پھر بھی اسے
پُر اہتمام اور خوش ذائقہ ناشتے سے بھرپور انصاف کرنے
میں کامیاب نہ رہے۔ معلوم نہیں یہ نیند کی کمی کا اور تھکن کا
نتیجہ تھا یا اوصافی تنہا کا۔ گل خان کی تیار کردہ خوشبودار
چائے دونوں نے البتہ شوق سے پی اور اس کے بعد تھوڑی
سی کوشش کے بعد اپنے اپنے کمروں میں لمبی تان کر
سو گئے۔ سولی پر بھی آجانے والی نیند بالآخر ان پر مہربان
ہو چکی تھی۔

☆☆☆

”بچہ! میں اور ابو ذرا واک کے لیے پارک تک
جا رہے ہیں۔“ اس نے وردوار سے ہی سے جھانک کر دھلتے
ہوئے کپڑوں کو تسکاتی بچہ کو اطلاع دی تو ان کے ساتھ ساتھ
لیپ ٹاپ پر مصروف تو یہ بھی اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”ٹھیک ہے بیٹا، جاؤ۔ اچھا ہے کہ خاور کو باہر نکلنے کا
خیال آنے لگا ہے ورنہ مجھے تو ڈر لگنے لگا تھا کہ کہیں وہ گھر
میں پڑے پڑے پیار نہ ہو جائے۔“ ان کے لہجے میں
بیٹوں والی مخصوص گہر مندی تھی۔

”ماسوں جان بلڈ پریشر کی دوا تو پابندی سے لے
رہے ہیں، علیہ؟“ ثوبیہ نے بھی گھر سے پوچھا۔

”جی آپ! میں خود اپنی نگرانی میں انہیں دوا کھلاتی ہوں۔“
”گند اب تم جاؤ۔ آج میں گھر میں ہی ہوں۔ رات

کے کھانے کے بعد ماسوں جان کا چیک اپ کروں گی۔“
ثوبیہ آج کل بہت مصروف رہنے لگی تھی۔ اسپتال، بچہ حائی
اور کالج کے چکر میں پھنسی وہ اپنے لیے آرام کا موقع بھی
مشکل سے نکال پاتی تھی اس لیے علیہ سمیت اس کی تمام
اہل خانہ سے کم عمریات چھت ہوتی گئی۔

”او کے آپ!“ علیہ نے مسکرا کر اس سے کہا اور
ہاتھ ہلا کر دہاں سے ہٹ گئی۔ بیرونی گیٹ کے قریب خاور
احمد اس کے منتظر تھے۔

لیٹا ہوا تھا اس لیے دور سے دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ان دونوں نے باقی کے چار قدم طے کیے جب تک وہ نہاں سے کوئی لفظ نکالے بغیر ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا اور انہیں اسٹارٹ کرنے لگا۔ جتنی دروازہ ہنوز کھلا ہوا تھا۔ خاور احمد ذرا سا جھجکے لیکن علیہ نے خود اعتمادی کا مظاہرہ کیا اور کھلے دروازے سے اندر نشست پر جا بیٹھی۔ اب خاور احمد کے پاس روکنے کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ بھی علیہ کے ساتھ ہی بیٹھ گئے۔ گاڑی فوراً چل پڑی۔

”تم ہمیں کہاں لے جا رہے ہو؟“ خاور احمد نے ڈرائیور سے دریافت کیا۔

”آپ خود دیکھ لیں گے سر!“ اس نے شائستگی سے جواب دیا۔

”ہمیں اس طرح سے بلوانے والا کون ہے؟“ انہیں اس کے ٹالنے والے انداز پر غصہ آیا۔

”میری ڈیوٹی صرف آپ کو طے شدہ جگہ تک پہنچانے کی ہے۔ باقی معلومات شاید آپ کو منزل پر پہنچ کر دی جائیں۔“ ان کے غصے کے باوجود اس کے لہجے کی شائستگی برقرار رہی۔

”گاڑی روکو۔ ہمیں تمہارے ساتھ نہیں جانا ہے۔“ وہ اعصابی تناؤ کا شکار تھے اس لیے اس کے جوابات پر ضرورت سے زیادہ غصہ آ رہا تھا۔ برابر میں بیٹھی علیہ نے ان کا ہاتھ تھام کر انہیں ریلیکس کرنے کی کوشش کی۔

”ایز یو وٹ سرائی؟“ ڈرائیونگ کرتے لڑکے نے ایسے انداز میں جواب دیا جیسے ان کے حکم کی تعمیل کرنے جا رہا ہے لیکن توقع کے برخلاف گاڑی چلتی رہی اور سرسری معمولی آوازوں کے ساتھ ڈرائیور اور ان کے درمیان ایک شیشے کی دیواری آ موجود ہوئی۔

”یہ کیا حرکت ہے؟“ علیہ نے بے ساختہ ہی دروازے کے وینڈل پر ہاتھ رکھا لیکن وہ جام تھا۔ اس نے شیشہ ٹپچے کرنے کی کوشش کی لیکن اس میں بھی ناکام رہی۔

”سوری امیں آپ لوگوں کو تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا لیکن آپ لوگوں کو کسی حاققت سے روکنے کے لیے مجھے یہ حرکت کرنا پڑی۔ میں نہیں چاہتا کہ جذبات میں آکر آپ لوگ دینا کوئی نقصان کریں۔“ جتنی طور پر وہ عقب نما آئینے میں سب دیکھ رہا تھا چنانچہ سمجھانے والے انداز میں بولنے لگا۔ درمیان میں شیشہ تھا اس لیے اب انہیں اس کی آواز اہلکار سے سنائی دے رہی تھی۔

”آخر تم لوگ کون ہو جنہیں ہمارے نفع نقصان کی اتنی

فکر ہے؟“ اس بار تو علیہ بھنپلا گئی۔ خاور احمد البتہ حیرت انگیز طور پر بالکل خاموش ہو گئے تھے۔ شاید یوں کہیں کر دے جانے پر ان میں کچھ بولنے کی سکت ہی نہیں رہی تھی۔

”میری آپ سے درخواست ہے کہ تھوڑی دیر صبر کر لیں۔ آپ کی ہر ایک بات بہت جلد دور ہو جائے گی۔“ اس نے نرمی سے جواب دیا تو علیہ ایک گہرا سانس لے کر پشت گاہ سے سرٹکا کر بیٹھ گئی۔ موجودہ صورت حال میں اس کا مشورہ مان لینے کے سوا کچھ کرنے کی گنجائش بھی نہیں تھی۔ گاڑی مختلف راستوں پر سے گزرتی ہوئی ماڈل ہاؤس میں داخل ہوئی اور ایک خوبصورت بنگلے کے سامنے جاد کی۔ ڈرائیور کے ہارن دینے پر بنگلے کا گیٹ کھل گیا۔ گاڑی کے اندر جا کر رکنے تک دونوں باپ بیٹی دیکھ چکے تھے کہ گیٹ کھولنے والے چوکیدار کے علاوہ اندرونی دروازے پر کھڑا شخص بھی پوری طرح مستحکم ہے۔

”آجے، اندر تشریف لے چلیے۔“ ابھی وہ ارد گرد کا عمل جائزہ بھی نہیں لے سکے تھے کہ ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان نوجوان نے مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جتنی جانب کے دروازے کھولے اور انتہائی تہذیب سے انہیں اندر چلنے کی دعوت دی۔ وہ دونوں قدرے حوصلے سے اس کی مانتھائی میں چل پڑے۔

”آپ دونوں یہاں تشریف رکھیے۔ کچھ دیر میں باس آپ سے ملاقات کریں گے۔“ وہ انہیں ایک شاندار ڈرائنگ روم میں چھوڑ کر واپس پلٹ گیا۔ انہیں وہاں بیٹھے چند منٹ ہی گزرے تھے کہ ایک ملازمہ لوازمات سے لٹی لڑائی لیے حاضر ہو گیا۔ لڑائی میں ٹھنڈے گرم شراب کے علاوہ ذخیرہ اسٹیکس موجود تھے۔

”آپ کیا لینا پسند کریں گے سر؟“ ملازمہ مودبانہ خاور احمد سے مخاطب ہوا۔

”کچھ نہیں۔“ انہوں نے روکے پن سے جواب دیا۔ ”پلیز سر! کچھ تو لیں۔“ اس نے ہنسا کر کہا۔ خاور احمد خاموش رہے۔

”آپ ایسا کریں کہ چائے بنا دیں۔“ علیہ نے آہستہ سے کہا۔ وہ اپنی عمر سے زیادہ کچھ داری اور ہمت کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ اس بنگلے کو دیکھ کر ہی اسے احساس ہو گیا تھا کہ جس شخص نے انہیں اسے قریب سے یہاں آنے کی دعوت دی ہے وہ یقیناً اتنا طاقتور اور با حیثیت ہوگا کہ اگر چاہتا تو انہیں زبردستی بھی یہاں بلا سکتا تھا۔ زبردستی نہیں کی تھی تو اس کا مطلب تھا کہ وہ دوست بن کر ان سے ملا

چاہتا تھا۔

”ہم زیادہ دیر یہاں نہیں رک سکتے۔ جس کسی نے بھی ہم سے ملنا ہے اس سے کہو کہ جلدی آکر ملاقات کر لے۔“ یہ مشکل آدھا کپ چائے زہر مار کرنے کے بعد خاور احمد نے ملازم سے کہا تو وہ سر جھکا کر باہر نکل گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں انہیں یہاں لانے والا لڑکا لہجے کے سامنے تھا۔

”آپ لوگوں کو کچھنے والی رحمت کے لیے میں آپ سے معذرت خواہ ہوں۔ ہاس وائل میں ایک میٹنگ میں تھے اس لیے فوری طور پر آپ کو اٹینڈ نہیں کر سکے۔ بس کچھ ہی دیر میں وہ یہاں کچھنے والے ہوں گے۔“ وہ اس انداز سے گفتگو کر رہا تھا جیسے کسی بڑے بزنس من کا سیکرٹری ہو۔

”ہم گھر والوں کو مطلع کیے بغیر آئے ہیں۔ اگر ہمیں واپسی میں زیادہ دیر ہوگئی تو وہ لوگ پریشان ہوں گے۔“ خاور احمد نے اسے بتایا۔

”آپ ایسا کریں بچہ کون کر کے انہیں بتادیں کہ ہمیں گھر واپس آنے میں دیر ہو جائے گی۔“ ان کی پریشانی دیکھ کر علیہ نے انہیں مشورہ دیا۔

”کوئی بہانہ بنانا پڑے گا۔“ خاور احمد نے بڑبڑاتے ہوئے سوہاگل جیب سے باہر نکالا۔

”ایکسکیوز می سرائے آپ یہاں سوہاگل استعمال نہیں کر سکتے۔ میں معذرت چاہتا ہوں لیکن آپ کو اپنا سوہاگل میرے حوالے کرنا ہوگا۔“ اس نے اتنی پھرتی سے خاور احمد کا سوہاگل چھینا کہ وہ حراحت تک نہ کر سکے۔

”یہ کیا تیزی ہے؟“

”یہ صرف ایک حفاظتی تدبیر ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ آپ کو یہاں ٹریس کیا جاسکے۔“ اس نے ان کا سوہاگل آف کرتے ہوئے جواب دیا اور ساتھ ہی سوالیہ نظروں سے علیہ کی طرف دیکھا۔

”میرے پاس سوہاگل نہیں ہے۔“ اس نے اس کی نظروں کا مشہوم سمجھتے ہوئے جواب دیا۔

”گڈ!“ وہ کہہ کر باہر نکل گیا۔

”یہ لوگ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔“ خاور احمد نے اپنا سر تھام لیا۔

”ہیٹرز لہجہ پریشان مت ہوں۔ پتا نہیں کیوں میرا دل کہہ رہا ہے یہ لوگ جو بھی ہیں ان سے لیے دوست ثابت ہوں گے۔“ علیہ نے انہیں تسلی دی۔

”دل کی گواہی ہمیشہ سچی ہوتی ہے صاحبزادی! مجھے

سپنس ڈائجسٹ

کیا آپ

لبوب مقوی اعصاب
کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے اعصابی کمزوری دور کرنے تھکاوٹ سے نجات اور مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے کستوری عنبر زعفران جیسے قیمتی اجزاء والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب ایک بار آزما کر دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوہلا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے بے پناہ اعصابی قوت والی لبوب مقوی اعصاب ٹیلیفون کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی پی مگکوالیس فون میں 10 بجے تا رات 9 بجے تک

المسلم دارالحکمت (پشاور)

(دیکسی پوتانی دواخانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061

0301-6690383

آپ صرف فون کریں۔ آپ تک

لبوب مقوی اعصاب ہم پہنچائیں گے

امید ہے کہ تمہیں ہم سے مایوسی نہیں ہوگی۔" بھاری آواز پر علیہ اور خاور احمد نے بیک وقت مڑ کر دیکھا۔ قدرے بھاری جھٹکا اور جھڑپ آدی کر رہے تھے۔ پانچاچھ سالہ بچے موجود تھا۔ وہ دونوں بچے سمیت اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"مجھے آپ سے جو بات کرنا ہے اس کے لیے اصولاً مجھے خود آپ کے پاس آنا چاہیے تھا لیکن ایک تو میں آپ سے اس ملاقات کو کسی کی نظروں میں نہیں آنے دینا چاہتا تھا دوسرے مجھے شک تھا کہ آپ کی رہائش گاہ پر ہونے والی گفتگو محفوظ نہیں ہوگی اس لیے آپ کو زحمت دینا پڑی۔" ہاتھ سے ان دونوں کو جینے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ شخص خود بھی ایک صوفے پر جا بیٹھا۔ اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کا رعب تھا اور سرخ غمور آنکھوں میں ایسی چمک تھی کہ باپ بیٹی دونوں کو اپنی زبانیں تلک محسوس ہو رہی تھیں۔

"ملاقات کا سب سے پہلا مرحلہ تعارف کا ہوتا ہے۔ اتفاق سے میں تو آپ دونوں سے ابھی طرح واقف ہوں لیکن آپ شاید ہی مجھ سے واقف ہوں۔ اس لیے پہلے میں اپنا تعارف کروا دیتا ہوں۔ میرا نام محمد یحییٰ ہے لیکن زیادہ تر لوگ مجھے لالہ یحییٰ کے نام سے جانتے ہیں۔" اس نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے خاص طور پر خاور احمد کی طرف دیکھا۔ نام سن کر وہ چمکے تھے اور انہیں سمجھ آ گیا تھا کہ یہ شخص انہیں قدرے شناسا کیوں محسوس ہو رہا تھا۔

"میرے خیال میں آپ کسی حد تک مجھ سے واقف ہیں اسی لیے میرے اس دعوے کو مان سکتے ہیں کہ میں آپ کے مسائل کے حل کے لیے آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔" لالہ یحییٰ نے فوراً ہی ان کا چوکنا محسوس کر لیا۔

"میں خود سے آپ کی اس ہمدردی کے لیے حیران ہوں۔" خاور احمد نے تھوک نکل کر اپنا حلق تر کرتے ہوئے یہ جملہ ادا کیا۔

"سوچا تو میں نے بھی کبھی نہیں تھا کہ مجھے کسی عام فرد سے اس طرح ملاقات کی ضرورت پڑ سکتی ہے لیکن بعض اتفاقات ایسے ہوتے ہیں جو دو مختلف دنیاؤں کے افراد کو آپس میں ملنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ میں آپ کے بیٹے معاذ کے ساتھ پیش آنے والے واقعات سے ابھی طرح واقف ہوں۔ اب آپ اسے اتفاق کہیے کہ میرا بیٹا تو نہیں لیکن بیٹوں جیسا ہی ایک لڑکا آپ کے بیٹے کے معاملات میں الٹا ہوا ہو گیا اور یوں میرا آپ سے ایک تعلق بن گیا۔ محالہ اس وقت لفظوں والے لب و لہجے کے بجائے بہت طریقے اور سلیقے سے بات کر رہا تھا اسی لیے خاور احمد میں بھی ہمت

پیدا ہوئی کہ اس سے کوئی سوال کر سکیں۔

"میں سمجھا نہیں کہ آپ کیا بات کر رہے ہیں اور میرے بیٹے کا آپ کے منہ سے لے جانے سے کیا تعلق ہے؟"

"تعلق میں سمجھاتا ہوں۔" لالہ نے خاور احمد کو تھمیل سے بتانا شروع کر دیا کہ جیسے آشیانہ آزادی نام کی ایک پرانی حویلی میں معاذ اور وقاص (وکی) کی ملاقات ہوئی اور کوئی تعلق نہ ہوتے ہوئے وقاص، معاذ کی مدد پر کمر بستہ ہو گیا۔ یہ جان کر تو وہ لوگ حیران ہی رہ گئے کہ اپنے محبوب کے عرصے میں معاذ کچھ دن وقاص کے ایک قلیٹ میں بھی مقیم رہا لیکن پھر سب کے اقوال کی اطلاع ملنے پر اس نے وکی کو بتائے بغیر خود کو اپنے دشمنوں کے حوالے کر دیا اور پھر بعد میں وکی کی تمام تر کوششوں کے باوجود اسے معاذ کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔

"میں نے اپنے بیٹے کو ہمیشہ بے پیر اور غیر مستقل مزاج ہونے کے طعنے دیے لیکن اس نے پہلی کو بچانے کے لیے جس طرح قربانی دی ہے، میں خود کو اس کے سامنے شرمسار محسوس کرتا ہوں۔" خاور احمد نے تم آنکھوں سے معاذ کے بارے میں تبصرہ کیا۔

"کبھی کبھی انسان سے اپنے بچوں کو سمجھنے میں بھی غلطی ہو جاتی ہے۔ جہاں تک مجھے معاذ کے بارے میں معلوم ہوا ہے، اس سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ وہ غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک ایک اچھا لوجوان ہے۔ کراچی میں میرے گھوڑا سودا کی ایک بندے کا معاذ سے جیل میں واسطہ پڑ چکا ہے۔ وکی کے علاوہ مجھے گھر سے بھی معاذ کے بارے میں کچھ باتیں جاننے کو ملیں اور میں نے محسوس کیا کہ معاذ ان بچوں میں سے ہے جن پر والدین کو بھلا طور پر فخر ہونا چاہیے لیکن ایسے بچوں کی بدقسمتی یہ ہوتی ہے کہ ان کے غیر معمولی ہونے کی وجہ سے والدین بھی انہیں سمجھ نہیں پاتے۔ آپ بہر حال پھر بھی خوش قسمت رہے کہ آپ کے بیٹے نے آپ کے کھلائے رزق حلال کی لالچ رکھنے کی کوشش کی اور خود کو منشی سرگرمیوں میں ملوث نہیں کیا۔" لالہ کی باتیں سن کر خاور احمد کا دم مزید بڑھ گیا جبکہ علیہ کی آنکھوں سے ہاتھ دھو آنسو بہہ لگے۔

"آپ خفک کہتے ہیں۔ میں اپنے بیٹے کو پوری طرح سمجھ نہیں پایا اور اب اسے سمجھنے لگا ہوں تو وہ نہ جانے کن دور آوروں کے چمک میں گھس گیا ہے کہ چاہتے ہوئے بھی ہمارے درمیان واپس نہیں لوٹ سکتا۔" جذبات کی شدت سے خاور احمد کا گلا بندھنے لگا۔

”کیا آپ سے معاذ کا کوئی رابطہ ہوا تھا؟“ لالہ کو ان کی بات نے چوٹ لائی۔

”جی..... ایک بار وہ اچانک ہم سے ملنے آیا تھا۔ اپنے بارے میں زیادہ کچھ بتایا نہیں۔ بس یہی اعزازہ ہوا کہ کچھ ایسے طاقتور لوگوں کے چنگل میں ہے کہ اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتا۔“ خاور احمد نے اعتراف کر لیا۔

”آپ نے اس سلسلے میں بزدلی یا عرقان اللہ میں سے کسی سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی؟“ لالہ نے غصا انداز میں پوچھا۔

”مجھ جیسے عام سے سرکاری ملازم کی کوششوں کی اوقات ہی کیا ہے۔ قانون بھی ہم جیسوں کا ساتھ دینے کے بجائے طاقتوروں کے ساتھ سودا کر لیتا ہے۔ معاذ کے ساتھ چھری دھن کی آگ نے جب میرے دوسرے بچوں کے ساتھ ساتھ اس کے دوست احباب کو بھی لپیٹ میں لیتا شروع کر دیا تو مجھے تن بہ نقد یہ ہو کر خاموشی سے ایک طرف ہونا پڑا۔“ انہیں بے ساختہ ہی بشری کے خاندان کا الٹا انجام اور حسنین کی تھوڑے دنوں میں باد آگئی تھی۔

”ہمارے ہاں شریف اور کمزور لوگوں کو ایسا ہی کرنا پڑتا ہے۔ میں آپ کو ایک بات اور بتا دوں کہ میں تو بزدلی اور عرقان اللہ بھی خالص طاقتور لوگ ہیں لیکن آپ کا چناؤ ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہے جو ان کے بھی باپ ہیں۔ میں خود بھی ان لوگوں سے براہ راست ٹکر نہیں لے سکتا لیکن آپ کی اتنی مدد کرنے کی ضرورت کوشش کروں گا کہ آپ لوگوں کی وجہ سے معاذ کو بلیک میل نہیں کیا جاسکے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کی یہ کمزوری دور ہوگئی تو وہ ایک دن خود اپنے آپ کو ان کے مقابلے میں شہ زور ثابت کر دے گا۔“

”میں آپ کی اس مہربانی کی وجہ سمجھنے سے قاصر ہوں!“ خاور احمد کی حیرت بھائی۔

”وجہ میں آپ کو بعد میں بتاتا ہوں۔ پہلے آپ کی دلی سے ملاقات کرادوں۔“ لالہ نے اپنے ہاتھ میں موجود موبائل پر انگلیوں کو حرکت دیتے ہوئے کہا اور مختصر نظروں سے وردازے کی طرف دیکھنے لگا۔ ایک منٹ سے بھی کم دقت میں وقاص عرف دلی اجازت لے کر کمرے میں داخل ہوا۔ آج اس نے اہتمام سے بہترین چوٹ شرٹ پہن رکھی تھی اور سیاہ پال نہایت سلیقے سے جھے بوندے تھے۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی خوشبو کا ایک جھوٹا بھی ساتھ آیا تھا۔ خوش شکل وہ پہلے ہی تھا، اس تیاری کے ساتھ باپ بیٹی پر اس کی شخصیت کا مجموعی تاثر اچھا پڑا۔

”ہی سلام علیکم!“ اس نے خاور احمد سے ہاتھ ملا لیا اور علیحدہ سے نظر ملانے بغیر لالہ بیٹی کے قریب بیٹھ گیا۔

”معاذ کی مدد کرنے پر اس کے ہاتھیں دلی سے بھی سخت ناراض تھے۔ اگر میں درمیان میں نہ ہوتا تو شاید وہ اسے سخت مزاحمت دیتے۔ میں نے اسے ان کے صواب سے بچانے کے لیے کافی عرصے کے لیے دبی بھی بھجوا دیا تھا لیکن میرے لاکھ بھانے پر بھی یہ باز نہیں آتا۔ ابھی حال ہی میں اس نے معاذ کی دوست بشری کے گھر کے ساتھ مل کر عرقان اللہ کے خاص آدمی بالوں پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ قسمت ختمی کہ یہ لوگ اس کوشش میں مارے جانے سے بچ گئے اور میں سنجیدگی سے اس سے بات کرنے پر مجبور ہوا کہ آخر یہ کیوں خود کو اس معاملے سے الگ کرنے پر تیار نہیں ہوتا۔“

”مجھے بھی اس بات پر حیرت ہو رہی ہے کہ یہ لوجوان کوئی خاص تعلق نہ ہوتے ہوئے بھی اس معاملے میں اتنا اہمیت کیوں اور ہا ہے ورنہ تو ہمارے حالات ایسے ہیں کہ چند ایک کو چھوڑ کر زیادہ تر عزیز واقارب اور دوست احباب نے ہم سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے۔“ خاور احمد نے وقاص کو غور سے دیکھتے ہوئے اپنی حیرت کا اظہار کیا۔

”یہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہے خاور صاحب!“ ”مطلب؟“ خاور احمد پوچھ گئے۔

”مطلب یہ کہ...“ لالہ بیٹی کی لٹا ہونے والی علیحدہ سے پر جا کر تک نہیں۔

☆☆☆

”میں یہ نہیں کر سکتا۔“ ”یہ ضروری ہے معاذ! تم یہ سوچ کر اس کام کے لیے اٹھ نہیں کر دو کہ تم سے یہ کام ہم سارے ہیں۔ تم یہ سوچو کہ تم یہ کام اپنے وطن کے لیے کر رہے ہو۔“ سونیا نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔

”میکروں انسانی جالوں سے کھیل جانے میں بھلا میرے وطن کا کیا مفاد ہو سکتا ہے۔“ وہ آگ بگولا ہوا۔

”تمہارے حکام اعجاز، عباس اور سلیم درانی کو بھارت کی قید سے آزاد کروانے کے لیے یہ کارروائیاں کر رہے ہیں اور تم جانتے ہو کہ یہ تین افراد سچے جیوتی ہیں کہ ان کے لیے سو ڈیڑھ سو افراد کی جالوں کی قربانی دے دینا ہنگامہ سودا نہیں ہوگا۔“ سونیا نے تین ایسے افراد کے نام لیے جن کے بارے میں ہر خاص و عام یہ تاثر رکھتا تھا کہ یہ حکومتی سرپرستی میں کئی گروپوں کو کنٹرول کر رہے ہیں۔

”کیا ان تینوں کو ڈائریکٹ انکشن کے ذریعے نہیں

چہرہ دایا جاسکتا؟“ اس سے جو کچھ کرنے کو کہا جا رہا تھا اس کا ذہن وہ سب کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔

”اگر ایسا ممکن ہوتا تو یہ کام پہلے ہی کیا جا چکا ہوتا۔ ان تینوں کو نہایت سخت حفاظتی حصار میں رکھا گیا ہے اور وہاں تک کسی کی رسائی ممکن نہیں ہے۔ تمہاری حکومت کے پاس واحد حل یہی ہے کہ اس طرح کی کارروائیاں کر کے بھارت پر دباؤ ڈالے اور اسے مجبور کرے کہ وہ ان تینوں حضرات کو رہا کر دے۔“

”لیکن اس طرح تو ملک کی بدنامی ہوگی۔“

”پہلے کون سا بہت ٹیک ٹیک ٹامی ہے۔ بھارت شور مچائے گا تو تمہارے ہاں کے عہدے دار بیان داغ دیں گے کہ پاکستان کو بدنام کرنے کے لیے بھارت خود اپنی زمین پر اس طرح کی کارروائیاں کر رہا ہے۔ تمہارے ہاں لوگوں کو اس طرح کے بیانات دینے کی بہت پرکٹیس ہے۔“

سونیا کا لہجہ طنزیہ ہوا۔

”مجھے سوچنے کے لیے سہلت دو۔“ اس کے دل و دماغ ایسی کسی کارروائی کے لیے تیار نہیں ہو رہے تھے جس میں کئی بے گناہ افراد مارے جاتے۔ ابھی تو وہ سرد مگر والے دافنے میں ہونے والی ہلاکتوں کا بوجھ اپنے دل سے نہیں اتار پاتا تھا۔

”اتنا سوچ کر کیا کرو گے۔ کیا تمہیں اپنے گھر والوں کی جانیں پیاری نہیں ہیں؟“ سونیا کے لہجے میں واضح دھمکی تھی۔

”بکو اس بند کرو۔“ اسے غصہ آ گیا۔

”مجھے خاموش کروا کر تم حقائق کو بدل نہیں سکتے۔ تم سمیت تمہارے خاندان کی جان اور عزت ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ اگر تم نے انکار کیا تو ہو سکتا ہے کہ تمہارے گھر والوں کو برا اور راست نشانہ بنانے کے بجائے ان کی جان بچانے کے لوگوں میں چھ ایسی تصویریں اور ویڈیوز تقسیم کر دی جائیں کہ اس کے بعد وہ کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہیں۔“ سونیا نے ہاتھ میں تھا تا ایک چھوٹا سا بٹن اس کے سامنے پھینکا۔ بٹن میں موجود تصویریں ادھر ادھر بکھر گئیں۔ ان شرمناک تصویروں کو دیکھ کر معاذ کا منہ سرخ ہو گیا۔ تصویروں میں موجود عورت کا چہرہ واضح نہیں تھا لیکن وہ خود واضح طور پر پہچانا جا رہا تھا۔

”تم نے مجھے بلیک میل کرنے کے لیے یہ سارا پکر چلایا تھا؟“

”تم پر بھاری الزامیہ مسودہ کی گئی ہے۔ اسے وصول کرنے کے لیے ہر وہ پکر چلایا جاسکتا ہے جس کے ذریعے

تمہیں قابو کیا جاسکے۔“ اس نے اذیتا سے اعتراف کر لیا۔

”مجھے آج بھی یقین نہیں آتا کہ میں کیسے تمہارے حسن کے جال میں پھنس کر اخلاقی کی سطح سے اتنا نیچے گر گیا تھا۔ سچ بتاؤ تم نے مجھے قابو کرنے کے لیے کیا ترکیب لرائی تھی؟“ تصویروں کو دیکھ کر اسے غصہ آیا تھا لیکن اس نے انہیں پھاڑ کر ضائع کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ جانتا تھا یہ پڑتیس صرف اسے دکھانے کے لیے تیار کیے گئے ہیں اور ان کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔ وہ لوگ ان تصویروں کو پھیلانا چاہتے تو اس کے لیے ایک ٹک کافی تھا۔

”کیا تم میرے حسن کی چادر مری سے اٹکاری ہو؟“ مسکراتے ہوئے اس نے سینہ بان کر خود کو مزید نمایاں کیا۔ اس وقت اس نے مختصر سا ناپ لیس اسکرٹ نما لباس پہن رکھا تھا اور ظاہر ہے یہ لباس اس کی ستر پوشی کے بجائے ترشے ہوئے جسم کی نمائش میں بذیل وہ کردار ادا کر رہا تھا۔

”تمہارا یہ حسین جسم میرے نزدیک قصائی کی دکان پر پڑے اس گوشت کے ڈبیر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا جس پر دنیا جہاں کی کھیاں بھڑھار رہی ہوئی ہیں اور میں گندگی کے ڈبیر پر لپکتے والی مٹی ہرگز نہیں ہوں۔“ اس نے سونیا کو اشتعال دلانے کی پوری پوری کوشش کی تھی لیکن اس کی طرف سے کوئی سخت رد عمل نہیں آیا۔ بس ایک لمحے کے لیے چہرے کی رنگت خفیر ہوئی اور پھر اس نے خود پر قابو پا لیا۔

”اس رات ہم دونوں نے جو چاہئے لی تھی اس کے ساتھ آنے والی چٹنی میں ایک ایسی دوا شامل تھی جو انسان کے جذبات میں بھگان پیدا کر کے اسے ہوش و غور سے بیگانہ کر دیتی ہے۔“ اس نے شرافت سے اعتراف کر لیا تو معاذ کے ذہن سے یہ بوجھ مٹ گیا کہ وہ اپنے کردار کی حفاظت نہیں کر سکا تھا۔ اسے ہاتھ دھر رہا تھا کہ کیا کیا تھا۔

”بھر..... اب..... اب کیا فیصلہ ہے تمہارا؟“ وہ منھ کو وہی پہلے والے نکتے پر لے آئی۔

”میں نے کہا ہے مجھے سوچنے کے لیے سہلت دو۔“

”سہلت نہیں مل سکتی۔ آج رات ہی کارروائی کرنا ہے۔ انکار کی صورت میں ہم ایسا پکر بھی چلا سکتے ہیں کہ تمہاری اکلوتی، لاڈلی اہلیکسن، لیکن آج رات ہی کی ڈیٹ کلب میں ہوتی ہوئی پائی جاسکتی ہے۔ ہو سکتا ہے ناچنے کے علاوہ وہ کوئی گاہک پھنسانے میں بھی کامیاب ہو جائے۔“

”بکو اس بند کرو۔“ اس نے شدت سے پیش کے عالم میں

”زخم کو پانی سے بچانے کا تو خیال رکھا تھا ؟“
سائیں ؟ ”سرمہ نے تشویش سے پوچھا۔
”ہاں بابا! خیال رکھا تھا۔ ویسے کچھ مرے سے زخمی
ہونے اور زخموں کو سنبھالنے کی پریشانی ہو گئی ہے۔“ اس
نے بے ساختگی سے جواب دیا تو سرمہ کے ہونٹوں پر
مسکراہٹ آ گئی۔ یہ حقیقت تھی کہ گزشتہ چھ ماہ میں عالم شاہ
کئی بار زخمی ہوا تھا لیکن یہ فضل باری تعالیٰ صحت بھی نصیب
ہو گئی تھی۔

”آؤ تو پھر چل کر ذرا گل خان کی محنت کھانے
لگاتے ہیں اور افتالی پلاؤ اور چلی کہاں کو ان کے اصل
مقام تک پہنچاتے ہیں۔“ وہ اور سرمہ آگے پیچھے چلتے کرے
سے باہر نکلتے ہی تھے کہ سامنے سے گل خان آتا دکھائی دیا۔
”آپ اچھ گئی صیب! گھٹیل صیب نے ام کو بولا تھا
کہ آپ کا کھانے پینے کا بہت خیال رکھنا ہے پر آپ ایسا لمبی
تان کر سو رہا تھا کہ ام کو نگاہیں آپ رات تک بھوکا ہی نہ
سوتا رہے۔“ گل خان جو اس کے سونے کے دوران اچھا
خاصا پریشان رہا تھا کہ مہمان کی خاطر عداوت کیسے کرے،
اسے کرے سے باہر دیکھ کر کھل اٹھا۔

”تمہارے پلاؤ اور کہاویوں کی خوشبو نے جاگنے پر
مجھ کو زندہ یاد دلا دیا۔“ گل خان نے مسکراتے ہوئے
”کھا کر آپ کا دل خوش ہو جائے گی صیب!“ گل
خان کی باتیں سنیں۔

”بس تو جلدی سے کھانا لگاؤ۔ پیٹ میں چر ہے دوڑ
رہے ہیں۔“ رات کو کھانا نہیں کھایا تھا اور صبح بھی برائے نام
ناکھا کیا تھا اس لیے اس وقت کچھ بھوک لگ رہی تھی۔
”ام منالی کا پورا خیال رکھتی ہے۔ ادھر کوئی میں
ایک بھی چوبائیں ہے پھر آپ کے پیٹ میں چرہا کدھر سے
گیا؟“ گل خان یکدم ہنسنے لگا۔ اس کی یہ بات سن کر
عالم شاہ اور سرمہ دونوں کے منہ سے تہیجے ابل پڑے۔
”آپ لوگ ایسے ہنستا کیوں اے صیب؟“ وہ بے
چارہ حریف پریشان ہوا۔

”تم بھی کمال کرتے ہو گل خان! دہلی میں رہ کر تمہارا
یہ حال ہے کہ ایک چھوٹا سا عمارت بھی نہیں سمجھ سکتے۔ پیٹ میں
چرہا دہلنے کا مطلب ہے کہ بہت زیادہ بھوک لگ رہی
ہے۔“ سرمہ نے ہنسی کو قابو میں کر کے اسے مطلب سمجھایا۔

”امارا خان غراب۔ ام بھول گیا تھا۔“ گل خان نے
اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا پھر ذرا غصائی شکل بنا کر بولا۔
”اماری سمجھ میں یہ بات نئی آئی اے کہ ادھر کا لوگ سیدھا

سوتیا کا گلاب بوج لیا۔ فوراً ہی وہ مسلخ افراد کرے میں داخل
ہوئے اور دائیں بائیں سے اپنے ہتھیاروں کی ٹالیں اس کی
کنکھوں پر رکھ دیں۔ اس کی گرفت سوتیا کے گلے پر ڈھیلی
پڑ گئی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ یہاں غصہ کمرے لگے ہوئے ہیں
اور کہیں سے انکسار دیکھا جا رہا ہے۔

”یہاں مرنے اور مارنے کی آزادی صرف ہمیں
حاصل ہے، معاذ ڈارنگ! تمہارے پاس زیادہ سے زیادہ
انتہا اختیار ہے کہ ہماری بات ماننے سے انکار کر دو لیکن یاد
رکھنا کہ انکار کی جہیں بھاری قیمت ادا کرنا پڑے گی۔“ سوتیا
نے اپنا گلا اس کی کمرور گرفت سے چھڑایا اور اس جگہ کو
سہلاتے ہوئے بولی جہاں اس کی انگلیوں کا دباؤ پڑا تھا۔
معاذ کوئی جواب نہ دے سکا۔

”تو پھر تیار رہنا۔ ہمیں آج رات ہی کارروائی کرنا
ہوگی۔“ سوتیا نے اس کی گھست خوروی کو محسوس کر لیا اور
تھکسان لہجے میں کہہ کر اٹھلاتی ہوئی کمرے سے باہر نکل
گئی۔ اس کے پیچھے ہی مسلخ افراد بھی باہر نکل گئے۔

☆☆☆

عالم شاہ کی آنکھ کھلی تو گھڑی دوپہر کے ڈھائی بج رہی
تھی۔ اچھا خاصا سولینے کے باوجود طبیعت پر کسٹندی سی
چھائی ہوئی تھی۔

”خس کر لیٹا جاوے۔“ اس نے خود سے کہا اور اپنے
ہیک کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ ہیک سے پہلے
ہی اسے ونگر میں لٹکا ہوا ایک استری شدہ جوڑا دکھائی دے
گیا۔ کسی کے بتائے بغیر بھی وہ جانتا تھا کہ اس کے مزاج اور
فطرت سے آشنا سرمہ نے اس کے لیے یہ انتظام کر دیا
ہوگا۔ وہ کپڑے اٹھا کر ملحقہ غسل خانے میں گھس گیا لیکن
جب نہیں اتارتے ہوئے شانے میں دردی نہیں اٹھیں تو
خیال آیا کہ پانی اس کے زخم کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ زخم کو
بچا کر جس حد تک ممکن تھا، آدھا ادھر غسل لے کر باہر نکلا تو
اچھا خاصا فرق پڑ چکا تھا اور وہ خود کو تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔

”آپ اچھ گئے سائیں! میں آپ ہی کو دیکھنے آیا
تھا۔ گل خان افتالی پلاؤ اور چلی کہاں تیار کر چکا ہے اور
اسی کھانے کے لیے سخت بے تاب ہے۔“ سرمہ نے
دروازہ کھول کر اندر چھانکا اور اسے آہنیٹے کے سامنے کھڑے
ہو کر گھبراہٹ سے دیکھ کر مسکرا کر غلام ہوئی۔

”بس آنکھ ہی ابھی کھلی ہے۔ میں نے سوچا پہلے
فریش ہو جاؤں پھر کھانے کے لیے باہر آؤں گا۔“ اس نے
گھٹھا اوپس ڈرینگ بھلی پر رکھتے ہوئے جواب دیا۔

پر وہاں بھی پریشان کن خبریں دیکھنے کو تھیں۔ سنیل کی موت کی ذمہ داری اسی پر ڈال دی گئی تھی اور اب اس کی حیثیت ایک مفرور قاتل کی تھی۔ سرمد کو بھی اس کا شریک جرم ٹھہرایا جا رہا تھا اور کوشش کی جا رہی تھی کہ انہیں مفرور خزان سے زیادہ پاکستانی دہشت گرد قرار دیا جاسکے۔ کچھ لوگ دہے الفاظ میں نیاز شاہ کے خاندان کو دہشت گردوں کا سمولت کار بھی قرار دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ سید ہادیہ سائب و لہجہ بھی شاید اس لیے تھا کہ نیاز شاہ کا خاندان صاحب ثروت ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ حکام سے قریبی تعلقات بھی رکھتا تھا۔ فی دی پر اس نے جلیل کا ایک بیان بھی دیکھا اور سنا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”ہمارا خاندان نسلوں سے بھارتی سرکار کا وقار ہے۔ ہمارے بزرگوں نے بنوارے کے وقت پاکستان ہجرت نہ کر کے عملاً اپنی وقاداری کا ثبوت دینے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ظاہر کر دیا تھا کہ ہم بنوارے کے قاتل نہیں اور نہ پاکستان کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس لیے اس بات کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اب ہم تیسری اور چوتھی نسل کے لوگ اپنے دل میں پاکستان کے لیے ایسا کوئی نرم گوشہ کھتے ہوں کہ وہاں سے آنے والے کسی دہشت گرد کے لیے سمولت کاری کریں۔ ہم نے صرف خوبی رشتے کے ساتھ چھوٹے بھائی کی شادی میں شرکت کے لیے پاکستان میں رہنے والے رشتے داروں کو دعوت دی تھی۔ ہم اپنے ان مہمانوں کے کسی قول و فعل کے لیے ذمہ دار نہیں ہیں۔ سرکار انہیں گرفتار کر کے ان کے خلاف قانون کے مطابق جو بھی کارروائی کرے گی، ہمیں نہ تو اس پر کوئی اعتراض ہوگا اور نہ ہی ہم اس کارروائی میں روڑے لگائیں گے۔“

”کیا یہ آپ سے لاطعلی کا اعلان ہے سائیں؟“ جلیل کے بیان پر سرمد نے پریشانی محسوس کی۔ ”ہو سکتا ہے یہ مصلحت ہو۔ ہم پر طعن الزامات عام کر کے جا رہے ہیں۔ ایسے میں یہ لوگ کل کر ہماری حمایت نہیں کر سکتے لیکن یہ سمولت رہائش گاہ گواہ ہے کہ میرے انہوں نے اس مشکل وقت میں میرا ساتھ نہیں چھوڑا ہے۔“ وہ اس وقت بھی جلیل کے رویتے سے ڈسٹرب ہوا تھا جب وہ گھیل کے کہنے پر فردوس کے ساتھ بن دولوں کو یہاں چھوڑنے آیا تھا اور اب بھی اس کے جان پر دل میں ہے جتنی محسوس کی تھی لیکن اس نے سرمد کو ٹپکی دی۔ سرمد نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔ وہ ساما دن ان دولوں نے پونہ بکاری میں گزارا۔ وقت گزاری کے لیے کچھ دیر ٹی وی

سیدھا بات کرنے کے بجائے اتنا ٹھہرا کر کہیں بولتی ہے۔ ام اتنے مرحے سے ادھر ہے پھر بھی اکثر باتوں پر اباراد مارے گھوم جاتی ہے۔ ”گل خان نے شکوہ کیا پھر سڑ کر باورچی خانے کی طرف چلا گیا۔ عالم شاہ، سرمد کی راہنمائی میں ڈائننگ روم میں پہنچی گیا۔ سرمد کاٹی دیر پہلے جاگ کر اچھی طرح پوری کوٹھی کا جائزہ لے چکا تھا۔

ان کے میز کے گرد بیٹھے ہی گل خان نے خامے سلپے سے ان کے سامنے کھانا سجا دیا۔ ناشتے کی طرح کھانے کے لیے بھی عالم شاہ کو حکماً سرمد کو اپنے ساتھ بٹھانا پڑا تھا۔ کھانا واقعی لاجواب تھا۔ ان دونوں نے خوب سیر ہو کر کھایا۔

”گھیل بھائی نے آنے کا کہا تھا، ابھی تک آئے نہیں۔“ کھانے کے بعد جب وہ لوگ گل خان کا تیار کردہ خوشبودار تہہ پی رہے تھے تو عالم شاہ نے دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”گھیل صیب نے آپ کے لیے پیغام دیا ہے۔ صیب کہتا ہے آج آنا مشکل ہے۔ وہ کل آئے گا۔“ گل خان نے اطلاع دی۔

”تمہاری گھیل بھائی سے بات ہوئی تھی؟“ اس نے پوچھا تو جواب میں گل خان نے ٹھکس سر ہلایا۔

”میری بات کرواؤ ان سے۔“ اسے ٹھک کی طرف سے ٹکڑھی۔

”بات نئی ہو سکتا صیب۔ گھیل صیب نے ادھر سے فون کرنے سے منع کیا ہے۔ وہ خود بھی کھیں باہر سے بات کرتی تھی۔“ گل خان کی دی اطلاع سے ظاہر تھا کہ گھیل کو اپنا نمبر آبز رویشن پر ہونے کا خدشہ تھا اس لیے وہ یہ احتیاط برت رہے تھے۔ ممکن تھا کہ ان کے علاوہ دیگر اہل خانہ کے موبائل اور گھر کا لینڈ لائن فون بھی آبز رویشن پر ہو۔

”صیب نے یہ بھی بولا ہے کہ اگر فردوس بی بی آپ کو دیکھنے نہیں آسکا اور آپ کو کوئی تکلیف محسوس ہو تو ام ادھر پاس ہی سے کوئی ڈاکٹر بلوائے۔ آپ دونوں کو کوٹھی سے باہر نکلنے سے منع کیا ہے صیب نے۔“ گل خان نے ایک اور اطلاع دی۔

”تکلیف کا کوئی مسئلہ نہیں۔ سرمد دیکھ لے گا۔“ وہاں ہیں میرے پاس۔ اگر اپنی بدلتا پڑی تو یہ بدل دے گا۔“ عالم شاہ نے اسے جواب دیا اور گہری سوجھی میں ڈوب گیا۔ حالات خامے خدوش تھے۔ گھیل کے نہانے سے سفارت خانے سے رابطے کا معاملہ بھی ٹل گیا تھا۔ پاتی کا سارا دن اضطراب کی سی کیفیت میں گزر گیا۔ ٹی وی کھولنے

دیکھا اور جب اس سے طبیعت بیزار ہو گئی تو گل خان کو بھیج کر شام کے اخبارات منگوا لیے۔ وہ اخبارات لے کر آیا تو انہیں دیکھ کر پتا چلنے لگا کہ یہ ہندی اخبارات ہیں۔

”یہ کیا اٹھالائے ہو گل خان؟ یہ ہندی اخبارات ہیں؟ ہم کسے پڑھ سکتے ہیں؟“ اصحاب پہلے ہی تباہ کا نظارہ تھے۔ گل خان کی اس حماقت پر غواغواہی ضرورت سے زیادہ بھڑک اٹھی اور اخبارات اٹھا کر زور سے پھینک دیے۔

”صاف کر صیب ام کو بھی معلوم تھا کہ آپ کو ہندی پڑھنا ہی آتی ہے۔“ اس کے اس انداز پر گل خان نے سمجھ کر وضاحت دی تو اسے احساس ہوا کہ فطرتی اصل میں اس کی اپنی تھی۔ گل خان کو اخبار کے لیے بھیجے ہوئے اس نے اسے اس سلسلے میں کوئی ہدایت نہیں دی تھی۔ دوسرے شاید گل خان کو بھیج سے معلوم بھی نہیں تھا کہ وہ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں۔

”اس اد کے۔ مجھے بس ایسے ہی صبر کیا تھا۔“ اس بار اس نے گل خان کو زبردستی جواب دیا۔ سرحد خاموشی سے بیٹھا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنے مالک کی پریشانی سمجھ آرہی تھی لیکن فی الحال وہ بھی کچھ کرنے سے قاصر تھا۔

”آپ بولو تو ام آپ کو اخبار پڑھ کر سنا دیتا ہے۔“ اس کو زبردستی گل خان نے فراخ دلی سے پیشکش کی۔

”تمہیں ہندی پڑھنا آتی ہے؟“ اسے حیرت ہوئی۔

”کیوں نہ آتی صیب ام ادھر انڈیا میں ہی پیدا ہو کر پلا بڑھا ہے۔ اماں اماں نے ام کو تین چار جماعت تک مار مار کر زبردستی اسکول بھی بھجوا دیا تھا۔ ام ہندی پڑھنے کے ساتھ ساتھ لکھ بھی سکتا ہے۔“ گل خان نے دھوئی کیا۔

”تم پیدائشی طور پر بھارت کے رہنے والے ہو تو پھر اتنے خالص پنہان کیوں دکھائی دیتے ہو؟“ اس نے دلچسپی لی۔

”اس لیے کہ ام پنہان اے اور اماں ادا کہتا تھا کہ پنہان کو ہمیشہ پنہان دکھنا چاہیے۔ وہ پاکستان بننے سے پہلے

اماں سے پردادا کے ساتھ پشاور سے ادھر آیا تھا۔ جیسا یوسف خان کا بھائی (بھیل) آیا تھا۔ یوسف خان کی طرح اماں

پر دادا کو بھی میرد بننے کا بہت شوق تھا لیکن انڈین مسلم انڈسٹری کا قسمت خراب تھا جو اس نے اماں سے پردادا جیسا

مہان ادا کار کو چانس ہی دیا اور خالی یوسف خان کو دلچسپ کار بنا کر گزارہ کرتا رہا۔ اگر وہ اماں پر دادا کو چانس دیتا تو اماں

پر دادا گلاب خان کے بعد اماں اولاد، باپ اور ام سب باری باری انڈین فلموں میں انٹری مارتا اور آج انڈین مسلم

انڈسٹری ہالی وڈ سے بھی آگے ہوتا۔“

”پھر تو ہالی وڈ والوں کو انڈین فلم انڈسٹری کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس نے تمہارے پردادا کو چانس نہیں دیا۔“ گل خان کی گل افشانیوں نے یکدم ہی اس کا موز خوشگوار کر دیا اور وہ ساری جھنش بھول کر سننے لگا۔

”ہالی وڈ والا کا پھر لوگ ہے۔ وہ کسی کا شکر گزار ہی ہو سکتا۔“ اس کی بات پر غور کیے بغیر گل خان نے فحشی دہش کے اعزاز میں کہا۔

”ہالی وڈ اور ہالی وڈ کو چھوڑ دو، یہ تباہ کر لسل ورسلس بھارت میں رہ کر بھی تم اتنے شدید پنہان کیسے ہو کر گئے۔“ لہاس اور زبان سب کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ ابھی ابھی سیدھے پشاور سے یہاں لینڈ کیا ہے؟“

”یہ اماں پر دادا کا وصیت تھا صیب۔ وہ مرنے سے پہلے بول کر مرا تھا کہ پنہان کا کچھ ہمیشہ پنہان لگنا چاہیے۔

اس کے بعد اماں ادا نے بھی اماں سے باپ کو یہ وصیت کیا تھا اور اماں سے باپ نے ام کو بولا تھا کہ گل خانیں..... تیرے کو

اماں قسم اے۔ تو پورے انڈیا میں ہر مرد دل چاہے چلے جائے پر اپنے کو اور اپنے بچوں کو پنہان رکھنا۔ بس اسی واسطے آپ

کو اماں سے اندر پشاور کا پنہان دکھائی دیتا ہے ورنہ ام نے تو کبھی پشاور کا منہ بھی نہیں دیکھا ہے۔“ گل خان نے پوری

سنجیدگی سے اسے دھڑ سے آگاہ کیا۔ یہ اور بات کہ اس کی سنجیدہ شکل زیادہ مستحکم خیر لگ رہی تھی۔

”یعنی اب تم اپنے بچوں کو بھی ایسی وصیت کرو گے؟“

”کرے گا کیا صیب، کر بھی اسے۔“ تذکیر دانیث کے سواٹے میں اس کی زبان بار بار لڑھکتی تھی۔

”اوہو..... تم شادی شدہ ہو۔ کتنے بچے ہیں تمہارے؟“ عالم شاہ نے دلچسپی سے جوں سال گل خان کو

دیکھا۔ بے شک وہ خاصے بھاری بدن کا مالک تھا لیکن اس کا چہرہ بتاتا تھا کہ اس کی عمر کسی طور چوبیس چھبیس سال سے

زیادہ نہیں ہے۔

”اماں لو کچھ اے صیب۔ پانچ لڑکا اور چار لڑکی۔“

گل خان نے بچوں کی تعداد بتا کر اس کے ہوش اڑا دیے۔

”نو..... پورے نو بچے ہیں تمہارے؟“ بچپن میں شادی کر لی تھی مگر آئندہ پڑھ لکھ رہتا ہے؟“

”ہمارا بھائی میں جلدی شادی کا رواج ہے۔ اماں پہلا شادی سولہ سال کی عمر میں ہوا تھا اور دوسرا جینی سال کی

عمر میں۔ چلی بیوی سے اماں اچھ بچے اور دوسری سے تین بچے آئے۔ اب دونوں کو ایک بار پھر بچے ہونے والا ہے۔ ام نے کھیل صیب سے بول دیا کہ ام اگلے مہینے چھٹی لے کر

اپنے گھر جائے گی۔“

”اور جا کر تیرا شادی کرے گی۔“ سرمد جواب تک خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ بے ساختہ ہی بول پڑا۔

”نئی صیبا ام اور شادی نئی کر سکتا۔ مہنگائی کا زمانہ اے۔ ام کو دو بیویوں سے ہونے والا بچہ پالنے کے لیے ہی گھر سے دور رہ کر نوکری کرنا پڑتا اے۔ تیرا آگیا تو کمانے کے لیے ملک سے باہر جانا پڑے گا۔“ چہرے پر اوداسی طاری کرنے کی کوشش میں وہ اپنے بڑے بڑے کانوں کے ساتھ اچھا خاصا کارٹون لگ رہا تھا۔ وہ سرخ و پید رنگت کا مالک تھا اور نقوش بھی اچھے تھے لیکن بڑے کانوں اور فٹ بال جیسی جسامت کے ساتھ رواجی لباس میں عجیب و غریب غلوں محسوس ہوتا تھا۔

”ملک سے باہر جا کر تم انڈیا کے محکمہ بہبود آبادی پر رجم کرو گے۔ میرے خیال میں خود خود کوشش کر کے تمہارا کم از کم دس سال کا انگریسٹ کروادیں گے تاکہ تم بار بار گھر کے پھیرے لگا کر آبادی میں اضافے کا سبب نہ بن سکو۔“ اب سرمد بھی اس سے تفریح لینے کے سوڈ میں آگیا تھا۔

”آپ کیسا بات کرتی اے سرمد صیبا؟“ گل خان نے دانت باہر نکالے پھر موضوع بدلتے ہوئے بولا۔

”آپ یہ بتاؤ کہ ام رات کے کھانے میں کیا پکائے؟“ سرمد نے اس کے سوال کا جواب خود دینے کے بجائے عالم شاہ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”جو چاہے پکا لو خان! تمہارے بھاری بھرکم لہجے کے بعد ویسے بھی رات کے کھانے کی گنجائش مشکل سے لگے گی۔“

عالم شاہ پر ایک بار پھر بیزاری طاری ہونے لگی۔ اسے سب سے زیادہ گل کی پریشانی تھی۔ یہ بیزاری اور لگن اس پر ایسے سوار رہی کہ وہ سچے سچ گل خان کے محنت سے تیار کردہ ڈنر کے ساتھ انصاف نہیں کر سکا۔ سونے سے پہلے سرمد نے اس کا زخم

چیک کیا۔ وہ ٹھیک ہونا شروع ہو گیا تھا۔ بہر حال رات بے چینی میں گزری۔ جسمانی تکلیف سے زیادہ ذہنی دباؤ تھا۔ سچ بھی ناشا کرنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن سرمد کے اصرار پر

اس نے ایلے ہوئے انڈوں اور شامی کہا یوں سے انصاف کیا۔ گل خان کے مطابق انڈے اور گوشت دونوں کو جلدی بھر لے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں اس لیے اس نے بطور

خاص ناشتے میں یہ دونوں آئٹم شامل کیے تھے۔ ناشتے کے بعد دوا کھا کر اس کے پاس فردوس، جلیل اور گل کی راء دیکھنے کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔ انتظار طویل ثابت ہوا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد جب وہ قیلولے کے لیے لیٹے ہوئے

تھے کہ اطلاق ٹھنسی بچنے کی آواز سنائی دی۔ وہ اور سرمد بیٹک وقت اپنے کمروں سے باہر نکلے۔ جب تک وہ باہر پہنچے، گل خان بیرونی گیٹ کھول چکا تھا اور کھلے گیٹ سے اندر داخل ہوتی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے گل کیل کو صاف دیکھا جاسکتا تھا۔ عالم شاہ لپک کر گاڑی کے قریب پہنچا۔ سرمد احتیاطاً دو قدم پیچھے تھا۔

”السلام علیکم گل کیل بھائی! بہت رات دکھائی آپ نے۔“ اس کی بے قراری اس کے لہجے سے بھی ظاہر تھی۔

”ہنس یار۔۔۔ حالات ہی ایسے تھے۔“ گل کیل نے معافہ کرتے ہوئے اسے جواب دیا لیکن اب اس کی توجہ کہیں اور تھی۔ وہ حیرت بھری نظروں سے گل کیل کی گاڑی کی پچھلی نشست پر موجود گل کو دیکھ رہا تھا۔ پہلے یقیناً وہ نشست پر لیٹی ہوئی تھی اس لیے دکھائی نہیں دی تھی۔

”گل۔۔۔ ا!“ وہ جذباتی انداز میں اسے پکار کر جب تک گل کیل سے الگ ہوا، وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر آ چکی تھی۔

”یہ ہم کس مصیبت میں گھر گئے ادا سا کی؟“ عالم شاہ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو وہ اس کے بچنے سے لگ کر رونے لگی۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم یہ بتاؤ تمہیں تو کوئی تکلیف نہیں پہنچی؟“ اس نئے دلا سا بچے ہوتے چار سے پوچھا۔ جواب میں اس نے غلی میں سر ہلایا اور پلٹ کر گاڑی کے فرش پر رکھے بے بی کارٹ میں سوئے بچے کو اپنی بانہوں میں اٹھالیا۔ بچہ راساً کسمسا لیکن چپکے پر دو بارہ سو گیا۔

”چلو اندر چل کر بات کرتے ہیں۔“ گل کیل نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے متوجہ کیا۔ وہ سب آگے پیچھے چلتے اندر داخل ہو گئے۔

”بچے کو اندر کمرے میں لے جا کر سلا دو۔“ عالم شاہ نے ہاتھ سے کمرے کی سمت اشارہ کیا تو گل کیل سر ہلاتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔

”میں گل کو ساتھ لانا نہیں چاہتا تھا لیکن یہ تمہارے معاملے میں بہت جذباتی ہے۔ رورو کر برا حال کیا ہوا تھا۔ کھانا تک نہیں کھا رہی تھی اس لیے مجبوراً مجھے سب سے چپا کر اسے یہاں لانا پڑا۔“

”جی، شروع سے ہی میرے ساتھ بہت زیادہ الجھل رہی ہے پھر تو اسٹیم کی موت نے بھی حساس بنا دیا ہے اس لیے اس کے لیے حالات کا مقابلہ کرنا مشکل ہو رہا ہے ورنہ

بھی بڑی کپڑا لڑکی بھا کرتی تھی۔“ وہ اپنی بھین کی کنیت

کو ابھی طرح سمجھ سکتا تھا۔

”آپ بتائیں حالات کیسے ہیں؟“ سہیل کو دایں آٹا دیکھ کر اس نے موضوع بدلا۔

”حالات ابھی نہیں ہیں۔ وٹا صاف صاف تم پر سہیل کے قتل کا الزام لگا رہا ہے۔ کسی پاکستانی کے مقابلے میں انڈین پولیس کے حاضر سردوں کا لازم کی بات زیادہ معتبر ہے۔“

”اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ مجھے کیسے جانتا ہے اور میرے پاس ایک انجینیئر کو اس کے گھر میں کس کر رہا ہے کا کیا جواز تھا؟“ اس نے جیسے لہجے میں پوچھا۔ اسے اندازہ تھا کہ اس معاملے میں اجالا کا نام نہیں لیا گیا ہوگا۔ گھیل کے جواب نے اس کے اندازے کی تصدیق کر دی۔

”اس نے کہا ہی بتائی ہے کہ تم اور تمہارا ساتھی سرحد سڑک پر کچھ لوہیوں کو تنگ کر رہے تھے۔ سہیل نے تمہیں روکا تو تم لوگوں کا اس کے ساتھ جھگڑا ہو گیا۔ تھوڑی مار مارا بھی ہوئی لیکن کچھ راہ گیروں نے معاملہ رٹ دینا شروع کر دیا۔ سہیل نے سمجھا بات ختم ہو گئی اس لیے وہ وہاں سے چلا گیا لیکن تمہارے دل میں اس کے لیے بغض پیدا ہو گیا تھا۔ تم نے اس کا پیچھا کر کے اس کا گھر دیکھا پھر اسے سمیت اپنے ساتھی کے ساتھ وہاں کھس کر اسے قتل کر دیا۔ وٹا جو سہیل سے لٹنے کے لیے وہاں آیا ہوا تھا، خواہ مخواہ وہاں آ گیا لیکن خوش قسمتی سے تم لوگوں نے اسے قتل کرنے کے بجائے صرف بے ہوش کرنے پر اکتفا کیا۔ ہوش میں آنے کے بعد اس نے تمہارے بارے میں اپنے جیسے کو اطلاع دے کر فوری کارروائی شروع کرنے کی درخواست کی۔“

”حالا کہ حقیقت یہ ہے کہ سہیل خود اس کے اپنے ہاتھوں قتل ہوا تھا۔“

”میں نے کہا کہ یہاں اس کے مقابلے میں تمہاری نہیں سنی جائے گی۔“

”میری ستانے والا تو ویسے بھی کوئی نہیں ہے۔ میرے اپنے ہی مجھ سے لائق کا اعلان کرتے پھر رہے ہیں۔“ اس نے شکوہ کیا۔

”تم نے شاید بی وی پر چیل کا بیان دیکھا ہے۔ آئی ایم سوری لیکن ظاہر ہے ہماری بھی مجبوریوں ہیں۔“ گھیل فوراً ہی اس کی بات سمجھ گئے۔

”اس اور کے اب آپ یہ بتائیں کہ آگے کیا کرنا ہے۔ آپ کل آئے تھیں ورنہ میرا ارادہ تو فوری طور پر اپنے سفارت خانے سے مدد لینے کا تھا۔“ اس نے بات بدلی۔

”مجھے گرائی کا شبہ تھا اس لیے فوری طور پر تمہاری

طرف آنے سے گریز کیا۔ میری یہ کوئی فریڈ حالت میں کرائے پر چلتی ہے لیکن اتفاق سے آج کل خالی ہے۔ میں نے خود ہی کوئی نیا کرائے دار نہیں رکھا تھا کہ دور دراز سے آنے والے کاروباری دوستوں کے لیے ایک اچھا انتظام ہو جائے۔ تمہاری تلاش میں ہم سے حلقہ بہت سی جگہوں پر چھاپے مارے گئے ہیں لیکن انکا ٹاس کوئی کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا۔ شاید یہی سمجھا جا رہا ہوگا کہ کوئی میں اب بھی گراہیدار ہی رہ رہے ہیں۔“

”اجالا کا کیاری انکشن ہے؟“ اس نے ایک اور اہم سوال کیا۔

”اسے میرے علم پر ایک کمرے میں بند کر دیا گیا تھا جہاں اس کے پاس مایہ جیلے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے اس لیے اسے سہیل کی موت کی خبر بھی نہیں مل سکی ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ اسے اسی بے خبری میں اپنے ایک دوست کے گھر بھجوا دوں گا۔ وہ ایک ایسی دور دراز ریاست میں رہتا ہے جہاں لینڈ لائن فون کے علاوہ جدید دور کی کوئی ایجاد نہیں چلتی ہے۔ حالات کا وہاں آنے تک اسے وہیں رہنا پڑے گا۔“

”اس نے ہنگامہ تو بہت مچایا ہوگا؟“

”خوشگوشات سے کم۔ سہیل نے اسے دے الفاظ میں بتا دیا ہے کہ مجھ سمیت تمام بھائیوں کو اس کے سہیل سے قتل اور دیگر پلاننگ کا علم ہو گیا ہے اس لیے اس کا اپنے کمرے تک محدود رہنا اس کے اپنے حق میں ہی بہتر ہے۔“ گھیل نے اپنی بی بی کا حوالہ دیا۔

”بھیل کی شادی.....؟“ وہ افسوس کے باعث پورا سوال نہ کر سکا۔

”بھڑی کر بی بی۔ حالات سہیل جائیں تو دوسری لڑکتھیں کر لیں گے۔“ گھیل نے سر آہ کے ساتھ جواب دیا۔

”چاچا سائیں تو اس صورت حال پر بہت ڈسٹرب ہوں گے۔“ اسے نیاز شاہ کا خیال آیا۔

”ان کی عمر کا شخص ایسے حالات کو کیسے برداشت کر سکتا ہے؟“ مائٹرا ملک کے بعد اسپتال میں ایڈمٹ ہیں۔“

گھیل کی دی گئی اطلاع اس کے لیے مزید تکلیف دہ تھی۔ کچھ دیر وہ سر جھکا کر بیٹھا رہا۔ کمرے میں موجود تمام نفوس ہی انسرودہ اور خاموش تھیں۔ واحد آواز جو ستلی دیتی تھی وہ

ہادرچی خانے میں جاری گلی خان کی کھٹ پٹ کی تھی۔ پتا نہیں وہ چائے کا اہتمام کر رہا تھا یا ابھی سے رات کے کھانے کی تیاری میں جت گیا تھا۔

”ان حالات میں سب سے بہترین حل یہی ہے کہ ہم

اپنے سفارت خانے سے مدد مانگیں اور قانونی راستے سے یہ جنگ لڑیں۔ یہاں کامیڈیا ہمارے پاکستانی ہونے کی وجہ سے بے شک ہمارے دہشت گرد ہونے کا پردہ چکڑا کر رہا ہے لیکن حقیقتاً مجھ پر واحد الزام سنیل کے قتل کا ہے جس میں میں خود کو بے گناہ ثابت کر سکتا ہوں۔ اس صورت میں آپ لوگوں کی پوزیشن بھی ٹھیک ہو جائے گی اور کل اور سرحد کے لیے بھی آسانی پیدا ہوگی۔" تھوڑی سی سوچ بچار کے بعد اس نے وہ حل پیش کیا جس کے نزدیک مناسب ترین تھا۔

"میں ہر صورت میں تمہارے ساتھ ہوں۔ یہ مت سوچنا کہ کسی پریشانی کے خیال سے میں تمہاری مدد سے پیچھے ہٹ جاؤں گا۔ اب بھی کل کے سامنے ہوتے ہوئے بھی میں نے کسی کو اس پر انگلی اٹھانے کی اجازت نہیں دی اور اپنے بھرپور تعلقات کا استعمال کر کے اسے پروٹیکشن دی ہے۔" گھیل کا انداز مغالی پیش کرنے والا تھا۔

"میں آپ کے تعاون کے لیے شکر گزار ہوں گھیل بھائی! لیکن یہ طے ہے کہ ہم ہمیشہ اس طرح چھپ کر نہیں رہ سکتے۔ اس لیے بہتر ہے کہ دیر کرنے کے بجائے فوری طور پر قانون کا سامنا کرنے کی تیاری کریں۔" ان کے اخلاص پر جین دہانی کروانے کے ساتھ اس نے اپنا حتمی فیصلہ سنایا۔ اس موقع پر کل اور سرحد ذرا بے قرار نظر آئے۔ وہ ان کی بے قراری کی وجہ سمجھ سکتا تھا۔ قانون کا سامنا کرنے میں سب سے زیادہ اسے مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا کیونکہ اس کیس میں اسے ہی مرکزی ملزم قرار دیا جا رہا تھا۔

"میں اب مزید کسی بحث و مباحثے میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ تم دونوں اپنا سامان لے آؤ۔ ہم فوری طور پر سفارت خانے کے لیے نکل رہے ہیں۔" اس نے انہیں کچھ کہنے کا موقع دے بغیر فیصلہ کن انداز میں کہا تو وہ مجبوراً خاموش ہو گئے۔ کل چونکہ صرف ملاقات کے لیے آئی تھی اس لیے اس کے ساتھ سامان نہیں تھا۔ دو صرف بچے کی ضرورت کی اشیاء ساتھ لے کر نکل گئی جو ایک بیگ میں بند گاڑی میں ہی موجود تھیں۔ سرحد البتہ اس کا اور اپنا سامان گاڑی میں منتقل کرنے کے ارادے سے اٹھ گیا۔ اسی وقت گل خان مشروبات اور اسٹیکس سے بھری ٹرالی لیے وہاں چلا آیا۔

"مجم بنے اتنا اہتمام کیوں کر لیا گل خان! ہم بس روانہ ہی ہوئے گئے تھے۔" عالم شاہ نے گل خان کو لوکا۔

"کوہر جاتی اسے صیب! ابھی تو ام رات کا کھانا بھی تیار کرتی تھیں۔" گل خان گل خان کی بردباری کا سن کر حیرت منہ ہوا۔

"تمہاری خدمت گزاری کو میں ہمیشہ یاد رکھوں گا گل خان! لیکن اب ہمارا یہاں سے دانا پانی اٹھ گیا ہے۔ قسمت نے ساتھ دیا تو پھر بھی تمہارے ہاتھ کا مزید اور کھانا کھانے دوبارہ آئیں گے۔" اس نے گل خان کو جواب دیا اور جیب سے والٹ نکال کر ایک بڑی مالیت کا نوٹ اس کی طرف بڑھایا۔

"یہ کیا کرتا ہے صیب! آپ کا خدمت امارا پھر ض (فرض) تھا۔" نوٹ دیکھ کر گل خان بدکا۔

"یہ تمہاری فرض شناسی کا انعام ہے۔"

"ام کو کام کا واسطے صیب سے خواہ ملا ہے۔ ام یہ بنی لے سکتا۔" گل خان نے زبان سے انکار کرنے کے ساتھ ساتھ زور زور سے نفی میں سر ہلایا تو اس کے بڑے بڑے کان بھی ہلنے لگے۔ اس منظر کو دیکھ کر شاہ کے باوجود عالم شاہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی لیکن فوراً سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولا۔

"تم سمجھو یہ تمہارے لیے نہیں تمہارے بچوں کے لیے ہے۔ چینیوں پر گھر جاؤ تو ان کے لیے میری طرف سے پھل، مشائیاں وغیرہ لے جانا۔"

"دیکھ لو گل خان۔ صاحب اپنی خوشی سے دے رہے ہیں۔" گھیل نے مداخلت کی تو گل خان نے جھپکے ہوئے نوٹ وصول کر لیا۔ اس کے بعد وہ سب گوان کی پسند سے مشروبات پیش کرنے لگا۔ ٹھنڈے گرم دونوں طرح کے مشروبات تھے۔ مردوں نے چائے پیٹا پسند کی جبکہ گل نے پائین اپیل جوس کا انتخاب کیا۔ اسٹیکس البتہ کسی نے بھی نہیں لیے تھے۔ اس سرے سے گزر کر وہ دواگی کے لیے تیار تھے۔ جب تک وہ گاڑی میں سوار ہوئے، گل خان گیٹ پر پہنچ چکا تھا اور مکن کے کاموں کے دور ان ایک طرف رکھ دی جانے والی رائفل دوبارہ اس کے شانے سے لٹک چکی تھی۔ یہ امریکن سامان ریچر میٹھی اور معلوم نہیں تھا کہ یہ اسے گھیل نے فراہم کی تھی یا پٹھان اپنا "زیور" اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔

گھیل گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے۔ سرحد نے ان کے ساتھ والی نشست سنبھالی جبکہ عالم شاہ اور کل پچھلی نشستوں پر براجمان ہو گئے۔ گل کا بچہ اس کی گود میں تھا۔ گھیل نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھائی تو گل خان نے پھر کی سے گیٹ کے دونوں پٹ داکر دیے۔ پٹ اٹھ کر گل خان نے گاڑی آگے بڑھی اور وہاں پٹ کے ساتھ کھڑا گل خان جیسے رہ گیا۔ وہ گاڑی کے باہر نکلے ہی گیٹ بند کرنے کے لیے تیار تھا لیکن تھا میں کو بچے والے

اور طوق سے نجات حاصل کر چکا ہوتا۔" اپنی پشت پر موجود درخت سے ٹپک لگاتے ہوئے وہ لمبے سے جڑ پایا اور بوجھی بے اختیاری میں اوپر آسمان کی طرف نظر کی۔ آسمان تاروں سے محروم دیر ان، اجاڑ اور اداس محسوس ہو رہا تھا۔

"کسی شیطان کے دل جیسی اندھیری رات ہے۔" اس کے دل میں خیال ابھرا ہی تھا کہ تاریک آسمان پر ایک تہا تار اجملا لایا۔ اسے ستارہ بنی کی مشق کیے کافی دن ہو چکے تھے لیکن یہاں اس جگہ بیٹھے بیٹھے طبعی غیر ارادہ اس ستارے کو ٹپکا چلا گیا اور حسب معمول روشنی کے سحر نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔

"زندگی کو ٹھکانے کا سوچنا بھی گناہ ہے ہٹا دینے والے نے کسی کو بھی بے مقصد یہ نعمت نہیں دی ہے۔ تو پھر تو جو اتنی خوبیاں رکھتا ہے، اپنی زندگی کو اتنا بیکار کیسے سمجھ سکتا ہے کہ چند آدما کشوں سے گھبرا کر اسے گنوانے کا سوچے۔" وجود میں اترتی ان روشنیوں کے درمیان ابھرتے فیضو کے چہرے نے جہاں اسے حیران کیا تھا وہاں وہ اس کی بات سن کر شرمندہ ہو گیا تھا۔

"ہمت سے حالات کے آگے ڈٹا رہا۔ ان مشکلات کے درمیان سے ہی کھنک آسانی کی راہ بھی نکل آئے گی۔" اسے نصیحت کر کے فیضو کا چہرہ مہر دم ہونے لگا۔ وہ اسے ہکا بکا رہتا تھا لیکن سامعوں میں اترنے والی سیٹی کی مخصوص آواز نے اس پر طاری ہو جانے والے سحر کو توڑ دیا اور بادل کا خواستہ اس نے اپنے ساتھ لائے جانے والے بیگ کو اپنے قریب کھسکا کر اس کی زپ کھولنے کے ساتھ ساتھ جیب سے ایک نسل تاریخ نکال کر آن کی اور اس کی مدد و روشنی میں اندر حفاظت سے رکھی ان بارودی سرنگوں کو دیکھا جن میں سے ہر ایک کا وزن کم از کم چار کلو گرام تھا۔ ایسی ہی مزید چار بارودی سرنگیں سونپا کے پاس موجود بیگ میں بھی تھیں اور انہیں یہ بارودی سرنگیں اس ریلوے ٹریک پر نصب کرنا تھیں جس پر سے شہر دل کے مطابق دہلی سے نکلتی جانے والی راجدھانی ٹرین کو کچھ دیر بعد گزرنا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس وزن کی ایک بارودی سرنگ کا دھماکا کسی بڑی گاڑی کو پرزے پرزے کر دینے کے لیے کافی تھا جبکہ یہاں کم از کم آٹھ بارودی سرنگیں نصب کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ ان سرنگوں کا درمیانی فاصلہ اتنا رکھا جاتا تھا کہ پہلے دھماکے کے بعد ٹرین کے ریلوے رستے ہائی کی سرنگیں بھی پھٹ چکی ہوتیں۔ اتنی بڑی تعداد میں بارودی سرنگوں کے پھٹنے کا مطلب تھا بہت بڑی

دھماکوں نے اسے اپنے ارادے پر عمل نہیں کرنے دیا۔ کسی خود کار عمل کی طرح اس نے خود کو نیچے گرایا اور ریپر ہاتھ میں تمام لی۔ گل خان نے گیٹ کے پت کو دھکا دے کر اپنے لیے ایک آڑ کا بندوبست کیا اور اپنے ہتھیار کی خصوصیت کا فائدہ اٹھا کر باہر سے ہونے والی قازنگ کا جواب دینے لگا۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ قازنگ کا آغاز ہونے ہی باہر نکلتی گاڑی ڈمگالی تھی اور خود بخود دائیں طرف موڑتی تھی۔ یعنی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا شخص کسی نہ کسی طور حائر ہوا تھا۔ اپنے مالک کی خیریت کی طرف سے شکریاں ادا کرتے ہوئے قازنگ کا سلسلہ جاری رکھا۔ وہ اس گاڑی کو دیکھ چکا تھا جس میں سے گھیل کی گاڑی پر قازنگ کی گئی تھی۔ کاشکوف کی مدد سے قازنگ کرنے والا بھی اس کی نظر میں آ گیا تھا اور وہ اسی کونٹا نہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ شخص اس کے نشانے پر تو نہیں آیا تھا لیکن اس کی توجہ ہٹ چکی تھی۔ وہ گھیل کی گاڑی کی طرف قازنگ کر رہا تھا کہ اب گل خان کی قازنگ کا جواب دے رہا تھا۔ گل خان قازنگ پوزیشن میں تھا لیکن اسے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ دائیں طرف مڑ جانے والی گھیل کی گاڑی چند سیکنڈ کے رہنے کے بعد دوبارہ چل پڑی ہے۔ یعنی وہ گھیل کی زندگی کی امید رکھ سکتا تھا لیکن اس کے لیے ضروری تھا کہ حملہ آور قازنگ نہ کر سکیں جبکہ ان کی گاڑی حرکت میں آ رہی تھی۔ اس موقع پر اس نے عجیب بے جگری اور جاں نثاری کا مظاہرہ کیا اور بہتر نشانہ لینے کے لیے گیٹ کی آڑ سے نکل کر حملہ آوروں کی گاڑی کے تاروں کی طرف گمن کا رخ کر دیا۔ وہ نہیں دیکھ سکا کہ اس کی چلائی گئی گولیاں نشانے پر لگی ہیں یا نہیں۔ جسم میں اتر جانے والی دھاتی سلاخوں نے اسے اتنی سہلت ہی نہیں دی تھی۔

☆☆☆

اس نے اپنے اطراف میں پھیلے محو اندھیرے کو دیکھا۔ اسے یقین تھا کہ اس اندھیری اور ویران جگہ پر اس کے اور سونپا کے علاوہ کوئی انسان موجود نہیں ہوگا۔ سونپا بھی اس سے دور ریلوے لائن کی دوسری طرف کسی جگہ چھپی ہوئی تھی اور وہ ہرگز نہیں دیکھ سکتا تھا کہ وہ کہاں موجود ہے۔ اس کی طرح یقیناً سونپا بھی اسے دیکھنے سے کامرہمی لیکن وہ اس موقع کا فائدہ اٹھا کر بجائے گئے کے بارے میں نہیں سوچ سکتا تھا۔ اس کے چروں میں اپنے پیادوں کی صلاحیت کی زنجیریں پڑی تھیں اور محروم میں اس عزت کا طوق ڈالا گیا تھا جس کا بھرم وہ انہوں کی نظروں میں ٹوٹے نہیں دینا چاہتا تھا۔

"خودکشی حرام نہ ہوتی تو میں ایک جھگڑے میں ان زنجیروں

تھائی۔ اس تھائی میں درجنوں انسان مارے جاتے اور اسے انسانوں کے خون کا بوجھ اپنے سر لے کر چبھنے کا تصور ہی اس کے لیے بھیا تک تھا۔

”کیا میں ان کی پلیٹیں نکال کر انہیں نہ کارہ بنادوں؟“ طے شدہ پروگرام کے مطابق اسے سیٹی کی آواز سن کر کام شروع کر دینا تھا لیکن وہ ابھی تک وہیں بیٹھا غور و خوض کر رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ سرنگ کے ساتھ موجود پلیٹ پروڈاکٹ نے سے ہی سرنگ دھماکے سے پھٹتی ہے اور اگر اس پلیٹ کو نکال دیا جائے تو دھماکے سے بچا جاسکتا ہے لیکن غور کرنے پر اسے اپنی یہ تدبیر بے مصرف محسوس ہوئی۔ وہ پلیٹیں نکال بھی دیتا تو سونیا کی نصیب کردہ بارودی سرنگیں پھٹ کر اپنا کام دکھا دیتیں۔

یہ اس کا ملک تھا۔ اس کے لوگ..... لیکن وہ انہیں مارنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ انسان تھا اور اس کے نزدیک سب سے پہلے انسانیت محترم تھی۔ بے شک اسے اپنے اور اپنے خاندان کے تحفظ کی فکر تھی لیکن وہ یہ تحفظ اتنی زنجیروں کی قیمت پر حاصل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے اس بات پر بھی یقین نہیں تھا کہ غریب کاری کی ان کارروائیوں میں اس کے وطن کا کوئی مفاد پوشیدہ تھا۔ پروفسر دیکر جیسے لوگوں کے ہاتھوں اپنا دماغ کنٹرول کرنے کی کوششوں کے باوجود اس میں اچھی صلاحیت موجود تھی کہ جھوٹ اور سچ میں فرق کو سمجھ سکے۔ وہ ہرگز بھی یہ دھوکا کھانے کے لیے تیار نہیں تھا کہ اسے جو کچھ کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے وہ اس کی طرف سے اس کے ملک کی خدمت ہوگی۔ وہ جانتا تھا ایسی خدمات ایسے دو نمبر لوگوں کے ذریعے حاصل نہیں کی جاتیں لیکن فی الحال اسے یہ مسئلہ درپیش تھا کہ ہونے والی تباہی کو کیسے روکے۔ اس کے نزدیک انسانی جانوں کو بچانے کی واحد ترکیب یہ تھی کہ ٹرین کی آمد سے قبل ہی دھماکے ہو جائیں تاکہ ٹرین پیچھے ہی روک لی جائے لیکن سوناں یہ پیدا ہوتا تھا کہ دھماکے کیسے کیے جائیں۔ سونیا کے سیٹی بجانے کا مطلب تھا کہ ٹرین کی اس جگہ آمد میں زیادہ وقت نہیں ہے اور طے شدہ پروگرام کے مطابق اپنا کام مکمل کر سونیا اور اسے یہاں سے نکل جانا تھا۔ اس ویرانے میں آگے جا کر وہ گاڑی موجود تھی جس میں انہیں دھماکوں سے قبل فراہم ہو چکا تھا لیکن اس کے دماغ میں سوراخا گیا تھا کہ دھماکے ٹرین کی آمد سے پہلے پہلے ہونے ہیں۔ آخر کار اس کے دماغ میں ایک ترکیب آئی مگنی۔ وہ جس درخت کے تنے سے ٹپک لگے بیٹھا تھا، اس کی لمبی لمبی شاخیں زمین کو

چھوری تھیں۔ اس نے پھل خارج بھی بجا دی اور اپنے پاس موجود پتھر نکال کر پھرتی سے ان لمبی جٹاؤں کو کاٹنے لگا۔ اس کے ہاتھ اس وقت کسی مشین سے بھی زیادہ تیزی سے چل رہے تھے اور ساتھ ساتھ دماغ کمپیوٹر کی طرح وقت کا حساب کتاب کرتا جا رہا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ ٹرین ابھی اس مقام سے کتنی دور ہوگی۔ سرنگوں کو نصب کرنے کے لیے قریب ترین وقت کا تعین کرنے کے باوجود بہر حال اتنا مار جن رکھا گیا تھا کہ وہ اور سونیا اپنا اپنا کام مکمل کر بھگت و ہاں سے نکل سکیں۔ اسے اسی مار جن سے قائلہ اٹھانا تھا اور اس بات کا انتظام کرنا تھا کہ بارودی سرنگیں ٹرین کی آمد سے قبل پھٹ سکیں۔

درخت کی جٹاؤں کو کاٹنے کے بعد اس نے اندھیرے میں ہی ان کے سروں کو آپس میں بائیں بائیں کر ایک دوسری کی کل دینا شروع کر دی۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ بہت زیادہ لمبی تیار کر سکتا چنانچہ جتنا ممکن ہوا اتنی لمبی تیار کر لی اور لحظہ بھر کے لیے خارج ہلا کر دو بھاری پتھر بھی حاصل کر لیے۔ ایک پتھر کوری کے سرے پر بائیں کر اپنا جگ شانے سے لٹکایا اور کل سامان ریل سے ٹریک کے قریب پھل کر ڈالا۔ چاروں بارودی سرنگوں کو ایک ساتھ پتھروں پر رکھنے کے بعد اس نے ان کے نزدیک ہی ایک پتھر رکھنے کے بعد اپنی تیار کردہ دسی سے بندھا دوسرا پتھر اس کے اوپر لٹکادیا اور اس دسی سمیت احتیاط سے پیچھے ہٹا چلا گیا۔ آخری حد تک جانے کے بعد اس نے دسی کو زور سے جھٹکا دیا۔ اسے معلوم تھا کہ اس عمل کے نتیجے میں پتھر اپنی جگہ سے حرکت کر کے بارودی سرنگوں پر گرے گا اور دباؤ پڑے گی سرنگیں پھٹ جائیں گی۔ چنانچہ دسی کا سرا جھوڑ کر فوراً ہی خود کو گھٹنوں کے بل زمین پر گرالیا اور دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ یہ پورا عمل شاید سیکنڈ کے بھی دسویں حصے میں انجام پایا تھا۔ زمین پر گرتے ہی اس نے کان پھاڑ دھماکے سنے۔ دھماکوں سے زمین لرز اٹھی اور اس نے اپنے جسم کو جھکے تگتے محسوس کیے۔ ابھی وہ ان جھکوں سے سنبھلا نہیں تھا کہ اس کے سر پر ایک قیامت سی ٹوٹ پڑی۔ تکلیف کے شدید احساس کے ساتھ ہی اس کے دماغ پر اندھیروں نے چھا کر دی۔

ظلم و جبر کے سامنے سب سے سہمراں نوجوان
کسی دستان جو غلط کاروں کو لے لے
نصیب ناک تھا ہائیں واقعات اپنا ماہ پڑھیں

TAGPK.COM

قسط: 18

شہزادہ رولہ

اس کا سارا

زندگی پیار کا ثبوت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ نابھوار یوں
کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی
سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تند و تیز
اندھیوں نے اسے محض سرایا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون
حرب و ضرر کے ماہر باتھوں نے اسے ناقابل شکست بنایا تو دوسری
طرف ظلم و حیر کے حلال علم و طاقت بلند کرنے والے اس پر عزم
نہ جوان کو حرفِ علم کے مانند مٹانے جانے کے منصوبے بناتے جا رہے
تھے... اس کی زندگی جو سمیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور
روشنی سے دور تھی لیکن... بے حسری میں جسے اپنے والے عشق کی لو
اسے تیر کی میں مٹی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے
صوفیانہ کاروبار میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک
تھی... اس کی یہ قرار یوں کو قرار دینے سے لیے اس کا خون، اس کا پیار
اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار
مان لیتا... اگرچہ تاریک کنوٹ نے طاقت اور کیمند کے نشے میں چور
ہو کر اپنے دل کو بوجھا لیا وہ برو کا بھارتیہ تھا اور باصر کی

TAGPK.COM

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سرِ پانچ مہنہ جوان کی تحریر نگار داستان



گذشته افسانه‌ای کاخ خلاصه

معاذ ایک ذہین لیکن مستون مزاج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جوائن کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ انسٹی ٹیوٹ سے واپس آ رہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو سڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی نذر فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشری نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بشری ماس کیو لی کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اختیار کے لیے کام فیروز لکھتی ہے۔ وہیں وہ اپنی بہن کی تعلیم بھی دیکھتا ہے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر معاذ نے اپنے لیے ایک نیا ہیرو بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ معاذ بشری کی فیروز لکھتی ہے۔ وہیں وہ اپنی بہن کی تعلیم بھی دیکھتا ہے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر معاذ نے اپنے لیے ایک نیا ہیرو بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دے دیتے ہیں۔ معاذ کے واہس نہ آنے پر انتقامیہ کے افراد پولیس اور ریسلنگ ڈسٹریکٹ سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جوگی کی ہسٹری میں پاتا ہے۔ اپنی حالت سے اسے اپنے شدید زخمی ہونے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ جوگی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ معاذ کا موبائل جنگل میں ہی پھنس کر جاتا ہے اور جوگی کے پاس ایک کوئی ذریعہ نہیں ہوتا جس سے باہر کی دنیا سے رابطہ کیا جاسکے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے۔ جوگی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نواز کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے پراسرار علم سکھانے کی ہانی بھرائیتا ہے اور معاذ واقعی اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ادھر جانے وقوع سے ملنے والے معاذ کے کیمرے سے جب تصویریں نکلوائی جاتی ہیں تو بہت سے قدرتی مناظر کی تصویریں اس سے ایک ایسی تصویر بشری کی نظر میں آ جاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانک رہا تھا۔ وہ کانی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پر وجینت نے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشری تحقیق کر رہی تھی۔ بشری کے اپنے والد جرنلسٹ ہیں اور حق گوئی ان کے خون میں شامل ہے۔ اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشری کو کانی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ مدد سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باڈل نامی فنڈے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشری انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دنوں میں ہی معاذ واہسی کا ارادہ کرتا ہے تاہم دوسرے ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا عرفان اللہ اور یحیٰی دانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو دق نامی ایک لڑکا دہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باڈل اچانک بشری کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر دیتا ہے۔ ادھر معاذ کو واہسی لانے کے لیے اوچھے جھنڈے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اسے واہسی آنے کا پیغام دیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کر کے اسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات لی جاتی ہیں، نہ بتانے پر اس کے بھائی کا ایک گروہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشری بھی انتقام کی آگ میں جھتی ہوئی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریٹنگ شروع ہو جاتی ہے۔ معاذ کو بچنے والا لڑکا دق نامی اپنے گروہ کے ساتھ ایک پارٹی میں جاتا ہے۔ وہاں اسے معاذ کے حوالے سے مشکوک ایک شخص نظر آتا ہے۔ وہ اس کے پیچھے جاتا ہے مگر اسے گھیر لیا جاتا ہے۔ بہر حال اس کو تنبیہ کے ساتھ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ادھر معاذ کے دوست عالم شاہ کے بہنوئی کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ کئی خون میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے پتہ چل کر کے اس کے دماغ پر کنٹرول کرنے کی

کوشش کی جاتی ہے تاہم پھر سے حاصل ہونے والے علم کی بدولت میں کامیابی نہیں ملتی۔ پھر یہی کامیابی کو چھلانے کا پروگرام بناتی ہے۔
 اسی عالم شاہ مزمل کا لگتا ہے کہ اس کے جینوں کا لگتا کسی نے کیا۔ وہ قاضی کو گھبراتا ہے اور اپنے پیش اسے گولیاں مار کر تل کر دیتا ہے تاہم وہ
 جاتی ہے۔ عالم شاہ اس کے بعد فاکوؤں کے سرخار چاچ کو چھاپتا ہے اور ادا ہے کیفر کردار تک پہنچاتا ہے اس کے بچے کو بھی قتل کر دیتا ہے۔
 ہے۔ عالم شاہ اس کا لگتا ہے کہ باڈل کے لگتا ہے کہ وہ جا رہا ہے۔ تاہم یہاں سوس ماحر کو چھلانے کا پروگرام بناتی ہے۔
 والوں پر حملہ کر دیتا ہے تاہم ان کی فائرنگ سے ماحر مارا جاتا ہے اور الزام معاذ پر نہیں آتا مگر معاذ سے کام لینے والوں کو اس پر شک
 گزرتا ہے۔ عالم کی بہن فہمیل شاہ کے نو مولود بیٹے کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اغوا کا الزام لطیف سومرو پر آتا ہے۔ عالم شاہ وہاں موجود ایک

محاطات ہوتے ہیں تا وہ عجیب طرح سے ملے پاتے ہیں۔
 وقاص کا بھی معاملہ کچھ ایسا ہی ہے۔ اس نے اتفاقاً علینہ کو
 کہیں دیکھا اور اسے دل دے بیٹھا۔ آپ اس کے جذبے
 کی شدت کا اندازہ اس بات سے لگایے کہ اس نے اپنی عمر
 کے عام لڑکوں کی طرح بھی علینہ سے رابطہ کرنے یا اسے
 اپنے جذبات سے آگاہ کرنے کی کوشش نہیں کی اور صرف
 اور صرف اس لیے اپنی جان خطرے میں ڈال کر معاذ کی مدد
 کرتا رہا کہ وہ علینہ کا بھائی تھا اور وقاص، علینہ کو خوش اور
 نرسکون دیکھنا چاہتا تھا۔ لہذا بہت جلد ہی وقاص کا تیس
 اور احمد کے درمیان رابطہ قائم ہو گیا۔ انہوں نے اس صورت
 حال پر خود کو اس سے روکا۔ مگر علینہ کی باتوں پر
 ”محبت کی داستانیں عموماً حیرت انگیز ہوتی ہیں اور
 عام لوگ انہیں سمجھ نہیں پاتے۔ بہر حال میں نے اس وقت
 آپ کو اس لیے زحمت دی ہے کہ میں فرنگسٹو کریں اور کوئی
 ایسا مل سکے کہ جو دونوں فریقین کے مسائل کو حل کر سکے۔“
 لالہ نے فرنگسٹو من سب سمت دی۔

”آپ کے ذہن میں جو کچھ ہے سے بیان
 فرمادیں۔ بے درپے مسائل و مصائب کا سامنہ کرتے
 ہوئے میرا تو دماغ ہی ماؤف ہو گیا ہے اور مجھے لگتا ہے کہ
 میں کچھ بھی سوچنے اور فیصلہ کرنے کے لائق نہیں رہا۔“ خاور
 احمد کے انداز میں بے چارگی تھی۔ سیدھی سادی زندگی
 گزارنے والے اس ایماندار اور محنتی شخص نے کب سوچا تھا
 کہ زندگی میں بھی ایسا وقت بھی دیکھ پڑے گا کہ اپنے بچوں
 کو تحفظ دینا بھی ممکن نہ ہوگا۔

”میں وقاص کے لیے آپ کی بیٹی علینہ کا رشتہ مانگنا
 چاہتا ہوں۔ اس طرح علینہ میری حفاظت میں آجائے گی
 اور آپ کم از کم بیٹی کی طرف سے بے فکر ہو جائیں گے۔“
 آخر لالہ نے صاف الفاظ میں اپنا مدعا بیان کر دیا۔

”مگر میں کیسے اپنی بیٹی کو ایک “خاور احمد نے
 اپنی بات ادھوری چھوڑ دی لیکن لالہ جیسے زیرک بندے
 کے لیے اس ادھوری بات کو سمجھنا مشکل نہیں تھا۔

”میں جانتا ہوں کہ آپ کے لیے ایک ایسے لڑکے کو
 جس کا خلق پروردگار نے دنیا سے بے پروائی کی حیثیت
 سے قبول کرنا سزا نہیں ہوگا۔ مگر آپ کی طرح آپ بھی
 ڈاکٹر کی طرح کسی معزز طبقہ سے وابستہ دانا دل خواہ
 رہتے ہوں گے۔ میں رسولی کے خاندان خواہشات سے
 برخلاف ہوتے ہیں۔ ایمانداروں سے بتائیے کیا موجودہ

حالات میں کسی شریف گھرانے میں اتنی ہمت ہے کہ آپ کی
 بیٹی سے رشتہ جوڑنے کا سوچ سکے؟“

”تو تو کیا میں حالات سے گھبرا کر اپنی بیٹی کو اپنے
 ہاتھوں سے گڑھے میں دھکا دے دوں؟“ انہیں لالہ جیسی کے
 الفاظ نے سخت چوٹ پہنچائی تھی اس لیے جھپٹا کر فٹی اٹھے۔

”معذرت چاہتا ہوں کہ میں نے آپ کی دل
 آزاری کی لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ وقاص کے لیے انکار
 کر کے آپ اپنی بیٹی کی زندگی میں آئی خوش فہمی کو لوٹا دیں

”مگر وہ بہت احمق لڑکا ہے اور علینہ کو بہت چاہتا ہے اس
 لیے میں اسے اپنا بیٹا سمجھتا ہوں۔ آپ کی بیٹی کی جگہ اس کے
 لیے بہت خوش رہے گی۔“ لالہ جیسی نے انہیں سمجھانے کے

”ایک خوفناک سے کھانڈے میں جاکر انسانیت
 کس طرح خوش رہ سکتا ہے۔ یہاں وہ بھائی کے لیے
 پریشان ہے، وقاص سے شادی کر کے اس کے دل کو مسلسل

یہ دھڑکا رہے گا۔ اس کا جرائم پیشہ شوہر جانے کب اور
 کہاں اپنے جیسے کسی مجرم یا پولیس والوں کا نشانہ بن جائے
 گا۔“ بیٹی کا معاملہ تھا اس لیے وہ لالہ جیسی جیسی و بنگ شخصیت
 کے سامنے بھی نہایت کھل کر بول رہے تھے۔

”اگر میں آپ کو اس بات کی ضمانت دوں کہ وقاص
 ہماری دنیا چھوڑ کر علینہ کے ساتھ ایک نئی دنیا بسائے گا تو کیا
 تب بھی آپ کا بک جوا ب ہوگا؟“ لالہ جیسی کے سوال نے

انہیں سمجھنے کے لیے بالکل خاموش کر دیا۔
 ”میں دونوں بچوں کو مک سے باہر کی محفوظ جگہ پر
 بھجوا دوں گا۔ میرے شرفاء سے بھی رابطے ہیں۔ کئی

دوسرے ملک میں وقاص کے لیے رہائش اور ملازمت کا
 انتظام میرے لیے چنداں دشوار نہیں ہوگا۔“ لالہ جیسی نے
 ان کے جواب کا انتہائی بے بغیر مزید پیشکش کی۔

”لیکن آپ اتنا سب کچھ کیوں کریں گے؟ وقاص
 آپ کے گروہ کا بندہ ہے اور یقیناً آپ کے لیے بہت سی
 خدمات انجام دیتا ہے۔ اپنے ایک قابل اعتماد کن کوٹھونے

کی صورت میں یقیناً آپ کو نقصان ہوگا پھر بھی آپ اس کے
 لیے اس حد تک جانے کو تیار ہیں تو آخر کیوں؟“ خاور
 صاحب نے جو سوالات اٹھائے انہوں نے اس بار لالہ کو

”خاور صاحب! میں نے اسے بھجوا دیا۔“
 ”جواب میں لالہ جیسی نے میری بات کو خاور
 احمد سے نوکا۔“

”جواب تو بہت واس ہے لیکن یاد میں کہ جائے
 کے بعد آپ ایک ایسے راز کے امین بن جائیں گے جسے

میں نے زندگی میں کبھی کسی پر غا ہر نہیں کیا۔ "لالہ میسلی نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے یوں خاور احمد کو دیکھا جیسے تول رہا ہو کہ اس بندے پر بھروسہ کیا بھی جاسکتا ہے یا نہیں۔

"آپ کی خواہش کے مطابق یہ رشتہ طے پائے یا نہیں، میں ہر صورت آپ کو اس بات کی ضمانت دیتا ہوں کہ آپ کا راز ہمیشہ میرے پاس امانت رہے گا۔" خاور احمد نے یقین دہانی کروائی۔

"میں یہ سب چھو اس لیے کر رہا ہوں کہ وقاص صرف میرے گرد و کارن نہیں ہے، وہ میرا سگا بھتیجا ہے لیکن اسے خود بھی اس کیفیت کا علم نہیں ہے۔" لالہ کے اٹکٹکے ہوئے

خاور احمد نے طے کر لیا۔ "میرا خیال تھا کہ یہ سب شریف اور پیارا لڑکا جسے میں نے اپنے دھندے سے پاگل کر رکھا

ہو تھا۔ اس نے اپنے شوق سے پڑھا لکھا اور ایک کانٹا میں پھنسا کر رکھ لیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ شادی کے لیے اپنی کسی کوئی انتخاب کرے گا لیکن میں یہ جان کر حیران رہ گیا کہ اس کا سرس میں کام کرنے والی ایک رقا مہ اور گائیکہ پر دل آ گیا ہے۔ میں نے اس رشتے کی مخالفت کی لیکن اس وقت میں یہ نہیں جانتا تھا کہ محبت جیسے طاقتور جذبے کے سامنے میرے انکار کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔" لالہ کے لبوں سے ایک سرد آہی نکلی۔

"اس نے میری اجازت کے بغیر خاموشی سے اس عورت سے شادی کر لی اور میں نے اپنی ناراضی کے اظہار کے لیے اس سے توبہ تعلق کر لیا لیکن مجھے اس کے بارے میں ساری خبریں تھیں۔ اس سے ہاں بیٹے اور بیٹی کی پیدائش ہوئی تو میرا جی چاہا کہ جا کر اس کے بچوں کو دیکھوں لیکن پھر اتنا نے اجازت نہیں دی۔ میں اپنے غصے میں اتنا کھنور ہو گیا تھا کہ وہ کئی بار مجھ سے منے اور معافی مانگنے آیا لیکن میں نے اس سے ملنا ہی گوارا نہیں کیا۔ ایک ایسے ہی دن جب وہ میرے در سے ناکا م لوٹ رہا تھا، میرے ایک دشمن نے سے گولی مار دی اور میں ہمیشہ کے لیے بچھتا مارہ گیا کہ کاش میں نے اسے اس کی نافرمانی معاف کر دی ہوتی اور اس کی محبت کو قبول کر لیا ہوتا۔" لالہ کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے بلکہ ہوش سدا ہوئی تھیں۔

"یقیناً آپ نے اپنی اس غلطی کی تلافی کے لیے میری بھائی کے دل و خیال کی اسے داری اسے سرے لی ہوگی۔" لالہ نے ہنسنے لگا۔

"ہرگز نہیں۔ میں تو اپنا سایہ بھی ان پر نہیں ڈالنا چاہتا

تھا۔ جوان بھائی کی میت اٹھا کر میں بہت بزدل ہو گیا تھا اور ڈر گیا تھا کہ مجھے نقصان پہنچانے کے لیے میرے دشمن کہیں ان کو بھی نشانہ نہ بنائیں۔ اپنے بھائی کی نشانوں کو زندہ رکھنے کے لیے میں نے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ اس خوددار عورت نے بھی کبھی میرے در پر آنا گوارا نہیں کیا اور سرکس کی دنیا میں واپس لوٹ کر لیکن پھر ایک دن مجھے پتا چلا کہ میری یہ احتیاط بھی کام نہیں آئی اور قسمت نے میرے دل پر ایک اور وار کر دیا۔ پتہ بد نظروں نے میری بھونچ اور نو جوان بھائی کی جان لے لی تھی اور وقاص غم و غصے سے پاگل ہوا پولیس

نے مجھے لالہ کی تلاش میں قوموں کو اپنے سر پر رکھا۔ تب اس نے کہا کہ اس وقت میں وہ اپنے پاس ہے۔ اس دن کے بعد سے آج تک وہ میرے ساتھ ہی ہے۔ میں تو دوسرا آدمی تھا، وہ خود ہی نہیں جانتا کہ اس سے میرا کیا رشتہ ہے۔ لالہ نے اپنی بات ختم کر کے خاموشی اختیار کر لی۔

"جو چاہو مجھے اس پر بہت فسوس ہے۔" خاور احمد نے افسوس کا اظہار کیا۔

"صرف افسوس مت کیجیے۔ میرے بھائی کی آخری نشانی کو بچانے میں میری مدد کیجیے۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر اسے سینہ نہیں ملی تو میں اسے بھی کھودوں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ یوں مرنے مارنے میں اپنی زندگی ضائع کرنے کے بجائے زندگی سے پیار کرے اور یہ اسی صورت ہو سکتا ہے کہ اس کی محبت اس کے ساتھ ہو۔" لالہ کا لہجہ التجا ہیہ ہو گیا۔

"آپ کے ایسے خیالات مجھے حیرت میں مبتلا کر رہے ہیں۔" خاور احمد بولے بغیر نہیں رہ سکتے۔

"میں یوں سمجھ رہی ہوں کہ بھائی کی محبت کو قبول نہ کر کے اس کے ساتھ جو زیادتی کی تھی، اس سے بیٹے کو اس کی محبت دنا کر اس کی تلافی کرنا چاہتا ہوں۔" لالہ نے اتنی سادگی سے جواب دیا کہ وہ لالہ کی شکل دیکھتے رہ گئے۔ ایک ایسا شخص جس کی شہر میں دھماکے لگی اور جس کے بارے میں ان جیسا شخص کی اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ نہایت سخت دل انسان ہوگا۔ اندر سے کتنا ٹوٹا ہوا اور اس تھا۔

"میں آپ کے احساسات و جذبات کو سمجھ رہا ہوں لالہ اور امید ہے کہ آپ جیسا سمجھ دار انسان میری کیفیات کو

بھی سمجھ سکا۔" لالہ کا باپ ہوں اور میرے بھائی کی طرح اور گولی بھی چلی فیصلہ کرنا نہیں ہے اس لیے اگر آپ مجھے سوچ کر فیصلہ کرنے کی ہمت نہایت ہے تو آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔" لالہ نے لالہ کی طرف سے ہنسنے لگا۔

تک تو متاثر کیا تھا کہ وہ فوری طور پر انکار کرنے کا نہیں سوچ

کے تھے اور قرینے سے مہلت مانگ لی تھی۔

”بالکل، کیوں نہیں۔ مئی کے باپ کی حیثیت سے یہ آپ کا حق ہے۔ آپ اچھی طرح سوچیں مگر میری درخواست ہے کہ یہاں ہونے والی کل گنگو کو عینہ مئی سے شیئر کر کے اس سے اس کی رائے ضرور نیچے گا۔ بعض اوقات بچے بڑوں سے زیادہ سمجھ داری اور جرأت کے ساتھ فیصلے کرتے ہیں۔“ لالہ نے دھیمے لہجے میں مشورہ دیا۔ خاور احمد وہاں سے رخصت ہوئے تو ان کا ذہن الجھا ہوا ضرور تھا لیکن وہ لالہ کے بچے اور خصل میں کوئی شک نہ ہو محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

ہم مشکل حالات کا شکار ہیں لیکن اللہ نے چاہا تو جلد ان مشکلات سے نکل جائیں گے۔“ عالم شاہ جواب تک گل خان کی فکر میں اس کی طرف متوجہ نہیں ہو سکا تھا، اس کی بات سن کر فوراً اس کی طرف رخ موڑا اور اس کے شانے پر اچھا بازو پھیلاتے ہوئے اسے حوصلہ دینے کی کوشش کی۔

”عالم شاہ ٹھیک کہہ رہا ہے بھل! یقین مانو کہ میرے دل میں ایک بار بھی بھروسے سے یہ خیال نہیں آیا کہ تم لوگوں کی وجہ سے ہمارے اوپر کوئی مصیبت آئی ہے۔ اللہ میں تو اس بات پر شرمندہ ہوں کہ ہم اپنے غمخیزوں میں شرکت کے لیے آپ کے واسطے مہربانوں کا خاقت نہیں کر سکے۔“ گل خان نے اس کی بات سن کر ہنس کر کہا۔

”خیر یہ فیصلہ چھائی لالہ کا بیان ہے کہ آپ اسے انداز سے سوچتے ہیں لیکن جس طرح ہماری وجہ سے آپ لوگوں کی خوشیاں درہم برہم ہوئیں اور آپ ایک مستقل پریشانی میں مبتلا ہو گئے، وہ ہمارے لیے شرمندگی کا باعث ہے اور اس وقت تو مجھے سب سے زیادہ فکر اس بات کی ہو رہی ہے کہ بے چارے گل خان کے ساتھ کیا ہوا ہوگا؟“

اس نے سوتے ہوئے چہرے کے ساتھ اپنے احساسات کا اظہار کیا۔

”اللہ بہتر کرنے والا ہے۔ ممکن ہے فائرنگ کی آواز سن کر پولیس وہاں آگئی ہو اور گل خان کے لیے بچنے کی صورت نکل آئی ہو۔“ گل خان نے اسے تسلی دی اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید بولے۔

”پہلے میں تم لوگوں کو کسی محفوظ مقام پر پہنچا دوں پھر گل خان کے بارے میں معلومات حاصل کروں گا۔“

”کیا مطلب؟ کیا آپ اس وقت ہمیں سفارت خانے لے کر نہیں جا رہے ہیں؟“ عالم شاہ نے چونک کر پوچھا۔

”نہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ موجودہ حالات میں تم لوگوں کا وہاں جانا مناسب نہیں ہوگا۔ فی الحال میں تمہیں اپنے ایک دوست کے پاس لے جا رہا ہوں۔ وہ بہت چلتا پرزہ آدمی ہے۔ اس کے پاس تم لوگ محفوظ بھی رہو گے اور تمہارے مسائل کا کوئی نہ کوئی حل بھی نکل آئے گا۔“ گل خان نے جواب دیتے ہوئے گاڑی کو دائیں جانب والی سڑک پر

ساتھ والی نشست پر ہی براجمان تھا اس لیے اس نے گاڑی کے رکنے اور چلنے کے درمیان ٹھیک کے ہونٹوں سے ٹکٹے والی آہ گولیوں کے شور میں بھی سن لی تھی اور اب اس سے پریشانی کے عالم میں اس کی خیریت دریافت کر رہا تھا۔

”میں ٹھیک ہوں۔ بس اچانک گولیاں چلنے سے ہلکا سا ہتکا ہوا کہ دروازے سے ٹکرا گیا تھا۔ کاندھے پر ہلکی سی چوٹ لگی ہے لیکن تم پریشان نہ ہو۔ میں ٹھیک ہوں۔“ انہوں نے تیز رفتاری سے گاڑی چلائے ہوئے اس کو تسلی دی۔ وہ لوگ آگے نکل آئے تھے لیکن گولیاں چلنے کی مدد ہم آوازیں اب بھی ان کی سماعتوں تک پہنچ رہی تھیں۔

”گل خان بے چارہ اکیلا وہاں پھنس گیا ہے۔ کہیں اسے کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔“ بھل اور اس کے بچے کے ساتھ پچھلی نشست پر براجمان عالم شاہ نے پریشانی سے پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے فکر مندی کا اظہار کیا۔ اب وہ اتنے آگے نکل آئے تھے کہ نہ تو وہ بگھانظر آ رہا تھا اور نہ ہی حملہ آوروں کی گاڑی۔

”ہمارے پاس اسلحہ ہوتا تو اس کی مدد کے لیے رک سکتے تھے۔ خالی ہاتھ رک کر تو نقصان میں اضافے کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔“ گل خان نے اپنی رائے کا اظہار کیا جو کہ حقیقت پر مبنی تھا۔

”یہ ہم کس مصیبت میں پھنس گئے ہیں ادا سامیں! کیا یہ ہماری دوست ہے کہ اسے اسلحہ دے کر نقصان رکھے؟“

”نہیں۔ یہ ہماری مصیبت ٹوٹ پڑی ہے۔“ بچے کو اپنے سینے سے لٹائی ہوئی گل خان کا چہرہ یوں سپرد ہوا تھا جیسے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی موجود نہ رہا ہو۔

”ایسا کیوں سوچ رہی ہو میری پیاری بہن! بے شک

موجودہ حالات میں ان لوگوں کے پاس ان کے لیے کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ حال خرابی میں تھے اور ان سے زیادہ اچھا راستہ اور حکمت رکھتے تھے۔

”یہ ہم کس مصیبت میں پھنس گئے ہیں ادا سامیں! کیا یہ ہماری دوست ہے کہ اسے اسلحہ دے کر نقصان رکھے؟“

”کیا حال ہے پانڈے! یہ بتاؤ کہ اس وقت گھر پر

”ایسا کیوں سوچ رہی ہو میری پیاری بہن! بے شک

ہی ہوئے تھے۔ بنوارے کی کبیر کھینچ دینے سے پرانے رشتے
ناتے کوئی ختم تھوڑی ہو گئے ہیں۔ اس نے بڑے جوش
سے انہیں خوش آمدید کہا۔

پانڈے اسکول کے زمانے سے میرا دوست ہے۔
ہم ایک ساتھ کھیل کود کر بڑے ہوئے ہیں۔ اب اپنی اپنی
مصروفیات کی وجہ سے ملاقات کم کم ہوتی ہے لیکن مجھے جب
بھی ضرورت ہو اسے پکار لیتا ہوں اور یہ بھی میری مدد کرنے
سے انکار نہیں کرتا۔ اب کھیل ان لوگوں سے پانڈے کا

لوگے یا نہیں؟ ایک ذیلی سڑک پر گاڑی دوڑاتے ہوئے
کھیلنے لگا ہوا بال نکالا اور کسی سے بات کرنے لگے۔

بس تو پھر ٹھیک ہے، انتظار کرو۔ میں پانچ دس
منٹ میں تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں۔ میرے ساتھ میرے
بچہ مہین بھی ہوں گے۔ وہ لوگ صرف فون پر ہونے
والی یکطرفہ گفتگو ہی سن سکتے تھے۔

میں تم لوگوں کو اپنے جس دوست کے پاس لے
جا رہا ہوں وہ ہے تو ہندو لیکن متعصب بالکل بھی نہیں ہے۔

میرے حوا کے ساتھ لوگ بھی جا رہے ہیں۔ ان لوگوں کو بتایا۔
فون بند کرنے کے بعد انہوں نے ان لوگوں کو بتایا۔

اب میں مناسب سمجھوں۔ اس صورت حال میں
میرا چاہو یاں کو بالکل ناؤف ہو چکا ہے۔

میں نے اختلاف نہیں کیا۔ اب گاڑی ایسے آہستہ آہستہ میں پہنچ
گئی تھی جہاں قطار در قطار بنے جدید اور خوبصورت بلکوں
کی موجودی رہائشیوں کی خوشحالی کی گواہی دے رہی تھی۔
کھیل نے سر کی گیت والے ایک بچے کے سامنے گاڑی
روک کر ہارن دیا تو پہلے کسی نے گیت میں بنی چھوٹی سی
کھڑکی کھول کر جھانکا پھر گیت کھول دیا۔ کھیل گاڑی اندر
لے گیا۔

پانڈے صاحب اندر آپ لوگوں کا انتظار کر رہے
ہیں۔ گاڑی سے اترتے ہی ایک ملازم نے ان کی
راہنمائی کی۔

کھیل مائی ڈیز! تمہیں اپنے گھر میں دیکھ کر
خوشی ہو رہی ہے۔ بہت لمبے عرصے بعد مل رہے ہیں نا ہم۔
جینز کے اوپر زردی بال اونٹیا کرتے پنے ہوئے وہ شخص تقریباً
کھیل کا ہم عمر ہی تھا لیکن ان کی سوبر شخصیت کے مقابلے میں
کافی مختلف محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے کتھی مائل بالوں
کو سیٹ کر پونی کی شکل میں باندھا ہوا تھا۔ ایک کان میں
چھوٹے چھوٹے گھینے جڑی بالی، گلے میں موتیوں کی مالا اور
دونوں ہاتھوں میں موٹے موٹے پتھروں والی انگشتریاں
موجود تھیں۔

بس پارا مصروفیات ہی اتنی ہوتی ہیں کہ چاہنے کے
باوجود ملاقات نہیں ہو پاتی۔ کھیل نے کچھ مجھنے ہوئے

انڈیا میں جئے ہوئے میں اسے ہاتھ ملایا پھر فوراً ہی اس کی
توجہ جان لوگوں کی طرف مبذول کراتے ہوئے بولے۔

اب اسے ملے گا۔ کون سا عالم شاہ اور کون سا شاہ
ہیں اور کچھ ہی عرصہ قبل پاکستان سے آئے ہیں۔

دیکھ جی دیکھ! پاکستان سے آئے ہیں تو پھر اپنے

TAGPK.COM

تعارف کے بعد پانڈے صاحب نے اس مرحلے میں سر ہاتھ لگا کر
انڈیا میں جئے ہوئے میں اسے ہاتھ ملایا پھر فوراً ہی اس کی

توجہ جان لوگوں کی طرف مبذول کراتے ہوئے بولے۔
اب اسے ملے گا۔ کون سا عالم شاہ اور کون سا شاہ

ہیں اور کچھ ہی عرصہ قبل پاکستان سے آئے ہیں۔
دوسرے سے چند رکی باتیں کرنے کے بعد پانڈے نے

کھیل کوئی عجب کر کے اس سے سنجیدہ لہجے میں دریافت کیا۔
”مسند تو ہے اور چم بڑا ہے یہیں امید ہے کہ تم کوئی

حل نکال لو گے۔“ کھیل نے موقع جتنے ہی ساری تفصیل
اس کے گوش گزار کر دی۔

”یہ تو واقعی بہت میریس پر ابلم ہے۔ میں اس دشنا کو
جانتا ہوں۔ سالہ بڑا ہے۔“ اس نے بلا تکلف دشنا کے

لیے ایک موٹی سی گالی کا استعمال کیا پھر گردن کو جھٹکا دیتے
ہوئے بولا۔

”اپنی دے تم میرے پاس آجے ہو تو تمہیں زراش تو
نہیں وٹاؤں گا۔ کچھ لو آج سے یہ میری رہ سہلٹی ہے۔“

”بل کو میں اپنے ساتھ واپس لے جاؤں گا۔ اس
سینے میں دشنا کو پہلے ہی پیغام بھجوادیا تھا کہ عورتوں کو

درمیان میں مت لانا ورنہ انجام اچھا نہیں ہوگا۔“ کھیل نے
اپنا فیصلہ سنایا۔

”اگر تم مبذول کر سکتے ہو تو ٹھیک ہے، ایسے ہی کر لو۔“
”تم کیا کہتے ہو عالم! تمہیں تو میری اس تجویز سے

انکار نہیں ہے؟“ پانڈے کا جواب سن کر کھیل نے عالم شاہ
سے پوچھا۔

”اب بہتر سمجھ سکتے ہیں کھیل بھائی، لیکن مجھے بس یہ
کہا ہے کہ اور سرحد میں پھر پھر پھر پھر پھر پھر پھر پھر

کر چکے۔ میں اپنی جان بچانے کے لیے اپنی بہن کو ان
کے نشانے پر نہیں چھوڑ سکتا۔ میں نے ہر ممکن کارروائی کی۔

میں صرف تمہاری بیٹی، میری بیٹی ہیں۔ اسے
نشانہ بنانے کے لیے دشمنوں کو میری لاش پر سے

TAGPK.COM

”کھلیل بھائی غصیک کہہ رہے ہیں ادا! فی الحال آپ میری فکر چھوڑ کر خود کو بچانے کی کوشش کریں۔ میرے لیے تو کھلیل بھائی آپ کو ضمانت دے رہے ہیں نا۔“ اس موقع پر سبیل نے گفتگو میں دخل دے کر کھلیل کی تجویز پر عمل کرنے پر زور دیا تو عالم شاہ کو بھی قائل ہونا پڑا۔ ویسے بھی اسے معلوم تھا کہ سبیل ایک اجنبی شخص کے مقابلے میں نیاز شاہ کے گھر میں زیادہ سکون سے رہ سکتے ہیں۔

”کو پھر اب اجاڑت دوں گا۔ میں کو پھر بر چھوڑ کر
 باقی کے معاملات دیکھنا ہوں گے۔ میں نے پانڈے
 سے بت کرنے کے بعد احتیاطی معاکل آف کر دیا تھا اس
 لیے اگر کسی نے مسور ستو خاں کے حوالے سے کال کر کے
 کوشش بھی کی ہوگی تو ناکام رہا ہوگا۔“ فیصلہ ہو چکنے کے بعد
 قبیل پر وہاں سے روانگی کی بے چینی سوار ہوئی۔

”اپنا اور بچے کا خیال رکھتا تھل اور خواجہ امیر میری قبر میں خود کو ہلکان نہیں کرتا۔ ان شاء اللہ بہت جلد سب چھ ٹھیک ہو جائے گا۔“ عالم شاہ نے کھڑے ہو کر بہن کے سر پر ہاتھ رکھا اور اس کی بانہوں میں سوتے ہوئے بچے کو پیار کرتے ہوئے اسے سمجھایا۔ بچہ فیند کا بہت بکا تھا۔ اتنا سب چھ ہونے کے باوجود اس کی آنکھ نہیں کھلی تھی اور ماں کے سینے سے لگا آراء سے سوتا رہا تھا۔

”ان شاء اللہ!“ اس کی فحوت کے جواب میں تہل نے آہستہ سے صرف اتنا ہی کہا۔ وہ خود کو سنبھالنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔

”او کے یار پاؤں سے! اب اجازت دو۔“ ٹھیکل نے دوست کو مخاطب کیا۔

”ٹھیک ہے مگر! ابھی روکنے والی سچویشن نہیں ہے
ورنہ میں تمہیں اپنے سوکھے منہ والہی نہ جانے دیتا۔“
پانڈے نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

”اگلی بار احمینان سے آؤں گا تو خاطر کروالوں گا۔ ابھی تو میرے اس بھائی کا خیال رکھو اور سمجھو کہ مجھے سب کچھ مل گیا۔“ انہوں نے پانڈے سے ہاتھ ملانے کے بعد عالم

شاہ کے شاہزادے کہتے ہیں کہ جواب دہا
 "اسی کی شکایت ملے تو بے شک میری گردن
 کاٹ دی جائے گی۔" شاہزادے کی طرف سے اسکی یقین دہانی کے بعد
 شاہ نے اسکی تلاش بھی کرنا چاہی۔ شاہ کی طرف سے اسکی تلاش
 بے نتیجہ رہی۔ شاہزادے کو گردن دانا ہو گئے۔

☆☆☆

درد تھا اور بے حد تھا۔ اس کے لیے فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ یہ درد کی زیادتی تھی جو اسے ہوش میں لے آئی تھی یا ہوش میں آنے کے باعث وہ درد کو محسوس کرنے کے قابل ہوا تھا لیکن یہ کیسی ہوش مندی تھی کہ آنکھیں کھلی ہونے کے باوجود کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

”گنہیں میں اندھا تو نہیں ہو گیا؟“ ذہن میں
 ابھرنے والی اس تکلیف دہ سوچ نے اسے ایک جھٹکے سے
 اٹھ کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ اس طرح انھنے سے درد کی شدت
 اور اضافہ ہوا اور اس کے ساتھ ہی اس کے دل سے
 ایک عجیب سی کیفیت گھٹنے لگی۔ یہ وہی وہی
 تھیں انہری جھلکوں میں سر میں ہونے والے وہی
 تکلیف پر بھاری تھیں۔ تکلیف کی شدت نے اسے دونوں
 ہاتھوں سے سر قدام کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔

”کیا یہ سب کی چوٹ کا نتیجہ ہے کہ میں اپنی بیٹائی کو بیٹھا ہوں؟“ خیال خوفناک تھا لیکن حقیقت سے قریب نظر آتا تھا۔ اسے وہ منظر یاد آیا جب بارہوی سرنگ پھسنے پر نئی پتھر اڑ کر اس کی طرف آئے تھے اور وہ خود کو ان کی زد میں آنے سے نہیں بچا سکا تھا۔ ان پتھروں میں سے ایک پتھر سر پر لگ کر ہوش و حواس کھونے کا سبب بنا تھا اور اب وہ ہوش میں تو آچکا تھا لیکن اپنے ارد گرد پتھر دیکھنے سے قاصر تھا۔

”میں کہاں ہوں اور کتنا وقت گزر چکا ہے؟“
آنکھوں کے آگے چھائی تاریکی اس کے سوالات کی راہ میں
دیوار بن کر کھڑی تھی۔ انسان رکھ سکتا ہو تو اطراف کے
منظر اسے بہت چمکاتا دیتے ہیں لیکن اس کے اطراف میں
تو تاریکی کے سوا کچھ تھا ہی نہیں۔

”یا اللہ! مجھ پر رحم فرما۔“ وہ بہ آواز بلند بڑبڑایا اور ارد گرد کے ماحول کو سمجھنے کے لیے سماعت پر زور دیا۔ وہاں کھل خاموشی تھی۔ ایسی خاموشی کہ اگر کچھ دیر قبل اس نے اپنی ہی بڑبڑاہٹ نہ سنی ہوتی تو گمان کرتا کہ شاید بصارت کے ساتھ ساتھ حس سماعت سے بھی محروم ہو چکا ہے۔

”یا میرے خدا! یہ کون سی جگہ ہے جہاں انسان تو کیا
چاند پرند کی بھی آواز سنا کی نہیں دیتی؟“ اس نے کچھ
کھینچ کر محسوس کرتے ہوئے انھوں سے اپنے اطراف کو

آگے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ اسے اور ان کے ساتھ ساتھ وہ سب کچھ

ہوں اور ظاہر ہے ایسا کسی انسان نے ہی کیا ہے۔ "اس کے ذہن نے نتیجہ اخذ کیا اور اس بار وہ تکلیف کی پروا نہ کرتے

"یا اللہ تیرا شکر ہے۔" یہ اور اک ہوتے ہی کہ اس نے اپنی بصارت نہیں کھوئی تھی بلکہ یہ روشنی کی عدم موجودگی تھی جس نے اسے دیکھنے سے محروم کر دیا تھا، وہ فوراً شکر بھالا یا اور یکم رنگ روشنی کے اس منبع کو دیکھنے لگا جو ایک چراغ کی صورت بالکل واضح قلعہ چراغ کچھڑی بالوں اور ڈاڑھی والے اس شخص کے ہاتھ میں تھا جس کے جسم پر موجود زرد لباس اور گنگے میں پڑے موئے موئے منکوں کی کالا اسے بطور سادھو متعارف کروا رہی تھی۔ سادھو دھیرے دھیرے

ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ قدم آگے بڑھاتے ہوئے اس کے ہاتھ غیر ارادی طور پر کسی نامتناہی شخص کی طرح پھیل گئے تھے اور وہ خود کو کسی نقصان سے بچانے کے لیے ایک ایک قدم بڑی احتیاط سے اٹھا رہا تھا۔

چار قدم چلنے کے بعد ہی اس کے ہاتھوں نے آگے رکاوٹ کا پیغام دیا۔ اس نے اس رکاوٹ کو نٹول کر دیکھا تو احساس ہوا کہ وہ دیوار ہے۔ بغیر پلاستر کی اور مٹی سے نہیں ہوئی دیوار۔ دیوار میں در کی موجودگی کا امکان ہوتا ہے اس

لئے اس نے دیوار کے ساتھ ساتھ ہی آگے بڑھنا شروع کیا۔ چار قدم چلنے کے بعد انھوں نے کام دیکھ کر ہاتھوں سے بتایا کہ دیوار سے جڑی دوسری دیوار شروع ہو رہی ہے اور اسے اب بائیں جانب مڑنا ہے۔ وہ مڑ گیا اور

سابقہ طریقے سے آگے بڑھنے لگا۔ ابھی دو تین قدم ہی چلا ہو گا کہ سنائی دینے والی آہٹوں نے ٹھٹھا کا دیا۔ یہ سوچے بغیر کہ وہ کچھ بھی دیکھنے سے قاصر ہے۔ بے ساختہ ہی اس نے اپنے سر کو اوپر کی طرف اٹھایا۔ نتیجہ نامی کی صورت نکلا اور اس کے دل میں کرب کی ایک لہری اٹھی۔ نعمتیں جب تک حاصل ہوں ان کی اہمیت کا اندازہ نہیں ہوتا، چھن جائیں تو ان کا نہ ہونا انسان کو تڑپا دیتا ہے۔ وہ بھی تڑپا تھا لیکن سماعتیں اب بھی ان آہٹوں پر ہی مرکوز تھیں جو اسے اپنے سر کے اوپر سے سنائی دے رہی تھیں۔ شاید جس جگہ وہ موجود تھا اس سے بالائی منزل پر کچھ لوگ موجود تھے لیکن وہ تعین نہیں کر سکتا تھا کہ وہ لوگ کون ہو سکتے ہیں۔ زیادہ امکان تو اسی بات کا تھا کہ وہ سونیا اور اس کے ساتھی ہی تھے جو اسے جانے حادثہ سے زخمی حالت میں اٹھالائے تھے اور کسی کمرے میں ڈال کر بھول گئے تھے۔

"کمرہ؟ کیا میں واقعی کسی کمرے میں ہوں؟" خود سے سوال کرتے ہوئے اس نے اپنی ٹاک زور سے سکڑی۔ حس شامہ نے اس بار اس ہلکی سی بو کا کامیابی سے تجزیہ کر لیا۔ وہ سلین کی بو تھی جو ہوش میں آنے کے بعد سے وہ محسوس تو کر رہا تھا لیکن بو بھسنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"یعنی ان لوگوں کو مجھ پر شک ہو گیا ہے اور انہوں نے مجھے ایک قیدی کی حیثیت سے کسی تہ خانے میں ڈال دیا ہے؟"

اس نے اپنے اندر سے انہیں اسے زیادہ دقت نہیں ہوگی اس لیے انہیں بھروسہ کیا اور اس نے اسے چمکا دیا۔ یعنی طویل مدتی روشنی کی بہت کم روشنی جو اب اس کے نیچے کی طرف آ رہی تھی۔ چند ہی ثانیوں میں روشنی مزید تیز ہوئی اور پھر رے سخت ہوئی نیچے کی طرف آنے لگی۔

اس نے اپنے ہاتھوں کی طرف متوجہ ہو کر دیکھا اور جواباً اس کے ہونٹوں پر ایک دستانہ مسکراہٹ اُبھری۔

لگ گیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ تم ہوش میں آچکے ہو گے لیکن اوپر آئی بلاؤں کو نالے بنا میں ادھر کا رخ نہیں کر سکتا تھا۔" اس نے سیز حیاں اترتے ہی اسے وضاحت دی اور چراغ کو دیوار میں بنے ایک حلقے میں رکھ دیا۔ چراغ کی روشنی اس چھوٹے سے تہ خانے کو منور کرنے کے لیے کافی تھی اور معاذ اس روشنی میں زمین پر بھی چٹائی، چٹائی پر رکھا کھانا، دیوار کے ساتھ ایک کونے میں دھری صراحی اور صراحی پر الٹ کر رکھا گیا تانبے کا گلاس دیکھ سکتا تھا۔ صراحی سے کچھ خالصے پر ایک کھل، مٹی کے پیالے، ایک نمک کا کنستر اور لمبوتری شکل کا مٹکا بھی موجود تھا۔

"بیٹھ جاؤ بالک! ابھی تمہاری حالت ایسی ہے کہ تم جتنا آرام کرو، تمہارے لیے اتنا ہی اچھا ہے۔" سادھو اس سے ایسے انداز میں مخاطب تھا جیسے وہ آپس میں آشنا ہوں اور کسی باہمی تحارف کی ضرورت ہی نہ ہو۔

"میں جانتا چاہتا ہوں کہ یہ کون سی جگہ ہے اور میں یہاں کیسے پہنچا؟" سر میں انہی ٹیسوں اور جسمانی تھکتا نے اسے باور کروا دیا تھا کہ سادھو کی اس کے بارے میں رائے درست ہے اس لیے خاموشی سے چٹائی پر جا بیٹھا اور اپنے مقابل آٹھننے والے سادھو سے سوال کیا۔

"تم سادھو کی کنیا میں ہو بالک اور تمہیں میرا چیلہ ریو سے پٹری کے پاس سے زخمی حالت میں اٹھا کر لایا تھا۔"

اس نے اپنے خیال میں بولنے لگے اور اس نے بے ساختہ ہی سوال کیا کہ اسے اور کون سی چیزیں اختیار کر لیں۔

"جھون کی کرپا سے پٹری اڑ جائے گی سوا کوئی نقصان نہیں ہوا۔" سادھو کے جواب نے اسے مطمئن کر دیا۔

اس نے اپنے خیال میں بولنے لگے اور اس نے بے ساختہ ہی سوال کیا کہ اسے اور کون سی چیزیں اختیار کر لیں۔

"جھون کی کرپا سے پٹری اڑ جائے گی سوا کوئی نقصان نہیں ہوا۔" سادھو کے جواب نے اسے مطمئن کر دیا۔

”آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے میرا خیال رکھا اور یہاں پناہ دی۔ میرے خیال میں مجھے آپ پر مزید بوجھ نہیں بننا چاہیے اور یہاں سے چلنا چاہیے۔“ اسے خدشہ تھا کہ اب سادھو اس سے اس کے بارے میں سوال جواب شروع کر دے گا اس لیے خود اپنے ذہن میں اچھے بہت سے سوالوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنا ارادہ ختم کر لیا۔

”تم ابھی یہاں سے نہیں جاسکتے۔“
”کیوں نہیں جاسکتا؟“ سادھو کے قطعی انداز پر اس

”تیرے لیے جو مجھے پوچھنا ہے وہ تو بالکل نہیں ہے۔“ اس نے شروع کر دیا اور اپنے حتمی انداز سے اس کی بات کرتے ہوئے اس میں ماننا ہوں کہ بہت دیر ہو چکا تھا کہ بہت کی بھی تو ایک سیما ہوتی ہے۔ وہ اس سیما سے آگے جانے کی کوشش میں بھی کبھی ٹوٹ بھی جاتا ہے۔ ”سادھو اسے بڑے رومان سے سمجھا رہا تھا۔

”مجھے آپ پر بوجھ بننا اچھا نہیں لگا تو اس لیے کہہ رہا تھا۔“ سادھو کے نرم لہجے نے اسے شرمندہ کر دیا۔

”بھگوان نے ہمیں ایک دوسرے کی سیوا کے لیے ہی جنم دیا ہے۔ ہم میں سے ایک، دوسرے کی سیوا کرے تو اس میں بوجھ کیسا؟“ اس کے انداز میں بلائی سادگی اور خلوص کی آمیزش تھی۔ معاذ نے خود کو کچھ اور بھی شرمسار محسوس کیا۔

”کیا میں کچھ بھی بہت دیر بعد ہوش میں آیا ہوں؟“
جیسٹپ منانے کو اس نے سوال کیا۔

”ہاں۔ پوری رات اور دن تم نے بے ہوشی میں گزارا ہے لیکن چٹا ست کرو، اس میں چم ہاتھ ان دواؤں کا بھی تھا جو میں نے تمہیں پلائی تھیں۔ درد سے بچانے کے لیے ایسا کرنا پڑا تھا مجھے۔“

”سر میں تو اب بھی خاصا درد محسوس کر رہا ہوں۔“
”وہ دیر سے دیر سے ٹھیک ہو جائے گا۔ بھگوان کی کرپا ہے کہ خون کا بہاؤ ترنت رک گیا تھا۔ کیول رات بھر مٹی باندھے رکھنے سے ہی کافی فرق پڑ گیا تھا۔ صبح میں نے مٹی کھول کر کیول مرہم کا لپ کر دیا تھا۔ زخم کو کھلا رکھ کر مرہم لپ کرتے ہوئے بھگوان نے نہایت ہی جلدی ٹھیک ہو جانے کا ارادہ کیا۔

”اب اسے ہر ممکن طور پر لکھن رکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“
”جہاں جہاں کا ہفتہ ہوں سے یہ کتنی دور ہے؟“

اس نے کچھ جھپکتے ہوئے پوچھا۔

”خاصی دور ہے۔ روئی چھبیں اپنی گدھا گاڑی پر

ڈال کر لایا تھا۔“ سادھو نے جواب دیا پھر کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔

”میں روئی کو تمہارے لیے کاڑھا بنانے کا یوں کر آیا تھا۔ اس نے اب تک بتایا ہوگا۔ مزے میں اتنا اچھا نہیں ہوگا پر زور زبردستی سے ہی لیتا۔ اس سے تمہارے شریر کو اندر سے شکتی ملے گی اور تم جلدی اچھے ہو جاؤ گے۔“ وہ اسے شفقت سے ہدایات دیتے ہوئے جس دھیمے انداز میں نیچے آیا تھا، اسی دھیمے انداز میں بیڑھیاں چڑھنے لگا۔

”ابھی یہاں سے چلنا سارے آدمی محسوس ہوتا ہے۔“ اس نے اپنے غصے کے خصلتوں کے بارے میں اس کے دل کے کواچھڑا کر رکھا اور کچھ پر غور کر دیا۔ ”میں اس کی حالت کے بارے میں بائیس ٹھیک بتا رہا ہوں۔ غور اس چنے اور بیٹھ کر باتیں کرنے سے ہی تکلیف اور خدشہ میں اضافہ ہو گیا تھا۔ ایسے میں وہ اس ٹھکانے سے باہر نکال کر اپنی بقا کی جنگ کیونکر جاری رکھ سکتا تھا۔ وہ کبھی موندے لینا رہا اور سونیا اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں سوچتا رہا کہ مقصد میں ناکامی کے بعد اس کے غیاب پر انہوں نے نہ جانے کیا سوچا ہوگا۔

”تمہیں وہ یہ نہ سوچ رہے ہوں کہ میں انہیں دھوکا دے کر نکل بھاگتا ہوں۔“ ذہن میں آنے والے اس خیال نے اسے مضطرب کر دیا۔ قسم عدولی اور فرار کی کوشش کا نتیجہ اس کے گھر والوں کو بھگتن پڑے گا۔ یہ بات بہت پہلے اسے سمجھا دی گئی تھی۔ بے چینی نے اسے اٹھ کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ اسی وقت ایک سترہ اٹھارہ سال کا لڑکا بیڑھیاں اتر کر نیچے آتا ہوا آگاہی دیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے ایک تھلی تمام رکھی تھی جس میں مختلف سائز کی کنوئیاں رگی دھانی دے رہی تھیں۔

”اچھا ہوا کہ آپ ابھی سوئے نہیں بھایا ورنہ گرد جی ہم پر بڑا غصہ ہوتے۔ اصل میں ہم آپ کے کھانے کے لیے چم مزیدار سا بنانے کے چکر میں پڑ گئے تھے اس لیے کاڑھا تیار کرنے میں تھوڑی دیر ہو گئی۔ بس اب آپ جلدی سے یہ گرما گرم کاڑھا پی لیجیے پھر ہمارا بتایا ہوا کھانا

کھا لیجئے گا تو میں کاڑھا لپک دوں گا۔“ وہ بولا۔ ”تھالی اس کے سامنے رکھ کر اس نے بولنا شروع کیا تو چھ ساتھیوں نے اپنی باتیں سن کر اس کے دل کا۔ معاذ نے اس کے دل کی بات سن کر اسے خاموشی سے کھانا کھانے سے روک دیا۔

”وہ اس حقیقت کو سمجھتا تھا کہ اپنی صحت بحال کیے بغیر آدمی

کسی دوسرے کو کیا، اپنے بھی کام کا نہیں رہتا۔

انتباہ

ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ پہلی کیشنز کی جانب سے تنبیہ کی جاتی ہے کہ جو ویب سائٹس ہمارے ادارے کا نام لے کر "آفیشل ہیج" کی اصطلاح استعمال کر رہی ہیں ان سائٹس سے ہمارے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسے فوری طور پر ہمارے معزز کارکنین کی اطلاع دینے کے لیے ایک تمام ویب سائٹس اور پبلیکیشنز میں شائع کیا گیا ہے۔ اگر کوئی شخص یا تنظیم جو اپنے کسی معاملات کی خاطر ادارے سے شائع ہونے والے مابینوں کے مضامین، افسانے اور کہانیاں بلا اختیار اور غیر قانونی طور پر اپ لوڈ کر کے ادارے کو تخمینہ مالی نقصان پہنچانے کے ساتھ ادارے کی ساکھ متاثر کر رہے ہیں، انہیں خبردار کیا جاتا ہے کہ اس قبیح فعل کو فوری ترک کرویں، بصورت دیگر ادارہ، سائبر کرائمز کے قانون

PREVENTION OF ELECTRONIC CRIMES ACT 2016

اور

COPYRIGHT ORDINANCE 1962/2000

کے تحت کسی بھی قسم کی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔ ایف آئی اے اور دیگر متعلقہ اداروں میں بھی ان افراد/اداروں کے خلاف شکایات درج کرائی جائیں گی۔

جاسوسی ڈائجسٹ، سپینس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سمر گزشت

جاسوسی ڈائجسٹ پہلی کیشنز

C-63 ٹرانزیکشن ڈیفنس ہاؤس، عمارتی بین کوالی سٹریٹ، کراچی

فون: 35804200-35804300

”مگر وحی آپ کو یوں ملے ہوں گے کہ اس کا مزہ تھوڑا خراب ہوتا ہے پر ہم کو پتا ہے کہ اس کا مزہ تھوڑا نہیں، بہت خراب ہوتا ہے اس لیے ہم آپ کے لیے میوے اور بہت سارا شہد ڈال کر یہ خاص کھانا بنائے ہیں۔“ اسے شاید خاموش رہتا پسند نہیں تھا اس لیے اب تک معاذ کی طرف سے ایک لفظ بھی نہ کہے جانے کے باوجود غور بولتا جا رہا تھا۔ ویسے اس کی یہ بات سچی تھی کہ کارمے کا ذائقہ بے حد بڑھتا اور اسے حلق سے نیچے اتارنا بڑے دل گردے کا کام تھا۔

صحت کی بحالی اور تکلیف نجات دہندہ کسی نہ کسی

وہاں خانی کے تختہ کے سامنے ایک عورت بیٹھ کر اپنے ہاتھوں سے ایک بڑے بڑے گولے بنا رہی تھی۔

سائز کا پیالہ اس کے سامنے کر دیا۔ پیالے میں سفیدی مائل
دلے نما کوئی نیم ٹھوس شے موجود تھی جو دیکھنے میں تو عجیب سی
لگ رہی تھی لیکن معاذ نے منہ کا ذائقہ بہتر کرنے کے لیے
فوراً ہی ایک چمچ بھر کر اپنے منہ میں رکھ لیا۔ منہ کا ذائقہ اتنا
مخم ہو رہا تھا کہ اسے منہ میں ڈالی جانے والی غذا کا ذائقہ
محسوس ہی نہیں ہو رہا۔

”جبدی جبدی دو تین چمپے منہ میں ڈال کر نگل جائیے۔ کازمے کی فنی منہ سے ختم ہوئی تو اس کا سوا آنا شروع ہوگا۔“ وہ یقیناً اپنے تجربے کی بنیاد پر یہ مشورہ دے رہا تھا جس پر معاذ نے سن و عن کمال کیا اور واقعی مین چمپے صحت سے بچنے اتارنے کے بعد اسے ذائقہ محسوس ہوتا شروع ہوا۔ وہ ڈش مین طور پر جو کو دودھ میں ڈال کر پکائی تھی مکی اور وہ برچمپے کے بعد اس کے ذائقے کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ رہا تھا۔ شہد کی منہ اس لیے ہوئے اس ڈش میں کا جو باوا اور انجیر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے شات کیے گئے تھے جنہوں نے کھانے کو خوش ذائقہ کے ساتھ ساتھ بے حد مقوی بنا دیا تھا۔

”تیجیف یوروی۔ یہ بہت مزیدار تھا۔ اس نے کچ کچ کازمے کی فنی کا بہترین ٹونڈ کیا ہے۔“ پورا پالا خالی کرنے کے بعد اس نے کھلے دل سے پکانے والے کی تعریف کی۔

ہم کو یہ توڑ تیار کرنا پڑا۔ اب جب بھی تیرو جی کاڑھاتیار

انعام کرنے والے ہیں۔ تعریف پر خوش ہوا اور بڑے غرور سے کہنے لگا ہے۔

اچھا آپ کام کر رہی ہو! ذرا تھکی ہے جا؟

کہ کاڑھے اور دلے کے استعمال کا میری صحت پر اچھا اثر

پس دانست

پس دانست

پس دانست

وہ بولا

کون سا ایسا مشکل کام تھا کہ اسی سے کروانا ضروری تھا۔ ہم

7 اکتوبر 2021ء

جاتا ہے۔" وہ تھالی اٹھا کر فوراً ہی جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد معاذ کے پاس لیٹ کر آرام کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا لیکن آرام کرتے ہوئے بھی اس کا ذہن مسلسل الجھا ہوا تھا اور وہ اندازہ لگانے سے قاصر تھا کہ اس کے غیاب پر تھملائے ہوئے اس کے دشمن اب کون سا قدم اٹھا یں گے۔

☆☆☆

"آپ انہیں ہاں کہہ دیں ابو۔" وہ باپ بچی آج پھر چہل قدمی کے بہانے ملک میں موجود تھے۔ گھر کے منظر کے لیے محفوظ نہ پائے انہوں نے مہم اسوہ کی اور خیال کر لیا تھا کہ یہ سب کچھ لاچار اور احمد نے امانت کی روایت کے مطابق ابھی تک اس کے ساتھ قاصر کا رشتہ اس کے ساتھ رکھ دیا تھا اور اس نے دو منٹ کی خاموشی کے بعد اثبات میں جواب دے کر انہیں حیران کر دیا تھا۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو بچی! میں ہاں کر دوں؟ مطلب ایک غنڈے سے تمہاری شادی کے لیے ہاں کر دوں؟"

"یہ وقت کا تقاضا ہے ابو۔ عام حالات میں شاید آپ اس رشتے کو میرے سامنے پیش کیے بغیر ہی انکار کر دیتے لیکن اب ہم اسے رد نہیں کر سکتے۔ ہمیں مدد کی ضرورت ہے ابو۔ اور یہ طے ہے کہ ہماری مدد کوئی شریف آدمی نہیں کر سکتا۔" وہ وہی بات کہہ رہی تھی جو لالہ بیٹی بھی ذرا علقہ الفاظ میں انہیں سمجھا چکا تھا۔

"میرا دل راضی نہیں ہوتا کہ میں یوں تمہاری زندگی داؤ پر لگا دوں؟" وہ تذبذب کا شکار تھے۔

"میری زندگی داؤ پر ہی لگی ہوئی ہے ابو! آپ مانیں یا نہ مانیں مگر یہ بات آپ انہی طرح جانتے ہیں کہ آپ یا بھو کی فیملی میری حفاظت کی طاقت نہیں رکھتے۔ میں اب تک محفوظ ہوں تو صرف اس لیے کہ یقینی طور پر معاذ بھائی نے اب تک ان لوگوں کی حکم عدولی نہیں کی ہے۔ جس دن انہوں نے ایسا کیا، میں بھی سعد کی طرح غائب کر دی جاؤں گی اور آپ لوگ حسب سابق ان کا نام و نشان بھی تلاش نہیں کر پائیں گے۔" وہ جو کچھ کہہ رہی تھی وہ سچ ہی تھی،

میں سے کوئی بھی کر سکتا تھا یہ کام۔ اب دیکھو سالے نے کام بھی ٹھیک نہیں کیا اور اپنے سر پر اسے ڈھونڈنے کی ڈیوٹی بھی لگ گئی۔"

رومی کے انکشاف نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔ یعنی وہ جن لوگوں کی پناہ میں تھا، وہ جانتے تھے کہ وہ ریلوے ٹریک پر ہونے والے دھوکے میں غوث تھا۔

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ وہ لوگ یہ باتیں میرے ہی بارے میں کر رہے تھے؟" مانتے پر چمکتی پسینے کی بوندوں کو

آستین سے صاف کرتے ہوئے اس نے سوال اٹھایا۔ "آپ ہمیں پٹری کی پٹری کے پاس ہی زخمی حالت میں لے گئے تھے اور آپ جو بھی مسلمان اس لیے "اس کے بڑے بے رحمی سے جواب دیا۔

"تمہیں کیسے معلوم کہ میں مسلمان "اس کا سوال اچھوڑا رہ گیا۔ وہ اب تک دھیان نہیں دے سکا تھا لیکن اب اسے اپنے جست کپڑوں کی جگہ لے لینے والے ڈھیلے ڈھالے لباس کا احساس ہو گیا تھا۔

"آپ کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے۔ مرہم بنی کے لیے ہم نے گروٹی کے ساتھ مل کر لباس اتارا اور پھر دوسرا پہنا دیا۔" اسے کپڑوں کی طرف دیکھتا پا کر رومی نے اسے سادگی سے بتایا۔

"تم سوچ رہے ہو گے کہ میں کوئی آنکھ داوی ہوں جس کا کام لوگوں کو مارنا ہے؟" اس نے اپنے بارے میں رائے جانتا جانی۔ حقیقتاً اس وقت وہ مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی خود کو مجرم محسوس کر رہا تھا اور اسے رومی سے نظریں ملاتے ہوئے دشواری پیش آرہی تھی۔

"نہ بھایا۔ اگر ہم آپ کو ایسا سمجھتے تو یہاں پناہ کیوں دیتے۔ ہمارے گروٹی بڑے گیانی ہیں۔ وہ آپ کی صورت دیکھتے ہی بول دیے تھے کہ یہ بڑی نیک آتما ہے پر اپنے حصے کی کنھنیاں سہہ رہا ہے۔" رومی نے اس کے خیال کی تردید کر دی۔

"اگر وہ لوگ مجھے ڈھونڈتے ہوئے یہاں پہنچ گئے تو تم لوگوں کو بھی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔" اب اسے اپنے محسنوں کی فکر لاحق ہوئی۔

"کوئی خطرہ ہوا ابھی آپ کو پہنچنے کے

لی لیے تو آپ کو یہاں رکھا ہے۔ آپ کسی بات کی چننا کر رہیں اور چنانچہ سے چلیں۔ ہم بھی اب واپس لوٹ جائیں گے اور یہاں دیر لگا دی تو کوئی خطا ہوئی سکتی ہے کہ رومی

جہاں جاتا ہے جلدی لوٹ کر نہیں آتا اور باتیں کرنے بیٹھ

ہیں۔" وہ بہت ضبط سے کام لے کر آنسوؤں کو بہنے سے روکے ہوئے تھی۔

"سعد! سعد کا کیا ہوگا؟ تم منظر سے ہٹ بھی گئیں تو معاذ کو بیک میل کرنے کے لیے وہ تو ان کے نشانے پر موجود ہی ہوگا۔" وہ اپنی تیسری اولاد کو جیسے فراموش کر سکتے تھے۔ اس سارے قہر میں اب تک اسی نے تو سب سے زیادہ نقصان اٹھا دیا تھا۔

"سعد بھائی کو زندگی اور کیریئر میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب کرنا ہوگا۔ یہ فیصلہ ہی ہے کہ کب سے اہم زندگی ہے انسان دیکھ رہا ہے تو زندگی کے دیگر کو زخم بھی کسی نہ کسی طور پہنچا رہی ہے کی صورت میں آتی ہے بالآخر اپنی عمر سے بہت تلخ جائزہ لے لیا میں سمجھتی ہوں۔"

"تمہارے ذہن میں کیا ہے علینہ؟ لالہ بیس نے مجھ سے صرف تمہارے سلسلے میں بات کی تھی۔ ان کا خیال ہے کہ وہ تمہیں اور وقاص کو کسی محفوظ مقام پر سیٹل کر دیں گے۔"

"وہ اتنے بے وقوف نہیں ہو سکتے کہ یہ نہ سمجھ سکیں کہ میں اپنی فیملی کے تحفظ کی ضمانت حاصل کیے بغیر ان کی پیشکش قبول نہیں کر سکتی۔"

"یعنی میں ان کے سامنے مطالبہ رکھوں کہ وہ تمہارے ساتھ ساتھ سعد کے تحفظ کا بھی انتظام کریں؟"

"اب ان سے ہر مطالبہ میں خود کروں گی۔ آپ بس صرف اتنا بتائیں کہ انہوں نے دوبارہ رابطے کی کیا صورت بتائی ہے؟" اس کے انداز میں ایسا عزم تھا کہ خاور احمد اس کی شکل دیکھ کر رہ گئے۔ انہیں بالکل ایسا لگا تھا کہ ان کے مقابل علینہ نہیں، معاذ کھڑا ہے۔ معاذ جو بدتمیز نہیں تھا لیکن ہمیشہ اپنے ہی کیے فیصلوں پر چلنا پسند کرتا تھا۔

☆☆☆

"آپ نے مجھے بلوایا تھا، تکمیل بھائی؟"

"ہاں، بیٹھو۔ مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔" وہ جو صوفے کی پشت سے قہقہے لگائے کسی گہری سوچ میں مستغرق نظر آ رہے تھے، کھل کی آواز سن کر چوٹے اور اسے اپنے سامنے والے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"تو کی بات ہے؟" وہ تھوڑی دیر ان کے مقابل میں ان کے بولنے کی حکمرانی نہیں چاہتا وہ اس کے بعد کے بغیر اس سوچ میں بیٹھ رہے تو انہیں اسے تو کہنا پڑا۔

"مسکد تو تمہیں معلوم ہی ہے۔ میں تو بس اس کا ممکنہ

حل سوچ رہا ہوں۔ ہم پر بے پناہ دباؤ ہے۔ عالم اور سرمد کو منظر پر لانے کا مطالبہ کرنے کے ساتھ ساتھ تمہاری گرفتاری کے لیے بھی آوازیں اٹھ رہی ہیں اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں تم لوگوں کے بچاؤ کے لیے کیا کروں؟" انہوں نے بے خیالی میں سر کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بالوں کو منہ کی میز پر پکڑ کر ہکا ساجھکا دیا اور بولتے چلے گئے۔

"میڈیا پر خبر آنے پر اب تو بات پاکستان تک پہنچ گئی ہوگی۔ کیا بابا سائیں سے آپ کی اس سسے میں کوئی بات ہے؟" اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں جکڑ کر انتظار ابھارے پوچھا۔

"تمہارا احاطہ درست ہے۔ میری ان باتوں سے

بات ہوئی ہے اور میں غلط فہمی کو یقین دہانی دیتی ہوں۔ لیکن وہ کوئی قطعی فیصلہ کرنے سے جھجک رہے ہیں۔ اچھوٹی ان کا خیال ہے کہ فیصلہ کرنے کا حق اصل میں تمہیں حاصل ہے اسی لیے میں نے تمہیں یہاں بلوایا ہے۔ امید ہے کہ تم میری بات غلطی سے سنو گی اور سوچ سمجھ کر فیصلہ دو گی۔"

"میں سمجھی نہیں تکمیل بھائی! آپ جیسا بار سوخ اور مقامی مرد جس معاملے میں کچھ بھی کرنے سے قاصر ہے، آخر میں اس معاملے میں کیا کر سکتی ہوں؟" وہ حیران ہوئی۔

"اپنا کردار سمجھنے کے لیے تمہیں میری بات غلطی سے سننا ہوگی۔" انہوں نے اس کے چہرے کو بہ نظر غائر دیکھا اور پھر ذرا سے توقف کے بعد دوبارہ بولنا شروع ہوئے۔

"جس طرح کے حالات ہو گئے ہیں ان میں عالم اور سرمد کو قانونی طور پر واپس پاکستان بھیجنا ممکن نہیں ہے بلکہ اب تم بھی آسانی سے واپس نہیں جاسکتیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ تمہیں غیر قانونی طور پر بھی واپس جینے کا نہیں سوچا جاسکتا۔ تم جیسی گھریلو نرکی کے لیے یہ عمل بہت مشکل اور تکلیف دہ ہوگا پھر تمہارے ساتھ ایک شیر خوار بچہ بھی ہے جس کی وجہ سے مشکلات اور مسائل میں اضافہ ہو سکتا ہے۔" وہ اپنے مخصوص دھیمے انداز میں اس سے مخاطب تھے۔

"یعنی آپ نے ادا سائیں اور سرمد کو غیر قانونی طور پر پاکستان بھیجنے کا سوچا ہے۔" اس نے تہیجہ اخذ کیا۔

"اب یہی ایک صورت رہ گئی ہے۔"

"میں تو سمجھتی تھی کہ یہ بات ہوگی۔" وہ منظر پر ہوئی۔ منظر پر ہونے والے سوا اٹھارے پاس والے بارہ بیس میرا دوست یا نڈی کے ممکنہ خدائوں کی قیادت کے ساتھ۔

کے قتل سے ایک دن پہلے ان دونوں کی پاکستان واپسی کا

شادی کر رہے ہیں۔ وہ آخر کیسے؟“ اس نے اپنا سوال ادھورا چھوڑ دیا۔ حقیقتاً اس صورت حال نے اس کا دماغ چکرا کر رکھ دیا تھا۔

”میرنی فیصل سے بات ہو چکی ہے۔ وہ سمجھ دار لڑکا ہے اور اس بات کو سمجھتا ہے کہ تم لوگوں سمیت اپنے خاندان کو بچانے کے لیے ایسا کرنا ناگزیر ہے۔ تم لوگوں کی سنگین الزامات کے تحت گرفتاری کا مطلب ہوگا کہ ہمارا خاندان بھی مشکوک ہے اور ایسے میں ہم قانونی اجنبیوں کے ساتھ

ساتھ اپنی دباؤ والی شکار مچائیں گے۔ خاروہ اچھے اچھے
معاشرے کے ہر پہلو سے آگاہ کر رہے ہیں۔ لیکن اس کی کوئی
سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی سبب ہوئی تھی۔ وہ دونوں
ہاتھوں سے سر جھامے ہیں گے معاملہ بالکل خاموشی سے
بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ بھی اب چپ تھے۔ اس خاموشی کو دستک
کی آواز نے توڑا۔

”آجاکو“ شہیل نے اجازت دی تو ایک ملازمہ اندر داخل ہوئی۔

”کھل بی بی! آپ کا متا جاؤ۔ گیا ہے اور کسی سے بھی نہیں پہل رہا۔ صوبہ بی بی نے کہا کہ آپ کو بلا لاکھ ورنہ بچہ درود کر چکان ہو جائے گا۔“ ملازمہ نے براہ راست اسے مخاطب کر کے پیغام دیا تو وہ تڑپ کر اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی۔

”میں تمہارے فیصلے کا خضر ہوں گا کھل! اچھی طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا۔“ وہ دروازے کی طرف جا رہی تھی تو عقب سے گھیل کی آواز سنائی دی۔ وہ سر کو اثبات میں جنبش دے کر تیزی سے باہر نکل گئی لیکن یہ خیال ایک کانٹے کی طرح اس کے دماغ میں گڑ چکا تھا۔ اس کے پاس سوچنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور جو فیصلہ ہونا تھا وہ ہو چکا ہے۔

☆☆☆

”میں یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔“

”ایک نہ ایک دن جانا ہی ہے، پر نتو ابھی تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ پوری طرح ٹھیک ہو جاؤ تو چلے جانا۔“

مرہم کا لب کرتے سادھو نے اس کی بات پر چونکے بغیر رمان سے جواب دیا۔

”نہیں، تم ایک عجیب اتنا ضروری نہیں ہے جتنا ان لوگوں
 جس پر پہنچنا ضروری ہے جو ہماری تلاش میں آس پاس جگتے
 پھر رہے ہیں۔ اگر میں انہیں نہیں ملا تو یہ معجزانہ فیصلہ کو کوئی
 نقصان پہنچا سکتے ہیں۔“ اسے مناسب لگا کہ یہ امر کہ اپنی
 مجبوری سے آگاہ کر دے۔

”جگوان کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔ شانت

ریکارڈ تیار کروالیا جائے جب یہ ثابت ہو جائے گا کہ وہ
دو روز سے ایک روز پہلے ہی یہاں سے جا چکے تھے تو پھر ان
پر قتل کا کیس کسے ثابت ہو سکے گا۔

"انہی تجویز ہے۔ اے گے بتا ہے۔"

”اس تجویز پر عمل کی راہ میں دو رکاوٹیں تھیں۔ اول یہ کہ جب تم لوگ فیصل کی شادی میں شرکت کے لیے آئے تھے تو شادی وینینڈ کے بغیر وہ دونوں واپس کیوں چلے گئے؟ دوئم یہ کہ تم ان کے ساتھ واپس کیوں نہیں گئیں؟“ انہوں نے

”کیا اس سلسلے میں کوئی بہانہ نہیں بتایا جاسکتا؟“ اسکا
 جواب بھائی پر سوچنے والے انداز میں مل رہا تھا۔
 ”اوپھوں“ کیا بہانہ بتائیں گے ہم؟“ اس نے سروسہ

دیتے ہیں کہ تمہارے بابا کی اچانک طبیعت خرابی کی وجہ سے انہیں واپس جانا پڑا تو یہ بات ماننے والی نہیں ہے کہ باپ کی بیماری کا سن کر بیٹا دوڑا جائے اور جینی شادی میں شرکت کے لیے یہیں رک جائے۔"

”یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ اس نے جھٹ
ٹھٹھیل سے اتفاق کیا۔

”تو بس مسئلہ صرف اتنا ہے کہ ہمیں تمہارے یہاں
رکنے کا کوئی مضبوط جواز تلاش کرنا ہے اور وہ مضبوط جواز
صرف ایک ہی ہے“

”وہ کیا؟“ اسے ٹھیکلے چہرے پر سچہ ایسا نظر آیا کہ دل بے اختیار ہی زور سے دھڑک اٹھا۔

”ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہارا اور فیصل کا نکاح کروا کر تمہارے یہاں رکنے کا جواز پیدا کر دیا جائے۔ نکاح نامہ بیک ڈیٹ میں تیار کروایا جائے گا اس طرح سب چیزیں منطقی انداز میں انجام پاتی چلی جائیں گی اور سب کی زندگیوں میں سکون لوٹ آئے گا۔“

”یہ کیسے ہو سکا ہے؟“ مکمل کے چہرے کا سارا خون جیسے کسی نے لچوڑ لیا۔

”اب بس یہی ہو سکتا ہے۔ عالم، سرحد اور خود اپنی زندگی بچانے کے لیے کہیں یہ مشکل فیصلہ کرنا پڑے گا۔ مجھے معلوم ہے کہ تم لوگوں کو معلوم کیوں ہے کہ وہ بڑے سے بڑے مسئلہ کو حل کر لیں گے۔“

ہر ایک کی سب کی بہتری کے لیے ہمیں پورا بانی دینا پڑے گا۔
 اور شکر کہ اس سے ہمیں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ فیصلہ ہے
 اچھا ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ ہی زندگی گزارنے کی
 وہ اسے قائل کرنے کی بھرپور کوشش کر رہے تھے۔

”مگر میں نے سنا تھا کہ وہ اپنی پسند کی لڑکی سے

رہو۔ جب تک تم میرے پاس ہو، وہ تمہیں یا تمہارے گھر والوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔" سداھو کا اطمینان قابلِ دید تھا۔ معاذِ اس کے انداز پر تصور اسے جھنجھلا گیا۔

"آپ ان لوگوں کو مجھ سے بہتر نہیں جانتے۔ پہلے بھی انہوں نے میرے خائب ہونے پر میرے چھوٹے بھائی کو ظلم کا نشانہ بنایا تھا۔ وہ اب بھی ایسی کوئی حرکت کر سکتے ہیں۔"

ہوئی تھی۔ ڈرائیور صبح صبح نہیں اسپتال لے کر گیا تھا اور وہاں سے اس کا فون آیا تھا کہ حامد صاحب کو ایڈمٹ کر لیا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ شام تک اسپتال میں ہی رہیں۔ "ملازم نے اسے تفصیلی جواب سے نوازا۔

"ہوا کیا ہے انہیں؟" اس کے جیم کی بوقلمون ہوتے ہاتھ ذرا سی دیر کے لیے ساکت ہوئے۔

"شاید فوڈ پوائزننگ کا مسئلہ ہے۔" ملازم کے جواب نے اس کی اچھن دور کر دی کہ حامد جیسا ہنا کتا بندہ اچانک اتنا

ان آوازوں کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کرتے رہے۔ اور ایک سے زائد افراد کی موجودگی کا صاف اندازہ ہو رہا تھا لیکن وہ کیا بول رہے تھے، یہ سمجھ نہیں آتا تھا۔ سامان کھدکائے جانے کی آوازیں بھی سنائی دیں لیکن چند منٹوں سے زیادہ یہ سلسلہ جاری نہیں رہا۔ اوپر خاموشی چھا جانے کے تھوڑی دیر بعد روٹی سیڑھیاں تر کر نیچے آیا۔

"اوی بد معاش تھے۔ آپ کا صبر بتا کر ہم سے پوچھنا چہ کر رہے تھے۔ ہم بول دیے ہمیں اس سنسار میں اپنے

ان کے سیوک ہیں۔ وہ جاتے سے ہمیں سیوا کے لیے ساتھ لے جائیں تو ساتھ چلے جاتے ہیں ورنہ ان کے انتہار کو بھی سیوا جان کر آنکھیں رستے پر جمائے بیٹھے رہتے ہیں۔" اس کی ہکا بھوک کے سوال کو پڑھ کر روٹی نے حسب عادت ایک سی سانس میں ساری تفصیل سنا ڈالی۔ سادھو اس تفصیل سے بے نیاز سر جھکائے اپنے ہی کسی دھیان گیان میں تھا۔

"انہیں یہ خانے کا پتا نہیں چلا؟" اس نے پوچھ حیرت سے دریافت کیا۔ اتنے معلوم تھا کہ سونیا کے ساتھی تربیت یافتہ تھے اور ایسے لوگوں کے لیے ایک عام سے خانے کی موجودگی و محسوس کر لینا کوئی مشکل بات نہیں تھی۔

"چھوڑ دے بالک! کوئی کتنی ہی گیانی ہو، اس کی ایک مدد ہوتی ہے۔ اندھیروں میں بھٹکنے والوں کا گیان سادھو کی دنیا میں کام نہیں کرتا۔" سادھو نے اسے ٹوک دیا تو وہ مزید کوئی سوال کرنے کی جرأت نہیں کر سکا۔ کچھ ایسا تھا اس سادھو میں کہ وہ خود کو اس کے احترام پر مجبور پاتا تھا۔

"تھوڑا سے صبر سے بتالے یہاں پھر میں خود تیرے نکلنے کا بندوبست کر دوں گا۔ بغیر بندوبست کے نکلے گا تو فوراً دھریا جائے گا۔ جیسا تجھے شک ہے، ویسا نہیں ہے لیکن کچھ تو ایسا ہے جو انہیں تیری سمت بتاتا ہے اور وہ تیری تلاش میں ہیں۔ آس پاس بھٹکتے پھرتے ہیں۔" سادھو اٹھ کر سیڑھیوں کی طرف جاتے ہوئے بولا تو اس کے لہجے میں گہری سوچ کا لمس تھا۔

"ملازم صاحب کہاں ہیں؟ ان سے بولو مجھے ان سے بات کرنا ہے۔" اس نے اپنے لیے ناشائستہ کر آنے والے ملازم سے حکیمانہ لہجے میں کہا۔

"وہ تو نہیں ہیں میڈم! ان کی طبیعت کافی خراب

جانے کی اجازت دی اور خود ناشتے سے انصاف کرتے ہوئے بہت کچھ سوچتی رہی۔ باؤل کے اغوا کی تا کام کوشش کے بعد وہ عمل طور پر خان ہاؤس میں قید تھی۔ حامد نے اسے صاف بتا دیا تھا کہ سونیا کی طرف سے اگلے احکامات ملنے تک وہ اسے نہیں بھی جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ یہاں تک کہ اس نے وکی کے پاس رو جانے والا اس کا موبائل فون واپس منگوا لینے کے باوجود اس سے حوالے نہیں کیا تھا جس کی وجہ سے وہ باہر کی دنیا سے رابطے سے محروم ہوئی تھی اور یہ چیز اسے جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر رہی تھی۔

"مجھے حامد کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھانا ہوگا۔" اب وہ کانٹے کی مدد سے آلیٹ کو چھوئے چھوئے ٹکڑوں میں تقسیم کرتے ہوئے ایک فیصلہ کر چکی تھی۔ فیصلہ کر چھنے کے بعد اس نے جدی جدی ناشتے کو نمٹایا اور کمرے سے باہر نکل آئی۔ خان ہاؤس کے اندر اس کی نفس و حرکت پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ ملازم نے اسے کمرے سے باہر دیکھا تو ناشتے کی نرالی واپس لانے اس کے کمرے میں چلا گیا۔ ملازم کے جاتے ہی اس نے اپنے اطراف ایک حیرانہ نظر ڈالی۔ وہاں کوئی دوسرا ملازم نظر نہیں آ رہا تھا البتہ ایک قریبی کمرے سے آتی مدھم آوازوں سے ظاہر تھا کہ وہاں صفائی کا عمل جاری ہے۔ اس نے موقع کا فائدہ اٹھایا اور تیز تیز قدم اٹھاتی حامد کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ مینڈل

میں جہاں وہ آواز نہیں سن سکتا تو دل خوشی سے دھڑکتا تھا۔ وہ غور سے کمرے کے اندر دیکھ گئی۔

"اچھا! میرا موبائل سانی سے مل جائے۔" اس نے

پہرائیوں سے دعا مانگی اور احتیاط سے ایک ایک جگہ کی تلاشی

83 سب ڈانچمت

لینے لگی۔ حامد خود جتنا تک سک سے رہتا تھا، اس کا کمر ابھی اتنا ہی منظم تھا۔ اس نے پہلے اسٹڈی ٹیبل کی درازوں کا جائزہ لیا۔ وہاں ترتیب سے رکھے سامان میں اسے اپنا موبائل نہیں ملتا تو ہماری ڈور ہماری کی طرف بڑھ گئی۔ ہماری مقفل تھی۔ اس نے اپنی ہیئر پین نکال کر قفل کھولنے کی کوشش کی لیکن اسے اپنی کوشش میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ معلوم نہیں قفل خاص قسم کے تھے یا اس کی تربیت میں یہی کوئی کمی رہ گئی تھی کہ وہ انہیں کھولنے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ ناکامی پر جھنجھلاہٹ

ہزار سے زیادہ نہیں تھی لیکن اس کے کام آسکتی تھی اس لیے اس نے گریبان میں اڑس لی۔ بڑی کامیابی اسے بائیں جانب کی عملی دراز کھونے پر حاصل ہوئی۔ وہ جو خیال کر رہی تھی کہ حام نے اس کا موبائل متقلل الساری میں رکھا ہوگا، وہاں اپنا موبائل رکھا دیکھ کر خوشی سے اچھل پڑی۔ رقم اور موبائل دو اہم اشیاء کے حصول کے بعد اسے کسی شے کی ضرورت نہیں تھی اس لیے کمرے سے باہر نکل گئی لیکن سیدھے اپنے لیے مختص کمرے میں جانے کے بجائے باہر کا رخ کیا۔ باہر گاؤں کے محکمہ معمول اپنی ڈیوٹی پر موجود تھے۔ وہ لان میں گھوم پھر کر ممتاز نظروں سے برحرف کا جائزہ لینے لگی۔ اس نے محسوس کیا کہ بظاہر بے نیازی سے اپنی ڈیوٹی انجام دیتے گاؤں اس کی آمد کے بعد زیادہ چوکنے ہو گئے ہیں۔ ظاہر ہے انہیں حام کی طرف سے ہدایت ہوگی کہ اسے باہر نہ جانے دیا جائے۔ وہ کسی طرح ان گاؤں کی آنکھوں میں دھول جھونک بھی دیتی تو اس کے لیے اس اونچی چار دیواری کو پار کر کے دوسری طرف جانا ممکن نہیں تھا۔ کم از کم دن کی روشنی میں تو وہ ایسی کوئی کوشش نہیں کر سکتی تھی۔ چوری جیسے فرار کے خیال کو ذہن سے جھٹک کر وہ واپس اندر کی طرف پلٹ گئی اور کمرے کا دروازہ بند کر کے اپنا موبائل آن کیا۔ یہ دیکھ کر اس کا دل خوش ہو گیا کہ موبائل میں ابھی خاصی چارجنگ موجود ہے۔ اس نے جھٹ وکی کا نمبر ڈائل کیا۔

”کوئی خاص بات تھی کہا؟ باؤل کے معاملے میں تم

نے کچھ اور کیا؟“ وہ فوراً خوش فہم ہوئی۔

”نہیں، وہ تو میں آپ کی خیریت معلوم کرنے اور آپ سے معذرت کرنے کے لیے آپ سے رابطہ کرنا چاہتا تھا۔ اس دن آپ اسپتال میں پھنس گئی تھیں اور میں آپ کو وہاں سے نکالنے کے لیے کچھ نہیں کر سکا تھا۔“ اس نے معذرت خواہانہ لہجہ میں وضاحت کی۔

”فی، مجھے معلوم ہے اور اس سلسلے میں اچھا خاصا شہکار بھی کیا جا چکا ہوں۔ سچی بڑی منافقت ہے بلکہ ایک ایجنٹ پر تھوڑے سے مضمون ہی نہیں تھا کہ کوئی ہمیں گالو کر رہا ہے۔ ویسے ایک طرح سے اچھا ہی ہوا۔ ارمیڈم سونیا کا آدمی آپ کے پیچھے وہاں نہ پہنچتا تو آپ کا وہاں سے لکھنا مشکل ہو جاتا۔“ وہ خاصا شرمندہ ہو رہا تھا لیکن اسے اس کی شرمندگی سے کوئی غرض نہیں تھی اس نے تھوڑی بیزاری سے بولی۔

”بات سمجھ لوں ہے مس بشری۔“ ”وکی نے ذرا سا توقف کیا اور پھر گرا کھٹکھٹاتے ہوئے بول۔

معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیے ہیں۔ انہوں نے معاف بھائی کے والد سے رابطہ کر کے میرا علیینہ سے رشتہ طے کر دیا ہے اور آج ہمارا نکاح ہو رہا ہے۔ جید ہم دونوں اور علیینہ کے والد اور بھائی کسی دوسرے ٹکٹ منتقل ہو جائیں گے۔" وہ گویا اسے اپنے اس معاملے سے الگ ہونے کی اطلاع دے رہا تھا۔

معاذ بھائی کی اصل مجبوری ان کی یہی ہے۔ اگر انہیں ان کی

خازین میں سے ایک نے اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے پیر کو مضبوطی سے کپڑے میں لپیٹ دیا۔ اس عمل کے دوران وہ یوں کراہتی رہی جیسے ضبط کی زبردست کوشش کے باوجود برداشت کرنے سے قاصر ہو۔

”کیا ہوا ہے؟“ ابھی چہر پر ہنسی باندھنے کا عمل مکمل ہی ہوا تھا کہ چیف سیکورٹی افسر وہاں چلا آیا۔ حامد کی غیر موجودگی میں خان ہاؤس کے معاملات دیکھنا اسی کی ذمہ داری تھی شاید اسی لیے کسی نے اسے اطلاع دے دی تھی۔

فیلی کے محفوظ ہونے کی یقین دہانی کروادی جائے تو وہ خود ہاتھ چہ مار کر اس دلدل سے نکل آئیں گے جس میں انہیں زبردستی پھنسا دیا گیا ہے۔" وہی کے پاس اس کے ہر اعتراض کا جواب تھا۔ اس نے ہارے ہوئے انداز میں سلسلہ منقطع کر دیا۔ وہ اس سے یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ تم لوگوں کی زندگیوں میں سب کچھ ٹھیک ہو جانے سے کیا بشری کی زندگی میں بھی سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا؟ وہ خود پر گزری کا انتقام لیے بغیر جہن نہیں پاسکتی تھی لیکن اس انتقام میں کسی کو نقصان نہ پہنچے۔ اس نے مجھے بھی نہیں بتا سکتی تھی۔ بشری کو اس میں کسی سے کوئی ایسا رشتہ نہیں تھا کہ اسے اپنے جسم کی جگہ خود کو بخوشی۔

موبائل کی جی مٹنی ہے اسے اس سکتہ زدوں کی حیثیت سے باہر نکالا۔ اسکرین پر وقاص کا نمبر چمک رہا تھا۔ اس نے لائن کاٹ دی۔ ٹھنی دوبارہ بجنے لگی۔ اس بار اس نے موبائل ہی آف کر دیا۔ اسے کسی کے وضاحتی اور معذرتی جملے سننے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

”بشری لوہی کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے گویا خود کو باور کروایا اور دھرد پر پھسل کر آنے والے آنسو ہاتھ کی پشت سے صاف کرتے ہوئے ایک عزم سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

پانچ منٹ بعد ہی خان ہاؤس اس کی چیخوں سے گونج رہا تھا۔ چیخوں کی آواز سن کر اپنے فرائض انجام دیتے ملازمین نے دوز لگائی تو وہ میز میوں کے قریب اس حال میں پڑی دھڑکی دی کہ اس کے ماتھے سے خون بہہ رہا تھا وروہ اپنی ایک ٹانگ پکڑے بری طرح جھلار ہی لگی۔

”یہ کیا ہوا میڈم؟“ ایک طائر نے جلدی سے اس کے ماتھے کے زخم پر اچھا دو چٹا رکھ کر اس کا بیہوش خون روکنے کی سعی کی۔

”خیر میرے حیر میں بہت درد ہو رہا ہے۔ لگتا ہے فریج پر ہو گیا ہے۔“ مائے پر زخم اس نے اپنے ہاتھوں سے لگا یا تھا اور جانتی تھی کہ زخم زیادہ گہرا نہیں اس لیے خون بند رک جائے گا اس لیے حیر کی چوٹ کے حوالے سے شور مچایا۔ دیکھنے والے دیکھ سکتے تھے کہ اس کا حیر بری طرح

میرے بچے کو کسی چیز سے بے پائندہ دوتا کہ اسے

بلکہ ملازم سے التجا کی۔ کسی کے سرخی کا مصنوعی پتہ محسوس کرنے سے پہلے ہی اسے چھپ دینا منسب تھا۔ فکر مند

”ٹھیک ہے میں گاڑی نکھواتا ہوں، تم انہیں سہارا دے کر باہر لاؤ۔“ نسیب پوری افسر کو مجبوراً کہتا پڑا۔ وہ اٹھ کر باہر چلا گیا تو ملازم نے اسے سہارا دے کر کھڑا کرنے کی کوشش کی لیکن وہ کھڑے ہونے کے بجائے کرا سننے لگی۔

یہ اردو ہوا ہے۔ اردو اسے کجے میں لکھتے ہوئے ۱۵۹۷ء

انہیں کڑی سمیت اٹھا کر گاڑی تک لے جائیں گے۔" اس کے بعد پرکپڑے کی ہٹی باندھنے والے ملازم نے ملازمہ کو

مخاطب کر کے تجویز پیش کی۔ تھوڑی دیر میں ہی اس تجویز پر عمل کیا جا رہا تھا۔ گاڑی کے قریب کھڑے سیکورٹی افسر نے اسے اس حالت میں باہر آتا دیکھا تو اس کی آنکھوں میں دوڑتی ہلکوک و شبہات کی لہریں تھوڑی کم ہو گئیں۔

”خیال سے لے جانا اور چیک اپ ہوتے ہی مجھے کال کر کے صورت حال بتانا۔ حامد صاحب کو ڈسٹرب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی ان کی طبیعت پوری طرح سنبھل نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ انہیں سکون سے آرام کرنے دیا جائے۔ اسے گاڑی میں منتقل کرنے کے بعد ان کو وہ ڈاکٹر اور ساتھ چلانے والے سیکورٹی گارڈ کو بلا کر لے دیا جائے۔“

”تم میڈم کے ساتھ جاؤ گی زریںہ! خیال سے ان کے ساتھ ساتھ ہی رہنا۔“ اب رخ ملازمہ کی طرف تھا۔ اس نے جان بوجھ کر خود کو بے نیاز ظاہر کیا اور یوں پشت گاہ سے سرٹکا کر آنکھیں بند کر لیں جیسے تکلیف سے غم حال ہو کر ادھر ادھر دیکھنے کی ہمت بھی نہ رہی ہو۔ اس کا یہ نڈھال انداز، صبح والا روف علیہ اور خالی ہاتھ ہونا سیکورٹی افسر کے ہلکوک و شبہات میں مزید کمی لے آیا۔ آخر کار گاڑی وہاں سے روانہ ہوئی اور سبک رفتاری سے چلتی ہوئی دس بارہ منٹ میں ایک نئی اسپتال کی محارت کے سامنے جا کر کی۔ اسے اندازہ تھا کہ حامد بھی یہیں داخل ہوگا۔ بہر حال اس وقت اسے حامد سے کوئی فرض نہیں تھی اور وہ خود اپنے فرار کے مواقع کا جائزہ لے رہی تھی۔ ان کے ساتھ آنے والا گارڈ وکیل چیئر کے انتظام کے لیے اندر کی طرف چلا گیا تھا۔ اس کے ساتھ آنے والی ملازمہ گاڑی میں اسی کے ساتھ پچھلی نشست پر بائیں جانب بیٹھی ہوئی تھی جبکہ ڈرائیور اپنی سیٹ چھوڑ کر دائیں دروازے کے ساتھ آکھڑا ہوا تھا۔ یوں اس کے لیے ممکن نہیں تھا کہ دائیں یا بائیں کسی بھی جانب سے اتر کر راہ فرار اختیار کر سکے۔ بیروں میں جو توں کی عدم موجودگی بھی خواہش کی تکمیل میں ایک رکاوٹ تھی۔

”میڈم آگئیں۔“ وہ اپنے خیالوں میں ہی ڈوبی ہوئی تھی کہ ملازمہ کی آواز نے چونکا دیا۔ وکیل چیئر لائی جا چکی تھی۔ وہ اپنی اداکاری کو جاری رکھتے ہوئے ان لوگوں کی طرف سے گاڑی سے اس پر حمل ہوئی۔ اب اسے اندر لے جایا جا رہا تھا۔ ملازمہ اور گارڈ اس کے ساتھ ساتھ ہی تھے۔

”آپ لوگ باہر ہی رہیں۔ کچھ چیخنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ معائنے کے کمرے میں جانے سے قبل ہی ایک نرس نے ملازمہ اور گارڈ کو اندر جانے

سے روک دیا اور خود اس کی وکیل چیئر کو دھکیلے ہوئے اندر لے گئی۔

”اوہو، کیا ہوا اس پر اپنی گرل کو؟“ اس کے ماتھے پر جھٹکا تو اس کا خون اور ہیر پر اپنی ہٹی اندر داخل ہوتے ہی نازک سی ڈاکٹر کی نظر میں آئی تھی۔

”سیزمیوں سے گر گئی ہیں۔ شاید پاؤں میں فریکچر ہو گیا ہے۔“ نرس نے ملازمہ سے حاصل شدہ معلومات ڈاکٹر کے گوش گزار کی۔

”اب وہ بڑی کمزور ہیں! جیٹا جیٹا ہیں۔ میا بیس سال کی ڈاکٹر کے ہاتھوں کسی نہ سمجھیں اور کی طرح فٹ لگا ہوا تھا اور بہت خوش مزاج محسوس ہو رہی تھی۔“

”میڈم! میں اوکی میں چلی جاؤں۔ آپ تو بتایا تھا کہ آج وہاں اسٹاف کم ہے اور ڈاکٹر جاوید نے مجھے وہاں آنے کو کہا تھا۔“ ڈاکٹر ابھی اس کے ماتھے کے زخم کا جائزہ لے رہی تھی کہ نرس اس سے مخاطب ہوئی۔

”ان کے ہیک کی پٹی کھول دو پھر چلی جانا۔“ ڈاکٹر کے چہرے پر ہلکی سی ناگواری کا تاثر ابھرا لیکن اس نے خود کو قابو میں رکھتے ہوئے نرس کو نری سے جواب دیا۔

”یہ چوٹ تو معمولی سی ہے۔ ہلکی پھلکی ڈریسنگ سے بھی کام چل جائے گا۔“ ماتھے کی چوٹ کا جائزہ لیتی ڈاکٹر نے اپنے تئیں اسے اطمینان دلایا۔

”جی، مگر میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔ کہیں کوئی اندرونی چوٹ تو نہیں لگ گئی؟“ اس نے جان بوجھ کر تشویش کا اظہار کیا۔ اصل فکر تو اسے ہیک کی طرف سے تھی۔ جس طرح اس نے ملازمین کو بے وقوف بنالیا تھا کسی پروڈیوشل کو نہیں بنا سکتی تھی۔ اچھی بات یہ تھی کہ نرس بھی جلدت میں ہونے کے باعث زیادہ توجہ دے بغیر پٹی کھول کر باہر نکل گئی تھی۔

”ڈونٹ ڈری۔ چوٹ کی وجہ سے درد ہو رہا ہے۔ میڈم بس اپنے سے ٹھیک ہو جائے گا۔“ ڈاکٹر اس کی تشویش پر پہلے تھوڑا سا مسکرائی اور پھر سہولت سے اسے سلی دی۔

”آئی ایم سوری ڈاکٹر! مگر مجھے اطمینان ہے کہ آپ

تھیں۔“ وہ اپنی اداکاری کو جاری رکھتے ہوئے ان لوگوں کی طرف سے گاڑی سے اس پر حمل ہوئی۔ اب اسے اندر لے جایا جا رہا تھا۔ ملازمہ اور گارڈ اس کے ساتھ ساتھ ہی تھے۔

”آپ لوگ باہر ہی رہیں۔ کچھ چیخنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ معائنے کے کمرے میں جانے سے قبل ہی ایک نرس نے ملازمہ اور گارڈ کو اندر جانے

شکوہ

شوہر اور بیوی کھانے کے لیے گئے تو کسی لڑکی نے بیوی کہا۔

بیوی: "کون تھی یہ؟"

شوہر: "میرا دماغ خراب نہ کرو۔ ابھی اسے بھی بتانا ہے کہ تم کون ہو؟"

ملک پرانی اور شہزادی

بیوی: "میرے بھائی نے مجھے شادی سے پہلے یہ نہیں بتایا تھا کہ تمہاری پہلے سے من بیویاں تھیں؟"

شوہر: "بتایا تو تھا کہ تمہیں حکمہ رانی اور شہزادی کی طرح رکھوں گا۔"

دادا کی شادی

ایک بچے کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ بھئی کے لیے کیا عذر پیش کرے۔ آخر اس نے استاد سے کہا۔

"مجھے اپنے دادا کی شادی کے لیے بھئی چاہیے۔"

استاد نے پوچھا۔ "وہ اس عمر میں شادی کیوں کر رہے ہیں؟"

لڑکے نے کہا۔ "سرا وہ تو نہیں کر رہے، میں زبردستی کروا رہا ہوں۔"

24 گھنٹے

سردار اور سردارنی شادی کے بعد سردارنی: "ہماری شادی کو ماشاء اللہ چوبیس گھنٹے ہو گئے ہیں۔"

سردار: "ہاں، اور ایسا لگتا ہے جیسے کل ہی کی بات ہے۔"

جوتی کا ساٹن

سردار: "میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں۔"

سردارنی: "میرے جوتی کا ساٹن دیکھو، اسے میں نے اپنے لیے لیا ہے۔"

(مرسد: محمد الوردیم۔ حویلی کھٹا، اڈکڑہ)

اسے تمام لیا اور وکیل چیئر پر بیٹھا دیا۔ ڈاکٹر کے مکمل طور پر بے ہوش نہ ہونے کی وجہ سے اس موقع پر اسے ایک گھونسا مزید جڑنا پڑا تھا۔ اس کی بے ہوشی کا اطمینان ہو جانے کے بعد اس نے بھرتی سے پہلے کرسی کی پشت پر لٹکا ڈاکٹر کا سفید کوٹ پہنا پھر اس کا دوپٹا کھینچ کر اچھی طرح سر اور ماتھے پر لپیٹنے کے بعد میز پر رکھے ماسک اور گارڈ بھی چہرے پر سیٹ کر لیے۔ چلے میں اتنی تہدیلی کے بعد اسے اطمینان تھا کہ سرسری نظر ڈالنے پر کسی کے لیے اسے شناخت کرنا آسان

ہو گا۔ اسے اس بہرہ کو مزید پر فیکشن دینے کے لیے ایک ایک طرف ڈاکٹر کے شولڈر بیگ کا سارا سامان پھینک دیا۔ اسے لگتا تھا کہ اس کا دوسری طرف اس کا اسٹو اسکوپ بھی ہاتھ میں تمام لیا۔ اب بس آخری چیز رہ گئی تھی۔ ڈاکٹر کے پیروں میں موجود سیاہ نرم سی چمکی کو اتار کر پہننے ہوئے اس نے ایک بار پھر دل ہی دل میں اس سے معذرت کی اور خود کو کمپوز کرتے ہوئے باہر کا رخ کیا۔ چمکی اس کے پیروں میں معمولی سی ڈسٹیلی تھی لیکن اس سے اتنا فرق نہیں پڑ رہا تھا کہ اسے چلنے میں دشواری پیش آتی۔

کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلتے ہوئے پل بھر کے لیے اس کا دل زور سے دھڑکا لیکن کسی قسم کی گھبراہٹ کا مظاہرہ کیے بغیر سیدھی چلتی چلی گئی۔ بائیں جانب انتظار میں بیٹھے گارڈ اور ملازم نے دروازہ کھلنے کی آواز پر اس جانب دیکھا ضرور لیکن ایک تو اس کا رخ براہ راست ان کی طرف نہیں تھا اور دوسرے وہ چلے سے کوئی ڈاکٹر ہی لگ رہی تھی اس لیے زیادہ توجہ نہیں دی اور وہ اطمینان سے باہر نکلتی چلی گئی۔ باہر نکل کر رکشے میں بیٹھنے کے بعد اس نے اپنا رکاب ہوا سانس بحال کیا اور لباس کے اندر چھپائی ہوئی رقم اور موبائل نکال کر پرس میں خفیہ کیا۔

"کہاں جانا ہے بی بی؟" رکشا ڈرائیور نے اس سے دریافت کیا۔

"نئی روڈ چلو۔" یہ تین نظلی جملہ بولتے ہوئے اس کی سانسوں میں کتنا زہر بھرا ہوا تھا، یہ وہ خود ہی جانتی تھی۔

اس کا بچہ چائیں چائیں چائیں میرے گھر کی طرف چل رہا ہے۔ جس جگہ اس کی سانسوں کا تھکنا تھا اس کے پاس سے چلے گئے۔ ملازم کو چھان مارا ہے۔ کئی لوگوں سے پوچھنا چھ کی ہے لیکن معاذ کا کوئی اتنا پتا نہیں چل سکا ہے۔" سوچا اس وقت

پروفیسر وکٹر سے نئی فونک گفتگو کر رہی تھی اور اس کے لیے سے ظاہر تھا کہ وہ معاذ کے لیے پریشان ہے۔

”میں نہیں جانتا میڈم کہ وہاں کیا حالات ہیں لیکن میں آپ کو ایک بات واضح طور پر بتا سکتا ہوں کہ سنگلز نہ ملنے کا مطلب ہے معاذ اب اس دنیا میں نہیں رہا ہے اور ہم اسے کھو چکے ہیں۔“

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو پروفیسر؟ سنگلز نہ ملنے کی کوئی اور وجہ بھی تو ہوتی ہے۔“ پروفیسر وکٹر کے جواب نے نہ جانے کیوں اسے لرزہ کر رکھا دیا۔ وہ بے ساختہ نئی اس نے اس کے خیال کو دہرائے کی کوشش کی۔

”آپ تمام حقائق کو دیکھ کر میڈم! اگر ہم معاذ کے جسم میں کوئی چپ یا ڈیوائس فٹ کی ہوئی تو ہم سوچ سکتے تھے کہ اسے اس کے جسم سے نکال کر ضائع کر دیا گیا ہے یا وہ خود ہی کسی وجہ سے آڈٹ آف ورک ہو گئی ہے لیکن یہاں معاملہ بالکل مختلف ہے۔ آپ کے پاس موجود ریسیور خاص معاذ کے دماغ سے نکلنے والی لہروں کو ریسوکر کے اس کی لوکیشن شو کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس وقت بھی کام کر سکتا ہے جب ٹارگٹ حالت خیمہ یا بے ہوشی میں ہو۔“ وکٹر نے اس کے رد کے جواب میں تفصیلی دلیل دی۔

”یہ سب مجھے پتا ہے لیکن میرا ذہن معاذ کی موت کو قبول نہیں کر پار رہا۔ نہ اس کی ڈیڈ باڈی ملی ہے اور نہ ہی دوسرا کوئی کلیو۔ وہ تو بس ایسے غائب ہو گیا ہے جیسے اچانک ہی دھواں بن کر فضا میں تحلیل ہو گیا ہو۔“ اس بار سونیا کا لہجہ تھکا تھا سا تھا۔

”اس چیز نے تو میرے علاوہ میڈم! آپس کو بھی الجھن میں ڈالا ہوا ہے لیکن میڈم کا خیال ہے کہ وہاں موجود آپ کی ٹیم نے سو فیصد کارکردگی نہیں دکھائی اور پھر نہ پتہ کس کر گئے ہیں جس کی وجہ سے معاذ تک رسائی نہیں ہو پائی۔“ پروفیسر کا نہجہ پتہ خشک تھا۔

”ایسی بات نہیں ہے پروفیسر! میں اس ٹیم کے ساتھ پہلے بھی کام کر چکی ہوں اور یہ لوگ ہمیشہ بہترین پرفورمنس دیتے ہیں۔“ اس نے فوراً اپنی ٹیم کی حمایت کی۔

”آپ کو جتنا اپنی ٹیم پر اعتماد ہے وہاں سے اس سے دس گنا زیادہ میں اسے کام پر بھروسہ کرتا ہوں۔ معاذ کی لوکیشن ملنے والی باتیں اس کے لیے جو تکنیکی استعمال کی گئی تھی، اس پر میں نے برسوں محنت کی ہے اور میں اسے ملے گا پورا اعتماد ہوں کہ اگر یہ کام نہیں کر رہی تو اس کا صرف ایک ہی مطلب ہے اور وہ یہ کہ معاذ اب نہیں رہا۔“ پروفیسر کو اس کی

اپنی ٹیم کی حمایت پسند نہیں آئی۔

”مجھے آپ کی قابلیت پر کوئی شک نہیں ہے پروفیسر لیکن آپ جانتے ہیں کہ معاذ کی طرف سے ہم کبھی مطمئن نہیں رہے اور ہمیں ہمیشہ اس پر شک رہا کہ وہ ہمیں ڈاج دے رہا ہے۔“ اس نے جلدی سے وضاحت دے کر پروفیسر کا موڈ بحال کرنے کی کوشش کی۔

”جو کچھ بھی ہے، معاذ بہر حال آپ کی ذمہ داری تھا اور اسے کھودنے پر آپ کو میڈم! آپس کے سامنے دیکھنا پڑے گا۔“ اس کے لیے تیار رہتا تھا۔ ”پروفیسر! اگر معاذ کو ڈیڈ ڈوگس سے ظاہر تھا کہ اس کی ٹارگٹ لائی ہوئی دوپٹاں ہوئی ہے۔“ اس نے دراصل اپنی انوکھی جینی کی سطح میں ہلاکت کے بعد وہ بہت نازک مزاج ہو گیا تھا اور کبھی بھی ایسے ہی رویے کا مظاہرہ کر جاتا تھا۔ سونیا نے اس سے مزید گفتگو کو دقت کا زیاں جان کر سلسلہ منقطع کر دیا لیکن وہ خود بہت الجھی ہوئی تھی اور اس کا ذہن کسی طور معاذ کی موت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہو رہا تھا۔

”سجاش سے کہو مجھے معاذ نہ سہی اس کی لاش ہی تلاش کر کے دے ورنہ خود اس کا وہ انجام ہو گا کہ دیکھنے والے لرز جائیں گے۔“ غصے اور شدید جھنجھلاہٹ کے عالم میں اس نے انٹرکام اٹھا کر قسم جاری کیا لیکن سکون کسی صورت حاصل نہیں تھا۔

”پروفیسر وکٹر کو تمہاری موت کا یقین ہے لیکن میرا دل اس بات کو ماننے کے لیے راضی نہیں ہوتا۔“ ادھر سے ادھر بھٹتے ہوئے اس نے تصور میں معاذ کو مخاطب کیا اور پھر خود ہی چونک گئی۔

”دل! بھدا دل کا کیا ذکر اس قصے میں؟ میں نے تو ہمیشہ ہر فیصلہ دماغ سے کیا ہے۔ میری تربیت میں دل کی سننے اور ماننے کا تو کوئی عنصر شامل ہی نہیں ہے۔“ یہ ایک نئی الجھن تھی جس نے اسے گھیر لیا تھا۔ معاذ کوئی پہلا نوجوان نہیں تھا جسے اس کی صلاحیتوں کی بدولت اس کی تنقید نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرنے کے لیے شکار کیا تھا۔ وہ ماضی میں کئی بار کامیابی سے یہ شکار بچتے

رہے تھے۔ اس فونک گفتگو کے بعد معاذ شکار ہو جانے اور لوگوں کے ہاتھوں میں لپکے جانے کے باوجود انہیں اس کے شکار سے باز نہیں رکھ سکے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی صلاحیتوں کے لیے اسے اپنے آپ کو ہتھیار بنانا پڑے گا۔ اس کی رائے کے مطابق معاذ اب تک شکار کیے گئے نوجوانوں میں سب سے

زیادہ باصلاحیت تھا اس لیے اگر انہیں اسے اپنے ذہب پر ماننے کے لیے کچھ زیادہ وقت لگ رہا تھا تو یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ اس سے مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کے لیے ہی سونیا کو اس کے ساتھ باقاعدہ تھیں کیا گیا تھا اور یہ ترکیب کافی حد تک کارگر بھی ثابت ہوئی تھی لیکن اب اچانک ہی وہ ریت کی طرح ان کی منہوں سے پھسل گیا تھا۔

”اے نوجوان کو چیک کرو سونیا! میری مچھنی حس کہہ رہی ہے کہ یہ غیر معمولی ہے اور اگر ہم اسے قابو میں کر لیں تو

میں اسے بہت کم آگے بڑھنے دے گا۔“ انہوں نے لکھنے سے پہلے ہی اس وقت کے لیے جب معاملہ اور بشری اپنی پہچان بنانے کے لیے اتفاقاً ٹھکانا ہاؤس میں آگئے تھے۔ اس وقت وہ بھاری اور غیر معمولی طور پر خوش حال نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے ایکس کے ساتھ کسی کام سے روانہ ہو رہی تھی۔ فنڈ شیٹوں والی گاڑی میں اس کے ساتھ منجھی میڈم ایکس کو معاذ اور بشری نہیں دیکھ سکے تھے لیکن جس طرح معاذ تھوڑا سا بے چین ہو تھا اس سے صاف پتا چلتا تھا کہ اس نے زمین شیٹوں کے بارے میں خود کو بطور خاص دیکھا جانا محسوس کیا تھا۔

میڈم ایکس کے قہر پر اس نے نہ صرف معاذ کے بارے میں معلومات حاصل کروائی تھیں بلکہ اسے یزدانی اور عرفان اللہ سے باقاعدہ سودا کر کے حاصل بھی کیا تھا۔ بشری کے جذبہ انتقام سے فائدہ اٹھا کر اسے اپنے ساتھ شٹل کر لینے کا مقصد بھی یہی تھا کہ معاذ کو ہر طرف سے جکڑ لیا جائے لیکن عجیب قسم خرابی تھی کہ اتنی کوششوں کے بعد بھی وہ باخبران کے ہاتھوں سے پھسل گیا تھا۔

”تم کہاں چلے گئے معاذ؟ تم مرے بھی تو کیسے مرے؟“ اسے خود انہیں معلوم تھا کہ وہ اس قدر کیوں جھنجھکیا رہی ہے۔ شاید اپنے وقت میں جب اس کے حساب سے سب ہاتھ بیک ہونے لگا تھا، معاذ کا یوں ہاتھوں سے نکل جانا قابل قبول تھا۔ وہ وہ وقت کیسے بھول سکتی تھی جب وہ اور معاذ دو مختلف مقامات پر ایک دوسرے کی نظروں سے ٹکھٹک رہے تھے۔ وہ وہ وقت کیسے بھول سکتی تھی جب وہ اور معاذ دو مختلف مقامات پر ایک دوسرے کی نظروں سے ٹکھٹک رہے تھے۔ وہ وہ وقت کیسے بھول سکتی تھی جب وہ اور معاذ دو مختلف مقامات پر ایک دوسرے کی نظروں سے ٹکھٹک رہے تھے۔

تھوڑے عرصے میں جہاں کہیں وہ ریل کی کڑی دیکھ کر دھماکا کرے گا بھی پائیں لیکن یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ معاذ کو کچھ کرتا پتا نہ تھا، خود وہ اس کام کو مکمل کرنے کے لیے تیار تھی۔ لیکن پھر اچانک ہی وہ سب ہو گیا۔ ریل کی کڑی سے نکل ہی معاذ کی طرف سے بالکل غیر متوقع طور پر دھماکا

کر دیا گیا۔ وہ اس دھماکے کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھی اور اتفاقاً ایک ایسے پتھر پر کھڑی ہوئی تھی جو تھوڑا سا غیر متوازن تھا۔ دھماکے کے رد عمل میں اسے جھکا لگا اور وہ گر گئی۔ اب یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ گرنے سے اس کا سر ایک پتھر سے ٹکرایا اور وہ کچھ دیر کے لیے اپنے ہوش و حواس نہ کر سکی۔ حواس بحال ہونے کے بعد اس نے اپنی ٹیمر کو بلایا اور معاذ کے بارے میں جاننے کی کوشش کی لیکن وہ جانے

حادثہ کے آس پاس کہیں موجود نہیں تھا۔ دھماکے کے تھوڑی ہی دیر بعد ہی اس نے اپنے والے ریچھ کے ملازمین کو پتھر کے پتھروں کے باعث ہونے والے ہاتھ بھجھ پھوٹ جانے والا دیکھا۔ یہ ساری باتیں اس کی اس لیے غصے کی طور پر معاذ کے بارے میں کچھ بتانے والی تھیں۔ ریچھ کی کوشش کرتے

کھونٹے لگانے کی کوشش بھی ناکام رہی کہ ایک ویران سی جگہ کے بعد ریچھ بھی کچھ بتانے سے قاصر تھا۔

”کیا وہ کچ کچ مر گیا ہے؟“ حالات کا تجزیہ کرتے کرتے اس نے ایک بار پھر خود سے سوال کیا اور اس سوال کے جواب میں دل کے ایک دم رک جانے اور پھر زور سے دھڑکنے پر ششدر رہ گئی۔

”معاذ میری ذمے داری تھا۔ اس کا یوں تم ہو جانا میری اب تک کی کارکردگی پر سوا یہ نشان لگا دے گا۔ اس کے بارے میں کچ جانے بغیر میں سکون سے نہیں بیٹھ سکتی۔“ اس نے جھنجھکائے ہوئے انداز میں خود کو باور کرایا اور وارڈ روم کھول کر کھڑی ہو گئی۔ تھوڑی سی دیر میں وہ سادہ شلوار قمیض اور دوپٹے میں بیٹھیں، ہالوں کو قریب سے سینے

پر ہر جا رہی تھی۔ اس کے موڈ کی خرابی کو محسوس کرتے ہوئے کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس سے ہاتھ پھٹا۔

”سادھو جی کی آگیا ہو تو میں اندر آ جاؤں؟“ وہ بہت تیز ڈرایو کر کے اس ویرانے میں پہنچی تھی جہاں معاذ کی موجودگی کے آخری سنسز تھے۔ اسے اور اب ویرانے میں موجود واحد کتیا کے دروازے پر کھڑی نرمی سے پوچھ رہی تھی۔

”یہ سادھو کی کتیا ہے، کوئی راجا کا دربار نہیں جو آنے والے کو روکنے کے لیے دربان کھڑے ہوں۔ دروازہ کھلا ہے اور اس کھلے دروازے سے جس کا من چاہے اندر آ سکتا ہے۔“ اس کی ہلکی آواز میں اب بھی وہی ڈرایو

کونے میں بیٹھ گئی۔

سادھو اس کی موجودگی سے بے نیاز پورے انہماک سے پانی میں روٹی ڈبو کر کھانے میں مصروف رہا۔ وہ اپنی جگہ بیٹھی کن آنکھوں سے کشیا کا جائزہ لیتی رہی۔ ایک کونے میں رکھا چولہا، نئی کے چند برتن، دیوار کے ساتھ پیٹ کر رکھی گئی دو چڑیاں اور دائیں طرف پڑی کھل اور ٹاکھل سمجھور کی چھاڑیوں کا چھوٹا سا ڈھیر۔ سادھو کی کشیا میں موجود کل اسباب کا جائزہ لینے میں اسے ایک منٹ کا وقت نہیں لگا۔

”یہ چھاڑیاں کون بناتا ہے؟“ اگرچہ اس کی آدھی لپٹے ہوئے تھیں لیکن اس نے اس کے لئے تھے پھر بھی اس نے اپنے اس حقیقہ کو دہرائے۔

”میں اور میرا چچا روٹی واس۔“ سادھو نے اس کے سوال کا جواب دینے کے لیے چبانے کا سلسلہ ایک لمحے کو سوقوف کیا تو اس کی سماعتوں کو چپڑ چپڑ کی ناگوار آوازوں سے نجات ملی۔

”روٹی شاید تمہیں گیا ہوا ہے۔ آس پاس کہیں دکھائی نہیں دیا؟“

”چھاڑیاں بیچنے کو گیا ہے۔“ سادھو نے مختصر جواب دیا اور وہ یہ جواب پہلے ہی سے جانتی تھی۔ اس کے آدمیوں نے کشیا کی گمرانی کرنے کے ساتھ ساتھ روٹی کا باقاعدہ تعاقب کر کے ان لوگوں کے بارے میں کھلی رپورٹ فراہم کی تھی اور اس رپورٹ کے مطابق وہ لوگ کسی طور مشکوک دکھائی نہیں دیتے تھے۔

”یہ چھاڑیاں بہت خوبصورت ہیں۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس ڈھیر کے پاس آئی تھی اور ایک چھاڑی اٹھ کر بظاہر اس کا جائزہ لینے لگی لیکن اس کی نظریں آس پاس کا بھی جائزہ لے رہی تھیں۔ کوئی یہ خانہ، کوئی خفیہ راستہ اس کا تربیت یافتہ ذہن ہر امکان پر غور کر رہا تھا۔

”اپنی سسپا بتا سندری! بتا کہ وہ کیا ہے جو تجھے سادھو کی کشیا میں لے آیا ہے؟“ پورے انہماک سے سوچی روٹی کا وہ ٹکڑا کھانے کے بعد سادھو نے پیالے میں ٹکی رہنے والا پانی پیا اور کھلی بار اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

”میرا شوہر صوفی ہے سوای می! پچھلے دنوں ریل کی لٹری کے دو حمار ہوا تھا وہ اس کے گھر سے غائب ہوئے تھے والے کہتے ہیں وہ زندہ نہیں ہے پر میرا دل یہ ماننے کو تیار نہیں ہوتا۔“ اپنی تلاش میں ناکام ہونے کے بعد اس

نے چھاڑی کو واپس اس کی جگہ پر رکھا اور مؤذبانہ سادھو کے مقابل آئی تھی۔

”لیکن دھماکے میں تو کوئی نہیں مرا تھا پھر لوگ کیوں کہتے ہیں کہ تیرا بھتی اس دھماکے میں مارا گیا ہے؟“

”کسی نے اسے زخمی حالت میں دیکھنے کا بتایا تھا۔ میں نے سارے اسپتالوں سے معلوم کروالیا، وہ کہیں نہیں ملا لیکن لوگ کہتے ہیں کہ اس کے لوٹ کر نہ آنے کا یہی مطلب ہے کہ وہ زندہ نہیں ہے۔ زندہ ہوتا تو لوٹ کر میرے پاس آ جاتا۔“

”پھر اس کے لہجے میں اپنے حسن کا ذکر تھا۔“ سادھو سے یہ آگاہی کر آئی تھی۔

”آپ دعا کریں کہ وہ مجھے مل جائے۔“ پہلے تو بھگوان سے خود اپنے مل جانے کی پرارتھنا کر۔ ”تجھے اپنا آپ مل گیا تو باقی سب بھی مل جائے گا۔“ سادھو کی آنکھوں سے جمال نکلا۔

”کیا مطلب؟“ وہ جواب تک کھیل، کھیل رہی تھی سادھو کی بات سن کر الجھ گئی۔

”مطلب مجھ سے نہیں، خود سے پوچھ سندری! جیون بہت تھوڑا ہے۔ اسے فریب میں ہی گزار دے گی تو پائے کی کیا۔ سب کچھ چھوڑ دے اور اپنے اندر کے سچ کو تلاش کر۔“ سادھو کی آنکھیں اس کی آنکھوں میں یوں گڑی ہوئی تھیں جیسے وہ اسے بہت اندر تک دیکھ رہا ہو۔

”میں آپ کو پہنچا ہوا ہوں کچھ کر آپ سے اپنے شوہر کی واپسی کی دعا کروانے آئی تھی اور آپ نے جانے کیا باتیں شروع کر دیں۔“ اس کی الجھن، جھنبلاہٹ بن کر اس کے لہجے میں اتر آئی۔

”تو خود کو پائے تو تیرے اس کے سچ کوئی رکاوٹ نہیں ہے لیکن جب تک تو خود کو نہیں پائے گی، تجھے یہ بھی پتا نہیں چلے گا کہ تو اسے پانا بھی چاہتی ہے یا نہیں۔“ سادھو کے جواب نے اسے ہر سوال سے محروم کر دیا۔

”میں چلتی ہوں۔“ وہ یکدم ہی جانے کے لیے کھڑی ہو گئی۔

”چھوٹے باپ! تم نہیں سوچا۔ اب تم اپنی تلاش کے سفر پر پہنچے ہو کہ کشیا میں کچھ سے بچاؤ تھا۔“ ”میرا بچا لگتا ہے کشیا! اپنی جگہ پر اس کی باتیں سن کر اسے کوؤں کا دماغ بھٹکائے کے بعد ان سے یقیناً پیسے شورٹا ہوگا۔“ گاڑی کا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ

فرائیڈ نے کہا

”دنیا کی 99% عورتیں شادی کی خواہش مند ہوتی ہیں۔“ کسی نے پوچھا۔ ”باقی 1%؟“
”وہ جھوٹ بولتی ہیں۔“ فرائیڈ نے جواب دیا۔

افلاطون نے کہا

”سچائی اور سچ کی عظمت سے انکار کون کر سکتا ہے۔“
”ایک شخص نے ایک شخص سے پوچھا۔ ”تجربہ کیا ہے؟“
”ایک شخص نے جواب دیا۔ ”تجربہ کیا ہے؟“
”افلاطون نے جواب دیا۔ ”تجربہ کیا ہے؟“
”پرہیز اور وہ ہے اپنی تعریف اور ستائش۔ بے شک وہ تمام خوبیاں اور اوصاف تم میں موجود ہی کیوں نہ ہوں جن کا اظہار تم کر رہے ہو۔“

مرسلہ: ریاض بٹ، از حسن ابدال

لیکن اس نے اس کی بات کاٹ دی۔

”نہیں وہ مرا ہوتا تو اس کی لاش ہمارے سامنے آجاتی۔ میں دکن کی ایجاد کے ٹی بڑے پر اس خبر کو سچ نہیں مان سکتی۔“ اس کے غصیلے انداز کی وجہ سے سب اس کو مزید کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہو سکی۔

”میں میڈم سے بات کرتی ہوں پھر دیکھیں گے کہ ہمیں اب کیا کرنا ہے۔“ سب اس کی خاموشی نے اسے اپنے رویے کا احساس دلایا تو ذرا سنبھل کر آرام سے بولی اور تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے اپنے لیے مختص کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

”سچ! سچ!“

”اوسا! سچ!“ ضبط کے باوجود اس کے ہونٹوں سے ایک سسکی نکل گئی جس نے عالم شاہ کو تڑپا کر رکھ دیا۔

”مجھے افسوس ہے میری پیاری بہن کہ تمہیں حالات

کی وجہ سے ایک ایسا فیصلہ کرنا پڑا جس کے لیے تم اپنی طبیعت کو برباد کر رہی ہو۔“

”پاپے کوئی فکارت نہیں۔“ اس نے کہا۔

”اگر تمہارے تحفظ کا مسئلہ نہیں ہوتا تو میں خود بھی اتنا

پر بیٹھتے ہوئے وہ تھوڑی سی مشتعل تھی اور اسی اشتعال کے سبب بلند آواز سے بڑبڑا رہی تھی۔ خراب موڈ کے باعث اس نے گاڑی بھی بہت رش اسٹائل میں چلائی اور نتیجتاً واپسی کا سرنسبٹا کم وقت میں طے کر کے اپنے ٹھکانے پر پہنچی تھی۔

”میڈم آپ کہاں تھیں؟ آپ اپنا سوبال بھی ساتھ نہیں لے گئی تھیں۔ میں آپ سے کالکٹ کرنا چاہ رہا تھا لیکن۔۔۔“

”گاڑی کے ڈرائیور نے تمہیں بتا دیا ہوگا کہ میں کہاں گئی تھی اس لیے اس سوال کو چھوڑنا اور یہ بتاؤ کہ کیا معاملہ ہے؟“

”میں نے اپنے کمرے کے سوال کرنے والے سب کو سنا ہے۔“

”یہ سنا ہے۔“ ایک منہ بولنے والا سب نے کہا۔

”فورا آجی جی بن کر اسے مؤدبانہ بتانے لگا۔ اس نے زبان کا استعمال کرنے کے بجائے محض بھویریں اچکا کر سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔“

”معاذ کی فیملی غائب ہے۔“

”کیا مطلب؟ کیسے؟ مجھے تفصیل سے بتاؤ۔“ وہ خبر سن کر چونک گئی۔

”خاور احمد اور علیہ چھ روز سے ریگورڈاک کے لیے جا رہے تھے۔ آخری بار وہ دونوں گئے تو واپس نہیں آئے۔“

”انویسٹی گیشن کرنے پر معلوم ہوا کہ انہیں ایک گاڑی میں بیٹھ کر جاتے دیکھا گیا ہے لیکن گاڑی کا نمبر وغیرہ نہیں پتا چل سکا۔ پارک کا سامنے والا سی سی ٹی وی کیمرہ بھی کئی دنوں سے خراب پڑا ہے اس لیے اس سے بھی کوئی مدد نہیں ملی۔“

”اور سعد؟“ اس نے بے تابی سے پوچھا۔

”وہ اسپتال سے اپنی یونیورسٹی کے لیے نکلا لیکن وہاں پہنچا نہیں۔“ سب اس کی وی اطلاع نے اسے سر پکڑنے پر مجبور کر دیا۔

”کون۔۔۔ معنوم کرو کہ وہ کون ہے جو ہمارے معاملے

آ کر معاذ اور اس کی فیملی کی ہیلپ کر رہا ہے؟“ وہ چیخ پڑی۔

”ہو سکتا ہے یہ کوئی اور چکر ہو۔“ سب اس نے خیال آرائی کی۔

”نہیں۔ کوئی اور چکر نہیں ہے۔ تم ٹائٹف پر غور کرو۔“

”اوہ! ہمارے ہاتھوں۔۔۔ اور اور اس کی فیملی

نکال دی ہے اور ہمارے۔۔۔ مطلب کوئی ہے جو اس

سب کے لیے ہے اور ہمیں اسے تلاش کرنا ہوگا۔“ اس نے

”معاذ کو تو شاید مردہ۔۔۔“ سب اس نے کچھ کہنا چاہا

میں منزل تک پہنچا ہے۔" زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ اسے بہت غلٹ میں لیتا پڑا تھا اور فی الحال اس تبدیلی سے متعلق وہ کچھ بھی کہنے سے قاصر تھی اس لیے بات کو صرف عالم شاہ کی ذات تک محدود رکھا۔

"اللہ حافظ۔" عالم شاہ نے مزید کچھ کہے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا اور اپنے مقابل آہٹنے والے پانڈے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"تمہیں کیسے پتا ہو کر بات کرنا چاہیے تھی۔ کال ٹریس

ہو گئی تو یہی تیرا ہی سہا ہے۔" پانڈے جیسے اپنی ہجواری کے اظہار کے لیے غور بند کرنے کا ہی حکم بیٹھا تھا۔ "آپ کی تو سب کچھ کال کھولنے سے پہلے

میرے بات کر رہا ہے۔" پانڈے کی طرف سے اس کا استہزاء نہیں ہے۔" اس نے اپنی صفائی پیش کی۔

"مصاب یہ تھا کہ جس نمبر پر بات کر دانی جاری ہے، اس کے اندر آہر و شین ہونے کا ڈر نہیں ہے لیکن جزی تو کاڑچیک ہوتی ہی ہیں نا۔ تم اپنی بات میں جیسے بار بار پاکستان کا نام لے رہے تھے وہ بڑا خطرہ کہ تھا۔" پانڈے کے الفاظ نے اسے شرمندہ کر دیا اور معذرت خواہانہ لہجہ میں بولا۔

"سوری! جذبات میں، میں اس بات پر دھیان نہیں دے سکا۔"

"تمہاری عمر کے لوٹاؤں کا یہی پر اہم ہوتا ہے۔ خود کوششوں میں رکھتے تو اس لوہے میں پڑتے ہی کیوں؟" پانڈے نے اسے مزید شرمندہ کیا۔ اس کا جی چاہا کہ اسے جنائے کہ وہ اس مسئلے میں اپنی جذباتیت نہیں بلکہ اس کے ہم قوموں کی ذلت اور سازشوں کے نتیجے میں چھڑے ہیں پھر ضبط کر لیتا ہی منسوب سمجھا کہ ایک تو شکلیں کا دوست ہونے کے ناتے وہ پانڈے کا احترام کرنے پر مجبور تھا دوسرے ایک ایسا شخص جو اس کا اہم ترین مسئلہ حل کرنے جا رہا تھا، اسے ناراض کرنا کی عورت منسوب نہیں تھا۔

"وہ تمہارا سا مگی کہاں ہے؟" اس کی خاموشی نے پانڈے کو بھی موضوع کو مزید طویل نہیں دینے دیا اور وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سرحد کی غیر موجودگی کے بارے میں

بڑا فیصلہ انکی جنگی بنیادوں پر کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا لیکن تمہارے اور بچے کی زندگی کے تحفظ کے لیے ایسا کرنا ناگزیر تھا۔" وہ جیسے اس کے سامنے صفائی پیش کر رہا تھا۔

"میں جانتی ہوں ادا! بابا سائیں نے بھی اس فیصلے کو وقت کی ضرورت قرار دیا تھا اسی لیے میں نے نکاح نا سے پر دستخط کر دیے لیکن مجھے دکھ ہے کہ اس موقع پر آپ اور بابا سائیں میرے سر پر ہاتھ رکھنے کے لیے موجود نہیں تھے۔" وہ ایک بار پھر اپنی ادا اسی کو چھپانے میں نا کام رہی۔

"بات کرتے ہو مگی! نہیں شکلیں بھائی نے جان دیا کہ نکاح کے وقت کے بارے میں نہیں بتایا۔" پانڈے نے اس کے سامنے اس کے لیے جمع کرنے کے لیے باوجود وہاں پہنچ جانے کا

"انہوں نے بالکل ٹھیک کیا۔ یہاں پولیس والے کتوں کی طرح آپ کی بوسہ جھٹکتے پھر رہے ہیں۔ سنا ہے آج صبح بھی وہ مردود اسپتروشا یہاں آیا تھا۔" اس نے شکلیں کے عمل کی حمایت کرنے کے ساتھ ساتھ حالات کی بھی خبر دی۔ "تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ شکلیں بھائی خود اس سے نمٹیں گے۔" عالم شاہ نے تسلی دی۔

"جی ہاں، شکلیں بھائی نے بھی یہی کہا ہے اور بابا سائیں نے بھی تسلی دی ہے کہ وہ سفارت خانے کے ذریعے بھی اس معاملے کو بینڈنی کریں گے۔ شکلیں بھائی کے اقدامات نے میری قانونی پوزیشن کافی بہتر کر دی ہے لیکن میں آپ کے لیے پریشان ہوں۔ جب تک آپ بحفاظت پاکستان نہیں پہنچ جاتے، مجھے سکون نہیں ملے گا۔" اس کے لہجے سے فکر مندی جھٹک رہی تھی۔

"بے فکر ہو۔ ہم آج ہی روانہ ہوں گے۔" دو چار دن میں ان شاء اللہ میں پاکستان سے تمہیں کال کروں گا۔" اس نے کھنکھسیاتے ہوئے فحاشی تو اندر آتے پانڈے کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر چونک گیا۔ وہاں واضح ناگواری درج تھی۔

"اچھا اب اجازت دو۔ موقع ملے ہی میں تمہیں پھر کال کروں گا۔ تم میرے لیے فکر مند مت ہونا اور اپنی نئی زندگی پر فوکس کرنا۔ فیصل اچھا لڑکا ہے اور مجھے امید ہے کہ وہ تمہیں غم نہ دے گا۔" وہ بھائی کی باتوں سے محبت سے بھری زندگی میں آ جانے والی اس اچانک تبدیلی کے لیے اندھا تھا اس لیے نصیحت کے ساتھ ساتھ اسے اچھی امید بھی دنا رہا تھا۔

"اللہ حافظ ادا! اللہ سائیں آپ لوگوں کو اپنی امان

کر لیتا چاہیے تھا۔ پانڈے صاحب بتا چکے ہیں کہ سفر آرام وہ نہیں ہوگا۔ اس کی کارکردگی جان کر عالم شاہ نے غلگی کا اظہار کیا۔

”وہ خانساں وال، بھڑی اور پنیر کے علاوہ کچھ پکاتا ہی نہیں اس لیے میں نے پھلی منگوا کر خود روست کی ہے۔ طاقت اور زخم کے بھرنے کے لیے آپ کو ایسی غذا کی ضرورت ہے۔“ اس نے سادگی سے وضاحت دی۔

”تم تو اللہ کی طرف سے اتارا ہوا انعام ہو سرمد!“ اس نے خوشی سے کہا۔

”میں تو صرف سنا فرض ادا کرتا ہوں سائیں۔“ عریف پر خوش ہونے کے بجائے وہ جیسٹ کیا۔

”فرض ادا کر کے ہی دیکھیں جو برائی تو نہیں ہوتی۔“ اس دنیا میں کتنے ہی ایسے ہیں جو عبادات سے لے کر معاملات تک فرض کا فرض گردلوں پر لیے قبر میں اتر جاتے ہیں لیکن انہیں اپنی کوتاہی کا احساس نہیں ہوتا۔ وہ جو بھی ایک کلندرا سا لڑکا ہوا کرتا تھا، حالات کے بچہ و خم سے گزر کر گہری باتیں کرنا سیکھ گیا تھا۔

”ریڈی ہو تم لوگ؟ بس تھوڑی دیر میں نکلنے کا ہے۔“ تھوڑا سستا اور آپس میں بات چیت کرنے میں وقت سرکتے سرکتے آخر آگے بڑھ ہی گیا اور پانڈے نے کمرے میں جھانک کر پوچھا۔

”بالکل ریڈی ہیں۔“ سرمد نے ان دو چھوٹے بیٹوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا جس میں اس کا اور عالم شاہ کا سامان موجود تھا۔

”یہاں سے میں تمہیں اپنی گاڑی میں ایک گودام تک لے جاؤں گا۔ وہاں سے تم لوگ ہریانہ جانے والے ایک لوڈنگ ٹرک میں سوار ہو گے۔ ہریانہ سے آگے ایک تیسری پارٹی تمہارے سفر کا اربنمنٹ کرے گی اور وہی تمہارے سفر کا سب سے نازک مرحلہ ہوگا۔ خیر، تکمیل ڈیڑے منہ مانگے دام دینے کی آفر کی ہے اس لیے پارٹی پوری کوشش کرے گی کہ تم لوگوں کو سیٹھی تمہاری منزل پر ڈیلیور کر دے۔“ وہ ایسے الفاظ استعمال کر رہا تھا جیسے انسانوں کے بجائے کسی تجارتی مال کی ڈیلیوری کی بات کر رہا ہو۔ ان کے پاس اس کی باتوں کے جواب میں کچھ نہیں لے سکتے تھے۔

”کچھ دیر بعد وہ لوگ اس کے ساتھ اس کی گاڑی میں سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔ گاڑی کے دھن دھن کے پارس شہر کے مناظر پھیلے ہوئے تھے جہاں قدم رکھتے ہی انہیں

”آگیا ہوں سائیں! بس ذرا خانساں کے ساتھ مصروف ہو گیا تھا۔“ ذکر چھینرتے ہی سرمد وہاں آن پکا۔

”خانساں سے یاد آیا۔ وہ اپنے گل خان کا کیا حال ہے؟ اس کی کوئی خبر ہی نہیں ملی۔“ اس نے پانڈے سے پوچھا۔

”کوئی گل بھی لیکن بچ گیا ہے۔“ پانڈے نے مختصر جواب دیا اور موضوع بدلتے ہوئے بولا۔

”میں تمہیں یہ بتانے آیا تھا کہ آج رات تم لوگوں کو یہاں سے اٹھنا ہے۔ چھپ چھپ کر جانا ہے اس لیے تھوڑی

تکلیف کا کوئی مسئلہ نہیں۔ ہم برہماتہ کر لیں گے۔“ اس نے پانڈے کو پھیلے

”بھائی بھائی! پانڈے نے کہا اس سے جواب سے مطمئن ہو کر جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

”تھکیل بھائی سے کوئی بات ہوئی ہے آپ کی؟“ جانے سے پہلے کیا وہ ہم سے منے آئیں گے؟“ اس نے ذرا اضطراب سے پوچھا۔ تھکیل سے ملاقات ہو جاتی تو وہ تھکیل کے سلسلے میں ان سے تھوڑی بات کر لیتا۔ ٹاڈی بہن کو دیار غیر میں چھوڑ کر جاتے ہوئے اس کا دل بے چین سا تھا اور خود کو درپیش سفر کی مشکلات سے زیادہ تھکیل کی فکر تھی۔

”نہیں۔ اسے میں نے منع کر دیا ہے۔ تم لوگوں کے ہوتے اب وہ یہاں کا رخ نہ ہی کرے تو ٹھیک ہے ورنہ پولیس کا دھیان ادھر ہو گیا تو مشکل ہو جائے گی۔“ پانڈے نے جواب دے کر وہاں سے چلا گیا۔

”لائیں سائیں میں آپ کے زخم کی ڈریسنگ کر دوں۔“ اب تک احراما خاموش رہنے والے سرمد نے پانڈے کے جاتے ہی اسے مخاطب کیا۔

”ہوں۔“ ہنکارا بھرتے ہوئے وہ خاموشی سے سرمد کے ساتھ تعاون کرنے لگا۔ ”زخم تقریباً بھر گیا ہے۔ کوئی بے احتیاطی نہیں ہوئی تو دو چار دن میں بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔“ مٹی تھکول کر زخم کی صفائی کرتے ہوئے سرمد نے تبصرہ کیا۔ حالات غیر یقینی تھے لیکن اس کی وفاداری اور جان فدا کی دیکھ کر کسی کی بھی۔ اپنی ذات سے بے پرواہ ہر آن جس کی قبر میں جتا رہا تھا۔ اس کی عزت توجہ سے اٹلا کام تھا۔

”یہ سب کرنے کے بجائے تمہیں بھی کچھ دیر آرام

مصائب نے گھیر لیا تھا۔
 "اجالا جانے کیسی ہوگی اور سنیل کے مرنے کا سن کر
 اس پر کیا گزری ہوگی؟" عالم شاہ کو جانے کیوں وہ بے مہر
 حسد یاد آئی جس کی وجہ سے وہ حالات کے اس گرداب میں
 پھنس کر رہ گئے تھے۔

"سیاہ رنگ اس پر ستا چکا ہے اور بال۔ وہ تو بالکل
 اسی کی طرح بے قابو اور نٹ کھٹ ہیں۔" فیصل کی مہندی
 والے روز کا اس کا بتا سنورا روپ یاد آیا۔ شوئڈر کسٹ بال
 کوشش کی اور جہاں پر کی طرف جڑ لے میں گھر نہیں ہو سکے
 تھے اور شادی فیصل آزاد ہو کر اس کے رخساروں اور پتلی
 گردن کے ہاتھ لگایاں کر رہا تھا۔
 "اوبھوں" نہ سوچو اس ظالم کے حقوق جس سے

دل میں تمہارے لیے نفرت اور حقارت کے سوا کچھ نہیں
 ہے۔" اس نے اس کے خیال سے ہونٹوں پر بھرنے والی
 سٹراپٹ کو لب بھینچ کر روکا اور دھوکہ دیکھنے لگا۔

پندرہ بیس منٹ میں ہی وہ سفر طے کر کے گودام تک
 پہنچ گئے۔ پانڈے گاڑی کو اندر تک لے گیا اور گودام کا
 دروازہ بند کر دیا گیا۔

"سب ریڈی ہے؟" پانڈے نے گاڑی سے نکل کر
 اس بھتہ سے اور سالوے آدی سے پوچھا جو ان کی آمد کے
 ساتھ ہی ٹرک کے پاس سے ہٹ کر دوڑا آیا تھا۔

"بس پاس۔ سب ایک دم پرفیکٹ ریڈی ہے۔"
 اس نے زور و شور سے ہاتھ اور سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔
 "گڈ!" پانڈے نے اسے سراہا اور ان دونوں کی

طرف رخ کر کے بولا۔
 "یہ چنگی ہے۔ یہ اس ٹرک کا ڈرائیور ہے جس میں تم
 لوگ ہر یا نہ تک جاؤ گے۔"

"آجاؤ صاحب! آپ لوگوں کے واسطے ایک دم
 جھکاس جگہ ریڈی کر دی ہے۔ زیادہ پریشانی نہیں ہوگا۔"
 تعارف کے جواب میں انہیں اپنی طرف متوجہ ہونا دیکھ کر
 چنگی نے خوش اخلاقی کے مظاہرے کے طور پر اپنے پہلے
 دانتوں کی نمائش کی۔

"اس کے بائیں سٹارڈا ساتھ تک نہیں تھا۔"
 پانڈے نے فیصل کے لیے اپنی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ
 اس کے بائیں باری ہاتھ ملا کر چنگی کے پیچھے ٹرک کی طرف

ٹرک میں بیچے سے لے کر اوپر تک متھے کے کارشن
 بھرے ہوئے تھے۔ ان کارشنز میں کیا تھا؟ انہیں اس کا طر

نہیں تھا اور نہ ہی فی الحال اس طرف توجہ دینے کی فرصت
 تھی۔ وہ اپنے سفری بیگ سنبھالے خاموشی سے کارشنز کے
 درمیان چھوڑے گئے خلا سے گزر کر ٹرک کے اندرونی حصے
 میں داخل ہو گئے۔ اندر اتنی جگہ چھوڑی گئی تھی کہ دو آدمی
 آرام سے ناچیں پھیلا کر بیٹھ سکتے تھے۔ بیٹھنے کی جگہ پر ایک
 پلاسٹک کارپٹ کا ٹمرا ڈال دیا گیا تھا۔

"ادھر تھوڑی سی گھنٹن ہوئی پر ایسی بھی نہیں کہ بندے
 کے پران ہی پہلے جائیں۔" چنگی نے انہیں وہاں شفٹ
 کر کے ہونٹوں پر مسکراتے ہوئے ایک بار پھر اپنے دانتوں

کی نمائش کی۔
 "کوئی مسئلہ نہیں، برداشت کر لیں گے۔" عالم
 شاہ نے اسے جواب دے کر گودام کے بڑے کارپٹ پر

بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ اس کے اس اقدام کے بعد
 قدرے تشویش میں جھاسرہ کے لیے بھی پیچھے رہنا ممکن نہیں
 تھا۔ اس نے ایک کونے میں ایک کے اوپر ایک دونوں بیگ
 رکھے اور خود بھی سکر کر بیٹھ گیا۔

"باقی مال بھی لوڈ کر دوائے۔" چنگی نے ہانک لگا کر
 کسی کو حکم دیا۔ تھوڑی دیر میں درمیانی خلا متھے کے کارشنوں
 سے پُر کیا جا چکا تھا اور اب وہ اپنی مرضی سے وہاں سے نہیں
 نکل سکتے تھے۔

"ہمارے پاس کوئی ہتھیار اور راجیلے کا ذریعہ ہونا
 چاہیے تھا۔ کوئی مشکل آپڑی تو اس قبر جیسی جگہ پر ہم کیا کریں
 گے؟" کارشن رکھے جانے کے بعد وہاں اندھیرا سا ہو گیا
 تھا۔ اس اندھیرے میں عالم شاہ کے ہیولے کو دیکھتے ہوئے
 سرمد نے تبصرہ کیا۔

"پہلے دھیان ہی نہیں آیا۔ اب تو جو ہے سو ہے۔"
 عالم شاہ نے شانے اچکا کر بے نیازی کا مظاہرہ کیا لیکن سرمد
 کی بات اس کے دل کو گئی تھی۔ وہاں تو ان کے لیے روشنی اور
 پینے کے پانی تک کا بندوبست بھی نہیں تھا۔ بہر حال اسی عالم
 میں سفر کا آغاز ہو گیا۔ گھنٹن زدہ فضا میں طے ہونے والا وہ
 سفر خدشات سے پُر تھا۔ شاید دو ڈھائی گھنٹے گزرے ہوں
 کے کر ٹرک ایک جھکے سے رکا۔

"کیا ہوا ہے؟" سوالیہ نونوں میں تھا لیکن جواب
 دینے والا کوئی نہیں تھا۔

عالم و جبر کہیں سامنے سے ایک سیر ہو گیا
 کسی داستان جو کھلا کاروں کی ہے
 غضب ناک تھا باقی واقعات اپنا ماہ پڑھیں

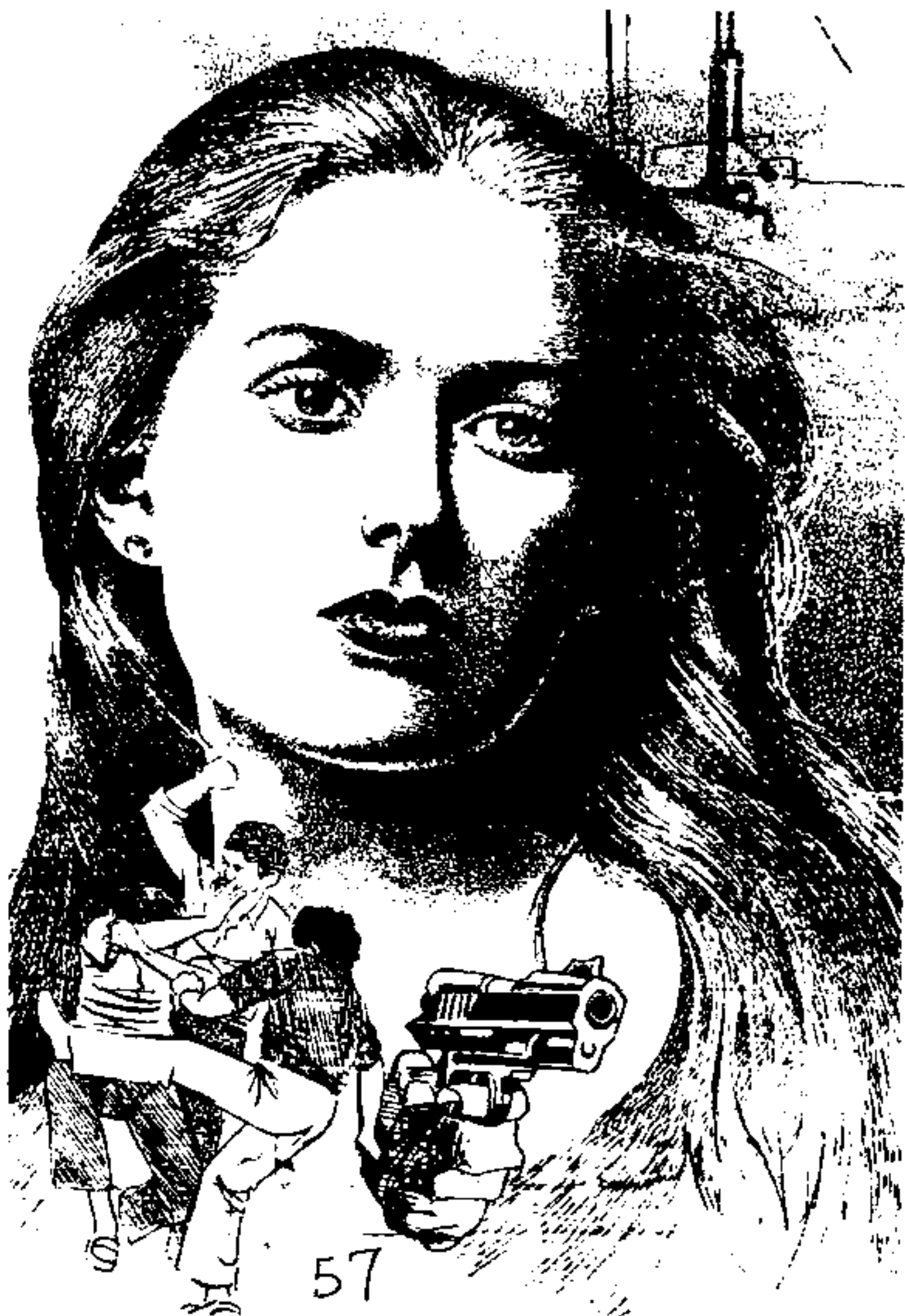


قسط: 19

سپاہِ رسول شاہدِ وفا

زمین کی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تند و تیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابل شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پُر عزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جا رہے تھے... اس کی زندگی جو العیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... یہ خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفانِ کار و پد ہمار گیا جس میں شعلوں کی لہک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قرار یوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چہرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تار عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ پروار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ میں لڑتا رہا کہ وارِ دہشتِ قلب بھی اس کے فریضہ کی راہ میں حائل نہ ہو سکتی...

اسپاہِ رسولوں پر قہر میں کرنا دل جوئے والے ایک سراپا انتقام جو جس کی تحریر انگیزہ داستان



سجاد ایک دلچسپ لیکن متلون مزاج لڑکا جو نور علی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک سالہ وہاں کیا ہوا ہے۔ سجاد کے والد سرکاری افسر ہیں اور ابھی مددے پر فائز ہیں۔ ایک شام سجاد انٹرنیٹ ٹیوٹ سے واپس آ رہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو ملوک پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی جو نور علی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی بڑی نظر سے سجاد کو دیکھتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ وہ لڑکی کو اغوا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بشری ماس کمیونیٹی گھنٹن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم و غیرہ لکھتی ہے۔ اس دیر ان جگہ بھی وہ ایک نر پر تعمیر رہا کئی منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی آئی تھی۔ سجاد بشری کو پہچانتا ہے اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کر دیتا ہے لیکن جن رئیس زادوں سے اس نے ان کا شکریہ ادا کیا تھا وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ یہ موقع انہیں جو نور علی ٹرپ کی صورت میں مل جاتا ہے اور ایک جنگل کی سیر کے دوران وہ نوکرانی کے شوق میں سب سے الگ تھلک ہو جانے والے سجاد کو بے خبری میں گھیر کر بری طرح زد و کوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دے دیتے ہیں۔ سجاد کے واپس نہ آنے پر انتقامیہ کے اطوار پھیلنے لگے اور پولیس اور ریسکوریس کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر سجاد کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جگہ کی چھوٹی سی گلی میں پاتا ہے۔ اپنی حالت سے اسے اپنے شدید زخمی ہونے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ جوگی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ سجاد کا سوناگل جنگل میں ہی کہیں گر جاتا ہے اور جوگی کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا جس سے وہاں کی دنیا سے رابطہ کیا جاسکے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے۔ جوگی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نواز کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ سجاد سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے پراسرار علم سکھانے کی باقی بھر لیتا ہے اور سجاد واقعی اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ادھر جانے دوڑ سے ملنے والے سجاد کے گھر سے جب تصویریں نکلائی جاتی ہیں تو بہت سے قدرتی مناظر کی تصویریں اس سے ایک ایسی تصویر بشری کی منظر میں آ جاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ ہمارا دکھائی دے رہا ہے۔ وہ کانی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے بعد جیکٹ کے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشری تحقیق کر رہی تھی۔ بشری کے اپنے والد بزرگوار ہیں اور حق کوئی ان کے خون میں شامل ہے۔ اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشری کو کانی تھانہ اٹھاتا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ مددے سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باؤل نامی فٹرز کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشری انتظام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دنوں میں ہی سجاد واپس کا مارا دھکاتا ہے تاہم دوسرے لڑکوں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ لڑکوں سے بچان کر اس کا سوا حریفان اٹھتا ہے والی سے کہتا چاہتے ہیں۔ سجاد کو واپس لائے کی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باؤل اچانک بشری کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر دیتا ہے۔ ادھر سجاد کو واپس لائے کے لیے ابھی جھکندے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اسے واپس آنے کا پیغام دیا جاتا ہے۔ سجاد دشمنوں کے پاس خود حاضر ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ کئی دوسری پارٹی سے اس کا سوا کر کے اسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ لید میں سجاد سے معلومات لی جاتی ہیں، نہ بتاتے یہ اس کے بھائی کا ایک گروہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً سجاد کو سب بتا دیتا ہے۔ ادھر بشری بھی انتظام کی آگ میں جلتی جلتی سوجھا خٹن سے مل جاتی ہے اور اس کی نرسنگ شروع ہو جاتی ہے۔ سجاد کو بچانے والا لڑکا وہی ہے جو کہ سجاد ایک پارٹی میں جاتا ہے۔ وہاں اسے سجاد کے حوالے سے ملوک ایک شخص نظر آتا ہے۔ وہ وہیں کے پیچھے جاتا ہے مگر اسے پھیر لیا جاتا ہے۔ بہر حال دقاس کو تنبیہ کے ساتھ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ادھر سجاد کے دوست عالم شاہ کے بہنوئی کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ سجاد کی خون میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے چنانچہ کر کے اس کے دماغ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ شخص سے حاصل انوکھے علم کی بدولت ان کا معمول نہیں بنتا۔ بشری کامران کو چھاپنے کا پروگرام بناتی ہے۔ ادھر عالم شاہ مران لگا لیتا ہے کہ اس کے بہنوئی کا قتل کس نے کیا۔ وہ قاتل کو گھیرتا ہے اور اسے تین ماہے گولیاں مار کر قتل کر دیتا ہے۔ تاہم وہ بھی جاتا ہے۔ عالم شاہ اس کے بعد لڑکوں کے سردار چاچ کو چھاپتا ہے اور اسے کھنکھار کر مار کر ہٹا دیتا ہے۔ اس کے پیچھے پولیس لگ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور اس کا گروہ سر پہ پلا لڑکے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ ادھر سجاد جاسوس باجر کو چھاپتا ہے اور اسے قتل کر دیتا ہے۔ لڑکوں پر حملہ کر دیتا ہے۔ سجاد کی ہڈیوں سے باجر مارا جاتا ہے اور باجر ام سجاد پر نہیں آتا مگر سجاد سے کام لینے والوں کو اس پر حملہ کرتا ہے۔ عالم کی بہن گل شاہ کو قتل کر دیتا ہے اور اغوا کر لیا جاتا ہے اور اغوا کا لڑکا اعلیٰ سحر دہ آتا ہے۔ عالم شاہ وہاں موجود ایک مذہبی شخص کی مدد سے باؤل کی قید سے چھٹکارا پاتا ہے۔ آخر بشری واقعی بھی

جاتی ہے۔ وہاں دھام دھام سے بارہا کے دروپ میں بچپان لیتا ہے اور ان دونوں کے درمیان اتحاد کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ وہ سلطان کو مارا جاتی ہے تاہم دھام دھام سے ایسا کرنے سے مدد کرتا ہے۔ ادھر عالم شاہ، باذل کی قید سے نکل کر اس کا چچا کرتا ہے تاہم وہاں اچانک قاتلنگ اور دھماکے ہونے لگتے ہیں۔ وہ وہاں سہاؤ کو دیکھتا ہے۔ صداقت شاہ، لطیف سومرو کو گھبرانے کے لیے اس کی غصہ بھری اور بچے کا کھوج لگاتے ہیں اور بچے کو اغوا کر لیتے ہیں۔ لطیف سومرو مجبور ہو جاتا ہے۔ سہاؤ کو اس کے گھر والوں سے ملنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ عالم شاہ کو اس کے والد اغوا یا روانگی کا عندیہ دیتے ہیں۔ ادھر سہاؤ بھی ایک مشن پر سونا کے ساتھ اغوا یا روانہ ہوتا ہے تاہم کچھ لوگ شک یا تریوں سے بھری ہیں کہ یہ اغوا یا روانگی کا عندیہ دیتے ہیں۔ سہاؤ اور سونیا بھائی کے ساتھ ہزاروں گھوڑوں کے ساتھ ہزاروں گھوڑوں سے مقابلہ ہوتا ہے اور سہاؤ زخمی ہو جاتا ہے۔ صداقت شاہ کے دھڑپا میں موجود ہونے دار کے ہاں شادی ہوتی ہے۔ عالم شاہ، نکل اور سرور اغوا یا روانہ ہو جاتے ہیں۔ سہاؤ رچرٹ سے گھر روانگی پر رات میں کچھ ٹیرے اٹھ کر لوٹ لیتے ہیں۔ عالم شاہ ایکشن میں آتا ہے تاہم اجالا نامی عالم شاہ کی کزن اس کا راستہ روک لیتی ہے۔ گھر پہنچنے پر پولیس بھی ریہ ہوتی ہے اور وہ عالم شاہ اور سرور کو لے جاتے ہیں۔ ادھر بشری اور دھام باذل کو اسپتال میں مارنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ بچ جاتا ہے۔ سہاؤ اور سونیا بھائی کی تلاش میں ہوتے ہیں اور بالآخر اپنے سمیت کاروں سے مل جاتے ہیں۔ عالم شاہ اور سرور کو تھکد کا نشانہ بنا کر دیمانے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ واپس اپنے میزبانوں کے ہاں پہنچ جاتے ہیں۔ شادی کے دوران انہیں پتا لگتا ہے کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں اجالا اور اس کا عاشق شامل ہونے لگا۔ وہ چھپ کر ان کی باتیں سن رہا ہوتا ہے کہ اسے چھاپ لیا جاتا ہے۔ تاہم وہاں مارا ماری ہوتی ہے اور اجالا کا عاشق مارا جاتا ہے۔ پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ ان کے کزن انہیں اپنے دوسرے غصہ بھگنے پر پہنچا دیتے ہیں جہاں کچھ لوگ ان پر حملہ کر دیتے ہیں۔ وہ وہاں سے بھاگتے نکل جاتے ہیں۔ ادھر سہاؤ کو سونیا بھائی کے ساتھ نئے مشن پر لے کر جاتی ہے جس میں ایک ریلوے لائن کو دھماکے سے اڑا دیا ہے۔ سہاؤ ایسا نہیں چاہتا اس لیے وہ ٹرین کی آمد سے قبل بارودی دھماکا کر دیتا ہے۔ دھڑپا ہو جاتا ہے اور اسے ہندوستان بھائی کھینا میں لے جاتا ہے جہاں اس کی ابھی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ سونیا کے آدمی سہاؤ کو تلاش کرتے ہیں مگر ناکام ہو جاتے ہیں۔ ادھر عالم شاہ اور سرور غصہ زور سے بارود پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس ٹرک میں وہ بوجھ ہوئے ہیں وہ اچانک بھگنے سے رک جاتا ہے اور کھٹکھٹا ہے۔ یہ سوال ان دونوں کے ذہنوں میں آتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

میں معمولی تبدیلیاں کی گئی تھیں لیکن وہ تبدیلیاں ایسی نہیں تھیں کہ اس کی شخصیت کو مکمل طور پر تبدیل کر دیں اس لیے سلطان بھی اسے دیکھ کر کھٹکھٹا گیا تھا۔
”مجھے بھی آپ کے متعلق ایسا ہی ملل ہو رہا ہے۔“
بشری نے اسے ٹالنے کے بجائے اس کے خیال کی تصدیق کی پھر اس کی طرف بنور دیکھتے ہوئے قدرے جوش سے بولی۔
”ارے آپ وہی ہیں؟ جو دہائی کے ایک شاہنشاہ مال میں اپنے دوست کے ساتھ ملے تھے۔ آپ کا دوست مجھے مللی نامی واقعہ کچھ کچھ سے طالب تھا۔“
”بالکل، میں وہی ہوں اور تم مریم عرف میری ہونا؟ خاص مینجنگ لگ رہی ہو۔“ دہائی کے حوالے نے سلطان کی ابھن دور کر دی۔

”ہاں، ایک فیشن میگزین کے لیے فوٹو شوٹ کر دانا تھا پھر انہیں میرے چہرے میں کچھ چیزیں پسند نہیں آ رہی تھیں تو ان کی زینا بھائی نے مجھے مللی نامی سنی تبدیلیاں کروائیں۔“
اس نے شاہے بھگتے ہوئے بے نیازی سے بتایا۔
”زبردست۔ یعنی ہی وقت میں ایک فیشن ماڈل

”لفٹ چلیز!“ وہ یونیورسٹی کے سلور جوبلی گیٹ کی طرف جانے والے راستے پر کھڑی ہوئی تھی۔ جیسے ہی اسے اپنی مطلوبہ گاڑی نظر آئی اس نے اسے لفٹ کا اشارہ دے کر روک لیا۔ حسب توقع گاڑی کا ڈرائیور ایک امارت لڑکی کے اشارے پر روک گیا۔

”مجھے بس اگلی چورنگی تک لفٹ چاہیے۔ اس لیے ہے آپ کو زحمت نہیں ہوگی۔“ وہ خوش تھی کہ اس کا مطلوبہ شخص گاڑی میں اکیلا ہے ورنہ عام طور پر وہ کسی نہ کسی دوست کو اپنے ساتھ لے کر چلتے کھادی تھا۔

”زحمت کبھی؟ حسیناؤں کی خدمت تو میں راحت ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے اگلی نشست کے ساتھ والا دروازہ کھول دیا۔

”تھیک پوسج۔“ کچھ ٹپلی میری گاڑی خراب تھی اس لیے میں پبلک ٹرانسپورٹ سے آئی ہوں۔“ وہ خوشگوار لہجے میں بولتے ہوئے بے غصگی سے اس کے پرانے چہرے کی طرف دیکھتی تھی۔
”مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ ہم پہلے کبھی آپس میں مل چکے ہیں۔“ دہائی سے پاکستان واپس آ کر اس کے چہرے

کے ساتھ ہوں۔" سلطان کا موڈ ایک خوبصورت لڑکی کی سنگت کے باعث بہت خوشگوار ہو چکا تھا اور وہ اس ساتھ کو طول دینے کے لیے گاڑی بہت آہستہ رفتار میں چلا رہا تھا۔

"ابھی بس اسٹارٹ ہی کیا ہے۔ دعویٰ بھی کام کے چکر میں ہی گئی تھی۔ وہاں سے سننے پر وینکٹ کے لیے جلدی میں کینیڈا واپس جانا چاہیے تم لوگوں سے دوبارہ ملاقات کا موقع ہی نہیں مل سکا۔" چہرے پر آئی بالوں کی ایک لٹ کو کان کے پیچھے ڈھپتے ہوئے اس نے سلطان کو جواب دیا۔

"مجھے بھی ڈیڑھ نے پاکستان کال کر لیا تھا اس لیے مجھے بھی دوبارہ تمہارے ہوٹل کا چکر لگانے کا موقع نہیں ملا۔" اسے ہوٹل میں ہونے والی ملاقات کی جزئیات تو یاد نہیں تھیں لیکن کچھ اپنی یادداشت اور کچھ دیکھی فراہم کردہ معلومات کے سہارے یہ علم تھا کہ وہ وہاں ضرورت سے زیادہ پینے کے نیچے میں ہالنگن ہو گیا تھا اور دیکھی کو ہوٹل کے عملے کی مدد سے اسے واپس لانا پڑا تھا اس لیے کھسیا ہٹ کی وجہ سے اس ذکر کو زیادہ طول نہیں دیا اور بات کو بدلتے ہوئے بولا۔

"تم پاکستان میں کیا کر رہی ہو؟ کیا کسی سے ملنے آئی ہوئی ہو؟"

"ملنے ملانے کے لیے کسی کے پاس اتنی دور آنے کی فرصت ہے۔ میں تو کسی اور چکر میں آئی ہوں۔" اس نے لوت سے ناک سکیڑتے ہوئے جواب دیا۔

"یہاں شو بزنس سے متعلق تو کسی کام سے نہیں آسکتیں پھر کیا چکر۔" سلطان جھپٹا ہوا۔

"بس کچھ پراپرٹی کا معاملہ ہے۔ ڈیڈ کی کچھ زمین ہے یہاں جس کی ویلیو ساڑھے بہت بڑھ گئی ہے۔ ڈیڈ بڑی ختمے تو میں نے کہا میں اسے سب مل کر دیتی ہوں لیکن یہاں آکر پتا چلا کہ اس زمین پر تو کسی نے قبضہ کر لیا ہے۔ ڈیڈ کے ایک کزن یہاں بچہ دہنی میں ٹھہر کر رہتے ہیں اور پارٹ ٹائم اسٹیٹ کا کام کرتے ہیں۔ ڈیڈ کے کہنے پر میں ان سے مشورہ کرنے آئی تھی لیکن ٹائم ہی ڈیڈ ہوا۔" اس نے اپنی بات کے اختتام پر براہ راست بتایا۔

"کیوں، کیا کہا تمہارے ڈیڈ کے ان کزن نے؟"

سلطان نے حسب توقع اس معاملے میں دلچسپی ظاہر کی۔

"انہوں نے کہا کہ قبضہ گراپ بہت طاقتور ہے اس لیے میں ان سے پنگا لینے کے بجائے انہیں چھوڑ دوں اور کینیڈا واپس لوت جاؤں۔" اس نے لہجے میں گلی سوجھتے ہوئے جواب دیا۔

"ارے واہ! یہ کیا بات ہوئی۔ اگر تمہارے پاس پراپرٹی کی ملکیت کے کچے ثبوت ہیں تو تم دعویٰ دائر کر سکتی ہو۔" سلطان نے اسے سخت مشورے سے گوارا دیا۔

"میرے انکل کا خیال ہے اس سے وقت اور پیسے کے دیاں کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ یہاں معاملات قانون کے سہارے نہیں بلکہ طاقت کے سہارے طے ہوتے ہیں اور ظاہر ہے یہاں مجھے سپورٹ کرنے والا کوئی نہیں ہے۔" مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے وہ گاہے بگاہے سلطان کے تاثرات کا جائزہ بھی لے رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ موضوع ایسا ہے جس میں سلطان دلچسپی لیے بغیر وہی نہیں سکتا۔

"میرے ہوتے ہوئے تم یہ نہیں کہہ سکتیں۔" حسب توقع اس نے جیسی میں پھنسا چار اٹھل لیا۔

"کیا مطلب؟ تم اس سلسلے میں کیا کر سکتے ہو؟" بشری نے چہنچہنے کی اداکاری کی۔

"ہم خود اس بزنس میں ہیں اس لیے ایسے معاملات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔" اس نے سینہ پھلا کر دعویٰ کیا۔

"اگر تم میری کوئی مدد کر سکو تو میں تمہاری بہت شکر گزار ہوں گی۔" جواہر اس نے بھی خوشی کا مظاہرہ کیا۔

"ایسا کرتے ہیں لیکن چھوڑ کر تفصیل سے اس معاملے کو دیکھیں گے۔" جواہر نے دیکھوں گا کہ کس طرح تمہاری مدد کی جاسکتی ہے۔" اگلی چورنگی ہالنگن قریب آگئی تھی اس لیے سلطان نے ملاقات کو حریف طویل دینے کا انتظام کیا۔

"اوکے۔" اسے تو اس کی بات ماننا ہی تھی۔

"تم یہاں کرو، مجھے اپنے کسی ایسے بندے سے طواور جو ایسے پھڑے نہٹانا جانتا ہو۔ میں اسے اس کام کے لیے مناسب پے بھی کروں گی۔" ریسپونڈنٹ کی خوشگوار فضا میں بیٹھے اس نے سلطان سے فرمائش کی۔

"میرے لوگ، میرے دوستوں سے کام کی صلاح لینے لگیں تو یہ میرے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہوگا۔ تم تو بس اچھا مسئلہ بناؤ اور سمجھو کہ کام ہو گیا لیکن بہتر ہے کہ پہلے ہم کچھ کھالی لیں۔ کام تو تمہارا ہو ہی جائے گا۔" اس نے فراغ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اچھا خاصا بڑا آرڈر دے دیا۔

"تم بہت چارنگ ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارا فوٹو صحت مند اور جاسوس کام کا ہوگا۔ تمہاری طرف سے... تو وہی ہے بھی کھلی کھرا کام ہوتا ہے۔" سلطان کی انداز خواہش پابندیاں نہیں لگائی جاتیں۔

"اپنی میرانیوں کے بدلے وہ اسے حق سمجھ رہا تھا کہ اس کے خدوخال کو اپنی عریضی لگا ہوں سے

سمجھ رہا تھا کہ اس کے خدوخال کو اپنی عریضی لگا ہوں سے

سمجھ رہا تھا کہ اس کے خدوخال کو اپنی عریضی لگا ہوں سے

سمجھ رہا تھا کہ اس کے خدوخال کو اپنی عریضی لگا ہوں سے

سمجھ رہا تھا کہ اس کے خدوخال کو اپنی عریضی لگا ہوں سے

متول سکے۔

”حسن پر پابندی لگانا قدرت کے ساتھ انصافی ہے۔ جب بنائے والے نے کسی کو اتنی نفاذی سے نوازا ہے تو پھر اس کی تخلیق کو سراہنے کے لیے قدردانوں کے در و بر و پیش تو کیا ہی جانا چاہیے۔“ اس نے جواباً ان ہی خیالات کا اظہار کیا جو سلطان محسن لڑبیت کے بندے کو پسند آسکتے۔

”واہ واہ کیا بات کہی ہے۔ میں تو کہتا ہوں حسن کی تعریف بھی خالق کی عبادت ہے۔ یہ سمجھو لوگ یوں تو خالق کی حمد و ثناء کی نصیحت کرتے ہیں لیکن جب کسی دربار کے حسن کو سراہا جائے تو خواہ مخواہ لٹوے لگانے لگتے ہیں۔“ اپنی بات سے خود ہی لطف اندوز ہوتے ہوئے اس نے ہلکے پین سے قہقہہ لگایا۔ بشری کو بھی اس کے ہم خیال ہونے کا ثبوت دینے کے لیے اس قہقہے میں شامل ہونا پڑا۔ کھانے پینے کا سلسلہ نشتانے تک وہ اسی نوعیت کی گفتگو کرتا رہا۔

”میرے پاس یہاں زیادہ دن رکھنے کی گنجائش نہیں ہے۔ بہتر ہوگا کہ تم فوری طور پر مجھے اپنے اس آدمی سے ملو اور وہ میرا کام نشتانے پر لگ جائے گا تو ہم سکون سے گپ شپ اور ملاقاتیں کرتے رہیں گے۔“ موقع پا کر اس نے ایک بار پھر اپنا دماغ جان کیا۔

”اچھا، مظلوم کرتا ہوں کہ وہ مل بھی سکتا ہے یا نہیں۔ ڈیڑھ کی ناک کا بال ہے اس لیے ذرا زیادہ ہی غزے دکھانا ہے۔“ سلطان کو اس کے اصرار پر ناچار موہاگل لٹال کر اس پر ایک نمبر ڈال کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔

”ہاں یار باذل اتم سے ایک کام ہے۔ میری ایک حسین و جمیل دوست کا مسئلہ ہے۔ آئی ہوپ کہ تم اس کی مدد کرنے میں خوشی محسوس کرو گے۔“ سلطان نے فون پر بات کرتے ہوئے باذل کا نام لیا تو اس کا دل خوشی سے اچھل پڑا۔ توقع کے باوجود وہ سولہ صد پڑھیں نہیں تھی کہ سلطان اس کام کے لیے باذل کا ہی انتخاب کرے گا۔

”ہمیں تو پھر میں اسے تمہاری طرف لے کر آتا ہوں۔“

تم اس کا مسئلہ سن لو اور دیکھ لو کہ اس کی کیا مدد کر سکتے ہو۔“ خوبصورت لڑکی کے ذکر پر باذل نے یقیناً فوری ملاقات کی منظوری دے دی تھی لیکن اس لیے سلطان نے اس سے کہا اور پھر فون بند کر کے اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”لو سمجھو ہو گیا تمہارا کام۔ لیکن بدلے میں تمہیں مجھے اپنا نام دینا ہوگا۔ ہم ذرا سا مل کر کریں گے اور اس کے بعد لاٹک ڈرائیو پر چلیں گے۔“ وہ یہ مطالبہ نہ کرتا تو اسے حیرت ہوتی چنانچہ خود کو پھر سکون رکھتے ہوئے مسکرا کر بولی۔

”اتنی بڑی مدد کے لیے تو تم ہر چیز داخ رو کرتے ہو۔“

ویسے بھی یہاں کون سا میرا کوئی گھر ہے جہاں گھر والے میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ تم جتنا چاہے میرا نام لے لیتا۔“ اس کا جواب سلطان کے لیے بڑا حوصلہ افزا تھا۔ اس کی باجھیں خوشی سے چرچیں اور وہ خوشی سے بولا۔

”چلو تو پھر تمہیں جلدی سے باذل سے ملو دیتا ہوں تاکہ تمہاری بے گینی ختم ہو اور تم سکون سے میرے ساتھ وقت گزرو سکو۔“

”بہت شکریہ ادا فیملہ کیا ہے تم نے۔“ وہ خوش ہو گئی۔

ایک سو سو سی امید تو تھی کہ زمین جا بجا دے کے جھڑے کا سن کر سلطان باذل سے رابطہ کرے گا لیکن اتنی جلدی اس تک رسائی کا نہیں ہو چکا تھا اور اب یہی چیز خوش کرنے کے ساتھ ساتھ تازہ درد بھی گروہی تھی۔ جن حالات میں وہ خان ہاؤس سے نکل تھی، اپنے ساتھ تھپتھپار لانے کا بھی موقع نہیں ملا تھا اور باذل جیسے مفریت کے رویہ بغیر تھپتھپار کے جاتے ہوئے کچھ گہرا ہمت کی ہو رہی تھی۔

”اگر ہاسٹل نہ کرو تو ذرا مجھے ایک چھوٹا سا کمرہ ملے گا“ ڈانڈ کچھ عجیب سا ہو رہا ہے۔“ گاڑی میں سلطان کے ساتھ سفر کرتے ہوئے اسے راستے میں آنے والا پان کا ایک کھوکھا نظر آیا تو ذہن میں آنے والے ایک خیال کے تحت اس نے فرمائش کی۔

”نیو ہاسٹل پارا ابھی لانا ہوں۔“ اس نے گاڑی کھوکھے سے کچھ فاصلے پر روکی اور اپنے تئیں کسی دھوکا دہی سے بچنے کے لیے چابی لٹال کر ساتھ لے گیا۔ وہ اس پر نظر جمائے بیٹھی تھی۔ جیسے ہی وہ کھوکھے پر موجود گاڑیوں میں شامل ہو کر کھوکھے والے کے ساتھ مصروف ہوا، اس نے گلو و کپارمنٹ کھول کر دیکھا اور وہاں پہلے موجود پا کر پھرتی سے اسے اپنے پرس میں منتقل کر لیا۔

”اگر بڑی گاڑیوں کا کنکیشن تو چیک کروا ڈالنا۔ بغیر میوزک کے سفر کرنے میں بوریٹ ہو رہی ہے۔“ سلطان چھوٹے گاڑیوں اور کچھ سپار ہاؤس وغیرہ لے کر واپس آیا تو اس سے یہ چیزیں وصول کرتے ہوئے نئی فرمائش بڑی۔ مقصد بس اسے مسلسل مصروف رکھنا تھا۔

”مجھے بھی انگلش میوزک بہت پسند ہے۔ جب میں ادا کا می ساتھ ہوتے تھے تو تیز آواز میں میوزک سنتے تھے۔“ اس کی فرمائش بھاری ٹھکنے کے لیے مصروف وہ بے ساختگی میں اس طرح کا ذکر چھیڑ بیٹھا۔

”یہ کای کون ہے؟“ بشری نے حجاب پر توجہ

ہوئے پوچھا۔

”اپنا جگری یاد تھا۔ کچھ عرصے پہلے عجیب و غریب بیماری کا شکار ہو کر اچانک ہی مر گیا۔ ڈیڑے نے اس کی موت کا غم غلط کرنے کے لیے ہی تو مجھے دعویٰ بھجوا دیا تھا۔“
کامران سے اس کی دوستی اتنی پرانی تھی کہ اچھا خاصا غور و خوض اور مطلب پرست ہوتے ہوئے بھی وہ اس کی کسی محسوس کرتا تھا۔

”بھگوار کی ملاقات کا بہانہ تھا۔“ اس نے ایک ادا سے کہا۔

”ہاں، یہ تو ہے۔ کالی کی موت تم جیسی حسین لڑکی سے ملنے کا بہانہ بن گئی۔“ اس کی ادا پر فریفتہ ہوتا وہ پل میں دوست کی جدائی کا غم بھول گیا۔

”تم جتنے دن پاکستان میں ہو، بھگوار میری مہمان ہو۔ تمہارا کام باڈل کے ہاتھ میں دے کر ہمیں ہانکل فرسٹ ہو جائے گی۔ میں تمہیں پاکستان کے ناردرن ایریا کی سیر کے لیے لے جاؤں گا۔ ان ایریا کی سیر تمہیں سوئٹزرلینڈ کو بھی بھلا دے گی۔“ ایک حسین رفاقت کی چاہ میں وہ نئے جوش سا منصوبے بنا رہا تھا۔ بشری کی فوجی اس کی باتوں سے زیادہ راستے پر تھی اور راستے سے ہٹا رہے تھے کہ وہ بزدلانی بلڈرز کی تعمیر کردہ اسی ہاؤسنگ سوسائٹی کی طرف گامزن ہیں جہاں سے اس کی زندگی نے سب سے خوفناک موڑ لیا تھا۔

”باڈل بچھلے دونوں اسپتال میں رہا ہے اور اب بھی ریست پر ہے اس لیے ڈیڑے نے اسے الگ تھلک رہنے کے لیے یہاں بھیجا ہوا ہے۔ یہ کالی کے ڈیڑے کا پروجیکٹ ہے لیکن میرے ڈیڑے نے بھی اس میں انویسٹمنٹ کر رکھی ہے۔“
جس وقت سلطان اسے یہ ساری تفصیل سن رہا تھا وہ ہاؤسنگ اسکیم کے سائنٹ آفس کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ بشری کبھی نہیں بھول سکتی تھی کہ اسی سائنٹ آفس میں کالی اور سلطان نے اسے اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی اور ان سے بچ کر بھاگنے کے چکر میں اس کا سناؤ سے گھراؤ ہو گیا تھا۔

”سناؤ..... آہ سناؤ! نہ جانے تم کہاں اور کس حال میں ہو؟“ سناؤ کے خیال سے اس کے دل میں کرب کی ایک لہر اٹھی لیکن بظاہر مسکراتے ہوئے سلطان کی باتوں کی طرف متوجہ رہی۔

”گلتا ہے باڈل کے پاس کوئی گھسٹہ تو یا ہوا ہے۔“ ایک تقریباً مکمل تعمیر شدہ دو منزلہ مکان کے سامنے گاڑی روکتے ہوئے اسے وہاں کھڑی چھوٹی سی مہران نظر آئی تو۔

بہ آواز بلند بڑبڑایا۔

”کون ہے اندر؟“ گاڑی سے اترتے ہی اس نے مستحوی سے حاضر ہو جانے والے گاڑے سے پوچھا۔
”مس مہناز آئی ہوئی ہیں سراسر!“ گاڑی کی زبان سے نکلنے والا نام بشری کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ وہ مہناز کو ہال کی گرل فرینڈ کی حیثیت سے ابھی طرح جانتی تھی۔

”ایک تو یہ سانا بھی عورت کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ موت کے منہ سے واپس آیا ہے پھر بھی اپنی پانچک چھلکوں پر پشوری کے لیے بلا لیا ہے۔“ گاڑی کا جواب سن کر سلطان نے بہ آواز بلند تبصرہ کیا اور اسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کرتے ہوئے اندر کی طرف بڑھا۔ اندر پہنچ کر اس نے جس کمرے کا دروازہ کھولا، اس کے کھلنے سے کل بشری کو غصے کا اندازہ نہیں تھا کہ وہ بیڈروم ہے۔ مگر بھی خاصتا بیڈروم کا ہی تھا۔ وہ باڈل کو بالائی مریاں دن کے ساتھ بستر پر اوٹھاتا لیتا ہوا دیکھ سکتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی مہناز بھی نیم مریاں سے لباس میں بستر پر بیٹھی ہوئی تھی اور اس کا دایاں ہاتھ باڈل کی پشت کو سہارا دیتا تھا۔

”بڑی جلدی پہنچ گئے تم۔ میں تو سمجھا تھا کہ لوٹو یا ساتھ ہے تو آتے آتے کچھ دقت لگ جائے گا۔“ اس نے لینے لینے ہی نکلیں اٹھا کر ان دونوں کی طرف دیکھا اور اپنی پوزیشن تبدیل کیے بغیر بولا۔

”اس لیے تم اپنی اس کتو سے خدشیں کروانے میں مصروف ہو گئے۔“ سلطان نے اسے ترکی پر ترکی جواب دیا۔
”ابھی کہاں خدشیں..... ابھی تو بس آدمی ادھوری خدشیں ہی کر رہی ہے۔ میں ذرا پوری طرح فٹ ہو جاؤں تو لیتا ہوں اس سے بھر پور خدشیں.....“ وہ ایک آنکھ دبا کر اوباشانہ لہجے میں بولا تو اس کے قریب بیٹھی مہناز بھیچپ ٹپنی جبکہ بشری کے اندر نفرت و طیش کی لہر نے جوش مارا۔
”آٹھوں والے اس مرد کو خفا کر دینے سے زیادہ اہم کام کوئی نہیں تھا اس کے لیے لیکن اس وقت وہ جس طرح سے اس کی نظروں کے حصار میں تھی اس کے لیے پرس میں سے پتول نکال کر اس پر قاز کرنا ممکن نہیں تھا۔

”اس کا جو چاہے کرنا لیکن پہلے میری دوست کا راز کھلو۔ اس کے والد کی کوئی زمین ہے یہاں جسے مل کر بچے کے ہوائے سے یہ کیبتا ہے آئی ہے لیکن یہاں کسی قبضہ گر (پ) نے اس کی زمین پر قبضہ کیا ہوا ہے۔“
”قبضہ ختم کروا کے زمین کو اچھے داموں فروخت کروانا ہے۔“ سلطان، بشری سمیت بحر کے مین مقابلہ صوفے پر بیٹھ گیا

اور اپنی آم کا مقصد بتایا۔

”کس علاقے میں ہے تمہارے باپ کی زمین؟“
 ہازل نے سہانہ لہجہ میں اپنی پشت پر سے بتایا اور اٹھ کر بیٹھے
 ہوئے بشری سے یوں مخاطب ہوا کہ اس کی نظریں مسلسل
 اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ان غلط اور برے کی
 طرح اندر گھس جانے والی نظروں کو خود پر عیاں کر رہے
 آرام سی ہوئی۔

”وہ مٹی..... وہ شادمان.....“ اس نے گڑبڑاتے
 ہوئے جواب دینے کی کوشش کی لیکن ہازل نے اس کی بات
 کاٹ دی اور عجیب سے لہجے میں بولا۔

”میری معلومات کے مطابق تو گھڑاہ عامم بڑا
 ایماندار صحابی تھا اور اس نے شاہ فیصل میں موجود مکان کے
 علاوہ ساری زندگی کوئی پر اپنی نہیں بنائی پھر تم یہ کس زمین کا
 افسانہ لے کر یہاں پہنچ گئی ہو۔“ ہازل کے الفاظ نہیں، کوئی
 دھماکا تھا جس نے بشری سمیت سلطان کو بھی لرزاکر رکھ دیا۔
 ”یہ..... یہ کیسی بھکی بھکی باتیں کر رہے ہو تم؟ یہ میری
 دوست ہے۔ اس کا بھلا گھڑاہ عامم سے کیا تعلق؟“
 پوچھا ہٹ میں سلطان جو کچھ کہہ رہا تھا اس پر توجہ دینے کی
 فرمت کسی کے پاس نہیں تھی۔

”اپنی موت کو بالکل ٹھیک سمجھتا ہے تو نے۔ میں چھ
 تک پہنچ گئی ہوں اور اب تجھے جہنم داخل کر کے ہی یہاں
 سے جاؤں گی۔“ وہ جو نہایت خاموشی سے گود میں رکھے
 پرس کی زپ کھول کر ہاتھ اندر ڈال چکی تھی، پستول نکال کر
 غرمت سے بولی اور لگا تار ہازل کی طرف دو قائر کیے۔
 ہازل تو پہلے ہی ہلے سے نیچے پھسل کر خود کو قائر کی زد میں
 آنے سے بچا چکا تھا۔ سہانہ لہجہ اس لیے محفوظ رہی کہ
 سلطان نے مین موقع پر اس کے پستول والے ہاتھ پر اپنا
 ہاتھ مار دیا تھا۔

”تو نے ہازل کو بھی کامی اور سلطان جیسا کچا لوٹھا
 سمجھا ہوا ہے سالی جو یوں اس کی کچھار میں گھس آئی ہے۔
 اب آگئی ہے تو دیکھنا کیا حال کرتا ہوں تیرا۔“

ہازل نے فرش پر پھیلتے ہوئے کمال پھرتی سے اپنے
 اور اس کے درمیان کا فاصلہ پانا اور اس کو ایک زوردار دھکا
 دیتے ہوئے زمین پر گر دیا۔ گرنے سے اسے جوت تو لگی
 لیکن وہ اسے نظر انداز کرتے ہوئے پھل کی طرح پھسل کر
 صوفے کے پیچھے چلی گئی اور وہیں سے ہاتھ باہر نکالی کر وہ
 قائر مزید کیے۔ پہلے والے کھڑوں کی طرح یہ قائر بھی بے
 نتیجہ ثابت ہوئے لیکن اسے اتنی مہلت مل گئی کہ وہ کمرے

کے کھلے دروازے سے باہر نکل سکے۔

کمرے سے باہر نکلتے ہی اس نے بیرونی دروازہ
 کھلتے اور وہاں سے رائل برادر گارڈ کو اندر داخل ہوتے
 ہوئے دیکھا۔ جیسے جیسے گولیاں چلنے کی آواز سن کر صورتحال
 معلوم کرنے اندر آ رہا تھا۔ گارڈ کے اپنی رائل سیدھی
 کرنے سے قبل ہی اس نے ایک چھٹانگ لگائی اور اوپر جاتی
 سیڑھیوں پر بجٹ بھاگنا شروع کر دیا۔ ہازل کی نظر نے
 اسے اپنے اندازے کے برخلاف بہت جلد مصیبت میں
 ڈال دیا تھا اور وہ اس کے خلاف کچھ کرنے سے قبل ہی خود
 مصیبت میں پھنس گئی تھی۔ دھماکہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر
 جاتے ہوئے وہ اپنے پیچھے قدموں کی آواز سن سکتی تھی۔ وہ
 نیچنی طور پر دو سے تین افراد تھے جو اس کے تعاقب میں
 بھاگے آ رہے تھے۔ وہ بغیر ر کے اور پیچھے مڑے مسلسل
 سیڑھیاں چڑھتی ہی چلی گئی اور بالآخر ایک ٹھکی چھت پر پہنچ
 کر سیڑھیوں کا یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ جس وقت وہ سیڑھیوں
 کے اختتام پر موجود کھڑکی کے دروازے کو کھینچ کر بند کر رہی
 تھی، اس نے ہازل کو دیکھا۔

صرف ٹراؤزر میں لمبوس، بالوں بھرے ہلائی
 عریاں جسم کے ساتھ خالی ہاتھ اس کے پیچھے آتے اس شخص
 کے چہرے پر کسی قسم کی پریشانی نہیں تھی۔ دروازہ بند کرتے
 ہوئے اس کی نظریں ذرا کی ذرا ہازل کی نظروں سے
 ٹکرائیں اور وہ کپکپا کر رہ گئی۔ ان نظروں میں بالکل ایسا
 تاثر تھا جیسے کوئی شکاری اپنے شکار کو گھیر کر کارٹر کر دینے کا
 لطف لے رہا ہو۔ اس نے وحشت زدہ سے انداز میں دوڑ کر
 چھت کا چکر لگایا۔ دو منزل مکان کی چھت سے اترنے کا کوئی
 راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا اور یہاں سے نیچے جانے کی
 واحد صورت یہی تھی کہ وہ نیچے چھٹانگ لگا دے۔ اچھی
 خاصی پلٹری کے باعث نیچے چھٹانگ لگانے کا کم سے کم بُرا
 نتیجہ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے ہاتھ پر تڑا چلی گئی اور اس کے بعد
 بھی نکال رہا ہے اسے ہازل کی گرفت میں آ جاتا تھا۔

”تم یہاں سے نکال کر نہیں نکلتیں بشری ابھر ہے
 کہ خود کو ہمارے حوالے کر دو۔“ دروازے کے اس پار
 سیڑھیوں پر موجود ہازل نے اسے پکار کر وہ حقیقت باور
 کر دلی جسے وہ پہلے ہی جان چکی تھی۔

”خود کو تمہارے حوالے کرنے سے بھر ہے کہ میں
 بخود نکلی کر لوں۔“ اس نے غرمت زدہ لہجے میں ہازل کو جواب
 دیا اور اس کی سسکی ہوئی نظروں سے دروازے کی طرف دیکھا
 جیسے اس پار موجود ہازل کو اپنی نظروں سے ہی جسم کر دینا

چاہتی ہو۔

”ایسا کر کے تم اپنے حق میں اچھا کرو گی۔“ جو اڈا پاؤل کی سرد آواز اس کے کانوں میں اتر کر اس کے جسم میں جھرمھراہٹ پیدا کر گئی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ صرف دھمکی نہیں تھی۔ وہ اگر زندہ اس درندے کے ہاتھ لگ جاتی تو وہ اس سے ایسا سلوک کرتا کہ اسے اس کے مقابلے میں موت بدرجہا بہتر محسوس ہوتی۔

”آج میں تمہیں پکڑ لوں گا۔“ دل میں مصمم ارادہ کرتے ہوئے وہ دانت پکچھائی زیر لب بڑبڑاتی۔ اسی وقت دوکان چھانڈ دھماکے ہوئے اور گھڑی کے دروازے کا کھڑی والا حصہ اڑ گیا۔ اگر وہ دروازے کے سامنے کھڑی ہوتی تو یقیناً رائفل کی ان ہلاکت خیز گولیوں کا نشانہ بن جاتی جنہوں نے دروازے کے ایک بڑے حصے کے پرچے اڑا کر رکھ دیے تھے۔

کھڑی کے ٹکڑے ہوتے ہی دروازہ دھڑ سے کھلا اور کوئی گھولنے کی طرح چھت پر آیا۔ دائیں جانب کھڑی وہ آنے والے کے استقبال کے لیے پوری طرح تیار تھی چٹانچہ پہلی جھک پر ہی اس کے پھول نے گولی اگلی۔ دروازے سے چھت پر آنے والے کو گولی لگی اور وہ زمیں پر ہوس ہو گیا لیکن اسے پہلے ہی اور اک ہو چکا تھا کہ اس نے کسی زندہ وجود کے بجائے ایک ہڈی پر گولی چلائی تھی۔ گولی کے زبیاں پر جھنجاہٹ کا شکار اس نے یکے بعد دیگرے چھت پر آنے والے ان دو افراد کو نشانہ بنانے کی خواہش میں جنوہوں کی طرح ٹرنگر دیا۔ جواب میں جہاں ایک دلہنوز چنچ نے اسے کامیابی کا احساس دلایا وہیں ”ٹرنگ ٹرنگ“ کی آواز نے گولیاں ختم ہونے کا اعلان بھی سنایا۔

اس نے ایک نظر پیٹ پکڑ کر لوٹ پٹت ہوئے سلطان پر ڈالی اور خود اخطراری طور پر دائیں جانب کی منڈیر کی طرف بھاگی۔ سلطان کے ساتھ ہی چھت پر وارو ہونے والے پاؤل نے ایک خوفناک چنچ کے ساتھ اس پر چھلانگ لگائی اور اسے لپٹا ہوا منڈیر سے گرایا۔

”بس۔“ مکمل ختم۔“ اس کے پچھلے وجود کو قابو میں کرتے ہوئے وہ اس کے کان میں پھنکارا۔

”یہ مکمل ہم دونوں میں سے ایک کی موت سے پہلے ختم نہیں ہو سکتا۔“ اس نے غرت میرے لہجے میں اسے بتایا اور اپنے ناخن اس کی گریٹوں میں جکڑتے کرتے کا کوشش کی۔

”نہیں میری جان اس میں تم جیسی میر پر جوانی کو اتنی

جلدی مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔“ اس نے اپنے سر کی ٹھکر بشری کے چہرے پر ماری۔ ایک تو پاؤل کے غلیظ بدن کی بدور دوسرے یہ ٹھکر۔ اس کا سر بڑی طرح پکڑا نے لگا۔

”میں جس صورت کے بدن کی مہک ایک بار سونگھ لوں اسے کبھی نہیں بھلا سکتا۔ تم بھی مجھے اچھی طرح یاد ہو اور تمہیں قریب پا کر میں ایک بار پھر اس مہک کو اپنے امد اتارنے کے لیے بے چین ہو گیا ہوں۔“ وہ اپنی غلیظ ٹھکروں سے اسے چھیدا تا اس کے ہاتھوں کو بے بس کر چکا تھا۔ اس کے مقابلے میں کئی گنا کمزور بشری کے جسم میں اس جیلے سے نفرت و طیش کی ایک بلند ترین لہر اٹھی اور اس نے اپنی تمام تر توانائی کو نکپا کر کے اس کی ناک پر ایک زوردار ٹھکر ماری۔ ٹھکر اتنی شدید تھی کہ پاؤل کی ناک سے خون پھوٹ پڑا۔ وہ ذرا سا لڑکھایا لیکن اس پر سے اپنی گرفت کمزور نہیں کی۔ بشری کے انتہا کو چھوتے جنون نے اس میں اسے ایک عجیب راہ بھائی۔ اس نے ذرا سی گردن ترچھی کر کے اس تقریباً ڈیڑھ دو فٹ کی منڈیر کو دیکھا اور گویا حتیٰ فیصلے پر پہنچ گئی۔ فیصلے کی مضبوطی نے اس کے نازک بدن میں ایسی طاقت بھری تھی جس کے سامنے پاؤل کی وحشت بھی کچھ نہیں تھی۔ حقیقتاً وہ اس کی نیت کو سمجھ ہی نہیں پایا تھا جب ہی اپنے جسم کو لگنے والے جیسے پر ذرا سا شہٹایا اور اخطراری طور پر خود کو بچانے کے لیے ایک ہاتھ منڈیر پر جمادیا۔ اس کا ایک ہاتھ اب بھی منڈیر سے خود کو لپٹا رکھا اپنے والی بشری کے ہاتھوں کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھا اور وہ اس کے ہاتھ سے لگی گھڑی کے پینڈولم کی طرح بھول رہی تھی۔

”خچے میرے ساتھ ہی مرنا ہوگا۔“ وہ غرت سے غرائی اور اپنے بدن کو زوردار جھٹکا دیا تاکہ پاؤل کا ہاتھ منڈیر پر سے اپنی گرفت کھو دے۔ پاؤل نے اپنی کمزور ہوتی گرفت کو محسوس کیا۔ وہ جانتا تھا کہ گارڈز بھی ہو جانے والے سلطان کی ٹھکر میں جھٹکا ہے اور اس لیے وہاں کوئی نہیں ہے جو اس کمزور صورت حال میں اس کی مدد کر سکے۔

ہاں... اس وقت اس نے بشری کی نفرت اور جنون کے مقابلے میں خود کو کمزور محسوس کیا تھا اور جانتا تھا کہ وہ واقعی اسے اپنے ساتھ لے ڈوبے گی۔ اس کو اتنی حساب کتاب میں وہ جان چکا تھا کہ اس وقت وہ صرف ایک زندگی بچا سکتا ہے۔ خود کو اپنی زندگی

اس نے ایک سرسبز چھتر بشری پر ڈالی اور اس کی کالی پر سے اپنے ہاتھ کی گرفت ختم کر دی۔ وہ جو پہلے ہی

"نیچے اترو۔" ان کی طرف سے کسی حراست کے نہ ہونے کے باوجود ان لوگوں کے تیز خطرناک تھے اور بلاوجہ ہی ان کے شانوں پر گتوں کے دستے رسید کرتے ہوئے انہیں آگے کی طرف دھکے دے رہے تھے۔ کنارے پر پہنچ کر سرحد کو اچانک ہی اس زور کا دھکا دیا گیا کہ وہ خود کو سنبھال نہ سکا اور گتوں اور ہتھیاروں کے غل مزک پر گرنے سے گہری خراشیں لگوا بیٹھا۔

"اویسے آرام سے پار۔ یہ پاکستانی شیر ہیں اور تم نے ان کو کھوتا بنا دیا ہے۔" مسکراتے ہوئے اس آواز کو پہچاننے میں انہیں کوئی وقت نہیں نہ آئی۔ فٹس لائٹس کی روشنی میں دانت کھوس کر مسکراتے نظر آنے والے لوشا کا چہرہ ان کے لیے موت کا پیغام تھا۔

"ہم نے انہیں کیا کچھ بنانا ہے سراسر یہ تو خود چھ ہوں کی طرح دیک کر پٹھے ہوئے تھے۔" انہیں بزور طاقت ٹرک سے اتار کر لانے والے سپاہیوں میں سے ایک نے خاتی اڑاتے ہوئے کہا تو باقی سب قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ احساس تو ہیں سے عالم شاہ کا چہرہ دیک اٹھا لیکن اتنے سارے مسلح افراد کے درمیان بچنے گھرے کھڑے وہ دلوں بالکل بے بس تھے۔

"کیوں بلاوجہ ہم سے دشمنی کر رہے ہو؟ تم ابھی طرح جانتے ہو کہ ہم دہشت گرد نہیں ہیں۔ ہم صرف اپنے کزن کی شادی میں شرکت کے لیے آئے تھے اور اگلے تھے ہمیں واپس چلے جانا تھا۔" بے حد ضبط سے کام لیتے ہوئے عالم شاہ نے اس سے گفتگو کا آغاز کیا۔

"کل کا کیس ہے سالے چھوٹے۔ تیری وجہ سے میرا پارسیل مرا ہے اور تو کہتا ہے میں بنا کسی کارن کے تجھ سے دشمنی کر رہا ہوں۔" اس کا سوال سن کر وٹا پھر گیا۔

"پارسیل کی موت میں میرا کوئی تصور نہیں۔ وہ کسی کی لٹلٹی سے مرا، تم ابھی طرح جانتے ہو۔" وٹا کے توہین آمیز رویے کے باوجود اس نے ضبط سے کام لیا۔

"صرف تیری لٹلٹی سے مرا ہے وہ۔ ساری لٹلٹی تیری تھی۔ نہ تو اپنی منہوس صورت لے کر پاکستان سے یہاں آتا نہ یہ سب کچھ ہوتا۔" وٹا کا خود پر سے قابو ختم ہو گیا اور اس نے جھپٹ کر عالم شاہ کی گردن پکڑ لی۔ اس موقع پر سرحد خاموش کھڑا رہتا تو اس کی وقار کی طرف حرف آتا۔

"پھلو دو سا بچہ کو؟" وٹا کی پردا کیے بغیر وہ عالم شاہ کو وٹا کی گرفت سے بچر دانے کے لیے اس پر جھپٹا۔ یہ جرات اسے بہت پہلے ہی پڑی۔ یکدم ہی بہت سے سپاہی اس

اپنے ساتھ بچنے کی طرف کھینچنے کے لیے زور لگا رہی تھی، ایک جگہ سے کسی پتھر کی طرح سیدھی چبھے گئی۔ اس کے زمین تک کا سفر طے کرنے تک باؤل اپنا دوسرا ہاتھ منڈ پر بٹھا کر خود کو محفوظ کر چکا تھا۔ منڈ پر ہاتھوں کے تل لٹکے ہوئے اس نے گردن جھکا کر بچھو دیکھا۔

پختہ زمین پر بشری کا وجود بے ترتیب پڑا تھا اور ایک پتھر پر جا پڑنے والے سر سے لٹکتا خون تیزی سے اس کے گرد جمع ہوتا تھا۔ اس نے سر کو ایک خفیف سا جھٹکا دے کر گویا بے پروائی کا مظاہرہ کیا اور پھر بازوؤں پر زور دے کر اپنے جسم کو منڈر سے اوپر لے جانے کی جدوجہد میں مصروف ہو گیا۔

☆☆☆

وہ دلوں دم سادھے باہر کی سن گن لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں لیکن کچھ اندازہ نہیں ہو پارہا تھا کہ کیا مسئلہ ہے۔

"شاہ معمول کی چینگ کے لیے روکا ہو۔" باہر کی افراد کی موجودگی کا احساس ہو رہا تھا اور لب و لہجے سے یہ بھی اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ بولنے والے عام لوگ نہیں ہیں لیکن الفاظ واضح نہیں تھے اس لیے سرحد نے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔

"مجھے گڑ بڑ لگ رہی ہے سرحد۔" عالم شاہ مطمئن نہ ہوا۔ اٹھانے کی آوازوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ٹرک پر لوڈ ہتھیاروں کو ہٹا کر اس کی تلاشی لی جا رہی ہے۔ اس بار سرحد کوئی تسلی بھی نہیں دے سکا۔ بس ایک آس سی تھی کہ شاید معمول کی چینگ ہو اور سامنے کی چھ ہتھیاروں کی تلاشی لینے کے بعد وہ لوگ مطمئن ہو کر چلے جائیں لیکن وہ لوگ جس سرگرمی سے مصروف عمل تھے، جلد ہی اس امید نے بھی دم توڑ دیا۔ انجام ان کے سامنے تھا لیکن بالکل بے دست و پا اس مفکر سے غلامیں بیٹھے وہ اپنے بچاؤ کے لیے کچھ کر ہی نہیں سکتے تھے۔

"سر پر ہاتھ رکھ کر باہر آ جاؤ۔ کوئی غلط حرکت کی تو بھون دے جاؤ گے۔" ہالائٹران کے سامنے رکھے کار فٹز بھی ہٹا دیے گئے اور انہوں نے اپنی جانب رخ کی ہوئی خطرناک گتوں کی نالوں کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ ایک سرد آواز بھی سنی۔

ان کے پاس موقع تھا نہ مقابلین کی طرف سے بھی راجہ رعایت کی امید، سو خاموشی سے دنگی کی بدانتہا پر عمل کرتے ہوئے باہر آ گئے۔

والے سادھو نے اسے اپنی خدمت کے لیے منتخب کر رکھا تھا۔
 "کھانا تو ضرور کھاؤں گا میں۔ تمہیں بتاؤں کہ یہاں
 کی سب سے اچھی چیز ہی تمہارے ہاتھ کا پکا کھانا ہے۔ بڑا
 ذائقہ ہے تمہارے ہاتھ میں۔ کچھ بھی پکاؤ حرے کا ہی لگتا
 ہے۔" وہ خوشخبری کے سلسلے میں اپنے تجسس کو دبا کر اس کی
 دلجوئی کے لیے فوراً کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"یہ تو آپ کی بڑائی ہے بھایا درندہ ہم تو بس اگلے
 سیدھے ہاتھ چلا کر جو بھی بن جائے، پکا دیتے ہیں۔"
 تعریف سن کر وہ تھوڑا سا جھنجھٹ گیا۔ معاذ اس کے انداز پر
 سکرایا اور پھر کھانا کھانے بیٹھ گیا۔ کھانے کے ذائقے کے
 سلسلے میں اس نے روی کی بے جا تعریف نہیں کی تھی۔
 زیرے کے بھار والی اس سادھی آلوی بھجیا اور روٹیوں
 میں بھی ایسی لذت تھی کہ وہ رغبت سے کھانا چٹا گیا۔

"اب ساؤ خوشخبری۔" کھانا کھا چکے کے بعد اس
 نے روٹیوں والے رومال سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے
 سامنے بیٹھے روی سے کہا۔

"بھگوان نے آپ کے من کی سن لی ہے۔ آپ کے
 یہاں سے جانے کا آسرا ہو گیا ہے۔ آج شام ڈھلے آپ
 یہاں سے جانے والے ہیں۔"

"واقعی؟" تفصیل سے پوری بات بتاؤ نا۔" روی کی
 دی اطلاع پر اس کا دل دھڑک اٹھا۔

"ہمیں تو بس اتنا ہی پتا ہے۔ باقی کاروباری خود ہی
 بتائیں گے۔ ہمیں تو بس وہ پوچھ دے تھے اور بولے تھے کہ
 آپ کے بازو پر باندھ دیں۔ اسے باندھنے سے آپ
 سرکشت رہیں گے۔" بولتے بولتے اس نے اپنی جیب میں
 ہاتھ ڈال کر سیاہ کپڑے میں بندھی کوئی شے باہر نکالی۔ یہ
 کچھ نامضام سنسن سے مشابہ شے تھی جس کے وسط میں دقتی
 گھڑی کے ڈائل کی ساخت اور جسامت کا بھورا پتھر اس
 طرح سلا ہوا تھا کہ پتھر کی محض ایک سائڈ ہی دکھائی دے
 رہی تھی۔

"گروٹی نے اسے اس طرح باندھنے کو کہا ہے کہ پتھر
 آپ کی پہلی کو چھوٹا رہے۔ آئینہ اوپر کیجیے، ہم اسے آپ
 کے بازو پر باندھ دیتے ہیں۔" اس نے اپنے ارادے پر عمل
 کرنے کے لیے اس کے بازو کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"ہمیں۔" اس نے بے سادھوی ہادی کے ہاتھ کو پیچھے
 دھکیلتے ہوئے اپنی سادھی کھانسی سے ملنے والی اور طعام کی سہولیات
 سے مستفید ہونے والا مسلمان خون اس موقع پر نہ جانے کیوں
 اچانک جوش میں آ گیا تھا اور اسے گوراندہ ہوا تھا کہ وہ سادھو کا

پر ٹوٹ پڑے اور بے دردی سے اسے پیٹنے لگے۔ عالم شاہ
 نے اسے بچانے کی کوشش کی تو خود بھی زرد میں آ گیا۔ وہ مسلح
 تھے اور انہیں ہادی برتری بھی حاصل تھی چنانچہ لکھوں میں ہی
 وہ ان دونوں کو نیچے گرا لینے میں کامیاب ہو گئے تھے اور
 بے دردی سے جانوروں کی طرح پیٹ رہے تھے۔

"ڈراما کھیل (خیال) سے۔ مرنے نہیں دیتا ہے ان
 کہیوں کو۔" سر پر ایک زوردار ٹھوکر کھا کر بے ہوش ہونے
 سے قبل یہ وحی کی طرف سے دلی جانے والی آخری ہدایت
 تھی جو اس نے سنی تھی۔

☆☆☆

"کھش (خوش) ہو جائیے بھایا جی! ہم آپ کے
 لیے کھش کھری (خوشخبری) لے کر آئے ہیں۔" کھانے
 کے برتن اس کے سامنے رکھتے ہوئے روی نے لہک کر اس
 سے کہا تو وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"پہلے مجھے تو ہم آپ کے لیے کیا کھیر (خیر) لائے ہیں؟"
 اس کی صورت پر سوجھ بوجھ نے روی کو خوشی پر اکسایا۔

"اس وقت تو میرے لیے سب سے بڑی خوشخبری
 یہی ہو سکتی ہے کہ مجھے اس تیر تھائی سے نجات کی اطلاع دی
 جائے۔ یہاں سے نکلوں گا تو اپنے گھر والوں کی بھی کوئی خیر
 خبر لے سکوں گا۔ ابھی تو یہ حال ہے کہ لگتا ہے جیتے جی مر گیا
 ہوں۔" وہ واقعی اس بھدردی جگہ پر چہاں روی اور سادھو
 کے علاوہ کوئی انسانی شکل دکھائی دیتی تھی اور نہ باقی دنیا کی
 کوئی خیر خبر ملتی تھی، رہتے رہتے بیزار آ چکا تھا۔

"آپ ہم سے ادب کئے ہیں بھایا؟" روی کی شکل
 اتر گئی۔

"یہ بات نہیں ہے یا راجم لوگ تو بہت پیارے ہو۔ تم
 سے مل کر تو میں نے جانا ہے کہ انسانیت کیا ہوتی ہے ورنہ ہم
 میں سے اکثریت تو مذہب اور قوم سے آگے جا کر کچھ دیکھتا
 پسند ہی نہیں کرتی۔" روی کی اداسی نے اسے شرمندہ کر دیا اور
 اس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر وضاحت دینے لگا۔

"تم اور گروٹی بہت اچھے ہو لیکن یہ تو تم بھی مانو گے؟
 کہ ایک بھدردی جگہ پر رہتے رہتے بندہ بیزار ہو جاتا ہے اور
 پھر مجھے میرے گھر والوں کی بھی تو فکر ہے نا۔"

"آپ ٹھیک بولتے ہیں بھایا۔ ہم ایسے ہی بیکار میں
 اپنا دل چھوٹا کر لیے تھے۔ اچھا آپ کھانا تو کھا پیے۔" حضرا
 ہو گیا تو سواد نکس رہے گا۔" اس کی غصائی وضاحت پر ہی
 روی کا حراج اچھا ہو گیا۔ وہ تھائی بڑا گھس اور سادھو دلی
 لڑکا۔ یقیناً اس کی اسی خوبی کی وجہ سے دغا سے کٹ کر رہے

جنر مسٹر پڑھا ہوا یہ پتھر اپنے بازو پر باندھے۔

"پتھر تو ایسے ضروری ہے۔ اس کے بنا آپ یہاں سے باہر نکلنے ہی دھڑلے جائیں گے۔" ردی اس کے انکار پر حیران پریشان سا ہو گیا۔

"میری بات کو سمجھو ردی! میں مسلمان ہوں اور یہ نہیں چاہتا کہ اس نے قدرے بھجلائے ہوئے لہجے میں اس کے اصرار کو رد کیا۔

"یہاں لے جاؤ۔ ایک کوئی جنر مسٹر پڑھا ہوا تھوڑے یا کچھ دھڑلے سے۔ یہ دنیا بنانے والے کی کارگیری کی ایک چھوٹی سی نشانی ہے۔ ایک ایسی چیز جسے تمہاری سائنس نے تلاش کرنے میں ابھی جانے کتنے برس اور لگائے ہیں۔" ردی کے ساتھ اچھے ہوئے ہونے کے باعث وہ سادھو کا بیڑیاں اتر کر نیچے آٹھسوس نہیں کر سکا تھا اس لیے اس کی آواز سن کر چونک گیا۔

"بڑا مت مانیے گا۔ آدمی اپنے عقیدے کے معاملے میں تھوڑا سا جذباتی ہو جاتا ہے۔"

"اسی لیے تو تجھے بتا رہا ہوں کہ اس کا دھرم سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ اسے جگوان کی طرف سے ہی ایسا اتارا گیا ہے۔ یہ جس بندے کے شریر کے ساتھ بندھا ہوا، سمجھو اس کا شریر اپنے اندر کی ساری لہریں نکالنا بند کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ کبھی اور پھر تک ایسے آدمی کے بدن پر آکر نہیں بیٹھتے کہ ان تک اس کے بدن کی گرمی پہنچتی ہی نہیں۔"

سادھو نے اسے پتھر کی خوبیوں سے آگاہ کیا تو وہ حیران رہ گیا اور پوچھا۔ "آپ کو یہ حیرت انگیز پتھر کہاں سے ملا؟"

"سادھو کی تمہارا سے جنگ، صحرا، ندی، نالے، پہاڑ اور جانے کہاں کہاں لیے پھرتی ہے۔ پھر اُتر رلتے پھرتے جھاگ جھاگ جائیں تو کچھ خزانے بھی ہاتھ لگ جاتے ہیں۔ یہ پتھر بھی سمجھو کہ میرے ہاتھ آئے خزانے میں سے ایک ہے۔"

"اور آپ اپنا یہ قیمتی خزانہ مجھے دے رہے ہیں؟" وہ حیران ہوا۔

"سادھو کی کنیا میں آنے والوں کو دینی ملتا ہے جس کی انہیں ضرورت ہو۔" سادھو نے بے نیازی سے جواب دیا اور مڑ کر واپس بیڑیاں چڑھنے لگا۔ خواہش کے باوجود اس کی ہمت نہیں ہو سکی کہ سادھو کو روک کر اس سے ظلم کے پروگرام کے بارے میں پوچھ سکے کہ کس لیے اور کہاں بکھا جا رہا ہے۔

"دو اپنی لیں بھایا پھر ہم بھی جا کر اپنے کام نہٹائے

ہیں۔" ردی نے اسے پکارا تو اس نے اس کے ہاتھ سے دوا کا پیالہ تمام کر حلق سے نیچے اچاڑ لیا۔ یہ کڑوی سی دوا اگرچہ مٹہ اور حلق کو تادیر کڑوا رہتی تھی لیکن کئی جادو اثر۔ اس دوا اور مرہم کے استعمال سے جتنی تیزی سے اس کے زخم مندمل ہو رہے تھے اور تکلیف میں کمی آئی تھی اس نے اسے متاثر کرنے کے ساتھ ساتھ ٹیٹو کی یاد بھی دلادی تھی۔ کیڑھری پہاڑیوں میں پتاہ گزیریں پر اسرار صلاحیتوں کے مالک ٹیٹو نے بھی ایسی ہی دلچسپی سے اس کا علاج کیا تھا اور موت کے منہ سے جھپٹ کر زندہ میں لاکھڑا کیا تھا۔

"جانے وہ سب کیسے ہوں گے؟ لیلیٰ، مراد، ٹیٹو چاہا۔" وہ ایک ایک کر کے ان مہربان چہروں کو یاد کرنے لگا جنہوں نے بغیر کسی غرض کے اس کی بے لوث خدمت کی تھی لیکن اسے مہلت نہیں مل سکی تھی کہ مڑ کر اپنے ان مہربانوں کا شکر یہ ادا کرنے جائے۔ وہ تو بال بال یاد دل رہی تھی اس لڑکے کی موت پر تعزیت کے لیے بھی نہیں جاسکا تھا جس نے ٹیٹو لاکھڑا کر کے باقی ساتھیوں سے اسے بچانے کے لیے اپنی جان نچھاور کر دی تھی۔

"بلال یا بلادل۔" جو بھی اس کا نام تھا، جانے اس کی ناش کب ان لوگوں کو ملی ہوئی اور ناش لٹنے کے بعد انہوں نے میرے بارے میں کیا سوچا ہوگا؟ ردی کب کا برتن سیٹ کر وہاں سے چاچکا تھا اور وہ پوچھی لینے گزرے واقعات کو سوچ رہا تھا۔ سوچتے سوچتے اسے خند آگئی۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو بھی وہ اکیلا ہی تھا لیکن طاق میں جلا دیا دیکھ کر اندازہ لگا سکتا تھا کہ اس کے سونے کے دوران ردی وہاں آیا تھا اور دے میں چل ڈال کر گیا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ بیڑیاں چڑھ کر اوپر جائے اور ردی کو آواز دے کر پوچھے کہ اس کی روانگی میں کتنی دیر ہے؟ لیکن ایسا کرنا خلاف مصلحت تھا۔ اوپر کیا صورت حال تھی، وہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا چنانچہ بہتر یہی تھا کہ صبر سے انتظار کرے۔

آخری لحظات کا یہ انتظار پچھلے دنوں کے قیام پر بھاری ہو گیا۔ خانے کی ٹھانی اور محدودیت نے پہلے بھی، سے اتنا نہیں ستایا تھا جتنا اس وقت ستا رہی تھی۔ بے نیازی میں بازو پر بندھے پتھر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ آنے والے وقت کے حلق سوچ رہا تھا۔ اگر پتھر کے حلق سادھو کی بتائی ہوئی خوبیاں درست تھیں تو وہ آنے والے وقت میں خود کو اس دہل سے نکالنے کے لیے ہاتھ بڑھا سکتا تھا۔ بس اسے یہ اطمینان ہو جاتا کہ اس کے گھروالے محفوظ ہیں۔

”گرمی بھاری ہے جی بھایا! اوپر آجائیے۔“ آخر کار انتظار کے جاں نسل کھات گزر گئے اور روی نے اسے مڑا دیا۔ وہ بھوس اور پٹے جوش ساروی کے پیچھے بیڑھیاں چڑھتا اوپر پہنچ گیا۔ اوپر پہنچنے سے پہلے ہی اس کی سماعت تک ایک قدرے ہماری نسوانی آواز پہنچی تھی۔ اوپر پہنچا تو ایک برقع پوش وجود کی موجودگی کی بھری تصدیق بھی ہو گئی۔ وہ ایسے ذرا بے سے بیٹھی تھی کہ وہ اس کی پشت ہی دیکھ سکتا تھا لیکن وہ جتنے ادب سے گھٹنے موڑ کر سر ہٹا کر سادھو کے سامنے بیٹھی تھی، اس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے سادھو سے خاص لگاؤ ہے۔

”لو آگیا وہ جوان جس کے لیے میں نے جھپٹ بھرا تھا۔ اسے پرایا جان کر بے پروائی نہ کرنا۔“ اسے آواز دے کر سادھو نے اپنے سامنے بیٹھی برقع پوش سے کہا تو اس نے ذرا کی ذرا رخ موڑ کر اس کی طرف دیکھا اور سادھو کے چہرے پر ہونے والی ہنساری سے بولی۔

”آپ جس کی اتنی چٹا کریں، میں اس سے بے پروائی برتوں، ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ کیا آپ کو دشواں نہیں ہے اپنی داسی پر؟“

”دشواں نہ ہوتا تو جھپٹیں مدد کے لیے چٹا ہی کیوں؟“ سادھو نے نرمی سے اسے جواب دیا۔

”دشواں کیا ہے تو پھر چٹا نہ کریں۔ مجھ سے جہاں تک ہو سکا آپ کے اس مہمان کی سیدھا کر دیں گی۔“ ان دونوں کے درمیان محبت اور مان بھرے مکالموں کا سلسلہ جاری تھا اور معاذ اپنی جگہ بہت بتا اس برقع پوش کی پشت کو گھور رہا تھا۔ وہ جو اس نے ایک لمحے کے لیے رخ موڑ کر اپنے رخ روشن کا دیدار کر دیا تھا، یہ سیکھ ہی کا نتیجہ تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنی آنکھوں سے بالی دلا کی حسین اور مقبول ترین ہیر و رن کو بوسیدہ لباس اور اچھے ہوئے بالوں والے سادھو کے سامنے دوڑا اور بیضا دیکھ رہا تھا۔ اگر اس کی مخصوص قدرے بھرائی ہوئی اور ہماری آواز مسلسل اس کے کانوں میں نہ پڑ رہی ہوتی تو وہ یہی گمان کرتا کہ اس کی بصارت نے دھوکا کھایا ہے۔

”بیٹھ جائیے نا بھایا، کھڑے کیوں ہیں؟“ روی جو سارے منظر سے بے نیاز غافلانہ کاراستہ بند کر کے وہاں چھاڑیاں جمانے میں مصروف تھا، اپنے کام سے غافل ہوا تو اسے یوں کھڑے دیکھ کر نوک پہنچا۔

”اب بیٹھنے کا سے نہیں ہے بالک۔“ وہ جھپٹیں مہمان کو روانہ کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ ”سادھو نے فوراً ہی روی کو

ٹوک دیا تو وہ ”جی اچھا“ کہتا ہوا تیزی سے اس کپڑے سے لپٹے اس سونے اور لپے سے رول کی طرف بڑھا جس نے کتیا کا اچھا خاصہ حصہ گھیر لیا تھا۔ رول پر لپٹا کپڑا احتیاط سے اتار کر اس نے اس پر تلف مقامات پر موجود بندھنیں بھی کھول ڈالیں اور پھر آہستہ سے اسے کھولنا شروع کیا۔ عموماً صورت دین ان لمود خوشنارنگوں والا وہ قالمین جیسی طور پر پیش قیمت بھی تھا اور سادھو کی سادی کی کتیا میں بڑا اجنبی سا لگ رہا تھا۔

”مجھے تم سے اسی ذہانت کی اس تھی۔“ قالمین کی تہوں کے کھلنے کے بعد اندر سے برآمد ہونے والے لکڑی کے لیے اور بھاری ٹکڑے کو دیکھ کر سادھو نے اس مہمان کو داد دی تو وہ خوشی سے مسکرا دی۔ مسکرا کر اس کے سوتوں کی لڑی جیسے دانت لہایاں ہو کر اس کی دھنکی میں کچھ اور بھی اضافہ کر گئے اور معاذ کو اعتراض کرنا پڑا کہ وہ جتنی اسکرین پر خوبصورت لگتی ہے، عام دیکھنے میں بھی اتنی ہی خوبصورت ہے۔ بس کچھ فرق تھا تو رنگت کا۔ اسکرین پر وہ جیسی سفید اور گلابی سی دکھائی دیتی تھی، اس وقت اس کے مقابلے میں قدرے سائولی لگ رہی تھی۔ تاہم آپ کے اتنا فرق تو پڑتا ہی تھا اور جیسا رنگت کا یہ سالو لپٹن بھی برا لگتے کے بجائے اسے زیادہ جاذب نظر اور پُرکشش بنا رہا تھا۔

”جھپٹیں تھوڑا کشت تو ہو گا بالک لیکن یہاں تو نظروں سے بچ کر نکلنے کی جی ایک راہ ہے۔“ سادھو نے قالمین پر سے لکڑی کا وہ ہماری کھلا ہاتھ ہوئے روی پر ایک نظر ڈالی پھر معاذ سے مخاطب ہوا تو وہ سمجھ گیا کہ اسے لکڑی کے اس ٹکڑے کی جگہ لینا ہے۔

”زیادہ لمبا سفر نہیں ہے۔ بس آدھے بجتے سے دو چار منٹ ہی اوپر نہیں گئے۔“ جھپٹیں تھوڑی گرمی تو لگے گی پر دشواں رکھو کہ دم گھٹ کر مرو گئے نہیں۔ میرا ایک بھروسہ کا آدمی راستے میں تمہارا ہمارا خیال رکھے گا۔“ اس نے معاذ کی جھجک محسوس کی تو خود اس کی تسلی کے لیے لب کشا ہوئی۔ چاروٹا چار اسے قالمین پر جا کر لپٹا پڑا۔ اس کے پیچھے ہی روی نے ایک بار پھر قالمین کو پہلے کی طرح لپیٹنا شروع کر دیا۔ اس بار وہ خود بھی اس کا ساتھ دے رہی تھی۔

”کوشش کرنا کہ جسم کو اکڑا کر رکھو تا کہ کسی کوتاہی کا پتہ نہ لگے۔“ اپنی مخصوص آواز میں اسے یہ ہدایت دیتا وہ اصل کھلے تھے تو یہ جی کہ وہ اس کے ہاتھ کی خوشبو کو محسوس کر رہا تھا۔ اس خوشبو کو جھپٹیں دھڑکاتے ہوئے وہ قالمین کے اندر لپٹا ہوا مسکرایا۔ اگر یہ یو یورپی کے دھ ہے

اندر لپٹا چپ چاپ پڑا رہا۔ یہ کوئی آسان سفر نہیں تھا۔ مری اور محسن سے اس کی حالت کتنی ہی ہو رہی تھی۔ لیکن سینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ خدا خدا کر کے سفر ختم ہوا اور اسے گاڑی سے نکال کر کسی کمرے میں منتقل کیا گیا۔

"ضہک ہے۔ اب تم لوگ جاؤ۔" قالین زمین پر رکھے جاتے ہی اس نے کسی کے ہدایت دینے کی آواز سنی اور پھر ہاتھ ہوئے قدموں کی آواز کے مصداق ہوتے ہی قالین پر موجود بندشوں کا کھٹکا محسوس کیا۔

"آئیے، اٹھ کر بستر پر بیٹھ جائیے۔" قالین کھلا تو اس کے جسم نے ٹھنڈی ہوا کا لمس محسوس کیا لیکن آنکھیں روشنی کے باعث چندھیا گئی تھیں اس لیے وہ خود سے قاطب ہونے والے کو نہ دیکھ سکا۔ اس نے ہاتھ قدام کر سہارا دیا تو اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ پان گھنٹے تک قالین میں لیٹے رہنے کے باعث جسم کچھ آگڑ سا کیا تھا اور اعضا کو حرکت دینے میں دشواری محسوس ہو رہی تھی اس لیے یہ سہارا اچھا لگا۔

"میں تم تھوڑی دیر میں یہاں پہنچی جائیگی گی۔ جب تک آپ ریٹیکس کریں۔ میں آپ کے لیے کچھ ٹھنڈا شٹلا لاتا ہوں۔" وہ ایک بے حد سیاد و نکلت والا مضبوط ہاتھ بڑ کا آدمی تھا جس کی عمر چالیس کے آس پاس محسوس ہو رہی تھی۔ اپنی بات کہہ کر وہ وہاں رکائیں اور جیڑی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ معاذ، جس کی آنکھیں اب روشنی سے ہم آہنگ ہو گئی تھیں، بستر پر بیٹھے بیٹھے کمرے کا جائزہ لینے لگا۔

کمرہ کشادہ تھا اور غیر ضروری سامان کی بھرمار نہ ہونے کے باعث مزید کشادہ لگ رہا تھا۔ کشادگی کے اس تاثر کو سفید اور ڈل گولڈن کی ٹکڑا شکم مزید مضبوط کر رہی تھی۔ فرنیچر سے لے کر فینسی لائٹس، پردوں اور گئے چتے شوہر تک ہر چیز بے حد قیمتی تھی۔

"یہ لیجیے، جوس پی لیجیے۔" ابھی اس نے کمرے کا جائزہ مکمل ہی کیا تھا کہ وہ شخص رے میں مشہور کھنی کا جوس کا ڈبا اور ٹیکس سے گلاس رکھے چلا آیا۔

"ٹھکر پ۔" اس کا حلق خشک ہو رہا تھا اس لیے بے لکھی سے جوس کو قبول کر لیا۔

"اور لیجیے۔" اس کے لمحوں میں گلاس خالی کر دینے پر اس کی پیاس کی شدت کا اندازہ لگاتے ہوئے اس نے گلاس دوبارہ بھر دیا۔ اس بار اس نے آٹھ گلی سے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لہتا شروع کیے کھنی گرجیں کے پسندیدہ ذائقے نے پیاس بجھانے کے بعد لطف دینے کا کام شروع کر دیا تھا۔

"آپ کا تعارف؟" اس نے اپنی خدمت میں

فکر سے دیں ہوتے اور وہ اپنے دوستوں کو بتاتا کہ اس نے ہائی وڈ کی ٹاپ ہیروئن کو اتنے قریب سے دیکھا ہے تو پہلے تو وہ اس کی بات کا اعتبار ہی نہیں کرتے اور جب اعتبار آ جاتا تو اس کی قسمت پر ہلکے کرتے ہوئے ٹھنڈی آہیں بھرتے کہ انہیں کیوں اس حینہ سے ملاقات کا شرف حاصل نہ ہوا جس کے مسن کے ساتھ ساتھ منظر آواز میں بھی ایک الگ کشش ہے۔

"ہم آپ کے نوکروں کو بلا کر لاتے ہیں۔" قالین میں اچھی طرح پیک ہو چکے کے بعد اس نے رومی کی مدغم آواز سنی۔ سادھو کے ہر حکم پر سر تسلیم خم کرنے والے اس چھوٹے سے لڑکے کے لیے وہ اپنے دل میں جو انسیت محسوس کر رہا تھا، اس نے اسے قہر تہائی سے نکل جانے کی خوشی کے باوجود اس لمبی اداس کر دیا۔ رومی نے اپنے جذبات کے اظہار کے لیے ایک لفظ بھی ادا نہیں کیا تھا لیکن اسے قالین میں لیٹتے وقت اس کی آنکھوں میں جوئی تھی وہ گواہی دے رہی تھی کہ وہ چند دنوں کے اس مہمان کو رخصت کرتے ہوئے بے پناہ اداس ہے۔

"اگر آپ میرا یہ قہقہہ سو بیکار کر لیتے تو مجھے بہت خوشی ہوتی۔" اسے قالین سمیت انسانی ہاتھوں پر اٹھا کر باہر موجود ایک مٹی ٹرک پر لوڈ کیا جا رہا تھا جب اس نے رادھا دیوی کی ٹھوکر کرتی ہوئی آواز سنی۔

"سادھو اگر نرم ملائم قالینوں پر لیٹنے بیٹھنے لگے تو سادھو نہیں رہتا۔ میں نے تمہارا یہ قہقہہ سو بیکار کر لیا تو میری ساری تپتیا بھرٹ ہو جائیگی گی۔ کیا تیری خوشی کے لیے خود کو برباد کر لوں؟" جواب دیتے ہوئے آخر میں سادھو کا لہجہ خاصا غضب ناک ہو گیا تھا۔

"تھا جانتی ہوں۔ میری یہ! چٹا نہیں تھی۔ میں تو بس آپ کی سیوا کرنا چاہتی تھی۔" رادھا دیوی رو ہانے لہجہ میں بولی تو وہ خود تکلیف میں ہونے کے باوجود مسکرا دیا۔ گرد اور چٹلی دونوں مل کر اس وقت بھر پور پر قارنس دے رہے تھے اور اگر آس پاس کوئی سن گن لینے والا موجود تھا تو اسے شک نہیں ہو سکتا تھا کہ قالین کے آنے اور جانے میں کوئی گڑبڑ کھلا ہے۔

"اب منہ بند ہوسو۔ تو جانتی ہے۔" سادھو جواہر جانے کیا کہہ رہا تھا، انہیں اس بات ہونے کی آواز کے ساتھ ہی گاڑی کے ٹکڑا پونے کے باعث وہ نہیں سن سکا۔ رادھا دیوی جینی طور پر دوسری گاڑی میں آگئی تھی جہاں سے اسی میں واپسی کا سفر اختیار کرنا تھا۔ وہ تو یہ تقدیر یونہی قالین کے

حاضر شخص کے بارے میں جاننے کی کوشش کی۔

”میرے خیال میں میڈم آگئی ہیں۔“ اسے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے وہ ہارن کی آواز سن کر باہر کی طرف لپکا۔ کچھ ہی دیر میں اس نے کمرے کے باہر سیڑیوں کی ٹھک ٹھک اور بھاری جوتوں کی دھک دھک وقت سنی تو سمجھ گیا کہ رادھا دیوی نے گھر واپس آتے ہی اسے ملاقات کا شرف بخلا ضروری سمجھا ہے۔

”ٹھیک ہو تم؟ کوئی پرالیم تو نہیں ہے؟“ وہ کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی اور اس کی صورت پر نظر پڑتے ہی سوال جواب شروع کر دیے۔

”جی، میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ اس نے رادھا پر ایک نظر ڈالی اور دیکھنے لہجے میں جواب دیا۔

”جھیک گا! مجھے تو چتا ہو رہی تھی کہ کہیں فالین میں لپٹے لپٹے تمہیں کچھ ہو ہی نہ جائے۔“ اس نے اتنی سادگی سے اس کی سلامتی پر ٹھکرا دیا کہ وہ اس کی صورت دیکھتا رہ گیا۔ وہ اپنا برقع اتار چکی تھی اور اس وقت جینز اور ٹی شرٹ میں دکھائی دے رہی تھی۔ اسکرین پر سبک اپ کی تہوں سے سجھ رہے والا چہرہ بالکل سادہ تھا لیکن پھر بھی وہ خوبصورت دکھائی دیتی تھی، صرف خوبصورت..... طرح دار نہیں۔ اس نے اپنے دل میں اعتراف کیا کہ رادھا کی سادگی اس کے لہجے کی سادگی سے کیل کھاتی ہے اور اپنے گھر کی چار دیواری میں وہ قلمی ہیروئن کے بجائے محض ایک لڑکی دکھائی دیتی ہے۔ خوبصورت اور سادہ لڑکی۔

”تم کچھ دیر آرام کر لو۔ آدھے گھنٹے بعد ہم ساتھ ڈنر کریں گے۔“ اس کی سوچوں سے بے لگروہ کہتے ہوئے جانے کے لیے مڑ گئی۔

”تم میری بات سنو کالے خان! تمہیں ڈنر سے پہلے ایک کام کرنا ہوگا۔“ جاتے جاتے وہ اپنے پیچھے مڑ کر کمرے میں سے ہی مخاطب ہوئی تو محاذ حیران رہ گیا۔ بے شک وہ محض بے حد سیاہ رنگ کا لک تھا لیکن یہ تو کئی طریقہ نہیں تھا کہ اس کا نام ہی کالے خان رکھ دیا جائے۔

”مالک تیری دنیا اور اس کے رنگ ڈھنگ.... یہاں لوگ جانے کس کس طرح اپنے زعمہ ہونے کا خراج دیتے ہیں۔“ ایک سرد آہ بھرتے ہوئے وہ بستر پر دراز ہو گیا۔ دل تو اس کا قسطنطنیہ کے پہلے تبدیل کرنے کا تھا لیکن اس کے پاس دوسرا لباس تھا ہی نہیں اور آدھے گھنٹے بعد وہ اس مسئلے ہوئے پیچھے سے تر ہر تھیرا نہ لباس میں بالی وڈ کی ٹاپ ہیروئن کے ساتھ ڈنر کرنے جانے والا تھا۔

”اپنے ملازم کو تو وہ کالے خان کہہ کر پکارتی ہے، تجھے جانے کس خطاب سے نواز ہے۔“ اس نے دل ہی دل میں خود سے کہا اور آنکھیں موند کر لیٹ گیا۔ یہاں آنے سے قبل وہ طویل خیر لے کر آیا تھا اس لیے اس وقت خیر آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اس کے پاس کرنے کے لیے کوئی اور کام بھی نہیں تھا۔ یونہی لیٹے لیٹے ہیں بائیں منٹ گزر گئے تو وہ دروازے پر دی جانے والی دھک کو سن کر چوٹا دھک کے ساتھ ہی کالے خان دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اس کے داغیں ہاتھ میں ایک خوبصورت سا شاٹنگ بیگ تھا۔

”میں آپ کے لیے کیتھ شلوار اور ٹائٹ سوٹ لایا ہوں۔ جلدی سے شاور لے کر کپڑے پہنچ کر لیں لیکن خیال رکھیے گا کہ کسی زخم کو پانی نہ لگے۔ سادھو جی نے اس کے لیے خاص تاکید کی ہے۔“ شاٹنگ بیگ اسے چھاتے ہوئے کالے خان نے ہدایات بھی جاری کیں اور اسے کسی سوال کا موقع دینے بغیر مزید بولا۔

”شاور لے کر تیار ہونے کے لیے آپ کے پاس صرف سات منٹ ہیں۔ آٹھویں منٹ پر آپ کو ڈانٹنگ روم میں موجود ہونا چاہیے۔ میڈم وقت کی بہت پابند ہیں اور وقت کی پابندی نہ کرنے والوں کو اپنے آس پاس برداشت نہیں کرتیں۔“

”ڈانٹ وری۔ میں تیار ہو جاؤں گا۔“ اس نے کالے خان کو تسلی دی اور خود بالحقہ غسل خانے کا رخ کیا۔ سہولیات سے آراستہ اس غسل خانے کو دیکھ کر ایک طویل غسل کی خواہش کو دہانا آسان نہیں تھا لیکن اس نے پھرتی کا مظاہرہ کیا اور نتیجاً سات کے بجائے پانچ منٹ میں ہی تیار ہو گیا۔ تیار ہونے کے بعد وہ کمرے میں دے دے رہنے کے بجائے باہر آ گیا۔ وسیع و عریض گھر میں ڈانٹنگ روم کا نہیں کرنا آسان نہیں تھا۔ وہ اپنے انداز سے سے بیڑیاں اتار کر کچھ کی طرف بڑھ گیا۔ بیڑیاں فالین سے ملنے لگی بیڑیاں پر اس کے قدموں کی آواز پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ نیچے نیچے کر داگیا مست سے آنے والی مدھم آوازیوں نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا تو وہ اسی طرف چل پڑا۔

”اچھا نا، اب غصہ تھوکتے دو۔ میں سوری کہہ تو رہی ہوں۔“ آگے بڑھتے ہوئے بازو اٹھا کر کہا جیسا کہ کالوں میں پڑا۔ بولنے والی کو اس کی مخصوص آواز کی وجہ سے شناخت کر لینا بالکل بھی دشوار نہیں تھا۔

”کچھ تھکادی ہوئی کی ضرورت نہیں ہے رادھا! میں

نہل میں ہاتھ دھو بیٹھ دوپٹے کے ساتھ سے کڑے فلوئور میں بھی دھو لگ رہی تھی۔ میک اپ کے نام پر اس نے نکل لپ اسٹک کا استعمال کیا تھا اور اس لپ اسٹک نے ہی اس کے چہرے کو سجا دیا تھا۔ سجاد کی نظر بے اختیار ہی اس کے ہاتھوں کی طرف اٹھ گئی۔ دائیں ہاتھ کی دوسری انگلی پر بیڑی باندھی ہوئی تھی۔

”غیریت۔ یہ آپ کے ہاتھ کو کیا ہوا؟“

”معمولی سا کٹ لگ گیا ہے۔ لیسا کوئی خاص بات نہیں۔ تم کھانا شروع کرو۔ غلط اور ہا ہے۔“ اس نے بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے کھانے کی طرف متوجہ کیا اور خود بھی ایک ڈش کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ڈش تک اس کا ہاتھ پہنچنے سے قبل ہی دو سیاہ ہاتھوں نے پھرتی سے اس کی پلیٹ میں کھانا منتقل کر دیا۔ وہ کالے خان تھا جو رادھا کے بائیں جانب آکھڑا ہوا تھا اور اس کے اشارہ ابرو پر ہر خدمت بھالانے کو تیار تھا۔

”اس گھر میں تم جب تک جاؤ آرام سے رہ سکتے ہو۔ کسی بھی ضرورت یا خواہش کے لیے ذرا بھی ٹکلف سے کام نہ لیتا۔ میرے گھر میں فل ٹائم سروس نہیں ہیں لیکن کالے خان یہیں ہوتا ہے اور تم اس سے کوئی بھی کام کہہ سکتے ہو۔“ کچھرے کا ایک ٹکڑا چبائے ہوئے وہ اس سے مخاطب ہوئی۔

”تھینک یو سوچ۔ میری اس وقت کی سب سے اہم ضرورت یہ ہے کہ میں کسی محفوظ ذریعے سے پاکستان میں اپنے گھر والوں سے رابطہ کرنا چاہتا ہوں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ کوئی ایسا طریقہ ہو کہ کال فرمیں نہ ہوسکے اور مجھے یا آپ کو کوئی زحمت نہ اٹھانا پڑے۔“ گھر والوں کی گھر مسلسل اس کے دماغ سے چلتی ہوئی تھی اس لیے موقع ملنے ہی اپنی خواہش بیان کر دی۔

”کل صبح انتظام ہو جائے گا میڈم اورو کا ہے نا سہرا۔ دو ایسے کاموں میں بڑا چالو ہے۔ اس کو بلوائوں گا۔ وہ کچھ نہ کچھ کر لے گا۔“ رادھا نے سجاد کی فرمائش کے جواب میں ایک نظر کالے خان کی طرف دیکھا تو اس نے توری طور پر اس کی تسلی کر دی۔

”ٹھیک ہے نا۔ کل تمہاری اپنے گھر والوں سے بات ہو جائے گی۔ اگر اور کوئی کام ہو تو بتاؤ؟“ وہ سجاد سے مخاطب ہوئی۔

”نو ٹھینکس۔ فی الحال تو سب سے اہم کام ہے۔ ایک بار میں اپنے گھر والوں سے بات کر لوں تو پھر آگے کی سوچوں گا۔“

بس اس بات کی شہرینی چاہتا ہوں کہ تم میرے کچے پر عمل کرو گی۔ خدا نے تمہیں سبک سروس سے تراشا یہ خوبصورت بدن دیا ہے تو تمہارا فرض ہے کہ اس کی قدر کرو۔ تم اندازہ نہیں کر سکتیں کہ تمہاری زخمی انگلی دیکھ کر مجھے کتنا دکھ ہو رہا ہے۔ ذرا سوچ کر کل جب گانے کی شوٹنگ ہو گی تو کیرا مین اس زخمی انگلی والے ہاتھ کا کلوز اپ کیسے لے گا؟“ رادھا نے لہجے میں بولنے مرد کی آواز نے اس کے قدموں کو ساکت کر دیا تھا۔ کالے خان، جسے کچھ دیر قبل اس نے ایک معمولی ملازم کی حیثیت سے دیکھا تھا، رادھا کی بوی سے اتنی بے تکلفی سے ہم کلام اسے حیرت میں مبتلا کر گیا تھا۔

”میں تو بس تمہاری ہیسلپ کروانا چاہتی تھی اس لیے سلاو بنانے کھڑی ہو گئی تھی۔ میری تو بہ جو آئندہ ایسی مخلصی کی۔“ یہ محضرت خواہانہ لہجہ جس کے پیچھے ایک شوخی سی چھپا ہوئی تھی، کسی ملازم کے لیے تھا؟ کالوں کو نہیں نہیں آ رہا تھا۔

”اب اس تو بہ پر قائم بھی رہتا۔ میں تمہاری سہرتا پر کوئی کچھر دما کر نہیں کر سکتا، یہ تم ابھی طرح چاہتی ہو۔“

بڑے حق سے کی گئی تاکید تھی۔

”اچھا ہاں! اب جاؤ جا کر گیٹ کی بھی خبر لو۔“

”اوہو۔۔۔ اسے تو میں بھول ہی گیا۔ بے چارے کو وقت کی پابندی پر بھاشن دے کر آیا تھا۔ بیٹھا انتظار میں سوکھ رہا ہوگا۔“ رادھا کے توجہ دلوانے پر کالے خان چونک کر بولا تو سجاد بھی چو کھتا ہو گیا۔ اس کے پاس پلیٹ کر دیا نہیں کمرے میں جانے کی مہلت نہیں تھی چنانچہ گھاٹکھٹکار کر قدموں کی آواز پیدا کرتے ہوئے آگے بڑھا۔

”آپ یہاں؟“ کالے خان ایک قریبی دروازے سے نکل کر سامنے آیا اور اسے دیکھ کر حیرانی کا اظہار کیا۔

”میں وہاں کمرے میں آپ کا انتظار کر رہا تھا۔ آپ نہیں آئے تو اس ڈر سے کہ کہیں میڈم میرے لیٹ ہوئے پر عارض نہ ہو جائیں، خود ہی ڈانٹنگ روم کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔“

”میں آ ہی رہا تھا۔ چلیں خیر، اچھا ہوا آپ آگئے۔“

میڈم کھانے پر آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔“ اس نے عام سے لہجے میں جواب دیتے ہوئے اسے ڈانٹنگ روم میں داخل ہونے کا اشارہ کیا۔ اندر سے اچھے ہوئے ہونے کے باوجود سجاد نے چہرے کے تاثرات کو داخل رکھا اور سر کا ہل سی جنبش دیتے ہوئے ڈانٹنگ روم میں داخل ہو گیا۔

”گڈ اینٹک۔“ رادھا نے اپنی خوبصورت مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ بالوں کو پانی کی

”ایزیدوش۔ میں نے تمہیں بتا دیا ہے کہ تم جب راجا ہو گے ہو جائے گا۔ تم یہاں اصل میں میرے نہیں، گرو جی کے مہمان ہو اور گرو جی کے مہمان کی کوئی اچھا پوری کرنے سے میں انکار نہیں کر سکتی۔“ اس کے الفاظ سے کاہر تھا کہ وہ سادھو سے خصوصی لگاؤ رکھتی ہے۔

”تھینک یو۔“ اس کے پاس ایک بار پھر شکر یہ ادا کرنے کے سوا کچھ کہنے کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ جن حالات میں پالی وڈ کی اس ٹاپ ہیروئن سے ملا تھا، وہ اسے اجازت نہیں دیتے تھے کہ وہ اس سے اس قسم کی کوئی گفتگو کرے جو عام طور پر اس کے مداح اس سے کرتے ہوں گے۔ ویسے بھی اسے ٹین انچ میں بھی اننگس ستاروں اور کھلاڑیوں وغیرہ سے ملنے اور بات کرنے کا کوئی شوق نہیں رہا تھا۔ وہ شخصیت کے بجائے فن سے متاثر ہونے والا بندہ تھا اور اس کے متاثر ہونے کا طریقہ کار یہ تھا کہ وہ سامنے والے کا کام دیکھ کر اس سے کچھ نہ کچھ سیکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ اپنی اس عادت کی وجہ سے ہی اس نے ہر پسند آ جانے والے کام میں اپنی ٹانگ اڑائی تھی اور کافی کچھ سیکھا تھا۔

”تھینک یو کہنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے کہا تھا کہ تم گرو جی کے مہمان ہو اور گرو جی کے مہمان کی سیدھا کرنا خود میرے لیے گرو (فر) کی بات ہے۔“ اس نے ٹینک سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے نرمی سے اسے ٹوکا اور اپنی نشست سے اٹھتے ہوئے بولی۔

”اپنی دے۔ تم آرام سے اپنا ڈزفٹ کر دو۔ مجھے کچھ کام ہے اس لیے میں تمہیں مزید ٹائم نہیں دے سکتی۔“ کالے خان تمہارا خیال رکھے گا۔“

”کالے خان! کھانے کے بعد انہیں خیال سے گرو جی کی دی ہوئی دوا میں کھلا دینا۔“ اگلے ہی وقت کالے خان کی طرف رخ کر کے دی گئی تھی۔ معاذ نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ پالی وڈ کی ٹاپ ہیروئن اپنے ٹکڑی ٹکڑی کھانے کو محض سو گھنٹہ کی فاصلے پر جبکہ اسے اپنی صحت کو بحال کرنے کے لیے ابھی خوراک کی ضرورت تھی۔ میر ہو کر کھانے کے بعد وہ کالے خان سے فرمائش کر کے کچھ دیر کے لیے لان میں چھل قدمی کرتا رہا۔ اسے بڑے گھر میں کل دو افراد رہتے تھے اور ان دو افراد کی حیثیت و تعلق کا وہ یقین نہیں کر سکا تھا۔ چھل قدمی کرتے ہوئے اسے گھر کی حفاظت پر متنبہ رکھنے والی گارڈ نظر آتے رہے۔ وہ سب پوری طرح چوکس تھے لیکن رہائی جیسے دور رہ کر ہی اپنا فریڈ انجام دے رہے تھے۔ جیتا انہیں

نیک اہانت دی گئی تھی۔

”یہ دوا پی لیجیے۔“ وہ چھل قدمی کے بعد اندر آ گیا تو کالے خان نے پانی کے گلاس کے ساتھ اسے دوا پیش کی۔ اس پل اسے شدت سے روی کی یاد آئی۔ وہ چھوٹا لڑکا اسے بڑے غلوں سے دوا کھلاتا تھا۔

”اور کوئی کام؟“ اس کے دوا کھالنے کے بعد کالے خان نے اس سے پوچھا۔

”نہیں، بس اب آپ جہاں ملو آرام کریں۔“ اس نے کالے خان کو جانے کی اجازت دی اور خود دی وی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس ایل ای ڈی ٹی وی پر اس کی پہلے بھی نظر پڑی تھی لیکن کھولنے کا خیال ابھی آیا تھا۔ فی الحال وہاں کمرشل چل رہے تھے۔ ریوٹ کے جن دبا کر جیتل پر چیتل بدلتے اس کی آنکھیاں سناچار (خبردار) کے آغاز پر ہی ساکت ہو گئیں۔

کلی ہی خبر نہایت سنسنی خیز اور چونکا دینے والی تھی۔ دو پاکستانی جاسوسوں اور دہشت گردوں کی مبینہ فرار کے موقع پر پکڑے جانے کی اطلاع دی جا رہی تھی۔ خبر کے ساتھ ہی جب اسکرین پر انٹروپول بھارتی میڈیا دہشت گردوں کی تصویریں دکھائی گئیں تو اس کے ہاتھ سے ریوٹ گر گیا اور وہ بے ساختہ ہی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

☆☆☆

”آپ نے ناقص ٹھیک سے نہیں کیا۔ اگر کسی اور چیز کی خواہش ہے تو بتادیں۔ کک بکن میں موجود ہے۔ میں اس سے آپ کی پسند کا ناقص بنوا دوں گا۔“ اس کی رات غائبے خطر اب میں گزری تھی۔ ایک طرف اپنے گھروالوں کی فکر تھی تو دوسری طرف عالم شاد کو اس کے خادم سرمد سمیت گرفتار دیکھ کر طبیعت بے چین ہو گئی تھی۔ خبروں میں جس طرح ان پر قائل، دہشت گرد اور جاسوس ہونے کے الزامات لگائے جا رہے تھے اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ بہت بری طرح پھنس چکے ہیں۔ وہ کن حالات کے تحت ہیں چکر میں پھنس گئے تھے۔ یہ تو وہ نہیں جانتا تھا لیکن اتنا یقین ضرور تھا کہ وہ بے قصور تھے اور انہیں اس معاملے میں پھنسا یا گیا تھا۔

”رات کو ذرا زیادہ ڈٹ کر کھالیا تھا اس لیے اس وقت کچھ کھانے کی خواہش نہیں۔“ اس نے ناشتے کی بھری ہوئی خیر پڑ سے صرف ایک سلاخ اٹھائی اور چائے کا کپ اپنے منہ سے نیچے اتار دیا اور اب کالے خان کو اس کم خوراک کی جوبیل پیش کر رہا تھا۔

انتباہ

ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی جانب سے تنبیہ کی جاتی ہے کہ جو ویب سائٹس ہمارے ادارے کا نام لے کر "آئیٹیل ویج" کی اصطلاح استعمال کر رہی ہیں ان سائٹس سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں، اسے فوری ترک کیا جائے تاکہ ہمارے معزز قارئین کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ ایسی تمام ویب سائٹس اور سوشل میڈیا گروپس کو مرتب کرنے والے منظمین جو اپنے سطحی مفادات کی خاطر ادارے سے شائع ہونے والے مہتمموں کے مضامین، افسانے اور کہانیاں بلا اختیار اور غیر قانونی طور پر آپ لوڈ کر کے ادارے کو عظیم مالی نقصان پہنچانے کے ساتھ ادارے کی ساکھ متاثر کر رہے ہیں، انہیں خبردار کیا جاتا ہے کہ اس قبیح فعل کو فوری ترک کر دیں، بصورت دیگر ادارہ، سائبر کرائمز کے قانون

PREVENTION OF ELECTRONIC CRIMES ACT 2016

اور

COPYRIGHT ORDINANCE 1962/2000

کے تحت کسی بھی قسم کی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔ ایف آئی اے اور دیگر متعلقہ اداروں میں بھی ان افراد/اداروں کے خلاف شکایات درج کرائی جائیں گی۔

جاسوسی ڈائجسٹ، سائبر سائنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیئر II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35804200-35804300

”ٹھیک ہے، تھوڑی دیر بعد میں آپ کے لیے جس لے آؤں گا۔ میڈم نے آپ کے کھانے پینے کا خاص خیال رکھنے کی تاکید کی ہے۔ جلدی رکھو ری کے لیے آپ کا اچھی غذا ایسا ضروری ہے۔“

”میڈم کہاں ہیں؟ وہ ناشتے کے لیے نہیں آئیں؟“
کالے خان کی بات سن کر وہ بے ساختہ ہی اس سے پوچھ بیٹھا۔
”میڈم کی اپنی روٹھیں ہے۔ وہ اسی کے حساب سے چلتی ہیں اس لیے ان کے لیے ہر کھانے پر آپ کو کچنی دینا ممکن نہیں ہے۔“ کالے خان کے سپاٹ سے لہجے میں دے دے جواب پر وہ جھینپ سا گیا۔ واقعی اتنی بڑی ہیر و من کے پاس اتنا وقت کہاں تھا کہ وہ دن رات اس کی میزبانی کے فرائض انجام دیتی رہے۔

”میڈم نے مجھے آپ کا خیال رکھنے کی خصوصی تاکید کی ہے۔ آئی ہوپ کہ آپ بنا جھک مجھے اپنی ہر ضرورت سے آگاہ کرتے رہیں گے۔“ اس کا بھیچنا محسوس کر کے کالے خان نے گویا اس کی دلجوئی کی کوشش کی۔
”جی بالکل۔“ اس نے مختصر جواب دیتے ہوئے کرسی چھوڑ دی۔

”میری مشرا سے بات ہوگئی تھی۔ وہ پانچ دس منٹ میں پہنچتا ہی ہوگا۔ آپ اس دوران دوا لیں دفیور لے لیں۔ مشرا کے آتے ہی میں اسے سیدھا آپ کے کمرے میں لے آؤں گا۔“

”اوکے۔“ اس نے کالے خان کی دی اطلاع پر سر ہلایا اور اپنے لیے مخصوص کمرے کی طرف چل پڑا۔ رات کے مقابلے میں اس وقت گھر میں چاہل پہل نظر آرہی تھی۔ اس نے دو ملازماؤں کو گھر کی صفائی ستھرائی کرتے اپنی آنکھوں سے دیکھا جبکہ کچن میں لگ کی موجودگی کی اطلاع خود کالے خان نے دی تھی۔

کمرے میں آکر اس نے سادھوی دی ہوئی دوا کھائی۔ تلخ ذائقے والی اس دوا کے جلدی اثر کا وہ قائل ہو چکا تھا۔ سب سے زخمی حالت کے باوجود وہ بہت تیزی سے صحت یاب ہو رہا تھا اور اب تو زخموں پر مرہم کا لپ لپ کرنے کی بھی ضرورت نہیں رہی تھی۔ دوا کھانے کے بعد وہ بونہی چل قدمی کرتا ہوا کچر کی طرف چلا گیا اور پردہ ہٹا کر باہر مہانگہ کھڑکی سے لان کے خوبصورت منظر کے ساتھ ساتھ مین گیٹ بھی دکھائی دے رہا تھا۔ لان میں مالی ایک چھوٹے لڑکے کو ساتھ لگائے سمجھتی سے مصروف تھا۔ لڑکا چھوٹوں کو پانی دے رہا تھا جبکہ مالی ان کی کاٹ مہانت میں مصروف

تھا۔ کارڈز بھی اپنی ڈیوٹی میں مصروف تھے۔ وہ پردہ چھوڑ کر اپنی جگہ پر آ بیٹھا۔ عجیب غیر عینی سے حالات تھے اور وہ انجمن میں جتنا نہیں بھی دل لگانے سے قاصر تھا۔

”میری سٹائش میں ناکامی کے بعد سونپا کا اگلا قدم کیا ہوگا؟“ اس نے خود سے وہ سوال کیا جس کے جواب میں دل و دماغ میں بہت سے اندیشے سر اٹھانے لگے۔ ہنر کام کی تہل نے اسے ان اندیشوں پر زیادہ دیر سوچنے کی سہلت نہیں دی۔

”مشرا آگیا ہے جاب! کہا میں اسے آپ کے کمرے میں لے آؤں؟“ وہ کالے خان تھا اور اس سے اجازت طلب کر رہا تھا۔

”بالکل لے آؤ۔ میں اس کا مختصر ہوں۔“ اس نے بے قراری سے جواب دیا۔ کچھ ہی لمحوں بعد کالے خان ایک تفریحی ساڑھے پانچ فٹ کے دبے پتلے لڑکے کے ساتھ اس کے کمرے میں موجود تھا۔ لڑکے کا رنگ سانولا تھا اور سر کے بڑھے ہوئے بال ٹھنڈے ہونے کے باعث گھوں کی کھل میں دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے اپنے سونے فیشوں کی بینک کے پیچھے سے اس پر ایک سرسری نظر ڈالی اور بھل میں دبا ہوا بڑا سا سیاہ بیگ بستر پر رکھ کر اسے کھولنے لگا۔

”کال کس نمبر پر کرنا ہے؟“ بیگ سے لپٹاپ اور کچھ دیگر متعلقہ چیزیں برآمد کر کے انہیں ترتیب دیتے ہوئے اس نے بطور خاص کسی کو مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا۔ جواب میں معاذ نے اسے پیچھے کے گھر کا نمبر بتا دیا اور ذرا اضطراب سے پوچھا۔

”یہ کال ٹریس تو نہیں ہوگی نا؟“
”کال ٹریس نہ ہو اسی لیے مجھے یہاں بلایا گیا ہے۔“ لپٹاپ کی اسکرین پر نظر میں جمائے ہوئے اس نے تنہائی سے جواب دیا۔

”کیا ہم اس کال کے لیے وائس چیٹر استعمال کر سکتے ہیں؟“ اس کال کو غیر منطوق رکھنے کے لیے اس کے ذہن نے ایک لمحہ قبل طے کر لیا تھا اسی لیے اس نے پوچھا۔

”بالکل کر سکتے ہیں۔ میرے پاس ایسا انڈوسٹ ہے کہ سنیل شیٹھی بولے تو سننے والے کو شلیا ٹیٹھی کی آواز سنائی دے۔“ وہ بہت پُر اعتماد تھا۔

”بس مجھے یہی چاہیے۔ میں لڑکی کی آواز میں بات کرنا چاہتا ہوں۔“ وہ بے جوش ہوا۔

”تو جانے گی۔“ جس نے اطمینان سے کہا اور اپنے کام میں مصروف رہا۔ اس کی لمبی انگلیاں جس تیزی سے

سلسل کی بورڈ پر متحرک تھیں اس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے اپنے کام میں مہارت حاصل ہے اور یہی مہارت اتحاد میں کراس کے روپے سے جھلک رہی تھی۔

”اگر آپ ریڈی کی ہیں تو میں کال ملاؤں؟“ کچھ دیر کی مصروفیت کے بعد اس نے محاذ کی طرف ذرا سارخ پھیر کر اس سے دریافت کیا۔

”میں ریڈی ہوں۔“ جواب دیتے ہوئے اس کا دل تیزی سے دھوک رہا تھا۔ ایک طرف اتنے دلوں بعد انہوں سے بات کرنے کی خوشی تھی تو دوسری طرف یہ خوف کہ جانے وہاں سے کیا سننے کو مل جائے۔

”نیل جا رہی ہے، آپ بات کیجیے۔ اگر کوئی پرابلم ہو تو میں باہری موجود ہوں۔ آپ مجھے بلا لیجیے گا۔“ تھیرل جانے پر وہ اس سے کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ کالے خان بھی اس کے پیچھے تھا۔ ان کے اس طرز عمل پر محاذ نے دل ہی دل میں ان کا شکریہ ادا کیا۔ تنہائی میں وہ زیادہ بہتر طور پر اور کھل کر گفتگو کر سکتا تھا۔

”ہیلو، السلام علیکم!“ دوسری طرف سے کال ریسیو کر لی گئی۔ کال ریسیو کرنے والی ٹوپیہ تھی۔ اس کی آواز سن کر اس نے اپنے دل کو عجیب سی کیفیت میں محسوس کیا۔ اپنی اس خبر پر اور قاطع پھوپھی زاد کزن سے اس کی خاصی ذہنی ہم آہنگی تھی۔ باقی گھر والے بھی اسے پسند کرتے تھے اور اسے اس کے مستقبل کی سچی کی حیثیت سے دیکھتے تھے تاہم خود اس نے اس سلسلے میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا تھا۔

”ہیلو، کون بات کر رہا ہے؟“ لائن پر خاموشی پا کر ٹوپیہ نے اٹھے ہوئے انداز میں سوال کیا۔

”السلام علیکم امی، وہ میں انم!“ اس نے خود کو سنبھالا اور حلق میں پھنسی ہوئی آواز کو براہ آہ کر کے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں منگھو کا آواز کیا۔

”انم بول رہی ہو کراچی سے؟“ ٹوپیہ نے استفسار کیا۔ ”جی۔“ اس نے یک لفظی تصدیق کی۔ انم، علیہ کی نسب سے قریبی سہیلی تھی اور اس سے گھر والوں کے ساتھ ساتھ تمام قریبی رشتے دار بھی واقف تھے۔

”کیسی ہو انم؟ بڑے عرصے بعد فال کی؟“ ٹوپیہ کے الفاظ سے ظاہر تھا کہ انم لاہور میں بھی کسی حد تک علیہ سے رابطہ رکھے ہوئے تھی۔

”جی، خدا مصروفیت تھی۔ آپ سنا میں سب کچھ ہیں؟ علیہ سے بات ہو چکی ہے؟“ علیہ سب سے ادا ہو گیا تھا اور یہ یقین ہونے کے بعد کہ ٹوپیہ کو اس کی آواز ملا کی آواز

عی محسوس ہو رہی ہے، زیادہ احتیاط سے بات کر رہا تھا۔ ”علیہ تو نہیں ہے انم۔“ جواب دیتے ہوئے ٹوپیہ کے لہجے میں کچھ عجیب سی بات تھی۔ محاذ کا ماتھا ٹھکا لیکن لہجہ کو نارمل رکھتے ہوئے آہستہ سے بولا۔

”علیہ نہیں ہے تو آپ میری انگلی سے عی بات کر داریں۔ میں ان سے عی سلام دعا کر لوں گی۔“ ”وہ بھی نہیں ہیں۔“ انھیں وہ دونوں ایک ساتھ عی غائب ہیں۔“

”کیا مطلب غائب ہیں؟ سب ٹھیک تو ہے نا ٹوپیہ آئی؟“ اس بار ٹوپیہ کے الفاظ بھی چونکا دینے والے تھے۔ اس نے یہ مشکل انم کا کردار نبھاتے ہوئے بے چینی سے دریافت کیا۔

”واقع طور پر کچھ نہیں کیا جاسکتا انم۔ ماموں اور علیہ بغیر اطلاع دے چکا تھا عی کہیں چلے گئے ہیں۔ ہم نے تمام رشتے داروں اور جان بچکان کے لوگوں سے ان کے بارے میں معلوم کیا ہے لیکن ان کا کچھ پتا نہیں چلا۔ میں اور سارے گھر والے ان کے لیے بہت پریشان ہیں۔“ ٹوپیہ کی دی اطلاع نے اس کے ہاتھ پیروں سے جان نکال لی۔

”کیا مطلب؟ کہیں چلے گئے ہیں؟ وہ ایسے کیسے کہیں جاسکتے ہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ جو لوگ اتنے دلوں سے انہیں نگ کر رہے تھے انہوں نے عی انہیں غائب کر دیا ہے؟“ اس وقت اسے اتنا ہوش نہیں تھا کہ اپنے لہجے کی تیزی کو قابو میں رکھ سکتا اس لیے تقریباً چلاتے ہوئے بولا۔

”ایسی بات نہیں ہے انم! میں نے ہور بھائی نے بہت فحشہ سے دماغ سے اس معاملے کو دیکھا ہے۔ غائب ہونے سے پہلے وہ دونوں کچھ چپ چپ اور کسی سوچ میں گم دکھائی دیتے تھے۔ بعد میں عی لینے پر ہم نے ان کے شاختی کاغذات اور کچھ ذاتی استعمال کی چھوٹی سولی اشیا کو بھی غیر موجود پایا۔ سب سے اہم بات یہ کہ سبھی اسی تاریخ سے اپنے اپنے ہاسٹل سے غائب ہے اور اس کے معاملے میں بھی زبردستی کے کوئی آثار نہیں پائے گئے۔“ اس کے لہجے کی تیزی کے باوجود ٹوپیہ نے بڑے رومان سے جواب دیا۔

”مگر وہ لوگ ایسے کیسے کہیں جاسکتے ہیں؟ آئی؟ ان کے پاس کوئی ٹھکانا نہیں تھا جب عی تو وہ سب کچھ گاڑ چھاڑ کر؟ نہ لوگوں کے پاس آگئے تھے۔“ اس نے کسی حد تک خود پر قابو پایا اور لہجہ کو دھیمہ کرتے ہوئے چڑبان انم اپنی

ابھن کو بیان کیا۔

”اس سوال کا تو ہمارے پاس بھی کوئی ٹھوس جواب نہیں ہے۔ بس ایک خیال سا آتا ہے کہ شاید معاذ نے ان سے کوئی رابطہ کیا ہو اور وہ اس کے کہنے پر خاموشی سے یہاں سے چلے گئے ہوں۔“

”معاذ بھائی کیسے رابطہ کر سکتے ہیں؟ علیحدہ نے بتایا تھا کہ وہ کسی کی قید میں ہیں۔“ اس نے ثوبیہ کے خیال کو رد کیا۔
”تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن بس ایک امکان سا دیکھنا میں آتا تھا۔ ہو سکتا ہے معاذ کے بھائی کسی اور جگہ لے آئے ہوں۔“

”ہونے کو تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ سب اس وقت دشمن کی قید میں ہوں اور معاذ بھائی کو بلیک میل کرنے کے لیے انہیں تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہو۔“ جن حالات میں وہ اپنے گمراہوں کے غیاب کی اطلاع سن رہا تھا، وہ اس کے لیے بہت تشویشناک تھے اس لیے ثوبیہ کی قیاس آرائیوں پر چڑسا گیا تھا۔

”ایسا نہیں ہو سکتا اہم! وہ لوگ تو خود انہیں تلاش کر رہے ہیں۔ ان لوگوں کے غیاب کی اگلی ہی رات ہم سب گھر والوں کو ہمارے ہی گھر میں پریشان بنا کر ہم سے ان کے بارے میں پوچھ گچھ کی گئی تھی اور اب بھی ہم محسوس کرتے ہیں کہ گھر سے باہر ہماری مسلسل نگرانی کی جا رہی ہے۔“

وہ اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ اسے ثوبیہ کے چائیک ہی بچھ جانے والے لہجے نے زیادہ تکلیف دی ہے یا اس خبر نے جو اس نے ابھی سنی تھی۔

”کیا ان لوگوں نے آپ لوگوں کو تشدد کا نشانہ بھی بنایا تھا؟“ سوال کرتے ہوئے اس کی آواز کانپ سی گئی۔

”جب پوچھ گچھ کرنے والے اپنے مطلب کے جواب نہ حاصل کر سکیں تو ان کا اگلا قدم تشدد ہی ہوتا ہے۔“ ثوبیہ کے جواب نے اس کی تکلیف میں اضافہ کیا۔

”آئی ایم سوری۔“ ہے سائنسہ ہی اس کے لبوں سے پھلا۔

”اُس اوکے۔“ کچھ لوگ اسے عزیز ہوتے ہیں کہ ان کے لیے تکلیف اٹھانا بھی برا نہیں لگتا۔ تمہیں ایک بات بتاؤں؟ کل رات میں نے معاذ کو خواب میں دیکھا۔ وہ کسی جہری بھری جگہ پر پھیل قیدی کر رہا تھا اور اسے دیکھ کر یوں لگ رہا تھا کہ وہ کوئی بڑی بیماری پھیل کر صحت یاب ہوا ہے۔ بس میرے دل کو کچھ دلیہ چھو رہا ہو گیا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ٹھیک ہے تو باقی سب کچھ بھی

ان شاء اللہ ایک دن ٹھیک ہو جائے گا۔“ ثوبیہ کے الفاظ اسے سن کر گھٹے۔ اس کا وجد ان اسے ہمیشہ اس کے بارے میں صحیح خبر دیتا تھا۔

”خیر تم مطمئن رہو۔ ہم نے علیحدہ، ماسوں اور سحر کے غیاب کی رپورٹ تھانے میں درج کر دادی ہے اور خود بھی ان کی تلاش کے لیے جو کچھ کر سکتے ہیں، وہ کر رہے ہیں۔ تم بس اپنی دعاؤں میں سب کو یاد رکھنا۔“ اس کی طرف سے خاموشی پا کر ثوبیہ اپنے غصوں نرم لہجے میں اس سے مخاطب ہوئی۔

”وہ لوگ کس تاریخ سے قاسب ہیں؟“ یہ ایک ہیسا تکنیکی سوال تھا جو اسے بہت دیر میں کرنے کا خیال آیا تھا۔ جواب میں اسے ثوبیہ نے جو تاریخ بتائی، اسے سن کر وہ ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ یہ اس سے ایک دن پہلے کی تاریخ تھی جب وہ سونا کے ٹپے سے نکل کر سادھوی کنیا میں پہنچا تھا۔ یعنی وہ لوگ وہاں کسی انتہائی کارروائی کے نتیجے میں غائب نہیں کیے گئے تھے اور ثوبیہ کے اندازے کے مطابق اپنی مرضی سے نہیں گئے تھے۔

”اچھا، اب اجازت دیجیے آپلی۔ میں نے آپ کا بہت زیادہ وقت لے لیا ہے۔ امید ہے آپ نے میری کئی بات کا برا نہیں مانا ہوگا۔“ اسے اندازہ تھا کہ وہ اس گفتگو میں کچھ مقامات پر تلخ ہو گیا تھا اور یہ سبھی علیحدہ کی دوست کی حیثیت سے بات کرتے ہوئے بھی نہیں تھی اس لیے کال ٹم کرنے سے پہلے ثوبیہ سے معذرت چاہی۔

”اُس اوکے اہم! میں نے کئی بات کا برا نہیں مانا۔ مجھے تو تمہاری اپنائیت نے خوشی دی ہے۔ انسان انہوں ہی سے تو اس انداز میں بات کرتا ہے۔“ ثوبیہ کا لہجہ کچھ معنی خیز تھا۔

”ٹھیک ہو آپلی لیکن پھر بھی اگر آپ کو میری کوئی بات بری لگی ہو تو آئی ایم سوری۔“ وہ بہ خرابی اہم کا کرہ ہمارا ہوا تھا۔
”برا ہی نہیں مانا تو سوری کس بات کی۔“ ثوبیہ دیرے سے فنی پھر پکارنے والے انداز میں ہوئی۔

”اچھا، بات سنو۔ ہو سکے تو کال کرنی رہتا۔ کیا چا کسی دن ہم ایک دوسرے کو کوئی اچھی خبر سن سکیں۔ میں تمہیں بتاؤں کہ یہاں سب معمول پر ہے اور تم مجھے احلاص دو کہ تمہاری ساری مجبوریوں ختم ہو گئی ہیں اور اب ہم جلد تم سے ملاقات کر سکیں گے۔“ ثوبیہ کے الفاظ اور لہجے کی جذباتیت نے ایک نئی کڑی اسے سانس لینا بھلا دیا۔ وہ اس بات کو لے کر خوش تھی کہ اسے یہ خبر مل سکی تھی۔

”کیا اس نے جان لیا ہے کہ یہ میں ہوں؟“ اس نے



مکے باز

زندگی میں ہاریت کا مکمل جاری رہتا ہے
کھیل اور زندگی دونوں میں ہمارا اس کا مقدر رہی
رہی تھی۔ ایک کے بازی نہ ہونی داستان
ظاہر جاوید مغل کے قلم سے
شعلہ ان

بے بسی کے اندھیراں میں ڈھکی لڑکی کی
دردناک داستان حیات

روبینہ رشید - قلم کی جادوگری
الاف

سبوں کے بھیس میں شاعر مجرموں کا کھیل
زندہ انسانوں کے لیے دیکھتے لڑاؤ کی صورت موت تیار
کی جاری تھی ذاکٹر عبدالرب بھٹی
کے قلم سے نیا منشی خج سلسلہ

سردق کی رنگ

پہلا رنگ

رنگ لاتا ہے شبیدوں کا ابو
وطن دشمن اپنوں کی حسیلہ ساریاں

دوسرا رنگ

اس شخص کی کتاب جسے اپنے قلم سے شہید
خواہش تھی۔ سردق کی قیس کی کہانی

جینی انگہ جینی

قلم کے تھپتھپے شور سے... جھپٹتی...
کھا... اور کئی نئی دلچسپ باتیں... کتنا نہیں

خود سے پوچھا۔
"ہیلو انکم اکیا تم لائن پر ہو؟" اس کی خاموشی پر ٹوپی
نے بے چمن ہو کر پوچھا۔

"جی، لیکن اب مجھے اجازت دیجیے۔ میں کوشش
کروں گی کہ دوبارہ آپ کو کال کر سکوں۔" کھوئے کھوئے
لہجے میں ٹوپی کو جواب دے کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا اور
خود سر قلم کر بیٹھ گیا۔ ان عجیبہ حالات کے مطابق کوئی لاکھ
عمل طے کرنا آسان نہیں تھا۔

☆☆☆

شیشے کے الگ الگ جیمبرز میں مقید وہ ایک دوسرے
کو بے بسی سے دیکھ رہے تھے۔ ان دونوں کے درمیان
مالک اور نوکر کا رشتہ تھا لیکن اس وقت تو مالک، نوکر کو کوئی
سمجھت دینے کی پوزیشن میں تھا اور نہ ہی نوکر، مالک کے
لے کوئی خدمت بھالا سکتا تھا۔ یہ سلیپٹر رول جیمبرز اسے محض
تھے کہ وہ ان میں کھڑے ہونے کے سوا کچھ انکڑوں ہو کر
بیٹھ سکتے تھے۔ کئی گھنٹوں تک کھڑے رہنے کے باعث بری
طرح دکھ جانے والے چروں کو اس پوزیشن میں بیٹھ کر آرام
دینے کی کوشش کارگر ثابت نہیں ہوئی تھی اس لیے انہیں مجبوراً
ایک بار پھر کھڑا ہونا پڑا تھا اور اب وہ کمرے کے واحد
دروازے کو گاہے بگاہے دیکھتے کھنکھاتے تھے کہ عیاد آئے تو
بات کچھ آگے چلے۔ یہاں تو وہ ایک دوسرے سے بھی بات
کرنے سے قاصر تھے کہ شیشے کے ان جیمبرز سے آواز باہر
ہی نہیں جاتی تھی۔

"اگر ان لوگوں نے ہماری گرفتاری کی خبر میڈیا پر
دے دی ہوگی تو بات پاکستان تک چلی گئی ہوگی۔ وہاں
اماں، بابا سا میں اور دوسرے سب لوگ بہت پریشان ہوں
گے۔" شیشے کی دیوار سے ٹک ٹک کر اس نے جسم کا سارا بوجھ
دائیں ٹانگ پر منتقل کرتے ہوئے بائیں ٹانگ کو اٹھا کر شیشے
پر ٹکایا اور کئی بار کی سوچا ہوئی بات ایک بار پھر سوچی۔ حقیقتاً
اس طرح کھڑے ہونے اتنا زیادہ وقت گزر گیا تھا کہ اپنا ہی
بوجھ اٹھانا مشکل ہو گیا تھا۔ اگر وہاں گرنے کی گنجائش ہوئی
تو وہ لوگ اب تک شاید زحیر ہو چکے ہوتے۔

"بابا سا میں یقیناً اعلیٰ حکام سے رابطے کر رہے ہوں
گے۔ معلوم نہیں پاکستانی حکومت ہماری رہائی کے لیے کچھ
کر بھی سکے گی یا نہیں۔ پاکستانیوں کے بارے میں تو وہ بے
ہی بھارتی حکومت کا رویہ بہت حسیانہ ہے۔ وہ تو مونیخ
دھوڑتے ہیں کہ کسی شہر میں جیل راج میں جلاوطن کر سکیں۔"
اس قید میں جتنی تکلیفیں اٹھانا پڑ رہی تھیں، ان میں اندیشے

اس سے بھی نکلتا آگے کے پیدا ہو رہے تھے۔

"یہ ٹھنڈک کیسی ہے؟" سوچوں میں گھرے اسے احساس ہوا کہ شیشے کی دیوار جس سے اس نے اپنا سر اور چہرہ لٹا رکھی ہے، بتدریج ٹھنڈی ہوتی جا رہی ہے۔ ذرا سی دیر میں یہ ٹھنڈک اتنی بڑھ گئی کہ اس کے لیے شیشے سے ٹک لگا کر کھڑے رہنا ممکن نہیں رہا۔ سیدھے کھڑے ہوتے ہوئے اس نے سرہ کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بھی پریشانی کے آثار تھے، یعنی اس کے جیمبر میں بھی کوئی تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔

"یہ عجیبیت ہمارے ساتھ کون سا نیا کھیل، کھیل رہی ہے ہیں؟" چند منٹوں میں ہی جیمبر میں ٹھنڈک اتنی بڑھ گئی کہ اس نے اپنے جسم میں کھپکی سی محسوس کرنا شروع کر دی۔ اس کے برخلاف سرہ کے جسم سے پسینا پھوٹ پڑا تھا اور اپنے ہی پسینے میں نہایا وہ یوں بار بار اپنے سر اور ہاتھ ہاتھ جیسے اس کے لیے بیروں کو بچنے لگانے رکھتا مشکل ہو رہا ہو۔

"اس تشدد کے ذریعے یہ ہمارے اعصاب کو توڑنا چاہتے ہیں۔" ٹھنڈک مزید بڑھ گئی تھی اور اب وہ اکڑوں بیٹھا ہوا اپنے ہاتھوں کو اپنے جسم کے گرد لپیٹ کر سردی کے احساس کو کم کرنے کی کوشش کر رہا ہوا اس کھیل کی بنیاد کو سمجھ رہا تھا۔ سرہ کی حالت اس سے بھی زیادہ غصہ تھی اور وہ پیسے میں نہایا مشکل اچھل کود کر رہا تھا۔

"سرد جنم۔" ہڈیوں کے گودے تک میں اترتی ٹھنڈک کو محسوس کرتے ہوئے اس نے اس عذاب کے بارے میں سوچا اور اپنے چہرے کو گھٹنوں میں چھپا کر ٹھنڈک سے من ہو جانے والی ناک اور رخساروں کو حرارت پہنچانے کی کوشش کی لیکن وہاں حرارت تھی ہی کہاں؟ اس کے دل میں بے اختیار ہی خواہش پیدا ہوئی کہ کچھ دیر کے لیے سرہ والے جیمبر میں جانے کا موقع مل جائے تو وہ اپنے برف ہوتے جسم کو تھوڑی سی حرارت پہنچا سکے۔ سر کو پہ مشکل گھٹنوں پر سے اٹھاتے ہوئے اس نے سرہ کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی آواز نہیں سن سکتا تھا لیکن اس کے کپلے ہوئے منہ کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ تکلیف سے گھبرا کر جھپٹیں مار رہا ہے۔

اسی مل اسے اس بات کا ادراک ہوا کہ خود اس کے منہ سے بھی عجیب و غریب آوازیں نکلی رہی ہیں۔ ٹھنڈک ناقابل برداشت ہو گئی تھی۔ اس کے سینے کا بندھن ٹوٹ گیا۔ بنا سوچے سمجھے اس نے پہلی گالی دشا کو دی اور اس کے جسم بھارتی پر گئیں۔ راء آری سب کو ایک سے بڑھ کر ٹھنڈک چھو

گالی دیتا چلا گیا۔ غصے کی آگ نے اس سرد جنم کے درجہ حرارت پر کوئی اثر نہیں ڈالا اور وہ پہلے سے بھی بڑھ کر ٹھنڈا ہوتا چلا گیا۔ آخر کار اس کی برداشت جراب دے گئی اور من ہوتے اعصاب کے ساتھ اس کی گردن ڈھلک گئی۔ بے ہوش ہونے سے قبل اس کی نظر سرہ پر پڑی تھی۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور خشک زبان منہ سے باہر نکل رہی تھی۔ وہ بے ہوش نہیں بھی ہوا تھا تو بے ہوش ہونے کے قریب تھا۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو وہ لوگ اس سلیپٹر رٹا جیمبر کے بٹھائے ایک اسٹریچر پر لیٹے ہوئے تھے اور ان کے جسم اسٹریچر سے خشک چوڑے کے تسوں سے بندھے ہوئے تھے۔ عالم شاہ نے گردن سوڑ کر سرہ کا جائزہ لیا۔ اس کی جلد سرخ ہو رہی تھی اور کہیں کہیں سے جھلسی ہوئی بھی تھی۔ وہ شاید ابھی پوری طرح ہوش میں نہیں آیا تھا اور نیم بے ہوشی میں ہی آہستہ آہستہ کراہ رہا تھا۔ اس کے مقابلے میں اس نے خود کو قدرے بہتر محسوس کیا۔ ٹھنڈک کے عذاب نے اسے بس اس حد تک متاثر کیا تھا کہ وہ کہیں کہیں اپنی جلد پر جلن سی محسوس کر رہا تھا۔ یہ دیکھی ہی جلن بھی جو شدید سردی کے باعث جلد کے چھٹ جانے سے محسوس ہوتی ہے۔

"سرہ! سرہ! اٹھو۔" اس نے اپنی جگہ پر بٹے پڑے ہی سرہ کو پکارا۔ پہلی پکار پر تو وہ متوجہ نہیں ہوا لیکن دو تین بار پکارنے پر اس کی طرف سے رد عمل ظاہر ہوا اور اس نے کراہتا بند کر کے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔

"سرہ! یہاں ادھر میری طرف دیکھو۔" سرہ کہنے کو ملازم تھا لیکن اس کی جاں نثاری اتنی قابل قدر تھی کہ وہ اس کی حالت دیکھ کر اپنے دل میں ایک تڑپ سی محسوس کر رہا تھا۔

"سامی۔۔۔" اس کی پکار نے سرہ کی خالی ذالی آنکھوں میں تحریک پیدا کی اور وہ اسے پہچان کر آہستہ سے بولا۔

"کیا حال ہے سرہ؟" اس نے دردمندی سے پوچھا۔ "تھوڑی سی تکلیف ہے پر آپ مجھے پھوڑیں اور اپنا حال بتائیں۔ آپ تو ٹھیک ہیں نا؟" وہ اس حال میں بھی خود سے زیادہ اس کے لیے شکرت تھا۔

"میں تم سے بہت بہتر ہوں۔" اس نے اسے تسلی دی۔ "مجھے کچھ بے لوگ ہم سے کیا چھوڑا ہے؟ بلاوجہ سنی کے کل کا الزام ہمارے سر چھوڑنے سے انہیں آخر کیا ملے گا؟" لدا کا الزام لگا رہی ہے تو ہمیں حدالت میں بیٹھ کر کریں تاکہ

ہم وہاں اپنی صفائی پیش کر سکیں۔" سرد کا بھیا ہوا لہجہ گراہ تھا کہ وہ خاصی تکلیف میں ہے۔

"میں اس معاملے کو سنیل کے قتل سے کہیں آگے دیکھ رہا ہوں۔ سرد اقم ذہنی طور پر بُرے سے بُرے حالات کے لیے تیار رہو۔ میرا اندازہ ہے کہ یہ لوگ حسب معمول رائل کا پھاڑ کھڑا کرنے کے موڈ میں ہیں۔ تم دیکھ لینا ابھی ہم پر بہت بڑے بڑے الزامات لگنے والے ہیں۔"

"تمہارا اندازہ بالکل ٹھیک ہے پیارے! ہم تمہیں پاکستانی جاسوس اور آنگ دہری ڈکلیئر کر چکے ہیں اور بہت جلد تم پبلک کے سامنے اپنی زبان سے اس سب کو سچ مانو گے۔" آنے والا بہت خاموشی سے اندر آیا تھا۔ وہ دونوں اس کی گفتگو میں دخل دینے پر اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

"تو تم سمجھتے ہو کہ ہم پر اس طرح تشدد کر کے تم ہم سے ہمارے وطن کے مفاد کے خلاف بیان دلوانے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔" توقع کے برخلاف آنے والا دشا نہیں تھا لیکن اس کی آنکھوں اور چہرے کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ وہ دشا کے عی قبیل کا فرد ہے اور پاکستان کی عزت اس کی گھٹی میں پڑی ہے۔

"آف کورس۔ ایسا ہی ہونا ہے۔ اگر تم نے زیادہ دیش پریمی بننے کی کوشش کی تو زیادہ تکلیف اٹھاؤ گے۔ فیصلہ تمہارے ہاتھوں میں ہے۔ جلد ہماری سکھائی ہوئی بولنے لگو گے تو کم تکلیف اٹھاؤ گے۔ دیر لگائی اور ضد پر اڑے رہے تو ایسی ایسی تکلیفیں اٹھاؤ گے جن کے بارے میں کبھی سنا بھی نہیں ہوگا۔" وہ بہت دھیمے لہجے میں انہیں دھمکا رہا تھا۔

"لیکن کیوں؟ تم زبردستی ہمارے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہو؟ ہم نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ چہا را وہ (سپیکر دشا) ہم پر جس شخص کے قتل کا الزام لگا رہا ہے وہ شخص خود دشا کے ہاتھوں قتل ہوا تھا۔ ہم تو اسے جانتے تک نہیں تھے۔ تم ہمیں کورٹ میں پیش کرو۔ ہم کورٹ سے اپیل کریں گے کہ دشا کے خلاف انکوائری کروائی جائے۔ وہ شخص پولیس کی وردی کو اپنی دوستیاں اور ذاتی تعلقات نبھانے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اس کے خلاف سخت ایکشن ہونا چاہیے۔" وہ ہنسے اور جوش میں بولنے پر آیا تو بول چلا گیا۔

"سوری! میں تمہارا یہ فراموشی پر دگرام پورا نہیں کروا سکتا۔ وہ کیا ہے؟ کد دشا ہمارا لالہ ہے اور جن کرہیں وہ دشا پیش کرتا ہے کہ ہمارا ہی جوش ہو چکا ہے۔ تو یہ اگر ہم تمہیں اس کے خلاف کہیں سلیمن کرنے کا چاہیں دے بھی

دیں تو تمہاری کہیں شنوائی نہیں ہوگی۔ وہ ہمارا پٹو ہے اور ہم اپنے پٹو کو ہر جگہ پروٹیکشن دینے کے لیے تیار رہتے ہیں۔" اس کے اندر ہنر گفتگو اور لہجے کے طاغر نے عالم شاہ کو چھٹکا یا اور اسے احساس ہوا کہ وہ شخص وہ نہیں ہے جو وہ اسے اب تک سمجھتا رہا ہے۔

"کیا تم خود پولیس ڈیپارٹمنٹ سے نہیں ہو؟" وہ اپنے اندر مہر نے والے سوال کھدک نہیں سکا۔

"نہیں۔۔۔۔۔!" وہ اگلی آواز میں جہا۔

"تم اس وقت را کی کسٹری میں ہو۔" انکشاف ہلا دینے والا تھا۔ اس نے بے ساختہ ہی رخ موڑ کر اس ساری گفتگو کے دوران خاموشی رہنے والے سرد کی طرف دیکھا۔ اس انکشاف پر اس کی آنکھوں میں بھی تشریش جھلکنے لگی تھی۔

"کیا دشا اس نہیں آیا؟ اگر ایسا ہے تو تو پر اہم۔ ایک آدھ دن میں خود ہی مان لو گے۔ تب تک کے لیے را کا گیسٹ ہونا الجوائے کرو۔" ان کے تاثرات سے لطف اندوز ہوتے ہوئے وہ ہنس کر بولا اور اچانک ہی ہاتھ لہرا کر باہر نکل گیا۔ اس کے باہر نکلتے ہی ایک قوی الجش شخص اندر داخل ہوا۔ اس شخص نے ان دونوں پر اک اچھتی ہوئی نظر ڈالی اور خدا ان کے سر کی طرف چلا گیا۔ وہ وہاں کسی کام میں مصروف ہے، یہ تو سنا کی دینے والی معمولی کھٹ پٹ سے اندازہ ہو رہا تھا لیکن کیا کر رہا تھا یہ اس وقت پتا چلا جب وہ ہاتھوں میں دو بھری ہوئی سرنگیں لے سامنے آیا۔ اس کا پہلا نشانہ سرد تھا۔ اس نے نہایت اطمینان سے سرد کے ہاتھ بازو میں سوئی داخل کر کے سرنگ میں موجود مگلول کو اس کے جسم میں منتقل کیا اور پھر یہی عمل عالم شاہ کے ساتھ دہرایا۔

سرنگ میں کیا تھا؟ زہر۔ بے ہوشی کی دوا یا کوئی اور خطرناک کیمیکل۔۔۔ وہ نہیں جانتے تھے۔ اپنے تمام تر اندیشوں کے باوجود ان دونوں میں سے کسی نے بھی اس شخص کو اس کے عمل سے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ جانتے تھے کہ یہ کوشش بے سود ہوگی۔ وہ جس بے رحم شخص کے ہتھے میں جکڑے جا چکے تھے۔ اس سے کوئی بھی ابھی توقع رکھنا عبث تھا۔ انکشن لگانے کے بعد وہ شخص جس خاموشی سے آیا تھا، اسی خاموشی سے واپس چلا گیا اور وہ دونوں خالی خالی نظروں سے جا چکے دوسرے کو سمجھتے ہوئے جیسے کا انتظار کھڑے تھے۔ خلاف توقع گلنے والے انکشن کا کوئی فوری اثر ظاہر نہیں ہوا تھا۔ پانچ چھ منٹ یونہی گزر

گئے تو ان کے سنے ہوئے اعضاء ڈھیلے پڑنے لگے۔
 آخوئیں منٹ پر وہ سوچنے لگے کہ شاید یہ کوئی نفسیاتی حربہ
 تھا جو ان پر دباؤ ڈالنے کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ اس
 سوچ نے نویں منٹ پر بیروں کے گروں میں پیدا ہونے
 والی معمولی سی جلن کو فوری طور پر محسوس نہیں ہونے دیا۔
 جلن بدتر تاج پڑھتے ہوئے ٹخنوں تک پہنچی تو دونوں نے
 ایک دوسرے کی طرف سوا لہ نظروں سے دیکھا۔ چروں
 کے تاثرات نے بتا دیا کہ دونوں طرف ایک جیسی صورت
 حال ہے۔ پھر وہ جلن تیزی سے بڑھی اور گویا جسم کے ہر
 خلیے تک پہنچ گئی۔ شدید کوشش کے باوجود ان دونوں پر
 جلد وہ لہو آ گیا جہاں ان کے لیے اپنی جینوں پر قابو پانا
 مشکل تھا۔ اپنے اپنے اسٹریچر پر پڑے وہ دونوں ہی کی
 ذرا کیے جانے والے جانور کی طرح پھڑک اور تحسپ
 رہے تھے۔ اگر ان کے جسم اسٹریچر کے ساتھ مضبوطی سے
 بندھے ہوئے نہیں ہوتے تو یقیناً وہ وہاں سے گر جاتے
 اور کمرے کے فرش پر لوٹ پوٹ ہو رہے ہوتے۔ اس
 اذیت کو سہتہ ان کے پاس کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں
 رہی تھی کہ اچھی وہ ساری حراست میں تھا۔

☆☆☆

”کچھ معلوم ہوا ان گرفتار پاکستانیوں کے بارے
 میں؟“ وہ آج پھر کھانے کی میز پر تھا اور بے دلی سے
 تفریق لگتے ہوئے اپنی خدمت پر کمر بستہ کالے خان سے یہ
 سوال کیا تھا۔

”آپ کی خواہش پر میں نے اس سلسلے میں جانکاری
 حاصل کرنے کی کوشش کی ہے اور کافی باتیں معلوم بھی ہوئی
 ہیں۔ آپ کھانے سے فارغ ہو جائیں تو پھر بتاتا ہوں۔“
 ”نہیں ابھی بتاؤ۔ میں ابھی جانا چاہتا ہوں۔“
 کالے خان کے نرم لہجے کے مقابلے میں اس کا لہجہ تلخ تھا۔
 مسلسل ذہنی پریشانیوں نے اسے یہ بات بھی بھلا دی تھی کہ
 ایک ساادھی کی خواہش پر اسے پتا نہ ہے اور ہر کھلت قرنام
 کرنے والوں پر اس کا ایسا کوئی حق نہیں ہے کہ وہ ان میں
 سے کسی سے اس لہجے میں بات کر سکے۔

”عالم شاہ اور سرہ نامی گرفتار شدہ دونوں افراد کچھ
 عرصہ قبل ہی دہلی پہنچے تھے۔ انہیں یہاں کسی رشتہ دار کی
 شادی میں شرکت کرنا تھی مگر آج کے ساتھ ہی ان کے
 ساتھ حادثات کا سلسلہ شروع ہو گیا اور ان پر پورٹ سے حملے
 جاتے ہوئے ڈاکوؤں نے ان سے ان کا جیسی سامان چھین
 لیا۔ اس سامان کے ساتھ ہی ان کے پاسپورٹ اور دوسرے

کاغذات بھی چلے گئے تھے۔ یوں پریشانی بڑھ گئی۔“
 کالے خان نے ماتھے پر شکن لائے بغیر اس کی خواہش
 پوری کرتے ہوئے بتانا شروع کیا۔
 ”انہوں نے ڈاکے کی ایف۔آئی آر کو کنواٹی ہوئی؟“
 کالے خان کی بات غور سے سنتے ہوئے اس نے سنجیدگی سے
 سوال کیا۔

”انہیں فوری طور پر اس کا موقع نہیں ملا اور
 پاکستانی مسافروں کی انکوائری کے لیے پولیس پہلے پہنچ
 گئی۔ پولیس والوں نے کسی بھی بات پر کان دھرنے بغیر
 کاغذات کی غیر موجودگی کو وجہ بنا کر دونوں کو گرفتار کر لیا۔
 ان کی گرفتاری کے بعد ان کے میزبان خیر خیر لینے تھانے
 پہنچے تو وہاں ان کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلا۔ یزدان
 اپنے طور پر بھاگ دوڑ کرتے رہے اور پھر کئی گھنٹوں کی
 خواری کے بعد وہ دونوں انہیں گھر سے کچھ فاصلے پر زخمی
 حالت میں مل گئے۔“

”یہ تو بہت عجیب سی صورت حال ہے۔ کیا واپس
 آنے پر انہوں نے بتایا تھا کہ انہیں کس نے گرفتار کیا تھا
 اور ان کا کیا مقصد تھا؟“ معاذ پہلے ہی بے دلی سے کھانا
 کھا رہا تھا۔ اب اس کی توجہ کھانے سے ہٹ گئی
 اور اس نے کالے خان کی طرف دیکھتے ہوئے حیرت
 سے پوچھا۔

”نہیں۔ وہ کوئی خاص بات نہیں بتا سکے لیکن پھر اتنا
 ضرور ہوا کہ میزبانوں نے اثر و سوغ سے کام لے کر ان کے
 کاغذات وغیرہ کی چوری کی رپورٹ لکھوادی اور وہ آرام
 سے رہنے لگے۔ گھر میں شادی کی تقریبات شروع ہو گئیں
 لیکن پھر حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ شادی نہ ہو سکی۔“
 ”ایسا کیا ہوا؟“ کالے خان کی دی گئی سنسنی خیز
 اطلاع نے اسے بے چین سا کر دیا۔

”کیا ہوا، یہ تو پتا نہیں چلی سکا۔ میرا مطلب ہے جو
 ہوا اس کا اصل کارن نہیں پتا چلا بس اوپر اوپر کی جرحانکاری
 ہے اس کے مطابق مہندی کی تقریب سے عالم شاہ اور سرہ
 کسی کو بھی کچھ بھی بتائے بغیر غائب ہو گئے اور پھر عالم شاہ
 نے اپنے کزن شکیل کو کال کر کے مہندی کی تقریب سے گھر
 واپس بلوایا۔ شکیل گھر پہنچے تو انہیں پتا چلا کہ عالم زخمی ہے۔
 انہیں نے لیڈی ڈاکٹر بھادرج سے اس کی مرہم ملنی کروائی۔
 ابھی یہ سب ہو رہا تھا کہ اطلاع ملی کہ پھر ایک لوجوان شکیل
 کے گلے کے انضمام میں عالم شاہ کو گرفتار کرنے آ رہی ہے۔
 یہاں سے آگے گھر والوں کا چلنا ہے کہ عالم اور سرہ اس

پاکیزہ سیرت

جس مقام پر اب مٹکا ڈیم واقع ہے وہاں پہلے میرپور کا پرانا شہر آباد تھا۔ جنگ کے دوران اس شہر کا بیشتر حصہ لمبے کا ڈمیر بنا ہوا تھا۔ ایک روز میں ایک مقامی افسر کو اپنی جیب میں بٹائے اس کے گرد و نواح میں گھوم رہا تھا۔ راستے میں ایک مفلوک الحال بوڑھا اور اس کی بیوی ایک گدھے کو ہانکتے ہوئے سڑک پر آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ دونوں کے کپڑے میلے گیلے اور پھنے پرانے تھے۔ دونوں کے جوتے بھی ٹوٹے پھوٹے تھے۔ انہوں نے اشارے سے ہماری جیب کدوک کر دیا۔

”بیت المال کس طرف ہے؟“ آڑو کشمیر میں سرکاری خزانے کو بیت المال کہا جاتا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”بیت المال میں تمہارا کیا کام ہے؟“

بوڑھے نے سادگی سے جواب دیا۔ ”میں نے اپنی بیوی کے ساتھ مل کر میرپور شہر کے لمبے کو کرید کر سونے اور چاندی کے زیورات کی دہلیزیاں جمع کی ہیں۔ اب انہیں اس کھوٹی پرغا کر ہم بیت المال میں جمع کروانے جا رہے ہیں۔“

ہم نے ان کا گدھا ایک پولیس کانسٹیبل کی حفاظت میں چھوڑا اور یوروں کو جیب میں رکھ کر دونوں کو اپنے ساتھ بٹھالیا تاکہ انہیں بیت المال لے جائیں۔

آج بھی جب وہ محیف و نزار اور مفلوک الحال جوڑا مجھے یاد آتا ہے تو میرا سر شرمندگی اور ندامت سے جھک جاتا ہے کہ جیب کے اندر میں ان دونوں کے برابر کیوں بیٹھا رہا۔ مجھے تو چاہیے تھا کہ میں ان کے گرد آلود پاؤں اپنی آنکھوں اور سر پر رکھ کر بیٹھوں۔ ایسے پاکیزہ سیرت لوگ بھر کہاں ملتے ہیں؟ اب انہیں وصوٹ چرائی کر دیا جائے گا۔

(قدت اللہ جالب کی کتاب ”شہاب نامہ“ سے انتخاب)
(سرکار: سلطان احمد قاسم خانی بلوچستان)

اطلاع کے بعد فرار ہو گئے اور اس کے بعد سے انہیں ان کی کوئی خبر نہیں۔“

”کچھ مجھے نہیں آتی کہ وہ دونوں کس جگہ میں گھر گئے اور نوبت یہاں تک کیوں پہنچی کہ عالم کے ہاتھوں ایک قتل ہو گیا۔ پانی دار سے یہ سنیں کون تھا اور اس کی عالم اور سرمد سے کیا دشمنی تھی؟“ اسے دلتی یہ سارا کچھ مجھے نہیں آ رہا تھا۔ میڈیا جو خبریں دے رہا تھا اس کے مطابق تو اسپیکر وٹا کا دوست سنیل دونوں کی کچھ مفلوک حرکات کی وجہ سے ان کی طرف متوجہ ہوا تھا اور مرنے سے پہلے اس نے وٹا کو اطلاع بھی دے دی تھی لیکن وٹا کو سنیل کے بتائے ہوئے مقام پر پہنچنے میں کچھ دیر ہو گئی۔ اس وقت تک وہ دونوں سنیل کو قتل کر چکے تھے اور جائے واردات سے فرار ہو رہے تھے۔ وٹا نے ان کا تعاقب کیا اور ان کی جائے قیام پر پہنچ کر انہیں کوئی کارروائی کرنے کے بجائے پولیس فورس طلب کر لی۔ وٹا اگلے دروازے کے سامنے کھڑا مگرانی کر رہا تھا اس لیے اسے معلوم نہ ہوسکا کہ پولیس فورس کے آنے سے پہلے ہی وہ لوگ مقامی دروازے سے غائب ہو گئے ہیں۔ مگر ان کے فرار کے بعد پولیس اور غلیہ اداروں کی جدوجہد کی کہانی تھی جس کا اختتام اس بات پر ہوا تھا کہ عالم اور سرمد کو پاکستان فرار ہونے کی کوشش کرتے ہوئے ایک مال بردار ٹرک سے گرفتار کر لیا گیا ہے اور اب ان سے تحقیق کی جا رہی ہے۔“

”مفتیس کے بارے میں یہ اطلاع درست ہے کہ وہ اسپیکر وٹا کا دوست تھا۔ اس کے علاوہ جو کچھ کہا جا رہا ہے اس کی تصدیق یا تردید کرنے والا کوئی نہیں ہے۔“ کالے خان نے اس کے سوال کا جواب دیا۔

”تھینک یو کالے خان! ہم نے اتنے کم عرصے میں جتنی معلومات حاصل کر لی ہیں، وہ بھی کمال ہے۔ تم تو واقعی کام کے آدمی ہو۔“ اس نے کالے خان کو دودھ کی

”شکر یہ جناب! لیکن اس میں میرے کسی کمال سے زیادہ ہاتھ قسمت کا ہے۔ میں نے جس جرحیت کو معلومات اکٹھا کرنے کے لیے ہانڈ کیا تھا، اس کی بہن میزبان نیلی کی ایک بیوہ اکثر فردوس کی جیسٹ فرینڈ اور کولیگ تھی۔ اسی کے ذریعے یہ سب اچھی آسانی سے معلوم ہوسکا ہے۔“ حنا نے اسے جواب دیتے ہوئے کالے خان نے کو پا کر بیٹھ لینے سے انکار کر دیا۔

”اور...“ حنا نے غصے سے دونوں کو گولہ بکس کر دیا۔ ”ڈاکٹر فردوس کے بارے میں پتا چلا ہے کہ وہ ان

گرفتاریوں پر بہت اپ سیٹ ہے۔ اس کی رائے کے مطابق عالم شاہ اور اس کا ملازم سرمد دونوں ہی بہت ناکس انسان ہیں اور وہ امید نہیں کرتی کہ ان پر لگائے گئے الزامات سچ ہوں گے۔ "کالے خان نے اس کی مطوعات میں اضافہ کیا۔

"اس کا مطلب ہے کہ میزبان ان کے لیے سوئٹ کارز رکھتے ہیں اور ان سے امید کی جا سکتی ہے کہ وہ ان دونوں کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے کوئی مذکورہ کوشش تو کریں گے۔" لیکن حال کر ایک طرف دیکھتے ہوئے اس نے امید ظاہر کی۔

"شاید۔ ویسے فی الحال تو وہ لوگ خاموش ہی نظر آ رہے ہیں لیکن کچھ واقعات کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ ان کی بہرویاں اپنے مہمان کے ساتھ ہیں۔ سب سے بڑی فیور جو انہوں نے دی وہ یہ تھی کہ عالم شاہ کی بہن کا نکاح اس لڑکے کے ساتھ کر دیا گیا جس کی شادی ہو رہی تھی۔ وہ لڑکی اپنے بھائی کے ساتھ گرفتار ہو کر سلاخوں کے پیچھے نہیں پہنچی تو صرف اس لیے کہ میزبانوں نے اس معاملے میں پوری جان لڑائی ہے اور بہت مضبوطی سے اس موقف پر قائم ہیں کہ بھائی کے جرم کی سزا بہن کو نہیں دی جاسکتی۔" کالے خان اور بھی کچھ بتا رہا تھا لیکن اس کی سوئی بہن کے ذکر پر ہی انک محنت گئی تھی۔

"بہن کہاں سے آئی؟ تم نے تو مجھے بتایا ہی نہیں کہ عالم کے ساتھ اس کی بہن بھی بھارت آئی ہوئی ہے۔"

"ذہن سے نکل گیا تھا، ابھی خیال آیا۔" کالے خان کا لہجہ معذرت خواہانہ ہو گیا۔

"عالم کی چھوٹی بہن ہوگی۔ اس نے بتایا تو تھا کہ اس کی دو بہنیں ہیں۔ بڑی بھلی تو اپنے ماسوں زاد مہم سے بیٹھ رہی ہوگی، یہ چھوٹی ہی ہوگی۔" وہ اب کالے خان کو سننے کے بجائے اپنے طور پر سوچ رہا تھا اور نکل کا حجابی چادر میں لپٹاؤ جڑی چھن سے آنکھوں میں اتر آیا تھا۔

"ڈاکٹر فردوس کے شوہر جلیل بہت دن پہلے ہی میڈیا کے سامنے عالم اور سرمد سے لاطعلی کا اظہار کر چکے ہیں اور اب باقی گھروالوں کا بھی رویہ کچھ ایسا ہی ہے لیکن دیکھا جائے تو اپنے کتوارے بچے کی شادی روک کر اسے بیوہ اور ایک بچے کی ماں سے بچا کر انہوں نے رشتے داری کا حق ادا کر دیا ہے۔ ان حالات میں وہ اس سے بڑھ کر کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔" وہ اپنے غم میں ابھی نکل کو جھک رہی تھی لیکن اسے تھا کہ کالے خان کے الفاظ نے ہلکے سے دماغ از لویا۔

"کیا کہا، بیوہ اور ایک بچے کی ماں؟" وہ کرسی چھوڑ کر کھڑی ہو گیا۔ اسے معلوم تھا کہ عالم کی چھوٹی بہن کتواری تھی۔ ان چھ ماہ میں اس کی شادی ہو جائے تو ممکن تھا لیکن بچے کی ماں اور بیوہ ہونے کی باتیں اس سے بچ گئیں کر رہی تھیں۔ اسے نکل کا سراپا یاد آیا۔ وہ جب اس سے ملا تھا تو اس کی حالت سے ظاہر تھا کہ وہ بہت جلد ماں بننے والی ہے لیکن یہ۔

اس کے دل نے شدت سے اس کے لیے تکلیف محسوس کی۔

"جی ہاں بیوہ۔ میں تو اس جوان کو دودھ پیتا ہوں کہ اس نے رشتے داری نبھانے کے لیے اس حد تک قربانی دی۔" اس کی کیفیت سے بے خبر کالے خان اپنے خیالات کا اظہار کر رہا تھا۔

"میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ میں کچھ دیر آرام کروں گا۔ کوئی مجھے ڈسٹرب نہ کرے۔" وہ کالے خان کو نہیں بتا سکتا تھا کہ جسے اپنانے پر وہ کسی کو دودھ سے جدا تھا وہ اتنی اصول تھی کہ اگر اس کے پاس دونوں بچوں کی دولت ہوتی تو وہ اسے بھی اس پر بلا تر دوٹو دیتا۔ اس اظہار پر خود کو سنبھالنے اور کچھ سوچنے کے لائق بنانے کے لیے اسے مہلت کی ضرورت تھی چنانچہ کالے خان سے گفتگو کا سلسلہ اچانک موقوف کر کے انک روم سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

"کہنا پیسے مل جائیں گے تو مطلب ہے مل جائیں گے۔ بار بار فون کر کے بے اعتباری کا اظہار کیوں کرتے ہو؟" جینک کے دروازے کے باہر کھڑی نکل نے گھٹیل کی آواز سنی تو دستک کے لیے اٹھا اس کا ہاتھ رک گیا۔ گھٹیل کے الفاظ سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ فون پر کسی کا رد ہاری گفتگو میں مصروف ہیں اس لیے تذبذب کا شکار ہو گئی تھی کہ دستک دے کر ان کی مصروفیت میں خلل ہو جائے۔

"کچھ دنوں میں پیسوں کا انتظام ہو جائے گا لیکن تم بھی اپنا وعدہ یاد رکھنا۔ اگر ہمیں کوئی نقصان پہنچا تو بھارت دور تک مل جائے گی۔" دروازے پر اس کی موجودگی سے بے خبر وہ موبائل کان سے لگائے گفتگو میں منہمک تھے۔

ان کے اہلک اور لہجے کی تنبیہ کی کو دیکھتے ہوئے اسے غل ہو رہا تھا کہ مشکل کا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ جس پر چٹائی سے گزر رہی تھی اس کے سامنے بڑے بڑے بات غیر اہم تھی۔ اگلے بھائی جس کے لیے وہ ماں بنیں دن رات دعا کر رہی تھیں، ایسی مشکل میں پھنسا ہوا تھا کہ دل کو کسی طور

میں نہیں آتا تھا۔ اب بھی وہ گھیل سے عالم شاہ کے سلیطے میں ہی بات کرنے آئی تھی۔

”اجالا جہاں ہے ٹھیک اور محفوظ ہے۔ تمہیں کیا کسی اور کو اس کے بارے میں فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ گھیل کے سخت اور مرد لہجے میں کئی بات نے اسے چونکا دیا اور وہ خود اپنے اس خیال کی تردید کرنے پر مجبور ہوئی کہ وہ کسی کاروباری گھنگو میں مصروف ہیں۔

”میں نے کہا تھا کہ اجالا کا نام بھی زبان پر نہ لانا۔“ دوسری طرف سے جانے کیا کہا گیا تھا کہ ان کا لہجہ پہلے سے بھی زیادہ سخت ہو گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ حیران کھڑی کوئی بھی اندازہ لگانے سے قاصر تھی۔ اسے اجالا کے بارے میں کبھی معلوم تھا کہ اسے حالات کے پیش نظر گھیل نے اپنے کسی دوست کے گھر بھرا دیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ان حالات میں جوان کواری لڑکی کا منظر پرست ہونا ہی بھرتھا۔

”تم یہاں کھڑی کس بات کی نوہ لے رہی ہو؟ کیا ماں باپ نے سکھا یا نہیں کہ چھپ چھپ کر کسی کی باتیں سننا بری عادت ہے۔“ تیز چھتی ہوئی آواز پر وہ بری طرح چونک کر پلٹی تو سامنے سرین بھائی کو کھڑے دیکھ کر گڑبڑائی۔ وہ ہاتھوں میں چائے کے لوازمات سے بھٹی ٹرے تھا۔ کھڑی بڑی کاٹ دار نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

”ایسی کوئی بات نہیں بھائی! مجھے گھیل بھائی سے کچھ بات کرنا تھی لیکن وہ فون پر مصروف تھے تو میں باہر ہی رک گئی۔“ جھینپے ہوئے انداز میں اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے وہ اندر سے شرمندہ بھی تھی۔ قصد اُنہی کسی لیکن گھیل کی لاپٹی میں ان کی گھنگو سننے کی غلطی تو اس سے بہر حال سرزد ہوئی تھی۔

”ابھی گھرانوں کی بہوشیاں سسر اور جینٹ و فیروہ سے فاصلہ رکھ کر رہتی ہیں لیکن تم عجیب ہو کہ جب دیکھو گھیل سے بات کرنے پٹنگی ہوئی ہو۔“ اس کی وضاحت کو خاطر میں لائے بغیر انہوں نے ایک اور تیر چلا دیا۔

”آپ جانتی ہیں بھائی کہ میں ادا سامی کے لیے پریشان ہوں۔ اسی لیے بار بار گھیل بھائی سے بات کرنے آئی ہوں۔ ویسے بھی وہ میرے لیے خیر نہیں۔ میرے ہالہ زاد بھائی ہیں جنہیں میں بڑے بھائی کا درجہ دیتی ہوں۔“ سرین کے الفاظ ایسے نہیں تھے کہ وہ انہیں خاموشی سے سہ جاتی چنانچہ نرم لیکن مضبوط لہجے میں انہیں جواب دیا۔

”یہ ایک اور مصیبت ہمارے سر پر چڑھی ہے۔ کسے معلوم تھا کہ اباجی پاکستان سے مہمان نہیں، مصیبت طار ہے

ہیں۔ ابھی پہلے خوشیوں کے گھر کو بر باد کر کے دکھا دیا ہے۔“ وہ تیز لہجے میں بولیں اور اپنے بیوی ہونے کا استحقاق استعمال کرتے ہوئے دروازہ دھکیل کر مڑے سے کمرے میں داخل ہو گئیں۔ ان کی گھنگو سے صدمے میں جتاوہ اپنی جگہ سے مل بھی نہیں سکی۔ جب سے اس کا لیصل سے نکاح ہوا تھا، وہ گھر کی خواتین کے رویے میں ایک کھچاؤ سا محسوس کر رہی تھی لیکن اپنی نکلی کیفیت کی وجہ سے ان روتیوں پر زیادہ خود نہیں کر سکی تھی۔ اب سرین نے جو رویہ اختیار کیا اس نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔ انکی واضح نظرت اور بیزارگی کے اظہار نے اسے جس احساس ذلت میں مبتلا کر دیا تھا، ایسی ذلت کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

”ارے بھئی کل ادھاں باہر کیوں کھڑی ہو۔ آکا اندر آ جاؤ۔ لی کر چائے پیتے ہیں۔“ گھیل فون کال سے فارغ ہو گئے تھے اور انہوں نے اسے کھلے ہوئے دروازے کے سامنے کھڑا دیکھ لیا تھا۔ ان کے بلانے پر اپنی بے عزتی بھول کر اسے اندر جانا پڑا کہ ایک طرف ان کے بڑے ہونے کا احترام تھا تو دوسری طرف عالم شاہ کے سلیطے میں گھنگو کرنے کی خواہش۔

”چائے بناؤ بھئی سرین! سب لی کر چائے پیتے ہیں۔“ اس کے چہرے پر بھائی پادیت سے نظریں چراتے ہوئے گھیل نے خوشگوار لہجے میں یہی سے فرمائش کی۔

”مجھے تو آپ معاف رکھیے۔ مجھے اپنی چائے کا ذائقہ خراب نہیں کرنا۔“ وہ تن ٹن کر لی باہر نکل گئیں۔

”شاید کسی سے منہ ماری ہوئی ہے جو مختصر سا سوا اتنا خراب ہے۔“ بیگم کی بد اخلاقی کا اثر ڈال کرنے کے لیے گھیل ہنس مڑ پڑے۔

”میں آپ سے ادا سامی کے بارے میں بات کرنے آئی تھی گھیل بھائی! خبروں میں ان کے بارے میں جو کچھ کہا جا رہا ہے، اسے سن سن کر میرا دل ہول رہا ہے۔ ادا سامی کو اس مصیبت سے نکالنے کے لیے ہمیں کچھ تو کرنا ہوگا۔“ انسان جب ضرورت مند اور مجبور ہو تو اسے بہت کچھ جان بوجھ کر نظر انداز کرنا پڑتا ہے۔ اس نے بھی سرین کے رویے کو نظر انداز کر دیا اور جو بات کرنے آئی تھی وہ کہہ دی۔

”مجھے تمہاری پریشانی کا احساس ہے کل! میں خود بھی کم پریشان نہیں ہوں۔ بھرا اچھے طور پر چرکھن کوشش کر رہا ہوں لیکن صورت حال ابھی خراب ہے کہ کسی کوشش کا کوئی نتیجہ نہیں نکل رہا۔ کچھ تو اس وقت میرے لیے خود کو، مگر

دالوں کو اور خصوصاً قصہیں پر دیکھت کرنا بھی مشکل ہو رہا ہے۔ بعض حلقوں کی طرف سے مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ قصہیں بھی عالم اور سرمد کی طرح گرفتار کر لیا جائے۔ وہ اسے پریشان کن اطلاعات دے رہے تھے۔

”بات صرف تمہاری ہی نہیں ہے۔ ہم پر بھی دہشت گردوں کی سہولت کاری کا الزام لگایا جا رہا ہے۔ لیڈ لائن سمیت گھر کے ہر فرد کا سوبائیکل آزر روٹیشن پر ہے۔ ہم میں سے کوئی باہر جاتا ہے تو اس کی گمرانی ہوتی ہے۔ کئی بار ہم بھائیوں کو تفتیش کے لیے بلوایا گیا ہے اور گرفتاری کی گوارا مسلسل ہمارے سروں پر لٹک رہی ہے۔ تم سمیت ہر فرد کو پروٹیکشن دینے کے لیے میں پانی کی طرح چھوٹا ہوں۔ کاروباری تعلقات، الگ متاثر ہوئے ہیں اور ہماری برسوں کی گزردول پر وطن دشمنی کے شکوک و شبہات ہماری ہو گئے ہیں۔ کوئی ایک پریشانی ہو تو تم سے کہوں۔“ وہ بولتے بولتے چپ ہو گئے اور پریشانی کے عالم میں اپنی چیشانی مسلتے لگے۔ مسائل کی اس طویل لہر سست کو سننے کے بعد گل کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ ان سے حریف عالم شاہ اور سرمد کی رہائی کے لیے کوشش کرنے کا مطالبہ کر سکتی۔ وہ مایوس ہی اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

”ارے! جا کہاں رہی ہو۔ چائے تو تم نے پی ہی نہیں؟“ اس کا ارادہ بگھٹتے ہوئے کھیل نے اسے روکنے کی کوشش کی۔

”میرا دل نہیں چاہ رہا کھیل بھائی! پلیز، آپ چائے پیجیو، میں جا کر اعظم کو دیکھتی ہوں کہیں جاگ نہ گیا ہو۔“ آہستہ سے جواب دے کر وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ دل بہت پر جھل تھا اور وہ کسی سے اپنے دل کا بوجھ نہیں بانٹ سکتی تھی۔ کچھ عرصہ قبل مہمان کی حیثیت سے محبتوں اور عزت سے نوازنے والوں کے دوتے بدل چکے تھے۔ اسے ان بدلے ہوئے روتیوں پر شکوہ نہیں تھا کہ وہ سمجھ سکتی تھی کہ ان کی وجہ سے وہ لوگ جس مشکل میں گھر گئے تھے وہ معمولی نہیں تھی۔

”کاش! آپ ہی یہاں ہوتے چاہا سا میں تو شاید میرے سر پر ہاتھ رکھ کر مجھے کوئی دلاسا دے دیتے۔“ نیاز شاہ کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس کے دل میں ایک ہلک سی آہ تھی۔ ابھی برسوں ہی نیاز شاہ کو یہ کہہ کر گھر سے کہیں اور منتقل کر دیا گیا تھا کہ اس عمر میں ان کے لیے زیادہ پینشن لینا مناسب نہیں ہے اس لیے بہتر ہے کہ وہ گھر سے دور ایسی جگہ رہیں جہاں

تک کوئی پریشان کن خبر نہ پہنچ سکے۔ ان کی خدمت کے لیے عقل ان کے ساتھ گیا تھا اور عقل کی بیوی کا سوڈ بھی پرسوں سے بہت خراب تھا۔

”انسانوں سے کوئی امید پوری ہونا مشکل ہے میرے مالک! تو ہی ہمارے حال پر رحم کر اور ہمیں اس مشکل سے نکال۔“ دل ہی دل میں دعا کرتے ہوئے وہ اس کمرے میں آگئی جو نکاح کے بعد اس کی اور فیصل کی مشترکہ خواب گاہ قرار پایا تھا۔ بستر پر اعظم، ماں اور دنیا کی سب پریشانیوں سے سبے نیاز گہری نیند سو رہا تھا۔

”تمہارے پاپا اور دادا سا میں تمہاری دیکھ کے لیے ترستے ہوں گے لیکن میں اتنی بھجور ہوئی ہوں کہ قصہیں ان تک لے جانا تو دور کی بات، فون پر بھی ان سے رابطہ نہیں کر سکتی۔“ اس کے طام بالوں کو نرمی سے چھوتے ہوئے وہ بے آواز اس سے مخاطب ہوئی۔ عالم ہر سرمد کی گرفتاری کے بعد سے اس کی پاکستان میں کسی سے بات نہیں ہو سکی تھی کہ فون لوکل کالز کے علاوہ ہر کال کے لیے جلاک کیے جا چکے تھے۔

”جب ہر سہارا ساتھ چھوڑ جائے تو اسے پکارو جو کبھی اپنے بندوں کو بے سہارا نہیں چھوڑتا۔“ مایوسی میں گھر کے دل میں یہ خیال جا کا تو اس نے اپنے رب کے حضور حاضر ہونے میں دیر نہیں لگائی اور وضو کر کے چائے نماز پر کھڑی ہو گئی۔ نوافل کی ادائیگی کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو مصائب سے بوجھل دل کا سارا غم آنسو بن کر آنکھوں سے بہہ نکلا۔ اپنے رب کے حضور التجا کیا کرتے ہوئے کب سسکیاں، ہچکیاں بھی بدلیں، اسے پتا بھی نہیں چلا۔ چھتا کے کی زوردار آواز مچی جس نے اس کی تجویز کو توڑا۔ اس نے گھبرا کر آواز کے ماخذ کی طرف دیکھا۔ دیوار کے ساتھ ہی ایک آرائشی نگدان کی گھڑوں میں تقسیم پڑا ہوا تھا۔

”شادی کے نام پر بیجا مافی صورت والی عورت میرے سر تھوپنے کے لیے رہ گئی تھی۔ گھر کو ہاتھ بٹا کر رکھ دیا ہے اس نخوں عورت نے۔“ اس کے حجب میں کھڑا مطلق کے مل دھاڑتا وہ مرد اس کا ہمازی خدا ہونے کا اعزاز رکھتا تھا اور وہ اس کی زیبائی اپنے لیے وہ الفاظ سن رہی تھی جس کا اس نے زندگی میں بھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

عظیم گھر کے سامنے سینہ سپر ہو جوان
کسی ہاستان چو شط کثروں کبر لہر
نصیب ناک نہا ہا لہر و افلاک لہر و ماہ ہر

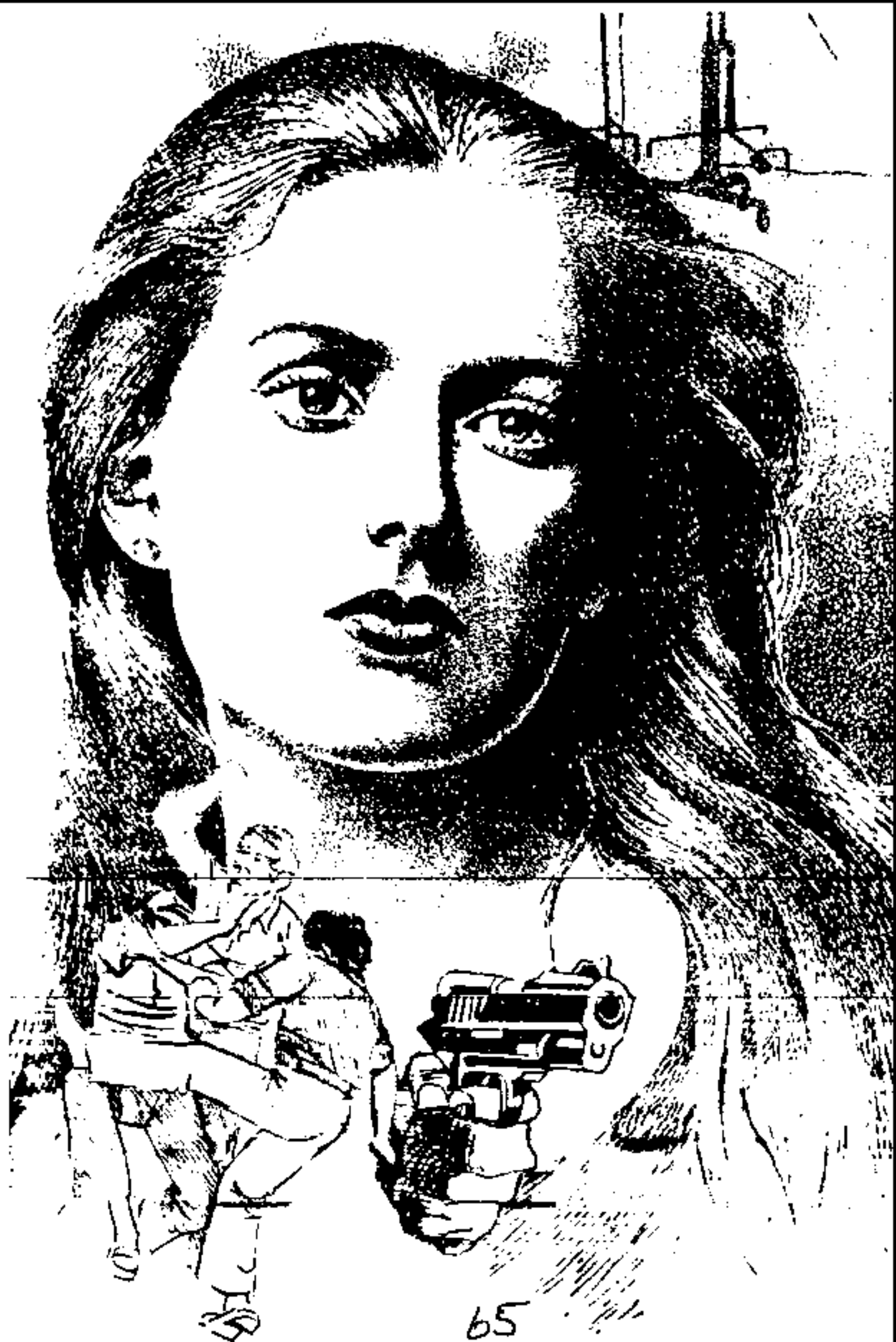
قسط: 20

شہزادوں کا شہ

اساتذہ کی

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقافہ پور اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تندوتیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابل شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پُر عزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جا رہے تھے... اس کی زندگی جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... یہ خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قراریوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تار عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر واقعہ کا توڑ کرنا حق و باطل کی ازلی جنگ ہوں لڑتا رہا کہ وہ لوہات قلب بھی اس کے قیڑھ کی رام میں حائل نہ ہو سکی...

اپنے کریکول پر پیر بن کر مائل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی خیر انگیز داستان



معاذ ایک ذہین بین متون مزاج نرگس یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جرائن کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور ان کے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ اپنی بیوی سے واپس آ رہا تھا تو وہ چھ لڑکوں کو سڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی عیسیٰ میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی نافرمانی کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے۔ بشری نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بشری مائیکھوئی ٹیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم لکھ رہی ہے۔ ان دنوں ان جگہ بھی وہ ایک زیرِ تعمیر رہائشی منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی آئی تھی۔ معاذ بشری کو یہ حفاظت اس گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو راز میں کر دیتا ہے لیکن جن رئیس زادوں سے اس نے ان کا شمار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو راز میں نہ کرتے اور موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ یہ موقع انہیں یونیورسٹی لڑکی کی صورت میں مل جاتا ہے اور ایک جنگ کی سیر کے دوران وہ لڑائی کے شوق میں سب سے اگے چلک ہو جانے والے معاذ کو بے خبری میں گھر کر بری طرح زد و کوب کرنے لگتا اور ہلندی سے اسے دے دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس نہ آنے پر انتحاریہ کے افراد، پولیس اور سیکورٹی کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو سوشل آف بے تو وہ خود کو ایک جوگی کی جھوٹیائی میں پاتا ہے۔ اپنی حالت سے اسے اپنے گھر لانے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ جوگی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ معاذ کا سوشل آف جنگ میں ہی کہیں پڑتا ہے اور جوگی کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا جس سے باہر کی دنیا سے رابطہ کیا جاسکے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی شخصیت اس کے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے۔ جوگی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت نے خاص صلاحیتوں سے نوازا کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاص بات چیت کے بعد وہ اسے پراسرار علم سکھانے کی ہامی بھر لیتا ہے اور واقعی اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ادھر جانے دوڑے لگے والے معاذ کے گھر سے جب تصویریں نکلوا لی جاتی ہیں تو بہت سے قدرتی مناظر کی تصویروں میں سے ایک ایسی تصویر بشری کی نظر میں آ جاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے چھبے سے بے چہرہ جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پردیخت کے غیر قانونی ہونے کے سبب میں بشری تفتیش کر رہی تھی۔ بشری کے اپنے والد جرنیل ہیں اور حق گوئی ان کے خون میں شامل ہے۔ اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشری کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ صدمے سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باؤل نامی شخص سے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشری انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دلوں میں ہی معاذ واپس کا ارادہ کرتا ہے تاہم دوسرے ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا عرفان اللہ اور بیروانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو وقاس نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باؤل اچانک بشری کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر دیتا ہے۔ ادھر معاذ کو واپس لانے کے لیے اوجھے جھکڑے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اسے واپس آنے کا پیغام دیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کر کے اسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات لی جاتی ہیں، منہ بتانے پر اس کے بھائی کا ایک گروہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشری بھی انتقام کی آگ میں جلتی ہوئی سونا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریجک شروعات ہو جاتی ہے۔ معاذ کو بچانے والا لڑکا وقاس اپنے گروہ کے ساتھ ایک پارٹی میں جاتا ہے۔ وہاں اسے معاذ کے حوالے سے مشکوک ایک شخص نظر آتا ہے۔ وہ اس کے پیچھے جاتا ہے مگر اسے گھر لیا جاتا ہے۔ بہر حال وقاس کو تیسرے کے ساتھ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ادھر معاذ کے دوست عالم شاہ کے بیوی کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ کی خون میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے چاہا نہ کر کے اس کے دماغ پر مفلوج کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ مفلوج سے حاصل انوکھے علم کی بدولت ان کا معمولی نہیں پڑتا۔ بشری کامران کو چھاپنے کا پردہ گھمباتی ہے۔ ادھر عالم شاہ سرائے نکلتا ہے کہ اس کے بیوی کا قتل کس نے کیا۔ وہ وقاس کو گھیرتا ہے جسے تیس ماہے گولیاں مار کر قتل کر دیتا ہے۔ وقاس وہ جاتا ہے۔ عالم شاہ اس کے بعد ڈاکوؤں کے سردار چاچ کو چھاپتا ہے اور اسے گھر کر دار تک پہنچاتا ہے۔ اس کے پیچھے پولیس لگ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور اس کا نوکر سرد باؤل کے پیچھے چڑھ جاتے ہیں۔ ادھر معاذ چاچوں کے گھر کو جاتا کر کے ایک کے ذریعے اسے نکالنے والوں پر حملہ کر دیتا ہے تاہم ان کی فائرنگ سے بے مہر مارا جاتا ہے اور الزام معاذ پر نہیں آتا مگر معاذ سے کام لینے والوں کو اس پر شک گزرتا ہے۔ عالم کی بہن گل شاہ کے نو مہلوہ میں کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اغوا کا الزام ملیف سوار پر آتا ہے۔ عالم شاہ وہاں موجود ایک دشمنی شخص کی مدد سے باؤل کی قید سے چھٹکارا پالیتا ہے۔ ادھر بشری اپنی

جاتی ہے۔ وہاں دکان اس سے پارلی کے روپ میں پہچان لیتا ہے اور ان دونوں کے درمیان اشتاد کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ وہ سلطان کو مارنا چاہتی ہے تاہم دکان اس سے ایسا کرنے سے روکتا ہے۔ ادھر عالم شاہ، باڈل کی قید سے نکل کر اس کا پیچھا کرتا ہے تاہم وہاں اچانک قاتلنگ اور دھماکے ہونے لگتے ہیں۔ وہ وہاں محاذ کو دیکھتا ہے۔ صداقت شاہ، لطیف سومرو کو گھیرنے کے لیے اس کی غصیدہ بندی اور بچے کا کھوج لگاتے ہیں اور بچے کو اغوا کر لیتے ہیں۔ لطیف سومرو مجبور ہو جاتا ہے۔ محاذ کو اس کے گھروالوں سے ملنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ عالم شاہ کو اس کے والدہ اعزہ یار دکانگی کا عندیہ دیتے ہیں۔ ادھر محاذ بھی ایک مشن پر سوئیا کے ساتھ انڈیا روانہ ہوتا ہے تاہم کچھ لوگ سکھ یا تریوں سے بھری بس کو یرغمال بنا لیتے ہیں۔ محاذ اور سوئیا نہ خانے کے تمام افراد کو ہٹانے لگا دیتے ہیں تاہم باہر موجود دیگر اغوا کاروں سے مقابلہ ہوتا ہے اور محاذ زخمی ہو جاتا ہے۔ صداقت شاہ کے انڈیا میں موجود رشتے دار کے ہاں شادی ہوتی ہے۔ عالم شاہ، نکل اور سرمد انڈیا روانہ ہو جاتے ہیں۔ انڈیا رٹ سے گھر و دکانگی پر راستے میں کچھ ٹھہرے انہیں لوٹ لیتے ہیں۔ عالم شاہ انکسٹن میں آتا چاہتا ہے تاہم اجالا نامی عالم شاہ کی کزن اس کا راستہ روک لیتی ہے۔ گھر پہنچنے پر پولیس کی رہی ہوتی ہے اور وہ عالم شاہ اور سرمد کو لے جاتے ہیں۔ ادھر بشری اور دکان باڈل کو اسپتال میں مارنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ بچ جاتا ہے۔ محاذ اور سوئیا پناہ کی تلاش میں ہوتے ہیں اور بالآخر اپنے سہولت کاروں سے مل جاتے ہیں۔ عالم شاہ اور سرمد کو تشدد کا نشانہ بنا کر ویرانے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ واپس اپنے میزبانوں کے ہاں پہنچ جاتے ہیں۔ شادی کے دوران انہیں پتا لگتا ہے کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں اجالا اور اس کا عاشق شامل ہوتے ہیں۔ وہ چھپ کر ان کی باتیں سن رہا ہوتا ہے کہ اسے چھاپ لیا جاتا ہے۔ تاہم وہاں مارا ماری ہوتی ہے اور اجالا کا عاشق مارا جاتا ہے۔ پولیس ان کے پیچھے چڑھ جاتی ہے۔ ان کے کزن انہیں اپنے دوسرے غصیدے پر پہنچا دیتے ہیں جہاں کچھ لوگ ان پر حملہ کر دیتے ہیں۔ وہ وہاں سے بھگت لٹھل جاتے ہیں۔ ادھر محاذ کو سوئیا اپنے ساتھ نئے مشن پر لے کر جاتی ہے جس میں ایک ریل سے لاکن کو دھماکے سے اڑا دیا جاتا ہے۔ محاذ ایسا نہیں چاہتا اس لیے وہ ٹرین کی آہ سے نکل پارودی دھماکا کر دیتا ہے۔ وہ زخمی ہو جاتا ہے اور اسے ہندو سادھو اپنی کلیا میں لے جاتا ہے جہاں اس کی امی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ سوئیا کے آدمی محاذ کو تلاش کرتے ہیں مگر ناکام ہو جاتے ہیں۔ ادھر عالم شاہ اور سرمد غصیدہ ڈریس سے ہارڈ پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس فرک میں وہ جو سفر ہوتے ہیں وہ اچانک جھٹکے سے رک جاتا ہے اور کیا ہوا ہے۔ یہ سوال ان دونوں کے ذہنوں میں آتا ہے۔ وہ دھڑلے جاتے ہیں اور "را" کی قید میں پکڑے جاتے ہیں۔ انہیں تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ادھر بشری باڈل کو مارنے کی کوشش میں خود نشانہ بن جاتی ہے۔ محاذ سادھو کی مدد سے ایک انڈین ہیروئن کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ وہیں اسے عالم اور سرمد کی گرفتاری کا پتا چلتا ہے۔ ادھر نکل کو اس کا شوہر ذہنی ماییت دیتا ہے اور اس نے ایسی تبدیلی کا رعب کی میں تصویر نہیں کیا تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

کرنا پڑا ہے۔" صلیبی کی بہ نسبت اس شخص کا لہجہ بہت مہذب تھا جس کے باعث فردوس کے خوف میں قدرے کمی آئی اور ذرا سی ناک چڑھا کر ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔

"کسی سے گفتگو کے لیے یہ طریقہ کار نہایت غیر مہذبانہ ہے۔"

"مجھے احساس ہے لیکن میں پہلے ہی اپنی مجبوری کا ذکر کر چکا ہوں۔"

"ٹھیک ہے، جو بولتا ہے بولو۔" فردوس نے اپنے ماتھے کی شکنیں کم نہ ہونے دیں۔

"پہلے یہاں سے چلیے نہ یا دیر پارکنگ میں رو کر گفتگو کرنا مناسب نہیں ہوگا۔"

"تم مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو؟" وہ ایک بار پھر تلوار میں جھلا ہوئی۔

"اسٹریٹنگ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ جہاں کا چاہے رخ کر لیں۔ مجھے بس آپ کا تھوڑا سا وقت درکار ہے۔"

"ڈاکٹر فردوس!" فردوس ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد پارکنگ میں کھڑی اپنی گاڑی میں بیٹھی ہی تھی کہ کسی نے دوسری طرف کے شیشے پر انگلی سے دستک دے کر اسے ہکا اور پھر نہایت تیزی سے دروازہ کھول کر اس کے برابر والی نشست پر بیٹھ گیا۔

"کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو؟" فردوس کھنی ڈاڑھی موٹھوں، مدخسارے موٹے سے سے اور برادکان گلہز دلے اس بندے کو یوں اپنی گاڑی میں گھستا دیکھ کر ہراساں ہو گئی تھی اسے اچھی طرح یاد تھا کہ وہ اپنی گاڑی کے سارے دروازے لاک کر کے اسپتال کے اندر گئی تھی لیکن وہ شخص اتنے آرام سے گاڑی میں آگھسا تھا جیسے یہ اس کی اپنی گاڑی ہو۔

"ڈریس مت! مجھے بس آپ سے تھوڑی سی بات چیت کرنا ہے لیکن میں نہیں چاہتا کہ ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو کسی کے علم میں آئے اس لیے مجھے یہ طریقہ کار استعمال

”میں یہاں خود کو نسبتاً محفوظ محسوس کر رہی ہوں۔“
فردوس نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

”لیکن میرے حساب سے یہ جگہ مناسب نہیں۔
یہاں آپ کی جان پہچان کا کوئی بھی فرد آسکتا ہے اور میں
نہیں چاہتا کہ بعد میں آپ کو میرے حوالے سے کسی کو کوئی
وضاحت دینا پڑے۔“ اس نے نرمی سے فردوس سے
اختلاف کیا لیکن وہ اب بھی گاڑی کو پارکنگ سے نکالنے
میں جتنہ بذب تھی۔

”میں آپ سے دوستانہ ماحول میں گفتگو کا خواہش
مند ہوں ورنہ میرے لیے یہ کوئی مشکل بات نہیں تھی کہ میں
آپ کو کوئی اصرار دکھاتا اور آپ کو اپنے ساتھ چلنے پر مجبور
کر دیتا۔“ اس نے فردوس کا تذبذب دیکھ کر ایسی دیبل دی
جسے وہ رد نہ کر سکی اور ایک گہری سانس لیتے ہوئے انگلیٹھن
میں چابی تھما دی۔

”اگر کا شکریہ۔ اس شاندار آپ کو اپنے فیصلے پر کوئی پچھتاوا
نہیں ہوگا۔“ وہ آہستہ سے بولا۔ جواباً فردوس خاموش رہی۔

”اب بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟“ گاڑی پارکنگ سے نکل کر
سڑک پر دوڑنے لگی تھی جب فردوس نے اس سے پوچھا۔

”میں آپ سے عالم شاہ اور سرمد کے بارے میں
گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔“ اس نے گویا فردوس کی ساحتوں
میں بم پھوڑ دیا۔

”کنک۔۔۔ کون ہو تم؟“ اس نے رخ موڑ کر اس کا
چہرہ کھوجنے کی کوشش کی۔

”میں دوست ہوں اور عالم سمیت آپ سب کا خیر
خواہ ہوں اسی لیے میں نے اس ملاقات کو غلطی نہ رکھنے کی
کوشش کی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ ذرا کہ بے احتیاطی کی
صورت میں آپ کی جیل کے لیے مسائل کھڑے ہو جائیں
گے۔“ اس نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

”میں کسے مان لوں؟ ہو سکتا ہے تمہارا کسی خفیہ
ادارے سے تعلق ہو اور تم مجھے نہ بچ کر نہ کرنے کی کوشش
کر رہے ہو؟“ عالم کا نام سننے کے بعد سے وہ بھڑکی ہوئی سی
دکھائی دے رہی تھی۔

”میرے خیال میں آپ کے ہاں کے ادارے اس
طرح سے کام نہیں کرتے۔ یہاں کے خفیہ اداروں کو اگر
آپ سے کچھ معلوم کرنا ہوتا تو سیدھے سیدھے آپ کو
اریسٹ کرتے اور اپنے کسی تارچے سِل میں آپ سے سب
کچھ معلوم کر لیتے۔“ اس کا لہجہ خود بخود طنزیہ ہو گیا۔

”یعنی تمہارا تعلق بھارت سے نہیں ہے؟ کون ہو تم؟“

کیا پاکستانی۔۔۔؟“ فردوس نے جین عورت تھی اس لیے اس
کے الفاظ سے اس کے بارے میں اندازہ قائم کرنے میں
دیر نہیں لگائی۔

”جی ہاں! میں پاکستانی ہوں اور عالم میرا دوست ہے۔
میں نے لی وی پر اس کی گرفتاری کی خبر دیکھی تو رہ نہیں سکا اور اس
کے بارے میں معلومات حاصل کرتے کرتے آپ تک پہنچ
گیا۔“ اس نے اعتراف کرنے میں دیر نہیں لگائی۔

”میں ہی کیوں؟ تم جیلی کے کسی مرد سے بھی رابطہ
کر سکتے تھے؟“ فردوس نے گاڑی ایک پبلک پارک کے
قریب روک لی اور تجسس سے اس کی طرف دیکھا۔

”میری معلومات کے مطابق جیلی میں آپ ایک ایسی
فرد ہیں جو عالم کے بارے میں مثبت رائے رکھتی ہیں اس
لیے مجھے امید ہے کہ میں آپ سے اس کے حالات کے
متعلق قطعی غیر تحفظانہ معلومات حاصل کر سکوں گا۔“

”تمہاری اتنی گہری معلومات کو دیکھتے ہوئے مجھے
شک ہے کہ تم کوئی عام پاکستانی نہیں ہو۔“ فردوس نے اس
کے چہرے کو ٹھٹھا۔ توڑی دیر کے بعد اس کا احتیاطی طور پر
بہال ہو چکا تھا اور وہ بے خوف ہو کر اس سے گفتگو کر رہی تھی۔

”کسی حد تک آپ کا اندازہ درست ہے لیکن میں
پہلے ہی واضح کر دوں کہ میرا پاکستان کے کسی خفیہ ادارے
سے تعلق نہیں ہے اور نہ ہی عالم ایسا انسان ہے جس قسم کا
شک اس پر کیا جا رہا ہے۔“

”تم عالم کے بارے میں کیا جانتا چاہتے ہو؟“
فردوس نے اپنی نظریں مستقل اس کے چہرے پر جمائی
ہوئی تھیں۔

”کچھ ایسا نہیں جو آپ کے لیے پریشانی کا سبب
بنے۔ میں بس اتنا چاہتا ہوں کہ آپ عالم کی یہاں آمد سے
لے کر اب تک کے تمام حالات و واقعات بلا کم و کاست
میرے گوش گزار کر دیں۔ ان واقعات سے نتائج اخذ کرنا
میری اپنی ذمہ داری ہوگی۔“ اس نے سنجیدگی سے مطالبہ
کیا۔ اس بار فردوس نے بنا کوئی سوال کیے اسے حالات
سے آگاہ کرنا شروع کر دیا۔ یہ تقریباً وہی معلومات تھیں جو
اسے کالے خان کے ذریعے پہلے ہی مل چکی تھیں بھر بھی وہ
پوری وجہ سے فردوس کا ہر لفظ سنا رہا تھا۔

”ان حالات کے بعد آپ کا خاندان تو بہت مشکل
میں پڑ گیا ہوگا۔ میرا مطلب ہے پولیس اور خفیہ اداروں کے
لوگوں نے تو آپ کا ہاتھ بند کر رکھا ہوگا؟“ من کر اس نے
تجبرہ کیا۔

”تھوڑی بہت پریشانی تو ہے لیکن گھلیل بھائی سب کچھ بہت اچھے سے پنڈل کر رہے ہیں اس لیے گھر کے دیگر افراد کو زیادہ پریشانی نہیں اٹھانا پڑ رہی۔“

”کیا عالم کی بہن کو بھی نہیں؟ مجھے حیرت ہے کہ انہیں اب تک گرفتار کیوں نہیں کیا گیا؟“ ذہن میں چبھتا سوال لیوں پر آ گیا۔

”گھلیل کی بات کر رہے ہو؟ اسے کسی مسئلے سے بچانے کے لیے ہی تو اس کا فیصل سے نکاح کیا گیا ہے۔“ اس کے دل میں کوئی شک و شبہ تھا بھی تو فردوس کی زبان سے گھلیل کا نام سن کر دور ہو گیا۔

”گھلیل تو پہلے ہی شادی شدہ تھیں؟ ان کے کزن معظم شاہ ان کے شوہر تھے؟“ وہ گھلیل کے حوالے سے اپنے تجسس پر قابو نہ رکھ سکا اور سوال کر بیٹھا۔

”گلتا ہے تم بہت عرصے سے ان لوگوں سے رابطے میں نہیں ہو اس لیے تمہیں معلوم نہیں ہے کہ گھلیل کا شوہر معظم شاہ گھلیل ہو گیا تھا۔ عالم کی ہندوستان آمد کا مقصد بھی یہی تھا کہ ماحول بدلے گا اور یہاں گھلیل شادی کے ہنگاموں میں مصروف ہوگی تو اس کا دل بھل جائے گا اور وہ خود پر بیٹھنے والے حادثے کے اثر سے نکل آئے گی لیکن یہاں آ کر تو بے چاری اور مشکل میں پڑ گئی۔“ فردوس کے لہجے میں حقیقی افسوس تھا۔

”کیا آپ کے دہر فیصل نے اس نکاح کو قبول کر لیا ہے؟ میرا مطلب ہے کہ اس کی کہیں اور شادی ہو رہی تھی تو ظاہر ہے اس کا اعتراض بھی اسی لڑکی میں ہوگا؟“ گھلیل کے بارے میں سوال کرتے ہوئے اسے جب تک محسوس ہو رہی تھی لیکن جن غیر معمولی حالات میں اس کا نکاح ہوا تھا وہ اس کی طرف سے مطمئن نہیں تھا۔

”سویرا سے فیصل کی پسند کی شادی ہو رہی تھی لیکن شاید گھلیل بھائی کے مجبور کرنے پر اسے گھلیل سے نکاح کے لیے ہاں کرنا پڑی۔ وہ مزاح کا قہقہہ دیتے ہوئے اور اسے اس فیصلے سے دھچکا بھی پہنچا ہے لیکن مجھے امید ہے کہ وہ جلد گھلیل کے ساتھ اپنے جہت کر جائے گا۔ وہ اتنی پیاری ہے کہ کسی کے لیے زیادہ دیر تک اسے نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہے۔“ انی ہاؤ فردوس نے ذرا ہلکے دمک کرادہ سوچتے ہوئے غصہ بدلتا تھا۔

”مطلب ابھی فیصل کی طرف سے نظر انداز کیا جا رہا ہے؟“ اس نے ساری گفتگو میں سے وہ بات پکڑی جس سے اسے سب سے زیادہ تکلیف دی تھی۔

”گھلیل نے تو کچھ نہیں کہا لیکن میرا اندازہ ہے وہ بے

چاری تو اپنے بھائی کو لے کر ہی بہت پریشان ہے، اوپر سے.....“ فردوس نے یکدم اپنی زبان بند کر دی۔

”اوپر سے کیا؟“ تو اس کے کان سے بولے۔

”بس ویسے ہی۔ تم ہم شرقی خواہش: نکاح لیوں تو جانتے ہی ہو۔ ذرا کہیں کچھ ہو جائے تو سب سے پہلے عورت ذات کو ہی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔..... ہاں بھی موجودہ حالات کا نزول گھلیل پر گر رہا ہے۔ انہوں نے جیسے ہی ہوئے اندام میں اسے بتایا۔ وہ بڑی جھنجھکی بھر کر عورت کی جیسے گھلیل سے ہمدردی بھی کرتی لیکن گھلیل کی زبان رین کے پگڑے ہونے کے احترام میں اسے ان سے..... سے خاموش رہنا پڑتا تھا اور یہاں مسئلہ یہ بھی تھا کہ گھرنی..... دو تین بھی نرسوں کی ہنوائی ٹیبلٹی تھیں اس لیے ان کی..... ٹیبلٹ مزید مضبوط ہو گئی تھی۔

”لیکن یہ تو انصافی ہے۔“ اسے سن کر..... نے لگ۔

”ہے تو سہی۔ پر کوئی نئی بات بھی تو..... ہمارے معاشرے میں عموماً کمزور پر ہی اپنا غصہ نکالتا ہے۔“

”آپ عورتیں ساس مندیں بن کر..... عالم کیوں ہو جاتی ہیں؟“ وہ جھنجھکیا۔

”کوئی میٹو فیکچرنگ فالٹ ہے شاید..... اس کی جھنجھکاہٹ پر اس دی پھر تنبیہ ہو کر پوئی۔

”یہاں ساس مندوں کا مسئلہ نہیں ہے..... اس ہماری فوت ہو چکی ہیں اور جو ایک کنواری مند رہ گئی..... اسے بھی گھلیل بھائی نے حفاظت کے خیال سے کہیں اور بھجوا دیا ہے۔ گھلیل اس وقت دراصل جھانپوں کے نرے میں پھنسی ہوئی ہے۔“

”آپ ان خواتین کو سمجھانے کی کوشش کریں کہ وہ اپنا رویہ بدل لیں۔“ اس نے اپنے غصے کو دباتے ہوئے فردوس سے درخواست کی۔

”کوشش کر کے دیکھوں گی لیکن تم بتاؤ کہ تم اپنے معیشت زدہ دوست سے زیادہ اس کی بہن کی فکر میں کیوں جھکا ہو گئے ہو؟“ فردوس نے بھویر اچکا کر اس سے پوچھا تو وہ گڑبڑا گیا اور صفائی پیش کرنے کے انداز میں بولا۔

”میں تو عالم کی وجہ سے ہی کہہ رہا ہوں۔ اسے اپنی کنویری سے بہت محبت ہے۔ اگر کبھی پتا چلا کہ آپ کے ہاں گھلیل کے ساتھ بدسلوکی کی جا رہی ہے تو اسے بہت دکھ ہوگا۔“

”ابھی بات ہے۔ دوستوں کی پیشین گوئی اپنی بہنوں جیسی ہی ہوتی ہیں۔ چہا را گھلیل کے لیے گھر منہ ہونا چاہیے۔“

ظاہر تنبیہ لہجے میں بولتی ہوئی فردوس کی آنکھوں میں ایسی

دو فحی جیسے کسی شریر بچے نے اپنے کسی بڑے کو اس کی لٹلی پر بین سوئچ پر پکڑ لیا ہو۔

”مجھ سے عالم کی رہائی کے لیے جو کچھ ہو سکا کروں گا۔ ہو سکا ہے مجھے دوبارہ آپ سے رابطہ کرنے کی ضرورت پیش آجائے۔“ فردوس اس کے انداز سے سے زیادہ ذہین مٹی چنانچہ اسے حریف کوئی وساحت دینے کے بجائے اس نے ٹھنوکا موضوع ہی بدل دینا مناسب سمجھا۔

”اچھی بات ہے۔ اگر میں اس سٹیج میں تمہاری کوئی ذکر کی تو مجھے خوشی ہوگی۔“ وہ بھی سنجیدہ ہو گئی۔

”آپ کا موبائل نمبر ہے میرے پاس۔ آئندہ قات کی ضرورت پیش آئی تو بس ایک لفظ ”میننگ“ لکھ کر بھیج دوں گا۔ آپ اسی جگہ چلی آئیے گا تاکہ مجھے دوبارہ آپ کو اغوا کرنے کی ضرورت نہ پڑے۔“

فردوس کے بے تلف انداز کی وجہ سے وہ بھی اس سے بہت کھل کر بات کر رہا تھا۔

”میں تمہاری کامیابی کی خواہش مند ہوں لیکن تمہیں نانا چاہتی ہوں کہ عالم کو آزاد کروانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اگر یہاں تمہارے پاس وسائل کی کمی ہے تو میرا مشورہ ہے کہ اس کام میں ہاتھ مت ڈالو۔ مارے جاؤ گے۔“ بہت سوچ سے اسے مشورہ دیتے ہوئے فردوس کا شوخ و شنگ انداز بالکل گم ہو چکا تھا۔ وہ جو گاڑی سے اترنے کے لیے ڈینڈل پر ہاتھ رکھ چکا تھا، قہم سا گیا پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

”میرا ایمان ہے کہ اگر آپ حق اور سچ کا ساتھ دیں تو مسائل اللہ خود پیدا کر دیتا ہے۔“ فردوس اس کا جواب سن کر ساکت سی بیٹھی رہ گئی۔

”اللہ حافظ۔“ اس نے گاڑی کا دروازہ کھول کر ایک جگہ باہر رکھا۔

”سنو!“ فردوس نے اسے پیچھے سے پکارا۔

”اگر میں تم سے رابطہ کرنا چاہوں تو کیسے کروں؟“

اس کے چپٹ کر دیکھنے پر اس نے مضطرب لہجے میں پوچھا۔

”اگر کبھی ایسا کرنا بہت ضروری سمجھیں تو اپنا حذو اسکرین پر ہائیکس جانب انداز کے ہینڈلے کا اسٹیکر چپکا دیجیے گا۔ شہ خفا آپ سے رابطہ کر لوں گا۔“ وہ جواب دے کر نیچے اتر گیا۔ فردوس ایک پل کے لیے اس کی جانب دیکھتی رہی پھر گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھنے لگی۔

اس کی گاڑی نظروں سے اوجھل ہوتے ہی ایک گاڑی اس کے قریب آ کر رکی اور فرنٹ سیٹ والا دروازہ کھلا۔ وہ کھلے

دروازے سے اندر بیٹھ گیا۔

”کچھ کام بتا؟“ ڈرائیونگ سیٹ پر براہمان کالے خان نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”ایک کام کروا کر خان! نیاز شاہ کے گھر میں کام کرنے والی کسی ملازمہ کو استعمال کر کے گھر کے اندرونی حالات جاننے کی کوشش کرو۔ خاص طور پر یہ جاننے کی کوشش کرنا ہے کہ وہاں عالم شاہ کی بہن سے اس کے شوہر اور دیگر گھروالوں کا کیسا سلوک ہے؟“ وہ ٹھنک جاتا تھا کہ وہ کل کے گھریلو حالات میں بھرتی کے لیے کچھ کر بھی سکتا ہے یا نہیں پھر بھی اس کے بارے میں جاننے کا خواہش مند تھا۔

”لو پر اہم، ہو جائے گا یہ کام۔“ کالے خان نے بھرپور احماد سے جواب دیا تو وہ پُرسوج انداز میں اپنی ڈائری پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ ڈائری سوچوں کی مدد سے حل تبدیل کر کے باہر لکھنے کا آئیڈیا کالے خان کا ہی تھا اور اس نے یہ سب اتنی مہارت سے کیا تھا کہ معاذ نے خود کو اپنی فصد تک بدلا ہوا محسوس کیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس جیسے میں کسی قریبی جاننے والے کے سوال سے کوئی شناخت نہیں کر سکتا۔

☆ ☆ ☆

”تم نے اپنی ٹیم بتائی ہے؟“ وہ ایک اوسط درجے کا ریسٹوران تھا جس میں سونیا سہاش کے ساتھ میز کے ایک طرف بیٹھی ہوئی تھی۔ اس وقت اس کے بالوں کی رنگت سیاہ تھی۔ بالوں میں بچ کی مانگ نکال کر انہیں جوڑے کی شکل میں باندھا گیا تھا اور مانگ میں سیندر بھرا تھا۔ اس نے اپنے خوبصورت جسم کے گرد سٹک کی گھائی سازی لپیٹ رکھی تھی اور کانوں اور گتے کے علاوہ ہاتھوں میں بھی طلائی زیورات پہنے ہوئے تھی۔ ساتھ پر مکتی ہنڈل اور خوبصورت ایک اپ کے ساتھ اسے اس جیسے میں دیکھنے والا کوئی بھی شخص اس کے نئی ٹوپی دہن ہونے کا اندازہ لگا سکتا تھا اور اس انداز سے کو تقویت دینے کو تو بیس سوٹ میں بیس سہاش اس کے ساتھ موجود تھا۔

”نیم تیار ہے میڈم اور ایکشن کے لیے صرف آپ کے اشارے کا انتظار ہے۔“ میز کی دوسری طرف بیٹھے کپل میں سے ایک مرد نے اسے جواب دیا۔ وہ کپل بھی اچھی طرح ڈریس میں تھا اور میز پر سب لوازمات کے باعث ایسا لگ رہا تھا کہ اس کپل کی طرف سے اسے تو بیٹھا جوڑے کی خدمت کی جا رہی ہے۔

”سچے لوگ ہیں؟“ چیر کا ٹکڑا کاٹنے کی مدد سے نزاکت سے منہ میں رکھتے ہوئے سونیا نے سوال کیا۔

انتباہ

ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی جانب سے تقسیم کی جاتی ہے کہ جو ویب سائٹس
 اور ادارے کا نام سے آرگنائزیشنل ڈائجسٹ کے استعمال کو روکتی ہیں۔ اس کے علاوہ
 سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسے فوری ترک کیا جائے تاکہ ہمارے محترم قارئین کی غلط
 فہمی کا شکار نہ ہوں۔ اسی تمام ویب سائٹس اور سوشل میڈیا گروپس کو مرتب کرنے والے
 تنظیمین جو اپنے سطحی مفادات کی خاطر ادارے سے شائع ہونے والے مابینوں کے
 مضامین، افسانے اور کہانیاں بلا اختیار اور غیر قانونی طور پر اپ لوڈ کر کے ادارے کو تکلیف
 مالی نقصان پہنچانے کے ساتھ ادارے کی ساکھ متاثر کر رہے ہیں، انہیں خبردار کیا جاتا ہے
 کہ اس قبیح فعل کو فوری ترک کر دیں، بصورت دیگر ادارہ، سائبر کرائمز کے قانون

PREVENTION OF ELECTRONIC CRIMES ACT 2016

اور

COPYRIGHT ORDINANCE 1962/2000

کے تحت کسی بھی قسم کی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔ ایف آئی اے اور دیگر متعلقہ اداروں میں
 بھی ان افراد اداروں کے خلاف شکایات درج کرائی جائیں گی۔

جاسوسی ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ
 ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیروز ایسٹیشن روڈ سنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
 فون: 35804200-35804300

”آٹھ افراد کی ٹیم ہے۔ عمریں سترہ سے پانچیس سال۔ درمیان ہیں۔ سارے کے سارے مسلمان خاندانوں۔ تعلق رکھنے والے مہجائی بیک گراؤنڈ کے لڑکے ہیں۔ کسی کی بیک پر کوئی ایسا ٹکس موجود نہیں جو بعد میں ان کے لیے آواز اٹھا سکے۔“ اس بار ڈراگنٹیل جواب دیا گیا۔

”گنڈ۔“ سونیا نے کولڈ ڈرنک کا ایک گھونٹ بھرا اور

”جی کی پیٹ میں ایک ٹکس رکھا جیسے ایک چاہنے والی

”وہ ٹکس ان کے ہارے میں برقیف کیا ہے؟“ اس نے

”یہ اثرات اور اندازہ گفتگو کو دیکھ کر کوئی سوچ بھی

”اس میز پر کس نوعیت کی گفتگو ہو رہی ہے۔

”والی انٹرکشن کے مطابق وہ سب بہت

”ہاں کہ ایک بڑا کام کرنے جا رہے ہیں۔“

”یہ سب ہونے کا تو ڈر نہیں؟“

”ماں نہیں۔ بہت چن کر لڑکے سلیکٹ کیے ہیں

”نہایت کا شدید شوق رکھتے ہیں۔ جان دے دیں

”ہاں ہاں۔“ پیچھے نہیں ہٹیں گے۔“ دوسری طرف سے

”بڑی وی کئی۔“

”گنڈ۔“ مجھے ایسے ہی سر دھڑکی بازی لگا دینے والی

”ڈریشن چاہیے۔ جب تک ایسا نہیں ہوگا، ڈراے میں

”ت کا رنگ نہیں آئے گا۔“ وہ سن کر خوشگوار انداز میں

”والی۔“ سہاش نے بھی اس کی مسکراہٹ میں اس کا ساتھ

”اپنے سامنے بیٹھی عورت سے بولا۔

”آپ کی دعوت لا جواب ہے بھابی جی! لیکن میں

”غ کرتا ہوں کہ آپ اگر ایک بار پرمی کے ہاتھ کا کھانا

”ماں کی تو انگلیاں چانتی رہ جائیں گی۔“ بولتے ہوئے

”اس نے سونہا کی طرف عاشقانہ نظروں سے بھی دیکھا تھا۔

”ب کے قریب سے گزرتا دیکھ اس جملے کو سن کر زیر لب

”خراپا۔ اس کا تجربہ تھا کہ نئے شادی شدہ مرد اسی طرح

”اپنی بیویوں پر فریخت ہوتے ہیں۔

”جو کچھ ہوگا اتنا پرنیک ہوگا کہ کوئی ڈراے کا ٹک

”ہی نہیں کر سکے گا۔ بس آپ اس چیز کو شیور بنائیے گا کہ ان

”میں سے ایک بھی لڑکا بچنے نہ پائے۔“ اس بار عورت نے گفتگو

”میں حصہ لے لیا۔ غر کے دور نکل جانے پر آہستہ سے بولی۔

”ڈونٹ دری۔ ایسا ہی ہوگا۔ ان لوگوں کا بچ لکنا

”کسی کے بھی مفاد میں نہیں ہے۔“ سونیا نے اسے یقین دہانی

”کروائی۔ اس کے بعد حریف چھ مسور پر گفتگو کے بعد اس

”طاقت کو برخاست کر دیا گیا۔ دونوں جوڑے ایک

”دوسرے سے الوداعی مصافحہ کر کے باہری طرف بڑھے۔

”ان دونوں کو ایک لمبے لمبے نظروں سے اوجھل

”نہیں ہونے دینا ہے۔ اگر اپنے قیمتی آدمیوں کی جانیں بچانے

”کا مسئلہ نہ ہوتا تو میں بھی تھرڈ پارٹی کو ہار نہ کرتی۔“ گاڑی کی

”طرف جاتے ہوئے سونیا نے سہاش کو ہدایت دی۔

”چنانچہ کریں میڈم! ان کا لمبے لمبے دائرہ ہوا ہے

”مگر۔“

”مگر کیا؟“ اس نے تیز نظروں سے سہاش کو گورا۔

”پہلے تو پلان بکھلا دیتا تھا؟“

”پہلے معاذ تھا ہمارے پاس، اب وہ نہیں ہے اس

”لئے پلان کو تھوڑا سا پیچ کرنا پڑا۔ کیا اتنی معمولی سی بات تم

”میرے بتائے بغیر نہیں سمجھ سکتے؟“ اس کا سوا سہاش کو

”جواب دیتے ہوئے خاصا آف ہو گیا تھا۔

”سوری میڈم!“ سہاش نے ندامت سے کہتے

”ہوئے فرنٹ کے دونوں دروازے اُن لاک کیے۔

”سہاش قاسٹ۔ جلدی گاڑی اسٹارٹ کرو اور مین

”روڈ پر لو۔“ ابھی وہ اندر بیٹھ ہی رہا تھا کہ سونیا تیز لیجے میں

”بولی اور خود اس سے بھی زیادہ تیزی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔

”ہری اپ۔۔۔ ہری اب سہاش! ہمیں ہر صورت اس

”گرے شیر اڈ کو بکھانا ہے جو ابھی ابھی یہاں سے گزری ہے۔“

”کون سی گرے شیر اڈ میڈم؟“ سہاش جو گاڑی کو

”مشکل سے سروں روڈ سے مین روڈ پر لایا تھا، سامنے کی

”طرف نظریں دوڑاتا ہوا بولا۔ اسے ٹریفک کے جھوم میں کوئی

”گرے شیر اڈ نظر نہیں آرہی تھی۔

”وہ آگے نکل گئی ہے۔ تم تیز چلاؤ تو ہم اسے پکڑ لیں

”گے۔“ وہ خاصی پرجوش تھی۔

”اس میں کون تھا میڈم؟“ سہاش نے گاڑی کی

”رٹار بڑھائی اور ٹریفک میں سے راستہ بنانے کی کوشش

”کرتے ہوئے پوچھا۔

”معاذ۔ اس نے ڈانگی سوچیں رکھی ہوئی تھیں اور

”آنکھوں پر سن گھاسز بھی تھے لیکن میں نے اسے پہچان لیا

”ہے۔“ وہ اب بھی پہلے جیسی پرجوش تھی لیکن اس کا جواب سن

”کر سہاش نے خود کار انداز میں گاڑی کی رٹار کم کر دی۔

”مجھے یقین تھا کہ وہ زندہ ہے۔“ سہاش نے اسے

”اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ سہاش کی پوری طور

”پر سہاش کی حرکت کو محسوس نہیں کر سکتی تھی۔

”آپ کو کوئی حد نہیں ہوئی تھی میڈم۔“

”کوئی حد نہیں ہوئی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ معاذ

ہی تھا۔" اس نے سہاش کی رائے کو کوئی اہمیت نہیں دی اور پھر ذرا بھنجلائے ہوئے لہجے میں بولی۔

"میں نے تم سے کہا تھا کہ گاڑی کی رفتار بڑھاؤ۔"

"اسنے فریٹک میں یہ رفتار ٹھیک ہے میڈم! حریف رفتار بڑھا کر میں کسی حادثے کو آواز نہیں دے سکتا۔ ہمارا پولیس کی نظروں سے دور رہنا ضروری ہے۔" سہاش کا لہجہ مزہ باز لیکن انداز دو ٹوک تھا۔

"ہاؤ۔۔۔۔۔" سونیا نے بے اختیار ہی اسے ایک گالی دی اور مشتعل انداز میں اپنا پرس کھولا۔

"میں تمہیں کوئی مار دوں گی۔" ننھا سا آٹو بیک پمپل اس کے چوڑیوں اور مہندی سے سجے ہاتھوں میں بڑا اجنبی لگ رہا تھا۔

"گاڑی میں ریسیور اب بھی موجود ہے۔ آپ اس پر سنکٹر چیک کر سکتی ہیں۔ اگر سنکٹر ملتے ہیں تو میں آپ کے حکم پر عمل کرنے کے لیے تیار ہوں۔" اس کے غصے کے جواب میں سہاش نے خود کو کاہلی میں رکھا۔

"میں اس فضول ریسیور کو نہیں مانتی۔" سونیا نے اپنا سر جھٹکا۔

"آئی ایم سوری میڈم! میں بھی آپ کی بات نہ ماننے پر مجبور ہوں۔ مجھے اوپر سے آرڈر ملا ہے کہ معاذ کی تلاش میں بے کار سے ضائع کرنے کے بجائے ہمیں اپنے ٹارگٹ کو فوکس کرنا ہے۔"

"اوکے۔" وہ سہاش کی بات سن کر ڈھیلی پڑ گئی اور پمپل واپس اندر رکھ کر پرس بند کر دیا۔ اسے معلوم تھا کہ جس گاڑی میں اسے معاذ کی موجودگی کا شک ہو تھا، وہ گاڑی اس دودھان فریٹک کے جھم میں کبھی غائب ہو چکا ہوگی اس لیے اب سہاش سے الجھنا بے معنی تھا۔

"جیسے ہی کام پورا ہو، اس ڈل پارٹی کو بھی اڑا دیتا۔ ہمیں کہیں بھی خود تک پہنچنے والے نشانات باقی نہیں رہنے دینے ہیں۔" خود کو پھر سکون کر لینے کے بعد وہ وہاں ایسے جگہ والی بات پر آگئی تھی جیسے درمیان میں کچھ اور ہوا ہی نہ ہو۔

"ایز پوڈ میڈم!" کچھ دیر تک ہی حکم عدولی کرنے والا سہاش ایک بار پھر تباہ دار بن چکا تھا۔

"کیا جھ میں نے دیکھا وہ کوئی الوڑن تھا؟ کیا معاذ بچ بچ مر چکا ہے؟" ٹھٹھ میں خاموشی سے باہر دوڑتی گاڑیوں پر لگائے وہ خود سے سوال کر رہی تھی لیکن بار بار اس ڈانڈی موٹوں والے کی جھٹک ڈھن کے پردے پر ٹہر جاتی تھی۔ ایک جھٹک میں کسی کو بدلے ہوئے جلیے میں شناخت کر لینا

آسان نہیں تھا۔ وہ تو یہ بھی نہیں دیکھ سکی تھی کہ اس جیورنلر گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر کون موجود تھا۔ گاڑی کا نمبر بھی دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا لیکن دل بار بار یہی بات کہہ رہا تھا کہ جس کی ایک جھٹک دیکھی تھی، وہ معاذ ہی تھا اور یہ دل معاذ کے معاملے میں جانے کیوں کچھ نہ کچھ کہنے لگا تھا۔ اس کی زندگی میں بھلا دل کی باتیں سننے کی کہاں گنجائش تھی۔

☆☆☆

"میری بات سمجھنے کی کوشش کرو سویرا! جھ کچھ ہوا، مجبوری میں ہوا۔ مجبوری میں کچھ کر جانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مجھے تم سے محبت نہیں رہی۔ میں آج بھی تم ہی سے محبت کرتا ہوں اور میرا وعدہ ہے کہ میں ایک دن ضرور تم سے شادی کروں گا۔" بستر پر کبھی کے مل ہائیں کر وٹ لٹھا لیٹل گنگو میں اتنا گن تھا کہ اسے کرے کا دروازہ کھلنے اور کچل کے اندر داخل ہونے کا پتا ہی نہیں چلا۔

"کب تک اس طرح بی ہو کرتی رہو گی؟ میں ماننا ہوں کہ ظلمی ہماری طرف سے ہوئی اور تمہارے گھر والوں کا ہم سے ناراض ہونا جاتا ہے لیکن تم تو کم از کم میرا ساتھ دو یا ر! تم بھی اس طرح مجھے باتیں سناتی رہو گی۔ ان حالات میں کون میری صحت بندھائے گا؟" یقیناً دوسری طرف سے اسے کچھ طعنے تھنے دیے گئے تھے جن کے جواب میں وہ نہایت بے بسی سے شکوہ کر رہا تھا۔ دروازے کی طرف پشت ہونے کے باعث وہ ابھی تک کچل کی کرے میں موجودگی سے آگاہ نہیں ہو سکا تھا اور کچل جو اس کے لیے گھیل کا پیغام لے کر آئی تھی، تذبذب میں کھڑی تھی کہ اسے پکار کر پیغام دے یا خاموشی سے واپس پلٹ جائے۔

"میں نے گھیل بھائی سے بات کی تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ۔۔۔۔۔" اس نے بولتے بولتے کر وٹ بدلی اور کچل کو کھڑا دیکھ کر چمک گیا۔

"میں بعد میں تم سے بات کرتا ہوں۔" جھٹ میں کہہ کر اس نے سلسلہ منتقلیہ کب ہا اور موہا کی بستر پر رخ کر کچل کو شر بار نظروں سے گھورتا ہوا کھڑا ہوا۔

"تمہیں کسی نے تیز نہیں سکھائی کہ کسی کے کرے میں داخل ہونے سے پہلے دروازہ ٹاک کرتے ہیں۔"

"اھ اگر کرا اپنا ہی ہونو؟" وہ جو فیصل کی خود سے بدسلوکی کے جواب میں عجوبہ خاموشی رہتی تھی، جتائے بغیر نہیں رہ سکی۔

"مہنا کر؟" وہ چہرہ تپتا تھا۔ سویرا کی طرف سے نہ تو کچھ معلوم نہیں کہ تمہیں کب اس کرے سے ٹال دیا جائے۔"

دور دور رہتی تھیں اور اس کے کسی بھی کام کے لیے وہ بھرتی نہیں دکھاتی تھیں جو دیگر افراد کے لیے ممکن تھی۔ یہ ملازمہ شاید بھی ایک آدمہ دن سے ہی اس کے ساتھ اچھا رویہ رکھ رہی تھی اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ شاید کو اس اچھائی کے بدلے ہمارے پڑ جائے۔

”ڈانٹ پڑنے کی خیر ہے بی بی! ہم غریب تو جھڑکیاں کھا کھا کر لپٹے بڑھتے ہیں اس لیے ان کے عادی ہو جاتے ہیں لیکن آپ کی حالت دیکھ کر کچ پڑا دکھ ہوتا ہے۔ سنا ہے آپ کے ابا چڑھے زمیندار ہیں اور آپ کو بڑے تازوں سے پالا ہے لیکن یہاں آپ سے جو سلوک ہوتا ہے، وہ آپ پر نہیں کیسے برداشت کرتی ہیں۔“ ملازمہ کے لب و لہجے سے ظاہر تھا کہ وہ سرے میں پیش آنے والے واقعے سے مکمل نہیں تو کچھ نہ کچھ ضرور واقف ہے۔ ممکن تھا کہ فیصل کے بلند لب و لہجے میں، لڑنے کی آوازیں باہر نکل گئی ہوں اور بعد میں اس نے نکل کی جو حالت دکھی، اس کی بنیاد پر کچھ اندازے قائم کر لیے ہوں۔

”یہاں بیٹھ کر فضول باتیں کرنے سے بہتر ہے کہ باہر جاؤ اور اپنے کام ٹھنکنا۔“ ملازمین کی اپنے ہی معاملات میں مداخلت اسے پسند نہیں تھی اس لیے شاید وہ کی ہمدردی کے باوجود اسے شہ زور کی اور کمرے سے باہر کا راستہ دکھایا۔

”یا اللہ! میرے ادا سائیں اور سرمد کو خیریت سے واپس لے آ۔ وہ سلامت رہیں تو میں یہ کانتوں بھری زندگی بھی بنا سکتا ہے کے گزار لوں گی۔“ ملازمہ کے جاتے ہی اس کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا اور اعظم کو گود میں لٹا کر چپکتے ہوئے دل ہی دل میں دعائیں مانگتی آنسو بہانے لگی۔

”کھل! کیا ہوا ہے تمہیں؟ ہے چوٹ کیسے لگی؟“ ابھی چند منٹ ہی گزرے تھے کہ فردوس اس کے کمرے میں چلی آئی۔

”کچھ نہیں فردوس بھابی! بس وہ ذرا ابیر سلپ ہونے سے گر گئی تھی تو بے چوٹ لگ گئی۔“ اس نے جلدی جلدی آگلی سے آنسو صاف کرتے ہوئے بات بتانے کی کوشش کی۔

”چوٹ لگ گئی اور تم کسی کو کچھ بتانے کے بجائے یہاں بیٹھی چپکے چپکے رو رہی ہو۔ کیا خالی رونے سے تکلیف ٹھیک ہو جائے گی؟“ فردوس نے ناماشی کا اظہار کیا۔

”اہل میں اعظم سونے کے لیے بے چین ہو رہا تھا تو میں نے سوچا پہلے اسے سلا دوں پھر دیکھتی ہوں۔ ویسے معذرت ہی چوٹ ہے۔ کوئی ہام وغیرہ لالوں کی تو ٹھیک ہو جائے گی۔“ اس نے کافی حد تک خود کو مستحیال لیا تھا۔

”جب تک ایسا ہو نہیں جاتا، میں یہاں رہنے اور اس کمرے کو اپنا کراہیے پر مجبور ہوں۔“ سپاٹ سے لہجے میں کہتے ہوئے اس نے فیصل کو باور کروادیا کہ اس کے لیے بھی یہ شادی کوئی خوشی کا سودا نہیں تھی۔ عالم شاہ کے حوالے سے کوئی اچھی خبر نہ ملنے کے باعث وہ پہلے ہی بہت رنجور تھی۔ ایسے میں اس کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ فیصل سے ایسی گفتگو برداشت کر پاتی۔ ایک ایسا شخص جسے نکاح کے مقدس رشتے کے نالج ان مشکل حالات میں اس کی دلجوئی کرنا چاہیے تھی، مسلسل تھکیک و تھکھل کرتا رہے تو یو داشت کا جواب دے جانا بھی تھا۔

”بکواس مت کرو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں یہ چلتی ہوئی زبان گدی سے پکڑ کر کھینچ لوں اور تم ساری زندگی بولنے کے لیے ترستی رہ جاؤ۔“ اس نے نکل کا بازو اتنی سختی سے پکڑ کر جھنجھوڑا کہ اس نے صحت سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اس کی تکلیف کی پروا ہے میر۔ نکل نے اسے زور سے دھکا دیا اور خود کمرے سے باہر نکل گیا۔ نکلے ہوئے اس نے پلٹ کر یہ بھی نہیں دیکھا۔ اس سے دھکے کے نتیجے میں نکل بیڈ کے قریب جا کر گر گئی ہے اور گرتے ہوئے اس کی پیشانی بیڈ کی سخت پٹی سے جا ٹکرائی ہے۔ اس کمرے سے اس کا سر تو نہیں پھٹا تھا لیکن دماغ بری طرح چکرا گیا تھا اور آنکھوں کے آگے رنگ برنگے دائرے ناچنے لگے تھے۔

”بی بی! اسی وقت ایک ملازمہ نے کمرے میں جھانکا اور اسے ابتر حالت میں لیٹے بیٹھے دیکھ کر اندر چلی آئی۔ نکل کا بیٹا اعظم اس کی گود میں تھا۔

”یہ کیا ہوا ہے بی بی؟“ اس نے فکر مندی سے نکل کی پیشانی پر ابھرا آنسو لے کر سونے سے سرخ گونڈ کر دیکھا۔

”کچھ نہیں۔ لاڈ تم اعظم کو مجھے دے دو۔“ اس نے اپنا لہجہ ہموار کھینے کی کوشش کرتے ہوئے ملازمہ کی گود میں ہاتھ بھر مارتے بیچ کو لینے کے لیے ہاتھ بڑھائے۔ بچہ ماں کو سامنے پا کر اس کی گود میں آنے کے لیے نکل بہا تھا۔

”شاید آپ گر گئی ہیں۔“ ملازمہ نے اس کی ضبط کی کوشش میں سرخ ہوتی آنکھوں کو غور سے دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا۔

”معذرت ہی چوٹ ہے۔ تم اس کی فکر چھوڑو اور جا کر اپنا کام دیکھو، ایسا نہ ہو کہ تمہیں کام چوری کے الزام میں ڈانٹ پڑ جائے۔“ اس نے ملازمہ کو سمجھایا۔ اس ملازمہ سمیت گھر بلو کام کاج میں مدد دینے کے لیے دو ملازما بھی مزید تھیں لیکن مکان کے روپے کو دیکھ کر وہ سب اس سے

”کوئی معمولی چوٹ نہیں ہے۔ سر پر لگنے والی چوٹ کو کبھی معمولی نہیں سمجھنا چاہیے۔ میں ابھی تمہارے لیے کوئی میڈیسن بیجواتی ہوں۔ اس گومڑے پر کچھ دیر برف کی سٹائی کرو اور دوا کھا کر آرام کرو۔ اگر آرام نہ آئے تو مجھے بتا دینا۔“ فردوس نے اسے دھیرے سے لپٹے ہوئے دایات دیں۔ گھر میں موجود خواتین میں سے وہی تھی جس سے آپ تک اسے کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی تھی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات کی وجہ سے ایک تو فردوس کا اچھا خاصا وقت گھر سے باہر گزارتا تھا دوسرے جب وہ گھر میں ہوتی تھی تو اس کی کوشش ہوتی کہ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت اپنی بیٹیوں پر صرف کرے۔

”اور ہاں، یہ فیصل کہاں ہے؟ اسے کوئی خیال نہیں ہے کہ اپنی نئی ٹوپی بھڑی کا خیال رکھے۔“ وہ شاید کھیل بھائی کے پاس گئے ہیں۔ انہیں کوئی کام تھا ان سے۔“ اس نے فردوس سے نظریں چراتے ہوئے جواب دیا۔

”نظر رکھا کرو اس پر۔ سویرا کے جنون میں جلتا تھا۔ اباجی تو ان لودولتوں کے خاندان میں رشتہ کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھے لیکن اس کی ضد سے مجبور ہو کر ہاں بھرنا پڑی۔ وہ تو اچھا ہوا کسی بھی بہانے سے، اس سے سب کی جان چھوٹی لیکن تم خیال رکھنا۔ بہت تیز لڑکی ہے، کہیں دوبارہ فیصل پر جال پھینکنے کی کوشش نہ کرے۔“

”جی بھابی!“ فردوس کے مشوروں کے جواب میں اس کے پاس نقطہ دو الفاظ ہی تھے۔

”عالم اور مرید کی رہائی کا کیا ہوا؟ کھیل بھائی نے کوئی اچھا واسطہ ڈالنا ہے یا نہیں؟“ فردوس ایک کے بعد ایک سوال داغ رہی گئی۔

”ابھی تک تو کچھ نہیں ہوا۔ کھیل بھائی بھی اپنی جگہ پریشان ہیں۔ بے چارے اپنے طور پر جتنی جھاگ دوڑ کرکتے ہیں بکھر رہے ہیں۔“ اس نے اسی سے جواب دیا۔ ”ہوں۔“ اس بار فردوس نے صرف ایک ہنکارا بھر کر اپنا رد عمل ظاہر کیا۔ اس کے انداز سے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کسی سوچ میں گم ہو۔

”ایک بات پوچھوں بھل؟“ آخر کار اس نے قدرے تذبذب سے لب کشائی کی۔

”جی پوچھیے۔“ بھل کو اس کے انداز نے الجھا دیا۔ ”عالم کا کوئی ایسا بگڑی دوست ہے جو اس کی خاطر اپنی جان کی پروا کیے بغیر خطرے میں کود پڑے؟“

”جی.....؟“ فردوس کا سوال اتنا غیر متوقع تھا کہ وہ حیران رہ گئی اور اس سے بھی بڑھ کر حیرت کا مقام یہ تھا کہ اس کے ذہن میں فوراً ہی ایک چہرہ جھلک گیا۔ ایک ایسے بے لوث شخص کا چہرہ جس نے ڈاکوؤں کی قید سے آزاد ہونے کا موقع ملنے پر خود اس موقع کا فائدہ اٹھانے کے بجائے اسے اور معظم کو واحد دستیاب سوشل سائیکل پر فرار کروایا تھا اور خود مشکل میں گرفتار ہو گیا تھا۔

”اتنی حیران پریشان کیوں ہو؟ ہر انسان کا کوئی نہ کوئی بہت اچھا اور گہرا دوست ہوتا ہے۔ عالم کا بھی ہوگا۔“ فردوس نے اسے اس کی کیفیت پر لٹو کا۔

”مجھے اندازہ نہیں ہے بھابی آپ کو معلوم ہے کہ ہم بیٹنیں پردہ کرتی ہیں اس لیے ہمیں ادا سائیں کے دوستوں کے بارے میں زیادہ علم نہیں ہے۔ ہم تو بس سرے کو جانتے ہیں جو ہر وقت ان پر جان چڑھنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ سرے کے علاوہ کچل بھی خاصا وفادار ہے لیکن وہ دوست تو نہیں ہے۔“ اس نے اپنا سر جھٹکتے ہوئے ذرا تفصیل سے جواب دیا پھر پوچھا۔ ”لیکن آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟“

”بعد میں بتاؤں گی۔ فی الحال تم دوا کھا کر آرام کرو۔ اگر فرق نہیں پڑا تو میں کہیں اسے ساتھ اسپتال لے جاؤں گی۔“ فردوس نے اس کے سوال کو بلا اور خود قدرے غلط فہمی میں وہاں سے چلی گئی۔ پیچھے وہ ابھی ابھی ہی بیٹھی رہ گئی۔

☆☆☆

رات کا آخری پہر چل رہا تھا لیکن خیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ وہ ایک قید سے نکل کر دوسری قید میں آ گیا ہے۔ تمام تر سہولیات کی دستیابی کے باوجود کچھ نہ کر سکنے کی اذیت نے اسے ہر شے سے بیزار کر دیا تھا۔ نہ اسے اپنے گھر والوں کی کوئی خبر مل رہی تھی، نہ وہ بھل کے لیے کچھ کر سکتا تھا اور نہ ہی عالم شاہ کی رہائی کے لیے کوئی لائحہ عمل طے کر پایا تھا۔

کُل جس نے شرابی حدود سے دو بارہ پاکستان کال کی تھی اور حسب سابق انم بن کر گفتگو کرتا رہا تھا البتہ کُل والی کال پر اس کی ٹوبیہ کے بجائے پچھو سے بات ہوئی تھی۔ ٹوبیہ کے آج کل داماد چل رہے تھے اس لیے وہ بہت مصروف ہو گئی تھی۔ پچھو نے اس سے ٹوبیہ کی طرح کھل کر گفتگو نہیں کی تھی۔ (بھینا وہ بھل کی سبکی سے اس موضوع پر کھل کر گفتگو کرنے سے احتراز کر رہی ہوں گی) لیکن بہر حال اسے اتنا تو پتا چل گیا تھا کہ ابو اور علیہ لوٹ کر گھر نہیں آئے ہیں اور نہ ہی سعد کی کوئی خبر ہے۔

نیپال سے کرا چھوڑ کر لان کا رخ کیا۔ خلاف معمول لان کی لائیں بند تھیں اور محض چاند کی روشنی ہی تھی جس کی مدد سے راستہ دیکھا جاسکتا تھا۔ وہ یہاں محض تازہ ہوا کی خواہش میں آیا تھا اس لیے روشنی کی غیر موجودگی سے کوئی فرق نہیں پڑا اور دھیمے قدموں سے چلتا ہوا نیپالی گھاس پر جا بیٹھا۔ سادھو نے اسے بازو پر باندھنے کے لیے جو پتھر دیا تھا اس کے متعلق اس دھوے کی تو تصدیق ہو گئی تھی کہ پتھر کی موجودگی میں کوئی کیڑا اکوڑا اس کے جسم پر نہیں بیٹھا تھا اس لیے اندھیرے میں گھاس پر لیٹے ہوئے دل میں یہ اندیشہ پیدا نہیں ہوا تھا کہ گھاس میں چھپا کوئی کیڑا نقصان پہنچا دے گا۔

”اب جا کر سو جاؤ رادھا! صبح ہوئی آئی ہو۔ اس طرح بیٹھی رہو گی تو بیمار پڑ جاؤ گی۔“ گھاس پر لیٹے ہوئے چند سیکنڈ ہی گزرے تھے کہ قریب سے سنائی دینے والی مردانہ آواز نے بری طرح چونکا دیا اور وہ یہ مشکل خود کو اچھٹنے سے باز رکھ سکا۔

”تم تو ایسی بات نہ کہو۔ دنیا کے لیے میں کتنی ہی نرم و نازک ہیر و من سہی، تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں کتنی سخت جان ہوں۔ اگر میں ایسی نہ ہوتی تو کیا ان جھکیوں اور بہتی نالیوں والی جگہی بستی سے اٹھ کر یہاں پہنچ پاتی؟ تمہاری کوششوں کے بعد یہ میری سخت جانی ہی تو تھی جس نے مجھے یہاں تک پہنچایا۔“ وہ بلا شک و شبہ رادھا ہی تھی جو اس سے کچھ غاصلے پر موجود تھی بیٹھ کر کسی مرد کے شانے پر سر ٹکائے بیٹھی تھی اور اسے کوئی شک نہیں تھا کہ وہ مرد کالے خان تھا۔ پختہ عمر اور گہری رنگت کا مالک کالے خان۔

”وہ دن بھول جاؤ۔ اس بڑے وقت کو بچے لبا سے گزر گیا۔ آج کا بچ یہ ہے کہ تم اس ملک کی ٹاپ ہیر و من ہو اور لاکھوں دلوں پر راج کرتی ہو۔“ وہ بولے ہوئے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتا ہوا رادھا کو سمجھا رہا تھا اور محاذ اپنی جگہ لیٹا ساکت تھا۔ پشت پر ہونے کے باعث وہ دونوں اسے دیکھنے سے قاصر تھے۔ یوں بھی وہ ایک دوسرے میں ایسے مگن تھے کہ انہیں ارد گرد کا دھیان ہی نہیں تھا۔ رادھا شاید لیٹ نائٹ آئی تھی مگر اس کی معلومات کے مطابق تو وہ شوٹنگ کے لیے بستی میں تھی۔

”راج کرنے کی تو تم نے خوب کہی۔ جتا ہے کل بریک بین سورج میرے پاس آیا اور مجھ سے مشت جھاڑنے لگا۔ کہہ رہا تھا کہ تم سے بیاہ کرنا چاہتا ہوں۔“ وہ ٹھٹھکتا ہے لیجے میں کالے خان کو وقت کے سب سے ہٹ ہیرو کے

دوسری طرف کالے خان نے نکل کے حالات معلوم کرنے کے لیے جس ملازمہ کی خدمات حاصل کی تھیں، وہ بھی کچھ اچھی خبریں نہیں لائی تھی۔ ملازمہ کے مطابق کھیل اور ڈاکٹر فردوس کے علاوہ گھر کے افراد نکل سے بات چیت کرنا گوارا نہیں کرتے تھے۔ مردوں کی تو چلو خیر تھی کہ وہ اپنے اپنے دھندوں میں مصروف رہتے تھے اور انہیں نکل کی طرف توجہ دینے کی فرصت نہیں تھی لیکن خواتین کا سلوک عجیب سا تھا اور وہ اس کے ساتھ ایسے پیش آتی تھیں جیسے وہ کوئی اچھوت ہو۔ جھٹائیوں کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی ملاقات کے لیے آنے والی بیواہی خندوں کا رویہ بھی مناسب نہیں تھا اور وہ بھی اسے ہی ان بگڑے ہوئے حالات کے طعنے دیتی تھیں۔

فیصل، جس نے اس سے نکاح کر کے ہر طرف سے رادھو صولی تھی اور ایک بیوہ لڑکی کو اپنانے پر سب کے نزدیک ہیرو بنا بیٹھا تھا، سب سے زیادہ اس کے ساتھ بدسلوکی کر رہا تھا۔ اس کے رویے سے صاف ظاہر تھا کہ بڑوں کے دباؤ میں آ کر کی جانے والی شادی پر چھٹا رہا ہے۔ ملازمہ نے اطلاع دی تھی کہ فیصل نے نکل پر ہاتھ بھی اٹھایا تھا جس کے نتیجے میں اسے اچھی خاصی چوٹ بھی آئی تھی۔ یہ سب سن کر اسے سخت غصا آیا تھا اور بس نہیں چل رہا تھا کہ اس ناشکرے انسان کی، جسے بغیر کسی تنگ و دو کے نکل جیسی لڑکی مل گئی تھی، اس ناقدری پر خوب فحشائی لگائے لیکن اس کے پاس یہ سب کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔

نکل کے ساتھ ساتھ اسے عالم شاہ کی طرف سے بھی شدید تشویش تھی۔ وہ جن لوگوں کی تحویل میں تھا، ان سے کوئی اچھی امید نہ کھٹکتی تھی لیکن وہ چاہنے کے باوجود اس کے لیے کچھ نہیں کر پا رہا تھا۔ رادھا دہلی اور کالے خان کے قصوں کے باوجود وہ سمجھتا تھا کہ اس کام میں کوئی مدد کرنا ان کے بس سے باہر ہے۔ دولت کے بل پر وہ لوگ اس کی جتنی مدد کر رہے تھے، وہ بھی بہت زیادہ تھی۔ اس سے زیادہ مطالبہ کرنا ان کے ساتھ زیادتی ہوتی۔ رادھا دہلی کا بتایا کیریز تو کیا، زندہ گی بھی واؤ پر لگ سکتی تھی اور وہ اس بے چاری کو گردنی سے عقیدت کی اتنی بڑی مزا نہیں دے سکتا تھا۔

”ناحق کو ہم مجبوروں پر تہمت ہے غلطی کی۔“ ساری صورت حال کے متعلق سوچتے ہوئے وہ ایک آہ بھر کر زیر لب بڑبڑایا اور سونے کی مزید کوشش کرنے کو بیکار جان کر بیستر چھوڑ دیا۔ اندر کی گھنٹن نے اچھے خاصے کشادہ اور ہر سہولت سے مزین کمرے میں بھی گھنٹن کا احساس پیدا کر دیا تھا۔ اس نے کچھ دیر تازہ ہوا میں سانس لینے کے

ملک بھر میں جاسوسی ڈائجسٹ پیلی کیشنز کے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسٹمز ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت ملنے میں اگر دشواری ہے تو مندرجہ ذیل نمبرز پر ہمارے نمائندوں سے رابطہ کیجیے۔

03460827027	منڈی بہاؤ الدین	03016215229	کراچی	03002680248	گجرات
0524568440	سیالکوٹ	03456892591	لاہور	03004009578	وزیر آباد
03460397119	میرپور AK	03216203640	مٹمان	03006301461	لالہ موی
057210003	انگلش	03337472654	حیدر آباد	03213060477	خان پور
03004059957	دیپالپور	03325465062	سرگودھا	03447475344	کوہاٹ
03002373988	لیہ	03446804050	پشاور	02005930230	ساہیوال
03083360600	قصبہ نگہ	03006946782	گومل	03337805247	پاک پتن
03008758799	عارف والا	03469616224	فیصل آباد	03006698022	منظر آباد
03023844266	نور الدلی	03347193958	راولپنڈی	03335205014	بوروالہ
03016299433	کوٹلہ ارب علی خان	03136844650	نواب شاہ	03003223414	دہاڑی
03338303131	جلاپور علی والا	03346712400	سکس	03009313528	تونسہ شریف
03321905703	جری پور	03336481953	رحیم یار خان	03055872626	ڈیرہ غازی خان
03348761952	چکوال	03336320766	بہاولپور	0622730455	بہاولنگر
03346383400	دہوا	03329776400	گوجرانوالہ	03316667828	بنوں شہر
03006885976	حافظ آباد	03004719056	جہلم	03235777931	رائے وٹ
03325465062	کوہاٹ	03317400678	سیالکوٹ	03008711949	ہڑپہ
0992335847	ایبٹ آباد	03349738040	جنگ	0477626420	ڈیرہ اسماعیل خان
03454678832	چوکی	03348761952	بکر	03337979701	چشتیان
0333-5021421	مانسہرہ	0301-7681279	منڈی بہاؤ الدین	0331-7619788	تھن آباد
03004992290	کوٹ رادھا کشن	0333-8604306	ڈسکہ	0300-9463975	سموہیال
0300-6575020	قصور	0315-6565459	منجہرہ شاہ	03006969881	نوبلک سنگھ

جاسوسی ڈائجسٹ پیلی کیشنز

C-263 لاہور، پاکستان۔ دفتر مرکزی فون: 35895313

E-mail: jdpgroup@hotmail.com

پر وپازل کے بارے میں آگاہ کر رہی تھی۔

”مگر تم نے کیا جواب دیا؟“

”جیسے نہیں خبر میرے جواب کی؟“ اس نے کالے خان کے جواب پر خفا سے لہجے میں کہتے ہوئے اپنا سر ایک جھٹکے سے اس کے شانے پر سے اٹھایا۔

”اچھا لڑکا ہے۔ خوبصورت، جوان اور فیس۔۔۔ جس میں اسے بال بناسو ہے سمجھے رجبکٹ نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ کالے خان کا لہجہ سمجھانے والا تھا۔

”مجھ سے اسکی باتیں نہ کرو جیسے تم کوئی انجان شخص ہو، جسے میرے سن کی خبر ہی نہیں ہے۔“ رادھا کے لہجے کی خفگی کچھ اور بھی بڑھ گئی۔

”لو کہیں کی نا کجی سے نکل آ کر رادھا اور دیکھو کہ تمہارے سامنے کتنی رنگین اور روشن دنیا بنائیں گھولے کھڑی ہے۔“

”تم جانتے ہو کہ سنسار کا ہر رنگ اور روشنی میرے لیے اس گھر کے آگے بے معنی ہے۔ میں سنسار کے کسی بھی حصے میں چلی جاؤں، اس گھر میں وہیں لوٹ کر آنے کے لیے بے چین رہتی ہوں۔ ممیٹی سے دہلی کی جتنی فکائش میں لیتی ہوں شاید ہی کوئی اور لیتا ہو اور تم جانتے ہو کہ یہ سب صرف تمہاری خاطر ہے۔“

”میں نے تو تم سے کہا تھا کہ میں ممیٹی شفٹ ہو جاتا ہوں تاکہ تمہاری اس آئے دن کی پریذ سے جان چھوٹے۔“

”نہیں، مجھے معلوم ہے کہ تمہیں ممیٹی میں رہنا پسند نہیں ہے۔ تم یہاں دہلی کی فضاؤں میں خوش رہتے ہو۔“

”یہ خوشی سے زیادہ عادت کا معاملہ ہے رادھا! تم جانتی ہو کہ اگر میں دو چار دن پرانی بستی کا چکر نہ لگاؤں تو میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔“

”ہاں، یہ بھی عجیب ہی بات ہے کہ میں نے ایک بار اس بستی کو چھوڑا تو پھر بھی لوٹ کر وہاں نہیں گئی اور تم وہاں جاسے بنا رہ نہیں پاتے۔“

وہ ارد گرد سے بے خبر اپنی گتھوں میں مگن تھی اور محاذ کو ان کی گتھوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ان کے تعلق کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ دیکھنے میں ایک دوسرے سے متضاد نظر آنے والے دو عذرا لوگ کہیں اندر جا کر ایک ہی تھے۔

”اس بستی کے احسانات ہیں مجھ پر۔ اس ٹھیکتی چتوں والی جنگیوں کی بستی نے مجھے اس وقت بنا دیا تھا جب میرے پاس سر چھپانے کی جگہ نہیں تھی۔ میں نے وہاں قاتلے کالے لیکن بے گھرئی کے عذاب سے بچ گیا۔ آج اس اتنے بڑے گھر میں رہ کر بھی مجھے اس جگہ کی کمی

دیواروں کا تحفظ نہیں بھولتا ہے۔“ کالے خان کے لہجے میں ایک محسوس کی جانے والی اداسی تھی۔

”چھوڑو اس ٹاپک کو۔ اس ٹاپک پر بات کرتے ہوئے تم ہمیشہ سستی میں مبتلا ہو جاتے ہو۔“ رادھا کو اس کی یہ اداسی بھائی نہیں۔

”ٹھیک ہے تو پھر دوسرے ٹاپک پر بات کر لیتے ہیں۔ میں نے تم سے کہا تھا ممیٹی میں اپنے لیے کوئی اچھا سا گھر دیکھو۔ اتنی بڑی بیرونی اپارٹمنٹ میں رہتے ہوئے ابھی گھر گھر۔“

”مجھے نہیں دیکھنا کوئی گھر۔ یہ گھر ہے ہمارے پاس۔ مجھے ایک دن لوٹ کر ہمیشہ کے لیے اس گھر میں آنا ہے۔ ممیٹی تو ورک پلیس ہے۔ وہاں گزارے کے لائق رہنے کی جگہ ہے، بس کافی ہے۔“ وہ لاڈ جتانے والے انداز میں بولی اور اپنا ہاتھ کالے خان کی گردن میں حائل کرتے ہوئے اس کے مزید قریب ہو گئی۔

”بولی دو تمہیں اتنی آسانی سے نہیں چھوڑنے والا۔ میری مانو اور ممیٹی میں بھی ایک اچھا گھر بنا لو۔“ کالے خان نے اسے سمجھایا۔

”میں موسیٰ، یوایا مانی داوی بن کر کام کرنے والی نہیں ہوں۔ جب تک بیرون آرہی ہوں میں تب تک کام کروں گی۔“ رادھا نے اسے اپنا ارادہ بتایا۔

”میں گارنٹی دیتا ہوں کہ اگلے دس سال تک بھی تم بیرون کاسٹ ہوئی رہو گی۔ تمہارا حسن دو چار برسوں میں اچھلنے والا نہیں۔“

”تم تو مجھے ایسے ہی بتاتے ہو۔“ وہ شوخی سے ہنسی۔

”سارے عمر کی تو کام کیا ہے۔“ کالے خان کا لہجہ مسکراتا ہوا تھا۔ معاذ کو اس سے زیادہ ان کی تنہائی میں کل ہونا مناسب نہیں لگا۔ وہ بہت احتیاط سے اٹھا اور خاموشی سے واپس پلٹ گیا۔ آج اس نے جو کچھ سنا تھا، اس نے رادھا اور کالے خان کے تعلق کی کچھ تو پوری طرح نہیں سلجھائی تھی لیکن یہ بھی البتہ سلجھ گئی تھی کہ اس بڑے سارے مکان میں کوئی مستقل ملازم کیوں موجود نہیں ہے۔ یہ مکان اپنے اہم محبت کی ایک عجیب و غریب داپٹان کو چھپائے ہوئے تھا اور ہر وقت خبروں کی ترغیب دیتی رہے تھے اسی رادھا کو اپنی محبت دنیا سے چھپا کر دکھاتا تھی۔

☆☆☆

”سائیں“

”ہوں۔“

"کیا سوچ رہے ہیں سائیں؟"

"سوچنے کو ہے ہی کیا ہمارے پاس؟" اس نے

ماپوسی سے سر جھٹکا۔

"ماپوسی کیوں ہو رہے ہیں سائیں! باہر والے ہمیں قید میں چھوڑ کر کوئی سکون سے تو نہیں بیٹھے ہوں گے۔ ادھر تکھیل سائیں اور وہاں پاکستان میں وڈے سائیکہ ہماری رہائی دینے کے لیے کوششوں میں کیے ہوں گے۔ وڈے سائیں نے تو چھری گورنمنٹ کو ہلا کر رکھ دیا ہوگا۔ ان کی بہت عزت ہے۔ ان جیسے شخص کے بیٹے کو بھونے الزامات میں گرفتار کر لینے پر کوئی پاکستانی گورنمنٹ خاموش تھوڑی بیٹھے گی۔" سرمد اس کے اندر خوش امید کی جگانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن رویں رویں میں بس جانے والے درد کے احساس کے سوا اب کچھ محسوس ہی نہیں ہوتا تھا۔

"مجھے نہیں لگتا سرمد کہ کچھ ہو سکے گا۔ مجھے ایک ایک کر کے وہ سارے پاکستانی یاد آ رہے ہیں جنہیں ہماری طرح کسی نہ کسی بھونے الزام میں گرفتار کیا گیا اور پھر اس بھونٹ کوچ بٹاتے ہوئے انہیں سخت سزاؤں کا حقدار قرار دیا گیا۔"

"بچھلے قصوں کو چھوڑیں سائیں! آپ کی بات ان سب سے الگ ہے۔ آپ سائیں صداقت شاہ کے بیٹے ہیں اور سائیں کے دوست اس نازک وقت میں ان کا پورا پورا ساتھ دیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر سیدھے طریقے سے بات نہ بنی تو معاملہ بہت اوپر تک بھی جاسکتا ہے۔ بس ہمیں اس وقت تک کے لیے ذرا صبر سے کام لینا ہوگا۔" سرمد امید کا دامن چھوڑنے کو تیار نہیں تھا لیکن اسے خبر نہیں تھی کہ جس سائیں صداقت شاہ کے رہتے پر وہ اتنا فائدہ اٹھا رہا تھا، ان کے دشمن سوچ کا فائدہ اٹھا کر میدان میں آ گئے تھے اور ان کے اور ان کے بیٹے کے لیے ایسے نیرت انگیز بیانات داغ رہے تھے جو ان کے کہیں کو خراب سے خراب تر کرتے جا رہے تھے۔

مخالفین اور حامدین کی اس فوج میں لطیف سومرو،

عرفان اللہ اور یزدانی پیش پیش تھے۔ انہوں نے اپنے ساتھ بہت سوں کو ہٹا بیٹا لیا تھا اور ایوزیشن ارکان تو ایک طرف رہے خود صداقت شاہ کی پارٹی میں سے بھی ان کے خلاف آوازیں اٹھ رہی تھیں۔ انہیں برا بھلا کہا جا رہا تھا۔ ان کے خلاف ہم دیکھیں گا اظہار کیا جا رہا تھا کہ ان کے بیٹے نے دشمن ملک میں ایسی حرکتیں کر رکھی ہیں کہ ان کی بدنامی کا سامان کیا ہے۔ ان کی اپنی پارٹی کے کسی ارکان کی طرف سے مطالبہ کیا جا رہا تھا کہ ان کی پارٹی رکنیت ختم کی جائے۔

دل کے مرض میں مبتلا صداقت شاہ کے لیے ایک طرف اپنی اولاد کی زندگیاں داؤ پر لگی دیکھنا تکلیف دہ تھا تو دوسری طرف انہوں کے چلائے تیروں سے زخم زخم ہو گئے تھے۔

"تمہیں یاد ہے سرمد! جب معاذ غائب ہو گیا تھا تو اس کے گھر والے بھی اس کے لیے کیسے ترپتے تھے۔ اپنے ملک اور اپنے لوگوں کے درمیان ہوتے ہوئے بھی معاذ کے لیے کچھ نہیں کیا جاسکتا تھا اور ہم تو پروسس میں اور وہ بھی بدترین دھمنوں کے قلعے میں تھا۔ ہمارے لیے بھلا کوئی کیا کر سکے گا؟" وہ پتہ نہیں چلے بہت زیادہ یاسیت کا شکار تھا۔ "معاذ صاحب! کیس! الگ تھا سائیں! ان کی تو خبر ہی نہیں تھی کہ وہ کہاں غائب ہو گئے ہیں لیکن ہمارے بارے میں تو ساری دنیا جانتی ہے نا۔" سرمد نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"کوئی الگ۔۔۔ نہیں تھا سرمد! ہماری طرح وہ بھی سازش کا شکار بنا تھا۔ اس کے ماں باپ اور بہن بھائی بھی اس کے لیے ترپتے تھے لیکن اس وقت باپ سائیں کو یہ بات سمجھ نہیں آئی تھی اور انہوں نے مجھے ایسٹرن بلیک میل کر کے معاذ کے لیے کچھ بھی کرنے سے روک دیا تھا۔" معاذ کے معاملے میں وہ ہمیشہ ان میں شرمندہ رہا تھا اس لیے اس مصیبت کے وقت میں بھی اس کا خیال شدت سے یاد آیا تھا۔ "وہ بالکل فطری بات تھی سائیں! سارے ماں باپ پہلے اپنی اولاد کی سیفٹی کا سوچتے ہیں۔"

"اور یہ سوچ دوسروں کا بھلا نہیں ہونے دیتی۔ اس سوچ کی وجہ سے ظلم کا سلسلہ راز ہوتا چلا جاتا ہے۔" اس نے کہہ کر اپنا سر جھٹکا اور پھر خود کو پریشانی سے دیکھتے سرمد کی طرف دیکھ کر ہنس دیا۔

"اسنے پریشان نہ ہو۔ میری ذہنی حالت ٹھیک ہے لیکن میں بے کار خوش امیدیاں پالنے کے بجائے حقیقت پسندی سے سوچ رہا ہوں۔ حقیقت پسند ہونا کوئی بری بات تو نہیں ہے نا۔"

"بڑی بات تو نہیں ہے لیکن ہم جن حالات سے دوچار ہیں ان میں خوش امیدیاں توڑا سا حوصلہ پیدا کر دیتی ہے۔ دل میں کوئی آس ہو تو انسان بڑا وقت یہ سوچ کر کاٹ لیتا ہے کہ آنے والے وقت میں حالات بدل جائیں گے۔" آج انہیں کسی تھک دکان نہیں بنایا گیا تھا بلکہ یہ کہہ کر ایک کمرے میں تنہا چھوڑ دیا گیا تھا کہ آپن میں ابھی طرح مہرہ کر کے طے کر لو کہ ہماری بات مان کر اپنے لیے کچھ آسانیاں حاصل کرنا ہیں یا یونہی تشدد سہتے رہنے کے بعد

ایک دن تھک ہار کر ہارے آگے ہتھیار ڈالنے لگے۔ یعنی آپشن کوئی نہیں تھا۔ مانتی ہر حال میں ان کی ہی تھی۔

”دوسروں سے آس لگانے والا بے عملی کا بھی تو شکار ہو جاتا ہے۔ اسے خیال ہی نہیں آتا کہ وہ خود بھی تو اپنے لیے کچھ کر سکتا ہے۔“ سرد سے اختلاف کرتے ہوئے اس کے لہجے میں مستی خیزی تھی۔ سرد نے اس کے اس انداز پر چونک کر اس کی طرف دیکھا تو اس نے سر جلا کر اعتراف کیا کہ بدعقلی کے بعد از سے جو کچھ سمجھا ہے وہ غلط نہیں ہے۔

”کیا آپ یہاں سے قرار کا سوچ رہے ہیں سائیں؟“ وہ عالم شاہ کے قریب کھسک آیا اور اس کے کان پر لب رکھ کر اتنی دہمکی آواز میں پوچھا کہ اگر کمرے میں ان کی آواز سننے کے لیے کوئی آلہ نصب بھی ہے تو آواز اس تک نہ پہنچے۔ جواب میں عالم شاہ نے محض سرکواشات میں جنبش دینے پر اکتفا کیا۔

”کیسے؟“ سرد کے لبوں نے پھر سرکوشی کی۔ جواب میں عالم شاہ اس کے کان میں کھسک پھر کر نے لگا۔ سرد نے بھی اپنی رائے شامل کی۔ وہ پرجوش جوان تھا اور حرکت میں آنے کا سوچ کر ہی اس کے اندر سسٹنی دوڑنے لگی تھی۔ روز قطرہ قطرہ کر کے مرنے سے بہتر تھا کہ ایک بار میں ہی آر پار کا فیصلہ کر لیا جاتا۔

فیصلہ کر لینے کے بعد ان کو صرف انتظار کرنا تھا۔ میاں نے انہیں فیصلہ کرنے کا موقع دیا تھا اور انہوں نے سوچ کچھ کر آزادی کے لیے ایک کوشش کر لینے کا فیصلہ کیا تھا اور اب کسی شکاری جانور کی طرح جسٹے کا موقع ملنے کے انتظار میں دم سادھے بیٹھے تھے۔ نظریں مسلسل کمرے کے واحد دروازے پر لگی ہوئی تھیں اور کان معمولی سے معمولی آہٹ سننے کے لیے کھڑے تھے۔ آہٹ ابھری اور ٹکل کھولے جانے کی معمولی سی آواز کے ساتھ ہی دروازہ کھلا تو طے شدہ پروگرام کے تحت پہلے سرد حرکت میں آیا اور آنے والے کو چھاپ لیا۔ دوسرے دروازہ پر بچنے کے انتظار میں کھڑے عالم شاہ کو البتہ مایوسی کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ وہاں کوئی دوسرا موجود ہی نہیں تھا حالانکہ صبح جب انہیں یہاں لایا گیا تھا تو دو سگ سپاہی ساتھ آئے تھے۔ ناشتے کے نام پر کالی چائے اور دو پاپوں کی فراہمی کے لیے بھی دو سپاہیوں کو زحمت دی گئی تھی اور دو پھر کے کھانے کے لیے بد مزہ دلیا بھی دو عدد دسپاہیوں کے جلو میں آیا تھا۔ (ناشتے اور کھانے کی فراہمی کی میاشی بھی آج ہی سیا کی گئی تھی۔ شاید ان لوگوں کا خیال تھا کہ بھرے پیٹ کے ساتھ وہ زیادہ بہتر طور پر سوچ سکیں گے)۔

”آواز مت نکلنے دینا سالے کی۔“ سرد کی گرفت میں چپٹا سپاہی شور مچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ عالم شاہ نے تیزی سے کمرے کا دروازہ بند کیا اور اس کی پیچھے گر جانے والی کن اٹھالی۔

”بہت سخت جان ہے غبیٹ۔“ سرد نے ایک ہاتھ سے سپاہی کا منہ مار کھا تھا اور دوسرے سے اس کی گردن پر دباؤ ڈال رہا تھا لیکن وہ بھی خود کو چھڑانے کے لیے بھرپور زور لگا رہا تھا اس کے نتیجے میں سرد پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوا تھا۔ قید میں بار بار کھے جانے والے ٹھنڈ اور غذائی قلت نے ویسے بھی ان لوگوں کو جسمانی طور پر کمزور کر دیا تھا اور وہ پہلے جیسے چاق و چوبند نہیں رہ سکتے۔

”قصہ ہی ختم کر دیتا ہوں اس کا۔“ غم و غصے سے بھرے عالم شاہ نے بنا رو رعایت کے اس کے سر پر گن کا دستہ دے مارا۔ ضرب شدید تھی۔ سپاہی کا سر پھٹ گیا اور وہ سرد کی ہانپوں میں جھولنے لگا۔

”بس ایک ہی گن ملی ہے۔ باہر جانے کتنے لوگوں سے واسطہ پڑے۔“

”یہ گن آپ اپنے پاس رکھیں۔ میں باہر نکل کر کسی دوسرے سے گن حاصل کرنے کی کوشش کروں گا، بس آپ مجھے کور دیتے رہیے گا۔“ زخمی سپاہی کو ایک طرف ڈال کر سرد نے اسے جواب دیا۔ پہلے ہی سر طے پر مل جانے والی کامیابی نے اس کا اعتماد بڑھا دیا تھا اس لیے خلاف توقع ایک ہی گن حاصل کرنے کے باوجود وہ مایوس نہیں تھا۔

”اوکے۔ پھر نکلتے ہیں یہاں سے۔“ عالم شاہ نے دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا یا۔

”ایک منٹ سا گئیں اس باہر نکلنے سے پہلے آپ سے ایک وعدہ لینا چاہتا ہوں۔“ سرد نے اسے روکا۔

”کیسا وعدہ؟“

”فرض کریں مجھے کوئی ہتھیار نہیں مل پاتا اور میں گنس جاتا ہوں تو آپ اسے پاس گن کی موجودگی کا قاعدہ اٹھاتے ہوئے خود کو بچا کر نکلنے کی کوشش کریں گے۔ آپ میری خاطر خود کو خطرے میں نہیں ڈالیں گے۔“

”کھانا کیسے ہو سکتا ہے سرد؟“ وہ اس کی خواہش پر تڑپ اٹھا گیا۔

”آپ کو ایسا کرنا پڑے گا سامیں ورنہ ہم میں سے ایک بھی نہیں بچ سکے گا۔“ سرد اس وقت بھی ایچے بے مثال دغا داری و جہاں شکاری کا اظہار کر رہا تھا۔

”ہم اس شاندار ساتھ یہاں سے نکلیں گے۔“ عالم شاہ

نے بے سارے ہی اسے گلے سے لگالیا۔

”سامیں.....!“ جذبات کی شدت کے باعث سرمد اس ایک لفظ سے آگے کچھ نہ بول سکا۔

”ہلو، بس اب چلتے ہیں۔ دیر کرنے سے کہیں دیر ہی نہ ہو جائے۔“ عالم شاہ اس کا شان چمکتے ہوئے اس سے الگ ہو گیا اور دروازہ تھوڑا سا کھول کر احتیاط سے باہر جھانک سامنے ایک مختصر برآمدہ تھا جس میں اس وقت کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

”راستہ صاف ہے، آجائے۔“ اس نے سرمد کو اشارہ کیا۔ دونوں ایک ایک قدم پھونک پھونک کر رکھتے برآمدے سے گزرنے لگے۔ برآمدے کی دونوں طرف کی دیواریں سپاٹ تھیں اور وہ اندازہ لگانے سے قاصر تھے کہ دوسری طرف کیا ہے۔ بہر حال برآمدہ خیریت سے پار ہو گیا لیکن اس کے اختتام پر لوہے کی مضبوط گرل لگی ہوئی تھی جس میں موجود دروازہ لاک تھا۔

”میرے پاس چابیاں ہیں۔ میں چیک کرتا ہوں۔“ سرمد سرکوشی میں کہہ کر آگے بڑھا اور اپنے پاس موجود چابیوں کے ایک کچھے میں موجود چابیوں کو باری باری آزمانے لگا۔ چابیوں کا یہ عجیبیہ اس نے اندر بے ہوش پڑے سپاہی سے حاصل کیا تھا لیکن عالم شاہ کو پتا نہیں چل سکا تھا۔

”حل گیا۔“ تیسری ہی چابی پر لاک مخصوص آواز سے کھل گیا تو اس نے چوکنے پن سے اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے عالم شاہ کو پڑسرت لہجے میں آگاہ کیا لیکن عالم شاہ خوش ہونے کے بجائے کچھ کھٹک گیا تھا۔ انہیں اطلاع دی گئی تھی کہ وہ راکی قید میں ہیں اور راکی بہر حال ایک ساکھ تھا جسکے یہاں عالم تھا کہ وہ بڑا کسی رکاوٹ کے آگے بڑھنے ہی چلے جا رہے تھے۔

”آجائیں سامیں۔“ سرمد نے گرل کھول کر اسے نکارا تو اسے اپنے تمام تر اندیشوں کے باوجود قدم آگے بڑھانا ہی پڑے۔ آگے ایک کشادہ احاطہ تھا جو شام کے لیے ہوتے سایوں میں نیم تاریک پڑا ہوا تھا۔ احاطے میں کھڑی دو تین گاڑیوں کی موجودگی سے عمارت میں کچھ لوگوں کی موجودگی کا اندازہ ہو رہا تھا لیکن اب تک کوئی سامنے نہیں آیا تھا اور ایسی خاموشی تھی جیسے سب کوئی نشہ آواز شے کھا کر سوئے پڑے ہوں، یہاں تک کہ روشنیاں بھی کھولنے کی زحمت نہیں کی گئی تھی۔

”یہاں تو کوئی نظر نہیں آ رہا لیکن مین گیٹ پر تو چیخا کوئی نہ کوئی موجود ہوگا۔ ہمیں اس سے دودھ ہاتھ کرنے کے

لیے تیار رہنا پڑے گا۔“ سرمد نے دور نظر آتے پڑے سے گیٹ کو دیکھتے ہوئے اس کے کان میں سرکوشی کی۔ روشنی کی کمی اور قاصطے کی وجہ سے سیاہ رنگ کا وہ گیٹ زیادہ نمایاں نہیں تھا اور نہ ہی وہ یہاں سے گیٹ پر موجود حفاظتی اقدامات کا جائزہ لے سکتے تھے لیکن یہ طے تھا کہ انہیں یہاں سے نکلنے کے لیے گیٹ کا ہی راستہ اختیار کرنا پڑے گا کیونکہ احاطے کی دیواریں اتنی زیادہ بلند تھیں کہ بغیر کسی سیڑھی کے ان کے پار اترنا ممکن ہی نہیں تھا۔ دیواروں پر خادراتاروں کی موجودگی کا بھی احساس ہو رہا تھا۔

”سرمد.....! تمہیں کچھ عجیب نہیں لگ رہا؟ مطلب ہم راکی قید میں ہیں اور اتنی آسانی سے۔“

”ہے تو عجیب سامیں، پر اب ہمارے پاس آگے بڑھنے کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔“ سرمد نے اس کی ادھوری بات کا مفہوم سمجھتے ہوئے جواب دیا اور قدم آگے بڑھائے۔ عالم شاہ کو بھی اس کا ساتھ دینا پڑا۔

”بیٹھنا پ۔“ ابھی انہوں نے دو قدم ہی آگے بڑھائے تھے کہ احاطہ روشنی سے منور ہو گیا اور ساتھ ہی ایک بلند آواز نے حکم دیا۔ عالم شاہ نے فوراً ہی آواز کی سمت دیکھا۔ وہ ایک تنہا شخص تھا جو اچانک ہی باہر نکل کر آ گیا تھا اور ان پر پہنچنے والے حکم صادر کر رہا تھا۔ عالم شاہ نے بے اختیار ہی اپنی گن کا رخ اس شخص کی طرف کر کے گولی چلا دی۔ گولی چلنے کا دھماکا ضرور سنائی دیا لیکن وہ شخص گولی کھا کر گرنے کے بجائے ہنسنے لگا پھر جیسے وہاں کسی کا طوفان آ گیا۔ ہنسنے والوں میں سے کچھ عمارت کے دروازے کھول کر برآمدہ ہوئے تھے اور کچھ وہاں کھڑی گاڑیوں کی آڑ میں سے۔ عالم شاہ کا گن دلا ہاتھ خود بخود نیچے ہو کر اس کے پہلو میں جھولنے لگا اور گن آواز کے ساتھ نیچے زمین پر جا گری۔ نقلی گولیوں والی اس گن کا ہاتھ میں ہونا یا نہ ہونا ایک برابر تھا۔

”اسے خالصی کا گھر سمجھا تھا کیا کہ جب ہی چاہے گا۔“

”مارو ساتوں کو اور اتنا مارو کہ ثانی یاد آ جائے۔“ وہ سارے ایک دم ہی ان پر پل پڑے۔ مارنے کے لیے

تکوں، لاتوں اور گھٹوں کے دستوں کا بے دریغ استعمال کیا جا رہا تھا۔ ابتدا میں انہوں نے اپنے دفاع کی کوشش کی لیکن مارنے والوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ ہر کوشش راکٹوں کی آگ اور وہ دونوں جگہ جگہ میں ڈھیر ہو گئے۔

☆☆☆

”کھل.....!“ وہ آنکھیں موندے بستر پر لیٹی ہوئی تھی کہ ایک ہاتھ اس کے ماتھے پر آکر ٹکا اور ساتھ ہی نرمی سے پکارا گیا۔ پکارنے والے کی آواز پہچان کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔

”کیسی ہو؟“ اسی نرم لہجے میں پوچھتے ہوئے وہ اس کے قریب بیٹھ گیا۔

”ٹھیک ہوں۔“ اس نے ساٹ لہجے میں جواب دیا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس سے بدسلوکی کرنے کے بعد وہ اب پہلی بار اس کے سامنے آیا تھا۔

”سویری! میری وجہ سے تمہیں تکلیف پہنچی۔ میں ایسا نہیں چاہتا تھا لیکن غصے میں خود بخود ہی ایسا ہو گیا۔“ سنا تھا کہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ کسی فارم ہاؤس پر وقت گزارنے گیا ہوا تھا اور یقیناً وہاں اس کا وقت بہت اچھا گزارا تھا جو اسے اپنی زیادتی کا احساس ہو گیا تھا اور اب یہی سے معافی کا طلب گار تھا۔

”کس بات کا قصہ؟“ اس نے اپنے بال سمیٹ کر جوڑے کی شکل میں باندھے اور سر پر اوپٹا ٹھیک کرنے لگی۔

”تمہارے بال بہت خوبصورت ہیں۔“ فیصل نے اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے اس کے بالوں کی تحریف کی۔

”میں نے پوچھا کس بات کا قصہ؟“ اس نے تعریف کو ان سنا کیا اور اپنا سوال دہرایا۔ وہ صداقت شاہ کی جینی تھی جسے بھی کسی نے پھولوں کی چھری سے بھی نہیں مارا تھا۔ وہ فیصل کا اپنے ساتھ جاہلانہ سلوک اتنی آسانی سے نہیں بھول سکتی تھی۔

”تم جانتی ہو یار! سویری میری پسند ہے اور میں بہت شوق سے اس سے شادی کرنے جا رہا تھا۔ جو کچھ ہوا میرے خواب و خیالی میں بھی نہیں تھا۔ ایسے میں میرا لہجہ، جھجھکاؤ اور چڑچڑاہوا ہوا کھلایا ایسا ناچازگی نہیں ہے لیکن پھر بھی بہر حال میں تم سے اپنے کیے پر معذرت کرتا ہوں نا۔“ اس کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ وہ اب بھی جھجھکاؤ کا شکار ہے لیکن کسی نہ کسی طرح خود کو قابو میں رکھے بات کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا ہے۔

”تم انکار کر سکتے تھے۔ کسی نے گن پوائنٹ پر تو تم سے نکاح نامے پر دستخط نہیں کروائے تھے؟“ وہ اس کی دلیل سے کانٹا نہیں ہوا۔

”گھٹیل بھائی نے خاندان کی عزت اور سلامتی کا واسطو دے کر مجھے مجبور کر دیا تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے ایسا کچھ غلط بھی نہیں کیا تھا لیکن فی الحال میں اپنے دل کو پوری طرح سمجھا نہیں پا رہا ہوں۔ تم مجھے تھوڑا سا ٹائم دو کہ میں اپنی طوط پر خود کو تیار کر سکوں۔“ اس نے گل کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”میں تمہیں صرف ٹائم نہیں، مکمل آزادی دیتی ہوں کہ تم جب چاہو سویرا کو اپنا لو۔“ اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ فیصل کی گرفت سے آزاد کر دیا اور پہلو میں سوئے ہوئے بچے کو نرمی سے چھپنے لگی۔ اسے شاید باتوں کی آواز نے ڈسٹرب کیا تھا جو وہ نیند میں بے چمن سما ہو گیا تھا۔

”مسئلہ تمہاری اجازت سے زیادہ سویری کی رضامندی کا ہے۔ وہ اس مزاج کی لڑکی نہیں ہے جو دوسری بیوی بن کر مجھے کسی کے ساتھ بانٹنے کے لیے تیار ہو جائے گی۔“

”تو ضرورت بھی کیا ہے ایسا کرنے کی؟ ان سارے معاملات کو سنبھال دو۔ میں خود ہی تم سے طلاق لے کر پاکستان واپس چل جاؤں گی۔“

”کیا.....؟“ اس کی بات پر فیصل کا منہ کھل گیا۔

”میں غلط نہیں کہہ رہی ہوں۔ حالات کی مجبوری کے تحت باندھا گیا بندھن ساری عمر نبھایا جائے، یہ کوئی ایسا ضروری نہیں ہے۔ تمہاری طرح میرے لیے بھی یہ ایک سمجھوتہ کا رشتہ ہے اور میں ساری زندگی انہوں سے دور رہ کر یہ سمجھوتہ کا رشتہ نہیں نبھانا چاہتی۔“ آج بہت عرصے بعد وہ اس گل شاہ کے انداز میں بات کر رہی تھی جسے خود پر بھرپور اعتماد تھا۔

”ایسا باتیں کیوں کر رہی ہو گل؟ میں تم سے کہہ تو رہا ہوں کہ مجھے تھوڑا سا وقت دو۔ آہستہ آہستہ میں سناٹا سب

ٹارل ہو جائے گا۔“ وہ اس کا فیصلہ سن کر شینٹا سا گیا تھا۔

”میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔ فیصل! ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے سوٹ مائل نہیں ہیں۔ ہم نے اس موٹے کو چلانے کی کوشش کی تو ہمیشہ ایک دوسرے سے الجھتے رہیں گے اس لیے بھڑ ہے کہ خود کو اس بوجھ سے رہا رکھنے کے بجائے آج یہ فیصلہ کر لیں کہ ادا جائیں اور سرحد کی رہائی کا مسئلہ حل ہونے پر ہم اپنی راہیں جدا کر لیں گے اور اپنے اپنے حساب سے زندگی گزاریں گے۔“ وہ

کے ساتھ بہک وقت خود کو اور اعظم کو نہیں سنبھال پائے گی تو جسم و جان کی پوری طاقت صرف کر کے ملازمہ کو بلند آواز میں پکارا۔

”بی بی بی!“ ملازمہ اس کی ایک ہی پکار پر دوڑی پھلی آئی۔

”اسے سنبھالو۔“ اس نے اعظم کو اس کے حوالے کیا اور اپنا سر دونوں ہاتھوں سے دباتے ہوئے ٹپکے میں دبے دیا۔

”آپ کو کیا ہوا ہے بی بی؟ میں ڈاکٹر صاحبہ کو بلا کر لاتی ہوں۔“ ملازمہ اس کی حالت دیکھ کر گھبرا گئی اور اس کا جواب سنے بغیر بچے کو گود میں لیے باہر دوڑ گئی۔ تھوڑی دیر میں ہی فردوس اپنے میڈیکل باس سمیت اس کے کمرے میں تھی۔

”کیا ہوا ہے کل؟ کیا ہو رہا ہے تمہیں؟“ فردوس نے اس کے رخسار چھنچھا کر اسے پکارا۔

”میرا سر درد سے بھٹ رہا ہے۔“ اس نے نجیف سی آواز میں جواب دے کر آنکھیں دوبارہ بند کر لیں تو فردوس نے لب کھلتے ہوئے اپنا میڈیکل باکس کھول کر اس میں سے ایک انجکشن نکالا۔ اس وقت وہ جتنی شدید تکلیف میں دکھائی دے رہی تھی اس کو بہن کمرہ دینے کے سوا کوئی حل نہیں تھا۔ وہ دل ہی دل میں سمجھتا تھی کہ اپنی پیشہ ورانہ اور گھریلو مصروفیات کے باعث ہمیشہ کی طرح کی ڈھنگ سے خیریت دریافت نہیں کر پاتی۔ بس ایک بار ہی سرسری سا اس سے پوچھا تھا اور اس نے ”بہتر ہوں“ کہہ کر بات ختم کر دی تھی لیکن اب پتا چلا تھا کہ وہ بہتر نہیں تھی۔

”میرے کمرے میں آؤ۔“ انجکشن کے زیر اثر کل تھوڑی سی دیر میں غصہ کی جلی جلی گئی تو فردوس نے بچے کو شانے سے لگا کر چھٹی ملازمہ کو میڈی آواز میں حکم دیا۔ وہ فوراً ہی اس کے پیچھے پھل پڑی۔

”اسے یہاں لٹا دو۔“ اعظم ملازمہ کے شانے سے نکلے گئے ایک بار پھر سو گیا تھا۔ فردوس نے دیکھا تو اپنے بستر کی طرف اشارہ کر کے حکم دیا۔

”بی بی اچھا بی بی!“ اس نے بچے کو یہ احتیاط بستر پر لٹایا۔ بہت صبر اور سکون والا بچہ تھا اور عموماً کسی کو پریشان نہیں کرتا تھا۔

”کیا پہلے بھی کل کو ایسی شدید تکلیف ہوئی ہے؟“ ملازمہ بچے کو لٹا چکی تو فردوس نے تشویش سے پوچھا۔

”اگلی گپ چپ سی تو ہیں وہ بی بی ازہان سے اپنی تکلیف کا کیا بتائیں گی۔ ہاں دیکھنے میں کچھ بڑا حال بڑا حال

بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس سے بات کر رہی تھی لیکن اس طویل گفتگو نے اس کے سر میں ہونے والے درد کو بڑھا دیا تھا اور وہ بہ مشکل شدت اختیار کرتی ٹیسوں کو برداشت کر رہی تھی۔ فیصل کے دھکے سے سر پر گھٹنے والی چوٹ کے بعد سے اس کی یہی حالت تھی۔ فردوس نے جو دوا گئی اسے کھانے کے لیے دی تھی، ان کے استعمال سے وقتی طور پر تو فرق پڑ جاتا تھا لیکن دوا کا اثر ختم ہوتے ہی پھر دوبارہ تکلیف شروع ہو جاتی تھی۔

”ان دونوں کی رہائی کو بچوں کا مکمل سمجھ لیا ہے تم نے؟ تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ اس سارے پکڑ میں ہماری فیملی کتنی مشکل میں پڑ گئی ہے۔ فیملی کو پروٹیکشن دینے اور عالم اور سرمد کی رہائی کے لیے کوئی راستہ نکالنے کے لیے پانی کی طرح جیسا بہانا پڑ رہا ہے۔ ایک طرف کاروباری تعلقات متاثر ہونے سے بزنس پر بڑا اثر پڑ رہا ہے تو دوسری طرف کاروبار میں سے جیسا نکال نکال کر اس مسئلے کے حل پر لگانے سے ہم اندر سے کھوکھلے ہو گئے ہیں۔ ان حالات میں بجائے اس کے کہ تم اپنی ذمہ داری سمجھو اور ہمیں سپورٹ کرو، تم یہ سوچ رہی ہو کہ اپنا الو سیدھا ہوتے ہی یہاں سے چلتی بنو گی۔“ فیصل کا وہ ٹھہرا ہوا اور سلجھا ہوا لب و لہجہ اس کا حتیٰ فیصلہ کن کر پل بھر میں ہی اثرن چھو ہو گیا تھا اور وہ بلند آواز میں اس پر چیخنے چلانے لگا تھا۔

”کیسی سپورٹ؟ کیسی سپورٹ چاہتے ہو تم مجھ سے؟“ اس نے درد کی شدت سے پھٹا اپنا سر تھا اور کمزور لہجے میں پوچھا۔

”مائی سپورٹ اور کیسی سپورٹ؟ اپنے باپ سے رابطہ کرو اور ان سے کہو کہ اپنے بچے کی سلاحتی چاہتے ہیں تو

خود بھی مال پانی خرچ کریں۔ اس کے علاوہ ان سے کہہ کہ جائیداد میں تمہارا جو بھی حصہ بنا ہے اسے کیش کی شکل میں یہاں ٹرانسفر کرنے کا انتظام کریں۔ تم میری مشکوٰۃ ہو اور میرا حق ہے کہ میں اپنی جی کے لیے اسے استعمال کر کے خود کو انجکشن کر سکوں۔“ بی بی حکیم ہی جیسے سے باہر آ گئی تھی لیکن شکل میں حوصلہ نہیں رہا تھا کہ اسے کوئی جواب دے سکے۔

ایک طرف اسے تکلیف نے بڑا حال کر دیا تھا تو دوسری طرف فیصل کی بلند آواز پر جاگ کر رونا شروع کر دینے والے بچے کو بہلانا مشکل ہو رہا تھا۔ فیصل کو بھی شاید اس کے فوری جواب سے کوئی دھچکی نہیں تھی جب ہی بچے جھکنے کے بعد خود ہی کمرے سے باہر نکل گیا۔

”شاہدہ...!“ جب اسے لگا کہ وہ اپنے چکراتے سر

معلوم ہو رہی تھیں۔ ایک دو بار میں نے انہیں آپ کی دی ہوئی دوا میں بھی کھاتے ہوئے دیکھا لیکن ابھی جو حالت ہوئی ہے، وہ پہلے نظر نہیں آتی۔ شاید فیصل بھیا کی باتوں کا اثر۔۔۔ ملازمہ بولتے بولتے رک گئی جیسے حکم ہی اپنے ضرورت سے زیادہ بولنے کا احساس ہو گیا ہو۔

”تفصیل سے بتاؤ۔ کیا کہا ہے فیصل نے؟“ فردوس نے اسے جتنے نظروں سے گھورتے ہوئے حکم دیا۔

”مجھے زیادہ نہیں پتا بی بی! فیصل بھیا ابھی تھوڑی دیر پہلے اپنے کمرے میں گئے تھے۔ میں نے بس ان کے زور زور سے بولنے کی آوازیں سنیں۔ کوئی پیسوں ویسوں کی بات کر رہے تھے پر مجھے ٹھیک سے نہیں پتا۔ آپ کل بی بی سے ہی پوچھ لیجئے گا۔“ ملازمہ آدھا ادھورا جواب دے کر کئی کتر اگئی۔

”اس سے تو خیر میں پوچھ لوں گی لیکن ابھی کھیل بھائی سے بات کرتی ہوں کہ وہ فیصل کو سمجھائیں۔“ فردوس کی عموما کوشش ہوتی تھی کہ سسرالی مسائل میں مداخلت نہ کرے کیونکہ اس کا نتیجہ بدحرکی کی صورت میں ہی نکلتا تھا لیکن کل کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا، اسے کسی طور پر مہذبانہ رویہ نہیں کہا جاسکتا تھا۔

”تم یہاں بچے کے پاس رکو۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں واپس آتی ہوں۔“ کھیل کی اس وقت گھر میں موجودگی کٹرم تھی اس لیے اس نے اسی وقت یہ کام نمٹانے کا فیصلہ کیا اور اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

”بی بی! وہ بڑی بھابی نے مجھے مریچوں میں مسالا بھرے کو بولا تھا۔ دیر ہو گئی تو ان کے ہاتھوں میری شامت آجائے گی۔ پہلے ہی انہیں مجھ پر غصہ رہا ہے کہ میں کیوں کھل بی بی اور ان کے بچے کا خیال رکھتی ہوں۔“ ملازمہ نے جھپکتے ہوئے اپنی بھجوری بتائی۔

”ٹھیک ہے تم جاؤ لیکن پہلے مینا کو یہاں بھیج دو۔“ لکرن کے حراج کی تیاری کی وجہ سے فردوس خود بھی ان سے ذرا احتیاط ہی برتی تھی اس لیے ملازمہ کو مشکل میں ڈالنا مناسب نہیں سمجھا اور اپنی بڑی بیٹی کو بلاوا بھجوا دیا۔

”جی کی؟“ کچھ دیر میں ہی حیرہ سالہ مینا اس کے سامنے تھی۔ وہ ماں سے ملنے چلتے نقوش کی مالک خوش مزاج سی لڑکی تھی جو لڑکپن اور جوانی کے سنگم پر کھڑی دیکھنے والوں کی نظروں کو ایک بار اپنی طرف متوجہ ضرور کرتی تھی۔

”آپ زیادہ بڑی تو نہیں تھیں چنا؟ مجھے آپ کا تھوڑا سا نا تم چاہیے تھا۔“ اس نے ملاوت سے بیٹی سے پوچھا۔

”نومی! بس حنا کو چھس کے کوچن سمجھا رہی تھی۔ وہ سمجھ گئی ہے۔ اب باقی کی ایکسرسائز خود ہی کر لے گی۔“ فردوس کی جانب کی مصروفیت کی وجہ سے حنا بڑی بیٹی ہونے کے ناتے خود بخود ہی زیادہ دیرے دیر ہو گئی تھی اور بعض اوقات چھوٹی بہنوں کے بھی چھوٹے موٹے مسائل خود کچھ لیتی تھی۔ اس وقت بھی اس نے سب سے چھوٹی بہن کے حوالے سے ماں کو اطلاع دی تھی۔

”گڈ اتواب آپ ایسا کر دو تھوڑی دیر یہاں اطمینان کے پاس بیٹھ جاؤ۔ یہ سوراہا ہے ایسا تھوڑا بیلہ سے گر جائے۔“

”ہائے اللہ! یہ کیونکر یہاں ہے۔ میری تو نظری نہیں پڑی۔“ فردوس کے کہنے پر وہ بستر پر سوتے ہوئے بچے کی طرف متوجہ ہوئی اور فوراً ہی لپک کر اسے پیاد کرنے کے لیے لپکی۔

”اونہیوں۔“ فردوس نے اسے ٹوکا۔ ”سونے دو۔“ مکی خینہ سے اٹھ گیا تو روئے گا۔ اس کی ماما کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ اپنے روم میں آرام کر رہی ہیں۔“

”اوکے۔“ وہ روکے جانے پر قدرے مایوس ہوئی لیکن ماں کی حکم چروٹی نہیں کی۔ فردوس نے آہستہ سے اس کے لہرے دار بالوں کو نکھیرا اور خود سکراتی ہوئی ہاتھ لگائی۔ کھیل حسب توقع بیٹھک میں موجود تھے۔ وہ ان سے اجازت لے کر اندر چلی گئی۔

”خیریت ہے فردوس! کیسے آنا ہوا؟“ انہوں نے اس کے چہرے پر موجود سوچ کی لکیریں پڑھتے ہوئے سوال کیا۔

”میں آپ سے کل کے حوالے سے بات کرنا چاہا رہی تھی۔“ اس نے محتاط لہجے میں گتھو کا آغاز کیا۔

”کیا ہوا ہے کل کو؟“ انہوں نے اپنے سو بائیل کی اسکرین پر نظریں جمائے بے نیازی سے پوچھا۔

”شاید آپ کو معلوم نہیں ہے کہ اس کے سر پر زوردار چوٹ لگی ہے اور وہ سخت تکلیف میں ہے۔“ فردوس نے ان کے سرسری لہجے سے اعذارہ لگایا۔

”مجھے معلوم ہونا اتنا ضروری بھی نہیں ہے۔ تم ڈاکٹر ہو جنہیں معلوم ہے یہ کافی ہے۔ اچھا سا علاج کر دو اس کا۔“ اطلاع سن کر بھی ان کی بے نیازی حکم نہیں ہوئی اور یوں اپنے سو بائیل کی طرف متوجہ رہے جیسے کوئی بہت ضروری کام کر رہے ہوں۔

”وہ تو خیر سے میں دیکھ لوں گی لیکن آپ کو کم از کم یہ تو

نثر منوعہ

میں اسلام کا کالج میں فرسٹ ایئر میں پایا داخل ہوا تھا۔ ڈاکٹر تاج محمد انگریزی کی کلاس کو پھر دے رہے تھے۔ معائنہ انہوں نے کسی متعلقہ چیز کا ذکر کرتے ہوئے ایک عجیب و غریب نام لیا۔ ”گالی دی سوپاں“ اور کہنے لگے ”اس مصنف کی 88 کہانوں کا ایک مجموعہ کالج کی لائبریری میں آیا ہے لیکن مصنف کی صاف کوئی اور ہے یا کی اس امر کی مستحسی ہے کہ لومر ظہیر کو یہ کتاب پڑھنے کو نہ دی جائے۔ چنانچہ لائبریری میں کو ہدایت کر دی گئی کہ یہ کتاب بھر منورہ قصور کی جائے۔“

جیسے ہی پتہ چلی ہوئی پائل کا رخ کرنے کے بجائے میں سید حامدا کرشنا کے ہاں آ پہنچا۔ جب میں کتاب کا نام زبان پر لایا تو تاجر نے مسکرا کر پوچھا ”کیا اسلام کالج میں پڑھتے ہو؟“

میں نے سر کی جنبش سے اثبات میں جواب دیا۔

تاجر نے سامنے کی الماری سے کتاب نکالی پھر دوس کے دام بتاتے ہوئے بولاس کتاب کی آٹھ کاپیاں بچھلے دو گئے میں اسلام کالج کے طلبہ کے ہاتھ بچ چکا ہوں کیا یہ کتاب کورس میں داخل ہوگی ہے؟“

(محمود نکاحی کی کتاب ”نظر نامہ“ ہے اقتباس)

انتخاب: اظہر جلیل صدیقی کراچی

راست اس کی طرف دیکھا۔

”جی۔“ وہ ان کی طرف متوجہ ہوئی۔

”کسی بھی معاملے میں دخل دیتے ہوئے احتیاط سے کام لیا کرو۔ پہلے ہی گھر کی خواتین کو تم سے شکوہ رہتا ہے کہ

باب کے بھانے تم گھر پر اور میں خاطر خواہ حد تک

نہیں۔“ انہوں نے ایک ایسی بات جتنی جو شادی کے بعد

سے مسلسل کسی نہ کسی بھانے جتنی جاتی رہتی تھی حالانکہ گھر

میں رہنے والی خواتین پر بھی گھر پر کام کاج کا کوئی بوجھ نہیں

تھا اور انہیں صرف ملازماؤں کو احکامات دینے کی زحمت کرنا

پڑتی تھی۔ ان خواتین کا گھر پر کھل راج تھا جبکہ ان کے

مقابلے میں خود اسے یہ نقصان تھا کہ کبھی گھر میں پکے والے

کھانے کا صلیب اس کی پسند کے مطابق ملے نہیں پایا تھا اور

بعض اوقات اسے بچپن کی کوئی لڑائی پوری کرنے کے

لیے خود کچن کا رخ کرنا پڑتا تھا لیکن یہاں یہ سب کہنے کا کوئی

فائدہ نہیں تھا، سو وہ خاموشی سے سر جھکا کر باہر نکل گئی۔

☆☆☆

”سوری یار! ایک ایمر جنسی کیس آگیا تھا تو میں وہاں

معلوم ہونا چاہیے کہ اسے چوٹ لگنے کا سبب فیصل ہے۔“

کھیل کے احرام کے باوجود وہ اپنے لہجے میں در آنے والی

ہلکی سی کٹی کو نہ چھپا سکی۔

”فیصل نے کیا کیا ہے؟“

”تشدید۔۔۔۔۔ وہ مسلسل کھل کے ساتھ یہ سلوکی کر رہا

ہے۔“ فردوس کو اب ان کا تھیل بری طرح کھٹکنے لگا تھا پھر

بھی برداشت سے کام لیتے ہوئے انہیں آگاہ کیا۔

”اچھا۔۔۔۔۔ کسی اور نے تو مجھے ایسی کوئی بات نہیں

بتائی۔“ کھیل نے حیرت کا مظاہرہ کیا۔

”کوئی اور آپ کو کیسے بتا سکتا ہے جبکہ وہ خود کھل کے

ساتھ اس گھر میں تیسرے درجے کے شہری کا سلوک کرنے

میں پیش پیش ہے۔“ ”کوئی اور“ پر بطور خاص زور دیتے

ہوئے فردوس نے انہیں جتنا لیکن براہ راست نسرین کا نام

لینے سے گریز کیا۔

”مجھے اندازہ ہے کہ کھل کے لیے یہاں حالات

تھوڑے سے مشکل ہیں لیکن یہ کوئی غیر فطری بات نہیں

ہے۔ اس کی خاطر سب کی زندگیوں پر اپ سیٹ ہوئی ہیں۔

مجبوراً ہی سہی، اس کے لیے قربانی دی گئی ہے اس لیے اس کا

بھی فرض بنا ہے کہ کچھ قربانی وہ بھی دے۔ وہ صبر اور

برداشت سے کام لے گی تو آہستہ آہستہ اس کے لیے حالات

موافق ہو جائیں گے۔ مگر بسانے کے لیے عورت کو یہ سب

کرنا ہی پڑتا ہے۔“ کھیل کے پاس کھل کے ساتھ روار کے

جانے والے سلوک کے لیے دلائل موجود تھے جو فردوس کو

قابل قبول محسوس نہیں ہوئے۔

”لیکن بھائی جان۔۔۔۔۔“

”بس۔“ کھیل نے ہاتھ کے اشارے سے اسے

مزید کچھ بھی بولنے سے روک دیا۔ ”میں کھل کے لیے جو کچھ

کر سکتا تھا، کر چکا ہوں اس لیے بہتر ہوگا کہ تم مجھے قائل

کرنے کے بجائے اسے سمجھاؤ کہ اپنے شوہر کی قدر کرے

اور اس کے دل میں اپنے لیے جگہ بنانے کی کوشش کرے۔

وہ بیوی ہے۔ وہ کوشش کرے گی تو ایک دن وہ سب کچھ

بھول بھال کر اس کا بن جائے گا۔“ کھیل اسی روايتی سوچ

کا مظاہرہ کر رہا ہے تھے جو برصغیر میں رائج ہے۔ فردوس کو

احساس ملا کہ یہ بحث کی صورت میں بھی کوئی مثبت نتیجہ

برآمد نہیں ہوگا۔ مزید کی بجائے بچنے کے لیے اس نے ٹھنڈی قسم

کر کے وہاں سے اٹھ جانا مناسب سمجھا۔

”میری طرف سے تمہارے لیے ایک مشورہ ہے۔“

اس بار انہوں نے سوبائیں کی اسکرین سے سر اٹھا کر براہ

بڑی ہو گئی۔ تم زیادہ پور تو نہیں ہوئیں؟“ فردوس نے ایشیتھو اسکوپ گلے سے اتار کر میز پر رکھا اور پختہ جیسی سہل سے حضرت خواجہ شاد احمد از میں بولی۔ آج وہ اسپتال آتے ہوئے کل کو چیک اپ کے لیے اپنے ساتھ لے کر آئی تھی اور اسے ایک اچھے نیورولوجسٹ کو دکھایا تھا۔

”وائس او کے بھائی! لیکن مجھے اعظم کی فکر ہو رہی ہے۔ کچننا وہ شاید کوہ پریشان نہ کر رہا ہو۔“

”اے! تم فکر نہ کرو۔ شاید بہت سمجھ دار عورت ہے۔ اسے اچھی طرح سنبھال لے گی پھر آج میری تینوں بلبلیں بھی گھر پر ہی ہیں۔ تینوں نے ٹل کر اعظم کے ساتھ خوب میلا لگا لیا ہوا ہے۔ یہ دیکھو، یہ ویڈیو بھی مجھے وائس ایپ کی ہے انہوں نے۔“ فردوس نے اپنا موبائل اس کے حوالے کیا۔ وہ دلچسپی سے وائس ایپ پر بچوں کی طرف سے بھیجی جانے والی ویڈیو دیکھنے لگی۔ ویڈیو میں اعظم ایک چھوٹے سے رنگ برنگے ہوا بھر کر بنائے گئے سوئنگ پول میں بیٹھا نظر آ رہا تھا۔ اس کے تاثرات سے ہی ظاہر تھا کہ وہ اس سرگرمی سے بے حد لطف اندوز ہو رہا ہے۔ اس کے پانی میں ہاتھ مار مار کر پھینکتے اور قلعار یاں مارنے کو تینوں بچیاں بہت الجھائے کر رہی تھیں اور خود بھی بار بار کوئی ایسی حرکت کرتی تھیں جس سے اعظم مزید پُر جوش ہو جاتا تھا۔ اس ویڈیو کو دیکھتے ہوئے بے ساختہ ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

”ہنسی مسکراتی رہا کرو۔ تمام پریشانوں کو جھک کر تھوڑا سا مسکرا دینے سے انسان کی صحت پر اچھا اثر پڑتا ہے۔“ اسے مسکراتا دیکھ کر فردوس بے ساختہ ہی بول پڑی۔

”کچھ پریشانیوں ایک ہولی ہیں جنہیں ذہن سے جھٹکتا انسان کے بس میں ہی نہیں ہوتا۔ آپ ہی بتائیں کہ میں کیسے اس بات کو اپنے ذہن سے جھک سکتی ہوں کہ میرے ادا سائیکس ایک سنگین الزام میں زیر حراست ہیں اور کوئی انہیں بچانے کے لیے کچھ نہیں کر پارا۔“ اس کی مسکراہٹ ہل بھر میں غائب ہو گئی۔

”میں مانتی ہوں کہ یہ واقعی بہت بڑی پریشانی ہے لیکن اس پریشانی سے جھٹنے کے لیے تمہیں اپنا حوصلہ بگڑھ کرنا ہوگا۔ ایسے عجیب و غریب معاملات میں جلدی کوئی نتیجہ سامنے آتا مشکل ہوتا ہے اور عالم اور مرد تو خود اپنا کچھ مشکل بناتے چارے ہیں۔“ فردوس رات سے جو خبر اس سے چھپائے ہوئے تھی، وہ بے ساختہ ہی لبوں سے پھسل گئی۔

”کیا مطلب؟ کیا کیا ہے انہوں نے؟“ کل نورانی

بے چین ہو گئی۔

”انہوں نے فرار کی کوشش کی ہے اور اس کوشش میں ایک سپاہی کو اتنی بری طرح زخمی کر دیا ہے کہ اس کی جان کے لالے پڑ گئے ہیں۔ اگر وہ مر گیا تو قسطنطنیہ کے علاوہ قسطنطنیہ بھی ان کے حصے میں لکھ دیا جائے گا۔“ فردوس نے افسردگی سے اسے آگاہ کیا۔

”یہ میرے اللہ! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“ سہل نے بے ساختہ ہی اپنا سر تھام لیا۔

”میں تمہیں یہ بتا کر رینش نہیں دیتا چاہ رہی تھی لیکن مجھے پتا ہے کہ گھر میں کوئی نہ کوئی تمہارے سامنے ذکر ضرور کرے گا۔ وہ بھی ایسے الفاظ میں جو تمہارے لیے زیادہ تکلیف دہ ہوں گے اس لیے اب خود ہی تمہیں یہ سب بتا رہی ہوں۔“

”واہاں بابا سائیکس بھی یہ خبر سن کر بہت پریشان ہوئے ہوں گے؟“ اسے پاکستان میں بیٹھے باپ کی فکر نے ستایا۔

”وہ تو لازمی بات ہے۔ اس واقعے کے بعد ہماری حکومت کا ان لوگوں کو دہشت گرد قرار دینے کا موقف مزید مضبوط ہو گیا ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ سپاہی کو زخمی کر کے انہوں نے اس کی گن بھی چھین لی تھی جس کی وجہ سے انہیں بہت مشکل سے قابو کیا گیا۔ عالم کی گن سمیت ایک تصویر بھی میڈیا سے شیئر کی گئی ہے۔“ فردوس نے اسے کچھ مزید تفصیلات سے بھی آگاہ کیا۔

”اور آپ ان حالات میں مجھ سے مسکرانے کا کہہ رہی ہیں؟“ سہل نے شکوہ کیا اور پھر بے تحاشہ رو پڑی۔

”صرف اس لیے میری جان کہ مجھے تمہاری صحت کا خیال ہے۔ تمہارے اس طرح افسردگی لینے سے وہ لوگ رہا تو نہیں ہو جائیں گے نا۔ اس لیے بہتر ہے کہ خود کو سنبھالو اور پورے یقین کے ساتھ اللہ سے دعا مانگو۔ جہاں کوشش کام نہ کر رہی ہو وہاں دعا سے کوئی ایسی راہ نکل آتی ہے جس کی طرف ہمارا ایمان بھی نہیں جاتا۔“ فردوس اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آ گئی اور اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے بہت غلوں سے۔۔۔ سمجھانے لگی۔ بالآخر اس نے خود پر قابو پا لیا اور ہستہ ہستہ اس کی چکیاں کھم کھمیں۔

”جاک، فاش روم میں جا کہ مٹھ ہاتھ دم نو پھر ہم گھر چلے ہیں۔“

”جی اچھا۔“ وہ فردوس کے کہنے پر اٹھ کر تباہ داری سے ملحقہ وائس روم میں چلی گئی۔ اسی وقت فردوس کا موبائل بجنے لگا۔ نمبر انجانا تھا۔

”میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہیں جہاں ہم پہلے ملے تھے۔“ کال ریسیو کرتے ہی دوسری طرف سے بغیر کسی تمہید کے مطالبہ کیا گیا۔

”آج ممکن نہیں ہے۔ آج میرے ساتھ کل بھی موجود ہے۔“ اس نے کار کو پکھانے میں ذرا توقف نہیں کیا۔ ”اسی لیے تو میں آج آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔“ موجودہ حالات میں میری کل سے ایک ملاقات ضروری ہو گئی ہے۔

”اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ ڈاکٹر نے کہا ہے وہ شدید اسٹریس کا شکار ہے۔“ فردوس نے چلاوٹی کرنا چاہی۔ ”اسٹریس کے ساتھ آپ نے اس ڈاکی اور جسمانی تارچہ کا ذکر نہیں کیا جو اسے فیصل کے ہاتھوں برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔“ اس کا طعنے جملہ اس کے باخبر ہونے کا بھی مظہر تھا۔ فردوس سے شرمندگی کے مارے کچھ کہا ہی نہیں گیا۔

”کیا ڈاکٹر نے کل کا سی ٹی اسکین کروایا ہے؟ مجھے تشویش ہے کہ سر کی چوٹ نے کوئی بڑا نقصان نہ کر دیا ہو۔“ فردوس کو خاموش پا کر اس نے سوال داغا۔ ”ڈاکٹر نے مشورہ تو دیا ہے لیکن کسی ٹیکنیکل پراجیکٹ کی وجہ سے آج یہ کام نہیں ہو سکا۔ ایک آدھ دن میں، میں کل کو دوبارہ اسپتال لے کر آؤں گی۔“

”ٹھیک ہے۔ فی الحال تو آپ اسے وہاں لے کر آئیں جہاں میں نے بلایا ہے۔“ ”مجھے یہ ٹھیک نہیں لگ رہا۔“ فردوس اب بھی تذبذب کا شکار تھی۔

”تو کیا آپ کو یہ ٹھیک لگ رہا ہے کہ اس بے چاری کو ایک طرف تشدد کا نشانہ بنایا جائے تو دوسری طرف اس سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ پاکستان میں موجود اپنی جاکد اد کے حصے کے لیے اپنے باپ سے رابطہ کرے؟“

”یہ کب ہوا؟ اور تمہیں کیسے پتا چلا؟“ فردوس کی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں پھر اس نے دواش روم سے آتی کھل کو کھوجتی نظروں سے دیکھا۔

”معلوم کرنے والے سب معلوم کر لیتے ہیں۔ بہر حال ابھی ان باتوں کو چھوڑیے اور یہ بتائیے کہ کب تک ملاقات کے لیے پہنچ رہی ہیں؟“ وہ اپنے مطالبے پر مضبوطی سے جما ہوا تھا۔

”تقریباً آدھا گھنٹہ لگے گا۔ ہم بس اسپتال سے نکلنے ہی لگے ہیں۔“ اس بار فردوس حراست نہ کر سکی۔

”کیا گھر سے کال مچی؟“ اس نے جیسے ہی سلسلہ

منقطع کیا کل نے اس سے پوچھا۔ ”نہیں مگر تم اسے چھوڑ دو اور مجھے یہ بتاؤ کہ کیا فیصل قم پر جاکد اد میں اپنا حصہ طلب کرنے کے لیے ہذا ڈال رہا ہے؟“ ”آپ کو کس نے بتایا؟“ کل اس کا سوال سن کر حیران رہ گئی اور حیرت سے پوچھا۔ اس کے پوچھنے پر فردوس کو مزید تصدیق کی ضرورت نہیں رہی۔ ”چلو آؤ، چلتے ہیں۔“ اس نے پھل پر پڑی اپنی ایک دو چیزیں میٹھ لیں اور پرس میں رکھتے ہوئے تنہی لگے بول۔ ”آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“ کل نے اپنے ٹوکا۔

”جواب دینے کے لیے ہی ساتھ لے کر جا رہی ہوں۔“ فردوس نے اس تنہی لگ سے کہا کہ کل کی مزید سوال کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اس کے بعد ان کے درمیان خاموشی ہی رہی۔ یہاں تک کہ فردوس نے گاڑی مذکورہ پارک کے سامنے لے جا کر روک دی۔

”گاڑی لاک کر کے آپ دونوں پارک میں آجائیں۔“ ابھی اس نے ارد گرد اس کی موجودگی کا اندازہ لگانے کے لیے گردن گھمائی ہی تھی کہ اس کا موبائل بھا اور صرف ایک بات کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ ”آؤ میرے ساتھ۔“ اس نے ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اپنے ساتھ بیٹھی کل سے کہا۔

”ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟ آپ کو پتا ہے کہ مجھے اعظم کی فکر ہو رہی ہے۔“ اس کے کہنے پر کل گاڑی سے اتر تو آئی لیکن وہ خوش نہیں تھی۔

”یہ بھی ایک ضروری کام ہے۔ یوں سمجھ لو کہ اس کا تعلق تھوڑے ادا سائیں سے ہے۔“ فردوس نے تنہی لگ سے جواب دیا اور اس کا ہاتھ تمام کر پارک میں داخل ہو گئی۔ اس کا موڈ دیکھتے ہوئے کل نے دوبارہ کوئی سوال کرنے سے گریز کیا۔

”السلام علیکم؟“ ابھی وہ دونوں اندر داخل ہی ہوئی تھیں کہ وہ جانے کس سمت سے کل کران کے سامنے آ گیا۔ ”وعلیکم السلام؟“ سلام کا جواب دیتے ہوئے فردوس نے بطور خاص کل کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ وہاں شاسائی کا کوئی تاثر نہیں تھا۔

”آئیے، اس طرف بیٹھتے ہیں۔“ اس نے ایک طرف لگ بیٹھنے کی طرف اشارہ کیا اور کل پڑا۔ فردوس نے اس کی حیرت کی جو کل کو بھی لگم لگم آگے بڑھانے پڑے لیکن وہ انھیں کا شکار مچی کہ یہ شخص کون ہے جس سے ملنے کے لیے

فردوس یہاں آئی ہے۔

”یہ تمہارے ادا سائیں کے دوست ہیں اور ان کی رہائی کے سلسلے میں کچھ کرنا چاہتے ہیں اسی لیے میں تمہیں ان سے ملوانے لائی ہوں۔“ اس کی جھجک کو محسوس کرتے ہوئے فردوس نے اسے بتایا۔

”ادا سائیں کے دوست؟“ کل نے اس بار اسے ذرا غور سے دیکھا۔ اب وہ فردوس کے ساتھ ایک شیخ پر بیٹھ چکی تھی لیکن وہ ان کے مقابل شیخ پر بیٹھا ہوا تھا۔ یکدم ہی اس نے اپنی آنکھوں پر موجود گہرے رنگ کے گھاسڑا تار پے تو گھنی ڈاڑھی مونچھوں کے پیچھے اس کے نقوش کو کھوجتی کل کے دماغ میں کچھ کلک ہوا۔

”معاذ!“ اس کے لبوں سے بے اختیار ہی پھلا۔

”جی میں۔“ اس نے تصدیق کی تو یکدم ہی کل کا دل بھر آیا۔ یہ وہ شخص تھا جس نے پہلے بھی ایسے حالات میں اس کی مدد کی تھی جب بظاہر کہیں کوئی امید دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ کیسے بھول سکتی تھی آشیانہ آزادی نامی اس پرانی چرٹکوہ عمارت کو جہاں ایک تہ خانے میں اس کے اور معظم کے ساتھ اس شخص کو بھی قید میں رکھا گیا تھا اور پھر وہ اس کی بے مثال بہادری اور جرأت کی وجہ سے وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ یہ حقیقت تو انہیں بعد میں جا کر معلوم ہوئی تھی کہ وہ عالم شاہ کا گمشدہ دوست معاذ تھا اور اب وہی معاذ ایک بار پھر جبکہ وہ مشکل میں گھری ہوئی تھی، اس کے سامنے آ گیا تھا۔

”کیسی ہیں آپ؟“ اس نے سیاہ چادر کے نقاب سے چھپتی اس کی آنکھوں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے آہستہ سے پوچھا۔ اس ایک نظر میں ہی اس نے وہ کچھ دیکھ لیا تھا جس کے بعد اسے اپنے سوال کے جواب کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ یہ کل اس کل سے مختلف تھی جسے اس نے ڈاکوؤں کی قید میں دیکھا تھا۔ حالات اس وقت بھی موافق نہیں تھے لیکن اس کی مثالی چادر سے چھپتی آنکھوں میں یہ ویرانی نہ تھی جو آج دکھائی دے رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ چادر کے رنگ کی تبدیلی کے ساتھ ہی اس کی زندگی بھی بدل کر رہ گئی ہے اور چادر کے کدبک کی سیاہی کی طرح اس کی زندگی میں بھی سیاہی پھیل چکی ہے۔

”میں ٹھیک ہوں۔ آپ یہاں کیسے؟“ مانی تو اسے بھی خبر تھی کہ معاذ ہنوز سب کے لیے گمشدہ ہے اس لیے اس سے سوال کیے بغیر نہیں رہ سکی۔

”مجھے تو گردش حالات جہاں لے جاتی ہے وہاں پہنچ

جاتا ہوں لیکن مجھے بالکل امید نہیں تھی کہ آپ کو یہاں، ان حالات میں دیکھوں گا۔ کیا اس روز آپ اور معظم شاہ... یہ خبریت گھروا نہیں نہیں پہنچ سکے تھے؟“ کل کی بیوی کے حوالے سے اس کے ذہن میں بڑی الجھن تھی اس لیے ذہن میں آنے والے خیال کے تحت سوال کیا۔

”نہیں۔ اس روز تو ہم بہ حفاظت گھر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے لیکن قسمت میں شاہ معظم کا مجھ سے بچھڑنا طے تھا جو وہ ایک بار پھر دشمنوں کے ہتھے چڑھ گئے اور ان کا بیٹا اس دنیا میں آنکھ کھولے بغیر ہی ختم ہو گیا۔“ معاذ نے اس کے اس زخم کو چھیر دیا تھا جو ابھی پوری طرح بھرا بھی نہیں تھا۔

”مجھے بہت افسوس ہوا۔ اللہ آپ کو صبر دے۔“ اس کے پاس اسے دلا سادہ پن کے لیے الفاظ نہیں تھے۔

”آپ ادا سائیں کی رہائی کے لیے کیا کرنا چاہتے ہیں؟“ فیصل کے نکاح میں ہوتے ہوئے وہ اپنے دل کے اس زخم پر کیسے ماتم کرتی چنانچہ فوراً ہی اصل بات پر آ گئی۔

”کیا کرنا ہے، یہ تو فی الحال طے نہیں ہے لیکن یہ طے ہے کہ میں اپنے دوست کو اس مشکل میں نہیں چھوڑ سکتا۔ اسے اس مشکل سے نکالنے کے لیے مجھ سے جو بھی ہو سکا، ضرور کروں گا۔“ اس نے کالے خان کو دشا کی سن گن لینے کی ڈسے داری سونپ دی تھی لیکن ابھی کوئی حتمی لائحہ عمل طے نہیں کر سکا تھا اس لیے کل کو بھی بہم سہا ہی جواب دے سکا۔

”آپ اکیلے کیا کر سکیں گے؟“ وہ تھوڑی سی مایوس ہوئی۔

”اللہ ہے ناہد و کرنے والا۔ وہ ظالموں سے نجات کی راہ نکال ہی دے گا۔“ اس نے امید دلائی۔ حقیقتاً وہ خود بھی اسی امید پر عالم اور سرد کی رہائی کے لیے جدوجہد کرنا چاہتا تھا ورنہ راہبھی الجھنی کے خلاف قدم اٹھانے کے لیے وسائل ہی نہیں تھے اس کے پاس۔ راہدادیوی اور کالے خان بس ایک حد تک ہی کارآمد تھے۔

”آمین۔“ کل نے آہستہ سے کہا تو ساتھ فیصل فردوس نے بھی زیر لب اس کا ساتھ دیا۔ وہ اس ملاقات کے دوران ان کے ساتھ بیٹھی ضرور تھی لیکن نگاہوں میں دخل بالکل نہیں دے رہی تھی۔

”میں دقت میں نے آپ کو عالم شاہ سرد کی رہائی کے مسئلے پر نہیں بلکہ کسی اور مسئلے پر اسکشن کے لیے بھاں تک آبنے کی زحمت دی ہے اس لیے میری آپ پر یہ ریکورڈ ہے کہ میری بات ذرا کل سے سن کر کوئی رد عمل ظاہر نہ کیجے گا۔“ معاذ گھٹکھٹارتے ہوئے اصل مدد کی طرف آیا۔

”جی فرمائیے۔“ وہ حیران ہوئی۔

”مجھے علم ہے کہ آپ کی شادی کن حالات میں فیصل کے ساتھ ہوئی اور فیصل کا آپ کے ساتھ کیا سلوک ہے۔ میں اس کے مزاج کی ساری نیکیوں اور بے ہودہ مطالبات سے بھی واقف ہوں اور اندازہ لگا سکتا ہوں کہ آپ اس کے ساتھ کس عالم جبر میں وقت گزار رہی ہیں۔ عالم یقیناً اپنی بہن کے لیے اس زندگی کو قبول نہیں کرتا اس لیے اس کا دوست ہونے کے نامے میں بھی آپ کے ساتھ اس زیادتی پر رنجیدہ ہوں اور آپ کو پیشکش کرتا ہوں کہ آپ چاہیں تو اس زندگی سے نجات حاصل کر سکتی ہیں۔“

”یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟“ جہاں وہ اس کی معلومات پر حیران تھی، وہیں اس کی پیشکش سن کر شدید رو گئی۔

”آپ میری بات کا کوئی غلط مطلب نہ لیں۔ میں صرف آپ کو اس مشکل سے نکالنا چاہتا ہوں۔ فیصل کا گھر چھوڑ کر آپ پوری عزت اور احترام کے ساتھ ایسی محفوظ جگہ پر رہ سکتی ہیں جہاں کوئی آپ کو ذہنی اور جسمانی تشدد کا نشانہ نہیں بنائے گا۔ بعد میں حالات موافق ہوں تو آپ عالم کے ساتھ پاکستان واپس چلی جائے گی۔“

وہ رادعا دیوی سے فرمائش کر کے محل کی رہائش کا مسئلہ حل کر سکتا تھا اس لیے اسے یہ پیشکش کر رہا تھا۔

”آپ کی ہمدردی کا شکریہ لیکن میں اس پیشکش کو قبول کر کے اپنی اور اپنے والدین کی بدنامی کا سامان نہیں کر سکتی۔ آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ اس طرح میری ذات پر کیسے کیسے الزامات عائد کیے جاسکتے ہیں؟“ وہ غصے کا اظہار نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن حقیقتاً اسے معاذ کی پیشکش ناگوار گزری تھی۔

”مجھ نے الزامات کے ڈر سے ذمہ کی جھکی جیتی تھی کو داد پر لگا دینا کہاں کی جھنڈی ہے؟ ایک ایسا شخص جو کسی اور عورت میں انٹرسٹ ہے، کسی بھی موڑ پر آپ کے ساتھ کچھ بھی نہ کر جائے گا اور ہو سکتا ہے اس وقت کوئی آپ کی مدد کرنے کے لیے موجود نہ ہو تو کیا بہتر نہیں ہے کہ آپ اس موقع کا فائدہ اٹھالیں۔“ معاذ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کس طرح قائل کرے۔

”اپنی ذات کو بچانے کے لیے دوسروں کو مشکل میں ڈال دینے کی خود غرضی نہیں دکھا سکتی ہیں۔ فیصل کا رد یہ کچھ بھی سمجھا لیکن میں اس حقیقت کو نہیں بھول سکتی کہ ان لوگوں نے بہت مشکل وقت میں میرا ساتھ دیا ہے اور میرے چپکے سے غائب ہو جانے کا مطلب ہوگا... ان لوگوں کو مصیبت

میں جٹا کر دینا۔ کیا آپ کو اندازہ ہے کہ ایسا کرنے کی صورت میں مجھے پناہ دینے والے جوابدہ ہوں گے؟“ اس کے پاس اپنے انکار پر قائم رہنے کے لیے ٹھوس دلائل موجود تھے۔ معاذ اس بار کچھ بھی نہیں کہہ سکا۔

”آپ کا بے حد شکریہ کہ آپ نے میرے بارے میں اتنی فکر کی لیکن میری خواہش ہے کہ آپ اگر ادا سائیکس کے لیے کچھ کر سکتے ہیں تو ضرور کریں لیکن خود کو میرے معاملات سے الگ رکھیں۔ مجھے اپنی زندگی کے لیے جو بھی فیصلہ کرنا ہوا، میں خود کروں گی۔“ اب وہ بہت دو ٹوک انداز میں معاذ کو اپنی زندگی سے دور رہنے کی تلقین کر رہی تھی۔ معاذ جواباً کچھ نہ کہہ سکا اور اس پر ایک بے بس سی نظر ڈال کر رہ گیا۔

”چلیں بھائی اُدیر ہو رہی ہے، اب گھر چلتے ہیں۔“ اپنی بات کہہ چکنے کے بعد اس نے معاذ کا رد عمل دیکھنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی اور بیچ پر سے اٹھتی ہوئی فردوس سے بولی۔ فردوس کو اس سے ہمدردی تھی لیکن اس کے فیصلے سے اختلاف وہ بھی نہیں کر سکتی تھی چنانچہ خاموشی سے اس کے پیچھے چل پڑی۔ چلتے چلتے اس نے ایک پارکسٹ کر معاذ کی طرف دیکھا۔ وہ بہت ہار ا ہوا سا ابھی تک اسی بیچ پر بیٹھا ہوا تھا۔

”کیا صرف ایک دوست کی بہن سے ہمدردی میں انسان کا یہ حال ہوتا ہے؟“ فردوس اپنے ذہن میں اس سوال کو ابھرنے سے نہیں روک سکی۔

☆☆☆

”یہ بات بالکل کفرم ہے کہ دشنام اس وقت ناسٹ کلب میں ہی ملے گا۔“ اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا جائزہ لیتے ہوئے کالے خان سے در پاشت کیا۔ اس

دقت اسے آئینے میں اپنے عکس کی صورت جو چہرہ دکھائی دے رہا تھا، وہ خود اس کے لیے بھی کچھ اجنبی سا تھا۔ برگر کئنگ کے ساتھ سنہری بال، بالوں کی ہم رنگ فرنیج کٹ ڈانڈی، بھوری آنکھیں، ٹاک کی دایک جانب سونا سا بھورستہ، پیشانی پر کسی منڈل ہو جانے والے پرانے زخم کا چھوٹا سا نشان اور کسی جادو اثر لوشن کی مدد سے بے تحاشا گوندی ہو جانے والی رنگت نے اسے اس کو یکسر بدل کر رکھ دیا تھا۔ جو تھوڑی بہت گس رہ گئی تھی اسے جسم پر موجود اسکن ٹائٹ پنٹ، بھولیلی سی ہاف آئین کی ٹی شرٹ اور گلے میں لٹکتی تین عدد سونے زنجیروں نے پورا کر دیا تھا۔ اس جلیبے میں وہ صاف صاف کوئی ایسا نو ورتھا جو وہ دکھائی دے رہا تھا جو خود کو فیشن ایبل ظاہر کرنے کے چکر میں نمونہ بنا بیٹھا

تھا۔ چلے کی یہ تہذیبی کالے خان کی مرہون منت تھی۔ اسے اس قدر تہذیبی کر کے اس نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ ایک اچھا ختم نم ہی نہیں، بہترین میک اپ آرٹسٹ بھی ہے۔

”وشا کے بارے میں یہ ساری معلومات نہایت احتیاط سے جمع کی گئی ہیں اس لیے میں یہ تو یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اپنے معمول کے مطابق اسے اس وقت ٹائٹ کلب میں ہی ہونا چاہیے لیکن اگر کسی وجہ سے آج اس کے معمول میں کوئی تبدیلی آجاتی ہے تو میں اس کی ذمہ داری نہیں لے سکتا۔“ کالے خان نے نہایت صاف گوئی سے اس کے سوال کا جواب دیا۔

”وہ تو پھر اس کی یا میری قسمت کی بات ہوگی اور قسمت کے الٹ پھیر سے بچنا کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔“ معاذ جواہر اسکرابر بولا اور اسٹول پر بیٹھ کر ایک جانب رکھے جوتے پہنے گا۔

”آپ جو کرنے جا رہے ہیں، کیا آپ نے اس کے بارے میں کسی طور پر سوچ لیا ہے؟ میرا مطلب ہے کہ کیا آپ اس کے خطرناک نتائج سمجھنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہیں؟“ اسے بالکل تیار دیکھ کر کالے خان نے ہنسنے لگا۔

”میں خوش امید ہی زیادہ رکھنے والا انسان ہوں لیکن بہر حال خطرناک کام کرتے ہوئے انسان کو خطرناک نتائج کے بارے میں سوچنا تو پڑتا ہے۔“ معاذ نے بے پروا سے انداز میں اس کے سوال کا جواب دیا۔

”میں موجودہ حالات کی وجہ سے تشویش کا شکار ہوں۔ پچھلے کچھ عرصے سے ویش کے مختلف حصوں میں جو دہشت گردی کی وارداتیں ہوئی ہیں، انہوں نے پہلے ہی پولیس وغیرہ کو مارے کر دکھا تھا لیکن کل ہونے والے واقعے کے بعد تو حالات بہت ہی نازک ہو گئے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ کسی مشکل میں نہ پھنس جائیں۔“ کالے خان اپنی گفتگو میں کہیں کہیں ایک آدھ لفظ ہندی کا بول جاتا تھا ورنہ وہ بے اس کی اردو خاصی صاف تھی۔

”آپ کی حکومت آئے دن اس قسم کے گھنیا ڈرامے رچانے کی عادی ہے۔ ان ڈراموں سے بھارت کے پروپیگنڈا میڈیا اور بے وقوف عوام کے سوا اب کوئی متاثر نہیں ہوتا۔“ اسی نے جیسے کان پر سے بھی اڑائی۔

”یعنی آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ کل کے حملے میں پاکستان کے جن تین چبوتے راہنماؤں کو فرار کروانے کی کوشش کی گئی تھی، وہ دراصل ہماری حکومت کا ڈراما تھا؟“ کالے خان کو جیسے اس کی بات کا یقین نہیں آیا۔

”بالکل ڈراما تھا ورنہ ہم اسے نااہل نہیں کہ ایک تو اپنا مشن پورا نہ کر سکیں، دوسرے سارے سارے موقع پر ہی مارے جائیں۔“ وہ کل کی خبریں دیکھنے کے بعد یہ ویسے ہی بہت تپا ہوا تھا اس لیے کالے خان کو قدرے عجیب سے جواب دیا۔

خبروں کے مطابق حملہ اس وقت کیا گیا تھا جب پاکستان کے منظور نظر تینوں افراد کو کھدائی کا ردوالی کے لیے لے جایا جا رہا تھا۔ حملہ آور دو گاڑیوں اور چار عدد ہتھیار پر آئے تھے۔ انہوں نے حملے کے دوران ویڈیو گریفٹرز اور جدید ہتھیار کا بے دریغ استعمال کیا تھا چنانچہ وقتی طور پر قیدیوں کی حفاظت پر مامور سکیورٹی فورس کے جوانوں پر غالب آنے میں کامیاب رہے تھے۔ شاید وہ اپنے مطلوبہ افراد کو لے کر فرار ہو جانے میں بھی کامیاب ہو جاتے لیکن قسمت سے فائرنگ اور دھماکوں کی آوازوں نے قریب سے گزرتی سکیورٹی فورسز کی دو گاڑیوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ فورسز کے جوانوں نے اپنی جان پر کھیل کر حملہ آوروں سے زبردست مقابلہ کیا اور فرار ہونے کی کوشش کرتے تینوں قیدیوں سمیت تمام حملہ آوروں کو ہلاک کرنے میں کامیاب رہے۔

کل سے بھارتی میڈیا اپنی فورسز کے جوانوں کی بے مثال کارکردگی کے راگ الاپ رہا تھا اور حملے کا الزام پاکستان پر عائد کرتے ہوئے پاکستان کے خلاف زہرا لگنے میں مصروف تھا۔ معاذ کو اس سارے ڈرامے میں شاید حقیقت کی کوئی رت دکھائی دے ہی جاتی اگر تینوں محتول قیدیوں کے نام اس کے لیے شاسانہ ہوتے۔ اعجاز، عباس اور سلیم درانی۔ یہ تین نام اس نے سونیا کی زبان سے سنے تھے۔ سونیا کا دعویٰ تھا کہ حکومت پاکستان ان تین افراد کو رہائی دلوانے میں دیکھی رکھتی ہے اور ان کی رہائی کے لیے بھارت پر دباؤ ڈالنے کے لیے بھارتی سرزمین پر کارروائیاں کرنا چاہتی ہے۔ معاذ کو سونیا کی اس کہانی پر اس وقت بھی یقین نہیں آیا تھا اور اس خبر کے بعد تو اسے یقین ہو گیا تھا کہ سونیا اسے قائل کرنے کے لیے دھوکا دہی سے کام لے رہی تھی۔

اسے ابھی طرح یاد تھا کہ اس وقت اس نے ان تینوں افراد کی رہائی کے لیے سونیا کے سامنے براہ راست ایکشن کی تجویز رکھی تھی لیکن سونیا نے وہ تجویز یہ کہہ کر رد کر دی تھی کہ ان تینوں کو سخت حفاظتی حصار میں رکھا گیا ہے اور اس حفاظتی حصار کو توڑ کر انہیں وہاں سے فرار کروانا عملی

ضرورت یا مشکل کے وقت آپ انہیں کال کر سکتے ہیں۔“
کالے خان نے اسے باردہائی کردی جس کا جواب اس نے
مکھل سر ہلا کر دیا اور باہر کی طرف بڑھ گیا۔ رات کے اس پہر
حسب معمول گھر میں کوئی ملازم موجود نہیں تھا۔ رادھا دیوی
بھی ایک دن کے قیام کے بعد اپنی شوٹنگ پر چلی گئی تھی۔ اس
ایک روزہ قیام میں ایک بار دوپہر کے کھانے پر اس سے
ملاقات ہوئی تھی جس میں رادھا نے اس کا حال احوال
در پافت کرنے کے ساتھ ساتھ کالے خان کو ایک بار گھر اس
کا خیال رکھنے اور ہر ضرورت پوری کرنے کی تاکید کی تھی۔

”اپنا خیال رکھیے گا۔“ جب وہ ہیلیمٹ سر پر پہن کر
اپنے لیے موبائی گئی بیوی بانگ پر سوار ہو رہا تھا تو اس کے
پیچھے پیچھے باہر تک چلے آنے والے کالے خان نے اسے
تاکید کی۔ جواہر اس نے مکھل سر کو جنبش دی اور وہاں سے
روانہ ہو گیا۔ جس ٹائٹ کلب میں دشنا کی موجودگی کی اطلاع
تھی، وہاں تک پہنچنے میں اسے تیز رفتاری کے سبب مکھل میں
منٹ ہی لگے تھے۔ بانگ پارکنگ میں کھڑی کر کے وہ اندر
داخل ہو گیا۔ اندر کا ماحول وہی تھا جو کسی ٹائٹ کلب کا ہو سکتا
تھا۔ تیز میوزک، کھٹکھٹانے قہقہے، تھرکتے جسم، آپس میں
گھبراتے جام اور دھواں دھواں تھا

عادی نہ ہونے کے باعث اس نے بدبو اور دھواں
سے بھری اس فضا میں اپنا دم گھٹاتا ہوا محسوس کیا لیکن مقصد
کے حصول کے لیے اس کھن زدہ ماحول کو برداشت کرنا ہی
تھا۔ وہ وہاں موجود افراد کا جائزہ لیتا ہوا کاؤنٹر کی طرف
بڑھ گیا۔ ابھی تک اسے دشنا نظر نہیں آیا تھا۔

”ہائپ پیگ۔“ کاؤنٹر کے قریب رکھے ایک اسٹول
پر براجمان ہوتے ہوئے اس نے وہاں کی رسم نبھانے کے
لیے آرڈر دیا اور خود کچا کچ بھرے ہال کا جائزہ لینے لگا۔ یہ
کوئی بہت اعلیٰ درجے کا ٹائٹ کلب نہیں تھا لیکن فیشن کی دوز
میں آگے نکلنے کے لیے ہر مرد و زن نے ایڑی چوٹی کا زور لگا
رکھا تھا۔ مختلف چہروں سے اس کی نظریں پھسلتی پھسلتی بالآخر
ایک چہرے پر جا گئیں۔ دشنا کو اب تک اس نے مکھل
تصویروں میں ہی دیکھا تھا لیکن اس کے نقوش اس حد تک
حفظ ہو گئے تھے کہ پہلی ہی نظر میں اسے شناخت کر لیا۔

وہ ارد گرد سے بے غماز ایک ٹوجوان لڑکی کو بانہوں
میں لیے محو رقص تھا۔ لڑکی زیادہ خوبصورت نہیں تھی لیکن
بیجان خیر لباس میں اس کا آپ سے باہر ہوتا جسم وہاں آنے
والے دشنا جیسے مردوں کو دلچسپ بنانے کے لیے کافی تھا۔ تیز
میک اپ اور رنگ برنگے ڈائی بالوں کی مدد سے اس نے خود

ممکن نہیں ہے۔ اب وہ ناممکن کام اس طرح ممکن ہو گیا تھا
کہ بھارتی حکومت خود ان تینوں کو سخت حفاظتی حصار سے
نکال کر سڑک پر لے آئی تھی جہاں ان کی رہائی کے لیے ایک
طرف منظم حملہ ممکن ہو گیا تھا تو دوسری طرف تینوں قیدیوں
اور حملہ آوروں کو شکانے لگانے کا مکمل انتظام بھی موجود تھا۔
اس جیل کے بعد سے پاکستان پر الزامات کی بوچھاڑ کر دی
گئی تھی اور بھارت عالمی برادری کو یہ باور کروانے کی کوشش
کند ہاتھ کر رہا تھا کہ وہ تو ایک پُر امن ملک ہے لیکن پاکستان مسلسل
کارروائیوں میں مصروف ہے۔

”کیا آپ کا تعلق پاکستان کے کسی خطیہ ادارے سے
ہے؟“ کالے خان نے اس کے جیل سے جانے کیا نتیجہ اخذ
کیا تھا کہ اس سے پوچھ بیٹھا۔

”ہم سے میری مراد اپنے خفیہ اداروں کے بہادر
ہیں۔ تم مجھے ان قابل فخر لوگوں سے کہاں ملارہے ہو۔ میں تو
ایک عام سا پاکستانی شہری ہوں جسے حالات کی ستم ظریفی نے
یہاں لا پٹا ہے۔“ اس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کالے
خان کے سوال کا جواب دیا اور ایک بار پھر آنکھوں کے سامنے
کھڑا ہو کر اپنا جائزہ لینے لگا۔ میک اپ بالکل پرفیکٹ تھا۔

”میں مان لیتا ہوں کہ آپ کا پاکستان کے کسی
ادارے سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن میں یہ نہیں مان سکتا کہ
آپ کوئی عام فرد ہیں۔ عام لوگ نہ تو آپ جتنی قوت
برداشت رکھتے ہیں نہ اس طرح سوچے اور عمل کرتے ہیں
جس طرح کہ میں نے آپ کو دیکھا ہے۔“ کالے خان نے
صاف گوئی سے اس کے متعلق اپنا تجزیہ بیان کیا تو وہ کچھ
خاموش سا ہو گیا پھر آہستہ سے بولا۔

”میں نے اپنے متعلق کوئی جھوٹ نہیں کہا ہے وہاں
بس اتنا ہے کہ کچھ سچ ہیں جو میں نے بتائے نہیں ہیں اور
ایسے سچ ہر شخص کی زندگی میں ہوتے ہیں جو وہ کسی کے سامنے
بیان نہیں کر پاتا۔ کیا تمہاری زندگی میں ایسی چیزیں نہیں
ہیں؟ اس کی سوالیہ نظریں کالے خان کے چہرے پر جا کر
لگیں تو اس نے اپنی نظریں چرائیں۔

”آپ درست فرما رہے ہیں۔“
”تو بس پھر ٹھیک ہے۔ میرے متعلق پہ ساری حقیقتیں
ختم کر دتا کہ میں بھی اپنے کام سے نگلوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ
زیادہ لیٹ ہونے پر دشنا ہی ہاتھ سے لگ جائے۔“ اس نے
ایک میز پر رکھا ہوا ہیلیمٹ اٹھاتے ہوئے کچھ غلبت کا
مظاہرہ کیا۔

”میک اپ پر دو آدمی موجود ہوں گے۔ کسی بھی

کو اپنے تئیں مزید دکھ بتانے کی کوشش کی تھی۔ محاذ کے خیال میں اگر وہ ایسا نہ کرتی تو شاید کچھ معقول نظر آتی لیکن معقولیت کا وہاں موجود لوگوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ خود بھی ان سے ملتے جلتے طبقے میں ہی وہاں موجود تھا۔

”ہے ونڈم! یہاں کیوں چٹھے ہو؟ آؤ انجوائے کرو۔“ وہ دشا اور اس کی ساتھی لڑکی کا جائزہ لینے میں مصروف تھا کہ ایک چپکتے ہوئے سیاہ اسکرٹ والی لڑکی اس کے مقابل آکھڑی ہوئی اور اس کا ہاتھ بے لکھی سے کھینچتے ہوئے اسے دعوت دی۔ اس نے دوسرے ہاتھ میں پونجی تھا ہوا جام کا دھڑ پر رکھا اور مسکرا کر لڑکی کی دعوت قبول کر لی۔ اب وہ بھی ڈانس کرنے والے جڑوں میں شامل ہو چکے تھے۔

”تم بہت ہاٹ ہو۔“ اس کی ساتھی لڑکی نے اس کے کان میں سرگوشی کی (پھر اور بات کہ وہاں جاری تیز میوزک کی وجہ سے سرگوشی بھی سچ کر ہی کرنا پڑ رہی تھی)۔

”یہاں سب ایک دم۔۔۔ بیکار ہیں۔ تم جیسا ونڈم بہت لانگ ٹائم کے بعد دکھائی دیا ہے۔“ وہ جوش و خروش سے اس کے ساتھ رقص کرتے ہوئے مسلسل بولتی جا رہی تھی۔ اس کے لہجے سے ظاہر تھا کہ وہ اچھے خاصے نئے میں ہے۔ محاذ کی توجہ اس کی باتوں سے زیادہ اس بات پر تھی کہ زیادہ سے زیادہ دشا کے قریب ہو سکے اور وہ کافی حد تک اس کوشش میں کامیاب بھی تھا۔ دشا کی حالت سے ظاہر تھا کہ وہ بھی ٹھیک ٹھاک نئے میں ہے۔ رقص کے دوران وہ لڑکی کے ساتھ بے ہودہ اور بے ہاک حرکتیں کرنے کے ساتھ ساتھ بلند و بانگ قہقہے بھی لگا رہا تھا۔ لڑکی کو اس کی کسی حرکت پر کوئی اعتراض نہیں تھا اور وہ ایسے گفتاریاں مار رہی تھی جیسے اسے یہ حرکتیں بہت لطف دے رہی ہیں۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ وہ دونوں وہاں سے واپسی کے موڈ میں دکھائی دینے لگے۔ محاذ کو بھی اپنے گلے پڑی جلا سے جان چھڑانے کی فکر ہوئی۔ اس نے اس کا کندھا ہلا کر متوجہ کیا اور چھوٹی انگلی اٹھا کر مخصوص اشارہ کرتے ہوئے اجازت چاہی۔

”بدرنگ پرن۔“ اس نے منہ بتاتے ہوئے مجھپھا اسے جانے کی اجازت دی۔ اس اثنا میں دشا اور اس کی ساتھی لڑکی باہر نکل چکے تھے۔ وہ بھی جیوتیز چلتا ہوا ان کے پیچھے باہر نکلا۔

”چل دفع ہو۔ میں تجھے کباب میں ہڈی بنا کر اپنے ساتھ نہیں لے جاؤں گا۔“ اس نے دیکھا کہ دشا خود کو دیکھ کر

گاڑی کی طرف دوڑے آنے والے شخص پر الٹ پڑا اور اسے زور سے دھکا دیا۔

”میں ہڈی نہیں بنوں گا سر! میں صرف گاڑی چلاؤں گا۔“ اس شخص نے جوتھیتا ڈرائیور تھا، موڈ پانہ گزارش کی۔

”کہا نا دفع ہو جا۔“ اس بار دشانے اسے ایک لات رسید کر دی۔ اس کے اس کارنامے پر اس کی ساتھی لڑکی نے اسے ہاتھ بندھ تالیاں بجا کر داد دی۔

”چالی دے سائلے۔“ اس ولد نے دشا کو مزید بھٹا دیا اور اس نے گردن اکڑا کر ڈرائیور کو حکم دیا۔ اس بار اس نے خاموشی سے گاڑی کی چابیاں نکال کر اس کے حوالے کر دیں۔

”آؤ ڈرائنگ!“ دشانے گاڑی کا دروازہ غیر منتقل کرتے ہوئے لڑکی سے کہا۔ جب تک اس کی گاڑی وہاں سے روانہ ہوئی، محاذ بھی بانک کے ونڈل کے ساتھ لنگے ہیلمٹ کو سر پر پہن کر اسے اسٹارٹ کر چکا تھا۔

دشا کی گاڑی سڑک پر اس سے چند گز آگے جا رہی تھی۔ گاڑی جس انداز میں چل رہی تھی، اسے دیکھ کر ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ ڈرائیور مکمل طور پر اپنے حواس میں نہیں ہے۔ نئے میں غرق اس شخص کا تعاقب کرنے کے لیے اسے بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت نہیں تھی پھر بھی وہ محتاط تھا کہ کچھ بھی سکی، دشا پولیس والا تھا اور کسی بھی لمحے اپنے تعاقب کو محسوس کر کے چمک سکتا تھا۔

رات کے وقت سڑکوں پر ٹریفک کا دباؤ کم ہونے کی وجہ سے وہ بہت زیادہ رفتار سے ڈرائیور کر رہا تھا۔ ٹریفک کا کم ہونا اس کے حق میں اس اعتبار سے ٹھیک تھا کہ باوجود اتنی خراب ڈرائیونگ کے وہ ابھی تک کسی حادثے سے بچا ہوا تھا۔ اس کی یہ تیز رفتاری ایک اور ویڈیو پر چڑھتے ہوئے بھی برقرار رہی۔ آدھے پل تک سب ٹھیک رہا لیکن پھر اچانک ہی محاذ نے گاڑی کو سبے قابو ہو کر پل کی ریٹنگ کی طرف پڑھتے ہوئے دیکھا۔ اس کے بعد بس ایک دھماکے کی آواز سنائی دی اور دشا کی گاڑی سطر سے غائب ہو گئی۔

”شت۔۔۔۔۔“ عالم بھنجا ہٹ میں محاذ کے لبوں سے صرف ایک لفظ نکل سکا۔

تکلم و جہر کہے سامنے سپنہ سپر نوجوان

کسی داستان جو غلط کاروں کے لیے

غضب ناک تھا باتیں واقعات اینڈ ماہ پڑھیے

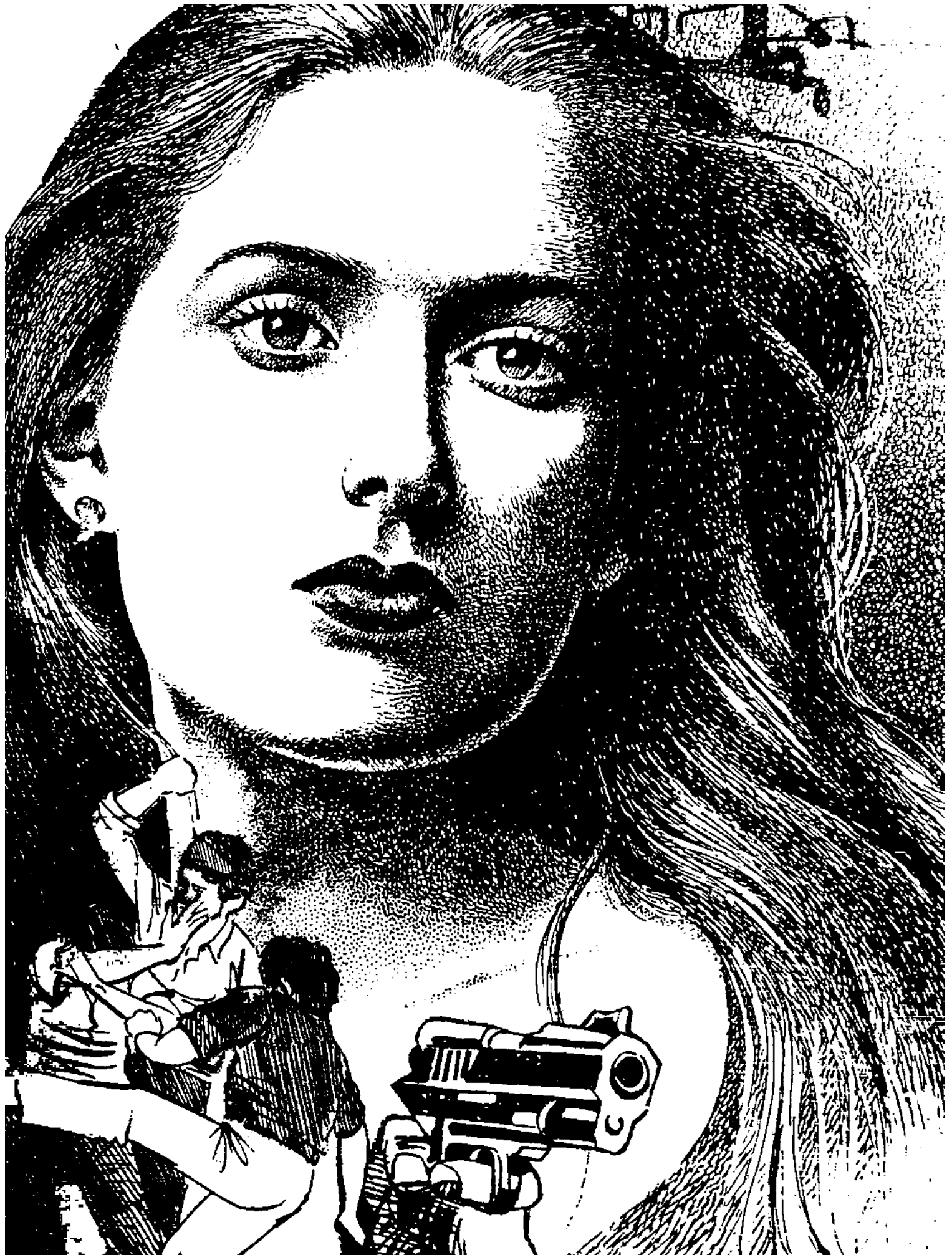


قسط: 21

نورجوان

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تند و تیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابل شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پُر عزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جارہے تھے... اس کی زندگی جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... یہ خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قرار یوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تار عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ پروار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ وارداتِ قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہو سکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تحیر انگیز داستان



معاذ ایک ذہین نین سٹون مزاج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارسل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جوائن کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری انسپریں اور اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ انٹی ٹیوٹ سے واپس آ رہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو سڑک پر گھنری ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی نڈر فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشری نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بشری ماس کیونی کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم وغیرہ لکھتی ہے۔ اس دوران جگہ بھی وہ ایک زیر تعمیر رہائشی منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی آئی تھی۔ معاذ بشری کو بہ حفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کر دیتا ہے لیکن جن رئیس زادوں سے اس نے ان کا شکار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ یہ موقع انہیں یونیورسٹی ٹرپ کی صورت میں مل جاتا ہے اور ایک جنگل کی سیر کے دوران وہ فوٹو گرافی کے شوق میں سب سے الگ تھلگ ہو جانے والے معاذ کو بے خبری میں گھیر کر بری طرح زد و کوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دے دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس نہ آنے پر انتظامیہ کے افراد، پولیس اور ریسکیو ذرائع کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جوگی کی جھونپڑی میں پاتا ہے۔ اپنی حالت سے اسے اپنے شدید زخمی ہونے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ جوگی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ معاذ کا سوبائیل جنگل میں ہی کہیں گر جاتا ہے اور جوگی کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا جس سے باہر کی دنیا سے رابطہ کیا جاسکے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے۔ جوگی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نواز کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے پراسرار علم سکھانے کی ہامی بھر لیتا ہے اور معاذ واقعی اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ادھر جانے دو تو وہ لٹنے والے معاذ کے کمرے سے جب تصویریں نکلوا ئی جاتی ہیں تو بہت سے قدرتی مناظر کی تصویریں اس میں سے ایک ایسی تصویر بشری کی نظر میں آ جاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پروجیکٹ کے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشری تحقیق کر رہی تھی۔ بشری کے اپنے والد جرنلٹ ہیں اور حق گوئی ان کے خون میں شامل ہے۔ اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشری کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ صدمے سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باذل نامی غنڈے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشری انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دنوں میں ہی معاذ واپسی کا ارادہ کرتا ہے تاہم دوسرے ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا عرفان اللہ اور یزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو وقاص نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باذل اچانک بشری کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر دیتا ہے۔ ادھر معاذ کو واپس لانے کے لیے اوجھے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اسے واپس آنے کا پیغام دیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کر کے اسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات لی جاتی ہیں، نہ بتانے پر اس کے بھائی کا ایک گروہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشری بھی انتقام کی آگ میں جلتی ہوئی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہو جاتی ہے۔ معاذ کو بچانے والا لڑکا وقاص اپنے گروہ کے ساتھ ایک پارٹی میں جاتا ہے۔ وہاں اسے معاذ کے حوالے سے مشکوک ایک شخص نظر آتا ہے۔ وہ اس کے پیچھے جاتا ہے مگر اسے گھیر لیا جاتا ہے۔ بہر حال وقاص کو تنبیہ کے ساتھ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ادھر معاذ کے دوست عالم شاہ کے بہنوئی کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ کئی فون میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے پہچان کر کے اس کے دماغ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ فیض سے حاصل انوکھے علم کی بدولت ان کا معمول نہیں پڑتا۔ بشری، کامران کو چھاپنے کا پروگرام بناتی ہے۔ ادھر عالم شاہ سراغ لگا لیتا ہے کہ اس کے بہنوئی کا قتل کس نے کیا۔ وہ قاتل کو گھیرتا ہے اور اسے تین اسے گولیاں مار کر قتل کر دیتا ہے۔ تاہم وہ بچ جاتا ہے۔ عالم شاہ اس کے بعد ڈاکوؤں کے سردار چاچو کو چھاپتا ہے اور اسے گھیر کر دلا تک پہنچاتا ہے۔ اس کے پیچھے پولیس لگ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور اس کا نوکر سرد باذل کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ ادھر معاذ جاسوس ماتھر کو پہچان کر کے اس کے ذریعے اسے نکالنے والوں پر حملہ کروا دیتا ہے تاہم ان کی فائرنگ سے ماتھر مارا جاتا ہے اور الزام معاذ پر نہیں آتا مگر معاذ سے کام لینے والوں کو اس پر شک گزرتا ہے۔ عالم کی بہن نجل شاہ کے نومو لو د بیٹے کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اغوا کا الزام لطیف

بیب ذہین سٹون مزاج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارسل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جوائن کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ انسٹی ٹیوٹ سے واپس آ رہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو سڑک پر گھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی نڈر فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشری نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بشری ماس کمیونی کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم وغیرہ لکھتی ہے۔ اس دوران جبکہ بھی وہ ایک زیر تعمیر رہائشی منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی آئی تھی۔ معاذ بشری کو بہ حفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کر دیتا ہے لیکن جن رئیس زادوں سے اس نے ان کا شکار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ یہ موقع انہیں یونیورسٹی ٹرپ کی صورت میں مل جاتا ہے اور ایک جنگل کی سیر کے دوران وہ فوٹو گرافی کے شوق میں سب سے الگ تھلک ہو جانے والے معاذ کو بے خبری میں گھیر کر بری طرح زد و کوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دے دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس نہ آنے پر انتظامیہ کے افراد، پولیس اور ریسکیو ذرائع کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جوجی کی جھونپڑی میں پاتا ہے۔ اپنی حالت سے اسے اپنے شدید زخمی ہونے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ جوجی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ معاذ کا موبائل جنگل میں ہی کہیں گر جاتا ہے اور جوجی کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا جس سے باہر کی دنیا سے رابطہ کیا جاسکے۔ وہاں رہتے ہوئے جوجی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے۔ جوجی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نواز کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے پر اسرار علم سکھانے کی ہامی بھر لیتا ہے اور معاذ واقعی اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ادھر جائے وقوعہ سے ملنے والے معاذ کے کمرے سے جب تصویریں نکلوائی جاتی ہیں تو بہت سے قدرتی مناظر کی تصویروں میں سے ایک ایسی تصویر بشری کی نظر میں آ جاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پردیگٹ کے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشری تحقیق کر رہی تھی۔ بشری کے اپنے والد جرنلسٹ ہیں اور حق گوئی ان کے خون میں شامل ہے۔ اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشری کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ صدمے سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باذل نامی غنڈے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشری انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دلوں میں ہی معاذ واپسی کا ارادہ کرتا ہے تاہم دوسرے ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا عرفان اللہ اور یزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو وقاص نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باذل اچانک بشری کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر دیتا ہے۔ ادھر معاذ کو واپس لانے کے لیے اویجھے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اسے واپس آنے کا پیغام دیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کر کے اسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات لی جاتی ہیں، نہ بتانے پر اس کے بھائی کا ایک گروہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشری بھی انتقام کی آگ میں جلتی ہوئی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہو جاتی ہے۔ معاذ کو بچانے والا لڑکا وقاص اپنے گروہ کے ساتھ ایک پارٹی میں جاتا ہے۔ وہاں اسے معاذ کے حوالے سے مشکوک ایک شخص نظر آتا ہے۔ وہ اس کے پیچھے جاتا ہے مگر اسے گھیر لیا جاتا ہے۔ بہر حال وقاص کو تنبیہ کے ساتھ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ادھر معاذ کے دوست عالم شاہ کے بہنوئی کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ کئی فنون میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے پتانا ناز کر کے اس کے دماغ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ فیضو سے حاصل انوکھے علم کی بدولت ان کا معمول نہیں جتا۔ بشری، کامران کو چھاپنے کا پروگرام بناتی ہے۔ ادھر عالم شاہ سراغ لگا لیتا ہے کہ اس کے بہنوئی کا قتل کس نے کیا۔ وہ قاتل کو گھیرتا ہے اور اپنے تئیں اسے گولیاں مار کر قتل کر دیتا ہے۔ تاہم وہ بچ جاتا ہے۔ عالم شاہ اس کے بعد ڈاکوؤں کے سردار چاچو کو چھاپتا ہے اور اسے کیفر کردار تک پہنچاتا ہے۔ اس کے پیچھے پولیس لگ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور اس کا نوکر سرد، باذل کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ ادھر معاذ جاسوس ماتھر کو پتانا ناز کر کے اس کے ذریعے اسے نکالنے والوں پر حملہ کر دیتا ہے تاہم ان کی فائرنگ سے ماتھر مارا جاتا ہے اور الزام معاذ پر نہیں آتا مگر معاذ سے کام لینے والوں کو اس پر شک گزرتا ہے۔ عالم کی بہن نجل شاہ کے نومولود بیٹے کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اغوا کا الزام لطیف

بیب ذہین سٹون مزاج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارسل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جوائن کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ انسٹی ٹیوٹ سے واپس آ رہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو سڑک پر گھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی نڈر فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشری نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بشری ماس کمیونی کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم وغیرہ لکھتی ہے۔ اس دوران جبکہ بھی وہ ایک زیر تعمیر رہائشی منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی آئی تھی۔ معاذ بشری کو بہ حفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کر دیتا ہے لیکن جن رئیس زادوں سے اس نے ان کا شکار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ یہ موقع انہیں یونیورسٹی ٹرپ کی صورت میں مل جاتا ہے اور ایک جنگل کی سیر کے دوران وہ فوٹو گرافی کے شوق میں سب سے الگ تھلک ہو جانے والے معاذ کو بے خبری میں گھیر کر بری طرح زد و کوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دے دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس نہ آنے پر انتظامیہ کے افراد، پولیس اور ریسکیو ذرائع کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جوجی کی جھونپڑی میں پاتا ہے۔ اپنی حالت سے اسے اپنے شدید زخمی ہونے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ جوجی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ معاذ کا موبائل جنگل میں ہی کہیں گر جاتا ہے اور جوجی کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا جس سے باہر کی دنیا سے رابطہ کیا جاسکے۔ وہاں رہتے ہوئے جوجی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے۔ جوجی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نواز کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے پر اسرار علم سکھانے کی ہامی بھر لیتا ہے اور معاذ واقعی اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ادھر جائے وقوعہ سے ملنے والے معاذ کے کمرے سے جب تصویریں نکلوائی جاتی ہیں تو بہت سے قدرتی مناظر کی تصویروں میں سے ایک ایسی تصویر بشری کی نظر میں آ جاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پردیگٹ کے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشری تحقیق کر رہی تھی۔ بشری کے اپنے والد جرنلسٹ ہیں اور حق گوئی ان کے خون میں شامل ہے۔ اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشری کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ صدمے سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باذل نامی غنڈے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشری انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دلوں میں ہی معاذ واپسی کا ارادہ کرتا ہے تاہم دوسرے ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا عرفان اللہ اور یزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو وقاص نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باذل اچانک بشری کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر دیتا ہے۔ ادھر معاذ کو واپس لانے کے لیے اویجھے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اسے واپس آنے کا پیغام دیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کر کے اسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات لی جاتی ہیں، نہ بتانے پر اس کے بھائی کا ایک گروہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشری بھی انتقام کی آگ میں جلتی ہوئی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہو جاتی ہے۔ معاذ کو بچانے والا لڑکا وقاص اپنے گروہ کے ساتھ ایک پارٹی میں جاتا ہے۔ وہاں اسے معاذ کے حوالے سے مشکوک ایک شخص نظر آتا ہے۔ وہ اس کے پیچھے جاتا ہے مگر اسے گھیر لیا جاتا ہے۔ بہر حال وقاص کو تنبیہ کے ساتھ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ادھر معاذ کے دوست عالم شاہ کے بہنوئی کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ کئی فنون میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے پتانا ناز کر کے اس کے دماغ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ فیضو سے حاصل انوکھے علم کی بدولت ان کا معمول نہیں جتا۔ بشری، کامران کو چھاپنے کا پروگرام بناتی ہے۔ ادھر عالم شاہ سراغ لگا لیتا ہے کہ اس کے بہنوئی کا قتل کس نے کیا۔ وہ قاتل کو گھیرتا ہے اور اپنے تئیں اسے گولیاں مار کر قتل کر دیتا ہے۔ تاہم وہ بچ جاتا ہے۔ عالم شاہ اس کے بعد ڈاکوؤں کے سردار چاچو کو چھاپتا ہے اور اسے کیفر کردار تک پہنچاتا ہے۔ اس کے پیچھے پولیس لگ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور اس کا نوکر سرد، باذل کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ ادھر معاذ جاسوس ماتھر کو پتانا ناز کر کے اس کے ذریعے اسے نکالنے والوں پر حملہ کر دیتا ہے تاہم ان کی فائرنگ سے ماتھر مارا جاتا ہے اور الزام معاذ پر نہیں آتا مگر معاذ سے کام لینے والوں کو اس پر شک گزرتا ہے۔ عالم کی بہن نجل شاہ کے نومولود بیٹے کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اغوا کا الزام لطیف

سومر و پر آتا ہے۔ عالم شاہ وہاں موجود ایک زخمی شخص کی مدد سے باڈل کی قید سے چھٹکارا پالیتا ہے۔ ادھر بشری دینی پہنچ جاتی ہے۔ وہاں وقاص اسے باربی کے روپ میں پہچان لیتا ہے اور ان دونوں کے درمیان اعتماد کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ وہ سلطان کو مارنا چاہتی ہے تاہم وقاص اسے ایسا کرنے سے روکتا ہے۔ ادھر عالم شاہ، باڈل کی قید سے نکل کر اس کا پیچھا کرتا ہے تاہم وہاں اچانک فائرنگ اور دھماکے ہونے لگتے ہیں۔ وہ وہاں معاذ کو دیکھتا ہے۔ صداقت شاہ، لطیف سومر و کو گھیرنے کے لیے اس کی خفیہ بیوی اور بچے کا کھوج لگاتے ہیں اور بچے کو اغوا کر لیتے ہیں۔ لطیف سومر و مجبور ہو جاتا ہے۔ معاذ کو اس کے گھر والوں سے ملنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ عالم شاہ کو اس کے والد انڈیا روانگی کا عندیہ دیتے ہیں۔ ادھر معاذ بھی ایک مشن پر سونیا کے ساتھ انڈیا روانہ ہوتا ہے تاہم کچھ لوگ سکھ یا تریوں سے بھری بس کو غلام بنا لیتے ہیں۔ معاذ اور سونیا تھکانے کے تمام افراد کو شکاک لگا دیتے ہیں تاہم باہر موجود دیگر اغوا کاروں سے مقابلہ ہوتا ہے اور معاذ زخمی ہو جاتا ہے۔ صداقت شاہ کے انڈیا میں موجود رشتے دار کے ہاں شادی ہوتی ہے۔ عالم شاہ، سبکل اور سرد انڈیا روانہ ہو جاتے ہیں۔ اترپورٹ سے گھر روانگی پر راستے میں کچھ لٹیرے انہیں لوٹ لیتے ہیں۔ عالم شاہ ایکشن میں آتا چاہتا ہے تاہم اجالا نامی عالم شاہ کی کزن اس کا راستہ روک لیتی ہے۔ گھر پہنچنے پر پولیس کی ریڈ ہوتی ہے اور وہ عالم شاہ اور سرد کو لے جاتے ہیں۔ ادھر بشری اور وقاص باڈل کو اسپتال میں مارنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ فوج جاتا ہے۔ معاذ اور سونیا پناہ کی تلاش میں ہوتے ہیں اور بالآخر اپنے سہولت کاروں سے مل جاتے ہیں۔ عالم شاہ اور سرد کو تشدد کا نشانہ بنا کر ویرانے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ وہاں اپنے میزبانوں کے ہاں پہنچ جاتے ہیں۔ شادی کے دوران انہیں پتا لگتا ہے کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں اجالا اور اس کا عاشق شامل ہوتے ہیں۔ وہ چھپ کر ان کی باتیں سن رہا ہوتا ہے کہ اسے چھاپ لیا جاتا ہے۔ تاہم وہاں مارا ماری ہوتی ہے اور اجالا کا عاشق مارا جاتا ہے۔ پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ ان کے کزن انہیں اپنے دوسرے خفیہ ہنگلے پر پہنچا دیتے ہیں جہاں کچھ لوگ ان پر حملہ کر دیتے ہیں۔ وہ وہاں سے بھگت نکل جاتے ہیں۔ ادھر معاذ کو سونیا اپنے ساتھ نئے مشن پر لے کر جاتی ہے جس میں ایک ریلوے لائن کو دھماکے سے اڑانا ہوتا ہے۔ معاذ ایسا نہیں چاہتا اس لیے وہ ٹرین کی آمد سے قبل بارودی دھماکا کر دیتا ہے۔ وہ زخمی ہو جاتا ہے اور اسے ہندو سادھو اپنی کنیا میں لے جاتا ہے جہاں اس کی اچھی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ سونیا کے آدمی معاذ کو تلاش کرتے ہیں مگر ناکام ہو جاتے ہیں۔ ادھر عالم شاہ اور سرد خفیہ ذریعے سے بارڈر پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس ٹرک میں وہ مجوسر ہوتے ہیں وہ اچانک جھٹکے سے رک جاتا ہے۔ اور وہ دھر لے جاتے ہیں اور ”را“ کی قید میں پہنچ جاتے ہیں۔ انہیں تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ادھر بشری باڈل کو مارنے کی کوشش میں خود نشانہ بن جاتی ہے۔ معاذ سادھو کی مدد سے ایک انڈین ہیروئن کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ وہیں اسے عالم اور سرد کی گرفتاری کا پتا چلتا ہے۔ ادھر سبکل کو اس کا شوہر ذہنی اذیت دیتا ہے۔ معاذ ڈاکٹر فر دوس سے ملتا ہے اور اسے سبکل کی مدد کرنے کا کہتا ہے۔ عالم اور سرد قید سے فرار کا سوچتے ہیں اور دھر لے جاتے ہیں جس کی پاداش میں انہیں مزید تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ معاذ، دشنا کے ذریعے عالم اور سرد کو رہائی دلوانا چاہتا ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ اس کا پیچھا کرتا ہے تاہم دشنا کی گاڑی حادثے کا شکار ہو جاتی ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

طرف لگی۔ وہاں اس وقت صرف دو ڈاکٹر موجود تھیں جو ڈھیلے ڈھالے انداز میں بیٹھی گرم چائے کی مدد سے اپنی تھکن اتارنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

”ہیلو!“ فون کا ریسپور اٹھا کر کان سے لگاتے ہوئے وہ بولی تو اس کی آواز میں خود بخود ہی کپکپاہٹ در آئی۔ پتا نہیں کیوں لیکن اس کے دل میں ایک خیال ساتھ کہ آنے والی یہ کال غیر معمولی ہے۔

”السلام علیکم ٹوپی آئی! مجھے معلوم ہے کہ آپ میری آواز پہچان گئی ہوں گی لیکن پلیز میرا یا ہم میں سے کسی اور کا نام مت لیجیے گا۔“ اس کی ”ہیلو“ کے جواب میں دوسری طرف سے اتنی تیزی سے یہ سب کچھ کہا گیا تھا کہ شدید حیران ہونے کے باوجود اسے زبان سے ایک لفظ تک

نومبر 2021ء

”ڈاکٹر ٹوبیہ! آپ کی کال ہے۔“ وہ راز ڈنڈ مکمل کر کے ابھی وارڈ سے نکلی ہی تھی کہ ایک نرس کی دی اطلاع نے حیران کر دیا۔

”میرا فون.....؟“ حیرت و استفسار میں ڈھلی اور بے ساختہ ہی اس نے گاؤن کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا موبائل باہر نکالا۔

”جی..... کوئی لڑکی ہے جو آپ سے بات کرنا چاہتی ہے۔“ نرس اسے بتا کر آگے بڑھ گئی اور وہ جو کہ اس خیال کے تحت اپنا موبائل چیک کر رہی تھی کہ شاید موبائل ڈائریکشن پر ہونے کی وجہ سے گھر سے آنے والی کوئی کال مس کر بیٹھی ہے اس لیے اب اسے اسپتال کے نمبر پر کال کی گئی ہے، چونکہ سی گئی اور تیز تیز قدموں سے ڈاکٹر زروم کی

سپنس ڈائجسٹ

نکالنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ ایک بار..... بس ایک بار وہ اپنی مجبوریوں کی زنجیریں توڑ کر ہم تک پہنچ جائیں تو پھر.... ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا اور وہ بھی ہمارے ساتھ آرام اور سکون سے رہ سکیں گے۔“

علینہ کی معاذ کے لیے بے قراری اپنی جگہ لیکن ثوبیہ اس کے لب و لہجے میں واضح اطمینان اور اعتماد محسوس کر رہی تھی اور یوں لگتا تھا کہ اسے اپنے محفوظ ہونے کا بھرپور یقین ہے جب ہی وہ معاذ کو بھی اپنے ساتھ دیکھنے کی خواہش کر رہی ہے۔

”اللہ تمہاری دعا قبول کرے۔“ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ سب کے ساتھ مل کر رہنے کے اس ذکر میں خود اس کی اپنی ذات کا کوئی تذکرہ نہیں تھا پھر بھی خلوص دل سے دعا دی۔ اسے معاذ کے ساتھ رہنے سے زیادہ اس کے سلامت رہنے سے دلچسپی تھی اس لیے جو محسوس کیا تھا، اس کا برا نہیں مانتا تھا۔

”اچھا، اب اجازت دیں آئی! پھر کبھی موقع ملا تو دوبارہ کال کروں گی۔“ وہ جانے کتنی مجبور تھی کہ نہ خود زیادہ سوال کیے تھے نہ اسے کرنے کا موقع دیا تھا۔

”کیا بات ہے ڈاکٹر ثوبیہ؟ کوئی پریشانی کی بات ہے کیا؟“ وہ لائن بے جان ہو جانے کے باوجود ریسیور تھاے کم کم کھڑی تھی کہ وہاں موجود اپنی کولیکٹر میں سے ایک کے ٹوکنے پر چوکی۔

”نہیں..... بس وہ امی کا پی ہائی ہو گیا تھا تو گھر سے کال تھی۔“ اس نے بہ مشکل خود کو سنبھال کر بہانہ بنایا۔

”اگر ان کی طبیعت زیادہ خراب ہے تو چھٹی لے کر گھر چلی جائیں۔“

”ہاں..... بات کر کے دیکھتی ہوں۔“ مشورے نے

اسے منظر سے غائب ہونے کا موقع فراہم کر دیا اور وہ ریسیور کریدل پر ڈال کر تیزی سے باہر نکل گئی۔ علینہ کی اس کال کے بعد کام میں دل لگنا مشکل ہی تھا اس لیے بھر تھا کہ وہ چھٹی لے کر گھر ہی چلی جاتی۔

☆☆☆

”کل کس کے ساتھ تھیں تم؟“

”کیا مطلب، کس کے ساتھ؟“ جلیل کے سوال پر اس کا بالوں میں برش کرتا ہاتھ ساکت ہوا اور اس نے آئینے میں اپنے عکس کے پیچھے نظر آتے جلیل کے عکس کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”سیدھا سادہ سوال ہے، اب اس کا مطلب کیا بتاؤں

تمہیں؟“ جلیل کے مرد لہجے نے اسے مڑ بڑکا احساس دلایا۔

”کل میں جیل کو چیک اپ کے لیے اسپتال لے کر

میں بہت ریسک لے کر صرف آپ لوگوں کی تسلی کے لیے بہ کال کر رہی ہوں۔ پلیز، اس کال پر ایسا کوئی ری ایکشن مت دیجیے گا کہ کوئی متوجہ ہو جائے اور سب کیا دھرا لیکن اس کے لہجے کی کپکپاہٹ سے ظاہر تھا کہ وہ خود بھی اس وقت خاصی جذباتی ہو رہی ہے۔

”کیسی ہوتی اور باقی سب کیسے ہیں؟“ ثوبیہ نے اپنی فطرت کے مطابق خود کو جلد سنبھال لیا اور منہ پر ہونے لہجے میں سوال کیا۔

”میں ٹھیک ہوں آپلی اور خوش ہوں کہ اس وقت ہم تینوں ایک جگہ موجود ہیں۔“ اسے بتاتے ہوئے علینہ کی آواز بھرا سی گئی تھی۔

”شکر الحمد للہ!“ ثوبیہ نے بے اختیار ہی ایک پرسکون سانس لی اور گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے بولی۔

”ہم سب تم لوگوں کے لیے بہت پریشان تھے۔ اب تمہاری آواز سن کر مجھے کیسا اطمینان حاصل ہوا ہے، میں تمہیں بتا نہیں سکتی۔“

”مجھے معلوم ہے سب، اسی لیے تو پابندی کے باوجود میں نے آپ کو کال کرنے کا ریسک لے لیا ہے۔ اب کم از کم آپ کو یہ تو اطمینان رہے گا کہ ہم سب سلامت اور محفوظ ہیں۔“

”کیسی پابندی؟ کس نے لگائی ہے یہ پابندی؟“

اس نے قدرے پریشان ہو کر علینہ سے دریافت کیا اور دزدیدہ نظروں سے اپنی کولیکٹر کو دیکھا۔ وہ اس کی طرف سے بے نیاز اپنی گفتگو میں مصروف تھیں۔

”ہے ایک بھی خواہ اور ہمدرد جس نے ہمارے لیے

ایک راہ نکالی ہے۔ بس اب اللہ سے دعا ہے کہ بھائی کو ہمارے محفوظ اور بہ خیریت ہونے کی خبر مل جائے تو وہ اپنی رہائی کے لیے آزادی سے ہاتھ پیر چلا سکیں۔“ اس بار اس کے لہجے میں واضح طور پر آنسوؤں کی آمیزش تھی۔

”اس کی کال آئی تھی۔ تم لوگوں کے بارے میں سن

کر پریشان ہو گیا تھا۔ اب دوبارہ کال کی تو اسے یہ خوشخبری سنا دوں گی۔“ ثوبیہ خود بھی حتی الامکان محتاط الفاظ میں گفتگو کر رہی تھی۔

”کیسے ہیں وہ؟ کیا انہوں نے اپنے بارے میں کچھ

بتایا؟“ علینہ سن کر ہی بے چین ہو گئی۔

”بتاتا تو نہیں لیکن مجھے لگتا ہے کہ اس کی طرف بھی حالات

میں کوئی تبدیلی آئی ہے ورنہ وہ یوں کال نہیں کر سکتا تھا۔“

مئی تھی اور واپسی بھی اسی کے ساتھ ہوئی۔ واپس آنے کے بعد میں گھر۔۔۔ باہر نہیں نکلی۔ اب آپ ہی بتائیں کہ آپ کے اس سوال کا میرے پاس کیا جواب ہو سکتا ہے؟“ اندر سے اندیشوں میں گھر جانے کے باوجود اس نے بے نیازی کا مظاہرہ کیا۔

”تم اتنی معصوم ہو نہیں جتنی بن رہی ہو۔“ جلیل یکدم ہی اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آیا اور اس کے بازو میں اپنی انگلیاں گھونپتے ہوئے طنز یہ لہجہ میں بولا۔

”آپ واضح بات کیوں نہیں کرتے؟“ اس نے آنکھوں میں آنے والی نمی کو بے مشکل ضبط کیا۔

”کل میں نے تمہیں اور سہیل کو پارک میں ایک مرد کے ساتھ دیکھا تھا۔ سہیل کی جان پہچان کا تو یہاں کوئی ہے نہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ تمہارا ہی کوئی جاننے والا تھا۔“ جلیل کی آنکھوں میں لہراتے خشک کے سائے وہ واضح طور پر دیکھ سکتی تھی۔

”وہ میرا جاننے والا نہیں تھا۔ بس اتفاقاً اس سے ٹکراؤ ہو گیا تھا۔“

”ویسے ہی جیسے ماضی میں کبھی راہ چلتے تمہارے عاشق کے پامبرٹل جایا کرتے تھے۔“ جلیل کے لہجے کے ساتھ ساتھ اس کے بازو پر انگلیوں کی گرفت مزید سخت ہو گئی تھی۔

”کیسی باتیں کر رہے ہیں جلیل؟ میں جوان ہوتی بچوں کی ماں ہوں۔ اب میری زندگی میں ان باتوں کی گنجائش کیسے ہو سکتی ہے؟“ وہ بلبلا سی گئی۔

”گنجائش تو ایک عورت کی زندگی میں اسی وقت ختم ہو جاتی ہے جب وہ کسی کے ساتھ شادی کے بندھن میں بندھ جاتی ہے لیکن میں کیسے بھول سکتا ہوں وہ بار بار کے پیغام، خاموش ٹیلی فون کالز اور جگہ جگہ کیا جانے والا تعاقب.....“ جلیل زہر خند ہوا۔

”ایسا صرف چند ماہ تک ہوا تھا لیکن آپ اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی جب موقع ملتا ہے ان باتوں کو دہرانے بیٹھ جاتے ہیں۔ خدا کے لیے چھوڑ دیں یہ باتیں۔ ہماری بچیاں جوان ہو رہی ہیں۔ اب آپ کو مجھ پر ایسے الزامات لگاتے ہوئے محتاط رہنا چاہیے۔“ اس نے گویا جلیل سے درخواست کی۔

”بہت خوب فردوس بیگم! یعنی کہ محتاط بھی مجھے رہنا چاہیے۔ تمہیں آزادی ہے کہ تم پارکوں میں اور ہوٹلوں میں جب جس سے چاہے ملتی پھرو۔“ اس کی آواز بلند ہو گئی۔

”میں کسی سے نہیں ملی۔ وہ بس ایک اتفاق تھا۔ سہیل کو

بڑی طرح چکر آرہے تھے تو ہم کچھ دیر کے لیے اس پارک میں رک گئے تھے۔ وہاں ہمیں وہ شخص ملا تھا جس نے میری درخواست پر سہیل کے لیے جوس لاکر دیا تھا اور پھر کچھ دیر اس کی طبیعت کے بارے میں پوچھنے کے لیے ہمارے ساتھ بیٹھ گیا تھا۔“ وہ سمجھ تو پہلے ہی چکی تھی کہ جلیل انہیں معاذ کے ساتھ دیکھ چکا ہے بس بہانہ تراشنے کے لیے تھوڑی سی مہلت حاصل کی تھی۔

”اللہ بہتر جانتا ہے کہ چکر کھل کو آرہے تھے یا تم مجھے چکر دینے کی کوشش کر رہی ہو۔“ جلیل نے اسے ٹھوکر کر دیکھا۔

”آپ چاہیں تو سہیل سے پوچھ سکتے ہیں۔“

”اس سے پوچھ کر اپنی ہی سبکی کروالوں۔ یہاں والوں کے دل و دماغ میں تو پہلے ہی تمہارے کردار کے حوالے سے شکوک موجود ہیں۔ اب میں اس دوسرے ملک سے آئی لڑکی کو بھی سوال جواب کر کے یہ جتا دوں کہ مجھے میری بیوی کے کردار پر بھروسہ نہیں ہے۔“ جلیل کو اس کی تجویز سخت ناگوار گزری۔

”آپ میرا بھروسہ کرنے لگیں تو کسی کی مجال نہیں کہ میری طرف انگلی اٹھا سکے لیکن آپ نے ہی کبھی مجھ پر اعتبار نہیں کیا ورنہ حقیقت تو یہی ہے کہ آپ سے شادی کے بعد میں نے کبھی کسی اور کے بارے میں نہیں سوچا۔“ ہنسی ہوئی آواز میں یہ سب کہتی وہ جانتی تھی کہ ہمیشہ کی طرح اب بھی اس کے الفاظ رانگیاں ہی جائیں گے۔

”جس عورت کا عاشق شادی کے بعد بھی اس کا تعاقب کرتا رہا ہو، اس کا شوہر مرتے دم تک اس پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔ تم میری زندگی میں ہو تو صرف اس لیے کہ مجھے ابائی کو دیے وعدے کا پاس ہے۔“ جلیل نے اس کے بازو کو ایک جھٹکا دیا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد فردوس ہارے ہوئے انداز میں دونوں ہاتھوں میں ہر تھام کر بیٹھ گئی۔ اسے برسوں سے جس جرم کی سزا دی جا رہی تھی، وہ اس سے سرزد ہی نہیں ہوا تھا۔ کہیں کوئی آپ کو دیکھے اور خود ہی آپ کے عشق میں جھٹلا ہو کر دیوانگی کا مظاہرہ کرنے لگے تو آپ کیا کر سکتے ہیں؟ وہ بھی کسی کی طوفانی محبت کے سامنے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے ہر شریف لڑکی کی طرح بس یہ کیا تھا کہ والدین کے منتخب کردہ رشتے کے لیے سر جھکا دیا تھا اور اپنے تئیں اس دیوانے کو پیچھے چھوڑ آئی تھی لیکن اس دیوانے نے یہ سمجھنے میں بہت دیر لگا دی تھی کہ وہ اس کے لیے بنی ہی نہیں تھی۔ اس کی یہ نا سمجھی فردوس کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا گئی تھی اور شادی

چودہ پندرہ برس گزرنے کے باوجود بھی وہ جلیل کی نظر میں معتبر نہیں تھی۔ صورت، سیرت، نسب اور تعلیم کسی شے میں کمی نہ ہونے کے باوجود وہ جس مقام پر آکر رہا رہی تھی اس کے لیے قسمت کو الزام دیتی یا اس دیوانے کو، اس سے بھی فیصلہ نہیں ہو سکا تھا۔

☆☆☆

”بی بی! آپ کو بڑی بی بی یاد کر رہی ہیں۔“ وہ سر ہانے سے سر کی پشت نکائے جانے کن سوچوں میں الجھی ہوئی تھی کہ پیغام لے کر آنے والی ملازمہ کی آواز نے چونکا دیا۔

”مجھے.....؟“ ہاتھ سے اپنی جانب اشارہ کرتے ہوئے قدرے حیرت سے تصدیق چاہی۔

”جی۔ انہوں نے مجھ سے کہا ہے کہ سبیل بی بی سے کہو کہ ذرا اپنے حجرے کو چھوڑ کر اپنی شکل دکھانے کی زحمت کر لیں۔“ ملازمہ نے اس کے سامنے من و عن سرین کے الفاظ دہرائے تو اہانت کے احساس سے اس کا چہرہ قدرے سرخ پڑ گیا۔

”تم چلو، میں آرہی ہوں۔“ ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے ملازمہ کو نرمی سے جواب دیا اور بستر سے بچر نیچے اتارتے ہوئے اپنے سر پر دو پٹا درست کیا۔ آج اس کی طبیعت قدرے بہتر تھی۔ دواؤں کی تبدیلی نے اثر دکھایا تھا۔ فردوس کی ہدایت پر ملازمہ شاہدہ اور فردوس کی بیٹیاں اس کا خیال رکھ رہی تھیں۔ قوت بخش غذا کی فراہمی کے ساتھ ساتھ آرام کا بھی خیال رکھا جا رہا تھا۔ ملازمہ کو تو ذمے داریوں کی وجہ سے کم موقع ملتا تھا لیکن بچیوں کی کوشش ہوتی تھی کہ اپنے فارغ اوقات میں اعظم کو زیادہ سے زیادہ اپنے ساتھ رکھیں۔ اس وقت بھی اعظم انہی کے پاس تھا۔

”السلام علیکم بھابی! آپ نے مجھے یاد کیا؟“ نسرین کے حضور پیش ہو کر اس نے دھیمی آواز میں انہیں مخاطب کیا۔ ”کیا کریں بی بی! تمہیں خود تو کوئی خیال ہی نہیں ہے اس لیے مجبوراً ہمیں ہی تمہیں یاد کرنا پڑا۔“ اس کے سلام کا جواب گول کرتے ہوئے انہوں نے طنز کا تیر چلایا لیکن نظریں ہنوز سویٹر کے اس نمونے پر تھیں جسے وہ بڑی مہارت سے بن رہی تھیں۔

”میں سمجھی نہیں بھابی!“ ان کے لب و لہجہ نے اسے کنفیوز کیا۔

”اتنی ننھی بھی نہیں ہو تم۔ خیر سے دوسری شادی ہے اور فیروزے داری کا یہ حال ہے کہ جیسے ابھی سولہ کا سن لگا ہو۔“ اس بار بھی انہوں نے سیدھا جواب دینے کے بجائے

طنز کا تیر چلایا۔ اس طنز گفتگو کی عادی نہ ہونے کے باوجود سبیل نے ضبط سے کام لیا اور خاموشی سے انہیں دیکھتی رہی۔ ”دیکھو بی بی! صاف بات یہ ہے کہ اب تم اس گھر میں مہمان نہیں ہو اس لیے تمہارا یوں رات دن بستر توڑتے رہنا جتنا نہیں ہے۔ ہمارے ہاں گھر کو محض ملازموں کے ذمے چھوڑ دینے کا رواج نہیں ہے۔ تمہیں چاہیے کہ تم خود سے اس بات کو سمجھو اور آگے بڑھ کر ذمے داریوں میں ہاتھ بٹاؤ۔“ انہوں نے تیز رفتاری سے پھندے ڈالتے ہوئے بالآخر اصل بات کہہ ڈالی۔

”آئی ایم سوری بھابی! وہ اصل میں میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو..... خیر آپ بتائیں کیا کرنا ہے؟“ وہ جانتی تھی کہ اب وہ معزز مہمان کے بجائے آن چاہی بیوہ کی حیثیت رکھتی ہے اس لیے مفاہمت کی راہ تو اختیار کرنا ہی پڑے گی۔

”شاہدہ سوئیاں بٹ رہی ہے۔ تم بھی اس کا ہاتھ بٹا دو تاکہ جلدی سے کام منٹ جائے۔“ ٹھیک کہہ رہے تھے کہ اباجی گھر واپس آنے پر اصرار کر رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے ایک آدھ ہفتے میں وہ واپس آجائیں۔ انہیں ہاتھ کی مٹی ہوئی سوئیاں بہت پسند ہیں اس لیے میں چاہ رہی ہوں کہ ان کے آنے سے پہلے پہلے سوئیاں تیار ہو جائیں۔“ انہوں نے اسے کام بتاتے ہوئے جو اطلاع دی وہ اس کے لیے خوش کن تھی۔

”جی ٹھیک ہے۔“ اس نے ان سے یہ نہیں کہا کہ جو کام اسے بتایا گیا ہے وہ سرے سے کرنا نہیں جانتی۔ وہ دھیمے مزاج کی مالک تھی اور زیادہ سے زیادہ مفاہمت سے کام لیتا چاہتی تھی اس لیے خاموشی سے ان کے حکم کو تسلیم کیا اور جا کر شاہدہ کے ساتھ شامل ہو گئی۔

”آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے بی بی! آپ کیوں یہاں آگئیں؟ آپ آرام کریں۔ یہ کام میں خود نمٹا لوں گی۔“ شاہدہ نے اسے روکنا چاہا۔ ”نہیں، اب میری طبیعت بہتر ہے۔ تم میری فکر نہ کرو اور بس مجھے بتاتی جاؤ کہ یہ کیسے کرنا ہے۔“ اس نے شاہدہ کے مقابل بیٹھتے ہوئے نرم لیکن قطعی لہجے میں کہا تو وہ مزید اسے روک نہیں سکی اور سمجھانے لگی کہ یہ کام کس طرح کیا جاتا ہے۔ شاہدہ کی راہنمائی میں سوئیاں بننے کا کام کرتے ہوئے ابھی اسے مشکل سے دس منٹ ہی گزرے تھے کہ فیصل دہاں چلا آیا۔

”ارے..... یہ کیا کر رہی ہو تم؟ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ تمہیں تو آرام کرنا چاہیے۔“ فیصل کا یہ خیال

نہیں اس نے اپنے اصرار سے۔

”جس میں کچھ خیال نہیں ہے شاہد! فردوس بھابی نے اس سے کہا تھا کہ بی بی کے آرام کا خیال رکھتا ہے اور تم نے انہیں یہاں اپنے ساتھ کام میں لگا رکھا ہے۔“ اب وہ شاہد کو غصے سے گھورتے ہوئے اسے ڈپٹ رہا تھا۔

”میں نے تو منع کیا تھا جی، پر بی بی خود ہی.....“ اس بے چاری نے منناتے ہوئے اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی لیکن فیصل کو سننے کی فرصت ہی کہاں تھی۔ اب وہ کھل کا ہاتھ تھامے اس سے پُر اصرار لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”پلو اٹھو یہاں سے۔ چل کر اپنے کمرے میں آرام کرو۔“

”پلیز فیصل..... یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟ نسرین بھابی نے مجھے یہ ذمہ داری سونپی ہے۔ میں ایسے اٹھ کر چلی گئی تو انہیں برا لگے گا۔“ وہ ایک طرف فیصل کے اس رویے پر حیران تھی تو دوسری طرف نسرین کی ناراضگی کی بھی فکر تھی۔

”بھابی سے میں خود بات کر لوں گا۔ بس اب تم بحث نہیں کرو اور چلو میرے ساتھ۔“ فیصل اپنی ضد پر اڑا رہا تو اس نے ہی ہار مان لی اور اس کے ساتھ اٹھ کر چل پڑی۔

”میں ابھی گھر آیا تھا۔ تم کمرے میں نہیں ملیں تو تمہیں ڈھونڈتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ کیا ضرورت پڑی تھی تمہیں ایک ملازمہ کے ساتھ بیٹھ کر کام کرنے کی۔“ اب وہ اس پر خفگی کا اظہار کر رہا تھا لیکن اس خفگی میں بھی حلاوت سی تھی۔

”گھر کی ساری خواتین کچھ نہ کچھ کرتی رہتی ہیں۔ اچھا نہیں لگتا کہ میں سارا سارا دن ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہوں۔“ اس کے رویے کی تبدیلی پر غور کرتے ہوئے اس نے بردباری سے جواب دیا۔

”غلط فہمی ہے تمہاری کہ ایسا کچھ ہے۔ یہاں سب کام ملازما کیس کرتی ہیں۔ بس اتنا ہے کہ یہ خواتین اپنی بوریت دور کرنے کے لیے شغل کے طور پر بھی کبھار اپنے ہاتھ پیر ہلاتی ہیں لیکن تمہیں فی الحال اس کی بھی اجازت نہیں ہے۔ پہلے پوری طرح صحت یاب ہو جاؤ پھر جو چاہے کرتی رہنا۔“ وہ اب خواب گاہ کے اندر پہنچ گئے تھے۔

”سمجھ گئی ہوتا میری بات؟“ اس نے یکدم ہی اپنا بازو پھیلا کر سہل کے گرد لپیٹتے ہوئے اس سے استفسار کیا تو وہ گنگ رہ گئی۔ یہ مہربان لہجہ، توجہ اور التفات..... سب بہت اجنبی سا تھا۔ وہ فیصل سے اس سب کی توقع نہیں رکھتی تھی۔

”مجھے معلوم ہے کہ مجھ سے تمہارے حق میں زیادتی ہوئی ہے لیکن یقین مانو میں جُرا آدمی نہیں ہوں۔ بس حالات کی اچانک تبدیلی نے مجھے الجھا کر رکھ دیا تھا اور میرا بس

چونکہ صرف تم پر ہی چل سکتا تھا تو میں اپنی جھنجھلاہٹ تم پر نکال رہا تھا لیکن اب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔“ اس نے سہل کو بازو کے گھیرے میں لیے بیڈ پر لے جا کر بٹھایا اور اپنے رویے کی وضاحتیں دینے لگا۔

”اتنی اچانک یہ احساس کیسے ہوا آپ کو؟“ اس کی اتنی باتوں کے جواب میں سہل نے سپاٹ لہجے میں ایک سوال کیا تو اس کی چلتی زبان کو ذرا سا بریک لگا پھر جھینمی ہوئی ہنسی کے ساتھ بولا۔

”کھیل بھائی سے ٹھیک ٹھاک ڈانٹ پڑی ہے یار! ان کے انداز سے تو یوں لگ رہا تھا کہ وہ میرے بھائی کے بجائے سالے صاحب ہوں۔“

”کھیل بھائی نے واقعی مجھے ایک بھائی ہونے کا احساس دلایا ہے۔ اگر ان کا یہ ہمدردانہ رویہ نہ ہوتا تو جانے ان حالات میں، میں کہاں جاتی۔“ وہ دل سے کھیل کی ممنون تھی۔

”بھائی واقعی بہت جرأت مندی سے تمہارا ساتھ دے رہے ہیں۔ اس چکر میں انہوں نے اچھے خاصے جے بجائے مشترکہ بزنس کو بھی داؤ پر لگا دیا ہے۔ باقی دوسرے بھائی زبان سے کہہ نہیں رہے لیکن ظاہر ہے انہیں اس پر اعتراض ہے۔“

”بابا سائیں مالی نقصان کا ازالہ کر دیں گے بس کسی طرح ادا سائیں کی رہائی کا انتظام ہو جائے۔ ادا سائیں کے سامنے ہمارے لیے مال و دولت کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ انہیں بچانے کے لیے بابا سائیں اپنی پوری جائداد داؤ پر لگا سکتے ہیں۔“ ٹھہرے ہوئے مزاج کی پالک ہونے کے باوجود وہ اپنے بھائی کے لیے خاصی جذباتی تھی۔

”چاچا سائیں کے رویے سے ان باتوں کی تصدیق نہیں ہوتی۔ کل انہوں نے کسی ذریعے سے کچھ رقم بھجوائی ہے لیکن وہ اتنی تھوڑی ہے کہ اسے اونٹ کے منہ میں زیرے کے برابر ہی کہا جاسکتا ہے۔ فی الحال ہم اپنے بزنس کی بات نہیں کرتے لیکن انہیں یہ تو سوچنا چاہیے کہ عالم کے معاملے کو منڈل کرنے کے لیے پانی کی طرح روپیہ بہانا ہوگا۔ ویسے ہی اس نے فرار کی کوشش میں جو کچھ کیا ہے اس سے اس کا کیس مزید بگڑ گیا ہے۔“

”کسی رکاوٹ کی وجہ سے بابا سائیں زیادہ رقم نہیں بھجوا سکے ہوں گے لیکن یہ طے ہے کہ وہ ادا سائیں کے لیے ہر ممکن قدم اٹھائیں گے۔“ اسے اپنے باپ پر بھروسہ تھا۔

”تم ایک بہن اور بیٹی کے دماغ سے سوچ رہی ہو

اس لیے ایسا کہہ رہی ہو لیکن چاچا سائیں ایک سیاست دان اور جاگیردار ہیں اس لیے وہ تمہاری طرح جذباتی انداز میں فیصلے نہیں کر سکتے۔ اس وقت انہیں عالم کے ساتھ ساتھ اپنی بھائی بھی گھر ہوگی۔ وہ حساب کتاب کر رہے ہوں گے کہ عالم کو بچانے کے کتنے فیصد امکانات ہیں۔ انہیں روز بروز بگڑتی ہوئی صورت حال کی بھی پوری خبر ہوگی اس لیے انہیں خدشہ ہوگا کہ شاید بہت کچھ خرچ کر کے بھی وہ اپنے بیٹے کو اس مشکل سے نہیں نکال پائیں۔ ایسے میں اگر وہ بیٹے کو اس حال پر چھوڑ کر اپنا روپیہ جاکد اد بچانے کا فیصلہ کر لیں تو مجھے کوئی حیرت نہیں ہوگی۔“ فیصل نے بات نہیں کی تھی، اس کے دل پر تیر مارا تھا۔

”یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟“ وہ ایک جھٹکے سے اس کے پہلو سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں وہی کہہ رہا ہوں جو حقیقت ہے، بس تم اس حقیقت کو سمجھنا نہیں چاہتیں۔“ فیصل اپنے موقف پر قائم رہا۔ ”تف ہے ایسی حقیقت پسندی پر۔ میں آپ سے زیادہ اپنے بابا سائیں کو جانتی ہوں۔ ان کے لیے اپنی اولاد دنیا کی ہر دولت سے بڑھ کر ہے۔“ وہ کوشش کے باوجود اپنے غصے کو قابو میں رکھنے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو پارہی تھی اور چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

”اگر میری بات پر یقین نہیں تو جاکد اد میں سے اپنا حصہ مانگ کر دیکھو۔ اگر انہوں نے تمہارے حصے کے مساوی کیش یہاں ٹرانسفر کر دیا تو میں مان جاؤں گا کہ تمہارے بابا سائیں کو اپنی اولاد مال و دولت سے بڑھ کر پیاری ہے۔“ اس نے گویا جمل کو چیلنج دیا۔

”مجھے یہ سب کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں پہلے ہی آپ کو بتا چکی ہوں کہ یہ سارے معاملات نمٹنے کے بعد میں پاکستان واپس چلی جاؤں گی اور ہمارے درمیان موجود یہ نام نہاد کاغذی رشتہ بھی ختم ہو جائے گا پھر آپ اپنی مرضی سے شادی کر کے سویرا کو اپنی زندگی میں شامل کر لیجیے گا۔“ کسی چیلنج کو قبول کرنے کے بجائے اس نے فیصل کو دو ٹوک لہجے میں جواب دیا تو لہجوں میں اس کی شخصیت پر چڑھا طبع اتر گیا اور وہ نہایت طیش کے عالم میں اس پر جھپٹا۔ ”طلاق کی بات کرتی ہے سالی! کون سا یار چھوڑ کر آئی ہے پاکستان میں جس کی خاطر واپس جانے کے لیے پھر پھڑا رہی ہے؟“ اس نے نکل کی چٹا کو اپنی مضبوط گرفت میں جکڑ لیا تھا اور اس کے سر کو بری طرح جھٹکے دیتے ہوئے تمہارے لہجے میں الزام لگا رہا تھا۔

”شادی سے پہلے غیر لڑکوں سے یارانے لگانے اور انہیں اپنے قابو میں رکھنے کا کام تمہاری سویرا جیسی لڑکیاں کرتی ہوں گی۔ میں صداقت شاہ کی بیٹی ہوں اور صداقت شاہ کی بیٹیاں بے حیا نہیں ہیں۔“ فیصل کے عائد کردہ الزام نے اسے بھی طیش دلادیا اور خلاف عادت وہ بہت کچھ کہہ گئی۔

”زبان چلاتی ہے مجھ سے۔ بکواس کرتی ہے۔ تیری جیسی سستی سادگری کی تو ایسی کی تھیں۔“ اس نے صرف زبان سے نہیں کہا، عملاً بھی لہجوں میں اس کی ایسی کی تھیں کر کے رکھ دی۔ تھپڑ، لاتیں، گھونسنے..... وہ تشدد کا ہر حربہ اتنی تیزی سے اس پر آزمایا تھا کہ اسے اپنا بچاؤ کرنے کا بھی موقع نہیں مل رہا تھا۔ شور شرابا سن کر جب تک دوسرے لوگ وہاں پہنچے، وہ اسے مار مار کر نیلا پیلا کر چکا تھا۔

”تیری جیسی اڈیل گھوڑی کو لگام ڈالنا خوب آتا ہے مجھے۔ دودن میں تیر کی طرح سیدھا نہ کر دیا تو میرا نام فیصل نہیں ہے۔“ گھر والے بہ مشکل اسے قابو کر کے کمرے سے باہر نکھینٹ کر لے جانے لگے تو وہ جاتے جاتے دھمکی دینا نہ بھولا۔ ”بھل!“ فردوس جو سب کے ساتھ باہر نکلنے کے بجائے وہیں کھڑی رہ گئی تھی، گھنٹوں کے بل نیچے پڑی بھل کے قریب بیٹھی اور اسے پکارا۔ جواب میں اس کے منہ سے فقط ایک آہ ہی نکل سکی۔

”درندے۔“ فردوس زیر لب بڑبڑاتی اور اس کے بکھرے ہوئے وجود کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کوشش کے دوران اس کی آنکھوں سے خود بخود آنسو ٹپکتے چلے جا رہے تھے۔ اس وقت اس کے سامنے صرف بھل کا بکھرا ہوا وجود ہی موجود نہیں تھا، وہ اس میں فردوس کا عکس بھی دیکھ رہی تھی۔ ایسا عکس جسے اس نے خود ہی کرچی کرچی کر کے سمیٹا تھا اور اب بڑے حوصلے سے جیسے چلی جا رہی تھی۔

☆☆☆

”پولیس دین پر حملہ کر کے.... پر و فائل قیدیوں کو چھڑانے کی کوشش کرنے والے آئینک وادیوں کے بارے میں آنکھیں کھول دینے والی جانکاری..... حملہ آوروں کے ایک مدرسے کے طالب علم ہونے کے ثبوت.....

مدرسے کا معلم بھی اپنے پر یوار سمیت ہلاک..... معلم اور اس کے پر یوار کی موت سوال بن گئی.....“ ایک تو وہ دشنا والے حادثے کے بعد جھنجھلا ہوا تھا، دوسرے ہر روز منظر عام پر آنے والی نئی خبر مزید ذہنی کوفت کا سبب بن جاتی تھی۔ دشنا اور اس کی ساتھی لڑکی پیش آنے والے

پر کارروائیاں کروا تا رہا۔“

ایسے انکشافات کیے جا رہے تھے کہ دماغ محمو کر رہ گیا تھا۔ اگر سونیا..... اعجاز، عباس اور سلیم درانی کی رہائی والا معاملہ اس کے سامنے نہ رکھ چکی ہوتی تو ایک بار اس کے دل میں بھی شک آ جاتا کہ شاید اس کارروائی کے پیچھے سچ سچ پاکستان ہے۔ باور تو سونیا نے بھی اسے یہی کروایا تھا کہ یہ کام پاکستان کی خواہش پر کیا جانے والا ہے لیکن اس کا دل نہیں مانتا تھا۔ اسے سرحدی گاؤں سندرنگر میں بم کی مدد سے نہر پر موجود پل اڑانے جانے کا واقعہ نہیں بھولا تھا۔ اس بم بلاسٹ کے بارے میں بھی سونیا کا دعویٰ تھا کہ وہ اسلحے سے بھری فوجی گاڑی کو اڑانے کے لیے کیا جا رہا ہے لیکن ہوا یہ تھا کہ براتیوں سے بھری بس اڑ گئی تھی اور بعد میں نہر سے ایسے کئی ثبوت حاصل کر لیے گئے تھے جو سیدھے پاکستان کے ملوث ہونے کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ اس وقت وہ نہیں سمجھا تھا لیکن بعد میں یہ حقیقت اس کے سامنے آ گئی تھی کہ وہ ثبوت سونیا نے جان بوجھ کر وہاں چھوڑے تھے اور وجہ صرف ایک تھی..... پاکستان پر دہشت گردی کے الزامات عائد کرنا۔

اسے آج بھی سندرنگر میں اپنی میزبانی کا فریضہ انجام دینے والے سیدھے سادے میاں بیوی رشید آرا میں اور مختار بی بی نہیں بھولے تھے۔ بم بلاسٹ والی رات اتفاق سے شہر سے گاؤں آنے والے رشید آرا میں کے بیٹے یوسف کو سونیا نے نہر پر بے دردی سے قتل کر ڈالا تھا۔ وہ جب بھی یہ سوچتا تھا کہ اکلوتے بیٹے کی موت پر، آنکھوں میں ڈھیروں خواب سجائے بیٹھے رشید آرا میں اور مختار بی بی پر کیا گزری ہوگی، اس کی روح کانپ جاتی تھی لیکن سونیا اور اس کے ساتھی جانے کیسے پتھر دل لوگ تھے کہ انسانوں کو برباد کر کے بھی انہیں کچھ نہیں ہوتا تھا۔ اب بھی تباہی و بربادی کی ایک داستان اس کے سامنے تھی اور اس واقعے میں بھی متعدد لوگ مارے گئے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ایک بار پھر اس کے وطن کا نام رسوا کیا جا رہا تھا۔ اس پر ایسے الزامات عائد کیے جا رہے تھے جو عالمی برادری میں اسے سراٹھا کر کھڑا نہ ہونے دیں۔ عالمی سیاست میں پاکستان کی تنہائی کو بڑھانے کی سازش در سازش تھی جس میں سونیا اینڈ مینی اسے یقیناً اس وقت تک شامل رکھتی جب تک وہ ان کے لیے کارآمد رہتا۔ پکڑے جانے یا مارے جانے کی صورت میں پاکستانی دہشت گرد کاٹھپتا اس کے لیے موجود تھا۔

”تیرا شکر ہے میرے رب کہ کسی بھی طرح سہی،

حادثے میں زخمہ نہیں بخ سکے تھے۔ وشنا تو موقع پر ہی ہلاک ہو گیا تھا جبکہ لڑکی شدید زخمی حالت میں اسپتال پہنچائے جانے کے دو گھنٹوں بعد مری گئی۔ وشنا کی موت نے اس پر عالم تک پہنچنے کا راستہ بند کر دیا تھا۔ اس نے تو یہی سوچا تھا کہ وشنا کو چھاپ کر اس سے عالم کے متعلق معلومات حاصل کرے گا اور پھر اس کی رہائی کے لیے کوئی منصوبہ تشکیل دے گا لیکن اس نے حادثاتی موت مر کر اس کا سارا منصوبہ ہی ٹھپ کر دیا تھا۔ ادھر بھارتی میڈیا کا یہ حال تھا کہ کسی کو چھینک بھی آ جائے تو بس نہیں چلتا تھا کہ اس کا الزام پاکستان کے سر دھر دے۔ اب بھی یہی تماشہ جاری تھا۔

”ایک بار پھر ہونے والی دہشت گردی کے سرے پاکستان سے جا ملے۔ مدرسے کے معلم اور اس کی چینی کی عجب ویڈیو سامنے آ گئی.....“

وہ جتنا بھی جھنجھایا ہوا تھا، توجہ بہر حال ٹی وی پر چلتی خبروں کی طرف ہی تھی جہاں سنسنی خیز لہجے میں جانے کون سا نیا انکشاف کیا جانے والا تھا۔

”سریہ عمامہ پہننے اور حجاب میں خود کو چھپائے رکھنے والی معلم کی چینی کی ایک ریسٹورنٹ سے ملنے والی فوٹیج نے عقل دنگ کر دی۔ دونوں ہتھی چینی ہندو کپل کے بہروپ میں ایک دوسرے کپل کے ساتھ دعوت اڑاتے رہے.....“

خبر کے ساتھ ہی ٹی وی کی اسکرین پر دو تصویریں بھی دکھائی جا رہی تھیں۔ ایک تصویر میں عمامہ پوش مرد کے ساتھ حجاب سے سراور چہرے کا بیشتر حصہ چھپائے ایک عورت دکھائی دے رہی تھی جبکہ دوسری تصویر ایسے زاویے سے لی گئی تھی کہ ایک جوڑے کی شکل و صورت واضح نہیں تھی لیکن دوسرے جوڑے کو بہ خوبی دیکھا جاسکتا تھا۔ بدلے ہوئے چلیے کے باوجود شناخت کیا جاسکتا تھا کہ ماڈرن ہندو مرد کے روپ میں عمامہ پوش معلم ہی موجود ہے۔ عورت کے بارے میں البتہ کوئی حتمی رائے دینا اس لیے مشکل تھا کہ پہلی تصویر میں موجود عورت کا چہرہ حجاب میں چھپا ہونے کے باعث میچ نہیں کیا جاسکتا تھا۔

”معلم عجیب کے پاکستان کے ساتھ گہرے روابط کے ثبوت۔ عجیب پچھلے دس سالوں میں رشتے داروں سے ملنے کے بہانے کئی بار پاکستان گیا۔ شک ہے کہ ان دوروں کا کارن کوئی اور تھا۔ عجیب وہاں رشتے داروں سے ملنے نہیں بلکہ اپنے سرپرستوں سے ملنے اور دہشت گردی کی ٹریننگ لینے جاتا رہا تھا۔ یہی ٹریننگ اس نے واہس آکر مدرسے میں پڑھنے والے لڑکوں کو دی اور ان سے بھارت کی دھرتی

تو نے مجھے ان نکالوں کے قبضے سے نکال لیا۔ میرے لیے وہ حساب پیدا کر میرے مالک کہ میں اپنے جیسے مظلوموں کی مدد کر سکوں۔ بہت کچھ واضح ہو جانے پر اس نے تیر دل سے اپنے رب کے حضور دعا کی اور ریوٹ کی مدد سے ٹی وی بند کر دیا۔ وہاں اس کے وطن کے متعلق جیسی زبان استعمال کی جا رہی تھی، اسے برداشت کرنا اس کے بس سے باہر تھا۔

☆☆☆

”بھائی سے پھر دوبارہ رابطہ ہوا ثوبیہ آپی؟“ علیہ نے اگرچہ پہلا فون اس نیت سے کیا تھا کہ ایک بار چھو کی فیملی کو اپنی، سعد اور ابو کی خیریت کی طرف سے مطمئن کرنے کے بعد دوبارہ کوئی رابطہ نہیں کرے گی لیکن ثوبیہ کی زبانی معاذ کی کال کاسن کر اس کے دل کو بے چینی سی لگ گئی تھی اور اس بے چینی ہی نے اس سے یہ دوسری کال کروائی تھی۔

”نہیں۔ دوبارہ اس کا کوئی فون نہیں آیا۔ اس نے تمہاری دوست انیم کے بھانے ایک بار مجھ سے اور ایک بار امی سے بات کی تھی، اس کے بعد کوئی رابطہ نہیں ہے۔ شاید وہ محتاط ہوگا کہ کسی کو شک نہ ہو جائے۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ ہمارے سارے نمبرز آرزویشن پر ہیں۔ ان حالات میں اس کا زیادہ سے زیادہ احتیاط کرنا ہی بہتر ہے۔“ آج ڈاکٹر زروم میں اس کے سوا کوئی اور نہیں تھا اس لیے وہ نسبتاً کھل کر بات کر رہی تھی لیکن معاذ کا نام بہر حال گفتگو میں نہیں آنے دیا تھا۔

”ہاں، انہیں تو میری طرح اسپتال کے نمبر پر آپ سے بات کرنے کا خیال بھی نہیں آیا ہوگا۔“ علیہ اس کا جواب سن کر اداس ہو گئی۔ جب سے اپنی زندگی میں سکون آیا تھا، دل اور بھی شدت سے معاذ کو اپنے ساتھ دیکھنے کے لیے تڑپنے لگا تھا۔ امی نہیں رہی تھیں لیکن اس کا بھائی زندہ تھا اور وہ جانتی تھی کہ جب تک بھائی ساتھ نہیں ہوگا، کوئی خوشی مکمل نہیں ہوگی۔

”اسے کیسے خیال آسکتا ہے؟ تم تو ہمارے ساتھ رہی ہو اور کسی نہ کسی وجہ سے اس نمبر پر مجھ سے رابطہ کرتی رہی ہو اس لیے نمبر تمہارے ذہن میں رہ گیا ہوگا لیکن وہ بیچارہ.....“ ثوبیہ نے اپنا جملہ ادھر اچھوڑ دیا۔

”اب بھی وہ آپ سے رابطہ کریں تو انہیں اس نمبر پر بات کرنے کا اشارہ دے دیجیے گا تا کہ کچھ تو کھل کر بات ہو اور ہمیں ان کے صحیح حالات کا علم ہو سکے۔“ علیہ نے اسے مشورہ دیا۔

”پتا نہیں یہ نمبر بھی کتنا محفوظ ہے؟ جس طرح کے

حالات دیکھنے پڑے ہیں اس کے بعد تو اپنے سائے سے بھی ڈر لگنے لگا ہے۔“ ثوبیہ کے الفاظ پر علیہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ لالہ عیسیٰ نے پاکستان سے روانہ کرتے ہوئے اسے ہر طرح سے محتاط رہنے کی نصیحت کی تھی اس کے باوجود اس نے اس نمبر کو محفوظ سمجھتے ہوئے ثوبیہ سے رابطہ کر لیا تھا اور اپنی اس حرکت کے بارے میں وہی کو بھی کچھ نہیں بتایا تھا۔

”اچھا چھوڑو ان خوفناک باتوں کو اور یہ بتاؤ کہ تم اور باقی سب کیسے ہیں؟ تم نے مجھے کچھ بتایا تو نہیں لیکن نہ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ تمہاری زندگی میں کوئی بہت بڑی تبدیلی وقوع پذیر ہو چکی ہے۔“ علیہ کی خاموشی کو محسوس کر کے اس نے خود ہی موضوع گفتگو تبدیل کر دیا اور اس سے اپنا وہ احساس شیئر کیا جو پہلی کال میں بھی اس نے محسوس کیا تھا۔

”آپ کا اندازہ بالکل درست ہے آپی! اب میں وہ پہلے والی لڑکی نہیں رہی۔ میں کسی کی بیوی بن چکی ہوں۔“ ”کیا واقعی.....؟“ علیہ کا انکشاف اس کے لیے بہت بڑا جھٹکا تھا۔

”اتنی بڑی بات میں مذاق میں تو نہیں کہہ سکتی؟“ دیے بھی زندگی نے ہمارے ساتھ اتنا بڑا مذاق کیا ہے کہ اب خود کسی مذاق کی ہمت ہی نہیں ہوتی۔“ وہ اداس ہوئی۔ ”لیکن ابھی تو تم بہت چھوٹی ہو۔ تمہاری ایجوکیشن بھی ان کپلیٹ ہے۔“ اسے علیہ کی اتنی کم عمری میں شادی ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

”حالات انسان کو وقت سے پہلے بڑا کر دیتے ہیں۔ میں نے بھی حالات کے تحت اس فیصلے کو قبول کر لیا۔“ علیہ نے سنجیدگی سے اس کے اعتراضات کا جواب دیا۔ ”کون ہے وہ؟ کیا ہے؟ تمہیں پسند تو ہے؟“ تم خوش ہو اس کے ساتھ؟“ ثوبیہ نے ایک ساتھ ہی کئی سوالات کر ڈالے۔

”وقت آنے پر اس سے آپ کی ملاقات کرواؤں گی۔ فی الحال تو یہی بتا سکتی ہوں کہ گڈ لکنگ اور کیئرنگ ہے۔ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے اور میرے پیاروں کے لیے میرے ساتھ مل کر فکر مند رہتا ہے۔“

”گڈ..... یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ سن کر مجھے اطمینان ہو گیا کہ تم نے قبل از وقت سہی لیکن ایک بہترین شخص کو اپنی زندگی کا ساتھی چنا۔“

”میں نے اسے نہیں چنا۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ اس نے مجھے چن لیا۔“ علیہ نے پوری سچائی سے اعتراف کیا۔

کے لیے ہاتھ پیر چلا سکیں۔“ وضاحتیں پیش کرتے ہوئے اسے احساس نہیں تھا کہ وہ کیا کچھ بتاتی چلی جا رہی ہے لیکن وقاص اس کے الفاظ پر چونک گیا تھا۔

”کیا مطلب؟ یعنی یہ تمہارا پاکستان میں پہلا رابطہ نہیں تھا۔ تم اس سے پہلے بھی وہاں کال کر چکی ہو؟“ پریشانی میں وقاص کی آواز معمول سے بلند ہو گئی تو وہ کہہ سکتا زدہ سی اسے دیکھتی چلی گئی۔ پچھلا کال ریکارڈ صاف کر کے اس نے اپنی جس پہلی غلطی کو چھپا لیا تھا، وہ بھی روانی میں عیاں کر بیٹھی تھی۔ آج بھی اس کا ایسا ہی کچھ ارادہ تھا لیکن ایک تو گفتگو کچھ طویل ہو گئی تھی، دوسرے وہ دونوں اس کی توقع کے برخلاف اپنا میچ جلدی ختم کر کے آگئے تھے۔

”وکی کے سوال کا جواب دو علیینہ! تم تو ہمارے لیے آپیشل ڈیزتار کرنے کا کہہ کر اندر آئی تھیں پھر بیچ میں یہ فون کال کیسے آگئی؟“ سعد بھی اس صورت حال پر پریشان سا ہو گیا تھا۔

”آئی ایم سوری۔ میں جذبات میں حماقت کر بیٹھی۔“ اب بھلائی اسی میں تھی کہ وہ سچ بول دیتی چنانچہ اگلے چند منٹوں میں اس نے ساری تفصیل کہہ سنائی۔

”یہ تم نے بہت بڑی حماقت کر دی علیینہ! یہ لالہ کا سب سے محفوظ ٹھکانا تھا جس کا اب تک مجھے بھی علم نہیں تھا۔ انہوں نے یہ ٹھکانا اس لیے بنایا تھا کہ جب کبھی ریٹائرمنٹ کا موڈ ہوا تو یہاں آکر ساری دنیا کی نظروں سے اوجھل ہو جائیں گے۔ تم نے اپنی اس حرکت سے اپنے ساتھ ساتھ ان کا بھی بہت بڑا نقصان کر دیا۔“ اس نے اپنا غصہ دبا لیا تھا لیکن افسوس کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

”ریلیکس وکی! ضروری تو نہیں ہے کہ یہ کال ٹریس ہو جائے۔ وہاں اسپتال کے نمبر پر دن میں پتا نہیں سننے کا لازمی ہوں گی۔ اس کال پر بھلا کون توجہ دے گا۔“ سعد، علیینہ کی حماقت کو کور کرنے کے لیے فی الحال یہی کر سکتا تھا کہ وقاص کو تسلی دے کر ٹھنڈا رکھنے کی کوشش کرے۔ ظاہری طور پر اس کا علیینہ سے جتنا بھی جھگڑا ہوتا تھا لیکن سقیقت یہی تھی کہ اسے اپنی یہ چھوٹی بہن بہت عزیز تھی اور اب تو وہ لاشعوری طور پر اسے معاذ کے حصے کی محبت بھی دینے کی کوشش کرتا تھا۔

”یہ معمولی مسئلہ نہیں ہے سعد کہ میں مفروضات پر مطمئن ہو کر بیٹھ جاؤں۔ لالہ نے مجھے خاص طور پر حد سے زیادہ محتاط رہنے کی نصیحت کی تھی اور لالہ کی طرف سے اتنی سخت ہدایات کا مطلب ہے کہ مقابلہ ہماری سوچ سے بھی زیادہ کائیاں ہے۔ تم نے دیکھا نہیں تھا کہ انہوں نے ہمیں ملک سے

”اوہو اب تو اور بھی زیادہ شدت سے ان موصوف سے ملاقات کی خواہش ہو رہی ہے۔ ہم بھی دیکھیں کہ کون ہے وہ شہزادہ گلغام جسے پاکر ہماری پیاری کزن خود کو خوش قسمت سمجھنے لگی ہے۔“ ثوبیہ نے اسے چھیڑا تو اس کے رخسار سرخ پڑ گئے۔ اسی وقت آہٹ پا کر اس نے مڑ کر دیکھا۔ وقاص ہاتھ میں ریکٹ پکڑے اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس کے پیچھے ہی سعد بھی تھا۔ اس نے غلت میں ثوبیہ سے کچھ بھی کہے بغیر کال منقطع کر دی۔

”بڑے طرم خان بن رہے تھے تمہارے شوہر موصوف۔ وہ بگنی کا ناچ بچایا ہے کہ میدان چھوڑ کر بھاگ آنے پر مجبور ہو گئے ہیں جناب۔“ ہاتھ میں موجود ریکٹ کو گھماتا سعد اپنی کامیابی پر بہت مسرور تھا اس لیے نہ تو اس نے علیینہ کا ریسپور رکھنا دیکھا تھا، نہ ہی اس کی یکدم فح ہو جانے والی رنگت پر غور کر سکا تھا۔

”کس سے بات کر رہی تھیں تم؟“ وکی نے نہ صرف یہ دونوں باتیں نوٹ کی تھیں بلکہ بہت تیزی سے فون سیٹ کے قریب آکر اسے چیک بھی کرنے لگا تھا۔

”اوہ مائی گاڈ! پاکستان اتنی لمبی کال.....“ اس کی تو جیسے اوپر کی سانس اور پر اور نیچے کی نیچے ہی رہ گئی تھی۔ اس کے ان الفاظ نے سعد کو بھی چونکایا اور وہ بھی سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”میں نے ثوبیہ آپ کی کال کی تھی۔ میں انہیں اپنی خیریت سے آگاہ کرنا چاہتی تھی لیکن آپ لوگ فکر نہ کریں۔ میں نے انہیں گھر پر یا ان کے موبائل پر کال نہیں کی تھی۔ میں نے اسپتال کے نمبر پر ان سے رابطہ کیا تھا۔ اس کال پر ہم نے مجھ سمیت کسی بھی فرد کا نام تک نہیں لیا۔“ اسے خود بھی احساس تھا کہ اس نے ایک ایسا کام کیا ہے جس سے اسے سختی سے منع کیا گیا تھا اس لیے تیز تیز بولتی اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”یہ صرف خیر خیریت سے آگاہ کرنے والی کال نہیں ہے علیینہ! تم نے کئی منٹ طویل کال کی ہے اور یہ کال ہمارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔“ وکی پورا کال ریکارڈ چیک کر چکا تھا اس لیے خاصا پریشان تھا۔

”بس بات سے بات نکلی تو بڑھتی چلی گئی۔ اصل میں ثوبیہ آپ نے بھائی کی کال کے متعلق بتایا تھا تو میں ان سے پوچھ رہی تھی کہ انہوں نے دوبارہ بھی کال کی ہے یا نہیں۔ میری خواہش تھی کہ ثوبیہ آپ کی ذریعے انہیں ہم سب کے بہ خیریت ہونے کی اطلاع مل گئی ہوتا کہ وہ خود اپنی آزادی

باہر نکالنے کے لیے بھی کتنے واؤچ استعمال کیے تھے۔ مقصد صرف ایک ہی تھا کہ ڈھونڈنے والے ہمارے نقش پا دیکھتے ہوئے یہاں تک نہ چلے آئیں اور اب وہ ساری محنت ضائع ہو چکی ہے۔“ وہ اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام کر بیٹھ گیا۔

”آئی ایم سوری! ریلی سوری! مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میں اتنی بڑی حماقت کر رہی ہوں۔“ وقاص کے تاثرات نے اس کی شرمندگی میں خوف کو بھی شامل کر دیا اور وہ پوری شدت سے رونے لگی۔

”جو ہوتا تھا وہ تو ہو گیا۔ اب سوچنا ہے کہ آگے کیا کریں؟“ علینہ کے برابر میں بیٹھ کر اس کے شانے پر تسلی دینے والے انداز میں بازو پھیلاتے ہوئے سعد، وقاص سے مخاطب ہوا۔

”لالہ سے بات کرنا پڑے گی۔ میرا نہیں خیال کہ یہ ٹھکانا ہمارے لیے محفوظ رہ گیا ہے۔ ہمیں یہاں سے کہیں اور شفٹ ہونا پڑے گا۔“ اس کی فکر مندی ختم نہیں ہو رہی تھی اور وجہ صرف ایک تھی کہ جن لوگوں سے لالہ عیسیٰ اس قدر محتاط تھا، ان کی خطرناکی میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا تھا۔

”کاش تم مجھ سے بات کر کے یہ کال کرتیں تو میں کسی محفوظ ذریعے سے تمہاری بات کروا دیتا۔“ پریشانی میں وہ علینہ کوٹو کے بغیر نہیں رہ سکا۔

”اب تو غلطی ہو گئی یار! اپنی نا سمجھی کی وجہ سے بیچاری نادانستگی میں یہ سب کر بیٹھی۔ اب تم اسے کچھ نہ کہو ورنہ یہ ایسے ہی رورور کر اپنی جان پر بنا لے گی۔“ سعد کو اس وقت ہر صورت میں بہن کو ہی سپورٹ کرنا تھا اور وہ کر رہا تھا۔

”میں کون سا اس پر چیخ چلا رہا ہوں۔ میں تو بس اپنے افسوس کا اظہار کر رہا ہوں۔“ وہ تھوڑا سا جھنجھلا کر بولا لیکن جوں ہی نظریں علینہ کے رونے کی وجہ سے گلابی ہو جانے والی آنکھوں پر پڑیں، وہ ٹھنڈا پڑ گیا۔

”میں سنبھال لوں گا سب۔ تم منہ دھو کر اپنا حلیہ درست کرو اور کچن دیکھو۔ انکل مغرب پڑھ کر اپنے کمرے سے باہر نکلنے ہی والے ہوں گے۔ تمہاری یہ روتی ہوئی صورت دیکھیں گے تو پریشان ہو جائیں گے۔“ نرم لہجے میں اس سے مخاطب ہو کر وہ اسے تو پُر سکون کر رہا تھا لیکن خود جیسے انکاروں پر کھڑا تھا۔

☆☆☆

”فیصل نے سبکل کے ساتھ بہت برا سلوک کیا ہے۔ پہلے ہی سر پر لگنے والی چوٹ کی وجہ سے اس کی حالت ٹھیک نہیں تھی، اب اس نئی مار پیٹ کے بعد وہ بالکل ہی نڈھال

ہو کر رہ گئی ہے۔ میں اسے چیک اپ کے لیے اسپتال لے جانا چاہتی تھی لیکن اس کی بھی فیصل نے اجازت نہیں دی۔ آپ اسے سمجھائیں کہ وہ ایسا نہ کرے۔“ سبکل کی ہجر حالت کی وجہ سے فردوس بہت اب سیٹ تھی اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی اس وقت جلیل سے مدد کی خواستگار ہوئی تھی۔

”میں کیا کہہ سکتا ہوں بھئی، سبکل اس کی بیوی ہے اور وہ اپنی بیوی پر کوئی بھی پابندی عائد کرنے کے لیے آزاد ہے۔“ موبائل کی اسکرین پر سے نظریں ہٹائے بغیر جلیل نے اس کی بات کا بے نیازی سے جواب دیا۔

”پلیز جلیل! وہ بالکل بھی ٹھیک نہیں ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ سر پر لگنے والی چوٹ کی کوئی سیریس پرابلم نہ بن جائے۔ آپ یقین کریں اسے چیک اپ کے لیے اسپتال لے جانا بہت ضروری ہے۔“ اس کی بے نیازی کے باوجود فردوس اپنے موقف سے پیچھے نہیں ہٹی اور مزید اصرار کیا۔

”تو تم ہونا ڈاکٹر۔ تم علاج کر دو اس کا۔“ وہاں اب بھی وہی عالم تھا۔

”میں جو کر سکتی ہوں، وہ کر رہی ہوں لیکن اسے فائدہ نہیں ہو رہا۔ اسے کسی اچھے نیورولوجسٹ اور سی ٹی اسکین وغیرہ کی ضرورت ہے اور اس سب کے لیے اسے اسپتال لے جانا ضروری ہے۔“

”اسے شکیل بھائی کے علاوہ مشکل سے ہی کسی کی بات سمجھ آتی ہے اور ان دنوں تو اس کا موڈ بھی بہت خراب ہے۔ ایسے میں اس سے کوئی بات کروں گا تو میری بات ہی خالی جائے گی اور یہ مجھے بالکل اچھا نہیں لگے گا۔“ جلیل نے ایک بار پھر پہلو جچی کی۔

”موڈ کی بھی آپ نے خوب کہی۔ شادی کو جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے نہیں اور لاٹ صاحب چلے ہیں بیوی کا اس کے باپ کی جائداد میں سے حصہ مانگتے۔ بھئی اس کا حصہ ہے، وہ جب چاہے لے یا نہ لے۔ فیصل کون ہوتا ہے ایسا مطالبہ کرنے والا۔ ایک تو بے شری سے مطالبہ کیا اور نہ ماننے پر بیوی کی ٹھکانی بھی لگا دی۔ کون سا غیرت مند مرد ایسی گری ہوئی حرکت کرتا ہے بھلا؟“ سارے ہنگامے کی وجوہات اس کے سامنے آچکی تھیں اس لیے فیصل کے لیے اس کے دل میں خاصی بدگمانی تھی۔

”اس نے سبکل کے انکار کی وجہ سے اس پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ ہاتھ اٹھانے کی وجہ اس کی طرف سے طلاق کا مطالبہ بنا۔ کوئی غیور مرد ایسے مطالبے کو برداشت نہیں کر سکتا۔“ اس نے اپنے بھائی کی حمایت کی۔

”بچیاں.....!“ جلیل نے اپنی مٹھیاں بھینچیں۔
 ”بس یہی زنجیر تو پڑ گئی تھی میرے پیروں میں کہ میں
 تم جیسی عورت سے اپنی جان نہیں چھڑا سکا۔“
 ”پلیز بند کر دیں ایسی باتیں۔ آپ جانتے ہیں کہ
 میں بدکردار نہیں ہوں۔“ اس بار فردوس کا ضبط بھی جواب
 دے گیا اور وہ بلند آواز میں چیخی۔
 ”آواز نیچی رکھو، ورنہ تم جانتی ہو کہ میں بھی فیصل ہی
 کا بھائی ہوں۔“ اس نے فردوس کے جڑوں کو اٹھکیوں اور
 انگوٹھے کی مدد سے بری طرح بھیجتے ہوئے اسے دمھکی دی تو
 وہ محض ایک سسکاری لے کر رہ گئی۔ بظاہر آزاد اور خود مختار
 عورت ہو کر بھی وہ خود کو اس ذہنی اور جسمانی تشدد سے کبھی
 محفوظ نہیں رکھ سکتی تھی۔

☆☆☆

وہ جلے پیر کی ملی کی طرح کمرے میں ادھر سے ادھر
 چکر لگا رہا تھا۔ شاہدہ سے ہونے والی تازہ ٹیلی فونک گفتگو
 کے بعد اس کی یہ حالت ہوئی تھی۔ شاہدہ نے اسے بتایا تھا
 کہ فیصل نے جیل کو کیوں اور کس قدر تشدد کا نشانہ بنایا تھا اور
 اب وہ عملاً اپنے سسرال میں قیدی کی حیثیت اختیار کر گئی
 تھی۔ شاہدہ کے مطابق ڈاکٹر فردوس کی کوشش کے باوجود
 اسے اسپتال تک جانے کی بھی اجازت نہیں دی جا رہی تھی
 حالانکہ اس کی طبیعت بالکل ٹھیک نہیں تھی اور ظاہر ہے یہ
 ساری خبریں سن کر وہ غصے سے کھول رہا تھا۔
 ”میں جیل کو اس درندے کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ
 سکتا۔ ہمیں اسے وہاں سے نکالنا ہوگا۔“ جلیل نے دہرایا اور
 ایک طرف سکون سے کھڑے کالے خان کی طرف دیکھتے
 ہوئے اپنے عزم کا اظہار کیا۔
 ”اس کے لیے خاتون کی رضامندی ضروری ہے اور
 آپ مجھے بتا چکے ہیں کہ اس کے لیے خاتون پہلے ہی انکار
 کر چکی ہیں۔“ کالے خان نے اسے حقیقت کا احساس دلایا۔
 ”تو پھر..... پھر کیا کریں اس مسئلے کے حل کے لیے؟“
 وہ سامنے رہی تو وہ جاہل انسان اپنے ناجائز مطالبات منوانے
 کے لیے اسی طرح اس پر دباؤ ڈالتا رہے گا اور انکار کی صورت
 میں تشدد کا نشانہ بنائے گا۔“ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ فیصل
 سامنے آجائے تو اس کی گردن ہی مروڑ کر رکھ دے۔
 ”آپ ڈاکٹر فردوس سے بات کر کے ان سے کہیں
 کہ وہ گھر کے کسی ایسے فرد کے ذریعے جس کی بات فیصل ماننا
 ہو، اسے سمجھانے بجھانے کی کوشش کریں۔“ کالے خان
 نے مشورہ دیا۔

”اس میں غیرت کی بات کہاں سے آگئی۔ سب جانتی
 ہے کہ فیصل، سویرا کو پسند کرتا ہے اور اس کی فیصل سے شادی
 محض ایک مجبوری ہے۔ ایسے میں اگر اس نے کہہ دیا کہ
 معاملات نمٹنے کے بعد وہ یہ مجبوری کا رشتہ ختم کر کے پاکستان
 چلی جائے گی تاکہ فیصل، سویرا سے دوبارہ رشتہ جوڑنے کے
 لیے آزاد ہو تو اس میں غلط کیا ہے؟ اچھا ہی ہے تاکہ فیصل کو
 ایک بار پھر اپنی پسند حاصل کرنے کا موقع مل جائے گا۔“ وہ
 انہیں حالات کا مثبت رخ دکھا رہی تھی۔

”غلط یہ ہے کہ عورت کی طرف سے طلاق مانگی
 جا رہی ہے اور طلاق وہی عورت مانگتی ہے جو پیچھے کوئی یار
 چھوڑ کر آئی ہو۔“

”خدا کے غضب سے ڈریں جلیل! آپ اس معصوم
 اور تنہا لڑکی پر بہتان لگا رہے ہیں۔ آپ کو معلوم نہیں ہے کیا
 کہ اس نے چند ماہ پہلے ہی بیوگی کا غم سہا ہے اور اس غم کے
 ہاتھوں وہ اتنی نڈھال تھی کہ چاچا سائیں نے اسے دل
 بہلانے کے لیے۔ سہاں بھجوا دیا۔ ایسے میں وہ بھلا کون سا
 عاشق پیچھے چھوڑ کر آگئی ہے؟“ اسے سب جیل پر لگایا جانے والا
 الزام بہت برا لگا۔

”جو عورت اپنے منہ سے طلاق کا مطالبہ کرے اس
 کے بارے میں ایسے ہی گمان کیے جاتے ہیں۔“ جلیل
 پوری ڈھٹائی سے اپنے موقف پر قائم تھا۔

”سب جیل نے یہ مطالبہ صرف اس لیے کیا ہے کہ فیصل
 سویرا کو پسند کرتا ہے۔ ان حالات میں ساری زندگی کپڑا مار
 کرتے رہنے سے بھی بہتر ہے کہ دونوں اپنے راستے الگ
 کر لیں۔“ اس نے ایک بار پھر سب جیل کے حق میں دلیل دی۔

”ہمیں تو نہیں سوچھی ایسی سمجھ داری حالانکہ ہماری
 بیوی کا عاشق تو شادی کے بعد بھی اس کے پیچھے آیا کرتا
 تھا۔“ جلیل کی ہمیشہ سے عادت تھی جب وہ اس کے دلائل
 کے آگے ٹھہر نہیں پاتا تھا تو طنز و تضحیک پر اتر آتا تھا۔

”آپ بھول کیوں نہیں جاتے اس بات کو؟“ وہ
 پُر اعتماد اور پڑھی لکھی عورت اس ذکر پر ہمیشہ ہار جاتی تھی۔
 ”بھول تو جاؤں اگر یہ یقین ہو کہ تم نے اسے بھلا دیا
 ہے۔“ جلیل کے لہجے میں عجیب سی پیش تھی۔

”کیوں خواہ مخواہ فضول کے واہموں میں مبتلا ہو کر خود
 کو اذیت دیتے ہیں۔ میرے لیے آپ اور میری بچیاں ہی
 سب کچھ ہیں۔“ وہ بے بسی سے اسے اس بات کی یقین دہانی
 کروانے لگی جسے وہ خود بھی جانتا تھا لیکن کبھی ماننے کے لیے
 تیار نہیں ہوتا تھا۔

کا کبھی سوچا تک نہیں تھا۔ کالے خان اس کی بات سن کر یوں سفید پڑ گیا جیسے اس کے بدن میں لہو کی ایک بوند بھی باقی نہ رہی ہو۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر معاذ شرمندہ ہو گیا۔

”آئی ایم سوری! میں یہ سب نہیں کہنا چاہتا تھا۔ بس سبکل پر حرف آتے دیکھ کر بے ساختہ ہی میری زبان پھسل گئی۔ اصل میں میری جب سبکل سے پہلی ملاقات ہوئی وہ تب بھی شادی شدہ تھی اور اپنے شوہر معظم کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی گزار رہی تھی۔ درمیان میں میرا ان لوگوں سے رابطہ نہیں رہا اس لیے مجھے اس کی زندگی میں آنے والی تبدیلیوں کا علم نہیں ہو سکا۔ اب دوبارہ ملاقات ہوئی تو پتا چلا کہ وہ فیصل کی بیوی بن چکی ہے۔ ایسے میں سوچا جاسکتا ہے کہ اس کی زندگی میں میری کوئی گنجائش کیسے نکل سکتی ہے۔ وہ تو مجھے ڈھنگ سے جانتی بھی نہیں۔“ وہ صفائی پر صفائی پیش کر رہا تھا لیکن کالے خان دھلے لٹھے جیسا چہرہ لیے یونہی ساکت کھڑا تھا۔

”آئی ایم سوری کالے خان! بس یوں سمجھو کہ کوئی بات ہوئی ہی نہیں۔ آئندہ کبھی میں اس بات کو زبان پر نہیں لاؤں گا۔“ اسے یوں لگ رہا تھا کہ اس نے کسی مقدس راز کو افشا کر کے اس کے تقدس کو پامال کر دیا ہے اس لیے مسلسل معذرت طلب کر رہا تھا۔

”ریلیکس ہو جاؤ میرے دوست! تمہارے دل کا راز ہمیشہ میرے دل میں دفن رہے گا۔“ کالے خان کو ہنوز خاموش پا کر اس کے احساس ندامت میں مزید اضافہ ہو گیا اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے بولا۔

”غلطی میری ہے۔ میں نے ہی آپ کی طرف پہلا ہتھرا اچھا لیا تھا۔“ اس نے تجھے ہوئے لہجے میں اعتراف کیا۔ ”میں نے تم سے کوئی بدلہ نہیں لیا ہے یا! بس سیلف ڈیفنس سمجھ لو۔ میں نہیں چاہتا کہ اس کے نام پر کوئی حرف آئے۔“ اس نے ایک بار پھر وضاحت کی۔

”ہر گنجی محبت کرنے والے کی یہی سوچ ہوتی ہے۔ میں بھی اس کے وجود پر اپنے نام کی سیاہی نہیں دیکھنا چاہتا۔ وہ ایسی ہے کہ آسمانوں کو چھو لینا ہی اسے سمجھا ہے۔ میری جانب آنے کے لیے اسے زمین کی پستوں کا سفر کرنا پڑے گا اس لیے میں اس سے دور رہتا ہوں پر وہ میری جانب ایسے لپکتی ہے جیسے کشش ثقل ہر زمینی شے کو وہیں کی طرف کھینچتی ہے۔“ کالے خان کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔

”محبوب ہمیشہ خود سے بلند ہی دکھائی دیتا ہے لیکن تم تو خوش قسمت ہو کہ جسے چاہتے ہو وہ تم سے بڑھ کر تمہاری محبت کا دم بھرتی ہے۔“ ہر عام آدمی کی طرح وہ بھی رنک

”میں سب سے پہلے ہی ڈاکٹر فردوس سے کوشش کر چکی ہیں لیکن افسوس کہ ان کے شوہر اس امر پر تیار نہیں ہوئے اور ان کے جینے ٹھیک جین کی گھر میں سب سنتے ہیں، کسی کاروباری مصروفیت کی وجہ سے گھر سے باہر ہیں۔“ اس نے شاہدہ کی دی ہوئی اطلاع کالے خان کے گوش گزار کی۔

”ایسی صورت حال میں ہم خاتون کی مدد کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟“ کالے خان نے مایوسی کا اظہار کیا۔ ”میرا تو دل چاہ رہا ہے کہ میں اس خبیث کو کہیں راستے سے اغوا کر لوں اور اس کی وہ ٹھکانی کروں کہ آئندہ عورت پر ہاتھ اٹھانا ہی بھول جائے۔“

”ایسی صورت میں آپ کو سب سے زیادہ انہی خاتون کی ناراضگی کا سامنا کرنا پڑے گا جس کی ہمدردی میں آپ یہ سب کچھ کریں گے۔ ہماری مشرقی خواتین کی نفسیات ذرا منفرد ہے۔ شادی ہو جانے کے بعد ان کے لیے اپنا پتی ہی سب کچھ ہوتا ہے اور محبوب بچا رہ کتنا ہی مخلص ہو، اسے یہ فوراً سائیڈ لائن کر دیتی ہیں۔“ کالے خان اس کے جذباتی پن پر زیر لب مسکراتے ہوئے بولا تو اسے زوردار جھٹکا لگا۔

”محبوب.....!“ بے حد حیرت سے اس نے اس لفظ کو دہرایا۔

”تو پھر اور کیا؟ آخر کس ناتے آپ خاتون کے لیے اس قدر پریشان ہیں؟“

”وہ تو بس میں دوستی کے ناتے..... وہ میرے بہترین دوست کی بہن ہے اس لیے.....“ اس نے گڑبڑا کر صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

”دوست کی بہن ہے اس لیے آپ خود بھی اسے اپنی بہن جیسا محسوس کرتے ہیں۔“ کالے خان نے گویا اس کا جملہ ملل کیا لیکن آنکھوں میں واضح شرارت تھی۔

”میں نے ایسا کب کہا؟ ضروری تو نہیں کہ دنیا کے ہر انسان سے ہمارا کوئی رشتہ ضرور ہو۔“ وہ جھنجھلا سا گیا۔

”بغیر رشتے کے کوئی کسی کے لیے اتنا پریشان نہیں ہوتا۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ رشتہ ہے لیکن آپ اس رشتے کو کوئی نام دیتے ہوئے شرماتے ہیں۔ وہ رشتہ جسے کوئی نام نہ دیا جاسکے درحقیقت دنیا کا مضبوط ترین رشتہ ہوتا ہے۔“

”یہ بات آپ جناب ہی اتنے یقین سے کہہ سکتے ہیں۔ آخر کو پانا تجربہ ہے بے نام رشتے نبھانے کا۔“ وہ کالے خان پر اپنا حال دل عیاں ہو جانے پر کچھ اس طرح زچ ہو گیا تھا کہ بے ساختہ اسے وہ بات جتا بیٹھا جسے جانے

کر معاذ چونک گیا۔

”کیا واقعی.....؟“

”مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ اس کے متعلق جھوٹ بولوں۔“ کالے خان نے برا مانایا۔

”تمہارا اس سے کیا رشتہ ہے؟ میرا مطلب ہے کہ تم اسے کب سے اور کیسے جانتے ہو؟“

”مجھے تو لگتا ہے کہ جب سے ہوش سنبھالا ہے اس کے سوا کسی کو جانتا ہی نہیں ہوں۔ میرے لیے وہ صرف ایک فرد نہیں پوری کائنات ہے۔ کسی کے پاس بہت سارے رشتے ہوں تو اس کا پیارا ان رشتوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ میرے پاس صرف رادھا بھی سو میرے پاس موجود پیار کا سارا خزانہ صرف رادھا کے لیے ہے۔“ وہ بڑے جذب سے کہہ رہا تھا اور اس وقت اس کے چہرے پر کچھ ایسے تاثرات تھے کہ عام سے نقوش اور سیاہ رنگت کے باوجود وہ خوبصورت لگنے لگا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سی کشش پیدا ہو گئی تھی۔

”کچھ بتاؤ نا اپنے اور رادھا دیوی کے ماضی کے بارے میں؟“ تجس نے وقتی طور پر اسے سبک کا مسئلہ بھلا دیا تھا۔

”میرے ماضی میں اگر کچھ اچھا ہے تو وہ صرف رادھا کا میری زندگی میں آنا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ میرے ماں باپ کون تھے۔ آنکھ کھولتے ہی میں نے خود کو آشرم میں پایا۔ تین سال کا تھا تو وہاں سے ایک مسلمان جوڑا مجھے گود لے گیا۔ چار سال میں ان کے ساتھ رہا۔ دونوں میاں بیوی میرا بڑا خیال رکھتے تھے۔ وہیں میں نے اردو بولنا اور قرآن پڑھنا سیکھا۔ اس گھر میں مجھے کوئی پریشانی تھی تو اس بوڑھی عورت کے روپے سے جسے مجھے دادی کہنا سکھا یا گیا تھا لیکن وہ میری زبان سے یہ لفظ سن کر آگ بگولا ہو جاتی تھی۔“ بچپن کی وہ تکلیف یاد کر کے اس کے چہرے پر اب بھی دکھ اتر آیا تھا۔

”دادی کو اپنے اعلیٰ نسب کا بہت تمہند تھا اور وہ اکثر اپنے بہو بیٹے پر غصہ ہوتی تھی کہ وہ یتیم خانے سے جانے کس چوڑی چھار کی اولاد کو ان کے گھر لے آئے ہیں۔ پہلے وہ اس کی باتوں کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتے تھے لیکن جب ان پر اوپر والے کا کرم ہوا اور سونی گود بھر گئی تو دادی کی باتوں پر کان دھرنے لگے۔ آخر ایک دن دوبارہ مجھے اسی آشرم میں واپس بھجوا دیا گیا۔ میں جو چار سال تک اچھی زندگی گزار چکا تھا، دوبارہ وہاں کی زندگی سے سمجھوتا نہیں کر سکا اور ایک دن وہاں سے بھاگ نکلا۔ وہاں سے نکلا تو دنیا نے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ چند ماہ کے

میں مبتلا تھا کہ رادھا جیسی حسین و جمیل لڑکی جس کی ایک ایک آنکھوں دلوں کی دھڑکنیں منتشر ہو جاتی تھیں، دولت و شہرت جس کے گھر کی باندی بنی بیٹھی تھیں، بڑے بڑے سا ہو کار جس کے ایک اشارے کے منتظر رہتے تھے، دل کی بازی ہاری تھی تو ایک ایسے شخص کے آگے جو بہت معمولی شخصیت کا مالک تھا۔ دھن، دولت، حسن، تعلیم، حیثیت کچھ بھی تو نہیں تھا کالے خان کے پاس پھر بھی وہ رادھا دیوی کے دل پر راج کرنے کا اعزاز رکھتا تھا۔

”وہ جتنا بھی دم بھر لے، اس کی محبت میری محبت سے جیت نہیں سکتی۔ اگر میں اسے اس سے بڑھ کر نہ چاہتا ہوتا تو آج وہ میری بیوی ہوتی۔“ کالے خان کا موڈ بدل چکا تھا اور اب وہ خود اس موضوع پر بات کر رہا تھا جسے چھیڑ کر معاذ شرمندہ ہو گیا تھا۔

”ہیں..... یہ کیا بات ہوئی؟ لوگ شادی کو محبت کی تکمیل سمجھتے ہیں اور تم درمیان میں ظالم سماج نہ ہونے کے باوجود شادی نہ کر کے محبت نبھانے کے دعویدار ہو؟“ اس نے حیرت کا اظہار کیا۔

”محبت خود غرضی نہیں سکھاتی۔ میں جانتا ہوں کہ مجھ سے شادی کر کے وہ زیادہ عرصے خوش نہیں رہ سکے گی۔ فلم اس کا جنون ہے اور شادی فلمی ہیروئن کے کیریئر کو ختم کر دیتی ہے۔ پھر ہماری دنیا کے لوگ ہیں۔ آپ خود ہی بتائیں کہ کیا وہ مجھ سے شادی کر کے اپنے مداحوں کے سامنے تماشا نہیں بن جائے گی۔ میڈیا ویسے ہی ہر وقت فلم اسٹارز کے پیچھے پڑا رہتا ہے۔ لوگ ہماری شادی کی صورت میں اتنی باتیں بنائیں گے اور ایسے ایسے لطفے گھڑیں گے کہ وہ ڈپریشن میں چلی جائے گی۔“ یقیناً رادھا کی خاطر وہ اس موضوع پر سوچتا رہا تھا اس لیے اس کے پاس گریز کی بہت سی وجوہات تھیں۔

”جو محبت کرتے ہیں ان کے لیے اپنے محبوب کے سوا ہر شے ثانوی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تمہارا ہر خوف آنے والے وقت میں غلط ثابت ہو اور تم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بہت اچھی زندگی گزارو۔“

”میں نے کہا نا کہ میں اسے بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ خود بھی اپنے آپ سے اتنی واقف نہیں ہوگی جتنا میں اس کا مزاج آشنا ہوں۔ ابھی وہ دعویٰ کرتی ہے کہ مجھ سے بڑھ کر اسے کوئی عزیز نہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ اسے اس فلم انڈسٹری سے بڑھ کر کچھ بھی عزیز نہیں۔ فلموں کے جنون میں اس نے اپنے خون کے رشتوں تک کو چھوڑ دیا تھا۔“ اس نے رادھا دیوی کے متعلق ایسا انکشاف کیا جسے سن

اس عرصے میں، میں نے اتنا جسمانی اور جنسی تشدد سہا کہ قریب المرگ ہو گیا۔ ایسے میں رادھا کے باپ کے دل میں جانے کیا آیا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ اپنے گھر لے گیا۔ مگر بھی کیا بس ایک گھولی تھی جس میں وہ اپنی جینی کے ساتھ رہتا تھا اور گزر بسر کے لیے ہائر پنچر کی دکان ڈال رکھی تھی۔

”مجھے بھی اس نے اپنے ساتھ کام پر لگالیا۔ مار پیٹ اور گالی گلوچ سے میری یہاں بھی جان نہیں چھوٹی تھی لیکن سر پر جھٹ اور پیٹ بھرنے کو روٹی کا آسرا ہو گیا تھا۔ جنسی درندگی سے بھی نجات مل گئی تھی اس لیے میں نے آشرم کی طرح وہاں سے بھاگنے کی کوشش نہیں کی اور صبر شکر سے وہاں رہنے لگا۔ اپنے صبر شکر کے انعام میں مجھے رادھا مل گئی۔ رادھا کی ماما اس کو جنم دینے کے بعد بیمار رہنے لگی تھی اس لیے رادھا کو سنبھالنے کی ذمہ داری مجھ پر آ پڑی۔ چودھویں کے چاند جیسی اس گڑیا کو میں نے بہت پیار سے سنبھالا۔ اس کا اتنا خیال رکھا کہ میرے ہوتے اسے کانٹا چبھنے کی بھی تکلیف نہیں پہنچتی۔ جواب میں وہ بھی مجھے اپنے ماما پتا سے بڑھ کر چاہنے لگی۔ اس کے لیے سارا سنسار ایک طرف تھا اور میں ایک طرف۔ میرے آگے وہ کسی کو کچھ مانتی ہی نہیں تھی۔“ ماضی کے ان دنوں کو یاد کرتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر بڑی خوبصورت مسکراہٹ تیرنے لگی تھی۔ معاذ دم بخود سا اسے دیکھتا رہا۔ محبت ایک عام سے انسان کو بھی کتنا خوبصورت اور پرکشش بنا دیتی ہے، اس چیز کا مشاہدہ وہ کالے خان کو دیکھ کر کر رہا تھا۔

”رادھا کو شروع ہی سے فلمیں دیکھنے کا شوق تھا۔ مجھے جو بھی تھوڑے بہت پیسے کمانے کا موقع ملتا، وہ رادھا کا شوق پورا کرنے پر لگا دیتا۔ فلم دیکھ کر آنے کے بعد وہ مکھنوں اسی کے سحر میں ڈوبی رہتی۔ کبھی ناچتی گاتی تو کبھی اپنی ماما کی ساڑی لپیٹ کر ہیر وٹن کی طرح ڈانسیلاگ ہوتی۔ میں چھوٹی سی رادھا کی اتنی پادریل ایکٹنگ دیکھ کر دنگ رہ جاتا۔ آخر کار ایک دن رادھا نے میرے سامنے اعلان کر دیا کہ اسے فلمی ہیر وٹن بننا ہے۔ میں اس کی ضدی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھا اس لیے اس بات کو بچپن کا شوق سمجھ کر ٹالنے کے بجائے آنے والے وقت کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔“ اب وہ ماضی کے اس حصے کو یاد کر رہا تھا جس میں یقیناً اس کے لیے بہت سختی تھی۔

”فلم انڈسٹری میں رادھا کو دھکوں سے بچانے کے لیے میں خود وہاں کے دھکے کھانے لگا۔ صفائی والا، چائے والا، اسپاٹ بوائے جس جس حیثیت سے مجھے موقع ملا، میں

اس انڈسٹری میں گھستا چلا گیا۔ رادھا کا باپ کام کاج چھوڑ کر اس نئے شوق کے پیچھے بھاگنے پر مجھ سے سخت خفا ہوتا۔ کئی بار میں اس کے ہاتھوں پٹا بھی لیکن رادھا کی راہ کے کانٹے چننے کے جنون نے ہمت نہیں ہارنے دی۔ رادھا کو سولہواں سن لگنے تک میں کسی نہ کسی طرح ایک بڑے میک اپ آرٹسٹ کا اسٹنٹ بننے میں کامیاب ہو چکا تھا اور اس چکر میں رہتا تھا کہ کسی طرح اسے رادھا کی سفارش کرنے پر تیار کر سکوں۔ ان دنوں رادھا بھی بڑی ایکسائیز رہتی تھی۔ اس کی ہر چٹھی میں مجھ سے سوال ہوتا تھا کہ میں اسے کب بمبئی بلارہا ہوں۔ ان دنوں ممبئی، بمبئی کہلاتا تھا۔“ اس نے یوں معاذ کی طرف دیکھتے ہوئے وضاحت کی جیسے اس کے علم میں اضافہ کر رہا ہو۔

”یعنی تم ممبئی شفٹ ہو گئے تھے؟“

”ہونا ہی تھا۔ فلم والوں کا فیوچر تو وہیں ہے نا۔“ وہ سادگی سے مسکرایا۔

”پھر؟ پھر کیا ہوا؟“ معاذ نے اس سے استفسار کیا۔

”پھر رادھا کی ماں مر گئی۔“

”ہیں.....!“ معاذ سن کر چونکا۔

”روٹی تو تھی۔ بس مرنے میں بہت سال لگا دیے۔ وہ مری تو پتا چلا کہ اس کا پیارو جو بھی بڑی نعمت تھا۔ اس کے مرتے ہی رادھا کے پتا کو دوسری جینی لانے کی چاہ چڑھ گئی پر اس کام سے پہلے وہ رادھا سے جان چھڑانا چاہتا تھا۔ ادھر ادھر کہہ سن کر اس نے رشتہ بھی ڈھونڈ لیا بڑی عمر کا پر ڈرامے والا آدمی تھا جو رادھا کا حسن دیکھ کر اس کے باپ کی شرطیں ماننے کو بھی تیار ہو گیا تھا لیکن رادھا کیسے مان جاتی۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے قدرے بلند آواز میں ہنس پڑا۔

”اس نے مجھے تار ڈالا اور خود کپڑوں کی گھڑی باندھ کر ٹرین میں بیٹھ کر ممبئی کے لیے روانہ ہو گئی۔ پیچھے بڑا ہنگامہ ہوا لیکن ہم تو انسانوں کے سمندر میں گم ہو چکے تھے پھر رادھا کے ممبئی میں قدم رکھتے ہی قسمت کی دیوی بھی جاگ گئی۔ تھوڑی سی سفارش کے ساتھ ڈھیروں حسن اور ٹیلنٹ نے خود ہی اس کے لیے بولی دوڑ میں جگہ بنا دی اور اب وہ لاکھوں دلوں پر حکمرانی کرتی ہے۔“ کالے خان نے رادھا دیوی کی کامیابی کی داستان کا خلاصہ کیا۔

”وہ کتنے ہی دلوں پر حکمرانی کرے، اس کے دل پر تو بس تمہاری حکمرانی ہے نا۔“ معاذ نے شرارت سے اسے چھیڑا۔

”بھلی ہے وہ۔ بچپن سے میرے بہت قریب رہی ہے اور ایک طرح سے ماں کا پیار بھی مجھ سے ہی پایا ہے تو

سے میرے سوا کوئی دکھائی نہیں دیتا۔“ وہ اس پہلے رادھا دیوی کے محبوب کے بجائے بزرگ بن گیا۔

”تم نے فلمی لائن کیوں چھوڑ دی؟ میک اپ آرٹسٹ بن کر جے رہتے وہیں۔ رادھا دیوی کا ساتھ بھی رہتا۔“

”میں نے اس گھری میں صرف رادھا کی خاطر قدم رکھا تھا۔ اس کے قدم وہاں جم گئے تو مجھے ضرورت نہیں رہی اور میں اپنے پیارے دلی میں لوٹ آیا۔ یہاں رہ کر میں اپنی پرانی بستی جاتا ہوں۔ رادھا کے پتا سے بھی ملتا ہوں۔ وہ پہلے مجھے گالیاں دیتا ہے پھر بیتی کرتا ہے کہ رادھا سے کہو اپنے پتا سے مل لے لیکن وہ نہیں مانتی۔“

”کیوں نہیں مانتی؟“

”اس کا ہر بار ایک ہی جواب ہوتا ہے کہ باپو سے کہو تم نے پیسوں کے لیے ایک ساہوکار سے اپنی بیٹی کا سودا کر دیا تھا۔ سمجھو اب بھی بیٹی کسی ساہوکار کے پاس رہن رکھی ہے۔ بیٹی کے بدلے روپے لیتے جاؤ، بیٹی مت مانگو۔ ہر بار بڑی بڑی رئیس بھجواتی ہے وہ اپنے پتا کے لیے لیکن پتا کو یہ ادھیکار نہیں ہے کہ اس کے گھر کی چوکھٹ میں قدم رکھ سکے۔“ کالے خان نے افسوس سے بتایا۔

”تم نے کبھی اسے سمجھایا نہیں؟“ معاذ نے پوچھا۔

”سمجھانے سے کیا ہوتا ہے؟ مانتی تو مجھے بھی ہمیشہ اسی کی ہوتی ہے۔ بتانا بہت ضدی ہے۔ ایک بار جو ٹھان لے اس سے پیچھے نہیں ہتی۔“

”بس تو پھر تمہارے پیار سے بھی پیچھے نہیں ہٹے گی۔“ معاذ نے اسے یقین دلایا۔

”یہ تو وقت ہی بتائے گا۔ جب تک وہ فلم کی جادوگری میں ہے، ہم کوئی قانونی رشتہ نہیں جوڑیں گے۔ اس جادوگری کو چھوڑ کر بھی وہ میرے پاس واپس لوٹ آنے میں کامیاب ہوگی تو میں مان لوں گا کہ ہم ایک امر پریم کہانی رقم کرنے جا رہے ہیں۔“ وہ بڑا حقیقت پسند اور مضبوط آدمی تھا جو ایک لڑکی کی جذباتیت سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اسے پورا پورا موقع دے رہا تھا کہ وہ پہلے سارے جگ کو کھنگال لے پھر فیصلہ کرے کہ کالے خان ہی اس کا مطلوب و مقصود ہے یا نہیں۔ ایسا ایثار بھی سچی اور خالص محبت میں ہی کیا جاسکتا ہے ورنہ ایسی عورت کو کون نہیں اپنانا چاہتا جو سرتا پا حسن، شہرت اور دولت سے مالا مال ہو۔

”میری دل سے دعا ہے کہ یہ پریم کہانی ضرور رقم ہو۔“ معاذ نے محبت سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”دعائیں تو وہ اپنے گرو جی سے بھی بہت کرداتی

ہے۔“ کالے خان سن کر ہنسا۔

”یہ سادھو کا کیا پکڑ ہے؟ رادھا دیوی اس کو اتنا کیوں مانتی ہے؟“ اس نے موقع پا کر دل میں چپا سوال پوچھ ڈالا۔

”پہلی بار ممی آتے ہوئے سادھو اسے راستے میں ملا تھا۔ وہ اس سے اپنی کامیابی کے لیے تعویذ لے کر آئی تھی۔ کامیابی مل گئی تو سادھو کو اپنا گرو مان لیا اور آج تک اس کے نام کی مالا جیتی ہے۔ کوئی بھی خاص موقع ہو، اپنے گرو سے آشرم باد لیے بغیر آگے نہیں بڑھتی۔“ کالے خان نے اس کی یہ الجھن بھی دور کی اور اپنی جگہ سے کھڑا ہوتا ہوا بولا۔

”آپ کو ہم راز پا کر پہلی بار کسی سے دل کی باتیں کی ہیں۔ امید ہے میرے بھروسے کو ٹوٹے نہیں دیں گے۔“

”یہ تو کوئی کہنے کی بات ہی نہیں ہے یار کالے خان!“ وہ غلوس سے بولا پھر کچھ جزبہ ہوتے ہوئے بولا۔

”یہ تمہارا نام کالے خان کس نے رکھا ہے؟ بالکل بھی اچھا نہیں لگتا تمہیں اس نام سے پکارتا۔“

”ارمانوں سے نام تو جنم دینے والے رکھتے ہیں۔ میرے جنم دینے والوں کا جانے کیا معاملہ تھا کہ میں بے نام آشرم میں جا پہنچا اور وہاں کسی نے میری یہ کالی چڑی دیکھ کر مجھے کالے خان کا نام دے دیا۔ بس اسی طرح چلا آ رہا ہے یہ نام۔“

”تو تم اسے بدل بھی تو سکتے تھے۔ کوئی ضروری تو نہیں کہ بچپن میں ملا نام بندہ ساری زندگی خود سے چپکا کر رکھے۔“ اس کا جواب سن کر معاذ نے منہ بتایا۔

”رادھا بھی یہی کہتی تھی لیکن میں اپنا یہ نام نہیں چھوڑنا چاہتا۔ یہ نام مجھے اپنی حقیقت کو بھولنے نہیں دیتا اور میں اپنی حقیقت کے ساتھ ہی جینا چاہتا ہوں۔“ اس کا اپنا ایک موقف تھا جس سے معاذ اختلاف نہیں کر سکا۔

”میں کھانا لگاتا ہوں۔“ معاذ کو خاموش پا کر وہ اس کے شانے پر تھکی دیتے ہوئے نرمی سے بولا۔

”کھانے کے بعد میں تم سے اپنے ذہن میں آنے والا ایک خیال ڈسکس کروں گا۔ عالم اور سرمد کی رہائی کے لیے کوئی نہ کوئی قدم تو اٹھانا ہی ہوگا۔ اس کام کو انجام دے بغیر جل کی بہتری کی بھی کوئی راہ نہیں نکل سکے گی۔“ بات

چاہے کتنی ہی گھوم گئی تھی، وہ اس مسئلے کو نہیں بھول سکتا تھا۔

”بے فکر رہیں۔ مجھ سے جہاں تک ممکن ہو آپ کی مدد ضرور کروں گا۔“ کالے خان نے اسے تسلی دی اور باہر کی

طرف بڑھا۔

”چلو میں بھی تمہارے ساتھ چل کر تمہاری مدد کروانا

نومبر 2021

ہوں۔“ خود کو تنہائی اور سوچوں سے بچانے کے لیے اس نے پٹیکش کی۔

”ہم مہمانوں سے کام نہیں کروایا کرتے۔“

”چھوڑو یار! مہمان ایک دن کا ہوتا ہے۔ میں تو بلائے جان بن کر تمہارے سر پر سوار ہوں۔ میری وجہ سے خواجوا تمہارا کام بھی بڑھ گیا ہے۔“ کالے خان کا ہاتھ تھام کر کچن کی طرف رخ کرتے ہوئے اس کے انداز میں بے تکلفی سی تھی۔

”میں ایسا بالکل نہیں سوچتا۔ آپ کے یہاں رہنے سے تو مجھے دوسرا ہٹ مل گئی ہے ورنہ تو اس محل جیسے گھر میں تنہا بیٹھا بس اس کے آنے کی گھڑیاں گنتا رہتا تھا۔“

”واقعی یار! اتنے بڑے گھر میں تنہا رہنا بھی بندے کے لیے ایک امتحان ہے۔ کچھ نہیں تو ایک دوکل وقتی ملازمین ہی رکھ لو۔“

”ملازمین رکھ لیے تو وہ بات سارے زمانے کو پتا چل جائے گی جو آپ نے یہاں چند دن رہ کر جان لی۔“ ظاہر ہے کالے خان سمجھ چکا تھا کہ اس نے اس کے اور رادھا دیوی کے درمیان ہونے والی رومان پرور گفتگو سن لی تھی اس لیے ان کی محبت کا راز جان گیا تھا۔

”اچھا تو یہ زمانے سے چھپنے کا انتظام ہے۔“ وہ ہنسا اور کالے خان کے ہاتھ سے سائن کا ڈونگا لے کر وہیں کچن ٹیبل پر رکھ دیا۔ کالے خان جو اب محض مسکرا دیا۔

”یہاں سے ڈائننگ روم تک بار بار پرید کرنے سے بہتر ہے کہ کھانا ہمیں کھالیا جائے۔“

”جو آپ چاہیں۔ اب تو ہماری جان آپ کی منگی میں ہے۔ ہماری کیا مجال کہ آپ کے حکم کے خلاف چوں چاں کر سکیں۔“ مذاق مذاق میں کالے خان کا خوف اس کی زبان پر آ گیا۔

”ایسا سوچنا بھی نہیں۔“ سلا د میں سے کھیرے کے کلڑے چٹا معاذ کا ہاتھ ساکت ہو گیا اور اس نے نہایت سنجیدہ تاثرات کے ساتھ کالے خان کو دیکھا۔

”محبت کسی بھی روپ میں ہو، میرے لیے محترم ہے اور تمہاری محبت جیسی پاکیزہ اور بے لوث محبت کو بدنام کرنے کے لیے تو سینے میں شیطان کا دل چاہیے جو بہر حال میرے پاس نہیں ہے۔“

”بہت شکریہ۔ آپ کے یہ الفاظ میرے لیے بہت قیمتی ہیں۔ زندگی میں کبھی اگر میں خود غرض ہونے لگا تو آپ کے یہ الفاظ یاد کر لوں گا۔“ کالے خان کی آنکھوں میں چمکتے

آنسو اس کے جذبات کی طرح ہی شفاف تھے۔

☆☆☆

”ایک گھنٹے کے اندر سب اپنا ضروری سامان پیک کر لیں۔ خاص طور پر ایسی کوئی چیز نہیں رہنا چاہیے جس سے ہماری شناخت ظاہر ہو سکے۔ ٹھیک ایک گھنٹے بعد ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔“ ڈائننگ ٹیبل پر سب سے پہلے کھانے سے ہاتھ کھینچنے والا شخص وقاص تھا۔ کچھ دیر قبل ہی اس کی پاکستان میں لالہ عیسیٰ سے تفصیلی بات ہوئی تھی اور اس کی طرف سے دی گئی ہدایات کے مطابق ہی اب وہ ان لوگوں سے مخاطب تھا۔

”خیریت؟ کوئی مسئلہ ہے کیا؟ کوئی خطرے کی بات؟“ خاور صاحب جو ماحول میں پہلے ہی کچھ تناؤ سا محسوس کر رہے تھے، اس کی ہدایات سن کر زرد پڑ گئے اور فکر سے بوجھنے لگے۔

”ایسی کوئی خاص پریشانی کی بات نہیں ہے انکل! بس ایک احتیاطی تدبیر سمجھ لیں۔“ اس نے اپنی مسکراہٹ سے ان کی پریشانی کم کرنے کی کوشش کی لیکن خاور احمد سے اس کی مسکراہٹ کا پیکا پن نہ چھپ سکا۔

”کیسی احتیاطی تدبیر..... اور کس لیے؟ تم نے کوئی خطرہ دیکھا ہوگا تب ہی تو ایسا کہہ رہے ہو، وہ بھی اتنی ہنگامی بنیادوں پر۔“ وہ بچے نہیں تھے کہ اس کے بہلانے سے بہل جاتے۔

”آپ ٹینس نہیں ہوں! ابو! اطمینان سے اپنا کھانا ختم کریں پھر ہم چل کر اپنا سامان پیک کرتے ہیں تو میں آپ کو بتاتا ہوں کہ وقاص یہ سب کیوں کہہ رہا ہے۔“ انہیں تسلی دینے کی کوشش کرتے ہوئے سعد کی نظریں بے ساختہ ہی علیہ پر جا گئیں۔

”یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔ میری ذرا سی غلطی نے سب کو مشکل میں ڈال دیا ہے۔“ وہ جو پہلے ہی کھانے سے زیادہ جھج سے چادلوں کو الٹ پلٹ کرنے میں مصروف تھی، پلیٹ ایک طرف کھسکا کر شرمساری سے رونے لگی۔

”پلیز علیہ! اس طرح مت روؤ۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔ آگے کے حالات میں سنبھال لوں گا۔“ وقاص سے اس کا رونا کیسے دیکھا جاتا، فوراً ہی اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دینے لگا۔

”کوئی مجھے بھی تو بتائے کہ آخر ماجرا کیا ہے؟“ خاور صاحب کی پریشانی، غصے میں ڈھلی اور وہ قدرے بلند آواز میں بولے۔

”آپ میرے ساتھ چلیں، میں بتاتا ہوں۔“ سعد نے ان کا ہاتھ تھام کر انہیں ان کی جگہ سے اٹھایا۔ کھانا

لیے لیٹ ہونے کی کوشش کی۔ میں یہ سوچے بغیر کہ تم میری اکلوتی بیگم ہو، تمہیں یہاں چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔“ مکن ایریا سے باہر نکل کر اپنے زیر استعمال کمرے کی طرف جاتے ہوئے اس نے ہلکے پھلکے انداز میں یاد دہانی کروائی تو علیہ کے ہاتھ پھرتی سے چلنے لگے۔ جب وہ کمرے میں آئی تو دیکھا وقاص اپنی ٹی شرٹ کے نیچے کوئی ہتھیار لگا رہا تھا۔ اس کی رنگت فٹ ہو گئی۔

”صرف احتیاط رکھی ہے۔ ان شاء اللہ استعمال کی نوبت نہیں آئے گی۔“ اس کی کیفیت محسوس کر کے وقاص نے تسلی دی تو وہ یونہی سر ہلا کر باقی کی پیکنگ میں مصروف ہو گئی۔ گھریلو استعمال کے ساز و سامان میں سے بے شک کچھ ساتھ نہیں لے جاتا تھا لیکن ادھر ادھر بکھری ذاتی استعمال کی اشیاء کو مکمل طور پر سیٹنا بھی کوئی اتنا آسان کام نہیں تھا۔ بہر حال کسی نہ کسی طور یہ کام مکمل ہو گیا اور وہ سب بھاری دل سے وقاص کی منگوائی کیب میں سوار ہو کر وہاں سے روانہ ہوئے۔ کیب جب تک اسی علاقے میں رہی، وقاص بے حد چوکنا رہا۔ اس کی آنکھیں تیزی سے حلقوں میں گردش کرتی اطراف کا جائزہ لیتی رہیں۔ خصوصاً اپنے عقب کی طرف سے وہ بے حد ہوشیار تھا۔ کافی آگے جانے کے بعد جب اسے ہر طرح سے اطمینان ہو گیا تو وہ تھوڑا ریلیکس ہوا۔ اسے ریلیکس ہوتے دیکھ کر باقی سب کے تناؤ میں بھی قدرے کمی آئی لیکن وقاص کے بجتے فون نے پھر سب کو چونکا دیا۔

”جی، جی سب ٹھیک ہے۔ ہم راستے میں ہیں۔“ وہ کار کو مخاطب کیے بغیر بہت محتاط الفاظ میں بات کر رہا تھا لیکن وہ لوگ سمجھ سکتے تھے کہ آنے والی کال لالہ عیسیٰ کی ہے۔ وہ دور بیٹھا ان لوگوں کے لیے پریشان ہو رہا تھا۔ اس موقع پر علیہ نے خاص طور پر شرمندگی محسوس کی۔ اس کی ذرا سی جذباتیت نے یہاں سے وہاں تک سب کو پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔

”ڈونٹ وری، میں خیال رکھوں گا۔“ وہ نہایت سنجیدگی سے دوسری طرف موجود شخص کو جواب دے رہا تھا۔ ایسے جواب جن سے کسی انجان شخص کے لیے کوئی نتیجہ اخذ کرنا آسان نہیں تھا۔

”نہیں، میں نے اسے کچھ نہیں کہا۔ اگر آپ کو کوئی شک ہے تو خود بات کر کے تصدیق کر لیں۔“ بات کرتے کرتے اس نے یکدم ہی موبائل علیہ کو پکڑا دیا۔ ”یہ لو، بات کرو مگر ذرا خیال رکھنا۔“ سرگوشی میں ہدایت کرتے ہوئے اس نے آنکھوں سے کیب ڈرائیور کی

کھا۔ نہ کا اب ویسے بھی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ”اور تم۔۔۔!“ وہ جاتے جاتے علیہ کی طرف رخ کر کے سختی سے بولا۔ ”یہ ردنا دھونا بند کرو اور جا کر وہ کرو جو وقاص نے تم سے کہا ہے۔“

”جی اچھا۔“ وہ پھرتی سے آنسو صاف کر کے کھڑی ہو گئی۔ ایک تو شدت سے اپنی غلطی کا احساس تھا دوسرے بھائیوں میں سے کوئی بھی اس سے اس لب و لہجے میں بات نہیں کرتا تھا اس لیے سعد کے اس انداز نے تیر کی طرح سیدھا کر دیا تھا۔

”سالا، میری بیوی سے اکھڑ پین سے بات کرتا ہے۔ دیکھنا موقع ملے ہی دماغ درست کر دوں گا اس سالے کا۔“ ڈانٹنگ ٹیبل پر موجود برتن سینے میں علیہ کی مدد کرتے ہوئے وقاص نے مصنوعی غصے سے کہا تو اس کی تیوری پر فوراً ہی بل پڑ گئے اور چمک کر بولی۔

”میرے بھائی کو گالی کیوں دی؟“

”گالی کہاں دی؟ اب سالے کو تو سالا ہی بولوں گا نا۔“ اس نے سننے کی اداکاری کی لیکن اس اداکاری کے ساتھ ساتھ اس کے ہاتھ بھی پھرتی سے چل رہے تھے۔

”سالا کہنا ضروری نہیں ہے۔ آپ انہیں براورہستی بھی کہہ سکتے ہیں۔“ وہ کمر پر ہاتھ رکھے فل لڑائی کے موڈ میں آچکی تھی۔

”تھوڑا مشکل ہے پر تمہاری خاطر کوشش کر کے دیکھوں گا۔“ اس نے فوراً تابعداری کا مظاہرہ کیا اور برتنوں سے بھری ٹرے سمیٹ کر چمکن کی طرف بڑھا۔

”پر ایک بات ہے یار! جو مزہ سالا بولنے میں ہے وہ کسی اور لفظ سے نہیں آتا۔ دل میں ایک ٹھنڈی پڑ جاتی ہے بیوی کے بھائی کو سالا کہہ کر پکارنے سے۔“ برتنوں کو ڈش وائر میں ڈالتے ہوئے وہ اپنے ذریعہ خیالات کا اظہار کرنا نہیں بھولا تھا۔ پلٹ کر اسے دیکھا تو جیسے چون دیکھ کر فوراً کانوں کو ہاتھ لگا دیے۔

”بڑی ڈراما چیز میرے پلے پڑ گئی ہے۔“ وہ یکدم ہی ہنس کر بولی تو وہ خود بھی مسکرا دیا۔ اس کا موڈ بہتر کرنے کی کوشش میں کامیاب ہو کر وہ خود بھی ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ لاکھ اس کی غلطی تھی پھر بھی وہ اسے ادا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس نے اسے خوشیاں اور سکون دینے کے وعدے کے ساتھ اپنی زندگی میں شامل کیا تھا پھر وہ اس کی آنکھوں میں آنسو کیسے دیکھتا۔

”دیے گئے ٹائم میں ایک منٹ کا بھی اضافہ نہیں ہوگا اس لیے خبردار جو اپنے پاکستانی ہونے کا ثبوت دینے کے

طرف اشارہ کیا۔

”ہیلو۔ السلام علیکم۔“ وہ لالہ بیٹی سے بات کرنے کے خیال سے خوفزدہ تھی لیکن انکار بھی نہیں کر سکتی تھی اس لیے بڑی مشکل سے پھنسی پھنسی آواز ہی حلق سے برآمد ہوئی۔

”وعلیکم السلام۔ جیتی رہو بیٹا! کیا بات ہے، تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے کیا؟ مجھے تم آواز سے ٹھیک نہیں لگ رہی ہو۔“ دوسری طرف سے لالہ نے اتنے پُر شفقت لہجے میں پوچھا کہ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ آنسوؤں کو نلگتے ہوئے اس نے بھرائے ہوئے لہجے میں لالہ کو تسلی دینے کی کوشش کی۔ اس ناکام کوشش پر وقاص نے بے ساختہ ہی اپنے سر پر ہاتھ مارا۔

”کیا بات ہے، تم رورہی ہو؟ مطلب کہ اس گدھے نے تمہیں کچھ کہا ہے؟“ لالہ اس کی بھرائی ہوئی آواز سن کر فوراً جلال میں آ گیا۔

”نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ جلدی جلدی ہتھیلی سے آنسو پونچھتے ہوئے وہ جلدی سے بولی۔

”پھر رونا کیوں آرہا ہے؟“ لالہ نے تفتیش کی۔

”بس ایسے ہی۔ میری وجہ سے بڑی پریشانی ہوگئی تا اس لیے۔“ اس نے اعترافِ جرم کرنے والے لہجے میں وضاحت دینے کی کوشش کی۔

”جو ہوا اسے بھول جانے کا ہے۔ غلطیاں سدھارنے کو وہ گھونچو ساتھ بیجا ہے نا، وہ دیکھ لے گا۔ سب۔“ لالہ نے وکی کو ایک اور نئے خطاب سے نوازا جسے سن کر اس کے لبوں پر بے ساختہ ہی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”اب میں فون بند کرتا ہوں۔ تم نے اب پریشان بالکل نہیں ہونا۔ بس دے کر تئی جانا جیسے وکی بولے۔“ لالہ اسے اس کی کوئی بھی غلطی جنائے بغیر نہایت نرم لہجے میں بات کر رہا تھا۔

”جی بالکل!“ اس نے جواباً فرمانبرداری کا مظاہرہ کیا۔

”ٹھیک ہے پھر میں فون رکھتا ہوں۔ ابھی تم لوگ سفر میں ہو۔ کسی ڈھنگ کے ٹھکانے پر پہنچ جاؤ تو پھر کسی دن تسلی سے بات کرتے ہیں۔“

”جی بہتر۔ اللہ حافظ۔“ اس نے احترام سے جواب دیا۔ لالہ سے بات کر کے اسے اپنے دل کا بوجھ خاصاً کم محسوس ہو رہا تھا۔

”یہاں روک دو۔“ علیہ کا بڑھایا ہوا موبائل اس سے لے کر جیب میں رکھتے ہوئے وقاص نے کیب ڈرائیور

کو حکم دیا۔

”اب ہم کہاں جا رہے گے؟“ کیب انہیں سامان سمیت اتار کر آگے بڑھ گئی تو علیہ نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پریشانی سے سوال کیا۔ وہ جس جگہ اترے تھے وہ ایک مصروف شاہراہ تھی جہاں ایک بڑا سا شاپنگ مال، سینما اور چند فاسٹ فوڈ ریستورانس تو دکھائی دے رہے تھے لیکن کسی ہوٹل یا رہائشی عمارت کا نام و نشان نہیں تھا جس پر اسے اپنی منزل کا گمان ہوتا۔

”نی الحال تو سڑکوں پر پیدل مارچ کرنے کا پروگرام ہے۔ سنا ہے پیدل چلنا صحت کے لیے بہت مفید ہوتا ہے۔“ غیر سنجیدگی سے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے اس نے خاور صاحب کی طرف دیکھا اور معذرت خواہانہ لہجے میں بولا۔

”سوری انکل! آپ کو تھوڑی سی تکلیف تو ہوگی لیکن آگے کی پریشانی سے محفوظ رہنے کے لیے تھوڑی سی زحمت کرنی پڑے گی۔“

”سوری کہہ کر مجھے شرمندہ نہ کرو بیٹا! شرمندہ تو میں تم سے ہوں کہ میری بیٹی کی صحت نے تمہیں مشکل میں ڈال دیا۔“ خاور احمد کے لہجے میں اس کے لیے محبت تھی۔ حقیقتاً علیہ کا اس سے نکاح کرتے ہوئے ان کے دل میں جتنے خدشات تھے، وہ ان چند دنوں کے ساتھ میں مٹ گئے تھے اور انہیں یقین ہو گیا تھا کہ وہ خود بھی تلاش کرتے تو اپنی بیٹی کے لیے اس سے زیادہ مخلص اور محبت کرنے والا جیون سا بھی تلاش نہیں کر سکتے تھے۔

”یہ ڈھول تو میں نے اپنی خوشی سے اپنے گلے میں ڈالا ہے انکل! اسے تو اب مجھے ساری زندگی بجاتے ہی رہنا ہے۔“ اس کے چہرے پر مظلومیت اور لہجے میں شرارت تھی جسے محسوس کر کے خاور احمد اور سعد مسکرا دیے جبکہ علیہ نے چپکے سے اس کے بازو میں چپکی کاٹ لی۔

”سی.....“ اس نے اتنے زور کی سسکاری لی کہ دونوں باپ بیٹا چونک گئے۔

”کیا ہوا وقاص؟“ سعد نے فکر مندی سے پوچھا۔

”لگتا ہے شہد کی مکھی نے کاٹ لیا ہے۔“ اس نے اپنے چہرے کے تاثرات بھی دروناک بنا لیے۔

”شہد کی مکھی..... یہاں اور اس وقت؟“ سعد نے جگر جگر روشنیوں میں نہائی اس سڑک کو حیرت سے دیکھا۔

”تم ایک شادی شدہ آدمی کا دکھ نہیں سمجھ سکتے بھائی۔“

شادی کر کے اصل میں آدمی ایک خطرناک جھتے میں ہاتھ ڈال دیتا ہے اور کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ اس چھتے میں سے

ب اور کہاں کوئی کھسی کل کر اسے ڈنک مار دے۔“ اس کی زبان جتنے فرائے سے چل رہی تھی، آنکھیں اس سے بھی زیادہ تیزی سے اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس جائزے سے وہ اچھا خاصا مطمئن ہو گیا تھا کہ آس پاس سے گزرتے اجنبی چہروں میں سے کوئی چہرہ ایسا نہیں ہے جس پر موجود آنکھیں بطور خاص ان کی نگرانی کر رہی ہوں۔

”جب پیدل مارچ کا ہی پروگرام ہے تو یہاں کھڑے کھڑے وقت ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے، بس اب چلیں۔“ علیہ جو پہلے اس کے ڈرائے پر تھوڑی سی گھبراہٹ تھی، خاور احمد اور سعد کے چہروں پر پھیلنے والی مسکراہٹ پر جربز ہوتے ہوئے بولی اور خود ہی اپنے قدم آگے بڑھا دیے۔

”اکیلے نہ جانا ہمیں چھوڑ کر، تمہارے بنا ہم بھلا کیا جنیں گے۔“ اس نے شرارتی لہجے میں پیچھے سے تان لگائی پھر بھاری بیگ گھسیٹا اس کے پیچھے لپکا۔ ایسا ہی ایک بیگ سعد کے پاس بھی موجود تھا۔ خاور احمد نے ایک ہلکا ہلکا بیگ اپنے شانے سے لٹکا رکھا تھا جبکہ علیہ بی بی کے نازک شانوں پر محض اپنے خوبصورت سے شولڈر بیگ کو سنبھالنے کی ذمہ داری تھی۔

”بائیں طرف مڑ جاؤ۔“ جب وہ لوگ شاپنگ سینٹر کے آخری کونے پر پہنچے تو وقاص نے علیہ کو ہدایت دی۔ اس نے بھی شرافت سے ٹھل کیا۔ شاپنگ سینٹر کی بغلی گلی سے نکل کر وہ لوگ دوسری طرف موجود مصروف سڑک پر نکل آئے۔ یہاں سے ایک دوسری کیب لے کر وقاص نے ایک مشہور جگہ کا نام لیا۔ اس جگہ پہنچنے کے بعد تیسری کیب لی گئی۔ اب سب سمجھ گئے تھے کہ وہ اپنے تعاقب کی طرف سے مطمئن ہونے کے لیے ایسا کر رہا ہے اس لیے خاموشی سے اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ اللہ اللہ کر کے وہ ایک مضافاتی رہائشی علاقے میں پہنچے۔ یہاں کیب کو پیچھے چھوڑ کر پھر پیدل مارچ کا سلسلہ شروع ہوا۔ چلتے ہوئے وقاص گا ہے بگا ہے مکانات پر لگی نام و پتے کی تختیاں دیکھتا جا رہا تھا۔ آخر کار وہ ایک ایسے دروازے کے سامنے رک گیا جس پر مس سینڈی کے نام کی تختی لگی تھی۔ نیل دینے پر ایک ادھیز عمر خاتون نے دروازہ کھولا۔ اس کے لباس اور بالوں کو دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ ابھی وہ سونے کے لیے نہیں لیٹی تھی۔

”مس سینڈی.....؟“ وقاص نے سوالیہ لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ ”میں دکی.....!“ جواب اثبات میں پاکر اس نے اپنا تعارف کر دانا چاہا لیکن مس سینڈی نے اس کی

بات کاٹ دی۔

”اندر آ جاؤ۔ میں تم لوگوں کا ہی انتظار کر رہی تھی۔“ ”تھینک یو۔“ وہ تینوں باری باری سامان سمیت گھر کے اندر داخل ہو گئے۔ مختصر احاطے میں بلب روشن تھا جس کی روشنی میں کیار یوں اور گلوں میں لگائے گئے پودے سب سے زیادہ نمایاں ہو رہے تھے۔

”میرا گھر زیادہ بڑا نہیں ہے۔ میں نے تمہارے لیے دو بیڈروم ریڈی کر دیے ہیں۔ ایک میں تم میاں بیوی اور دوسرے میں یہ دونوں رہ سکتے ہیں۔“ انہیں اپنی راہنمائی میں مکان کے اندرونی حصے کی طرف لے جاتے ہوئے مس سینڈی نے مطلع کیا۔

”آئی ایم سوری۔ ہماری وجہ سے آپ کورات کے وقت زحمت کرنی پڑی۔“ وقاص نے اخلاقیات کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی۔

”زحمت کیسی؟ میں تمہیں جو بھی فینسیلیٹی دوں گی، اس کے بدلے مجھے پے کیا جائے گا۔“ مس سینڈی نے ساٹھ سے لہجے میں اسے جواب دیا پھر پوچھنے لگی۔ ”کیا تم لوگ بھوکے ہو؟ میں اس ٹائم کھانا تو نہیں لیکن کافی اور سینڈو چڑ پر دوائیڈ کر سکتی ہوں۔“

”پلیز ضرور!“ وہ لوگ جلدی میں رات کا کھانا ٹھیک سے نہیں کھاپائے تھے اور اچھی خاصی دیر سے خوار ہوتے پھر رہے تھے اس لیے وقاص نے اس پیشکش سے انکار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

”تم لوگ فریش ہو جاؤ۔“ فٹنٹین منٹ میں سب ریڈی ہو جائے گا۔“ انہیں کمروں کے سامنے پہنچا کر وہ مستعدی سے بولی اور تیز قدموں سے چلتی ہوئی وہاں سے ہٹ گئی۔ عمر بے قطع نظر وہ ایک اسارٹ اور پھر تیلی عورت دکھائی دیتی تھی۔ گھر کی ترتیب اور صفائی سے بھی اس کی خوش ذوقی اور چستی کا اظہار ہو رہا تھا۔ الغرض وہ اپنی ہم عمر پاکستانی خواتین کے مقابلے میں بہت مختلف تھی۔ پاکستانی خواتین عموماً اس عمر میں بھدی اور ست ہو جاتی ہیں اور ان کی زیادہ سے زیادہ مصروفیت یہ ہوتی ہے کہ تخت پر بیٹھے بیٹھے بھی سبزی ترکاری کاٹ پیٹ کر دے دی یا روتے بسورتے پوتے یا پوتی کو گود میں لٹا کر تھپک تھپک کر سلا دیا۔ موقع مل جانے پر کسی آئے گئے کے سامنے بہو یا کسی پڑوسن کی غیبتیں کرنا انسانی مشغلہ تھا اور سب سے زیادہ دلچسپی اسی میں لی جاتی تھی لیکن مس سینڈی کو دیکھتے ہی احساس ہو رہا تھا کہ اس کی زندگی میں ایسی کسی چیز کی گنجائش نہیں ہوگی۔

”یہ ایک اور مصیبت ہے۔ گھر والوں سے ہٹ کر کوئی ملے تو اس کی گت پٹ سمجھنے میں دماغ کھپاتے رہو اور جب تک جواب سوچے، وہ جا بھی چکا ہو۔“ کمرے کے اندر پہنچ کر علیہ اپنا شولڈر بیگ بستر پر پھینک کر خود بھی یوں بستر پر دراز ہوئی جیسے سامان کا بڑا سا بیگ اسے ہی ڈھو کر لانا پڑا ہو۔

”ابھی عادی نہیں ہوئی ہو۔ رہتے رہتے عادی ہو جاؤ گی تو اتنی رداں ہو جاؤ گی کہ پاکستان جانا ہو تو پھر اردو بولنے میں مشکل پیش آئے گی۔“ ٹرائی بیگ کو ایک دیوار کے ساتھ کھڑا کرتے ہوئے وقاص نے مسکرا کر اسے جواب دیا۔

”مجھے نہیں ہونا عادی وادی۔ میں تو روز اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی ہوں کہ جلد از جلد سارے مسئلے ختم ہوں اور ہم پاکستان واپس جا سکیں۔“ اس نے اپنے دل کی خواہش بیان کی پھر کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

”کتنے پیارے دن تھے وہ جب ہم سب گھر والے ساتھ ہوتے تھے۔ میں امی کے چاہت سے بنائے کھانے سو سو خیرے کر کے کھاتی تھی۔ زندگی میں اگر کوئی ٹینشن تھی تو بس زیادہ سے زیادہ یہ کہ اچھے نمبروں سے پاس ہو جائیں۔ کاش..... کاش کسی طرح وہ پیارے دن لوٹ آئیں۔“

”اللہ نے چاہا تو تم ایک بار پھر زندگی کا خوبصورت وقت دیکھو گی علیہ! ہم ایک پیارا سا گھر بنائیں گے جہاں ہمارے بہت سارے بچے ہوں گے اور تم ان بچوں کو سنبھالنے میں اتنی ہلکان ہو جاؤ گی کہ تمہیں میری طرف دیکھنے کی بھی فرصت نہیں ملے گی۔“ اسے اداس محسوس کر کے وہ اس کے قریب آیا اور اس کا ہاتھ تمام کر نرمی سے بولنا شروع کیا لیکن بولتے بولتے ہی یکدم ہنسی سے اتر گیا۔

”کیا کہا، بہت سارے بچے.....؟ کوئی بہت سارے بچے نہیں ہوں گے۔“ وہ سن کر بدگ مئی اور اس سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے تیزی سے بولی۔

”اچھا بابا جیسی تمہاری مرضی۔ میں ایک دو سے بھی کام چلا لوں گا۔“ اس نے فوراً فرمانبردار شوہر ہونے کا مظاہرہ کیا۔

”بہت ہی فضول بولتے ہیں۔ جائیں جا کر حلیہ درست کریں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ پھر تیلی مانی پندرہ منٹ میں کافی اور سینڈوچز لیے ہمارے سر پر سوار ہوگی۔“ شرم سے علیہ سرخ ہوئی اور خجالت مٹانے کے لیے اسے ڈپٹ کر بولی۔

”مامی..... اف مائی گاڈ۔ تم نے مس سینڈی کو مائی کا لقب دے دیا۔“ وقاص نے اس کی ساری بات میں سے مائی کا لفظ پکڑ لیا اور بے ساختہ ہنسا چلا گیا۔ کئی گھنٹوں کی ٹینشن

کے بعد یوں ہنسا نصیب ہو جانا بھی ایک نعمت تھی۔ علیہ بھی دھیرے سے مسکرا دی۔ اس کے مسکرانے پر دل میں اطمینان محسوس کرتا ہوا وقاص اٹیچڈ ہاتھ کی طرف بڑھ گیا۔

مس سینڈی نے حسب توقع ٹھیک پندرہ منٹ بعد ہی انہیں کافی اور سینڈوچز مہیا کر دیے تھے۔ ان لوگوں نے ساتھ بیٹھ کر ان سے انصاف کیا۔ ہلکی تھلکی گفتگو ہوتی رہی لیکن کسی نے بھی حالیہ صورت حال کو موضوع گفتگو نہ بنایا۔ البتہ وقاص کے گاہے بگاہے سیل فون کو دیکھنے اور میسجز ٹائپ کرنے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کچھ نہ کچھ ہے جو چل رہا ہے۔ سوال کرنے کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔ کھانے پینے سے فارغ ہو کر وہ اپنے کمروں میں آگئے۔ ان کی میزبان مس سینڈی پہلے ہی انہیں گڈ نائٹ کہہ کر سونے کے لیے جا چکی تھی۔

”مجھے افسوس ہے کہ میری غلطی کی وجہ سے لالہ کا وہ مکان دشمنوں کی نظر میں آ گیا اور اب شاید وہ بھی اس مکان کو استعمال نہ کر سکیں۔“ کمرے میں آ کر سونے کے لیے لیٹتے ہوئے علیہ نے ایک بار پھر اپنی شرمندگی کا اظہار کیا۔

”خواخواہ اس بات کو اپنے سر پر سوار مت کرو۔ ہم نے صرف احتیاطاً وہ جگہ چھوڑی ہے۔ ضروری نہیں کہ کچ بج تمہاری کال ٹریس ہوگی ہو اور کوئی وہاں حملہ کرنے کے لیے چڑھ دوڑا ہو۔“ وقاص نے اسے نشانی دی۔

”آپ بہت اچھے ہیں۔“ نیکی پر سر رکھتے ہوئے اس نے نہایت سادگی سے اعتراف کیا۔

”یہ اتنی پیاری باتیں، آپ جناب میں لپیٹ کر کرتی ہو تو ایسا لگتا ہے میں تمہارا شوہر نہیں، بزرگ ہوں۔“ اس نے شریں مسکراہٹ کے ساتھ اسے چھیڑا۔

”امی کہتی تھیں شوہر کا ہمیشہ احترام کرنا چاہیے۔ وہ خود ابو سے بہت احترام سے بات کرتی تھیں۔“ اس نے اسی سادگی سے جواب دیا تو وقاص نے بے حد محبت سے اسے دیکھا اور بولا۔

”تم بہت سادہ اور خالص ہو علیہ! میں خوش قسمت ہوں کہ مجھے تم ملیں۔“

”ہاں، یہ تو ہے۔ اتنی پیاری لڑکی آپ کو اور بھلا کہاں ملتی۔“ اس بار وہ شریں ہوئی اور ہنستے ہوئے اس کے بازو پر سر رکھ دیا۔ وقاص محبت سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں اسے لگا کہ وہ سو گئی ہے۔ خود اسے بھی ادکھ آگئی لیکن موبائل پر ہونے والی سیپ نے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔ وہ جلدی سے موبائل کی طرف متوجہ ہوا۔ اسکرین کو انگلیوں سے چھوتے ہی اس کی

تھے۔ اس الاؤ کو دکھانے کے بعد ویڈیو ختم ہو گئی تھی لیکن وہ یوں ساکت سا اسکرین کو دیکھ رہا تھا جیسے کوئی مجروح وقوع پذیر ہو جائے گا۔ اس کا یہ سکوت سسکیوں کی آواز سے توڑا۔
”کیا ہوا علیینہ! کیوں رو رہی ہو؟“ اس نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ ہنوز اس کے بازو پر سر رکھے لیٹی تھی اور یک ٹک اسکرین کو دیکھتے ہوئے روئے جا رہی تھی۔
”سب ختم ہو گیا، سب کچھ برباد ہو گیا۔ میری غلطی نے لالہ کے خواب کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔“ اس کے الفاظ سے ظاہر تھا کہ اس نے بھی اس کے ساتھ ساتھ وہ ویڈیو دیکھی ہے۔

”تم سوئی نہیں تھیں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔
”آپ جس قدر بے چین دکھائی دے رہے تھے، مجھے نیند آ سکتی تھی کیا؟“

”اچھا پریشان نہ ہو، جو ہونا تھا ہو گیا۔“ اگرچہ صدمہ اسے بھی پہنچا تھا لیکن اسے خود سے لپٹا کر تسلی دینے لگا۔

”لالہ ریٹائرمنٹ کے بعد اس گھر میں آکر رہنے کا خواب دیکھتے تھے لیکن اب تو یہ گھر ہی نہیں رہا۔“ اس کی سسکیاں تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔

”لالہ کو کوئی کمی تھوڑی ہے۔ وہ دوسرا گھر بنا لیں گے بلکہ ہو سکتا ہے دنیا کے کسی اور حصے میں اب بھی کوئی ایسا دوسرا گھر موجود ہو۔“ وہ اسے بہلانے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔
”یہ ویڈیو آپ کو کس نے بھیجی؟“ وہ تھوڑا سا سنبھلی تو اس سے دریافت کیا۔

”لالہ ہی کا آدمی ہے۔ لالہ کے گھر کے سیکورٹی کیمرے اس کے کمپیوٹر سے کنکٹ تھے۔“ اس نے تھکے تھکے لہجے میں بتایا۔

”مطلب اسے پتا تھا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے پھر بھی اس نے گھر کو بچانے کے لیے کچھ نہیں کیا اور ہمیں یہ ویڈیو بھیج دی۔“ وہ حیرت و اشتعال کی ملی جلی کیفیت میں بولی۔
”لالہ کی طرف سے مداخلت نہ کرنے کا حکم تھا۔ مداخلت کرنی ہوتی تو اسی وقت کردی جاتی جب یہ لوگ اسٹیٹ ایجنسی سے ہمارے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔“

”یعنی آپ لوگوں کو سب پتا تھا؟“ وہ مزید حیران ہوئی۔ جواب میں اس نے ٹھنڈی بات میں سر ہلایا۔

”پھر تو انہوں نے وہاں سے ہمارے بارے میں سب معلوم کر لیا ہوگا؟“ وہ گھبرائی۔
”معلوم کرنے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں۔ سافٹ اور

اسکرین پر ایک گھر کے کھلے دروازے سے اندر داخل ہوتے چار سیاہ پوش صاف دکھائی دے رہے تھے۔ یہ وہی گھر تھا جس کو وہ ابھی چند گھنٹوں قبل ہی چھوڑ کر آئے تھے۔ سیاہ پوش سائے اندر داخل ہو کر گھر کے مختلف حصوں میں پھیل گئے تھے اور اب اسکرین چار حصوں میں منقسم ہو کر ہر ایک کی حرکات دکھا رہی تھی۔ وہ چاروں پورے گھر کی تلاشی لے رہے تھے۔ تلاشی لینے کے ساتھ ساتھ وہ مختلف مقامات پر پاؤ ڈر چھڑک کر فنکٹر پرنس اٹھانے کا کام بھی کر رہے تھے۔ ان کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ گھر میں کسی بھی فرد کے موجود نہ ہونے سے اچھی طرح باخبر تھے اس لیے بے فکری سے اپنا کام کر رہے تھے۔ ان کی بے فکری کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے وہاں کسی خفیہ کیمرے کو تلاش کرنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی۔ شاید چہروں پر ماسک کی موجودگی کی وجہ سے انہیں اپنی شناخت کا کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ ان کی مہارت، پھرتی اور اعتماد سے ان کے تربیت یافتہ ہونے کا اندازہ ہو رہا تھا۔ آدھے گھنٹے کے اندر اندر انہوں نے اپنا کام نمٹایا اور ڈائنگ ایریا میں جمع ہو گئے۔ وہاں انہوں نے آپس میں مختصر مذاکرات کیے۔ ویڈیو میں صرف ان کی حرکات و سکنات دکھائی دے رہی تھیں، آواز نہیں آرہی تھی اس لیے وہ نہیں جان سکا کہ انہوں نے آپس میں کیا گفتگو کی ہے۔ جاننے کے لیے البتہ زیادہ دیر انتظار بھی نہیں کرنا پڑا۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے ان چاروں میں سے ایک شخص الگ ہو کر کچن ایریا کی طرف گیا۔ اب وہاں نصب کیمرہ اس شخص کی حرکات دکھا رہا تھا۔ کچن میں پہنچ کر اس نے چولہے کے دونوں برنز فل کھول دیے اور تیزی سے ڈائنگ ایریا کی طرف واپس آیا۔ اسے آتا دیکھ کر باقی تین میں سے ایک نے اپنی جیب میں سے لائٹر برآمد کیا اور کھانے کی میز پر رکھے شمع دان میں موجود تین عدد موم بتیوں کو روشن کر دیا۔

”اوہ مائی گاڈ!“ ان کا مقصد جان کر اس کے منہ سے اضطرابی طور پر نکلا لیکن عملاً وہ کچھ کر نہیں سکتا تھا اس لیے خاموشی سے تماشا دیکھتا رہا۔ موم بتیاں روشن کرنے کے بعد وہ چاروں بہت پھرتی سے وہاں سے باہر نکل گئے اور اسکرین پر محض وہ تین جلتی ہوئی موم بتیاں باقی رہ گئیں۔ آخر کار وہی ہوا جس کا ہونا طے پا چکا تھا۔ بند گھر میں چھپتی کیس نے جلد موم بتی کے ننھے شعلوں تک رسائی حاصل کر لی تھی اور اب ننھے شعلے بھڑکتے الاؤ میں تبدیل ہو چکے

”پلیز سونے دیں بھابی! مجھے بہت چکر آرہے ہیں۔ آنکھیں کھولنے کا دل نہیں چاہ رہا۔“ اس نے مندی مندی آنکھوں سے جواب دیا اور ایک بار پھر کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کی۔

”چکر اس لیے آرہے ہیں کہ تم نے کئی گھنٹوں سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ شاباش! اٹھو، اٹھ کر منہ ہاتھ دھوؤ۔ دیکھو شاہدہ تمہارے لیے فروٹس اور فریش جوس لائی ہے۔ دیر کرو گی تو جوس خراب ہو جائے گا۔“ اس کی بے ترتیب زلفوں کو انگلیوں کی مدد سے سمیٹ کر ماتھے سے پیچھے کرتے ہوئے فردوس نے دوبارہ اسے بکارا۔

”بچ بھابی..... مجھ سے کچھ نہیں کھایا جائے گا۔ عجیب متلی سی ہو رہی ہے۔“ اس نے یہ مشکل آنکھیں کھولتے ہوئے بے بسی کا اظہار کیا۔ آنکھیں کھولنے کے باوجود بائیں آنکھ پوری طرح نہیں کھل سکی تھی۔ یہ آنکھ شاید فیصل کی شوکر کی زد میں آگئی تھی کہ اتنا وقت گزرنے کے باوجود نہ تو اس پر پڑا نیل ہلکا ہوا تھا، نہ ہی سوجن ہی پوری طرح اترتی تھی۔ ”رات میں نے تمہیں جوائنکشن لگایا تھا، یہ اس کا اثر ہے۔ ہمت کر کے اٹھو گی اور تھوڑا کھاؤ پیو گی تو طبیعت میں بہتری آئے گی۔“

رات وہ اتنی شدید تکلیف میں تھی کہ فردوس کو مجبوراً اسے ایسا انجکشن لگانا پڑا تھا جو درد کی شدت گھٹانے کے ساتھ ساتھ نیند آور بھی تھا۔ فردوس جانتی تھی کہ اس قسم کا انجکشن لگانا مسئلے کا حل نہیں ہے لیکن اسے اسپتال لے جانے کی ہر کوشش میں ناکام ہو جانے کے بعد اس کے پاس یہی حل رہ گیا تھا۔

اس کی حالت دیکھ کر وہ اپنی انا کو پس پشت ڈال کر نرسین بھابی تک کے پاس سفارش کی گزارش کرنے لگی تھی۔ جس طرح بڑے بھائی ہونے کی حیثیت سے گھیل کی گھر میں بہت سنی جاتی تھی، اسی طرح بڑی بھالوج کی حیثیت سے ان کی بات بھی اہمیت رکھتی تھی۔ فیصل بھی دیگر بھابیوں کے مقابلے میں ان سے زیادہ انس رکھتا تھا اس لیے اسے امید تھی کہ اگر وہ زور دیں تو وہ اپنی ضد اور ہٹ دھرمی چھوڑ کر سب کو اسپتال بھیجنے پر راضی ہو جائے گا لیکن انہوں نے اس کی درخواست پر غور کرنے کے بجائے یوں ظاہر کیا تھا جیسے وہ اس معاملے میں قطعی بے بس ہوں۔ بے بسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ ایک ایسی بات بھی کہہ گئی تھی جس سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ سب کو اسپتال نہ بھجوانا دراصل ان سب کا متفقہ و مشترکہ فیصلہ ہے۔ انہوں نے کہا تھا۔

بارڈ دونوں طرح کا ریکارڈ مٹا دیا گیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ انہیں ایجنٹ نے ہمارے نام اور چلے بتائے ہوں گے جو پہلے ہی نقلی تھے اس لیے ان کی مدد سے کوئی ہم تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔“ اس کے پاس علیہ کے ہر سوال کا جواب تھا۔

”وہ لوگ گھر کی تلاشی کیوں لے رہے تھے؟“ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور دونوں پیر کھڑے کر کے گھنٹوں کے گرد بازو لپیٹے ہوئے اپنا بابا یاں رخسار گھنٹوں پر لگا دیا۔

”تصدیق کے لیے کہ اس گھر میں کون ٹھہرا ہوا تھا لیکن بے فکر رہو، ان شاء اللہ انہیں وہاں سے کچھ نہیں ملا ہوگا۔ ہمارے وہاں سے نکلتے ہی ایجنٹ نے گھر کی مکمل صفائی کروا ڈالی تھی۔“

”وہ کیوں؟“

”اسے حکم ملا تھا کہ مہمان رخصت ہو گئے ہیں۔ گھر کو مکمل کلیں کر دیا جائے۔“

”یعنی یہ آپ لوگوں ہی کا کام ہے۔ آپ لوگوں کو پہلے ہی سے خطرہ تھا کہ ایسا کچھ ہوگا اس لیے سارے انتظامات پورے تھے۔“

”ہم جس دنیا کے لوگ ہیں، ہمیں ایسا کرنا پڑتا ہے۔ اگر ہمارے انتظامات ادھورے رہ جائیں تو ہمارے دن پورے ہو جاتے ہیں۔“ نہایت رمان سے دیے گئے اس جواب پر وہ اس کی صورت نکتی رہ گئی۔

”پریشان مت ہو۔ میں لالہ کے دیے ہوئے قول پر قائم ہوں اور اب میرا جرائم سے کوئی تعلق نہیں رہا ہے لیکن یہ بات تمہیں سمجھنا پڑے گی کہ موجودہ حالات میں صرف یہی لوگ ہماری مدد کر سکتے ہیں اس لیے میں ان سے قطع تعلق نہیں کر سکتا اور لالہ سے تو اچھے بُرے ہر طرح کے حالات میں تعلق رہتا ہے۔ وہ میرا باپ بے شک نہیں ہے لیکن بالکل باپ جیسا ہے۔“

”وہ میرے بھی محسن ہیں اور سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میں آپ کو ان سے ترک تعلق پر مجبور کروں۔“ اس نے آہستہ سے جواب دیا اور بستر چھوڑ کر غسل خانے کی طرف بڑھ گئی۔ نیند نے تو اب آنا ہی نہیں تھا اس لیے بہتر تھا کہ وضو کر کے کچھ دیر عبادت ہی کر لی جاتی۔ کبھی کبھی پچھلے پہر کی عبادتیں وہ کمال کر جاتی ہیں جو دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں نہیں کر پاتیں۔

☆☆☆

”سبکل..... اٹھو، اٹھ کر تھوڑا سا کچھ کھا پی لو تو میں تمہیں میڈیسن دیتی ہوں۔“ سوئی ہوئی سبکل کے رخسار کو نرمی سے چھتھپاتے ہوئے فردوس نے اسے جگانے کی کوشش کی۔

سامنا کرنا پڑے گا۔“ وہاں رہتے رہتے وہ ان لوگوں کی خوب مزاج آشنا ہو چکی تھی۔ فردوس کے خلوص کے جواب میں ممنونیت کا اظہار کرتے ہوئے بے ساختہ ہی اس کی آنکھیں بھرا آئیں۔

”میں پہلے بھی ان کی گڈ بکس میں نہیں ہوں اس لیے تم میری فکر نہ کرو اور صرف اپنے بارے میں سوچو۔“

”اپنے بارے میں کیا سوچوں؟“ اس نے نا بھجی سے پوچھا۔

”یہی کہ ان حالات سے چھٹکارا کیسے حاصل کر سکتی ہو؟“

”ادا سائیکس کی واپسی تک تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہ رہا ہو جائیں تو میں اپنے لیے کوئی قدم اٹھا سکوں گی۔“

”یہ کوئی آسان کام نہیں ہے سب! غلطی سے سمندری حدود پار کر لینے والے بے گناہ ماہی گیر بھی برسوں جیلوں میں پڑے سڑتے رہتے ہیں اور عالم پر تو باقاعدہ قتل وغیرہ کے الزامات عائد کیے گئے ہیں۔ اس کی جان اتنی آسانی سے چھوٹی نظر نہیں آرہی مجھے۔ اس لیے تم حقیقت پسندی سے کام لو اور خود اپنے مسئلے کو حل کرنے پر فوکس کرو بلکہ اگر میری مانتو تو.....“ وہ بولتے بولتے ذرا سا جھجک کر رک گئی۔

”آپ کیسے بھابی! میں سن رہی ہوں۔“ اپنے سر میں اٹھتی درد کی ٹیسوں کو برداشت کرتے ہوئے اس نے فردوس کو بات مکمل کرنے کا اشارہ دیا۔

”شاید تمہیں میرا مشورہ مناسب نہیں لگے لیکن حالات کو دیکھتے ہوئے میں اب تم سے یہی کہوں گی کہ اس دن ہمیں عالم کا جو دوست ملا تھا، تمہیں اس کی آفر کو کنفیڈر کرنا چاہیے۔“

”جی.....؟“ فردوس کا مشورہ سن کر اس کا منہ چل گیا۔

”میں جانتی ہوں کہ تمہارے لیے یہ سوچنا بھی مشکل ہے لیکن میں تمہیں اس بات کا مشورہ دے رہی ہوں تو صرف اس لیے کہ میں ان لوگوں کو تم سے زیادہ بہتر جانتی ہوں۔ بظاہر یہ ایک تعلیم یافتہ اور کلچرڈ گھرانہ ہے لیکن اندر سے یہ کتنے بے لچک اور خود غرض لوگ ہیں، اسے سمجھنے کے لیے تمہیں ایک لمبا عرصہ درکار ہوگا اور میں نہیں چاہتی کہ تم اپنی زندگی کا قیمتی وقت اس فضول تجربے کے حصول میں ضائع کرو۔“ سب کے ساتھ اس گھر میں جو کچھ ہو رہا تھا، اس نے اسے اپنے ماضی کے زخم یاد دلادیے تھے اسی لیے وہ اپنے سرال والوں کے خلاف وہ کچھ کہہ رہی تھی جو اب تک کسی سے نہیں کہا تھا۔ یہاں تک کہ اپنے میکے والوں سے بھی سارے حالات چھپاتی رہی تھی۔ اس کی شوخ و شنگ اور پُر اعتماد شخصیت کے اندر جس زخمی اور خوفزدہ عورت کا جنم

”پہلے تم کچھ دوا دارو کر کے اس کی ظاہری حالت تو ٹھیک کر دو پھر بعد میں نیورولوجسٹ کو بھی دکھالینا۔ ایسی کنڈیشن میں اسپتال لے جاؤ گی تو فیصل کو گھریلو تشدد کے الزام میں حوالات میں بند کر دیا جائے گا۔“ یعنی وہاں سب کی زندگی بچانے سے زیادہ فیصل کو قانون کی گرفت میں آنے سے بچانے کی کوشش کی جارہی تھی۔

”شاید..... ایسا کرو کہ یہیں سلفی لا کر کئی وغیرہ کروالو۔ اٹھ کر ہاتھ روم تک جانے کی تو اس میں طاقت بھی دکھائی نہیں دے رہی۔“ یہ محسوس کر لینے کے بعد کہ وہ واقعی بستر سے اٹھنے کے قابل نہیں، اس نے ملازمہ کو حکم دیا۔

”جی اچھا۔“ وہ تابعداری سے حرکت میں آ گئی۔ اس کے جانے کے بعد فردوس نے سب کو سہارا دے کر اٹھایا۔ ذہنی دباؤ اور درد کی شدت کے باعث اسے بخار بھی ہو رہا تھا۔ اپنے تجربے کی بنیاد پر فردوس بغیر تھرما میٹر سے چیک کیے بھی اندازہ لگا سکتی تھی کہ بخار کی شدت کسی طور ایک سو ایک ڈگری سے کم نہیں ہے۔

”اعظم کہاں ہے بھابی؟“

”اس کی تم فکر نہ کرو۔ وہ بچیوں کے کمرے میں ان کے ساتھ آرام سے سو رہا ہے۔ اس کی دیکھ بھال کے خیال سے رات میں نے شاید کو بھی وہیں سلایا تھا۔ بڑی تعریفیں کر رہی تھی کہ بڑا بیباچہ ہے۔ فیڈر کے لیے جاگنے کے سوا ایک بار بھی تنگ نہیں کیا۔“ انہوں نے اس کی تشفی کے لیے ذرا تفصیلی جواب دیا۔

”یہ تو واقعی سچ ہے۔ میرا بچہ بڑا صبر والا ہے۔“ ہر ماں کی طرح اپنی اولاد کی تعریف اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لے آئی۔

”کچھ دن میری بیٹیوں کی محبت میں رہے گا تو ساری عادتیں بگڑ جائیں گی۔ تینوں ایک سے بڑھ کر ایک شریر ہیں۔“ فردوس نے گویا اسے آگاہ کیا۔

”شریر ہونا کوئی برائی نہیں بس بد تمیز نہیں ہونا چاہیے اور ماشاء اللہ آپ کی تینوں بیٹیاں ہی تمیز دار ہیں۔“ اس نے کھلے دل سے تعریف کی۔ اسی دوران شاید سچی اور دیگر سامان سنبھالے چلی آئی اور منہ ہاتھ دھونے میں اس کی مدد کرنے لگی۔ اس کام سے فارغ ہو کر فردوس نے اپنی نگرانی میں اسے بہ اصرار جوس اور فروٹس پر مشتمل ہلکا پھلکا ناشتا کر دیا اور دوائیں کھلائیں۔ شاید کو اس نے باہر بھیج دیا تھا۔

”تمہیں یو بھابی! مجھے معلوم ہے کہ میرے لیے اتنا سب کرنے کے لیے آپ کو کئی لوگوں کی مخالفت اور طنز کا

سامنا کرنا پڑے گا۔“ وہاں رہتے رہتے وہ ان لوگوں کی خوب مزاج آشنا ہو چکی تھی۔ فردوس کے خلوص کے جواب میں ممنونیت کا اظہار کرتے ہوئے بے ساختہ ہی اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

”میں پہلے بھی ان کی گڈ بکس میں نہیں ہوں اس لیے تم میری فکر نہ کرو اور صرف اور صرف اپنے بارے میں سوچو۔“
”اپنے بارے میں کیا سوچوں؟“ اس نے ناگہی سے پوچھا۔

”یہی کہ ان حالات سے چھٹکارا کیسے حاصل کر سکتی ہو؟“
”ادا سائیکس کی واپسی تک تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہ رہا ہو جائیں تو میں اپنے لیے کوئی قدم اٹھا سکوں گی۔“

”یہ کوئی آسان کام نہیں ہے سبیل! غلطی سے سمندری حدود پار کر لینے والے بے گناہ ماہی گیر بھی برسوں جیلوں میں پڑے سڑتے رہتے ہیں اور عالم پر تو باقاعدہ قتل وغیرہ کے الزامات عائد کیے گئے ہیں۔ اس کی جان اتنی آسانی سے چھوٹی نظر نہیں آ رہی مجھے۔ اس لیے تم حقیقت پسندی سے کام لو اور خود اپنے مسئلے کو حل کرنے پر فکس کرو بلکہ اگر میری مانو تو.....“ وہ بولتے بولتے ذرا سا جھجک کر رک گئی۔

”آپ کہیے بھابی! میں سن رہی ہوں۔“ اپنے سر میں اشقی درد کی نیسوں کو برداشت کرتے ہوئے اس نے فردوس کو بات مکمل کرنے کا اشارہ دیا۔

”شاید تمہیں میرا مشورہ مناسب نہیں لگے لیکن حالات کو دیکھتے ہوئے میں اب تم سے یہی کہوں گی کہ اس دن ہمیں عالم کا جو دوست ملا تھا، تمہیں اس کی آفر کو کسید کرنا چاہیے۔“
”جی.....؟“ فردوس کا مشورہ سن کر اس کا منہ مکمل گیا۔

”میں جانتی ہوں کہ تمہارے لیے یہ سوچنا بھی مشکل ہے لیکن میں تمہیں اس بات کا مشورہ دے رہی ہوں تو صرف اس لیے کہ میں ان لوگوں کو تم سے زیادہ بہتر جانتی ہوں۔ بظاہر یہ ایک تعلیم یافتہ اور کلچرڈ گھرانہ ہے لیکن اندر سے یہ کتنے بے لچک اور خود غرض لوگ ہیں، اسے سمجھنے کے لیے تمہیں ایک لمبا عرصہ درکار ہوگا اور میں نہیں چاہتی کہ تم اپنی زندگی کا قیمتی وقت اس فضول تجربے کے حصول میں ضائع کرو۔“ سبیل کے ساتھ اس گھر میں جو کچھ ہو رہا تھا، اس نے اسے اپنے ماضی کے زخم یا دلدل دیے تھے اسی لیے وہ اپنے سسرال والوں کے خلاف وہ کچھ کہہ رہی تھی جو اب تک کسی سے نہیں کہا تھا۔ یہاں تک کہ اپنے میکے والوں سے بھی سارے حالات چھپائی رہی تھی۔ اس کی شوخ و شنگ اور پُر اعتماد شخصیت کے اندر جس زخمی اور خوفزدہ عورت کا جنم

”پہلے تم کچھ دوا دارو کر کے اس کی ظاہری حالت تو ٹھیک کرو پھر بعد میں نیورولوجسٹ کو بھی دکھالینا۔ ایسی کنڈیشن میں اسپتال لے جاؤ گی تو فیصل کو گھریلو تشدد کے الزام میں حوالات میں بند کر دیا جائے گا۔“ یعنی وہاں سبیل کی زندگی بچانے سے زیادہ فیصل کو قانون کی گرفت میں آنے سے بچانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

”شاید..... ایسا کرو کہ یہیں سبیل لاکر کئی وغیرہ کروالو۔ اٹھ کر ہاتھ روم تک جانے کی تو اس میں طاقت بھی دکھائی نہیں دے رہی۔“ یہ محسوس کر لینے کے بعد کہ وہ واقعی بستر سے اٹھنے کے قابل نہیں، اس نے ملازمہ کو حکم دیا۔

”جی اچھا۔“ وہ تابعداری سے حرکت میں آ گئی۔ اس کے جانے کے بعد فردوس نے سبیل کو سہارا دے کر اٹھایا۔ ذہنی دباؤ اور درد کی شدت کے باعث اسے بخار بھی ہو رہا تھا۔ اپنے تجربے کی بنیاد پر فردوس بغیر تھرما میٹر سے چیک کیے بھی اندازہ لگا سکتی تھی کہ بخار کی شدت کسی طور ایک سو ایک ڈگری سے کم نہیں ہے۔

”اعظم کہاں ہے بھابی؟“

”اس کی تم فکر نہ کرو۔ وہ بچیوں کے کمرے میں ان کے ساتھ آرام سے سو رہا ہے۔ اس کی دیکھ بھال کے خیال سے رات میں نے شاید کو بھی وہیں سلا یا تھا۔ بڑی تعریفیں کر رہی تھی کہ بڑا میا بچہ ہے۔ فیڈر کے لیے جاگنے کے سوا ایک بار بھی تنگ نہیں کیا۔“ انہوں نے اس کی تشفی کے لیے ذرا تفصیلی جواب دیا۔

”یہ تو واقعی سچ ہے۔ میرا بچہ بڑا صبر والا ہے۔“ ہر ماں کی طرح اپنی اولاد کی تعریف اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لے آئی۔

”کچھ دن میری بیٹیوں کی صحبت میں رہے گا تو ساری عادتیں بگڑ جائیں گی۔ تینوں ایک سے بڑھ کر ایک شری رہیں۔“ فردوس نے گویا اسے آگاہ کیا۔

”شریر ہونا کوئی برائی نہیں بس بد تمیز نہیں ہونا چاہیے اور ماشاء اللہ آپ کی تینوں بیٹیاں ہی تمیز دار ہیں۔“ اس نے کھلے دل سے تعریف کی۔ اسی دوران شاید سبیل اور دیگر سامان سنبھالے چلی آئی اور منہ ہاتھ دھونے میں اس کی مدد کرنے لگی۔ اس کام سے فارغ ہو کر فردوس نے اپنی نگرانی میں اسے بہ اصرار جوس اور فردوس پر مشتمل ہلکا پھلکا ناشتا کروایا اور دوا مکین کھلائیں۔ شاید وہ اس نے باہر بیج دیا تھا۔

”تھینک یو بھابی! مجھے معلوم ہے کہ میرے لیے اتنا سب کرنے کے لیے آپ کو کئی لوگوں کی مخالفت اور طعنے کا



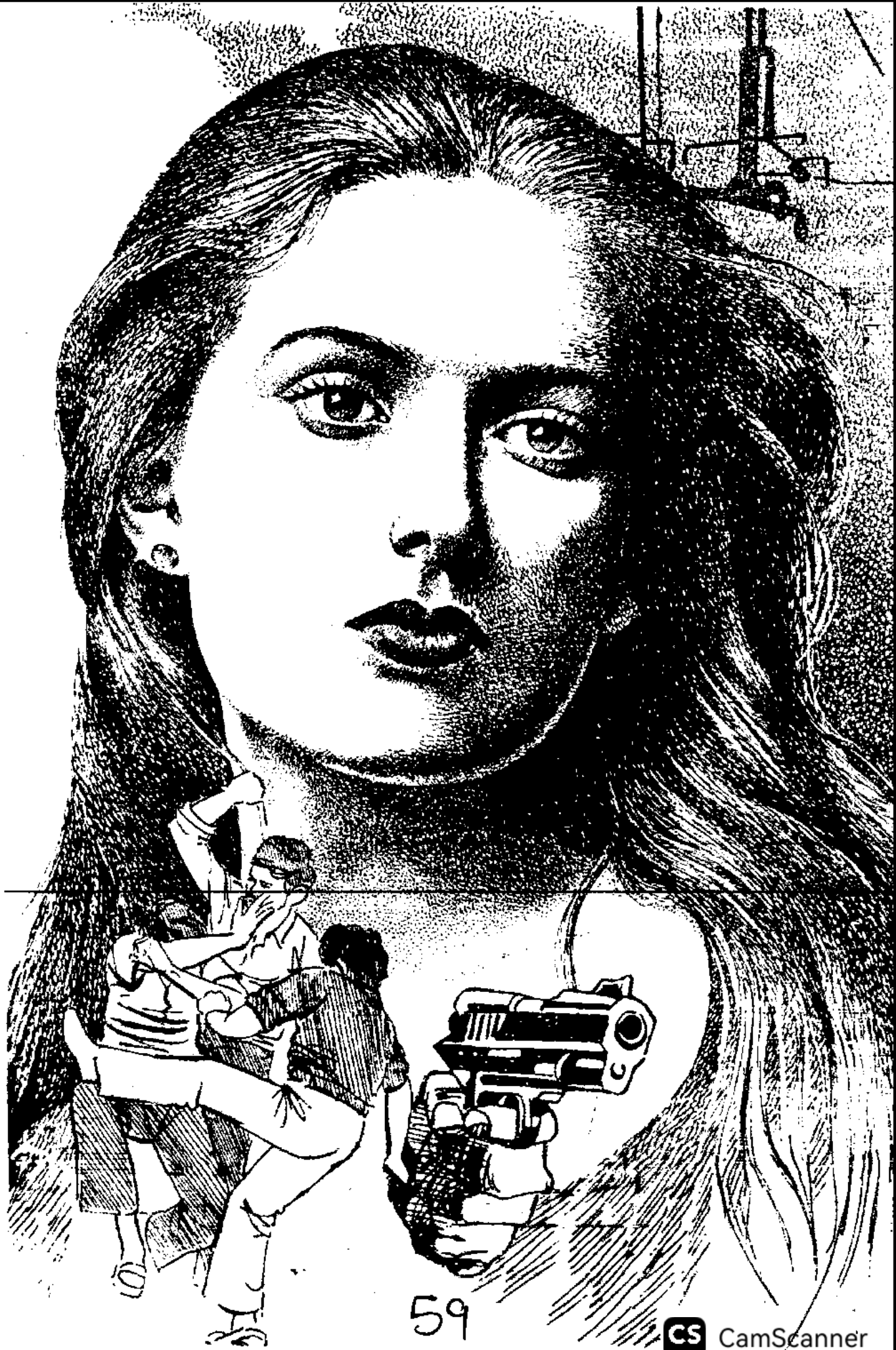
قسط: 22

سہ ماہی

سہ ماہی

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تندو تیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابل شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پُر عزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جا رہے تھے... اس کی زندگی جو انیسویں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... یہ خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی یہ قرار یوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تار عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ پروار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ وارداتِ قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہو سکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تحیر انگیز داستان



معاذ ایک ذہین مین مٹون حراج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جوائن کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ انسٹی ٹیوٹ سے واپس آ رہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو سڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی بزرگ فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشری نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بشری ماس کمیونی کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم وغیرہ لکھتی ہے۔ اس دوران جگہ جگہ وہ ایک زیرِ تعمیر ہائٹی منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی آئی تھی۔ معاذ بشری کو یہ حفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کر دیتا ہے لیکن جن رئیس زادوں سے اس نے ان کا شکار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور موفیے کی تلاش میں رہتے ہیں۔ یہ سوچ انہیں یونیورسٹی ٹرپ کی صورت میں مل جاتا ہے اور ایک جنگل کی سیر کے دوران وہ فوٹو گرافی کے شوق میں سب سے الگ تھلگ ہو جانے والے معاذ کو بے خبری میں گھیر کر بری طرح زد و کوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دے دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس نہ آنے پر انتقامیہ کے افراد، پولیس اور ریسکیو ذرائع کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جگہ کی چھوٹی سی گلی میں پاتا ہے۔ اپنی حالت سے اسے اپنے شدید زخمی ہونے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ جوگی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ معاذ کا موبائل جنگل میں ہی کہیں گر جاتا ہے اور جوگی کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا جس سے باہر کھد دنیا سے رابطہ کیا جاسکے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے۔ جوگی ہم اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نوازا کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے پراسرار علم سکھانے کی ہائی بھر لیتا ہے اور معاذ واقعی اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ادھر جانے دوڑے سے ملنے والے معاذ کے کمرے سے جب تصویریں نکلوا لی جاتی ہیں تو بہت سے قدرتی مناظر کی تصویروں میں سے ایک ایسی تصویر بشری کی نظر میں آ جاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانکنا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پردیجیٹ کے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشری تحقیق کر رہی تھی۔ بشری کے اپنے والد جرنلست ہیں اور حق گوئی ان کے خون میں شامل ہے۔ اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشری کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ مدد سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باڈل نامی شخص نے کامیاب ہوتا ہے۔ بشری انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دنوں میں ہی معاذ واپسی کا ارادہ کرتا ہے تاہم دوسرے ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا مر قان اللہ اور یزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو وقاص نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باڈل اچانک بشری کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر دیتا ہے۔ ادھر معاذ کو واپس لانے کے لیے اوجھے جھکنڈے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اسے واپس آنے کا پیغام دیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کر کے اسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات لی جاتی ہیں، نہ بتانے پر اس کے بھائی کا ایک گردہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشری بھی انتقام کی آگ میں جلتی ہوئی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریڈنگ شروع ہو جاتی ہے۔ معاذ کو بچانے والا لڑکا وقاص اپنے گرو کے ساتھ ایک پارٹی میں جاتا ہے۔ وہاں اسے معاذ کے حوالے سے مشکوک ایک شخص نظر آتا ہے۔ وہ اس کے پیچھے جاتا ہے مگر اسے گھیر لیا جاتا ہے۔ بہر حال وقاص کو سمجھنے کے ساتھ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ادھر معاذ کے دوست عالم شاہ کے بہنوئی کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ کئی فٹون میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے پہتا تا کر کے اس کے دماغ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ فٹون سے حاصل انوکھے علم کی بدولت ان کا معمول نہیں جتا۔ بشری، کامران کو چھاپنے کا پروگرام بناتی ہے۔ ادھر عالم شاہ سراغ لگا لیتا ہے کہ اس کے بہنوئی کا قتل کس نے کیا۔ وہ قاتل کو گھیرتا ہے اور اپنے تئیں اسے گولیاں مار کر قتل کر دیتا ہے۔ تاہم وہ جی جاتا ہے۔ عالم شاہ اس کے بعد ڈاکوؤں کے سردار چاچو کو چھاپتا ہے اور اسے کینر کر دار تک پہنچاتا ہے۔ اس کے پیچھے پولیس لگ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور اس کا نوکر سردہ ہاڈل کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ ادھر معاذ جاسوس کا تھر کو پہتا تا کر کے اس کے ذریعے اسے نکالنے والوں پر حملہ کر دیتا ہے تاہم ان کی قاتلنگ سے تھر مارا جاتا ہے اور الزام معاذ پر نہیں آتا مگر معاذ سے کام لینے والوں کو اس پر شک گزرتا ہے۔ عالم کی بہن کل شاہ کے نوکر کو دینے کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اغوا کا الزام لطیف سومرو پر آتا ہے۔ عالم شاہ وہاں موجود ایک زخمی شخص کی مدد سے باڈل کی قید سے بھٹکارا پالیتا ہے۔ ادھر بشری دینی کالج جاتی ہے۔ وہاں وقاص اسے باربی کے روپ میں پہچان لیتا ہے اور ان دونوں

کے درمیان احسان کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ وہ سلطان کو مارنا چاہتی ہے تاہم وقاص اسے ایسا کرنے سے روکتا ہے۔ ادھر عالم شاہ، باذل لی نید سے نکل کر اس کا چچا کرتا ہے تاہم وہاں اچانک فائرنگ اور دھماکے ہونے لگتے ہیں۔ وہ وہاں معاذ کو دیکھتا ہے۔ صداقت شاہ، لطیف سومرو کو گھیرنے کے لیے اس کی خفیہ بیوی اور بچے کا کھوج لگاتے ہیں اور بچے کو اغوا کر لیتے ہیں۔ لطیف سومرو مجبور ہو جاتا ہے۔ معاذ کو اس کے گھر والوں سے ملنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ عالم شاہ کو اس کے والد اعظم یارو انکی کا عندیہ دیتے ہیں۔ ادھر معاذ بھی ایک مشن پر سونپا کے ساتھ اعظم یارو انہ ہوتا ہے تاہم کچھ لوگ سمجھ پاتریوں سے بھری بس کو یرغمال بنا لیتے ہیں۔ معاذ اور سونپا نہ خانے کے تمام افراد کو کھانے لگا دیتے ہیں تاہم باہر موجود دیگر اغوا کاروں سے مقابلہ ہوتا ہے اور معاذ زخمی ہو جاتا ہے۔ صداقت شاہ کے اعظم یارو میں موجود رشتے دار کے ہاں شادی ہوتی ہے۔ عالم شاہ، سگل اور سرمد اعظم یارو انہ ہو جاتے ہیں۔ انرپورٹ سے گھر روانگی پر راستے میں کچھ ٹیرے انہیں لوٹ لیتے ہیں۔ عالم شاہ انکیشن میں آتا چاہتا ہے تاہم اجالا نامی عالم شاہ کی کزن اس کا راستہ روک لیتی ہے۔ گھر پہنچنے پر پولیس کی ریڈ ہوتی ہے اور وہ عالم شاہ اور سرمد کو لے جاتے ہیں۔ ادھر بشری اور وقاص باذل کو اسپتال میں مارنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ فوجی جاتا ہے۔ معاذ اور سونپا پناہ کی تلاش میں ہوتے ہیں اور بالآخر اپنے سہولت کاروں سے مل جاتے ہیں۔ عالم شاہ اور سرمد کو تشدد کا نشانہ بنا کر ویرانے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ واپس اپنے میزبانوں کے ہاں پہنچ جاتے ہیں۔ شادی کے دوران انہیں پتا لگتا ہے کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں اجالا اور اس کا عاشق شامل ہوتے ہیں۔ وہ چھپ کر ان کی باتیں سن رہا ہوتا ہے کہ اسے چھاپ لیا جاتا ہے۔ تاہم وہاں مارا ماری ہوتی ہے اور اجالا کا عاشق مارا جاتا ہے۔ پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ ان کے کزن انہیں اپنے دوسرے خفیہ ہنگامے پر پہنچا دیتے ہیں جہاں کچھ لوگ ان پر حملہ کر دیتے ہیں۔ وہ وہاں سے بھگتات نکل جاتے ہیں۔ ادھر معاذ کو سونپا اپنے ساتھ نئے مشن پر لے کر جاتی ہے جس میں ایک ریلوے لائن کو دھماکے سے اڑانا ہوتا ہے۔ معاذ ایسا نہیں چاہتا اس لیے وہ ٹرین کی آمد سے قبل بارودی دھماکا کر دیتا ہے۔ وہ زخمی ہو جاتا ہے اور اسے ہندو سادھو اپنی کنیسا میں لے جاتا ہے جہاں اس کی اچھی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ سونپا کے آدمی معاذ کو تلاش کرتے ہیں مگر ناکام ہو جاتے ہیں۔ ادھر عالم شاہ اور سرمد خفیہ ذریعے سے بارڈر پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس ٹرک میں وہ محسوس ہوتے ہیں وہ اچانک بھٹکے سے رک جاتا ہے۔ اور وہ دھر لیے جاتے ہیں اور "را" کی قید میں پہنچ جاتے ہیں۔ انہیں تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ادھر بشری باذل کو مارنے کی کوشش میں خود کشاں نہ بن جاتی ہے۔ معاذ سادھو کی مدد سے ایک انڈین ہیر وٹن کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ وہیں اسے عالم اور سرمد کی گرفتاری کا پتا چلتا ہے۔ ادھر سگل کو اس کا شوہر ذہنی اذیت دیتا ہے۔ معاذ ڈاکٹر فر دوس سے ملتا ہے اور اسے سگل کی مدد کرنے کا کہتا ہے۔ عالم اور سرمد قید سے فرار کا سوچتے ہیں اور دھر لیے جاتے ہیں جس کی پاداش میں انہیں مزید تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ معاذ، وشاکا کے ذریعے عالم اور سرمد کو رہائی دلوانا چاہتا ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ اس کا چچا کرتا ہے تاہم وشاکا کی چڑی حاد نے کا شکار ہو جاتی ہے۔ علیحدہ اور وقاص وغیرہ کو لالہ بھلی نے ملک سے باہر نکال دیا تھا اور ہر ممکن احتیاط کی ہدایت کی تھی لیکن علیحدہ نے پاکستان میں ٹوبہ سے رابطہ کیا تھا جو ان کے لیے مصیبت بن گیا۔ ادھر معاذ سگل کے لیے پریشان تھا اور اسے وہاں سے نکالنا چاہتا تھا۔ سگل کو فر دوس نے بھی سمجھایا تھا کہ وہ وہاں سے بھاگ نکلے۔ اسی دوران کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ اپنا جملہ مکمل نہ کر سکی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیں

بھلے سے اس نے ہمارے ساتھ اچھا نہیں کیا لیکن میں ہمایہ ہونے کا حق ادا کرنے چلا آیا۔
"کس نے کس کے ساتھ کیا، کیا اس وقت آپ اس حساب کتاب کو جانے دیجیے سومرو صاحب! آپ میرے مہمان ہیں اور ہمارے ہاں مہمان کو بے عزت کرنے کا رواج نہیں ہے۔" صداقت شاہ نے اسے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا اور اپنی پشت پر مودب کھڑے سگل کی طرف رخ کر کے اس سے بولے۔

"مہمان کے لیے کوئی چائے پانی کا انتظام کرو سگل۔"
"اس کی ضرورت نہیں سائیں! بندہ بھلے وقت میں آئے تو خاطر تواضع کر داتا اچھا بھی لگتا ہے۔ ابھی تو میں آپ سے آپ کے اکلوتے پٹ کاغذوں کو لے آیا ہوں۔"

دسمبر 2021ء

صداقت شاہ نے آنے والے مہمان کو خالی خالی نظروں سے دیکھا۔ موجودہ حالات میں جبکہ دوست بھی ان سے نظریں چرانے لگے تھے، دشمن کا ملاقات کے لیے چلا آنا باعث حیرت تھا۔
"کیا حال ہے سائیں؟ مزاج کیسا ہے آپ کا؟"
چہرے پر منافقانہ مسکراہٹ نبھائے ان سے مصافحہ کرتے ہوئے اس نے ان کا حال پوچھنے سے زیادہ گویا ان کی حالت سے خطا اٹھایا۔

"ٹھیک ہوں سومرو صاحب! آپ سنا میں، آپ نے کیسے زحمت کی؟" انہوں نے خود کو سنبھالتے ہوئے مکار آنکھوں والے لطیف سومرو سے دریافت کیا۔
"بس سائیں! آپ کے پٹ کاغذوں کو لے کر رہ نہیں سکا۔"

”کیسا افسوس.....؟ میرا بیٹا ابھی زندہ ہے۔“
صداقت شاہ کی آواز خود بخود بلند ہو گئی۔

”ہے تو کسی پر کب تک رہے کیا معلوم.....؟ یہ انڈینز تو پاکستانیوں کے لیے ویسے بھی بڑے ظالم ہیں۔ ذرا رو رعایت نہیں کرتے ہمارے لوگوں کے ساتھ اور آپ کے بیٹے کے خلاف تو ثبوت بھی بڑے پکے ہیں۔“ وہ ان کے زخموں پر نمک چھڑک رہا تھا۔

”مجھے ان ثبوتوں سے کوئی لینا دینا نہیں۔ حالات جو بھی ہوں، میرے دل کو پورا یقین ہے کہ میرے بیٹے نے کوئی غلط اور غیر قانونی حرکت نہیں کی ہوگی۔ وہ یقینی طور پر کسی سازش کا نشانہ بنا ہے۔“

”سارے ماں بہو اپنی اولاد کے بارے میں ایسا ہی سوچتے ہیں۔“ اسے بھی صداقت شاہ کے یقین سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ وہ تو یہاں بس مزے لینے آیا تھا۔

”کیا آپ بھی اپنے بیٹے پر ایسا یقین رکھتے ہیں سومرو صاحب؟“ صداقت شاہ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سرد لہجے میں پوچھا تو وہ گڑبڑا سا گیا۔
”کک..... کیوں نہیں۔“

”اس کے باوجود کہ وہ بد کردار، شرابی اور جواری تھا اور اس کے باقاعدہ ڈاکوؤں کے ساتھ تعلقات تھے؟“ ان کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

”آپ میرے بیٹے پر جھوٹے الزامات لگا رہے ہیں۔“ توہن سے اس کی سیاہ رنگت مزید سیاہ پڑ گئی۔

”بالکل نہیں سومرو صاحب! اگر آپ کو یقین نہیں ہے بابا تو کسی بھی اچھے انویسٹی گٹر کو ہائر کر کے سب باتوں کی تصدیق کروالیں۔ تھوڑے پیسے لے کر کافی لوگ یہ کام کر دیتے ہیں۔“ وہ زیرک سیاست دان تھے اور انہوں نے سومرو کی باتیں اسی پرالٹ دینے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔

”خیر چھوڑیں ان باتوں کو۔ بیچارہ آپ کا بیٹا مہینوں سے بستر پر پڑا ہے۔ سنا ہے اس کا شمار زندوں میں ہے اور نہ مردوں میں۔ اب بھلا ایسے بندے کے بارے میں کیا بات کرنا۔“ انہوں نے ترکش تھا تا تھا تو پھر تیر پر تیر چلاتے جا رہے تھے۔

”خیر ہے سائیں! ایک بیٹا مر بھی گیا تو دوسرا موجود ہے نامیری نسل چلانے کو..... پر آپ کا کیا ہوگا؟ آپ کا تو اکھوتا بیٹا ہے نا؟“

”دوسرا..... ہاں وہ اس فلم ایکٹریس کا بیٹا، سنا ہے

بازاری عورت ہے۔ چلیں آپ کی مرضی کہ بازاری عورت سے بھی نسل چلا کر خوش ہیں۔ ہم تو جالور بھی کم نسل رکھنا پسند نہیں کرتے۔“ وہ عموماً اس طرح کی گفتگو نہیں کرتے تھے لیکن اس شخص نے ان کے اندر کے جاگیردار کو جگا دیا تھا۔ وہ ایسے حالات میں ان کے دل پر چر کے لگانے آیا تھا جب وہ بے انتہا مشکل میں تھے۔ برسوں کی سیاسی خدمات کے باوجود ان حالات میں کوئی انہیں سہارا دینے کو تیار نہیں تھا۔ ٹھیکل کورٹم بھی انہوں نے ایک تھریڈ پارٹی کو بھاری معاوضہ دے کر غیر قانونی طریقے سے بھجوائی تھی۔ کوشش کے باوجود وہ بھارت کا ویزا حاصل کرنے میں ناکام تھے پھر گھر میں الگ مشکل تھی۔ ماں، بیٹے کے لیے پریشان ہو ہو کر بستر سے لگ گئی تھی۔ ڈاکٹروں کے لیے اس کے بی پی اور شوگر کو کنٹرول کرنا چیلنج بن گیا تھا۔ مول کا بھی رورور کر برا حال تھا اور وہ اس واقعے کے بعد سے مرجھا کر رہ گئی تھی۔ ہر حال میں ان کا ساتھ دینے والے قربان شاہ الگ ناراض ناراض سے تھے۔ انہیں بجل کا فیصل سے نکاح ذرا نہیں بھایا تھا اور وہ اس اندیشے کا شکار تھے کہ بیٹے کو ہمیشہ کے لیے کھودینے کے بعد اب وہ پوتے کی صورت کو بھی ترس جائیں گے۔ ایسے حالات میں وہ اس شخص کو کتنی دیر برداشت کر سکتے تھے۔

”آپ میری توہین کر رہے ہیں صداقت سائیں!“ غصے میں لطف سومرو کے نقوش بگڑ سے گئے تھے۔

”میں نے آپ کو دعوت نہیں دی تھی کہ آپ یہاں آ کر اپنی توہین کروائیں۔“ انہوں نے ٹھنڈے لہجے میں انہیں جواب دیا۔

”میرا دماغ خراب تھا کہ میں اخلاق نبھانے کو یہاں آ گیا تھا۔“ وہ غصے سے کھڑا ہو گیا۔

”آپ جیسوں کی زبان پر اخلاقیات کے قصے بچتے نہیں ہیں۔“

”لعنت ہے۔“ وہ جھنجھلا کر وہاں سے چلا گیا۔

”مجھے معاف کر دینا میرے مالک! تو جانتا ہے میں غرور کرنے اور بڑے بول بولنے والوں میں سے نہیں ہوں لیکن اس شخص کی کیننگی کا بھی حل تھا میرے پاس۔“ لطف سومرو کے جاتے ہی انہوں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور دل ہی دل میں رب سے توبہ کرنے لگے۔ مزاجاً پہلے بھی وہ روایتی جاگیرداروں کی طرح ظالم اور مغرور نہیں تھے اور اب اپنے دو بچوں کی زندگیوں کی مشکل میں پڑ جانے کے بعد تو رہی سہی کسر بھی نکل گئی تھی۔ اب وہ صرف ایک ایسے باپ تھے جو ہر طرف سے مایوس ہو کر عاجزی سے اپنے رب کے

حضور جھکے اس سے اپنی اولاد کی سلامتی مانگتے رہتے تھے۔

☆☆☆

”اجالا تم! وہاں کیوں کھڑی ہو؟ آؤ اندر آ جاؤ۔“

ان دونوں میں سے پہلے فردوس نے خود کو سنبالا اور کھلے دروازے میں کھڑی اجالا سے مخاطب ہوئی۔ گھر سے دوری کے اس عرصے میں وہ خاصی تبدیل ہوئی تھی۔ صحت گر جانے سے اس کے رخساروں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ چمکتی جلد زرد اور بے رونق سی نظر آرہی تھی۔ اسٹاکلش کنگ والے پال بے ترتیب اور روکھے پھیکے ہو چکے تھے اور سب سے بڑھ کر اس کی آنکھوں کی ویرانی اور وحشت تھی جس کے باعث اسے دیکھ کر عجب سا احساس ہو رہا تھا۔

”یہ قاتل کی بہن اس گھر میں کیا کر رہی ہے؟ میں نے سنا ہے اس کا فیصل سے نکاح ہو گیا ہے۔“ اس کی آنکھوں میں شعلے سے لپکنے لگے تھے۔

”تم میرے ساتھ آؤ اجالا! میں تمہیں آرام سے سب بتاتی ہوں۔“ فردوس نے اس کا غیر معمولی انداز محسوس کیا تو لا شعوری طور پر اپنی جگہ چھوڑ دی اور نرمی سے اس کا ہاتھ تمام کمرے سے باہر لے جانے کی کوشش کی۔

”چھوڑیں مجھے۔“ اجالا نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور تیزی سے کھل کی طرف لپکی۔

”تیرے بھائی نے مجھ سے میرے سنبیل کو چھین لیا اور تو یہاں میرے گھر میں مزے کر رہی ہے۔ میں تجھے ہرگز یہاں نہیں رہنے دوں گی۔“ اپنے جنون میں اسے کھل کی ابتر حالت دکھائی نہیں دی اور لپک کر اس کی گردن دیوچلی۔

”کیا کر رہی ہو اجالا! کھل کا اس سب میں کوئی تصور نہیں ہے۔“ فردوس کوشش کرنے لگی کہ کسی طرح کھل کو اس کی گرفت سے چھڑوا لے لیکن اجالا کی وحشت کے سامنے اس کی کوشش کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ وہ ہانپنے لگی۔

”شادہ، سکینہ، تلسی..... کوئی ہے؟ جلدی سے آؤ۔“ گھبرا کر اس نے ملازماؤں کو پکارا۔ تھوڑی دیر میں وہ سب وہاں موجود تھیں۔ ان کی مدد سے اس نے بہ مشکل اجالا کو قابو کیا۔

”چھوڑو مجھے۔ میں اس کمینے کی بہن کو زندہ نہیں رہنے دوں گی۔ میں اس کے پورے خاندان کو قتل کر دوں گی۔ میرے سنبیل کو مارنے والا میرے انتقام سے بچ نہیں سکتا۔“ ہڈیانی انداز میں چیختے چلاتے اسے ہوش نہیں تھا کہ وہ اپنی زبان سے ایک ایسی داستان سنارہی ہے جس میں اس کی بدنامی کے سوا کچھ نہیں تھا۔

”اسے اس کے کمرے میں لے جا کر بند کر دو۔ میں

کھل کو دیکھ لوں، پھر اسے بھی دیکھتی ہوں۔“ پہلے ہی کمزوری اور تکلیف کا شکار کھل کے لیے اجالا کا حملہ بڑا نقصان دہ ثابت ہوا تھا۔ گلے میں پڑنے والے دباؤ نے اس کا سانس لینا محال کر دیا تھا اور اب وہ گلے پر ہاتھ رکھے کھانسنے کی کوشش میں نڈھال ہوئی جا رہی تھی۔

”یہ کیا تماشا بچا ہوا تھا یہاں؟ کسی کو خاندان کی عزت کا کچھ خیال بھی ہے کہ نہیں۔“ شور سن کر وہاں چلی آنے والی گھر کی خواتین میں نسرین بھابی بھی شامل تھیں جو اب کڑے تہدوں سے فردوس اور کھل کو گھورتی ہوئی نفیث کر رہی تھیں۔

”پلیز بھابی! آپ جا کر اجالا کو سنبھالیں۔ مجھے لگتا ہے اسے ہسٹریا کا دورہ پڑا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ خود کو کوئی نقصان پہنچالے۔“ کھل کی سانسیں بحال کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے انہیں جواب دینے کی فرصت نکالی۔

”میں کیوں.....“ حسب عادت وہ کوئی رنج جواب دینے جا رہی تھیں کہ ملازمدار شادہ کی مداخلت نے انہیں بات مکمل نہیں کرنے دی۔

”وہ جی آپ لوگ چل کر دیکھیں۔ اجالا بی بی کسی کے قابو میں نہیں آرہیں۔ چیزیں اٹھا اٹھا کر پیچنک رہی ہیں۔ تلسی کا سر پھاڑ دیا ہے جی انہوں نے۔“ گھبراہٹ ہوئی شادہ نے چڑھی سانسوں کے ساتھ اطلاع دی تو مجبوراً انہیں دیوار انہوں کے ساتھ اجالا کے کمرے کا رخ کرنا پڑا۔

”تم ٹھیک ہو کھل؟ اب سانس لینے میں مشکل تو نہیں ہو رہی؟“ تھوڑی دیر کی کوشش کے بعد جب اس نے کھل کی حالت معمول پر آتی محسوس کی تو اس سے دریافت کیا۔

”میں ٹھیک ہوں بھابی! آپ جائیں، جا کر اجالا کو دیکھیں۔“ ہلکا ہلکا شور اب بھی یہاں تک آرہا تھا اس لیے کھل نے اپنی حالت کی طرف سے اطمینان دلاتے ہوئے اس سے کہا۔

”ہاں، میں دیکھتی ہوں اسے۔“ فردوس متکثری اس کے کمرے سے باہر نکل گئی۔ اجالا کے کمرے میں جانے سے پہلے وہ ایک ملازمدار کو کھل کا خیال رکھنے کے لیے اس کے کمرے میں بھیجنا نہیں بھولی تھی۔ اجالا کے چائے ہوئے ہنگامے نے پورے گھر کو ہی متوجہ کر لیا تھا۔ بچوں کی تو ہمت نہیں ہوئی تھی کہ اپنے کمروں کے دروازوں سے آگے بڑھتے، البتہ بڑے جو اس وقت گھر میں موجود تھے سارے ہی اس کے کمرے میں جمع ہو گئے تھے۔ اندر داخل ہوتے ہی فردوس کی نظر جلیل اور علیل پر پڑی۔ خواتین کی ناکامی کے بعد دراصل ان دونوں بھائیوں نے ہی پھری ہوئی

کے پیر کا لنگ اس سخت محنت کی راہ میں حائل ہوتا تھا لیکن اس کی جانفشانی ایسی تھی کہ زیادہ رجم دل آدمی نہ ہوتے ہوئے بھی وہ کبھی اس مزدور کو کام سے فارغ کرنے کا نہیں سوچ سکا تھا۔

وہ دیکھ رہا تھا کہ نئے مزدور کی کوشش تھی کہ پٹھان مزدور کا خیال رکھے اور اس کے حصے کا کام بھی خود انجام دے ڈالے۔ کھانے کے وقفے میں بھی اس نے اپنا کھانا اس پٹھان مزدور کے ساتھ ہی کھایا تھا۔ مشرومز، پنیر اور سبز یوں پر مشتمل وہ کھانا دیکھ کر ٹھیکیدار کو تھوڑی سی حیرت ہوئی تھی۔ عام طور پر مزدور اس قسم کے چمکے اور بدبکلی کھانے نہیں کھاتے تھے لیکن وہ نہ صرف خود کھا رہا تھا بلکہ اپنے ساتھی مزدور کو بھی با اصرار کھلا رہا تھا۔ سورج ڈھلا اور اس کی طرف سے کام روکنے کا حکم جاری ہوا تو باقی مزدوروں کے ساتھ ساتھ وہ بھی دہاڑی وصول کرنے اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

”کدھر رہتا ہے؟“ ٹھیکیدار نے نوٹ مکن کر اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے سرسری لہجے میں پوچھا۔
”کسی بھی فٹ پاتھ پر پڑ کر سو جاتا ہوں۔“ اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔
”کیوں، گھر نہیں ہے؟“

”ضرورت ہی نہیں ہے مائی باپ۔ گھر بناؤ، اس میں گھر والی کو رکھو، بچے پالو اور خود محنت کرتے کرتے مرکب جاؤ۔ اپن کو یہ لائف اسٹائل پسند ہی نہیں ہے۔ فٹ پاتھ پر اپن بے فکری سے سوتا ہے۔ مست کھاتا پیتا ہے اور موج مستی کا موڈ ہو تو کسی چھمک چھلو کے ساتھ نکل پڑتا ہے۔ نہ کوئی جھنجھٹ نہ جج جج۔ زندگی میں مرے ہی مرے۔“
اپنے درودوں کی فحاش کرتے اس نے اسی بے پردے

انداز میں اپنا فلسفہ حیات بیان کیا۔ اس کا جواب سن کر ٹھیکیدار مسکرایا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ ذمے داریوں کے بوجھ سے آزاد رہنے کے باعث ہی وہ مزدور دوسرے مزدوروں سے مختلف تھا۔

”ذرا ادھر سائڈ میں بیٹھو۔ میں فارغ ہو کر تیرے سے بات کرتا ہوں۔“ ٹھیکیدار نے اسے حکم دیا تو وہ شانے اچکا کر ریت کے ڈھیر پر جا بیٹھا۔ کچھ دیر بعد پست قامت پٹھان کے سوا سارے مزدور اور مستری وغیرہ وہاں سے جانچکے تھے۔

”ادھر آؤ۔“ ٹھیکیدار نے اسے پکار کر پاس بلایا۔
”آگیا مائی باپ!“ وہ جھٹ ٹھیکیدار کے سامنے

اجالا کو قابو میں کیا تھا لیکن اس کی مغلظات اگلی زبان کو قابو میں کرنے سے وہ بھی معذور دکھائی دے رہے تھے۔ فردوس نے بغیر ایک لفظ کے سکون آور انجکشن تیار کیا اور اجالا کے بازو میں لگا دیا۔ تھوڑی دیر میں اس کے اکڑے ہوئے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑنے لگے اور آواز دھیمی ہوتے ہوئے معدوم ہوگئی۔

”اب یہ کافی دیر تک سوتی رہے گی۔ آئی ہوپ کہ اٹھنے کے بعد نارمل ہو جائے گی لیکن پھر بھی مجھے اطلاع دے دیجیے گا۔ ضرورت ہوگی تو میں اسے مزید میڈیسن دے دوں گی۔“ کسی کو بھی مخاطب کیے بغیر اس نے کہا اور اپنا میڈیکل بکس بند کر کے باہر نکل گئی۔

”سمجھ نہیں آرہی کہ یہ اچانک اجالا کو کرا ہو گیا ہے۔ پہلے تو کبھی اس نے ایسا نہیں کیا۔“ جلیل جو اس کے پیچھے ہی چلے آئے تھے، پیشانی مسلتے ہوئے بہن کے لیے پریشانی کا اظہار کرنے لگے۔

”مرض عشق ایسے ہی اچانک لاحق ہوتا ہے۔“ اس نے جلیل سے نظریں ملائے بغیر دھیمی آواز لیکن سگلتے لہجے میں جواب دیا۔

”کیا بکواس کر رہی ہو؟“ حسب توقع وہ چراغ پا ہو گیا۔

”ایک ہندو لڑکے کا نام لے لے کر ڈہانیاں آپ کی بہن دے رہی ہے اور بکواس میں کر رہی ہوں پتہ اس نے برسوں جلیل کے طعنے سنتے ہوئے گزارے تھے، آج اسے طعنہ دینے کا موقع کیسے گنوا دیتی۔

”تم.....“ جلیل نے اسے کچھ کہنا چاہا لیکن کہہ نہیں سکا۔ آج پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ اس نے بیوی کو اپنے مقابل کھڑا محسوس کیا تھا۔

☆☆☆

خاکی رنگ کے سوتی پا جاسے پر تلگبی سی بھورے رنگ کی آدمی آستھیوں والی بنیان پہنے وہ سالولی رنگت اور بکھرے بالوں والا مزدور خاصی مضبوط جسامت کا مالک تھا اور دیگر مزدوروں کے مقابلے میں زیادہ پھرتی سے کام انجام دے رہا تھا۔ یہ مزدور آج ہی کام پر لگا تھا اور ٹھیکیدار خوش تھا کہ اس نے آج غیر حاضر مزدور کی جگہ اسے کام دے کر گھانٹے کا سودا نہیں کیا ہے۔ ٹھیکیدار کی حقانی نظریں اس مزدور کے ساتھ ساتھ باقی مزدوروں کا بھی چابکدستی سے جائزہ لے رہی تھیں۔ یہاں کام کرنے والے مزدوروں میں پست قامت کا ایک ایسا پٹھان مزدور بھی شامل تھا جس

جا کھڑا ہوا۔

”کل بھی ادھر کام کرے گا؟“

”آپ دو گے تو کر لوں گا۔“ اس نے اپنے بے پروا

انداز میں ٹھیکیدار کو جواب دیا۔

”تو پھر ٹھیک ہے۔ رات ادھر ہی رک جا۔ یہ خان بھی

رات ادھر ہی گزارتا ہے تو بھی اسی کے ساتھ رک جاتا۔“

”ادھر کو ٹھے پر؟“ اس نے زیر تعمیر مکان کی بالائی

چھت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ مکان کی

ذریں منزل محل طور پر فرشتہ نشی اور اس میں مکین موجود

تھے۔ اب شاید کسی ضرورت کے تحت بالائی منزل تعمیر

کر دائی جا رہی تھی۔

”تیرا موج مستی کا موڈ نہیں تو اس کو ٹھے کوٹ باتھ

سے اچھا ہی پائے گا۔ صبح خان کے ہاتھ کا مزیدار ناشتا بھی

مل جائے گا۔ بڑا سوا دے ہے اس کے ہاتھوں میں۔“ وہ جیسے

اسے لالچ دے رہا تھا۔

”ایسا ہے تو پھر ٹھیک ہے۔“ اس نے پیشکش قبول

کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔

”تھوڑے دھیان سے رہتا۔ پولیس والے بابو کا

مکان ہے۔ کوئی ففر گیری کی تو سیدھا حالات پہنچا دیں

گے۔“ ہامی بھرتے ہی ٹھیکیدار نے اسے پہلی نصیحت پکڑائی۔

”باپ رے باپ۔ آپ تو ذرا رہے ہو باپا باپ!“

”تیرے بھلے کو سمجھا رہا ہوں سالے! تو بندہ کام کا

ہے پر لگتا پوری ہے۔“ ٹھیکیدار نے اس کے بارے میں

اپنی رائے دی تو وہ پورے دانت نکال کر ہنسنے لگا پھر ذرا

سنجیدگی اختیار کر کے بولا۔

”دھندے کی جگہ پر اپن کبھی نظر نہیں پالتا۔ موج

مستی اپنی جگہ پر اتنا تو اپنے کو مگی چاہے کہ سارا شوخا ہیں

بھری جیب کے ساتھ ہی ہے۔“

”واہ رے، تو تو بڑا سیانا ہے۔“ ٹھیکیدار نے اسے

سراہا۔ جواب میں اس نے ٹھیکیدار کو سیلیوٹ مار دیا۔

”ٹھیک ہے، پھر تو جا۔ کھانی کر آرام کر تاکہ

سویرے جلدی آکھ محل سکے۔ میں بھی اب نکلتا ہوں۔ گھر

والی نے آج اپنے میکے والوں کو کھانے پر بلوایا ہوا ہے۔

میں دیر سے پہنچا تو منہ پھلا لے گی کہ جان کر دیر سے آیا

ہوں۔“ دن بھر مزدوروں پر کڑی نظر رکھنے اور ذرا سی سستی

پر موٹی موٹی گالیاں دینے والا ٹھیکیدار اس وقت بڑا خوش

مزاج بنا ہوا تھا۔

”پھر تو جلدی جاؤ گی۔“ وہ شوخی سے ہنس کر بولا اور

مستلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔

”خان کو دیکھ رہا ہے؟ وہ تو کب کا اوپر چلا گیا۔“

ٹھیکیدار نے اس کی نظروں کا مفہوم سمجھتے ہوئے اسے اطلاع

دی اور کپڑے جھاڑتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

”اچھا سن!“ جاتے جاتے وہ یوں پلٹا جیسے ابھی کسی

بات کا خیال آیا ہو۔ ”یہ دو چار سینٹ کی بوریاں پڑی ہیں،

ذرا انہیں اوپر چڑھا دیتا۔“ اس کی سوالیہ نظروں کے جواب

میں ٹھیکیدار نے اسے کام بتایا اور پھر بغیر مڑے اپنی گاڑی

میں جا بیٹھا۔ گاڑی کے وہاں سے روانہ ہونے کے بعد اس

نے سینٹ کی بوریوں کی طرف دیکھا۔ وہ نصف درجن سے

بھی زائد تھیں۔

”بڑا سیانا ہے۔ بنا دو رٹائم دیے مزدوری سے لگا گیا

ہے۔“ وہ زیر لب بڑبڑایا لیکن بوریاں اوپر پہنچانے کا کام

شروع کر دیا۔ اس کام کے دوران اس نے خان کو دیکھا۔

وہ ایک کونے میں رکھے چوہے پر کچھ پکانے میں مصروف

تھا۔ چاولوں کی خوشبو محسوس کر کے اس کی بھوک جاگنے لگی۔

”کیا پکا یا ہے پارا! بڑی خوشبو میس اٹھ رہی ہیں؟ سالا

پیٹ بھی خالی کنسٹر کی طرح شور مچا چا کر کھانے کو مانگ رہا

ہے۔“ قارخ ہو کر وہ خان سے مخاطب ہوا۔

”چاول دم پر ہے۔ پک جاتی ہے تو ام ابھی نکالتی

اسے۔“ پٹھان اسے سنجیدگی سے جواب دے کر اپنے کام

میں مصروف ہو گیا۔ وہ اس وقت بغیر چھت والے ایک زیر

تعمیر کمرے کی صفائی کر رہا تھا۔ ذرا سی دیر میں اس نے

وہاں پھسکی ریت وغیرہ سمیٹ کر فرش کو صاف کر لیا اور بستر

بچھانے لگا۔

”تمہارا تو لگتا ہے کھانا کھاتے ہی سونے کا ارادہ

ہے؟“ وہ جو ایک اینٹ پر بیٹھا یہ ساری کارروائی دیکھ رہا

تھا، بول پڑا۔

”سویرے جلدی اٹھ کر سب کے آنے سے پہلے

ٹھیکیدار صیب کے بتائے کام بھی تو کرنے ہیں۔ سونے میں

دیر کرے گا تو جلدی کیسے اٹھے گا۔“

”پر دن نزی کا ٹائم تو آٹھ بجے سے شروع ہوتا ہے

نا؟“ وہ حیران ہوا۔

”ٹائم ٹھیک کو گولی مارو۔ اور ٹھیکیدار جب جو بولے وہ

کرنا پڑتی اسے۔“

”یہ کیا بات ہوئی۔“ اس نے اعتراض کیا۔

”ابھی تم بھی تو ٹائم ختم ہونے کے بعد بوریاں چڑھایا

ہے نا؟ کیوں نہیں بولا ٹھیکیدار سے کہ دھاڑی کا ٹائم ختم

ہو گیا اے؟“

”وہ الگ مسئلہ ہے۔ میری کچھ مجبوری تھی۔“ اس نے نظریں چرائیں۔

”ابھی اپنی بھی مجبوری ہے۔ ٹھیکیدار نے وعدہ کیا ہے کہ جب تک یہ ٹھیکا چل رہا ہے ام کو مزدوری سے نئی بنائے گا۔ رہنے کو یہ جگہ دی ہے اور پکانے کی اجازت بھی۔“ وہ اسے جواب دے کر ایک کونے میں چلتے سیلنڈر والے چولہے تک گیا اور ڈھکن اٹھا کر چاولوں کو چپک کرنے لگا۔

”جلدی لے آؤ یارا! اب مہر نہیں ہو رہا۔“ ڈھکن اٹھانے سے خوشبو پوری طرح آڑو ہو گئی تھی۔ سخت محنت کے باعث خالی ہو چکے پیٹ کو اس خوشبو نے دیوانہ سا کر دیا۔

”ابھی لاتی اے۔ ام نے یہ خاص تمہارے واسطے ہی بنایا ہے۔ تم نہ ہوتی تو ام چھو لے شور بے سے روٹی کھاتی اور سو جاتی۔“ خان نے جلدی جلدی اس کے سامنے پلاسٹک کی سستی سی پلیٹیں، پانی کا جگ اور چاولوں والا پتلیا رکھتے ہوئے اسے اطلاع دی پھر کھانا نکال کر پہلے اس کی پلیٹ میں ڈالا۔ اس نے بنا سوال کیے خاموشی سے کھانا کھانا شروع کر دیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس طرح خان نے اس کے دو پہر کو کھائے گئے کھانے کا احسان اتارنے کی کوشش کی ہے۔

”تم تو کمال کا کھانا پکاتے ہو یارا یہ مزدوری و مزدوری چھوڑو اور کسی ہوٹل میں باورچی لگ جاؤ۔“ کابلی چنوں کا..... بہت کم سالوں سے تیار کردہ پلاؤ اتنا لذیذ تھا کہ وہ بے ساختہ ہی خان کو مشورہ دے بیٹھا۔

”ام نے کوشش کی تھی پر قسمت نے ساتھ نہیں دیا۔ ام نے سو چار یڑمی لگا کر پلاؤ بیچ لے گا پر پولیس والے پٹرائض ہو گئے کہ ان سے پریشانی لیے بغیر فٹ ہاتھ پر

ریڑمی کیسے کھڑی کی۔ انہوں نے امارار یڑمی الٹ دی۔ سارا پلاؤ سڑک پر گر گیا۔ برتن مرقن سب ٹوٹ گیا اور ریڑمی کا ایک پیسہ بھی نکل گیا۔ بس پھر ام نے ہمت ہار دی اور اور مزدوری پر لگ گئی۔ اور محنت زیادہ مزدوری کم اے پر کچھ نہ ہونے سے ہونا اچھا ہے۔ ام مرد بچہ اے۔ ایسے بیروزگار ہو کر گھر میں تو خفی بیٹھ سکتی اے نا۔“ اس نے بہت سادگی سے اپنی داستان بیان کر دی۔ وہ جو بہت رنجیت کے ساتھ پلاؤ کھا رہا تھا، اسے لگا کہ نوالہ حلق میں انک گیا ہو۔ کتنے بٹے کٹے بہرہ دیے تھے جو جھوٹ موٹ کی داستانیں سنا کر ہمدردیوں کے ساتھ ساتھ لوٹ بھی بھور لیتے تھے لیکن یہ شخص اپنے ہر کے لنگ کے باوجود اتنی سخت محنت کا کام کر رہا تھا کیونکہ اس کی غیرت کو مفت خوری گوارا نہیں تھی۔

”ایک بات بتاؤ خان! یہ تمہارے پیر کا کیا معاملہ ہے؟ میرا مطلب ہے کہ یہ پیداؤشی نقص ہے یا تمہارے ساتھ کوئی حادثہ پیش آیا تھا؟“ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے خان سے دریافت کیا۔

”یہ امارا وفاداری کا تمغا اے۔“ اس نے تلخی سے جواب دیا اور کھانے کے برتن سمیٹنے لگا۔

”تفصیل نہیں بتاؤ گے؟“ اسے اس شخص کے ساتھ عجیب سی انسیت محسوس ہو رہی تھی اس لیے اسے کریدنے سے باز نہیں رہ رہا تھا۔

”کیا بتائے یارا! دنیا کا سارا رنگ ڈھنگ نرالا اے۔ ام ایک امیر آدمی کے پاس کام کرتا تھا۔ لو کر ہی بھی آسان تھا اور پگہر بھی ٹھیک ملتا تھا۔ ام اور بہت خوش تھا۔ ایک دن صاب نے اپنا دو مہمان کو امارے پاس بھیجا۔ وہ پاکستان سے آیا تھا اور اور پولیس کے چکر میں پھنس گیا تھا۔“ خان کو بھی شاید اپنی داستان سنانے کے لیے کوئی درکار تھا اس لیے وہ بغیر پس و پیش کے شروع ہو گیا تھا لیکن وہ خود اس کے ابتداء کی جیلے سن کر ہی چونک گیا تھا۔

”بہت اچھا لوگ تھی وہ۔ ام ان کا خوب خدمت کیا۔ ام کو ان کی باتیں سن کر پتا چل گئی تھی کہ وہ مجرم بنی اے بس کسی کی سازش سے اس چکر میں پھنس گئی اے۔ اس لیے ام دل سے ان کی عزت کرتی تھی۔ وہ بھی ام سے خوش تھا اور انعام شام بھی دیتا تھا۔“ اس کے چوکنے کو محسوس کیے بغیر خان اپنے فطری سادہ انداز میں اسے اپنی داستان سنانا جا رہا تھا۔

”ایک دن امارا صاب ایک بی بی اور چھوٹا بچہ کو لے کر اور کوٹھی پر آیا۔ بی بی مہمان کا بہن تھا۔ وہ سب لوگ مل کر پاکستان کے سفارت خانے جانے والا تھا کہ اور سے مدد لے کر اپنی بے گناہی ثابت کر سکے۔ وہ لوگ گاڑی میں بیٹھ کر کوٹھی سے نکلا ہی تھا کہ ان کی گاڑی پر گولی برسے لگا۔ ام نے اپنا گن نکال کر ان حملہ کرنے والوں پر گولی چلایا تو صاب کو گاڑی نکال کر لے جانے کا موقع مل گیا، پر ام ان ظالموں کی گولی سے نہیں بچ سکا۔ جب گولی لگا تو ام سمجھا کہ اب ام زندہ ہی بچے گی، پر اوپر والا امارے بیوی بچوں پر رحم کھایا اور امارا زندگی بچا لیا۔“ خان اپنی رو میں تفصیلات سنانا جا رہا تھا اور سن کر اسے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ ایک اتفاق نے اسے بڑے کام کے بندے سے ملا دیا ہے۔

”پھر..... پھر کیا ہوا؟“ اس نے ذرا بے چینی سے پوچھا۔

”ہونا کیا تھا۔ ام ٹھیک ہو کر دوبارہ صاب کی کوٹھی پر

”پھر کھیل نے اسے کیا جواب دیا؟“ اسے کچھ کچھ
 معاملہ سمجھ آ رہا تھا اس لیے بے تابی سے سوال کیا۔
 کھیل صیب بولا۔ ”میں اس بات کو سمجھتا ہوں لیکن سچ
 تم بھی اچھی طرح جانتے ہو۔ میرے مہمان قطعی بے قصور
 ہیں اور تم بلاوجہ انہیں پھنسا رہے ہو۔“
 سن کر وہ ہنسنے لگا اور بولا۔ ”عزت بچانے کے لیے
 جھوٹ تو آپ نے بھی بولا ہے مسٹر کھیل بلکہ آپ نے تو دھوکا
 دیا ہے اپنے مہمانوں کو۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکے ہوں گے
 کہ ہمدردی کی آڑ میں آپ ان سے دشمنی کر رہے ہیں۔“
 خان کی زبان بہت بڑے انکشافات کر رہی تھی۔
 ”پھر؟“

”بس پھر ام اس سے زیادہ نہیں سن سکی۔ امارے دل
 سے کھیل صیب کا عزت ختم ہوگئی اور ام نے اسی رات کوٹھی
 چھوڑ دیا۔ جو بندہ اپنے مفاد کے لیے امارا جان، جان بوجھ
 کر داؤ پر لگا یا اور اپنے خون کے رشتوں کو دھوکا دیا، اس پر
 اور بھروسہ نہیں کر سکتی تھی ام۔“ اس کے حساب سے کہانی ختم
 ہو چکی تھی۔

”کیا وہ دونوں مہمان وہی ہیں جن کا آج کل خبروں
 میں بہت جھجھکاؤ ہے اور انہیں پاکستانی جاسوس اور دہشت گرد
 قرار دیا جا رہا ہے؟“ سنانے والا کہانی ختم کر چکا تھا لیکن
 سننے والے کے پاس سوالات باقی تھے۔ اس داستان کے
 ساتھ بہتادہ یہ بھی فراموش کر چکا تھا کہ اسے ایک آوارہ گرد
 مزدور کے روپ میں خان سے کس طرح کی زبان استعمال
 کرنی چاہیے۔

”تم ٹھیک سمجھا اے، پر یہ بتاؤ کہ تم کو اس استوری
 میں اتنا دلچسپی کیوں ہے؟“ خان اتنا بھی سادہ نہیں تھا کہ کسی
 بات کو محسوس نہیں کر سکتا۔ اس نے کچھ مشکوک نظروں سے
 اسے گھورا۔

”ایسے ہی ٹائم پاس کے لیے سن رہا تھا یا رات
 میں دیر تک جاگنے کی عادت ہے نا اس لیے۔“ اس نے اپنی
 صفائی پیش کی اور بات کو بدلتے ہوئے بولا۔ ”تمہارے
 پاس چائے بنانے کا سامان ہے نا۔ لاؤ میں اپنے اور
 تمہارے لیے اکٹھا چائے بناتا ہوں۔“

”ام بنادیتا ہے۔“ خان نے پیشکش کی۔
 ”نہیں، میں بناؤں گا۔“ اس نے خان کو اٹھنے نہیں
 دیا۔ چائے بنا کر اسے پیالیوں میں انڈیلے ہوئے اس نے
 اپنے پاچے کی جیب سے ایک گولی برآمد کر کے نہایت
 ہوشیاری سے خان کی پیالی میں شامل کر دی۔

کام کرنے لگا۔ تھوڑا تھوڑا تکلیف تھا پر مرد بچے کا کیا بگڑتا
 اے تھوڑا تکلیف سے۔ اور کام بھی تھوڑا ہوتا تھا اور کھانا پینا
 بھی کھاتا تھا اس لیے ہم جلدی ہٹا کٹا ہو گیا۔“
 ”تو پھر تم یہاں کیسے؟“

”مت پوچھو یا ر! ام نے صاب کا نمک کھایا ہے اس
 لیے اس کا برائی کرتے ہمارا زبان جلتی اے۔“ پہلی بار وہ
 کچھ بتانے سے ہچکچایا۔

”میں کون سا کسی کو بتانے جا رہا ہوں؟ بس یہ ہے کہ
 کہہ دینے سے تمہارے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ مجھے لگتا
 ہے کہ تم اپنے دل میں کوئی ایسی بات لیے پھر رہے ہو جس
 نے تمہیں اندر سے اداس کر دیا ہے۔“ وہ خان کی ٹائپ سمجھ
 گیا تھا اس لیے بہت سجاوے سے اسے بولنے پر اکسایا۔

”کہتا تو تم ٹھیک اے یا ر! جب سے ام پر کھیل
 صیب کا صیب کھلا ہے، امارا دل بھجھ گیا ہے۔ کھیل صیب نے
 اپنے مہمانوں کے ساتھ بہت برا کیا۔“ حسب توقع خان فوراً
 ہی اس کے ڈھب برآ گیا۔

”کیا، کیا تھا کھیل صاحب نے؟“ کھیل کا نام سن کر
 اسے کوئی شک نہیں رہا تھا کہ یہ کن لوگوں کا قصہ ہے اس لیے
 اپنی وحشت پر قابو پا کر بہت ضبط سے پوچھا۔

”اس دن وہ ایک مہمان کے ساتھ کوٹھی پر آیا تھا۔
 مہمان نے وردی نہیں پہنتا تھا پر ام کو اس کی شکل دیکھ کر ہی پتا
 لگ گئی تھی کہ وہ پولیس والا ہے۔ صاب ام سے چائے پانی
 کا انتظام کرنے کا بولا اور مہمان کو ڈرائنگ روم میں لے کر
 بیٹھ گیا۔ چائے بناتے بناتے ام کو ایک ضروری کام یاد آیا تو
 ام صاب سے بات کرنے ڈرائنگ روم کی طرف چلی گئی
 لیکن اندر جانے سے پہلے ہی ام کو اپنا نام سنائی دے گیا اور
 ام باہر ہی رک کر صاب کا بات سننے لگا۔“ وہ دلی میں رہ کر کچھ
 فرق تو آیا تھا لیکن خان کی زبان بار بار لڑھکتی تھی اور تذکیر و
 تانیث کی غلطیاں جاری رہتی تھیں۔

”صاب اپنے مہمان سے بولا۔۔۔ دیکھو انسپکٹر! میں
 نے تمہارا بہت ساتھ دیا۔ تمہاری خاطر اپنے وفادار ملازم
 گل خان کی جان بھی خطرے میں ڈالی لیکن پھر بھی تمہارا منہ
 بند نہیں ہوتا اور تم ڈیمانڈ پر ڈیمانڈ کرتے جاتے ہو۔“

مہمان صاب کی بات سن کر ہنسا اور بولا۔ ”آپ نے
 میری خاطر کچھ نہیں کیا مسٹر کھیل! آپ نے سب کچھ خود کو
 اور اپنی فیملی کو سیف رکھنے کے لیے کیا۔ سوچیں اگر ہم آپ
 کی اس کوٹھی سے ان پاکستانیوں کو اریسٹ کرتے تو آج
 آپ کہاں ہوتے؟“

”لوحی بیو، اپن کے ہاتھ کی اسٹبل چائے۔ پی کر مرہ نہ آئے تو نام بدل دینا۔“ اس نے پیالی خان کو تھمائی۔
 ”تم نے ام کو اپنا کیا نام بتایا تھا، ام بھول گئی اے۔
 بولنے کے واسطے پہلا نام یاد بھی تو ہونا چاہیے نا۔“ خان نے اس کے ہاتھ سے چائے کی پیالی لے کر ایک جانب رکھی اور انگلیوں سے اپنی کھوپڑی بجاتا ہوا نہایت ساوگی سے بولا۔
 ”پہلے چائے پی لو پھر نام بھی یاد آجائے گا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور اپنی پیالی سے ایک گھونٹ بھرا۔

”ایسے کیسے بھول گئی ام نام؟ تم نے ام کو بتائی بھی تھی کہ نئی؟“ خان بدستور الجھار ہا اور کھوپڑی بجا بجا کر اس میں سے نام برآمد کرنے کی کوشش کرتا رہا۔
 ”چائے تو پیو یا ر! ٹھنڈی ہوئی تو مزہ کھو دے گی۔“ اسے خان کو وہ نشہ آور چائے پلانے کی بے تالی تھی۔
 ”اچھا بیتی ہے۔“ خان نے پیالی کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن اگلے ہی لمحے پیالی زمین پر لڑھکی ہوئی نظر آرہی تھی اور پیالی سے ساری چائے نکل کر فرش پر بہہ چکی تھی۔
 ”خانہ خراب یہ کیا ہو گئی؟“ یوں چائے کے گر جانے سے خان پوکھلا یا ہوا نظر آنے لگا۔

”چلو میں دوسری بنا دیتا ہوں۔“ مایوسی تو اسے بھی ہوئی تھی لیکن اس نے خود پر قابو رکھا اور خوش اخلاقی سے پیشکش کی۔

”رہنے دو یا ر! ام کو تو ویسے بھی بہت نیند آرہا ہے۔ اب ام سوئے گا۔ تم وہ میلے کپڑے سے یہ گرا ہوا چائے صاف کر دینا۔“ خان نے ایک طرف پڑے میلے کپڑے کی طرف اشارہ کر کے زوردار بھائی لی اور اپنے لیے بچھائے گئے بستر پر جا کر دراز ہو گیا۔ وہ سنا کیا نہ کرنا کے حقدار گری ہوئی چائے صاف کرنے لگا۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ خود بھی لیٹ گیا لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ سونے کے لیے یہاں آیا بھی نہیں تھا۔

وشا کی موت کے بعد سارے راستے بند دکھائی دینے کے بعد اس کی توجہ اس کے نائب کی طرف مبذول ہوئی تھی۔ ظاہر ہے وشا جیسا کرپٹ پولیس والا اپنے کالے دھندوں میں اکیلا نہیں ہو سکتا تھا۔ ایسے لوگ اوپر والوں سے تال میل ملا کر چلتے ہیں اور عموماً ان کے نیچے کے لوگ کئی رازوں سے واقف ہوتے ہیں۔ اس نے بھی کالے خان کے تعاون سے وشا کے معاون خاص وکرم تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ کہنے کو وکرم کے پاس کوئی بڑی پوسٹ نہیں

تھی لیکن اس کے شاندار گھر کو دیکھ کر لگتا تھا کہ کسی بڑے افسر کا بنگلا ہو۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ ان دنوں وکرم کے گھر کی بالائی منزل زیر تعمیر تھی۔ وہ کسی اچھے موقع کے حصول کے لیے کام کرنے والوں میں شامل ہو گیا۔ یہ موقع اسے گل خان کے ساتھ اسی گھر کی بالائی منزل پر قیام کی صورت میں مل گیا۔ ٹھیکیدار اسے رکھنے کو نہ بھی کہتا تو وہ خان کے ساتھ گپ شپ لگانے کے بہانے پہلے ہی وہاں کچھ دیر رکھنے کا جواز سوچ چکا تھا اسی لیے دوپہر کے کھانے کے وقتے میں کھانے کے ساتھ ساتھ نیند کی گولیاں بھی خرید لایا تھا مگر خان کے چائے گرا دینے سے تھوڑی گڑبڑ ہو گئی تھی۔

”اچھا پاپا! گند ہائے کل یاد سے فنکشن میں پہنچ جانا۔“ لینے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ اسے نیچے سے آواز سنائی دی۔ وہ اٹھا اور تیزی سے باہر کی طرف لپکا۔ اور برکی پوری منزل پر تقریباً چار فٹ اونچی چار دیواری کھڑی کی گئی تھی۔ اس نے سامنے کے رخ سے ذرا سا سر نکال کر جھانکا۔ نیچے ایک گاڑی کھڑی ہوئی تھی اور گاڑی کے ساتھ ہی مرد و زن کے جوڑے کے علاوہ تقریباً دس بارہ سالہ بچہ کھڑا دکھائی دے رہا تھا۔ اسے سنائی دینے والی آواز یقینی طور پر اسی بچے کی تھی۔ بچہ بلند آواز میں بولا تھا اس لیے اسے اس کی آواز اوپر تک سنائی دی تھی۔

”اپنا پراس یا در کھتا وکرم! ایسا نہ ہو کہ تمہارے نہ آنے سے میری سب کے آگے اسٹلٹ ہو جائے۔“ اب عورت ذرا مختلف الفاظ میں بچے والی بات ہی دہرا رہی تھی۔ اس کی آواز بچے کی طرح بلند نہیں تھی لیکن کھلے میں آ جانے کی وجہ سے وہ آرام سے سن سکتا تھا۔

”کیسی باتیں کرتی ہو ڈارلنگ! تمہارے بھائی کی مہندی کا فنکشن میں کیسے مس کر سکتا ہوں۔ اگر ضروری کام نہ ہوتا تو میں آج بھی تمہارے ساتھ چلتا۔“ مرد نے بھی سجاتی عورت کو خود سے قریب کر کے اس کے رخسار پر بوسہ دیا تو وہ شرمیلی ہنسی ہنستی ہوئی اس سے الگ ہو گئی۔ کچھ دیر میں ماں بیٹا گاڑی کی پچھلی نشست پر بیٹھ کر ڈرائیور کے ساتھ وہاں سے روانہ ہو گئے اور وکرم واپس گھر کے اندر چلا گیا۔ اس کے اندر جاتے ہی وہ بھی پیچھے ہٹ گیا۔ کالے خان کی دی ہوئی رپورٹ درست ثابت ہوئی تھی۔ وکرم آج کی رات گھر پر اکیلا تھا اور اسے اس کے اکیلے پن سے ہی فائدہ اٹھاتا تھا۔

وہ واپس اسی ادھورے کمرے میں آیا جہاں خان نے اس کے اور اپنے سونے کا انتظام کیا تھا۔ سینٹ اور

بجری کی ملی جلی بو سے بے نیاز خان آنکھوں پر بازو رکھے چٹ لٹ کر سو رہا تھا۔ اس کا منہ مضحکہ خیز انداز میں کھلا ہوا تھا اور اس کھلے منہ سے پوری گھن گرج کے ساتھ خراٹے برآمد ہو رہے تھے۔ خراٹے لینے کے ساتھ ساتھ اس کا موٹا پیٹ بھی مسلسل پھول چک رہا تھا۔ کسی مداخلت سے بچنے کے لیے اس نے خان کو خواب آور دوا پلانے کی کوشش کی تھی لیکن اب وہ جس طرح مدہوش ہو کر سو رہا تھا، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے ایسی کسی دوا کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

خان کو اس کے حال پر چھوڑ کر وہ آہستہ سے باہر نکلا اور اس سمت پڑھا جہاں ٹہلی منزل پر جانے کے لیے سیزھیاں موجود تھیں۔ سیزھیوں پر گرل لگی تھی اور اس گرل کے دروازے میں تالا لگا کر اس بات کا بندوبست کیا گیا تھا کہ کوئی شخص ٹہلی منزل تک رسائی حاصل نہیں کر سکے۔ اس نے اپنے پا جاسے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک پتلی سی دھاتی خلال برآمد کی اور گرل میں گھسے تالے کو ہاتھ میں پکڑ کر اسے چند لمحوں کے بعد اپنا کام شروع کر دیا۔ تک کی مدد آوازوں کے ساتھ چند لمحوں میں ہی تالا کھل گیا۔ کھلتے تالے کو نکال کر ایک طرف ڈالتے ہوئے اس نے آہستہ سے گرل کی کنڈی کھولی۔ اب وہ دبے قدموں سے سیزھیاں اتر کر نیچے جا رہا تھا۔ نیچے گھر میں خاموشی طاری تھی اس لیے وہ مزید احتیاط کر رہا تھا کہ اس کے قدموں کی چاپ ابھر کر وکرم کو اس کی موجودگی سے آگاہ نہ کر دے۔ ابھی وہ آخری سیزھی پر ہی تھا کہ اطلاعی گھنٹی بجنے کی آواز نے قدموں کو ٹھنکا دیا۔ اس وقت کسی کی آمد اس کے ارادے کی راہ میں رکاوٹ تھی لیکن ظاہر ہے وہ آنے والے کو نہیں روک سکتا تھا۔

یعنی بیوی کو گھر سے رخصت کر کے اس بازاری عورت کے ساتھ وقت گزارنے کا پروگرام تھا۔ وہ دل ہی دل میں وکرم پر لعنت بھیجتا ہوا اپنی پناہ گاہ سے باہر نکلا اور جائزہ لینے لگا۔ بند دروازے سے اندر جھانکنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اس طرف سے مایوس ہو کر وہ کھڑکی کی طرف آیا۔ کھڑکی کے پٹ شیشے کے تھے لیکن اندر بھاری پردے بڑے ہوئے تھے۔ وہ مایوس ہو کر دہاں سے بھی ہٹ جاتا لیکن نظر دماغیں طرف موجود جھری پر پڑ گئی۔ اس جھری کا مطلب تھا کہ سلائڈنگ پٹ کو اندر سے لاک نہیں لگایا گیا ہے۔ اس نے انگلیوں کے معمولی دباؤ سے پٹ کو دھکا دیا تو وہ آسانی سے کھٹک چلا گیا۔ فوری طور پر پردے کو ہٹا کر اندر جھانکنے کے بجائے اس نے اپنی قوتِ سماعت پر زور دیا۔

”چنی گھر میں کچی اس بریانی کی طرح ہوتی ہے جو چاہے جتنے مزے کی ہو، کھا کھا کر آدمی کا جی اوب جاتا ہے اور پھر باہر ریڑھی پر بھی مسالے دار چاٹ کھانے کو من کرتا ہے۔ اشوک نے تو تیری بڑی تعریف کی تھی۔ اب تو ثابت کر کے دکھانا کہ سچ کچھ کتنی مسالے دار اور چٹ پٹی ہے۔“

اپنا ذاتی فلسفہ بھارتے وکرم کے الفاظ نے عورت کے متعلق اس کے اندازے کی تصدیق کر دی۔ یقیناً اس کی حرام کی کمائی اتنی زیادہ تھی کہ ہر طرح کی آسائشات سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ ایسی عیاشیاں بھی آرام سے انورڈ کر لیتا تھا۔

”پہلے بوتل کھول لے پھر مجھے چکھیے گا۔ شاب کو شراب سے ملائے بنا پورا مزہ نہیں آتا۔“ عورت نے اٹھا کر مطالبہ کیا۔

”یہ تو وکرم بھی جانتا ہے جان من لیکن پینے کا مزہ بھی تو تیرے ہاتھ سے ہی آئے گا نا۔“ اپنی ”ڈارلنگ“ چنی کو

وعدوں کے ساتھ رخصت کرنے کے بعد وہ کسی اور کو جان من بنائے بیٹھا تھا۔ اس موقع پر اس نے انگلیوں کی مدد سے پردے کو معمولی سا کھسکا کر اندر جھانکا۔ عورت جام تیار کر کے نو سینر صوفے پر بیٹھے وکرم کی طرف بڑھ رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس کی گود میں بیٹھ گئی اور جام سے پہلی چسکی خود لے کر اسے وکرم کے ہونٹوں سے لگایا۔

”اوشا کے لب جس جام کو چھو لیں اس کا نشہ ڈبل ہو جاتا ہے۔“ میک اپ کی اس دکان کے مخمور لہجے میں اپنے لیے بڑا اعتماد تھا اور یہ اعتماد یقیناً وکرم جیسے بازاری کھانے کے شوقین مردوں نے اسے بخشا تھا۔

شراب نوشی کے اس شغل کے دوران خود کو اوشا کہنے والی کئی رنگین و شگین حرکات کرتی واقعی وکرم کا نشہ دو آتشہ

سیڑھیوں پر ہی دبکے دیکھے اس نے ایک کمرے کا دروازہ کھٹکے اور بیرونی دروازے کی طرف جاتے قدموں کی آوازیں سنیں۔ موقع پا کر وہ تیزی سے ایک قریبی کمرے میں گھس گیا۔ کمرے میں ٹائٹ بلب جل رہا تھا جس کی روشنی میں وہ کمرے کا جائزہ لے سکتا تھا۔ سجاوٹ کے اعتبار سے وہ کسی بچے کا کمرہ لگ رہا تھا، یعنی اس وقت وہ وکرم کے بیٹے کے کمرے میں موجود تھا۔ اندر کی طرف آتے قدموں کی آوازیں سن کر اس نے دروازے کی جھری میں سے باہر جھانکا۔ کپڑوں کے اختصار اور میک اپ کی بہتات کے ساتھ وکرم کے شانے سے لگی عورت کو دیکھ کر اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ کس قبیل کی عورت تھی۔ اس کے کپدے دیکھتے ہی دیکھتے وکرم اس عورت کے ساتھ اپنے کمرے میں گھس گیا۔

کرتی رہی۔ اپنے پروگرام میں رخنہ ڈالنے والی اس مصیبت کو دل ہی دل میں کوستا وہ امکانات کا جائزہ لیتا رہا۔ وکرم اگر چہ اوشا کے ساتھ مصروف تھا لیکن وہ جس صوفے پر بیٹھا تھا، وہ کمرے کے دروازے کے بالکل سامنے موجود تھا اور یہ ممکن نہیں تھا کہ اس کے اندر داخل ہو کر وکرم تک پہنچے کے دوران اسے سنبھلنے کا موقع نہیں ملتا۔ پھر وہ اکیلا نہیں تھا، اس کے ساتھ اوشا بھی موجود تھی جو کچھ کرتی نہ کرتی دو تین سریلی چیئرس ضرور مار سکتی تھی اور اسے جو کچھ کرنا تھا اس کے لیے کسی ہنگامہ آرائی سے بچنا ضروری تھا۔ یعنی اس کے پاس انتظار کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اس کے پاس بہت زیادہ وقت نہیں تھا۔

خان نیند کی دوا پی لیتا تو پھر بھی تھوڑی زیادہ مہلت مل جاتی لیکن اب تو یہی امکان تھا کہ وہ علی الصباح اٹھ جائے گا اور اٹھنے پر اسے غائب پا کر ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوگا۔ سیرھیوں کی گرل کا کھلاتا اس کی راہنمائی کے لیے کافی ہوتا۔

”دبٹ..... میں ابھی دو منٹ میں آتا ہوں۔“ اوشا کی آنکھیلیاں جاری تھیں کہ وکرم نے اس سے مہلت طلب کرتے ہوئے اپنی جگہ چھوڑ دی اور ملحقہ باتھ روم میں گھس گیا۔ اس کے اس طرح جانے پر اوشا نے بے نیازی سے شانے جھٹکے اور اسی ٹویٹر صوفے پر ہوشربا انداز میں نیم دراز ہو گئی۔ اسے اس سے زیادہ اور بہتر موقع ملنے کی امید نہیں تھی اس لیے فوری طور پر حرکت میں آیا۔

حسب توقع دروازہ اندر سے لاک نہیں تھا۔ تاب پر ہلکا سا دباؤ ڈالتے ہی کھل گیا۔ کھلے دروازے سے اندر داخل ہونے اور اوشا تک پہنچنے میں اسے چند سیکنڈ ہی لگے

تھے۔ ان چند سیکنڈ میں اس نے معمولی سی بھی آواز پیدا نہیں ہونے دی تھی چنانچہ جب اوشا کے سر پر پہنچ کر اس کا منہ دبوچا تو اس اچانک ٹوٹنے والی افتاد پر اس کی آنکھیں دہشت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ کنٹی پر ایک چچی تلی ضرب لگا کر اس نے ان دہشت زدہ آنکھوں کے بند ہونے کا معقول انتظام کیا اور خود دوسرے صوفے کی آڑ میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ وکرم تقریباً پانچ منٹ باتھ روم میں گزار کر باہر نکلا۔ وہ ہلکے سے سرو میں تھا۔

”کیا بات ہے جان میں؟ ہم نے تمہیں رستے کے لیے بلا یا ہے اور تمہیں ابھی سے نیند آرہی ہے۔“ باہر نکلتے ہی اس کی نظر صوفے پر آنکھیں بند کیے لٹھی اوشا پر پڑی تو شوخی سے بولتے ہوئے اس کے قریب آیا اور اس کا ہاتھ پکڑ

کر کھینچے ہوئے بولا۔

”آؤ بیڈ پر چلتے ہیں۔“ رُخ عمل حسب توقع نہ آیا تو وہ چونکا لیکن اسے تاخیر ہو چکی تھی۔

”آواز نکالے بغیر اس دوسرے صوفے پر بیٹھ جاؤ۔“ لوہے کے سرولس سے بھی زیادہ وہ لہجے کی سرد مہری تھی جس نے اس کے جسم میں پھریری سی دوڑا دی۔ اگلے دو منٹوں میں وہ بے بسی کی تصویر بنا اس کے سامنے بیٹھا تھا اور اسے اس کے سوالوں کے جوابات دے رہا تھا۔ ان جوابات سے اسے علم ہوا کہ عالم اور سرمد کی زندگی میں آنے والی اس مصیبت کے ڈانڈے دشا کے دوست سنیل سے جا کر ملتے تھے۔ سنیل کا عالم کی کزن اجالا سے افیئر چل رہا تھا اور وہ دونوں اپنی خفیہ شادی پلان کر چکے تھے کہ اجالا کو علم ہوا کہ پاکستان سے فیصل کی شادی میں شرکت کے لیے آنے والے عالم سے اس کی شادی کی بات چلانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ خدشہ تھا کہ فیصل کی شادی کے فوراً بعد اس کا عالم سے نکاح کر دیا جائے گا۔ سنیل سے کورٹ میرج کا فیصلہ کر لینے کے باوجود اجالا فیصلے پر عملدرآمد کے لیے کچھ وقت لینا چاہتی تھی اس لیے اس نے سنیل سے آنے والی مصیبت کا کوئی حل ڈھونڈنے کی فرمائش کی۔

سنیل کو یہ حل اپنے دوست دشا کی صورت میں ملا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ڈرامہ کار عالم کو جلد از جلد پاکستان واپس لوٹنے پر مجبور کر دیں گے لیکن صورت حال غیر متوقع طور پر بگڑ گئی۔ سنیل کے گھر میں عالم سے ہونے والے مقابلے کے دوران دشا کے ہاتھ اتفاقاً سنیل کا قتل ہو گیا لیکن اپنے جرم کو قبول کرنے کے بجائے اس نے الزام عالم کے سر ڈالنے کی کوشش کی اور اس حد تک آگے چلا گیا کہ اس پر پاکستانی جاسوس اور دہشت گرد ہونے کا الزام لگا دیا۔ ”را“ والوں سے تعلق کی وجہ سے اسے اپنے عائد کردہ ان الزامات کو حقیقت کا روپ دینے میں مشکل نہیں ہوئی اور یوں عالم اور اس کے ساتھ ساتھ سرمد بھی ایک دہال میں پھنس کر رہ گئے۔

تھوڑی سی مزید کوشش کے بعد وکرم نے یہ بھی اگل دیا کہ عالم کے کیس کو انسپکٹر موہن ونڈل کر رہا ہے۔ موہن کا پتا وغیرہ بتانے میں بھی اس نے زیادہ حراست کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اس کے انداز سے اسے مطابق وکرم ایک بزدل اور کمزور دل کا آدمی تھا جسے حرام کے پیسے نے صرف عیش پرستی کے لائق ہی رہنے دیا تھا اور وہ اس قابل نہیں تھا کہ کسی مشکل صورت حال کا سامنا کر سکے۔ اس کا تو ذرا سے تشدد سے ہی

کے پھل سے گولی برآمد ہوتی اور سیدھی گل خان کے سینے میں اتر جاتی لیکن فطرت نے اسے روک لیا اور وہ یونہی اپنی جگہ کھڑا خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

”ام پہلے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ آپ جو دکھتا ہے، وہ ہے نہیں۔ آپ دوست ہے عالم صاب کا؟“ گل خان کے سوال اور لہجے نے اسے باور کروادیا کہ اسے فوری طور پر اس سے کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے بلکہ ایک طرح سے اس کا انداز دوستانہ ہی تھا۔

”تم سمجھ ہی چکے ہو۔“ اس نے اعتراف کیا۔
”ابھی مہمیل (تفصیل) میں جانے کا وقت نہیں ہے۔ آپ جلدی سے یہاں سے نکل جاؤ۔ ام ابھی یہیں کام پر ہے۔ یہاں نہیں بھی ہوا تو وہ جو پاس میں چائے کا ہوٹل اے، وہاں سے امارا پتا کر لیتا۔ ام آپ کا کوئی خدمت کر سکا تو ام کو اچھا لگے گا۔“ مشورے کے ساتھ ساتھ اس کی پیشکش میں بھی بڑا غلوص تھا۔

”میرے جانے کے بعد تم مشکل میں پڑ جاؤ گے۔ پولیس تم سے پوچھ گچھ کرے گی کہ تم کہاں تھے اور جب یہ سب کچھ ہوا تو کیا کر رہے تھے؟“ اسے اس غلوص بندے کو ان حالات میں چھوڑ کر جانا مشکل محسوس ہوا۔

”آپ کے پاس نیند کا دوسرا گولی اے تو ام کو دے دو۔ ام خود ہی چائے میں ڈال کر پی لے گا۔“ خان کے سادہ سے لہجے کے پیچھے چھپی شرارت کو محسوس کر لیتا اس کے لیے بہت آسان تھا۔

”یعنی تم نے مجھے گولی چائے میں ڈالتے ہوئے دیکھ لیا تھا اسی لیے جان بوجھ کر چائے گرا دی۔“ اس نے خان کو گھورا۔ جواباً وہ مسکراتا رہا۔

”ٹھیک ہے، یہ گولی رکھ لو، اس کو کھانے سے تم سوال جواب سے بچ جاؤ گے۔“ اس نے اپنی جیب سے دوسری گولی نکال کر خان کے حوالے کر دی۔

”اب میں چلتا ہوں۔“
”ایسے خالی ہاتھ نئی جاؤ صاب!“ گل خان نے اسے ٹوکا۔

”مطلب؟“

”مطلب آپ کو تالا مالا کھولنا تو آتا ہے تو جاتے جاتے ادھر سے ٹھوڑا زور اور دوپہ بیسہا ساتھ لے جاؤ۔“

”ہیں.....!“ خان کے اس مشورے پر اس کا منہ کھل گیا۔
”اس لیے بڑی ہے صاب کہ پولیس اس کو چوری

ایسا حال ہو گیا تھا جیسے کسی لمحے دم نکلنے والا ہو۔ سائڈ کی طرح پلے جسم میں چڑیا جیسا دل مضحکہ خیز بھی لگ رہا تھا۔

”میں نے تم کو سب کچھ ٹھیک ٹھیک بتا دیا ہے۔ اب تم ادھر سے چلے جاؤ اور میری جان چھوڑو۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ اگر تم تھوڑی دیر اور اسی طرح میرے سر پر سوار رہے تو مجھے ہارٹ ایک آجائے گا۔“ جب اس نے دیکھا کہ اب اس سے مزید کوئی سوال نہیں کیا جا رہا ہے تو دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے الٹھا کرنے لگا۔ اس الٹھا پر اس نے کچھ چونک کر اسے دیکھا۔ وہ ایڑی سے چونی تک پیسے میں نہا گیا تھا اور واقعی ایسا لگ رہا تھا کہ کسی بھی لمحے اس کا دل بند ہونے والا ہے۔ اس رشوت خور اور عیش پرست آدمی پر اسے رحم تو خیر کیا ہی آتا لیکن مسئلہ یہ آکھڑا ہوا تھا کہ اب وہ اس کا کیا کرے؟ لازمی سی بات تھی کہ وہ اس واقعے کو خاموشی سے تو ہضم نہیں کر سکتا تھا۔ وہ یقیناً موہن تک یہ خبر پہنچاتا کہ کوئی ہے جو اس تک رسائی کی کوشش کر رہا ہے۔ ایسی صورت میں موہن بے حد ہوشیار ہو جاتا اور اس کے لیے اس پر ہاتھ ڈالنا مشکل ہو جاتا۔

”یہاں سے جاؤ مالی باپ اور وشواس کرو کہ میں اس سب کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔“ وکرم نے شاید اس کی آنکھوں میں اس کی سوچ پڑھ لی تھی جو اسے اس طرح کی یقین دہانی کروا رہا تھا لیکن اس کے لیے بھروسہ کرنا آسان نہیں تھا تو صرف اور صرف ایک بندے کی زبان بند رکھنے کے لیے اس کی موت کا فیصلہ کرنے سے بھی ہچکچاہٹا تھا۔ تذبذب کی اس کیفیت میں اس کی توجہ وکرم پر سے کم ہوئی تھی یا وکرم ہی کی مایوسی اور خوف نے شدت اختیار کر لی تھی کہ وہ ایک دم اس پر حملہ آور ہوا اور اس کے ہاتھ سے پھل بچھنے کی کوشش کی۔ اس کی یہ کوشش خود اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی۔ پھل کا سیٹی ٹیج ہٹا ہوا تھا۔ جھٹکا لگنے سے ٹریگر پر جی اس کی انگلی پر دباؤ پڑا اور گولی نکل کر سیدھی وکرم کے دل میں گھس گئی۔ وہ تڑپا اور لمحوں میں ساکت ہو گیا۔ وہ ایک گہری سانس لیتے ہوئے پیچھے ہٹ گیا۔ جو فیصلہ اس سے نہیں ہوسکا تھا، وہ وکرم کی حرکت نے خود کر ڈالا تھا۔

ابھی بات یہ تھی کہ گولی کے دھماکے کے باوجود اوشا ہنوز بے ہوش تھی۔ اس کے بے ہوش وجود پر ایک نظر ڈال کر وہ پلٹا تو دروازے میں استدھ گل خان کو دیکھ کر چونک گیا۔ وہ آنکھوں میں عجب سے تاثرات لیے اسے دیکھ رہا تھا۔ اگر وہ خود کو ملنے والی تربیت پر عمل کرتا تو اس وقت اس

ڈکیتی کا کیس سمجھے۔“ اس کی حیرانی کو دیکھتے ہوئے خان نے اسے سمجھایا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

”شکر یہ خان۔“ اس نے نہ صرف مشورہ سنا بلکہ اس پر عمل بھی کیا۔

”ام سے رابطہ کرنا صاب! ام آپ کے کسی کام آسکتا تو ام کو خوشی ہوگا۔“ جاتے جاتے اس نے خان سے مصافحہ کیا تو اس نے جذباتی لہجے میں ایک بار پھر اس سے فرمائش کی۔ وہ خاموش رہا۔ حقیقتاً وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ شخص جو پہلے ہی پرانی لڑائی میں نقصان اٹھا چکا ہے، مزید کسی مشکل سے گزرے۔

”ام کو عالم سائیکس کا بھکر ہے۔ وہ اچھا آدمی ہے۔ اس کے ساتھ ایسا ظلم نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اللہ کرے کہ آپ ان کو آزاد کروانے میں کامیاب ہو جائے۔ اگر ان سے امارا ملاقات نہ ہو سکے تو آپ اماری طرف سے ان کو سلام بولنا اور یہ بھی کہنا کہ شکیل صیب کے دھوکے میں امارا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔“ وہ اتنی سادگی اور خلوص سے یہ سب کہتا جا رہا تھا کہ اسے اس پر پیار آگیا اور بے ساختہ ہی اسے گلے سے لگا لیا پھر دھیرے سے اس کی پیٹھ تھپکتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس رنگ بدلتی دنیا میں جہاں قدم قدم پر دھوکا اور فریب تھا، گل خان جیسے سادہ اور مخلص آدمی کا مل جانا کسی نعمت سے کم نہیں تھا۔

☆☆☆

”آپ نے مجھے بلایا تھا؟“ وہ اکھڑی اکھڑی سی کھیل کے رو برو کھڑی ان سے پوچھ رہی تھی۔

”ہاں، بیٹھو۔“ انہوں نے موبائل کی اسکرین پر سے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور حکم صادر کیا۔

”آپ کو مجھ سے کیا کام تھا؟“ دو ڈھائی منٹ گزر جانے کے باوجود وہ اس کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے موبائل ہی میں مصروف رہے تو اس نے انہیں ٹوکا۔

”بات کرنی تھی تم سے۔“ آخر انہوں نے موبائل ایک جانب رکھا اور پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

”سیجیے۔“ اس کے انداز میں ایک ایسی بے نیازی تھی جو اگلے کو بری طرح جیسے۔

”یہ کیا ڈراما لگا رکھا ہے تم نے گھر میں؟ کیوں اپنے ہاتھوں اپنی بدنامی کا انتظام کر رہی ہو؟“ انہوں نے سخت لہجے میں اس سے استفسار کیا۔

”ڈراما آپ کو لگتا ہوگا۔ میری زندگی کی تو یہ سب سے تلخ سچائی ہے۔“

”بھول جاؤ سب کچھ۔ بھول جانے میں ہی تمہاری۔“

اور باقی سب کی بھلائی ہے۔“ انہوں نے اسے نصیحت کی۔

”بھول جاؤ؟ کیسے بھول جاؤں؟ اس قاتل کی بہن کو اس گھر میں بھوکے حیثیت سے دیکھوں اور مجھے کچھ یاد نہ آئے، ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟“ اس کے اندر کا غصہ اس کے لہجے سے جھلکنے لگا۔

”جو کچھ تم کرنے جا رہی تھیں اس کے بعد ہم میں سے کسی نہ کسی کو تو قاتل بننا ہی پڑتا۔ اچھا ہوا کہ عالم نے یہ بوجھ اپنے سر لے لیا۔“ ان کا لہجہ بے پناہ سرد ہو گیا۔

”آپ.....“ شدید غصے اور بے بسی کے باعث اس کے لیے کچھ کہنا ممکن نہ ہو سکا۔

”بہت ہو چکا اجالا! جتنا برداشت کیا جا چکا ہے اس سے زیادہ کی اب گنجائش نہیں ہے۔ تمہاری وجہ سے ہمارا خاندان کس عذاب میں پھنس گیا ہے، کچھ اندازہ ہے تمہیں؟“ ان کی آواز بلند نہیں تھی لیکن لہجے میں محسوس کیا جانے والا طیش تھا۔

”میری وجہ سے یا اس خونی اور دہشت گرد کی وجہ سے؟“ وہ تھملائی۔

”تمہاری وجہ سے۔ یہ تم تھیں جس کی وجہ سے کرشنا جیسے کرپٹ پولیس والے نے اس گھر کا راستہ دیکھا۔ تمہیں کچھ معلوم ہے کہ وہ کس کس طرح کی دھمکیاں دیتا رہا ہے ہمیں۔ اس کی دھمکیوں اور بدنیتی کی وجہ سے مجھے خود عالم اور اس کے ملازم کو گرفتار کروانا پڑا۔ میرے اتنے بڑے تعاون کے باوجود وہ شخص اور اس کے افسران بالابڑی بڑی رقوم وصول کرتے رہے ہیں مجھ سے۔“

”لیکن کیوں؟“ وہ حیران ہوئی۔

”تمہارے خیال میں عالم کو دہشت گرد قرار دے جانے کے بعد ہمارا یہاں سکون سے رہنا اتنا آسان تھا۔ ہم سب دہشت گردوں کے سہولت کاروں کی حیثیت سے گرفتار کر لیے جاتے اگر میں وقت کی نزاکت کو سمجھ کر پہلے ہی دشنا کے ساتھ سیٹلفٹ نہ کر لیتا۔“

”میں نے تو سنا ہے کہ آپ عالم کی رہائی کے لیے کوششیں کر رہے ہیں اور اس کے لیے بڑا روپیہ پیسا خرچ کر رہے ہیں۔“ اسے گویا ان کی بات کا یقین نہیں آیا۔

”وہ تو اس کے باپ سے رقم منگوانے کے لیے ایسا شوکرنا پڑ رہا ہے۔ اپنا نقصان کہیں نہ کہیں سے تو پورا کرنا ہی ہے نا۔“ انہوں نے اسے حیران کر دیا۔

”بھل کی فیصل سے شادی کروانے کی کیا ضرورت تھی؟ آپ کو معلوم تھا کہ فیصل سویرا سے محبت کرتا ہے۔“

گا۔ وہ یہاں ہوں گے تو ہر معاملے میں اپنی ٹانگ اڑائیں گے۔“ آخری جملہ اس نے خود کھائی کے انداز میں ادا کیا تھا لیکن اجالا کے تیز کانوں نے سب سن لیا تھا۔
”اب میں جاؤں؟“ اس کے لیے وہاں بیٹھنا دو بھر ہو گیا۔

”ہاں، جاؤ لیکن میری باتوں کو یاد رکھنا۔ اب اگر گھر میں کوئی ہنگامہ ہوا تو میں تمہیں پاگل خانے شفٹ کروادوں گا۔ وہاں جا کر پھر جتنے چاہے پاگل پن کے مظاہرے کرتی رہنا۔“ ان کی دی گئی سنگین دھمکی پر اس کا چہرہ غصے سے سرخ پڑ گیا لیکن زبان سے کچھ کہے بغیر ایک جھٹکے سے اٹھ کر باہر نکل گئی۔ گم صم سی کیفیت میں اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے وہ مسلسل ٹھیل کے رویے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اب تک گھر میں اس کے والد نیاز شاہ کا حکم چلتا رہا تھا اور وہ والد کی لاڈلی ہونے کی وجہ سے باقی سب سے بھی اپنے لاڈ اٹھواتی تھی لیکن موجودہ حالات نے گویا سب ہی کی حیثیتیں بدل کر رکھ دی تھیں۔ نیاز شاہ کو معزول حکمران کی طرح سب معاملات سے الگ کر کے گھر سے دور کر دیا گیا تھا اور اب وہ بھائیوں کی لاڈلی بہن کے بجائے ایک ایسی معتب لڑکی تھی جس نے خاندان کی عزت کو بیٹا لگانے کی کوشش کی تھی۔

”دیکھ کر نہیں چل سکتیں کیا؟ آنکھوں کی جگہ بننٹ کروا لیے ہیں؟“ چلتے چلتے اسے زور کا دھکا لگا تو خود سے ٹکرانے والی ملازمہ شاہدہ پراٹھ پڑی۔

”معاف کیجیے گا بی بی! وہ سکل بی بی بے ہوش ہو گئی ہیں۔ میں فردوس بی بی کو بلانے جا رہی ہوں۔“ شاہدہ نے عجلت میں اس سے معذرت کی اور بھاگتی ہوئی فردوس کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کے جانے کے بعد اجالا نے نوٹ کیا کہ وہ اس وقت سکل کے کمرے کے آگے کھڑی ہوئی ہے۔ بے ساختہ ہی وہ کھلے دروازے سے اندر داخل ہو گئی۔ سکل دنیا و مافیہا سے بے خبر بستر پر بے ہوش پڑی تھی لیکن اس حالت میں بھی اس کے چہرے پر موجود تکلیف کے آثار صاف دیکھے جاسکتے تھے۔

”اس کا کیا قصور ہے؟ یہ بھی تو مردوں کے معاشرے میں ایک بے بس عورت ہے جسے اپنے بھائی کے جرم کے بدلے سزا کا پتی پڑ رہی ہے۔“ اسے خود ٹھیل کے رویے سے تازہ تازہ صدمہ پہنچا تھا اس لیے پہلی بار سکل کے لیے ہمدردی سے کچھ سوچ رہی تھی۔ اسی ہمدردی میں اس نے سکل کا بستر سے نیچے لٹکا ہوا ہاتھ زنی سے اٹھا کر اس کے سینے پر

”تو کر لے گا سویرا سے دوسری شادی۔ بیوی کا کیا ہے، ایک جاتی ہے تو دوسری آ جاتی ہے۔ اگر پہلی جاتے جاتے ڈھیروں دولت دے جائے تو اسے کچھ عرصے کے لیے برداشت کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔“
”مطلب؟“ اسے ان کے لہجے کی معنی فیزی نے الجھا دیا۔

”بڑی دولت جائداد ہے چاچا سائیں صداقت شاہ کے پاس۔ اس میں سے کچھ بیٹے کی رہائی اور کچھ بیٹی کے حصے کے نام پر ہماری طرف منتقل کر دیں گے تو زیادہ کی نہیں آئے گی ان کی دولت مندی میں۔“ انہوں نے اس کی الجھن دور کی لیکن وہ مزید الجھ گئی۔
”ہمارے پاس کوئی کمی تو نہیں ہے؟“

”جتنا ہے، اس سے زیادہ حصے دار ہیں۔ جب تک سانچا بن چل رہا ہے تب تک ہی سارے عیش و آرام ہیں۔ اباجی کی آنکھیں بند ہوتے ہی سب حتر ہوتا ہے۔ تم بہنوں سے بھی مجھے کوئی اچھی امید نہیں ہے۔ معلوم ہے کہ سب موقع ملتے ہی اپنا حصہ مانگنے لگتی ہو جائیں گی۔“
”تو حصہ تو ہے نا ہمارا۔“ وہ اپنے بھائی کی باتیں سمجھنے سے قاصر تھی۔

”حصہ ہے لیکن یہ مت بھولو کہ ساری محنت ہم بھائی کرتے ہیں اس لیے تم میں سے کوئی منہ کھول کر مطالبہ نہیں کر سکتا۔ جس کو جتنا دے دیں، اسے خاموشی سے قبول کر لینا چاہیے۔ صبیحہ اور صالحہ کی شادی اور جینز پر جتنا خرچ ہوا ہے اس کا بھی تو کچھ حساب کتاب بننا ہے یا نہیں؟ تمہاری شادی ہوگی تو ظاہر ہے اس پر بھی خرچ کریں گے۔“ وہ اپنی گفتگو سے لمحہ بہ لمحہ اس کی حیرانی کو بڑھاتے جا رہے تھے۔

”خیر، میں نے یہ سب کہنے کے لیے تمہیں یہاں نہیں بلایا تھا۔ مجھے تم سے صرف یہ کہنا تھا کہ پاگل پن کا ڈراما بند کرو اور شرافت سے رہو۔ میں ایک اچھے گھر میں تمہاری شادی کی بات چلانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ تم اپنے جنون میں جوان پ شاپ بکتی ہو اگر تو کرائیوں کے ذریعے گھر سے باہر نکل گیا تو ساری زندگی اسی گھر میں بیٹھی رہ جاؤ گی۔“

”اباجی کو کب داپس بلوار ہے ہیں آپ؟“ ٹھیل کے انداز نے اسے جو باور کروا دیا تھا، اس نے اسے خوفزدہ کر دیا تھا اور حسب عادت وہ کوئی ہنگامہ مچانے کا بھی نہیں سوچ سکتی تھی اس لیے اپنا لاڈ اٹھانے والا باپ یاد آ گیا تھا۔
”ان کی صحت کے لیے اچھا ہے کہ ابھی کچھ عرصہ وہ وہیں رہیں۔ اس دوران میں کچھ اہم معاملات بچ کر ٹھیلوں

رکھ دیا۔ اسی وقت فردوس شاہدہ کی معیت میں اندر داخل ہوئی اور اجالا کو وہاں پا کر ٹھٹک گئی لیکن پھر اسے خاموش اور پُرسکون پا کر اسے تسلی ہوئی اور آگے بڑھ کر سبیل کا معائنہ کرنے لگی۔

”مجھے اس کی کنڈیشن بالکل بھی ٹھیک نہیں لگ رہی۔ اسے اسپتال لے جانا ضروری ہے۔“ معائنہ کرتے کرتے وہ پریشانی سے بلند آواز میں بڑبڑاتی۔

”آپ اسے گاڑی میں پہنچائیں۔ میں چابیاں لے کر ابھی آتی ہوں۔“

”لیکن وہ فیصل.....؟“ فردوس کے لیے اس کی پیشکش قطعی غیر متوقع تھی۔

”وہ سب میں دیکھ لوں گی۔ آپ بس اسے گاڑی میں پہنچائیں۔“ اس نے اپنے ازلی پُر اعتماد لہجے میں حتیٰ فیصلہ سنایا تو فردوس بھی مطمئن سی ہو کر ملازماؤں کے ساتھ سبیل کو گاڑی میں منتقل کروانے میں مصروف ہو گئی۔

غیر معمولی آوازیں سن کر گھر کے دیگر لوگ بھی صورت حال معلوم کرنے چلے آئے۔ سبیل کی حالت ایسی تھی کہ اگر کسی کو اس کے اسپتال منتقل کیے جانے پر اعتراض تھا بھی تو وہ اظہار کی جرأت نہیں کر سکا۔

”آپ کے اسپتال ہی چلنا ہے نا؟“ اجالا نے گاڑی اشارت کرتے ہوئے اس سے استفسار کیا۔

”ہاں، وہاں میں اس کا زیادہ بہتر ٹریٹمنٹ کروا سکتی ہوں۔“ فردوس نے بے ہوش سبیل کے چہرے پر سے بال سینے اور اس کے اوپر اس کی چادر درست کی۔ وہ خود پردہ نہیں کرتی تھی لیکن جانتی تھی کہ سبیل اس معاملے میں خاصی حساس ہے۔ اسپتال پہنچنے سے قبل ہی اس نے موبائل فون کے

ذریعے وہاں ایمرجنسی کی اطلاع کر دی تھی چنانچہ جب وہ لوگ وہاں پہنچے تو عملے کے افراد تیار ہی کھڑے تھے۔ سبیل کو نہایت پھرتی سے گاڑی میں سے اسٹریچر پر منتقل کر کے اسپتال کی عمارت کے اندر لے جایا گیا۔

”اوکے! میں چلتی ہوں۔ آپ تو یقیناً ابھی یہیں رہیں گی؟“ فردوس اجالا سے کوئی استفسار کرتی، اس سے قبل ہی وہ بول پڑی۔

”تم جاؤ۔ میرا یہاں رکنا ضروری ہے۔“ اس نے نرمی سے اجالا کو جواب دیا تو اس نے سر ہلاتے ہوئے انکیشن میں چابی گھما دی۔

”تھیک یو اجالا!“ فردوس نے بے ساختہ ہی اس کا شکریہ ادا کیا۔

”اس اوکے۔“ اس نے آہستہ سے کہہ کر گاڑی آگے بڑھا دی۔ فردوس کو ٹھٹک گزرا کہ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی ہلکی سی چمک تھی۔ کسی تہدیلی کے احساس کے ساتھ وہ اسپتال کی مرکزی عمارت کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

”ہیلو گاڑا! کیا ہو رہا ہے؟“ وقاص نے ڈانٹنگ نچل کے گرد بیٹھے خاور صاحب اور سہد کو دیکھا اور دانستہ لہجے کو خوشگوار بناتے ہوئے ان سے دریافت کیا۔

”اپنے سے بڑوں سے ادب سے بات کرتے ہیں۔“ ان دونوں کی طرف سے کوئی جواب موصول ہوتا، اس سے قبل ہی علیہ نے اسے ٹوکے کا فریضہ انجام دیا۔

”اچھا، وہ کیسے؟“ براماننے کے بجائے اس نے علیہ سے دریافت کیا۔

”ہمارے ہاں تو بڑوں کو ماتھے پر ہاتھ رکھ کر آداب کہتے ہیں اور پھر جھک کر ان سے سر پر دستِ شفقت رکھواتے ہیں۔“ اس نے سنجیدگی سے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

”تو کوئی مسئلہ نہیں۔ ابھی یہ سب کیے دیتے ہیں۔“ وہ نور اعلیٰ کے لیے کمر بستہ ہو گیا۔

”ارے رہنے دو بیٹا! یہ علیہ تو بس یونہی شرارت کر رہی ہے۔“ خاور صاحب نے اسے اس کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔

”ارے نہیں اکل! جب کوئی اور خاص طور پر بیوی اچھی بات بتائے تو اس پر لازمی عمل کرنا چاہیے۔ میں نے تو دیسے ہی شادی سے پہلے سے جو رو کا غلام بن کر رہنے کا عہد کر رکھا ہے۔“ اس پر ان کے انکار کا کوئی اثر نہیں ہوا اور پورے اہتمام سے انہیں آداب کہنے کے بعد ان کے آگے جھک گیا۔

”جیتے رہو بیٹا! سدا ایسے ہی خوش اور ہنستے مسکراتے رہو۔“ اسے محبت سے دعا میں دیتے ہوئے خاور صاحب کو بے ساختہ ہی معاذ یاد آیا۔ پتا نہیں کہاں تھا وہ اور کتنی مشکلات سے غمتا پھر رہا تھا۔

”رشتے میں تو آپ جناب بھی مجھ سے بڑے ہی ہوتے ہیں۔ اس لیے آپ کو بھی آداب.....“ خاور صاحب کی سوچوں سے بے خبر اب وہ سہد سے مخاطب تھا۔

”علیکم آداب! سہد نے ہنستے ہوئے اسے گلے لگایا۔

میز پر ناشائستہ سیٹھی نے بھی اس منظر کو دلچسپی سے دیکھا۔ وہ ان لوگوں کی گفتگو میں کمی مداخلت نہیں کرتی تھی لیکن مقررہ

اور وہ وقاص سے بھی ویسی ہی محبت محسوس کرنے لگے تھے جیسی اپنے بیٹوں سے کرتے تھے۔

☆☆☆

”معلوم نہیں پولیس نے گل خان کے ساتھ کیا سلوک کیا ہوگا۔ بچارہ اچھا آدمی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ پولیس والے اسے تنگ کریں گے۔“

”آپ کا ڈر غلط نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ پولیس والوں نے اسے گرفتار ہی کر لیا ہو اور اب بذریعہ تشدد اس سے سچ اگوانے کی کوشش کر رہے ہوں۔“ کالے خان نے آلو چھیلے ہوئے اس کے خیال کی تائید کی۔

”لیکن ٹھیکیدار تو گواہی دے گا نا کہ گل خان کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں خود ہی وہاں مزدوری کے لیے آیا تھا اور مجھے اس نے خود وہاں ٹھہرایا تھا۔ گل خان کا اس میں کوئی ہاتھ نہیں تھا۔“ اس نے امید ظاہر کی۔

”کچھ کہا نہیں جاسکتا، ہو سکتا ہے اپنی جان بچانے کے لیے وہ گل خان پر ہی سارا ملبا ڈال دے۔“ آلوؤں کو ککڑوں میں تقسیم کرتے ہوئے کالے خان نے اپنی رائے دی۔

”تم کوئی پاز بیٹو بات نہیں کہہ سکتے؟“ معاذ جھنجھلایا۔

”اپنے اور ہمارے ہاں کی پولیس کو آپ جانتے ہیں۔ یہ لوگ جس کی گردن پٹنی دکھے، اس میں پھندا لٹکس کر دیتے ہیں۔ ایسے میں ہر شخص اپنی جان بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہاں تو معاملہ بھی ان کی برابری کے بندے کا ہے۔ پولیس والے کا قتل اتنی آسانی سے ہضم نہیں کریں گے۔“ اس نے کئے ہوئے آلوؤں کو ہانڈی میں جھونکا اور تیزی سے ہانڈی میں ڈوکی چلائی۔

”ایک تو تم کھانا ڈھنگ کا نہیں بناتے۔ صبح بھی تم نے جو

آلیٹ کھلایا تھا سخت بد مزہ تھا۔“ معاذ نے اس پر تنقید کی۔

”مجبوری ہے۔ جب تک کسی دوسرے قابل اعتماد خانہ ماں کا انتظام نہیں ہو جاتا، آپ کو میرے ہاتھ گئے کچے کھانوں پر ہی گزارہ کرنا پڑے گا۔“ اس کی تنقید کا بُرا مانے بغیر کالے خان نے اطمینان سے جواب دیا اور ہانڈی میں پانی اٹھایا۔

”تمہیں ضرورت کیا پڑی تھی خانہ ماں کو اتنا ڈانٹنے کی کہ وہ نوکری چھوڑ کر ہی چلا گیا۔“ اس کا ذہن الجھا ہوا تھا چنانچہ خراخواہ ایک غیر ضروری معاملے میں کالے خان سے الجھ رہا تھا۔

”ضرورت کیوں نہیں تھی۔ وہ رادھا کی محنت کی کمائی کو بیدردی سے ضائع کر رہا تھا۔ چند مہینوں میں ہی مچن کا

اوقات میں ہر خدمت مستعدی سے بچالاتی تھی۔

”کچھ بتایا لالہ نے کہ ہمیں کب تک یہاں رہنا ہوگا؟“ ناشتے کا آغاز ہوا تو خاور احمد نے دھیمی آواز میں وقاص سے پوچھا۔

”کیا آپ یہاں کوئی تکلیف محسوس کر رہے ہیں انکل؟“ وہ فوراً فکر مند ہوا۔

”ایسی کوئی بات نہیں بیٹا۔ یہاں بہت آرام ہے لیکن عارضی ٹھکانے اور مستقل سکونت میں فرق تو ہوتا ہے نا؟ سب سے بڑھ کر مجھے یہ فیشن ہے کہ ہم ایک ایسے شہر میں موجود ہیں جہاں دشمنوں کو ہماری موجودگی کی خبر ہو چکی ہے اور وہ کسی بھی وقت ہماری بوسٹنگتے ہوئے یہاں پہنچ سکتے ہیں۔“ انہوں نے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔

”یہ سب لالہ کے ذہن میں بھی ہے۔ وہ ہمیں یہاں سے نکالنے کے انتظامات بھی کر رہے ہیں بلکہ سمجھیں کر ہی چکے ہیں۔ بس ذرا سی تشویش یہ ہے کہ پتا نہیں آپ اور علیہ سفر کی سختی سہہ سکیں گے یا نہیں۔“

”انہوں نے کون سا ذریعہ سفر تجویز کیا ہے۔“ اس کی ہچکچاہٹ دیکھ کر خاور احمد نے سوال کیا۔

”سمندر کا سفر۔ آپ میں سے شاید کسی کو بھی بحری جہاز کے ذریعے سمندری سفر کی عادت نہیں ہوگی۔“ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی تشویش تھی۔

”کوئی بات نہیں۔ ایک تجربہ یہ بھی سہی۔“ خاور احمد سے پہلے علیہ بول پڑی۔

”اتنا آسان نہیں ہوتا بحری سفر۔ کبھی کبھی تو عادی لوگ بھی بیمار ہو جاتے ہیں۔“ وقاص نے اسے مطلع کیا۔

”ہم کر لیں گے۔ آخر ہم زندگی کی اور مشکلات سے بھی تو گزر رہی گئے ہیں۔“ علیہ کی بات نے سب کو چپ سی لگا دی۔

”ٹھیک ہے، پھر میں لالہ کو ہاں کہہ دیتا ہوں۔ آپ کو تو کوئی اعتراض نہیں ہے انکل؟“ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد وقاص آہستہ سے بولا اور جیم کی بوتل کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے خاور احمد سے سوال کیا۔

”اعتراض کیسا بیٹا! میں تو کب سے تن بہ نقدیر ہو کر بیٹھا ہوں۔ قسمت جس سمت میں لے جاتی ہے، چل پڑتا ہوں۔“

”حوصلہ رکھیں انکل! ان شاء اللہ ایک نہ ایک دن حالات ضرور بدلیں گے۔“ وقاص نے انہیں حوصلہ دیا۔

”شکر یہ بیٹا! انہیں اس کا سلی دینا اچھا لگا۔ حالات کے جبر کے تحت جڑنے والا یہ رشتہ اب انہیں اچھا لگنے لگا تھا

بجٹ کہیں سے کہیں پہنچا دیا تھا اس نے۔“ کالے خان نے چمک کر اسے جواب دیا۔

”چلو، اب تو بجٹ ہی بجٹ ہوگی۔ نہ کوئی یہ بدذائقہ کھانا کھائے گا نہ خرچہ ہوگا۔“ اس نے تبصرہ کیا۔ کالے خان کو جواب دینے کا موقع مل پاتا اس سے قبل ہی اس کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ اسکرین پر ملازمہ شاہدہ کا نمبر آتا دیکھ کر اس نے اپنے ہونٹ سمجھ لپے۔ شاہدہ کو یہ خبر دینا اس کی واحد بے احتیاجی تھی جو وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر کر گزرتا تھا۔ سبیل کی طرف سے اس کا دل قطعی مطمئن نہیں تھا اور اسے اندیشہ تھا کہ وہ کسی ایسی انتہائی صورت حال سے دوچار ہو سکتی ہے جس کے بعد اس کی طرف سے عائد کردہ پابندی کے باوجود اس کی مداخلت ناگزیر ہو جائے گی۔

”ہاں شاہدہ! پولو، کیا مسئلہ ہے؟“ کال ریسو کرتے ہی اس نے بے چینی سے پوچھا۔ جواب میں شاہدہ نے اسے جو کچھ بتایا، اسے سن کر اس کے سینے میں ایک آگ سی بھڑک اٹھی۔

”کون سے اسپتال لے گئے ہیں اسے؟“ تنے ہوئے اعصاب کے ساتھ اس نے شاہدہ سے پوچھا۔ یکطرفہ گفتگو کے ساتھ اس کے تاثرات ملاحظہ کرتا کالے خان اپنا کام روک کر تشویش زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”ٹھیک ہے، میں دیکھ لیتا ہوں۔“ دوسری طرف کا جواب سن کر اس نے مختصراً کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

”مجھے ابھی اور اسی وقت اسپتال جانا ہے۔“ فون بند کرتے ہی اس پر غلت سوار ہو گئی۔

”خیریت؟ کیا ہو گیا ہے؟“ کالے خان نے دریافت کیا۔

”سبیل کا پراپر علاج نہ کروانے کا نتیجہ برآمد ہو گیا ہے۔ اسے بے ہوشی کی حالت میں اسپتال لے جایا گیا ہے۔“ اس نے سنے ہوئے چہرے کے ساتھ کالے خان کو آگاہ کیا۔ ”میں اسے دیکھنے اسپتال جا رہا ہوں۔“

”لیکن آپ اس طرح منہ اٹھا کر اسپتال کیسے جاسکتے ہیں؟ یہ خطرناک ہوگا۔“

”مجھے روکنے کی کوشش مت کرنا کیونکہ میں رکوں گا نہیں۔“ اس وقت وہ کچھ بھی سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔

”ٹھیک ہے، نہیں روکتا لیکن کوئی احتیاطی تدبیر تو کرنے دیں۔ اس طرح اندھا دھند وہاں پہنچ جانے سے آپ خاتون کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ ٹریمنٹ دینا ڈاکٹروں کا کام ہے اور وہ یقیناً دے رہے ہوں گے۔“

کالے خان اس کی بے صبری کے آگے بند باندھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”میں کچھ نہیں کر سکتا تو کیا میں وہاں جاؤں بھی نہیں؟ اگر تمہاری رادھا دیوی ایسی حالت میں اسپتال میں پڑی ہوگی تو تم رک جاؤ گے؟“ کالے خان کے روکنے نے اسے مشتعل کیا۔

”نہیں رکوں گا اور آپ کو بھی میں روک نہیں رہا، صرف عقل کے استعمال کا مشورہ دے رہا ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ سبیل بی بی کے اس جنجال سے جان چھوٹنے کی صرف ایک راہ ہے اور وہ یہ کہ ان کے بھائی کو آزادی مل جائے۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کی بے احتیاجی سے اصل کام پیچھے رہ جائے اور آپ خود کسی مشکل میں پڑ جائیں۔“ اس کی برہمی کے باوجود کالے خان نے اسے سمجھانا ترک نہیں کیا۔

”اچھا، تم بتاؤ کہ میں کیا کروں؟“ آخر عقل کی بات اس کے پلے پڑی مگر اور اس نے کالے خان سے پوچھا۔

”بتاتا ہوں۔ پہلے میرے ساتھ اندر کمرے میں چلیے۔“ کالے خان نے چولہا بند کیا اور اس کا ہاتھ تمام کر مکن سے باہر لے گیا۔ کمرے میں پہنچ کر پہلے اس نے اپنے موبائل فون سے ایک کال کی اور دوسری طرف موجود بندے کو کچھ چیزوں کا فوری انتظام کرنے کا حکم دیا۔ اس کی گفتگو سن کر معاذ سمجھ گیا کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ یہ بات خود اس کے دماغ میں بھی آسکتی تھی لیکن سبیل کی کیفیت کے بارے میں سن کر وہ اتنا جذباتی ہو گیا تھا کہ وقتی طور پر کچھ بھی سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو گئی تھی۔

”موہن کے بارے میں کب تک معلوم ہو جائے گا؟“ کچھ خفت مٹانے کے لیے اور کچھ وقت گزاری کی خاطر اس نے کالے خان سے سوال کیا۔

”ایک ہوشیار بندے کی ڈیوٹی لگادی ہے۔ دیکھیے شام تک ور نہ کل صبح تک تو لازماً وہ رپورٹ دے دے گا۔“ ”موہن پر ہاتھ ڈالنے کے لیے ہمیں ٹھیک ٹھاک تیاری کرنی پڑے گی۔“ کالے خان کے اشارے پر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھتے ہوئے اس نے تبصرہ کیا۔

”مقتصد محض دھیان بیٹا تھا۔“ وہ تو ظاہر ہے کسی عام پولیس والے کے مقابلے میں ”را“ کے ایجنٹ پر ہاتھ ڈالنا بہت زیادہ مشکل کام ہے۔“ کالے خان نے اس کے چہرے پر اپنے ہاتھ چلاتے ہوئے اس کے خیال کی توثیق کی۔

”وکر م کے معاملے میں قسمت نے ہمارا بہت ساتھ

”ہیلٹ کس لیے ہے۔ ایک تو اس حلیے میں کوئی مجھے ایسے ہی نہیں پہچان سکتا۔ دوسرے ہیلٹ لگا لوں گا تو کسی کو دکھائی ہی نہیں دوں گا۔“ اس کے پاس جواب موجود تھا۔ ناچار کالے خان کو اس کی بات ماننا پڑی۔

فردوس کے اسپتال کا راستہ اس کے لیے جانا پہچانا تھا اس لیے وہاں پہنچنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ موٹر سائیکل اسٹینڈ پر اپنی بائیک کھڑی کر کے وہ اطمینان سے اندرونی عمارت کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ اسپتال میں وہی مخصوص ہچکل اور گہما گہما تھی۔ کہیں بیماری اور تکلیف سے سستے ہوئے چہرے تھے تو کہیں ان کی امید و ناامیدی کے مابین لٹکے تیار دار۔ کچھ چہروں پر یہ اطمینان دکھائی دے رہا تھا کہ وہ اپنے پیارے کو صحت مند ہونے کے بعد گھر لے جانے والا ہے تو کہیں کھو دینے اور بچھڑ جانے کا خوف ثبت ہو کر رہ گیا تھا۔ ان رنگارنگ تاثرات والے چہروں کا جائزہ لیتا، اپنے اطراف سے پوری طرح باخبر وہ کمر نمبر تین سو آٹھ کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ کمرے کے دروازے پر پہنچ کر اس کے قدم ٹھٹک گئے۔ اندر صرف فردوس ہوتی تو کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن گھر کے کسی اور فرد کی موجودگی میں اس کا کھل کر بات کرنا ممکن نہیں تھا۔

”جو بھی ہو، کم از کم میں اس کی خیریت تو معلوم کر سکوں گا۔“ اس نے سوچا اور دروازے پر دستک دی۔
”نہیں، کم ان۔“ حسب توقع اندر سے فردوس کی آواز سنائی دی تو اس کے اعتماد میں مزید اضافہ ہو گیا اور وہ تاب گھما کر دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ بے قرار دل کی خواہش تھی کہ سب سے پہلی نظر کھل پر ڈالے لیکن اس کے پردہ دار ہونے کے خیال نے نظروں کو اٹھنے ہی نہیں دیا۔ جو محبوب کو ادب و احترام نہ سکھائے وہ محبت بھی بھلا کوئی محبت تھی۔

”نہیں.....؟“ فردوس کے لیے اسے اس حلیے میں پہچانا ممکن نہیں تھا اس لیے ایک میل نرس کو یوں نظریں جھکائے سامنے کھڑے دیکھ کر حیران ہوئی اور قدرے سخت لہجے میں استفسار کیا۔
”میں سبیل کی خیریت معلوم کرنے آیا تھا۔“ وہ بولا تو فردوس چونک گئی۔

”تم.....!“ شناسا آواز نے اسے ٹھٹکا دیا۔
”جی۔ میں وہی ہوں، عالم کا دوست۔“ اس نے اپنا تعارف کروایا۔ وہ دانستہ ایسے رخ سے کھڑا تھا کہ سبیل کا بیڈ اس کے بائیں جانب تھا اور وہ گردن موڑے بغیر اسے نہیں

دیا۔ ڈرائیور کو اس نے بیوی بچے کے ساتھ بھجوا دیا تھا اور گارڈ کو جان بوجھ کر چھٹی دے دی تھی کہ کہیں وہ اس کی بیوی کو گھر پر اوشا کی آمد سے باخبر نہ کر دے۔“

”ان شاء اللہ آگے بھی قسمت ساتھ دے گی۔“ کالے خان نے اسے یقین دہانی کروائی۔ تھوڑی دیر میں کالے خان کا منگوا یا ہوا سامان بھی پہنچ گیا۔ یہ ایک میل نرس کا یونیفارم تھا جس پر فردوس کے اسپتال کا مونو گرام بھی بنا ہوا تھا۔ یونیفارم پہن کر اس نے خود کو آئینے میں دیکھا۔ اس کے سامنے ایک گہری سائولی رنگت اور ہلکی مونچھوں والا ایسا شخص کھڑا ہوا تھا جس کی ناک قدرے پھولی ہوئی تھی۔

”جادو ہے یا تمہارے ہاتھوں میں۔“ اس نے کالے خان کو سراہا۔ روپ بدلنے کی تربیت اسے بھی دی گئی تھی لیکن اب تک اسے خود اپنے اس ہنر کو آزمانے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔

”اس حلیے میں آپ آرام سے اسپتال میں مو کر سکتے ہیں۔ سبیل بی بی کا روم نمبر تھری زیر و اسٹ (308) ہے۔ امید ہے کہ آپ کو وہاں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی پھر بھی ایک آدمی آپ کے قریب رہے گا تاکہ کسی ضرورت کے وقت کام آسکے۔“ کالے خان نے محض مسکرا کر اس کی تعریف و وصول کی اور دیگر معلومات فراہم کرنے لگا۔

”آدمی کو رہنے دو کالے خان! مجھ میں اتنی صلاحیت ہے کہ کسی مشکل کے وقت خود کو محفوظ کر سکوں۔“ اس نے کسی مددگار کو ساتھ رکھنے سے انکار کر دیا۔ اسے احساس ہونے لگا تھا کہ زیادہ لوگوں سے رابطے میں رہنا اسے نقصان پہنچا سکتا ہے۔ وہ غیر قانونی طور پر یہاں موجود تھا اور اس کے لیے بہتر تھا کہ وہ لوگوں سے بچ کر رہتا۔

”اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں تو ٹھیک ہے۔ دیے بھی ڈرائیور جو آپ کو وہاں ڈراپ کرنے جائے گا تو وہ گاڑی میں موجود ہی ہوگا۔“

”کیسی باتیں کر رہے ہو یا! ایک میل نرس ایسی شاندار سی گاڑی سے جسے ڈرائیور چلا رہا ہو، اترتا ہوا دیکھ لیا گیا تو فوراً مشکوک ہو جائے گا۔“ اس نے کالے خان کی دوسری پشیمکش بھی رد کر دی۔

”پھر آپ وہاں کیسے جائیں گے؟“ وہ شکر ہوا۔
”بائیک پر۔“ اس نے اپنا فیصلہ سنایا۔
”لیکن یہ مناسب نہیں ہے۔ آپ کسی کی نظروں میں بھی آسکتے ہیں۔“ وہ تشویش میں مبتلا ہو گیا۔

دیکھ سکتا تھا۔ اسے اس کی اجازت کے بغیر دانستہ دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اسے تو عمر بھر کے لیے وہ ایک نظر ہی کافی ہوگئی تھی جب آشیانہ آزادی کے تہ خانے میں سیزمیں سے اترتی سبیل کو گرنے سے بچانے کے لیے اس نے اسے بے ساختہ اپنی بانہوں میں لے لیا تھا۔ اس وقت وہ بس ایک ہل کے لیے اس کے سامنے بے حجاب ہوئی تھی اور اس ایک ہل کی جگہ نے اسے خاکستر کر دیا تھا۔ اس دن کے بعد سے بدترین حالات میں بھی نہ اسے وہ صبح پیشانی بھولی تھی، نہ وہ سیاہ جل۔ اسے لگتا تھا کہ اس کا ایک ہل کا قرب اس کے پورے وجود میں سرایت کر گیا تھا اور اس کی خوشبو روح میں چکراتی پھرتی تھی۔

”تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ اگر کوئی آ گیا تو؟“ اس کی موجودگی نے فردوس کو متوجش کیا۔

”کون آئے گا اس مظلوم لڑکی کو دیکھنے؟ کیا وہ لوگ جنہوں نے اس پر ظلم کے پہاڑ توڑ کر اسے اس حال کو پہنچا دیا ہے؟“ وہ سچ ہوا تو فردوس کی نظریں جھک گئیں۔

”بہر حال، آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ کو کسی قسم کی وجہیگی سے بچانے کے لیے ہی میں اس حلیے میں یہاں آیا ہوں۔“ اسے احساس ہوا کہ وہ ایک ایسی ہستی کو شرمندہ کر گیا ہے جو پورے سسرال میں سبیل کی واحد ہمدرد ہے تو لہجہ کو نرم کر کے رسانیہ سے بولا۔

”میں شرمندہ ہوں کہ میں چاہ کر بھی سبیل کے لیے کچھ خاص کرنے سے قاصر ہوں۔“ وہ بیچاری دوسروں کے جرم پر خود شرمندہ تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اسے سبیل کے بارے میں خبریں مل جاتی ہیں اس لیے اس کی یہاں موجودگی پر سوال نہیں اٹھایا تھا۔ اسے اس کا سبیل کے لیے اغلاص اچھا لگتا تھا اس لیے کبھی اس کھوج میں بھی نہیں پڑی تھی کہ کون ہے جو اس تک یہ خبریں پہنچاتا ہے۔

”میں آپ کی مجبوری کو سمجھتا ہوں اس لیے مجھے آپ سے کوئی شکوہ بھی نہیں ہے۔ بس یہاں میں سبیل کی مکمل کیفیت معلوم کرنے آیا تھا۔ کیا آپ مجھے بتائیں گی کہ ڈاکٹر زاس کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔“

”نی الحال تو یہ کافی سنبھل گئی ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس کی بے ہوشی ختم ہوگئی ہے لیکن ہم اس کی حالت کو قابل اطمینان نہیں کہہ سکتے۔ میری نیورولوجسٹ سے بات ہوئی ہے۔ سی ٹی اسکین اور کچھ اور ٹیسٹ ہیں جو کروانے پڑیں گے اس کے بعد ہی کوئی حتمی رائے دی جاسکے گی۔“ فردوس کے لہجہ ہی سے ظاہر تھا کہ وہ سبیل کی

حالت کی طرف سے مطمئن نہیں ہے۔

”کیا اس وقت یہ دواؤں کے زیر اثر ہے؟“ وہ سبیل کی طرف دیکھ نہیں رہا تھا لیکن اس کی طرف سے مکمل خاموشی پر یہ تو سمجھ سکتا تھا کہ وہ ان کے درمیان ہونے والی گفتگو نہیں سن رہی ہے۔

”ہاں۔ تکلیف زیادہ تھی تو ایسی دوا میں دینا مناسب سمجھا گیا جن کے اثر سے یہ سوئی رہے۔“ فردوس نے دھیمی آواز میں بتایا۔

”آپ میری ایک بات کان کھول کر سن لیں ڈاکٹر فردوس اور سبیل کو بھی سمجھا دیں کہ اب میں اسے اسپتال سے واپس اس گھر میں نہیں جانے دوں گا جہاں انسانوں کے بجائے قصائی بستے ہیں۔ میں یہ برداشت کر ہی نہیں سکتا کہ اب اس کے ساتھ کوئی بدسلوکی ہو اور اسے ذہنی یا جسمانی تشدد کا نشانہ بنایا جائے۔“ اس کا لہجہ بالکل فیصلہ کن تھا۔

”نی الحال تو اسپتال سے ہی اسے گھر جانے کی پر مشق نہیں ملے گی۔ بعد میں تم خود سبیل سے مل کر اس معاملے کو طے کر لینا۔ جہاں تک میری بات ہے، میں تو خود اسے مشورہ دے چکی ہوں کہ تمہاری تجویز قبول کر لے۔“

”آپ محترمہ کو میرے فیصلے سے آگاہ کر دیجیے گا۔ میں دوبارہ آؤں گا تو بات بھی کر لوں گا۔“ اس کی جان عالم میں اٹکی ہے۔ جب تک عالم اور سرمد کی رہائی کا کوئی انتظام نہیں ہو جاتا، اس کے لیے خود کو آزاد کروانا ممکن نہیں ہوگا۔ شکیل بھائی اسے امید دلاتے رہتے ہیں کہ وہ ان دونوں کی رہائی کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے اور یہ اس واحد امید کے سہارے سب کچھ سہا رہی ہے۔ فردوس نے حقیقت کو شکر گزار کی۔

”اس سلسلے میں، میں خود مسلسل کوششوں میں لگا ہوا ہوں لیکن جانے کیا بات ہے کہ ہر بار کوئی نہ کوئی رکاوٹ سامنے آکھڑی ہوتی ہے البتہ ایک اہم کلیہ ہے جو ابھی سامنے آیا ہے اور مجھے امید ہے کہ اس بار مجھے عالم تک پہنچنے کا راستہ ضرور مل جائے گا۔“ وہ خود امید و ناامیدی کے درمیان لٹکا ہوا تھا۔ ”را“ دالوں کی قید میں موجود لوگوں کو نکال لانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ یہ درندوں کے غول میں پھنسے شکار کو بچالانے جیسا معاملہ تھا۔

”اگر تمہیں ضرورت پڑے تو اس نمبر پر کال کر کے دوپہر سے ملاقات کا وقت لے لیں۔ میرا حوالہ دینے پر ملاقات ضرور ہو جائے گی اور وہ تمہاری مدد کے لیے بھی تیار

”کیا مطلب، کیسے آتا ہوا؟ فیصل کی منکوحہ ہے کل اور یہ جب چاہے اس سے ملنے آسکتا ہے۔“ فردوس کے سوال نے جہاں ٹھیک کو چراغ پا کیا وہیں آنے والوں کا تعارف سامنے آنے پر باہر کھڑے معاذ کے اندر بھی طیش کی لہریں اٹھنے لگیں۔ ٹھیک وہ شخص تھا جس نے اپنے ذاتی مفادات کے حصول کے لیے عالم اور سرمد کے ساتھ ساتھ کل اور اس کے معصوم بچے کی زندگیوں بھی داؤ پر لگا دی تھیں۔

”مجھے یقین ہے کہ اسے اپنے اس رشتے کا احساس یہ اطلاع ملنے کے بعد ہوا ہوگا کہ میں نے کل کے جسم پر موجود چوٹوں کی وجہ سے بیڑھیوں سے گرنا لکھوائی ہے لہذا اسے اسپتال آنے میں کوئی خطرہ درپیش نہیں ہے۔“ عمومی حالات میں سسرالی رشتے داروں سے بحث میں گریز کرنے والی فردوس کو کل کی حالت پر اتنا غصہ اور دکھ تھا کہ وہ اپنے جذبات پر مکمل طور پر قابو رکھنے میں ناکام تھی۔

”تمہیں اس طرح کی گفتگو قطعی زیب نہیں دیتی فردوس! تم ہمارے خاندان کی بہو ہو اور خاندان کی عزت کا خیال رکھنا تمہارا فرض بنتا ہے۔“

”مجھے اپنا فرض نبھانے سے انکار نہیں ہے لیکن کچھ خیال آپ لوگ بھی تو کریں۔ یہ لڑکی جو آج اس حال میں یہاں پڑی ہوئی ہے آپ کے خاندان کی بہو ہی نہیں بیٹی بھی ہے۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو آپ اپنے بچے سے کیسے نظر ملائیں گے۔“ فردوس نے دھمی سے کچھ میں انہیں ملامت کی۔ اس موقع پر اب تک خاموش رہنے والے فیصل نے گفتگو میں حصہ لیا اور تلخ لہجے میں بولا۔

”آپ کی ساری بھڑکیاں بس اس کے ساتھ ہیں۔ میرا آپ کو کوئی خیال نہیں کہ میں کس ذہنی اذیت سے گزر رہا ہوں؟ ایک ایسے وقت میں جبکہ میں اپنی محبت کو پانے ہی والا تھا، میرے سر پر بیوہ اور ایک بچے کی ماں کو مسلط کر دیا گیا۔ آپ کو نہیں معلوم کہ مجھے کیسی نفرت محسوس ہوتی ہے اس عورت سے۔“ اس کے الفاظ پر باہر کھڑے معاذ کی مٹھیاں غصے سے بجھنے لگیں۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اندر جائے اور اس شخص کا چہرہ تھڑوں سے سرخ کر دے جو اتنی بڑی نعت بن مانگے مل جانے پر باغشکری کا اظہار کر رہا تھا۔

”میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں اور ایک بار پھر کہہ رہی ہوں کہ جو ہو اس میں کل کا کوئی قصور نہیں تھا۔ تم پر رشتے کے لیے دباؤ کل کی طرف سے نہیں ڈالا گیا تھا۔ جس نے

ہو جائے گا۔“ فردوس نے اپنے پرس سے قلم نکالا اور ایک کاغذ پر کوئی فون نمبر لکھ کر اس کے حوالے کیا۔

”یہ کون ہے؟“ نمبر پڑھتے ہوئے اس نے تجسس سے پوچھا۔

”بس ہے کوئی جو بہت بلند دباؤ دھوے کرتا تھا۔ پندرہ سالوں میں کبھی میں نے اس کے دعوؤں کی سچائی کو پرکھنے کا نہیں سوچا۔ اب یا تو تمہارا کام ہونے کا سبب بن جائے گا یا اس کے دعوؤں کی قلعی کھل جائے گی۔“ وہ چپکا سا مسکرا کر بولی تو معاذ مزید کوئی سوال نہیں کر سکا۔

”اب مجھے چلنا چاہیے۔“ وہ جس کی مزاج پر سی کے لیے آیا تھا اسے ایک نظر بھی نہیں دیکھا تھا اور اب واپسی کی بات کر رہا تھا۔

”تم بہت اچھے لڑکے ہو۔ میری دعا ہے کہ اللہ تمہیں تمہارے نیک مقاصد میں کامیاب کرے۔“ فردوس نے بہت خلوص سے اسے دعا دی۔ وہ جواب میں کچھ کہہ پاتا، اس سے قبل ہی کمرے کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور دوسرا اندر داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک پختہ العمر جبکہ دوسرا نوجوان تھا۔ دونوں کو دیکھ کر فردوس کے چہرے کی رنگت زردی ہو گئی تاہم اس نے تیزی سے خود کو سنبھال لیا اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”ٹھیک ہے اب تم جاؤ۔ کوئی کام ہوا تو میں تمہیں کال کر لوں گی۔“

”جی۔“ اسے آنے والوں کے بارے میں خاصا تجسس تھا لیکن رکنے کے لیے کوئی بہانہ موجود نہیں تھا اس لیے خاموشی سے باہر کی راہ لی۔ باہر نکل کر اس نے دانستہ دروازے کو پوری طرح بند نہیں کیا اور وہیں رک کر اندر ہونے والی گفتگو پر کان لگا دیے۔

”کون تھا یہ لڑکا؟“ وہاں پہلا استفسار اسی کے متعلق کیا جا رہا تھا۔

”اساف میں سے تھا۔ آپ نے اس کی یونیفارم نہیں دیکھی تھی؟“ فردوس اپنی گھبراہٹ پر پوری طرح قابو پا چکی تھی۔

”جس طرح اس کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا جا رہا تھا، مجھے لگا کوئی خاص بندہ ہے۔“ پختہ عمر کے مرد کا لہجہ طنزیہ تھا۔

”میرے لیے میرے ساتھ کام کرنے والا ہر شخص خاص ہے ٹھیک بھائی! بہر حال آپ ان باتوں کو چھوڑیے اور یہ بتائیے کہ آپ لوگوں کا کیسے یہاں آتا ہوا؟“ فردوس کے لہجے میں بھی طنز کی آمیزش آگئی۔

ایسا کیا تھا، تم اسی سے شکایت کرو۔“

سے گزرتا چلا گیا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ سباش کے پیچھے یہاں تک کیوں چلا آیا تھا لیکن یہ طے تھا کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ کوئی پیچھے چھاڑ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

”کافی دیر لگا دی آپ نے واپس آنے میں۔“ وہ واپس پہنچا تو کالے خان اس کا منتظر تھا۔

”ہاں بس..... دیکھو میں کچھ دیر آرام کروں گا۔

مجھے ڈسٹرب نہیں کرنا۔“ اس نے کالے خان کو کوئی واضح جواب دیے بغیر اپنے کمرے کا رخ کیا۔ سبیل کے معاملے

میں اس کا ذہن بہت بری طرح الجھا ہوا تھا۔ وہ اسے اس کے ظالم رشتے واروں کے شکنجے سے آزاد کروانا چاہتا تھا

لیکن جانتا تھا کہ یہ سب آسان نہیں ہے۔ سب سے بڑھ کر سبیل سے ہی تعاون کی امید نہیں تھی۔ بقول فردوس، اس کی

جان عالم میں انگی تھی اور جب تک عالم اور سرمد کی رہائی کا انتظام نہیں ہوتا، اس کے لیے خود کو اس قید سے آزاد کروانا

ممکن نہیں ہوتا۔

”تمہیں اس جہنم سے نجات دلانے کے لیے مجھے جس حد تک بھی جانا پڑے، میں جاؤں گا۔“ اس نے تصور

میں سبیل کو مخاطب کر کے اس سے عہد کیا اور اپنی جیب سے وہ کاغذ نکال کر دیکھنے لگا جس پر کسی دیوانی آدمی سے رابطے کا

نمبر موجود تھا۔ نمبر ذہن نشین کرنے کے بعد اس نے کاغذ کے پرزے پرزے کر ڈالے۔ دپو اکون تھا اور کس حد تک اس

کی مدد کر سکتا تھا، اسے اندازہ نہیں تھا اس لیے فوری طور پر اس سے رابطے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ فی الحال تو اسے موہن

کے بارے میں رپورٹ ملنے کا انتظار تھا۔ رپورٹ ملنے کے بعد ہی وہ کوئی عملی قدم اٹھا پاتا۔ اس نے اپنا میک اپ

صاف کیا اور اعصاب کو سکون کرنے کے لیے شاور لے کر

بستر پر دراز ہو گیا۔ ذہن پر ایک طرف اپنے گھروالوں کی فکر سوار تھی تو دوسری طرف عالم کی رہائی اور سبیل کے حالات

کی الجھنیں تھیں۔ آکھ لگ ضرور تھی لیکن یہ کوئی پرسکون نیند نہیں تھی۔ سوتی جاگتی اس کیفیت میں جانے کتنا وقت گزر

گیا۔ دروازے پر ہونے والی دستک نے اسے اس کیفیت سے باہر نکالا۔

”آئی ایم سوری! آپ نے ڈسٹرب کرنے سے منع کیا تھا لیکن میں پھر بھی آ گیا۔ اصل میں مجھے غم ہو رہی تھی کہ

آپ نے کھانا نہیں کھایا۔“ کالے خان کے لہجے میں ایسا خلوص تھا کہ وہ ہدایت کی خلاف ورزی کرنے پر اسے کچھ نہ

کہہ سکا۔ ویسے بھی کالے خان اس کا ذاتی ملازم نہیں تھا۔ یہ صرف اس کی وضع داری تھی کہ وہ رادھا دیوی کے کہنے پر

”یہ کیا فضول کی بحث لگا رہی ہے تم لوگوں نے؟ ہم سبیل کے بارے میں معلوم کرنے آئے ہیں۔ فی الحال تم

ہمیں اس کے بارے میں بتاؤ۔“ خود پر بات آتی دیکھ کر

شکیل نے تیزی سے موضوع بدل دیا۔ باہر کھڑے محاذ نے بھی مزید وہاں رکنا فضول جان کر قدم آگے بڑھا دیے

اور کسی بھی دشواری کا سامنا کیے بغیر اسپتال کی عمارت سے باہر نکل گیا۔

پارکنگ میں اس کی موٹر سائیکل ہیڈلٹ سمیت موجود تھی۔ وہ بہت خراب دل کے ساتھ موٹر سائیکل پر سوار ہو کر

وہاں سے روانہ ہوا۔ پُرہجوم سڑکوں پر سے گزرتے اس کا رادھا دیوی کے گھر کی طرف واپسی کا سفر جاری تھا کہ ایک

جگہ سرخ بتی پر رکنے پر بائیں طرف دیکھتے ہوئے ٹھنک گیا۔ بلا ٹھنک و شہدہ سباش تھا۔ دہلی میں سونیا کا رائنٹ

پینٹ..... وہ جب سے ان لوگوں کی قید سے آزاد ہوا تھا، پلٹ کر ان کی طرف جانے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن اس وقت

جانے کس ترنگ میں تھا کہ سبیل غلتے ہی سباش کی گاڑی کے پیچھے اپنی موٹر سائیکل لگا دی۔ تعاقب کرنے کے جتنے

سبق اسے پڑھائے گئے تھے، سب از بر تھے چنانچہ نہایت ہوشیاری سے سباش کا پیچھا کرتا ہوا ایک رہائشی علاقے میں

پہنچ گیا۔ علاقہ پُر رونق نہیں تھا۔ ایک آدھ ملازم صورت آدمیوں، دو چار آتی جاتی گاڑیوں اور ایک گھر کے باہر

بھونکتے کتے کی موجودگی ہی بس اس بات کا ثبوت تھی کہ وہاں جیتے جاگتے انسان بستے ہیں۔

ان اونچے اور بڑے گھروں والے علاقے میں سباش کا تعاقب کرنا آسان نہیں تھا۔ اسے سخت احتیاط اور

مصلحت سے کام لینا پڑ رہا تھا۔ فاصلہ اتنا بڑھا لیا تھا کہ اندیشہ تھا کہ کہیں وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو جائے لیکن

خیریت گزری کہ ایسا نہ ہوا اور جب ایک موٹر پر وہ اپنی بائیک روکے سباش کے آگے نکل جانے کا انتظار کر رہا تھا،

اس کی گاڑی کو ایک گیٹ کے آگے رکتے اور ہارن دیتے دیکھا۔ رد عمل میں گیٹ فوراً ہی کھلا اور گاڑی رینگتی ہوئی

کھلے گیٹ سے گزر کر اندر داخل ہونے کے بعد اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ گاڑی کے غائب ہونے کے بعد

اس نے موٹر سائیکل کو حرکت دی اور دھیمی رفتار سے چلا تے ہوئے اس گیٹ کے سامنے سے گزرا۔ گاڑی کے اندر

جانے کے بعد گیٹ بند ہو چکا تھا اور چونکہ وہ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اپنی موٹر سائیکل کو روکے بغیر وہ وہاں

”کیا پتا چلا؟“ اس کا ہاتھ جو پہلے ہی ست روی سے

چل رہا تھا، بالکل رک گیا۔

”موہن محکمہ آب پاشی میں ایک معمولی سا کلرک

ہے۔ صبح اپنی ڈیوٹی پر جاتا ہے اور شام تک واپس آ جاتا

ہے۔ شادی شدہ ہے لیکن بچہ کوئی نہیں ہے۔ جتنی بھی دل

بھلانے کو ایک کارخانے میں کام کرتی ہے۔ دونوں اپنے

اپنے کام سے واپس آ کر اکثر گھومنے چلے جاتے ہیں اس

لیے محلے داروں سے زیادہ ملنا ملنا نہیں ہے لیکن لوگوں کو ان

سے کوئی شکایت بھی نہیں ہے۔“

”تو کیا وکرم نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا؟“ کالے

خان کی بتائی تفصیلات سن کر وہ مایوس ہوا۔

”شاید اپنی جان چھڑانے کے لیے اس نے ایسا کیا

ہو۔ موہن کو وہ کسی طرح جانتا ہوگا۔ آپ کی پوچھتاچھ کے

وقت اسے اس کا خیال آ گیا ہوگا اور اس نے جان چھڑانے

کے لیے اس شریف آدمی کا نام لے لیا۔“ کالے خان نے

اپنا تجربہ پیش کیا۔

”لیکن مجھے لگا نہیں تھا کہ وکرم جھوٹ بول رہا ہے۔“

اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کی ساری جدوجہد اور محنت

اکارت چلی گئی ہے۔

”پولیس والا تھا جناب! یہ لوگ دن میں دسیوں

جھوٹ بولتے اور حرام خوری کرتے ہیں۔ ان سے زیادہ

اچھی طرح کون دوسروں کو دھوکا دے سکتا ہے۔“ کالے

خان نے دلیل دی لیکن وہ اس کی بات توجہ سے سننے کے

بجائے سوچ رہا تھا کہ جن معلومات کے حصول کی خاطر ایک

انسانی جان گئی اور کل خان جیسا بندہ مصیبت میں پھنسا، وہ

معلومات ہی بے فائدہ ہو گئی تھیں۔

”اسے مایوس نہ ہوں۔ ایک در بند ہوتا ہے تو اوپر

والا دس در کھول دیتا ہے۔“ کالے خان نے اسے حوصلہ

دینے کی کوشش کی۔

”تم نہیں جانتے کہ اس وقت میری کیا کیفیت ہے۔

میں ایک بندگی میں کھڑا ہوں اور بھنچلا ہٹ کے باعث میری

یہ حالت ہے کہ میں کسی بھی وقت کوئی بھی انتہائی قدم اٹھا سکتا

ہوں۔ بچ پوچھو تو مجھے خود اپنے آپ سے ڈر لگنے لگا ہے۔“

اس کی آنکھوں میں بچ بچ وحشت تھی۔

”حوصلے سے کام لیں۔ رب نے جاہا تو سب ٹھیک

ہو جائے گا۔“ کالے خان کے پاس محض تسلی دہنی کے چند

الفاظ ہی تھے اور الفاظ سے وہ پہلے کے لیے تیار نہیں تھا۔

☆☆☆

اس کا اس قدر خیال رکھ رہا تھا۔

”تم چلو، میں فریش ہو کر آتا ہوں۔“ اس نے نرمی

سے جواب دیا تو کالے خان واپس پلٹ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ

اس کے روبرو بچن ٹیبل پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کے سامنے گرم

گرم ویکٹریبل پیزا اور رشین سلاد سجے ہوئے تھے۔

”آپ کے لیے خاص آرڈر پر منگوایا ہے۔“ کالے

خان نے بتایا۔

”خواجواہ زحمت کی یا راجھے کوئی خاص بھوک نہیں تھی۔“

”میرے ہاتھ کا بد مزہ کھانا سامنے آتا تو رہی سہی

بھوک بھی اڑ جاتی۔“

”لگتا ہے تم نے میری بات دل پر لے لی۔“ اس

نے چیز کا ایک ٹکڑا اپنی پلیٹ میں منتقل کیا۔

”ایسی کوئی بات نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ میں ایک بُرا

لگک ہوں۔“ وہ مسکرایا۔

”جب تک کسی لگک کا انتظام نہیں ہو جاتا، گزارہ ہو

ہی جائے گا۔ تم خواجواہ کھلف نہ کیا کرو۔“ اسے شرمندگی

ہوئی کہ اس کے اعتراض کی وجہ سے یہ نوبت آئی۔

”ہم چاہتے ہیں کہ ہماری میزبانی میں آپ صرف

گزارہ نہ کریں بلکہ اچھا وقت گزاریں۔ رادھا سے بات

ہوئی تھی میری۔ میں نے اسے سب کے حالات کے بارے

میں بتایا ہے۔“

”پھر.....؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے کالے خان

کی طرف دیکھا۔

”اس نے کہا ہے کہ آپ ہر قدم اٹھانے کے لیے

آزاد ہیں۔ ہماری طرف سے آپ کے ساتھ بھرپور تعاون

کیا جائے گا۔ اگر آپ سبھل کو اسپتال سے ڈسچارج کروانے

کا فیصلہ کرتے ہیں تب بھی اسے اسپتال بھی ہر سہولت

پرووائیڈ کی جاسکتی ہے۔“ کالے خان کے پاس اس کے

لیے ایک اہم خبر تھی۔

”تھینک یو کالے خان! میرے لیے یہ ایک بہت

بڑی مدد ہوگی۔ میں واقعی سبھل کو ان لوگوں کے رحم و کرم پر

نہیں چھوڑنا چاہتا۔ بس کسی طرح وہ میری بات ماننے پر

راضی ہو جائے۔“

”ان شاء اللہ وہ سمجھ جائیں گی۔ آپ زیادہ پریشان

نہ ہوں۔“ کالے خان نے اسے تسلی دی۔

”موہن کا کچھ پتا چلا؟“

”جی، رپورٹ آگئی ہے لیکن کچھ خوش کن نہیں

ہے۔“ کالے خان کا لہجہ پست ہو گیا۔

”مجھے تم سے کچھ شکایات ہیں۔“

”کیسی شکایات؟ جہاں تک میں جانتی ہوں میری کارکردگی میں کوئی فرق نہیں آیا اور میں نے اب تک خود کو سونپا گیا ہر کام بہترین طریقے سے انجام دیا ہے۔“ اس نے شکایت کرنے والی کو نہیں، گویا آئینے میں اپنے عکس کو دیکھا۔ وہی متناسب جسم، وہی شہد رنگ آنکھیں اور بال، وہی جلد کی چمکی رنگت میں گھلا سنہرا پن، ترشے ہوئے گلابی ہونٹ، ستواں ناک اور بڑی بڑی غزالی آنکھیں تھیں جو دیکھنے والوں کے ہوش اڑا دیتی تھیں۔ کوئی فرق تھا تو بس اتنا کہ اس عکس کی عمر اس سے چند برس زائد دکھائی دیتی تھی لیکن وہ جانتی تھی کہ مردوں کا یہ فرق محض چند برس کا نہیں بلکہ دو دہائیوں سے زائد تھا۔

”مجھے تمہاری کارکردگی نہیں بلکہ تمہاری ذہنی حالت سے شکایت ہے۔ سنا ہے تم نے اب تک معاذ کی موت کو قبول نہیں کیا اور دہلی کی سڑکوں پر تمہیں اجنبی صورتوں میں اس کی صورت دکھائی دیتی رہی۔“ وہ کوئی اور نہیں، مادام ایکس تھی اس لیے اسے اس کی معلومات پر کوئی حیرت نہیں تھی۔

”موت کا یقین کرنے کے لیے مجھے ٹھوس ثبوت نہیں ملے۔ اگر اس کی لاش مل جاتی تو مجھے اس کی موت کا یقین آ جاتا۔“ اس نے سپاٹ سے لہجے میں خود پر لگائے گئے الزام کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے رویے کے حق میں دلیل دی۔

”تمہیں پروفیسر وکٹر کے دیے آلے کی کارکردگی پر کوئی شک ہے کیا؟ وہ آلہ معاذ کے دماغ سے نکلنے والی لہروں کو ریسو نہیں کر رہا ہے تو اس کا صرف اور صرف ایک مطلب ہے کہ وہ اس روئے زمین پر زندہ حالت میں موجود نہیں ہے۔“ میڈم ایکس نے اپنے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”ہو سکتا ہے وہ کسی ایسے مقام پر موجود ہو جہاں سے کسی بھی قسم کی لہریں باہر نہ نکل سکتی ہوں۔ اس دنیا میں ٹیکنالوجی میں صرف ہم ہی نے تو ترقی نہیں کی ہے، دوسرے لوگ بھی ہیں جو نہ جانے کیا کیا کارنامے انجام دے رہے ہیں۔“

”اوہ..... واقعی.....!“ میڈم ایکس اس کی دلیل سن کر استہزا سے بولی۔

”چلو مان لیا کہ ایسا ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معاذ کو اس ریلوے ٹریک سے اٹھا کر ایسے مقام تک آنا قانا کس جادو کی قوت نے ممکن کیا ہو اب تک وہ خاموش کیوں ہے؟ میرے حساب سے تو اگر وہ زندہ ہے تو اسے

اب تک کوئی نہ کوئی انکسشن لے لینا چاہیے تھا۔ وہ اس منہ پر کا لڑکا تو ہے نہیں کہ اپنی جان بچا کر کہیں دیک کر بیٹھ گیا ہو اور کچھ نہیں تو اسے اپنی فیملی سے ملنے کی کوشش تو کرنی چاہیے تھی نا.....؟“

”ہو سکتا ہے وہ زخمی ہو۔“ وہ درست سمت میں سوچ رہی تھی لیکن میڈم ایکس اس کی بات کسی صورت ماننے کے لیے تیار نہیں تھی۔

”یہ خیال تمہارے دل میں کیوں آیا؟“ میڈم ایکس نے اسے گھورا۔

”مجھے نہیں معلوم، بس مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ زندہ ہے۔“

”تمہیں ایسا اس لیے لگتا ہے کہ تم یہی سمجھنا چاہتی ہو کہ وہ زندہ ہے۔“ میڈم ایکس کے لہجے میں ایک کاٹ سی تھی۔

”میں ایسا کیوں سمجھنا چاہوں گی؟“ جواباً اس کا لہجہ بھی تیز ہو گیا۔

”یہ تم خود سے پوچھو۔ شاید یہ داراب جیسے بھدے اور عمر دراز شخص کے ساتھ زندگی کے دو سال گزارنے کا رد عمل ہے۔ تمہارا اس خوبصورت اور اسرارٹ نوجوان پر دل آگیا تھا اسی لیے تم ذہنی طور پر اس کی موت کو قبول کرنے کو تیار نہیں ہو۔“

”ایسا کچھ نہیں ہے۔“ اس نے میڈم ایکس کے الزام پر احتجاج کیا۔

”اگر نہیں ہے تو بہت اچھی بات ہے۔ بہتر ہے کہ تم کچھ دن آرام کرو اور فریش ہو جاؤ۔ اس عرصے میں، میں تمہیں داراب کے بزنس کو دیکھنے کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں دوں گی۔ فریش ہو لو تو پھر معاذ جیسا کوئی دوسرا نوجوان ڈھونڈ لینا۔ اس اسٹوڈنٹ پر کی گئی ہماری ساری سرمایہ کاری تو

ڈوب ہی گئی ہے۔“ میڈم ایکس تھوڑی سی ہنسیلاہٹ کا شکار تھی۔ اپنے بھارتی دوستوں سے کیے گئے معاہدے کے مطابق دو چار بڑی کارروائیوں کے بعد معاذ کا نام ایک ایسے پاکستانی ایجنٹ کے طور پر منظر عام پر لانا تھا جو پاکستانی حکومت کی ایما پر بھارت میں دہشت گردی کی کارروائیاں کر رہا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے میڈم ایکس نے بھارتی حکومت سے سی سی ٹی وی فوج اور انٹرنیشنل پریس جیسے ثبوتوں کی فراہمی کا وعدہ کر رکھا تھا البتہ وہ معاذ کو گرفتار کمرہ لانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ وہ آگے چل کر اس کے مزید کام آ سکتا ہے۔ بھارتیوں نے بھی اس بات کو قبول کر لیا تھا۔ پاکستان کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ وہ کسی بھی طرح خبروں

اسے اسکرین کی طرف متوجہ کیا۔ وہاں ایک نہایت خوبصورت لڑکی سفید اور آبی پہنے ایک اسپتال کی عمارت سے باہر نکلتی دکھائی دے رہی تھی۔

”معاذ کی کزن، ڈاکٹر ثوبیہ!“ لڑکی کو پہچان کر وہ پوری طرح اسکرین کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ثوبیہ بائیں شانے پر سیاہ رنگ کا لیڈ بڑیگ لٹکائے درمیانی رفتار سے چل رہی تھی۔ یہ دوپہر کا وقت تھا اور موسم کچھ گرم معلوم ہوتا تھا اس لیے اس کی شفاف پیشانی پر پسینے کی نشانی بھی بوندیں چمک رہی تھیں۔ چند قدم چلنے کے بعد ہی وہ سڑک کے کنارے رک گئی اور ہاتھ میں موجود ٹشو پیپر سے پیشانی پر آبی پسینے کی بوندوں کو صاف کرتے ہوئے یوں واپس بائیں دیکھا جیسے سواری کی تلاش میں ہو۔ تلاش کے اس عمل کے دوران اس کی نظر ان دو موٹر سائیکل سواروں پر اتنی تاخیر سے پڑی کہ پیچھے بیٹھا ہوا بندہ اپنے ہاتھ میں موجود بظاہر سوفٹ ڈرنک کی بوتل کا ڈھکن کھول کر اس میں موجود مٹھول اس کی طرف اچھا چمکا تھا۔ وہ چینی اور فطری رد عمل کے طور پر اپنے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ لیے۔ اس کی چیخ سن کر اس کی طرف متوجہ ہونے والے راہ گیروں کے کچھ سمجھنے تک موٹر سائیکل اپنے سواروں سمیت گولی کی رفتار سے وہاں سے نکل چکی تھی۔

”اس کی ضرورت کیوں پیش آئی؟“ ویڈیو ختم ہونے پر اس نے ساٹ سے لہجے میں استفسار کیا۔

”خود گودھوکا دینے والوں کو کوئی نہ کوئی سزا تو دینی تھی۔ یہ لڑکی ہماری آنکھوں میں دھول جھونک کر معاذ کی بہن سے رابطے میں تھی۔“

”معاذ کی بہن.....؟ مطلب ہم معاذ کی فیملی کو نہیں کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں؟“ اسے میڈم ایکس کے انکشاف نے چونکا یا۔

”ہاں، سنگاپور میں ان کی موجودگی کے اشارے ملے ہیں۔ ہمارے لوگ تقریباً ان کے سر پر پہنچ گئے تھے لیکن انہوں نے خطرے کی بوسگھ لی اور اپنے ٹھکانے سے فرار ہو گئے۔ اب نئے ٹھکانے کی تلاش جاری ہے۔ امید ہے جلد یہ لوگ اپنے انجام تک پہنچ جائیں گے۔“

”جب معاذ ہی نہیں رہا تو اس کی فیملی کے ساتھ یہ سب کچھ کیوں کیا جا رہا ہے؟ فیملی کو تو ہم بس اس پر دباؤ ڈالنے کے لیے یوڈو کر رہے تھے۔“ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ معاذ کی فیملی کے لیے اپنے دل میں ہمدردی کیوں محسوس کر رہی تھی۔

میں رہنے والے ایک جانے مانے پاکستانی پر اپنے ملک میں دہشت گردی کے الزامات ثابت کر سکتے۔

”داراب کا بزنس میرے بغیر بھی اچھی طرح چل سکتا ہے۔ اسے سنبھالنے کے لیے حامد موجود تو ہے۔“ اسے جیسے داراب میں کوئی دلچسپی نہیں تھی، ویسے ہی اس کے بزنس سے بھی بیزاری محسوس کر رہی تھی۔

”حامد سے ایک چھوٹی سی لڑکی تو سنبھال نہیں گئی۔ بزنس کیسے سنبھالے گا۔“

”کیا آپ کا اشارہ بشری کی طرف ہے؟“ اسے میڈم ایکس کے الفاظ نے چونکا یا۔

”ہاں، وہ حامد کو جیل دے کر خان ہاؤس سے نکلنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔“ میڈم ایکس اتنا بتا کر خاموش ہو گئی۔

”پھر، پھر کیا ہوا؟“

”ہونا کیا تھا، ماری گئی۔ اپنے جنون میں سیدھی باڈل تک پہنچ گئی تھی۔“

”ہماری پناہ میں موجود لڑکی کی جان لینے کی ہمت کیسے ہوئی کسی کو؟“ وہ طیش میں آئی۔

”موت حادثاتی تھی۔ باڈل نے صرف اپنا دفاع کیا تھا لیکن وہ اسے چھت پر سے گرنے سے نہیں بچا سکا۔“

”ویڈیو باڈی؟“

”انہوں نے خود ہی دفنا دیا تھا۔ میرے لیے اس لڑکی کی لاش سے زیادہ یزدانی اور سلطان کو خوش رکھنا اہم ہے۔

ان دونوں کو اپنی انگلیوں پر نچا کر اتنے عرصے سے جو فوائد حاصل کیے جا رہے ہیں، ان کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔“ میڈم ایکس کا جواب دونوں تھا۔ وہ مزید کوئی سوال نہیں اٹھا سکی لیکن خود اس کے اپنے ذہن میں یہ سوال ضرور اٹھا تھا کہ اگر معاذ بچ بچ زندہ ہوا اور کسی دن اچانک آگیا تو

بشری کی موت پر اس کا کیا رد عمل ہوگا؟

”میں تمہیں کچھ اور بھی دکھانا چاہتی ہوں۔“ میڈم ایکس اس کی سوچوں سے بے نیاز تھی۔

”ضرور!“ اس پر کیسی ہی بے دلی طاری تھی، وہ میڈم ایکس کی کسی بات کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ میڈم کی فرمانبرداری کسی کمپیوٹر پروگرام کی طرح اس کے اندر انشال کی گئی تھی۔ اس فرمانبرداری کے نتیجے میں ہی وہ حکم ملنے کے ساتھ بھارت سے واپس آ گئی تھی حالانکہ اسے امید تھی کہ وہاں رہ کر کسی نہ کسی طرح معاذ کو تلاش کر لے گی۔

”اس لڑکی کو پہچانتی ہونا؟“ میڈم ایکس کی آواز نے

”یہ ثابت کرنے کے لیے کہ ہماری گرفت سے نکل کر دنیا میں کہیں پناہ حاصل کر لینا ناممکن ہے۔ اس فیملی کا انجام بہت سوں کے لیے اہم سبق ہوگا۔“ میڈم ایکس کا لہجہ بے لچک تھا۔

”جو آپ مناسب سمجھیں۔ میرے خیال میں مجھے اب چلنا چاہیے۔ سفر کی تھکن ہے۔ شاور لے کر ریٹ کروں گی تو طبیعت فریش ہو جائے گی۔“ اس کا دل وہاں سے مکمل طور پر بیزار ہو گیا۔

”اوکے، یوے۔ گو۔ آئی ول سی یو لینر۔“ میڈم ایکس نے نزاکت سے اپنا خوبصورت ہاتھ لہراتے ہوئے اسے جانے کی اجازت دی۔

”ایک منٹ، میری بات سنو!“ وہ اٹھ کر دروازے کے قریب ہی پہنچی تھی کہ میڈم ایکس کی آواز نے اس کے قدموں کو روک لیا۔ وہ مڑ کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”ہم اپنے جذبات کو اپنے مقاصد کے تحت رکھنے کے پابند ہیں۔ ہم نے قسم کھائی ہے کہ اپنے وطن اور قوم کے مفاد کی خاطر کوئی بھی قربانی دینے سے دریغ نہیں کریں گے۔“

”مجھے یہ سبق ازبر ہے۔ آپ کو یاد دہانی کروانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ کہہ کر باہر نکل گئی اور زیر لب بڑبڑائی۔

”مجھ سے بڑھ کر کون اس سیٹ اپ کو سمجھے گا۔ میں جو ایک پلاننگ کے تحت پیدا کی گئی۔ خاص انداز میں پروان چڑھائی گئی اور مستقل کھ تپلی کی طرح اشاروں پر مچائی جا رہی ہوں۔ میں کیسے بھولوں گی اس قول و قرار کو۔“

☆☆☆

”اور بھی تیاری مکمل ہے؟“ وقاص نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بیڈ پر چپ چاپ بیٹھی علیینہ سے دریافت کیا۔

”ہمیں کیا تیاری کرنی ہے۔ ہم مسافروں کا سامان تو پہلے ہی بندھا پڑا ہے۔“

”کیا بات ہے علیینہ! تمہارا موڈ کیوں ایسا ہو رہا ہے؟“ وقاص نے اس کے لہجے کی بیزاری کو محسوس کیا اور اس کے مقابل بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں، کچھ نہیں۔ بس اس بھانگت ووز سے طبیعت الجھنے لگی ہے۔ کیا ہمارے نصیب میں دوسرے لوگوں کی طرح سکھ سے ایک جگہ تک کر رہنا نہیں لکھا ہے۔“ وہ سچ سچ

ڈسٹرب تھی۔

”تمہارے نصیب میں وقاص عرف وکی جو لکھ دیا گیا ہے۔ میں نے زندگی کا آغاز موت کے کنوئیں میں موٹر سائیکل چلانے سے کیا تھا۔ بظاہر میں وہ کام چھوڑ چکا ہوں لیکن سچ یہ ہے کہ ایک چھوٹے کنوئیں سے نکل کر بڑے کنوئیں میں آ گیا ہوں اور اب بھی فل اسپڈ میں موٹر سائیکل چلا رہا ہوں۔ تمہاری قسمت ہے کہ تم اس موٹر سائیکل پر میرے پیچھے سوار ہو گئی ہو۔“

”نہیں، یہ غلط ہے۔ آپ خود کو خواہ مخواہ الزام دے رہے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آپ سب کچھ جانتے ہو جیسے ہماری ڈوبتی ناؤ میں سوار ہو گئے ہیں اور اب اس کوشش میں ہیں کہ کسی طرح اس ڈوبتی ناؤ کو ساحل پر پہنچا دیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے وقاص کی بات کی تردید کی۔

”تو کیا تمہیں یقین نہیں ہے کہ ہم ساحل پر پہنچ جائیں گے؟“ اس نے علیینہ کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

”پتا نہیں کیوں، مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ اس نے اعتراف کیا۔

”ڈرنا تو چاہیے۔ سمندر کا سفر ہے اور سمندر میں خونی شارکس، بڑے بڑے مگرچھ کے علاوہ اور بھی جانے کون کون سی مخلوق ہوتی ہے۔ اگر ان میں سے کسی کا لٹچ یا ڈنر میں ہڈی والا گوشت کھانے کا موڈ بن گیا تو ان کا پہلا انتخاب تم ہی ہوگی۔“ وہ حسب عادت پٹری سے اتر گیا۔

”اگر ایسا ہوا تو میں ان سے کہوں گی کہ وقاص عرف وکی صاحب کو بھی میرے ساتھ ہی نوش کریں۔ اب چاہے کسی مگرچھ یا شارک کے پیٹ میں ہی رہتا ہو، میرا ان صاحب کے بغیر دل نہیں لگتا۔“ جواباً وہ کچھ ایسی ادا سے بولی کہ وقاص کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

”سچ سچ؟“

”جی ہاں، سچ سچ۔“ وہ اس کے شانے سے آگئی۔

”تمہارے اس اعتراف کے بعد تو موت بھی مجھے ہنستے کھیلتے قبول ہے۔“

”مرنے کی بات نہ کریں۔ ساتھ جینے کی باتیں کریں۔“ علیینہ نے دل کراس کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”ساتھ جینے کے لیے ہی تو یہ بندھن باندھا ہے لیکن جب تمہیں اداس دیکھتا ہوں تو بے چین ہو جاتا ہوں کہ میرا ساتھ تمہیں پوری خوشی نہیں دے پاؤ گا۔“ اس نے اپنے اندر کے احساسات کو زبان دی۔

یہ ان کا مس سینڈی کی میزبانی سے استفادہ کرنے کا آخری دن تھا۔ وہ جس طرح رات کی تاریکی میں اچانک وہاں پہنچے تھے، ویسے ہی رات کی تاریکی میں اچانک روانہ ہو گئے۔ مس سینڈی نے انہیں جس مشینی انداز میں یہاں ویکم کیا تھا، اسی مشینی انداز میں رخصت بھی کر دیا۔ فرق تھا تو صرف اتنا کہ اس بار انہیں لینے کے لیے دروازے کے باہر ایک گاڑی موجود تھی۔ آرام وہ گاڑی میں بندرگاہ کی طرف سفر کرتے ہوئے بھی وہ سب اپنی اپنی جگہ بے چین تھے۔ ایک طرف بھوکے بھڑیوں کی طرح خود کو تلاش کرتے دشمنوں سے خطرہ تھا تو دوسری طرف انجان منزل کے اندیشے..... لالہ نے روائگی کے لیے تیار رہنے کا حکم دیتے ہوئے کچھ بتایا ہی نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔

”یہاں سے تم لوگوں کو لالچ میں سفر کرنا پڑے گا۔ لالچ تمہیں سمندر میں موجود اس بحری جہاز تک پہنچا دے گی جس میں تمہیں آگے کا سفر کرنا ہے۔“ وہ بندرگاہ پہنچ گئے تو گاڑی چلا کر انہیں یہاں تک لانے والے شخص نے انہیں آگاہ کیا اور پھر انہیں اپنی راہنمائی میں لے کر آگے بڑھا۔ سمندر کے قرب کی وجہ سے ہوا نم آلود اور ٹھنڈی تھی۔ وہ سب خاموشی سے اپنا اپنا سامان اٹھائے اس کے پیچھے چلتے رہے۔ یقیناً کچھ معاملات پہلے سے طے تھے اس لیے دو ایک جگہ قانون کے رکھوالوں سے مڈبھڑ تو ہوئی لیکن انہیں روکا نہیں گیا۔

”میرا آپ کا ساتھ بس یہاں تک تھا۔ امید ہے آپ کا سفر اچھا گزرے گا۔“ مخصوص مقام پر پہنچ کر راہنما نے ایک لالچ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ فوراً ہی لالچ سے ایک آدمی اتر کر ان کی طرف آیا۔

”آپ لوگوں کو اگلی منزل تک پہنچانے کی ذمہ داری تم کی ہے۔“ راہنما نے انہیں بتایا اور پھر فوراً غم سے مخاطب ہوا۔

”تمہیں تمہارا کام سمجھا دیا گیا ہے۔ یاد رکھنا کسی غلطی کی بالکل بھی گنجائش نہیں ہے۔“

”تم غلطیاں نہیں کرتا۔“ لالچ والے نے دعویٰ کیا۔

”اوکے دین گڈ بائے۔“ راہنما واپس پلٹ گیا اور وہ سب ٹیم کی ہدایت پر لالچ میں سوار ہونے لگے۔ تاریکی، سناٹا، سمندر کا مہیب شور، سب نے مل کر ماحول کو بہت خوفناک بنا دیا تھا۔ ہر لمحے ایک دھوکا سا تھا کہ دشمن آ کر حملہ نہ کر دے لیکن خیریت گزری اور وہ سب سکون سے لالچ

”میری ہر خوشی معاذ بھائی کے بغیر ادھوری ہے وقاص! میں کتنی بھی کوشش کر لوں، ان کے بغیر خوش نہیں رہ سکتی۔“ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

”ان شاء اللہ ایک دن وہ ضرور ہمارے ساتھ ہوں گے۔ تم بس دعا کیا کرو۔“ اس نے علیہ کو خود میں سمو کر تسلی دی۔

”آپ ہمارے مسائل سے گھبرا کر ہمیں چھوڑ تو نہیں دیں گے؟“ وہ بہت سے اندیشوں کا شکار تھی۔

”دنیا چھوڑنا ممکن ہے، تمہیں چھوڑنا نہیں۔“

”پھر وہی مرنے کی باتیں۔“ وہ خفا ہوئی۔

”زندگی کی طرح موت بھی ایک اٹل حقیقت ہے۔ اس کے ذکر سے کیا گھبرانا۔“ وہ ہنسا۔

”میں آپ سے نہیں بولتی۔“ وہ روٹھ کر اس سے دور ہٹ گئی۔

”کچھ لوگ روٹھ کر بھی لکتے ہیں کتنے پیارے.....“ وہ شوشی سے گنگنایا۔ علیہ نے اپنی مسکراہٹ چھپانے کے لیے رخ بدل لیا۔

”بہنی تو پھنسی۔“ اس کی حیرت نظروں سے علیہ کی مسکراہٹ نہ چھپ سکی۔

”پھانس تو آپ پہلے ہی چکے ہیں۔“ وہ بے ساختہ ہنس دی تو وہ دھور شوق سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟“ وہ جینب گئی۔

”تم اتنی ہوتی ہوئی کتنی اچھی لگتی ہو۔ بالکل ایسے جیسے کوئی

گلاب کھل رہا ہو۔ کسی خوبصورت وادی میں کوئی جھرنابہر رہا ہو یا پھر، یا پھر.....“ وہ مزید تشبیہات اور استعارے تلاش کرنے میں ناکام ہو کر اٹک گیا۔

”سمندر ہی سفر کے دوران بہت فرصت ملے گی۔ یہ مشق سخن وہاں فرما لیجیے گا۔ فی الحال انھیں اور ذرا اس بیگ کی زب بند کرنے میں میری مدد کریں۔ سامان تو وہی پہلے والا ہے مگر پتا نہیں کیوں بیگ سے باہر ایلنے کے لیے زور لگا رہا ہے۔“ علیہ اس کی اس ناکامی پر ہنسی اور ایک کونے میں پڑے سفری بیگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

”ابھی تھوڑی دیر پہلے تو تم کہہ رہی تھیں کہ ہم مسافروں کا سامان تو پہلے ہی بندھا پڑا ہے۔“

”ناکام شاعر کی ہوتی ناکام فلسفہ بگھارنے کی کوشش کر رہی تھی۔“ وہ بے نیازی سے شانے اچکاتے ہوئے بولی تو وہ اسے مصنوعی غصے سے گھورتا ہوا بیگ کی طرف بڑھ گیا۔

میں سوار ہو گئے۔ لالچ پر تم کا ایک مددگار بھی موجود تھا۔
 ”آپ سب نیچے چلے جائیں۔ لالچ کے کھلے سمندر
 میں پہنچنے سے پہلے آپ لوگوں کے دیکھ لیے جانے کا اندیشہ
 ہے۔“ تم نے انہیں حکم دیا تو وہ سب سیڑھیاں اتر کر لالچ
 کے نچلے حصے میں چلے گئے۔ یہ زیادہ کشادہ جگہ نہیں تھی اور
 یہاں پھلی کی مخصوص بو بھی ہوئی تھی۔ یقیناً یہ لالچ پھلی
 پکڑنے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔

”میں مزید یہاں نہیں رک سکتی۔ اگر میں کچھ دیر اور
 یہاں رہی تو مجھے اٹنی ہو جائے گی۔“ علیہ نے لالچ کے روانہ
 ہونے کے بعد کچھ دیر تو انتظار کیا لیکن پھر بو سے گھبرا کر
 کھڑی ہو گئی۔

”تھوڑی سی دیر اور صبر کر لو۔ ابھی باہر خطرہ ہے۔“
 وقاص نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ اسے بٹھالیا۔

”یہ کھالو۔ اس سے تم طبیعت میں بہتری محسوس
 کرو گی۔“ سعد نے اپنی جیب سے سو فٹ منٹ کی ایک گولی
 نکال کر اسے دی۔ وہ اسے منہ میں ڈال کر خاموشی سے بیٹھ
 گئی لیکن چہرے کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ خود پر جبر کیے
 بیٹھی ہے۔

”اب تم لوگ باہر آ سکتے ہو۔“ کچھ منٹ مزید
 گزرے تو تم کے مددگار نے اوپر سے جھانک کر اطلاع
 دی۔ وہ سب شکر کا سانس لیتے ہوئے ایک ایک کر کے باہر
 آ گئے۔ باہر آنے کے بعد بھی انہیں چند ہدایات دی گئیں
 جن پر انہوں نے سن و عن عمل کیا۔ وقاص کے سوا ان سب
 کے لیے یہ سفر ایک انوکھا تجربہ تھا اس لیے وہ سب اندر سے
 خوفزدہ تھے۔ خاص طور پر علیہ، جس نے باپ بھائی کی
 طرح کبھی تفریحاً بھی کسی لالچ کا سفر نہیں کیا تھا۔ وقاص اس
 کے خوف کو بہ خوبی سمجھ رہا تھا اس لیے اسے ڈھارس دینے
 کے لیے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”سب ٹھیک ہے؟“ اس نے ٹائٹ ویژن
 آنکھوں سے لگائے سمندر کا جائزہ لیتے ہوئے تم کے مددگار
 سے دریافت کیا۔

”ابھی تک تو ٹھیک ہے۔ دور دور تک کسی کا نام و
 نشان دکھائی نہیں دے رہا۔“ اس کی دی اطلاع اطمینان
 بخش تھی۔ سب کے دھڑکتے دلوں کو تھوڑا سا قرار آیا۔ وہ
 سمندر میں اتنے آگے نکل آئے تھے کہ اب سر پر تنے
 لا محدود آسمان اور بے کراں سمندر کے سوا کوئی منظر باقی نہیں
 رہا تھا۔ ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔ لالچ کی روشنیاں
 بھی مکمل طور پر بند تھیں حتیٰ کہ نچلے حصے میں جلنے والی مدھمکتی

کو بھی بجھا دیا گیا تھا۔

”ہمیں جس جہاز پر سوار ہونا ہے، وہ کہاں ہوگا؟“
 علیہ نے دور دور تک کسی جہاز کو کھوجنے کی کوشش میں ناکام
 ہو کر وقاص سے پوچھا۔

”تم کو معلوم ہوگا۔ ممکن ہے جہاز کی روشنیاں بھی
 بجھا دی گئی ہوں۔ جب انہیں کسی شے کی غیر قانونی لوڈنگ
 کرنی ہو تو اس طرح کی احتیاط کرتے ہیں۔“

”یعنی اس وقت ہم اسٹنگ کا مال ہیں؟“ علیہ نے
 اس کا جواب سن کر مسکراتے کی کوشش کی لیکن بس یہ ایک
 کوشش ہی تھی۔ زندگی کے اس انوکھے اور خوفناک تجربے
 سے گزرتے ہوئے اس کے دل کی دھڑکنیں بار بار منتشر
 ہو جاتی تھیں۔ اسے احساس تھا کہ آگے کے مراحل اس سے
 بھی زیادہ سخت ہیں۔

”یہ وقت گزر جائے گا اور ایک دن ہم اس آسمان پر
 وہ سورج طلوع ہوتا ہوا دیکھیں گے جو ہمارے لیے خوشیوں
 کا پیغام لے کر آئے گا۔“ وقاص نے اسے تسلی دی تو اس نے
 نظر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ سیاہ آسمان پر بہت دور
 دور چند ستارے دکھائی دے رہے تھے۔ دور غمٹاتے یہ
 تارے اس کی دسترس سے دور تھے ورنہ کم از کم وہ اپنے
 بھائی کے مقدر کے ستارے کی چال تو ضرور ہی سیدھی
 کر دیتی۔

”دعا کرو علیہ! مقدر ستاروں کی چال سے نہیں، دل
 کی گہرائیوں سے مانگی گئی دعاؤں سے بدلتے ہیں۔“
 وقاص نے جانے کیسے اس کے دل کی بات جان لی تھی۔
 بات ایسی تھی کہ سیدھی اس کے دل کو لگی۔ اس نے فوراً ہی دعا
 کے لیے اپنے ہاتھ بلند کر لیے۔

”یا اللہ.....! اس کی آواز بہت بلند نہیں مگر اتنی تھی
 کہ کچھ فاصلے پر کھڑے سعد اور خادر احمد اسے سن سکتے
 تھے۔ اس کی ہر دعا پر ان کے لب بے آواز ”آمین“ کہتے
 چلے گئے۔ وہ خاموش ہوئی تو ماحول پر مکمل خاموشی طاری
 ہو گئی۔ خاموشی کے اس طویل وقفے کو ایک کان بھاڑ
 دھماکے نے توڑا۔ دھماکے کی آواز کے ساتھ ہی لالچ کے
 ٹکڑے، خون اور گوشت کے لوتھڑے تاریک سمندر کی
 سطح پر تیرنے لگے۔

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نوجوان

کی داستان جو غلط کاروں کے لیے

غضب ناک تھا باقی واقعات آیت ماہ پڑھیے



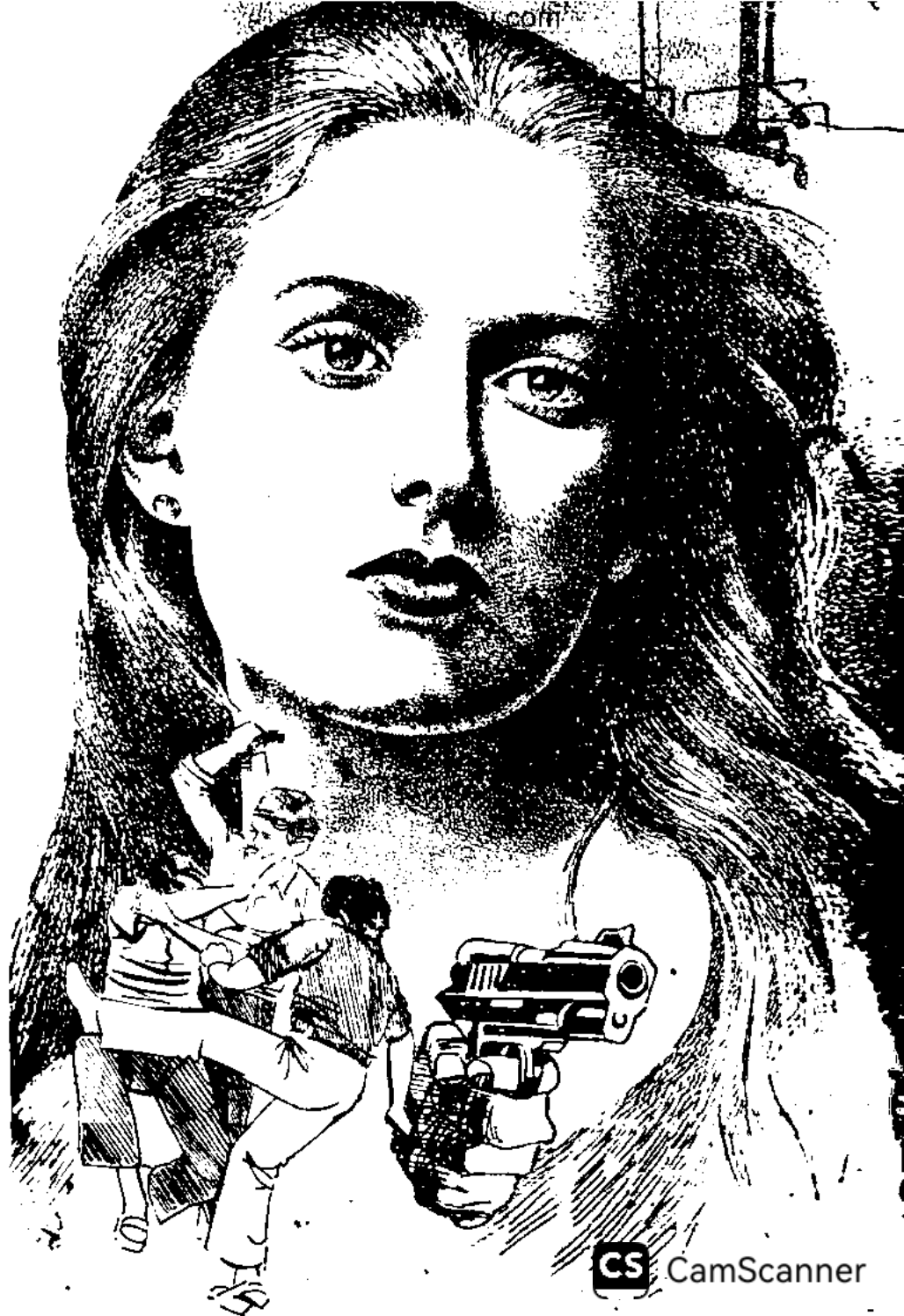
قسط: 23

شہ زونہ

شہ زونہ

زندگی بیمار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہو اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تندو تیز آندھیوں نے اسے محض سر پایا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف قانون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابل شکست بنا دیا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پُر عزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جا رہے تھے... اس کی زندگی جو المیوں کا شکار... اندھیرے کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کی شو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قرار یوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تار عنکبوت نے طاقت اور گھمٹ کے نشے میں چور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ وارداتِ قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہوسکی...

آپے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تیراگیر داستان



حاذ ایک ذہن لیکن متون حزان لڑکا جو یورپی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جوائن کیا ہوا ہے۔ حاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور اب ریٹائر ہوئے ہیں۔ ایک شام حاذ انٹرنیٹ میٹ سے وابستہ آرہا تھا تو وہ چند لوگوں کو سڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو انوکھا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یورپی ہی میں پرستی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی بڑی رفتار کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بھرتی نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بھرتی اس کیویو کی پیش کی طالب ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم وغیرہ لکھتی ہے۔ اس دوران جگہ جگہ ایک ذہن پرست فیئر ہائیٹ منسوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی آتی تھی۔ حاذ بھرتی کو یہ طاقت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کر دیتا ہے لیکن جن ریٹائرڈوں سے اس نے ان کا فکڑا چھینا تھا وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور سوتے کی تلاش میں رہتے ہیں۔ یہ موقع انھیں جو یورپی ٹیپ کی صورت میں مل جاتا ہے اور ایک جنگل کی سیر کے دوران وہ فوٹو گرافی کے شوق میں سب سے الگ تھلک ہو جانے والے حاذ کو یہ خبری میسر کر رہی تھی کہ وہ کوہ کرتے ہیں اور بھرتی سے اسے وہاں سے دیکھ کر دیتے ہیں۔ حاذ کے وہاں نہ آنے پر انتھاکے کے افراد، پولیس اور سکیورٹی ذرائع کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ اور حاذ کو کوشش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جوبی کی جھوٹی بی بی پاتا ہے۔ اپنی حالت سے اسے اپنے شدید زخمی ہونے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ جوبی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ حاذ کا موہل جنگل میں ہی نہیں کرتا ہے اور جوبی کے پاس ایسا کوئی دوا نہیں ہوتا جس سے باہر کی دوا سے رابطہ کیا جاسکے۔ وہاں رہتے ہوئے جوبی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے جو بھی کھانے سے پسند کر لے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے لوا کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ حاذ سے خاص بات سچیت کے بعد وہ اسے برسرِ اہم علم سکھانے کی ہامی بھی لیتا ہے اور حاذ واقعی اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اور حاذ جانے تو وہ سے ملنے والے حاذ کے کمرے سے جب تصویریں نظر آتی جاتی ہیں تو بہت سے قدرتی مناظر کی تصویروں میں سے ایک ایسی تصویر بھرتی کی نظر بھی آ جاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانک رہا تھا اور آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچانتی ہے۔ یہ وہی لڑکا تھا جسے وہ اس کے کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پردے جیکب کے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بھرتی تحقیق کر رہی تھی۔ بھرتی نے اپنے والد جرنل سے اس اور حق کوئی ان کے خون میں شامل ہے۔ اس کا شکاف کھلے ہوئے ہے۔ اس کی پاداش میں بھرتی کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ مدد سے جاتی دے دیتا ہے۔ اس سب میں باؤل نامی فٹنر کے ساتھ ہوتا ہے۔ بھرتی انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دونوں میں ہی حاذ واقعی کامرادہ کرتا ہے تاہم پھر سے ڈاکو کو بے رحمیت سے چڑھا جاتا ہے۔ ڈاکو سے بچان کر اس کا سودا مرغان اللہ اور یزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ حاذ کو وہ خاص نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ اور باؤل ایک بھرتی کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر دیتا ہے۔ حاذ کو وہاں لانے کے لیے اچھے منصوبے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو انوکھا کر لیا جاتا ہے اور اسے وہاں آنے کا پیغام دیا جاتا ہے۔ حاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ کچھ دوسری پارٹی سے اس کا سودا کر کے اسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قید میں حاذ سے معلومات لی جاتی ہیں، نہ بتانے پر اس کے بھائی کا ایک گردہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً حاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ اور بھرتی بھی انتقام کی آگ میں جلتی ہوئی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی کھریٹنگ شروع ہو جاتی ہے۔ حاذ کو بچانے والا لڑکا وہاں اپنے گرو کے ساتھ ایک پارٹی میں جاتا ہے۔ وہاں اسے حاذ کے حوالے سے شکوک ایک شخص نظر آتا ہے۔ وہ اس کے پیچھے جاتا ہے مگر اسے گھیر لیا جاتا ہے۔ بہر حال وہ قاصد کو سمجھ کے ساتھ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اور حاذ کے دوست عالم شاہ کے بہنوئی کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ حاذ کی فون میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے جتنا تڑکے اس کے دماغ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ لیٹو سے حاصل انوکھے علم کی بدولت ان کا معمول نہیں جاتا۔ بھرتی کامران کو چھاپنے کا پروگرام بناتی ہے۔ اور عالم شاہ مرغان لگا لیتا ہے کہ اس کے بہنوئی کا قتل کس نے کیا۔ وہ قاصد کو گھیرتا ہے اور اپنے تئیں اسے گولیاں مار کر قتل کر دیتا ہے۔ تاہم وہ بھی جاتا ہے۔ عالم شاہ اس کے بعد ڈاکوؤں کے سردار چاچ کو چھاپتا ہے اور اسے گھیر کر دار تک پہنچاتا ہے۔ اس کے پیچھے پولیس لگ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور اس کا نوکر مرہ باؤل کے ہتھے چڑھا جاتا ہے۔ اور حاذ جاسوس ماهر کو جتنا تڑکے اس کے کڈ رہے اسے کالے لٹو والوں پر حملہ کر دیتا ہے تاہم ان کی فائرنگ سے ماهر مارا جاتا ہے اور الزام حاذ پر نہیں آتا مگر حاذ سے کام لینے والوں کو اس پر شک گزرتا ہے۔ عالم کی، لیکن کل شاہ کے نوٹوں کو اپنے کو انوکھا کر لیا جاتا ہے اور خود کا الزام غلیف سومر پر آتا ہے۔ عالم شاہ وہاں موجود ایک ذہنی شخص کی مدد سے باؤل کی قید سے چھٹکارا پالیتا ہے۔ اور بھرتی دعویٰ بھی جاتی ہے۔ وہاں قاصد اسے باربی کے روپ میں پہچان لیتا ہے اور ان دونوں

کے درمیان احسا کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ وہ سلطان کو مارنا چاہتی ہے تاہم وقاص اسے ایسا کرنے سے روکتا ہے۔ ادھر عالم شاہ، باڈل کی قید سے نکل کر اس کا پیچھا کرتا ہے تاہم وہاں اچانک فائرنگ اور دھماکے ہونے لگتے ہیں۔ وہ وہاں محاذ کو دیکھتا ہے۔ صداقت شاہ، لطیف سومر کو گھیرنے کے لیے اس کی بغیر بیوی اور بچے کا کھوج لگاتے ہیں اور بچے کو اغوا کر لیتے ہیں۔ لطیف سومر مجبور ہو جاتا ہے۔ محاذ کو اس کے گھر والوں سے ملنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ عالم شاہ کو اس کے والدہ اظہار دلوگی کا قصد یہ دیتے ہیں۔ ادھر محاذ بھی ایک مشن پر سونا کے ساتھ اظہار دلوں سے ملتا ہے تاہم کچھ لوگ کچھ باتریوں سے بھری بس کو پر غلام بنا لیتے ہیں۔ محاذ اور سونا بنانے کے تمام اظہار کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں تاہم باہر موجود دیگر اغوا کاروں سے مقابلہ ہوتا ہے اور محاذ زخمی ہو جاتا ہے۔ صداقت شاہ کے اظہار میں موجود رشتے دار کے ہاں شادی ہوتی ہے۔ عالم شاہ، بگل اور سرد اظہار دلوں سے ملتا ہے۔ انہیں انٹرپورٹ سے گھر روانگی پر راستے میں کچھ پیرے انجین لوٹ لیتے ہیں۔ عالم شاہ، انجین میں آتا جاتا ہے تاہم اچانک عالم شاہ کی کزن اس کا راستہ روک گئی ہے مگر کچھ پیرے پولیس کی ریڈ ہوتی ہے اور وہ عالم شاہ اور سرد کو لے جاتے ہیں۔ ادھر بشری اور وقاص باڈل کو اسپتال میں مارنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ بچ جاتا ہے۔ محاذ اور سونا پناہ کی تلاش میں ہوتے ہیں اور بالآخر اپنے حکومت کاروں سے مل جاتے ہیں۔ عالم شاہ اور سرد کو تھک دکان سے بنا کر ورائے میں چھپک دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ وہاں اپنے میزبانوں کے ہاں بھیجے جاتے ہیں۔ شادی کے دوران انہیں پتا لگتا ہے کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں اجالا اور اس کا عاشق شامل ہوتے ہیں۔ وہ چھپ کر ان کی باتیں سن رہا ہوتا ہے کہ اسے چھاپ لیا جاتا ہے۔ تاہم وہاں مارا ماری ہوتی ہے اور اجالا کا شہنشاہ مارا جاتا ہے۔ پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ ان کے کزن انہیں اپنے دوسرے بغیر بنگے پر پہنچا دیتے ہیں جہاں کچھ لوگ انہیں تھک کر رہتے ہیں۔ وہ وہاں سے بھگت لے کر جاتے ہیں۔ ادھر محاذ کو سونا اپنے ساتھ ملے مسکن پر لے کر جاتی ہے جس میں ایک ریلوے لائن کے کھدکے سے اڑا ہوتا ہے۔ محاذ ایسا نہیں چاہتا اس لیے وہ ٹرین کی آگ سے قبل بارودی دھماکا کر دیتا ہے۔ وہ ڈکی ہو جاتا ہے۔ پورا سے پورا وسادہ اپنی کنیا میں لے جاتا ہے جہاں اس کی ابھی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ سونا کے آدمی محاذ کو تلاش کرتے ہیں لیکن کام ہو سکتا ہے۔ پھر عالم شاہ اور سرد بغیر ڈریس سے بارڈر پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر وہ صر لے جاتے ہیں اور "رق" کی قید میں بھیج دیتے ہیں۔ انہیں تھک دکان سے بنا دیا جاتا ہے۔ ادھر بشری باڈل کو مارنے کی کوشش میں خود کشاں بن جاتی ہے۔ محاذ سادہ کی خدمت سے ایک اظہار دلوں کے گھر بھیج دیتا ہے۔ وہیں اسے عالم اور سرد کی گرفتاری کا پتا چلتا ہے۔ ادھر بگل کو اس کا شوہر بڑی اذیت دیتا ہے۔ محاذ انہیں ڈکھ دکان سے بنا دیتا ہے اور اسے بگل کی مدد کرنے کا کہتا ہے۔ عالم اور سرد قید سے فرار کا سوچتے ہیں اور صر لے پاتے ہیں جس میں آداس میں بھیج دیتا ہے۔ محاذ کو تھک دکان سے بنا دیا جاتا ہے۔ سونا، وہ بچنے کے لیے عالم اور سرد کو رہائی دلا دیتا ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ اس کا پیچھا کرتا ہے تاہم بگل کی کاڑی خاد نے کاٹ کر ہوا جاتی ہے۔ علیحدہ اور وقاص وغیرہ کو لالہ بھی ملے۔ باہر نکال دیتا ہے اور ہر ممکن احتیاط کی بات کرتا ہے۔ بگل بگل میں ٹیپ سے رابطہ کرتی ہے جو ان کے لیے مصیبت بن جاتا ہے۔ ادھر محاذ، بگل کے لیے پریشان ہوتا ہے۔ سونا سے ٹکنا چاہتا ہے۔ محاذ، وکرم نامی شخص کے خلاف کارروائی کرتا ہے مگر خاطر غواہ بغیر برآمد نہیں ہوتا۔ ادھر وقاص علیحدہ اور بگل کے گھر والوں کو خبر دھکانے پر تھک کر نے کے لیے لے جا رہا ہوتا ہے کہ دھماکے سے لالہ کے گھر سے ہو جاتے ہیں۔ خون اور گوشت کے ٹکڑے کے ساتھ ایک ہتھیار کی تل پر تھکے لگتے ہیں۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

رات دھیرے دھیرے گہری ہو رہی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں نیند کا نام نہ تھا۔ اس کے سارے عزیز ترین لوگ کسی نہ کسی مصیبت میں گرفتار تھے اور ان کے لیے کچھ نہ کر پانے کی تکلیف اسے چھین نہیں لینے دے رہی تھی۔

"نہیں، میں اس بے بسی کو قبول نہیں کر سکتا۔" وہ ٹپٹے ٹپٹے رکاوٹوں سے بچتے ہوئے اپنے کمرے سے نکل کر کالے خان کے کمرے کی طرف بڑھا۔

"غیریت، کوئی مسئلہ ہے؟" اس کی دستک کے جواب میں کالے خان بھانپاں لیتا ہوا باہر آیا اور تشویش سے پوچھا۔

"مجھے کچھ چیزوں کی ضرورت ہے۔"

"اس وقت؟" وہ حیران ہوا۔

"عام کی چیزیں ہیں۔ یقیناً گھر میں ہی موجود ہوں گی۔"

"لیکن اتنی اہم چیزیں میں.....؟" کالے خان الجھا ہوا تھا۔

"مجھے ابھی فوراً باہر جانا ہے۔ اگر تم اپنی نیند خراب کر کے یہ چیزیں مجھے فراہم کر دو تو شک ہے ورنہ مجھے شاید

کسی دکان کا کالا توڑنا پڑے۔“
 ”آپ مجھے بتائیں کہ کیا چاہیے۔“ کالے خان اس کے انداز و الفاظ دونوں سے شینا گھرا۔ وہ ایک ایک کر کے اسے مطلوبہ اشیا کے نام بتاتے لگا۔
 ”اسٹور روم میں سے یہ سارا سامان مل جائے گا لیکن کچھ پتا بھی تو چلے کہ آپ کو یہ سب کچھ کیوں چاہیے؟“
 کالے خان کی نیند غائب ہو چکی تھی اور وہ ابھمن زدہ سا اس سے وجہ جانتا چاہتا تھا۔ تاہم وہ اپنی جگہ ساکن نہیں رہا تھا اور اسے اپنے ساتھ لیے وسیع و عریض گھر کے ایک گوشے کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔

”میں کبھی مجھڑے کے انتقال میں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہیں بچھ سکتا۔ مجھے کسی نہ کسی طور عالم تک رسائی چاہیے اور اس کے لیے مجھے ایک راستہ دکھائی دے گیا ہے۔“
 ”کیسا راستہ؟“ کالے خان اسٹور روم کی لائن چلائے ہوئے ٹھنکا۔
 ”مجھے اب ان دشمنوں کے حلق سے ہی جاکر اگوانا ہے جنہوں نے مجھے اس عذاب میں ڈال دیا۔“

”مجھے لگتا ہے آپ خود کو کسی بڑے خطرے میں ڈالنے جا رہے ہیں۔“ کالے خان کے ہاتھ اس کی مطلوبہ اشیا ایک قہقہے میں منتقل کر رہے تھے لیکن ذہنی طور پر وہ اسے کسی کارروائی کے لیے بھیجے گئے لیے تیار نہیں تھا۔
 ”خود کو خطرے میں ڈالنے بغیر کوئی مسئلہ نہیں ہو سکتا۔ اگر میں اسی طرح یہاں اپنی جان بجائے جینا رہا تو آنے والے وقت میں زندہ رہتا میرے لیے محض شرمندگی بن جائے گا۔“ اس کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ وہ روکے سے بھی نہیں رکے گا۔

”کیا میں آپ کے ساتھ چلوں؟“
 ”نہیں، میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے کوئی رادھا دیوی تک رسائی حاصل کرے اور میری محنت مشکل میں پڑ جائے۔ کوئی آپ سیٹ ہو گیا تو تیساری موجودگی کی وجہ سے ہی ایسا ہوگا۔“ اس کی دلیل ایسی تھی کہ کالے خان حریف اصرار نہیں کر سکا۔

”کچھ تو بتا کر جائیں کہ خدا غواست اگر آپ واپس نہیں آئیں تو آپ کا کہاں پتا کیا جائے؟“ وہ اپنے مطلوبہ سامان سمیت رداگی کے لیے ہائیک پر سوار ہو رہا تھا تو کالے خان نے اس سے پوچھا۔

”میں واپس نہ آ سکتا تو مجھے بھول جاتا۔“ اس نے عجیب سے لہجہ میں جواب دیا اور ہائیک کو لگ لگائی۔ گیسٹ

کرنے کے لیے تیار کر لیا۔

”بھل یا آرا گئے لگ۔ یہ راؤنڈ پورا ہو تو میں نے جا کر سو جاتا ہے۔ تو دیتا رہنا ساری رات چہرا۔ میں تو اب سویرے تھوڑی دیر پہلے ہی اٹھوں گا۔“ ٹائیکر نے کہنے کا پتا پکڑ کر آگے کی طرف دھکیلا تو وہ حیرت انگیز طور پر بھل پڑا۔ معاذ نے بے اختیار ہی ایک گہری سانس لی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ اس کے بازو پر بندھے اس جاوولی پتھر کا کمال تھا کہ کتے کی حس شامہ نے اس کی بو محسوس نہیں کی تھی درندہ ہنگامہ بنا کر دیتا۔ وہ جو ذرا دیر کر کور کا بھی تھا تو شاید اس لیے کہ اس کی جبلت نے اسے کوئی اشارہ دیا تھا لیکن اسے پوری طرح کچھ سمجھنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔

”ٹھیک ہے دوست! آج کی رات تم بھی اپنے ساتھی کی طرح آرام کرتے ہوئے گزارنا۔“ کتا اور وہ آدھی آگے نکل گئے تو معاذ زیر لب بڑبڑایا اور بیگ میں سے گوشت کا پکیٹ نکال کر اس میں موجود گوشت کے پارچے ایک طرف اچھال دیے۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے اصل عمارت کی طرف جیش قدی شردی کی۔ سرسری سا جائزہ لینے پر ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ تمام کھڑکیوں پر لوہے کی مضبوط گرلز لگی ہوئی ہیں۔ ان گرلز کو کاٹنے کی اہلیت رکھنے والا کتا اس کے پاس موجود نہیں تھا اور دروازے کا رخ وہ خود نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ایسے میں اس کے پاس ایک ہی عمل رہ گیا تھا۔ اس نے لوہے کا مضبوط کھڑکی کی ری کو نکالا اور کٹے کو چھت کی طرف اچھال دیا۔ پہلی ہی کوشش میں اسے کامیابی حاصل ہو گئی۔ ہلکا سا جھکا دے کر مضبوطی کا اعلاہہ لگانے کے بعد اس نے جوتے بیگ میں محفوظے اور جیزی سے لاپر چڑھنا شروع کر دیا۔ ابھی وہ آدھا ہی فاصلہ طے کر سکا تھا کہ تیز دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز نے غصہ کا دیا۔

اس نے فوراً ہی آواز کی سمت نظریں دوڑھیں اور پتہ پکڑا ہی کتے کا ایو لا دکھائی دے گیا۔ شاید وہ اپنا ٹک دوڑ کر نکلے آیا تھا۔ معاذ نے دونوں بچوں اور ایک ہاتھ کی مدد سے خود کو رسی پر مضبوطی سے بنایا اور دوسرے ہاتھ سے بھل تھا سے کتے کو نشانہ بنانے کے لیے تیار ہو گیا لیکن پھر یہ دیکھ کر بے اختیار ایک گہرا سانس لیا کہ کتا اس کی طرف آنے کے بجائے اس گوشے کی طرف بڑھ گیا ہے جہاں اس نے گوشت کے پارچے پھینکے تھے۔ کتے کو پیٹ پوجا میں مشغول چھوڑ کر وہ اطمینان سے اوپر چڑھ گیا۔ اوپر چڑھتے ہی اس نے سب سے پہلے وہی کو لپٹا اور اسے بیگ میں واپس رکھنے سے پہلے اپنے جوتے نکال کر پہنے۔ ربر سول


نہیں کہا جاسکتا تھا کہ کتا گوشت کے اس کلوے کو کھائے گا۔ بہترین تربیت یافتہ کتے اس جھانے میں آنے سے بچ بھی جاتے ہیں۔ اگر یہاں بھی ایسا ہی ہوتا تو کتے کے مقتدر میں سائیکسنگ بھل کی گولی آتی۔ آج وہ جس موڈ میں تھا، اس نے اس کی رحم دلی کی محنت کو خامی حد تک سلا دیا تھا۔

”ایک، دو، تین.....“ ذرا سی ویر دیوار کی منڈ پر پر ٹھہر کر اور گرد کا جائزہ لینے کے بعد اس نے بے آواز نکتی گئی اور بچے کو گویا۔ کسی بلی کی طرح بچوں کے بل لگائی گئی اس چھلانگ کے نتیجے میں بہت معمولی سی دھمک پیدا ہوئی تھی پھر بھی احتیاط کے پیش نظر ریٹک ہوا ان دو بڑے گھلوں کی آڑ میں ہو گیا جو ساتھ ساتھ رکھے تھے اور ان میں پھتری جیسا پھیلا کر کھینے والے انجان پودے لگے ہوئے تھے۔ ان گھلوں کی آڑ میں چھپا ابھی وہ ارد گرد کی سن گن لے ہی رہا تھا کہ چھٹی جانب سے اس طرف آئی قدموں کی چاپ نے اس کی جیز حساسیت کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ یہ دوڑتے قدموں کی چاپ نہیں تھی۔ بس ایسا لگتا تھا کہ کوئی شخص پورے اطمینان سے چھلنے کے انداز میں اس طرف بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ شاید وہ زمین کے پاؤں پر تھا۔

”دیکھ بھی شیر! تو تو ہے ہی کتا اس لیے تجھے شیر نہ رکھے جانے کے باوجود اس بات پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا کہ تجھ سے یہ کتوں والی ڈیوٹی لی جارہی ہے لیکن مجھے یقینی ٹائیکر کو یوں کتے کی طرح رات بھر چکراتے پھرنا بالکل اچھا نہیں لگتا۔ تو کان گھول کر سن لے کہ مجھے کوئی اچھی پارٹی مل گئی تو میں نے ایک دن تیرے صاحب کے پاس سے پھر ہو جانا ہے۔“ قدموں کی چاپ کے ساتھ ساتھ اب بولنے کی آواز بھی آ رہی تھی اور بولنے والے کے لب و لہجے سے ظاہر تھا کہ وہ بی کر قدرے بہک چکا ہے۔

”لے بھی، لگتا ہے تجھے میرے جانے کی بات بری لگ گئی ہے جو یوں اڑ کر کھڑا ہو گیا ہے، پر ٹائیکر بولتا ہے ایک دم بچ۔ اب جا ہے کسی کو اچھی لگے یا بری۔“

کتا چلتے چلتے ان گھلوں سے کچھ فاصلے پر رک گیا تھا جہاں وہ چھپا ہوا تھا۔ اس کے کتے پر خود کو ٹائیکر کہنے والے نے اسے اپنے خیالات سے مستحکم کیا تھا لیکن تربیت یافتہ جانور اس کی سننے کے بجائے قدرے بے چینی سے ادھر ادھر گردن گھما رہا تھا۔ معاذ کو خدشہ محسوس ہوا کہ وہ کسی بھی لمحے اس کی موجودگی کا راز فاش کرتے ہوئے اس پر حملہ آور ہو جائے گا۔ ایسی کسی مشکل سے نمٹنے کے لیے اس نے اپنے خاموش اٹھیا کر اسے اور ٹائیکر کو ہمیشہ کے لیے خاموش

 CamScanner

کر چکی تھی۔ دوسرا خانہ بچے کرتے ہوئے سہاش کے سر میں لگا تھا اور اس کی کھوپڑی کا ایک بڑا حصہ اڑ گیا تھا۔ معاذ کے لیے کھٹا مشکل نہیں تھا کہ عورت نے تجھے وغیرہ کے بچے رکھا سہاش کا رپو اور نکال کر کارروائی کی تھی لیکن یقیناً وہ ایک عام سی عورت تھی جو سہاش کے ساتھ رہنے کی وجہ سے اسکو چلانا تو جانتی تھی لیکن ایسی صورت حال میں اس کے لیے اپنے اعصاب پر قابو رکھنا ممکن نہیں تھا اس لیے وہ سہاش کی مدد کرتے کرتے اس کی موت کا سامان کر گئی تھی۔

وہ ایک مل تو وہیں کھڑا خون اگلے ان دو انسانی جسوں کو دیکھ رہ گیا۔ دشمن کا مرجانا بھی اتنے شدید مدد سے دو چار کرتا ہے، اسے یہ تجربہ پہلی بار ہو رہا تھا۔ سہاش کے مرنے سے وہ ایک بار پھر بندگی میں آکھڑا ہوا تھا لیکن اب کچھ کیا بھی نہیں جاسکتا تھا اس لیے بہتر تھا کہ وہ پہلی فرمت میں وہاں سے نکل جاتا۔ وہاں کے لیے چنی والا راست اختیار کرنے کے بجائے اس نے سیدھا راست اختیار کیا۔ مضبوط دروازے کو اندر سے کھول کر باہر نکلا ذرا بھی دشوار ثابت نہیں ہوا۔ ہاتھوں میں موجود ربر کے دستلوں کی وجہ سے اسے اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں تھا کہ وہ وہاں اپنی کوئی نشانی چھوڑ کر جا رہا ہے لیکن کوئی تونشانی تھی جسے وہ چھوڑے جا رہا تھا۔

☆☆☆

”عزیزو!“ نصرت نے بیٹے کی شکل دیکھی اور ہلکے بلکے کودنے لگی۔

”خوش ہے امی! ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ اس نے انہیں پہنچنے سے روک کر قہقہے مانی کہ خود اس کے دل پر جو گزر رہی تھی، بس وہی جانتا تھا۔

”کیسی ہے میری بچی؟ ڈاکٹر زبھیے ابی مے پاس کیوں نہیں جانے دے رہے؟“ وہ ماں تھیں، سہلی کے چند بولوں سے کیسے بہل جاتیں۔

”ابھی ٹریسٹ چل رہا ہے۔ حالت ابھی اسٹیبلی ہونے لگی ہے۔ کچھ اور سنبھل جائے تو اسے روم میں شفٹ کر دیں گے۔ پھر آپ اسے دیکھ لیجئے گا۔“ کہنے کو وہ انہیں تسلیاں دے رہا تھا لیکن اندر ہی اندر اس لیے سے کانپ رہا تھا جب اس کی ماں اپنی عزیز ترین بیٹی کا چہرہ دیکھتی۔ اس بیٹی کا چہرہ جس کے بے مثال حسن کو ایک دنیا سراہتی تھی۔ جس کو دیکھنے والی نظریں وہیں چلتا بھول جاتی تھیں۔ وہ کیسے انہیں بتاتا کہ وہ حسن بے مثال اس طرح داخلہ ہوا ہے کہ اسے نظر بھر کر دیکھا بھی نہیں جاسکتا۔ وہ مرد ہو کر نہیں

”ہیلپ، ہیلپ۔“ عورت جو بستر پر اٹھ بیٹھی تھی اور ایک چادر سے اپنی عریانیٹ چھپانے کی کوشش کر رہی تھی، کمرے کے سائڈ پر پروف ہونے کو بھلائے دد کے لیے نکال رہی تھی۔ اگر اس کی آواز باہر تک رسائی حاصل کر بھی لیتی تو اس بات کا امکان بہت کم تھا کہ نشر کے سو یا ہوا ملازم جاگ کر یہاں کا رخ کر پاتا۔ کتا بھی جتنی طور پر بے وقت کی دعوت اڑانے کے بعد کہیں بے ہوش پر اٹھا۔

”یو ہاسٹرز! تمہاری ہمت کیسے ہوئی میرے گھر میں سمجھنے کی؟“ سہاش کرتے کے ساتھ ہی اچھل کر کھڑا ہوا اور لیپ کے لیے سے پانپ کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر اس پر حملہ آور ہوا۔ اس نے نہ صرف سہاش کے داکو کا کام بنایا بلکہ ایک لائٹ تھما کر یوں اس کے سینے پر ماری کہ اس کی پشت کھڑکھڑا کر پڑے کھڑکی۔ معاذ چلا گیا۔ لگا کر اس کے قریب پہنچا اور پھر دوڑ لگا کر اسے دو دروازے کے ساتھ رکھ دیا۔

”بھئی منہ سہاش! اب تمہارا بھیل ختم۔ اب اگر حرکت کرتے ہی کوشش کی تو اس بھیل کی ساری گولیاں تمہاری کھوپڑی میں اتر دوں گا۔“ اس نے یکدم ہی بھیل نکال کر سہاش کی کھوپڑی پر دکھوایا۔ چونکہ سہاش سہاش سے معلومات درکار تھیں اس لیے اب تک لڑائی میں اس ہتھیار کا استعمال نہیں کیا تھا۔

”معاذ.....!“ اگرچہ اس نے اپنے چہلے میں خاصی تہذیبیاں کر رکھی تھیں لیکن سہاش جیسا تجربے کار بندہ اتنے قریب سے اسے پہچاننے میں ناکام ہو جاتا، یہ کیسے ممکن تھا۔ اس نے اسے پہچان لیا لیکن آواز سے ظاہر تھا کہ وہ بہت زیادہ حیران ہے۔

”معاذ نہیں، تمہاری موت۔“ کچھ اس کا اندرونی غصہ تھا اور کچھ سہاش پر اپنی دہشت، بھٹانا مقصود تھا کہ اس نے خوفناک لہجے میں کہتے ہوئے اس کی گردن دیوچ لی۔ یکدم ہی سہاش کی آنکھوں میں دہشت اتر آئی۔ معاذ کو سمجھنے میں کچھ تاخیر ہوئی کہ اس کی آنکھوں میں یہ دہشت اس کے عقب میں دیکھتے ہوئے بھٹکی تھی۔ وہ بے سامنے ہی پلٹا۔ پلٹتے ہوئے اس نے یوں محسوس کیا کہ ایک انگارہ اس کے بازو کو چھوتا ہوا گزرا ہے۔ اگلے ہی مل اس نے سہاش کے عریاں سینے پر نمودار ہونے والے سوراخ سے خون اہٹا ہوا دیکھا۔ فطری رد عمل کے طور پر اس نے گولی چلا دی۔ گولی بستر پر جتنی عورت کے سینے میں لگی اور وہ الٹ کر گر گئی۔ مرنے سے اس کے ہاتھ سے پو اور بھی نکل کر دور جا کر لیا لیکن یہ سب ہونے سے قبل ہی وہ دوسرا خانہ

”پھر؟“

”لالہ نے اس لڑکے کو مت بولا جیتا یا ہوا تھا۔“

”کمال ہے۔ منہ بولے بیٹے کی خاطر وہ اس حد تک چلا گیا کہ اپنی زندگی سمیت سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔ جہاں لوگ اپنے مقاصد کے لیے اپنی ساری اولا د کو بھی داؤ پر لگا دیتے ہیں۔“ اس کے لہجے میں غرور آیا۔

”مقاصد بڑے ہوں تو انہیں اولاد پر ترجیح دینی پڑتی ہے۔“

”یہ کون طے کرے گا کہ جنہیں بڑے مقاصد قرار دیا جا رہا ہے وہ صحیح یا غلط ہیں بھی یا نہیں۔“ اس کے ترکی پر ترکی جواب پر میڈم ایکس نے اسے غور سے دیکھا۔ ”کیا کوئی مسئلہ ہے؟“

”نہیں، بس بات سے بات نکل آئی۔“ اسے احساس ہوا کہ لاشعوری طور پر وہ ایسی باتیں کر رہی ہے جو قابل گرفت ہو سکتی ہیں۔

”بیکار باتوں کے بجائے کام پر دھیان رکھو تو زیادہ مناسب ہوگا۔ میرے پاس تمہاری ذہنی الجھنوں کو حل کرنے کے علاوہ بھی کئی مسائل ہیں۔“ میڈم ایکس اٹھ کرے ہوئے لہجے میں بولی۔

”کیا میں کوئی مدد کر سکتی ہوں؟“

”تمہاری اتنی ہی مدد کافی ہوگی کہ خود کو سونے گئے فرائض اٹھکے سے اجنبی سمجھو۔“ وہاں پر دہی برقرار تھی۔

”آپ مجھے شیئر تو کر سکتی ہیں۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر میڈم ایکس کے قدموں میں بیٹھی اور اس کا ہاتھ چام کیا۔

”کچھ اور پروالوں کا داؤ پاؤ ہے اور کچھ چھوٹے موٹے مسائل۔ سنگاپور سے وہ صحت سیٹری غائب ہے جس کے ذریعے ہم نے علیحدہ کے بیگ میں ٹائم نیم رکھوایا تھا۔ مگر پر اس کے استعمال کا سامان موجود ہے لیکن کاغذات وغیرہ غائب ہیں اور مگر کی حالت ایسی ہے جیسے کسی نے جگہ میں وہاں کی غلطی کی ہو۔“ میڈم ایکس لہجہ نرم ہوا۔

”مطلب ہم بلاسٹ کے بعد وہ لوگ مجرم تک پہنچ گئے تھے لیکن سوال یہ ہے کہ سیڈی کو زندہ چھوڑا اسی کیوں گیا؟ اسے تو کام نکلنے ہی ختم کر دینا چاہیے تھا۔“ اس نے فوراً اعتراض کیا۔

”یہی کیا جانے والا تھا لیکن شوٹر کے چہنچے سے پہلے ہی وہ غائب کر دی گئی۔“

”ہو سکتا ہے وہ خود غائب ہوئی ہو۔“ اس نے اندازہ لگا دیا۔

”نہیں۔“ میڈم ایکس نے سر کوئی میں جھیش دی۔

”اگر وہ خود گئی ہوتی تو کم از کم وہ رقم اپنے ساتھ لے جاتی جو

”وہ شاید ٹھوڑا بہت زخمی ہو گیا تھا۔ باہر برآمدے میں اور بیرونی دیوار پر خون کے قطرے پڑے ہیں جن کا تجزیہ کرنے پر ثابت ہو گیا ہے کہ وہ معاذ کے خون کے قطرے ہیں۔“ مادام کا ثبوت بہت ٹھوس تھا۔

”آخر ثابت ہو گیا کہ وکٹر کے آلے نے دھوکا دیا ہے۔ معاذ کے زندہ ہوتے ہوئے بھی وہ اس کے دماغ کی لہروں کو نہیں بچھڑا سکا۔“

”میرے خیال میں تو معاذ نے آلے کو دھوکا دیا ہے۔“ مادام ایکس کی آنکھوں میں گہری سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔

”کیسے؟“

”مشرق کے بہت سے اسرار ایسے ہیں جو سائنس کو بھی شکست دے دیتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے معاذ کو بھی ایسی کوئی دھول مٹی ہے۔“

”کیا واقعی آپ ایسا سمجھتی ہیں؟“ وہ اس تجزیے پر حیران ہوئی۔

”وقت سب بتا دے گا۔ ہمارا اصل مسئلہ یہ ہے کہ اب معاذ کو کیسے وینڈل کیا جائے؟ بد قسمتی سے ہم اپنا تپ کا پتا اپنے ہاتھوں سے کوئی نہیں ہیں۔ معاذ کی پہلی زندہ ہوتی تو ہم پھر بھی بہتر پوزیشن میں ہوتے۔“ میڈم ایکس نے سر کے کانٹا لپیٹے ہوئے پریشانی کی اصل وجہ بیان کی۔

”اسے اپنی پہلی کے بارے میں معلوم ہو گیا تو واقعی وہ بے قابو ہو جائے گا۔“ سونیا کو خود بھی حالات کا ادراک تھا۔

”یہ تو ہونا ہی ہے۔ اس کے کزن فراڈ کو اطلاع دے دی گئی تھی۔ وہاں سے خبر دو ستوں اور رشتے داروں میں پھیل چکی ہے۔ معاذ بھی نہ سمجھی، نہ کسی سے تو رابطہ کرے گا۔“

”اب آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟“

”جنہیں انڈیا جانا ہوگا۔ معاذ کو وہاں کی ٹیم پر نہیں چھوڑا جاسکتا۔ مجھے یہاں کے بکٹیرے دیکھنے ہیں۔ مکارالہ میں مسلسل مہرے غائب ہے۔ معلومات کرنے پر پتا چلا ہے کہ وہ پاکستان میں موجود اپنی ساری پراپرٹی کافی دن پہلے ہی خفیہ طور پر بیچ چکا ہے۔ ٹینک کے معاملات اس کے بندے اپنے طور پر چلا رہے ہیں لیکن یہی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ ان میں سے کسی کا لالہ سے رابطہ ہے یا نہیں۔“

”اور لالہ نے یہ سب کچھ اس کے ذہن کی خاطر کیا ہے؟“

”اب تک کی معلومات کے مطابق ایسا ہی ہے۔“

سگریٹ کا دھواں کچھ اور بھی گہرا ہوا گیا۔

آنے والوں کی تعداد خاصی کم ہو چکی تھی۔

ساحل کی ٹھنڈی ریت پر ننگے پاؤں چلتے ہوئے وہ کیا کیا سوچتی جا رہی ہے، اسے خود بھی اندازہ نہیں تھا۔ ابھی ابھی لاشعاری سوچیں گئیں جو اسے ادھر ادھر بٹکار رہی تھیں۔ وہ اس پاس کی دروازوں اور اس کی آوازوں سے مکمل طور پر کٹ چکی تھی اور تصور کی آنکھ سے ایک دھندلی سی فلم دکھا رہی تھی۔

سنہری بالوں والی ایک گزیا سی بچی چند دوسرے بچوں کے ساتھ قلعین پر بیٹھی اس مشکل سبق کو یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی جسے یاد نہ کرنے پر معلم نے کل بھی اسے سزا دی تھی۔ ان کا معلم ایک نہایت سخت گیر انسان تھا اور ذرا سی کوتاہی پر سخت مزا میں دینے میں کسی دروہایت سے کام نہیں لیتا تھا۔ اس وقت بھی اسے کوئی پروا نہیں تھی کہ اس کے سامنے بیٹھے بچے اس وقت سبق یاد کرنے سے زیادہ باہر برسی بارش میں کھیلنے سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس کی تیز نظروں کے باعث بچوں میں ہمت نہیں تھی کہ کھلی کھڑکی سے نظر آتی بارش کی سمت نظر اٹھا کر دیکھ سکیں۔ وہ خود پر جبر کیے کسی نہ کسی طرح اپنی کتابوں پر نگاہیں جمائے بیٹھے ہوئے تھے لیکن سنہری آنکھوں والی اس بچی کے لیے یہ جبر بہت مشکل تھا۔ فطرت سے محبت، اسے فطرت کے حسن سے دور نہیں رہنے دیتی تھی۔ اس وقت بھی وہ گاہے گاہے نظر اٹھا کر کھڑکی کے باہر کا منظر دیکھتی جا رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اُمی کی یہ چندی معلم کی نظروں سے پوشیدہ ہے لیکن جلد ہی اس کا یہ خیال غلط ثابت ہو گیا۔

”کھڑی ہو جاؤ۔“ چھڑی کی ٹوک اس کی پشت پر چھوٹے ہوئے معلم نے اسے سوجھ بوجھ میں گھم دیا تو وہ کانچتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”جہیں بارش ابھی لگتی ہے؟“ سوال کیا گیا جس کے جواب میں اس کا سر خود بخود اٹھاتا ہوا تھا۔

”بارش میں نہانا چاہتی ہو؟“ دوسرا سوال ہوا اور شدید خوف میں مبتلا ہونے کے باوجود مزے دار و خواہش نے دوسری بار بھی اس کے سر کو اٹھاتا ہوا دیکھا۔

”بارش کا پانی کیسا ہوتا ہے؟“

”گھٹا۔“ اس نے آنکھیں کھج کر یک لفظی جواب دیا۔

”تم اس ٹھنڈک کو اچھو لے کر نا چاہتی ہو؟“ ایک اور سوال ہوا۔

”جی ہاں۔“ معلم کے سوالات اس کی امید بندھا رہے تھے کہ اسے باہر جا کر بارش میں کھیلنے کی اجازت ملے والی ہے۔

ہماری طرف سے اسے دی گئی تھی۔ وہ رقم اس کی ایک جیکٹ کی جیبوں سے برآمد ہوئی ہے۔“

”یہ تو واقعی اچھا کا معاملہ لگ رہا ہے۔“

”ابھی باؤ، جو بھی ہے میں خود دیکھ لوں گی۔ تم بس اپنے کام پر فوکس کرو اور اپنی تیاری مکمل کر کے مجھے بتاؤ کہ کب انڈیا کے لیے کھل رہی ہو؟“

”اوکے سیم اجڑا آپ کا حکم۔“ اس نے فرمانبرداری کا مظاہرہ کیا اور اجازت لے کر وہاں سے رخصت ہونے لگی۔ ”سنو!“ وہ ابھی دروازے تک ہی پہنچی تھی کہ میڈم ایکس نے اسے پیچھے سے پکارا۔

”جی۔“ اس نے پلیٹ کر میڈم کی طرف دیکھا۔ نظروں سے نظریں نہیں اور اسے لگا کہ ان شدید رنگ آنکھوں میں کسی جذبے نے نہ کر ڈالی ہے۔ اس کا دل زور سے پڑکا۔ ”کھلی کوتاہی نہیں ہوتی چاہیے۔ میں تم سے صرف کامیابی کی خبر سننا چاہتی ہوں۔ سناؤ کہ ہمارے درمیان واپس لانے میں کامیاب نہ ہو سکو تو اس کی موت کا پروانہ جاری کرنے میں ہنگامہ مت۔“ انہیں کے احساسات کے برعکس وہاں صرف کام کی بات ہی جاری تھی۔

”اوکے۔“ وہ تیزی سے پھر مکمل گئی لیکن طبیعت یکدم ہی بہت بوجھل ہو گئی تھی۔ دل کو کوئی ایسا معلوم صدر پہنچا تھا جو اسے اس بات پر بھی خوش نہیں ہونے دے رہا تھا کہ معاذ کی زندگی کی اطلاع کے بعد اس کے علاوہ ہر شخص جھوٹا پڑ چکا ہے۔

خارج میں آنے والی اس تبدیلی نے اسے خان ہاؤس کی طرف بھی رخ نہ کرنے دیا اور یونہی سڑکوں پر گاڑی دوڑاتی بہت دور نکل گئی۔ ہوا میں نمی کا تناسب بڑھا تو اسے احساس ہوا کہ وہ ساحل سے قریب ہے۔ بے ساختہ ہی دل نے خواہش کی کہ ساحل کی ٹھنڈی ریت پر دروہیت ننگے پاؤں چلتی چلی جائے۔ خواہش کی تکمیل کے لیے اس نے گاڑی کا رخ ساحل کی طرف ہی رکھا اور ایک مناسب جگہ دیکھ کر گاڑی پارک کی۔ ابھی گاڑی سے اتر رہی تھی کہ موٹا بھلے تنگنا اٹھا۔ اس نے اسکرین پر آٹا حاد کا نام دیکھا اور جھنجھلائے ہوئے انداز میں کال منقطع کرنے کے ساتھ ساتھ موٹا بھلے بھی آف کر دیا۔

”میں کسی کو حساب نہیں دینا چاہتی کہ میں کہاں ہوں اور کیا کر رہی ہوں۔“ موٹا بھلے وہیں بیٹھ کر سہجیک کر وہ باہر نکل اور گاڑی کا دروازہ لاک کر کے ساحل کی طرف بڑھ گئی۔ رات اتر آئی تھی اور ساحل پر تفریح کی غرض سے

”جاؤ۔“ مسلم چٹا اور شامیں شامیں کی آوازوں کے ساتھ چمڑی اس کی پشت پر برستی چلی گئی۔ چاروہ چار اسے دل کڑا کر کے شب کے اندر اترا پڑا۔ صبح پانی نے اس کے جسم کو جھلکا سا لگایا۔ بے ساختہ ہی اس نے شب کے کنارے پر ہاتھ جما کر باہر نکلنے کی سعی کی۔

”لیٹ جاؤ۔“ اندر لیٹ جاؤ اور ٹھنڈے پانی میں نہانے کے سارے ارمان پورے کرلو۔“ چمڑی ایک بار پھر برسی اور اس کے سنہری بالوں کو لمبی میں جکڑ کر اس کا سر اس صبح پانی میں ڈوب دیا گیا۔ وہ سانس لینے کو تڑپتی تو اس کے بالوں کو چھوڑ دیا گیا۔ انسانی جبلت کے مطابق اس نے تیزی سے سر باہر نکال کر جلدی جلدی پیچھڑوں میں آسکین بھری پھر اپنے من پڑتے بدن کو اس سرد جہنم سے نجات دلانے کے لیے ایک بار پھر شب کے کناروں پر ہاتھ جما کر باہر نکلنے کی سعی کی۔ ایک بار پھر اسے زور سے دھکا دیا گیا۔ من پڑتے جسم اور رکتی ہوئی سانس کی تکلیف کے ساتھ وہ بالآخر اپنے ہوش و حواس کو بخشی۔ بے ہوش ہوتے ہوئے اسے احساس تھا کہ وہ ہاتھ جب میں نہیں، سمندر کے پانی میں گری ہے اور بے ہوشی کا سبب پانی میں دم ٹھنکا نہیں بلکہ ناک پر رکھا جانے والا کوروہ مقام میں ترومال ہے۔ اس نے ان سايوں کو بھی محسوس کر لیا تھا جو اس کے گرد گھیر ڈالے ہوئے تھے۔ لیکن تارکی میں ڈوبتے ذہن کے ساتھ وہ کچھ بھی کرنے سے قاصر تھی۔

بے ہوشی کا یہ عرصہ چٹا نہیں لگتا طویل تھا۔ آنکھ کھلی تو اسے اپنے ارد گرد تاریکی محسوس ہوئی۔ طبیعت اتنی بھاری ہو رہی تھی کہ ہوش میں آجائے نہ سکا باوجود بستر سے اٹھنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ کھانے جسم کو روک ڈالا ہو۔ وہ کوئی نا تجربے کار لڑکی نہیں تھی کہ اپنی اس کیفیت کو سمجھ نہ پائی۔ دھیرے دھیرے اسے ادراک ہونے لگا تھا کہ بے ہوشی کے اس دورانیے میں اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ جو ہوا اس کا ثبوت اسے اپنی بے لباہی سے بھی مل رہا تھا۔ دائیں بازو، پیٹے اور گردن میں شدید میلن کا بھی احساس تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ان مقامات کو کسی ٹھنڈی شے سے زخمی کیا گیا ہو۔ پیش کی ایک لہری اس کے وجود میں اٹھی۔ وہ جو اپنے اشاروں پر ایک دنیا کو نبھانا جانتی تھی، کچھ نا معلوم غنڈوں کی درندگی کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔

”بہت لمبی پڑے گی تمہیں یہ حرکت۔“ داستوں کو پکھلاتے ہوئے وہ زیر لب بڑبڑاتی اور بے آہستہ بستر چھوڑ دیا۔ کمرے میں اندھیرا تھا لیکن اب اس کی آنکھیں کسی حد

”تم اس پانی میں خوب اچھلتا کودنا بھی چاہتی ہوگی؟“ ایک اور سوال آیا جس کا جواب اسے اٹھات میں ہی دینا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ میں تمہاری خواہش پوری کرنے کا انتظام کرتا ہوں۔“ مسلم پڑ سوچ لیجے میں کہتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا تو اسے گمان ہوا کہ وہ کسی سے اجازت طلب کرنے گیا ہے۔ وہ امید بھری نظروں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ دروازہ دوبارہ کھلا اور اس کی نگاہ مسلم کے چہرے پر پڑی۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا لیکن آنکھوں میں کوئی ایسی تحریر تھی جسے وہ پڑھنے سے قاصر تھی۔

”آؤ۔“ مسلم نے اسے اشارہ کیا تو اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ قدم آگے بڑھائے۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ لہجے سے باہر بارش میں بیٹھنے کی اجازت مل چکی ہے اور وہ بھی عام بچوں کی طرح موسم سے لطف اندوز ہو سکتی ہے۔

”تم سب بھی قطار بنا کر بیٹھے آؤ۔“ مسلم کا یہ حکم باقی بچوں کے لیے تھا۔ بچوں نے حکم کی نینل کی۔

”اس طرف رخ۔“ یقین و بے یقینی کے درمیان ڈوٹن سنہری بالوں والی بچی عجلت کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی کہ روکے جالے پر پلٹ کر کسی سمت دیکھنا پڑا جہاں مسلم اپنی انگلی سے اشارہ کر رہا تھا۔ وہ ایک حقل خانے کا کھلا دروازہ تھا۔

”واں۔۔۔۔۔!“ کچھ نہ سمجھ پانے کے باوجود بچی کے چہرے کی رنگت بدلی۔

”ہاں وہاں۔“ اس بار مسلم کے ہاتھ میں موجود چمڑی کی ”شامیں“ نے لٹھ میں خوف کو مزید گہرا کر دیا۔ وہ لرزتی کا پتی حقل خانے کی طرف بڑھی۔ پانی نیچے سے ہوئے چروں کے ساتھ اسے دیکھ رہے تھے۔ انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کی ساتھی کے ساتھ کچھ اچھا نہیں ہونے جا رہا ہے۔ ”شب کے اندر جاؤ۔“ وہ حقل خانے کے اندر بیٹھتی تو اسے ناختم دیا گیا۔ وہ مستقبل شکل کے بڑے سے ہاتھ شب کے کنارے جارہی اور یہ دیکھ کر اس کی روح فنا ہو گئی کہ پانی سے بھرے اس شب میں برف کے بڑے بڑے ٹکڑے تیر رہے ہیں۔

”تمہیں بارش کا ٹھنڈا پانی پسند ہے نا اور یہ پانی اس سے بھی زیادہ ٹھنڈا ہے۔“ شب میں جاؤ اور ٹھنڈے پانی سے لطف اندوز ہو۔“ مسلم کی سرد آواز اسے پکپکا ہٹ میں جٹا کر رہی تھی لیکن اس کے باوجود وہ اس ٹھنڈے صبح پانی سے بھرے شب میں اترنے کی ہمت نہیں کر پارہی تھی۔

دروازے کا ہٹ بند کیا اور تیزی سے بستر پر آکر لیٹ گئی۔
بند آنکھوں کی جھری سے دروازے پر آرام سے نظر رکھی
جاسکتی تھی۔ ذرا سی دیر میں ہی دروازہ کھلا اور ہلکی سی روشنی
اندر آئی۔ اس روشنی میں اس نے صرف شارٹس میں لمبوس
اس بندھے سے آدی کو اندر آتے دیکھا جو اپنی بیوی سے
ڈرتا بھی تھا لیکن بال غیبت کی طرح ہاتھ آئی عورت سے
پورا پورا لطف کشید کرنے کی حوصلہ بھی رکھتا تھا۔ اندر آکر اس
نے دروازے کو دوبارہ بند کرنے کے ساتھ ساتھ کھنڈی بھی
چڑھائی۔

”کمال ہے، ابھی تک بے ہوش پڑی ہے۔“ یہ آواز
بلند حیرت کا اظہار کرتے ہوئے اس نے سوچ بورد پر ہاتھ
مار کر لائٹ کا بٹن آن کیا تو دروازہ بند ہو جانے سے دوبارہ
تاریکی میں ڈوب جانے والا کمر روشن ہو گیا۔ یہ ہلکی روشنی
والا بلب تھا لیکن اتنی دیر سے تاریکی میں رہنے کے باعث
یہ روشنی بھی زیادہ ہی محسوس ہو رہی تھی۔ سونیا نے احتیاطاً
آنکھیں پوری طرح بند کر لیں۔ اب وہ اس کے اپنے قریب
آنے کا انکار کر رہی تھی۔

”بخش تو ٹھیک چل رہی ہے۔ لگتا ہے اب ہوش میں
آنے ہی والی ہے۔“ قریب آکر وہ اس پر جھکا اور کھائی تمام
کر بخش چپک کرتے ہوئے بڑبڑایا۔ اگلا لمحہ اس کے لیے
اعصاب کو ٹھنڈ کر دینے والا تھا۔ ساکت پڑی سونیا نے بچہ
ایسی پھر کی ہے اس پر حملہ کیا تھا کہ وہ فوری طور پر کوئی بریک
ہی نہیں دے سکا تھا۔ ٹانگ پر گھسٹا کھانے سے گردن پر
کھڑی ہلکی کھار سننے کے درمیان اتنا کم وقت تھا کہ وہ حیرت
سے چٹ پڑنے والی اپنی آنکھوں کو کھپکھپاتی نہیں سکا تھا۔

”میں ہوش میں آچکی ہوں اور اب تمہارے ہوش
اڑنے کی باری ہے۔“ اسے ٹھیس کر بستر پر گرے ہوئے
وہ دھیمی آواز میں غرائی اور ایک مکا اس کی جھٹی پر رسید کیا۔
وہ منہ سے تیز سسکاری نکالنا ہوا اٹھا نہیں ہو گیا۔ اس اٹھاؤ
کی آوازیں باہر بھی گئیں لیکن باہر والوں کو کچھ مسموت حال کا
ادراک نہیں ہوا اور ان آوازوں کو اپنے سامنے کی کارکردگی
سمجھتے ہوئے ان میں سے ایک نے ہانک لگائی۔

”خیال سے اوئے۔ ہمارے لیے بھی کچھ جان چھوڑ
دیتا۔“ اس ہانک کے جواب میں ان سب نے مل کر ایک
بلند و جاگ تہقہ لگایا۔

”تمہارے لیے پوری کی پوری سونیا باقی بچی ہے
باشرطاً! وہ انجام کروں گی تمہارا کر دیکھنے والے صبرت
بکریں گے۔“ وہ دانت پر دانت جھکا کر بڑبڑائی اور بستر کی

تک اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو چکی تھیں۔ وہ بے
پاؤں چلتی ہوئی وہ اس سمت بڑھی جہاں دروازے کی
موجودگی کا اندازہ ہو رہا تھا۔ یہ پرانی طرز کا لکڑی کا دوپٹوں
والا دروازہ تھا۔ دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے سے قبل اس
نے دروازے سے کان لگا کر باہر کی سن سن کرنے کی کوشش
کی۔ مردانہ قہقہوں کی آواز نے اسے احساس دلایا کہ وہ
لوگ اس کمرے کے باہر ہی ڈیر اڈالے بیٹھے ہیں۔
”کیا ممکن ملائی عورت ہے یا راج میں سواد آگیا پر
دل نہیں بھرا۔“

”دل نہیں بھرا تو دوسرا دور چلائے، تو ویسے بھی
لاچکی ہلا ہے۔ ایک بار میں تیرا دل بھی بھرتا بھی نہیں ہے۔“
وہ آپس میں ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کر رہے تھے۔
آوازوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ نفٹے میں ہیں اور اپنے
پلاسٹک سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

”تیری طرح نہیں ہوں جو ایک ہی بار میں عورت کو
کچا چبا ڈالتا ہے۔ دیکھا تھا میں نے کیسے تو نے اسے
چاری کے پٹھنے پر جگہ جگہ دانت گاڑ دیے ہیں۔“ پہلی
والی آواز دوبارہ سنائی دی۔ سونیا نے آہستہ سے ہٹ پر دباؤ
ڈال کر دونوں بٹنوں کے درمیان درز پیدا کی۔ یہ لمحہ باہر
موجودوں پر بیٹھے چار افراد کو کھائی دے۔ ان کے درمیان
ایک خستہ حال میز پر شراب کی بوتل رکھی تھی اور وہ چھوٹوں
میں جام تھا جسے اس شراب سے لطف اندوز ہوتے آہٹیں میں
مکھنکو کر رہے تھے۔

”اتنی بے چاری نہیں ہے جتنی تو اس سے ہمدردی
کر رہا ہے۔ مجھے تو صاف دوسرا عورت لگتی ہے۔ شریف
زادی ہوئی تو رات گئے کیلی سمندر پر نہ محوم رہی ہوئی۔“
”لگتا ہے شکار کی تلاش میں نکل گئی اور خود شکار
ہوئی۔“

”پنڈلی پر فخر باندھے محوم رہی تھی جہانسی کی رانی۔
ہم نے اچانک نہ چھاپ لیا ہوتا تو خون خرا بے پر اتر آتی۔“
وہ سب باری باری اس کی ذات پر تہنیرے کرتے
تہنیرے لگا رہے تھے اور انہیں نہیں معلوم تھا کہ انہوں نے خود
اپنی موت کو آواز دی ہے۔

”پہلے میں دوسرا دور چلا کر آ جاتا ہوں۔ واپس گھر
بھی جاتا ہے۔ لبا عرصہ یہاں لگا تو وہ جو گھر پر ایک داروغہ
بیٹھی ہے، سوال پوچھ پوچھ کر ٹانگ میں دم کر دے گی۔“
کھیلے دانتوں والے نے خالی جام میز پر رکھا اور انگڑائی لیتا
ہوا اٹھرا ہو گیا۔ اس کا ارادہ بھانپ کر اس نے چپکے سے

رہے تھے، اب اسے قابو کر لیں۔ لہجوں میں اس نے ان کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ جتنی طور پر لڑنے بھڑنے میں مہارت نہیں رکھتے تھے۔ دوسرے لڑنے کی حالت میں بھی تھے اس لیے اس کے خلاف کوئی موثر جوابی کارروائی کرنے سے قاصر تھے۔

”نک جاسانی! ایک چادر نہ تجھے کوئی بار دوں گا۔“ اپنا سر پھنوا کر لٹو کے مانند رقص کرنے والے کو ہوش آگیا تھا کہ اپنے پاس موجود ہتھیار کو نکال لے۔ ایک عام سے ریوالتور کے زور پر اسے لٹکارنے والے کو طم نہیں تھا کہ وہی صورت کو نہیں، قیامت کو لٹکا رہا ہے۔ سونیا نے ایک نظر اس کے خون آلود چہرے کو دیکھا اور پھر جس آدمی کا کریان پلڑے کھڑی تھی، اسے پوری قوت سے اس کی طرف اچھال دیا۔ خود پر حملہ ہوتے دیکھ کر ریوالتور بردار نے گھبراہٹ میں غیر اختیاری طور پر کوئی چلائی۔ کوئی اچھالے گئے شخص کے پیٹ میں لگی اور وہ گرے کرتے ریوالتور والے کو اپنے ساتھ لے کر گرا۔ گرے سے ریوالتور اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ سونیا نے لپک کر ریوالتور پر قبضہ کر لیا۔ وہ جس قسم کے لوگ تھے، اس کے آگے ہتھیار کے بغیر بھی نکلنے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے اور اب تو وہ مسخ دکھائی دے رہی تھی چنانچہ فوراً ہی صبر جھکا کر اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

”بھلا جاؤ۔ سب فرش پر اوندھے ہو کر لیٹ جاؤ۔“ اس نے صلیق کے بل چلتے ہوئے انہیں حکم دیا۔ جو شخص گوئی کھا کھا بھائی ہے اب کی طرح تڑپ رہا تھا، اس پر ایک خوفزدہ نظر ڈالتے ہوئے ہائی دوڑنے کو رہا اس کے حکم کی تعمیل کی۔ اس نے ان کے سروں پر ریوالتور کا دست بجا کر انہیں ہوش درخو سے بگاڑ دیا اور پھر اس جگہ کا سانس کرتے لگی۔ یہ ایک چھوٹا مگر پختہ مکان تھا جس کے سامنے والے کھلے حصے میں ایک گاڑی کھڑی دکھائی دے رہی تھی۔ یہ کھلا حصہ اتنا مختصر تھا کہ گاڑی کھڑی ہونے کے بعد مشکل سے اتنی جگہ بچی تھی کہ ایک شخص سائز میں سے گزر کر گیت تک جاسکے۔ کھڑکیوں سے جھانکنے پر علاقہ بھی کچھ غیر آباد سا محسوس ہوا۔ کہیں کہیں بس اسی طرز کے کچھ مکانات تھے جس طرح کے مکان میں وہ اس وقت موجود تھی۔ آس پاس موجود رہائشی زمین سے اعزازہ دور ہوا تھا کہ یہ سمند کے آس پاس کا ہی کوئی علاقہ ہے۔

مکان کا اندرونی جائزہ لینے پر بھی اسے کوئی خاص شے نہ مل سکی۔ کچھ کھانے کا بچا کچھا سامان، شراب کی تین چار بوتلیں اور ان کے لمبوسات ہی تھے۔ بجلی کے حصول کے

چادر بچاؤ کر کے ہوش پڑے بندے کے ہاتھ پر باندھے گئے ساتھ ساتھ منہ میں بھی کپڑے کا کولہ خوش دیا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد اس نے کمرے میں نظر دوڑائی۔ ایک کونے میں وہ لباس پڑا ہوا تھا جو اس نے خواہ کے وقت زیب تن کر رکھا تھا۔ اس نے جاکر لباس اٹھایا لیکن یہ دیکھ کر ایک گہری سانس لے کر وہ گئی کہ وہ کسی طور بھی پہننے کے لائق نہیں رہا تھا۔ انہوں نے دھکیوں کی طرح کوچ کر اس کے جسم سے لباس کو الگ کیا تھا جس کے سبب وہ کھڑوں میں تھیل جی ہو گیا تھا۔ اس طرف سے باہر ہو کر اس نے ایک کھوٹی پر ٹھکڑا نہ کپڑوں کی طرف توجہ دی۔ یہ دو جوڑے تھے۔ اس نے دونوں میں سے نسبتاً چھوٹے سائز کا لباس منتخب کیا اور اسے پہننے لگی۔ لباس پہنتے ہوئے اسے اپنے بازو اور جسم کے دیگر حصوں پر موجود اٹتوں کے نشان دیکھنے کا بھی موقع ملا۔ یہ نشان اسی شخص کی نشانی تھے جو اسی کمرے میں بے بسی پڑا ہوا تھا۔ اس نے پلٹ کر کس کر چیٹ کو کسی نہ کسی طرح اپنی گرفت میں لے کر پھر چیٹ کے پانچ فوٹو کے سیدھی ہوئی۔ بے ہوش پڑے آدمی سے بعد میں بھی حساب بے باقی کیا جاسکتا تھا۔ اس وقت پھر والوں سے نمٹنا ضروری تھا۔ کمرے میں کسی ہتھیار کی تلاش میں کام ہونے کے بعد اس نے صبرانے کی میز پر زیادہ بٹھا دیا جس پر پھر دھکی لہر دی نے قدرتی طور پر اپنے نقش و نگار بنادے تھے کسی نے بطور شوہن اسے یہاں لا رکھا تھا۔ پھر خاما دوڑی تھا۔ اسے بائیں ہاتھ میں توتلی ہوئی وہ دروازے کی طرف بڑھی اور کھڑکی کھول کر اسے تیزی سے دکھایا۔

”بھئی آگیا اپنا شیر۔“ دروازہ کھلنے کی آواز پر باہر والوں میں سے ایک نے تبصرہ کیا لیکن اسے اتنی مہلت نہیں مل سکی کہ توقع کے برعکس سونیا کو وہاں کھڑا دیکھ کر اپنے حیرت سے محل جانے والے منہ کو بند کر سکے۔ سونیا کے ہاتھ میں موجود پتھر کوئی کی سی تیزی سے لٹل کر اس کے ماتھے سے ٹکرا پایا اور وہ ایک جھنجھکاڑ مارتے ہوئے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر لٹو کی طرح ڈالنے لگا۔

”مر گیا اونے، مر گیا میں۔“ زخم پر ہاتھ رکھے بہتے خون کو روکنے کی کوشش کرتا وہ یہ آواز بلند پایا اس دے رہا تھا لیکن وہاں کس کو فرصت تھی کہ اس کی طرف توجہ دیتا۔ اس کے دونوں ساتھی تو کسی چھلاوے کی طرح خود پر حملہ آور ہو جانے والی سونیا سے منہ میں مصروف تھے۔ وہ ہڈ توڑ ہاتھ اور پاؤں چلا رہی تھی اور ان دونوں کے لیے مشکل ہو رہا تھا کہ جس عورت کو بے ہوش کی حالت میں روندتے

”اب تک کتنی عورتوں کو اس طرح فحوا کر کے یہاں لپکے ہوئے؟“ اس نے جس لہجے میں یہ سوال کیا، وہ جواب دینے کی ہمت نہیں کر سکا۔

”جواب دو۔“ اس نے غصے کی لہجہ سے اس کے بالوں بھرے سینے پر ایک ہلکا سا ٹک لگایا۔ خون نکلا جس کا کچھ حصہ بالوں میں جذب ہو گیا اور کچھ بہہ کر اس کی گردن کی طرف چلا گیا۔

”تم سے پہلے صرف ایک لڑکی کو معاملہ پر سے فحوا کر کے لائے تھے۔“ اس نے نظریں چماتے ہوئے جواب دیا۔

”اسے کتنوں کی طرح پھینچوڑنے کے بعد نکال دیا تھا اس کا؟“ مارکر معاملہ پری چپک دیا ہوگا؟“ وہ اس کے بچ اور جھوٹ کو پرکھنے کے چکر میں پڑنے کے بجائے اگلے سوال پر آئی۔ اس بار بھی وہ خاموش رہا۔

”تم جیسے آدراہ کہتے ہو جبکہ جگہ منہ مارتے پھرتے ہیں، کسی رعایت کے لائق نہیں ہیں۔ بہت مرے کر لیے تم نے۔ اب اعمال کا حوالہ دیکھنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔“ وہ کوئی ٹپک اور پارا سمورت نہیں تھی بلکہ جس طرح شکار کی گئی تھی، اس نے اسے اندر سے بری طرح بھڑکا دیا تھا اور وہ ان چاروں کو ان کے جرم کی بدترین سزا دینا چاہتی تھی۔

”معاف کر دو ہمیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ ہم کبھی ایسی کوئی حرکت نہیں کریں گے۔“ اس کی آنکھوں میں بھڑکتے نظریں کے علاوہ کچھ نہیں ہوئے اس نے عاجزی سے ٹھکراتے ہوئے درخواست کی۔

”مجھے تمہارے وعدوں اور دعوؤں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود اس بات کو یقینی بنانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ تم آئندہ ایسا کچھ نہ کر سکو۔“ اس نے اس کی کوئی گردن پر پتھر کی ٹوک رکھ کر بڑے پیار سے ایک چمک لگاتے ہوئے جواب دیا تو اس کا چہرہ خوف سے زرد پڑ گیا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ جس عورت نے اپنے جسم پر نین مقامات پر کالے جانے کا بدلہ اس کے جسم پر نین مقامات پر پتھر چلا کر لیا ہے، وہ واقعتاً میں ابھی حیران آگے جاسکتی۔

”اگر تم ہمیں معاف کر دو تو ہم تمہیں تمہارے ساتھ ہوئی زیادتی کے بدلے میں تمہاری تادان ادا کر سکتے ہیں۔ مجھے اپنے ساتھیوں سے بات کرنے کا موقع دو۔“ وہ لالچ کے آئینہ سے اس کے ارادے کو کمزور کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”اگر تم اپنے جسم کا ایک ایک عضو کاٹ کر مجھے دیتے جاؤ تو میں اس کے وزن کے برابر سونا تول کر دیتے کو تیار

لیے سولہ فیصل استعمال کیا جا رہا تھا۔ لیکن اسے اپنا پتھر مل گیا۔ تینوں کے لباس کی تلاش لینے پر دو کی بیویوں سے جس کی پڑیاں اور ایک کے پاس سے گاڑی کی چابیاں برآمد ہوئیں۔ چابیاں اپنے جسم پر موجود شرت کی جیب میں ڈال کر وہ دو بارہ اس کمرے کی طرف بڑھی جہاں اسے رکھا گیا تھا۔ بستر پر وہ بعد ازاں اب تک سے ہوش پڑا تھا جس نے سنی کی ٹھنک کے مطابق اسے سب سے زیادہ عجیبے مشق بنایا تھا۔ تھوڑی سی کوشش سے وہ اس شخص کو ہوش میں لانے میں کامیاب ہو گئی۔

”تمہارے منہ سے کپڑا نکال رہی ہوں۔ اگر چہنچہ چلانے کی کوشش کی تو زخروں کاٹ کر رکھ دوں گی۔“ ریلو اور اس نے ایک جانب ڈال دیا تھا اور اس شخص کی آنکھوں کے آگے پتھر لہراتے ہوئے خوفناک لہجے میں پتھکاری تھی۔ وہ آدنی تجربہ کر چکا تھا کہ اسی بظاہر نرم و نازک نظر آتی عورت نے بغیر کسی ہتھیار کے اسے ناک آؤٹ کر کے بے بس کر دیا تھا چنانچہ جلدی جلدی سرکواشت میں ہلاتا اپنے تعاون کی یقین دہانی کر دیا۔

”کون ہو تم لوگ؟“ اس کے منہ سے کپڑے کا گولہ نکالنے ہی اس نے پہلا سوال دیا تھا۔

”دوست ہیں۔ حیدر آباد سے تفریح کے لیے یہاں آئے ہوئے ہیں۔“

”یہ مکان کس کا ہے؟“

”میرا۔۔۔۔۔ میں نے پچھلے سال ہی خریدا ہے۔ بند پڑا رہتا ہے۔ بس کبھی کبھی جب دوستوں کے ساتھ تفریح کا موڈ ہو تو دو ٹین دن کے لیے ہم یہاں آ جاتے ہیں۔“

”تفریح میں شراب، چرس اور جوئے کے ساتھ یقیناً عورت بھی شامل ہے۔“ اس کے سپاٹ سے لہجے میں کبھی کچھ ایسا تھا جس کے باعث وہ کچھ بول نہ سکا۔

”جواب دو۔“ اس نے ہڈیانی انداز میں اس کے بازو پر پتھر سے ایک چمک لگایا۔ عین اسی مقام پر اس کے اپنے بازو پر دانتوں کے نشان گڑے ہوئے تھے۔

”بتانا ہوں۔“ اس شخص کے منہ سے سسکاری ضرور نکلی لیکن انجام کا اندازہ لگاتے ہوئے اس نے خود کو چہنچہ سے باز رکھا۔

”عورت بھی ہوتی ہے لیکن زیادہ تر بھاڑے کی۔“

”بھاڑے کی عورت نہ ملے تو جو عورت ہاتھ لگے،

اسے شکار کر کے یہاں لے آتے ہوئے؟“ اسے اندازہ لگاتے

میں دیر نہ لگی۔ جواب وہ خاموش رہا۔

”کیا چاہتے ہو؟“ درمیانی قامت اور چہرے سے بدن کا مالک وہ شخص بظاہر بڑا عام سا آدمی دکھائی دیتا تھا لیکن جن نظروں سے اس نے معاذ کی جانب دیکھا تھا، انہوں نے اسے اس کے خاص ہونے کا احساس دلایا تھا۔ اندر تک اتر جانے والی ایسی گہری نگاہیں جو آدمی کو پوری طرح کھنگال ڈالیں، کسی عام شخص کی نہیں ہو سکتی تھیں۔

”کام بہت مشکل ہے۔ کافی جائیں جاسکتی ہیں بلکہ رنج کھوں تو بھولی چوک کے نیچے میں تمہارا سارا سیٹ اپ بھی تباہ ہو سکتا ہے۔“ اس نے ہر طرف سے مایوس ہونے کے بعد فردوس کے دیے ہوئے نمبر پر رابطہ کر لیا تھا اور اب تینو ڈیوانا ہی اس شخص کے سامنے کھڑا تھا جو فردوس کے دعوے کے مطابق اس صورت حال میں اس کی مدد کر سکتا تھا۔

”جس کی سفارش لے کر آئے ہو، وہ اپنی چہری سے بھی لگا کاٹ دے تو مجھ سے انکار نہیں ہوگا۔“ بے نیازی کے اظہار کے لیے وہ خوشخوار عی مز کر اپنی کمر کے پیچھے رکھے گاؤں کیے خوشک کرنے لگا تھا لیکن کچھ ایسا تھا اس کے لیے جس نے معاذ کے دل کو چھو لیا۔ اسے احساس ہوا کہ بکھری زلفوں، گھنی ڈاڑھی اور بڑی بڑی مونچھوں کے ساتھ خنڈے کی گدی پر بیٹھے شخص کے اندر اب بھی وہ نوجوان سانس لے رہا ہے جو اپنی ایک کاغذی ٹیبلو پر جی جان سے مڑتا تھا۔ نوجوانی کی وہ محبت اتنے برسوں بعد بھی اس کے اندر پھٹی آب و تاب سے زندہ تھی۔

”مرا، والدین سے بنگالے لو گے؟“ معاذ نے اسے آزمانے کی کوشش کی۔

”کہنا مناسب کر لیں گے۔ بس تو اپنا کام بتا۔“ اس کے احاطہ میں ذرا فرق نہ آیا۔

”میرا ایک دوست اپنے وفادار ملازم کے ساتھ ان کے چنگل میں پھنس گیا ہے۔ اسے کسی بھی طرح آزاد کر دینا ہوگا۔“ اس نے کام کی اہمیت بتائی اور آہستہ آہستہ ساری تفصیل بتاتا چلا گیا۔

”میں نے تجھ سے کہا تھا ابھی کہ سارا لو چاکھ اور ہے۔ لونڈوں کو چھانسا گیا ہے۔“ اس کی زبانی تفصیل سن کر دیوانے دائیں جانب خاموشی سے بیٹھے شخص کو مخاطب کیا تو وہ تائیدی انداز میں سر ہلانے لگا۔

”برسوں سے آٹھ بھولی بھلی رہے ہیں ان سرسوں کے ساتھ۔ ان کی ایک ایک ادا سے واقف ہیں۔ صاف جان لیتے ہیں کہ کب سالے بچ بول رہے ہیں اور کب خوشخوار کی خوشی لگا کر بیٹھے ہیں۔“

ہوں۔ بولو، دے کہ اپنے ہاتھ پاؤں کاٹ کر مجھے؟“ وہ جواب دینے کا وہ خاموشی اختیار کر گیا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ جس صورت کو لایا دے رہا ہے وہ حیثیت میں اس سے بہت اونچی ہے۔

”اؤکے، گنڈہ بنائے۔“ وہ اسے بندی ہوئی حالت میں بستر پر پڑا چھوڑ کر باہر نکلے اور اس کے سامنے سے حاصل کردہ رپوالور بھی بے پروائی سے وہیں فرش پر پھینک دیا۔ رپوالور دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک آگئی اور جیسے ہی وہ باہر نکلے، خود کو بستر سے گرا کر لٹھکھا ہوا اس رپوالور تک پہنچ گیا۔ ہاتھ اگرچہ اب بھی بندھے ہوئے تھے لیکن رپوالور ہاتھ آجانے سے وہ خود کو خاصا براہ راست محسوس کر رہا تھا۔ اسی اعتماد نے اسے حوصلہ دیا کہ وہ لٹھکھا ہوا اس کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں آگیا۔ وہ یہاں بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی لیکن وہ بے ہوش بڑے اپنے ساتھیوں کو دیکھ سکتا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک بھتیجی عورت نے ان چار مردوں کو اس حال تک پہنچا دیا ہے لیکن یقین تو کرنا ہی تھا کہ وہ خود اس چہرے سے گزر رہا تھا۔

”اچھا تو ڈارنگ میں جا رہی ہوں۔“ وہ رپوالور تھا اس کے دوبارہ اندر آنے کا شکر تھا لیکن وہ اندر نہیں آئی اور باہر سے ہی ہانک لگا کر اپنے جانے کی اطلاع دی۔ اس نے بے تالی سے بند دروازے کی طرف دیکھا۔ بند کواڑوں کے نیچے سے ابلیسی روشنی اندر آ رہی تھی اور یوں لگ رہا تھا کہ روشنی کا پہنچ کر زرد ہے۔

”لنٹرن۔“ دماغ نے فوراً ہی اسے جواب دیا۔ بند دروازے کی چوکت پر جلتا ہوا لنٹرن چھوڑ جانے کی وجہ بیڑول کی اس بوئے سمجھادی جو گاڑی اشارت ہونے کی آواز کے ساتھ ہی اس کے منتھوں سے گھرائی تھی۔ وہ گاڑی میں موجود بیڑول کے اضافی کین کا ڈھکن کھول کر اسے لٹھکھا کر نکل گئی تھی۔ بہتا ہوا بیڑول اپنی خاموشیت کے مطابق لنٹرن تک پہنچنے سے قبل ہی آگ پکڑ بیٹھا۔ اب یہ آگ پہلے بیڑول کے ساتھ چوکت کے نیچے سے نکل کر اندر داخل ہو رہی تھی۔ آگ کے ان لپکتے شعلوں کو دیکھ کر اس نے وحشت کی زیادتی کے باعث ایک زوردار چیخ ماری لیکن یہ کوئی آخری چیخ نہیں تھی۔ چیخیں تو اصل میں وہ تھیں جو آگ میں گھرنے کے بعد بلند ہوئی تھیں۔ لٹس کی بھڑکی آگ کو بجھانے کے لیے فلم کا بازار گرم کرنے والے وہ آوارہ گرد اس آگ کا اپنا من بننے کے بعد ہمیشہ کے لیے مرد ہو چکے تھے۔

☆☆☆

یہاں مشکل میں ہو تو سن کو چین نہیں آتا۔ پہلے مجھے اچھی طرح جانچ پڑتال کرنے دو پھر بتانا ہوں تمہیں کہ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں۔" اس نے ایک بار پھر سلی دی تو معاذِ قدرے مطمئن سادہاں سے اٹھا اور واپس کے لیے پلٹا۔ پلٹنے پر اس کی نظریں دیوار پر لگی ایک تصویر پر پڑیں۔ وہ قدم آگے نہیں بڑھا سکا۔ تصویر میں موجود چہرہ کچھ تبدیلی کے ساتھ اس کے لیے آشنا تھا۔ جو تبدیلیاں محسوس ہو رہی تھیں وہ بھی عمر کے تفاوت کی وجہ سے تھیں۔ تصویر میں موجود جوان کو اس نے ایک ہنستہ و بردبار مرد کی شکل میں دیکھا تھا۔ وہ ان لوگوں کا لہجہ و دلیپ تھا جنہوں نے پاکستان سے ہجرت میں داخل ہونے کے بعد مسافروں سمیت ان کی گاڑی کو اپنے قبضے میں لے لیا تھا اور چاہتے تھے کہ یہ غریبوں کے بدلے اپنے ساتھیوں کی رہائی کا مطالبہ منظور کروالیں۔ سو فیہا کی چالاک اور دلیری کے باعث وہ لوگ ان انخواہ کاروں سے نجات پانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ قرار کے اس منصوبے پر عمل کرتے ہوئے انہیں دلیپ کے کئی ساتھیوں کو ہلاک بھی کرنا پڑا تھا۔ خود دلیپ کو بھی گولیاں لگی تھیں اور اس کی حالت ایسی تھی کہ سونیا نے اسے مردہ تصور کر لیا تھا لیکن خود وہ جان گیا تھا کہ دلیپ ابھی زندہ ہے۔ اسے جانے کیوں دلیپ پر رحم آسکا تھا اور اس نے سونیا کے حکم کے مطابق اسے مزید گولیاں نہیں باری تھیں۔ اس وقت اسے بھی معلوم تھا کہ نیم مردہ دلیپ زندہ بھی بچے گا یا نہیں۔ زندگی میں بھی دوبارہ اس سے واسطہ پڑنے کا تو اسے خیال بھی نہیں آیا تھا اور اب وہ ایک ایسی جگہ اس کی تصویر دیکھ رہا تھا جہاں خود دلیپ طلبہ کرتے آیا تھا۔

"کیا دیکھ رہے ہو بھیا؟" اسے تصویر کی طرف متوجہ پا کر دہانے پوچھا۔

"یہ کون ہیں؟ ان کے چہرے میں آپ کی پڑی جھلک ہے۔" وہ سمجھ گیا تھا کہ دیو اکو کچھ کر اسے شناسائی کا احساس کیوں ہوا تھا۔

"سمجھو ہم ہی ہیں۔ ایک نئے کے دور رخ۔" دیوانے کل کر اس کے سوال کا جواب دینے سے گریز کیا۔

"مطلب آپ کے چہرے بھائی ہیں؟" اسے اپنے اندازے کی درستی پر اٹھ اٹھا۔

"جانتے ہو کیا ہے؟" دیوانے استفادہ کیا۔

"ارے نہیں۔ میں تو بس تصویر میں آپ کی مشابہت دیکھ کر خشک گیا تھا۔" وہ جن نازک حالات میں دلیپ سے ملا تھا، ان کا تقاضا تھا کہ اس سے شناسائی کی

"پھر تو آپ کو میری مدد کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" عالم کے شطرنج اس کے خیالات جان کر معاذ نے خوش محسوس کی۔

"اعتراض تمہارے دوست کے دوستی ہونے کی صورت میں بھی نہیں ہوتا۔ بتایا ہے تمہیں کہ جس کی سفارش لائے ہو اسے انکار نہیں کر سکتا میں۔ زندگی میں پہلی بار تو اس نے مجھے اس لائق سمجھا ہے کہ مجھے کسی کام کے لیے کہے۔" اس بار اس نے اپنے جذبات کو چھپانے کی کوشش نہیں کی اور معاذ حیران تھا کہ اس قسم کے لوگ بھی کسی سے اس درجے کی محبت کر سکتے ہیں۔

"تم نے خود بھی تو اب تک کچھ نہ کچھ ہاتھ پاؤں چلائے ہوں گے۔ مجھے اس کی ساری تفصیل بتاؤ۔ ہر اس بات کا ذکر کرو جو تمہارے نزدیک اہم یا غیر اہم ہے۔" دیو نے اس سے فرمائش کی تو وہ اسے اب تک کی جانے والی اپنی کوششوں کا احوال سناتے لگا۔

"تو وکرم نے مرتے سے تمہیں موبن کا نام بتایا تھا۔" اس کی سنائی تفصیل سن کر دیو نے تیرہ کیا۔ معاذ نے اپنی جدوجہد کا بھی حصہ اسے تفصیل سے سنایا تھا۔ سہاش والا معاملہ وہ گول کر گیا تھا کہ اس سے اس کی ذات پر سمجھ سے سوال اٹھ سکتے تھے اور وہ اپنی ذات کو مضموع بحث نہیں بنانا چاہتا تھا۔

"ہاں، لیکن وہ نام تو بیکار ہو گیا۔ میرے ساتھی اپنے طور پر تصدیق کر چکے ہیں کہ موبن کا "را" سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ ایک عام سائیکس کار کی ملازم ہے۔"

"مطلب، وکرم مرتے مرتے تمہیں پکڑ دے گیا۔" دیوانے اس کے چہرے کو فور سے دیکھا۔

"اس وقت تو مجھے شک نہیں ہوا تھا لیکن بعد کے حالات نے یہی ثابت کیا۔"

"پلو، دیکھتے ہیں کہ تمہارے دوستوں کو آزاد کروانے کے لیے کیا کیا جاسکتا ہے۔ ابھی تم جاؤ اور ریٹیکس ہو جاؤ۔ دیوانے زبان دے دی ہے تو سمجھو کہ علم ہی ابھی خبر سننے کو ملے گی تمہیں۔" اس نے اس کا جواب سن کر نرمی سے جواب دیا لیکن اس نے واپسی کے لیے قدم نہ اٹھائے۔

"کوئی ایکشن لینے کی نوبت آئے تو مجھے اپنے ساتھ ضرور شامل کیجیے گا۔ دوست کی خاطر جان بھی دینے کا حوصلہ ہے مجھ میں لیکن صرف وسائل کی عدم دستیابی نے ہاتھ پیر باندھ رکھے ہیں۔"

"میں تمہاری حالت کو سمجھتا ہوں جوان اپنا کوئی

بات کو سامنے نہ آنے دے۔
 ”سب بتانے والے کے کمالات ہیں۔ روپ،
 بہرہ و سب میں اس کا کمال اپنی جھلک دکھا جاتا ہے۔“
 دلچسپ انداز ظنیانہ ہو گیا۔
 ”یہ تو ہے۔“ اس نے تائید کی اور اجازت طلب کرتا
 ہوا وہاں سے روانہ ہو گیا۔ وہ واپسی میں اسپتال جانے کی
 نیت سے نکلا تھا اس لیے پہلے کی طرح میل نرس کا روپ
 دھار رکھا تھا اور اسے یقین تھا کہ وہ جیسے گھاگ بندے نے
 اس کا میک اپ میں ہونا محسوس کر لیا تھا۔ بہر حال اس سے
 کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ یہ بات دہرائی جی سمجھ سکتا تھا کہ
 وہ جن حالات سے دوچار ہے، اس کے لیے کھلے بندوں
 اپنے اصل چیلے میں گھومنا ممکن نہیں تھا۔

”میں کل سے ملے آ رہا ہوں۔ مجھے اس سے کچھ اہم
 اور دو ٹوک باتیں کرنی ہیں۔ آپ اسے میری آمد کی اطلاع
 دے دیں۔“ وہ آج بھی موثر سائیکل استعمال کر رہا تھا اور
 آج بھی اس نے کالے خان کے کسی آدمی کو اپنے آگے پیچھے
 رکھنے سے صاف انکار کر دیا تھا اس لیے پوری آزادی سے
 اسپتال کا رخ کرتے ہوئے کسی جھجک کا شکار نہیں تھا۔ بس
 اس بات کا خیال رکھا تھا کہ کوئی اس کے تعاقب میں نہ ہو اور
 اسے خوشی تھی کہ وہ اپنے ایسی کوئی غلطی نہیں کی تھی۔
 ”کیا کوئی خاص بات ہے؟“ دوسری طرف سے کال
 سننے والی فردوس کو اس کے لہجے نے ٹھنکا دیا۔
 ”وہاں پہنچ کر بتانا ہوں۔“ اس نے کال منقطع
 کر کے اسپتال میں مزید اضافہ کیا۔ اگلے پانچ چھ منٹ میں وہ
 اسپتال کی پارکنگ میں پہنچ چکا تھا۔
 ”میں پہنچ گیا ہوں۔ کوئی مسئلہ نہیں تو آ جاؤں؟“
 پارکنگ سے ایک بار پھر کال کر کے اس نے فردوس سے
 اجازت چاہی۔

”آ جاؤ۔ صرف میں ہی ہوں کل کے ساتھ۔ آج
 گھر سے کوئی اور نہیں آیا۔“ فردوس نے اسے بڑی سنجیدگی
 تو وہ تیز تیز قدموں سے چلا مطلوبہ کمرے کے دروازے
 پر جا پہنچا اور دھیرے سے دھک دی۔
 ”آ جاؤ۔“ اندر سے فردوس نے اجازت دی۔
 ”السلام علیکم؟“ وہ دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوا
 اور بلند آواز میں اندر موجود دونوں نفوس کو مشعر کہ سلام کیا۔
 ”وعلیکم السلام۔ آؤ بیٹھو۔“ فردوس اس کے روبرو
 کھڑی تھی جبکہ کل چادر سے اچھی طرح اپنے جسم اور چہرے
 کو ڈھانپے بستر پر تکیوں کے سہارے براجمان تھی۔ فردوس

نے اس کے سلام کا جو پُر جوش جواب دیا تھا اس کے ساتھ
 کل کی یقین سی آواز بھی شامل تھی۔
 ”شکریہ۔“ اس نے دیکھ کر کہا اور کل کے بستر
 کے قریب موجود کرسی پہنچ کر اس پر بیٹھ گیا۔
 ”کیسی طبیعت ہے آپ کی؟“ اس بار وہ براہ راست
 کل سے مخاطب ہوا۔
 ”پہلے سے بہت بہتر ہوں۔“ اس نے جھکی نظروں
 کے ساتھ مختصر جواب دیا۔
 ”یہ اچھی خبر ہے۔ اس طرح مجھے آپ کو اسپتال سے
 کہیں اور شفٹ کرتے ہوئے زیادہ فکر نہیں ہوگی۔“
 ”کیا مطلب؟ کہاں شفٹ کرنے والے ہیں آپ
 مجھے؟“ وہ چمکی اور نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ کل
 بھر کے لیے دونوں کی نظریں ایک دوسرے سے ملیں اور کل
 کو بے ساختہ سی وہ لمحہ یاد آ گیا جب ڈاکوؤں کے ٹھکانے پر
 اس نے اسے بیڑیوں سے گرنے سے بچانے کے لیے اپنی
 ہاتھوں میں لے لیا تھا۔ اس لمحے اس کا حال ایسا تھا جیسے کسی
 نے اسے جادو کے زور سے سبکی جسے میں تبدیل کر دیا ہو۔
 اس وقت بھی وہ نظریں ملنے پر ایسے ہی سکت ہو گیا تھا۔
 اسے اس سحر سے آزاد کرنے کے لیے اس نے اپنی نظریں
 دوڑا دی تھیں۔

”آئے فاعلے دنوں میں ان شاء اللہ ہم عالم اور سرحد
 کے لیے کوئی بڑی کارروائی کرنے جا رہے ہیں اور میں چاہتا
 ہوں کہ اس کارروائی کا روکل بگھٹنے کے لیے آپ منظر پر
 موجود نہ ہوں۔“ وہ بھی نظریں جھکا کر مکمل مدد پر آ گیا۔
 ”میں کہاں جا سکتی ہوں؟“ اپنے ہاتھوں پر نظریں
 جمائے وہ بے بسی سے بولی۔
 ”آپ صرف ہاں کریں۔ جگہ کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔
 میں آپ کے لیے بہت اچھی اور محفوظ پناہ گاہ کا انتظام
 کر دوں گا۔“

”لیکن باقی لوگوں کا کیا ہوگا؟ کچھ بھی سہی، کلکل
 بھائی اور باقی لوگ بھی محسن ہیں ہمارے۔ میرے منظر سے
 ہٹنے پر وہ لوگ مشکل میں پڑ جائیں گے۔“ وہ انہی باتوں کو
 دہرائی تھی جو پہلے بھی اس سے کہی گئی تھیں۔
 ”کوئی محسن نہیں ہیں وہ آپ کے۔ اپنے خادات کی
 خاطر آپ کی مشکلیں بڑھانے میں پورا پورا حصہ لیا ہے ان
 لوگوں نے۔ آپ کے وہ کلکل بھائی جنہیں آپ اپنا ہمرد
 اور بہی خواہ سمجھتی ہیں، دشمن کے ساتھ مل کر باقاعدہ سازشیں
 کرتے رہے ہیں۔“ وہ کل کی باتیں سن کر بھٹ پڑا۔

”میں غصے میں نہیں ہوں۔ میں صرف حقیقت پسندی سے کام لے رہا ہوں اور ان سے بھی بیکجا چاہتا ہوں کہ یہ اس نام نہاد معاشرے کے خوف سے آزاد ہو کر وہ فیصلہ کریں جس میں سب کی بھلائی ہے۔“ اس نے لہجے کو نرم کر کے اپنے رویے کی وضاحت دی اور قدم دروازے کی طرف بڑھائے۔

”سنئے اڈا ایک منٹ رکیے۔“ مکمل کی پکار نے اس کے قدموں کو زنجیر کیا۔

”میں آپ کی تجویز قبول کرنے کو تیار ہوں لیکن میرے ساتھ ساتھ آپ کو اعظم کے لیے بھی انتظام کرنا ہوگا۔“ اس نے جیسے کوئی مژدہ جاں فرما سٹایا تھا۔ وہ تیزی سے اس کی طرف پلٹا اور بولا۔

”یہ تو کوئی کہنے کی بات ہی نہیں ہے۔ لازمی کی بات ہے جہاں ماں ہوگی وہیں بچہ بھی رہے گا۔“

”میں ادا سامی کی خاطر یہ انتہائی قدم اٹھانے کے لیے راضی تو ہو گئی ہوں لیکن فیصل سے اپنے رشتے کو قائم رکھنے یا نہ رکھنے کا فیصلہ میرے اپنے ہاتھ میں رہے گا اور اس سلسلے میں کوئی مجھ پر دباؤ نہیں ڈالے گا۔“ اس نے اپنی دوسری شرط پیش کی۔

”یہ تو ویسے بھی آپ کا حق ہے۔ میں اس پر کوئی اعتراض کیسے کر سکتا ہوں۔“ حقیقت پر مبنی یہ جواب دیتے ہوئے وہ جیٹ لڑکتے ہوئے گزرتا تھا اسے خود ہی جانتا تھا۔ زندگی کا بہت بڑا مسئلہ تھا کہ بھول پر راہ چل گئی تھی، اس پر وہ اپنا معمولی سا حق بھی نہیں جتا سکتا تھا۔

”تو بس پھر ٹھیک ہے۔ آپ جب و جس دن اور جہاں چلنے کو کہیں گے، میں آپ کو تیار ملوں گی۔“ اسی نے اپنا حق فیصلہ سنا دیا۔

”مگر مکمل.....“ فردوس نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

”ہیلز ڈاکٹر فردوس! آپ فکر مند نہ ہوں۔ مکمل کو یہاں سے لے جاتے ہوئے میں پورا پورا خیال رکھوں گا کہ آپ پر کوئی الزام نہ آئے۔“ معاذ نے فردوس کا مسئلہ سمجھتے ہوئے اسے یقین دہانی کروائی۔

”وہ انگ بات ہے لیکن جمل کی صحت کا معاملہ بھی تو ہے۔ یہاں اس کا ٹریسٹ مل رہا ہے۔“ فردوس کے لہجے میں الجھن تھی۔

”میں اب ٹھیک ہوں بھائی! ڈاکٹر نے جو دوا میں تجویز کی ہیں انہیں پابندی سے لیتی رہوں گی تو حریہ بہتر ہو جائے گی۔“ مکمل نے اس کی تسلی کروائی۔

”آپ کس بنیاد پر یہ الزامات لگا رہے ہیں؟“ مکمل کا لہجہ بلند ہو گیا جبکہ فردوس بھی کچھ پریشان تھی اس کے قریب چلی آئی۔

”مکمل خان سے ملا تھا میں۔ اس نے یہ معلومات فراہم کی ہیں مجھے۔ مکمل اور دشا کی ملاقات کا گواہ ہے وہ۔ اپنے کانوں سے سب کچھ سننے کے بعد اس غیر متند آدمی نے مکمل کی ملازمت چھوڑ دی اور اب محنت مزدوری کر کے اپنا پیسہ بھر رہا ہے۔“ اس نے ایسا حوالہ دیا کہ مکمل کے ساتھ ساتھ فردوس بھی انکشت بد مذاں رہ گئی۔ اس سارے قصے میں مکمل خان کا کردار ایسا نہیں تھا کہ ہر کوئی اس سے واقف ہو جاتا لیکن معاذ اس کے حوالے سے ایک بڑی اطلاع دے رہا تھا تو اس کا مطلب تھا وہ واقعی اس سے ملتا تھا۔

”آپ کو مکمل خان کہاں ملا؟“ مکمل کی حیرت سوال جنم کر لیتی پراتری۔

”اگر آپ مجھ تو میں آپ کے سامنے کواہی دینے کے لیے اسے یہاں بلوا سکتا ہوں۔“ اس نے قدرے چارہ نہ لہجے میں پیش کی۔

”میں یہ نہیں کہہ رہی۔ مجھے آپ کی سہائی پر کوئی شک نہیں ہے لیکن.....“ وہ مذہب کا ذکر کرتی تھی کہ فردوس تو عموماً کچھ بھی کہنے کی ہزیمیں میں محسوس نہیں کر رہی تھی۔ یہ ایک ہیسا معاملہ تھا جس کا فیصلہ کرنے کا حق کلی طور پر مکمل کو حاصل تھا۔

”اس لیکن اسے آگے صرف یہ سوال ہے کہ آپ اپنے ادا اور سرمد کو آزاد دیکھنا بھی چاہتی ہیں یا نہیں کیونکہ میں جہاں تک عالم کو جانتا ہوں، مجھے معلوم ہے کہ وہ ہرگز اس بات کو قبول نہیں کرے گا کہ اس کی آزادی کے بدلے آپ کی زندگی مصیبت میں پڑ جائے۔“ وہ پہلے بھی اسے یہ نکتہ سمجھا چکا تھا لیکن آج لب و لہجہ مختلف تھا اور یہ مختلف لب و لہجہ مکمل کو متاثر کر رہا تھا۔

”جب آپ کوئی فیصلہ کر لیں تو مجھے مطلع کر دیجیے گا۔ کوئی بھی عملی قدم اٹھانے کے لیے آپ کے فیصلے کی بہت اہمیت ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اپنے ساتھ کئی لوگوں کی زندگیاں داؤ پر لگانے کے بعد میں ان دونوں کی رہائی کا انتظام کروں اور وہ آپ کو مشکل میں دیکھ کر دوبارہ از خود گرفتاری دینے پر مجبور ہو جائیں۔“ اس سے بالکل دونوں بات کر کے وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

”آج تم اسٹے جسے میں کیوں ہو؟“ فردوس دیکھ رہی تھی کہ اس کا لب و لہجہ مکمل کو خائف کر رہا ہے اس لیے اسے ٹو کے ہاتھ نہیں رو سکی۔

نے گویا اپنی صفائی چش کی۔

"اتنی بھولی تو نہ ہو ڈارلنگ۔۔۔ اس مظلوم لڑکی کو انتقام کا رادے کر استعمال کرنے کی سازش میں تم بھی پیچھے نہیں نہیں۔" اس بار اس کے اپنے گھس نے سچائی کا کوڑا مارا تو وہ تڑپ کر رہ گئی۔ احتساب کا کامل اس طرح اچانک بھی شروع ہوتا ہے، اسے نہیں معلوم تھا۔ یکدم فون کی بجلی گھنٹی نے اسے اس کیفیت سے باہر نکالا۔ آنے والی کال کو نظر انداز کرنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا چنانچہ کال ریسیو کر لی۔

"کہاں تھیں تم؟ ساری رات حادہ جہیں ٹریس کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ تمہاری گاڑی ساحل پر کھڑی لیکن خود تمہارا کوئی اتنا چاہ نہیں تھا۔" اس کی آواز سننے ہی دوسری طرف سے لپٹیش شروع ہو گئی۔

"حادہ کی فامی کا حساب مجھ سے کیوں لے رہی ہیں۔

میں تو خود کو ایک رات کے لیے غائب کرنے والوں کو دنیا سے

بھی غائب کرنے کا کارنامہ انجام دے کر واپس لوٹی ہوں۔"

"گنڈ! مجھے تم پر برا اعتبار تھا ایسے لیے تمہارے ٹریس

نہ ہو سکے کے باوجود بھی تشویش میں مبتلا نہیں ہوئی۔" اس کا

جواب میڈم "انکس کو خوش کر گیا لیکن وہ میڈم کی خوشی پر خوش

نہ ہو سکی۔ ضروری تو نہیں کہ ہر بار آدمی جیت کے انعام میں

لینے والی جھکی اور ستائش کا ہی منتظر ہو۔" بھی بھی اس ہمدردی

بھی تو ضرورت ہوتی ہے جو درویش زخمی ہو جانے والے

بھروسہ پر مہم بہد کرتا ہے۔" کبھی وہ ہمدردی بھی نہیں تھا۔

"وہ بے گناہ تھے وہ سورا جو ہماری شیرینی پر ہاتھ

ڈالنے کی غلطی کر بیٹھے؟" میڈم کو پتہ نہ تھا پوری پھیل کر کا رہی۔

"کوئی سورا نہیں تھے بس ہمدرد تھے جتنے

ان کی آواز گئی کا پورا نتیجہ جھکتا پڑا۔ بہتر ہوگا کہ آپ اس

ٹاپک کو مزید ڈسکس کرنے کے بجائے کوئی اور کام کی بات

کریں۔" وہ تو نہیں بتا سکتی تھی کہ اس موضوع پر بحث

کرنے سے اسے تکلیف ہو رہی ہے اس لیے بیزاری اور بے

نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے موضوع بدلنے کا مطالبہ کیا۔

"جہیں آج ہی روانہ ہوتا ہے۔ ہمارے لوگ ابھی

تک معاذ کو ٹریس نہیں کر سکے ہیں اور میں نہیں جانتی کہ اسے

زیادہ پھلنے پھولنے کا موقع دے کر اپنے لیے کوئی مصیبت

کھڑی کر لوں۔"

"ایز بوش۔" اس نے میڈم کو عین لفظی جملے میں منڈایا۔

"ادکے۔ بیسٹ آف لک۔" دوسری طرف سے

ہیشہ کی طرح اس کے کندھے پر معمولی جھکی دے کر متاقلے

کے میدان میں اتار دیا گیا۔

"آپ بے فکر رہیں ڈاکٹر صاحب! میں کھل کو لے کر

ہی اس بنیاد پر چار باہوں کو مجھے یہ اطمینان دے کہ میں اسے

ہر طرح کی سہولیات فراہم کر سکوں گا۔ جس جگہ اسے رکھا

جائے گا وہاں اس کے علاج کا پورا انتظام ہوگا۔" اس

موقع پر معاذ نے بھی فردوس کو اطمینان دلانا ضروری سمجھا۔

"لیکن۔۔۔ فردوس اب بھی تذبذب کا شکار تھی۔

"لیکن دیکھ نہیں بھائی! مجھے اپنے ادا ساس کی

ملاستی اور آزادی ہر شے سے بڑھ کر پیاری ہے۔ اگر ادا

سائیکس کا معاملہ حل نہیں ہوا تو دنیا کا بہترین علاج بھی مجھے

صحت یاب نہیں کر سکے گا۔" کھل کے دو ٹوک فیصلے کے بعد

فردوس کے پاس مزید اعتراض کی گنجائش نہیں تھی۔ اس نے

کھل پر ایک ٹھوہر کنٹال نظر ڈالی لیکن اس کی آنکھوں میں جو

الٹا بھی وہاں نے اسے ہارنے پر مجبور کر دیا۔

☆☆☆

اس نے آنے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا جائزہ لیا۔

آنکھوں میں اب تک سرخی اور سہجائی دکھائی دے رہی

تھی۔ کہنے کو وہ خود کو روکھنے والوں کو مسخرہ مہستی سے مٹا آئی

تھی اور ان سے ایسا بدترین انتقام لیا تھا کہ اسے یقین تھا کہ

ان کی روج میں بھی ابھی تک بلبلا رہی نہیں گی پھر بھی قرار تھا

کہ آتا ہی نہیں تھا۔

"جسم کا یہ کھیل تمہارے لیے کون سی فنی بات ہے جو

ایسے تڑپ رہی ہو۔ تم دار اب جیسے دوشی کی جج پر بھی سولی ہو

اور ان مردوں کو بھی اپنے جسم کی مندرتا سے اٹھایا ہے جن

سے کسی مطلب کا حصول مقصود تھا۔" آنے میں دیکھتے

ہوئے اس نے خود کو بھی ڈپٹا۔

"شاید یہ دھشت، یہ بے چینی اس لیے ہے کہ اس بار

اس کھیل میں تمہاری حیثیت کھلاڑی کے بجائے محض کھلونے

کی گئی۔ تم نے پہلی بار اس بے بسی کو جھیلنا ہے جس سے ایک

عام سی لڑکی گزرتی ہے۔" وہ آنے میں اپنے ہی گھس سے

مخاطب تھی۔ یکدم ہی اس عکس کے ساتھ ایک اور عکس ابھرایا۔

یہ عکس بشری گزار کا تھا۔

"تم۔۔۔؟" وہ جانے کیوں اس عکس کو دیکھ کر لرز گئی۔

"دیکھتے آئی تھی کہ دوسروں کی برہادی میں حصہ لینے

والے جب خود اسی اذیت سے گزرتے ہیں تو کیا ان کے

اندرا حساس کی کوئی رنج جانتی ہے؟" وہ آنکھوں میں طنز

لے لے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"میں۔۔۔ میں تو تمہارا ساتھ دے رہی تھی۔ جہیں

برباد کرنے والا تو یہی والی ہے۔" اللہ کا فرستادہ تھا۔" اس

”تم تو بالکل بدل کر رہ گئی ہو اجالا! پہلی نظر میں تو میں پہچانی ہی نہیں تھی کہ تم وہی اجالا ہو جو ہر پارٹی میں ہم سب سے زیادہ سندر دکھائی دیتی تھیں۔“ ویز کو کافی کا آرڈر دینے کے بعد سائشی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے افسوس کا اظہار کیا تھا۔

”سکیل کے بعد زندہ ہوں تو یہ بھی ایک چٹکار ہے۔ میرے دل کی حالت پوچھو تو ہر بل کی خیال آتا ہے کہ وہ چلا گیا ہے تو میں اس سنسار میں کیا کر رہی ہوں۔“ اپنے ہندو دوستوں کے ساتھ وہ بھی کثرت سے ہندی کے لفظ استعمال کرنے کی عادی تھی۔

”سکیل کی موت کا سب کو بہت افسوس ہے۔ کچھ سمجھ نہیں آتا کہ اس کی موت اور ایک پاکستانی سیکرٹ ایجنٹ کا آپس میں کیا کچھ جوڑ تھا۔ تم کچھ بتا سکتی ہو اس بارے میں؟ وہ ایجنٹ تو تمہارا اکرن ہی ہے نا؟“ سائشی کے لہجے میں گہرا تجسس تھا۔

”نہیں۔ مجھے کچھ نہیں معلوم۔“ اس نے اپنا سر جھکا لیا۔ وہ جانتی تھی کہ سکیل کے ساتھ مل کر عالم کو اس مصیبت میں پھنسانے میں اس کا بھی ہاتھ تھا۔ اپنے سنی تودہ بس عالم کو ڈرا دھکا کر اڑا یا سے واپس بھیجتا چاہتی تھی مگر معلوم نہیں تھا کہ حالات اس حد تک بگڑ جائیں گے۔

”چلو جو بھی جگ ہے، وہ تو اس سے اگلا ہی لیا جائے گا لیکن تم تو خود کو کسی کس سبھی سے لٹا لو۔ مرنے والوں کے ساتھ کھانا کون صرا ہے۔“ سائشی نے تجسس کے باوجود اس پر زیادہ زور نہیں دیا تھا اور بعد ہی سے اسے سمجھانے لگی تھی۔

”کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ میں سکیل کے ساتھ ہی مر چکی ہوں اور میرے پاس بنا آفتل کے بس یہ کھوکھلا بدن رہ گیا ہے جو کسی بھی بل ختم ہو جائے گا۔“ اگلی کی مدد سے میری شفاف سطح پر آن دیکھے دائرے بناتی وہ کہیں سے بھی چوڑی نہیں لگ رہی تھی۔

”کافی لو۔“ سائشی نے اس کی کیفیت کو پوری طرح محسوس کیا اور ویز کی سرو کی کافی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تنبیہ کی۔ کافی ختم ہونے تک ان کے درمیان کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ اس دوران سائشی صرف اس کا جائزہ لیتی رہی۔ زندگی سے مایوس وہ لڑکی اسے ہر صورت قابل رحم دکھائی دے رہی تھی چنانچہ کافی ختم ہونے تک وہ ایک سنی ٹیبل پر بیٹھ چکی تھی۔

”میں تمہیں کچھ بتانا چاہتی ہوں اجالا! کچھ ایسا جو تمہیں بہت درد دے گا لیکن مجھے دھواں ہے کہ اپنے

یہ عورت جو اس قدر مرد شاس ہے کہ کسی کو ایک بار نظر بھر کر دیکھ لے تو اس کی صلاحیتوں کو بھانپ لیتی ہے۔ کبھی میرے اندر جھانک کر دیکھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتی۔“ اس نے مایوسی سے سوچا اور موبائل کو بے دلی سے ایک طرف ڈال دیا کہ دوسری طرف اس کے شکوے سننے کے لیے کوئی موجود نہیں تھا۔

☆☆☆

”جنون میں کہیں سکون نہیں ہے۔ کم از کم آپ ہی لوٹ کر گھر آ جائیں ابھی تاکہ مجھے یہ تو یقین ہو کہ میرے ارد گرد کوئی ایک تو ایسا فرد موجود ہے جس پر میں آنکھیں بند کر کے بھروسہ کر سکتی ہوں۔“ نیاز شاہ کے کمرے میں ان کی کرسی پر برائچان ہاتھ میں ان کی تصویر والا فریم تھا۔ وہ ہنسنے سے عیاں تھا۔

”کھیل بھائی کہتے ہیں آپ کی محنت ٹھیک نہیں ہے بھی لیے بہتر ہے کہ آپ یہاں کے ٹیچرز سے دور رہیں۔ میں نے ان کی بات مان کر آپ کو واپس بلانے پر زور دینا چھوڑ دیا ہے لیکن پتا نہیں کھلیں اب ان پر پہلے جیسا اعتبار نہیں رہا ہے۔“ تصویر سے مخاطب وہ دراصل اپنا اظہار کر رہی تھی۔ جب سے اس نے کھیل کی دہائی اس حقیقت کو جانتا تھا کہ عالم اور کل کی مدد کے پیچھے دراصل ان کے مفادات تھے، اس کے دل میں ایک کلک سی پیدا ہو گئی تھی اور بھائیوں پر وہ پہلا سا اعتبار نہیں رہا تھا۔

”آپ نے مجھے اتنے لاڈ پیار سے پالا کہ مجھے کبھی ماں کی کمی کا احساس نہیں ہوا۔ آپ کے کل بولتے پر سارے گھر پر راج کرتی میں سمجھنے لگی تھی کہ میں اس دنیا میں بس راج ہی کرنے آئی ہوں اور مجھے حق ہے کہ میں اپنی ہر سن پسند شے حاصل کر لوں لیکن دیکھیں قسمت نے مجھے کیا دھوبی بنگا دیا ہے۔ ایک طرف آپ کے نہ ہونے سے اس گھر میں میری کوئی دلچسپی نہیں رہی ہے تو دوسری طرف اس شخص کا اعتبار بھی چلا گیا ہے جس کی خاطر سارے سنسار کو چھوڑ دینا بھی مجھے سستا سودا دکھائی دیتا تھا۔“ وہ بہت دنوں سے ذاتی اور جذباتی طور پر تکلیف میں تھی لیکن اب ایک نیا جھٹکا لگا تھا جس نے اسے مزید توڑ کر رکھ دیا تھا۔ کل ہی اس کی سائشی سے ملاقات ہوئی تھی۔ سائشی، سکیل کے دوست کپل کی گرل فرینڈ تھی اور ان کے پارٹینر میں ان کی ایک دوسرے سے ملاقات ہوئی رہی تھی۔ کل ذاتی ملاقات اتفاقی تھی اور سائشی نے زبردستی اسے اپنے ساتھ ایک ریسٹورنٹ میں لے لی تھی۔

بیانی کرتی۔ ساسکی کی باتوں کے ساتھ ساتھ اسے سنیل کی پانک بھی یاد آتی تو سنیل اور بھی پختہ ہونے لگتا کہ پیار کے نام پر اسے دھوکا دیا گیا ہے۔ سنیل نے اس سے بھی یہ نہیں کہا تھا کہ وہ خالی ہاتھ ہی اس کے لیے قابل قبول ہے۔ وہ اسے ہمیشہ سے سمجھاتا رہا تھا کہ وہ اپنے ساتھ جتنا مال سیٹ کر لے آئے گی، ان کی زندگی اتنی ہی بڑھ سکتی ہوگی۔

”اولاد سے اتنا لاؤ بھی نہیں کرنا چاہیے ابھی کہ اسے گلے کرو یا میں اس کے لیے سب اچھا ہی اچھا ہے۔ تھوڑے قریب، تھوڑے دکھ اور تھوڑے امتحان کے لیے بھی تو اپنی اولاد کو تیار کرنا چاہیے تاکہ وہ وقت بڑنے پر میری طرح اس بری طرح ٹوٹ پھوٹ نہ جائے۔“ اب اس کی آنکھوں سے باقاعدہ آنسو نکل کر غنا شاہ کی تصویر پر گر رہے تھے اور یوں لگتا تھا کہ مسکراتے لیوں والی تصویر بھی ادا اس ہو گئی ہو۔ وہ نہیں سمجھ سکتی تھی کہ اس کا بوڑھا اور پیار باپ اس سے دور رہ کر بھی سچ سچ اس کے لیے پریشان اور ادا اس ہے۔ ابھی زندگی نے اس کے اندر محض انتہائی احساس جگا یا تھا کہ وہ لوگوں کے غلط رویوں کو سمجھنے لگی تھی۔ ابھی اسے اس منزل پر پہنچنے میں کچھ وقت لگنا تھا جہاں وہ یہ سمجھ سکتی کہ اس کے غلط رویے بھی دوسروں کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

”عجب محنت چھائی ہوئی ہے اس گھر میں۔ سارا وقت روزانہ جو تان کر طبیعت بیزار ہو گئی ہے۔“ نسرین کی تیز بڑبڑاہٹ من کر وہ ہڑبڑا کر ابھی جگہ سے کھڑکی ہوئی اور تصویر کو احتیاط سے اس کی جگہ پر واپس رکھا۔

”گھر نہ ہوا مات کدہ ہو گیا، پچھلے دنوں کو سنبھالنے ہے اور ندرات کو آرام۔“ وہ جس طرح اس کمرے کے باہر کھڑکی ہو کر اپنے خیالات کا اظہار کر رہی تھیں، اسے سنیں ہو چلا تھا کہ وہ اس کی یہاں موجودگی سے واقف ہیں۔ اس کے اندر طیش کی ایک شدید لہر اٹھی اور دل میں نسرین کو کھڑکی کھری سٹاؤ لے کر خیال لیے تیزی سے دروازے کی طرف بھاگا۔

”فون کر دو اور بتاؤ اپنی ماں کو کہ یہاں اس کی جیتی کے لاڈ لے لے سیال پڑا لے رکھا ہے اور اس کا رو تان سن کر گھارے کان پک گئے ہیں۔“ دروازہ کھول کر باہر نکلے ہی اس کی نظر نسرین کے حضور سر جھکا کر کھڑکی پر پڑی اور ادراک ہوا کہ کم از کم وہ اس سے براہ راست مخاطب نہیں ہے۔

”ایک اور دروازہ۔“ اسے کمرے سے باہر نکلتا دیکھ کر نسرین وحشی آواز میں بڑبڑاتی ہوئی وہاں سے ہٹ گئی۔ سر کی سحرانی کے دلوں میں جس تند کے زبردستی لاڈ اٹھانے پڑتے تھے، اب وقت بدلے دیکھ کر وہ غیر اہم

دوسرے دروازوں کی طرح اس دروازے بھی تم گزر جاؤ گی اور پھر اپنے آگے کے جیون کے لیے کچھ اچھا سوچ سکتی۔“

”اکیس کیا بات ہے؟“ اب تک کی گفتگو میں بہت زیادہ دلچسپی نہ لینے والی اجالا کو ساسکی کی اس تنبیہ نے حیران کر دیا۔

”سنیل تمہیں دھوکا دے رہا تھا۔ وہ تمہارے ساتھ سنبھل نہیں تھا۔ وہ صرف تمہاری خوبصورتی اور دولت کو انجوائے کرنا چاہتا تھا۔ اب نہ سہی، کچھ مہینوں یا سالوں بعد اسے تمہارے جیون سے نکل ہی جانا تھا اس لیے میرا کہا مانو تو اسے بھول جاؤ اور نئے سرے سے اپنا جیون شروع کرو۔“ ساسکی ایک دم وہ سب کچھ کہہ گئی جسے سن کر بھی اسے یقین نہیں آیا۔

”سنیل کے مرنے کے بعد اس پر ایسے گھناؤنے الزامات لگانے کے پیچھے تمہارا کیا مقصد ہے ساسکی! اگر تم سچ بھی کہہ رہی ہو تو تمہیں بہت پہلے مجھے یہ سب بتادینا چاہیے تھا۔ اس وقت جب سنیل زندہ تھا اور خود پر لگائے گئے الزامات کا جواب دے سکتا تھا۔“ اس کی حیرانی ویرے دھیرے دھیرے میں ڈھلنے لگی تھی اور اس نے سخت لہجے میں ساسکی کو ٹوٹا تھا۔

”اگر میں اس وقت سب کچھ جانتی ہوتی تو تمہیں ضرور وادار کرتی لیکن مجھے یہ سب سنیل کے مرنے کے بعد پتا چلا۔“ انکیٹ پلٹنے ہی بجھے یہ سب بعد میں بتایا۔ اس کا خیال ہے کہ تمہارے پاکستانی کزن کو کسی طرح سنیل کی اصلیت پتا چل گئی تھی اور شاید اسی وجہ سے ان دونوں کا جھگڑا ہوا۔ وہ دونوں آپس میں کیسے ملے اور لڑتے یہاں تک کیسے پہنچی، یہ تو تم ہی جانتی ہو گی۔“ ساسکی نے اپنی بات کے اختتام پر بے غمازی کے اظہار کے لیے شانے اچکائے لیکن اجالا کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ اس معاملے میں بہت سی باتیں اس کی نگاہوں سے بھی اوجھل تھیں۔

”اپنی وے! میں نے یہ سب کچھ انسانیت کے نامے تمہیں بتایا ہے تاکہ تم ایک فراڈی کے پیچھے اپنا سارا جیون برباد کرنے کے بجائے شکر کر دو کہ جگوان نے تمہیں اس سے بچا لیا ہے۔“ اگر تم میرا دواں نہ کرو اور اسی دھوکے میں رہنا چاہو تو یہ تمہاری اپنی چوائس ہے۔“ ساسکی مل کی رقم میز پر ڈال کر وہاں سے چلی گئی تھی لیکن اسے ایک نئی اہمیت میں جلا کر رکھنی تھی۔ کل سے اس نے بے شمار بار اس سب کے بارے میں سوچا تھا اور اس کا تجویز اس سے کہہ رہا تھا کہ ساسکی کو کوئی ضرورت نہیں تھی کہ

سنہری یادوں کا سفر

یادیں سے لے کر سب سے پہلی جگہ پہنچے ہوئے خوشگوار یوں یہ

خوشگوار یادیں یہ ہیں مسکین لب بکاتی ہیں تو بھی امید کی کرنیں

پسند آتی ہیں ایسی ہی خوب صورت باتوں اور حسین یادوں کا

ایک سفر آج کے قلمریہ سب سے پہلے

کھر کے ہر فرد کے لئے

پاکیزہ

و صورت شمع صدف کی طرح پاکیزہ ہیں روشن ہوئی جو دست بدست چلتی کھڑے اور معطر

پسند آتی ہیں ایسی ہی خوب صورت باتوں اور حسین یادوں کا

اسے مجھے نہ کہے گی ہوا زمانے کی

جلا چلے ہیں لبو سے جو ہم چراغِ سحر

الحمد لله ہم اب گولڈن جوبلی کی طرف گامزن ہیں

انہی سنہری یادوں میں آپ کا بھی روپ سلا اور سنہرا خوب صورت سا حصہ کتنا ہے؟

میں بھی بتائیں۔ یہ سلسلہ آپ جیسے باذوق قارئین ہی کے لیے تو ہے۔

1. مایہ ناز پاکیزہ کی موت پہ پہنچاؤ؟

2. پاکیزہ و تحریروں سے کوئی تین ایسی باتیں کیا سیکھیں جو آج بھی زندگی کا حصہ ہیں.....؟

3. سینے سے... رحمہ کے پسندیدہ قلم کار کی جن کی تحریریں پڑھنے کو آج بھی بے چین رہتی ہیں.....؟

4. یہ ان کی... شہسوار سے توجہ رو رہتا تھا۔

ہو چکی تھی۔

لائیں اور اسے ان میں گمن کر دیا۔ اچانک ایک طرف بیٹھی اسے ہٹا کھینچ دیکھتی رہی۔ کمال یہ تھا کہ اس سارے عرصے میں اسے ایک بار بھی یہ یاد نہیں آیا تھا کہ وہ کھل کر بیٹھا ہے جس سے وہ اس کے بھائی سمیت نفرت کرتی ہے۔ شاید حالات نے اس پر ہیبت کرنا شروع کر دیا تھا کہ وہ اس قدر نفرت کے مستحق نہیں تھے جتنا وہ سمجھتی رہی تھی۔

”کیا ہو رہا ہے بھئی۔ یہ یہاں کیسی محفل جی ہے؟“ اسے وہاں بیٹھے تقریباً آدھا گھنٹا گزارا تھا کہ فردوس چلی آئی۔ اب وہ اپنی ڈیوٹی ٹائم سے ہٹ کر اسپتال میں نہیں رہتی تھی۔ جھیل کی مدد سے اس نے کم از کم ہندوں کو قاتل کر لیا تھا کہ اس کے مستقل اسپتال میں رہنے سے اس کے بچے ڈسٹرب ہو رہے ہیں اس لیے خاندان کے دیگر افراد کو بھی اس کام میں اس کا ہاتھ بٹانا چاہیے۔ مطالبہ جاتا تھا اس لیے چاروٹا چار مسیجہ اور صالحہ نے ہائی بھری اور اب وہ دونوں بہنیں باری باری کھل کے ساتھ اسپتال میں رک رہی تھیں۔

”اعظم بیٹے سے گر گیا تھا ماما! بہت زور سے چوٹ لگی تھی۔ چپ پی نہیں ہو رہا تھا ہم سے۔ وہ تو پچھلے آکر اسے سنبھالنا تو تب جا کر مشکل سے بہلا۔“ بچوں نے ناں کو دیکھتے ہی تفصیلی رپورٹ پیش کرنا شروع کر دی۔ ان کی باتوں کو توجہ سے سنتی فردوس جلدی جلدی اعظم کا معائنہ کرنے لگی۔ دیر میں ان میں چند سوالات بھی کیے۔

”بچے بچاں اس ملائق نہیں ہیں کہ اتنے چھوٹے بچے کی ڈسے دلدی نہ تھامس۔ ان پر بچہ بوجھ ڈالنا قطعی نامناسب ہے۔“ بہت دیر سے خاموش بیٹھی اچانک نے آخر اپنے لب کھولے اور فردوس کو جتایا۔

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن میں بھی کیا کروں۔ شاید سے کہہ کر جاتی ہوں کہ اعظم کا خیال کرے لیکن نرسن بھائی ڈانٹ ڈپٹ کر اسے دوسرے کاسوں میں لگا گئی ہیں۔ وہ غریب نوکری جانے کے ڈر سے انکار بھی نہیں کر سکتی اور اسے بچوں کے حوالے کر دیتی ہے۔“ فردوس نے اعظم کا ہاتھ جوتے ہوئے اسے صورت حال سے آگاہ کیا۔

”گھر میں ملازماؤں کی کمی تو نہیں جو نرسن بھائی شاید سے ہی کام لینا ضروری سمجھتی ہیں۔“ اچانک نے حیرت کا اظہار کیا۔

”بس ان کی ضد سمجھ لو۔ اباجی کی غیر موجودگی میں انہوں نے خود کو اس گھر کا حاکم اعلیٰ سمجھ لیا ہے اور ہر کام میں مکمل اپنی مرضی چلا رہی ہیں۔“ فردوس جو ویسے ہی نرسن کے روپ سے شاکی تھی، موقع پا کر بول اٹھی۔

”کیا مسئلہ ہے؟“ اس نے نرسن سے الجھنے کا ارادہ ترک کر کے بھی کھڑی بیٹا سے پوچھا۔

”اعظم بستر سے گر گیا ہے اور روئے جا رہا ہے۔ چنا اور میں اسے چپ کراتے کراتے تھک گئی ہیں۔ پٹانے مجھے بھیجا تھا کہ شاید وہ گولہ مار لے آؤں تاکہ وہ اعظم کو سنبھال لے لیکن شاید وہ بڑی امی نے کسی کام پر لگا رکھا ہے۔ میرے اسے بلانے پر وہ ناراض ہوئیں اور باتیں سنانے لگیں۔“ بیٹا نے رو پٹانے لہجے میں اسے تفصیل سے آگاہ کیا۔

”اچھا، آؤ میں دیکھتی ہوں۔“ وہ اس کی بات سن کر اس کے ساتھ چل پڑی۔ بچوں کے مشترکہ کمرے میں چنا، اعظم کو شانے سے لگاتے بہلانے کی کوشش میں بری طرح ہلکان ہو رہی تھی۔ وہ بہت بلند آواز میں رورہا تھا لیکن جس طرح اس کی پکیلیاں بندھی ہوئی تھیں، اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ بہت دیر سے رو رہا ہے اور غاصی تکلیف میں ہے۔

”لاؤ مجھے دکھا داسے۔“ اس نے جلتے ہوئے بچے کو چنا کی گھوڑے سے لیا اور اس کا جائزہ لینے لگی۔ چنانہ یہ نہیں سمجھی لیکن گھر میں اپنی نظروں کے سامنے عجیبے عجیبوں کو پتا بڑھتا دیکھا تھا اس لیے اعظم کا انجی طرح معائنہ کر کے سر کے پچھلے حصے میں بالوں کے اندر چھپے اس کو مزید چھپنے میں کامیاب ہو گئی تھی جو بستر سے گرنے کے نتیجے میں نمودار ہوا تھا۔

”ہام دو مجھے اور کوئی درد کا سیرپ بھی۔“ اس نے قسم جاری کیا تو چنا تیزی سے کمرے سے باہر نکلی۔ روزمرہ استعمال ہونے والی عام دوا میں فردوس کی الماری میں پڑی رہتی تھیں۔

”تم اس کے لیے فیڈر لے آؤ۔“ دوسرا حکم بیٹا کے لیے تھا۔ حکم دینے کے ساتھ ساتھ وہ اعظم کو اپنے سینے سے لگائے نرمی سے سنبھال رہی تھی۔ بچہ تکلیف سے زیادہ گرنے کے صدمے سے ڈر گیا تھا اور بیچاں مناسب طریقے سے اسے بہلانے میں کامیاب نہیں ہو چکی تھیں۔ اس کی نرم گرم آغوش ملی تو اس کی کیفیت میں تبدیلی آنے لگی۔ بچوں کے مطلوبہ اشارے کے بعد اس نے ان کی مدد سے اعظم کی خاطر مددگاریت کی تو وہ مکمل طور پر نرسن ہو گیا اور سونے کے موڈ میں دکھائی دینے لگا۔

”ڈرا آؤ ڈی دیر اسے اپنے ساتھ کھیل میں لگا لو۔ سر پر چوٹ لگی ہے۔ فوری طور پر سلاو بنا مناسب نہیں ہوگا۔“ اس نے چنا اور بیٹا کو ہدایت کی تو وہ اعظم کے کھلونے اٹھا

حل پیش کیا۔

”میرے لیے تو مشکل ہی ہے یا رامس وہاں ڈیوٹی پر ہوتی ہوں اور ڈیوٹی قائم ختم ہونے سے پہلے گھر نہیں آ سکتی۔ اب اتنے کمٹوں کے لیے تو بچہ کو اسپتال میں کوئی الاؤ نہیں کرے گا نا اور یہاں کوئی ایک نہیں ہے جو اس ڈے داری کو نبھانے کے لیے تیار ہو جائے۔“ فردوس بہت بلیتے سے اسے اپنے ڈھب پر لارہی تھی۔

”پلیس میں لے جاؤں گی۔“

”تم؟“..... اجالا کی پیشکش غیر متوقع نہ ہونے کے باوجود فردوس نے جان بوجھ کر حیرت کا اظہار کیا۔

”ہاں تو اس میں کیا ہے؟“ اس نے عادتاً بے نیازی کا اظہار کیا۔

”اگر تمہیں سہل کی شکل دیکھ کر خضر آگیا تو؟“ فردوس نے جان بوجھ کر تذبذب کا اظہار کیا۔

”میں کون سا اس کے روم میں جم کر بیٹھ جاؤں گی۔“ اعظم کو اس کے حوالے کر کے آدھا پون کھٹا کینے میریا میں بھی مزارا جا سکتا ہے۔“

”یہ اچھا آئیڈیا ہے۔ کل ویسے بھی وہاں صبیہ باقی موجود ہوں گی۔ انہیں بھی اپنے ساتھ لے جانا۔ ان کے ساتھ تو ویسے بھی تمہیں وقت گزارنے کا پتا نہیں چلتا۔“ فردوس نے گویا اس کے فیصلے کی تائید کی۔

”ہاٹی میں مجھے امی کی جھگ دکھائی دیتی ہے اس لیے ان کے ساتھ وقت گزارنا دیکھا لگتا ہے۔“ اس کے سادگی سے کیے اعتراض نے فردوس کو احساس دلا یا کہ بظاہر اکھڑا اور بد مزاج دکھائی دینے والوں کی زندگی میں بھی کوئی ایسی محرومی ہوتی ہے جو ان کے رویے کی حقیقی وجہ ہوتی ہے لیکن لوگ اسے کھوج نہیں پاتے۔ اجالا کی اس کلیتہ کو محسوس کر کے وہ اندر ہی اندر ٹھمرندہ بھی ہوئی کہ وہ اسے ایک نازک کام کے لیے استعمال کرنے جا رہی ہے لیکن وہ مجبور تھی۔ ہاتھ آیا موقع نکل جانے کی صورت میں ہوتا کام رک سکتا تھا اور وہ دل سے خواہش مندگی کا ایسا نہ ہو۔

”آپ کہاں کھوئیں؟“ اس کی خاموشی کو محسوس کر کے اجالا نے اسے ٹوکا۔

”نہیں نہیں، بس سوچ رہی تھی کہ تمہارا ٹکڑا یہ کیسے ادا کروں؟“ فردوس نے بات بتائی۔

”اس کی ضرورت ہی نہیں ہے۔“ وہ کہہ کر وہاں سے اٹھ گئی تو فردوس نے سکون کا سانس لیا۔ اسے معلوم تھا کہ ارادے کی پکی اجالا کوکل کوئی نہیں روک پائے گا۔ اس نے

”حاکم اعلیٰ تو گھٹیل بھائی بنے بیٹھے ہیں۔ سرین بھالی تو بس فرسٹ لیڈی کا رول پلے کر رہی ہیں۔“ اجالا کا جواب چونکا دینے والا تھا۔ فردوس نے اسے غور سے دیکھا۔ اس میں واضح طور پر تبدیلی دکھائی دے رہی تھی۔ جنون اور نفرت کے بجائے آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں تھیں اور صاف لگتا تھا کہ اس کے ذہن کی کمزوریاں کھلنے لگی ہیں۔

”جو جیسا کر رہا ہے، اسے وہ کرنے دو اور یہ سوچو کہ خود میں کیا کرنا چاہیے۔ غلط اور صحیح یہ دو راستے ہمیشہ ہر ایک کے لیے کھلے رہتے ہیں۔ دوسروں کو کچھ کر خود غلط راستے پر قدم رکھو یا دانش مندی نہیں۔ دانش مندی اسی میں ہے کہ انسان اپنے لیے درست راستہ چنے۔“ اس نے بہت نرم اور دھیمے لہجے میں اجالا کو یہ نصیحت کی تھی کہ کہیں وہ بدک کر بھلائی کی راہ سے پیچھے ہی نہ ہٹ جائے۔

”میں آپ کی اس نصیحت کو یاد رکھنے کی کوشش کروں گی۔“ ”میرے خیال میں تو تم آل ریڈی اس پر عمل کر رہی ہو۔ آج جس طرح تم نے اعظم کا خیال رکھا، اس کے لیے میں ذاتی طور پر جہاد پر ہنگر گزار ہوں۔ تم یقین کر دو کہ اس بچے کی وجہ سے میں کتنی پریشان ہوں۔ ایک طرف یہ اپنی ماں سے جدا ہے تو دوسری طرف کوئی اس کا ڈھنگ سے خیال رکھنے والا نہیں۔ پھر بھی میں ہر روز کھل کر چھوٹے بھلاوے دیتی ہوں کہ اس کا بیٹا اس کے بغیر بالکل ٹھیک اور خوش باش ہے۔ ایک بیمار ماں کے لیے میں اس کے سوا کبھی کیا سکتی ہوں۔“

”ڈاکٹر ذکیا کہتے ہیں اس کے بارے میں؟ وہ کب تک گھر واپس آجائے گی؟“ اس روز امیر ہنسی میں کھل کر اسپتال پہنچانے کے بعد آج وہ پہلی بار اس کے بارے میں استفسار کر رہی تھی۔

”اس کا کیس میری سر ہے۔ مکمل نیسٹ ہو جائیں تو ہی کوئی فائل فیصلہ لیا جاسکے گا۔“ فردوس نے بے جواب دینے کے ساتھ ساتھ اسے کچھ اور تھمیلیات سے آگاہ کیا۔

”یہ تو واقعی کافی سیریس سچویشن ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ اسے جلد اسپتال سے ریلیز کیا جاسکے گا۔“ تھمیلیات سن کر اس نے تیسروں کیا۔

”جے تو ایسا ہی لیکن اب سہل کی برداشت جواب دینے لگی ہے۔ کسی دن وہ دینے سے ملنے کے لیے اسپتال سے بھاگ کر آجائے گی۔“ فردوس نے اس کی تائید کی۔

”تو اعظم کو اس سے ملانے کے لیے اسپتال لے جائیں۔ یہ کوئی اتنا مشکل کام تو نہیں ہے۔“ اس نے سادہ سا

سے اسے سنا اور پوسج لیجے میں سوال کیا۔
 ”جی ہاں، اس سے آسانی ہو جاتی ہے وہاں سو
 کرنے میں۔“
 ”لیکن اس سے اسے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ ہو سکتا
 ہے کسی اور نے بھی تمہیں اس جلیے میں وہاں دیکھا ہو۔ ایسی
 صورت میں سوالات اٹھ سکتے ہیں۔“ وہ فرد دس کا ذکر کرتا
 تھا لیکن اس کا نام اپنے لہوں پر نہیں لاتا تھا۔ اس کی یہ احتیاط
 محاذ کو اچھی لگتی تھی۔

”میں کوئی اور میس بدل لوں گا۔“ اسے خود بھی یاد
 آ گیا تھا کہ موجودہ جلیے میں وہ کھیل اور فیصل کا سامنا کر چکا
 تھا اس لیے فوراً دیوار کی تسلی کروائی۔

”دوست کے بجائے دشمن کا طور استعمال کرنا۔ گے
 کرم زبردستی اسے لے جا رہے ہو۔ کسی ایک آدھ کمرے
 میں ہتھیار کی جنگ بھی آ جاتے تو اچھا ہے۔ میسروں کا معطوم
 کر لیا ہے تاکہ کہاں کہاں گئے ہیں۔“ مشوروں سے
 نوازتے ہوئے دیا نے اس سے استفسار کیا جس کا جواب
 اس نے محض سر کی اٹھائی جیش سے دیا۔

”جانے سے پہلے ایک بار ہمارے پاس موجود
 ڈیٹیل بھی دیکھ لیتا۔“ دیا ”را“ کی وجہ سے بہت محتاط تھا۔
 ”ٹھیک ہے۔“ محاذ کو اس سے کوئی انکشاف نہیں
 چھا۔ دیوار کے مشوروں کے مطابق اس نے ہر کنڈ احتیاط کے
 ساتھ ساری منصوبہ بندی کی اور اجالا کی اعظم کے ساتھ
 ردائی کی اطلاع ملے ہی حرکت میں آ گیا۔ اجالا اعظم کو لے
 کر کھل کے کمرے میں پہنچا تو وہ پہلے ہی ایک سنہری فریم والا
 چشمہ پہنے ایک اہمارٹ ڈاکٹر کے روپ میں وہاں موجود
 تھا۔ اپنے بچے کو دیکھ کر کھل جس طرح غصہ کر اس کی طرف
 لگی اور جس والہانہ انداز میں بچہ اس سے جھپٹا وہ سنہرے
 اس سمیت اجالا اور میجر کو بھی بے حد متاثر کیا۔

”یہ بہت اچھا کیا آپ نے کہ ان کے بے بی کو ان
 سے طوائف لے آئیں۔ بے بی کے نہ ہونے سے یہ بہت
 آپ سیٹ تھیں۔“ اس نے بطور خاص اجالا کو اس کے کھل پر
 سراہا جس پر وہ تجویز ہی خوش دکھائی دی۔

”آپ تو ہمیں یہ خبریں ڈاکٹر صاحب کہ اس کی چھٹی
 کب تک ہوئی تاکہ ہماری بھی جان اس اسپتال کی ڈیوٹی
 سے چھوٹے اور ماں بچہ بھی سکون سے ایک ساتھ رہ سکیں۔“
 میجر نے اس کی بات سن کر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

”بس سمجھیں کہ آپ کی جان چھوٹے ہی والی ہے۔
 جلد آپ گڈ نیوز سنیں گی۔“ اس نے مسکرا کر ان کی تسلی کروائی

فوری طور پر یہ خوشخبری آگے بڑھادی۔ احتیاط کے تقاضوں
 کے تحت وہ آج کل محاذ کا فرائض کر رہا ایک علیحدہ موبائل
 اس سے رابطے کے لیے استعمال کر رہی تھی جسے کھل کے
 غائب ہوتے ہی تک کر دیا جاتا تھا۔

☆☆☆

”دکرم نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔“

”مطلب؟“

”مطلب یہ کہ موبن ہی ”را“ کا وہ آدمی ہے جس
 کے لیے دشنام کام کرتا تھا۔“
 ”مگر وہ تو۔۔۔“ اس نے دیوار کی طرف دیکھتے ہوئے
 اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”اس کی سرکاری نوکری وغیرہ سب ایک کور ہے جس
 سے عام لوگ دھوکا کھا سکتے ہیں لیکن دیوار کے آدمیوں کے
 لیے اس کی اصلیت سمجھ لینا بائیس ہاتھ کا کھیل تھا۔ میں نے
 سب چٹا کھلایا ہے۔ میڈیا کو کسی کی بریٹنگ دینے والے
 ہاتھی کے دکھانے والے دانت ہیں۔ اصل بندہ یہ موبن ہی
 ہے اور یہی ہمیں تمہارے وہ دوستوں تک پہنچائے گا۔“ دیوار کی
 دی اطلاع نے اس کے اٹھ سنبھلی ہی پھیلا دی۔

”ہم کب تک اس کے خلاف ایکشن لے سکیں
 گے؟“ اس نے سرسراہٹے لیجے میں سوال کیا۔

”بہت جلد گھر پہلے تم اپنی سائبر سیف کر لو یہاں لڑکی
 کو اسپتال سے شفٹ کرنے کا آرگنٹیشن کر لیا ہے تم نے؟“
 دیوار کے سوال نے اسے چار سو چالیس واٹ کا گرنٹ لگایا
 اور وہ بہت مشکل سے خود کو پھینکنے سے روک سکا۔

”آگے پیچھے دیکھنا تو پڑتا ہے نا۔ پھر اس کی سیٹھی کا
 خیال بھی کرنا ہے جس کی سفارش لے کر ہم تک آئے ہو۔“
 دیوار کی تیز نظروں سے اس کی کیفیت پوشیدہ نہیں تھی چنانچہ
 رمان سے اسے سمجھایا۔

”مجھے خود بھی ان کا بہت خیال ہے اور پوری کوشش
 کر رہا ہوں کہ اس سارے قصے میں ان پر کوئی الزام نہ
 آ سکے۔“ ظاہر تھا کہ اس سے کچھ چھپا ہوا نہیں ہے اس لیے
 خود کو پرسکون رکھتے ہوئے جواب دیا۔

”میں اپنی تسلی کے لیے تمہاری منصوبہ بندی کے
 متعلق جاننا چاہتا ہوں۔“ دیوار نے مطالبہ کیا تو اسے بتانا پڑا
 کہ وہ آج کس طرح کھل اور اعظم کو اسپتال سے نکال لائے
 گا اور وہ رکھتا ہے۔

”آئی ایم شیور کرم پہلے بھی اپنے اس وارڈ بوائے
 والے جلیے میں اسپتال جاتے رہے ہو۔“ دیوار نے خاموشی

کہ آپ مجھے کبھی بے بس نہیں پائیں گے۔“ وہ اسے جانے کیا جاتا چاہتی تھی۔

”جس دن میری نیت میں کوئی کھوٹ دکھائی دے، اپنے ہاتھ سے گولی مار دوںیجیے گا۔“ اس نے اپنا منہ اس کے سامنے ڈال دیا۔ کھل اس ادا پر دم بخود بیٹھی رہ گئی۔ بانی کا راستہ خاموشی سے کنا۔ محض اعظم کی چھوٹی چھوٹی حریفیں تھیں جو ثابت کر رہی تھیں کہ اس مشین سواری میں زندہ نفوس سفر کر رہے ہیں۔

”یہاں آپ کی دیکھ بھال کے لیے مستقل ایک نرس موجود رہے گی اور ڈاکٹر بھی روزانہ وزٹ کرے گا۔ آپ اپنی فائل نرس کے حوالے کر دیجیے گا۔“ منزل مقصود پر پہنچ کر اس نے کل کو مخاطب کیا۔

”کیسی فائل؟“ جو اب اس کا حیرت سے استفسار کرنا خود اس کے لیے باعث حیرت تھا۔

”آپ کی میڈیکل رپورٹس وغیرہ۔“ فردوس بھابی نے آپ سے کہا نہیں تھا کہ انہیں ساتھ رکھیے گا تاکہ آپ کا ٹریسٹ چلتا رہے۔“

”بچے کو لان میں مہلانے لے جانے کے لیے کون فائل اپنے ساتھ رکھتا ہے؟ میں نے تو اپنی میڈیکل رپورٹیں بھی نہیں اٹھائی۔“ وہ اپنے جواب سے اسے لاجواب کر رہی مگر وہ پریٹن تھا کہ اس طرح اس کے علاج کا تسلسل کیسے جاری رہے گا۔ دلچوائے تو اسے فردوس کے سامنے سے بھی دور رہنے کی ہدایت کی تھی۔

”آپ پریٹن نہ ہوں۔ میری صحت ٹھیک ہے۔ کبھی درد وغیرہ ہوا بھی تو ڈاکٹر سے کہہ کر چین کر لے لوں گی۔ فی الحال آپ میری فکر چھوڑ کر اٹا سامی پر فوکیں کیجیے۔ وہ رہا ہونے اور ایک بار ہم پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہوئے تو ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ صبح کمرہ پر تھی لیکن وہ مطمئن نہیں تھا۔

☆☆☆

”ریڈی، ون، نو، تھری ایکشن۔“ انرجی میں آواز ابھرتی تھی اس نے موٹر سائیکل کی رفتار بڑھا لی اور اسے بڑے رफ سے انداز میں گاڑیوں کے درمیان گھسا دیا۔ اس کے انداز نے سڑک پر چلتی دیگر سواریوں کے ڈرائیورز کو ڈسٹرب کیا۔ کچھ نے ہارن بجا کر تنبیہ کی اور کچھ نے برباد بڑا کر رہ گئے۔ سڑک پر پھٹنے والوں کے لیے اس طرح کے سرگرمی سے موٹر سائیکل سواری جیسے چلتے ٹریفک میں اپنے کتب دکھانے کا شوق ہوتا ہے، کوئی نئی چیز نہیں تھی۔

پھر کل سے مخاطب ہو کر بولا۔
”آئی صحت آپ کو بے بی کو لان میں لے جاتا چاہیے۔ اس سے آپ کی کنڈیشن میں بھی بہتری آئے گی اور اسے بھی وہاں زیادہ اچھا لگے گا۔“

”جی اچھا۔“ کل نے فریامندواری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اعظم کو گودے اتار کر اس پر ام میں بٹھایا جس میں اجالا اسے لے کر آئی تھی۔

”ان کو جانے دے۔“ تو میرے ساتھ کینے ٹیریا چل۔ وہاں کی کافی اور سینڈوچز بڑے میسجی ہیں۔ آ، میں تجھے ٹرائی کرواتی ہوں۔“ میسر نے پر ام کو دھکیل کر باہر کی طرف جاتی کل پر ایک نظر ڈالی اور خود اجالا کا ہاتھ تمام کر اسے پیش کر دی۔

”یہ خود کو اور بچے کو سنبھال تو لے گی نا؟“ اجالا کو ذرا تشویش تھی۔

”ڈونٹ وری۔“ مگر کوئی پر اہم ہوا بھی تو ہمارا اسٹاف ہے تا سنبھالنے کے لیے۔“ معاذ نے اسے تسلی کروائی اور باہر نکل گیا۔ اب اس کا رخ لان کی طرف تھا۔ جلد ہی اس نے بڑی سی چادر میں خود کو لپیٹ کر کھانچا۔

”یہ پھل کیمروں کے لیے ہے۔ آپ اپنے روپے سے ظاہر کریں کہ آپ ڈر اور سکھ کر مجبوراً میرے ساتھ جاری ہیں۔“ اس کے پہلو پہلے ہوئے اس نے اپنے سفید گاؤن کی جیب سے پھل برآمد کر کے اس کی جھلک دکھاتے ہوئے کل کو مشورہ دیا تو اس نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔ اس کے انداز میں کوئی ظاہری مزاحمت نہیں تھی مگر بعد میں غور سے دیکھنے والے کو ایسی دے سکتے تھے کہ اس کی پاؤں لیکوئج سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مجبوراً اسپتال سے باہر لے جاتی تھی ہے۔ دنیا کے کور کھدندے سے بے نیاز اعظم قلعہ بیاں مارتاں کی سنگت میں بہت خوش تھا۔

”پر ام بینک چھوڑ دیں اور اس وہانت گاڑی میں بیٹھ جائیں۔“ پارکنگ میں پہنچ کر معاذ نے ایک اور ہدایت دی جس پر کل نے سن و سن کر عمل کیا۔ کچھ دیر میں ہی وہ لوگ جعلی نمبر پلیٹ والی اس سفید گاڑی میں اسپتال کو چھوڑ چکے تھے۔ مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ آپ کو اغوا کرنا اتنا آسان ہے۔“ گاڑی کھلی سڑک پر آئی تو وہ اپنی کامیابی کی خوشی میں چپکا۔ ”عورت کو اغوا کر لینے کو کوئی کامیابی سمجھتے ہیں آپ؟“ جو اب کل نے جس لمحے میں پوچھا، وہ شرمندہ ہو گیا۔

”میرا وہ مطلب نہیں تھا۔“
”آپ کا جو بھی مطلب ہو لیکن ایک بات یاد رکھیے گا

کال کر لیتا ہوں۔" شریف صورت زخمی موثر سائیکل سوار خود کو سنبھال چکا تھا چنانچہ جیب کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ "مقدمہ یقیناً سوار ہونے کا لانا تھا۔"

"اے کیسے صاحب امیری گاڑی سے آپ کو نقصان ہوا ہے تو میرا فرض جتا ہے کہ آپ کو اسپتال لے کر جاؤں۔ آپ راستے میں جس کو چاہے کال کر کے اسپتال بلوائیجے گا۔" ہائی روف والے نے اصرار کیا اور اسے جواب کا موضوع دے دئے بغیر اپنے ساتھی سے بولا۔

"تم ان کی موٹر سائیکل لے کر پیچھے پیچھے آؤ۔ کوئی ٹوٹ پھوٹ ہوئی ہو تو اسے بھی دیکھ لینا۔" دوسرے لےوہ پھر زخمی موٹر سائیکل سوار سے مخاطب ہوا۔

"آئیے صاحب! آپ گاڑی میں بیٹھیے۔ ہماری وجہ سے سارا ٹریفک ڈسٹرب ہو رہا ہے۔" اس ہار اس نے موٹر سائیکل سوار کا بازو دبوچ کر باقاعدہ ہائی روف کی طرف دھکیلا تھا۔ موقع پر موجود دیگر لوگوں نے بھی اس کی بات مان لینے پر اصرار کیا تو موٹر سائیکل سوار کو نہ چاہتے ہوئے بھی گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھنا پڑا۔

"نشو سے اپنے زخم صاف کر لیں۔" گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے ہائی روف والے نے زخمی سے ہمدردی سے کہا تو اس نے سر ہلاتے ہوئے نشو پاس سے تین چار شو بچر سمجھ لیے۔ یکم مقامات سے خون رس رہا تھا لیکن کوئی بھی چوٹ شدید زخمیت کی نہیں تھی۔

"یہ آج کل کے لوٹوے بڑے بے پروا ہیں۔ ان کی کرحب بازی میں کسی کی جان مچل جائے، انہیں پروا نہیں ہوتی۔" ہائی روف کو ٹریفک کے پٹھانوں میں ڈالتے ہوئے ڈرائیور نے تبصرہ کیا۔

"ساری تربیت کی کتنی ہے۔" جوبلی تبصرہ کرتے ہوئے موٹر سائیکل والے نے بیک دیوڑھی پر نظر ڈالی اور بے دیکھ کر اطمینان محسوس کیا کہ دوسرا بندہ اس کی موٹر سائیکل لے لے پیچھے پیچھے آ رہا ہے۔ اطمینان کا یہ دورانیہ بے حد مختصر تھا کیونکہ عقب میں محسوس ہونے والے تحریک نے اسے ہلکا دیا تھا۔ خود کار روٹیل کے تحت اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا مٹل نکالنے کی کوشش کی لیکن عقب میں موجود شخص زیادہ تیز رفتار ثابت ہوا۔ اس کے ہاتھ میں موجود اسپرے سے ہونے والی پھوار نے موٹر سائیکل والے کا چہرہ جھگوڑا۔ خود کو بے ہوش سے بچانے کی خاطر اس نے سانس روکنے کی کوشش کی لیکن سر پر لگائی جانے والی ضرب نے اس کی کوشش کو کامیاب نہیں ہونے دیا اور وہ اپنے

لوگوں کو متاثر کرنے کے شوقین ان دیوالوں کو پروا بھی نہیں ہوتی کہ اس طرح اپنی اور دوسروں کی جان خطرے میں ڈال کر وہ جس حماقت کا مظاہرہ کر رہے ہیں اس کے لیے لوگ انہیں کیسے کیسے خطابات سے نوازتے ہیں۔

وہ بھی لوگوں کی سوچ سے بے پروا مزے سے بچ سڑک پر ون وینگ کرتا ہوا جا رہا تھا۔ یکم مقام قسم کے ڈرائیور نے ازخود اس سے فاصلہ پیدا کر لیا تھا لیکن اس ہائی روف والے کو خطرے کا احساس نہیں ہو سکا۔ وہ اپنے قریب جھرتی موٹر سائیکل سے بے نیاز پانچر سیٹ پر بیٹھے اپنے ساتھی سے مٹھکو میں مصروف تھا اس لیے اس کے لیے میں اس وقت گاڑی کو سنبھالنا مشکل ہو گیا جب وہ کرحب دکھائی موٹر سائیکل اس کے سامنے آگئی۔ مگر اڈ سے پیچھے کے لیے اس نے اسٹیرنگ کو موڑا۔ کرحب بازو موٹر سائیکل سوار ہال ہال بچا لیکن ہائی روف کے بائیں جانب بیٹھے موٹر سائیکل سوار کے لیے اس اچانک افتاد سے چٹا مٹکن نہیں ہو سکا۔ موٹر سائیکل کو ٹکرنے والے معمولی دھکے نے اس کا توازن ہکا بکا اور وہ اپنے سوار سمیت سڑک پر پھسل چکی تھی۔ یکدم بہت سے بریک چرچرائے اور ہر ایک نے اچھے طور پر کوشش کی کہ اس کی گاڑی سے حادثے کا فکرا ہونے والے موٹر سائیکل سوار کو نقصان نہ پہنچے۔ ٹریفک بہت زیادہ نہ ہونے کی وجہ سے پچھلے کامیاب رہی لیکن موٹر سائیکل سوار کی کھرنے سے نقصان بہر حال پہنچ چکا تھا۔

"آئی ایم سوری سر! امیری فطرتی نہیں تھی۔ بس میں اس باگل موٹر سائیکل والے کو بچانے کے چکر میں آپ کو ہٹ کر بیٹھا۔" ہائی روف والا اپنی گاڑی سے نکل کر متاثرہ شخص تک پہنچنے والا پہلا شخص تھا۔ مگر نے اس کو اچھی خاصی چوٹیں آئی تھیں اور ان چوٹوں سے خون رس رہا تھا۔

"وہ بد معاشرہ تو نکل گیا اور یہ بے چارے شریف آدمی مشکل میں پڑ گئے۔" ایک دوسری گاڑی کے ڈرائیور نے سڑک پر بہت آگے جاتی موٹر سائیکل کو دیکھتے ہوئے غصے سے تبصرہ کیا۔

"تکبیر بیٹنے کا کوئی قاعدہ نہیں۔ ان صاحب کو ٹورا اسپتال لے کر چلو تاکہ ان کی مرہم پٹی ہو سکے۔" ہائی روف والے کے ساتھی نے بلند آواز سے کہا اور زخمی موٹر سائیکل سوار کو ہمارا دے کر اٹھانے کی کوشش کی۔

"آپ لوگ رہنے دیں۔ میں اپنے کسی دوست کو

خاص ٹھکانے پر منتقل کیا جا رہا تھا کہ اگر اس کے پاس کوئی فریجنگ ڈیوائس موجود بھی تھی تو اب اس کی مدد سے اس کا سراغ نہیں لگایا جاسکتا تھا۔

تقریباً نو گھنٹے میں وہ اپنی منزل مقصود پر پہنچے اور بے ہوش موہن کو ایک بستر پر لٹا کر اس کا معائنہ کیا جانے لگا۔ ”سب ٹھیک ہے۔ ہوش میں آنے میں دو گھنٹے لگیں گے۔“ معائنہ کرنے والے نے خبرستانی اور پھر بطور خاص معاذ کی طرف رخ کر کے بولا۔

”آپ تھوڑی دیر آرام کرو۔ ہوش میں آنے کے بعد جب اس سے پوچھنا چاہیں گے تو آپ کو بلا لیں گے۔“ ”اوکے۔“ اس کے پاس ہائی بمرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ لوگ اس کا بھرپور ساتھ دے رہے تھے اس کے باوجود وہ ان کے ساتھ خود کو مکمل طور پر محسوس نہیں کرتا تھا۔ لاشعوری طور پر اس کے ذہن میں یہ بات رہتی تھی کہ ان کا دلپ سے تعلق ہے اور دلپ اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ اس نے سونپا کے ساتھ مل کر جو کچھ کیا تھا، اسے معاف کرنا تقریباً ناممکن تھا۔

”چل بھی جاؤ! کمراد کہا صاحب کو۔“ اس کا شت جواب پا کر مشورہ دینے والے نے اپنے ایک ساتھی کو حکم دیا۔ چارو نامی شخص اسے اپنی راہنمائی میں ایک کمرے کے دروازے تک لے آیا۔

”آج دیا صاحب دکھائی نہیں دیے؟“ کمرے میں داخل ہونے سے پہلے اس نے چارو سے استفسار کیا۔

”وہ اپنی مرضی سے دکھائی دیتا ہے۔“ وہ لٹھ مار انداز میں جواب دے کر وہیں پلٹ گیا۔ چارو تا چارو معاذ نے دروازے کا منڈل کھٹایا اور اندر داخل ہو گیا۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ اس نے سوچا جو برف کی تلاش میں دلوں پر ہاتھ مارا۔ سوچا پور تو نہ ملا لیکن اسے وہاں اپنے سوا بھی کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ احساس کے جواب میں روٹل ظاہر کرنے سے پہلے ہی کسی نے پیچھے سے اسے جکڑ لیا۔

”ہلتا مت ورنہ جان سے جا دے۔“ یہ جکڑنے والے کے بازو کے زور سے زیادہ سر پرنگی ریوالتور کی نال کا کمال تھا کہ وہ بچ بچ سا کت ہو گیا۔

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نوجوان
کی داستان جو غلط کاروں کے لیے
نفس ناک تھا باقی انعامات ایسا ماہ پڑھیے

”اس کی جیبوں کی تلاشی لے کر سارا سامان باہر نکالو۔“ ڈرائیور نے گاڑی روکے بغیر اپنے ساتھی کو حکم دیا۔ ”خاموش ہو گیا ہے سالار! اگر سامان لے لو۔“ ڈرائیور اب پیچھے آتے اپنے ساتھی سے مخاطب تھا۔ لکھوں میں بے ہوش آدمی کا مکمل سامان ایک پلاسٹک کے تھیلے میں منتقل کیا گیا اور یہ تھیلہ پیچھے آنے والے ساتھی کو ہتھ دیا گیا۔ اسے تھیلے میں موجود سامان کو موٹر سائیکل سیٹ ٹھکانے لگانے کی ذمہ داری نبھانی گئی۔

”شتر کھولو۔“ ہائی روف کا ڈرائیور اب کسی اور کو پیغام دے رہا تھا۔ آٹھ منٹ کے مختصر عرصے میں وہ ایک عمارت کے کشادہ گیراج میں موجود تھے۔ اس گیراج میں دو گاڑیوں کے ساتھ ساتھ ایک موٹر سائیکل بھی کھڑی نظر آ رہی تھی اور اس موٹر سائیکل سے ٹیک لگائے تھیں طور پر وہ لڑکا کھڑا تھا جس نے تھوڑی دیر پہلے سوک پر حادثے کے اسباب پیدا کیے تھے۔ وہ لڑکا معاذ تھا اور اس کے چہرے پر موہن کو بے ہوشی کی حالت میں دیکھ کر مسکراہٹ چمک رہی تھی۔ ”را“ کے چپ اچھٹ کو اتنی ساوکی کے ساتھ ٹرپ کر لیا گیا تھا کہ وہ اندازہ بھی نہیں لگا سکتا تھا۔

”شفٹ کرو اسے۔“ ہائی روف کے ڈھائیڈ مٹے دروازہ کھول کر باہر نکلتے ہی احکامات جاری کیے تھے۔ اس کے حکم پر دو بندوں نے بے ہوش موہن کو کھینٹ کر ہائی روف سے باہر نکالا اور گیراج کے فرش پر لٹا کر اس کے کپڑے اتارنے لگے۔ اتارے ہوئے کپڑوں اور جوتوں کو ایک تھیلے میں منتقل کرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے موہن کے جڑے زبردستی کھول کر دانتوں کا بھی معائنہ کیا اور ایک ڈاڑھ کے خلا میں موجود کپسول برآمد کرنے میں کامیاب رہے۔ دانتوں کے بعد کانوں اور سر کے بالوں کا بھی اچھی طرح معائنہ کیا گیا اور ہر طرف سے مطمئن ہونے کے بعد اسے مریضوں جیسا ڈھیلا ڈھالا لباس پہنا دیا گیا۔ ان سب کاموں سے فارغ ہونے کے بعد اس کے بازو میں ایک اور انجکشن لگا کر اسے وہاں کھڑی گاڑیوں میں سے ایک میں منتقل کر دیا گیا۔

”پارسل ریڈی ہے۔ ریسیو کرنے کے لیے تیار رہو۔“ ہائی روف والے نے آگے اطلاع دی اور معاذ کو بھی اسی گاڑی میں سوار ہونے کا اشارہ کیا جس میں موہن کو ڈالا گیا تھا۔ ان لوگوں کی ہوشیاری پر دل ہی دل میں داد دیتا معاذ گاڑی میں سوار ہو گیا۔ موہن کو اب ایسی حالت میں

قسط: 24

شہزادہ

شہزادہ

پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار ہے ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جہاں معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تندوتیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابل شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پُر عزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند متائے جانے کے منصوبے بنائے جا رہے تھے... اس کی زندگی جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قرار یوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تار عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ پروار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ وارداتِ قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہوسکی...

بچے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تحریر نگارستان



معاذ ایک ذہین لیکن متلون مزاج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جوائن کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ انسٹی ٹیوٹ سے واپس آ رہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو سڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی نڈر فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشری نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بشری ماس کیوٹی کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم وغیرہ لکھتی ہے۔ اس دوران جگہ بھی وہ ایک زیر تعمیر رہائشی منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی آئی تھی۔ معاذ بشری کو یہ حفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کر دیتا ہے لیکن جن رئیس زادوں سے اس نے ان کا شکار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ یہ موقع انہیں یونیورسٹی ٹرپ کی صورت میں مل جاتا ہے اور ایک جنگل کی سیر کے دوران وہ نوٹوگرانی کے شوق میں سب سے الگ تھلک ہو جانے والے معاذ کو بے خبری میں گھیر کر بری طرح زد و کوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکادے دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس نہ آنے پر انتظامیہ کے افراد، پولیس اور ریسکیو ذرائع کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جوگی کی جھوپڑی میں پاتا ہے۔ اپنی حالت سے اسے اپنے شدید زخمی ہونے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ جوگی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ معاذ کا موبائل جنگل میں ہی کہیں گر جاتا ہے اور جوگی کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا جس سے باہر کی دنیا سے رابطہ کیا جاسکے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے۔ جوگی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نواز کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے پراسرار علم سکھانے کی ہامی بھر لیتا ہے اور معاذ واقعی اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ادھر جانے وقوع سے ملنے والے معاذ کے کیمرے سے جب تصویریں نکلوا لی جاتی ہیں تو بہت سے قدرتی مناظر کی تصویروں میں سے ایک ایسی تصویر بشری کی نظر میں آ جاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانک رہا نظر آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پروجیکٹ کے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشری تحقیق کر رہی تھی۔ بشری کے اپنے والد جرنلٹ ہوتے ہیں اور حق گوئی ان کے خون میں شامل تھی۔ اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشری کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ مدد سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باذل نامی فنڈے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشری انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دنوں میں ہی معاذ واپس کا ارادہ کرتا ہے تاہم دوسرے ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا عرفان اللہ اور یزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو دو قاص نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باذل اچانک بشری کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر دیتا ہے۔ معاذ کو واپس لانے کے لیے او جے جھکنڈے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اسے واپس آنے کا پیغام دیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کر کے اسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات لی جاتی ہیں، نہ بتانے پر اس کے بھائی کا ایک گردہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشری بھی انتقام کی آگ میں جلتی ہوئی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہو جاتی ہے۔ معاذ کو بچانے والا لڑکا دو قاص اپنے گرد کے ساتھ ایک پارٹی میں جاتا ہے۔ وہاں اسے معاذ کے حوالے سے مشکوک ایک شخص نظر آتا ہے۔ وہ اس کے پیچھے جاتا ہے مگر اسے گھیر لیا جاتا ہے۔ بہر حال دو قاص کو تنبیہ کے ساتھ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ادھر معاذ کے دوست عالم شاہ کے بہنوئی کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ کئی فنون میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے چھپاتا کر کے اس کے دماغ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ فیضو سے حاصل انوکھے علم کی بدولت ان کا معمول نہیں جتا۔ بشری، کامران کو چھاپنے کا پروگرام بناتی ہے۔ ادھر عالم شاہ سراغ لگا لیتا ہے کہ اس کے بہنوئی کا قتل کس نے کیا۔ وہ قاتل کو گھیرتا ہے اور اپنے تئیں اسے گولیاں مار کر قتل کر دیتا ہے۔ تاہم وہ بچ جاتا ہے۔ عالم شاہ اس کے بعد ڈاکوؤں کے سردار چاچو کو چھاپتا ہے اور اسے کیفر کردار تک پہنچاتا ہے۔ اس کے پیچھے پولیس لگ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور اس کا نوکر سرد باذل کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ ادھر معاذ جاسوس ماتھر کو چھپاتا کر کے اس کے ذریعے اسے نکالنے والوں پر حملہ کروا دیتا ہے تاہم ان کی فائرنگ سے ماتھر مارا جاتا ہے اور الزام معاذ پر نہیں آتا مگر معاذ سے کام لینے والوں کو اس پر شک گزرتا ہے۔ عالم کی بہن بھل شاہ کے نو مولود بیٹے کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اغوا کا الزام لطیف سومرو پر آتا ہے۔ عالم

شاہ وہاں موجود ایک زخمی شخص کی مدد سے باذل کی قید سے چھٹکارا پالیتا ہے۔ ادھر بشری دعی پہنچ جاتی ہے۔ وہاں وقاص اسے باری کے روپ میں پہچان لیتا ہے اور ان دونوں کے درمیان اعتماد کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ وہ سلطان کو مارنا چاہتی ہے تاہم وقاص اسے ایسا کرنے سے روکتا ہے۔ ادھر عالم شاہ باذل کی قید سے نکل کر اس کا پیچھا کرتا ہے تاہم وہاں اچانک فائرنگ اور دھماکے ہونے لگتے ہیں۔ وہ وہاں محاذ کو دیکھتا ہے۔ صداقت شاہ، لطیف سومر و گھیرنے کے لیے اس کی خفیہ بیوی اور بچے کا کھوج لگاتے ہیں اور بچے کو اغوا کر لیتے ہیں۔ لطیف سومر و مجبور ہو جاتا ہے۔ محاذ کو اس کے گھر والوں سے ملنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ عالم شاہ کو اس کے والد انڈیا روانگی کا عندیہ دیتے ہیں۔ ادھر محاذ بھی ایک مشن پر سونیا کے ساتھ انڈیا روانہ ہوتا ہے تاہم کچھ لوگ سکھ یا تریوں سے بھری بس کو یرغمال بنا لیتے ہیں۔ محاذ اور سونیا تہ خانے کے تمام افراد کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں تاہم باہر موجود دیگر اغوا کاروں سے مقابلہ ہوتا ہے اور محاذ زخمی ہو جاتا ہے۔ صداقت شاہ کے انڈیا میں موجود رشتے دار کے ہاں شادی ہوتی ہے۔ عالم شاہ، نکل اور سرمد انڈیا روانہ ہو جاتے ہیں۔ انرپورٹ سے گھر روانگی پر راستے میں کچھ ٹیرے انہیں لوٹ لیتے ہیں۔ عالم شاہ ایکشن میں آنا چاہتا ہے تاہم اجالا نامی عالم شاہ کی کزن اس کا راستہ روک لیتی ہے۔ گھر پہنچنے پر پولیس کی ریڈ ہوتی ہے اور وہ عالم شاہ اور سرمد کو لے جاتے ہیں۔ ادھر بشری اور وقاص باذل کو اسپتال میں مارنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ بچ جاتا ہے۔ محاذ اور سونیا پناہ کی تلاش میں ہوتے ہیں اور بالآخر اپنے سہولت کاروں سے مل جاتے ہیں۔ عالم شاہ اور سرمد کو تشدد کا نشانہ بنا کر ویرانے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ واپس اپنے میزبانوں کے ہاں پہنچ جاتے ہیں۔ شادی کے دوران انہیں پتا لگتا ہے کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں اجالا اور اس کا عاشق شامل ہوتے ہیں۔ وہ چھپ کر ان کی باتیں سن رہا ہوتا ہے کہ اسے چھاپ لیا جاتا ہے۔ تاہم وہاں مارا ماری ہوتی ہے اور اجالا کا عاشق مارا جاتا ہے۔ پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ ان کے کزن انہیں اپنے دوسرے خفیہ ہنگامے پر پہنچا دیتے ہیں جہاں کچھ لوگ ان پر حملہ کر دیتے ہیں۔ وہ وہاں سے بھاگتے نکل جاتے ہیں۔ ادھر محاذ کو سونیا اپنے ساتھ نئے مشن پر لے کر جاتی ہے جس میں ایک ریلوے لائن کو دھماکے سے اڑانا ہوتا ہے۔ محاذ ایسا نہیں چاہتا اس لیے وہ ٹرین کی آمد سے قبل بارودی دھماکا کر دیتا ہے۔ وہ زخمی ہو جاتا ہے اور اسے ہندو سادھو اپنی کشیا میں لے جاتا ہے جہاں اس کی اچھی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ سونیا کے آدمی محاذ کو تلاش کرتے ہیں مگر ناکام ہو جاتے ہیں۔ ادھر عالم شاہ اور سرمد خفیہ ذریعے سے بارڈر پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ دھریے جاتے ہیں اور "را" کی قید میں پہنچ جاتے ہیں۔ انہیں تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ادھر بشری باذل کو مارنے کی کوشش میں خود نشانہ بن جاتی ہے۔ محاذ سادھو کی مدد سے ایک انڈین ہیروئن کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ وہیں اسے عالم اور سرمد کی گرفتاری کا پتا چلتا ہے۔ ادھر نکل کو اس کا شوہر ذہنی اذیت دیتا ہے۔ محاذ ڈاکٹر فردوس سے ملتا ہے اور اسے نکل کی مدد کرنے کا کہتا ہے۔ عالم اور سرمد قید سے فرار کا سوچتے ہیں اور دھریے جاتے ہیں جس کی پاداش میں انہیں مزید تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ محاذ، وشاک کے ذریعے عالم اور سرمد کو گورہائی دلوانا چاہتا ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ اس کا پیچھا کرتا ہے تاہم وشاک کی گاڑی حادثے کا شکار ہو جاتی ہے۔ علیحدہ اور وقاص وغیرہ کو لالہ عیسیٰ ملک سے باہر نکال دیتا ہے اور ہر ممکن احتیاط کی ہدایت کرتا ہے لیکن علیحدہ پاکستان میں ٹوبہ سے رابطہ کرتی ہے جو ان کے لیے مصیبت بن جاتا ہے ٹوبہ پر تیزاب پھینک دیا جاتا ہے۔ ادھر محاذ، نکل کے لیے پریشان ہوتا ہے اور اسے وہاں سے نکالنا چاہتا ہے۔ محاذ، وکرم نامی شخص کے خلاف کارروائی کرتا ہے مگر خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ ادھر وقاص، علیحدہ اور اس کے گھر والوں کو مار دیا جاتا ہے۔ محاذ سہااش نامی شخص کے خلاف کارروائی کرتا ہے تاہم وہ مارا جاتا ہے اور محاذ بھی زخمی ہو جاتا ہے اور اپنا نشان وہاں چھوڑ دیتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس محاذ کو دیوانا نامی شخص سے مدد لینے کا کہتی ہے۔ محاذ اس کے ساتھ مل کر موہن نامی "را" کے ایجنٹ کو اغوا کرتا ہے تاہم ٹھکانے پر پہنچ کر کمرے میں داخل ہونے پر کوئی اس کے سر پر ریوالتور کی نال رکھ دیتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

"کون..... کون ہو تم؟" وہ اندھیرے کمرے میں کپٹی سے لگی پستل کی زد میں کھڑا تھا پھر بھی لہجے کو پُر سکون رکھتے ہوئے سوال کیا۔

"ایسے ہی تمہاری بہادری کا امتحان لے رہا تھا۔"

دیوانے آرام سے کہا اور خود کمرے میں رکھے صوفے کی طرف بڑھ گیا۔

"امتحان میں پاس ہوا ہوں یا نل؟" محاذ نے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائی۔

"کون..... کون ہو تم؟" وہ اندھیرے کمرے میں کپٹی سے لگی پستل کی زد میں کھڑا تھا پھر بھی لہجے کو پُر سکون رکھتے ہوئے سوال کیا۔

"دیوانے کے ٹھکانے پر دشمن تو جہیں مل نہیں سکتا۔"

یکدم ہی لائٹ جل گئی اور دیوانہ اس کے سامنے آ گیا۔

"اچھا، تو یہ آپ ہیں۔" وہ جواباً فقط اتنا ہی کہہ سکا۔

حقیقتاً اسے یہ سب بہت عجیب لگا تھا۔ دیوانے کی جو حیثیت تھی

”سو فیصد پاس ہو بابا۔“ اس نے ایک بار پھر قہقہہ لگایا لیکن نہ جانے کیوں معاذ کو اس کا یہ انداز مصنوعی لگا۔
 ”کس سوچ میں پڑ گئے؟ آؤ، یہاں بیٹھو۔ تھوڑی گپ شپ لگاتے ہیں۔“ دیوانے اس کے انداز کو محسوس کیا اور نرم لہجے میں اپنے ساتھ بیٹھنے کی دعوت دی۔
 ”فینشن مت لو۔ کام چل پڑا ہے۔ جلد کوئی اچھی خبر سنو گے۔“ معاذ اس کے مقابل بیٹھ گیا تو اس نے اسے سلی دینے والے انداز میں کہا۔

”موہن سے انفرمیشن اگوالیس گے آپ؟ سنا ہے یہ انجینئرز بڑے سخت جان ہوتے ہیں۔ جان دے دیتے ہیں، زبان نہیں کھولتے۔ پھر اس کا غیاب بھی مسئلہ بن سکتا ہے۔ کہیں وہ لوگ چوکنے نہ ہو جائیں۔“ اس نے دیوا کے روپے کو ذہن سے جھٹکا اور موہن سے متعلق اپنے خدشات بیان کرنے لگا۔

”ہم نے اس کی زبان کھلوانی ہی کب ہے۔ اس کی زبان تو اس کی جتنی کھلوائے گی۔“
 ”کیا مطلب؟“ اسے دیوا کے جواب نے حیران کر دیا۔

”مطلب یہ کہ اس کی جتنی بھی ہمارے قبضے میں ہے اور اس کی سلامتی کے لیے اسے ہمارے ساتھ کوآپرٹ کرنا پڑے گا۔“ دیوانے اسے اطلاع دی تو وہ چپ سا ہو گیا۔ مقاصد کے حصول کے لیے عورتوں اور بچوں کو یرغمال بنانا اس کے لیے ناپسندیدہ فعل تھا لیکن وہ دیوا سے اختلاف بھی نہیں کر سکتا تھا۔

”مجبوری ہے دوست! جب انسان کے اپنے تلوے جل رہے ہوں تو وہ صحیح غلط سوچنے کے چکر میں نہیں پڑتا۔ کبھی خود کو بچانے کے لیے دوسرے کے سینے پر چڑھ کر کھڑے ہو جاتا ہی واحد حل ہوتا ہے۔“ اس کے اظہار کے بغیر بھی وہ اس کی ناپسندیدگی کو بھانپ گیا۔
 ”شاید ایسا ہی ہو لیکن میں کبھی اس انداز میں نہیں سوچ سکا۔“

”ان باتوں کو جانے دو اور جو ہم کر رہے ہیں، ہمیں کرنے دو۔“

”جی ٹھیک ہے۔“ اس نے بحث نہیں کی۔
 ”اب تم آرام کرو۔ جلد ہی گڈ نیوز سناؤں گا۔“ دیوا کمرے سے جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ معاذ خاموشی سے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کے یوں ملاقات کرنے کا سبب اسے سمجھ نہیں آیا تھا لیکن کوئی شے بھی جو مسلسل دماغ

میں کھٹک رہی تھی۔
 ”ایک منٹ.....“ اس نے جاتے ہوئے دیوا کو روکا۔
 ”میں سوچ رہا تھا کہ جب آپ نے اسٹریٹیجی بدل دی ہے تو میرا یہاں رک کر موہن کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنا بے کار ہے۔ آپ لوگ موہن اور اس کی بیوی کے معاملات سنبھال لیں۔ میں اس دوران اپنے کچھ ضروری کام نمٹا لیتا ہوں۔ فائنل ایکشن سے پہلے ہم دوبارہ آپس میں مل کر ڈسکشن کر لیں گے۔“

”ایز یوش۔ میرے کو کوئی آئیجنکشن نہیں ہے۔“
 دیوانے اس کی بات توجہ سے سنی اور بے نیازی سے شانے اچکاتے ہوئے جواب دیا۔
 ”تو پھر ابھی میں چلتا ہوں۔“ معاذ وہاں سے جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

”اوکے، گڈ بائے۔“ دیوانے اسے اجازت دے دی۔ وہاں سے نکل کر وہ سیدھا سبھل سے ملنے جا پہنچا۔ وہ اپنے بیٹے کو کار پٹ پر بٹھائے ایک خالی ڈبے اور چھوٹی سی ڈنڈی کی مدد سے کھلانے میں مصروف تھی۔ ڈنڈی کو خاص انداز سے ڈبے پر مارنے سے ایک ردھم میں آواز پیدا ہو رہی تھی اور بچہ اس آواز پر خوش ہو کر تالیاں بجا رہا تھا۔ سبھل کی دروازے کی طرف پشت ہونے کی وجہ سے وہ اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن اسے یقین تھا کہ بچے کی کھلکھلاہٹ نے اس کے چہرے پر بھی ہنسی کے پھول کھلا رکھے ہوں گے۔

”السلام علیکم!“ سبھل کو اپنی آمد سے باخبر کرنے کے لیے اس نے کھٹکھٹاتے ہوئے اسے سلام کیا۔

”وعلیکم السلام! آپ کب آئے؟ مجھے پتا ہی نہیں چلا۔“ چادر نما بڑے سے دوپٹے سے اس کا سر پہلے ہی ڈھکا ہوا تھا۔ اس کی آواز سن کر دوپٹے کا پلو تیزی سے قلاب کی شکل میں پھیلا یا اور آہستہ سے بولی۔

”میں بس ابھی آیا ہوں۔ شاپا نے دروازہ کھولا تھا۔ آپ کو شاید مصروف ہونے کی وجہ سے نفل کی آواز سنائی نہیں دی۔“

”ہاں، بس وہ اعظم کھیل کے موڈ میں تھا تو میں اس کے ساتھ کھلی ہوئی تھی۔“ وہ بولتی ہوئی اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی لیکن اگلے ہی لمحے ڈمگسا گئی۔ معاذ بے اختیار دو قدم آگے بڑھا مگر وہ اس کے سہارا دینے سے پہلے ہی قریبی دیوار تمام کر خود کو سنبھال چکی تھی۔

”مجھے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔“ معاذ

اور سرمدی آزادی کے معاملے کا کیا بتاؤ؟“ وہ گفتگو کا رخ بدل گئی۔

”کوششیں جاری ہیں۔ ان شاء اللہ جلد آپ خوشخبری سنیں گی۔“

”اللہ سائیں جلد از جلد وہ وقت لائے کہ میں اپنے ادا سائیں کو آزاد دیکھوں۔“ سبھل نے تڑپ کر دعا کی تو اسے بے سائیت علیہ یاد آئی۔ وہ بھی تو اس سے ایسی ہی شدید محبت کرتی تھی۔

”میں چلتا ہوں۔ آپ اپنا خیال رکھیے گا اور ڈاکٹر کی ہر ہدایت پر عمل کیجیے گا۔“ علیہ کا خیال آتے ہی دل ایسا بے قرار ہوا تھا کہ اس کے لیے وہاں رکنا مشکل ہو گیا تھا۔ کچھ مصروفیات تھیں اور کچھ احتیاط کے تقاضے کہ وہ گھر والوں کی خبر لینے کے لیے دوبارہ پاکستان رابطہ ہی نہیں کر سکا تھا۔ ثوبیہ سے آخری بار جو بات چیت ہوئی تھی، اس سے یہی اندازہ ہوا تھا کہ وہ لوگ از خود کہیں روپوش ہو گئے ہیں لیکن بہر حال اس کے برعکس خدشات بھی دل میں موجود تھے۔

”اتنی اچانک کہاں جا رہے ہیں؟ میں نے تو ابھی آپ کو چائے کافی کے لیے بھی نہیں پوچھا۔“ سبھل اس کے یوں اچانک جانے کا سن کر حیران و پریشان ہوئی۔

”نیکسٹ ٹائم آؤں گا تو پی لوں گا۔ ابھی اچانک ایک کام یاد آ گیا ہے۔“ اس نے جبکہ کمرھیل میں مصروف تھا اس کے رخسار پر ہلکی دی اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ جیسے ہی اسے کالے خان کو کال کر کے مشرا کو بلوانے کی بھی فرمائش کر دی کہ پاکستان میں محفوظ رابطہ کرنے کے لیے کمپیوٹر پر بے پناہ دسٹرس رکھنے والا وہ دھان پان سا لڑکا ناگزیر تھا۔

”مشرا آگیا؟“ مشرا دھان پان کے گھر پہنچے ہی اس نے کالے خان سے سوال کیا۔

”بس، آتا ہی ہوگا۔ آپ بتائیں موبن کا کیا ہوا؟“ کالے خان اس سے اس کام کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین تھا جس کے لیے وہ گھر سے نکلا تھا۔

”لے آئے ہیں اسے۔ آگے کا پلان ابھی طے کرنا ہے۔ میں نے سوچا اس سے پہلے ایک بار گھر والوں سے بات کر لوں۔ آنے والے وقت میں کیا حالات ہوں، کیا معلوم۔“

”شہبہ شہبہ بولیے۔ اوپر والے نے چاہا تو آگے بھی سب اچھا ہوگا۔“

”میں ٹھیک ہوں۔ ایک دم اچانک کھڑے ہونے سے ذرا چکر سے آگئے تھے۔ ویسے پریشانی کی کوئی بات نہیں۔“ معاذ کی آنکھوں میں دکھائی دیتی بے پناہ اہمیت سے نظر چراتے ہوئے اس نے آہستہ سے جواب دیا اور ایک قریبی کرسی پر بیٹھ گئی۔

”ڈاکٹر نے آپ کا چیک اپ کیا تھا؟“ وہ اس کی وضاحت سے مطمئن نہیں تھا۔

”جی ہاں۔ چیک اپ ہوا تھا اور میں دوا بھی پابندی سے لے رہی ہوں۔ اللہ نے چاہا تو یہ جو معمولی تکلیف ہے، یہ بھی جلد ٹھیک ہو جائے گی۔“ وہ اس کی تسلی کروانے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔

”کہیں کوئی بھی مسئلہ ہو، بالکل بھی تکلف سے کام مت لیجیے گا۔ ایسا نہ ہو کہ کل کو مجھے عالم کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے کہ میں نے اس کی بہن اور بھانجے کا ٹھیک سے خیال نہیں رکھا۔“

”شرمندہ تو میں ہوں کہ میری وجہ سے آپ کو اتنی زحمت اٹھانا پڑ رہی ہے۔ ایک ایسے وقت میں جبکہ ہمارے خونی رشتے ہمارا ساتھ چھوڑ گئے ہیں، آپ کی اتنی مہربانیاں مجھے مفروض کرتی جا رہی ہیں۔“ پلوں کی چلمن کے پیچھے آنسوؤں کی چمک ابھری تو وہ بے چین ہو گیا۔

”ایسا بالکل نہیں سوچیں۔ میں یہ سب اپنی خوشی سے کر رہا ہوں۔“

”میں جانتی ہوں۔“ سبھل بے ساختہ ہی بولی تو وہ چونک گیا اور بے اختیار اس کی طرف دیکھنے لگا کہ کیا سچ سچ وہ اس کے دل کی بے قراری سے واقف ہے لیکن اب وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھی اور ذرا سے رخ موڑے خالی ڈبے اور ڈنڈی کی مدد سے کھیلنے لگے۔

”معذرت چاہتا ہوں۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ اعظم کے لیے کھلونوں کا بھی انتظام کرنا چاہیے تھا۔“ اس کا گریز دیکھ کر اس نے اسے کھوجنے کی کوشش ترک کر دی۔

”آپ نے جتنا کیا ہے، وہ بھی بہت زیادہ ہے۔ کھلونوں کا کیا ہے۔ نہیں بھی ملیں تو بچے کسی بھی دستیاب شے کو اپنا کھلونا بنا لیتے ہیں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن اعظم کے پاس کھلونے ہونے چاہئیں۔ میں دوبارہ آؤں گا تو کھلونے لیتا ہوا آؤں گا۔“ اس نے اپنا فیصلہ سنایا۔

”جیسی آپ کی مرضی۔ ابھی تو یہ بتائیں کہ ادا سائیں

پسپ ہوں رہی تھا وہ وہی اس کے ساتھ رہی تھی۔
 ”کوشش کرتا ہوں لیکن بہت کمپلیکٹڈ ہے۔ ایک بار
 میں شاید ہی سمجھ آ سکے۔“ اس نے قدرے نخوت سے جواب دیا
 لیکن معاذ پوری استقامت سے اپنے ارادے پر ڈٹا رہا۔ مجبوراً
 مشرا کو اسے گائیڈ کرنا پڑا۔ طریقہ کار واقعی صحیح تھا اور کچھ مشرا
 بھی جان بوجھ کر جلدی جلدی سب کرتا جا رہا تھا اس لیے پوری
 طرح اس کے لیے نہ پڑ سکا۔ کال مل گئی تو وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ
 کر بات کرنے کے لیے بے چین ہو گیا۔

”ہیلو!“ دوسری طرف سے سنائی دیتی مردانہ آواز
 بلاشبہ دشبہ فراز کی تھی۔ وہ اس کی آواز سن کر جھجک گیا۔

”ہیلو! کون بات کر رہا ہے؟“ اس کی طرف سے
 خاموشی پر فراز نے پوچھا۔

”جی، وہ میں علیہ کی دوست انعم بات کر رہی ہوں۔

”تو یہ آپنی سے بات ہو سکتی ہے کیا؟“ اسے خیال آیا کہ وہ
 وائس چیئر کی مدد سے کال کر رہا ہے تو اپنا مدعا بیان کیا۔

”انعم.....!“ فراز کچھ چونکا ہوا محسوس ہوا۔
 ”جی، انعم..... کراچی سے۔“

”مجھے خود تمہاری کال کا انتظار تھا انعم! مجھے تو یہ نے
 تمہارے متعلق بتایا تھا۔“ فراز کی اگلی بات مزید معنی خیز
 تھی۔

”وہ خود کہاں ہیں؟“ اس نے اپنے اندر بے چینی سی
 محسوس کی۔

”ہسپتال میں۔“
 ”کیا ڈیوٹی پر ہیں؟“

”نہیں۔ ایڈمٹ ہے۔ اسے تیزاب گردی کا نشانہ
 بنایا گیا ہے۔“ فراز کی آواز بھرا سی گئی۔

”کب؟ کیسے؟“ وہ اس اطلاع کو سن کر ٹپ اٹھا۔
 ”علینہ سے چوری چھپے رابطہ رکھنے کی پاداش میں۔“

انہوں نے میری پریوں سی بہن کو نشان عبرت بتا دیا اور اب
 شاید ہمیں اس بات کا بھی خیال نہ ہو سکتا پڑے کہ ہم جنہیں

یہاں کی ساری خبریں پہنچا رہے ہیں۔“ فراز پھٹ پڑا جبکہ
 وہ اپنی جگہ گنگ رہ گیا۔ فراز کے الفاظ سے ظاہر تھا کہ وہ

جانتا ہے کہ انعم کے پردے میں کون اس سے مخاطب ہے۔
 ”مجھے بہت افسوس ہے میرے بھائی! بلکہ سچ پوچھو تو

میں بے انتہا شرمندہ ہوں۔“ اس کے منہ سے بے مشکل الفاظ
 نکل رہے تھے۔ یہ احساس کہ اس کے دامن میں لگی آگ

نے دوسروں کی ہستی ہستی زندگیاں راکھ کرنا شروع کر دی
 ہیں، بڑا ہی تکلیف دہ تھا۔

”ان شاء اللہ تعالیٰ! میں خیال رکھنا کالے خان کہ
 اگر مجھے کچھ ہو جاتا ہے تو تمہیں سب کچھ کا بہت خیال رکھنا ہے اور
 پوری پوری کوشش کرنی ہے کہ اسے پاکستان میں اسے
 اپنوں تک پہنچا دو۔“ اس کے ساتھ بہت اندیشے تھے۔

”نہی رکھیے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میرا ایمان ہے
 کہ اگر آپ غلط راستے پر نہیں ہیں تو زندگی میں چاہے کتنی ہی

مشکلات کیوں نہ آئیں، آخر کار ایک دن سب ٹھیک ہو جاتا
 ہے۔“ کالے خان نے اسے دلاسا دیا پھر پوچھنے لگا۔

”کھانے کے سلسلے میں کیا ارادہ ہے آپ کا۔ ابھی
 کھائیں گے یا کچھ دیر بعد؟“

”آج بھی تمہارے ہاتھ کا پکا زہر مار کرنا پڑے گا تو
 پھر رہنے دو۔“ چہرے پر بے چارگی کے تاثرات سجاتے

ہوئے اس نے کالے خان کو جواب دیا۔
 ”آج میں نے ایک فوڈ چینل سے ریسپی دیکھ کر کھانا

پکایا ہے تو امید ہے کہ کچھ نہ کچھ ٹھیک بن ہی گیا ہوگا۔ اگر پھر
 بھی آپ کو پسند نہ آئے تو ہمارے منگوا لیں گے۔“ کالے

خان نے قطعی برامنائے بغیر اسے جواب دیا۔
 ”ان سارے چکروں میں پڑنے سے بہتر ہے کہ تم

جلد از جلد کوئی نیا کک تلاش کرو۔“ اس نے کالے خان کو
 نصیحت کی۔

”وہ تو میں کر ہی رہا ہوں لیکن کوئی قابل اور اعتبار
 والا بندہ ملے بھی تو۔“

”گل خان کو اس جاب کے لیے کیوں نہ بلا لیں۔
 اس کو پکانے میں مہارت بھی ہے اور بندہ بھی بہت وقادار

ہے۔ جب سے گھلیل کے ہاں سے نوکری چھوڑی ہے، اس
 کے پاس کوئی مستقل روزگار بھی نہیں ہے۔“ اسے اچانک ہی

گل خان کا خیال آیا۔
 ”آئیڈیا تو اچھا ہے لیکن میں واضح کر دوں کہ اس کی

جاب اسی وقت تک ہوگی جب رادھا اسے اوکے کر دے
 گی۔ وہ کبھی کبھی یہاں آتی ہے لیکن کک میں وہی رکھتا ہوں

جس کے ہاتھ کا ڈاکٹر رادھا کو بھائے۔“
 ”مجھے معلوم ہے بھائی۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارا بس

چلے تو اس دنیا میں موسم بھی رادھا دیوی کی مرضی سے تبدیل
 ہوا کریں۔“

”اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔“ کالے خان اس کی
 بات سن کر جھینپ گیا۔ اسی وقت مشرا کی آمد ہو گئی تو معاذ کو

اس کے ساتھ مزید چھیڑ چھاڑ کرنے کا موقع نہ مل سکا۔
 ”آج مجھے بھی کال کرنے کا یہ طریقہ سمجھا دو۔“ مشرا

ہے میں اسے سعد کی زندگی بچانے کے لیے وقاص کے خلوص کو ٹھکرا کر اپنے صیاد کے پاس واپس جانا پڑا تھا اور اب اسے بتایا جا رہا تھا کہ وہی مخلص سا وقاص اور اس کی فیملی کے سارے لوگ مارے گئے ہیں۔ ابو، سعد، علیہ..... کوئی بھی نہیں بچا۔

”معاذ.....!“ اس کی طرف سے مسلسل خاموشی پر فراز نے اسے پکارا۔ حالات جس ٹچ پر آگئے تھے، ساری احتیاطیں بے کار تھیں اس لیے فراز نے اسے اس کے نام سے ہی پکارا تھا۔

”کیا سچ کچ کوئی نہیں بچا۔ ابو، سعد، علیہ..... کوئی ایک بھی؟“ الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے لبوں سے نکلے۔

”کوئی نہیں بچا میرے بھائی، سب ختم ہو گیا۔“ فراز کے لیے خود پر قابو پانا ممکن نہیں رہا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ خود اس کا یہ حال تھا کہ رونے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ غم و غصے کی انتہا پر پہنچ کر اس نے سب سے پہلے اپنے سامنے رکھے لیپ ٹاپ کو ہی اٹھا کر دیوار پر دے مارا پھر زور زور سے چیختے ہوئے جوتا اٹھا کر پھینکا چلا گیا۔ اس وقت اس کے منہ سے جو آوازیں نکل رہی تھیں، وہ کسی شیر کی دھاڑ سے مشابہ تھیں۔ شور سن کر کالے خان اور مشرا بھاگے آئے۔ کمرے کی حالت دیکھ کر دونوں دنگ رہ گئے۔

”معاذ.....“ کالے خان نے اسے پکارا لیکن اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے اپنے پیادوں کے چہرے گھوم رہے تھے اور یہ خیال دل کو نوچ رہا تھا کہ وہ سب ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر سمندر برد ہو چکے ہیں۔

”کیا ہو گیا ہے معاذ.....“ وہ پکارے جانے پر متوجہ نہ ہوا تو کالے خان اس کے قریب چلا آیا اور اس کا بازو تھام کر پریشانی سے پوچھا۔ لیکن اسے تو اپنا ہوش ہی نہیں تھا۔ زور سے چیخا اور کالے خان کو پرے دھکیل دیا۔ وہ بے چارہ بے خبری میں دور جا کر گرا۔

”آپ ٹھیک ہیں؟“ مشرا لپک کر کالے خان کے قریب آیا اور سہارا دے کر کھڑا کرتے ہوئے پوچھا۔ ”میں ٹھیک ہوں مگر سمجھ نہیں پا رہا کہ انہیں کیا ہوا ہے۔“ کالے خان نے تشویش سے معاذ کی طرف دیکھا جو اب دیوار پر لگی ایک پینٹنگ اتار کر پھینک رہا تھا۔ انداز ایسا تھا جیسے دنیا کی ہر شے کو نیست و نابود کر دینا چاہتا ہو۔

”اسے تو لگتا ہے کہ پاگل پن کا دورہ پڑا ہے۔ کیا یہ کسی قسم کے ذہنی مرض میں مبتلا ہے؟“ دھان پان سا مشرا اس کے جنون کو دیکھ کر خوفزدہ سا تھا۔

”یہ اسے سعد کی سرمدہ مرنا دینا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ تم تو خود بے قصور اس مصیبت میں مبتلا ہو۔“ اس کے شکستہ لہجے نے فراز کو سنبھلنے پر مجبور کر دیا۔ ”بے قصور تو ہوں لیکن یہ احساس مجھے چین نہیں لینے دیتا کہ میری وجہ سے میرے اپنے مصائب میں مبتلا ہیں۔“ اس کی آواز بھرا سی گئی۔

”بعض اوقات حالات پر انسان کا اختیار نہیں رہتا اور نہ چاہتے ہوئے بھی اسے عظیم دکھوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔“ فراز کو ابھی اسے بدترین اطلاع بھی دینی تھی اس لیے اپنے طور پر پیش بندی کی کوشش کر رہا تھا۔

”ثوبیہ نے تو مجھے بتایا تھا کہ علیہ سمیت سب گھر والے اچانک غائب ہو گئے ہیں پھر اس کی علیہ سے کب اور کیسے بات ہوئی؟“ اس نے مزید حالات جاننے کی کوشش کی۔

”علیہ نے خود رابطہ کیا تھا۔ وہ سنگاپور میں تھی لیکن اس وقت اس نے ثوبیہ کو یہ سب نہیں بتایا تھا۔ اس بات کا علم ہمیں اس وقت ہوا جب کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔“

”کیا مطلب؟“ فراز کے الفاظ پر اس کا دل دھک سے رہ گیا اور بے ساختہ ہی آواز بلند ہو گئی۔

”علیہ، خاور ماموں، سعد..... کوئی بھی نہیں رہا۔ ان سب کو اس وقت بم دھماکے میں اڑا دیا گیا جب وہ دشمنوں سے بچنے کے لیے سمندری راستے سے سنگاپور سے فراز ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔“ یہ سب بتاتے ہوئے فراز کی آواز بھیگ گئی لیکن اس کا ذہن اس اطلاع کو قبول کرنے کو تیار نہیں تھا اس لیے چیخ کر بولا۔

”کیا بکواس کر رہے ہو فراز؟ علیہ اور باقی لوگ سنگاپور کیسے جاسکتے تھے؟ کون لے گیا تھا انہیں وہاں؟“

”لالہ بیٹی اور اس کا منہ بولا بیٹا وقاص عرف وکی۔“ مجھے بہت زیادہ تفصیلات نہیں معلوم، بس اتنا پتا ہے کہ وہ لوگ تمہارے گھر والوں کی مدد کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ملنے والی اطلاعات اور ثوبیہ کی علیہ سے ہونے والی بات چیت سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وکی سے علیہ کا نکاح ہو گیا تھا۔ وہ بے چارہ بھی ان سب کے ساتھ مارا گیا ہے۔“ فراز ایسے حوالے دے رہا تھا جنہیں جھٹانا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اسے وقاص عرف وکی بھولا نہیں تھا۔ وہی تھا جس نے اسے عرفان اللہ اور یزدانی کی قید سے نکال کر اپنے پاس پناہ دی تھی اور پورے خلوص سے چاہتا تھا کہ وہ اس دلدل سے نکل جائے جس میں اسے زبردستی پھنسا دیا گیا

کچھ صحت سے دیکھیں۔ میں سبک دھان سے
ساتھ دوسرے کمرے میں تھا۔ یہ کسی سے فون پر بات
کر رہے تھے۔ اچانک ہمیں ان کے چیخنے چلانے اور سامان
کے ٹوٹنے پھوٹنے کی آوازیں سنائی دیں تو یہاں آئے اور
پھر یہ میری نظروں کے سامنے ہی اچانک بے ہوش
ہو گئے۔“ اس نے تفصیل بتائی۔

”نروس بریک ڈاؤن۔ لگتا ہے انہیں کوئی بری خبر
سننے کو ملی ہے لیکن فکر کریں کہ کوئی شدید نقصان نہیں ہوا۔
وقت بے ہوشی ہے۔ ابھی ہوش میں آجائیں گے۔“ ڈاکٹر
بولنے کے ساتھ ساتھ اپنا کام بھی کرتا جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر
میں معاذ کسمانے لگا۔

”یہ ہوش میں آ رہے ہیں۔“ کالے خان دیکھ کر خوش
ہو گیا لیکن اگلا ہی لمحہ پریشان کن تھا۔ معاذ نے آنکھیں
کھولنے سے پہلے ہی چیخنا چلانا شروع کر دیا تھا۔

”ابو..... کہاں جا رہے ہیں آپ؟ ہمیں بہت تیز
ہیں۔ سمندر میں آگے نہ جائیں۔ سعد، علیہ! رک جاؤ۔ میں
کہتا ہوں رک جاؤ ورنہ ڈوب جاؤ گے۔“ چیخنے کے ساتھ
ساتھ وہ یوں ہاتھ پیر چلا رہا تھا جیسے کسی کو پکڑنے کی کوشش
کر رہا ہو۔

”مسٹر معاذ! آنکھیں کھول لے۔ آنکھیں کھول کر
دیکھیے۔ یہاں کوئی سمندر نہیں ہے۔“ ڈاکٹر نے اس کے
رخسار تھپتھپاتے ہوئے اسے پکارا تو آخر کار اس نے آنکھیں
کھول دیں لیکن اس کی آنکھوں میں اجنبیت تھی اور خالی
الذہنی کی کیفیت میں یوں اس پاس دیکھ رہا تھا جیسے اپنی
وہاں موجودگی پر حیران ہو۔

”اب آپ کیسا ٹھیک کر رہے ہیں مسٹر معاذ؟“ ڈاکٹر
نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

”میں ٹھیک ہوں۔ مجھے کچھ نہیں ہوا۔ کیا کچھ ہوا
تھا؟“ وہ اٹھ کر بیٹھتے ہوئے ڈاکٹر کی وہاں موجودگی پر حیرت
کا شکار نظر آ رہا تھا۔

”آپ کو تھوڑے سے چکر آ گئے تھے اور آپ نے
ہوش ہو کر گر گئے تھے۔“ ڈاکٹر نے اسے جواب دیا۔

”لیکن کیوں؟ میں بے ہوش کیوں ہوا تھا؟“ وہ الجھا۔
”شاید آپ کو کمزوری ہو گئی ہے یا پھر آپ بہت
زیادہ ذہنی ذباذ کا شکار ہو گئے تھے۔“ ڈاکٹر نے محتاط الفاظ
میں اسے جواب دیا۔

”ذہنی ذباذ..... لیکن کیوں؟“ وہ سوچ میں پڑ گیا
اور پھر یکدم ہی اس کے چہرے کی رنگت متغیر ہو گئی۔

باس مئی دیں۔ مجھے لگا ہے فون پر انہوں نے فون
بہت ہی بری خبر سنی ہے جب ہی خود پر قابو نہیں رکھ پا رہے
ہیں۔“ کالے خان کو نتیجہ اخذ کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔
”لیکن اس طرح تو یہ خود کو اور دوسروں کو نقصان
پہنچا سکتا ہے۔“ مشرا نے اسے تشویش زدہ نظروں سے
دیکھتے ہوئے تبصرہ کیا اور عین اسی وقت معاذ لہرتا ہوا نیچے
گرا۔ اذیت کی انتہا پر کھولتے دماغ کو ریلیف دینے کے
لیے طاری ہونے والی یہ بے ہوشی قدرت کی طرف سے کی
جانے والی مہربانی تھی۔ کالے خان اس کے گرتے ہی دوڑ
کر اس کے قریب پہنچا اور اس کا سر اپنے زانو پر رکھ کر
رخساروں کو تھپتھپاتے ہوئے اسے پکارنے لگا۔ قریب مشرا
بھی آیا لیکن اتنا چوکتا تھا کہ جیسے ڈر ہو کہ معاذ ابھی ہوش میں
آ کر اس پر حملہ کر دے گا۔

”انہیں اٹھا کر بیڈ پر لٹانے میں میری مدد کرو۔“
کالے خان نے جب دیکھا کہ وہ ہوش میں نہیں آ رہا ہے تو
اس نے مشرا سے درخواست کی۔ مشرا بادل ناخواستہ اس ن
مدد کروانے لگا۔ دراز قد اور ورزشی جسم کے مالک معاذ کو اٹھا
کر بستر پر لٹانا ان دونوں کے لیے ایک دشمن کام تھا جو انہوں
نے کسی نہ کسی طور انجام دے ہی لیا۔

”میں ڈاکٹر کو کال کرتا ہوں۔“ ہانپتے ہوئے کالے
خان نے ماتھے پر آیا پسینا صاف کرتے ہوئے کہا تو مشرا
نے جلدی سے اس کی تائید کی اور بولا۔

”جی، جی۔ جلدی سے ڈاکٹر کو بلوائیں۔ ایسا نہ ہو کہ
ہوش میں آ کر اسے دوبارہ دورہ پڑ جائے اور آپ مشکل میں
پڑ جائیں۔ میں تو اب یہاں سے جانے لگا ہوں۔ ایک
پارٹی کو ٹائم دے رکھا ہے۔ دیر سے پہنچا تو میرا لاس
ہو جائے گا۔“ انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ یہاں رکنے
سے خوفزدہ ہے۔

”ٹھیک ہے، تم جاؤ۔“ کالے خان کو بھی پتا تھا کہ
دماغی طور پر بے حد تیز یہ لڑکا حرا جا بزدل ہے اس لیے اسے
اجازت دے دی۔ اس کے جانے کے بعد کالے خان نے
پہلے ڈاکٹر کو کال کی پھر بھرے ہوئے کمرے کو سمیٹنے لگا۔
اس کام کے دوران وہ گاہے گاہے معاذ پر بھی ایک نظر بھری
نظر ڈال لیتا تھا۔ ڈاکٹر کی آمد تک وہ ٹوٹ کر ادھر ادھر بکھر
جانے والی اشیاء کے کلوے سمیٹ چکا تھا لیکن بہر حال کمرہ
اپنی سادہ حالت میں نہیں آیا تھا۔

”کیسے بے ہوش ہوئے ہیں یہ؟“ ڈاکٹر آیا تو معاذ کا
معائنہ کرتے ہوئے کالے خان سے پوچھنے لگا۔

”کیا بات ہے معاذ صاحب؟ کیا ہو گیا ہے؟“
 کالے خان نے اس کی پہنچی ہوئی مٹھیاں دیکھیں اور تیزی سے اس کے قریب بیٹھ کر اس کے گرد اپنا بازو پھیلا دیا۔
 ”سب ختم ہو گیا کالے خان! سب تباہ ہو گیا۔“
 خالوں نے میرے پورے خاندان کو ختم کر دیا۔“
 سہارا پا کر وہ بکھرنے لگا۔ کالے خان نے بے ساختہ اسے سینے سے لگا لیا۔

”مارڈالوں گا میں ان سب کو۔ تباہ و برباد کر دوں گا۔“
 میرے گھر کو اجاڑنے والے اب خود بھی سکھ سے نہیں رہے۔
 ”بہنیں گے۔“ بولتے بولتے اس کا جسم اٹھنے لگا تھا۔ ڈاکٹر نے اس کی یہ کیفیت دیکھی تو تیزی سے ایک انجکشن تیار کر کے اس کے بازو میں لگا دیا۔ دیر دیر سے اس کے جسم کا تناؤ کم ہونے لگا۔ آواز دھیمی ہو کر پستی میں ڈھلی اور پھر معدوم ہو گئی۔ ڈاکٹر کے اشارے پر کالے خان نے اسے آہستہ سے ہٹکے پر لٹا دیا۔

”شدید ڈپریشن ہے۔ ان کی حالت سنہلنے تک بہت زیادہ خیال رکھنا ہوگا۔ بہتر ہوگا کہ کوئی ایسا شخص ان کے ساتھ رہے جس سے انہیں جذباتی سہارا مل سکے۔“ ڈاکٹر نے اس کی کیفیت بیان کرنے کے ساتھ ساتھ تجویز بھی پیش کی۔
 ”میں خیال رکھوں گا ڈاکٹر صاحب!“ کالے خان نے جواب دیا۔ ڈاکٹر کو وہاں سے رخصت کرتے ہوئے اس کے چہرے پر گہری سوچ کے سائے تھے۔

☆☆☆

”معاذ کی تلاش میں کتنے فیصد کامیابی حاصل ہوئی ہے آپ لوگوں کو؟ میں اب تک کی مکمل رپورٹ سننا چاہتی ہوں۔“ سونیا اپنے سامنے موجود دونوں مردوں کے مقابل ٹانگ پر ٹانگ رکھے کرسی پر براجمان مگی اور نہایت سنجیدہ لہجے میں ان سے دریافت کر رہی تھی۔

”ہم اسے مسلسل تلاش کر رہے ہیں۔ اتر پورس، ریلوے اسٹیشن اور لاری گاڑیوں پر ہمارے لوگ پھیلے ہوئے ہیں۔ امید ہے کہ ہم کہیں نہ کہیں اسے ٹریس کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے کیونکہ یہ تو طے ہے کہ وہ دہلی میں ہی ہے۔“

”وہ کیسے؟ آئی مین آپ اس کے دہلی میں ہی موجود ہونے پر اتنے شیور کیسے ہیں؟“ اس نے چونک کر سوال کیا۔

”ہم نے اس کے دوست عالم شاہ کے حوالے سے کام کیا ہے۔ ہمیں شک تھا کہ وہ عالم شاہ اور اس کے ملازم کی آزادی کے سلسلے میں کچھ ہاتھ پاؤں چلا سکتا ہے۔“

”انٹر سٹنگ..... تو پھر کیا نتیجہ نکلا؟“ وہ کرسی پر سیدھی

ہو کر بیٹھی۔
 ”عالم شاہ کے آس پاس تو ہمیں اس کی موجودگی کے نشانات نہیں ملے لیکن ابھی حال ہی میں ہونے والے ایک واقعے نے ہماری توجہ کھینچ کر ہمیں معاذ کی ایک جھلک دکھادی۔“

”کہاں؟ کیسے؟“ وہ بے چین ہوئی۔

”عالم شاہ کی بہن جس کا نکاح اس کے کزن فیصل

سے ہوا تھا، اچانک ہی اسپتال سے اپنے بچے سمیت غائب ہو گئی۔ اس کے غائب ہونے پر اس کے شوہر اور سسرال والوں نے واویلا مچایا تو پولیس نے انکوائری کی اور آخر ایک ایسی فوج حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی جس میں ایک ڈاکٹر کو ہسپتال کے زور پر لڑکی اور اس کے بچے کو اسپتال سے باہر لے جاتے ہوئے صاف دیکھا جاسکتا ہے۔ ہم نے اس فوج کا تجزیہ کیا تو پتا چلا کہ ڈاکٹر کے بہرہ دہ میں وہ معاذ تھا۔“

”آر یو شیور؟“ وہ رپورٹ سن کر حیران ہوئی۔

”یس میم! ہمیں ٹائٹلی پرسنٹ سے زیادہ دشواری

ہے کہ وہ معاذ ہی تھا۔ پولیس کی چھان بین سے بھی ثابت ہو گیا ہے کہ فوج میں نظر آنے والا ڈاکٹر اسپتال کے عملے میں شامل ہی نہیں تھا۔“

”لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معاذ نے اس لڑکی کو اغوا کیوں کیا؟ اسے کچھ کرنا تھا تو اپنے دوست کی آزادی کے لیے کرتا۔“ اس نے اعتراض کیا۔

”ہم نے اس پر درک کیا ہے میم! کھوج لگانے سے پتا چلا ہے کہ اس لڑکی کل کے سسرال والوں کا اس کے ساتھ برتاؤ ٹھیک نہیں تھا۔ یہاں تک معلوم پڑا ہے کہ اس کے ساتھ مار پیٹ کی گئی تھی جس کی وجہ سے وہ زخمی ہو گئی تھی لیکن جھوٹا بہانہ بنایا گیا کہ وہ میز میوں سے گر کر زخمی ہوئی ہے۔“

”ہمارا اندازہ ہے میم کہ معاذ نے کل کو اغوا نہیں کیا بلکہ اسے اس کے سسرالی ظلم سے بچایا ہے۔“ دوسرے نے پہلے والے کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بتایا۔

”اس کا تو ایک ہی مطلب ہے کہ معاذ کو یہاں کوئی مضبوط سپورٹ حاصل ہے۔ اس کے پاس کوئی محفوظ ٹھکانا ہوگا تب ہی تو وہ اس لڑکی کو اپنے ساتھ لے کر گیا ہے۔“

”بالکل میم! یہ پوائنٹ تو شروع سے ہمارے ذہنوں میں ہے۔ اگر اس کے پاس سپورٹ نہیں ہوتی تو وہ یہاں سروائیو کیسے کرتا؟ جس طرح وہ سارے انتقامات کے ساتھ سہاگش کے گھر میں گھسا اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس کے پاس کوئی مضبوط سپورٹ ہے لیکن ہم ابھی تک اسے

موت کے منہ میں گراتے ہوئے نہیں کاٹتا تھا، معاذ کو کچھ ہو جانے کے خیال سے سہم سا جاتا تھا۔
 ”میرے اندر کی عورت آخر کیوں جاگ گئی ہے۔
 میں عورت کے بجائے اس شیطانی سسٹم کا ایک پرزہ ہی بنی رہتی تو اچھا تھا۔“ اپنی اس کیفیت پر خود ہی جھنجھلائی وہ کمری سے اٹھ کر کھڑکی تک گئی اور وہاں سے نیچے جھانکنے لگی۔ نیچے سڑک پر گاڑیوں کا سبیل رواں بہہ رہا تھا۔

”ممکن ہے ان گاڑیوں میں سے کسی ایک میں وہ بھی سفر کر رہا ہو۔“ اس کے ذہن میں خیال آیا تو ساتھ ہی وہ واقعہ بھی یاد آ گیا جب اسے ایک گزرتی گاڑی میں معاذ کی موجودگی کا گمان ہوا تھا۔ وہ اس گاڑی کا پیچھا کرنا چاہتی تھی لیکن سہاش نے معاذ کے دکھائی دینے کو اس کی نظر کا دھوکا اور الوڈن قرار دے کر اس کا ساتھ نہیں دیا تھا اور نتیجتاً اپنی زندگی گنوا بیٹھا تھا۔

”کہاں ہو معاذ! ایک بار میرے سامنے آ جاؤ تاکہ میں تمہیں ان سب سے چھپا دوں۔“ زیر لب اسے پکارا تو یوں لگا کہ کوئی دراز قامت سایہ اس کے پہلو میں اکھڑا ہوا ہے۔ یہ سایہ کچھ عرصے سے اس کے ساتھ ساتھ رہنے لگا تھا اور جب سے ایسا ہونے لگا تھا، اس کے لیے وہ دنیا اجنبی ہوتی جا رہی تھی جس کو وہ اب تک جیتی آتی تھی۔ یہ تبدیلی اور اس کا انجام بھی اسے خوفزدہ کر دیتا تھا لیکن وہ اس تبدیلی کو اپنے لئے روکنے پر قادر نہیں تھی۔

☆☆☆

گلاب تار کی بے اجالے کا سفر طے کرتے ہوئے اس کی حس شہوانت نے ایک اتھوڑی خوشبو کو موصول کیا تو وہ چونک گیا۔ یہ خوشبو..... خوشبو دنیا میں سب سے الگ تھی۔ اس لیے ذہن میں سوال ابھرتے ہی جواب بھی حاضر ہو گیا۔

”نجل.....!“ اس نے ایک جھٹکے سے پوچھیں کھولیں تو اسے اپنے بے حد قریب پایا۔ وہ اس کے بستر کے بالکل قریب کھڑی اس کے جسم پر پھیلی چادر کو شیک کر رہی تھی۔
 ”آپ یہاں کیسے نجل.....؟“ حیرت سے سوال کیا۔
 ”آپ کی طبیعت کی خرابی کی اطلاع ملی تو چلی آئی۔ اب کیسا محسوس کر رہے ہیں آپ؟“ اس نے نرمی سے جواب دیتے ہوئے اس کی خیریت دریافت کی اور غیر محسوس طور پر بستر سے دور ہٹ کر کرسی پر جا بیٹھی۔

”میں.....“ اس نے نجل کے سوال کا جواب دینا چاہا تو پہلی بار اپنے منہ اور حلق میں گلی کڑواہٹ کا احساس ہوا

پناہ دینے والے کو تلاش نہیں کر پائے ہیں۔ ہم نے اس پوائنٹ پر بھی کام کیا ہے کہ اس کے کوئی رشتے دار یا دوست وغیرہ یہاں رہتے ہوں لیکن ایسا کوئی کلیو نہیں ملا ہے۔ اب ہمارے پاس بس ایک آس رہ گئی ہے۔“
 ”وہ کیا؟“ ایک ایک لفظ بغور سنتی سونیا نے فوراً سوال کیا۔

”نجل نامی اس لڑکی کے سر میں ٹیومر ہے تو آئی ہوپ وہ لوگ اس کے علاج کے لیے اسی ڈاکٹر یا کسی دوسرے نیوروسرجن سے کونٹیکٹ کریں گے۔ اس وقت ہم دہلی کے تمام اچھے نیوروسرجنز پر فوکس کیے ہوئے ہیں۔ جیسے ہی انہوں نے ان میں سے کسی سے کونٹیکٹ کیا، ہمیں خبر مل جائے گی۔“

”گڈ! یہ اچھا قدم ہے لیکن ہم صرف اسی پر ڈیپنڈ نہیں کر سکتے۔“ سونیا نے ان کی کوشش کو سراہنے کے ساتھ ساتھ متنبہ بھی کیا۔

”آئی ٹیومم! اس کے علاوہ ہم جو دوسرا اسٹیپ لینے جا رہے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم معاذ کی تصویریں پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے ہر طرف پھیلا دیں گے۔ جتنا سے کہا جائے گا کہ یہ شخص خطرناک ذہنی مریض ہے جو کسی کو بھی، کسی سے نشانہ بنا سکتا ہے۔ اتنی عوام میں سے کہیں تو کوئی اسے پہچان کر ہمیں خبر دے گا۔“ اس کی دوسری تجویز کو سن کر سونیا کانپ گئی اور فوراً بولی۔

”نہیں۔ تم لوگ ایسا نہیں کر دو گے۔“
 ”وہ کیوں میم؟“

”احقو.....! وہ میرے ساتھ انڈیا آیا تھا اور میرے ساتھ مل کر یہاں کارروائیاں بھی کی تھیں۔ ذرا سوچو کہ وہ سب لوگ جو اس عرصے میں کسی نہ کسی طور متاثر ہوئے تھے، اگر اس کو پہچان کر ہمارے پیچھے چلے آئے تو ہمارے لیے نئی مصیبت نہیں کھڑی ہو جائے گی کیا؟“ اس نے انہیں ڈپٹا۔
 ”سوری میم! اس بارے میں تو ہم نے سوچا ہی نہیں تھا۔“ جلدی سے معذرت کی گئی۔

”اٹس اوکے۔ ابھی تم لوگ جاؤ۔ میں سوچ کر بتاؤں گی کہ آگے کے لیے کیا پلان ہے۔“ اس نے انہیں چلتا کیا لیکن خود اس کا ذہن سوچوں سے آزاد نہ ہو سکا۔ اسے معلوم تھا کہ معاذ ہاتھ آ گیا تو اس کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا جائے گا اور پتا نہیں ایسا کیوں تھا کہ وہ اس کے ساتھ کچھ برا ہونے کا سوچتی تو اس کا دل ڈوبنے لگتا تھا۔ وہ دل جو بھی بہت سخت ہوا کرتا تھا اور کئی کئی لوگوں کو ایک ساتھ

ساتھ آپ کا غم بانٹ سکتے ہیں۔ میں اور خان بھائی بھی یہی کوشش کر رہے ہیں۔“

”میں جانتا ہوں لیکن اس وقت مجھے خود پر قابو نہیں ہے۔“ وہ اس کے ٹوکے پر شرمندہ سا ہو گیا۔

”کوئی بات نہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ جس نے درد دیا ہے، وہ اس درد کا مداوا بھی ضرور کرے گا۔“ اس نے سوپ کے پیالے کا ڈھکن ہٹاتے ہوئے بڑے یقین سے کہا۔

”مداوا تو اب بس صرف اسی ایک صورت میں ہو سکے گا کہ میں اپنے پیاروں کے قتل میں ملوث ہر شخص کو جہنم واصل کر ڈالوں۔“ اس کے چہرے پر شدید نفرت جھلکی۔

”اس کام کے لیے تو آپ کو بہت سی توانائی درکار ہوگی۔ کھاپی کر جان بنائیے تاکہ آپ کی جان اس بستر سے چھوٹے۔“ سوپ کی کچھ مقدار ایک چھوٹے پیالے میں چھل کرتے ہوئے اس نے نرمی سے سمجھایا اور پیالے میں چمچ رکھتے ہوئے اسے اس کی طرف بڑھایا لیکن وہ ویسے ہی بیٹھا رہا۔

”پلیز، لیجیے نا۔ بہت خلوص سے آپ کے لیے بنایا ہے۔“ اس نے اصرار کیا تو وہ مزید انکار نہیں کر سکا۔ جو چلے گئے تھے، ان کے غم میں وہ اسے مایوس نہیں کر سکتا تھا جو اس کا غم بانٹنے کے لیے بنا کسی رشتے کے یہاں تک چلی آئی تھی۔

”اعظم کہاں ہے؟ اسے ساتھ نہیں لائیں؟“ اس نے ایک بار پھر خود پر سے دھیان ہٹانے کی کوشش کی۔

”وہ بیمار تھا۔ میں شلیا کو ہدایت دے آئی ہوں۔ اٹھے گا تو وہ اسے سنبھال لے گی۔“ اس نے معاذ کے سوال کا جواب دیا پھر آہستہ سے ٹوکا۔

”پلیز! لیجیے نا۔ ٹھنڈا ہو گیا تو بد مزہ ہو جائے گا۔“

”جی، لے رہا ہوں۔“ معاذ نے ایک گہرا سانس لیا اور سوپ سے بھرا چمچ منہ کی طرف لے گیا۔ خوراک کا پہلا چمچ منہ میں گیا تو اسے احساس ہوا کہ اس کا پیٹ بالکل خالی تھا۔

”کیسا ہے سوپ؟“ سبھل کو نہ تو اتنی باتیں کرنے کی عادت تھی اور نہ ہی وہ کسی سے اس قدر بے تکلف ہوتی تھی لیکن معاذ کا غم بانٹنے کی دلی خواہش اسے بولتے رہنے پر مجبور کر رہی تھی۔

”اس سوپ کو پی کر مجھے اپنی امی کی یاد آگئی۔ ان کے ہاتھ میں بے حد ذائقہ تھا۔ جو بھی بناتی تھیں، لا جواب ہوتا تھا۔ بریانی بنانے میں تو ان کا کوئی ثانی ہی نہیں تھا۔“ اسے کتنا ہی بہلانے کی کوشش کی جاتی لیکن اس وقت صورت حال یہ تھی کہ انہوں کے چہرے مسلسل اس کی نظروں کے سامنے گھوم رہے تھے۔

اور ساتھ ہی ایک جھماکے سے وہ سب یاد آ گیا جس نے اسے ہوش و خرد سے بیگانہ کر دیا تھا۔

”آپ جس تکلیف سے گزر رہے ہیں، اس کے سامنے دنیا کے سارے الفاظ بیچ ہیں۔ اس لیے میں صرف یہ کہوں گی کہ جو ہوا اس پر مجھے بے حد افسوس ہے۔“ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں پھنسائے وہ جو کچھ کہہ رہی تھی وہ محض رسمی الفاظ نہیں ہیں، اسے سمجھانے کے لیے اس کی آنکھوں میں جھللاتے آنسو کافی تھے۔ معاذ نے ایک نظر اس کی غم آنکھوں کو دیکھا اور سر جھکا لیا۔ یہ صرف اس کی موجودگی کا اعجاز تھا کہ اس بار اس کے غم نے جنون کی شکل اختیار نہیں کی تھی لیکن درد تو تھا اور بے حد تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس درد کی شدت اس کی ایک ایک رگ کو کاٹتی جا رہی ہو۔

”آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آپ کو آرام کرنا چاہیے تھا۔ یہاں کیوں چلی آئیں؟“ جسم و جاں میں اتنی بے قراری تھی کہ دل چاہتا تھا کہ بیان چاک کر کے دیوانوں کی طرح چٹخیں مارتا سڑکوں پر بھاگتا پھرے۔ اپنے اس جنون سے گھبرا کر ہی اس نے خود پر سے توجہ ہٹا کر اس کی طرف مبذول کی۔

”میں ٹھیک ہوں اور آرام کر کر کے تھک چکی ہوں۔ اس لیے آپ اس بات کے لیے قطعی پریشان نہ ہوں کہ یہاں آنے سے مجھے کوئی تکلیف یا زحمت پہنچی ہے۔“ اسے نہایت رمان سے جواب دے کر وہ دروازہ کھلنے کی آواز پر اس طرف متوجہ ہوئی۔ کالے خان ٹرائی دھکیلا اندر آ رہا تھا۔

”کیا لائے ہیں خان بھائی؟“

”معاذ صاحب کے لیے سوپ اور آپ کے لیے چائے اور ہلکے پھلکے اسٹیکس ہیں۔“ کالے خان نے مسکرا کر جواب دیا۔

”لے جاؤ یہ سوپ۔ مجھے کچھ نہیں کھانا پینا ہے۔“ معاذ نے روکھے لہجے میں اسے حکم دیا۔

”آپ بہت دیر سے بھوکے ہیں۔ آپ نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ پلیز! یہ تھوڑا سا سوپ لے لیں تاکہ آپ کو دوا دی جاسکے۔“ کالے خان نے ہاتھی لہجے میں اسے سمجھایا۔

”کون سی دوا.....؟ کون سی دوا دو گے تم مجھے جس سے میرے غم کا علاج ہو جائے۔ کیا اس دنیا میں آج تک ایسی کوئی دوا ایجاد ہوئی ہے؟“ وہ کالے خان پر پھٹ پڑا۔ سبھل نے اس کا یہ انداز ملاحظہ کیا اور کالے خان کو چپکے سے چلے جانے کا اشارہ کیا۔

”انسان غم کا علاج نہیں کر سکتے۔ وہ صرف آپ کے

معاذ کی آنکھوں میں بولتے جذبے اور خاموشی میں تپتی داستان سے پہلے ہی ڈر لگتا تھا۔ آج اس کے الفاظ سے بھی اس کی شدتیں جھٹک پڑیں تو کچھ اور بھی خائف ہو گئی لیکن لہجے سے کچھ ظاہر کیے بغیر سنجیدہ اور سپاٹ لہجے میں اسے ٹوک ڈالا۔

”آئندہ ایسا کوئی فریضہ ادا کرنے کی کوشش مت کیجیے گا۔ آپ کو اندازہ نہیں لیکن مجھے معلوم ہے کہ ان حالات میں بچے چپے چپے پر آپ کی تلاش جاری ہوگی۔ اگر آپ پکڑی گئیں تو اب تک کی ساری بھاگ دوڑ رائیگاں چلی جائے گی اور ایسا میں ہونے نہیں دوں گا۔“ سبیل کے لہجے کی بیگانگی اسے بری طرح چبھی تھی اس لیے خود بھی سبیل سے بولتا چلا گیا۔

”آپ میرے ساتھ آئیے سبیل بی بی! میں خود آپ کو آپ کی قیام گاہ تک چھوڑ کر آتا ہوں۔“ کالے خان نے یہ صورت حال دیکھی تو خود درمیان میں دخل دے بیٹھا۔

”جی بالکل، چلیے۔“ اس نے فوراً اپنے قدم دروازے کی طرف بڑھائے۔

”اپنا خیال رکھیے گا سبیل!“ معاذ بے ساختہ ہی پیچھے سے پکارا تو وہ ہل بھر کو ٹھٹک کر رکی پھر سر کو اثبات میں جنبش دیتی ہوئی باہر نکل گئی۔

”میں بھی جا رہا ہوں۔ کب تک واپسی ہوگی، کہہ نہیں سکتا لیکن تم جتنی جلدی ممکن ہو سکے، میرا ایک کام کروینا۔“ اس نے کالے خان کو کام کی نوعیت سے آگاہ کیا۔

”ٹھیک ہے۔ پہلے میں سبیل صاحبہ کو ڈراپ کر دوں، پھر آپ کا کام دیکھوں گا۔“ کالے خان نے گواہی انکار نہیں کیا تھا لیکن اس کے لہجے سے ظاہر تھا کہ وہ بھی اس کے روتے سے تھوڑا سا ہرٹ ہوا ہے۔

”زندگی پہلے ہی خفا ہے یار! اب تم تو خفا نہ ہو۔“ اس نے بے ساختہ ہی کالے خان کے بازو پر ہاتھ رکھ کر محبت سے کہا تو وہ مسکرا دیا اور دھیرے سے اس کا ہاتھ چپک چپک باہر نکل گیا۔

☆☆☆

”اس کو کیا ہوا ہے؟“ اس کے سینے میں ایسی آگ جل رہی تھی کہ ایسے لگتا تھا سانسے آنے والے ہر دھن کو ادھیڑ کر رکھ دے گا۔ دل میں نفرت کا ایک طوفان لیے ہی وہ دیوار کی طرف گیا تھا اور جاتے کے ساتھ موہن سے ملاقات کی خواہش کی تھی لیکن اس سے سامنا ہونے پر بری طرح ٹھٹک گیا تھا۔ وہ اس حالت میں بستر پر لیٹا ہوا تھا کہ اس

”ماں کی توبہ ہی دنیا میں سب سے جدا ہوتی ہے۔“ ماں کی صورت دیکھ کر ہی دل میں ٹھنڈک پڑ جاتی ہے۔ میں بھی شدت سے اس دن کی خطر ہوں جب پاکستان واپس جاؤں گی اور اپنی اماں سائیں سے ملوں گی۔“

”ان شاء اللہ وہ دن بہت جلد آئے گا۔ میں پوری کوشش کر رہا ہوں عالم اور سرمد قید سے آزاد ہو جائیں تاکہ آپ کے چہروں میں پڑی نا دیدہ زنجیریں ٹوٹ سکیں۔“ اس کے جواب سے ظاہر تھا کہ سبیل اس کی توجہ پلٹانے کی کوشش میں کامیاب ہو چکی ہے۔

”مجھے بہت ضروری ایک جگہ پہنچنا ہے۔“ اسے یاد آ گیا تھا کہ دیوار کے ہاں راکا موہن مہمان تھا۔

”لیکن آپ کی طبیعت؟“ سبیل نے اسے جلدی جلدی سوچ ختم کرتے دیکھ کر ٹوکا۔

”میرے مرض کا اب ایک ہی علاج ہے۔ اپنے ان دشمنوں کو نیست و نابود کر ڈالنا جنہوں نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا ہے۔ میں اب جیوں گا تو صرف اس لیے کہ مجھے ان پر جینا حرام کرنا ہے۔“ اس کے لہجے میں ایسا عزم اور اٹل پن تھا کہ سبیل کی کچھ کہنے کی ہمت نہ ہو سکی۔

”کالے خان.....!“ سوپ کا پیالہ خالی کر کے ٹرالی میں واپس رکھتے ہوئے اس نے کالے خان کو پکارا اور خود بستر چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ سبیل بھی مضطرب سی کھڑی ہو گئی۔ چادر کے نقاب سے جھانکتی اس کی آنکھوں سے ظاہر تھا کہ وہ اس موقع پر کچھ کہنے کی خواہش رکھتی ہے لیکن کہنے کی ہمت نہیں کر پاتی۔

”انہیں ان کی رہائش گاہ پر چھوڑ آؤ اور خیال رکھنا کہ آئندہ کسی انتہائی ضرورت کے بغیر انہیں وہاں سے باہر نہ نکلتا پڑے۔ ان کا تحفظ میری جان سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ انہیں کوئی نقصان پہنچا تو میں کسی اور کو تو کیا، خود کو بھی معاف نہیں کروں گا۔“ کالے خان کی آمد کے ساتھ اس نے اسے جو ہدایات دینی شروع کیں، ان میں سخت تنبیہ تھی۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ کالے خان نے اسے سنبھالنے کی خاطر سبیل کو یہاں بلوایا تھا اور یہ سچ تھا کہ سبیل کی موجودگی نے اسے بے حد سنبھالا دیا تھا لیکن وہ یہ کیسے گوارا کرتا کہ کسی بھی وجہ سے اس کا تحفظ خطرے میں پڑ جائے۔

”آپ میرے لیے اتنے پریشان نہ ہوں۔ نہ ہی خان بھائی کو کچھ کہیں۔ انہوں نے تو مجھے صرف آپ کے گھر والوں کے بارے میں اطلاع دی تھی۔ یہاں آنے کا فیصلہ میں نے ایک اخلاقی فریضہ سمجھتے ہوئے خود کیا تھا۔“ اسے

رخساروں کو تھپتھپا کر اسے دھیمی آواز میں پکارا لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا تو اندر کے غصے کو باہر نکلنے کا راستہ مل گیا۔

”موہن.....!“ بلند اور سخت لہجے میں پکارنے کے ساتھ ہی اس نے پوری قوت سے موہن کے دائیں رخسار پر ایک تھپڑ جڑ دیا۔ وہ ہڑبڑا کر جاگا اور بے ساختہ ہی اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی لیکن بستر سے بندھے ہوئے ہاتھ جیروں کی وجہ سے وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔

”موہن.....!“ اس بار معاذ نے اسے ایک خاص ردھم سے پکارا اور بستر پر ذرا سا جھکتے ہوئے اپنی آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑ دیں۔ موہن عجیب کھوئی کھوئی سی نظروں سے اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ اس کے آگے کا مرحلہ معاذ کے لیے زیادہ دشوار نہیں تھا۔ فیضو کے سکھائے ہوئے علم کی مدد سے اس نے ”را“ کے ایک اہم اہلکار کو زبان کھولنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ممکن تھا کہ موہن کھل ہوش میں ہوتا تو اسے یہ کامیابی حاصل نہ ہوتی لیکن نیند کی گولیوں کے زیر اثر وہ ایسی حالت میں پھنس گیا تھا کہ معاذ کی آنکھوں سے نکلتی مقناطیسی لہروں کی کشش کے مقابلے میں کوئی مزاحمت کرنے کے لائق نہیں تھا۔ معاذ اس سے جو سوالات کرتا گیا، وہ بلا تامل ان کے جوابات دیتا چلا گیا۔ ہر ضروری سوال کرنے کے بعد اس نے موہن کو پرسکون نیند سو جانے کی تاکید کی اور خود تھکا تھکا سا ایک کرسی پر گرنے کے بعد از میں بیٹھ گیا۔ اس وقت اس کے دماغ کی حالت اچھی نہیں تھی۔

”مجھ سے جانے کیوں کو تباہی ہو جاتی ہے۔ اگر فیضو چاچا کی ہدایت کے مطابق روزانہ بلاناغہ ستارہ بینی کی مشق کرتا رہوں تو ایسے مواقع پر میزبانہ حال نہ ہو۔“ اس نے اپنی حالت محسوس کر کے خود کو گھر کا لیکن حقیقت یہ تھی کہ مستقبل میں بھی پابندی سے مشق کرنے کے امکانات کم ہی تھے۔ اس کی متحرک اور مشکل پسند فطرت ایسی آسانیوں کی طرف مشکل ہی سے جاتی تھی۔ وہ عمل کا بندہ تھا اس لیے پراسرار علوم سے زیادہ اپنے قوت ستون باز و پری انحصار پسند کرتا تھا۔

☆☆☆

”کہاں بھگایا ہے کل کو؟ کون تھا وہ جو اسے اسپتال سے نکال کر لے گیا؟“ گھر کی بیٹھک میں عدالت جیجی تھی اور فردوس اس عدالت کے روبرو کھڑی اپنے شوہر کو خود پر چننا چلاتا دیکھ رہی تھی۔

”آپ مجھ پر اتنا بڑا الزام کس بنیاد پر لگا رہے ہیں؟ آپ جانتے ہیں کہ کل کو اغوا کیا گیا ہے اور میں تو اس دن

کے ہاتھ جیروں پر پلا سٹر چڑھا ہوا تھا اور چہرے پر بھی زخم دکھائی دے رہے تھے۔“

”بھائی کی کوشش میں اوپر سے گر کر ہاتھ جیروں پر دیا۔“ دیوانے مختصر اس کے سوال کا جواب دیا۔ چہرے سے بھی وہ کچھ ناخوش دکھائی دیتا تھا۔

”کوئی کام کی بات بتائی اس نے؟“ معاذ نے اس کے چہرے کے تاثرات کو نوٹ کیا اور سنجیدگی سے پوچھا۔

”بڑا ڈھیٹ بندہ ہے۔ ہم سمجھتے تھے جتنی کا دیوانہ ہے۔ اسے بچانے کی خاطر زبان کھول دے گا لیکن سارے نے صاف جواب دے دیا کہ چاہے میری اور میری جتنی کی چھری اور میز دو، تمہاری بات نہیں مانوں گا۔“

”بیوی کہاں ہے اس کی؟“

”وہیں اپنے گھر میں۔ ہماری دو ٹریڈ مورتیں سائے کی طرح اس کے ساتھ ہیں۔ آس پاس میں مشہور کر دیا ہے کہ اس کی موسیٰ کی لڑکیاں ہیں اور کچھ دن رکنے کے لیے آئی ہیں۔ دفتر والوں کو یہی اطلاع ہے کہ موہن بانک سے گر کر زخمی ہے اس لیے چھٹی پر ہے۔ موبائل بھی حادثے میں خراب ہونے کا بہانہ بنایا ہے۔“

”ہم.....“ معاذ نے ساری تفصیل سن کر ایک پُرسوج بھکارا بھرا پھر بستر پر آنکھیں بند کچے لیٹے ہوئے موہن کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ابھی یہ اٹھانے سے اٹھ جائے گا؟ میرا مطلب ہے بے ہوشی کی تو کوئی دوا نہیں دے رکھی ہے؟“

”بے ہوش نہیں ہے، بس نیند کی دوا دے رکھی ہے۔ ایک اٹنے ہاتھ کا دیں گے تو آنکھیں کھول دے گا۔“

”اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں اکیلے میں اس کی زبان کھلوانے کی ایک کوشش کرنا چاہتا ہوں۔“ اس نے دیوانے سے فرمائش کی۔

”اعتراض کیسا۔ اصل میں تو یہ تمہارا فرائض ہے۔

ہماری سیٹنی کا دھیان کرتے ہوئے تم جیسے چاہو، اس کیس کو منڈل کر سکتے ہو۔“ دیوانے خوش دلی سے اسے جواب دیا

اور وہاں موجود اپنے دونوں بندوں کو ساتھ آنے کا اشارہ کرتے ہوئے باہر نکل گیا۔ ان لوگوں کے باہر چلے جانے کے بعد معاذ نے سب سے پہلے اس کمرے کا دروازہ اندر سے بند کیا پھر کمرے کی موجودگی کا اندازہ لگانے کے لیے

پورے کمرے میں نظریں دوڑائیں۔ کسی خفیہ کمرے کی موجودگی کے آثار نہ پا کر وہ موہن کی طرف متوجہ ہوا۔

”موہن..... موہن۔“ پہلے اس نے موہن کے

سرے سے اسپتال ہی نہیں گئی تھی۔“ فردوس کے لیے یہ باز پرس غیر متوقع نہیں تھی اس لیے بڑے اعتماد سے جلیل کے سوال کا جواب دیا۔

”ہمیں بچہ مت سمجھو فردوس! ہم اتنے بے وقوف نہیں ہیں کہ یہ بات نہ سمجھ سکیں کہ اس روز تم جان بوجھ کر اسپتال نہیں گئی تھیں۔“ اس بار جلیل نے تفتیش میں حصہ ڈالا اور جلیل کے لگائے گئے الزام کو درست ثابت کرنے کے لیے دلیل دی۔ الزام تراشی ان کے انداز میں بھی تھی لیکن فرق صرف یہ تھا کہ وہ جلیل کی طرح چیخنے چلانے کے بجائے سرد لہجے میں گفتگو کر رہے تھے۔

”ڈیوٹی چارٹ میں اپنی مرضی سے ترتیب نہیں دیتی۔ آپ جس سے چاہے پوچھ سکتے ہیں کہ اس دن میری ڈیوٹی نہ ہونے میں میرا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔“ اس نے خود کو ہر سوال کے جواب کے لیے تیار کر رکھا تھا۔

”آپ تو ڈیوٹی کے بغیر بھی اس کے بستر کی پٹی سے لگی بیٹھی رہتی تھیں پھر اس دن ایسا کیا تھا کہ آپ اپنی لاڈلی کی حصار داری کے لیے اسپتال جانے کے بجائے گھر میں بیٹھی رہیں۔“ اس کا جواب سن کر فیصل نے حیران لہجے میں طنز کا تیر چلایا۔

”پہلے اس کی حالت زیادہ خراب تھی اس لیے میں اسے فل ٹائم دے رہی تھی۔ بعد میں وہ کچھ بہتر ہو گئی تو میں نے ضروری سمجھا کہ کچھ وقت اپنی بچیوں پر بھی صرف کروں۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ صرف اسی دن ہی نہیں بلکہ اس سے پہلے ہی سے میں نے سب کی دیکھ بھال کی ذمہ داری صبیحہ آپا سے بانٹ لی تھی اور یہ اتفاق ہی تھا کہ جس وقت یہ واقعہ پیش آیا، سب کے پاس صبیحہ آپا ٹھہری ہوئی تھیں۔“

”کیا یہ بھی اتفاق تھا کہ تم نے عین اسی دن اعظم کو سب سے ملاقات کے لیے لے جانے کی ذمہ داری اجالا کو سونپی اور اغوا کار کو سب سے سب سے اسپتال سے لے جانے کا موقع مل گیا؟“ جلیل اور فیصل کے لہجے کی تندہ اتنی خطرناک نہیں تھی جتنا خوف وہ گھٹیل کے سرد و سپاٹ لہجے اور وجود میں اتر جانے والی نظروں سے محسوس کر رہی تھی۔

”آخر میں سب کو کیوں اور کس لیے اغوا کرواؤں گی؟ اس سے مجھے حاصل ہی کیا ہے؟“ اس نے اپنے خوف کو جھنجھلاہٹ کے پردے میں چھپانے کی کوشش کی اور اس کوشش میں اس کی آواز قدرے بلند ہو گئی۔

”تمیز سے بات کرو جاہل عورت! کیا تمہیں ہوش

نہیں ہے کہ تم کس سے بات کر رہی ہو؟“ جلیل کو تو اسے بے عزت کرنے کا موقع چاہیے ہوتا تھا۔

”سوری! میرا مقصد گھٹیل بھائی سے بدتمیزی کرنا نہیں تھا لیکن خود پر لگائے گئے غلط الزام پر احتجاج کرنا تو میرا حق بنتا ہے نا؟“ اس کی آواز فوراً پست ہو گئی لیکن اپنا دفاع کرنا بہر حال وہ نہیں بھولی۔

”حفظ مرا تب کوئی الحال جانے دو جلیل اور مجھے اپنی بیگم سے یہ سوال پوچھنے دو کہ کیا اس دن اعظم کو اجالا کے ساتھ اسپتال بھیجتا بھی محض اتفاق ہی تھا؟“ جلیل کسی صورت جواب حاصل کیے بغیر اسے بخشنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

”اگر آپ اس اتفاق کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو پھر اجالا اور صبیحہ آپا سے جا کر پوچھیے کہ جب وہ سب کی حصار داری کے لیے اسپتال میں موجود تھیں تو اسے چھوڑ کر کنیشن میں بیٹھی دعوت کیوں اڑا رہی تھیں۔ ان کا بھی فرض تھا کہ اس کے ساتھ ساتھ ہی رہیں۔“ اس کے چہرے کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ اسے ان بھائیوں کی عدالت میں کھڑے ہو کر جواب دینا قطعی پسند نہیں آ رہا تھا۔

”بکواس کرتی ہے جاہل عورت! الزام لگاتی ہے میری بہنوں پر۔“ اس کے صاف جواب نے جلیل کو ایک بار پھر ہنسنے سے اکھاڑ دیا اور وہ اس کے بال اپنی منہمی میں جکڑ کر اسے بری طرح جھٹکنے دینے لگا۔

”میں کسی پر کوئی الزام نہیں لگا رہی۔ میں صرف اپنی پوزیشن کلیئر کر رہی ہوں۔ آپ خود ہی بتائیں کہ اگر اجالا اور صبیحہ آپا، سب کے ساتھ رہیں تو کیا وہ سب اتنی آسانی سے ہو سکتا تھا، جو ہوا؟ کیا آپ کو ان دونوں کے منظر سے غائب ہو جانے میں بھی میرا کوئی کردار نظر آ رہا ہے؟“ تکلیف کے باوجود اس نے اپنا مقدمہ لڑنا جاری رکھا۔

”تم کچھ بھی کہو فردوس! مجھے معاملہ اتنا سیدھا دکھائی نہیں دے رہا۔ سب کے اس طرح غائب ہو جانے میں تمہارا کوئی کردار ہو یا نہیں مگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ تمہیں کچھ نہ کچھ علم ضرور ہے اور میں تم سے وہ کچھ نہ کچھ جانا چاہتا ہوں۔“

”آپ ایک بالکل بے بنیاد بات کر رہے ہیں۔“ اس نے گھٹیل کی اندر تک اتر جانے والی نظروں سے آنکھیں چرائیں اور جلیل سے مخاطب ہو کر بولی۔

”پلیز! میرے بال چھوڑ دیں۔ مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔“

”اگر تو نے گھٹیل بھائی کے سوالوں کا سیدھا

جواب نہیں دیا تو میں تیری کھال بھی اتار سکتا ہوں۔“
جلیل نے بڑی بے دردی سے اس کے بالوں کو ایک اور
زوردار جھٹکا دیا۔

”بات کو سمجھو فردوس! تم اس خاندان کی بہو ہو اور
خاندان کے مفادات کا خیال رکھنا تمہارا فرض ہے۔ سبیل کے
اس طرح غائب ہونے سے ہمارے لیے مسائل بڑھ
جائیں گے۔ ابھی تو میں نے کسی نہ کسی طرح پولیس والوں کو
گھر کی عورتوں سے دور رکھا ہوا ہے لیکن اگر انہیں شک ہو گیا
کہ اس معاملے میں گھر کی کوئی عورت شامل ہے تو وہ کسی
رعایت سے کام نہیں لیں گے۔ تم نے فلموں میں پولیس کے
مجرموں پر تشدد کے جتنے سین دیکھے ہوں گے، انہیں کم سے کم
چار سے ضرب دوگی تو اصل حالات کو سمجھ سکو گی۔ پولیس
والوں کے مارچ کو برداشت کرنا عادی مجرموں کے لیے بھی
آسان نہیں ہوتا، تم تو پھر ایک کمزور عورت ہو۔“ جلیل کے
لمحہ فہم سے مکمل چشم پوشی کرتے ہوئے جلیل نے اسے
سمجھانے بلکہ کسی حد تک ڈرانے کا سلسلہ جاری رکھا۔

”مجھ پر شک کیا ہی کیوں جا رہا ہے؟ صرف اس لیے
کہ اس بے حس خاندان میں، میں وہ واحد فرد تھی جو اس
مظلوم لڑکی سے ہمدردی رکھتی تھی؟ میں نے اس کے زخم زخم
وجود پر مرہم رکھنے کی کوشش کی تھی یا پھر اس لیے کہ میں اسے
یہاں سسک سسک کر مارتا ہوا نہیں دیکھ سکی تھی اور اس کے
نیم مردہ جسم کو اٹھا کر اسپتال لے گئی تھی۔“ غصے کے باعث
اس کی آواز خاصی بلند ہو گئی تھی۔

”آواز نیچی رکھو، ورنہ گلاب دادوں گا۔“ جلیل سے
اس کا زور سے بولتا برداشت نہیں ہوا اور ایک بار پھر بالوں
کو جھٹکا دیا۔

”دبا دیں گلاب ورنہ آنے والے کل میں آپ میری
زبان کو بند نہیں رکھ سکیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ میں خود ہی پولیس
کے سامنے پیش ہو جاؤں اور بیان دوں کہ سبیل کو اپنے شوہر
فیصل اور دیگر سسرالی رشتے داروں سے شدید جانی خطرہ
ہے۔ فیصل شادی کے بعد اسے متعدد بار تشدد کا نشانہ بنا چکا
ہے۔ وہ اس پر باپ سے وراثت میں حصہ لینے پر زور دیتا
رہا ہے اور اب بھی مجھے شک ہے کہ اس نے اپنے مقصد کے
حصول کے لیے سبیل کو اغوا کر دیا کسی خفیہ جگہ پر رکھا ہوا ہے
تاکہ بلا روک ٹوک بذریعہ تشدد اس سے اپنا مطالبہ تسلیم
کر دے۔“

جلیل جس طرح اپنے بھائیوں کے سامنے اسے
تشدد کا نشانہ بنا رہا تھا اور وہ بغیر کسی رد عمل کے یہ سب ہوتا

ماہنامہ جاسوسی



موسم کی دلربا ادائیں

جنوری 2022ء

کے شمارے کی روئیں

سرخ رات

نئے سال کی پہلی رات کا امتحان..... بے نشان، بے خطا
جرم سازی قند انگیز کارروائیاں..... اسجد ونیس

جیسے قلندر کی ایک اور ناقابل فراموش داستان

شعلہ زن

بے بسی کے اندھیروں میں ڈوبتی لڑکی کی
وردناگ داستان حیات.....

روبینہ رشید کے قلم کی جادوگری

الاؤ

میخاؤں کے بھیس میں شاطر مجرموں کا کھیل.....

زندہ انسانوں کے لیے دیکتے الاؤ کی صورت موت تیار

کی جارہی تھی..... ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

کے قلم سے نیا سنسنی خیز سلسلہ

سروق کے رنگ

پہلارنگ

وقت کی راسیں ان کے ہاتھوں میں تھیں۔ احساس برتری
کے خمار نے منزل کو دور کر دیا۔ اسما قادری کی کاوش

دوسرا رنگ

نئے سال کے حالات و واقعات..... مسیں

رنگا سروق، حسام بٹ کے قلم سے

جینی نکتہ جینی

آپ کے تھرے... مشورے... تجویزیں...

شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کھائیں

دیکھ رہے تھے، اس چیز نے فردوس کے اندر غم و غصہ بھر دیا تھا اور اس غصے کی کیفیت میں جو اس کے دل میں آ رہا تھا، بولتی چلی جا رہی تھی۔

”تیری یہ بھال کہ ہمارے گھر میں کھڑی ہو کر ہمیں ہی دھمکیاں دے۔ میں تجھے اس لائق ہی نہیں چھوڑوں گا کہ تو کہیں جاسکے اور ہمارے خلاف زبان کھول سکے۔“

فردوس کی جرأت نے جلیل کو چراغ پا کر دیا اور اس کے رخساروں پر متحدہ طمانچے رسید کرنے کے ساتھ اسے دھکا دے کر نیچے گرا دیا۔ نیچے گرانے کے بعد وہ اس پر چڑھ کر بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھوں سے اس کے گلے پر دباؤ ڈالنے لگا۔ اس منظر نے کھڑکی کی جھری سے سب کچھ دیکھتی شاہدہ کے جسم میں کپکپی پیدا کر دی اور وہ خوف کی شدت سے ہانپتی کانپتی مدد کے لیے بھاگی۔ اس کا پہلا کراؤ ہی اجالا سے ہوا۔

”کیا ہو گیا ہے؟ تمہارے چہرے پر ایسے ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں؟“ اجالا نے اس کے چہرے پر ثبت خوف کو دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔

”وہ..... بی بی.....!“ شاہدہ کے منہ سے یہ مشکل الفاظ ادا ہو رہے تھے۔

”کیا ہوا ہے؟ کیا کوئی بھوت دیکھ لیا ہے؟“ اجالا نے اسے جھنجھوڑا۔

”وہ جلیل صاحب..... وہ..... وہ فردوس بی بی کو بری طرح مار رہے ہیں۔ وہ انہیں جان سے مار دیں گے۔“ آخر کار شاہدہ صورت حال بیان کرنے میں کامیاب ہوئی گئی۔

”کیا.....؟“ یہ سن کر اجالا کی بھی سٹی کم ہو گئی پھر وہ تیزی سے حرکت میں آئی۔ ”کہاں ہیں وہ؟ آؤ چلو میرے ساتھ۔“

”جلیل صاحب کی بیشک میں جی۔“ شاہدہ نے بتایا اور ہانپتی کانپتی اس کے ساتھ چل پڑی۔ صورت حال ایسی تھی کہ اجالا کو کمرے کے دروازے پر پہنچ کر دستک تک دینے کا خیال نہ آیا اور اس نے ایک جھٹکے سے دروازے کو چوٹ کھول دیا۔ شاہدہ البتہ نظروں میں آنے سے بچنے کے لیے دروازے کے ایک طرف ہوئی تھی۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ اجالا نے کمرے میں قدم رکھا اور اندر کا منظر دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ فردوس چنچے قالین پر ہوش و حواس سے بیگانی، بے حرکت پڑی تھی اور جلیل اس حالت میں اس سے چند قدم دور کھڑا ہوا تھا کہ اس کی سانس اس کے سینے میں نہیں سارہی تھی۔ چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور اس کے

ایک ایک بازو کو کھیل اور فیصل نے جکڑ رکھا تھا۔

”بھابی کو کیا ہوا ہے؟“ کمرے میں موجود نفوس نے اس کے پہلے سوال کا جواب نہیں دیا لیکن وہ دوسرا سوال کرتی ہوئی کھنٹوں کے بل فردوس کے قریب بیٹھ گئی تھی۔

”بھابی..... بھابی انہیں۔“ اس نے کچھ گھبرا کر

فردوس کو آوازیں دینا شروع کیں اور دھیرے دھیرے اس کے رخساروں کو تھپتھپایا۔ اس عمل کے دوران وہ فردوس کے رخساروں پر چپے انگلیوں کے نشانات دیکھ چکی تھی پھر اس کی گردن پر موجود نشانات بھی اس کی نظر میں آ گئے۔

”کیا..... کیا ہوا ہے انہیں؟ کیا یہ مر گئی ہیں؟“ وہ کچھ خوفزدہ سی ہو کر پیچھے ہٹی اور پچھنی پچھنی آنکھوں سے بھائیوں کو دیکھتی ہوئی مستفسر ہوئی۔

”کچھ نہیں ہوا ہے۔ صرف بے ہوش ہے۔“ جلیل نے اسے جواب دیا اور فیصل کو اشارہ کیا کہ وہ جلیل کو لے کر وہاں سے چلا جائے۔ فیصل اس کے اشارے کو سمجھتے ہوئے فوراً حرکت میں آ گیا جبکہ جلیل نے اجالا کے ساتھ ہی فردوس کے قریب بیٹھتے ہوئے اس کی کلاکی کی بغض پر ہاتھ رکھا۔

”مری نہیں، زندہ ہے۔ بغض چل رہی ہے۔“

”مگر مجھے تو ایسا لگ رہا ہے کہ انہیں سانس نہیں آرہی۔“ اجالا کو بڑے بھائی کے بیان نے مطمئن نہیں کیا۔

”ایسا کچھ نہیں ہے۔ تم خواب خواہ پریشان مت ہو۔ میں ڈاکٹر کو کال کرتا ہوں۔“ سپاٹ سے لہجے میں اسے جواب دیتے ہوئے جلیل خود بھی قدرے پریشانی کا شکار ہو چکے تھے۔ بے شک فردوس کی بغض چل رہی تھی لیکن اس کی رفتار بے حدست تھی۔

”کیا انہیں جلیل بھائی نے مارا ہے؟“ جلیل کے کال سے فارغ ہونے کے بعد اجالا نے دریافت کیا۔

”فضول باتوں میں وقت ضائع مت کرو۔ میری اپنے ایک جاننے والے ڈاکٹر سے بات ہو گئی ہے۔ وہ اپنی ایبوی لینس بھجوا رہا ہے۔ ہم فردوس کو اس کے اسپتال میں شفٹ کر دیں گے۔“

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس گھر میں کیا ہو رہا ہے؟ اباجی نے تو بھی یہ روئیہ نہیں اپنایا پھر ان کے بیٹوں میں یہ عادت کہاں سے آ گئی کہ اپنی بیویوں کو عزت دینے کے بجائے انہیں ٹھوکروں میں رکھنے لگے۔“ وہ فردوس کی ہتھیلیوں کو سہلاتی روتی بھی جا رہی تھی اور بولتی بھی جا رہی تھی۔

گا۔" ایسبولینس کے پیچھے روانہ ہونے سے قبل شکلیں سب کو دھمکانا نہیں بھولے تھے۔ اتفاق سے یہ وقت بھی ایسا تھا کہ فردوس کی بچیوں سمیت گھر کے بیشتر بچے اپنے اسکولز اور کالجز میں تھے اس لیے تھوڑی سی کوشش سے بات کو گھر سے باہر نکلنے سے روکا جاسکتا تھا۔

ان کی اسپتال روانگی کے بعد گھر میں چہ میگوئیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ خواتین نے اجالا سے تفصیلات جاننا چاہیں لیکن وہ کسی کو کچھ بھی بتائے بغیر اپنے کمرے میں بند ہوئی اور یہ طے تھا کہ جب اجالا کچھ نہ بتانا چاہے تو کوئی اس سے اگلا نہیں سکتا تھا۔ سارے واقعے کی اصل چشم دید گواہ شاہدہ نے تو منہ سے بھاپ بھی نہیں نکالی تھی کہ اسے کسی بات کا علم ہے۔ وہ خود کو دیگر ملازماؤں کی طرح انجان ظاہر کرتی ہوئی معمول کے کام کاج نمٹا رہی تھی لیکن اندر سے بے حد خوفزدہ ہو چکی تھی۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ بھل والے معاملے میں اس نے جو کردار ادا کیا تھا، وہ اس کے لیے مصیبت بھی بن سکتا تھا۔ فردوس کے حکم پر وہ اس موبائل فون کو سم سمیت تلف کر چکی تھی جس کے ذریعے معاذ سے رابطہ رہتا تھا پھر بھی اندیشے اندر ہی اندر لرزا رہے تھے۔ فردوس کا حال دیکھ کر وہ سوچنے پر مجبور ہو گئی تھی کہ اگر شک کا کاٹنا اس پر آرکا تو پھر اس کا انجام کیا ہوگا؟ اسے اپنے ساتھ تو ذرہ برابر در عایت کی گنجائش دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

"آج کی رات چھٹی دے دیں بی بی! جی عجیب طرح سے گھبرا رہا ہے۔ گھر اور بچوں کی یاد بھی آ رہی ہے۔" مسلسل ڈہنی تاکنے اسے اتنا ستایا کہ وہ شام ڈھلے نرسن سے چھوٹی بھوشازیہ کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور لجاجت سے اس سے درخواست کی۔

"لیکن آج تو تمہاری چھٹی کا دن نہیں ہے پھر نرسن بھابی بھی گھر پر موجود نہیں ہیں۔ تمہارے بے وقت چھٹی کرنے سے وہ ناراض نہ ہو جائیں۔" شازیہ نے تذبذب کا مظاہرہ کیا۔

"وہ کیوں ہوں گی ناراض؟ کیا آپ کا کوئی اختیار نہیں ہے؟ آپ بھی تو ان کی طرح اس گھر کی بھوی ہیں نا۔" شاہدہ برسوں سے گھریلو ملازمہ کے طور پر کام کر رہی تھی اور اسے معلوم تھا کہ کون سا کام نکلوانے کا کیا کر تھا۔ یہاں بھی اس نے شازیہ کو ذرا سا چڑھا کر اپنا مقصد آسانی سے پورا کر لیا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ چلی جاؤ لیکن دھیان رکھنا کہ کل صبح گیارہ بجے تک واپس آ جاؤ۔" شازیہ نے اپنے اختیار کو

"خاموش رہو۔ اگر یہ بکواس کسی اور کے سامنے کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔" شکلیں نے اسے سرد لہجے میں دھمکایا تو اسے اپنے لب سینے پڑے۔ وقت کے پلٹا کھا جانے نے اسے یوں خاموش ہو جانا بھی سکھا دیا تھا۔ اب وہ، وہ اجالا نہیں رہی تھی جس کی تیوری کے بل پرے گھر کو ہلا ڈالتے تھے۔ ایک طرف سنیل والے معاملے نے اس کی نظریں سب کے سامنے جھکا دی تھیں تو دوسری طرف نیاز شاہ کی عدم موجودگی نے اس کی حیثیت بدل دی تھی۔ ان چند دنوں میں ہی اس نے جان لیا تھا کہ مردوں کے اس معاشرے میں عورت بس اسی وقت تک سرچڑھی ہوتی ہے جب تک اسے سپورٹ کرنے والا مرد طاقتور مقام پر ہو۔ اس کی حکمرانی بھی اپنے اباجی کے بل پر تھی۔ وہ منظر پر نہیں آتا ہے تھے تو سارا منظر ہی بدل گیا تھا۔

"میرے خیال میں ایسبولینس آگنی ہے۔ تم یہ رونا دھونا بند کر دو اور اسے کوئی چادر اوڑھا دو تاکہ طریقے سے اسپتال شفٹ کیا جاسکے۔" چند منٹ گزرے تو شکلیں نے باہر ایسبولینس کے سائرن کی آوازیں کر اسے حکم دیا۔ اس نے حکم کی تعمیل کی۔ فردوس کو ایسبولینس میں منتقل کرنے کے لیے شاہدہ سمیت دیگر ملازماؤں کو بلانا پڑا تھا۔ ملازمین کے ساتھ ساتھ گھر کی خواتین کو بھی خبر ہو گئی تھی۔ سب آنکھوں میں تجسس لیے یہ سارا منظر دیکھ رہی تھیں۔

"نرسن! تمہیں میرے ساتھ اسپتال چلنا ہوگا۔ عورت کا معاملہ ہے۔ اس لیے کسی عورت کا ساتھ ہونا ضروری ہے۔" شکلیں نے اپنی بیگم کو حکم دیا اور خود گاڑی کی جابیاں اٹھالیں۔ اس عرصے میں فردوس کو ایسبولینس میں منتقل کر کے آکسیجن لگا دی گئی تھی۔

"میں بھی ساتھ چلوں بھائی؟" اجالا نے اجازت طلب کی۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تمہاری بھالی تجربہ کار ہیں۔ وہ زیادہ بہتر طور پر فردوس کی دیکھ بھال کر سکتی ہیں۔" شکلیں نے رکھائی سے جواب دیا۔ حقیقتاً فردوس کے لمحہ بہ لمحہ نیلے پڑتے چہرے نے انہیں بھی تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ ایسے میں انہیں خدشہ تھا کہ کہیں اجالا کو ساتھ لے جانے سے معاملہ خراب نہ ہو جائے۔ اپنی بیگم کو تو وہ راستے میں بریف کر دیتے تو وہ ان کی غشا کے خلاف کسی کے سامنے زبان سے ایک لفظ نہ نکالتیں۔

"گھر سے باہر کوئی بات نہ نکلنے پائے۔ اگر میں نے کہیں سے کچھ بھی سنا تو ایک ایک کی کھال اتار کر رکھ دوں

ثابت کرنے کے لیے نہ صرف اجازت دے دی بلکہ نخواست سے اگلا حکم بھی صادر کیا۔

”آجاؤں گی بی بی! آپ فکر ہی نہ کریں۔“ شاہدہ کو اجازت ملی تو گویا پرلگ گئے۔ ایک رات کی چھٹی گزارنے کے لیے اسے کوئی ساز و سامان تو ساتھ لے جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس لیے اپنا بوسیدہ سا بٹوا سنبھال کر فوراً ہی گھر سے روانہ ہو گئی۔ امراء کا علاقہ ہونے کی وجہ سے آس پاس سے کوئی سواری ملنے کا امکان نہیں تھا۔ جلد از جلد منزل پر پہنچنے کی خواہش میں وہ تیز تیز قدم اٹھاتی اپنی دھن میں آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ اس لیے اس گاڑی پر قطعاً دھیان نہیں دے سکی جو کسی سانپ کی طرح ریچکتی اس کے قریب آئی اور بہت احتیاط سے اسے ہلکے سے سائڈ ماری۔ گاڑی کا یہ ہلکا سا دھکا ہی شاہدہ کو لڑکھڑا کر سڑک پر گرانے کے لیے کافی تھا۔

”ہائے رہا۔ مر گئی میں۔ میرے گوڈے گئے ٹوٹ گئے۔“ شاہدہ اس ٹکراؤ سے اس قدر دہشت زدہ ہوئی کہ از خود اٹھنے کی کوشش کرنے کے بجائے وہیں سڑک پر پڑی رہائیاں دینے لگی۔

”سوری! میں ذرا جلدی میں تھی اس لیے تم پر نظر نہیں پڑی۔ کیا زیادہ چوٹ آئی ہے؟“ گاڑی اسے ٹکرایا کرنے کے بعد بھاگی نہیں تھی بلکہ چند قدم آگے جا کر رک گئی تھی اور اس میں سے ایک الٹرا مائڈرن اور خوب صورت عورت اتر کر اس کے قریب کھڑی جمک کر اس سے پوچھ رہی تھی۔

”میرا گوڈا بہت درد کر رہا ہے بی بی! لگتا ہے ٹٹ (ٹوٹ) ہی گیا ہے۔“ ایک امیر عورت کو اپنی غلطی پر نادم پا کر شاہدہ نے موقع سے فائدہ اٹھانے کا سوچا اور مزید شور مچایا۔ اس کے حساب سے اس کے لیے ایک اچھی بات یہ تھی کہ ایک دور راہ گیر جو اسی کی طرح ملازم پیشہ دکھائی دیتے تھے، اس طرف متوجہ ہو کر قریب آ کھڑے ہوئے تھے۔

”آؤ، میری گاڑی میں بیٹھو۔ میں تمہیں کسی اچھے ڈاکٹر کے پاس لے چلتی ہوں۔“ عورت اس کے شور مچانے پر قدرے خوفزدہ دکھائی دی اور پریشان سے لہجے میں اسے پیشکش کی۔

”صرف علاج معالجہ نہ کروائیے گا بیگم صاحبہ! غریب کو ہر جانے میں کچھ روپے بھی دے دیجیے گا۔ بے چاری اب نہ جانے کتنے دنوں تک کام پر نہیں جاسکے گی اور اس کے آپ کی طرح پیسے والے مالکوں نے کام سے نہ بھی نکالا تو اس کی نگار ضرور کاٹ لیں گے۔“ راہ گروں میں سے

ایک نے کسی مزدور لیڈر کی طرح تقریر جھاڑنے والے انداز میں اسے نصیحت کی۔

”سب ہو جائے گا بھیا! آپ انہیں سہارا دے کر گاڑی میں بٹھانے میں میری مدد کریں، بلکہ رکیں، میں گاڑی ریورس کر کے پیسے لے آتی ہوں تاکہ آسانی رہے۔“ عورت نے خود ہی تجویز پیش کی اور فوراً ہی اس پر عمل بھی کر ڈالا۔ دونوں راہ گیروں نے شاہدہ کو سہارا دے کر کھلے دروازے سے اگلی پینجر سیٹ پر بٹھایا اور خود پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھنے کی کوشش کی لیکن دروازہ لاک ہونے کی وجہ سے اپنی اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے۔

”مدد کا شکر یہ بھائی صاحب!“ ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان عورت نے غمخوارانہ لہجے میں کہا اور تیزی سے گاڑی آگے بڑھانے لگی۔ ہائے اوئی کرتی شاہدہ نے اس کے انداز کی اس تبدیلی کو محسوس کیا اور چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”مجھے معلوم ہے کہ تمہیں زیادہ چوٹ نہیں آئی ہے لیکن تم میرے گلے پڑنے کے لیے چل رہی تھیں تو میں نے سوچا تمہاری یہ اچھا پوری کردوں۔“ وہ عورت جو کچھ دیر قبل حادثے پر خوفزدہ اور پریشان دکھائی دے رہی تھی، اب بالکل مختلف لہجے میں شاہدہ سے مخاطب تھی۔ اس کے انداز کی اس تبدیلی پر شاہدہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو یہ دیکھ کر لرز گئی کہ عورت کے بائیں ہاتھ میں ایسی نال والا پستل موجود ہے۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟ کبھی کبھی ہتھیاری خود بھی جال میں آ پھنستا ہے۔“ عورت نے گویا اس کی کیفیت سے حفا اٹھایا۔

”میں آپ کی گل بھی نہیں بی بی! کیسا بے پروا کون شکاری؟“ سوال کرتے ہوئے اس کی آواز کا پتہ نہ تھا۔

”سمجھ کر تمہیں کرنا بھی کیا ہے۔ بس اتنا جان لو کہ مجھے تم سے کچھ کام تھا اور آج قسمت سے تم میرے ہاتھ آ گئی ہو۔“ ڈرائیونگ کرتی عورت جو کہ سونیا تھی، زمین پر مسکراہٹ کے ساتھ بولتی شاہدہ کو مزید ہراساں کر گئی۔ معاذ کی تلاش میں اس نے جن نکات پر غور کیا تھا، اس میں سے سب سے اہم اسے یہی لگا تھا کہ معاذ نے سبھل کو اسپتال سے ایسے ہی اغوا نہیں کر لیا ہوگا۔ اندر کا کوئی بندہ رہا ہوگا جو اسے سبھل کے متعلق اطلاعات فراہم کرتا رہا ہوگا۔ اس اندر کے فرد کے متعلق جاننے کے لیے اس نے ایک ملازم کے ذریعے ہی سیندھ لگائی تھی۔ ملازم کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق گھر میں دو ہی افراد سبھل کے قریب تھے۔ ایک

معمولی ملازمہ سے کس نوعیت کا کام ہو سکتا ہے اس لیے پیش بندی کے طور پر پہلے ہی اعلان کر دیا تھا۔

”جب تم نکل کے متعلق معاذ کو اطلاعات فراہم کرتی تھیں، اس وقت تمہاری یہ وفاداری کہاں تھی؟“

سونیا نے اندھا تیر چلا یا تھا جو ٹھیک نشانے پر جا کر لگا اور رد عمل میں شدید گھبراہٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے شاہدہ نے چلتی گاڑی کا دروازہ کھول کر اترنے کی کوشش کی لیکن اسے دروازہ لاک ہونے کی وجہ سے اس کوشش میں قطعی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

”میری مرضی کے بغیر تم ہرگز بھی اس گاڑی سے باہر نہیں نکل سکتیں اس لیے بہتر ہوگا کہ آرام سے بیٹھی رہو۔“ سونیا نے اسے تنبیہ کی۔

”میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ تم مجھے کہیں نہیں لے جا سکتیں۔“ شاہدہ کی حالت بند کمرے میں قید ملی کی سی ہو گئی اور اس نے اپنے انجام کی فکر کے بغیر سونیا پر حملہ کر دیا۔ اس کا حملہ ایک حماقت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس جیسی عام عورت سونیا جیسی عیار اور مکار حسینہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ اس نے ایک ہی وار میں شاہدہ کے حملے کو پسپا کر دیا اور وہ اپنی کھوپڑی پر پسل کے دستے کی ضرب کھا کر ”ہائے“ کی آواز نکالتے ہوئے بے ہوش ہو گئی۔

ہوش میں آنے پر اس نے خود کو رسیوں سے جکڑا ہوا پایا تو دہشت کا گراف کچھ اور بلند ہو گیا۔ اس بلندی کو ادراج تک پہنچانے میں وہاں سچے تشدد کے آلات نے مزید کردار ادا کیا اور کسی لرزے کے مریض کی طرح اس کے جسم کا ایک ایک عضو کانپنے لگا۔

”کیسی ہو شاہدہ؟ ان بندشوں سے تمہیں کوئی تکلف تو نہیں پہنچ رہی؟“ الفاظ ہمدردی لیے ہوئے تھے لیکن پوچھنے والی کا لہجہ اتنا سرد و سیاٹ تھا کہ وہ کم فہم عورت بھی ان الفاظ میں خیر سگالی نہ ڈھونڈ سکی۔

”مجھے معاف کر دیں بی بی! میں غریب، کمی کمین عورت ہوں۔ میں نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا۔ آپ مجھے یہاں سے جانے دیں۔“ اگر وہ حرکت کرنے کے قابل ہوتی تو ہوا میں چابک کو ایک خاص انداز میں چٹختی سونیا کے قدموں میں جا گرتی۔

”معافی ہی معافی ہے بس تم مجھے میرے سوالوں کے درست جوابات دے دو۔“ وہاں وہی ایک مطالبہ تھا۔ اگلے چند منٹوں میں اس نے ثابت کر دیا کہ شاہدہ کے پاس سچ بولنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے لیکن سچ نے بھی اسے آگے

اس کی حیثیاتی ڈاکٹر فردوس اور دوسری ملازمہ شاہدہ۔ ان دو افراد میں سے اس نے شاہدہ کا انتخاب کیا تھا کیونکہ اس کا تجربہ تھا کہ عموماً گھر کے راز ان ملازمین کے ذریعے ہی باہر نکلتے ہیں۔

شاہدہ کے انتخاب کے بعد دوسرا مسئلہ شاہدہ تک رسائی کا تھا۔ معلومات کے مطابق باہر کے کام کاج کے لیے مرد ملازمین ہی کو ذمے داری سونپی جاتی تھی۔ ملازما مکس صرف اپنی ہفتہ وار چھٹی والے دن گھر سے باہر نکلتی تھیں یا اس صورت میں کہ گھر کی خواتین شاپنگ یا کسی دوسری ضرورت کے لیے انہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہیں۔ سونیا نے شاہدہ کو اس کی چھٹی والے دن ہی چھاپنے کا فیصلہ کیا تھا اور اس کے لیے ابھی اسے درمیان کے تین دن انتظار کرنا تھا لیکن اچانک اسے اطلاع ملی کہ آج شاہدہ اتفاقی چھٹی لے کر اپنے گھر جانے کا ارادہ باندھ رہی ہے۔ اس نے اپنی طبیعت کی خرابی کا عذر تراشتے ہوئے چھٹی لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ اطلاع دینے والے کو یقین نہیں تھا کہ اسے چھٹی ملے گی یا نہیں لیکن سونیا نے پچاس فیصد امکان کی بنیاد پر ہی کوشش کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اس کا یہ فیصلہ درست ثابت ہوا تھا۔

”آپ مجھے کہاں لے جا رہی ہیں جی؟“ شاہدہ کو اتنا تو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اسے کسی اسپتال لے جانے کا ارادہ نہیں رکھتی۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ راستے میں پڑنے والے دو تین اسپتالوں میں سے کسی ایک کا رخ کر سکتی تھی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا تھا تو صاف ظاہر تھا کہ اس کے کچھ اور ہی عزائم تھے۔ ان عزائم کو نہ بکھنے کے باوجود شاہدہ کو اس سے اتنا خوف آ رہا تھا کہ وہ خود کو کٹنے والی چوٹوں کی تکلیف بھی فراموش کر چکی تھی۔

”پریشان مت ہو۔ میں تمہیں کسی غلط جگہ نہیں لے جا رہی ہوں۔ مجھے تمہارے بس اپنے چند سوالات کے جواب چاہئیں۔ تم جواب دے دو گی تو میں تمہیں واپس تمہارے گھر بھجوانے کے ساتھ ساتھ انعام بھی دوں گی۔“ اس کی پریشانی دیکھتے ہوئے سونیا نے اس کے ساتھ نرمی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔

”کیسے سوالات جی؟ اگر آپ میرے بالکون کا کوئی راز جاننا چاہتی ہیں تو جان لیں کہ میں ایسا ہرگز نہیں کروں گی۔ میں نمک حرام نہیں ہوں۔“ شاہدہ کی چھٹی حس مسلسل خطرے کا الارم بجا رہی تھی اور اسے خود ہی ادراک ہو گیا تھا کہ... شکل ہی سے بے حد امیر کبیر دکھتی عورت کو اس جیسی

میں ڈھلی۔

”چنکار کہیں یا جو بھی لیکن یاد رکھیں کہ ہمارے پاس بہت زیادہ مہلت نہیں ہے۔ موہن سے حاصل کردہ معلومات میں آپ کو دے چکا ہوں اور ان معلومات کی روشنی میں ہمیں جلد از جلد کوئی اسٹیپ لینا ہوگا کیونکہ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ موہن کتنے عرصے تک ہمارے قابو میں رہے گا پھر ہمیں یہ بھی خیال رکھنا ہوگا کہ کہیں اس کے ٹکڑے والے ہی اس کے غیر معمولی رویے پر نہ چونک جائیں۔“

”اپن سمجھتے ہیں ان سب باتوں کو۔ میرے لوگوں کو تھوڑا سا ہوم ورک اور کر لینے دو پھر بس ایکشن ہی لینا ہے لیکن اب تم کو بھی تھوڑا دھیان کرنا ہوگا۔“

”کیا مطلب؟“ اس نے دیوا کی بات کی وضاحت چاہی۔

”مطلب، اب آنا جانا اور فون کا لزب بند۔ مشن کمپلیٹ ہونے تک اب تم کو بالکل خاموشی سے ادھر ہی رہنا ہے۔“

”ایسے تو پیچھے والے پریشان ہو جائیں گے۔ کم از کم ایک بار اطلاع دینے کے لیے تو مجھے ان سب سے رابطہ کرنے دو۔“ وہ بے چین ہوا۔

”نہیں۔ اب ایک بار بھی نہیں۔ پہلے ہی تم بڑی غلطیاں کر چکے ہو۔ اب میں تمہیں مزید غلطی کا چانس نہیں دے سکتا کیونکہ غلطی کا مطلب ہے ناکامی۔“ دیوا کے بے چلک لہجے میں کچھ ایسا تھا جس نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ واقعی وہ جذبات میں پہلے ہی غلطیاں کر چکا تھا۔ اپنی ان غلطیوں کے باعث اگر گرفت میں آجاتا تو عالم شاہ اور سرد کی آزادی کے مشن کے ساتھ ساتھ اپنے پیاروں کے قاتلوں کو انجام تک پہنچانے کی خواہش بھی ادھوری رہ جاتی۔

”موہن!.....“ دیوانے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس نے خاموشی سے موہن کا لہجہ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

”اب جا کر سو جاؤ۔ اگر قدرتی طریقے سے نیند نہ آئے تو گولیاں بھی مل سکتی ہیں کھانے کے لیے۔“

”یہ ہے کہ صبح تمہیں بالکل فریش ہونا چاہیے۔“ دیوانے اسے مشورہ دیا تو وہ بنا حیل و حجت وہاں سے اٹھ گیا۔ اس بار بھی اسے رہائش کے لیے وہی پہلے والا کمرہ دیا گیا تھا۔ کمرے میں آکر ادھر سے ادھر ٹپکتے ہوئے وہ مختلف سمتوں میں سوچتا رہا۔ بھی اپنے بچھڑ جانے والے پیاروں کی صورت نظروں کے سامنے لہراتی تھی اور دل پر ایک ٹھوس سا لگتا تھا۔ کبھی تجل کا خیال آتا تھا کہ اگر اسے کچھ ہو گیا تو وہ اس دیار غیر میں ایک چھوٹے بچے کے ساتھ اپنی بقا کی جنگ کیسے لڑے گی اور کبھی ”را“ کے جڑوں میں ہاتھ ڈال کر عالم شاہ اور سرد کو

بڑھنے میں بہت زیادہ مدد نہیں دی تھی۔ ہاں اتنا ضرور ہوا تھا کہ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اس معاملے میں فردوس کا بھی کردار تھا۔ اس کے علاوہ وہ شاہدہ سے اس کی ضائع ہو جانے والی اس سم کا نمبر حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی جس کے ذریعے وہ معاذ سے رابطے میں رہتی تھی۔

”تمہارے اندر ڈیٹنگ پینٹنگ کا کافی کام نکل آیا ہے۔ یہ پیسے رکھ لو۔ تمہارے کام آئیں گے لیکن یاد رکھنا کہ اگر کسی کے سامنے منہ سے ایک لفظ بھی نکلا تو اس کا انجام تمہارے ساتھ ساتھ تمہارے بچوں کو بھی بھگتنا پڑے گا۔“

دل ہی دل میں اپنے آئندہ کا لائحہ عمل طے کرتے ہوئے اس نے ادھ موٹی پڑی شاہدہ کو مخاطب کیا۔

”مجھے میرے بچوں کی قسم جی، کسی کو کچھ نہیں بتاؤں۔ بس یہی کہوں گی کہ کسی گڈی نے ٹکر ماری تھی۔“

”مہنتی بات پر قائم رہ کر اپنا ہی بھلا کرو گی۔ کسی گڑ بڑ کی صورت میں یاد رکھنا کہ میرے ہاتھ اتنے لمبے ہیں کہ میں تمہیں پاتال میں سے بھی کھینچ لاؤں گی۔“ سونیا نے اسے مزید دھمکایا۔ کچھ دیر بعد وہ اسے ایک اسپتال کے قریب اتار کر اپنے ٹھکانے پر واپس آئی تو خود اپنے رویے پر حیران تھی۔ اصولاً معلومات کے حصول کے بعد ایسے شاہدہ کو ہلاک کر دینا چاہیے تھا لیکن وہ خلاف معمول اس پر رحم کھا گئی تھی۔ رحم کھانے جیسا مثبت رویہ سونیا خان میں کیسے پیدا ہو گیا تھا، اس سوال کے جواب میں اس کے اندر ایک گہری خاموشی تھی۔ ایسی خاموشی جس کی کوکھ سے کوئی بڑا ہنگامہ جنم لینے کے لیے بے چین تھا۔

☆☆☆

”میں ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوں۔ مرنے سے سخت چوٹیں آئی ہیں۔ تھوڑے دن اور دفتر سے چھٹی کروں گا۔“

”نہیں، نہیں۔ چھٹا والی کوئی بات نہیں ہے۔ یوں بھی لیے سے سے چھٹی نہیں لی تو سوچ رہا ہوں آرام کے بہانے ہی ٹھہر میں رہ کر جتنی کے شکوے بھی دور کروں گا۔“

”بالکل، بالکل۔ پورے ویک کی چھٹی مل جائے تو اچھا ہے کوشش کروں گا کہ کل صبح تمہیں رٹن اپیلیکیشن بھی بجا دوں۔“

ریکارڈنگ میں سنائی دینے والی آواز بلا ٹک و شبہ موہن کی تھی۔ دیوا آنکھوں میں حیرت لیے یہ ریکارڈنگ سن رہا تھا۔

”یہ تو تم نے چنکار کر دیا ہے۔“ اس کی حیرت لفظوں

”میری آنکھوں میں دیکھتے تو دکھائی دے جاتا۔“
 ”بڑا فلمی سا جواب ہے۔“ وہ دیوا کا جواب سن کر ہنسا
 لیکن اندر ہی اندر اسے ایک جھرجھری سی آئی تھی۔

”ہماری سچائی کو فلمی جواب سمجھتے ہو۔ بڑے بھولے
 ہو۔“ دیوا گنگناتے کے انداز میں بولا پھر یکدم ہی بات کو
 بدلتے ہوئے اس سے پوچھا۔ ”یہ تو بتاؤ کہ انڈیا میں کیسے
 آئے تھے؟ مطلب ال لیگل طریقے سے یہاں آنے کے
 لیے کون سا راستہ اپنایا تھا؟“

”سکھ پاتریوں کا بہروپ بھر کر انہی کے ساتھ آیا
 تھا۔“ اس نے سچ بتایا۔

”کہیں پاتریوں کی اس بس میں تو نہیں تھے جسے کچھ
 آنکھ دادیوں نے ہالکی جبک کر لیا تھا؟“
 ”نہیں۔ اس میں نہیں تھا۔“ اس بار سچ بولنا ممکن نہ
 ہو سکا۔

”ساتھ میں کوئی ساتھی بھی ہوگا؟“
 ”ساتھ کوئی تھا لیکن میرا ساتھی نہیں تھا۔“ دیوا کے
 سوال پر سونیا کا چہرہ آنکھوں کے سامنے لہرایا تو پورے وجود
 میں تغیر کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ سونیا سے ملاقات اس کی
 زندگی کا وہ بدترین واقعہ تھا جس کے بعد سب کچھ تباہ ہوتا چلا
 گیا تھا اور آج یہ حال تھا کہ اسے لگتا تھا وہ بالکل تنہی دامن رہ
 گیا ہو۔

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی ساتھ ہو اور ساتھی نہ
 ہو؟“ ناشتا تقریباً منٹ چکا تھا اور اب وہ دونوں چائے کی
 پیالیاں سامنے رکھے گفتگو میں مصروف تھے۔

”دھوکے اور فریب کے ساتھ زبردستی ساتھ مل جانے
 والے ساتھی کہلانے کے تو حقدار نہیں ہوتے۔“

”واہ بھئی، کیا بات کی ہے۔ اس بات پر تمہیں کوئی تھو
 دینے کو دل چاہتا ہے۔“ دیوا اس کی بات پر پھڑک اٹھا۔
 ”میرے دوست کی آزادی سے بڑھ کر میرے لیے
 کوئی تحفہ نہیں ہو سکتا۔“

”وہ تو ہمارے درمیان طے شدہ معاملہ ہے۔ آؤ
 میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں تمہاری پسند سے تحفہ دینا چاہتا
 ہوں۔“ دیوا کے اصرار نے اسے اپنی جگہ سے اٹھنے پر مجبور
 کر دیا۔ کچھ دیر بعد وہ اسے مختلف راہداریوں سے گزارتا
 ہوا ایک زیر زمین کمرے میں لے گیا۔ وہاں پہنچ کر معاذ کی
 آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ اس کمرے میں چھوٹے بڑے
 ہتھیاروں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ڈراموں اور فلموں وغیرہ سے
 ہٹ کر اس نے زندگی میں پہلی بار اتنی بھاری تعداد میں اسلحہ

ان کے قبضے سے نکال لینے کے خیال سے جسم میں بجلیاں
 کوندنے لگتی تھیں۔ سوچ کی جو بھی سمت تھی، طبیعت کو بے
 چین کر دینے والی تھی۔ آخر کار اس نے دیوا کے مشورے پر
 عمل کرتے ہوئے اپنے لیے نیند کی گولیاں منگوائیں۔ ایک
 گلاس دودھ کے ساتھ لی جانے والی ان گولیوں نے اس
 پر جادو کا سا اثر کیا اور آخر کار وہ پرسکون نیند سو گیا۔ صبح آکھ
 کھلتے ہی ایک آدمی دیوا کا پیغام لے کر آ گیا۔ اس کی
 راہنمائی میں وہ ایک ہال نما کمرے میں پہنچا تو وہاں نصب
 ورزش کی مشینوں نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کی۔ وہ بھی
 پہلے سے وہاں موجود لوگوں کے ساتھ شامل ہو گیا۔ اس
 شدید جسمانی مشقت نے اسے ذہنی طور پر بھی پرسکون
 ہونے میں مدد دی۔ سینے میں جو غم و غصے کی آگ بھڑک رہی
 تھی، اس کا بغیر کسی منطقی سدباب کے بجھ جانا تو ناممکن تھا
 لیکن اخصا بنی کشیدگی میں خاصا فرق آیا تھا اور وہ خود کو عملی
 اقدامات کے لیے بہتر حالت میں محسوس کر رہا تھا۔ ورزش
 کے بعد دیوانے اسے اپنے ساتھ ناشتا کرنے بلالیا۔

”موہن کی طرف سے کوئی پرابلم تو نہیں ہے؟“
 ناشتے کے دوران اس نے دیوا سے دریافت کیا۔

”سب ٹھیک ہے۔ بہت شانتی سے ہے وہ۔ اگر گڑبڑ
 کرنے کی کوشش کی بھی تو اندر باہر موجود میرے لوگ سنبھال
 لیں گے۔ جو دلازکیاں اس کے گھر پر رکھ چھوڑی ہیں، وہ باری
 باری نرس بن کر اس کی دیکھ بھال کر رہی ہیں۔ میں نے
 انہیں حکم دے رکھا ہے کہ موہن کی چینی پر سخت نظر رکھیں اور
 اسے موقع نہ دیں کہ وہ اس سے کوئی ایسی بات کہہ سکے جو
 اسے پٹری سے اتار دے۔“ دیوا بہت مطمئن تھا حالانکہ
 جب اس نے موہن کو اس کے گھر پہنچانے اور حالات معمول
 پر دکھانے کی تجویز دی تھی تو دیوا کو اس سلسلے میں کچھ تحفظات
 تھے۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ موہن کا دماغ اس حد تک
 معاذ کے قبضے میں ہے کہ وہ اس کی دی گئی ہدایات کے
 برخلاف کچھ کرنے کا سوچ بھی نہیں سکے گا لیکن اب عملی طور پر
 سب دیکھ لینے کے بعد اسے اطمینان ہو گیا تھا۔

”آپ کے بھائی کبھی آپ سے ملنے نہیں آتے؟“
 ناشتا کرتے ہوئے اس کی نظر دلیپ کی تصویر پر پڑ گئی اور
 زیر گفتگو موضوع کو چھوڑ کر بے ساختہ سوال کر بیٹھا۔

”تم اس سے ملنا چاہتے ہو؟“ دیوانے ترنت سوال
 کے جواب میں سوال کیا۔

”نہیں، بس کبھی یہاں دیکھا نہیں تو ایسے ہی خیال
 آ گیا تھا۔“ معاذ نے بات بنائی۔

دیکھا تھا۔

”اتنے رنجیدہ اور پریشان کیوں ہیں؟ سچ پوچھیں تو آپ پر یہ انداز بالکل سوٹ نہیں کرتا۔“ تاج بائی وہ عورت تھی جس کی زندگی رنگارنگ کے مردوں سے معاملات کرتے گزری تھی اور عرفان اللہ سے تو اس کا تعلق سب سے زیادہ گہرا اور پرانا تھا اس لیے فون پر بھی ان کی کیفیت محسوس کرنے میں اسے کوئی دقت نہیں ہوئی۔

”میں سلطان کی طرف سے پریشان ہوں۔ بہترین علاج کے باوجود اس کی حالت سنبھلنے میں نہیں آ رہی۔ ڈاکٹرز بیرون ملک لے جانے کی بھی اجازت نہیں دے رہے کہ ان کے مطابق سلطان کی حالت ایسی نہیں ہے کہ وہ سفر کر سکے۔ اب تم خود بتاؤ کہ ایک ایسے وقت میں جبکہ اولاد کو میرا سہارا بننا چاہیے، اولاد بستر پر پڑی ہے تو میرے دل پر کیا گزر رہی ہوگی۔“ انہوں نے اپنا دکھڑا دیا۔

”بازل ہے نا، جو بھی کام ہو، جو بھی مسئلہ ہو، اس سے کہیے۔“ تاج بائی نے صبر سے مشورہ دیا۔

”بازل ہی سے کہتا ہوں لیکن سلطان کے مسائل کو بھول تو نہیں سکتا۔ آفرآل اسی نے میری جگہ سنبھالنا ہے لیکن افسوس کہ اس کے لیے اس کی تیاری بالکل نہیں ہے۔“

”میرا بازل اتنا باصلاحیت ہے پر آپ اسے کوئی مقام دینے کو تیار ہی نہیں۔“ تاج بائی نے موعجہ دیکھ کر بات نکالی۔

”کیا کمی ہے بازل کو؟ سب کچھ اس کے اختیار میں ہے۔ سیاہ کرے یا سفید، میں اس سے سوال نہیں کرتا۔ میرا ایک ایک آدمی اس کے حکم کے آگے ہاتھ باندھے کھڑا رہتا ہے۔ شہزادوں کے ٹھاٹھ باٹ سے زندگی گزار رہا ہے۔“

انہوں نے ایک ایک کر کے اپنی عنائیں گنونا شروع کر دیں۔

”میں مانتی ہوں کہ وہ شہزادوں کی سی زندگی گزارتا ہے لیکن وہ آپ کا ولی عہد تو نہیں ہے تا عرفان اللہ صاحب!“ تاج بائی کے اندر تڑپتی حسرت زبان پر آ گئی۔

”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ہے؟ کیا تم نہیں جانتیں کہ تم جیسی ماؤں کی اولاد کو کبھی ولی عہد کی نصیب نہیں ہوتی؟“ انہوں نے فوراً آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں۔

”نسب تو باپ سے چلتا ہے تا عرفان اللہ صاحب!“

تاج بائی نے کمزور سے لہجے میں باور کرایا۔

”ہمارے ہاں نسب اس کا تسلیم کیا جاتا ہے جو نکاحی بیوی کی کوکھ سے جنم لے۔“ تاج بائی کو دو ٹوک لہجے میں جواب دیتے ہوئے وہ آہٹ پر پلٹے تو بازل کو اپنے سامنے کھڑا پایا۔

”ابھی میں مصروف ہوں، بعد میں بات کریں

”ان میں سے جو چاہو اور جتنے چاہو لے لو۔“ دیوا نے کمرے میں پھیلے ہتھیاروں کی سمت اشارہ کرتے ہوئے فراخ دلی سے پیشکش کی تو اس نے انکار نہیں کیا۔ زندگی جس بچ پر چل پڑی تھی، اسے چاہتے اور نہ چاہتے ہوئے بھی ہاتھوں میں ہتھیار اٹھانا تھے۔

”گڈ چوائس۔“ اس نے ان ہتھیاروں میں سے اسے کے فوری سیون اور لمبی نال کا ایک بریٹا منتخب کیا تو دیوا نے اسے داد دی پھر اپنے ساتھ سائے کی طرح چپکے چپکے آنے والے اپنے ساتھی کو مخاطب کر کے بولا۔

”ان ہتھیاروں کو اچھی طرح چیک کر کے اور تیل وغیرہ دے کر ریڈی کرو۔ مشن پر صاحب یہی ہتھیار استعمال کریں گے۔“

”ٹھیک ہے جناب!“ اس شخص نے فوراً آگے بڑھ کر معاذ کے ہاتھ سے ہتھیار لے لیے۔

”آج رات لینے جا رہے ہیں ہم تمہارے دوستوں کو۔ برات کے ساتھ جانے والی تام جھام تم نے دیکھ لی ہے۔ بس اب بیٹھ کر اپنے رب سے پرار تمنا کرو کہ کامیابی ہمارے قدم چومے۔“ دیوانے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اطلاع دی تو اس کے اندر جوش و جذبات کی لہریں ٹھاٹھیں مارنے لگیں۔ آج پہلی بار وہ ایسے کسی معرکے میں حصہ لینے جا رہا تھا جس میں مرنے اور مار دینے والی لگن اس کے ساتھ تھی۔

☆☆☆

”بہت عرصہ ہوا، آپ ملاقات کے لیے نہیں آئے؟“ ”بزئس، سیاست اور سوشل ویلفیئر کی کشتیوں میں بیک وقت چہرہ کر زندگی کا سفر کرنے والے بندے کے پاس اپنے لیے وقت نہیں بچتا تو کسی سے کیا ملاقاتیں کرتا پھرے۔“ عرفان اللہ نے فون پر شکوہ کنال تاج بائی عرف تاجور کو کھل سے جواب دیا۔

”کبھی وہ وقت ہوا کرتا تھا جب آپ ساری دنیا چھوڑ کر ہمارے پاس بھاگے چلے آتے تھے۔“ اس نے یاد دلایا۔

”وقت ہی تو بدل گیا ہے جان من! پہلے آتش جوان تھا اور سر پر ذمے داریوں کا بوجھ نہیں تھا۔ اب مجھے یاد رکھنا پڑتا ہے کہ میرے بگڑے کام سنوارنے کے لیے سر پر میرا باپ موجود نہیں ہے بلکہ میں خود ایک باپ ہوں جسے اور بہت ساری ذمے داریاں سنبھالنے کے ساتھ ساتھ اولاد کے پیدا کیے مسائل سے بھی نمٹنا پڑتا ہے۔“

”نہیں۔ کوئی اور کام نہیں ہے۔ بس تم اس کام کو دھیان سے کرنا۔ پہلے ہی ہمیں.....“

”سلطان اور کامی کی وجہ سے بہت سکی اٹھانا پڑی ہے۔“ اس نے ان کا جملہ مکمل کیا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔
 ”ڈونٹ وری۔ مجھے معلوم ہے کہ میں سلطان اور کامی کی طرح غلطیاں کرنا انور ڈنٹیں کر سکتا۔ مجھ میں اور ان میں فرق ہے۔ انہیں کبھی خود کو اہل ثابت کرنے کی فکر نہیں رہی لیکن مجھے ہر بار ثابت کرنا پڑتا ہے کہ میں اہل ہوں۔“ وہ وہاں سے نکلتے نکلتے انہیں بہت کچھ بتا کر نکلا تھا پھر بھی خون سر میں ٹھو کریں مار رہا تھا۔ کسی تاج بانی کا بیٹا ہو کر معاشرے میں رہنا آسان نہیں ہوتا۔ اس نے ساری زندگی بہت عیش و عشرت میں گزاری تھی اور کبھی کسی شے کے لیے نہیں ترسا تھا۔ اس کی زندگی میں بس ایک خلا تھا اور وہ یہ کہ اس کی ولدیت کے خانے میں لکھا شوکت عرف شوکی کا نام کبھی اس کے باپ کے طور پر تسلیم نہیں کیا گیا تھا اور جس پر باپ ہونے کا الزام تھا، اس نے کبھی اپنا نام ولدیت کے خانے میں لکھنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ اپنی زندگی کے اس خلا کو پُر کرنے کے لیے اس نے اتنے عجیب و غریب تجربات کیے تھے کہ خود ایک عجیب سی شخصیت بن کر رہ گیا تھا لیکن سکون اسے کسی صورت حاصل نہیں ہوا تھا۔ اب بھی اس نے سکون کے حصول کے لیے اپنی محبوبہ مہناز کے پاس جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس نے عرفان اللہ سے غلط بیانی کی تھی کہ اس کی آج مہناز کے ساتھ ڈیٹ ہے لیکن اب وہ وہیں جا رہا تھا۔

مہناز کا اور اس کا معاملہ بھی عجیب تھا۔ وہ برسوں سے اس کی محبوبہ کے عہدے پر فائز تھی۔ وہ ذائقہ بدلنے کے لیے جب چاہے ادھر ادھر منہ مار لیتا تھا اور پھر پلٹ کر مہناز کے پاس آ جاتا تھا لیکن کبھی مہناز کو بیوی کے عہدے پر ترقی دینے کا نہیں سوچا تھا۔ مہناز کو اس کی اس خصلت سے لاکھ تکلیف تھی لیکن اعتراض کی ہمت نہیں تھی اور نہ ہی وہ سوچ سکتی تھی کہ باذل کو چھوڑ کر کسی اور کا ہاتھ تھام لے۔ اسے معلوم تھا کہ جس دن اس نے ایسا سوچا، باذل اس کے جسم کا ریشہ ریشہ کر کے چیل کوؤں کو کھلا دے گا۔ حقیقتاً ان کا تعلق محبت سے زیادہ خوف کی بنیاد پر قائم تھا لیکن باذل کو اس بات کی پروا نہیں تھی۔ اس کے لیے یہ اطمینان کافی تھا کہ وہ جب چاہے اپنی من پسند عورت کو اپنے تصرف میں لاسکتا ہے۔ اب بھی وہ اسی یقین کے تحت اس کی طرف روانہ ہوا تھا۔

”انہوں نے باذل کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے گفتگو کا اختتام کیا۔“

”کیسے ہو؟“ فون بند کر کے وہ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور ساتھ ہی اس کے چہرے کو کھوجنے کی کوشش کی۔ اس کا چہرہ ہمیشہ کی طرح سپاٹ تھا۔ وہ اندازہ نہیں لگا سکے کہ اس نے تاج بانی سے کہا گیا ان کا جملہ سنا تھا یا نہیں۔

”میں ٹھیک ہوں۔ آپ نے مجھے کس سلسلے میں یاد کیا تھا؟“ اس نے اپنے مخصوص انداز میں سوال کیا۔

”ایک اہم کام سے اور مجھے معلوم ہے کہ بس تم ہی اس کام کو نمٹا سکتے ہو۔ یوں سمجھو کہ اس کام کو ایک چیلنج کے طور پر ہمیں سونپا گیا ہے اور موقع دیا گیا ہے کہ ماضی میں کامی اور سلطان کی نا تجربہ کاری کی وجہ سے جو سکی اٹھانا پڑی ہے، اس کی صفائی کر ڈالیں۔“

”کام کیا ہے؟“ اسے ان کی تمہید میں کوئی دلچسپی نہیں تھی کیونکہ وہ سارے حالات سے واقف تھا۔ اسے معلوم تھا کہ سیاسی اور فلاحی کاموں کے لیے فنڈنگ کرنے والے مطالبات بھی کرتے تھے اور آزمائشوں سے بھی گزارتے تھے۔

اسکی ہی ایک آزمائش کے نتیجے میں حیات یزدانی کا بیٹا کامران یزدانی عرف کامی اپنی جان سے چلا گیا تھا۔ اسے سرحد پار سے آئی ہوئی اسمگلنگ کی ایک کمپ کے ساتھ خفیہ طور پر آنے والی ایک ڈیوائس نکال کر لانی تھی۔ وہ اس مشن پر باربی نامی رقاہ کو اپنے ساتھ لے گیا۔ نتیجے میں ڈیوائس بھی ہاتھ سے نکلی اور کامی بھی جان سے گیا۔ بعد میں انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ ڈیوائس اس پارٹی تک پہنچ چکی ہے جس نے انہیں یہ کام سونپا تھا لیکن نااہلی کے داغ کے ساتھ وہ شکوہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہے تھے۔

”لالہ بیٹی منظر سے غائب ہے۔ تمہیں اسے تلاش کرنا ہے۔“ عرفان اللہ نے اسے کام کی نوعیت سے آگاہ کیا۔

”صرف تلاش کرنا ہے یا ٹھکانے بھی لگانا ہے؟“ اس نے بے نیازی سے دریافت کیا۔

”نی الحال صرف تلاش کرنا ہے اور تم اس کام کو اتنا ہلکا نہ لو۔ لالہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔“ انہیں اس کی بے نیازی کھٹکی۔

”ہو جائے گا۔ اگر آپ کو کوئی اور کام نہ ہو تو میں جاسکتا ہوں؟ میری آج مہناز کے ساتھ ڈیٹ ہے۔“ کھائی موڑ کر وقت دیکھتے ہوئے اس نے انہیں بے خونی سے اپنی مصروفیت سے آگاہ کیا۔ وہ کوئی اس کے اعلائیہ باپ نہیں تھے جو وہ انہیں ایسی کسی بات سے آگاہ کرتے ہوئے جھجکتا۔

جھجکتی باذل کے قریب چلی آئی۔ گھٹنوں کے بل اس کے قریب بیٹھتے ہوئے اس نے جوتا اس کے نیچے پاؤں کی طرف بڑھایا۔ اس نے پاؤں کو یوں ذرا سا فرش سے اوپر اٹھایا جیسے اسے جوتے میں ڈالنے کا ارادہ رکھتا ہو لیکن پھر یکدم اس کا پاؤں تیزی سے حرکت میں آیا اور لڑکی کے منہ پر اس زور سے پڑا کہ وہ کراہتی ہوئی پیچھے کی طرف الٹ گئی۔

”پلیز ڈارلنگ! بے ضرر ہے بے چاری۔ خاموشی سے اپنا کام کرتی ہے اور بغیر کوئی ڈیمانڈ کیے جو ملے اس پر گزارہ کر لیتی ہے۔ سچ، اس کی وجہ سے مجھے بہت آرام ہو گیا ہے۔ میرے صدقے ہی اسے برداشت کر لو۔“ مہناز بہت پیار سے اس کا غصہ قابو کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”تمہاری خاطر ہی برداشت کر رہا ہوں ورنہ ایسی بد شکل عورت کو کب کا اٹھا کر باہر پیٹک چکا ہوتا۔“ اس نے لڑکی پر تحقیر بھری نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

”تومت دیکھو اس کی طرف۔ آؤ میرے ساتھ بیڈ روم میں چلو۔ وہاں تمہیں میرے سوانہ کچھ دکھائی دے گا اور نہ بھائی۔“ مہناز نے ناز سے اسے اپنی طرف متوجہ کیا تو اس کی آنکھوں میں مخصوص چمک لہرائی۔ بد صورت ملازمہ کے چکر میں واقعی اس نے مہناز پر توجہ نہیں دی تھی۔ کھلے گلے کے چین سے گاؤں میں ملبوس وہ واقعی دعوتِ نظارہ دے رہی تھی۔

”کم آن مائی بے بی! میرے ہوتے ہوئے تمہیں کہیں اور دیکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ میرا بے داغ حسن ہے نا تمہارے ذوق پر پورا اترنے کے لیے۔“ اس کی نگاہوں کی تبدیلی کو محسوس کر کے وہ مزید اٹھلائی اور بازو پکڑ کر خواب گاہ کی طرف دھکیلنے لگی۔ اس بار باذل نے مزاحمت نہیں کی۔ ان دونوں کے بندر دوازے کے پیچھے گم ہو جانے کے بعد نیچے لڑھکی پڑی لڑکی اٹھی اور پاؤں کی ٹھوکر سے پھٹ جانے والے اپنے ہونٹ سے بہتے خون پر دوپٹے کا پلہ رکھا۔ اس بل ہونٹ سے بہتے خون کی سی سرخی اس کی آنکھوں میں بھی اتر آئی تھی۔ اس کا بس چلتا تو باذل کا پورا جسم خونِ گرد جی لیکن بس ہی تو نہیں چلتا تھا۔ دائیں ہاتھ کی فریکچر شدہ انگلیاں بغیر علاج کے خود بخود ہڈی جڑنے کے نتیجے میں نیڑمی میڑمی ہو چکی تھیں۔ ان نیڑمی میڑمی انگلیوں کے ساتھ وہ گھر کے معمولی کام تو نمٹا لیتی تھی لیکن اس لائق نہیں تھی کہ کسی ہتھیار کو گرفت میں لے کر استعمال کر سکتی۔ دائیں پاؤں کا ٹنگ بھی ایک امتحان تھا اور اس امتحان کو مزید

جس اپارٹمنٹ بلڈنگ میں مہناز رہائش پذیر تھی وہاں سیکورٹی کا نظام سخت تھا اور باہر سے آنے والوں کو مکینوں سے تصدیق کے بغیر اندر آنے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی لیکن باذل پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ سب جانتے تھے کہ مہناز کے رہائشی اپارٹمنٹ کا اصل مالک وہی ہے۔ اب بھی وہ بنا روک ٹوک کے آسانی سے اوپر پہنچ گیا اور اپنے پاس موجود چابی سے دروازہ کھول کر بیٹا چاپ اندر داخل ہوا۔ سامنے لاؤنج میں ہی ایک دہلی پتلی سی لڑکی اس کی طرف پشت کیے جھائڑ پونچھ میں مصروف تھی۔ لڑکی کی بے خبری میں وہ وہیں کھڑا اس کے جسمانی خدو خال کو ٹاپنے لگا۔ یہ شاید اس کی نظروں کا ارتکاز تھا کہ لڑکی نے ایک دم پلٹ کر پیچھے دیکھا اور کچھ گھبرائے ہوئے سے انداز میں پیچھے ہٹی۔ اس نے بھی بے ساختہ اپنی نظروں کا زاویہ بدلا۔ زاویہ بدلنے کا سبب کسی قسم کی جھجک یا شرمساری نہیں بلکہ کراہت کا احساس تھا۔ لڑکی کا داغ دار چہرہ اور لقوے کے مریض کی طرح ٹیڑھا منہ اس کی حسن پرست طبیعت کو کمزور کر گیا تھا۔ طبیعت کے اس کمزور کو دور کرنے کے لیے اس نے اپنے بائیں پاؤں سے جوتا اتارا اور لڑکی کی طرف اچھال دیا۔ جوتا اڑتا ہوا جا کر لڑکی کے شانے پر لگا اور اس کے منہ سے بے ساختہ ہی ایک کھسکیا کی ہوئی خوفزدہ آواز نکل۔ اسی وقت ایک کمرے سے برآمد ہوتی مہناز نے یہ منظر دیکھا اور تیزی سے چلتے ہوئے اس کے قریب آئی۔

”واٹ آ سر پرائز ڈارلنگ! تم یوں اچانک بغیر بتائے ہی آ گئے۔“ اس کی حرکت کو مکمل نظر انداز کرتے ہوئے اس نے اپنی بائیں اس کے گلے میں حائل کیں۔

”مجھے کیا معلوم تھا کہ آتے کے ساتھ ہی یہ بھیا تک سین دیکھنے کو مل جائے گا۔“ اس کا موڈ بدستور خراب تھا۔

”چھوڑو اسے۔ آؤ میرے ساتھ، اندر بیڈ روم میں چلو۔“ اس بار مہناز نے اپنا بازو اس کی کمر کے گرد لپیٹے ہوئے اسے خواب گاہ کی طرف دھکیلنے کی کوشش کی۔

”اے..... میرا جوتا ادھر لا اور میرے پاؤں میں پہنا۔“ مہناز کی کوشش کو نا کام بناتا وہ مضبوطی سے اپنی جگہ جما کھڑا رہا اور شانے پر ہاتھ رکھے کبھی کھڑی لڑکی کو سختی سے حکم دیا۔ اس کا حکم سن کر لڑکی مزید ہراساں نظر آنے لگی۔

”جوتے آؤ شیو! شاباش، آ جاؤ۔ اب صاحب کچھ نہیں کہیں گے۔“ مہناز نے باذل کے موڈ کو بہتر کرنے کے لیے لڑکی پر پیار سے زور ڈالا تو اس نے بے بس سے انداز میں جھک کر اپنے قریب ہی گرا جوتا اٹھایا اور ڈرتی

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور
اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

سرگزشت



تاریخ کے درپے سے حسیران

کردین والی داستان



پاکستانی سینما سنبھری

ایام کی یادیں، باتیں



برف کے پیرانے میں دو بیٹائی
میں محسوس ہو کر جھک جیسا



ایک بالکل الگ انداز کی عجیب سیانی
جو آنکھوں میں آنسو لاوے



سفر کہانی "اوسلو" طویل لمبرنگ داستان "روسیا"
سیر پاکستان کے حوالے سے "محبزے"
شکاریات کی دلچسپ کہانی "سجھا"



دوسب کچھ جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں
جو آپ کو پڑھنا چاہیے۔

سخت بنانے کے لیے بیروں میں بیڑیاں بھی ڈال دی گئی
تھیں۔ اب وہ ایک زرخیز غلام کی طرح اس اپارٹمنٹ
کے طول و عرض میں خدمات تو انجام دے سکتی تھی لیکن یہاں
سے باہر نکل کر آزاد فضا میں سانس نہیں لے سکتی تھی۔

☆☆☆

رات کی تاریکی میں وہ تین گاڑیاں بہت تیزی سے
دہلی کے مضافات کی طرف دوڑتی چلی جا رہی تھیں۔ ہر
گاڑی میں کم سے کم تین سے چار نفوس موجود تھے لیکن ان
کے درمیان موت کی سی گھبر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔
محنت مایا بلومات کے ہاتھ دھارے کے ہمارے جان
کی بازی لگانے کے لیے تیار تھے۔ ان کے سپاٹ چہرے
ہر قسم کے تاثر سے آزاد تھے۔ اگر کوئی تاثر ہوتا تو بھی
گاڑیوں کی بجھی ہوئی روشنیوں کے باعث دیکھا نہ جاسکتا
تھا۔ ان سپاٹ چہروں کے درمیان اس کا چہرہ وہ واحد
چہرہ تھا جو اندرونی جوش و جذبے سے تھمتا رہا تھا اور وہ بار بار
گردن گھما کر یوں راستے کے دائیں اور بائیں جانب دیکھتا
تھا جیسے نشانیوں سے اندازہ لگانا چاہ رہا ہو کسب کتنا سفر باقی
ہے لیکن اس مضافاتی علاقے کا بیشتر حصہ ٹافیک ہی تھا اور
وہ گاڑیوں کی بجھی ہوئی روشنیوں کے ساتھ صرف ڈرائیورز
کی مہارت کے سہارے آگے بڑھ رہے تھے۔

"ہم ٹارگٹ سے قریب ہیں۔ ٹھیک ایک منٹ بعد
ساری گاڑیاں روک لی جائیں۔" ہر گاڑی میں سوار افراد
کے کانوں میں گونجنے والی ٹیم لیڈر کی آواز نے محاذ کو مزید
الٹ کر دیا۔ اس مشن پر دیوان کے ساتھ نہیں تھا لیکن اس
نے محاذ کو اطمینان دلایا تھا کہ وہ اس مشن پر اپنے بہترین
آدمی اس کے ساتھ بھیج رہا ہے۔ وہ اس وقت ٹیم لیڈر والی
گاڑی میں ہی سوار تھا۔ ٹھیک ایک منٹ بعد ان کی گاڑی
رک گئی۔ اسے یقین تھا کہ باقی دونوں گاڑیاں بھی رک چکی
ہوں گی لیکن وہ انہیں دیکھنے سے قاصر تھا۔

"اپنی پوزیشن بتاؤ۔" گاڑی رکے ہی ٹیم لیڈر نے
حکم دیا۔

"ٹارگٹ۔"

"ساؤتھ۔"

فورا ہی پے در پے دو آوازیں گونجیں۔

"خاموشی سے اپنی اپنی پوزیشن پر پھیلنا شروع کرو
لیکن یاد رکھنا کہ میرے حکم سے پہلے آگے نہیں بڑھنا ہے۔"
اپنے حکم کی پوزیشن جان لینے کے بعد اس نے نیا حکم

جاری کیا۔ معاذ کے لیے یہ ایک انکشاف ہی تھا کہ ان کے ساتھ روانہ ہونے والی گاڑیوں نے کسی وقت خاموشی سے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تھا اور اب ٹارگٹ کی مختلف سمتوں میں موجود تھیں۔

”سیکیورٹی کیمروں کی کیا پوزیشن ہے؟“ اس بار معاذ نے ٹیم لیڈر کی آواز اپنے اڑپس کے بجائے براہ راست سنی تھی۔ اب وہ یہاں سے دور بیٹھے اس کمپیوٹر انکسپرٹ سے مخاطب تھا جس نے ان کی مطلوبہ عمارت کے سیکیورٹی کیمروں کو ہیک کرنے کی ذمہ داری سنبھالی ہوئی تھی۔

”گڈ! ٹھیک ہیں سینڈ بعد سارے کیمرے بند ہو جانے چاہئیں۔“ دوسری طرف کی رپورٹ سن کر اس نے نیا حکم جاری کیا اور اپنے ساتھ گاڑی میں موجود افراد کو حرکت میں آنے کے لیے اشارہ کیا۔ وہ سب تیار ہی تھے۔ ایک بل میں سیٹوں کے نچلے خلا میں موجود ان کے بیگ باہر نکلے اور ان کے گیندوں پر پہنچ گئے۔ گاڑی سے نکل کر باہر کے تاریک سڑکوں میں خود کو مدغم کرتے ہوئے ان کو کوئی مشکل پیش نہ تھی۔

”ایک، دو، تین.....“ دوسروں کے ساتھ حرکت کرتا معاذ دل ہی دل میں کئی کر رہا تھا۔ میں کہتے ہی اس نے اپنے کان میں آواز سنی۔ ”ایکشن!“

وہ جانتا تھا کہ اس ایک لفظ کے بعد طاقتور جیمز کام کرنا شروع کر دیں گے جن کے باعث تمام مواصلاتی آلات کام کرنا بند کر دیں گے۔ ان میں خود اس کے اور اس کے ساتھیوں کے آلات بھی شامل تھے۔ یعنی اب ان میں سے کوئی بھی ایک دوسرے سے مواصلاتی آلات کے ذریعے رابطہ نہیں کر سکتا تھا لیکن اندر والوں کو بیرونی مدد حاصل کرنے سے روکنے کے لیے یہ ایک اہم قدم تھا۔ خود ان کا لائحہ عمل طے شدہ تھا اور کسی مشکل یا ضرورت کے تحت ساتھیوں کو متوجہ کرنے کا طریقہ بھی طے تھا۔

”ایکشن“ کی آواز سنتے ہی اس سمیت تمام افراد نے اپنی اپنی طے شدہ پوزیشن سے پیش قدمی شروع کی۔ اس وقت وہ جس عمارت کو گھیرے ہوئے تھے وہ بظاہر قدیم طرز کا ایک گیسٹ ہاؤس تھا لیکن موہن کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق عالم اور سرمد کے علاوہ کچھ اور خاص مجرموں کو بھی یہاں رکھا گیا تھا۔ وہ لوگ اپنی اہم میٹنگز اور پلاننگز کے لیے بھی اس مقام کو استعمال کرتے تھے۔ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ عمارت میں زیادہ گہما گہمی اور ہلچل نہ دکھائی دے لیکن سیکیورٹی سخت تھی۔ ان کے پاس چونکہ اس

سیکیورٹی سے متعلق تمام تفصیلات موجود تھیں اس لیے پوری منصوبہ بندی اور تیاری کے ساتھ آئے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ سیکیورٹی کیمروں کے ایک ساتھ بند ہوتے ہی اندر تشویش کی لہر دوڑ جائے گی اور وہ ہر ممکنہ قدم اٹھانے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ ان کی اس تیاری کو دھوکا دینے کے لیے ان کے پاس لائحہ عمل موجود تھا۔

جب تک وہ اپنے ایک ساتھی کے ساتھ پنجوں کے بل دوڑتا ہوا عمارت کی باؤنڈری وال تک پہنچا، فضا میں دو دھماکوں کی آواز گونج چکی تھی۔ یہ آواز بہت بلند نہیں تھی لیکن آوازیں پیدا ہوتے ہی عمارت کے شمالی اور جنوبی حصوں میں دھوئیں کے بادل سے چھا گئے تھے۔ دھوئیں کے ان بادلوں کو دیکھتے ہی معاذ اور اس کے ساتھی نے عمارت کی بلند دیواروں پر کندیں ڈالیں اور بندروں کی سی پھرتی سے اوپر چڑھتے چلے گئے۔ کندیں ڈالنے کے لیے انہوں نے جو آنکڑے استعمال کیے تھے ان پر ربر کی تہ چڑھی ہوئی تھی اس لیے وہ دیواروں پر بچھے لوہے کے تاروں میں دوڑتی برقی رو سے محفوظ رہے تھے۔ دیوار کے پار جانے سے قبل انہوں نے برقی رو کے اس سلسلے کو منقطع کر دیا۔ جس وقت وہ اس کام سے فارغ ہو کر اپنے ربرسول کے جوتوں کے باعث احاطے میں بے آواز کودے، شمالی اور جنوبی سمتوں سے فائرنگ کی آوازیں گونجنا شروع ہو چکی تھیں۔ حسب منصوبہ وہ ان لوگوں کی توجہ ہاتھ میں کامیاب ہو گئے تھے اور دھماکوں اور دھوئیں کے باعث یہ سمجھتے ہوئے کہ شمالی اور جنوبی سمتوں سے اندر داخل ہونے کی کوشش کی جا رہی ہے، انہوں نے اپنا سارا زور اس طرف لگا دیا تھا۔ ان کی اس غلط فہمی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے معاذ اور اس کے ساتھی کے علاوہ دو دوا افراد پر مشتمل دوسرے ٹیمیں بھی بالکل اسی طرح عمارت کے احاطے میں پہنچ چکی تھیں اور اب وہ سب اپنے اپنے طور پر اندر تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

دھماکوں سے قبل اندرونی حصے میں کچھ روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں لیکن دھماکے ہوتے ہی پوری عمارت گہری تاریکی میں ڈوب گئی تھی۔ اس تاریکی کا مقابلہ کرنے کے لیے انہوں نے اپنے ٹائٹ ویژن چشمے آنکھوں پر چڑھا لیے تھے اور بہ احتیاط آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ اندرونی عمارت کے مرکزی دروازے تک پہنچنے میں انہیں کسی قسم کی دقت پیش نہ آئی لیکن جیسے ہی معاذ کے ساتھ

وہ اندر ہی اندر مل کھا کر رہ گیا لیکن گردن پر رکھی گن کی نال کے ساتھ کوئی حرکت کرنا حماقت ہوتی۔

”تھیار پیچک دو۔“ ابھی اس نے پہلے حکم پر عمل نہیں کیا تھا کہ گردن پر دباؤ ڈال کر دوسرا حکم دیا گیا۔ چارونا چار اسے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے تھیار پیچک کر ہاتھ اٹھانے پڑے۔

”آگے بڑھو۔“ گن بردار نے اسے اسی طرف دھکیلا جہاں قیدیوں کے کمرے بنے ہوئے تھے۔ شاید وہ اسے ان کمروں میں سے کسی میں قید کرنا چاہتا تھا۔ موقع کا منتظر معاذ بظاہر بے بس اس کے حکم پر آگے بڑھنے لگا۔ ٹائٹ ویڈن کی وجہ سے تارکی کے باوجود اسے آگے بڑھنے میں دشواری کا سامنا نہیں تھا۔ ایک کمرے کے بند دروازے کے سامنے سے گزرتے ہوئے یکدم ہی اسے عقب سے اپنی زد میں لے کر آگے بڑھنے والا لڑکھڑا گیا۔ اس کے لڑکھڑانے کی وجہ پر غور کرنے کے بجائے وہ پھرتی سے ایک طرف ہوا اور بیلٹ کے ساتھ لٹکا بریٹا نکال کر اس پر فائر کر دیا۔ گولی سیدھی اس شخص کی کھوپڑی میں ٹکسی اور وہ مٹی سے بھرے پورے کی طرح زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

”ہے مین! ہیلپ می۔ دیکھو میں نے تمہاری ہیلپ کی ہے۔ تم بھی میری ہیلپ کرو۔“ ابھی وہ گولی چلا کر پلٹا بھی نہیں تھا کہ کسی نے اسے پکارا۔ آواز اس دروازے کے پیچھے سے آرہی تھی جس کے سامنے مرنے والے کی لاش پڑی تھی۔

”کون ہو تم؟“ اس نے بے ساختہ ہی تیزی سے سرگوشی میں پوچھا۔

”میں وہ ہوں جس نے دروازے کے نیچے سے چھڑی ڈال کر تمہارے دشمن کو لڑکھڑانے پر مجبور کیا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو تم اس سے آسانی سے جان نہ چھڑا پاتے۔“

”لیکن تم نے اتنے اندھیرے میں یہ کیسے کیا؟“ وہ واقعی حیران تھا۔

”میرے کان بہت تیز ہیں۔ تم کہو تو تمہارے اندر داخل ہونے سے لے کر اس پہرے دار کے مرنے تک، ایک ایک پل کی تفصیل سنا سکتا ہوں لیکن آئی تھنک کہ تمہارے پاس اتنا ٹائم نہیں ہوگا۔ بہتر ہے کہ تم مجھے آزادی دلوا کر میرے احسان کا بدلہ چکاؤ اور اپنا مشن مکمل کرو۔“

کمال کا اعتماد تھا اس کے لہجے میں۔ معاذ اسے نظر انداز کر کے آگے نہ بڑھ سکا۔

”ٹھیک ہے۔ میں لاک توڑنے کے لیے گولی چلا رہا

موجود شخص نے دروازے کی طرف ہاتھ بڑھایا، عمارت کی ایک کھڑکی سے گولیوں کی بارش آئی۔ معاذ نے کسی خود کار رد عمل کے مانند نیچے گرتے ہوئے اس کھڑکی کی طرف فائر کھول دیا۔ وہاں موجود شخص کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ اس کا ساتھی جو اسی کی طرح نیچے گر کر خود کو نشانہ بننے سے بچانے میں کامیاب ہو گیا تھا، اس موقع کا فائدہ اٹھا کر ایک بار پھر دروازے پر قسمت آزمائی کرنے لگا اور جب اسے لاک پایا تو گولیوں سے لاک کو اڑا ڈالا۔

کھڑکی والے کو آگے آ کر مزید فائر کرنے کا موقع دیے بغیر جب تک معاذ اپنے ساتھی کے قریب پہنچا، ایک دوسرا ساتھی بھی ان سے آن ملا تھا۔ معاذ نے کھڑکی والے کو الجھائے رکھا جبکہ نیا آنے والا اس کے ساتھی کو اندر جانے کے لیے کور دینے لگا۔ یہ وہ لحظات تھے جب پوری عمارت کے اطراف میں ہلکی اور بھاری فائرنگ کی آوازیں گونج رہی تھیں اور کسی کو کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ آیا کس کا پلڑا بھاری ہے۔

عمارت کے اندر داخل ہونے کی کوشش کرنے والے اس کے ساتھی نے ٹوٹے لاک والے دروازے کو دھکیل کر قدم اندر رکھا ہی تھا کہ کہیں سے گولیوں کی پوجھاڑ آئی اور اس کے نچلے بدن کو چھید ڈالا۔ وہ بلند آواز میں چیختا ہوا نیچے گر گیا لیکن اسے گرانے والا بھی نہ فوج سکا اور اسے کور دینے والے ساتھی کی گولیوں کی زد میں آ گیا۔ معاذ نے کھڑکی کی طرف ایک طویل برسٹ مارا اور پھرتی سے کھلے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ موہن کا بتایا ہوا عمارت کا نقشہ پوری طرح اس کے ذہن میں محفوظ تھا۔ ارد گرد سے چونکا وہ اس راستے پر آگے بڑھتا چلا گیا۔ عمارت کے مختلف حصوں سے آتی ہلکی فائرنگ کی آوازوں سے ظاہر تھا کہ اس کے کچھ اور ساتھی بھی اندر داخل ہو گئے ہیں یا ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بہر حال وہ جس راستے پر آگے بڑھ رہا تھا، وہاں اسے کسی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑ رہا تھا۔ یعنی طور پر ”را“

والے یہاں اپنی محدود نفری کے ساتھ موجود تھے اور اب وہ ساری کی ساری نفری حملہ آوروں سے نمٹنے کے لیے میدان میں اتری ہوئی تھی۔

”ہینڈ ز اپ۔“ وہ ایک گرل پر نگے تالے کو توڑ کر اس حصے میں داخل ہوا ہی تھا جہاں سے آگے موہن کی اطلاع کے مطابق قیدیوں کے کمرے تھے کہ کسی تاریک گوشے میں دیکھے شخص نے اپنی گن پیچھے سے اس کی گردن پر رکھ دی۔ منزل کے اتنے قریب پہنچ کر گرفت میں آنے پر

ہوں۔ تم دروازے کے سامنے سے ہٹ جاؤ۔“ فیصلے پر پہنچتے ہوئے اس نے اپنے لمبی نال والے بریٹا کو سیدھا کیا اور فائر کر ڈالا۔

”دروازہ کھولو اور ہاتھ اٹھا کر باہر آ جاؤ۔“ لاک ٹوٹتے ہی اس نے اندر والے کو حکم دیا۔

”یہ لو، دروازہ کھول دیا اور ہاتھ بھی اوپر اٹھالے لیکن باہر نہیں آ سکتا۔ میرے پیروں میں پڑی بیڑیاں مجھے اس دروازے سے آگے نہیں آنے دیتیں۔“ کھلے دروازے کے اندر وہ ایک ٹیم ٹیم ہولے کی صورت اس کے سامنے کھڑا تھا۔

”ٹائم کیوں ویسٹ کر رہے ہو؟ جلدی سے ان بیڑیوں کو توڑ دتا کہ میں یہاں سے جاسکوں۔“ ہولے نے فرمائش کی۔

”تم تو ایسے فرمائش کر رہے ہو جیسے میں تمہیں آزاد کروانے کے لیے ہی یہاں آیا ہوں۔“ وہ اس کے ٹوکے پر بھنگا گیا۔

”ارادہ بے شک تمہارا نہیں ہوگا لیکن کہیں اوپر سے اشارہ ہوا ہوگا کہ تم میری آزادی کا وسیلہ بنے یہاں موجود ہو۔“ ایسا پریقین لہجہ تھا کہ معاذ کو کچپی سی آگئی۔ بے ساختہ ہی اس نے اپنے پاس موجود نارنج نکال کر روشن کی اور اس شخص پر روشنی ڈالی۔ ابھی ڈاڑھی مونچھ اور بالوں والے چہرے پر موجود نیل اور درم سے ظاہر تھا کہ یہاں اس کی خاطر خواہ خاطر مدارت کی جاتی رہی ہے لیکن پھر بھی وہ مسکرا رہا تھا اور مسکرا کر شوخی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے یکدم ہی اسے آزادی دلوانے کا فیصلہ کر لیا اور جب فیصلہ ہو گیا تو اس شخص کو بیڑیوں سے آزاد ہونے میں دیر نہیں لگی۔

”لگتا ہے تمہارے ساتھی پوری طرح غالب آ گئے ہیں۔ بہتر ہے میں ان سے ٹکراؤ ہونے سے پہلے نکل جاؤں۔“ آوازوں پر کان لگائے وہ یوں دوستانہ انداز میں اس سے مخاطب تھا جیسے برسوں کی آشنائی ہو۔

”کون ہو تم؟“ اس کے لبوں سے سوال پھسلا۔
”کھل تعارف کروانے کا موقع نہیں۔ کبھی دل چاہے یا کوئی ضرورت پڑے تو ممبئی میں مشہور ایڈیٹر غالب انبالوی سے مل کر کہہ دینا کہ جارو سے ملتا ہے۔ آئی ہوپ کہ وہ تمہیں مجھ تک پہنچا دیں گے۔“ اس نے جواب دیا اور بالکل اچانک اپنے ٹیم ٹیم وجود کو بے پناہ پھرتی سے حرکت دیتے ہوئے مرنے والے کے نیچے پڑی گن تک رسائی

حاصل کر لی۔ معاذ نے اضطرابی طور پر بریٹا کا رخ اس کی طرف کر کے ٹریگر پر دباؤ ڈالا لیکن کسی انجانی قوت نے اسے مکمل دباؤ ڈالنے سے روک رکھا۔

”گڈ بائے۔“ خود کو جارو کے نام سے متعارف کروانے والا اپنے بھاری تن و توش کے ساتھ چھٹاؤے کی سی پھرتی سے اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اس کے نظروں سے اوجھل ہونے پر وہ گویا کسی ٹرانس سے باہر آیا اور عالم اور سرمد کو تلاش کرنے لگا۔ سوہن کے مطابق انہیں ان کمروں میں سے ہی کسی ایک میں رکھا گیا تھا لیکن اتنے ہنگامے کے باوجود ان کی طرف سے کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا تھا۔

”کیا ہوا؟ ملے وہ لوگ؟“ وہ تیسرے کمرے کا دروازہ کھول کر اس میں جھانک رہا تھا جب ٹیم لیڈر وہاں آیا اور اس سے غلٹ میں پوچھا۔

”ابھی نہیں۔“ وہ اگلے کمرے کی طرف بڑھا۔
”جلدی کرو۔ اس ٹائم سب ہمارے کنٹرول میں ہے لیکن آس پاس سے کسی نہ کسی نے فائرنگ اور دھماکوں کی آواز سن کر پولیس کو انفرام کر دیا ہوگا۔ ہماری نفری کم ہو چکی ہے۔ اگر پولیس نے گھیرا ڈال دیا تو ہمیں یہاں سے نکلنا مشکل ہو جائے گا۔“ ٹیم لیڈر نے اس سے اضطرابی لہجے میں کہا اور خود بھی ایک بند دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ معاذ کی طرح نارنج روشن کر چکا تھا۔

”نفری کم ہو گئی ہے سے کیا مطلب؟“
”سریش اور رادھے شدید زخمی ہوئے ہیں۔ میں نے ایک گاڑی میں انہیں یہاں سے واپس بھجوا دیا ہے۔“

”ہم۔“ معاذ نے محض ہنکارا بھرا اور چوتھے کمرے کا دروازہ کھول کر روشنی اندر ڈالی۔ (مین سوئچ آف تھا یا سرکٹ میں کوئی گڑبگڑ کی گئی تھی کہ جب سے وہ اس عمارت میں داخل ہوئے تھے، وہ مسلسل تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی اور انہیں روشنی کے لیے نارچوں کا ہمارا لیتا پڑ رہا تھا۔)

”اوہ، میرے خدایا!“ نارچ کی روشنی نے اسے جو منظر دکھایا، اسے دیکھ کر وہ بے حد کرب سے بڑبڑایا اور تیزی سے اندر داخل ہوا۔

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نوجوان
کی داستان جو غلط کاروں کے لیے
غضب ناک تھا باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیے

TAG

قسط: 25

شہزادہ شاہ

سہ ماہی

زندگی پیار کا ثبوت ہے مگر... صریح وہاں حجابِ سعادت پر... اردواریوں کا شکار ہو... وہاں انصاف اور ان کے عقائد پر... ذریعہ عدالتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں نا انصافیوں کی قدوتیں اندھیوں نے اسے محض سڑیا انتقام بنادیا تھا... اور ان ماریف قیوں حور و صبر کے ماہر ہانپتوں نے اسے ناقابلِ شکست بنایا تو وہ سب سے طرفِ ظلم و حذر کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے والے اس پُر عزم نوجوان کو حرفِ غلط کے مانند سدائے جاے کے منصوبے پٹانے جا رہے تھے... اس کی زندگی جو انیسویں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور رہ شہنی سم دہر تھی لیکن... بے خبری میں جہم لینے والے عشق کی لو اسے تیرکی میں بھی راستہ دکھایا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے جلو خان کارویہ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قرار یوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس نے سماتہ تھا... پھر وہ کیسے زعافے سے چھوڑ دہستیوں کے آگے ہار کر لیا... اگرچہ قاتل کی طاقت اور قاتل کے ہاتھ میں چور لڑنے والے کی طاقت لیکن وہاں وار کا تو یہ تھا کہ ایک کی ان کے چہرے میں طاری ہو وہ جس طرح اپنے قاتل کے قاتل میں حائل نہ ہو سکی...

اپنے خریفوں پر قہر بن کر ہارل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تحریر انگیز داستان

سپنر ڈائجسٹ 48 مارچ 2022



ہاتھوں میں تمام کرا سے پکارا لیکن وہ منہ پر چپکے شپ کی وجہ سے کوئی جواب دینے سے قاصر تھا۔ ذہنی حالت بھی ایسی نہیں تھی کہ محض آواز سے اسے شناخت کر پاتا چنانچہ ٹکر ٹکر ٹکل دیکھا رہا۔

”میں نہیں یہاں سے رہائی دلانے آیا ہوں میرے دوست!“ اس نے اپنے اطلاع دی پھر جھٹ کر چلے گئے۔ اس نے خود جاننے کوئی کہیں سے پہلے اس کے بنوے ہوئے ہاتھوں کو دیکھا۔ اسی لمحہ میں نیم لیدر بھی وہاں پہنچا تھا۔ اس نے زبیاں کاٹ کر عام اور سرد ہو چکے آٹا بھٹنے میں اس کی مدد کی پھر آہستہ سے بولا۔

”ان دونوں کی حالت تو ایسی نہیں ہے کہ یہ اپنے حیروں پر چل کر ہمارے ساتھ جا سکیں۔ ہمیں انہیں اپنے کندھوں پر اٹھانا پڑے گا۔“

”بالکل!“ اس نے بغیر کسی توقف کے عالم شاہ کو اپنے شانے پر لا دیا۔ سرہ نیم لیدر کے حصے میں آیا۔ اپنے سے بھی نکلے ہوئے قہر والے عالم شاہ کو یوں شانے پر اٹھا کر لے جانا عام حالات میں اس کے لیے آسان نہیں ہو سکتا تھا لیکن ”را“ کی قید میں اٹھائی جانے والی صعوبتوں نے اس صحت مند شخص کا وزن بہت کم کر دیا تھا۔ سرہ کا بھی ایسا ہی حال تھا۔ معاذ کو بے ساختہ ہی وہ وقت یاد آیا جب استاد بدرو کے اکھاڑے پر وہ اور عالم شاہ ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تھے۔ اس دوستانہ مقابلے میں عالم شاہ نے اسے تانوں چنے چوڑے تھے لیکن اب اسی عالم شاہ کا ”را“ والوں نے یہ حال کر دیا تھا کہ وہ اپنے حیروں پر چلنے کے لائق نہیں رہا تھا۔

”میں ساتھیوں کو بلاتا ہوں۔“ اندرونی حصے سے نکلنے کے بعد نیم لیدر نے ہانکی ہوئی آواز میں کہا اور اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک چمچی تال کی پھوٹی سی گن نکالی۔ اس گن کا رخ اوپر کی طرف کرتے ہوئے اس نے ٹریگر دیا تو روشنی کی ایک لکیر نیچے سے اوپر بلند ہوتی چلی گئی۔ یہ ساتھیوں کے لیے اشارہ تھا کہ اس جگہ مدد درکار ہے۔ فوراً ہی رد عمل بھی ظاہر ہوا اور دو تین ساتھی دوڑے چلے آئے۔ ان ساتھیوں کی مدد سے عالم اور بدرو کو گاڑیوں میں بٹھل کر کے الیاس سے روکے گاڑی میں لے کر آگے بڑھ گئے۔

”میری شہید کی ہے چار سو منٹ گزرنے کے بعد کھانے لیں گے۔“

میں تمہاری طرف دوڑا تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کے زخمی ہونے کی وجہ سے تم اکیلے رہ گئے ہو گے لیکن اکیلے بھی تم نے زبردست کام دکھایا۔“ اس نے کھلے دل سے معاذ کی تعریف کی۔

”جب بات اپنی عزیز ہستیوں کی ہو تو انسان کا سر دھری بانٹ لگا دیتی ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ اس کے ہاتھوں کے درمیان نیم لیدر کی ہاتھوں کی تعریف کی۔ اس نے زبیاں کاٹ کر عام اور سرد ہو چکے آٹا بھٹنے میں اس کی مدد کی پھر آہستہ سے بولا۔

”میں اپنے دوستوں سے ملنا چاہتا ہوں۔“ اس سارے عمل سے فارغ ہو کر جب وہ لوگ چائے پیتے بیٹھے تو معاذ نے فرمائش کی۔

”طبیعت وغیرہ تو ہمارے بندے دیکھ لیں گے لیکن ملاقات کا پتہ یہ ہے کہ تمہارے ساتھی ابھی یہاں نہیں ہیں۔ انہیں دوسرے پوائنٹ پر ڈراپ کیا گیا ہے۔“

”اوہ نو“ نیم لیدر کی دی اطلاع نے اسے سخت مایوس کر دیا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ اس گاڑی میں بیٹھتا جس میں عالم اور سرہ کو بٹھایا گیا تھا لیکن وہاں موقع ہی نہ مل سکا اور یہاں پہنچنے ہی وہ سب کے ساتھ دی گئی ہدایات پر عمل کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اس لیے اسے پتا ہی نہیں چل سکا کہ عالم اور سرہ وہیں نہیں لایا گیا ہے۔

”سب کا ایک جگہ ہونا ٹھیک نہیں تھا۔ اس لیے ہم گردہس میں ڈیوائنڈ ہو گئے۔ تم چتا نہ کرو۔ تمہارے دوست بالکل ٹھیک ہوں گے اور ان کی بہت اچھے سے کیئر کی جا رہی ہوگی۔“ چائے کا ایک بڑا سا گھونٹ بھرے ہوئے نیم لیدر نے اسے تسلی دی۔

”میں اکیلا رہتا ہوں۔“ اس نے سرخسہ خیر نہیں ہے۔“ اس نے نیم لیدر کی بات کو سنا۔ وہ ہمارے اور مفروہوں کی تلاش میں زمین آسمان یک کر ڈالیں گے۔ ابھی تو ہم کو ایسے رہتا ہے

حق طافدوسوں سے چلتے ہوئے رہا پائی جسے کا رخ کیا ہی تھا کہ
 لان میں کسی کی موجودگی کے احساس نے چونکا دیا۔ اپنا رخ
 بدل کر وہ اس سمت چل پڑی جہاں اسے کسی کی موجودگی
 محسوس ہوئی تھی۔ جلد ہی اس کی نظروں نے دھمکی روشنی میں
 ایک دوسرے میں مدغم ہوتے سایوں کو جالیا۔ تجسس اور
 حسد کی آگ جلنے کی فست میں وہاں کے کچھ اور غم سب ہو گئے تھے۔
 ان کی زندگی بے رنگ ہو گئی۔

میں نے اس پر غور کرنے لگا ہے کہ یہ کون سا معاملہ ہے۔
 وہی تمہیں شہرت پر پہنچے گا۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ جلاکار
 نہیں بلکہ لیکن اس نے جن لوگوں سے دشمنی پال رکھی ہے، وہ
 کسی کو بھی نہیں بخشے۔ اس کی وجہ سے ہمیں قلم کسی کی نظروں
 میں نہ آ جاوے گا۔" سرو کے ہونٹوں سے ادا ہونے والے الفاظ
 پر اس کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ اس نے سوچا تھا کہ معاذ
 کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے اسے ان
 لوگوں کے ساتھ زبردستی کرنا پڑے گی لیکن یہاں تو بغیر کسی
 کوشش کے ہی معلومات سامنے آنے لگی تھیں۔ ان کی گتھکو
 پر کان دھرے اس نے خود کار انداز میں اپنے موبائل پر
 آڈیو ریکارڈنگ شروع کر دی۔

”جو ہو گا سو دیکھا جائے گا۔ میں سہا دھو جی کو اس کی رکھ رکھاؤ کا دچن دے چکی ہوں اور اس وجہ سے کسی صورت بیچے نہیں سکتی۔“ خوب صورت نسوانی آواز جو یقیناً رادھا ہی کی تھی، اس کے کانوں میں پڑی۔

”بچے نے کانٹیں کھ رہا ہوں میں لیکن اپنی سسٹنی کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہوگا کہیں۔“ ایسا کر رہا کہ جب تک وہ یہاں ہے تم یہاں آنا چھوڑ دو۔ اگر کبھی کوئی مسئلہ ہو ابھی تو میں ساری بات اپنے اوپر لے لوں گا۔ میں کہہ دوں گا کہ اسے میں نے غناہ دی ہے اور رادھا کو تو اس سارے سفاکی کی کوئی خبر ہی نہیں ہے۔“ مرد کی آواز میں شدید فکر مندی تھی۔

”تمہارے خیال میں میں تمہیں دیکھ کر نے دوں گی؟ چائیں تم دیکھ سوچ کیسے لیتے ہو کہ میں تمہیں کسی مصیبت کو اکیلے چھیننے کے لیے چھوڑ کر خود چین سے بیٹھ جاؤں گی۔“ نسوانی آواز میں نکلی اسی جتنی۔

AGIP

تہارے سن میں ہے۔ "تمہیں کچھ جوتہ مجھے تکلیف نہیں

جیسے اندھیرے کمرے میں سانپ کے ساتھ موجود ہوں۔
ہم سانپ کو دیکھ بھی نہیں سکتے اور ہمیں اس سے بچنا بھی
ہے۔ "اسی نے ایک ایسی حقیقت گوشِ مژبری جس کے آئے
معاذ کے پاس پتھہ کہنے کی گنجائش ہی نہیں تھی لیکن پتا نہیں
کیوں وہ اپنے اندر ایک عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔
اسے لگتا تھا کہ یہ خیال اسے جو سوجھ بوجھ لیکن سامنے نہیں آتا۔
یاد آئے کچھ نہیں رہا۔"

☆ ☆ ☆

مگر نے کہ جسے چاہے وہ اندر جانے کے لیے پوری طرح تیار تھی۔ اس کا تجربہ تھا کہ عام طور پر ایسے بڑے گھروں کی سلیپر رنی پر کئی کئی افراد تعینات ہوتے ہیں لیکن یہاں ایسا نہیں تھا۔ بس سمیت پر ایک سلیپر رنی کارڈ متعین تھا اور اس کے علاوہ سارے انحصار خود کار حفاظتی نظام پر تھا۔ عام چور و چکوں اور چرموں کے لیے یہ نظام یقیناً نواصاً موثر رہا ہوگا لیکن اس کے آگے اس نظام کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ وہ اپنی بھرپور تیاری کے ساتھ گھر کو نظروں میں تو لیتی اندر جانے کے لیے بالکل تیار تھی۔

”میں آرمی ہوں معاہدہ! اب تم مجھ سے خرید نہیں
 چھپ سکتے۔“ آہستہ سے بڑبڑاتے ہوئے اس نے مکان
 کی طرف چل کر قدمی کی۔ اس مکان کی نشاندہی شاہدہ سے
 ہونے والے فون نمبر کی مدد سے ہوئی تھی۔ خاصی جلد و جہد کے
 بعد وہ یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہوئی تھی کہ جس نمبر سے
 معاہدہ شاہدہ سے بات کرتا رہا ہے وہ اس گھر میں استعمال
 ہوتا رہا ہے۔ ظاہری طور پر ایک فلم ایکٹریس کی کوئی حیثیت
 نہیں تھی لیکن وہ جانتی تھی کہ بانی دفن کی فلم انڈسٹری کا انڈر
 ورلڈ سے گہرا تعلق ہے۔ اس لیے وہ حاد یونی نے اگر غیر
 معمولی جرأت کا مظاہرہ کر کے معاہدہ کو اپنے ہاں بٹا دیا تو
 کوئی ایسا جینے کی بات نہیں تھی۔

خفاقی نظام کو بے کار دینا کر گھر کے اندر داخل ہونا اور اپنے کیمین میں موجود سیکڑوں کی گارڈ کو بے ہوش کرنا اس کے لیے بالکل بچوں کا کھیل تھا۔ اس کھیل کو کامیابی سے کھیلنے کے بعد وہ عطا قد سونے سے اندر کی طرف بڑھ رہی تھی۔

آئی ہے۔ آج، تم جتنا کہ تمہارے پیکیو کی سسٹم کو تیار رہنا کہ تمہارے اندر داخل ہوتا۔ اندر داخل ہونے کے بعد اس نے

ی رادھا ساری معدومیت چھوڑ کر دہلی آئی اور "کالے خان" نے اسے بالکل سچائی سے بتا دیا کہ معاذ ان تک اس طرح پہنچا۔

"اس سادھو پر مجھے پہلے ہی شک تھا لیکن اس نے پروں پر پانی ہی نہیں چڑھ دیا۔ حد یہ کہ اس کی کنیا پر پہنچ کر ہمارے آلات نے بھی ہلکا دھوکا دے دیا۔" وہ چہرے پر ہلکا سا ہنسی بھری نگاہ سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"اس سادھو کی بڑے کہانی ہیں۔ وہ جس کو آشیر باد دے دیں، اس کا پھر کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میں آج جو کچھ ہوں، ان ہی کے کارن ہوں۔" اس کی بڑ بڑاہٹ من کر رادھا بے ساختہ بول پڑی۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ اب تم یہ بتاؤ کہ یہاں رہ کر معاذ نے کیا کچھ کیا؟ تم ہی لوگ تھے نا جو اس کی ساری کارروائیوں میں اس کی مدد کر رہے تھے؟" وہ اتنی آسانی سے تسلیم نہیں کر سکتی تھی کہ ایک بہترین منصوبہ ساز تنظیم کے بہترین وسائل ایک معمولی سادھو کے آگے زبردستی ہو گئے تھے۔

"یہاں وہ بہت زخمی اور کمزور حالت میں لائے گئے تھے۔ کئی دن تو ان کے زخم بھرنے اور کمزوری دور کرنے میں گزر گئے۔"

"اس کے بعد وہیں کے بعد کیا کیا اس نے۔ مجھے وہ بتاؤ۔" وہ خواہ مخواہ ہی ٹیش میں آئی۔

"وہ 'را' کے ہاتھوں گرفتار ہونے والے اپنے ایک دوست کے لیے چریشان تھے اور انہیں رہا کروانے کے لیے کوششوں میں لگے رہتے تھے لیکن یہ کام آسان نہیں تھا۔ نہ ہی ہمارے اتنے وسائل تھے کہ ہم اس کام میں ان کی مدد کر سکتے۔ وہ خود اپنے طور پر کوششیں کرتے اور ناکامی پر بھجھکتے رہتے تھے۔"

"تم یہ کہتا چاہ رہے ہو کہ 'را' کی قید سے عالم شاہ اور اس کے ملازم کو فرار کروانے کے لیے جو منظم کارروائی کی گئی اس سے معاذ کا کوئی تعلق نہیں ہے؟" اس کا لہجہ تیز ہو گیا۔

"جی ہاں۔ صرف ایک شخص ہی تھا جس نے اس کی مدد کی۔ وہ رادھا کی کنیا تھی۔ اس نے اسے اپنے ہاتھوں سے لے کر معاذ صاحب یہاں سے چلے گئے تھے اور ابھی تک لوٹ کر نہیں آئے۔"

"یہاں نہیں ہے تو پھر کہاں ہے؟" وہ اسے گھورتے ہوئے غرائی۔

"مجھے نہیں معلوم۔ وہ پچھلے کئی روز سے غائب ہے۔"

نہ اس نے کوئی رابطہ کیا ہے اور نہ ہی لوٹ کر یہاں واپس آیا ہے۔ "کالے خان" نے مچائی گوش گزار کی لیکن وہ یقین کرنے کے لیے تیار نہ ہوئی اور دھمکیاں دیتے ہوئے بولی۔

"اگر تم اپنے اس سسٹم معتمد کو اس کے متعلق کچھ معلوم کرنے کے لیے اس کی بجائے دیکھو گے تو اس کا بدلہ ہم تم سے لے سکتے ہیں۔"

سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ آج ہی یہاں آئی ہے اور معاذ کے معاذات کے بارے میں کچھ بھی تفصیل سے نہیں جانتی۔ "وہ اس کی دھمکی پر تڑپے ہی اٹھا۔"

"چلو مان لیا کہ یہ کچھ نہیں جانتی لیکن تم تو یقیناً بہت کچھ جانتے ہو۔ تم بتاؤ مجھے اس کے متعلق۔" سونیا نے طنزیہ لب دیکھ میں اس سے کہا جس پر رادھا نے کچھ متوجہ نہ انداز میں کالے خان کے دونوں ہاتھ تمام کر ان پر دباؤ ڈالا۔ معاذ اس کے پاس سادھو کا مہمان تھا اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ سادھو کے مہمان کو کوئی نقصان پہنچے۔

"مجھے بتانے دو رادھا۔ ہمارے پاس بتانے کے لیے ایسا کچھ نہیں ہے جس سے معاذ کو نقصان پہنچے لیکن نہ بتانے کی صورت میں یہ ہمیں سخت نقصان پہنچا سکتی ہے۔" کالے خان نے رمنیت سے اسے سمجھایا۔ زندگی کے سرور گرم سے آگاہ اس شخص نے اس صورت حال میں خود کو تیزی سے جمت کر لیا تھا اور اب موجودہ حالات سے نمٹنے کے لیے اپنے طور پر ایک لائحہ عمل طے کر لیا تھا۔

"گنہ! اچھا فیصلہ کیا ہے تم نے۔ بہتر ہے کہ اب مزید دیر لگائے بغیر بتانا شروع ہو جاؤ۔" سونیا نے درمیان میں دخل دے کر اسے قسم دیا۔

"کیا جانتا چاہتی ہو تم اس کے متعلق؟"

"سب کچھ لیکن چلو تمہاری آسانی کے لیے بتا دیجی

ہوں کہ سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ وہ تم تک پہنچا کیسے؟ میں اس کے متعلق ایک ایک بات جانتی ہوں اور مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ اس کا کم از کم اس جہنم میں تھیں جہنم میں

ہو گیا۔ لیکن رادھا! کہہ دو دلچسپ خود سے کہہ دیجئے۔" وہ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

بالکل بھی نہیں جانتے تھے لیکن پھر ایک روز سادھو کی کا پیغام ملا کہ رادھا دیوی فوری طور پر ان سے ملنے پہنچے۔ پیغام ملے

موٹی کی پرورش اس کے جانی دشمن کے محل میں کروا سکتا ہے، وہ معاذ صاحب کو بھی ہر مصیبت سے بچا سکتا ہے۔" کالے خان کا جواب سمجھنا کر رکھ دینے والا تھا۔ وہ بھی تو ان ہی لوگوں میں سے تھی جو کل تک معاذ کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتا چاہتی تھی لیکن پھر پتا نہیں کیسے اس کا دل بدل گیا اور اس کے لیے معاذ کا ٹھکانہ کی اسٹج بن گیا۔

معاذ صاحب نے اس کی بات کو سمجھ لیا۔ بہتر ہو کہ تم لوگ میرے پاس آئے گا کر کے سے بچ کر رہا۔" ان نے ہنسنے سے پہلے اندر اٹھ کر رادھا اور کالے خان کے چہرے دیکھے اور وہاں سے دو اندہ ہونے کا غلطیہ دیا۔ اپنی اس کیفیت میں وہ محل کے بارے میں مزید پوچھتا چھوڑ کر بھی بھول چک گیا۔ دوسری طرف رادھا اور کالے خان بھی حیران سے تھے کہ وہ انہیں کوئی نقصان پہنچائے بغیر اتنی آسانی سے وہاں سے جا رہی تھی۔

☆☆☆

آنے والے کو دیکھ کر وہ اپنی جگہ سے بے قراری سے کھڑا ہوا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات کچھ ایسے تھے کہ وہ کچھ کہتے اور پوچھتے ہوئے جھجک گیا۔

"بیٹھو۔" اپنی بڑی بڑی مونچھوں کو مل رہا تھا وہ اس کے مقابل کی کرسی پر بیٹھ گیا تو معاذ نے بھی اس کی تھلید کی۔

"میں آپ سے ملنے اور بات کرنے کے لیے آپ جہنم تھا لیکن یہاں کوئی مجھ سے تعاون ہی نہیں کر رہا تھا۔" دیوانے خود سے گفتگو کا آغاز نہیں کیا تھا تا چارہ اسے ہی اپنی کہنے میں پھل کرنی پڑی۔

"رادھوں کے بچھوڑے میں آگ۔ لگا کر خود شافی سے ایک چھت کے نیچے سرکشت بیٹھے ہو اور شکایت کر رہے ہو کہ کوئی تم سے تعاون نہیں کر رہا تھا۔"

"نہیں۔ وہ بات نہیں ہے۔ میں بس اپنے دوستوں کے لیے پریشان تھا۔ ملنا چاہتا تھا ان سے۔" دیوانے کے ہنر پر وہ مادم سا وضاحت دینے لگا۔

"جیسے تم سرکشت ہو، ویسے ہی تمہارے مٹر بھی سرکشت ہیں لیکن یاد رکھو کہ اس سفار میں صرف تم اور تمہارے دوست ہیں جن کی چٹا چٹا جگہ ہے۔" معاذ نے اس کی بات کو سمجھ لیا۔

"کیا کوئی تڑپ رہا ہے؟" اس نے دیوانے کے ہنرے پر ملاحظہ کیے تو اس بار فوراً مٹر سے اس کے چہرے کی تحریر پڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

اس سے یہ اپنے حواس میں نہیں ہے۔" کالے خان کو ڈر محسوس ہوا کہ کہیں وہ غصے میں رادھا کو گولی ہی نہ مار دے۔ اس لیے ہاتھ جوڑ کر خود معافی طلب کرنے لگا۔

"میں محل کے بارے میں جانتا چاہتی ہوں۔ یقیناً کرو میں اس کی یا معاذ کی دشمن نہیں ہوں۔ میں بس اسے ان لوگوں کے ہاتھ سے بچانا چاہتی ہوں جو اس کی جان کے دشمن ہیں اس کے محکمہ رہے۔ اگر وہ ان میں سے کچھ آگے آئے تو الٹی بات ہوگی۔" اس کا ہنرے غصے سے تھیں۔ "اس کے اپنے اندر کوئی بوجھ اور گری می اور سارا لطف اور غصہ ریت کی عمارت کی طرح ڈھلے گیا تھا۔

"کیا تم سچ کہہ رہی ہو؟" کالے خان اس کا خلقت خور وہ لہجہ سن کر بھی شلوک و شبہات کا شکار تھا۔

"اگر یہ سچ نہ ہوتا تو میں ایٹمی یہاں آنے کے بجائے اپنی پوری ٹیم کے ساتھ آئی ہوتی اور وہ لوگ اب تک اس گھر کی اینٹ سے اینٹ بچا رکھے ہوتے۔ میں نے ان چند دنوں میں معاذ تک پہنچنے کے لیے بہت کام کیا ہے لیکن کسی کو بھی کسی کیوں ہوا نہیں نکلنے دی ہے۔ تم لوگوں کی ایک خوش قسمتی یہ رہی ہے کہ اس سارے قیصر میں سہولت کار کا کردار ادا کرنے والی دونوں عورتیں کسی کو کچھ بتانے کے لائق نہیں رہی ہیں۔ شاید ہمارے ایک کے نتیجے میں اپنی جاننا سے چلی گئی ہے اور ڈاکٹر فردوس سر پر نکلنے والی چوٹ کی وجہ سے اب تک اپنے حواس میں ہی نہیں آئی ہے کہ کسی کو کوئی بیان دیکھ کر ڈکڑا کر دے۔" وہ ایک سانس میں اسے سب کچھ بتاتی چلی گئی۔

"میں مان لیتا ہوں کہ یہ سب سچ ہے لیکن یہ بات تو اپنی جگہ ہے کہ ہمیں بالکل نہیں معلوم کہ معاذ صاحب کہاں ہیں۔ ہمارے ان سے رابطہ بالکل ٹوٹا ہوا ہے۔"

"اس کا رابطہ نہر مجھے دو۔" کالے خان کا جواب سن کر اس نے مطالبہ کیا۔

"وہ نہر تو مسلسل بند ہے۔" اس مطالبے کو سن کر کالے خان بڑبڑایا۔

"یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ میں نے تم سے جتن کھا لیا ہے۔" معاذ نے اس کی بات کو سمجھ لیا۔

"یہاں اتنا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" معاذ نے اس کی بات کو سمجھ لیا۔

"یہاں اتنا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" معاذ نے اس کی بات کو سمجھ لیا۔

"خفاقت کرنے والی آیت خدا کی ہے۔ جو رب

”ہسپتال کے آئی سی یو میں بڑی سہوہ۔
ڈاکٹر کو شش کر کے تھک گئے ہیں لیکن ہوش میں
آنے کا نام نہیں لیتی۔“ دیو کی سرخ آنکھیں گویا خون
چھلکانے لگیں۔

”کون... کس کی بات کر رہے ہیں آپ؟“ وہ چونکا۔
”اسی کی زبان۔“ بڑا سوجھ بھڑکا ہوا لہجہ تھا۔
”تو تو فریادیں کر رہی ہیں۔“ اس نے سر کرکٹ سا لگا
”کیا ہوا ہے انہیں؟ کیا بیمار ہیں؟“

”تجھ سے ہمدردی کی سزا ہوگئی ہے۔“ قائلوں
نے سچ اگوائے کے لیے پولیس والوں کی طرح اسکی چار
چوٹ کی مار لگائی ہے کہ نہائی ہوش ہی کھو بیٹھی ہے۔“ دیو
نے تفصیل سنائی۔

”کیسے پتا چلا یہ سب؟ کیا شہدو سے معلوم ہوا
ہے؟“ دیو کی زبانی سننے والی اطلاع بے حد تکلیف دہ تھی۔
ڈاکٹر فروس جیسی قائل اور ہمدرد خاتون کے ساتھ ہونے
والے اس ظلم نے دس نے اعصاب کو جھنجھٹا کر رکھا تھا۔
”شہادہ کا تو کریا کریم ہو چکا ہے۔“ خاں بے دل کا دورہ
پڑنے سے مری ہے۔“ فلیک اور بری اڈارٹ اس کے لیے
جود بھی۔

”اف دانی گاڈ! یہ سب کیا ہو رہے؟“ اس نے اپنا
ترجمہ کیا۔

”جو ہوتا تھا، وہ ہو چکا۔ اب جو ہوگا وہ ہم کریں
گے۔“ دیو کے چار چہرے چمکے۔
”آپ کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔“ اس نے
پریشانی سے پوچھا۔

”اپنے چاروں کو تکلیف دینے والوں سے حساب
لینے کے سوا کیا کروں گا۔ کیا تم اس کام میں میرا ساتھ
دو گے؟“

”باہکل دوں گا لیکن۔“
”یہ لیکن کہاں سے آگیا؟“ وہ ناراض ہوا۔

”میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ ہماری مشرقی خواتین عجیب
منطق کی مالک ہوتی ہیں۔ طاقت لاکھڑے سے بولیں، ان
کو ہتھ پکڑ لیں، ان کو ہتھ پکڑ لیں۔“ وہال کی طرف آنکھ
دھڑکاتے ہوئے دیکھتا تھا۔

”اسی چیز کے لیے اب تک میرے ہاتھ پکڑے گئے
تھے لیکن اب نہیں۔ اب مزید اور نہیں۔ اس بار چلیں اور اس
کے دونوں بھائیوں کو اپنے ظلم کا مزہ چکھنا ہوگا۔“

”فیصل کو بھی؟“ دیو اس کے فیصلے نے اسے غم میں
جھکا دیا۔ کبھی اب تک فیصلے کے نکاح میں تھی اور وہ نہیں جانتا
تھا کہ وہ اس کے حوالے سے کیا سوچ رکھتی ہے۔ اسے کوئی
مزدہ پہنچنے پر وہ اس سے شکی بھی ہو سکتی تھی۔

”ہر ایک اپنے کیے کا حساب دے گا لیکن میں
نہیں ہوں۔“ اس کا کام ہے۔ ایک سناٹا کھاتے ہوئے
”میں جانتا ہوں کہ اس کا کام ہے۔“ اس نے حوالہ دے کر
سوالات کیے۔

”ابھی پتا چل جائے گا۔“ دیو نے کہتے ہوئے اپنے
موبائل کی اسکرین پر انگلیوں کو حرکت دی اور اسے ہونٹوں
سے لگا کر صرف دو لفظ بولا۔

”اندروں کے آؤ۔“ حکم جاری کیے ہوئے پورا ایک
منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ دروازہ ہلکی سی دھمک سے کھلا اور
اس کی پہلی نظر وکیل چیئر کے پیروں پر پڑی۔ وکیل چیر
کے اندر آئے آئے اس کی نگاہیں اس پر برسرِ منہ تھیں۔
چہرے تک پہنچ چکی تھیں۔ گزرے عرصے میں اس چہرے
میں خاصی تبدیلی آئی تھی لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ اسے
شناخت نہ کر پاتا۔

”وکیل۔“ ایسا سرگوشی کی صورت میں نکلا۔
”یہ وہی ہے کہ زیادتی۔“ بامثل اپنی جگہ پر بیٹھا۔

”یہ کیا، وہی وکیل جسے تم اور تمہاری سانبھی اپنی
دانت میں لے کر بیٹھے تھے۔“ دیو کا اچھا بڑا آنور ہو گیا۔

”جس نے تمہیں بتا دیا تھا کہ یہ رہا ہے۔“
”تمہیں پھر بھی میں تقدیر کے سب سے انہیں ان سے حال پر
پھونڈ آیا تھا۔ اس وقت میں ان کے لیے بس اتنا ہی کر سکتا
تھا۔“ وہ سچائی پر تھا اس لیے لہجہ بھی مضبوط تھا لیکن حیرت
اب بھی برقرار تھی۔ اس نے کبھی گمان بھی نہیں کیا تھا کہ زندگی
میں کسی سوز پر وکیل سے سامنا ہو سکتا ہے۔ اسے دلچسپ
پر اسے کھنڈرات میں تڑپ رہے وہ روز و شب یاد آگئے تھے
جب وکیل اور اس کے ساتھیوں نے اسے دوسو تین کو کھ
باز تروں سے بھری بس سمیت اغوا کر کے پرفعال بنایا تھا۔

”میں نے تمہیں بتا دیا تھا کہ یہ رہا ہے۔“
”میں نے تمہیں بتا دیا تھا کہ یہ رہا ہے۔“
”میں نے تمہیں بتا دیا تھا کہ یہ رہا ہے۔“
”میں نے تمہیں بتا دیا تھا کہ یہ رہا ہے۔“

”میں جانتا ہوں کہ تم سچ کہہ رہے ہو لیکن یہ بھی توجہ

قریب جا کر اس کا ہینڈل دبا تو اسے لاک پا کر ٹھٹک گیا۔
ایک دوسرے حریف کو کوشش کرنے کے بعد اس نے دروازے
پر دستک دی۔

”نیس سر!“ دستک کے رد عمل میں باہر سے آواز سنائی دی۔
”یہ دروازہ کس نے لاک کیا ہے؟ کھولو اسے۔“

”نیس سر!“ دروازے کو لاک رکھنے پر آواز
آپ نے کون سا نام ہے؟ دروازے کو لاک رکھنے پر آواز
رہا وہ اس سے ہر ایک کو کوشش کرنے کے بعد ٹھٹک گیا۔
بٹ گیا۔ مسلسل دروازہ وہاں اس کی حیثیت میں تبدیلی کا
اطلاع تھا۔ بہر حال اس نے خود کو ٹرسکون رکھا اور کوئی ایسا
رد عمل ظاہر نہیں کیا جس سے وہ لوٹ اس کی طرف سے
مٹھلک ہو جاتے۔

وہ ڈھانکی گھٹنے بعد اسے کھڑکی کے راستے رات کا
کھانا فراہم کیا گیا۔ اس نے بغیر کسی احتجاج کے کھانا وصول
کر کے اسے تناول کیا۔ کھانے کے بعد کچھ دیر کمرے میں
بی چہل قدمی کرتا رہا پھر روشنی بجھا کر کھڑکی کے دونوں پٹ
کھولی کر آسمان پر چمکتے ستاروں کو نظروں سے ٹوٹنے لگا۔ جلد
ہی اس کی نظروں نے زمین کی جانب ایک تہا ستارے کو منتخب
کر لیا۔ یہاں قیام کے عرصے میں تنہائی اور فرصت نے
اسے ستارہ بینی کی مشق کے لیے خاصا وقت فراہم کر دیا تھا۔
اس کھڑکی میں کھڑا ہو کر وہ گھنٹوں اپنے منتخب کردہ ستارے
کے ساتھ کھیلتا تھا۔ اس کھیل کے لیے اسے فیضو کے
بڑے حائے سارے سبق اذہر تھے اور وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس
مستقل مشق سے اسے بے انتہا فائدہ ہو رہا ہے۔ اپنی دماغی
قوت میں اضافے کو اس نے واضح طور پر محسوس کیا تھا۔

ابھی کل ہی کی بات تھی کہ کھانا کھاتے ہوئے اس نے
شیشے کے گلاس کو گھورتے ہوئے پوچھا سوچا تھا کہ کیا وہ گلاس
کو اپنی دماغی قوت کے سہارے توڑ سکتا ہے؟ اور وہ گلاس
نوٹ کر کر پڑا کر پڑی ہو گیا تھا۔ دیکھنے والوں کو شاید لگ ہو کہ
گلاس کی وجہ سے ٹڑھک کر نیچے گرنے سے نوتا ہے لیکن اس
نے واضح طور پر دیکھا تھا کہ گلاس فرش سے ٹکرانے سے قبل
ہی مٹھا میں نوٹ گیا تھا۔

”نیس سر!“ دروازے کو لاک رکھنے پر آواز
آپ نے کون سا نام ہے؟ دروازے کو لاک رکھنے پر آواز
رہا وہ اس سے ہر ایک کو کوشش کرنے کے بعد ٹھٹک گیا۔
بٹ گیا۔ مسلسل دروازہ وہاں اس کی حیثیت میں تبدیلی کا
اطلاع تھا۔ بہر حال اس نے خود کو ٹرسکون رکھا اور کوئی ایسا
رد عمل ظاہر نہیں کیا جس سے وہ لوٹ اس کی طرف سے
مٹھلک ہو جاتے۔

نے اسے تسلی دی۔
”اس کے باوجود کہ تمہارے کئی ساتھیوں کا خون
میرے دامن پر ہے۔“

”ہم مرنے یا مارنے کے لیے ہی مگر سے نکلے ہیں۔ تم
اس سب کو چھوڑو اور اپنی سزاؤں کی طرف سے اصرار
نہیں کرنے دو۔“ اس نے اپنے دامن میں اپنے ساتھیوں کے
خون سے لکڑیا لگا کر کہا۔ ”یہ حال ہے کہ میں کو اس کی مرضی سے
نہیں کر سکتا۔“ اس نے اپنے دامن میں اپنے ساتھیوں کے
خون سے لکڑیا لگا کر کہا۔ ”یہ حال ہے کہ میں کو اس کی مرضی سے
نہیں کر سکتا۔“

”جینا حرام کرنے والوں کو کوئی مسئلہ توڑ جواب دینے
والا جو نہیں ملتا۔“

”دے دو اس لڑکی کا نشان پتا۔ جواب دینے کا
سلسلہ جاری طرف سے شروع ہو جائے گا۔“ لپ بے
ساختہ بولا۔

”جس جرم کی سزا تم مجھے نہیں دے رہے، اس کے
لیے میں اسے کیوں نیا چڑھا دوں۔ میں اسے ان ہی جرائم
کے لیے کٹہرے میں کھڑا کروں گا جن کے لیے اسے اپنے
آگے جوابدہ سمجھتے ہوں۔“ اس کا جواب اب بھی وہی تھا۔

”مرضی ہے تمہاری لیکن اتنا بتا دوں کہ ہمیں بہت
ضد ہی ہیں۔ وہ ڈاکٹر فردوس کی وجہ سے تمہیں کوئی نقصان
نہیں پہنچا دیں گے لیکن ان کا مطالبہ پورا کیے بغیر تمہارا
یہاں سے نکلنا اور اپنے دوستوں سے مل پانا ناممکن ہوگا۔“

”کیا میں اسے دھمکی کہوں؟“ اس نے من کر لپ
کو گھورا۔

”ایک اچھا مشورہ سمجھ لو۔“ لپ نے جواب دیا اور
اپنی وہیل چیئر کو حرکت دیتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس
کے باہر جاتے ہی معاذ کے ماتھے پر ایک پڑھکر سا بل
پڑ گیا۔ یہ ٹھیک تھا کہ ڈاکٹر فردوس کی خاطر دیوا اس کے
ساتھ اچھی طرح پیش آتا رہا تھا لیکن اب کوئی ضمانت نہیں رہ
گئی تھی۔ شاید دیوا کے ذہن میں شروع سے تھا کہ وہ وقت
آنے پر اپنے احسان کے بدلے اس سے سونیا کا پتا حاصل
کر لے گا لیکن اس نے اسے انکار کر کے براہِ حقہ کر دیا تھا۔

”نیس سر!“ دروازے کو لاک رکھنے پر آواز
آپ نے کون سا نام ہے؟ دروازے کو لاک رکھنے پر آواز
رہا وہ اس سے ہر ایک کو کوشش کرنے کے بعد ٹھٹک گیا۔
بٹ گیا۔ مسلسل دروازہ وہاں اس کی حیثیت میں تبدیلی کا
اطلاع تھا۔ بہر حال اس نے خود کو ٹرسکون رکھا اور کوئی ایسا
رد عمل ظاہر نہیں کیا جس سے وہ لوٹ اس کی طرف سے
مٹھلک ہو جاتے۔

لیے ہی تو اس نے اسے ٹرانس میں لینے کا اہتمام کیا تھا۔
موجودہ صورت حال جو بھی تھی، لیکن یہ بات اپنی جگہ تھی کہ
دیوانے اس کا بہت ساتھ دیا تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس
کے ہاتھوں اس کے کسی ساتھی کو نقصان پہنچے۔
"کیا وہ اسی شہر میں تھا؟" اس نے دوسرے

زاویے سے سوال کیا۔

"جی ہاں، جیسا کہ میں نے بتایا تھا۔" وہ بے ہوش ہو گیا
اور اس نے اس کے سوال کے جواب میں کہا کہ وہ اس کے پاس
آگیا۔ اس بارے میں جو بھی جاننے ہو، بتاؤ۔" گے
بندھے جو ابوں والے سوال کرنے کے بجائے اس نے
لوٹش کے دماغ کو آزادی دی۔
"دیوانہ بھیا نے انہیں کسی دوسرے شہر اپنے کسی
دوست کے پاس بھجوا دیا تھا۔ ان کے یہاں رہنے میں سب
کے لیے خطرہ تھا۔"

"اس دوست کا نام معلوم ہے؟"
"نہیں۔" ایک بار پھر لاشی کا اظہار ہوا۔

"میرے بارے میں کیا علم دیا تھا؟"

"آپ کے آدمی کا خیال رکھنے کا کہا تھا لیکن کمرے
سے باہر آنے دینے کا آرڈر نہیں تھا۔" عمرانی کا بھی بولا تھا۔
اس کی دی گئی اطلاع سے واضح تھا کہ دیوانہ بہر حال اسے
نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تھا لیکن سونیا کے حوالے سے وہ
بے لگن مقصود تھا۔

"اپنے دیوانہ بھیا سے کہنا کہ میرے دوستوں کو کوئی
نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔ میں بہت جلد لوٹ کر واپس آؤں
گا۔" اس شخص سے مزید کچھ حاصل نہیں ہونے والا تھا اس
نے اپنا وقت برباد کرنے کے بجائے اس نے اسے پیغام
ذہن نشین کروایا اور پھر اسی کی مدد سے بغیر کسی ہنگامے کے
وہاں سے روانہ ہونے میں کامیاب رہا۔ روانہ ہونے سے
قبل وہ اس سے چھوٹا ہتھیار اور مقولی رقم حاصل کرنا نہیں
بولتا تھا۔

☆☆☆

"آپ اور اس سے میرا" مٹھنی کے جواب میں

"جی ہاں، جیسا کہ میں نے بتایا تھا۔" وہ بے ہوش ہو گیا
اور اس نے اس کے سوال کے جواب میں کہا کہ وہ اس کے پاس
آگیا۔ اس بارے میں جو بھی جاننے ہو، بتاؤ۔" گے
بندھے جو ابوں والے سوال کرنے کے بجائے اس نے
لوٹش کے دماغ کو آزادی دی۔
"دیوانہ بھیا نے انہیں کسی دوسرے شہر اپنے کسی
دوست کے پاس بھجوا دیا تھا۔ ان کے یہاں رہنے میں سب
کے لیے خطرہ تھا۔"

— بحث صفحہ 69 — مارچ 2022ء

گھرائے وہ پورے اطمینان کے ساتھ ستر سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔
پہنچ گیا۔ انہار کی کارایاں پٹ کھول کر اس نے اس میں سے
ایک فنگر نکالا۔ یہ لوہے کی پٹی تار سے بڑا وہ فنگر تھا جس پر
پلاسٹک کی کورنگ ہوتی ہے۔ اوپر چڑھی پلاسٹک کو کھینچ کر
اتارنے کے بعد اس کی مضبوط انگلیاں کچھ دیر لوہے کے تار
سے لپکی رہیں۔ بالآخر وہ اس میں سے اپنی مرضی کے
میں ایک ٹکڑا حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔
"جی ہاں، جیسا کہ میں نے بتایا تھا۔" وہ بے ہوش ہو گیا
اور اس نے اس کے سوال کے جواب میں کہا کہ وہ اس کے پاس
آگیا۔ اس بارے میں جو بھی جاننے ہو، بتاؤ۔" گے
بندھے جو ابوں والے سوال کرنے کے بجائے اس نے
لوٹش کے دماغ کو آزادی دی۔
"دیوانہ بھیا نے انہیں کسی دوسرے شہر اپنے کسی
دوست کے پاس بھجوا دیا تھا۔ ان کے یہاں رہنے میں سب
کے لیے خطرہ تھا۔"

دیوانہ اور لیپ کے بارے میں تو اسے معلوم تھا کہ وہ
اس سے گفتگو کے بعد وہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرے تھے لیکن
لوٹش نامی یہ شخص جو اس ٹکڑے پر سب سے زیادہ بااختیار
شخص تھا، اسے کچھ اہم معلومات فراہم کر سکتا تھا۔ پہلے سے
طے کر رہا تھا کہ اس کے تحت اس نے لوٹش کے کمرے میں
داخل ہو کر سب سے پہلے اسے بے ہوش کیا پھر ایک کرسی پر
بٹھا کر ہاتھ چبھڑکنے کے بعد اس کے مقابل بیٹھ کر اسے
بوش میں لانے کی تدبیر کرنے لگا۔ تھوڑی سی کوشش کے
نتیجے میں اس نے آنکھیں کھول دیں۔ یہ کھلی آنکھیں اسے
کے ماحول کو کچھ باتیں اس سے مل گئیں اس نے انہیں اپنی
آنکھوں کے حصار میں لے لیا۔ ذرا سی دیر میں وہ لوٹش کے
حس پر غالب آ چکا تھا۔

"میرے دوستوں کو کہاں رکھا گیا ہے؟ اس جگہ کا
پتہ بتاؤ جہاں وہ موجود ہیں۔" چند بنیادی ہدایتیں
سہولت کے ساتھ حاصل ہو گئیں۔
"جی ہاں، جیسا کہ میں نے بتایا تھا۔" وہ بے ہوش ہو گیا
اور اس نے اس کے سوال کے جواب میں کہا کہ وہ اس کے پاس
آگیا۔ اس بارے میں جو بھی جاننے ہو، بتاؤ۔" گے
بندھے جو ابوں والے سوال کرنے کے بجائے اس نے
لوٹش کے دماغ کو آزادی دی۔
"دیوانہ بھیا نے انہیں کسی دوسرے شہر اپنے کسی
دوست کے پاس بھجوا دیا تھا۔ ان کے یہاں رہنے میں سب
کے لیے خطرہ تھا۔"

چھوٹے قد والے دل چھوٹا نہ کریں!!

گروٹال®

فنیٹن گروٹال ایڈوانسڈ ایجنسی ہارمونز اور ایڈوانسڈ ٹیکنالوجی سے تیار ہے۔
 اس میں شامل اجزاء انسانی جسم میں ہورمونز کو متوازن کرتے ہیں، انہیں دوبارہ بنانے میں
 مدد دیتے ہیں اور ان سے بڑھنے کی رفتار کو بڑھاتے ہیں۔



اگر آپ کی عمر 30 سال سے کم ہے تو
 گروٹال آپ کا قد بڑھا سکتی ہے!

ORDER
 ONLINE

ایک بھر کے لیے اچھے میڈیکل مشور اور دواؤں پر دستیاب



9230474753



tupirealments



tupirealments



www.tupireal.pk



tupirealments



کسی اسپتال بھی نہیں لے جایا جاسکتا۔

”میری فکر چھوڑیے اور یہ بتائیے کہ فردوس بھابی کو کیا ہوا ہے؟“ اپنے بڑے دونوں کی واحد تمکداری کی حالت کی خبر نے اسے بے چین کر دیا۔

”تفصیلات نہیں معلوم۔ شاید کوئی حادثہ پیش آیا ہے۔ یہ وہ بے ہوشی کی حالت میں اسپتال میں داخل ہیں۔“ اس نے عملی تفصیلات بتاتے سے گریز کیا کہ کس وہ خود کو قہقہے دار سمجھتے ہوئے احساسِ حماقت میں مبتلا نہ ہو جائے۔ اور نکل نکلے بھی اس کی ہوشی کہ عملی طور پر حالات کا صحیح جائزہ نہ دے سکتے ہیں۔ یقیناً کالے خان آیا ہوگا۔“ وہ اچھ کر دروازہ کھولنے چلا گیا۔

”سوری یار! آج رات کے اس پیرڈ میں کیا۔“ کالے خان کے اندر آتے ہی اس نے اس کا ہاتھ تھامے ہوئے اس سے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

”بہت مشکل سے آیا ہوں۔ قدم قدم پر اندیشہ تھا کہ کہیں کوئی میرا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک نہ پہنچ جائے۔“ سمجھیں پورے وجود کو آگے نہیں بنا کر یہاں کا رخ کیا ہے۔“ کالے خان کا چہرہ سنا ہوا تھا۔

”کیا کوئی گزربہ ہے؟“ وہ چونک گیا۔

”آپ کو ڈھونڈتی ہوئی ایک حسین عورت کوٹھی میں کھس آئی تھی۔ اس عورت کی آمد کے بعد سے مجھے شک رہنے لگا ہے کہ کوٹھی کی بھرائی ہو رہی ہے۔“

”کون تھی وہ عورت؟ کیا اس نے اپنا نام بتایا تھا؟“ کالے خان کی دی اطلاع نے اسے شدید مضطرب کر دیا۔

”نام تو اس نے نہیں بتایا۔ بس آپ کا اور نکل جی بی کا پوچھ رہی تھی۔“

”مجھے تفصیل سے پوری ہمت بناؤ کالے خان!“

”حسین عورت کے حوالے پر اس کا دھیان فوراً آفت کی پرکار سونپا کی طرف گیا تھا۔ اس لیے تشویش انتہا پر تھی۔

کالے خان نے اس کی پریشانی ملاحظہ کی اور بلا کم و کاست ساری تفصیل کہہ سنائی۔

”وہ یقیناً سونپا تھی۔ میں اس کے اس دھوکے میں نہیں آسکتا کہ وہ میری بھلائی کے لیے مجھے ڈھونڈ رہی ہے۔

میں اس کی غلطی جانتا ہوں۔ تمام عورت کے دل کے میں

نہیں دیکھتا کہ وہ میری بھلائی کے لیے مجھے ڈھونڈ رہی ہے۔

اس کا جواب دے سکتی ہے۔ اس نے مضطرب کالے خان کو

ہدایت اپنے لگا۔

”میں ہر ممکن احتیاط پہلے ہی کر رہا ہوں لیکن آپ یہ

بتائیں کہ آپ نے اس سے مجھے کیوں اور کیسے یاد کیا ہے؟“

”میرے دماغ سے کچھ اختلافات ہو گئے ہیں۔ اس

لئے میں نے سیدھا کوٹھی کا رخ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

یہاں بھی زیادہ دیر نہیں رک سکتا۔ اس لیے چاہتا تھا کہ

تھکاد سے بچوں۔ کسی معمولی پہلی سہانہ گاہ کا انتظام

ہو جائے۔“ اس نے اس کی طرف سے ہوشیاروں کی روں کو

ان کے دل میں تم سے دلچسپی تک نہیں لگا۔ میں سہانہ

پہلی کوئی بڑی بڑی سہانہ گاہ میں تم آتی ہو۔ وہ سادہ عورتی

اور نکل کی حفاظت کا غول پر دف انتظام کر دے۔“ اس کے لیے

سونپا کی آس پاس موجودتی کی خبر معمولی نہیں تھی۔ وہ اسے

جانتا تھا کہ وہ کیسے مشکل ترین حالات میں بھی اپنے لیے راہ

نکال لیتی ہے۔ اسی لیے تو اب بھی ”را“ یا کسی دوسرے

ادارے سے نکل راہ اور کالے خان تک پہنچنے میں

کامیاب ہوئی تھی۔

”میں صبح ہی اٹھانی سیکورٹی کا انتظام کر لوں گا اور

آپ کے لیے مکان کا بھی۔“

”نہیں۔ میرے لیے مکان ڈھونڈنے کی کوئی

ضرورت نہیں۔ بس تم سیکورٹی کا خیال رکھو۔“ اس نے

کالے خان کو ٹھنی سے ٹوک دیا۔ سونپا کے بارے میں

اطلاع ملنے ہی اس کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا اور ایک

نئے منصوبے کے خدوخال ذہن میں ابھرنے لگے تھے۔

”نکل خان سے رابطہ کیا تھا تم نے؟“ اپنے منصوبے

پر سوچتے ہوئے اس نے سوال کیا۔

”نہیں۔ حالات کی وجہ سے میں نے مناسب سمجھا

کہ فی الحال کوٹھی میں کسی سے ملازم کی آمد نہ ہو۔“

”ٹھیک ہے۔ اپنے اعتماد کے بندوں سے کام لو اور

دونوں جگہ کا پورا دھیان رکھو۔“ بولتے بولتے اس کی نظریں

تکلی پر جا پڑیں۔ ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو

کے دوران اس نے ذرا بھی دخل نہیں دیا تھا لیکن یہ تو ممکن

نہیں تھا کہ وہ تشویش میں مبتلا نہ ہوئی ہو۔

”پریشان مت ہوئے گا۔ آپ کے تحفظ کا پورا پورا

خیال رکھا جائے گا۔“

”کہا جانتی تھی کہ چلیز جاتا ہے۔“

”اس کا جواب دے سکتی ہے۔ اس نے مضطرب

لہجے میں بولی کہ وہ حیران رہ گیا۔

”نکل تک اداس نہیں کی۔ ہلی ایک ناممکن بات لگا

64

کرتی تھی لیکن ممکن ہو گئی نا۔ بس مجھے اپنے رب سے امید ہے کہ وہ باقی کی مشکلات بھی آسان کر دے گا۔ دس کے اس قدر پُرچین ہونے نے معاذ کو عجیب سی ڈھارس دی اور وہ اس عرصے میں پہلی بار مسکرایا۔

”صبح ہونے لگی ہے۔ میں آپ لوگوں کے لیے ناشیہ لے کر آتی ہوں۔“ وہ پادری کے سامنے جا کر گھڑی بولنے لگی۔

☆☆☆

”تم وہاں کیا کر رہی ہو؟ سناؤ ابھی تک پھرا کیوں نہیں آیا؟“ صبح کی پہلی کرن کے ساتھ میڈم ایکس کی آواز سنہ کوئی خوشگوار واقعہ نہیں تھا۔ اپنی کوفت کے اٹھارے کے لیے اس نے فریج میں سے اپیل جوس کا ڈبا نکال کر دروازے کو زور سے بند کیا اور کاؤچ پر دونوں پاؤں اوپر رکھ کر بیٹھنے ہوئے اطمینان سے بولی۔

”اگر معاذ اتنی آسانی سے پکڑا جاتا تو ہماری تربیت پر حرف آتا۔ آپ جانتی ہیں کہ آپ نے اسی کا انتخاب اسی لیے کیا تھا کہ اس میں ٹینٹ تھا اور اب جب وہ اسے ٹینٹ کو ثابت کر رہے تو آپ کو ناراض نہیں ہونا چاہیے۔“

”میں اس عذر کو تسلیم نہیں کر سکتی کیونکہ میں جانتی ہوں کہ تمہارے پاس معاذ سے بہتر تربیت اور وسائل ہیں۔“

”میرے پاس غصے اور نفرت کی وہ آگ نہیں ہے جو آپ نے محاذ کے پیادوں کو نقصان پہنچا کر اس کے اندر بھڑکا دی ہے۔“ میڈم ایکس کے سرومہ لہجے نے بھی اس کے اطمینان میں فرق نہیں آنے دیا۔

”گو تا تم اپنی ناکامی کا اعتراف کر رہی ہو۔ اگر ایسا ہے تو میں کسی اور کو یہ کام سونپ سکتی ہوں۔“

”نہیں ایسی تھوکی بات نہیں۔“ اس کا سارا اطمینان
رخصت ہوا۔

میں صرف تپ کو یہ بتانا چاہ رہی تھی کہ اس کام میں

عظیم یہ کام جلد اور جلد نمٹا لو تو آپ کی وجہ سے وہ ہے آپ کے
 "را" کے دوستوں کو یہ بہت دیتا ہے گا کہ عالم شاد اور
 سرحد کے افراد میں اس کا ہاتھ ہے۔ "منہزم انجس کے لہجہ کی

”آپ یہاں نہیں کریراگی۔ آپ جانتی ہیں کہ میں بلا مداحیت کام کرنے کی عادی ہوں۔“

”اور میں جلد از جلد نتائج حاصل کرنے کی۔“ میڈم ایکس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

”میں نے یہ سب کچھ آپ کے مطلوبہ طرح حاصل کر لیا ہے۔ لیکن مجھے تمہاری اس حالت سے مرعوب ہو گیا ہے۔“
 ”آخر کار پس منظر کو نظر انداز کرنا پڑا۔“
 ”صرف دو دن اور۔ ان دونوں میں چاہے زمین آسمان الٹ دو، مجھے معاذ اپنے قبضے میں چاہیے۔“

”او کے۔“ اس نے مختصر جواب دیا اور رابطہ منقطع کر کے ہاتھ میں موجود جوس کا ڈبا بے دلی سے سائڈ ٹیبل پر رکھا۔ اس ڈبے میں سے اس نے ابھی یہ مشکل ایک تہائی جوس ہی پیا تھا لیکن میڈم انکس کی تنبیہ سننے کے بعد کچھ بھی چھانچیں لگ رہا تھا۔ اس کے لیے معاذ کو ڈھونڈنا اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا لیکن اصل بات یہ تھی کہ وہ اپنے لوگوں سے چپ کر اسے تلاش کرنا چاہتی تھی۔ اسی لیے سارے وسائل استعمال کرنے سے بھی قاصر تھی۔

”خدارا مجھے مل جاؤ معاذ“ اگر کسی اور نے صہیں تلاش کر لیا تو یہ تہذہ رے حق میں بالکل اچھا نہیں ہوگا۔“

اب وہ کمرے میں داخلہ سے اُدھر شہتی ہوئی اس کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ ایک سوہوم سی امید تھی کہ شاید وہ رادھا دہوی کی کوٹھی پر واپس آئے لیکن وہ وہاں جو خفیہ کمرے نصب کر کے آئی تھی، انہوں نے اب تک اسے ایسی کوئی نوید نہیں سنائی تھی۔ دوسری طرف ”را“ والے بھی ابھی تک عالم اور سرمد کو فرار کر کے لے جانے والوں کو کھوجنے میں ناکام رہے تھے لیکن وہ جانتی تھی کہ ان کی یہ اکائی وقتی ہے۔ بانا خردہ کبھی نہ کہیں سے سرنگ لگا کر پتے مجرموں کو کھوج نکالیں گے اور اسے ان کی کامیابی سے میلے خود کا سا بھوٹا تھا۔

”گلتا ہے آج رات کالے خان سے ایک ملاقات
 اور کرنی پڑے گی۔ اس روز تو میں ذرا جذباتی ہو گئی تھی
 بے اختیار ہاتھوں میں لکڑیوں کو دبا دبا کر دیکھ کر آج مجھے
 ”کالنا ہوگا۔“ کہتے تھے۔
 ”ملاقات کے علاوہ آج کی ڈورس اور سب اس کے
 معمولات کا حصہ تھے۔“

غسل کرتے کرتے ہی دس سینہ طے کر لیا کراچی تاج

بجائے دوسروں کے آگے ہاتھ کیوں پھیلاتا ہے؟“ وہ گویا اپنی حیرت کا اظہار کر رہا تھا۔

”ایک نام کا کھانا کھلا کر یوں چلنے دو گے۔ جاؤ میں نہیں کھاتا۔“ معاذ نے روٹھنے کی اداکاری کی۔

”ٹھیک ہے دے رہا بھائی! بس ام حیران ہو رہا ہے کہ

میں یہ سب کچھ کھاتا ہوں تو وہ دوسروں کا بارہا نہیں کھاتا اور میں اپنا کھانا کھانے کے لئے دوسروں کے ہاتھ پھیلاتا ہوں۔“

”کیا مطلب ہے ہاتھ پھیلاتے سے؟ میں نے تو بس دوستی میں ایسے ہی فرمائش کر دی تھی۔ تم نے تو نے کر مجھے فقیر ہی بنا دیا۔“ اس بار اس نے براہی کا اظہار کیا۔

”دوستی؟ ہمارا تمہارا دوستی کب سے ہو گیا؟ ام تو تمہیں آج پہلی بار ہی دیکھ رہا ہے۔“ خان جیسے سادہ لوح شخص کے لیے اسے بدلے ہوئے حلیے میں پہچاننا مشکل نہیں تھا۔

”لو اب تم دوستی سے بھی بکر گئے۔ ٹھیک ہے مت مانو مجھے دوست۔ میں بھی تمہیں جہاں احمد جیسے اتنے دنوں سے امانت کے طور پر سنبھال کر پھر رہا ہوں، نہیں دوں گا۔“ اس نے کچھ دیر بھی اکڑ دکھائی۔

”او یاہ! کون اے تم اور جیسے جسے کی بات کر رہا ہے؟ ہمارا اس پورے شہر میں کیا سے لین دین نہیں ہے۔“ بہت اداوار بیٹا اسے دیکھتا ہے۔ ”خان! مجھے سمجھنا دینا۔“

”بھئی! اسے وکرم کے گھر میں ڈالے کو بھول گئے؟“ تنی کی تھی تم نے منہ لے کر کھل جانے میں میری۔ نی انسان کا بدلہ چکانے سے ہے تمہارا احمد دینے آئے ہوں۔“ اس نے سر پر ہنسیاں دکھا کر اس کی طرف قدرے بھٹکتے ہوئے سرگوشی میں کہا تو دوش میں خان بری طرح اچھل پڑا اور آنکھیں پھیلا کر سبے بھنی سے بولا۔ ”کون کون اے تم؟ کیا پولیس کا بھڑے؟“

”پولیس کا بھڑے کیوں ہونے لگا۔ تمہارا پادشہ ہوں۔ تم ہی نے تو کہا تھا جب ضرورت ہو میرے پاس چلے آنا۔ مجھے آپ کی مدد کر کے خوش ہوگی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے حکایت خان نے ذرا سنبھل کر غور سے اس کی طرف دیکھا۔

”خان! یہ سب کچھ ہو گیا؟ آخر کار اس نے پہچان کر کے مسکرائے ہوئے منہ دکھائی دیا۔“

”ام رو! آپ کا راہ دیکھی تھی۔ آپ نے لوہاڑا چھکا مار دیا۔ دل خوش ہوئی اماری سالہ۔“ خوشی اور جوش میں وہ جانے کیا کہنے جا رہا تھا۔ معاذ نے ہاتھ کے اشارے سے

کہیں باہر کرے گی چنانچہ ذرا اجتماع سے مغربی طرز کا ایک لباس زیب تن کیا اور آکھنے کے سامنے کھڑی ہو کر بال سنوارنے لگی۔ ابھی اس کے سٹری بال پونی ٹیل کی صورت میں ہی تھے کہ موبائل نے اشارہ دیا۔ موبائل کے ساتھ خفیہ کیمروں سمیت کئی دوسری اہم ڈیوائس کے منسلک ہونے کے باعث وہاں کے معاملے میں بہت جلدی رہتی تھی۔ اس نے موبائل پر دیکھا کہ اسے کچھ کیا اور گویا کچھ کر رہا تھا۔ موبائل اسے کچھ اشارہ دیتے رہا تھا۔ اس نے موبائل کو اسے جانے کب سے انتظار تھا۔

☆☆☆

”ایک کڑک۔“ جانے ملائی مار کے، مسکا بن کے ساتھ اس غریب کے لیے بھی منگوا لو تو تمہاری بڑی مہربانی ہوگی خان! نہیں منگواؤ تو میں سامنے بیٹھ کر اتنا تمہیں گھوروں گا کہ تمہارے پیٹ میں شریہ در رہ جائے گا۔“ وہ ایک موہوم سی امید کے سہارے چائے کے اس ہوٹل پر پہنچے تھا لیکن سامنے ہی جانے میں پراگھے نے نوالے بھگو کر خاتہ گل خان کو دیکھ کر طبیعت خوش ہوئی اور اس کے سامنے رکھی خالی کرسی پر براجمان ہوتے ہوئے بے تکلفی سے فرمائش دلائی۔

”تم کون! اسے ملت خان کی اولاد اور ام سے ایسے فرمائش کیوں کرتی! اسے جیسے ام تمہارے مائے کا بچہ ہے۔“ اس کی یہ بے تکلفی تن و فیک تھ نہیں بھائی اور تیرہویں چڑھا کر قدرے پیش سے پوچھا۔ حلقہ با مقدم نے تحت اس نے جانے کے کب اور پوچھے، اپنی تھیلی کی آڑ میں چھپانے کی کوشش بھی کی تھی کہ کہیں حق نی وہ اس کے جانے پہنچنے کی چیزوں کو نظر نہ لگا دے۔

”بھوکہ ہوں بھائی! اور تمہیں موقع دے رہا ہوں کہ اپنے بھوکے مسلمان بھائی کو کھانا کھلا کر ڈاؤن مائو۔“ اسے خان کو چھیڑنے میں مزہ آرہا تھا اس لیے اپنے ڈراے کو جاری رکھا۔ اتنی صبح صبح وہاں کا کب بھی زیادہ نہیں تھے اس لیے اسے یہ ڈر نہیں تھا کہ گل خان کا مزاج بگڑ گیا تو اسے سنبھالنے سنبھالنے میں ایک مجمع سر پر آن کھڑا ہوگا۔

”ایک چائے اور مسکا بن الاڈ چھوئے۔“ خلاف توقع خان نے پچھلے ہی سیدھے کہتے ہوئے چائے نوش کے لیے کوئی اشارہ کیا مگر چہرے سنجیدہ تاڑتے ہوئے جانے لگا۔ اس نے نوٹ کیا کہ اس نے اسے دیکھنے پر معاذ نے چہرے پر مسکراہٹ سجائی۔

”جوان اے۔ ہاتھ پاؤں بھی سلامت اے۔ بیمار شہر بھی دکھائی نہیں پڑتا پھر محنت کر کے کھانے کھانے کے

جیسی کیفیت میں گھر گیا۔ قسمت کا عجیب المٹ پھیر تھا کہ جو اس کے اپنے تھے، وہ اس سے چھین گئے۔ تھے اور وہ غیروں سے بے لوث اپنائیت پا رہا تھا۔

”آپ کس سوچ میں پڑ گئی اے؟“

”میرا یہاں رہنا تمہارے لیے ٹھیک نہیں ہوگا خان! میں تمہیں بچتا ہوں۔ اس وقت میں اپنے دشمنوں کو دعوت دے رہا ہوں۔ یہاں کوئی بڑا بنگا نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ میں تم کو بچاتا ہوں۔ پولیس کے ہاتھوں میں نہیں آؤں گا۔ اور میں نہیں چاہتا کہ تم جیل جالو۔ یہ دار آؤں گی پھر میں میں پھنسے گا۔“ وہ خان سے مدد تو لینا چاہتا تھا لیکن اسے کسی مصیبت میں نہیں پھنسانا چاہتا تھا۔

”ام کو معلوم اے کہ آپ جو بھی کام کرے گا، وہ غلط ہی ہوگا۔ ام حق کا ساتھ دینے والا آدمی اے اور امارا ایمان ہے کہ اگر حق کی راہ پر امارا جان چلا بھی گیا تو امارا رب امارے ہال بچوں کا خیال رکھے گا۔“ خان کے جذباتی لہجے نے ایک بار پھر اسے متاثر کیا۔ اس کی اس سے کوئی پرانی جان پہچان نہیں تھی۔ نہ ہی اس نے اس پر کوئی اسباب کیا تھا پھر بھی وہ اس کے لیے ایسا سوچ رہا تھا۔ اپنی اس سوچ کا اس نے خان کے سامنے اظہار بھی کر دیا۔

”ام ایسے ہی سوچتی اے۔ ام اس سے دیکھتی اے۔“ ”نوں کی بات امارے دل کو ٹھیک لگ رہی اے۔ آپ کے لیے امارا دل بوتا اے کہ آپ ایک نمبر ٹھیک آدمی اے۔ اس لیے ام آپ کا ساتھ دیتی اے۔ مرنا تو ایک دن سب کو اے۔ اچھا ہے نا آزادی کوئی اچھا کام کرتے ہوئے مرے۔“ کتنا سیدھا سادہ فلسفہ حیات تھا اس کا۔ معاذ اسے دیکھتا رہ گیا۔

”اب ام کو بتاؤ کہ آپ کے دل میں کیا اے۔ عالم صیب اور سرمد کو تو آپ نے آزادی دلوا دیا اے۔ اب آپ اور کیا کرنے کو مانگتی اے؟“ وہ کتنا پریقین تھا کہ عالم دوسرہ کی آزادی میں اسی کا ہاتھ ہے۔

”میں اپنے ان دشمنوں سے پنجہ آزمائی کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا ہے۔ وہ دشمن بہت طاقتور ہیں۔ اس لیے میں سب کو چھوڑ کر خود الگ تھلک

ہو گیا ہوں۔ میں یہاں سے دور ہونے والوں میں سے ہوں گا۔ اس لیے میں یہاں سے دور ہونے والوں میں سے ہوں گا۔ اگر ایسا ہو اور میں پھنس گیا تو کہیں مجھے فرار ہونے میں مدد دینا ہوگی۔“ وہ یہ سارا رسک کالے خان کی دی ہوئی اطلاع

اسے فل اسٹاپ لگا دیا۔
”ناشا کر میں خان پھر آرام سے باتیں کریں گے۔“ شکر ہوا کہ خان اس کی بات سمجھ گیا۔ دونوں نے چند منٹوں کے اندر ناشا ختم کیا اور باہر نکل آئے۔
”اکرم کے قتل کی تفتیش میں پولیس نے جیسے زیادہ راز تو نہیں لگا دیا؟“

”میں نے اس میں راز لگا دیا۔“ وہ پوچھتی ہی رہی۔
”اور پھر اس کے ہال کا جنازہ ام بول کر کوئی نہیں لگاؤں گا۔“ وہ پوچھتی ہی رہی۔
”چھوٹ گیا۔“ پولیس والے اپنی گرفت میں آئے ہوئے بندے کو کس بڑی طرح رکھتے ہیں، اس بات کو معاذ بھی جانتا تھا لیکن خان نے اس ساری خوارگی کو بہت اختصار سے بیان کر کے اپنی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیا تھا۔
”آج کل کیا کر رہے ہو؟“

”وہی ٹھیکیدار کے ساتھ اے۔ اس نے دوسرا ٹھیکہ کچل لیا ہے۔ پر اب کام کی جگہ پر سنے کا پر مشین بنی اے۔ ام کو ادھر ایک کھولی کرائے پر لے کر رہنا پڑ رہا ہے۔“ اس کی کھولی والی اخراج سجاد کے لیے خوش کن تھی۔
”مجھے اپنی کھولی میں نے چلو گے؟“

”بالکل، چلو صاحب! ام اس کو اپنی خوش بختی سمجھے گی۔“ خان نے خوش دلی سے جواب دیا اور پھر دونوں پیدل چلتے ہوئے ایک غریبانہ بستی میں پہنچ گئے۔ اس کی بستیاں بڑے شہر میں ہوتی ہیں۔ شہر کی چھ پونہ اور نوٹھالی سے پر ہے۔ شہر کی اور گندگی سے آلودہ ہوتی چھان بظاہر انسانی شکل کی تھوکی کیزوں کوزوں کی سی زندگی گزارتی اپنے دنیا میں آنے کا خراج ادا کرتی رہتی ہے۔

”مجھے یہاں آس پاس میں کوئی کھولی کرائے پر مل سکتی ہے؟“ اس نے خان کی کھولی میں ایک چٹائی پر بیٹھے ہوئے اس سے پوچھا۔

”بالکل مل سکتی اے پر آپ کو کیا کرنا اے کھولی کا۔“
”آر رہے کو چاہیے تو یہ امارا کھولی حاضر اے۔ ادھر آرام سے رہو۔ ام آپ کو اپنے ہاتھ کا مزے مزے کا کھانا پکا کر کھائے گا۔“

”خود تو میں سے قیامت ہو رہی ہے۔“ اس نے کہا۔
”خود تو ام آپ کے واسطے ٹھکانہ بنی جاتی اے۔“
”آپ کو ادھر کا چٹا دیا تھا کہ ام سے خانا ہو تو ادھر ہوں پر بولنا۔“ خان کی سادگی اور غلوں بے مول تھے۔ معاذ کا دل

پر لے رہا تھا۔ کالے خان نے اسے بتایا تھا کہ سونیا کیل اس کی تلاش میں راجہ ادا دیوی کے گھر آئی تھی اور اس کا دعویٰ تھا کہ وہ اس کی زندگی بچانا چاہتی ہے۔ اسے سونیا کے اس دعوے پر تو اعتبار نہیں تھا لیکن اس کے پیچھے بھی چال تک پہنچنا چاہتا تھا۔

”سب کچھ ہے گی، بس آپ صبر کرنا۔“ اس نے کہا۔
 ”مگر کیا کرنا ہے؟“ گل خان کو پوچھا۔
 ”وہ صرف یہ کہتا ہے۔“ وہ صرف یہ کہتا تھا۔

”تمہارے پاس ہتھیار ہے؟“ آخر کار اس نے گل خان کے غلوں کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔

”اگلے اے۔“ ہتھیار تو پھان کی شان اے۔ ام دو وقت کا فائدہ کر سکتی اے پر ہتھیار کے بغیر ہی رہ سکتی۔ گل خان نے سینہ بھد کر اطلاع دی تو وہ اس کے ہتھیار کے بارے میں معلوم کرنے لگا۔ یہ وہی رچی بڑھا جو گلیوں کی ملازمت کے عرصے میں ہی گل خان کے زیر استعمال رہتا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ کھولی میں صرف میں رہوں گا۔ تم اس پاس رہ کر بس نگرانی کرتے رہو گے۔ دیکھو کہ کوئی گڑبڑ ہوئی ہے تو فوراً غلط کرنا اور نہ خاموشی سے بس نگرانی کرتے رہنا۔“ اس نے گل خان کو اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔

”کیا ام ابھی باہر چلا جائے؟“ اس نے معصومیت سے پوچھا۔

”کیوں؟ کوئی مسئلہ ہے کیا؟“

”نہی، وہ ہم سوچ رہی تھی کہ دوپہر کے لیے ہانڈی اس نے معاذ کے ہونٹوں پر ابھرنے والی بھرپور مسکراہٹ کو دیکھ کر اپنی بات اور دہری چھوڑ دی۔

”ام نے کچھ غلط بول دیا کیا؟“ سوال میں بھی ایک معصومیت تھی۔ معاذ زور سے ہنس پڑا۔ خان کے چہرے کی بے چارگی اور شرمندگی مزید بڑھ گئی۔

”مجھے ہنسی اس لیے آ رہی ہے بار کہ یہاں میں نہ پیش ظاہر کر رہا ہوں کہ کوئی بڑا ہنگامہ ہو سکتا ہے اور تمہیں کسی گھنیز بیوی کی طرح یہ فکر لگی ہے کہ اگر کسی وجہ سے گھر سے باہر جانا پڑے تو جاتے جاتے حصار کے لیے کھانچا

”اس نے مسکراتے ہوئے اپنے منہ کی وجہ سے ہنسنا شروع کیا۔

”تم بہت بھاری ہو خان۔“ معاذ کو اس کی سادگی پر حیران کیا اور خان بول سرخ پڑا جیسے کسی کٹوری دو شیرہ کو

پکلی باران ظہار محبت کا تجربہ ہوا ہو۔ اس کے باہر جانے کے بعد معاذ نے اپنی شرٹ اتار دی اور بازو پر کسی تعویذ کی طرح بندھے سادھو کے طمسائی پتھر کو خود سے جدا کر دیا۔ سادھو کا دعویٰ تھا کہ جب تک یہ پتھر اس کے جسم سے مس ہوتا رہے گا، اس کے جسم کا کوئی سنگل نہیں موصول نہیں ہوگا۔ یہاں

تک کہ موڈی جانور اور حشرات بھی اس سے دور رہیں گے۔
 ”مگر اس کا کیا مطلب ہے؟“ وہ سادھو کے اس دعوے کے کو خود کو یاد دلاتا تھا۔ وہ اس کا بپ چچا اس کے پتھر اپنے بازو کے ساتھ باندھا تھا، یہ کوئی پتھر اسے کاشا تھا اور اس کی جسم پر بیٹھتی تھی۔ سادھو کے چیلے روی کی زبانی اسے معلوم ہوا تھا کہ جب وہ سادھو کی کنیا کی خفیہ زمین دور پناہ گاہ میں تھا تو سونیا کوئی آئینہ لیے اسے ڈھونڈتی ہوئی رہاں تک پہنچ گئی تھی لیکن سادھو کی قسم کے آگے سانس لبل ہوئی تھی اور کنیا کے اندر آ جانے کے باوجود سونیا نہیں جان سکی تھی کہ وہ عین اس کے قدموں کے نیچے موجود ہے۔

”بپ رہے۔“ یہاں تو پھر اور تاثر لگائے بیٹھے تھے۔ رات کو چھوڑ کر دن میں بھی کاٹ رہے ہیں۔ بازو میں جھین ہوئی تو وہ بے ساختہ اپنا ہاتھ بازو پر مار کر بڑبڑایا۔ درجہ جلدی نہیں دوبارہ چڑھائی۔ اب امید اور انتظار کے سوا کچھ نہیں تھا۔ سو فیصد یقین بھی نہیں تھا کہ یہ تدبیر کارگر ثابت ہوگی اور سونیا اس کی تلاش میں یہاں پہنچ جائے گی یا پہنچے گی بھی تو اسے کتنی مدت لگے گی۔

اپنی ان ہی سوچوں میں غلطیاں وہ چنتی پر دھرے دھندے پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ کھولی میں اس چنتائی کے سوا ایک طرف نہ کر کے رکھا گیا بستر اور باورچی خانے کا ضروری سامان ہی موجود تھا اور اس مختصر کم قیمت سامان کو وہ مقتول و کرم کے گھر کی زیر تعمیر بالائی منزل پر پہنچے بھی دیکھ چکا تھا۔ یقیناً گل خان نے اپنے مجدد بحث میں سے یہ مشکل اس کھولی کے کرائے کی گنجائش نکالی تھی پھر بھی وہ دل کا اتنا مانی تھا کہ بغیر کسی غرض کے اس کا ساتھ دینے پر کمر بستہ ہو گیا تھا۔

”کالے خان پر زوروں کا کہ گل خان کو جہاز جہ ملازمت پر رکھ لے۔ سونیا کے گھر میں داخلے کے بعد وہ اپنے بی بی مارت ہو چکا ہے کہ خود کو سیکھائی سسٹم اتنا جلد قابل استعمال کرے گا کہ وہ اپنے گھر سے گل خان کو اپنے گھر کے ساتھ لے جائے گا۔“ وہ اس کا خیال کرتا تھا۔
 ”مگر اس کا کیا مطلب ہے؟“ وہ سادھو کے اس دعوے کے کو خود کو یاد دلاتا تھا۔ وہ اس کا بپ چچا اس کے پتھر اپنے بازو کے ساتھ باندھا تھا، یہ کوئی پتھر اسے کاشا تھا اور اس کی جسم پر بیٹھتی تھی۔ سادھو کے چیلے روی کی زبانی اسے معلوم ہوا تھا کہ جب وہ سادھو کی کنیا کی خفیہ زمین دور پناہ گاہ میں تھا تو سونیا کوئی آئینہ لیے اسے ڈھونڈتی ہوئی رہاں تک پہنچ گئی تھی لیکن سادھو کی قسم کے آگے سانس لبل ہوئی تھی اور کنیا کے اندر آ جانے کے باوجود سونیا نہیں جان سکی تھی کہ وہ عین اس کے قدموں کے نیچے موجود ہے۔

میں پورے کرنا آسان سمجھتی تھی۔ "ظاہر فرادہ گل خان کے متعلق سوچ رہا تھا لیکن اندر سے سونیا کے انتظار نے بے چین کر رکھا تھا۔ اس بے چینی نے اسے زیادہ دیر بیٹھنے نہیں دیا اور اٹھ کر کھولی کے دروازے تک گیا۔ دروازے میں کئی ایک جھریاں تھیں جن سے ہر آسانی باہر جھانکا جاسکتا تھا۔ کچھ کھجور کے کوٹھے واضح نظر آتے تھے کہ انہوں نے بجھاوے توڑ دی تھے۔ کھولی کے کنارے دو تار بٹنی اس کے لیے سجھوہ پوشی کا انتظام کر سکتی تھی۔

دروازے کی جھری سے باہر جھانکنے پر اسے وہی
سندگی سے جہر اناحول، آدھے ادھورے لباس والے مرد
زین اور اچھے بالوں والے سلیے چیکٹ پہنے ہوئے دکھائی دیے
جنہیں وہ یہاں آتے وقت دیکھ چکا تھا۔ کسی خطرے کی
صورت میں فرار کی راہ بھی بس یہ تھی کہ وہ برابر والی کھولی
کے ساتھ مشترک کھڑکی کے پٹ کو ایک لاسٹ مار کر توڑنا اور
دوسری طرف کود کر وہاں سے نکلنے کی کوشش کرنا۔ کھڑکی کی
حالت جتنی مخدوش دکھائی دے رہی تھی اس کے تناظر میں
دوسری لاسٹ مارنے کی ضرورت قطعی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔
چھت پر جانے کا کوئی راستہ تھا ہی نہیں کہ وہ جھٹیلنا چہتے
ہوئے راہ فرار اختیار کرنے کا سوچتا۔ بالفرض راستہ ہوتا بھی
تو ان چھتوں کی حالت ایسی نہیں تھی کہ اس کا وزن سہار
سکتیں۔ امید یہ تھی کہ پہلی سے دوسری چھت پر چھلانگ
لگاتے ہی وہ اندر جا کر تال اور اہل کھولی میچر پھاڑ کر ملنے والی
دوست کے بجائے ایک چھ فٹے مرد نے کود کر اس پر ٹپا
پڑے۔ ایسے میں سونایا یا اس کے ہر کاموں کے کرنے کے
لیے کچھ باقی ہی نہیں بچتا تھا۔

لا یعنی اور فضول سوچوں میں گھرے وقت بہر حال کچھ نہ کچھ آگے بڑھ ہی گیا۔ وہ چونکا اس وقت جب دروازے پر شانگل سے دستک دی گئی۔ اس دستک میں محاندہ اندازہ اندازہ ٹاپید تھا۔ یوں بھی دشمن دستک دے کر کبہ آتے ہیں۔

”کہیں آس پڑوسی سے کوئی کسی ضرورت کے تحت نہ
آتا ہو؟“ سوچا سوچا اور اس نے ایک طوفان بڑھا اور جھڑپ
کرنا لگا۔ ہر سو نیا اپنا تمام تر حشر طغیانی کے ساتھ
کھڑا اس کے سامنے تھا۔

وجود بہت ہی زیادہ غمخیاں ہو رہا تھا۔ اس نے ایک نظرسوچیا کی جینز کی غیر ابھری جیبوں، شانے سے نکلے بہت چھوٹے سائز کے پرس اور خالی ہاتھوں کو دیکھا اور آہستہ سے دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ بغیر کسی جھجک کے یوں اندر چلی آئی جیسے یہ ایک معمول ہو۔ اس کے اندر آنے کے بعد

وہ وہاں پہنچے تو ان کا دوسرا گروہ دیکھتے رہے اور چلے گئے۔

”وہ اب بھی قابلِ اشتعال ہے۔“
”وقت اس طرز پر گفتگو کے لیے موزوں نہیں ہے۔“ وہ ٹھٹھکی سے بولی۔

”کیوں، قہارے ہر کاروں کو مجھے ساتھ لے جانے کی جلدی ہے؟“

اس کے ہونٹوں پر طعنے بھسم بکھرا۔

”میں تمہیں لے جانے نہیں آئی۔ میں صرف اس لیے آئی ہوں کہ تم مجھ سے ملنا چاہتے ہو۔“ اس بار اس نے معاذ کو حیران کر دیا۔

”تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے میں نے تمہیں بلاوا بھیجا تھا۔“

”میرے حساب سے بلاوا ہی ہے۔ اگر تم نہ ملنا چاہتے تو اب بھی اسی طرح غائب رہتے جیسے اتنے عرصے سے تھے۔“ سونیا کے جواب نے سادھو کے حیلے روی کی اس بات کی تصدیق کر دی کہ اسے کسی ڈیلو اگسٹ کی مدد سے ٹریس کیا جا رہا تھا لیکن سادھو کی فطرتی نے ڈھونڈنے والوں کو ناکام کر دیا۔ بعد میں بازو پر بندھا سادھو کا دیا پتھر اپنا چنگر دکھا جا رہا اور جیسے ہی اس نے پتھر کو اپنے بازو سے جدا کیا، سونا سادھی اس تک پہنچ گئی۔

”ملا تو تھائی۔ تمہاری طرف میرا حساب کتاب
 ہے کہ ملے بنا کوئی حارہ ہی نہیں تھا۔“ اب اس کے اندر کا

پچھلوں سے حساب کروں گا جنہوں نے آج مجھے اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔" اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ نفرت

”پلیز معاذ! اس خیال کو اپنے دماغ سے نکال پھینکو۔ وہ بہت طاقتور لوگ ہیں اور تم اکیلے ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے۔“

”تم تو ایسے بہادر ہی ہو جیسے تم سے زیادہ میرا کوئی خیر خواہ نہ ہو۔“

تمہاری بھانجی چاہتی ہوں۔ میرا مشورہ ہے کہ تمہیں جو قصہ مانتے ہو چکے، ان پر سب سے زبردستی اپنی جان بچا کر ایسے طرف ہو جاؤ۔ اگر تم ان کی نظروں سے بچ کر خود کو بدست و ناجائز نہ کرنا چاہو۔ یہ بھی تمہاری بہت بڑی کامیابی ہوگی۔"

میں نے بھی اس سے باہر سے کہ اس وقت میں
 جیتنے سے کے تحت میرے پاس کی ہو رہا ہوں
 میں نے کیا فائدہ حاصل کرنا چاہتی ہوں وہ اس صورت میں
 بہتر رہے۔ یہ ہے جو میں نے کیا۔

مائی اجیتہ! کیسے ہے میرا۔ تم چاہو تو اب بھی یہاں سے ٹھکراؤ اور اس دنیا کی بھڑھڑ میں گم ہو جاؤ۔ میں تمہاری مرضی سے بغیر تمہارے چھپے نہیں آؤں گی لیکن یہ گارنٹی نہیں دے سکتی کہ وہاں بھی نہیں آئے گا۔ میں جس سسٹم کا حصہ ہوں وہ دنیا کا دیر کی غیر ہوتا۔ آہ پرزے ہوئے شے نہیں کرتا۔ اب کارکردگی نہیں آہٹوں کی تو میری جہتوں اور ذہن سے ادنیٰ سوچ دی جا رہی ہے۔ اس کے سچے میں ہاتھ ایسا تھا جس نے معاذ اللہ بھی پھونکایا لیکن مایا پر حقہ نہ رہا بھی آسمان میں تھا اس نے سچے میں نظر بھر کر بول۔

”میری کچھ سے باہر ہے کہ مجھے آٹا میں جھونکنے
 کی نستی کو مجھ سے جتنی بھردی کیوں پور ہی ہے۔“

”تم میرا انتخاب نہیں تھے۔ میںیں خود میثم ایلیس نے منتخب کیا تھا۔ میں تو بس احکامات پر عمل کر رہی تھی۔“

”ہے کوئی۔ تم اسے نہیں جانتے لیکن وہ تمہاری زندگی کے ہر پہلو سے واقف ہے۔ اس کی عقلی نگاہ ایک نظر

مختار نظمیں منتخب کر لیں اور پھر بعض اشعار کو بھی

یہ سب کی بات ہے؟ میں تو ابھی رگڑوں میں تھی
 کی میڈم انکس سے نہیں ملا۔ سو نیا کے لیے میں اسکا
 نئی تھی کہ اس بار کسی فنز کے اظہار کے بغیر شخص حیرت

”جب تم پہلی بار اپنی دوست بشری کے ساتھ پڑاؤ کی تلاش میں خان ہاؤس میں آ گئے تھے۔ یہ اسی روز کا قصہ ہے۔ ہمیں یا بشری کو معلوم نہیں ہو، کاتھولیکن اس روز گناہ کی پہلی نشت پر میرے ساتھ میڈم بائیس بھی موجود تھی۔“

ACPK

”مجھے لڑ مجھے بھی نہیں پتی لیکن یہ سچ ہے۔ میں تمہیں
چاہتا ہوں۔ میری بات کو سمجھو اور خود کو ان لوگوں کی فکری
سے اور رکھنے کی کوشش کرو۔“ اس نے لہجہ میں ٹھوس کی
جہان والی بے بسی اور اوجھل تھی۔ مودتوں خاصوٹی سے
سے دیکھتا ہوں۔ اگر وہ وہاں کی رہی تھی تو کوئی شک نہیں تھا
کہ کسی کا کہنا تھا کہ یہ سچ تھی۔

کہتا ہے: "معاذ اللہ! مجھے متاثر نہ رہتا۔" وہ اپنے سر پر خوشامی
 ۵۵: بیٹھا ہوا ہے۔ ایک وقت تھا کہ یازدہویں اور عراقی نے
 تمہارے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ تمہارے سر کی گرفت
 میں تھے اور وہ بہت آسانی سے تمہیں ہلکے کر سکتے تھے
 جن میڈرائٹس کی مداخلت نے تمہیں یہاں نہیں لے دیا۔
 یہ تمہاری گرفت سے نکلے تو بھی صورت حال جو بدلی ہی
 تھی۔ تمہارے جاتے تو تمہارے ساتھ چم چھوڑ دیتا لیکن
 تمہارے تمام تر دستوں کے باوجود محفوظ رہے اور اس
 سے تمہیں سے میرے دل میں یہ خیال آتا کہ تمہیں
 محفوظ رہنا چاہیے۔ نیوں، یا اور کیسے؟ میں نہیں جانتی لیکن
 مجھے یہ بات سمجھ آئی ہے کہ انسانی طاقت سے باز کوئی قوت
 ہے جو تمہاری حفاظت کر رہی ہے۔ "وہ گویا ہے خودی کی
 کیفیت میں گی۔ اس نے سونپا کے ساتھ اچھا خاصہ وقت
 گزارا تھا۔ وہ اس کی مکاری، اسفا کی، جتنی نور و ہائی سے
 بھی طرح و قطف تھا لیکن اس کا یہ روپ بالکل الٹا تھا۔
 ہر طرف اسے لگتا کہ وہ اس کے لیے کوئی نیا جہان بچھا رہی
 ہے لیکن پھر کہیں اندر سے اشارہ ملتا کہ اس روپ میں کوئی

ACER

کہا کہ یہاں سے نکلتے جاؤ اور دنیا کے کسی گمراہ کو شے میں
نہ ملے۔ اس سے زندگی شروع کرو۔ چاہو تو میں تمہیں یہاں
سے نکالنے میں تمہاری مدد بھی کر سکتی ہوں لیکن ایسا صرف

”ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟ بتاؤ میری مدد کرو گی؟“ وہ اسے پورا پورا آزمائش دیتا تھا۔
”مجھے سوچنے کے لیے تھوڑی سی مہلت دو۔“ وہ تھذذب کی گئی۔

”مہلت پر تو شاید اب میں ہوں۔ کب، کس لمحے تم سے مل سکے گی؟“ وہ پوچھتا تھا۔
”میں نہیں جانتی۔“ وہ کہتی رہتی تھی۔
”پچھلے دو دنوں میں اس کا کسی خاص کام نہیں ہو سکا۔“ وہ کہتی تھی۔
”اس بار سوچنا کے لیے مجھے میں بھی دیکھائی آگئی۔“

”بہرے، مہل دو بارہ رابطہ کاؤ۔ پھر کیا ہوگا؟“ اس نے سوچنا کی بات کو نظر انداز کر کے سوال کیا۔

”خفیہ چارون بعد اخبار میں اشتہاروں کی کہ ایک مضبوطی رت کو منہدم کرنے کے لیے ضرورت ہے۔ خود دشمنی افرارہ کر رہی۔ تم جڈنگ بریکر کے نام سے کال کرنا۔ اس کال کے جواب میں، میں تمہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کر دوں گی۔“ اس نے ساتھ ہی دلی سے کہنے لگا۔
”ایک مشہور انگریزی اخبار کا نام بھی بتاؤ۔“

”بڑا پراثریقتہ چنا ہے۔“ وہ سن کر ہنس دیا۔

”جدید انداز میں کام کرنے والے نئی نئی پرائے طریقوں سے بات بھا جاتے ہیں کیونکہ ان کا، ان طریقوں کی طرف دھیان ہی نہیں جاتا۔“ وہ دہاتی کے لیے پرتوتی نظر آتی۔ معاذ کا دل چاہا کہ اسے روک لے اور زبردستی وہ سب معلوم کر لے جو جانتا چاہتا ہے۔ لیکن جس جگہ وہ موجود تھا، وہاں ایسا ممکن نہیں تھا۔ وہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ جن لوگوں نے سوچا جیسی طرح راز عورت کو اس کینیا میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا ہوگا، وہ نظریں جمائے بیٹھے ہوں گے اور ایک ایک مل کا حساب ہو رہا ہوگا کہ وہ کب اور کتنی دیر میں وہیں لوٹتی ہے۔ کچھ بعید نہیں تھا کہ زیادہ تاخیر ہونے کی صورت میں کوئی کسی بہانے سے من گھڑی بیٹھا آئے۔ ایسے میں وہ خاک اس سے کوئی معلومات حاصل کر پاتا۔ چنانچہ دل پر تھک کے اس نے رخصت ہوتا دکھایا۔ اس کا تھک کے ساتھ

”کسک یہ کوئی فریب ہی نہ ہو اور کچھ دیر میں اس کے حواری یہاں ہڈا بول دیں۔“ دماغ ایسے ایسے خدشات

اسی صورت ہوگا کہ تم بعد از جلد فیصلہ کرلو۔ میڈم ایکس میری ناکامی کو زیادہ عرصے برداشت نہیں کرے گی۔ بہت جلد مجھے یہاں سے ہٹا کر میری جگہ کسی اور کو ڈیوٹی سونپ دی جائے گی اور ظاہر ہے کوئی اور تمہارے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرے گا۔“ وہ نہایت صاف گوئی سے کام لے رہی تھی۔

”جسٹس اس بہرہ میں کو میں کچھ مان لوں جو تمہارے لیے مفید ہو۔“ وہ کہتی تھی۔
”اس صورت میں مجھے اپنے پیارے لڑکی جہاں کو بھروسہ پڑے گا اور یہ مجھ سے ہوگا نہیں۔ اس احساس کے ساتھ رندہ رہنا۔ صرف اپنی جان کو محفوظ رکھنے کے لیے میں نے ان کے قاتلوں کو معاف کر دیا ہے۔ میرے لیے سوچنا روٹ ہوگا۔“

”خفیہ راز کے تو مزید نقصان اٹھا رہے۔ خونی رشتے کھو چکے ہو لیکن دو دوست احباب تو باقی ہیں، تا جن کی تھیفہ تھیفہ دل پر محسوس کر رہے۔“

”تم مجھے دھمکی دے رہی ہو؟“ وہ مشتعل ہوں۔
”تنبیہ کر رہی ہوں۔ اس سے کہ میں حالات کو تم سے بہتر جانتی ہوں۔“ سوچنے کے لیے کاسٹون اس کی چٹائی کی تھامی اس نے۔ ہاتھ تھا۔

”اگر مجھ سے ایسی ہی بہرہ دہی ہے تو مجھے اپنی میڈم ایکس اور اس کے حواریوں تک رسائی دو۔ میری زندگی میں سکون اسی وقت آئے گا جب میں اپنے دشمنوں کا قتل شروع کر دوں گا۔“

”خودکشی کرنا چاہتے ہو؟“ وہ اس کے منہ لے پھینچا گئی۔

”مرنا تو ایک دن ہے ہی۔ کیوں نا ان سے کر کر مروں جنہوں نے جیسا حرام کر رکھا ہے۔“

”کس کس سے لڑو گے تم۔ وہ کوئی ایک فرد یا پھوٹا سا گروہ نہیں ہے جسے تم کسی فلمی ہیرو کی طرح ٹھکانے لگا دو گے۔ سچ یہ ہے کہ میں ان کا وعدہ ہوتے ہوئے بھی نہیں جانتی کہ ان کی چیزیں کہاں کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں۔“ سوچنا نے آہستہ آہستہ کہا۔

”اگر تم نے بہتر چلنے سے مرعہ یہ کرنا ہے تو دشمنوں سے چھوٹ کر رہو۔“ اس نے کہا۔
”میں یہ نہیں کر رہی۔“ اس نے کہا۔
”سوچنا کو خاموش کر دیا اور کچھ عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔“

پیدا کر رہا تھا جن کی اسے خود اپنے اندر سے گواہی نہیں مل رہی تھی۔

”جو بھی ہے۔ اب گل خان کا یہاں رہنا من سب نہیں ہے۔ آجائے تو اسے کالے خانا کی طرف روانہ کرتا ہوں۔ وہاں تلک وغیرہ کر کے آرام سے زندگی گزارے گا۔ میں اس کی کسی بھی چیز کو بھی کھڑی کرانے سے منع کرتی ہوں۔“ مادھو نے بتا دیا کہ وہ کھڑی ہو کر نظر بند ہو جائے گا۔ مادھو نے اپنے چاہنے والوں پر ہاتھ پیر کر رکھے تھے۔ وہ بھائی بیٹے کے ساتھ ساتھ آرام کر رہے تھے۔ باہر شور مچا رہا تھا۔ اسے فوراً علی خان کی فکر لاحق ہوئی۔ جلدی سے قمیص کا بازو برابر کرتا باہر کی طرف لپکا۔ تنگ سی گلی کے کھڑے پر اسے لوگوں کا ہجوم نظر آیا۔ اس ہجوم میں اسے گل خان کو پہچاننے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ اس کا گریبان چٹا ہوا تھا اور چہرے پر خون دکھائی دے رہا تھا۔ تین چار افراد اس کے دلوں بازو دبوچے اسے ایسی طرف آ رہے تھے اور صاف مٹھوس ہو رہا تھا کہ وہ زبردستی لایا جا رہا ہے۔

”شیو! جلدی سے ناشتا لے آؤ۔ مجھے پارلر کے لیے درپور ہونی ہے۔“ سناڑھے گیورہ سے اوپر کا وقت ہو چکا تھا جب مہناز اپنے نم پاؤں میں انگلیوں سے تنگھی کرتی ہوئی خواب گاہ سے باہر آئی اور شیو کو حکم دیا۔ صوفے سے ٹپک لگائے نیچے کارپٹ پر بیٹھی کسی سوچ میں گم سم شیو نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ برانڈو جینز اور ٹاپ میں ملبوس مہناز نو میک اپ لک کے ساتھ باہر جانے کی تیاری میں نظر آ رہی تھی اور یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ باڈل رات سے یہاں موجود تھا اور جب وہ یہاں ہوتا تھا تو مہناز کہیں نہیں جاتی تھی۔ اپنی جاب پر پارلر بھی نہیں۔

”اتنی ٹھکن ہو رہی ہے۔ ہاں کل دل نہیں چاہ رہا پارر
جانے کا لیکن کیا کروں۔ کلائنٹ نے پہلے سے کہہ کر دیا
ہوئی سیبہ اور میر سے علاحدہ کسی سے سرگرم نہیں بن سکی۔“
کری سٹیج کر ڈاننگ ٹیبل پر بیٹھتے ہوئے وہ خود کلامی کے
اعداز میں بڑبڑاتی تو صبیحہ نے دیکھا کہ واقعی غسل اور مناسب
کے بارے میں بحث چھیڑتی تو بازو نہیں لگتی تھی اور
ساتھ ساتھ زری رائے کی نیچہ تھا۔ غصہ بھی
سہارے کے لیے کمر کی بھر دی محسوس کی۔

”تم کیا کھڑی میرا جائزہ لے رہی ہو۔ ناشائستہ کیوں نہیں بتاؤ؟“ اس کے اپنے لیے جذبات کو محسوس کیے بغیر

مہناز نے اسے حرکت میں نہ آتے دیکھ کر دھیرے سے نوکا اور اپنے موبائل پر مصروف ہو گئی۔

”میں توڑی دیر میں پہنچ رہی ہوں میڈم! شیا سے کہیں کہ سب کچھ ریڈی رکھے اور اگر مسز جوجہ میرے پہنچنے سے پہلے آجائیں تو انہیں ہینڈل کر لے۔“ فریج سے اٹھتے ہوئے نے چھوٹے چھوٹے ہنسی کی آواز دی۔

میں نے اپنے دل کی دوا کے لئے اپنے دل کو اپنے دل سے نکال دیا۔
آپ کا پارلر میں ایک کمرہ داسی ہیں۔ اس کے میں بہتر سوس ت
کمرے کے باوجود پارلر آنے کی تیاری کر رہی ہوں۔ آپ
جیسے بس اتنی مہلت دیں کہ میں ناشتا کر کے خود کو اس لائق
بنا لوں کہ میں باجوہ کو سر اسز دے سکوں۔ اب آپ یہ نہیں
کہیے گا کہ آپ تھوڑی سی دیر سویر کو بیچ نہیں کر سکیں گی۔
پندرہ بیس منٹ تو آپ چائے پانی کے بہانے بھی آرام سے
کاٹا سکتی ہیں۔ ”انڈے جھینے کی ہلکی آواز کے ساتھ ساتھ
مہمان کی آواز ہوں دم ہو رہی تھی جیسے کسی ڈرامے کے سین
میں بہک گرا انڈ میوزک چل رہا ہو۔

”آپ جانتی ہیں کہ میں کام چور اور سست نہیں ہوں اور صرف یہ میں تھا ہوں جو آپ کے بیٹے کے ساتھ رات گزار کر بھی اس لائق رہتی ہوں کہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو جاؤں لیکن بہر حال یہ کھڑا ہونا اتنا آسان نہیں ہوتا ہے۔“ یقیناً دوسری طرف سے تاج بائی عرف تاجور نے سے کوئی سخت بات کہی تھی جس کے رد عمل میں اس کی آواز بلند ہوئی تھی اور لہجے میں فضا جھٹکنے لگا تھا۔ فرانسس چین میں آلیٹ کے آمیزے کو ذلتی شیوے نے ذرا کی ذرا گردن تھما کر مہنا زدہ کیا۔ وہ باؤل کی بیوی نہیں تھی لیکن نہایت آرام سے باؤل کی ماں کو اطلاع دے رہی تھی کہ اس نے رات میں کے بیٹے کے ساتھ گزاری ہے۔ شاید ماں ”تاج بائی“ کو تو ایسی باتیں کرنا دشوار نہیں رہتا۔

13 "تمی ہاں۔۔۔ رات سے وہ بیٹھی ہے اور فی الحال سو رہا ہے۔ آپ کو تو صرف سبزہ جڑ کی فکر ہے لیکن مجھے یہ اہمیت ملتی ہے کہ اگر میری والدہ سے پہلے اس کی شادی ہو جائے تو میری شادی کی کیا ضرورت ہے؟"

بہت بھاری تھی۔
 ”او کے، پھر پہنچتی ہوں میں تھوڑی دیر میں۔ آئی
 ہو۔ کہ میری سچویشن کو سمجھنے کے بعد آپ اب معاملات کو
 بہتر طور پر منڈل کر لیں گی۔“ اس نے بیزار سے انداز میں
 سلسلہ منقطع کیا اور موہاگل میز پر رکھتے ہوئے اسی میز اداری

کے استعمال کی نوبت آگئی تھی۔ آج کل باڈل جلدی جلدی
 وہاں کا پتھر لگانے لگا تھا اور شدہ بعض اوقات وہ پندرہ بیس دن
 تک بھی وہاں کا رخ نہیں کرتا تھا۔
 میری نیڈ مٹن رات کو ایک بڑی سی ٹرے میں رکھ کر
 اس نے دروازے سے ایک بڑے سائز کی تیز دھار والی چھری

سے اپنی
 ”اب نے بھی آگے بڑھنا۔ کیا آپ نے مجھے بجائے پاسے
 نے آگے بڑھنا۔ کیا آپ نے مجھے بجائے پاسے
 سے آگے بڑھنا۔ کیا آپ نے مجھے بجائے پاسے
 سے آگے بڑھنا۔ کیا آپ نے مجھے بجائے پاسے

لڑ کر رکھیں اور خود دم پر رکھی چائے کو چیک کرنے لگی۔
 ”کیا تم کسی لینیشن میں ہو؟“ شیو کو بولنے میں
 دشواری پیش آتی تھی اور الفاظ واضح نہیں ہوتے تھے۔ اس
 لیے وہ بہت کم بولتی تھی۔ اتنا کم کہ اپنی لوگ اس پر ہونگی
 ہونے کا متنبہ کر سکتے تھے لیکن مہنہ نہ لے اس کی خاموش
 مزاحی کے باوجود اس پر طاری ہونے والے غیر معمولی موڈ و
 ہوا نہ لپکتا تھا۔

”قمر مت کرو۔ دو دن ڈھکے تک سوینا پڑا رہے گا اور
 میں اس سے اٹھنے سے پہلے پہلے وہاں آ جاؤں گی۔“ شیو
 اس کے استفسار کے باوجود خاموش رہی تو وہ خود ہی سب
 سمجھتی ہوئی اسے تسلی دینے لگی۔ وہ اب بھی زبان سے کچھ نہ
 بولی اور بھاپ اڑتا خوشبو دار چائے کا قل سا کٹھ اس
 کے سامنے لا رکھا۔ مہناز کا کل ناشائان تین لوازمات پر ہی
 مشتمل ہوتا تھا اور اس ناشتے سے انصاف کرتی وہ ناشائان
 بنانے والی کو اپنی سی تسلی دے رہی تھی۔

”او کے، اب میں چلتی ہوں۔ تم ڈیپ فریزر سے
 بکرے کی دان نکال کر اسے روست کر لیتا لیکن دیکھو
 روست کرنے سے پہلے اسے کٹ لگا کر تھوڑے سے سبائے اور
 لگا لیتا۔ باڈل کو اسپانسی کھانا پسند ہے۔ دان پھینک سیکھی رہ گئی
 تو اس کا موڈ آف ہو جائے گا۔“ چند منٹوں میں ناشائان کو
 تگلے کے لیے تیار وہ اسے آخری ہدایات دے رہی تھی۔ شیو
 نے سن کر تاجعداری سے سر ہلا دیا۔ اسنے دنوں سے یہاں
 رہتے رہتے وہ جان گئی تھی کہ اگرچہ باڈل اس اپارٹمنٹ
 میں مستقل نہیں رہتا لیکن اس کی ہر طرح کی خاطر

میں سب سے زیادہ خوش ہو کر اور خوش
 ہو کر رہتا تھا۔ اس کی ہر طرح کی خاطر
 جاتی تھی۔ بکرے کی یہ دان بھی اس نے پرسوں ہی مہنہ
 کے حکم پر میری نیٹ کر کے رکھی تھی اور اتفاق سے جلد ہی اس

دنیائے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں گھر بیٹے حاصل کریں

جاسوسی، ڈائجسٹ، سسٹمز ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ایک سال کے لیے 12 ماہ کی ادائیگی 1800 روپے

ایک سال کے لیے 12 ماہ کی ادائیگی 1800 روپے

ایک سال کے لیے 12 ماہ کی ادائیگی 1800 روپے

ایک سال کے لیے 12 ماہ کی ادائیگی 1800 روپے

ایک سال کے لیے 12 ماہ کی ادائیگی 1800 روپے

ایک سال کے لیے 12 ماہ کی ادائیگی 1800 روپے

مرزا شمس عباس: 0301-2454188

مرکز لکھنؤ: 0333-3285269

مرکز لکھنؤ: 0333-3285269

مرکز لکھنؤ: 0333-3285269

مرکز لکھنؤ: 0333-3285269

عمل

”میں نے اور میرے بہترین دوست ارشد نے جب یہ پڑھا کہ تمہارا سچا اور حقیقی دوست وہ ہے جو تمہیں تمہارے صیروں سے آگاہ کرے۔ تو ہم نے اس پر عملدرآمد کا فیصلہ کیا۔“

”میں نے ہم دونوں کی اپنی اصلاح کے لیے اس بات پر اتفاق کیا کہ ہم ایک دوسرے کی باتیں سنا سکیں۔“

(مرسلہ: پرویز خان، سکھر)

رکھے تھے لیکن وہ بہت اہم ہو کر بھی اتنا اہم نہیں تھا جتنا کہ سلطان سلطان کو ہر جگہ عرفان اللہ کے جانشین کی حیثیت سے اہمیت دی جاتی تھی حالانکہ وہ اتنا باصلاحیت نہیں تھا جتنا کہ وہ خود۔ اب بھی سلطان، بشری کے ہاتھوں زخمی ہو کر عرصے سے ہسپتال پر پڑا ہوا تھا جبکہ اس نے عرفان اللہ اور عرفان اللہ کی اس مسئلہ سے جان بچاؤ کی تھی۔ خود بشری نے اپنے لیے مصیبت کی کاشی بھی سلطان نے ہی بتائی تھی۔ اس نے جب یہ بات سنی تو وہ دونوں دوستوں کے لیے حیرت منگوا کر کہنے لگے اور وہ ان مسائل کے حل کے لیے حیرت منگوا کر پھر رہا تھا۔ اس نے ہمیشہ ہر موقع پر اپنی صلاحیتوں کو ثابت کیا تھا لیکن پھر بھی سلطان کے برابر نہیں پہنچ پاتا تھا اور ہر گزرتے دن کے ساتھ یہ بات اس کے لیے ناقابل برداشت ہونے لگی تھی۔

اب بھی وہ عرفان اللہ کے حکم پر لالہ بھیجے رہا اور اور قلعہ ٹاک آدمی کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ کچھ عرصے سے منظر سے بالکل غائب لالہ تک رسائی آدمی آسان نہیں تھی لیکن اس نے بنا پورا زور لگا دیا تھا۔ جاسوسوں کا پورا ایک جال بچھانے کے بعد وہ لالہ کے گروہ کے ایک ایسے آدمی تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا جو گروہ میں اہم حیثیت رکھنے کے ساتھ ساتھ قابل خرید بھی ثابت ہوا تھا۔ ایسے آدمی تک رسائی کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ لالہ کے بارے میں مشہور تھا کہ اس کے قریب جاں نثار اس کے پیچھے پر اپنا خون بہانے کے لیے تیار رہتے تھے اور اس نے کسی قریبی بندے کو توڑ دینا تو بڑا کام تھا۔ لالہ کی محبت اور دیہشت کی شدت ان کی زیادہ بھی تھی جو ایک بار اس کا ہو جاتا تھا پھر نہیں نہیں جاتا تھا لیکن اس بندے کو لالہ کی محبت نے توڑ دیا تھا۔ معلوم ہوا تھا کہ اس کی اگلی قیچی کینڈر کا ٹکڑا، مانی تھی اور اس کے علاج کے لیے خطبہ رقم کی ضرورت تھی۔ اس کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے انڈونیس میں ایک بڑی رقم اس کے اکاؤنٹ میں جمع کروادی گئی تھی اور وعدہ کیا گیا تھا کہ باقی کی رقم بھی اس کی طرف سے کوئی اہم اطلاع ملنے پر فراہم کر دی جائے گی۔

”تمہاری اس آدمی سے سلطان کی مطلوبہ اطلاع ملنے کے بعد اس کی بھاری گولی اس کے دل میں لالہ کی طرف سے آگے بڑھ گئی تھی۔ اس نے اس کی طرف سے اطلاع دی تھی اور وہ فوراً ہی اپنے آدمیوں کے ساتھ حرکت میں آ گیا تھا۔ باذل اب ان لوگوں کے پیچھے وہاں جا رہا تھا۔ اس کی

پچاڑی کی رفتار خطرناک حد تک تیز تھی اور اسے کوئی پروا نہیں تھی کہ اسے ہمیشہ خطروں سے کھینچنے میں لطف آتا تھا۔

”نیا پ ڈھٹ ہے؟“ آخر کار وہ طویل فاصلہ طے کر کے اپنی منزل پر پہنچ گیا اور زمانہ سے سامنا ہوتے ہی اس سے پوچھا۔

”وہ لوگ اندر ہی ہیں۔ ظہور کے مطابق لالہ کی طبیعت پتھر خراب ہے اور وہ آتے کے ساتھ اپنے کمرے میں آرام کرنے گیا ہے۔ تو ابھی تک وہ جیسے نکلا۔ بس اس کا ایک خاص بندہ ہے جو ایک دو پارہوں کے بلاوے پر اندر کا پتھر لگا کر آیا ہے۔“ زمانہ نے فوراً پوچش کی۔

”مذہب ظہور بھی اندر ہی ہے۔“ زچہوت بن کر وہ پوچھ گیا۔

”جی۔“ سے یہاں پہنچنے کا پیغام ملا تھا بھی تو اسے پتا چلا کہ لالہ یہاں پر ہے۔ ”زمانہ مطمئن تھا لیکن باذل کی فحش بے لوث بھرتی لینے والی وحشت جس جاگ گئی تھی اور وہ بالکل کسی جاؤری کی طرح یوں نکلے پھڑپھڑا رہا تھا جیسے سوکھ کر خطرے کی سمت کا اندازہ لگانا چاہ رہا ہو۔

”گارڈز کی پوزیشن بتاؤ۔“ اس نے غراہٹ آواز لہجہ میں زمانہ کو حکم دیا۔

”وہ دونوں کی صورت باری باری ڈیوٹی دے رہے ہیں۔ بالکل ٹولی کچھ ویرنل آرام کرنے جا چکی ہے اور اب دوسری تازہ دم ٹولی ڈیوٹی پر ہے۔ ان کے انداز سے

کفار میں سے کسی کو نہ دیکھا گیا اور نہ ہی اس کی طرف سے کوئی اطلاع ملنے لگی۔ زمانہ نے اس کی بات سنی اور وہ یہ بات اسی طرح جانتا ہے جب ہی خود وہ روپوش کر رہا ہے۔ ایسے میں یہ سو منٹ اور بے پروائی میری کچھ سے بالاتر ہے۔“ اس نے اعتراض کیا۔

”پھر کیا کریں باس؟ کیا پیچھے ہٹ جائیں؟“ زمان نے تشریحات سے بوجھ۔

”بازل پر گزرجی پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں ہے۔ اگر یہ کوئی چال چل بھی رہے ہیں تو انہیں میری طرف سے مٹ کیا کھا پڑے گی۔“ اس کی آنکھوں میں کسی شکار کے لیے زور دے کھلی ایک ہلکے سیڑھی کی سی۔ زمان کے پاس کا چاندی کا گھڑا اور آدے کے تیار ہو گیا۔ ابتدا کی حکامات دیتے اور کچھ لوگوں کو مطلوبہ اشیاء حاصل کے لیے روانہ کرنے کے بعد اس نے زمان سے مطالبہ کیا۔ زمان نے خاموشی سے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ دوسری طرف سے دو گھنٹیوں کے بعد ہی کال ریسیور کر لی گئی۔

”ہاں ظہور یہ! میں بول رہا ہوں زمان!“

”یار بارفون کیوں کرتا ہے بابا! کسی نے کچھ سن لیا تو گزیر ہو جائے گا۔“ دوسری طرف سے ظہور نے دہلی آواز میں اس کال پر اپنی ٹائپنگیری کی کا اظہار کیا۔

”آئی ایم سوری ٹیکن وہ بات یہ ہے کہ باس خود تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔“

”کیوں اور کون سا بات؟“ وہ گزیرا کر بولا لیکن زمان اس کی سنے بغیر موبائل باڈل کو تھما چکا تھا۔

”تمہیں تم سے تموڑا سا اور تعاون و کار رہے ظہور!“

عادت کے برخلاف اس نے ظہور کو نرم لہجے میں غی طلب کیا۔

”ہم پہلے ہی ضرورت سے زیادہ کر چکا ہے مائی باپ۔ اب ایسا کچھ مست بولنا کہ ہم کو اپنے ہاتھ سے اپنا گنا کا شاپڑ ہے۔“ وہ اس کی بات سن کر ٹھکیا۔

”تمہارے قاعدے کی بات ہے۔ اس کا مہی میسج تمہیں الگ سے دی جائے گی۔“ اس نے ظہور کو لالچ دیا۔

”ہم کو کمر کیا ہوگا؟“ ظہور کے جواب سے ظاہر ہوا کہ وہ اس کا ڈالا گیا دانت چٹنے کے لیے تیار ہے۔

”تمہیں رات کے کھانے یا کسی شراب میں ملا کر سب کو قینہ کی گولیاں دینا ہوں گی تاکہ جب ہم اندر داخل ہوں تو کوئی مزاحمت کرنے والا نہ ہو۔“

”ہم کیسے دیکھ سکتے ہیں جس جگہ میں جاتے ہیں؟ تو یہ اس کا سبب سے بڑا مسئلہ ہے۔“ اس کا مطالعہ کرتے ہوئے اس نے

”کچھ نہیں ہوتا۔ تم خود ہی ان کے ساتھ گولیاں کھا لیتا۔ بعد میں کھانا پکانے والا خود جواب دیتا رہے گا۔ پس تم کسی کو خبر نہ ہونے دیتا۔“

”کو کچھ لیں جی۔ نہیں ہم مفت میں مارا نہ جاوے۔“

ظہور اب بھی اپنی کپا ہٹ کا شکار تھا۔

”تموڑی ہوشیاری سے کام لو گے تو کچھ نہیں ہوگا اور یاد رکھو مفت میں تو تم بالکل نہیں مارے جانے والے۔ ہم تمہیں ہر کام کا محقول معاوضہ دے رہے ہیں۔“ اس کے

لہجے میں سختی اور کڑواہٹ۔

”ہم ٹھیک کیا رہے؟“ زمان نے مری آواز میں اس کا جواب دیا۔

”ہم ٹھیک کیا رہے؟“ زمان نے مری آواز میں اس کا جواب دیا۔

”وقت تمہیں سب ادا کرے گا چاہیے۔“ وہ دھیرے دھیرے ظہور پر غالب آتا جا رہا تھا۔

”نہیں تم غارت سے غارت ہو گا؟“ وہ خوفزدہ تھا۔

”نہیں غارت سے بچنے کے لیے ہی تو تمہیں کہا ہے کہ سب کو خیر کی گولیاں دے کر سلا دو۔ جب کوئی ہمارے راستے میں ہی نہیں آئے گا تو ہمیں بھی ہتھیار نہیں نکالنا پڑیں گے اور ہم خاموشی سے اپنا کام نمٹا کر واپس لوٹ جائیں گے۔“ اس بار اس نے قدرے نرمی سے ظہور کو بولی دی۔

”آپ کو کام کیا ہے جی؟“ کہیں آپ لال کو بارنا تو نہیں چاہتے؟“ وہ اللہ کا بندہ بھی کسی طور مطمئن ہونے کو نہیں آ رہا تھا اور اپنی پٹاری میں سے سوال پر سوال نکال جا رہا تھا۔

”تمہیں پہلے بھی بتایا جا چکا ہے کہ ہمارا اول کو قتل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ کیا ارادہ ہے؟ یہ تمہارے لیے ت جانتا ہی بہتر ہے۔“ اس پر اس کے لہجے میں ایسی سرد مہرئی ورات کی کاسٹ کی سواہی کرنے کی ہمت ختم ہو گئی۔

”وقت کا خیال رکھنا۔ ہم ٹھیک کیا رہے؟“ اندر داخل ہوں گے لیکن تم کو شش کرنا کہ اس بجے تک سب غافل ہو چکے ہوں۔“ ایک بار پھر اسے جتا کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا اور زمان کو اس کا موبائل واپس لوٹا لیکن وہ دیکھ سکتا تھا کہ زمان کی آنکھوں میں الجھن ہے۔ شاید وہ حیران تھا کہ جب اس کا منصوبہ اتنا سادہ تھا تو کچھ دیر قبل اس نے جن انتظامات کے لیے بندے دوڑائے تھے۔ ان کی کیا ضرورت تھی؟

”ہم کیسے دیکھ سکتے ہیں جس جگہ میں جاتے ہیں؟ تو یہ اس کا سبب سے بڑا مسئلہ ہے۔“ اس کا مطالعہ کرتے ہوئے اس نے

”کچھ نہیں ہوتا۔ تم خود ہی ان کے ساتھ گولیاں کھا لیتا۔ بعد میں کھانا پکانے والا خود جواب دیتا رہے گا۔ پس تم کسی کو خبر نہ ہونے دیتا۔“

غفلت میں بری طعن مارے جاتے۔ تاہم ایک کے فرق نے انہیں مقابل پر تھوڑی سی برتری دے دی تھی اور اس برتری کو قائم کرنے کے لیے اس کے پاس مکمل انتظام بھی تھا۔ اپنے پاس موجود رکتی بم کی پٹا کھینچ کر اسے اچھالتے ہوئے وہ یوں مطمئن تھا جیسے دیواری پر پٹا نہ چلانے لگا ہو۔ دینی بم کا کھسکا ہوا دھماگے کے بعد معمولی دھماکا لگا، ایسی ہی مزید دو دھماکے سنائی دیے۔ سب سے پہلے اس کی ہلکتی ہوئی جگہ پر ہوا ہاتھ سے لگے ہوئے غصے سے لہجہ میں مقابلاً پڑے۔ پچھلے دھماکے کے بعد اس لیے اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں تھا کہ اس سارے جنگ سے بے نیاز ماحول سے ہم آہنگ چست لباس میں ملیوں، ریجٹ کر فارم ہاؤس کی رہائشی عمارت کی طرف بڑھتے ان دو افراد کو کوئی فرق پڑے گا جنہیں ایک اہم ذمے داری سونپ کر بھیجا گیا تھا۔

اندھیرے کا حصہ بنے ان دو افراد نے نہایت کامیابی سے اپنا سفر طے کیا اور عمارت کی عقبی کھڑکیوں کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ اتنی فاصلے میں کسی کی ہمت نہیں تھی کہ کھڑکیوں کے نزدیک آئے۔ تمام کھڑکیاں مضبوطی سے بند تھیں اور اندر تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ یقیناً حفاظت کے پیش نظر اندرونی روشنیاں بجھادی گئی تھیں۔ (باہر کی روشنیوں کو خود انہوں نے چن چن کر نشاندہ بنا لیا تھا کہ اپنی حرکات و سکنات کو پوشیدہ رکھ سکیں)۔

”ایکشن۔“ ان دو میں سے ایک نے آہستہ سے کہا تو دوسرے نے کسی خطرے کی پروا کیے بغیر اپنا مکمل تکیا کر باری باری کئی کھڑکیوں کے شیشوں پر فائر کیا۔ نتیجے میں شیشے ٹوٹ کر بکھر گئے۔ اس سے مل کر اندر سے اس فائرنگ کا جواب آتا، اس کا سامنے بے مکمل پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نوے شیشوں والی کھڑکیوں سے کئی گولے اندر چبھک چکا تھا۔ گولے اندر جا کر پھنسنے لگے اور ان سے کار حادثوں کی شکل کر اندر پھیلنے لگا۔

”کام ہو گیا ہے باس! پانچ منٹ میں سب کھینچ ہو جائے گا۔“ ان میں سے ایک نے باڈل کو اطلاع دی۔

”گنہ دوہیں ویٹ کرو۔ میں آ رہا ہوں۔“ وہ اطلاع

پاکستان کے لیے لڑنے والے ہیں۔ اپنے سر پر تھوڑا سا خون ہے۔

”آپ کہیں تو میں چلا جاؤں یاں؟“ زمان نے وفاداری دکھا کر کہا۔

”کیسا؟ کیا تم مجھ سے زیادہ جی دار ہو؟“ وہ غرایا۔

ایک وقت سلاسنے کا انتظام کر سکے۔“ سگریٹ جلا کر اس کا ٹکڑا لگاتے ہوئے اس نے تخت اٹھایا۔ سگریٹ کے جھتے ہی فضا میں جو بو پھیلی تھی اس نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ سادہ سگریٹ نہیں ہے۔

”ہوسکتا ہے وہ خود تیرے گولیوں کا عادی ہو۔“ اس

نے اس کے لیے کئی ممکنہ بات کہی۔ ”زبردستی لے لیں

پہلے کی گولی۔“ تو وہ اس کا جواب دے کر

خاموشی سے لالہ کو ساتھ لے کر یہاں سے نکل جائیں گے۔“

اس نے زمان سے کوئی بحث نہیں کی اور سکون سے سگریٹ چٹا رہا۔ یہ علاقہ عام آبادی سے بہت بہت کر تھا اور دور دور بنے فارم ہاؤسز کے مالکان اور ملازمین کے سوا شاید ہی کوئی اس طرف آتا تھا۔ اس لیے انہیں کسی کی نظروں میں آ جانے کا بہت کم اندیشہ تھا۔ تاہم کوشش کی تھی کہ خود کو اور اپنی ساریوں کو ایسے مقامات پر پوشیدہ رکھا جائے کہ کسی کی اتفاقی آمد کی صورت میں بھی دیکھے جانے کا امکان نہ ہو۔

نوبت تک ان کے وہ ساتھی واپس لوٹ آئے جنہیں پانچ انتظامات کے لیے بھیجا گیا تھا۔ مطلوبہ سامان کے ساتھ ساتھ وہ مزید افرادی کمک بھی ساتھ لائے تھے۔ وہ ان سب کو ان کی ذمے داریاں سمجھانے کے ساتھ ساتھ پوزیشن سے بھی آگاہ کر رہے تھے۔

”بہر حال سوا دس بجے حرکت میں آئیں گے۔ ہمیں ہر حال میں اندر داخل ہونا ہے۔ جو بھی راہ میں آئے، اسے گولی مار دینا۔“ اس کے لہجے میں وہی سفاکیت تھی جو اس کی شخصیت کا سب سے نمایاں جز تھی۔ زمان اگر اسے ظہور کے ساتھ کیے گئے سیارہ جہت کے وقت کی یاد دہانی کروانا بھی چاہتا تھا تو ہمت نہ کر سکا۔ اس نے عرضے اس کے ساتھ رہ کر وہ اس کے اس سو کو پہچاننے لگا تھا اور جانتا تھا کہ ایسے میں وہ کسی کی نہیں مٹتا تھا۔

ٹھیک سوا دس بجے وہ اور اس کے ساتھی خاص ترتیب میں فارم ہاؤس کی طرف بڑھنے لگے اور اگلے چند منٹوں میں فضا گولیوں کی ترتر آہٹ سے گونجنے لگی۔ اس دھچک کا نشانہ اندر سے جبرجستہ طور پر جوالی فائرنگ کے انداز سے ظاہر ہوا کہ اس کے گارڈوں کی طرح پڑکھنے والوں نے اس کے سامنے کھڑے ہوئے۔ انداز سے کی درستی پر باڈل کے ہوشوں پر زبردستی سگریٹ پھیل گئی۔ اگر وہ گارڈز کی بے ہوشی کا شکار نہ ہوتے مقررہ وقت پر اندر داخل ہونے کی کوشش کرتے تو یقیناً

KOM

TAGPICK.COM

”انہیں باس! بس وہ تو میں۔“ زمان اس کے اندر پر گڑبڑ اٹھایا۔

”میں ایسی خوشحالانہ و قادری سے متاثر ہونے والوں میں سے نہیں ہوں۔ مجھے خوش رکھنا چاہیے ہو تو بس وہ کیا کرو جس کا حکم طے۔“ سخت لہجہ میں کہتے ہوئے وہ حرم میں آگیا۔ ان کا ہنسنا سننے لے کر اس کے ہر لمحہ ہونے والے غبار اٹھایا۔ ویسے اب اندر و اقبال کی طرف سے کوئی اور حرکت نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ اپنی عورت کے استعمال سے صورت حال کو ایک غور پر ان کے حق میں نروا رہا تھا۔

”سب ٹیکٹر ہے یاں! ہم نے اندر جاتے کا راستہ بھی
 کھول دیا ہے۔“ اس کے ہاتھی عمارت تک پہنچتے ہی ایک
 چھنچھن دوڑتا ہوا اس تک پہنچا اور اسے اطلاع دی۔ وہ سر کو
 ہلکی سی جھٹک دیتا ہوا گاڑی سے اتر اور اندر کی طرف بڑھا۔
 داخلی دروازے کے قریب ہی اسے ظہور زخمی حالت میں پڑا
 نظر آیا۔ اس کا ہتھکڑیاں اس کے قریب ہی گرا ہوا تھا لیکن وہ
 اس سے بے نیاز اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا۔

”پاسٹر ڈاکٹر“ پاؤں نے تشنہ سے اسے ایک ٹھوکر پریدگی
 اور اندر داخل ہو گیا۔ ظہور کے بارے میں اس کا خدشہ
 درست ثابت ہوا تھا۔ مگر وہ اس پر بھروسہ کر لیتا اور اندر
 والوں کی بے ہوشی کا اطمینان کر کے ایسے ہی اپنے ساتھیوں
 سمیت وہاں ٹھس جاتا تو یقیناً پھنس جاتا۔ اس کی چھٹی حس
 اور بہترین منصوبہ بندی نے انہیں نہ صرف بچا لیا تھا بلکہ وہ
 غالب بھی آچکے تھے۔ اسے امید تھی کہ جب تک اس
 ساز سے ہنگامے کی اطلاع پولیس تک پہنچے گی اور وہ من سب
 غری کا انتظام کر کے یہاں پہنچے گی، وہ اپنا کام تمنا کر نکل
 چکے ہوں گے۔

”مارے کمرے چیک کرو۔“ اس نے اپنے
 قریبی کھنکھم دیا اور خود بھی کمروں کے دروازے کھولا کر
 دیکھا۔ وہاں پر ہوشیار رہی کہ۔۔۔ والا دھواں
 اس کی نینک پر اٹھ رہا تھا۔ اس نے
 محسوس ہو رہی تھی۔ وہ دروازے کھولتا ہوا تیسرے کمرے
 تک پہنچا تو بستر پر دراز وجود نے اسے چمکا دیا۔ منہ پر
 اس کیجسٹن ماسک لگائے چیت لیٹا وہ شخص لالہ جیسی کاسایہ معلوم

عبدالحق صاحب

ہور ہا تھا۔ اس کی گری ہوئی صحت سے صاف ظاہر تھا کہ وہ شدید بیمار ہے۔ آئینہ ماسک لگا ہونے کے باعث وہ بے ہوش ہونے سے محفوظ رہا تھا اور پوری آنکھیں کھولے اور بازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ لیٹی بوز حاشیر تھا ہوا کی ٹپکس، بیمار بھی تھا اور عملانا کا رہ چکا تھا۔

اس کی سزا کی زد میں۔ یا پھر اچھا سمجھ کر لگ رہا ہو۔ اس کے لیے بہت سے دلائل چال پڑا کر آئے ہیں۔ سامعین پر اس نے ہوشیار کیا ہے کہ اس کی سزا کی زد میں نہ آئے۔ تمہارے علاج کا اہتمام ہو جائے۔ ”رہ کی بے بسی نے اس کی کمین فطرت کو مختلف دیا۔ لالہ کو کی جواب دیے بغیر اسے گھورتا رہا۔

”دو پروالوں نے انی چڑھی تھی نہ لالہ کوڑھونڈو۔ پتا نہیں وہ چھپ چھپ کر کس مٹے کی تیاری کر رہا ہے لیکن یہاں تو لالہ کا یہ حال ہے کہ ساتھ سے جانے کے لیے بھی میرے بندوں کو بوجھ دھونڈا پڑے گا۔“ وہ طنز کے تیر برساتا لالہ کی بے کسی سے ظف اندوز ہو رہا تھا۔

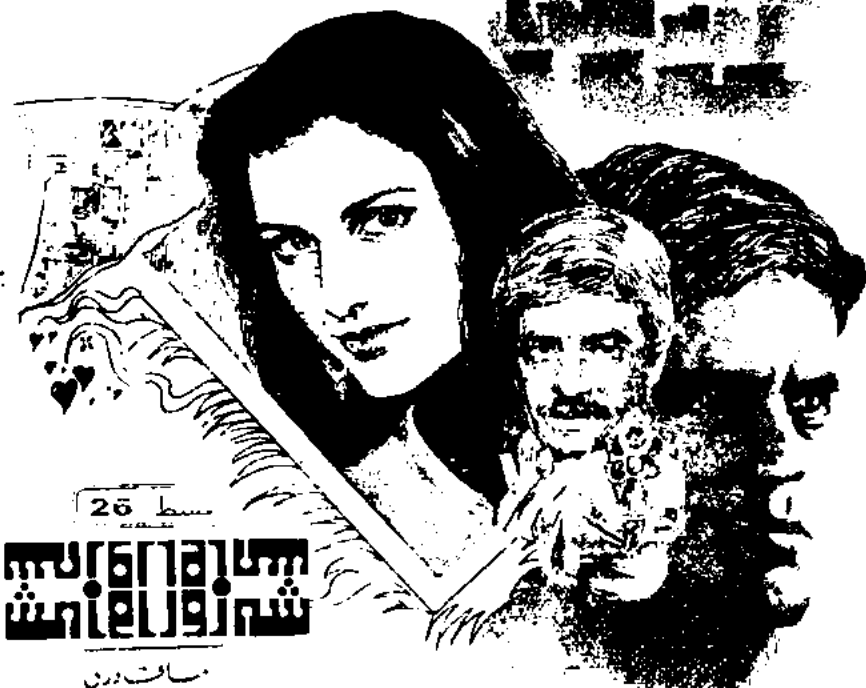
”تم لایا نہیں کر سکتے۔ میں کہتے بھی کمزور سی، اتنا بے بس نہیں ہوں کہ تم جیسا کل کا لونڈا مجھے میری مرضی کے خلاف متنبہ کرے جائے۔“ لافہ نے چادر سے دیاں اٹھوایا پر اکال کر اپنے منہ پر سے آنکھیں ماسک ہٹایا اور فحش لہجے میں بولا۔ لیکن اس کی آواز سے کمزوری بہر حال ٹھٹھکی تھی۔ مصعبہ نہیں اسے کس بنا دینے کے جکڑ لیا تھا کہ یوں ہنسنے لگ گیا تھا۔

”دو کہتے ہیں تاکہ رتی جل گئی پر مل نہیں گیا۔ بھلا کون روکے گا تجھے؟ تمہارے ملازم اور گارڈز کیا تو مارے گئے ہیں یا پھر فرار ہو گئے ہیں۔“

”تمہارے ارادے کو ناکام بنانے کے لیے میں اکیلا ہی کافی ہوں۔“ لالہ نے اس کے قفس کو غصہ میں لائے بغیر دعویٰ کیا اور یکدم نئی چادر کے نیچے سے اچٹا دایاں ہاتھ باہر نکالا۔ اس ہاتھ میں موجود گلاک 19 دیکھ کر باؤل خود کو بچانے کے لیے اضطرابی طور پر نیچے گر گیا۔ نیچے گرتے ہی اس نے فائر کی آواز سنی اور پھر وہ ٹھوٹی مٹھ کر رکھا۔ لالہ اپنا

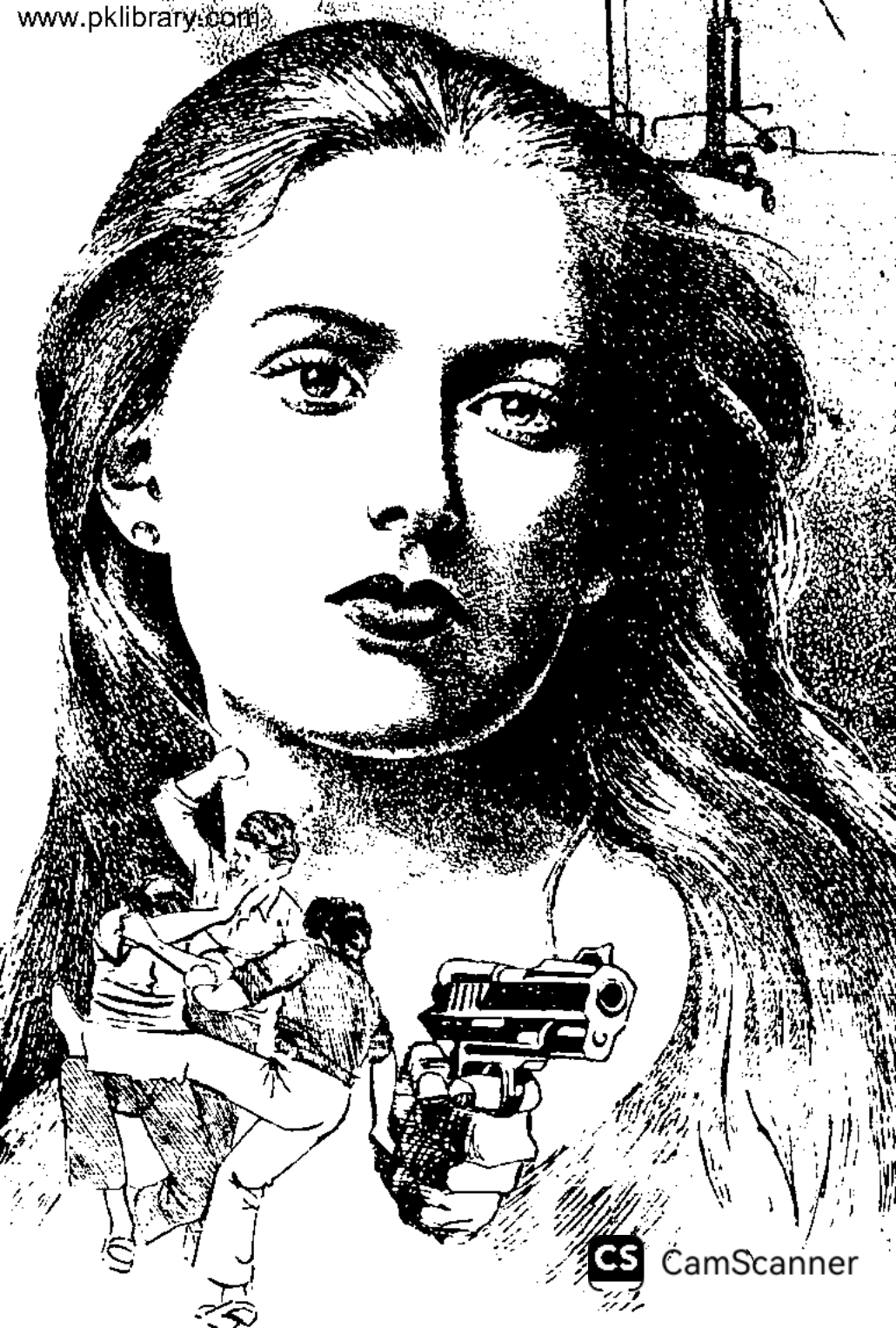
ایک لکھنؤی نے لکھنؤ میں ایک ایسے ہی ایجنٹ کو جو ان کی

7 مايو 2022



زندگی پیار کا نیت ہے مگر... صرف وہاں حیار معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن بننا نہ ہو اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں نا انصافی کی تندو تیز اندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنادیا تھا... اہک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابل شکست بنا دیا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پُر عزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند منانے جانے کے منصوبے بناتے جا رہے تھے... اس کی زندگی جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... یہ خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی یہ قرار یوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تار عنکبوت نے طاقت اور گھمٹ کے نشے میں چور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ پروار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ وارداتِ قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہو سکی...

ایک حریف سے بڑھ کر نازل ہونے والے ایک... اپنا انتقام لوجوان کی غیر انجیر داستان



گن شدہ اقساط کا خلاصہ

سزا ایک آجین ٹکون حراج لڑا کو یورپی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ کیلئے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جو ان کیا ہوا ہے۔ محاذ کے مدرسہ کاری آسٹریا اور اگلے مہد سے بر فاکر ہیں۔ ایک شام محاذ آسٹریا لیٹ سے وہاں آ رہا تھا وہ چار لوگوں کو بڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ ملری یو یورپی میں ہی پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی نظر فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کو بہ پڑتا ہے اور بشری نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بشری ماس کیوٹی کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم و فیئر لکھتی ہے۔ اس پر ان جگہ کی وہ ایک ذریعہ ہر ہائی منسوبی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی آئی تھی۔ محاذ بشری کو بہ حفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو فرائیوش کر دیتا ہے لیکن جن رئیس زادوں سے اس نے ان کا نکار چھینا تھا وہ اس واقعے کو فرائیوش نہیں کرتے اور سوچتے ہی تلاش میں رہتے ہیں۔ یہ موقع انھیں یو یورپی ٹرپ کی صورت میں مل جاتا ہے اور ایک دن جنگل کی سیر کے دوران وہ فوٹو گرافی کے شوق میں سب سے الگ تھلگ ہو جانے والے محاذ کو بے خبری میں گھیر کر بری طرح زد و کوب کرتے ہیں اور پلندی سے اسے دھکا دے دیتے ہیں۔ محاذ کے وہاں سنائے پر انھیں کھانسی کے افراد، پولیس اور ریسکیو ڈرائیج کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ اور محاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جگہ کی جمو پیڑی میں پاتا ہے۔ اپنی حالت سے اسے اپنے شہید زخمی ہونے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ جو کہ اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ محاذ کا موبائل جنگل میں ہی نہیں گر جاتا ہے اور مدد کی گئی یا سنا گیا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا جس سے باہر کی دنیا سے رابطہ کیا جاسکے۔ وہاں رہتے ہوئے جو کہ کی شخصیت اس کے لیے دھکی کا باعث بن جاتی ہے۔ جو کہ بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نوازا کر دیتا ہے جتنی ہے۔ محاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے پراسرار مٹھانے کی ہائی بھر لیتا ہے اور محاذ واقعی اس سے پہلے کیلئے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اور جانے ڈوبنے والے محاذ کے کمرے سے جب تصویریں لکھوائی جاتی ہیں تو بہت سے قدرتی مناظر کی تصویریں اس سے ایک ایسی تصویر بشری کی نظر میں آ جاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے چھجے سے ایک چہرہ جھانک رہا تھا اور نظر آتا ہے۔ وہ لڑکی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پروجیکٹ کے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشری تحقیق کر رہی تھی۔ بشری کے اپنے والد جرنلست ہوتے ہیں اور حق کوئی ان کے خون میں شامل تھی۔ اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشری کو کئی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ مہد سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باؤل نامی شخص کے ساتھ ہوتا ہے۔ بشری انتقام لینے کی کھان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دونوں میں ہی محاذ وہاں کا ارادہ کرتا ہے تاہم ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا مرغان الشاد پر دانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ محاذ کو وقاص نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ اور باؤل ایک جنگل میں لے جاتا ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہو جاتی ہے۔ محاذ کو بچانے والا لڑکا وہاں لانے کے لیے اوجھے جھنگل سے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اسے وہاں آنے کا پیغام دیا جاتا ہے۔ محاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کر کے اسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قید میں محاذ سے معلومات لی جاتی ہیں، نہ بتاتے پر اس کے بھائی کا ایک کردہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً محاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ اور بشری بھی انتقام کی آگ میں جلتی ہوئی سونا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہو جاتی ہے۔ محاذ کو بچانے والا لڑکا وقاص اپنے گرو کے ساتھ ایک پارٹی میں جاتا ہے۔ وہاں اسے محاذ کے حوالے سے مشکوک ایک شخص نظر آتا ہے۔ وہ اس کے پیچھے جاتا ہے مگر اسے گھیر لیا جاتا ہے۔ بہر حال وقاص کو سمجھنے کے ساتھ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اور محاذ کے دوست عالم شاہ کے بہنوئی کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ محاذ کی فحش میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے پتا نہ کر کے اس کے دامغ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ ٹیٹو سے حاصل انوکھے طرز کی بدولت ان کا معمول نہیں ہوتا۔ بشری، کامران کو چھاپنے کا پروگرام بناتی ہے۔ اور عالم شاہ سراخ نکالنے کے کہ اس کے بہنوئی کا قتل کس نے کیا۔ وہ قاتل کو گھیرتا ہے اور اپنے تئیں اسے گولیاں مار کر قتل کر دیتا ہے۔ تاہم وہ بیچ جاتا ہے۔ عالم شاہ اس کے بعد ڈاکوؤں کے سردار چاچو کو چھاپتا ہے اور اسے ٹیکر اور دیگر ہتھیار پہنچاتا ہے۔ اس کے پیچھے پولیس لگ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور اس کا نوکر سرد باؤل کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ اور محاذ جاسوس ہاتھ کو چپتا تا کر کے اس کے ذریعے اسے نکالنے والوں پر حملہ کر دیتا ہے تاہم ان کی فائرنگ سے ہاتھ مارا جاتا ہے اور الزام محاذ پر نہیں آتا مگر محاذ سے کام لینے والوں کو اس پر شک گزرتا ہے۔ عالم کی بہن گل شاہ کے نومو لوہے کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اغوا کا الزام لطیف سومر پر آتا ہے۔ عالم شاہ وہاں موجود ایک زخمی شخص کی مدد سے ہائی

میں پہچان لیتا ہے اور ان دونوں کے درمیان اعتماد کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ وہ سلطان کو مارنا چاہتی ہے تاہم وقاص اسے ایسا کرنے سے روکتا ہے۔ ادھر عالم شاہ باذل کی قید سے نکل کر اس کا پیچھا کرتا ہے تاہم وہاں اچانک فائرنگ اور دھماکے ہونے لگتے ہیں۔ وہ وہاں معاذ کو دیکھتا ہے۔ صداقت شاہ، لطیف سومرو کو گھیرنے کے لیے اس کی خفیہ بیوی اور بچے کا کھوج لگاتے ہیں اور بچے کو اغوا کر لیتے ہیں۔ لطیف سومرو مجبور ہو جاتا ہے۔ معاذ کو اس کے گھر والوں سے ملنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ عالم شاہ کو اس کے والد انڈیا روانگی کا عندیہ دیتے ہیں۔ ادھر معاذ بھی ایک مشن پر سونیا کے ساتھ انڈیا روانہ ہوتا ہے تاہم کچھ لوگ سکھ یا تریوں سے بھری بس کو پرغال بنالیتے ہیں۔ معاذ اور سونیا خانے کے تمام افراد کو لٹکانے لگا دیتے ہیں تاہم باہر موجود دیگر اغوا کاروں سے مقابلہ ہوتا ہے اور معاذ زخمی ہو جاتا ہے۔ صداقت شاہ کے انڈیا میں موجود رشتے دار کے ہاں شادی ہوتی ہے۔ عالم شاہ، بھل اور سرد انڈیا روانہ ہو جاتے ہیں۔ امر پورٹ سے گھر روانگی پر راستے میں کچھ لٹیرے انہیں لوٹ لیتے ہیں۔ عالم شاہ ایکشن میں آتا چاہتا ہے تاہم اجالا نامی عالم شاہ کی کزن اس کا راستہ روک لیتی ہے۔ گھر پہنچنے پر پولیس کی ریڈ ہوتی ہے اور وہ عالم شاہ اور سرد کو لے جاتے ہیں۔ ادھر بشری باذل کو اسپتال میں مارنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ بچ جاتا ہے۔ معاذ اور سونیا پناہ کی تلاش میں ہوتے ہیں اور بالآخر اپنے سہولت کاروں سے مل جاتے ہیں۔ عالم شاہ اور سرد کو تشدد کا نشانہ بنا کر ویرانے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ واپس اپنے میزبانوں کے ہاں پہنچ جاتے ہیں۔ شادی کے دوران انہیں پتا لگتا ہے کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں اجالا اور اس کا عاشق شامل ہوتے ہیں۔ وہ چھپ کر ان کی باتیں سن رہا ہوتا ہے کہ اسے چھاپ لیا جاتا ہے۔ تاہم وہاں مارا ماری ہوتی ہے اور اجالا کا عاشق مارا جاتا ہے۔ پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ ان کے کزن انہیں اپنے دوسرے خفیہ ہنگلے پر پہنچا دیتے ہیں جہاں کچھ لوگ ان پر حملہ کر دیتے ہیں۔ وہ وہاں سے بھگات لے جاتے ہیں۔ ادھر معاذ کو سونیا اپنے ساتھ نئے مشن پر لے کر جاتی ہے جس میں ایک ریلوے لائن کو دھماکے سے اڑانا ہوتا ہے۔ معاذ ایسا نہیں چاہتا اس لیے وہ ٹرین کی آمد سے قبل بارودی دھماکا کر دیتا ہے۔ وہ زخمی ہو جاتا ہے اور اسے ہندو سادھو اپنی کنیاس لے جاتا ہے جہاں اس کی اچھی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ سونیا کے آدمی معاذ کو تلاش کرتے ہیں مگر نام کام ہو جاتے ہیں۔ ادھر عالم شاہ اور سرد خفیہ ذریعے سے بارڈر پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ دھریے جاتے ہیں اور "را" کی قید میں پہنچ جاتے ہیں۔ انہیں تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ادھر بشری باذل کو مارنے کی کوشش میں خود نشانہ بن جاتی ہے۔ معاذ سادھو کی مدد سے ایک انڈین ہیر وٹن کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ وہیں اسے عالم اور سرد کی گرفتاری کا پتا چلتا ہے۔ ادھر بھل کو اس کا شوہر ذہنی اذیت دیتا ہے۔ معاذ ڈاکٹر فردوس سے ملتا ہے اور اسے بھل کی مدد کرنے کا کہتا ہے۔ عالم اور سرد قید سے فرار کا سوچتے ہیں اور دھریے لیے جاتے ہیں جس کی پاداش میں انہیں مزید تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ معاذ، دشا کے ذریعے عالم اور سرد کو رہائی دلوانا چاہتا ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ اس کا پیچھا کرتا ہے تاہم دشا کی گاڑی حادثے کا شکار ہو جاتی ہے۔ علیینہ اور وقاص وغیرہ کو لالہ عیسیٰ ملک سے باہر نکال دیتا ہے اور ہر ممکن احتیاط کی ہدایت کرتا ہے لیکن علیینہ پاکستان میں ٹوبہ سے رابطہ کرتی ہے جو ان کے لیے مصیبت بن جاتا ہے۔ ٹوبہ پر تیزاب پھینک دیا جاتا ہے۔ ادھر معاذ، بھل کے لیے پریشان ہوتا ہے اور اسے وہاں سے نکالنا چاہتا ہے۔ معاذ، وکرم نامی شخص کے خلاف کارروائی کرتا ہے مگر خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ ادھر وقاص، علیینہ اور اس کے گھر والوں کو مار دیا جاتا ہے۔ معاذ سبھاش نامی شخص کے خلاف کارروائی کرتا ہے تاہم وہ مارا جاتا ہے اور معاذ بھی زخمی ہو جاتا ہے اور اپنا نشان وہاں چھوڑ دیتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس معاذ کو دیوانامی شخص سے مدد لینے کا کہتی ہے۔ معاذ اس کے ساتھ مل کر موہن نامی "را" کے ایجنٹ کو اغوا کر لیتا ہے۔ معاذ اپنے کزن کو پاکستان کال کرتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ اس کے گھر والوں کو مار دیا گیا ہے۔ وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کی ٹھان لیتا ہے۔ ادھر ڈاکٹر فردوس کو اس کے سرسرا والے بھل کو بھگانے کی پاداش میں تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ معاذ، عالم اور سرد کی رہائی کے لیے کارروائی کرتا ہے اور انہیں "را" کی قید سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن عالم اور سرد کو دیوانامی کے آدمی کسی دوسری جگہ پہنچا دیتے ہیں۔ سونیا معاذ کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتی ہے اور اسے اپنے تعاون اور مدد کی تعین دہانی کر داتی ہے۔ ادھر باذل ایک جگہ لالہ عیسیٰ کی موجودگی پر کارروائی کرتا ہے تاہم لالہ خود کو گولی مار کر ختم کر لیتا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ لالہ کو زندہ پکڑے اب اپنے ساتھ ایک لاش لے جا کر کیا کرتا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

”مہمیں سکون نہیں ہے ملی! نہ خود چین سے رہتی ہو نہ مجھے رہنے دیتی ہو۔“ مسلسل بچتے موبائل نے اسے علیینہ کی ویڈیو کال لے لینے پر مجبور کر دیا تھا۔
”میں نے سوچا کہ آپ گھر میں اکیلے، اداس اور پورے میں اپنے ہورے ہوں گے تو تھوڑی دیر آپ کو یہاں کی رونقوں میں شامل کر لیا جائے۔“ وہ اس کے لہجے کی جھنجھلاہٹ کو خاطر میں لائے بغیر شوخی سے بولی۔
”میں کیوں ہونے لگا اداس اور پورے میں اپنے

ایجازام کی تیاری میں مصروف ہوں۔“ اس نے اپنے قلم کو انگلیوں کے درمیان بڑے اسٹائل سے گھماتے ہوئے

جواب دیا۔ ”آپ اور ایجازام کی تیاری..... کسے بے وقوف بنارہے ہیں۔“ وہ کھٹکھٹا کر ہنسی بہت پیاری لگ رہی تھی۔ معاذ بھی اس کے ساتھ ہی ہنس پڑا۔ وہ سچ سچ کسی امتحان کی تیاری نہیں کر رہا تھا۔ وہ اس وقت ہالی وڈ کی ایک ایکٹریس کا اسٹیج بنانے کی کوشش کر رہا تھا اور یہ کوشش خاصی حد تک کامیاب بھی تھی۔

”دیکھیں ٹوبیہ آپ کی کتنی پیاری لگ رہی ہیں۔ پورے خاندان میں ایک لڑکی بھی نہیں جو ان سے زیادہ پیاری لگ سکے۔“ علیہ نے ایک دم موبائل کے کمرے کا رخ بدل دیا۔ اب وہ اسکرین پر مہندی کے تھال میں لگی موسم بٹیوں کو روشن کرتی ٹوبیہ کو دیکھ سکتا تھا۔ کاہی سبز رنگ کے پٹکے کام والے لباس میں اپنی دراز زلفوں کو کھولے وہ واقعی اتنی خوب صورت لگ رہی تھی کہ وہ یقین سے کہہ سکتا تھا کہ علیہ اپنے دعوے میں بالکل درست ہے۔ ٹوبیہ یوں بھی خاندان کی خوب صورت ترین لڑکی تھی اور اس وقت موقع کی مناسبت سے تیار اتنی حسین لگ رہی تھی کہ اس کے آگے کسی کا چراغ جلنا ممکن نہیں تھا۔

”دیکھتے دیکھتے رو گئے نا؟ بس اسی لیے میں کہتی ہوں کہ سب باتوں کو ایک طرف رکھیں اور پچھو سے بات کر کے ٹوبیہ آپ کی بگ بگ کر دالیں ورنہ ایسا نہ ہو کہ کوئی اور بازی مار جائے اور ہم دیکھتے ہی رہ جائیں۔“ اس نے ٹوبیہ پر معاذ کی نظروں کا ٹھہرنا محسوس کر لیا تھا اس لیے مزید شوخ ہوئی جا رہی تھی۔

”زیادہ داوی اماں مت بنو اور ذرا امی سے میری بات کروادو۔“

”ٹوبی آپ کی لیے رشتہ دینے کی بات کریں گے؟“ وہ اس کے جھڑکنے کا برا منائے بغیر اسے چھیڑنے لگی لیکن اسکرین پر متحرک منظر سے ظاہر تھا کہ وہ اپنی جگہ سے حرکت میں آچکی ہے۔

”انہیں سمجھاؤں گا کہ جب تک اس بچے مارنے والی بلی کو گھر سے نہ نکال دیں تب تک بہولانے کا سوچے گا بھی نہیں۔“

”اسکی بات ہے تو جاییے، نہیں کرواتی آپ کی امی سے بات۔“ وہ روٹھ گئی اور روٹھے ہوئے انداز میں ہی اگلے قدموں ہی پیچھے ہٹنے لگی۔ معاذ یہ دیکھ کر ہراساں ہو گیا

کہ اس کے پیچھے سوئمنگ پول ہے۔

”رک جاؤ علیہ، رگ جاؤ۔ پانی میں گر جاؤ گی۔“ وہ چیختا ہوا بے ساختہ ہی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور ہاتھ کو یوں پھیلا یا جیسے اسے پکڑ لینا چاہتا ہو لیکن وہ اس کے پاس تھا ہی کہاں جو اسے گرنے سے بچا پاتا۔

”علیہ..... میری گڑیا!“ وہ کرناک انداز میں اتنی زور سے چلایا کہ خود اپنے ہی چلانے سے آنکھ کھل گئی۔ آنکھ کھلنے پر اسے تنگ و تاریک ماحول کو پہچاننے کے لیے چہرے لٹک گئے۔ وہ کرائے کی اس کھولی میں تھا جہاں گل خان کی کھولی کو چھوڑ کر دو دن پہلے منتقل ہوا تھا اور اسے ادراک ہو گیا تھا کہ وہ خواب دیکھ رہا تھا۔ ایسا خواب جو اصل میں حقیقت ہی تھا۔ خاندان کی ایک شادی کے موقع پر سچا سچ علیہ کے ساتھ وہ حادثہ پیش آیا تھا لیکن خوش قسمتی سے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ ہاں، بس وہ ڈر گئی تھی اور معاذ سے ملاقات ہونے پر بھی اس واقعے کو یاد کر کے اس کے گلے لگ کر رو پڑی تھی۔ اس وقت بھی علیہ کے آنسوؤں نے اسے بے حد تکلیف دی تھی اور وہ بہت دیر تک بچھتا تارہا تھا کہ وہ اس تقریب میں شرکت کرنے گھر والوں کے ساتھ کیوں نہیں گیا تھا۔ اگر وہ وہاں ہوتا تو کبھی اپنی بہن کو گرنے نہیں دیتا۔

”میں اب بھی تمہیں نہیں بچا سکا میری گڑیا!“ اس نے کرب سے بڑبڑاتے ہوئے اپنا سر دونوں گھٹنوں میں دے دیا۔

”اس بھیانک اور بے کراں سمندر میں ڈوبے ہوئے تم نے مجھے ریکار تو ہوگا۔ تمہارے ہاتھ میرے ہاتھ کو تھامنے کے لیے پھیلے تو ہوں گے لیکن نہیں، شاید تم تو..... تم تو اس ظالم سمندر کا حصہ بننے سے پہلے ہی کئی حصوں میں تقسیم ہو چکی ہو گی۔“ دو دن کی تنہائی نے اسے ذہنی طور پر ایک بار پھر وہیں لا کھڑا کیا تھا جب پہلی بار فرار نے اسے علیہ اور باقی گھر والوں کی ہلاکت کی اطلاع دی تھی۔ اس اطلاع کے ساتھ ہی ٹوبیہ کو تیزاب گردی کا نشانہ بنائے جانے کی خبر بھی تھی۔

”وہ جس کے حسن کے سامنے سب کے چراغ گل ہو جاتے تھے، آئینے میں اپنا رخ شدہ چہرہ دیکھتی ہوئی تو کس اذیت سے گزرتی ہو گی۔“ اس کو تر پانے کے لیے کوئی ایک اذیت یا تکلیف نہیں تھی۔ امی کی موت، مسجد کا انخلاء، اس کی ایک گردے سے محرومی، گھر کا شیرازہ بکھر جانا اور اب ب کچھ کھودینا..... کوئی ایک واقعہ تو نہیں تھا جسے وہ بھول جاتا

رہتی اے۔“

”کیا سمجھاتی رہتی ہے؟“ اس نے بھی گل خان کا ساتھ دیتے ہوئے کالے خان کے لیے مذکر کے بجائے مونث کا صیغہ استعمال کیا۔

”بولتی اے، اتنا تیل مت ڈالو۔ رادھا دیوی ڈانٹتے کرتی اے۔ گوشت کے بجائے سبزی کے کوفتے بناؤ، سوٹ ڈش میں میٹھا لگا رکھو، پلاؤ بریانی سے زیادہ مختلف قسم کی سلا دیں بنانا سیکھو، مرغی کم ڈالو اور پتا نہیں کیا کیا۔ ام سچ بولوں، ام کو تو ایسا لگتی ہے کہ ام کوئی نئی بیاتہ عورت اے جس کو سارا ٹیم سسرال والوں کی پسند ناپسند پر لپکھ رہتی اے۔“ اس نے اپنا دکھڑا رونا شروع کر دیا۔

”تمہارے ساتھ تو بڑا ظلم ہو رہا ہے خان! بولو تو پولیس کو بھجواؤں تمہاری مدد کے لیے۔“ پہلی دفعہ میں گل خان اس کی آواز شناخت نہیں کر سکا تھا اور پھر وہ اس کی گفتگو کا لطف لینے کے لیے خود ہی جان بوجھ کر قدرے بدلے ہوئے لہجے میں بات کر رہا تھا۔ اس لیے ابھی تک وہ یہ اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ اس کا مخاطب کون ہے لیکن اپنی فطری سادگی کے باعث اس کی گفتگو میں ضرور الجھ گیا تھا۔ خان کی اس سادگی نے سونیا کی کھولی پر آمد والے دن خوب تماشا لگایا تھا۔

اس روز سونیا کے جانے کے بعد وہ کھولی سے باہر نکلا تھا تو یہ دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا کہ خان کا گریبان پھنا ہوا ہے اور چہرے پر خون ہے۔ البتہ جو لوگ اس کو دونوں بازوؤں سے تھام کر لیے چلے آ رہے تھے، ان کا انداز دوستانہ تھا۔

”ام بولتی اے ام کو چھوڑ دو۔ ام اس خانہ خراب کو چھوڑے گی نئی۔ ام اس کو بتا کر رہے گی کہ پٹھان کا بچہ کی بازوؤں میں کتنا دم ہوتی اے۔“ پکڑنے والوں کی نسبت خان کا انداز خاصا جارحانہ تھا اور وہ بار بار ان کی گرفت سے نکلنے کے لیے زور لگا رہا تھا۔

”کیا بات ہے؟ کیا مسئلہ ہے؟“ صورت حال کو نہ سمجھتے ہوئے معاذ آگے بڑھا تھا اور سب سے مشترکہ سوال کیا تھا۔

”وہ ادھر محلے کا ایک لنگا ہے۔ اس سے بھڑ گئے تھے خان صاحب۔ انہوں نے اس کا سر پھوڑا اور اس نے ان کا منہ توڑا۔ بات زیادہ نہ بڑھے اس لیے ہم لوگوں نے بچ بچاؤ کروا دیا لیکن خان جی سخت ناراض ہیں اور چاہتے

اور سونیا اس سے کہتی تھی کہ سب بھول کر دنیا کے کسی گوشے میں چھپ کر اپنے لیے نئی زندگی کا آغاز کر دے۔

وہ جب سے اس کھولی میں آیا تھا، بار بار سونیا سے ہونے والی ملاقات، مشورے اور اپنی تکلیف کا خیال آتا رہتا تھا۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اسے آگے کیا کرنا ہے۔ سونیا پر اعتبار کرنے یا نہ کرنے کے متعلق بھی کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر سکا تھا۔

”کچھ بھی ہو جائے، میں اپنے پیاروں کو تکلیف دینے والوں کو ان کے انجام تک پہنچائے بغیر نہیں چھوڑوں گا۔“ بہت دیر تک ایک ہی حالت میں بیٹھے رہنے کے بعد وہ زیر لب بڑبڑایا اور گھٹنوں سے سر اٹھاتے ہوئے بستر کو چھوڑ دیا۔ کچھ ہی منٹوں بعد وہ کھولی سے باہر جا رہا تھا۔ اس کا رخ اس قریبی ڈھابے کی طرف تھا جہاں چائے سمیت دن کے تینوں اوقات کا کھانا آرام سے مل جاتا تھا۔

”چائے۔“ ڈھابے پر پہنچ کر اس نے لپک لپک کر آؤر لیتے چھوٹے سے کھا اور ڈھیلے ڈھالے انداز میں راز ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ طبیعت اتنی مکدر ہو رہی تھی کہ ناشتے کا راز دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ چائے بھی وہ اپنے دیکھے سردر سے رنجات حاصل کرنے کے لیے پیتا چاہتا تھا۔ پتا نہیں میڈیکل سائنس چائے سے سردرد کا ٹھیک ہو جانا تسلیم کرتی ہے یا نہیں لیکن پاکستانیوں کی اکثریت کی طرح وہ بھی سردرد کے علاج کے لیے چائے کو اسیر سمجھتا تھا۔

”ذرا چل کر گل خان کا حال احوال لیتے ہیں۔“ چائے پی چکنے کے بعد طبیعت ذرا بحال ہوئی تو اس نے فیصلہ کر لیا اور اس گریبانے کی دکان پر جا پہنچا جس کا مالک دکان پر موجود لینڈ لائن فون پر رقم کے عوض کال کروا دیتا تھا۔ آج اس نے احتیاطاً موبائل فون کا استعمال ترک کر دیا تھا۔ اس لیے اس طرح کی سہولت اس کے لیے ایک نعمت تھی۔

”کیا حال ہے گل خان؟“ کئی گھنٹیاں بچنے کے بعد اسے گل خان کی ”ہیلو“ سننا نصیب ہوئی تو اس نے پوچھا۔ ”حال وال کا چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ کون بولتی اے؟“

”اگر کچھ گڑبڑ ہو گیا تو وہ کالا یوٹاری جان کھالے گا۔ بہت نخرہ نخرہ ہے سالے کا۔“ اس کو سمجھاتا تھا کہ خان ہوا در گڑبڑ نہ کرے، ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ گل خان کا مخصوص سادہ لب و لہجہ سن کر اس کے ہونٹوں پر بے ساختہ ہی مسکراہٹ دوڑ گئی اور اعصاب پر طاری تناؤ خود بخود یک دم ہونے لگا۔

”وہ کچھ نہیں سمجھتی اے، الٹا سارا دن ام کو سمجھاتی

ہیں کہ انہیں فل فاسٹ کے لیے آزاد کر دیا جائے۔" ایک شخص نے صورتِ حال اس کے گوشِ گزار کی۔
 "لمبڈ یا تھی ہی ایسی کہ اس کے لیے سر پھٹول کرنا پڑتا ہے۔" مجھے میں سے کسی نے مسخرانہ لہجے میں ہانک لگائی تھی اور معاذ کو کچھ کچھ صورتِ حال کا ادراک ہونے لگا تھا لیکن خان اس جملے کو سن کر کچھ اور بھی طیش میں آ گیا تھا۔
 "ام چھوڑے گا نئی تم کو خانہ خراب اتہارے اپنے گھر میں ماں بہن نہیں اے؟" وہ لوگوں کی گرفت سے نکلنے کے لیے پھلنے لگا تھا۔

"بند کرو یہ تماشا خان اور چلو میرے ساتھ۔" معاذ نے اس کی کلائی کو مضبوطی سے پکڑ کر اسے سخت لہجے میں یہ حکم دیا تو وہ کچھ چونک کر ساکت ہو گیا تھا۔
 "آؤ میرے ساتھ۔" وہ اسی سخت لہجے میں حکم صادر کر کے اسے اپنے ساتھ کھینٹتے ہوئے کھولی کی طرف لے گیا تھا۔ اس کے انداز میں کوئی ایسی بات تھی کہ جہوم میں سے کسی کی ان کے پیچھے آنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔
 "یہ سب کیا تھا؟" کھولی میں پہنچ کر اس نے سخت لہجے میں گل خان سے دریافت کیا تھا۔

"وہ خانہ خراب پوری لوگ بی بی کو چھیڑتی تھی۔ ام سے برداشت نہیں ہوا تو ام ان کو مزہ چکھا دیا۔" ہونٹ سے بہتے خون کو صاف کرتے ہوئے اس نے فخریہ اپنا کارنامہ بیان کیا تھا۔

"وہ بی بی تمہاری کون لگتی تھی جس کی خاطر یہ سب کرنے کی ضرورت پیش آئی؟" اس نے ایک ایک لفظ کو چباتے ہوئے خان سے دریافت کیا تھا۔

"امار کوئی نہیں لگتی تھی پر آپ کی تو مہمان تھی نا؟ نہ بھی ہوتی تو ماں بہن تو سب کا سانچا ہوتا اے۔" وہ اپنے عمل سے پوری طرح مطمئن تھا لیکن اس کے روپے سے قدرے خائف ہو گیا تھا۔

"اس ماں بہن نے کیا تم سے مدد کی درخواست کی تھی؟" اس نے دانت پکچپاتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں تو مگر....." خان کے پاس یکدم ہی اپنی صفائی دینے کے لیے الفاظ ختم ہو گئے تھے اور پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ وہ کوئی غلط حرکت کر چکا ہے۔ اسے یاد آ گیا تھا کہ وہ تو کسی بھی آواز پر کان دھرے بغیر گاڑی میں بیٹھ کر اطمینان سے روانہ ہو گئی تھی۔

"اجس انسان..... وہ کوئی عام عورت نہیں تھی جسے تم اپنی ماں بہن کے عہدے پر فائز کر کے اس کی مدد کرنے

چلے تھے۔ وہ اتنی خطرناک عورت تھی کہ اگر اس کے چھیڑنے کی کوئی پردا ہوتی تو دو منٹ میں اسے تلوے چائے پر مجبور کر سکتی تھی۔" اس نے سونپا کی خان کے گوشِ گزار کی تو اس کا منہ کھل گیا۔

"خیر جو ہوا سو ہوا۔ تم یہ بتاؤ کہ تم نے اس پر اس پاس کوئی دوسری گاڑی یا کوئی ایسا شخص دیکھ تمہیں مشکوک لگا ہو؟" معاذ نے اسے مزید شرمندہ کے بجائے اصل موضوع چھیڑ دیا تھا۔

"نہیں۔ وہ ایک دم اکیلی آئی تھی۔ ام نے اس پاس تو کیا، دور دور تک بھی کوئی مشکوک بندہ نہیں دیکھا۔" ٹھیک ہے۔ میری بات غور سے سنو۔ ہم اسی وقت یہ کھولی چھوڑ رہے ہیں۔ میں تمہیں ایک دوں گا۔ وہاں تم کا لے خان نامی شخص کو اپنا نام بتاؤ۔ حوالہ دینا۔ وہ تمہیں نوکری پر رکھ لے گا۔ میں کوئی کہ تم سے رابطے میں رہوں لیکن میں تمہیں اپنا بتاؤ نہیں دوں گا۔"

"کیوں، کیا آپ کو ہم پر بھروسہ نئی اے؟" کر برامان گیا تھا۔

"بھروسہ ہے یا لیکن ابھی میرے پاس کوئی نہیں ہے۔ یہاں سے نکل کر کوئی ٹھکانا ڈھونڈو گا سے رابطہ کروں گا۔" اس نے خان کو بہلا لیا تھا۔

"یہ بستر اور برتن وغیرہ یہیں چھوڑ دو۔ بس کپڑے اور ذاتی اشیاء ساتھ رکھ لو۔ میں تمہیں جہاں ہوں وہاں تمہیں ضرورت کا سب سامان مل جائے گا۔ دل لگا کر دیانت داری سے کام کرتے رہنا۔"

"ام کام کو عبادت سمجھ کر کرتا اے۔ اس لیے ایمانی کا سوال ای نئی اے۔" خان نے اس کی دہانہ سینہ ٹھونک کر جواب دیا تھا اور معاذ جانتا تھا کہ وہ دعوے میں سچا ہے۔

اس روز خان کو کوٹھی کی طرف روانہ کرتے ہوئے نے راستے میں سے اسے مس ایک چھوٹا موبائل بینہ

دلوادیا تھا اور اب اسی موبائل پر اس سے گفتگو کر رہا تھا۔ "کال لمبی ہو گئی ہے جناب! ٹائم کا دھیان رکھ

میں ہر منٹ کے حساب سے خارج کروں گا۔ یہ نہ ہو کہ میں زیادہ پیسے لینے کا الزام لگا کر رونا ڈال دو۔" گا کوٹھی نمٹاتے کر یا نہ اشور والے نے درمیان میں اسے ٹوکا

یاد دہانی کر دانا ضروری سمجھا تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے تسلی دے کر اپنی توجہ گل خان کی طرف مبذول

کی۔ وہاں گل خان اپنی گل انشائیوں میں مصروف تھا۔
 ”پولیس غریب کا ساتھ کب دیتی اے۔ ام اس سے
 بددعا ہے گا تو وہ امارتی تھوڑی سنے گی۔ وہ اس کا لے دیو کا
 سننے کی جو چری جیسی رادھا دیوی کے گھر پر قبضہ کر کے بیٹھی

اے۔“ ”بریں بات ہے گل خان کسی کی شکل و صورت کا
 مذاق نہیں اڑاتے۔ اللہ کو ناگوار گزرتا ہے۔“ اس بار اس

نے سنجیدگی اختیار کی۔
 ”بات تو آپ کی ٹھیک ہے یار..... بس امارادل جلا
 ہوا تھا اس لیے ام ایسا بول دیا۔“ وہی اس کی طبیعت کی
 سادگی تھی کہ فوراً ہی اپنی غلطی تسلیم کر لی، ساتھ ہی دماغ نے

بھی شاید کام شروع کر دیا، اس لیے چونکتے ہوئے بولا۔
 ”تم اتنی دیر سے ام کو باتوں میں لگا کر رکھا اے پر

ابھی تک اپنا نام نہیں بتایا کہ تم کون بولتی اے؟“
 ”تم نے اپنا موبائل نمبر کس کس کو دے رکھا ہے؟“
 ”ام نے تو کسی کو بھی نہیں دیا اے۔ ام کو نمبر معلوم ای

نہیں اے۔ وہ تو معاذ صیب کو ہی.....“ ”روانی سے بولتے
 بولتے اے یکدم بریک لگے۔“

”آپ معاذ صیب بات کرتی اے؟“ آواز میں
 ایک جوش سا تھا۔

”شکر ہے پہچان گئے ورنہ مجھے لگ رہا تھا مرج
 مسالوں کا حساب رکھتے رکھتے مجھے ہی بھول گئے ہو۔“ معاذ

ہنس پڑا۔
 ”اس کا تو سوال ای پیدا نہی ہوتی اے۔ آپ کے
 فون کے انتظار میں ہی تو ام موبائل اپنے ساتھ ساتھ رکھتی

اے۔“
 ”مجھے معلوم تھا کہ تم انتظار کر رہے ہو گے اسی لیے
 نہیں کال کی ہے۔“ معاذ کو اس کے خلوص پر پورا بھروسا

تھا۔
 ”ام آپ کے لیے بہت پریشان تھی۔ آپ خیریت
 سے تو ہوتا؟“ اس کے لہجے میں حقیقی فکر مندی تھی۔

”میں بالکل ٹھیک ٹھاک اور مزے میں ہوں۔ بس
 ابھی تک ناشتا نہیں کیا ہے۔ سوچا تم سے پوچھ لوں کہ کیا

پکارتے ہو؟“
 ”ام دوپہر کے کھانے کی تیاری میں اے۔ آپ
 آجاؤ اور۔ آپ جو حکم کرے گی، ام آپ کے لیے بنادے

گی۔ ابھی تو ویسے دیوالی ہنڈیا بناتی اے۔ عجیب دیوٹی اے
 ام کو جو کوشش کے بجائے سبزی کھاتی رہتی اے۔“ خان

16

وہاں کے میو سے سخت ناراض تھا۔ معاذ جانتا تھا کہ رادھا
 سبزی خور تھی اور اپنی فٹنس کو برقرار رکھنے کے لیے مخصوص
 ڈائٹ پلان پر عمل کرتی تھی۔ اگرچہ وہ کوشی میں بہت کم آتی
 تھی لیکن کالے خان کی کوشش ہوتی تھی کہ روزانہ کاسینیو اس
 کی پسند کے مطابق ہی ترتیب دیا جائے۔ رانجھا رانجھا
 کرتے میں آپ رانجھا ہو گئی، والی بات اس پر صادق آتی
 تھی۔ اس نے اپنی پسند ناپسند تک رادھا کی پسند کے تابع
 کر رکھی تھی اسی لیے وہی کچھ کھاتا پیتا اور کچھ انا تھا جو رادھا کو
 پسند تھا۔ ہاں اس کی موجودگی کے دنوں میں مہمان داری کی
 اخلاقیات کا خیال کرتے ہوئے اس کے لیے خصوصی اہتمام
 کروانا تھا اور کبھی کبھی اس کے اصرار پر بد پرہیزی کرتے
 ہوئے خود بھی وہ ڈش کچھ لیتا تھا۔

”ایسا کرو، کالے خان سے بولو کہ آج معاذ صاحب
 نے مشن کڑا ہی بنانے کا حکم دیا ہے۔ مزید اسی مشن کڑا ہی
 بناؤ اور عیش کرو۔“ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ خان گوشت کی
 کوئی ڈش نہ پکنے کی وجہ سے بد مزہ ہو رہا ہے۔ ویسے تو وہ ایسا
 بندہ تھا کہ صرف پیاز سے روٹی کھا کر بھی اللہ کا شکر ادا کر سکتا
 تھا لیکن ایک دسائل سے مالا مال گھر میں اسے یہ تنگی ٹھک
 رہی تھی۔

”آپ کھانے پر یہاں آرہی ہے صیب؟“ گل
 خان نے خوش ہو کر اس سے تعہد قی چاہی۔

”اتنے سوال کیوں کرتے ہو یار؟ جو کچھ کہا ہے وہ
 کرو اور موج اڑاؤ۔“ اس نے گل خان کے سوال کو ٹالا۔

”ام ساتھ میں بیٹن کا حلوا بھی بنالے گی۔“ وہ اپنی
 خوشی میں مست تھا۔

”جو جی چاہے کرو مگر مجھے اب اجازت دو۔ کال
 بہت لمبی ہو گئی ہے۔“ اس نے جواب دیا اور رکی اختتامی

جملے بول کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ شکر تھا کہ گفتگو میں مگن ہو کر
 خان کو اس سے ایڈریس مانگنے کا خیال نہیں آیا تھا اور وہ کوئی
 جھوٹا بہانہ بنانے سے بچ گیا تھا۔

کریاناہ اسٹور کے مالک کو اس کال کے منہ مانگے دام
 ادا کر کے وہ یونہی بہت دور تک پیدل چلا چلا گیا۔ دماغ

میں بے شمار سوچیں تھیں لیکن فی الحال کرنے کو کوئی کام نہیں
 تھا۔ سونیا نے اسے الجھن میں ڈال دیا تھا۔ پچھلے حالات کو

دیکھتے ہوئے وہ اس پر اعتبار نہیں کر سکتا تھا لیکن غیر ارادی
 طور پر اعتبار کرنا بھی چاہتا تھا۔ اسی لیے اس کی طرف سے

اشتہار چھپوائے جانے تک کوئی بھی قدم اٹھانے سے
 گریزاں تھا۔ ہاں، یہ ضرور سوچ رہا تھا کہ دیوا سے رابطہ

”میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیے بھائی“

”کوئی خدمت نہیں ہے یا اربس اب راستہ دے دھا بے پر جائیں گے اور چائے پی کر اپنی کھانسی دھو گے۔“ اس نے پیٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے خوش دلانہ جواب دیا تو ٹھیلے والا ہنس دیا۔ یہ ہنسی بھی عجیب سے سڑک کنارے ٹھیلے لگائے کھڑے ایک عام کی آدمی استعداد رکھنے والے شخص کو نصیب ہو جاتی ہے اور ایک ذہن فطین، صلاحیتوں سے مالا مال شخص اس کے لیے ترستار ہے۔

خدا کی بنائی دنیا کے ان عجیب و غریب رنگوں کا کرتا ہوا وہ چائے کے ڈھا بے پر پہنچ گیا اور پہنچ کر اپنے لیے ایک چائے کا آرڈر دیا۔ ڈھا بے والے گاہکوں کی تفریح طبع کے لیے وہاں ایک ٹی وی بھی لگا تھا۔ ٹی وی پر اس وقت ایک اوٹ پانگ مزاحیہ ڈراما رہا تھا جسے..... اپنے حلیے سے کسی گیراج کے چوڑے والے دو نو عمر لڑکوں کے علاوہ کوئی بھی دلچسپی سے نہیں دیکھ رہا تھا۔ لڑکے البتہ خوب تہقے لگا رہے تھے۔ اچانک ہی روک دیا گیا اور بریکنگ نیوز کی اطلاع دی جانے لگی۔

”سالہ سارا مزہ خراب کر کے رکھ دیا۔ اب خبر دو کہ فلاں حلوائی کی دکان پر تیس کا سلسٹر پھٹ گیا یا بولی وڈ اسٹار کی ڈیوورس ہو گئی۔“ ڈراما روکے جانے لڑکوں کا موڈ سخت خراب ہوا اور اس کا اظہار انہوں نے تیسرے سے کیا۔ معاذ سن کر مسکرا دیا۔ کچھ چیزیں پاکر اور ہندوستان میں بڑی مشترک تھیں۔ وہاں بھی ڈراما خبروں کو بریکنگ نیوز بنا کر عوام کے ضبط کا اہتمام کیا جاتا اور یہاں بھی چھوٹی چھوٹی باتوں سے سنسنی پھیلانے کی کوشش کی جاتی تھی۔

”دہلی کے نواحی علاقے میں ایک افسانہ ساز پیش آئی ہے۔ یہ درگھٹنا ایک مسلمان پر یوار کے ساتھ سے ہوئی جب پر یوار کی مرنے والی بہو ڈاکٹر نزدہ ارٹھی اٹھائی جانے والی تھی۔“ وہ جو بے توجہی سے پہنچا تھا، ڈاکٹر فردوس کا نام سن کر بری طرح چونک گیا۔ موت کی خبر اس کے دل پر کسی گھونے کی طرح لگی تھی پیاری اور مخلص سی ڈاکٹر، سبیل سے ہمدردی کی پادشاہ آخر کار اپنی زندگی کی بازی ہار گئی تھی۔ اس کا قصور صرف تھا کہ اس نے سبیل کو مہذب نظر آنے والے دلچسپ چنگل سے نکالنے کے لیے اپنی بساط کی حد تک کردار ادا کیا تھا اور اس جرم کی پاداش میں انہوں ہی کے ہاتھوں سے

کر کے عالم شاہ اور سرمد کے سلسلے میں بات کرے۔ اسے سمجھائے کہ اگر اس نے فردوس کی خاطر اس کا اتنا ساتھ دیا تھا تو پھر اسی کی خاطر عالم اور سرمد کو غیر مشروط طور پر اس کے حوالے بھی کر دے۔ وہ دونوں یہاں سے صحیح سلامت نکل جاتے تو سبیل کی پاکستان واپسی کی راہ بھی نکالی جاسکتی تھی۔ اس پر کسی قسم کا الزام نہیں تھا اور فیصل سے نکاح کے باعث قیام بھی قانونی حیثیت رکھتا تھا۔ اس لیے اس کا معاملہ اتنا عجیبہ نہیں تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ ایک بار بحفاظت پاکستان پہنچ جاتی تو اپنے اور فیصل کے رشتے کے حوالے سے بھی مناسب فیصلہ کرنے کے لائق ہو جاتی۔ اسے سبیل جیسی سمجھ دار اور باوقار لڑکی سے یہ امید نہیں تھی کہ وہ دھوکے اور لالچ کی بنیاد پر بنائے گئے اس رشتے کو مستقل قائم رکھنا چاہے گی۔

”پاؤ بھاجی، گرم پاؤ بھاجی۔“ اپنے خیالات میں غم چلتے چلتے اس نے آواز سنی تو بے ساختہ ہی اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ ایک دبلا پتلا، سانولا سا شخص تھا جو ٹھیلے پر اپنی دکان سجائے آتے جاتے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا۔ وہ بے ساختہ ہی اس کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ نہ پٹ بھی اب دھائی دے رہا تھا کہ اس پر مزید ظلم نہ کیا جائے۔ اس نے پیٹ کے اس احتجاج کو قبول کیا اور ٹھیلے کے ساتھ رکھے اسٹول پر بیٹھ کر پاؤ بھاجی سے انصاف کرنے لگا۔ دو دن کے اس عرصے میں حلال گوشت کی غیر یقینی صورت حال کے باعث اس نے دال سبزی وغیرہ پر مشتمل کھانے ہی کھائے تھے اور اس بات کا قائل ہو گیا تھا کہ گوشت سے عمومی طور پر گریز کرنے والے ہندوؤں نے بغیر گوشت کے بھی کھانے میں بڑی ورائٹی پیدا کر رکھی تھی اور ثابت کر دیا تھا کہ ضروری نہیں کہ پُر تکلف اور لذیذ کھانا صرف گوشت سے ہی تیار کیا جاسکے۔ اس وقت بھی وہ جو پاؤ بھاجی کھا رہا تھا، وہ خاصی لذیذ ڈش ثابت ہوئی تھی اور اس کے ساتھ دی جانے والی چٹنیوں نے کھانے کا لطف دو بالا کر دیا تھا۔ اس نے خوب سیر ہو کر کھایا۔

”اور دوں بھیا؟“ وہ خالی پلیٹ ٹھیلے والے کو واپس کرنے لگا تو اس نے بڑے احترام سے پوچھا۔

”دل تو کر رہا ہے کہ کھانا چلا جاؤں مگر پیٹ اجازت نہیں دیتا۔ تمہارے ہاتھ میں بڑا ڈالٹھ ہے دوست!“ اس نے کھانے کے بل کے ساتھ کچھ نرم اضافی دی تو وہ مزید خوش ہو گیا اور خوش ہو کر کہنے لگا۔

سسپنس ڈائجسٹ

لیے کیا کر رہی ہے؟ مجرموں کے چہرے سب کے سامنے
 تھے۔ ایسے میں پولیس کو تیزی نہیں دکھانی چاہیے کیا؟“ نیوز
 روم میں موجود اینکر حسب روایت عوام میں جوش اور سنسنی
 پھیلانے کی کوشش کر رہی تھی اس لیے نمائندے کو پوری
 بات کرنے کا موقع دیے بغیر ہیچ میں ٹائیک اڑا کر بیڑھے
 سوالات اٹھانے لگی تھی۔

”جی، میں آپ کو یہی بتانے جا رہا تھا۔ جس سے یہ
 سب ہوا پولیس کی ایک موبائل قریب ہی تھی۔ فائرنگ کی
 آواز سن کر وہ لوگ چوکنے ہو گئے اور آخری اطلاع کے
 انوسار پولیس اپرا دیوں کا چچھا کرتے ہوئے ایک بلڈنگ
 تک پہنچ گئی ہے۔ اپرا دیوں نے بلڈنگ میں موجود کچھ
 لوگوں کو بندی بنالیا ہے اور دھمکی دے رہے ہیں کہ اگر
 پولیس نے بلڈنگ میں ٹھنسنے کی کوشش کی تو وہ ان زردوش
 شہریوں کو گولی مار دیں گے۔“ نمائندے کی دی اطلاع نے
 نیوز اینکر کے چہرے کی تسمتاہٹ اور جوش کو مزید بڑھا دیا
 اور جتنی ہوئی آواز اور تیز لہجے میں بولنے لگی۔

”جی تو دیورز آپ دیکھ رہے ہیں کہ سچویشن
 ہرگز رتے سے خطرناک اور سمیر ہوتی جا رہی ہے۔ اتنا خون
 بہا کر بھی ان خونیں کی پیاس ابھی بجھی نہیں ہے اور وہ کچھ
 اور زردوش لوگوں کو بھی اپنے ظلم کا نشانہ بنانا چاہتے ہیں۔“
 لوگوں میں سراسیمگی پھیلا کر انہیں اپنے چینل سے جوڑے
 رکھنا نیوز چینلز کی سب سے اہم پالیسی ہوتی ہے اور وہ اینکر
 اپنی اس کوشش میں پوری طرح کامیاب تھی۔ ڈھابے پر
 موجود گاہکوں کے علاوہ بھی ارد گرد سے لوگ وہاں چلتے
 دی سیٹ کے نزدیک سمٹ آئے تھے۔ یہاں تک کہ کچھ دیر
 قبل اپنا ڈراما خراب ہونے کا شکوہ کرنے والے لڑکے بھی
 سانس روکے اسکرین کی طرف متوجہ تھے۔

”ہم اپنے دیورز کو بتاتے چلیں کہ اپنے چینل کی پر
 پرا کے انوسار ہم نے آپ کو سب سے پہلے یہ نیوز دی ہے
 اور اب سب سے پہلے ہی اس بلڈنگ تک بھی پہنچ چکے ہیں
 جہاں کینیگسٹر دیوا اپنے ساتھیوں کے ساتھ زردوش شہریوں کو
 بندی بنائے بیٹھا ہے۔ آئیے ہم آپ کو وہاں کے لائیو دیورز
 دکھاتے ہیں۔“ اب ٹی وی اسکرین پر ایک عمارت کو زوم
 کر کے دکھایا جا رہا تھا۔

”ہاں تو اہمیت بتائیے کہ وہاں کیا سچویشن ہے۔
 پولیس کیا کر رہی ہے؟“ وہ اب اپنے دوسرے نمائندے
 سے مخاطب تھی۔

”یہاں بہت چنک پھیلا ہوا ہے انوشکا! پولیس نے

مرح زد کو ب کی مٹی تھی کہ نوبت بے ہوشی کی حالت میں
 اسپتال پہنچائے جانے تک پہنچ گئی تھی۔ دوسروں کی مسیحا
 کرنے والی وہ خوش مزاج ڈاکٹر جانے کس اذیت سے
 مزاری مٹی تھی کہ اپنی ہی زندگی کی جنگ نہیں جیت سکی تھی
 اور وہ ٹیلی ویژن پر اس کی موت کی خبر سن رہا تھا۔

”ہماری جانکاری کے مطابق ار بھی اٹھائے جانے
 سے کچھ سے پہلے ہتھیار بند آدمی پنڈال میں کھس آئے اور
 فائر کھول دیا۔ فائرنگ کے انوسار ڈاکٹر فردوس کے جیٹھ اور
 ہتی سے پر ہی ہلاک ہو گئے جبکہ دیور فیصل اور ایک مہمان
 سٹر بانڈے کو شدید زخمی حالت میں اسپتال شفٹ کر دیا گیا
 ہے۔“ نیوز اینکر کی سناٹی مٹی خبر سن کر اس کے لیے یہ سمجھنا ذرا
 مشکل نہیں تھا کہ ڈاکٹر فردوس کی موت کا یہ رد عمل کہاں سے
 آیا ہوگا۔ وہ جو اس کے اسپتال میں داخل ہونے کی خبر سن کر
 ہی نیم دیوانہ ہوا پھر رہا تھا، اس کی موت کی خبر سن کر اپنے
 حواس میں ہی کہاں رہا ہوگا؟ اس کی تو دنیا ہی اجڑ گئی ہوگی
 اور اس کے بعد وہ فردوس کے ظالم سرسرایوں کے ساتھ یہ
 سب نہ کرتا تو کیا کرتا۔

”حملہ آور بالکل کھلے بندوں آئے تھے اور انہوں
 نے خود کو چھپانے کا جتن کیے بنا کھلے عام فائرنگ کی تھی۔
 اس ٹی وی کی دی فوج میں آپ دہلی کے فیس دیوا گینگ کے
 دیوا اور اس کے ساتھیوں کے چہرے صاف دیکھ سکتے
 ہیں۔“ اسکرین پر بکھرے بالوں اور سرخ انگارہ آنکھوں
 والے دیوا کے ساتھ ساتھ اس کے دو وفاداروں کے چہرے
 بالکل واضح تھے۔

”جی سونو، آپ ہمارے دیورز کو بتائیے کہ یہ سب
 کیوں اور کیسے پیش آیا اور مجرموں کے چہرے سامنے آنے
 کے بعد پولیس اب کیا کر رہی ہے؟“ اینکر اب موقع
 اور بات پر موجود اپنے نمائندے سے بات کر رہی تھی اور
 اسکرین پر وہاں کے لائیو مناظر دکھائے جا رہے تھے۔
 لاشوں اور زخمیوں کو اگرچہ وہاں سے اٹھالیا گیا تھا لیکن سفید
 چاندنیوں پر پھیلا ڈھیروں خون گواہی دے رہا تھا کہ وہاں
 انسانی خون سے ہولی تھیلی مٹی ہے۔

”جی انوشکا! بہت دردناک دُر گھٹنا ہوئی ہے۔ دو
 لوگ سر چکے ہیں اور دو کی حالت سخت خراب ہے۔ دو تین اور
 لوگ بھی نشانے پر آئے ہیں لیکن ان کو بہت زیادہ گہرے
 کھانڈ نہیں آئے ہیں اور بھگو ان کی کرپا سے ان کی جان کو
 کوئی خطرہ نہیں ہے۔“

”یہ بتائیے سونو کہ پولیس اپرا دیوں کی گرفتاری کے

بلڈنگ کے گرد گھیرا ڈال رکھا ہے۔ کسی کو آگے نہیں جانے دیا جا رہا ہے۔ ہمیں بھی بلڈنگ سے کافی دور روک لیا گیا ہے۔ پولیس کے انوسار یہ سب ہماری پروٹیکشن کے لیے کیا جا رہا ہے۔“ کیراگوم کر آس پاس کے مناظر دکھا رہا تھا۔ پولیس والوں کی بھاری نفری کے ساتھ ساتھ میڈیا پرسن چیلنژر کی گاڑیاں اور عام پبلک کی بھی کثیر تعداد دکھائی دے رہی تھی اور پولیس کی بہت سی توانائی ان لوگوں کو پیچھے دھکیلنے میں بھی صرف ہو رہی تھی۔

”عام پولیس کے بس کے نہیں ہیں یہ سارے۔ کمانڈو ایکشن کرنا پڑے گا۔“ ڈھابے پر بیٹھ کر خبریں دیکھنے والوں میں سے ایک نے اپنی ماہر اندر رائے دی لیکن اب معاذ نہ تو ٹی وی اسکرین پر چلتے مناظر کی طرف متوجہ تھا اور نہ اپنے ارد گرد بیٹھے ان ماہرین کی طرف جن کی رائے مانتا تو دور کی بات، سننے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ وہ کچھ اور سوچ رہا تھا اور یہ اس کی سوچ ہی تھی جس نے اسے زیادہ دیر وہاں بیٹھنے نہیں دیا۔

”دلیپ سے بات کرواؤ۔ میرے پاس اس کے لیے ایک آفر ہے۔“ کچھ ہی دیر بعد وہ ایک پبلک فون سے اس نمبر پر کال کر رہا تھا جس نمبر کو کبھی دیوا سے رابطے کے لیے ملا یا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس وقت اس کا دیوا کے کسی معلوم ٹھکانے پر جانا بے سود ہوگا۔ موجودہ حالات میں ان کا ایسی کسی جگہ پر موجود ہونا ممکن ہی نہیں تھا۔ اس لیے دلیپ سے رابطے کے لیے وہی طریقہ کار استعمال کیا تھا جو کبھی فردوس نے اسے دیوا سے رابطے کے لیے بتایا تھا۔

”اپنا نمبر دے دو۔ دلیپ بابو کو تم سے بات کرنا ہوئی تو خود کاٹیکٹ کر لے گا۔“

”میرا کوئی کاٹیکٹ نمبر نہیں ہے۔ میں پندرہ منٹ بعد پھر کال کروں گا۔ اپنے دلیپ بابو سے بولو کہ اگر اپنے بھائی کو زندہ دیکھنا چاہتے ہیں تو مجھ سے بات کریں۔“ دوسری طرف اگر سرد مہری برتی جا رہی تھی تو اس نے بھی ساٹ انداز میں اپنا پیغام دے کر سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔ اس کال کے چار جزا ادا کرنے کے بعد وہ ایک لمحے کے لیے بھی اس مقام پر نہیں رکھا اور ایک آٹو میں بیٹھ کر فوری طور پر وہاں سے نکل گیا تھا۔ اگر وہ لوگ اس کال کے ذریعے اسے ٹریس کرنے کی کوشش کرتے بھی تو کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔ اگلی کال اس نے حسب وعدہ ٹھیک پندرہ منٹ بعد کسی اور مقام سے ملائی۔

”کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟“ اس بار لائن پر دلیپ

موجود تھا۔

”تمہارے بھائی کے اپنے اوپر کیے گئے احسان کا بدلہ اتارنے کے ساتھ ساتھ ایک سودا بھی کرنا چاہتا ہوں۔“ ”یقیناً اپنے دوستوں تک رسائی چاہتے ہو گے؟“ اس کے سنجیدہ لہجے میں کیے گئے مطالبے کے جواب میں دلیپ نے طنزیہ لہجے میں اپنا اندازہ پیش کیا۔

”بالکل۔ میں مرتے دم تک دوستیاں نبھانے والا شخص ہوں۔ اس مشکل وقت میں اپنی خدمات پیش کر کے تمہاری بھی مدد کرنا چاہتا ہوں اور اپنے دوستوں کی بھی۔“ اس نے سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے جواب دیا۔

”تمہارے پاس ہمارے لیے کیا آفر ہے؟ اس سچویشن کو معمولی نہ سمجھو۔ ہم اتنے ریسورسز رکھتے ہوئے بھی خود کو بالکل ہیلپ لیس فیل کر رہے ہیں۔“ دلیپ کے لہجے سے بے بسی اور پریشانی چھلک رہی تھی۔

”یہ فون پر کرنے کی باتیں نہیں ہیں۔ ہمیں مل بیٹھ کر ڈسکشن کرنا ہوگی اور پلان بنانا ہوگا۔“

”اپنی لوکیشن بتاؤ۔ میرے آدمی تمہیں لینے آجائیں گے۔“ دلیپ نے فوراً پیشکش۔

”آئی ہو پ کہ یہ ہمارے درمیان ایک نئی ڈیل ہوگی اور کسی پرانی بات کے بدلے چکانے کی کوشش نہیں کی جائے گی۔“ اپنی لوکیشن بتانے سے پہلے اس نے دلیپ سے یقین دہانی چاہی۔

”آف کورس، ایسا ہی ہوگا۔“ دلیپ نے اس سے وعدہ کیا۔

”میں میا محل بازار میں جواہر ریسٹورنٹ کے سامنے ملوں گا۔ میرے جانے پہچانے آدمی بھیجتا۔ میں خود انہیں پہچان کر ان تک پہنچ جاؤں گا۔“ اس نے اس قریب ترین مقام کے بارے میں بتایا جہاں وہ اپنے موجودہ مقام سے آسانی سے فوری طور پر پہنچ سکتا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ میں انوش کو بھجوا دیتا ہوں۔“ دلیپ نے بتا کر رابطہ منقطع کر دیا تو وہ جلدی سے کال کے پیسوں کی ادائیگی کر کے مطلوبہ مقام کی طرف روانہ ہو گیا۔

گل خان سے علیحدہ ہونے کے بعد اس نے اپنے حلیے اور چہرے مہرے میں خاصی تبدیلیاں کر لی تھیں۔ اس لیے جانتا تھا کہ دیوا کا کوئی آدمی اس حلیے میں اسے شناخت نہیں کر سکے گا۔ شناخت کا یہ مرحلہ اس نے خود ہی طے کیا۔

”پدھاریے۔“ حکم حاکم مرگہ مفاجات کے تحت انوش اسے لینے تو آ گیا تھا لیکن اس کے ہاتھوں جو زک اٹھا

تھے۔ رات کے اندھیرے میں کمانڈو ایکشن کرنے والے یقیناً ہر طرح کی سہولیات سے لیس ہوتے۔۔۔ جبکہ ان کے مقابلے میں دلپ اور اس کے ساتھیوں کے پاس بس محدود اسلحہ ہی تھا جو یقیناً کسی بھرپور کمانڈو ایکشن کو سنبھالنے کے لیے ناکافی ثابت ہوتا۔

”سنا ہے ان لوگوں نے پولیس والوں کو مہارت سے دور رکھنے کے لیے دتی بم بھی پھینکا ہے۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ ان کے پاس مزید کتنے بم موجود ہو سکتے ہیں؟“ اپنے ذہن میں موجود منصوبے پر سوچتے ہوئے اس نے دلپ سے دریافت کیا۔

”میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بھیا میری لاعلمی میں گئے تھے۔ مجھے بعد میں پتا چلا کہ وہ بے حد نشے کی حالت اور شدید غصے میں کہیں گئے ہیں۔ میرے کچھ معلوم کرنے سے پہلے ہی ٹی وی پر نیوز آگئی۔ آگے کی ساری سچویشن تو تمہارے بھی سامنے ہی ہے۔“ دلپ نے بے بسی سے ہاتھ مسکے۔

”ٹھیک ہے۔ میری بات غور سے سنو اور بتاؤ کہ تم ان میں سے مجھے کیا کیا رینج کر کے دے سکتے ہو؟“ اس نے اس کو مطلوبہ اشیا کی فہرست لکھوائی۔

”یہ سب ابھی ہو جائے گا۔۔۔۔۔ اور کچھ؟“ دلپ تھوڑا پرجوش ہوا۔

”اس وقت موقع پر لیڈ کون کر رہا ہے؟“

”ایس ایس پی بی ایچ ٹھاکر۔“

”مجھے اس تک رسائی چاہیے۔“ اس نے فوراً مطالبہ کیا اور اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولا۔

”یہ بہت ضروری ہے۔ اس کے بغیر ہم کچھ نہیں کر سکیں گے۔“ جواب میں دلپ سوچ میں پڑ گیا۔

”تم کسی میڈیا پرسن کی حیثیت سے مجھے اس تک پہنچا سکتے ہو۔ کسی بھی بڑے نیوز چینل کے حوالے سے میرا صحافتی کارڈ بنوا کر اس کے پاس جانے کا انتظام کر سکتے ہو۔ کرنا صرف یہ ہوگا کہ ایس ایس پی کو بہت بڑی رقم کالاچ دے کر اس بات پر راضی کر لو کہ وہ مجھے اپنے ساتھ رکھے۔ جہانہ بھی ہوگا کہ چینل سب سے پہلے اور سب سے زیادہ دھماکے دار خبریں عوام تک پہنچانا چاہتا ہے۔“

”تم کرنا کیا چاہتے ہو؟“

”بی ایچ ٹھاکر کو اپنے اشاروں پر مچانا۔“ اس نے بے خوفی سے اپنا ارادہ ظاہر کیا۔

”کیا سچ ایسا ہو سکتا ہے؟“ دلپ بے یقینی کا شکار

جانتا تھا، اس کی وجہ سے کچھ گھما گھما سکتا تھا۔ اس کے اس انداز کو خاطر میں لائے بغیر وہ اٹکینان و سکون سے گاڑی کی آرام دہ نشست پر براجمان ہو گیا۔ اس کے بیٹھے ہی گاڑی روانہ ہوئی۔ سفر زیادہ طویل نہیں تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ

اور دلپ ایک دوسرے کے روبرو تھے۔ ”کیا پلان ہے؟“ اپنی دھیل چیر پر بیٹھے دلپ نے بغیر کسی تہید کے سیدھا سوال کیا۔ وہ جتنا دلپ کو جانتا تھا، اس کے مطابق وہ مشکل حالات میں بھی خود کو قابو میں رکھنے والا بندہ تھا لیکن آج اپنی یہ خصوصیت اس پر حاوی نہیں دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے اچھے بال اور آنکھوں میں اتنی سرخی گواہی دے رہی تھی کہ وہ انتہائی درجے تک پریشان ہے۔

”اپنا پلان بتانے سے پہلے میں تم لوگوں کے ریمورمز کے بارے میں کچھ سوالات کرنا چاہتا ہوں۔ اگر مجھے اپنے سوالوں کے جوابات ہاں میں ملے تو میرے پلان پر عمل کرنا زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔ دوسری صورت میں ہم اپنے پلان میں کچھ تبدیلیاں کر لیں گے۔“

”اوکے، پوچھو۔“ دلپ نے اسے اجازت دی۔ وہ اپنے ذہن میں موجود منصوبے کے حساب سے اس سے سوالات کرتا رہا جن کے جوابات اس کے لیے خاصے سلی بنش تھے۔ اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد اس نے دیوا اور اس کے ساتھیوں کی مکمل پوزیشن جاننے کے لیے چند سوالات کیے جن کا جواب دیتے ہوئے دلپ نے اسے بتایا۔

”بھیا اور ان کے ساتھ موجود بندے جس بلڈنگ میں پناہ گزین ہیں، وہ نئی تعمیر شدہ ہے اور ابھی اس میں قائم آئرس آبا نہیں ہوئے ہیں لیکن خوش قسمتی سے وہ لوگ بلڈنگ میں بنائے گئے بنگ آفس میں موجود بلڈر، اس کی سیکرٹری اور بیون کے علاوہ ایک وزیٹر کو ریمال بنانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ ایک طرف بلڈر شہر کا جانا مانا بزنس مین ہونے کا وجہ سے بہت اہم ہے تو دوسری طرف وزیٹر کی بھی ایک سوشل ورکر کی حیثیت سے اچھی پہچان ہے۔ سرکار کے لیے آسان نہیں ہے کہ اپنے دو معزز شہریوں کی جان خطرے میں ڈال کر کوئی سخت ایکشن لینے کا حکم دے سکے لیکن دوسری طرف اس کو اپنی پاور بھی ثابت کرنا ہوگی۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ رات کا اندھیرا بھٹکنے کے بعد کمانڈو ایکشن کے ذریعے انہیں پھانسنے کی کوشش کریں گے اور یہ ان کے لیے زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔“ دلپ کے اندیشے غلط نہیں

Scanned with CamScanner

اسے دیکھ رہا تھا۔ ٹھاکر کے لیے ممکن نہ ہو سکا کہ اپنی نظروں کو موڑ سکے۔

”اب تم نے وہی کرنا ہے اور وہی کہنا ہے جس کا حکم میں تمہیں دوں۔“ مؤدبانہ لہجہ یکدم ہی غائب ہو گیا اور اس کی جگہ حکم نے لے لی۔

”میں وہی کروں گا اور وہی کہوں گا جو تم چاہتے ہو۔“ اس نے کسی اچھے پیچے کی طرح سبق دہرایا۔ معاذ نے تین بار اسے یہ بات ذہن نشین کروائی۔

”گاڑی کے سارے شیشے بند کر دو۔“ زبان سے نکلنے کی دیر تھی، چاروں شیشے بند ہو گئے۔ ڈرائیور کو پہلے ہی ٹھاکر نے باہر کھڑا کر رکھا تھا۔ شاید یہ اپنی رشوت خوری کو چھپانے کی کوشش تھی۔

”دیوا سے رابطہ کرو اور جو کچھ میں تم سے کہنے کے لیے کہوں، اس سے وہ کہو۔“ اس نے ٹھاکر کو مکمل طور پر اپنے ٹرانس میں لے لیا تھا چنانچہ اس نے فوری طور پر لینڈ لائن فون کا نمبر ملایا اور اس کی ہدایات کے مطابق بولنا شروع ہوا۔

”رات ہو چکی ہے مسٹر دیوا۔ آئی ایم شیور کہ آپ لوگوں اور یرغالیوں نے پورے دن سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ آپ اجازت دیں تو آپ لوگوں کے لیے کھانا بھجوا دیا جائے۔“

”بھاڑ میں گیا کھانا۔ میں بتا رہا ہوں کہ کسی نے نزدیک بھی آنے کی کوشش کی تو اپنی جان سے جائے گا۔“ وہ جواباً بڑی طرح دہاڑا۔

”ہم نے اچھی نیت سے آپ کو یہ آفر کی ہے۔ سمجھیں یہ آپ کے بھائی کی طرف سے ہے۔ مینیو میں ساری آپ کی فیورٹ ڈشز شامل ہیں۔“ وہ ایک ایک کر کے دیوا کے پسندیدہ کھانوں کے نام گنوانے لگا۔ یہ نام معاذ اسے بتا رہا تھا۔ جیلے میں بھائی کا حوالہ اور اپنے پسندیدہ کھانوں کے نام شامل ہونے سے دیوا چونک گیا۔

”تم ہمیں دھوکا دینے کی کوشش تو نہیں کر رہے؟“ شک کی گنجائش پھر بھی تھی۔

”دھوکا تو آپ ماں کو دیتے تھے۔ آلو کے تین پرائٹھے کھا کر کہتے تھے کہ ابھی صرف دو کھائے ہیں۔“ وہ دلیب سے ایسی معلومات لے کر آیا تھا جن کا حوالہ دیوا کے شک کو دور کر سکے۔ اس کے دھیمی آواز میں کہے الفاظ ٹھاکر فون پر دہراتا جا رہا تھا۔

”اگر یہ کھانا میری ماں کے ہاتھ کے کھانوں کی طرح

کرنے جا رہا تھا کہ ایک پولی ٹھین بیگ میں رکھی کوئی شے لے کر ایک پولیس والا چلا آیا۔

”ٹھاکر نے ہاتھ بڑھا کر اس شے کو ہاتھ میں لے لیا۔ نزدیک سے اس شے کو دیکھنے پر اس کے ہاتھ کے تاثرات سمجھ ہو گئے۔ معاذ بھی چونک گیا۔ وہ چہرے کے تاثرات انگلی تھی جس کے سرے پر موجود خوبصورتی سے ایک انسانی انگلی تھی اور اس ناخن پر موجود گلابی نیل پالش اعلان کر رہی تھی کہ وہ ایک نسوانی انگلی ہے۔

”ایک کھڑکی سے اس انگلی کے ساتھ ساتھ انہوں نے ایک چتر بھی پینٹا ہے سہ!“ اس بار ماتحت پولیس والے نے ایک لفافہ ٹھاکر کی طرف بڑھایا۔ ٹھاکر نے سنجیدہ تاثرات کے ساتھ لفافہ کھول کر اندر موجود کاغذ باہر نکالا۔ لکھا تھا۔

”ہم نے تمہیں بہت مہلت دے دی۔ اب ہر پندرہ منٹ بعد ہم یرغالیوں کے جسم کا کوئی نہ کوئی حصہ کاٹ کر تمہارے پاس بھیج رہیں گے۔ اگر تم اپنے مزدوش شہریوں کی نگڑوں میں داپنی نہیں چاہتے تو ہمیں یہاں سے نکلنے کا موقع دو۔“ وہ ایک کھلی دھمکی تھی۔ ایس ایس پی ٹھاکر اسے پڑھ کر تھملا گیا لیکن فوری طور پر کچھ کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔

”آپ کمانڈو ایکشن کب شروع کر دائیں گے؟“ اس نے لہجے سے فکر مندی ظاہر کرتے ہوئے ٹھاکر سے پوچھا۔

”رات گیارہ بجے کے بعد کا ٹائم طے ہوا ہے۔“ اس نے سرے سرے لہجے میں بتایا پھر بولا۔

”ابھی تو گیارہ بجنے میں کافی سے ہے۔ اگر وہ اپنی جانی ہوئی رفتار سے چلا تو سمجھو گیارہ بجے تک یرغالی اپنے اچھے خاصے باڈی پارٹس کھوپکے ہوں گے۔“ ایس ایس پی کے چہرے سے پریشانی ہوید اٹھی۔

”ان لوگوں سے رابطہ کریں اور کوشش کریں کہ انہیں بہلا سکیں۔ ایسا کریں کہ انہیں رات کے کھانے کی پیشکش کریں۔“ اس نے تجویز پیش کی اور خود چونکا ہو کر بیٹھ گیا۔

”وہ نہیں مانیں گے۔ سارے بلڈنگ کے قریب کسی کا سایہ بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔“ وہ سچ سچ پریشان تھا۔

”میری طرف دیکھیں سر اور میری بات غور سے سنیں۔“ معاذ نے یکدم اس کے دونوں ہاتھ تھام کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ ٹھاکر اس کی اس جسارت پر حیران سا ایسے دیکھنے لگا لیکن اب اسے اس کے دیکھنے کی پروا نہیں تھی۔ اپنی آنکھیں ٹھاکر کی آنکھوں میں ڈالے وہ یک ٹک

سوادش ہے تو بھواد لیکن کھانا کوئی پولیس والا لے کر نہیں آئے گا۔“ اس نے شرط رکھی۔

”جیسی آپ کی! چھا۔“ ٹھا کر نے شرط منظور کر لی۔ وہ وہی کچھ کہہ رہا تھا جس کا اسے معاذ کی طرف سے حکم مل رہا تھا۔ کیرتھر کی پہاڑیوں میں ملنے والا فیضو کا دیا علم زندگی کی مشکلات سے نمٹنے کے لیے ایک نعمت بن گیا تھا۔ بنیادی طور پر وہ ایک عملی انسان تھا اور زندگی میں عموماً ایسی آسانیاں نہیں تلاش کرتا لیکن اب حالات نے مجبور کر دیا تھا کہ اپنے پاس موجود ہنر کو استعمال کرے۔ اتفاق سے ان دنوں وہ ستارہ جینی کی مشق بھی پابندی سے کر رہا تھا جس کے باعث اس کی صلاحیت میں خاطر خواہ اضافہ ہوا تھا اور یہ اس کا ہی نتیجہ تھا کہ وہ پہلی کوشش میں ہی ایس ایس پی، بی ایچ ٹھا کر کو زیر کر لینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس کے اندازے کے مطابق ٹھا کر بلا فوش تھا۔ ایسے لوگوں کے اعصاب عموماً کمزور ہوتے ہیں اور انہیں معمول بنانے میں زیادہ محنت نہیں لگتی۔ اس وقت ایس ایس پی اس کا معمول بنا ہر حکم نہایت فرمانبرداری سے پورا کر رہا تھا۔

”ہم نے انہیں کھانے کی آفر کی ہے مگر کھانے میں اگر کوئی نشہ آور شے شامل کر دی جائے تو آئی ہوپ کہ ہماری پرالہم ایسے ہی سولو ہو جائے گی اور ہمارے کمانڈوز کو زیادہ محنت نہیں کرنا پڑے گی۔“ اب ٹھا کر اس کی ہدایت پر اپنے کسی سینئر سے بات کر رہا تھا۔

”مجھے پورا اوشواس ہے سر کہ یہ آئیڈیا کام کرے گا۔ بات جیت اسٹارٹ کرنے سے اتنا تو ہوا ہے کہ وہ تھوڑا نرم پڑا ہے ورنہ تو وہ اتنے خطرناک موڈ میں تھا کہ اس نے یرغالیوں کے باڈی پارلس کاٹ کر بھیجنے شروع کر دیے تھے۔“ وہ اپنے افسر کو مکمل تفصیل سناتے لگا۔

”آپ کھانا آرہے کر دیا میں۔ بندہ ہے میرے پاس جو کھانا لے کر جانے پر تیار ہے۔“

”جی..... چھیل کا نمائندہ ہے۔ کمانڈو ایکشن کی کوریج کے لیے یہاں موجود ہے۔ میری اس سے بات ہوگئی ہے۔ وہ اپنی خوشی سے راضی ہے۔“ دوسری طرف سے یقیناً کوئی استفسار کیا گیا تھا جس کے جواب میں اس نے بتایا۔

”ہم گیارہ بجے کے بعد کمانڈو ایکشن لیں گے۔ کھانا اگر ساڑھے آٹھ اور نو بجے کے درمیان ان تک پہنچا دیا جائے تو بہتر ہوگا۔“ وہ نوٹ پیڈ پر لکھ کر دی جانے والی معاذ کی ہدایات کے مطابق گفتگو کر رہا تھا۔

”ٹھیک یوسر! آئی ہوپ کہ میں جلد آپ کو گڈ نیوز

دوں گا۔“ دوسری طرف کی بات سن کر اس نے خوش دلی شکر یہ ادا کرتے ہوئے سلسلہ منقطع کر دیا۔

”نیوز چینلز، والوں کو بتا دو کہ ہم انسانی بھدردی تحت اندر موجود افراد کے لیے کھانا بھجوا رہے ہیں لیکن پل میرے بارے میں کوئی انفارمیشن مت دینا۔ انہیں اندازے لگانے دو۔“ اس نے ٹھا کر کوئی ہدایت دی تو گاڑی سے نیچے اتر گیا اور اپنے ایک سینئر ماتحت کو ساتھ لے کر اس طرف بڑھ گیا جہاں مختلف نیوز چینلز کے نمائندے موجود تھے۔ معاذ گاڑی میں بیٹھا اس کا جائزہ لیتا رہا۔ ایک سب، کچھ ٹھیک چل رہا تھا۔ کڑ بڑ صرف اس صورت میں ہو سکتی تھی کہ ٹھا کر اس کے ٹرانس سے نکل جاتا یا کسی سینئر طرف سے کوئی اعتراض اٹھایا جاتا۔

اسے اس بات کا بھی اندازہ تھا کہ صحافتی سلقوں میں اس کی ایس ایس پی کی گاڑی میں سوجوگی نے بچل بچاوا ہوگی اور وہ اس کے بارے میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرتے ہوئے کھوج لگانے کی کوشش کر رہے ہوں گے کہ آخر وہ کون ہے؟ ایس ایس پی کو اس نے اپنے حواس سے کچھ بھی اپنے سے بطور خاص اس لیے منع کیا تھا کہ جس چھیل کے حوالے سے یہاں پہنچا ہے، کہیں وہ اس جھوٹ ہمانڈا نہ پھوڑ دے۔ منصوبے کے مطابق اسے ایس ایس پی تک پہنچانے والا اسے ایس آئی بھی طبیعت کی خرابی کا ٹانگہ رچا کر کسی بھی وقت وہاں سے غائب ہونے والا تھا۔ بعد میں تفتیش ہوتی تو وہ یہی جواب دیتا کہ بندے نے مجھے چھیل کا آئی ڈی کارڈ دکھا کر ایس ایس پی صاحب سے بات کروانے کی فرمائش کی تھی۔ میں نے اسے ان تک پہنچا دیا۔ آگے کیا ہوا، وہ ایس ایس پی صاحب جانیں یا وہ بندہ..... بندہ تو ظاہر ہے کسی کے ہاتھ آنے والا نہیں تھا اور ایس ایس پی صاحب بہت سی باتوں کی توجیحات نہ پیش کر سکنے اور گاڑی میں رقم سے بھرے بریف کیس کی موجودگی کے باعث برے بچھنے والے تھے۔ ایسا راہی افسر کسی بھی ملک کا ہوتا، اس کے حساب سے قابلِ رحم نہیں تھا۔

”کمانڈو ایکشن کے وقت میں بھی ساتھ ہوں گا ساری ویڈیو بنانے کے لیے۔ اپنے کمانڈوز کو سمجھا دینا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ مجھے ہی نشانہ بنا دیں۔“ حفظ ماتقدم کے تحت اس نے ایک اور ہدایت دی۔

ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے ایک ایچھے ریسٹوران سے تیار شدہ کھانا وہاں پہنچ چکا تھا۔ دیوا کو کھانا پہنچنے کی اطلاع

دی گئی۔ اس نے اس شرط کے ساتھ اجازت دی کہ صرف ایک ٹپا آدی ٹرائی پر کھانا رکھ کر بلڈنگ کے مرکزی دروازے تک آئے گا اور خاموشی سے واپس لوٹ جائے گا۔ اس کی اس اجازت کے بعد معاذ کو وہاں بھیجنے کے لیے تیار کیا جانے لگا۔ احتیاطی تدبیر کے طور پر بلٹ پروف جیکٹ اور ہیلمٹ پہنائے گئے۔ شانے سے لٹکا بیگ اس نے یہ کہہ کر اتارنے سے انکار کر دیا کہ اس میں خفیہ کیمرا نصب ہے۔ ممکن ہے وہ موقع کی کوئی کارآمد لائیو ویڈیو بنا کر بیچنے میں کامیاب ہو جائے۔ لائیو ویڈیو کے لالچ میں اسے اجازت دے دی گئی۔ پونے نو بجے وہ کھانے سے لڑی ٹرائی کو دھکیلنا ہوا بلڈنگ کی طرف جا رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ عام نظروں کے ساتھ ساتھ کیمروں کی نظریں بھی اس پر لگی ہوئی ہیں اور یہ کیمرے زوم کر کے اس کی ایک ایک جنبش کو دیکھ رہے ہیں۔ اس صورت حال میں طے تھا کہ وہ کھانے کے ساتھ جو کچھ اندر بھیجنا چاہتا ہے، نہیں بھیج سکتا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ بلڈنگ کے اندر جاتا اور کچھ تپائے کے لیے سبکی، سب کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا لیکن اندر والے جس کیفیت کا شکار تھے ممکن نہیں تھا کہ وہ کسی کو اندر آنے دیتے۔ اس مسئلے پر غور کرتا کرتا وہ مرکزی دروازے کے عین سامنے پہنچ گیا۔ دروازہ بند تھا۔

”میں کھانا لے کر آ گیا ہوں۔ باہر آ کر لے جاؤ۔“
”باہر آ جائیں تاکہ کسی بلڈنگ کی چھت پر بیٹھا اسٹیمپ اپنا کام کر سکے۔“ اس کے نفسیاتی حربے نے کام کیا تھا۔ اس کی طرف سے باہر آنے کا مطالبہ سن کر فوراً یہ شک پیدا ہو گیا تھا کہ باہر بلائے کے پیچھے کوئی مقصد ہے۔ اس لیے فوراً انکار ہوا۔

”پھر میں کیا کروں؟“ اس نے خود کو مکمل طور پر بے بس ظاہر کیا۔
”ٹرائی لے کر اندر آؤ۔“ حسب توقع حکم صادر ہوا۔
”نہیں..... نہیں۔ اگر تم لوگوں نے مجھے بھی یرغمال بنالیا تو.....؟“ اس نے ظاہر کیا کہ وہ اس حکم کو سن کر پریشان ہو گیا ہے۔

”اگر بات نہیں مانی تو دونوں پیروں میں گولیاں بار دیں گے۔ اس کے بعد تم بھی بھی واپس لوٹنے کے قابل نہیں رہو گے۔“ دھمکی دینے کے ساتھ ہی اس کے پیروں کے قریب ایک فائر کیا گیا۔ اس نے جان بوجھ کر ایک انٹراڈیسی ٹیچن ماری۔ جانتا تھا کہ روانگی سے قبل اس کے گردبان کے اندر جو مائیکروفون چھپایا گیا ہے، اس کی مدد

پریسی

سردار رنجیت سنگھ اور سردار سنگیت سنگھ کسی فلم کا مشنی شو دیکھنے گئے۔ شام کو فلم ختم ہوئی تو غروب ہوتے ہوئے آفتاب کو دیکھ کر سردار رنجیت سنگھ نے کہا۔ ”یار شام ہو گئی۔“

سردار سنگیت سنگھ نے کہا۔ ”اسحق ہوئے ہو۔ صبح کو شام بتا رہے ہو۔ دیکھتے نہیں سورج طلوع ہو رہا ہے۔“
دونوں میں جھگڑا بڑھا۔ گالی گلوچ تک نوبت پہنچی۔ قریب تھا کہ کرپانیں باہر نکل آتیں اور دونوں ایک دوسرے کو ختم کر دیتے کہ اچانک ادھر سے گزرتے ہوئے سردار اجیت سنگھ ان کے درمیان میں آگئے اور ان سے لڑنے کا سبب پوچھا۔

سردار رنجیت سنگھ اور سردار سنگیت سنگھ نے بیک زبان کہا۔ ”آپ ہمارے جھگڑے کا فیصلہ کر دیجیے۔ ذرا غور سے سورج کی طرف دیکھ کر بتائیے کہ وہ غروب ہو رہا ہے یا طلوع ہو رہا ہے؟“

سردار اجیت سنگھ آہ بھر کر بولے۔ ”بھائیو! یہ بات تو مجھے بھی نہیں معلوم۔ میں تمہارے شہر میں پر دیسی ہوں۔ آج ہی آیا ہوں۔“

(مرسلہ: پرویز خان، سکھر)

سے ان کے درمیان ہونے والی گفتگو کا ایک ایک لفظ سنا جا رہا ہے۔

”اب آ رہے ہو اندر یا نہیں؟“
”اندر جائیے مسٹر شرما! دشواں کریں آپ بالکل سرکت رہیں گے۔“ وہ اندر سے پوچھے گئے سوال کا جواب دیتا، اس سے قبل اس کے کان میں سرگوشی کی گئی۔ بے ہوشی کی دوامیہ کھانا اندر پہنچانا یقیناً کرنا دھرتاؤں کے لیے اس کی زندگی سے زیادہ اہم تھا۔ اس کی بلی چڑھا کر وہ نہ صرف مجرموں کو گرفتار کر سکتے تھے بلکہ اس سے زیادہ قیمتی شہریوں کو بھی بچا سکتے تھے (اس کا نواز اینکر ہونا ان کے نزدیک اس لیے غیر اہم تھا کہ وہ پبلک فگر نہیں تھا۔ اپنے غیر معروف چہرے کے لیے اس نے یہی لاجب دی تھی کہ چمپل جانے مانے چہروں کو سامنے لا کر کسی کو چونکانا نہیں چاہتا۔ اس لیے کیمرے کے پیچھے رہ کر کام کرنے والے شخص کو بھیجا ہے۔)
”اوکے سر!“ اس نے مری مری آواز میں جواب دیا اور یوں آگے بڑھنے لگا جیسے جان پھیلی پر رکھی ہو۔ ویسے اس

کے درمیان واپس پہنچ کر اس نے گویا سکون کا سانس لیا۔
"اندر کی سچویشن بتاؤ۔" انہیں اس کی حالت سے
زیادہ دوسری فکریں تھیں۔

"میرے کمرے سے آپ لائیو سب کچھ دیکھ
رہے تھے۔" اس نے ناراضی کا اظہار کیا۔
"تمہارا کمرہ ہمیں دکھائی کیا رہا تھا، کیول چار
اور دیواریں۔ کم سے کم کسی کافیس ہی فوکس کر لیتے۔" اسے
طعنہ دیا گیا۔

"بیگ میں فکس کمرے کی طرف ان کا دھیان نہیں
گیا۔ میرے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ چہرے فوکس کرنے
کے چکر میں وہ میرا بوجھ بھی بگاڑ سکتے تھے بلکہ ہو سکتا ہے دنیا
سے ہی آؤٹ آف فوکس کر دیتے۔"

"اتنا ڈرتے ہو تو پھر اس کام کے لیے آئے کیوں
ہو؟ ابھی سے سوچ لو آگے کمانڈو ایکشن کے سے تو گولیاں
بھی چل سکتی ہیں بلکہ چلیں گی۔" ڈرانے والوں کو تو دنیا اور
ڈراتی ہے۔ اس کا بھی مذاق اڑایا جا رہا تھا۔

"پلیز سر! میں ان لوگوں کے منہ نہیں لگنا چاہتا۔ آپ
ہی انہیں سمجھائیے۔" اس بار اس نے ایس ایس پی ٹھاکر کو
اپنی مدد کے لیے پکارا۔

"پلیز گاؤ! آپ لوگ مسٹر شرما کو پریشان نہ کریں
اور میرے ساتھ آئیں۔ ہم اپنا پلان فائل کرتے ہیں۔"
ٹھاکر نے فوراً انہیں ٹوکا اور بولتے ہوئے اپنے ساتھ آنے کا
اشارہ کیا۔ پلان پہلے ہی طے ہو چکا تھا۔ بس اب فائل
انسٹرکشنز دی جا رہی تھیں۔ ان ہدایات کو سنتے ہوئے وہ یہ
جان کر انہیں داد دے بنا نہ رہ سکا کہ انہوں نے ٹرمان کے
فرار کے لیے سیوریج والے راستے کو بھی نظر انداز نہیں کیا
تھا۔ ویسے کھانا پیسے جانے کے بعد سے ان کی طرف مستقل
خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ یرغالیوں کے اعضا کاٹ کر باہر
پھینکنے والی دھمکی پر بھی انہوں نے دوبارہ عمل نہیں کیا تھا۔
دراصل کھانے سے پہلے ایس ایس پی نے گفتگو کا نیا دور چلا
کر انہیں رات بارہ بجے تک کی مہلت دینے پر راضی کر لیا تھا
اور یہ سبز باغ دکھایا تھا کہ وہ اعلیٰ حکام کو راضی کرنے کی
کوشش کر رہا ہے کہ قیمتی انسانی جانیں بچانے کے لیے ان
کے مطالبات قبول کر لیے جائیں۔ صرف معاذیہ بات جانتا
تھا کہ وہ راضی نہیں ہوئے ہیں بلکہ راضی ہونے کا دھوکا دیا
ہے۔

ٹھیک گیارہ بج کر پانچ منٹ پر کمانڈو ایکشن کا آغاز
کر دیا گیا۔ اس آغاز کے ساتھ ہی اس بلڈنگ سمیت

کی نظروں سے وہ شخص چھپا نہیں رہ سکا تھا جو مرکزی
دروازے سے اوپر موجود خلا میں گن کی نال پھنسائے اسے
نشانے پر لیے ہوئے تھا۔

"میں آ رہا ہوں۔ گولی نہ چلاؤ۔" اس نے بلند آواز
میں پکار کر ان لوگوں کو اپنی منظوری دی اور پھر جھٹ دروازہ
کھول کر ٹرائی اندر دھکیلنے کی کوشش کی۔ انداز ایسا تھا کہ جیسے
ٹرائی اندر دھکیل کر باہر سے ہی پلٹ کر بھاگ جانے کا ارادہ
رکھتا ہو۔

"اندر آؤ۔" وہ لوگ ہر وہ حکم دے رہے تھے جو اس
کی ظاہری کیفیت کے مخالف تھا۔ بالآخر اس نے جھپکنے کی
اداکاری کرتے ہوئے حکم کی تعمیل کر دی۔ اندر ایک اسٹول
پر مرکزی دروازے اور دیوار کے درمیانی خلا میں گن کی
نال پھنسائے بندہ کھڑا تھا جبکہ دوسرا بندہ ذرا دائیں جانب
کھڑا اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے دائیں جانب
کھڑے بندے کو خاموش رہنے کا اشارہ کر کے پہلے کھانے
کی طرف انگلی کی پھر اسی انگلی کو دائیں بائیں حرکت دے کر
سمجھایا کہ اس کھانے کو نہیں کھانا ہے۔ اسے اندیشہ تھا کہ کئی
گھنٹوں سے بھوکے یہ لوگ کہیں ڈبوں میں بند اس خوراک
کو محفوظ سمجھ کر استعمال نہ کر لیں۔ انہیں دھوکا دینے کے لیے
ہی ریسٹوران کی پیکنگ کو کھولا نہیں گیا تھا اور سرخ کی مدد
سے دوا اندر داخل کی گئی تھی۔

"وہیں کیوں انک گیا ہے۔ ٹرائی کو لے جا کر اس
لفٹ کے ساتھ کھڑا کر دے۔" اس کے اشارے کو سمجھ لیا گیا
تھا لیکن بندہ زیادہ ہی ہوشیار تھا اس لیے یہ سمجھتے ہوئے کہ
انہیں کہیں باہر سے دیکھا اور سنا جا رہا ہے، اس کے ساتھ اسی
لبجے میں گفتگو کی جس میں اپنے دشمن سے کی جاسکتی ہے۔
ٹرائی دھکیل کر لفٹ تک لے جاتے ہوئے معاذ کو
موقع مل گیا کہ اپنے بیگ میں سے وہ چھوٹا سا پیکٹ جو بظاہر
اس کے آلات کا ہی ایک حصہ تھا، نکال کر ٹرائی کے نچلے حصے
میں خفیہ کر دے۔ اس کے بیگ سے منسلک کمر صرف
اس کے سامنے کا منظر دکھا سکتا تھا اس لیے اسے یہ ڈر نہیں تھا
کہ اس کی یہ حرکت کہیں دیکھی جاسکے گی۔

"ٹھیک ہے، اب پھوٹ لے۔ یاد رکھنا اگر مڑ کر
پچھے دیکھا تو گولی مار دوں گا۔" کام ہوتا دیکھ کر اس شخص نے
اسے سخت لہجے میں نیا حکم دیا اور وہ واقعی ایسے وہاں سے
نکل کر بھاگا جیسے سچ گولی مار دیے جانے کا ڈر ہو۔

"تھینک گاڈ۔ ان کے موڈ سے تو ایسا لگ رہا تھا کہ
شاید مجھے بھی روک کر یرغمال بنالیں گے۔" پولیس والوں

ہارے علاقے کی بجلی بند کر دی گئی۔ یہ وہ وقت تھا جب میٹر کے لائسنس ہولڈر سمیت ہر شخص کو بہت پیچھے دھکیل دیا گیا تھا اور کسی شخص کو اجازت نہیں تھی کہ وہ اپنے موبائل فون کی بجلی سمیت کسی قسم کی روشنی جلائے۔ اس گھپ اندھیرے میں کمانڈرز آنکھوں پر ٹائٹ ویژن گلاسز چڑھائے بڑی ہمارت سے عمارت کی طرف بڑھ رہے تھے۔ معاذ بھی ہمارے کمرے کو ٹائٹ موڈ پر کیے اس سارے آپریشن کا اپنا اپنے کمرے کے لیے ان کے ہمراہ تھا۔ ایس ایس پی ٹھاکر کی عین بندی کے لیے ایک کمانڈر کو اس کے ساتھ منتقلی کے لیے اس کی حفاظت کے لیے ایک کمانڈر کو اس کے ساتھ منتقلی کر دیا تھا۔

”مجھے نہیں لگتا کہ تم اپنے چیلن کے لیے کوئی دھانسو ہاپ کی ویڈیو بنا سکو گے۔ زیادہ چانس تو اس بات کا نظر آ رہا ہے کہ وہ سب ہمیں مزے سے سوئے ہوئے ملیں گے۔“ اس کے ساتھ تھی کمانڈر نے آگے بڑھتے ہوئے سرگوشی میں اظہار خیال کیا۔ اندر کی مسلسل خاموشی سے انہوں نے گمان کر لیا تھا کہ وہ لوگ بھجوا یا جانے والا کھانا کھا کر غافل ہو چکے ہیں۔

”دیکھتے ہیں۔“ اس نے مختصر جواب دیا اور عین اسی وقت دھماکے کی زوردار آواز پر انہیں اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونسی پڑیں۔ دھماکا عین مرکزی دروازے کے سامنے ہوا تھا اور سب سے آگے جانے والے دو کمانڈرز اس کی زد میں آ گئے تھے۔

”بزنڈ گرینڈ مارا ہے سالوں نے۔“ اس کا ساتھی کمانڈر بڑبڑایا۔

”لیکن مارا کدھر سے ہے۔ ادھر تو کوئی ونڈو بھی نظر نہیں آ رہی۔“ اس نے سر اٹھا کر گرینڈ چھینکے جانے کے مقام تعین کرنا چاہا اور یکدم چونک گیا۔ معاذ نے نہ صرف اس کا چونکنا محسوس کیا بلکہ چونکنے کی وجہ بھی سمجھ گیا۔ اب اس کا حرکت میں آنا ناگزیر تھا۔ کسرا چھوڑ چھاڑ وہ کسی جیتے کی پھرتی سے حرکت میں آیا اور اپنے ساتھ موجود کمانڈر کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔ وہ جو پوری توجہ ادھر کی طرف مرکوز کیے ہوئے تھا، اس افتاد پر بوکھلا گیا۔ سنہیلنے اور کچھ کرنے کی ہمت دیے بغیر معاذ نے پوری قوت سے اس کی گردن مروڑ لی۔ وہ بے چارہ کوئی احتجاجی آواز بھی نہیں نکال سکا۔ معاذ نے اس کے ہتھیار اور گلاسز پر قبضہ جمایا اور بریگتا ہوا پھرتی سے آگے بڑھا۔ چشم تصور سے وہ، وہ منظر دیکھ سکتا تھا جسے دیکھنے کی پاداش میں اس کے ساتھی کمانڈر کو اس کے ہاتھوں کا کمال دیکھنا پڑا تھا۔

ہوا کچھ یوں تھا کہ اس بلڈنگ کے بائیں جانب چند سوگز کے فاصلے پر موجود ایک دوسری بلڈنگ کی چھت پر دیپ کے ساتھیوں نے ڈیرا ڈال رکھا تھا۔ ان کے پاس ایک مخصوص ساخت کی گن موجود تھی جو بلیٹ تو فائر نہیں کرتی تھی لیکن بلیٹ جیسی ہی رفتار سے اس سے ایک مخصوص ساخت کی ایسی شے فائر ہوتی تھی جس کا اگلا حصہ قیف کی طرح پھیلا ہوا اور اندر سے خالی تھا جبکہ پچھلے ڈنڈی نما حصے کے ساتھ ایک پتلی لیکن مضبوط ڈوری کا سرا منسلک تھا۔ نشانہ لینے والے نے بجلی بند ہونے سے پہلے ہی اپنا نشانہ باندھ لیا تھا چنانچہ جب اندھیرا ہوتا ہی اس کی انگلی نے حرکت کی تو قیف نما حصہ ... سارے ہنگامے کا مرکز عمارت کی دیوار پر عین اس کے طے کردہ مقام پر جا کر چپک گیا۔ وہاں ظاہر ہے پہلے سے کوئی تیار بیٹھا تھا۔ اس نے جھوٹی سی قیف کو دیوار پر سے اکھاڑا ہوگا اور سی کو کسی مضبوط مقام سے باندھ کر آگے کی کارروائی شروع کر دی ہوگی۔ اس کارروائی کی راہ میں کوئی رکاوٹ اس لیے بھی نہیں تھی کہ دیوار کے لیے دیپ کے خط کے ساتھ ایک ٹائٹ ویژن پہنچا کر معاذ نے انہیں اندھیرے میں اندھا ہونے سے بچالیا تھا۔ ہاں، اوپر چھت سے بزنڈ گرینڈ چھینک کر جاتے جاتے تھے فٹن کوزک پہنچانے کا خیال یقیناً دیوار کا ہوگا جس کی وجہ سے اس کا ساتھی کمانڈر اس طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ اس نے اسے بروقت خاموش تو کر دیا تھا لیکن اندیشہ تھا کہ کوئی اور بھی متوجہ ہو سکتا ہے۔ یہ اندیشہ اسے اپنی ست میں حرکت کرنے والے کمانڈرز سے زیادہ تھا کیونکہ ان ہی کا زاویہ ایسا بن رہا تھا کہ وہ سر اٹھاتے تو عمارت کے بائیں پہلو میں جاری کارروائی دیکھ سکتے تھے۔ وہ خود بھی یہ کارروائی دیکھ رہا تھا۔ اندھیرے کے باعث نہ نظر آنے والی رسی پر پھسل کر دوسری طرف جاتا انسانی جسم ٹائٹ ویژن میں سبز دھبے کی صورت نمایاں تھا۔ رسی اس زاویے سے باندھی گئی تھی کہ یہاں سے دوسری عمارت تک بتدریج ڈھلان سی بن رہی تھی اور اسی لیے رسی پر پھسلنے کی رفتار زیادہ تھی۔

فرار کے اس منظر پر بس ایک نگاہ ڈال کر وہ اپنے پیچھے آنے والوں کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ ایک دوسرے سے قدرے فاصلے پر اسی جانب چلے آ رہے تھے۔ وہ سبز دھبوں کی صورت انہیں آگے بڑھتا دیکھتا جا رہا تھا۔ پھر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ ان میں سے ایک کی نظر اس سمت اٹھ گئی جہاں ڈوری سے پھسلتا ایک اور انسانی جسم دوسری عمارت میں منتقل ہو رہا تھا۔ اسے سمجھنے اور اپنی آنکھوں پر

اس لیے اس کا سر بُری طرح پکڑا لگا تھا۔ اس کی حالت دیکھتے ہوئے اس سے پوچھ گچھ پھوڑ کر اسے طبی امداد کے لیے پیچھے بھجوا دیا جانے لگا۔

ادھر معاذ تاریکی اور بدبو کو سہتا آگے بڑھ رہا تھا۔ عمارت چونکہ ابھی آباد نہیں ہوئی تھی اس لیے سیدرتج سسٹم ایسا کوئی بوجھ نہیں تھا لیکن بند جگہ کی اپنی ہی ایک گھٹن اور ہوتی ہے۔ اس گھٹن اور بوجھ کو سہتا وہ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ ساتھ ساتھ اس کے دماغ میں وہ نقشہ بھی چل رہا تھا جو اس نے آج دوپہر ہی دلپ کے ساتھ بیٹھ کر ڈسکس کیا تھا۔ نتیجے کے مطابق اس سیدرتج لائن کا ایک دہانہ اس عمارت سے کچھ ہی آگے سڑک کنارے تھا اور دوسرا اور آخری دہانہ کافی آگے تھا۔ اگر وہ آخری دہانے سے باہر نکلتا تو لازماً اندر اندر اس عمارت سے کافی آگے نکلنے میں کامیاب ہو جاتا لیکن اس کا ایک نقصان یہ بھی تھا کہ اگر باہر والوں کو اس کے فرار کے راستے کا علم ہو جاتا تو انہیں اس آخری دہانے پوری تیاری سے اس کے استقبال کی مہلت مل جاتی۔ ابھی بس انہوں نے بعض احتیاطی تدبیریں دبانوں پر ایک ایک آدمی کی ڈیوٹی لگا رکھی تھی۔ ان کو مزید نفری استعمال کرنے کی مہلت نہ دینے کے لیے اس نے فوری آنے والے قریبی دہانے سے باہر نکلنے کا فیصلہ کیا۔ ڈھکن ہٹا کر سر باہر نکالے بغیر ہی باہر کی سن گن لیتے ہوئے اسے اس بات کا توازن انداز ہو گیا کہ علاقے کی بجلی ابھی تک بحال نہیں ہوئی ہے۔ ساڑھے گیارہ بجے سے پہلے ایسا ہونا بھی نہیں تھا۔ ایئر ایس بی لٹھا کرنے اس کے کہنے پر خاص طور پر یہ ہدایت جاری کی تھی۔ اس پر کسی کو اعتراض بھی نہیں ہوا تھا کیونکہ ان کے خیال میں چونکہ ان کے کمانڈرز کی اکثریت کے پاس ٹائٹ ویژن موجود تھیں اور دوسرے اس سے محروم تھے تو اندھیرا ان کے حق میں بہتر ثابت ہونے والا تھا۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ اس فیصلے کے نتیجے میں وہ بعد میں اپنا سر پیٹنے والے تھے۔

باہر کے حالات کو سازگار محسوس کر کے اس نے سر باہر نکالا۔ دہانے کے قریب ایک سنتری موجود تھا لیکن اس کی توجہ کسی اور طرف مبذول تھی۔ ماحول کو سازگار پاتے ہوئے وہ احتیاط سے باہر رینگ گیا۔ ابھی زمین پر قدم جمائے ہی تھے کہ سنتری اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس سے قبل کہ وہ کوئی ایکشن لے پاتا، معاذ نے اس پر چلاٹنگ لگائی اور اپنے ساتھ لیتے ہوئے زمین پر گر دیا۔ مرنے سے اس کی گن ہاتھ سے نکل گئی۔ اس نے ٹپ کر اس کی گرفت

یقین کرنے میں شاید کچھ لمبے لگے پھر اس نے اپنے ساتھی کو پکار کر اس طرف متوجہ کیا۔ اگلے لمبے ان میں سے ایک نے اپنے ہتھیار کا رخ بلندی کی طرف کیا اور دوسرے نے گریبان کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ یقیناً وہ جو دکھائی دیا اس سے دوسروں کو آگاہ کرنے جا رہا تھا۔ اگر ایسا ہو جاتا تو سب اکارت چلا جاتا۔ پولیس کے لیے اس بلڈنگ کی طرح اس دوسری بلڈنگ کو بھی ٹھیر لینا کوئی مشکل نہیں تھا۔ فیصلہ کرنے کے لیے وقت لینے کی مہلت نہیں تھی اس کے پاس چنانچہ اپنے ہتھیار کو برسٹ پریٹ کیا اور ٹریگر دبا دیا۔ گولیاں ایک باڑھ کی صورت ان دونوں کی طرف بڑھیں اور ان کے جسموں کو چھیدتی چلی گئیں۔ ہیلمٹ اور بلٹ پردف جیکٹس پورے جسم کو تحفظ فراہم نہیں کر سکتی تھیں۔ اس کی چلائی گئی گولیوں نے ایک کے چہرے کو نشانہ بنایا جبکہ دوسرے کے بازو اور نچلا جسم چھدتا چلا گیا۔ فراریوں کی طرف ہتھیار بلند کرنے والے کا چہرہ نشانہ بنا تھا۔ مرتے مرتے اس کی انگلی کے خود کار دباؤ کے باعث اس کے ہاتھوں سے آخری فائر ہوا اور وہ الٹ کر پیچھے گر گیا۔

اب معاذ کے پاس گنجائش نہیں کتنی کہ مزید وہاں ٹھہرتا۔ گولیاں کھانے والوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر وہ سانپ کی سی پھرتی اور تیزی سے رینگتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ اس کا رخ عمارت کی بائیں جانب موجود آٹھ دس فٹ چوڑی گزرگاہ کی طرف تھا۔ اس گزرگاہ تک پہنچ کر اس نے اندازے سے لوہے کے اس ڈھکن کو اٹھایا جو عمارت کے جدید سیدرتج سسٹم کا ہی ایک حصہ تھا۔ حکم کے مطابق اس کے ساتھ موجود کمانڈر کو اسی ڈھکن تک پہنچ کر ڈیوٹی دینا تھی اور نگرانی کرنا تھی کہ آپریشن شروع ہونے کے بعد کوئی شخص اس طرف سے فرار ہونے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ معاذ کا ارادہ تھا اپنے ساتھی کو اسی مقام پر پہنچ جانے کے بعد ناکارہ بنائے گا لیکن اس کی سانس پہلے ہی پوری ہو چکی تھی تو وہ کیا کر سکتا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر لوہے کا وہ ڈھکن اٹھایا اور خود اندر اتر گیا۔ نیچے اترنے کے لیے لوہے کی سیڑھی موجود تھی۔ اس سیڑھی پر کھڑے ہو کر اس نے ڈھکن کو واپس اس کی جگہ پر رکھ کر دیا۔ اب نیچے گھور اندھیرا اور سناٹا تھا اور اوپر ایک ہنگامہ۔ چہرے پر گولی کھانے والا تو یقینی طور پر مرنے کا تھا لیکن زخمی سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ وہ تکلیف کی شدت سے کراہتا کچھ بتانے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ ایک ساتھ کئی گولیاں لگنے کے باعث تکلیف اور جریان خون دونوں کا تناسب بہت زیادہ تھا۔

یقیناً وہ تمہارے بھیا اور باقی ساتھیوں کے نکلنے سے پہلے پہلے اس کمارت کے گرد گھیرا ڈالنے میں کامیاب رہے گا جہاں وہ اس وقت موجود ہیں۔ اس کا لہجہ دلپ سے کہیں زیادہ سنجیدہ تھا۔

”وہ اس وقت حیدر آباد کے لوہا بدر الدین کی پناہ میں ہیں۔ میں نے تمہیں ان کا پتا بتا دیا لیکن ان تک پہنچنا اور انہیں وہاں سے نکالنا تمہاری اپنی ذمہ داری ہوگی۔“
روکے لہجے میں اسے اطلاع دے کر دلپ نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ اسے بھی اس سے مزید بات کرنے کی خواہش نہیں تھی۔ موبائل آف کر کے اس سے سم نکالی اور اسے دو کلوں میں تقسیم کر کے ایک جانب اچھال دیا۔ چند قدموں کے فاصلے پر موبائل بھی کسی دوسری سمت اچھال دیا گیا۔ وہ اپنی زندگی سے دیوا اور دلپ کا باب خارج کر رہا تھا۔ وہ کون تھے؟ حکومت سے ان کی کیا لڑائی تھی اور آگے چل کر وہ پہنچنے والے تھے یا نہیں، اسے اس سب سے کوئی غرض نہیں تھی۔
اس کے بعد ان کے درمیان سارے حساب برابر ہو گئے تھے اور اب اسے سارا زور دوستوں کو بچانے اور دشمنوں سے نشہ میں صرف کرنا تھا۔

☆☆☆

اگلے دو دن اس نے اسی کھولی تک محدود رہ کر گزارے تھے۔ صرف کھانا کھانے اور چائے پینے کی غرض سے باہر نکلتا تھا اور کئی اوقات ہوتے تھے جب خبرنامے کے ذریعے اسے حالات کا علم ہو جاتا تھا۔ دلپ اور دیوا منظر سے مکمل غائب تھے۔ پولیس ان کی تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مار رہی تھی لیکن مسلسل ناکامی کا سامنا تھا۔ پولیس کی ناکامی پر تنقید کے ساتھ ساتھ مسلسل یہ سوال بھی اٹھایا جا رہا تھا کہ وہ اینکر پرسن کون تھا جو کمانڈو ایکشن کے دوران ایس بی کی اجازت سے ایکشن کی براہ راست فلم بندی کے لیے کمانڈوز کے ساتھ گیا تھا لیکن پھر بعد میں اس کا کوئی نام و نشان نہیں ملا تھا۔ نیوز چینل نے اس بات سے صاف انکار کر دیا تھا کہ انہوں نے ایسا کوئی اینکر بھیجا تھا۔ ان کا دفتری ریکارڈ بھی ان کے بیانے کی تائید کر رہا تھا۔

دوسری طرف حالات بتا رہے تھے کہ کمانڈوز کی ناکامی اور مجرموں کے فرار میں سوئوشرما کے نام سے خود کو متعارف کروانے والے اینکر کا بڑا ہاتھ تھا۔ اس اینکر کو لے کر جہاں طرح طرح کی قیاس آرائیاں کی جا رہی تھیں، وہاں ذمہ داران پر بھی انگلیاں اٹھ رہی تھیں کہ کیسے تصدیق کیے بغیر ایک باہر کے آدمی کو اتنے اہم آپریشن کا

یہ کام کیا لیکن کامیاب نہ ہو گا۔ معاذ نے اپنے کھینے کا سارا بوجھ اس کے سینے پر منتقل کر کے اسے ہٹنے سے تقریباً معذور کر دیا۔ اس نے کوشش کی کہ اپنے آزاد ہاتھوں کا استعمال کرتے ہوئے معاذ کو اپنے اوپر سے دھکیل سکے لیکن اس کا اس پر بھاری ثابت ہوا اور کپٹی پر تو اتار سے دو ایسے سارا اس کے بڑے کہ اس کے لیے اپنے حواس قائم رکھنا زوردار کے برابر۔ معاذ نے اپنی اور اس کی گن اٹھا کر کھلے دہانے سے اندر چھٹی اور ڈھکن کو داپس فکس کر دیا۔ یہاں اس جگہ پر کوئی موجود نہیں تھا اس لیے اس ساری کارروائی کو دیکھنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ اس نے ایک نظر سڑک کے پار نظر آنے کلب پر ڈالی۔ بجلی نہ ہونے کے باوجود اس کے شیشے کے دروازوں اور کھڑکیوں سے روشنی چھن کر باہر آرہی تھی اور ساتھ ہی شوخ دھن میں بجنے والے انگریزی گانے کی آواز بھی۔ سنتری بیزار کن ڈیوٹی ادا کرتے ہوئے اسی رونق کی طرف متوجہ ہو گیا تھا جب ہی اسے ڈھکن ہٹائے جانے کا پتا نہ چل سکا اور آسانی سے معاذ کے ہاتھوں شکار ہو گیا۔ اس کی یہ غفلت معاذ کے لیے تو نعمت، ہی ثابت ہوئی تھی اور اب دو لمبے لمبے قدم اٹھاتا سڑک کی دوسری جانب جا رہا تھا۔ گن کے ساتھ ساتھ اس نے سر پر پہنے ہیلیمٹ سے بھی نجات حاصل کر لی تھی۔ بلٹ پروف البتہ اس نے اب بھی نہیں اتاری تھی۔ اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ قمیص کے نیچے ہونے کی وجہ سے وہ نظر نہیں آرہی تھی۔ اس لیے اسے امید تھی کہ کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوگا۔ سڑک پار کر کے دوسری طرف جاتے ہوئے اس نے پولیس کی گاڑیوں کے سائرن کے ساتھ ساتھ ایسبولینس کے ہوٹروں کی آوازیں بھی سنیں۔ یقیناً زخمیوں اور لاشوں کو اسپتال منتقل کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا گیا تھا۔

وہ سڑک کے پار ٹائٹ کلب کے باہر گئے سی سی وی کیمرے سے بچتا ہوا ایک بغلی کٹی میں گھسا اور وہاں سے گزرتے ہوئے اپنی جیب سے موبائل نکال کر اسے آن کیا۔

”کام ہو جانے کی اطلاع مل گئی ہوگی تمہیں۔ اب مجھے میرے دوستوں کا پتا بتاؤ۔“ کہیں بھی ر کے بغیر اس نے ایک نمبر ملا یا اور دوسری طرف سے ”ہیلو“ سنتے ہی بلا تمہید مطالبہ کیا۔

”اگر میں نہ بتاؤں تو؟“ دوسری طرف موجود دلپ نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”تو میں اگلی کال ایس ایس پی ٹھاکر کو ملاؤں گا اور

عقل پر ترجیح دیتے ہوئے مدت پوری ہونے پر صبر کیا۔ انگریزی اخبار خریدنا جس کا نام سونیا نے بتایا تھا اور اشتہارات والا صفحہ کھول کر بیٹھ گیا۔ جلد ہی اسے اپنا مطلوبہ اشتہار مل گیا۔ اشتہار میں دیے ہوئے نمبر پر رابطہ کر کے تجویز کردہ الفاظ دہرائے تو جواب ملا۔

”آپ کی اپیلی کیشن پر دسکس میں ہے۔ پانچ دن بعد دوبارہ رابطہ کریں۔“

وہ محتاط تھا اس لیے دوبارہ رابطے کے لیے نیا کال آفس ڈھونڈا اور ایک بار پھر ان ہی الفاظ میں اپنا تعارف کروایا۔ اس بار فوراً ہی سونیا سے رابطہ کروا دیا گیا۔

”قون پر لمبی بات نہیں کروں گی۔ ایک گھنٹے میں ریلوے اسٹیشن پہنچو۔ وہاں راجدھانی ٹرین احمد آباد جانے کے لیے تیار کھڑی ہوگی۔ اس میں سوار ہو جاؤ۔ میں تمہیں وہیں ملوں گی۔“ ادھر ادھر کی کوئی بات کیے بنا اس نے معاذ سے کہا اور ساتھ ہی ضروری معلومات بھی فراہم کر دیں کہ ٹرین میں وہ اسے فرسٹ کلاس کے کس کوپے میں ملے گی۔ معاذ کو اس کا یہ پروگرام عجیب لگا لیکن چونکہ وہ اسے آزمانے کا فیصلہ کر چکا تھا اس لیے کسی پس دہش کے بغیر ہائی بھرلی۔ ایک گھنٹے بعد وہ ٹرین کی فرسٹ کلاس کے ایک کوپے میں موجود تھا۔ سرخ تختل سے مزین 3x7 کے گدیلے کاؤچ پر زرد ساڑی پہن کر بیٹھی سونیا نے مسکرا کر اس کا استقبال کیا۔ کوپے کی سجاوٹ فرسٹ کلاس کے شاہانہ شان تھی۔ خوب صورت لائٹ شیڈز، سرہانے لگے ننھے لیپ، اسٹینڈ پر آویزاں منرل واٹر کی بوتلیں، اوپر برتھ پر صاف ستھری چادریں اور نیچے۔ ایک آرام دہ سفر کے لیے کہیں کوئی کمی نہیں تھی۔

”میں نے سوچا کہ شہر میں کہیں ملنے کے بجائے ساتھ مل کر سفر کرتے ہیں۔ کسی کی نظروں میں آنے کا ڈر بھی نہ ہوگا اور تمہیں بھی یہ فکر نہیں ستائے گی کہ میرے آدمی کسی بھی لمحے تمہیں چھاپنے کے لیے نازل ہونے والے ہیں۔“ دھیمے سروں میں بولتی وہ اس کی توجہ اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ وہ اس سے کتنی ہی نفرت کرتا، اس کی خوب صورتی سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ وہ حسیناؤں کی اس قسم سے کتنی جن پر مشرقی اور مغربی ہر دو طرح کا لباس یکساں طور پر چلتا ہے اور دیکھنے والی آنکھیں فیصلہ نہیں کر پاتیں کہ کس روپ کو کس پر ترجیح دیں۔

”اگر تم ایسا کچھ کرنے کا ارادہ رکھتی ہو تو پھر شہر یا اس ٹرین سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجھے معلوم ہے کہ یہاں بھی

حصہ بنالیا گیا۔ ایس ایس پی ٹھاکر کڑی تنقید کی زد میں تھا۔ کسی نے اس کی گاڑی میں لوٹوں سے بھرے بریف کیس کی موجودگی کی خبر بھی اڑادی تھی لیکن بہر حال جھگے کی طرف سے اسے بہت زیادہ کھل کر کچھ نہیں کہا جا رہا تھا اور صرف اتنا سننے میں آیا تھا کہ ایس ایس پی اور دوسرے متعلقہ لوگوں سے انکوائری کی جا رہی ہے۔ بطور سونو شرمیکسروں کی زد میں آنے والی کچھ تصاویر بھی میڈیا پر شیئر کی جا رہی تھیں۔ ان تصاویر کے پھیلنے پر اسے کوئی فکر نہیں تھی کہ اس وقت وہ اتنے بھرپور میک اپ اور مختلف حلیے میں تھا کہ اس کے کسی جان پہچان کے فرد کے لیے بھی اسے شناخت کرنا ممکن نہیں تھا۔ ڈھاپے پر اس کے ساتھ بیٹھ کر خبریں سننے والے تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ اول جلول کپڑوں، بکھرے بالوں اور بے ترتیب ڈاڑھی کے ساتھ ان کے درمیان موجود بظاہر یہ عام سا شخص وہی سونو شرم ہے جو اس وقت دہلی کی پولیس کو سب سے زیادہ مطلوب ہے۔

اس سارے ہنگامے میں سب کے سسرالی خاندان کی بھی کوئی نہ کوئی خبر مل جاتی تھی۔ شکیل اور جلیل کی تدفین ہو چکی تھی جبکہ فیصل اور پانڈے ابھی تک اسپتال میں تھے۔ پانڈے کو بہت شدید زخم نہیں آئے تھے لیکن فیصل کی حالت تشویش ناک بتائی جا رہی تھی۔ ڈاکٹروں نے عندیہ دیا تھا کہ زندگی بچ جانے کی صورت میں بھی اس کو ہمیشہ کے لیے اپنی ایک ٹانگ سے محروم ہونا پڑے گا۔ میڈیا اس واقعے اور دیوانے دشمنی کی بنیاد کھوجنے کی ٹنگ دو دو میں لگا ہوا تھا۔ اہل خانہ سے طرح طرح کے سوال کیے جا رہے تھے لیکن کوئی بتاتا بھی تو کیا بتاتا۔ جو لوگ اس واقعے کی حقیقت سے واقف تھے، ان میں سے کوئی بھی کچھ بتانے کے لائق نہیں رہا تھا۔ پیچھے جو باقی بچ گئے تھے، انہیں تو خود کو سنبھالنا بھی مشکل ہوا جا رہا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ یہ ساری خبریں ٹی وی کے ذریعے سب تک بھی پہنچ رہی ہوں گی اور وہ شدید اضطراب کا شکار ہوگی لیکن اس کے پاس اس کے لیے کوئی حرف تسلی نہیں تھا چنانچہ دو دنوں سے چپ سا دمے بس وقت گزار رہا تھا، یہاں تک کہ عالم اور سرمد کے بارے میں یہ جان لینے کے باوجود کہ وہ حیدر آباد کے کسی بدرالدین کے ہاں موجود ہیں، ان تک رسائی کے لیے کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا تھا۔ اس نے اپنا ہر قدم سونیا سے ختمی بات ہونے تک کے لیے روک رکھا تھا۔ کہنے کو وہ اس کی دشمن نہیں تھا لیکن کچھ تھا جو اسے اس کو سچا مان لینے پر اکسار رہا تھا۔ اپنے اندر کی اس آواز کو اس نے

معاذ نے طنز یہ لہجہ میں دریافت کیا۔
 ”اگر میں ایسا کچھ کرنا چاہتی تو یہاں اس طرح تمہارے سامنے نہ پیشی ہوتی۔“ وہ جیسے اس کے طنز پر تڑپ اٹھی تھی۔

”تمہاری یہ کیا پلٹ مجھ سے ہضم نہیں ہو رہی۔“ اس نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

”میں خود اپنی اس جرأت پر حیران ہوں۔ تمہاری بے یقینی کیسے دور کروں؟“ وہ اداس سی مسکرائی اور پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”شاید میں ایک قیدی کی سی زندگی گزارتے گزارتے تھک گئی ہوں اور چاہتی ہوں کہ زندگی میں کچھ تو ایسا کروں جو میری مرضی کے مطابق ہو۔“
 ”تم اور قیدی.....؟“ اس کے لیے سونیا کا جواب مزید حیران کن تھا۔

”قید صرف جسمانی نہیں ہوتی۔ کسی کے دل و دماغ پر قابض ہو کر اس کے ہر عمل کو اپنے تابع کر لیتا بھی قیدی ایک قسم ہے۔ میں جو تمہیں اتنی ماؤرن اور آزاد نظر آتی ہوں، کبھی اپنی زندگی کا کوئی فیصلہ اپنی مرضی سے نہیں کر سکتی۔ مجھے کبھی اتنی ذہنی آزادی دی ہی نہیں گئی۔“
 ”کیا واقعی؟“

”اگر یہ سچ نہ ہوتا تو کیا میں داراب جیسے شخص کی بیوی ہوتی؟“ اس نے ایک ایسی دلیل دی جسے نظر انداز کرنا آسان نہیں تھا۔ معاذ کی نظروں میں گوشت کے پہاڑ جیسے داراب خان کا وجود گھوم گیا۔ وہ واقعی کسی طرح سونیا جیسی طرح دار عورت کا شوہر ہونے کے لائق نہیں تھا۔
 ”کیوں کی تمہی تم نے داراب سے شادی؟“ وہ اپنی گفتگو میں اتنے محو ہو چکے تھے کہ ٹرین کب حرکت میں آئی، اس کا بھی احساس نہ رہا۔

”اوپر والوں کے حکم پر۔ داراب خان پاکستان اور افغانستان کے درمیان اسلحے اور فشیات کا سب سے بڑا ڈیلر تھا۔ اس کے ساتھ رہ کر میں ہر ڈیل اپنے اوپر والوں کے حکم کے مطابق طے کرواتی تھی۔ بہت کام نکلوائے گئے داراب کے ذریعے۔ وہ کہاں کہاں استعمال ہوا، خود اسے بھی پتا نہیں چلا۔ میں اس کی ناک کے نیچے اس کے وسائل کو دوسرے مقاصد کے لیے استعمال کرتی رہی اور وہ مجھے کچھ نہیں کہہ سکا۔ یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کوئی بہت بے وقوف انسان تھا لیکن اس کی آنکھوں پر میرے حسن کی مٹی کچھ اس طرح بندھی تھی کہ دیکھتے بھالتے بھی بہت کچھ نظر انداز کر دیتا تھا۔ بس آخری دنوں میں ایسا لگنے لگا تھا کہ ہمارے درمیان کچھ

ہمارے لیے کام کرنے والے اتنے لوگ ہیں کہ ایک اشارے پر اس پوری ٹرین کو گھیرا جاسکتا ہے۔“ وہ جواب دیتے ہوئے اطمینان سے بیٹھ گیا۔

”جو بندہ دہلی پولیس کے ٹھہرے میں پھنسے مجرموں کو فرار کروا دے اور خود بھی صاف بچ نکلے، اسے میرے آدمیوں کا گھیرا بھلا کہاں روک سکتا ہے۔“ ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی تو وہ ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ بے شمار لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے باوجود وہ اس مکار حسینہ کی تیز نظروں سے نہیں بچ سکا تھا۔

”تمہیں خواجواہ اس جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہیے تھا۔ تمہارے لیے پہلے ہی حالات اتنے سخت ہیں اور تم نے لے کر ایک اور معاملے میں اپنی ٹانگ اڑادی۔“ اس بار وہ چہرے پر قدرے سنجیدگی طاری کیے اس سے مخاطب تھی۔

”خواجواہ نہیں الجھا۔ اس کام کے بدلے ایک ڈیل کی ہے۔“ اس نے عالم شاہ اور سرمد کا پتا حاصل کرنے سے متعلق، دلیپ سے ہونے والی ڈیل کے بارے میں اسے مختصر آگاہ کیا۔

”یعنی ابھی تمہارا انڈیا سے نکلنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے اور تم اپنے دوست کے مسئلے میں الجھنے والے ہو؟“
 ”بالکل۔“

”میں چاہتی تھی کہ آج کی اس ملاقات میں تمہیں یہاں سے نکال دینے کے معاملے پر گفتگو کریں۔ میں انڈیا اور پاکستان دونوں سے دور کسی محفوظ مقام پر تمہاری رہائش کا انتظام کر سکتی ہوں۔“ وہ اس کے فیصلے پر کچھ خوش نہیں دکھائی دے رہی تھی۔

”میرے خیال میں تمہاری اس تجویز کو تو میں پچھلی ملاقات میں ہی رد کر چکا تھا اور آج تم مجھے یہ فیصلہ سنانے والی تھیں کہ تم میرا ساتھ دو گی یا نہیں؟“ اس نے سونیا کے چہرے کو ٹٹولا۔ اسی وقت ٹرین نے دسل دی۔ وہ چلتے کے لیے بالکل تیار تھی۔

”میڈم میری کارکردگی سے خوش نہیں ہے۔ اگرچہ میں نے اپنی پوزیشن کلیئر کرنے کے لیے تمہارے اور ڈاکٹر فردوس کے روابط کے ثبوت اسے فراہم کر دیے ہیں اور مزید بھی کچھ معلومات فراہم کی ہیں لیکن اسے شکوہ ہے کہ میں اپنا سنڈریٹ ہاسٹ نہیں دے رہی ہوں۔ وہ تمہاری گرفتاری یا موت سے کم کی بات پر راضی ہونے کے لیے تیار نہیں ہے۔“

”تو پھر تم نے دونوں میں سے کس کا فیصلہ کیا ہے؟“

پیدا ہو گیا ہے لیکن داراب کو مکمل کر اس کے اظہار کا موقع نہیں ملا اور وہ اپنی زندگی ہار گیا۔“

”ہار گیا یا تم نے خود اپنے ہاتھوں اس کی زندگی کا باب بند کر دیا؟“ وہ ایک بار پھر سونیا پر طنز کا تیر چلائے بغیر نہ رہ سکا۔

”اس کی موت بشری کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ وہ خان ہاؤس میں پناہ گزین تھی۔ میری غیر موجودگی میں داراب نے اس کے ساتھ دست درازی کی کوشش کی اور نتیجے میں اپنی جان سے چلا گیا۔ میں نے تو صرف اتنا کیا تھا کہ بشری کو اس قتل کے الزام سے محفوظ رکھا تھا۔“ معاذ کے طنز کے جواب میں اس نے نہایت سادگی سے حقیقت اس کے سامنے گوش گزار کی۔

”باجیا ماؤں کی گود میں پل کر جوان ہونے والی لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ بشری کے لیے بھی اپنی عزت اپنی پاکیزگی دوسرے کی جان سے زیادہ قیمتی شے تھی۔“ پتا نہیں کیوں وہ اسے مسلسل کچھ لگائے جا رہا تھا۔ اس موقع پر اسے بشری کی والدہ عائشہ بھی شدت سے یاد آئی تھیں۔ برطانیہ کے آزاد معاشرے کو چھوڑ کر پاکستان میں آسینے والی ان خاتون نے اسلام کو کچھ اس طرح اپنایا تھا کہ پیدائشی مسلمانوں کو پیچھے چھوڑ گئی تھیں لیکن ان باجیا خاتون کے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی تھی۔ انہیں شوہر اور بیٹی کی موجودگی میں پامال کیا گیا تھا اور اس حادثے میں وہ اپنی جان کی بازی ہار گئی تھیں۔ افسوس کی بات یہ تھی کہ ان سے ان کی زندگی اور عزت چھیننے والے بھڑیے اب بھی آزادی سے گھوم رہے تھے۔

”ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن وہ کیا کرے جسے تربیت کے لیے ماں کی گود کے بجائے ایک ایسی تربیت گاہ میسر آئے جہاں انسان کو بطور انسان نہیں بلکہ بطور پروڈکٹ پر دان چڑھایا جائے اور پھر اس پروڈکٹ کے ذریعے صارفین کے دل و دماغ کو اپنے قبضے میں لے کر اپنے من مانے فیصلے کروائے جائیں۔“ اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا جس نے اس بار معاذ کی زبان کو گنگ کر دیا اور وہ یک ٹک اس کی طرف دیکھے گیا۔ اس کا ایک ایک نقش قدرت کی فیاضی کا نمونہ تھا۔ آنکھ، ناک، لب..... کہیں کچھ ایسا نہیں تھا جس میں کسی کی بیٹی کا احساس ہو۔ جسمانی خدو خال بھی ایسے تھے جیسے کسی ماہر مجسمہ ساز نے ایک ایک انگ کو اچھی طرح ناپ تول کر تراشا ہو۔ وہ ایسی تھی کہ وہ اسے ہمیشہ ثوبیہ کی خوب صورتی کے گن گانے والی علیینہ کے سامنے بطور

چیلنج پیش کر سکتا تھا۔

”بشری کہاں ہے؟“ اسے لگا کہ سونیا کا مسرنا جہاں سوز اس پر اثر انداز ہونے لگا ہے تو گھبرا کر اس سے بشری کی بابت دریافت کیا۔

”وہ نہیں رہی۔ باذل سے انتقام کی دھن نے اس سے اس کی زندگی چھین لی۔“ اس نے میڈم ایکس سے حاصل شدہ معلومات معاذ کو فراہم کیں۔

”اور تم مجھ سے کہتی ہو کہ میں سب کچھ بھولا بھال کر دنیا کے کسی گوشے میں چھپ کر اپنی زندگی کے دن پورے کر لوں؟ یہ جو اتنا قرض چڑھا ہے میری جان پر، کیا یہ مجھے کہیں کسی جگہ سکون سے چینی دے گا؟“

اس بار سونیا خاموش رہی اور بنا کچھ کہے اپنے ہاتھوں کی لکیریں دیکھتی رہی۔

”مجھے کچھ میڈم ایکس کے بارے میں بتاؤ۔ وہ کون ہے اور اس کی تنظیم کی حقیقت کیا ہے؟“ سونیا کو خاموش پا کر اس نے اس سے ایک ایسا سوال کیا جو بہت نازک تھا۔ اس سوال کے جواب کی بنیاد پر وہ اس کی نیت کو بھی کسی حد تک پرکھ سکتا تھا۔

”وہ ایک کٹر یہود ہے جو دنیا کی تمام اقوام پر برتری رکھنے کے زعم کے ساتھ ساتھ مسلمانوں سے خصوصی نفرت رکھتی ہے۔ وہ ایک ایسی بین الاقوامی سطح کی تنظیم کا حصہ ہے جس کی فڈنگ دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں کرتی ہیں۔ اسلحے اور نشیات کی اسمگلنگ کے علاوہ دہشت گردی کے لیے فری لانس خدمات بھی اس تنظیم کی آمدنی کا بڑا ذریعہ ہے۔ تنظیم کی جڑیں دنیا کے تقریباً ہر اہم ملک میں موجود ہیں لیکن میڈم ایکس نے اپنے لیے جنوبی ایشیا کا میدان عمل چن رکھا ہے۔ وہ اس بات کو یقینی بناتی ہے کہ خطے میں بھی مکمل امن و امان قائم نہ ہو سکے اور جہاں نفرت کی آگ پھیلی ہے وہاں یہ آگ مسلسل بھڑکتی رہے۔“

”اور تم..... تم کیسے ان کا حصہ بنیں؟“ اس کے پاس نہ ختم ہونے والے سوالات کا ایک سلسلہ تھا۔

”دنیا میں کچھ بچے ایسے بھی آنکھ کھولتے ہیں کہ انہیں جنم دینے والی ہستی نے محبت کے بجائے نفرت کے احساس کے ساتھ جنم دیا ہوتا ہے۔ میں بھی ایسی ہی ایک ہٹی تھی۔ چنانچہ میری ماں نے مجھے خود پالنے کے بجائے نفرت کی سوداگر اس تنظیم کے حوالے کر دیا۔ یوں میں اس روپ میں ڈھل گئی جس سے تم نفرت کرتے ہو۔“

”تمہاری ماں اب کہاں ہے؟“ اس نے جس سے پوچھا۔

”سب جان کر کیا کرو گے؟ تمہارے جاننے سے میری زندگی میں کچھ بدلنے تو والا نہیں ہے اس لیے بہتر ہے کہ اس پر بات کریں جس سے تمہیں فائدہ پہنچے۔“ وہ اسے بال گئی۔

”مجھے فائدہ پہنچانا چاہتی ہو تو میرا ساتھ دو اور مجھے اپنا جتیم کے اندر تک رسائی دو۔“ اس نے جھٹ مطالعہ کیا۔ ”یہ بعد کا کام ہے۔ پہلے تم اپنے دوست اور اس کے ملازم کو بازیافت کرواؤ تاکہ اسے اس کی بہن کے ساتھ پاکستان واپس بھیج کر کم از کم ایک بوجھ سے تو آزاد ہو جاؤ۔ جو کچھ تم کرنے کا سوچ رہے ہو، اسے کرنے سے پہلے اپنے دوست احباب کو محفوظ کر دینا زیادہ بہتر ہوگا۔“ اس کا مشورہ صاب تھا جسے ماننے سے وہ انکار نہیں کر سکا۔

”کیا تم اس کام میں میرا ساتھ دو گی؟“ جانے کیوں وہ اس سے پوچھ بیٹھا۔

”تم چاہو تو ضرور۔“ وہ نیم باز نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ ان نظروں میں کچھ ایسے جذبے جھلک رہے تھے کہ وہ خفیف سا ہو گیا اور اپنی نظروں کا رخ بدل لیا۔ اس کی اس حرکت پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”ایسا کون سا زعفران کا کھیت دیکھ لیا کہ تمہاری ہنسی رکھنے میں ہی نہیں آ رہی؟“ وہ اس کے یوں ہنسنے پر چڑ گیا۔ ”بس دیکھ رہی ہوں کہ میڈم انکس کا انتخاب، جس سے اس نے جانے کون کون سی امیدیں وابستہ کی ہوئی تھیں، ایک عورت کی نظروں کے تیر برداشت نہیں کر سکتا۔“ وہ اب بھی اس انداز میں مسکرا رہی تھی جس سے وہ چڑ محسوس کرے لیکن اس نے خود کو سنبھال لیا اور اسی کے الفاظ سے موضوع نکال کر منہ بناتے ہوئے بولا۔

”تمہاری میڈم نے اب تک مجھ سے ایک بھی ایسا کام نہیں لیا جس سے مجھے اندازہ ہو سکے کہ وہ مجھ سے کوئی اونچا کام لینا چاہتی تھی۔ سارے تھرڈ کلاس مشن میرے ذمے سونپے گئے تھے۔“

”اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔ بھارتی جاسوس روڈن ماتھر کو فرار کروانے کا مشن اہم تھا لیکن تم وہاں بھی میڈم کو چنا لگائے۔ ماتھر کو ایسا فرار کروایا کہ وہ زندگی کی قید سے علی آزاد ہو گیا۔“

”اس میں میرا کیا قصور تھا۔ وہ تو خود اس کا اپنا ہی دام بچھ گیا تھا کہ خود کو آزادی دلوانے والوں کو ہی گولیوں سے بھون کر رکھ دیا۔“ وہ معصوم بنا۔

”یہ معما تو خیر کسی سے حل نہیں ہو سکا کہ ایسا کیوں ہوا

لیکن یہ طے ہے کہ تمہاری کھوپڑی میں کوئی ایسا شیطانی دماغ فٹ ہے جسے پروفیسر وکٹر بھی کنٹرول نہ کر سکا۔ اگر ایسا ہو پاتا تو میڈم کے بہت سے سپنے بچ ہو جاتے اور وہ تم سے یہ چھوٹے چھوٹے کام لینے کے بجائے بڑے کام لیتی۔ تم نے تو اسے اس بری طرح زچ کیا کہ وہ تمہیں ضائع کر دیا کہ بھارتیوں سے دام کھرے کرنے پر بھی راضی ہو گئی لیکن تم چکنی پھل کی طرح پھسلے چلے گئے۔“

”اسے کہتے ہیں جسے اللہ رکھے، اسے کون چکھے۔“ وہ شونی سے ہنسا پھر سنجیدہ ہو کر پوچھنے لگا۔

”بھلا میڈم مجھ سے ایسا کون سا خاص کام لینا چاہتی تھی؟“ ”تمہارے بارے میں رپورٹ تھی کہ اپنی بے شمار صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ تم بہترین نشانے باز بھی ہو۔ تم نے اپنی متلون مزاجی کے باعث شاید اپنی صلاحیت پر اتنا غور نہ کیا ہو لیکن بھانپنے والوں نے بھانپ لیا تھا کہ تم ایسے نشانے باز ہو جسے گاڈ گنٹھ کہا جاسکتا ہے۔ ایسے گاڈ گنٹھ لوگوں کو تربیت دی جاتے تو وہ بہت اوپر تک جاتے ہیں۔“

”اوہ..... اسی لیے دور این تربیت مجھے نشانے بازی کی خاص مشقیں کروائی جاتی تھیں اور اسلحے سے متعلق معلومات بھی فراہم کی جاتی تھیں؟“ وہ سن کر چونکا۔

”ایسا ہی ہے۔ اگر تم ان کے ڈھب پر آ جاتے اور خود کو قابل اعتماد ثابت کر دیتے تو پھر تمہیں ان چھوٹے موٹے کاموں میں نہ پھنسا یا جاتا اور تمہیں بڑے بڑے پروجیکٹ دیے جاتے۔“

”بڑے پروجیکٹ..... مطلب بڑے بڑے لوگوں کا قتل؟“ اسے اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی۔

”اس کام کے بدلے تمہیں اتنا خطرہ معاوضہ دیا جاتا کہ تمہارے دارے نیارے ہو جاتے۔“

”اور اس کے بعد میں ایک ایسا پیشہ ور قاتل کہلاتا جو آئینے میں خود اپنے آپ سے بھی نظر میں نہ ملتا پاتا۔“ اس کا جواب ایسا تھا کہ سونیا سوچ میں پڑ گئی۔ شاید اسی کا نام تربیت تھا کہ ایک عام متوسط گھرانے کا لڑکا ہزار کوشش کے باوجود کسی کے قابو میں نہ آ سکا تھا۔

☆☆☆

”لالہ کی موت سے پارٹی خوش نہیں ہے۔“ ”کیوں خوش نہیں ہے؟ ان کی دوسری ختم ہو گئی۔ پکڑ کر بھی تو انہوں نے بعد میں اس کے ساتھ یہی کرنا تھا۔“ وہ جانتا تھا کہ لالہ جیسی کو زندہ پکڑ کر نہ لاسکتا اس کی ناکامی ہے لیکن اس ناکامی کو قبول کیوں کرتا، سو عرفان اللہ کے

پارٹی میں آپ کی جگہ چھین لے۔ ویسے بھی بہت چالاک اور مکار آدمی ہے۔ دوست بن کر رہتا ہے لیکن اندر ہی اندر آدمی کی جڑیں کاٹ دیتا ہے۔“

”کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو۔ آدمی واقعی بڑا چالاک ہے۔ اب یہی دیکھ لو کہ صداقت شاہ کی آبائی سیٹ جس پر وہ برسوں سے بلا مقابلہ جیت رہے تھے، اس نے ہتھیالی۔ سخت جان اتنا ہے کہ جوان بیٹے کے بستر پر گتے کا بھی اثر نہیں لیا اور آج بھی اسی طرح دندندتا پھرتا ہے۔“ عرفان اللہ نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے جوابی تہمید کیا۔

”بس تو پھر یہ طے ہے کہ آپ کہیں نہیں جا رہے۔ آپ کی یہاں موجودگی بہت ضروری ہے۔ میں بیک پرورہ کر تو معاملات سنبھال سکتا ہوں لیکن فرنٹ پر تو آپ ہی کو کام کرنا ہے۔ لوگ آپ کو جانتے ہیں اور آپ سے متاثر بھی ہیں۔ کوشش کریں کہ جیسے لطیف سومرو نے صداقت شاہ کا ہتھ کاٹا ہے، آپ اس کا ہتھ کاٹ دیں۔ لطیف سومرو نے بھلے صداقت شاہ کو بچھا ڈیا ہے لیکن اتنی بات سب سمجھتے ہیں کہ وہ دو نمبر آدمی ہے۔ اس کے مقابلے میں آپ کی گڈول ہے۔ اپنے ویلفیئر کے کاموں کو مزید بڑھائیں۔ آج اگر چار لگائیں گے تو کل سولہ کما سکیں گے۔“ وہ مشوروں پر مشورے دے رہا تھا۔

”کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو۔ میرے پاس یہ موقع ہے کہ اپنی جگہ بنا سکوں۔ صداقت شاہ تو ویسے ہی اپنی اولاد کے مسائل میں الجھ کر سیاست کو بالکل بھول چکا ہے۔ اس کے بعد میں ہی ایسا بندہ ہوں جسے عوامی سطح پر پسند کیا جاتا ہے۔“ عرفان اللہ اس کے مشوروں پر صاد کرتے ہوئے بولا۔

”بازل ہے میرا نام۔ تاج بائی کا بیٹا ہوں اور خوب جانتا ہوں کہ لوگوں کو کب اور کیسے چلانا ہے۔“ اس نے عرفان اللہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جتایا۔

”کاش تم تاج بائی کے بیٹے نہ ہوتے تو آج میں بطور جانشین تمہیں فخر سے دنیا کے سامنے پیش کر سکتا۔“ عرفان اللہ نے دل ہی دل میں سوچا اور اس سے نظریں چرائیں۔ وہ جہاندیدہ آدمی تھا۔ اسے معلوم تھا کہ بازل کے دل میں اس کے خلاف کیا شکوہ ہے لیکن مجبوری تھی کہ وہ اس کے اپنا بیٹا ہونے کا اعلان کر کے اپنے کردار پر دھبا نہیں لگوا سکتا تھا۔ دنیا والوں کے شکوک کو الزام قرار دے کر جھٹلانا آسان تھا لیکن اپنے ماضی کی غلطی کو تسلیم کرنے کا مطلب تھا کہ ایک پنڈورا بکس کھولنا۔ یہ پنڈورا بکس کھلتا تو اس کی نجی اور سیاسی دونوں زندگیاں تباہ ہو کر رہ جاتیں۔ اس لیے بہتر یہی تھا کہ

اعتراض کے جواب میں منہ بناتا ہوا بولا۔
”شاید وہ اس سے کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے یا پھر انہیں اس کی اتنی آسان موت قبول نہیں تھی۔ اس لیے اس کے مرنے پر براہم ہیں۔“

”بڑھا بھی اس بات کو سمجھتا ہوگا اسی لیے اس نے خود موت کو گلے لگا لیا۔ ویسے بھی اس کے پاس زندگی کی کون سی امید بچی ہوئی تھی کہ رسک لیتا۔ ابھی نہ سبھی، دو چار مہینے بعد سبھی، اسے مری جانا تھا۔ اسی لیے غفلندی سے کام لیا اور اپنے لیے آسان موت چن لی۔“ بے پروائی سے ٹانگ ہلاتے ہوئے اس نے اپنے موبائل کی اسکرین کو اسکرول کرتے ہوئے گفتگو میں حصہ ڈالا۔

”سالا پانی کی طرح تو شراب پیتا تھا۔ پھیپھڑوں کا سرطان تو اسے ہونا ہی تھا لیکن تھا بڑا چالاک۔ اپنی بیماری کو آخر تک سب سے چھپا کر رکھا۔ کافی لمبے عرصے سے تو کسی کے سامنے بھی نہیں آیا تھا۔ اس لیے پتا ہی نہیں چلا کہ بیمار شہید ہے۔“ عرفان اللہ کو اس کے بے نیاز انداز کی عادت تھی اس لیے بغیر برا متائے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا۔ معلوم تھا کہ بظاہر متوجہ نہ ہوتے ہوئے بھی وہ ایک ایک لفظ سن رہا ہے۔

”اب آپ کے پاس موقع ہے کہ خود کو آگے لائیں اور زیادہ سے زیادہ کام خود پکڑیں۔ سیاست میں بہت اوپر تک جانا چاہتے ہیں تو شہر پر اپنا ہولڈ بھی رکھنا پڑے گا۔“ اس نے عرفان اللہ کو مشورہ دیا۔

”ارادہ تو کچھ ایسا ہی ہے۔ سوچ رہا ہوں اس سلسلے میں یزدانی سے بھی مشورہ کر لوں۔“

”ان سے کیا مشورہ کرنا ہے۔ کامی کے بعد وہ ویسے بھی ناکارہ ہو گئے ہیں۔“ اس نے فوراً ٹوکا۔

”یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ جوان اولاد کی موت نے اسے توڑ کر رکھ دیا ہے۔ میں بھی سلطان کے لیے پریشان ہوں۔ تمہاری آنٹی زور دے رہی ہیں کہ ہم اسے لے کر امریکا چلیں۔ وہاں ڈاکٹرز سے ڈسکشن چل رہی ہے۔ ہو سکتا ہے اگلے ہفتے اسے وہاں شفٹ کر دیں۔“ سلطان کے لیے لہجے میں جو پریشانی تھی، اس نے اسے سلگا کر رکھ دیا۔

”اس کے لیے آپ کا ساتھ جانا ضروری نہیں ہے۔ آنٹی ساتھ ہوں گی یہ کافی ہے۔ آپ کوئی ڈاکٹر تو ہیں نہیں کہ آپ کے ساتھ جانے سے کوئی فرق پڑ جائے گا۔ ہاں یہاں آپ کے نہ ہونے سے فرق پڑ سکتا ہے۔ لطیف سومرو بہت ہاتھ دیکھتا رہا ہے۔ یہ نہ ہو کہ آپ کے نہ ہونے سے وہ

جو جیسا چل رہا ہے، اسے چلنے دیا جائے۔

سننے میں آیا ہے کہ صداقت شاہ کا بیٹا "را" والوں کی قید سے فرار ہو گیا ہے۔ "عرفان اللہ نے زبان سے جو نہیں کہا تھا اسے وہ اس کے آنکھ جھالنے سے جان سکتا تھا اس لیے لوں کو خفیہ سی زہریلی مسکراہٹ نے چھوڑا اور پھر جبری سے موضوع بدل گیا۔

"میری اوپر والوں سے اس سلسلے میں بات ہوئی تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ اس لونڈے کے فرار میں معاذ کا ہاتھ ہے۔" عرفان اللہ نے سرگوشیاں لکھ میں اسے مطلع کیا۔ "کون معاذ.....؟ وہ بشری گلزار کا یونیورسٹی فیلو ہے ہم نے....." اطلاع سن کر باڈل کو جھٹکا لگا۔

"ہاں وہی۔ سننے میں آیا ہے کہ بہت تیز لڑکا ہے۔ بڑے بڑوں کے قابو میں نہیں آیا اور اب ان کے ہاتھوں سے سلپ ہو کر وہاں انڈیا میں پتا نہیں کیا کچھ کرتا پھر رہا ہے۔" اس کا مجھ جیسے کسی بندے سے واسطہ نہیں پڑا ہو گا۔ "ہو سکتا ہے۔" عرفان اللہ نے اختلاف کرنا مناسب نہ سمجھا۔

"مجھے موقع ملے تو میں ثابت کر دوں گا کہ میں اس سے بہترین ہوں۔" وہ جیسے کسی چیلنج کو قبول کر لینے کے لیے تیار تھا۔ عرفان اللہ نے اسے کوئی جواب نہیں دیا اور بس پر خیال نظروں سے اس کا جائزہ لیتا رہا۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟ کیا میرے کہنے کا اعتبار نہیں؟" وہ چڑسا گیا۔

"نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔" "سنائے گلو استاد، لالہ عیسیٰ کی موت پر بہت پیش میں ہے اور اس نے لالہ کے جنازے پر کھڑے ہو کر قسم کھائی ہے کہ لالہ کی موت کے ذمے داروں کو نہیں بخشے گا۔" عرفان اللہ نے بات بنائی۔

"جو گر جتے ہیں، وہ برستے نہیں۔" اس نے گویا ہوا میں بات اڑائی۔

"گلو استاد کو اتنا ہلکا بھی نہ لو۔ وہ لالہ کا خاص آدمی رہا ہے اور سنائے کہ اب وہی گینگ کو چلائے گا۔ گینگ پر اپنا ہولڈ قائم رکھنے اور خود کو لالہ کی جانشین کا اہل ثابت کرنے کے لیے اسے کچھ نہ کچھ کارکردگی تو دکھانا پڑے گی۔ تمہیں چاہیے کہ ان دنوں تھوڑے محتاط رہو۔" عرفان اللہ نے اسے سمجھایا۔

"اسے کیا معلوم کہ اس سب کے پیچھے میں تھا۔ ہم لوگ تو پولیس کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی نکل گئے تھے۔"

صاحب ذوق

جدید تعلیم سے فارغ ہونے والے دو نوجوان دوستوں کو ایک ہی ملٹی نیشنل کمپنی میں اچھی ملازمت مل گئی۔ باس نے کمپنی کے ملازمین کو دعوت دی۔ دعوت کے دوران میں باس نے ان میں سے ایک نوجوان کے ادبی ذوق کا اندازہ کرنے کے لیے پوچھا۔ "عمر خیام کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

"اچھی جگہ ہے سر..... لیکن ذاتی طور پر میں کے ایف سی میں جانا زیادہ پسند کرتا ہوں۔" نوجوان نے جواب دیا۔

باس نے ناگواری سے نوجوان کی طرف دیکھا اور دوسرے مہمانوں سے باتیں شروع کر دیں۔ دعوت سے واپسی پر راستے میں دوسرے نوجوان نے پہلے کو ڈانٹا۔ "بے وقوف آدمی! اگر تمہیں نہیں معلوم تھا کہ عمر خیام کیا ہے..... تو بات بدل دیتے..... احقرانہ جواب تو نہ دیتے..... گدھے کہیں کے۔ تمہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ عمر خیام کسی ریسٹورنٹ کا نہیں بلکہ پر لیوم کا نام ہے۔"

یہ قربتیں، یہ فاصلے

ایک نوجوان ایک سیٹھ کے سامنے شرمائے اور گھبرائے ہوئے انداز میں کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "سر..... وہ..... بات دراصل یہ ہے کہ..... میں..... میں....."

"میں سمجھ گیا۔" سیٹھ صاحب مسکراتے ہوئے بولے۔ "تم میری بیٹی انیلا سے شادی کرنا چاہتے ہو۔ میری طرف سے اجازت ہے۔"

"یہ بات نہیں ہے سر!" نوجوان کو یاہمت کر کے بولا۔ "میں تو آپ سے پچاس ہزار روپے قرض لینا چاہ رہا تھا۔"

"کیا کہا.....؟ پچاس ہزار روپے قرض.....؟" سیٹھ صاحب غصے سے چلا اٹھے۔ "تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟ میں تمہیں جانتا تک نہیں..... اور تم مجھ سے پچاس ہزار قرض مانگتے چل دیے۔" (مرسلہ: ناہید یوسف، اسلام آباد)

ہو کر اس کے ساتھ رہو اور میری طرف سے اشارہ ملنے پر حیدر آباد کے لیے نکل پڑو۔ تفصیلات تمہیں منوج سے معلوم ہو جائیں گی۔“

حیرت انگیز طور پر اس نے سونیا پر اعتماد کر لیا تھا اور پورے ہفتے منوج کے ساتھ اس کے گھر میں رہا تھا۔ منوج کے گھر میں اس کی چینی اور چھوٹے سے بیٹے کے سوا کوئی نہیں تھا اور انہوں نے اس کی اپنے گھر میں ایسی آذینیت کی تھی جیسے وہ ان کا کوئی خاص الٹی ص مہمان ہو۔ ان کے اس رویے کی وجہ سے وہاں رہتے ہوئے معلوم ہوئی تھی۔ منوج کا بیٹا جگر کے عارضے میں مبتلا تھا اور اس کا واحد علاج جگر کی پیوند کاری تھا۔ سرکاری محکمے میں کلرک کی نوکری کرنے والے منوج کے اتنے وسائل نہیں تھے کہ اس کے علاج کے اخراجات برداشت کر سکتا۔ ان مایوسانہ حالات میں سونیا کا ملنا اور تمام اخراجات اپنے ذمے لے لینا اس کے اور اس کی چینی کے لیے ایک غیبی مدد کی طرح تھا۔ سونیا کی اس سخاوت کے بدلے اس نے اپنی ملازمت اور دوستیوں کا فائدہ اٹھا کر معاذ کے لیے تمام مطلوبہ کاغذات تیار کر دے دیے تھے۔ کاغذات کی تیاری میں جہاں جہاں رقم کی ضرورت پڑی تھی، سونیا نے رقم فراہم کر دی تھی۔ اس لیے ہر کام خوش اسلوبی سے انجام پا گیا تھا اور اب وہ کاغذات کے مطابق بھارتی شہری مائیکل ڈی سوزا تھا جو ملازمت کے حصول کے لیے حیدر آباد کے نواب بدر الدین کی خدمت میں حاضر ہونے جا رہا تھا۔

”اے، اکیلے کہاں بھاگے جا رہے ہو؟ اپنی بیگم مطلب سزمار گریٹ ڈی سوزا کو تو ساتھ لے چلو۔“ اسٹیشن پر اتر کر ابھی وہ ٹیکسی کی تلاش میں نظریں دوڑا ہی رہا تھا کہ ایک جانی پہچانی آواز نے مڑ کر پیچھے دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ لانگ اسکرٹ، ہائی ہیل کی سیٹھل، سر پر اسکارف اور کالے چشمے کے اہتمام کے ساتھ اس کے عقب میں کھڑی وہ حسینہ یقینی طور پر سونیا تھی۔

”تم.....؟“ وہ اسے وہاں دیکھ کر حیران ہوا۔
”جناب جس ملازمت کے حصول کے لیے نواب بدر الدین کی حویلی میں حاضر ہونے جا رہے ہیں، وہ کل کے لیے ہے۔ نواب صاحب کو اپنے بیٹے اور بیٹی دونوں کے لیے ہر فن مولا ایسے استاد اور استانی کی ضرورت ہے جن کے آپس میں میاں بیوی ہونے کو ترجیح دی جائے گی۔“ اس نے معاذ کی معلومات میں اضافہ کیا۔
”یعنی تم مستقبل میرے سر پر مسلط ہونے جا رہی

وہ اتنی آسانی سے کہاں قائل ہونے والا تھا۔
”بات کسی نہ کسی طرح نکل ہی جاتی ہے۔ تم ظہور کو کیوں بھول رہے ہو۔ اس نے تمہیں ڈیل کر اس کرنے کی کوشش کی تھی۔ ہو سکتا ہے گلو استاد تک بھی تمہارا نام پہنچ گیا ہو۔“ عرفان اللہ نے اسے عقل کی راہ بھائی۔

”اس نے پنگا لیا تو نمٹ لوں گا اس سے۔ پہلے ذرا ظہور کے ہوتے سوتوں کو دیکھ لوں تاکہ آئندہ کے لیے لوگوں کو نصیحت رہے کہ باذل کو دھوکا دینا کتنا مہنگا پڑتا ہے۔“ اس کی آنکھوں میں وہی مخصوص جھلک تھی جو مردار خور جانور کی آنکھوں میں آخری سانس لیتے جاندار کو دیکھ کر ابھرتی ہے۔ ظہور کے بعد ظہور کی فیملی بھی یقیناً اس کے لیے ایک آسان ہدف ثابت ہونے والی تھی۔

☆☆☆

ایک نئے حلیے میں، نئی شناخت کے ساتھ سفر کرتا ہوا وہ لمحہ بہ لمحہ اپنی منزل سے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ اس وقت اس کے پاس بھارتی شناختی کارڈ بھی تھا اور ایسی تعلیمی اسناد بھی جن سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ بھارت کے اچھے تعلیمی اداروں سے فارغ التحصیل ہے۔ ان تعلیمی اسناد کے علاوہ کچھ فنون کے سرٹیفکیٹ بھی اس کے پاس موجود فائل میں لگے ہوئے تھے جن سے ثابت ہوتا تھا کہ اسے ان فنون میں مہارت حاصل ہے۔ مہارت کی حد تک بات ٹھیک بھی تھی لیکن یہ اور بات تھی کہ اس نے بھارت کے ان سارے تعلیمی اداروں اور انسٹی ٹیوٹس میں قدم بھی نہیں رکھا تھا جن کا ثبوت اپنے ساتھ لیے پھر رہا تھا۔

اسے یہ سب فراہم کرنے والا احمد آباد کا ایک رہائشی تھا۔ سونیا نے صرف ایک محفوظ ملاقات کے لیے اسے دہلی سے احمد آباد کا سفر نہیں کروایا تھا بلکہ جاتے جاتے وہ اسے احمد آباد میں اپنے ایک قابل اعتماد آدمی کے حوالے کر کے گئی تھی۔ اسی آدمی نے حلیے کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ اسے مطلوبہ تمام کاغذات بھی تیار کر دے دیے تھے۔ یہ کاغذات اسے تھے کہ بہت بار ایک بیٹی سے جائزہ لینے پر ہی ان کے جعلی ہونے کا اندازہ ہو سکتا تھا۔ اس چلتا پرزہ آدمی کے پاس اسے چھوڑتے ہوئے سونیا نے کہا تھا۔

”تمہارا ساتھ دے کر میں تنظیم سے غداری کی مرگب ہو رہی ہوں۔ میری اس غداری کا بھانڈا کب پھوٹ جائے، کچھ کہہ نہیں سکتی۔ ایسے ہی کسی وقت کے لیے میں نے تنظیم سے ہٹ کر کچھ دوست بنائے ہیں۔ منوج بھی میرے ان ہی دوستوں میں سے ایک ہے۔ تم بالکل بے فکر

”اس کی زبانی تفصیل جان کر اس نے تبصرہ کیا۔“

”مسلط تو پہلے تھی، اب تو ساتھی بن کر ساتھ دینے جا رہی ہوں۔“ وہ کچھ ایسے لہجے میں بولی کہ معاذ سے کچھ کہا نہ گیا اور فوراً اس ٹیکسی والے کی طرف متوجہ ہو گیا جو ہارن بجا کر اشارے میں اس سے اس کی منزل کی بابت پوچھ رہا تھا۔ اسے نواب بدرالدین کی حویلی کا پتا بتا کر اس نے کرایہ وغیرہ ملے کیا اور پھر دونوں ٹیکسی کی پچھلی نشست پر سوار ہو گئے۔ راستہ لمبا تھا لیکن انہوں نے چند سرسری باتوں کے سوا احتیاطاً آپس میں زیادہ گفتگو نہیں کی۔ حویلی پہنچ کر مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے بالآخر انیس نواب بدرالدین کے سیکریٹری سے شرفِ ملاقات حاصل ہوا۔ ان کے ضروری کوائف وغیرہ نوٹ کرنے کے بعد اس نے کہا۔

”آپ لوگ لمبا سفر طے کر کے آئے ہیں۔ فی الحال آرام کیجیے۔ بعد نماز عصر آپ کو انٹرویو کے لیے نواب صاحب کے سامنے پیش کیا جائے گا۔“ اس کے بعد ایک ملازم نے انہیں مہمان خانے میں پہنچا دیا۔ قیمتی ساز و سامان سے آراستہ پریش کرے میں پہنچ کر سونیا نے اپنا سامان ایک طرف رکھا اور تازہ دم ہونے غسل خانے میں گھس گئی۔ معاذ ایک ٹو سیٹر صوفے پر بیٹھا کمرے کا جائزہ لیتا رہا۔ دولت کی فراوانی کا احساس تو حویلی کے دروازے پر کھڑے ہو کر ہی ہو گیا تھا۔ حویلی کی وسعت، طرزِ تعمیر، رنگ و روغن اور تزئین و آرائش چیخ چیخ کر مالک کی امارت کا اعلان کر رہی تھی اور صاف ظاہر تھا کہ نواب بدرالدین صرف نام کے نواب نہیں تھے بلکہ آج بھی وہ ترکِ احتشام قائم و دائم تھا جو باضی میں نوابین سے منسوب تھا۔

سونیا کے غسل خانے سے برآمد ہونے تک ملازم پُر تکلف کھانے سے لدی ٹرائی کمرے میں پہنچا چکا تھا۔ دونوں نے سیر ہو کر کھانا کھایا لیکن گفتگو میں اب بھی محتاط رہے۔ کھانے کے بعد ملازم ٹرائی واپس لے گیا تو سونیا اعلان کرنے والے انداز میں بولی۔

”میں تو بھی سفر سے بہت تھک چکی ہوں۔ انٹرویو سے پہلے کچھ دیر آرام کروں گی۔“ لیکن اعلان کے بعد وہ سیدھی بستر پر نہیں گئی اور اپنے بیگ سے ایک آلہ نکال کر کمرے کو چیک کرنے لگی۔ معاذ سمجھ گیا کہ وہ خفیہ کمرے یا مائیک وغیرہ کی موجودگی کے بارے میں اطمینان کرنا چاہ رہی ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ مطمئن تھی کہ وہاں ایسا کچھ نہیں ہے جو ان کے لیے پریشانی کا سبب بنے۔

”تم کب تک ایسے بیٹھے رہو گے۔ تم بھی تھوڑی دیر

آرام کر لو۔“ بستر پر لیٹتے ہوئے اس نے معاذ کو مشورہ دیا۔

”ضرورت محسوس ہوئی تو کر لوں گا۔ تمہیں میرے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ اکھڑ لہجے میں بولتے ہوئے اس نے اپنا رخ پھیر لیا۔ وہ میاں بیوی کی حیثیت سے یہاں آئے تھے اس لیے انہیں ذلیل بید والی خواب گاہ فراہم کی گئی تھی۔ اس خواب گاہ میں سونیا کے ساتھ تنہا بیٹھنے سے بہت کچھ یاد آ گیا تھا۔ یہیں انڈیا میں قیام کے عرصے میں اس فتنہ کرنے دھوکے سے مخصوص دوا کھلا کر اس کا زعمِ پارسائی درہم برہم کیا تھا۔ مقصد محض اسے اپنے اشاروں پر نچانا تھا اور اب وہ اس دھوکے کے ساتھ اس کے ساتھ ایک چھت تلے موجود تھی کہ اس کی مدد کرنا چاہتی ہے۔

”کیا سانپ کو اپنے ساتھ لیے پھرنے والا شخص امید کر سکتا ہے کہ سانپ اسے ڈسے گا نہیں۔“ دماغ میں آنے والی سوچ نے اس کا سکون غارت کر دیا۔

”ٹھیک ہے، نہیں ہوتی تمہارے لیے پریشان لیکن تم خود بھی تو اپنے آپ کو پریشان نہ کرو۔ اعتبار کیا ہے تو پورا کر لو اور اس خیال کو دل سے نکال دو کہ میں تمہیں کوئی نقصان پہنچاؤں گی۔“ وہ گویا اس کی سوچ پڑھ رہی تھی چنانچہ رسان سے کہہ کر کرڈٹ بدل گئی۔ معاذ جواب میں کچھ بولنا نہ اپنی جگہ سے ہلا۔ عصر کے بعد چائے پر نواب بدرالدین کا بلاوا آ گیا۔ وہ دونوں جانتے تھے کہ اس ملاقات میں انہیں ہر ہر زادیے سے جانچا جائے گا۔ یہ بھی اندازہ تھا کہ اشتہار کے بعد انٹرویو کے لیے آنے والے وہ واحد نہیں ہوں گے اس لیے خود کو بہترین ثابت کرنے کے لیے انہیں اپنا پورا زور لگانا ہوگا۔ وہ بھی کچھ اس انداز میں کہ ادب صاحب کو ان میں بناوٹ کا احساس نہ ہو۔ ملاقات کا آغاز ہوا۔ دورانِ گفتگو نواب صاحب بظاہر غیر رسمی اور بے تکلفانہ گفتگو کرتے رہے لیکن وہ دونوں محسوس کر سکتے تھے کہ ان کی تیز چمک دار آنکھیں ان کی ایک ایک جنبش کا جائزہ لے رہی ہیں۔ گفتگو کے دوران ہی انہوں نے اپنے دونوں بچوں کو بھی بلوا بھیجا۔ تیرہ چودہ سال کے وہ دونوں بہن بھائی مہذب لیکن قدرے شرمیلے تھے۔ لڑکے کا نام عبید اور لڑکی کا منیرہ تھا۔ دونوں جڑواں تھے۔

”ہمارا ارادہ ہے کہ ہائی اسکول کے بعد ان دونوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن بھجوا دیں گے۔ وہاں کے ماحول میں ایڈ جسٹ ہونے کے لیے ہم ابھی سے ان کی تربیت شروع کروانا چاہتے ہیں۔ کیا آپ دونوں کو اعتماد ہے کہ آپ ہمارے بچوں کو اس لائق بنانے میں کامیاب ہو جائیں

”؟“ بچوں سے تعارف کا مرحلہ طے کرنے کے بعد نواب بدرالدین نے ان سے سوال کیا۔

”کیوں نہیں نواب صاحب! آپ ہمیں صرف ایک ہفتے کا موقع دیں۔ اگر آپ کو اس ایک ہفتے میں بچوں کی شخصیت میں نمایاں تبدیلی نظر نہ آئے تو ہمیں ملازمت سے برخواست کرنا آپ کے اختیار میں ہوگا بلکہ ہم خود کو اس ملازمت کا حقدار ہی اس وقت سمجھیں گے جب آپ پر اپنی اہلیت ثابت کر چکے ہوں گے۔“ سونیا نے نہایت پُر اعتماد لہجے میں ششہ انگریزی میں نواب صاحب کو یقین دلایا۔ ہفتے بھر میں وہ نواب صاحب کو مطمئن کر پاتے یا نہیں، کم از کم اتنی مہلت حاصل کر لیتے کہ اس وسیع و عریض حویلی میں عالم اور سرمد کی تلاش کا کام مکمل کر لیتے۔

”گذا ہمیں آپ کا یہ اعتماد اچھا لگا۔ آپ کی خواہش پر آپ کو ایک ہفتے کی مہلت دی جا رہی ہے۔ خود کو ثابت کر دکھائیں گے تو آپ اور بچوں ہر دو فریقین کا مستقبل سنور جائے گا۔“ سونیا جیسی حیدر، جس کے شیریں لبوں سے کوئی گالی سن کر بھی بے مزہ نہ ہو، نواب صاحب کو کیسے متاثر نہ کر پاتی چنانچہ حسبِ خواہش انہیں ایک ہفتے کی مہلت حاصل ہوئی جس میں وہ کافی کچھ کر دکھانے میں کامیاب ہو سکتے تھے۔

”موقع عنایت کرنے کا شکر یہ نواب صاحب! ہم میں سے کوئی آپ کو مایوس نہیں کرے گا۔“ اس بار محاذ نے گفتگو میں حصہ لیا۔ نواب صاحب نے جواباً محض مسکرانے پر اکتفا کیا۔

”میرے خیال میں ہمیں آج ہی بچوں کے ساتھ ایک سٹنگ کر لینی چاہیے تاکہ ہمیں ان کی روٹین سے واقفیت ہو سکے اور ہم ان کے ساتھ مل کر ایک نیا شیڈول طے کر سکیں۔“ سونیا نے تجویز دی۔

”اب سب کچھ آپ اور آپ کے شاگردوں کے درمیان ہے۔ ہم مداخلت نہیں کریں گے۔“ نواب صاحب نے خود کو غیر جانبدار کر لیا۔

”کیوں بچو!... آپ کیا کہتے ہیں؟“ سونیا نے فوراً بچوں کو مخاطب کیا۔

”ڈنر کے بعد ملتے ہیں۔“ اس بار عبید نے خود اعتمادی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا فیصلہ سنایا جس پر سب نے صاف کیا۔

وہ دونوں بھی پہلا مرحلہ کامیابی سے طے ہونے پر خوشی خوشی اپنے لیے مختص کمرے میں واپس آئے اور کل

شروع ہونے والے معمول کے متعلق آپس میں گفتگو کر لے گئے۔ انہیں بچوں کے معمولات کو کچھ اس طرح سے ترتیب دینا تھا کہ عالم اور سرمد کو حویلی میں تلاش کرنے کا موقع بھی حاصل کر سکیں۔ ان دونوں کی یہاں موجودگی کی اطلاع دیتے ہوئے دلپ نے جو انداز اختیار کیا تھا اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ یہاں آکر سیدھے سیدھے ان سے ملاقات کی خواہش ظاہر کرنے پر ان سے نہیں مل سکتے۔ انہیں خود ان دونوں تک رسائی حاصل کرنا تھی اور رسائی کے لیے ایک راستہ انہیں مل گیا تھا۔

”تو پھر کل سے کام شروع کرتے ہیں۔“ آپس میں کچھ چیزیں طے کر لینے کے بعد سونیا نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا۔ وہ جواب میں کچھ کہتا، اس سے قبل دروازے پر دستک ہوئی۔

”کم ان۔“ سونیا نے دستک دینے والے کو اندر آنے کی اجازت دی۔

”بابا اور بے بی نے آپ دونوں کو یاد کیا ہے۔ وہ ڈنر پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“ آنے والا ایک ملازم تھا جو انہیں عبید اور میزہ کا پیغام دے رہا تھا۔

”ٹھیک ہے، ہم آتے ہیں۔“ محاذ نے اسے جواب دے کر رخصت کیا پھر سونیا کی طرف متوجہ ہوا جو ملازم کے چلے جانے کے بعد بھی ابھی تک دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”تمہیں کیا ہوا؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”تم نے اس ملازم کے چہرے پر غور کیا؟“

”نہیں۔ کیا وہ مسٹر انڈیا تھا؟“

”وہ ایک بھوت تھا۔“ سونیا کا لہجہ پراسرار ہو گیا۔

”بھوت..... تم مذاق کر رہی ہو؟“ وہ پوچھ رہا تھا لیکن سونیا کی سنجیدگی نظر انداز کئے جانے کے لائق نہیں تھی۔ ”کوئی مُردہ شخص زندہ ہو کر سامنے آجائے تو اسے بھوت نہیں تو اور کیا کہیں گے؟“ اس کا جواب مزید الجھا دینے والا تھا۔

”صاف بات کرو۔“ وہ تھوڑا سا چڑا۔

”صاف بات یہ ہے مسٹر محاذ کہ ہم یقیناً پریشانی کا شکار ہونے والے ہیں۔“ وہ بے حد سنجیدہ تھی۔

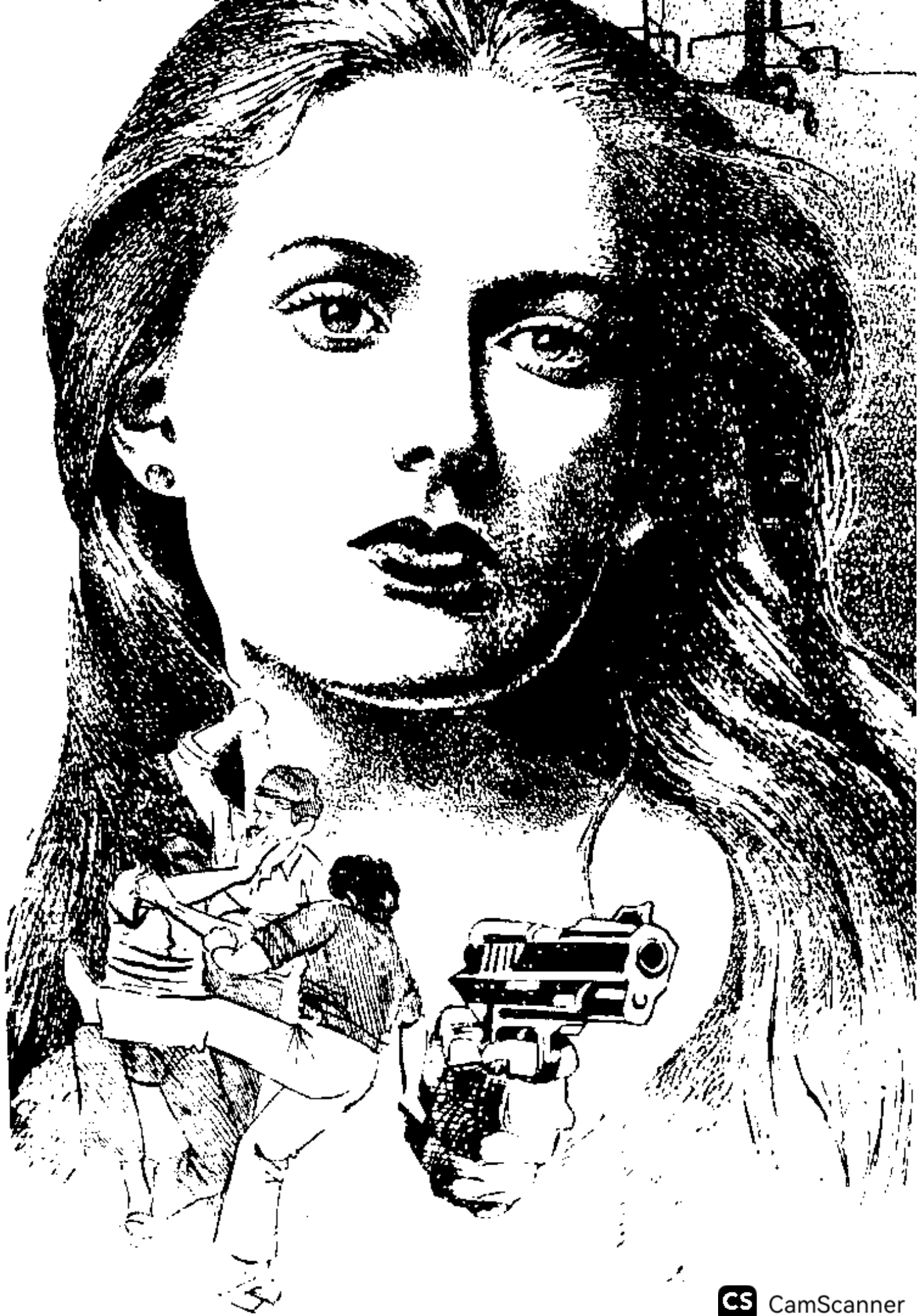
ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نہ جوان
کی داستان جو غلط کاروں کے لیے
غضب ناک تھا باقی واقعات آیت ماہ پر ہے



اساتذہ

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تندوتیز اندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابل شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پُر عزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جارہے تھے... اس کی زندگی جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قراریوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تاری عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ پروار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ وارداتِ قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہو سکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تحیر انگیز داستان



معاذ ایک ذہین لیکن متکون حراج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جوائن کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ انسٹی ٹیوٹ سے واپس آ رہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو سڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی نڈر قدرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشری نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بشری ماس کمیونی کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم و غیرہ لکھتی ہے۔ اس دوران جگہ جگہ بھی وہ ایک زیر تعمیر رہائشی منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی آئی تھی۔ معاذ بشری کو بہ حفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کر دیتا ہے لیکن جن ریکس زادوں سے اس نے ان کا شکار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور سو فتنے کی تلاش میں رہتے ہیں۔ یہ موقع انہیں یونیورسٹی ٹرپ کی صورت میں مل جاتا ہے اور ایک دن جنگل کی سیر کے دوران وہ فوٹو گرافی کے شوق میں سب سے الگ تھلک ہو جانے والے معاذ کو بے خبری میں گھیر کر بری طرح زد و کوب کرتے ہیں اور بخدی سے اسے دھکا دے دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس نہ آنے پر انتقامیہ کے افراد، پولیس اور ریسکیو ذرائع کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جوگی کی جمو پٹری میں پاتا ہے۔ اپنی حالت سے اسے اپنے شدید زخمی ہونے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ جوگی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ معاذ کا سوا سال جنگل میں ہی کہیں گرجاتا ہے اور جوگی کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا جس سے باہر کی دنیا سے رابطہ کیا جاسکے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی شخصیت اس کے لیے دیکھنی کا باعث بن جاتی ہے۔ جوگی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نوازا کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے ہر اہم علم سکھانے کی ہامی بھر لیتا ہے اور معاذ واقعی اس سے بہ علم سیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ادھر جانے والے معاذ کے گھر سے جب تصویریں لگوائی جاتی ہیں تو بہت سے قدرتی مناظر کی تصویروں میں سے ایک ایسی تصویر بشری کی نظر میں آ جاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانک رہا تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پروجیکٹ کے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشری تحقیق کر رہی تھی۔ بشری کے اپنے والد جرنل ہوتے ہیں اور حق گوئی ان کے خون میں شامل تھی۔ اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشری کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ مدد سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باؤل نامی فنڈے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشری انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دنوں میں ہی معاذ واپسی کا ارادہ کرتا ہے تاہم ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا عرفان اللہ اور یزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو وقاص نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باؤل اچانک بشری کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر دیتا ہے۔ معاذ کو واپس لانے کے لیے اچھے بھٹکدے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اسے واپس آنے کا پیغام دیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کر کے اسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات لی جاتی ہیں، نہ بتانے پر اس کے بھائی کا ایک گروہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشری بھی انتقام کی آگ میں جلتی ہوئی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہو جاتی ہے۔ معاذ کو بچانے والا لڑکا وقاص اپنے گروہ کے ساتھ ایک پارٹی میں جاتا ہے۔ وہاں اسے معاذ کے حوالے سے مشکوک ایک شخص نظر آتا ہے۔ وہ اس کے پیچھے جاتا ہے مگر اسے گھیر لیا جاتا ہے۔ بہر حال وقاص کو تنبیہ کے ساتھ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ادھر معاذ کے دوست عالم شاہ کے بہنوئی کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ کی فتنوں میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے چھپاتا کر کے اس کے دماغ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ فتنو سے حاصل الو کے علم کی بدولت ان کا معمول نہیں دیتا۔ بشری، کامران کو چھاپنے کا پروگرام بناتی ہے۔ ادھر عالم شاہ سراغ لگا لیتا ہے کہ اس کے بہنوئی کا قتل کس نے کیا۔ وہ قاتل کو گھیرتا ہے اور اپنے تئیں اسے گولیاں مار کر قتل کر دیتا ہے۔ تاہم وہ بیخ جاتا ہے۔ عالم شاہ اس کے بعد ڈاکوؤں کے سردار چاچ کو چھاپتا ہے اور اسے کیفر کر دیتا ہے۔ اس کے پیچھے پولیس لگ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور اس کا نوکر سرد، باؤل کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ ادھر معاذ جاسوس ماحر کو چھپاتا کر کے اس کے ذریعے اسے ٹالنے والوں پر حملہ کروا دیتا ہے تاہم ان کی فائرنگ سے ماحر مارا جاتا ہے اور الزام معاذ پر نہیں آتا مگر معاذ سے کام لینے والوں کو اس پر شک گزرتا ہے۔ عالم کی بہن گل شاہ کے نو مولود بیٹے کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اغوا کا الزام لطیف سمر پر آتا ہے۔ عالم شاہ وہاں موجود ایک ذہنی شخص کی مدد سے باؤل کی قید سے چھٹکارا پالیتا ہے۔ ادھر بشری یعنی کلج جاتی ہے۔ وہاں وقاص اسے باربی کے روپ میں پہچان لیتا ہے اور ان دونوں کے درمیان احساہ کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ وہ سلطان کو مارنا

اور دھماکے ہونے لگتے ہیں۔ وہ وہاں سہاؤ کو دیکھتا ہے۔ صداقت شاہ، لطیف سومرو کو گھیرنے کے لیے اس کی خفیہ بیوی اور بچے کا کھوج لگاتے ہیں اور بچے کو اغوا کر لیتے ہیں۔ لطیف سومرو مجبور ہو جاتا ہے۔ سہاؤ کو اس کے گھر والوں سے ملنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ عالم شاہ کو اس کے والد اغوا ہونے کی اطلاع دیتے ہیں۔ ادھر سہاؤ بھی ایک مشن پر سونپا کے ساتھ اغوا یار روانہ ہوتا ہے تاہم کچھ لوگ سکھ یا تریوں سے بھری بس کو یہ غبار بنا لیتے ہیں۔ سہاؤ اور سونیا نہ خانے کے تمام افراد کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں تاہم باہر موجود دیگر اغوا کاروں سے مقابلہ ہوتا ہے اور معاذ زخمی ہو جاتا ہے۔ صداقت شاہ کے اغوا میں موجود رشتے دار کے ہاں شادی ہوتی ہے۔ عالم شاہ، مکمل اور سرمد اغوا یار روانہ ہو جاتے ہیں۔ انرپورٹ سے گھر روانگی پر راستے میں کچھ ٹھیرے انہیں لوٹ لیتے ہیں۔ عالم شاہ ایکشن میں آنا چاہتا ہے تاہم اجالا نامی عالم شاہ کی کزن اس کا راستہ روک لیتی ہے۔ گھر پہنچنے پر پولیس کی ریڈ ہوتی ہے اور وہ عالم شاہ اور سرمد کو لے جاتے ہیں۔ ادھر بشری اور وقاص باڈل کو اسپتال میں مارنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ بچ جاتا ہے۔ معاذ اور سونیا پناہ کی تلاش میں ہوتے ہیں اور بالآخر اپنے سہولت کاروں سے مل جاتے ہیں۔ عالم شاہ اور سرمد کو تشدد کا نشانہ بنا کر ویرانے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ واپس اپنے میزبانوں کے ہاں پہنچ جاتے ہیں۔ شادی کے دوران انہیں پتا لگتا ہے کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں اجالا اور اس کا عاشق شامل ہوتے ہیں۔ وہ چھپ کر ان کی باتیں سن رہا ہوتا ہے کہ اسے چھاپ لیا جاتا ہے۔ تاہم وہاں مارا ماری ہوتی ہے اور اجالا کا عاشق مارا جاتا ہے۔ پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ ان کے کزن انہیں اپنے دوسرے خفیہ ہنگامے پر پہنچا دیتے ہیں جہاں کچھ لوگ ان پر حملہ کر دیتے ہیں۔ وہ وہاں سے بھگناہٹ نکل جاتے ہیں۔ ادھر معاذ کو سونیا اپنے ساتھ نئے مشن پر لے کر جاتی ہے جس میں ایک ریلوے لائن کو دھماکے سے اڑانا ہوتا ہے۔ سہاؤ ایسا نہیں چاہتا اس لیے وہ ٹرین کی آمد سے قبل بارودی دھماکا کر دیتا ہے۔ وہ زخمی ہو جاتا ہے اور اسے ہندو سادھو اپنی کنیا میں لے جاتا ہے جہاں اس کی ابھی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ سونیا کے آدمی معاذ کو تلاش کرتے ہیں مگر ناکام ہو جاتے ہیں۔ ادھر عالم شاہ اور سرمد خفیہ ذریعے سے بارڈر پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ دھر لے جاتے ہیں اور "را" کی قید میں پہنچ جاتے ہیں۔ انہیں تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ادھر بشری باڈل کو مارنے کی کوشش میں خود نشانہ بن جاتی ہے۔ سہاؤ سادھو کی مدد سے ایک انڈین ہیروئن کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ وہیں اسے عالم اور سرمد کی گرفتاری کا پتا چلتا ہے۔ ادھر مکمل کو اس کا شوہر ذہنی اذیت دیتا ہے۔ سہاؤ ڈاکٹر فردوس سے ملتا ہے اور اسے مکمل کی مدد کرنے کا کہتا ہے۔ عالم اور سرمد قید سے فرار کا سوچتے ہیں اور دھر لے جاتے ہیں جس کی پاداش میں انہیں مزید تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ معاذ، دھماکے کے ذریعے عالم اور سرمد کو رہائی دلوانا چاہتا ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ اس کا پیچھا کرتا ہے تاہم دھماکے کی گاڑی حادثے کا شکار ہو جاتی ہے۔ علیحدہ اور وقاص وغیرہ کو لالہ بیٹی ملک سے باہر نکال دیتا ہے اور ہر ممکن احتیاط کی ہدایت کرتا ہے لیکن علیحدہ پاکستان میں ٹوہید سے رابطہ کرتی ہے جو ان کے لیے مصیبت بن جاتا ہے۔ ٹوہید پر تیزاب پھینک دیا جاتا ہے۔ ادھر معاذ، مکمل کے لیے پریشان ہوتا ہے اور اسے وہاں سے نکالنا چاہتا ہے۔ ادھر وقاص، علیحدہ اور اس کے گھر والوں کو مار دیا جاتا ہے۔ سہاؤ سہاؤ نامی شخص کے خلاف کارروائی کرتا ہے تاہم وہ مارا جاتا ہے اور معاذ بھی زخمی ہو جاتا ہے اور اپنا نشان وہاں چھوڑ دیتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس معاذ کو دیوانی شخص سے مدد لینے کا کہتی ہے۔ معاذ اس کے ساتھ مل کر موہن نامی "را" کے ایجنٹ کو اغوا کر لیتا ہے۔ معاذ اپنے کزن کو پاکستان کال کرتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ اس کے گھر والوں کو مار دیا گیا ہے۔ وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کی ٹھان لیتا ہے۔ ادھر ڈاکٹر فردوس کو اس کے سسرال والے مکمل کو بھگانے کی پاداش میں تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ معاذ، عالم اور سرمد کی رہائی کے لیے کارروائی کرتا ہے اور انہیں "را" کی قید سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن عالم اور سرمد کو دیوانے کے آدمی کی دوسری جگہ پہنچا دیتے ہیں۔ سونیا معاذ کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتی ہے اور اسے اپنے تعاون اور مدد کی تعین دہائی کر داتی ہے۔ باڈل ایک جگہ لالہ بیٹی کی موجودگی پر کارروائی کرتا ہے تاہم لالہ خود کو گولی مار کر ختم کر لیتا ہے۔ ادھر دیوانہ گینگ ڈاکٹر فردوس کی میت اٹھنے پر وہاں غارتگ کر دیتے ہیں۔ مکمل اور مکمل مارے جاتے ہیں اور فیصل اور بانو زخمی ہو جاتے ہیں۔ پولیس دیوانہ کو گھیر لیتی ہے۔ معاذ دیوانہ اور اس کے آدمیوں کو نکالنے کے عوض عالم کا پتا معلوم کر لیتا ہے۔ سونیا اور معاذ حیدر آباد کو اب بدرالدین کی حویلی پہنچ جاتے ہیں۔ تاہم وہاں کسی کو دیکھ کر سونیا معاذ کو بتاتی ہے کہ اب وہ پریشانی کا شکار ہونے والے ہیں۔

اب اپنا مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

ایمبولینس عام سی رفتار سے چلتی متوسط طبقے کی آبادی والے اس علاقے میں داخل ہوئی اور ایک، ایک سو بیس گز کے گھر کے سامنے رک گئی۔ اس کے رکستے ہی اندر سے پہلے ایک درمیانی عمر کی عورت نیچے اتری۔ عورت ہر طرح کے سنگار سے

عاری تھی اور اس نے اپنے گرد ایک بڑی سی سفید چادر کو اس انداز میں لپیٹ رکھا تھا کہ اس کے جسم کے ساتھ ساتھ چہرہ بھی چادر کے پلو سے ڈھکا ہوا تھا اور دیکھنے والے مشکل سے صرف اس کی آنکھیں ہی دیکھ سکتے تھے۔

”میں نہ رہی تو آپ کیا کریں گی امی؟“ لڑکی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”خبردار! ایسی باتیں نہ سے نہ نکالو۔ تمہارے ابو کے بعد میرے پاس بیٹے کی صرف ایک وجہ رہ گئی ہے اور وجہ تم ہو۔ اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو میں اگلا سانس نہیں لے سکوں گی۔“

”میں کینسر پیشانت ہوں امی!“ لڑکی نے گویا یاد دہانی کروائی۔

”تو کیا ہوا؟ ہم تمہارے مرض سے لڑیں گے اور اسے شکست دے کر دم لیں گے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے نا کہ تم قابل علاج ہو۔“ ماں کی محبت پر یقین تھی۔

”اچھا جائیں، لیکن جلدی آجائے گا۔ اکیلے گھر میں مجھے ابو زیادہ شدت سے یاد آئیں گے۔“ لڑکی نے کہا تو وہ سر کو محض اثبات میں جنبش دیتے ہوئے باہر نکل گئی۔ حقیقتا گلے میں آ پھنسنے والے آنسوؤں کے گولے نے اسے کچھ بولنے کے قابل ہی نہیں چھوڑا تھا۔ وہ بیٹی کو نہیں بتا سکتی تھی کہ مرنے والے کو وہ بھی ہر لمحہ شدت سے یاد کرتی ہے اور اسے بھی اس کے بغیر جینا مشکل لگتا ہے۔ زندگی کے ساتھی کو کھو دینا کوئی معمولی واقعہ نہیں ہوتا اور اس کے لیے تو اس سانچے کی شدت اس لیے بھی بہت زیادہ تھی کہ ظہور کے علاوہ اس کا کوئی اپنا تھا ہی نہیں۔ وہ خیم خانے میں ملی کر جوان ہوئی تھی اور وہاں سے ظہور اسے اپنی دلہن بنا کر لے آیا تھا۔ خود ظہور کے رشتے داروں کا بھی کوئی اتنا پتا نہیں تھا۔ وہ سوتیلے باپ کی مار سے گھبرا کر گھر سے بھاگا تھا اور ادھر ادھر نزل کو جوان ہوتے اس گھر کا پتا بھول گیا تھا جس میں سوتیلا ہونے کے ناتے بھی اس کی جگہ بنی ہی نہیں تھی۔

ایمبولینس کے پیچھے وہاں تک آنے والے جو کوئی کارروائی ڈالنے کا ارادہ کر رہی تھی کہ عورت کو گھر سے باہر جاتے دیکھ کر چونک گئے اور پھر ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ فوراً ہی ان میں سے ایک الگ ہو کر عورت کے پیچھے چل پڑا جبکہ باقیوں نے اس کے گھر کا رخ کیا۔ وہ ایسے لوگ تھے جن کے لیے بند تالے کھولنا اور اونچی دیوار پر پھلانگ لینا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

”آئی۔۔۔ آپ کے گھر سے آپ کی بیٹی کے چہنچے کی آوازیں آرہی ہیں۔ شاید اسے کوئی مسئلہ ہے۔“ ابھی عورت مطلقہ، مگر دوسری اسٹور تک پہنچی ہی تھی کہ اس کا بیچھا کرنے والا شخص اس کے سر پر پہنچ کر اطلاع دینے لگا۔ انداز ایسا تھا جیسے وہ بھاگتا ہوا یہاں تک آیا ہو اور اس کا

ایمبولینس سے اترنے کے بعد اس نے پہلے اپنے ہاتھ میں موجود چابی سے بیرونی دروازے پر لگا تالا کھولا پھر پلٹ کر واپس ایمبولینس کی طرف آئی۔ اس بار اس نے سہارا دے کر ایک دہلی پتلی سی لوجوان لڑکی کو نیچے اتارا۔ لڑکی کی آنکھوں کے گرد موجود جھلنے اور جلد کی زرد رنگت سے ظاہر تھا کہ وہ بیمار ہے۔ عورت کے لڑکی کو لے کر گھر میں داخل ہونے تک ایمبولینس وہاں سے روانہ ہو چکی تھی لیکن ایمبولینس کا بیچھا کرتی ہوئی وہاں تک آنے والی گاڑی اب تک اپنی جگہ موجود تھی۔

”تم تھوڑی دیر آرام کرلو۔ میں جب تک تمہارے لیے سوپ چڑھا دیتی ہوں۔“ لڑکی کو بستر پر لٹاتے ہوئے عورت نے اس سے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ فریڈر کھولنے پر وہاں مرنے کا گوشت نظر نہ آنے پر اس کے ماتھے پر مل پڑے اور پھر اس نے زور سے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ اسے یاد آ گیا تھا کہ جس روز وہ اپنی بیٹی کو لے کر اسپتال گئی تھی، اسی روز اس نے چکن قورمہ بنایا تھا اور اپنی ضرورت کے مطابق تھوڑا سا رکھ لینے کے بعد باقی سارا مستحقین میں تقسیم کروا دیا تھا۔

”اب بازار جا کر مرنے لانا پڑے گی۔ چلو چلی جاتی ہوں۔ ضرورت کی دوسری دو چار چیزیں بھی ختم ہیں۔ وہ بھی لے لوں گی۔“ خود کلامی کے انداز میں بولتے ہوئے اس نے ایک بار پھر چادر کو پہلے کی طرح اوڑھا اور پرس کندھے سے لٹکا کر بیٹی کے کمرے کی طرف آئی۔

”سوپ کورہنے دیتیں امی! آپ ابھی تھکی ہوئی گھر آئی ہیں اور آتے کے ساتھ ہی آپ کے کام شروع ہو گئے ہیں۔“ لڑکی نے ماں کو باہر جانے سے روکنے کی کوشش کی۔ ”تمہاری صحت پر میں کوئی کپڑا نہیں کر سکتی۔ ڈاکٹر نے مجھے ہدایت کی ہے کہ تمہاری غذا پر خاص دھیان رکھوں۔“

”لوگ آپ کے بازار جانے پر باتیں بنائیں گے۔“ لڑکی نے دھیمی آواز میں اپنے اندیشے کا اظہار کیا۔

”لوگ تو اس بات پر بھی باتیں بناتے ہیں کہ عدت میں ہوتے ہوئے میں تمہارے ساتھ اسپتال میں کیوں رہی؟ تو بتاؤ کیا لوگوں کی باتوں کے ڈر سے میں تمہیں ایسے ہی بغیر ٹریٹمنٹ کے رہنے دیتی؟ نہیں میری جان امیرے لیے تم سب سے زیادہ قیمتی ہو اور میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میں تمہاری صحت پر کوئی کپڑا نہیں کر سکتی۔“ اس نے بیٹی کے گال کو دھیرے سے چھتے ہوئے اسے سمجھایا۔

ہوئی لیکن سوال ضرور اٹھایا۔
 میں کم لون ہوں۔" صورت اطلاع سن کر پریشان ہو کر

"میں آپ کے محلے میں نیا کرائے دار آیا ہوں۔
 ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے آپ کو ایسویٹس میں گھر آتے
 ہوئے دیکھا تھا۔ مجھے آپ کے حالات پر افسوس ہے۔"

وہ بڑی تہذیب سے بات کر رہا تھا۔ اس گفتگو کے
 دوران ان کا تیز قدموں سے داپسی کا سفر شروع ہو چکا تھا۔

"تمہاری بھردری کا شکریہ بٹا!" عورت نے پھولی
 ہوئی سانس کے ساتھ اسے جواب دیا لیکن کسی تہرے سے

گریز کیا۔ اس وقت اس کا پورا دھیان گھر تک کا فاصلہ جلد از
 جلد طے کر لینے پر لگا ہوا تھا۔ ظہور اگرچہ محلے میں بہت

شرافت سے رہتا تھا لیکن لوگوں کو اس کے لالہ بیٹی کے کینگ
 میں شامل ہونے کی خبر تھی اس لیے وہ احتیاطاً ان کے گھرانے

سے دور رہتے تھے۔ اس کے کل کے بعد یہ دوری مزید بڑھ
 گئی تھی۔ چند محلے دار رساجناڑے میں شرکت کے لیے

آئے تھے اور پھر وہ ماں بیٹی تمہارہ گئی تھیں۔ شاید لوگ
 ڈرتے تھے کہ ایک مجرم کی بیوی، بیٹی سے تعلق رکھنے پر وہ بھی

زد میں آسکتے ہیں۔ اس لیے ان سے فاصلے پر رہتے تھے۔
 اسے لوگوں سے کوئی شکوہ نہیں تھا لیکن کینسر کا شکار اکلوتی بیٹی

کے ساتھ زندگی کی جنگ لڑنا آسان نہیں تھا۔ بس اچھی بات
 یہ تھی کہ روپے پیسے کے لحاظ سے محتاج نہیں تھی۔ عجب

بینک میں اتنی رقم چھوڑ کر گیا تھا کہ وہ گھر پر اخراجات کے
 ساتھ ساتھ بیٹی کا علاج سہولت سے کر داری تھی۔

"اندر تو بالکل خاموشی ہے۔" گھر کے سامنے رک کر
 خود کار تالے کے سوراخ میں چابی کھاتے ہوئے وہ بڑبڑائی۔

"ہو سکتا ہے اب ان میں جینے کی سکت نہ رہی ہو۔"
 وہ اب بھی اس کے پیچھے کھڑا تھا اور مزید گل افشانی کرتے

ہوئے ہولارہا تھا۔
 "نامہ.....!" وہ پریشان سی بیٹی کو آوازیں دیتی

ہوئی گھر کے اندر داخل ہوئی اور اس کے کمرے میں پہنچ کر
 خشک مٹی۔

"کک..... کون ہو تم لوگ؟" اس نے ایک نظر بستر
 پر بھی ہوئی بیٹھی بیٹی اور دوسری اندر موجود افراد پر ڈالی اور

سب سے لہجے میں پوچھا۔
 "ہم موت کے فرشتے ہیں اور مرنے سے قبل ہی تم

سے اس رقم کا حساب لینے آئے ہیں جسے تمہارا شوہر ہمیں
 دھوکا دے کر تمہارے لیے چھوڑ گیا ہے۔" کرسی پر ٹانگیں

عورت نے کمرے سے نکلنے کے بعد اپنے ساتھیوں کی اطلاع پر
 وہاں پہنچا تھا۔

"میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی لیکن تم مجھے بتادو
 کہ ظہور نے تم سے کتنی رقم لی تھی؟ میں تمہیں تمہارے

سارے پیسے واپس کر دوں گی۔" وہ تھوک لگتے ہوئے
 خوفزدہ لہجے میں بولی۔ خوف کی وجہ صرف وہاں موجود افراد

کے ہاتھوں میں موجود ہتھیار نہیں تھے۔ وہ اس شخص کی
 نگاہوں سے بھی سر اسیسہ ہو رہی تھی۔ عجیب سی نظریں تھیں

جنہیں وہ مکمل طور پر چادر میں لپٹے ہونے کے باوجود اپنے
 اندر گڑنا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ یہ نگاہیں باڈل کے علاوہ بھلا

کس کی ہو سکتی تھیں؟ ظہور کی قیمتی کونشان عبرت بنانے کے
 لیے اس نے مسلسل اپنے آدمیوں کو پیچھے لگا رکھا تھا اور ان

ماں بیٹی کی گھر واپسی کی اطلاع سننے ہی وہاں آدھکا تھا۔
 "رم تو ہم وصول کر ہی لیں گے لیکن پہلے سود تو وصول

ہو جائے۔" وہ یکدم ہی کرسی سے اٹھا اور اس کی چادر کھینچی۔
 "خدا کے لیے نہیں۔" وہ اس کی آنکھوں میں موجود

شیطنیت دیکھ کر کانپ گئی اور بے ساختہ ہی کمرے سے باہر
 لکھتا چاہا لیکن وہاں وہ بطل تھا بے کھڑا تھا جو اسے گھیر کر گھر

واپس لایا تھا۔
 "خدا ہی نے تو یہ رنگ برنگی اور کھٹی ٹیشی عورتیں بنائی

ہیں اور میرے دل میں یہ ہوس ڈال دی ہے کہ میں زیادہ
 سے زیادہ اس بھل کو جکھ سکوں۔" اپنی بے راہ روی کا انزائم

خدا کے سر ڈالتے ہوئے اسے کوئی خوف نہیں تھا۔ ہوتا بھی
 کیسے؟ اسے دنیا میں لانے کا سبب بننے والے خود اس خوف

سے بے نیاز تھے اور اسے بھی خدا کی مخلوق کو اذیت میں مبتلا
 کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا تھا۔

"تم جتنی رقم کہو گے، میں تمہیں دے دوں گی۔ ظہور
 سے اگر تمہاری کوئی دشمنی تھی تو خدا کے لیے اسے معاف

کر دو۔ میری پیار بیٹی ہی کا خیال کر لو۔ اس کا میرے سوا
 کوئی نہیں ہے۔" راہ فراہ نہ پا کر وہ منتوں پر اتر آئی تھی لیکن

نہیں جانتی تھی کہ اس کے سامنے کھڑا شخص رحم کی صفت سے
 نا آشنا ہے۔

"عورتوں کے لسوؤں کے آسمے بچھلنے لگے تو لوگوں
 کے دل سے ہمارا خوف ہی نکل جائے گا اور تیرے شوہر کی

طرح ہر دوسرا بندہ ہمارے ساتھ دھوکا کرنے لگے گا۔" اس
 نے اپنی انگلیاں آنسو بہاتی عورت کی گردن میں گاڑ دیں۔
 وہ تکلیف اور خوف سے کراہی لیکن باڈل کے تیز کالوں نے

اس کراہ کے ساتھ ہی ہلکی سی دھب کی آواز بھی سن لی۔

”باہر کون ہے، دیکھو۔“ وہ کسی درندے کی طرح چونکا نظر آنے لگا اور غراتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے بولا۔ حکم سنتے ہی وہ تیزی سے باہر نکلے۔ اگلے ہی لمحے وہاں فائرنگ کی آواز گونجی۔

”خاموشی سے ایک طرف بیٹھ جاؤ۔ آواز نکالی تو دونوں کو گولی مار دوں گا۔“ باذل نے عورت کو اس کی بیٹی کی طرف دھکیلا اور خود لپک کر دروازے کے قریب پہنچا لیکن باہر نکلنے کی کوشش نہیں کی۔

”اپنے اپنے ہتھیار گرا دو۔ اگر کسی نے بھی گڑبڑ کی کوشش کی تو اس کی طرح دوسروں کی ہاڈی میں بھی سوراخ ہو جائے گا۔“ سائی دینے والی گرج دار آواز سے ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کے سامنے کتنے چکے ہیں۔ دروازے کی جھری سے جھانکنے پر اپنا ایک ساتھی اسے زخمی ٹانگہ تھا۔ اپنے ہی خون میں لت پت دکھائی دیا لیکن بولنے والا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے اپنے ایک ساتھی کو پستل سیدھی کر کے آواز کی سمت میں فائر کرتے دیکھا۔ رد عمل میں دو اطراف سے فائر آئے اور وہ شخص جھٹکا کھا کر نیچے گر گیا۔ اس کی حالت سے ظاہر تھا کہ اسے مہلک زخم آئے ہیں۔ اس کے اس انجام نے باقی دو کا دم خم خم کر دیا اور انہوں نے شرافت سے ہتھیار پھینک دیے۔ اس منظر نے باذل کو غصے کی شدت سے جڑے لپٹے پر مجبور کر دیا لیکن وہ خود کچھ کرنے سے لاجار تھا۔ کمرے میں اس دروازے کے سوا باہر جھانکنے کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں تھا اور یہاں سے وہ اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ کسی کے خلاف کوئی کارروائی کر سکے۔

”باذل.....! باہر آ جاؤ۔ اگر تم شرافت سے باہر نہ آئے تو تمہارے سارے لوگ مارے جائیں گے اور اس کے بعد تمہارا نمبر ہو گا۔“ اس بار اسے حکم دیا گیا۔

”تم لوگ کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟“ اس نے مہلت حاصل کرنے کے لیے ان لوگوں سے گفتگو کا سلسلہ شروع کیا اور مزید کمک منگوانے کا فیصلہ کر کے اپنا موبائل باہر نکالا لیکن یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ موبائل پر سنسنز موجود نہیں ہیں اور اس بات کا ایک ہی مطلب تھا کہ حملہ آوروں کی طرف سے جبر کا استعمال کیا گیا ہے۔

”گفتگو کرنا ہے تو مردوں کی طرح سامنے آ کر کرو۔ پردے دار عورتوں کی طرح کواڑ کے پیچھے سے مذاکرات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ یہ تو تمہیں اب تک پتا چل ہی گیا ہو گا کہ باہر سے کوئی تمہاری مدد کے لیے نہیں آئے گا۔“

”تمہیں مذاکرات کرنے ہوتے تو ہتھیار لے کر مجھ پر حملہ آور نہیں ہوتے۔ تم مجھے مارنے آئے ہو۔“ اس جیسا کانیاں شخص یہ حساب کتاب نہ کر پاتا، کیسے ممکن تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کے خون کے پیاسے بے لال میسے کے ساتھی بھی ان لوگوں ہی کی طرح ان ماں بیٹی کی نگرانی کر رہے تھے۔ اس کی فطرت سے واقف لوگوں کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ وہ ظہور کے مرنے کے بعد بھی اس کی دھوکا دہی کو معاف نہیں کرے گا۔ اس لیے اسے اس طریقے سے گھبرانے کی کوشش کی گئی تھی اور یہ کوشش خاصی حد تک کامیاب رہی تھی۔

”تو پھر ٹھیک ہے، اندر کھسک کر مار دیتے ہیں۔“ جواب کے ساتھ ہی دروازے پر مشین گن کا پورا برسٹ مارا گیا۔ وہ سامنے پر ہونے کی وجہ سے محفوظ رہا۔ ظہور کی بیوی اور بیٹی بھی زد میں نہیں تھیں لیکن خوف کے مارے ان کے حلق سے چیخیں نکل گئیں۔

”اگر تم نے اگلا فائر کیا تو میں تمہارے وفادار کی بیوی اور بیٹی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ اس نے دھمکی دی۔

”وہ دونوں ہمارے کسی کام کی نہیں۔ تم ان کے ساتھ جو چاہے سلوک کر سکتے ہو۔“ لہجائی توقف کے بعد بے نیازی ظاہر کرتا یہ جواب دیا گیا لیکن باذل کے لیے وہ لہجائی توقف ہی بہت کچھ بھانپ لینے کے لیے کافی تھا۔ وہ زیر لب مسکرایا اور بستر پر سہمی ہوئی بیٹی کی طرف بڑھا۔

”اٹھو۔“ ان کے سر پر پستل تان کر غرایا تو وہ دونوں حریف خوفزدہ ہو گئیں۔

”ساتھ نہیں؟ میں نے کہا ہے اٹھو۔“ وہ بری طرح غرایا تو ان دونوں کو چاروں طرف بستر چھوڑ کر نیچے اترنا پڑا۔

”دروازے کی طرف بڑھو۔“ اس نے اگلا حکم صادر کیا۔

”وہ گولیاں چلا دیں گے۔“ عورت لرزتی آواز میں بولی۔

”ان سے شاید بچ جاؤ لیکن مجھ سے ہرگز نہیں بچو گی۔“ اس نے پستل کی نال عورت کی کنٹھ پر رکھ کر دباؤ ڈالا تو اس کی سسکی نکل گئی لیکن اس نے قدم آگے بڑھا دیے۔ بیٹی بھی ماں کے ساتھ گئی آگے بڑھ رہی تھی۔

ابھی وہ لوگ دروازے تک پہنچے نہیں تھے کہ وہاں سے دو افراد بھڑامار کر اندر داخل ہوئے۔ باذل جو پہلے ہی دونوں خواتین کے پیچھے تھا مزید ان کی آڑ میں ہو گیا اور غرا کر بولا۔

”اگر میری راہ روکنے کی کوشش کی تو ان دونوں کو جان سے مار دوں گا۔“

”مت بھولو کہ باہر تمہارے ساتھی بھی ہمارے رحم و کرم پر ہیں۔“

خواجہ بھر حال اس نے اڑے اڑے طور پر موجود رہا۔
استاد اپنی جگہ کھڑا سے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ اس کے پاس اتنی
افرا دی نظری تھی کہ باذل کو روک لینا مشکل نہیں تھا لیکن وہ
کسی گہری سوچ میں پڑ چکا تھا۔

”ان دونوں کا بھی آج بھیا نک انجام ہونا تھا لیکن
چلو تم سے دوستی بنانے کے لیے انہیں بھی زندہ چھوڑ جاؤں
گا۔“ جاتے جاتے وہ ایک اور مہربانی کر گیا۔ اشارہ دونوں
خواتین کی طرف تھا۔

گلو استاد اپنی جگہ کھڑا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس
کے ساتھی جاتے ہوئے اپنے زخمی ساتھیوں کو بھی ساتھ اٹھا کر
لے گئے تھے۔ اس چھوٹے سے گھر میں برپا ہونے والا
ہنگامہ اتنی آسانی سے سرد ہو جائے گا، کسی کو بھی توقع نہیں تھی۔
”استاد.....!“ گلو کے ساتھ اندر آنے والے نے
اس سے کچھ کہنا چاہا۔

”جانے دے یار! بعد میں دیکھ لیں گے۔ ابھی تو
میں اس کی آفر پر غور کر رہا ہوں۔“ گلو نے ہاتھ اٹھا کر اسے
بولنے سے روکا۔

”لیکن.....“ اس سے آگے پوچھنے والے کی بھی کچھ
کہنے کی ہمت نہیں تھی۔

”مہر کر اور اب یہاں سے نکلنے کی کر۔ سالے علاقہ
ایس ایچ او پر پریشا آ جائے گا کہ گولیاں چلیں اور پولیس اتنی
دیر تک موقع پر نہیں پہنچی۔“ اس نے گولیاں بات ہی ختم کر دی
لیکن بات اس کے اپنے دماغ میں ختم نہیں ہوئی تھی۔ وہ
بہت کچھ سوچ رہا تھا اور کسی حتیٰ نتیجے تک پہنچنے تک اسے
سوچتے ہی رہتا تھا۔

”ظہور کی بیوی اور بیٹی سے کہنا اپنا سامان پیک
کر لیں۔ اب ان کو یہاں نہیں چھوڑنا ہے۔“ خود باہر نکلتے
ہوئے وہ آخری حکم دے کر نکلا تھا۔

☆☆☆

”کیسی پریشانی؟“

”جہیں یاد ہے کہ جب ہم دلیپ اور اس کے
ساتھیوں سے بچ کر بھاگے تھے تو ہمیں درختوں کے ایک
جھنڈ میں ایک شخص اپنی گاڑی میں ٹرودہ حالت میں ملا تھا؟“
سونیا نے اس سے پوچھا۔

”ہاں، ہاں۔ اس شخص کے بارے میں بعد میں ہمیں
پتا چلا تھا کہ وہ حیدر آباد کا کوئی نواب ہے۔“ اسے بھی یاد آیا
پھر چونکا۔ ”کیا یہ اسی نواب کی جوتلی ہے؟“
”ابھی کفرم نہیں لیکن وہ شخص جس نے ہمیں نواب کے

پروا نہیں۔ ایسے بہت چھوٹے پیرے پاس۔ یہ چار
مارے جائیں گے تو ان کی جگہ لینے دس اور آجائیں گے۔“
”سنا تھا تو انسان کے روپ میں وہ غلیظ مخلوق ہے
جس کا انسانیت سے دور و در تک بھی تعلق نہیں ہے۔ آج اپنی
آنکھوں سے دیکھ بھی لیا۔“ اندر داخل ہونے والوں میں
سے ایک نے اپنے چہرے پر لگا ماسک ہٹاتے ہوئے اس پر
تھارت سے تہرہ کیا۔

”خواجہ کی انسانیت دکھانے والے لاشوں کے
سرہانے کھڑے ہو کر کیے جانے والے عہد نبھانے کے لیے
خود کو خوار کرتے پھرتے ہیں۔ عقل سے کام لو، گلو استاد! اور
بے کار کے کام کرنے کے بجائے لالہ عیسیٰ کے سیٹ اپ کو
سنجھانے کے لیے جان مارو۔ مفت میں جو جگہ مل گئی ہے، خود
کو اس کا اہل ثابت کرو۔“ اسے یقین ہو چکا تھا کہ جب تک
اسے ان دونوں عورتوں کی آڑ حاصل ہے، اس پر حملہ نہیں کیا
جائے گا۔ اس لیے اطمینان سے جواب دیا۔

”لالہ کے قاتل کو قبر میں پہنچائے بغیر میں خود کو اس
گدڑی کا حق دار نہیں سمجھ سکتا۔“ گلو استاد نے اسے گھورا۔
”کون قاتل؟ لالہ عیسیٰ نے خود کشی کی تھی۔ تم جانتے
ہو وہ اپنی زندگی سے بیزار تھا۔“

”اور تو اپنے آدمیوں کی فوج اور اسلحہ لے کر وہاں
اس کی آرتی اتارنے گیا تھا نا؟ لالہ خود کشی نہ کرتا تو، تو نے
اسے گولی مار دیتا تھی۔“

”نہیں، مجھے تو بس اسے کہیں ڈلیور کرنے کی ڈیوٹی ملی تھی۔
مجھے اس کی جان کا بھلا کیا کرتا تھا۔“ اس نے شانے اچکائے۔

”کہاں ڈلیور کرنا تھا؟“ گلو استاد چونکا۔
”دھندے والے آدمی ہو کر ایسے سوال کر رہے ہو۔“

پارٹی کا نام راز میں نہ رکھنے والے کی مارکیٹ میں کیا ساکھ
ہوتی ہے، کیا تمہیں نہیں معلوم؟“

”نام تو میں تیرے حلق سے آنتیں کھینچ کر بھی
اگلوالوں کا بچھا۔“ گلو نے بڑک ماری۔

”چھوڑو یار! کیا دکھا ہے ان باتوں میں۔ کبھی موڈ
ہے تو ہمارے ساتھ مل کر دھندا کرنا۔ دوسروں سے اچھا ہی
ریٹ دیں گے ہم تمہیں۔“ لہجہ ایسا دوستانہ تھا جیسے اب تک
وہاں کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

”اچھا تو اب میں چلتا ہوں۔ میرے بندوں کا جو
نقصان ہوا ہے، وہ نئی ڈیل کے لیے خیر سگالی کے طور پر
جانے دیتا ہوں۔“ گلو کو سوچ میں دیکھ کر اس نے بڑے
اعتماد سے دروازے کی طرف قدم بڑھائے لیکن دونوں

ہٹ کر حویلی کے منظم ماحول اور ملازمین کی مخصوص وردی میں اس کی شخصیت خاصی مختلف محسوس ہو رہی تھی۔

کھانے کے بعد اپنے شاگردوں عبید اور خیزہ سے اگلی صبح کے اوقات کار ملے کر کے وہ دونوں اپنے لیے مخصوص کی گئی خواب گاہ میں واپس چلنے لگے تو معاذ کو موقع مل گیا۔

”پلیز، آدھے گھنٹے بعد ہمارے کمرے میں گرین ٹی بھجوا دینا۔“ اس نے اس شخص کے قریب سے گزرتے ہوئے اسے ہدایت دی۔

”او کے سر!“ اس نے سر کو ادب سے ہلکا سا خم دیا۔

”کیا کرنے کا ارادہ ہے؟“ کمرے میں پہنچ کر سونیا نے پریشانی سے پوچھا۔

”بس دیکھتی جاؤ۔“ کوئی واضح جواب دینے کے بجائے وہ ٹی وی کھول کر بیٹھ گیا اور ہلکی آواز میں خبریں دیکھنے لگا۔ اسے گفتگو پر آمادہ نہ دیکھ کر سونیا نے اپنا شب خوابی کا لباس نکالا اور تبدیل کرنے چلی گئی۔ خبروں میں ابھی تک دلپ اور اس کے ساتھیوں کے پولیس کے گھیرے سے نکلنے والے واقعے کی گونج باقی تھی۔ سب سے زیادہ کھنچائی ایس ایس پی، بی ایچ ٹھا کر کی، کی جارہی تھی جس نے یقینی تصدیق کے بغیر ہی ایک نیوز اینکر کو اپنے حساب سے کمانڈر ایکشن کی کوریج کے لیے اجازت دے دی تھی اور مبینہ طور پر وہ اینکر ہی ساری خرابی کا سبب بنا تھا۔ بہر حال خبریں دیکھنے میں اس کا وقت آسانی سے گزر گیا اور ٹھیک آدھے گھنٹے بعد دروازے پر دستک ہوئی۔

”یس کم ان۔“ اس نے بارعجب لہجے میں دستک کا جواب دیا اور ایک نظر سونیا کی طرف ڈالی۔ وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی اپنے چہرے پر نائٹ کریم کا سماج کر رہی تھی۔ ملازم خاموشی سے اندر آیا اور پورے اہتمام سے لائی گئی گرین ٹی کی ٹرے ایک تپائی پر رکھی۔ معاذ نے اشارہ کیا تو کیتلی سے قبوے کو پیالی میں انڈیل دیا۔ سارا کمرہ گرین ٹی اور لالہ لہجی کی ملی جلی مہک سے بھر گیا۔

”یسن سر؟“

”یس، اوکلی نوڈر ایس۔“ معاذ نے اس کے استفسار کا سنجیدگی سے جواب دیا اور بغور اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لینے لگا۔ بظاہر وہ بہت سلیقے سے ایک طشتری میں دھرے لیمو کے ٹکڑوں میں سے ایک ٹکڑا اٹھا کر اس کی ہدایت پر عمل پیرا تھا لیکن اس کی باڈی لینگویج اس کے اعصابی تناؤ کی چٹلی کھا رہی تھی۔ یہ تناؤ کیوں تھا؟ اس سوال کا ایک ہی جواب تھا۔ سونیا کا خدشہ درست تھا۔ وہ اسے

بارے میں اطلاع دی تھی، وہ اس حویلی میں موجود ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے وہ کھیتوں کا رکھوالا.....؟“ معاذ کو بھی وہ شخص یاد آیا۔ اس روز انہوں نے اس رکھوالے سے ہی کھانے پینے کا سامان اور کپڑے حاصل کیے تھے۔

”ابھی جو ملازم ہمیں بلانے آیا تھا، وہ وہی رکھوالا تھا۔“ سونیا نے ہم پھوڑا۔

”لیکن.....“ معاذ حیرت کے باعث شخص اتنا ہی کہہ سکا۔ اسے یاد تھا کہ اس شخص کو سونیا نے بے ہوشی کی حالت میں ہندی برد کر دیا تھا۔

”جب ہی تو کہہ رہی ہوں کہ مژدہ زندہ ہو کر واپس آ گیا ہے۔“

”جسہیں کوئی غلط فہمی تو نہیں ہوئی؟“

”نہیں، ہم نے غور نہیں کیا لیکن میں نے نوٹ کیا تھا کہ وہ مجھے ابھی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ شاید پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ جلد یا بدیر اسے یاد آ جائے گا۔ ایسے میں وہ کوئی گڑبڑ کر سکتا ہے۔“ اس نے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔

”پھر.....؟“ معاذ نے مشورہ لینے والے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

”لازمی بات ہے، ہمیں اس کو خاموش رکھنے کا انتظام کرنا پڑے گا۔“

”کیسے؟“ اس نے حکیمی نظروں سے سونیا کی طرف دیکھا تو وہ جزبزی ہو گئی۔ اسے لوگوں کو خاموش رکھنے کا جو طریقہ آتا تھا، جانتی تھی کہ معاذ اس سے اتفاق نہیں کرے گا۔

”ایسا کرو، یہ کام مجھ پر چھوڑ دو۔ ہمیں یہاں دو چار دن ہی رہنا ہے اور اتنے دن اس کی زبان بندی کا انتظام میں کر دوں گا۔“

”شیور؟“ وہ حند بذب تھی۔

”بالکل۔ اب چلو اٹھو۔ سچے کھانے پر ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔ نوابی خون ہے، کہیں تاخیر پر برا ہی نہ مان جائیں۔“ وہ بہت مبرا اعتماد تھا۔ اس بار سونیا نے کچھ نہیں پوچھا اور اس کے ساتھ کمرے سے باہر آ گئی۔ ایک ملازم نے ڈائننگ روم تک ان کی راہنمائی کر دی۔ پُر تکلف کھانا، تکلف زدہ ماحول میں ہی کھایا گیا۔ چند ایک رکی جملوں سے آگے گفتگو بھی نہیں ہوئی البتہ معاذ کو کھانا پروسے والے ملازمین کے درمیان مذکورہ ملازم کو دوبارہ دیکھنے کا موقع مل گیا۔ اس بار اس نے بھی اسے پہچان لیا۔ وہ واقعی وہی رکھوالا تھا لیکن مکمل سرسری نظر میں وہ اس لیے اسے شناخت نہیں کر سکا تھا کہ خالص دیہاتی ماحول اور لباس سے

مکڑی سونیا نے شانوں پر دباؤ ڈال کر ناکام بنا دیا اور آہستہ سے فرائی۔

”آرام سے منظور نہ آج بھی تمہاری کچنی پر اس روز کی طرح ایک گھونسا مار کر تمہیں بے ہوش کر سکتی ہوں۔“
”ہوسکتا ہے آج بے ہوش ہونے کے بعد تمہیں دوبارہ آنکھیں کھولنا نصیب نہ ہو۔ اس لیے بہتر ہے کہ خود کو مشکل میں ڈالنے کے بجائے آرام سے بیٹھ جاؤ۔“ معاذ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گھیر لہجے میں اسے سمجھایا تو وہ ایک لمبے لمبے خاموش ہو گیا پھر منت بھرے لہجے میں بولا۔

”بھگوان کے لیے مجھے جانے دیں۔ میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا آپ کے بارے میں۔“

”یہ باتیں چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ اس روز تم زندہ کیسے بچ گئے تھے؟“ معاذ نے اس بار نسبتاً نرم لہجے میں اس سے سوال کیا۔ آنکھیں اب بھی بدستور اس کی آنکھوں پر جمی تھیں۔

”قسمت تھی جی۔ بس، دن پورے نہیں ہوئے تھے۔ ندی میں گرتے ہی مجھے ہوش آ گیا۔ تھوڑے ہاتھ پاؤں مارے۔ خیر بھگوان کی کرپا سے ایک کسان ادھر آ نکلا۔ اس نے مجھے ندی میں ڈکیاں لگھاتے دیکھا تو خود بھی ندی میں چھال لگا دی۔ اسی کی مدد سے میں بچ پاپا۔“ اس کا لب و لہجہ پہلے کے مقابلے میں بہت بدل چکا تھا لیکن بہر حال کہیں نہ کہیں گنگو میں پنجابی الفاظ کا استعمال کر ہی ڈالتا تھا۔
”یہاں کیسے آئے؟“ معاذ کا اشارہ اس کی ملازمت کی طرف تھا۔

”نواب رکن الدین کی میت کے ساتھ آیا تھا۔ یہاں کا ماحول اور ملازمین کے ٹھٹھا ہاٹ دیکھے تو نواب صاحب سے درخواست کی کہ مجھے بھی یہاں رکھ لیں۔ وہ بڑے مروت والے آدمی ہیں۔ میری بات مان لی لیکن شرط رکھی کہ یہاں کا ماحول اور ادب تہذیب سیکھنے کے لیے محنت کرنا ہوگی۔ میں جی جان سے مان گیا۔ آپ دیکھ ہی سکتے ہیں کہ اب میں کتنا بدل چکا ہوں۔ مجھے یہ لو کری اس آگنی ہے۔“ اب وہ قدرے اطمینان سے جواب دے رہا تھا۔ سونیا پیچھے مکڑی سب سننے کے ساتھ ساتھ بخور معاذ کے انداز کا جائزہ لے رہی تھی۔

”نواب رکن الدین کی لاش کہاں سے ملی تھی؟“

”درختوں کے ایک جھنڈ سے۔“

”وہ طبی موت مرے تھے پھر تم نے ان کی موت کا

”نام کیا ہے تمہارا؟“ معاذ یکدم ہی اپنی جگہ سے اٹھا اور صحن اس کے سر پر پہنچ کر اس سے دریافت کیا۔

”بھگ..... بھگوان داس سرا“ اسے معاذ کی حرکت نے بوکھلا دیا اور گڑبڑا کر دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے ذرا سا ہٹکا کر جواب دیا۔ اب سونیا بھی اپنے چہرے کا مساج چھوڑ کر آئینے میں سے اس سب کو فور سے دیکھ رہی تھی۔

”اس حویلی سے پہلے کہاں ملازمت کرتے تھے؟“ معاذ نے اس سے دریافت کیا۔

”گنگ..... گنگیں نہیں جی۔ شروع سے ہی ادھر ہوں۔“ اس کی بوکھلاہٹ میں اضافہ ہوا۔

”گنگ تو نہیں ہے۔ تمہارا لب و لہجہ تو پنجاب والوں جیسا ہے۔“ معاذ نے اس کا گھیراؤ کیا۔

”وہ جی پیدائش پنجاب کی ہے پر ملازمت شروع ہی سے ادھر کر رہا ہوں۔“ اس نے بات بتانے کی کوشش کی لیکن اس کے لہجے کی گھبراہٹ اس کی کوشش کو ناکام بنا رہی تھی۔

”میرے خیال میں جس وقت بے چارہ ندی میں ڈوبا تو اس کی یادداشت چلی گئی اور یہ اپنا سارا پچھلا بھول گیا۔ ایسا کرتے ہیں ہم دونوں مل کر اسے یاد دلانا دیتے ہیں۔“ معاذ نے سونیا کی طرف رخ کر کے متقی خیر لہجے میں کہا تو اس کی حالت مزید خراب ہو گئی۔

”مجھے رسوئی میں خانساں کی مدد کروانے جانا ہے۔ آپ لوگ قبوہ نہیں۔ میں چلتا ہوں۔ اگر کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو انٹرکام پر بتا دیجیے گا۔“ وہ وہاں سے فرار کے لیے پرتولنے لگا۔

”ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ ذرا ٹٹھو تو سہی۔“ معاذ نے اس کے شانوں کو اپنے مضبوط ہاتھوں کی گرفت میں لیتے ہوئے اسے صوفے کی طرف دھکیلا جس پر کچھ دیر قبل خود بیٹھا ہوا تھا۔ اس موقع پر سونیا بھی حرکت میں آئی اور پھرتی سے اس صوفے کے عقب میں جا مکڑی ہوئی۔

”مجھے جانے دو ورنہ میں شور مچا دوں گا اور نواب صاحب کو یہ بھی بتاؤں گا کہ تم ان کے والد نواب رکن الدین کے قاتل ہو۔“ اس بار وہ کل گیا اور دھمکی دی۔

”ہم تمہیں اس کی مہلت ہی نہیں دیں گے۔“ معاذ نے چہرے پر خوفناک سنجیدگی طاری کرتے ہوئے اسے دھمکی دی اور صحن اس کے سامنے آ کر کھڑے ہوتے ہوئے اپنی آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈالیں۔

”مم..... میں.....“ بھگوان داس نے ہڑبڑا کر

انرا مہارے اوپر لگانے کی کوشش کیوں کی؟

”نواب صاحب کے دونوں کتوں کو مل کیا گیا، ان کی گاڑی چوری ہو گئی اور وہ مردہ حالت میں زمین پر پڑے پائے گئے تو یہی نتیجہ نکلا کہ لٹیروں نے ان پر حملہ کر دیا تھا۔ وہ بوڑھے اور دل کے مریض تھے۔ ان حالات کو برداشت نہیں کر سکے اور دل کا دورہ پڑنے سے مر گئے۔“ اس نے بتایا تو معاذ اس تحقیق پر دل ہی دل میں اُش اُش کر اٹھا۔ نتائج اخذ کرتے ہوئے کسی سائنسی توجیح کی ضرورت ہی نہیں محسوس کی گئی تھی ورنہ نواب رکن الدین اور کتوں کی موت کے درمیان کم از کم آٹھ نوکھنوں کا فرق تھا۔ نواب صاحب کی موت کے اتنی دیر بعد مرنے والے کتوں کی موت کو ان کے دل کے دورے کا سبب قرار دینے والا یقیناً کوئی سپر جینس ہی تھا۔ ان کتوں کو بھی انہیں محض اپنے بچاؤ کے لیے ہلاک کرنا پڑا تھا۔ وہ اور سونیا تو درختوں کے اس جھنڈ میں محض پناہ کے لیے مجھے تھے اور کتوں نے اچانک ہی ان پر حملہ کر دیا تھا۔ نواب رکن الدین کی لاش انہوں نے کتوں سے جان چھڑانے کے بعد دریافت کی تھی اور گاڑی بھی اس لیے آرام سے استعمال کر لی تھی کہ مردہ نواب صاحب کو اس کی احتیاج نہ رہی تھی۔

”جو ہوا، اسے بھول جاؤ اور اب یہ یاد رکھو کہ نواب صاحب کی موت سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ تم ہمیں جانتے ہی نہیں ہو۔“

”جی ٹھیک ہے۔“ اس نے مان لیا۔

”میرے ساتھ وہراؤ۔“ معاذ نے تاکید کی

زور دیا۔

”میں آپ دونوں کو نہیں جانتا ہوں۔ میں نے آپ کو آج پہلی بار دیکھا ہے اور مجھے یہی معلوم ہے کہ آپ مسٹر اور سسر ڈی سوزا ہیں جو عبید بابا اور میزہ بی بی کو پڑھانے کے لیے یہاں آئے ہیں۔“ وہ بولتا جا رہا تھا اور بھگوان داس اس کے الفاظ کو دہراتا جا رہا تھا۔ اس کا لہجہ کچھ خراب آلود تھا۔ سونیا نے لہجے کی اس تبدیلی اور معاذ کے انداز کو بغور دیکھا اور اسے پہلی بار ادراک ہوا کہ وہ بھگوان داس پر تنقیدی عمل کر رہا ہے۔ وہ اپنی جگہ دنگ رہ گئی۔ وہ پروفیسر وکٹر کو دیکھتی رہی مگر اس طرح کسی کو تنقیدی عمل کرتے اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔

معاذ نے بھگوان داس کو کچھ مزید ہدایات ذہن نشین کروائیں اور پھر پوچھا۔ ”کیا تمہیں معلوم ہے کہ دہلی سے آئے ہوئے وہ دو افراد کہاں ہیں جنہیں دیوانی شخص نے

نواب صاحب کے پاس بھجوایا ہے؟“

”مجھے ایسے افراد کے بارے میں کوئی علم نہیں۔“ اس نے لاطینی کا اظہار کیا۔

”اگر نواب صاحب کسی کو خفیہ طور پر یہاں رکھیں تو ایسے افراد کو کہاں رکھا جاتا ہے؟“ اس نے اپنے سوال کی نوعیت تبدیل کی۔

”اگر وہ کوئی معزز شخص ہے تو اسے پچھلے مہمان خانے میں ٹھہرایا جاتا ہے اور وہاں خاص ملازمین کے علاوہ کسی کو جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔“

”اور اگر وہ کوئی عام شخص ہو؟“ اسے معلوم تھا کہ عالم شاہ اور سرمد کو معزز مہمانوں کی فہرست میں نہیں رکھا گیا ہوگا اس لیے بے یقینی سے پوچھا۔

”مجھے ٹھیک سے نہیں معلوم۔ بس دوسروں سے سنا ہے کہ پانچ بارگ کے ساتھ جو برہمنی بی بی ہے اس کے نیچے وہ خانے کا راستہ ہے۔ اس خانے میں نواب صاحب کے قیدیوں اور ایسے ننگ خواروں کو رکھا جاتا ہے جنہیں قانون یا دشمنوں سے چھپانا ہو۔“

”تم بھی اس طرف مجھے ہو؟“

”نہیں۔ عام ملازموں کو وہاں جانے کی اجازت

نہیں۔“ اس نے بتایا۔

”اوکے۔ اب تم ایسا کرو کہ اپنے کمرے میں جاؤ اور جا کر آرام سے سو جاؤ۔ صبح سے پہلے تمہیں اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلتا ہے۔“ یہ اندازہ ہو جانے کے بعد کہ بھگوان داس اسے مزید کوئی کارآمد معلومات فراہم نہیں کر سکتا، اس نے اسے آخری ہدایات دیں اور خود تھکا تھکا سا بستر پر گر گیا۔

”امیڈنگ اتھبہاری اس صلاحیت کا تو کسی کو علم ہی نہیں تھا۔“ بھگوان داس کمرے سے باہر چلا گیا تو اب تک خاموش قماشائی کا کردار ادا کرتی سونیا نے تسمین آمیز لہجے میں اپنی حیرت کا اظہار کیا۔ وہ جواباً خاموش رہا۔

”اب میں سمجھی کہ تم پروفیسر وکٹر کے قایم میں کیوں نہیں آسکے۔ وہ بے جا رہ جاتا ہی نہیں تھا کہ وہ جس کے ذہن کو کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہا ہے، وہ خود ایک ماہر فن ہے۔“ وہ کچھ پرجوش سی تھی۔

”تم نے یہ کہاں سے سیکھا؟ یہ پٹا ٹرم ہی ہے نا؟ لیکن تمہارا طریقہ بہت عجیب ہے۔ پروفیسر وکٹر جب کسی کو پٹا ناز کرتا ہے تو پورا ماحول بناتا ہے۔ خاموشی، نیم تاریک کمرہ، کچھ آلات وغیرہ لیکن تم نے تو اتنی آسانی سے بغیر کسی اہتمام کے یہ سب کر لیا جیسے چھری سے کیک کاٹ رہے

اور معاذ کی طرف سے کوئی جواب نہ ملنے کے باوجود وہ بولتی جا رہی تھی۔

”پلیز! میں تمکا ہوا ہوں اور سونا چاہتا ہوں۔ تم بھی سو جاؤ تاکہ ہم صبح اٹھ کر اپنے کام پر فوکس کر سکیں۔“ اس کا نہایت بیزاری سے دیا گیا جواب سونیا کو باور کروا گیا کہ وہ اس کے کسی سوال کا جواب نہیں دینا چاہتا۔ وہ اپنی جگہ بچھری گئی۔ وہ اس کے ساتھ ہو کر بھی اس کے لیے زیادہ قابل اعتبار نہیں تھی۔ اعتبار کا رشتہ قائم ہونے میں کتنا وقت لگتا، اسے نہیں معلوم تھا۔ اسے بس مسلسل کوشش کرنا تھی اور انتظار کرنا تھا۔ وہ یہ دونوں کام کرنے کے لیے تیار تھی۔

☆☆☆

صبح معاذ کی آنکھ کھل تو فصل خانے سے پانی گرنے کی آواز آرہی تھی جس کا مطلب تھا کہ سونیا وہاں موجود ہے۔ اس نے ایک نظر بستر پر ڈالی اور درمیان میں ایک قطار سے رکھے صوفے کے کشتہ کو گھورتا رہ گیا۔ کشتہ کی یہ قطار گویا شرافت کی دیوار تھی جس نے وسیع و عریض بیڈ پر ان دونوں کے درمیان حد کھینچ دی تھی۔ سونیا جیسی عورت کا یہ رویہ اس کے لیے اچھے کا باعث تھا۔ چنانچہ وہ یہ سب اسے متاثر کرنے کے لیے کر رہی تھی یا واقعی سچ بچ بدل گئی تھی۔

”اٹھ گئے ہو تو جلدی سے فریش ہو کر تیار ہو جاؤ۔ ہمیں ٹھیک ساڑھے سات بجے ناشتے کی میز پر ہونا ہے۔“ سونیا کی آواز پر وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ ٹھہری ٹھہری سی اس کے سامنے کھڑی تھی۔

”بس دس منٹ میں تیار ہو رہا ہوں۔“ اس نے پھرتی سے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ دوبارہ کمرے میں واپس آیا تو بستر پر موجود کشتہ واپس صوفوں پر پہنچ چکے تھے اور سونیا آگینے کے سامنے کھڑی اپنے بال سنوار رہی تھی۔ سات بج کر پچیس منٹ پر وہ دونوں ہی محل تیار ہو گئے۔ ٹھیک آٹھ بجے وہ بھگوان داس کی راہنمائی میں ڈائننگ ٹیبل پر پہنچ چکے تھے۔ بھگوان داس کے روپے میں ایک واضح تبدیلی تھی۔ وہ اب سونیا کو کھوجتی نگاہوں سے گھورنے کے بجائے دوسرے ملازمین کی طرح مؤدبانہ انداز اختیار کیے ہوئے تھا۔

ناشتا خوشگوار ماحول میں کیا گیا۔ عید اور میزہ دونوں ہی منہذب پہنچے تھے۔ ان کے ساتھ ناشتے کے دوران ہلکی پھلکی گپ شپ میں انہیں مزہ آیا۔ باقی کا دن انہوں نے ایک طے شدہ شیڈول کے مطابق گزارا۔ معاذ کے پاس اکیڈمی میں پڑھانے کا تجربہ تھا لیکن وہ یہ دیکھ کر تھوڑا سا حیران ہوا تھا کہ سونیا بھی یہ کام احسن طریقے سے

انجام دے رہی ہے۔ حقیقتاً وہ ایک حیران کن شخصیت کی مالک تھی۔ حین کامل کے ساتھ ساتھ بے شمار صلاحیتوں نے اس کی شخصیت کو ہر جہت بنادیا تھا لیکن معاذ جب بھی اس کی طرف دیکھتا تھا، اسے اپنے خاندان کی تباہی یاد آ جاتی تھی۔ وہ بھول ہی نہیں سکتا تھا کہ اس کی تباہی کا آغاز سونیا سے ملاقات کے بعد ہوا تھا۔

وہ یہاں بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے نہیں آئے تھے۔ یہ کام فقط ایک بہانہ تھا لیکن دونوں ہی نے محسوس کیا کہ انہیں اس کام میں لطف آرہا ہے۔ بچوں کی ذہانت اور متعاون رویے نے بھی ان کے لیے اس کام کو دلچسپ بنایا تھا۔ دوپہر کے کھانے تک وہ بنا کسی تھقل کے مصروف رہے۔ ایک بچے سے تین بجے تک آرام کا وقفہ تھا۔ تین بجے سے پانچ بجے تک کا وقت ہم نصابی سرگرمیوں کے لیے وقف تھا۔ انہوں نے اس وقت ٹیبل ٹینس کھیلنے پر زور دیا۔ دونوں بہن بھائی کا دعویٰ تھا کہ وہ اس کھیل میں بہترین ہیں۔ وہ اس دعوے میں غلط بھی نہیں تھے لیکن سونیا اور معاذ کے اسٹیمنٹ نے انہیں بری طرح متاثر کیا۔

”آپ دونوں نے ہمیں تمکا دیا مسٹر ایڈمز سڑی سوزا!“ میزہ کے لیے جب اپنی سانس بحال رکھتا مشکل ہو گیا تو کھیل چھوڑ کر ایک کرسی پر ڈھیر ہوتے ہوئے بولی۔

”کسی بھی کھیل میں مہارت اور اسٹیمنٹ ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ بہترین کھلاڑی وہی ہوتا ہے جو ان دونوں پر توجہ دے۔ اچھے اسٹیمنٹ کے بغیر تو کسی بھی کھیل کے میدان میں کامیابی کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔“ سونیا نے ماتھے پر آئی پسینے کی بوندیں صاف کرتے ہوئے اسے سمجھایا۔ وہ وزن اور عمر دونوں میں میزہ سے زیادہ تھی لیکن اتنی دیر کی مشقت کے باوجود اس کی سانس ہوار تھی۔

”اسٹیمنٹ مضبوط کرنے کے لیے ہمیں کیا کرنا ہوگا؟“ میزہ نے تجسس سے پوچھا۔

”ہماری ہدایات پر پورا پورا عمل.....“ سونیا نے ہنس کر جواب دیا تو وہ بھی جھابا اس دی۔ نوجوانی کی سرحد پر کھڑی وہ لڑکی خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ پُر محنت بھی تھی اور ظاہر ہے یہ اس کی خاندانی شان کا اثر تھا۔ عبید اللہ اس کے مقابلے میں قدرے لالچالی اور شوخ مزاج کا مالک تھا۔

کھیل سے فارغ ہو کر انہوں نے شام کی پُر تکلف چائے بھی دونوں بہن بھائی کے ساتھ پی۔ اس کے بعد پھر پڑھائی کا سیشن تھا۔ رات کے کھانے تک وہ بچوں کے ساتھ رہے اس لیے خواہش کے باوجود کسی قسم کی معلومات

حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا۔

”ہم کچھ دیر پائیکس باغ میں چہل قدمی کرنا چاہتے ہیں کسی کو اعتراض تو نہیں ہوگا؟“ جب وہ فارغ ہو کر اپنے لیے مخصوص کمرے میں پہنچے تو معاذ نے بھگوان داس کو بلا کر اس سے پوچھا۔

”آپ جاسکتے ہیں۔ وہاں جانے پر پابندی صرف اس وقت ہوتی ہے جب تنیم صاحبہ باغ میں موجود ہوں۔“ اس کی دی گئی اطلاع حوصلہ افزا تھی۔ وہ دونوں خوش خوش باغ میں پہنچے۔ وہاں روشنی کا مناسب انتظام تھا۔ اس لیے پھول پودوں کی خوبصورتی سے رات کا وقت ہونے کے باوجود بھی لطف اندوز ہوا جاسکتا تھا۔ اگر ان کا مقصد محض چہل قدمی ہوتا تو وہ مہارت سے ترتیب دیے گئے اس باغ کی خوب صورتی کو سراہنے میں بخل سے کام نہ لیتے لیکن ان کے سامنے ایک مقصد تھا اور انہیں اپنی توجہ اسی مقصد کے حصول پر مبذول رکھنا تھی۔

”ہمارے پاس صرف ایک ہفتے کی مہلت ہے اور اس میں سے پہلا دن کچھ کیے بغیر بیکار گزر چکا ہے۔“ وہ دونوں شانہ بشانہ چلتے ہوئے اس بات کا خیال رکھ رہے تھے کہ اگر کہیں سے انہیں دیکھا بھی جا رہا ہو تو دیکھنے والے کو یہی گمان ہو کہ وہ محض چہل قدمی کر رہے ہیں۔

”دن کے اوقات میں ہم اس طرف نہیں آسکتے تھے لیکن تم تسلی رکھو۔ مجھے امید ہے کہ ہم اپنے مقصد میں کامیاب ضرور رہیں گے۔“ سونیا نے معاذ کو تسلی دی اور ایک نظر اس برستی پر ڈالی جس کے نیچے وہ خانے کے راستے کی اطلاع بھگوان داس نے دی تھی۔ برستی پر باقاعدہ پہرے دار موجود تھے جو یقیناً حویلی کی حفاظت کے لیے بٹھائے گئے ہوں گے۔ آس پاس پھیلی تیز روشنی کے باعث کسی کے لیے ممکن نہیں تھا کہ پہرے داروں کی نظروں میں آئے بغیر وہاں داخل ہوسکا۔

”میں اپنا زیادہ وقت اس کام میں صرف نہیں کرنا چاہتا۔ یہاں سے نکلنے کے بعد مجھے دوسرے بہت سارے کام نمٹانے ہیں لیکن ہم جس رفتار سے جا رہے ہیں، لگتا ہے لمبے عرصے یہ ٹیوٹری کی ڈیوٹی نبھانی ہوگی۔“ وہ کچھ جھنجھایا ہوا سا تھا۔

”مجھے تو یہ ٹیوٹری بہت اچھی لگ رہی ہے۔ میں اپنی زندگی میں پہلی بار کوئی ایسا کام کر رہی ہوں جس میں مجھے سکون محسوس ہو رہا ہے۔ کاش میں سچ سچ سونیا خان کے بھائے مارگریٹ ڈی سوزا ہوتی تو ایک آسان اور سادہ زندگی سے

لطف اندوز ہو پاتی۔“ سونیا کے لہجے میں ایک حسرت کی تھی۔ معاذ محض اس کی شکل دیکھ کر رہ گیا۔ وہ اس کے بارے میں بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے، وہ اس کے اندر کی سچائی ہے یا وہ اداکاری کر رہی ہے۔

”اپنی دسے۔ میرے خیال میں ابھی ہم آس پاس کا نقشہ اور پہرے داروں کی تعداد وغیرہ کا جائزہ لے لیتے ہیں پھر دوسرا چکر آدمی رات کے بعد لگائیں گے۔ امید ہے کہ اس وقت یہاں اتنی زیادہ روشنی نہیں ہوگی اور ہم کوئی کارروائی کرنے کے امکانات کا جائزہ لے سکیں گے۔“ وہ خود ہی بات بدل گئی۔

”صرف جائزہ.....؟“ معاذ کو اس کی تجویز پر گویا اعتراض ہوا۔

”یہی بہتر ہوگا۔ فوری کارروائی سے نقصان کا اندیشہ ہے۔ ہم نظروں میں بھی آسکتے ہیں۔ ایسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ ہمیں تمہارے دوستوں کے بغیر ہی یہاں سے اپنی جان بچا کر لھٹنا پڑے۔ ابھی تو یہ بھی کفرم نہیں ہے کہ ان دونوں کو اسی خانے میں رکھا گیا ہے یا وہ کہیں اور موجود ہیں۔“ سونیا نے اسے سمجھایا تو اسے اس سے متفق ہونا پڑا۔ تقریباً آدھے گھنٹے وہ دونوں وہاں ٹہل کر ارد گرد کا جائزہ لیتے رہے۔ اس موقع پر حویلی کے دو ملازمین بھی ان کی نظروں میں آ گئے۔ وہ دو بڑے بڑے تھیلے لیے برستی سے باہر نکلے تھے اور صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ تھیلے اس وقت خالی ہیں۔ شاید وہ کسی قسم کا ضرورت کا سامان وہ خانے میں پہنچانے گئے تھے۔

”ان کے چہرے اچھی طرح ذہن نشین کرلو۔ موقع ملنے پر ان سے ضروری معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔“ سونیا نے سوگوشتی میں مشورہ دیا۔

”اب تک میں نے جن ملازمین کو دیکھا ہے، یہ ان میں شامل نہیں تھے۔ صرف ان کی یونیفارم دیکھ کر ہی ان کے ملازم ہونے کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔“ معاذ نے تبصرہ کیا جبکہ وہ دونوں خود پر مرکوز ان کی نگاہوں سے بے خبر آپس میں باتیں کرتے ہوئے حویلی کے پچھلے حصے کی طرف جا رہے تھے۔

”بھگوان داس نے بتایا تو تھا کہ وہ خانے اور مہمان خانے میں صرف خاص ملازمین جاسکتے ہیں۔ یقیناً ان ملازمین سے عام خدمات نہیں لی جاتی ہوں گی۔ اس لیے یہ ہمیں دکھائی نہیں دے پھر ہمیں یہاں آئے ہوئے وقت ہی کتنا گزرا ہے جو حویلی میں موجود ملازمین کی فوج سے مکمل

”یہ بھی ٹھیک ہے۔“ اس نے سونیا کی رائے سے اتفاق کیا پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

”میرا خیال ہے ہمیں ان کے پیچھے جا کر دیکھنا چاہیے۔“

”او کے، تو پھر آ جاؤ۔“ سونیا نے نکلنے میں دیر نہ لگائی اور وہ دونوں اس سمت چل پڑے جہاں ان ملازمین کو جاتے دیکھا تھا۔

”شاید یہ سرونٹ کوارٹرز ہیں۔“ حقیقی جیسے روشنی زیادہ نہیں تھی لیکن ایک قطار میں بنے چھوٹے چھوٹے رہائشی یونٹ صاف دکھائی دے رہے تھے۔ وہ نسبتاً تیز قدموں سے چل کر آئے تھے اس لیے جن دو افراد کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک آئے تھے، ان کی ایک کوارٹر میں داخل ہوتے ہوئے جھلک بھی دکھائی دے گئی تھی۔

”ذرا قریب سے چل کر دیکھتے ہیں۔“ سونیا نے مشورہ دیا تو دونوں نے کورہ کوارٹر کی طرف چل پڑے۔ وہ محتاط تھے کہ کہیں کسی اور کوارٹر سے نکلنے والا کوئی فرد انہیں نہ دیکھ لے لیکن وہاں ایک خاموش سی تھی اور کوئی دوسرا فرد دکھائی نہیں دیا۔ مطلوبہ کوارٹر کے قریب پہنچ کر محاذ نے پہلے ارد گرد کا جائزہ لیا پھر ایک کھڑکی سے کان لگا دیے۔ اندر سے ہلکی آوازیں آرہی تھیں جو توجہ دینے پر سمجھ بھی آنے لگیں۔

”میں ٹشٹی مٹی سے صاف کہہ رہا ہوں کہ اس مہینے کے آخر میں میرے کو پندرہ دن کی چھٹی ہونا ہی ہونا۔ چھٹی نہیں ملی تو میں نوکری اچھوڑ کر چلا جاؤں گا۔“

”مگر کیا بولے انہوں؟ سن کر تاک بھوں تو بہت چڑھائے ہوں گے؟“ دوسری آواز میں تجسس تھا۔

”چڑھائے تو چڑھائے۔ میں بول دیا ہوں کہ میرے کو چھٹی ہونا تو ہونا۔ تنگ آ گیا ہوں میں ادھر کی پابندیوں سے۔ تم اچھوڑ لو کہ یہ بھی کوئی انصاف ہے کہ نہ بیوی بچوں کو ادھر رہنے کی اجازت دیتے ہیں نہ ملنے جانے کو ڈھنگ کی چھٹی..... گھر والوں کی صورتیں دیکھنے کو آگئیں ترس کر اچھوڑ رہ گئی ہیں۔“ پہلا شخص زیادہ ہی بھرا بیٹھا تھا۔

”میں سمجھتا ہوں تیرے جذبات کو۔ نئی نوپلی دہن کے ساتھ ڈھنگ سے رہنے کو اچھوڑ نہیں ملا۔ پہلے تیرا یہ حال نہیں تھا پر اب روز اچھوڑنے کی باتیں کرتا ہے۔ پرسوج لے پایا، نواب صاحب کی نوکری سے زیادہ پکار نہیں نہیں ہے اور تیرے سر پر قرض کا بوجھ ہے۔ نوکری چھوڑ دے گا تو قرض کیسے اتارے گا؟“ دوسرے شخص نے اسے سمجھایا۔

”مجھے بھی معلوم ہے پر تم اچھوڑ لو کہ اس بے چاری کو

کیسا لگے گا اگر میں پہلے بچے کے جہم کے وقت اس کے پاس نہ ہوں۔ میرے کو بھی ارمان ہے کہ اپنے بچے کے کان میں اذان میں اچھوڑ دوں۔“ وہ اب لمبی ناخوش تھا لیکن لہجہ ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ مجبور یاں ایسے ہی انسان کے جوش کے غبارے میں سے ہوا نکال دیتی ہیں۔

”تھوڑا حوصلہ اور صبر سے کام لو۔ اتنی اچھی نوکری دوبارہ ملنا مشکل ہے۔ یہ تو تمہاری خوش نصیبی ہے کہ آتے کے ساتھ اچھوڑنے کی باتیں کر کے ناشکری مت کرو۔ مل جائیں گی چھٹی بھی۔ میں بھی سفارش کروں گا مٹی سے تمہاری۔“ اب دوسرا شخص پہلے والے کو نرمی سے سمجھانے کے ساتھ ساتھ تسلی بھی دے رہا تھا۔ محاذ نے پلٹ کر سوالیہ نظروں سے سونیا کی طرف دیکھا۔

”ابھی نہیں۔ رات میں دیکھیں گے۔ ابھی کوئی آسکتا ہے۔“ اس نے سرگوشی میں جواب دیا اور پھر واپس چلنے کا اشارہ کیا۔

”میرے خیال میں اگر ہم اس شخص کو قابو میں کر لیں تو یہ خانے کا راستہ اور دیگر تفصیلات آرام سے حاصل کر لیں گے۔“ وہاں سے ہٹ کر واپس جاتے ہوئے محاذ نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

”رات کو سب کے سونے کے بعد آئیں گے تو اطمینان سے یہ کام کریں گے۔ دو جاگتے ہوئے بندوں کو قابو کر کے اپنے بس میں لینے میں ہنگامے کا خطرہ تھا۔ اس لیے میں نے ابھی کے لیے منع کر دیا۔“

”یہ یہاں کہاں؟“ محاذ اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے حیرت سے بولا تو سونیا نے بھی نظر اٹھا کر دیکھا۔ وہ عیب تھا جو سامنے سے چلا آ رہا تھا۔

”آپ یہاں کیسے نواب زادہ صاحب؟“ وہ ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تو سوال لیوں پر نکل گیا۔

”آپ لوگوں کی فکر ہی سمجھنے لگی۔“

”ارے، وہ کیوں؟“ اس کے جواب نے تجسس بڑھا دیا۔

”اطلاع تھی کہ آپ لوگ ہواخوری کے لیے پائیں باغ میں آئے ہوئے ہیں۔ مجھے بھی ابھی نیند نہیں آرہی تھی تو سوچا چل کر آپ لوگوں سے گپ شپ کر لیتے ہیں لیکن آپ لوگ وہاں ملے ہی نہیں اور میں آپ کو ڈھونڈتا ہوا یہاں پہنچ گیا۔“ وہ ہمیشہ بے زبان انگریزی گفتگو کرنے کی کوشش کرتا تھا اس لیے اس کے کچھ میں نوابوں کا مخصوص انداز نہیں جھلکتا تھا۔

”اوہ زحمت کے لیے معذرت۔ اصلی میں آپ کی حویلی بہت خوب صورت ہے۔ اسے دیکھنے کا جس ہمیں اس طرف لے آیا۔“ محاذ نے مسکرا کر اسے وضاحت دی۔

”خیال رہے، تجس تجس میں کہیں آپ کوئی نقصان نہ اٹھا بیٹھیں۔“

”مطلب؟“ عید کی سنجیدہ چونکا دینے والی تھی۔

”آدمی رات کے بعد حویلی میں انسانوں کے ساتھ کتے بھی پہرا دے رہے ہوتے ہیں۔ ان کتوں کی تربیت ایسی ہے کہ اگر کوئی غیر متعلقہ شخص نظر آجائے تو اسے بھنبھوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔“ عید کی دی اطلاع اہم تھی۔

”آدمی رات کے بعد ہمیں کوئی خطرہ نہیں کیونکہ اس وقت ہم آرام سے خوابو خرگوش کے مزے لے رہے ہوتے ہیں۔“ اس بار سونیا نے جواب دیا پھر مسکرا کر بولی۔

”آئیے، وہاں چلتے ہیں۔ سونا بھی ہے تاکہ صبح وقت پر آنکھ کھل سکے۔“

”جی ہاں۔“ عید نے جواب دیا بعد ازاں اس کا اظہار کیا۔

”مجھے اس لڑکے کے انداز میں کوئی بات چھ رہی ہے۔“ وہ واپس کمرے میں پہنچ گئے تو سونیا نے تشویش کا اظہار کیا۔

”عید کی بات کر رہی ہو؟“ محاذ چونکا۔

”ہاں۔ پتا نہیں کیوں مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ کتوں کے حوالے سے وہ خاص طور پر ہمیں سنجیدہ کر رہا ہو۔“

”اس کی سنجیدہ ہمارے حق میں بہتر ہی ہے۔ انجانے میں باہر نکل کر تو ہم لازماً پھنس جاتے۔ اب کم از کم ان کتوں کا کوئی حل سوچ کر باہر نکلیں گے۔“

”یہ تو خیر ہے لیکن خیال رہے کہ آج کی رات ہمارے پاس کوئی حل نہیں ہے اور ہمیں کم از کم کل رات تک انتظار کرنا پڑے گا۔“ سونیا نے بہتر سمجھا کہ اسے حالات سے آگاہ کر دے کیونکہ آج کل وہ کچھ آٹا ڈالا ہو رہا تھا اور ہر کام جلد از جلد نٹانے کا خواہش مند تھا۔

”کل تک کیا حل نکال لوگی؟“

”کچھ نہ کچھ کر ہی لوں گی۔ ہو سکتا ہے سچ بریک میں حویلی سے باہر جانا پڑے۔“ وہ پھر سوچ انداز میں بولی اور پھر اپنے موبائل پر مصروف ہو گئی۔ محاذ بیزار سا سونے کی تیاری کرنے لگا۔ جس وقت اس نے بستر پر دراز ہو کر آنکھیں بند کیں، سونیا صوفے پر بیٹھی اپنے موبائل پر کچھ دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر کی کوشش کے بعد وہ سونے میں کامیاب ہو گیا اس لیے نہیں جان سکا کہ سونیا نے آدمی رات سے اوپر تک کا

وقت جاگ کر گزارا تھا۔ وہ اپنے بیگ سے دو مین نکال کر بہت دیر تک کھڑکی سے باہر جھانکتی رہی تھی اور ان کتوں کو دیکھنے میں کامیاب رہی تھی جنہیں رات کے وقت پہرے داری کے لیے آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔ ان کی بھاری جسامت اور خوفناک تھوٹھنیوں اور جبرڑوں سے ظاہر تھا کہ وہ خاصے خطرناک ہیں اور منٹوں سیکنڈوں میں مقابل کو ڈھیر کر سکتے ہیں۔ اس کے انداز سے کے مطابق وہ تعداد میں کم سے کم بھی سات آٹھ تو تھے ہی لیکن تربیت یافتہ ایسے ستھے کہ بلاوجہ بھونکتے نہیں تھے۔ اگر وہ بھونکنے کے عادی ہوتے تو گزشتہ شب ہی انہیں حویلی میں کتوں کی موجودگی کا احساس ہو جاتا۔ بہر حال اب بھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ سونے سے پہلے وہ کتوں کے لیے معقول انتظام کر چکی تھی۔

☆☆☆

دوسرا دن معمول کے مطابق شروع ہوا۔ سونیا نے صبح ہی نواب بدرالدین کو پیغام بھجوادیا کہ اگر انہیں اعتراض نہ ہو تو وہ اپنے نئی کام کے سلسلے میں سچ بریک کے دوران حویلی سے باہر جانا چاہتی ہے۔ نواب صاحب کی طرف سے بغیر کسی غرض کے اجازت دے دی گئی۔ حسب پروگرام جب وہ سچ بریک میں روانہ ہو گئی تو محاذ بجائے آرام کرنے کے پائیں باغ میں آگیا۔ بھری دوپہر میں یہاں آنا عجیب سا تھا لیکن وہ خود کو روک نہیں پایا تھا۔ پائیں باغ سے اس کی اگلی منزل سرونٹ کوارٹرز والا حصہ تھا۔ وہاں حسب سابق سناٹا چھایا ہوا تھا لیکن آج اسے یہ سناٹا عجیب نہیں لگ رہا تھا کیونکہ وہ جان گیا تھا کہ ملازمین کو اپنے اہل خانہ کو ساتھ رکھنے کی اجازت نہیں تھی اور وہ خود اپنی ملازمت پر موجود ہوتے ہوں گے۔ یہ سرونٹ کوارٹرز بس آرام کے لیے ہی ان کے استعمال میں رہتے ہوں گے۔ اس لیے یہاں شور شرابے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

وہ باقی کوارٹرز پر سرسری نظر ڈالتا ہوا اس کوارٹر کے سامنے آٹھرا جہاں کل دو افراد کے درمیان ہونے والی گفتگو سنی تھی۔ کوارٹر کا دروازہ اندر سے بند تھا جس کا مطلب تھا کہ رہائشی اندر ہی موجود ہیں۔ اس نے کچھ سوچتے ہوئے دروازے پر دستک دے ڈالی۔

”کون ہے جی؟ آ رہا ہوں۔“ اندر سے قدرے توقف کے بعد جواب دیا گیا اور پھر کسی کے دروازے کی طرف آتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ دروازہ کھلا تو کڑتے پا جاے میں ملبوس سر پر ٹوپی لگائے شخص کا چہرہ دکھائی دیا۔ وہ ان دونوں میں سے ایک تھا جنہیں کل اس نے برقی کی

طرف سے آتے ہوئے دیکھا تھا۔

”جی میاں، آپ کون ہیں؟“ ایک اجنبی کو سامنے کھڑے دیکھ کر اس نے حیرت سے پوچھا۔ اب تک اس کی آواز سے محاذ اندازہ لگا چکا تھا کہ یہ وہی ہے جو کل چھٹی پر جانے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔

”کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟“ محاذ نے شانسی سے دریافت کیا۔

”آجیے۔“ اس کے چہرے پر الجھن ضرور تھی لیکن انکار نہیں کیا۔ اتنی تو اسے سمجھ گئی کہ معقول طے میں حویلی کے اندر پایا جانے والا شخص کوئی معزز ہستی ہے۔ کسی غیر متعلقہ شخص کے حویلی میں یوں آزادانہ گھومنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

”مذرت چاہتا ہوں۔ میں نے آپ کی عبادت میں خلل ڈالا۔“ اندر پہنچ کر اس نے کمرے کے ایک کونے میں کھجی جائے نماز دیکھی تو سمجھ گیا کہ وہ شخص نماز پڑھ رہا تھا۔ شاید اسی وجہ سے اسے دستک کا جواب دینے میں بھی کچھ وقت لگا تھا۔

”کوئی بات نہیں جناب! میں بس سلام پھیرنے آج والا تھا۔“ اس نے وضع داری کا مظاہرہ کیا اور بیٹھنے کے لیے ایک موزہ پیش کرتے ہوئے پوچھا۔ ”میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”میں بچوں کا نیا ٹیوٹر ہوں۔ ایسے ہی ذرا حویلی کا جائزہ لینے نکلا تھا تو گھومتے گھومتے اس طرف آ نکلا۔ پیاس محسوس ہو رہی تھی تو اس لیے آپ کے دروازے پر دستک دے دی۔“ اس نے اپنی آمد کا جواز پیش کیا۔

”میں ابھی پانی لاتا ہوں۔“ وہ شخص جلدی سے کمرے سے باہر نکلا اور ٹافٹ ایک طشتری پر شیشے کے گلاس میں پانی رکھ کر لے آیا۔ محاذ یہ دیکھ کر متاثر ہوا کہ گلاس کریمے سے بنے خوب صورت سفید کور سے ڈھکا ہوا تھا۔ حیدر آباد کی ثقافت اور نفاست ایک ملازم کے کوارٹر میں بھی اپنی شان دکھا رہی تھی۔

”نوازش!“ اس نے شکر ہے کے ساتھ گلاس تھا ما اور ایک گھونٹ بھر کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”آپ یہاں اکیلے رہتے ہیں؟“

”ایک سا مکی اور ہے۔ اس وقت (وقت) ڈیوٹی پر گیا ہوا ہے۔ میری طبیعت ٹھوڑی خراب تھی تو میں ادھر آج رک گیا۔“

”یہاں بہت خاموشی ہے۔ کیا آپ لوگوں کی فیملی

میں رہیں؟“ اس نے اس شخص کی دکھتی رنگ کو جھنڑا۔

”نواب صاحب کی طبیعت پر شور گراں گزرتا ہے اس لیے وہ فیملیز کو رہنے کی اجازت نہیں دیتے۔ زمان خانے میں کام کرنے والی کچھ خواتین کے علاوہ یہاں سب مرد ملازم آج ہیں اور انہیں بھی محتاط رہنے کا حکم ہے۔ میں تو آپ کو آج دیکھ کر حیران ہوں کہ آپ کیسے یہاں چلے آئے؟“ اس نے ایک بار پھر اپنی حیرت کا اظہار کیا۔

”بتایا نا بس کہ ایسے ہی گھومتے گھومتے چلا آیا۔ تم بتاؤ، قہار کیا نام ہے؟“ اس نے اس شخص سے راہ و رسم بڑھانے کی کوشش کی۔

”نام تو خرم الدین (قرالدین) ہے لیکن سب خرم و خرو آج کہتے ہیں۔“ بیشتر حیدر آبادیوں کی طرح وہ قاف کی درست ادائیگی سے قاصر تھا اور اس کی جگہ ”خ“ استعمال کر رہا تھا۔

”کام کیا کرتے ہو یہاں؟“ اس نے ایک نازک سوال کیا۔

”جواد پر سے حکم مل جائے کر دیتا ہوں۔ مزدور آدمی ہوں۔ کسی کام سے انکار نہیں ہے۔ آپ کو کوئی کام ہے تو بتائیں۔“ وہ دیکھ چکا تھا کہ محاذ نے ابھی تک آدمی گلاس سے زیادہ پانی نہیں پیا ہے۔ اس لیے اس کی آمد کی کوئی اور وجہ کھوجنے کی کوشش کی۔

”کوئی کام نہیں دوست! میں بس ایسے ہی یہاں آ گیا تھا۔ اب چلا ہوں۔“ وہ چاہتا تو اس شخص پر غوی عمل کر کے اپنے مطلب کی معلومات حاصل کر سکتا تھا لیکن اس کی ہمت نہ ہوئی کہ ایک ایسا شخص جو اس کی دستک کے سبب اپنی عبادت درمیان میں چھوڑ کر اس کے سامنے بیٹھا اتنے اخلاق سے گفتگو کر رہا ہے، اسے کسی قسم کی زحمت دے۔ وقت بھی کچھ موزوں نہیں تھا۔ کوئی آ بھی سکتا تھا۔

”میری کوئی بات نا گوار گزری ہو تو معافی چاہتا ہوں۔“ اس کے اچانک جانے کا سن کر وہ متحیر ہو گیا۔

”پریشان مت ہو۔ میں سادہ سا انسان ہوں اور چھوٹی چھوٹی باتوں کا برا نہیں مانتا اور تم نے تو ایسی کوئی بات کی ہی نہیں۔ میں تو بس اس لیے واپس جا رہا ہوں کہ آرام کا وقفہ ختم ہو گیا ہے۔ مجھے تھوڑا سا فریش ہو کر دوبارہ اپنی ڈیوٹی پر پہنچنا ہے۔“ اس نے قرالدین کا شانہ جھپکے ہوئے اسے تسلی دی۔ اسے یہ سالو لاسلو نا اور دلچا پٹا نو جوان اچھا لگا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک بھولپن سا تھا اور صاف پتا چل رہا تھا کہ اسے بہت کم عمری میں شادی کے بندھن میں

باندھ دیا گیا تھا اور غریب ایک باپ کی ذمہ داری بھی اس کے شانوں پر پڑنے والی تھی۔

”شکر یہ جناب“ اس سے اوپر کے درجے کے لوگ یقیناً اس سے اتنے اخلاقی سے پیش نہیں آتے ہوں گے۔ اس لیے معاذ کے رویے نے اسے خوش کروایا۔ معاذ اس سے گرم جوشی سے ہاتھ ملاتا ہوا باہر نکل گیا۔ باہر نکل کر وہ چند قدم ہی آگے بڑھا ہوگا کہ تیز تیز قدموں سے اپنی طرف آتے بھگوان داس کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

”آپ کی پتی واپس آگئی ہیں جناب اور آپ کو یاد کر رہی ہیں۔“ قریب آنے پر اس نے اسے اطلاع دی۔ ”میں بس آ ہی رہا تھا لیکن تم یہ بتاؤ کہ تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں اس طرف ہوں؟“ اس کی دانست میں اسے اس طرف آتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا تھا اس لیے بھگوان داس کے سیدھا یہاں چلے آنے پر حیران ہوا۔

”یہاں کسی سے کچھ نہیں چھپتا۔ سب پتا چل جاتا ہے۔“ بھگوان داس معنی خیزی سے ہنسا۔

”سیدھا جواب دو۔“ اس کا ماتھا ٹھک گیا تھا۔ اس لیے سختی سے دریافت کیا۔

”مجھے تو نواب زادہ عبید صاحب نے حکم دیا تھا۔“ اس نے جلدی سے بتادیا۔

”نواب زادہ عبید..... لیکن انہیں کیسے پتا چلا کہ میں کہاں ہوں؟“ اس کی تشویش میں مزید اضافہ ہوا۔

”یہ تو آپ ان ہی سے پوچھنا چاہیے۔“ بھگوان داس طرح دے گیا اور اسے اس کے کمرے کے دروازے پر چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ وہ اندر گیا تو سونیا تو لیے سے اپنا گیلٹا چہرہ صاف کر رہی تھی۔

”کہاں چلے گئے تھے؟ تین بجنے ہی والے ہیں۔“ اسے دیکھ کر وہ بول اٹھی۔

”بعد میں بتاتا ہوں۔ ذرا واش روم سے ہو آؤں۔“

”میں کامیاب لوٹی ہوں۔“ وہ واش روم سے باہر نکلا تو سونیا نے اسے اطلاع دی۔ اس مختصر دورانیے میں وہ اپنا میک اپ تازہ کر چکی تھی اور ہمیشہ کی طرح خوبصورت اور متحرک دکھائی دے رہی تھی۔

”گڈا“ وہ الجھا ہوا تھا اس لیے اس کی بات کا مختصر جواب دیا۔ سونیا نے اس کے اس انداز کو محسوس کیا لیکن گھڑی کی سوئیاں کچھ پوچھنے کی اجازت نہیں دے رہی تھیں۔ وہ دونوں اپنے کمرے سے نکل کر عبید اور منیزہ تک پہنچ گئے۔

”وقت کی پابندی میں آپ دونوں متاثر کن ہیں۔“ منیزہ نے دیکھ کر سراہا۔

”بس صرف وقت کی پابندی.....؟“ سونیا نے تازہ کا مظاہرہ کیا۔

”آپ تو پوری کی پوری متاثر کن ہیں مسز ڈی سوزا اور انسان کو سوچنا پڑتا ہے کہ اتنی شاندار خاتون کو متاثر کرنے کے لیے کیا طریقہ کار استعمال کرے؟“ عبید اتنی بے ساختگی سے بولا کہ سونیا کو کسی آگئی پھر تینہی انداز میں بولی۔

”ویسے یہ اپنی عمر سے کچھ بڑھ کر بات نہیں ہے۔“ ”سچ کسی بھی عمر میں بولا جاسکتا ہے۔ ہاں، خوب صورت لوگ جھوٹ بھی بولیں تو برے نہیں لگتے۔“ اس کا انداز اب بھی مزاحیہ سا تھا لیکن معاذ کو اس میں ایک معنی خیزی ہی محسوس ہوئی۔

”مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ چھوٹے نواب صاحب مجھے غلط کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ سونیا ایک بار پھر ہنسی۔

”آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ اگر میرا ایسا کوئی ارادہ ہوتا تو آپ کے سر تاج جہاں تھے، انہیں وہیں مصروف رہنے دیتا اور کباب میں ہڈی بننے کے لیے ہرگز بھی واپس نہ بلواتا۔“ اس نے کچھ شرمائے ہوئے سے لہجہ میں اپنی صفائی پیش کی لیکن معاذ کو اپنے ذہن میں اٹکا کاٹنا نکالنے کا موقع مل گیا۔

”آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں کہاں ہوں؟“ اس نے فوراً سوال کر ڈالا۔

”جامر جہاں نما ہے۔“ عبید نے ترنت جواب دیا لیکن معاذ کی آنکھیں برقرار تھیں۔

”ڈیڈی نے بیڈروم کے علاوہ حویلی کے ہر حصے میں خفیہ کمرے لگوا رکھے ہیں۔ ان کمروں کو چوبیس گھنٹے مانیٹر کرنے کے لیے اسٹاف بھی موجود ہے۔ عبید نے ڈیوٹی پر موجود شخص کو کال کر کے پوچھا کہ دیکھو مسز ڈی سوزا حویلی کے کس حصے میں موجود ہیں تو اس نے آپ کی لوکیشن بتادی۔“ منیزہ نے مسکراتے ہوئے وضاحت دی تو وہ ایک پل کے لیے سن ہو گیا اور نظریں بے ساختہ ہی عبید کی نظروں سے جا ملیں۔ وہ بظاہر شرارت سے مسکرا رہا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں کچھ تھا۔ کچھ ایسا جسے پڑھنے سے وہ قاصر تھا۔

اسے لگا کہ عبید کے بارے میں اپنی پہلی رائے پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ اتنی گہری آنکھیں جنہیں پڑھنا نہ جاسکے، کسی لاپرواہی لڑکے کی تو نہیں ہو سکتی تھیں۔

یہ سب کو ہے۔ اس کا کوئی نہ کوئی اس میں کوئی
ہوگا۔" سونیا سوچ میں ڈوب گئی پھر قدرے توقف کے بعد
چٹکی بجاتے ہوئے چکی۔
"آگیا آئیڈیا۔"

معاذ زبان سے کچھ پوچھنے کے بجائے اس کی طرف
سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"بھگوان داس کو استعمال کرو۔ اسے حکم دو کہ وہ اس
حصے کے کمروں کو غیر فعال کر دے۔"

"بالکل صحیح۔ ساتھ ہی کنٹرول روم میں ڈیوٹی پر
موجود شخص کو خواب آور دوا پلانے کا بھی انتظام کر دوں گا۔

اس طرح کسی کو کالوں کا خبر نہیں ہو سکے گی۔" سونیا کی
جھوٹ سے اتفاق کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے اپنی رائے

بھی دی۔
"کتوں کا بھی انتظام کرنا پڑے گا لیکن میرے

خیال میں بے ہوشی کی دوا اتنی زیادہ نہیں ہے کہ ہم دوبار
اسے استعمال کر سکیں۔"

"کتوں کو بے ہوش کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔
کتے بے ہوش پائے گئے تو سب چوکنے ہو جائیں گے۔ ہم یہ

کام صرف اس دن کریں گے جس دن عالم اور سرمد کو حویلی
سے باہر نکالنا ہوگا۔"

لیکن اس طرح تو تمہارے لیے خطرہ ہوگا۔" سونیا
نے تشویش کا اظہار کیا۔

"میں جسم کی یوکتوں تک نہ پہنچنے دینے والے مخلوق
سے کام چلا لوں گا۔" اس نے سونیا کو اطمینان دلایا۔ تھوڑی

دیر اور آپس میں اس معاملے پر گفتگو کرنے کے بعد فیصلہ ہوا
کہ آج ہی کارروائی کا آغاز کر دیا جائے۔ سونیا نے بھگوان

داس کو انٹرکام پر کمرے میں بلوایا۔ اسے اپنے زیر اثر لے کر
ہدایات ذہن نشین کروانا معاذا کے لیے چند منٹوں کا کام تھا۔

اس کی ہدایت پر بھگوان داس نے پہلے کنٹرول روم
میں ڈیوٹی دینے والے شخص اور خود ان کے لیے چائے تیار

کر کے دونوں جگہ پہنچائی اور پھر کمروں کو ناکارہ بنانے کے
لیے کل پڑا۔ اس کا کام کاج کے سلسلے میں حویلی کے مختلف

حصوں میں آنا جانا لگا رہتا تھا اس لیے نگرانی کے کتے اس
سے مانوس تھے اور پہرے داروں کو بھی اس کے کہیں آنے

جانے پر اعتراض نہیں ہو سکتا تھا۔
"مجھے مخلوق لگا لینا چاہیے۔ بھگوان داس اپنا کام مکمل

کر کے واپس آتا ہی ہوگا۔" چائے پی کر فارغ ہونے کے
بعد معاذا اگلے مرحلے کی تیاری کرنے لگا۔ اس کے ذہن میں

"یہ دو دوائیں ہیں۔ ان میں سے ایک گوشت میں
شامل کر کے کتوں کو دینے سے وہ بے ہوش ہو جائیں گے

جبکہ دوسری جسم پر تلے لینے سے کتوں کو ہمارے جسم کی بو نہیں
ملے گی۔ یہ میں نے احتیاطاً اس لیے منگوائی ہے کہ اگر اتفاقاً

کوئی کتا گوشت نہ کھائے تو بھی ہم اس سے محفوظ رہیں۔" وہ
رات کے کھانے کے بعد ہی کمرے میں واپس آ سکے تھے

اور اس وقت سونیا نے اسے دو شیشیاں دکھاتے ہوئے ان
میں موجود مخلوق کی خصوصیات بتائی تھیں۔

"گڈ ورک۔" معاذا نے مختصراً اس کی کارکردگی کو
سراہا۔ وہ کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

"میں گوشت کے پارچے بھی خرید کر لائی ہوں اور
انہیں ریفریجریٹر میں رکھ دیا ہے۔" سونیا نے اسے حریہ

بتایا۔ ان کے کمرے میں روم ریفریجریٹر کی سہولت تھی جس
میں ہمہ وقت ٹھنڈا پانی، مشروبات اور فروٹس موجود رہتے

تھے۔ ملازم ان کی اجازت سے ہر دن ریفریجریٹر کا جائزہ
لے کر ضرورت کے مطابق تازہ اشیاء کا اضافہ بھی کر جاتا تھا۔

"میرے خیال میں ہمیں باہر نکلنے سے پہلے کنٹرول
روم میں کارروائی کرنا پڑے گی۔"

"اس صورت میں معاملہ بڑھ جائے گا اور ہم پر لازم
ہوگا کہ ہم ایک ہی رات میں سب کچھ نپٹا کر یہاں سے نکل

جائیں اور صورت حال یہ ہے کہ ہمیں ابھی یہی کفرم نہیں
ہے کہ عالم شاہ اور سرمد کو کہاں رکھا گیا ہے؟"

"پھر؟" سونیا سمجھتی تھی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ کنٹرول
روم میں کارروائی، کتوں کی بے ہوشی اور نہ خانے کے

مخالفوں سے نمٹنے جیسے مشکل کام انجام دینے کے بعد بھی
اگر وہ عالم شاہ اور سرمد تک نہ پہنچ پاتے تو ایک طرف ان کی

ساری محنت ضائع ہو جاتی اور دوسری طرف حویلی میں رہنے
کی گنجائش بھی ختم ہو جاتی کیونکہ یہ ممکن نہیں تھا کہ اتنا سب

کچھ ہونے کے دوران وہ کسی کی نظر میں ہی نہ آ پاتے۔
"میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے۔"

"بتاؤ۔"

"میں نہ خانے میں ڈیوٹی دینے والے قرالدین نامی
ایک ملازم سے ملتا تھا آج۔ سید حاسادہ نوجوان ہے۔ اسے ہم

معلومات کے حصول کے لیے استعمال کر سکتے ہیں لیکن مسئلہ یہ
ہے کہ وہ حویلی کے اس حصے میں نہیں آتا جاتا اور اگر میں وہاں

جاتا ہوں تو گہرے کی پکڑ میں آ جاؤں گا۔ تم نے سنا تھا نا کہ
کس طرح وہاں میری موجودگی کو ٹریس کر لیا گیا تھا۔"

تھا کہ جوگی کے دیے گئے پتھر کے اثر سے وہ ویسے بھی محفوظ ہے لیکن پھر بھی احتیاطاً محلول کا استعمال ضروری سمجھا تھا۔

”کنٹرول روم سے چائے کے برتن اٹھا لو اور دیکھ کر آؤ کہ وہاں ڈیوٹی پر موجود بندہ کیا کر رہا ہے۔“ بھگوان داس لوٹ کر واپس آیا تو اس سے رپورٹ لینے کے بعد معاذ نے اسے دوسرا کام سونپا۔ کچھ دیر بعد وہ اس اطلاع کے ساتھ موجود تھا کہ کنٹرول روم میں موجود بندہ گہری نیند سو رہا ہے۔

”بس اب میں لکھا ہوں۔“ اس نے پہلے بھگوان داس کو اس کے کمرے میں آرام کرنے بھیجا پھر خود بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

”احتیاط سے معاذ!“ سونیا کے لہجے کی فکر مندی میں بے ساختگی تھی جسے اس نے محسوس تو کیا لیکن نظر انداز کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ رات کے اس پہر بیشتر روشنیاں گل کردی گئی تھیں لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ وہاں تاریکی کا راج ہو۔ کہیں کہیں روشن لائیں اب بھی مدھم روشنیاں پھیلائے ہوئے تھیں۔ اس کی کوشش تھی کہ خود کو تاریک گوشوں میں رکھتے ہوئے آگے بڑھے۔ اس کوشش میں وہ خاصی حد تک کامیاب بھی تھا اور آہستہ آہستہ اپنی منزل سے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ اس دوران گمرانی کے دو کتے بھی اس کی نظر میں آئے تھے لیکن وہ اس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر آگے بڑھ گئے تھے۔ پائیں باغ سے گزر کر جب وہ سرونٹ کوارٹرز والے حصے میں پہنچا تو یکدم ہی اپنے قریب ایک خراہٹ سن کر رک گیا۔ اس سے صرف چند قدم کے فاصلے پر ایک بھاری بھرکم جسامت کا کتا کھڑا اسے گھور رہا تھا لیکن اس کے انداز میں جارحیت نہیں تھی۔ معاذ نے آہستہ سے اسے پکارا تو وہ مزید قریب چلا آیا۔

”مجھے جانے دو دوست۔ میرے جانے سے تم پر کوئی آج نہیں آئے گی۔ بس اتنا ہوگا کہ دو بے قصور اور مظلوم انسانوں کی زندگیاں مزید خراب ہونے سے بچ جائیں گی۔“ کتے کے سر اور پیٹھ پر دوستانہ انداز میں ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ یوں اس سے مخاطب ہوا جیسے وہ اس کی بات سمجھ سکتا ہو۔ ایک آدھ منٹ اسی طرح اس کے جسم پر ہاتھ پھیرنے اور اس سے سرگوشیوں میں گفتگو کرنے کے بعد اس نے یوں اس کی پشت پر ہلکی دی جیسے اسے وہاں سے جانے کا کہہ رہا ہو۔ کتے نے ہلکی کا مطلب سمجھا اور خاموشی سے ایک طرف دوڑ گیا۔ اس مصیبت سے جان بچوٹ جانے پر وہ دوبارہ حرکت میں آگیا۔ اگر کتا محبت کی زبان نہ سمجھتا تو مجبوراً اسے پنڈلی سے بندھا خنجر نکالنا پڑتا۔ قمر

الدین والے کوارٹر کے سامنے پہنچ کر اس نے چند لمحے ارد گرد کی سن گن لی پھر دروازے پر ہلکا سا ہاؤ ڈال کر اسے چیک کیا۔ دروازے کے اندر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔ اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا پھر کھڑکی کی منڈیر پر چڑھ جا کر پہلے جھجے پر چڑھا اور وہاں سے چھت پر پہنچ گیا۔ چھت سے کوارٹر کے مختصر مچن میں کود جانا اس کے لیے کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ خوش قسمتی سے اس طرف کھلنے والا کمرے کا دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ وہ محتاط قدموں سے کمرے میں داخل ہوا اور اپنے اپنے بستر پر گہری نیند میں ڈوبے دو نفوس کو زیر و پا کر کے بلب کی روشنی میں غور سے دیکھا۔ ان میں سے ایک قمر الدین تھا جبکہ دوسرا اس کے مقابلے میں پختہ عمر کا اور مضبوط کاٹھی کا مرد تھا۔ وہ اس مرد کے قریب گیا اور پھر اس کے ہاتھ تیزی سے حرکت میں آئے۔ اس شخص کو حالت نیند سے حالت بے ہوشی میں پہنچا کر وہ اطمینان سے قمر الدین کی طرف متوجہ ہوا اور بازو کو دھیرے سے ہلاتے ہوئے اسے اس کے نام سے پکارا۔

”کون.....؟ کیا ہوا؟“ وہ کچھ بڑبڑا کر نیند سے جاگا لیکن معاذ نے اسے زیادہ سننے کا موقع نہیں دیا۔ کچھ ہی دیر میں وہ اسے اپنے ڈھب پر لا کر اس سے مطلوبہ معلومات حاصل کر رہا تھا۔

قمر الدین سے اسے جو معلومات حاصل ہوئیں، ان کے مطابق تہ خانہ دو حصوں میں منقسم تھا۔ ایک حصے میں نواب بدر الدین کے معتوب افراد کو باقاعدہ سلاخوں کے پیچھے باندھ کر رکھا جاتا تھا اور ان کے جرم کی نوعیت کے اعتبار سے مختلف سزائیں دی جاتی تھیں۔ معمولی سزا کے حق دار افراد سے ہلکی پھلکی مشقت کے کام لیے جاتے تھے جن میں کھانا پکانا، تہ خانے کی صفائی کرنا، برتن اور کپڑے دھونا جیسے کام شامل تھے۔ معمول کے ان کاموں کے لیے تہ خانے میں باقاعدہ انتظامات موجود تھے۔ قمر الدین اور اس کے ساتھی کے ذمے بس اتنا کام تھا کہ وہ باقاعدگی سے ضرورت کی تمام اشیاء وہاں پہنچاتے رہیں اور تہ خانے کی صفائی اور وہاں موجود افراد کی حالت کا اچھی طرح جائزہ لیں۔ کسی کی بیشی کی صورت میں انہیں ذمے داران کو اپنی صوابدید پر سزا سنانے کا بھی اختیار حاصل تھا۔ سزا پر عمل درآمد وہاں موجود مگرالوں کی ذمے داری تھی۔ یہی مگران سخت معتوب قیدیوں کو بھی روزانہ کی بنیاد پر دی جانے والی سزاؤں پر عملدرآمد کرتے تھے۔ کچھ قیدیوں کو روزانہ مخصوص تعداد میں کوڑے لگائے جاتے تھے۔ کچھ کو چھت

سے لانا نکادیا جاتا تھا۔ کچھ کے جسم کے کسی حصے پر معمولی سا کٹ لگا کر اس پر نمک چھڑک دیا جاتا تھا۔ غرض عجیب و غریب سزا دیں گئیں جو نواب صاحب کی طرف سے تجویز کی گئی تھیں اور ان پر پابندی سے عمل ہوتا تھا۔

قیدیوں کے علاوہ یہ خانے کے دوسرے حصے میں کچھ پناہ گزین بھی موجود تھے۔ ان کی حیثیت باقاعدہ قیدیوں جیسی نہیں تھی لیکن انہیں یہ خانے سے باہر آنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ ان افراد سے کسی قسم کی مشقت نہیں لی جاتی تھی اور ان کے تمام کام بھی قیدیوں کو ہی انجام دینے ہوتے تھے لیکن وہ اپنی ذاتی صفائی اور صحت کا خیال رکھنے کے پابند تھے۔ ان کے لیے مخصوص اوقات میں ورزش کرنا بھی لازم تھا اور آنا کافی کرنے والے سے کوئی رعایت نہیں کی جاتی تھی۔ ان افراد کو ان کی خواہش پر وقت گزاری کے لیے کتابیں اور انڈورگیز بھی فراہم کیے جاتے تھے۔

”ان دو افراد میں سے کسی کو تم نے یہ خانے میں دیکھا ہے؟“ ابتدائی عمومی معلومات حاصل کرنے کے بعد اس نے اپنے سوئٹل کی اسکرین قمر الدین کی نظروں کے سامنے کر کے اس سے پوچھا۔ یہ تصویر اس نے انٹرنیٹ پر خبروں کے ایک چینل سے اٹھائی تھی۔ اس تصویر میں عالم اور سرمد کے چہرے نمایاں تھے۔

”جی ہاں۔ یہ دونوں پناہ گزینوں میں شامل ہیں اور بہت اچھے اور شریف لڑکے ہیں لیکن پچھلے دنوں انہوں نے کوشش کی ہے کہ یہ خانے سے نکل کر بھاگ جاویں۔ جب سے اچھ نواب صاحب ان کے پیروں میں بیڑیاں ڈالوا دیے ہیں۔“ قمر الدین کی طرف سے کی گئی تصدیق پر اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ آخر کار وہ انہیں کھوجنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ان دونوں کے بارے میں چند مزید معلومات حاصل کرنے کے بعد اس نے یہ خانے میں جانے کے طریقہ کار اور وہاں موجود چہرے داروں کی تعداد وغیرہ سے متعلق معلومات حاصل کیں۔ تمام ضروری معلومات کے حصول کے بعد جب وہ واپس لوٹا تو کامیابی کی خوشی سے سرشار تھا۔ اس خوشی میں جلدی جلدی سونیا کو ساری تفصیلات سے آگاہ کرتا چلا گیا۔

”کیا بات ہے۔ تم کوئی رسپانس کیوں نہیں دے رہی؟“ اتنا سب کچھ سن کر بھی سونیا سنجیدہ تاثرات کے ساتھ بیٹھی رہی تو اس نے تشویش سے پوچھا۔

”میرے پاس ایک بڑی خبر ہے۔“

”کیسی بڑی خبر؟ کل تو تمہیک ہے؟“ وہ اپنے

سارے قریبی رشتوں کو کھوپکا تھا اس لیے بڑی خبر کے ساتھ دھیان سب سے پہلے کل کی طرف گیا۔

”وہ تمہیک ہے لیکن اس کی حفاظت کے لیے اسے کسی دوسرے محفوظ مقام پر منتقل کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ اگر اس کام میں دیر ہوئی تو اس پر بھی مصیبت آسکتی ہے۔“

”ہوا کیا ہے؟ تم مجھے بتانی کیوں نہیں ہو؟“ وہ جھنجھایا۔

”میڈم ایکس کے ساتھی رادھا دیوی اور کالے خان تک پہنچ گئے ہیں اور اس وقت وہ دونوں ان کے قبضے میں ہیں۔“ اس نے سفاکی ماعتوں میں ہم پھوڑا۔

”تمہیں کیسے پتا چلا؟“ وہ بے قرار ہوا۔

”میرے راجیلے ہیں۔ ویسے بھی ابھی میں نے میڈم سے علیحدگی کا اعلان نہیں کیا ہے۔ اس لیے مجھے کوئی اطلاع ملنا بڑی بات نہیں ہے۔“

”وہ دونوں میرے محسن ہیں۔ مجھے ان کے بچاؤ کے لیے کچھ کرنا ہوگا۔“ وہ اندھ کر ٹپکنے لگا۔

”ان سے پہلے تمہیں کل کو شفٹ کرنا پڑے گا۔ ان دونوں کو اٹھانے کا مقصد محض تم تک پہنچنا ہے۔ جب رادھا اور کالے خان تمہارا پتا نہیں بتا پائیں گے تو تم پر دباؤ ڈالنے کے لیے کل تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔“

”گل خان کے بارے میں کیا اطلاع ہے؟“ وہ

بکدم کل کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اسے اب بھی سونیا پر مکمل اعتماد نہیں تھا اور کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ کہیں اس نے اس سے کل کا پتا حاصل کرنے کے لیے یہ ترکیب نہ لرائی ہو۔

”گل خان کون؟“

”رادھا دیوی کی کوٹھی پر ملازم تھا۔ گارڈ کم نگ بچھ لو۔“

”اوہ۔۔۔۔۔“ سونیا چونکی۔

”مجھے معلوم ہوا ہے کہ کوٹھی میں داخل ہونے والوں کو مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ شاید یہ اسی گل خان کا کارنامہ ہو لیکن مجھے اس کے بارے میں تفصیل معلوم نہیں۔“

”ہمیں واپس دہلی جانا ہوگا۔ ہاں ہماری ضرورت ہے۔“

”میں اس کا مشورہ نہیں دوں گی۔“ سونیا نے اس کی تجویز رد کی۔

”کیوں؟“ وہ چڑا۔

”ہو سکتا ہے اس حرکت کے پیچھے مقصد ہی تمہیں سامنے لانا ہو۔ ویسے بھی یہاں کامیابی ہمارے اتنے قریب ہے۔ اس کام کو ادھورا چھوڑ کر چلے گئے تو دوبارہ شاید موقع نہ مل سکے۔ یہ نواب وغیرہ بہت نازک مزاج لوگ ہوتے

ہیں۔ آزمائشی عرصے میں ہی ہماری طرف سے کسی قسم کی کوتاہی ہم سے یہ موقع چھین سکتی ہے۔“ اس نے محاذ کو سمجھانا چاہا۔

”نواب صاحب سے کوئی معقول بہانہ بنا کر رخصت لی جاسکتی ہے۔ ویسے بھی عالم اور سرمد یہاں کسی بڑی پریشانی میں مبتلا نہیں ہیں لیکن رادھا اور کالے خان کو معلومات کے حصول کے لیے بدترین تشدد کا نشانہ بنایا جاسکتا ہے۔“ وہ سونیا کی دلیل سے قائل نہیں ہوا۔

”رادھا اور کالے خان کو تلاش کہاں کرو گے؟“ سونیا نے گویا ہتھیار ڈال دیے۔

”ان تک مجھے تم پہنچاؤ گی۔ تنظیم میں تمہارا ایک اہم مقام ہے۔ کیا تم اتنی معمولی سی معلومات بھی حاصل نہیں کر سکتیں؟“ معاذ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تو وہ اس کی شکل دیکھتی رہ گئی پھر ایک حشمتی سانس بھر کر بولی۔

”اگر اس آزمائش سے تمہیں میرے خلوص پر یقین آ جاتا ہے تو میں اس سے گزرنے کے لیے تیار ہوں۔“

”گنہ! اب سوچنا یہ ہے کہ نواب صاحب سے کیا بہانہ بنانا ہے کہ وہ ہماری مجبوری کو سمجھ سکیں۔“ کسی عزیز یا دوست کی حادثاتی موت سے زیادہ معقول بہانہ کیا ہو سکتا ہے۔“ وہ اس طرح منہ بنا کر بولی کہ پریشانی کے باوجود معاذ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی لیکن یہ مسکراہٹ بس لمحاتی ہی تھی۔ اسے رادھا اور کالے خان کے ساتھ ساتھ سبھل اور گل خان کی فکر بھی کھائے جا رہی تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ وہ کسی کو کال کرنے کا بھی رسک نہیں لے سکتا تھا۔ اگر کسی طرح کال ٹریس ہو جاتی تو اس کی حویلی میں موجود گی کا دشمنوں کو علم ہو جاتا اور یہ اچھا نہ ہوتا کہ عالم اور سرمد انوز قید میں تھے۔ فکر نے اسے رات کے سچے کچھے جیسے میں بھی سونے نہیں دیا۔ صبح ہوتے ہی نواب بدرالدین کی خدمت میں عرضی بھجوائی گئی۔ انہوں نے کمال مہربانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے عرضی منظور کر لی اور یوں وہ سفر کے لیے تیار ہو گئے۔ سونیا نے اپنے سامان کے ساتھ ریفریجریٹر میں رکھے ہوئے گوشت کے پارچے بھی پیک کر لیے تھے کہ کہیں ان کے پیچھے ریفریجریٹر کی صفائی کرنے والا ملازم انہیں دیکھ کر چوٹ نہ جائے۔

”ہمیں افسوس ہے کہ آپ کو ان حالات میں یہاں سے جانا پڑ رہا ہے۔“ عبید اور منیرہ انہیں رخصت کرنے آئے تھے اور منیرہ نے یہ الفاظ ادا کیے تھے۔

”حالات پر انسان کا اختیار تھوڑی ہوتا ہے ورنہ ہم تو

خود اپنی جگہ مطمئن تھے کہ ایک ہفتے کے آزمائشی عرصے سے گزر کر مستقل بنیادوں پر یہاں رہ سکیں گے۔“ سونیا نے اس کا شانہ چھپتے ہوئے خود بھی افسوس کا اظہار کیا۔

”ہمیں بھی آپ کو ساتھ پا کر خوشی ہوگی۔ یاد رکھیں دوست کی آخری رسومات سے فارغ ہو کر آپ کو یہاں واپس آنا ہے۔ ہم بے چینی سے آپ کا انتظار کریں گے۔“ منیرہ نے اس کا ہاتھ تمام کر خلوص سے کہا تو سونیا کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”فکر نہ کرو ہمشیرہ! ان کا کام ابھی ادھورا ہے۔ یہ ضرور واپس لوٹ کر ہمارے پاس آئیں گے۔“ عبید نے درمیان میں دخل اندازی کی۔

”کون سا کام؟“ معاذ اس کے لہجے کی معنی فہمی پر چوٹا۔

”ہمیں پڑھانے کا کام اور کون سا؟“ عبید شوشی سے

جسا تو معاذ کو بھی جبراً اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ لانا پڑی لیکن وہ سوچنے پر مجبور تھا کہ عبید کے الفاظ کا وہ مطلب نہیں تھا جو اس نے بیان کیا ہے۔

☆☆☆

”ہیلو شلیا! یہ میں بات کر رہا ہوں۔“ روائگی سے قتل اسے جیسے ہی موقع ملا، پبلک فون سے قتل کی موجودہ رہائش گاہ کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف سے فون نرس شلیا نے اٹھایا۔

”سرا! آپ؟ میڈم سے بات کرواؤں؟“ وہ اس کی آواز پہچان کر جلدی سے بولی۔

”نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے تم سے کام ہے۔“ وہ فی الحال قتل کے سوالوں کے جواب دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

”نہیں سرا! میں سن رہی ہوں۔“ وہ ہمدن گوش ہو گئی۔

”کیا تمہارے پاس کوئی ایسی محفوظ جگہ ہے جہاں تم سبھل اور اعظم کو ایک دودن کے لیے ٹھہرا سکو؟ کچھ علی تم لوگ جس اپارٹمنٹ میں موجود ہو اس کے کسی کی نظروں میں آنے کا خدشہ پیدا ہو گیا ہے اس لیے میں سبھل اور اعظم کو وہاں سے شفٹ کروانا چاہتا ہوں۔ میں خود دہلی میں نہیں ہوں ورنہ تم سے یہ کام نہ کہتا۔“

”میں انہیں اپنی ویدی کے گھر لے جاتی ہوں سرا! لیکن آپ بتائیں کہ کیا گڑبڑ ہے۔ ادھر سوشل میڈیا پر بھی رادھا دیوی کی کوئی پرکولیاں چلنے کی نیوز آئی ہے لیکن پولیس کی طرف سے اسے فیک نیوز کہا جا رہا ہے۔ آپ اور سر

کالے خان کی طرف سے پابندی بھی اس لیے ہم کو بھی پرفون کر کے بھی صحیح بات معلوم نہیں کر سکے۔“ شلیا نے قدرے

مہراے ہوئے سجے میں اس سے لہا۔ اسی وقت اسے اس
مختصر میں کل کی آواز سنائی دی۔ شاید وہ شلپا سے پوچھ رہی
تھی کہ فون پر کون ہے؟

”میڈم بات کرنا چاہتی ہیں سر!“ شلپا نے اس کے
انداز سے کی تصدیق کر دی۔
”ٹھیک ہے کر دو۔“

”کہاں ہیں آپ؟ یہاں سب کیا ہو رہا ہے؟“ سلام
کے فوراً بعد کل نے سوال جواب کا سلسلہ شروع کر دیا۔

”ابھی زیادہ لمبی بات کرنے کا وقت نہیں ہے۔ میں
نے شلپا کو چند ہدایات دی ہیں۔ آپ اس کی بات پر عمل
کریں۔ میں دہلی آ کر آپ سے رابطہ کرتا ہوں۔“ اس نے
چند جملوں میں کل کو نمشا دیا۔ حالات ایسے تھے کہ وہ چاہنے
کے باوجود اس سے گفتگو کو طول نہیں دے سکتا تھا۔

”جی بہتر۔“ دوسری طرف سے اس نے بھی اصرار
نہیں کیا اور اس کے کہنے پر ریسپورڈ ایک بار پھر شلپا کے
حوالے کر دیا۔ شلپا سے چند ضروری باتیں کرنے کے بعد
اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ اسے خدشہ تھا کہ یہ کال بھی غیر
محفوظ ہو سکتی ہے لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

”دہلی پہنچنے ہی پہلے ہم، میرے ایک ٹھکانے پر چلیں
گے تاکہ وہاں سے ضروری اسلحہ وغیرہ لے سکیں۔ میں کوشش
کروں گی کہ ان دونوں کو بغیر کسی ہنگامے کے وہاں سے نکال
لاؤں لیکن دوسری سچویشن کے لیے بھی ہمیں تیار رہنا ہوگا۔“
کال ختم کر وہ سونیا کے پاس واپس آیا تو خلاف توقع اس نے
کچھ پوچھنے کے بجائے آگے کی منصوبہ بندی پر گفتگو شروع
کر دی۔ اسے احساس ہو گیا کہ سونیا بھی یہ بات سمجھ رہی ہے
کہ وہ کل کے معاملے میں اس پر اعتماد نہیں کرنا چاہتا۔ اس
لئے دانت اس معاملے سے الگ ہو گئی ہے۔ شاید وہ ہرٹ بھی
ہوئی تھی لیکن اس نے وہی کیا تھا جو اسے ٹھیک لگا تھا۔ وہ خود کو
خطرے میں ڈال سکتا تھا لیکن کل کو نہیں۔

دہلی پہنچ کر وہ اپنے پروگرام کے مطابق سیدھے سونیا
کے ٹھکانے پر گئے۔ سونیا فون پر مسلسل معلومات بھی حاصل
کر رہی تھی۔ جلد ہی اس کے پاس بہت ساری معلومات اکٹھی
ہو گئیں جن سے اس نے معاذ کو بھی آگاہ کرتے ہوئے بتایا۔

”رادھا دیوی کو اغوا نہیں کیا گیا۔ اسے اس کے میٹی
والے اپارٹمنٹ میں کچھ گھنٹوں کے لیے یرغمال بنا کر
معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن وہ زیادہ کچھ
نہیں بتا سکی کیونکہ اس کے مطابق دہلی کے سارے معاملات
کالے خان دیکھتا ہے اور اس کو سرسری سی اپ ڈیٹ دے

دیتا ہے۔ کالے خان اور ادھارے اس بیان کے بعد ہی ان کو الیا
مکھا۔ اس موقع پر کل خان نے مزاحمت کی کوشش کی تھی اور
چند ایک گولیاں بھی چلی تھیں لیکن بعد میں اسے ڈاٹ گرن کے
ذریعے بے ہوش کر کے معاملہ نمٹا لیا گیا۔ وہ اس وقت کوٹھی پر
ہی موجود ہے اور اسے اچھی طرح سمجھا دیا گیا ہے کہ اگر اس
نے شور مچایا تو کالے خان کی واپسی مشکل ہو جائے گی۔“
تکمل اور درست معلومات اب حاصل ہو چکی تھیں۔

”کالے خان کو بھی مصیبت میں تو نہیں چھوڑا جاسکتا
نا۔ اس نے میرا بہت ساتھ دیا ہے۔ اب وقت ہے کہ میں
اس کی مدد کروں۔“

”ٹھیک ہے۔ میں کچھ کرتی ہوں، بلکہ خود ہی وہاں
جاتی ہوں جہاں اسے رکھا گیا ہے۔“ وہ اپنی ہلکی سی جیکٹ
کی اندرونی جیب میں ہنسل رکھتے ہوئے کھڑی ہوئی۔
”کیا میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا؟“ وہ بے
چین ہوا۔

”میرا کیلا جانا زیادہ بہتر ہے۔ جہیں وہاں کسی نے
پہچان لیا تو معاملہ بگڑ بھی سکتا ہے۔ بلکہ ٹھہرہ میرے ذہن
میں ایک ترکیب آئی ہے۔ اس پر عمل سے ہم کالے خان کو
بھی بجالیں گے اور مجھ پر بھی آج نہیں آئے گی۔“ وہ اسے
اپنی ترکیب سے آگاہ کرنے لگی۔

”یہ ٹھیک رہے گا۔“ سن کر اس نے بھی تائید کی۔
اب وہ اپنے اگلے منصوبے کی تیاری کے ساتھ روانہ
ہوئے۔ دونوں الگ الگ گاڑیوں میں تھے۔ معاذ کے
ساتھ مدد کے لیے ایک دوسرا بندہ بھی تھا اور ایسا انتظام کر لیا
گیا تھا کہ وہ سونیا کی ساری گفتگو سن سکے۔ روانگی سے قبل وہ
شلپا سے رابطہ کر کے تازہ صورت حال معلوم کرنا نہیں بھولا
تھا۔ وہ لوگ شلپا کی بہن کے گھر پہنچ چکے تھے اور اس کی
طرف سے نئی ہدایات کے منتظر تھے۔ اس نے چند گھنٹے
مزید انتظار کا کہہ کر بات ختم کر دی اور اب وہ سونیا کے
تقابل میں جا رہا تھا۔ اس کا رخ دہلی کے ایک پوش علاقے
کی طرف تھا۔ اس علاقے میں داخل ہونے کے بعد اس نے
معاذ کو ایک جگہ رک جانے کی ہدایت کی اور خود آگے نکلتی چلی
گئی۔ اس کی منزل ایک جدید انداز کی کوٹھی تھی۔

”آپ کہاں غائب ہو گئی تھیں میڈم! ہم کوشش کے
باوجود آپ سے کاٹیکٹ نہیں کر پا رہے تھے۔“ کوٹھی میں
اس کا استقبال ان دونوں میں سے ایک نے کیا جو سہاش
کے بعد یہاں اس کی مدد کے ذمے دار تھے۔

”میں کچھ ضروری کام نمٹا رہی تھی لیکن تم یہ بتاؤ کہ تم

میری پریشانی کے بغیر کیا کچھ کرتے پھر رہے ہو؟" اس نے سر ہلچے میں اس شخص کو جواب دیا۔

"ایسا تو سمجھ نہیں ہے میڈم! ہم یا تو آپ کے حکم پر عمل کرتے ہیں یا اوپر سے ملنے والے آرڈرز پر۔" اس نے جلدی سے صفائی پیش کی۔

"قلم اشارہ رادھا دیوی کی کوشی سے اس کے خاص آدمی کا لے خان کو اٹھانے کا حکم کس نے دیا تھا؟"

"ہمیں کلیو ملا تھا کہ معاذ کی وہاں سے مدد کی جاتی رہی ہے بلکہ وہ کچھ دن اس کوشی میں رہا بھی ہے۔ تو ہم نے اس پر مزید کام کرنے کے لیے پہلے آپ سے کانٹیکٹ کرنے کی کوشش کی پھر ناکام ہو کر اوپر سے رابطہ کر لیا۔ وہاں سے جو حکم ملا ہم نے اس پر عمل کیا۔ کالے خان اس وقت ہمارے پاس ہے اور اس نے مان لیا ہے کہ اس نے کوشی میں معاذ کو پناہ دی تھی۔ باقی بھی اس نے کچھ معاملات میں معاذ کی مدد کرنے کو مان لیا ہے لیکن معاذ یا سبیل کا پتا دینے سے انکاری ہے اور مسلسل یہی کہہ رہا ہے کہ وہ کچھ نہیں جانتا۔" اس شخص نے اسے مکمل رپورٹ پیش کی۔

"یہ سب باتیں میں پہلے ہی سے جانتی ہوں۔ کالے خان پر نظر بھی رہی ہوئی تھی کہ اگر وہ ان دونوں میں سے کسی کی طرف جاتا ہے یا ان سے رابطہ کرتا ہے تو ہمیں معلوم ہو جائے لیکن اسے یوں اٹھوا لینے سے سارا بتا بٹا کھیل بگڑ گیا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اب اگر تم کالے خان کی زبان کھلوانے میں کامیاب ہو بھی گئے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ہو سکتا ہے اب تک معاذ اور سبیل اپنا ٹھکانا تبدیل بھی کر چکے ہوں۔" وہ اس ساری صورت حال پر اپنے جھنجھلائے ہوئے ہونے کی اداکاری کر رہی تھی۔

"آئی ایم سوری میڈم! میں نے تو بس وہی کیا جس کا مجھے آرڈر ملا تھا۔"

"یہاں تم میرے اندر کام کر رہے ہو۔ جب تم مجھے بائی پاس کر کے اوپر جاؤ گے تو اس طرح کی سچویشن تو ہوگی۔ مگر آڈنڈ پر وہ کرائیڈ کرنے والا جو کچھ جانتا ہے وہ اوپر والوں کو کیسے معلوم ہو سکتا ہے؟" وہ مسلسل اپنی برہمی کا اظہار کر رہی تھی۔

"سوری میڈم! میں نے بتایا تھا کہ آپ سے کانٹیکٹ نہیں ہو رہا تھا تو اس لیے....."

"آئندہ کے لیے ذہن میں رکھ لو کہ بھلے سے تمہیں ملے کہ میں رابطے میں نہیں ہوں لیکن مجھے سارے حالات کا معلوم ہوتا ہے۔ اب بھی تمہارے کارنامے کے بارے میں

جان کر مجھے اپنا ایک اہم کام چھوڑ کر واپس آنا پڑا ہے۔" اس کے لیےجی کی سرد مہری نے اس یا اس بیچارے کو معذرت کرنے کی بھی ہمت نہیں دی اور وہ یونہی منہ لٹکائے کھڑا رہا۔

"چلو، چل کر طواؤ مجھے کالے خان سے۔ اس کا کیا کرنا ہے، اب یہ بھی سوچنا پڑے گا۔"

"جی، آئیے میرے ساتھ۔" وہ جلدی سے حرکت میں آیا۔ کالے خان کو ایک زیر زمین کمرے میں رکھا گیا تھا اور اس کی حالت کو دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ اس سے معلومات اگوانے کے لیے بڑی بے دردی سے تشدد کیا گیا ہے۔ سونیا کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں شامسائی جھلکی لیکن سونیا نے آنکھوں میں آنکھوں میں اسے اشارہ کیا کہ وہ اس کے معاملے میں اپنی زبان بند رکھے پھر اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے باند آواز میں بولی۔

"کیوں اپنی جان کو مشکل میں ڈال رکھا ہے۔ بتا دو ان دونوں شخصوں کا پتا۔ تمہاری جان چھوٹ جائے گی۔" "جو بتا سکتا تھا، بتا دیا۔ باقی تم لوگ میری جان بھی نکال لو تو نہیں بتا سکتا۔"

"تم نے نہیں بتایا تو ہم رادھا سے معلوم کر لیں گے۔ وہ نرم و نازک سی ہیر دکن تمہارے جتنی سخت جان تو نہیں ہو سکتی۔"

"وہ کچھ نہیں جانتی۔ نہ ہی تم لوگ اس کے ساتھ میرا والا سلوک کرنے کی کوشش کرنا۔ تمہیں نہیں معلوم اس کی پانچ قلموں پر بڑے بھیا کا پیسا لگا ہوا ہے۔ ہیر دکن کو کچھ ہونے کا مطلب ہے بڑے بھیا کا نقصان اور خود کو نقصان پہنچانے والوں کا وہ بیڑا غرق کر دیتا ہے۔" اس نے ایک انڈر ورلڈ ڈان کا حوالہ دیا اور یہ بات سب جانتے تھے کہ بالی ووڈ میں سب سے زیادہ پیسا اسی کا لگا ہوا تھا۔

"دھمکی مت دو۔ ہم تمہارے بڑے بھیا کے بھی باپ ہیں۔ اپنی پر آئیں گے تو اسے جیونتی کی طرح مسل کر رکھ دیں گے۔"

"اتنی ہی طاقت والے ہو تو اگلو لو مجھ سے معاذ اور سبیل کا پتا۔" کالے خان اس دھمکی سے متاثر نہیں ہوا۔

"اسے پوائنٹ ٹو پرفیکشن کرواؤ۔ میں وہیں موجود رہوں گی۔ دیکھتی ہوں کہ میرے آگے یہ اپنی زبان کیسے بند رکھتا ہے۔" سونیا نے گویا غصے میں مل کھا کر اپنے مقب میں کھڑے شخص کو حکم دیا۔

"او کے میڈم! لیکن....."

”کیا لیکن؟ تمہیں میرے فیصلے سے اختلاف ہے؟“
وہ پھٹکاری۔

”لومیڈم! بس میں یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ ابھی ہمارے پاس لوگ کم ہیں۔ اس لیے فوری شفٹنگ مشکل ہوگی۔“
”ایک بندے ہوئے بندے کو شفٹ کرنے کے لیے کیا تمہیں پوری پلانٹوں چاہیے۔“

”نو۔۔۔ لومیڈم! میں ابھی انتظام کرتا ہوں۔“ اس کے طنز پر وہ بوٹھا کر باہر بھاگا۔ سونیا کالے خان کی طرف دیکھ کر مسکرائی لیکن ساتھ ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ بھی کر دیا۔ اپنے ہاں کے سیٹ اپ کا اسے کچھ نہیں پتا تھا کہ یہاں ہونے والی گنگو خفیہ طور پر ریکارڈ ہو رہی ہو۔

”زبان نہ کھول کر تم نے خود کو مشکل میں ڈال لیا ہے۔“ خاموشی کو مناسب نہ جان کر وہ کالے خان سے مخاطب ہوئی۔

”میں نے دنیا میں آنکھیں کھولنے کے بعد سے زیادہ تر مشکل زندگی ہی گزاری ہے۔ اس لیے مجھے مشکلات سے ڈر نہیں لگتا۔“ کالے خان نے اپنی زندگی کی حقیقت بیان کی۔
”لیکن اب تم پر جو مشکل پڑی ہے، وہ پوری زندگی کی مشکلات پر بھاری ثابت ہوگی۔ میں اب بھی تمہیں مشورہ دیتی ہوں کہ زبان کھول دو۔“

”اور میرا مشورہ ہے کہ تم اپنے مشورے اپنے پاس رکھو۔“ کالے خان کے ترکی بہ ترکی دیے ہوئے جواب نے سونیا کو محظوظ کیا۔ اسی وقت وہ شخص واپس آ گیا جس کو اس نے کالے خان کی منتقلی کے احکامات دیے تھے۔ اس کے ساتھ ایک دوسرا شخص بھی موجود تھا۔

”یہ لالو ہے۔ اچھا پھر تیرا بندہ ہے۔ اسے میں آپ کے ساتھ بھیج دیتی ہوں۔ اسے آرام سے سنبھال لے گا۔“ اپنے ساتھ موجود شخص کا تعارف کرواتے ہوئے اس نے کالے خان کی طرف اشارہ کیا۔

”مجھے یہاں سے کسی اور کام سے جانا ہے۔ تم دوسری گاڑی میں انہیں بھجواؤ۔ رہی سنبھالنے کی بات تو یہ کون سا مسئلہ ہے۔ اس بندے کو بے ہوشی کا انجکشن لگا کر گاڑی کی ڈکی میں ڈالو اور شفٹ کروادو۔“ اس نے ٹاک چڑھا کر مشورہ دیا اور پھر اپنی جگہ سے کھڑی ہوتے ہوئے بولی۔

”آدمی پون گھنٹے کے اندر یہ کام ہو جانا چاہیے۔ مجھے پوائنٹ نو پینچتے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔“

”اوکے میڈم!“ اس شخص کے چہرے پر تذبذب

کے آثار تھے لیکن اس کے حکم کی مخالفت نہیں کی۔ وہ مطمئن سی وہاں سے روانہ ہو گئی۔ مشکل محسوس ہونے والے کام کا پہلا مرحلہ آسانی سے طے ہو گیا تھا۔ اب دوسرے مرحلے کی کامیابی کا انحصار معاذ کی کارکردگی پر تھا۔

”تم نے سب کچھ سن لیا ہوگا۔ میں یہاں سے جاری ہوں۔ تم یہاں نظر رکھو۔ کالے خان کو جس گاڑی میں شفٹ کیا جائے گا، اسے چالیس یا پچاس سال کا ایک گہری سانولی رنگت والا شخص چلا رہا ہوگا۔ تمہیں گاڑی کو مناسب مقام پر رکوا کر کالے خان کو اپنی گاڑی میں شفٹ کرنا ہوگا۔“ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اس نے معاذ کو مخاطب کیا اور پھر اسے مشورہ دینے لگی کہ کون سی سڑک۔ گاڑی روکنا مناسب رہے گا۔

”جیک، دہلی کا رہائشی ہے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر اس کو بٹھانا۔ وہ تمہیں محفوظ راستے سے منزل پر پہنچا دے گا۔“ اس نے معاذ کے ساتھ موجود شخص کے حوالے سے اسے مشورہ دیا۔

”ٹھیک ہے۔“ معاذ نے اس کی ساری باتوں کے جواب میں مختصر کہا۔ وہ مذکورہ کوٹھی سے مناسب فاصلے پر جیک کے ساتھ ایسی جگہ موجود تھا کہ کوٹھی کا گیٹ اسے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ سونیا کی گاڑی کو وہاں سے نکلتے ہوئے بھی وہ دیکھ چکا تھا۔

”تم ڈرائیونگ سیٹ پر آ جاؤ۔“ سونیا کی ہدایت کے مطابق جیک کو ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھاتے ہوئے وہ اسے بتانے لگا کہ آگے انہیں کیا کرنا ہے۔ ابھی وہ اس کام سے فارغ ہی ہوا تھا کہ ایک سیاہ رنگ کی ماروٹی کو کوٹھی سے نکلتے ہوئے دیکھا۔ ماروٹی کی ڈرائیونگ سیٹ پر اسی جلیے کا شخص تھا جس کے متعلق سونیا نے اسے بتایا تھا لیکن اس کے ساتھ والی سیٹ پر قدرے بھاری جسامت کا ایک دوسرا شخص بھی بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے فوراً سونیا کو اس شخص کے بارے میں آگاہ کیا۔

”وہ جگدیش ہے۔ اسلحہ کے استعمال میں مہارت رکھتا ہے۔ لالو سے پہلے تمہیں اس بندے کو کنٹرول کرنا ہوگا۔“ سونیا نے فوراً اسے مشورہ دیا۔ کچھ کچھ اسے جگدیش پر غصہ بھی آ رہا تھا جس نے اس کی ہدایت کے باوجود کالے خان کی شفٹنگ کو معمولی کام نہیں سمجھا تھا اور خود بھی اس کام میں شریک ہو گیا تھا۔

”اوکے، میں خیال رکھوں گا۔“ اس نے اپنی گود میں رکھی گن کو تھپتھپاتے ہوئے سونیا کو جواب دیا پھر جیک سے مخاطب ہو کر بولا۔

”گاڑی آگے نکال لو۔ ان لوگوں کو تعاقب کا شک ہو سکتا ہے۔ ہم آگے ان کا انتظار کریں گے۔ تمہاری میڈم

لے بتایا ہے کہ پوائنٹ تو جاتے ہوئے اس سڑک سے گزرنا ناگزیر ہے۔

”ایز یوش سرا“ جنکی نے فرمانبرداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسلٹریٹر پر دباؤ بڑھا دیا۔ کچھ ہی منٹوں میں وہ کافی آگے نکل چکے تھے۔ متعلقہ سڑک پر پہنچ کر جنکی نے گاڑی ایک جانب روک دی اور یوں اس کا پونٹ اٹھا کر کھڑا ہو گیا جیسے گاڑی میں پیدا ہونے والے کسی نقص کو دور کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ معاذ بھی اپنی جگہ پر بیٹھا نہ رہا اور گاڑی کی دوسری جانب جا کر دبک گیا۔ اس جگہ سڑک پر سے گزرنے والوں کی براہ راست اس پر نظر نہیں پڑ سکتی تھی۔ اسے وہاں دیکھے مشکل سے ایک دیر بے منت گزرا ہو گا کہ پونٹ اٹھائے کھڑے جنکی نے ماروٹی کی آمد کا اشارہ دیا۔ وہ سینے کے بل نشانہ باندھ کر یوں لینا کہ اس کی انگلی فریگر پر جمی ہوئی تھی۔ ماروٹی سبک رفتاری سے چلتی جیسے ہی اس کے سامنے سے گزری، فریگر پر دباؤ بڑھا اور ماروٹی کا ایک ٹائر برسٹ ہو گیا۔ اضطرابی طور پر دوسری طرف سے بھی گولیاں چلائی گئیں لیکن انہیں ان گولیوں نے کوئی نقصان نہ پہنچایا کیونکہ اپنی گاڑی سڑک کنارے روکتے ہوئے انہوں نے پہلے ہی اس بات کا خیال رکھا تھا کہ وہ جگدیش سے مخالف سمت میں ہوں۔ مخالف سمت میں ہونے کی وجہ سے جگدیش کے لیے درست نشانہ لینا ممکن نہیں تھا جبکہ لالو گاڑی کو بے قابو ہونے سے بچانے میں مصروف ہو گیا تھا۔

دوسری طرف اسے یہ ایڈوائس حاصل تھا کہ پہلی گولی چلتے ہی جنکی بونٹ گرا کر خود بھی اس کے ساتھ شامل ہو گیا تھا اور اس کی گن نے بھی گولیاں اگنا شروع کر دی تھیں۔ اتنی تیز فائرنگ کی وجہ سے ایک طرف ماروٹی کو کھل بھاگنے کا موقع نہیں ملا تھا تو دوسری طرف سڑک پر پیچھے سے آتی گاڑیاں بھی رک گئی تھیں۔ کسی میں ہمت نہیں تھی کہ اتنی دھواں دھار فائرنگ کے آگے آسکے۔ ماروٹی کے دونوں سوار بھی دوسری جانب سے اتر کر گاڑی کی اوٹ لے چکے تھے اور زبردست جوانی فائرنگ کر رہے تھے۔ جلد ہی معاذ نے محسوس کیا کہ وہ لوگ فائرنگ کرتے ہوئے پیچھے ہٹ رہے ہیں۔ وہ جس جانب پیچھے ہٹ رہے تھے، اس طرف مٹی زمین اور جھاڑیاں وغیرہ تھیں۔ معاذ نے جنکی کو کور دینے کا اشارہ کیا اور خود احتیاط سے آگے بڑھنے لگا۔ جب تک وہ ماروٹی تک پہنچا، وہ لوگ اتنی دور جا چکے تھے کہ اب ان کی طرف سے فائرنگ بھی نہیں کیا جا رہا تھا۔ اسے ان لوگوں

سے زیادہ کالے خان کی رہائی سے دلچسپی بھی چنانچہ ان کا تعاقب کرنے کے بجائے گاڑی کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کے ڈنکی کھولنے کے دوران جنکی نے اس بات کو یقینی بنائے رکھا کہ کہیں سے مداخلت نہ ہو۔ ویسے بھی جتنی فائرنگ وہاں ہو چکی تھی، اس کے بعد کسی میں مداخلت کی ہمت نہیں تھی۔ بیشتر گاڑیاں یوٹرن لے کر واپس مڑ چکی تھیں۔

”مائی گاڈ!“ ڈنکی کھلنے پر جو منظر اس کے سامنے آیا، اس نے اسے ہلا کر رکھ دیا اور بے ساختہ ہی سہارا لینے کے لیے ڈنکی کے کنارے کو پکڑا۔ ڈنکی کے اندر سے کالے خان کی بے نور پھٹی پھٹی آنکھیں اسے دیکھ رہی تھیں۔ سینے میں عین دل کے مقام پر دھتے تک دھتے خنجر نے اس دل کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا تھا جس کی ہر دھڑکن میں رادھا دیوی بسا کرتی تھی۔ وہ جو سمجھتا تھا کہ اپنے گھر والوں کو کھو کر درد کی آخری حد سے گزر چکا ہے، اپنی جگہ مل کر رہ گیا۔ ایک دوست، ہمدرد اور محسن، جس نے دیا ر غیر میں اسے بڑا سہارا دیا تھا، اچانک اس سے چھین لیا گیا تھا۔ اس کا دل چاہا وہیں کھڑے کھڑے دھارڑیں مار کر رونے لگے یا پھر ساری دنیا کو آگ لگا دے۔

”ایلیس موو، سرا! ہمیں یہاں سے نکلتا ہے۔ میڈم کا حکم ہے کہ جلد از جلد ٹھکانے پر پہنچیں۔“ جنکی نے لاش دیکھتے ہی سونیا سے رابطہ کر کے اسے اطلاع پہنچا دی تھی اور اب اس کی طرف سے ملنے والی ہدایت کے مطابق معاذ سے کہہ رہا تھا۔ معاذ سننے کے باوجود عمل سے قاصر تھا۔

”پلیز سرا!“ جنکی نے اس کا بازو پکڑ کر کہنیا تو وہ اس کے ساتھ ٹھسٹا چلا گیا۔ جنکی نے برق رفتاری سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ ماروٹی پیچھے بہت پیچھے رہ گئی لیکن کالے خان کی بے نور آنکھیں اس کے ساتھ چلی آئیں۔ یہ بے نور آنکھیں خود اس کی آنکھوں کو بہت دلوں تک نیند سے محروم رکھنے والی تھیں۔

☆☆☆

”بلوئی معاذ! جب میں وہاں سے نکل تو کالے خان زندہ تھا۔ تم نے خود بھی تو میرے اور اس کے درمیان ہونے والی باتیں سنی تھیں۔ وہ میرا اشارہ سمجھ گیا تھا اور اتنی ذہانت سے اس طرح میری ہر بات کا جواب دے رہا تھا کہ مجھے یقین ہے کہ کوئی ہماری گفتگو پر شک کر ہی نہیں سکتا تھا۔ گڑبڑ کیسے اور کہاں ہوئی؟ میں خود سمجھنے سے قاصر ہوں۔“ وہ جب سے سونیا کے ٹھکانے پر واپس پہنچا تھا، مٹی کے مادھو کی طرح چپ چاپ بیٹھا تھا اور سونیا اس کے سامنے وضائیں پیش

”میں بھی اس گزری کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں نے تم دونوں کی جو گفتگو سنی، اس میں تم کالے خان کو دھمکیاں ہی دیتی رہیں۔ یہاں تک کہ جب جگدیش وہاں نہیں تھا تب بھی تم نے کالے خان سے کوئی ایسا بات نہیں کی جس سے اندازہ ہوتا کہ تمہیں اس سے ہمدردی تھی۔“

”مجھے اندیشہ تھا کہ وہاں ہونے والی ہر بات ریکارڈ ہو رہی ہوگی اس لیے میں نے ایسا نہیں کیا لیکن میں نے تمہیں بتایا تاکہ میں نے کالے خان کو اشارے سے اپنے دوست ہونے کا بتا دیا تھا۔“

”ہوسکتا ہے تم نے اشارے سے جگدیش اور لالو کو کالے خان کے قتل کا حکم بھی دے دیا ہو؟“

”تم مجھ پر شک کر رہے ہو؟“ سونیا کو صدمہ ہوا۔

”حالات ہی کچھ ایسے ہیں۔“ معاذ نے شانے اچکائے۔

”حالات تمہاری سوچ سے بھی زیادہ بُرے ہیں۔ مجھے تو یوں لگ رہا ہے کہ میری اپنی ذات شک کی زد میں آ چکی ہے۔ کیا تم نے اس بات کا نوٹس لیا تھا کہ جب جیگی تمہیں یہاں واپس لارہا تھا تو تمہاری گاڑی کا تعاقب کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اگر جیگی ہوشیار نہ ہوتا تو اس وقت وہ تعاقب کا تمہارے پیچھے یہاں تک پہنچ چکے ہوتے۔“

”تمہارے کہنے کا مطلب ہے وہ لوگ تمہارے ذریعے مجھے ٹریس کرنے کی کوشش کر رہے تھے؟“ معاذ کو یاد تھا کہ جب وہ واپسی کے سفر میں کالے خان کی موت کے صدمے کے زیرِ اثر بالکل چپ چاپ بیٹھا ہوا تھا تو اس نے محسوس کیا تھا کہ جیگی نے گاڑی کو کئی بار غیر ضروری طور پر دائیں بائیں موڑا تھا اور کئی ایسے علاقوں سے بھی گزرا تھا جہاں سے وہ جاتے وقت نہیں گزرے ہوتے۔ یعنی وہ تعاقب کرنے والوں کو آج دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

”بالکل ایسا ہی ہے۔ میں تو شکر کر رہی ہوں کہ میں وہاں سے سیدھی یہاں نہیں آئی اور راستے میں ایک ریسٹورنٹ پر رک گئی کہ تھوڑا وقت گزار کر پوائنٹ ٹو چلی جاؤں گی۔ جیگی کی کال آنے پر میں نے اپنے سارے پروگرام تبدیل کر لیے۔ گاڑی ریسٹورنٹ پر ہی چھوڑ کر جیسی پرتھما اسٹاپ تک آئی ہوں اور وہاں سے پیدل یہاں۔“

”یعنی تمہیں لگتا ہے کہ ان لوگوں نے تمہاری لاعلمی میں تمہاری گاڑی میں کوئی ڈیوائس لگا دی ہوگی؟“ وہ چونکا۔

”بالکل۔ میں نے ملکیت کو فون کر دیا ہے کہ گاڑی کو وہاں سے لے جائے اور اچھی طرح چیک کرے۔“

”اگر ایسا ہے تو گاڑی یا ملکیت کے ذریعے بھی تو اس جگہ کو ٹریس کیا جاسکتا ہے۔“ معاذ نے نکتہ اٹھایا۔

”ہرگز نہیں۔ گاڑی ایک دوست کی ہے۔ ملکیت اور گاڑی دونوں اسی دوست کا ہوتا ہیں گے اور وہ آج کل اغذیہ سے باہر ہے۔“

”یہاں تمہارے دوست بھی ہیں؟“

”میں کوئی پہلی بار یہاں نہیں آئی ہوں۔ اپنے مسائل حل کرنے کے لیے دوستیاں اور تعلقات بنانے پڑتے ہیں۔“ اس نے بغیرنگی لہجی کے اعتراف کیا۔

”اگر تم ان کی نظروں میں مشکوک ہو چکی تھیں تو

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں

جاسوسی ڈائجسٹ پبلیشرز

ایک محلے کے لیے 12 ماہ کا رسالہ بشمول رجسٹرڈ ایکسپریس پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 2000 روپے

امریکا کینیڈا آسٹریلیا رینوز لینڈ کے لیے 20,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 19,000 روپے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں

رابطہ:

0301-2454188: میرزا امیر عباس

0333-3285269: سرکولیشن مینیجر سید نسیم حسین

جاسوسی ڈائجسٹ پبلیشرز

C-63 فیز II ایکسپنشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی
مین کورنگی روڈ - کراچی

ابھول سے ہمیں وہیں میرے لیے بھائے انا ہزارا کیوں پھیلا یا؟“

”تمہاری خاطر.....“ وہ مسکرائی۔

”اگر میں تمہیں بھی اپنے ساتھ ہی وہاں لے گئی ہوتی تو وہ لوگ ایسا ہی کرتے لیکن وہ ایک تیرے دو شکار کرنا چاہ رہے تھے۔“

”مگر انہیں کیسے پتا چلا کہ تم میرے ساتھ ہو؟“

”وہ دنیا کو اپنے اشاروں پر بچاتے ہیں۔ اتنی سی بات جان لینا ان کے لیے کیا مشکل ہوگا۔ تمہاری تلاش میں میری مسلسل ناکامی ہی مجھے مشکوک بنانے کے لیے کافی تھی۔ اس پر سے میں نے اپنے سارے راجے ختم کر لیے۔ ہو سکتا ہے اس کے علاوہ بھی انہیں کچھ اور اشارے ملے ہوں۔“

”اس کا مطلب تو یہ ہے کہ کالے خان کا انخواہ شخص ہمیں گھیرنے کی ایک ترکیب تھی۔“

”بالکل، اس بے چارے کو چارہ بنایا گیا۔ انہیں اندازہ ہوگا کہ اس خبر کو سن کر تم ضرور مدد کے لیے دوڑو گے۔“

”لیکن تم کسی سے تو رابطے میں تھیں نا جب ہی تمہیں اس واقعے کی اطلاع ملی۔ کیا اس اطلاع دینے والے نے میڈم ایکس کو کچھ نہیں بتایا؟“

”نہیں بتایا ہوگا۔ وہ میڈم سے زیادہ میرا وفادار ہے۔“ سونیا کے ہونٹوں پر مسی خیز مسکراہٹ آئی۔ معاذ سوائے نظروں سے اس کی جانب دیکھتا رہا۔

”اپنے بچاؤ اور مفادات کے لیے انتظامات رکھتے پڑتے ہیں۔ ادھر ادھر بنائے گئے دوستوں اور وفاداروں کے علاوہ تنظیم میں بھی میرے کچھ وفادار ہیں جو مجھے ہر طرح کے حالات سے باخبر رکھتے ہیں۔“

”یقیناً انہیں بھی تم نے اپنے جسم کی رشوت دے کر خریدوا ہوگا۔“ اس موقع پر وہ سونیا کو کچھ کالگانے سے باز نہ آیا۔

”جو جس قیمت پر بکنے کے لیے راضی ہوا، میں نے اسے وہ قیمت ادا کی۔“ سونیا نے چہرے پر کوئی تاثر لائے بغیر اطمینان سے اس کی بات کا جواب دیا۔

”پتا نہیں بے چارے کالے خان کی تجھیز و بھنجی کے لیے کون انتظام کرے گا؟ وہ بد بخت گاڑی اور اس کی لاش واپس تو نہیں لے گئے؟“ اسے نیانم لائق ہوا۔

”گاڑی چوری کی تھی اور لاش کا بھی انہیں کچھ نہیں کرنا تھا۔ اس لیے دونوں کو سڑک پر چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ میرے خیال میں میڈیا کے ذریعے خبریں اور تصاویر پھیلیں گی تو رادھا دیوی خود اسے شناخت کر لے گی۔“ وہ

باجبری ہی اور جس کے لیے اندازے ہی لگا سکی۔

”رادھا دیوی کو کالے خان کی موت کا بہت صدمہ ہوگا۔“ معاذ کی نظروں میں کچھ دل کو گداز کرتے مناظر گھوم گئے۔

”ہاں، پہلے پہل جھٹکا تو تھکے گا پھر سنبھل جائے گی۔ سچ پوچھو تو اس کی اور کالے خان کی دنیا ایک دوسرے سے الگ تھی۔ وہ ایک دوسرے سے محبت کرنے کے باوجود کبھی ایک نہیں ہو سکتے تھے۔ اگر ایک ہو جاتے تو محبت ختم ہو جاتی۔ اب یہ ہوگا کہ رادھا بے شک بھی اسے دل سے نہیں نکال سکے گی لیکن کبھی نہ کبھی ایک نئی زندگی شروع کر دے گی۔“ سونیا نے اپنے تجزیے سے اسے حیران کر دیا۔ کالے خان بھی کچھ اسی انداز میں ہی سوچتا تھا۔ اسے رادھا کی محبت پر شک نہیں تھا لیکن اسے یقین تھا کہ رادھا اس کے ساتھ خوش نہیں رہ سکے گی۔

”جو ہو چکا، اسے ہم بدل نہیں سکتے۔ اب آگے کا سوچو کہ آگے کیا کرنا ہے۔“ تھوڑی دیر ان کے درمیان خاموشی چھائی رہی پھر سونیا نے اگلی بات کی۔ خود پر مکمل قابو قائم کر کے وہ معاذ کا موڈ تبدیل کرنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ اب وہ پہلے والی کیفیت سے نکل چکا تھا اور کوئی فیصلہ کر سکتا تھا۔

”سوچنا کیا ہے؟ جس کام کو ادھر اچھوڑ کر آئے ہیں، اسے مکمل کرنا ہے اور بس۔“

”اوکے، ڈن ہو گیا لیکن اب ہمیں پہلے سے زیادہ محتاط رہنا ہوگا۔ یہاں سے حیدر آباد پہنچنے کے لیے حلیوں میں بھی تبدیلی کرنا ہوگی۔“

”کر لیں گے۔ یہ کون سا مشکل کام ہے۔“ اس نے بے پروائی سے جواب دیا لیکن حقیقتاً وہ بالکل بھی بے پروا نہیں تھا اور بہت فکر مندی سے ایک دوسرے مسئلے پر سوچ رہا تھا۔ سگل اور اس کے بٹے کو غیر معینہ مدت کے لیے شلیپا کی بہن کے گھر نہیں چھوڑا جاسکتا تھا۔ ان کے لیے کوئی دوسرا بہتر انتظام ضروری تھا۔

”میرے خیال میں جلد از جلد نکل چلتے ہیں۔ جتنی زیادہ دیر رکھیں گے، اتنی رکاوٹیں کھڑی کر دی جائیں گی۔“

”ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ تمہارے سارے اندازے غلط ہوں۔ کوئی تم پر شک نہ کر رہا ہو اور جو کچھ ہوا، وہ محض اتفاق ہو۔ کیا خبر کالے خان نے کسی قسم کی مزاحمت کی ہو اور غیر ارادی طور پر تمہارے آدمیوں کے ہاتھوں مارا گیا ہو۔ انسان جب دہم میں مبتلا ہو جائے تو اپنے سائے سے بھی ڈرنے لگتا ہے اور اسے وہ نظر آنے لگتا ہے جو اس نے سوچا نہ ہو۔“ معاذ نے اس

سوچ میں پڑ گئی پھر سر جھٹک کر بولی۔
 ”اگر ایسا ہے بھی تو کوئی بات نہیں۔ میں طے کر چکی ہوں
 کہ پہلے تمہارے معاملات پر فوکس کرتا ہے۔ میڈم ایکس اور
 دیگر لوگوں کو میں بعد میں اپنے طور پر وینڈل کر لوں گی۔“
 ”اگر ایسا ہے تو پھر ٹھیک ہے، واپس چلتے ہیں لیکن
 جانے سے پہلے میں ایک ضروری کام نمٹانا چاہتا ہوں جس
 کے لیے مجھے رقم کی ضرورت ہے۔“
 ”کتنی رقم چاہیے؟“ سونیا نے اس سے کام کی نوعیت
 پوچھے بغیر رقم کے ہارے میں دریافت کیا۔ اس نے
 اندازے سے ایک بڑی رقم بیان کی۔
 ”ٹھیک ہے، مل جائے گی۔ یقیناً تمہیں کیش چاہیے
 ہوگا؟“

”ہاں۔“ اس نے سونیا کے خیال کی توثیق کی۔
 ”میں ابھی لا دیتی ہوں۔“ وہ فوراً اٹھ کر چلی گئی۔
 واپس آئی تو اس کی مطلوبہ رقم ساتھ تھی۔
 ”میں کچھ دیر کے لیے باہر جانا چاہتا ہوں۔“
 ”یہ خطرناک ہو سکتا ہے۔“ وہ حذبذب ہوئی۔
 ”حلیہ تبدیل کر کے جاؤں گا۔ کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔“
 ”کسی کو ساتھ لے جاؤ۔“ سونیا مطمئن نہیں تھی۔
 ”نہیں، میں جس کام کے لیے جا رہا ہوں اس کے
 لیے اپنے سائے پر بھی بھروسہ نہیں کر سکتا۔“ اس نے بنا
 مروت کے صاف انکار کر دیا۔
 ”ٹھیک ہے، جیسی تمہاری مرضی۔“ خلاف توقع سونیا
 نے اصرار نہ کیا۔

”تم پریشان مت ہونا۔ میں پوری احتیاط کروں
 گا۔“ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس نے کس جذبے کے تحت سونیا
 کو تسلی دینے کی کوشش کی تھی لیکن اس ذرا سی تسلی پر اس کے
 ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔
 ”آؤ، میں حلیہ تبدیل کرنے میں تمہاری مدد کرنی
 ہوں۔“ وہ اسے اپنے ساتھ ڈریسنگ روم میں لے گئی۔ کچھ
 دیر کی محنت کے بعد وہ وہاں سے روانہ ہوا تو ایک عام سے
 نوجوان کے روپ میں تھا۔ اس جیسے حلیے اور خدوخال
 والے وہلی کی سڑکوں پر نہ جانے کتنے پھرتے تھے۔ اس
 لیے کسی کا اس کی طرف متوجہ ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔
 سب سے پہلے اس نے ایک جگہ سے گل خان سے رابطہ کیا۔
 ”آپ کدھر آئے صبح اُدھر تو غضب ہو گیا ہے۔
 کوئی کالے گل خان صبح کو کوٹنگی سے اٹھا کر لے گیا اے۔“

پولیس اسٹیشن جا کر رپورٹ کرنے کا سوچا تھا پھر اس لیے
 رگ گیا کہ پتا بنی یہ بڑے لوگوں کا کیا لہذا ہے۔ کہیں الزام
 سے اسی ناراض نہ ہو جائے۔“ گل خان نے اس کی آواز
 سنتے ہی دکھڑے رونے شروع کر دیے۔
 ”تم نے ٹھیک کیا۔ اب ایسا کرو کہ میں ایک جگہ کا پتا
 دے رہا ہوں۔ وہاں پہنچ جاؤ اور ہاں، خیال سے آنا۔ ایسا
 نہ ہو کہ کوئی تمہارا پیچھا کرتا ہو اوہاں پہنچ جائے۔“
 ”ام کو احمق سمجھا اے کیا جوام کسی کو دم چھلنا بنا کر اپنے
 ساتھ لے آئے گا۔ ام تو اتنا ہوشیار آدمی اے کہ امارا مرضی
 کے بغیر امارا پر چھائیں بھی امارے پیچھے نہیں آ سکتا۔“ گل
 خان نے بڑک ماری۔

”ٹھیک ہے تو پھر جلدی سے آ جاؤ۔“ گل خان سے
 بحث کرنا بیکار جان کر اس نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔
 دوسری کال اس نے شلپا کو کی تھی۔ شلپا اس کی آواز سن کر
 رونے لگی۔

”کیا بات ہے شلپا؟ سب ٹھیک تو ہے؟“ وہ گھبرا گیا۔
 ”آپ کو پتا نہیں چلا؟“
 ”کیا پتا نہیں چلا؟“

”کسی نے مسٹر کالے گل خان کا مرڈر کر دیا ہے۔ میں
 نے ابھی ابھی نیوز میں ان کا نوٹو دیکھا ہے۔“
 ”اوہ.....“ وہ فقط اتنا ہی کہہ سکا۔ خبرٹی وی پر آگئی
 تھی تو مطلب تھا کہ جلد ہی ہر طرف پھیل جائے گی۔

”ہو سکتا ہے تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہو۔ کیا نیوز میں نام
 بھی بتایا تھا؟“ کچھ دقتی سے سنی اس نے بات بتائی تھی۔
 ”نام تو نہیں بتایا لیکن میں ہنڈریڈ پرسنٹ شیور ہوں سراسر
 میڈم نے بھی کفرم کیا ہے۔“ وہ یقیناً کھل کی بات کر رہی تھی۔

”تم اس معاملے سے خود کو الگ ہی رکھو تو بہتر ہے۔
 جو کرنا ہوا، ارادہ ادا یوی خود کر لیں گی۔ ان کے تعلقات ہیں۔
 وہ سب سنبھال سکتی ہیں۔ غریب آدمی ایسے معاملات میں
 پڑے تو پولیس سب سے پہلے اسی کی جان کو آجاتی ہے۔“
 ”یہ تو آپ ٹھیک بول رہے ہیں سراسر“ حسب توقع وہ
 ڈر گئی۔

”اچھا، میں نے تمہیں ایک کام سے فون کیا تھا بلکہ تم
 ایسا کر دینا میڈم سے بات کر دو اور پھر وہ جو کہیں، دیا
 کر دینا۔ تمہیں میں تمہاری سٹری کے ساتھ بونس بھی ابھی
 ایک آدمی کے ہاتھ بھجواتا ہوں۔“

”ٹھیک یو سرا“ وہ خوش ہو گئی پھر کھل کوفون تھما دیا۔

”کیسی ہیں آپ؟“
 ”ٹھیک ہوں۔ آپ بتائیں یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“
 ”میں کیا بتاؤں۔ میں تو خود ہی تماشائی ہوں۔“
 ”کیا کچھ؟“

”اگر آپ کو اعتبار نہیں تو میں اصرار نہیں کرتا۔ یوں بھی فی الحال میں نے آپ کو کسی اور مقصد سے فون کیا ہے۔“

”فرمائیے۔“ اس کا لہجہ کچھ نرم ہوا۔
 ”آپ کو سفر کی زحمت کرنا ہے۔ کچھ ضروری انتظامات کر لیجیے۔“ وہ ان انتظامات کے متعلق اسے ہدایات دینے لگا۔

”ٹھیک ہے، جیسے آپ کہیں۔“ وہ زیادہ لمبی بات کرتی تھی نہ کسی معاملے میں بحث۔ اس لیے وہ جانے کے باوجود بھی اس سے لمبی گفتگو نہیں کر پاتا تھا۔ اب بھی کام کی بات ہوئی اور رابطہ ختم۔ اس کال کو نمٹانے کے بعد وہ گل خان سے ملے کیے گئے مقام کی طرف چل پڑا۔ وہاں اسے کافی دیر انتظار کرنا پڑا۔

”کہاں رہ گئے تھے خان؟ میں کب سے تمہاری راہ دیکھ رہا ہوں۔“

”آپ نے تو بولا تھا کہ دیکھ بھال کر آنا۔ ام راسد چلتا تھا تو لگتا تھا ہر دو سر ایندھ مارا پیچھا کر رہا ہے۔ ام گھبرا کر اپنا رخ بدل لیتا تھا۔ ماز ااتنی بارام نے اپنا رخ بدلا کہ ام کو لگا ام گول گول محوم رہا ہے۔ آپ نے تو ام کو گھن چکر بنوا دیا صیب! پھر ام نے بولا گولی مارو اس چکر کو اور سیدھا اپنے راستے پر چلو۔ کوئی تھو اشخرا ہوا تو ام نمٹ لے گا۔“ گل خان کی بے ساختگی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لے آئی۔
 ”ام کو گھن چکر بنوا کر آپ خود نمستی ہے۔ یہ تو اچھی بات نئی اسے۔“ اس نے ناراضی کا اظہار کیا۔

”چھوڑو دان باتوں کو اور وہ سنو جس کے لیے میں نے تمہیں بلوایا ہے۔“

”آپ بولے گا تو ام سن لے گا۔“ کیا شان بے نیازی تھی۔

”تمہیں سب مل اور اس کے سب کے ساتھ حیدر آباد جانا ہے۔ وہاں تم لوگ ہوٹل میں ٹھہرو گے۔ میں موقع ملنے پر خود تم سے رابطہ کر لوں گا۔“ اس نے گل خان کو ایک اچھے ہوٹل کا نام بتانے کے ساتھ ساتھ بھاری رقم اور شلپا کی بہن کے گھر کا ایڈریس دیا۔

”یہ واسے روپے تمہیں شلپا کو دینے ہیں اور خیال رکھنا ہے کہ سب مل لازماً تمہاری پٹھان عورتوں کے روایتی

برقعے میں ہو۔“ شلپا کی سٹیری اور یوس الگ سے اسے تھماتے ہوئے اس نے مزید ہدایات جاری کیں۔ یہ ہدایت وہ سب مل کو بھی دے چکا تھا لیکن کسی بھی غلطی کے امکان سے بچنے کے لیے سب کو الگ الگ باور کروا رہا تھا۔ اس کے لیے ممکن نہیں تھا ورنہ وہ سب مل کو اپنی نگرانی میں اپنے ساتھ حیدر آباد لے کر جاتا۔

”آپ بے ہنگم (کھر) ہو جاؤ۔ ام اپنی جان سے بڑھ کر بی بی کا خیال رکھے گا۔“ گل خان نے اس کی پریشانی سمجھتے ہوئے اسے تسلی دی۔

”جو رقم میں نے تمہیں دی ہے، اس میں سے اپنے گھر پر بھی خیال سے خرچہ بھجوا دینا۔ تمہارے پیچھے انہیں کھلی نہیں ہونی چاہیے۔“ اسے گل خان کے گھر والوں کا خیال آیا تو اسے خاص طور پر تاکید کی۔

”بڑی مہربانی صیب!“ وہ اسنے سے خیال پر ہی خوش ہو گیا۔

”دعا کرو گل خان کہ جو لوگ باقی رہ گئے ہیں، میں ان کو بچانے کے لیے کچھ کر سکوں۔ میرے یہ پیارے بچے لٹکے تو شاید ان کو کھونے کا غم کچھ کم ہو جائے جن کو بچانے کے لیے میں کچھ نہ کر سکا۔“ ایک مخلص شخص کے سامنے اس کے دل کا درد زبان پر آ گیا۔ وہ زخم جو میرے ہی نہیں تھے ان پر کالے خان کی موت نے نمک چھڑک دیا تھا اور یہ وہ ہی جانتا تھا کہ وہ اندر سے کس قدر تکلیف میں ہے۔ حالات ایسے تھے کہ وہ اس پیارے شخص کو آخری آرام گاہ تک پہنچانے کا فریضہ بھی انجام نہیں دے سکتا تھا اور یہ امر دل کے لیے ایک بوجھ تھا۔

”اللہ سے بہتری کی امید رکھو صیب! آدمی میں کچھ بات ہوتا ہے تبھی اللہ اسے آزمائش میں ڈالتا ہے۔ امارا دل بولتا ہے کہ اللہ کو آپ سے بڑا کام لیتا ہے۔ بس آپ اپنا حوصلہ بلند رکھو۔“ بظاہر بے وقوف دکھائی دینے والا گل خان ایسی بات کہہ گیا تھا جس نے اسے سوچ میں ڈال دیا تھا۔ واقعی اتنی بڑی کائنات تخلیق کرنے والے نے یونہی تو اسے گردش ایام میں نہیں پھنسا دیا تھا۔ اس کے اپنے بندوں سے کام لینے کے اپنے طریقے تھے اور وہ شاید اس طریقے سے اسے کسی خاص سمت میں دھکیل رہا تھا۔

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نوجوان
 کی داستان جو غلط کاروں کے لیے
 غضب ناک تھا باقی واقعات آیت ماہ پڑھیے

قسط: 28

شہزادہ شاہ

استادری

زندگی پھر سے مگر، ایک نیا جہان معاشرہ ناہمواریوں کا شکار تہ ہو... ایک نیا جہان معاشرہ ناہمواریوں سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا اس کی تندوتیز اندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا۔ طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناشی و سستی کی طرف طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے تھے... اس کی زندگی جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... یہ خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی یہ قرار یوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تار عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ وارداتِ قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہو سکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام لوجوان کی تحریر انگیز داستان



معاذ ایک ذہین لیکن متکون مزاج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جوائن کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور ابھی عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ انسٹی ٹیوٹ سے واپس آ رہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو سڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہاں سے ہے۔ اپنی نڈر فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشری نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بشری ماس کمیونی کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم وغیرہ لکھتی ہے۔ اس دوران جگہ بھی وہ ایک زیر تعمیر رہائشی منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی آئی تھی۔ معاذ بشری کو بہ حفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کر دیتا ہے لیکن جن رئیس زادوں سے اس نے ان کا شمار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ یہ موقع انہیں یونیورسٹی ٹرپ کی صورت میں مل جاتا ہے اور ایک دن جنگل کی سیر کے دوران وہ فوٹو گرافی کے شوق میں سب سے الگ تھلگ ہو جانے والے معاذ کو بے خبری میں گھیر کر بری طرح زد و کوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دے دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس نہ آنے پر انتقامیہ کے افراد، پولیس، سکیورٹس کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو جنگل کے گہرے جھونپڑی میں پاتا ہے۔ اپنی حالت سے اسے اپنے شدید زخمی ہونے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ جوگی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے معاذ کا موبائل جنگل میں ہی نہیں کر جاتا ہے اور جوگی کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا جس سے باہر کی دنیا تک پہنچ سکے۔ جوگی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے۔ جوگی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک لمحے کے لیے اسے گردہ ان کے ہونٹوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نوازا کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد اسے اس کا گھر لکھانے کی بات ہو جاتی ہے اور معاذ واقعی اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ادھر جانے وقوع سے ملنے والے معاذ کے گھر سے جوگی کی جڑی بوٹی جاتی ہیں تو بہت سے قدرتی مناظر کی تصویروں میں سے ایک ایسی تصویر بشری کی نظر میں آ جاتی ہے جس میں ایک چہرہ جھانکنا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی شخصیت ہے جو اس کے والد کی موت کے بعد اس کے ساتھ رہی تھی۔ بشری کے اپنے والد جرنلسٹ ہوتے ہیں اور حق گوئی ان کے خون میں شامل تھی۔ اس انکشاف کے بعد وہ جوگی سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کا دادا اس میں بشری کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ کو بھی اس کے والد کے ہاتھوں میں باذل نامی خنڈے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشری انتقام لینے کی ضمان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دونوں شخصیات کو خائفانہ طور پر دیکھتا ہے تاہم ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا مرغان اللہ اور یزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو اس کا ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باذل اچانک بشری کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر دیتا ہے۔ معاذ کو اس کا لپے اور بھی جھکنڈے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اسے واپس آنے کا پیغام دیا جاتا ہے۔ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کر کے اسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات لی جاتی ہیں، نہ بتانے پر اس کے بھائی کا ایک گردہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشری بھی انتقام کی آگ میں جلتی ہوئی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہو جاتی ہے۔ معاذ کو بچانے والا لڑکا وقاص اپنے گرد کے ساتھ ایک پارٹی میں جاتا ہے۔ وہاں اسے معاذ کے حوالے سے مشکوک ایک شخص نظر آتا ہے۔ وہ اس کے پیچھے جاتا ہے مگر اسے گھیر لیا جاتا ہے۔ بہر حال وقاص کو سمجھ کے ساتھ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ادھر معاذ کے دوست عالم شاہ کے بہنوئی کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ کوئی فنون میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے پتا چلتا ہے کہ اس کے دامخ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ نغو سے حاصل انوکھے علم کی بدولت ان کا معمول نہیں جتا۔ بشری، کامران کو چھاپنے کا پروگرام بناتی ہے۔ ادھر عالم شاہ سراج لگا لیتا ہے کہ اس کے بہنوئی کا قتل کس نے کیا۔ وہ قاتل کو گھیرتا ہے اور اپنے تئیں اسے گولیاں مار کر قتل کر دیتا ہے۔ تاہم وہ جی جاتا ہے۔ عالم شاہ اس کے بعد ڈاکوؤں کے سردار چاچ کو چھاپتا ہے اور اسے کفر کردار تک پہنچاتا ہے۔ اس کے پیچھے پولیس لگ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور اس کا نوکر سرد، باذل کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ عالم کی بہن گل شاہ کے نومولود بیٹے کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اغوا کا الزام لطیف سومرو پر آتا ہے۔ عالم شاہ، باذل کی قید میں موجود ایک زخمی شخص کی مدد سے وہاں سے فرار ہو جاتا ہے۔ ادھر بشری دغی پہنچ جاتی ہے۔ وہاں وقاص اسے باربی کے روپ میں پہچان لیتا ہے اور ان دونوں کے درمیان اتحاد کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ وہ سلطان کو مارنا چاہتی ہے تاہم

دعائے اسے ایسا کرنے سے روکتا ہے۔ ادھر عالم شاہ، باذل کی قید سے نکل کر اس کا پیچھا کرتا ہے تاہم وہاں اچانک قاتلنگ اور دھماکے ہونے لگتے ہیں۔ وہ وہاں معاذ کو دیکھتا ہے۔ صداقت شاہ، لطیف سومرو کو گھیرنے کے لیے اس کی خفیہ بیوی اور بچے کا کھوج لگاتے ہیں اور بچے کو اغوا کر لیتے ہیں۔ لطیف سومرو مجبور ہو جاتا ہے۔ معاذ کو اس کے گھر والوں سے ملنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ عالم شاہ کو اس کے والد انڈیا روانگی کا عندیہ دیتے ہیں۔ ادھر معاذ بھی ایک مشن پر سونپا کے ساتھ انڈیا روانہ ہوتا ہے تاہم کچھ لوگ مکہ یا تریوں سے بھری بس کو پر غمال بنا لیتے ہیں۔ معاذ اور سونیات خانے کے تمام افراد کو کھانے لگا دیتے ہیں تاہم باہر موجود دیگر اغوا کاروں سے مقابلہ ہوتا ہے اور معاذ زخمی ہو جاتا ہے۔ صداقت شاہ کے انڈیا میں موجود رشتے دار کے ہاں شادی ہوتی ہے۔ عالم شاہ، بگل اور سرد انڈیا روانہ ہو جاتے ہیں۔ انڈیا پر رٹ سے گھر روانگی پر راستے میں کچھ لٹیرے انہیں لوٹ لیتے ہیں۔ عالم شاہ ایک مشن میں آنا چاہتا ہے تاہم اجالا نامی عالم شاہ کی کزن اس کا راستہ روک لیتی ہے۔ گھر پہنچنے پر پولیس کی ریڈ ہوتی ہے اور وہ عالم شاہ اور سرد کو لے جاتے ہیں۔ ادھر بشری اور وقاص باذل کو اسپتال میں مارنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ بچ جاتا ہے۔ معاذ اور سونیات خانہ کی تلاش میں ہوتے ہیں اور بالآخر اپنے سہولت کاروں سے مل جاتے ہیں۔ عالم شاہ اور سرد کو تشدد کا نشانہ بنا کر ویرانے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ واپس اپنے میزبانوں کے ہاں پہنچ جاتے ہیں۔ شادی کے دوران انہیں پتا لگتا ہے کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں اجالا اور اس کا عاشق شامل ہوتے ہیں۔ وہ چھپ کر ان کی باتیں سن رہا ہوتا ہے کہ اسے چھاپ لیا جاتا ہے۔ تاہم وہاں مارا ماری ہوتی ہے اور اجالا کا عاشق مارا جاتا ہے۔ پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ ان کے کزن انہیں اپنے دوسرے خفیہ ہنگے پر پہنچا دیتے ہیں کچھ لوگ ان پر حملہ کر دیتے ہیں۔ وہ وہاں سے بھگت نکل جاتے ہیں۔ ادھر معاذ کو سونیات خانہ کے ساتھ نئے مشن پر لے کر جاتا ہے۔ ایک ریلوے لائن کو دھماکے سے اڑا دیتا ہے۔ معاذ ایسا نہیں چاہتا اس لیے وہ ٹرین کی آمد سے قبل بارودی دھماکا کرتا ہے۔ اسے ہندو سا دھواہنی کشیا میں لے جاتا ہے جہاں اس کی اچھی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ سونیات خانہ کے آدمی معاذ کو لے جاتے ہیں۔ ادھر عالم شاہ اور سرد خفیہ ذریعے سے بارڈر پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ دھماکے سے لے جاتے ہیں اور ان کی تلاش کی جاتی ہے۔ انہیں تشدد کا نشانہ بنا دیا جاتا ہے۔ ادھر بشری باذل کو مارنے کی کوشش میں خود نشانہ بن جاتی ہے۔ معاذ سرد کے ایک انڈین گھروں کے گھر پہنچتا ہے۔ وہیں اسے عالم اور سرد کی گرفتاری کا پتا چلتا ہے۔ ادھر مکمل کو اس کا شوہر یعنی اذیت دیتا ہے۔ سرد دوس سے ملنے کے دوران باذل کی مدد کرنے کا کہتا ہے۔ عالم اور سرد قید سے فرار کا سوچتے ہیں اور دھم لے جاتے ہیں جس کی پاداش میں سرد اور باذل کی مدد کرنے کا کہتا ہے۔ عالم اور سرد قید سے فرار کا دلوانا چاہتا ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ اس کا پیچھا کرتا ہے۔ سونیات خانہ کے آدمی اسے لے جاتے ہیں۔ عالم اور سرد کو لالہ جیسی ملک سے باہر نکال دیتا ہے اور ہر ممکن احتیاط کی ہدایت کرتا ہے۔ سینیات خانہ کے لیے سونیات خانہ کے لیے جو ان کے لیے مصیبت بن جاتا ہے۔ نویس پر تیزاب پھینک دیا جاتا ہے۔ ادھر معاذ، بگل کے لیے پریشانی پیدا کرتا ہے۔ سونیات خانہ کے لیے وقاص، علیحدہ اور اس کے گھر والوں کو مار دیا جاتا ہے۔ معاذ سبش نامی شخص کے خلاف کارروائی کرنا چاہتا ہے۔ معاذ بھی زخمی ہو جاتا ہے اور اپنا نشان وہاں چھوڑ دیتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس معاذ کو دیوانی شخص سے مدد لینے کا کہتی ہے۔ سونیات خانہ کے ساتھ مل کر موہن نامی "را" کے ایجنٹ کو اغوا کر لیتا ہے۔ معاذ اپنے کزن کو پاکستان کال کرتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ اگلے دن والدین کو مار دیا گیا ہے۔ وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کی ضمان لیتا ہے۔ ادھر ڈاکٹر فردوس کو اس کے سسرال والے مل کو بھگانے کا پاداش میں تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ معاذ، عالم اور سرد کی رہائی کے لیے کارروائی کرتا ہے اور انہیں "را" کی قید سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن عالم اور سرد کو دیوانے کے آدمی کی دوسری جگہ پہنچا دیتے ہیں۔ سونیات خانہ کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتی ہے اور اسے اپنے تعاون اور مدد کی تحسین دہانی کر دیتی ہے۔ ادھر باذل ایک جگہ لالہ جیسی کی موجودگی پر کارروائی کرتا ہے تاہم لالہ خود کو گولی مار کر ختم کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس کا انتقال ہو جاتا ہے۔ دیوانہ گینگ ڈاکٹر فردوس کی میت اٹھنے پر وہاں قاتلنگ کر دیتے ہیں۔ کھیل اور جیل مارے جاتے ہیں اور فیصل اور پاٹھ سے زخمی ہو جاتے ہیں۔ پولیس دیوانہ کو گھیر لیتی ہے۔ معاذ دیوانہ اور اس کے آدمیوں کو نکالنے کے عوض عالم کا پتا معلوم کر لیتا ہے۔ سونیات خانہ اور معاذ حیدر آباد نو اب بدر الدین کی حوٹلی پہنچ جاتے ہیں۔ تاہم کالے خان اور رادھا دیوی کو میڈم ایکس کے قہقہے سے چھڑانے کے لیے انہیں واپس آنا پڑتا ہے، کالے خان کو گل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ، بگل کو ہوش بھل کرنے کے لیے گل خان کی مدد دیتا ہے اور اس کا خیال رکھنے کو کہتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیں

”تھینک گاڈ کہ ہم بغیر کسی بدحی کے یہاں پہنچے“ کا سوچ سکیں۔
 انہوں نے دہلی سے حیدرآباد تک کا سفر بد لے ہوئے
 میں کامیاب ہو گئے۔ بس آج رات ہی کام نشتا کا آگے
 سپنس ڈائجسٹ 69 جون 2022ء

”تھیک گا ذکر تم نے مجھے روک دیا ورنہ اب تک ہمارا راز افشا ہو چکا ہوتا۔“ کلی ہوا میں آتے ہی سونیا نے شکر کا اظہار کیا پھر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔

”پہلے دن میں نے کمرے کو چیک کیا تھا تو ایسا کچھ
موجود نہیں تھا پھر اب ایسی کوئی ضرورت کیوں پیش آگئی؟“
”اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہم پر شک کیا جا رہا
ہے۔“ حجاز نے اطمینان سے اس کے سوال کا جواب دیا۔
”لیکن کیوں.....؟ کون ہے جو ہم پر شک کر رہا ہے؟“
”عبید!“ اس نے پورے یقین سے جواب دیا۔
”عبید.....! آ رہے ہو؟“

”ہاں۔ بظاہر لاابالی دکھائی دینے والے اس لڑکے نے مجھے کئی بار چونکایا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اس کے کانوں میں کوئی بات پڑ گئی ہے جس کی بنیاد پر وہ ہم پر شک کر رہا ہے اور اپنے شک کو دور کرنے کے لیے ہی اس نے یہ انتظام کیا ہے۔“ اس نے ان چھوٹے موٹے واقعات کا ذکر کیا جس میں عبید کے دویے نے اسے چونکایا تھا۔

”پھر اب کیا کریں؟“

”کچھ بھی نہیں۔ ہم اپنے پلان پر عمل کریں گے۔
اس لڑکے کی طرف سے جو کنارہ ہونا ہوگا۔“
”سو نیا نے تشویش کا
کر دے۔“

”اب تم بھی غور کیجنا ہے کہ بچہ ہے کی؟“
 ”بات کو نہ سمجھتا ہوں۔“
 ”بھی بھئی معمولی نظر آئے وہاں بائیں دیوار سے جہاں سے نظر
 کر دیتی ہیں۔“ سونیا نے رسوائیت سے جواب کیا۔
 ”میرا جہاں تک خیال ہے، وہ اس معاملے کو اپنے
 کے طور پر لے رہا ہے اور کوئی بات نہیں ہے۔ ہم اسے جیل
 دینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔“

”او کے۔ جب تم اسنے پُر اعتماد ہو تو پھر اس کام کو آج ہی نمٹا لیتے ہیں۔“ سونیا نے گویا اس کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔
”نہیں، آج نہیں۔ کل دن میں مجھے اپنا ایک اہم کام نمٹانا ہے، وہ کروں تو پھر کل رات میں دیکھتے ہیں۔“
”او کے، ایز یوش۔“ اس نے معاذ سے کام کی نوعیت دریافت نہیں کی۔ گویا وہ جانتی تھی کہ وہ اس کو بتانا پسند نہیں کرے گا۔

”میں لالہ کا نمبر نو ضرور تھا لیکن لالہ جیسی بات اپنے میں کہاں۔ سچ یہ ہے کہ اپنے کو لالہ کی مالک محالاً چلانے میں مشکل ہے۔“

”یعنی تم امید کرتے ہو کہ ہم ساتھ مل کر کام کریں تو تمہاری مشکل آسان ہو سکتی ہے؟“ باذل نے اسے جانچتی نظروں سے گھورا۔

”کیوں نہیں۔ پہلے بھی تو اپنے درمیان کو آپریشن چلا رہتا تھا۔“

”ہاں، مگر اس وقت ہمارے درمیان اختلافات نہیں تھے۔ ایک ہی پارٹی کے لیے کام کرتے تھے لیکن تمہارے لالہ نے اسی پارٹی سے بگاڑی۔“

”سارا لہو اس چھوکرے کی کا تھا۔ لالہ جان چھڑکتا تھا اس پر۔ اس نے بولا کہ معاذ کی فیملی کو بچانے کا ہے تو لالہ پڑ گیا اس چکر میں۔“ گلو نے یوں منہ بٹا کر جواب دیا جیسے لالہ کے اس عمل سے اسے خود بھی اختلاف رہا ہو۔

”کمال ہے۔ منہ بولے بیٹے کے لیے اتنی محبت۔ ہماری فیملی میں تو بندہ مکی اولاد کو مکی داد پر لگا دیتا ہے۔“ باذل کو خواہواہ کی سے حسد محسوس ہوا۔ وہ خود عرفان اللہ کا ان کیس اس نے کبھی عرفان اللہ کو اپنے معاملے میں ایسا نہ پایا تھا۔

”خاندانی آدمی لالہ اور لالہ کی آدمی کی زبان اس میں آن ہوئی ہے۔ وہی کہ زبان بولا تھا تو پھر آخر دم تک نبھایا۔“

”اوکے۔ جو گزر رہا تھا۔ اب یہ کیا کرے؟“

”سے کیا چاہتے ہو؟ ساتھ مل کر کام کرتے ہو؟“ گلو نے ہنس کر کہا۔

”اپنی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ اوپر والوں کے ساتھ معاملات ٹھیک ہو جائیں اور جو کچھ ہوا اسے لالہ کے ساتھ ہی ختم سمجھا جائے۔“

”تم کیا سمجھتے ہو یہ اتنا آسان ہوگا؟ کیا بھول گئے کہ تم نے لالہ کی میت پر کھڑے ہو کر اس کے قاتلوں سے بدلہ لینے کا عہد کیا تھا؟“ باذل نے طنز سے بھریں اچکا گئیں۔

”وہ نام الگ تھا۔ ایک طرف میں جذباتی ہو رہا تھا تو دوسری طرف مجھے اپنے لوگوں کو بھی شانت کرنا تھا۔“ گلو نے کھسکا کر صفائی پیش کی۔

”اوکے۔ تم کہتے ہو تو میں تمہاری سفارش کروں گا لیکن خود میرے ذہن میں اس سے الگ اور بڑا منصوبہ ہے۔“ وہ بولتے بولتے دروازہ دارانہ انداز میں گلو کی طرف جھکا۔

”یہی احوال تو بتلی یہاں ایک سیف ہاؤس کا انتظام کر چکا ہے۔ آگے میں اپنے سوسائز استعمال کر کے ان کے پاکستان بچنے کا بندوبست بھی کر دوں گی۔“

”کیوں کر رہی ہو یہ سب کچھ؟“ سونیا کا جواب سن کر خوش ہونے کے بجائے وہ اسے کھوجتی نظروں سے گھورنے لگا۔

”پتا نہیں۔“ اس نے نظریں چرائیں اور یکدم ہی واپسی کے راستے پر چل پڑی۔ معاذ عجیب سے احساسات میں گھرا اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔

☆☆☆

”آئیے آئیے جناب باذل صاحب! امید ہے ملاقات کے لیے میرا چٹا ہوا مقام آپ کو پسند آیا ہوگا۔“ گلو نے دروازے سے اندر داخل ہونے والے باذل کا استقبال کیا۔

”اس وقت آپ کی کونسی سٹیشن میں اپنے آدمیوں سمیت موجود ہیں؟“ باذل کو اس کا پیغام بھجوا کر فوری ملاقات کی خواہش تھی۔ وہ دیکھتا تھا کہ اس کی اس حرکت پر باذل کچھ بڑبڑاتے ہیں۔

”لیکن وہ اپنی کیفیات کو چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اصل اہمیت مہمان کی خوشی کی ہے۔“

”کرتے تو میں اس سے شاندار جگہ کا چٹا کرتا۔ بہر حال جیسے تمہاری مرضی۔“ وہ خود پر کھل قابو رکھتے ہوئے خوش اخلاقی سے مسکرایا اور پھر ایک طرف قدرے پریشان بیٹھی مہماز سے مخاطب ہو کر بولا۔

”کیوں بھی، کچھ خاطر خاطر بھی کی ہمارے گھو استاد کی یا اب تک سوکھا ہی بنھا رکھا ہے؟“

”نعمیہ انتظامات کر رہی ہے۔ بس سرو کرتی ہی ہوگی۔ میں دیکھتی ہوں اسے۔“ وہ جیزی سے اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ گلو استاد جس طرح سکیورٹی والوں کو کسی خاطر میں نہ لا کر تقریباً زبردستی اس کے اپارٹمنٹ میں داخل ہوا تھا، اس سے وہ بہت سراسیمہ ہو گئی تھی اور خدشہ تھا کہ باذل کی آمد کے ساتھ کوئی بڑا جھگڑا کھڑا ہو جائے گا لیکن اب باذل کے پڑ سکون انداز نے سارے خدشات دور کر دیے تھے۔

”تمہاری یہاں آمد سے ظاہر ہے کہ تم نے میری آفر پر غور کیا ہے اور اس کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو۔“ اب وہ گلو کے مقابل بیٹھا اس سے مخاطب تھا۔

”تم نے ٹھیک کہا۔“ گلو نے تائید کی اور پھر ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولا۔

تھے لیکن ان میں سے کوئی مہناز کے اپارٹمنٹ کے اندر داخل نہیں ہوا تھا۔

”اس کی طرف سے بے فکر ہو۔ یہ گونگا بھرا ہے۔“ اس نے باذل کا اشارہ سمجھ کر اسے تسلی دی تو باذل چند لمحوں کے لیے اس گارڈ کو دیکھا رہ گیا۔ کتنی رنگ کے قدرے لمبے بالوں، بھوری آنکھوں، صاف رنگت اور کھنی ڈازمی مونچھوں کے ساتھ وہ بلا شک و شبہ ایک وجیہ نو جوان تھا جو اپنے متعلق ہونے والی گفتگو سے بے نیاز اپنی ڈیوٹی تندی سے انجام دے رہا تھا۔

”میں چاہتا ہوں کہ ہم شہر میں اپنا ہولڈ ٹاؤن کر کے پارٹی کو اس بات پر قائل کر لیں کہ اگر انہیں یہاں کام کرنا ہے تو ہم سے بہتر کوئی چوائس نہیں۔“

”ہر کیسے؟“ گونے دلچسپی۔

”تھوڑا گڑبڑ گھٹا تو کرنا پڑے گا۔ اگلوں کو دو چار بار نقصان اٹھانا پڑے گا تو سمجھ جائیں گے کہ کس کا انتخاب کرنا ہے۔“ باذل سچی خیر سے مسکرایا۔

”واہ یار! واقعی تو نے توجہ کج بڑا شیطانی دماغ پایا ہے۔“ گلو اس کی تجویز سن کر پھڑک اٹھا۔ باذل داد دینے لگا۔

☆☆☆

”راکھ سر پر۔“ گونے ایک سائیکل سوار اس کا پیچھا کر رہا ہے۔

”اگلے چوک سے ٹریفک کے لیے روکنا۔“ ڈرائیور کو ہدایت دی۔

”لیکن صاحب! آپ کو تو.....“ ڈرائیور نے اس کی یاد دہانی کروانے کی کوشش کی کہ اس کی منزل کو یہ راستہ نہیں جاتا ہے۔

”مجھے معلوم ہے، مجھے کہاں جانا ہے۔ تم بس میری بات پر عمل کرو۔ تم کو کرایہ میٹر کے حساب سے پورا ملے گا۔“ بیک دیو مرر میں بدستور پیچھے آتے موٹر سائیکل سوار کو دیکھتے ہوئے اس نے سختی سے جواب دیا تو ڈرائیور کو اس کی ہدایت پر عمل کرنا پڑا۔ جونہی ٹیکسی نے بائیں جانب موڑ کاٹا، یہ دیکھ کر اس کے ہونٹوں سے اطمینان بھری سانس خارج ہوئی کہ موٹر سائیکل سوار ٹیکسی کے پیچھے آنے کے بجائے سیدھا لٹکا چلا گیا ہے۔

”اب آگے جہاں سے راستہ بنتا ہے، دوبارہ اپنی منزل کی طرف چل پڑو۔“ اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو ہدایت دی۔

”نیل ریڈی ہے۔“ اسی وقت مہناز نے آکر اطلاع دی۔

”چلو، پہلے میری جان سن کی میزبانی کا لطف لے لو پھر بات کرتے ہیں۔“ باذل نے کسی بے تکلف دوست کی طرح گلو استاد کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس سے کہا تو وہ بھی جواباً مسکراتا ہوا اس کے ساتھ چل پڑا۔ جس وقت وہ لوازمات سے بھری میز کے گرد بیٹھے، مشروبات کی ٹرالی دھکیلتی شیو اندر داخل ہوئی۔

”خدا یا.....“ گلو استاد اس کا بگڑا ہوا چہرہ دیکھ کر بے ساختہ ہی بول اٹھا۔

”جاؤ یہاں سے اور اب دوبارہ مت آنا۔“ باذل نے تیز نظروں سے اسے گھورا۔ مہناز نے جلدی سے آگے بڑھ کر خود ٹرالی کا ہینڈل تھام لیا۔ شیو واپس چلی تو اس کے چہرے میں بڑی دلچسپی کی نظروں میں آگئی۔

”یہ ذرا عجیب سا موقع ہے۔ موقع ملے ہی میرے پاس آنا ہے۔“ گلو اس کی تلاش میں کھنٹوں کو رار ہٹاتا چلا۔ اس لیے اس نے اٹھا اس کے پاؤں میں زنجیر ڈال کر اس کی نظر سے لٹکا دیا وہ دیکھ کر مہناز نے وضاحت دی۔

”یہ ہماری جانم کے ہمدردی کے بخانا ہیں۔“ گلو نے کہا تو کہتا ہوں کہ جان چھڑاؤ اس جھنجٹ سے لیکن یہ مان لیں نہیں۔“ باذل نے بھی گفتگو میں حصہ ڈالا۔

”بے ضروری ہے بے جاری۔ گھر کے کئی کام کر دیتی ہے۔ بدلے میں اگر میں اس کا تھوڑا سا خیال رکھ لیتی ہوں تو اس میں کیا حرج ہے۔“ مہناز نے شیو کی طرف داری کی اور پھر بات بدلنے کے لیے بولی۔

”آپ یہ فکر فٹ توڑائی کریں گلو استاد! بہت ڈانٹے دار ہے۔“ گونے خندہ پیشانی سے اس کی بڑھائی ہوئی ڈش میں سے دو کڑے اپنی پلیٹ میں منتقل کیے۔ کچھ دیر خاطر مدارات کا یہ سلسلہ چلتا رہا پھر وہ واپس صوفوں پر آ بیٹھے۔

”ہاں، تو تم کیا کہہ رہے تھے؟ کون سا منصوبہ ہے تمہارے ذہن میں؟“ گونے گفتگو کا سلسلہ وہیں سے جوڑا جہاں وقفہ آیا تھا۔

”بتاتا ہوں لیکن.....!“ باذل نے گلو کے عقب میں جیسے کی طرح ایسا وہ باڈی گارڈ کی طرف دیکھا۔ وہ سائے کی طرح گلو کے ساتھ موجود تھا اور صرف اسی وقت متحرک ہوتا تھا جب گلو حرکت کرتا تھا۔ اس باڈی گارڈ کے علاوہ بھی گلو کے ساتھ اس کے کئی آدمی آئے

”کیا ہے صاحب! خانا پہلی میں راستہ لبا کر دایے ہیں۔ اپنا کوئی نقصان نہی پر آپ اچ کو دیری ہوں گی نا۔“
ڈرائیور بڑبڑایا۔

”کوئی بات نہیں۔ دیر ہوتی ہے تو ہو جائے لیکن اطمینان ضروری تھا کہ میں کسی بلا کو تو اپنے پیچھے لگا کر نہیں لے جا رہا ہوں۔“

”کیا بولتے ہیں صاحب! اپنے کو کچھ سمجھ نہیں آئی۔“
”سمجھ کر کرنا بھی کیا ہے دوست! تمہارا کام ٹیکسی چلانا ہے، وہ چلاؤ اور اپنے بیوی بچوں کے لیے روزی روٹی کماؤ۔“

”ابھی بیوی بچے نہی ہیں صاحب! اماں بولے ہیں پہلے دو تولے سونے اور پکے کرے کے لیے روپے جوڑ پھر رشتہ ڈالتے تیری خالہ کے گھر جاؤں گی۔“ اس نے نہایت

دکی سے جواب دیا تو معاذ مسکرا دیا۔ وہ اس وقت کھل اور مان ملاقا کے لیے جا رہا تھا اور حد سے زیادہ

ڈرائیور نے اس کا شکار ہو رہا تھا۔
”خالہ! میں نے اس کا شکار کیا ہے؟“
”بچپن سے صاحب! یہاں کبیر بنی۔ ان

بتا دیا تا تو انہوں دنیا کی کسی بھی شے سے یہ لاشہ جوڑ دے گے مگر خالہ کے گھر کا رخ نکو کریں گے۔“
”وہ کیوں بھی؟“

”بولیں گے، جس پر بیٹا پہلے اچ لٹو ہے، انہیں گھر آ کر تو سر پر ناچیں گی۔“ اس نے اس بے ساختگی سے ماں کے انکار کی وجہ بتائی کہ معاذ اس پڑا۔ ایک شرقتی ماں کی اس طرح کی سوچ اس کے لیے بالکل بھی انوکھی نہیں تھی۔

”پھر تو تمہیں اپنی خالہ کی بیٹی سے اظہار محبت کا موقع بھی نہیں ملتا ہوگا۔“
”بیاد کرنے والے کوئی نہ کوئی راہ نکال اچ لیتے ہیں

صاحب! پر سچ بتاؤں، اماں کے سامنے تو ہم زیادہ تر تیر بنیر کی طرح چوتھیں اچ لڑاتے رہتے ہیں۔ کبھی بھی تو ایسی گھمسان کی لڑائی ہوتی ہے کہ لگا ہے لڑتے لڑتے سچ سچ

ایک کی چوٹی اور ایک کی دم ٹم ہو جائیں گی۔“ محبوب کے ذکر سے بڑھ کر بھی بھلا کوئی ذکر ہوتا ہے۔ ڈرائیور بھی پورا دل لگا کر اس موضوع پر گفتگو کر رہا تھا۔

”وہ یہ نہیں سوچتیں کہ دونوں شادی سے پہلے اتنا لڑتے ہیں تو شادی کر کے ایک دوسرے کے ساتھ پیار محبت سے کیسے رہیں گے؟“
”یہی اچ تو سوچتے ہیں، تبھی تو اس سے ہمارا رشتہ

کرنے کی ٹھانے بیٹھے ہیں۔ نہ جو رو سے بنے گی نہ بیٹا جو رو کا غلام بن کر ماں کا گھٹنا چھوڑیں گا۔“

اس نے رشتہ جوڑنے کی جو منطق بتائی، اسے من کر معاذ کے ہونٹوں سے قہقہہ نکل گیا لیکن ساتھ ہی اس کی توجہ دوبارہ بیک ویو مرر کی طرف مبذول ہو گئی تھی۔ وہاں اسے ایک سفید گاڑی کافی دیر سے اپنے پیچھے آتی دکھائی دے رہی تھی۔

”اپنے ہاں ماں بہنوں کی نفسیات کو سمجھ کر عشق کرنا پڑتا ہے صاحب! اگر سیدھے سیدھے بول دیں کہ فلاں لڑکی پسند ہے تو سمجھ لو دنیا ادھر سے ادھر ہو جائیں گی لیکن اس

لڑکی سے شادی نہی ہوں گی۔“ ڈرائیور اس کی بدلتی کیفیات سے بے خبر اپنی ہڈیاں جا رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ ایک بار پھر ڈرائیور کو راستہ بدلنے کی ہدایت دے لیکن ایسا کرنے سے پہلے ہی سفید گاڑی ایک بھٹی مڑک پر مڑ گئی۔

”میں بھی حد سے زیادہ وہی ہو رہا ہوں۔“ اس نے خود کو ڈپٹا۔ مطلوبہ ہوٹل پہنچنے تک پھر کوئی مشکوک گاڑی دکھائی نہیں دی۔

”یہ لو دوست! میری دعا ہے کہ اماں کی ڈیمانڈ کے مطابق ہم جمع ہونے تک ان پر چہارہ ارازنہ کھلے۔“ ڈرائیور کو اپنے لیے اس کے زائد رقم تھماتے ہوئے اس نے

”خوش رہیں صاحب! آگے کسی آگے کر دل کی مراد ملے۔“ وہ خوش ہو کر دیا اور ماں کے روبرو ہو گیا۔ معاذ اس دعا پر عجیب سی کیفیات میں گھرا ہوا۔ وہ کسی سے کیا کہتا کہ دل اس کی محبت کا اسیر ہوا تھا جسے اپنے کا دل اسے بھی حاصل ہی نہیں رہا تھا۔ پہلی بار جب وہ بی بی کی شاہ کی بیوی تھی اور اب فیصل جیسے ناقدرے انسان کی

منکوحہ..... پہلے سے یہ رشتہ کاغذی تھا لیکن قائم تھا اور اس کی قید میں ہوتے ہوئے بھل کسی کی نہیں بن سکتی پھر اس کے اپنے حالات بھی ایسے کہاں تھے کہ وہ کوئی رشتہ جوڑنے اور ایک گھر بنانے کے خواب دیکھتا چنانچہ سر کو جھٹکتے ہوئے قدم آگے بڑھا دیے۔

”شکر اسے صیب آپ آگیا۔ بی بی بڑا پریشان تھا۔“ گل خان اسے سامنے پا کر کھل اٹھا۔

”کچھ کہہ رہی تھیں بی بی؟“
”نہیں صیب! وہ کہاں کچھ بولتا ہے، پر ام نے اس کا صورت دیکھ کر اندازہ لگایا تھا۔“

”آؤ چل کر ملتے ہیں تمہاری بی بی سے۔“ وہ بولتا ہوا

”آپ.....؟ السلام علیکم! آجئے، اندر آ جائیں۔“
 دستک کے جواب میں ساجل نے دروازہ کھولا اور اسے دیکھ کر
 اندر آنے کا راستہ دیا۔ وہ آج بھی حسبِ معمول اپنے
 چہرے کو چادر میں چھپائے ہوئے تھی اور وہ اس کی سحر طراز
 آنکھوں کے سوا کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔

”آپ ٹھیک ہیں؟ کوئی پریشانی تو نہیں؟“
 ”جی نہیں۔“ اس کے دو برویشے اس نے جھکی نظروں سے
 مختصر جواب دیا لیکن معاذ اس کی آنکھوں کی سرخی دیکھ چکا تھا۔
 ”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ وہ بے چین سا ہوا۔

”میں ٹھیک ہوں۔ بس ادا سامیں اور سرہ کی طرف
 یثانی ہے۔“ حقیقتاً اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور
 اسے اس کی طبیعت کو قابو میں کرنے کے لیے مسلسل
 دواؤں کی ضرورت تھی لیکن وہ یہ سب کچھ
 سنا کر ہنس رہی تھی۔

کر سکیں گی۔ آج دعا کریں ہمیں اس دعا کی ضرورت ہے۔
 ”اللہ سامیں آپ کی مدد فرمائے۔“ وہ دعا کہ خوش ہو گئی۔

”میں اس وقت اسی لیے آپ لوگوں سے ملاقات کے لیے آیا ہوں۔ اگر ہم کامیاب رہے تو میں گل خان سے رابطہ کر کے اسے اطلاع دوں گا اور آپ لوگوں کو پوری احتیاط سے میرے دیے گئے پتے پر پہنچنا ہوگا۔“ اس نے سونیا سے حاصل کردہ اس سیف ہاؤس کا پتہ گل خان کے حوالے کیا جس کا انتظام جنگی نے کر رکھا تھا۔

”اللہ سامیں آپ کو کامیاب کرے۔“ وہ اس وقت سراپا رہا۔
 ”آمین۔“ اس نے آہستہ سے کہا اور پھر ذرا سے توقف کے بعد بولا۔

”خدا نا خواستہ اگر ہم ناکام رہتے ہیں اور میں آپ سے رابطہ نہیں کر پاتا تو آپ کو گل خان پر بھروسہ کرنا ہوگا۔ اس سے مجھے امید ہے کہ جہاں تک ممکن ہو، یہ آپ کی حمایت کرے گا۔“

”بالکل کرے گا صیب! اہم اپنی جان دے دے گا۔“
لیکن آپ کا بھروسہ نہیں ٹوٹنے دے گا۔“ گل خان نے
فورا اپنے پر ہاتھ رکھ کر جھین وہانی کروائی۔
”کسی بھی قسم کے پیچیدہ حالات میں، میرا آپ کے

”میں نے یہی مشورہ دیا کہ پاکستانی سفارت خانے پہنچ کر مدد طلب کریں اور اس سے بھی پہلے اپنے والد صاحب سے رابطہ کر کے انہیں صورتحال سے آگاہ کریں۔ وہ اپنے تعلقات استعمال کریں گے تو یہاں سفارت خانے والے آپ سے تعاون کریں گے اور کچھ مشکلات کے ساتھ ہی سہی، آپ کی واپسی کی راہ نکل آئے گی۔“

”میں ادا سائیکس کے ساتھ یہاں آئی تھی اور ان کے بغیر واپس جانے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔“ اس کی ساری ہدایات کے جواب میں سکیل نے اپنا اگلے فیصلہ سنایا۔

”ان شاء اللہ ایسا ہی ہوگا لیکن دوسرے امکانات کو بھی سامنے تو رکھنا پڑتا ہے۔“ معاذ نے رحنیت سے اسے سمجھایا۔

”آپ صرف کامیابی کے امکان کو سامنے رکھیں اور جان لیں کہ اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔“ وہ ایسے ضد بھی کر سکتی ہے، معاذ کو پہلی بار پتا چلا تھا۔

”او کے۔ جیسا آپ چاہیں۔“ وہ ایک گہری سانس لیتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

”آپ کو اگر امارا ضرورت اے تو پولو صیب اام کے ساتھ مل کر آپ کے دشمنوں سے لڑے گا اور بی بی کے کھانہ کو کھال کر لانے میں مدد دے گا۔“ وہ کھل کے باہر چل گیا۔

یہاں رہو اور بی بی نور الدین کی خدمت میں نہ جانا۔ تم ان حالات جو بھی ہوں، تم ان کا سامنا کرنا پڑے گا۔
 ”نہ ہنکر نہ کرو صیب! ام پٹھان اسے خود جیسے پٹھان
 ایک بار زبان دے دے تو پیچھے نہیں ہٹتا۔“ گل گل کی
 یقین دہانی نے اسے کافی ڈھارس دی۔ حقیقت یہ تھی کہ
 موجودہ حالات میں وہ کل کے لیے اس سے بہتر انتظام
 کر بھی نہیں سکتا تھا۔

☆☆☆

”جائے صاحب!“
 ”خجیک بھگوان داس۔“ اس نے ٹرے میں
 موجود چائے کے کپس میں سے ایک پہلے سونیا کی طرف
 بڑھایا پھر خود دوسرا کپ اٹھاتے ہوئے بھگوان داس کی
 آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرایا۔

ایسی ہی چائے تیار کر کے رات ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے کنٹرول روم میں اور اوپر برقی پر پھرا دینے والوں کو دے۔

تھا تو میرے ہاتھ میں موجود تھیلا دیکھ کر بولا، لگتا ہے سر شاہجگ کر کے آ رہے ہیں۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور بس مسکرا کر نال گیا۔ وہ کل سے ملاقات کے بعد واپسی میں کتوں کے لیے گوشت کے پارچے خرید کر لایا تھا اور اس کا حویلی میں داخل ہوتے ہی عید سے سامنا ہو گیا تھا۔

”مجھے لگتا ہے تم خواہواہ اسٹے کا ٹیکس ہو رہے ہو۔
عبید نے تم سے بالکل جزل کوٹھن کیا تھا۔“

”مجھے اس کے سوال نہیں، اس کا انداز چونکنا ہے۔“

ایک بھید سا ہوتا ہے اس کی سکر اہٹ میں اور تم ہمارے کمرے میں مائیکروفون کی موجودگی کو کیوں بھول رہی ہو؟ اسے بلا وجہ تو وہاں نہیں چھپا یا گیا ہے نا؟

رات کے کھانے کا بھی وقت ہو رہا ہے۔“ سونیا کھڑی ہوئی۔

معمول کے مطابق رات کے کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آئے تو جان بوجھ کر ایسی گفتگو کرتے رہے جس میں آج کے معمولات کے ساتھ عبید اور منیرہ کی کارکردگی کا ذکر تھا اس گفتگو کے دوران ان کی کارروائیاں بھی جاری رہیں۔ ششما کے بارہ چوں پر مخصوص دوا کا چمڑکا ڈال دیا۔ اس میں غلطی کے باعث وہ غلطی انجام دیے گئے۔ اس طرح ان کے پاس سرخوردگی پیدا ہوئی اور ایسا اس لیے تھا کہ حویلی میں غلطی کے باعث وہ اس کا سامنا کرنا پڑا۔ اس لیے اس میں وہ اسے فوری طور پر ختم کرنے کے لیے کوشش کر رہے تھے۔

روں سے بھی حاصل کیا جاسکتا تھا۔ اس کے بعد اسے ایک مہرہ عالم اور سرحد تک رسائی کا تھا اور آج وہ اس کام کو انجام دینے جا رہے تھے۔

ٹھیک ٹھیکارہ چالیس پر سونے گوشت کے پارچے
کھڑکی سے باہر پھینکنا شروع کر دیے جبکہ معاذ نے اپنی
توجہ برقی سے اس طرف آنے والے راستے پر مبذول
کر رکھی تھی۔ بھگوان داس کی ہدایت پر پھر سے داروں
کو چائے پہنچانے جا چکا تھا۔ جونہی وہ واپس آتا ہوا دکھائی
دیا، معاذ ٹپک کر مرکزی دروازے پر پہنچا اور اسے باہر ہی
روک لیا۔

”سب کو چائے پلا دی؟“

”محمی ہاں۔“

”گھر والوں کو دودھ پہنچا دیا تھا سلیم نے؟“

”جی ہاں۔“ بھگوان داس ایک معمول کی حیثیت

دیتا اور اس چائے میں ان میں سے ایک پڑیا کا سنوف ملادیتا۔“ اس نے بند مٹھی بھگوان داس کی تھیلی پر خالی کی۔
شخاف تھیلی کی پیکنگ میں بے رنگ شخاف سنوف موجود تھا۔
”ٹھیک ہے صاحب۔“ بھگوان داس نے بغیر کسی مزاحمت کے اس کی بات مان لی اور سنوف سے بھری چھوٹی چھوٹی پڑیاں جیب میں رکھ لیں۔

”رات سونے سے پہلے گھر والوں کو دودھ کون پینھاتا ہے؟“

“السلام صاحب۔“

”اچھی بات ہے۔ تم یہ کرنا کہ اس سے نظر ہچا کر دودھ کی پتلی ہی میں دوسری پڑیا کا سنوف ملا دیتا۔ اس سے کسی کو کوئی نقصان نہیں ہوگا، بس سب گہری نیند سوجائیں گے۔“ یہاں قیام کے مختصر عرصے میں وہ لوگ پانی کے حوض میں مخصوص اوقات کے بعد ملازمین کو بلانے لگے۔ ان کو بلانے کے لیے جلتے ہیں اور کسی کے کین پر سکون کے طور پر ملازمین کو بلانے والے کو کوئی باقی نہیں رہتا۔ چہرے پر سکون کا انتظام پہلے ہی ہو گیا تھا۔

”اچھا صاحب!“ جگوان داس ایک معمولی آدمی تھا۔
 اس کے کسی علم سے انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

”اب جاؤ۔ تھوڑی دیر میں آکر چائے کے برتن
پس لے جانا۔“ معافی نے اسے چلنا کہا۔

”یہ ایک کام تو سمجھو نہٹ گیا۔ ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے ہی میں غمرانی کے کتوں کو گوشت ڈال دوں گی۔“

لکوان داس کے جانے کے بعد سونیا نے اپنا پلان بتایا۔ وہ

نوں اس وقت پاکیں باغ میں موجود تھیں۔ کمرے میں

جود یا ٹیکروفون کے ساتھ انہوں نے کوئی پیچھے جھاڑ

س کی تھی اور اہم گفتگو یا تو لکھ کر کرتے تھے یا کمرے سے

ر۔ اس وقت چونکہ بلکوان داس کو ہدایات دینا تھیں اس

ہ چائے کے بہانے اسے باغ میں بلوایا گیا تھا۔

”باہر نکل کر رہا ہوں جسے کے مرکزی دروازے کو باہر
 سے بند کرنا ہے تاکہ اگر کوئی بے ہوش ہونے سے رو
 جا جائے تو باہر نہ نکل سکے۔“

”کبھی شاید عید کی طرف سے خطرہ ہے؟“ سونیا
اندازہ لگایا۔

”ہوشیار لڑکا ہے۔ کسی طرح گڑ بڑ بھانپ گیا تو دودھ سے رک بھی سکتا ہے۔ پتا ہے آج جب میں واپس آیا

بھی حسب توقع تھا۔ پہرے وار ادھر ادھر بے ہوشی کی حالت میں پڑے ہوئے تھے۔

”ان کا سارا اسلحہ جمع کر کے کسی جگہ چھپا دو۔“ معاذ نے اپنے اور سونیا کے لیے ہتھیار منتخب کیے اور بیچ جانے والے ہتھیاروں کے لیے قمر الدین کو حکم دیا۔ اس نے تابعداری سے یہ کام انجام دے دیا۔ اب وہ خانے کی طرف جانے والے راستے پر گامزن تھے۔ ایک اندر سے بند دروازے پر رک کر قمر الدین نے دستک دی۔

”کون ہے؟“

”میں ہوں قمر الدین! سرکار کے مہمانوں کو ساتھ لایا ہوں۔“ اندر سے سخت لہجے میں کیے گئے سوال کا قمر الدین نے اطمینان سے جواب دیا۔ ردعمل میں اندر سے کٹھڑی کھولے جانے کی آواز سنائی دینے لگی۔

”ہمیں سیدھے ان دو افراد تک لے چلنا جن کی میں نے جہیں تصویریں دکھائی تھیں۔“ دروازہ کھلنے کے دوران قمر الدین کو سرگوشی میں ہدایت دی تو اس نے سرکوا اثبات میں جنبش دے کر بات سمجھ جانے کا اشارہ دیا۔

”کون ہے بھائی قمر الدین.....! الی رات کو کس کو لے کر آئے ہیں؟“ دروازہ کھولنے والے نے قمر الدین

کو جواب صاحب کے حکم سے لایا ہوں جی۔ ان کو پناہ گزینوں والے کمرے میں لے جانے کا۔“ قمر الدین نے اسے جواب دیا اور بے ہوشی سے چپے تھے۔ سونیا اور معاذ اس کے پیچھے آئے۔ انہوں نے اپنے لیے ہتھیاروں کا انتخاب کیا تھا اور اس وقت ہتھیار ان کے لمبوسات میں چھپے ہوئے تھے۔

”یہ..... یہ بیک ہے ان دونوں کا۔ دونوں اندر سو رہے ہوں گے۔“ وسیع و عریض خانے کے دائیں جانب آخری دروازے پر رکھے ہوئے قمر الدین نے انہیں اطلاع دی پھر دروازے کا ہینڈل گھما کر اسے آہستہ سے کھولا۔ سامنے ہی لوہے کے دو پلنگوں پر انہیں ایسے افراد لیٹے ہوئے نظر آئے جن کے پیروں میں بیڑیاں پڑی تھیں۔ شاید وہ دونوں ابھی تک سوئے نہیں تھے جب ہی دروازہ کھلنے کی ہلکی سی آواز پر بھی فوراً اٹھ بیٹھے۔

”عالم.....!“ معاذ نے بڑھی ہوئی شیو اور فضاہت زدہ چہرے کے باوجود عالم کو فوراً شناخت کر لیا اور لپک کر اس کے قریب پہنچا۔

”سب لوگ دودھ پی کر سو چکے ہیں؟“

”جی ہاں۔“ اس کا وہی دو لفظی جواب تھا۔

”جاؤ، جا کر قمر الدین کو اس کے کوارٹر سے بلا لاؤ۔“

کہنا نواب صاحب نے یاد کیا ہے۔ ”قدرے مطمئن ہو کر اس نے بھگوان داس کو اگلا حکم دیا تو وہ وہاں سے چلا گیا۔ معاذ اپنی جگہ کھڑا سن گن لیتا رہا۔ حویلی میں معمولات کی سختی سے پابندی کی جاتی تھی اور ہر کام کے لیے وقت مخصوص تھا۔ عام حالات میں بھی حویلی کے مکین اس وقت تک سو چکے ہوتے تھے اور آج تو نشہ آور دودھ کی وجہ سے کسی کے جاگتے رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اسے کچھ خیال آیا تو تیز تیز قدموں سے کنٹرول روم کی طرف بڑھ گیا۔ حسب توقع وہاں ڈیوٹی پر موجود شخص کرسی پر بیٹھے بیٹھے ہی بند سوچا تھا اور اسکرین پر حویلی کے مختلف حصوں کے روبرو تھے۔ اس نے سب سے پہلے کنٹرول روم کی طرف توجہ دی۔ وہاں ویڈیو بھی تلف کر دی۔ ”سب سو چکے ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”ابھی تو بھگوان داس، قمر الدین کو لے کر آئے ہیں۔“ اس نے ہلکت کا دہلا پتا قمر الدین اس بے وقت کے دروازے پر ہتھیار پریشان دکھائی دے رہا تھا اور اس کی آنکھوں کی سرخی سے ظاہر تھا کہ غیند سے جگا کر لایا گیا ہے۔

”تم جاؤ بھگوان داس! جا کر آرام سے سو جاؤ۔“ قمر الدین کو اس کا کام میں خود بیتادوں کا۔“ اس نے بھگوان داس کو وہاں سے چلتا کیا۔ اسی وقت سونیا وہاں آگئی۔

”سب ٹھیک ہے؟“

”ہاں۔ تم بتاؤ، تمہارا کام مکمل ہو گیا؟“

”سو فیصد۔ میں نے دور بین کی مدد سے بھی چیک کیا ہے۔ مجھے گوشت کھانے کے لیے جمع ہو جانے والے کتوں کے علاوہ کہیں کوئی اور کتا دکھائی نہیں دیا۔“ وہ خاصی مطمئن تھی۔

”گنڈ! اب ہمیں قمر الدین خانے تک لے کر جائے گا۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا قمر الدین.....؟“ اس نے قمر الدین کی آنکھوں میں جھانک کر سوال کیا اور یہ طے تھا کہ جب وہ اپنے کسی معمول سے اس انداز میں گھٹکھٹکے تو انکار کی کوئی تنجائش ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ قمر الدین بھی سر جھکا کر حکم کی پیروی کے لیے چل پڑا۔ سونیا نے حسب پروگرام دروازہ بند کر کے باہر سے کٹھڑی لگا دی۔

حویلی میں اس وقت ہو کا عالم طاری تھا۔ برقی کی طرف جاتے ہوئے انہیں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بے ہوش یا نیم بے ہوش پڑے کتے دکھائی دیے۔ برقی کا ماحول

نوٹ کر چکے تھے۔ نمبر کی مدد سے ڈرائیور تک پہنچے۔ اس کے بعد تو کام بالکل آسان تھا۔ ہوٹل کا پتا معلوم ہو گیا تو یہ بھی معلوم کر لیا گیا کہ آپ وہاں کس روم میں اور کن لوگوں سے ملاقات کرنے گئے تھے۔“ اس کے لیے یقیناً یہ سب بہت حیرانگ تھا جب ہی وہ ایک ایک بات تفصیل سے بتا رہا تھا۔ معاذ کو افسوس ہوا کہ وہ ایک چھوٹے سے لڑکے کے ہاتھوں ٹریپ ہو گیا۔ حقیقتاً وہ عبید سے اس بات کی توقع نہیں کر رہا تھا اور حیدر آباد میں کسی دشمن کی موجودگی کا بھی شک نہیں تھا اس لیے اتنی احتیاط نہیں برتی تھی جتنی برتنی چاہیے تھی۔

”وہ لوگ اب کہاں ہیں؟“ معاذ نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

”فکر نہ کریں۔ حفاظت سے ہیں۔ انہیں کوئی تکلیف

”آئی گئی۔“

”میں نے اسے کوئی تمہاری زندگی کی ضمانت

”میں نے اسے کوئی تمہاری زندگی کی ضمانت

”یکو اس بندہ کو اس کے ساتھ لے کر آئے۔“

”ایک منٹ معاذ! مجھے بات کرنے کی ضرورت ہے۔“

اب تک کمرے میں موجود ہر شخص خاموش سا سا رہا ہوا

تھا۔ سونیا نے معاذ کا ضبط ٹوٹا دیکھا تو خود آگے بڑھی۔

”ٹھیک ہے، جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب یہ بتاؤ کہ

ہمارے درمیان ڈیل کیسے ہو سکتی ہے؟“

”ڈیل کی ضرورت ہی کیا ہے۔ میں آپ لوگوں کو بے

پس کر چکا ہوں۔ صبح جب بابا اور دوسرے لوگ ہوش میں

آئیں گے تو یہ معاملہ ان کے سامنے رکھا جائے گا۔ جو کچھ آج

رات آپ لوگوں نے یہاں کیا ہے، وہ بابا کے نزدیک ہرگز

بھی قابلِ معافی نہیں ہوگا۔“ وہ حد سے زیادہ خود اعتمادی کا

مظاہرہ کر رہا تھا۔ ویسے ایک لحاظ سے وہ قابلِ تحسین بھی تھا۔

اس نے نہ صرف ان دونوں کا مشکوک ہونا بھانپ لیا تھا بلکہ

ان کی پوری ٹوہ بھی لگا لی تھی اسی لیے آج اس قابلِ تھا کہ باقی

لوگوں کی طرح نشہ آور دودھ لی کر بے ہوش پڑے ہونے

کے بجائے یہاں ان کے سامنے کھڑا تھا۔

”جہاں ڈیل کی گنجائش نہ ہو وہاں پھر ایک ہی گنجائش

رہ جاتی ہے۔“ سونیا اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

عجیب سے لہجے میں بولی۔

”وہ کیا؟“ وہ اس کی آنکھوں کی سرد مہری سے پہلی

بار گڑبڑایا۔

”اس کی۔“ وہ بولی اور اپنی جیزی سے اچھل کر اس

تک پہنچی کہ اسے سننے کا موقع بھی نہیں ملا۔

”یہ، یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟ مجھے کچھ ہوا تو کوئی بھی

نہیں بچ سکے گا۔ نہ آپ، نہ آپ کے یہ دوست اور نہ ہی

آپ کے وہ ہوٹل والے مہمان۔“ سونیا کے بظاہر نازک

دیکھنے والے بازوؤں کی مضبوط گرفت میں پھڑپھڑاتا وہ

اسے دھمکیاں دے رہا تھا۔

”کوئی بات نہیں۔ ہم تو ہیں ہی سر پر کفن باندھ کر

نکلنے والے لوگ۔ ہم جانتے ہیں کہ موت بھی بھی، کہیں

بھی ہمیں اپنے بچوں میں دیوچ سکتی ہے اس لیے تم

ہمارے نہیں، صرف اپنے بارے میں سوچو۔ کتنی عمر ہوگی

تمہاری؟ زیادہ سے زیادہ پندرہ سال..... سوچو اگر تم اتنی

سی عمر میں مر جاؤ گے تو تمہارے ماں باپ اور بہن کو کتنا

صدمہ ہوگا۔ کتنے خواب ہیں تمہارے لیے ان کی

آنکھوں میں۔ تم نہ رہو گے تو وہ خواب کون پورے

کرے گا؟“ وہ اتنی سفاکی سے اسے حقائق کا احساس

دلا رہی تھی کہ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ کتنا بھی ہوشیار بننا،

تھا تو ایک نو عمر سا لڑکا ہی۔

”آپ..... آپ لوگ یہ نہیں کر سکتے۔“ تھوک نکل

کر رہی تھی۔ وہ ہنسیا ہنسیا۔

”میں نے اسے کوئی تمہاری زندگی کی ضمانت

”میں نے اسے کوئی تمہاری زندگی کی ضمانت

”میں نے اسے کوئی تمہاری زندگی کی ضمانت

”میں نے اسے کوئی تمہاری زندگی کی ضمانت

”میں نے اسے کوئی تمہاری زندگی کی ضمانت

”میں نے اسے کوئی تمہاری زندگی کی ضمانت

”میں نے اسے کوئی تمہاری زندگی کی ضمانت

”میں نے اسے کوئی تمہاری زندگی کی ضمانت

”میں نے اسے کوئی تمہاری زندگی کی ضمانت

”میں نے اسے کوئی تمہاری زندگی کی ضمانت

”میں نے اسے کوئی تمہاری زندگی کی ضمانت

”میں نے اسے کوئی تمہاری زندگی کی ضمانت

میں اپنے امیر زادوں کی برداشت کی ایک حد ہوتی ہے اور عبید کے لیے وہ حد آگئی تھی۔ فائر ہوتے ہی اس کے اعصاب نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور وہ سونیا کی بانہوں میں جمبول گیا۔

”سنبھالو اسے اور بستر پر لٹاؤ۔“ معاذ نے مٹی کے مادھو کی طرح ایک طرف کھڑے ہو کر آنکھیں پٹیٹاتے اور سارا تماشا دیکھتے قمر الدین کو حکم دیا تو وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ عالم شاہ نے اپنے بیڈ کی پائنتی کھسک کر اس کو لٹانے کے لیے جگہ بنائی۔

”ان کی بیڑیوں کی چابیاں لے کر آؤ اور سمجھا دینا سب کو کہ اگر کسی نے ذرا بھی گڑبڑ کی کوشش کی تو نواب زادہ اپنی جان سے جائے گا۔“ معاذ نے قمر الدین کو دوسرا حکم دیا اس پر فوری عملدرآمد ہوا۔ بیڑیاں کھل گئیں تو وہ لوگ قمر الدین کی طرف ہی پر جا کر ہتھیار بھی لے آئے۔ یہ خانے کے چاروں طرف لوگوں نے اس میں اکٹھا کر دیا گیا۔

”بار پھر اس کے لیے ہے کہ ہماری یہاں کسی سے کوئی بات نہ ہو۔“ معاذ نے کہا کہ یہاں سے خاموشی سے نکل جائیں۔ قمر الدین کی طرف ہاری راہ روڑے اٹکانے کی کوشش کی تو وہ خود کچھ نہیں کر سکا۔ ایسے شخص کے ساتھ ہم خود کچھ نہیں کر سکتے۔ اسے ان قیدیوں کے درمیان بند کر دیں گے جنہیں یہاں روز سخت سزا دی جاتی ہیں۔ ایسے قیدی موقع ملنے پر کس طرح اپنا بدلہ لیں گے، یہ بتانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ دیکھ رہا تھا کہ اس کے الفاظ پہرے داروں کے چہروں پر زردی کھنڈر ہے ہیں۔ یہی اس کا مقصد تھا۔ لوگوں پر خوف طاری کر کے ان پر حکمرانی کرنا سب سے آسان حکمت عملی ہے اور اس وقت وہ اسی پر عمل کر رہا تھا۔

”میرے خیال میں ہمیں لمبے چوڑے بکھیرے میں پڑنے کے بجائے اب یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ صبح ہوگئی تو ہمارے فرار کی راہیں بند ہو جائیں گی۔“ وہ پہرے داروں کی طرف سے مطمئن ہوا تو سرمد نے آکر اس کے کان میں سرگوشی کی۔

”ہم ایسے نہیں جا سکتے سرمد! تم شاید ان لوگوں کو بھول رہے ہو جنہیں عبید نے کہیں چھپا رکھا ہے۔“

”کون ہیں وہ لوگ؟“ سرمد نے تجسس سے پوچھا۔

”وقت آنے پر بتا دوں گا۔“ وہ عالم شاہ کو ذہنی دباؤ سے بچانا چاہتا تھا اس لیے سرمد سے بھی حقیقت چھپائی۔ اسی وقت سونیا نے اسے اشارے سے بلایا۔ وہ اسی کمرے میں تھی

جہاں نواب زادہ عبید بے ہوشی کی حالت میں پڑا ہوا تھا۔

”ہمارے پاس وقت کم ہے معاذ! تم عبید سے نکل کا پتا معلوم کرو تا کہ ہم جلد از جلد یہاں سے نکل سکیں۔“

”وہ تو تم خود بھی اسے دو چار تھپڑ لگا کر معلوم کر سکتی ہو۔“

”جب تم اس سے بہتر طریقے سے معلوم کر سکتے ہو تو پھر اس کی کیا ضرورت ہے؟ ویسے بھی نازوں میں بلا کیجیے۔“

”سختی اس کے لیے مناسب نہیں۔“ سونیا نے اس سے اختلاف کیا۔ حقیقتاً اس کا دل بھی نہیں چاہ رہا تھا کہ عبید کے ساتھ سختی کی جائے۔ دو چار دن کے ساتھ میں اسے عبید اور

منیزہ اچھے لگنے لگے تھے اور دل میں ان کے لیے نرم گوشہ تھا

اس لیے وہ عبید کے ساتھ وہ رویت اختیار کرنے سے گریزاں

تھی جس کے آگے اس کے بڑے بڑے مخالفین بھی اپنے

کھنکھنے فک دیتے تھے۔

”بندر کے ہاتھ ادرک لگ جانا اسی کو کہتے ہیں۔“

تمہیں میری ایک صلاحیت کا پتا کیا لگ گیا، میرے لیے تو

مصیبت ہوگئی۔“ وہ بڑبڑاتا ہوا عبید کی طرف بڑھا۔ سونیا

باقی لوگوں کو کمرے سے دور رکھنے کے لیے باہر چلی گئی۔

معاذ عبید کو ہوش میں لایا اور پھر تھوڑی سی کوشش کے بعد

اپنے ذہن پر لانے میں کامیاب ہو گیا۔

”میرے ذہن میں یہاں کو کہاں رکھا ہے تم نے؟ کیا وہ اسی

جگہ میں ہے؟“ وہ نے سونیا سے سوال کیا جس کا جواب

اسے دل و جان سے دیا۔

”جیسے جیسے میں سمجھتا ہوں۔“

جواب چو نکا دینے والا تھا۔

”تم نے نہیں رکھا تو کس نے رکھا ہے؟“

نہیں چل رہا تھا کہ اس کا گریبان جھنجھوڑ کر رکھ دے۔

مشکل سے اس نے خود پر قابو پایا۔

”سراج الدین بھائی جان نے۔ وہی انہیں ہوش سے

لے گئے تھے اور وہی جانتے ہیں کہ وہ لوگ کہاں ہیں۔“

”یہ سراج الدین کون ہے؟“ معاذ نے بے قراری

سے پوچھا۔

”میرے ماموں زاد بھائی۔ عمر میں مجھ سے پانچ چھ

سال بڑے ہیں۔ میں نے انہیں آپ لوگوں کے بارے

میں سب کچھ بتا کر ان سے مدد مانگی تھی اور انہوں نے ہی

مجھے یہ آئیڈیا دیا تھا کہ اگر آپ کے ہوش والے ساتھیوں کو

اپنی تحویل میں لے لیا جائے تو کسی نازک صورت حال میں

یہ چیز ہمارے کام آ سکتی ہے۔“

”کیا تم سراج الدین سے ابھی رابطہ کر کے ان

لوگوں کے بارے میں معلوم کر سکتے ہو؟ بلکہ اس سے کہو کہ ان لوگوں کو لے کر ابھی یہاں آجائے۔“ سہل کسی کی قید میں ہے، اس کے لیے یہ تصویر سیو ہاں روح تھا اس لیے مسلسل بے چینی کا اظہار کر رہا تھا۔

”میں.....“ عبید کا جواب ابھی اس کے منہ میں ہی تھا کہ سونیا ایک موبائل ہاتھ میں لیے اندر چلی آئی۔

”اس کے نمبر پر کسی سراج الدین کی کال آرہی تھی۔ میں نے کال ہسٹری چیک کی ہے۔ کل سے اب تک دونوں نے متعدد بار ایک دوسرے سے رابطہ کیا ہے۔ آخری بار ایک گھنٹے پہلے ان کی گفتگو ہوئی ہے اور اب بھی دوسرا کال آچکی ہیں۔“ موبائل معاذ کے سامنے کرتے ہوئے اس نے اطلاع دیا، ہم کی۔

سراج الدین جنہیں کیوں کال کر رہا ہے؟“ معاذ نے پوچھا۔

”اب اسے دوسرا کال کر رہا ہے، وہ ہر ایک گھنٹے بعد مجھے کال کر کے یہاں کی صورت حال بتا رہا ہے۔ میں نے گھنٹا بھر پہلے میں نے اس سے کہا تھا کہ اس کی اطلاع ہو چکا ہے اور حویلی میں موجود سب کو اس کی اطلاع کر دیتے ہیں۔“

”تم کیوں بے ہوش نہیں ہوئے؟ کیا تم نے وہ دودھ نہیں پیا تھا؟“ معاذ نے اپنے دانت کچکچائے۔

”مجھے شک تھا کہ دودھ میں کچھ ملا گیا ہے اس لیے میں نے دودھ نہیں پیا تھا اور آپ لوگوں نے پہلے ہی نکل کر خانے میں پہنچ گیا تھا۔“ اسی اثناء میں موبائل ایک بار پھر بجنے لگا۔ کال سراج الدین ہی تھا۔

”بات کرو اور اسے یقین دلاؤ کہ یہاں سب کچھ ٹھیک ہے۔“ معاذ نے سونیا کو کال ریسیو کرنے کا اشارہ دیا۔ اس نے کال ریسیو کر کے موبائل عبید کے کانوں سے لگایا۔

”السلام علیکم سراج بھائی! سب ٹھیک تو ہے؟“ اس کا مدعا سمجھتے ہوئے عبید نے گفتگو کا آغاز کیا۔

”ہاں ہاں..... یہاں سب ٹھیک ہے۔ میں ہاتھ روم میں تھا اس لیے آپ کی کال نہیں لے سکا۔“ دوسری طرف سے یقیناً کال ریسیو نہ کرنے کے سلسلے میں استفسار کیا جا رہا تھا جس کی وضاحت میں عبید نے بہانہ بنایا۔ معاذ نے اس کی پسلیوں میں ہلکا سا ٹھوکا دے کر سرگوشی میں ان لوگوں کو یہاں لانے کی بات کرنے کو کہا۔

”ایسا کیجیے سراج بھائی! ان لوگوں کو لے کر یہاں حویلی ہی آجائیے۔ صبح سب کو ایک ساتھ بابا کے سامنے پیش

کر دیں گے۔“ عبید نے سلیقے سے بات کی اور پھر دوسری طرف کی سننے لگا۔

”ٹھیک ہے تو پھر آجائیے۔ میں آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔“ آخری بات کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا اور پھر معاذ کی طرف رخ کر کے اطلاع دینے والے انداز میں بولا۔

”آرہے ہیں وہ لوگ۔ آدھے گھنٹے تک پہنچ جائیں گے۔“

”باہر گیٹ پر موجود سکیورٹی اسٹاف کو اطلاع کر دو۔ کہنا کہ ان لوگوں کو سیدھے یہاں تہ خانے کی طرف بھجوائیں۔“ معاذ نے اسے نئی ہدایت دی۔ اس ہدایت پر عمل ہوتے ہی وہ عبید کے ساتھ تہ خانے سے باہر نکل گیا۔ پیچھے کے معاملات دیکھنے کے لیے سونیا کافی تھمی اور اب تو عالم شاہ اور سردار جیسے قابل اعتبار ساتھیوں کا ساتھ بھی مل گیا تھا۔

باہر نکل کر وہ عبید کے ساتھ برجی پر پہنچ گیا۔ یہاں سے ہر جانب نظر رکھی جاسکتی تھی۔ ابھی آدھا گھنٹا پورا ہونے میں دو تین منٹ باقی تھے کہ مین گیٹ کے سامنے گاڑیوں کی روشنیاں دکھائی دیں پھر فوراً ہی اس کے ہاتھ میں موجود عبید کا موبائل بجنے لگا۔

”ان لوگوں سے پوچھو کہ سیدھے تہ خانے کی طرف

آجائیں۔“ معاذ نے ہدایات کے ساتھ موبائل عبید کو چھمایا۔ اس نے اس کی بات دوسری گاڑیاں اندر آئیں۔

یہ تو وہی دو گاڑیاں تھیں۔ سب سے پہلی گاڑی میں دو افراد اترے اور گاڑی کا گلا کھول کر کھول کر باہر آنے کا راستہ دیا۔ اترنے والے دو افراد

اس کی چال ڈھال میں موجود لوگوں سے متعلق معاذ کی

لگایا کہ وہی سراج الدین ہے۔ اس کے اسٹاف کے ساتھ

گاڑی کے سواروں کو بھی اتاراجانے لگا۔ گود میں بچہ اس کے

نازک سی سہل اور گول مول سے گل خان کو اس نے ان کی

ہست سے ہی پہچان لیا۔

”نیچے جا کر ان لوگوں کا استقبال کرو۔ خبردار! کوئی

گڑبڑ نہیں ہونا چاہیے۔“ معاذ نے عبید کو حکم دیا جس کی تعمیل

کے لیے وہ فوراً حرکت میں آگیا۔ معاذ ایک محفوظ فاصلے سے اس کے پیچھے ہی تھا۔

”تو تم نے بازی مار لی۔“ عبید آنے والوں کے مقابل پہنچا تو پینٹ شرٹ والے نے جو یقینی طور پر سراج تھا، اس کے بازو پر ایک مشفقانہ دھب لگاتے ہوئے داد دینے والے انداز میں کہا اور پھر اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر بولا۔

”جج پوچھو تو میں ڈر رہا تھا کہ تم کوئی گڑبڑ نہ کر بیٹھو۔ تم نے پروگرام کے مطابق میری کال ریسیو نہیں کی تو میں اچھا خاصا

دوستوں کو ساتھ لے کر یہاں سے جا رہے ہیں۔ ان کے درمیان جاری اس گفتگو کے دوران سونیا، عالم اور سرمد محافظوں کے ہتھیار اپنے قبضے میں لینے کے ساتھ ساتھ ان کو ایک کھڑی میں قفل کرنے کا کام انجام دے چکے تھے۔ ایک کونے میں سٹ کر کھڑی کھلی، اس کے بچے اور گل خان پر کسی نے بھی توجہ نہیں دی تھی لیکن اب فارغ ہونے کے بعد عالم بار بار تعجب سے گل خان کو دیکھ رہا تھا۔ کھل کو پشتوں عورتوں کے مخصوص برقع کی وجہ سے شناخت کرنا اس کے لیے مشکل تھا اور اعظم بھی چونکہ ماں کے شانے سے لگا گہری نیند میں تھا اس لیے اس کا چہرہ بھی سامنے نہیں تھا۔ سامنے ہوتا بھی تو اس کے لیے بھانجے کو پہچانا آسان نہ ہوتا کہ اس عمر کے بچوں میں بہت تیزی سے تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں اور زیادہ وقت سے دیکھنے والوں کے لیے شناخت کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

”مل لو جا کر۔ وہ تمہاری ہمشیرہ کھل ہے۔“ معاذ نے آہستہ سے اس کے کان میں کہا تو پہلے وہ حیران ہوا پھر جذباتی سا ہو کر کھل کی طرف بڑھا۔

”ادا سامیں!“ عالم شاہ کا ہاتھ کھل کے سر پر آیا تو وہ اس کی حرکت پر حیران ہو گیا اور بے اختیار رونے لگی۔

”میری جان! یہ کونسی عورت ہے؟“ عالم نے اس کی طرف سے بہت شرمندہ انداز میں اس کی طرف سے

”میری جان! یہ کونسی عورت ہے؟“ عالم نے اس کی طرف سے بہت شرمندہ انداز میں اس کی طرف سے

”میری جان! یہ کونسی عورت ہے؟“ عالم نے اس کی طرف سے بہت شرمندہ انداز میں اس کی طرف سے

”میری جان! یہ کونسی عورت ہے؟“ عالم نے اس کی طرف سے بہت شرمندہ انداز میں اس کی طرف سے

”میری جان! یہ کونسی عورت ہے؟“ عالم نے اس کی طرف سے بہت شرمندہ انداز میں اس کی طرف سے

”میری جان! یہ کونسی عورت ہے؟“ عالم نے اس کی طرف سے بہت شرمندہ انداز میں اس کی طرف سے

”میری جان! یہ کونسی عورت ہے؟“ عالم نے اس کی طرف سے بہت شرمندہ انداز میں اس کی طرف سے

”میری جان! یہ کونسی عورت ہے؟“ عالم نے اس کی طرف سے بہت شرمندہ انداز میں اس کی طرف سے

”میری جان! یہ کونسی عورت ہے؟“ عالم نے اس کی طرف سے بہت شرمندہ انداز میں اس کی طرف سے

پریشان ہو گیا تھا اور اپنے اس ڈی ایس بی دوست کو کال بھی کر دی تھی جس کا تم سے ذکر کیا تھا۔ وہ تو تم نے میری کال ریسیو کر لی ورنہ اس وقت وہ بھی میرے ساتھ ہمیں موجود ہوتا۔“ سراج جو کچھ کہہ رہا تھا وہ خاصا خوفناک تھا۔ پولیس حویلی تک چلی آئی تو وہ لوگ مزید الجھن میں پڑ جاتے۔

”آپ نے تو مجھے بالکل ہی بچہ سمجھ رکھا ہے۔“ سراج کی بات سن کر عبید نے جھینپے ہوئے لہجے میں کہا۔ آئیں میں گفتگو کرنے کے ساتھ ساتھ وہ لوگ قدم بھی اٹھاتے

جا رہے تھے۔ سب سے آگے عبید اور سراج تھے۔ ان سے دو ایک قدم پیچھے دائیں اور بائیں جانب سراج گارڈز پھر کھل اور گل خان اور سب سے آخر میں پھر دو سراج گارڈز۔ سراج

الدین اچھی خاصی تیاری سے وہاں آیا تھا۔ معاذ ان کی حویلی کے ساتھ ہی سونیا کو پیغام بھیج چکا تھا اس لیے

معاذ نے سونیا کو اس کی طرف سے استقبال ہوگا۔ حسب توقع

”تو میرے خدشات درست تھے۔“ سراج نے فوراً

کوئی اشارہ ہی کر دیتے، سراج نے فوراً اس صورت حال پر سراج طیش میں آ کر عبید کو دھکے لگائے۔

سراج کاٹے کھڑا تھا جیسے اس کا اس سارے قصے سے

”میں تم سے کچھ کہہ رہا ہوں عبید۔۔۔۔۔!“ عبید کی خاموشی نے سراج کو مزید جھنجھلاہٹ میں مبتلا کیا۔

”یہ تمہیں کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ جو پوچھا ہے مجھ سے پوچھو بلکہ کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ صبح تک آرام سے اس خانے میں مہمان رہو۔ صبح حویلی کے

لیکن اور پھر یہاں وغیرہ ہوش میں آئیں گے تو تم لوگوں کو یہاں سے نجات مل جائے گی۔ یہ چند گھنٹے ہمارے یہاں سے دور نکل جانے کے لیے کافی ہوں گے۔ یوں ہم اور تم دونوں ہی مزید پریشانوں سے بچ جائیں گے۔“ معاذ پیچھے

سے آگے آیا اور سراج کو مخاطب کر کے بولتا چلا گیا۔

”یہ تمہاری بھول ہے کہ حویلی میں نقب زنی کر کے اتنی آسانی سے فرار ہو جاؤ گے۔ ہماری پہنچ کو اتنا معمولی نہ سمجھو۔ ہم ڈھونڈنے پر آئیں گے تو پاتال سے بھی تمہیں ڈھونڈ نکالیں گے۔“ سراج خود کے یوں بے بس ہو جانے پر بری طرح جھلایا ہوا تھا۔

”نقب زنی۔۔۔۔۔ کس نقب زنی کی بات کر رہے ہو تم؟ ہم نے یہاں سے ایک تنکا بھی نہیں اٹھایا ہے اور بس اپنے

سپنس ڈائجسٹ 81 جون 2022ء

بھرتے ہوئے سونیا نے کہا تو اس نے محض سر کی جنبش سے اس کی تائید کی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ وہاں سے روانہ ہو رہے تھے۔ سواری کے لیے سراج کی گاڑیوں کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ایک گاڑی کو سونیا جبکہ دوسری کو معاذ ڈرائیو کر رہا تھا۔ سونیا کی برابر والی نشست پر عبید تھا اور پیچھے سرمد اور گل خان بیٹھے تھے جبکہ معاذ والی گاڑی میں عالم شاہ اور بجل موجود تھے۔ انہیں امید تھی کہ سراج کی گاڑیوں میں روانگی کی وجہ سے وہ بلا روک ٹوک حویلی سے نکلتے چلے جائیں گے لیکن مین گیٹ پر روکے جانے سے ان کی یہ امید دم توڑ گئی۔

”کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس وقت آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟“ وہ بھی سراج صاحب کی گاڑیوں میں؟“ سونیا نے اس کے پیچھے چیف سکیورٹی افسر اسی گاڑی کے ساتھ ساتھ چلے گئے۔ پوچھ رہا تھا لیکن اس کی اس بات پر اس نے غصے سے جواب دیا۔ رات گئے سراج کی اس گاڑی میں دو گھنٹے تک بیٹھے اور اب ان گاڑیوں کی آپس میں اس کے بغیر باہر ہے معمول کی بات نہیں تھی اس لیے اس نے سراج صاحب کو جتلا ہونا تھا لیکن عبید کی اگلی نشست پر سونیا کے ساتھ موجودگی اسے اپنے رویے کو نرم رکھنے پر مجبور کر رہی تھی۔

”میرے خیال میں تم نہیں پوچھ سکتے۔ میرے اس گاڑی میں ہوتے ہوئے تمہیں گاڑی کو روکنے کی بھی جرأت نہیں ہونا چاہیے تھی۔“ سونیا کے اشارے پر عبید نے چیف سکیورٹی افسر کو برہمی سے جواب دیا۔

”آئی ایم سوسری نواب زادہ صاحب! لیکن آج سے قبل آپ بھی اس طرح اتنی رات گئے حویلی سے باہر نہیں گئے ہیں اور میرے خیال میں نواب صاحب اس بات کو پسند بھی نہیں کریں گے۔“

اس نے حسب سابق لہجہ کو نرم رکھتے ہوئے جواب دیا لیکن اس کے جواب سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ عبید کی موجودگی کے باوجود گاڑیوں کو آسانی سے جانے کی اجازت نہیں دے گا۔

”نواب زادہ صاحب صرف ہماری خاطر یہ زحمت اٹھا رہے ہیں۔ ہماری ٹیلی میں کوئی ایمر جنسی ہو گئی ہے اور یہ ہمیں اڑ پورٹ تک چھوڑنے جا رہے ہیں۔“ اس بار سونیا نے گنگو میں دخل دیا اور اس پھر حویلی سے باہر جانے کی توجیہ پیش کرنے کی کوشش کی۔

”کیا نواب صاحب کو اس بات کا علم ہے؟“

”اس وقت ان کے آرام میں خلل ڈال کر انہیں اطلاع دینا ممکن نہیں تھا۔ صبح نواب زادہ عبید انہیں حالات سے آگاہ کر دیں گے۔ فی الحال ہمارا جلد از جلد یہاں سے روانہ ہونا بے حد ضروری ہے۔“ اس نے جواب دیتے ہوئے کن انکھوں سے معاذ کی طرف دیکھا۔ وہ ان کی گنگو سننے کے لیے اپنی والی گاڑی سے اتر کر قریب چلا آیا تھا۔

”اور سراج صاحب اور ان کے گاڑی کہاں ہیں؟“ یقینی طور پر اسے سونیا کی بات پر یقین نہیں آیا تھا اور مسلسل سوال پر سوال کر رہا تھا۔

”وہ آرام کر رہے ہیں۔ کل ہمارا شکار پر ساتھ جانے کا ارادہ ہے اس لیے وہ یہاں آئے ہیں۔“ عبید نے سراج کی وہاں موجودگی کا مستحکم جواب پیش کیا۔

”اور یہ..... یہ کون لوگ ہیں؟“ اس نے باری باری دونوں گاڑیوں کی پچھلی نشستوں پر موجود سواریوں پر نظر ڈالتے ہوئے سوال اٹھایا۔

”آئی ڈونٹ نو، یہ کون لوگ ہیں۔ انہیں سراج بھائی اپنے ساتھ لائے تھے اور ہمیں انہیں راستے میں اتارتے جا رہے ہیں۔“ عبید نے شانے اچکاتے ہوئے بے

”پلیز اب مجھ سے جانے دیں ورنہ ہم لیٹ ہو جائیں گے اور سونیا زیادہ بے چین اٹھانا پڑے گی۔“ آپ اطمینان رکھیں۔ سونیا صاحبہ اور سراج صاحب ہمیں ڈراپ کر کے فوراً چلے جائیں گے۔ سونیا نے اس بار ملتجیانہ لہجہ اختیار کیا۔

حورت جب کسی مرد سے اس لہجے میں گنگو سننے کو پہنچ جاتا ہے لیکن چیف سکیورٹی افسر ایک مختلف مرد ہوا اور گھر درے لہجے میں بولا۔

”سوری میڈم! مجھے آپ کے مسائل سے زیادہ اپنی ڈیوٹی کی فکر ہے۔ میرے نزدیک یہ ایک ملکیوک چوہیشن ہے اور میں نواب صاحب کی اجازت کے بغیر آپ لوگوں کو نواب زادہ سمیت یہاں سے جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔“

”آپ ایسا کریں کہ اپنے اسٹاف میں سے ایک ایک گاڑی کو دونوں گاڑیوں میں بٹھادیں۔ اس طرح آپ بھی مطمئن ہو جائیں گے اور ہمارا کام بھی نہیں رکے گا۔“ سونیا نے اسے قائل کرنے کی ایک اور کوشش کی۔

”صبح ہونے میں بہت زیادہ دیر نہیں ہے۔ بہتر ہوگا کہ آپ لوگ چند گھنٹے انتظار کر لیں۔ میں نواب صاحب کی اجازت کے بغیر ہرگز آپ لوگوں کو اس طرح سے جانے کی

گیت سے باہر نکلتی چلی گئیں۔

”تعاقب سے پوری طرح ہوشیار رہتا۔“ سونیا نے تیز آواز میں کہا اور خود چکی سے رابطہ کرنے لگی۔ کچھ دیر کی گفتگو کے بعد ان کے درمیان طے پا گیا کہ وہ انہیں کس جگہ سے پک کرے گا۔ سونیا نے معاذ کو بھی آگاہ کر دیا۔ وقت ایسا تھا کہ سڑکوں پر برائے نام ہی گاڑیاں موجود تھیں اور یہ صورت حال اس حساب سے ان کے حق میں تھی کہ ایک تو وہ نہایت تیزی سے سفر کر رہے تھے، دوسرے تعاقب میں آنے والی کوئی گاڑی نظروں میں آنے سے بچ نہیں سکتی تھی۔ بیس بائیس منٹ کی مسافت طے کر کے وہ اپنے مطلوبہ مقام پر پہنچ گئے۔ جتنی حسب ہدایت ایک وین سپت ان کا خطر تھا۔ وہ لوگ تیزی سے اس وین میں منتقل ہو گئے۔

”واپس جاؤ دوست! میری دعا ہے کہ تم زندگی میں بہت کامیاب رہو اور زندگی میں پھر کبھی حشر کے نام پر ایسا کوئی تجربہ کرنے کا نہ سوچو۔“ معاذ نے عبید سے باقاعدہ مصافحہ کرتے ہوئے ناصحانہ لہجے میں کہا اور خود بھی وین کی طرف بڑھ گیا۔ اسے امید تھی کہ دونوں گاڑیاں بہ خیریت حویلی واپس پہنچ جائیں گی۔ عبید کے بارے میں انہیں علم تھا کہ عمری کے باوجود وہ ڈرائیونگ میں مہارت رکھتا ہے۔

میں پودینے کی چٹی سے ہٹاؤں اور دیکھ لوں گا۔ وہ بھی نہیں گھایا۔“ حسب معمول پارکنگ کے لیے چلتے ہوئے سے تیار ہناز نے اپنے پرس میں موجود اسٹارٹ اپ کیا۔ وہ بڑھاپے کے ساتھ دوستانہ لہجے میں حکم جاری کیا۔ باؤل کاھیو کے ساتھ جتنا حقارت آمیز سلوک تھا، وہ اس کے لیے اپنے دل میں اتنی ہی ہمدردی رکھتی تھی۔ شیو کی خاموش عزاجی اور فرمانبرداری نے اس ہمدردی کو آہستہ آہستہ پسندیدگی میں تبدیل کر دیا تھا اور کبھی کبھی وہ اس سے دل کی بات بھی کر جاتی تھی۔

”میری ماں کے ہاتھ میں بہت ڈانٹہ تھا۔ وہ جب کبھی دال چاول بناتی تھی، اس کے ساتھ پودینے اور املی کی چٹنی ضرور ہوتی تھی۔ کبھی کبھی پاپڑ بھی مل جاتی تھی۔ اس ساوہ سے کھانے کا ڈانٹہ اتنا جواب ہوتا تھا کہ اس کے آگے فائدہ اشارہ ہونے کا کھانا بھی کمتر لگتا ہے مجھے۔“ وہ تصور میں اپنے اس چھوٹے سے گھر کو یاد کر رہی تھی جہاں وہ سب بہن

اجازت نہیں دے سکوں گا۔“ کلک کا پشتون برقع، عالم اور سرمد کا اجر حلبی، گل خان کے چہرے پر پریشانی اور عبید اور قمر الدین کا کھوپیا سا انداز..... اتنے سارے مشکوک عناصر یکجا تھے وہاں کہ ایک تربیت یافتہ اور پروفیشنل شخص کے مطمئن ہونے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اپنی ناکامی کو محسوس کر کے سونیا نے سوالیہ نظروں سے معاذ کی طرف دیکھا۔ دونوں کے درمیان آنکھوں ہی آنکھوں میں تبادلہ خیال ہوا اور معاذ پلٹ کر پیچھے والی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ اس نے گاڑی اشارت کی اور سونیا کا نمبر طے کیا۔

”آپ میری بات سمجھنے کو تیار نہیں ہیں اور پیچھے سے مجھے کالز پر کالز آرہی ہیں۔“ سونیا نے جھنجھلاہٹ سے اداکاری کرتے ہوئے کال ریسیو کی۔

”ایکشن۔ ہمیں عبید کو یہ فعال بنا کر یہاں سے لگتا

ڈانٹنے سے ہدایت دی۔

ایک منٹ کے بعد جواب دیتے ہوئے اس نے

”ہمیں راستہ دے گا۔“ اس نے

نواب زادہ عبید تھوڑی دیر میں

آجائے گا۔ دوسری صورت میں ہر نقصان کی ذمہ داری

صرف اور صرف تم پر ہوگی۔“ وہ اتنے خوفناک لہجے میں

دھمکی دے رہی تھی کہ چیف سکیورٹی افسر کی پیشانی سے پینا

پھوٹ پڑا تھا۔ اس خوفناکی میں اضافے کے لیے سرمد اور

گل خان نے جبکہ کرلشتوں کے نیچے سے گارڈز سے

حاصل کردہ اسلحہ نکال لیا تھا۔ کچھ ایسی ہی صورت حال پچھلی

گاڑی کی بھی تھی۔ معاذ اور عالم شاہ نے باقاعدہ اپنے

تھمپاؤں کی نمائش کرتے ہوئے اسے باور کروایا تھا کہ اس

کے پاس ان کا مطالبہ مان لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔

”اس حرکت کے خطرناک نتائج سمجھنے پر اس کے تم

لوگوں کو۔“ اس وقت وہ انہیں خالی خولی دھمکی ہی دے سکتا تھا۔

”ہمارا پیچھا کرنے اور پولیس کو اطلاع دینے سے

گریز کرنا۔ ذرا سے بھی مشکوک حالات نواب زادہ کی جان

جانے کا سبب بن جائیں گے۔“ اس کی دھمکی کو کان پر بیٹھی

کبھی جتنی بھی اہمیت دیے بغیر سونیا نے جوابی دھمکی دی اور

ایکسر میٹر پر دباؤ ڈالا۔ چیف سکیورٹی افسر نے ایک پے بس

سی نظر عبید پر ڈالی اور کسی حکم کے خطر اپنے ماتحتوں کو گیت

کھول دینے کا اشارہ کیا۔ دونوں گاڑیاں تیزی سے کھلے

بھائی فرحتی دسترخوان لگائے ماں کے ہاتھ کا کھانا رنج کر کھاتے تھے۔

”گھر یاد آرہا ہے آپ کو؟“ بہت کم بات کرنے والی شیو برتن دھونا چھوڑ کر اس کے سامنے آنکھری ہوئی اور بھر دی سے پوچھا۔

”کیا کروں گی اس گھر کو یاد کر کے جسے میں نے اپنی مرضی سے چھوڑا تھا اور اب تو وہ گھر بھی وہ پہلے والا گھر نہیں رہا۔ میرے بیٹے ہوئے پیسے سے بڑی ترقی کر لی سب نے لیکن آپس کا پیار گھٹ گیا۔ کبھی ملنے جاؤں بھی تو ایسا لگتا ہے سب کو میرے آنے کی خوشی سے زیادہ اس بات کی فکر ہے کہ میں کس کے لیے کیا لے کر آئی ہوں۔“ وہ واضح طور پر اداس تھی۔ شیو کچھ نہ بولی۔ وہ جانتی تھی کہ دولت کے حصول کے لیے کب کچھ داؤ پر لگا دینے والوں کے حصے میں عموماً بے رحمی ہوتی ہے۔ اماں آواز اٹھ کر اس سے حاصل کی ہوئی دولت کی طرف اشارہ کرتی تھی۔

”میرے بچے! میں نے اس گھر کو یاد کرنے سے باز رکھا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ اس گھر سے میری زندگی کے دل میں آئے ملال پر تادیر تک غور نہ کرنا پڑے۔“ شیو نے سر ہلا کر سارے خیالات کو ذہن سے جھٹکا اور برس شانے سے لٹکا کر باہر نکل گئی۔ شیو بھی اپنے کاموں میں مصروف ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد کاسوں سے فراغت ہوئی تو حسب معمول ایل ای ڈی کے سامنے جائیشی۔ مختلف چیل تبدیلی کرتے ہوئے ایک جگہ اس کا ہاتھ رک گیا۔ اسکرین پر سینئر سیاست دان صداقت شاہ کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بڑے دروہرے انداز میں کہہ رہے تھے۔

”میری حکومت سے درخواست ہے کہ میری سیاسی خدمات کا لحاظ کرتے ہوئے میرے بچوں کی بازیابی کے سلسلے میں کوئی کارروائی کریں۔ میں بڑی سے بڑی قسم اٹھا سکتا ہوں کہ میرا بیٹا دہشت گرد نہیں ہے۔ وہ اور میری بیٹی صرف ایک خاندانی تقریب میں شرکت کے لیے بھارت گئے تھے۔ وہاں ان کے ساتھ جو کچھ بھی پیش آیا، وہ ایک سازش کے سوا کچھ نہیں ہے۔ میں صدر اور وزیراعظم صاحب سے اہل کرتا ہوں کہ اپنے شہریوں کو دیارِ غیر میں اس طرح بے آسرا نہ چھوڑیں اور ان کے لیے کچھ کریں۔“

”لیکن شاہ صاحب! آپ کی اپنی پارٹی کے چند سیاست دانوں کی طرف سے یہ رائے دی جا رہی ہے کہ آپ کے بیٹے عالم شاہ نے بھارت جا کر جو کچھ کیا ہے، اس نے دنیا کے سامنے پاکستان کا امیج خراب کر دیا ہے اور اپنے

بیٹے کے اس مل پر آپ کو قوم سے معافی مانگنا چاہیے۔“ اینکر کو ان کے دکھ سے زیادہ اپنی صحافت اور قابلیت کی دھاک بٹھانے کی فکر تھی۔ صداقت شاہ سے بھر دی محسوس کرتی شیو ان کی طرف سے جواب سننے کی خاطر تھی کہ ڈور تیل کی آواز نے اس کے انتہاک میں خلل ڈال دیا۔ وہ ریوٹ کی مدد سے آواز بند کر کے دروازے تک گئی اور ڈور آئی کی مدد سے باہر جھانکا۔ وہاں نظر آنے والے گھو استاد کے ہاؤس گارڈ کے چہرے نے اسے تھوڑا حیران کیا لیکن بہر حال اس نے دروازہ کھول دیا۔

”السلام علیکم ا!“ اس کی شکل دیکھتے ہی اس شخص نے یوں سلام کیا جیسے ان کے درمیان بہت پرانی جان پہچان ہو۔ ”علیکم!“ شیو نے اس کی گرم جوشی کے مقابلے میں اتنی سرد مہری کا مظاہرہ کیا کہ سلام کا جواب بھی مکمل دینے کی زحمت نہیں کی۔

”فرمائیے۔“

”فرماؤں گا تو میں تب جناب جب آپ مجھے اندر آنے کا راستہ دیں گی۔“ صرف اس کی بے تکلفی ہی چونکا نے شیو کی۔ طرزِ خطاب بھی حیران کن تھا۔ بھلا ملازموں کو ایسی بات کہہ کر جناب کر کے منگوا کرتا ہے۔

”مجھے اندر آنے دو۔“ بھر بعد میں آرام سے بیٹھ کر شیو نے ان کی بات کو دہرایا۔ ”مشکل سے بھاری رشوت ملے کر کچھ جتن کئے گئے۔“ شیو نے سرے بند کر دائے ہیں۔ اگر کچھ ہے تو ان کے درمیان کچھ نہیں ہے۔ یہ پوچھا آگیا تو مشکل ہو جائے۔ ”وہاں کچھ نہیں ہے۔“ زبان کے جوہر ہی نہیں دکھائے بلکہ اندر سے جھٹکے کے لیے پیش قدمی بھی کی۔ اس نے بے ساختہ ہی ایک ہو کر اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔ اس موقع پر وہ چاہتی تو دروازے کے قریب ہی لگا سکیورٹی الارم کا بٹن دبا کر مدد طلب کر سکتی تھی لیکن اس شخص میں کچھ ایسا تھا جس کی وجہ سے وہ اس سے خوف محسوس نہیں کر رہی تھی بلکہ قدرے اپنایت اور شائستگی کا احساس تھا جو اس کی وہاں موجودگی سے پیدا ہوا تھا۔

”سامیں صداقت شاہ کا اعتراف۔“ مطلب یہ کہ ان حالات میں بھی آپ نے اپنے باضی کو فراموش نہیں کیا ہے اور ان لوگوں کے بارے میں باخبر رہنے کی کوشش کرتی ہیں جن سے باضی میں آپ کا تعلق رہا ہے۔“ ایل ای ڈی کی آواز بند تھی لیکن اس کے لیے اسکرین پر صداقت شاہ کا دکھائی دینا ہی کافی تھا۔

”کھڑی کیوں ہیں۔ تشریف رکھیں۔ میری طرف سے آپ کو آرام سے بیٹھ کر پریشان ہونے کی پوری آزادی ہے۔“ وہ اس کے چہرے کے بننے بگڑنے زاویوں سے اس کے اندر رچ جانے والی اٹھل پٹھل کا اندازہ لگا سکتا تھا۔

”کون..... کون ہیں آپ اور کیا چاہتے ہیں؟“ وہ اس کے مقابل بیٹھ گئی اور انک انک کر پوچھا۔

”میں آپ کو اس حالت میں دیکھ کر شاکد ہوں۔ ہماری معلومات کے مطابق تو خدا ناخواستہ آپ.....“ اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا پھر پیشانی کو ہاتھ سے مسلتے ہوئے بولا۔

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ کو اس حالت میں دیکھ کر دکھ کا اظہار کروں یا اس بات پر شکر کہ جیسے بھی سہی، آپ زندہ تو ہیں۔“

”میں پوچھ رہی ہوں..... تم کون ہو؟“ وہ اتنی زور سے کہتی تھی کہ اس کی آواز میں گونج رہی تھی۔

”خود پر قابو نہیں رہیں شرم نہیں ہوں اور آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔“ وہ پھر اس کے اٹھ کر بچن میں گیا اور اس کے لیے گلاس میں سے لے کر اس کے طبیعت پر قابو پانے کے لیے اس کے سر پر ہاتھ پڑھانے لگا۔ چاہتے ہوئے بھی گلاس تمام لیا اور گھونٹ کر پی لیا۔ پینے لگی۔ پانی پینے کے بعد وہ سامنے بیٹھے شخص کا غور سے جائزہ لینے لگی۔ وہ اس کے لیے اجنبی تھا لیکن ایک شناسائی کا سا بھی احساس ہوتا تھا۔ بس وہ کوشش کے باوجود اسے شناخت نہیں کر پاری تھی۔

”بہت ہی سا خرچ ہوا ہے طبیعت کی اس تبدیلی پر۔ آپ اتنی آسانی سے پہچان نہیں تو مجھے لگے گا کہ میرا سارا سرمایہ ڈوب گیا۔“ شوخ چمکتی مسکراہٹ بڑی جانی بچانی تھی۔

”بتا کیوں نہیں دیتے کہ کون ہو تم؟“ وہ جھجھلائی۔

”وہی ہوں جس سے آپ ہارلی کے روپ میں چھپ سکیں اور نہ عرب رقاصہ کے بہروپ میں۔“ اس ایک جملے میں اس نے گویا اپنا مکمل تعارف کر دیا۔

”تم.....؟“ وہ پٹ پٹ آکھوں سے اسے گھورنے لگی۔

”جناب.....؟“ وہ سر کو تم کے شوخی سے مسکرایا۔

”تم نے گھو استاد کے ہاڈی گاڑ کا روپ کیوں بھر رکھا ہے؟“ وہ حیران تھی۔

”خود کو دشمنوں کی نظروں سے چھپا کر ادھورے کام مکمل کرنے کے لیے۔“

”اوہ.....“ وہ بس ہونٹوں کو گول کر کے رہ گئی۔

”آپ اس حال میں یہاں کیسے؟ میں تو آپ کو پہچان لینے کے باوجود یقین نہیں کر پا رہا تھا کہ یہ آپ ہی ہیں۔“ اس کی نظروں میں گہرا تاسف تھا۔

”قسمت کا کھیل.....“ وہ ایک آہ بھر کر رہ گئی پھر ٹھکست خوردہ لہجے میں بولی۔

”گئی تھی باڈل سے انتقام لینے لیکن خود مصیبت میں پڑ گئی۔ اس کے ایک ٹھکانے پر ہونے والی جھڑپ میں، جس سے گر پڑی اور اتنی بری طرح زخمی ہوئی کہ میرا زندہ رہنا بھی ایک معجزہ ہے۔ تم مجھے جس حال میں دیکھ رہے ہو، وہ اسی حادثے کا نتیجہ ہے۔“

”آپ کے زندہ ہونے کی کسی کو خبر نہیں۔ سب یہی جانتے ہیں کہ آپ مر چکی ہیں۔“

”ایک چلتی پھرتی لاش ہی تو ہوں میں۔“ اس کی مسکراہٹ بڑی کر بناک تھی۔

”اس نے مجھے صرف اپنی انا کی تسکین کے لیے زندہ رکھا ہوا ہے۔ میرے پیر میں پڑی زنجیر اور میری بے بسی اس کی اذیت پسند فطرت کو خوشی دیتی ہے۔ بس مہناز کا دم قسمت ہے جو مجھ سے قدرے ہمدردی سے بھی پیش آتی ہے۔“

”اس کے چہرے پر اس کے عتاب سے بھی بچانی رہتی ہے۔“

”اس کے چہرے پر اس کے عتاب سے بھی بچانی رہتی ہے۔“

”اس کے چہرے پر اس کے عتاب سے بھی بچانی رہتی ہے۔“

”اس نے مجھے صرف اپنی انا کی تسکین کے لیے زندہ رکھا ہوا ہے۔ میرے پیر میں پڑی زنجیر اور میری بے بسی اس کی اذیت پسند فطرت کو خوشی دیتی ہے۔ بس مہناز کا دم قسمت ہے جو مجھ سے قدرے ہمدردی سے بھی پیش آتی ہے۔“

”اس نے مجھے صرف اپنی انا کی تسکین کے لیے زندہ رکھا ہوا ہے۔ میرے پیر میں پڑی زنجیر اور میری بے بسی اس کی اذیت پسند فطرت کو خوشی دیتی ہے۔ بس مہناز کا دم قسمت ہے جو مجھ سے قدرے ہمدردی سے بھی پیش آتی ہے۔“

”اس نے مجھے صرف اپنی انا کی تسکین کے لیے زندہ رکھا ہوا ہے۔ میرے پیر میں پڑی زنجیر اور میری بے بسی اس کی اذیت پسند فطرت کو خوشی دیتی ہے۔ بس مہناز کا دم قسمت ہے جو مجھ سے قدرے ہمدردی سے بھی پیش آتی ہے۔“

”اس نے مجھے صرف اپنی انا کی تسکین کے لیے زندہ رکھا ہوا ہے۔ میرے پیر میں پڑی زنجیر اور میری بے بسی اس کی اذیت پسند فطرت کو خوشی دیتی ہے۔ بس مہناز کا دم قسمت ہے جو مجھ سے قدرے ہمدردی سے بھی پیش آتی ہے۔“

باتوں کے ساتھ یہ بات بھی غلط تھی ہو کہ ہماری حویلی میں کارروائی کا مقصد عالم شاہ اور سرحد کو ساتھ لے جانا تھا۔
 "لیکن اس طرح تو نواب صاحب خود مصیبت میں پڑ سکتے ہیں۔ انہیں جواب دینا ہوگا کہ ریاست کو انتہائی مطلوب یہ دونوں افراد ان کی حویلی میں کیا کر رہے تھے۔ سید حاسد خان غدار کی کاکیس بن سکتا ہے ان پر۔" محاذ نے اعتراض کیا۔

"دولت اور تعلقات کے بل بوتے پر حقائق کو توڑنا مردوزنا کون سا مشکل ہے۔ نواب صاحب کا نمک خوار کوئی اعلیٰ افسر ایسی شاندار کہانی گھڑ کر پیش کر دے گا کہ نواب صاحب پر ذرہ برابر آج نہیں آئے گی۔" سونیا کی دلیل بھی غلط نہیں تھی۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں ہی ملکوں میں اشرافیہ کو نوازنے اور انہیں تحفظ فراہم کرنے کی روایات عام تھیں۔

"پھر کیا کہتی ہو تم؟ کیسے نکلیں گے ہم یہاں سے؟" محاذ نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس وقت وہاں جنگی اور ان دونوں کے علاوہ صرف عالم شاہ موجود تھا اور اس نے ایک محنگو میں کوئی دخل نہیں دیا تھا۔

"تو وہ دن تو ہم نگرانی ہلکی ہونے کا انتظار کرتے ہیں۔" محاذ نے اسے کچھ لکھنے کے بجائے ایک ایک دوڑ کے دوپٹے کے گوشے پر لکھ کر دے دیے۔ اس عرصے میں سب کو اپنے عہدے پر فائز رہنے کی ہدایت مل جائے گی۔ اس نے جو یہ لکھ کر دیا اسے سب نے لکھ کر لیا۔ الحال کوئی چارہ نہیں تھا۔ دیکھ کر سب نے حیدر آباد سے نکل جانا ہی ان کے مسائل کے لیے پورا بھارت ہی ایک منجرے کی طرح تھا۔ اب تک وہ اس منجرے سے نکلنے کا راستہ تلاش نہ کر لیتے، ان کا مستقبل خندوش ہی تھا۔

"ادے ہوئے کیونو، تم کہاں چلے آئے؟ ماما کہاں ہیں تمہاری؟" وہ سب ایک تناؤ کی سی کیفیت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ سونیا کی نظر ایک دروازے سے باہر آتے اعظم پر پڑی۔ اس نے نیا نیا ریگنا شروع کیا تھا اور موقع پاتے ہی ادھر ادھر کھسک جاتا تھا۔ اس وقت بھی وہ ماں کو چھوڑ کر اکیلا کمرے سے باہر آ گیا تھا۔ سونیا نے آگے بڑھ کر اسے گود میں اٹھالیا اور گدگدی کی تودہ کھٹکھٹا کر فٹس دیا۔
 "بہت ہی پیارا بچہ ہے۔ صبر بھی بہت ہے اس میں۔ عام بچوں کی طرح زیادہ تنگ نہیں کرتا۔" سونیا نے اعظم کو پیار کرتے ہوئے اس کے بارے میں تبصرہ کیا۔

میں بگڑ گیا تھا، مسکرانے سے بھیا تک لگ رہا تھا۔
 "آپ کے پاس یقیناً رابطے کا تو کوئی ذریعہ نہیں ہوگا؟" اس کے انکار کے بعد اب وہ معاملات کو دوسرے رخ سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے سر کی جنبش سے اس کے اندازے کی تصدیق کی۔

"ٹھیک ہے تو پھر یہ موبائل اور اس کا چارجر اپنے پاس رکھیں۔ اسے کس طرح محفوظ رکھنا ہے اور کیسے ضرورت کے وقت مجھ سے رابطہ کرنا ہے، یہ سب سکھانے کی یقیناً مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آپ خود بہت سمجھ دار ہیں۔ بس اتنا خیال رکھیے گا کہ کسی بھی موقع پر جذباتی نہ ہوں اور ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھائیں۔" اس نے جیب سے موبائل اور چارج نکال کر اس کے حوالے کیا اور ساتھ ساتھ کچھ نصیحتیں بھی کر دیں۔
 "کچھ دیر بعد وہ وہاں سے روانہ ہو رہا تھا۔

آپ کے وعدہ ہے کہ ان شاء اللہ بہت جلد آجائے گا۔ وہ اس وقت اس کا اور آپ شیو کے بیچے ایک بار پھر گھر کا سفر کرنا کی زندگی جنیں گی۔ وہ اُن کے ساتھ ہی آجائے گا۔ وہ جاتے جاتے ان میں امید کی لہر پارہن کر رہا تھا۔

☆☆☆
 "کیا رپورٹ ہے جنگی؟" چند گھنٹوں کی فینڈ لپے۔ جب وہ دوسری صبح ناشتا کرنے بیٹھے تو سونیا نے جنگی سے پوچھا۔
 "شہر کے داخلی اور خارجی راستوں کی نگرانی کی جارہی ہے۔ شہر میں پولیس کا گشت بھی بڑھ گیا ہے اور اندازہ ہے کہ خفیہ ادارے والے بھی سرگرم ہیں۔"
 "مطلب، ہمارا یہاں سے لکنا مشکل ہوگا۔"
 "بالکل۔ میرا مشورہ ہے کہ تھوڑا ٹھہر کر، معاملہ ٹھنڈا ہونے کے بعد ہی یہ کام کیا جائے۔"

"یہاں رہنا محفوظ ہوگا کیا؟ آس پڑوس سے کوئی مخبری بھی کر سکتا ہے۔" سونیا نے تشویش کا اظہار کیا۔
 "میں نے یہ گھر کرائے پر لیا ہے اور مالک مکان کو پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ پیچھے کیل بھی آرہی ہے تو میرا نہیں خیال اسے کسی قسم کا شک ہوگا۔ رہے آس پڑوس والے تو یہ جس قسم کا علاقہ ہے، یہاں لوگ اپنے آپ میں گمن رہتے ہیں۔ کون آرہا ہے، کون جارہا ہے، انہیں اس کی خبر نہیں ہوتی اور نہ ہی جاننے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔" جنگی نے تسلی دی۔

"اس معاملے کو اتنا ایزی مت لو جنگی! یقیناً نواب بدر الدین کے بہت اوپر تک تعلقات ہوں گے۔ انہوں نے یہ معاملہ اعلیٰ افسران کے سامنے رکھا ہوگا تو ہو سکتا ہے بہت سی

”جس بچے نے دنیا میں آنکھ کھولے ہی پہلی چیز جیتی دیکھی ہو، اسے شاید خود بخود مہر کرنا آ جاتا ہے۔“ عالم کی کئی بات نے سب کو ایک دم خاموش کر دیا۔ اس بچے کا دماغی یہ المیہ تھا کہ اس نے جس روز دنیا میں آنکھ کھولی، اسی روز اس کے باپ کو قتل کر دیا گیا تھا۔

”جو بھی ہے، مجھے امید ہے کہ ان شاء اللہ یہ بہت بلند نصیب ہوگا اور بہت کامیاب زندگی گزارے گا۔“ معاذ نے پُر امید لہجے میں کہہ کر ماحول کی اداسی دور کرنے کی کوشش کی۔

”ابھی تو ہمارے ساتھ دھکے کھا رہا ہے۔ اللہ آگے کے لیے تمہاری زبان مبارک کرے۔“ عالم واضح طور پر ڈپریشن کا شکار تھا۔

”کیا ہو گیا ہے یار! کیوں اتنے مایوس ہو رہے ہو۔“ معاذ نے کہا اور ایک نہ ایک دن ہم اس سارے چکر میں گھوم رہے ہیں۔ اذ نے اس کے شانے پر ہاتھ

”مگر والوں، خصوصاً والدین جو اپنے بچے کے ساتھ اپنے ایک احساس جرم سا ہوتا ہے، اس کو بچوں کے لیے ایک

جان لٹا دیتے ہیں اور یہاں میری بہن میری بہن ہیں۔“ انھاری ہے۔“ اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ وہ جن حالات سے گزرا تھا اس میں اس کا یہ رویہ بالکل

فطری تھا۔ پہلے ”را“ والوں کی قید اور تشدد پھر نواب بدر الدین کی حویلی میں نظر بندی کی زندگی۔ ایک با اختیار اور صاحب ثروت جاگیر زادے کے لیے یہ آزمائشیں بہت سخت تھیں۔ اپنی تکالیف شاید وہ نظر انداز کر دیتا لیکن کھل کی

زندگی جس اتار چڑھاؤ اور مشکلات کا شکار ہو گئی تھی، اس چیز نے اسے مایوسی اور اداسی کا شکار کر دیا تھا۔

”خود کو مورد الزام مت ٹھہراؤ۔ نقصان ہم سب نے اٹھایا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سب میں ہمارے ارادے کا کوئی دخل نہیں ہے۔ قسمت خود ہمیں گھیر گھا کر اس

مقام تک لائی ہے اور مجھے لگتا ہے کہ شاید ہمارے ہاتھوں کوئی بڑا کام انجام پانا ہے جو ہمیں اتنی آزمائشوں سے گزرا

گیا ہے۔“ آپ کے دوست بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ادا

سائیں! جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے، اس کو مایوسی کی نظر سے دیکھنے کے بجائے اس نظر سے دیکھیں کہ اللہ سائیں مشکل ترین حالات میں بھی ہمارے لیے کسی نہ کسی طور راستہ بنائی

دیتا ہے۔ خود کو اللہ سائیں کی مرضی کے حوالے کر دیں اور ایسا بالکل بھی مت سوچیں کہ مجھے آپ کی وجہ سے کوئی تکلیف ہے۔ اللہ نے چاہا تو جلد سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ کھل کب وہاں آئی تھی، ان میں سے کوئی نہیں دیکھ سکا تھا لیکن اس کے الفاظ نے ان سب کے دلوں میں اس کے لیے ایک احترام سا پیدا کر دیا تھا۔

”جیتی رہو میری بہن! میں جانتا ہوں کہ تمہارے لبوں پر کبھی شکوہ نہیں آئے گا لیکن سچ میں تم سے شرمندہ ہوں۔“ عالم شاہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب جا کھڑا ہوا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دل گرفتگی سے بولا۔

”موجودہ حالات میں مجھے سمیت ہم میں سے کسی کو بھی آپ کی شرمندگی کی نہیں بلکہ امت و حوصلے کی ضرورت ہے۔ خود کو مایوسی اور ناامیدی کے اندھیروں سے نکالیں اور

پوری طاقت سے اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر ان حالات کا مقابلہ کریں۔“ اس وقت وہ تاریخ کا کوئی ایسا کردار ایسی مثالی عورت دکھائی دے رہی تھی جو میدان جنگ کی طرف

روانہ ہوتے ہوئے اپنے گھر کے مردوں کو عزم و حوصلے کی دولت سے مالا مال کر کے بھیجتی ہے۔ عالم شاہ نے بھی یکدم

اپنی روشنی کیفیت کو بدلتے ہوئے محسوس کیا۔ ”اللہ تعالیٰ سلامت رکھے میری بہن! اس وقت تم سے شکر ادا کر رہی ہوں کہ اس طرف سے ہوتے ہوئے بولی۔“

”یہ سب کچھ ہے۔“ ”اب بچے ہیں۔“ ”اب بچے ہیں۔“ ”اب بچے ہیں۔“ ”اب بچے ہیں۔“ ”اب بچے ہیں۔“ ”اب بچے ہیں۔“ ”اب بچے ہیں۔“ ”اب بچے ہیں۔“

”اتنے ہمارے پھول جیسے بچے کو گود میں اٹھا لے سے بھلا کسی کو کیا ٹھکن ہوگی۔ تم جاؤ اور جا کر آرام کرو۔ میں اس کے ساتھ انجوائے کر رہی ہوں۔“ سونیا نے اعظم کو اس کے حوالے کرنے کے بجائے چنا چٹ اس کے گالوں پر پیار

کر ڈالا۔ اعظم اس کے اس عمل سے خوش ہو کر کھلکھلا یا تو وہ مزید نہال ہو گئی اور محبت پاش نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ معاذ کے لیے یہ مہر نہایت الوکھا اور عجیب تھا۔ وہ عورت جو نہایت سنگینی سے انسانی جان لے لیتی تھی اور بے

حد عیاری سے لوگوں کو اپنے اشاروں پر بچانے کا ہنر جانتی تھی، اس وقت پور پور محبت میں ڈوبی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اس وقت ڈھیر سا دے رنگ تھے اور ان رنگوں میں سب سے نمایاں رنگ ممتا کا تھا۔

☆☆☆

تو ایک خوشخبری اور سناؤ؟“ باذل نے ایک بڑا سا کھونٹ بھرتے ہوئے تریگ میں جواب دیا۔
”کیوں نہیں یار! ضرور سناؤ۔“

”میری ماں تاجور، لطیف سومرو کی بیٹی کے لیے میرا رشتہ لے کر گئی تھی۔ آج کل میں سومرو اس رشتے کے لیے ہاں کہنے والا ہے۔“

”کیا سچ ہے؟“ گلو کو اس خبر نے حیران کر ڈالا۔
لطیف سومرو بے شک کھیلے باز اور فراڈی آدمی تھا لیکن ہمیشہ یہی سننے میں آیا تھا کہ وہ لوگ رشتے ناتے چھان چنک کر اپنی برابری کے لوگوں میں کرتے ہیں اور باذل کا تعارف مشکوک تھا۔

”عرفان اللہ صاحب نے خصوصی سفارش کی ہے اس رشتے کے لیے۔“ باذل نے آنکھ کا کونا دبا کر اسے آگاہ کیا اور بات کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

”جب سے سومرو کا بڑا بیٹا کھیل بستر سے لگا ہے، اس میں زیادہ دم خم نہیں رہا ہے۔ بیٹے کے بستر سے اٹھنے کا کوئی امکان ہوتا تو سومرو غرے بازی کرتا بھی لیکن اب اسے اپنا ہاتھ بٹانے کو اور معاملات سنبھالنے کو جوان خون کی ضرورت ہے۔ اس کام کے لیے کوئی شریف زادہ تو بے کار ہے۔“

”ادھر سے؟“ باذل نے پوچھا۔
”اس کے رشتے پر غور کر رہا ہے۔“

”میں تو بڑا ہوں، کھیل بستر سے لگنے سے منع ہے۔“
”تو سومرو کو بھی پار لگا دو، اس کے رشتے کے لیے کھیل بستر سے لگا دو۔ پھر دیکھتا میں کیسے وہ رشتہ سنبھال کر اپنے ہونے کا حق ادا کرتا ہوں اور سومرو کے سارے معاملات کو سنبھالتا ہوں۔“ اس کے اندر کی خواہش اس کے لیے اور آنکھوں سے چھلکی پڑ رہی تھی۔

”مال میں اپن کا حصہ کتنا ہوگا؟“ گلو استاد کو اس کے کردار سے کچھ لینا دینا نہیں تھا اس لیے سیدھا کاروباری سوال کیا۔

”انفارمیشن میں لایا ہوں۔ مال کو آگے بچنے کی ذمہ داری بھی میری ہے تو اس حساب سے تو میرا حصہ ہی زیادہ بنتا ہے مگر چلو یہ اپنی پہلی پہلی ڈیل ہے تو میں خیر سگالی کے طور پر تمہیں فتنی پر سٹف حصہ دے دوں گا۔“ باذل نے حاتم طائی کی قبر پر لات ماری۔

”سکسٹی پر سٹف سے کم پر ڈیل نہیں ہوگی۔“ گلو استاد نے سنجیدگی سے اسے جواب دیا۔

”لگتا ہے کام کا ٹیم آگیا ہے۔“ گلو استاد کے لیے باذل کی اپنے اڈے پر آمد چونکا دینے والی تھی اس لیے فوراً ہی نتیجہ اخذ کر لیا۔

”بالکل ٹھیک سمجھ استاد! کام کا ٹیم آگیا ہے اور تمہیں اس ٹیم پر بڑی بھرتی دکھانا ہے۔“ باذل نے اس کے سامنے بے تکلفی سے بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

”تم ڈنشل ہوو۔ اپن کے پاس ایک سے ایک چپا بندہ ہے۔ ایسی تیزی دکھائے گا اپن کہ تم بھی دیکھتے رہ جاؤ گے۔“ گلو استاد نے بولتے ہوئے شاید اپنے باڈی گارڈ کو کوئی اشارہ کیا تھا کہ وہ نہایت تیزی سے ان کے سامنے پہنچنے پلانے کے لوازمات سجانے لگا۔

”پڑوس سے مال کی نئی کھپ آرہی ہے۔“ باذل نے مال کی طرف تشریف لے جھکتے ہوئے سرگوشی میں اطلاع دی۔

”ایک؟ کہاں؟“ گلو استاد کے بھی کان کھڑے ہوئے۔
”میں... وہ مال سائڈ میں معمول کے مطابق کھپ کو لطیف سومرو مال گھرے گا اور اس کے لیے سیو کر کے آگے بچھائیں گے۔“

”تمہیں کیا کرنا ہوا؟“ گلو استاد کی طرف اشارہ تھا۔
”ہمارے بیچنے سے پہلے پہلے... اس طرح ایک طرف تو مال ہمارے ہاتھ میں آجائے گا۔“

دوسری طرف لطیف سومرو کی ساکھ خراب ہو جائے گی۔
”اچھا منصوبہ ہے پر معاملہ اتنا سیدھا نہیں رہے گا۔ ہم مال خود سے بیچنے اور ٹھکانے لگانے کی کوشش میں پکڑے بھی جاسکتے ہیں۔ دوسرے لطیف سومرو کا بھی کچھ خاص نہیں بگڑے گا۔ اس سائڈ پر اس کا ہولڈ ہے۔ اوپر والے اس کو ڈانٹ پھٹکار کر دوبارہ نرم پڑ جائیں گے۔ اس علاقے میں وہ واحد بندہ ہے جو معاملات کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔ تم اس کو اتنی آسانی سے الگ نہیں کر سکو گے۔“ گلو استاد نے اپنے تحفظات کا اظہار کیا۔

”تم بس اپنے حصے کا کام کرو اور وہ بھی اتنی بھرتی اور صفائی سے کہ کسی کو کالوں کا ان خبر نہ ہو سکے کہ مال کو آسان کھا گیا یا زمین نکل گئی۔ باقی سارا میں نے بندوبست کر رکھا ہے کہ مال کو کہاں اور کیسے ٹھکانے لگانا ہے۔ ایک پارٹی سے ایڈوائس میں ہی سودا ہو گیا ہے میرا۔“ باذل بہت پُر جوش تھا۔

”واہ یار اتم تو بہت تیز جا رہے ہو۔“ گلو نے اسے رادری۔

”میں تمہاری سوچ سے بھی زیادہ تیز جا رہا ہوں۔ کہو“

”کیا کہا، سسٹی پرسنٹ؟“ باذل کو جیسے کرنٹ لگا۔
 ”ہمارے لیے اس کام میں رسک زیادہ ہے۔
 بندے، گاڑیاں، ہتھیار..... سب ہمارا ہوگا۔ کچھ معلوم نہیں
 کام پورا ہوتے ہوئے کتنے بندے کام آجائیں۔ آگے
 سے ان کے خاندانوں کی بھی دیکھ بھال کرنا پڑتی ہے۔ جن
 کے مال پر ہاتھ ڈال رہے ہیں، انہیں کوئی بن کن مل گئی تو وہ
 رنگ کھاتا کھل جائے گا۔ اس لیے اپن صاف بولنا ہے کہ
 سسٹی پرسنٹ سے کم میں یہ ڈیل نہیں ہو سکتی۔“
 ”تم زیادہ مانگ رہے ہو استاد!“ باذل نے شکایتی
 لہجے میں کہا۔

”مال میں سے زیادہ حصہ مانگ رہے ہیں لیکن اس
 ڈیل میں فائدہ تو زیادہ تمہارا ہی ہونے والا ہے۔ لطیف
 کرو کی گدی پر قبضہ بجا کر ایک طرف تم مال سیٹو گے تو
 دوسری طرف اس کے میدان سے ہٹ جانے سے عرفان
 کے سانپ ہونگے۔ ابھی تو اسے خطرہ رہتا ہے تا
 کہ اس کی خوشامد کے لیے سو مرو اس سے
 اچھی وزارت کے لیے۔ جب سو مرو کا ٹکٹ جائے
 گا تو پھر کون ہوگا جو اسے آگے لے گا؟ استاد نے اپنا
 گفتگو سے واضح کر دیا کہ وہ اتنا سست اور معصوم نہیں کہ
 سیاسی اتار چڑھاؤ کی خبر نہ رکھتا ہو۔

”بڑے ضدی ہو استاد لیکن چلو اپنی پہلی پہلی دیں
 ہے تو تمہاری بات رکھ لیتے ہیں۔ تمہارا حصہ سسٹی پرسنٹ
 ہی سہی۔“ باذل کو بالآخر ہتھیار ڈالنے پڑے۔
 ”اب باقی کے معاملات طے کر لیتے ہیں۔ پوری
 تفصیل سامنے رکھو تاکہ اسی حساب سے اپن پلاننگ
 کر سکے۔“ گلو استاد کا انداز خالعتا کاروباری تھا۔ باذل
 اس کی فرمائش پر اسے تمام تفصیلات سے آگاہ کرنے کے
 ساتھ ساتھ اسے اس کے سوالوں کے جواب دیتا رہا۔ کافی
 طویل میٹنگ کے بعد بالآخر ان کے درمیان تمام معاملات
 طے پا گئے اور باذل وہاں سے رخصت ہوا۔

”یہ آدمی سانپ سے بھی زیادہ خطرناک اور
 زہریلا ہے۔ ہمیں اس سے ہر لمحہ ہوشیار رہنا ہوگا۔“
 باذل کے رخصت ہوتے ہی گلو استاد کا گونگا بہرا ہاڈی
 گاڑ بول اٹھا۔

”اپن سب سمجھتا ہے لاڈلے! پر قسمت کا کھیل دیکھ
 کہ اس سانپ نے خود ہماری کچھار کا رخ کیا ہے۔ اپن کو
 تھوڑا موقع ملے دے۔ اپن ایسے اس کا سر پکڑیں گے کہ سارا
 قصہ ہی ختم ہو جائے گا۔“ گلو استاد نے اس کی پیٹھ چھتے

ہوئے پورے یقین سے تسلی دی تو وہ مطمئن سا ہو گیا۔ اگلی
 میٹنگ اس کے اور گلو استاد کے درمیان ہو رہی تھی جس میں
 تمام احتیاطی تدابیر کو بھی زیر بحث لایا جا رہا تھا۔
 اس میٹنگ کے چند گھنٹوں بعد ہاڈی گاڑ کو ایک
 ٹیکسٹ میسج موصول ہوا جس میں تنبیہ کی گئی تھی۔
 ”باذل سے ہوشیار رہو۔ سو مرو سے چھٹکارا پانے کے
 بعد وہ تم لوگوں کا بھی پتا صاف کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔“
 اس نے جوابی میسج کیا۔

”بے فکر رہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ سانپ پر کبھی
 بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔“

☆☆☆

”یہ لیس میڈم! میں یہ ساری دوا میکلے آیا ہوں۔
 بس ایک گولی الگ کمپنی کی ہے لیکن میں نے تسلی کر لی تھی کہ
 فارمولا سیم ہے۔“

”یہ کس کی دوائیں ہیں؟“ ابھی ابھی لاؤنج میں
 آنے والے معاذ نے جبکی کو دواؤں کی ایک چھوٹی سی تھیلی
 سونیا کو چھاتے دیکھ کر تشویش سے پوچھا۔

”تھیل کی ہیں۔ بتا رہی تھی کہ نیورو لو جسٹ نے اس
 کے کمرے کے لیے یہ دوائیں لکھ کر دی تھیں۔ سراج ان
 دواؤں کو ہسپتال سے نکال کر لایا تو جلدی میں وہ
 دواؤں کی بجائے دھن لائیں۔“ سونیا نے نہ لینے کے سبب
 اس کا سر درد ہونے لگا تھا۔ میں نے اسے خبر دے کی زبردستی اور
 سوچی ہوئی آواز میں اسے بتا دیا کہ یہ تو میکلے کی دوا
 بتایا۔ شکر ہے اس کے پاس دواؤں کا بڑا موجودہ تھا۔ میں نے
 جبکی کو بھیج کر ساری دوائیں منگوا لیں۔ سب سامان گھر پہنچ
 ہوں۔“ سونیا نے تفصیل سے اس کے سوال کا جواب دیا۔
 ہوئے سب کے ذریعہ استعمال کمرے کی طرف قدم بڑھائے۔

”تھیل سے کہو دوا کھا کر مجھ سے بات کریں۔“ پیچھے
 سے معاذ نے اسے ہدایت دی۔ سونیا نے اس ہدایت پر ذرا
 کی ذرا مڑ کر اس کی طرف دیکھا اور پھر سر ہلاتی ہوئی
 کمرے کے اندر چلی گئی۔ معاذ قدرے پریشان سا وہیں
 ایک کرسی پر ٹک گیا۔ اتنے دنوں بعد بھی قائم رہنے والے
 تھیل کے سر درد نے اسے تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ جب
 سے وہ تھیل کو اسپتال سے نکال کر لایا تھا، اس کے دوبارہ
 معائنے کی نوبت نہیں آ سکی تھی۔ اس سارے عرصے میں
 ایک تو حالات ہی اتنے ہنگامہ خیز رہے تھے پھر دوسرا مسئلہ
 رازداری کا بھی تھا۔ خوف تھا کہ معائنے کے لیے ڈاکٹر کے
 پاس جانے کی صورت میں کہیں تھیل کسی کی نظروں میں نہ

آجائے۔ پھر سبکل نے بھی ہمیشہ اپنی طبیعت کی طرف سے اطمینان ہی دلایا تھا لیکن اس وقت اس کے سر میں ہونے والا درد اور دواؤں کا منگوانا ظاہر کر رہا تھا کہ طبیعت اتنی اطمینان بخش ہے نہیں جتنی وہ ظاہر کرتی رہی ہے۔

”کہاں تم ہو؟“ کئی منٹ گزرنے کے بعد سونیا نے اس کے چہرے کے آگے چٹکی بھاتے ہوئے اسے مخاطب کیا تو وہ چونک کر اپنی سوچوں سے نکلا اور اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”کیا کوئی پریشانی ہے؟“

”کوئی ایک پریشانی تو نہیں ہے لیکن اس وقت میں سبکل کی طبیعت کی طرف سے پریشان ہوں۔ تم نے میرا پیغام دیا تھا انہیں؟“ سونیا کے سوال کا جواب دیتے دیتے اس نے اس سے استفسار کیا۔

”دے دیا تھا لیکن اس کی طبیعت اتنی خراب ہو رہی تھی کہ میں اسے ہی روک دیا اور مشورہ دیا کہ فی الحال اسے گھر پر ہی رکھ دو۔“ سونیا نے اس سے جواب دیا۔

”میرا خیال ہے کہ اس کی طبیعت اب بھی اچھے ڈاکٹر کو دکھانا ہے۔ وہ طبیعت کے معاملے میں میری تشویش کو ٹال دیتی ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ وہ ٹھیک نہیں ہیں اور انہیں ایک اچھے ڈاکٹر کی شدید ضرورت ہے۔“

”کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو۔ سبکل میرا درداشت دوست لڑکی ہے لیکن آج اس کی کیفیت سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ خاصی تکلیف میں ہے اور اسے سچ سچ ایک اچھے ڈاکٹر اور براہ علاج کی ضرورت ہے۔“ سونیا اس کی بات کی تائید کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے کے تاثرات کا بھی جائزہ لے رہی تھی۔ وہ سبکل کے لیے جس قدر فکرمند تھا، وہ اس قدر فکرمندی کو محض ہمدردی اور خیال کے کھاتے میں نہیں ڈال سکتی تھی۔ وہاں ایک تعلق خاص تحریر تھا اور اس تحریر کو بڑھ کر اس نے اپنے دل میں چھن چھن کی محسوس کی تھی۔ یہ ایک ایسی تکلیف تھی جس سے وہ زندگی میں پہلے بھی آشنا نہیں ہوئی تھی۔

”تم ان کا خیال رکھا کرو اور یاد دلاتی رہا کرو کہ دوا میں پابندی سے لیں۔ جب تک کسی ڈاکٹر سے معائنہ نہیں ہو جاتا، ان دواؤں کے سہارے وہ تکلیف سے محفوظ رہ سکتی ہیں نا۔“ اس کے ہر لفظ میں سبکل کے لیے احترام تھا۔ وہ اس سے عمر میں چھوٹی تھی لیکن سونیا نے کبھی نہیں دیکھا تھا کہ وہ اس سے آپ جناب کے بغیر مخاطب ہوا ہو یا جینے جیسے بھی اس کے لیے ادب و احترام سے ہٹ کر کوئی

صیغہ استعمال کیا ہو۔ خود اس کے معاملے میں معاذ کا یہ عالم تھا کہ ابتدائی دور کے علاوہ جب وہ سزاوارا اب ہوا کرتی تھی، معاذ نے اس سے احترام والا انداز اختیار کرنا بند کر دیا تھا حالانکہ اگر عمر کے اعتبار سے بھی دیکھا جاتا تو وہ اس سے کچھ بڑی ہی تھی لیکن بڑے ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ اصل بات تو یہ تھی کہ وہ اس کی من چاہی عورت نہیں تھی اور اگر اس نے اسے اپنے ساتھ رکھا ہوا تھا تو صرف اپنے مفادات اور مقاصد کے لیے۔

”سونیا.....!“ معاذ نے اسے زور سے پکارا تو وہ بڑبڑا کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

”کہاں کھوئی ہوئی ہو؟ میں کب سے تمہیں پکار رہا ہوں۔“ قدرے تیز لہجے میں استفسار کر کے اس نے اسے جواب دینے کا موقع بھی نہیں دیا اور بولا۔ ”دیکھو، اعظم رورہا ہے۔ اسے کمرے سے باہر لے آؤ۔ سبکل نے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی دوا لی ہے۔ بیچ کے رونے سے ڈسٹرب ہو جائیں گی۔“ اس کی فکرمندی قابل دید تھی۔

”میں لاتی ہوں اسے۔“ سونیا جلدی سے اٹھ کر کمرے کی طرف بھاگی۔ دواؤں کے زیر اثر سو جانے والی سبکل کے رونے کی آواز پر نیند میں بے چین تو ہو رہی تھی۔

”اوہ! بے رحمی! بے رحمی!“ سونیا نے ہاتھ دھو کر اپنے کمرے میں داخل ہو کر سبکل کے پاس سے اسے دھیرے دھیرے اٹھائے اور اسے کمرے سے باہر لے کر گئے۔

”میرے خیال میں یہ بھوکا ہے۔“ سونیا نے فیڈر بتاتی ہوں تب تک تم اسے سنبھالو۔“ لاکھ میں آکر اس نے اعظم کو مطلق کی گود میں دے دیا۔

”ٹھیک ہے بھی، تم فیڈر تیار کرو تب تک ہم ذرا اپنے منے کو پھول پودے دکھاتے ہیں۔“ معاذ کو روٹے ہوئے بچے تو کیا سُرے سے ہی بچے سنبھالنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا اس لیے کچھ بوکھلایا ہوا سا اعظم کو لے کر باہر کی طرف بڑھ گیا۔ وہ لوگ جس مکان میں مقیم تھے، وہ بہت زیادہ بڑا نہیں تھا۔ لان کے لیے بھی ایک مختصر سا قطعہ ہی مختص تھا لیکن اس مختصر قطعے کو بھی بڑے سلیقے سے استعمال کر کے خوبصورت اور سودمند پودے لگائے گئے تھے۔ ایک طرف کیاریوں میں خوشنما اور خوشبودار پھولوں کے پودے لگائے گئے تھے تو دوسری طرف کچھ سبزیاں بھی لگائی گئی تھیں۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ چند درخت بھی موجود تھے۔ وہ اعظم کو لے کر

باہر دیکھیں تو اس نے اسے یوں سوس ہوا کہ جیسے کوئی زلزلہ آگیا ہو۔

☆☆☆

”تیار کیسی ہے گلو استاد؟ خیال رہے باذل سے سودا کیا ہے۔ تمہیں کوئی کمی بیشی رہ گئی تو ناک کٹ جائے گی تمہاری۔“ کتنی لمبے بالوں اور بھوری آنکھوں والا باڈی گارڈ جو دوسروں کے نزدیک گونگا بہرا تھا اس وقت نہایت بے تکلفی سے گلو استاد کے مقابل بیٹھا اس سے استفسار کر رہا تھا۔

”جیسے جیسے تم نے کہا تھا ویسے ساری تیاری کر لی ہے۔ دو پارٹیاں بہترین اسلحے اور گاڑیوں کے ساتھ تیار ہیں۔ ایک پارٹی پہلے ہی نکل جائے گی اور پروگرام کے مابقی اس علاقے میں خود کو کیوں فلاح کر لے گی۔ دوسری پارٹی اپنے نام سے نکلے گی اور اگر کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی تو اپنا کام پورے کے مال سمیت سیدھی طے شدہ جگہ پر پہنچ جائے گی۔“ گلو نے اسے تسکین دلائی۔

”ابھی تو تمہیں گلو استاد نے حرام کا حکم باذل پر بغیر گڑبڑ کے رہ جانے کا حکم دیا تھا۔ اس کا جواب دینا ہی پڑتا ہے۔“ تمہیں اس بارے میں کون ہے؟“ گلو استاد نے اسے غور سے دیکھا۔

”دھوکے بازوں کی نسل سے نکلے ہیں اس کا نام اس کا ناجائز باپ اتنے برسوں سے شرافت کا لبادہ اوڑھ رہا ہے ملک کی بھولی بھالی عوام کو بے وقوف بنانے میں مصروف ہے اور خدمت کے نام پر عوام کا مال کھا رہا ہے تو اس جیسے بد معاش سے میں ایمان داری کی امید کیسے رکھوں۔ تم دیکھ لیتا وہ اپنے عمل سے اپنی نسل ضرور بتائے گا۔“

”وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن اپن کو ایسا لگ رہا ہے کہ تیرے پاس کوئی کلیو بلکہ ٹھوس ثبوت موجود ہے۔“ گلو استاد کے لہجے میں اس کا تجربہ بول رہا تھا۔

”بہت گہری نظر ہے تمہاری استاد! اس نے استاد کو مراہا۔“ لالہ بیٹی کا ہنسا ہوں۔ ایک عمر اس کی تربیت میں گزاری ہے۔ اتنی عمر میں اگر اتنا بھی نہیں سیکھتا تو لعنت تھی مجھ پر۔“

”خیر لعنت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لالہ کی گدی پر بیٹھنے والے کے لیے تو آفرین ہی آفرین ہے۔“

”تو یہ تو یہ..... میں اور لالہ کی گدی۔ کوڑھی ہو کر مروں جو کبھی لالہ کی گدی پر بیٹھنے کا سوچوں۔ یہ سب تو بس وقت کی جھوٹی ہے کہ اپن لوگوں کو لالہ کی جگہ گمراہ کھائی دے رہا ہوں ورنہ اپن تو خواب میں بھی ایسا نہیں سوچ

سنا۔“ گلو استاد نے اپنے کان میں پیٹ ڈالے۔ ”تمہاری اسی وفاداری و جاں نثاری نے ہی تو تمہیں لالہ کا چہرہ بنا رکھا تھا۔“ اس نے گلو کو سراہا۔

”ابھی یہ مکھن پالش چھوڑو اور اپنے کو اصل بات بتاؤ۔“ گلو استاد اصل مد سے پر آیا۔

”اصل بات تو یہی ہے کہ مجھے شروع سے باذل کی نیت پر شک تھا لیکن اب پکا ثبوت بھی مل گیا ہے۔ لو تم خود دیکھ لو۔“ اس نے اپنے موبائل کی اسکرین پر انگلیاں چلاتے ہوئے یکدم اسکرین گلو استاد کے سامنے کی۔ اسکرین پر ایک سبکی ہوئی ڈانٹنگ ٹیبل دکھائی دے رہی تھی۔ گلو استاد کو اسے دیکھ کر شش پاشی کا احساس ہوا اور جیسے ہی ساکت منظر میں مرد و زن کا ایک جوڑا داخل ہوا اس نے پہچان لیا کہ وہ مہناز کے اپارٹمنٹ میں بنائی گئی ویڈیو ہے اور وہ چند دن قبل اس ڈانٹنگ ٹیبل پر کھانے پینے کا شرف حاصل کر چکا ہے۔

”اب موڈ ٹھیک کر لو ڈارلنگ! دیکھو ساری تمہاری فیورٹ ڈشز تیار کروائی ہیں۔ غصہ تھوک کر ان سے انصاف کرو اور اپنے مخالفین کو جس نہیں کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔“ مہناز بھی جو سالن کے باؤل سے بڑی بڑی ہوشیارانہ انداز میں ٹیبلٹ میں غفلت کرتی اسے کسی ضدی

نہیں سمجھتا تھا۔ ”اوقات کے ساتھ ہی کی۔“ مہناز پر چڑھ رہا ہے۔

کہتا ہے کتنی پریشان ہے۔“ مہناز کا منہ پرنا کا کی چیخ کے ساتھ اپنے بندوں کی انصاف اٹھائے گا تو لگ پتا جائے گا کہ کی باذل سے کتنا کڑا باؤل معاف نہیں کرتا ہے اپنے منہ لگنے والوں کو کتنا مہناز کے سمجھانے بجھانے کے باوجود وہ غصے کے اظہار سے باز نہیں آیا۔

”جب اگلے کے منہ پر چیخ مارنے کی تیاری ہے تو پھر اپنا موڈ کیوں آف کرتے ہو۔“ انجوائے کرو اپنا کھانا اور میرا ساتھ۔“ اس نے باذل کی طرف جھکتے ہوئے محبت کا بے باک اظہار کیا۔ دوسری طرف سے بھی بھرپور پذیرائی کی جانے لگی جس کا سلسلہ یقیناً دراز تھا لیکن ویڈیو وہیں ختم ہو گئی تھی۔

”کھانے کی میز پر بیٹھ کر کون پاگل ایسے عشق لڑاتا ہے۔“ گلو استاد نے منہ بتاتے ہوئے موبائل اسے واپس کیا تو اس کے حلق سے قہقہہ نکل گیا۔

”ایسے منہ پھاڑ کر کیوں ہنس رہا ہے بے؟“ استاد

نے اس کے ہنسنے کا برا منایا۔

”میں اس لیے ہنس رہا ہوں کہ پوری ویڈیو میں اگر تم نے کسی بات پر غور کیا تو صرف عاشقی کے سین پر۔“ اس نے سنجیدہ ہونے کی کوشش کی لیکن مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے پھوٹی پڑتی تھی۔

”ہائی باتوں پر غور کر کے کرنا بھی کیا ہے۔ اپنی کی تیاری پوری ہے۔ سالا اپنے کو ڈٹل کر اس کرنے کی کوشش میں خود ہی منہ کے بل گر جائے گا۔“ استاد نے بے نیازی سے جواب دیا اور سگریٹ کی ڈبیا سے ایک سگریٹ نکال کر اسے سلگانے لگا۔ اس نے استاد کی اس بے نیازی کو سانس کی نظروں سے دیکھا اور مطمئن سا اٹھ کر اپنے لیے مخصوص کمرے میں چلا گیا۔ چند گھنٹوں بعد وہ گہرے رنگ کا دردار شلوار قمیض زیب تن کیے روائگی کے لیے تیار تھا۔ لباس کے اوپر اوڑھی اجڑک اور سر پر دھری سندھی ٹوپی اس کے چہرے پر ایک عجیب سا سادہ دے دیا تھا۔ رہی سہی کسر نے اس کو چھوٹے سے کھٹکے کو کدھر بٹا کر پوری کر دی تھی۔

”میں تو اب سب سے زیادہ شہزادہ کی تو نہ جانے تیرے بغیر بھی کام ہو جائے گا۔“ استاد نے کئی بار کئی بات کو دہرایا۔

”کیا چڑیاں پہن کر بیٹھ جاؤں؟“ وہ بھی باوجود ایک بات سن کر جھنجھلا گیا تھا۔

”یہ بات نہیں ہے بچے..... بس خیال آتا ہے کہ تو نے بہورانی سے شرافت کی زندگی گزارنے کا وعدہ کیا تھا لیکن اب اس وعدے کو توڑ کر نقل و غارت کے لیے جا رہا ہے۔“ گلو استاد نے اپنے اصرار کی وجہ بیان کی۔

”میں اسے دھوکا نہیں دے رہا استاد! میں نے اس سے جرم کی راہ چھوڑنے کا وعدہ کیا تھا اور اپنے اس وعدے پر قائم ہوں۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ اس وقت میں جرم کرنے نہیں بلکہ بھروسوں کو ان کے انجام تک پہنچانے جا رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ وہ یہاں سے دور بیٹھی اس وقت بھی میری کامیابی کی دعا کر رہی ہوگی۔“ اس نے گلو کا ہاتھ تھامے ہوئے جذباتی لہجے میں اسے جواب دیا۔

”تو مطمئن ہے تو پھر ٹھیک ہے لیکن یاد رکھنا خواہ وہ خود کو خطرے میں نہیں ڈالتا بلکہ حالات خراب ہوئے تو سب سے پہلے اپنی جان بچا کر نکلنے کی فکر کرنی ہے۔“

”یہ تم مجھے کیسے سبق پڑھا رہے ہو استاد؟“ اس پر بیک وقت حیرانی اور جھنجھلاہٹ نے حملہ کیا۔

”جان ہے تو جہان ہے شہزادے! تجھے یہ جنگ بس اس حد تک لڑنا ہے جہاں تک تیری جان کو خطرہ نہ ہو۔ میں بہورانی سے وعدہ کر کے آیا ہوں کہ تجھے ہر حال میں اس تک سلامت واپس بھجواؤں گا۔“

”تمہاری بہورانی خود بھی دیوانی ہے اور تمہیں بھی دیوانہ کر دیا ہے۔ اب اس کی ان باتوں کو چھوڑو اور چلنے کی تیاری کرو۔“ بظاہر اس نے گلو استاد کو جھڑکی دی تھی لیکن اپنی دلربا کے خیال سے آنکھوں میں ایک نرم سا تاثر جاگ گیا تھا اور دل اڑ کر اس تک پہنچنے کے لیے پھلنے لگا تھا لیکن ابھی دل کی نہیں، دماغ کی ماننے کا وقت تھا۔

ان کا سفر شروع ہو گیا۔ یہ ایک خاما طویل سفر تھا جو پختہ شاہراہوں پر سے گزرتے ہوئے تو محسوس نہیں ہوا لیکن جب کچے کچے اور تاریک راستوں پر پہنچے تو آرام دہ گاڑیوں اور ماہر ڈرائیورز کی موجودگی کے باوجود جھٹکے لگنے لگے۔ کچے راستے پر آنے کے بعد سے انہوں نے گاڑیوں کی بھی تمام لائسنس، بھگادی قمیض اور بہت مختا انداز میں آگے بڑھ رہے تھے۔ موبائل کو اپنی ہتھیلی کی اوٹ میں رکھے وہ ڈرائیور کو جی پی ایس لوکیشن کے مطابق آگے بڑھنے کے لیے ہدایات دے رہا تھا۔

”کیا راستہ ہے رپورٹ لو استاد!“ ایک جگہ راستہ بدلتا تھا اور اس نے گلو استاد سے کہا۔ استاد فوراً اس حکم میں جت گیا۔

”سب سے زیادہ شہزادہ کی تو نہ جانے کچھ دیر پہلے لطف سومرو کی گاڑیوں کے ہتھکنڈے کی گاڑیوں میں یہاں سے گزر رہے ہیں۔“ کچھ دیر بعد ہی وہ رپورٹ دے رہا تھا جسے سن کر اس نے محض ہلکا سا اشارہ کر کے سفر جاری رکھنے کے سلسلے میں راہنمائی جاری رکھی۔

”بس یہاں روک لو۔ اب ہم بہت قریب ہیں۔ اس سے آگے گاڑیوں میں گئے تو وہ انہوں کی آواز سن سکتے ہیں۔“ ایک جگہ اس کی ہدایت پر گاڑیاں روک لی گئیں اور ڈرائیورز کو چھوڑ کر سب کے سب اپنے ہتھیاروں سمیت نہایت خاموشی سے آگے بڑھنے لگے۔ کچھ دور دکھائی دیتی مدھم روشنی منزل کی طرف ان کی راہنمائی کر رہی تھی۔ دیرانے میں لطف سومرو کا ڈرائیور کی مدد سے آج پھر روشن تھا اور لطف سومرو فکار کے بھانے اپنے ساتھیوں سمیت وہاں براجمان اپنے ان غیر ملکی مہمانوں کا خیر تھا جن کا لایا ہوا مال اسے تو مالا مال کر دیتا تھا لیکن ملک کی جڑیں کھوکھلی کرتا جا رہا تھا۔

ان سب نے نہایت ہوشیاری اور چابکدستی سے ڈیرے کے آس پاس اپنی اپنی پوزیشن سنبھال لیں۔ آگے بہت صبر و تحمل سے ہدایات کے مطابق عمل کرنا تھا۔ پہلا مرحلہ انتظار کا تھا جو خوش قسمتی سے زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا۔ پہلے گاڑیوں کے انجنوں کی دھمکی آوازیں سنائی دیں پھر انسانی قدموں کی چاپیں اور سرگوشیاں بھی سنائی دینے لگیں۔ وہ سب اپنی اپنی جگہ دم سادھے بیٹھے رہے کہ اس مرحلے پر انہیں کوئی دخل اندازی نہیں کرنا تھی۔ بیرونی دشمنوں کے مقابلے میں اندرونی دشمنوں اور غداروں سے ترجیحاً نمٹنے کا فیصلہ پہلے ہی ہو چکا تھا۔ آنے والے آئے اور ان کی گاڑیوں میں لد امال خاموشی سے لطیف سومرو کی مہیا کردہ گاڑیوں میں لا دیا گیا۔ اس کام کی تکمیل کے بعد سواروں نے واپسی کی راہ اختیار کی اور چھپر بیٹھے افراد کو جانے دیا۔

آکھڑا لطف لانی کے لیے خود باہر
کے منہ میں ہی لے گیا۔ وہاں کاٹریوں کے ڈرائیورز
نے ابھی اپنے قدموں کو گولٹ ہی مٹی کی فائرنگ
کی تیز آواز سے گونج ابھی۔ کئی اڑھائی گز کے
لیکن پھر فوراً ہی جوابی کارروائی شروع ہو گئی تھی۔
دلوں طرف کے لوگوں کو حاصل تھی لیکن گلو استاد و ان
پارٹی کو حملہ آور ہونے کے ناطے یہ تھوڑا سا فائدہ حاصل
ہو گیا تھا کہ وہ پوری منصوبہ بندی کے ساتھ وہاں آئے
تھے جبکہ انگوں کے لیے وہ ان کی معمول کی کارروائی تھی
جس میں وہ بس معمول کے حساب سے ہی چوکنے تھے
لیکن بہر حال وہ ان کی جگہ تھی اور ان کے پاس ایک
عمارت کا تحفظ بھی موجود تھا۔ باہر والوں کو بے شک پہلے
ہلے میں شدید نقصان پہنچا لیکن ڈیرے کی چھت پر
موجود افراد نے موثر کارروائی کرتے ہوئے گلو استاد کے
ساتھیوں کے آگے بڑھتے قدم روک دیے۔

اس ساری کارروائی کے دوران مختصی بالوں اور
بھوری آنکھوں والے کو سب سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی
کہ اسے لطیف سومرو کو نشانہ بنانے میں کوئی مشکل پیش نہیں
آئی تھی۔ اس نے پہلے ہی مرحلے میں اسے شناخت کر کے
سیدھا اس پر قائر کیا تھا لیکن اس خیال کے ساتھ کہ گولیاں
صرف سومرو کے نچلے حصہ کو نشانہ بنائیں۔ وہ اس وطن فروش
کو آسان موت نہیں دینا چاہتا تھا۔ اب اس نے جو کچھ اس
کے ساتھ کیا تھا، اس کے بعد سومرو یا تو عمر بھر کے لیے محذور

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر ہو جوان
کی داستان جو غلط کاروں کے لیے
فضیلت ناک تھا باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیے



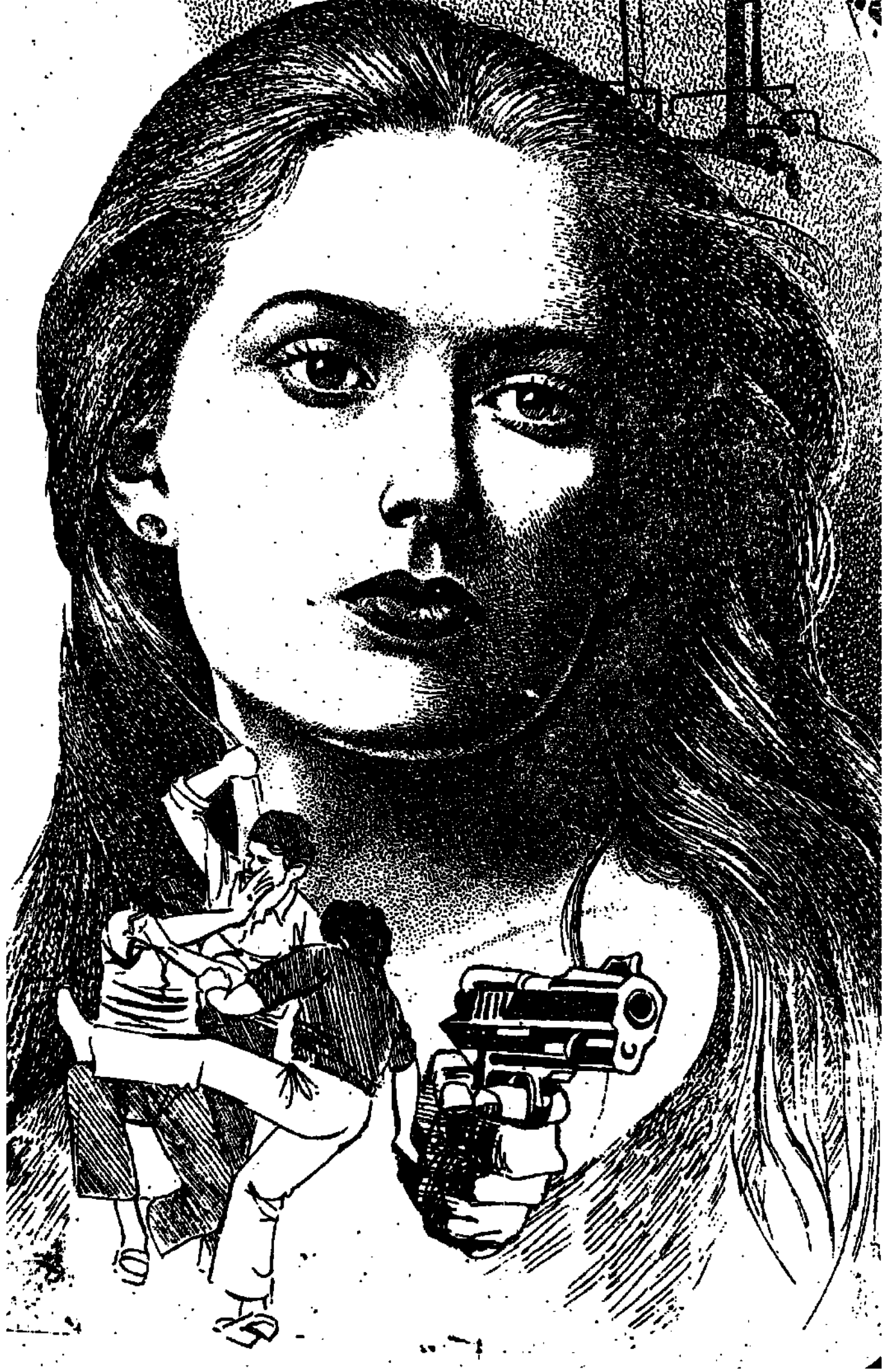
قسط: 29

سہارا

ایمان داری

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ نابھوار یوں
کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عتقانہ ہوں اور بدقسمتی
سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں نا انصافیوں کی تند و تیز
آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف جنون
حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابل شکست بتایا تو دوسری
طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پُر عزم
نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جارہے
تھے... اس کی زندگی جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور
روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو
اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے
طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک
تھی... اس کی بے قرار یوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار
اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار
مان لیتا... اگرچہ تاریک عبوت نے ملاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چور
لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ پروار کا توڑ کرتا حق و باطل کی
ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ وارداتِ قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں
حائل نہ ہوسکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تھرا گیز داستان



معاذ ایک ذہین لیکن متلون مزاج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جوائن کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور اچھے مہذب پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ انسٹی ٹیوٹ سے واپس آ رہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو سڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی بڑی فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشری نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بشری ماس کیونی کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اختیاریہ کے لیے کالم وغیرہ لکھتی ہے۔ اس ویران جگہ بھی وہ ایک زیرِ تعمیر رہائشی منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی آئی تھی۔ معاذ بشری کو یہ ضمانت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کر دیتا ہے لیکن جن رئیس زادوں سے اس نے ان کا شمار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ یہ موقع انھیں یونیورسٹی ٹرپ کی صورت میں مل جاتا ہے اور ایک دن جنگل کی سیر کے دوران وہ فوٹو گرافی کے شوق میں سب سے الگ تھلک ہو جانے والے معاذ کو بے خبری میں گھر کر بری طرح زد و کوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دے دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس نہ آنے پر انتظامیہ کے افسر اور پولیس اور ریسکیو ذرائع کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جگہ کی جمبو پڑی میں پاتا ہے۔ اپنی حالت سے اسے اپنے شدید زخمی ہونے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ جو کہ اپنی خاص جڑی یونیورسٹی کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ معاذ کا موبائل جنگل میں ہی کہیں گر جاتا ہے اور جوگی کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا جس سے باہر کی دنیا سے رابطہ کیا جاسکے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے۔ جوگی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نوازا کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے پراسرار علم سکھانے کی ہامی بھر لیتا ہے اور معاذ واقعی اس سے بے علم سیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ادھر جانے وقوع سے لپٹے والے معاذ کے گھر سے جب تصویریں نکلائی جاتی ہیں تو بہت سے قدرتی مناظر کی تصویریں بھی سے ایک ایسی تصویر بشری کی نظر میں آ جاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پروجیکٹ کے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشری تحقیق کر رہی تھی۔ بشری کے اپنے والد جرنلٹ ہوتے ہیں اور حق گوئی ان کے خون میں شامل تھی۔ اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشری کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ مدد سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باؤل نامی شخص کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشری انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دنوں میں ہی معاذ واپس کا ارادہ کرتا ہے تاہم ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا اعرقان اللہ اور یزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو دقاس نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باؤل اچانک بشری کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر دیتا ہے۔ معاذ کو واپس لانے کے لیے اچھے جھکٹے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اسے واپس آنے کا پیغام دیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کر کے اسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات لی جاتی ہیں، نہ بتانے پر اس کے بھائی کا ایک گردہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشری بھی انتقام کی آگ میں جلتی ہوئی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہو جاتی ہے۔ معاذ کو بچانے والا لڑکا دقاس اپنے گرو کے ساتھ ایک پارٹی میں جاتا ہے۔ وہاں اسے معاذ کے حوالے سے مشکوک ایک شخص نظر آتا ہے۔ وہ اس کے پیچھے جاتا ہے مگر اسے گھیر لیا جاتا ہے۔ بہر حال دقاس کو سمجھ کے ساتھ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ادھر معاذ کے دوست عالم شاہ کے بیٹوں کو گل کروایا جاتا ہے۔ معاذ کئی فنون میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے جہان نگر کر کے اس کے دماغ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ فیض سے حاصل انوکھے علم کی بدولت ان کا معمول نہیں جتا۔ بشری، کامران کو چھاپنے کا پروگرام بناتی ہے۔ ادھر عالم شاہ سراغ لگا لیتا ہے کہ اس کے بیٹوں کا قتل کس نے کیا۔ وہ قاتل کو گھیرتا ہے اور اپنے تئیں اسے گولیاں مار کر گل کر دیتا ہے۔ تاہم وہ قتل جاتا ہے۔ اس کے پیچھے پولیس لگ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور اس کا نوکر سرد، باؤل کے پیچھے چڑھ جاتے ہیں۔ عالم کی بہن گل شاہ کے نو مولو بیٹے کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اغوا کا الزام لطیف سومرو پر آتا ہے۔ عالم شاہ، باؤل کی قید میں موجود ایک ذہنی شخص کی مدد سے وہاں سے فرار ہو جاتا ہے۔ ادھر بشری دعویٰ کرتی جاتی ہے۔ وہاں دقاس اسے پارٹی کے روپ میں پہچان لیتا ہے اور ان دونوں کے درمیان احمق کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ وہ سلطان کو مارنا چاہتی ہے تاہم دقاس اسے ایسا کرنے سے روکتا ہے۔ ادھر عالم شاہ، باؤل کی قید سے نکل کر اس کا پیچھا کرتا ہے تاہم وہاں اچانک فائرنگ اور دھماکے ہونے لگتے ہیں۔ وہ وہاں معاذ کو دیکھتا ہے۔ صداقت شاہ، لطیف سومرو کو گھیرنے کے لیے اس کی غیبت ہی اور بچے کا کھوج لگاتے ہیں اور بچے کو اغوا

کر لیتے ہیں۔ لطیف سومرہ مجبور ہو جاتا ہے۔ معاذ کو اس کے گھر والوں سے ملنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ عالم شاہ کو اس کے والد اعجاز کو روک کر کاغذ دیتے ہیں۔ ادھر معاذ بھی ایک مشن پر سونیا کے ساتھ اعجاز یا روانہ ہوتا ہے تاہم کچھ لوگ سکھ یا تریوں سے بھری بس کو پرغال بنا لیتے ہیں۔ معاذ اور سونیا خانے کے تمام افراد کو لٹکانے لگا دیتے ہیں تاہم باہر موجود دیگر افراد کو روک سے مقابلہ ہوتا ہے اور معاذ زخمی ہو جاتا ہے۔ صدرات شاہ کے اعجاز میں موجود رشتے دار کے ہاں شادی ہوتی ہے۔ عالم شاہ، بگل اور سرد اعجاز یا روانہ ہو جاتے ہیں۔ اعجاز رٹ سے گھر رو آگئی پر راتے میں کچھ لٹیرے انہیں لوٹ لیتے ہیں۔ عالم شاہ انکسٹن میں آنا چاہتا ہے تاہم اجالا نامی عالم شاہ کی کزن اس کا راستہ روک لیتی ہے۔ گھر پہنچنے پر پولیس کی ریڈ ہوتی ہے اور وہ عالم شاہ اور سرد کو لے جاتے ہیں۔ ادھر بشری اور وقاص باؤل کو اسپتال میں مارنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ جگ جاتا ہے۔ معاذ اور سونیا پناہ کی تلاش میں ہوتے ہیں اور بالآخر اپنے سہولت کاروں سے مل جاتے ہیں۔ عالم شاہ اور سرد کو تشدد کا نشانہ بنا کر دیرانے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ وہاں اپنے میزبانوں کے ہاں بھیجے جاتے ہیں۔ شادی کے دوران انہیں پتا لگتا ہے کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں اجالا اور اس کا عاشق شامل ہوتے ہیں۔ وہ چپ کران کی پانچم سن رہا ہوتا ہے کہ اسے چھاپ لیا جاتا ہے۔ تاہم وہاں مارا ماری ہوتی ہے اور اجالا کا عاشق مارا جاتا ہے۔ پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ ان کے کزن انہیں اپنے دوسرے خفیہ ہنگے پر پہنچا دیتے ہیں جہاں کچھ لوگ ان پر حملہ کر دیتے ہیں۔ وہ وہاں سے بھاگتے نکل جاتے ہیں۔ ادھر معاذ کو سونیا اپنے ساتھ نئے مشن پر لے کر جاتی ہے جس میں ایک ریلوے لائن کو دھماکے سے اڑانا ہوتا ہے۔ معاذ ایسا نہیں چاہتا اس لیے وہ ٹرین کی آمد سے قبل بارودی دھماکا کر دیتا ہے۔ وہ زخمی ہو جاتا ہے اور اسے ہندو سا دھواہی کٹیا میں لے جاتا ہے جہاں اس کی امچی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ سونیا کے آدمی معاذ کو تلاش کرتے ہیں مگر ناکام ہو جاتے ہیں۔ ادھر عالم شاہ اور سرد خفیہ ذریعے سے باڈر پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ دھریے جاتے ہیں اور ”را“ کی قید میں بھیجے جاتے ہیں۔ انہیں تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ادھر بشری باؤل کو مارنے کی کوشش میں خود نشانہ بن جاتی ہے۔ معاذ سا دھواہی مدد سے ایک انٹرین ہیرڈن کے گھر بھیجے جاتا ہے۔ وہاں اسے عالم اور سرد کی گرفتاری کا پتا چلتا ہے۔ ادھر بگل کو اس کا شوہر ذہنی اذیت دیتا ہے۔ معاذ ڈاکٹر فردوس سے ملتا ہے اور اسے بگل کی مدد کرنے کا کہتا ہے۔ عالم اور سرد قید سے فرار کا سوچتے ہیں اور دھریے جاتے ہیں جس کی پاداش میں انہیں مزید تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ معاذ، وحشا کے ذریعے عالم اور سرد کو رہائی دلوانا چاہتا ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ اس کا بیچا کرتا ہے تاہم وحشا کی گاڑی حادثے کا شکار ہو جاتی ہے۔ علیہ اور وقاص وغیرہ کو لالہ بیٹی ملک سے باہر نکال دیتا ہے اور ہر ممکن احتیاط کی ہدایت کرتا ہے لیکن علیہ پاکستان میں ٹوپیہ سے رابطہ کرتی ہے جو ان کے لیے مصیبت بن جاتا ہے۔ ٹوپیہ پر تیزاب پھینک دیا جاتا ہے۔ ادھر معاذ بگل کے لیے پریشان ہوتا ہے اور اسے وہاں سے نکالنا چاہتا ہے وقاص، علیہ اور اس کے گھر والوں کو مار دیا جاتا ہے۔ معاذ سب جاش نامی شخص کے خلاف کارروائی کرتا ہے تاہم وہ مارا جاتا ہے اور معاذ بھی زخمی ہو جاتا ہے اور اپنا نشان وہاں چھوڑ دیتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس معاذ کو دیوانی شخص سے مدد لینے کا کہتی ہے۔ معاذ اس کے ساتھ مل کر موہن نامی ”را“ کے ایجنٹ کو اغوا کر لیتا ہے۔ معاذ اپنے کزن کو پاکستان کال کرتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ اس کے گھر والوں کو مار دیا گیا ہے۔ وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کی ٹھان لیتا ہے۔ ادھر ڈاکٹر فردوس کو اس کے سرسٹال والے بگل کو بھگانے کی پاداش میں تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ معاذ، عالم اور سرد کی رہائی کے لیے کارروائی کرتا ہے اور انہیں ”را“ کی قید سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن عالم اور سرد کو دیوانے کے آدمی کسی دوسری جگہ پہنچا دیتے ہیں۔ سونیا معاذ کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتی ہے اور اسے اپنے تعاون اور مدد کی تحنیں دہائی کر دیتی ہے۔ ادھر باؤل ایک جگہ لالہ بیٹی کی موجودگی پر کارروائی کرتا ہے تاہم لالہ خود کو گولی مار کر ختم کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس کا انتقال ہو جاتا ہے۔ دیوانی گینگ ڈاکٹر فردوس کی میت اٹھنے پر وہاں قاتل تک کر دیتے ہیں۔ بھگیل اور جلیل مارے جاتے ہیں اور فیصل اور پانڑے زخمی ہو جاتے ہیں۔ پولیس دیوانی کو گھیر لیتی ہے۔ معاذ دیوانی اور اس کے آدمیوں کو نکالنے کے عوض عالم کا پتا معلوم کر لیتا ہے۔ سونیا اور معاذ حیدر آباد لواب بدرالدین کی حویلی بھیجے جاتے ہیں۔ تاہم کالے خان اور رادھا دیوی کو میڈم ایکس کے قہقہے سے چڑانے کے لیے انہیں وہاں آنا پڑتا ہے، کالے خان کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ، بگل کو ہوش بھل کرنے کے لیے گل خان کو قہم دیتا ہے اور اس کا خیال رکھنے کو کہتا ہے۔ معاذ لواب صاحب کی حویلی میں عالم اور سرد کی رہائی کے لیے کارروائی کرتا ہے مگر لواب صاحب کا چٹان کے سامنے آ جاتا ہے۔ وہ بگل کو بھی اغوا کر کے حویلی لے آتا ہے۔ تاہم وہ لوگ حبید کو قہقہے میں کر کے وہاں سے نکل جاتے ہیں۔ وہ لوگ بے ٹھکانے پر پہنچتے ہیں تو وہاں معاذ سے ملنے کوئی آتا ہے۔ معاذ اور اس کا ساتھی چو کنا ہو جاتے ہیں۔ ادھر وقاص اور گو لطیف سومرہ کے اسٹینک کے مال کو لوٹنے کے لیے کارروائی کرتے ہیں لیکن وہاں پولیس دھاوا بول دیتی ہے۔

آبِ حیات و آفتابِ حیات

وہ بچہ کج کار نہ تھا بلکہ ایک مددگار گریج والا
تہہ تھا جس نے دلزلے کی صورت حال پیدا کر دی تھی۔
آئی ہول سے آنکھ لگائے کھڑے معاذ نے حیرت سے قہقہے
اٹھائے اس نیم نیم شخص کو دیکھا۔ ایک بھولا بھالا کمین شیو چہرہ

کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ جادو کے اندر کچھ ایسا تھا جو اسے اس کے بارے میں مثبت سوچنے پر اکسارہا تھا۔
 ”ہا ہا ہا.....“ اس کی بات سن کر جادو نے اپنا وہی زلزلہ برپا کر دینے والا قہقہہ لگایا۔ معاذ نے اس قہقہے پر اسے حیرت سے دیکھا کیونکہ اس کے حساب سے تو اس نے ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی جس پر ہنسا جائے۔

”ہا ہا یہ ہے یاد رکھو کہ یہ جو بندہ تمہارے سامنے بیٹھا ہے جبار علی عرف جادو..... یہ بندے کو آنکھ سے نہیں، کان سے پہچانتا ہے۔ اوپر والے نے یہ دو پیشینے ایسے دیے ہیں کہ آس پاس کی ساری صوتی شریات پکڑ بھی لیتے ہیں اور اسے دماغ میں محفوظ بھی کر لیتے ہیں۔ اس رات تمہاری سنی آواز دماغ کے کمپیوٹر میں محفوظ تھی۔ دیوار کے پار سے تمہیں بچے کے ساتھ کب شپ لگاتے سنا تو دماغ نے فوراً کلک کیا کہ یہ تو وہی شیر ہے جس نے ”را“ کے بل میں مٹس کر اسے مارا تھا۔ بس کچھ گپ کیا تم سے ملنے۔“ اس نے اپنے کانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کے سوال کا مفصل جواب دیا۔

”بہت شکریہ آپ کا۔ یہ بتائیں کہ آپ کے لیے ٹھٹھا منگواؤں یا گرم؟“ معاذ کو سمجھ نہیں آئی کہ اس ملاقاتی سے جو اس قدر پُر غلوں لہجے میں بول رہا ہے، کیا سلوک کرے۔ چنانچہ ریکی مہمان نوازی ہی نبھانے لگا۔

”چھوڑو یار یہ تکلف کی باتیں۔ میں یہاں ٹھٹھا گرم پینے نہیں آیا ہوں بلکہ یہ پوچھنے آیا ہوں کہ میرے لائق کوئی خدمت ہے تو بتاؤ۔ میں تو اس رات بھی تمہیں بول کے آیا تھا کہ کسی قسم کی مدد کی ضرورت ہو اور کوئی کام ہو تو تمہیں میں غالب ابوالوی صاحب سے میرا پوچھ لینا۔“

”جی، بس کوئی ایسی ضرورت ہی نہیں پڑی۔“
 ”اوسے نہ کہ یار اچھے پتا ہے کہ تم اور تمہارے ساتھی مشکل میں ہو۔“

اس کے دعوے پر معاذ اس کا منہ نکتارہ گیا۔
 ”آکھیں، کان سب کچھ سنے رہتے ہیں جادو کے۔ پاورے حیدر آباد میں جو جگہ ڈھنگی ہوئی ہے اس سے بے خبر نہیں ہوں میں۔ اوپر سے مجھے تک سب کی دوڑیں لگی ہوئی ہیں۔ سن گئی تھی کہ کوئی نواب بدر الدین سے ہاتھ کر گیا ہے اور اس کی ناک کے پیچھے سے اس کے قیدیوں کو نکال لے گیا ہے۔ تمہاری یہاں موجودگی کا پتا چلا تو سارا چکر کھڑا آگیا۔ اس کام میں تو تم اپنے کو ایک پکھڑا لگتے ہو۔“ اس نے اپنی بات کے اختتام پر ایک آنکھ دبائی اور مٹی خیر سے ہنسا۔

اس کے سامنے تھا۔
 ”نہ ڈرو سرکار! میں کوئی جاسوس نہیں بلکہ دوست ہوں اور بڑی محبت سے تم سے ملنے آیا ہوں۔“ قہقہہ رکا تو اس نے بے تکلفی سے یوں دروازے کو گھورتے ہوئے کہا جیسے دروازے کے اس پار کھڑا بھی اسے دیکھ رہا ہو۔ معاذ کو اس کی آواز کچھ جانی پہچانی لگی۔ اس نے جی کی اشارے سے ہوشیار رہنے کا کہا اور خود آہستہ سے دروازہ کھول دیا۔
 ”جلو شکر ہے، کچھ تو اعتبار کیا تم نے۔“

”آپ کا تعارف؟“ معاذ نے اس کی بے تکلفی کو نظر انداز کرتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔

”بہتر ہے مجھے اندر بلا کر تعارف لے لو۔ آس پاس کوئی میرے جیسے حیر کانوں والا موجود ہوا تو مجھے اور تمہیں دونوں کو مصیبت پڑ جائے گی۔“ اس بار نوادہ نے بھی سنجیدگی اختیار کر لی۔ معاذ نے کچھ سوچتے ہوئے اسے اندر آنے کی اجازت دے دی۔ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے لان چیریز پر آ بیٹھے جبکہ جنگلی اپنی جگہ کھڑا جا کر رہا۔ وہ بے حد چرکنا تھا اور ذرا سی گڑبڑ کی صورت میں اس کا ہتھیار گولیاں برسانے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔

”مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو نہیں پہچان سکا۔“
 آنے والے کا انداز چونکہ دوستانہ تھا اس لیے معاذ نے بھی طریقے سے گھٹکھٹکا آغاز کیا۔

”ہماری ملاقات جس ہنگامہ خیر رات میں ہوئی تھی، اس میں تمہارے پاس موقع نہیں تھا کہ مجھے ڈھنگ سے دیکھ سکو۔ روشنی کا بھی مسئلہ تھا۔“

”کس رات کی بات کر رہے ہیں آپ؟ میں سمجھا نہیں۔“ اس کے جواب نے معاذ کو حیر پریشانی میں مبتلا کیا۔
 ”اس رات کی جب تم اپنے دوستوں کو ”را“ کی قید سے نکال لے گئے تھے اور ساتھ ہی میری رہائی کا بھی انتظام ہو گیا تھا۔“

”اوہ..... مسٹر جادو!“ معاذ کو وہ شخص یاد آگیا۔ اس رات اس شخص کو اس نے گھنی ڈاڑھی مونچھ اور درم زدہ چہرے کے ساتھ دیکھا تھا اس لیے فوراً پہچان نہیں سکا تھا۔
 ”صحیح پہچانا۔“ وہ خوش ہوا۔

”لیکن آپ نے مجھے کیسے پہچانا؟ اس رات تو آپ نے بھی مجھے صحیح سے نہیں دیکھا تھا اور اگر دیکھا بھی ہوتا تو اس وقت میں بالکل تبدیل شدہ چلے رہا ہوں۔“

یہ بات خوفناک تھی کہ کوئی شخص ایک ایسے خطرناک حوالے کے ساتھ اس سے ملنے آ پہنچا تھا لیکن اس نے انکار

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ کو کوئی غلط فہمی۔۔۔“
معاذ نے اس کی تردید کرنا چاہی۔

”اوتے نہ کریا رامیں اندران دو بندوں کی آواز بھی صاف سن رہا ہوں جنہیں تو اس رات چھڑا کر لے گیا تھا۔ وہ جولیڈ لارڈ ہے نا، وہ اپنے ملازم سے کہہ رہا ہے کہ عجیب معیت ہے۔ آسمان سے گرتے ہیں تو کجور میں اٹک جاتے ہیں۔“ ”را“ نے پھانس رکھا تھا۔ اب یہ نواب بدر الدین گھلے میں اٹک گیا ہے۔“ اس کے لہجے میں ایسا اعتماد تھا کہ معاذ کو کسی تردید کی ہمت نہیں ہوئی۔

”پریشان نہ ہو دوست امیری ذات سے تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی بلکہ جہاں تک ہو سکا میں تمہارے کام کی آؤں گا۔ ہم دونوں ہی دشمنوں کے ویش میں ہیں اور تمہارے احسان کے علاوہ بھی میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ تمہارے کام آؤں۔ ہمارے تمہارے درمیان محبت اور دوستی کی بنیاد میں صرف ایک احسان نہیں، برسوں پرانا تعلق موجود ہے۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتے۔“ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، معاذ اس کا پس منظر سمجھنے سے قاصر تھا اس لیے نا سمجھی سے اس کی صورت تنکرا رہا۔ اس کی اس کیفیت پر چارو نے ایک اور تہقیر لگا لی لیکن اس تہقیر کی ثبوت نسبتاً کم مٹی اس لیے بلکے پھٹکے تو محسوس ہوئے لیکن باقاعدہ زلزلہ نہیں آیا۔

”میں ایک مجاہد ہوں۔“ چارو نے سنجیدگی اختیار کی اور سرگوشی میں اسے اطلاع دی۔
”مطلب؟“

”مطلب یہ کہ کشمیری مجاہد۔ یہاں ایک خفیہ مشن پر تھا کہ ”را“ والوں نے دھریا۔ کوشش کر رہے تھے وہ کہ ماہرین اور تشدد سے مجھ سے میری اصلیت اگوا لیں کہ اللہ نے تمہیں میرے لیے فرشتہ بنا کر بھیج دیا اور آج میں آزاد ہوں۔“ وہ مزے سے اپنے بارے میں انکشافات کر رہا تھا۔
”مطلب بھارت کا یہ دعویٰ درست ہے کہ کشمیری مجاہدین خفیہ طور پر یہاں آکر دہشت گردانہ کارروائیاں کرتے ہیں؟“ اس کی زبان سے ایک ایسا سوال پھسلا جس نے چارو کے چہرے کے زاویے بگاڑ دیئے لیکن اس نے بہت تیزی سے خود کو سنہال لیا اور دھیمے مگر مضبوط لہجے میں بولا۔

”جو اس سے سب ان کی۔ اپنی زیادتیوں اور ظلم پر پردہ ڈالنے کے لیے اس قسم کا پروپیگنڈا کرتے ہیں یہ لوگ۔ میں یہاں کوئی دہشت گردی کی کارروائی کرنے نہیں آیا ہوں۔ میری یہاں آمد کا صرف ایک مقصد ہے اور وہ۔۔۔“

کہ یہاں اپنے وطن کے خلاف ہونے والی سازشوں کا کھوج لگا سکوں تاکہ ہمارے پاس آنے والے وقت سے خشنی کے لیے کچھ تو تیاری ہو۔ تمہارے خیال میں اپنے لوگوں اور اپنے وطن کی حفاظت کے لیے یہ سب کرنا کسی قسم کی دہشت گردی ہو سکتی ہے؟“ بولتے بولتے آخر میں اس کا لہجہ کسی قدر تلخ ہو گیا تھا۔ معاذ نے خود ہی اپنے سوال پر شرمندگی محسوس کی۔

”تم بالکل درست کہہ رہے ہو دوست! مجھے بلکہ میرے تمام ہم وطنوں کو تمہارے ساتھ ہمدردی ہے اور ہم وادی میں ہونے والے ہر قتل کا درد اپنے دل میں محسوس کرتے ہیں۔“

”مجھے معلوم ہے جیسی تو میں نے تم سے کہا تھا کہ ہمارے تمہارے درمیان برسوں پرانا تعلق ہے اور ہم ایک دوسرے کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتے۔“ اس نے معاذ کا شرمندہ ہونا محسوس کر لیا تھا چنانچہ کشادہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے چہرے پر مسکراہٹ سجائی پھر موضوع گفتگو بدلتے ہوئے کہا۔
”کچھ اپنے بارے میں بھی تفصیل بتاؤ۔ تمہوڑا بہت مجھے قید کے دوران اور کچھ میڈیا کے ذریعے معلوم ہوا لیکن تصویر پوری طرح واضح نہیں ہے۔“

”بہت طویل داستان ہے۔ کبھی فرصت میں سناؤں گا۔“ معاذ نے اسے ٹال دیا۔ دل بے شک چارو پر اعتماد کے لیے تیار تھا لیکن مصلحت کا تقاضا تھا کہ احتیاط برتی جائے۔

”چلو جب فرصت ملے، بتا دینا۔ میں اور تمہارے پڑوس میں ہی ہوں اور ایک آواز پر تمہاری مدد کے لیے حاضر ہو سکتا ہوں۔“ وہ یقینی طور پر ذہین آدمی تھا جو اس کا گریز بھانپ کر اصرار نہیں کیا اور یکدم ہی وہاں سے جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

”اتنی اچانک کہاں چل ڈیے۔ میں نے تو آپ کو جانے پانی کا بھی نہیں پوچھا۔“ معاذ بھی اس کی عیروبی میں گھڑا ہو گیا اور شرمندہ سا بولا۔

”جانے پانی پھر کبھی سہی۔ ابھی مجھے ایک اہم کام یاد آ گیا ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے معاملے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو معاذ نے اس کا ہاتھ تمام لیا۔ چارو کے اعزاز میں ایک گرجوٹی سی تھی۔ معاذ نے بھی جرجوٹی کا مظاہرہ کیا اور احتراماً اسے چھوڑنے دروازے تک گیا۔ واپس پلٹ کر اندر آیا تو سونیا کو اپنا منتظر پایا۔

”کون تھا یہ شخص؟“ اسے چارو کی وہاں آمد کا علم ہو چکا تھا۔

”تھا ایک پرانا جاننے والا۔“

”پرانا جاننے والا اس نئے طبقے میں جنہیں کیسے پہچان کر یہاں لئے پہنچ گیا؟“ سونیا کوئی عام عورت نہیں تھی کہ اس کے ہالنے سے آسانی سے ٹل جاتی۔

”پڑوس میں آباد ہے اوزلیہ کالوں والا ہے۔ میری آواز سے مجھے پہچان کر یہاں تک پہنچا ہے۔“

”اور تمہیں اس پر ذرا بھی تشویش نہیں ہے؟“ سونیا کو اب بھی اس کے جواب نے مطمئن نہیں کیا۔

”تشویش کا اظہار کرنے یا نہ کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم جن حالات میں گھرے ہیں، یہ پورے کے پورے تشویشناک ہیں۔ ان حالات میں ایک دوست کی آمد سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔“ وہ سونیا کو جادو کے بارے میں بتانے سے گریزاں تھا اور یہ بات سونیا نے محسوس کر لی

چنانچہ کچھ خفا اور بھرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

”مجھے لگتا ہے کہ میں اپنی نیک نیتی ثابت کرنے کے لیے اپنی جان بھی دے دوں گی تو تم بھی مجھ پر اعتبار نہیں کرو گے۔“

”میں تم سے کچھ نہیں چھپا رہا۔ اس لیے یہ خواہواہ کی ایموٹل بلیک میلنگ بند کرو۔“ اس نے سونیا کے انداز پر

چڑچڑے پن کا مظاہرہ کیا۔ حقیقتاً اس وقت وہ اس بات پر چڑا تھا کہ سونیا کو ناقابل اعتبار سمجھتے ہوئے بھی کہیں اندر اسے اس کی نیک نیت پر یقین آتا جا رہا تھا اور اس نیک نیتی کے پیچھے موجود جذبہ بھی عیاں ہونے لگا تھا۔ سونیا کا اپنی

طرف جھکاؤ اسے جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر رہا تھا۔

”کیا بات ہے بھائی! کس بات پر جھگڑ رہے ہو دونوں؟“ عالم شاہ اندر سے نکل کر آیا اور ان دونوں کی بلند آوازیں سن کر اس نے اندازہ لگایا تھا کہ ان کے درمیان

کسی بات پر بحث چل رہی ہے۔

”ہمارے جھگڑے کو چھوڑو اور خود ذرا صحت حاصل پکڑو ورنہ آسمان سے گر کر کجور میں اتر گئے کے بعد وہیں اگلے

برہ جاؤ گے۔“ خراب موڈ کے باعث اس نے عالم شاہ کو بھی لٹاؤ کر رکھ دیا۔

”تم چھپ چھپا کر ہماری باتیں سننے ہو؟“ عالم شاہ بھی اس کا طعنہ سن کر بگڑ گیا۔

”مجھے ایسی بے ہودہ عادت نہیں ہے۔“

”ایسی عادت نہیں تو پھر تمہیں اس بات کا کیسے پتا چلا جو ابھی تھوڑی دیر پہلے میں سرمد سے کر رہا تھا۔“ عالم شاہ اس کے انکار کو خاطر میں نہ لایا۔

”یہ ٹھیک کہہ رہا ہے عالم! یہ بہت دیر سے باہر لان پر تھا اور ابھی ابھی میرے سامنے اندر آیا ہے۔“ سونیا نے دونوں دوستوں کو ایک دوسرے کے مد مقابل دیکھا تو جلدی سے معاذ کی صفائی پیش کی۔

”اگر یہ سچ ہے تو اسے اندر کمرے میں ہونے والی گفتگو کا کیسے پتا چلا؟“ عالم شاہ کا مزاج ہنوز زبردست تھا۔

”اس کا ایک لمبے کالوں والا دوست اس سے ملے آیا ہوا تھا۔ شاید اسی نے خبر دی ہو۔“ سونیا نے بہت جلدی نتیجہ اخذ کر لیا۔

”ہیں دوست..... اور یہاں؟“ عالم شاہ کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

”مکی تو میں اس سے پوچھ رہی تھی لیکن یہ جواب دینے کے بجائے مجھ سے لڑنے لگا۔“ وہ فوراً معصوم بن گئی۔

”یہ کیا پکڑ ہے معاذ؟“ عالم شاہ نے اسے گھورا۔

”جو بھی پکڑ ہے، میں تمہیں بتا دوں گا لیکن تم اس کے پکڑ میں نہ آؤ۔ یہ ہم دوستوں کو لڑوا کر خود اپنا التوسیدہ حاکم کرنا چاہتی ہے۔“ معاذ نے تیزی سے اپنے مزاج پر قابو پایا اور

رازدارانہ لہجے میں بولا تو عالم شاہ نے ایک لمحے تک بذب سے اسے دیکھا پھر سونیا کے مقابلے میں دوست کے حق میں

احقاد کا ووٹ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ سونیا اس گٹھ جوڑ پر بھنائی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

☆☆☆

سائرن کی بلند سے بلند تر ہوتی آوازیں اعلان کر رہی تھیں کہ پولیس والے ان کے قریب آتے چلے جا رہے ہیں۔

”شہزادے.....“ گلو استاد نے ایک بار پھر اضطراب سے اسے پکارا۔

”سومرو والی گاڑیاں ایک قطار میں چھوڑ کر سب اپنی گاڑیوں میں واپس آ جاؤ۔ میں صرف دس تک منتی گلوں گا۔

اس کے بعد تم میں سے کوئی ان گاڑیوں کے قریب موجود نہیں ہونا چاہیے۔ اور ہاں دیکھو، دائیں جانب سے نکلنے کی کوشش کرو۔ میرا اندازہ ہے کہ اس طرف پولیس کا دباؤ کم

ہے۔“ وہ جو اس نے خاموشی کے چہرہ پر بتائے تھے، وہ خالص نہیں کیے تھے بلکہ آنکھیں اور کان کھولے سارا حساب کتاب کرتا رہا تھا۔

”تم یہ مال یہیں چھوڑ جاؤ گے؟“ گلو کو اندازہ ہوا کہ وہ اتنی محنت سے حاصل کیا گیا مال چھوڑ کر جانے لگا ہے تو بے چین ہو گیا۔

”اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ میں نہ اپنے ساتھیوں کی لاشیں گردانا چاہتا ہوں اور نہ وردی والوں کی۔“ اس نے اٹل لہجے میں گلو کو جواب دیا اور گنتی شروع کر دی۔

”ایک، دو، تین.....“ گنتی سمجھتے ہوئے وہ اپنی والی گاڑی سے باہر نکل آیا تھا اور گلو کو اشارے سے ڈرائیو تک بیٹھ سنبھالنے کو کہا۔

”نو، دس.....“ ایک قسطل سے گنتی سمجھتے ہوئے جیسے ہی اس کے ہونٹوں سے دس نکلا، گلو نے اپنے سامنے برقی سی کوئرتے ہوئے دیکھی اور ایک کے بعد ایک قطار سے کھڑی گاڑیاں دھماکوں کے ساتھ آگ کے گولوں میں تبدیل ہونے لگیں۔

”چلو۔“ آخری گاڑی کے اڑتے ہی وہ بھاگتا ہوا اپنی گاڑی میں بیٹھا اور چلا کر گلو سے بولا۔ گلو پہلے ہی تیار تھا۔ فل اسپڈ میں گاڑی دوڑا دی۔

”کوشش کرنا ہے کہ پولیس سے سامنا ہونے کی صورت میں انہیں جانی نقصان پہنچائے بغیر آگے بڑھ سکو۔“ اس نے خود سے چند ثانیے قبل روانہ ہو جانے والے ساتھیوں کو ہدایت دی۔

”ٹھیک ہے جناب۔“ دوسری طرف سے بھی باری باری یقین دہانی کروائی گئی اور وہ قدرے مطمئن ہو کر عقب نما آئینے میں پیچھے کا منظر دیکھنے لگا۔ گاڑیاں قریب قریب ایک قطار میں کھڑی کی گئی تھیں اور اب ان کے چلتے کا منظر یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے آگ کی ایک دیواری ہو۔ پولیس کی بیشتر گاڑیاں آگ کی دیوار کے اس پار آ کر رکنے لگی تھیں۔ اس نے دو جیپوں کو اپنے تعاقب میں آتے ہوئے دیکھا تو ایک بار پھر دستی ہوں کا استعمال کیا۔ تعاقب میں آتی جیپیں ان کا نشانہ نہیں تھیں۔ اس لیے ہم ان تک پہنچنے سے پہلے ہی زمین پر گر کر پھٹ گئے لیکن تعاقب میں آتی جیپوں کو اشارہ مل گیا کہ اگر اب بھی نہ رکنے تو اگلی بار خود نشانہ بن جائیں گے۔

ہوں کے ان دھماکوں کے دوران اس نے فائرنگ کی آوازیں بھی سیں۔ یہ آوازیں اسی سمت سے آرہی تھیں جس سمت وہ آگے بڑھ رہے تھے۔ یعنی ان کے آگے جانے والے ساتھیوں نے راستہ صاف کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ آگے بڑھے تو دو پولیس کی گاڑیوں کو ناکارہ حالت میں رستے میں کھڑا دیکھا۔ دونوں گاڑیاں خالی تھیں۔ یقیناً پولیس والے اپنی جان بچانے کے لیے گاڑیوں سے نکل کر

ادھر ادھر بھاگ گئے تھے۔ اس نے اندھیرے میں ان کے چھپ کر حملہ کرنے کے اندیشے کے پیش نظر اپنی سی آٹو جیک کا شکوف کھڑکی سے باہر نکالی اور ہوائی فائرنگ شروع کر دی۔ جلد وہ بہ خیریت اس راستے سے گزر گئے۔ آگے کے لیے وہ منصوبہ بندی کر کے آئے تھے اس لیے وہاں اپنے ٹھکانے تک پہنچنے میں زیادہ مشکل پیش نہ آئی۔

”یہ تو سارا پلان ہی چو پٹ ہو گیا۔ ہاتھ ہی کچھ نہیں آیا تو پھر آگے کرنے کے لیے کیا بچا ہے؟“ بہت دیر بعد جا کر انہیں سکون سے بیٹھنے کا موقع ملا تو گلو نے افسوس کا اظہار کیا۔

”ابھی تو وہ والی بات ہے کہ جان بچی سولا کھوں پائے۔ باڈل پولیس کو بیچ میں لے آئے گا، اس بات کی مجھے ذرا امید نہیں تھی۔ پولیس والوں کی وجہ سے مجھے اپنا ہاتھ بھی ہلکا رکھنا پڑا۔ اس کے بندے مقابلے پر آتے تو سب کو اڑا کر مال ساتھ لے آتا۔“ افسوس اسے بھی کم نہیں تھا۔ ان کا منصوبہ تھا کہ اس مال کو خود وصول کر کے کسی طرح میڈم ایکس تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کریں گے اور اسے اپنی وقاداری کا یقین دلا کر اس کی منوں میں جگہ بنالیں گے لیکن کچھ بھی ہاتھ نہیں آیا تھا۔

”ذرا باڈل کو فون لگا تا ہوں۔ دیکھوں تو وہ کہیں کیا کہتا ہے اس معاملے پر۔“ گلو کو خیال آیا تو باڈل کا نمبر ملانے لگا۔

”بڑی دیر کر دی گلو استاد میں کب سے اپنے بندوں کو ارٹ کیے تمہاری کال کا انتظار کر رہا ہوں۔ اگر ہمارے درمیان بٹے نہ ہوا ہوتا کہ کام مکمل ہونے پر کال تم خود کرو گے تو اب تک میں تم سے رابطہ کر چکا ہوتا۔“ باڈل نے کچھ ایسی بے قراری سے اس کی کال ریسیو کی، گویا وہ اس کی محبوبہ ہو اور وہ اس کے انتظار میں دیدہ و دل فرشی راہ کیے بیٹھا ہو۔

”کیا مطلب؟ جنہیں کوئی خبر ہی نہیں کہ ہمارے ساتھ کیا ہوا؟“ گلو نے اس ادائے بے نیازی پر دانت کچکپائے لیکن لہجے سے اسے غصے کو جھلکنے نہ دیا۔

”کیا ہوا؟ کیا کوئی گڑبڑ ہوئی؟“ باڈل کی تشویش کے اظہار پر اداکاری کا گمان بھی نہیں ہوتا تھا۔

”پولیس والوں نے ہماری فکری کے ساتھ دھماکا بول دیا تھا۔ ہم بڑی مشکل سے اپنی جانیں بچا کر نکل سکے۔ ابھی ابھی وہاں پہنچے ہیں اور ذرا سانس آئی ہے تو تم سے رابطہ کیا ہے۔“ اس کی اداکاری پر دل ہی دل میں اسے گالیوں سے

توازتے گھونے جواب دیا۔ قریب بیٹھنا جو ان اس کی اس کیفیت سے محفوظ ہوتا شوقی سے مسکرا رہا تھا۔
 ”مال کا کیا ہوا؟“ باذل نے کھٹی کھٹی آواز میں پوچھا۔
 ”مال کو کوئی مارو۔ ابھی تو بس ہم اپنی جانیں بچا کر لے آئے ہیں۔“ اس بار جواب دیتے ہوئے گلو گچ گچ پڑ سکون تھا۔

”اور لطیف سومرو.....؟“

”اگر زیادہ سخت جان ہو اور اچھے اسپتال پہنچ گیا ہو تو بچ گیا ہو گورنہ.....“ گلو نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”علی شٹ..... مجھے نہیں معلوم تھا کہ تمہارے ساتھ میرا پہلا کام اتنے بڑے انجام سے دوچار ہوگا۔“ باذل کا غصہ بالآخر باہر آ گیا۔

”ناکامی کا مجھے تم سے زیادہ افسوس ہے۔ ہمارا ٹھیک ٹھاک مال پانی خرچ ہوا ہے اور ہاتھ بھی کچھ نہیں آیا۔“ گلو نے بھی اپنا لہجہ بگاڑا۔

”تو اس میں میری تو کوئی غلطی نہیں ہے نا۔ میں نے تو پولیس کو وہاں نہیں بھجوایا تھا۔“

”کسی نہ کسی نے تو بھجوایا تھا ورنہ یہ ممکن ہی نہیں کہ اس اتنے دور دراز کے چھوٹے سے علاقے میں پولیس کی اتنی بڑی نفری ہم پر دھاوا بول دیتی۔ وہ تو میرے شیر جی دار نکلے کہ گھیرا توڑ کر قتل آئے ورنہ لطیف سومرو کے آدمیوں کی طرح وہاں ہماری لاشیں بھی پڑی ہوتیں۔“ گلو کا لہجہ خاصا بلند تھا۔

”خبر کو اپنے آس پاس تلاش کرو۔ مجھ پر شک نہ کرنا۔ کیونکہ تمہاری ناکامی سے نقصان میرا بھی ہوا ہے۔“ باذل نے اس بار اپنا لہجہ بدل لیا۔

”مجھے اپنے ایک ایک بندے پر اتنا ہی اعتبار ہے جتنا اپنی ذات پر۔ خبری اگر ہوئی ہے تو تمہاری طرف سے۔ تم اپنی اس کالی بھیڑ کو تلاش کرو، اس کے بعد ہی ہم سے بڑکس کرنے کا سوچنا۔“ گلو استاد نے اب بھی اپنے لہجے کو تیز رکھا اور بات کے اختتام پر لائن کاٹ دی۔

”بالکل ایسا لگ رہا تھا کہ کسی پنجابی فلم کے ڈائلاگ اردو میں سن رہا ہوں۔“ وہ جو مسکراتی نظروں سے گلو کو دیکھ رہا تھا، اس کے فارغ ہوتے ہی شوق لہجے میں بولا۔

”بھئی بھئی بندے کو بڑکیں بھی مارتی پڑتی ہیں شہزادے اتو یہ چیک کر کہ اس سارے معاملے کی ابھی تک میڈیا نے کوئی خبر دی یا نہیں۔“

”ہلکی ہلکی خبریں آنا شروع ہوئی ہیں۔ آہستہ آہستہ

تفصیل بھی آجائے گی۔ پولیس اور لطیف سومرو دونوں کی ساتھ داک پر لگی ہے۔ سوچ سمجھ کر کوئی اسٹوری بتائیں گے پھر ہی خبر دیں گے۔“

”یہ پولیس والے تو خود بڑے..... ہیں۔ تو نے خواہ مخواہ ہی ان سے رعایت کی۔ چھبک دینا تھا ایک آدھ بم ان کی طرف بھی۔“ پولیس والوں کے لیے ایک موٹی سی کالی استعمال کرتے ہوئے گلو نے دل جلے لہجے میں اسے مشورہ دیا۔

”نہیں استاد! ہم نے ایک بار فیصلہ کر لیا ہے کہ اب ہم سے ہمارے وطن کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا تو یہ طے ہے کہ اب ایسا ہی ہوگا۔ ہم صرف اپنے اعمال کے ذمے دار ہیں۔ اس لیے ہمیں بس اسی پر فوکس کرنا ہے۔“ اگلے لہجے میں گلو کو جواب دیتے ہوئے ان کی نگاہیں دور کسی کود کچھری تھیں۔ وہ جو دربار اور دلکش تھی اور جس کے لیے اپنا آپ بہت اچھا بنانے کو دل کرتا تھا۔

☆☆☆

”ٹوپی آئی جی حسنین لڑکی پورے خاندان میں تو کیا، دور دور تک کوئی نہیں ہے۔ انہیں اپنے ساتھ لے کر باہر نکلیں گے تو لوگ مڑ مڑ کر آپ دونوں کو دیکھیں گے۔“ علینہ اسے ٹوپی سے رشتہ جوڑنے پر قائل کرنے کے لیے اپنی جانب سے بہت ٹھوس دلیل دے رہی تھی۔

”اور کہیں گے کہ وہ چارہا ہے پہلوے سحر میں لنگور۔ نہ بابا نہ۔ مجھے خود کو لنگور کہلوانے کا کوئی شوق نہیں۔“ اس نے فوراً کانوں کو ہاتھ لگائے۔

”کوئی نہیں۔ اتنے پیڑم ہیں آپ۔ دیکھنے والوں نے چاند سورج کی جوڑی نہ کہا تو میرا نام بدل دیجیے گا۔“ وہ اپنے بھائی پر دل و جان سے فدا تھی۔

”یہ چاند سورج کی جوڑی والی لالچ تو بھی مجھے سمجھ ہی نہیں آتی۔ چاند سورج بچارے تو بھی اکٹھے ہی نہیں ہوتے۔ ایک آتا ہے تو دوبرا جاتا ہے۔“ اسے علینہ کو چھیننے میں ہمیشہ مزہ آتا تھا۔

”آپ اپنے فلسفے بہکا رہے ہیں گا اور ادھر ٹوپی آئی کو کوئی اور لے اڑے گا۔ اتنی حسنین لڑکیوں کے لیے تو ویسے ہی رشتوں کی لائن لگی رہتی ہے۔“ علینہ نے اپنا منہ پھلایا۔

”ہلکی۔“ وہ اس کی اس اداس مسکرایا اور محبت سے اس کا رخسار چھپھانے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ یہ بڑھا ہوا ہاتھ فضا میں تیر کر رہ گیا تو اسے زور کا جھٹکا لگا اور اوراک ہوا کہ ایک بار پھر پھڑپھڑے ہوئے گھر والوں کی یاد نے زور مارا تھا اور یادوں کا یہ ریلوے اسٹیشن تھا کہ وہ اپنے

نہرو کو حقیقت سمجھ بیٹھا تھا۔

”مجھے ہمت دے میرے مالک کہ میں یہ بار اٹھا سکوں۔“ اس نے بہت تڑپ کر دھاوا لگی لیکن دل بے چین ہو چکا تھا اور اب اس کے لیے اپنے کمرے میں ٹھہرے رہنا ممکن نہیں رہا تھا۔ اپنے اندر کی ٹھن سے گھبرا کر وہ باہر نکل آیا۔ صبح صبح کا وقت تھا اور فضا میں ایک تازگی سی تھی۔ اس نے لان میں کھڑے ہو کر گہری سانسیں لیں تو لگا کہ اس تازگی نے اندر تک رسائی حاصل کر لی ہو۔ اس کا دل اس تازہ ہوا میں داک کرنے کے لیے کھلنے لگا لیکن احتیاط کے اپنے تقاضے تھے۔ وہ باہر نکل کر کسی کی نظروں میں آنے کا غلہ مول نہیں لے سکتا تھا چنانچہ اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے نظروں سے ہی لان کا طول و عرض نا پنے لگا اور پھر گویا کسی پتھر کے مجسمے میں تبدیل ہو گیا۔ دائیں جانب سبیل ایک چڑ کے تنے سے کمر ٹکائے خیالوں میں غلطیاں کھڑی اٹھیوں کے درمیان پھنسی بیچ کے دانے گھمار رہی تھی۔ اپنے پورے وجود کو اس نے ایک بڑی سی چادر میں لپیٹا ہوا تھا لیکن فی الحال چہرے پر اس چادر کا پلو نہیں تھا۔ وہ صبح کی ہلکی روشنی میں اس چہرے کو اچھی طرح دیکھ سکتا تھا جس پر موجود ایک گل نے اسے زیر کر لیا تھا۔ بے خودی نے اسے احترام

بھلا دیا اور اپنی عادت اور فطرت کے برخلاف بنا چکی تھیں جسکے اسے نکتا چلا گیا۔ غیر ارادی طور پر وہ اس کا ٹوپیہ سے قائل کرنے لگا اور بہت ایمان داری سے خود کو یہ فیصلہ سنایا کہ ٹوپیہ کے حسن جہاں سوز کے آگے وہ کچھ نہیں ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ جو وہ ہے، وہ کوئی اور نہیں ہے کہ دل جس چہرے پر رک جائے وہ خود بخود دنیا کا حسین ترین چہرہ بن جاتا ہے۔

”ما..... ما.....“ بے خودی کے یہ لہجے جاتے جاتے طویل پکڑتے کہ اعظم کی بیٹی نے بھر توڑ ڈالا۔ آواز کے تعاقب میں نظریں دوڑانے پر وہ اسے ایک بڑے سے گیلے کے قریب کھڑا روٹا ہوا دکھائی دیا۔ وہ اس کی طرف بڑھتا اس سے مل ہی سبیل اس تک پہنچ چکی تھی۔

”کیا ہوا میری جان؟ چوٹ لگی ہے؟“ بے تابی سے بولتی وہ اس کے جسم کو ٹٹول رہی تھی لیکن کہیں کوئی سراغ نہیں تھا اور اعظم بدستور خوف اور تکلیف کی ملی جلی کیفیت میں روئے جا رہا تھا۔

”اس کی ناک چیک کریں۔ مجھے لگتا ہے اس نے اپنے تنے میں کچھ پھنسا لیا ہے۔“ محاذ جو ان دونوں کے پیچھے آکھڑا ہوا تھا، اس نے لوٹ کر لیا کہ اعظم روٹے ہوئے بار بار اپنی ناک میں انگلی ڈال رہا ہے۔

اہم اطلاع

برائے اہمیت حضرات / قارئین

السلام علیکم! اطلاعاً عرض ہے کہ ناگزیر وجوہ اور کاغذ کی بے انتہا گرانی کے سبب اولدے سے شائع ہونے والے چناروں مناسموں



کی قیمت مئی 2022ء سے 150/- روپے فی شمارہ ہوگی۔

آپ سے تعاون کی درخواست ہے۔

چناروں مناسموں کی قیمت

سپینڈر ایجنسی

”آپ فکر نہ کریں سہل! اسپتال میں ڈاکٹر دو منٹ میں یہ مسئلہ حل کر دیں گے۔ وہاں تو ہر روز ایسے کیسز آتے ہی رہتے ہیں۔“ وہ جارو کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھا تھا لیکن پچھلی نشست پر بیٹھی سہل کی کیفیت سے خوب واقف تھا۔ اس لیے اسے تسلی دینے کی اپنی ہی کوشش کر رہا تھا۔

”یہ بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے بہن جی! مجھے ہی دیکھ لیں۔ میری ماں بتاتی تھی کہ بچپن میں کم سے کم پانچ چھ بار میں نے ناک، کان اور حلق میں کچھ نہ کچھ پھنسا کر اس کی جان سولی پر لٹا دی لیکن دیکھیں آج آپ کے سامنے ہٹا کتا اور ٹھیک ٹھاک بیٹھا ہوا ہوں۔“ جارو نے بھی گفتگو میں اپنا حصہ ڈالا۔

”ضرورت سے کچھ زیادہ ہی بچے کتے بیٹھے ہو۔“ معاذ نے اسے چھیڑا۔ جواب میں اس نے حسبِ عادت اپنا زلزلہ پاکر دینے والا قبضہ لگایا۔

”ویسے یہ جو جناب کے لیے کان ہیں، انہوں نے تو ہماری زندگیوں سے پرانی ایسی ہی قسم کر دی ہے۔ اب بندہ اپنے گھر میں بیٹھ کر کچھ کہہ بھی نہیں سکتا۔“ اس نے جارو سے شکوہ کیا۔

”ارے نہیں یار! ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تو کسی کام سے باہر نکلا تھا تو بچے کے رونے کی آواز اور تم لوگوں کی گفتگو کانون میں پڑ گئی اور نہ عام طور پر میں دور سے لوگوں کی گفتگو صرف اسی وقت سن پاتا ہوں جب پوری طرح فوکس کروں۔ تم خود سوچو کہ اگر میں یونہی ہر وقت لوگوں کی باتیں سن رہا ہوں تو میری اپنی زندگی عذاب ہو جائے گی۔ میں تو سو بھی نہیں سکوں گا۔“ جارو کا جواب غور طلب تھا۔ واقعی اسے خیال نہیں آیا تھا کہ جارو کی غیر معمولی سماعت جس پر وہ خشک و خیرت کا شکار تھا، اس کے لیے مصیبت بھی بن سکتی تھی۔

”یقین جانو کہ میری یہ غیر معمولی سماعت بچپن میں میرے لیے اتنا بڑا مسئلہ بن گئی تھی کہ میں یاگل پن کے قریب جا پہنچا تھا۔ وہ تو میرے ایک ڈاکٹر انفل نے میرا مسئلہ سمجھا اور مجھے اس بات کی مشق کروائی کہ کیسے اپنے ارد گرد کی آوازیں کو نظر انداز کرنا ہے۔ مجھے کم سے کم دو سال لگے تھے یہ سب سیکھنے میں لیکن اس کے بعد میری زندگی آسان ہو گئی۔ اب میری یہ صلاحیت میرے کنٹرول میں ہے اور میں اس سے کام لے کر اپنے وطن کے لیے جو کچھ کر سکتا ہوں، وہ کر رہا ہوں۔“ سنجیدگی سے جواب دیتے ہوئے جارو نے گاڑی ایک اسپتال کی پارکنگ میں داخل

”یا میرے خدا!“ سہل گھبرا گئی اور اس کی ناک چپک کرنے کی کوشش کرنے لگی لیکن ایک طرف اعظم کھل رہا تھا تو دوسری طرف خود اس کے اپنے ہاتھ ہر پھول چکے تھے۔ اس لیے اس کوشش کا کوئی نتیجہ نہیں نکل رہا تھا۔

”میں دیکھتا ہوں۔“ معاذ بولا ہوا اس کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور موبائل کی ٹارچ کا استعمال کرتے ہوئے اعظم کی ناک کا جائزہ لیا۔

”اندر کوئی گول سا پتھر پھنسا ہوا ہے جو کافی آگے تک چلا گیا ہے۔“

”اب کیا ہوگا؟ کیسے نکلے گا یہ پتھر؟“ وہ پریشانی میں روتے ہوئے اعظم کی ناک پر انگلی کا دباؤ ڈالنے لگی۔

”پلیز نہیں۔“ پتھر کے مزید اوپر چڑھ جانے کے ڈر سے اس نے گھبرا کر بے ساختہ کھل کا ہاتھ تمام کر اسے روکا۔ اس کی اس حرکت سے سہل کو گویا کرنٹ لگ گیا۔ اس نے تیزی سے اپنا ہاتھ کھینچا اور اسی لمحے اسے اپنے کھلے ہوئے چہرے کا احساس ہوا تو جلدی سے چہرے کو چادر کے پلو سے ڈھانپ لیا۔

”سوری!“ معاذ نے شرمندگی سے معذرت کی لیکن وہ اس کی معذرت پر توجہ دینے کے بجائے بے تحاشا روتے ہوئے بچے کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”اے اسپتال لے جانا پڑے گا۔ آپ ایک منٹ رکیں، میں جیکسی سے چابی لے کر آتا ہوں۔“ ایک مقصوم بچہ تکلیف سے بلبلارہا تھا۔ ایسے میں اسے کہاں یاد رہتا کہ گھر سے باہر قدم رکھنے میں خود ان لوگوں کی اپنی جان خطرے میں پڑ سکتی ہے۔

”بچے کو لے کر باہر آ جاؤ یا ر! میری گاڑی بالکل ریڈی ہے۔ میں لے چلتا ہوں تم لوگوں کو اسپتال۔“ ابھی وہ اندر گیا نہیں تھا کہ بیرونی گیٹ کے اوپر سے سر نکال کر جارو نے جھانکا اور پیشکش کی۔ اس وقت انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے اعظم کو گود میں اٹھایا اور گیٹ کی طرف بھاگا۔ سہل بھی اس کے پیچھے تھی۔

”کیا بات ہے؟ کیا ہوا ہے اور تم لوگ اتنی صبح صبح کہاں جا رہے ہو؟“ شاید رونے کی آواز اعدہ گئی تھی جسے سن کر سونیا باہر نکل آئی تھی۔

”اعظم نے اپنی ناک میں کچھ پھنسا لیا ہے۔ ہم اسے لے کر اسپتال جا رہے ہیں۔“ وہ اسے غلت میں جواب دے کر سہل کے ساتھ باہر نکل گیا۔ معاملہ ایسا تھا کہ سونیا اسے یوں باہر جانے پر ٹوک نہیں سکی۔

کی گاڑی رکھتے ہی معاذ تیزی سے باہر نکلا اور پچھلی طرف کا دروازہ کھولا۔

”لامیں اسے مجھے دے دیں۔“ اس نے سبل کی گود سے اعظم کو جھپٹ لیا اور اسے اپنی ہاتھوں میں سنبھالے تیزی سے اندر کی طرف بھاگا۔ بچہ روتے روتے نڈھال ہو چکا تھا اور اب محض سسکیاں ہی بھر رہا تھا۔ ایمر جنسی میں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

”بس ابھی ٹھیک ہو جاتا ہے۔ آپ اہمیت سے کام لیں اور یہاں آرام سے بیٹھیں۔“ اعظم کو اندر لے جایا گیا تھا اور وہ اپنے پیچھے پیچھے وہاں آگئیے والی سبل سے مخاطب تھا۔ اس کی آنکھوں سے مسلسل ٹپکتے آنسو اسے تکلیف دے رہے تھے۔ وہ جب پہلی بار سبل سے ملا تھا تو اسے بہت باہمت و باحوصلہ پایا تھا۔ ڈاکوؤں کی قید میں ہوتے ہوئے بھی وہ گھبرائی ہوئی نہیں لگ رہی تھی اور بہت وقار سے حالات کا سامنا کرتی رہی تھی لیکن اب شاید بے درپے زندگی میں رونما ہونے والے حادثات نے اسے کمزور کر دیا تھا۔

”میں آپ کے لیے پانی لاتا ہوں۔“ اس کے کہنے پر سبل دزیز کے لیے رکھی گئی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گئی تو وہ کہتا ہوا وہاں سے ہٹ گیا۔ اندر ہی ایک میڈیکل کم جزل اسٹور موجود تھا جہاں دواؤں کے ساتھ ساتھ کھانے پینے کی مختلف اشیا بھی موجود تھیں۔ اس نے پانی کی ڈسپوزیبل بوتل کے ساتھ ساتھ جوس کا ڈبا بھی خرید لیا اور سبل کے قریب پہنچا۔ جارو بھی اس دوران وہاں پہنچ چکا تھا اور سبل کو تسلی بخشی دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ معاذ پانی اور جوس سبل کی طرف بڑھاتا، اس سے قبل ہی دروازہ کھلا اور ایک نرس اعظم کو گود میں اٹھائے باہر نکلی۔

”یہ لیس، ٹھیک ہو گیا آپ کا بے بی۔ بس تھوڑا سا ڈر کیا ہے۔ آہستہ آہستہ نارمل ہو جائے گا۔“ نرس نے اعظم کو بے ساختہ ہی اپنی لپٹ چھوڑ کر کھڑی ہو جانے والی سبل کے حوالے کیا۔

”یا اللہ اتنا شکر ہے۔“ سبل نے اسے اپنے ساتھ بھیج لیا اور بے تحاشا یاد کرنے لگی۔ ”بچے کی ناک میں رگڑ کی وجہ سے معمولی زخم ہو گئے ہیں۔ آپ نے ٹیوب لے لی ہیں۔ صبح شام ہلکے ہاتھ سے ناک کے اندر یہ کریم لگا دیجیے گا۔ جگوان لے چاہا تو کل تک بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔“ نرس نے نرسہ اس کی طرف بڑھایا تو وہ جلدی سے اسے تمام کر میڈیکل اسٹور کی طرف بڑھ گیا۔ نرس کے مطابق ٹیوب لے کر وہ پلٹ ہی رہا تھا کہ اس کی نظر

ایک آدمی پر پڑی اور وہ یہ دیکھ کر لرز گیا کہ اس آدمی کی توجہ پوری طرح سبل اور اعظم کی طرف مبذول ہے۔ وہ آدمی سراج الدین تھا۔ عبید اور منیزہ کا کزن..... معاذ آگے بڑھنے کے بجائے اپنی جگہ رک کر اس کے رد عمل کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے سراج نے اپنا موبائل نکالا اور اس پر کسی سے بات کرنے لگا۔ بات کرتے ہوئے اس کی نظریں مسلسل سبل اور اعظم پر جمی ہوئی تھیں۔ سبل کا چہرہ تو چادر کے پلو میں چھپا ہوا تھا لیکن اعظم اس کی پہچان بنا سارے راز کھول رہا تھا۔ معاذ مزید اپنی جگہ کھڑا نہ رہ سکا اور تیزی سے آگے بڑھا۔

”لے آیا ہوں میں ٹیوب۔ چلیں اب جلدی سے مگر چلیں۔“ اس نے اعظم کو سبل کی گود سے لیا اور غلت بھرے لپچے میں بولا۔ اس کے اس انداز نے سبل اور جارو دونوں کو چونکا دیا۔

”کیا بات ہے، کیا کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے؟“ جارو نے اس سے پوچھا۔

”پہلے یہاں سے نکل پھر بتانا ہوں۔“ قدموں کی رفتار کو مزید بڑھاتے ہوئے اس نے کن آنکھوں سے سراج الدین کی طرف دیکھا۔ وہ ان ہی کی طرف متوجہ تھا اور چہرے پر جوش لیے ہوئے فون پر مصروف تھا۔

”پلیز! جلدی کریں ورنہ ہم یہاں پھنس جائیں گے۔“ وہ آہ تقریباً دوڑ رہا تھا۔ جارو اور سبل بھی صورت حال کو کچھ کچھ سمجھتے اس کا بھرپور ساتھ دے رہے تھے لیکن پارکنگ میں پہنچتے ہی انہیں ٹھنک کر رکنا پڑا۔ وہاں دو چوڑے چکے آدمی راستہ روکنے کے انداز میں کھڑے ہوئے تھے اور ان میں سے ایک کے ہاتھ میں پستل بھی دکھائی دے رہا تھا۔ معاذ نے آہستہ سے اپنی گود میں موجود اعظم کو سبل کی گود میں دیا۔

”اگر ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو جان سے جاؤ گے۔“ پستل والے نے دھمکی دی جبکہ دوسرا سبائل پر ہاتھ کرنے لگا۔

”ہم نے انہیں روک لیا ہے سراج اب گاڑی میں بٹھانے جارہے ہیں۔“ یقیناً وہ سراج الدین کو اپنی کارگزاری کی رپورٹ دے رہا تھا۔

”چلو آگے بڑھو۔“ پستل والے نے اپنے پستل سے ان تینوں کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ معاذ نے اس کے حکم پر عمل کرنے سے پہلے ایک نظر پارکنگ لاٹ پر ڈالی۔ پارکنگ بوائے دور کھڑا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا لیکن اس کا

اسے ہدایت دی جس پر عمل کرنے کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ چند سیکنڈوں میں یہ کام مکمل کر کے وہ نشتر پر بیٹھا تو جادو نے گولی کی طرح گاڑی نکال لی۔ اسی وقت پولیس کی گاڑیوں کے ہوٹر سنائی دینے لگے۔ یقیناً اپنے آدمیوں کی ناکامی کے بعد سراج الدین نے پولیس کو بلا لیا تھا۔ جادو نے ایکسپلریٹر پر دباؤ مزید بڑھا دیا لیکن اس کا رخ اپنی رہائش گاہ کی طرف جانے والے راستے پر نہیں تھا۔ معاذ نے اپنے پورے وجود میں شدید تناؤ محسوس کیا۔ پچھلی نشست پر سرجل اور اعظم کی موجودگی نے اس تناؤ میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔

”وہ ہمارے پیچھے آرہے ہیں۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ کسی طرح انہیں ڈانچ دے کر نکل سکیں۔“ جادو نے عقب نما آئینے میں دیکھتے ہوئے لب بھنج کر کہا تو معاذ محض سر ہلا کر رہ گیا اور ہتھیار پر اس کی گرفت مزید سخت ہو گئی۔

”کبخت سر پر چڑھے آرہے ہیں۔ اگر یہی صورت حال رہی تو جلد یہ ہمیں روکنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔“ مسلسل پیچھے آتی پولیس کی گاڑیوں کو دیکھ کر جادو بڑبڑایا۔ دن پوری طرح طلوع ہو گیا تھا اور معمولات زندگی انجام دینے کے لیے گھروں سے نکلنے والوں کی وجہ سے سڑکوں پر ٹریفک کا ڈباؤ بڑھنے لگا تھا۔

”اگر گلیوں میں گھس کر ان سے جان چھڑانے کی کوشش کی جائے تو کیسا بے گناہ؟“ معاذ نے تجویز دی۔

”ہم محض بھی سکتے ہیں۔ میں اس شہر سے بہت زیادہ واقف نہیں اس لیے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ آگے ہمیں کس چیز کا سامنا کرنا پڑ جائے۔“

”ٹھیک ہے تو پھر ہائے دے کی طرف چلو۔ وہاں ان سے جان چھڑانے میں آسانی رہے گی۔“ گن کو ایک ہاتھ سے سہلاتے ہوئے معاذ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا تو جادو نے سر کو ہلاتے ہوئے گاڑی شہر سے باہر جانے والے راستے کی طرف ڈال دی۔

”یاد رکھنا کہ میں گرفتار ہونے پر مرنے کو ترجیح دوں گا۔“

”بھرا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ جہارے ساتھ تو ہو سکتا ہے یہ پھر بھی کچھ رعایت کر دیں لیکن مجھے تو دیکھتے ہی اٹاٹا کا دیں گے۔ میں ان کی قید سے فرار ہوا ہوں۔ میرے لیے تو کسی رعایت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ جادو نے تیرے لہجے میں اسے جواب دیا۔ پچھلی نشست پر سرجل، اعظم کو اپنے سینے میں بچنے لپ بچے ٹپٹپ ہوتی تھی۔ ہوا کی طرح اڑتی گاڑی، غمناک آسمان بلاؤں کی طرح تعاقب میں آتی پولیس

کسی قسم کی دخل اندازی کرنے کا کوئی ارادہ نظر نہیں آرہا تھا۔ یقینی طور پر شہر میں نواب بدر الدین کے خاندان کا اثر رسوخ تھا اور خاندان کے افراد کو جانا جاتا تھا اس لیے کسی کی جرأت نہیں تھی کہ سراج الدین کے گاڑی کی کارروائی میں داخل اندازی کرے۔ پارکنگ میں آتے جاتے لوگ بھی اس منظر سے نظر چراتے ہوئے گزر رہے تھے۔

”ساتھ نہیں، آگے بڑھو۔“ حکم کی تعمیل میں تاخیر ہوئی تو پٹل والا چلایا۔ اس بار انہیں قدم آگے بڑھانے ہی پڑے۔ سراج الدین کی جانی پیچانی گاڑی سامنے ہی کھڑی تھی۔ اسی گاڑی میں تو وہ حویلی سے فرار ہوئے تھے۔

ایک دوسرے کے آگے پیچھے چلتے وہ ست روئی سے قدم آگے بڑھانے لگے۔ سراج الدین کی گاڑی سے چند قدم کا فاصلہ باقی رہ گیا تھا کہ جادو اچانک ہی لڑکھڑا کر نیچے گرا۔

”اے، اے،“ پٹل والا چلایا لیکن کوئی عملی قدم اٹھانے سے قبل ہی اس کے پٹل والے ہاتھ پر ایک پتھر توپ کے گولے کی طرح آکر لگا۔ پٹل اس کے ہاتھ سے نکل گیا اور نیچے گرا۔ جادو اپنے بھاری تن و توش کے ساتھ یوں اچھل کر کھڑا ہوا جیسے اسے اسپرنگ لگے ہوئے ہوں۔

”آپ اپنی گاڑی کے پاس جائیں۔“ معاذ نے نکل کر ہدایت کی اور خود بھی جادو کا ساتھ دینے کے لیے میدان کارزار میں اتر گیا۔ پٹل ہاتھ سے نکلنے کے بعد کسی گاڑی کے نیچے چلا گیا تھا۔ اس لیے سراج الدین کے آدمیوں کو بھی محض ہاتھ پاؤں سے مقابلہ کرنا پڑ رہا تھا۔ وہ دونوں اپنے ذیل ڈول کے حساب سے خاصے طاقتور تھے اور لڑنا بھڑنا بھی جانتے تھے لیکن انہیں اس درجے کی تربیت حاصل نہیں تھی جس سے معاذ اور جادو گزر چکے تھے۔ ایک آدھ منٹ میں ہی دونوں طرف کا فرق واضح ہونے لگا۔ دونوں کی ٹھیک ٹھاک درگت بنانے کے بعد جب انہوں نے دیکھا کہ وہ دونوں ہلے چلنے کے لائق نہیں رہے ہیں تو انہیں وہیں پڑا چھوڑ کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔ حیرت انگیز طور پر اس عرصے میں اسپتال کے سکیورٹی عملے نے کسی قسم کی مداخلت نہیں کی تھی اور نہ ہی کسی دوسرے فریق نے درمیان میں پڑ کر جھگڑا ختم کرنے کی کوشش کی تھی۔

”جلدی نکلو یہاں سے۔ میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ کوئی بڑی گڑبڑ ہونے والی ہے۔“

”مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگ رہا ہے۔ تم ایسا کرو کہ پیٹ اٹھا کر نیچے سے گن نکال لو تا کہ کسی گڑبڑ کی صورت میں ہم اپنا دفاع تو کر سکیں۔“ جادو نے اس کی تائید کرتے ہوئے

کی گاڑیاں اور ان کے چٹکھڑتے ہوئے ہوٹر کسی مضبوط اعصاب کے مرد کے لیے بھی امتحان بن سکتے تھے جبکہ وہ تو ایک عام سی گھریلو لڑکی تھی جس نے زندگی کا بیشتر حصہ بہت محفوظ و مامون ماحول میں تفریبات کے ساتھ گزارا تھا۔

”اگر مجھے کچھ ہو جائے تو بھل اور اس کے بچے کو محفوظ مقام تک پہنچانے کی ذمہ داری تمہاری ہوگی۔ سمجھو ان دونوں کی حفاظت کا وعدہ لے کر میں تم سے اس رات کے احسان کا بدلہ مانگ رہا ہوں جب میں نے تمہیں ”را“ کی قدر سے آزاد کر دیا تھا۔“ محبت انسان سے کچھ بھی کر دالیتی ہے۔ وہ بھی احسان کا بدلہ مانگ رہا تھا۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا دوست! اس وقت ہم سب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ پار لگے تو سب ہی پار لگیں گے ورنہ سب ڈوب جائیں گے۔“ جادو نے سنجیدگی سے اسے جواب دیتے ہوئے پولیس کی گاڑیوں کو دیکھا۔ کوشش کے باوجود وہ درمیانی فاصلہ مزید بڑھانے میں کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا بلکہ یوں لگ رہا تھا کہ یہ فاصلہ کچھ کم ہو گیا ہو۔

پچھلی نشست پر بیٹھی سبیل نے بھی یہ ساری گفتگو سنی تھی اور دم بخود رہ گئی تھی۔ معاذ کی دلی کیفیت اس سے چھپی ہوئی نہیں تھی لیکن جذبے کی اس شدت کا اندازہ نہیں تھا۔ سوت خائب میں تھی اور اسے اپنے بجائے اس کی فکر تھی۔ اس لمحے وقت کی نزاکت کے باوجود اسے شکلیں سومر و یاد آیا۔ لطف سومر و کا وہ عیاش بیٹا بھی اسے چاہنے کا دعویدار تھا لیکن اس کی حاجت میں ہوس کے سوا کچھ نہ رکھا تھا۔ اسے نہ اس کی عزت کی فکر تھی، نہ زندگی کی۔ وہ بس اس کے بدن کے حصول کا خواہش مند تھا۔ تب ہی تو ڈاکوؤں کی بددست سے اسے اور معظم کو اغوا کر دیا کہ ایک طرف مالی فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کی تھی تو دوسری طرف اسے بھی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ان مشکل حالات سے انہیں نکالنے کے لیے معاذ نے بے مثال قربانی دی تھی اور خود کو بچانے کے بجائے اسے اور معظم کو بچایا تھا۔ وہ آج بھی ویسا ہی تھا۔ قربانی دینے والا اور خود سے بڑھ کر اس کی پروا کرنے والا۔ اس کے لیے بہت کچھ کرنے کے باوجود اس نے اس سے بھی کچھ طلب نہیں کیا تھا۔ یہاں تک کہ کبھی نظر بھر کر اس کی طرف دیکھتا بھی نہیں تھا۔

خیالات کے اس جہم میں گھری وہ گاڑی کو لگنے والے جھٹکے کے باعث ہڑبڑا کر چوگی۔ گاڑی کے بری طرح لہرانے کے باعث اسے اپنا توازن برقرار رکھنے کے لیے کئی بے حد کوشش کرنا پڑی تھی۔

”لیٹ جائیں، سیٹ پر لیٹ جائیں۔ وہ قاترنگ کر رہے ہیں۔“ معاذ نے چیختے ہوئے اس سے کہا تو وہ اعظم سیٹ سیٹ پر لیٹ گئی۔ اسی اثنا میں گاڑی کی باڈی پر مزید دو قاتر آکر لگے۔ شاید پولیس والے ہانڈوں کو نشانہ بنانے کی کوشش کر رہے تھے اور ان کی اس کوشش کو ناکام بنانے کے لیے جادو مسلسل گاڑی کو لہرا رہا تھا۔ گاڑی کے لہرانے کی وجہ سے سبیل کے لیے خود کو اور اعظم کو سیٹ پر جمائے رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس ساری صورت حال سے گھبرا کر اعظم نے بری طرح روٹا شروع کر دیا تھا۔ خود سبیل کا دل بھی بے طرح دھوکا رہا تھا لیکن وہ کسی نہ کسی طرح خود پر قابو رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اعظم کو اس نے مضبوطی سے خود سے چمٹا رکھا تھا اور پوری کوشش کر رہی تھی کہ خود کو اور اسے گرنے نہ دے۔

”اب مزید برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ مجھے انہیں جواب دینا ہوگا۔“ پانی کو سر سے اونچا جاتے دیکھ کر معاذ سے برداشت نہیں ہو اور جس طرح سیٹ پر جھک کر بیٹھا ہوا تھا، اسی طرح جھکے جھکے اپنی جانب کا دروازہ کھولا۔

”کیا کر رہے ہو؟ سنبھل کے۔“ اپنے نیم نیم وجود کو ممکنہ حد تک جھکا کر ڈرائیونگ کرنے والا جادو پریشانی سے چلا یا لیکن معاذ اب کسی کی سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے پیچھے آتی گاڑیوں پر ایک برسٹ مارا۔ وہاں سے بھی جوابی کارروائی ہوئی لیکن اتنا فرق ضرور پڑا تھا کہ وہ جو سر پر چڑھے چلے آ رہے تھے، ذرا سنبھل گئے اور رفتار کم کر کے درمیانی فاصلہ بڑھالیا۔ فاصلہ بڑھنے کے باوجود دونوں فریقین کے درمیان قاترنگ کا تبادلہ جاری رہا لیکن کسی کو بھی نقصان نہیں پہنچا۔

”آگے چوکی آنے والی ہے۔ یقیناً وہاں ہمارے بارے میں اطلاع کر دی گئی ہوگی اور ہم وہاں سے بھاگ کر نہیں نکل سکیں گے۔“ قاترنگ کے وقفے کے دوران جادو نے اسے اطلاع دی۔

”اوکے۔ میں دس تک گنتی گنتا ہوں۔ جیسے ہی میں دس کہوں، تم گاڑی کی رفتار بالکل سلو کر لیتا۔“ معاذ نے فیصلہ کن انداز میں اس سے کہا اور خود گن سنبھال کر گنتی کرنے لگا۔ اس دوران پیچھے سے ایک بار پھر گولیاں برسائی گئیں لیکن اس نے جواب نہیں دیا۔ اس کی طرف سے خاموشی پر پیچھے والوں کا حوصلہ بڑھا اور انہوں نے اپنی گاڑیوں کی رفتار بڑھا دی۔ ادھر جیسے ہی اس کے ہونٹوں سے ”دس“ نکلا، جادو نے بھی رفتار کم کر دی۔ فاصلہ کم ہونے کے ساتھ ساتھ جسم کو توازن قائم کرنے کا موقع ملا تو معاذ نے

کیفیت کو پوری طرح محسوس کر رہا تھا۔ وہ اپنی ذات سے زیادہ اعظم کے لیے فکر مند تھی۔ بچکیوں سے روتا بچہ اب سسکیوں پر آ گیا تھا اور بطور ماں وہ اس کے لیے دیکھتی تھی۔

”معدرت تو مجھے کرنا چاہیے۔ میری بے پروائی سے اعظم نے وہ حرکت کی اور آپ کو ایک محفوظ پناہ گاہ سے نکل کر اسپتال جانا پڑا۔ وہ سب نہ ہوا ہوتا تو یہ سب بھی نہ ہوتا۔“ اس کے لہجے میں شرمندگی تھی۔

”پلیز ایسا مت سوچیں۔ جو کچھ ہمارے نصیب میں لکھا تھا، وہی ہوا ہے۔“ وہ نکل کر شرمندہ کیسے دیکھ سکتا تھا۔

”مگر.....“ نکل نے جوا باز پر کچھ کہنا چاہا۔

”پلیز.....!“ اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے کچھ بھی کہنے سے روک دیا اور گاڑی میں پڑی پانی کی چھوٹی سی بوتل اٹھا کر اسے تھمائی۔

”اعظم کو پانی پلا میں اور بہلانے کی کوشش کریں۔ بچہ بری طرح ڈر گیا ہے۔“

”جی۔“ وہ خاموشی سے اس کی ہدایات پر عمل کرنے لگی۔

”ہم کس طرف جا رہے ہیں؟“ اب وہ ڈرائیو کرتے ہوئے چارو کی طرف متوجہ ہوا۔

”کچھ غلط نہیں ہے۔ ابھی تو اسی کوشش میں ہوں کہ سڑک سے جتنی دور نکل سکتے ہیں، نکل جائیں۔ آگے کوئی دوسری سڑک یا بھڑا سیدل گیا تو سست کا تھین بھی کر لیں گے۔“

”مجھے سب ہماری راہ دیکھ رہے ہوں گے۔“ اسے اپنے ساتھیوں کی بھی فکر تھی۔

”اب تو انہیں خبر دوں سے ہی صورتحال کا اندازہ ہوگا۔ رابطے کا کوئی ذریعہ تو ہے نہیں ہمارے پاس۔“ چارو نے اپنی رائے دی تو وہ اس سے اتفاق کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکا۔ نکل تو آئی ہی خالی ہاتھ تھی جبکہ اس کی اپنی جیب میں بھی والٹ کے سوا کچھ نہیں تھا۔ موبائل فون وہ سائڈ پیکل پر ہی چھوڑ آیا تھا۔

”میرے خیال میں ہم اس گاڑی کو بھی زیادہ دیر استعمال نہیں کر سکیں گے۔ اب تک پولیس کے پاس اس کی ساری تفصیلات پہنچ گئی ہوگی اور ہو سکتا ہے انہوں نے اسے ہر طرف پھینکا بھی دیا ہو۔“ کوئی ایک گھر میں کسی جو دامن گیر تھی۔

”یہاں اس ویرانے میں تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ کسی سڑک یا آبادی کے قریب پہنچ کر چھوڑ دیں گے اسے۔“

چارو نے بے پروائی سے جواب دیا۔

”گاڑی کا نقصان تو ہو جائے گا نا۔ ویسے کس کی

سائس روک کر ایک نپا حلا فار کیا۔ آگے دوڑتی پولیس کی گاڑی کا ٹائر برسٹ ہوا اور تیز رفتاری کے باعث ڈرائیو کے لیے اس پر قابو پانا ممکن نہیں رہا۔ گاڑی بری طرح لہرائی اور پھر گول گھوم گئی۔ پیچھے اسی کی رفتار سے آتی دوسری گاڑی کا ڈرائیو پر وقت بیک نہیں لگا سکا اور گاڑی آگے والی گاڑی میں ٹکس گئی۔ اس زوردار تصادم نے جہاں پچھلی گاڑی کے ڈرائیو اور اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹے شخص کو بری طرح متاثر کیا، وہیں اگلی گاڑی سڑک پر الٹ گئی۔

”وہ مارا۔“ چارو تعاقب میں آنے والوں کے اس انجام پر خوشی سے چیخا۔

”گاڑی کچے میں ڈال دو۔ آگے چیک پوسٹ پر سے گزرتا مشکل ہوگا۔ بہتر ہے ہم کوئی دوسرا راستہ تلاش کریں۔“

”اوکے پاس!“ چارو فوراً اس کی تجویز پر عمل کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔

”سیٹ سے سر مت اٹھائیے گا۔ ابھی ہم پوری طرح خطرے سے نکلے نہیں ہیں۔“ معاذ جو دوبارہ سیٹ پر بیٹھ چکا تھا، ذرا سا پیچھے کی طرف جھک کر نکل سے بولا۔ نکل جو اب اس حلقے سے آواز نہ نکال سکی اور شخص سر کی جنبش سے اپنی آمادگی ظاہر کی۔ اس دوران چارو گاڑی سڑک سے کچے میں اتار چکا تھا۔ گاڑی کے کچے میں اترتے ہی اس بار پھر اس پر قائر دانے گئے۔ معاذ نے جوابی قائرنگ کر کے اپنے چوکنے ہونے کا پیغام دیا۔ دونوں جانب کی گولیوں نے ہی کسی کا کچھ نہیں بگاڑا اور درمیانی فاصلہ بڑھنے لگا۔

”کیس خبیث یہاں بھی پیچھے نہ چلے آئیں۔“ کچے راستے پر گاڑی مسلسل پچھلے لے رہی تھی۔ اسے پوری مہارت سے سنبھالتے ہوئے چارو نے اندیشے کا اظہار کیا۔

”نہیں آئیں گے۔ اول ان کی گاڑیاں اس قابل نہیں رہی ہیں۔ دوم اب انہیں ہم سے زیادہ اپنے زخمی ساتھیوں کی فکر پڑی ہوگی۔“ معاذ نے اسے تسلی دی تو وہ سر کو تھینک جھنجھ سے گاڑی چلائے لگا۔

”اب آپ بھی سیدھی ہو کر بیٹھ سکتی ہیں۔“ وہ نکل سے مخاطب ہوا تو وہ ہنسنے لگی ہوئی سیدھی ہو بیٹھی۔ اعظم کو البتہ اب بھی اس نے یوں سینے سے پیچھا ہوا تھا جیسے اسے دنیا کے ہر خطرے سے محفوظ کر رہی ہو۔

”آپ اور اعظم ٹھیک ہیں نا؟“ معاذ نے فکر مندگی سے پوچھا۔

”جی۔“ اس کی طرف سے مختصر جواب آیا۔

”آئی ایم سوری۔ آپ کو تکلیف ہوئی۔“ وہ نکل کی

زیادہ دیر چلنا آپ کے لیے مشکل ہوگا۔“ روانگی سے قبل اس نے کل کی کوڑ میں سو جانے والے اعظم کو اس سے لے لیا۔ کچھ اندازہ نہیں تھا کہ کتنی دیر پیدل یہ مسافت طے کرنا ہے اور اس کے حساب سے ناز و نعم میں کتنا سہل کے لیے یہ بہت مشکل کام ثابت ہوتا۔

”ادرا سائیں پہلے ہی اسٹرب تھے۔ اس صورت حال میں مزید پریشان ہو جائیں گے۔“ ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کل نے پہلی بار پریشانی کا اظہار کیا۔

”آپ فکر مت کریں۔ عالم سمجھ دار اور باحوصلہ آدمی ہے۔ خود کو سنبھال لے گا۔ ویسے بھی اس کو اتنا بھروسہ تو ہوگا کہ آپ میرے ساتھ ہیں اور میں جب تک زندہ ہوں آپ پر کوئی آج نہیں آنے دوں گا۔“ معاذ نے اسے تسلی دی پھر بات کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”ان لوگوں کے ساتھ سونیا اور اس کا ساتھی جنگی موجود ہے۔ وہ بہت تجربہ کار اور بڑا لوگ ہیں۔ وہ اس ساری صورت حال کو بہت اچھی طرح سنڈل کر لیں گے۔“

”اللہ کرے ہم سب اس مشکل میں سے بہ آسانی نکل جائیں۔“ کل نے صدقہ دلی سے دعا کی۔

”آمین۔“ وہ بے ساختگی سے بولا۔ اس کے بعد ان کے درمیان خاموشی چھا گئی۔ موسم اگرچہ زیادہ سخت نہیں تھا لیکن وہ سب بھوکے پیاسے گھر سے نکلے تھے اور اس بات کو بھی اچھا خاصا وقت گزر چکا تھا اس لیے آہستہ آہستہ ان فطری ضروریات نے اپنا احساس دلانا شروع کر دیا تھا۔ خصوصاً مسلسل پیدل چلنے کی وجہ سے پیاس شدت اختیار کرنے لگی تھی۔ قیمت تھا کہ اعظم ابھی تک سویا ہوا تھا۔ وہ جاگ جاتا تو ان کے پاس اسے دینے کے لیے پانی کی چھوٹی سی بوتل کے سوا کچھ بھی موجود نہیں تھا۔

”اتنی دیر ہو گئی ہے یارا ہم پتا نہیں کس سمت نکل کھڑے ہوئے ہیں کہ ابھی تک آبادی کے کوئی آثار ہی نہیں دکھائی دے رہے۔“ اعظم کے جاگ کر بھوک پیاس کے باعث رونے کا سوچ کر ہی اسے وحشت ہونے لگی تو اپنی رفتار تھوڑی سی بڑھا کر چند قدم آگے جاتے جا رہے جا ملا۔

”میرا خیال ہے ہم آبادی سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ وہ اوپر اڑتے ہوئے جنگی کبوتر دیکھو۔ یہ عام طور پر آبادیوں کے آس پاس ہی رہتے ہیں تاکہ خود راک آسانی سے ملتی رہے۔“ جادو نے انگلی سے اشارہ کیا تو اس نے بھی ان کبوتروں کو دیکھا اور جادو کی بات میں وزن محسوس کیا۔ وہ اب تک جس علاقے میں چلتے رہے تھے، وہاں تو چھ جنگی

گاڑی ہے۔“ کوئی نقصان نقصان نہیں ہونے والا۔ ایک دست کی گاڑی ہے جس نے پہلے ہی احتیاطاً گمشدگی کی رپورٹ کھوار کھی ہے۔ اچھی خاصی کٹتی والا بندہ ہے۔ کسی نہ کسی طرح بعد میں گاڑی کو پولیس کی کسٹڈی سے نکلوا لے گا۔“ جادو نے فکر تھا۔

”کیا کہنے ہیں بھائی تمہارے۔ مجھے تو تم خود کوئی بڑی پہنچی ہوئی ہستی لگتے ہو۔“ معاذ نے اسے گھورا۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بس کچھ دوست اور ہمدرد ہیں یہاں جو سمجھتے ہیں کہ ہمارے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے اور ہمیں اپنے ساتھ ہونے والی اس زیادتی کے خلاف جدوجہد کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔ اس لیے وہ ہمارا ساتھ دیتے ہیں۔“ جادو نے اپنی صفائی دیتے ہوئے اسٹریٹنگ گھمایا۔ گاڑی دائیں طرف غڑی اور پھر چند گز چل کر پچھلیاں لیتی ہوئی ایک جھکے سے رک گئی۔

”ادھش یار! فیول ختم ہو گیا۔“

”اوہ نو۔ اب ہم کیا کریں گے؟“ معاذ اس بدخبری کو سن کر کرا رہا۔

”پیدل مارچ ہی واحد اور بہترین آپشن ہے۔“ جادو نے کندھے اچکاتے ہوئے جواب دیا۔

”آپ پیدل چل سکیں گی کل؟“ معاذ نے پیچھے مڑ کر پریشانی سے کل سے پوچھا۔

”جی ضرور۔“ وہ خود ہی دروازہ کھول کر نیچے اتر آئی۔

”آپ تھوڑی دیر اس جھاڑی کے سائے میں بیٹھ جائیں۔ میں اور معاذ اتنے میں ایک کام نکالتے ہیں۔“ جادو نے ادب سے کل سے کہا اور باکس میں سے کچھ لٹو بچہ نکال کر معاذ کے حوالے کیے۔

”زیادہ ایمر جنسی نہیں ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ ہم ملکہ حد تک اپنے فنگر پرش مٹاتے ہوئے چلیں۔“

”بالکل۔“ معاذ نے اس کے خیال سے اتفاق کیا۔

آٹھ دس منٹ میں دونوں مل کر گاڑی کو اچھی طرح اندر باہر سے صاف کر چکے تھے۔ جس نشست کے نیچے سے بڑی گن لالی گئی تھی، وہیں سے دو مسلح نکال کر جادو نے ایک خود رکھا اور دوسرا اس کے حوالے کیا۔ بڑی گن وہ چھپا کر ساتھ رکھ لے جاسکتے تھے اس لیے اسے ایک چھوٹے سے گڑھے میں ڈال کر گڑھے کو مٹی اور پتھروں وغیرہ سے بھر دیا گیا۔

”اسے میری کوڑ میں دے دیں۔ بچہ کوڑ میں لے کر

پودوں اور جھاڑیوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔

”تمہارا اندازہ ٹھیک.....“ اس نے جارو کی تائید کرنا چاہی لیکن اس نے یکدم ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا اور خود رک کر ایک کان کو ہاتھ کی اوٹ میں لیے اس انداز میں کھڑا ہو گیا جیسے کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کر رہا ہو۔

”تیز تیز چلو۔ ہمیں جلد از جلد یہاں سے لکھنا ہے۔“
”کیا ہوا؟“ معاذ اس کے لہجے پر پریشان ہو گیا۔
”مجھے پولیس کی گاڑیوں کے سائرن سنائی دے رہے ہیں۔ لگتا ہے ہمارے لیے سرچ آپریشن شروع ہو گیا ہے۔“ اس نے ایک تشویشناک خبر سنائی جسے قریب آ پہنچنے والی جمل نے بھی سن لیا۔

اب وہ بھوک پیاس سب بھول کر پوری رفتار سے چلنا شروع ہو چکے تھے۔ جیسے جیسے آگے بڑھتے جا رہے تھے، آبادی کے آثار بھی نظر آنے لگے تھے۔ موٹا بٹل ٹاور، بجلی کا کھمبا، آسمان پر اڑتی ایک عدد چٹنگ..... سب کی سب نشانیاں بتا رہی تھیں کہ وہ آبادی کے قریب ہیں۔ ابھی وہ باقاعدہ آبادی میں نہیں پہنچے تھے کہ..... اچھے ہوئے بالوں والے ایک آدمی پر نظر پڑی۔ میلے سے کپڑوں میں ملبوس وہ شخص سگریٹ کے سونے لگنا جھومتا ہوا اسی طرف چلا آ رہا تھا۔ اس نے بھی انہیں دیکھ لیا اور منہ کھول کر اپنی حیرت کا اظہار کیا۔

”کون ہو جی آپ لوگ؟“ اگرچہ ان کے اپنے چلے بھی خامے اتر ہو چکے تھے اور ہاتھ پاؤں دھول مٹی میں اٹ گئے تھے لیکن وہ لباس وغیرہ سے اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ لوگ کم از کم اس کے قبیل سے تعلق نہیں رکھتے تھے اس لیے اپنی جانب سے ذرا مہذب انداز میں ان سے مخاطب ہوا تھا۔

”مسافر ہیں۔ گاڑی کے ساتھ حادثہ پیش آ گیا تھا جس کی وجہ سے وہ کچے میں اتر گئی اور ہم مدد کی تلاش میں بھٹکتے ادھر آ نکلے۔ تم بتاؤ تم کون ہو؟ کیا کسی قریب کی آبادی سے آئے ہو؟“ جارو نے اس کے سوال کا جواب دینے کے ساتھ ساتھ اس پر بھی سوالات داغ دیے۔

”میں ہاشو ہوں۔ ادھر پاس میں ہی ہماری بستی ہے۔ آپ آؤ میرے ساتھ اور تھوڑا آرام کر لو پھر میں کسی مکینک وٹیک کو ڈھونڈ کر لاتا ہوں آپ کی گاڑی کے لیے۔“ وہ پیشکش نہ کرتا تو وہ جن حالات میں گھرے ہوئے تھے، خود اس سے مدد طلب کرنے پر مجبور ہو جاتے۔

”ٹھیک ہو ہاشو۔ تم اس سے ہمارے لیے فوراً بن کر آئے ہو۔“ جارو نے فوراً اس کی پیشکش قبول کر لی۔
”بس میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ آپ۔“ اس نے خوش دلی سے بولتے ہوئے سگریٹ کا ایک زوردار سہ (کش) لگایا اور جس سمت سے آ رہا تھا، اسی سمت پلٹ کر پلٹ شروع ہو گیا۔

”مجھے تو یہ کوئی نشی لگ رہا ہے۔ تم نے محسوس نہیں کیا اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں اور جو سگریٹ پی رہا ہے اس کی بھی بہت عجیب گندی سی بو ہے۔“ معاذ نے جارو کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے آگے جاتے ہاشو کے بارے میں دھیمی آواز میں ٹھٹھوک و شبہات کا اظہار کیا۔

”محسوس کرنے کی کیا بات ہے۔ مجھے سو فیصد یقین ہے کہ یہ شخص عادی نشے باز ہے اور یہی بات ہمارے جی میں جاتی ہے۔“ جارو کا اطمینان قابل دید تھا۔

”یہ کیا کہہ رہے ہو؟ یاد رکھو کہ ہمارے ساتھ ایک جوان خاتون بھی موجود ہے۔“ حیرت اور غصے کے باوجود اس نے اس خیال سے کہ پیچھے آتی جمل کچھ سن نہ لے، بہت ہلکی آواز میں جارو کو سرزنش کی۔

”دیکھو یاد آپریشن ہماری بھی مشکوک ہے۔ اس نشی کے بجائے کسی شریف آدمی سے واسطہ پڑتا تو وہ آؤ آسانی سے ہماری مدد کے لیے تیار نہ ہوتا۔ اس آدمی کو تھوڑا سا لالچ دے کر ہم آسانی سے اپنے ڈھب پرلا سکتے ہیں۔“ جارو کی بات کچھ کچھ سمجھ میں آنے والی تھی لیکن معاذ، جمل کے وجہ سے بہت حساس ہو رہا تھا۔

”تم فکر مت کرو اور دیکھو کہ میں کیسے سارے معاملات طے کرتا ہوں۔“ جارو نے اس کے شانے پر ہتھوڑی دی اور قدموں کی رفتار تھوڑی سی بڑھا کر ہاشو سے جاملا۔ اگلے وقت اس کے شانے سے لگا اعظم کسمسا کر جاگ گیا اور جاگتے ہی رونا شروع کر دیا۔

”لایم، اسے مجھے دے دیں۔ یہ اس وقت آپ سے نہیں سننے کا۔“ جمل نے جلدی سے آگے بڑھ کر اعظم اس سے لے لیا اور بوتل میں بچا ہوا پانی اسے پلانے لگا۔ اس نے دو گھونٹ پھر کر پانی چھوڑ دیا اور دوبارہ رونے لگا۔
”اسے یقیناً بھوک لگ رہی ہے۔“ معاذ کو اس کے رونے کی وجہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ ان لوگوں کو گھر سے لے ہوئے کئی گھنٹے گزر چکے تھے اور اب تک تو بڑوں کے پیٹ میں بھی جھبہ نہ چنے لگے تھے۔ ایسے میں ایک چھوٹے بچے سے کتنے صبر کی امید رکھی جاسکتی تھی۔

”ہوں..... صبح جاگا تھا تو میں نے فیڈر بنا کر دیا تھا۔ تب سے اب تک بچے کے حساب سے تو بہت زیادہ وقت گزر چکا ہے۔ وہ تو شکر ہے کہ اتنی دیر تک سوتا رہا تو شور نہیں کیا ورنہ بہت مشکل ہو جاتی۔“ سبیل نے مضطرب لہجے میں جواب دیا، ساتھ ساتھ وہ روتے ہوئے اعظم کو تھپک تھپک کر بہلانے کی بھی کوشش کر رہی تھی لیکن اس صبر والے بچے کا صبر بھی بھوک کے آگے ہار چکا تھا۔

”بس بستی میں پہنچ جائیں تو سب سے پہلے اس کی بھوک کا ہی انتظام کریں گے۔“ اس نے محل کو دلا سادیا۔

وہ لوگ دو تین منٹ مزید چلے تو ہنگی پکی جھوپڑیوں والی بستی دکھائی دینے لگی۔ بستی دکھائی دیتے ہی آگے چلتے جا رہا شور دکھ گئے۔

”ابھی آپ لوگ ادھر ہی رکو۔ میں ذرا اچھی طرح دیکھ لوں کہ آس پاس کوئی ہے تو نہیں۔“ وہ لوگ قریب پہنچے تو ہاشو نے کہا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا آگے نکل گیا۔

”میں نے کچھ رقم دے کر اسے راضی کر لیا ہے کہ وہ یہاں ہماری آمد کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتائے گا۔ ہم کچھ دیر اس کے ہاں رک کر خود کو فریش کریں گے پھر آگے کا لاکھ مل طے کریں گے۔“ جاوہ نے انہیں اپنی کارگزاری سے آگاہ کیا۔

”مجھے یہ شخص قابل اعتبار نہیں لگ رہا۔“ معاذ کو ہاشو کی طرف سے اب بھی تحفظات تھے۔

”رہسک تو لینا پڑے گا۔ فی الحال ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔“

جاوہ کی بات بھی اپنی جگہ ٹھیک تھی۔ معاوضے خاموشی اختیار کر لی اور ایک نظر محل کی گود میں موجود اعظم پر ڈالی۔ دو دروتے روتے نڈھال ہو گیا تھا اور اب اس کے قلعے سے چٹکی ٹپکی آوازیں نکل رہی تھیں۔ اس بھی جان کے لیے خوراک کا فوری بندوبست ضروری تھا اور فوری بندوبست اسی صورت ہو سکتا تھا کہ وہ ہاشو پر اعتبار نہ ہوتے ہوئے بھی اس پر اعتبار کر لیں۔

”آؤ، وہ دیکھو ہاشو ہاتھ کے اشارے سے ہمیں بلاتا ہے۔“ جاوہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مڑو جھکیا تو اس نے بھی دور کھڑے ہاتھ بلاستے ہاشو کی طرف دیکھا۔

”اس بچہ پر ہماری بستی کے زیادہ تر مرد اور عورتیں اپنے اپنے دھندلے پر لٹکے ہوئے ہیں۔ اس لیے چھوٹے بچوں کے سوا بس دو چار میرے جیسے ہی آوارہ گروی کرتے یا دھتے ہوئے مرد یہاں دکھائی دیتے ہیں۔ تم لوگوں کا

نصیب اچھا ہے کہ ابھی ان میں سے کوئی بھی ادھر دکھائی نہیں دے رہا۔ بس وہ ایک تھو ہے جو باہر چار پائی ڈالے جنگ پی کر بے خبر سو رہا ہے۔ اسے تو موت کا فرشتہ بھی لینے آ جائے تو ہوش میں نہیں آئے گا۔ اس لیے آپ لوگ اس کی چٹانہ کرنا۔“ وہ ان کی راہنمائی کا فریضہ انجام دینے کے ساتھ ساتھ حالات کی پوری پوری رپورٹنگ بھی کر رہا تھا۔

وہ بستی اپنی نوعیت کی دیگر بستیوں کی طرح ہی گندی سندی اور بے ترتیب تھی۔ چند ایک جھوپڑے ہی ایسے تھے جن کی حالت بہتر دکھائی دے رہی تھی ورنہ زیادہ تر کی حالت سے غربت و افلاس فک رہی تھی اور اندازہ ہوتا تھا کہ گھر کے نام پر دستیاب یہ پناہ گاہیں انہیں موسموں کی شدت سے بچانے میں بھی پوری طرح کامیاب نہ ہو پاتی ہوں گی۔ راستے میں دکھائی دینے والے بچوں کے نامکمل لباس، ننگے پاؤں، بے ترتیب بال، جسموں پر چوڑی میل کی نہیں اور آنکھوں میں ڈیرے ڈالے میٹھی خسر تیں سب اس الجھے کا اظہار کر رہی تھیں کہ وطن عزیز کی طرح ہی ایسی طاقت رکھنے والے بھارت جیسے بڑے ملک میں بھی لاکھوں لوگ غربت کی ککیر سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ خالی پیٹ اور دیران آنکھوں والے لوگ ہر صاحب اختیار و صاحب اقتدار شخص کے لیے سوالیہ نشان تھے لیکن کوئی ان کی طرف نظر ہی نہیں کرتا تھا۔

وہیں انہوں نے باہر چار پائی ڈال کر سوتے تھو کو بھی دیکھا۔ اس کا منہ نیم دا تھا اور اس کے وجود پر بھٹکنے والی کھیول میں سے چند اس کھلے منہ سے بہ آسانی اندر باہر ہو رہی تھیں۔ یہ معلوم نہیں تھا کہ خود کو اس حد تک بستی میں لے جاتے ہیں دنیا کے دھکوں کا حال تھا یا اس کی بے عملی کا۔ وہ سب اس شخص سے نظریں چرائے ہاشو کے جھوپڑے میں داخل ہو گئے۔ اس کا جھوپڑا بستی کے ان چند ایک جھوپڑوں میں سے تھا جن کی حالت بہتر تھی۔ اندر پہنچ کر اس بہتری کا مزید احساس ہوا۔ اگرچہ اندر قدرے پھیلاوا تھا لیکن اس درجے کی گندی نہیں تھی جس کا انہیں اندیشہ تھا۔ ساز و سامان بھی کافی مناسب تھا۔ ہاشو نے انہیں بیٹھنے کے لیے جو کرسیاں پیش کیں وہ اگرچہ پرانی لیکن اچھی کوالٹی کی تھیں۔

”آپ لوگ چاہو تو ادھر غسل خانے میں جا کر اپنا حلیہ ٹھیک کر لو۔ میں اتنے میں آپ کے کھانے پینے کا کچھ کرتا ہوں۔“ اس نے ایک اچھے میزبان کا کردار ادا کرنا شروع کر دیا لیکن اس کی آنکھوں کے تاثر سے ظاہر تھا کہ یہ

ساری خوش اخلاقی واصل جادو کے دیے نوٹوں کی رہیں
منت تھی۔

”اگر دودھ ہے تو پہلے بچے کے لیے لا دو۔ ہم بڑے
بعد میں آرام سے بھی کھاپی سکتے ہیں۔“ معاذ سے صبر نہیں
ہوا تو جلدی سے بولا۔

”کیوں نہیں جی۔ ابھی لاتا ہوں۔“ وہ جھٹ سے
کمرے سے باہر نکلا۔ معاذ بھی احتیاطاً اس کے پیچھے تھا۔
وہاں کوئی الگ سے باورچی خانہ موجود نہیں تھا۔ بس کچن میں
ہی ایک جگہ کچھ تختے ٹھونکن کر سالوں کے ڈبے وغیرہ رکھنے
کے لیے انتظام کیا گیا تھا اور مٹی لپ کر چولہا بنایا گیا تھا۔
یہاں بھی صفائی کا قائل قبول انتظام تھا اور برتن بھی مناسب
تھے۔ ہاشو نے ایک ٹیڑھا پیک کھول کر اس میں سے دودھ
نکالنا شروع کیا تو معاذ کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ وہ اچھوڑ
کوائی کا دودھ تھا۔

”تم یہاں اکیلے رہتے ہو؟“ ابھی تک وہاں کوئی
دوسرا فرد دکھائی نہیں دیا تھا اس لیے اسے سوال کرنے کا
موقع مل گیا تھا لیکن گھر کی حالت سے اسے یقین تھا کہ یہ
ہاشو جیسے گندے سندے شخص کے بجائے کسی اور کی
کارگزاری ہے۔ شاید اس کی بیوی بھی اس سب کے پیچھے۔
”اکیلا نہیں رہتا جی۔ وہ میرا یار ہے نا انوپ، وہ
آجاتا ہے ہر رات پھر خوب محفل جیتی ہے اور ہم ایک
دوسرے کو دل کا حال سناتے ہیں۔“ اس نے بہت خوشی اور
جوش سے اظہار دی۔

”اوہ اچھا، میں سمجھا تمہاری بیوی ہوگی جس نے سب
سنجالا ہوا ہے۔“

”انوپ کو بھی بیوی ہی سمجھو جی۔“ دودھ کو ایک کپ
میں اٹھ لیتے ہوئے ہاشو عجیب سے انداز میں ہنسا پھر اپنی ہی
بات کا اثر زائل کرنے کے لیے بولا۔ ”بڑا سکھ لڑکا ہے
انوپ۔ یہاں سب کچھ اسی نے سنبالا ہوا ہے۔ ابھی تھوڑی
دیر میں کام پر سے آتا ہے تو آپ سے ملواتا ہوں۔“

”کہاں کام کرتا ہے وہ؟“ اس نے ہاشو کے ہاتھ
سے دودھ کا کپ لیتے ہوئے سرسری لہجہ میں پوچھا۔

”متر صاحب کے ہنگے پر۔“ ہاشو کے جواب نے
خود بخود بہت سے سوالات کے جواب دے دیے۔ یقیناً
انوپ کے مالکان مہربان لوگ تھے اور اپنا پرانا ساز و سامان
اسے دان کر دیتے تھے۔ اس لیے اس مجموعہ میں نسبتاً
خوشحالی کی جھلک تھی۔

وہ دودھ سے بھرا کپ لیے اندر کمرے میں چلا گیا۔

کپ سہل کو چھایا تو اس کی گود میں موجود اعظم شور مچاتا کہ
پر پٹکنے لگا۔ سہل نے یہ مشکل اسے سنبال کر کپ ہونٹوں سے
اگایا۔ بھوکا بچہ بے تابی سے دودھ پیتے لگا۔ عام حالات میں
وہ فیڈر سے دودھ پیتا تھا۔ کچھ اس کی نا تجربہ کاری اور کچھ
بے تابی کی وجہ سے دودھ پیتے ہوئے گر بھی رہا تھا۔ معاذ
نے سہل کے کپڑے خراب ہوتے دیکھ کر اپنی جیب سے
رومال نکال کر اسے دیا۔

”بڑا پیارا بچہ ہے جی آپ کا۔ لگتا ہے بڑی دیر سے
بھوکا ہے۔ آپ اسے یہ کپلے بھی کھلا دینا۔“ ہاشو پلاسٹک کی
ایک ٹوکری میں کچھ کپلے رکھے اندر آیا اور ٹوکری معاذ کے
ہاتھ میں ختماتے ہوئے بولا تو وہ اس کے الفاظ پر کھسیا نا ہو گیا
اور بے ساختہ ہی سہل کو دیکھا۔ وہ خود کو مکمل انجان ظاہر کر لی
اعظم کے ساتھ مصروف تھی۔

”میں نے منہ ہاتھ دھو لیا ہے۔ تم بھی جا کر اپنا حلیہ
ٹھیک کر لو تو پھر بھابی کی باری آئے گی۔“ جادو نے آنکھوں
کو نادبا کر اسے کسی بھی تردید سے روکا تو وہ بات کو سمجھ کر سر
ہلاتا ہوا باہر نکل گیا۔ ہاشو پر یہ ظاہر ہونے کی نسبت کہ سہل
ان دونوں میں سے کسی سے کوئی رشتہ نہیں ہے، یہ تاثر دینے
کا زیادہ مناسب تھا کہ وہ اس کی بیوی ہے۔

بازی باری وہ اور سہل غسل خانے جا کر اپنی حالت
بہتر کر آئے۔ ہاشو اس دوران چائے تیار کر کے ان کے لیے
رسک اور بسکٹ لے آیا تھا۔

”مجھے بس چائے پانی آتی ہے اس لیے کھانے کو بھی
کچھ دے سکتا تھا۔ انوپ آجائے تو آپ لوگوں کے لیے کھا
بھی بنا دے گا۔“ ہاشو نے معذرت خواہانہ لہجہ میں کہا تو اس
کے انداز میں معنوی پن تھا جس کی ان میں سے کسی نے
پردائش کی اور جادو خوشدلی سے بولا۔

”یہ بھی بہت ہے یار اصل چیز ہے چائے۔ یہ لگا
ہے تو کسی اور چیز کی پروا نہیں ہے۔“

”آپ لوگ کھاپی کر آرام کر لو۔ میں اتنی دیر میں
کوئی مکینک ڈھونڈ کر لاتا ہوں۔“ جادو کے دہانے ہونے
نوٹوں کا نکال تھا کہ وہ ان کی خدمت کے لیے بھا جا رہا تھا۔
”رہے دو یار! ہم سوچ رہے ہیں کہ کوئی ٹیکسی وغیرہ
لے کر یہاں سے نکل جائیں۔ گاڑی کے لیے بعد میں غم
مکینک لے کر آجائیں گے۔“ ظاہر ہے کہ انہیں اب گاڑی
کے قریب بھی نہیں پہنچنا تھا اور جلد از جلد اس علاقے سے بھی
نکلنا تھا اس لیے معاذ نے اس کی پیشکش کے جواب میں
بات پانی۔

”کسی نے لاوارث گاڑی کھڑی دیکھ کر کچھ التاسیدھا کر دیا تو پھر.....؟“ ہاشو نے تشویش کا اظہار کیا۔

”کچھ نہیں ہوگا یار! اور ہوا بھی تو ہم برداشت کر لیں گے کیونکہ ہمارے ساتھ ایک عورت اور بچہ بھی موجود ہیں اور ان کے لیے مناسب ہے کہ جلد اندر جلد ٹھکانے پر پہنچ جائیں۔ یہاں تمہارے گھر میں تو جگہ ہی نہیں ہے کہ یہ دونوں آرام سے اٹھ بیٹھ سکیں۔“ جادو نے مسئلہ بیان کیا تو ہاشو کی نظر کھل کی طرف گئی۔ وہ ان لوگوں کی طرف پشت کیے چائے پی رہی تھی۔

”یہ بات تو آپ کی ٹھیک ہے۔“ اسے قائل ہونا پڑا۔ اسی وقت دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی اور کوئی اندر آیا۔

”لوئی، انوپ آگیا۔“ ہاشو نے یوں خوشی کا اظہار کیا جیسے بچے شام ڈھلے کام پر سے واپس آنے والے باپ کی آمد پر خوش ہوتے ہیں۔

قدموں کی آہٹ کے ساتھ ایک ذرمیانی قامت اور چھریرے بدن کا خوش شکل لڑکا اندر داخل ہوا۔ وہ صاف ستھرا لباس پہنے ہوئے تھا اور اس کے قدرے لمبے بال بھی سینے سے سنورے ہوئے تھے۔ عمر کے اعتبار سے وہ ہاشو سے کئی سال چھوٹا محسوس ہوتا تھا۔ مجموعی طور پر دیکھا جاتا تو اس میں اور ہاشو میں کچھ بھی ایسا مشترک نہیں تھا جسے دونوں کی دوستی کی بنیاد سمجھا جاتا۔ ان لوگوں کو وہاں موجود پا کر وہ ٹھنک سا گیا۔

”آجا انوپ! یہ بے چارے مصیبت زدہ ہیں۔ ان کی گاڑی.....“ آگے ہاشو نے اسے وہی کہانی سنائی جو جادو نے اسے سنائی تھی۔ یہ ساری داستان سنتے ہوئے اس نے ان سب پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور جب ہاشو خاموش ہوا تو سنجیدہ سے لہجے میں بولا۔

”تو ذرا باہر آ کر میری بات سن لے۔“

”ہاں، ہاں چل یار! مہمانوں کے کھانے کا بھی کچھ کرنا ہے۔ میرا تو خجے پتا ہی ہے کہ چائے کے سوا کچھ نہیں بنا سکتا۔“ ہاشو بولتا ہوا اس کے پیچھے باہر نکل گیا۔

”مجھے کوئی گڑبڑ لگ رہی ہے۔“ انوپ کے چہرے کے تاثرات عجیب سے تھے۔ ”ان کے باہر نکلنے ہی معاذ نے خیال آرائی کی۔“

”شش.....“ جادو نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور خود بالکل سادگت ہو کر بیٹھ گیا تو معاذ سمجھ گیا کہ وہ انوپ اور ہاشو کی گفتگوں رہا ہے۔ انوپ، ہاشو سے کہہ رہا تھا۔

”کچھ پتا بھی ہے کہ کس مصیبت کو گلے میں ڈال لیا ہے۔ پولیس ڈھونڈتی پھر رہی ہے تمہارے ان مہمانوں کو۔“

”کیا کہہ رہے ہو یار؟“ ہاشو نے کر پوچھا کیا۔

”ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ یہ دیکھو، ہر طرف ان کی فونوز دکھار ہے ہیں نوز میں کہ یہ آنکھ وا دی ہیں۔ ادھر اسپتال میں کسی نے پہچان کر پولیس کو انعام کیا تھا لیکن یہ وہاں سے نکل بھاگے۔ بعد میں ان کے اور پولیس کے درمیان مقابلہ بھی ہوا جس میں یہ پولیس کی گاڑیاں الٹا کر بھاگ نکلے۔ ادھر کچے میں پولیس کو ان کی گاڑی کھڑی ملی ہے اور وہ آس پاس کے علاقے میں ناکا لگائے انہیں ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔“ انوپ اسے ایک ایک حقیقت سے آگاہ کر رہا تھا۔

”ہائے میرے رے بابا! اب کیا ہوگا؟“

”پولیس کو پتا چل گیا کہ ہم نے ان آنکھ وا دیوں کو اپنے پاس پناہ دی ہوئی ہے تو ہمیں بھی ان کے ساتھ گرفتار کرنے کی پھر باقی کا سارا جیون جیل میں چلنی کاٹنے ہوئے گزارنا۔“ انوپ کا لہجہ کشیدہ تھا۔

”مجھے کیا پتا تھا اس گڑبڑ ٹھونڈالے گا۔ میں نے کہا کہ چلو تھوڑی سی سیوا کے بدلے اچھی رقم مل رہی ہے تو ہاں کر دیتا ہوں۔ تھوڑا حیران ہو جھڑپ ہو جائے گا۔“ ہاشو اس کے سامنے کھسیانا ہو رہا تھا۔

”میں نے ہزار بار تم سے کہا ہے کہ پیسوں کے لیے اٹنے سیدھے کام نہ کیا کرو۔ جب میں سارے خرچے پورے کر دیتا ہوں تو کاہے کو کشتہ اٹھاتے ہو۔“ انوپ نے ناراضی ظاہر کی۔

”جو ہوا اسے جانے دو۔ یہ بتاؤ کہ اب کرنا کیا ہے؟“ ہاشو کا انداز منانے والا تھا۔

”پولیس کو کال کرتا ہوں اور کیا۔ جو ج ہے سب بتا دیتا۔“ انوپ نے اپنا فیصلہ سنایا اور موبائل کی اسکرین پر انگلی پھیرتی۔

”اتنی تیزی نہ دکھاؤ یارو! ابھی تو ہم نے تمہاری میزبانی کا پورا الطاف بھی نہیں اٹھایا ہے۔“ جادو جو حالات کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے تیزی سے کمرے سے نکل کر ان کے سروں پر پہنچ چکا تھا، اس کے ہاتھ سے موبائل اچکتے ہوئے بولا تو اس نے قدرے طیش سے اس کی طرف دیکھا لیکن جب اس کے ہاتھ میں بدل نظر آیا تو زور سے سنا ہو گیا۔

”یہ..... یہ غلط ہے۔ میں نے اس لیے تمہاری مدد نہیں کی تھی کہ تم ہماری ہی جان لینے کھڑے ہو جاؤ۔“ ہاشو نے ہکلاتے ہوئے احتجاج کیا۔ وہ دیکھ سکتا تھا کہ معاذ بھی

کمرے سے نکل آیا ہے اور اس کے ہاتھ میں بھی ایک عدد پمفل موجود ہے۔

”ہم بالکل بھی تمہاری جان نہیں لینا چاہتے لیکن تم اپنی حرکتوں سے ہمیں مجبور کر رہے ہو تم کیا کر سکتے ہو۔“

”ہم ایسا کچھ نہیں کریں گے۔ تم بس ہمیں شاکر دو۔“

ہاشو کی ہوا بالکل ہی کھسک چکی تھی البتہ انوپ خاموش کھڑا کینہ تو زنگاہوں سے انہیں گھور رہا تھا۔ وہ عمر میں کم ہونے کے باوجود ہاشو کے مقابلے میں زیادہ ہوشیار دکھائی دیتا تھا۔

”ہم بہت غریب لوگ ہیں جی۔ ہم پر کوئی مصیبت آگئی تو کوئی ہماری مدد کرنے والا بھی نہیں ہوگا۔“ ہاشو اپنی جگہ ہائیاں دے رہا تھا۔

”غریب تو تم لوگ مجھے کہیں سے نہیں لگتے۔ اپورٹڈ دودھ کے ڈبے، ہنگی ہتی، پمفل فروٹ سب کچھ ہے تمہارے گھر میں۔ کوئی غریب آدمی تو یہ سب انورڈ نہیں کر سکتا۔“ اس بار محاذ نے گفتگو میں حصہ ڈالا۔

”یہ سب تو انوپ کی نوکری کی وجہ سے ہے۔ پمفل میں کام کرتا ہے تا تو بھی بالکل کوئی چیز دان کر دیتی ہے اور کبھی یہ وہاں سے پار کر کے لے آتا ہے۔ آج کل زیادہ حرے اس لیے ہیں کہ مالک لوگ گھومنے کے لیے گئے ہوئے ہیں۔ یہ پیچھے سے پمفل کی دیکھ بھال کے لیے جاتا ہے تو جو ہاتھ لگے، لے آتا ہے۔“ ہاشو نے سب اگل دیا۔

”بہت خوب..... یعنی جس تھالی میں کھاتے ہو، اسی میں چھید کرتے ہو۔“ محاذ نے طنز کیا۔

”تم سے تو بہتر ہیں، دوسروں پر گولیاں چلا کر ان کی جان تو نہیں لیتے پھرتے۔“ بیچ و تاب کھاتے انوپ کو جوابی حملہ کرنے کا موقع مل گیا۔

”ہم کون ہیں اور کیا ہیں، یہ تم نہیں جانتے۔ تم ہمارے بارے میں وہی کہہ رہے ہو جو تمہارا جھوٹا میڈیا دکھا رہا ہے۔“ اس کے الزام پر محاذ کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

”ان سب بیکار کی باتوں کو جانے دو۔ لی الحال ہمیں مسٹر انوپ سے حالات کی پوری ڈیٹیل لینا ہے تاکہ اپنے بچاؤ کا راستہ نکال سکیں۔“ ہارو نے اس ساری بحث کو قسم کیا اور ان دونوں کو اندھ پٹے کا اشارہ کیا۔ اس کے ہاتھ میں پمفل کی موجودگی نے ان دونوں میں سے کسی کو بھی انکار کی جرأت نہ کرنے دی۔ اندھ نکل دوڑا ہے پر نظریں جمائے پھر بھی جی جیکہ نضا اعظم بھرے پیٹ کی آسودگی کے ساتھ دنیا کی ہر فکر سے آزاد گتے کے ایک خالی ڈبے سے کھیل رہا تھا۔ انہوں نے انوپ کو سامنے بٹھا کر ایک ایک بات کی تفصیل

معلوم کرنا شروع کر دی، خصوصاً سائیلیس کے ناکوں پر زیادہ زور تھان کا۔ انوپ کے موبائل پر انٹرنیٹ کنکٹیج نے بھی ان کی خاموشی مدد کی اور ہر طرف کی خبریں دیکھتے ہوئے انہیں اندازہ ہوا کہ ان کی تاش پوری شدہ سے جاری ہے۔

”اس صورت حال میں تو ہمارا یہاں سے نکلنا مشکل ہو جائے گا۔ پولیس کسی نہ کسی نام کے پر ہمیں دھر لے گی۔“ ساری تفصیلات سامنے آنے پر محاذ نے تشویش کا اظہار کیا۔

”تم یہاں بھی بہت دیر تک چھپ کر نہیں بیٹھ سکو گے۔ یہ غریبوں کی ہستی ہے۔ آپس میں دیوار سے دیوار ملی ہوئی ہے۔ کسی سے نہیں چھپے گا کہ یہاں کوئی رہ رہا ہے۔

انعام کے لالچ میں آس پاس سے کوئی بھی پولیس کو خبری کر دے گا۔“ انوپ نے منہ بناتے ہوئے اس کی بات میں نقد دیا۔ اس کی گئی اپنی جگہ تھی لیکن یہ بات سامنے والی تھی کہ وہ جو کہہ رہا ہے، وہی حقیقت ہے۔

”دیکھیں اس معاملے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم نکال لیں گے اپنے اس مسئلے کا حل۔“ جارد نے ترش لہجے میں اسے ڈپٹا اور پھر اسی رعب سے بولا۔

”ابھی تو تم دونوں دوست مل کر ہمارے لیے رات کا کھانا بناؤ، ہم کھانا کھالیں تو اس مسئلے پر بھی بات کر لیں گے۔“

”کیوں، میں کیوں بناؤں تمہارے لیے کھانا؟ میں کیا تمہارا نوکر ہوں؟“ انوپ اس کی فرمائش سن کر کڑ گیا۔

”نوکر نہیں لیکن اس وقت ہمارے قبضے میں تو ہو۔ اس کی موجودگی میں انکار کی جرأت ہے تم میں؟“ اس نے اپنا پمفل انوپ کے سامنے لہرایا۔

”پمفل نہ یاد! کاہے کو خد بحث کرتا ہے۔ کھانا تو اپنے کو اپنے لیے بھی رکھنا ہے نا۔“ انوپ سے زیادہ ہاشو گھبرا گیا اور اس کا بازو پکڑ کر کھینچا۔

”پمفل، میں تیری ہیلپ کرتا ہوں۔“ اس نے اصرار کر کے انوپ کو کھڑا ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ دونوں باہر نکلے تو جارد بھی ان کے پیچھے پیچھے باہر نکل گیا۔

”آپ گھبراہٹے گا مت پمفل! ان شاء اللہ ہم بہت جلد ان سارے مسائل سے نکل جائیں گے۔“ ان لوگوں کے جانے کے بعد کمرے میں کچھ دیر خاموشی طاری رہی پھر محاذ نے سر جھکائے ٹیٹھی بجل سے کہا۔

”مجھے آپ پر اعتماد ہے۔“ اس نے نہایت جتن سے جواب دیا تو محاذ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اسے کھل کی آنکھوں کا تاثر دیکھ کر ایسا لگا جیسے وہ مسکرائی ہو۔

”میں جانتی ہوں کہ آپ نے، میں نے یا ادا سامیں

نے کچھ غلط نہیں کیا ہے۔ ہم لوگ بس حالات کے چنگل میں پھنس گئے ہیں اور اس چنگل سے ایک نہ ایک دن اللہ سائیں ہم سب کو نکال دے گا۔“ اب وہ اپنی کئی بات کی وضاحت دے رہی تھی۔

”ان شاء اللہ۔“ معاذ جواہر اتنا ہی کہہ سکا پھر اپنی جگہ سے کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔

”میں باہر جا کر ان لوگوں کے ساتھ بیٹھتا ہوں۔ آپ اتنی دیر پر ٹیکس کر لیں بلکہ ایسا کریں اندر سے کٹری لگا کر تھوڑی دیر کے لیے لیٹ جائیں۔ بہت دیر ہو گئی ہے آپ کو یوں بے آرا می میں۔“

”جی ٹھیک ہے۔“ نکل نے انکار نہیں کیا۔ یہ سچ تھا کہ وہ بہت تھک گئی تھی پھر خود کو مستقل چادر میں لپیٹ کر مردوں کے درمیان میں بیٹھے رہنا بھی خاصا تکلیف دہ تھا۔ ایسے میں اگر اسے کچھ دیر آرام کا موقع مل رہا تھا تو اسے تکلفات میں پڑ کر ضائع کر دینا مناسب نہیں تھا۔

☆☆☆

سرخ، نیلے، پیلے، عنبائی، اودے، جانے کون کون سے انوکھے رنگوں کے پھول تھے جو اس کی نگاہوں کے سامنے پھیلے ہوئے تھے۔ ان پھولوں کو دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں ایک چمک اور حیرانی سی تھی۔ زندگی کے جو رنگ اس نے دنیا سے الگ تھلک اس بستی میں دیکھے تھے، وہ کہیں اور دکھائی نہیں دیے تھے۔ یہ دنیا اس دنیا سے بالکل جدا تھی جہاں وہ اب تک رہتی آئی تھی۔ سادگی اور حسن کا جو احتیاج اس نے یہاں دیکھا تھا، اس سے اس کا پہلے بھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ سخت محنت و مشقت کی زندگی گزارتے صاف دل اور سادہ مزاج لوگ، بناوٹ سے عاری رویتے، ملاقاتی اور موٹی ضرورت بات کا خیال رکھ کر بنائے گئے غیر نمائشی گھر، موسم کی سختیوں کو چھپانے کے لیے شونخ رنگ بھاری لباس اور ان لمحوں کی شان بڑھانے والے ایسے حسین چہرے جنہیں کسی سنگار کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

سچ یہ تھا کہ اسے یہ دنیا اپنی سادہ دنیا سے زیادہ پسند آئی تھی اور اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ ہمیشہ ہمیش کے لیے یہیں رہ جائے۔ اپنے ان سارے پیاروں کے ساتھ جن کا ساتھ زندگی کو خوشیوں سے بھر دیتا تھا۔ اگرچہ اس کی یہ خواہش ابھی ادھوری تھی لیکن یہاں ان رنگوں اور خوبصورتیوں کے درمیان رہتے ہوئے اس کے دل نے اچھی امیدیں باندھنا سیکھ لیا تھا۔ اسے لگنے لگا تھا کہ زندگی میں خوشیوں اور رنگوں سے بھرے دن ایک بار پھر لوٹ کر آئیں گے۔ ایک بار پھر

اس کا ہر پیارا رشتہ اس کے قریب ہوگا اور ایک بار پھر وہ زندگی کو پورے دل سے جی سکے گی۔

”کیا سوچ رہی ہے ہماری بلیا؟“ ہاتھ میں کدال اٹھائے ایک بوڑھا کب اس کے برابر میں آ بیٹھا، اسے اپنی سوچوں میں گم پتا ہی نہیں چل سکا۔

”کچھ نہیں، بس اپنے سامنے پھیلی اس خوبصورتی کو دیکھ کر بتانے والے کے ہنر کی داد دے رہی تھی۔“ اس نے رخ موڑ کے بوڑھے کے ماتھے پر چمکتی پسینے کی پوندوں کو دیکھا اور آہستہ سے جواب دیا۔

”کہیں وہ گھونچ تو یا نہیں آ رہا؟“
”کون گھونچ؟“

”وہی تمہارا مجازی خدا۔“ بڑی بے پروائی سے اس کی حیرانی دور کی گئی۔

”آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ ہر روز میرے مجازی خدا کو ایک تیانام دے دیتے ہیں۔“ وہ زور سے کہی۔

”کیا کروں، وہ میرے خاندان کا واحد چشم و چراغ ہے۔ اس لیے دل چاہتا ہے کہ سارے القابات اسے ہی نواز دوں لیکن تم فکر نہ کرو۔ میں نے اپنی لغت کے بہت سے الفاظ سنبھال رکھے ہیں۔ گھونچ کا سپوت دنیا میں آجائے تو باقی بچے ہوئے نام اسے دوں گا۔“ بوڑھے نے اس کی طرف قدرے جھکتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں کہا تو اس بار اس کے رخساروں پر شرم کی لالی پھیل گئی اور اس نے چادر کے اندر آہستہ سے اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھا۔ اس کے ہاتھ نے اس کی کونہ میں پلٹی زندگی کو محسوس کیا۔

”بات کرو گی اس سے؟“ بوڑھے نے نرم مسکراہٹ کے ساتھ دریافت کیا۔

”نیکی اور پوچھ پوچھ۔“ وہ اس پینکشن پر نکل اٹھی۔
”آج رات میں کھانے کے بعد بات کرواؤں گا۔“
”جی ٹھیک ہے۔“

”تو پھر ٹھیک ہے۔ اسی بات پر ایک پان کھلاؤ۔“
”جی ہاں، کھلاتی ہوں۔“ اس نے قریب رکھے بیگ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ بیگ میں پان اور اس سے متعلقہ تمام لوازمات موجود تھے۔

”یہ پان پارٹی کس خوشی میں چل رہی ہے بھی؟“
ایک اور بوڑھا کاندھے پر پھاؤ ڈار کے وہاں چلا آیا۔
”یہ تو میرے اور میری بیٹی کے درمیان ایک راز ہے۔“ اسے آنکھ مار کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا گیا۔

”آپ کی یہ بیٹی اتفاق سے میری سگی بیٹی ہوتی

”یہ تو زیادتی ہے بلایا“ دونوں نے اپنے چہرے لٹکا لیے۔
 ”سچ کو زیادتی نہیں کہا جاسکتا۔“ وہ سختی سے اپنے موقف پر قائم رہی۔
 ”اگر یہ بات ہے تو پھر رات والا وعدہ منسوخ۔“ اسے دھمکی دی گئی۔
 ”ایسا ہوا تو اگلی بار میں آپ کے کھونچ سے آپ کی شکایت کروں گی۔“ اس کے پاس بھی جوابی دھمکی موجود تھی جسے دینے کے بعد وہ روکی نہیں اور اپنی جگہ سے کھڑی ہو کر وہاں سے جانے کے لیے قدم اٹھایا۔ غلٹ کے باعث اس کا جیڑا سار پٹا لیکن اس نے خود کو سنبھال لیا۔
 ”سنبھل کر بیٹا!“
 ”خیال سے بیٹی۔“

دونوں یوزموں کے لبوں سے بے ساختہ وہ یک وقت لفظ پھسلے۔ اس نے پلٹ کر تسلی دینے والے انداز میں ہاتھ ہلایا اور ہنستی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ اس رات جب وہ سیٹلائٹ فون پر اپنے محبوب شوہر سے بات کر رہی تھی تو فرقت کی اداسی کے باوجود اس کے پاس اسے سنانے کے لیے بہت سی خوشگوار باتیں تھیں۔
 ”کچھ پتا چلا؟“ بہت سی باتیں کر لینے کے بعد اس نے وہ مختصر سا سوال کیا جسے وہ سیاق و سباق کے بغیر بھی سمجھ سکتا تھا۔
 ”میں پوری کوشش کر رہا ہوں۔ ان شاء اللہ جلد کوئی اچھی خبر سناؤں گا۔“
 ”اللہ آپ کو کامیاب کرے۔“ وہ تسلی ہی سے ہل گئی کہ نہ ہل کر خود کا اتنا خیال رکھنے والوں کو مایوس نہیں کیا جاسکتا تھا۔

☆☆☆

”ان آنکھ وادیوں کو غور سے دیکھیں اور ان کے بارے میں کوئی بھی جانکاری رکھتے ہیں تو پولیس کو ترنت انظار کریں۔ ہو سکتا ہے ان آنکھ وادیوں کے مددگار آپ کے آس پڑوس میں اب بھی موجود ہوں۔“ اسکرین پر سی سی ٹی وی کیمرے کی فوجی بار بار دکھائی جا رہی تھیں۔ یہ اسپتال کی پارکنگ میں لگے کیمرے سے حاصل کی گئی فوجی تصویر تھیں جن پر چہرے کو نقاب سے چھپائے گئے، اس کی گود میں موجود اطفال اور معاذ نمایاں تھے البتہ چاروں کا چہرہ واضح نہیں آسکا تھا اور اسے اس کے ڈیل ڈول سے ہی پہچانا جاسکتا تھا۔ ان تصاویر کے علاوہ جو دوسری تصاویر دہراؤ ہرا کر

ہے۔“ دوسرے یوزر نے منہ بنا کر یاد دہانی کروائی۔
 ”آپ کی بیٹی پرانی ہو چکی۔ اب تو یہ ہماری بیٹی بن چکی ہے۔ کیوں بلایا بتاؤ اپنے ابو کو۔“
 ”جی میں.....؟“ وہ جو چہرے پر مسکراہٹ سجائے ان دونوں کی لوک جھونک سے لطف اندوز ہو رہی تھی، خود کو ریفری بنائے جانے پر بوکھلائی۔
 ”تمہارے علاوہ بھلا یہاں کون ہے جس سے مخاطب ہوا جاسکے۔“ پھاڑے والا یوزر حانراض ہوا۔
 ”اپنی لڑائی میں مجھے کیوں سچ میں لاتے ہیں؟“ اس نے ناراضی دکھائی۔
 ”ہم سچ میں لاتے نہیں، تم پہلے ہی سے سچ میں ہو۔“ وہاں اس سے بھی دگنی ناراضی تھی۔

”کیا ہو گیا ہے ابو! آپ اتنے غما کیوں ہو رہے ہیں؟“
 ”خانہ ہوں تو کیا کروں؟ بیٹھے بیٹھے یہ شخص میری سگی بیٹی پر قابض ہو گیا ہے۔“
 ”یہ میری بھی سگی بیوی ہے اور اب اس پر میرا تم سے زیادہ حق ہے۔“ کدال والے یوزر نے کا اطمینان قابل دید تھا۔

”جاؤ، جاؤ۔ میں نہیں مانتا اس حق کو۔“ ہاتھ مچا کر اعلان کیا گیا۔
 ”کیا ہو گیا ہے آپ دونوں کو؟ شروع شروع آپس میں ملے تھے تو کتنا کلفت برستے تھے اور اب جب دیکھو تب یوں چوتھیں لڑ رہے ہوتے ہیں جیسے پیدا انی دشمن ہوں۔“ وہ اس صورت حال پر رد ہائی ہو گئی۔
 ”اونہوں..... روٹنا نہیں بلایا! ہم تو یوں ہی وقت گزاریں گے لیے ایک دوسرے سے لوک جھونک کرتے ہیں۔“
 کدال والے یوزر نے فوراً شرافت اختیار کی۔

”بالکل ویسے ہی جیسے یہ پھاڑا اور کدال لے کر کھیتوں میں کام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آتا جاتا دونوں کو خاک کچھ نہیں لیکن ایسے خود کو خوش کرتے ہیں کہ کھیتی باڑی کر رہے ہیں اور اگلی جو فصل اگے گی، اس میں ہماری محنت بھی شامل ہوگی۔“
 ”اس بات کو تو خیر میں کبھی نہیں مانوں گی۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ میں سے ایک ظلم اور دوسرا ہتھیاز کے سوا دنیا کا کوئی اور ارکا میابی سے استعمال نہیں کر سکتا۔ اس لیے اگلی جو بھی فصل اگے گی، اس میں سارا کمال یہاں کے مقامیوں کا ہی ہوگا۔“ اس نے منہ بنا کر دونوں کو ایک ہی بال میں طین آکٹ کیا۔

دکھائی جا رہی تھیں، ان میں دو عدد پولیس گاڑیاں نمایاں تھیں جن میں سے ایک سڑک پر الٹی پڑی تھی اور دوسری کا اگلا حصہ بڑی طرح تباہ ہوا تھا۔

”یہ دیکھیے ویورز ایہ گولیوں کے خول یہاں کتنی بڑی تعداد میں بکھرے ہوئے ہیں۔ ان خولوں کو دیکھ کر صاف معلوم ہو رہا ہے کہ آنک وادیوں نے بنا کسی ڈر اور خوف کے کتنی شدید قاتلنگ کی ہے پولیس والوں پر۔“ جینٹل بدلنے پر بھی کوئی اچھی خبر دیکھنے سننے کو نہیں مل رہی تھی۔ وہ سب ٹی وی اسکرین کے سامنے تھے ہوئے چہرے لیے بیٹھے تھے اور کسی میں ہمت نہیں تھی کہ کچھ بول سکے۔

”یہ وہ گاڑی ہے جسے آنک وادی پیڑوں ختم ہونے پر چھوڑ کر بھاگے ہیں۔ پولیس کا وہ چارہ ہے کہ وہ وہاں سے پیدل چل کر گئے ہیں اس لیے انہیں آڑو بازو کی بستوں میں ڈھونڈا جاسکتا ہے۔ اس سے پولیس ایسی بستوں کی تلاشی لینے کے ساتھ ساتھ ایگزٹ کے راستوں پر بھی ٹانگے لگائے بیٹھے ہے۔ آس ہے کہ جلد ہی آنک وادیوں کو دھریا جائے گا۔“ ہر نئی اطلاع دل و دماغ پر قیامت ڈھارہی تھی۔ وہ سب پچھلے کئی گھنٹوں سے پریشانی میں مبتلا تھے۔ چکی پریشان کن اطلاع تو سونیائی نے دی تھی کہ اعظم کو ایمر جنسی میں اسپتال لے جایا گیا ہے۔ اس اطلاع پر عالم شاہ نے اسپتال جانا چاہا تھا لیکن سونیائی نے اسے روک لیا تھا کہ جتنے لوگ پناہ گاہ سے نکل کر باہر جاتے، خطرات اتنے ہی بڑھ جاتے۔ عالم کو اس کا موقف سمجھ آ گیا تھا اس لیے اعظم کی طرف سے فکر مند ہونے کے باوجود اس کی بات مان لی تھی۔ فکر مندی نے تشویش کا روپ جانے والوں کی واپسی میں تاخیر کے سبب دھارا اور پھر جنگ کی زبانی یہ بدترین خبر سننے کو ملی کہ نواب زادہ سراج الدین نے اسپتال میں ان لوگوں کو دیکھ کر پولیس کو اطلاع کر دی تھی جس کے نتیجے میں ہنگامہ کھڑا ہوا تھا اور ہر گزرتے لمحے کے ساتھ صورتحال حال تشویشناک ہوتی چلی گئی تھی۔

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اسے مشکل حالات میں سبک، اعظم کے ساتھ کیسے سروانہ کر رہی ہوگی۔ بابا سائیں نے تو کبھی اسے گرم ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی اور یہاں وہ گولیوں کی برسات میں سے گزر کر زندگی کے لیے بھگتی پھر رہی ہے۔“ بہن کو خطرے میں محسوس کر کے عالم شاہ کے اہصاب جواب دینے لگے۔

”ڈونٹ وری امعاذ ہے کل کے ساتھ اور وہ اپنے جیتے ہی اس پر یا اس کے بچے پر آج بھی نہیں آئے دے گا۔“ سونیائی نے نہایت یقین کے ساتھ اسے تسلی دی۔ امعاذ

چاہے کتنی ہی احتیاط برتنا تھا، وہ اس کی آنکھوں میں بکھرے جذبوں کے رنگ پڑھ چکی تھی۔ اس کی شکل کے ساتھ جذباتی وابستگی نے ہی اسے عالم شاہ سے یہ الفاظ کہنے پر مجبور کیا تھا۔

”میں سونیائی ٹھیک کہہ رہی ہیں سائیں۔ یاد نہیں پہلے بھی امعاذ سائیں نے بی بی کو کیسی حفاظت سے ڈاکوؤں کی قید سے نکلوایا تھا۔ وہ اب بھی کچھ نہ کچھ کر لیں گے۔“ سونے نے بھی وقاداری کا حق نبھاتے ہوئے مالک کو تسلی دینے کی کوشش کی۔

”وہ اور بات تھی، یہ اور بات ہے۔ اس وقت ہم اپنے وطن میں موجود تھے اور اب ان کے دیس میں ہیں جو بغیر کسی سبب کے بھی ہم سے شدید نفرت کرتے ہیں اور یہاں تو الزام ہی دہشت گردی کا لگ گیا ہے۔ بچت ہوگی تو کیسے ہوگی؟“ وہ اپنے بالوں کو مٹیوں میں جھپکے مایوسی کا شکار دکھائی دے رہا تھا۔

”یہ خدشات اپنی جگہ لیکن موجودہ صورتحال میں ہمیں ان لوگوں سے ہٹ کر اپنے بارے میں بھی سوچنا چاہیے۔“

”کیا مطلب؟ کہنا کیا چاہتی ہو تم؟“ عالم شاہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

”میرا مطلب ہے کہ وہ لوگ جن حالات میں گھرے ہیں، انہیں ان میں سے نکالنے کے لیے ہم سوائے ذمہ کے کچھ نہیں کر سکتے۔ اس لیے ہمیں ان کے بارے میں سوچ سوچ کر بلکان ہونے کے بجائے اپنے بارے میں سوچنا چاہیے۔ مجھے نہیں لگا کہ اس واقعے کے بعد ہم زیادہ دیر یہاں محفوظ رہ سکیں گے۔ بے شک ہم نے احتیاط کی تھی لیکن ممکن ہے کہ آس پڑوس میں سے کسی نے ہمارے چہرے دیکھے ہوں۔ لان تک تو سب ہی جاتے رہے ہیں اور سامنے والوں کی چھت سے لان صاف دکھائی دیتا ہے۔ سبکل، امعاذ یا اعظم میں سے کسی کے بھی چہرے اگر کسی کی یادداشت میں نہ گئے ہوں گے تو وہ پولیس کو اطلاع دینے میں دیر نہیں لگائے گا۔“ پریشانی اسے بھی تھی لیکن اسے مشکل حالات سے غصے کی مشق تھی اور پریشانی میں بھی منطقی انداز میں سوچنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

”تو تمہارے خیال میں اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ کیا یہاں سے کہیں اور شفقت ہونے کی گنجائش ہے ہمارے پاس؟“ اس بار عالم شاہ نے اس کی بات کو سمجھا اور سوال کیا۔

”ہمیں یہاں سے بھٹنا ہوگا۔ صرف اس مکان سے نہیں، اس شہر سے بھی۔“ سونیائی نے اسے جواب دیا۔

”پر بی بی خطرہ تو اس میں بھی ہے۔ پولیس ادھر سے باہر جانے والے راستوں کی گمرانی کر رہی ہے، یہ تو آپ

نے ہی ام کو بولا تھا۔ "اب تک کی گفتگو میں خاموشی مٹا دینی چاہیے۔" اب تک کی گفتگو میں خاموشی مٹا دینی چاہیے۔
 بنے رہنے والے گل خان نے لب کشائی کی۔
 "ہم ساتھ نہیں جائیں گے۔ ہر ایک اپنے اپنے طور پر نکلنے کی کوشش کرے گا۔ تھوڑے بہت اپنے حلیے بھی تبدیل کر لیے جائیں گے۔ آئی ہوپ کہ اگر ہم نے کانفیڈنس سے کام لیا تو کسی کو ہم پر شک نہیں ہوگا۔" وہ اپنے انداز سے ان سب کو حوصلہ دینے کی کوشش کر رہی تھی۔
 "لیکن یہاں سے نکل کر ہم جائیں گے کہاں؟" عالم شاہ نے سب سے اہم سوال کیا۔

"میں ایک فون نمبر اور کوڈ سب کو بتاؤں گی۔ محفوظ جگہ پر پہنچنے کے بعد میرے دیے نمبر پر رابطہ کر کے کوڈ بتانے پر آگے سے سارا کچھ سنبھال لیا جائے گا۔ بس اصل مسئلہ یہاں سے نکلنے کا ہے۔ یہاں میرے زیادہ وسائل نہیں ہیں اور پولیس بہت زیادہ ایکٹو ہو چکی ہے۔ پولیس کے ہاتھ آئے بغیر یہاں سے نکل جانا ہی اس وقت ہماری سب سے بڑی کامیابی ہوگی۔" وہ ان لوگوں کو سمجھا رہی تھی اور عالم شاہ سمیت سب ہی اس کی بات کو توجہ سے سن رہے تھے۔
 "ہم یہاں سے چلے جائیں گے تو بعد میں وہ لوگ کہے ہم تک پہنچیں گے۔" جب تقریباً سب کچھ طے ہو گیا تو عالم شاہ نے ایک اہم سوال اٹھایا۔ اس سوال پر پہلی بھر کے لیے سوینا کی رنگت خستہ ہوئی لیکن پھر خود کو سنبھال کر جلدی سے بولی۔

"ڈونٹ وری! معاذ کو پہلے سے ہی اس فون نمبر کے بارے میں پتا ہے۔ وہ خود ہی کا ٹیکٹ کر لے گا۔"
 "ٹھیک ہے۔ اس بندگی میں تمہاری بات مان لینے کے سوا چارہ ہی کیا ہے؟" عالم شاہ کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ مجبوراً ہی اس سب پر راضی ہوا ہے۔

"بس تو پھر سب تیاری شروع کر دیں۔ خلیوں کی تبدیلی میں، میں اور جنکی آپ لوگوں کی مدد کریں گے۔" اس نے عالم کے انداز کو جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا۔ چارونا چار سب اس کی بات پر عمل کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ تیاری کا مرحلہ طے ہونے کے بعد سوینا نے سب کو اخراجات کے لیے معقول رقم فراہم کی۔ وہ خود بھی بدلے ہوئے حلیے میں ردائی کے لیے تیار دکھائی دے رہی تھی۔ ایک ایک کر کے سب نکلے چلے گئے اور صرف سوینا باقی رہ گئی۔

"آپ میزے ساتھ چلیں گی میڈم یا میں آپ کو کہیں ڈراپ کر دوں؟" جنکی نے نمودار انداز میں اس سے دریافت کیا۔

"مجھے کہیں نہیں جانا۔ میں معاذ کو تلاش کروں گی۔" سوینا نے اپنا فیصلہ سنا کر اسے حیران کر دیا تو وہ ہنسنے لگا۔
 بولا۔ "مگر میڈم.....!"
 "کوئی اگر مکر نہیں..... جس علاقے میں ان کی گاڑی ملی تھی، اس کے آس پاس کی بستیوں کی ڈیٹیل نکال کر دو مجھے۔" سوینا نے اسے درمیان میں ہی ٹوک کر حکم سنایا تو اس نے اپنا سر جھکا دیا۔

"اور ہاں، یہ سب کچھ سامان بھی لانا ہوگا جنہیں۔" اس نے ایک چھوٹی سی فہرست جنکی کو چھائی۔
 "ٹھیک ہے، میں یہ سب کر دوں گا لیکن مناسب ہوگا کہ پہلے آپ یہاں سے دوسری جگہ شفٹ ہو جائیں۔ یہاں خطرہ ہے، اس سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا۔"
 "دوسری جگہ ہے تمہارے پاس؟" سوینا نے اسے گھبراہٹ میں "ایک چھوٹا سا ایک کمرے کا اپارٹمنٹ ہے۔ میں نے ایک میٹھے کے لیے ریٹ پر لیا ہوا ہے۔ آپ کا کام چل جائے گا۔" اس نے اطلاع دی۔

"چلو تو پھر چلتے ہیں۔" وہ سمجھ گئی تھی کہ جنکی نے اس جگہ سے الگ اپنی عیاشی کا انتظام کیا ہوا تھا چنانچہ مزید بوجھ تاجر کرنے کے بجائے اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔ جنکی اسے جس جگہ پر لے کر گیا، وہ ایک گندی سی اپارٹمنٹ بلڈنگ تھی جس کو دیکھ کر ہی اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ یہاں حدود اور معمولی ملازمت پیشہ طبقے کے لوگوں کی رہائش تھی۔ عمارت میں لفٹ تک نہیں لگی ہوئی تھی۔

"کمال ہے، بڑی خاموشی ہے ورنہ ایسی جگہوں پر تو عموماً بہت شور رہتا ہے۔" میز حیاں چڑھتے ہوئے اس نے جنکی سے حیرت کا اظہار کیا۔

"یہاں زیادہ تر وہ چھڑے چھانٹ مرد رہتے ہیں جو چھوٹے علاقوں سے نکل کر یہاں محنت مزدوری کے لیے آتے ہیں۔ یہ لوگ یا تو ڈیوٹی پر ہوتے ہیں یا تھک ہار کر سوئے ہوئے اس لیے شور شرابے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں آنے والی عورتیں عموماً سستی کال گرلز ہوتی ہیں اور ان کے بارے میں کوئی کسی سے سوال نہیں کرتا۔" جنکی نے اس کی حیرت دور کی تو وہ سر ہلا کر رہ گئی۔ اسے اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی کہ اسے دیکھنے والے اسے بھی کوئی کال گرل سمجھیں گے۔

"آپ اندر جا کر ریٹ کریں۔ میں تھوڑی دیر میں آپ کا مطلوبہ سامان اور کچھ کھانے پینے کے لیے لاتا ہوں۔ یہاں سوائے چائے بنانے کے سامان کے کچھ نہیں

ہے۔“ جیسی اسے دروازے پر ہی چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ وہ اندر جا کر جائزہ لینے لگی۔ سامان مختصر تھا لیکن اس گندی سی عمارت کے برعکس صفائی ستھرائی بہتر تھی۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھ کر جیکب کا انتظار کرنے لگی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ ذہن میں موجود منصوبے کے خدوخال بھی سنوارتی رہی۔ جیکب اس کی توقع کے برخلاف کافی دیر سے واپس آیا۔

”سوری میڈم! میں کچھ خبروں کو کنفرم کرنے کے لیے رک گیا تھا اس لیے دیر ہوگئی۔“ وہ لدا پھندا واپس آیا تو سب سے پہلے اس سے معذرت کی۔

”کچھ خاص ہوا ہے؟“ اس نے اندازہ لگایا۔

”بس کے اڈے سے ایک مشکوک پنٹھان کے اریسٹ ہونے کی اطلاع ملی تھی۔ مجھے شک ہوا کہ کہیں وہ گل خان نہ ہو لیکن معلوم کرنے پر پتا چلا کہ میرا شک غلط تھا۔“

”تھینک گاڈ!“ اطلاع سن کر اس نے بے اختیار شکر ادا کیا۔

”دوسری خبر بھی اس لیے بری نہیں کہ ہم نے سچ سے پر جگہ چھوڑ دی گئی۔“

”یو مین..... ہم جس مکان میں رہ رہے تھے، وہاں پولیس کا ریڈ ہوا ہے؟“ اس نے فوراً اندازہ لگایا۔

”ایسا ہی ہے۔“ جیکب نے تصدیق کی۔

”جو بھی ہے، اچھی بات ہے کہ اب تک ان تینوں کے بارے میں کوئی بری خبر نہیں ملی ہے اور اس سے مجھے تسلی ہو رہی ہے کہ وہ یہاں سے نکلنے میں کامیاب رہے ہیں۔ تم اپنے ساتھیوں کو ہدایت کر دینا کہ جیسے ہی ان میں سے کوئی رابطہ کرے، فوراً اس کی مدد کے لیے پہنچ جائیں۔“

”میں کہہ چکا ہوں میڈم!“ جیکب نے اسے آگاہ کیا۔

”گڈ!“ وہ مسکرائی اور اس کے لائے ہوئے تھیلوں کا جائزہ لینے لگی۔ وہ اس کی بتائی ہوئی تمام اشیاء حسب خواہش لایا تھا۔ جب تک اس نے ان اشیاء کا جائزہ لیا، وہ کھانا نکال کر لے آیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر اس نے وہاں موجود واحد بیڈ پر قبضہ کر لیا۔ اسے صبح جلد اٹھنا تھا اور آگے بہت کام تھا اس لیے جلد سو جانا ہی بہتر تھا۔

صبح وہ منہ اندر مڑے جاگی تو جیکب پہلے ہی اٹھ چکا تھا اور ناشتا تیار کر رہا تھا۔ ابلے ہوئے انڈوں، کنسن، سلاکس اور چائے پر مشتمل بھرپور ناشتا کرنے کے بعد وہ اپنی تیاری میں جت گئی۔ گوری رنگت کو گہری سالولی رنگت میں تبدیل کرنا سب سے زیادہ وقت طلب مرحلہ تھا۔ خصوصاً اس لیے

بھی کہ اس تبدیلی سے پورے جسم کو گزرا گیا تھا۔ بالوں کی رنگت تبدیل کرنے کے ساتھ انہیں بے رونق اور قدرے

سہنس ڈال جیت

82

سہنس ڈال جیت

میلے دکھانے کے ساتھ ساتھ ہاتھ پیروں میں بھی ایسی تبدیلیاں کی گئی تھیں کہ وہ کسی آسودہ حال عورت کے بجائے محنت مشقت کرنے والی عورت کے ہاتھ پاؤں دکھائی دیتے تھے۔ شوخ رنگ مگر کافی پرانا سا کھاکھرا چولی پہن کر جب وہ دوپٹا سیٹ کرنے آئیں گے سامنے کھڑی ہوئی تو آئینے میں ایک قطعی اجنبی عورت کا عکس دکھائی دیا۔ ایک ایسی عورت کا عکس جس نے ہاتھوں اور گلے میں سستے سے نکل زیندات پہن رکھے تھے اور جس کے دانت اور ہونٹ پان خوری کی وجہ سے سرخی سے رنگے ہوئے تھے۔

”میرے لیے کوئی حکم؟“ وہ تیاری مکمل کر کے چھاڑی میں رنگی کاچ کی چوڑیوں، پلاسٹک کے کھلونوں، نقلی ہار پندوں، سنگھوں اور شیشے جیسے معمولی سامان کا جائزہ لے رہی تھی جب جیکب نے اس سے سوال کیا۔

”اچھی بری جو بھی خبر ہوگی تم تک پہنچ ہی جائے گی۔ آگے اس پر کیا ایکشن لینا ہے، یہ تم خود فیصلہ کر سکتے ہو۔“ وہ

چھاڑی اٹھا کر باہر کی طرف بڑھ گئی۔ جیکب میں ہمت نہیں تھی کہ اپنی خدمات پیش کرنے کے لیے اس کے پیچھے جاتا۔

وہ سیڑھیاں اتر کر باہر نکلی اور منڑک پارکر کے بس اسٹاپ پر جا کھڑی ہوئی۔ منزل کی طرف جانے والی بسوں کی تفصیل جیکب اسے فراہم کر چکا تھا۔ جیسے ہی مطلوبہ بس آئی، وہ اس میں سوار ہو گئی اور جاہل عورتوں کی طرح ہنسنے مارا کر ایک سیٹ پر قبضہ جمالیا۔ بس میں بھانت بھانت کے لوگ

موجود تھے۔ وہ بھی ان بھانت بھانت کے چہروں کا جائزہ لیتی اور کبھی بے نیازی سے کھڑکی کے باہر جماعتی تیز تیز پان چبانے لگتی۔ درمیان میں ایک چپے بیچنے والا بس میں چڑھا

تو اس سے تھوڑے سے چپے خرید کر وہ بھی پھانک لیے۔ سفر اچھا خاصا تھا اور رک رک کر چلتی بس کے باعث مزید

طویل ہو گیا تھا لیکن اس نے اپنے اطمینان میں فرق نہ آنے دیا۔ راستے میں ایک دو جگہ بس رکوا کر پولیس والوں نے

مسافروں کا جائزہ بھی لیا لیکن اس کی طرف کسی کی توجہ نہ گئی۔ بالآخر اس کی منزل آگئی۔ وہ چھاڑی سنبھالتی ہوئی

بس سے نیچے اتری۔ جیکب نے اسے تین بستیوں کے بارے میں معلومات فراہم کی تھیں جن میں سے اس نے سوچا سمجھا کر

ایک بستی کا انتخاب کیا تھا۔ اگر وہاں سے کچھ معلوم نہ ہوتا تو وہ دوسری بستی کا رخ کرتی۔

”ہر مال میں روپے۔ چوڑی لے لو، سنگھالے لو،

شیشے لے لو، گڑیا لے لو، گڈا لے لو..... ہر مال میں روپے۔“

چھاڑی کو سر پر اٹھائے، دوپٹی کی معمولی چٹل پہنے وہ مزے

جولائی 2022

مذہب اور اطمینان

ہم مذہب سے اس طرح مطمئن کیوں نہیں ہوتے جس کا علیحدہ سے سانس یا کوئی اور علم ہمیں مطمئن کر رہا ہے۔

اس لیے کہ ہم نے صرف کلمہ نماز اور روزہ کو مذہب کی تکمیل سمجھ لیا ہے جبکہ یہ بنیادی ارکان تو مذہب کی ابتدا ہیں۔ اصل آغاز مذہب تو اس کے بعد ہوتا ہے۔ اور پھر امتحان کی تو بات ہی کیا ہے۔ وہاں تک پہنچنا تو انبیاء کا خاصہ ہے۔ ہم جیسے معمولی انسان بظاہر مذہب کی امتحان کو کیا پاس کریں گے۔ جس دن ہم یہ بات سمجھ گئے کہ ہم صرف اسلام لائے ہیں۔ ایمان لانا ابھی باقی ہے، اس روزہ سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔ قرآن مجید میں بھی اسی لیے جاننا اس طرح مخاطب کیا گیا ہے۔ ”اے ایمان والو.....!“

(مدرسہ محمدانور ندیم، حوالی لکھا، ادکارہ)

میں لیے ہوئے تھا۔ ”شاگرد موسیٰ، پھر نہیں کروں گا۔“ آخر کار بچے کو اپنی ڈھٹائی چھوڑ کر معذرت طلب کرنا پڑی۔ ”ایسے کیسے بنا کر دوں۔ چل پلیس نہیں تو تیری ماں کو چل کر تیرے کتوت بتاتی ہوں۔“ اس نے تھوڑی سی رعایت برتی لیکن بچہ اپنی جگہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ یقیناً ماں سے شکایت پر بھی پولیس والوں جیسی ہی چھترول ہونا تھی۔ ”کدھر ہے اس کا گھر؟“ اب کی بار اس نے تماشاخیوں سے مدد چاہی۔ اب ان تماشاخیوں میں بچوں کے علاوہ ایک دو بڑی عمر کے مرد بھی شامل ہو چکے تھے۔ ”چل چھوڑ دے، جانے دے، بچہ ہے۔ ماں کے پاس لے کر جائے گی تو وہ چار چوٹ کی مار مارے گی۔“ بڑی پتے ایک میلے میلے مرد نے بچے سے ہمدردی جتاتے ہوئے اس کی سفارش کی۔

”مارے گی تو اچھا کرے گی۔ کل کو سالا چوڑا چکا بنے سے تو بچہ گا۔“ اس نے نہایت بے مروتی سے سفارش کو رد کیا اور ایک بار پھر بچوں کی طرف متوجہ ہوئی۔

”ہاں بتاؤ، کدھر ہے اس کا گھر؟“ ”وہ ادھر، چل موسیٰ میں چل کر تجھے دکھاتا ہوں۔“ بالآخر ایک بچے نے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ اس کی

سے چلتی چلی جا رہی تھی۔ جیسے ہی مکانات کا سلسلہ شروع ہوا، اس نے آوازیں لگانا شروع کر دیں۔ اس کی آوازیں کرچند بچے بھاگتے ہوئے آئے اور اس سے سامان دکھانے کی فرمائش کی۔ بچوں کی حالت سے ہی ظاہر تھا کہ وہ کچھ خریدنے کی حیثیت نہیں رکھتے لیکن پھر بھی وہ چھابڑی نیچے رکھ کر انہیں ایک ایک چیز دکھانے لگی۔ توقع کے مطابق نیچے صرف چیزیں الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے۔ کسی کی جیب سے رقم برآمد نہیں ہوئی۔ وہ بظاہر بے نیاز لیکن حقیقتاً بے حد چوکی ایک ایک بچے پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ ان بچوں میں سے ایک بچے کے چہرے کے تاثرات نے اسے خصوصیت سے متوجہ کیا۔ وہ پلاسٹک کی ایک رنگین گیند کو بار بار چھو رہا تھا پھر واپس رکھ کر دوسری چیزوں کو الٹ پلٹ کرنے لگتا تھا۔ اس نے جان بوجھ کر اس کی طرف سے نظریں پھیر لیں۔ وہ اسے سوخ دے رہی تھی۔ نتیجہ اس کی توقع کے مطابق نکلا۔ بچہ ایک دم ہی ہجوم سے نکل کر جانے لگا۔ اس نے اپنی بڑی سی چھابڑی پر نظر ڈالی۔ گیند غائب تھی۔

”اے رک۔“ وہ تیزی سے بچے کی طرف ہلکی۔ بچے نے چاہا کہ تیزی سے بھاگ نکلے لیکن گھبراہٹ میں اس کا پاؤں رہٹ گیا۔ اس نے فوراً ہی بچے کو جالیا۔ ”چوری کر کے بھاگتا ہے۔ چل نکال میری بال۔“ ”اچ۔“ بچے کے کان پکڑے اس کی خبر لیتی وہ مہارت سے جیلے میں ایک بڑی سی گالی ٹانگ چکی تھی۔

”میں چور نہیں ہوں۔ میں نے کچھ نہیں چرایا۔“ پہلے مرحلے میں بچے نے ڈھٹائی کا مظاہرہ کرنا چاہا۔ جواب میں اس نے بچے کا بازو پیچھے کی طرف موڑا اور اس کی جیب میں سے گیند برآمد کر لی۔

”ایک تو چوری کرتا ہے، اس پر سالا جھوٹ بھی بولتا ہے۔“ اس نے بلا تکلف بچے کو ایک تھپڑ بڑوایا۔ دیگر بچے یہ تماشا دیکھنے کے لیے ان کے گرد ہجوم بنا چکے تھے۔ چوری کرنے والا بچہ رکتے ہاتھوں پکڑے جانے کے بعد کچھ کہنے کے لائق تو نہیں رہا تھا لیکن اس کی گرفت سے اٹکنے کے لیے چل رہا تھا۔ وہ بے چارہ کہاں جاتا تھا کہ یہ ہونیا خان کی گرفت ہے جس سے لگتا بڑے بڑے سوراخوں کے لیے بھی آسان نہیں تھا۔

”چل تجھے پلیس کے پاس لے کر چلتی ہوں۔“ وہ بچے کو کھینچتی ہوئی اپنی چھابڑی تنگ لائی اور چھابڑی کو کمر پہ لا کر ایک ہاتھ سے سنبالا۔ دوسرا ہاتھ ہنوز بچے کو گرفت

راہنمائی میں وہ چور بچے کا ہاتھ پکڑے اسے گھسیٹتی ہوئی آگے بڑھی تو ہائی کا جھوم بھی اس کے پیچھے تھا۔
 ”تم کا ہے کو پیچھے آتے ہو ماں کے پلو..... چلو بھاگو
 ورنہ ایک ایک کو دو دو تھپڑ دوں گی۔“ وہ پلٹ کر زور سے غرائی تو نے بچے ہم کر رک گئے۔
 ”بس اب ٹو بھی جا۔“ راہنمائی کرنے والا بچہ ایک بوسیدہ حال مکان کے سامنے جا کر رکھا تو اس نے اسے بھی چلا کیا۔ دروازہ کھلا تھا اور اس کے آگے ایک سیلا اور پھٹا پرانا پردہ جھول رہا تھا۔

”جل اندر۔“ اس نے بچے کو زور سے دھکیلا تو وہ اندر کی طرف زمین پر جا گرا، گرنے سے چوٹ تو اتنی شدید نہیں آئی تھی لیکن خوفزدہ بچہ اپنے انجام کے ڈر سے زور زور سے رونے لگا۔
 ”کیا ہو گیا ہے تجھے؟ کس سے پٹ کر آیا ہے جواب منہ پھاڑے رو رہا ہے؟“ رد گل میں ایک عورت کی چیخ ہوئی آواز سنائی دی تو وہ پردہ اٹھا کر اطمینان سے اندر داخل ہو گئی۔

”میں نے مارا ہے تیرے لاڈلے کو۔ اب پوچھ کہ کیوں مارا ہے؟“ سامنے ہی ایک چھوٹے قد کی دہلی پٹلی عورت کھڑی تھی جسے روتے بچے کو چپ کر دینے سے زیادہ تعیش میں دلچسپی تھی۔ اسے دہنگ انداز میں اندر داخل ہوتے دیکھ کر اس عورت کا منہ کھل گیا پھر قدرے غصے سے بولی۔
 ”کیوں مارا ہے تو نے میرے بچے کو؟“

”اس لیے مارا ہے کہ بڑا ہو کر سارے سنساری جو تیاں کھانے سے بچ جائے۔“ اس نے چھاڑی ایک طرف رکھی اور سیدھی ہو کر کھڑی ہو گئی۔ جس جگہ کھڑے ہو کر بچہ سارا مکالہ پور ہاتھ، وہ اس بوسیدہ سے گھر کا چھوٹا سا کچا گھن تھا جہاں انکی پردہ چلے پڑے پھیلے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

”کیا کیا بولے جا رہی ہے، میرے بچے کچھ نہیں پڑا۔“ عورت جھنجھلائی۔

”چوری کر کے بھاگ رہا تھا میری چھاڑی سے۔ میں نے کہا چل چل کر تیری ماں کو بتاتی ہوں تیرے کرتوت۔“
 ”یہ مجھے پلیس کو دیتے جا رہی تھی۔“ بچے نے ماں کی ہمدردی حاصل کرنا چاہی۔

”تو، تو کیوں چوری چکاری کرتا پھر رہا تھا.....“ ماں نے ایک کلاسیکل سی گالی دینے کے ساتھ ساتھ اسے دو تھپڑ بھی رسید کر دیے۔

”میں تو بس اسے ڈرا رہی تھی۔ ابھی اتنی سی عمر میں چوری کی عادت پڑ گئی تو بڑا ہو کر خندا سوا لی ہی نکلے گا۔“
 ”بھگوان نہ کرے۔“ ماں دہلی گئی پھر رقتی سے لہجے میں بولی۔

”ایک ہی بیٹا ہے میرا۔ اپنی ہڈیاں گھس کر اسے پال رہی ہوں۔ باپ تو نشی ہے۔ اسے پروا نہیں کہ بچہ چور ڈاکو بنے یا اس کی طرح نشے باز، چرہ۔“
 ”کیا کام دھندا کرتی ہو؟“ اس نے عورت سے ہمدردی سے پوچھا۔

”بنگلوں میں صاف ستھرائی کا کام کرتی ہوں۔ بنگلے والے کھانے کو بچا کچا اور ساتھ تھوڑے پیسے دے دیتے ہیں جن میں سے زیادہ تر تو اس کا باپ اپنے نشے کے لیے چھین کر لے جاتا ہے۔ بس روپیٹ کر گزارہ چل رہا ہے ہم ماں بیٹے کا۔ غریب جیب سے پیدا ہوا ہے، بھی کھیلنے کو کھلونے نہیں ملے۔ شاید اسی لیے لالچ میں آ کر آج اس نے چوری کر لی۔“ عورت کے بیان میں ایک پوری داستان اٹھ اٹھی۔

”مالکوں سے بات کر کے بچی کا علاج کروانے کی کوشش کرتیں۔ بڑے لوگوں کی تو بڑی پہنچ ہوتی ہے۔“ اس نے عورت سے ہمدردی جتائی۔ اسے بستی میں اپنے ساتھیوں اور پولیس کی آمد و رفت سے متعلق معلومات درکار تھیں اور وہ جانتی تھی کہ ہمدردی ایسا ہتھیار ہے جس سے لوگ بہت جلد آپ کے سامنے کھل جاتے ہیں۔ وہ اس عورت کے دکھ سنتی تو وہ بھی اسے اس کے سوالوں کے جواب دینے میں تامل نہ کرتی۔

”بڑا کشت کیا بہن مالکوں کی بچی کر کے ایک نہیں تین تین بار اسے علاج کے لیے بھجوا یا ہے پردہ..... ہے ہی کتے کی دم۔ چٹا سیدھا کرنا چاہو، ٹیڑھا ہی رہتا ہے۔ اوپر سے یہ بنا جو والا ہاشو..... پن دکھاتا ہے۔ ادھر میرا مرد علاج کروا کر واپس نہیں آتا تو وہ اگلے ہی دن اسے بھری ہوئی سگریٹ پکڑا دیتا ہے۔“ غصے میں وہ بیک وقت شوہر اور پڑوسی دونوں کو گالیوں سے نواز رہی تھی۔

”کبت سے کھڑی کھڑی باتیں کر رہی ہے۔ آء اندر آ کر روئل کے لیے بیٹھ جا۔“ آخر کار اسے خیال آ گیا تھا کہ وہ دونوں گھن میں ہی کھڑے ہو کر یہ طویل گفتگو فرما رہی ہیں۔
 ”اے شامو! جا ذرا موسیٰ کے لیے غیظا پانی تو لا کر دے۔“ سوچا کو اپنے ساتھ اندر لے جاتے ہوئے اس نے ابھی تک زمین پر پھسکا مارے بیٹھے بچے کو مخاطب کر کے حکم دیا۔

”ہاشم کہیں غشیات کا دھند اتو نہیں کرتا؟“ عورت کے ساتھ میلی کچلی درری پر پھسکا مار کر بیٹھتے ہوئے اس نے لہجہ کو زاردارانہ بناتے ہوئے سوال کیا۔

”اور نہیں تو کیا۔ اپنا دھند چلانے کو ہی تو..... نے مارے میں نشے کی لت پھیلا رکھی ہے..... مرتا بھی نہیں ہے۔“ وہ بغیر گالی کے بات کرنے کی عادی نہیں تھی یا پھر شاید اس کے اندر کا خصلہ اسے گالی دینے پر مجبور کر دیتا تھا۔

”تو تم پلیس میں رہت لکھو اودنا۔“ سونیا نے بڑی ہمدردی سے اسے مشورہ دیا۔

”پلیس والے..... تو خود ملے ہوئے ہیں اس..... کے ساتھ۔ ان کے زور پر تو چوڑا ہو کر گھومتا ہے۔“ اس نے وہ حقیقت بیان کی جسے سونیا خود بہت اچھی طرح سمجھتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ پولیس کو ساتھ ملائے بغیر ایسا کوئی کام نہیں ہوتا۔

”لو موسیٰ! پانی پی لو۔“ شامو، ماں کے حکم پر جستی گلاس میں بھورے سے رنگ کا مشروب لے تو آیا تھا لیکن لہجے میں اس موسیٰ کے لیے خشکی تھی جس نے اسے سارے بچوں کے سامنے بے عزت کر کے رکھ دیا تھا اور ماں سے ڈانٹ پڑوانے کے بعد اب ماں کی پکی کھٹی بنی بیٹھی تھی۔

”جنگ جگ جی میرا بچہ!“ سونیا نے اس کے ہاتھ سے گلاس لے لیا۔ مشروب جو بھی تھا اور جیسا بھی تھا، ایک غریب عورت نے خلوص سے اس کے لیے بنوایا تھا۔ وہ پہلے والی سونیا ہوتی تو اس خلوص سے متاثر نہ ہوتی لیکن جب سے دل کی زمین نرم ہوئی تھی، وہ ایسے جذبوں کو سمجھنے لگی تھی۔

”کل سارا دن بستی میں پیسے گھومتے رہے تھے۔ سنا ہے آٹک دادیوں کی تلاش میں آئے تھے۔“ شامو کے آنے سے گھنگو کا جو سلسلہ ٹوٹا تھا، اسے عورت نے ایک بار پھر جوڑ لیا تھا۔ سونیا جو اس موضوع پر آنے کے لیے ہی راہ ہموار کر رہی تھی، اس کے اذ خود یہ موضوع چھیڑ دینے پر خوش ہو گئی۔

”پھر ملے نہیں آٹک دادی؟“ خوشی کو دبا کر اس نے تجسس بھرے جوش سے پوچھا۔

”نہ..... خالی ٹاکٹ کو بیٹیاں مار کر چلے گئے۔“ اس نے غصہ بنا کر جواب دیا۔

”اس کا مطلب ہے آٹک دادی یہاں نہیں آئے ہوں گے۔“ پلیس کو کسی نے جھوٹی خبر دی ہوگی۔“ عورت کے اعداد میں کوئی ایسی بات تھی جس نے اسے چوٹایا تھا اور اب وہ اس کے تاثرات پر چوڑی توجہ مرکوز کیے بول رہی تھی۔

”پلیس کو کوئی کھرا ملا ہے تب ہی کہیں کارخ کرتی ہے۔“ اس کا جملہ معنی خیز تھا۔

”لگتا ہے تمہیں کوئی سن گن ملی ہے؟“ اس بار اس نے عورت کو پکڑ لیا۔

”میں تو بس ایسے ہی ایک بات بول رہی تھی۔“ وہ تھوڑی شیشائی۔

”نہ بتانا چاہو تو کوئی زبردستی تھوڑی ہے۔ انسان ہر ایک پر بھروسہ تھوڑی کرتا ہے۔“ اس نے عورت پر ایک جذباتی سادار کیا اور اس پر سے توجہ ہٹا کر بچے کو آواز دینے لگی۔

”شامو، شامو، ادھر آ بیٹا اذرا میری ایک بات سن۔“ ”کیا موسیٰ؟“ اس سے یا پھر شاید ساری دنیا ہی سے تھا بچہ سامنے آ کھڑا ہوا اور لٹھ مارا انداز میں بلانے جانے کا سبب پوچھا۔

”جامیر نے سامان میں سے دو بلاسٹک کی بال لے لے۔ بلکہ ایسا کر اس کے علاوہ بھی اگر تجھے کوئی دوسرا کھلونا اچھا لگے تو وہ بھی لے لینا۔“ اس کی فراخ دلانہ پیشکش نے شامو کو کنگ کر دیا اور وہ سوالیہ نظروں سے ماں کو دیکھنے لگا۔

”ماں کو کیا دیکھ رہا ہے رے۔ مجھے تو نے موسیٰ بولا ہے تو کیا موسیٰ کی بات ماننے سے انکار کرے گا؟“ اس نے محبت بھرے لہجے میں بچے کو ڈانٹا تو وہ جلدی سے باہر بھاگ گیا۔

”دھنیو اذ دیدی! تم نے مجھے بڑا مان دیا ہے۔“ بیٹے پر کی گئی اس مہربانی نے عورت کو اتنا جذباتی کیا کہ اس کا گلا رندہ گیا۔

”دیدی بولتی ہے تو پھر دھنیو اذ کیسا؟ شامو جیسے تیرا بیٹا ہے، ویسے میرا۔“ اس نے عورت کے شانوں کو محبت سے دبایا۔

”ماں! دیکھو یہ کتنا سندر ہے۔“ اسی اثنا میں شامو بلاسٹک کی رنگین گیند کے ساتھ مٹی سے بنا ایک چھوٹا سا طوطا لیے اندر آیا اور خوشی سے ماں کو مخاطب کیا۔

”اپنی موسیٰ کو دھنیو اذ بول پہلے پھر مجھے یہ سب دکھانا۔“ عورت نے بیٹے کو ٹوکا۔

”دھنیو اذ موسیٰ!“ اس کی ساری ناراضی بے تحاشا خوشی میں تحلیل ہو چکی تھی۔

”جیتا رہ۔“ پر یاد رکھنا کہ آئندہ کبھی چوری نہ کرنا۔ چوری بہت بری عادت ہے۔“ اس نے بچے کو سمجھایا پھر کمرے ہوتے ہوئے بولی۔

”اچھا، اب چلتی ہوں۔ اتنا سے بیت کیا اور ابھی تک میرا ایک بھی مال نہیں بکا۔“

”تھوڑی دیر اور رک جاؤ تو میں کھانا پردس دیتی ہوں۔“ عورت نے پیشکش کی۔

”آج تمہیں اپنے کام پر نہیں جانا کیا؟“

”ایک ہنگلے والے کہیں گئے ہوئے ہیں۔ اس لیے آج کل دیر سے جا رہی ہوں۔ باقی دو ہنگلوں والی دیدیاں تو دیر سے سوکر اٹھتی ہیں۔ اس لیے ان کا حکم ہے کہ دوپہر کے بعد آیا کروں۔“ اس نے جواب دیا اور ایک بار پھر اس سے رکنے پر اصرار کرنے لگی۔ سونیا کو ان تلوں میں تیل دکھائی دے رہا تھا اس لیے اس کے اصرار پر ہتھیار ڈال دیے۔ عورت، جس نے بعد میں اپنا نام سرسوتی بتایا، کھانا تیار کرنے لگی۔

”شام کو میرے ہاتھ کی آلو کی بجلیا بہت پسند ہے پر میں بنا ہی نہیں پاتی۔ کوشش کرتی ہوں مالگوں کے دیے کھانے سے گزارہ ہو جائے۔ روج روج اپنے گھر جی پکا کر کھانے کی حیثیت نہیں ہے اپنی۔“ آلو کا نٹے ہوئے وہ اس سے باتیں بھی کر رہی تھی۔ سونیا کو اس پر بڑا ترس آیا۔ کہاں تو کسی کو اتنی نعمتیں میسر تھیں کہ ان کا شمار ممکن نہیں تھا اور کہیں ایسی بد حالی تھی کہ ایک ماں اپنے بچے کو اس کی من پسند معمولی سی سبزی بھی بنا کر نہیں کھلا سکتی تھی۔

”ہاں.....!“ ابھی سرسوتی نے آلوؤں کو بکھار لگا کر اس میں نمک مرچ ڈالا ہی تھا کہ شاموردتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ رونے کی وجہ کلڑوں میں تقسیم مٹی کے طوطے کی صورت اس کے ہاتھ میں موجود تھی۔

”یہ کیا ہوا؟“ سرسوتی گھبرا کر کھڑی ہوئی۔ شامو جواب دینے کے بجائے زار و قطار دو تار ہا۔

”کیا ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا تھا؟“ وہ بیٹے کے قریب جا کر پیار سے اس کے بال سہلاتے ہوئے پوچھنے لگی۔ جواب میں اس نے ٹلی میں سہلایا۔

”کیا کسی نے شرارت میں توڑا ہے؟“

”میں پتائی کو دکھانے لے گیا تھا۔ انہوں نے اٹھا کر زمین پر دے مارا۔“ شامو نے ہچکچاہٹ کے درمیان اصل واقعہ بیان کیا۔

”تو اس کے پاس کیا ہی کیوں تھا؟ وہ تو کل سے پاگل ہوا گھوم رہا ہے۔ وہ حرام کا جناہا شوکل سے غائب ہے اور تیرے پتا کو اس کا نشانہ نہیں ملا ہے اس لیے یو لایا پھر رہا ہے۔“ وہ بچے کو بہلانے کے ساتھ ساتھ مٹلی سے بولتی

جا رہی تھی۔

”پہل چھوڑو رونا دھونا اور میرے پاس سے کوئی ڈھنوا کھلو نا لے۔“ سونیا نے ات فراخ دلی سے پیشکش کی۔

”نہ دیدی اتم سارے کھلونے اسے ایسے وقت میں دے جاؤ گی تو تمہارا دھندا کیسے ہوگا؟“ سرسوتی نے جلدی سے اسے ٹوکا۔

”کبھی کبھی دھندے میں کھانا بھی چل جاتا ہے۔“ اس نے بے پردائی سے جواب دیا اور اصرار سے شامو کو ایک دوسرا کھلونا تمہا دیا۔

”تم بڑی دیالو ہو دیدی! ایسا کھلا ہاتھ تو ہنگلے والوں کا بھی نہیں۔“ سرسوتی نے اس کے ہاتھ تمام کر عقیدت سے کہا تو وہ محض مسکرا کر رہ گئی۔ یہ لمحہ گزرا تو ایک بار پھر کھانا پکانے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

”کیا جب بھی ہاشوغائب ہو، تمہارا پتی ایسے ہی پاگل ہو جاتا ہے؟“ باتوں باتوں میں اس نے کرید کی۔ اس کی چٹنی حس کہہ رہی تھی کہ اس موضوع کو چھیڑ کرنی اسے اپنے مطلب کی معلومات حاصل ہوں گی۔

”کبلی ہار غائب ہوا ہے ناس پیٹا۔ کسی اونچی ہوا میں بے وزن۔ یہاں سے کبھی ملتا نہیں۔ اس کا سارا دھندا سہین پر چلتا ہے۔“ سرسوتی کے جواب نے اس کو ایک بار پھر چونکا یا۔

”لگتا ہے تمہیں کچھ سن گن ہے؟“ اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

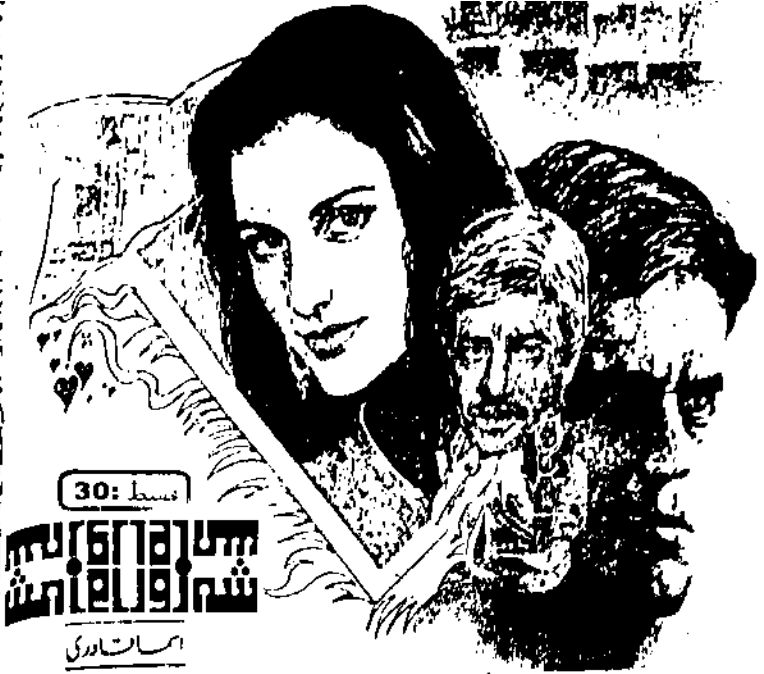
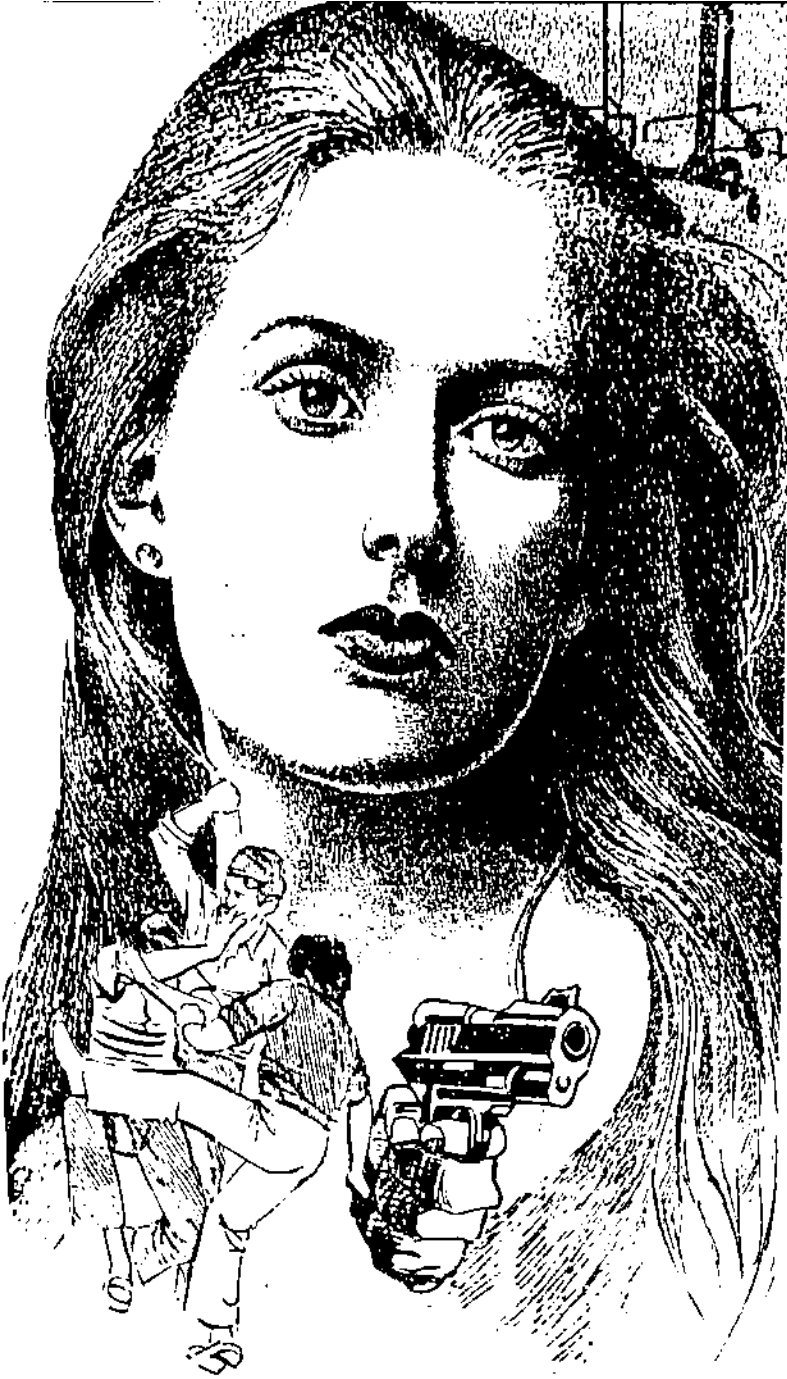
”بات بڑی خطرناک ہے اس لیے میں منہ سے نکالتے ڈرتی ہوں۔“ وہ آہستہ سے بولی اور یوں داکین بائیں دیکھا جیسے کسی کے سن لینے کا ڈر ہو۔

”کیا گڑبڑ ہے؟“ اس نے سرسوتی کو بولنے پر اکسایا۔

”کل ہاشو کچھ لوگوں کو ساتھ لے کر آیا تھا۔ وہ دیوار میں سوراخ دیکھ رہی ہو؟“ اس نے دائیں جانب کی دیوار کی طرف اشارہ کیا اور آواز کو مزید دہاتے ہوئے بولی۔

”میں نے وہاں سے جھانک کر دیکھا تھا۔ دو مرد، ایک عورت اور بچہ تھے۔ دیکھنے میں پڑھے لکھے بابو لوگ لگتے تھے۔“ وہ جوں جوں بتاتی جا رہی تھی، سونیا کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نہو جوان
کسی داستان جو غلط کاروں کے لیے
غضب ناک تھا باقی واقعات اپنے ماہ پڑھیے



منسل: 30

شہزادہ کا شکار

اساتذہ

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عقائد پور اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تندوبیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابل شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پُر عزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جا رہے تھے... اس کی زندگی جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قراریوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تار عنکبوت نے طاقت اور گھمٹ کے نشے میں چور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ پروار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جھٹ یوں لڑتا رہا کہ وارداتِ قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہو سکی...

اپنے تحریروں پر تجربہ کار ناول ہونے والے ایک سراپا اہتمام نوجوان کی تحیر انگیز داستان

سپنس ڈائجسٹ 60 اگست 2022ء

کی۔ اس نے ریکارڈ کے لیے جواب دیس اور فون نمبر کھسکایا تھا۔ فریسی ہے۔ ایک سوال کے جواب میں میڈم انکس کو تمام معلومات فراہم کر دی گئیں۔

”تمہارا پس و پیش کے بارے میں کیا خیال ہے؟“
”جس طرح وہ یہ صرف باڈل کو فوکس کیا گیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ وہی ان ہی لوگوں نے تیار کیا ہے جن سے وہ معاملہ ملے کر رہا ہے۔“
”اور ہمیں وہی بچھانے میں بھی ان ہی لوگوں کا ہاتھ ہے۔“

”آف کورس میڈم! ایسا ممکن ہے کہ باڈل کو پھانسنے کے لیے جال بچھایا گیا ہے۔ خیال آرائی کی تھی۔“
”یہ لگنے لگنے کی اصطلاح تو اس وقت استعمال ہوتی جب تھانہ پانی کی طرف سے ڈیل آفر ہوتی۔ اس دیکھو یہ صاف ظاہر ہے کہ آفر نے کر باڈل ان کے پاس کیا تھا۔“ میڈم انکس نے اس کی رائے سے اختلاف کیا۔
”آپ درست کہہ رہی ہیں میڈم! لیکن وہی جو سے بھر حال یہ اعجاز ہو رہا ہے کہ دوسری پانی کا بھی فل اکرمت ہے۔“

”مگر پوائنٹ۔ اب ایسا کرو کہ باڈل کو بلواؤ۔ دوسری پانی کون ہے۔ یہ اسی سے پتا چلے گا پھر ہم ایک ساتھ دونوں سے سخت لیں گے۔ ہمارا اثرا اتنا نقصان ہوا ہے، جواب تو دیتا ہی نہیں۔“

”اوکے میڈم!“ ماتحت قسم کی قسم کے لیے چلا گیا جبکہ میڈم انکس کمرے میں ادھر سے ادھر گھومتی تھی۔ اسے جو دیکھ موصول ہوئی تھی وہ بالکل سبکی کے لحاظ سے ہونے والی گھوڑا باڈل کی ملاقات کی دیکھ چکی تھیں لیکن وہی گھوڑا نہیں آ رہا تھا۔

”ایک کے بعد ایک ہر روز ایک نیا مسئلہ ملتا رہتا ہے۔“
”لگتے لگتے وہ زہر بلب جڑ بلی پھر انعام کے قریب جا رہی۔“
”سونا کے بارے میں کوئی اطلاع؟“ اس نے دوسرے طرف لائن پر موجود شخص سے پوچھا۔

”ایک نیم ہی خبر آئی ہے میڈم! میں آپ سے شیئر کر رہا تھا۔“
”تو آج آج!“ اس نے حکم دیا۔ اگلے چند منٹوں میں اس ہانک اور ماتحت اس کے کدو پر کھڑا تھا۔

”کیا خبر ہے؟“
”خبر حیدر آباد وکس سے موصول ہوئی ہے۔ خبر کی تفصیلات سے زیادہ اس کے ساتھ موصول ہونے والی یہ

فوج زیادہ اہم ہے۔“ اس نے لب لباب کی انگریز میں ایکس کے سامنے کی۔ اس فوج میں ایک لیے قہر کا مرد، ایک چرسے کو چادر کے پتے سے چھپائے عورت اور عورت کی کمر میں موجود بچہ نمایاں تھے۔

”مرد اور عورت کے بارے میں شک ہے کہ یہ معاذ اور کل تھا، اور کل کی گود میں موجود بچہ اس کا بیٹا اظہر من الشمس ہے۔ ہمارے ذریعے نے یہ فوج اصل میں بچے کی وجہ سے ہی بھیجی ہے۔ اسے جہیز ہے کہ یہ بچہ صداقت شاہ کا نوادر اعظم شاہی ہے۔“

”مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔ تم فوج میں نظر آنے والے جوان پر غور کرو۔ اگرچہ اس کی شکل و صورت مختلف ہے لیکن قہر کا کھڑا اور کمرے ہونے کا انداز بالکل سا جیسا ہے۔“
”اگر یہ وہی لوگ ہیں تو مجھے شک ہے میڈم سونیا اس وقت مشکل میں ہوں گی۔“

”کیا مطلب؟“ ماتحت کے چہرے کے کھیمہ تاثرات نے میڈم کو چوک کر سوال کرنے پر مجبور کیا۔ جواب اسے ساری تفصیل سنائی گئی۔

”میری سمجھ سے باہر ہے کہ یہ اسٹوڈنٹ کی کرتی کیا پھر رہی ہے۔ میں نے اسے معاذ کو تلاش کرنے کی ذمہ داری سونپی تھی اور یہ ہے کہ اس کا ساتھ دیتی پھر رہی ہے۔“
اس کے انداز میں سونیا کے لیے غصہ تھا۔

”میڈم سونیا سے ملاقات سے پہلے کوئی حتمی نتیجہ نکالنا درست نہیں ہوگا میڈم! میڈم سونیا بہت ذہین ہیں اور ہم کو نہیں کہہ سکتے کہ وہ جو چاہے کر رہی ہیں اس کے پیچھے کیا ریزن ہے۔“ وہ ان کا بہت پرانا ساتھی تھا اور اس نے سونیا کو تنظیم کے لیے بے شمار کارنامے انجام دیے دیکھا تھا اس لیے اسے یہ یقین کرنے میں تامل تھا کہ وہ تنظیم کے بجائے کسی اور کا ساتھ دے رہی ہے۔

”آئی ہوپ کہ ایسا ہی ہو لیکن فی الحال میں اس سب سے بہت پریشان ہوں۔ کالی عرصے سے ہمیں مسلسل ہاکسیر کا سامنا ہے اور یہ جزیرے لیے شرمندگی کا باعث بنی ہوئی ہے۔“

”مجھے تو ایسا لگتا ہے میڈم کہ معاذ ہمارے لیے منحوس ثابت ہوا ہے۔ جب سے ہم نے اسے اپنے ساتھ ملانے کی کوششیں شروع کی ہیں تب سے ہی ہم مسائل کا شکار ہیں۔“ ماتحت نے ایک ایسا بات کہی جس پر میڈم انکس اس کی شکل دیکھتی رہ گئی۔

”میں نے کچھ لاکھڑا یا میڈم؟“ وہ اس کے یوں

شہ زور

دیکھنے پر بیٹھ گیا۔
”نہیں۔ بس میں یہ سوچ رہی تھی کہ ہماری ناکالی

کے پیچھے ہماری بیلنگ جس جگہ معاذ کی گڈ لک ہے۔ وہ غیر معمولی صلاحیتوں والا جوان ہے اور ایسے لوگوں کی قسمت بھی ان کا بہت زیادہ ساتھ دیتی ہے۔ کاش کہ ہم اس کی گڈ لک کے ساتھ اسے اپنا وفادار بنانے میں کامیاب ہو جاتے تو آج ہماری کامیابیوں کا کتاب ہی کچھ اور ہوتا۔“ میڈم کے لہجے میں ایک حسرت کی تھی۔

”آپ غم نہ کریں۔ مجھے پوری امید ہے کہ میڈم سونیا اسے گھر کر جائے۔ اس واپس لانے میں کامیاب ہو جائیں گی۔“ وہ کتنی خوش کن امیدیں دلا رہا تھا۔ میڈم انکس کو اپنے حراج میں ایک خوشگوار سی تبدیلی کا احساس ہوا۔ واقعی اس انداز میں تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔

”مگر سونیا۔“ اچھا سوچے سوچے سونیا کے خیال نے اسے بے چین کر دیا۔ اس نے غصے کیا تھا کہ سونیا کے انداز میں کوئی تبدیلی در آئی ہے بلکہ اسے شک تھا کہ سونیا، معاذ کی طرف مقلبت ہے اور یہی شک اسے سونا پر وہ اعتماد نہیں کرنے دیتا تھا جواب بھی ارد گرد کے لوگوں کو اس پر تھا۔ وہ سونیا کے بارے میں کئی غلط فہمیاں پھیلنے کے باوجود بھی ابھی تک اس کے لیے غلطی انداز میں نہیں سوچ رہے تھے اور ان کے دلوں میں بھی خیال تھا کہ وہ جو کچھ کرتی پھر رہی ہے، اس کے پیچھے کوئی گہری چال ہے۔

”کاش کہ تم میری تربیت کی لاج رکھو اور تمہارا خون اپنا اثر نہ دکھائے۔“ اس نے ماتحت کو سخت کر دیا اور سونیا کا تصور کرتے ہوئے قاتلانہ اس سے مخاطب ہوئی۔ تصور بھلا اسے کیا جواب دیتا لیکن باڈوں کا ایک سلسلہ تھا جو اسے اپنی گرفت میں لے چکا تھا۔ بہت سخت دل اور عملی افراد کی زندگی میں بھی کوئی کمزور کھڑا ہوتا ہے اور وہ بھی ایسا ہوتا ہے جو پوری حیات پر چھل جاتا ہے۔ میڈم انکس بھی اپنی زندگی کے اس کمزور کھڑے کی گرفت میں تھی۔

☆☆☆

”جو کچھ تو کہہ رہا ہے اس کا انجام سوچا ہے شہزادے؟“
”انجام ان شاء اللہ اچھا ہی ہوگا۔ بس تم تھک دیکھو اور تھکی کی دھار نہ کھو۔“ شہزادہ مطمئن تھا۔

”وہ حرام۔“ باڈل پھینکے گا تو ساتھ ہماری بھی ہانک مچے گی۔“ گلستا کی خوشنویس برقرار تھی۔
”تمہیں وہ ہانک۔ ہماری ہانک تمہیں کر رہی۔“ اپنی گردن نہیں ہٹا سکتے گا۔“

”یہ تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ گلستا نے اس کی تائید کی۔

”دیکھو استاد! اس پوری دیکھ میں ہمیں بھی یہ ظاہر نہیں ہو رہا کہ ہم اور باڈوں کو کوئی نقصان پہنچا رہا ہے۔“
”ہاں۔ یہ ایک کام کی آخری جڑ میں باڈل نے دی تھی۔ ہمیں نہیں پتا تھا کہ اس سے کس کا نقصان ہوگا۔ ہم تو انہماں لوگ ہیں اور لالہ بھٹی کے بعد خود سے اپنے قدم جمانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لالہ گہرا آدمی تھا اور اپنے تمام معاملات کی اپنے قریبی ساتھیوں کو بھی ہوا نہیں گئے دیتا تھا اس لیے ہمیں اس کی ڈیکھ کر بھی علم نہیں تھا۔ باڈل نے بھی میڈم کا نام بعد میں اس وقت لیا جب ہم ہاکم ہو گئے اور وہ ہماری ناکالی پڑیش میں آ گیا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ باڈل کی باقی سب کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی پھانسنے کی کوشش تھی۔ اگر ہم بال سبست پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہو جاتے تو ہمارا برا حشر ہو جاتا۔“

”یہ تو بالکل ٹھیک بات ہے۔ تمہاری ہمت اور پھر ترقی نے ہماریا نہیں در نہ بھی نیکی ویزن پر ہر طرف اگلے ٹوٹو دکھائی دے رہے ہوتے۔“ گلستا نے اعتراف کیا۔ اسی وقت اس کے موبائل پر کوئی پیغام موصول ہوا۔ اس نے پیغام بھیجے ڈالے کا نام پڑھا تو فوراً اسے کھول کر پڑھنے لگا۔

پیغام پڑھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اڑ گئی۔

”سہارک ہوا استاد! باڈل کو میڈم کے آدمی اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔“

”بس تو پھر ہمارا بلاوا بھی آتا ہی ہوگا۔“ گلستا نے ساتھ بولا تو اس کا قبضہ ٹھل گیا۔

”بلاوا آنے سے پہلے مجھے سارے امپ پوائنٹ ڈسکس کرلو۔ میڈم کے سامنے یہ کیس تم نے ہی لڑا ہے۔ میں تو گھوٹا ہوں۔“ جیلے کے آخر میں اس نے مظلومی شکل بنائی تو گلستا استاد دھس دیا اور محبت سے بولا۔

”تو کی سالانہ انوکھی ہے۔“
”وہ تو ہو رہی ہے۔ آخر حلق کہاں سے ہے میرا۔“

اس نے کار کھڑا کیا۔

”تھقل جہاں سے بھی ہو، ہماری تو بوجھان ہے۔“
گلکی آنکھوں میں اس کے لیے اجمرد جلتی تھی۔

”میرے خیال میں اگلیا محبت بہت ہو چکا۔ اب کام کی باتیں کر لیں۔“ اس نے کہا تو گلستا استاد بدترق گوش ہو گیا۔ بہت دیر تک دلوں با یک ٹپتی ہے ایک ایک کتے پر مباحثہ کرتے رہے۔ جب کالی حد تک اطمینان ہو گیا تو ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا۔ کھانے کے بعد قہرے کا سلسلہ چل

وہاں سے بھی کوئی ابھی خبر نہیں ملی۔ ایسا لگتا ہے وہاں وہ لوگوں کی قید میں ہیں اور ان لوگوں کی اجازت کے بغیر یہ نہیں کر سکتیں ورنہ اب تک مجھ سے رابطہ کر چکی ہوتیں۔

حادثہ بڑی عجیب و غریب داستان بنا رہا تھا۔

”تم نے اوپر والوں سے اس سلسلے میں مدد منگوائی؟“ گھوٹے دبے لہجے میں پوچھا۔ ہم کوئی نہیں لیا تو لیکن معلوم ہو گا کہ شہر میں جتنے بھی کروڑ کام کر رہے ہیں، سب کے سامنے ہائے کہاں جا کر جڑتے ہیں۔

”اوپر والے جس کام اور مال کی بات کرتے تھے ہمارے اندرونی مسائل سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس طرف سے ایسے ہو کر ہی تو میں یہاں مذک کے لیے آیا ہوں۔“

”مستقل معاوضے کے تو انکار کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“ گھوڑا باز نس میں بین گیا۔

”مٹا ناگ معاوضہ دوں گا۔ جس کام ہونا چاہیے۔“

حادثہ نے اسے تعین دہانی کروائی۔

”کام ایک دم چکا ہو گا۔ اپنے سب سے قابل بندے لگاؤں گا میں اس کام پر لیکن جس شخص پر سب سے پہلے دینا ہو گا اور ساتھ ہی خرچ پانی بھی۔“ گھوڑی تیزی سے اس کے ساتھ معاملات طے کرنے لگا۔

”اوکے ڈن۔“ حادثہ اس کی ساری شرطیں ماننے کے لیے تیار تھا۔

”ایسا ہے تو میری طرف سے بھی ڈن ہے۔ تم مجھے میڈم کے بارے میں ساری افکار پیش دے دو۔ اگے کا کام میرے آدمی سنہال لیں گے۔“ گھوڑا ستون ہادی بھری۔ اس کے ہائی بھرنے کے بعد ان کے درمیان حرید کچھ معاملات طے پائے پھر حادثہ رخصت ہو گیا۔

”یہ کیا ہوا؟ ہم تو کسی اور کے انتظار میں تھے اور یہاں کوئی اور چلا آیا۔“ حادثہ کے رخصت ہوتے ہی کوٹاہ بول پڑا۔

”پھر تو اپنے اپنے بھی نہیں پڑا۔ اسی واسطے ہاں بول دی ہے۔“ بھی بھی پھر میں پڑ کر ہی چکر بچھاتا ہے۔

”یہ سونا گڑ بڑ گھٹلا موت ہے۔ بشری گزار کی زندگی خراب کرنے میں بھی اس کا بڑا ہاتھ تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ چکر باز موت خود کیسے کم ہو سکتی ہے۔“ وہ الجھا ہوا ہی تھا۔

”بھی بھی چروں کو بھی سوچ پڑ جاتے ہیں۔“ گھوڑا۔

”میرا ذہن اس سب کو قبول نہیں کر رہا۔ کچھ ہے جو کلک رہا ہے۔“

”مجھے بھی کلک رہا ہے اور اسی لیے میں نے اس کام

سینئر ایجنٹ 66 اگست 2022

شہ زور

آواز سنائی دی تو وہ سیدھا ہو بیٹھا۔

”کیا مطلب؟ کیا کہہ رہے ہو؟“ وہ انجان بنا۔

”اب یہ نہ کہنا کہ تمہارے اڈے پر تمہارے لوگوں کے سوا بھی کوئی وہ دیکھو یا سکتا تھا۔“ ہال کے لہجے کی پتکار برقرار رہی۔

”کون سی دیکھو؟“ اس نے اب بھی سوالیہ لہجہ میں دہرایا۔

”وہی دیکھو جسے دیکھ کر میڈم انکس نے مجھے میرے ٹھکانے سے اٹھایا تھا کیونکہ اس دیکھو میں، میں تمہارے ساتھ مل کر اس کا مال غائب کرنے کی پانچنگ کر رہا تھا۔“

”کیا کہہ رہے ہو؟ اس کا مطلب ہے میڈم کا اٹھا لٹا ہم ہوں گے۔“ گھوٹے گھبرانے کی آواز کا رک کی۔

”زیادہ انجان مت بنو۔ وہ دیکھو تمہارے آدمی نے بتائی تھی اس لیے اس میں تمہارا تھوڑا سا موجودہ نہیں ہے۔“

ہال فرمایا۔

”تم سنا سوچے کچھ مجھ پر الزام لگا رہے ہو۔“

”میں الزام لگا رہا ہوں تو تم اپنی خبر مٹاؤ۔ تمہاری اس حرکت سے مجھے جو جھگڑنا پڑا ہے، اس کا دس گنا نہیں نہ لو تا تو تو میرا نام بدل دیتا۔“ ہال فیس سے باقاعدہ اٹل رہا تھا۔

”تم کہاں ہو؟ مل کر بیٹھے ہیں اور سیکون سے اس مسئلے پر بات کرتے ہیں۔“ گھوٹے اسے پکارا۔

”میں اس وقت ضرور ہوں۔ میڈم انکس کے آدمیوں کی قید سے نکل کر بھاگا ہوں اور ان کے لشکر دیکھو۔“

”سے دیکھو بھی ہوں لیکن میں بہت جلد تم سے حساب لینے والی آؤں گا۔“ ہال اب انڈین فلموں کے ہیرو کی طرح بڑکھیا مار رہا تھا۔

”تم نے میڈم کے سامنے میرا نام تو لیا ہو گا؟“ گھوٹے اپنے جیس پر مزید قابو نہیں پاسا۔

”نہیں لیا۔“ کیونکہ اسی ایک سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے اس نے مجھے زندہ رکھا تھا۔ میں ذمہ دار ہوں اس لیے بار بھوکھ کب نہیں اور تمہارے کروڑ کو کوئی تباہی سے نہیں بچا سکتا۔“ اس کی دھمکیوں کا سلسلہ جاری تھا۔

”بے وقوفی کی انہی مت کر دو۔ ہم مل کر اس مسئلے پر بات کر سکتے ہیں بلکہ میں تمہیں میڈم سے بچانے میں مدد کر سکتا ہوں۔“ گھوٹے اسے چیلنج کی۔ ہال کی باتوں سے یہ سمجھن تو دور ہو کر کوئی بھی میڈم انکس کی طرف سے ابھی تک ان کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لیا تھا تھا۔

”تم جو کچھ کر رہے ہو وہ کالی ہے۔ اب میں اس کا

کو کرنے کی ہائی بھری ہے۔ یہ سونا خان معمولی بھری نہیں ہے۔ سچم کی ہر پارٹی میں کالٹی نمایاں ہوتی تھی۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اس کا میڈم انکس سے ڈائریکٹ کاٹ لیتا تھا۔ اگر ہم میڈم انکس تک پہنچا چاہتے ہیں تو اس کو تلاش کرنا ہو گا۔“ گھوٹے الفاظ میں اس کا تجربہ بول رہا تھا۔

”فیک ہے۔“ پھر کے بھیجے اس کام کے لیے؟“ وہ کچھ کچھ قائل ہو گیا۔

”ابھی سوچا نہیں۔ تو ایسا کر حادثہ نے جراثیم پھیل دی ہیں، ان کو مٹانے کے لیے تھوڑا سا کام کر کے اس پر۔“

یہ ضرورت کرنا کہ آج کل حیدر آباد میں حالات کیسے ہیں؟ حالات کی گزرتے سے بھی کوئی سراغ مل سکتا ہے۔“ گھوڑا لالہ

میں کی کاروبار یا تھوڑا اور اسی کی طرح منتقلی انداز میں سوچ رہا تھا۔

”اور یہ میڈم انکس اور ہال کا کیا ہو گا؟ جتنی دیر ہو جی ہے اس کی طرف سے ہال کو بلائے، اسی دیر میں تو کوئی نیچر نکل جائے گا۔“ حادثہ نے ہال کی جاری نشاندہی کرنے میں کسی تکلف سے تو کام لے گا نہیں۔“ وہ ایک بار

پھر پہلے والے مسئلے پر آ گیا۔ اصل میں اس نے دیکھو میڈم انکس تک رسائی کے لیے ہی بھیجی تھی۔ عام حالات میں تو میڈم کی مرضی کے بغیر اس سے رابطہ ممکن ہی نہیں تھا۔ جس ایک نوٹ شاہ کا ایڈریس تھا جہاں اندر ضرورت کے وقت

پتلا بھجوانے کی اجازت تھی، وہ بھی ڈاک یا کوریئر وغیرہ کے ذریعے۔ براہ راست کوئی وہاں قدم بھی نہیں رکھ سکتا تھا۔ شاہ پر بھجوانے جانے والے پیغام پر زور مل دیتا یا نہ دیتا میڈم کی مرضی پر ہوتا تھا۔ اسے پہلے اس سارے سیٹ

اب کا حکم نہیں تھا۔ اسے بہت اہمیت دینے کے باوجود لالہ نے بہت سے معاملات میں اسے لالہ رکھا تھا اور اب وہ آہستہ آہستہ ان معاملات کو جان کر سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”کابے کو سوچ سوچ کر اپنا دماغ چلی کرتا ہے۔“

جب جو ہونا ہو گا، ہو جائے گا۔“ گھوٹے اسے ڈانٹنے کے انداز میں تو کہہ تو وہ خاموشی اختیار کر گیا۔ اس کے بعد دونوں

ہی اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ رات گئے تک باوجود انتظار کے کہیں سے کوئی رابطہ نہیں کیا گیا۔ رات

سونے کے لیے لیٹنے سے لگ جھگڑا پتا آخری جام لی رہا تھا، اس کے قون کی کھنٹی بجی۔ خبر انجان تھا پھر بھی اس نے

کال نہ دیکر لی۔

”جو تم لوگوں نے میرے ساتھ کیا ہے، اسے میں بھی نہیں بھولوں گا۔“ دوسری طرف سے ہال کی پتکار بولی

سینئر ایجنٹ 67 اگست 2022

بہترین تحریریں، لاجواب رد واد اور
اہلی داستانیں پڑھنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے



شمارہ اگست 2022ء
کی جھلکیاں

باقی

اس باقی و تکار کا احوال زبست
جس نے جھٹک نہیں سکیا

وقت آخر

موت سے پہلے مصروف
شخصیات کے آخری جملے

دیدبان

للم عری کی کمی ان کی یادیں، ملاقاتیں

درد آزادی

خون کے دریا میں فوسل ذن
فمن کی سچ بیانی



بہن کی سچ بیانی، بے قصہ تاریخی واقعات
دوب کچھ جواب پڑھنا چاہتے
ہیں، آپ کو پڑھنا چاہیے

دی گئی۔

”اس کا تو بہت خون نکل رہا ہے۔“ چارو کے ساتھ
اندرا نے والا شوڑپ کر دی انوپ کی طرف بڑھا۔

”ٹھکر کر دیکھو، یہ درخت مجھ پر حملہ کرنے کے جرم
میں جان سے بھی جاسکتا تھا۔“ معاذ فیصلے لیجے میں غرایا۔
حالات کو اپنے قابو میں رکھنے کے لیے چارو حاد روئے اختیار
کر ضروری تھا اور نہ ان دونوں میں سے کسی کو بھی ہونے
کا شوق چھوڑ سکتا تھا۔ خصوصاً انوپ حراج کا ذرا جھکا لگا تھا
اور اس کا معاذ اندر روئے بھی واضح تھا۔

”کامیاب کو اپنی جان خطرے میں ڈال ہے۔ جو یہ
کرتے ہیں، مرنے دے۔ مالک کے لیے جان دے دے
تو مالک کون سا تجھے سورگ میں جگہ دلا دے گا۔“ ہاشم
نے دارا سے لیجے میں انوپ کو ٹوکا۔ بولنے کے ساتھ
ساتھ اس کے ہاتھ بھی کام کر رہے تھے۔ اس نے انوپ کی
تیزی سے سرخ ہوئی آستین پھاڑ ڈالی تھی اور اس کے زخم کا
جاڑو لینے کی کوشش کر رہا تھا۔

”اس کو معلوم ہو گا کہ یہاں ایمر جنسی میڈیکل باکس
کہاں رکھا ہے۔ دو ٹکڑا اور اس کی مرہم پٹی کر دو۔“ معاذ
نے ضرور دیا اور مرکز ایک بار پھر تالے پر چابی آزمائی کرنے
لگا۔ اگلے چند سیکنڈوں میں تالا کھل چکا تھا۔

”آئیے کل!“ اس نے زور سے بولے واقعے پر
ہنوز شہر پہنچی تھی کل کو طالب کیا اور خود آگے بڑھ کر انوپ کو
گرد میں اٹھالیا۔ ہاشم اور انوپ، چارو کی گھرائی میں میڈیکل
باکس لینے وہاں سے جا چکے تھے۔

”مجھے معلوم ہے کہ موجودہ صورت حال میں آپ
بہت پریشان ہیں اور آپ کو کئی مسائل کا سامنا ہے لیکن
میری آپ سے درخواست ہے کہ مجھ پر تھوڑا سا اعتبار کرتے
ہوئے ہر پریشانی کو سر سے جھک کر اس لئے والی مہلت کا
فائدہ اٹھائیں اور فریض ہو کر سکون سے سو جائیں۔ باہر میں
اور چارو کسی بھی مشکل سے منسنے کے لیے جاتے رہیں گے۔“
آرام دہن است کرے میں داخل ہو کر اس نے انوپ کو کمر
پر لٹایا اور کھل سے مخاطب ہوا۔

”تمی ٹھیک ہے۔“ کھل نے گویا اس کی بات سے
اتفاق کیا۔

”میں یہ الماری کھول دیتا ہوں۔ آپ اس میں سے
اپنی ضرورت کے حساب سے کوئی لباس نکال کر پہن لیں۔“
اب وہ خشک الماری کا تالا کھول رہا تھا۔

”رہے دیں۔ میں انہی کپڑوں میں ٹھیک ہوں۔“

”یہ جھوٹی مالکین کا کمر ہے۔“

”اس کی چابی ہے تمہارے پاس؟“

”نہیں۔“

”مطلب ہمیں اس کالاک توڑنا پڑے گا۔“

”تم ایسا نہیں کر سکتے۔ جھوٹی مالکین بنا اجازت کسی کا
اچھے کمرے میں آنا پسند نہیں کرتیں۔ اس لیے انہوں نے
مٹائی سٹرائی کے لیے مجھے اپنے کمرے کی چابی ہمیں مل
گئی۔“ انوپ نے منہ پٹا کر جواب دیا۔

”اس وقت یہاں باس ہم ہیں اس لیے پسند نہیں
میں ہماری پلے گی۔“ اس نے انوپ کو خاطر میں لائے بغیر
پہل لہراتے ہوئے اسے جتا دیا اور لاؤنج میں انوپ کو کمرے
لیے کھڑی کھلی کی طرف رخ کر کے اس سے پوچھا۔

”ہیئرین ہوئی آپ کے پاس؟“

”سب نے جواب میں کچھ غصے کے بجائے اپنی جان
کے اندر ہاتھ ڈال کر بالوں میں گلی پن لگائی اور اس کی
طرف بڑھا۔“

”آپ انوپ کو لے کر وہاں صوفے پر بیٹھ جائیں۔
میں ابھی دو منٹ میں یہ لاک کھل جائے تو پھر آپ اہمیت
سے اندر کمرے میں آرام کیجیے گا۔“ اس نے کھل کے ہاتھ
سے پن لیتے ہوئے اس سے کہا اور پھر مرکز کمرے کے آگے
ایک لاک کی طرف متوجہ ہو گیا۔ بند تالوں کو کھولنے کی
تربیت سے میڈیم ایکس کی قید میں دی گئی تھی۔

”کھل تک۔۔۔۔۔ وہ کان لگائے تالے کی نہیں بنے
کی آواز میں رہا تھا۔ اس کا پہل اس کی چیخ میں اڑا
ہوا تھا۔“

انوپ نے اسے مصروف دیکھا تو موقع کا فائدہ اٹھا
کر اسے قابو کرنے کا سوچا اور عقب سے اس پر حملہ آور
ہوا۔ معاذ کے لیے یہ غیر متوقع نہیں تھا۔ بھاہرتالے کے
ساتھ مصروف وہ انوپ کی طرف سے بھی چونکا تھا چنانچہ
جیسے ہی وہ اس کے قریب آیا، اس کی ٹانگ کھوی اور انوپ
تقریباً اڑتا ہوا ایک شیشے کی تپالی سے گر آیا۔ گرانے سے
شیشہ ٹوٹ گیا اور اس کا ایک ٹکڑا انوپ کے بازو میں
جا گھسا۔ اس کے منہ سے ایک تیز سکاری نکل بیگہ انوپ
میں کن آواز سن کر متوجہ ہونے والی کھل بڑا کر اپنی جگہ
سے کھڑی ہو گئی۔

”گڈ شارٹ۔“ ہاشم کو تنک لے کر تنک کے معائنے
کے لیے نکلے ہوئے چارو نے مین اسی وقت ستر میں قدم
رکھا تھا اور معاذ کو اس کی پھرتی اور مہارت پر بے ساختہ داد
دے کھڑی ہو گئی۔

”یہ کس کا کمر ہے؟“ ایک بند کرے کے آگے
کھڑے ہو کر اس نے انوپ سے پوچھا۔ وہ رات کی
تاریکی میں ہاشم اور انوپ کو اسے کے زور پر انوپ کے
بالوں کے تنکے پر لائے تھے۔ ان حالات میں بالوں سے
خالی یہ بنگالہ کے لیے ایک اچھا ٹھکانہ ثابت ہو سکتا تھا اس
لیے انہوں نے ہاشم کو غیر متوجہ نہ ہونے کا مکان کو چھوڑ
کر یہاں آنے کا فیصلہ کیا تھا۔

انکار کر دیتے ہیں تمہارے ساتھ کروں گا۔“ ہال نے آخری
دیکھ دیتے ہوئے فون بند کر دیا تو گھوٹے اضطراب میں جام
میں بھاسا مشروب ایک سانس میں مٹن میں اڑ گیا۔
اس کے چہرے پر سرخی اٹھ ائی۔ وہ چپا تھا لیکن لالہ کی طرح
بالوں میں کھنکھاتا۔

”یہ دیکھو استاد یہ ایک بڑی زبردست میز دلی ہے
حیدر آباد کا ہے۔“

”کیسی غیر فضا دے؟“ گھوٹے خود کو سنبھالنے کی
کوشش کی اور اچانک دروازہ کھول کر اندر آنے والے کی
طرف متوجہ ہوا۔

”تم ٹھیک تو ہو استاد؟“

”ٹھیک ہوں۔ بس دروازہ یاد دہانی ہے۔“

”لالہ بننے کی کوشش کر رہے ہو؟“ وہ ہنسا۔

”شراب پینے سے کوئی لالہ بن سکتا تو شراب خانے
بھرے ہوتے۔“ گھوٹے بے ساختہ جواب دیا پھر بات
بدلتے ہوئے بولا۔

”تو کھانا کون کی خبر کئے آ یا تھا؟“

”یہ خبر دیکھو۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ اس خبر میں کچھ نہ
کچھ ہمارے مطلب کا ہے۔ تم اس تصویر میں موجود خاتون کو
دیکھو۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے یہ وہی خاتون ہیں جنہیں ایک
بار میں نے ایشیہ آزادی میں معاذ بھائی کے ساتھ دیکھا
تھا۔“ اس نے کھل کی باغیاب تصویر پر انگلی رکھی ہوئی تھی۔

”پھر۔۔۔۔۔ کیا ارادہ ہے تمرا؟“ گھوٹے اس کے جوش
کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”مجھے لگتا ہے کہ مجھے وہاں جا کر خود تحقیق کرنا
چاہیے۔“ اس نے کچھ مجھتے ہوئے جواب دیا۔

”تو پھر ٹھیک ہے۔ جانے کی تیاری کر۔ میری
طرف سے تجھے پوری اجازت ہے۔“ گھوٹے فیصلہ سنایا۔

لاشعوری طور پر وہ اسے ہال کے جنون اور عتاب سے دور
کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

☆☆☆

”یہ کس کا کمر ہے؟“ ایک بند کرے کے آگے

کھڑے ہو کر اس نے انوپ سے پوچھا۔ وہ رات کی

تاریکی میں ہاشم اور انوپ کو اسے کے زور پر انوپ کے

بالوں کے تنکے پر لائے تھے۔ ان حالات میں بالوں سے

خالی یہ بنگالہ کے لیے ایک اچھا ٹھکانہ ثابت ہو سکتا تھا اس

لیے انہوں نے ہاشم کو غیر متوجہ نہ ہونے کا مکان کو چھوڑ

کر یہاں آنے کا فیصلہ کیا تھا۔

اسے عجیب لگا کہ وہ کسی اجنبی لڑکی کے دادا اور بپا میں سے بلا اجازت اس کے کپڑے نکال کر پہن لے۔
 "بالکل بھی عجیب نہیں ہیں آپ۔ لباس اتنا خراب اور میلادور ہے کہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اس میں آپ کو سکون کی خیر آجائے۔" اپنے کام میں مصروف رہتے ہوئے اس نے گلے کے کنارے گھبراہٹ سے کہا۔
 "مجھے کھل گیا لاک۔ اب اپنے حساب سے کپڑے نکال لیں۔" اس نے الماری کا پت کھول کر اندر موجود کپڑوں کی طرف اشارہ کیا اور خود کمرے سے باہر نکل گیا۔
 "جتنے کمرے کے دادا وہ اندر سے بند کیا اور پھر الماری میں موجود کپڑوں کا جائزہ لیتے گئے۔ وہ زیادہ تر سفری انداز کے کپڑے تھے۔ بڑی مشکل سے اس نے ایک شلوار لیں اور صبح کر نکالا۔

اعظم نے سکون نیکو سوچا تھا اور اسے معلوم تھا کہ وہ ابھی اتنی جلدی نہیں جاتے گا اس لیے امیدوار سے کچھ فصل خانے میں کھس گئی۔ فصل کرنے کے بعد صاف سترے کپڑے پہنے تو طبیعت میں ایسا ہلکا پن محسوس ہوا کہ بے ساختہ سناڑ کے لیے دل سے دعا کی۔ اگر وہ اسرار ذکر توفیق اس سکون سے محروم رہتی، ہال خشک کر کے بستر پر لیٹنے سے قہقہے لگتی اس نے ڈراما دورا کو کھول کر باہر نکالا۔ ہاشور اوپ دریں میں بکڑے مخالف سمتوں میں قائم پر پڑے ہوئے تھے جبکہ سناڑ کوٹ بدلے ایک سوٹ پر سو یا ہوا تھا۔ چارہ کو اس نے دوسرے صوفے پر چکر اور گھٹا ہوا پایا۔ بیٹیاں انہوں نے سونے کے لیے پاریاں لگائی تھیں اور اس وقت جاو پہرے کے لیے جاگ رہا تھا۔ اس سارے منظر پر ایک نظر ڈال کر وہ جھپٹنے لگی تھی کہ سناڑ کے کوٹ بدل دی اور اس کا چہرہ سامنے آ گیا۔ اس وقت وہ اس ایک اپ خود جینے میں نہیں تھا جس میں وہ اسے اتنے دنوں سے دیکھ رہی تھی۔ شاید میڈیا پر تصاویر آنے کے بعد اس لیے کہ خطرناک سمجھے ہوئے اس نے اپنا ایک اپ اتار دیا تھا اور اس وقت اپنی اصل شکل و صورت میں تھا۔ کشادہ پیشانی پر سیاہ نکل بال بکھرے ہوئے تھے اور چہرے پر وہ امیدوار تھا جو حق کی راہ پر چلتے والوں کی خاصیت ہوتا ہے۔ وہ اس شخص کے کردار، گفتار اور انداز کی شغافیت کی گواہی اور جانتی تھی کہ وہ جو اس کی آنکھوں میں اس کے لیے چمکے جھلکے ہیں، وہ بہت خالص ہیں لیکن اسے اپنا آپ اس ناک نہیں لگتا تھا کہ ان خالص اور شغافہ جذبوں کی پذیرائی کر سکے۔
 "تم بہت اچھے ہو سناڑ اور مجھ سے بہت زیادہ اچھی

لڑکی ڈیڑھ رو کر رہے ہو۔" اس کے چہرے پر نظریں لگائیں اس نے بند لپوں سے سرگوشی کی جگہ بے آواز دورا وہ اندر کر کے بستر پر آ گئی۔ ایک اداس سی جگہ جس نے اسے اپنی لپٹ میں لے لیا تھا۔ بستر پر سوتے تھے اعظم کے سر پر چہرے پر نظر پڑی تو اس اداسی میں حیرت افزا ہوا گیا۔
 "مسلم نہیں میں نہیں ایک محفوظ اور پرسکون زندگی دے بھی پاؤں کی یا نہیں۔ موجودہ حالات میں تو مجھے خود اپنی زندگی کا بھی بھروسہ نہیں ہے۔" بچے کو دیکھتے ہوئے ایک حسرت سی جگہ اس کی آنکھوں میں۔ ان حسرت زدہ آنکھوں پر زندگی دیوی کوئی دم آیا اور چپکے سے اسے اپنی صریان آغوش میں لے لیا۔

☆ ☆ ☆
 "سچل کو لیے بغیر میں اس شو کو چھوڑ دوں، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" عالم شاہ اور سرد، سونیا کی ہدایت پر طبع تہل کر کے گھر سے نکل تو پڑے تھے لیکن باہر لگتے ہی عالم نے اپنا لپٹ سناڑ پایا تھا۔

"جیسا آپ کا حکم سامنے آیا، سرد تو قہا ہی حکم کا قلام۔ مجھے یقین ہے کہ یہ میڈم سونیا بھی اس طرح شر چھوڑ کر نہیں جائے گی۔ اسے ہم میں سے کسی کی پرہیزگار نہیں، سناڑ کی پرہیزگار ہے اور سونیا ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ سناڑ کو بے مشکل میں چھوڑ کر چلی جائے۔" سونیا کا سناڑ سے الگ عالم کی نظروں سے چھپا ہوا آئینہ تھا اس لیے اس نے بالکل درست اندازہ لگایا تھا۔

"آپ نے کرنے کا کیا سوچا ہے؟" سرد نے لاکھ گل جانا پایا۔
 "ہم نہیں سمجھیں رک کر سونیا کے باہر نکلنے کا انتظار کریں گے اور پھر اس کا مقابلہ کریں گے۔ وہ چالاک عورت ہے اور اس طرح کے حالات سے نکلنے کا تجربہ رکھتی ہے اس لیے اس کو قہر کرنا ہمارے لیے قاعدہ مند ہوگا۔"

عالم شاہ کا منصوبہ بہت سادہ تھا۔
 "میرے خیال میں ہمیں کسی گاڑی کا بندوبست کرنا ہوگا۔ میڈم سونیا ہوشیار عورت ہے۔ اس کا کسی جیس کی مدد سے مقابلہ کرنا مشکل ہوگا۔ کسی ڈرائیور اس کی ہوشیاری کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ ایک بات طے ہو گئی تو دوسرے پہلوؤں کا جائزہ لیا جائے گا۔
 "مگر تو تم عجیب رہے ہو لیکن گاڑی کا حصول بھی آسان نہیں ہے۔"
 "آسان نہیں تو انکسپان لیزر کی لیے لیا سامی؟"

شہ زور

سرد کا لہجہ سنی خیر ہو گیا۔
 "کیا کرنا چاہتے ہو؟" عالم شاہ نے چمک کر پوچھا۔
 "وہ سناڑ گاڑی دیکھ رہے ہیں آپ؟"
 "وہ جس پر کارڈشٹ پر کسی لکھ کر چکا گیا ہے؟" عالم شاہ نے اس کی نظروں کے مقابلہ میں دیکھا اور غصہ پی چاچی۔
 "بالکل وہی سامی! ام اس گاڑی کو اپنے مقصد کے لیے حاصل کر سکتے ہیں۔ اب آئیے میرے ساتھ۔" سرد نے قدم اٹھائے تو عالم شاہ کو بھی اس کا ساتھ دینا پڑا۔
 "ہاں جی۔" اسپتال تک چلو گئے؟ اور انڈر گاڑی کے پونٹ پر بیٹھا سگریٹ سے شعل کر رہا تھا۔ سرد نے قریب جا کر مقابلہ کیا تو اس کی طرف توجہ ہوا۔
 "بالکل جیسی گے سرا آپ جاتیں کون سے اسپتال جانا ہے؟ یہ جو قریب میں پرائیویٹ اسپتال ہے، اس میں ڈا سرکاری اسپتال؟" اس نے فوراً سگریٹ پیٹ کر جوڑے سے سلا اور خوش اخلاقی سے پوچھا۔
 "سرکاری اسپتال۔"

"عجب ہے، اے چلوں گا مگر تین سو روپے چارج کروں گا۔" اس نے صاف بات کی۔
 "عجب ہے بھائی! ہم نہیں تین سو روپے دیں گے مگر اب ذرا جلدی کرو۔" سرد نے اسے جواب دیا اور خود ہی کچلی طرف کا دروازہ کھول کر عالم شاہ کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ چند چکر تو خود اس نے ڈرائیور کے ساتھ والی نشست سنبھال لی۔

"لگتا ہے پارٹ ٹائم جاب کے طور پر یہ کام کرتے ہو؟" گاڑی چل پڑی تو سرد نے ٹھنکٹو کا سلسلہ بچھڑا۔
 "آج کل تو کچھ ہی نام جاب ہی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر سناڑ کے کاغذ ہو کر دو مہینے سے جاب نہیں ہوں۔ مینا بھر تو مختلف کمپنیوں میں نوکری کے لیے چکر لگاتے ہوئے بیٹھے ہیں۔ مگر سناڑ پر بھرنیال آیا کہ اگر لے کر لے کر عرصے تک نوکری نہیں ملتی تو بیٹھے ہی قہقہے ہونے کے بعد چھری بیچنے کی نوبت آجائے گی۔ اچھے دنوں میں بچت کر کے یہ چھوٹی سی گاڑی لی گئی۔ بس اسی کو روزی روٹی کا ذریعہ بنانے کا سوچا اور کارڈشٹ پر کسی لکھ کر پیشہ پر چکا دیا۔ اب جاب کے لیے دفتروں کے پکڑ پکڑ لگتا ہوں اور کوئی نہ بھرنیال جاتے تو چار پیسے بھی کالیتا ہوں۔ لاکھ کا احسان ہے کہ نوکری جاتے کے باوجود گھر کا گزارہ چل رہا ہے۔" اس نے سرد کے سوال کا مفصلی جواب دیا۔

"مگر تو یہ جہادی خوش قسمتی ہے کہ جہادی ہم سے ملے گا لہجہ سنی خیر ہو گیا۔
 "کیا کرنا چاہتے ہو؟" عالم شاہ نے چمک کر پوچھا۔
 "وہ سناڑ گاڑی دیکھ رہے ہیں آپ؟"
 "وہ جس پر کارڈشٹ پر کسی لکھ کر چکا گیا ہے؟" عالم شاہ نے اس کی نظروں کے مقابلہ میں دیکھا اور غصہ پی چاچی۔
 "بالکل وہی سامی! ام اس گاڑی کو اپنے مقصد کے لیے حاصل کر سکتے ہیں۔ اب آئیے میرے ساتھ۔" سرد نے قدم اٹھائے تو عالم شاہ کو بھی اس کا ساتھ دینا پڑا۔
 "ہاں جی۔" اسپتال تک چلو گئے؟ اور انڈر گاڑی کے پونٹ پر بیٹھا سگریٹ سے شعل کر رہا تھا۔ سرد نے قریب جا کر مقابلہ کیا تو اس کی طرف توجہ ہوا۔
 "بالکل جیسی گے سرا آپ جاتیں کون سے اسپتال جانا ہے؟ یہ جو قریب میں پرائیویٹ اسپتال ہے، اس میں ڈا سرکاری اسپتال؟" اس نے فوراً سگریٹ پیٹ کر جوڑے سے سلا اور خوش اخلاقی سے پوچھا۔
 "سرکاری اسپتال۔"

سہنہ زور الجبت 74 اگست 2022

ملقات ہو گئی۔

"کیا مطلب؟ کیا آپ مجھے کہیں جاب دلوانے کے لیے؟" اور انہر اس کی بات سن کر چٹا اور غصہ سا بڑبڑا ہوا۔
 "جواب تو نہیں مگر آج کی خدمت کا اہم سناڑ وہ ہے جسے کہیں کہیں کہیں ہی تکلیف لگاتا ہے۔" "کیسی تکلیف؟" سرد کی بات نے اسے اچھن میں ڈالا۔
 "جس میں اپنے ہاتھ پر بندھا کر گاڑی کے پچھلے حصے میں پڑا رہتا ہوگا۔ ہم جب جہادی گاڑی چھوڑ کر جائیں گے تو ہمیں اتنی رقم دیں گے کہ تم مینا بھر کام کر کے بے مشکل اتنا کما سکو گے۔"

"یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟" اس نے سرد کی باتوں پر لہجہ خیر کر کے اپنی عقلی کا اعجاز کرنا چاہا لیکن اس کی آواز کی لڑائی سے ظاہر تھا کہ وہ غور نہ ہو چکا ہے۔ ہر اس شریف آدمی کی طرح جو کچھ بدی زندگی گزارتا ہے اسے حال سے مطمئن ہوتا ہے اور زندگی کے کسی موڑ پر اگر کوئی خیر معمولی صورت حال پیش آجائے تو گھبرا جاتا ہے۔

"ہم جیسی باتیں کر رہے ہیں، ہم اس پڑیشن میں جہیں ہو کر ہمیں انکار کر سکتے۔" سرد نے انہار پر انور نکال کر اس کے زانو سے چھوئے ہوئے اسے بار بار دیا۔

"یہ کیا ہے؟" وہ چھوڑا مگر کیا۔
 "یہ وہ ہے جس وقت تک بے ضرر رہتا ہے جب تک بات مانی جاتی رہے۔ نافرمانی کی صورت میں یہ آتی ہو جاتا ہے۔" سرد نے اس بارے میں آگے بڑھ کر دیا۔

"میں جہادی ہر بات مالوں گا بس اسے دور کرو۔"

اس چارے کی جگہ بندھ گئی۔
 "گاڑی کو سناڑ میں روک لو اور اگر کچھ بھی سیٹ پر چلے جاو۔ خبردار اچھا لگنے کی کوشش مت کرنا۔ میرا نشانہ بہت اچھا ہے۔ میں نہیں بیٹھے جہادی کھوپڑی بھی اڑا سکتا ہوں۔" سرد اس کے خوف کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کو ڈرا ڈرا کر اپنی ہر بات سناڑ ہوا تھا۔

"تم گاڑی چلاؤ۔ اسے میں ونڈل کر لوں گا۔" اور انہر اتر کر کچلی نشست پر چلا گیا تو عالم شاہ نے سرد کو تاکید کی۔ سرد اور مینا بھر ایک بھر عالم کی بات مان لی۔ تھوڑی دیر نہیں ہی وہ اتنی دور نکل آئے تھے کہ سونیا کی گھرائی ممکن نہیں رہی تھی۔ اگر سرد دیر ہو جاتی تو اسی وقت کہ سونیا نکل جائے گی اور انہیں خبر نہیں ہو سکے گی۔ اس نے گاڑی موڑ کر اداسی کی راہ اختیار کی تو عالم شاہ اپنی کارروائی شروع کر چکا تھا۔ اس نے ڈرائیور کی جیس اترا و

سہنہ زور الجبت 74 اگست 2022

کر اسی سے بیٹیاں بچاؤنے کے کام کا آغاز کر دیا تھا۔
اب وہ غریب قبیلہ پر بیان پہنچا رہی تھیں کہ اپنے انھوں
سے گلوں میں تبدیلی کر رہا تھا۔
"یقیناً کروڑوں آدمی بڑے لوگ نہیں ہیں۔ بس
ہماری تھوڑی سی بھجوری ہے۔ جس میں جو تکلیف پہنچ رہی ہے،
اس کی ہم پوری پوری اجرت دیں گے۔" اس نے سونیا سے
لئے والی لوگوں کی گڈی ڈرائیور کی گود میں رکھ دی۔ یکسوشت
اتنی ساری رقم دیکھ کر پہلے اس کی آنکھیں پٹی رہ گئیں پھر
رضا کا رانہ طور پر خود کو بندھانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس
کے ہاتھ بندھنے کے ساتھ ساتھ عالم نے اس کے سر
میں بھی کپڑے کا کولہ غونسا اور پھر اسے شست سے نیچے
لڑھکایا۔ جتنی دیر میں یہ کام فٹا، وہ انہیں باہر مالتے میں
پہنچ چکے تھے جہاں ایک گھر میں سونیا موجود تھی۔
"ڈرار اڈنہ مار کر دیکھ لو کہ وہ لوگ نکلے تو نہیں۔"
اگرچہ انہیں ڈرائیور کو قابو کر کے گاڑی حاصل کرنے میں
بہت زیادہ وقت نہیں لگا تھا مگر یہی عالم تھا کہ چنانچہ اپنی
تکلی کر کے۔ اس کی خواہش پر سرمد نے گلی کا ایک چکر لگا دیا۔
جنگلی کی گاڑی موجود تھی اس لیے اطمینان ہو گیا کہ وہ لوگ
ابھی موجود ہیں۔ وہ ایک مناسب جگہ پر کھڑک کر انتظار کرنے
لگے۔ اس بار انتظار زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا۔ انہوں نے
سونیا کو بدلے ہوئے طے میں جنگلی کے ساتھ جاتے ہوئے
دیکھا اور احتیاط سے ان کی گاڑی کا تعاقب شروع کر دیا۔
درستی حاصل زیادہ رکھنے کے باعث تھوڑی سی تھوڑی تھوڑی
کرکٹیں وہ لوگ ہاتھ سے ہی نہ نکل جائیں لیکن خود کو پوشیدہ
رکھنے کے لیے یہ احتیاط ضروری تھی۔ خوش قسمتی رہی کہ ان
لوگوں نے سرمد کے لیے زیادہ پر پیچ راتے اختیار نہیں کیے۔
پھر زیادہ پریشانی نہیں ہوئی۔
"دیکھا، میں نے کہا تھا کہ یہ شہر نہیں چھوڑے
گی۔" سونیا اور جنگلی ایک ایوارمنٹ بلڈنگ میں جاتے
ہوئے دکھائی دیے تو عالم شاد ہو گیا۔
"ہائیکل سامیں!" سرمد نے کہا مگر گاڑی سے اترتے
ہوئے بولا۔
"میں ڈراما مٹاتے لے کر آتا ہوں کروڑوں کہاں
غیر رہے ہوتے ہیں۔"
"فیک ہے جاک۔" عالم شاد نے اسے اجازت دی
اور خود ایک سکرین ملگا کر اس کے کئی لپٹے لگے۔ وہ جس جگہ
گاڑی روک کر کھڑے تھے، وہاں سے فوریات کا مرکزی
دروازہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ پھر وہیں صحت انتظار

کی کوفت اٹھانے کے بعد اسے سرمد واپس آتا دکھائی دیا۔
"سب معلوم کر کے آیا ہوں سامیں اور ساتھ ہی ان
کے سامنے والے قبیلہ میں جگہ بھی حاصل کر لی ہے۔" وہ
اپنی کار کو کی پر غرض تھا۔
"یہ تو زبردست کام ہو گیا پر تم نے کیا کیسے؟" عالم
شاد نے بھی خوشی کا مظاہرہ کیا۔
"تھوڑے ٹوٹ خرچ کیے تو چکر دار قابو میں آ گیا
اور ساری مشکلیں آسان کر دیں۔" اس نے دانت لٹائے
ہوئے بتایا۔
"کام تو تم نے اچھا کیا ہے لیکن اس کا کیا کریں
گے؟" عالم نے اپنے قدموں کے قریب پڑے جوتے
ڈرائیور کی طرف اشارہ کیا۔
"اس کو سمجھا دیا کہ اندر اپنے ساتھ لے چلے ہیں۔
اگر بڑی خوشی کی تو گوئی باریں گے۔" سرمد نے دائرہ
آخری الفاظ تیر آواز میں ادا کیے۔
"سن لی تم نے۔ اب بتاؤ کیا ارادہ ہے؟" عالم شاد
جبکہ قدموں میں بڑے ڈرائیور سے مخاطب ہوا۔ اس
نے جلدی جلدی سر ملاتے ہوئے اپنی رضامندی کا عندیہ
دیا۔ عالم شاد نے اس کی بندھن کھول کر منہ میں غونسا کپڑا
بھی ڈال دیا۔ وہ لمبی لمبی سانس لیتا ہوا اٹھ بیٹھا۔
"شرٹ تو ہے نہیں اس کے پاس۔ صرف بیٹیاں پہنے
ہوئے ہے۔"
"گوئی مسئلہ نہیں ہے سامیں۔ اس بلڈنگ میں زیادہ
تر حذرور پیشہ لوگ رہ رہے ہیں اور وہ ہر طرح کے میٹھے میٹھا
گھوڑے بھرتے ہیں۔" سرمد نے اسے تسلی دی تو وہ لوگ
بلڈنگ کی طرف چل پڑے۔ سرمد چانی پہلے ہی حاصل
کر چکا تھا چنانچہ وہ لوگ سیدھے ایوارمنٹ میں پہنچ گئے۔
قد سے میلا اور بے سرو سامان ایوارمنٹ قابلین باہر گاڑی
میں رات گزارنے کے مقابلے میں بہتر تھا۔
"میں کچھ کھانے پینے کے لیے آتا ہوں۔"
سرمد انہیں چھوڑ کر باہر نکل گیا۔
"آپ لوگ کون ہیں؟" خاموشی سے ایک کونے
میں بیٹھا ڈرائیور نے ہت کر کے عالم سے پوچھا۔
"ہم جو بھی ہیں، تم یہ بھروسہ کرنا کہ جب تک تم
ہمارے لیے خطرہ نہیں بنو گے، ہماری ذات سے تمہیں کوئی
تقصان نہیں پہنچے گا۔ دم میں نہیں دے چکا ہوں۔ رات بھر
کی کوفت یہ سوچ کر برداشت کر لو کہ تمہیں اسی کوفت کا
مناظرہ دیا گیا ہے۔" عالم نے سنجیدگی سے اس کے سوال کا

جواب دیا۔ "مسی رات کی دشمنی کا معاملہ ہے۔ ویسے دیکھتے میں
"شاہد کسی رات کی دشمنی کا معاملہ ہے۔ ویسے دیکھتے میں
جو آپ لوگ مجھے جراتم پیشہ نہیں لگتے۔" ڈرائیور نے اعزازہ
کا جیس کی قسم دینی یا تردید کی عالم شاد نے ضرورت نہ
سمجھی۔ اسی وقت اسے باہر کچھ کھٹ پٹ سنائی دی تو تیزی
سے اٹھ کر دروازے تک گیا اور ڈور آلی سے باہر نکلا۔
اسے جنگلی ایوارمنٹ سے نکل کر بیڑیوں کی طرف جاتا ہوا
دکھائی دیا۔
"کیا مجھے اس کے پیچھے جانا چاہیے؟" اس نے ایک
لے کے لیے سوچا لیکن پھر واپس مڑ گیا۔ وہ ڈرائیور کو کہاں
ایکلا چھوڑ کر نہیں جاسکتا تھا اور سب سے بڑا اطمینان یہ تھا کہ
سونیا ابھی موجود تھی۔
"شاہد جنگلی بھی سرمد کی طرح ضرورت کا سامنا کرنے
لیے گیا ہو۔" اس نے اعزازہ لگا دیا اور سکون سے بیٹھ گیا لیکن اس
بار اس نے دروازے کا پتہ خود اس کا کھلا چھوڑ دیا تھا تاکہ
سامنے والوں کی نقل و حرکت پر نظر رکھ سکے۔ کافی دیر اسی طرح
مکڑ مچی۔ اس کی ایک آنکھ ڈرائیور پر مچی تو دوسری دروازے
سے باہر۔ ڈرائیور تو بالآخر اس کی کڑمیں پر ہی لیٹا اور سو گیا
لیکن اس کی بے چینی بڑھ رہی تھی۔ لے کے ساتھ بڑھتی چلی
گئی۔ سرمد گئے کافی وقت گزر چکا تھا اور ظاہر ہے انتظار زیادہ
وقت صرف کھانا لانے میں نہیں لگ سکتا تھا۔ دوا دھر سے اصر
فہم اس کا انتظار کرنے لگا۔ اتفاق سے جنگلی بھی واپس نہیں آیا
تھا۔ ایک ایسے لمحے پر جب اس کی پریشانی اپنے عروج پر پہنچی
تھی، اس نے جنگلی کو واپس آتا ہوا دیکھا۔ اس کے دونوں
ہاتھوں میں سامان کے قبیلے تھے جس سے ظاہر ہوا تھا کہ وہ
خاصی خبر بھاری کر کے واپس آیا ہے۔
"لیکن سرمد کہاں رہ گیا؟ وہ تو صرف کھانا لینے گیا
تھا۔ اب مجھے مزید انتظار میں وقت ضائع کرنے کے بجائے
باہر نکل کر دیکھنا چاہیے۔" اب اس میں مزید صبر کا پار نہیں
رہا تھا اور سونے ہوئے ڈرائیور کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا
کہ جاننے سے پہلے ایک بار پھر اسے باغی بننے کا انتظام کرنا
ہوگا۔ ابھی وہ اپنی اس سوچ کو مکمل جامد نہیں پہنچا تھا کہ
سرمد چلا آیا۔
"کہاں وہ مجھے گئے تھے؟ کچھ اعزازہ بھی ہے کہ میں
تمہارے لیے کتنا پریشان تھا؟" اس کی شکل دیکھتے ہی وہ
اس پر برس پڑا۔
"معافی چاہتا ہوں سامیں!" سرمد نے فوراً ہی اس
کے آگے ہاتھ جوڑ دیے اور پھر وضاحت دیتے ہوئے بولا۔

"میں کھانے کے کراہیں آ رہا تھا تو جنگلی کو گاڑی میں
بیٹھ کر جاتا ہوا دیکھا۔ میں بھی اس کے پیچھے لگ گیا۔" اس
نے عالم شاد کو ساری تفصیل سنائی کہ جنگلی کہاں گیا تھا
اور کہاں گیا غریب اداری کر کے واپس لوٹا ہے۔ غریب اداری کی
تفصیل کے ساتھ اس نے بھی ساہجہ ہائیں گاہ پر چمکیں کے
ریڑی کی اطلاع دی۔
"جنگلی کو دیکھتے ہوئے میں نے بھی کچھ غریب اداری کی
ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ میڈم سونیا کے پیچھے جانے کے لیے نہیں
جنگلی کچھ اس بھی ہی تیار کی ضرورت ہوگی۔" اس نے اپنا
کارنامہ بتایا اور اپنی غریبی کی ہولی اشیائے سے دکھائے لگا۔
"تم تو بہت کچھ دار ہو گئے ہو یا؟" سب چیزیں
دیکھ کر عالم نے اسے سراہا۔
"سب آپ کی محبت کا کمال ہے سامیں!" سرمد کی
دق دار سی اسے کوئی گریٹ کہاں لینے دیتی تھی۔
"نہیں یا راجا یہ ہے کہ تم میری محبت میں اس لیے
ہو کہ باکمال آدمی ہو۔ تم اسے باکمال نہ ہوتے تو میں نہیں
یوں اپنی ناک کا پال بکرا کر اپنے ساتھ کیوں رکھتا؟" عالم شاد
نے مکمل کر اس کی تعریف کی۔
"مہربانی سامیں!" سرمد تعریف سن کر مجھپ کر گیا۔
"چلو آؤ، اب کھانا کھا لیتے ہیں پھر باقی کی تیاری
کریں گے۔ کچھ معلوم نہیں کہ کب روانہ ہونا پڑ جائے۔"
"تمی سامیں!" سرمد جلدی سے کھانے کے سامان
والا تھپکا کھولنے لگا۔
"اس غریب کو بھی بچا دیتا ہوں۔ ہمارے چکر میں یہ
بھچارہ خود بھی خوار ہوتا پھر رہا ہے۔" عالم شاد ڈرائیور کو
آواز میں دیتے لگا۔ دو تین آوازیں دیتے ہی اس کی آنکھ کھلی۔
"واہ بھئی۔ تم ایسے حالات میں بھی اسے حراسے
اتنی گہری نیند سوتے ہو۔" عالم کو اس پر دھک آیا۔
"کل رات کسی نے انر پورٹ سے مہمان لانے کے
لیے گاڑی کی کراہی ہوئی تھی۔ رات میں بچے کی تلاوت
تھی۔ گھر آ کر سونے تک سناڑے چارہ ہو گئے۔ کچھ ایک جگہ
اعز و ب کے لیے جانا تھا تو اس چکر میں جلدی جاگ گیا۔ اب
یہاں کرنے کو کچھ نہیں تھا تو سوچا اور دوسری نیند پوری کر لوں۔
آپ لوگوں کے بارے میں اتنا تو خواہش ہو گیا ہے کہ
برے لوگ نہیں ہو۔ کم سے کم سوتے تو میری جان بالکل
نہیں لو گے۔" وہ انگریزی لے کر اٹھ بیٹھا اور 10 بجے
خانے میں گھس گیا۔ اس کے منہ ہاتھ دھو کر واپس آنے تک
دو لوگ اس کا انتظار کرتے رہے۔

انتباہ

ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی جانب سے تحبیہ کی جاتی ہے کہ جو ویب سائٹس ہمارے ادارے کا نام لے کر "آفیشل پیج" کی اصطلاح استعمال کر رہی ہیں ان سائٹس سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں، اسے فوری ترک کیا جائے تاکہ ہمارے معزز قارئین کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ ایسی تمام ویب سائٹس اور سوشل میڈیا گروپس کو مرتب کرنے والے منتظمین جو اپنے سطحی مفادات کی خاطر ادارے سے شائع ہونے والے مباحثوں کے مضامین، افسانے اور کہانیاں بلا اختیار اور غیر قانونی طور پر آپ لوڈ کر کے ادارے کو عین مالی نقصان پہنچانے کے ساتھ ادارے کی ساکھ متاثر کر رہے ہیں، انہیں خبردار کیا جاتا ہے کہ اس سطحی فعل کو فوری ترک کر دیں، بصورت دیگر ادارہ، سائبر کریمز کے قانون

PREVENTION OF ELECTRONIC CRIMES ACT 2016

اقد

COPYRIGHT ORDINANCE 1962/2000

کے تحت کسی بھی قسم کی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔ ایف آئی اے اور دیگر متعلقہ اداروں میں بھی ان افراد/اداروں کے خلاف شکایات درج کرائی جائیں گی۔

جاسوسی ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیروز ٹیکسٹس ہاؤسنگ اتھارٹی مین گورنگی روڈ، کراچی

فون: 35804200-35804300

مکمل آرام کا وقت ضرور دیا گیا۔ ہاں جب صبح سویرا کے قریب میں جگہ کے آگاہ محسوس ہوئے تو وہ دونوں تھوڑی تھوڑی نیند لے کر قدرے تازہ دم ہو چکے تھے۔

"میرے خیال میں یہاں بیٹھے رہنے کے بجائے باہر چل کر انکھار کرتے ہیں۔ یہ تو بے گھر دوڑا رہے ہیں۔ یہ بھی نہیں رہے گی اور باہر نکل کر کچھ نہ کرے گی۔" باہمی مشورے کے بعد وہ دونوں باہر نکل گئے۔ ڈرامہ راز کوئی نیند سو رہا تھا۔ رقم وہ پہلے ہی اس کے حوالے کر چکے تھے جائگے کے بعد اب یہ اس کی مرضی پر منحصر تھا کہ خاموشی سے اپنی راہ لیتا یا اپنے ساتھ جی کو جھوم جگہ کے ساتھ۔

وہ دونوں عمارت سے باہر آئے اور سب سے پہلے دروازہ کھولا پھرے کے درم میں ڈالاجس میں ان کے اشارے ہوئے پکڑے، جوئے اور رات کے کھانے کے باکسز دیکھ کر موجود تھے۔ اس کام سے قانع ہو کر وہ اپارٹمنٹ بلڈنگ کے مین سامنے موجود چمچہ ہوٹل میں جا بیٹھے۔ یہاں وہ ٹاک کرنے کے ساتھ ساتھ عمارت کے خارجی راستے پر بھی نظر رکھ سکتے تھے۔ اپنے جیلے کی متابعت سے ابھی وہ چائے پرائے پر مشتمل سادہ سا ناشتا کر کے فارغ ہی ہوئے تھے کہ عمارت سے ایک سسر جلد ہلنے لگا۔

"یہ سونا ہے۔" علی سسر جلد ہلنے کے بعد وہ سسر نے اسے پہچان کر عالم کے کان میں سرگوشی کی۔ اس نے سونا کو اس کے لباس اور چھاپڑی کی وجہ سے شناخت کیا تھا۔ یہ چیزیں کل بچپن میں اس کے سامنے ہی خریدی تھیں۔

ان کے دیکھنے ہی دیکھتے وہ سسر کے اسٹاپ پر آکر کھڑی ہوئی اور اس جانب دیکھنے لگی جہاں سے بیس آ رہی تھیں۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور جلدی سے مل ادا کر کے ہوٹل سے باہر نکلے۔ اسی وقت ایک بس اسٹاپ پر آکر رکی اور سونا اس میں سوار ہونے لگی۔ وہ

دونوں بھی بھاگ کر بچھلے دروازے سے بس میں سوار ہو گئے۔ دونوں نے بیٹھے کے لیے الگ الگ سیٹیں منتخب کی تھیں اور خیال رکھا تھا کہ ایسے زاویے سے بیٹھیں کہ سونا کی آن پر نظر نہ پڑ سکے۔ بسی لیے روٹ کی تھی۔ راستے میں کئی مسافر اترے اور کئی نئے مسافر چڑھے۔ وہ پہلے ہی احتیاطاً آخری اسٹاپ کا کٹ لے چکے تھے اس لیے آرام سے بیٹھے رہے۔ اللہ اللہ کہ یہ طویل سفر ختم ہوا اور سونا ایک اسٹاپ پر اترتی۔ وہ دونوں راستہ اپنی نشستوں پر بیٹھے رہے کہ اس اسٹاپ پر اترنے والی سونا واہ فرود تھی اور وہ اس کے ساتھ اتر کر اس کی توجہ اپنی طرف مبذول نہیں کروانا چاہتے تھے۔

"ادامی، چرا گیا۔ بڑے دونوں بعد انا اچھا کھانا کھانے کو لانا۔" وہ اپنے لیے لایا گیا دیکھی بیکل بیڑا دیکھ کر خوش ہو گیا۔ بیڈ بھر کر بیڑا کھانے اور مشروبات پینے کے بعد ڈرامہ راز دوبارہ سونے کے لیے لیٹ گیا اور جلد ہی گرائے لیٹے گا۔

"نیکے کوڑیہ سمیت میں پھنسا ہوا ہے لیکن کچھ چھو تو مجھے اس پر رکھ آ رہا ہے۔" عالم نے اسے پوچھ کر ہی نیند سوتے دیکھا تو بول پڑا۔

"اس کے لیے اس پر سکون نیند کا انتظام میں نے کیا ہے سائیں۔ یہ گہری نیند سوتا رہے گا تو سیکس بھی بے گہری رہے گی۔" سمر نے سچی فیزی سے مسکراتے ہوئے اسے آگاہ کیا۔

"مطلب تم نے..."

"جی سائیں مطلب یہ کہ میں نے اس کے کھانے میں تھوڑی سی نیند کی دوا ملا دی تھی تاکہ ہم مکمل کر اپنا کام کر سکیں۔" سمر نے اسے جواب دیا اور پھر حرکت میں آ گیا۔ جیلوں سے اس نے اپنے اور عالم کے لیے پرانے اور شیعہ لباس پر آمد کیے۔ لباس کے ساتھ ہی بھار پرانے دیکھنے والے لیکن مضبوط جوتے بھی تھے۔ لڈے میں بہت سا مال ایسا بکنا ہے جسے امر اول بھر جانے پر نکال بیٹھتے

ہیں اور خواہ اس میں سے اپنی ضرورت کے حساب سے بہترین چن کر کام چلا لیتے ہیں۔ سمر جو جوتے لایا تھا اگر انہیں دھو کر صاف سٹرا کر لیا جا تو وہ اتنے بڑے نہیں لگتے جتنے اس وقت لگ رہے تھے۔ بہر حال انہیں تو اپنے بہرہ پر کو حقیقت سے قریب تر رکھنے کے لیے ایسے ہی بدو بیج جوتے اور لباس دیکھ رہے تھے۔ ان دونوں اشیا کی تبدیلیاں کے ساتھ انہوں نے اپنے حلیوں میں مزید کچھ تبدیلیاں کیں۔ سبک اپ کے فن میں دونوں میں سے کسی کو

مبادرت حاصل نہیں تھی اس لیے یہ تبدیلیاں معمولی نوعیت کی تھیں۔ دونوں نے اپنے سروں میں خوب سارا سرسوں کا تیل ڈال کر بالوں کو کچ کی مانگ لٹائی کہ ابھی طرح جانے کے ساتھ ساتھ آنکھوں میں بھر بھر کر سرمہ بھی ڈال لیا تھا۔

سومچوں کو بھی خوب تیل پلا کر تیل ڈال لیے گئے تھے۔ گئے کے لیے کچھ سکون وغیرہ کا بھی انتظام تھا۔ بھولی طور پر ان کی شخصیت اب اس سے خاصی مختلف ہو چکی تھی جس جیلے میں

دوسرا سے جدا ہونے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ سرسری نظر میں انہیں شناخت نہیں کیا جائے گا۔ حلیوں کی تبدیلی سے مطمئن ہونے کے بعد وہ

اس کے تڑپنے کے بعد میں پلٹ کر ایک منہ بند عری مرد لپک کر دروازے تک پہنچا اور آواز لگائی۔
 "خود آکر دروازہ کھولو۔"
 "آپ کی بات پر کیا؟" وہ چلا گیا۔
 "اگر سے گھر پر ہے گا استاد" اس نے دانت لٹائے ہوئے جواب دیا۔ اسی اثنا میں عالم شاہ کی نشست چھوڑ کر پچھلے دروازے پر جا کھڑا ہوا اور بس روکنے کے لیے دروازے پر زور سے ہاتھ مارا۔ دروازے نے تقابلی لٹا دیا ہاری ہاری آوازوں کو دیکھا اور مدتی مدتی میں بڑبڑاتے ہوئے جس دروک دلی۔
 "میں آئے جا رہا ہوں سامی! آپ میرے پیچھے تھوڑے قافلے سے آنا۔" سرور نے لباس کی جیب میں ہاتھ ڈال کر کچے پائروں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور انہیں گھسے میں ڈال لیا۔ لباس تو اس کا قاضی سپرد اور ہرگز وہ نہ۔ گھسے میں کھڑے الٹے سے وہ اچھا سا نظیر لگتے لگا۔ اپنے اسی نظیرانہ چہرے میں وہ تیز تر چلا اس اسٹاپ کی طرف پلٹا جہاں سونا بازی تھی۔ اسٹاپ پر تو اسے سونا نہیں دکھائی دی لیکن یہ اعجاز ہو گیا کہ وہ کس راستے سے گزری ہوئی۔ وہ خود بھی اس راستے سے گزرتا ہوا جیسی میں داخل ہو گیا۔ وہ چار گایاں گھونٹنے کے بعد اسے سونا دکھائی دے گئی۔ وہ کسی گھنٹے میں وہاں دے بغیر دور دور سے اس پر نظر رکھتا رہا۔ عالم شاہ کی جیب میں آدھا کھی اسے علم ہو گیا لیکن دانت اس کے کرب نہیں گیا۔
 شاموٹا ہی ہے کے سونا کی چھائی میں سے گیند چرانے اور سونا کے اسے پکڑ کر اس کے کمر تک لے جانے کا مہر اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ سونا جو کچھ کر رہی تھی، وہ کچھ تو نہیں آ رہا تھا لیکن یہ واضح تھا کہ اس کا اصل مقصد سوا تک رسائی ہے اس لیے پوری دیکھی اور احتیاط سے اس کے پیچھے تھا۔ پہلے اس کا اعجاز تھا کہ سونا اس مگر سے کچھ مطلوبات کے حصول کے بعد باہر نکل آئے کی لیکن جب بہت دیر تک وہ باہر نہ نکلے تو اسے بے چینی ہو گئی۔ اس نے وقفے وقفے سے جیک کے لیے ہانک لگانے کا سلسلہ چھوڑا اور اس میں پوری توجہ مرکوز کر کے درخت کے نیچے ہر چہارہ کر دیا گیا۔ کچھ وقت مزید گزرا تو اس نے چہرہ کر کے والے نیچے کو پڑتے ہوئے دیکھا۔
 "آپ ایک ہاتھ میں پلاسٹک کی دھن گیند اور دوسرے میں مٹی سے بنا طوطا تھا۔"
 "شامو۔۔۔ اب تیرے پاس کہاں سے آیا؟" اس نے پوچھا۔
 "میں نے دیکھا ہے اس کے ہاتھ میں کھلنے دیکھ کر اس

کی طرف لپکے آئے۔
 "میری نے مجھے قلعے میں دیے تھے۔" اس نے پوچھا۔
 "آپ کو اسے خود ڈالنا کر اپنے ہم جولیوں کا اطلاع دی۔"
 "وہ اس کھلنے والی ہے؟ وہ تو مجھے تیری ماں سے مار کھلوانے کی تھی۔" بچوں کے لیے وہ اطلاع حیران کن تھی۔
 "ہاں، پر اس نے مجھے شکر دیا اور ماں نے اس کو اپنی دیکھی بنا لیا۔" اس نے کھلوں کو اپنے ساتھیوں کے سامنے لہراتے چلتے ہوئے بتایا۔
 "اچھا، جب ہی وہ انکی دیر سے تیرے مگر میں جی بیٹھی ہے۔"
 "ہاں تو پھر کیا۔" اس نے اسے کھانے پر روک لیا ہے۔ اب وہ کھانا کھا کر ہی ہمارے مگر سے جائے گی۔"
 "آپ کیجیے۔" بچے، جنہوں نے اپنی زمین کی میں شاید صرف عمر دیاں ہی دیکھی تھیں، اس کے ہاتھ میں موجود کھلوں کو لپکائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے لیکن شامو نے ان کی غراہی روک دی اور بولا۔
 "ابھی میرا کھینے کو سن نہیں ہے۔ میں اپنے کھلنے پائی کو دکھانے لے جا رہا ہوں۔" وہ وہاں سے بھاگ گیا اور دوسرے بچے کی منہ بناتے ہوئے ادھر ادھر ہو گئے۔ سرور کے پاس انتظار کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ اپنی جگہ بیٹھا اور ادھر دیکھتا رہا۔ وہ قہر کے سہروپ میں تھا لیکن اس غربت کی بنا سے بچے زبردستی گزارنے والے بستی کے پاس اسے جیک کہاں سے دیتے۔ اسے کچھ نہ سوجھا تو منہ سر پھین کر اسی درخت کے نیچے لیٹ گیا اور مدتی مدتی آنکھوں سے گھرائی کرنے لگا۔
 ادھر عالم شاہ ایک پریشان حال شخص کا کردار نبھاتا جیسی میں کوئی خالی جگہ تلاش کر رہا تھا۔ اس کی کہانی یہ تھی کہ وہ جس کھولی میں رہتا تھا، اسے ایک خالی کردار تھا اور اس کے پاس گھاس نہیں تھی کہ وہ زیادہ کرائے پر دوسری کھولی حاصل کر سکتے اس لیے اس بستی میں ٹھکانا پھر رہا تھا کہ اپنی گھاس کے مطابق کوئی جگہ کرائے پر حاصل کر سکے۔ ایک دو لوگوں سے پوچھنے پر اسے انکار سننے کو ملا۔ اسے کون سا جگہ کرائے پر چاہیے تھی کہ انکار سن کر پریشان ہوتا۔ اسے تو بس سونا پر نظر رکھنے کے لیے بستی میں اپنی موجودگی کا جواز چاہیے تھا لیکن پھر ایک جگہ وہ نہیں گیا۔ اسے بتایا گیا کہ ایک خالی خالی ہے لیکن وہاں بھی گاؤں کی بندوبست نہیں۔
 "بنا جلی کے میں کیسے رہوں؟" اس نے پوچھا۔
 "میرا جگہ کی گال کا جواز بنا چکا۔"
 سہنس ڈالجت 76 اگست 2022

شہزاد

"چنانچہ کر پار میں اپنے ہاں سے ایک تاروے روں گا۔ رات کو سوتے سے چھٹا چلا کر دن کو تو مریے گی اپنے کام دھندے پر رہو گے۔" خالی جگہ کی اطلاع دینے والے نے اس کا یہ مسئلہ بھی حل کر دیا۔ پہلے اس نے سوچا کہ مزید کوئی بھانہ بنا کر انکار کرے پھر خیال آیا کہ اگر کچھ دلم خرچ کر کے سکون سے بیٹھ کر کھانا کھال رہا ہے تو حاصل کر لیا جائے۔ اس طرح کم از کم ادھر ادھر بھٹکتے سے توجہ جانے گا۔
 "جیک ہے پھر جی دیکھاؤ۔ میں خود آؤں اور اس دے کر قبضہ لے لیتا ہوں۔" پانی رقم اپنا سامان ادھر لائیں گا، جب دوں گا۔" اس نے شرط دیکھی جسے خود ہی سی بحث کے بعد قبول کر لیا گیا۔ ابھی بات یہ تھی کہ جگہ کی اس مکان سے زیادہ دور نہیں تھی جہاں سونا بھی بیٹھی تھی۔ جگہ کے دروازے سے جھانک کر بھی اس مکان کی گھرائی کی جاسکتی تھی۔ بس اب اسے گھر اس بات کی جگہ کی توقع لے کر دوسرے کو بھی در پر بھٹکتے سے بھا کر وہاں بلائے۔ یہ موقع اس نے اس طرح نکالا کہ جگہ کی منطالی کے بھانے وہاں موجود کچھ کھرا دکھایا اور اسے بھٹکتے سے بھانے اس درخت تک گیا جس کے نیچے کچھ لٹا سونے کی اداکاری کر رہا تھا۔
 "میں نے وہ طیلے دروازے والی جگہ کرائے پر لے لی ہے۔ جب موقع ملے پھر بھا کر وہاں آ جانا۔" کچھ سے کا خیمہ کھینچے ہوئے اس نے سر کوئی کی اور خود وہاں جگہ میں آ گیا۔ سرور باہر گرانی کے لیے موجود تھا اس لیے فی الحال اسے ذمہ کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے ادھر دیکھ کر پورا کرنے کا فیصلہ کیا اور فرش پر ہی لیٹ گیا۔ صدقات شادا اپنے اگلوتے بیٹے کو اس حالت میں دیکھ لیتے تو تپ اٹھتے۔ وہ جو ان کی وسیع جائیداد کا وارث تھا، دھول مٹی سے اسے فرش پر پناہ ستر کے ایک ایسی جگہ میں سوراہا تھا جہاں زمین کی کی بنیادی سہولیات بھی دستیاب نہیں۔
 ☆☆☆
 "تم کو ان لوگوں کے بارے میں کیا اعجاز ہوا؟
 کچھ بتا چلا کہ کون تھے وہ لوگ؟" سونا نے اپنی دھوکوں کو سنبھال کر سرسوتی سے سرسری لہجے میں پوچھا۔
 "میں کیا اعجاز لگا؟" بس حیران ہوئی رہی کہ ایسے لوگ ہاتھ کے تلے بیٹنے والوں میں کہاں سے آئے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں پتھر بھی دیکھا تھا میں نے لیکن اصل بات جب سمجھ آئی جب جس آٹھ وادیوں کی تلاش میں بستی میں آئی۔
 "پھر تو نہیں کو بتایا اس بارے میں؟"
 سہنس ڈالجت 77 اگست 2022

بھی اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئی۔
 "دو کا ہے کوئی بھی نہ ہو سکتا اور کئی کے سہولتے۔
 ان کے بچوں کے پاس تو بڑے بچے ہیگے سہولتے ہیں۔
 زیادہ تر تو ہمارے گھروں سے آئے ہوتے ہیں۔" سروسٹی
 اس کی بات سن کر ہنس کر بولی اور اپنے مالکان کی شان
 بنانے لگی۔

"کسی چارترس کما کر لے لیں یا پھر ایسے ہی کچھ دے
 دلا دیں۔ مجھے تو پتا ہے آج میرا خدا نہیں ہوا۔ چار پچھل
 گئے تو میرا بھلا ہو جائے گا۔"

"تم نے کوئی سہولت لے کر نہیں لے کر میرے ساتھ پر پہلے
 ہی بتا دوں گے کہ ان بڑے لوگوں کا کچھ چاہیے ہوتا۔ سوڈ
 ہو اور بھولی بھر دیتے ہیں اور نہ گالی اور دھکے دے کر نکال
 دیتے ہیں۔" سروسٹی کو تجربہ تھا وہ بچے کھڑوں کے لوگوں
 کے درویشوں کا اس لیے دلی سے اسے اپنے ساتھ لے
 چلنے کی پالی بھری۔ سوڈا کو بھی بھلا کر لیا اور پتا تھا ان لوگوں
 کے درویشوں سے۔ دو تو اس میں ملائے میں کافی کراں ہنگے
 تھے۔ رسائی حاصل کرنا چاہتی تھی جہاں انوکھ کام کرتا تھا۔
 "میں تجھے اپنے ساتھ ہنگے میں لے کر کھینچ جاؤں
 گی۔ میرے اندر جانے کے کوڑی دیر بعد خود کوئی بھی
 لیتا۔ میں ساتھ لے کر گئی تو وہی مجھ پر تھا ہو گئی۔" سروسٹی
 کے اپنے ٹھکانے تھے چنانچہ راستہ چلتے چلتے اس نے سوڈا
 پر آگے کی صورت حال بھی دیکھ کر راج کر رہی تھی۔

"تو چنانچہ نہ کر۔ میں کوئی کچھ نہیں لیتے دوں گی کہ میں
 تجربے ساتھ آئی ہوں۔" سوڈا نے اسے دلی اور رازدار کرنا
 چاہا کہ لیا۔ کافی پیچھے اسے ایک فقیر آتا ہوا دکھائی دیا۔ بھری
 دوپہر میں ان دونوں کے علاوہ صرف وہی تھا جو بنگلوں کی
 طرف جانے والے بے سایہ دروازے پر چلا جا رہا تھا۔ شاید
 اسے بھی ان بڑے لوگوں سے کچھ نہ جانے کی امید تھی۔

"جس ہنگے پر تو سویرے کام پر آئی ہے، وہ کون سا
 ہے؟" کافی قاصد ملے کرنے کے بعد جب وہ دونوں اس
 مقام پر پہنچیں جہاں سے بنگلوں کا آغاز ہوا تھا تو سوڈا نے
 سروسٹی سے پوچھا۔

"آگے چل کر آئے گا وہ بنگلا۔" سروسٹی نے اسے
 جواب دیا تو وہ "اچھا" کہہ کر اس کے ساتھ آگے بڑھتی چلی
 گئی۔ ان کے پیچھے آئے والا فقیر بھی بنگلوں کی قطاروں کے
 درمیان چلتی چلا تھا اور کھیتیاں بھا کر بھیک کے لیے صدا
 لگا رہا تھا۔

"وہ دیکھ، وہ جو کالے گیت اور پلے بھر کی
 سہنڈا لگت 78 اگست 2022

دیواروں والا بنگلا نظر آ رہا ہے، وہاں جاتی ہوں میں
 سویرے کام کرنے۔" کچھ اور آگے بڑھنے کے بعد سروسٹی
 نے ایک اونچی دیواروں والے ہنگے کی طرف اشارہ کرتے
 ہوئے اسے بتایا۔

"ہائے رام۔ یہ تو بہت بڑا ہے۔ تو تو ٹھیک جاتی
 ہو گی اس کی جھانڈو پر کچھ کرتے کرتے۔" اس نے سروسٹی
 سے بھر دہری بتائی۔

"اب تو عادی ہو گئی ہوں۔" سروسٹی نے لاچار سی
 مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

"وہ تیرا بڑی انوکھ ساتھ کے مفید گیت والے
 ہنگے میں کام کرتا ہے؟" اس نے باتوں باتوں میں اہم
 سوال کیا۔

"ہاں، اسی میں کرتا ہے۔ دیکھو حرام خورد نے گیت
 صاف بھی نہیں کیا۔ سارا دھول کٹی میں اٹا ہوا ہے۔" سروسٹی
 نے جواب دینے کے ساتھ ساتھ تھمر بھی کیا۔

"کام پر آیا ہو گا تو مٹائی کرے گا تو ہی تو تیار ہی
 تھی کہ آگے دوایوں کے ساتھ مجھے وہاں دھوا اور باغی۔"
 "بھئی۔ بھولی جاں بات کو۔ اب کسی کے سامنے
 زبان پر نہ لانا۔" اس کے سرگوشی میں کیے گئے تھمرے پر
 بھی سروسٹی بھلا گئی۔

"لے۔ میں نے کس کے سامنے بولنا ہے۔ یہاں
 سے آگے تو اپنے راستے، میں اپنے راستے۔" اس نے منہ
 بنا کر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

"ابا کر تو اپنے دھندے پر جا۔ میں دھلے دوسرے
 بنگلوں پر بھیرا لگا کر اپنا مال بیچنے کی کوشش کرتی ہوں۔ بعد
 میں بھرتی بھرتی تیری دیدی کے ہنگے پر بھی کٹی جاؤں گی۔"
 "ہاں، یہ شک ہے۔ اس طرح وہی دی کو مجھ پر شک
 بھی نہ ہو گا۔" سروسٹی کو اس کی جو بڑا اچھی لگی اور جلدی
 جلدی کچھ انورانی کلمات اور کر کے آگے بڑھ گئی۔ سوڈا اس
 کے نظروں سے اوجھل ہونے تک وہیں کھڑی رہی پھر پلٹ
 کر اس قطار کی طرف واپس آئی جہاں اس کا مطلوبہ بنگلا
 موجود تھا۔ سارا اور سفید گیت والے ساتھ ساتھ موجود دونوں
 بنگلوں میں سے اگرچہ اسے مفید گیت والے ہنگے میں اصل
 دلچسپی تھی لیکن اس وقت وہ سیاہ گیت والے ہنگے کو چاہتی
 ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اسرار کے رہائشی علاقوں کی
 روایت کے مین صفاتی یہاں ویرانی تھی اور کئی اس کی
 حرکات و سکنات کو دیکھنے والا نہیں تھا۔ وہ چاہتی تو دونوں
 بنگلوں میں سے کسی کا بھی گیت بھا کر کام سے امداد سکتی

شہ زور

جی لیکن ابراہم کا اندر کوڑے سے قتل ہی گئی کے کوڑے
 پر اسے کسی کے لباس کی جھک دکھائی دی۔ اس نے اندر
 جانے کا ارادہ ترک کیا اور تیز قدموں سے چلتی ہوئی
 کوڑے تک پہنچی۔

نوسیدہ لباس والا ایک آدمی ایک ہنگے کی اطالی مٹتی
 پر اچھی رکھے کھڑا تھا۔ وہ اپنی جگہ کھڑی اس آدمی کا جائزہ لیتی
 رہی۔ وہ اس کے لمبے جانب قاصد سے کھڑی تھی لیکن وہ
 گردن موڑ کر اس کی جانب دیکھنے کے بجائے سر جھکا کر
 کھڑا تھا اور صرف ایک بار نگاہیں ترمیمی کر کے اس کی جانب
 دیکھا تھا۔

"ہاں بھی کون ہو؟ کیا کام ہے؟" ہنگے کا دروازہ کھلا
 اور طے سے چڑھ کر دیکھنے والے شخص نے باہر جھانک کر
 سخت جھرا لہجے میں پوچھا۔

"کام دھندے کی تلاش میں ہوں۔ کوئی کام مل سکا
 ہے یہاں؟ میں سارے کام کر لیتا ہوں۔ مالی کا، مٹائی
 سترائی کا اور۔۔۔"

"کوئی اور گھر دیکھو بھائی۔ یہاں سارے نوکر
 بھرے ہیں۔" کچھ کھانے اسے پوری بات کرنے کا موقع
 نہیں دیا اور لہجے سے سروسٹی سے جواب دے کر گیت
 زوردار آواز سے بند کر دیا۔ سوڈا باہر کھڑے آدمی کا دھول
 دیکھنے کے لیے مزید وہاں کس کی اور پلٹ کر وہاں کالے
 گیت والے ہنگے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اس پاس کا
 علاقہ اب بھی سناں تھا۔ اس نے اپنے سامان کی چھانڈی
 ہنگے کے گیت کے سامنے رکھی اور خود گیت پر چڑھ کر دوسری
 طرف کود گئی۔ دوسری طرف پہنچنے کے بعد گیت کھولنے اور
 اپنی چھانڈی کو اندر پہنچانے میں اسے زیادہ وقت نہیں نہ
 آئی۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے ہنگے کا جائزہ لیا۔
 پورچ میں کور چڑھی گاڑی کھڑی تھی جو ظاہر کر رہی تھی کہ
 مالکان واپسی گھر میں موجود نہیں ہیں اور ان دونوں بگاڑی کسی
 کے زیر استعمال نہیں ہے۔ سرسبز و شاداب، صاف سحر اور
 خوبصورت چودوں سے نکالان الیت اس تاثر کی گئی کہ ہاتھ۔
 لان کی حالت سے صاف ظاہر تھا کہ اس کی باقاعدگی سے
 دیکھ بھال کی جارہی ہے لیکن لان کے پار کٹی جھے باند
 دروازہ اور ہر طرف چھانچا سکوت اس بات کی تائید کر رہے
 تھے کہ کین موجود نہیں ہیں۔ وہ کچ کچ کر قدم اٹھاتی
 دروازے تک پہنچی۔ بند دروازے کھولنا اس کے لیے کوئی
 مسئلہ نہیں تھا۔ اب بھی اسی ابراہم سے اس نے اپنا ہاتھ
 آگے نہ دیا لیکن بھر پور گیت کی۔ اسے اعزاز ہو گیا تھا کہ

جیسے کا کوئی قاصد نہیں۔ بہتر ہے تم دونوں سامنے
 آ کر مجھ سے بات کرلو۔" اس کی آواز بہت بھرپور تھی لیکن
 اتنی ضرورت تھی کہ وہ دونوں سن لیں۔ انہوں نے من کر دھول
 دینے میں زیادہ دیر نہیں لگائی اور کچھ جھپٹے ہوئے سے اس
 کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔

"اعزاز آج بچہ کرنا کام سے بات کرتے ہیں۔" اس
 نے ایک طرف ہٹے ہوئے انہیں امداد کے لیے کی اجازت دی۔
 "آپ جاتی ہیں کہ ہم آپ کے پیچھے ہیں؟" نوسیدہ
 کپڑوں میں لیڈی عالم نے اس کے متعلق پوچھے ہوئے
 کھانے کے لیے میں پوچھا۔

"میں نے تم لوگوں کو کس میں ہی پولس کر لیا تھا۔ دھن
 ہوتے تو پھٹارے کا بھی انتظام کرتی لیکن سوچ کر پھر
 انداز کرو کہ میری طرح تم بھی اپنے ساتھیوں کی گھر میں ہو

"اس کو چھوڑ دو۔ یہ نادان ہے۔ میں آپ کو اس کا آپاٹے بتاتا ہوں۔ آپ آکر میرے ساتھ۔" اس نے سزا کو بہ اسرار الوب سے دور بنایا۔ لوپ محروب رخسار پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا۔ "میں خود گھر تارہ کیا۔"

☆☆☆

"بچہ! میں اس کا استاد ہوں۔ اس کا نام ہے۔ اس نے گھوڑا کو اپنی خیریت کی اطلاع دیتے ہوئے ایک ٹکڑے کا نام دیا اور پھر چل کر پڑا۔" "نہیں، سڑک کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ آرام سے چلے گئے۔" "توڑی در آرام کروں گا اور پھر حیدر آباد کے لیے کل جاؤں گا۔" "دوسری طرف سے گونے اس کے کوئی سوال کیا تھا جس کے جواب میں اس نے اسے کھلی دیتے ہوئے اپنے اگلے پردہ گرام سے بھی آگاہ کیا اور چھ ایک حریفہ ہاتھ کر کے سلسلہ منقطع کر دیا۔ اب اس کے پاس آرام کرنے اور ایک شخص کی آدھ کا انکار کرنے کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔ آرام دہ کا آج پر نیم روزا وہ یہ دقت بتاتا تھا یہاں آدھ کے بارے میں سوچنے لگا۔

کہنے کو دو دنوں میں ایک کے درمیان سناٹا نہ لگتا تھا تھے اور دونوں طرف کے لوگوں کو یہی ایک دوسرے سے بہت سے خطرات لاحق رہتے تھے لیکن حاد نے اسے اتنی جیوری اور سہولت سے پاکستان سے یہاں منتقل کر دیا تھا جیسے ایک کتا جس کا کٹ کر پلٹ میں رکھنے کا معمولی کام ہو۔ اسے شہر کے ایک ایسے محل میں قیام کی سہولت بھی بطور کسی مشکل کے سمجھا گئی تھی اور اب وہ اس پر پیش کرے میں بیٹھا اس شخص کا انکار کر رہا تھا جسے اس کے لیے شادی کا فرائض سمیت دوسری اہم دستاویزات پہنچائے آتا تھا۔ یہاں آدھ سے ملے اس نے اپنے طبقے میں خاطر خواہ تہہ لیاں کر لی تھیں اور اب وہ چھوٹے سیاہ بالوں، سیاہ آنکھوں اور کھنٹی موٹوں کے ساتھ اس شخص سے بالکل مختلف لگ رہا تھا جو کہ گئے ہرے کا بہرہ وادارے گھوڑا دے گاڑی گاڑا کے فرائض انجام دیا کرتا تھا۔

"کیا سونا بچہ کی کسی مشکل میں گھر گئی ہے اور مجھے اسے اس مشکل سے نکالنے کے لیے باز کیا گیا ہے یا یہ ان لوگوں کا کوئی دھوکا ہے؟" وہ خود سے یہ سوال کرتے ہوئے انھیں میں ہنسا ہوا تھا۔ ایک ایسے وقت میں جبکہ وہ لوگ میڈم انیس سے چھڑ چھاڑ کر رہے تھے، حاد کا اس کام کو لے کر بے آواز سے زیادہ اہم نہیں ہوا تھا اور وہ اس کے پیچھے خطرے کی بومرنگس کر رہا تھا۔

کے لیے جوت گھرنی تھی۔ "میں ایک ہوں۔ لی اہل دواؤں کے بطور بھی محرارہ ہوا ہے۔" "کل نے اسے اپنی تکلیف سے آگاہ کر دیا تھا۔ تب بھی اس نے وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ بتاتا ہے بھی اس کی تکلیف کو محسوس کر چکا تھا۔ باہر آکر اس نے خود بھی کا رخ کیا اور ایک گلاس دودھ گرم کر کے ساتھ میڈیکل باکس میں سے دو بیٹن کرڈنگل کر اس کے لیے لے گیا۔

"یہ دقت کیوں کی آپ نے؟" "کل اسے یوں اپنی خدمت میں دودھ اور دوا پیش کرتے رہے کر چھٹی۔" "آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، یہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔" "مجھے شے بھی آپ نے برائے نام ہی کہا تھا اس لیے بہتر ہوگا کہ دودھ کے ساتھ یہ دوا لے لیں۔ آپ کی پرہیزگار دوا تو نہیں ہے لیکن امید ہے کہ درد میں کچھ نہ کچھ آفاقہ ضرور ہو جائے گا۔" "کیسی گھر اور پردہ کی اس کے لہجہ میں۔" "کل کی آنکھیں اسے خیال پر چھینکتی تھیں۔ لیکن کامیاب تو چلو سرسرقہ کی آواز میں منظم شاہ جاس کی زندگی میں آنے والے پہلے مرد تھے اور دوا دینی حد تک ایک ایسے شوہر بھی کسی اس طرح جن کے اس کی تکلیف کو نہیں بوجھ پائے تھے۔

"کھریہ۔" "بہ اعتبار ہی اس نے اپنی احسان مندی کا اظہار کیا۔

"کھریہ کی کوئی بات نہیں۔ میں انھیں کو اپنے ساتھ باہر لاؤنج میں لے جا رہا ہوں۔ آپ یہ دوا اور دودھ میںیں اور کمر بند کر کے اطمینان سے آرام کریں۔ انھیں کو میں سنبھال لوں گا۔" "اس نے انھیں کو اپنی کو دیکھ لے لیا۔" "لیکن....." وہ کہنا چاہتی تھی کہ انھیں کی وجہ سے اسے دقت ہوگی لیکن حاد نے اسے موقع نہیں دیا اور قدرے دھب سے بولا۔

"کوئی لیکن لیکن نہیں۔ آپ آرام کر کے خود کو دقت کریں۔ انھیں کو میں وینڈل کر لوں گا۔" وہ انھیں کو لے کر سے باہر نکل گیا۔

"بچہ کے لیے مجبوز اور دوسرے کپڑوں کی ضرورت ہے۔ کہیں سے یہ چیزیں مل سکتی ہیں؟" "باہر لاؤنج میں آکر اس نے جادو کی گھرائی میں بیٹھے لوپ اور ہاتھ سے دریافت کیا۔

"کسی پھر اسٹور پر چلے جاؤ، سب مل جائے گا۔" "لوپ نے چلے گئے لہجہ میں جواب دیا جس کے نتیجے میں اسے اپنے بوجھ پر اس کا ایک ہڈو گھونسا برداشت کرنا پڑا۔ اس کو گھونسا پڑنے ہی ہاتھ پر کر اٹھا اور بولا۔

"دات تک انکار کرتے ہیں۔ تم لوگ چاہو تو اس جہالت سے فائدہ اٹھا کر فریٹس ہو سکتے ہو۔ یہاں ضرورت کا تمام سامان اور سہولیات موجود ہیں۔ میرے اعزاز سے سنا مطابق تم لوگوں کے باپ کے مردانہ کپڑے بھی مل جائیں گے۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تو وہ دونوں بھی انکار کرنا شروع ہوئے۔ وہ بچے بھی اب انھیں ایک نیم کمر کر رہا تھا۔

☆☆☆

سہولیات سے آراستہ کمرے میں آرام دہ موسم بہار سونے کے باوجود آنے والی سچ کل کے لیے خوشگوار ثابت نہیں ہوئی تھی۔ آگے کھلتے ہی اسے اپنے سر میں درد محسوس ہوا تھا اور آہستہ آہستہ اس میں دوسری اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ سر درد کی اس تکلیف کے ساتھ انھیں کو سنبھالنا اس کے لیے دشوار ہو رہا تھا۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ اپنے ساتھ کوئی سامان نہ ہونے کے سبب اس کے پاس انھیں کو کچھ کرنے کے لیے کپڑے اور دیگر ضروریات نہیں تھے اور اس ڈر سے کہ کہیں کچھ جسم پر موجود واحد لباس کو بھی خراب نہ کر لے، وہ اسے بار بار دیکھ کر دیکھ کر جہالتی تھی۔ مگر حالات میں بہت سکون سے رہنے والا انھیں کو اس صورت حال پر کچھ چڑچڑ سے پن کا مظاہرہ کر رہا تھا اور اس کا چڑچڑا پن کل کے سر درد میں حریفہ اضافے کا سبب بن رہا تھا۔

"کلیا بات سے کل آگیا کی مسئلہ ہے آپ کو؟" "معاذ سے بہت دیر تک اس کی پریشانی چھپی نہ رہ سکی اور بالآخر وہ اس سے بوجھ بیٹھا۔

"نہیں..... کوئی خاص مسئلہ نہیں۔" "اس نے بتانے میں تکلیف سے کام لیا۔

"جو عام مسئلہ ہے، وہی بتاؤ۔" "معاذ نے اصرار کیا۔" "انھیں کو استعمال کے لیے کپڑے اور دیگر ضروریات نہیں ہیں، میرے پاس۔" اس نے دھجے سے بتایا تو حاد کو صورت حال کا کچھ گھما گھما تازہ ہوا۔ مرد ہونے کے ناتے ان میں سے کسی نے بھی اس مسئلے کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔ خود ان کے لیے تو لی اہل خوراک اور پناہ گاہ میسر آ جاتا تھا لیکن ایک چھوٹے لہجے کے مسائل بقیہ اس سے زیادہ تھے۔

"آپ پریشان مت ہوں۔ میں دیکھتا ہوں کہ اس مسئلے میں کیا انتظام ہو سکتا ہے۔" "اس نے کل کو کھلی دی اور جاتے جاتے پلٹ کر بوجھ۔" "آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" مجھے آپ کو ٹھیک نہیں لگ رہا۔ اس سارے پیکر میں آپ کی دوا میں بھی تو کمی لگتی ہے۔" اس کے اعزاز میں کل

بک رہی تھی اور مجھے کی وجہ سے جہالتی گھر مجھ سے کچھ بڑھ کر ہی ہوگی۔" "آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ میرے لیے ممکن ہی نہیں تھا کہ ان لوگوں کو یہاں مشکل میں چھوڑ کر خود محفوظ مقام پر چل ہو جاؤں۔ کل نے میری خاطر دیکھے ہی بہت زیادہ تکلیف اٹھائی ہے۔" "عام شاہد بھی نہیں بھول سکتا تھا کہ کل نے صرف اور صرف اس کی خاطر لیٹل سے علاج کا طوطا اپنی گردن میں ڈال لیا تھا۔

"میں تمہاری کیفیت سمجھ سکتی ہوں لیکن بات یہ ہے کہ ہماری قہر دہشتی زیادہ ہوگی، ہمارا پیس کی ضرورت سے بچ کر لٹا دینا ہی مشکل ہو جائے گا۔ تم نے ٹرس کیا ہوگا کہ اس علاقے کے خارجی راستوں پر پناہ گاہ کا لگا ہوا ہے اور یہاں سے کسی کا کل کر جاتا آتا آسان بہت ہوگا۔"

"کیا ان لوگوں کی یہاں موجودگی کے کوئی شائبہ لے لیا آپ کو؟" "جو ہو گا تو وہ ہو چکا تھا اس لیے سوچنا کی باتوں پر کوئی رد عمل دینے کے سہارے وہ اصل معاملے پر آیا۔" "تمہارا اعزاز درست ہے۔" "سوچنا نے ایک گھری سانس لینے ہوئے اس کے اعزاز کے کی جھڑکی کی اور پھر لہجہ کو ڈاڑھ پر اسرار بناتے ہوئے سرگوشی میں بولی۔

"مجھے کالی حد تک چھین ہے کہ میں ان کی کچھ بھی نہیں۔" "کیا نہیں۔" "کہاں لگاؤ لوگ؟" "عام شاہد بہت ہوا۔" "شاہد ہمارے پردہ میں۔"

"کیا واقعی؟" "عام شاہد اس کا جواب سن کر انھیں چڑا۔" "حالات دوا لگاتے سے تو سبکی اعزاز ہو رہا ہے۔" "اس نے اپنے چنگ کی وجہات بیان نہیں بھر دیکھ دینے والے اعزاز میں بولی۔

"نہیں دواؤں نے جس طرح خارجی راستوں پر پہرا لگا دیا ہے، اس کو دیکھتے ہوئے اس بات کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ وہ لوگ یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو سکتے ہوں گے۔ انکی صورت میں ان کے لیے سب سے محفوظ پناہ گاہ ان لوپ کے مالکان کا خالی بنگلہ ہی ہے۔"

"کہہ تو آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں لیکن میری کچھ میں یہ نہیں آ رہا کہ آپ اس بنگلے کو چھوڑ کر یہاں کیوں آئی ہیں؟"

"حالات کا درست اعزاز لگانے کے لیے۔ اگر یہ بنگلہ اتنا خالی نہ ہوتا تو مجھے براہ راست دوسرے بنگلے کا ہی رخ کرنا پڑتا لیکن مجھے ایک اچھا آپشن ملا تو میں نے اسے خارج کرنا مناسب سمجھا۔" "اس نے وضاحت دی۔

"آپ کیا ارادہ ہے؟"

"جو بھی ہے سانسے آئی جائے گا۔ سوچ سوچ کر خود کو بھگانے سے بچ کر حاصل نہیں۔" کچھ دیر اچھے کے بعد اس نے خود ہی اپنے خیالات کو ذہن سے جھٹکا اور کافی منگوانے کے ارادے سے اکثر کام کی طرف بڑھا لیکن اس کے ریسورسز اٹھانے سے پہلے ہی اکثر کام بیچ اٹھا۔

"نیں! اس نے تھکا لے لے لے میں ایک نقلی سوال کیا۔"

"آپ سے ملاقات کے لیے سسر امر تشریف لائے تھے۔"

"نہیں! کیا میں انہیں آپ کے کمرے میں بھجوا دوں؟"

دوسری طرف سے شیشہ اکریری میں پوچھا جا رہا تھا۔

"تھی بالکل۔" اس نے بھی بی زبان اکریری کی شائستگی سے جواب دیا۔ امر وی شخص تھا جس کا سے انکار تھا۔ اس کی طرف سے اجازت ملنے ہی ڈیڑھ منٹ کے اندر وہ شخص اس کے کمرے کے دروازے پر پر موجود تھا۔ دروازے پر ہی انہوں نے ایک دوسرے کے سانسے مخصوص کو ڈاڑا کیے اور وہ شخص اسے ایک پیکٹ تھا کر واپس لوٹ گیا۔ اس نے اندر آکر اس پیکٹ کو کھول کر دیکھا۔ اندر تمام ضروری دستاویزات موجود تھیں یعنی اسے کچھ آنے جانے کی صورت میں کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا تھا۔ ان دستاویزات کے ساتھ حیدر آباد جانے کے لیے ایک ٹکٹ بھی موجود تھا۔ یہ سب دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہاں ان لوگوں کے دستاویزات موجود تھے۔ ایسے میں انہیں سونا کی تلاش کے لیے کسی کو باز کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی تھی، یہ ایک بڑا سوال تھا جس کا جواب اسے وقت کے ساتھ ہی ملتا تھا۔

وقت کے سوال کو وقت پر چھوڑ کر وہ ہوش سے نکل کھڑا ہوا۔ قلائط میں ابھی خاصا وقت تھا اور وہ یہ وقت شہر میں ادھر ادھر محکمہ کرکڑار چاہتا تھا۔ ہوش سے چیک آؤٹ کرتے ہوئے البتہ یہ اس پر واضح نہیں تھا کہ کھونٹے کے لیے شہر کے کس مقام پر جائے گا۔

"کہاں چلتا ہے صاحب؟" باہر نکل کر وہ سانسے آنے والی پھٹی ٹیکسی میں بیٹھا تو ڈرائیور نے اس سے دریافت کیا۔

"جامع مسجد۔" بلا ارادہ ہی اس کی زبان سے پھسلا۔ اس کی پرورش جس ماحول میں ہوئی تھی، وہاں مذہب کا زیادہ عمل و فیل نہیں تھا لیکن بہ حال اس کی رگوں میں ایک مسلمان کا خون تھا اور وہ اپنی بنیاد سے الگ نہیں ہو سکتا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے اسے مسجد پر چھوڑا تو وہ شاہجہاں کی تعمیر کردہ کئی سرخ پتھر والی اس مسجد کے

پر شکوہ کنندوں اور بیزاروں کا جائزہ لیتا ہوا سیدھا وضو خانے میں جا پہنچا۔ اگرچہ یہ نماز کا وقت نہیں تھا لیکن وضو کر کے وہ لوافل کی نیت پانچہ کرکھڑا ہو گیا۔

"یا اللہ! ہماری زندگیوں میں اسن وسکون لا اور ایسے اسباب پیدا کر کہ جب میرا بچہ اس دنیا میں آئے گا کھوسے تو اسے ان مصائب اور حالات کا سامنا نہ کرنا پڑے جن سے ہم گزر رہے ہیں۔" لوافل کی ادائیگی کے بعد دعا کے لیے ہاتھ بندھے کئے تو بے اختیار ہی اس پر وقت طاری ہو گئی اور خود سے بہت دور دنیا کے ایک جھلک کوٹھے میں بیٹھی وہ اپنی نازک اندام بچی یا ر آئی تھی۔ بہت چاہے تھی اپنی زندگی میں شامل کیا تھا اور چاہتا تھا کہ دنیا کی ہر خوشی اس کے قدموں میں ڈھیر کر دے۔

"وہ بہت معصوم ہے میرے مالک! اسے مزید آزمائشوں سے بچالے اور مجھے تو جی دے کہ میں اس کے دکھوں کا دوا کر سکوں۔" اپنے پروردگار کے حضور درخواست پیش کر کے وہ باہر نکلا تو دل کافی ہلکا ہوا تھا۔ اپنی ہی وجہ میں سیرجھاں اتر آ رہا تھا۔ وہ جانے کس طرح اتر چڑھنے ایک شخص سے ٹکرایا۔ اس نے سر کے نیچے میں وہ شخص چپے چلا تھا اس سے ملنے ہی اس نے سہارا دے کر اسے سنبھال لیا۔

"امارا ناک پھوڑ والا خانہ غراب کا بچہ؟" ہماری جنامت اور قدر سے بہت قانت والا وہ شخص اپنی ناک پکڑے پر بھی کا اٹھا کر نہ لگا۔

"آئی ایم سوری خان صاحب! آئی ایم رنجی ویری سوری۔" مقابل کا پھٹان ہوتا محسوس کر کے اس نے اسے "خان" کہہ کر پکارا اور معذرت کی۔

"یہ تم بڑے گھمبوں کا اچھا طریقہ ہے۔ پہلے اگلے کا نقصان کرتے ہو پھر یہ جھوٹ موت کی سوری سوری کر کے جان چھڑا لیتے ہو۔" اس کی طرف سے جھپٹ کی جانے والی معذرت نے بھی خان کی باراشی کو دور نہ کیا۔

"نہیں خان صاحب! میں جھوٹ موت کی سوری نہیں کر رہا ہوں۔ مجھے کچھ بہت افسوس ہے کہ میری غلطی کی وجہ سے آپ کو تکلیف اٹھانا پڑی۔" اس نے وضاحت دی اور دھچکی سے اس شخص کا جائزہ لیا۔ روایتی کھردار لباس اور فرتی پہنے وہ گول مول چہرے والا فریب شخص اس ماحول میں بالکل مندرود تھا۔

"ہلو فیک ہے تم اتنا جاگری سے ہونے لے تو ہم جہیں ہمارے (صاف) کر دیتا ہے۔" آخر کار اس کا دل بچ گیا۔

"کیا آپ میرے ساتھ بیٹھ کر چاہئے بیٹا پسند کریں گے؟" اسے وہ شخص دلچسپ لگا تھا اور دل چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ کچھ وقت بتایا جائے۔

"پسند کا بات کرنا اسے تو پیرام توہمہ دیتے گا۔" خان نے اتنی مصیبت سے جواب دیا کہ وہ بے اختیار قہقہے پڑا اور ہنسنے لگا۔

"فیک ہے، تجوہ ہی سہی۔"

دونوں ساتھ ساتھ چلتے ایک قریبی ہوٹل میں جا پہنچے۔ وہ خاصا پر رونق علاقہ تھا اور بازار کی وجہ سے بہت زیادہ آمدورفت تھی۔

"اگر زیادہ تکلیف ہے تو میں آپ کو اکثر کے پاس لے چلا ہوں۔" ہوٹل میں ایک دوسرے کے متعلق نیٹے اس نے خان کی سرخ بڑی ناک کو دیکھ کر ہیکش کی۔

"اب ایسا چھوٹی موٹی بھی کئی اسے گل خان کو ذرا سی تکلیف پر ڈاکڑی طرف دوڑ جائے۔ نرکا پائے، نرکا پکچ اور اس سے بڑی بڑی چٹیں کھس کر سہ پکا اٹے۔ تم امارا ناک کا ٹکڑا ہٹ دیکھا ہو گا۔ پوچھو یہ کیسا ہوا؟"

"کیسے ہوا؟" اس نے خان کے جوش سے سرخ پڑتے چہرے کو دیکھی سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"گوئی لگا تھا اور۔ مالک اور اس کے مہمانوں کو بچاتے ہوئے ام نے اپنا جان خسرے میں ڈال دیا تھا۔" بیٹے پر ہاتھ مار کر بتاتے ہوئے اس کے انداز میں ایک فرسا تھا۔ اس شخص کے ساتھ اپنی زندگیوں کا وارہ دینے والے کئی ملک خوار اس نے دیکھ دیکھتے تھے جن میں سے زیادہ تر کے آکاؤں کو ان کی قربانی کی قدر بھی نہیں ہوتی تھی اس لیے گل خان سے اس کی بہادری کا سارا قصہ جاننے کے لیے اصرار کرنے کے بجائے آرڈر لینے کے لیے آئے داسے تیرے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"بے شک آپ جی دار انسان ہیں لیکن مجھے پھر بھی افسوس ہے کہ میری بے پروائی کی وجہ سے آپ کو تکلیف پہنچی۔ اصل میں میرا دھیان کی اور طرف تھا اس لیے میں آپ کو کچھ ہی نہیں سکا تھا۔" تیرا آرڈر لے کر چلا گیا تو اس نے گل خان کے سامنے ایک بار پھر معذرت خواہانہ وضاحت دی۔

"چھوڑ دیا سارا غلطی تمہاری تھی۔ تمہارا قصور مسود امارا بھی تھا، ام بھی تمہارا پریشانی میں تھا اس لیے ام نے بھی تمہارا طرف دھیان ہی دیا تھا۔" خان اس کے اختلاف کے آگے مکمل طور پر پھل چکا تھا اس لیے اس بار اپنی غلطی تسلیم

شہ زور

لاعلمی

بچنے نے باپ سے پوچھا۔ "لوڈی اسورن زمین سے دور ہے؟"

"جی ہاں مجھے معلوم نہیں۔" باپ نے جواب دیا۔

"بیٹا! مسافرت بنا کر بولا۔" آپ کی لاش کی سزا کل اسکول میں مجھے ملے گی۔"

وضاحت

پادری صاحب ایک خوبصورت عورت کا ہاتھ تھامے ایک تقریب میں پہنچے تو ایک خاتون نے غور غور حیرت سے انہیں پھیلانے ہوئے پوچھا۔

"کارو ایہ آپ کی وی بیوی ہیں جن کے حسن کے ہم نے بہت کچھ سنے ہیں؟"

"جی ہاں، یہ میری واحد بیوی ہیں۔" پادری صاحب نے کج کرنے کے انداز میں کہا۔

(مرسلہ: عام خان، کراچی)

کر لینے میں حرج نہیں سمجھتا۔

"بھئی پریشانی؟ کچھ گھر میں کوئی بیمار بیمار تو نہیں؟" اس نے خان کی پریشانی کی نوعیت کے بارے میں اندازہ لگا چاہا۔ اس کے انداز سے کے مطابق خان مالی طور پر زیادہ مضبوط نہیں تھا اور وہ اس کی پریشانی کی نوعیت جان کر اس کی مالی مدد کرنا چاہتا تھا۔

"اسے کئی ماہ! گھر میں تو سب اچھا ہے بلکہ خوشخبری ملا ہے کہ امارا دوسرا بیوی کے ہاں چاہا ہے۔ ابھی ام اپنا پریشانی میں بیٹے کو دیکھنے بھی نئی چکا اسے۔" وہ چھوڑا سا اداس لگتا رہا۔

"اگر چاہو تو مجھے اپنی پریشانی کے بارے میں بتا سکتے ہو۔" وہ جانتا تھا کہ اسے زیادہ دیر اس شخص میں رکنا ہے پھر بھی گل خان کی سادگی دے ساقطی نے اس کے لیے دل میں نرم گوشہ پیدا کر دیا تھا اور غرضی محسوس ہوری تھی کہ اس کی مدد کی جائے۔

"میں کیا بتاؤں پارا! کچھ عرصہ اور دست اسے جو کم ہو گیا اسے اور امارا سبکی میں کئی آ رہا کہ کیسے انہیں تلاش کرے۔" گل خان داغی پریشان تھا۔ وہ حیدر آباد سے دہلی واپس آ گیا تھا لیکن ساتھیوں میں سے کوئی دوسرا وہاں

نہیں پہنچا تھا۔
 "جہاد سے دو دوست کوئی بچے تھے جو کم ہو گئے؟"
 اس نے ان کی حیرت کا اظہار کیا لیکن گل خان کے جواب دینے سے پہلے ہی ان لوگوں نے اپنے پیچھے کیا اور انہیں میز پر ہانپنے لگا۔ بندے کی موجودگی میں خاموشی مناسب تھی۔
 "اس نے صرف تیرہ پتے کا پتہ لگا تھا۔ یہ اتنا سارا مسلمان کیوں مٹا رہا؟" گل خان نے اعتراض کیا۔
 "مجھے یوں لگتا ہے جی اس لیے مٹا دیا ہے۔ تم بس میرا ساتھ دو۔ دیکھو اب میں زیادہ دیر تمہارے ساتھ نہیں بیٹھ سکتا۔ مجھے کچھ دیر میں اڑھت چھٹی کر دیاں سے حیدر آباد کے لیے طائفہ چڑھنا ہے۔" اس نے کھانے پینے کی اشیاء کے ساتھ انصاف شروع کرتے ہوئے گل خان کو بھی اپنا ساتھ دینے کا اشارہ کیا لیکن گل خان حیدر آباد کے ذکر پر غصہ کیا تھا۔
 "حیدر آباد..... حیدر آباد کیا کرنے جا رہے ہو؟"
 "کچھ کھوئے کھوئے کچھ شے سواں لگی کر ڈالا۔"
 "مجھے بھی کسی کی تلاش ہے۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا اور آٹھ ایک سو اسی لاکھ روپے پیش کر دیا۔
 "تمہاری تلاش کرنے جا رہے ہو؟ ام کو بتاؤ۔ ام بھی تو حیدر آباد سے واپس آیا ہے۔ شاید ام اسے جانتا ہو۔"
 گل خان نے ایسے سوال کیا جیسے حیدر آباد کوئی چھوٹا سونا گاؤں ہو جہاں کتنی کے چور لوگ جتے ہوں اور وہ اپنے قیام کے عرصے میں ان تمام لوگوں سے مل کر آیا ہو۔
 "چلو فیک ہے۔ میں تمہیں اس کی تصویر دکھاتا ہوں۔" سادہ لوح خان کی پیشکش نے اسے شہرت پر آمادہ کیا اور سواں کی ٹیکری کھول کر سونا کی تصویر دکھائی۔ یہ تصویر حیدر آباد کے اسے فراہم کی تھی۔ تصویر میں سونا چست جینز کی چٹ پٹ پیرسٹنی شرٹ پہنے اپنی تمام تر خصوصیات سمیت مسکرا رہی تھی۔ اس نے یہ مسکرائی ہوئی تصویر گل خان کے آگے کر دی۔ تصویر پر نظر پڑے ہی خان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔
 "کیا بات؟ میں نے خان؟ میں نے نہیں اتنی خوبصورت لڑکی کی تصویر دکھائی ہے لیکن جہاد رنگ ایسے فنی ہو گیا ہے جیسے کوئی جوت دیکھ لیا ہو۔" اس سے گل خان کی کیفیت جھکی نہ رہ سکی۔
 "تم اس کو کیوں ڈھونڈ رہے؟" حیرت کی زیادتی نے آخر کار گل خان سے تذکیر و تہنیت کی غلطی کروا دی۔
 "اس کے والی واروں کا کہنا ہے کہ یہ تم ہو گئی ہے۔"

اور میں ان کے کہنے پر اسے ڈھونڈنے کے لیے جا رہا ہوں۔" خان کی کیفیت پر وہ اندر سے جھجھکیا اور اسے جھٹکا جتا ہوا تھا لیکن لہجے کو اس نے سادہ اور صوابی رکھا تھا۔
 "اس کا کوئی والی وارث بھی ہے؟" خان نے یوں حیرت کا اظہار کیا جیسے یہ کوئی ناممکن بات ہو۔
 "والی وارث تو سب کے ہوتے ہیں یا راہ کوئی آسان سے تو نہیں ملے گی؟" سرسری لہجے میں جواب دیتے وہ خان کے چہرے کے بدلنے تاثرات کا بخور جاگھڑا کر رہا تھا۔
 "ہر کوئی کوئی بندہ بڑا خود مختار ہوتا ہے۔ اس کو والی وارث کا ضرورت ہی نہیں ہوتا۔" خان نے سونا کی دنگ خصوصیت دیکھ کر بھی اس لیے یہ کہنے میں حق بجانب تھا۔
 "مجھے لگتا ہے تم اس خاتون کو جانتے ہو۔" وہ سوال سے ذہن میں پچھتا خیال زبان پر لے آیا۔ خان نے اس سوال کے جواب میں خاموشی اختیار کر لی۔
 "خاموش کیوں ہو گئے دوست! کچھ تو پوچھو اور اگر اس کے بارے میں کچھ جانتے ہو تو مجھے بتاؤ۔ ہمیں نہیں معلوم کہ میرا اس کے بارے میں جانتا کتنا ضروری ہے۔ اس خاتون کی تلاش کے ساتھ ہی افراد کی خوشیاں بکھرتی گئیں جڑی ہوئی ہیں۔" اس نے خان کا ہاتھ تمام کر ڈور سے دبا دیا اور جذباتی لہجے میں بولا۔
 "پہلے تم ام کو کچھ بتاؤ کہ تم کچھ ایسی ڈھونڈ رہے ہو؟ اس کے پیچھے کی اور کی تلاش میں اسے؟" سادہ لوح مصمم دکھائی دینے والے خان نے اس سے ایک وجہ سوال کیا۔ ایسا سوال جو گواہ اس کے ذہن میں بھی نہیں آیا تھا۔ وہ اس سوال پر کچھ دیر تک خاموشی سے خان کو گھورتا رہا پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔
 "کچھ یہ ہے کہ میں ایک ایسے بندے کی تلاش میں ہوں جس کے خواب کا اس خاتون سے گہرا تعلق ہے۔"
 "اس کا نام کیا ہے؟" خان کے بھونپنے سے مکمل سنجیدگی اور بردباری اڑھ لگی اور وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اس سے بات کر رہا تھا۔
 "سمازا" اسے لگا کہ اگر وہ کامیابی حاصل کرنا چاہتا ہے تو اسے یہ داؤد کھیلنا ہی پڑے گا چاہے ہر رات کے لیے میں سمازا کا نام لے لے لے۔
 "کیا تم کو اس کے کسی اور نام کا بھی پتا ہے؟" خان کے سوالات کا سلسلہ نکلتا تھا۔
 "مجھے کس نام نہیں ہے لیکن مجھے لگتا ہے کہ سمازا کے

ساتھ اس کا کوئی دوست موجود ہے تو وہ بیٹھا عالم شاہ ہوگا۔" مسلسل جوا بھیل رہا تھا اور اس کیل میں اسے گھڑی پر نظر ڈالنا بھی بھول گیا تھا۔
 "خاتون کا لہجہ اس بار سخت ہو گیا اور اسے یوں لگا کہ اس نے میری آڑ میں اپنے گھروار لباس کے اندر ہاتھ ڈال کر کچھ نکالا ہے۔ شاید کوئی اٹھیا۔" تم مجھے دوست بھی کہہ سکتے ہو اور غیر خواہی۔ شاید غورم بھی جیسا پیشیت رکھتے ہو لیکن مجھ میں اور تم میں ایک فرق ہے۔ جہاد ان لوگوں سے تعلق نیا ہوگا جبکہ میرا ان سے پرانا ہی نہیں، بہت گہرا تعلق ہے۔" وہ پوری طرح خان پر مکمل کیا تھا لیکن خان اب بھی تذبذب میں بیٹھا تھا کہ اس پر اعتماد کرے یا نہ کرے۔
 "میں خاموش نہ بیٹھو دوست! میں جانتا ہوں کہ وہ کونسا مشکل میں ہیں اور میں ان کی مدد کی نیت ہے کہ یہاں آیا ہوں۔ تم ان کے بارے میں جو کچھ جانتے ہو مجھے بتا دو تو تمہاری بڑی مدد ملی ہوگی۔" وہ اب باقاعدہ خان سے التجا کر رہا تھا۔
 "کیا تمہارے تم کو۔ ام تو خود ان لوگوں سے پچھڑ گیا ہے اور کچھ بھی آتا کہ ان کو ڈھونڈنے کا کھڑ جائے۔" آخر کار خان غور کا سلا اور اداس سے لہجے میں ایک حقیقت اس کے گوش گزار کی۔
 "تم مجھے تفصیل سے سب کچھ بتاؤ پھر ہم مل کر فیصلہ کریں گے کہ میں کیا کرتا ہے۔" اس نے ایک بار پھر خان کے دونوں ہاتھ تمام لیے اور جذباتی لہجے میں بولا۔ اس بار خان نے بھی حراحت نہیں کی اور سرگوشیوں میں اسے حالات سے آگاہ کرنے لگا۔
 ☆☆☆☆
 "کپڑوں کا تو در دست ٹیکس موجود ہے یہاں۔ زیادہ تر اپورٹڈ روٹی ہے۔" بڑی سی دارڈوب کھولنے کپڑوں کا جائزہ لیتے سرد نے مختلف ڈیزائنز کو ادھر ادھر کرتے ٹیکس آئیر لہجے میں عالم شاہ کو آگاہ کیا۔
 "اسے خوبصورت اور شاندار دیکھنے میں رہنے والا کوئی فٹ پوئیا تو نہیں سکتا اس لیے اس کے کپڑوں کا ٹیکس بھی شاندار ہی ہونا چاہیے۔" عالم شاہ نے بتائے سے سر اٹھائے بے نیازی سے جواب دیا۔ کئی ٹیکسوں کی بے آراہی اور درپردہ کے بعد لیٹنے کے لیے یہ آرام دہ بستر میسر آیا تھا تو اس کے سوا کسی اور شے میں دیکھی لینے کا موزون نہیں ہو رہا تھا۔ ویسے بھی وہ سونے کا چھپو منہ میں لے

کر بیٹھا ہونے والوں میں سے تھا جسے دنیا کی ہر نعمت میسر رہی تھی اس لیے کسی کے کپڑوں کی ٹیکس اسے متاثر نہیں کر سکتی تھی۔
 "آپ فیک کہہ رہے ہیں سائیں! لیکن مجھے کپڑوں کے جتنی ہونے سے زیادہ غریب نے والے کی چھٹا اس نے متاثر کیا ہے۔ ہر پچھے والا خوشی ذوق بھی ہو یہ ضروری نہیں ہوتا۔" سرد نے اسے جواب دیتے ہوئے ہلکے ہلکے رنگ کا ایک ٹوپی سوٹ باہر نکال کر اس کے سامنے کیا۔
 "یہ دیکھیں، کتنا نیا سوٹ ہے۔ ہرے خیال میں آپ یہ پہنیں گے۔ ناپ بھی آپ کے حساب سے ہے۔"
 "خدا کو الو یا را میں ان حالات میں ٹوپی سوٹ پہن کر کہاں برائے ہوگا۔" بہتر ہے تم میرے لیے کوئی ٹی شرٹ اور ٹراؤزر وغیرہ نکال دو۔ بہت سے بہت چیزیں چل جائے گی۔" ٹوپی سوٹ دیکھ کر پہلے عالم نے اسے گھورا پھر کوشش کر کے لہجے کو نرم بناتے ہوئے ٹوٹا۔
 "میری سائیں! مجھے تو اس بات کا دھیان ہی نہیں رہا تھا۔" سرد اس کے ٹوٹے پر جھنجھٹا کر دھڑک دھڑک کر اپنے مطلب کے کپڑے دکھائی دیے۔ یہ کپڑے بھی خوبصورت اور اعلیٰ کوالٹی کے تھے۔ خود اپنے لیے تو وہ ان میں سے کوئی بھی لباس انکھیں بند کر کے نکال اور پہن لیا لیکن عالم شاہ کے لیے سب سے عمدہ لباس کے انتخاب کے چکر میں اس نے تیزی سے پیکر کو ادھر سے ادھر سرکا کر شروع کر دیا۔ یہ کام کرتے ہوئے اچانک ہی اس کی نظر پھٹی اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ دارڈوب کے پچھلے حصے میں کچھ ہے جو گھڑی کی رنگت کا ہو کر بھی گھڑی سے قدرے مختلف ہے۔ بغور دیکھنے پر اس پر انکشاف ہوا کہ وہ ایک چھوٹا سا قفل ہے جس پر کچھ ہندسے درج ہیں۔
 "لگتا ہے آج کا سارا دن تم نے مالک کے ذوق سے متاثر ہوتے ہوئے ہی گزار دیا ہے اس لیے بہتر ہوگا کہ میں تمہارے کپڑے بدلنے کی خواہش کو چھوڑ دوں اور ایسے ہی میلے کپڑوں میں سو جاؤں۔" عالم شاہ کو اس کی تاخیر نے جھنجھلاہٹ میں جتا کر دیا۔
 "مسائیں! سائیں! اس نکال رہا ہوں کپڑے۔ ذرا ایک چیز دیکھ کر کہہ کر لیا تھا۔" عالم کی ہارمونی محسوس کر کے وہ گڑبڑایا اور جلدی سے ایک سوٹ نکال کر اس کی طرف پھینکا۔
 "کس چیز کی بات؟" عالم کا سوال ابھی منہ میں

فی تھا کہ کرے کے دروازے پر سونیا نمودار ہوئی اور اشارے سے انہیں باہر آنے کو کہا۔ باہر آنے کے اشارے کے ساتھ ساتھ اس نے ہونٹوں پر ہلکی رکھ کر انہیں خاموش رہنے کی ہدایت بھی دے دی تھی جس نے انہیں کسی غیر معمولی صورت حال کا احساس دلایا اور اپنی آپس کی گفتگو بھولی کر فوراً اس کے پیچھے چل پڑے۔ وہ انہیں اپنے ساتھ لیے واپس دروازے کی طرف بڑی اور اشارے سے دروازے کے دائیں بائیں پوزیشن لینے کی ہدایت دی۔ اس ہدایت کی روشنی میں وہ سمجھ سکتے تھے کہ کوئی ہے جو جگہ کے اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ ملاحظہ کار سے مٹنے کے لیے دروازے کے دائیں بائیں ہوشیاری سے کھڑے انہوں نے ایک جبرائیل کی نظر سونیا پر ڈالی جو دروازے کے صحن سامنے رکھے ہوئے پرزے اعجاز سے ہنگ پر ہانگ چڑھا کر بیٹھ گئی تھی۔ دروازے پر ہونے والے حرکت نے انہیں سونیا کے اس اعجاز پر زیادہ غور کرنے کی ہمت نہیں دی۔ دروازہ بے آواز کھلا۔ آنے والا یقیناً اس صحن کے ساتھ آتا تھا کہ بھلا بالکل خالی ہے اس لیے اس نے بے پروائی سے پہلا قدم اندر رکھا اور پھر سامنے بیٹھ سونیا کو دیکھ کر بری طرح ہلک گیا۔ اسے ہلک کر سنبھلنے کی ہمت نہ رہی۔ دروازے کے اندر وہ دیکھ رہا تھا کہ اس پر ہل پڑے۔ روٹل میں اس نے ایک گھونسا رسید کیا اور دوسرے کی پٹیوں میں کٹی سے وار کیا۔ چوت کھڑوہ دونوں مشتعل ہوئے اور اینٹ کا جواب ہتھ سے دینے کی تبت سے اسے زمین پر بچھاڑنے کی کوشش کی لیکن سونیا ہستی ہوئی سوٹنے سے کھڑی ہوئی اور شروع بچھے میں بولی۔

"بس کرو بھئی۔ تمہارا پتا دوست ہے۔"

اس کے بچلے نے چاک کا سا کام کیا اور وہ دونوں اسے چھوڑ کر پھرتی سے پیچھے بنے۔ آنے والا جو کہ محاذ تھا، سیدھا کھڑا ہو کر دیکھ دیکھنے لگا۔

"اوتے راتو؟ ہم کیسے، جانے کون چور اچھا اندر گھس آیا ہے۔" عالم شامر شامانگے گھنے کے لیے اس کی طرف پلکا۔

"میل اوئے تیل۔ میری کسی ہیک مٹے سے کوئی دوستی نہیں ہے۔" اس نے عالم کے طے پر چوٹ کی لیکن پھر ہموار جوش سے اسے سمجھا دیا۔

"یہ ہیک مٹا اچھا نہیں لگ رہا تو میں ابھی باہرین کر آجاتا ہوں۔ ایک سے ایک بڑھیا ورائی موجود ہے یہاں داندوب میں۔ اپنا سر تو ہر دوسرے سوٹ پر فدا ہو رہا

ہمیں اور بھائی کی گھر تھی تو بس ہم سب کسی نہ کسی طرح یہاں پہنچ گئے۔ تھکات میں جیسے فرست گئے پر سناؤں کی۔ وہ ایک الماری میں سر پہے سامان کا جائزہ لینے میں مصروف تھی اس لیے محاذ اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا اور اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ سونیا کا لہجہ ہی اس کے جذبات کا عکاس تھا۔

"یہ لو۔ یہ کپڑے اعظم کے لیے ٹھیک وہیں گے اور یہ انڈیز کا ٹیک بھی ہے۔" سونیا نے الماری میں سے مطلوبہ اشیاء نکال کر اس کی طرف بڑھائیں پھر بولی۔

"ڈوراکو۔ میں دیکھ کر کوئی ہیک نکالتی ہوں تاکہ کل کو بچے کی چیزیں رکھنے میں آسانی رہے۔" اب وہ گھنٹوں کے بل بھیجی الماری کی چمکی دروازوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ جلد ہی اس نے وہاں سے خوش قرار کوں والا ایک ایسا ہیک نکال لیا جس پر رنگ برنگے ستارے بنے ہوئے تھے۔

"کلک ہے اس بچے کے والدین کو ستارے بہت پسند ہیں۔ بچے کے استعمال کی اشیاء سے لے کر کمرے کی ڈیکوریشن تک، ہر شے میں ستارے ہی ستارے لپٹا ہوا ہے۔" اس کے ہاتھ سے ہیک لے کر اس میں سامان رکھتے ہوئے محاذ نے تہہ کو تو وہ پھر پہلے بس باہر سے ہی کمرے کا سرسری جائزہ لے کر بیٹھ گئی تھی، ہر طرف نظریں گھمانے لگی۔ محاذ کی بات بالکل ٹھیک تھی۔ بسز کی چادر، پردوں اور دھار پر لگے فریز سمیت ہر جگہ ستارے لپٹا ہوا تھے۔ ان ستاروں کو دیکھتے ہوئے اس کا ذہن اپنے بچپن میں چلا گیا اور اسے یوں لگا کہ یہ اسی کا کمرہ ہو۔

"کہاں تم ہو گئی ہو؟" محاذ نے اس کا غائب دماغ ہونا محسوس کیا تو اسے پکارا۔

"بھئی نہیں۔ بس تمہاری بات پر ہی غور کر رہی تھی۔ واقعی اس بچے کے والدین ستاروں کے خیل میں جلا دکھائی دیتے ہیں۔ پسند الگ چیز ہے لیکن دنیا کی ہر شے چھوڑ کر بچے کے لیے بس ایک مخصوص شے کا انتخاب کر لینا زیادتی ہے۔ کیونکہ اس عمر میں تو بچوں کو کثیف انواع اشیاء سے متعارف کر دانا چاہیے۔" بولتے ہوئے اس کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

"ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ یہ تو ماں باپ کی اپنی مرضی ہے۔" اس نے بے نیازی کے اظہار کے لیے شانے اچکائے پھر بولا۔

"میں ذرا یہ سامان کھل کو بچاؤں پھر ایک جگہ بیٹھ کر تفصیلی گفتگو کرتے ہیں۔ آئندہ کال کا خیال بھی تو بنے گا۔"

"ہاں ٹھیک ہے، تم جاؤ۔" سونیا نے کھوئے کھوئے سے لہجے میں جواب دیا اور کسی معمولی کی طرح ستارے کی شکل کے اس فوٹو فریم کی طرف بڑھی جس میں ایک جڑے کی تصویر بڑی ہوئی تھی۔

"یہ شاید بچے کے دادا دادی ہیں۔ دونوں یہاں ہی کی محروں میں خاما فرقی محسوس ہو رہا ہے۔" محاذ نے اس کی توجہ کا مرکز بھاپ کر تصویر پر تہہ کیا۔ تصویر میں نظر آنے والا مرد بلاشبہ ساتھ سال سے اوپر کا تھا جبکہ عورت پینتالیس چھیالیس سے زیادہ کی تھیں محسوس ہو رہی تھی۔

"اس ہنگ کے ماسٹر بلڈروم میں بھی اسی جڑے کی تصویر لگی ہوئی ہے۔ میں نے ان دونوں کے علاوہ یہاں کسی اور کی تصویر نہیں دیکھی۔" تصویر کو یک یک دیکھتے ہوئے اس نے محاذ کی بات کا جواب دیا۔

"مطلب یہ دونوں اس بچے کے چریش ہیں؟" محاذ کے لہجے میں بے چینی تھی۔ سونیا نے اس کے سوال کا جواب نہیں دیا اور بات بدلے ہوئے بولی۔

"تم جلدی جاؤ۔ تمہارے اتنی دیر یہاں رکھنے سے باقی لوگوں کو کوشش ہو رہی ہوگی۔"

"اس کا مسئلہ نہیں۔ وہ لیے کالوں والا ہاتھی ہے؟ ہمارے ساتھ۔ بس سب گن لے کر نہ صرف خود مطمئن بیٹھا ہوگا بلکہ کل کو بھی لے لے دی ہوگی۔"

"تمہاری بات کر رہے ہو؟" اسے تو میں بھولی ہی تھی۔ "وہ مسکرائی لیکن اس مسکراہٹ میں پھپکا پن تھا۔

"بہت اچھا اور فکس آؤ ہے۔ ان حالات میں بالکل اس طرح ساتھ دے رہا ہے جیسے کوئی پرانا دوست ہو۔"

"کھل تمہاری راہ دیکھ رہی ہوگی۔ تم اسے بچے کا سامان بچھاؤ تاکہ وہ اسے پہلا دھلا کر بیچ کر دے۔" ایسا لگا کہ اس نے جارو سے حلق محاذ کا تہہ ستا ہی نہ ہو۔ محاذ کو اس کا یہ اعزاز عجیب لگا لیکن پھر صیانت کھل کی پریشانی کی طرف چلا گیا۔ صاف سہرا رہنے کا عادی اعظم مسلسل ایک ہی لباس میں رہنے کی وجہ سے چڑچڑا ہوا تھا اور کھل کی طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں تھی۔

"اوکے۔ میں یہ سامان دے کر تھوڑی دیر میں واپس آتا ہوں۔ بلکہ ایسا کر دو کہ تم لوگ بھی اس طرف ہی آ جاؤ۔ وہاں ہمارے پاس ایک اچھا خانانا موجود ہے۔

تم لوگوں کو اس کے ہاتھ سے مزید سا کھانا بھرا کر کھلاؤں گا۔" وہ اسے پیش کر کے باہر نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی

لے ایک بڑا ثبوت فراہم کر رہا تھا۔ وارڈروب کا عقی بنی کھسکا ہوا تھا اور مختلف خانوں میں منقسم ایک بڑی سی تجوری دکھائی دے رہی تھی۔ تجوری کا سب سے بڑا خانہ جدید قسم کے اسلحے اور بارودی مواد سے بھرا ہوا تھا جبکہ نسبتاً چھوٹے دونوں خانوں میں سے ایک میں ملکی اور غیر ملکی کرنسی اور دوسرے میں سونے کے سکوں کے ڈھیر کے علاوہ زیورات کے چھوٹے بڑے ڈبے دکھائی دے رہے تھے۔

”یہ سرمہ نے دریافت کیا ہے۔ اودہ خدایا..... مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ ہم انجانے میں کسی انڈر ورلڈ ڈان کے گھر میں گھس گئے ہیں۔“ عالم شاہ نے جتنی دنیا دیکھی تھی، وہ اسلحہ اور مال و دولت کا یہ خفیہ ذخیرہ دیکھ کر یہی اندازہ لگا سکتا تھا لیکن سونیا جانتی تھی کہ یہ کسی انڈر ورلڈ ڈان کا انداز نہیں ہے۔ عالم شاہ کے تبصرے پر اپنی کوئی بھی رائے دیے بغیر اس نے زیورات کے ڈبوں کے درمیان رکھی ایک جانی پہچانی سی مچھلیں ڈیپانکالی اور مخصوص جگہ نصب چھوٹا سا بٹن دبا کر ڈیپا کا ڈھکن کھولا۔ ڈیپا میں سلور دائرے کے اندر نصب چھ کونوں والا سنہری ستارہ جگمگا رہا تھا۔ ستارے کے ہر کونے پر ایک ننھا سا ہیرا نصب تھا اور یہ چھ کے چھ ہیرے ایسے جھلملا رہے تھے کہ آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی تھیں۔

”سو بیوٹی فل۔“ عالم شاہ نے بھی اس کے شانوں کے اوپر سے سلور ہالے میں نصب اس سنہری ستارے کا نظارہ کیا اور بے ساختہ ہی بول پڑا۔

”جتنا اسلحہ، ایسوشن اور گرینڈز لے سکتے ہو، ساتھ لے لو۔ میں جا کر معاذ اور دوسرے ساتھیوں کو تیار کرنے کا کہتی ہوں۔ ہمیں دو منٹ کے اندر اندر ہر حال میں یہ جگہ چھوڑنی ہے۔“ اس نے بے حد سخت تاثرات کے ساتھ تجھمانہ لہجے میں ہدایات دیں اور عالم و سرمہ کی حیرت سے بے نیاز ایک گن اور اس کی گولیوں کی بیلٹ پہنچ کر نکالی اور تجزی سے باہر نکل گئی۔ مچھلی ڈیپا بھی ہنوز اس کے قبضے میں ہی تھی۔ ان اشیاء سمیت پڑوس کے بیٹنگلے میں کودتے ہوئے اس نے اس بات کا بالکل خیال نہیں رکھا تھا کہ کوئی اس کی یہ حرکت دیکھ رہا ہے یا نہیں۔ جو خطرہ سرمہ پر منڈلا رہا تھا، وہ کسی عام فرد کے دیکھ لینے کے مقابلے میں بہت بڑا اور ہولناک تھا۔

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نوجوان
کسی داستان جو غلط کاروں کے لیے
غضب ناک تھا باتی واقعات ایندھاہ پڑھیں

سونیا نے دیوانہ وار پورے گھر کا باریک بینی سے جائزہ لیتا شروع کر دیا۔ اسے اعتراف تھا کہ پہلے اس نے اس گھر کا صرف سرسری جائزہ لیا تھا اس لیے کیمروں کو نہیں دیکھ سکی تھی جو بے شک بہت مہارت سے خفیہ طور پر ایسے مقامات پر لگائے گئے تھے جہاں کسی کا دھیان نہیں جاسکتا تھا لیکن اس جیسی تربیت یافتہ بندی کے لیے ان کیمروں کو دریافت کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ بس ہوا یہ تھا کہ وہ ذرا سی بے پروا ہوئی تھی۔

”یہ میری غلطی ہے۔ یہ سب میری غلطی ہے۔ مجھے تو یہاں نصب سکیورٹی سسٹم کی موجودگی پر ہی ہوشیار ہو جانا چاہیے تھا۔“ وہ دیکھ چکی تھی کہ وہاں نصب سارے کمرے والی فائی سے کنکٹ ہیں اور ایسے میں یہ ممکن نہیں تھا کہ اس سمیت کسی کی بھی یہاں موجودگی اب تک مالکان سے پوشیدہ رہی ہو۔ اپنے تئیں وہ ایک غیر متعلقہ انجان گھر میں داخل ہوئی تھی اس لیے کسی خطرے کو دھیان میں ہی نہیں رکھا تھا اور سکیورٹی سسٹم کو بھی یہ سوچ کر نظر انداز کر دیا تھا کہ اب عام امراء بھی سکیورٹی کے لیے افرادی قوت کے بجائے ٹیکنالوجی پر انحصار کرنے لگے ہیں۔ اس کی یہ غلطی اب انہیں بری طرح ڈبونے والی تھی۔

”ہمیں فوری طور پر یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے ابھی ہمیں موقع مل جائے۔“ وہ بہت زیادہ پرامید نہیں تھی لیکن پھر بھی کوشش کر کے دیکھ لینا چاہتی تھی۔

”عالم، سرمہ.....! کیا کر رہے ہو تم لوگ؟ آؤ، جلدی سے میرے ساتھ چلو۔“ وہ آوازیں دیتی ہوئی اس کمرے میں پہنچی جہاں ان دونوں نے ٹھکانا کیا ہوا تھا۔ وہ دونوں اس کے پکارنے کے باوجود اس کی طرف متوجہ نہ ہوئے اور کپڑوں کی اس کھلی وارڈروب کی طرف رخ کیے کھڑے رہے جس کے تمام کپڑے نکال کر ستر پر ڈھیر کر دیے گئے تھے۔

”یہ کیا کر رہے ہو تم لوگ؟“ وہ دیکھ سکتی تھی کہ وہ دونوں ہی نہ ہا کر لباس تبدیل کر چکے ہیں لیکن اس کو ان کا یوں انہماک سے وارڈروب میں سرگھسا کر کھڑے ہونا سمجھ نہیں آ رہا تھا اس لیے حیرت اور الجھاہٹ کی ملی جلی کیفیت میں... بہ آواز بلند انہیں مخاطب کیا۔

”ذرا قریب آ کر یہ دیکھیں۔“ سرمہ نے پلٹ کر اسے مخاطب کیا تو اس کے لہجے میں ہیجان سا تھا۔ وہ عجالت میں جلا ہونے کے باوجود کسی نئے انکشاف کی پوسٹلٹی خود کار انداز میں ان لوگوں کے ساتھ جا کھڑی ہوئی۔ نظر آنے والا اس کے بدترین خدشات کو تقویت دینے کے



قسط: 31

شہزادہ گلشاہ

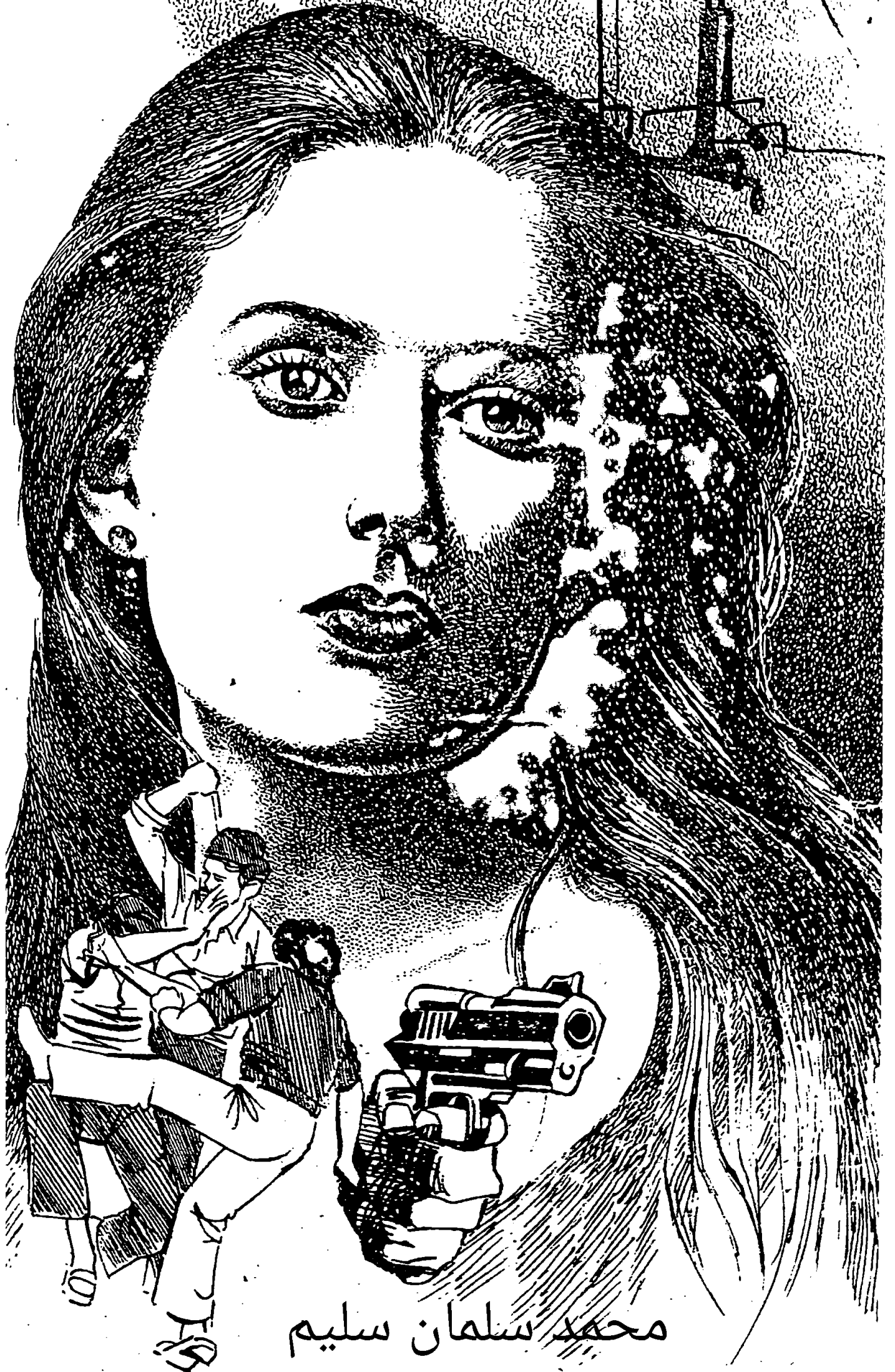
انصاف ادبی

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تند و تیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابل شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پُر عزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جارہے تھے... اس کی زندگی جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قراریوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تاری عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ وارداتِ قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہو سکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام لوجوان کی تحریر انگیز داستان

سپنس ڈائجسٹ 50 ستمبر 2022ء

محمد سلمان سلیم 03067163117



محمد سلمان سليم

معاذ ایک ذہین لیکن متکون مزاج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جوائن کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ انسٹی ٹیوٹ سے واپس آ رہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو مڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی نڈر فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کو پڑتا ہے اور بشری نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بشری ماس کمیونی کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم وغیرہ لکھتی ہے۔ اس ویران جگہ بھی وہ ایک زیر تعمیر رہائشی منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی آئی تھی۔ معاذ بشری کو یہ ثقافت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کر دیتا ہے لیکن جن رئیس زادوں سے اس نے ان کا شکار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ یہ موقع انہیں یونیورسٹی ٹرپ کی صورت میں مل جاتا ہے اور ایک دن جنگل کی سیر کے دوران وہ فوٹو گرافی کے شوق میں سب سے الگ تھلگ ہو جانے والے معاذ کو بے خبری میں گھیر کر بری طرح زد و کوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دے دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس آنے پر انتظامیہ کے افراد، پولیس اور ریسکیو ذرائع کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جگہ کی جھوپڑی میں پاتا ہے۔ اپنی حالت سے اسے اپنے شدید زخمی ہونے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ جوگی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ معاذ کا موبائل جنگل میں ہی کہیں گر جاتا ہے اور جوگی کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا جس سے باہر کی دنیا سے رابطہ کیا جاسکے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے۔ جوگی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نواز کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے پرانے علم سکھانے کی ہامی بھر لیتا ہے اور معاذ واقعی اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ادھر جانے وقوع سے ملنے والے معاذ کے کمرے سے جب تصویریں نکلوانی جاتی ہیں تو بہت سے قدرتی مناظر کی تصویروں میں سے ایک ایسی تصویر بشری کی نظر میں آ جاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانک رہا تھا۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پروجیکٹ کے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشری تحقیق کر رہی تھی۔ بشری کے اپنے والد جرنلسٹ ہوتے ہیں اور حق گوئی ان کے خون میں شامل تھی۔ اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشری کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ مدے سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باذل نامی غنڈے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشری انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دنوں میں ہی معاذ واپسی کا ارادہ کرتا ہے تاہم ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا عرفان اللہ اور یزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو وقاص نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باذل اچانک بشری کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر دیتا ہے۔ معاذ کو واپس لانے کے لیے اچھے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اسے واپس آنے کا پیغام دیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کر کے اسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات لی جاتی ہیں، نہ بتانے پر اس کے بھائی کا ایک گردہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشری بھی انتقام کی آگ میں جلتی ہوئی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہو جاتی ہے۔ معاذ کو بچانے والا لڑکا وقاص اپنے گرد کے ساتھ ایک پارٹی میں جاتا ہے۔ وہاں اسے معاذ کے حوالے سے مشکوک ایک شخص نظر آتا ہے۔ وہ اس کے پیچھے جاتا ہے مگر اسے گھیر لیا جاتا ہے۔ بہر حال وقاص کو تنبیہ کے ساتھ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ادھر معاذ کے دوست عالم شاہ کے بہنوئی کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ کئی فنون میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے پہنا کر کر کے اس کے دماغ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ لٹھو سے حاصل انوکھے علم کی بدولت ان کا معمول نہیں بنتا۔ عالم شاہ اور اس کا نوکر سرد، باذل کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ عالم کی بہن سہل شاہ کے نومولود بیٹے کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اغوا کا الزام لطیف سومرو پر آتا ہے۔ عالم شاہ، باذل کی قید میں موجود ایک ذہنی شخص کی مدد سے وہاں سے فرار ہو جاتا ہے۔ ادھر بشری دعویٰ کرتی جاتی ہے۔ وہاں وقاص اسے باربی کے روپ میں پہچان لیتا ہے اور ان دونوں کے درمیان اعتماد کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ وہ سلطان کو مارنا چاہتی ہے تاہم وقاص اسے ایسا کرنے سے روکتا ہے۔ ادھر عالم شاہ، باذل کی قید سے نکل کر اس کا پیچھا کرتا ہے تاہم وہاں اچانک فائرنگ اور دھماکے ہونے لگتے ہیں۔ وہ وہاں معاذ کو دیکھتا ہے۔ صداقت شاہ، لطیف سومرو کو گھیرنے کے لیے اس کی خفیہ بیوی اور بچے کا کھوج لگاتے ہیں اور بچے کو اغوا کر لیتے ہیں۔ لطیف سومرو مجبور ہو جاتا ہے۔ معاذ کو اس کے گھر والوں سے ملنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ عالم شاہ کو اس کے والد انڈیا روانگی کا عندیہ دیتے ہیں۔ ادھر معاذ بھی ایک مشن پر سونیا کے ساتھ انڈیا روانہ ہوتا ہے تاہم کچھ لوگ سکھ یا تریوں سے بھری بس کو یرغمال بنا لیتے ہیں۔ معاذ اور سونیا تھخانے کے تمام افراد کو لٹھکانے لگا دیتے ہیں تاہم باہر موجود دیگر اغوا کاروں سے مقابلہ ہوتا ہے اور معاذ زخمی ہو جاتا ہے۔ صداقت شاہ کے انڈیا

میں موجود رہتے دار کے ہاں شادی ہوتی ہے۔ عالم شاہ، بھل اور سرد اندر یا روانہ ہو جاتے ہیں۔ انڈر پورٹ سے گھر روانگی پر راستے میں کچھ ٹیرے انہیں لوٹ لیتے ہیں۔ عالم شاہ ایکشن میں آنا چاہتا ہے تاہم اجالا نامی عالم شاہ کی کزن اس کا راستہ روک لیتی ہے۔ گھر پہنچنے پر پولیس کی ریڈ ہوتی ہے اور وہ عالم شاہ اور سرد کو لے جاتے ہیں۔ ادھر بشری اور وقاص باڈل کو اسپتال میں مارنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ بچ جاتا ہے۔ معاذ اور سونیا پناہ کی تلاش میں ہوتے ہیں اور بالآخر اپنے سہولت کاروں سے مل جاتے ہیں۔ عالم شاہ اور سرد کو تشدد کا نشانہ بنا کر ویرانے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ واپس اپنے میزبانوں کے ہاں پہنچ جاتے ہیں۔ شادی کے دوران انہیں پتا لگتا ہے کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں اجالا اور اس کا عاشق شامل ہوتے ہیں۔ وہ چھپ کر ان کی باتیں سن رہا ہوتا ہے کہ اسے چھاپ لیا جاتا ہے۔ تاہم وہاں مارا ماری ہوتی ہے اور اجالا کا عاشق مارا جاتا ہے۔ پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ ان کے کزن انہیں اپنے دوسرے خفیہ جنگلے پر پہنچا دیتے ہیں جہاں کچھ لوگ ان پر حملہ کر دیتے ہیں۔ وہ وہاں سے بھاگتے نکل جاتے ہیں۔ ادھر معاذ کو سونیا اپنے ساتھ نئے مشن پر لے کر جاتی ہے جس میں ایک ریلوے لائن کو دھماکے سے اڑانا ہوتا ہے۔ معاذ ایسا نہیں چاہتا اس لیے وہ ٹرین کی آمد سے قبل بارودی دھماکا کر دیتا ہے۔ وہ زخمی ہو جاتا ہے اور اسے ہندو سادھو اپنی کشتیا میں لے جاتا ہے جہاں اس کی اچھی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ سونیا کے آدمی معاذ کو تلاش کرتے ہیں مگر ناکام ہو جاتے ہیں۔ ادھر عالم شاہ اور سرد خفیہ ذریعے سے بارڈر پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ دھر لے جاتے ہیں اور ”را“ کی قید میں پہنچ جاتے ہیں۔ انہیں تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ادھر بشری باڈل کو مارنے کی کوشش میں خود نشانہ بن جاتی ہے۔ معاذ سادھو کی مدد سے ایک انڈین ہیروئن کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ وہیں اسے عالم اور سرد کی گرفتاری کا پتا چلتا ہے۔ ادھر بھل کو اس کا شوہر ذہنی اذیت دیتا ہے۔ معاذ ڈاکٹر فردوس سے ملتا ہے اور اسے بھل کی مدد کرنے کا کہتا ہے۔ عالم اور سرد قید سے فرار کا سوچتے ہیں اور دھر لے جاتے ہیں جس کی پاداش میں انہیں مزید تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ معاذ، وشا کے ذریعے عالم اور سرد کو ہالی وڈ لانا چاہتا ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ اس کا پیچھا کرتا ہے تاہم وشا کی گاڑی حادثے کا شکار ہو جاتی ہے۔ علیہ اور وقاص وغیرہ کو لالہ عیسیٰ ملک سے باہر نکال دیتا ہے اور ہر ممکن احتیاط کی ہدایت کرتا ہے لیکن علیہ پاکستان میں ٹوبہ سے رابطہ کرتی ہے جو ان کے لیے مصیبت بن جاتا ہے۔ ٹوبہ پر تیزاب پھینک دیا جاتا ہے۔ ادھر معاذ، بھل کے لیے پریشان ہوتا ہے اور اسے وہاں سے نکالنا چاہتا ہے۔ وقاص، علیہ اور اس کے گھر والوں کو مار دیا جاتا ہے۔ معاذ سمبھاش نامی شخص کے خلاف کارروائی کرتا ہے تاہم وہ مارا جاتا ہے اور معاذ بھی زخمی ہو جاتا ہے اور اپنا نشان وہاں چھوڑ دیتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس معاذ کو دیوانا نامی شخص سے مدد لینے کا کہتی ہے۔ معاذ اس کے ساتھ مل کر موہن نامی ”را“ کے ایجنٹ کو اغوا کر لیتا ہے۔ معاذ اپنے کزن کو پاکستان کال کرتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ اس کے گھر والوں کو مار دیا گیا ہے۔ وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کی ٹھان لیتا ہے۔ ادھر ڈاکٹر فردوس کو اس کے سسرال والے بھل کو بھگانے کی پاداش میں تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ معاذ، عالم اور سرد کی رہائی کے لیے کارروائی کرتا ہے اور انہیں ”را“ کی قید سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن عالم اور سرد کو دیوانا کے آدمی کسی دوسری جگہ پہنچا دیتے ہیں۔ سونیا معاذ کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتی ہے اور اسے اپنے تعاون اور مدد کی تصدیق دہانی کرواتی ہے۔ ادھر باڈل ایک جگہ لالہ عیسیٰ کی سوجد کی پرکارروائی کرتا ہے تاہم لالہ خود کو گولی مار کر ختم کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس کا انتقال ہو جاتا ہے۔ دیوانا گینگ ڈاکٹر فردوس کی میت اٹھنے پر وہاں فائرنگ کر دیتے ہیں۔ بھل اور جلیل مارے جاتے ہیں اور فیصل اور پانڈے زخمی ہو جاتے ہیں۔ پولیس دیوانا کو گھیر لیتی ہے۔ معاذ دیوانا اور اس کے آدمیوں کو نکالنے کے عوض عالم کا پتا معلوم کر لیتا ہے۔ سونیا اور معاذ حیدر آباد نواب بدر الدین کی حویلی پہنچ جاتے ہیں۔ تاہم کالے خان اور زادہادی کو میڈم ایکس کے کھنبے سے چھڑانے کے لیے انہیں واپس آنا پڑتا ہے، کالے خان کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ نواب صاحب کی حویلی میں عالم اور سرد کی رہائی کے لیے کارروائی کرتا ہے مگر نواب صاحب کا بیٹا ان کے سامنے آ جاتا ہے۔ وہ بھل کو بھی اغوا کر کے حویلی لے آتا ہے۔ تاہم وہ لوگ عبید کو قبضے میں کر کے وہاں سے نکل جاتے ہیں۔ وہ لوگ نئے ٹھکانے پر پہنچتے ہیں تو وہاں معاذ سے ملنے جا رہا نامی شخص آتا ہے۔ اسے معاذ نے ”را“ کی قید سے نکالا ہوتا ہے۔ ادھر بھل کا بیٹا اعظم اپنی ناک میں پتھر پھنسا لیتا ہے۔ جاو اور معاذ، بھل سمیت اسپتال جاتے ہیں اور پہچان لیے جانے پر پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ پولیس سے مقابلے کے بعد وہ ایک بستی میں پناہ کے لیے گھس جاتے ہیں اور دو لوگوں کو یرغمال بنا کر ان کی جموہری میں قیام کرتے ہیں۔ ادھر سونیا عالم وغیرہ سمیت سب کو ٹھکانا بدلنے کا کہہ کر معاذ کی تلاش میں نکلتی ہے اور اسے بستی میں پہنچنے پر معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ معاذ اور جاو وغیرہ انوپ نامی شخص کے ساتھ اس کے مالک کے جنگلے میں قیام کرتے ہیں۔ سونیا بھی معلومات حاصل کرتی ہوئی مذکورہ جنگلے تک پہنچ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور سرد بھی سونیا کا پیچھا کرتے ہوئے وہیں پہنچ جاتے ہیں۔ ادھر وقاص وغیرہ زندہ ہوتے ہیں۔ وقاص حلیہ بدل کر گھوکا باڈی گارڈ بنتا ہے۔ وہ معاذ کو تلاش کرنے کے لیے انڈیا روانہ ہوتا ہے۔ وہاں اس کی گل خان سے ملاقات ہوتی ہے اور معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ سونیا، معاذ اور دیگر ساتھیوں سے مل جاتی ہے تاہم جہاں وہ ہوتے ہیں وہ جگہ خطرناک ہوتی ہے۔ خطرہ ان کے سر پر منڈلا رہا ہوتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیں

”بھارت سے بہت اہم خبریں آئی ہیں میڈم“
 ”تفصیل سے بتاؤ۔“ میڈم ایکس نے بے تاثر
 چہرے کے ساتھ حکم دیا۔
 ”گلو استاد نے اپنے جس آدمی کو حامد کے کہنے پر

”اب بتاؤ، کیا بات ہے؟“ وہ سب سے الگ تھلک دوسرے کمرے میں جا کر بیٹھے تو اس نے سونیا کو کھوجتی نظروں سے دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے سوال کیا۔ فون کال سننے کے بعد اس میں عجیب تبدیلی آئی تھی۔ چند لمحے قبل وہ بے چین تھی کہ فوری طور پر اس جگہ سے نکلا جائے اور اب یوں ٹھس ہو گئی تھی جیسے کرنے کو کچھ باقی نہ بچا ہو۔

”کچھ بولو گی بھی یا نہیں؟“ اسے مسلسل خاموش پا کر وہ تھوڑا سا جھنجھلا یا۔

”مجھ سے میری زندگی کی کہانی سنو گے معاذ؟“ سوال کے جواب میں سوال آیا، وہ بھی ایسا جس نے معاذ کو اس کی ذہنی حالت کی طرف سے مشکوک کر دیا۔

”ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ ہمیں فوری طور پر یہاں سے نکلنا ہے اور اب قصے کہانیاں سنانے کی بات کر رہی ہو۔“

”یہ اختیار اب ہمارے پاس سے ختم ہو گیا ہے۔ اب ہمیں کوئی اور فیصلہ کرنا ہے۔“ اس کی آنکھوں میں ویرانی سی تھی۔ وہ وہ سونیا ہی دکھائی نہیں دے رہی تھی جسے مشکل سے مشکل حالات سے بھی لڑنا آتا تھا۔

”میں کچھ سمجھا نہیں۔ کیا تم بتاؤ گی کہ تمہارے لیے یہاں کس کی کال آئی تھی؟“ معاذ کے لہجے میں ہلکا سا شک تھا۔ بے شک سونیا نے کئی بار ان کا ساتھ دیا تھا لیکن اسے بھولتا نہیں تھا کہ وہ دشمنوں کی صف میں سے ہے۔

”کال کرنے والے کی شخصیت اور کال کرنے کی وجہ کو سمجھنے کے لیے تمہیں میری کہانی سننا پڑے گی۔“

”اگر ایسا ہے تو پھر ضرور سناؤ۔“ آخر معاذ کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔

”میری کہانی، میرے باپ تیمور خان سے شروع ہوتی ہے۔ اس کا تعلق افغانستان سے تھا۔ برسوں پہلے وہ اپنے والدین کے ساتھ امریکا گیا تھا اور وہاں کی تہذیب میں رچ بس کر خود کو تیمور کے بجائے نام کہلوانے لگا تھا۔ رنگ و روپ بھی ایسا تھا کہ کسی کو شک نہیں ہو پاتا تھا کہ نام کے پردے کے پیچھے کوئی تیمور خان بھی ہو سکتا ہے۔“ اس کی طرف سے اشارہ پا کر سونیا نے بلا توقف اپنی داستان سنانا شروع کر دی تھی اور ابتدائی جملوں نے ہی معاذ کی توجہ پوری طرح اپنی طرف مبذول کروا لی تھی۔

”نام ڈھین بھی تھا اور ونڈ سم بھی اس لیے لڑکیوں کے لیے مقناطیس جیسی کشش رکھتا تھا۔ وہ اپنی اس کشش سے فائدہ اٹھانے سے چوکتا نہیں تھا لیکن ابھی تک اس کی زندگی میں ایسی لڑکی نہیں آئی تھی جس کے لیے وہ خود کش محسوس

رکھ دیا۔ انوپ کا خوشی سے کھل اٹھنے والا چہرہ لٹک گیا اور اس نے ریسور اٹھا کر مری مری آواز میں ”ہیلو“ کہا۔ دوسری طرف سے جو بھی کہا گیا، اس نے اس کے چہرے پر حیرت بکھیر دی۔

”وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔“ اگلے ہی لمحے وہ ریسور قریبی صوفے پر بیٹھی سونیا کی طرف بڑھا رہا تھا۔

”یہ کیا بکواس ہے؟ تمہارے مالک کو کیسے پتا کہ سونیا یا کوئی اور یہاں موجود ہے؟“ معاذ نے پستل کی نال سے اس کی گردن پر دباؤ ڈالتے ہوئے سوال کیا۔ سونیا البتہ مہربان لب تھی اور سستے ہوئے چہرے کے ساتھ ریسور تمام چکی تھی۔

”ہیلو!“ وہاں موجود ہر شخص اس کے لہجے کی لرزش محسوس کر چکا تھا۔ اس واحد لفظ کی ادائیگی کے بعد اس کی زبان سے کچھ نہ نکلا اور وہ لب بھینچے دوسری طرف کی گفتگو سنتی رہی۔ دوسری طرف سے جو کچھ کہا جا رہا تھا، وہ یقیناً اس کے لیے تکلیف دہ اور پریشان کن تھا جس کی وجہ سے اس کے ماتھے پر لمحہ بلمحہ شکنوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

”ٹھیک ہے، میں سوچتی ہوں۔“ کافی دیر خاموشی سے دوسری طرف کی گفتگو سننے کے بعد اس نے ایک مختصر جملہ ادا کیا اور ریسور رکھ دیا۔

”ارے سونیا تم؟ تم کب یہاں پہنچیں؟“ وہ خود پر جی سوالیہ نظروں کے جواب میں کچھ بولتی، اس سے قبل ہی سبیل، اعظم کو گود میں اٹھائے اپنے زیر استعمال کمرے سے باہر نکلی اور سونیا کو سامنے پا کر بڑبڑا کر جوش ہو گئی۔ سونیا عادت و فطرت میں اس سے مختلف سہی لیکن مسلسل غیر مردوں کے درمیان رہتے ہوئے ایک دوسری عورت کو سامنے پا کر اسے اچھا لگا تھا۔

”تھوڑی ہی دیر ہوئی ہے مجھے آئے اور میں اکیلی نہیں ہوں۔ میرے ساتھ اور لوگ بھی ہیں۔“ سونیا نے ہونٹوں پر زبردستی مسکراہٹ سجا کر اسے جواب دیا اور اس کی گود میں موجود اعظم کو پیار کرنے لگی۔ نہادھو کر صاف ستھرا لباس پہننے سے اس کے مزاج پر اچھا اثر پڑا تھا اور خوب قلقاریاں مار رہا تھا۔

”ادا سامیں..... ادا سامیں آئے ہیں تمہارے ساتھ؟“ سبیل بے چین ہوئی۔

”بالکل، میری بہن!“ جواب میں سونیا کے بجائے ہماری مردانہ آواز سننے کو ملی تو وہ کرنٹ کھا کر چلی اور بے قراری سے جا کر عالم شاہ سے لپٹ گئی۔ معاذ نے اس منظر سے نظریں پھیریں اور سونیا کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

”اب بتاؤ، کیا بات ہے؟“ وہ سب سے الگ تھلک دوسرے کمرے میں جا کر بیٹھے تو اس نے سونیا کو کھوجتی نظروں سے دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے سوال کیا۔ فون کال سننے کے بعد اس میں عجیب تبدیلی آئی تھی۔ چند لمحے قبل وہ بے چین تھی کہ فوری طور پر اس جگہ سے نکلا جائے اور اب یوں ٹھس ہو گئی تھی جیسے کرنے کو کچھ باقی نہ بچا ہو۔

”کچھ بولو گی بھی یا نہیں؟“ اسے مسلسل خاموش پا کر وہ تھوڑا سا جھنجھلایا۔

”مجھ سے میری زندگی کی کہانی سنو گے معاذ؟“ سوال کے جواب میں سوال آیا، وہ بھی ایسا جس نے معاذ کو اس کی ذہنی حالت کی طرف سے مشکوک کر دیا۔

”ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ ہمیں فوری طور پر یہاں سے نکلنا ہے اور اب تمہیں کہانیاں سنانے کی بات کر رہی ہو۔“

”یہ اختیار اب ہمارے پاس سے ختم ہو گیا ہے۔ اب ہمیں کوئی اور فیصلہ کرنا ہے۔“ اس کی آنکھوں میں ویرانی سی تھی۔ وہ وہ سونیا ہی دکھائی نہیں دے رہی تھی جسے مشکل سے مشکل حالات سے بھی لڑنا آتا تھا۔

”میں کچھ سمجھا نہیں۔ کیا تم بتاؤ گی کہ تمہارے لیے یہاں کس کی کال آئی تھی؟“ معاذ کے لہجے میں ہلکا سا شک تھا۔ بے شک سونیا نے کئی بار ان کا ساتھ دیا تھا لیکن اسے بھولنا نہیں تھا کہ وہ دشمنوں کی صف میں سے ہے۔

”کال کرنے والے کی شخصیت اور کال کرنے کی وجہ کو سمجھنے کے لیے تمہیں میری کہانی سننا پڑے گی۔“

”اگر ایسا ہے تو پھر ضرور سناؤ۔“ آخر معاذ کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔

”میری کہانی، میرے باپ تیمور خان سے شروع ہوتی ہے۔ اس کا تعلق افغانستان سے تھا۔ برسوں پہلے وہ اپنے والدین کے ساتھ امریکا گیا تھا اور وہاں کی تہذیب میں رچ بس کر خود کو تیمور کے بجائے ٹام کہلوانے لگا تھا۔ رنگ و روپ بھی ایسا تھا کہ کسی کو شک نہیں ہو پاتا تھا کہ ٹام کے پردے کے پیچھے کوئی تیمور خان بھی ہو سکتا ہے۔“ اس کی طرف سے اشارہ پا کر سونیا نے بلا توقف اپنی داستان سنانا شروع کر دی تھی اور ابتدائی جملوں نے ہی معاذ کی توجہ پوری طرح اپنی طرف مبذول کروا لی تھی۔

”ٹام ذہین بھی تھا اور ہنڈسم بھی اس لیے لڑکیوں کے لیے مقناطیس جیسی کشش رکھتا تھا۔ وہ اپنی اس کشش سے فائدہ اٹھانے سے چوکتا نہیں تھا لیکن ابھی تک اس کی زندگی میں ایسی لڑکی نہیں آئی تھی جس کے لیے وہ خود کشش محسوس

رکھ دیا۔ انوپ کا خوشی سے کھل اٹھنے والا چہرہ لٹک گیا اور اس نے ریسور اٹھا کر مری مری آواز میں ”ہیلو“ کہا۔ دوسری طرف سے جو بھی کہا گیا، اس نے اس کے چہرے پر حیرت بکھیر دی۔

”وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔“ اگلے ہی لمحے وہ ریسور قریبی صوفے پر بیٹھی سونیا کی طرف بڑھا رہا تھا۔

”یہ کیا بکواس ہے؟ تمہارے مالک کو کیسے پتا کہ سونیا یا کوئی اور یہاں موجود ہے؟“ معاذ نے پستل کی نال سے اس کی گردن پر دباؤ ڈالتے ہوئے سوال کیا۔ سونیا البتہ مہربان لب بھی اور ستے ہوئے چہرے کے ساتھ ریسور تمام چکی تھی۔

”ہیلو!“ وہاں موجود ہر شخص اس کے لہجے کی لرزش محسوس کر چکا تھا۔ اس واحد لفظ کی ادائیگی کے بعد اس کی زبان سے کچھ نہ نکلا اور وہ لب بھینچے دوسری طرف کی گفتگو سنتی رہی۔ دوسری طرف سے جو کچھ کہا جا رہا تھا، وہ یقیناً اس کے لیے تکلیف دہ اور پریشان کن تھا جس کی وجہ سے اس کے ماتھے پر لمحہ بہ لمحہ شکنوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

”ٹھیک ہے، میں سوچتی ہوں۔“ کافی دیر خاموشی سے دوسری طرف کی گفتگو سننے کے بعد اس نے ایک مختصر جملہ ادا کیا اور ریسور رکھ دیا۔

”ارے سونیا تم؟ تم کب یہاں پہنچیں؟“ وہ خود پر جی سوالیہ نظروں کے جواب میں کچھ بولتی، اس سے قبل ہی سبکل، اعظم کو گود میں اٹھائے اپنے زیر استعمال کمرے سے باہر نکلی اور سونیا کو سامنے پا کر بڑبڑ جوش ہو گئی۔ سونیا عادت و فطرت میں اس سے مختلف سنہی لیکن مسلسل غیر مردوں کے درمیان رہتے ہوئے ایک دوسری عورت کو سامنے پا کر اسے اچھا لگا تھا۔

”تھوڑی ہی دیر ہوئی ہے مجھے آئے اور میں اکیلی نہیں ہوں۔ میرے ساتھ اور لوگ بھی ہیں۔“ سونیا نے ہونٹوں پر زبردستی مسکراہٹ سجا کر اسے جواب دیا اور اس کی گود میں موجود اعظم کو پیار کرنے لگی۔ نہادھو کر صاف ستھرا لباس پہننے سے اس کے مزاج پر اچھا اثر پڑا تھا اور خوب قلقاریاں مار رہا تھا۔

”ادا سامیں..... ادا سامیں آئے ہیں تمہارے ساتھ؟“ سبکل بے چین ہوئی۔

”بالکل، میری بہن!“ جواب میں سونیا کے بجائے بھاری مردانہ آواز سننے کو ملی تو وہ کرنٹ کھا کر پلٹی اور بے قراری سے جا کر عالم شاہ سے لپٹ گئی۔ معاذ نے اس منظر سے نظریں پھیریں اور سونیا کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

کرتا۔ یونیورسٹی کے دور میں آخر کار ایسی لڑکی بھی اسے نکرا ہی گئی۔ اسرائیل سے تعلق رکھنے والی رائیل خوبصورتی اور ذہانت میں اس سے شاید ایک قدم آگے ہی تھی اور اس ایک قدم آگے ہونے نے نام کو رائیل کے پیچھے لگا دیا۔ رائیل بھی زیادہ دن اسے نظر انداز نہیں کر سکی۔ دونوں میں دوستی ہوئی اور دوستی بڑھتے بڑھتے محبت کا روپ دھار گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کے مزاج کے رنگ پہچانے اور فیصلہ کر لیا کہ وہ ایک دوسرے ہی کے لیے بنے ہیں لیکن..... اس ”لیکن“ سے آگے سونیا نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

”نام نے اسے تھوڑے دنوں کے ساتھ میں ہی جان لیا تھا کہ رائیل کبکی یہودن ہے اور وہ ہرگز یہ قبول نہیں کرے گی کہ کسی مسلمان کو اپنی زندگی کے ساتھی کے طور پر چنے۔ رائیل کو کھونے کے ڈر سے اس نے اپنا تیمور ہونا چھپا لیا اور نام بن کر اس کے ساتھ عشق کے وہ سارے مرحلے طے کر لیے جن پر آزاد معاشرہ میں کوئی قدغن نہیں ہوتی۔“

”لیکن یہ تو دھوکا تھا اور محبت میں دھوکا دینے کی گنجائش نہیں ہوتی۔“ معاذ بے ساختہ ہی درمیان میں بول اٹھا۔

”تیمور خان عرف نام اس نکتے کو نہیں سمجھ سکا تھا جس کا نتیجہ ناقابل تلافی نقصان کی صورت نکلا اور میں آج بھی اس کے نتائج بھگت رہی ہوں۔“ اس کے لہجے میں محسوس کی جانے والی اداسی تھی۔

”یقیناً رائیل پر اس کا جھوٹ کھل گیا ہوگا؟“

”ہاں۔“ سونیا کی گردن اثبات میں ہلی۔

”محبت کی نشانی کو کھ میں آنے پر رائیل نے اس سے مطالبہ کیا کہ اب اس تعلق کو قانونی رشتے میں تبدیل کر لینا چاہیے۔ نام کو اعتراض نہیں تھا لیکن وہ بھول گیا تھا کہ قانونی رشتہ طے کرنے کے لیے قانونی دستاویزات بھی استعمال ہوں گی اور ان دستاویزات میں وہ نام نہیں، تیمور خان ولد شامل خان تھا۔“

”یعنی دھوکا پکڑا گیا اور رائیل نے تیمور خان کو چھوڑ دیا؟“ معاذ نے فوراً اندازہ لگایا۔

”چھوڑا ہی تو نہیں۔ رائیل کوئی عام لڑکی تھوڑی تھی جو اپنے ساتھ ہونے والے دھوکے کو بریک اپ کا نام دیتی اور خاموشی سے تیمور کی زندگی سے نکل جاتی۔“

”پھر؟“

”پھر یہ کہ اس نے تیمور کو اس دھوکے کی سزا دینے کا فیصلہ کیا اور ایک روز وہ روڈ ایکسیڈنٹ میں مارا گیا۔“ اس کی خوبصورت آنکھوں میں اداسی جھلکی۔

”اوہ نو..... مجھے یقین نہیں آتا کہ کوئی کسی سے محبت کا دعویدار ہو اور اسے یوں بے دردی سے ہلاک کروادے۔“ معاذ کو سن کر دھچکا لگا۔

”انتہا پسندی انسان سے کچھ بھی کروا سکتی ہے۔ رائیل کی انتہا پسندی نے بھی محبت کو لکھوں میں نفرت میں بدل دیا۔“

”مگر کسی کو قتل کروا دینا، وہ بھی امریکا جیسے ملک میں، کوئی معمولی کام تو نہیں ہے۔ رائیل نے یہ کام کیسے کیا؟“

”میں نے بتایا نا کہ وہ کوئی عام لڑکی نہیں تھی۔ اس کا یہودی انتہا پسند باپ پہلے ہی ایک ایسی تنظیم سے وابستہ تھا جو دنیا بھر میں اسرائیل کے مفاد کے لیے کام کرتی تھی۔ رائیل بھی ہائی اسکول کے زمانے ہی سے اس تنظیم کی ممبر بن چکی تھی اور اس کے لیے بالکل بھی مشکل نہیں تھا کہ وہ یوں کسی کو ہلاک کر دیتی۔“

”بہت ہی عجیب اور افسوسناک داستان ہے۔“

”اگر داستان وہیں ختم ہو جاتی تو پھر بھی کم افسوسناک ہوتی لیکن رائیل کے غم و غصے نے اسے اور بھی افسوسناک بنا دیا۔ اس سے یہ ہتک سہی ہی نہیں جاتی تھی کہ وہ کسی مسلمان کے بچے کو جنم دینے جا رہی ہے۔ اگر خود اس کی جان کو خطرہ نہیں ہوتا تو وہ اس بچے یعنی مجھے اس دنیا میں آنے سے قبل ہی ختم کروا دیتی۔“ وہ اپنی ان چاہی زندگی پر ناخوش نظر آرہی تھی۔

”تمہیں یہ سب کچھ تمہاری ماں نے بتایا ہے؟“ معاذ نے پوچھا۔

”نہیں، شروع میں تو میں صرف اتنا جانتی تھی کہ میرا باپ میرے دنیا میں آنے سے قبل ایک حادثے میں مر چکا ہے لیکن آہستہ آہستہ مجھے پتا چل ہی گیا کہ حقیقت کیا ہے۔“

”کیا حقیقت معلوم ہونے کے بعد تم نے اپنے دل میں اپنی ماں کے لیے نفرت محسوس کی؟“

”جسے محبت سے شناسائی نہ ہو، وہ نفرت کرنے کی اہلیت بھی کہاں رکھتا ہے۔ میں تو بس ایک غلام تھی جسے خود سے کچھ سوچنے، سمجھنے اور کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ میں نے بچپن کو بچپن کی طرح نہیں جیا۔ مجھے بھی ماں کی آغوش کی گرمی نصیب ہوئی نہ بھی میں نے دوستوں کے ساتھ بے فکر سے کھیلنے کودنے کا لطف اٹھایا۔ میں ایک پالتو جانور کی طرح تھی جسے اس کی مرضی کے خلاف سدھایا جاتا رہا۔ جبلت نے کبھی مجھے ادھر ادھر بھٹکایا بھی تو سخت سزاؤں نے واپس اس ٹریک پر ڈال دیا جس پر وہ مجھے چلانا چاہتے تھے۔ کڑی مشقتوں سے گزر کر میں نے وہ سب سیکھا جو مجھے

سکھایا گیا اور وہ سب کیا جس کا مجھے حکم دیا گیا۔“

”یہ تو ظلم ہے۔“

”صرف تمہارے نزدیک..... جبکہ کرنے والے تو اپنے خیال میں اپنے ملک اور مذہب کی خدمت کر رہے تھے۔“ وہ پھیکا سا مسکرائی۔

”یعنی اپنی ماں کی طرح تم بھی اپنے نانا کی تنظیم کا حصہ بن گئیں؟“

”کہہ سکتے ہیں..... لیکن سچ یہ ہے کہ وہ تنظیم اب میرے نانا کے زمانے سے زیادہ خطرناک اور طاقتور ہو چکی ہے اور کچھ پالیسیوں میں تبدیلی کے بعد دنیا بھر میں اپنے بچے گاڑ چکی ہے۔ دولت اور طاقت کے حصول کے لیے ہر طرح کا حربہ استعمال کیا جا رہا ہے اور پشت پناہی کے لیے وہ ساری عالمی طاقتیں موجود ہیں جن کے مفادات کی تنظیم حفاظت کرتی ہے۔“ سونیا اس پر انکشاف کر رہی تھی۔

”یقیناً تمہاری ماں کو تنظیم میں اہم مقام حاصل ہوگا؟“

”بالکل، وہ تنظیم کے ان بڑوں میں شامل ہے جو فیصلہ سازی کا اختیار رکھتے ہیں۔ کئی برسوں سے اس نے میڈم ایکس کے نام سے پاکستان میں قیام کر رکھا ہے اور منشیات واسلے کی اسمگلنگ، خفیہ معلومات کی منتقلی اور دہشت گردی سمیت ہر اس معاملے کی سرپرستی کرتی ہے جس سے ایک طرف تمہارے لوگوں کو نقصان پہنچے تو دوسری طرف تنظیم کو مالی فوائد حاصل ہوں۔ بھارت کے لیے خصوصاً معاوضہ ایسے کام کیے جاتے ہیں جن سے پاکستان کی معیشت اور ساکھ کو نقصان پہنچایا جاسکے۔“

”اور تم اس تنظیم کا ایک اہم پرزہ تھیں۔“ معاذ نے شکوہ کرنے والے انداز میں کہا۔

”مجھے ہونا ہی تھا۔ ایک ایسی بچی جس نے آنکھ ہی ان کے درمیان کھولی تھی، ان کی مرضی پر چلنے کے سوا کچھ بھی کیا سکتی تھی۔ تم نے ان کی طاقت دیکھی ہے نا؟ میڈم ایکس نے جب تمہیں اپنی تنظیم کے لیے منتخب کیا تو تم ایک بالغ انسان ہو کر بھی ان کے آگے کھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو گئے تھے۔“ سونیا نے اسے بتایا۔

”اپنے پیاروں کی محبت نے میرے ہاتھ پیر ضرور باندھے تھے لیکن یہ تم بھی جانتی ہو کہ وہ بھی مجھ سے میرے وطن کے مفاد کے خلاف کام کروانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ہر بار میں نے انہیں ڈاج دے کر اپنا دامن صاف رکھا۔“ اس کے پاس بھی اپنی صفائی دینے کے لیے دلیل

موجود تھی۔

”تم نے مزاحمت اس لیے کی کہ تم باشعور تھے لیکن ایک چھوٹی سی بچی ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ ان کے زیر تربیت پرورش پا کر میں اس قدر ان کی مطیع بن چکی تھی کہ جب داراب خان جیسے ناپسندیدہ شخص سے وابستہ کی گئی، تب بھی آواز نہیں اٹھا سکی۔“ اس کے لہجے میں وہی دکھ تھا جس سے کسی ناپسندیدہ بندھن میں بندھی عورت گزرتی ہے۔

”عجیب ہے تمہاری ماں۔ خود اپنے لیے تو اسے ایک مسلمان مرد قبول نہیں تھا اور تمہیں جانتے بوجھتے ایک مسلمان سے بیاہ دیا۔“

”مسلمان کے ہاتھوں پھنسنے اور اسے پھسانے میں فرق تھا۔ داراب خان افغانستان سے اسلحے اور منشیات کی اسمگلنگ کا سب سے بڑا ڈیلر تھا۔ اسے اپنے قابو میں رکھنے کے لیے مجھے اس کے ساتھ بٹھائی کر دیا گیا۔ جب سے میں اس کی بیوی بنی تھی، ہر ڈیل میری مرضی کے مطابق ہوتی تھی اور داراب خان کی حیثیت بس ایک کٹھ پتلی کی رہ گئی تھی۔ ساتھ ہی مجھ پر پابندی بھی تھی کہ میں اس کے بچے کی ماں نہیں بنوں گی۔ ظاہر ہے مجھے بھی اس بن مانس سے کوئی انیت نہیں تھی اس لیے داراب خان اس شادی میں سراسر خسارہ اٹھا کر ہی دنیا سے گیا۔“ اس نے اپنے مخصوص بے نیاز انداز میں کندھے جھٹک کر جواب دیا۔

”اب کیا ہوا تھا کہ تم سارے خوف بھلا کر تنظیم سے بغاوت پر اتر آئیں۔“ معاذ اس سے سوال کرنا چاہتا تھا لیکن پھر نہ کر سکا۔ اسے خود ہی احساس ہو گیا تھا کہ وہ اس سوال کا جواب جانتا ہے۔

”چلو ٹھیک ہے۔ یہاں تک تو مجھے ساری بات سمجھ آ گئی ہے اور مجھے تم سے ہمدردی بھی ہے کہ ایک عورت نے اپنی انا اور نظریات کی جنگ میں تمہاری ذات کو بھیٹ کر چڑھا دیا لیکن اس سب میں میرے اس سوال کا جواب کہاں ہے کہ تمہیں یہاں کال کرنے والا شخص کون تھا اور اس نے تم سے ایسا کیا کہا کہ تمہاری حالت ہی یکسر بدل گئی؟“ کسی نازک معاملے کو چھیڑنے سے گریز کرتے ہوئے وہ دوبارہ اس سوال پر آ گیا جس کے جواب کے حصول کے لیے سونیا کو سب سے الگ تھلگ لیے یہاں بیٹھا تھا۔ سونیا نے زبان سے جواب دینے کے بجائے ہاتھ میں دبی محلی ڈبیا کا ڈھکن کھول کر اس کے سامنے کر دیا۔ سلور ہالے میں چھ کونوں والا سنہری ستارہ لوگوں پر نصب ہیروں کے باعث بے طرح جگمگا رہا تھا۔

سے فرار کی کوشش کر کے اپنے ساتھیوں سمیت ماری جاؤ یا وہ زندگی قبول کر لو جس کا ہم تمہارے لیے انتخاب کریں۔“
 ”یہ تو کچھ عجیب سی شرط ہے۔ کیا ڈیوڈ نے کچھ بتایا ہے کہ وہ کس قسم کی زندگی قبول کرنے کی پیشکش کر رہا ہے؟“
 ”تفصیل تو نہیں بتائی لیکن یہ صاف طور پر کہا ہے کہ وہ زندگی اتنی بری ہو سکتی ہے کہ تم اپنے لیے خود موت کی خواہش کرو۔“ وہ مایوس کی تھی۔

”ایسے میں تو ہمیں پھر فرار والے آپشن پر ہی غور کرنا چاہیے۔“

”یہ بھی تقریباً ناممکن ہے۔ دونوں بنگلوں میں اندر باہر ایسا نظام موجود ہے کہ وہ دور بیٹھے صرف ایک انگلی کے اشارے سے ہماری موت کا انتظام کر دیں گے۔ بالفرض کوئی بچ کر نکلنے میں کامیاب ہو بھی گیا تو باہر ان کی پوری فورس اس کو بھونسنے کے لیے تیار بیٹھی ہوگی۔“ سونیا نے اسے تفصیل بتائی۔

”تو پھر یوں کہو نا کہ آپشن ہے ہی نہیں۔ سو فیصد موت کے مقابلے میں تو آدمی بُری ہی سہی، زندگی کا ہی انتخاب کرے گا۔“

”دیکھا جائے تو یہی آپشن ہے۔ بُری ہی سہی، زندگی ملے گی تو یہ امید تو رکھی جاسکے گی کہ ہم کسی نہ کسی طور کوشش کر کے خود کو اس زندگی سے نکال لیں گے۔“ سونیا اب بھی تھوڑی سی پُر امید تھی۔

”کیا یہ پیشکش ہم اور ہمارے تمام ساتھیوں کے لیے ہے؟“ معاذ نے ایک اہم سوال کیا۔

”اس نے اس بات کی وضاحت نہیں کی۔ دوبارہ فون کرے گا تو میں پوچھ لوں گی۔“

”اس بار مجھے بھی گفتگو میں شامل کر لیتا۔“ معاذ نے اسے ہدایت دی اور خود کی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

☆☆☆

”سونیا.....!“ اس نے گمن بردار عورت کو چھلاوے کی طرح دیوار پھاند کر ایک بنگلے سے دوسرے بنگلے میں کودتے دیکھا تو حیرت سے بے ساختہ اس کی زبان سے عورت کا نام پھسلا۔

”کدھر، کدھر اے؟“ اس کے ساتھ موجود گل خان نے اس کی آواز سن لی اور ادھر ادھر سر گھماتے ہوئے بے قراری سے پوچھا۔

”وہ کالے گیٹ والا بنگلا دیکھ رہے ہوتا؟ ابھی ابھی اس کی دیوار پھاند کر برابر والے بنگلے میں کودی ہے۔“

”یہ کیا ہے؟“ معاذ بیک وقت حیران اور متاثر ہوا اور ڈبیا اس کے ہاتھ سے لے کر ستارے کو غور سے دیکھنے لگا۔

”یہ گولڈن اسٹار ہے جو تنظیم کے اعلیٰ عہدیداران کو دیا جاتا ہے۔ میری ماں، مطلب میڈم ایکس کے پاس بھی یہ گولڈن اسٹار موجود ہے۔“

”لیکن یہ تمہیں کہاں سے ملا؟“ سوال کرتے ہوئے بھی معاذ کی نظروں میں ڈبیا میں رکھے اس ستارے کے لیے ستائش تھی۔

”برابر والے بنگلے سے۔“ سونیا نے ہم پھوڑا۔

”کیا مطلب؟ کیا تم یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ برابر والے بنگلے میں تنظیم کا کوئی اعلیٰ عہدیدار رہتا ہے؟“ معاذ چونکا۔

”ہاں، میں یہی کہہ رہی ہوں اور کچھ دیر قبل میرے لیے جوفن کال آئی تھی، وہ اسی ستارے کے مالک مسٹر ڈیوڈ کی تھی۔“ سونیا نے تصدیق کرنے کے ساتھ ساتھ ایک اور انکشاف کیا۔

”اسے کیسے معلوم ہوا کہ تم یہاں ہو؟“

”بچوں جیسے سوال مت کرو معاذ! ہم جن لوگوں کی رہائش گاہوں میں گھسے ہوئے ہیں، وہ یہاں ہلنے والے پتے کی کھڑکھڑاہٹ بھی سن سکتے ہیں۔“

”مطلب، دونوں بنگلوں کی.....؟“

”ہاں، دونوں بنگلوں کی۔ تم اور میں جو اتنی آسانی سے ان بنگلوں میں گھس بیٹھے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہاں سکیورٹی کا نظام کمزور ہے۔ وجہ صرف اتنی ہے کہ ہمیں چھوٹ دی گئی ہے اور اس وقت ہم ایک ایسے چوہے دان میں ہیں جہاں ہماری ہر حرکت دیکھنے کے ساتھ ساتھ ایک ایک لفظ سنا جا رہا ہے۔“ اس کی دی ہوئی ہر اطلاع پریشان کن تھی۔

”اگر ایسا ہے تو ہم اب تک یہاں کیوں بیٹھے ہیں؟ ہمیں تو فوراً سے بیشتر یہاں سے نکل جانا چاہیے تھا۔“ وہ اضطرابی طور پر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

”میں نے بتایا تھا نا کہ یہ اختیار اب ہمارے پاس سے ختم ہو چکا ہے۔“ سونیا یونہی اپنی جگہ پر ڈھیلے ڈھالے انداز میں بیٹھی رہی۔

”کل کر بتاؤ۔“ معاذ دوبارہ اپنی جگہ واپس بیٹھ گیا۔

”ڈیوڈ نے مجھ سے کہا ہے کہ تم اور معاذ ہمارے ساتھ غداری کے مرتکب ہوئے ہو۔ اصولاً اس جرم کی سزا موت ہے لیکن تمہیں تمہاری ماں کی وجہ سے خاص رعایت دی جا رہی ہے۔ اب یہ تمہاری چوائس ہے کہ تم اس بنگلے

انمول حیرے

☆ دنیا کی ساری چیزیں ٹھوکر لگنے سے ٹوٹ جاتی ہیں مگر صرف انسان وہ چیز ہے جو ٹھوکر لگنے کے بعد بنتا ہے۔

☆ انسانی معاشرہ کسی بُرائی کو کبھی آسانی سے قبول نہیں کرتا اسی لیے بُرائی کو قبول و مقبول بنانے کے لیے فکری طور پر راہ ہموار کی جاتی ہے۔

☆ بہترین دنوں کے لیے بُرے دنوں سے لڑنا پڑتا ہے۔

☆ لوگ بدلتے نہیں، بس بے نقاب ہو جاتے ہیں۔

☆ باطل کا انحصار ہمیشہ اسباب پر ہوتا ہے جبکہ حق کا انحصار ہمیشہ مسبب الاسباب پر ہوتا ہے۔

☆ یاد رکھیں، اگر آپ کبھی ناکام نہیں ہوئے تو اس کا مطلب ہے آپ نے کبھی کوشش ہی نہیں کی۔

☆ ساری عمر رشتے نبھاتے رہو، بس ایک بار چوک جاؤ تو سارے رشتے روٹھ جائیں گے..... سارے تعلق حساب مانگیں گے، ساری محبتیں امتحان لینے لگیں گی۔

رشتے نبھانا

رشتے نبھانا کوئی آسان کام نہیں۔ کئی بار اپنا دل دکھانا پڑتا ہے۔ دوسروں کی خوشی کے لیے اپنے ظرف کا پیمانہ بلند کرنا پڑتا ہے، خطائیں معاف کرنا پڑتی ہیں، دل صاف کرنے پڑتے ہیں۔ زندگی گزر جاتی ہے اعتماد بنانے میں۔ ذرا سا تکبر نہ صرف نظروں سے گرا دیتا ہے بلکہ اللہ کی نظر میں بھی ناپسندیدہ بنا دیتا ہے۔

لوگوں کی بے اعتباری، غلط رویوں کا درد دل میں دفن کر کے ملنا پڑتا ہے تب کہیں جا کے رشتوں کی ڈوری مضبوط ہوتی ہے لیکن یہ بات صرف اور صرف اعلیٰ ظرف کے لوگ ہی سمجھ پاتے ہیں۔

(مرسلہ: محمد انور ندیم، حویلی لکھا، اودکاڑہ)

”اس سفید گیٹ والے بچکے میں؟“ گل خان نے آنکھیں چندی کر کے اس جانب دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”ہاں، اسی میں۔ وہ اپنے اصل حلیے میں تھی اس لیے میں نے ایک نظر میں ہی اسے پہچان لیا۔“ وہ خاصا بڑبڑا جوش تھا۔

”تم کو پکا یقین ہے یا رار.....؟“ گل خان اب بھی مشکوک تھا۔

”بالکل، میں اسے قریب سے دیکھ چکا ہوں اس لیے مجھے یقین ہے کہ میں نے اسے پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کی۔“

”پھر اب کیا ارادہ ہے؟“ گل خان نے پوچھا۔

”سوچتے ہیں کچھ۔“ وہ غور سے دونوں بنگلوں کا جائزہ لینے لگا۔ ان دونوں نے یہاں تک پہنچنے میں لمبا سفر طے کیا تھا۔ پہلے وہ سونیا کے ان ساتھیوں سے ملے تھے جن کے پاس سونیا نے گل خان اور دیگر ساتھیوں کو پہنچنے کی ہدایت کی تھی۔ وہاں سے انہیں جسکی کا کلیو ملا تھا اور پھر جسکی کی مدد سے انہوں نے یہ جانا تھا کہ سونیا کھلونے بیچنے والی بن کر کس طرف گئی تھی۔ اس بستی سے سونیا کا سراغ لگانے کے لیے اس نے ایک چھوٹی سی ترکیب لڑائی تھی۔ بستی کے بچوں کو اکٹھا کر کے اس نے ٹوپی سے کبوتر اور رد مال سے خرگوش نکالنے جیسے شعبہ دے دکھانا شروع کر دیے تھے۔ ان شعبہ دوں کو دکھاتے ہوئے ہی اس نے اعلان کیا تھا کہ جس بچے کے پاس سب سے اچھا کھلونا ہوگا، اسے ٹوپی سے نکلنے والا کبوتر تحفے میں دیا جائے گا۔ اس غربت زدہ بستی میں بچوں کے پاس مشکل ہی سے کوئی کھلونا موجود تھا چنانچہ جسکی نے ایک سانولے سے بچے کے ہاتھ میں موجود اس کھلونے کو فوراً شناخت کر لیا جو وہ خود ہی سونیا کے بہروپ میں رنگ بھرنے کے لیے دیگر کھلونوں کے ساتھ خرید کر لایا تھا۔

تماشا نمٹانے کے بعد انہوں نے شامو نامی اس بچے کو گھیر کر اس سے بہت سی باتیں اگوالی تھیں۔ شامو نے انہیں بتایا تھا کہ سونیا نے اس کے گھر میں اچھا خاصا وقت گزارا تھا اور اس کی ماں سرسوتی کے ساتھ کھلونے بیچنے بنگلوں کی طرف گئی تھی۔ شامو سے حاصل شدہ معلومات میں اضافے کے لیے وہ سرسوتی سے ملے تھے اور لالچ و دھمکی، دونوں سے کام لے کر اس سے باقی کی معلومات حاصل کر لی تھیں۔ سرسوتی کے مطابق سونیا کو اس کے پیچھے کچھ دیر میں اس بچکے پر کھلونے بیچنے آنا تھا جہاں وہ کام کرنے گئی تھی لیکن اس کی وہاں سے واپسی تک وہ وہاں نہیں پہنچی تھی اور اس نے گمان کیا تھا کہ وہ مایوس ہو کر کہیں اور چلی گئی تھی کیونکہ اس بات کا امکان بہت کم تھا کہ امراء میں سے کوئی

اپنے بچوں کے لیے اس کے معمولی کھلونے خریدنے کی زحمت کرتا۔

انہوں نے سرسوتی سے حاصل شدہ معلومات کا تجزیہ کیا تھا اور اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ سونیا کو کوئی سراغ مل گیا تھا اور وہ وہیں کسی بنگلے میں موجود تھی۔ وہ سونیا کے نقش پا پر چلتے اس علاقے میں پہنچ گئے تھے اور دو گروپس میں تقسیم ہو کر تلاش کا کام کر رہے تھے۔ ابتدا میں جبکی، سونیا کے غصے سے ڈر کر ان کا ساتھ دیتے ہوئے جھجک رہا تھا لیکن پھر اس نے جبکی کو اس بات پر قائل کر لیا تھا کہ سونیا مشکل میں ہے اور انہیں ہر حال میں اسے تلاش کرنا چاہیے۔ ان کی تلاش کا سلسلہ اس اتفاق کی صورت کا میاب ہوا تھا کہ اس نے سونیا کو بنگلے کی دیوار پھاندتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

”میری مائو تو جبکی کو بلا کر اس سے بھی مشورہ لے لو۔“ خان نے اسے سوچ میں پڑے دیکھ کر تجویز پیش کی۔

”ٹھیک ہے۔“ وہ فوراً ہی اس سے رابطہ کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں وہ تینوں ایک مقام پر کھڑے ایک دوسرے سے بات کر رہے تھے۔

”میڈم کے اس طرح دیوار جھپ کر کے جانے کا مطلب ہے کہ وہ اس بنگلے میں چوری چھپے داخل ہوئی ہیں۔“ جبکی نے ساری تفصیل سن کر رائے دی۔

”شاید ایسا ہی ہو لیکن اس کے انداز میں، میں نے عجیب سی غلٹ محسوس کی تھی۔ یوں جیسے دیکھ لیے جانے سے زیادہ، وہاں پہنچنے کی فکر ہو۔“ اس نے جواباً اپنے انداز سے کا اظہار کیا۔

”اگر میڈم غلٹ کا شکار ہوتیں تو اب تک کوئی ہاپل دکھائی دے جاتی۔“ سونیا کی فطرت سے واقف جبکی نے رائے دی۔

”ہو سکتا ہے معاملہ کچھ اور ہو۔“

”کچھ اور کیا؟“

”یہ تو معلوم کرنا پڑے گا۔“ اس نے دور سے ہی متعلقہ بنگلے پر نظریں دوڑائیں۔

”کیا تم وہاں داخل ہونے کا سوچ رہے ہو؟“ جبکی نے اندازہ لگایا۔

”یقیناً۔“

”کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔ اگر ہماری وجہ سے میڈم کا کوئی کام بگڑا تو وہ سخت خفا ہوں گی۔“ جبکی اس کی تجویز سے متفق نہیں تھا۔

”ٹھیک ہے، تھوڑی دیر دور دور سے جائزہ لیتے رہتے

ہیں پھر کوئی ایکشن لیں گے۔“ اس نے بھی غلٹ دکھانا مناسب نہیں سمجھا۔ طے پایا کہ وہ مختلف سمتوں سے سفید اور کانٹے ٹیٹ والے دونوں بنگلوں کا جائزہ لیتے رہیں گے۔ اس نے خود اپنے لیے عقبی سمت منتخب کر لی۔ بذریعہ موبائل فون تینوں بہ وقت ضرورت ایک دوسرے سے رابطہ کر سکتے تھے۔

”ہوشیار رہنا خان اور خیال رکھنا کہ خود کو غیر ضروری طور پر مشکل میں نہ ڈالو۔“ اپنی پوزیشن پر جاتے جاتے اس نے گل خان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے نصیحت کی۔ وہ خان کو اپنے ساتھ یہاں تک لے تو آیا تھا لیکن اب احساس ہو رہا تھا کہ وہ ایک گھر بار والا بندہ ہے جس کے بیوی بچے اپنی ضروریات کے لیے اس پر انحصار کرتے ہیں۔ ٹانگ کا ہلکا سا ٹنگ بھی اس کا ایک کمزور پہلو تھا اور اپنی اس کمزوری کے باعث وہ کسی نازک موقع پر پھنس بھی سکتا تھا۔

”بے پھر ہو یا را! ام کوئی پاگل خانہ تھوڑی اے کہ خود کو خواہ مخاہ مشکل میں ڈالے گا، پر یاد رکھنا کہ ام مشکل وقت پڑنے پر پیچھے ہٹنے والوں میں سے بھی نئی اے۔“ جواباً گل خان کی طرف سے جذباتی پن کا اظہار ہوا۔ اس بار اس نے کچھ کہنا غیر ضروری سمجھا اور اس کا شانہ جھجک کر خود ٹھٹھا ہوا عقبی سمت میں بڑھ گیا۔ یہ عقبی حصہ دراصل بنگلوں کی دو طرفہ قطار کی وہ عقبی گلی تھی جہاں سیورج کی لائنیں اور سیفی ٹینک وغیرہ موجود تھے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنے مطلوبہ بنگلے کے عقب میں پہنچا اور کان کھڑے کرتے ہوئے کوئی سن گن لینے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔

”اے، کون ہو تم اور یہاں کیا کر رہے ہو؟“ ابھی وہ اس بنگلے میں داخل ہونے کے امکانات کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ بالکل پیچھے والے بنگلے کا عقبی دروازہ کھلا اور کچرے سے بھری بالٹی لیے باہر نکلنے والے ایک شخص نے اسے ڈپٹا۔ مثل اور حلیے سے وہ شخص ملازم ہی دکھائی دیتا تھا جو یقیناً کچر ابا ہر رکھنے کے چکر میں وہاں آچکا تھا۔

”پلمبر ہوں یا را! ادھر کسی نے سیورج لائن لیک ہونے کی کسپلین کی تھی، وہی دیکھنے آیا ہوں۔“ اس نے بروقت بہانہ بنایا۔

”لیکن تمہارے پاس سامان تو دکھائی نہیں دے رہا؟“ اس کی نظروں سے پھٹکا شک دور نہیں ہوا۔

”اپنا چھوٹا لے کر پہنچتا ہوں گا۔ اپن ایک دعوت میں تھا، ادھر ہی سیٹھ صاحب کا فون آ گیا تو اپن سیدھا یہاں پہنچ گیا اور چھوٹے کو سامان لے کر پہنچنے کو بول دیا۔ سالا ابھی تک آیا نہیں۔ اپن اس کا ہی ویٹ کرتا ہے۔“ اس نے اپنی

حد تک معقول بہانہ بنایا۔

”کون سے سیٹھ نے بلایا ہے تمہیں؟“ وہ شخص بھی مکمل معلومات حاصل کرنے پر تلا ہوا تھا۔

”وہ ہے نا گپتا سیٹھ!“ اس نے ٹکا لگایا۔

”ادھر کوئی گپتا سیٹھ نہیں رہتا۔“ ملازم نے اسے گھورا۔

”تم کا ہے کو اتنی جھک جھک کرتا ہے یا ر! سیٹھ اپنے کو

بلایا ہے تو ہی اپن آیا ہے نا ورنہ کس کو فرصت ہے ایسے اچ

خواتنواہ ادھر آنے کی۔“ وہ اس شخص سے زچ آچکا تھا لیکن مجبوری تھی کہ اسے مطمئن بھی کرنا تھا۔

”چل دکھا مجھے، کون سا پائپ لیک کر رہا ہے؟“ اس

شخص کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے اس لیے اکڑ

کر چلتا ہوا اس کی طرف آیا اور یہی اس کی سب سے بڑی

غلطی تھی۔ گردن اور کنپٹی پر کیے جانے والے صرف دو

داروں نے اسے کسی مردہ چھپکلی کی طرح پٹ سے گرنے پر

مجبور کر دیا تھا۔ وہ اس بے ہوش شخص کو کھینچتا ہوا اس کھلے

ہوئے دروازے تک لایا جہاں سے وہ برآمد ہوا تھا۔ ارادہ

یہی تھا کہ اسے دروازے سے اندر دھکیل کر دروازہ بند

کر دے گا لیکن اسے اندر منتقل کرتے ہوئے اندر کی بے

تحاشا خاموشی نے اسے ایک اور راہ دکھادی۔ عقبی جانب

موجود ایک چھوٹے سے کمرے میں جو شاید اس ملازم کے

استعمال میں ہی رہتا تھا، اسے منتقل کر کے دروازہ بند کیا اور

بچلے کے نچلے حصے کا ایک چکر لگایا۔

کچن کے چولہے پر دیپتی رکھی تھی جس میں ہلکی آج پر

کچھ پک رہا تھا۔ بچے سجائے بچلے کے صرف ایک کمرے میں

اسے ایک بوڑھی خاتون سوتی ہوئی دکھائی دی۔ اوپر ہی منزل

پر بھی کوئی موجود نہیں تھا لیکن گھر کی ترتیب اور آرائش سے

ظاہر تھا کہ وہاں کچھ اور لوگ بھی مقیم ہیں۔ یقیناً وہ جوان اور

متحرک لوگ ہوں گے جو زندگی سے اپنا اپنا حصہ وصول

کرنے کے لیے گھر سے نکلے ہوئے تھے اور پیچھے زندگی کی

دوڑ سے نکل جانے والی محض سانس کی ڈوری سے بندھی بڑھیا

ایک ملازم کے رحم و کرم پر اپنے بستر پر پڑی رہ گئی تھی۔

وہ مکینوں کی طرف سے کسی مداخلت سے بے فکر سیدھا

چھت تک پہنچا اور ارد گرد کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے مطلوبہ

بچلے میں بظاہر خاموشی تھی لیکن اندرونی حصے میں جلتی مدم

روشنیوں سے ظاہر تھا کہ اندر کچھ لوگ موجود ہیں۔ اس بچلے

تک رسائی کی تدابیر پر غور کرتا وہ اطراف کا جائزہ لینے لگا۔

ذرا سی دیر کے جائزے نے ہی اسے چونکا دیا۔ پہلے شمالی

حصے میں کھڑی ایک پولیس دین اس کی نظروں میں آئی اور

پھر معمولی وقفے سے اس نے دو مختلف سمتوں میں کیے بعد دیگرے مزید گاڑیاں رکھتے اور ان میں سے پولیس والوں کو باہر نکلتے ہوئے دیکھا۔ ان کی حرکات سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اس علاقے کا گھیراؤ کر رہے ہیں۔ اس نے جلدی سے اپنے دونوں ساتھیوں کو کانفرنس کال ملائی اور صورت حال سے آگاہ کیا۔

”پھر اب کیا کرنا ہے؟“ جنکی نے پریشانی سے پوچھا۔

”ہمیں فوری طور پر اس علاقے سے نکلنا ہوگا۔ پولیس

جس بھی چکر میں علاقے کو گھیر رہی ہے، ہم مشکوک افراد کی

حیثیت سے ان کے ہتھے چڑھ کر مصیبت میں پڑ سکتے ہیں۔“

”کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو۔“ جنکی نے اس کی تائید کی۔

”بس تو پھر تم لوگ نکلو۔ جنوب کا رخ کرنا۔ ابھی تک

اس سمت کوئی پولیس دین نہیں ہے۔“

”اور تم.....؟“ اب تک خاموش گل خان نے اس

سے استفسار کیا تو اس کے لہجے میں فکر مندی تھی۔

”میں محفوظ جگہ پر ہوں۔ موقع دیکھ کر نکل جاؤں گا۔

تم لوگ چل پڑو۔ میں تمہیں گاڑی کا رتا رہوں گا۔ اپنے ہتھیار

کہیں چھپا دو تاکہ اگر اتفاقاً پولیس سے سامنا ہو بھی جائے تو

بہانہ بنا کر نکلنے میں آسانی رہے۔“ اپنی طرف سے اطمینان

دلا کر اس نے انہیں ہدایات دیں۔

”یہ سب میں دیکھ لوں گا۔ تم بس اپنا خیال کرو۔“

جنکی نے اسے جواب دیا۔ وہ تجربہ کار بندہ تھا اور اسے اس

قسم کے حالات سے نمٹنے کا تجربہ تھا۔ اصل فکر اسے گل خان

کی طرف سے تھی۔

”خان کا خیال رکھنا یا ر!“ وہ فون بند کرتے کرتے

جنکی سے کہے بغیر نہ رہ سکا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے ان

دونوں کو جنوب کی سمت جاتے ہوئے دیکھ بھی لیا۔ وہ سست

ہنوز صاف تھی اور ابھی تک وہاں کوئی پولیس کی گاڑی نہیں

پہنچی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے گفتگو کرتے اور بے

پروا انداز میں آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ بالکل اچانک ہی

پولیس کی ایک گاڑی منظر میں داخل ہوئی۔ اس نے چونک کر

انہیں کال کرنے کے لیے موبائل پر انگلیوں کو حرکت دی

لیکن پھر رک گیا۔ فون کرنے کا موقع ہی نہیں تھا۔ پولیس

والے بالکل ان کے سروں پر پہنچ چکے تھے۔ وہ اپنی جگہ

ساکت فکر مندی سے اس طرف دیکھتا رہا۔ پولیس والے

گاڑی سے نکل کر ان دونوں سے سوال جواب کر رہے

تھے۔ اتنی دور سے وہ کچھ سن تو نہیں سکتا تھا لیکن یہ اندازہ

ہور ہا تھا کہ زیادہ تر سوالات کے جواب جنکی ہی دے رہا

تھا۔ کچھ دیر گفتگو کرنے کے بعد ایک پولیس والے نے اپنی ڈائری میں کچھ نوٹ کیا اور ان دونوں کو جانے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں بہ خیریت پولیس سے بچ کر نکل گئے تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ جنگی نے پتا نہیں کیا کہانی سنا کر پولیس کو مطمئن کیا تھا۔ اس کے لیے بس یہ اطمینان کافی تھا کہ وہ دونوں خیریت سے نکل گئے ہیں۔

ان دونوں کی طرف سے اطمینان ہو جانے کے بعد اس نے توجہ ایک بار پھر اس جنگل کی طرف مبذول کی جہاں سونا کو جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہاں اب بھی اسے کوئی دکھائی نہیں دیا لیکن وہ احساس بہر حال ابھر رہا تھا جو کسی جگہ انسانوں کی موجودگی کی نشاندہی کرتا ہے۔

”اس جنگل کے اندر جائے بغیر بات بنے کی نہیں۔“ وہ زیر لب بڑبڑایا اور بیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچا۔ جنگی منزل پر صورت حال ہنوز ویسی ہی تھی جیسی وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ کوئی بھی چھیڑ چھاڑ کیے بغیر وہ چپکے سے باہر نکل گیا۔ عقبی گلی حسب سابق سنان تھی۔ وہ اپنے مطلوبہ جنگل کی پشت پر پہنچا اور دیوار کا جائزہ لیا۔ دیوار خاصی بلند اور سیاٹھی لیکن بنور جائزہ لینے پر چند چھوٹے چھوٹے رخنے دکھائی دے گئے۔ اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ دونوں جوتے اتار کر جیبوں میں ٹھونے اور ہاتھ پیروں کی انگلیاں ان رخنوں میں پھنسا کر پھرتی سے اوپر چڑھنے لگا۔ اوپر سے جھانک کر وہ اس چیز کا پہلے ہی جائزہ لے چکا تھا کہ دیوار پر کالج کے ککڑے یا بجلی کے تار وغیرہ موجود نہیں ہیں چنانچہ ذرا سا اوپر پہنچ کر کسی بندر کی طرح اچھلا اور دیوار کی منڈیر تھام لی۔ اگلے لمحے وہ دیوار کے اوپر موجود تھا۔ یہی لمحہ قیامت ڈھا دینے والا تھا۔ طاقتور کرنٹ نے اسے زور کا جھٹکا دیا تھا اور وہ کسی فٹ بال کی طرح اچھل کر دھم کی آواز کے ساتھ جنگل کے پچھلے حصے میں جا گرا تھا۔

☆☆☆

”تم جانتے ہو کہ یہودی تعداد میں دیگر بڑے مذاہب کے ہمدرد کاروں کے مقابلے میں بہت کم ہیں لیکن انہیں اپنی ذہانت اور چالاکی کے استعمال سے خود کو منوانا آتا ہے۔ وہ دنیا کے ہر میدان میں اپنے پیچھے گاڑ رہے ہیں اور جہاں ضرورت ہو، اپنی عددی کمی کو پورا کرنے کے لیے دوسروں کو استعمال میں لے آتے ہیں۔“ جب تک ڈیوڈ کی دوسری کال نہ آ جاتی، ان کے پاس باتوں کے سوا کرنے کے لیے کوئی کام نہیں تھا چنانچہ خاموشی کے ایک چھوٹے سے وقفے کے بعد ایک بار پھر گفتگو کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ یہ

گفتگو زیادہ تر سونیا ہی کر رہی تھی کہ اس کے پاس کہنے کو بہت کچھ تھا۔ وہ باتیں جو شاید آج تک اس نے کسی سے نہیں کی تھیں، اب معاذ کے گوش گزار کر رہی تھی اور معاذ ایک اچھے سامع کا کردار ادا کرتا، توجہ سے سب سن رہا تھا۔ ان کے الگ کمرے میں آکر بیٹھنے کا لحاظ کرتے ہوئے ساتھیوں میں سے کسی نے اخلاقا وہاں آنا مناسب نہیں سمجھا تھا البتہ وہ ان کی دھیمی دھیمی آوازیں اور اعظم کی فلفاریاں وہاں بیٹھے سن سکتے تھے۔

”میں اپنے تئیں آئیڈیا کے ایک امیر لیکن عام شہری کی رہائش گاہ میں داخل ہوئی تھی اور ظاہر آسکیورٹی کا جو جدید نظام نصب تھا، اسے بھی دولت مندی کے کھاتے میں ڈال دیا تھا۔ اگر میں تمہارے ساتھ بچے کے لیے سیٹ کیے گئے کمرے میں نہ جاتی اور وہاں ہر طرف مقدس ستارے کا عکس نہ دیکھتی تو مجھے احساس ہی نہیں ہوتا کہ میں انجانے میں کس شخص کے گھر میں آ گئی ہوں۔ تم نے ڈیوڈ اور اس کی بیوی کی تصویریں دیکھی ہوں گی نا؟ سچ بتاؤ، کیا تمہیں یہ جان کر حیرت نہیں ہوئی تھی کہ اتنے عمر رسیدہ جوڑے کا ایک شیر خوار بے بی بھی ہے؟“

”ہاں، ہوئی تھی حیرت اور میں نے سوچا تھا کہ ہو سکتا ہے بے اولادی سے گھبرا کر انہوں نے کوئی بچہ ایڈاپٹ کر لیا ہو۔“ معاذ نے اس کی تائید کی۔

”مجھے یقین ہے کہ ڈیوڈ اور اس کی بیوی بے اولاد نہیں ہوں گے۔ ان کے اپنے بچے کسی ترقی یافتہ ملک میں پُر آسائش زندگی گزار رہے ہوں گے اور وہ یہاں ہندوستانی لاوارث بچوں کو ایڈاپٹ کر کے اپنے ڈھنگ سے ان کی تربیت کر رہے ہوں گے۔ ایسے بچے شروع ہی سے مذہبی جنون میں مبتلا ہوتے ہیں اور اس جنون کا فائدہ اٹھا کر انہیں کسی بھی مقصد کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اس ترکیب کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ایسا بچہ مر بھی جائے تو خود اپنا کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ وہ جسے یہودی بناتے ہیں، اسے کافذات میں لھانا نام تو دے دیتے ہیں لیکن بھی یہودی تسلیم نہیں کرتے۔ ان کا نسل برتری کا غرور اس بچے کے سوا جس نے یہودی ماں کی کوکھ سے جنم لیا ہے، کسی کو یہودی تسلیم کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔“ اس نے خود یہودی ماں کی کوکھ سے جنم لیا تھا اور یہودیوں کے درمیان ہی پٹی بڑھی تھی اس لیے ان کی رگ رگ سے واقف تھی۔

”تمہاری پرورش بھی یقیناً اٹمی خطوط پر ہوئی ہوگی؟“ معاذ نے دریافت کیا۔

”بالکل۔“

”پھر تم میں وہ مذہبی جنونیت کیوں نہیں ہے بلکہ اب تو تم بغاوت کی راہ پر چل نکلے ہو؟“

”میرا معاملہ باقی بچوں سے تھوڑا مختلف اس لیے ہے کہ مجھے ان کی طرح نگہری ماحول میں نہیں پالا گیا۔ میں ان مظلوم فلسطینی بچوں کے ساتھ پلی بڑھی جن کو یتیم کرنے کے بعد اپنی جنگ کا آئندہ بنانے کے لیے تیار کیا جا رہا تھا۔ مجھے ان میں سے ایک بچہ آج بھی یاد ہے۔ اسے چھوٹی سی عمر میں قرآن کا کافی حصہ یاد تھا اور وہ مجھے بتاتا رہتا تھا کہ جو کچھ ہمیں مسلمانوں کے خلاف پڑھایا اور بتایا جا رہا ہے، وہ سچ نہیں ہے۔ وہ مجھے محمد ﷺ کی سیرت کے متعلق بہت سے متاثر کن ٹھسے سنا تھا لیکن پھر ایک دن ہمارے اتالیق نے ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو سن لی اور اس جرم میں اسے اتنی کڑی سزا دی گئی کہ وہ زخموں کی تاب نہ لا کر چند دنوں میں مر گیا۔ میں نے دفنائے جانے سے پہلے اس کی لاش دیکھی تھی اور میں قسم کھا کر کہہ سکتی ہوں کہ میں نے پوری زندگی میں کسی مرنے والے کے چہرے پر ایسی رونق اور روشنی نہیں دیکھی۔“ اس کی آنکھیں نم تھیں اور وہ دور کہیں کسی اور منظر میں پہنچی ہوئی تھی۔

”اس کی موت نے مجھے ڈرا دیا تھا اس لیے میں نے کبھی قاعدے قوانین سے ہٹ کر چلنے کی ہمت نہیں کی اور وہ سب کچھ سیکھتی رہی جو مجھے سکھایا جاتا رہا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اپنے بچپن کے دوست کی وہ باتیں ہمیشہ میرے ذہن کے کسی گوشے میں موجود رہیں۔ پھر جب میری داراب سے شادی ہوئی تو اس کی ماں کی وجہ سے بچپن کی وہ باتیں ایک بار پھر تازہ ہو گئیں۔ داراب جتنا بڑا ایدم عاشق تھا، اس کی ماں اتنی ہی نیک اور عبادت گزار عورت تھی۔ وہ روز بلند آواز میں قرآن کی تلاوت کرتی تھی اور انجانے میں ان سارے نظریات پر ضرب لگاتی رہتی تھی جو مجھے ازبر کردائے گئے تھے۔ داراب کی ماں مری تو مجھے خود سے لڑنے کی اذیت سے نجات ملی اور میں اس راہ پر آسانی سے چلنے لگی جس پر چلنے کی مجھے تربیت دی گئی تھی لیکن اندر جو تقسیم تھی، وہ تو قائم ہی رہی اور جب ایسا ہو تو بندہ کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی بہانے انقلاب سے گزرتا ہی ہے۔ میں بھی گزر گئی۔“ اس نے گویا اپنی داستان ختم کر کے چپ سا دھ لی۔

”اس سب میں تم ماں بیٹی کے تعلق کا کیا ہوا؟ کچھ بھی سہی، وہ تمہاری ماں تھی اور ماں اپنی اولاد سے محبت کیے بغیر رہ ہی نہیں سکتی۔“ سونیا سے یہ سب کہتے ہوئے اس کے تصور

میں اپنی ماں کی تصویر لہرا گئی۔ اس کی خوش ادا اور سلیقہ مند ماں اولاد کے آرام پر اپنا سکون وارد دیتی تھی۔ اس کی زندگی کا محور و مرکز اپنی اولاد تھی اور جب اسے اس اولاد کی دوری کی اذیت سہنی پڑی تو پھر وہ زیادہ دن جی نہیں سکی۔ اپنی ماں کی موت اور کنبے کی جدائی کا داغ سینے میں لیے وہ ان ظالموں کے خلاف بہت کچھ کرنا چاہتا تھا لیکن ہر بار حالات ہاتھ پیر باندھ کر اسے بے بس کر ڈالتے تھے۔

”میری ماں بھی ایک تقسیم شدہ عورت ہے۔ فطرت اسے مجھ سے محبت کرنے پر مجبور تو کرتی ہے لیکن زخمی اپنا ایسا کرنے نہیں دیتی۔ اسے ہر بار یاد آ جاتا ہے کہ میں اس شخص کی نشانی ہوں جو دھوکے سے اس کی زندگی میں شامل ہوا تھا۔ یوں بھی اس کے نزدیک اولاد کا نمبر ملک اور قوم کے بعد آتا ہے اور وہ اس جنون میں مبتلا ہے کہ اپنی قوم کی حکمرانی پوری دنیا پر قائم کر کے دم لے گی۔“ غداری کا الزام لگ چکا تھا اور سزا کا فیصلہ بھی ہو چکا تھا اس لیے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ وہ جو بھی گفتگو کر رہی ہے، اسے کہیں اور بتنا جا رہا ہوگا۔

”مذہبی جنون جہاں بھی ہو، وہ انسان کو نارمل نہیں رہنے دیتا۔ ایسا جنونی انسان بھول جاتا ہے کہ دنیا کا کوئی بھی مذہب نہ تو انسانوں سے نفرت کرنا سکھاتا ہے اور نہ ہی انسانیت کی تذلیل کی اجازت دیتا ہے۔ یہ بس کچھ مخصوص لوگ ہوتے ہیں جو معصوم لوگوں کو اپنے پیچھے لگا کر ایسی انتہا پسندی پر لے جاتے ہیں جس کے نتیجے میں پیدا ہونے والا ظلم انسانیت کو شرمانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ہمارے درمیان بھی ایسے جنونیوں کا ایک طبقہ موجود ہے۔ بس اللہ سے یہی دعا ہے کہ ایسے جنونیوں کو ہدایت دے اور اس دنیا میں اسن قائم کرے۔“ معاذ کے الفاظ میں دکھ بھی تھا اور اس بد صورتی کا اعتراف بھی جو وطن عزیز کے لیے ایک ایسا داغ بن گئی تھی جو آہستہ آہستہ دنیا بھر میں پاکستانیوں کے لیے ناپسندیدگی اور نفرت کا باعث بن رہی تھی۔

”تمہارے ہاں اس جنونیت کو باقاعدہ پلانٹ کیا گیا ہے۔ تمہاری مخالف قوتوں نے سمجھ لیا تھا کہ مذہب تمہاری سب سے بڑی قوت ہے اس لیے انہوں نے اس شعبے پر کام کیا اور چالاکي سے ایسے لوگوں کو اس شعبے میں داخل کیا جنہوں نے سب کچھ الٹ کر رکھ دیا۔ اس عدم توازن نے تمہارے لوگوں کو ذہنی طور پر متوازن نہیں رہنے دیا ہے۔“ سونیا کا تبصرہ سچ پر مبنی تھا لیکن اسے اس پر رائے دینے کا موقع نہیں ملا کہ باہر سے سنائی دینے والی ایک زوردار آواز

نے توجہ کھینچ لی تھی۔

”یہ کیا ہوا؟“ سونیا پریشانی سے بولتی ہوئی اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی۔

”ایسا لگتا ہے، باہر کوئی شے آ کر گری ہے۔“ معاذ نے تبصرہ کیا اور وہ دونوں تیزی سے کمرے سے باہر نکلے۔ لاؤنج میں موجود ان کے ساتھیوں نے بھی وہ آواز سن لی تھی اور پریشان کھڑے تھے۔

”آواز عقبی حصے سے آئی ہے۔ ہم چل کر دیکھتے ہیں کہ کیا ہوا ہے۔“ جارو، معاذ کی صورت دیکھتے ہی بولا تو معاذ اس کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے اس کے ساتھ چل پڑا۔ براہ راست باہر نکلنے کے بجائے انہوں نے پہلے عقبی کمروں کی اس طرف کھلنے والی ایک کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا۔ باہر ایک جوان العمر آدمی زمین پر آڑھا ٹیڑھا پڑا ہوا تھا اور اس کی حالت سے ظاہر تھا کہ وہ بے ہوش ہے۔

”یہ کون ہے اور کہاں سے آیا؟“ ان کے پیچھے چلی آنے والی سونیا نے بھی اس شخص کو دیکھا اور حیرت سے بولی۔

”باہر نکل کر دیکھنا بڑے گا۔“

”یہ کوئی چال بھی ہو سکتی ہے۔“ معاذ کا ارادہ جان کر اس نے خدشے کا اظہار کیا۔

”ہم جس طرح پھنس چکے ہیں، اس کے بعد کسی چال کی گنجائش باقی تو نہیں رہتی۔“ معاذ کی بات میں وزن تھا۔

”پھنس چکے ہیں سے مطلب؟“ جارو نے تشویش سے پوچھا۔

”کیا تمہیں نہیں معلوم؟ میں تو سمجھ رہا تھا کہ تمہارے لیے کانوں نے سونیا اور میرے درمیان ہونے والی تمام گفتگو تم تک پہنچا دی ہوگی۔“ معاذ کو اس کے یوں سوال کرنے پر حیرت ہوئی۔

”میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا دوست کہ کسی دوسری جگہ ہونے والی گفتگو سننے کے لیے مجھے ارادنا اپنی توجہ مرکوز کرنا پڑتی ہے اور میں اتنا بد اخلاق انسان نہیں ہوں کہ دو دوستوں کی تنہائی میں جاری گفتگو پر کان لگا کر بیٹھ جاؤں۔“

”پھر تو تمہیں پوری تفصیل سنانا پڑے گی اور یہ کام میں باد دوستوں کی موجودگی میں کروں گا۔ فی الحال جو مسئلہ درپیش ہے، اسے چل کر دیکھتے ہیں۔“ معاذ نے اس سے کہا اور لاؤنج میں واپس آیا جہاں باقی لوگ ان کے منتظر تھے۔

”پچھلی طرف ایک آدمی بے ہوش پڑا ہے۔ بظاہر کوئی زخم نظر نہیں آ رہا لیکن اس کی بے ہوشی جینوئن لگتی ہے۔“ اسے کرنٹ لگا ہوگا۔“ اس نے منتظر لوگوں کا تجسس

دور کرنے کے لیے جو اطلاع دی تھی، اس پر سب سے پہلے اور بے ساختہ رد عمل انوپ نے دیا۔

”کرنٹ؟ کیا یہاں دیواروں میں کرنٹ دوڑ رہا ہے؟ لیکن میں نے تو کوئی الیکٹرک وائر وغیرہ نہیں دیکھا۔ ہم خود کبھی پڑوس سے دیوار پھلانگ کر اندر آئے تھے۔“ انوپ کی دی اطلاع اس کے لیے حیران کن تھی۔

”الیکٹرک وائر نہیں بچھائے گئے ہیں۔ لوہے کی پتلی سی پتیاں منڈیروں پر ایک پٹی کی صورت موجود ہیں اور ان پر دیواروں کے جیسا ہی کلر کیا گیا ہے اس لیے ایسے دیکھنے میں نظر نہیں آتیں۔“ انوپ نے بتایا۔

”میرے خیال میں پہلے اس بندے کو اٹھا کر اندر لے آتے ہیں پھر باقی کی تفصیل کرتے رہیں گے۔“ جارو نے گفتگو میں دخل دیا اور سرمد کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کرتے ہوئے باہر نکل گیا۔ دونوں ذرا دیر میں اس شخص کو اٹھائے اندر لے آئے اور نیچے قالین پر لٹا دیا۔ فوراً ہی اسے ہوش میں لانے کی تدابیر کی جانے لگیں۔ جارو اور سونیا دونوں ہی ابتدائی طبی امداد کے اصولوں سے واقف تھے

اس لیے ان کی تدابیر کامیاب ٹھہریں اور وہ شخص آنکھیں کھول کر پلکیں پٹپٹانے لگا۔ انداز سے صاف ظاہر تھا کہ ہوش آ جانے کے باوجود حواس پوری طرح بحال نہیں ہوئے ہیں اور وہ ارد گرد کے ماحول کو سمجھنے سے قاصر ہے۔

”بڑا ظالمانہ طریقہ ہے سیکورٹی کا۔ اس طرح تو کسی کی جان بھی جاسکتی ہے۔“ اس شخص کی حالت دیکھتے ہوئے سرمد نے غصے سے تبصرہ کیا۔

”صرف پچھلی دیوار کا سسٹم آن کیا جاتا ہے اور وہ بھی فوری ایکٹیو نہیں ہوتا۔ پہلی بار پتری پر پریشر پڑنے سے کچھ نہیں ہوتا لیکن دوبارہ بھی ایسا ہو تو کرنٹ آ جاتا ہے۔ مجھے تو حیرت ہے کہ یہ بندہ اتنی اونچی دیوار پر چڑھا کیسے؟ وہاں تو بلایاں وغیرہ بھی نہیں چڑھ سکتیں۔“ انوپ نے گویا وضاحت دی۔ اس کی ملازمت کے عرصے میں یہ پہلا واقعہ پیش آیا تھا کہ کسی نے عقبی دیوار پھانک کر اندر داخل ہونے کی کوشش کی تھی اور کرنٹ کا نشانہ بن گیا تھا۔

”یہ سب باتیں چھوڑو اور اس کے لیے ایک گلاس گرم دودھ لے کر آؤ۔“ معاذ نے ڈپٹ کر اس سے کہا تو وہ منہ بناتا ہوا کچن کی طرف بڑھ گیا۔ پیچھے جارو اس کی نگرانی کے لیے موبود تھا۔ انوپ کے مزاج کی تیزی و طراری کی وجہ سے اس پر بالکل بھی بھروسہ نہیں کیا جاسکتا تھا البتہ اس کا ساتھی ہاشوا اس کے مقابلے میں قدرے بزدل اور بے ضرر تھا

”یہ سب باتیں چھوڑو اور اس کے لیے ایک گلاس گرم دودھ لے کر آؤ۔“ معاذ نے ڈپٹ کر اس سے کہا تو وہ منہ بناتا ہوا کچن کی طرف بڑھ گیا۔ پیچھے جارو اس کی نگرانی کے لیے موبود تھا۔ انوپ کے مزاج کی تیزی و طراری کی وجہ سے اس پر بالکل بھی بھروسہ نہیں کیا جاسکتا تھا البتہ اس کا ساتھی ہاشوا اس کے مقابلے میں قدرے بزدل اور بے ضرر تھا

”یہ سب باتیں چھوڑو اور اس کے لیے ایک گلاس گرم دودھ لے کر آؤ۔“ معاذ نے ڈپٹ کر اس سے کہا تو وہ منہ بناتا ہوا کچن کی طرف بڑھ گیا۔ پیچھے جارو اس کی نگرانی کے لیے موبود تھا۔ انوپ کے مزاج کی تیزی و طراری کی وجہ سے اس پر بالکل بھی بھروسہ نہیں کیا جاسکتا تھا البتہ اس کا ساتھی ہاشوا اس کے مقابلے میں قدرے بزدل اور بے ضرر تھا

”کیوں کا جواب تو آپ کو مجھ سے تنہائی میں بات کر کے ہی مل سکے گا۔“ اس پر گویا معاذ کے لہجے کا اثر ہی نہیں ہوا۔

”یہ بولتے ہوئے آواز بھی بدلنے کی کوشش کر رہا ہے۔“ سونیا نے معاذ کے کان میں سرگوشی کی۔

”میں نوٹ کر چکا ہوں۔“ معاذ نے اسے آہستہ سے جواب دیا اور نوجوان کی طرف متوجہ ہوا۔

”اگر میں تمہارا مطالبہ ماننے سے انکار کر دوں تو؟“ ”تو میں آپ سے معذرت کر لوں گا کیونکہ جو کچھ میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں، اس کے لیے تنہائی ہی مناسب ہوگی۔“ اس کے لہجے میں سنجیدگی اتر آئی۔ معاذ کچھ دیر اسے بغور دیکھتا رہا پھر فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

”ٹھیک ہے، آؤ میرے ساتھ۔“ ”بہت شکریہ۔“ وہ اس کا جواب سن کر خوش ہو گیا اور جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہونے کی کوشش کی لیکن اس کوشش میں اس کے چہرے کے زاویے بگڑ گئے۔

”کیا تم کوئی تکلیف محسوس کر رہے ہو؟“ معاذ نے فوراً محسوس کیا۔

”کرنٹ کھا کر جتنی بلندی سے میں گرا ہوں، اس کے بعد یہ سوال بنتا تو نہیں ہے۔“ اس نے سسکی سی صورت بنا کر جواب دیا۔

”مشورہ کس نے دیا تھا یوں دوسروں کے گھروں کی دیواریں پھاندنے کا؟“ سونیا کو اس کی اداکاری پر غصہ آیا۔

”میں تو صرف آپ کی نقل کر رہا تھا جی۔ بس غلطی یہ کی کہ بازو سے پھلانگ کر آنے کے بجائے پیچھے سے آ گیا۔“ ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے اس کے انداز میں اس بلا کی معصومیت بھی کہ نہ چاہتے ہوئے بھی معاذ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی البتہ سونیا کے ماتھے پر دو تین بل نمودار ہوئے۔

”خیال سے معاذ! مجھے یہ شخص خطرناک لگ رہا ہے۔“ اس نے معاذ کو نصیحت کرنا ضروری سمجھا۔ اگر وہ ذرا سا کبھی اشارہ کر دیتا تو وہ اس کے ساتھ نگرانی کے لیے اندر چلی جاتی۔

”ڈونٹ وری۔ میں دیکھ لوں گا۔“ معاذ نے اسے تسلی دی اور نوجوان کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

”معاذ بھائی.....! آپ کو یوں زندہ سلامت اپنے سامنے دیکھ کر مجھے کتنی خوشی محسوس ہو رہی ہے، میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔“ دروازہ بند ہوتے ہی نوجوان لپک کر اس کے

بلکے جب سے ان کی تعداد میں اضافہ ہوا تھا، وہ کچھ گھبرایا ہوا نظر آ رہا تھا اور مسلسل ایک کونے میں سٹ کر بیٹھا ہوا تھا۔

”تم کون ہو مسٹر؟ کیا تم بتانا پسند کرو گے کہ تم نے دیوار پھاند کر اندر داخل ہونے کی کوشش کیوں کی؟“ سونیا اب اس شخص سے مخاطب تھی اور اسے بات کرنے پر اکسار ہی تھی لیکن وہ جواب دینے کے بجائے خاموشی سے اس کے چہرے کو گھور رہا تھا۔

”اسے سہارا دے کر بٹھاؤ سرمد! دودھ وغیرہ پی کر شاید اس کے حواس پوری طرح بحال ہو سکیں۔“ معاذ کو پتا نہیں کیوں اس جوان پر رحم آ گیا جو اسے سونیا کی فوری تفتیش سے بچانے کی کوشش کی۔ اس کی آواز سن کر جوان نے نظروں کا رخ پھیر کر اس کی طرف دیکھا اور معاذ نے ان آنکھوں کا تاثر بدلتا دیکھا۔ یوں لگا کہ وہ اسے دیکھ کر خوش ہوا ہو لیکن بس یہ پل بھر کی بات تھی۔ اس نے نظروں کا زاویہ بدلا اور سرمد کے سہارے اٹھ کر بیٹھنے لگا۔ اسی اثنا میں انوپ، جارو کی نگرانی میں گرم دودھ کا گلاس لے کر آ گیا۔

نوجوان اطمینان سے دودھ کا گلاس خالی کرنے لگا۔ ”مجھے یقین ہے کہ یہ شخص میک اپ میں ہے اور اس نے اپنے چہرے میں تبدیلیاں لانے کے لیے پلاسٹک اور کاسمیٹک سر جریز بھی کروا رکھی ہیں۔“ سونیا اس کے قریب سے اٹھ کر معاذ کے پاس آئی اور دھیمی آواز میں آگاہ کیا۔

”واقعی؟“ معاذ چونکا اور غور سے نوجوان کے چہرے کو دیکھا۔ یقیناً جو بھی تبدیلیاں کی گئی تھیں، وہ بہت ماہر ہاتھوں نے کی تھیں اس لیے دور سے دیکھنے پر اسے کچھ محسوس نہیں ہو پا رہا تھا۔ سونیا البتہ اس کے بالکل قریب بیٹھی رہی تھی اس لیے اس کی تجربہ کار نظروں نے تبدیلیوں کو بھانپ لیا تھا۔

”پتا نہیں یہ کون مصیبت ہے۔ اب اس کی اصلیت معلوم کرنے کے لیے اس کا بھی انٹرویو کرنا پڑے گا۔“ وہ پہلے ہی تناؤ کا شکار تھا۔ ڈیوڈ کے اب تک دوبارہ کال نہ کرنے سے اس تناؤ میں اضافہ ہوا تھا اور اوپر سے ایک اور مسئلہ نازل ہو گیا تھا تو جھنجلاہٹ محسوس کرنا فطری سی بات تھی۔ اس جھنجلاہٹ نے خود بخود اس کی نظروں میں تندہ پیدا کر دی۔ نوجوان نے دودھ کا گلاس ختم کر کے نیچے رکھا اور اطمینان سے معاذ کی طرف دیکھنے لگا۔ معاذ کی تندہ کے مقابلے میں اس کی نظروں میں بڑی نرمی تھی۔

”مجھے آپ سے تنہائی میں کچھ باتیں کرنا ہیں۔“ بالکل اچانک ہی یہ فرمائش کر کے اس نے معاذ کو حیران کر دیا۔

”وہ کیوں؟“ لہجے میں سختی سمو کر دریافت کیا۔

دشمنوں کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں اور ہمارا یہاں ادا کیا جانے والا ایک ایک لفظ سنا جا رہا ہے۔ ”معاذ دھی اور شکستہ لہجے میں بولتا ہوا ایک طرف بیٹھ گیا۔ اسے اب افسوس ہو رہا تھا کہ جذباتیت میں ایک ایسی اطلاع دشمنوں تک پہنچ گئی جسے ہرگز بھی نہیں پہنچنا چاہیے تھا۔

”کیا واقعی ہماری یہاں کی جانے والی گفتگو کہیں سنی جا رہی ہے؟“ وہی کو بھی اس اطلاع نے صدمہ پہنچایا تھا۔

”ہاں۔“ معاذ نے مرے مرے لہجے میں تصدیق کی۔

”اوہ میرے خدا!“ وہی نے دلوں ہاتھوں سے اپنا

سر تھام لیا۔ وہ جانتا تھا جو کچھ ہوا ہے، اس کے نتیجے میں لالہ عیسیٰ کا خطیر سرمایہ اور بڑی قربانیاں رائگاں چل گئی ہیں لیکن یہ وہ کمان سے نکلا تیر تھا جو لوٹ کر واپس نہیں آ سکتا تھا۔

”کیا یہاں زکے رہنا آپ کی مجبوری ہے؟ میرا

مطلب ہے کیا ہم سب یہاں سے نکل نہیں سکتے؟“ کچھ دیر

صدے کی کیفیت میں بیٹھے رہنے کے بعد اس نے خود کو

سنبھالا اور معاذ سے پوچھا۔

”سو نیا کا خیال ہے کہ ایسی کوئی کوشش بے سود ثابت

ہوگی۔ دشمن اتنا طاقتور ہے کہ اپنی مرضی کے ذرا بھی خلاف

کچھ ہونے پر بیٹھے بیٹھے ہمیں دفن کر دے گا۔“

”کیا آپ سو نیا پر اعتماد کر سکتے ہیں؟ وہ تو خود دشمن کی

صف میں سے ہے۔“

”پہلے بالکل بھی اعتماد نہیں کرتا تھا لیکن اتنے عرصے

سے جس طرح وہ قدم قدم پر میرا ساتھ دیتی رہی ہے، اعتبار

قائم ہوتا جا رہا ہے۔“ معاذ کو اعتراف کرنا پڑا۔

”میں نے اس کی موجودگی کی وجہ سے ہی سب کے

درمیان اپنا تعارف نہیں کروایا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ

یہاں دیواروں کے بھی کان ہیں۔“

”جو ہوا، انجانے میں ہوا۔ امید ہے جس نے اب

تک ہم سب کی حفاظت کی ہے، وہ آئندہ بھی اپنا کرم کرتا

رہے گا۔“ معاذ نے اسے تسلی دی۔

”ان شاء اللہ!“

”یہ بتاؤ کہ تم ہم تک پہنچے کیسے؟ ہمارا کھوج لگانا، وہ

بھی پاکستان سے یہاں آکر کوئی آسان بات تو نہیں ہے۔“

”اس کے پیچھے بھی دشمنوں کی مہربانی ہے۔“ وہی نے

ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے جواب دیا اور اپنے یہاں

تک پہنچنے کی ساری تفصیل کہہ سنائی۔

”اچھا تو جیک اور گل خان بھی تمہارے ساتھ ہیں۔

ایسا کرو کہ انہیں یہاں سے دور نکل جانے کا کہہ دو۔ کہیں ایسا

سننے سے لگا اور جذباتی انداز میں بولتا چلا گیا۔ اس کے انداز میں سچائی اور خلوص کی اتنی فراوانی تھی کہ معاذ کو خود اپنے اندر کوئی تبدیلی محسوس ہوئی۔ ساتھ ہی اس نے نوٹ کیا کہ نوجوان کالب و لہجہ بدل چکا ہے۔ یہ لہجہ، یہ آواز اس کے لیے شنا سکتے۔

”وکی.....! تم وکی ہونا؟“ شناخت کا مرحلہ طے

کرنے میں اسے چند سیکنڈز سے زیادہ کا وقت نہیں لگا۔

”شکر ہے آپ نے مجھے پہچانا تو۔“ وہ اس کے

پہچاننے پر خوش ہو گیا۔

”شکر تو میں تمہیں زندہ دیکھ کر ادا کر رہا ہوں۔

میرے پاس تو تم لوگوں کے بارے میں بہت بڑی

اطلاعات پہنچی تھیں۔ اگر وہ اطلاعات جھوٹی تھیں تو میں امید

رکھ سکتا ہوں کہ میرا خاندان سلامت ہے۔“ وہ وقاص عرف

وکی کو اپنے سامنے پا کر بے حد جذباتی ہو گیا تھا۔

”الحمد للہ! سب سلامت ہیں اور آپ کی راہ دیکھ

رہے ہیں۔“ اس نے وہ خوشخبری سنائی جس کی اسے امید بھی

نہیں تھی۔ جذبات کی شدت سے معاذ کی آنکھوں سے آنسو

بہہ نکلے اور اس نے بے حد جذباتی انداز میں وکی کو اپنے

ساتھ لپٹا لیا۔

”تم نے مجھے پھر سے زندہ کر دیا وکی! میرا بس نہیں

چل رہا کہ اپنی اس خوشی کا اظہار کیسے کروں؟“ اس کی آواز

بھی شدت جذبات سے بھرا گئی تھی۔ خوشی کی انتہا پر کھڑا وہ

ان حالات کو بھی بھول گیا تھا جن میں ساتھیوں سمیت گھرا

ہوا تھا۔

”خوش تو وہ بچی بھی بہت ہوگی جب میں اسے آپ

سے ملنے کی اطلاع دوں گا۔“ وکی، علیحدہ کا تصور کر کے مسکرایا۔

”علینہ کی بات کر رہے ہونا تم؟ کیسی ہے میری گڑیا

اور کہاں ہے؟“ اتنا جذباتی وہ شاید زندگی میں پہلے کبھی نہیں

ہوا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ آپ کو بہت یاد کرتی ہے۔ سچ پوچھیں

تو میں اسی کی خاطر آپ کو ڈھونڈتا ڈھونڈتا یہاں پہنچا

ہوں۔ آپ کو اپنے ساتھ لے کر اس سے ملوانے.....“ وہی

پتا نہیں کیا کہنے جا رہا تھا کہ اس کو یکدم ہوش آیا اور تیزی

سے اس کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”نہیں وکی..... پلیز نہیں۔ آگے ایک لفظ بھی نہ بتانا۔“

”کیا بات ہے معاذ بھائی؟ کوئی مسئلہ ہے کیا؟“ وہی

کو اس کے انداز نے تشویش میں مبتلا کیا۔

”اس سے بڑا مسئلہ اور کیا ہوگا کہ ہم اس وقت

دانش کے موتی

☆ معافی مانگنے سے یہ بھی ثابت نہیں ہوتا کہ ہم غلط اور وہ صحیح ہے۔ معافی کا اصل مطلب یہ ہے کہ ہم میں رشتہ نبھانے کی قابلیت ان سے زیادہ ہے۔
☆ جب ہماری ”تمنا“ کے پاؤں ”حاصل“ کی چادر سے باہر نکل جائیں تو ہمیں سکون نہیں ملتا۔
☆ الفاظ، چاہیوں کے مانند ہیں۔ ان کا صحیح استعمال کر کے لوگوں کے منہ بند اور دل کھولے جاسکتے ہیں۔

☆ انسان کے غصے میں عجیب منافقت ہے۔ وہ اپنے سے طاقتور کے سامنے تو غصہ کنٹرول کر لیتا ہے لیکن اپنے سے چھوٹے اور کمزور پر غصہ کرنے میں دیر نہیں کرتا۔

☆ اپنی شخصیت کو سنوارنے اور زندگی کو بہتر بنانے میں اتنا مصروف ہو جاؤ کہ دوسروں پر تنقید کرنے کا وقت ہی نہ ملے۔
(مرسلہ: محمد انور ندیم، حویلی لکھا، اوکاڑہ)

ویسے ہی ان کے چنگل میں پھنس گئے ہیں۔“ معاذ کی بیان کردہ حقیقت نے سونیا کو شانے جھکانے پر مجبور کر دیا۔ واقعی اب ایسی باتیں غیر اہم ہو چکی تھیں۔
”ڈیوڈ کال کیوں نہیں کرتا؟ کال کرے تو ہم انتظار کی اس اذیت سے نکلیں۔“ وہ عجیب سی صورت حال میں گھرے تھے اس لیے معاذ اب اعصابی کشیدگی کا شکار ہونے لگا تھا۔

”خود کو کپوز رکھو۔ اگر تم خود کو نہیں سنبھال سکتے تو باقیوں کو کون حوصلہ دے گا؟“ سونیا نے اس کے بازو کو زری سے دباتے ہوئے سمجھایا تو اس نے ایک طویل سانس لیا اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے لاؤنج میں آیا۔ وہاں سب چہروں پر سوالیہ نشان لیے منتظر بیٹھے تھے۔

”میرے پاس آپ لوگوں کے لیے ایک خوشخبری ہے۔“ اس نے ان سے گفتگو کا آغاز اچھی خبر سے کرنے کا فیصلہ کیا اور انہیں وقاص کے بارے میں آگاہ کیا۔ اس دوران وقاص بھی ان کے درمیان واپس آ گیا تھا۔ سب معاذ اور اسے نئی زندگی کی مبارک باد دینے لگے۔ کچھ تجسس سوالات بھی ہوئے لیکن داد نے ٹوک دیا۔

نہ ہو کہ تمہیں تلاشتے ہوئے وہ بھی اندر آ کر پھنس جائیں۔“ ساری کہانی سن کر اس نے فکر مندی سے کہا۔

”ان دونوں کو تو میں نے پہلے ہی اس علاقے سے نکلنے کی ہدایت کر دی تھی۔ اصل میں مجھے لگا تھا کہ پولیس اس علاقے کا گھیراؤ کر رہی ہے۔“ اس نے عقبی بنگلے میں داخل ہونے اور چھت سے اطراف کا جائزہ لینے کی بات بتائی۔
”اللہ کرے کہ وہ دونوں صحیح سلامت نکل جانے میں کامیاب ہو گئے ہوں۔ ایسا کرو کہ ان سے رابطہ کر کے سختی سے تاکید کر دو کہ خود کو چھپانے اور بچانے کی کوشش کریں بلکہ اپنے موبائل فون بھی تمہیں پھینک دیں تاکہ ان کے ذریعے انہیں ٹریس نہ کیا جاسکے۔“

”میں ابھی یہ کام کرتا ہوں۔“ وقاص اس کی بات سمجھ کر جلدی سے کال ملانے لگا جبکہ معاذ خود اٹھ کر باہر نکل گیا۔ باہر سونیا اس کی منتظر تھی۔

”وہ وقاص ہے، وقاص عرف وکی!“
”مائی گاڈ.....! یہ تو ناقابل یقین ہے۔ میڈم ایکس نے خود مجھے اس کی باقی لوگوں کے ساتھ مرنے کی خبر دی تھی۔“ اسے سن کر یقین نہیں آ رہا تھا۔

”یہ معجزہ کیسے ہوا، مجھے نہیں معلوم مگر اتنا جانتا ہوں کہ میرے رب نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔“ وہ رب کا شکر گزار تھا۔

”تمہیں بہت مبارک ہو معاذ! یقین جانو، میں خود ان سب کو بچانا چاہتی تھی لیکن میرے اختیار میں کچھ نہیں تھا۔“ سونیا کے لہجے میں محسوس کی جانے والی سچائی تھی۔
”اللہ نے اتنی بڑی مہربانی کر دی ہے کہ اب تم سے کوئی شکوہ نہیں رہا۔“ معاذ کی خوشی چھپائے نہیں چھپتی تھی۔ اتنی پریشانی میں بھی اس خوشخبری کو پا کر اس کے اندر زندگی کی نئی لہر دوڑ گئی تھی۔

”وکی یہاں تک پہنچا کیسے؟“ سونیا بہر حال تشویش میں مبتلا تھی۔ معاذ نے وقاص کے یہاں تک پہنچنے کی ساری تفصیل کہہ سنائی۔

”مجھے یقین ہے کہ یہ ساری کارروائی تمہیں تلاش کرنے کے لیے کی گئی ہوگی اور ایسے میں ممکن نہیں کہ وکی پر نظر رکھنے کا کوئی انتظام نہ کیا گیا ہو۔ اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی ایسی ڈیوائس تھی کی گئی ہوگی کہ اس کی لوکیشن سے باخبر رہا جاسکے۔“ سنتے ہی اس نے تبصرہ کیا۔

”ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو لیکن اب ایسی کسی ڈیوائس کی اہمیت ہی کیا رہ گئی ہے۔ وکی کے خود تک پہنچنے سے قبل ہم

نہیں تھی۔ وہ، وہ تھی جس کی موجودگی سے اسے زندگی میں رنگ، سانسوں میں تازگی اور دل میں سرور محسوس ہوتا تھا لیکن اس وقت وہ سوچ رہا تھا کہ سب کو وہاں نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اسے ایسی جگہ ہرگز نہیں ہونا چاہیے تھا جس کے آگے ایک اندھی کھائی تھی اور وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ اسے اس کھائی میں گرنے سے بچانے کے لیے کچھ کر بھی پائے گا یا نہیں۔

”تمہیں ان لوگوں کو روکنا چاہیے معاذ! یقین کرو، ڈیوڈ نے بہت سنگین لہجے میں دھمکی دی تھی اور مجھے ڈر ہے کہ اس کے حکم کی خلاف ورزی ہمیں مہنگی پڑ سکتی ہے۔“

عالم شاہ، سرد اور جارو کو اپنے ساتھ ملا کر انوپ کی مدد سے کچھ ضروری سامان اکٹھا کر رہا تھا جب سونیا نے معاذ سے کہا۔

”وہ احتیاطی تدابیر اختیار کر رہے ہیں اس لیے مجھے امید ہے کہ کسی بڑے نقصان کا شکار نہیں ہوں گے البتہ میں نے انہیں زبردستی روک لیا تو ان کے دل میں ہمیشہ یہ خلش رہے گی کہ انہیں کوشش نہیں کرنے دی گئی۔ ہو سکتا ہے ان کی کوششوں کا کوئی اچھا نتیجہ نکل ہی آئے۔“ اس نے اپنے ساتھیوں کے حق میں دلیل دی تو سونیا کو خاموشی اختیار کرنا پڑی۔

”کیا کرنے کا ارادہ ہے، مجھے بتاؤ۔ میں تمہارا ساتھ دوں گا۔“ وہ اپنے ساتھیوں کے قریب چلا آیا۔

”تم صرف دیکھو۔ رسک لینے کا فیصلہ میرا ہے اس لیے جو کچھ کروں گا، میں خود کروں گا۔“ عالم شاہ نے اسے دو ٹوک جواب دیا۔ اس وقت وہ اپنے سامنے ہمیں سے اکٹھا کیا گیا سامان رکھے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس سامان میں ایک عدد میٹر، ہیلمٹ، ربر کے دستانوں کی جوڑی اور اسلحہ شامل تھا۔

”یہ کیا بات ہوئی؟ میں کوئی تم لوگوں سے الگ تو نہیں ہوں۔“ معاذ نے اس دو ٹوک جواب پر احتجاج کیا۔

”الگ نہیں ہو مگر میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے متفق بھی نہیں ہو۔ ایسے میں، میں تمہیں کسی خطرے میں کیسے ڈال سکتا ہوں۔ ویسے بھی کوئی تم فلمی ہیرو نہیں ہو جو ہر خطرے میں کودنے کے لیے تمہارا ہی انتخاب ہو۔“ عالم شاہ سخت بے مروتی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس کے اس انداز پر معاذ مسکرا دیا کیونکہ وہ سمجھ رہا تھا کہ عالم اسے خطرے سے دور رکھنے کے لیے ایسا رویہ اختیار کیے ہوئے ہے۔

”میں فلمی ہیرو نہیں ہوں تو تم کس خوبی میں ہیرو بننے کی کوشش کر رہے ہو۔ یہاں کون سا تمہارے کمالات دیکھنے کے لیے تمہاری ہیروین پیش کی ہوئی ہے۔“ معاذ نے

”ابھی موقع نہیں ہے کہ وقاص سے یہ تفصیلات معلوم کی جائیں۔ ابھی کچھ اور مسائل درپیش ہیں اور میں مکمل صورت حال آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔“ وہ انہیں ڈیوڈ کی گفتگو سے آگاہ کرنے لگا۔ پہلے یہ سوچ کر کچھ نہیں بتایا تھا کہ وہ لوگ پریشان ہو جائیں گے لیکن پھر سوچا کہ ان کی زندگیوں کے فیصلے میں ان کی رائے شامل ہونا ضروری ہے۔

”ہمیں یہاں سے نکلنے کی ایک کوشش تو کر کے دیکھنی چاہیے۔ ہو سکتا ہے ڈیوڈ ہمارے ساتھ بلف کر رہا ہو تاکہ ہمارے گرد دائرہ تنگ کرنے تک ہمیں یہاں روک سکے۔“ سب سے پہلے عالم شاہ نے اپنی رائے دی۔

”وکی کو کرنٹ لگنے والا واقعہ ثبوت ہے کہ ان بنگلوں میں کچھ خصوصی انتظامات کیے گئے ہیں اور یہاں سے نکلنا کوئی آسان کام نہیں ہوگا۔“

”لیکن کوشش کر کے دیکھنے میں تو کوئی حرج نہیں ہے۔“ بالکل، لیکن خیال رہے کہ اس کوشش میں اپنا کوئی نقصان نہ ہو۔“ اس نے تائید کی۔

”ہم احتیاطی تدابیر کا خیال رکھیں گے۔“ عالم شاہ نے یقین دلایا۔

”ایک بات اور..... وکی کی اطلاع کے مطابق علاقے کو پولیس اپنے گھیرے میں لے چکی ہے اس لیے ایک امکان یہ بھی ہے کہ اگر ہم یہاں سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو بھی گئے تو باہر پولیس والے ہمارے استقبال کے لیے موجود ہوں گے۔“ اس نے انہیں دوسری بُری اطلاع دی۔

”پہلے اس لعنتی جینکے سے تو باہر نکلیں پھر پولیس کو بھی دیکھ لیں گے۔“ عالم شاہ نے جھنجھلائے ہوئے لہجے میں کہا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ سرد کو تو لازماً اس کی پیروی کرنا تھی۔

”ادا سائیں!“ اب تک خاموش بیٹھی سب نے اضطرابی طور پر عالم شاہ کو پکارا۔ وہ اعظم کو اندر کمرے میں سلا آئی تھی اور سب کے درمیان بیٹھی ہونے والی گفتگو کو سنتی رہی تھی۔

”پریشان مت ہو سب! ہم جو کچھ بھی کریں گے، دیکھ بھال کر کریں گے۔“ عالم شاہ نے قریب آ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور تسلی دی تو وہ سر کو ہلکی سی جنبش دیتے ہوئے واپس اپنی جگہ پر بیٹھ گئی لیکن جس طرح وہ بیٹھے بیٹھے اپنی آنکھوں کو مروڑ رہی تھی، اس سے ظاہر تھا کہ وہ مکمل طور پر مطمئن نہیں ہے۔ اس منظر کو دیکھتے ہوئے معاذ نے اپنے دل میں تکلیف محسوس کی اور پہلی بار ایسا ہوا کہ اسے سب کی موجودگی اچھی

دوبارہ باندھ رہا تھا۔
”حکم کی تعمیل بھی نمک حلائی میں شامل ہے۔“ عالم شاہ نے اسے باور کرایا۔

”نیت اچھی ہو اور مالک کی بھلائی کی چاہ ہو تو حکم عدولی معاف بھی کی جاسکتی ہے۔“ اس نے ہیلیمٹ اٹھا کر اپنے سر پر پہنا۔

”پاکستان واپس پہنچنے دو، دیکھنا بابا سائیں سے تمہاری اس نافرمانی کی کیسی شکایت لگاتا ہوں۔“ وہ بظاہر خفا تھا لیکن اس کے لہجے میں سزمد کے لیے خصوصی پیار تھا۔ برسوں کے ساتھ میں اس شخص نے سیکڑوں بار اس کا دل جیتا تھا۔

”جیسی آپ کی خوشی سائیں! ابھی تو آپ مجھے اجازت دیجیے۔“ سرمد نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے۔

”نہ کریار!“ عالم شاہ نے اس کے جڑے ہوئے ہاتھ کھولے اور جذباتی انداز میں اسے گلے سے لگالیا۔ بُرے وقتوں کا سہمی، ایثار و وفا کی مٹی سے گندھا وہ شخص کب کا ملازم کی حیثیت سے نکل کر اس کے لیے ایک دوست کا روپ دھار چکا تھا اور دوستوں کو تو گلے سے ہی لگایا جاتا ہے۔

”اب اجازت دیں۔“ کچھ دیر بعد سرمد نے ہی نم آلود لہجے میں کہتے ہوئے اسے خود سے الگ کیا اور باہر کی طرف بڑھا۔ باقی لوگ اس کے پیچھے تھے۔ جارو نے ایک لوڈ گن اپنے ہاتھوں میں لے لی تھی۔ سرمد مضبوط قدموں سے چلتا ہوا مین گیٹ کی طرف گیا۔ امراء کے علاقوں کے رواج کے مطابق اطراف میں خاموشی چھائی ہوئی تھی لیکن وہ سب ایسا محسوس کر رہے تھے جیسے کوئی طوفان آنے کو ہے۔

سرمد نے گیٹ کے قریب پہنچ کر سب سے پہلے میسر سے اسے چیک کیا۔ فوراً ہی سرخ روشنی جل اٹھی۔ خدشات کے عین مطابق گیٹ میں کرنٹ دوڑ رہا تھا۔ وہ ربر کے موٹے دستانے اور پیروں میں مضبوط جوتے پہنا ہوا تھا اس لیے کرنٹ کی موجودگی کی تصدیق ہونے کے باوجود گیٹ کا لاک کھولنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا اور لاک کی تاب گھمانے کی کوشش کی لیکن کوشش ناکام رہی۔ اس نے تھوڑا سا زور مزید لگا لیا لیکن لاک تو گویا مکمل جام ہو چکا تھا۔

”کیا ہوا، لاک نہیں کھل رہا؟“ اس کے عین پیچھے آکھڑے ہونے والے جارو نے صورتِ حال کو محسوس کر کے سوال کیا۔

”بالکل جام ہے۔ بس سے مس بھی نہیں ہو رہا۔“
”پھر، اب کیا کرو گے؟“

ازراہ مذاق ایک بات کہی تھی لیکن عالم شاہ کی نظروں میں چہم سے ایک تصویر اتر آئی۔ بات بات پر اپنی چھوٹی سی ناک سکڑ کر، نخرے سے شولڈر کٹ بالوں کو جھکا دیتی، وہ اجلی رنگت والی لڑکی جس کا نام اجالا تھا، اپنی تمام تر بے مروتی اور کج ادائیگیوں کے باوجود اس کے دل و دماغ سے نہیں نکلی تھی۔ ”را“ والوں کی قید میں، ان کی سختیاں جھیلے ہوئے بھی اس کا خیال ذہن میں چکراتا تھا اور نواب بدر الدین کے قید خانے میں بھی اس کے روپ کے چراغ جلے تھے۔ ایسے میں اگر وہ یہاں اس مقام اور موقع پر یاد آگئی تھی تو یہ کچھ انوکھا نہیں تھا۔

”کس سوچ میں ڈوب گئے؟“ معاذ نے اس کے سامنے چٹکی بجا لی۔

”شاید ہیروئین کی عدم دستیابی پر غور ہو رہا ہے۔“ جارو نے بھی چھیڑ چھاڑ میں حصہ لیا۔ یہاں اعصاب کو کشیدہ کرنے والی صورتِ حال تھی اس لیے وہ لوگ شعوری طور پر ماحول کو ہلکا پھلکا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

”اگر مجھے کچھ ہو جائے تو سب کا بہت خیال رکھنا معاذ!“ عالم شاہ نے اس التجا کو کرتے ہوئے آواز اتنی دھیمی رکھی کہ اس کے سوا کوئی نہ سن سکے۔

”کچھ نہیں ہونے والا تمہیں۔ اگر ایسا کوئی وہم ہے تو رک جاؤ اپنے ارادے سے۔“ وہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس گفتگو کو سب سن پائے اس لیے اس نے بھی اپنی آواز کو بلند نہ ہونے دیا۔

”نہیں۔“ عالم شاہ نے نفی میں سر ہلایا۔

”جب ملے کر لیا ہے کہ کوشش کرنی ہے تو کر کے رہوں گا۔“ اس نے ربر کے دستانوں کی جوڑی کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن ایک ہاتھ نے اس سے پہلے ہی وہ دستانے اچک لیے۔

”یہ کیا کر رہے ہو سرمد؟“ اس نے دستانے اچکنے والے کو گھرکا۔

”وہی جو ایک غلام کو نمک حلائی کا ثبوت پیش کرنے کے لیے کرنا چاہیے۔“ دستانے ہاتھوں میں چڑھاتے ہوئے اس نے بے نیازی سے جواب دیا لیکن اس بے نیازی میں بھی اگلے کے لیے احترام میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔

”خود کو غلام مت کہو۔“ عالم شاہ ناراض ہوا۔

”نمک حلال یا نمک خوار تو کہہ سکتا ہوں نا اور نمک حلائی کی پہلی شرط یہی ہے کہ میں آپ کی جان کو اپنی جان سے قیمتی سمجھوں۔“ اب وہ اپنے جوتوں کے تسمے میچ کر

”گیٹ پر چڑھ کر باہر کودنے کی کوشش کرتا ہوں۔“
 ”اس میں خطرہ ہے۔ تمہارا۔ صرف ہاتھ اور پاؤں
 کرنٹ سے محفوظ ہیں۔ گیٹ پر چڑھنے میں اگر جسم کا کوئی
 دوسرا حصہ گیٹ سے چھو گیا تو غضب ہو جائے گا۔“ جارو نے
 اسے اس کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔

”کچھ نہیں ہوگا، میں احتیاط کروں گا۔“ سرمد نے
 اس کے روکنے کو خاطر میں لائے بغیر دونوں ہاتھ گیٹ کے
 اوپری حصے پر جما کر خود کو اوپر کی طرف اٹھایا۔ باقی لوگ
 فاصلے فاصلے پر کھڑے تھے اس لیے انہیں اس کے اور جارو
 کے درمیان ہونے والی گفتگو سنائی نہیں دی تھی۔

سرمد نے احتیاط کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے آہستہ
 آہستہ اپنا جسم بلند کیا اور سر نکال کر باہر جھانکا۔ ابھی وہ
 اطراف کا جائزہ نہیں لے سکا تھا کہ ایک سنسناتی ہوئی گولی
 آئی اور ہیلمٹ سے ٹکرائی۔ بائیکرز کے استعمال میں رہنے
 والا وہ عام سا ہیلمٹ گولی کے آگے کوئی حیثیت نہیں رکھتا
 تھا۔ گولی نے ہیلمٹ کے پرچے اڑائے اور سب نے سرمد
 کو الٹ کر نیچے گرتے دیکھا۔ بے ساختہ ہی کئی قدم اس کی
 طرف دوڑے۔ معاذ قریب پہنچنے سے قبل ہی خون کی سرخی
 دیکھ چکا تھا۔ وہ سرمد تک پہنچتا، اس سے قبل ہی فون کی تیز
 گھنٹی کی آواز اس کی سماعت تک پہنچی۔ اتنی دیر سے جس کال
 کا انتظار ہو رہا تھا، وہ آچکی تھی۔

☆☆☆

”یہ تو نے کیا کیا گلو! تو نے اسے کیوں جانے دیا؟“
 ”میں کیا کرتا لالہ! یہاں باذل پاگل کتے کی طرح
 اس کی جان کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ حامد کی آفر پر اس نے خود
 انڈیا جانے کا فیصلہ کیا تو مجھے لگا ایسا ہی ٹھیک ہے۔“ گلو نے
 اپنی صفائی پیش کی۔

”پاگل کتے کو گولی مار کر اس سے جان چھڑائی جاسکتی
 تھی لیکن اب تو وہ بھینڑیوں کے غول کے پیچھے چلا گیا ہے۔
 تجھے پتا ہے وہ کیوں گیا ہے؟ وہ اس لیے گیا ہے کہ اسے معاذ
 کے ملنے کی امید دکھائی دی ہوگی۔“

”تو پھر تو وہ بالکل ٹھیک کیا ہے لالہ! وہ اسی کام کے
 لیے تو تم لوگوں کو چھوڑ کر یہاں خوار ہو رہا تھا۔ اب جب
 اسے راہ مل گئی ہے تو تم اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہو؟“ گلو
 کو حیرت ہوئی۔

”وہ میرے اکلوتے بھائی کی نشانی اور میرے
 خاندان کا آخری چراغ ہے گلو! میں اسے جیتا دیکھنا چاہتا
 ہوں لیکن وہ جن کی راہ پر لگ گیا ہے، وہ بہت ظالم ہیں۔“

”انسان کو کبھی سے بھی کم اہمیت دیتے ہیں۔“
 ”تو اسے وہیں روک لیتے نا، کیوں آنے دیا یہاں
 اس جہنم میں؟“ گلو، لالہ کا پرانا فادار تھا چنانچہ لالہ کے دکھ
 نے اسے بھی دکھی کر دیا تھا۔

”روکنا چاہتا تھا، بتانا چاہتا تھا کہ اتنا پیسا لٹا کر،
 اتنے چکر چلا کر اور سب کچھ تیاگ کر دنیا کے اس الگ تھلک
 گوشے میں آکر بیٹھا ہوں تو صرف اس لیے کہ اپنے بھائی کی
 نسل کو بچا سکوں۔ دنیا کے ہنگاموں سے دور اپنی زندگی کے
 آخری دن اپنے خاندان کے ساتھ گزار سکوں۔ وہ زندگی
 جی سکوں جسے دولت اور طاقت کی ہوس میں، میں نے خود
 چھوڑ دیا تھا لیکن نہیں کہہ سکا، کہہ ہی نہیں پایا۔“

”کیوں نہیں کہا لالہ! کہنا تو چاہیے تھا۔“ گلو تڑپا۔
 ”میں ڈر گیا تھا کہ وہ میری بات نہیں مانے گا۔ اس
 کے باپ نے بھی اپنی محبت کی خاطر مجھے چھوڑ دیا تھا۔ وہ بھی
 نہیں رکتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ علینہ کو اس کا بھائی واپس لوٹائے
 گا، تب ہی محبت کے امتحان میں سرخرو ہو سکے گا۔“ لالہ نے
 سچائی بیان کی۔

”تو بس، دینے دو اسے یہ امتحان۔ وہ اپنی دھن کا
 جتنا پکا ہے، مجھے یقین ہے کہ اس امتحان میں ضرور پورا
 اترے گا۔“ گلو نے اسے حوصلہ دلایا۔ دوسری طرف سے
 لالہ نے کچھ بھی کہے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا۔

”اسلم! گاڑی نکال۔ مجھے لیاقت سومرو کو دیکھنے
 اسپتال جانا ہے۔“ گلو کچھ دیر اپنی جگہ چپ چاپ بیٹھا رہا
 پھر ایک بندے کو آواز لگا کر حکم دیا۔ لیاقت سومرو سے ان کی
 جو جھڑپ ہوئی تھی، اس میں وہ زندہ تو بچ گیا تھا لیکن سناہی
 تھا کہ مردوں سے بدتر حالت میں ہے۔

شہر کے ایک بڑے اسپتال کے پرائیویٹ روم میں
 پہنچ کر اس بات کی تصدیق بھی ہوگئی۔ دونوں ٹانگوں اور
 ایک ہاتھ سے محروم ہو جانے والا لیاقت سومرو بستر پر بے بسی
 کی تصویر بنا پڑا تھا۔ اس کی دوسری بیوی اور اس کا بیٹا بھی
 اس سے ملنے آئے ہوئے تھے۔ گلو کو ایسا لگا کہ اس کی آمد
 نے لیاقت سومرو کی بیوی کو تھوڑا بد مزہ کر دیا ہے چنانچہ
 معذرت خواہانہ لہجے میں بولا۔

”آپ کو میرا آنا برا لگا ہو تو معافی چاہتا ہوں پر میں
 زیادہ دیر روکوں گا نہیں۔“

”زیادہ دیر روکنے کا میں بھی ارادہ نہیں رکھتی۔ بس اتنا
 کہنے کے لیے آئی ہوں کہ یہ جو ایک ہاتھ سلامت رہ گیا ہے،
 اس سے طلاق نامے پر سائن کرے اور میری جان چھوڑ

لیکن کسی کسی کو آخر کار یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ یہ فیصلہ درست نہیں تھا۔ لالہ عیسیٰ کو یہ احساس ہو گیا تھا، لیاقت سومرو کو قدرت نے یہ حقیقت یاد کروادی تھی اور اب اسے اس سچائی کا ادراک ہونے لگا تھا۔ ماں باپ کی موت کے برسوں بعد اس نے ان کی قبروں کے پاس بیٹھ کر ویسے ہی آنسو بہائے جیسے ان کی میت پر رویا تھا۔ فضا میں فائرنگ کی آواز گونجی تو وہ چونک کر پلٹا اور پھرتی سے اپنا زیوالور نکالا لیکن کہیں سے ایک سنسنائی ہوئی گولی آئی اور زیوالور اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔

”بھاگنے کی کوشش مت کرنا گلو ورنہ بھون کر رکھ دیں گے۔“ اس سے قبل کہ وہ خود کو کسی آڑ میں لیتا، ایک چبھتی ہوئی آواز نے حکم دیا۔ وہ محسوس کر چکا تھا کہ فائرنگ کا سلسلہ رک گیا ہے اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن تھا کہ اسلم زیر کر لیا گیا ہو یا جان کی بازی ہار گیا ہو۔

”کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو؟“ اس نے بلند آواز میں دریافت کیا۔ جواب میں دو نقاب پوش جدید ساخت کی گتھیں لیے اس کے سر پر آکھڑے ہوئے۔

”شرافت سے ہمارے ساتھ چلو ورنہ تمہاری لاش بھی تمہارے ڈرائیور کے ساتھ دریافت ہوگی۔“ ایک نقاب پوش کے الفاظ نے اسلم کی موت کی تصدیق کر دی۔

”شرافت نہیں ہے اپنے پاس۔ تو گولی مار دے۔“ اس نے بے خوفی سے جواب دیا۔ اسی وقت اس نے اپنے عقب میں آہٹ سنی۔ بھڑک کر پلٹا ہی تھا کہ سر پر کسی بھاری شے سے وار ہوا۔ پہلے وار سے سنبھل نہیں پایا تھا کہ دوسرا بھی کر دیا گیا۔ کتنا ہی جی دار سہی، تھا تو گوشت پوست کا بنا آدمی۔ تیور کر زمین پر گر اور ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گیا۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو رسیوں سے بندھا بے دست و پا زمین پر پڑا تھا۔ نظریں گھما کر دیکھنے پر آس پاس کوئی شخص نظر آیا نہ ساز و سامان۔ سپاٹ فرش اور سپاٹ دیواروں والے کمرے میں کچھ نہ ہوتے ہوئے کچھ ایسا تھا جو دل میں خوف پیدا کر رہا تھا۔ سر کی تکلیف علیحدہ تھی۔ وہ بندھا ہوا ہونے کی وجہ سے اپنا ہاتھ سر تک نہیں لے جاسکتا تھا لیکن درد کی شدت سے اتنا اندازہ ضرور ہو رہا تھا کہ سر پھٹانہ بھی ہو تو چوٹ کی جگہ پر گومڑ ضرور نمودار ہو چکا ہوگا۔ تکلیف کو سہنے کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی غور کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کو اس طرح اغوا کروانے کے پیچھے کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ وہ جس دنیا کا بندہ تھا، وہاں دشمنیاں عام تھیں لیکن اس وقت اسے زیادہ شبہ باذل پر تھا۔ وہ اس وقت چوٹ کھایا

دے۔ میں ساری زندگی اس زندہ لاش کے نام پر نہیں بیٹھی رہ سکتی۔“ اس نے نخوت سے اپنی بات مکمل کی اور بیٹے کی انگلی تھام کر کھٹکھٹ کرتی وہاں سے چلی گئی۔

”دیکھا سومرو تم نے؟ یہ ہوتی ہے زندگی۔ انسان جن چیزوں کے پیچھے بھاگتا ہے اور جن کی خاطر ظلم کماتا ہے، وہ ایک ایک کر کے اسے چھوڑ کر جانے لگتے ہیں۔ کیا ہے آج تمہارے پاس؟ اولاد، صحت اور جوانی تم گنوا چکے ہو۔ جو دولت جمع کی تھی، وہ بھی بندر بانٹ میں ہاتھ سے نکل جائے گی اور تم یونہی بستر پر بے بس پڑے سب دیکھتے رہو گے۔“

”کیوں..... کیوں آئے ہو تم یہاں؟“ لیاقت سومرو غصے سے چیخ کر بولا لیکن اس کے غصے کے اظہار میں بھی ایک بے بسی تھی۔

”عبرت حاصل کرنے آیا ہوں۔ یہ سیکھنے آیا ہوں کہ جو ہمیشہ دوسروں سے جھینتے ہیں، آخر میں ان کے ہاتھ بھی کچھ نہیں آتا۔“

”تم خوش ہو رہے ہو میری تباہی سے؟“ سومرو نے شکوہ کیا۔

”ہاں، ہو رہا ہوں۔ اس لیے نہیں کہ میری تم سے کوئی ذاتی دشمنی ہے بلکہ اس لیے کہ تمہاری صورت قدرت کے انصاف کی ایک مثال قائم ہو گئی ہے۔ ہو سکتا ہے تمہارا یہ حال دیکھ کر تمہارے نقش قدم پر چلنے والا کوئی ایک اس راہ سے واپس پلٹ جائے۔“ گلو اپنی بات کہہ کر رکنا نہیں۔ حقیقت میں اسے لیاقت سومرو کی حالت نے متاثر کیا تھا اور دل میں یہ خواہش ابھری تھی کہ جرم کی دنیا سے تائب ہو کر گوشہ نشینی اختیار کر لے۔

”قبرستان چلو۔“ وہ گاڑی میں واپس آ کر بیٹھا تو ڈرائیونگ سیٹ پر موجود اسلم کو حکم دیا۔ اسلم جانتا تھا کہ اسے کون سے قبرستان جانا ہے چنانچہ گاڑی اسی سمت موڑ لی۔ گلو نے اپنے ماں باپ کی قبروں پر حاضری دی۔ قبروں پر پانی چھڑک کر کچھ دیر کے لیے وہیں بہنوں کے بل بیٹھا رہا۔

”کاش، تم دونوں مجھ پر ذمے داریوں کا پہاڑ لا کر اتنی جلدی اس دنیا سے نہ جاتے تو میں جرم کی دنیا میں گلو اہتا د بن کر جینے کے بجائے ایک عام آدمی کی زندگی جی رہا ہوتا۔“

آج پہلی بار ایسا ہوا کہ ماں باپ کی قبروں کے پاس بیٹھ کر ان کی مغفرت کی دعا کرنے کے ساتھ اس نے زبان سے کوئی شکوہ کیا۔ اس کے جرم کی دنیا میں داخل ہونے کے پیچھے بھی مجبوریوں اور مسائل کی وہی داستان تھی جو عموماً اس جیسے بہت سے اپنے سینوں میں لیے پھر رہے ہوتے ہیں

ہوا سانپ تھا اور کچھ بعید نہیں تھا کہ وہی کے ہاتھ نہ آنے کی صورت اسی پر ہاتھ ڈال بیٹھا ہو۔

”خوش آمدید گلو استاد!“ ابھی وہ اپنے صداد کے متعلق غور و خوض ہی کر رہا تھا کہ ایک نسوانی آواز سن کر اچھل پڑا۔ یہ اچھلنا صرف محاورہ تھا کیونکہ اسے جس انداز میں باندھ کر ڈالا گیا تھا اس کے لیے اپنی جگہ سے حرکت کرنا ہی ممکن نہیں تھا۔

”میں تم جیسے چھوٹے موٹے غنڈوں کو منہ نہیں لگایا کرتی لیکن تم نے ہمارے منہ کو آنے کی کوشش کر کے خود اپنے لیے مصیبت کھڑی کی ہے۔“

”آپ کون ہو میڈم اور مجھ سے کیا چاہتی ہو؟“ گلو نے تھوک نکل کر ان دیکھی عورت سے سوال کیا۔ ویسے وہ کہے گئے الفاظ سے ہی سمجھ گیا تھا کہ اس وقت وہ کس کی قید میں ہے اور بہر حال یہ ایک خوفناک صورت حال تھی۔

”سیدھا سوال کرتی ہوں۔ وقاص عرف وہی کے بارے میں جو کچھ جانتے ہو صاف صاف بتا دو۔“ حکم صادر ہوا۔

”میں اس کے بارے میں کیا بتاؤں۔ وہ تو ایک عرصے سے غائب ہے۔ اڑتی پڑتی خبر ملی تھی کہ کسی حادثے میں مارا گیا ہے لیکن اس کا بھی ثبوت نہیں ملا۔“

”بہت خوب۔“ اس کا جواب سن کر وہ زہریلے انداز میں ہنسی۔

”وہ جسے اپنا گونگا بہرہ گارڈ بنائے اتنے دنوں گلے سے لگائے گھومتے رہے، وہ کیا تمہاری بہن کا یا تھا؟“

”زبان سنبھال کر بات کرو میڈم! گلو استاد نے کبھی کسی کی ماں بہن کو نیڑھی نظروں سے نہیں دیکھا۔ اس لیے اپنی ماں بہن کے خلاف بھی کچھ نہیں سن سکتا۔“ گلو کو اس کے جملے پر طیش آ گیا۔

”نہیں سن سکتے تو جو بگاڑ سکتے ہو، بگاڑ لو۔“ اس نے تیر چلایا۔

”شیر کو بچرے میں بند کر کے اس پر کوئی بھی پتھر پھینک سکتا ہے۔“ گلو کو بھی اس بات کا احساس ہوا کہ بھلا وہ ایک آواز کا کیا بگاڑ سکتا ہے۔

”پتھر مارنا معمولی کام ہے۔ ہم تم جیسے شیروں کو چوما بلکہ اس سے بھی کمتر مخلوق بنا کر اپنے ہیروں سے تلے چل سکتے ہیں۔ اگر تم نے میرے سوالوں کے درست جوابات نہ دیے تو تمہیں اس کا تجربہ بھی کروادوں گی۔“ عورت کا لہجہ سخت سے سخت ہوتا جا رہا تھا۔ گلو کو اس کے لہجے کی سختی سے زیادہ اس بات کی فکر تھی کہ اسے وہی کے بارے میں کیسے علم ہوا۔ اس بات کی تو قریبی ساتھیوں کو بھی اطلاع نہیں دی گئی تھی۔

”جس سوال کا جواب میں جانتا ہی نہیں، وہ آپ کو کیسے دوں۔ جو جواب مجھے معلوم تھا، اسے آپ قبول نہیں کرو گی۔“

”اچھا لطیفہ ہے لیکن میں تمہیں بتا دوں کہ اس بات کا اعتراف وہی نے خود اپنی زبان سے کیا ہے۔“

”کیا؟“ گلو کی سماعتوں پر بم پھوٹا تو وہ رد عمل دینے بغیر نہیں رہ سکا۔ جواب میں میڈم نے زوردار قہقہہ لگایا۔

”ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ تمہیں کوئی خبر نہیں اور اب مجھ سے وہی کا ذکر سن کر کرنٹ لگ گیا ہے۔“ وہ یقیناً کسی کیمرے کی مدد سے اسے دیکھ رہی تھی جب ہی اس کے چونکنے پر چوٹ کی۔ گلو اس کے طنز پر لب بھینچ کر رہ گیا۔

”وہی کا کوئی مسئلہ نہیں۔ وہ تو ہمارے ہی قبضے میں ہے اور بہت جلد معاذ کے ساتھ ساتھ اس کا بھی کریا کرم ہو جائے گا۔ ہمیں تو تم وہی اور معاذ کی فیملی کا پتا ٹھکانا بتاؤ۔“

وہ اس کی حالت سے حظ اٹھاتے ہوئے نئی اطلاعات دینے کے ساتھ ساتھ فرمائش بھی کر رہی تھی۔ گلو، وہی کے ان کی گرفت میں ہونے کی اطلاع سن کر پریشان ہو گیا لیکن زبان سے کچھ کہنے کے بجائے لبوں کو بھینچ لیا۔

”یاد رکھنا گلو استاد! یہ ہماری انا اور وقار کی جنگ ہے۔ ہم برداشت نہیں کر سکتے کہ ہمارا شکار ہم سے بچ کر کہیں کسی بل میں گھس جائے۔ تمہیں میرے سوال کا جواب ہر صورت دینا ہوگا۔ اب یہ تم پر ڈیپنڈ کرتا ہے کہ سمجھ داری ہے کام لیتے ہوئے ایسے ہی زبان کھول دیتے ہو یا ہمیں زبان کھلوانے کی زحمت دیتے ہو۔ ہمیں زحمت دو گے تو تمہاری روح بھی بلبل اٹھے گی۔“ اب وہ نہایت سرد اور سنگین لہجے میں دھمکیاں دے رہی تھی۔

”سوچنے کے لیے ایک گھنٹے کی مہلت دے رہی ہوں۔ مان جاؤ گے تو خود پر ہی رحم کرو گے۔ ہو سکتا ہے ہم تمہاری پچھلی ساری غلطیوں کو معاف کر کے دوبارہ سے بزنس میں بھی شامل کر لیں۔“ دھمکی کے ساتھ لالچ کا اچھا امتزاج پیش کیا گیا تھا لیکن گلو نے اپنی خاموشی نہیں توڑی۔ دوسری طرف سے بھی خاموشی اختیار کر لی گئی۔

گلو کو سوچنے کے لیے ایک گھنٹے کی مہلت دی گئی تھی لیکن اس دی گئی مہلت میں وہ، وہ نہیں سوچ رہا تھا جو سوچنے کا اسے حکم دیا گیا تھا۔ وہ خود پر لالہ کے احسانات سوچ رہا تھا۔ یہ ٹھیک تھا کہ لالہ جرم کی دنیا کا بندہ تھا لیکن اس دنیا میں رہنے کے بھی اس نے کچھ اصول بنائے ہوئے تھے۔ وہ اپنے آدمیوں پر بہت مہربان رہتا تھا۔ خود گلو کو اس نے کئی

کروائی گئی تھیں اور تربیت بھی دی گئی تھی۔ یوں وہ مکمل طور پر لالہ کا روپ دھارنے کا اہل ہو گیا تھا۔ لالہ جب ضرورت محسوس کرتا تھا، اپنے اس ہم شکل کو اپنی جگہ استعمال کر لیتا تھا۔ اس سارے معاملے کی کتنی کے چند ایک وفاداروں کے سوا کسی کو خبر نہیں تھی۔ اس ہم شکل نے بھی ہمیشہ اپنا منہ بند رکھا تھا اور بدلے میں لالہ سے خطیر معاوضہ پاتا تھا۔ وہ ہم شکل پیچھے پھڑوں کے کینسر میں مبتلا ہوا تو بھی لالہ نے اس کا ہر ممکن علاج کروایا لیکن اس کا مرض قابو میں نہ آیا اور اس اسج پر پہنچ گیا کہ وہ خود اپنے منہ سے اپنی موت کی آرزو کرنے لگا۔

پہلے لالہ کے غیاب اور پھر منظر پر لا کر زمان اور ظہور کے ذریعے باذل کو بخبری کی ساری منصوبہ بندی گلوہی نے کی تھی اور نہایت خوبصورتی سے مخالفین کو باور کروانے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ فارم ہاؤس پر باذل کے حملے والے روز اپنے مرض سے تنگ آ کر خودکشی کر لینے والا لالہ عیسیٰ ہی تھا۔ لالہ کے گوشہ نشین ہونے کے بعد بظاہر وہ باس بن گیا تھا لیکن اب بھی دل سے لالہ کا وفادار تھا اور اس وفادار کو گوارا نہیں تھا کہ اس کی ذات سے لالہ یا لالہ کے پیاروں کو کوئی نقصان پہنچے۔

”تو پھر تم نے کیا سوچا گلوہا استاد؟“ مہلت میں ملا گھنٹا یادوں کی یلغار میں کیسے بیٹا، اسے پتا ہی نہیں چلا اور اس پہلے والی نسوانی آواز کو دوبارہ سن کر اپنے خیالات سے چونک کر نکلا۔

”میں تمہارا فیصلہ سننا چاہتی ہوں۔“ لہجے کی سرد مہری پہلے سے کہیں زیادہ تھی۔

”میں کچھ نہیں جانتا۔“ گلوہے بالآخر سپاٹ لہجے میں اپنا جواب سنا دیا۔

”اور ہم جانے بغیر رہیں گے نہیں۔ افسوس کہ تم نے خود کو ملی مہلت ضائع کر کے اپنے لیے ایک مشکل اور تکلیف دہ فیصلہ کیا ہے۔“ بولنے والی کے لہجے میں بھڑکتے شعلوں کی تپش عود آئی اور یہ تپش گلوہے کو نہ جھلساتی، یہ کیسے ممکن تھا۔ وہ جس فرش پررسیوں سے بندھا رہے بس پڑا تھا، وہ فرش اس کے لیے جہنم بن گیا۔ جلتے توے پر لیٹنے جیسی تکلیف نے اس کے حلق سے دردناک چیخیں نکلوادیں۔ وفا کا امتحان دینا بھی بھی آسان نہیں ہوا کرتا۔

توے کی طرح پتا فرش اس کی کھال کو جھلسائے دے رہا تھا۔ تکلیف اتنی شدید تھی کہ بندھا ہوا ہونے کے باوجود وہ زمین پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ اس کے حلق سے

مواقع پر سہارا دیا تھا۔ بہنوں کی شادی سے لے کر بھائی کی پڑھائی تک ہر معاملہ اس نے لالہ کے تعاون سے نمٹایا تھا۔ چند برس قبل جب اس کا چھوٹا بھائی طلبہ سیاست کا نشانہ بن کر جیل کی سلاخوں کے پیچھے چلا گیا تھا اور اس کا کیریئر اور زندگی دونوں تباہ ہونے کی نوبت آگئی تھی، یہ لالہ ہی تھا جس نے اپنے اثر رسوخ سے کام لے کر اس کے بھائی کو اس جنجال سے نکالا تھا۔ آج اس کا بھائی ایک عزت دار اور خوشحال زندگی گزار رہا تھا تو یہ لالہ کا احسان تھا۔ لالہ کے اتنے احسانات کے جواب میں وہ خود کو بچانے کے لیے بھلا ایسا کیونکر کر سکتا تھا کہ وہی اور معاذ کا خاندان داؤ پر لگتا سو لگتا، خود لالہ کا راز بھی کھل جاتا۔

انسان کتنی ہی طاقت، اختیار اور دولت حاصل کیوں نہ حاصل کر لے، اس کے اندر ایک گھر، ایک پرسکون زندگی اور خاندان کی آرزو بھی نہیں مرنی۔ خود پر خول چڑھا کر جینے والے لالہ عیسیٰ کے دل میں بھی یہ آرزو چھپی ہوئی تھی۔ وہی نے علیحدہ کی خاطر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنا گھر بسانے کا فیصلہ کیا تو لالہ کے اندر وہی آرزو بھی دھیرے دھیرے سر اٹھاتی چلی گئی۔ جب وہ بڑی جدوجہد کے بعد وہی اور معاذ کے خاندان کو دشمنوں کے پنجے سے نکال کر ایک الگ تھلگ گوشے میں بسانے میں کامیاب ہو گیا تو اس آرزو نے شدت اختیار کر لی۔ اس نے ایک بار گلوہے کے سامنے اپنی اس آرزو کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا۔

”یار گلوہے.....! بہت گزرا لی اس مارا ماری اور جھینا جھپٹی میں۔ اپنے تئیں دنیا بھر کی عیاشیاں بھی کر لیں پر اب جی چاہتا ہے کہ رشتوں کے بیچ رہ کر جیوں اور جتنی زندگی باقی رہ گئی ہے، اس سے حقیقی خوشی کشید کروں۔ تو جانتا ہے کہ میں وہی کو بہت چاہتا ہوں لیکن اس چاہت کا اتنا مکمل کر اظہار نہیں کر سکا جیسا کہ کرنا چاہتا ہے۔ اب میرا جی چاہتا ہے کہ اپنے بھائی اور وہی کے حصے کی چاہتیں بھی وہی کی اولاد پر لٹا دوں۔ میں سب کچھ چھوڑ کر وہی اور وہی کے بچوں کے ساتھ جینا چاہتا ہوں۔“

اور یہ اس آرزو کی شدت ہی تھی کہ لالہ نے اپنا راج پاٹ چھوڑ کر گوشہ نشین ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے جیتے جی خود کو دنیا کے لیے مار دیا۔ اس کے اس ناک میں رنگ بھرنے کے لیے اس کے ایک پرانے وفادار نے اہم کردار ادا کیا۔ وہ شخص لالہ سے حیرت انگیز مشابہت رکھتا تھا اور اس مشابہت کی بنیاد پر ہی گروہ میں شامل کیا گیا تھا۔ قدرتی مشابہت کو مزید بہتر کرنے کے لیے اس کی کچھ سرجریز بھی

ٹھٹھے والی چیخیں کسی ذبح ہوتے جانور کے درد کی عکاسی کر رہی تھیں۔ جسم کے ہر مسام سے پسینا پھوٹ کر فرش پر گرتا تھا اور گرتے ہی بھاپ میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ درد سہتے سہتے وہ بے ہوش ہوا تو کچھ دیر کے لیے اس اذیت سے نجات ملی۔ دوبارہ ہوش آیا تو احساس ہوا کہ فرش پہلے کی طرح تیا ہوا نہیں ہے لیکن آگ تو گویا اس کے ہر غلے میں بھر گئی تھی۔ ایسی تکلیف اور جلن محسوس ہو رہی تھی کہ کوشش کرنے سے بھی سہی نہیں جا رہی تھی اور بے اختیار ہی حلق سے کراہیں نکل رہی تھیں۔

”کیسے ہو گلو استاد! دیکھو تمہاری خاطر مدارت کے لیے میں اپنے سارے اہم کام چھوڑ کر تمہارے ساتھ مصروف ہوں۔ تم دیکھنا میں تمہاری تواضع میں بالکل بھی کوئی کمی نہیں آنے دوں گی۔“ ابھی اس کی آنکھیں کھلی ہی تھیں کہ کانوں میں وہی جانی پہچانی آواز گونجی جواب تک اس سے مخاطب ہوتی رہی تھی لیکن اب وہ اس آواز میں ایک واضح سفاکی کو محسوس کر سکتا تھا۔

”جانوروں سے بھی بدتر ہو تم لوگ۔“ تکلیف سے بلبلاتے ہوئے اس نے نفرت سے جواب دیا۔

”ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے۔ میرا تم سے وعدہ ہے کہ تمہیں اذیت کے اس لیول پر لے جاؤں گی جہاں تم خود کو جانوروں سے بھی کم تر محسوس کرو گے۔“ گلو کے اظہار نفرت نے دوسری طرف سفاکی کو مزید بڑھا دیا تھا۔ گلو نے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے فرش پر تھوک دیا۔ اگلا لمحہ قیامت کا تھا۔ اس کے جسم کو ایک زوردار جھٹکا لگا اور وہ فرش سے چند انچ اٹھ کر دوبارہ نیچے گرا۔ اس کے بعد وقفے وقفے سے پے در پے کئی جھٹکے لگتے چلے گئے۔ جھٹکے اتنی مہارت سے دیے جا رہے تھے کہ وہ بے پناہ اذیت سے تو گزر رہا تھا لیکن جسم و جان کا رشتہ برقرار تھا۔

”دیکھو کیسے ہانپنے ہوئے کتے کی طرح تمہاری زبان باہر نکلی پڑی ہے۔ تم دیکھنا کہ جلد تم کتوں کی طرح ہمارے جوتے چاٹنے کے لیے بھی تیار ہو جاؤ گے۔“ وہ زخمی ناگن تھی جس نے ایک نہیں کئی چوئیں کھائی تھیں۔ معاذ کو ہزار کوشش کے باوجود وہ اپنی مرضی پر نہیں چلا سکی تھی۔ سونیا نے بغاوت کر دی تھی اور اس سب کے ساتھ اسے یہ ہزیمت بھی اٹھانی پڑی تھی کہ وہ کی اور معاذ کی فیملی جن کی موت کا وہ اعلان کر چکی تھی، ان کے زندہ ہونے کی اطلاع ڈیوڈ کے ذریعے ملی تھی۔ کہنے کو وہ ڈیوڈ ایک تنظیم کا حصہ تھے اور ایک ہی ایجنڈے پر کام کرتے تھے لیکن پیشہ دار نہ محامست جیسی

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نوجوان
کی داستان جو غلط کاروں کے لیے
فضیلت ناک تھا باقی واقعات اینڈ ماہ پڑھیے



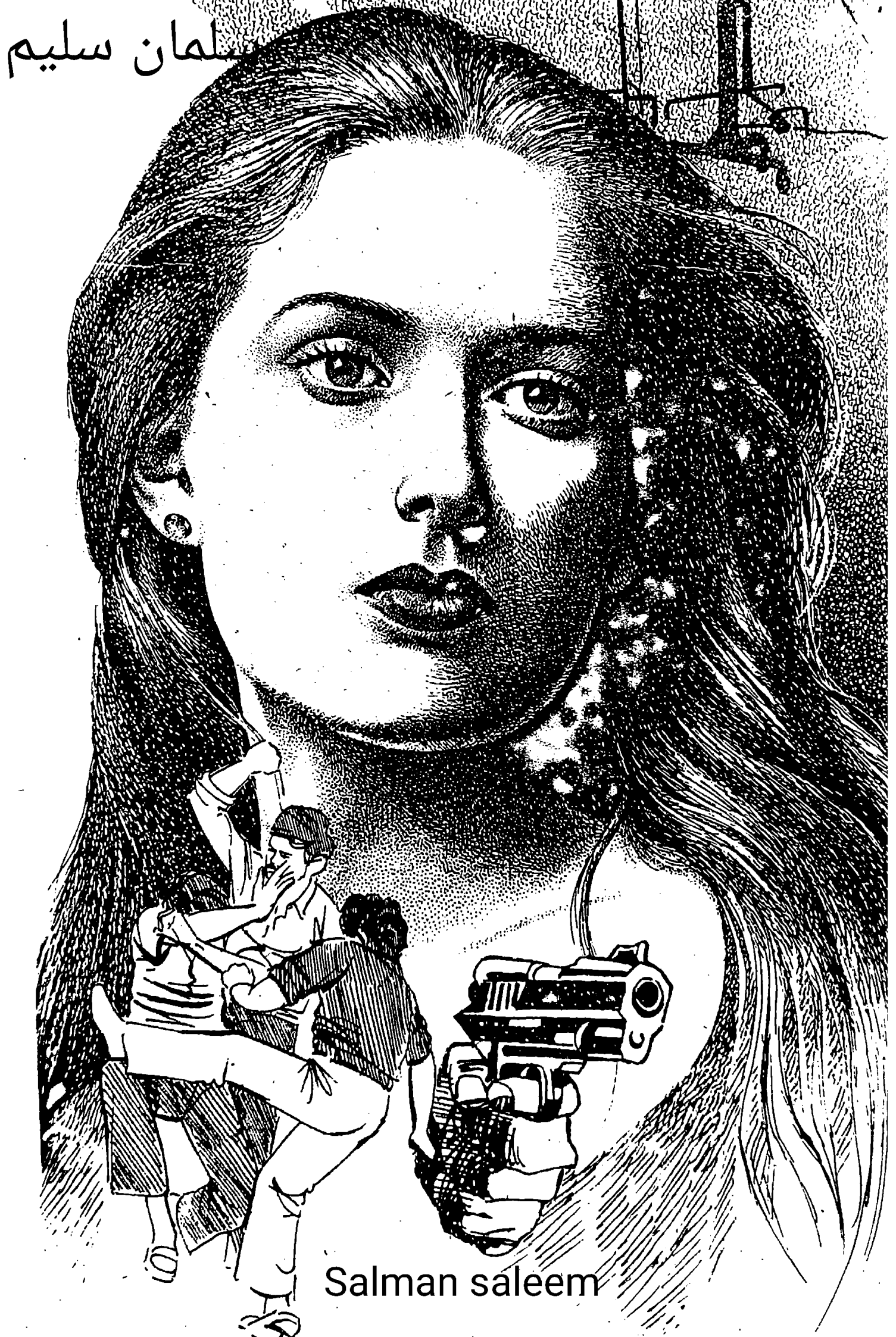
قسط: 32

شہزادہ ابراہیم

اساتذہ کی

زندگی پیار کا نیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تندوتیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابل شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پُر عزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جا رہے تھے... اس کی زندگی جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... یہ خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قراریوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تار عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ وارداتِ قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہوسکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام لوجوان کی تحیر انگیز داستان



سلیمان سلیم

Salman saleem

معاذ ایک ذہین لیکن متلون مزاج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جوائن کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ انسٹی ٹیوٹ سے واپس آ رہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو سڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی نڈر فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشری نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بشری ماس کمیونی کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم وغیرہ لکھتی ہے۔ اس ویران جگہ بھی وہ ایک زیر تعمیر رہائشی منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی آئی تھی۔ معاذ بشری کو یہ حفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کر دیتا ہے لیکن جن رئیس زادوں سے اس نے ان کا شکار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ یہ موقع انہیں یونیورسٹی ٹرپ کی صورت میں مل جاتا ہے اور ایک دن جنگل کی سیر کے دوران وہ فوٹو گرافی کے شوق میں سب سے الگ تھلگ ہو جانے والے معاذ کو بے خبری میں گھر کر بری طرح زد و کوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دے دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس نہ آنے پر انتظامیہ کے افراد، پولیس اور ریسکیو ذرائع کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جوگی کی جھوپڑی میں پاتا ہے۔ اپنی حالت سے اسے اپنے شدید زخمی ہونے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ جوگی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ معاذ کا موبائل جنگل میں ہی کہیں گر جاتا ہے اور جوگی کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا جس سے باہر کی دنیا سے رابطہ کیا جاسکے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے۔ جوگی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نواز کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے پراسرار علم سکھانے کی ہامی بھر لیتا ہے اور معاذ واقعی اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ادھر جائے وقوعہ سے ملنے والے معاذ کے کمرے سے جب تصویریں نکلوائی جاتی ہیں تو بہت سے قدرتی مناظر کی تصویروں میں سے ایک ایسی تصویر بشری کی نظر میں آ جاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پچھے سے ایک چہرہ جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پروجیکٹ کے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشری متعین کر رہی تھی۔ بشری کے اپنے والد جرنلٹ ہوتے ہیں اور حق گوئی ان کے خون میں شامل تھی۔ اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشری کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ صدمے سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باذل نامی غنڈے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشری انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دنوں میں ہی معاذ واپسی کا ارادہ کرتا ہے تاہم ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا عرفان اللہ اور یزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو وقاص نامی ایک لڑکا دہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باذل اچانک بشری کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر دیتا ہے۔ معاذ کو واپس لانے کے لیے اوجھے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اسے واپس آنے کا پیغام دیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کر کے اسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات لی جاتی ہیں، نہ بتاتے پر اس کے بھائی کا ایک گردہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشری بھی انتقام کی آگ میں جلتی ہوئی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہو جاتی ہے۔ معاذ کے دوست عالم شاہ کے بہنوئی کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ کئی فنون میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے ہٹنا سز کر کے اس کے دماغ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ فیضو سے حاصل انوکھے علم کی بدولت ان کا معمول نہیں ہٹتا۔ عالم شاہ اور اس کا نوکر سرد، باذل کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ عالم کی بہن بجل شاہ کے لومو لود بیٹے کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اغوا کا الزام لطیف سومر پر آتا ہے۔ عالم شاہ، باذل کی قید میں موجود ایک زخمی شخص کی مدد سے وہاں سے فرار ہو جاتا ہے۔ ادھر بشری دینی شوقی جاتی ہے۔ وہاں وقاص اسے باربی کے روپ میں پہچان لیتا ہے اور ان دونوں کے درمیان اعتماد کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ وہ سلطان کو مارنا چاہتی ہے تاہم وقاص اسے ایسا کرنے سے روکتا ہے۔ ادھر عالم شاہ، باذل کی قید سے نکل کر اس کا پیچھا کرتا ہے تاہم وہاں اچانک فائرنگ اور دھماکے ہونے لگتے ہیں۔ وہ وہاں معاذ کو دیکھتا ہے۔ صداقت شاہ، لطیف سومر کو گھیرنے کے لیے اس کی خفیہ بیوی اور بچے کا کھوج لگاتے ہیں اور بچے کو اغوا کر لیتے ہیں۔ لطیف سومر مجبور ہو جاتا ہے۔ معاذ کو اس کے گھر والوں سے ملنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ عالم شاہ کو اس کے والد انڈیا رواگئی کا عہدہ دیتے ہیں۔ ادھر معاذ بھی ایک مشن پر سونیا کے ساتھ انڈیا روانہ ہوتا ہے تاہم کچھ لوگ سکھ یا تریوں سے بھری بس کو پر غمال بنا لیتے ہیں۔ معاذ اور سونیا تہ خانے کے تمام افراد کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں تاہم باہر موجود دیگر اغوا کاروں سے مقابلہ ہوتا ہے اور معاذ زخمی ہو جاتا ہے۔ صداقت شاہ کے انڈیا میں موجود رشتے دار کے ہاں شادی ہوتی ہے۔ عالم شاہ، بجل اور سرد انڈیا روانہ ہو جاتے ہیں۔ رپورٹ سے گھر رواگئی پر راستے میں کچھ لٹیرے انہیں

لوٹ لیتے ہیں۔ عالم شاہ ایکشن میں آنا چاہتا ہے تاہم اجالانامی عالم شاہ کی کزن اس کا راستہ روک لیتی ہے۔ گھر پہنچنے پر پولیس کی ریڈ ہوتی ہے اور وہ عالم شاہ اور سرد کو لے جاتے ہیں۔ ادھر بشری اور وقاص باذل کو اسپتال میں مارنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ بچ جاتا ہے۔ معاذ اور سونیا پناہ کی تلاش میں ہوتے ہیں اور بالآخر اپنے سہولت کاروں سے مل جاتے ہیں۔ عالم شاہ اور سرد کو تشدد کا نشانہ بنا کر دیرانے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ واپس اپنے میزبانوں کے ہاں پہنچ جاتے ہیں۔ شادی کے دوران انہیں پتا لگتا ہے کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں اجالا اور اس کا عاشق شامل ہوتے ہیں۔ وہ چھپ کر ان کی باتیں سن رہا ہوتا ہے کہ اسے چھاپ لیا جاتا ہے۔ تاہم وہاں مارا ماری ہوتی ہے اور اجالا کا عاشق مارا جاتا ہے۔ پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ ان کے کزن انہیں اپنے دوسرے خفیہ ہنگلے پر پہنچا دیتے ہیں جہاں کچھ لوگ ان پر حملہ کر دیتے ہیں۔ وہ وہاں سے بحفاظت نکل جاتے ہیں۔ ادھر معاذ کو سونیا اپنے ساتھ نئے مشن پر لے کر جاتی ہے جس میں ایک ریلوے لائن کو دھماکے سے اڑانا ہوتا ہے۔ معاذ ایسا نہیں چاہتا اس لیے وہ ٹرین کی آمد سے قبل بارودی دھماکا کر دیتا ہے۔ وہ زخمی ہو جاتا ہے اور اسے ہندو سا دھواہنی کشیا میں لے جاتا ہے جہاں اس کی اچھی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ سونیا کے آدمی معاذ کو تلاش کرتے ہیں مگر ناکام ہو جاتے ہیں۔ ادھر عالم شاہ اور سرد خفیہ ذریعے سے بارڈر پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ دھریے جاتے ہیں اور ”را“ کی قید میں پہنچ جاتے ہیں۔ انہیں تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ادھر بشری باذل کو مارنے کی کوشش میں خود نشانہ بن جاتی ہے۔ معاذ سا دھو کی مدد سے ایک انڈین ہیروئن کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ وہیں اسے عالم اور سرد کی گرفتاری کا پتا چلتا ہے۔ ادھر کل کو اس کا شو ہر ذہنی اذیت دیتا ہے۔ معاذ ڈاکٹر فردوس سے ملتا ہے اور اسے سبکل کی مدد کرنے کا کہتا ہے۔ عالم اور سرد قید سے فرار کا سوچتے ہیں اور دھریے جاتے ہیں جس کی پاداش میں انہیں مزید تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ معاذ، وشاکہ ذریعے عالم اور سرد کو رہائی دلوانا چاہتا ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ اس کا بچھا کرتا ہے تاہم وشاکہ کی گاڑی حادثے کا شکار ہو جاتی ہے۔ علیہ اور وقاص وغیرہ کو لالہ عیسیٰ ملک سے باہر نکال دیتا ہے اور ہر ممکن احتیاط کی ہدایت کرتا ہے لیکن علیہ پاکستان میں ٹوبہ سے رابطہ کرتی ہے جو ان کے لیے مصیبت بن جاتا ہے۔ ٹوبہ پر تیزاب پھینک دیا جاتا ہے۔ وقاص، علیہ اور اس کے گھروالوں کو مار دیا جاتا ہے۔ معاذ سبکدوش نامی شخص کے خلاف کارروائی کرتا ہے تاہم وہ مارا جاتا ہے اور معاذ بھی زخمی ہو جاتا ہے اور اپنا نشان وہاں چھوڑ دیتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس معاذ کو دیوانا نامی شخص سے مدد لینے کا کہتی ہے۔ معاذ اس کے ساتھ مل کر موہن نامی ”را“ کے ایجنٹ کو اغوا کر لیتا ہے۔ معاذ اپنے کزن کو پاکستان کال کرتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ اس کے گھروالوں کو مار دیا گیا ہے۔ وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کی ٹھان لیتا ہے۔ ادھر ڈاکٹر فردوس کو اس کے سسرال والے سبکل کو بھگاڑنے کی پاداش میں تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ معاذ، عالم اور سرد کی رہائی کے لیے کارروائی کرتا ہے اور انہیں ”را“ کی قید سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن عالم اور سرد کو دیو کے آدمی کی دوسری جگہ پہنچا دیتے ہیں۔ سونیا معاذ کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتی ہے اور اسے اپنے تعاون اور مدد کی یقین دہانی کرواتا ہے۔ ادھر باذل ایک جگہ لالہ عیسیٰ کی موجودگی پر کارروائی کرتا ہے تاہم لالہ خود کو گولی مار کر ختم کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس کا انتقال ہو جاتا ہے۔ دیو ایکنگ ڈاکٹر فردوس کی میت اٹھنے پر وہاں فائرنگ کر دیتے ہیں۔ سبکل اور جلیل مارے جاتے ہیں اور فیصل اور پانڈے زخمی ہو جاتے ہیں۔ پولیس دیو کو گھیر لیتی ہے۔ معاذ دیو اور اس کے آدمیوں کو نکالنے کے عوض عالم کا پتا معلوم کر لیتا ہے۔ سونیا اور معاذ حیدر آباد نواب بدرالدین کی حویلی پہنچ جاتے ہیں۔ تاہم کالے خان اور رادھا دیوی کو میڈیم ایکس کے شکنجے سے چھڑانے کے لیے انہیں واپس آنا پڑتا ہے، کالے خان کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ نواب صاحب کی حویلی میں عالم اور سرد کی رہائی کے لیے کارروائی کرتا ہے مگر نواب صاحب کا بیٹا ان کے سامنے آ جاتا ہے۔ وہ سبکل کو بھی اغوا کر کے حویلی لے آتا ہے۔ تاہم وہ لوگ عید کو قبضے میں کر کے وہاں سے نکل جاتے ہیں۔ وہ لوگ بے ٹھکانے پر پہنچتے ہیں تو وہاں معاذ سے ملنے جا رو نامی شخص آتا ہے۔ اسے معاذ نے ”را“ کی قید سے نکالا ہوتا ہے۔ ادھر سبکل کا بیٹا اعظم اپنی ناک میں پتھر پھنسا لیتا ہے۔ جارد اور معاذ، سبکل سمیت اسپتال جاتے ہیں اور پہچان لیے جانے پر پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ پولیس سے مقابلے کے بعد وہ ایک بستی میں پناہ کے لیے مہس جاتے ہیں اور دو لوگوں کو یرغمال بنا کر ان کی جموہوری میں قیام کرتے ہیں۔ ادھر سونیا عالم وغیرہ سمیت سب کو ٹھکانا بنا دینے کا کہہ کر معاذ کی تلاش میں نکلتی ہے اور اسے بستی میں پہنچنے پر معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ معاذ اور جارد وغیرہ نوپ نامی شخص کے ساتھ اس کے مالک کے ہنگلے میں قیام کرتے ہیں۔ سونیا بھی معلومات حاصل کرتی ہوئی مذکورہ ہنگلے تک پہنچ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور سرد بھی سونیا کا پیچھا کرتے ہوئے وہیں پہنچ جاتے ہیں۔ ادھر وقاص وغیرہ زندہ ہوتے ہیں۔ وقاص حلیہ بدل کر گلوکا باڈی کارڈ بناتا ہے۔ وہ معاذ کو تلاش کرنے کے لیے انڈیا روانہ ہوتا ہے۔ وہاں اس کی گل خان سے ملاقات ہوتی ہے اور معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ سونیا، معاذ اور دیگر ساتھیوں سے مل جاتی ہے تاہم وہ جس ہنگلے میں ہوتے ہیں وہ دشمن کا ہوتا ہے۔ وقاص بھی معاذ کو ڈھونڈتا ہوا وہیں پہنچ جاتا ہے۔ دشمن سب کو بے ہوش کر کے کہیں لے جا رہے ہوتے ہیں کہ ان کی گاڑی کو حادثہ پیش آ جاتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیں

”میں ٹھیک ہوں۔ سب واپس اندر چلیں۔“ سرد کے ہیلمٹ کے اڑتے پرچوں، نیچے گرتے وجود اور خون کی سرخی نے اس منظر میں بجتی فون کی گھنٹی کی آواز کے ساتھ پورے منظر کو ساکت کر دیا تھا۔ اس منظر کو دوبارہ متحرک

کرنے والی آواز بھی سہم کی تھی۔ وہ خوش نصیب ثابت ہوا تھا۔ جس گولی نے اس کے سر پر موجود ہیلٹ کے پرچے اڑا کر رکھ دیے تھے وہ محض اس کے کان کو بوسہ دیتے ہوئے گزری تھی اور گولی کے اس بوسے ہی نے اچھا خاصا خون جاری کر دیا تھا۔

اندر آ کر کچھ لوگ اس کے زخم کی دیکھ بھال میں لگ گئے جبکہ سونیا نے مستقل مزاجی سے بجتے فون کا ریور اٹھالیا۔ معاذ بھی لپک کر دوسرے سیٹ تک پہنچا۔

”بہت خوب! بڑی رونق لگا رکھی ہے تم لوگوں نے۔ میں دور بیٹھا بھی بہت انجوائے کر رہا ہوں لیکن میرے خیال میں اب کچھ سنجیدہ باتوں کا وقت آ گیا ہے۔“ ڈیوڈ کی کھرکراتی آواز میں ان کے لیے مضحکہ بھی تھا اور تنبیہ بھی۔ ”ہم بھی سنجیدہ بات ہی کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے بہتر ہے کہ خوانخواہ کا تماشا کرنے کے بجائے سیدھے اپنی شرائط بتاؤ۔“ چند ثانیے قبل ہونے والے واقعے کے اثرات ابھی تک معاذ کے دل و دماغ پر تھے اس لیے سونیا کے کچھ بولنے سے قبل ہی وہ تیز لہجے میں بول اٹھا۔ ”اوہ معاذ ڈارلنگ! سنا ہے تم نے میڈم ایکس کو ناکوں چنے چبوا دیے ہیں اور وکٹر جیسے شاطر کی موجودگی کے باوجود اس کے قابو میں نہیں آئے۔ تمہارے اتنے قصے سن کر تم سے ملاقات کا بہت شوق تھا اور دیکھو ایک اتفاق نے یہ شوق پورا کر دیا۔ قسمت خود گھر کر تمہیں میری کچھار تک لائی ہے۔“ معاذ کے غصیلے لہجے کے مقابلے میں، اس کے انداز میں شوخی تھی۔

”کچھار نہیں ملے ہے، بزدل چوہوں کا بل۔ جن کے اندر سامنے آ کر لڑنے کی ہمت نہیں اور چھپ چھپ کر دار کرتے ہیں۔“ معاذ کو اس کی یہ شوخی ذرا نہ بھائی اور تند لہجے میں جواب دیا۔

”معاذ اپنے ساتھیوں کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہے ڈیوڈ۔ تم نے میرے اور اس کے لیے چوائس دی تھی کہ ہم یا تو موت کو قبول کر لیں یا اس زندگی کو جو تم ہمارے لیے منتخب کر دو گے۔ تمہیں یہ فیصلہ سنانے سے پہلے معاذ اپنے دوستوں کا مستقبل جاننا چاہتا ہے۔“ ان دونوں کے درمیان کوئی نئی بحث چھڑنے کے ڈر سے سونیا نے گفتگو میں دخل دیا اور اصل موضوع پر بات کی۔

”سوچا تو یہی تھا کہ ان سب کو زنگ پہنچا کر انڈین پولیس کو آٹک وادیوں کو ٹھکانے لگانے کا کریڈٹ دلوا دیں گے لیکن ابھی جو معاذ کی ان سے محبت دیکھی ہے تو کچھ اور

سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔“ اس کی منحوس آواز میں مکاری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

”کیا..... کیا سوچا ہے تم نے؟“ سونیا نے معاذ کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور خود بات کو آگے بڑھایا۔

”سوچا ہے کہ دوستوں کو دوست کے ساتھ رکھتے ہیں اور انہیں بھی وہ سارے مزے کرواتے ہیں جو تم لوگ کرنے والے ہو۔“ وہ گویا کسی بہترین تفریح کے خیال سے لطف لے رہا تھا اور یہ تو وہ اپنی پہلی کال میں ہی بتا چکا تھا کہ انہیں جو زندگی ملنے والی ہے وہ بے حد اذیت ناک ہوگی۔ اس لیے اس کا جواب سن کر معاذ کا چہرہ ست گیا۔

”ہمارے ساتھیوں میں ایک کمزور لڑکی اور معصوم بچہ بھی شامل ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اور کسی کے لیے نہ سہی ان دونوں کے لیے کوئی گنجائش نکالی جائے اور ان سے کچھ نرمی برتی جائے۔“ موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اس نے اپنے غصے پر قابو پایا اور قدرے عاجزی سے درخواست کی۔ ”کیوں نہیں؟ تمہاری یہ فرمائش بالکل پوری ہو سکتی ہے۔ ہم بچے اور اس کی ماں کو یہاں زندہ چھوڑ دیں گے۔ ماں کچھ دن انڈین پولیس کا دل بہلانے کے کام آجائے گی پھر اس پر کورٹ میں پاکستانی جاسوسہ کی حیثیت سے کیس چلائیں گے، اور رہا بچہ..... تو بچے کا کیا مسئلہ؟ بچہ جیل میں رہے یا انا تھ آشرم میں، لوٹ پوٹر کر بڑا ہو ہی جائے گا۔“ اس نے سبیل اور اعظم کے مستقبل کا وہ نقشہ کھینچا کہ معاذ ہونٹ بھیج کر رہ گیا۔

”لگتا ہے مسٹر معاذ کو میری آفر پسند نہیں آئی؟“ شاطر ڈیوڈ کے لیے اس کی کیفیت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔

”اس آفر کو کرنے سے بہتر تھا کہ تم صاف انکار کر دیتے۔“ معاذ سمجھ گیا کہ وہ اس کی درخواست قبول نہیں کرنا چاہتا۔

”میں، مقابل کی کمزوریوں کو نظر انداز کر دینے کا بالکل بھی قائل نہیں۔ یہ پیاری پیاری حسین کمزوریاں تو آگے چل کر بڑے کام آنے والی ہیں۔“ اس نے اپنے الفاظ سے جتا دیا کہ وہ سبیل کی اہمیت کو سمجھتا ہے۔ اس موقع پر معاذ نے خاموشی اختیار کر لیا ہی مناسب سمجھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ جتنا سبیل کی رہائی کے لیے زور لگائے گا ڈیوڈ اس کی اہمیت سے واقف ہوتا جائے گا اور یہ واقفیت آگے بلیک میلنگ کی راہ ہموار کر دیتی۔

”سبیل ایک بے ضرر سی گھریلو عورت ہے ڈیوڈ جو اتفاقاً اپنے بچے سمیت اس سارے چکر میں پھنس گئی ہے۔

بھی نہیں آرہے ہیں۔“ وکی نے نئی اطلاع دی۔
”مجھے یقین ہے کہ اب یہ لینڈ لائن نمبر بھی مردہ ہو چکا ہوگا۔ اس لیے یہ سوچنا بے کار ہے کہ ہم کسی صورت بچ کر نکل سکتے ہیں یا کسی کو اپنی مدد کے لیے بلا سکتے ہیں۔ ہمیں اب فرار کی ترتیبیں سوچنے کے لیے خود کو ذہنی طور پر ان حالات کے تیار کرنا ہوگا جو آگے پیش آسکتے ہیں۔“ سونیا نے صورت حال کی وضاحت کی۔

”تم سب کے حوالے سے اس سے کچھ کہہ رہی تھیں، کیا وہ اسے اور اعظم کو کوئی رعایت دینے کے لیے تیار ہوا؟“ عالم شاہ نے موہوم سی امید کے سہارے سوال کیا۔ وہ ایک بھائی تھا اور خود سے بھی زیادہ بہن اور بھانجے کے لیے فکر مند تھا۔

”نہیں، وہ کسی رعایت کے لیے راغبی نہیں ہوا۔“ سونیا کو اسے مایوس کرنا پڑا۔ اچھی بات یہ تھی کہ سب اس وقت وہاں موجود نہیں تھے۔ وہ اعظم کے رونے کی آواز سن کر اندر کمرے میں چلی گئی تھی۔

”ٹھیک ہے یارو! جب کچھ نہیں ہو سکتا تو کچھ کھانا پینا کر لیتے ہیں۔ پتا نہیں آگے ظالم پیٹ بھر روٹی کھائیں بھی یا نہیں۔“ جارو نے بوجھل فضا میں ایک الگ ہی مسئلہ اٹھایا اور پھر ایک کونے میں دیکے انوپ اور ہاشو سے مخاطب ہوا۔
”چلو اوائے شتو ٹکڑو! بڑی دیر آرام کر لیا تم نے۔ اب ذرا کچن میں چل کر میرے ساتھ روٹی شونی کا توازن قائم کرواؤ۔“

”اچھا صاحب۔“ انوپ کی طرف سے پہلے جواب آیا۔ بدلتی ہوئی صورت حال کے ساتھ ساتھ اس کی طراری بھی دم توڑنے لگی تھی۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ یہاں کوئی بڑا کھیل چل رہا ہے اور اتنا تو اسے اندازہ تھا کہ ایسے بڑے کھیلوں میں اس جیسے معمولی مہروں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ اسے اپنی اور ہاشو کی زندگیاں خطرے میں نظر آنے لگی تھیں۔
”جب تک کھانا تیار ہو رہا ہے، میں اندر سب کے پاس جا کر آرام کرتی ہوں۔“ سونیا مزید سوالوں سے بچنا چاہتی تھی اس لیے بہانہ بنا کر اٹھ گئی اور اٹلی سی دستک دے کر سب کے زیر استعمال کمرے میں داخل ہوئی۔ سب جو اعظم کو فیڈ کروانے کے بعد اس کے کپڑے تبدیل کروا رہی تھی اسے دیکھ کر مسکرائی۔

”کیسی ہو سب! طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری!“ سونیا نے بیڈ کے پائنٹی بیٹھے ہوئے اس سے پوچھا۔
”تھوڑا سا سر میں درد ہو گیا تھا لیکن اب پین کھالینے سے بہتر ہے۔“ اس نے دھیرے سے بتایا اور اعظم کی شرٹ

اسے اس سارے مسئلے سے الگ کر دو، وہ تمہارے کسی کام نہیں آنے والی۔“ سونیا نے بھی اپنے تئیں ڈیوڈ کو قائل کرنے کی کوشش کی۔

”تم تو ہم سے واقف ہو ڈارلنگ! ہم چاہیں تو پتھروں سے بھی کام لے لیں وہ تو ایک جیتی جاگتی، خوبصورت عورت ہے۔ کسی اور کام نہ بھی اسکی تورا تیں نکلیں.....“

”بکو اس بند کرکتے.....“ معاذ کے اندر حوصلہ نہیں تھا کہ سب سے متعلق اس کی مزید بے ہودہ گفتگو سن سکتا۔

”آرام سے معاذ۔“ سونیا نے اسے اس کے جذباتی بن پر ٹوکا۔ اچھی بات یہ تھی کہ وہ دوسرے کمرے میں رکھے سیٹ پر ڈیوڈ سے گفتگو کر رہا تھا اور ایسے زاویے سے بیٹھا تھا کہ صرف سونیا ہی اسے دیکھ سکتی تھی۔ باقی سبھی صرف وہی ایک طرفہ گفتگو سن پارہے تھے جو سونیا ڈیوڈ سے کر رہی تھی ورنہ ممکن تھا کہ معاذ کے جذباتی لب و لہجے سے عالم شاہ بھی صورت حال کو بھانپ لیتا اور اس کی طرف سے بھی کوئی ایسا رد عمل ظاہر ہو جاتا جو ڈیوڈ کی ناراضی کا سبب بنتا۔

”یہ انڈوپاک کے لوگ بڑے جذباتی ہوتے ہیں، معمولی معمولی باتوں پر بھڑک جاتے ہیں۔ تم معاذ کو سمجھاؤ ہنی کہ خود پر قابو پانا سیکھے کیونکہ آگے اسے صرف باتیں نہیں، عملی طور پر بھی بہت کچھ برداشت کرنا ہوگا۔“ ڈیوڈ ٹھنڈے لہجے میں سونیا سے مخاطب ہوا۔

”میرے خیال میں ہم ان باتوں کو رہنے دیتے ہیں ڈیوڈ! ہم یہاں تمہارے رحم و کرم پر ہیں اور ہونا وہی ہے جو تم چاہتے ہو اس لیے یہ جو اس دینے اور خواہشات پوری کرنے کے ڈرامے بند کرو اور وہ کر گزرو جو کرنا چاہتے ہو۔“ اس بار سونیا نے اس سے دو ٹوک بات کی۔

”تم کتنی سمجھدار ہو بے بی لیکن افسوس کہ تم نے ہمارا ساتھ چھوڑنے کا اہتمام قدم اٹھایا۔ بہر حال ابھی تو تم لوگ دیٹ کرو۔ میرا فیصلہ جلد تم تک پہنچ جائے گا۔“ ڈیوڈ نے یکدم ہی سلسلہ منقطع کر دیا۔

”کیا طے ہوا؟“ زیسیور رکھ کر سونیا اور معاذ سب کے درمیان بیٹھے تو پہلا سوال وکی کی طرف سے آیا۔

”ہمارے پاس کوئی اختیار نہیں ہے۔ جو کچھ طے کرنا ہے انہوں نے ہی کرنا ہے۔“ معاذ نے واضح صورت حال بیان کی۔

”وہ ہمیں اس پتھلے میں، مکمل طور پر بے بس کر چکے ہیں۔ نہ ہم یہاں سے نکل سکتے ہیں اور نہ ہی کسی سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ میں نے چیک کیا ہے۔ یہاں موبائل پر سگنلز

کے بٹن انہماک سے بند کرنے لگی۔ سونیا اس کے حرکت کرتے ہاتھوں اور صبح چہرے کو انہماک سے دیکھنے لگی۔
”ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟“ سبیل نے اس کے دیکھنے کو محسوس کیا۔

”دیکھ رہی ہوں کہ تم میں ایسا کیا ہے جو تمہیں دنیا کی سب عورتوں سے منفرد بناتا ہے۔“ سونیا کے دل کی حسرت اس کی زبان پر آگئی۔

”ایسی تو کوئی بات نہیں۔ میری جیسی تو بہت ہیں۔ ہاں تمہارے جیسا حسن نایاب ہوتا ہے اور کہیں کہیں ہی دکھائی دیتا ہے۔“ سبیل نے جواباً سچائی سے کام لیا۔
”نہیں، تم میں کچھ اور بات ہے جب ہی تو.....“

سونیا نے عین وقت پر اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔
”کیا جب ہی تو؟“ وہ اعظم پر سے توجہ ہٹا کر پوری طرح سونیا کی طرف متوجہ ہوئی۔

”کچھ نہیں۔ میں کچھ دیر آرام کروں گی۔ کھانا تیار ہونے کا پیغام ملے تو مجھے جگا دینا۔“ اس نے سبیل کو ٹالا اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر بستر پر دراز ہو گئی۔ وہ سبیل سے کیسے کہتی کہ ہوش رہا حسن کے باوجود وہ معاذ کی نظر سے محروم ہے جسے وہ سبیل کے حضور جھکائے رکھے تب بھی اس میں جذبات کا سمندر ٹھانٹیں مارتا دکھائی دیتا ہے۔

”ٹھیک ہے تم سو جاؤ، میں اسے باہر سرمد کے حوالے کر دیتی ہوں۔ یہ اپنی نیند پوری کر چکا ہے اور اب کھیلنے کے موڈ میں ہے۔“ وہ اعظم کو لے کر باہر نکل گئی۔ ان حالات میں سونیا کو نیند آنا تو ممکن نہیں تھا لیکن آنکھیں موندے لیٹی رہی۔

اس نے سبیل کا واپس کمرے میں آنا اور احتیاط سے چیزوں کا سمیٹنا بھی محسوس کیا لیکن آنکھوں پر سے ہاتھ نہیں ہٹایا۔

”باہر کھانے کے لیے بلارہے ہیں۔“ لیٹے لیٹے وہ نیم غنودگی میں چلی گئی جب سبیل نے ہولے سے اس کا بازو ہلا کر پکارا۔ وہ اٹیچڈ ہاتھ سے منہ ہاتھ دھو کر سب کے درمیان پہنچی تو کھانا لگ چکا تھا۔ سب ہی بہت دیر سے بھوکے تھے اس لیے تناؤ کے باوجود کچھ نہ کچھ حلق سے اتار لیا۔

”تمہارا کیا حال ہے؟“ کھانے کے بعد اس نے سرمد سے دریافت کیا۔

”ٹھیک ہوں۔ تھوڑا سا بخار ہو گیا تھا لیکن گولی کھانے سے وہ بھی اتر گیا۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

”یہاں کچھ ٹکٹن ٹکٹن سی محسوس نہیں ہو رہی؟“ کھانے کے بعد سب ذرا ڈھیلے ڈھالے ہو کر بیٹھ گئے جب معاذ نے رائے لینے والے انداز میں پوچھا۔

”نہیں تو، مجھے تو ایسا نہیں لگ رہا۔“ عالم شاہ نے اختلاف کیا۔

”مجھے تو پیٹ بھرنے کے بعد والی سستی محسوس ہو رہی ہے۔“ وہی صوفے پر ہی لمبا لیٹ گیا۔

”گلے میں کچھ خراش سی ہو رہی ہے۔“ جبار علی عرف جارو نے شکایت کی۔

”باہر نکلو۔ سب جلدی سے باہر نکلو۔“ فردا فردا سب کی رائے سستی سونیا زور سے چینی لیکن اسے اندازہ ہو گیا کہ اس کی آواز اتنی بلند نہیں نکلی ہے جتنا اس نے اپنا زور لگایا ہے۔ وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

”یہ کوئی بے رنگ اور بے بو گیس ہے جو ہم پر اپنا اثر دکھا رہی ہے۔“ وہ سب کو بتانا چاہتی تھی لیکن آواز پہلے سے بھی زیادہ گھٹ گئی تھی۔ دوسروں کے تاثرات سے بھی ظاہر تھا کہ ان پر اثر ہونے لگا ہے۔ اس نے اپنی پوری قوت صرف کر کے خارجی راستے کی طرف بڑھنا چاہا تاہم مشکل سے دو قدم چل سکی۔ تیسرا قدم اٹھنے تک وہ چکراتے سر کے ساتھ زمین بوس ہو چکی تھی۔ آنکھیں بند ہوتے ہوئے اس نے دیکھا کہ معاذ سمیت سب کا برا حال تھا۔ کچھ آنکھیں بند کر کے لڑھک چکے تھے اور کچھ بے ہوشی کے قریب تھے۔

بے ہوشی کا یہ عرصہ کتنا طویل تھا، ہوش میں آنے کے بعد وہ اندازہ نہیں لگا سکی۔ بس یہ تھا کہ اب وہ اس بیٹگلے میں نہیں تھی جہاں بے ہوشی کا یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ وہ ایک بالکل اندھیری جگہ پر موجود تھی اور یوں لگ رہا تھا جیسے کسی اسٹریچر نمائے پر لیٹی ہوئی ہے۔ اس کے جسم کو اس اسٹریچر پر جمائے رکھنے کے لیے بیلٹ وغیرہ سے باندھا گیا تھا اور وہ بالکل بھی اندازہ نہیں لگا پارہی تھی کہ معاذ اور اس کے دوسرے ساتھی بھی اس کے ساتھ اس جگہ پر موجود ہیں یا نہیں۔

”معاذ.....!“ اس نے کچھ بے چینی کے ساتھ پکارا۔ پکارتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ اس کی زبان اور حلق بالکل خشک ہو رہے ہیں۔

”میں یہاں قریب ہی ہوں سونیا! تمہیں کب ہوش آیا؟“ اندھیری قبر میں معاذ کی آواز سنائی دی تو جیسے آس کا کوئی جگنور روشن ہو گیا۔

”میں ابھی ہوش میں آئی ہوں لیکن کچھ اندازہ نہیں ہو پارہا کہ ہم کہاں ہیں؟“

”میرے خیال میں ہم کسی سواری میں موجود ہیں اور کافی دیر سے موجود ہیں۔“ معاذ نے جواب دیا تو اسے بھی احساس ہوا کہ وہ کسی حرکت کرتی ہوئی شے میں موجود ہیں۔

ہے۔“ معاذ نے شوق لہجے میں اسے جواب دیا۔ اسی وقت انہوں نے محسوس کیا کہ ہموار راستے پر دوڑتی گاڑی کسی ناہموار راستے پر آگئی ہے۔ پُر سکون چلتی گاڑی کو ہچکولے سے لگنا شروع ہو گئے تھے۔ ابتدا میں یہ ہچکولے معمولی تھے لیکن رفتہ رفتہ ان میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ان مستقل ہچکولوں ہی کا اثر تھا کہ جواب تک بے ہوش تھے، آہستہ آہستہ جاگنا شروع ہو گئے تھے اور اپنے اپنے انداز میں اپنے تاثرات کا اظہار کر رہے تھے۔

”ہم کہاں ہیں اور یہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟“ سوئے ہوئے میں سے سب سے پہلے چارو نے حیرت کے اس اظہار کے ساتھ اپنے جاگنے کا اعلان کیا۔

”اس وقت تم سے پرانی پاکستانی فلموں کی اس ہیروئین کی فیلنگ آئی ہے جو ایک تو پہلے موقع محل دیکھے بغیر بے ہوش ہو جاتی ہے اور جب ہوش میں لایا جائے تو آنکھیں پٹپٹا کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے ایسی پریشانی سے، میں کون ہوں اور کہاں ہوں، جیسے سوال کرتی ہے۔ جیسے زمین پر بے ہوش ہونے کے بعد سیدھے مرتخ پر آنکھ کھلی ہو۔“ ہچکولے اتنے شدید ہو چکے تھے کہ بات کرنے میں بھی دشواری ہو رہی تھی پھر بھی معاذ نے اسے پورا لیکچر دے ڈالا۔ ویسے اچھی بات یہ تھی کہ وہ سیٹوں کی مدد سے اپنی اپنی جگہ بندھے ہوئے تھے ورنہ ان شدید جھٹکوں میں ادھر ادھر لڑھک کر زخمی ہو سکتے تھے۔

”اعظم! میرا اعظم کہاں ہے؟“ ابھی وہ خاموش ہی ہوا تھا کہ اندھیرے میں سبیل کی وحشت اور کرب میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔

”یہیں ہوگا سبیل! سب کو علیحدہ علیحدہ جگہوں پر باندھا گیا ہے۔ اعظم بھی تمہارے آس پاس ہی کہیں ہوگا۔ بچہ ہے نا۔ ہو سکتا ہے ہوش میں آنے میں اسے بڑوں سے زیادہ وقت لگے۔“ عالم شاہ نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی لیکن اس کی آواز کی کپکپاہٹ بتا رہی تھی کہ وہ خود اندیشوں کا شکار ہے۔

”وہ نہیں ہے ادا سائیں! وہ ہوتا تو مجھے اس کے ہونے کا احساس ہو جاتا۔ اس کی خوشبو آ جاتی مجھے۔“ عالم شاہ کی تسلی کے باوجود اس کی وحشت میں کمی نہیں آئی تھی اور یہ وحشت ہی تھی جس نے اس جیسی لڑکی کا خود پر سے کنٹرول ختم کر دیا اور دیوانہ وارا اعظم، اعظم کرتی بیٹے کو پکارنے لگی۔ اس کے لہجے کی تڑپ اور وحشت نے معاذ کے اندر طیش کی ایسی لہر دوڑائی کہ اس نے خود کو سیٹوں کی جکڑ سے نکالنے کے لیے جسم کا سارا زور لگا دیا۔ یکدم ہی گاڑی میں بھونچال سا

منہ اور زبان کی خشکی کے ساتھ ساتھ اکڑا ہوا جسم بھی اس بات کی تصدیق کر رہا تھا کہ وہ واقعی بہت دیر سے اس حالت میں موجود ہے۔ پیٹ بھی بالکل خالی محسوس ہو رہا تھا لیکن زیادہ ناتوانی کا احساس نہیں تھا۔

”کیا ہمارے باقی ساتھی بھی ہمارے ساتھ موجود ہیں؟“ ”شاید ہوں۔ ہماری طرح انہیں بھی ہوش آئے تو پتا چلے گا۔ ان خبیثوں نے تو اتنا شدید اندھیرا کر رکھا ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہ دے۔“ معاذ کی آواز سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اس سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔

”میں ہوش میں آ گیا ہوں بھائی جان اور چپکے چپکے آپ کی باتیں سن رہا ہوں۔“ اندھیرے میں وکی کی آواز بھی گونجی۔

”چپکے چپکے سن لے بھائی مگر یہ میرے سر پر سوار ہو کر کیوں سن رہا ہے؟“ وکی کی آواز معاذ کو عین اپنے اوپر سے آئی تھی اس لیے اس نے فقرہ کسا۔

”سب دشمنوں کی مہربانی ہے جناب! ان کا جس کو جہاں جی چاہا ہے، فٹ کر دیا ہے۔“ وقاص نے حقیقت گوش گزار کی۔ آپس میں ہونے والی اس گفتگو سے ان پر واضح ہو گیا تھا کہ جگہ کی تنگی کے باعث اوپر نیچے برتھوں کی طرح کا کوئی سیٹ اب ہے جس میں انہیں ایڈجسٹ کیا گیا ہے۔ اس سیٹ اب کی وجہ سے امید کی جاسکتی تھی کہ باقی ساتھی بھی ان کے ساتھ ہی اس سواری میں موجود ہیں۔ وہ تینوں باقیوں کی نسبت زیادہ مضبوط قوئی کے مالک ہونے کی وجہ سے ذرا جلدی ہوش میں آ گئے تھے۔

”دشمن سبھی، پر حفظ مراتب کا خیال تو رکھنا چاہیے تھا۔ یہ بھی کوئی انصاف ہے کہ رشتے اور عمر دونوں میں چھوٹے بندے کو اوپر جگہ دے دی اور ہمیں اس کے نیچے لگا دیا۔“ معاذ نے یوں اعتراض کیا جیسے اس صورت حال پر سخت مد مزہ ہوا ہو لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔ اس طرح کی ہلکی پھلکی گفتگو کر کے وہ اپنے اور اپنے ساتھیوں کا دھیان بٹانے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ اس متحرک اندھی قبر میں نا معلوم سمت میں جاری سفر اعصاب کو متاثر نہ کرے۔

”کیا پتا انہوں نے سوچا ہو کہ یہ جو سرکس کا جوکر ہے، اسے اونچی چھلانگیں لگانے اور اوپر تپتی رسی پر چلنے کی عادت ہے تو اسے اوپر ہی رکھ دیتے ہیں ورنہ نیچے بے چین رہے گا۔“ وکی فضول گوئی میں اس کا بھرپور ساتھ دے رہا تھا۔

”یہ وجہ ہے تو ان لوگوں کو معاف کیے دیتا ہوں۔ ویسے بھی مجبوری ہے کہ یہ جوکر اب میری بہن کا شوہر بن چکا

آگیا۔ سب کے حلق سے بے ساختہ چیخیں بلند ہوئیں اور اس اوراک نے کہ گاڑی ڈرائیور کے کنٹرول سے نکل کر ڈھلوان سطح پر لڑھکتی جا رہی ہے، اوسان خطا کر دیے۔

☆☆☆

”جانا ضروری ہے کیا؟“ وہ آنکھوں میں ڈھیروں خوف لیے یوں جانے والے سے پوچھ رہی تھی جیسے اسے روک لینا چاہتی ہو لیکن یہ بات کہنے کی ہمت نہ ہو۔

”ضروری نہ ہوتا تو میں اپنی بیٹیا کو زبان پر یہ سوال لانے کی زحمت ہی نہیں دیتا۔“ وہ اس سے نرمی سے مخاطب تھا لیکن آج بنا پیسے ہی سرخ انگارہ ہو جانے والی آنکھوں میں غم و غصے کا جو آتش فشاں دھک رہا تھا، اس کی پیش آس پاس کھڑے نفوس محسوس کر سکتے تھے۔

”آپ کے بغیر میں خود کو غیر محفوظ محسوس کروں گی۔“ وہ عالم اضطراب میں اپنی دونوں ہتھیلیاں آپس میں مسل رہی تھی۔

”میں تم لوگوں کی حفاظت کا پورا انتظام کر کے جا رہا ہوں۔ اول تو یہاں تک کسی کی رسائی کا امکان نہیں لیکن اگر کوئی آہی گیا تو میرے آدمی استقبال کے لیے موجود ہوں گے۔ میرے وکی کی امانت ہو تم۔ تمہاری جان میرے لیے اپنی جان سے زیادہ قیمتی ہے۔“ گمبھیر لہجے میں سچائی تھی۔

”لیکن.....“

”کوئی لیکن ویکن نہیں۔ بس اب جانے دو انہیں۔ چھوٹی بچی تو نہیں ہو جو اس طرح ضد کر رہی ہو۔“ پہلو میں کھڑے خاور صاحب نے اسے ”لیکن“ سے آگے کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا اور ذرا سخت لہجے میں ٹوکا۔

”نہ نہ خاور صاحب! یوں ڈانٹیں مت میری بیٹیا کو۔ مجھے اس کے چہرے کی اداسی اچھی نہیں لگتی۔“ علینہ نے باپ کے ڈانٹنے پر منہ بسور تو فوراً اس کی حمایت کی گئی۔

”اداسی اچھی نہیں لگتی پھر بھی مجھے اداس کر کے جا رہے ہیں۔“ اس نے جھٹ جملہ پکڑا اور بچوں کی طرح منہ بسور کر بولی۔

”اداس تو میں خود بھی ہوں بیٹیا! ہمیشہ سے ایک خواب تھا دل میں کہ ایک دن سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنی ایک الگ تھلگ پرسکون دنیا بساؤں گا لیکن ہم جیسوں کے نصیب میں شاید جیتے جی سکون آنا ممکن ہی نہیں ہے۔ میں مجبور ہو گیا ہوں اس دنیا کی طرف لوٹنے پر جسے اپنی مرضی سے چھوڑ آیا تھا۔“ آنکھوں کی سرخی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا اور تصور میں گلو کی سوختہ لاش کی تصویر لہرائی۔ اسے جس

طرح تشدد کر کے ہلاک کیا گیا تھا، وہ ناقابل برداشت تھا۔ ایک ایسا وفادار جو اس کے پسینے پر اپنا خون بہانے کے لیے تیار رہتا تھا، اس بات کا حقدار تھا کہ اس کے قاتلوں سے اس کے خون کا حساب لیا جائے اور یہ حساب لینے کے لیے اس کا خود میدان میں اترنا ضروری تھا۔

”آپ بے فکر ہو کر جائیے لالہ! اسے میں خود سنبھال لوں گا۔ میری بیٹی بہت سمجھدار ہے۔ آپ کی مجبوریوں کو بھی سمجھ لے گی۔“ خاور صاحب نے ایک بار پھر دخل اندازی کی ضرورت محسوس کی۔

”ابو ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ آپ جائیے۔ میں اب آپ کو نہیں روکوں گی لیکن جانے سے پہلے وعدہ کر کے جائیں کہ پابندی سے رابطہ کرتے رہیں گے۔ کہیں یہ نہ ہو کہ آپ بھی وکی کی طرح ہمیں بھول جائیں۔“ جانے کی اجازت دیتے ہوئے فرمائش کے ساتھ ساتھ شکوہ بھی ہوا۔

”بھولا تو وہ بھی نہیں ہوگا۔ بس کسی ایسی مصروفیت میں پھنس گیا ہوگا کہ اس کے پاس تم سے رابطے کی گنجائش نہیں ہوگی۔“ وکی کی صفائی پیش کرتے ہوئے وہ خود اندر ہی اندر تشویش میں مبتلا تھا۔ وکی کی بھارت روانگی کے بعد سے اس کے متعلق کوئی خبر نہیں ملی تھی۔

”اسے صحیح سلامت مجھ تک لانا آپ کی ذمہ داری ہوگی۔ میں انہوں کی جدائی سہہ سہہ کر تھک گئی ہوں۔ وکی سے کہیے گا اب وہ میرا امتحان نہ لے۔“ علینہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

”کاہے کو فکر کرتی ہو بیٹیا! وکی ضرور آئے گا اور اپنے ساتھ سمعہاڈ کو بھی لے کر آئے گا۔“ لالہ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر یقین دہانی کروائی۔

”لالہ نے کہہ دیا ہے تو اعتبار کر لو بیٹی! تم جانتی ہونا کہ انہوں نے بڑے سے بڑا نقصان اٹھا کر بھی اپنا وعدہ نبھایا ہے۔ آج اگر ہم زندہ سلامت یہاں بیٹھے ہیں تو اللہ کے بعد یہ لالہ کی ہی مہربانی ہے۔“ خاور صاحب نے بیٹی کو سمجھانے کا فریضہ انجام دیا۔

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ابوا! انہوں نے مجھے صرف بیٹی کہا نہیں بلکہ دل سے اس رشتے کو نبھایا ہے اور اس کے لیے میں ان کا جتنا شکریہ ادا کروں، وہ کم ہے۔“ علینہ نے اعتراف کیا اور شکر گزار نظروں سے لالہ کی طرف دیکھا۔

”شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بیٹیوں کا باپ پر حق ہوتا ہے اور باپ تو اسی میں خوش رہتا ہے کہ اس کی بیٹی کے لبوں پر مسکراہٹ ہو۔“ لالہ کے الفاظ نے علینہ کو



ستمبر 2022ء

کے شمارے کی

دلکش کہانیوں

کی ایک جھلک

خونی محافظ

معمولی حادثہ کبھی کبھی ایک بڑی مصیبت کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔ بھرے پرے شہر میں دوڑتی بھاگتی لڑکی کی مشکلات..... **امجد رئیس** کے قلم سے

شعلہ زن

بے بسی کے اندھیروں میں ڈوبتی لڑکی کی دردناک داستان حیات.....
روبینہ رشید کے قلم کی جادوگری
ذہر

دنیا مجبور کرتی ہے کہ ان پر قہر بن کر ٹوٹ پڑو..... ایک ایسے ہی نوجوان کی کوچہ گردی..... زندگی اس کے لیے خالی کشکول کے مانند تھی..... **حسام بیٹ** کے قلم سے نئی سلسلے وار کہانی۔

سرواق کے رنگ

پہلا رنگ

وقت کی بے رحم موجوں کی زد میں آ جانے والوں کی دل گداز کہانی۔ **اسما قادری** کی جادوگری

دوسرا رنگ

پراسرار شہر میں شروع ہونے والی محبت کی کٹھنایاں **عبدالرب بھٹی** کے قلم کی جادو دانیوں

چینی ٹکٹہ چینی

آپ کے تہرے... مشورے... محبتیں... شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کھائیں

از حد متاثر کیا اور نرم آنکھوں کے ساتھ چہرے پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولی۔

”آپ کی بیٹی اس امید پر اپنے لبوں پر مسکراہٹ سجا کر آپ کو رخصت کر رہی ہے کہ جب آپ واپس آئیں گے تو آپ کے سبک اس کی خوشیوں کا خزانہ موجود ہوگا۔“

”ان شاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔“ لالہ نے بھی دل سے وعدہ کیا اور خاور صاحب سے الوداعی معافتہ کر کے سفر کے لیے قدم آگے بڑھائے۔ کچھ فاصلے پر وہ وفادار و خدمت گار سامان شانوں پر لاوے پتھر لیے راستے پر منتظر کھڑے تھے جنہوں نے اس کے ساتھ سفر پر جانا تھا۔ سفر جو مشکل اور دشوار گزر رہا تھا اور جس کے اختتام پر بھی کئی ہنگامے اس کے منتظر تھے۔

☆☆☆

معاذ کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو نرم و گرم بستر پر پایا۔ ساتھ ہی یہ بھی احساس ہوا کہ اس کے اوپر ایک بھاری کیبل پھیلا ہوا ہے۔ کیبل اس کے جسم کو خوشگوار حرارت دے رہا تھا اور اس کی موجودگی بھلی لگ رہی تھی لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ وہ اس گرم بستر میں کیوں موجود ہے؟ اس قسم کے بستر میں موجود ہونے اور خوشگواریت محسوس کرنے کا مطلب تھا کہ وہ کسی سرد مقام پر موجود ہے۔ معتدل موسم سے نکل کر اس سرد ماحول میں پہنچ جانے کے احساس نے اس کے ذہن میں بھونچال سا پیدا کر دیا تھا۔ اس ذہنی بھونچال نے یکدم ہی اسے وہ بھونچال یاد دلایا جس سے وہ بے ہوش ہونے سے قبل گزرا تھا۔

اسے یاد آ گیا تھا کہ وہ سب ایک ایسی گاڑی میں سفر کر رہے تھے جو کسی تابوت کی طرح بند اور تاریک تھی۔ اس گاڑی میں اسے اور اس کے ساتھیوں کو برتھ نمائستروں پر بیٹھوں سے جکڑ کر لایا گیا تھا اور گاڑی کو حادثہ پیش آنے سے قبل وہ سب اپنی جگہ لیٹے لیٹے آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ اس گفتگو کے دوران ہی گاڑی کو جھٹکے لگنے لگے تھے اور ان جھٹکوں سے سب کی کو بھی ہوش آ گیا تھا۔ ہوش میں آتے ہی اس نے اعظم کو پکارا تھا اور اس اندیشے کا اظہار کیا تھا کہ اعظم گاڑی میں موجود نہیں ہے۔ اس کے اعظم کے لیے واہلے کے دوران ہی گاڑی لڑھک گئی تھی اور کسی کو کسی کی کیا، اپنی ہی خبر نہیں رہی تھی۔

”سبیل!“ حادثے کا خیال آیا تو اس نے تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا کہ یہاں بھی بیٹھوں نے جسموں کو جکڑ رکھا تھا۔ وہ اٹھنے میں تو

کامیاب نہ ہو سکا لیکن اٹھنے کی کوشش میں پہلو سے اٹھنے والی درد کی ٹیس نے احساس دلایا کہ وہ زخمی ہے۔

”اوہ خدا، یہ سب کیا ہے؟“ وہ دھیرے سے بڑبڑایا پھر خود کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ وہ جگہ نیم تاریک سی تھی اور جو تھوڑی بہت روشنی موجود تھی، اسے اس کا منبع دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ روشنی کی کمی کے باوجود وہ یہ جاننے میں کامیاب ہو گیا کہ وہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے سے مزید فرشی بستر بھی موجود ہیں اور وہ جس جگہ موجود ہیں، وہ کوئی باقاعدہ کمرائیں ہے۔ کوئی مختلف سی جگہ تھی۔ عام رہائشی عمارتوں سے بالکل الگ۔

وہ نیم تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس جگہ کا جائزہ لیتا رہا اور بڑی دیر بعد اس کو یہ ادراک ہوا کہ وہ جگہ ایک غار ہے۔ ایک ایسا غار جس کی تراش خراش میں انسانی ہاتھوں کا بھی کچھ نہ کچھ کمال شامل ہے۔ وہ گمان کر سکتا تھا کہ وہاں موجود دیگر بستروں پر اس کے اپنے ساتھی محو آرام ہیں۔ ایک چلتی ہوئی گاڑی کے شدید حادثے کے بعد اگر وہ کسی مقام پر آرام دہ بستروں پر موجود تھے تو یہ لازمی بات تھی کہ انہیں یہاں تک پہنچانے میں انسانوں کا ہاتھ تھا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ وہ انسان ان کے دوست تھے یا دشمن۔ جس طرح انہیں آرام دہ بستروں پر لٹایا گیا تھا، اس سے تو ان کے دوست ہونے کا ہی گمان ہوتا تھا لیکن باندھ کر بے بس کر دینا دشمنوں کی ادائیگی۔

’ہو سکتا ہے انہیں ہماری طرف سے خدشات ہوں اور ہمیں باندھنا محض ایک احتیاطی تدبیر ہو۔ سوچتے سوچتے اسے یوں باندھ دیا جائے کہ ایک معقول وجہ سمجھ آگئی۔ ساتھ ہی کچھ دھندلے دھندلے مناظر بھی یاد آنے لگے۔ سب سے پہلا منظر حادثے کا ہی تھا۔ گاڑی لڑکھی تھی تو سب ہی فطری طور پر خوف سے چیخنے چلانے لگے تھے۔ اس یاد کے بعد دوسری یاد درد کی شدید لہروں، آہوں اور سسکیوں کی تھی پھر کچھ اور دھندلی یادداشتیں تھیں۔ جسم کو ہچکولے سے لگ رہے تھے۔ گھوڑے یا خیر جیسی کسی سواری پر لدے ہونے کا احساس تھا۔ کبھی کبھی کسی کے منہ میں رقیق غذا ڈالنے کا خیال آتا تو کبھی زبان پر ان کڑوی کیلی دواؤں کا ذائقہ تازہ ہو جاتا تھا جو حلق تک کو کڑوا کر دی تھیں۔ ان سب کے بیچ جسم کے مختلف حصوں میں درد کا احساس اپنی جگہ تھا لیکن کچھ بھی بہت واضح نہیں تھا۔ جو کچھ یاد آرہا تھا، وہ ٹکڑوں میں تھا اور ایک دھندلے میں لپٹا ہوا تھا اور اس سے وہ یہی اندازہ لگا پا رہا تھا کہ درد کے احساس کو کم کرنے یا پھر

کسی اور مقصد کے تحت اسے اور یقیناً باقی ساتھیوں کو بھی باقاعدگی سے نیند آور دواؤں کا استعمال کروایا جاتا رہا تھا۔ ان دواؤں کے زیر اثر وہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گئے تھے اور ذہن میں ابھرنے والے سوالات کے جواب حاصل کرنے کے لیے اب ان لوگوں سے ملاقات کے محتاج تھے، جو انہیں یہاں لائے تھے۔

’جانے اب بھی مجھے ہوش میں رکھا جائے گا یا نہیں؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ایک بار پھر کوئی مسکن دوا دے کر نیند کی آغوش میں بھیج دیا جائے۔‘ وہ دیکھ رہا تھا کہ بھاری کسبوں کے نیچے سوئے ہوئے نفوس میں سے کوئی ایک بھی جنبش نہیں کر رہا، اس لیے اس کے دماغ میں اندیشہ ابھرا۔

’مجھے فی الحال خاموشی سے لیٹے رہنا چاہیے اور سن گن لینے کی کوشش کرنی چاہیے کہ یہ سب کیا ہے؟‘ ذہن میں ابھرنے والے اندیشے نے اسے اس خواہش کو دبانے پر مجبور کر دیا کہ وہ آواز دے کر کسی کو وہاں بلائے اور اس سے صورت حال کے متعلق استفسار کرے۔ خاموش لیٹے لیٹے البتہ وہ اپنی بندشوں سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہا تھا۔ چڑے کے وہ بیلٹ بہت مضبوط تھے اور محض جسمانی طاقت کے بل بوتے پر انہیں توڑ دینا ممکن نہیں تھا۔

یونہی لیٹے لیٹے خاصا وقت گزر گیا۔ اس کے لیے یہ بات حیرت کا باعث تھی کہ اتنی دیر میں کسی اور ساتھی کو ہوش نہیں آیا تھا۔ جو جیسا لیٹا تھا، ابھی تک ویسا ہی ساکت لیٹا ہوا تھا۔ وہ جس زاویے سے لیٹا تھا اس کے سامنے محض تین بستر ہی تھے اور وہ پوری طرح اندازہ لگانے سے قاصر تھا کہ ان بستروں پر اس کے کون سے تین ساتھی موجود ہیں۔ کبھی آنکھیں کھولتے اور کبھی بند کرتے مزید کچھ وقت آگے سرکا تو اس کے کانوں میں قدموں کی مدھم چاپیں گونجیں۔ اس کے اندازے کے مطابق وہ کم از کم تین افراد تھے جو اسی طرف آرہے تھے۔ اس نے آنکھیں موند کر خود کو ساکت کر لیا۔ آنے والے قریب آتے چلے گئے اور آخر کار قدموں کی آوازیں اس کے قریب آکر ٹھہر گئیں۔ آنے والوں میں سے ایک تیز تیز کچھ بولا۔ معاذ اس کے الفاظ کا مفہوم نہیں سمجھ پایا لیکن اتنا اندازہ ہو گیا کہ وہ چینی زبان میں بات کر رہا ہے۔ اس نے اپنی پوری توجہ ہونے والی گفتگو کی طرف مرکوز کر لی۔ اپنی سٹون مزاجی کے ہاتھوں مجبور اس نے ایک بار چٹنیوں میں چینی زبان سیکھنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اپنے کورس میٹس میں سب سے اچھا طالب علم ثابت ہوا تھا اور اس کے استاد کا خیال تھا کہ اگر وہ ثابت قدمی کا مظاہرہ

سے معاندانہ لہجے میں باز پرس کر رہے تھے اس لیے وہ کھل کر کسی سوال کا جواب دینے میں متذبذب تھا۔
 ”اے باہر لاؤ۔“ اس کے سامنے کھڑے افراد میں سے دوسرے نے چینی زبان میں اپنے ساتھی سے کہا۔ معاذ اس بار اس کی بات سمجھنے میں کامیاب رہا لیکن اپنے تاثرات سے ظاہر نہیں کیا۔

”سیدھی طرح میرے سوالات کا جواب نہ دے کر تم نے خود کو کٹھنائی میں ڈال لیا ہے۔“ ہندی جاننے والے چینی نے اس سے سخت لہجے میں کہا اور جھک کر اس کی بندشیں کھولنے لگا۔ وہ نسبتاً لمبے قد اور بھاری جٹے کا مالک تھا اور بھکشوؤں کی طرح نارنجی لباس پہنے ہوئے تھا جبکہ اس کے ساتھ کھڑا شخص کوتاہ قد اور دبلا پتلا تھا۔ اس نے پینٹ شرٹ پر چرمی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ جیسے ہی اس کے ساتھی نے معاذ کی بندشیں کھولنا شروع کیں، اس نے اپنا پستول نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔ سر کے عقب میں کھڑا شخص مسلسل خاموش اور بے حرکت تھا۔ بندشیں کھولنے والے نے ہاتھوں کے سوا اس کی ساری بندشیں کھول دیں۔

”اٹھو۔“ حکم دینے کے ساتھ ساتھ اس نے اپنا ہاتھ بھی سہارا دینے کے لیے بڑھایا۔ معاذ کو جب سے ہوش آیا تھا، اپنی ٹانگوں کو محدود سی ہی سہی، حرکت دیتا رہا تھا۔ اس کے باوجود جب بستر سے اتر کر کھڑا ہونے کی کوشش کی تو ٹانگیں کپکپاسی گئیں۔ اگر اس شخص نے اسے سہارا نہ دے رکھا ہوتا تو ممکن تھا کہ وہ سیدھا کھڑا ہی نہ رہ پاتا۔ ٹانگوں کی یہ حالت گواہ تھی کہ انہیں کئی دنوں سے استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ کھڑے ہونے پر اسے تیسرا شخص بھی دکھائی دے گیا۔ وہ بھی چینی تھا اور اس نے بھی بھکشوؤں والا نارنجی لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے گلے میں مالا میں بھی موجود تھیں اور چھوٹے قد کے ساتھ بھاری بدن کے باعث قدرے مضحکہ خیز دکھائی دے رہا تھا۔ روشنی کے لیے اس نے اپنے ہاتھوں میں ایک جلتی ہوئی مشعل تھام رکھی تھی۔

”آگے بڑھو۔“ معاذ کو حکم دیا گیا تو وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھانے لگا۔ کسی نے اس کی ست روی پر اعتراض نہیں کیا۔ یقیناً وہ جانتے تھے کہ اس وقت چلنا اس کے لیے ایک کار دشوار ہے۔

”اسٹیمنا دیکھو اس کا۔“ ہندی بولنے والا چینی، چینی زبان میں پینٹ شرٹ والے چینی سے مخاطب ہوا اور اس جملے سے آگے بھی چند جملے کہے جو معاذ کو سمجھ نہیں آئے البتہ اندازہ ضرور ہوا کہ وہ اسی کے متعلق گفتگو کر رہا ہے۔ اس کا

کرے تو جلد اس مشکل زبان کو روانی سے بولنے کے لائق ہو جائے گا لیکن عادت کے مطابق وہ بہت دیر تک اس کورس میں ٹک نہیں پایا تھا اور کسی اور مشغلے کی طرف متوجہ ہو گیا تھا اس لیے اسے چینی زبان کی معمولی سی شد بد تو تھی لیکن اچھی طرح بولنے یا سمجھنے پر قادر نہیں تھا۔

”میں چیک کرتا ہوں۔“ پوری توجہ سے سننے پر اسے دوسرے آدمی کی زبان سے ادا ہونے والے جملے کا جو مفہوم سمجھ آیا، وہ کچھ بھی تھا۔ کلائی کی نبض پر کسی کی انگلیاں آکر ٹھہریں تو تصدیق بھی ہو گئی۔ نبض دیکھنے والا ایک بار پھر تیزی میں کچھ ایسا کہہ گیا جس کا مطلب اسے سمجھ نہیں آیا اور فوراً ہی کوئی اس کے گالوں کو تھپتھپاتے ہوئے اردو میں پکارا۔

”اٹھو، مسٹر اٹھ جاؤ۔“ اس پکار پر اس نے اداکاری ختم کی اور آہستہ سے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے عین سامنے دو افراد کھڑے ہوئے تھے جبکہ تیسرا جس نے اپنے ہاتھوں میں کسی قسم کی روشنی اٹھا رکھی تھی، اس کے سر کے پیچھے اس زاویے سے کھڑا تھا کہ وہ اس کی موجودگی کو محسوس تو کر سکتا تھا لیکن دیکھنے سے قاصر تھا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“ اسے آنکھیں کھول کر اپنی طرف متوجہ ہوتے دیکھ کر سامنے کھڑے دونوں افراد میں سے ایک نے پوچھا۔ اگرچہ وہ خاصی روانی سے اردو بول رہا تھا لیکن اس کا لہجہ چغلی کھارہا تھا کہ وہ اہل زبان نہیں ہے۔ ہاں، اس کا اور اس کے ساتھی کا ٹانگ نقشہ اور قد کا ٹھان کے چینی ہونے کی گواہی دے رہا تھا۔

”تم لوگ کون ہو؟“ اس نے خود سے کیا جانے والا سوال نظر انداز کر کے ان کی بابت دریافت کیا۔ اس کے یوں سوال کرنے پر اس سے مخاطب شخص کی آنکھوں میں ایک سرد سا تاثر ابھر اور تاثر جیسے ہی سرد مہر لہجے میں بولا۔

”تم سے جتنا پوچھا جائے کیوں اتنا ہی جواب دو۔ سوال کرنے کا ادھیکار نہیں ہے تمہارے پاس۔“ اس بار معاذ پر واضح ہو گیا کہ وہ اردو نہیں بلکہ ہندی بول رہا ہے۔

”ہاں، تو اب بتاؤ تم کون ہو؟“ اس نے ذرا مختلف الفاظ میں اپنا سوال دہرایا۔

”مسافر، جو ایک حادثے کا شکار ہو کر جانے کیسے آپ لوگوں تک آپہنچا ہے۔“ معاذ کو اندازہ تھا کہ اگر ایک بھیما تک حادثے کا شکار ہونے کے بعد وہ اور اس کے ساتھی زندہ تھے تو اس میں ان لوگوں ہی کی مہربانی تھی لیکن اتنی بڑی مہربانی کے بعد ان کا اندازہ دوستانہ نہیں تھا۔ انہوں نے اسے اور یقیناً دوسروں کو بھی باندھ کر رکھا ہوا تھا اور اب اس

طرف متوجہ ہوتے دیکھ کر مترجم اور پینٹ شرٹ والا چینی دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر پراسرار انداز میں مسکرائے اور پھر مترجم نے وہاں موجود بھکشوؤں کی طرف دیکھ کر کچھ کہا۔ وہ دونوں پھرتی سے آگے بڑھے اور پردے کو سمیٹ دیا۔ پردے کے پیچھے کا منظر دردناک تھا۔ معاذ نے بے ساختہ ہی اپنے قدم آگے بڑھائے لیکن پینٹ شرٹ والے چینی نے پھرتی سے آگے بڑھ کر ہسٹل کی نال اس کی کنپٹی پر رکھ دی اور بارعب لہجے میں بولا۔

”اسٹاپ۔“ کنپٹی پر رکھی ہسٹل اس کا مطلب سمجھانے کے لیے ویسے ہی کافی تھی۔ اس بار انگریزی کا استعمال بھی ہوا تو بات پوری طرح عقل میں آگئی۔

”اسے کیا ہوا ہے؟“ خود کو بہ مشکل قابو میں رکھتے ہوئے اس نے سوال کیا اور ایک بار پھر ستون کے ساتھ بندھی سونیا پر نظر ڈالی۔ بے ہوشی کی حالت میں اس کا سر ایک طرف جھول رہا تھا۔ خوب صورت چہرہ متورم اور نیلگوں تھا اور جگہ جگہ سے پھٹ جانے والے لباس کے باعث جسم پر پڑی سرخ لکیریں واضح دکھائی دے رہی تھیں۔ صاف ظاہر تھا کہ اسے ہنٹر وغیرہ کی مدد سے بری طرح پیٹا گیا ہے۔

”یہ ہمارے سوالوں کے جواب دینے کے لیے تیار نہیں تھی۔“ مترجم نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں کھلی دھمکی تھی یعنی وہ بتا رہا تھا کہ اگر اس نے زبان نہ کھولی تو اس کا بھی یہی انجام ہوگا۔

”تو کیا یہ سب کرنے کے بعد تمہیں اپنے جوابات مل گئے ہیں؟“ معاذ نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ وہ جانتا تھا کہ سونیا ایک مکمل تربیت یافتہ عورت ہے اور اپنی کمزوری نہیں کہ تشدد سے بچنے کے لیے اپنی مرضی کے خلاف زبان کھول دے۔

”یہ جواب نہ بھی دے تو کوئی پرابلم نہیں ہے۔ اس کے گلے میں موجود ڈیوڈ اسٹار نے ہمیں اس کی اصلیت بتادی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ سلور رنگ کے درمیان موجود چھ کونوں والا گولڈن اسٹار کس اسرائیلی تنظیم کے اعلیٰ عہدیدار کو دیا جاتا ہے۔“ سونیا نے پتا نہیں کب سنہری ستارے کو اس کے باکس سے نکال کر اپنے گلے کی زنجیر میں پرو لیا تھا اور اس کی موجودگی کے باعث مشکوک ٹھہری تھی۔

”وہ اس کی ذاتی ملکیت نہیں ہے۔ اگر ہو بھی تو آپ کو اس سے کیا مسئلہ ہے؟“ اس نے بے اختیار ہی سونیا کی طرف سے صفائی پیش کی۔

”ہمیں ہر اس شے سے مسئلہ ہے جو ہمارے دیش

دھیان اس گفتگو سے زیادہ آس پاس کا جائزہ لینے میں لگا ہوا تھا۔ کھڑے ہونے پر اسے غار میں ایک چوتھا بستر بھی دکھائی دے گیا تھا لیکن اسے یوں لگا تھا کہ وہ بستر خالی ہے۔ آگے بڑھتے ہوئے اس اندازے کی بھی تصدیق ہوگئی تھی کہ وہ اس وقت ایک غار میں موجود ہے۔ جوں جوں وہ آگے بڑھتے گئے، روشنی بڑھتی گئی اور وہ غار کے دہانے پر پہنچ گئے۔ غار جتنا کشادہ تھا، اس کے مقابلے میں اس کا دہانہ خاصا تنگ تھا اور اس تنگ دہانے سے اندر آنے والی روشنی اتنی نہیں تھی کہ غار کو اندر تک مکمل روشن کر دیتی اس لیے دن کا وقت ہونے کے باوجود غار اندر سے نیم تاریک تھا اور آنے والوں کو مشعل لے کر اندر آنا پڑا تھا۔

غار کے دہانے سے باہر قدم رکھتے ہی اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ ہر سو بکھری برف سے ٹکرا کر منعکس ہونے والی سورج کی تیز شعاعیں ایسے شخص کے لیے یقیناً تکلیف دہ تھیں جس نے ایک نامعلوم مدت کے بعد کھلی آنکھوں سے اس روشنی کو دیکھا تھا۔

”چنانہ کرو، تھوڑے سے میں تمہاری آنکھیں عادی ہو جائیں گی۔“ اردو یا ہندی دان چینی نے اس کی کیفیت کو محسوس کر کے ہنستے ہوئے تسلی دی اور اس سمت بڑھنے کا اشارہ کیا جہاں لکڑی اور گھاس پھوس سے بنا ایک بڑا سا جھوپڑا نما مکان دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے جسم پر جو لباس تھا، وہ اگرچہ اون کی پڑے کا بنا ہوا تھا لیکن غار کے مقابلے میں کھلی فضا میں آکر ٹھنڈک محسوس ہو رہی تھی۔ پینٹ شرٹ والے چینی نے بھی باہر نکل کر اپنی جیکٹ کی زپ بند کر لی تھی لیکن تاریخی لبادوں والے دونوں چینی بھکشوؤں کو کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا اور وہ مزے سے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ مشعل والے بھکشو نے باہر نکلنے کے بعد اپنی مشعل بچھادی تھی اور اب وہی سب سے آگے تھا۔ ان کے اس جھوپڑے نما مکان تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ لکڑی کے دروازے پر دستک دے کر اسے کھلوایا تھا۔ معاذ بنا کسی مزاحمت کے باقی سب کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ اندر، باہر کے مقابلے میں ٹھنڈک کم تھی لیکن غار جتنا آرام دہ ماحول نہیں تھا۔ یہاں اسے مزید دو چینی بھکشوؤں والے لباس اور حلیے میں دکھائی دیے تو اسے شک ہونے لگا کہ وہ ہندوستان کی حدود سے نکل کر چین میں داخل ہو چکا ہے۔ اس شک کی تصدیق کے لیے وہ مترجم کو مخاطب کرتا اس سے قبل ہی ایک تیز نسوانی چیخ نے توجہ منجلی۔ چیخ اس پردے کے پیچھے سے آئی تھی جو اس وسیع جھوپڑے کو دو حصوں میں منقسم کر رہا تھا۔ اسے چیخ کی

”کیا کوئی گڑبڑ ہے؟“ معاذ اس کے انداز پر ٹھنکا۔

”تم لوگ ہمیں جس حالت میں ملے ہو، اس سے تو یہ پتا چلتا ہے کہ تمہاری حیثیت قیدی کی بھی پرستو! اس سے تم زردوش ثابت نہیں ہوتے۔ گولڈن اسٹار کی موجودگی نے تمہیں بہت مشکوک کر دیا ہے۔“ اس نے معاذ کی تشویش کو نظر انداز کر کے اپنی مرضی کے موضوع پر گفتگو جاری رکھی۔

”میں نے تمہیں بتایا تو ہے کہ وہ میری ساتھی کی ذاتی ملکیت نہیں ہے۔ ہم ایک جگہ پناہ لینے کے لیے ر کے تھے۔ وہاں تلاشی کے دوران ایک الماری سے وہ گولڈن ڈیوڈ اسٹار ملا اور میری ساتھی نے اس کی خوب صورتی سے متاثر ہو کر اسے اپنے گلے کی زنجیر میں ڈال لیا۔“ وہ جس طرح اس ستارے کے باعث بھڑکے ہوئے نظر آ رہے تھے، مناسب جی تھا کہ سونیا کی تنظیم سے وابستگی کو ظاہر نہ کیا جائے اس لیے آدھی ادھوری بات بتا کر گزارہ کرنے کی کوشش کی۔

”تم کس سے پناہ لینے کے لیے اور کہاں چھپے ہوئے تھے؟“ اس نے بھی وقتی طور پر سنہری ستارے کی بات جانے دی اور معاذ کی گفتگو کا ایک نکتہ پکڑا۔

”یہ بہت طویل داستان ہے دوست اور یہاں کھڑے کھڑے نہیں سنائی جاسکتی۔“ معاذ نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے معذرت خواہانہ انداز میں جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔ ہم کہیں بیٹھ کر شانتی سے بات کر لیتے ہیں۔“ بھکشو نے پیشکش کی۔ اس ساری گفتگو کے دوران اس کے باقی ساتھی بالکل بے نیاز رہے تھے۔ صرف پنٹ شرٹ والا متوجہ تھا لیکن اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ اس گفتگو کو سمجھنے سے قاصر ہے۔

”میں چاہوں گا کہ اس سے پہلے میری ساتھی کو یہاں سے ہٹا کر اسے طبی امداد دی جائے۔“ معاذ نے سونیا کی طرف اشارہ کر کے مطالبہ کیا۔

”تم ہمارے سامنے شرطیں نہیں رکھ سکتے۔“ بھکشو کے چہرے پر غصے کی سرخی اٹھی لیکن پنٹ شرٹ والے نے اچانک گفتگو میں دخل دیا اور سونیا کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ بولا۔ اس کی بات سن کر بھکشو کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات آئے لیکن وہ خود پر قابو پا کر اپنے ساتھی بھکشوؤں سے تیز تیز لہجے میں کچھ کہنے لگا۔ ردعمل میں وہ سونیا کے قریب جا کر اس کی بندشیں کھولنے لگے۔

”تمہاری اچھا پوری کی جارہی ہے۔ اب تمہارا بھی کام ہے کہ ہمارے ساتھ کوآپریت کرو۔“ بھکشو نے اس پر احسان جنایا۔

کے لیے پراہلم پیدا کرے۔“

”کیسی پراہلم؟ کیا آپ نے اسے اپنے ملک میں دہشت گردی کی کوئی واردات کرتے ہوئے پکڑا ہے؟“ وہ جانتا تھا کہ گاڑی کو حادثہ ہندوستان میں پیش آیا تھا اس لیے سخت لہجے میں باز پرس کی۔

”واردات کرتے نہیں پکڑا لیکن وارداتیوں کو اپنی ملکی حدود کے قریب پا کر دو چار میں پڑ گئے ہیں۔“

”کیا مطلب؟ کیا اس وقت ہم چائنا میں ہیں؟“ وہ اس جواب کو سن کر بری طرح چونکا اور حیرت سے پوچھا۔

”ایسا ہی ہے۔“ دوسری طرف سے تصدیق کر دی گئی۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ معاذ حیرت سے بڑبڑایا۔

”یہی تو ہم چائنا چاہتے ہیں کہ یہ کیسے ہوا؟“ اس نے سخت لہجے میں کہا۔

”میرے لیے یہ ایک حیرت انگیز بات ہے۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں اپنے ہوش و حواس میں آخری بار ہندوستان کی حدود میں تھا۔ وہاں بے ہوش ہوا تو پھر ایک چینی گاڑی میں آنکھ کھلی اور پھر اس گاڑی کو حادثہ پیش آ گیا۔ حادثے کے بعد میں ایک بار پھر بے ہوش ہو گیا اور اب یہاں آپ لوگوں کے درمیان آنکھ کھلی ہے۔“ معاذ نے حقائق بیان کیے جنہیں سن کر موٹے بھکشو نے اپنی گردن کو جنبش دی اور پھر جیکٹ والے سے چینی زبان میں بات کرنے لگا۔ وہ شخص پوری توجہ سے اس کی بات سن رہا اور اپنے ساتھی سے بے حد روانی میں کچھ کہا۔ معاذ ان کے درمیان ہونے والی اس گفتگو کے چند الفاظ اور اکا دکا ادھورے جملے ہی سمجھ سکا۔ اس کے انداز سے کے مطابق بھکشو نے اپنے ساتھی کو اس سے ہونے والی گفتگو کے متعلق ہی آگاہ کیا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ حادثے کی حد تک ہم تمہاری بات مان سکتے ہیں کیونکہ تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو اس حادثے کے بعد بچانے والے ہم ہی تھے۔ تم اس بڑی سی گاڑی کے کابینہ نما حصے میں بنی برتنوں سے بندھے ہوئے تھے اور شاید اسی چیز نے تم لوگوں کی زندگیاں بچالیں ورنہ وہ لوگ جو گاڑی کے اگلے حصے میں سوار تھے، بری طرح زخمی ہو کر موقع پر ہی ہلاک ہو گئے تھے۔“

”میرے ساتھیوں میں سے کسی کو زیادہ نقصان تو نہیں پہنچا ہے نا؟“ تفصیل سن کر معاذ نے بے چینی سے پوچھا۔

”میں نے کہا نا کہ حادثے میں تم لوگ خوش نصیب ثابت ہوئے ہو پرستو.....“ اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”میں کوشش کروں گا کہ آپ کے ہر سوال کا جواب دے سکوں۔“ معاذ نے اسے یقین دہانی کروائی تو وہ اسے لے کر وہیں جھونپڑے میں ایک جانب بچھے فرشی قالین کی طرف بڑھ گئے۔ اس دوران سونیا کو ستون سے کھول کر ایک بستر پر لٹا دیا گیا تھا۔ وہ ابھی بے ہوشی کی حالت میں ہی تھی۔ ادھر وہ تینوں قالین پر بیٹھ چکے تو پینٹ شرٹ والے نے بھکشو سے کچھ کہا جسے سن کر اس نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر معاذ کی طرف متوجہ ہوا۔

”سب سے پہلے اپنا نام بتاؤ۔“ اس نے مطالبہ کیا۔
”معاذ احمد!“ اس بار معاذ نے مزاحمت نہیں کی اور اپنا اصل نام بتا دیا۔

”تم کہاں سے ہو؟ مطلب کس دلش سے؟“ اس بار بھکشو کے سوال سے پہلے پینٹ شرٹ والا چینی بولا تھا۔ یعنی اب وہ خود سوالات کر رہا تھا اور بھکشو کی حیثیت صرف مترجم کی تھی۔

”پاکستان سے۔“ معاذ نے قدرے تذبذب سے ہی سہی لیکن اس بار بھی سچ ہی بولا۔ اس نے دیکھا کہ پاکستان کے حوالے پر وہ دونوں ہی کچھ چونکے تھے۔

”پاکستان سے اپنے انڈیا پہنچنے اور وہاں سے آگے کی پوری تفصیل بتاؤ۔“ نہایت سنجیدگی سے سوال ہوا۔

”میری داستان بہت عجیب ہے۔ پتا نہیں آپ اس پر اعتبار کریں بھی یا نہیں۔“ معاذ جھجکا۔

”وہ ہم پر چھوڑ دو۔ دشو اس کرنا نہ کرنا ہمارا کام ہے۔“ بھکشو نے اسے ٹوکا۔

”میں پاکستان کے شہر کراچی کی ایک ملل کلاس فیل سے تعلق رکھتا ہوں۔ پڑھنے لکھنے میں اچھا تھا لیکن شوق کے ہاتھوں مجبور ہو کر آئے دن نئے نئے فنون بھی سیکھتا رہتا تھا۔

میری اس عادت سے گھر والے خوش نہیں تھے کیونکہ انہیں لگتا تھا کہ اسی عادت کی وجہ سے میں اپنی تعلیم کو پوری طرح فوکس نہیں کر رہا ہوں۔ بہر حال وہ ایک الگ قصہ ہے لیکن

آپ کو بتانے کی جو بات ہے وہ یہ ہے کہ میری شخصیت کے اسی رخ نے کچھ خاص لوگوں کو میری طرف متوجہ کر دیا۔“

اس نے ممکنہ حد تک انہیں سچ بتانے کا فیصلہ کر لیا تھا اس لیے روایتی سے بولتا جا رہا تھا۔ بھکشو اس کی بات ترجمہ کر کے اپنے

ساتھی تک پہنچا رہا تھا۔

”وہ لوگ جرائم پیشہ بلکہ ملک دشمن تھے اور چاہتے

تھے کہ میری صلاحیتوں کو دہشت گردی کی کارروائیوں میں استعمال کریں۔ مجھے اپنا قیدی بنانے کے ساتھ ساتھ میرے

بھائی کو یرغمال بنا کر انہوں نے مجھے بالکل بے دست و پا کر دیا تھا۔ وطن اور انسانیت دونوں سے دشمنی میرے خیر میں نہیں ہے لیکن بھائی اور دیگر گھروالوں کی خاطر میں نے ظاہری طور پر ان لوگوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ مجھے تربیت کے بعد مختلف ٹاسکس دیے جانے لگے۔ میں ظاہری طور پر سب کچھ ان کی مرضی کے مطابق کرتا لیکن چپکے سے کچھ ایسا بھی کر جاتا جس سے ان کا سارا پلان ٹل ہو جاتا۔ پاکستان میں میری مسلسل ناکامیوں کے بعد ان لوگوں نے مجھے انڈیا بھجوا دیا۔ ان کا خیال تھا کہ انڈیا سے روایتی دشمنی کی وجہ سے میں یہاں ان کے مطلب کی کارروائیاں خوشی خوشی کرنے لگ جاؤں گا۔ یہ لڑکی بھی میرے ساتھ میری گائڈ اور ہیلپر کے طور پر بھیجی گئی تھی۔“ اس نے دوسرے حصے میں موجود سونیا کی طرف اشارہ کیا اور خشک ہو جانے والے حلق کے باعث خاموشی اختیار کر لی۔ جب سے ہوش میں آیا تھا، ہلکی ہلکی پیاس محسوس ہو رہی تھی اور اب مسلسل بولنے سے پیاس نے شدت اختیار کر لی تھی۔

”چپ کیوں ہو گئے؟ بولتے رہو۔“ بھکشو نے اسے ٹوکا۔

”میرا حلق خشک ہو رہا ہے۔ میں پانی پینا چاہتا ہوں۔“ اس نے زبان سے مطالبہ کرنے کے ساتھ ساتھ اشارہ کر کے بھی بتایا تا کہ پینٹ شرٹ والا بھی اس کی بات سمجھ جائے۔ بھکشو کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ انکار کرنے کا ارادہ رکھتا ہے لیکن پینٹ شرٹ والا بات سمجھ کر درمیان میں بول پڑا۔ اس کی سفارش پر معاذ کو ایک چھوٹے

سے پیالے میں پانی پلایا گیا۔

”اس سے تمہارے لیے زیادہ پانی پینا ٹھیک نہیں رہے گا۔“ بھکشو نے پانی کی قلیل مقدار کے بارے میں وضاحت بھی دے دی تو معاذ نے ٹھیکسی انداز میں سر کو جنبش دی۔ ساتھ ہی اسے اپنے اس انداز سے پر بھی گہرا یقین ہونے لگا کہ وہ کئی دن کے وقفے کے بعد مکمل ہوش میں آیا ہے۔

”میں انسانیت پر یقین رکھنے والا انسان ہوں اور بغیر کسی نفوس وجہ کے محض ملک اور مذہب کی بنیاد پر کسی بے

قصور کو نشانہ بنانے پر یقین نہیں رکھتا۔ اسی لیے انڈیا میں بھی میں ان کے حسب منشا کام نہیں کر سکا۔ مجھے ایک ٹنک یہ بھی

تھا کہ میرے ہاتھوں انڈیا میں دہشت گردی کروا کر وہ لوگ پاکستان کو بدنام کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ بعد میں میرا

اندازہ درست ثابت ہوا اور ایک بار موقع سننے پر میں ان کے چنگل سے لپکنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ بھی مجھ سے متاثر ہو کر میرے ساتھ آئی اور یوں ہم دونوں ہی زیر عتاب

ہو کر رہ گئے۔

”میں انسانیت پر یقین رکھنے والا انسان ہوں اور بغیر کسی نفوس وجہ کے محض ملک اور مذہب کی بنیاد پر کسی بے

قصور کو نشانہ بنانے پر یقین نہیں رکھتا۔ اسی لیے انڈیا میں بھی میں ان کے حسب منشا کام نہیں کر سکا۔ مجھے ایک ٹنک یہ بھی

تھا کہ میرے ہاتھوں انڈیا میں دہشت گردی کروا کر وہ لوگ پاکستان کو بدنام کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ بعد میں میرا

کی بابت پریشان ہو رہی تھی اور اسے پورا یقین تھا کہ اعظم ان کے ساتھ گاڑی میں موجود نہیں ہے۔

”بچہ، کیسا بچہ.....؟“ بھکشو نے اس کے سوال پر حیرت کا اظہار کر کے اس امر کی تصدیق کر دی کہ سب کا شک غلط نہیں تھا۔

”ہمارے ساتھ ایک چھوٹا گود کا بچہ بھی تھا۔ ہمارے ساتھ موجود دوسری خاتون کا بچہ۔“ بھکشو کی حیرت نے اسے مایوس تو کر دیا تھا پھر بھی اسے اعظم کے متعلق بتایا۔

”کیا اس بچے کا نام اعظم ہے؟“

”ہاں ہاں، بالکل اعظم ہی ہے۔ کیا تم کچھ جانتے ہو اس کے بارے میں؟“ بھکشو کی زبان سے اعظم کا نام سن کر وہ زرجوش ہو گیا۔

”تمہاری وہ دوسری ساتھی غنودگی میں کئی بار یہ نام پکار چکی ہے۔“ بھکشو نے اسے بتایا تو اس کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ ایک ماں اپنی بچھڑی اولاد کے سوا کسے پکار سکتی تھی۔

”وہ خود کیسی ہے؟ اسے حادثے میں کوئی شدید چوٹ تو نہیں لگی؟“ موقع مل گیا تھا تو اس نے سب کا الگ سے احوال جاننا مناسب سمجھا۔ اس کے اس سوال پر بھکشو پہلے اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا پھر اس کے اثبات میں سر ہلانے پر معاذ کی طرف رخ کر کے بولا۔

”حادثے میں سب سے کم چوٹیں اسی لڑکی کو آئی ہیں لیکن اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ بنا کسی دوا کے بھی مسلسل غنودگی میں ہے۔ بس اتنا اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے سر میں شدید درد ہے پر تو، بہت دیکھنے پر بھی اس کے سر پر کوئی چوٹ دکھائی نہیں دیتی۔ وید جی کا اندازہ ہے کہ اس کے دماغ میں کوئی رسولی وغیرہ ہے جس کے کارن اس کی یہ حالت ہو گئی ہے۔“ بھکشو جو کچھ کہہ رہا تھا، اس نے معاذ کو ہلا کر رکھ دیا۔ دل میں پہلی خواہش یہ ابھری کہ ایسی بد فال منہ سے نکالنے والے کے ایک تھپڑ جڑ دے یا پھر اس وید کو گالیاں دے جو ایسے بڑے اندازے لگا رہا تھا لیکن پھر وہ خود ہی بھر بھری مٹی کی طرح ڈھس گیا۔ اسے بار بار سب کے سر میں ہونے والا درد یاد آیا۔ یہ درد فیصل کے وحشی پن کی دین تھا۔ اس نے سب کے اپنی زوجیت میں آنے کے بعد کئی بار اسے بے رحمی سے تشدد کا نشانہ بنایا تھا اور تشدد کی ان کارروائیوں میں ہی ایک بار سب کا سر بیڈ کے کنارے سے بری طرح ٹکرایا تھا۔ اس واقعے کے بعد اس کی جیٹھانی ڈاکٹر فردوس بڑی تنگ وود کے بعد اسے اسپتال لے گئی تھی۔ وہاں اس نے سب کے کچھ ٹیسٹ اور غالباً سی ٹی اسکین بھی

آگئے۔“ اس نے سونیا کے متعلق سارے حقائق کو حذف کر کے گفتگو کو اپنی ذات تک محدود رکھا۔

”اور باقی سارے لوگ؟ وہ کون ہیں؟“

”ہمارے ساتھیوں میں جو ایک بھاری تن و توش کا آدمی ہے، اس کے سوا سب پاکستانی اور میرے دوست ہیں۔ وہ بے چارے ایک نیپلی ٹرپ پر انڈیا آئے تھے اور یہاں آ کر مشکل میں پھنس گئے۔“ اس نے عالم شاہ وغیرہ کی داستان بھی اختصار کے ساتھ بیان کر دی۔

”میرے لیے ممکن نہیں تھا کہ اپنے دوستوں کو مشکل میں چھوڑ کر اپنے بچاؤ کی فکر کرتا۔ انہیں بچاتے بچاتے ایک بار پھر مشکل میں پھنس گیا اور قسمت کے ہاتھوں ہم سب خود ہی دشمن کے زرخے میں پہنچ گئے۔ دشمن ہمیں بے بس کر کے جانے کس عقوبت خانے میں پہنچانا چاہ رہا تھا کہ وہ حادثہ پیش آ گیا اور ہم سب آپ لوگوں کے درمیان پہنچ گئے۔“ اس نے جھوٹ سے گریز کیا تھا لیکن بہت سی باتیں حذف بھی کر گیا تھا۔

اس کے خاموش ہونے پر بھکشو کی زبانی سب کچھ سنتے چینی نے بھکشو کو کچھ ہدایات دیں اور خود ہسپتال ایک طرف رکھ کر جیب سے ڈیجیٹل نوٹ پیڈ نکالا۔ معاذ اس کی بات سمجھ چکا تھا کہ وہ اس کے گھر کا پتا وغیرہ جاننا چاہتا ہے لیکن بھکشو کی طرف سے سوال ہونے تک خاموشی اختیار کیے رکھی۔ اس نے اس کے ہسپتال کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے سے بھی گریز کیا کہ سمجھتا تھا کہ اس وقت کوئی بھی ایڈ وچر جنس حماقت ہے۔

”میرے باقی ساتھیوں کا کیا حال ہے؟ وہ سب ٹھیک تو ہیں؟ انہیں ابھی تک ہوش کیوں نہیں آیا ہے؟“ وہ انہیں ان کی مطلوبہ معلومات فراہم کر چکا تو ایک بار پھر اپنے ساتھیوں کی طرف سے اطمینان حاصل کرنا چاہا۔

”وہ ٹھیک ہیں۔ تھوڑی دیر میں ہوش میں بھی آجائیں گے۔ تم یقیناً ان سب کے مقابلے میں زیادہ مضبوط ہو جو ہر بار سب سے پہلے ہوش میں آجاتے ہو۔ ہمیں پورے سفر میں سب سے زیادہ تمہارا ہی دھیان رکھنا پڑتا تھا۔“ بھکشو نے اس سے جو کچھ کہا، اس سے تصدیق ہو گئی کہ اس کے ذہن میں جو دھندلی دھندلی تصویریں تھیں وہ محض اس کے تخیل کا کمال نہیں تھا بلکہ واقعی اسے سچ سچ میں ہوش آتا رہا تھا اور کچھ مناظر ذہن پر نقش ہو گئے تھے۔

”کیا میرے ساتھیوں میں کوئی بچہ بھی شامل تھا؟“

اسے اچھی طرح یاد تھا کہ حادثہ پیش آنے سے قبل سب، اعظم

آواز میں بولا۔

”شی از میرید!“

”اوہ۔“ دوسری طرف سے افسوس کرنے کے انداز میں ایک لفظ ادا کیا گیا یعنی وہ انکار یا اقرار دونوں نہ کرنے کے باوجود اس کی ٹریجڈی کو سمجھ گیا تھا اور اس کے لیے ہمدردی محسوس کی تھی جب ہی دھیمے سے ہلکھٹو سے کچھ بولا تھا۔ ہلکھٹو نے پہلے تو نفی میں سر ہلایا اور تیز لہجے میں کچھ بولا لیکن پھر پینٹ شرٹ والے چینی نے سمجھانے بھجانے والے انداز میں کچھ کہا تو ٹھنڈا پڑ گیا۔ معاذ کو اس کے الفاظ سے محض اتنا سمجھ آیا کہ وہ کسی معاملے میں پہلے دیدگی سے اجازت لینے کا خواہاں ہے۔

”اٹھو، تم نے جو کچھ بتایا ہے، پہلے اس کی پڑتال ہوگی پھر تم لوگوں کے بھوشے کا فیصلہ ہوگا۔ تب تک تمہیں اور تمہارے متروں کو ہماری قید میں رہنا ہوگا۔“ آپس کی گفتگو ختم کرنے کے بعد ہلکھٹو نے اسے رعب دار لہجے میں حکم دیا۔

”اور وہ ملاقات.....؟“ معاذ وہیں اٹکا ہوا تھا۔

”لڑکی، دیدگی کی نگرانی میں ہے۔ ان سے پوچھ لوں تو تمہیں وہاں لے جاؤں گا۔ تب تک اپنے متروں کے سنگ شانتی سے رہو۔ کھانا پینا سب ملتا رہے گا پر کوئی گڑبڑ نہ کرنا۔“ ہلکھٹو نے اسے جواب دیا اور ساتھ ہی کھڑے ہونے کا اشارہ کیا۔

”اور یہ..... اس کا کیا ہوگا؟“ وہ اشارے پر کھڑا تو ہو گیا لیکن بے سدھ پڑی سونیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فکر سے پوچھا۔

”آجائے گی یہ بھی تم لوگوں کے بیچ۔ پہلے اس سے پوری جانکاری تو لے لیں۔“ ہلکھٹو نے اسے ٹالا۔

”عورت ذات ہے سادھو جی اس پر اس کی طاقت سے زیادہ تشدد نہ کریں۔ جو کچھ سچ تھا، میں نے آپ کو بتا دیا۔“ اس نے انکساری سے سونیا کے لیے سفارش کی۔

”اتنی سیدھی عورت نہیں ہے یہ..... سیدھی ہوتی تو اس حال کو نہ پہنچتی۔ بہت کچھ ہے جو اس نے اپنے من میں چھپا رکھا ہے۔ اس کے من کے بھید تک پہنچنا ہمارے لیے ممکن نہیں دے سکتے۔“ ہلکھٹو نے اس کی سفارش کو رد کر دیا تو اسے جاروٹا چار خاموش ہونا پڑا۔ ایک بار پھر اسے اسی غار میں واپس پہنچا دیا گیا جہاں اس کے دوسرے ساتھی بھی موجود تھے۔ اب کی بار اتنی سہولت دی گئی کہ بندشوں میں اس طرح جکڑا گیا کہ محض بستر پر لیٹا نہ رہنا پڑے اور وہ اپنی مرضی سے اٹھ بیٹھ سکے لیکن بہر حال اتنی گنجائش نہیں تھی کہ وہ

کر دیا تھا لیکن معاذ کو رپورٹس کے بارے میں واضح طور پر کچھ نہیں معلوم تھا۔ اسے زبانی طور پر بتا دیا گیا تھا کہ سبکل ٹھیک ہے اور اس کے ساتھ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ اب اس وقت اسے احساس ہو رہا تھا کہ مسئلہ تو تھا لیکن سبکل نے اس سے چھپا لیا تھا۔ ڈاکٹر فردوس کو بھی یقیناً اس کی خواہش پر ہی نہ چاہتے ہوئے خاموش رہنا پڑا تھا۔ ان دنوں معاذ کو ان کے رویے میں کچھ عجیب سا محسوس بھی ہوا تھا لیکن بھاگ دوڑ اور افراتفری اتنی تھی کہ رک کر غور کرنے کا موقع ہی نہیں تھا پھر حالات نے ڈاکٹر فردوس سے رابطہ ہی منقطع کر دیا تھا اور اس بے چاری کے موت کی آغوش میں جانے تک دوبارہ رابطہ بحال نہیں ہو سکا تھا۔ اس کی خواہش پر اسپتال چھوڑ کر فرار اختیار کرنے والی سبکل اپنی دوائیں تو ساتھ لائی تھیں لیکن رپورٹس چھوڑ دی تھیں۔ رپورٹس کے بارے میں اس کا موقف تھا کہ افراتفری میں اسے خیال نہیں رہا لیکن شاید ایسا نہیں تھا۔ وہ جان بوجھ کر رپورٹس چھوڑ کر آئی تھی اور بعد میں بھی مسلسل اپنی بیماری کو چھپاتی رہی تھی۔

”کاش میں نے ہی بار بار اس کے سر میں ہونے والے درد کو سنجیدگی سے لیا ہوتا۔ اس کا قصور نہیں تھا۔ حالات نے تک کر سکون سے ایک جگہ بیٹھنے ہی نہیں دیا تھا پھر بھی اسے ایسا لگ رہا تھا کہ سبکل کے معاملے میں اس سے کوتاہی ہو گئی ہے اور اپنی یہ کوتاہی اسے بڑی طرح چھ رہی تھی۔

”ضروری تو نہیں کہ وید کا اندازہ بالکل درست ہو۔ اس سے تشخیص میں غلطی بھی ہو سکتی ہے۔ مجھے کسی بھی طرح سبکل کو اس برف زار سے نکال کر کسی بڑے شہر لے جانا ہوگا جہاں سبکل سے اس کے مرض کی تشخیص ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین علاج بھی ہو سکے۔ سبکل کے متعلق سوچتے سوچتے وہ ارد گرد سے یکسر بے خبر ہو گیا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ پینٹ شرٹ والا چینی بہت غور سے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لے رہا ہے۔

”میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔“ آخر کار اپنی سوچوں سے نکل کر اس نے ان لوگوں سے مطالبہ کیا۔ حسب معمول یہ مطالبہ ہلکھٹو کے ذریعے پینٹ شرٹ والے تک پہنچا۔

”کوہر؟“ اس نے معاذ کی آنکھوں میں بغور دیکھتے ہوئے دو لفظ سوالیہ انداز میں ادا کیے۔ یقیناً وہ معاذ سے پوچھنا چاہ رہا تھا کہ کیا تم اس لڑکی سے محبت کرتے ہو اور اس کے لیے اس نے اپنی انگریزی کے محدود ذخیرے میں سے دو لفظ نکال کر ادا کیے تھے۔ معاذ اس سوال کے جواب میں ہاں یا نہ کچھ بھی نہیں کہہ سکتا تھا چنانچہ نظریں جھکا گیا اور دھیمی

حاصل ہوئے ہیں۔ دعا کرو تم پر بھی یہ وقت جلدی آئے۔“ وہ اپنا دھیان بٹاتا چاہتا تھا اس لیے وہ کی الٹی سیدھی باتوں کا جواب اسی کے انداز میں دے رہا تھا۔ اسے شدت سے اس لمحے کا انتظار تھا جب بھکشو اسے سبیل سے ملاقات کے لیے لے کر جاتا۔

”مطلب قبر میں سوال جواب کا سلسلہ نہیں ہے۔ اس کے لیے الگ انتظام ہے۔“

”جی بالکل۔ الگ انتظام ہے اور وہ بھی بڑا دکھری قسم کا۔“ اسی نے جان بوجھ کر وہی کوڈرایا۔

”افواہوں پر کان دھرنے والے اے آسمان ہم نہیں۔“ وہ بہت کانیاں تھا۔ بھانپ گیا کہ اسے ڈرانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

”قبر میں محفل مشاعرہ پہلی بار سنی ہے سائیں!“ یہ سرد تھا جو ہوش میں آتے ہی شامل گفتگو ہو گیا تھا۔

”کوئی محفل مشاعرہ نہیں ہے بھائی۔ کہیں تم اپنے مالک کا نمک حلال کرنے کے لیے اس کی شان میں قصیدہ گوئی نہ شروع کر دینا۔“ معاذ نے بے اختیار اسے ٹوکا تو وہاں ایک قہقہہ پڑا۔

”آپ اچھے دوست ہیں معاذ سائیں جو دوست کا قصیدہ بھی نہیں سن سکتے۔“ قہقہے ختمے تو سرد نے شکوہ کیا۔

”دل چھوٹا نہ کرو یا رازمانہ ہی ایسا آگیا ہے۔“ عالم شاہ نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی لیکن سرد کی تسلی کیا ہوتی۔ وہ اس کی آواز میں کچھ محسوس کر کے چونک گیا۔

”آپ ٹھیک تو ہیں سائیں؟ کوئی پریشانی تو نہیں ہے نا؟ کوئی زخم وغیرہ.....؟“ اس کے بس میں ہوتا تو خود اٹھ کر عالم شاہ کا مکمل معائنہ کرتا۔

”مجھے لگ رہا ہے کہ میری بائیں ٹانگ میں فریکچر ہو گیا ہے۔ میں ٹانگ کو ہلانے پر پارہا اور ایسا لگ رہا ہے کہ ٹانگ پر پلاستر بھی چڑھا ہوا ہے۔“ اس نے اپنی حالت سے آگاہ کیا۔

”ہم حادثے کا شکار ہوئے تھے اس لیے سب کو لازمی کوئی نہ کوئی زخم آیا ہے۔ بس اچھی بات یہ ہے کہ ہم جہاں ہیں، وہاں ہمارے علاج کا خیال رکھا جا رہا ہے۔ تمہاری ٹانگ بھی ان شاء اللہ جلد ٹھیک ہو جائے گی۔“ معاذ کو خبر سن کر دھچکا لگا تھا لیکن اظہار کرنے کے بجائے عالم شاہ کو تسلی دی۔

”کوئی بتائے تو سہی کہ ہم ہیں کہاں؟“ اب تک خاموش پڑے جا رہے تھے وہاں کی دی۔

بستر سے اتر کر چند قدم بھی چل سکتا۔ رہنا اسے اب بھی بستر تک ہی محدود تھا۔ البتہ اب وہ گردن گھما کر آس پاس کا اچھی طرح جائزہ لے سکتا تھا۔ وہاں اس کے علاوہ کل پانچ عدد بستر مزید موجود تھے جن میں سے پانچواں بستر خالی تھا۔ وہ بستر شاید سبیل کے لیے لگایا گیا تھا لیکن اس کی طبیعت کے پیش نظر ویدجی نے اسے اپنے قریب اپنی زیر نگرانی رکھا ہوا تھا جبکہ سونیا کو تو شروع ہی سے انہوں نے مشکوک جان کر سب سے الگ رکھا ہوا تھا۔

”سبیل کو زندگی اور صحت دینا میرے مالک اور ساتھ ہی بہت سارا حوصلہ بھی کہ وہ اعظم کی جدائی کو سہہ سکے۔“ بستر پر سکڑ سٹ کر بیٹھے اس نے سبیل کے لیے دعا کی۔ وہ اس لمحے سے خوفزدہ تھا جب سبیل سے سامنا ہو اور وہ اس سے اعظم کے متعلق سوال کرے۔ اعظم کے ان کے ساتھ نہ ہونے کا مطلب تھا کہ ڈیوڈ نے اسے اپنے قبضے میں لے لیا تھا اور فی الحال وہ جن حالات میں گھرے ہوئے تھے، اعظم کی تلاش میں جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

”کوئی ہے اس قبر میں جو جاگ رہا ہو یا پھر میں اکیلا ہی مردہ ہوں جسے حساب کتاب کے لیے اٹھایا گیا ہے۔“ غار میں وہی کی بڑ بڑاہٹ گونجی تو وہ سوچوں کے گرداب سے نکل کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”اٹھایا تو تمہیں بھی نہیں گیا لیکن مسئلہ یہ ہے کہ کسی فتنے کو زیادہ دیر سلا یا بھی نہیں جاسکتا اس لیے تم خود بخود ہی جاگ گئے ہو۔“ معاذ نے اس پر چوٹ کی۔

”یعنی قبلہ برادر نسبتی پہلے سے جاگ رہے ہیں اور اگر جاگ رہے ہیں تو اس مسئلے پر روشنی ڈالیں کہ یہ کیسی جگہ ہے کہ بندہ جاگ تو گیا ہے لیکن اٹھ کر نہیں بیٹھ سکتا۔ یہاں تک کہ اپنے جسم کی درمیانی منزل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے بیت الخلا کا رخ نہیں کر سکتا۔“ وہ مضبوط اعصاب کا مالک زندہ دل لڑکا تھا جو ایسے مخدوش حالات میں بھی شوخی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

”میرے پاس کوئی نارنج ہوتی تو ایسا ضرور کرتا۔ فی الحال مجبوری ہے۔“

”آپ ہمارے مقابلے میں کچھ کم مجبور دکھائی دے رہے ہیں۔ کم از کم اٹھ کر بیٹھنے کے حقوق تو حاصل ہیں آپ کو۔“ وہی نے آواز کی مدد سے اس کی موجودگی کے مقام کا تعین کر لیا تھا اور لینے لینے ہی کسی طرح گردن گھما کر اسے دیکھنے میں کامیاب بھی ہو گیا تھا۔

”یہ حقوق کمرائے نفیث کا ایک دورہ کرنے کے بعد

دو بھکشوؤں کے ساتھ وہاں نازل ہو گیا۔
 ”لگتا ہے سب کو ہی ہوش آ گیا ہے۔“ مشعل کی
 روشنی میں وہاں کا جائزہ لے کر وہ اپنے بھاری سر کو ہلاتے
 ہوئے بولا۔

”آپ کا اندازہ درست ہے۔“ معاذ نے اسے
 جواب دینے کی ذمہ داری نبھائی۔

”اچھی بات ہے۔ یہ میرے ساتھی، ابھی سب کو
 باری باری فراغت کے لیے لے جائیں گے۔ اگر تم اوگ
 شانت رہے اور کوئی شرارت نہ کی تو سرکشٹ رہو گے۔
 دوسری صورت میں مجھے دوش نہ دینا کہ پہلے خبردار
 نہیں کیا۔“ اس کے انداز میں واضح دھمکی تھی۔

”آپ فکر ہی نہ کریں سوامی جی! یہ میرے دوست
 بہت سمجھ دار ہیں۔ آپ کو ان سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔“
 معاذ نے فوراً اپنے ساتھیوں کی طرف سے یقین دہانی
 کر دوائی۔

”میں کیوں کروں چننا؟ چننا تو تمہیں کرنا ہوگی کہ
 کہیں یہ تمہاری پہلے ہی سے ٹوٹی پھوٹی ٹیم مزید ٹوٹ پھوٹ
 کا شکار نہ ہو جائے۔“ اس نے بے نیازی کے اظہار کے
 لیے شانوں کو جھکا دے کر نخوت سے جواب دیا تو معاذ کو
 خاموشی اختیار کرنا پڑی۔

”میں تمہیں لینے کے لیے آیا تھا۔ وید جی سے بات
 ہو گئی ہے۔ انہوں نے تمہیں ملاقات کی اجازت دے دی
 ہے۔“ خاموشی کے صلے میں اسے وہ خبر سننے کو ملی جس کا
 شدت سے منتظر تھا۔

”میں تیار ہوں چلنے کے لیے۔“ ایک طرف ملاقات
 کے لیے بے چینی تھی تو دوسری طرف وہ اپنے ساتھیوں
 خصوصاً عالم شاہ کو سبیل کی حالت سے آگاہ نہیں کرنا چاہتا
 تھا اس لیے بہت ہی زیادہ جلدی کا مظاہرہ کیا۔ بھکشو نے معنی
 خیز انداز میں مسکراتے ہوئے اپنے ایک ساتھی کو اسے
 کھولنے کا اشارہ کیا۔ وہ اپنے ساتھی کا اس سے سبیل کے سلسلے
 میں استفسار سن چکا تھا اور اس کا رد عمل بھی اپنی آنکھوں سے
 دیکھا تھا اس لیے پُر یقین تھا کہ اسے اپنی محبوبہ سے ملنے کی
 بے چینی ہے اور بے چینی تو تھی۔ وہ لاکھ خود کو دلائل دیتا کہ وہ
 کسی اور کے نکاح میں ہے، ایک بچے کی ماں ہے یا یہ کہ عالم
 شاہ کی بہن ہے وغیرہ وغیرہ لیکن دل کی بے اختیاری اپنی جگہ
 مل اور یہ بے اختیار دل بے طرح دھڑکتا اسے بھکشو کے
 پیچھے پیچھے لے جا رہا تھا۔

☆☆☆

”اب تم جیسے لمبے کانوں والا بھی یہ سوال کرے گا؟“
 ”ان لمبے کانوں نے اب تک ہوا کی شاخیں شائیں
 کے علاوہ صرف چیاؤں شیاؤں سنی ہے اور بندے کو یہ چیاؤں
 شیاؤں سمجھ نہیں آتی۔“ اس نے معاذ کے ٹوکنے پر اپنی
 مجبوری بیان کی تو وہ ہنس پڑا۔

”یہ سبکل اور سونپا کہاں ہیں؟ اب تک ان دونوں میں
 سے کسی کی آواز سنائی نہیں دی۔“ عالم شاہ نے وہ سوال کیا
 جس کی توقع معاذ کو پہلے ہی تھی چنانچہ سوچا سمجھا جواب دیا۔
 ”خواتین کو الگ جگہ رکھا گیا ہے۔ ہم جن لوگوں کے
 درمیان موجود ہیں وہ سادھو، بھکشو قسم کے لوگ ہیں اور مردو
 زن کے آزادانہ میل جول کو پسند نہیں کرتے۔“

”مگر میں سبکل کا بھائی ہوں۔ میرے اس سے ملنے
 پر پابندی عام نہیں کی جاسکتی۔“ عالم شاہ نے احتجاج کیا۔

”بے شک تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ہمارے اور ان
 لوگوں کے درمیان اعتماد کی فضا قائم ہو جائے تو ان کے
 سامنے یہ بات رکھی جائے گی۔“ معاذ نے نرمی سے اسے
 جواب دیا۔

”لیکن یہ ہیں کون لوگ؟ ہمیں بھی تو ان کے بارے
 میں کچھ بتاؤ۔“ جارو نے مطالبہ کیا۔

”چیاؤں شیاؤں سے تم خود سمجھ گئے ہو گے کہ ہمارا
 واسطہ چینوں سے پڑا ہے۔ بد قسمتی سے وہ ہماری طرف سے
 شکوک و شبہات میں مبتلا ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ ہم کسی بری
 نیت سے ان کی حدود میں داخل ہوئے ہیں۔ جب تک اس
 سلسلے میں ان کی تسلی نہیں ہو جاتی، ہمیں تھوڑی تکلیف
 برداشت کرنا پڑے گی۔“

”ان کی حدود سے کیا مراد ہے آپ کی؟ کیا اس
 وقت ہم چین کی حدود میں ہیں؟“ وکی نے فوراً اس کے
 الفاظ پکڑے۔

”مجھے یہی اطلاع دی گئی ہے۔“ اس کے پاس
 اعتراف کر لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

”اس کا مطلب ہے ایک اور غیر قانونی داخلے کا
 الزام.....؟“ عالم شاہ کراہا۔

”الزام تو ہے لیکن اچھی بات یہ ہے کہ ہمیں اپنے
 دفاع کا موقع دیا جا رہا ہے۔“ وہ ہر حال میں اپنے ساتھیوں
 کا حوصلہ بلند رکھنا چاہتا تھا۔

”شش..... کوئی اس طرف آرہا ہے۔“ یکدم ہی
 جارو نے خبردار کیا تو ان سب نے چپ سادھ لی۔ تھوڑی
 دیر میں وہی لمبا، موٹا بھکشو اپنے ہی جیسے نارنجی لباس والے

”تو تم زندہ ہولالہ؟“ حامد اگرچہ بچ راستے سے خود کو اغوا کر کے لائے جانے پر گھبرایا ہوا تھا لیکن لالہ عیسیٰ کے سامنے آتے ہی بولے بنائیں رہ سکا۔

”جس طرح تم لوگوں نے میرے کلیجے پر ہاتھ ڈالا ہے، میں مر بھی گیا ہوتا تو قبر پھاڑ کر نکل آتا۔“ لالہ عیسیٰ نے غراتے ہوئے اس کی بات کا جواب دیا۔ واپسی کے سفر کا آغاز کرتے ہی اس نے گلو کے نائب اصغر کو حکم دے دیا تھا کہ میری آمد سے پہلے پہلے حامد کو اٹھوا کر اڑے پر پہنچا دو چنانچہ یہاں پہنچتے ہی حامد اس کی خدمت میں حاضر کر دیا گیا تھا۔

”میں سمجھا نہیں، آپ مجھ پر کس چیز کا الزام لگا رہے ہیں؟“ حامد نے تجاہل سے کام لیا۔

”اب تو یہ بولے گا کہ مجھے گلو کے مرڈر کا پتا نہیں؟“ ”معلوم ہے لالہ! سن کر افسوس بھی ہوا تھا کہ بے چارے کو اتنی بے دردی سے مارا گیا لیکن اس سب کا مجھ سے کیا تعلق ہے جو مجھے اس طرح سے یہاں لایا گیا ہے۔“ اس نے لالہ کی گھورتی نظروں سے آنکھیں چراتے ہوئے خود کو معصوم ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

”تو کیا سمجھتا ہے کہ میں نے اتنے سالوں اس شہر میں گھاس کھودی ہے؟ مجھے کچھ نہیں معلوم کہ تیری مالکن کا تال میل کدھر کولتا ہے؟“

”مجھیں جو کہنا ہے، کھل کر کہہ دو لالہ!“ حامد نے یوں ظاہر کیا جیسے اسے اس کا طنز برا لگا ہو۔

”تو اپنی میڈم کی تلاش کا کام میرے آدمیوں کو کیوں سوچ کر گیا تھا۔ تیرے اپنے پاس بندوں کی کمی ہے کیا؟“ لالہ پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولا۔

”میرے بندے مجھے اس کام کے لیے ٹھیک نہیں لگے تھے اس لیے تمہاری طرف آ گیا تھا اور منہ مانگے داموں پر بندہ ہانر کیا تھا۔ اگر گلو استاد کو اعتراض تھا تو وہ انکار کر سکتا تھا۔ میں نے کوئی گن پوائنٹ پر تو اس کو مجبور کیا نہیں تھا۔“ حامد نہ تو یہ بتا سکتا تھا کہ سونیا کی تلاش سونیا سے بھی چھپا کر کی جا رہی تھی اس لیے اپنے بندے سامنے لانا مناسب نہیں تھا اور نہ ہی اس بات کا اعتراف کر سکتا تھا کہ یہ میڈم ایکس کی خواہش تھی اس لیے قدرے جارحانہ لہجے میں لالہ کے سوال کا جواب دیا اور بات کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”تمہارے آدمی کو کام دینا ویسے بھی ایک غلطی ثابت ہوا ہے۔ کوئی پروگریس رپورٹ دینا تو دور کی بات، اس نے دوبارہ ہم سے کانٹیکٹ ہی نہیں کیا۔ اس کی دہلی سے

حیدر آباد کے لیے فلائٹ میں بکنگ تھی۔ اس نے وہ فلائٹ بھی نہیں لی۔ اصولاً تو مجھے یہاں آ کر باز پرس کرنی چاہیے تھی اور حساب لینا چاہیے تھا کہ تمہارا آدمی ہم سے پیسے لے کر کام کیوں نہیں کر رہا لیکن میں نے پرانے تعلق کا لحاظ کیا اور ایسے وقت میں جبکہ یہاں گلو کی موت کا سوگ منایا جا رہا تھا، اس قسم کی بات کرنا مناسب نہ سمجھا۔ میری اس مروت اور لحاظ کا یہ صلہ دیا گیا ہے کہ مجھے راہ چلتے اٹھوا لیا گیا ہے اور مجرموں کی طرح مجھ سے تفتیش کی جا رہی ہے۔“ ہر نئے جملے کے ساتھ حامد کا لہجہ مزید جارحانہ ہوتا جا رہا تھا۔

”زیادہ نوٹش نہ لگا۔ تو کیا سمجھتا ہے کہ میں تیری اس تقریر سے متاثر ہو جاؤں گا۔ میرے کو پورا حساب چاہیے کہ ادھر انڈیا میں جا کر میرا آدمی کدھر تم کیا ہے تم لوگوں نے؟“ لالہ عیسیٰ نے اس کی پوری تقریر کا جواب چند جملوں میں دے ڈالا۔

”یہ تو وہی حساب ہوا کہ الٹا چور کو توال کو ڈانٹنے۔“ حامد جلیلا کر بولا۔

”کو توال اور چور کا فرق تو تجھے ابھی پتا لگ جائے گا۔“ لالہ نے سرد لہجے میں جواب دیا اور اپنے دائیں طرف کھڑے اصغر کی طرف گردن گھما کر بولا۔

”ذرا کو توالوں والی خاطر مدارت کرو اس کی اور جب تک یہ میرے سوال کا ٹھیک ٹھیک جواب نہ دے، تو وضع رکھنی نہیں چاہیے۔“

اصغر نے حکم ملتے ہی ارد گرد کھڑے اپنے مسلح گروں کو اشارہ کیا۔ وہ سب تیر کی طرح حامد کی طرف لپکے۔

”تم یہ ٹھیک نہیں کر رہے ہو لالہ! تمہیں اس سب کا حساب دینا ہو گا۔“ حامد اس افتاد پر بوکھلا کر دھمکیوں پر اتر آیا۔

”کون لے گا حساب؟ تیری وہ میڈم ایکس جو خود سارا وقت مل میں چھپ کر بیٹھی رہتی ہے؟“ لالہ نے حقارت سے اس کی طرف تھوکا۔

”بل میں نہیں چھپی بیٹھی۔ شیرنی ہے وہ شیرنی اور جب اپنی کچھار سے نکل کر تم پر حملہ کرے گی تو بھاگنے کا موقع بھی نہیں ملے گا تمہیں۔“ اس کی طرف سے کسی رعایت کی امید نہ پا کر حامد بھی کھل کر بول رہا تھا۔

”شیرنی شیرنی کے پنجوں سے شکار نکال کر لے گیا تھا میں، پر ابھی تو جانے دے اس بات کو۔ ابھی تو، تو ثابت کر کے دکھا کہ تجھ میں کتنا دم خم ہے۔ حسین عورت کا باڈی گارڈ کم سیکریری بن کر ٹھنڈی گاڑیوں میں گھومنے اور

مردوں کی مار کھا کر اپنا گرم گرم خون بہتے دیکھنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔“ لالہ کے لہجے میں اس کے لیے استہزا تھا۔ غصے میں آیا حامد شاید کوئی جواب دیتا لیکن اصغر کے گرد گون نے اسے مزید زبان درازی کی مہلت نہیں دی اور کھینچتے ہوئے باہر لے گئے۔

اس کے باہر جاتے ہی لالہ کے ماتھے پر ایک موناسا بل پڑ گیا اور اس نے خود کو پرسکون کرنے کے لیے سامنے رکھا جام ہونٹوں سے لگایا۔ اس کے لیے ایک طرف گلو جیسے وفادار کی دردناک موت بڑا دھچکا تھا تو دوسری طرف وقاص کے بارے میں کوئی خبر نہ ملنے پر پریشان تھا۔ گلو کے اپنے موبائل بھول کر جانے کی غلطی اس حد تک تو کارآمد ثابت ہوئی تھی کہ وقاص سے اس کے آخری رابطے کے بارے میں علم ہو گیا تھا اور اس حد تک حامد بھی سچا ہی تھا کہ اس کے پاس وقاص کے بارے میں آخری خبر دہلی پہنچنے کی تھی لیکن لالہ کو اندازہ تھا کہ حامد پورا سچ نہیں بول رہا ہے۔

”بازل کے بارے میں کیا اطلاع ہے؟“ تھوڑی دیر میں اصغر واپس لوٹا تو لالہ نے اس سے دریافت کیا۔

”کوئی اطلاع نہیں لالہ! منظر سے بالکل غائب ہے۔ میں اس کے تمام ٹھکانوں کی نگرانی کروا رہا ہوں لیکن وہ کہیں بھی دکھائی نہیں دیا۔ ایک بندے نے عرفان اللہ کے ایک آدمی تک بھی کسی طرح پہنچ کر اندر کی بات نکالنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کا کہنا بھی یہی ہے کہ عرفان اللہ خود باذل کے لیے پریشان ہے۔ اس نے پچھلے ہفتے اپنے بیٹے سلطان کو بیوی کے ساتھ علاج کے لیے باہر روانہ کیا ہے اور خود سیاسی دائرے لگانے میں مصروف ہے۔ ان حالات میں اسے باذل کی بہت ضرورت ہے لیکن باذل گدھے کے سر سے سینک کی طرح غائب ہے۔“ اصغر نے اسے مکمل رپورٹ پیش کی۔

”میری چھٹی حس کہتی ہے کہ باذل، وکی کے پیچھے ہے۔ وکی نے میڈم ایکس کو چھیڑنے کی جو غلطی کی تھی، وہ اس کا پورا بدلہ چکا رہی ہے۔ وہ بہت تجربہ کار عورت ہے اور وکی اس کے سامنے کل کا بچہ ہے۔“ گلو کے بعد اصغر ہی سب سے قابل اعتماد بندہ تھا اس لیے لالہ اس کے سامنے مکمل کر بات کر رہا تھا۔

”بدھی والا کام اپن نہیں جانتے لالہ! اپنے کو آپ بس یہ بولو کہ کیا کرنے کا ہے۔ اپن کر کے دکھا دیتے ہیں۔“ اصغر قابل اعتبار بھی تھا اور نجی دار بھی لیکن یہ اس کی کمزوری تھی کہ دماغی سوچ بچار کے چکر میں نہیں پڑتا تھا اور اس کی یہ

کمی لالہ کو شدت سے گلو استاد کی یاد دلاتی تھی۔ گلو ایسے مواقع پر بڑے صاحب مشوروں سے نوازتا تھا۔

”ابھی تو، تو بس اس باڈی گارڈ کے بچے کی زبان کھلوا۔ اس سے کوئی کلیو ملے گا تو آگے کی سوچیں گے۔“ لالہ نے اسے جواب دیا اور ذہن نشین کروانے لگا کہ حامد سے کون کون سی معلومات حاصل کرنا ہیں۔

”بس، اب آپ بے فکر ہو جاؤ لالہ! اپن بندے کو الٹ کر اس کے اندر سے سب کچھ نکلوا لے گا۔“ اصغر نے سینہ ٹھوک کر یقین دہانی کروائی لیکن وہاں سے کیا نہیں۔

”کچھ کہنے کا رہ گیا ہے کیا؟“ لالہ نے نیا جام بناتے ہوئے اس کی موجودگی کو محسوس کر کے استفسار کیا۔ پچھلے عرصے میں اس نے شراب نوشی تقریباً چھوڑ دی تھی لیکن جب سے اپنے ٹھکانے پر قدم رکھا تھا، مسلسل پی رہا تھا۔ اس کے آدمی اس کی بلا نوشی کے عادی تھے اس لیے کسی نے کچھ محسوس نہیں کیا تھا لیکن خود لالہ اپنے اندر ایک احساس شرمندگی میں مبتلا تھا کہ جانتا تھا علینہ نے بڑے مان سے اس سے یہ عادت چھڑوائی تھی اور اگر اسے اس سب کی خبر ہو جاتی تو وہ بہت دکھی ہوتی۔

”ظہور کی بیٹی نے درخواست کی ہے کہ انہیں واپس گھر جانے دیا جائے۔ اصل میں ظہور کی بیوہ اپنی زندگی کے آخری دن پورے کر رہی ہے اور اس کی خواہش ہے کہ وہ یہ آخری دن اپنے گھر میں گزارے۔“ اصغر نے اسے مسئلہ بتایا۔ ظہور لالہ کا وہی آدمی تھا جس نے باذل کے بندے کو غلط اطلاعات فراہم کر کے باذل کو اس فارم ہاؤس پر حملہ کرنے کے لیے اکسایا تھا جہاں لالہ کا ڈپلیکیٹ اپنی زندگی کے آخری دن گن رہا تھا۔ اس شخص نے لالہ سے وفاداری نبھانے کے لیے اپنی زندگی کے ٹھماتے چراغ کو خود اپنے ہاتھ سے بجھا دیا تھا جبکہ ظہور کو اس کے جرم کی سزا میں باذل نے مار ڈالا تھا۔ اس شقی القلب انسان نے بدلہ لینے کے لیے محض ظہور کی موت کو کافی نہ جانتا تھا اور ایک روز ظہور کے گھر اپنے ساتھیوں کے ساتھ گھس گیا تھا۔ یہ تو اچھا تھا کہ ایسے ہی کسی خدشے کے پیش نظر گلو، ظہور کی بیوہ اور بیٹی کی نگرانی کردار ہا تھا اس لیے انہوں نے بروقت مداخلت کر کے ان ماں بیٹی کو بچا لیا تھا اور اب وہ دونوں ان ہی کی سرپرستی میں کہیں رہ رہی تھیں۔

”جانے دو ان دونوں کو۔ باذل کی غیر موجودگی میں انہیں وہاں کوئی خطرہ نہیں ہوگا پھر بھی تم اپنے بندوں کی باری باری ڈیوٹی لگا کر ان کی حفاظت کرتے رہنا۔“ لالہ نے

اجازت دے دی تو اصغر وہاں سے ہٹ گیا۔

”تو بھی بڑا بد قسمت ہے لالہ عیسیٰ ابندے کھا گیا پر اس گدی سے دور نہ رہ سکا۔ اب بیٹھا رہ یہاں اور خون کی ہولی دیکھ۔“ لالہ زیر لب بڑبڑایا اور جام ہونٹوں سے لگا کر ایک ہی سانس میں سارا مشروب پی گیا۔

☆☆☆

گھور سیاہ آنکھیں بند پوٹوں کے پیچھے گم تھیں۔ دیکھتے عارض زرد پڑ گئے تھے، ستواں ناک میں لشکارے مارنی لونگ غائب تھی اور گلاب کی پنکھڑی سے مشابہ لبوں پر یوں پھڑپھڑیاں جی تھیں جیسے عرصے سے پانی نہ ملا ہو۔ وہ اس سبیل شاہ کا بس سایہ ہی دکھائی دیتی تھی جس کے عنابی چادر میں چھپے رہنے واسطے چہرے کی اس نے ایک جھلک ہی دیکھی تھی اور اس کے آگے دل ہار بیٹھا تھا۔ اس کی جسمانی اور قلبی تکلیف نے اس کے چہرے کو کسی دھند کی طرح ڈھانپ لیا تھا اور اس دھند کے پار وہ اس پہلے والی سبیل کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس تلاش میں اس کی نظریں نچلے لب کے قریب بائیں کونے پر موجود موٹے سے سیاہ تل پر پڑیں تو دلی زور سے دھڑکا اور اس تل نے اسی طرح اسے اپنی طرف کشش کیا جیسے پہلی دید پر کیا تھا۔ وہ تل عجیب طرح سے اسے لہاتا تھا اور چمک چمک کر چھٹڑتا تھا کہ آؤ مجھے چھو کر دیکھو۔ اس وقت بھی یہی خواہش دل میں جاگی اور اس کے ہاتھ نے بے ساختہ ہی اپنی جگہ سے حرکت کی۔ دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی کی پور سے اس شرارتی تل کو چھوتے ہوئے اس کی پوری جان اس پور میں سمٹ آئی تھی۔ انگلی کی پور نے اس تل کو چھوا تو ایسا محسوس ہوا جیسے زیشم کو چھولیا ہو۔ پورے وجود میں ایک سرور سادوڑ گیا لیکن یہ بس ایک لمحے کا ہی احساس تھا۔ یکدم ہی اسے یاد آگیا کہ اس کی انگلی کی پور جس کے چہرے کو چھو رہی ہے، اسے اپنے چہرے پر کسی نامحرم کی نگاہ تک گوارا نہیں ہے۔ فوراً ہی ریشمی لمس کی جگہ دیکھتے انگارے نے لے لی اور اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا۔ سرور کی جگہ سکوت نے لے لی اور وہ گویا پوری طرح سن ہو گیا۔ یہ کیسی گستاخی سرزد ہو گئی تھی اس سے۔ وہ جو اسے خیال میں بھی بہت احتیاط سے سوچتا تھا، کسے اسے چھو بیٹھا تھا۔ چھونے کا تو حق ہی نہیں تھا اس کے پاس بلکہ دیکھنے کا بھی نہیں تھا۔ وہ کوئی نہیں تھا سبیل شاہ کا۔ بے تحک وہ اس کے دل میں بستی تھی لیکن وہ اس کا محرم نہیں تھا اور اس کی زندگی میں محرم رشتوں کے سوا کسی کی گنجائش نہیں تھی۔

شرمندگی اور جھنجھلاہٹ میں ڈوبے اس نے اپنی

دائیں ہاتھ کی انگلیوں کا رکا بنا کر پوری قوت سے بائیں ہاتھ کی انگلی پر مارا اور سبیل کی طرف سے رخ پھیر لیا۔ رخ پھیرتے ہی اس کی نظر نارنجی لباس والے بوڑھے پر پڑی۔ بوڑھا وہ بس اس اعتبار سے تھا کہ اس کے کندھوں پر جھولتے بالوں سمیت بھوس تک سفید تھیں لیکن ان سفید بالوں کے برعکس وہ کسی جوان کی سی شان سے بغیر کسی سہارے کے تن کر کھڑا ہوا تھا۔ اس کے چہرے اور ہاتھوں کی جلد جھریوں سے پاک، خوب کسی ہوئی تھی اور وہ آنکھوں میں بے پناہ چمک لیے اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ چمک اتنی زیادہ تھی کہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھنا دشوار ہو رہا تھا۔ معاذ نے خود کو اس دشواری میں نہ ڈالا اور نظریں جھکا لیں۔ وہ پہلی ملاقات میں ایک ایسے شخص سے مقابلے کی فضا پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا جو یقیناً وہاں خصوصی اہمیت کا حامل تھا۔

”تمہاری ساتھی کی حالت ٹھیک نہیں ہے جوان! یہ زندگی اور موت کے درمیان پھنسی ہوئی ہے اور کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ اس جنگ میں زندگی کی جیت ہوگی یا موت کی۔“ بوڑھے نے اس سے گفتگو کا آغاز کیا تو معاذ کو اس سے پوچھنے کی حاجت محسوس نہیں ہوئی کہ وہ کون ہے۔ وہ اس غار کے اندرونی گوشے سے نکل کر آیا تھا جس میں بھکشو اسے سبیل سے ملاقات کے لیے لے کر آیا تھا اور بھکشو نے اسے یہ بات پہلے ہی بتادی تھی کہ سبیل کو ویدی کی زیر نگرانی رکھا گیا ہے۔

”کیا آپ کو یقین ہے کہ اس کے دماغ میں رسولی ہے؟“ ویدی جی نے اسے اردو میں مخاطب کیا تھا اس لیے اس نے بھی اردو ہی میں سوال کیا۔

”یہ بھی یقین ہے کہ یہ بہت پرانی رسولی ہے جو عرصہ دراز سے خاموشی سے دماغ میں موجود تھی لیکن کچھ عرصے سے اس نے خاموشی توڑ کر اپنی موجودگی کا احساس دلانا شروع کر دیا ہے۔ یہ لڑکی بہت تکلیف میں ہے اور مجھے یہ بتاتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے کہ اس کی تکلیف میں بدترج اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔“ ویدی بولتا جا رہا تھا اور معاذ کو ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ اس کے سینے پر عین دل کے مقام پر پوری قوت سے گھونے رسید کرتا جا رہا ہو۔

”آپ کے اندازے غلط بھی ہو سکتے ہیں۔ آپ کون سا کوئی باہر سرجن ہیں۔“ اس نے سرخ آنکھوں سے ویدی کی چمکیل آنکھوں کو گھورتے ہوئے چیخ کر کہا۔ اس وقت وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ وہ ویدی سے مقابلہ کرنے کے حق میں نہیں تھا۔

”چھ دن یا زیادہ سے زیادہ چند ہفتے ہیں اس لڑکی کے پاس۔ اس کے لیے اگر کوئی کچھ کر سکتا ہے تو صرف یہ کہ

اس کی تکلیف کو کم کرنے کی کوشش کرے۔“ وید کو اس کے لیے کی تیزی کی کوئی پروا نہیں تھی اور جو بولنا تھا، اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولتا جا رہا تھا۔ اس کے یوں آنکھوں سے آنکھیں ملانے پر معاذ کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے دماغ کو بجلی کے ہلکے ہلکے جھٹکے لگ رہے ہوں۔

”ہناٹ!“ معاذ کے ذہن میں ایک لفظ گونجا اور اس بار اس نے ذرا سنبھل کر بوڑھے کی طرف دیکھا۔ اس کے یوں دیکھنے پر وہ خفیف سا مسکرایا۔

”اگر اسے کسی بڑے اسپتال لے جایا جائے تو اس کا علاج ہو سکتا ہے۔“ اس نے بوڑھے کی مسکراہٹ کو نظر انداز کر کے اپنی بات پر زور دیا۔

”ضرور لے جاؤ لیکن یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کی حالت سفر کرنے کے لائق نہیں ہے۔ ویسے کون سے بڑے اسپتال لے کر جاؤ گے تم اسے؟ انڈیا، پاکستان، چین یا یورپ کا کوئی ملک..... کسی اسپتال کا نام تو ہوگا تمہارے دماغ میں؟“ وید کے لیے میں طنز کی آمیزش تھی اور معاذ کو یکدم ہی ادراک ہوا کہ وہ محض جذباتیت کا مظاہرہ کر رہا ہے ورنہ حالات تو یہ ہیں کہ وہ خود اپنی مرضی سے کہیں نہیں جاسکتا، بیمار سب کو ساتھ لے جانا تو بہت دور کی بات تھی۔ حقیقت کو تسلیم کرتے ہی اس کی نظریں ایک بار پھر جھک گئیں۔

”انسان بہت سی جگہ بے بس ہوتا ہے۔ اسے اپنی بے بسی کو تسلیم بھی کرنا پڑتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ کوشش ہی نہ کرے۔ میں آخر تک کوشش پر یقین رکھنے والا انسان ہوں۔ اس لڑکی کے علاج کے لیے جو کچھ ممکن ہے، کر رہا ہوں اور میری کوشش ہے کہ یہ کم از کم اس لائق ہو جائے کہ سفر کر سکے۔ یہ سفر کے لائق ہوئی تو میں خود کوشش کروں گا کہ اسے فوری طور پر کسی بڑے اسپتال منتقل کروادوں۔“ بوڑھے وید کا لہجہ یکدم ہی نرم ہو گیا اور وہ تسلی دینے والے انداز میں بولتا چلا گیا۔

”اگر آپ ایسا کر سکیں تو میں ذاتی طور پر آپ کا بہت شکر گزار ہوں گا اور اس مہربانی کے بدلے آپ کی ہر خدمت کرنے کے لیے تیار رہوں گا۔“ اس نے دل کی گہرائیوں سے یہ الفاظ ادا کیے۔ اس وقت سب کی زندگی سے زیادہ کچھ بھی اہم نہیں لگ رہا تھا۔ سارے مسائل جیسے یکدم پس پشت چلے گئے تھے۔ بوڑھے نے اس کے الفاظ سنے اور متانت سے مسکرا کر رہ گیا۔

”یہ بہت مظلوم لڑکی ہے وید جی! اس کم عمری میں ہی اس نے بہت دکھ دیکھ لیے ہیں۔ میرا دل نہیں مانتا کہ اس

کے ساتھ کچھ بُرا ہو۔“ اس بار وہ پست لہجے اور عاجزانہ انداز میں گفتگو کر رہا تھا۔

”یہ دنیا کی سب سے خوش نصیب، خوشحال، مکار، چالاک یا ظالم لڑکی بھی ہوتی تو تم اپنے دل میں اس کے لیے یہی خواہش رکھتے جو ان! کوئی دنیا میں ایسا ہوتا ہے کہ وہ چاہے جیسا ہو، ہم اس کے ساتھ بُرا ہوتے نہیں دیکھ سکتے۔“ وہاں گویا سب ہی اس کے دل کا مجید جان چکے تھے۔ وہ کیا کہتا، بس خاموشی سے سر جھکا دیا۔

”آؤ، وہاں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“ بوڑھا وید اسے سبیل کے بستر سے ہٹ کر زمین پر بچھے ادنیٰ نمندے تک لے گیا اور بیٹھتے ہی بولا۔

”سنا ہے تم پاکستانی ہو؟“

”جی، آپ نے صحیح سنا ہے۔“ اضطرابی کیفیت میں اس کی انگلیاں اون کے ریشوں کو کھینچنے لگیں۔ وید نے سبیل کے بارے میں جو کچھ کہا تھا، وہ ایک بھاری بوجھ کی طرح اس کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔

”پاکستان میں کہاں کے رہنے والے ہو؟“

”میں نے اپنا پورا پتا آپ کے آدمیوں کو لکھوا دیا ہے۔ آپ جس ذریعے سے جاہیں، میرے بارے میں معلومات کروالیں۔ میں نے کوئی بھی غلط انفرمیشن نہیں دی ہے۔“ اس کے ذہن میں تھا کہ ان پر سے شکوک ختم ہوں گے تو سبیل کے علاج کے لیے بھی کوئی پیشرفت ہو سکے گی اس لیے اس انداز میں جواب دیا۔

”معلومات کروانا جن کا کام ہے، وہ کرواتے رہیں گے۔ میں تو صرف اس لیے پوچھ رہا تھا کہ اگر تم کراچی کے رہنے والے ہو تو تم سے اپنے ماضی کی کچھ یادیں بانٹ سکوں۔“ وید کا انداز دوستانہ تھا۔

”میں سمجھا نہیں۔“ معاذ ہنسی ہوا۔

”میں نے اپنی زندگی کے کئی ماہ کراچی میں گزارے ہیں۔ اردو بے شک میں چھین ہی سے سیکھ کر گیا تھا لیکن اس میں روانی اور حفاقی کراچی میں رہنے سے آئی ہے۔ زندگی کا وہ دور خوبصورت تھا لیکن پھر آہستہ آہستہ میرا دل ہجوم سے اٹھنے لگا اور ایک دن میں اٹھ کر برف زار میں آ گیا۔ یہاں زندگی بہت پرسکون اور دلچسپ ہے۔ فطرت سے اتنے قریب رہ کر مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔“ بوڑھے نے یوں ناک سیکڑ کر سانس لی جیسے ماحول کی تازگی اور سکون کو سانسوں کے ذریعے اپنے اندر اتار رہا ہو۔

”یعنی آپ کہنا چاہ رہے ہیں کہ آپ کسی جوگی یا سادھو

کی طرح بن باس لے کر اس ویرانے میں رہ رہے ہیں؟“
”تم چاہو تو یہی سمجھ لو۔“

”میں ایسا سمجھ لیتا اگر جدید دنیا کے لوگوں سے آپ کے اتنے گہرے روابط نہ ہوتے۔“
”تم یہ دعویٰ کیسے کر سکتے ہو؟“ بوڑھا چونکا۔

”حالات اور واقعات کے تجزیے سے..... آپ کے مطابق یہ جگہ آپ کا مستقل ٹھکانا ہے تو پھر آپ لوگ جائے حادثہ پر کیا کر رہے تھے؟ میرے اندازے کے مطابق وہ جگہ اگر ہندوستان میں نہیں تھی تو اس سے قریب ترین ضرور تھی اور آپ کو وہاں سے یہاں تک پہنچنے کے لیے طویل سفر طے کرنا پڑا ہے۔ ایک عرصے سے دنیا سے کٹ کر رہنے کے باوجود آپ کی معلومات کا یہ حال ہے کہ آپ گولڈن اسٹار کی حقیقت سے آگاہ ہیں اور نہ صرف آگاہ ہیں بلکہ آپ کے ٹھکانے پر جدید دنیا کا ایک ایسا شخص بھی موجود ہے جو یہاں سے وہاں آپ کا رابطہ بھی کر سکتا ہے اور آپ کو وہ ساری معلومات بھی حاصل کر کے دے سکتا ہے جس کی آپ کو ضرورت ہو۔“ معاذ بولنے پر آیا تو بولتا چلا گیا۔

”تمہارے بارے میں میرا اندازہ بالکل درست تھا جو ان! تم اپنے ساتھیوں میں سب سے زیادہ ذہین اور بیدار مغز ہو۔“

”میں جانتا چاہوں گا کہ اس اندازے کی بنیاد کیا ہے کیونکہ ہم تو پہلی بار ایک دوسرے سے باقاعدہ گفتگو کر رہے ہیں۔“ معاذ نے اس بار بھی اس کی بات پکڑ لی۔ سبیل کی پریشانی اپنی جگہ تھی لیکن اس کی فطری ذہانت اپنا کام دکھا رہی تھی۔

”تمہاری ساتھی کے پاس مخصوص سنہری ستارے کی موجودگی نے ہمیں مجبور کیا کہ تم لوگوں کو اپنے ٹھکانے پر منتقل کر کے تم سے اہم معلومات حاصل کی جائیں۔ اپنے اس ٹھکانے کے محل وقوع کو پوشیدہ رکھنے کے لیے تم لوگوں کو راستے میں بے ہوش رکھا گیا تھا لیکن تم وہ فرد تھے جو بار بار مخصوص دورانیے سے قبل ہوش میں آ جاتے تھے اور تم پر خصوصی دھیان رکھنا پڑتا تھا۔“

”اس سے میری ذہانت یا بیدار مغزی کیسے ثابت ہوتی ہے؟ زیادہ سے زیادہ آپ اسے اچھی تو بہدافت کا نام دے سکتے ہیں۔“ معاذ نے بوڑھے کی وضاحت قبول نہیں کی۔

”شاید تم یہ ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن میرے تجربے نے وہی نتیجہ اخذ کیا تھا جو میں نے تمہیں بتایا۔“ اس نے بے

نیازی سے جواب دیا۔

”آپ نے جو نتیجہ اخذ کیا، اس کے پیچھے اصل وجہ یہ تھی کہ آپ نے نیم بے ہوشی کی حالت میں میرے دماغ میں گھسنے کی کوشش کی تھی لیکن آپ اس میں کامیاب نہیں ہو سکے۔“ معاذ نے جیسے اس کی سماعتوں پر ہم پھوڑا۔

”مجھے راستے میں پیش آنے والے کچھ واقعات دھندلے دھندلے سے یاد ہیں اور ان دھندلی یادوں میں ایک یاد یہ بھی ہے کہ ایک پراسرار آواز میرے دماغ میں گونجا کرتی تھی لیکن یہ میرے استاد کا کمال ہے کہ میں نے بہت کم عرصے کی تربیت کے باوجود اپنے دماغ کو بلاک کرنا سیکھ لیا ہے اور کوئی نہیں ہے جو آسانی سے میرے اندر تک پہنچ سکے۔“ معاذ نے وہ کہہ دیا جو اس کے دل میں تھا۔ بوڑھا اس کی اس صاف گوئی پر کچھ دیر خاموشی سے اسے گھورتا رہا پھر شکست تسلیم کرنے والے انداز میں بولا۔

”تم بالکل صحیح کہہ رہے ہو۔“
”تم اپنے اس علم سے فائدہ اٹھا کر میری ساتھی سے بھی معلومات حاصل کر سکتے تھے۔ اسے بہیمانہ تشدد کا نشانہ بنانے کی کیا ضرورت تھی؟“ اس نے قدرے تلخ لہجے میں بوڑھے سے شکوہ کیا تو اس نے ایک گہری سانس لی اور متانت سے بولا۔

”میں اپنی اس صلاحیت کو ناگزیر حالات کے علاوہ استعمال کرنا پسند نہیں کرتا۔ ہم نے جب الوطنی کا ثبوت دیتے ہوئے مشکوک افراد کو بیجنگ کے نمائندے تک پہنچا دیا ہے۔ اب بیجنگ کا مسئلہ ہے کہ جیسے چاہے معلومات حاصل کرے۔۔۔ بات تمہارا معاملہ تو میری چھٹی حس نے تمہاری شخصیت کا غیر معمولی پن محسوس کر کے صرف تجسس کے تحت تبصرے بارے میں جاننے پر اکسایا تھا۔ میں کسی بھی قسم کے مفاد کے حصول کے لیے تمہارے بارے میں جاننے کا خواہشمند نہیں تھا۔“

”میرے اندر اگر کوئی صلاحیت ہے تو اسے پروردگار کی عنایت کے سوا کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ بانی میں اس سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوں جو پہلے ہی آپ کے ساتھیوں کو بتا چکا ہوں۔“ معاذ نے ایک بار پھر اپنا لہجہ نرم کر لیا کہ بوڑھے کا رویہ اس کے ساتھ مسلسل نرم اور مہربان تھا۔

”تم اگرچہ ہمیں مشکوک مقام اور مشکوک حالات میں ملے ہو لیکن میں تمہارے ساتھ سخت رویہ اس لیے نہیں رکھ پایا کہ مجھے تمہارے اندر سے مثبت لہریں نکلتی محسوس ہوتی ہیں۔ یہ لہریں ثبوت ہیں کہ تم ایک اچھے انسان ہو اور

ہمیں تم سے کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہیں ہے۔“

”میں اس کے لیے آپ کا شکریہ ہی ادا کر سکتا ہوں۔“ بوڑھے کی رائے سن کر وہ مزید نرم پڑا اور عاجزی سے جواب دیا۔ جو بابا بوڑھا کچھ نہیں بولا اور صرف مسکرا کر رہ گیا۔ اسی وقت فضا میں نسوانی کراہ گونجی۔ وہ تڑپ کر سبل کی طرف مڑا اور بے اختیار اس کی طرف بڑھنا چاہا۔

”اب تم واپس جاؤ جوان! مجھے اپنی مریضہ کو توجہ سے دیکھنے کے لیے تنہائی کی ضرورت ہے۔“ وید کے بلند آواز میں ٹوکنے پر اس کے قدم ٹھٹھکے اور ساتھ ہی وجود میں طیش کی ایک لہر بھی اٹھی۔ وہ کون ہوتا تھا اسے اس طرح جانے کا کہنے والا۔

”زائگ! اسے واپس لے جاؤ۔“ اس کی کیفیت سے بے نیاز بوڑھے نے بلند آواز میں چینی زبان میں پکارا تو نہ جانے کس گوشے میں گم نارجی لبادے والا بھکشو ٹیکدم نمودار ہو گیا۔

”چلو مہاراج!“ بھکشو نے سرد نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو اس نے یہ مشکل اپنے مزاج کو قابو کیا۔ یہاں ان کی حیثیت قیدیوں کی سی تھی، ان لوگوں کا سلوک برا نہیں تھا۔ ایسے میں خواہ مخواہ کا جوش حالات کو بگاڑ سکتا تھا اس لیے بہتر تھا کہ کچھ ضبط سے کام لیا جائے۔ وہ دل پر جبر کرتا ہوا بھکشو کے پیچھے چل پڑا۔ وید اس کی اندرونی کشش پر توجہ دے بغیر پہلے ہی سبیل کے بستر کے قریب پہنچ چکا تھا۔

”آ..... غلطی!“ غار سے نکلتے نکلتے اس کی سماعت سے سبل کی نجف آواز نکلائی تو بے بسی سے اپنی مٹھیاں بھینچ کر رہ گیا۔ وہ تکلیف میں تھی لیکن ہوش کی طرف آتے ہوئے سب سے پہلے بیٹے کا ہی نام پکارا تھا اور وہ مجبور تھا کہ اس کی پکار پر اس کا بیٹا اس کے سامنے پیش نہیں کر سکتا تھا۔

☆☆☆

”کیا پروگریس ہے؟“ میڈم ایکس نے پلکیں اٹھا کر اپنے سامنے کھڑے شخص پر سوالیہ نظر ڈالی تو اس نے دیکھا کہ میڈم کی آنکھوں میں گلابی ڈورے تیر رہے ہیں۔ یہ اس بات کی نشانی تھی کہ اس نے کافی زیادہ شراب نوشی کر رکھی ہے۔ اس وقت بھی وہ اپنے ہاتھ میں ایک جام تھام کر بیٹھی ہوئی تھی۔

”ہم حامد کا کچھ پتا نہیں چلا سکے۔ اسے خان ہاؤس سے سہراب گوثھ کی طرف جانے والے کچے راستے پر اغوا کیا گیا ہے اور اس راستے پر کوئی کیمرہ نصب نہیں ہے۔ آگے مین روڈ پر کیمرے ہیں لیکن وہاں سے گزرنے والی

سیکڑوں گاڑیوں میں سے اپنی مطلوبہ گاڑی تلاش کرنا ممکن نہیں ہے۔ شیر علی نے صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ لوگ سیاہ گاڑی میں حامد کو لے کر گئے ہیں اور ہم وہاں سے گزرنے والی ہر سیاہ گاڑی کے بارے میں معلومات حاصل نہیں کر سکتے کیونکہ جو فوٹوچرملی ہیں، ان میں سے بہت کم گاڑیوں کی نمبر پلٹیشن پڑھی جا رہی ہیں۔“ اس نے مؤدبانہ میڈم کو رپورٹ پیش کی۔ اس رپورٹ میں مذکورہ شیر علی نامی شخص ان تین افراد میں سے ایک تھا جو بہ وقت اغوا حامد کے ساتھ تھے۔ دو افراد تو موقع پر ہی مارے گئے تھے جبکہ شیر علی زخمی حالت میں بچ گیا تھا۔ شیر علی کے بیان سے صرف اغوا کی تصدیق ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ وہ کوئی قابل ذکر معلومات فراہم نہیں کر سکا تھا۔ اغوا کاروں کے بارے میں بھی اس کا یہی کہنا تھا کہ انہوں نے چہروں پر نقاب لگائے ہوئے تھے اس لیے وہ ان میں سے کسی کو شناخت نہیں کر پایا تھا۔

”کیا ممکن ہے اور کیا نہیں، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ میں صرف ایک بات جانتی ہوں اور وہ یہ کہ مجھے حامد اپنے سامنے چاہیے۔“

”ہم کوشش کر رہے ہیں میڈم! اس پہلو کو بھی ذہن میں رکھا گیا ہے کہ یہ گلو کی موت کاری ایکشن نہ ہو۔ اس کے آدمیوں کو ٹٹولنے کی بھی کوشش کی جا رہی ہے لیکن اب تک کوئی کام کی بات معلوم نہیں ہوئی۔ کہنے والوں کا کہنا ہے کہ اصغر نے توقع کے خلاف بہت تیزی سے سارے معاملات سنبھال لیے ہیں اور پہلے کے مقابلے میں کئی گنا ایکٹو دکھائی دے رہا ہے۔ اس بات پر کچھ لوگ اس کے خلاف باتیں بھی بنا رہے ہیں کہ ایسا لگتا ہے، گلو کی موت سے اس کی لائٹری نکل آئی ہے اور اب وہ خود باس بن جانے پر خوش ہے۔“

”ہوں.....“ میڈم ایکس نے شخص ہنکارا بھرنے پر اکتفا کیا۔

”کچھ لوگ یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ اصغر کے کام کرنے کے انداز نے لالہ کی یاد دلادی ہے۔ معاملات بالکل ایسے چلنے لگے ہیں جیسے لالہ کی زندگی میں چلتے تھے۔“

”کیا واقعی؟“ اس بار وہ چونکی۔

”مجھے خبر پہنچانے والے کا تو یہی کہنا ہے۔“

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نو جوان
کسی داستان جو غلط کاروں کے لیے
غضب ناک تشابہاتی واقعات آئندہ ماہ پڑھیں



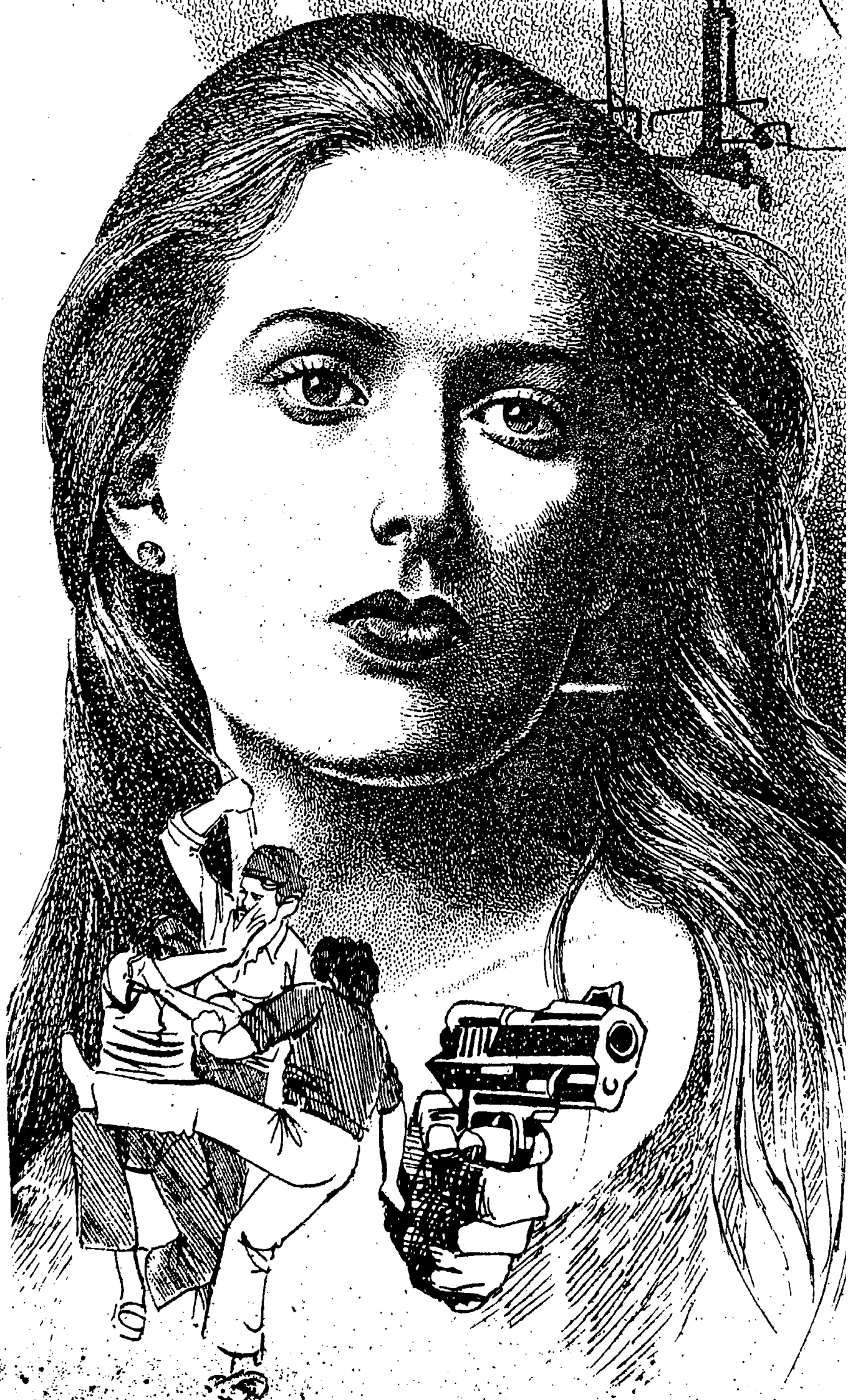
قسط نمبر: 33

ساز و ساز

استادری

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تندوتیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابل شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پُر عزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جا رہے تھے... اس کی زندگی جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قراریوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تار عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا ٹوڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ وارداتِ قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہو سکی...

اپنے جریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تھیرا نگیز داستان



معاذ ایک ذہین لیکن متلون مزاج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جوائن کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ انسٹی ٹیوٹ سے واپس آ رہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو مڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی مڈر فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشری نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بشری ماس کیونی کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم وغیرہ لکھتی ہے۔ اس ویران جگہ بھی وہ ایک زیر تعمیر رہائشی منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی آئی تھی۔ معاذ بشری کو بہ حفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کر دیتا ہے لیکن جن رئیس زادوں سے اس نے ان کا شکار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ یہ موقع انہیں یونیورسٹی ٹرپ کی صورت میں مل جاتا ہے اور ایک دن جنگل کی سیر کے دوران وہ نوٹو گرانی کے شوق میں سب سے الگ تھلک ہو جانے والے معاذ کو بے خبری میں گھیر کر بری طرح زد و کوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دے دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس نہ آنے پر انتظامیہ کے افراد پولیس اور ریسکیو ڈرائنگ کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جوگی کی جھونپڑی میں پاتا ہے۔ اپنی حالت سے اسے اپنے شدید زخمی ہونے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ جوگی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ معاذ کا موبائل جنگل میں ہی کہیں گر جاتا ہے اور جوگی کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا جس سے باہر کی دنیا سے رابطہ کیا جاسکے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے۔ جوگی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نواز کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے چراسر ارطلم سکھانے کی ہامی بھر لیتا ہے اور معاذ واقعی اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ادھر جانے وقوع سے ملنے والے معاذ کے کمرے سے جب تصویریں لکھوائی جاتی ہیں تو بہت سے قدرتی مناظر کی تصویروں میں سے ایک ایسی تصویر بشری کی نظر میں آ جاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانک رہا نظر آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پروجیکٹ کے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشری تحقیق کر رہی تھی۔ بشری کے اپنے والد جرنلسٹ ہوتے ہیں اور حق گوئی ان کے خون میں شامل تھی۔ اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشری کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ صدمے سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باذل نامی خندے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشری انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دنوں میں ہی معاذ واپسی کا ارادہ کرتا ہے تاہم ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا عرفان اللہ اور یزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو وقاص نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باذل اچانک بشری کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر دیتا ہے۔ معاذ کو واپس لانے کے لیے اوجھے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اسے واپس آنے کا پیغام دیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری بارٹی سے اس کا سودا کر کے اسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات لی جاتی ہیں، نہ بتانے پر اس کے بھائی کا ایک گردہ نکال لیا جاتا ہے۔ محبوس معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشری بھی انتقام کی آگ میں جلتی ہوئی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہو جاتی ہے۔ معاذ کے دوست عالم شاہ کے بہنوئی کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ کئی فنون میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے پٹانا ناز کر کے اس کے دماغ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ فیصو سے حاصل الو کے علم کی بدولت ان کا معمول نہیں بٹا۔ عالم شاہ اور اس کا نوکر سرد، باذل کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ عالم کی بہن بیکل شاہ کے لومو لوڈ بیٹے کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اغوا کا الزام لطیف سومرو پر آتا ہے۔ عالم شاہ، باذل کی قید میں موجود ایک زخمی شخص کی مدد سے وہاں سے فرار ہو جاتا ہے۔ ادھر بشری دینی پہنچ جاتی ہے۔ وہاں وقاص اسے باربی کے روپ میں پہچان لیتا ہے اور ان دونوں کے درمیان اعتماد کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ وہ سلطان کو مارنا چاہتی ہے تاہم وقاص اسے ایسا کرنے سے روکتا ہے۔ ادھر عالم شاہ، باذل کی قید سے نکل کر اس کا پیچھا کرتا ہے تاہم وہاں اچانک فائرنگ اور دھماکے ہونے لگتے ہیں۔ وہ وہاں معاذ کو دیکھتا ہے۔ صداقت شاہ، لطیف سومرو کو گھیرنے کے لیے اس کی خفیہ بیوی اور بچے کا گھوج لگاتے ہیں اور بچے کو اغوا کر لیتے ہیں۔ لطیف سومرو مجبور ہو جاتا ہے۔ معاذ کو اس کے گھر والوں سے ملنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ عالم شاہ کو اس کے والد انڈیا روٹنگی کا منہ یہ دیتے ہیں۔ ادھر معاذ بھی ایک مضمین پر سونیا کے ساتھ انڈیا روانہ ہوتا ہے تاہم کچھ لوگ سکھ یا تریوں سے بھری بس کو پرغمال بنا لیتے ہیں۔ معاذ اور سونیا بچ جانے کے تمام افراد کو گھٹکانے لگادیتے ہیں تاہم باہر موجود دیگر اغوا کاروں سے مقابلہ ہوتا ہے اور معاذ زخمی ہو جاتا ہے۔ صداقت شاہ کے انڈیا میں موجود رشتے دار کے ہاں شادی ہوتی ہے۔ عالم شاہ، بیکل اور سرد انڈیا روانہ ہو جاتے ہیں۔ انڈیا پورٹ سے گھر روٹنگی پر راستے میں کچھ لٹیرے انہیں لوٹ لیتے ہیں۔ عالم شاہ ایکشن میں آتا چاہتا ہے تاہم اجالا نامی عالم شاہ کی کزن اس کا راستہ روک لیتی ہے۔ گھر پہنچنے پر پولیس کی ریڈ ہوتی ہے اور وہ عالم شاہ اور سرد کو لے جاتے ہیں۔ ادھر بشری اور وقاص باذل

کو اسپتال میں مارنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ بچ جاتا ہے۔ معاذ اور سونیا پناہ کی تلاش میں ہوتے ہیں اور بالآخر اپنے سہولت کاروں سے مل جاتے ہیں۔ عالم شاہ اور سرد کو تشدد کا نشانہ بنا کر ویرانے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ واپس اپنے میزبانوں کے ہاں پہنچ جاتے ہیں۔ شادی کے دوران انہیں پتا لگتا ہے کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں اجالا اور اس کا عاشق شامل ہوتے ہیں۔ وہ چھپ کر ان کی باتیں سن رہا ہوتا ہے کہ اسے چھاپ لیا جاتا ہے۔ تاہم وہاں مارا ماری ہوتی ہے اور اجالا کا عاشق مارا جاتا ہے۔ پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ ان کے کزن انہیں اپنے دوسرے خفیہ ہنگامے پر پہنچا دیتے ہیں جہاں کچھ لوگ ان پر حملہ کر دیتے ہیں۔ وہ وہاں سے بحفاظت نکل جاتے ہیں۔ ادھر معاذ کو سونیا اپنے ساتھ نئے مشن پر لے کر جاتی ہے جس میں ایک ریلوے لائن کو دھماکے سے اڑانا ہوتا ہے۔ معاذ ایسا نہیں چاہتا اس لیے وہ ٹرین کی آمد سے قبل بارودی دھماکا کر دیتا ہے۔ وہ زخمی ہو جاتا ہے اور اسے ہندو سادھو اپنی کنیا میں لے جاتا ہے جہاں اس کی اچھی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ سونیا کے آدمی معاذ کو تلاش کرتے ہیں مگر ناکام ہو جاتے ہیں۔ ادھر عالم شاہ اور سرد خفیہ ذریعے سے بارڈر پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ دھریے جاتے ہیں اور ”را“ کی قید میں پہنچ جاتے ہیں۔ انہیں تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ادھر بشری باذل کو مارنے کی کوشش میں خود نشانہ بن جاتی ہے۔ معاذ سادھو کی مدد سے ایک انڈین ہیر وٹن کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ وہیں اسے عالم اور سرد کی گرفتاری کا پتا چلتا ہے۔ ادھر نکل کو اس کا شوہر ذہنی اذیت دیتا ہے۔ معاذ ڈاکٹر فردوس سے ملتا ہے اور اسے سبکل کی مدد کرنے کا کہتا ہے۔ عالم اور سرد قید سے فرار کا سوچتے ہیں اور دھر لیے جاتے ہیں جس کی یادداشت میں انہیں مزید تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ علیہ اور وقاص وغیرہ کو لالہ عیسیٰ ملک سے باہر نکال دیتا ہے اور ہر ممکن احتیاط کی ہدایت کرتا ہے لیکن علیہ پاکستان میں ٹوبہ سے رابطہ کرتی ہے جو ان کے لیے مصیبت بن جاتا ہے۔ ٹوبہ پر تیزاب پھینک دیا جاتا ہے۔ وقاص، علیہ اور اس کے گھر والوں کو مار دیا جاتا ہے۔ معاذ سمجھنا ناسی شخص کے خلاف کارروائی کرتا ہے تاہم وہ مارا جاتا ہے اور معاذ بھی زخمی ہو جاتا ہے اور اپنا نشانہ وہاں چھوڑ دیتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس معاذ کو دیوانا نامی شخص سے مدد لینے کا کہتی ہے۔ معاذ اس کے ساتھ مل کر مومن نامی ”را“ کے ایجنٹ کو اغوا کر لیتا ہے۔ معاذ اپنے کزن کو پاکستان کال کرتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ اس کے گھر والوں کو مار دیا گیا ہے۔ وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کی ٹھان لیتا ہے۔ ادھر ڈاکٹر فردوس کو اس کے سسرال والے نکل کو بھگانے کی یادداشت میں تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ معاذ، عالم اور سرد کی رہائی کے لیے کارروائی کرتا ہے اور انہیں ”را“ کی قید سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن عالم اور سرد کو دیوانے کے آدمی کسی دوسری جگہ پہنچا دیتے ہیں۔ سونیا معاذ کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتی ہے اور اسے اپنے تعاون اور مدد کی تعین دہانی کرواتی ہے۔ ادھر باذل ایک جگہ لالہ عیسیٰ کی موجودگی پر کارروائی کرتا ہے تاہم لالہ خود کو گولی مار کر ختم کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس کا انتقال ہو جاتا ہے۔ دیوانا گینگ ڈاکٹر فردوس کی میت اٹھنے پر وہاں فائرنگ کر دیتے ہیں۔ گھیل اور جلیل مارے جاتے ہیں اور فیصل اور پانڈے زخمی ہو جاتے ہیں۔ پولیس دیوانا کو گھیر لیتی ہے۔ معاذ دیوانا اور اس کے آدمیوں کو نکالنے کے عوض عالم کا پتا معلوم کر لیتا ہے۔ سونیا اور معاذ حیدر آباد نواب بدرالدین کی حویلی پہنچ جاتے ہیں۔ تاہم کالے خان اور راجہ دیوانی کو میڈیم ایکس کے قہقہے سے چھڑانے کے لیے انہیں واپس آنا پڑتا ہے، کالے خان کو نکل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ نواب صاحب کی حویلی میں عالم اور سرد کی رہائی کے لیے کارروائی کرتا ہے مگر نواب صاحب کا بیٹا ان کے سامنے آ جاتا ہے۔ وہ نکل کو بھی اغوا کر کے حویلی لے آتا ہے۔ تاہم وہ لوگ عید کو قہقہے میں کر کے وہاں سے نکل جاتے ہیں۔ وہ لوگ نئے ٹھکانے پر پہنچتے ہیں تو وہاں معاذ سے ملنے جا رو نامی شخص آتا ہے۔ اسے معاذ نے ”را“ کی قید سے نکالا ہوتا ہے۔ ادھر نکل کا بیٹا اعظم اپنی ناک میں پتھر پھنسا لیتا ہے۔ جاو اور معاذ، نکل سمیت اسپتال جاتے ہیں اور پچان لیے جانے چڑ پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ پولیس سے مقابلے کے بعد وہ ایک بستی میں پناہ کے لیے گھس جاتے ہیں اور دو لوگوں کو یرغمال بنا کر ان کی جمپوٹری میں قیام کرتے ہیں۔ ادھر سونیا عالم وغیرہ سمیت سب کو ٹھکانا بدلنے کا کہہ کر معاذ کی تلاش میں نکلتی ہے اور اسے بستی میں پہنچے ہر معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ معاذ اور جاو وغیرہ انوپ نامی شخص کے ساتھ اس کے مالک کے ہنگامے میں قیام کرتے ہیں۔ سونیا بھی معلومات حاصل کرتی ہوئی مذکورہ ہنگامے تک پہنچ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور سرد بھی سونیا کا پیچھا کرتے ہوئے وہیں پہنچ جاتے ہیں۔ ادھر وقاص، علیہ وغیرہ لوگ زندہ ہوتے ہیں۔ وقاص علیہ بدل کر گلو کا باڈی گارڈ بن جاتا ہے۔ وہ معاذ کو تلاش کرنے کے لیے انڈیا روانہ ہوتا ہے۔ وہاں اس کی محل خان سے ملاقات ہوتی ہے اور معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ سونیا، معاذ اور دیگر ساتھیوں سے مل جاتی ہے تاہم جس ہنگامے میں ہوتے ہیں وہ دشمن کا ہوتا ہے۔ وقاص بھی معاذ کو ڈھونڈتا ہوا وہیں پہنچ جاتا ہے۔ دشمن سب کو بے ہوش کر کے کہیں لے جا رہے ہوتے ہیں کہ ان کی گاڑی کو حادثہ پیش آ جاتا ہے۔ ان سب کو چینی بمکشطی امداد دیتے ہیں اور ان سے پوچھ کی جاتی ہے۔ نکل کی حالت تشویشناک ہوتی ہے اور اسے وہاں موجود ایک دید دیکھتا ہے اور اس کے دماغ میں رسولی کی موجودگی کا پتا چلتا ہے۔ ادھر لالہ واپس اپنے لوگوں میں پہنچ کر ایکشن میں آ جاتا ہے اور حامد کو اغوا کر دیا لیتا ہے۔ میڈیم ایکس کو شک ہو جاتا ہے کہ لالہ زندہ ہے۔

آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

جب میڈیم ایکس کو یہ احساس ہوا کہ شاید اس سے
کہیں غلطی ہو رہی ہے تو اس نے فوری طور پر نئے احکامات جاری کر دیے۔
'امگر کی گمرانی کرواؤ۔ مجھے اس کے ایک ایک پل کی

رپورٹ چاہیے۔ کہاں جاتا ہے، کس سے ملتا ہے؟ سب معلوم ہونا چاہیے۔“ یہ حکم جاری کرتے ہوئے وہ ایک مختلف ہیج پرسوج رہی تھی۔ اسے خیال آ رہا تھا کہ جیسے وکی کی موت کی مکمل یقین دہانی کے باوجود وہ منظر پر آ گیا تھا، ممکن تھا کہ لالہ بھی اسی طرح زندہ ہو اور اس کی خودکشی ایک سوچا سمجھا ڈراما ہو۔

”اوکے میڈم! اور کوئی حکم؟“ سامنے کھڑے غلام نے تابعداری سے پوچھا۔

”فی الحال یہ کام اچھی طرح کرو۔ مجھے امید ہے کہ کچھ نہ کچھ ضرور نکل کر آئے گا۔“ میڈم نے جواب دیا اور اشارے سے جانے کی اجازت دی۔

وہ چلا گیا تو اس نے اپنا جام ختم کیا اور کچھ دیر کسی ان دیکھے نقطے پر نظریں جمائے بیٹھی رہی پھر اپنا موبائل نکالا۔ اس جدید موبائل کی بڑی خوبی یہ تھی کہ اس پر آنے جانے والی کالز کا ٹریس ہونا ممکن نہیں تھا۔ اس نے موبائل کی اسکرین پر انگلی پھیرتے ہوئے اس میں محفوظ کانٹیکٹس نکالے اور ڈیوڈ کا نام منتخب کر کے کال ملائی۔ دوسری ہی گھنٹی پر اس کی کال وصول کر لی گئی۔

”کیا اطلاعات ہیں ڈیوڈ؟“ اس کے لہجے میں ہلکی سی پڑمردگی تھی۔

”گاڑی کو حادثہ پیش آنے کی تصدیق ہو گئی ہے۔ حادثہ شدید تھا۔ میرا ایک بھی آدمی زندہ نہیں بچا لیکن معاذ اور سونیا کے ساتھ ساتھ اس کے سارے ساتھی حیرت انگیز طور پر غائب ہیں۔“

”کیا مطلب ہے، غائب ہیں؟ اگر تمہارے آدمی مردہ حالت میں پائے گئے ہیں تو باقی لوگوں کو بھی مردہ یا کم از کم زخمی حالت میں ان کے ساتھ ہی پایا جانا چاہیے تھا۔“

”ہونا تو یہ چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہوا ہے اور جائے وقوعہ کے معائنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں کچھ لوگ موجود تھے۔ یقیناً وہی لوگ انہیں اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔“

”کون لوگ؟ کون ہو سکتے ہیں وہ لوگ؟“ میڈم ایکس نے اس کی دی اطلاع پر تیز لہجے میں پوچھا۔ دسپے اس اطلاع نے غیر محسوس طور پر اس کے اندر تہدیلی پیدا کی تھی اور وہ ریلیکس دکھائی دینے لگی تھی۔

”یقین سے نہیں کہا جاسکتا لیکن جو اطلاعات ملی ہیں، ان کی روشنی میں امکان ہے کہ انہیں چینی اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔“

”چینی.....؟“ اس نے اچھے سے استفسار کیا۔

”چینی کہاں سے آگئے وہاں؟“

”چینی بھکشوؤں کو فوٹا ان علاقوں میں حرکت کرتے رہتے ہیں۔ بنیادی طور پر ان کی آمد و رفت اپنے مذہبی پیشوا سے ملاقات کے لیے ہوتی ہے لیکن اڑتی اڑتی معلومات کے مطابق ان بھکشوؤں کے ہمیں میں کچھ جاسوس بھی موجود ہوتے ہیں۔“ ڈیوڈ نے اسے بتایا۔

”اگر ایسی اطلاعات ہیں تو تمہارے پاس ان بھکشوؤں کے بارے میں مکمل معلومات ہونی چاہیے تھیں۔“

”ان کے بارے میں معلومات رکھنا میرے دائرہ کار میں نہیں آتا۔ مجھے جو ذمے داریاں سونپی گئی ہیں، میں انہیں اب تک احسن طریقے سے پورا کرتا رہا ہوں۔ موجودہ مسائل تم اور تمہاری ٹیم کے پیدا کردہ ہیں۔“ اس کے اعتراض پر ڈیوڈ کا لہجہ سرد ہو گیا۔

”چینی خطرناک لوگ ہیں ڈیوڈ! اور دنیا کے موجودہ حالات میں ہم ان کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ وہ بھی بھی، کسی بھی وقت ہماری راہ پر لگ سکتے ہیں۔“ اس نے اپنا لہجہ قدرے نرم کیا۔

”اسی وجہ سے ہم ان سے دور دور رہتے ہیں لیکن تمہاری وجہ سے لگتا ہے اب ہمارا ان سے پالا پڑنے والا ہے۔ تمہیں پتا ہے سونیا میرا گولڈن اسٹار اپنے ساتھ لے گئی ہے اور اگر چینیوں نے اس کے پاس سے وہ برآمد کر لیا تو پھر وہ اس سے ایک ایک بات معلوم کیے بغیر اس کی جان نہیں چھوڑیں گے۔“ ڈیوڈ نے یہ اطلاع دے کر اس کا سارا اطمینان رخصت کر دیا۔

”سونیا گولڈن اسٹار اپنے ساتھ لے گئی ہے، اس بات کا کیا مطلب ہے؟ وہ کوئی اپنی مرضی سے تو نہیں گئی ہے۔ تمہارے لوگوں نے یہ کام کیا ہے اور ان کا فرض تھا کہ ہر فرد کی مکمل تلاشی لیتے۔“ وہ سونیا کے بارے میں نئی اطلاع سن کر بے چین ہوئی تھی تو یہ کیسے ممکن تھا کہ ڈیوڈ سے باز پرس نہ کرتی۔

”کو تا ہی کرنے والوں کو ان کے کیسے کی سزا مل چکی ہے لیکن یہ سوچو کہ اگر سونیا چینیوں کے سامنے زبان کھول دیتی ہے تو تنظیم کو کتنا نقصان پہنچ سکتا ہے۔“

”سونیا کوئی عام لڑکی نہیں ہے جو چینی اس سے آسانی سے کچھ معلوم کر لیں۔“

”پر لڑکی ہی تو ہے نا اور عورتوں کا کچھ پتا نہیں ہوتا کہ

قدم کیا ہوگا؟“ اس نے وہ سوال کیا جس کا جواب خود بھی جانتی تھی۔

”تم جانتی ہو، وہاں سے ان لوگوں کو نکالنا ہمارے لیے قریباً ناممکن ہوگا اس لیے تنظیم کے مفادات کے لیے سخت فیصلے کرنا پڑیں گے۔“ ڈیوڈ کا جواب صاف تھا۔ حقیقتاً ان لوگوں کی موت کے سوا اب ان کے پاس کوئی حل نہیں رہ گیا تھا۔

”مجھے افسوس ہے رائیل! لیکن تنظیم اور اس کا تحفظ ہر شے سے اوپر ہے۔“

”ہاں۔ تنظیم اور اس کا تحفظ ہر شے سے اوپر ہے۔“

اس نے ڈیوڈ کے الفاظ نہیں، اپنا عہد دہرایا۔

”میرے پاس تمہارے لیے ایک اچھی خبر ہے۔“

”وہ کیا؟“

”جبل شاہ کا بیٹا میرے پاس ہے اور میرے خیال میں تم مقامی معاملات کو سنبھالنے کے لیے اس بچے کا استعمال کر سکتی ہو۔ لطیف سومرو کے ناکارہ ہونے کے بعد اس علاقے میں کام کرنے کے لیے تمہیں کسی اور بڑے ڈیرے کی مدد درکار ہوگی اور اس بچے کے ماما اور دادا دونوں ہی بار سوخ ڈیرے ہیں۔“

”یہ تو تم نے بہت اچھی خبر سنائی۔“ ڈیوڈ کی دی اطلاع سن کر اس نے خوشی کا اظہار کیا لیکن اگر وہ اپنے دل میں جھانک کر دیکھتی تو وہاں خوشی کا نام و نشان نہیں تھا۔ وہاں اس کی ممتا پڑی کر لاری تھی۔ رائیل سے میڈم ایکس تک سفر اس نے ہر بار اپنی ممتا کو چل کر ہی طے کیا تھا۔

☆☆☆

”ہمارا پیچھا ہو رہا ہے استاد!“ اصغر کو ٹھکانے سے روانہ ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ڈرائیور نے اسے اطلاع دی۔

”کون ہیں بہن کے.....“ اصغر فوراً سیدھا ہو کر بیٹھا اور خود بھی بیک ویو مرر میں تعاقب کاروں کو دیکھنے کی کوشش کی۔

”نیل ہنڈا ہے۔ میں نے اپنے اڈے کے پاس بھی اسے دیکھا تھا اور اب پھر یہ اپنے پیچھے دکھائی دے رہی ہے۔“ ڈرائیور نے نشاندہی کی۔

”ڈرائیور! دھر کے پھیرے مار کر کنفرم کر پھر دیکھ لیتے ہیں سالوں کو۔“ اصغر کو گالی کے بغیر کم ہی بات کرنے کی عادت تھی اور اس وقت تو وہ یوں بھی زیادہ محتاط تھا کہ لالہ سے ملاقات کے لیے جا رہا تھا۔ اڈے پر گنتی کے چند نہایت

کب جذبات میں عقل پر ہتھ پڑ جائیں۔ تمہاری بیٹی تو پہلے ہی بہت عجیب کام کرتی پھر رہی ہے۔“ ڈیوڈ کا ایک طعنہ اس کے فخر کو سبوتاژ کرنے کے لیے کافی تھا۔

”وہ ہماری ایک نہایت تربیت یافتہ کارکن ہے ڈیوڈ! اس کی موجودہ نادانیاں اس کے ماضی کے کارناموں کو دھندلا نہیں سکتیں۔ تم اگر اسے اپنے تربیتی کیمپ تک پہنچانے میں کامیاب ہو جاتے تو وہ دوبارہ ہمارے لیے کارآمد بن سکتی تھی۔ میں نے تو پروفیسر وکٹر تک کو راضی کر لیا تھا کہ وہ وہاں پہنچ کر سونیا کی ذہن سازی کریں۔“ اس بار میڈم کا انداز ذرا مافقی تھا۔

”حادثے اور اتفاقات کبھی بھی، کسی بھی پلاننگ کو تباہ کر سکتے ہیں۔ تم جانتی ہو ان علاقوں میں سفر کرنا کتنا مشکل ہے۔ میں نے انہیں کیمپ تک بھجوانے کے لیے ٹھیک ٹھاک انویسٹمنٹ کی تھی اور امید تھی کہ تربیت کے بعد ایک بہترین ٹیم میدان میں بھیجنے کے لیے تیار ہوگی لیکن اس کے بالکل برعکس ہوا اور صورت حال یہ ہے کہ ہم خود مصیبت میں پڑ سکتے ہیں۔“ ڈیوڈ بھی درحقیقت الجھا ہوا اور پریشان تھا۔

”کیمپ پر موجود افراد میں سے کچھ کو بھکشوؤں کی راہ پر لگاؤ۔ ہمارے آدمی اگر بھکشوؤں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تو صورت حال بدل کر ہمارے حق میں بھی ہو سکتی ہے۔“ اس نے مشورہ دیا۔

”کوئی فائدہ نہیں۔ ہم لیٹ ہو چکے ہیں۔ ہمارے پاس حادثے کی اطلاع دیر سے پہنچی تھی اور بھکشوؤں کو علاقے سے نکلنے کا موقع مل گیا تھا۔ ویسے بھی وہ ان راستوں کے کیڑے ہیں اور کسی تعاقب کار کو دھوکا دے کر بہت آسانی سے بھاگ سکتے ہیں۔“ ڈیوڈ کے پاس اس کے لیے کوئی اچھی خبر نہیں تھی اور اسے لگ رہا تھا کہ سب کچھ ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہے۔

”سونیا کو کھونا ہمارا بہت بڑا نقصان ہوگا ڈیوڈ!“ اسے خود بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح اپنی کیفیت کا اظہار کرے۔

”ان بھکشوؤں میں اگر جاسوس بھی شامل تھے تو ہم امید رکھ سکتے ہیں کہ ان لوگوں کو سیدھا بیجنگ پہنچایا جائے گا۔ اگرچہ وہاں ہمارا زیادہ مضبوط سیٹ اپ نہیں لیکن میں کوشش کرتا ہوں کہ جو لوگ موجود ہیں، وہ اہم معلومات جمع کر کے دے سکیں۔“ ڈیوڈ نے اس کی بات اُن سنی کرتے ہوئے اپنی کہی۔

”بیجنگ میں وہ لوگ ٹریس ہو جاتے ہیں تو ہمارا اگلا

ہی وقادار لوگوں کے سوا کسی کو لالہ کے زندہ سلامت ہونے اور واپس لوٹ آنے کی خبر نہیں تھی۔ احتیاط کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے لالہ نے بھی وہاں قیام کو مناسب نہیں سمجھا تھا اور اپنی ایک خفیہ کوٹھی میں منتقل ہو گیا تھا۔ حامد کو بھی اسی کوٹھی میں رکھا گیا تھا تا کہ اگر کوئی اس کی تلاش میں اڈے کا رخ کرے تو ناکامی کا سامنا کرنا پڑے۔

”صحیح بولتا ہے۔ سالے ماں کے یار مستقل پیچھے لگے ہوئے ہیں۔“ تعاقب کرنے والے اگرچہ احتیاط کر رہے تھے لیکن مسلسل فوکس کرنے سے تصدیق ہوئی تھی کہ نیلی کار کبھی فاصلہ بڑھا کر تو کبھی گھٹا کر مسلسل تعاقب میں ہے۔ اصغر نے تعاقب کرنے والوں کو بلا تکلف مزید دو چار گالیوں سے نوازتے ہوئے اپنا موبائل نکال کر نمبر ملایا اور کال ریسیو ہوتے ہی بولا۔

”بندے تیار کر ٹوٹی اور پہنچ میرے پاس۔ کچھ آوارہ کتے پیچھے لگ گئے ہیں۔ ان کو ان کی آوارگی کا مزہ چکھانا ہے۔“ احکامات دیتے ہوئے اس نے ٹوٹی کو اپنے محل وقوع کے متعلق بھی بتا دیا۔

”یہاں سے نکل کر ہم سیدھا یزدانی ہاؤس اسکیم جانے والی سڑک پکڑیں گے۔ ہماری اسپید کم ہوگی۔ تو شارٹ کٹ مار کر تیزی سے آیا تو ہمارے ساتھ ساتھ ہی وہاں پہنچ جائے گا۔“

”تو میری فکر نہ کر۔ ان حرام کے پلوں کو حملہ کرنا ہوتا تو اب تک کر چکے ہوتے۔ میرے پیچھے لگنے سے ان کا کوئی اور مطلب ہے۔“ لالہ نے پہلے ہی اس خدشے کا اظہار کر دیا تھا کہ حامد کے والی وارث اس کا کھوج لگانے کے لیے ان کی طرف ضرور رخ کریں گے اس لیے اسے فوراً سمجھ آگئی تھی کہ تعاقب کار کون لوگ ہو سکتے ہیں۔

”آگے پیٹرول پمپ پر روک کر ٹینکی فل کروالے۔ ٹوٹی کو پہنچنے کے لیے تھوڑا ٹیم مل جائے گا۔“ کال منقطع کرنے کے بعد اس نے ڈرائیور کو حکم دیا تو اس نے بھی انداز میں سر کو جنبش دی اور پانچ منٹ بعد ہی گاڑی ایک پیٹرول پمپ پر لے جا کر کھڑی کر دی۔ اگرچہ وہ کسی حملے کی امید نہیں کر رہے تھے پھر بھی احتیاطاً اپنے ہتھیار تیار کر لیے تھے کہ ایسا کچھ ہونے کی صورت میں اپنا دفاع کیا جاسکے۔ توقع کے مطابق کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی اور نیلی کار انہیں چھوڑتی ہوئی آگے نکل گئی۔ اس موقع پر اس نے نوٹ کیا کہ کار میں ڈرائیور سمیت تین افراد موجود ہیں۔

گاڑی میں بیٹھ کر بھڑوانے کے بعد وہ لوگ

اطمینان سے آگے بڑھے۔ نیلی کار حسب توقع آگے جا کر منتظر کھڑی تھی۔ کار والوں نے اگرچہ کوشش کی تھی کہ سڑک پر موجود گڑھے میں پھنس کر ناکارہ ہو جانے والی بس کی آڑ میں خود کو پوشیدہ رکھ سکیں لیکن تاڑنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے تھے۔

”پیچھے آرہے ہیں سڑک چھاپ عاشق۔“ کچھ مزید آگے جا کر نیلی کار ایک بار پھر ان کے پیچھے دکھائی دی تو اصغر نے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے قہقہہ لگا کر اعلان کیا۔ ابتدا میں راستہ پر رونق تھا لیکن جیسے جیسے وہ یزدانی ہاؤسنگ اسکیم سے قریب ہوتے گئے، ٹریفک کم ہونا شروع ہو گیا۔ یہ کم ہونا ٹریفک ہاؤسنگ اسکیم والی سڑک پر گاڑی ڈالتے ہی بالکل برائے نام رہ گیا۔ اسی وقت اصغر نے اپنے موبائل پر ٹوٹی کی کال موصول کی۔

”ہم ہاؤسنگ اسکیم کے قریب پہنچ گئے ہیں استاد! اور ہمیں اپنے آگے ایک نیلی ہنڈا جانی ہوئی دکھائی دے رہی ہے۔“

”وہی ہے سالی..... لگا رہے پیچھے۔ تھوڑا اور آگے آنے پر دونوں مل کر دبائیں گے۔“ اصغر نے جوش سے جواب دیا۔ فی الحال اسے عقب نما آئینے میں نیلی کار دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

”بس، ادھر ہی روک لے۔ آتے ہوں گے کتے کے..... یہیں دیوچ لیں گے انہیں۔“ اس نے ڈرائیور کو رک جانے کا حکم دیا۔ اس کے خیال میں نیلی کار والوں نے انہیں ہاؤسنگ اسکیم والی سڑک پر چڑھتے دیکھ کر قصداً فاصلہ بڑھا لیا تھا کہ کہیں اس خالی سڑک پر وہ ان کی نظر میں نہ آجائیں۔ ابھی انہیں گاڑی روکے مشکل سے آدھا منٹ ہی گزرا ہو گا کہ ایک بار پھر ٹوٹی کی کال آنے لگی۔

”وہ ہاؤسنگ اسکیم والی سڑک پر نہیں چڑھے استاد! بالکل عین وقت پر انہوں نے پورن مار لیا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے وہ سمجھ گئے ہیں کہ ہم انہیں گھیرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ ٹوٹی نے اس کے ہیلو بولنے کا بھی انتظار نہیں کیا اور کال ملتے ہی جلدی جلدی اطلاع دینے لگا۔

”روک سالوں کو۔ بھاگ کر جانے نہ پائیں۔“ اصغر نے اسے حکم دیا اور ساتھ ہی اپنے ڈرائیور سے بھی چچا کر بولا۔ ”پیچھے لے پیچھے۔ سالے چوہے بھاگ رہے ہیں۔“ ڈرائیور نے گاڑی کا انجن اشارت ہی رکھا ہوا تھا چنانچہ فوراً ہی گاڑی ریورس کی۔ اسی وقت فضا میں گولیوں کی آواز گونجی۔ اصغر کے تجربے نے اسے بتایا کہ فائر لاسٹ

شک کیا جا رہا ہے۔“ لالہ نے ایک زوردار ہنکارا بھرتے ہوئے تبصرہ کیا۔

”حالات سے تو یہی ظاہر ہے۔“ اصغر نے تائید کی۔
”حالات سے تو یہ بھی ظاہر ہو رہا ہے کہ اڈے کی خبریں باہر لیک ہو رہی ہیں۔“ لالہ کے لہجے میں گہمیر سنجیدگی تھی۔

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟“ اصغر نے کراچیل پڑا۔
”ایسا ہی ہو رہا ہے اصغر! تیرے پاس سے یہ خبر نکل کر مخالفین تک پہنچی ہے کہ حامد وہاں نہیں ہے اس لیے وہ لوگ تیرا پیچھا کر کے اس تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔“ لالہ کے لیے نتیجہ اخذ کرنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ اصغر نے کچھ بھی کہنے کے لائق نہیں رہا۔

”کڑی نظر رکھ ہر طرف۔ غدار اور خبر سے بڑھ کر کوئی خطرناک نہیں ہوتا۔“ لالہ نے اس کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے نرم الفاظ میں نصیحت کی پھر موضوع بدلتے ہوئے پوچھنے لگا۔
”حامد نے میڈم ایکس کا جواب دے دیا تھا، اس کی نگرانی کروار ہے ہو یا نہیں؟“

”بالکل لالہ! چوبیس گھنٹوں کے لیے بندوں کی ڈیوٹی لگا دی ہے۔“

”خیال رکھنا، بس دور دور سے نگرانی ہو۔ نہ نظر میں آتا ہے، نہ کوئی چھیڑ چھاڑ کرنی ہے۔ بہت ہوشیار بندے بٹھانے ہیں نگرانی پر۔“ لالہ نے یاد دہانی کروائی۔

”جو حکم لالہ!“ اصغر نے سیدھے سیدھے تا بعد اری کا مظاہرہ کیا اور یہ یاد دلانا قطعی ضروری نہیں سمجھا کہ وہ یہ ساری ہدایات پہلے بھی دے چکا ہے۔

”دک کی بڑی فکر ہے مجھے۔ دیوانے بھی اب تک کوئی اطلاع نہیں دی۔“ لالہ نے بڑبڑاتے ہوئے جام اٹھا کر منہ سے لگایا۔

”سنا تھا دیوانے کے اپنے جڑے دن چل رہے ہیں اور وہ پولیس کے ڈر سے انڈر گراؤنڈ ہے۔“ اصغر نے جھجکتے ہوئے دیوانے کے متعلق اپنے تحفظات کا اظہار کیا۔

”ہاتھی مر کر بھی سوا لاکھ کا رہتا ہے اور دیوانے تو ابھی زندہ ہے۔ اس کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا وہ اسے ایڈ جسٹ کر لے گا۔ باقی رہی میرے کام کی بات تو وہ تو دیکھ لینا کہ ہو کر رہے گا۔ بڑے کانسٹیبل ہیں اس نامراد عاشق کے اپنے دیس میں۔“ دیوانے کے خیال سے لالہ کی آنکھوں میں چمک سی ابھری۔ کسی زمانے میں وہ دھندے کے ساتھی ہوتے تھے۔ بیرون ممالک سفر میں بھی ایک دوہرے سے

مشین گن کا ہے۔ اس فائرنگ کا جواب دینے میں بھی زیادہ وقت نہیں لگا اور یقینی طور پر ٹوٹی اور اس کے ساتھیوں کی طرف سے بھی بیک وقت دو روپٹر چلے۔

”جھپٹ لو میرے شیر و! بھاگنے مت دینا۔“ اصغر وہیں بیٹھے بیٹھے چلا یا۔ جوش میں اس نے اپنے ہتھیار کو ہاتھوں میں تھام کر اس کی نال کھڑکی سے باہر نکال لی تھی لیکن آگے ٹوٹی اور اس کے ساتھیوں کی گاڑی ایک جگہ کھڑی دکھائی دی تو اس کے جوش کی جگہ تشویش نے لے لی۔ قریب پہنچنے پر وجہ بھی سمجھ آ گئی۔ گاڑی کے ٹائر برسٹ ہو چکے تھے اور دو افراد نا کارہ ٹائروں کو بدلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ نیلی کار کا سڑک پر دور دور تک نام و نشان نہیں تھا۔

”انہوں نے پہلی بار میں ہی دونوں طرف کی کھڑکیوں سے فائر کر کے سیدھا ہماری گڈی کے ٹائروں کو بیکار کیا اور اسپید بڑھا کر بھاگ نکلے۔ ہم نے بھی فائر کیا پر وہ رینج سے نکل چکے تھے۔“ ٹوٹی رپورٹ پیش کرتے ہوئے کچھ شرمندہ تھا۔

”چل، کوئی بات نہیں۔ بھاگ گئے سارے بزدل چوہے۔ تم لوگ ٹائر بدل کر واپس جاؤ، ہم بھی اپنے رستے جاتے ہیں۔“ اصغر نے تسلی دینے والے انداز میں اس کا شانہ تھکا۔

”اگر تھوڑی دیر ویٹ کر سکو تو ہم ٹائر چینج کر کے سیکورٹی کے لیے ساتھ چلتے ہیں۔“ ٹوٹی نے پیشکش کی۔

”پہلے ہی اس چکر میں لیٹ ہو گیا ہے بابا! اب اور دیر نہیں کر سکتا۔“ اصغر اس سارے ہجوم کو لالہ کی رہائش گاہ تک نہیں لے جانا چاہتا تھا اس لیے ٹوٹی کو ٹال دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ ایک بار پھر اپنی منزل کی طرف گامزن تھے۔ اس بار انہوں نے اپنے تعاقب کا پہلے سے زیادہ خیال رکھا تھا چنانچہ لالہ والی کوٹھی میں قدم رکھتے ہوئے پوری طرح مطمئن تھے۔

”بہت لیٹ ہو گیا اصغر! پتا ہے نا اپنے کو ٹائم کی پابندی کرنے والا بندہ پسند ہے۔“ لالہ کے روبرو حاضر ہوتے ہی اسے وہ سننا پڑا جس کا خدشہ تھا۔

”راستے میں گڑبڑ ہو گئی تھی لالہ!“ دنیا بھر کو منہ بھر بھر کے گالیاں دینے والا اصغر، لالہ کے روبرو آواز بھی اونچی کرنے کا نہیں سوچ سکتا تھا۔

”کیسی گڑبڑ؟“ لالہ سن کر چونک گیا۔ جوا بابا اصغر نے ساری کتا سنا ڈالی۔

”ہوں..... اس کا مطلب ہے ہم پر حامد کے اغوا کا

ملاقات ہوتی رہتی تھی پھر الالہ کو اپنے آس پاس کے حالات اور افراد سے ناخبر رہنے کی بھی عادت تھی اس لیے دیوا کی داستان عشق سے بھی کسی حد تک واقف تھا۔ البتہ اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ دیوا کا بھوٹا بھائی دلیپ خفیہ طور پر کسی علیحدگی پسند تنظیم کا حصہ ہے اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ہندوستانی حکومت کو دگ بگھانے کا موقع لگا رہتا ہے۔

”اپنا وکی بڑا ہوشیار اور پھر تیز ہے۔ دیکھنا وہ وہاں بھی کسی نہ کسی طرح اپنا راستہ نکال لے گا۔“ اصغر صرف لالہ کو سلی نہیں دے رہا تھا، اسے اپنے کہے ہوئے ہر لفظ پر یقین بھی تھا۔ حقیقتاً وکی اپنی عادت، ذہانت اور جرأت مندی کے باعث ہر ایک کا ہی لاڈلا تھا۔

”وقت کی چال بہت بُری ہوتی ہے اصغر! کوئی کتنا ہی بڑا پختہ خان ہو، اگر اس چال کی زد میں آجائے تو.....“ لالہ کا جملہ ابھی مکمل نہیں ہوا تھا کہ اس کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اصغر نے جلدی سے آگے بڑھ کر میز پر رکھا سیل فون اٹھا کر اس کے حوالے کیا۔ اس دوران وہ اسکرین پر چمکتا دیوا کا نام دیکھ چکا تھا۔

”کیا خبر ہے میرے لیے یارا!“ ایک آدھ برسی جملے کے بعد ہی لالہ فوراً اپنے مطلب کی بات پر آگیا۔

”تو نے جو کلیوز دیے تھے منڈے کے بارے میں، ان کو لے کر بہت کچھ جاننے کو ملا ہے۔ اب پتا نہیں وہ تیرے لیے اچھا ہے کہ بُرا۔“ دوسری طرف دیوا بھی کچھ الجھا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

”جو کچھ پتا چلا ہے بتادے، اچھے بُرے کا فیصلہ میں خود کر لوں گا۔“

”ٹھیک ہے، بتاتا ہوں پر تھوڑا ہیگ گراؤنڈ بتانا پڑے گا۔“ دیوانے تمہید باندھی۔ لالہ زبان سے کچھ کہے بغیر اس کی اگلی بات کا منتظر رہا۔

”پچھلے دنوں، ادھر تیری طرف سے کچھ لوگ ادھر آئے تھے۔ سچ جھوٹ کی جانکاری سے میرا مطلب نہیں۔ بس ہوا یوں کہ دو بندے جاسوسی اور آٹھک داد کے چکر میں پکڑے گئے۔ ایسا ہوتا رہتا ہے اور ہم اس پر فوکس بھی نہیں کرتے لیکن بھگوان کا کرنا یہ ہوا کہ ایک دن ایک منڈا میرے پاس مدد مانگنے چلا آیا کہ ان دونوں بندوں کو چھڑوانے میں اس کی مدد کروں۔ وہ جس کی سفارش لے کر آیا تھا، اس کو میں کسی صورت الٹا نہیں کر سکتا تھا اس لیے یہ ریکی کام کرنے کو تیار ہو گیا۔“ دیوا اتنا بتا کر کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ لالہ بس اتنا ہی محسوس کر سکا کہ اس نے کچھ

سکلی لی ہے۔ کچھ کچھ حیران وہ دیوا کے دوبارہ کچھ بولنے کا انتظار کرنے لگا کہ خاموشی ضرور بھائی تھی لیکن سلسلہ منقطع نہیں ہوا تھا۔

”شما چاہتا ہوں یارا! حلق خشک ہو گیا تھا تو ذرا دو کھونٹ پیئے بیٹھ گیا تھا۔“ وہ دوبارہ لائن پر آیا تو اپنی خاموشی کی وضاحت دیتے ہوئے معذرت طلب کی۔ لالہ نے محسوس کیا کہ اس کی آواز پہلے کے مقابلے میں بھاری ہو گئی ہے۔ ویسے تو اسے دیوا ابتداء ہی سے پیسے ہوئے محسوس ہو رہا تھا لیکن آواز کا موجودہ بھاری پن شراب نوشی کا نتیجہ نہیں لگتا تھا۔

”تو ٹھیک تو ہے دیوا!“ وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھا۔

”اس کے مرنے کے بعد بھی زندہ ہوں تو کیا یہ کم ہے؟“ وہ جواباً جو بولا اس نے پل بھر کے لیے لالہ کو گنگ کر دیا۔ جس ہستی کا نام کبھی باقاعدہ دیوا کی زبان پر نہیں آیا تھا، وہ اس کے مرنے کی اطلاع دے رہا تھا۔

”کیسے؟ مطلب کیا ہوا تھا؟“ وہ بہت مشکل سے پوچھ سکا۔

”جیسے بھی اور جو کچھ بھی ہوا تھا، اس کے قاتلوں کو پورا پورا بھگتانا بھگتانا پڑا ہے۔ میں نے کسی کو اس کے کھون (خون) کا ایک قطرہ بھی معاف نہیں کیا۔“ اس کے لہجے میں غم و غصے کی عجیب سی پیش کش تھی۔

”سن کر بہت افسوس ہوا۔“ ہر تعزیت کرنے والے کی طرح لالہ کے پاس بھی دیوا کے دکھ سن کر پُرسہ دینے کو وہی لگے بندھے الفاظ تھے۔

”چھوڑو اس کتنا کتا کو اور اپنے مطلب کی بات سن۔“

دیوانے خود ہی موضوع بدل دیا۔

”میں تجھے بتا رہا تھا کہ سفارش ایسی تھی کہ میں کام کو منع نہیں کر سکتا تھا پر جو منڈا مدد لینے آیا تھا اس سے ہمارا اپنا کچھ حساب کتاب نکل آیا۔ ہم نے اس کے بندے تو چھڑوا لیے لیکن حساب پورا کرنے کے لیے اس کے حوالے نہیں کیے اور حیدر آباد میں ایک نواب صاحب کے ذاتی قید خانے میں رکھوا دیے۔ وہ منڈا بہت تیز تھا۔ اپنی ایک ساکھی کو لے کر بہانے سے نواب صاحب کی حویلی میں ٹھس گیا اور اپنے ساتھیوں کو وہاں سے لے کر بھاگ نکلا۔ نواب صاحب نے اس بات کو اپنی انسلف سمجھا اور ساروں کو ان بھگوڑوں کی تلاش پر لگا دیا۔ بڑی مشکل سے پتا لگا کہ وہ مین سٹی سے تھوڑی دور ایک پھلے میں چھپے ہوئے ہیں۔ پولیس نے پھلے کے آس پاس کے سارے علاقے کی ناکابندی



آغاز سرد موسم

کانداز دلبرانہ

اکتوبر 2022 کے

جاسوسی کانڈاز شاہانہ

اولین صفحات

دیس کی خاطر پردیس میں لڑی جانے والی جنگ کا خفیہ انداز..... رگوں میں دوڑتے خون کی گردش بڑھا دینے والے واقعات کی یلغار.....

یعقوب بھٹی کے قلم کا شاہکار

شعلہ زن

بے بسی کے اندھیروں میں ڈوبتی لڑکی کی دردناک داستان حیات.....

روبینہ رشید کے قلم کی جادوگری

دبیر

دنیا مجبور کرتی ہے کہ ان پر قہر بن کر ٹوٹ پڑو..... ایک ایسے ہی نوجوان کی کوچہ گردی..... زندگی اس کے لیے خالی کھول کے مانند تھی..... **حسام بیٹ** کے قلم سے نئی سلسلے وار کہانی

سروں کے رنگ

پہلا رنگ

چال بازی سے وقتی کامیابی حاصل کرنے والے گروہ کا سنسنی خیز انجام..... سروں کی مایا کہانی

دوسرا رنگ

نشر جب سرجن کے ہاتھ میں ہو تو زندگی ہے اور قاتل کے ہاتھ لگ جائے تو یقینی موت ہے..... ایک قاتل کہانی

چینی فکٹہ چینی

آپ کے تہرے... مشورے... مجھتیں... دکاتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کھائیں

کردی اور ریڈ کے لیے بھی تیار ہو گئی لیکن اچانک ہی عجیب قصہ ہوا۔ جس بنگلے کے بارے میں اطلاع ملی تھی، وہ اور اس کے ساتھ والے بنگلے میں اچانک ہی آگ بھڑک اٹھی۔ آگ اتنی تیز تھی کہ فائر بریگیڈ کے پہنچنے تک سب کھاک (خاک) ہو گیا۔ پولیس کو بلے ہوئے بنگلے کے بلے سے دو لاشیں ملیں۔ لاشیں اتنی بری طرح جھلسی ہوئی تھیں کہ پہچان کتنی تھی۔ دیواروں سے بولتا جا رہا تھا لیکن لالہ کی سانپوں کی روانی قائم نہیں رہی۔ دو جلی ہوئی ناقابل شناخت لاشوں کے ذکر نے اس کے دل کو اپنی مٹھی میں بھینچ لیا۔

”پولیس نے ڈی این اے کروا کر کھوج لگائی کہ وہ لاشیں وہاں بنگلے پر کام کرنے والے نوکروں اور اس کے دوست کی ہیں۔“ دیوار کو خبر بھی نہیں ہوئی کہ وہ ایک پل میں کسی کی سانس کٹنے اور بحال کرنے کا کارنامہ انجام دے چکا ہے۔

”اس سارے میں، میرا کی کدھر ہے دیوار؟“ لالہ کو خود معلوم نہیں تھا کہ اس پل وہ کتنا جذباتی ہو چکا ہے۔ قریب ہی مؤدب کھڑا اصغر اس کی آنکھوں میں نمی دیکھ کر بیک وقت حیران و پریشان ہوا تھا۔ وہ دوسری طرف کی گفتگو سننے سے قاصر تھا اور لالہ نے جو گئے چنے جملے بولے تھے، وہ کچھ بھی سمجھنے کے لیے ناکافی تھے۔

”وکی ہے، جب ہی تو میں تجھے یہ قصہ سنا رہا ہوں۔“ دیوار نے یوں ٹوکے جانے پر برہم مانایا۔

”اچھا تو چل، جلدی سے پوری بات بتا۔“ لالہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

”بنگلے سے وہ دو لاشیں نکالنے کے بعد پولیس شاید ہاتھ جما کر ایک طرف ہو جانے کا سوچ رہی تھی لیکن اچانک ہی ایک پٹھان کہانی میں گمس آیا اور میڈیا کے سامنے ہنگامہ مچا کر رکھ دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس بنگلے میں اس کے کم سے کم چار پانچ ساتھی موجود تھے لیکن پولیس اس بچ کو چھپا رہی ہے۔ اس نے تو یہاں تک الزام لگا دیا کہ پولیس لو اب صاحب کی پٹھوئی ہوئی ہے اور یہ آگ پولیس نے ہی لو اب صاحب کے کہنے پر لگوائی ہے اور اب لاشوں کو میڈیا اور پبلک سے چھپا رہی ہے۔“

”وہ پٹھان کون ہے؟“ لالہ نے پھنسی پھنسی آواز میں پوچھا۔

”یہ وہی پٹھان ہے جس کے ساتھ وکی کو دہلی میں دیکھا گیا اور پھر جس کے ساتھ تم کو اس کے حیدر آباد جانے

کی اطلاع ملی۔“ دیوانے شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی۔

”گل خان.....!“ لالہ کے ذہن میں حامد کا بتایا ہوا نام موجود تھا اس لیے فوراً زبان سے پھسل گیا۔

”ہاں، ہاں۔ یہی نام ہے۔ میں پولیس ریکارڈ سے کنفرم کروا چکا ہوں۔“ دیوانے تصدیق کی۔

”وکی اس بیٹکے میں کیسے اور کیا کرنے گیا تھا، اس بارے میں گل خان نے کچھ بتایا ہے؟“ لالہ نے سنبھل کر سوال کیا۔

”پولیس کو تو اس نے کچھ نہیں بتایا حالانکہ پولیس والوں نے مار مار کر اس کی حالت پتلی کر دی ہے پرائین نے اپنے ایک بندے کو تھانے میں گھسا کر اس سے بہت کچھ پتا کر لیا ہے۔“ دیوانے فخر سے بتایا۔

”تیرے بندے کے سامنے کیسے زبان کھول دی اس نے؟ شک نہیں ہوا اسے کہ پولیس کی ہی کوئی چال ہے؟“

”ہوا تھا شک اور سالا شروع میں پٹھے پر ہاتھ نہیں رکھنے دے رہا تھا پر میرا آدمی بھی پوری تیاری سے گیا تھا۔

پوری آگے پیچھے کی داستان سنا کر ثابت کیا کہ اپن تیرے معاذ صاحب، سوینا میڈم، سکل بی بی اور باقی سب کو جانتا ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ وکی، سوینا میڈم اور دوسرے لوگوں کو

تلاش کرتا ہوا پاکستان سے یہاں پہنچا تھا۔ اس نے یہ بھی وشواس دلایا کہ وہ وکی اور دوسرے لوگوں کو تلاش کرنے میں

اس کی مدد کر سکتا ہے۔ بس پھر سالا پٹھان پھسل گیا اور سب اگل دیا۔“ دیوانے تفصیل بتا رہا تھا لیکن اس کا ذہن تو معاذ

کے نام پر ایک گیا تھا۔

”یہ معاذ..... معاذ کون ہے؟“ تصدیق کے لیے کہ یہ معاذ وہی ہے جو علیہ کا بھائی ہے، اس نے دیوانے سے

پوچھا۔

”یہ معاذ بڑی دکھری چیز ہے۔ وہی بندہ جو میرے پاس اپنے دوستوں کو چمڑوانے میں مدد کے لیے میرے

پاس آیا تھا۔ اپنے بارے میں جانکاری نہیں دی تھی اس نے لیکن اپن نے ہاتھ پاؤں مار کر پتا لگا ہی لیا تھا۔ اسی کی مالا

چتا تیرا وکی اس بیٹکے میں گیا تھا۔ گل خان بتاتا ہے کہ اس نے سوینا کو اس بیٹکے میں دیکھ کر اندازہ لگایا تھا کہ معاذ اور

دوسرے ساتھی بھی وہیں ہوں گے۔ وہ سب الگ الگ پوائنٹ سے بیٹکے کی گھرائی کر رہے تھے تو وکی نے اسے کال

کر کے پولیس کے گھیرے کی خبر دی اور وہاں سے کھل جانے کو کہا۔ اسے نہ چاہتے ہوئے بھی وکی کی بات ماننا پڑی لیکن

اس کو پورا یقین ہے کہ وکی نچلا نہیں بیٹھا ہوگا اور اس بیٹکے میں ضرور گھسا ہوگا جہاں اس نے سوینا کو دیکھا تھا۔ اب اس کو درد ہی شک ہیں۔ ایک یہ کہ پولیس نے سب کو اریسٹ کر کے چپکے سے نواب صاحب کے حوالے کر دیا ہے اور دوسرے یہ کہ وہ سب بھی بیٹکے کی آگ میں جل کر مر گئے ہیں لیکن پولیس اصل بات چھپا رہی ہے۔“ دیوانے اسے تفصیلی جواب دیا۔

”جتنے والے بیٹکوں کے مالکان کون تھے؟“

”ان کے بارے میں، میں نے جانکاری کی کوشش نہیں کی۔ بس اتنا سنا ہے کہ دونوں بیٹکے والے آپس میں رشتے دار ہیں اور ساتھ مل کر کہیں گھومنے پھرنے گئے ہوئے ہیں۔“

”وہاں آگ کیسے لگی تھی؟“ لالہ نے جذبات کو سنبھال لیا تھا اور ایک کے بعد ایک تار بڑ توڑ سوال کر رہا تھا۔

قریب کھڑے اصغر کو سوالات کی نوعیت نے بے چین کر دیا تھا لیکن ظاہر ہے وہ گفتگو میں دخل نہیں دے سکتا تھا۔

”پولیس کی رپورٹ کے انوسار شارٹ سرکٹ ہوا تھا لیکن ایک جرنلسٹ کا کہنا ہے کہ اسے وہاں کسی کیمیکل کی بو محسوس ہوئی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ آگ لگی نہیں بلکہ لگائی گئی ہو۔“

”ہو سکتا ہے وکی اور دوسرے لوگوں نے پولیس کی توجہ ہٹانے اور فرار کا موقع پیدا کرنے کے لیے خود وہ آگ لگائی ہو۔“ لالہ نے امید ظاہر کی۔

”اپنے کو ایسا نہیں لگتا۔ پولیس جیسے میڈیا سے کئی کترا رہی ہے، اس سے اپنے کو بھی لگتا ہے کہ پولیس نے کوئی.....

پن کیا ہے۔ دوسرے وہ منڈا معاذ بھی دوسری طبیعت کا ہے۔ اپنا من نہیں مانتا کہ وہ خود کو بچانے کے لیے دو بے

بسائے گھروں کو زندہ انسانوں سمیت جلا کر بھاگ لکلا ہوگا۔“ دیوانے دنیا دیکھی تھی۔ اس کی معاذ کے ساتھ کئی

ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ کچھ قصے دلپ نے بھی سناے تھے اس لیے اسے ماننے میں تامل تھا کہ یہ سب معاذ نے کیا ہوگا۔

”ٹھیک ہے پھر۔ تو اپنی آنکھیں کھلی رکھ اور چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی انور نہ کر۔ میں تجھ سے اس بارے

میں اپ ڈیٹ لیتا رہوں گا۔“

”جو تیری اچھا۔“

”اور ہاں، اس کام کا خرچہ پانی تیرے فارن اکاؤنٹ میں بڑا سفر کروا رہا ہوں۔ جتنا چاہے ہاتھ کھول کر

خرچ کرنا پڑے، کام رکنا نہیں چاہیے۔“ لالہ خود جرم کی دنیا

کا باشندہ تھا اور جانتا تھا کہ مجرم بننے والا تقریباً ہر شخص پیسے کے لیے غیر معمولی محبت رکھتا ہے اس لیے خرچے پانی کے نام پر دیوا کو ایک خطیر معاوضہ دینے کے لیے تیار تھا۔
”نہیں رکے گا۔“ دیوانے اسے یقین دہانی کروا کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

لالہ کال سے فارغ ہو جانے کے باوجود کسی حکم کے منتظر کھڑے اصغر کی طرف متوجہ نہیں ہوا اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اصغر کی ہمت نہیں تھی کہ اسے اس سوچ سے نکال کر اپنی طرف متوجہ کرتا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار لالہ کو اس درجہ تشکر دیکھا تھا۔

☆☆☆

سونیا کو ہوش آیا تو درد کی تیز لہر نے اسے بے ساختہ کراہنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے آنکھیں کھول کر اپنے سامنے موجود چہروں کو دیکھا۔ یہ وہی لوگ تھے جو اس کی زبان کھلانے کے لیے اب تک اس پر تشدد کرتے رہے تھے۔ وہ ایک بار پھر تشدد برداشت کرنے کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کرنے لگی۔

”کیسی ہو دیوی جی؟“ ہندی سے واقف نارنجی لبادے والے بھکشو زانگ تاؤ نے بیٹھے لہجے میں اس سے پوچھا۔ اس نے جواب دینے کے بجائے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔

”ایسے منہ نہ پھیر دیوی جی! تم منہ پھیر دیگی تو ہمیں ہمارے سوالوں کا جواب کون دے گا؟“ بھکشو نے اسے چھیڑا۔ وہ کوئی جواب دیے بغیر دوسری طرف دیکھتی رہی۔

”یہ تو انیائے ہے دیوی جی! ہم آپ سے اتنے پریم سے بات کر رہے ہیں اور آپ ہماری طرف دیکھتی بھی نہیں۔“ بھکشو کا لہجہ بناوٹی تھا۔

”فضول باتوں میں ٹائم ضائع مت کرو اور مجھ پر نارچہ شروع کرو۔ ہو سکتا ہے کسی ایجنٹ پر آکر میری برداشت جواب دے جائے اور تم اپنا مقصد حاصل کر لو۔“ اس بار سونیا نے رخ بدلا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یوں بولی جیسے اسے چیلنج کر رہی ہو۔

”انتناخصہ نہ کریں شرمیتی جی! یہ تو ہماری مجبوری نے ہمیں آپ پر ہاتھ اٹھانے پر مجبور کر دیا ورنہ ہم بڑے شائق والے لوگ ہیں۔ اب بھی ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اب کوئی آپ کو انگلی بھی نہیں لگائے گا۔“ وہ نرم اور بیٹھے لہجے میں بات کر رہا تھا لیکن سونیا کو اس لہجے کی تہ میں کچھ اور محسوس ہو رہا تھا۔ وہ الجھ کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”ہم نے آپ کو سمجھنے میں غلطی کر دی تھی پر اب ہم سمجھ گئے ہیں کہ جو کچھ ہم کرتے رہے ہیں اس سے آپ کو توڑنا ممکن نہیں ہے۔ آپ مرنے جاؤ گی پر ہماری اچھا کے انوسار اپنی زبان نہیں کھولوی۔ پر ایسا بھی نہیں کہ آپ کی زبان کھلوانے کا کوئی آپائے ہی نہیں ہے ہمارے پاس۔ آپائے ہے اور اب ہم اسی کو آزمانے جا رہے ہیں۔“

”آزما کر دیکھ لو۔“ بھکشو کے ذہن میں کیا ہے، یہ تو وہ نہیں سمجھ سکی تھی لیکن خود کو اس کے سامنے کمزور ظاہر کرنا بھی مناسب نہیں تھا۔

”بس تو پھر دل تمام کر بیٹھے شرمیتی جی! ابھی یہ پردہ بٹے گا تو آپ اپنے ایک ساتھی کو اپنے سامنے دیکھیں گی۔ ہم اس کو اس سے تک مارتے رہیں گے جب تک آپ زبان نہ کھول دیں یا وہ اپنی جان سے نہ چلا جائے۔ ایک مرے گا تو ہم اس کی جگہ دوسرے کو لے آئیں گے اور دوسرے کی جگہ تیسرے کو پھر دیکھیں گے کہ آپ اپنی ضد پر اپنے کتنے ساتھیوں کو بلی چڑھاتی ہیں۔“ اب بھکشو زانگ تاؤ کے لہجے سے نرمی غائب ہو گئی تھی اور اس کی جگہ سفاکی نے لے لی تھی۔ وہ پہلے والی سونیا ہوتی تو اس دھمکی سے ذرا متاثر نہ ہوتی لیکن اس وقت وہ اندر سے کانپ گئی تھی۔

”یہ بھی کر دیکھو۔“ ڈر جانے کے باوجود اس نے اپنا ڈر ظاہر کرنا مناسب نہ سمجھا اور سپاٹ سے لہجے میں کہہ کر ایک بار پھر منہ پھیر لیا۔ اسے منہ پھیرتے دیکھ کر بھکشو دھیرے سے مسکرایا اور اپنے ساتھی کو اشارہ کیا۔ اگلے لمحے وسیع و عریض جھونپڑے کو دو حصوں میں منقسم ہونے والا پردہ ہٹ گیا۔

”تمہارا پہلا ساتھی، تمہاری ضد کی بھیٹ چڑھنے کو تیار ہے۔ نظریں نہ چراؤ اور اسے اپنی آنکھوں سے مرتا ہوا دیکھو۔“ بھکشو نے اسے مخاطب کیا لیکن اس نے رخ موڑ کر نہیں دیکھا۔ اگلے ہی لمحے ایک زوردار شواپ کی آواز اس کے کالوں میں گونجی۔ وہ جانتی تھی یہ کوڑا ہے جو پوری قوت سے کسی انسانی جسم پر برسایا گیا ہے۔ کوڑے کی آواز کے ساتھ ہی انسانی قہقہے سننے کی منتظر اس کی سماعت کو مایوسی کا سامنا کرنا پڑا تو اس نے پلٹ کر دیکھا اور پوری جان سے کانپ گئی۔

☆☆☆

”ہاں پرویز اہل کیا فلیٹ۔ کوئی مشکل تو نہیں ہوئی؟“ اصغر فون پر اپنے ایک آدمی سے رپورٹ لے رہا تھا۔
”ٹھیک ہے یار! لینے دے کرایہ زیادہ۔ بس کام

تیکھا پن محسوس کرنے کے باوجود نظر انداز کر دیا اور نرم لہجے میں بولا۔

”جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، یہ آنا جانا لالہ کے ہوتے بھی کافی پہلے چھوٹ گیا تھا اس لیے اس وقت گزرے دنوں کا حوالہ دینا بتائیں ہے۔“ اصغر اسے رعایت دینے کو تیار نہیں تھا۔

”چھوڑو یا رگزی باتیں۔ گا ہک دکان پر کتنے ہی عرصے بعد آئے، دکاندار اسے دھکارتا نہیں ہے۔ جو بیت گیا، سو بیت گیا۔ اب آگے کی بات کرو۔“

”کیا خریدنے آئے ہیں آپ یہاں؟“ اصغر نے اسے جا بختی نظروں سے گھورا۔

”تمہاری خدمات۔“ عرفان اللہ نے ہاتھ میں پکڑے سگار کا کش لگایا۔

”کس مقصد کے لیے؟“

”سیاست کے میدان میں اپنے قدم مضبوط رکھنے کے لیے تم جیسوں کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ تم میرا ساتھ دو۔ میں تمہیں منہ مانگے دام دوں گا۔“

”کیوں، وہ تمہارا ہتھیار بادل ہے نا۔ وہ تو تمہاری خاطر کشتوں کے پتے لگا سکتا ہے۔“ اصغر نے ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ بادل کے غیاب سے واقف ہے اور طنزیہ لہجے میں بولا۔

”بازل آج کل یہاں موجود نہیں ہے اور اس کی عدم موجودگی کی وجہ سے ہی مجھے باہر کے لوگوں سے کام لینا پڑ رہا ہے۔“ عرفان اللہ نے اب بھی محل کا مظاہرہ کیا۔

”کیوں، کیا اس ڈنگر کو دنیا فتح کرنے کے مشن پر بھیج دیا ہے؟“ اصغر کا لہجہ استہزائیہ تھا۔

”ہر بار میں ہی اسے کہیں سمجھوں، یہ ضروری نہیں ہے۔ وہ عاقل، بالغ اور آزاد بندہ ہے۔ اپنی مرضی سے بھی بھی اور کہیں بھی جاسکتا ہے۔“ حقیقتاً عرفان اللہ خود بھی باذل کے اچانک غیاب سے پریشان تھا لیکن اس پر اپنی پریشانی کو ظاہر کرنا مناسب نہ سمجھا۔

”یہ بھی ٹھیک کہا آپ نے۔ وہ حرام کا جنا تو دنیا کا وہ آزاد ترین بندہ ہے جو باپ کے ننھے سے بھی آزاد ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کی زندگی میں بھی ایسا موقع نہیں آیا ہوگا کہ کسی نے اس کا کان پکڑ کر برا بھلا سکھانے کی کوشش کی ہو۔ کیا بھی آپ نے ایسی کوئی کوشش کی؟“ اصغر کے اچانک پوچھے گئے سوال نے عرفان اللہ کو گڑبڑا کر رکھ دیا۔

”میں ایسا کیسے کر سکتا ہوں؟ میرا بھلا کیا حق ہے اس پر؟“ اس نے بے اختیار اپنے ماتھے پر سے پسینا صاف کیا۔

طریقے اور احتیاط سے ہونا چاہیے۔ میں نے سردار کو سارا ضروری سامان پیک کرنے کا بول دیا تھا تو اسے فون کر کے ایڈریس لکھوا دے، وہ سامان پہنچا دے گا۔ تو بس اس بات کا خیال رکھنا کہ اگلی پارٹی بہت چالاک ہے اس لیے تم لوگوں سے کوئی غلطی نہ ہونے پائے۔“ پرویز کو ہدایات جاری کرتے ہوئے اس نے کلائی کی گھڑی پر وقت دیکھا۔

”میں دیکھتا ہوں۔ ہو سکتا ہے آدھے پونے گھنٹے میں، میں خود ادھر کا چکر لگاؤں۔ اگر نہ بھی آسکا تو، تو سب اچھی طرح سنبھال لینا۔“ آخری ہدایت دے کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا اور کمپیوٹر کی اسکرین پر نظر آنے والے مناظر دیکھنے لگا۔ یہ اڈے کے مختلف حصوں کے مناظر تھے۔ وہ چاہتا تو ان میں سے کسی ایک کو منتخب کر کے وہاں کی آوازیں بھی سن سکتا تھا۔ ساتھیوں میں کسی غدار کی موجودگی کے شک کے باعث یہ سسٹم حال ہی میں نصب کروایا گیا تھا۔ اتفاق تھا کہ بجلی سے متعلق چند چھوٹے موٹے کام کافی دنوں سے التوا میں پڑے ہوئے تھے۔ مرمت کے بہانے بھروسے کے انٹیکٹریٹرز بلوائے گئے اور ساتھ ساتھ خفیہ کیمرے اور مائیک وغیرہ نصب کروا دیے گئے۔ اس سارے سیٹ اپ کی گنتی کے چند ایک لوگوں کو ہی خبر تھی اور انہیں اصغر نے سختی سے زبان بندی کا حکم دے دیا تھا۔ وہ موقع ملنے پر خفیہ کیمروں کی مدد سے اپنے آدمیوں کی سرگرمیوں کا جائزہ لیتا رہتا تھا۔ سسٹم میں ریکارڈنگ کا آپشن بھی موجود تھا اور اس وقت اس کا ریکارڈنگز ہی دیکھنے کا ارادہ تھا اس لیے پرویز کو آدھے پونے گھنٹے بعد پہنچنے کا بتایا تھا۔

”عرفان اللہ آیا ہے استاد!“ ابھی اس نے ریکارڈنگز کھولی بھی نہیں تھیں کہ ایک آدمی نے آکر اسے اطلاع دی۔

”عرفان اللہ!“ اس نے حیرت سے نام دہرایا پھر پوچھا۔

”اکیلا آیا ہے یا ساتھ کوئی اور بھی ہے؟“

”صرف گارڈز ہیں ساتھ۔“

”اچھا چلو، میں آتا ہوں۔“ اس نے کمپیوٹر بند کیا اور اپنی جگہ چھوڑ دی۔ ملاقاتیوں والے کمرے میں عرفان اللہ اس کا منتظر تھا۔

”آج آپ نے کیسے اس غریب خانے کو رونق بخشی؟“ رسمی علیک سلیک کے بعد اصغر نے عرفان اللہ سے براہ راست سوال کیا۔

”کوئی پہلی بار تو نہیں آیا ہوں۔ لالہ کے زمانے میں اکثر آنا جانا لگا رہتا تھا۔“ عرفان اللہ نے اس کے لہجے کا

”یہ بھی ٹھیک کہا۔ حق تو اصل میں حق ادا کرنے والوں کو ہی حاصل ہوتا ہے۔“ اصغر نے آہستہ سے اسے چمکا لگا یا اور جب دیکھا کہ اس کی رنگت متغیر ہو رہی ہے تو آرام سے بولا۔

”اب دیکھیے نا، اگر آج اس کا باپ زندہ ہوتا تو اسے ایسے بے تحفے بیل کی طرح آزاد تھوڑی چھوڑ دیتا۔ کچھ تعلیم و تربیت دیتا اس وحشی کو۔۔۔۔۔ سچ اپنے کو بڑا افسوس ہوتا ہے کہ اس جیسا جی دار اور میلنڈ بندہ محض تربیت کی محرومی کے باعث انسان بننے سے بھی محروم رہ گیا۔“

”اب کیا باذل پر ہی بات کرتے رہو گے اور مجھے میری اس بات کا جواب نہیں دو گے جس کے لیے میں خود چل کر یہاں تک آیا ہوں۔“ عرفان اللہ نے جبر ہوتے ہوئے اسے ٹوکا۔ حقیقت یہ تھی کہ آج کل تاجور نے بھی باذل کے حوالے سے اس کی جان کھائی ہوئی تھی کہ معلوم کرو باذل کہاں غائب ہے؟ تاجور کی فرمائش پر اس نے باذل کو تلاش کروانے کی تھوڑی بہت کوشش بھی کی تھی لیکن کوئی سراغ نہیں ملا تھا اور اس کے پاس اتنی فرصت نہیں تھی کہ سارا وقت اسی کام میں لگا رہتا۔

”سالا خود چل کر آنے کی بھی خوب کہی آپ نے۔ اپن کی مانو تو اسے بھی رب کا احسان جانو کہ اپنے پیروں پر چلنے کے لائق ہو ورنہ وہ ٹھکانا لطیف شاہ دیکھو کیسی اکڑ والا تھا لیکن اب بستر پر مردوں کی طرح بڑا ہے۔“

”تم ایسا کرو، اڈا چھوڑ کر تبلیغی جماعت کے ساتھ چلے چلے جاؤ۔ یہ تعلیم و تربیت کی باتیں، یہ شکرانے کی نصیحتیں وہیں بیٹھ کر کرتے ہوئے اچھے لگو گے تم۔“ بالآخر عرفان اللہ کا ضبط جواب دے گیا اور اصغر کو اس کی باتوں پر ٹوک ڈالا۔ اصغر اس کے یوں ٹوکنے پر ہلکھلا کر ہسا پھر سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولا۔

”بات اپن نے سن اور سمجھ لی ہے پر فیصلہ سنانے کو تھوڑی مہلت چاہیے ہے۔ سوچ سمجھ کر ایک آدھ دن میں جواب دے دوں گا۔“

”جواب ہاں میں ہی ہونا چاہیے۔ پرانے تعلق کا اتنا مان تو تمہیں رکھنا ہی ہوگا۔ اگر تمہاری جگہ یہاں لالہ بیٹھا ہوتا تو وہ بھی فیصلہ میرے حق میں ہی دیتا۔ اس کی وضع داری مجھے انکار کرنے ہی نہیں دیتی۔“ عرفان اللہ نے اسے جذباتی کرنے کی کوشش کی۔

”اب بھی فیصلہ لالہ ہی کا ہوگا۔“ اصغر بے اختیار بول اٹھا۔ ”کیا مطلب؟“ عرفان اللہ ٹھٹھا۔

”مطلب، لالہ کا طریقہ تھا کہ کوئی بھی الجھا ہوا کام ہاتھ میں لینے سے پہلے اپنے اعتبار کے بندوں سے مشورہ لے لیتے تھے۔ مجھے بھی بس یہی کرنا ہے۔“ اصغر نے بات بتائی۔ ”یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ تمہیں ایسے لوگ میسر ہیں۔ اب مجھے ہی دیکھ لو۔ سب طرف اکیلا ہی بھاگا پھرتا ہوں۔ پہلے یزدانی کا آسرا تھا لیکن اسے جوان بیٹے کی موت کا غم لے ڈوبا ہے۔ سارا وقت یا تو پیتا رہتا ہے یا روتا رہتا ہے۔ جب ان دونوں کاموں سے تھک جاتا ہے تو سو جاتا ہے۔ بالکل بھی کسی کام کا نہیں رہا ہے۔“ عرفان اللہ نے اپنا ردنا روایا۔

”سنا تھا آپ کا بیٹا بھی بیمار ہے اور آپ نے علاج کے لیے باہر بھیجا ہوا ہے۔ کچھ فرق پڑا اسے گوروں کے علاج سے؟“ اصغر نے ظاہری ہمدردی سے پوچھا۔ ”علاج ابھی شروع ہی کہاں ہوا ہے۔ ابھی تو ٹیسٹ پر ٹیسٹ کر رہا ہے ہیں وہ لوگ۔ یہاں کی رپورٹوں کو کہاں مانتے ہیں گورے ورنہ ٹیسٹ تو یہاں بھی بے حد و حساب ہوئے تھے۔“

”بس تو ٹھان لیجیے کہ جب بھی آپ کو موقع ملا، اپنے ملک میں بھی ایسے کالج اور اسپتال بتائیں گے جن کی ڈگریوں اور رپورٹوں کو گورے بھی مانیں۔“ اصغر نے مفت مشورہ دیا۔

”اچھا، اب میں چلتا ہوں۔ ایک دو دن بعد فون کر کے تمہارا جواب مانگوں گا۔“ عرفان اللہ اس کے مشورے کے جواب میں جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے روانہ ہوتے ہی اصغر نے بھی روانگی اختیار کی۔ روانی سے دوڑتی گاڑی شہر کے ایک ایسے حصے میں جا کر جہاں کثیر المعزلہ عمارات کی بہتات تھی۔ ان عمارتوں میں سے کچھ عمارتیں رہائشی تھیں جبکہ اکثریت کاروباری مقاصد کے لیے استعمال ہو رہی تھیں۔ اس کی گاڑی جس عمارت کے سامنے جا کر رکی، وہ رہائش کے لیے استعمال ہو رہی تھی۔ وہ گاڑی سے اترتا تو اس عمارت کے مقابل سڑک کے پار دوسری کثیر المعزلہ عمارت کا کن اکھیوں سے جائزہ لیا۔ عمارت کی تعمیر میں شیعوں کا کثرت سے استعمال کیا گیا تھا لیکن یہ وہ شیشے تھے جن کے باہر کی طرف سے اندر نہیں جھانکا جاسکتا تھا البتہ اندر والے بہ خوبی باہر کا جائزہ لے سکتے تھے۔

”یہیں انتظار کرو، میں اکیلا اوپر جاؤں گا۔“ اس نے ساتھ آئے ڈرائیور کو حکم دیا اور خود رہائشی عمارت کی

طرف بڑھ گیا۔ داخلی راستے پر موجود گارڈ نے اس کی منزل کا پوچھ کر پہلے پرویز سے رابطہ کیا اور وہاں سے گرین سگنل ملنے کے بعد ہی اسے لفٹ میں سوار ہونے کی اجازت دی۔ لفٹ میں اس کے ساتھ ایک تیرہ چودہ سالہ لڑکا اور اس سے کچھ برس چھوٹی بچی موجود تھی۔ دونوں شکل سے بہن بھائی لگتے تھے اور ہاتھوں میں آئس کریم پکڑے ارد گرد سے بے نیاز آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ یقیناً رہائشیوں کے تحفظ کے لیے ہی وہاں سیکورٹی کا انتظام ذرا سخت رکھا گیا تھا اور اجنبیوں کو بلا روک ٹوک داخلے کی اجازت نہیں تھی۔

”کیسا چل رہا ہے؟“ اصغر اپنی مطلوبہ منزل پر لفٹ سے اتر کر ایک اپارٹمنٹ میں داخل ہوا تو اندر کھستے ہی اپنے لیے دروازہ کھولنے والے پرویز سے پوچھا۔ اس کے ساتھ لفٹ میں سوار بچے پہلے ہی کسی پگلی منزل پر اتر چکے تھے۔ ”ٹیلی اسکوپ فٹ کر دی ہے اور ایک آدمی کو مستقل نگرانی پر بھی بٹھا دیا ہے لیکن زیادہ فائدہ دکھائی نہیں دے رہا۔ یہاں کی طرح وہاں بھی ایسے شیشے لگے ہیں کہ باہر سے اندر کا کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔ بس ہم انہی لوگوں کو دیکھ سکتے ہیں جو سڑکیاں چڑھتے اترتے سامنے آجاتے ہیں۔“ پرویز نے قدرے مایوسانہ انداز میں اس کے سوال کا جواب دیا۔ اس نے زبان سے کچھ کہنے کے بجائے تسلی دینے والے انداز میں پرویز کا شانہ تھپکا اور خود اس کھڑکی کی طرف بڑھ گیا جس کے ساتھ ٹیلی اسکوپ فٹ کی گئی تھی۔ کھڑکی کا شیشہ بے شک بند تھا لیکن جس منہمک انداز میں ٹیلی اسکوپ کے پیچھے بیٹھا بندہ اپنے کام میں مصروف تھا، اس سے ظاہر تھا کہ اسے سب صاف دکھائی دے رہا ہے۔ اصغر نے آہستہ سے اس شخص کا بازو دبا کر اسے متوجہ کیا اور اشارے سے سیٹ چھوڑنے کا حکم دیا۔ اب وہ خود آنکھ لگائے سامنے موجود عمارت کا جائزہ لے رہا تھا۔ صورت حال وہی تھی جو اسے بتائی گئی تھی۔ وہ نہیں دیکھ سکتا تھا کہ سامنے موجود عمارت کے دفاتر میں کیا ہو رہا ہے۔ پوری عمارت میں بس دائیں جانب بنائی گئی سڑکیاں ہی دکھائی دے رہی تھیں اور اس وقت ان سڑکیوں سے اپنی وردی سے چڑا سی دکھائی دیتا ایک آدمی ہاتھ میں چند فائلیں لیے نیچے کی طرف جاتا دکھائی دے رہا تھا۔

اصغر کی دلچسپی کا اصل مرکز عمارت کا ٹاپ فلور تھا۔ حامد پرکاش اتشد کر کے بالآخر وہ اس سے جو چند اہم معلومات حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے تھے، ان میں سے اہم ترین اطلاع یہی تھی کہ اس عمارت کے ٹاپ فلور پر میڈم

ایکس کا قبضہ تھا۔ یہاں اس کے دفاتر بھی تھے اور رہائشی یونٹ بھی۔ وہ عمارت میں آمد و رفت کے لیے ایک پرائیویٹ لفٹ استعمال کرتی تھی۔ یہ لفٹ عمارت کے گراؤنڈ فلور پر واقع پارکنگ اور اس سے آگے ہیمنٹ تک جاتی تھی۔ عمارت کا ہیمنٹ کئی حصوں میں منقسم تھا اور ہر حصہ مختلف کمپنیوں کے استعمال میں تھا جسے وہ اپنے ریکارڈ روم یا اسٹور وغیرہ کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ میڈم ایکس کی تحویل میں موجود حصہ ساؤنڈ پروف تھا جسے ضرورت کے مطابق مختلف مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔

”یہاں سے نگرانی بس اس حد تک کارآمد ہے کہ ہمارے مطلوبہ حلیے والے مرد اور عورت میں سے کوئی سیزھیوں کا استعمال کرے اور اس بات کا امکان بہت کم ہے کہ لفٹ کے ہوتے ہوئے کوئی سیزھی کا استعمال کرے۔“ پرویز اس کے پیچھے آکھڑا ہوا اور اپنی رائے دی۔

”ابن کو ہر ایریا کوور کرنا ہے۔ ادھر پارکنگ کی Exit پر بھی بندے بٹھائے ہیں۔ کہیں سے بھی اپنے مطلب کا کچھ بھی مل سکتا ہے۔ تو بس اپنے کو ہر بات کی اطلاع دیتے رہنا۔“ اصغر نے اسے جواب دیا۔ حقیقتاً وہ خود لالہ کی ہدایات پر عمل کر رہا تھا اور وہی ہدایات اپنے آدمیوں تک پہنچا دیتا تھا۔

”کہو تو وہ آواز سنانے والی ڈبی ابھی ادھر لگوا دوں۔ کچھ تو سن گن ملے اور بندہ خالی بیٹھا کھیاں مارنے سے بچے۔“ پرویز بھاگ دوڑ اور مار کٹائی کرنے والی فطرت کا بندہ تھا اس لیے اسے چند گھنٹوں میں ہی نگرانی کے اس شخص عمل سے اکتاہٹ ہونے لگی تھی۔

”ہرگز نہیں۔“ اصغر ٹیلی اسکوپ چھوڑ کر فوری طور پر اس کی طرف گھوما اور تیز لہجے میں بولا۔

”ڈبیا کو فائر کرنے کے لیے تمہیں کھڑکی کھولنا پڑے گی اور ایسے میں تم لوگ کسی کی نظر میں بھی آسکتے ہو۔“ ”بس دو منٹ کی تو بات ہے۔“

”دو سیکنڈ کے لیے بھی ایسا نہیں کرنا۔ جب بتا دیا ہے کہ کام آدمی رات کے بعد کرنا ہے تو بس اسی ٹائم کرنا ہے اور دھیان رکھنا ہے کہ اس ٹائم یہاں معمولی سی بھی روشنی نہ ہو۔ تم لوگوں کا نظر میں آجانا ساری محنت کو ضائع کر دے گا۔“ وہ بہت سختی سے پرویز کو باور کرواتا تھا کیونکہ یہ تو وہ بھی جانتا تھا کہ حامد سے معلومات اگلوانے میں کتنی محنت لگی تھی اور اس حساس آلے کا حصول کتنے مہنگے داموں ممکن ہوا تھا جسے کسی گولی کی طرح اس کے ٹریگر سے فائر کر کے کسی بھی

کی جان لگنے سے پہلے تمہارے ہاتھ رکنے نہ پائیں۔“
بھکشو زانگ تاؤ نے خوشخوار لہجے میں حکم جاری کیا اور ساتھ ہی ایک دوسرے بندے کو بھی اشارہ کر دیا۔ اب معاذ کے جسم پر بیک وقت دو آدمی کوڑے برسارے تھے اور اس کی کراہیں پہلے کے مقابلے میں مزید بلند ہو گئی تھیں۔ اتنی تکلیف کے باوجود بھی اس نے ایک بار بھی سونیا کو نہیں ہٹا دیا تھا اور نہ ہی اس سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ اپنی زبان کھول کر اسے اس اذیت سے نجات دلا دے۔ وہ تو اس کی طرف دیکھتے ہی نہیں رہا تھا اور سونیا اس کے اس انداز کو سمجھ رہی تھی۔ اس نے فیصلے کا اختیار مکمل طور پر اس کے ہاتھ میں دے دیا تھا اور کسی صورت اسے مجبور نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”یہ نرک میں پہنچ جائے تو اسے لے آنا جس کی ناک زخمی ہے۔ دیکھتے ہیں یہ اپنے کتنے ساتھیوں کو اپنی ضد کی بھینٹ چڑھاتی ہے۔“ زانگ تاؤ کا لہجہ غصے میں قہر برسا رہا تھا۔

”رک جاؤ۔ فار گاڈ سیک! رک جاؤ۔ جو تم جانتا چاہتے ہو، میں تمہیں بتاؤں گی لیکن پلیز! کسی کو کچھ نہ کرنا۔ یہ سارے زردوش ہیں اور ان میں سے کوئی بھی وہ نہیں جانتا جو میں جانتی ہوں۔“ معاذ کے جسم سے خون نکل کر لکڑیوں کی صورت بننے لگا تو سونیا کا ضبط جواب دے گیا۔ یوں بھی زانگ تاؤ کے لہجے کی سفاکی نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ اپنے کہے پر عمل کرے گا اور یہ وہ جانتی تھی کہ معاذ اسے اپنا خون معاف کر دے گا لیکن اپنے ساتھیوں میں سے کسی پر آج آنا اسے گوارا نہیں ہوگا۔

”رک جاؤ بھی اور ذرا بندے کے زخموں پر کوئی مرہم شرم لگاؤ۔ اپنی شرمیلی جی کی یادداشت واپس آگئی ہے تو ان کے ساتھی کو بھی تھوڑا آرام دو۔“ بھکشو کے حکم پر کوڑے برساتے ہاتھ رک گئے اور فوراً ہی زخموں سے خون روکنے کا کام شروع کر دیا گیا۔

”اب بولنا شروع کر دو دیوی جی! پر یاد رکھنا، جہاں تمہاری زبان رکی، وہیں میرے سیوکوں کے ہاتھ بھی مرہم لگانا چھوڑ کر اس کے زخموں پر نمک مریچ لپیٹنا شروع کر دیں گے۔“ بھکشو زانگ تاؤ نے سونیا کے بولنے سے پہلے ہی اسے دھمکانا ضروری سمجھا تھا۔ ویسے وہ شخص بھکشوؤں کی عمومی امن پسند فطرت کے بالکل مخالف تھا اور ایسا لگتا تھا کہ کسی انسان پر کیا جانے والا تشدد اسے تسکین دیتا ہے۔

”میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گی۔“ سونیا نے اسے یقین دہانی کروائی اور ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ پتا نہیں وہ اپنے الفاظ کو جمع کر رہی تھی یا عہد شکنی کے لیے دل

ٹھوس سطح پر چسپاں کیا جاسکتا تھا اور پھر اس کی مدد سے ارد گرد کے علاقے میں پیدا ہونے والی انسانی آوازیں سنی جاسکتی تھیں۔

”ٹھیک ہے بابا! نہیں کروں گا اپنی مرضی۔ تم شانت ہو جاؤ۔“ اس کے لہجے نے پرویز کو سمجھا دیا کہ وہ کتنی ہی بیزاری محسوس کیوں نہ کرے، کرنا اسے وہی ہے جو کہا گیا ہے۔

”مجھے تیری طبیعت کا پتا ہے اس لیے میں خود ادھر آیا تھا۔ خیال رکھنا، جلد بازی تیرے ساتھ دوسروں کو بھی مراد دے گی۔ اگلی پارٹی جتنی بگڑی ہے، تجھے اس کا اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔“ پرویز کو ہدایات دیتے ہوئے اصغر کو درحقیقت خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس کا واسطہ کن لوگوں سے پڑا ہے۔

☆☆☆

شرواپ..... شرواپ..... شرواپ..... کوڑا ایک تسلسل سے جس شخص پر برس رہا تھا، وہ کتنا ہی مضبوط قوت ارادی کا مالک سہی، تھا تو گوشت پوست سے بنا انسان ہی۔ ابتدائی تین چار ضربیں خاموشی سے برداشت کر لینے کے بعد اب اس کے منہ سے کراہیں لگنا شروع ہو گئی تھیں اور وہ کوشش کے باوجود انہیں روکنے میں کامیاب نہیں تھا۔

”تم خواخواہ اس کو ظلم کا نشانہ بنارہے ہو۔ یہ میرے ساتھ ضرور تھا لیکن اس کا ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں جن کے بارے میں تم جانتا چاہتے ہو۔“ سونیا نے ایک نظر ضبط کی کوشش میں سرخ پڑتے معاذ کے چہرے کو دیکھا اور ننتے ہوئے چہرے کے ساتھ زانگ تاؤ سے مخاطب ہوئی۔

”اس کا نہ سہی پر تمہارا تو سمبندھ ہے ان لوگوں سے۔ تم بتاؤ ہمیں ان کے بارے میں۔“ زانگ تاؤ مکاری سے بولا اور کوڑے برسائے والے کو اشارہ کیا کہ ہاتھ نہ روکے۔

”بتایا تو ہے کہ میرا کوئی تعلق نہیں کسی سے۔ وہ گولڈن اسٹار بس اتفاق سے میرے ہاتھ لگ گیا تھا۔“ بے شک وہ چند وجوہات کی بنا پر تنظیم سے بددل ہو گئی تھی اور

معاذ کی محبت میں ماں کی مخالف سمت میں بھی چل بیڑی تھی لیکن اس کی پردوش تو ان ہی لوگوں کے ہاتھوں ہوئی تھی۔

بچپن سے اس کے دماغ میں یہ بات بٹھائی گئی تھی کہ جان دے دینا لیکن دشمنوں کے سامنے تنظیم کا کوئی راز افشا نہ کرنا۔ اس لیے آج بھی اس کے لیے زبان کھولنا مشکل تھی۔

اس مشکل کو ایک ذاتی وجہ نے اور بھی شدید کر دیا تھا اس لیے اس کی زبان ٹھلنے کو تیار ہی نہیں ہو رہی تھی۔

”اس لڑکے کو اتنا مارو کہ اس کی کھال گر جائے۔ اس

ہی دل میں معافی مانگ رہی تھی۔

”گولڈن اسٹار اسرائیلیوں کی قائم کردہ ایک تنظیم ہے۔ اس بات کو بہت سے لوگ جانتے ہیں۔ گولڈن اسٹار ہماری معاوضے پر ان سارے ممالک کو سروسز فراہم کرتی ہے جن کے مفادات اسرائیل سے وابستہ ہیں۔ سروسز لینے والے ممالک جہاں ممکن ہو ہمیں فیس لیٹ بھی کرتے ہیں۔ اسی لیے گولڈن اسٹار نے تقریباً پوری دنیا میں اپنی جڑیں بہت مضبوط کر لی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اب یہ تنظیم دنیا پر اسرائیل کی تباہ کاری کے خواب دیکھ رہی ہے۔“

”تہا..... تمہارا مطلب ہے بالکل اکیلے..... کسی کو اپنے ساتھ ملائے بغیر؟“ زانگ تاؤ نے حیرت سے پوچھا۔
”ایسا ہی ہے لیکن پہلے مرحلے میں چھوٹے ممالک کو نشانہ بنایا جائے گا۔ بڑے اور دوست ممالک کے لیے ان کی پالیسی ذرا مختلف ہے۔ ہو سکتا ہے ظاہری طور پر ان کے حکمران نہ بدلیں لیکن ان ممالک میں بھی ہوگا وہی جو اسرائیل چاہے گا۔“

”یہ تو کسی دیوانے کا پہنا لگتا ہے۔“ زانگ تاؤ بڑبڑایا۔
”وہ لوگ جس دیوانگی سے اس سنے کو پورا کرنے کے لیے کام کر رہے ہیں، وہ دن دور نہیں جب دنیا سچ جیسا ہونا دیکھے گی۔“ سونیانے دعویٰ کیا۔

”مگر کیسے؟ کیا دنیا میں اپنے چند آنک وادیوں کو پھیلا کر ایسا کرنا ممکن ہو سکتا ہے؟“ زانگ تاؤ ماننے کو تیار نہیں تھا۔

”تمہیں صرف آنک وادی کیوں دکھائی دے رہے ہیں؟ تم ان سائنسٹس اور ایکسپرٹس کو کیوں نہیں دیکھتے جو دنیا بھر سے علم حاصل کرنے کے بعد لیبارٹریز میں ہر روز ایک نئی انوینشن کر رہے ہیں۔ ان تاجروں کی طرف تمہارا دھیان کیوں نہیں جاتا جو ہر بڑی پروڈکٹ کے مالک ہیں۔ اکٹائیس کو یہودیوں سے بڑھ کر جاننے والی دنیا میں کوئی دوسری قوم موجود نہیں ہے۔ تم ایک ایک کر کے ہر فیئلڈ کے بارے میں سوچتے جاؤ اور پھر بتاؤ کہ وہ کون سی جگہ ہے جہاں یہودی موجود نہیں ہیں۔ یہودی اور اسرائیل دونوں ایک دوسرے سے الگ دو نام نہیں ہیں۔ دنیا کا ہر یہودی جس نے چاہے اپنی زندگی میں ایک بار بھی اسرائیل میں قدم نہ رکھا ہو، وہ اسرائیل کا وفادار ہے۔ اسرائیل سے وفاداری کے بغیر کسی یہودی کا ایمان مکمل نہیں ہو سکتا۔“ وہ جو کچھ کہہ رہی تھی، اس نے معاذ کو اپنی تکلیف بھلا کر پوری طرح اس کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔ یہ اس سے بہت آگے کی

باتیں تھیں جو اب تک سونیانے سے بتا چکی تھی۔

”وشواس نہیں ہوتا کہ تم جو کچھ کہہ رہی ہو، وہ سچ ہے۔“ زانگ تاؤ اب بھی بے یقینی کا شکار تھا۔

”نہ کرو و شواس لیکن ایک دن دنیا یہ سب ہوتا دیکھے گی۔ ہو سکتا ہے وہ وقت آنے تک میں اور تم نہ رہیں لیکن یہ خواب مرے گا نہیں۔ یہ ایک دن پورا ہو کر رہے گا۔ اسرائیل دنیا کے ہر ملک کی شہرگ پر انگوٹھا رکھنے کی بھرپور تیاری کر رہا ہے۔ ہتھیار، منشیات، معیشت اور موسم..... ہر شے آنے والے سے میں اسرائیل کے کنٹرول میں ہوگی۔ زندہ بس وہ رہے گا جو سر جھکا کر اس کی غلامی کرے گا۔ سر اٹھانے والوں کو انگلی کی ایک جنبش سے پھل دینے کا اختیار ہوگا اسرائیل کے پاس۔“ وہ بول رہی تھی اور اب زانگ تاؤ اسے جھلانے کے بجائے غور سے سن رہا تھا۔ وہ خود دنیا کے ایسے ملک کا شہری تھا جس نے قلیل مدت میں انتھک محنت سے اپنا آپ منوایا تھا اور ہر شعبے میں ترقی کر کے خود کو اس لائق بنالیا تھا کہ کسی طاقت کے لیے اسے آنکھیں دکھانا آسان نہیں رہا تھا۔

”کوئی ملک کتنا ہی طاقتور ہو اور کتنی ہی بڑی مین پاور (انفرادی قوت) دکھتا ہو، اس سے کیا کر سکے گا جب اس کے قیمتی جنگلات میں اچانک ہی ایسی آگ بھڑک اٹھے گی جو جنگل کو راہ کے بغیر بجھنے کا نام نہیں لے گی۔ اس کی آبادیوں میں ایسے وبائی امراض پھوٹیں گے جن سے بچاؤ اور حفاظت کی دوا تیار کرتے کرتے وہ تھک مرین گے۔ زلزلوں سے پورے پورے شہر الٹ جانے کے بعد سردائیوں کی جنگ لڑنا کتنوں کے لیے ممکن ہوگا؟ کوئی خشک سالی کے ہاتھوں مرے گا تو کسی کو سیلاب لے ڈوبیں گے۔ تم اندازہ ہی نہیں لگا سکتے کہ اس دنیا کو اپنے کنٹرول میں کرنے کے لیے کتنے ٹول تیار کیے جا چکے ہیں اور کتنے لیبارٹریز میں تیاری کے پروسس میں ہیں۔ اسرائیل اگر گولڈن اسٹار جیسی تنظیموں کی صورت طاقتور ممالک کے لیے کرائے کا ٹوٹنا ہوا ہے تو صرف اس لیے کہ اسے ہر بڑی ٹیکنالوجی کے حصول کے لیے ہماری فنڈز کی ضرورت ہے۔ یہ فنڈز ایک طرف معاوضے کے طور پر حاصل کیے جارہے ہیں تو دوسری طرف ہم جیسے کارکن دنیا سے لوٹ ٹھوٹ کر اس تک پہنچا رہے ہیں۔ نیچے سے لے کر اوپر تک ہر لیول پر کام ہو رہا ہے۔ وسائل سے بھی پہلے ذہنوں پر قبضے کی تیاری ہے۔ کوئی کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو، اس کے ذہن میں شک کا بیج بودیا گیا ہے۔ اگلے ہوئے ذہنوں والی پوری ایک نسل تیار

کے بجائے گولی بھی چلا دیتے۔ ایسے وقت میں زانگ تاؤ نے ہی ہوش و حواس سے کام لیا اور سونیا کے کنارے ہاتھ کو دبوچ کر کنار پر اس کے ہاتھ کی گرفت ختم کرنے کی کوشش کی۔ رد عمل میں سونیا نے اسے ایک زوردار لٹا رسید کی جس کے نتیجے میں وہ الٹ کر پیچھے جا گرا۔ ہاتھ زانگ کی گرفت سے آزاد ہوتے ہی سونیا نے کنار کا رخ اپنی گردن کی طرف کر لیا۔ معاذ نے جو اس کے قریب پہنچ چکا تھا، اس کے ہاتھ پر ہاتھ ڈالا لیکن شاید اسے دیر ہو چکی تھی اور سونیا کی گردن پر ابھرنے والی سرخ لکیر نے تیزی سے خون اگلنا شروع کر دیا تھا۔

☆☆☆

برف پر اپنے تھکے ہوئے قدموں کو کھینچتا جب وہ بالکل ہی نڈھال ہو گیا تو نہ چاہتے ہوئے بھی رکنے کا فیصلہ کرنا پڑا اور ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ کر ہانپی ہوئی سانسیں لینے لگا۔ وہ مسلسل کئی روز سے اس برف زار میں موجود تھا اور وہ بھی کسی ساتھی کے بغیر۔ اتنے دشوار گزار راستوں اور سخت موسم کا مقابلہ تنہا کرنے کے لیے جس وحشت اور جنون کی ضرورت تھی، اس کی اس کے پاس کوئی کمی نہیں تھی۔ وہ باذل تھا۔ وحشیانہ فطرت والا وہ جنونی انسان جو اگر کچھ کرنے کی ٹھان لیتا تو پھر کسی بات کی پروا نہیں کرتا تھا۔ خود اپنی جان کی بھی نہیں۔ اس نے جس وقت جھکشیوں کا تعاقب کرنے کا فیصلہ کیا تھا، وہ جانتا تھا کہ وہ ایک ایسے اندھے سفر پر جا رہا ہے جس کے دوران اس کے ساتھ کچھ بھی پیش آ سکتا ہے لیکن اس کی حیوانی جبلت نے اسے زیادہ غور و خوض کا موقع نہیں دیا تھا اور اس نے لمحوں میں خود کو اس مشکل میں جھونک دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

اپنے اس اندھے فیصلے کے نتیجے میں اس نے اچھی خاصی مصوئیں برداشت کی تھیں۔ مسلسل پیدل چلتے رہنے سے پیروں میں چھالے ہو گئے تھے اور سوجن اتنی زیادہ ہو گئی تھی کہ اس کے جوتے تنگ ہو گئے تھے۔ سب سے بڑا عذاب ٹھنڈک کا تھا۔ بھاری گرم کپڑوں کے باوجود سردی اتنی زیادہ تھی کہ بندہ اگر پہلو بدلے بغیر زیادہ دیر ایک زاویے سے بیٹھا رہے تو اسی زاویے پر جم کر رہ جائے۔ اس کے پاس موجود سامان کے تھیلے میں سلپنگ بیگ اور ایک چھوٹا سا اسٹونہ ہوتا تو وہ زندہ بھی نہ رہا ہوتا۔ اسٹونہ کو بھی اس نے نہایت کفایت شعاری سے انتہائی ضرورت کے وقت استعمال کیا تھا۔ حقیقتاً سردی سے لڑتے لڑتے اس کی حالت پتلی ہو گئی تھی اور پورے سفر میں ایک آدھ بار ہی یہ

ہو رہی ہے اور یہ نسل ایسی ہوگی جو ملک اور قوم تو کیا، اپنا بھی کوئی بھلا نہیں کر سکے گی۔“ انکشافات کا سلسلہ تھا کہ رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ اول اول حیرت کا شکار معاذ کو بتدریج اس کی ہر بات کا یقین آتا جا رہا تھا۔ جو کچھ وہ کہہ رہی تھی، وہ کسی نہ کسی صورت اس کے ارد گرد موجود تو تھا لیکن اس سب سے مسلسل چشم پوشی اختیار کی جا رہی تھی۔ صاحب اختیار و اقتدار افراد اپنی عیاشیوں اور بینک بیلنس میں اضافے سے آگے کی نہیں سوچتے تھے اور عوام کو شعور نہیں تھا کہ وہ کتنے خطروں کی زد میں ہیں۔ کہیں تھوڑا بہت ادراک تھا بھی تو بچاؤ کی راہ نہیں سوچتی تھی۔

”سن رہے ہو مانک! جو کچھ یہ تمہاری سوکا لڈ ساتھی بتا رہی ہے؟ دشو اس کرو، اگر ہم نے اس کی ڈاڑھ میں چھپا سا نانا بڈ کا کپسول نہ نکال لیا ہوتا تو یہ ہمیں یہ سب کچھ بتانے کے بجائے آتما ہتھیا کر چکی ہوتی۔“ زانگ تاؤ نے معاذ کو مخاطب کر کے معنی خیز لہجے میں جتایا۔ جواباً معاذ کچھ نہ بولا اور خاموشی سے اس شخص کو دیکھتا رہا جو اسے بندشوں سے آزاد کر رہا تھا۔ اس کا دوسرا ساتھی ہاتھ میں گن تھا بے بالکل چونکا کھڑا تھا۔ اس کے علاوہ بھی وہاں مزید دو مسلح افراد موجود تھے اور ان کے ہوتے ہوئے کسی غلط حرکت کی گنجائش نہیں تھی۔

”سوری معاذ! مجھے معلوم ہے کہ میں نے تمہیں ہرٹ کیا ہے۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔ میں نے تمہیں کتنے ہی دھوکے میں رکھا ہو لیکن یہ سچ اپنی جگہ رہے گا کہ میں نے تم سے بالکل سچی محبت کی ہے۔“ بالکل غیر متوقع طور پر سونیا نے اسے مخاطب کر کے کہا تو وہ جھکشی کی طرح اسے نظر انداز نہیں کر سکا۔ کچھ ایسا تھا اس کے لہجے میں جس نے اسے نظریں اٹھا کر سونیا کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ دونوں کی نظریں آپس میں ملیں اور یکدم ہی معاذ کو ادراک ہوا کہ وہ اس سے صرف معافی نہیں مانگ رہی تھی، وہ اپنی زندگی کے آخری الفاظ ادا کر رہی تھی۔ اس نے اپنے قریب کھڑے شخص کو دھکا دیا اور چھلانگ لگا کر سونیا تک پہنچنے کی کوشش کی لیکن وہ اس سے پہلے ہی حرکت میں آ چکی تھی اور بجلی کی طرح لپک کر زانگ تاؤ کی کمر کے ساتھ بندھی کنار پہنچ لی تھی۔ اس ساری صورت حال پر وہاں ایک ہنگامہ ہوا گیا تھا۔ زانگ تاؤ کے ساتھی ہتھیار سونٹے للکاریں مار رہے تھے۔ یقینی طور پر وہ چینی زبان میں اسے زانگ تاؤ سے دور رہنے اور گولی مار دینے کی دھمکی دے رہے تھے۔ اگر وہ زانگ تاؤ کے بے حد قریب نہ ہوتی تو وہ صرف دھمکی دینے

موقع میسر آیا تھا کہ سوکھی لکڑی مل جانے پر اس نے آگ جلا کر اپنے نجد ہوتے وجود کو گرمی پہنچائی تھی۔

بکھشوؤں کا پیچھا کرتے اور ان کے ٹھکانے تک پہنچتے ہوئے موسم پھر بھی اتنا سخت نہیں تھا لیکن واپسی کے سفر میں درجہ حرارت یکدم ہی کئی ڈگری نیچے کر گیا تھا۔ موسم کے ساتھ ساتھ اسے خوراک کی کمی کا مسئلہ بھی درپیش تھا۔ وہ جو خشک خوراک ساتھ لے کر چلا تھا، وہ کفایت شعاری سے استعمال کرنے کے باوجود ختم ہو گئی تھی اور اب وہ گزشتہ کئی گھنٹوں سے بھوکا تھا۔ بھوک، تنہائی اور ٹھکن آہستہ آہستہ اس کے اعصاب کو متاثر کر رہی تھی لیکن وہ آخری حد تک لڑنے اور حالات کا مقابلہ ڈٹ کر کرنے والوں میں سے تھا۔ اگر اس کی فطرت میں منفی خصوصیات کے رنگ ضرورت سے زیادہ گہرے اور تیز نہ ہوتے اور وہ مناسب ماحول اور ہاتھوں میں پرورش پاتا تو اس باذل سے مختلف ایک شاندار جوان بھی ہو سکتا تھا لیکن وہ نہیں تھا کہ اس کی رگوں میں تاجور بائی کا خون دوڑتا تھا اور اپنی مشکوک ولادت نے اس کے اندر غم و غصے کا وہ الاؤ دہکائے رکھا تھا جس نے اس کی شخصیت کو ایک ایسے آتش فشاں پہاڑ کا روپ دے دیا تھا جو وقتاً فوقتاً تھوڑا تھوڑا الاؤ اگلتا رہتا تھا۔ یہ کھولتا ہوا الاؤ ابھی کسی عورت کی عزت کو خاک کر دیتا تھا تو کبھی کسی جیتے جاگتے وجود کو دردناک اذیت دے کر جسم کرڈالتا تھا۔ وہ سراپا تہر تھا اور اس تہر کی زد میں بھی بھی، کوئی بھی آسکتا تھا۔ خود اس کا اپنا آپ بھی۔

اب بھی دشمن کو نیست و نابود کر دینے کی ضد اسے اس حد تک لے آئی تھی کہ وہ غیر یقینی حالات میں بھوکا پیاسا ایک پتھر پر بیٹھا ہانپ رہا تھا اور خود کو سمجھا رہا تھا کہ اگر زندہ رہنا ہے تو ہمت کرو اور ایک بار پھر چلنا شروع کر دو ورنہ جس پتھر پر بیٹھے ہو، اسی پر بیٹھے بیٹھے حنوط ہو جاؤ گے۔ ہانپی ہوئی سانسیں ذرا بجالا ہوئیں تو اس نے خود کو دوبارہ چلنے پر آمادہ کر ہی لیا اور پتھر پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ کھڑے ہوتے ہی اس کی آنکھوں نے ایک ایسا منظر دیکھا کہ رگ و پے میں جوش دوڑنے لگا۔ وہ ایک چھوٹا پہاڑی بکرہ تھا جو جانے کس طرف سے بھٹک کر ادھر آکلا تھا اور کچھ بے چین سا ادھر ادھر گردن کو جنبش دیتا اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ شاید اسے وہ راستہ بھائی نہیں دے رہا تھا جس پر چل کر واپس اپنے ساتھیوں کے درمیان پہنچ جائے۔ اس بے زبان کو معلوم ہی نہیں تھا کہ باذل کی نظروں میں آنے کے بعد اس کے پاس واپسی کا کوئی راستہ ہی نہیں رہا تھا۔

اپنے وجود کو بالکل ساکت کرتے ہوئے اس نے بنا کسی آہٹ کے اپنا پستول نکالا اور دائیں ہاتھ کو دستانے سے آزاد کر کے احتیاط سے نشانہ باندھا۔ ٹریگر پر جی اس کی انگلی نے دو بار جنبش کی اور اگلے ہی لمحے پہاڑی بکرے کا جسم زوردار جھٹکا کھا کر ڈھلان پر پھسلا۔ باذل نے پستول واپس رکھا اور پنڈلی سے بندھا خنجر کھینچ کر تیزی سے تڑپتے پھڑکتے بکرے کی طرف بھاگا۔ فاصلہ مختصر تھا۔ اس نے بکرے کے گلے پر چھری پھیر کر اس کی مشکل آسان کی اور تیزی سے کھال اتار کر کچھ گوشت الگ کیا۔ اب وہ اسٹود جلائے اس پر گوشت کے پارچوں کو بھون رہا تھا۔ گوشت بھونے جانے کی خوشبو نے اس کی بھوک سے بے چین آنتوں کو مزید بے چین کر دیا تھا۔ بھوک کی زیادتی اور ایندھن کی کمی نے اسے زیادہ دیر گوشت کو بھوننے کی اجازت نہیں دی اور جلدی جلدی کچا کچا گوشت دانتوں سے نوچنے لگا۔ کئی گھنٹوں بعد میسر آنے والی یہ خوراک جو کہ مریج مسالوں سے محروم تھی، اس کے لیے اعلیٰ ترین ریسٹورانوں میں کھائے جانے والے کھانوں سے زیادہ عمدہ تھی۔ وہ گوشت کا شوقین تھا اور شدید ترین بھوک میں تازہ اور مغفرد ذائقے کا گوشت میسر آ جانے پر خوشی سے جھوم اٹھا تھا۔ وہ جب سے اس برف زار میں موجود تھا، رک سیک میں موجود بیٹھے چنوں، خشک میوہ جات اور چاکلیٹس کے علاوہ کسی چومنی شے کا ذائقہ چکھنا نصیب نہیں ہوا تھا۔ اب اپنے ذوق کے مطابق خوراک میسر آئی تھی تو جی بھر کر اسے اپنے شکم میں اتار رہا تھا۔ شکم سیری کے بعد اس نے برف سے ہی اپنی پیاس بجھائی اور پھر بکرے پر سے مزید گوشت کے پارچے اتارنے لگا۔ پورے کا پورا گوشت ساتھ لے جانا ممکن نہیں تھا اس لیے اس نے باقی رہ جانے والے راستے کی مناسبت سے گوشت کے ٹکڑے کاٹ کر پلاسٹک کی ان خالی تھیلیوں میں منتقل کیے جن میں محفوظ خوراک وہ کب کی اپنے معدے میں اتار چکا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ ایک بار پھر سفر کے لیے تیار تھا۔ بھرے پیٹ کی آسودگی نے اس دشوار سفر کی کوفت کو قدرے کم کر دیا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ کچھ روز قبل پاکستان سے روانہ ہوتے وقت اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایسی کسی جگہ پہنچ جائے گا۔

وہ تو وہی کے پیچھے پیچھے حیدر آباد پہنچا تھا۔ اسے اس کام پر لگانے والوں نے ہی اطلاع دی تھی کہ وہی کہاں موجود ہے۔ وہ بتائے ہوئے مقام پر پہنچ کر اپنا لائحہ عمل طے کر ہی رہا تھا کہ اسے حکم دیا گیا کہ وہاں جو ہو رہا ہے، وہ

ہونے دے اور ایک فون نمبر پر رابطہ کرنے کے بعد وہاں سے ملنے والی ہدایات پر من و عن عمل کرے۔ اس نے ایسا ہی کیا تھا اور نتیجتاً اس گاڑی میں سوار ہو گیا تھا جو قیدیوں کو لے کر کسی نامعلوم ٹھکانے کی طرف جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ اس سفر میں قیدیوں کے علاوہ تین مزید افراد شامل تھے۔ ان میں سے دو باری باری ڈرائیونگ کرتے تھے جبکہ ایک بے ہوش قیدیوں کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ وہ تینوں اس سے لیے دیے سے رہتے تھے لیکن ان کی آپس کی گفتگو سے اسے چند باتیں معلوم ہوئی تھیں۔ وہ جان گیا تھا کہ انہیں کسی سرد مقام تک پہنچنا ہے اور اس سرد مقام تک پہنچنے سے پہلے انہوں نے راستے میں گرم کپڑوں اور خشک خوراک کی خریداری بھی کی تھی۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ گاڑی بس ایک مخصوص مقام تک جائے گی جہاں کچھ لوگ اسے اور قیدیوں کو وصول کرنے کے لیے موجود ہوں گے۔ باقی لوگوں کو اسی مقام سے واپس لوٹ جانا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ جہاں اسے لے جایا جا رہا ہے، وہاں اس کے ذمے کیا کام ہوگا لیکن وہ بے چون و چرا وہاں تک جانے کے لیے تیار ہو گیا تھا کہ ایک نو اسے میڈم ایکس کو ناراض کرنا منظور نہیں تھا، دوسرے وہ سارے لوگ جو آج کل دشمنوں کی فہرست میں سب سے اوپر تھے، وہیں لے جائے جا رہے تھے اور اسے امید تھی کہ اسے ان سے نمینے کا بھرپور موقع ملے گا۔

اس کی سوچ جو بھی تھی، قدرت نے اس سے ہٹ کر منصوبہ بندی کر رکھی تھی۔ ڈرائیور تجربہ کار تھا اور اس کا ان علاقوں میں یہ کوئی پہلا سفر نہیں تھا پھر بھی جانے کیا ہوا کہ حادثہ پیش آ گیا۔ حادثے کے وقت وہ بالکل دروازے کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ دروازہ جھٹکے سے کھلا تو وہ توازن قائم نہ رکھتے ہوئے باہر جا گرا۔ گرنے سے اسے چوٹیں تو آئیں لیکن یہ گرنے ہی اس کی زندگی بچا گیا۔ وہ جب تک سنبھلتا اور الٹی ہوئی گاڑی کے قریب پہنچتا، وہاں بھکشو آگئے تھے۔ وہ فوری طور پر ان کے سامنے جانے کے بجائے ایک جگہ جمپا ان کی کارروائی دیکھتا رہا۔ انہوں نے اس کے سامنے گاڑی سے زخمیوں اور لاشوں کو نکالا پھر زخمیوں کو طبی امداد دینے لگے۔ ہاڈل کو خود بھی مرہم پٹی کی ضرورت تھی لیکن وہ ان کے سامنے جانے سے جھبک رہا تھا کہ وہ اس سے قیدیوں کی بابت سوال جواب کرتے۔ اس کے آزاد ہونے سے یہ بات تو بالکل واضح تھی کہ وہ قیدیوں کے بجائے ان کا ساتھی ہے جو قیدیوں کو لے کر جا رہے تھے۔

اسی شش و پنج میں کچھ لمحے مزید سرک گئے۔ حادثہ

جس مقام پر پیش آیا تھا وہ کوئی عام گزرگاہ نہیں تھی کہ کسی اور کے آنے کا امکان ہوتا۔ وہ بھکشو بھی جانے کیوں موجود تھے اور ان کے انداز و اطوار دیکھ کر اسے یہ نہیں لگ رہا تھا کہ وہ ان سیدھے سادھے بھکشوؤں کی طرح ہیں جو تارک الدنیا ہو کر اپنی تپسیا میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اس کے سامنے جو لوگ موجود تھے، ان کی حرکات و سکنات میں ایک طرح کی ہوشیاری اور تیزی و طراری تھی۔ سونیا کو طبی امداد دینے والا بھکشو اس کے گلے میں موجود زنجیر اتار کر تیز لہجے اور آواز میں اپنے ساتھیوں کو پکارنے لگا تو صورت حال میں تیزی سے تغیر آیا۔ وہ فاصلے پر ہونے کے باوجود زنجیر میں جھولتا سنہری ستارہ دیکھ سکتا تھا اور اس نے یہ بھی دیکھا تھا کہ اس سنہری ستارے کو دیکھ کر بھکشوؤں کے رویے میں عجیب سی تبدیلی آگئی تھی۔ وہ کچھ دیر کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ تیز تیز لہجے میں بولتے رہے تھے اور پھر گویا ان کے درمیان وہاں سے کوچ کر جانے کا فیصلہ ہو گیا تھا۔ باڈل کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ اکیلے نہیں جا رہے تھے بلکہ قیدیوں کو بھی انہوں نے اپنے ساتھ لے لیا تھا اور انہیں اپنے خچروں پر لادے تیزی سے وہاں سے روانہ ہو گئے تھے۔

ان کے روانہ ہونے کے بعد باڈل جائے حادثہ پر پہنچا اور وہ سارا سامان نکال لیا جس کی اسے اس بر فانی علاقے میں ضرورت پڑ سکتی تھی۔ بھکشوؤں کے مشکوک رویے نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ ان کا تعاقب کرے۔ بھکشوؤں کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ جلد از جلد سفر طے کر لینا چاہتے ہیں لیکن بے ہوش قیدیوں کی وجہ سے ان کے لیے اپنی رفتار تیز رکھنا ممکن نہیں تھا۔ ان کی یہ مجبوری اس کے لیے مددگار ثابت ہوئی تھی۔ وہ جسمانی طور پر چاق و چوبند اور مضبوط تو تھا لیکن ایسے راستوں پر سفر کرنے کا تجربہ نہیں رکھتا تھا اس لیے اس کی رفتار اتنی تیز نہیں تھی۔

بہر حال جیسے ہی وہ ان کا چھپا کرتے ہوئے اس مقام پر پہنچ گیا تھا جہاں ان بھکشوؤں نے اپنا ٹھکانا بنا رکھا تھا۔ پہلے اس نے سوچا کہ رات کے وقت وہاں کس کران کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرے گا لیکن ان کے پاس جدید اسلحے کی موجودگی اور مستقل پھریداری نے اسے اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کر دیا۔ خوش قسمتی سے حادثے میں اس کا موبائل محفوظ رہا تھا۔ اس نے موبائل کی چار جنگ بچانے کے لیے زیادہ تر اسے بند رکھا تھا۔ اس لیے وہ استعمال کے قابل تھا۔ واپسی کے سفر میں وہ مختلف مقامات پر رک رک کر تمام اہم نشانیوں کی ویڈیو بناتا

رہا تھا تاکہ دوبارہ جب اس طرف آنا ہو تو بھٹکنے کے امکانات نہ رہیں۔ اگر اس علاقے میں نیٹ ورک دستیاب ہوتا تو ان سب کی ضرورت ہی نہ پڑتی اور وہ پہلی فرصت میں اپنے مددگاروں سے رابطہ کر لیتا لیکن اب اسے جو کچھ کرنا تھا، خود ہی کرنا تھا۔

اگرچہ اس کی زندگی ابتدا ہی سے ہنگاموں سے پُر رہی تھی لیکن اتنے سخت وقت سے وہ پہلی بار گزرا تھا کہ نہ کوئی مددگار آس پاس تھا، نہ سفر کی مناسب سہولیات۔ سو بے ہوئے زخمی پیروں کے ساتھ خالی پیٹ ایک برف زار میں چلتے چلتے جانے کا تجربہ وہ یقیناً ساری زندگی نہیں بھول سکتا تھا اور کئی گھنٹے بھوکے رہنے کے بعد پیٹ بھرنے کی آسودگی کا نشہ بھی اس نے پہلی بار محسوس کیا تھا۔ اس نشے میں مست وہ آگے بڑھتا جا رہا تھا کہ ایک زوردار لٹکارنے ٹھٹھکنے پر مجبور کر دیا۔

”اسٹاپ!“ بلند آواز میں بکار کرنے صرف اسے رکنے کا حکم دیا گیا تھا بلکہ تنبیہا ایک گولی بھی چلا دی گئی تھی جو اس کے کان کے پاس سے سرسراہتی ہوئی گزرنی لگی۔

”ہینڈز اپ!“ رک جانے پر دوسرا حکم بھی فوراً ہی صادر ہو گیا۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ اسے جدید اسلحے سے لیس چار افراد نے گھیر رکھا ہے۔ وہ ایک ہاسل اور خنجر کے زور پر تنہا اس کھلی جگہ پر ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا چنانچہ بے چوں د چرا۔۔۔ اپنا بیگ نیچے رکھ کر دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ ان میں سے ایک اس کے قریب آیا اور اس کی جامہ تلاشی لینے لگا۔ جلد ہی وہ اس کا ہاسل اور خنجر اپنے قبضے میں لے چکا تھا۔ ”کون ہو تم؟“ نقش و نگار اور رنگت سے اس کی قومیت کا اندازہ لگا کر اس کی زبان میں سوال کیا گیا۔

”سیاح ہوں۔ پہاڑوں اور برف زاروں سے عشق کرتا ہوں اس لیے ان کے درمیان مارا مارا پھرتا ہوں۔“ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

”سیاح..... یہاں اور وہ بھی بالکل تنہا؟“ ”کوہ لوردی کا اصل مزہ تنہائی میں ہی ہے۔ میں کسی کو ساتھ رکھ کر خود کو ڈسٹرب کرنا پسند نہیں کرتا اس لیے ہمیشہ تنہا ہی سفر کرتا ہوں۔“ باذل کا انداز بڑا بے نیازانہ تھا۔

”لیکن یہ بہت خطرناک ہے۔ تمہیں کوئی حادثہ پیش آ گیا تو کوئی تمہاری ہیلپ کرنے والا بھی نہیں ہوگا۔“ اس سے گفتگو کرنے والا گفتگو کرتا جا رہا تھا جبکہ وہ شخص جس نے اس کی جامہ تلاشی لی تھی، اب اس کے رک سیک کی تلاشی لے رہا تھا۔

”میں ان پہاڑوں میں سر کر اگر اس کی برف کے نیچے دفن ہو گیا تو اسے اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا۔ مرنے کے بعد بھی اپنی پسندیدہ جگہ پر رہنے سے بڑی خوش قسمتی بھلا کیا ہو سکتی ہے۔“ وہ یوں ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا جیسے اس سے بڑھ کر کوئی پہاڑوں کا عاشق نہ ہو۔ عاشق بھی ایسا جسے اس کے عشق نے دیوانگی کی حد تک پہنچا دیا ہو۔

”تمہارا پاسپورٹ اور دوسرے شناختی کاغذات کہاں ہیں؟“ رک سیک کی تلاشی لینے والے نے اپنا کام ختم کر لیا تھا اور یہ سوال اسی کی جانب سے آیا تھا۔ وہ بہت جانچتی نظروں سے باذل کا جائزہ لے رہا تھا۔

”میرا چھوٹا بیگ جو بیٹل کے ساتھ کمر سے بندھا تھا، ایک کھائی کو پار کرتے ہوئے کھائی میں جا گرا تھا۔ میرے سارے اہم ڈاکیومنٹس اور کرنسی اسی بیگ میں تھے اس لیے اب میں وہ سب کچھ کھو چکا ہوں۔“ وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جھوٹ بولنے کی صلاحیت رکھتا تھا اور اس وقت بھی پوری ڈھٹائی سے یہ کام کر رہا تھا۔

”کس کنٹری سے ہو؟“ پہلے والے نے اس سے پوچھا۔ ”انڈیا۔“ غیر ملکوں کے لیے انڈوپاک کے شہریوں کو الگ الگ شناخت کرنا مشکل ہوتا ہے لیکن ان دو ممالک کے لوگ بہ خوبی ایک دوسرے کو الگ الگ شناخت کر لیتے ہیں۔ اس نے بھی ان دو افراد کے لب و لہجے سے ان کی قومیت کا درست اندازہ لگا لیا تھا اس لیے خود کو ان کا ہم وطن ظاہر کرنے میں ہی بھلائی سمجھی۔

”انڈیا میں کہاں سے؟“ ”تم لوگ اس کا انٹرویو ہی کرتے رہو گے یا کوئی کام کی بات بھی معلوم کرو گے؟“ باذل جواب میں کچھ کہتا، اس سے قبل ہی ایک تیسرے شخص نے گفتگو میں دخل دیا اور بیزاری سے اپنے ساتھیوں کو ٹوکا۔

”کام کا سوال تم کر لو۔ ہمیں تو یہ کچھ مشکوک لگ رہا ہے اس لیے اس کے بارے میں پوری جانکاری حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ جامہ تلاشی لینے والے نے ذرا سا برامان کر اپنے اس ساتھی کو جواب دیا۔

”اس کو بعد میں ٹھوک بجا کر دیکھ لیتا۔ ابھی تو اس سے پوچھو کہ اس نے کہیں چھپنی بکشتوں کو دیکھا ہے یا نہیں؟“ اس شخص کی زبان سے نکلنے والے سوال نے باذل کو چو نکا دیا۔

’لگتا ہے ہمیں یہاں بھجوانے والوں کو حادثے کا علم ہو گیا ہے اور انہوں نے ہماری کھوج میں بندے لگا دیے

ہیں۔ ان لوگوں کو بھکشوؤں سے متعلق کوئی کلیوٹا ہوگا جب ہی انہیں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ دل میں آنے والے اس خوش کن خیال نے ان لوگوں کی طرف سے اس کے شکوک کم کر دیے اور کسی کے سوال کیے بغیر خود ہی بول پڑا۔

”میں نے چینی بھکشوؤں کو دیکھا تھا۔ وہ تعداد میں اچھے خاصے تھے اور لدے ہوئے خجروں کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔“

”ان کے خجروں پر کیا لدا ہوا تھا؟“ فوراً ہی بے چینی سے سوال ہوا لیکن باذل نے فوراً جواب نہیں دیا اور چہرے پر ایسے تاثرات سجالیے جیسے جواب دینے میں شش و پنج کا شکار ہو۔

”تم نے بتایا نہیں کہ ان کے خجروں پر کیا لدا ہوا تھا؟“ اس بار ذرا سخت لہجے میں سوال دہرایا گیا۔

”میں ٹھیک سے دیکھ نہیں سکا۔ کیا ہے نا کہ انہوں نے خجروں کی پیٹھ کو بڑی بڑی چادروں سے ڈھانپ رکھا تھا۔ چادروں کے نیچے کیا ہے، دکھائی ہی نہیں پڑتا تھا، پرنتو.....“ اس نے ایک بار پھر زبان روک لی۔ اس طرح وہ ان کے تجسس کو ہوا دے رہا تھا۔

”پرنتو کیا.....؟ جو ہے صاف بول۔“

”میں نے ایک چادر کے نیچے جھولنے والے بال دیکھے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے..... جیسے خچر کے اوپر کوئی جوان مہیلا لدی ہو۔“ اس نے ڈرنے، جھجکنے کی شاندار اداکاری کرتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔

”کس طرف جاتے دیکھا تم نے ان لوگوں کو؟“

دیے گئے جواب نے سوال کرنے والوں کا جوش و خروش بڑھا دیا۔

”اگر تم لوگ مجھ پر دوش اس کرو اور بتاؤ کہ تم ان لوگوں کو کیوں کھوج رہے ہو تو شاید میں تمہیں زیادہ اچھی طرح سے گائیڈ کر سکوں۔“ اس بار اس نے تھوڑا مکمل کر بات کرنے کا فیصلہ کیا تا کہ تصدیق ہو سکے کہ یہ وہی لوگ ہیں جو وہ سمجھ رہا ہے۔

”شرطیں رکھتا ہے سالہ۔“ اس کے مطالبے نے جامہ تلاشی لینے والے کو آگے سے باہر کر دیا اور وہ اسے مارنے کے لیے لپکا۔ اس کے ایک ساگھی نے درمیان میں آکر مشکل اسے قابو کیا۔

”آپ لوگ مجھے غلط مت سمجھو۔ ہم ایک ہی دیش کے رہنے والے ہیں اور اپنے دیش سے پریم کرتے ہیں۔ میری بس اتنی اچھا ہے کہ میں اس بارے میں بس انہیں

بتاؤں جن کا ادھکار ہے۔“ باذل بڑے سلجھے ہوئے لہجے میں اپنا موقف پیش کر رہا تھا۔

”تیری اچھا کی ایسی کی تیری۔ اگر ہم نکلوانے پر آئے تو تیرے حلق میں ہاتھ ڈال کر ساری انفارمیشن نکلوالیں گے۔“ اس پر حملہ آور ہونے والے کو اگرچہ اس کا ساتھی پیچھے دھکیل چکا تھا لیکن اس کا غیظ و غضب اب بھی تھا نہیں تھا اور اب بھی خونخوار لہجے میں دھمکی دے رہا تھا۔

”تم چپ کرو شری! یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ پہلے ہمیں اپنے بارے میں اس کی تسلی کروانی چاہیے۔“ چوتھا ساتھی جواب تک خاموش رہا تھا، گفتگو میں دخل انداز ہوا اور اپنے جوشیلے ساتھی کو ڈانٹنے کے بعد باذل کی طرف متوجہ ہو کر نرم لہجے میں بولا۔

”بات کیوں اتنی ہے کہ ہمارے ساتھی ایک گاڑی میں کچھ کھاس (خاص) لوگوں کو لے کر ہم تک آرہے تھے کہ ان کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ ہمیں اس ایکسیڈنٹ کا پتا کافی سے گزرنے کے بعد تب ہوا جب طے شدہ ٹائم گزرنے کے کئی گھنٹے بعد بھی وہ لوگ ہم تک نہیں پہنچے اور ہمیں ان کی کھوج میں نکلنا پڑا۔ ایکسیڈنٹ کی جگہ پر ہمیں کیوں اپنے تین ساتھیوں کی لاشیں ملیں تو خود بخود دماغ میں ہلچل مچ گئی کہ باقی لوگ کدھر گئے۔ تھوڑی بھاگ دوڑ کے بعد جانکاری ملی کہ چینی بھکشوؤں کا ایک گروپ اپنے گروے ملنے ہماری سائڈ آیا ہوا تھا۔ یہ جگہ ایسی ہے کہ ہر طرف سرکار کی عملداری نہیں ہے اور بھکشوؤں اور کچھ دوسرے لوگوں کو ایسے راستوں کی جانکاری ہے جہاں سے چوری چھپے آنا جانا لگا رہتا ہے۔ ہمیں بھکشوؤں کی ادھر موجودگی کا پتا چلا تو ہم سمجھ گئے کہ وہ ہی ہیں جو ہمارے ساتھیوں کو اٹھا کر لے جاسکتے ہیں۔ بس اسی لیے ہم ان کی کھوج میں لگے ہوئے ہیں۔“ اس کی بات کے اختتام تک باذل کا چہرہ خوشی سے مکمل چکا تھا۔ جیسے ہی وہ چپ ہوا، خود چپک کر بولا۔

”بدھائی ہو، جن ساتھیوں کی کھوج میں آپ نکلے تھے، میں ان ہی میں سے ایک ہوں اور جانتا ہوں کہ ہمارے قیدیوں کو چینی بھکشو ہی اٹھا کر لے گئے ہیں۔ میں نے اپنی جان پر کھیل کر ان بھکشوؤں کا چچا کیا تھا اور ان کا ٹھکانا دیکھنے کے بعد مدد لینے ہی واپس آ رہا تھا۔“ یہ یقین ہو جانے کے بعد کہ یہ وہی لوگ ہیں جن تک اسے پہنچنا تھا، اس نے مکمل کر سب بتا دیا۔

”ٹھیک ہے۔ تو پھر تم ہمیں ترنت ان کے ٹھکانے پر لے چلو تا کہ ہم انہیں ان کی اس حرکت کا مزہ چکھا سکیں۔“

جو شیلہ بندہ ایک بار پھر جوش میں آ گیا۔

”نہیں دوست!“ باذل نے نفی میں گردن ہلائی۔

”میری حالت اتنی کھراب (خراب) ہے کہ میں ترنت اتنا لمبا سفر دوبارہ نہیں کر سکتا۔ اس سفر کے لیے مجھے تھوڑے سے آرام اور علاج کی ضرورت ہے اور تم لوگوں کو تیاری کی۔ ان بھکشوؤں نے بہت محفوظ جگہ اپنا ٹھکانا بنا رکھا ہے اور وہاں پہریداری بھی سخت ہے۔ میں ان کے پاس جتنا ایڈوائس و چین دیکھ کر آیا ہوں، مجھے دشواری ہی نہیں ہو رہی ہے کہ وہ کوئی بھکشو ہیں۔“

”تو کیوں بہانے بازی کر رہا ہے۔“ جو شیلے صاحب کو ایک بار پھر غصہ آنے لگا۔

”دھیرج شری! ہمیں اس کی بات سمجھنا چاہیے۔ آؤ، اسے لے کر اپنے ٹھکانے پر چلتے ہیں۔ وہاں سے اوپر والوں سے بات کریں گے اور پھر وہ جو فیصلہ سنائیں، ہمیں وہی کرنا ہوگا۔“

”بالکل ٹھیک۔ پہلے اوپر پورٹ کرنا ضروری ہے۔“ باری باری سب ہی سمجھانے لگے تو شری نامی بندے کو بادل ناخواستہ ہتھیار ڈالنے ہی پڑے لیکن وہ خوش نظر نہیں آ رہا تھا۔ باذل کو اس کی خوشی یا ناخوشی سے کوئی غرض نہیں تھی۔ اس وقت تو وہ اس بات پر خوش تھا کہ کئی دنوں کی خواری کے بعد کوئی ایسا ٹھکانا ملنے جا رہا ہے جہاں وہ اپنے تھکے ہوئے جسم کو آرام دینے کے ساتھ ساتھ ڈھنگ کی خوراک کھا سکے گا۔ اپنی اس خوشی میں اس نے اس بات کو بھی نظر انداز کر دیا تھا کہ ان لوگوں نے اسے اپنا سا بھی تسلیم کر لینے کے باوجود اس کا پٹل اور خنجر واپس نہیں کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ سب کچھ زیادہ عرصے اس طرح نہیں رہے گا۔

☆☆☆

سیاہ شیشوں والی گاڑی نے سڑک چھوڑ کر کثیر المنزلہ عمارت کی زیریں منزل پر قائم پارکنگ کی طرف ریٹنا شروع کیا تو قریب ہی بیٹھا ایک فقیر پھرتی سے اٹھ کر گاڑی کی طرف بھاگا۔ وہ کئی گھنٹوں سے وہاں بیٹھا تھا اور عقبی حصے سے پارکنگ میں آنے اور جانے والی ہر گاڑی کو دیکھ کر ایسے ہی دوڑ لگاتا تھا۔ اس کی اس تنگ و دو کے نتیجے میں ابھی تک ایک آدمہ ہی گاڑی والے نے رکنے اور خیرات میں کوئی چھوٹا لوٹ دینے کی زحمت کی تھی لیکن وہ پوری دلجمعی سے اپنے کام پر ڈٹا ہوا تھا۔ بالکل اس تاجر کی طرح جسے یقین ہو کہ شروع میں مندی سہی، بالآخر ایک دن کاروبار جم ہی جائے گا۔ ویسے ایک طرح سے دیکھا جاتا تو فقیر نے اپنے دھندے کے لیے کوئی معقول جگہ منتخب نہیں کی تھی۔

سانے کے مقابلے میں پارکنگ کے عقبی حصے میں گاڑیوں کی آمد و رفت بہت کم تھی اور اس کی صدا پر رکنے والوں کا تناسب تو اس سے بھی بے حد کم۔

سیاہ شیشوں والی گاڑی بھی دیگر بہت سی گاڑیوں کی طرح اس کی صدا پر نہیں رکی اور سیدھی پارکنگ ایریا میں داخل ہو گئی۔ گاڑی والے کی اس حرکت پر فقیر نے دایاں ہاتھ اٹھا کر پیچھے سے لعنت کا اشارہ کیا پھر یوں کمر پر ہاتھ جما کر باہر کھڑا کھڑا ہی پارکنگ کے اندر جھانکنے لگا جیسے دیکھنا چاہتا ہو کہ اسے بھیک نہ دینے والا کنجوس اور بد اخلاق شخص کون ہے؟ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے پہلے گاڑی سے ایک باوردی شوگر باہر نکلا جس نے پھرتی سے پچھلا دروازہ کھولا۔ نکلتے دروازے سے ایک غیر ملکی عورت چھوٹے بچے کو گود میں لیے باہر نکلی۔ عورت غیر ملکی ہونے کے باوجود اس حلیے پر پوری نہیں اتر رہی تھی جو اسے ذہن نشین کروایا گیا تھا پھر بھی وہ دلچسپی سے اسے اور اس کی گود میں موجود بچے کو دیکھتا رہا۔ بچہ نیند میں تھا اور اس کا سر عورت کے شانے پر ٹکا ہوا تھا۔ عورت اتر کر ایک خاص سمت میں بڑھنا شروع ہوئی تو فقیر کو احساس ہوا کہ بے شک وہ اس کی مطلوبہ عورت نہیں ہے لیکن کوئی اہم عورت ضرور ہے جو اس مخصوص لفٹ کی طرف بڑھتی جا رہی ہے جس پر نظر رکھنے کی ہدایت بھی دیگر ہدایات میں شامل تھی۔ اس نے جلدی سے اپنے کسکول کے اندر ہاتھ ڈال کر انگلیوں کو جنبش دی اور کسکول کو تھوڑا سا اوپر کر کے ایسے زاویے سے ترچھا کیا کہ اس کے پیندے کا رخ پارکنگ کی لفٹ کی طرف بڑھتی عورت کی جانب ہو گیا۔ سیاہ پیندے میں موجود چھوٹا سا سوراخ کسی کی نظر میں نہیں آ سکتا تھا۔ آج بھی جاتا تو کس کو غرض پڑی تھی کہ اس کے کسکول کے پیندے میں موجود سوراخ پر توجہ دیتا۔ یہ سوراخ یونہی نہیں تھا۔ اس سوراخ کے ساتھ اس جدید موبائل کے کیمرے کا لینس چپکا ہوا تھا جسے بڑی مہارت سے کسکول میں فٹ کیا گیا تھا اور اوپر گہرے سیاہ رنگ کا کپڑا اس انداز سے لگایا گیا تھا کہ موبائل اس کے نیچے چھپ گیا تھا۔ صرف فقیر ہی جانتا تھا کہ کس جگہ انگلیاں ڈال کر وہ کپڑے کو سیننے اور موبائل استعمال کرنے کے لائق ہو سکتا ہے۔ اس وقت اس نے یہی کام کیا لیکن اس کی پھرتی کے باوجود عورت کے چہرے کی تصویر کھینچنا ممکن نہیں تھا۔ وہ لفٹ کی طرف بڑھ رہی تھی اور فقیر کی طرف اس کی پشت تھی۔ پشت پر سے کھینچی گئی تصویر میں عورت کا چہرہ تو نہ آ سکا لیکن اس کے شانے سے لگے بچے کا چہرہ بہت عمدگی سے کیمرے کی آنکھ نے قید کر لیا۔ تصویر زوم

کر کے کھینچی مٹی تھی اس لیے فاصلے کے باوجود زلزلہ عمدہ تھا۔ اس نے اس اکلوتی تصویر پر اکتفا کرتے ہوئے کشکول نیچے کیا تو شوگر بھی گاڑی کی ڈنکی میں رکھے سامان کو نکال کر فارغ ہو چکا تھا۔ عورت کے پیچھے لفٹ کی طرف بڑھنے سے پہلے اس نے ایک تیز اور شک بھری نظر فقیر پر ڈالی۔ فقیر کی جوتی کو بھی اس کی نظر کی فکر نہیں تھی۔ اس نے پوری ڈھٹائی سے اس کی نظر کو سہا اور ہاتھ میں پکڑا کشکول آگے کی طرف کرنے کے ساتھ ساتھ دائیں ہاتھ کی انگلی کو یوں آسمان کی طرف اٹھایا جیسے شوگر کو دھمکی دے رہا ہو کہ اگر اب بھی اس نے اس کے کشکول میں کچھ نہ ڈالا تو ڈائریکٹ اس کی اوپر بھیجی گئی بد دعا کی زد میں آجائے گا۔ شوگر نے اس کی دھمکی کو خاطر میں لائے بغیر گردن موڑی اور اس لفٹ کی طرف بڑھ گیا جس کے کھلے ہوئے دروازے سے عورت اس کی جانب منتظر نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”اے ہٹ یہاں سے۔“ پارکنگ کے داخلی راستے پر ڈیوٹی دینے والا گارڈ جو شاید کسی ضرورت کے تحت کچھ دیر کے لیے وہاں سے ہٹ گیا تھا، ایک سمت سے نمودار ہوا اور فقیر کو دھتکارا۔

”بڑی ڈھیٹ قوم ہے یہ بھی۔ کتنی بار سارے کو دھتکار چکا ہوں پھر بھی ہر تھوڑی دیر بعد آکر کھڑا ہو جاتا ہے۔ لگتا ہے انتظامیہ کو کمپلین کرنا پڑے گی اس کی۔“ گارڈ بلند آواز میں بڑبڑایا لیکن فقیر نے اس کی بڑبڑاہٹ کا کوئی اثر نہیں لیا اور پلٹ کر اس مخصوص جگہ جا بیٹھا جہاں اس نے ڈیرا جمایا ہوا تھا۔

اب وہ اپنے کشکول پر چہرہ جھکائے بیٹھامنہ ہی منہ میں بڑبڑاتا تھا۔ کم از کم دور سے دیکھنے والوں کو یہی گمان ہوتا کہ وہ دیوانگی میں ایسا کر رہا ہے لیکن درحقیقت وہ ایک وائس میسج ریکارڈ کر رہا تھا۔ میسج مکمل ہونے کے بعد اس نے کچھ دیر قبل کھینچی گئی تصویر کے ساتھ اسے دو نمبروں پر بھیج دیا۔ ایک نمبر اصغر اور دوسرا پرویز کا تھا۔ پرویز کا جواب فوراً آیا۔

”تو اب وہاں سے ہٹ جا۔ تیری جگہ میں نورے کو ڈیوٹی پر بھجوا رہا ہوں۔“ اس نے سر کے لمبے بالوں میں پوشیدہ کان سے لگی بلیو ٹوٹھ میں یہ پیغام سنا اور ذرا سے توقف کے بعد اپنی جگہ چھوڑ دی۔ جاتے جاتے اسے وہ چھابڑی والا دکھائی دے گیا تھا جس کے کندھوں پر جمی لکڑی کے ساتھ دونوں جانب چھابڑیاں لٹکی ہوئی تھیں۔ ان چھابڑیوں میں بیٹھے ہوئے چنے بھرے تھے۔ چنوں کی گرماہٹ اور خشکی کو قائم رکھنے کے لیے ان کے درمیان رکھی گڑوی میں کوئلے سلگ رہے تھے۔

”چنا گرم.....“ چھابڑی والے نے اس کے قریب سے گزرتے ہوئے کراری آواز میں کہا تو وہ زیر لب مسکرا کر رہ گیا۔ وہ اگر کامیابی سے پیشہ ور فقیر ہونے کی اداکاری کرتا رہا تھا تو نورے نے بھی اپنا کردار نبھانے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی۔ اس جگہ سے دور نکل کر اس نے پرویز کو رپورٹ دی۔

”ٹھیک ہے۔ ابھی تو آرام کر۔ جب ضرورت پڑی، میں تجھے کال کر لوں گا۔“ پرویز نے اسے جواب دیا اور ایک بار پھر اپنے موبائل کی اسکرین پر اس کی بھیجی گئی تصویر دیکھنے لگا۔ تصویر میں عورت کی صرف پشت دکھائی دے رہی تھی لیکن بچے کا چہرہ نمایاں تھا۔ گہری نیند سویا ہوا بچہ چہرے مہرے سے ہی کسی اچھے گھرانے کا لگتا تھا لیکن یہ طے تھا کہ وہ مقامی ہے۔ کسی مقامی بچے کا ایک غیر ملکی عورت کے ساتھ میڈم ایکس کے دفتر میں جانا اس کے لیے نہیں پڑتا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ ساری مصلحتوں کو بھول کر ابھی وہ جادو کی ڈیبا میڈم کے دفتر کی طرف فائر کرے جس کی مدد سے وہ وہاں ہونے والی گفتگو بہ خوبی سن سکتا تھا۔ گفتگو سن کر یہ عقدہ حل ہو سکتا تھا کہ بچہ کون ہے اور وہاں کیوں لایا گیا ہے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اصغر نے آدھی رات سے قبل اس کام سے بچنے سے منع کیا تھا۔ بے چینی نے اسے اصغر کو کال کرنے پر مجبور کر دیا۔

”نہیں، بالکل بھی نہیں۔“ تجھے میں نے آدھی رات کا بولا ہے تو بس آدھی رات کو ہی کام کرنے کا ہے۔“ اصغر نے اس کا مدعا سن کر فوراً انکار کر دیا۔

”پر تب تک تو ہو سکتا ہے وہ لوگ واپس چلے جائیں۔“ پرویز منمنایا۔

”جانے دے واپس۔ تو نے ادھر جو سارے نورے کو بٹھایا ہے، وہ دیکھ کر اس بھوتی کے اجد کو اطلاع کر دے گا۔ اجد کو گاڑی دے کر ادھر پاس میں ایسے ہی تو نہیں بٹھایا ہوا ہے نا۔ سب کھوج لگالے گا کہ گاڑی کس کی ہے اور کدھر گئی ہے بچے کو لے کر۔“ اصغر نے اسے اچھا خاصا جھاڑ دیا۔

”ٹھیک ہے استاد! جیسی تمہاری مرضی۔“ پرویز کو مایوس ہو کر ہتھیار ڈالنا پڑے۔

”میرے کو معلوم ہے تجھ سے فارغ نہیں بیٹھا جا رہا پر یاد رکھنا بھوتی کے، اگر اپنی چل بازی میں کوئی گڑبڑ کی تو الٹا نکادوں گا۔“ اصغر نے اسے دھمکی دینا ضروری سمجھا۔

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نوجوان
کی داستان جو غلط کاروں کے لیے
غضب ناک تھا باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیے



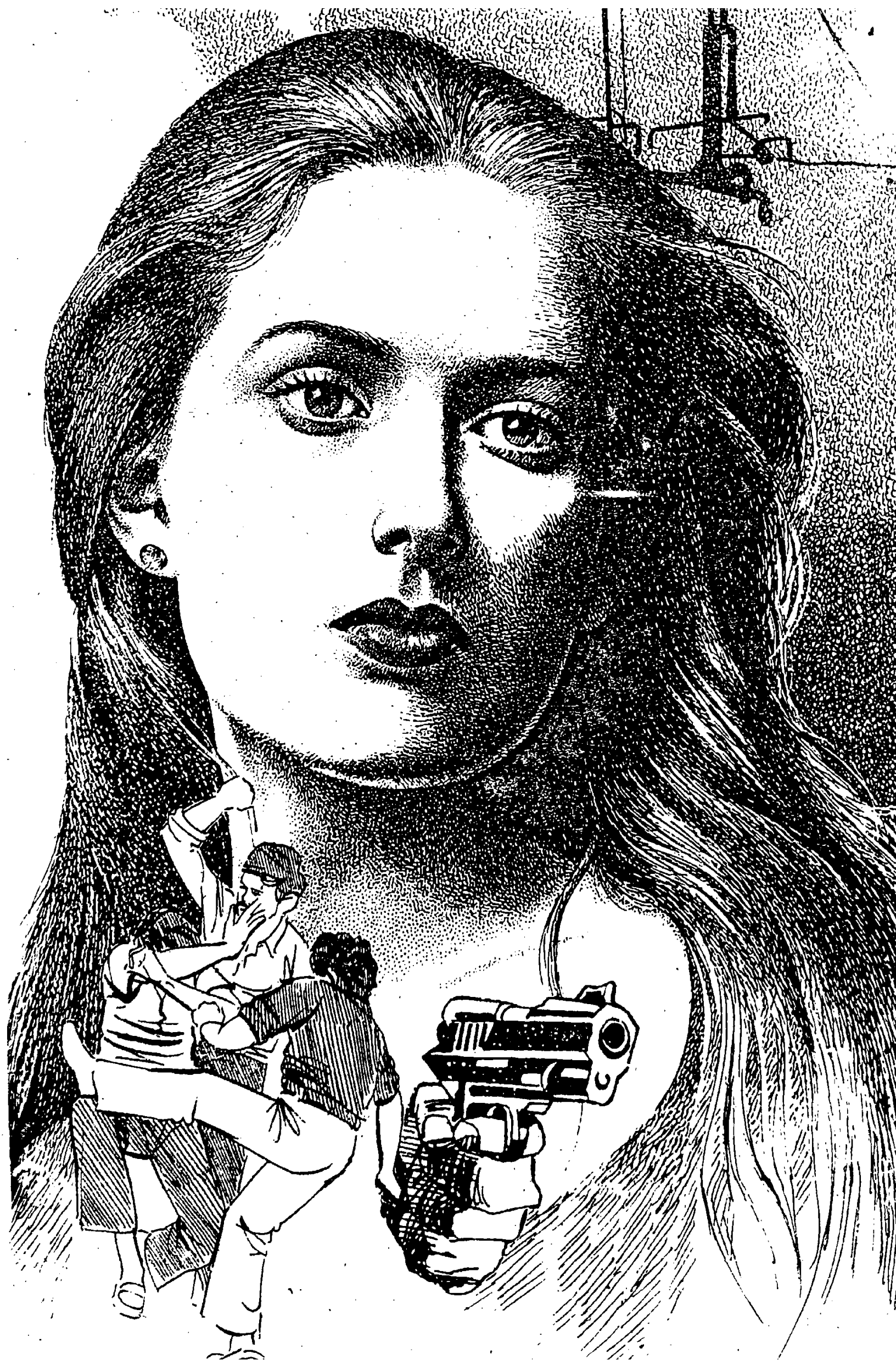
قسط نمبر: 34

شہزادہ زور و جلال

اساتذہ کی

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تندوتیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابل شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پُر عزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جا رہے تھے... اس کی زندگی جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قرار یوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تار عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ وارداتِ قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہو سکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام لو جوان کی تحیر انگیز داستان



گذشتہ اقساط کا خلاصہ

معاذ ایک ذہین لیکن متلون مزاج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جو ان کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ انسٹی ٹیوٹ سے واپس آ رہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو سڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی نڈر فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشری نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بشری ماس کمیونی کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم وغیرہ لکھتی ہے۔ اس ویران جگہ بھی وہ ایک زیر تعمیر رہائشی منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی آئی تھی۔ معاذ بشری کو بہ حفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کر دیتا ہے لیکن جن رئیس زادوں سے اس نے ان کا شکار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ یہ موقع انہیں یونیورسٹی ٹرپ کی صورت میں مل جاتا ہے اور ایک دن جنگل کی سیر کے دوران وہ فوٹو گرافی کے شوق میں سب سے الگ تھلگ ہو جانے والے معاذ کو بے خبری میں گھیر کر بری طرح زد و کوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دے دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس نہ آنے پر انتظامیہ کے افراد پولیس اور ریسکیو ذرائع کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جگہ کی جھوپڑی میں پاتا ہے۔ اپنی حالت سے اسے اپنے شدید زخمی ہونے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ جوگی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ معاذ کا موبائل جنگل میں ہی کہیں گر جاتا ہے اور جوگی کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا جس سے باہر کی دنیا سے رابطہ کیا جاسکے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے، جوگی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نواز کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے پراسرار علم سکھانے کی ہامی بھر لیتا ہے اور معاذ واقعی اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ادھر جائے وقوعہ سے ملنے والے معاذ کے کمرے سے جب تصویریں نکلوا لی جاتی ہیں تو بہت سے قدرتی مناظر کی تصویروں میں سے ایک ایسی تصویر بشری کی نظر میں آ جاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پرنسپل کے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشری تحقیق کر رہی تھی۔ بشری کے اپنے والد جرنلٹ ہوتے ہیں اور حق گوئی ان کے خون میں شامل تھی۔ اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشری کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ صدمے سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باذل نامی شخص نے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشری انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دنوں میں ہی معاذ واپسی کا ارادہ کرتا ہے تاہم ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا عرفان اللہ اور یزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو وقاص نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باذل اچانک بشری کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر دیتا ہے۔ معاذ کو واپس لانے کے لیے اوچھے چھکنڈے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اسے واپس آنے کا پیغام دیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کر کے اسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات لی جاتی ہیں، نہ بتانے پر اس کے بھائی کا ایک گردہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشری بھی انتقام کی آگ میں جلتی ہوئی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہو جاتی ہے۔ معاذ کے دوست عالم شاہ کے بہنوئی کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ کئی فنون میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے پہناؤ کر کے اس کے دماغ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ فیضو سے حاصل انوکھے علم کی بدولت ان کا معمول نہیں جتا۔ عالم شاہ اور اس کا نوکر سرد، باذل کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ عالم کی بہن سبل شاہ کے نو مولود بیٹے کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اغوا کا الزام لطیف سومرو پر آتا ہے۔ عالم شاہ، باذل کی قید میں موجود ایک زخمی شخص کی مدد سے وہاں سے فرار ہو جاتا ہے۔ ادھر بشری دعویٰ پہنچ جاتی ہے۔ وہاں وقاص اسے باربی کے روپ میں پہچان لیتا ہے اور ان دونوں کے درمیان اعتماد کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ وہ سلطان کو مارتا چاہتی ہے تاہم وقاص اسے ایسا کرنے سے روکتا ہے۔ ادھر عالم شاہ، باذل کی قید سے نکل کر اس کا پیچھا کرتا ہے تاہم وہاں اچانک فائرنگ اور دھماکے ہونے لگتے ہیں۔ وہ وہاں معاذ کو دیکھتا ہے۔ صداقت شاہ، لطیف سومرو کو گھیرنے کے لیے اس کی خفیہ بیوی اور بچے کا کھوج لگاتے ہیں اور بچے کو اغوا کر لیتے ہیں۔ لطیف سومرو مجبور ہو جاتا ہے۔ معاذ کو اس کے گھر والوں سے ملنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ عالم شاہ کو اس کے والد انڈیا روانگی کا عندیہ دیتے ہیں۔ ادھر معاذ بھی ایک مشن پر سونیا کے ساتھ انڈیا روانہ ہوتا ہے تاہم کچھ لوگ سکھ یا تریوں سے بھرپور کوریغمال بنا لیتے ہیں۔ معاذ اور سونیا تہ خانے کے تمام افراد کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں تاہم باہر موجود دیگر اغوا کاروں سے مقابلہ ہوتا ہے اور معاذ زخمی ہو جاتا ہے۔ صداقت شاہ کے انڈیا میں موجود رشتے دار کے ہاں شادی ہوتی ہے۔ عالم شاہ، سبل اور سرد انڈیا روانہ ہو جاتے ہیں۔ انڈیا پر گھر روانگی پر راستے میں کچھ لٹیرے انہیں لوٹ لیتے ہیں۔ عالم شاہ ایکشن میں آنا چاہتا ہے تاہم اجالا نامی عالم شاہ کی کزن اس کا راستہ روک لیتی ہے۔ گھر پہنچنے پر پولیس کی ریڈ ہوتی ہے اور وہ عالم شاہ اور سرد کو لے جاتے ہیں۔ ادھر بشری اور وقاص باذل کو اسپتال میں مارنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ ناکام ہو جاتا ہے۔

معاذ اور سونیا پناہ کی تلاش میں ہوتے ہیں اور بالآخر اپنے سہولت کاروں سے مل جاتے ہیں۔ عالم شاہ اور سرمد کو تشدد کا نشانہ بنا کر دیرانے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ واپس اپنے میزبانوں کے ہاں پہنچ جاتے ہیں۔ شادی کے دوران انہیں پتا لگتا ہے کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں اجالا اور اس کا عاشق شامل ہوتے ہیں۔ وہ چھپ کر ان کی باتیں سن رہا ہوتا ہے کہ اسے چھاپ لیا جاتا ہے۔ تاہم وہاں مارا ماری ہوتی ہے اور اجالا کا عاشق مارا جاتا ہے۔ پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ ان کے کزن انہیں اپنے دوسرے خفیہ ہنگامے پر پہنچا دیتے ہیں جہاں کچھ لوگ ان پر حملہ کر دیتے ہیں۔ وہ وہاں سے بحفاظت نکل جاتے ہیں۔ ادھر معاذ کو سونیا اپنے ساتھ نئے مشن پر لے کر جاتی ہے جس میں ایک ریلوے لائن کو دھماکے سے اڑانا ہوتا ہے۔ معاذ ایسا نہیں چاہتا اس لیے وہ ٹرین کی آمد سے قبل بارودی دھماکا کر دیتا ہے۔ وہ زخمی ہو جاتا ہے اور اسے ہندو سادھو اپنی کنیٹھا میں لے جاتا ہے جہاں اس کی اچھی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ سونیا کے آدمی معاذ کو تلاش کرتے ہیں مگر ناکام ہو جاتے ہیں۔ ادھر عالم شاہ اور سرمد خفیہ ذریعے سے بارڈر پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ دھریے جاتے ہیں اور ”را“ کی قید میں پہنچ جاتے ہیں۔ انہیں تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ادھر بشری باڈل کو مارنے کی کوشش میں خود نشانہ بن جاتی ہے۔ معاذ سادھو کی مدد سے ایک انڈین ہیروئن کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ وہیں اسے عالم اور سرمد کی گرفتاری کا پتا چلتا ہے۔ ادھر کل کو اس کا شوہر ذہنی اذیت دیتا ہے۔ معاذ ڈاکٹر فردوس سے ملتا ہے اور اسے سب کی مدد کرنے کا کہتا ہے۔ عالم اور سرمد قید سے فرار کا سوچتے ہیں اور دھریے جاتے ہیں جس کی پاداش میں انہیں مزید تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ علیہ اور وقاص وغیرہ کو لالہ عیسیٰ ملک سے باہر نکال دیتا ہے اور ہر ممکن احتیاط کی ہدایت کرتا ہے لیکن علیہ پاکستان میں ٹوبہ سے رابطہ کرتی ہے جو ان کے لیے مصیبت بن جاتا ہے۔ ٹوبہ پر تیزاب پھینک دیا جاتا ہے۔ وقاص، علیہ اور اس کے گھروالوں کو مار دیا جاتا ہے۔ معاذ سبکدوش نامی شخص کے خلاف کارروائی کرتا ہے تاہم وہ مارا جاتا ہے اور معاذ بھی زخمی ہو جاتا ہے اور اپنا نشان وہاں چھوڑ دیتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس معاذ کو دیوانامی شخص سے مدد لینے کا کہتی ہے۔ معاذ اس کے ساتھ مل کر موہن نامی ”را“ کے ایجنٹ کو اغوا کر لیتا ہے۔ معاذ اپنے کزن کو پاکستان کال کرتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ اس کے گھروالوں کو مار دیا گیا ہے۔ وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کی ٹھان لیتا ہے۔ ادھر ڈاکٹر فردوس کو اس کے سسرال والے محل کو بھگانے کی پاداش میں تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ معاذ، عالم اور سرمد کی رہائی کے لیے کارروائی کرتا ہے اور انہیں ”را“ کی قید سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن عالم اور سرمد کو دیوا کے آدمی کسی دوسری جگہ پہنچا دیتے ہیں۔ سونیا معاذ کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتی ہے اور اسے اپنے تعاون اور مدد کی یقین دہانی کر دیتی ہے۔ ادھر باڈل ایک جگہ لالہ عیسیٰ کی موجودگی پر کارروائی کرتا ہے تاہم لالہ خود کو گولی مار کر ختم کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس کا انتقال ہو جاتا ہے۔ دیوا گینگ ڈاکٹر فردوس کی میت اٹھنے پر وہاں فائرنگ کر دیتے ہیں۔ شکیل اور جلیل مارے جاتے ہیں اور فیصل اور پانڈے زخمی ہو جاتے ہیں۔ پولیس دیوا کو گھیر لیتی ہے۔ معاذ دیوا اور اس کے آدمیوں کو نکالنے کے عوض عالم کا پتا معلوم کر لیتا ہے۔ سونیا اور معاذ حیدر آباد نواب بدرالدین کی حویلی پہنچ جاتے ہیں۔ تاہم کالے خان اور رادھا دیوی کو میڈم ایکس کے شکنجے سے چھڑانے کے لیے انہیں واپس آنا پڑتا ہے، کالے خان کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ نواب صاحب کی حویلی میں عالم اور سرمد کی رہائی کے لیے کارروائی کرتا ہے مگر نواب صاحب کا بیٹا ان کے سامنے آ جاتا ہے۔ وہ محل کو بھی اغوا کر کے حویلی لے آتا ہے۔ تاہم وہ لوگ عبید کو قبضے میں کر کے وہاں سے نکل جاتے ہیں۔ وہ لوگ نئے ٹھکانے پر پہنچتے ہیں تو وہاں معاذ سے ملنے جا رہی نامی شخص آتا ہے۔ اسے معاذ نے ”را“ کی قید سے نکالا ہوتا ہے۔ ادھر کل کا بیٹا اعظم اپنی ناک میں پتھر بھنسا لیتا ہے۔ جبار اور معاذ، کل سمیت اسپتال جاتے ہیں اور پچھان لیے جانے پر پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ پولیس سے مقابلے کے بعد وہ ایک بستی میں پناہ کے لیے کھس جاتے ہیں اور دو لوگوں کو یرغمال بنا کر ان کی جمو نیڑی میں قیام کرتے ہیں۔ ادھر سونیا عالم وغیرہ سمیت سب کو ٹھکانا بدلنے کا کہہ کر معاذ کی تلاش میں نکلتی ہے اور اسے بستی میں پہنچنے پر معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ معاذ اور جبار وغیرہ انوپ نامی شخص کے ساتھ اس کے مالک کے ہنگامے میں قیام کرتے ہیں۔ سونیا بھی معلومات حاصل کرتی ہوئی مذکورہ ہنگامے تک پہنچ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور سرمد بھی سونیا کا پیچھا کرتے ہوئے وہیں پہنچ جاتے ہیں۔ ادھر وقاص، علیہ و دیگر لوگ زندہ ہوتے ہیں۔ وقاص علیہ بدل کر گلوکا باڈی گارڈ بنا ہے۔ وہ معاذ کو تلاش کرنے کے لیے وہ انڈیا روانہ ہوتا ہے۔ وہاں اس کی گل خان سے ملاقات ہوتی ہے اور معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ سونیا، معاذ اور دیگر ساتھیوں سے مل جاتی ہے تاہم جس ہنگامے میں ہوتے ہیں وہ دشمن کا ہوتا ہے۔ وقاص بھی معاذ کو ڈھونڈتا ہوا وہیں پہنچ جاتا ہے۔ دشمن سب کو بے ہوش کر کے کہیں لے جا رہے ہوتے ہیں کہ ان کی گاڑی کو حادثہ پیش آ جاتا ہے۔ ان سب کو چینی بمکشو طبی امداد دیتے ہیں اور ان سے پوچھ کی جاتی ہے۔ محل کی حالت تشویشناک ہوتی ہے اور اسے وہاں موجود ایک وید دیکھتا ہے اور اس کے دماغ میں رسولی کی موجودگی کا پتا چلتا ہے۔ ادھر لالہ واپس اپنے لوگوں میں پہنچ کر ایکشن میں آ جاتا ہے اور حامد کو اغوا کر دیتا ہے۔ میڈم ایکس کو شک ہو جاتا ہے کہ لالہ زندہ ہے۔ لالہ میڈم ایکس کے ٹھکانے کی ہنگامی کردہاتا ہے۔ ادھر سونیا پر تشدد کرنے کے اس سے معلومات لی جاتی ہیں تاہم وہ اپنے گلے پر پتھر پھیر لیتی ہے۔ باڈل، معاذ وغیرہ کے ٹھکانے سے باخبر ہو جاتا ہے۔ ادھر اصغر، پرویز کو بغیر حکم کے کسی بھی کارروائی سے گریز کرنے کا حکم دیتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

اصغر نے پرویز کو جب اس کی عجلت بازی پر جھڑکا تو ”نہیں کروں گا گڑبڑ، بس تم سکون میں آ جاؤ۔“ پرویز نے اسے دوبارہ یقین دہانی کروائی اور فون بند کر دیا۔

ابھی مشکل سے چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ فون پر میسج ٹون بجی۔ یہ نورے کا وائس میسج تھا۔ اس نے بتایا تھا۔

”گاڑی واپس جا رہی ہے لیکن عورت اور بچہ یہیں رک گئے ہیں۔ گاڑی میں صرف ڈرائیور ہے۔ میں نے امجد کو اطلاع کر دی ہے۔“

امجد وہ بندہ تھا جو کسی بھی ایمر جنسی کی صورت میں کچھ فاصلے پر گاڑی سمیت ہدایات کا منتظر تھا۔ اس نے نورے کا پیغام سنا اور فوراً ہی ایک نمبر ڈائل کیا۔

”ہاں اچھو! دیکھ امجد سے رابطے میں رہ۔ تجھے ضرورت پڑنے پر اس کی مدد کرنا ہے۔“ اچھو وہی فقیر تھا جس نے سب سے پہلے بچے اور عورت کی آمد کی اطلاع دی تھی۔

”ٹھیک ہے جی۔“ اس کی طرف سے مختصر جواب

موصول ہوا۔ پرویز نے ساری صورت حال سے اصغر کو آگاہ

کیا اور پلٹ کر ٹیلی اسکوپ کے پیچھے بیٹھے بندے کو دیکھا۔

وہ اپنی ڈیوٹی پر جما ہوا تھا لیکن کچھ بیزار سا دکھائی دے رہا

تھا۔ پرویز چلتا ہوا کھڑکی تک گیا۔ شیشے کی کھڑکی سے مطلوبہ

عمارت صاف دکھائی دے رہی تھی لیکن درود دیوار کے سوا

کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ان درود دیوار کے پیچھے جاری

سرگرمیوں کی سن گن لینے کے لیے مذکورہ ڈیبا کو کان بنا کر

ان درود دیوار کے ساتھ چسپاں کرنا ضروری تھا لیکن اسے

اجازت ہی نہیں مل رہی تھی۔ جھنجھلاہٹ کے باعث اس نے

اپنی پھیلی پر مکا مارا اور کمرے میں ٹپکنے لگا۔ چند لمحے ہی

آگے سر کے تھے کہ موبائل پر کال آنے لگی۔

”ہیلو۔“ اس نے اچھو کا نام دیکھ کر جلدی سے کال

وصول کی۔

”غضب ہو گیا پرویز بھائی! امجد جس گاڑی کا پیچھا

کر رہا تھا، اس کی سواری کو شاید پتا لگ گیا تھا۔ وہ جان بوجھ

کر ویران راستے پر مڑ گیا اور وہاں اس کے مددگاروں نے

پہنچ کر امجد کو گھیرنے کی کوشش کی۔ وہ شاید اسے اغوا کر کے

لے جانا چاہتے تھے لیکن اس نے فائر کھول دیا۔ فائرنگ کا

جواب دینے میں انہوں نے امجد کو کئی گولیاں مار دیں اور وہ

وہیں موقع پر ہلاک ہو گیا۔“

”کیا بکواس کر رہا ہے تو۔“ تجھے کہا تھا نا کہ امجد کے

پیچھے رہ کر اسے کوڑ دینا۔“ خبر ایسی تھی کہ پرویز کی برداشت

جواب دے گئی اور وہ اچھو پر الٹ پڑا۔

”میں اس کے پیچھے ہی تھا پرویز بھائی اور فون پر

ہمارا رابطہ بھی تھا۔ وہ گاڑی والا سنسان راستے پر مڑا تو اس

کے پیچھے جاتے ہوئے امجد نے خود مجھ سے کہا کہ تم دور رہو

ورنہ ویرانے میں میرے ساتھ تمہاری بانیگ بھی فوراً ٹولس

میں آ جائے گی۔ دونوں نظر میں آجائیں، اس سے بہتر ہے تم

پیچھے رہ کر میری طرف سے اشارے کا انتظار کرو۔ میں کال

پر ہی رہا لیکن امجد کی طرف سے کوئی اشارہ ملنے کے بجائے

گولیاں ملنے کی آوازیں ہی سنائی دیں۔ میں جتنی تیزی سے

وہاں پہنچ سکتا تھا، پہنچا لیکن وہاں کوئی گاڑی بھی نہ امجد کے

جسم میں جان۔“ رونا ضبط کرتے کرتے بالآخر اچھو کے

لبوں سے ایک ہچکی نکل ہی گئی۔ پرویز نے ضبط کی کوشش

میں اپنے ہونٹ کھل ڈالے۔ خاموشی کے ایک وقفے کے

بعد اچھو نے دوبارہ بولنا شروع کیا۔

”مجھے ایک راہ گہرے بتایا کہ وہ دو گاڑیوں اور تین

بانیگوں پر تھے اور امجد کو گھیرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن

اس کی فائرنگ کے جواب میں انہیں بھی فائرنگ کرنا پڑی،

یوں امجد مارا گیا۔“ بندہ مارا گیا تھا تو آگے کہانی ہی کیا باقی

بچی تھی۔ اچھو نے ایک بار پھر خاموشی اختیار کر لی۔

”خیال رکھنا کہ گھر والوں کو آرام سے لاش مل جائے

اور انہیں کوئی تشویش نہ ہو۔“ پرویز کے پاس بھی کہنے کو بس اتنا

ہی باقی رہ گیا تھا۔ اس نے سلسلہ منقطع کیا تو ٹیلی اسکوپ کے

پیچھے بیٹھا شخص اسی کی طرف متوجہ تھا۔ یکطرفہ گفتگو نے ہی

اسے صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا اس لیے اس کی

آنکھوں سے دکھ جھلک رہا تھا۔

”تیرا اور میرا بھی ایک دن یہی انجام ہونا ہے۔ اس

دھندے میں سالی موت سب سے زیادہ قریب رہتی ہے

اور موقع ملے ہی بندے کو جھپٹ لیتی ہے۔“ ایک ساتھی کی

موت نے پرویز کے لہجے میں تلخی گھول دی تھی۔ اس نے

اصغر کو امجد کی موت کی خبر دی اور خود دوسرے کمرے میں

پڑے صوفے پر جا لیٹا۔ اگلے کئی گھنٹے اس نے اسی صوفے

پر لیٹ کر سگریٹوں کا دھواں اڑاتے ہوئے گزار دیے۔

”پرویز بھائی! ٹائم ہو گیا ہے۔“ تاریکی بہت زیادہ

گہری ہو چکی تھی جب دوسرے کمرے سے آدمی اٹھ کر اس

کے پاس آیا اور آہستہ سے اسے اطلاع دی۔ پرویز نے

الگیوں میں دبا سگریٹ بجھایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ انہیں جو کرنا

تھا، اس کی تیاری مکمل تھی۔ کمرے کی ساری لائیں بجھا کر

کھڑکی کھولی گئی اور اس کے ساتھی نے عجیب و غریب

ساخت کی گن کی ٹال کھڑکی کی منڈیر سے ٹکائی۔

”ٹارگٹ؟“ بلبل پر انگلی رکھے اس نے آہستہ سے پوچھا۔

”بچ والی کھڑکی کے صین نیچے۔“ پرویز نے کچھ سسنی

انداز میں جواب دیا۔ اس کی زندگی میں یہ وقت پہلے بھی کئی

بار آیا تھا کہ مرنے والے ساتھیوں کے مرنے کا سوگ منانے کے بجائے میدانِ عمل میں کودنا پڑا تھا۔ اب بھی وہ یہی کر رہا تھا۔

”ایک، دو، تین۔“ گنتی پوری ہوئی اور گن کی ٹال سے منسلک ڈبیا پوری طاقت اور رفتار سے اڑتی ہوئی سامنے والی عمارت کی طرف بڑھی۔ چند سیکنڈ کی قلیل مدت میں ڈبیا ٹھک کی معمولی سی آواز کے ساتھ مطلوبہ ہدف پر چسپاں ہو چکی تھی۔ ڈبیا کے چسپاں ہوتے ہی پرویز کھڑکی چھوڑ کر اس ریسور کی طرف لپکا جس پر آوازیں سنائی دینا تھیں۔ اس کے کانوں نے سب سے پہلے ایک سائرن جیسی آواز سنی۔ یہ آواز تیس سیکنڈ کے اندر اندر ختم ہو گئی اور کچھ سرسراہٹیں اور قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ ان آوازوں سے اس نے اندازہ لگایا کہ رات کے اس پہر بھی عمارت میں کوئی سرگرمی جاری ہے لیکن کان لگا کر سننے کے باوجود اسے کوئی انسانی آواز سنائی نہیں دی۔ معمولی سا وقت مزید سرکا اور اس کے کانوں میں بچے کے رونے کی آواز پڑی۔ کوئی عورت روتے ہوئے بچے کو بہلانے لگی۔ بس یہ آخری آواز تھی جو وہ سن سکا۔ وہ ایک بلبہ سا تھا جو کھڑکی کے شیشے سے آکر ٹکرایا تھا اور شیشے کو کسی بلٹ کی طرح توڑ کر رکھ دیا تھا۔ شیشے کے ٹوٹے ہوئے حصے سے... چپکا وہ بلبہ تیزی سے کمرے میں زہریلی گیس منتقل کر رہا تھا۔ پرویز کا سانس جو ڈبیا فائر کرنے کے بعد کھڑکی بند کر کے گن کو واپس اس کی پیکنگ میں رکھ رہا تھا، اگر اس وقت ٹیلی اسکوپ کے پیچھے بیٹھا ہوتا تو اس کی آنکھیں اسے دکھاتیں کہ وہ شفاف بلبہ عین اس کھڑکی سے فائر کیا گیا تھا جس کے نیچے ان کی فائر کردہ ڈبیا چھکی ہوئی تھی۔ وہ عمارت میڈم ایکس کی راجدھانی تھی اور یہ ممکن نہیں تھا کہ کوئی اس کی راجدھانی میں نقب لگانے کی کوشش کرتا اور اسے خبر نہ ہوتی۔ خبر تو انہیں نہیں ہوئی تھی جو نقب لگانے کی کوشش کے دو منٹ کے اندر اندر مارے گئے تھے۔

☆☆☆

”یہ سب کیا ہے معاذ بھائی؟“ وکی، جسے اس کی خواہش پر وہاں بلوایا گیا تھا، اس کی حالت دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ اگرچہ اس کی مرہم پٹی کردی گئی تھی لیکن یہ تو بالکل واضح تھا کہ وہ اچھا خاصا زخمی ہے۔

”سب ٹھیک ہے یار! تم پریشان مت ہو۔“ معاذ نے بچکے کا سہارا لے کر بیٹھتے ہوئے اسے تسلی دی۔

”ان لوگوں نے آپ کو تشدد کا نشانہ کیوں بنایا؟“

وکی عمر میں بے شک اس سے چھوٹا تھا لیکن لالہ کے ساتھ منسلک رہنے کے باعث زندگی کا گہرا تجربہ رکھتا تھا اس لیے اس کے لیے سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ اس کے جسم پر موجود زخم تشدد کے باعث ہیں۔

”کہانا کوئی خاص بات نہیں۔ بس جو ہونا تھا، وہ ہو چکا اور فی الحال میں اس کے متعلق کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔“ اس نے دو ٹوک لہجے میں واضح کر دیا کہ اس سے سوال نہ کیا جائے۔ درحقیقت سونیا کے انکشافات اور پھر خودکشی کی کوشش نے اس کا دماغ جھنجھکا کر رکھ دیا تھا۔ وہ رہ کر سونیا کی صراحتی دار گردن پر ابھرنے والی سرخ لکیر یاد آتی تھی۔ واقعے کے فوراً بعد جھکشیوں نے سب کچھ سنبھال لیا تھا اور سونیا کو نہایت سرعت سے ویدجی کے غار میں منتقل کر دیا گیا تھا لیکن کافی دیر گزر جانے کے باوجود اس کے متعلق کوئی واضح اطلاع نہیں آئی تھی۔ بس یہی کہا جا رہا تھا کہ ویدجی اس کی جان بچانے کی بھرپور کوشش کر رہے ہیں۔ ان کوششوں کے درمیان ہی معاذ کی مرہم پٹی کر کے اسے اس چھوٹے سے غار میں منتقل کر دیا گیا تھا اور زانگ نے اس کی فرمائش پر وکی کو اس کے پاس بھیج دیا تھا۔ گویا یہ ان کی طرف سے تعاون کے بدلے میں دیا جانے والا انعام تھا۔

”جیسی آپ کی مرضی۔“ وکی نے مختصر آ کہہ کر خاموشی اختیار کر لی۔

”سوری یار! میرا دماغ بہت الجھا ہوا ہے۔ میں بعد میں تمہیں بہت کچھ بتاؤں گا لیکن فی الحال میں اپنے دماغ کو موجودہ پریشانی سے ہٹانا چاہتا ہوں اس لیے تمہیں یہاں بلوایا ہے۔“ معاذ کو احساس ہوا کہ اس کا انداز وکی کے ساتھ کچھ سخت تھا چنانچہ لہجے کو نرم کرتے ہوئے اس سے معذرت کی۔

”اٹس او کے معاذ بھائی! میرے دل میں آپ کے لیے بڑا احترام ہے اور اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میں آپ سے ناراض ہو جاؤں۔“ وکی نے سعادت مندی کا مظاہرہ کیا تو معاذ کے لبوں پر خود بخود ہی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ اسے بڑا برابر نسبتی ہونے کا پورا پورا پر وٹو کول دے رہا تھا۔

”حیدر آباد میں تم نے مجھے یہ خوشخبری سنائی تھی کہ میرے سارے گھر والے زندہ اور بخیر و عافیت ہیں۔ میرے لیے یہ دنیا کی سب سے بڑی خوشخبری تھی لیکن حالات نے اجازت ہی نہیں دی کہ اس بارے میں تم سے تفصیلات جان سکوں۔ ابھی کچھ فرصت میری آئی تو سوچا تم سے اس پر بات کروں اور پوچھوں کہ میرے سارے

سارے کہاں اور کیسے ہیں؟“ انہوں کا تصور کر کے اس کی آنکھوں میں نمی اٹھ آئی تھی اور وہ ساری تکلیف یاد آگئی تھی جس سے وہ ان کی موت کی خبر سن کر گزرا تھا۔

”سب ٹھیک اور محفوظ مقام پر ہیں اور آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔ خاص طور پر علیہ تو آپ کے نام کی مالا جپتی رہتی ہے۔ اس نے مجھ سے وعدہ لے رکھا ہے کہ اس کے بھائی کو ڈھونڈ کر زندہ سلامت اس تک پہنچاؤں گا۔“ وہی نے مسکراتے ہوئے اس کے سوال کا جواب دیا۔ خصوصاً علیہ کا ذکر کرتے ہوئے تو اس کی آنکھوں میں الگ ہی چمک تھی۔ آنکھوں کی یہ چمک ہی معاذ کو یہ باور کرانے کے لیے کافی تھی کہ وہ علیہ سے کتنی محبت کرتا ہے۔

”مجھے تفصیل سے سب بتاؤ کہ کیا ہوا تھا۔ کیسے تم علیہ سے ملے؟ کیسے تمہاری شادی ہوئی؟ اتنا عرصہ کیسے تم لوگ منظر سے غائب رہے اور کون تھا جو ان سارے حالات میں تم لوگوں کی مدد کرتا رہا؟“ معاذ نے ایک سانس میں ہی سارے سوال کر ڈالے۔

”یہ سب لالہ کی وجہ سے ممکن ہوا۔ مجھے اعتراف ہے کہ اگر لالہ ہمارا ساتھ نہ دیتا تو ہمارے لیے اپنی بقا کی جنگ لڑنا ناممکن ہو جاتا۔“ لالہ کے لیے لہجے میں گہری عقیدت سموئے وہی نے اسے جواب دیا اور پھر آہستہ آہستہ بتانے لگا۔

”آپ جب میرا قلیٹ چھوڑ کر چلے گئے تھے تو مجھے آپ کے اس فیصلے پر بہت دکھ ہوا تھا اور میں بجائے پیچھے ہٹنے کے، آپ کی کھوج میں لگ گیا تھا۔ کھوج کے نتیجے میں آپ کی خبر تو نہیں ملی لیکن آپ کے دشمنوں کو میں کھنکنے لگا۔ انہوں نے لالہ کو پیغام بھیجا کہ وہی سے کہو ہمارے معاملات سے دور رہو ورنہ جان سے جائے گا۔ لالہ نے مجھے روکنے کی بہت کوشش کی۔ یہاں تک کہ کافی عرصے ملک سے باہر بھی بھیج دیا لیکن مجھے اس معاملے سے الگ نہ کر سکے۔ میری اتنی مستقل مزاجی اور اپنی حکم عدولی نے لالہ کو حیران کر دیا اور انہوں نے دو ٹوک مجھ سے میرے اس رویے کی وجہ پوچھ لی۔ وجہ جاننے کے بعد انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ علیہ اور میرا رشتہ جوڑنے میں پوری مدد کریں گے۔“

”یعنی تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ تم نے جو کچھ کیا، صرف علیہ کی خاطر کیا؟“ معاذ نے بے حد حیرت سے پوچھا۔ جواباً اس نے فقط اشاہات میں سر ہلا دیا۔

”لیکن تم علیہ کو کیسے جانتے تھے؟ تمہارا تو ہماری فیملی سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں تھا؟“ معاذ کی حیرت کم

نہیں ہوئی۔

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اصل میں، میں نے علیہ کو پہلی بار اس احتجاجی ریلی میں دیکھا تھا جو آپ کے دوستوں اور یونیورسٹی کے طلبہ نے آپ کی گمشدگی کے بعد حکومت پر زور ڈالنے کے لیے نکالی تھی۔“ وہی کی بات نے اسے کیرتھر کا وہ تعلیمی دور یاد دلادیا جب سلطان نے اسے موت کے منہ میں دھکیلنے کی پوری پوری کوشش کی تھی۔ اس روز کیرتھر کی بھول بھلیوں میں بسنے والی وحشی ہرنی جیسی لیلیٰ اور مراد اس کو گہری کھائی سے نہ نکالتے اور فیضو جیسے پراسرار شخص کا علاج میسر نہ آتا تو اس کی کہانی شاید وہیں ختم ہو جاتی لیکن کہانی کو ختم ہی تو نہیں ہونا تھا۔ کہانی تو منہج کر اتنی لمبی ہو گئی تھی کہ آج وہ ایک برف زار میں بیٹھا اس کہانی کے باقی کرداروں کی کہانی سن رہا تھا۔

”لالہ نے آپ کے والد اور علیہ کو خفیہ طور پر آپ کی پھوپھو کے گھر سے نکالنے کا انتظام کیا اور ہر طرح کے تحفظ کی یقین دہانی کرواتے ہوئے خاور انکل سے میرے لیے علیہ کا رشتہ مانگا۔ ان یقین دہانیوں میں ایک وعدہ یہ بھی تھا کہ میں لالہ کے دھندے سے الگ ہو کر ایک صاف ستھری اور جرائم سے پاک زندگی گزاروں گا۔“

”اور یوں تمہاری اور علیہ کی شادی ہو گئی۔“ معاذ نے گویا پریوں کی کسی کہانی کا اختتام پڑھا۔

”جی، ہماری شادی ہو گئی لیکن پاکستان چھوڑ کر سنگاپور منتقل ہو جانے کے باوجود ہمیں ہنسی خوشی رہنے کا موقع نہیں ملا۔ دشمنوں نے وہاں بھی ہمیں کھوج نکالا اور ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس گھر تک بھی پہنچ گئے جہاں ہم پے انگ گیسٹ کے طور پر رہ رہے تھے۔“ وہی کے لیے وہ مشکل وقت ابھی کل کی بات جیسا تھا۔

”دشمنوں نے اس گھر تک پہنچ کر لینڈ لیڈی مس سینڈی کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ ہمارے سامان میں ٹائم بم رکھ دے گی۔ بیاری طرح وہ بھی نہیں جانتے تھے کہ مس سینڈی اصل میں لالہ کی وفادار ہے۔ اس نے ان حالات میں بہت جرأت کے ساتھ ہمارا ساتھ دیا۔ ہم جان گئے تھے کہ سمندری راستے سے ہمارے فرار کا منصوبہ دشمنوں کے علم میں آ گیا ہے لیکن دشمن نہیں جانتے تھے کہ ہماری آگے کی منصوبہ بندی کیا ہے۔ ہم طے شدہ پروگرام کے مطابق سمندر میں اتر گئے اور دشمنوں کے طے شدہ پروگرام کے مطابق بم دھماکے میں ہمیں لے جانے والی لالچ کٹڑے کٹڑے ہو گئی اور چشم لک نے سمندر کی سطح پر لالچ کے کٹڑوں کے ساتھ

نہیں تھا۔

”ان شاء اللہ!“ معاذ نے دل کی گہرائیوں سے کہا اور غور سے وہی کو دیکھنے لگا۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”دیکھ رہا ہوں کہ علیہ کا نصیب کتنا اچھا ہے۔“

”سچ سچ؟“ وہی سن کر خوش ہوا۔

”ہاں، سچ سچ۔ میرے حساب سے تو کسی لڑکی کے

لیے ایسا شوہر بہت ہی آئیڈیل ہو سکتا ہے جو بندروں کی

پھرتی سے اونچے درختوں پر چڑھ جائے اور وہاں سے اس

کے من پسند پھل توڑ کر لاسکے۔ علیہ کو تو ویسے بھی درختوں

سے کیریاں اور کچی اٹلی وغیرہ توڑ کر کھانا بہت پسند ہے۔“

اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ ماضی کے کچھ واقعات کے

حوالے سے وہی کو چھیڑ رہا ہے۔ وہی بھی سمجھ گیا اور اس کے

چہرے پر ایک جھینپی ہوئی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اسی وقت

زانگ تاؤ اندر داخل ہوا۔ معاذ اسے دیکھ کر فوراً اپنی جگہ

سے کھڑا ہو گیا۔

”بیٹھ جاؤ مہاشے! پہلے ہی تم زخمی ہو اور تمہیں آرام

کی ضرورت ہے۔“ زانگ نے فوراً اسے ٹوکا۔

”مجھے اس کے بارے میں بتاؤ کہ وہ کیسی ہے؟“

معاذ بیٹھ تو گیا لیکن بے چینی اس کے ہر انداز سے ظاہر تھی۔

”کھون بہت بہہ گیا ہے پر جان بچ گئی ہے۔ تم بیچ میں

نہ پڑتے تو شاید اس کی شہ رگ ہی کٹ گئی ہوتی۔ وار او چھا

پڑنے سے بڑی بچت ہو گئی۔ ویدجی کہہ رہے تھے کہ زخم

ٹھیک ہونے میں تھوڑا تاخیر لگے گا اور تھوڑے سے تک کمزوری

بھی رہے گی۔“ اس کی دی مکمل رپورٹ نے جہاں معاذ کی تسلی

کروائی، وہیں وہی کو پریشان کر دیا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ یہ

ساری گفتگو کس کے متعلق ہو رہی ہے لیکن درمیان میں دخل

دینا بھی مناسب نہیں تھا اس لیے خاموش بیٹھا رہا۔

”میں تمہیں یہ مشروب دینے آیا تھا۔ ویدجی نے

کھامس تمہارے لیے بھیجا ہے۔ کہہ رہے تھے کہ اسے پینے

سے زخم جلدی بھریں گے اور بدن کو شستی بھی ملے گی۔“ اس

نے اپنے لبادے میں سے ایک بوتل نکال کر معاذ کے

حوالے کی۔

”میری طرف سے ان کا شکریہ ادا کرنا اور یہ

درخواست بھی پہنچانا کہ میں مرلیضہ کو دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”میں انہیں تمہارا سندیس دے دوں گا۔ پر تو مشکل ہی

ہے کہ ابھی ملاقات ہو سکے۔ وہ ابھی بے ہوش ہے اور اسے

آرام کی ضرورت ہے۔“ بھکشو نے نرمی سے جواب دیا۔

ساتھ انسانی اعضا بھی تیرتے دیکھے۔“

”یہی سب کچھ بتایا گیا تھا مجھے۔ میں یہ جان کر بہت

ترپا تھا کہ میرے پیارے میری وجہ سے ایسی دردناک

موت کا شکار ہوئے۔“ وہ وقت بھولنے والا تھا ہی نہیں۔ ان

دنوں میڈم ایکس پر دیوانگی طاری تھی۔ اس کے اپنے ہاتھ

سے نکل جانے پر وہ اتنی بری طرح چراغ پا بھی کہ ٹوبیہ کو محض

علیہ سے فون پر بات کرنے کے جرم میں اس کے

خوبصورت چہرے پر تیزاب پھسکا دیا تھا۔

”ہم لوگ ٹائم بم پھٹنے سے پہلے ہی لائف بوٹس کے

ذریعے لائیج سے اتر کر اس بحری جہاز کی طرف روانہ ہو چکے

تھے جو کھلے سمندر میں ہمارا ہی منتظر کھڑا تھا۔ بم پھٹا تو لائیج

کے برف خانے میں رہی ان لاشوں کے اعضا بھی بکھر گئے

جو بے نام و نشان تھیں اور جنہیں ہمارا نام دے کر ہمیں ایک

نئی زندگی دینے کی منصوبہ بندی کی گئی تھی۔“

”یا خدا..... یہ تمہارا لالہ تو بہت زبردست منصوبہ ساز

نکلا۔“ معاذ نے بے ساختہ ہی لالہ عیسیٰ کو سراہا۔

”لالہ کی ذہانت میں کوئی شک نہیں ہے۔ یہ سب

انہی کے مرہون منت تھا کہ ہم سب پاکستان واپس لوٹے

اور اپنے وطن کے ایک محفوظ گوشے میں سکون کی زندگی

گزارنے لگے۔“

”پھر تم بھارت کیوں چلے آئے؟ تمہیں وہیں ان

سب کے درمیان سکون سے رہنا چاہیے تھا۔“ معاذ نے

ناراضی کا اظہار کیا۔

”میرا سکون اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا تھا جب

تک علیہ مکمل طور پر پُر سکون نہ ہوتی۔ وہ آپ کے لیے

بہت بے چین تھی معاذ بھائی! میں چاہے دنیا کی ساری

خوشیاں اس کے قدموں تلے جمع کر دیتا، ایک بہن کے دل

کی وہ تڑپ دور نہیں کر سکتا تھا جو اپنے بھائی کے لیے تھی۔

بس پھر اس کی وہ تڑپ دور کرنے کے لیے میں آپ کی تلاش

کے سفر پر نکل کھڑا ہوا اور دیکھیے کہ بالآخر آپ تک پہنچ ہی گیا

ہوں۔“ وہ اپنی کامیابی پر مسرور تھا۔

”پہنچ تو گئے ہو لیکن سوچو کہ اس ہنگی کے ہاتھ کیا

آپا؟ اب وہ بھائی کے ساتھ شوہر کی جدائی میں بھی تڑپ رہی

ہوگی۔“ بہن کی تکلیف کا خیال اس کی آنکھوں کے گوشے

بھگو گیا۔

”اللہ نے چاہا تو یہ جدائی عارضی ثابت ہوگی اور ہم

جلد ایک ساتھ علیہ کے سامنے پہنچ کر اسے حیران کر دیں

گے۔“ وہ بدترین حالات میں بھی مایوس ہونے والا انسان

”بیجنگ روانگی سے متعلق کوئی معلومات ہیں تمہارے پاس؟“ ویدجی نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ سب کو جلد از جلد بیجنگ بھجوانے کی کوشش کریں گے۔“

”شین، بیجنگ سے رابطے کے لیے روانہ ہو گیا ہے۔ وہاں سے اجازت ملتے ہی یہ کام بھی ہو جائے گا۔“ زانگ اسے جواب دے کر وہاں سے جانے کے لیے پرتولنے لگا۔ ”وکی کو آج رات میں یہاں اپنے پاس ہی روکوں گا۔“ ”جیسی تمہاری اچھا۔ میں تو چاہتا تھا کہ تم اپنے ساتھیوں کے ساتھ رہو تا کہ تمہارا امن بہلا رہے لیکن تم نے میری بات مانی ہی نہیں۔“

”میں انہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ میری حالت دیکھ کر وہ فکر میں پڑ جاتے۔“ معاذ نے پہلے بتائی وجہ ایک بار پھر بیان کی۔ زانگ اس بار کوئی جواب دیے بغیر واپس پلٹ گیا۔

”سونیا نے خودکشی کی کوشش کی تھی۔“ زانگ کے جانے کے بعد اس نے خود ہی وکی کو بتا دیا۔ ”لیکن کیوں؟“ وکی حیران ہوا۔

”شاید وہ شرمندہ ہے کہ دوستی اور اخلاص کے دعوے کرنے کے باوجود ہمارے دشمنوں سے اپنی وفاداری مکمل طور پر ختم نہیں کر سکی۔“ معاذ نے کھوئے کھوئے سے لہجے میں اسے جواب دیا۔

”میں آپ کی بات سمجھ نہیں سکا۔“ ”بنا سر ہیر کے سمجھو گے بھی کیسے؟ سمجھنے کے لیے طویل تفصیل سننا پڑے گی۔“

”سنانے میں حرج نہ سمجھیں تو سنا ڈالیں۔“ تجسس کے باوجود وکی نے اصرار نہیں کیا۔ معاذ کو بھی اس وقت سامع کی ضرورت تھی چنانچہ اختصار کے ساتھ بہت کچھ اس کے گوش گزار کر دیا۔ وکی پوری توجہ سے سنتا رہا۔ جب معاذ خاموش ہو گیا تو بردباری سے بولا۔

”بے شک سونیا کا کردار تضادات کا مجموعہ ہے لیکن اگر آپ اس کی زندگی کے حالات پر غور کریں تو اس کا ایسا ہونا عجیب بھی نہیں ہے۔ ایک ایسی لڑکی جس نے کبھی زندگی کو نارمل طریقے سے جیا ہی نہیں، اپنے روتیوں میں عجیب ہے تو یہ انوکھی بات نہیں۔ سچ پوچھیں تو مجھے اس کی خوبصورت اور پُر اعتماد شخصیت کے پیچھے پچھلی لوٹی پھوٹی اور زخمی لڑکی کو دیکھ کر افسوس ہو رہا ہے۔ بظاہر وہ کتنی با اختیار دکھائی دیتی تھی لیکن اسے تو کبھی کوئی اختیار حاصل ہی نہیں رہا۔ داراب جیسے بے جوڑ آدمی سے شادی ہی اس پر بہت بڑا ظلم تھا۔ آپ

سوچیں کہ وہ اتنا عرصہ ایک ناگوار تعلق میں بندھے بندھے کس اذیت سے گزری ہوگی۔“

”اس کے لیے مجھے اس سے ہمدردی ہے لیکن یہ فراموش کرنا آسان نہیں کہ وہ ان لوگوں سے تعلق رکھتی ہے جو میرے وطن بلکہ پوری انسانیت کے دشمن ہیں۔“ معاذ کا اعتبار سونیا پر قائم ہوتے ہوتے بگھرنے لگا تھا۔

”میرے خیال میں وہ یہ تعلق اسی وقت توڑ چکی تھی جب اس نے تنظیم کے مفادات کے خلاف آپ کا ساتھ دیا۔ جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی تھی، وہ بھی حالیہ اعتراضات کے بعد پوری ہو چکی ہے۔ آپ سوچیں کہ جو انسان محض شرمندگی کی وجہ سے اپنی جان دینے پر تل جائے، اس کی شرمندگی کتنی حقیقی ہوگی۔ ایسے انسان کے لیے معافی کے علاوہ مجھے تو اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔“ وکی کا موقف بالکل دو ٹوک تھا۔

”میرا دل نہیں مانتا یا! سونیا کے جرائم کی لسٹ چھوٹی نہیں ہے۔ وہ ان لوگوں کی آلہ کار رہی ہے جنہوں نے میرے خاندان سمیت کئی لوگوں کی زندگیاں تباہ و برباد کی ہیں۔“ باضی کے واقعات یاد آنے پر معاذ کی آنکھوں میں سرخی اٹھ آئی۔

”دل سے معاف نہیں کر سکتے تب بھی مصلحتاً معاف کر دیں۔ ہماری جنگ جن کے خلاف ہے، ان تک ہمیں سونیا کے سوا کوئی نہیں پہنچا سکتا۔“ وکی نے ایک ایسی بات کہی جسے سن کر معاذ ساکت رہ گیا۔ واقعی سونیا کے علاوہ کون تھا جو انہیں دشمنوں تک رسائی دیتا۔

”میں جب اس جنگ کا حصہ بنا تھا تو مجھے اندازہ بھی نہیں تھا کہ میں ایک بڑے مشن کا حصہ بننے جا رہا ہوں۔ میں نے ساری زندگی ماردھاڑ اور دو نمبر کاموں میں جان ہتھیلی پر رکھ کر گزاری ہے اور ذہنی طور پر اس بات کے لیے تیار رہا ہوں کہ کبھی بھی، کسی بھی موڑ پر زندگی کی شام ہو جائے گی۔ مجھ جیسے بندے کو اگر یہ موقع مل جائے کہ وہ سوچے کہ میں مرا بھی تو ایک بڑے آدمی کی موت مردوں کا، تو یہ بہت بڑی بات ہوتی ہے۔“ وقاص عرف وکی اتنی گہرائی اور حساسیت سے بھی سوچ سکتا ہے، اس بات کا معاذ کو اندازہ نہیں تھا لیکن نہیں..... یہ بڑا آدمی تو شاید شروع ہی سے اس کے اندر تھا جو چھوٹی سی عمر میں اسے وکی بھائی بنا کر لوگوں کی مدد کرنے کھڑا کر دیتا تھا۔

”مرنے مارنے کی باتیں مت کرو! حق امر کر میری بہن کو یہ وہ بناؤ گے کیا؟“ معاذ نے اسے ہلکے سے ڈانٹا اور بے ساختہ گلے لگا لیا۔

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ



نومبر 2022ء کے

جاسوسی کی پرتجسس و سنسنی

خیز کہانیوں کی ایک جھلک

اولین صفحات

پہاڑوں اور جنگلات کی سرزمین میں گھومتی... عشق و
محبت اور انتقام کے شعلوں سے گھری داستان.....
احمد سلیم سلیمی کے قلم کی کاوش

شعلہ زن

بے بسی کے اندھیروں میں ڈوبتی لڑکی کی
دردناک داستان حیات.....
روبینہ رشید کے قلم کی جادوگری

داہر

دنیا مجبور کرتی ہے کہ ان پر قہر بن کر ٹوٹ پڑو..... ایک ایسے ہی
نوجوان کی کوچہ گردی..... زندگی اس کے لیے خالی کھول کے
ماند تھی..... **حسام بیٹ** کے قلم سے نئی سلسلے وار کہانی

سورق کے رنگ

پہلا رنگ.....
آپ کے جانے مانے کرداروں سے سچی پرل گرہ
کی ہنگامہ خیزیاں..... **اسما قادری** کی تحریر
دوسرا رنگ.....

دوست، دوست ہوتا ہے۔ اچھا یا برا نہیں.....
دوستی کے بندھن میں جکڑے ایسے ہی دوستوں کی
کہانی..... **غلام قادر** کے قلم کی زور آزمائی

چینی نکتہ چینی

آپ کے تہرے... مشورے... محبتیں...
دکائیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کھائیں

”اف.....“ جوش کا یہ مظاہرہ اسے خود ہی مہنگا پڑا
اور زخموں سے ٹیسس سی انھیں۔ وکی فوراً پیچھے ہٹا۔
”سوری، سوری۔“

”تم کس لیے سوری کر رہے ہو۔ غلطی تو میری اپنی تھی۔“
”نہ جی نہ۔ بیوی کے میکے والے ہرگز غلط نہیں
ہو سکتے اور وہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا کہ ساری خدائی ایک
طرف، جو روکا بھائی ایک طرف۔“ اس نے حسب عادت
شوخی کا مظاہرہ کیا۔

”یہ تو خیر بالکل ٹھیک بات ہے اور اب یہ جو روکا
بھائی ہی تمہیں حکم دے رہا ہے کہ آئندہ میرے سامنے
مرنے مارنے کی بات مت کرنا۔ میں نے اپنے گھر والوں کو
محفوظ زندگی دینے کی خاطر اپنی ذات پر بہت کچھ برداشت
کیا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ وہ سب، خصوصاً علیہ بہت
اچھی اور خوشگوار زندگی گزارے۔“ وہ اس وقت جذباتی
ہو رہا تھا۔

”میری خواہش آپ سے مختلف نہیں ہے معاذ بھائی!
لیکن زندگی ہمیں ہمیشہ انتخاب کا موقع نہیں دیتی مگر ہم پھر بھی
اس اعتبار سے خوش قسمت ہوتے ہیں کہ وہ ہمیں کسی خاص
کام کے لیے منتخب کر لیتی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ہمیں اس کام
کے لیے منتخب کر لیا گیا ہے جب ہی ہم کسی نہ کسی طرح یہاں
اکیٹھے ہو گئے ہیں۔“

”تمہیں ایسا کیوں لگ رہا ہے؟ دیکھا جائے تو ہم
ایک مصیبت سے نکل کر دوسری مصیبت میں پھنس چکے ہیں
اور کچھ نہیں معلوم کہ آگے کیا ہونے والا ہے؟“ معاذ کو اس کی
باتیں حیران کر رہی تھیں۔

”آگے کیا ہونے والا ہے، درحقیقت انسان کو یہ کبھی
بھی نہیں معلوم ہوتا۔ رہی بات میرے احساسات کی تو اسے
آپ بس میری چھٹی حس کہہ سکتے ہیں۔“
”چلو، دیکھتے ہیں کہ تمہاری چھٹی حس کا یہ الارم ٹھیک
لگتا ہے یا نہیں؟“

”ان شاء اللہ ٹھیک ہی لگے گا۔ ابھی آپ مجھے یہ
بتائیں کہ یہ بیجنگ جانے کی کیا بات ہو رہی تھی؟ کیا یہ لوگ
ہمیں وہاں لے جائیں گے؟“

”بجل کو علاج کے لیے وہاں لے جایا جائے گا۔“
معاذ نے آہستہ سے اس کے سوال کا جواب دیا۔

”ان کے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟ ہم جب سے یہاں
آئے ہیں، وہ دکھائی نہیں دیں۔ عالم بھائی بھی بہت
پریشان ہیں ان کے لیے۔“

”یہاں یوان منگ نامی ایک وید ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ سب کے دماغ میں ٹیمر ہے۔ اسے اس ٹیمر کی تصدیق اور علاج کے لیے بیجنگ لے جانے کا انتظام کیا جا رہا ہے۔“ معاذ کو سب کے بارے میں یہ سب بتاتے ہوئے بہت تکلیف ہو رہی تھی لیکن کسی کو تو بتانا تھا، وہ اکیلا یہ بوجھ اٹھاتے اٹھاتے تھک گیا تھا۔

”بکواس۔ پہاڑوں میں بیٹھا ایک وید بغیر کسی ٹیسٹ کے اتنا بڑا دعویٰ کیسے کر سکتا ہے۔ فضول بکواس کر رہا ہے یوان منگ!“

”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔“ معاذ کو خود اپنی دعا کی قبولیت کا یقین نہیں تھا۔ ماضی میں ڈاکٹر فردوس کی زیر نگرانی، سب کے اسپتال میں گزرے دن اسے بار بار احساس دلاتے تھے کہ گڑبڑ اسی وقت شروع ہو چکی تھی اور سب نے جان بوجھ کر اس سے حقائق چھپائے تھے۔

”وہ چھوٹے قد والا چینی ہم سب کے فنگر پرنٹس لیتا پھر رہا تھا تو مجھے لگا کہ شاید ہم سب کو ہی بیجنگ لے جانے کے سلسلے میں کوئی کارروائی ہو رہی ہے۔“ اس کی کیفیت سے بے خبر وہ آہستہ آواز میں بڑبڑایا تو وہ چونکا۔

”کون..... وہ شین یا ہی..... اس کی بات کر رہے ہو تم؟“
”مجھے نہیں پتا شین یا ہی اور وہی تباہی کا۔ میں اس چینی کی بات کر رہا ہوں جو پینٹ شرٹ پہنتا ہے۔“
”وہی شین یا ہی ہے۔ اچھا تو اس نے تم لوگوں کے فنگر پرنٹس لیے تھے؟“

”جی، بالکل۔“ وہی نے تصدیق کی۔
”مجھے نہیں پتا کہ اس کا کیا مقصد ہے لیکن وہ مجھے دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ اسے سب کے بیجنگ منٹلی کا انتظام کرنے کے لیے کہیں بھیجا گیا ہے۔“
”ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو۔ آپ بلاوجہ خود کو پریشان نہ کریں اور کچھ دیر آرام کر لیں۔ آپ نے ابھی تک وید کا بھجوا یا ہوا مشروب بھی نہیں پیا ہے۔ کم از کم وہ ہی پی لیں۔“
وہی کو اس کی تکلیف اور بے آرامی کا خیال آیا۔

”نہیں ہو رہا پریشان یار! مجھے معلوم ہے کہ پریشان ہونے سے کوئی ہونے والی بات رکنے والی نہیں ہے۔“ معاذ نے اسے تسلی دی اور مشروب کی بوتل کا ڈھکن کھول کر اسے گھونٹ گھونٹ پینے لگا۔ ذائقہ اجنبی ہونے کے باوجود بُرا نہیں تھا اور جڑی بوٹیوں کی ہلکی سی مہک محسوس ہو رہی تھی۔

”اچھی چیز ہے، تم بھگے؟“ اس نے وہی سے پوچھا۔
”مجھے تو معاف ہی رکھیں۔ میں ان وید، حکیم اور

سنیاسیوں کے چکر میں نہیں پڑتا۔“ وہی نے منہ بنا کر جواب دیا۔ جواب میں معاذ مسکرا کر خاموش ہو گیا لیکن اسے بے ساختہ ہی کیرتھر کا فیض اور دہلی کا سادھو یاد آئے تھے۔ کسی کالج، یونیورسٹی کی ڈگری نہ رکھنے کے باوجود دونوں ہی کمال کے بندے تھے اور دونوں ہی نے شدید زخمی حالت میں اسے موت کے منہ سے کھینچ نکالا تھا۔

”معاذ بھائی.....!“ وہ سونے کے لیے لیٹنے ہی لگے تھے کہ وہی نے اسے پکارا۔

”ہوں، کیا بات ہے؟“ اس نے احتیاط سے اس کی سمت کروٹ لی۔

”مجھے آپ کو بشری گزرار کے بارے میں بتانا تھا۔“
”کیا؟“ معاذ تیزی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”وہ زندہ ہے لیکن بہت بُرے حال میں۔“ اس نے معاذ کو بشری کے بارے میں پوری تفصیل سنا ڈالی۔

”تمہیں اسے وہاں نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔ اسے وہاں سے نکال لینا چاہیے تھا۔“ جہاں بشری کے حالات سن کر اس کا دل لہو لہو ہوا، وہیں اس بات پر وہی سے ناراض ہونے لگا کہ اس نے اسے ایک ایسی جگہ کیوں چھوڑا جہاں باذل کا تسلط تھا۔

”میں نے اس سے بہت کہا تھا لیکن وہ راضی نہیں ہوئی۔ اس کا عزم اور حوصلہ دیکھ کر مجھے اس کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈالنے ہی پڑے۔ سچ پوچھیں تو اس کے پاس اس کے جذبہ انتقام کے سوا کچھ باقی بھی نہیں رہا ہے اور میری دعا ہے کہ وہ اس مقصد میں کامیاب ضرور ہو۔ اس کی کامیابی کی امید پر ہی میں نے اسے اس بھیڑیے کی کچھار میں چھوڑ دیا ہے لیکن آپ فکر مند نہ ہوں۔ ہمارے لوگ اس کا خیال رکھیں گے اور پوری کوشش کریں گے کہ اس پر کوئی آنچ نہ آنے پائے۔“ معاذ کو تسلی دیتے ہوئے اسے علم ہی نہیں تھا کہ اس کے پیچھے کیا کچھ بدل چکا ہے۔

☆☆☆

”پر دیز کی طرف سے کوئی اطلاع آئی؟“

”نہیں لالہ ابھی تو خاموشی ہے۔“

”کمال ہے۔ کہاں تو وہ اتنا بے چین تھا اور کہاں

بالکل چپ سادھ کر بیٹھا ہوا ہے۔“

”مات کے پچھلے پہر وہاں ہو بھی کیا رہا ہوگا جس کی وہ سالار پورٹ دے گا۔ ابھی تو بیٹھا بس سونے والوں کے خراٹے ہی سن رہا ہوگا۔“ اصغر نے لالہ کو جواب دیا اور پر دیز کے بارے میں سوچ کر مسکرانے لگا۔ پر دیز کچھ جان

لینے کے لیے بے چین تھا اور اس جگر میں کئی بار اس سے ڈبیا فائر کرنے کی اجازت بھی چاہی تھی لیکن اس نے لالہ کی سخت ہدایت کے سبب آدمی رات سے پہلے کسی صورت میں بھی اجازت نہیں دی تھی۔ خدشہ تھا کہ ایسی صورت میں آس پاس کا کوئی کیمرا اس منظر کو قید کر لے گا جس کے نتیجے میں انہیں پریشانی اٹھانا پڑے گی۔ رات کے پچھلے پہر کی بات الگ تھی۔ آس پاس زیادہ تر کاروباری عمارات ہونے کی وجہ سے اس پہر روشنیاں نہ ہونے کے برابر ہوتی تھیں اس لیے کوئی واضح فوج سامنے آنے کے امکانات نہیں تھے۔

”دفتری عملہ بے شک رات میں چھٹی کر جاتا ہوگا لیکن میڈم ایکس اور اس کے قریبی ساتھی تو مستقل وہیں رہتے ہیں اور یہ ممکن نہیں کہ موجودہ حالات میں وہ گدھے گھوڑے بچ کر سو جائیں۔“ لالہ نے اس سے اختلاف کیا۔ ”میں خود پرویز کو فون کر کے معلوم کرتا ہوں۔“ اصغر نے اپنے موبائل سے پرویز کا نمبر ڈائل کیا۔ کچھ دیر گھنٹی بجتی رہی لیکن کال ریسپونڈ نہ ہوئی۔

”یہ کہاں مر گیا مردود؟“ اصغر کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور لب بچھے نمبر دوبارہ ڈائل کیا۔ اس بار دو گھنٹیوں کے بعد کال ریسپونڈ کر لی گئی۔

”کہاں مر گیا تھا اوئے؟“ اصغر دباڑا۔

”وہیں مرا ہے جہاں تم اسے مرنے کے لیے چھوڑ گئے تھے۔“ دوسری طرف سے پرویز کے بجائے ایک نسوانی آواز سن کر اصغر اچھل پڑا۔

”کک..... کون؟“ اس نے شپٹا کر پوچھا۔

”وہی، جس تک پہنچنے کے لیے تم ٹاک ٹوئیاں مارتے پھر رہے ہو۔“ تسخراڑانے والے لہجے میں دیے گئے جواب نے اصغر کی بوکھلاہٹ میں مزید اضافہ کر دیا۔ اس کے انداز کے غیر معمولی پن کو محسوس کر کے لالہ نے اسے اہٹیکر آن کرنے کا اشارہ کیا۔

”اگر حامد کے اغوا کے بعد بھی میں اپنی جگہ جمی بیٹھی ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں بے وقوف ہوں اور یہ نہیں سمجھتی کہ حامد کے ذریعے مجھ تک پہنچنے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔ میں یہاں موجود ہوں تو صرف اس لیے کہ میں جانتی ہوں کہ میرا قلعہ ناقابلِ تسخیر ہے اور کوئی اس میں نقب نہیں لگا سکتا۔“ وہ بولتی جا رہی تھی اور اصغر کی زبان گنگ ہو چکی تھی۔ اسے سمجھائی نہیں دے رہا تھا کہ جواب میں خود کیا کہے۔ تصدیق یا تردید کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ بولنے والی کے لہجے کا اعتماد بتا رہا تھا کہ اسے ایسی کسی چیز

سے غرض ہی نہیں ہے۔

”پارکنگ کی طرف جو ٹکرانی کے بندے لگائے تھے تم نے، انہیں ہم نے پرانے تعلق کے لحاظ میں برداشت کر لیا تھا لیکن تم نے توجہ نہ کر دی۔ اپنے ایک بندے کی جان گنوا کر بھی عقل نہیں پکڑی اور ہماری کن سوئیاں لینے کی کوشش کرنے لگے۔“ وہ اصغر پر برس رہی تھی اور انداز سے ایسا ظاہر تھا کہ جیسے اسے اس بات سے کوئی دلچسپی نہ ہو کہ اصغر جواب میں کیا کہتا ہے۔ لالہ نے اس کا لفظ لفظ غور سے سنا اور اصغر کا شانہ دبا کر اسے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ اصغر کان سے موبائل لگائے لالہ کے اشارے پر کھڑا ہو گیا اور اس کے پیچھے پیچھے باہر کی طرف بڑھا۔

”میرے دفتر کی دیواروں پر کوئی ڈیوائس چسپاں کرنا تو دور کی بات، یہاں سے کسی چمچر اور کبھی کا بھی گزر نہیں ہو سکتا۔ آئندہ ایسی غلطی کرنے کی جرأت نہ کرنا ورنہ انجام اپنے ساتھیوں سے بھی زیادہ بُرا ہوگا۔“ اصغر ایک طرف اس کی کن ترانیاں سن رہا تھا تو دوسری طرف لالہ کی کارروائیاں دیکھ رہا تھا۔ لالہ نے اسے دروازے کے قریب ہی روک دیا تھا اور گاڑی باہر نکلا رہا تھا۔ گاڑی باہر نکل گئی تو اس نے ڈرائیور کو کچھ ہدایات دیں اور خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر اصغر کو اپنے ساتھ آکر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ حیران پریشان اصغر نے اس اشاراتی حکم کی بھی تعمیل کی۔

”تم نے پوچھا نہیں کہ تمہارے ساتھیوں کا کیا انجام ہوا؟“ ”جب اتنا سب کچھ خود بتا رہی ہو تو یہ بھی بتا دو۔“ اس بار بالآخر اصغر جھنجھلا کر بول ہی پڑا۔ جواباً ایک سرریلا قہقہہ لگایا گیا۔

”بتا ہی دیتی ہوں ورنہ صبح تم جا کر لاشیں اٹھاؤ گے پھر پولیس کارروائی اور پوسٹ مارٹم ہوگا اور بڑی دیر میں جا کر یہ بات کھلے گی کہ بے چاروں کی موت پھیمپھروں میں زہر پٹی گیس بھر جانے کی وجہ سے ہوئی۔ وہ کیا ہے نا کہ میرا سیکورٹی افسر تھوڑا جڈبائی بندہ ہے۔ سسٹم نے جیسے ہی اسے وہ کھڑکی دکھائی جہاں سے ہماری طرف ڈیوائس بھیجی گئی تھی، اس نے بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دیتے ہوئے اس کھڑکی پر ایک چھوٹا سا زہر پٹی گیس کا بم فائر کر دیا۔ تمہارے آدمیوں کو آئیڈیا ہی نہیں ہوا اور وہ بے خبری میں مارے گئے۔ بڑی بری حالت ہوئی تھی بے چاروں کی۔ میرے لوگوں سے تو ان کی بگڑی شکل والی لاشیں دیکھی ہی نہیں جاری تھیں اس لیے بس خاموشی سے ان کے موبائل اٹھا کر میرے پاس لے آئے۔ میں نے کہا کوئی والی وارنٹ رابطہ

اپنے لوگوں کو میڈم ایکس کے قہر کا نشانہ بننے سے بچانا چاہتا تھا اس لیے اتنے سخت احکامات جاری کیے تھے۔

☆☆☆

’کہاں ہو میرے دل کے قرار اور آنکھوں کی ٹھنڈک؟ کہاں ہو میرے جگر کے کلڑو.....! کہ تم تک کوئی صدا نہیں پہنچتی؟ تمہارا باپ تمہاری جدائی میں بھر بھری مٹی کے ڈھیر کی طرح اندر ہی اندر ڈھتا جا رہا ہے۔ یہ نہ ہو کہ تمہیں لوٹ کر آنے میں اتنا وقت لگ جائے کہ اس بوڑھے باپ میں انتظار کی تاب ہی نہ رہے۔‘ صداقت شاہ بستر پر دراز موبائل کی اسکرین کو دیکھتے ہوئے بڑے دل گیر انداز میں سوچ رہے تھے۔ اسکرین پر عالم شاہ، سبیل اور اعظم کی وہ تصویر دکھائی دے رہی تھی جو بھارت روانگی سے قبل عین ائر پورٹ پر لی گئی تھی۔ اس وقت یہ یادگار تصویر لیتے ہوئے انہیں گمان بھی نہیں تھا کہ آنے والے وقت میں وہ اپنے ان لاڈلوں کے دیدار کو بھی ترس جائیں گے۔ ان کی ترسی ہوئی آنکھیں اپنی اس بے بسی پر بے اختیار ہی چمک نکلیں لیکن دروازے پر ہونے والی دستک نے جلدی سے انہیں آنسوؤں کو پونچھ لینے پر مجبور کر دیا۔

”آجاؤ۔“ انہوں نے کھٹکھار کر گلا صاف کیا اور آنے والے کو اجازت دی۔

”آجاؤ دمی رانی!“ اجازت کے جواب میں دروازہ کھول کر موٹل نے اندر جھانکا تو انہوں نے شعوری طور پر خود کو بٹاش ظاہر کرتے ہوئے اسے پکارا۔

”آج آپ گھر آتے ہی آرام کرنے کمرے میں چلے آئے اور کھانے سے بھی منع کر دیا تو میں پریشان ہو گئی۔ آپ کی طبیعت ٹھیک تو ہے بابا سائیں؟“ وہ دھیمے قدموں سے چلتی ان کے قریب آئی اور تشویش سے پوچھا۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں میری دمی! کھانا اس لیے نہیں کھایا کہ اوطاق میں مہمانوں کے ساتھ کھالیا تھا۔ شہر والی فیکٹری کا منیجر آیا ہوا تھا حساب کتاب دکھانے۔ بس اس کے ساتھ دماغ کھاتے کھاتے تھوڑی ٹھکن ہو گئی تو میں نے کہا تھوڑی دیر آرام کر لوں۔“ وہ بیٹی کو یہ تو نہیں بتا سکتے تھے کہ جو فیکٹری بیٹے کی ضد پر اس کے لیے لگائی تھی اور جسے اسی نے چلانا تھا، اس کا حساب کتاب خود دیکھنا اتنا تکلیف دہ عمل ثابت ہوا تھا کہ رگ و پے میں اداسی اور ٹھکن اتر آئی تھی اس لیے ہلکے پھلکے انداز میں بہانہ بنا گئے۔

”نہ تھکایا کریں خود کو اتنا بابا سائیں! ہمارے پاس جتنی دولت ہے، وہی کافی ہے۔ کیا کرنا ہے اس دولت کا

کرے گا تو اس کو اطلاع ہی دے دوں گی۔“ اس کی مصنوعی ہمدردی پر اصغر کا خون کھولنے لگا۔ ابھی تو امجد کی موت کا غم ہی دل پر تازہ تھا کہ مزید دو ساتھیوں کے مرنے کی اطلاع دی جا رہی تھی۔ وہ بھی ایسے زخموں پر نمک چھڑکنے کے انداز میں۔ شدید طیش میں وہ اس کے عورت ہونے کا لحاظ کیے بغیر اسے کوئی گالی ہی دینے لگا تھا کہ قریب سے گزرتے ایک لوڈنگ ٹرک کے ڈرائیور نے کان پھاڑ دینے والا زوردار ہارن بجایا۔ ہارن کی آواز اتنی تیز تھی کہ گاڑی کے سارے شیشے بند ہونے کے باوجود نہ صرف آواز انہیں سنائی دی بلکہ لہروں کے دوش پر سفر کرتی ہوئی میڈم ایکس تک بھی پہنچ گئی۔

”تم سفر میں ہو؟“ اس نے بے ساختہ چونک کر پوچھا۔

”تمہیں کوئی اعتراض ہے۔“ اصغر نے جیسے ہوئے

لہجے میں پوچھا۔

”اعتراض کیوں ہوگا۔ بس اس بات کا یقین ہو گیا ہے کہ لالہ بھی تمہارے ساتھ ہی موجود ہے۔ وہ سمجھ گیا ہوگا کہ میں اس کال کے ذریعے تم لوگوں کی لوکیشن ٹریس کرنے کی کوشش کر رہی ہوں اسی لیے تمہیں مل سے نکال کر باہر لے گیا ہے۔“ وہ اپنے ہر نئے جیلے سے اصغر کو چاروں شانے چت کر رہی تھی۔ اس بار بھی وہ حیران پریشان رہ گیا کہ اسے لالہ کے زندہ ہونے کی خبر کیسے ملی؟

”لوگ کہہ رہے تھے کہ اصغر کے کام کرنے کا انداز بالکل لالہ جیسا ہے اور مجھے وہیں شک پڑ گیا تھا کہ ہو نہ ہو، اس نامرادو کی کی طرح لالہ بھی زندہ ہے۔ خیر..... زیادہ دن تک نہیں رہے گا۔ مجھ سے ٹکر لینے کا نتیجہ اسے بھگتنا ہی پڑے گا۔ سن رہے ہو نا لالہ عیسیٰ.....! غدار کی معاف نہیں کروں گی میں۔“ اب وہ براہ راست لالہ سے مخاطب تھی۔ لالہ نے اصغر کو سلسلہ منقطع کر دینے کا اشارہ کیا۔

”توبہ، کیسی خراٹ عورت ہے۔“ اصغر نے ایک کان کو ہاتھ لگاتے ہوئے موبائل واپس اپنی جیب میں رکھنا چاہا۔

”اٹھا کر باہر پھینک دے اسے ورنہ وہ ڈائن اس کے ذریعے تیری گردن دیوچنے پہنچ جائے گی۔“ لالہ نے اسے ٹوکا اور گاڑی ایک کھلے مین ہول کے قریب لے جا کر روک دی۔ اصغر کا موبائل گندے پانی کی گہرائی میں پھنک کر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔

”سب ساتھیوں کو انڈر رگراؤنڈ ہونے کا بول دے۔ کوئی کسی سے نہیں ملے گا اور نہ آپس میں رابطہ کرے گا۔ نیا حکم ملنے تک ہر ایک خود پر سورج کی روشنی حرام کر لے۔“ وہ

جسے استعمال کرنے والے ہی موجود نہیں ہیں۔“ مولیٰ کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ وہ سب سے چھوٹی تھی اور کبھی کسی ذمے داری کا بوجھ نہیں اٹھاتا پڑا تھا لیکن اب تنہا دکھوں کا بوجھ اٹھانا پڑ رہا تھا۔

”ایسا نہ کہو مولیٰ! ان شاء اللہ ایک دن تمہاری ادوی، ادا اور اعظم واپس آئیں گے اور ہم سب پہلے کی طرح مل جل کر خوش باش زندگی گزاریں گے۔“

”کب آئیں گے وہ؟ آپ ان کی واپسی کے لیے کچھ کریں نا بابا سائیں!“

”میں پوری کوشش کر رہا ہوں میری دمی۔ تم رب سے دعا کرو کہ یہ مشکل وقت جلد از جلد گزر جائے۔“ صداقت شاہ کے پاس اسے بہلا دے دینے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ حکومت اور سیاسی ساتھیوں کی اکثریت نے پہلے ہی طوطا چشتی کا مظاہرہ کیا تھا اور اب جبکہ عالم و سرمد مفرد اور سبیل و اعظم غائب تھے، ان کا کیس بالکل ہی سرد خانے میں چلا گیا تھا۔

”دعا تو دن رات کرتی ہوں بابا سائیں! لیکن سچ یہ ہے کہ اماں سائیں کی حالت دیکھ کر میری ہمت ٹوٹنے لگتی ہے۔ وہ دن بہ دن اس غم میں گھلتی جا رہی ہیں اور میرے لیے ہر گزرتے دن کے ساتھ انہیں سنبھالنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر بھی ان کی طرف سے مطمئن نہیں ہے۔ بلڈ پریشر، شوگر کچھ بھی تو کنٹرول میں نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ اگر یہی صورت حال رہی تو معاملات مزید خراب بھی ہو سکتے ہیں۔“ بہن، بھائی کی جدائی کا غم جو تھا سو تھا، وہ ماں کی حالت کی وجہ سے بھی بہت پریشان تھی۔

”انہیں حوصلہ دیا کرو بیٹا! دوائیں تو پابندی سے کھلا رہی ہونا انہیں؟“

”میں جو کر سکتی ہوں، وہ سب کر رہی ہوں بابا سائیں! لیکن نہ میری دی تسلی میں اثر ہے، نہ دواؤں میں۔ ان کا علاج صرف یہی ہے کہ ادی سبیل اور ادا سائیں ان کی نظروں کے سامنے آجائیں۔“

”آئیں گے، ان شاء اللہ ایک دن ضرور آئیں گے۔“ ان کا ہاتھ اس کے سر پر جاٹکا۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی تو دونوں اس طرف متوجہ ہو گئے۔ اجازت دیے جانے پر ایک ملازمہ اندر داخل ہوئی۔

”رمضان یہ رجسٹری دے کر گیا ہے سائیں! کہہ رہا تھا کہ کہیں ہا ہر ملک سے آئی ہے اور اہم ہفتی ہے اس لیے فوراً وڈے سائیں کو دے دو۔“ اس نے ایک رجسٹر ڈاک کا

لفافہ ان کے سامنے رکھا۔

”ٹھیک ہے، میں دیکھ لوں گا۔ تم جاؤ۔“ انہوں نے اس سے کہا اور لفافہ الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے۔ لفافہ امریکا سے آیا تھا اور بھیجنے والی کا نام اجالا نیاز شاہ درج تھا۔ حیرت اور جوش کی ملی جلی کیفیت میں انہوں نے لفافہ کھولا۔ لفافے کے اندر ایک خط کے علاوہ سربہ مہر لفافہ بھی موجود تھا۔ انہوں نے وہ لفافہ کھولنے سے پہلے خط پڑھنے کا فیصلہ کیا۔ اجالا نے رومن اردو کا استعمال کرتے ہوئے لکھا تھا۔

”چاچا سائیں!

آداب!

آپ کی خیریت پوچھنے کی تو ہمت نہیں ہے مجھ میں کہ اندازہ ہے جو کچھ آپ کے ساتھ بیٹا، وہ اتنا تکلیف دہ ہے کہ کوئی بھی والدین اسے سہہ نہیں سکتے۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ بے در پے انہوں کو کھونے کے بعد میں اس تکلیف کو بھگنے کے لائق ہو گئی ہوں جس سے آپ اور دیگر گھر والے گزر رہے ہیں۔ فردوس بھابی کے خون ناحق کا بدلہ کھیل بھائی اور لیلیٰ بھائی کے خون سے ادا ہوا اور اباجی اپنے سامنے اپنی اولاد کے جانے کا دکھ نہ سہہ کر قبر میں جا لیٹے۔ بیک وقت اتنی اموات نے مجھ سمیت پورے پر یوار کو ہی نکمیر کر رکھ دیا ہے۔ فیصل بھائی کی حالت سب سے زیادہ تباہ ہے۔ وہ مرنے سے توجھ گئے ہیں لیکن حالت مُردوں سے زیادہ خراب ہے۔ گولی کا زخم کسی طور ٹھیک ہونے کا نام نہیں لیتا۔ زندگی بچانے کے لیے ڈاکٹر ز نے گھٹنے سے اوپر ٹانگ کاٹ دی ہے لیکن اب وہ ٹھیک ہوتے دکھائی نہیں دے رہے۔ جب درد حد سے بڑھ جائے تو بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگتے ہیں اور پکار پکار کر سبیل سے معافیاں مانگتے ہیں۔ انہیں لگتا ہے کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے، وہ سبیل جیسی مظلوم لڑکی پر ظلم کا نتیجہ ہے۔ مجھے بھی ان کے اس خیال سے اتفاق ہے۔ اس لیے مدد دے کے لیے انہیں ایک مشورہ دیا ہے۔ میرے مشورے پر عمل کرتے ہوئے انہوں نے جو دوسرا لفافہ بھیجا ہے، اسے آپ میرا خط پڑھنے کے بعد دیکھ لیجیے گا۔

مجھے اعتراف ہے چاچا سائیں کہ ہم سب نے ہی کہیں نہ کہیں آپ کو دکھ دیا ہے اور ہم سب ہی آپ کے مجرم ہیں لیکن ہمیں اس بات کا احساس اتنی دیر سے ہوا ہے کہ ہمارے لیے شاید معافی کی گنجائش بھی ختم ہو گئی ہے اور ہم سب اپنے اپنے جیسے کی سزا بھگت رہے ہیں۔ وہ حویلی جہاں بے حد رونق ہوتی تھی، کسی قبرستان کی طرح لگنے لگی ہے۔

اس قبرستان میں رہنا دن بہ دن مشکل ہوتا جا رہا تھا اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ فیصل بھائی اور جلیل بھائی کے بچوں کے ساتھ امریکا منتقل ہو جاؤں۔ ہو سکتا ہے امریکا میں فیصل بھائی کا مناسب علاج ہو جائے۔ ابھی یہاں کے ڈاکٹروں نے بھی کوئی حتمی جواب نہیں دیا ہے لیکن کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔ فر دوس بھابی اور جلیل بھائی کی بچیوں کو میں نے یہاں اچھے تعلیمی اداروں میں داخل کروا دیا ہے۔ بچیاں ماں باپ دونوں کے ایک ساتھ چلے جانے پر اداس اور تنہا ہو گئی ہیں لیکن مجھے امید ہے کہ جلد نئے ماحول میں بھل جائیں گی۔ میں ہم میں سے کسی کے لیے بھی آپ سے معافی نہیں مانگتی چاچا سائیں! پر ان بچیوں کی آسانی اور اچھے مستقبل کے لیے ضرور دعا کیجیے گا کہ ان کی ماں وہ واحد ہستی تھی جس نے سب کے لیے اپنی بساط سے بڑھ کر ہمدردی کی اور شاید اسی ہمدردی میں ہی ماری گئی۔

جانے خدا ہم گناہ گاروں کی سزا ہے یا نہیں مگر میں آپ کو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ ان معصوم بچیوں کے ساتھ ساتھ میں اور فیصل بھائی بھی آپ کے حق میں بہت دعائیں کرتے ہیں اور اللہ سے التجا کرتے ہیں کہ آپ کو آپ کی اولاد سے ضرور ملوائے۔ جس دن وہ لوگ آپ سے آن ملیں گے، مجھے لگے گا ہمارے لیے بھی معافی کا کوئی در کھل گیا ہے۔

والسلام

آپ کی گناہ گار

اجالا نیاز شاہ

صداقت شاہ کو احساس ہی نہیں تھا کہ اس خط کو پڑھتے ہوئے ان کی آنکھوں سے مسلسل آنسو برس رہے ہیں اور مول ان آنسوؤں سے پریشان ہو رہی ہے۔ خط ختم کر کے وہ ہچکیوں پر اتر آئے تو مول میں بھی ضبط کا یار نہ رہا اور انہیں جھنجھوڑتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”کیا ہوا ہے بابا سائیں! کچھ تو بتائیں کہ اس خط میں کیا لکھا ہے اور اسے کس نے بھیجا ہے کہ آپ اسے پڑھ کر یوں بے قرار ہو گئے ہیں؟“

”تم خود پڑھ کر دیکھ لو۔“ صداقت شاہ نے خط اسے تھا دیا جسے وہ ان کی پائنتی پر بیٹھ کر پڑھنے لگی۔ خط پڑھ کر اس کی اپنی آنکھوں سے بھی اشک سِل رواں کی طرح برسنے لگے۔

”جانے کتنا ظلم سہا وہاں میری مظلوم بیٹی نے کہ ظالموں کی اتنی سخت پکڑ ہوئی ہے۔ یا اللہ! اب میری بیٹی کی مشکلات دور کر دے اور اسے مجھ سے ملو دے۔“ صداقت

شاہ تڑپ کر دعا مانگنے لگے۔ مول دعا اور اشک بہانے میں ان کے ساتھ ساتھ تھی اور دل ہی دل میں شکر ادا کر رہی تھی کہ سکینہ شاہ دعا کے زیر اثر گہری نیند سو رہی ہیں ورنہ اگر اس وقت وہ یہاں ہوتیں تو ان کا کلیجہ ہی پھٹ جاتا۔

”اس خط کو سنبھال کر میرے لاکر میں رکھ دینا بیٹا! تمہاری ماں یہ خط نہ ہی دیکھیں تو مناسب ہے۔“ صداقت شاہ نے اسے ہدایت دی اور خود دوسرا لفافہ کھول کر اس کے اندر سے پرآمد ہونے والے کاغذات کا جائزہ لینے لگے۔ ایک بڑی رقم کا چیک تھا، دوسرا طلاق نامہ اور تیسرا ایک مختصر سا خط۔ خط میں سلام دعا کے بعد فیصل نے لکھا تھا۔

”میری ذات سے سب کو کبھی کوئی سکھ نہیں ملا اس لیے میں چاہتا ہوں کہ جب وہ آپ سے ملے تو کم از کم اس ناپسندیدہ بندھن کی قید سے آزاد ہو۔ میرا جرم قابل معافی ہوتا تو آپ لوگوں سے معافی بھی مانگ لیتا۔ اب تو بس یہی کہہ سکتا ہوں کہ جس نے دنیا بنائی ہے، وہ اپنے مظلوم بندوں کا بدلہ خود لے لیتا ہے اور اس کا لیا بدلہ سب سے سخت ہوتا ہے۔“

”بے شک میرے رب! تجھ سے بڑھ کر تو کوئی مہربان ہے نہ مظلوم کی دادرسی کرنے والا۔ میں تیرے عدل کی گواہی دیتا ہوں اور آگے بھی تجھ سے ہی اپنے دکھوں کا علاج مانگتا ہوں۔“ عاجزی صداقت شاہ کے مزاج کا حصہ تھی لیکن آج تو وہ اپنے رب کے احسان تلے جھکے ہی جا رہے تھے۔ مول نے ان کے ہاتھ سے تینوں چیزیں لے کر ان کا جائزہ لیا۔ طلاق نامہ پڑھتے ہوئے اس کا دل تھوڑا سا کانپا کہ کچھ بھی سہی، طلاق ہمارے معاشرے میں ہمیشہ ناپسندیدہ اور دکھ دینے والی شے رہی ہے لیکن پھر اس نے خود کو سنبھال لیا۔ سبیل مجبوری میں جوڑے گئے ایک ناپسندیدہ اور تکلیف دہ بندھن سے نجات پا گئی تھی۔ اس سکون کے مقابلے میں طلاق کی تکلیف کچھ بھی نہیں تھی۔ وہ لوٹ کر ان کے درمیان واپس آ جاتی تو اس تکلیف کو بھلا کر دوبارہ ایک نئی اور اچھی زندگی شروع کی جاسکتی تھی۔

”سائیں! فرقان شاہ تشریف لائے ہیں۔“ مول نے ابھی سارے کاغذات سمیٹ کر رکھے ہی تھے کہ ملازم نے آکر اطلاع دی۔

”ادافرقان اس وقت.....؟“ صداقت شاہ نے اس اطلاع کو حیرت سے سنا۔ معظم شاہ کی موت کے بعد فرقان شاہ نے خود کو تقریباً اپنی حویلی تک ہی محدود کر لیا تھا اور جب سے سبیل کا فیصل سے نکاح ہوا تھا، وہ بالکل بھی ان سے ملاقات

کے لیے نہیں آئے تھے۔ حالات کی نزاکتیں اپنی جگہ تھیں لیکن انہیں اس بات کا شدید غم تھا کہ اس نکاح کے نتیجے میں ان کے معظم کی نشانی اور ان کا اکلوتا وارث ان سے دور ہو گیا ہے۔ صداقت شاہ ان کے جذبات کو سمجھتے تھے اس لیے ان کے ان اعتراضات کا بھی برا نہیں منایا تھا۔

”انہیں عزت سے بٹھاؤ، ہم ابھی آرہے ہیں۔“ انہوں نے ملازمہ کو حکم دیا پھر اس کے جانے کے بعد مول کو مخاطب کر کے اس سے بولے۔

”اپنی نگرانی میں چائے پانی کا انتظام کرواؤ بیٹا! تمہارے ماموں سائیں کی خاطر مدارت میں کوئی کسر باقی نہیں رہنا چاہیے۔“

”جی بابا سائیں!“ وہ فرمانبرداری سے کہتے ہوئے باہر نکل گئی۔ صداقت شاہ نے بھی ڈرائنگ روم کا رخ کیا۔

”مجھے تمہیں یہاں دیکھ کر بہت اچھا لگا فرقان شاہ! تمہاری ادی کو بھی تمہارے آنے کی خبر ہوگی تو بہت خوش ہوگی۔“ انہوں نے باقاعدہ بغل گیر ہو کر فرقان شاہ کا خیر مقدم کیا اور زبان سے بھی ان کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا۔

”ادی کی طبیعت کیسی ہے؟“

”طبیعت تو مستقل ہی خراب رہنے لگی ہے۔ آج بھی بلڈ پریشر بہت بڑھا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے ہی مول نے دوا دے کر سلا یا ہے ورنہ وہ تو خود تمہارے آنے کی خبر سن کر دوڑی ہوئی آتی۔“ صداقت شاہ نے اداسی سے جواب دیا۔

”عم کا پہاڑ ہی ایسا ٹوٹا ہے میری ادی پر۔ جیتے جی اس کے دو جوان بچے اور نواسہ اس سے جدا ہو گئے ہیں۔ وہ بے چاری صبر کرے بھی تو کس کس پر کرے۔“ اگرچہ فرقان شاہ جانتے تھے کہ جو کچھ ہوا، اس میں صداقت شاہ کا کوئی قصور نہیں تھا پھر بھی ان کے لہجے میں ایک شکوہ سا تھا۔

”نقدیر جو بھی امتحان انسان کے نصیب میں لکھ دے، ہر ایک پر صبر کرنا پڑتا ہے فرقان شاہ! داویلا کرنے سے آدمی کو آزمائش اور تکلیف سے نجات نہیں ملتی لیکن وہ صبر کے اجر سے محروم ہو جاتا ہے۔“ صداقت شاہ نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

”ایسا صبر تو نبیوں اور ولیوں میں ہی ہوتا ہے۔ ہم عام سے بندے بھلا ایسا کہاں کر سکتے ہیں۔“ فرقان شاہ کے الفاظ نے واضح کر دیا کہ وہ ان کی نصیحت قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ صداقت شاہ نے بھی زیادہ زور دینا مناسب نہیں سمجھا اور موضوع بدلتے ہوئے بولے۔

”اور سناؤ۔ تمہاری زمینداری کیسی چل رہی ہے؟“

لطیف سومرو کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس کے بعد تمہاری مشکل تو آسان ہو گئی ہوگی؟ کبخت اس لائق ہی نہیں رہا کہ اپنی مکاری اور بے ایمانی سے دوسروں کو تنگ کر سکے۔“ لطیف سومرو نہ صرف سیاست کے میدان میں ان کے لیے کانٹے بچھاتا تھا بلکہ زمینداری میں بھی آئے دن کوئی نہ کوئی تنازع کھڑا رکھتا تھا جس کی وجہ سے فرقان شاہ کو دشواری پیش آتی تھی۔ خصوصاً پانی کے معاملے میں تو وہ انہیں بہت ہی تنگ کرتا تھا جس سے ان کی فصل پر برا اثر پڑتا تھا۔

”زمینداری ٹھیک چل رہی ہے لیکن سومرو کے بستر سے لگنے سے جن کے کاموں میں رکاوٹ آرہی ہے، وہ اس کا نعم البدل چاہتے ہیں۔“

”کیا مطلب؟“ فرقان شاہ کے جواب نے انہیں چونکایا۔

”مطلب بتانے سے پہلے میں آپ کو کچھ دکھانا چاہتا ہوں ادا سائیں!“ فرقان شاہ کا انداز کچھ پراسرار سا تھا۔ اس بار صداقت شاہ کوئی سوال کیے بغیر تجسس آمیز نظروں سے ان کی طرف دیکھتے رہے۔

”یہ تصویریں دیکھیے ادا سائیں!“ فرقان شاہ نے اپنے موبائل کی اسکرین پر اٹھائیاں چلاتے ہوئے ان سے کہا اور اسکرین ان کے سامنے کی۔ اسکرین پر ایک صحت مند اور خوبصورت بچے کی تصویر موجود تھی۔

”یہ کون ہے؟“ وقت خاصا آگے بڑھ گیا تھا اس لیے صداقت شاہ پہلی نظر میں تصویر میں موجود بچے کو شناخت نہ کر سکے۔

”اس کے نین نقش آپ کو کچھ نہیں بتا رہے جو آپ مجھ سے پوچھتے ہیں؟“ فرقان شاہ نے شکوہ کیا۔

”اعظم!“ صداقت شاہ نے پہچان کا مرحلہ طے کر لیا۔ ”کہاں ہے یہ؟ اس کی تصویر کہاں سے ملی تمہیں؟“ انہوں نے فرقان شاہ کے ہاتھ سے موبائل جھپٹ لیا تھا اور تصویر کو غور سے دیکھتے ہوئے بے قراری سے پوچھ رہے تھے۔

”کہاں ہے، یہ تو میں بھی نہیں جانتا لیکن یہ جانتا ہوں کہ اگر آپ اپنے اصولوں میں ذرا سی لچک پیدا کر لیں تو میں اپنے معظم کی نشانی کو واپس حاصل کر سکتا ہوں۔“

”کیا مطلب؟ کیا کہنا چاہتے ہو؟“ صداقت شاہ کو احساس ہوا کہ فرقان شاہ کسی غیر معمولی مطالبے کے ساتھ ان کے پاس آئے ہیں۔

”میں آپ سے بس یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرا اکلوتا بیٹا مجھ سے جدا ہو کر ایسی دنیا میں جا چکا ہے جہاں سے وہ بھی

لوٹ کر واپس نہیں آئے گا لیکن یہ..... یہ جو میرے بیٹے کی آخری نشانی ہے، اسے میں آپ کے تھوڑے سے تعاون سے دوبارہ حاصل کر سکتا ہوں۔“

”کیا شرط رکھی گئی ہے اس کی واپسی کی؟“ صداقت شاہ نادان نہیں تھے جو سمجھ نہ پاتے کہ اعظم کی واپسی کے بدلے میں کوئی مطالبہ رکھا گیا ہے۔ کوئی ایسا مطالبہ جسے پورا کرنا اکیلے فرقان شاہ کے بس کی بات نہیں۔

”وہ شرط تو میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا لیکن پہلے آپ یہ جان لیں کہ اگر ہم نے ان کی بات نہ مانی تو وہ ایک ایک کر کے باری باری کھڑوں میں اعظم کو ہمیں لوٹائیں گے۔ میں اپنے جگر کے کڑے کو کھڑوں میں دیکھنے سے پہلے ہی مرجاؤں گا ادا سائیں.....!“ فرقان شاہ بولتے بولتے نہ صرف رو پڑے بلکہ اپنے دونوں ہاتھ بھی ان کے سامنے جوڑ دیے۔ صداقت شاہ کو لگا جیسے کسی نے ان کے ہاتھ پاؤں باندھ کر انہیں بالکل بے بس کر دیا ہے۔

☆☆☆

رات گہری ہو چکی تھی۔ معاذ بستر پر چت لیٹا حالات کے اتار چڑھاؤ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کے لیے زندگی کا ہر گز رتا دن عجیب سی پہل لے کر آتا تھا۔ وہ دن خواب ہو گئے تھے جب وہ اپنے آرام دہ گھر میں ماں باپ اور بہن بھائی کی محبتوں کے درمیان سکون سے رہا کرتا تھا۔ اب تو پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ سورج طلوع ہوگا تو وہ کس مقام اور کن لوگوں کے درمیان موجود ہوگا۔

”اب گھبراتے کیوں ہو معاذ میاں! یہ تم ہی تو تھے جسے اپنی پرسکون زندگی میں قرار نہیں تھا۔ ہر روز نئی تبدیلی، نئے تجربے اور نئے مشغلے کی تلاش میں رہتے تھے۔ اب ہر دن تبدیلی اور تجربے کا ہے تو تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔“ کسی نے اس کے اندر سے اسے ٹوکا تو وہ چونک گیا۔ واقعی جو کچھ ہو رہا تھا، اس کی فطرت کے عین مطابق ہی تو ہو رہا تھا پھر وہ ان حالات سے گھبرانے کیوں لگتا تھا۔

”یہ گھبراہٹ اس لیے ہے کہ پہلے ہر تبدیلی اور تجربہ تمہاری مرضی پر منحصر ہوتا تھا۔ اب تم قسمت کے رگڑے میں آگئے ہو اور تمہاری مجبوری ہے کہ قسمت تمہیں جہاں لے جائے، وہاں چل پڑو۔“ سارے جوابات اس کے اندر ہی موجود تھے۔

”میں تیری کبھی تقدیر پر راضی ہوں میرے مالک! بس مجھ پر اتنا احسان کرنا کہ میری زندگی کو رانگاں نہ کرنا۔“ اس نے بہت دل سے دعا مانگی اور ایک بار پھر موجودہ

صورت حال پر غور کرنے لگا۔ اس کا آج کا دن خاصا مصروف گزرا تھا۔ یوان منگ (وید) نے اس سے طویل ملاقات کی تھی۔ اس ملاقات میں سونیا اور سبیل کی صحت پر ہونے والی گفتگو بیچنگ منطقی تنقید چلی گئی تھی۔ سونیا کی طرف سے تو یوان منگ پوری طرح مطمئن تھا کہ وہ صحت یاب ہو رہی ہے لیکن سبیل کے بارے میں اسے تشویش تھی اور طے پا گیا تھا کہ اسے بیچنگ بھجوا کر وہاں اس کی سرجری کے متعلق حتمی فیصلہ کیا جائے گا۔

معاذ نے اس سے سبیل کے بیٹے اعظم کی تلاش کے سلسلے میں بات کی تھی۔ وہ اعظم کی تلاش میں دوبارہ بھارت جانا چاہتا تھا لیکن یوان منگ نے انکار کر دیا تھا۔ اس کے مطابق شین یا ہی نے اسے پیغام بھجوایا تھا کہ ان سب کو بیچنگ بھجوا دیا جائے۔ اعظم کی تلاش کا کام انہوں نے خود اپنے ذمے لے لیا تھا۔ بیچنگ پہنچنے کے بعد ان کے ساتھ کیا سلوک ہوتا، یہ طے نہیں تھا لیکن یوان منگ نے اسے اشارہ دیا تھا کہ وہاں ان سے کوئی اہم کام لینے کا سوچا جا رہا تھا۔

یوان منگ سے ملاقات کے بعد اس نے پہلے سونیا سے مختصر ملاقات کی تھی۔ اس ملاقات میں سونیا نے زبان سے کچھ نہیں کہا تھا، بس اس کی آنکھوں کی نمی نے بتایا تھا کہ وہ معاذ سے شرمندہ ہے۔ معاذ نے بھی اس کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے گفتگو کو اس کی خیریت معلوم کرنے سے آگے نہیں بڑھایا تھا اور عالم شاہ کے پاس اٹھ آیا تھا۔

اس روز اس نے عالم شاہ کو سبیل کی مکمل کیفیت سے آگاہ کرتے ہوئے یوان منگ کی رائے اور بیچنگ میں سرجری کے امکانات کے بارے میں مکمل معلومات فراہم کی تھیں۔ عالم شاہ ایک تو خود نمی تھا پھر بہن کے بارے میں تفصیل جان کر بالکل ہی ڈھے گیا تھا۔ اسے رہ رہ کر یہ غم ستاتا تھا کہ سبیل نے ساری قربانی اس کی خاطر دی اور فیصل جیسے شخص کو اپنی زندگی کا حصہ بنالیا۔ فیصل کسی گھن کی طرح اس کی بہن کی زندگی کو کھایا گیا تھا۔ معاذ سے جتنا ممکن ہوا، اسے تسلی بخشی دی اور پیشکش کی کہ اگر وہ چاہے تو کسی طرح اس کی سبیل سے ملاقات کروادی جائے لیکن عالم نے انکار کر دیا۔ اسے اندیشہ تھا کہ ملاقات کی صورت میں سبیل اس سے اعظم کے بارے میں پوچھے گی اور وہ اسے اس کے سوال کا جواب نہیں دے سکے گا۔ یہی خوف خود معاذ کے دل میں بھی تھا اس لیے یوان منگ کی زبانی سبیل کے ہوش میں آجانے کی اطلاع سن کر بھی اس کے سامنے جانے کی ہمت نہیں کر سکا تھا اور اب رات کی تنہائی میں بستر پر کروٹیں بدلتا

تھا؟ میں چاہتا ہوں کہ جب میڈم ایکس ہمارا بھیجا ہوا پارسل وصول کرے تو ہمارے سارے کام منٹ چکے ہوں۔ وہ عورت غصے میں پلٹ کر جوابی دار ضرور کرے گی۔“

”سامان شفٹ ہو گیا ہے اور سارے بندے بھی انڈر گراؤنڈ ہو گئے ہیں۔ میڈم ایکس نے حملہ کیا بھی تو خالی پتھروں سے سر کھرا کر رہ جائے گی۔“ اصغر نے رپورٹ پیش کی اور جھجکتے ہوئے بو چھا۔

”رواگی سے کل پارسل کا جائزہ لینا پسند کریں گے آپ؟“

”بالکل۔“ لالہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ گزرے

دنوں میں اس کا وزن خاصا کم ہوا تھا اور اس کے پیچھے اس کی مسلسل محنت تھی۔ غذا، دوا، ورزش..... ساری ترکیبیں لڑاکی تھیں اس نے اپنا وزن کم کرنے کے لیے اور اب اس کا نتیجہ سامنے آنے لگا تھا۔ مثلاً پانچ ہونے سے وہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ جوان اور کم عمر بھی لگنے لگا تھا۔ شخصیت میں آنے والی یہ تبدیلی محض ظاہری نہیں تھی۔ لالہ محسوس کر رہا تھا کہ اضافی وزن سے جان چھڑانے کے بعد وہ زیادہ چست اور پھرتیلا ہو گیا ہے۔ اب بھی وہ بہت آرام سے اصغر کے ساتھ چلتا ہوا سڑکیاں اتر کر یہ خانے میں پہنچ گیا۔ یہاں ایک لاغر سا شخص ٹنگی باندھے داخلی راستے کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔

”کیسے ہو حامد! تمہیں معلوم ہے تاکہ ہم تمہیں تمہاری میڈم کے پاس واپس بھجوانے والے ہیں۔“ لالہ نے اس کے سامنے کھڑے ہو کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ جواب میں محض حامد کی آنکھوں کا تاثر بدلا۔ اس تاثر میں غصہ، بے بسی، جھنجھلاہٹ اور خوف، سب ہی کی آمیزش تھی۔

”میں تمہارے ساتھ یہ سلوک نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن تم نے خود ہی اپنے لیے گڑھا کھود لیا۔“ لالہ نے اس کی حالت پر تاسف کا اظہار کیا۔ حامد فرار کی کوشش میں اس انجام کو پہنچا تھا۔ بلندی سے گرنے کے باعث اس کی ریڑھ کی ہڈی کو نقصان پہنچا تھا اور سارا جسم مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ اپنے پورے جسم میں آنکھ کی پٹیوں کے سوا کسی حصے کو حرکت نہیں دے سکتا تھا اور اکثر شدید ذہنی اور جسمانی اذیت سے گھبرا کر بچوں کی طرح رونے لگتا تھا۔ بطور انسان لالہ کو اس کا حال دیکھ کر افسوس ہوتا تھا لیکن وہ اس کے لیے کچھ کرنے سے قاصر تھا چنانچہ اسے میڈم ایکس کے پاس روانہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ ساری زندگی جس کی چاکری کرتا رہا تھا، اب اسی کی ذمہ داری تھی کہ اسے اس کی خدایا کے صلے میں لہاڑے۔

بے ربط سوچوں میں گھرا ہوا تھا۔ رات کتنی گزر چکی تھی، اسے اندازہ نہیں تھا لیکن یہ جانتا تھا کہ کل انہیں نئے سفر کا آغاز کرنا ہے۔ سفر کے لیے ضروری تھا کہ جسمانی حالت اچھی ہو۔ اس لیے اس نے فیصلہ کیا کہ اپنے دماغ کو پرسکون نیند کی ہدایت دے کر خود کو تازہ دم کرنے کا بندوبست کرے۔ ابھی اس نے اس کام کا آغاز کیا ہی تھا کہ ایک کان پھاڑ دھا کا ہوا اور زمین لرز کر رہ گئی۔

☆☆☆

”نبی اور موجود عرفان اللہ کے پاس بھجوادیا؟“

”بھجوادیا لالہ! لیکن.....“

”لیکن کیا؟“

”عرفان اللہ زیادہ خوش نہیں ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ لڑکے بہت کم عمر اور نا تجربہ کار لگتے ہیں۔ اسے امید نہیں کہ دونوں اس کی مرضی کا کام کر سکیں گے۔“ اصغر نے مسئلہ بتایا۔ ”اس سے کہو یہ لالہ کے پٹھے ہیں اور جسے لالہ تربیت دے، وہ چاہے چھوٹے سے چھوٹا ہی ہو، باون گز کا کھتا ہے۔“ لالہ کے لہجے میں بھرپور اعتماد تھا۔

”اصل میں لڑکوں کی صورتیں انجانی ہیں اور کسی نے ابھی تک ان کا کوئی کارنامہ دیکھا نہیں ہے۔ اس لیے عرفان اللہ بھروسہ کرنے میں ہچکچا رہا ہے۔“ اصغر نے اصل مسئلے کی نشاندہی کی۔

”ان کی اسی خصوصیت کی وجہ سے تو انہیں عرفان اللہ کی طرف بھیجا ہے۔ عرفان اللہ کو بھی تنبیہ کر دینا کہ لڑکوں کے سلسلے میں منہ سے بھاپ نہ نکالے۔ کسی کو خبر ہوئی کہ ان لڑکوں کا تعلق ہم سے ہے تو خود اس کی خیر نہیں ہوگی۔“

”فکر دہ سرکار! سب کچھ پہلے ہی بتا دیا ہے۔“ اچھی بات ہے۔ نبی اور موجود سے کہنا کہ روز کے روز پابندی سے رپورٹ دیں۔“

”کہہ دیا تھا۔ ایک بار اور تاکید کر دوں گا سالوں کو۔“ احتیاط کے باوجود اصغر کی زبان سے بھی لالہ کے سامنے بھی گالی نکل جاتی تھی۔

”حالات نے ہمارے ہاتھ پیر باندھ دیے ہیں اور صرف اس امید پر کہ عرفان اللہ کا بھی میڈم سے تعلق ہے، میں نے ان لڑکوں کو وہاں بھجوادیا ہے۔ یہ لڑکے کوئی کام کی بات نکال کر لے آئے تو محنت وصول ہو جائے گی۔“

”اللہ نے چاہا تو کوئی نہ کوئی راہ ضرور نکلے گی۔“ اصغر نے تسلی دی۔

”تم نے وہاں اڑے سے ضروری سامان، کھانا لیا

لیے کورٹ لے جائیں گے تو کام ہو سکتا ہے لیکن کام میں ہاتھ ڈالنے والوں کو جان ہتھیلی پر رکھنا ہوگی۔“

”جان ہتھیلی پر رکھنے والوں کو منہ مانگا معاوضہ دینے کی پیشکش کرو۔ جتنی بھی رقم خرچ ہوگی، سب میری ذمہ داری ہے۔“ دیوا کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے لالہ نے پیشکش کی۔

”تم انتظار کرو۔ میں کام ہونے کے بعد تمہیں بتاتا ہوں۔“ دیوانے گویا کام کرنے کی ہامی بھری۔ لالہ سلسلہ منقطع ہونے کے بعد ایک صوفے پر ٹم مٹ سا بیٹھ گیا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اتنی بھاگ دوڑ کے بعد بھی وہ اپنے دکان کی تک پہنچ سکے گا یا نہیں لیکن معمولی سے معمولی امکان کو بھی رد کرنا اس کے بس میں نہیں تھا۔

☆☆☆

ایک کے بعد ایک ہونے والے دھماکوں کے تسلسل میں گولیوں کی تڑتڑاہٹ بھی شامل تھی اور بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے دو فوجیں آپس میں ٹکرائی ہوں۔ معاذ نے پھرتی سے بستر چھوڑا اور غار سے باہر کی طرف لپکا۔ باہر نکلتے ہی اس کا زانگ تاؤ سے ٹکراؤ ہو گیا۔

”یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“

”کسی نے اچانک حملہ کر دیا ہے۔ اچھی بات یہ ہے کہ اوپر ہمارے آدمی ٹکرائی پر موجود تھے اور انہوں نے حملہ آوروں کو دیکھ لیا ورنہ وہ جس طرح زانگ سے آئے ہیں، ہم بے خبری میں مارے جاتے۔ اب بھی ان کی عددی برتری کے کارن ہمیں تھوڑی مشکل پیش آرہی ہے۔“ زانگ تاؤ نے اس کے سوال کے جواب میں پوری تفصیل سنا ڈالی۔

”اگر چاہو تو میں اور میرے ساتھی تم لوگوں کی مدد کر سکتے ہیں۔ ہمیں اسلحے کے استعمال میں مہارت حاصل ہے۔“ معاذ نے پیشکش کی۔

”ہمیں ضرورت ہے۔ تم میرے ساتھ آؤ۔“ مضطرب سے زانگ تاؤ نے اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ اس کے ساتھ مرکزی جھونپڑے میں پہنچا تو وہاں شین یا ہی موجود تھا اور کسی مواصلاتی آلے کے ذریعے اپنے ساتھیوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ زانگ کے ساتھ اسے آتا دیکھ کر اس نے زانگ کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”یہ ہماری مدد کرنا چاہتا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اسے اور اس کے ساتھیوں کو اسلحے کے استعمال میں مہارت حاصل ہے۔“ زانگ نے اسے بتایا تو اس نے ایک پل کے لیے معاذ کو غور سے دیکھا اور پھر بولا۔

”اگر یہ کچھ بتانے کے لائق ہوتا تو میں اسے اس بچے کی تصویر بھی دکھا کر اس کے متعلق پوچھتا جو نہ جانے کہاں سے میڈم ایکس کے قبضے میں آ گیا ہے۔“ اصغر نے حامد کو دیکھتے ہوئے حسرت سے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

”یہ تو اب اپنا نام بھی بتانے کے لائق نہیں رہا ہے۔ کسی دوسرے کے متعلق خاک کچھ بتائے گا۔“ لالہ کو خود بھی اس بچے کی طرف سے تجسس تھا جس کی تصویریں مرنے سے پہلے پرویز نے بھجوائی تھیں لیکن وہ اس بات کو سمجھتا تھا کہ حامد کچھ بھی بتانے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔

”مجھے اپنے قیمتی ساتھیوں کے جانے کا دکھ نہیں بھولا۔ جن معلومات کو ہم تک پہنچانے کی کوشش میں انہوں نے اپنی جانیں گنوائیں، وہ ہی عمل ہو جائیں تو غم تھوڑا کم ہو جاتا۔“

”وقت سارے زخم سی دے گا۔“ لالہ نے اس کا شانہ تھپکا اور تہ خانے سے باہر کا رخ کیا۔ ابھی وہ اوپر پہنچا ہی تھا کہ اس کے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے آنے والی کال کا نمبر دیکھا اور کال ریسیو کر لی۔

”تیرے لیے ایک انفارمیشن تھی تو سوچا کال کر کے بتا دوں۔“ دوسری طرف دیوا تھا۔

”ضرور بتاؤ۔“

”پولیس کسٹڈی میں اس پٹھان لڑکے گل خان کو مارنے کی کوشش کی گئی ہے۔“ دیوانے ہم پھوڑا۔

”یہ کیا کہہ رہے ہو؟“

”جو سچ ہے، وہی کہہ رہا ہوں۔ پٹھان کے کھانے میں زہر ملایا گیا تھا۔ اس کی قسمت اچھی تھی کہ بھوک نہ ہونے پر اس نے اس دن اپنا کھانا نہیں کھایا اور کسی دوسرے ساتھی کو دے دیا۔ اس کا کھانا کھانے والا منٹوں میں چٹ پٹ ہوا ہے۔ سب ہی کہہ رہے تھے کہ کوئی بہت ہی تیز زہر ملا تھا اس کے کھانے میں۔“

”پولیس نے انکوائری نہیں کی اس معاملے کی؟“

”کیا بچوں جیسی باتیں کر رہے ہو لالہ! میں اور تم اچھی طرح جانتے ہیں کہ پولیس کی اپنی انوائسٹ کے پتہ یہ کام ہو ہی نہیں سکتا تھا، پولیس نے انکوائری خاک کرنا تھی۔ زہر کا معاملہ گول کر کے مرنے والے کی موت کو پیسے کے کھاتے میں ڈال دیا۔“

”اس پٹھان کو پولیس کسٹڈی سے لکواؤ دیوا! لالہ مضطرب ہوا۔“

”کالنا زیادہ مشکل نہیں۔ دو دن بعد اسے پیشی کے

”ٹھیک ہے۔ اس کے ساتھیوں کو بھی بلوالو۔“

کچھ دیر میں دکی اور جادو بھی وہاں آچکے تھے۔ انہیں برف میں استعمال ہونے والے لباس، دستاں اور جوتے وغیرہ فراہم کیے گئے اور موقع دیا گیا کہ وہ اپنی پسند کے حساب سے اسلحے کا انتخاب کر لیں۔ معاذ نے اپنے لیے ایک بریٹا، نسل اور سیون ایم ایم رائفل کا انتخاب کیا۔ تقریباً ہزار گز تک مار کرنے والی یہ رائفل اپنی مار اور نشانے کی درستگی کے اعتبار سے بے مثال تھی اور اسے امید تھی کہ وہ اس سے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔ ان تینوں کو ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ موصلاتی آلات بھی فراہم کیے گئے اور الگ الگ سستوں میں بھیجا گیا۔ یقیناً وہ انہیں ساتھ رکھنے میں ہچکچاہٹ کا شکار تھے اور انہیں آپس میں اتحاد کر کے کسی سازش کے لیے موقع نہیں دینا چاہتے تھے۔

معاذ کو مشرقی پہاڑ کی طرف بھیجا گیا تھا جہاں پہلے ہی دو افراد ایک بڑے سے پتھر کی آڑ میں مورچا بنائے فائر کر رہے تھے۔ ان تک پہنچنے کے لیے اسے رینگ کر جانا پڑا تھا کیونکہ اس طرف مسلسل فائر آرہا تھا اور ذرا سی بداحتیاطی اس کی جان بھی لے سکتی تھی۔ وہ ان دونوں کے ساتھ شامل ہوا تو دیکھا کہ انہوں نے ٹائٹ ویشن گاگلز پہن رکھے ہیں۔ یقیناً ان لوگوں کے پاس ان گاگلز کی محدود تعداد تھی ورنہ اسے اور اس کے ساتھیوں کو ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ وہ بھی فراہم کر دی جاتیں۔ اندھیرے میں ان گاگلز کے بغیر وہ محض اندازے پر ہی فائر کر سکتا تھا۔

اس نے اپنی ساری توجہ سننے پر مرکوز کر دی۔ کچھ دیر سماعت پر زور دینے سے اسے اندازہ ہو گیا کہ ان کے سامنے قدرے دائیں جانب ایم جی تھری گریج رہی ہے اور یہ اسی کا فائر ہے جو کسی کو آڑ سے نکلنے کی مہلت نہیں دے رہا۔ یہی اور آٹو ٹینک دونوں طرز کا فائر موڈ رکھنے والی یہ گن بیس راؤنڈ میگزین کی حامل ہوتی ہے اور چار سو سے پانچ سو میٹر تک فائر کر سکتی ہے۔ اسٹینڈ پر رکھ کر چلائی جانے والی اس گن کو یہاں تک لانے والوں نے یقیناً بڑا کشت اٹھایا تھا اور اب اس کا فائدہ بھی حاصل کر رہے تھے۔ مقابلہ کرنے والوں کو اس کے مہلک فائر سے بچ کر بھرپور مقابلہ کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ وہ خود بھی پتھر کی آڑ میں رہ کر بس آواز کی سمت میں اندھے فائر کر رہا تھا۔ اس اعصاب شکن صورت حال میں اس کے ساتھ مورچا سنبھالے دو افراد میں سے ایک کا ضبط جواب دے گیا اور دوسری طرف سے فائرنگ میں معمولی سا تعطل آتے ہی وہ بے قراری سے آڑ

سے باہر نکل کر آگے کی طرف بڑھا۔ ابھی وہ چند قدم ہی آگے گیا تھا کہ اس کے جسم کو ایک زوردار جھٹکا لگا اور وہ لڑکھڑا کر گرنے کے ساتھ ہی نیچے کی طرف پھسل چلا گیا۔ معاذ کے برابر میں موجود اس کے ساتھی کے حلق سے یہ منظر دیکھ کر ایک کراہ سی نکلی لیکن ظاہر ہے وہ اپنے ساتھی کی کوئی مدد کرنے سے قاصر تھا۔ اس بے بسی کا غصہ اس نے ایک ساتھ کئی راؤنڈز فائر کر کے نکالا۔ دوسری طرف سے بھی بھرپور جواب دیا گیا اور ان کے گرد گولیاں مینہ کی طرح برسنے لگیں۔ گولیوں کی اس برسات میں سر تک باہر نکال کر دیکھنے کی گنجائش نہیں تھی۔ ایک آدھ منٹ میں دونوں طرف کا جوش تھوڑا ٹھنڈا ہوا تو معاذ نے اپنے ساتھ موجود شخص کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اپنی طرف متوجہ کیا۔

”انگلش؟“

”لعل۔“ اس شخص نے اس کے ایک لفظی سوال کو سمجھ کر ایک لفظی جواب دیا تو معاذ شکر کا کلمہ پڑھتے ہوئے اسے سمجھانے لگا۔ آخر الفاظ سے زیادہ اشاروں کے بل بوتے پر وہ اسے سمجھانے میں کامیاب ہو گیا کہ جب وہ پتھر کی آڑ سے نکل کر آگے کی طرف جائے تو وہ اسے کوردے۔ اس شخص کی طرف سے بات سمجھ لینے کا عندیہ دے جانے کے بعد وہ ایک بار پھر اپنا سارا زور سماعتوں پر ڈال کر بیٹھ گیا۔ آخر کار وہ لمحہ آگیا جس کا انتظار تھا۔ ایم جی تھری کا فائر رکنے سے اسے اشارہ ملا کہ میگزین ختم ہو گیا ہے۔ اس کے پاس پرانا میگزین ہٹا کر نیا میگزین لوڈ ہونے تک کی مختصر مہلت تھی۔ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر وہ اپنی کمین گاہ سے نکلا اور تیزی سے دشمن کے مورچے کی طرف بڑھا۔ اس کا ساتھی اس دوران مسلسل فائرنگ کے ذریعے اسے کوردیتا رہا تھا۔ ابتدا میں چند قدم دوڑنے کے بعد وہ نیچے گر گیا اور رینگتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ اس دوران فائر دوبارہ آنا شروع ہو گیا تھا اور گولیاں اس کے سر پر سے سنسنائی ہوئی گزر رہی تھیں۔ اگر وہ اٹھ کر بیٹھنے یا سر ذرا سا بھی اونچا کرنے کی حماقت کرتا تو اسے اگلا سانس نصیب نہیں ہوتا۔

کسی چھپکلی کی طرح زمین سے چپکا وہ آہستہ روی سے اپنے ہدف کی طرف بڑھ رہا تھا اور اس کا دماغ فائرنگ کی آوازوں کی مدد سے خود کار انداز میں حساب کتاب لگاتا اسے بتا رہا تھا کہ اب کتنا فاصلہ باقی رہ گیا ہے۔

اس کے کان سے لگے آگے میں مسلسل آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ چینی زبان کے استعمال کی وجہ سے وہ مکمل گنگو سمجھنے سے تو قاصر تھا لیکن اتنا اندازہ ہو رہا تھا کہ مختلف

ٹولیوں کی طرف سے اپنی اپنی پوزیشن اور حالات کی رپورٹ دی جا رہی ہے اور ان رپورٹس کی روشنی میں شین یا ہی ہدایات جاری کر رہا ہے۔ وہ اپنے ساتھی کو خصوصی تاکید کر کے آیا تھا کہ اس کے عمل کے متعلق فوری طور پر شین کو اطلاع نہ دی جائے۔ اسے خدشہ تھا کہ اگر کسی طرح مقابلہ تک بھی یہ خبر پہنچ گئی تو اس کی محنت رائیگاں چلی جائے گی۔ فکر تھا کہ اس کے اوپر اعتماد کیا گیا تھا اور ابھی تک اس کے بارے میں اطلاع نہیں دی گئی تھی۔

وہ ریگتے ریگتے کافی آگے نکل گیا تھا کہ اچانک اس کا ہاتھ کسی شے پر پڑا۔ اب تک اس کی راہ میں چھوٹے بڑے پتھر وغیرہ آتے رہے تھے لیکن اس وقت جس شے پر ہاتھ پڑا تھا وہ ساخت کے اعتبار سے مختلف محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے ٹول کر اس شے کا جائزہ لیا اور یہ اندازہ ہونے پر کہ وہ شے ممکنہ طور پر ٹائٹ ویژن گائز ہیں، اس کا دل خوشی سے دھڑک اٹھا۔ گائز کو آنکھوں پر چڑھا کر اس نے اطراف میں دیکھا تو اس کی تاریک دنیا روشن ہو گئی اور مختلف مقامات پر نظر آنے والے سرخ دھبوں نے انسانی وجود کی نشاندہی شروع کر دی۔ فی الحال اس کی توجہ کا مرکز باقی سب کو چھوڑ کر اس ایم جی تھری کی طرف تھا جس کی طرف سے مسلسل مہلک فائر آرہا تھا اور ان کے دفاع کے لیے مسئلہ بنا ہوا تھا۔ اپنے کان میں لگے ہوئے آلے سے سنائی دینے والی گنگو سے اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ دوسرے مقامات پر بھی اسی طرح کی پریشانی لاحق ہے۔ ایسے میں اگر ایک ایم جی تھری اس کے قبضے میں آجاتی تو مشکل کافی حد تک آسان ہو جاتی۔

اپنے ارد گرد جاری بھاگ دوڑ اور آوازوں کو نظر انداز کیے وہ مستقل مزاجی سے اپنے ہدف کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہ ایک پہاڑ سے دوسرے پہاڑ تک کا فاصلہ تھا اور اچھا خاصا تھا۔ وہ جس پہاڑی پر دفاعی مورچے میں بیٹھا رہا تھا، اس سے اتر کر اس پہاڑی کی طرف جا رہا تھا جہاں حملہ آوروں نے اپنا ٹھکانا بنارکھا تھا۔ پہاڑی تک پہنچنے کے لیے درمیان میں ایک نسبتاً ہموار اور کھلا میدان موجود تھا۔ اس جگہ سے بہت تیزی سے گزرنے کی ضرورت تھی کہ یہاں بچاؤ کے لیے کوئی آڑ موجود نہیں تھی اور کہیں سے بھی کوئی اندھی گولی آکر اسے چاٹ سکتی تھی۔ وہ ممکنہ حد تک تیزی سے اس جگہ سے گزرنے لگا۔ کئی بار گولیاں اس کے آس پاس آکر گریں لیکن ان میں سے کسی بھی گولی پر اس کا نام نہیں لکھا تھا اس لیے وہ ان سے بچ کر تیزی سے آگے بڑھتا

چلا گیا۔ وہ اپنی مطلوبہ پہاڑی سے بہت قریب تھا کہ اچانک اسے زور سے ٹھوکر لگی اور توازن قائم رکھنے میں ناکام ہو کر بری طرح لڑکھڑایا۔ لڑکھڑا کر سنبھلنے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ بے درپے کئی فائر سر پر سے گزرتے چلے گئے۔ وہ سمجھ گیا کہ اسے دیکھ لیا گیا ہے اور نشانہ بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ زگ زیک میں حرکت کرتا وہ جتنی تیزی سے وہاں سے ہٹ سکتا تھا، ہٹا چلا گیا۔ کئی گولیاں تعاقب میں آئیں اور ہر بار دائیں بائیں گم ہوتی اس کے اس یقین کو پختہ کرتی چلی گئیں کہ جسے اللہ رکھے، اسے کوئی نہیں چکھ سکتا۔ اپنی مطلوبہ پہاڑی کے دامن میں پہنچ کر وہ ذرا سادائیں جانب گھوما تو اس فائر کی ریخ سے باہر نکل گیا جو کسی موت کے ہرکارے کی طرح اس کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ یہاں سے اس نے بغیر رکے پہاڑی پر چڑھنا شروع کر دیا۔ یہ بہت دشوار چڑھا کی نہیں تھی لیکن بھاری لباس، کندھے سے لگی رائفل اور وہ ڈھیر ساری احتیاط جو وہ خاموشی سے اوپر پہنچنے کے لیے کر رہا تھا، اس کی حرکت کو آہستہ بنائے ہوئے تھی۔ آخر کار یہ فاصلہ بھی طے ہو گیا اور اس نے ایک بڑے پتھر کی آڑ میں بیٹھے نشا پچی کی جھلک دیکھی۔ ایم جی تھری کو ایک اسٹینڈ پر لٹائے وہ اپنا سارا جسم پتھر کی آڑ میں رکھتے ہوئے فائر کر رہا تھا۔ اس کی مہارت کا یہ عالم تھا کہ بلبلی پر رکھی انگلی کے علاوہ جسم کا ہر حصہ پوری طرح ساکت تھا۔ وہ اس جگہ پر اکیلا ہی تھا اور کسی مددگار کی موجودگی کے بغیر بھی پوری مہارت اور سکون سے اپنا کام انجام دے رہا تھا۔

معاذ نے محسوس کیا کہ اس کا اس سے فاصلہ اتنا کم ہے کہ وہ بریٹا کی مدد سے بھی اسے نشانہ بنا سکتا ہے۔ اس نے اوندھے منہ لیٹے لیٹے ہی اپنے ہاتھ کو حرکت دی اور پینٹ کی بیلٹ میں اڑے بریٹا کو پہنچ کر نکالا۔ اس عمل کے دوران اس کا ہاتھ شاید ذرا سا بہک گیا اور قریب پڑے چند چھوٹے چھوٹے پتھر نیچے لڑھک گئے۔ ایسا مین اس وقت ہوا جب نشانے باز اپنی کن کوری لوڈ کر رہا تھا۔ رکے ہوئے فائر کی وجہ سے اس نے پتھروں کے لڑھکنے کی آواز صاف سنی اور بھڑک کر پیچھے گھوما اور ہولسٹر سے پستل پہنچ کر بے درپے کئی فائر کر ڈالے۔ معاذ پتھر لڑھکنے کے ساتھ ہی پیچھے کی جانب نہ سرک گیا ہوتا تو اس وقت اس کی کھوپڑی اڑ چکی ہوتی۔ اس نے بالکل دم سادھ کر بریٹا والے ہاتھ کو بہت احتیاط سے حرکت دی۔ ابھی وہ اس کا سیٹھی لاک ہٹا ہی رہا تھا کہ اس شخص کی طرف سے ایک بار پھر فائرنگ ہوئی اور اس نے اپنے مین سامنے چنگاریاں سی اڑتی محسوس کیں۔ پھر ٹھک

سے کچھ اس کی پیشانی سے آکر ٹکرایا۔ چوٹ کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ ایک ہل کے لیے اس کا سر چکرا کر رہ گیا لیکن بے پناہ ضبط سے کام لیتے ہوئے اس نے منہ سے معمولی سی آہ بھی نہ نکلنے دی۔ اس کا یہ ضبط کام کر گیا اور وہ شخص شاید کسی کی موجودگی کو اپنا دھم سمجھتے ہوئے واپس پلٹ گیا۔

معاذ نے پہلے اپنے ماتھے سے بہہ کر آنے والی خون کی لکیر کو دستا نوں کی مدد سے صاف کیا پھر تھوڑا سا اوپر سرکا۔ اب ایک بار پھر اسے وہ شخص دکھائی دینے لگا جو ایم جی تھری کو پوری مشافی سے استعمال کرتا دوسروں پر قہر برسا رہا تھا۔ معاذ نے ایک گہرا سانس کھینچ کر اپنے اعصاب کو پرسکون کرنے کی کوشش کی اور پھر نشانہ باندھ کر اس کے سر پر فائر کیا۔ پہلا ہی فائر نتیجہ خیز ثابت ہوا اور شوٹر کی کھوپڑی اڑا کر رکھ دی۔ کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح نیچے گرتے شاید وہ حیران ہوا ہو گا کہ یہ کون ہے جو اس جیسے ماہر کو موت کا مزہ چکھا گیا لیکن یہ میدان جنگ کی تلخ ترین حقیقت ہے کہ جب کوئی لڑنے کے لیے میدان میں اترتا ہے تو اسے مرنے کے لیے بھی تیار رہنا پڑتا ہے۔ جنگجوؤں کے نصیب میں جیت کے ساتھ ہار بھی ہوا کرتی ہے اور آج اس شخص کی ہار کا دن تھا۔

اس کے نیچے گرتے ہی معاذ نے ایک گہرا سانس لے کر خود کو پرسکون کیا اور آگے بڑھ کر وہ جگہ سنبھال لی جہاں اب تک مرنے والے کی حکمرانی تھی۔ ایم جی کی بلبلی پرائنگی رکھتے ہوئے اس نے وہ حرارت بھی محسوس کی جسے بلبلی پر چھوڑ جانے والا خود ٹھنڈا ہو چکا تھا۔

”ہیلو..... ہیلو۔“ خود گن کو استعمال کرنے سے قبل اپنی جانب کے لوگوں کو حالات کی اس تبدیلی سے آگاہ کرنا ضروری تھا چنانچہ خود کو فرائم کردہ مواصلاتی آلے کا بٹن دبا کر بھرائی ہوئی آواز میں پکارنا شروع کر دیا۔ ”فرائم ای شین یا ہی کی طرف سے رد عمل ظاہر ہوا۔“

”حملہ آوروں کی ایک ایم جی تھری ان کے مورچے سمیت میرے قبضے میں آگئی ہے۔ مجھے اپنے ساتھیوں اور حملہ آوروں کی پوزیشنز سے آگاہ کیا جائے تاکہ میں درست فائر کر سکوں۔“ اس بار اس نے سپاٹ سے لہجے میں بہ زبان انگریزی مطالبہ کیا۔

”براوو..... یہ تو تم نے بہت بڑا کارنامہ انجام دے ڈالا۔“ شین یا ہی نے انگریزی میں اسے سراہا اور اس کی طرف سے کوئی رد عمل نہ دے جانے پر اس کی مطلوبہ معلومات فراہم کرنے لگا۔ اگلے چند لمحوں میں صورتحال میں واضح تبدیلی رونما ہوئی۔ حملہ آوروں پر اپنے ہی ایک

مورچے سے فائر کیا جانے لگا تو وہ شپٹا سے گئے۔ اس شپٹا ہٹ پر قابو پا کر سمجھنے تک ان کا بہت نقصان ہو چکا تھا۔ میدان کارزار سے لمحہ بہ لمحہ موصول ہو۔ نے والی رپورٹس کی روشنی میں شین یا ہی بہترین احکامات جاری کر رہا تھا۔ معاذ بھی اس کی ہدایات پر عمل کرتا ہوا بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں پانسا ایسا پلٹا کہ شین یا ہی کے حکم پر پیش قدمی کرنے والے ایک ٹولے نے حملہ آوروں کے دوسرے مورچے پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد تو جیسے سب کچھ ان کے ہاتھوں میں ہی آ گیا۔ سرچ لائٹیں جلا لی گئیں اور مورچوں میں پھنسنے والوں کے ساتھ ساتھ فرار کی کوشش کرنے والوں کو بھی گھیر کر پکڑ لیا گیا۔

معاذ جب دوبارہ سب کے درمیان واپس آیا تو لائٹیں اکٹھی کی جا رہی تھیں اور قید ہونے والوں کی مشکلیں کسے کے ساتھ ساتھ انہیں ایک قطار میں کھڑا کرنے کا سلسلہ جاری تھا۔ شین یا ہی سے سامنا ہونے پر اس نے اس کے شانے پر ایک گرجبوش چمکی دی۔

”آج تم نے ہمارا من خوش کر دیا جوان! یہ کیوں تمہاری بہادری تھی کہ ہم اتنی جلدی سب کچھ قابو کرنے میں پھل (کامیاب) ہو گئے۔“ جو کچھ شین یا ہی نے زبان سے نہیں کہا تھا، وہ زانگ تاؤ نے کہہ ڈالا۔ معاذ جواباً خاموش رہا۔ اسے اپنی کارکردگی پر ان سے تحفے وصول نہیں کرنا تھے۔ اس نے صرف اس لیے ان لوگوں کا ساتھ دیا تھا کہ اس کی اور اس کے ساتھیوں کی زندگیاں بھی انہی لوگوں سے جڑی ہوئی تھیں۔ اگر وہ اپنے دفاع میں ناکام ہو جاتے تو خود ان کی اپنی سلامتی بھی خطرے میں پڑ جاتی۔

”میرے ساتھی کہاں ہیں؟“ رادھر رادھر نظریں دوڑانے پر اسے وہی اور جارو دکھائی نہیں دیے تو ان کے متعلق پوچھا۔

”وہ یوان منگ کے ساتھ ہیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی میں اس کی مدد کر رہے ہیں۔ تمہارا وہ موٹا ساگھی اس کام میں خاصا ماہر ہے۔ خود اپنے بازو پر گھاؤ آنے کے باوجود دوسروں کو آرام پہنچانے میں لگا ہوا ہے۔“ زانگ کا تبصرہ جارو کے متعلق تھا۔ وہ بھلا کہاں جانتا تھا کہ جارو کا تعلق اس قوم سے تھا جو ایک طویل عرصے سے اپنے حقوق اور آزادی کی جنگ لڑ رہی تھی اور اس جنگ کو لڑتے لڑتے قوم کے ہر فرد کو اپنے زخموں کو بھول کر دوسروں کے زخموں پر مرہم رکھنے کا ہنر آ گیا تھا۔

”مجھے تمہارے ماتھے پر بھی گھاؤ دکھائی دے رہا

ہے۔ بہتر ہوگا کہ تم بھی اس پر کوئی مرہم وغیرہ لگوا لو۔“ زانگ کی توجہ اب جا کر اس کے زخم کی طرف گئی تو اس سے بولا۔
 ”میں ٹھیک ہوں۔ یہ معمولی زخم ہے، جلد ٹھیک ہو جائے گا۔“ اس نے اپنی پیشانی کو آہستہ سے چھوا اور بے پروائی سے بولا۔ زخم معمولی تکلیف دے رہا تھا لیکن خون فوراً ہی رک کر جم چکا تھا اس لیے اسے اس زخم کے سلسلے میں کوئی تشویش نہیں ہو رہی تھی۔

”میں پکڑے جانے والوں کو دیکھنے جا رہا ہوں۔ تم چاہو تو جا کر آرام کر لو۔ حالات کو دیکھتے ہوئے لگتا ہے کہ آگے ہمیں آرام کا موقع مشکل سے ہی مل سکے گا۔“ زانگ کے چہرے پر گہری فکر مندی تھی۔ معاذ نے اس کے مشورے پر عمل کر کے آرام کے لیے جانے کے بجائے اس کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی۔ وہ خود بھی حالات سے آگاہ رہنا چاہتا تھا اور اس بات کو جاننے کا تو سخت تجسس تھا کہ وہ کون لوگ ہیں جو اس دیرانے میں اتنے مشکل راستوں کے باوجود اتنی بھرپور تیاری کے ساتھ ان پر حملہ آور ہو گئے تھے۔ وہ زانگ کے ساتھ مل کر ان کا جائزہ لینے لگا۔

”دیکھنے میں تو یہ ہندوستانی لگتے ہیں۔“ زانگ نے ایک قطار میں بٹھائے گئے قیدیوں کی شکلوں پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے تبصرہ کیا۔ جواباً معاذ نے محض ہنکارا بھرا اور خاموشی سے ان کا جائزہ لینے لگا۔ وہ تعداد میں آٹھ دس سے زیادہ نہیں تھے اور ان کی قومیت کے بارے میں اسے زانگ کے خیال سے اتفاق تھا۔ جتنی تعداد میں وہ گرفتار ہوئے تھے، تقریباً اتنی ہی تعداد ہلاک ہونے والوں کی بھی تھی اور اس وقت شین یا ہی چار پانچ لاشوں کے قریب کھڑا ان کے سلسلے میں اپنے آدمیوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ اندازہ تھا کہ کچھ ہلاک ہونے والوں کی لاشوں کو اکٹھا نہیں کیا جاسکا تھا اور وہ ادھر ادھر درازوں وغیرہ میں گر جانے کے باعث نظروں سے اوجھل ہو گئی تھیں۔ حقیقتاً ان لاشوں کو تلاش کرنے کے لیے زیادہ جدوجہد بھی نہیں کی گئی تھی کہ لاشوں نے اب کسی کام نہیں آتا تھا۔ ہاں، قیدیوں سے البتہ معلومات حاصل کی جاسکتی تھیں۔

”تمہارا نام؟“ زانگ نے قطار میں بیٹھے پہلے قیدی سے ہندی زبان میں دریافت کیا لیکن وہ یوں بیٹھا رہا جیسے اسے زانگ کا سوال سمجھ ہی نہ آیا ہو۔

”یو آر نیم؟“ اس بار زانگ نے ذرا زیادہ سخت لہجے میں انگریزی زبان میں اپنا سوال دہرایا لیکن اب بھی کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں ہوا۔

”یہ تو شاید میری بات سمجھ ہی نہیں رہا ہے۔ بھائی

نہیں دے رہا کہ کس بھاشا میں اس سے سوال کروں۔“
 ”یہ تمہاری بات سمجھ رہا ہے لیکن جان بوجھ کر جواب نہیں دے رہا۔“ قیدی کی آنکھوں میں جھانک کر خاموشی سے اس کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے معاذ نے زانگ پر انکشاف کیا۔

”اگر ایسا ہے تو اسے بڑا کٹ اٹھانا پڑے گا۔ ہم اپنی پر آجائیں تو پتھروں کو بھی بولنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔“ زانگ نے اس قیدی پر ایک نفرت انگیز نظر ڈالتے ہوئے کہا اور اگلے قیدی کی طرف بڑھ گیا۔ معاذ کو اس کے دعوے کی سچائی میں کوئی شک نہیں تھا کیونکہ اس کی معلومات کے مطابق چینی تشدد کے بدترین طریقوں سے واقف تھے اور مخالفین پر بلا جھجک ان کا اطلاق بھی کرتے تھے۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“ زانگ اب اگلے قیدی کے سامنے کھڑا اس سے پوچھ رہا تھا۔ یہ شخص اپنے ساتھی کی طرح انجان تو نہ بنا لیکن زانگ کی طرف سے رخ پھیر کر واضح کر دیا کہ وہ اس کے سوال کا جواب نہیں دے گا۔ زانگ باری باری ہر ایک سے یہی سوال کرتا چلا گیا۔ ان کے ردِ عمل دینے کا انداز الگ تھا لیکن مشترکہ نتیجہ یہ تھا کہ ان میں سے کسی نے بھی اس کے سوال کا جواب نہیں دیا تھا۔ یہاں تک کہ آخری قیدی کا نمبر آ گیا۔ یہ قیدی اس حد تک سر جھکائے بیٹھا تھا کہ اس کی شکل دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ زانگ نے اس کے سامنے کھڑے ہو کر تلخ لہجے میں اپنا سوال داغا تو اس نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ زانگ کے ساتھ کھڑے معاذ کی نظر اس کے چہرے پر پڑی تو وہ دنگ رہ گیا۔ قیدی نے اس کی حیرانی کو محسوس کیا اور پراسرار انداز میں مسکرایا۔ اس کے یوں مسکرانے پر زانگ کا موڈ مزید خراب ہو گیا اور تلخ لہجے میں بولا۔

”تم تو ایسے دندیا نکال رہے ہو جیسے میں نے تمہارا نام پوچھنے کے بجائے تمہیں کوئی جوک سنایا ہو۔“

”جوک ہی تو ہے۔ میرے بارے میں ساری جانکاری رکھنے والے کو اپنے ساتھ لیے پھر رہے ہو پھر بھی مجھ سے سوال کرتے ہو۔“ خواہش اس کے لہجے سے پھولی پڑ رہی تھی۔ زانگ اس کی بات سن کر چوٹا اور سوالیہ نظروں سے معاذ کی طرف دیکھا۔

”میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ ہم اصل میں ایک ملک اور ایک شہر کے رہنے والے ہیں اور اس خوبصورت بلا کے حکم پر چلتے ہیں جو اس وقت بھی تمہارے ٹھکانے پر موجود ہے۔“ وہ بہت ہوشیاری سے معاذ کے گرد سازش کا جال

بننے کی کوشش کر رہا تھا۔

”کون بلا؟ کیا تم سونیا کی بات کر رہے ہو؟“ زانگ نے شپٹا کر پوچھا۔

”اس کے سوا اور کون ہو سکتا ہے۔ بہت زور آور عورت ہے۔ دنیا کے جس مرد کو چاہے، اپنے اشاروں پر نچا سکتی ہے۔“ وہ دھیرے دھیرے آگ بھڑکاتا جا رہا تھا اور معاذ کچھ بھی کہنے سے قاصر تھا کیونکہ باذل نائی اس شیطان کی باتیں صریحاً جھوٹ نہیں تھیں۔

”کیا بات ہے زانگ؟ کیا کہہ رہا ہے یہ شخص؟“ اسی وقت شین یا ہی وہاں چلا آیا اور ماحول میں تناؤ محسوس کر کے چینی زبان میں زانگ سے پوچھا۔

”یہ شخص میرا دشمن ہے اور یقیناً کسی نہ کسی طرح میرا پیچھا کرتے ہوئے ہی یہاں آیا ہے۔ تم یہاں حملہ کرنے والوں کے بارے میں کچھ جانتا چاہتے ہو تو اس شخص کی زبان کھلاؤ۔“ اس بار معاذ بول پڑا۔ اس کی بات سن کر باذل نے ایک زوردار تہقہہ لگایا اور خباثت سے بولا۔

”میری زبان جب جب کھلے گی، بس تمہاری ہی داستانیں سنائے گی۔“

”میں تمہارا خون پی لوں گا۔“ باذل کے خلاف اس کے دل میں پہلے ہی بہت غم و غصہ بھرا ہوا تھا۔ اس کے اس رویتے نے مزید آگ لگا دی اور طیش میں آکر اس کا گلا دبوچ لیا۔ ایک دم ہی وہاں ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ شین اور زانگ، باذل کو اس کی گرفت سے آزاد کروانے کے لیے زور لگانے لگے۔ شور سن کر مزید چند لوگ مدد کے لیے آگئے۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت سے باذل کو آزاد کروایا گیا تو وہ گلے پر ہاتھ رکھ کر بری طرح کھانسنے لگا۔

”تم..... تم مجھے مارنا چاہتے ہو تا کہ ان لوگوں پر تمہاری اصلیت نہ کھلے۔“ باذل کی کھانسی کچھ سنبھلی تو اس نے ایک اور شوشا چھوڑا۔

”تو ہے ہی اس لائق کہ اس دھرتی کو تیرے ناپاک وجود کے بوجھ سے آزاد کر دیا جائے۔“ چینیوں کی گردن میں چلتا معاذ غصے سے پھنکارا۔

”اگر تو خود پاک صاف ہوتا تو اس وقت یہاں اس جگہ موجود نہیں ہوتا۔“ باذل نے اسے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

”اسے لے جاؤ یہاں سے۔ میں بعد میں اس سے بات کروں گا۔“ شین یا ہی نے چیخ کر اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔ وہ باذل اور معاذ کے درمیان ہونے والی گفتگو کو سمجھنے سے قاصر تھا لیکن ان کے درمیان جاری کشیدگی پر قابو پانے

کے لیے یہ قدم اٹھایا تھا۔

”جانوروں سے بات نہیں ہوتی۔ ان کے گلے میں پٹا ڈال کر انہیں قابو کیا جاتا ہے۔“ اس بار معاذ نے اسے انگریزی میں مخاطب کیا۔

”کول ڈاؤن ینگ مین! تھوڑی دیر بعد اس سب پر سکون سے بات کرتے ہیں۔“ شین یا ہی نے اس کا شانہ تھپک کر نرمی سے کہا اور زانگ کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ یقیناً وہ اس سے واقعے کی ساری تفصیل جانتا چاہتا تھا۔

باذل کو نظروں کے سامنے سے ہٹالیا گیا تو معاذ کے دماغ کی گرمی بھی ذرا کم ہوئی اور وہ سوچنے لگا کہ اس عیار آدمی کی چلی چال کو توڑنے کے لیے اسے کیا لائحہ عمل اختیار کرنا ہوگا۔

سوچ بچار کے بعد اس کے دل و دماغ نے متفقہ فیصلہ دیا کہ وہ سچ بولے گا کہ سچ کی اپنی طاقت ہوتی ہے اور وہ کسی نہ کسی طور پر اپنا آپ منوالیتا ہے۔

☆☆☆

”تم نے جھوٹ بول کر قانون کا وقت کیوں ضائع کیا خان؟“

”ام مشہور ہونا چاہتی تھی۔“ عدالت سے نکلنے ہوئے گل خان نے اتنی معصومیت سے صحافی کے سوال کا جواب دیا کہ کئی لوگوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ آج عدالت میں پیشی پر وہ اپنے اس دعوے سے دستبردار ہو گیا تھا کہ جل کر خاک ہو جانے والے بنگلوں میں اس کے دوست موجود تھے۔

یہ سیکھ اسے دیوا کے آدمی نے دی تھی اور سمجھایا تھا کہ اگر وہ اپنے دعوے پر قائم رہا تو اسے اپنے ساتھیوں کے بارے میں تفصیلات بھی فراہم کرنا ہوں گی اور جیسے ہی ان لوگوں کی تفصیلات سامنے آئیں گی، وہ خود مشکل میں پڑ جائے گا کیونکہ اس کے ساتھی ریاست کو شدید مطلوب افراد میں شامل تھے۔

گل خان کو سلاخوں کے پیچھے کی زندگی نے جذباتیت سے نکال کر اس نکتے پر قائل ہونے پر مجبور کر دیا تھا چنانچہ آج عدالت میں وہ اپنے موقف سے پیچھے ہٹ گیا تھا اور یہ اعتراف کیا تھا کہ اس نے محض شہرت کے حصول کے لیے ایسا دعویٰ کیا تھا۔

عدالت نے اس کے اس بیان پر شدید برہمی کا اظہار کرتے ہوئے واضح کر دیا تھا کہ اسے قانون کے ساتھ کھلواڑ برسرِ ادا سامنا کرنا پڑے گا لیکن فی الحال سزا نہیں سنائی گئی تھی اور تفتیشی افسر کی اس درخواست پر کہ اسے گل خان سے متعلق کچھ مشکوک معلومات حاصل ہوئی ہیں جن کے بارے میں وہ مکمل تحقیق کرنا چاہتا ہے، فیصلے کو زیر التوا ڈال دیا گیا تھا۔

”تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ تمہاری اس حرکت پر عدالت تمہیں کیا سزا دے گی؟“ ایک صحافی نے اس کے

ساتھ چلتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔ پولیس والے پیشی پر آئے مگر ان کو کتنا ہی میڈیا سے دور رکھنے کی کوشش کرتے، کچھ چلبے قسم کے صحافی اپنے لیے راستہ بنا ہی لیتے تھے۔

”عدالت سزائے کی تو اس کی خبر بھی ہمارے پھوٹو کے ساتھ سارے دیش میں پھیلے گی اور ام اور مشہور ہو جائے گی۔“ گل خان نے نہایت فلسفیانہ انداز میں یہ جواب دے کر سب کو قہقہہ لگانے پر مجبور کر دیا تھا۔

”تم ایسی شہرت کا کیا کرو گے جس کا تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہے؟“ صحافی نے گویا اسے احساس دلانے کی کوشش کی۔

”ہمارے لیے یہی بھانڈا سب سے بڑا ہے کہ ام مشہور ہو جائے۔ ام نے اپنے مرحوم دادا سے وعدہ کیا تھا کہ ایک دن ام اتنا مشہور ہو جائے گی کہ دیپ کمار کی طرح دیش کا بچہ بچہ ام کو

پہچانے گا۔“ وہ جانتا تھا کہ اس کے سنجیدگی سے دیے گئے یہ جوابات لوگوں کو اس کی ذہنی حالت کی طرف سے شکوک و شبہات میں ڈال رہے ہیں لیکن فی الوقت وہ لوگوں کے بارے میں نہیں

سوچ رہا تھا۔ اسے اطلاع دی گئی تھی کہ آج عدالت میں پیشی کے بعد اسے وہاں سے فرار کروانے کی کوشش کی جائے گی چنانچہ اپنی

ساری حیات کو چوکنا کیے وہ اس کارروائی کا منتظر تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یوں فرار ہونا اسے سخت مشکل میں ڈال دے گا اور اس کی

حیثیت ایک مفروضہ اشتہاری کی ہو جائے گی لیکن جیل میں خود کو زہر دے کر مارنے کی کوشش نے اسے اس خطرناک کام کے لیے

راضی کر لیا تھا۔ اس نے دھوکے اور سازش سے مارے جانے کے مقابلے میں ہاتھ پاؤں مارنے اور لڑنے کا فیصلہ کیا تھا اور اس

فیصلے پر عمل کے لیے بالکل تیار تھا۔

”کیا یہ ٹھیک ہے کہ جیل میں.....“ صحافی جانے اس سے مزید کیا پوچھنا چاہ رہا تھا کہ وہاں ایک کان پھاڑ دھماکا ہوا

اور اس کا سوال ادھر رہ گیا۔ گل خان نے اپنی ہتھکڑی سے منسلک زنجیر پکڑ کر چلتے پولیس والے کے لڑکھڑانے کا فائدہ

اٹھایا اور اسے ایک زوردار لات مار کر خود سے دور پھینکا۔

”ادھر خان جی۔“ ہر طرف دھواں، بھاگ دوڑ اور چیخ و پکار تھی اور اس سچ کسی نے قریب سے اسے پکارنے کے

ساتھ ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تھا۔ وہ اس پکڑنے والے کے ساتھ کھینچا چلا گیا۔ ہنگامہ ہنوز جاری تھا۔ چیخ و پکار کے

ساتھ ساتھ درمیان میں فائرنگ کی تڑتڑاہٹ بھی وقفے وقفے سے سنائی دے رہی تھی۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے والا اسے ایک

اسٹارٹ گاڑی کے کھلے دروازے تک لے کر پہنچا ہی تھا کہ یکدم نیچے گر گیا اور گل خان کا ہاتھ اس کے ہاتھ کی گرفت سے نکل گیا۔ اس نے شہنشاہی کرنے والے کی طرف دیکھا۔ اس

کی کھوپڑی کا ایک حصہ اڑ چکا تھا اور وہ ایک ہل میں جیتے جانتے انسان سے بھیاں لاش میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس سے زیادہ دیکھنے کی گل خان کو مہلت نہیں ملی اور کوئی اسے اپنے ساتھ کھینچتا ہوا آگے لے گیا۔ اس کے حواس تھوڑے سے بحال ہوئے تو اس نے خود کو دو نومند افراد کے درمیان ایک تیز رفتار گاڑی کی عقبی نشست پر پایا۔

”کون اے تم اور ام کو کہاں لے جاتی اے؟“ اس نے احتجاجی لہجے میں ان دونوں سے دریافت کیا۔ جواب

میں اس نے اپنے دائیں طرف سے ناک اور منہ پر کی جانے والی پھوار کو محسوس کیا اور اس کے بعد کچھ بھی محسوس کرنے کے قابل نہیں رہا۔

☆☆☆

”آج صبح سویرے عرفان اللہ نے ہوٹل میں کوئی اہم ملاقات کی ہے۔“ اصغر نے شہر کے ایک بڑے اور مشہور

ہوٹل کا حوالہ دیتے ہوئے اطلاع دی۔

”ملاقاتی کون تھا؟“ لالہ نے موبائل پر خبریں اسکرول کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”ملاقاتیوں کے بارے میں جٹی اور جامو کو کفرم نہیں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ملاقاتی ان کے ہوٹل پہنچنے سے قبل ہی

ہوٹل کے سوٹ میں موجود تھا اور ان کی وہاں سے روانگی کے وقت بھی وہیں موجود رہا تھا۔ ان دونوں نے عرفان اللہ کے

ملاقات سے پہلے کے جوش اور ملاقات کے بعد کی خوشی کو دیکھ کر اندازہ لگایا ہے کہ یہ کوئی بہت خاص ملاقات تھی۔“

”تیری اپنی رپورٹ کیا ہے؟“ لالہ عیسیٰ نے موبائل پر سے نگاہیں ہٹائے بغیر دریافت کیا۔

”میں نے معلومات کروائی ہیں۔ ملاقاتی کوئی عورت تھی جو ملاقات سے دس منٹ پہلے اپنے باڈی گارڈز کے

ساتھ ہوٹل پہنچی تھی۔ اس نے سیاہ جالی دار ہیٹ لگایا ہوا تھا اس لیے کسی فوٹیج میں اس کی تصویر واضح نہیں ہے البتہ ہوٹل کے عملے میں سے ایک بیرے نے یہ اطلاع دی ہے کہ وہ

عورت سفید فام تھی۔“ مزاج آشا اصغر کے پاس اس کے سوال کا جواب دینے کے لیے تمام ممکنہ معلومات موجود

تھیں۔ اس نے لالہ کو اطلاع دی تھی اس وقت بھی جب اس کے پاس یہ معلومات اکٹھی ہو گئی تھیں۔

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نوجوان

کی داستان جو غلط کاروں کے لیے

غضب ناک تھا باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیے

بعض اوقات شہرت پانے کے لیے انسان کو بڑی عجیب و غریب حرکتیں کرنا پڑتی ہیں... ان کی سمجھ میں بھی کوئی طریقہ نہیں آ رہا تھا جبکہ اشتہار بازی ان کی ضرورت تھی ورنہ زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرنا ان کے لیے دشوار ہو جاتا پھر اچانک ایک غلطی نے ان زندگی کو درست سمت میں ڈال دیا...

ٹھوکروں میں پلٹنے والی دو بہنوں کی بے چارگی اور کاوشوں کا احوال

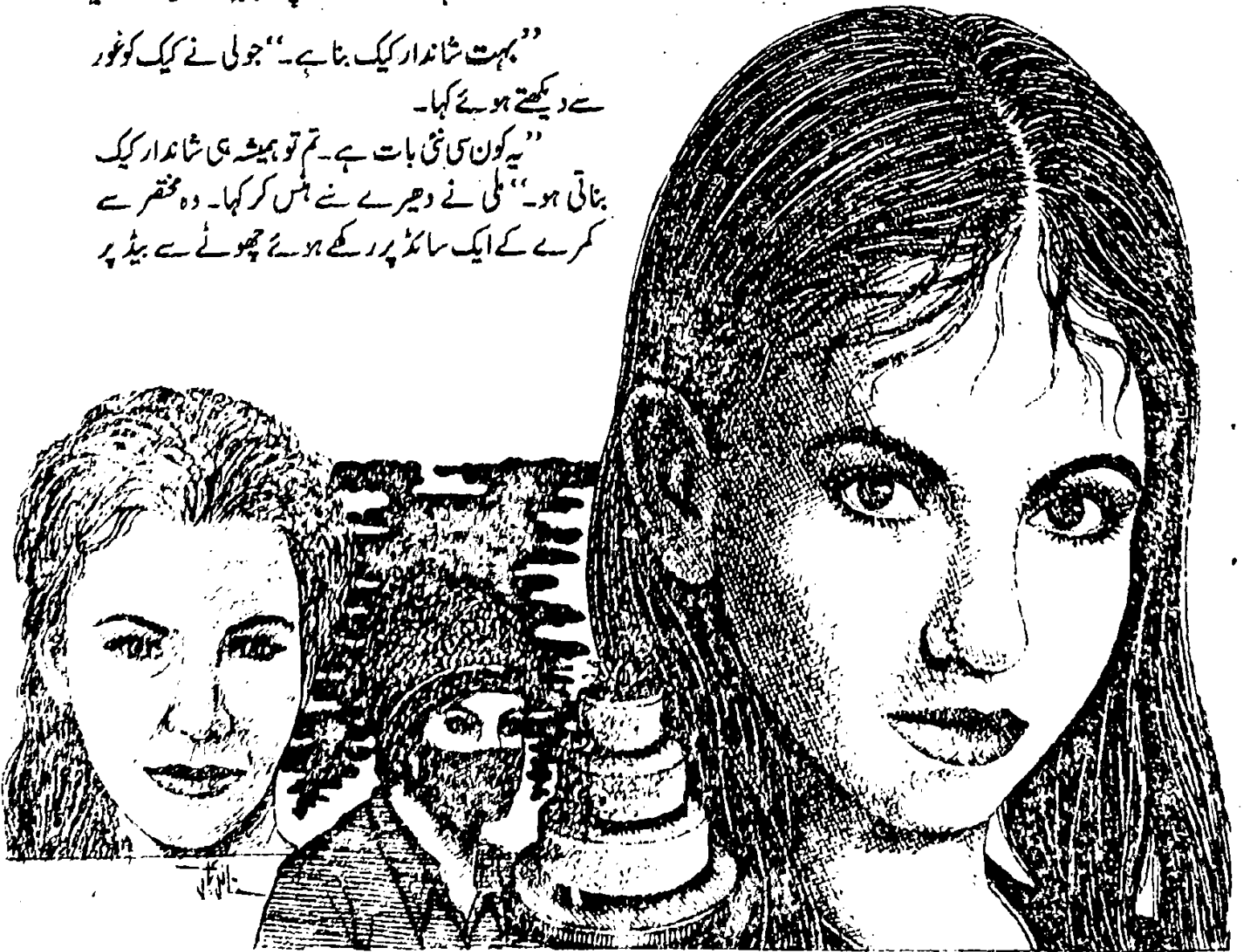
اشتہار بازی

عیون بھناری

اس طرح لینی ہوئی تھی کہ اس کا سر بیڈ پر تھا اور ٹانگیں اس نے دیوار کے ساتھ اس طرح لگا رکھی تھیں کہ پاؤں چھت کی طرف ہو رہے تھے۔

”نئی بات یہ ہے کہ یہ مسز جوزفین کی شادی کی سالگرہ کا کیک ہے اور اس نے اپنے قریبی لوگوں کو مدعو کیا۔“ بہت شاندار کیک بنا ہے۔“ جولی نے کیک کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ کون سی نئی بات ہے۔ تم تو ہمیشہ ہی شاندار کیک بناتی ہو۔“ ملی نے دھیرے سے ہنس کر کہا۔ وہ مختصر سے کمرے کے ایک سائڈ پر رکھے ہوئے چھوٹے سے بیڈ پر



ہے۔ مجھے یقین ہے کہ سب لوگ اس حیران کن ذائقے کو یاد رکھتے ہوئے آئندہ فنکشنز کے لیے مجھ سے رابطہ کریں گے۔“ جولی نے اس کی جانب مڑ کر کہا اور اس کے عجیب انداز کو گھور کر دیکھنے لگی۔ ملی نے جلدی سے دیوار سے ٹانگیں ہٹائیں اور سیدھی بیٹھ گئی۔

”کیا کہا تم نے.....؟ مسز جوزفین کے قریبی لوگ؟“ اس سڑیل عورت کے قریب کوئی لگتا ہے اس پر مجھے حیرت ہے اور تم بڑے بڑے خواب مت دیکھنا شروع کر دو۔ جوزفین کے دوست زیادہ سے زیادہ دو یا تین ہوں گے اور پہلی بات یہ کہ وہ شاید کیک کے ذائقے پر غور ہی نہ کریں اور اگر کر بھی لیا اور دو تین کیک تم سے بنوا بھی لیے تو تم کتنی دولت کما لو گی؟“ ملی اسے سمجھاتے ہوئے شرارت سے مسکرا رہی تھی۔

”تم بولتی رہو، مجھے پروا نہیں۔ عقل یا فکر نام کی کوئی چیز تم میں ہے ہی نہیں۔“ جولی کو ہلکا سا غصہ آ گیا۔

”او کے..... او کے، میں اپنا منہ بند کرتی ہوں۔ ذرا بتاؤ تو لچ کب کرنا ہے؟ بہت بھوک لگی ہے۔“ ملی صلح صفائی والے انداز میں بولی۔ جولی نے کوئی جواب دیے بغیر سینڈویچ کی پلیٹ لا کر اس کے سامنے رکھی اور خود ایک سینڈویچ اٹھا کر اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے باہر جھانکتے ہوئے کھانے لگی۔ سبز فراک اور سنہری بالوں کی پونی کے ساتھ وہ ایک گڑیا سی دکھائی دے رہی تھی۔ کم عمری میں ہی اسے حالات کے پھیڑے برداشت کرنا پڑے تھے۔

ملی اور جولی بہت چھوٹی تھیں کہ ان کی ماں نے طلاق لے لی۔ کچھ ہی عرصے بعد سوتیلی ماں ان کے سر پر مسلط ہو گئی۔ انتہائی بد دماغ اور ظالم عورت تھی۔ جولی اور ملی کے ساتھ بہت برا برتاؤ کرتی۔ باپ کو بالکل احساس نہ تھا کہ اس کی بچیوں کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ سوتیلی ماں کا ظلم اور باپ کی بے پردائی نے جولی کو سنجیدہ بنا دیا۔ وہ اکثر سوچتی کہ کاش، اس کو کوئی جاب مل جائے اور اتنی رقم ملے لگے جس سے وہ اپنا اور اپنی چھوٹی بہن کا خرچہ اٹھا سکے تو وہ فوراً گھر چھوڑ دے۔ سوتیلی ماں بھی انہیں گھر سے نکالنا چاہتی تھی۔ وہ بھی بہانے ڈھونڈتی تھی کہ کسی طرح ان سے جان چھوٹ جائے۔ جولی نے واجبی سی تعلیم حاصل کی تھی پھر وہ پڑھ نہ پائی۔ ملی اسکول جاتی تھی۔ دونوں کم عمر ہی تھیں کہ وہ رات آگئی جب انہیں اپنا گھر چھوڑنا پڑا۔ ملی کے ہاتھ سے اچانک وہ گل دان چھوٹ گیا جو چند دن قبل ان کی سوتیلی ماں اپنے بیلروم کے لیے لائی تھی۔ ملی کسی کام سے اس کمرے میں گئی تو گل دان کو اٹھا کر دیکھنے لگی۔ دیکھتے دیکھتے

اس کی نظر کھڑکی میں سے نظر آنے والے دولڑکوں پر پڑی جو آپس میں کھتم گتھا ہو رہے تھے۔ انہیں دیکھتے ہوئے وہ کھڑکی کی طرف بڑھی اور اپنی طرف سے گل دان اس کی جگہ پر رکھا لیکن ایسا نہ ہو سکا اور فرش پر گر گئے ہی اس کے ٹکڑے ہو گئے۔ سوتیلی ماں کو تو آگ لگ گئی۔

”جانتی ہو اس کی قیمت کیا ہے؟ بد تمیز لڑکی! اتنا بڑا نقصان کر دیا۔“ کہتے ہوئے اس نے ملی پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔ جولی بچانے آئی تو اس نے اسے بھی مارا۔ جولی کو شدید غصہ آیا۔ غصے میں اس نے سوتیلی ماں کو زوردار دھکا مارا جس کے نتیجے میں اس کا سر پاس پڑی میز کے کونے میں لگا اور ساتھ ہی خون نکلنے لگا۔ دونوں بُری طرح گھبرا گئیں۔ ”مجھے لگتا ہے یہ مر چکی ہے، ہل نہیں رہی۔“ ملی نے کانپتی آواز میں کہا۔

”ملی.....! ڈیڈی کے آنے سے پہلے گھر چھوڑ دیتے ہیں ورنہ وہ ہم دونوں کو بہت ماریں گے اور پولیس کے حوالے بھی کر دیں گے۔“ جولی نے اس کا بازو پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔

”ہاں ٹھیک ہے۔ چلو، ایک بیگ میں ضروری سامان رکھ لو، جلدی جلدی۔“ ملی نے کہا۔ جولی تو فوری خالی ہاتھ بھاگنا چاہتی تھی لیکن ملی نے اسے سامان لینے کا کہا۔ ”اور تب تک ڈیڈی آگئے تو.....؟“ جولی گھبرا رہی تھی۔ ”ہم دروازہ نہیں کھولیں گے اور کھڑکی سے نکل جائیں گے۔ جاؤ، جلدی کچھ کپڑے رکھ لو۔“ ملی نے اسے دھکا دیتے ہوئے کہا۔ جولی نے کانپتے ہاتھوں، لرزتے وجود کے ساتھ ایک چھوٹے سے بیگ میں کپڑے ڈالے۔ ”آؤ ملی..... کہاں ہو؟“ اس نے آواز دی۔ ملی سوتیلی ماں کے بیڈروم سے نکلے۔ اس کے ہاتھ میں بھی چھوٹا سا بیگ تھا۔

”یہ کیا..... تم اس کمرے سے کیا لائی ہو؟“ جولی دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے بولی۔ اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور قدم لڑکھڑاہے تھے۔ اس کے برعکس بے فکر اور بے پردا سی ملی کالی سنسبل ہوئی تھی۔

”آؤ جلدی، یہاں سے بھاگیں۔“ ملی نے جواب دیے بغیر اس کا بازو پکڑ کر آگے کو کھینچا۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے گھر سے کافی دور نکل آئیں۔

”کہاں جائیں؟“ فٹ پاتھ پر بیٹھتے ہوئے جولی نے نہ جانے کس سے پوچھا۔ ملی بھی پاس بیٹھ گئی۔ دونوں ہانپ رہی تھیں۔ کچھ دیر سانس لینے اور پانی پینے کے بعد دونوں

نے اپنا اپنا بیگ اٹھایا اور نامعلوم سمت میں چلنے لگیں۔
 ”کیا خیال ہے، مئی کو کال کریں؟“ مئی نے اچانک
 کہا۔ اس نے اپنی سگی ماں جو دوسرے شہر میں رہتی تھی، کے
 بارے میں پوچھا۔

”کوئی فائدہ نہیں ہوگا کال کرنے کا۔ وہ ہمیں پسند
 نہیں کرتیں اسی لیے تو ڈیڈی کے پاس چھوڑ گئی تھیں۔“ جولی
 نے مایوسی سے کہا۔

”لیکن اس برتھ ڈے پر جب انہوں نے تم سے بات
 کی تھی تو ان کا رویہ کافی اچھا تھا۔“ مئی کا لہجہ امید بھرا تھا۔

”ٹھیک ہے، میں فون کرتی ہوں..... مجھے نمبر تو یاد
 ہے لیکن موبائل کہاں سے لیں؟“ جولی نے بے چارگی سے
 کہا۔ منت سماجت سے انہیں ایک بوڑھے دکاندار نے اپنا
 سیل فون دے دیا۔ انہوں نے اسے بتایا کہ وہ اپنے گھر فون
 کر کے اپنے باپ کو بلانا چاہتی ہیں کیونکہ ان کی گاڑی خراب
 ہو گئی ہے۔ دکاندار نے انہیں مشکوک نظروں سے دیکھا۔

”باپ نے گاڑی دی اور لباس بھی اچھا ہے لیکن سیل
 فون یا پیسے نہیں دیے؟“ اس نے چبھتے لہجے میں دونوں
 لڑکیوں سے سوال کیا۔

”سیل فون اور رقم جس پرس میں تھے، وہ کہیں گر گیا
 ہے۔“ جولی نے بہانہ گھڑا۔ شاپ والے کو یقین تو نہیں آیا
 لیکن اس نے اپنا سیل فون جولی کو تھما دیا۔

”ہیلومی! ہم مشکل میں ہیں اور آپ کے پاس آنا
 چاہتے ہیں۔ ہمارے پاس کرائے کے پیسے بھی نہیں اور.....“
 کال ملتے ہی جولی نے بے تابی سے ماں کو پکارتے ہوئے
 کہنا شروع کیا۔ اس کی ماں نے بات کاٹ دی۔

”کیا تمہارے باپ نے تمہیں گھر سے نکال دیا
 ہے؟“ اس نے رکھائی سے پوچھا۔

”نہیں..... نہیں، کچھ اور پر ابلم ہے۔ فون پر نہیں
 بتائی جاسکتی۔ بس یوں سمجھ لیں کہ ہماری زندگی خطرے میں
 ہے۔“ جولی کی آواز بھرا گئی۔

”تو ٹھیک ہے پھر آ جاؤ کسی طرح۔ میں تمہیں اپنے
 پاس رکھنے کو تیار ہوں۔“ عام سے انداز میں کہہ کر ماں نے
 فون بند کر دیا۔

جولی نے مئی کی طرف دیکھا۔ مئی چپ چاپ اسے
 دیکھ رہی تھی۔

”اب کیا کریں؟“ جولی نے مئی سے یوں سوال کیا
 جیسے وہ یہ پر ابلم حل کر دے گی۔

”ہمیں مئی کے پاس ہی جانا ہوگا ورنہ ہم پکڑے

جائیں گے اس لیے فوراً اس شہر سے نکلیں۔“ مئی نے کہا اور
 پھر کچھ رک کر جولی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔
 ”میرے پاس تھوڑے سے پیسے ہیں۔ مئی کے کمرے سے
 اٹھالے تھے۔“ یہ کہہ کر اس نے بیگ میں ہاتھ ڈالا اور کچھ
 نوٹ جولی کو تھما دیے۔ جولی کو حیران کن خوشی ہوئی۔

”رکوزرا، میں آئی۔“ کہہ کر جولی ایک شاپ کی جانب
 بڑھ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ کچھ کھانے کا سامان لے کر آئی۔ اب
 انہوں نے ٹیکسی میں بیٹھنے میں دیر نہ لگائی۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر
 دونوں نے کھانا کھایا اور شہر سے نکلتے نکلتے کسی حد تک پرسکون
 ہو گئیں۔ چند گھنٹوں بعد وہ اپنی ماں کے پاس تھیں۔ دونوں
 بیڈ پر بیٹھی ہوئی کمرے کو دیکھ رہی تھیں جو انہیں اپنی ماں کے
 رویے کی وجہ سے بہت پر ایا لگ رہا تھا۔ ماں نے انہیں آتے
 ہی کہہ دیا تھا کہ اس کا نیا شوہر شاید ان کا یہاں رہنا پسند نہ
 کرے اس لیے وہ چند دن ہی یہاں رک سکتی ہیں۔

”تم اپنے باپ کی بیوی پر قاتلانہ حملہ کر کے آئی
 ہو؟“ ماں کی چیخ سی آواز سن کر دونوں بہنیں ہڑبڑا کر کھڑی
 ہو گئیں۔ مئی نے تو فوراً رونا شروع کر دیا۔

”قاتلانہ حملہ.....؟ نہیں مئی! وہ تو..... وہ تو سب
 اچانک ہو گیا۔ میں آپ کو بتانے ہی والی.....“ جولی نے
 انک انک کر بولنا شروع کیا تو ماں نے بات کاٹ دی۔

”تمہارے باپ کا فون آیا تھا اسپتال ہے۔ اس
 نے کہا کہ تم نے اس کی بیوی کو تشدد کا نشانہ بنایا اور اس کا سر
 میز سے ٹکرا کر جان سے مارنے کی کوشش کی۔ اسے پتا تھا کہ
 تم دونوں یقیناً میرے پاس آئی ہوں گی اس لیے وہ مجھ پر
 چلا رہا تھا۔ سچ سچ بتاؤ کیا کر کے آئی ہو؟“ ماں بہت غصے
 میں تھی کہ مئی اور جولی اسے بھی کسی کیس میں نہ پھنسا دیں۔

”کیا وہ..... زندہ ہے یا.....؟“ مئی نے ڈرتے
 ڈرتے پوچھا۔

”ہاں..... کمینہ بچ گئی ہے لیکن تم بتاؤ، تم دونوں نے
 کیا کیا ہے؟“ وہ زور سے بولی۔

جواباً جولی نے ساری تفصیل بتائی۔ اسی دوران ان
 کے باپ کا پھر فون آگیا۔ وہ آگ بگولا ہو رہا تھا۔ ماں فون
 سنتے سنتے باہر چلی گئی۔ مئی اور جولی دونوں ایک دوسرے کا
 ہاتھ پکڑے خوفزدہ بیٹھی تھیں۔ سگی ماں کے پاس آ کر بھی ان
 کا خوف ختم نہ ہو سکا تھا حالانکہ وہ یہ جان چکی تھیں کہ وہ مل
 کر کے نہیں آئیں۔

”تمہارا باپ بہت غصے میں تھا۔ وہ تم پر ریم کی چوری
 بھی ڈال رہا تھا۔ میں نے اسے سمجھا بھجا دیا ہے لیکن اس

نے یہ کہا ہے کہ تم دونوں اس وقت تک گھر واپس آ کر نہیں رہ سکتیں جب تک اس کی بیوی سے معافی نہ مانگ لو۔“

”ہم ہرگز اس گھر واپس نہیں جائیں گے اور اس لیے معافی مانگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ جولی نے مضبوط لہجے میں کہا۔ اسے لگا تھا کہ مٹی اب ان کا ساتھ دے گی۔

”تو پھر تم کیا کرو گی؟ میرا مطلب ہے کیا ہم یہاں رہیں گے؟“ مٹی کے لہجے میں امید تھی جو ان کی سگی ماں نے فوراً ختم کر دی۔

”نہیں، مجھے نہیں لگتا کہ میں تمہیں یہاں رکھ سکوں گی۔ میرا شوہر اس بات کو پسند نہیں کرے گا۔“

”لیکن آپ نے ہمیں فون پر کہا تھا کہ آپ ہم دونوں کو رکھنے کے لیے تیار ہیں۔“ جولی نے بڑے منت بھرے انداز میں یاد دلایا۔ مٹی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

”ہاں کہا تھا میں نے لیکن اس وقت مجھے یہ نہیں پتا تھا کہ تم کیا خطرناک کام کر کے آئی ہو۔“ ماں رکھائی سے بولی۔

”مٹی! میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ یہ سب محض ایک حادثہ تھا اور.....“

”تم دونوں چند دن رک سکتی ہو پھر میں تمہارا کوئی بندوبست کرتی ہوں، یعنی تمہارے رہنے کے لیے انتظام کرتی ہوں۔ یقیناً کوئی جگہ مل جائے گی۔“ ماں نے اس کے جملوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنا فیصلہ سنایا اور دروازے کی جانب بڑھ گئی۔

”اور ہاں سنو! میرے شوہر کو شور، اونچی آواز میں ٹی وی دیکھنا اور کچرا بکھیرنا بہت بُرا لگتا ہے۔ اس بات کا خیال رکھنا۔“ اس نے جاتے جاتے رک کر کہا اور چلی گئی۔

دونوں بہنیں خاموش بیٹھی ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں۔

☆☆☆

صبح ناشتے کی ٹیبل پر دونوں نے اپنے سوتیلے باپ کو دیکھا۔ عجیب سے حلیے والا وہ شخص دونوں بہنوں کو بار بار گھور رہا تھا۔ اس نے رسمی گفتگو کے علاوہ کچھ نہیں کہا۔ مٹی اور جولی سہمی سی بیٹھی تھیں۔

ناشتے کے بعد ان کا سوتیلا باپ اٹھا اور باہر جاتے ہوئے بولا۔ ”کسی مصیبت سے بچنا چاہتی ہو تو اپنی دونوں بیٹیوں کا کوئی نیا ٹھکانا جلدی سے ڈھونڈو۔“

ماں نے سر ہلا دیا۔ جولی چپ ہی تھی۔ مٹی کا خون کھولنے لگا۔ سگے باپ کے گھر میں سوتیلی ماں تھی۔ سگی ماں کے گھر میں سوتیلا باپ تھا۔

”مٹی! کیا آپ ہمیں نکالنے والی ہیں؟“ اس نے

ناراضی لہجے میں پوچھا۔ وہ اسکول گرل کے بجائے بڑی بڑی لکٹنے لگی تھی۔

”ہاں، میں نے اپنی ایک دوست سے بات کی ہے۔ وہ تمہیں کچھ عرصہ اپنے ایک چھوٹے سے خالی فلیٹ میں رکھنے کے لیے تیار ہے لیکن جونہی اسے فلیٹ کے لیے کوئی موزوں گاہک مل جائے گا، وہ تم سے خالی کر دالے گی..... لیکن میں تمہیں نکال نہیں رہی بلکہ حالات کے مطابق فیصلہ کر رہی ہوں۔“ ماں یوں بولی جیسے بہت مجبور ہو۔

”یعنی ہم جہاں جائیں گے، وہاں بھی عارضی طور پر رہیں گے پھر سے نئی جگہ ڈھونڈنا پڑے گی۔“ جولی نے ماں سے پوچھا۔ جواب میں ماں کچھ بولنے کے بجائے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

”چلو مٹی، چلیں..... کہیں نہ کہیں رہ لیں گے۔ مٹی کا چند دن کا احسان لینے کی ضرورت نہیں۔“ جولی نے بڑی افسردگی سے فیصلہ کرتے ہوئے مٹی کا ہاتھ پکڑا۔ جوا بٹلی نے عجیب حرکت کی۔ اپنا بازو بہن سے چھڑا کر باہر بھاگی اور بھاگ کر بیڈروم میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔ جولی اور ماں کھڑکی کے پاس جا کر زور زور سے اسے کچھ بھی غلط کرنے سے روکنے لگیں۔ مٹی نہایت سکون سے کمرے کے وسط میں کھڑی تھی۔

”کیا کرنے لگی ہو مٹی؟“ جولی رو دینے کو تھی۔

”میرا خون رات سے جل رہا ہے جب مٹی نے اپنے شوہر کی ہمارے متعلق ناپسندیدگی کا ذکر کیا تھا۔ اب اس شخص کا رویہ اور مٹی کی باتیں میرا صبر اور قوت برداشت ختم کر چکی ہیں۔ اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں اس شخص کا گھر لگاڑوں کی جس نے ہماری مٹی کو ہمارے لیے پرایا کر دیا۔“ مٹی غصے سے بولی رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے نظر آنے والا اس کے چہرے کا سکون کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

”کیا مطلب، کیا کرو گی تم؟“ ماں نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”میں اس کمرے میں موجودی وی، کمپیوٹر، فریج اور سارے گل دان، آرائشی چیزیں توڑنے لگی ہوں۔ اس کے بعد کچن کا بیڑا غرق ہوگا۔ برتن بچیں گے نہ ڈائننگ ٹیبل۔ میں پورے گھر میں جو جو چیز توڑ سکتی ہوں، توڑ پھوڑ دوں گی۔ آپ کے شوہر کو کچرا پسند نہیں ہے نا؟ میری ضد ہے اس کے آنے سے پہلے اس پورے گھر کو ڈسٹ بن بنا کر رکھ دوں گی۔ ایسا کچرا بکھرے گا کہ وہ پاگل ہو جائے گا۔“ چیخ چیخ کر بولتے ہوئے مٹی نے دی کی جانب بڑھی۔

”رکو مٹی..... رکو پلیز! میں کچھ کرتی ہوں۔“ ماں نے

کھڑکی پر زور زور سے ہاتھ مارتے ہوئے اسے رکنے کا کہا۔ جولی بھی اسے منع کر رہی تھی۔

”اوہ واقعی، آپ کچھ کریں گی؟“ ملی کا لہجہ طنزیہ تھا۔
”ہاں..... ہاں، میں تمہیں پریشانی سے نکالنے کے لیے کوئی مناسب قدم اٹھاتی ہوں۔ تم کوئی توڑ پھوڑ نہ کرو۔“
ماں نے یقین دہانی کروائی۔

”تو ٹھیک ہے پھر سنیں، اپنی دوست سے کہیں کہ جب تک ہم اپنا آسانی سے بندوبست نہ کر لیں، ہمیں فلیٹ میں رہنے دے۔ دوسرا ہمیں کچھ رقم دیں جس سے ہم اپنی زندگی شروع کر سکیں۔“

ماں نے فوراً نمبر ملایا اور چند منٹ میں دوست کو اپنی مجبوریاں بتا کر راضی کر لیا۔ جولی حیرانی سے اپنی چھوٹی بہن کو دیکھ رہی تھی جو ماں کو بلیک میل کر کے اپنا مسئلہ حل کروا رہی تھی۔

”تم چاہو تو آج ہی اس فلیٹ میں شفٹ ہو سکتی ہو، انتظام ہو گیا ہے لیکن رقم کے لیے سوری! وہ میرے پاس نہیں ہے۔“ ماں نے تیز تیز بولتے ہوئے کہا۔ ملی نے صاف و شفاف کھڑکی کے شیشے سے ماں کے دھندلے چہرے کو دیکھا جس پر حالات نے متاکی شفافیت چھین کر دھندلا ہٹ ڈال دی تھی۔

”میں جانتی ہوں کہ وہ آپ کے پاس نہیں ہے بلکہ..... وہ میرے پاس ہے۔ میں جانتی تھی کہ ایسا جواب ملے گا اس لیے میں الماری میں سے جو رقم سامنے پڑی تھی، وہ نکال چکی ہوں۔ اب برائے مہربانی ہمیں اجازت دیں۔ ہم چلتے ہیں۔ چلو جولی!“ ملی بات کرتے کرتے دروازہ کھول کر باہر آ چکی تھی۔ نہ جانے کیوں اسے یقین تھا کہ دوسرے شوہر کے سامنے مجبور اس کی ماں اس سے پیسے چھیننے کی کوشش نہیں کرے گی۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد دونوں اپنے دو چھوٹے چھوٹے بیگ جو وہ باپ کا گھر چھوڑتے ہوئے ساتھ لائی تھیں، سمیت اپنے نئے ٹھکانے پر پہنچی چکی تھیں۔

☆☆☆

دو دن تو انہیں نئی جگہ پر ادھر ادھر دیکھنے، فلیٹ کی مالکن کو سمجھنے اور تھکاؤ اتارنے میں لگے۔ تیسرے دن جب دونوں بازار سے خرید اہوا تھا کر رہی تھیں تو جولی نے ملی سے کہا۔ ”میں کوئی جاب ڈھونڈتی ہوں۔ کسی ریسٹورنٹ میں برتن دھونے یا صفائی کا کام مل جائے تو بہت اچھا ہوگا۔ تم اپنی پڑھائی جاری رکھو۔“

”کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کر لیں یعنی بہت چھوٹا سا اپنا کام؟“ ملی نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”مذاق کیوں کر رہی ہو؟ مجھے کوئی بزنس آتا ہے نہ میرے پاس پیسے ہیں۔ فضول باتیں بند کرو۔ میں ذرا باہر جا رہی ہوں۔ کسی ریسٹورنٹ میں اپنی جاب کے لیے بات کرتی ہوں۔“ جولی سنجیدگی سے بولتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔
”رکو جولی! میں مذاق نہیں کر رہی۔ ذرا بیٹھو، بات تو سنو۔“ ملی نے اسے تیزی سے روکا۔ جولی گہری سانس لے کر دوبارہ بیٹھ گئی۔

”ہاں بولو، جلدی۔“ جولی نے کہا۔ اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ اسے ملی سے کوئی فضول بات کہنے کی ہی امید ہے۔
”تم کیک بہت اچھے بنا لیتی ہو اور اس کی سجاوٹ تو تم کمال کی کرتی ہو..... ہے نا؟“ ملی نے کہا۔
”تو پھر؟“ جولی نے اچھے ہوئے انداز میں کہا۔

”تو..... یہ کہ کیوں نہ ہم کیک بنانے کا کام شروع کر دیں۔ میں تمہاری ہیلپ کروں گی۔ ارد گرد برتھ ڈے اور شادی کی سالگرہ اور دیگر تہواروں کے کیک لینے والے کافی لوگ ہیں۔ مجھے لگتا ہے یہ کام بہت اچھا رہے گا۔ کیا خیال ہے؟“ ملی نے بڑے جوش سے بات کرتے ہوئے سوال کیا۔ جولی کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر چپ چاپ اٹھ کر باہر جانے لگی۔ واقعی اس کی توقع کے عین مطابق فضول بات ہی تھی۔

”جولی! میرے پاس رقم ہے جس سے یہ کام شروع کیا جاسکتا ہے۔“ ملی نے اسے پکارا جب جولی دروازہ کھول رہی تھی۔ وہ رکی اور بہن کو گھورنے کے لیے پیچھے مڑی لیکن اس کی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں جب اس نے ملی کو اس بیگ میں سے رقم نکالتے دیکھا جو وہ اپنے باپ کے گھر کو چھوڑتے ہوئے ساتھ لائی تھی۔ یہ وہ بیگ تھا جولی اپنی سوتیلی ماں کے کمرے سے لے کر نکلی تھی اور ابھی تک جولی اس میں کوئی عام سی چیز سمجھ رہی تھی۔

”یہ..... یہ رقم تم اس روز لائی ہو نا جب.....“ وہ دروازہ بند کر کے واپس آ کر ملی کے پاس بیٹھ گئی۔

”ہاں، میں نے گھر سے بھاگنے سے پہلے اس ظالم عورت کی الماری کا صفایا کر دیا تھا اور یہ چوری نہیں ہے۔ یہ ہمارے باپ کے پیسے ہیں جو وہ دبا کر بیٹھی تھی۔ چند دن پہلے ہی میں نے اچانک دیکھ لیا تھا کہ وہ پیسے کہاں چھپاتی ہے اس لیے اس روز آرام سے نکال لیے۔ مگر کی الماری والے پیسے میں نے تم کو دے دیے تھے لیکن اس رقم کے

بارے میں، میں نے سوچا تھا مناسب وقت پر بتاؤں گی کیونکہ یہ کافی زیادہ رقم ہے۔“ ملی نے ساری تفصیل بتائی۔
”اوہ! تو اسی لیے ڈیڈی ہم پر چوری ڈال رہے تھے۔“ جولی نے رقم کو دیکھتے ہوئے کہا۔ بے تحاشا تو نہیں لیکن معقول رقم تھی جس سے وہ چھوٹے سے پیمانے پر کیک بنانے کا کام شروع کر سکتی تھیں۔

”ملی! یہ تم نے بہت اچھا کام کیا۔ ایسا کرتے ہیں سارے پیسے خرچ نہیں کرتے۔ کچھ رقم سنبھال لیتے ہیں اور ہم آج ہی سے آغاز کرتے ہیں۔ میں شام کو تھوڑا سا کیک بنانے کا سامان لاؤں گی اور ارد گرد بات بھی کرتے ہیں۔ مجھے یقین ہے مثبت نتائج ملیں گے۔“ جولی کے چہرے پر کافی اطمینان تھا۔ بڑی محنت اور جاں فشانی سے پہلا کیک بنا کر جولی نے اپنے فلیٹ کی مالکن کو دیا۔ دونوں بہنوں کی خوش قسمتی کہ اسے کیک بہت پسند آیا اور اس نے ان سے کیک بنانے کا کہا جو اس نے اپنے بھائی کی سالگرہ پر جاتے ہوئے لے کر جانا تھا۔ دونوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔

آہستہ آہستہ کئی لوگ ان سے کیک بنوانے لگے۔ ملی، جولی کی ہیلپ کرتی اور جولی نہایت خوش ذائقہ، بہترین خوشبو اور انوکھے ڈیزائن اور شیب والے کیک بناتی۔ ملی کی پڑھائی شروع ہو گئی تھی۔ جب کچھ عرصہ گزرا تو جولی کو احساس ہوا کہ ان کا بس گزارہ چل رہا ہے۔ بس اتنا ہی کام آ رہا تھا کہ وہ آسانی سے کھانا کھا سکیں۔ اچھے کپڑے، جوتے، ملی کی پڑھائی کے پیسے اور آئندہ زندگی کے لیے کوئی بچت وغیرہ اس کے لیے کچھ نہ بچتا۔ جولی نے اور زیادہ محنت کرنا شروع کر دی لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔

”کیا ہم ایسے ہی سکرسٹ کر گزارہ کرتے ہوئے زندگی گزاریں گے؟“ ایک روز اس نے ملی سے کہا۔ وہ کافی مایوس نظر آ رہی تھی کیونکہ نتائج ابھی تک توقع کے برعکس تھے۔ ”اب تو مجھے لگنے لگا ہے کہ میں نے تمہیں فضول آئیڈیا دیا تھا۔ خواہو! اچھے خاصے پیسے خرچ کر دادیے اور محنت بھی اکارت جا رہی ہے۔ اس سے بہتر تھا کہ میں اور تم کسی ریسٹورنٹ وغیرہ یا کسی گھر میں ہیلپر کی جاب کر لیتیں۔ کھانا اور گزارے لائق پہننے کو تو مل ہی جاتا۔ اپنا ”کاروبار“ کر کے بھی تو یہی مل رہا ہے۔“ ملی نے دل برداشتہ سا ہو کر کہا۔ اس نے ”کاروبار“ پر زور دیتے ہوئے گویا خود اپنا مذاق اڑایا۔ لگ رہا تھا کہ وہ رو دے گی۔

”ارے نہیں، نہیں..... تمہارا آئیڈیا ہرگز فضول نہیں ہے۔ بس، یہ تو ہماری قسمت ہے کہ کام زیادہ چل نہیں رہا۔“

جولی نے جلدی سے بہن کو گویا دلاسا دیا۔
”ہماری قسمت کچھ زیادہ ہی خراب ہے۔ ماں چھوڑ کر چلی گئی، سوتیلی ماں نے زندگی اجیرن کیے رکھی۔ حالات نے باپ کا گھر چھوڑنے پر مجبور کیا اور سگی ماں نے یوں آنکھیں پھیر لیں جیسے ہم سے اس کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ تمہاری تعلیم ادھوری رہ گئی اور اب مجھے صاف نظر آ رہا ہے کہ مجھے بھی اپنی پڑھائی کا سلسلہ جو چند دن پہلے شروع کیا تھا، ختم کرنا پڑے گا۔“ ملی کا لہجہ جلا کٹا تھا۔

”درست کہا تم نے۔ واقعی ہماری قسمت خراب ہے۔ میں نے بھی سوچا تھا کہ خوب کام چل نکلے گا۔ مجھے دو چار ملازم رکھنا پڑیں گے۔ کم از کم اس علاقے میں ہماری شہرت ہوگی اور ہمارے ماں باپ ایک دن خود ہم سے رابطہ کریں گے لیکن دیکھو، کیا ہو رہا ہے..... لیکن تم فکر نہ کرو۔ تمہاری تعلیم ادھوری نہیں رہے گی۔ میں کچھ نہ کچھ کر.....“ صوفے کی ڈسٹنگ کرتے ہوئے جولی بول رہی تھی کہ ملی نے بات کاٹ دی۔

”کیا کر لوگی.....؟ ہیں..... کیا پلان ہے تمہارے ذہن میں؟ یقیناً کوئی بھی نہیں تو پھر کیوں جھوٹی آس دلا رہی ہو؟“ بظاہر کم عقل اور بے فکر نظر آنے والی ملی بڑی پریشان اور دکھی تھی۔ جولی نے چپ چاپ صفائی مکمل کی۔

”چلو آؤ، ذرا گھوم کر آتے ہیں۔“ اس نے بڑی خوش دلی سے بڑے عام لہجے میں ملی سے کہا جیسے کچھ دیر پہلے وہ دونوں بالکل اداس، دکھی نہیں تھیں۔ ملی زبردستی مسکراتے ہوئے اٹھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد دونوں پارک میں بیٹھی عام سی باتیں کر رہی تھیں۔

”ملی! میں نے سوچا ہے کہ نئے سرے سے کام کا آغاز کیا جائے۔“ باتیں کرتے کرتے جولی نے اچانک کہا۔ ”کیا مطلب..... نئے سرے سے؟“ ملی حیران ہوئی کہ اس کی غریب بہن کون سا نیا سرا پکڑنے والی ہے۔ جولی مسکرائی اور بولی۔ ”میں نے سوچا ہے کہ اب جو کیک بناؤں گی، اسے سمجھوں گی کہ یہ میرا پہلا کیک ہے۔“ ”اس سے کیا ہوگا؟“ ملی اب بھی حیران تھی۔

”ہوگا یہ کہ پرانے دنوں یعنی جب سے یہ کام شروع کیا ہے، کی کوفت اور کچھ زیادہ حاصل نہ ہونے کا غم ہم ایک طرف رکھ دیں گے۔ سمجھیں گے کہ ابھی تک کچھ کیا ہی نہیں اور آج ہی شروع کر رہے ہیں۔ ہم نئی امید سے پہلا کیک بناؤں گے اور یقین رکھیں گے کہ اب ہماری توقع کے مطابق نتائج ملیں گے..... میں بس اتنا ہی ”نئے سرے سے“ کر

سکتی ہوں۔“ جولی کے لہجے میں امید تھی لیکن اداسی کا عنصر بھی شامل تھا۔ ملی کچھ نہیں بولی اور گھاس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

جولی نے واقعی نئی امید، نئے یقین سے پھر سے پہلا کیک بنایا۔ اسے بہت اچھا شپ دیا، انوکھے انداز میں سجایا۔ یہ مسز جوزفین کی شادی کی سالگرہ کا کیک تھا۔ جولی بار بار اسے دیکھ رہی تھی اور ملی شرارت سے مسکراتے ہوئے اس کا مذاق اڑا رہی تھی کہ خطی سی جوزفین کا حلقہ احباب زیادہ سے زیادہ دو تین لوگوں پر مشتمل ہوگا جو اگر اس سے کیک بنوا بھی گئیں تو کون سا بہت زیادہ دولت مل جائے گی۔ وہ واقعی خوب بے فکر ہو چکی تھی یا ایکٹنگ کر رہی تھی۔ جولی کو اس بات کی بالکل سمجھ نہیں آرہی تھی۔ اس نے ملی کے مذاق اڑانے پر برا مانا تو اسے ہلکا سا ڈانٹ دیا اور کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے سوچنے لگی کہ کیا کبھی وہ اپنے معاشی حالات سدھار سکے گی۔

☆☆☆

سبز فراک اور سنہری بالوں کی پونی کے ساتھ نازک سی جولی ایک گڑیا لگ رہی تھی۔ اس کے حلیے اور معصوم چہرے کو دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کے ذہن میں کتنی بڑی سوچیں چل رہی ہیں۔

”ملی! نہ جانے کیوں مجھے آگے بہت اچھا ہوتا نظر آرہا ہے۔“ سینڈوچ ختم کر کے جولی نے ملی کی جانب مڑتے ہوئے کہا۔

ملی کو یکدم اپنی بہن پر ترس آیا جو انتہائی نامساعد حالات میں بہت اچھے کا یقین کیے بیٹھی تھی۔ مسز جوزفین کا کیک ان کے گھر پہنچا دیا گیا تھا۔ انتہائی شاندار اور خوبصورت کیک نے کچھ بھی نیا یا انوکھا رزلٹ نہ دیا۔ جولی بہت افسردہ ہوئی۔

”ملی! دیکھو، ہمارے ساتھ پھر برا ہوا ہے نا؟“ وہ افسردگی سے کہہ رہی تھی۔

”تم نے نئے سرے سے کام شروع کیا ہے۔ اداس کیوں ہو رہی ہو؟ ابھی تو آغاز ہے۔“ ملی کا لہجہ عام ہی تھا لیکن جولی چڑھ گئی۔

”تم شاید میرا مذاق اڑا رہی ہو۔ ٹھیک ہے، اڑاتی رہو، میں ہوں ہی اسی لائق۔“ اس نے چنچ کر کہا اور ہاتھ میں پکڑا گلاس دیوار پر دے مارا۔

ملی سہم کر کھڑی ہو گئی۔ اسے لگا اب اس کی باری ہے۔ اب جولی کوئی چیز اس کے سر پر مار کر اپنی فرسٹریشن

نکالے گی۔ جولی نے اسے تو کچھ نہ کہا لیکن کمرے میں توڑ پھوڑ کرنے لگی۔ مختصر سے کمرے کا تھوڑا سا سامان بکھرنے لگا۔ ملی نے اپنے اوسان بحال کیے اور بہن کو سنبھالنے لگی۔

چند منٹ میں وہ اسے روکنے میں کامیاب ہو گئی۔ جولی نے فرش پر بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ ملی بالکل خاموشی سے اسے روتا دیکھ رہی تھی۔ آہستہ آہستہ جولی کی سسکیاں تھمنے لگیں۔

”سوری جولی! میں نے اپنے اور تمہارے کام کا مذاق اڑا کر تمہیں دکھی کر دیا۔“ ملی اس سے معذرت کرنے لگی۔ وہ پچھتا رہی تھی کہ وہ بولی ہی کیوں نہ بولتی، نہ کمرے میں اور جولی کے اعصاب میں اتنی توڑ پھوڑ ہوتی۔ ”نہیں ملی! میرے اس دکھ اور غصے کے پیچھے ایک اور وجہ ہے، تمہارا مذاق نہیں۔“ جولی نے آنکھیں صاف کرتے ہوئے دھیرے سے کہا۔ اس کا چہرہ گلابی سے سرخ ہو چکا تھا اور چہرے پر تھکن سی نظر آرہی تھی۔

”کون سی وجہ؟ مجھے بتاؤ۔“ ملی نے تیزی سے سوال کیا۔

”آج جب تم اسکول میں تھیں، می کا فون آیا تھا۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ اگر ہم یہاں ٹھیک نہیں رہ رہیں تو ڈیڈی اور سوتیلی ماں کے گھر چلی جائیں۔ می کا کہنا تھا کہ وہ بہت مجبور ہیں کیونکہ ان کا شوہران کی سوتیلی بیٹیوں کو ساتھ رکھنا پسند نہیں کرتا اس لیے ہم دونوں بہنیں معافی وغیرہ مانگ کر واپس اسی جہنم میں چلی جائیں جہاں سے ایک دن ہمیں ڈر کر نکلنا پڑا تھا۔“ جولی آہستہ آہستہ بتانے لگی۔

”اوہ! تو ہمارا خیال اگر می کو آیا بھی تو کیسا آیا کہ ہمیں پھر ظلم و ستم کے سپرد کر رہی ہیں۔“ ملی غصے میں تھی۔

”ہاں..... مجھے بھی اس بات پر بڑا دکھ محسوس ہوا۔

در اصل ہماری مکان مالکن نے می سے کہا ہے کہ ہم دونوں زیادہ سے زیادہ ایک ماہ یہاں ٹھہر سکتی ہیں۔ اس کے بعد وہ اپنا یہ فلیٹ ہم سے خالی کر دے گی اور کو دے گی جو اسے زیادہ کرایہ دے سکتا ہے۔ اسی لیے می نے فون کیا تھا۔ میں فون سننے سے لے کر اب تک بڑی ٹینشن میں ہوں۔ میں نے اپنی توجہ بٹانے کے لیے سارا دھیان بننے والے کیک پر لگا دیا اور ایک بار پھر سوچنے لگی کہ شاید کچھ اچھا ہو جائے لیکن نہیں ملی..... اب مجھے یقین نہیں رہا۔ بار بار خود کو اس دلاتے دلاتے میں تھک چکی ہوں کیونکہ مسز جوزفین یا کہیں اور سے کوئی رد عمل نہیں ملا۔ مجھے لگ رہا ہے کہ ان کا جاننے والا تو دور کی بات، وہ خود بھی ہم سے آئندہ کیک نہیں بنوائیں گی کیونکہ..... ہماری قسمت ایسی ہی ہے۔“ جولی

بتاتے بتاتے ایک بار پھر رودی۔ ملی میں اتنی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ بہن کو دلاسا دے سکے۔ وہ تو رہائش، کھانا، آئندہ زندگی کا سوچ سوچ کر ہول رہی تھی۔ اب کیا ہوگا؟ یہ سوال اسے لرز رہا تھا۔

”ایک بات تو طے ہے کہ ہم واپس ہرگز نہیں جائیں گے، چاہے حالات کیسے بھی ہو جائیں۔“ رونا روک کر جولی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ اس کے لہجے میں اپنے رشتوں سے نفرت واضح نظر آرہی تھی۔

”بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ واقعی ہم اس گھر واپس نہیں جائیں گے..... لیکن جولی اب ہم کریں گے کیا؟“ ملی نے بہن کی بھرپور تائید کی لیکن ساتھ ہی گھبرا کر سوال بھی کر دیا۔ ”سوچتے ہیں کچھ۔“ جولی نے دھیرے سے کہا اور منہ دھونے کے لیے چلی گئی۔ ملی اٹھ کر کمر اور ست کرنے لگی۔

رات کو دونوں سونے کے لیے لیشیں تو جولی اچانک اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ”ملی! میرا خیال ہے اگر ہم پُرکشش الفاظ اور شاندار طریقے سے ایڈورٹائزمنٹ کریں تو لوگ ہماری طرف متوجہ ہو سکتے ہیں۔“

”کیا کہا تم نے؟“ ملی نے جولی کو یوں دیکھا جیسے اس کی دماغی حالت پر شبہ کر رہی ہو۔

”میں یہ کہہ رہی ہوں ملی کہ ہم ایک کونے میں بیٹھ کر ترقی کرنے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ ہمیں اپنے کام کو مشتہر کرنا چاہیے۔ مشہوری کرنی چاہیے۔ دیکھنا پھر کیسے حالات تیزی سے بدلیں گے۔“

”جولی.....! کیا تم جانتی ہو کہ اس ”قابل عمل آئیڈیا“ پر اخراجات کتنے آئیں گے؟ کیا ہمارے پاس اتنی رقم ہے؟“ ملی نے لفظوں پر زور دیتے ہوئے جولی سے پوچھا۔

”ہاں، جو تھوڑی سی رقم پڑی ہے، وہ اس کام پر لگا دیتے ہیں۔“ جولی نے بڑے جوش سے کہا۔ وہ مایوس تو ہوتی تھی لیکن جلد ہی پُر امید بھی نظر آنے لگتی تھی۔

”نہیں..... اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور جو تھوڑے سے پیسے ہیں، ان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ یہ پیسے اشتہار دینے کے لیے ناکافی ہوں گے۔ اس کا اندازہ تو شاید تم کو بھی ہوگا۔“ ملی نے جولی کا ہاتھ پکڑ کر سمجھایا۔ جولی نے آنکھیں بند کر لیں۔

☆☆☆

”رکولی! ایک کام ہے تم سے۔“ ملی اسکول سے واپس آرہی تھی کہ جینی نے اسے آواز دی۔ جینی ایک امیر لڑکی تھی۔ ملی کی ذہانت اور معصومیت کی وجہ سے جینی نے اس سے دوستی

کر لی تھی ورنہ وہ عام طور پر کسی کو منہ نہ لگاتی تھی۔

”ہاں جینی! کیا بات ہے؟“ ملی رک گئی۔ وہ کافی ٹھکی ہوئی لگ رہی تھی۔ حالات کی ٹھکن اس کے چہرے پر نظر آرہی تھی۔ ”نہ جانے تعلیم کا یہ سلسلہ کتنے دن بعد رکنے والا ہے؟“ وہ اداسی سے سوچتے ہوئے چل رہی تھی کہ جینی نے اسے آواز دے کر روک لیا۔

”ملی! وہ تم سے نوٹس لینا تھے۔ تم کہہ رہی تھیں کہ آج دوں گی۔“

”اوہ ہاں، یاد آیا۔ رکو میں بیگ سے نکالتی ہوں۔“ کہہ کر ملی نے بیگ کندھے سے اتارا۔

”جلدی کرو..... می میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔ ہم نے شاپنگ کے لیے جانا ہے۔“ جینی نے اس کے دھیمے اور ٹھکے ہوئے انداز کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”شاپنگ؟ کس قسم کی شاپنگ کرنے جا رہی ہو تم؟“ نوٹس اسے تھماتے ہوئے ملی نے ہلکا سا مسکرا کر سوال کیا۔

”میری آنٹی کی پرسوں سالگرہ ہے۔ اسی کی تیاری کر رہی ہوں۔ میری آنٹی شہر کی معروف بزنس وومن ہیں۔ انہوں نے بہت خاص مہمان اور میڈیا والے بلائے ہیں اس لیے بہت خاص تیاری کرنا ہوگی۔“ جینی کے لہجے اور چہرے پر بڑا جوش تھا۔

”اوہ اچھا..... تو ٹھیک ہے۔ میں چلتی ہوں۔ تم بھی جاؤ اور کرو شاپنگ۔“ ملی زبردستی مسکراتے ہوئے بول رہی تھی۔ حالات نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔ وہ بیگ کندھے پر ڈال کر چلنے لگی کہ اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ وہ یکدم رک گئی۔

”جینی ارکو، میری بات سنو۔“ وہ زور سے چلائی۔ جینی گاڑی میں بیٹھنے ہی والی تھی۔ وہ ملی کی آواز سن کر رک گئی۔

”رکو، رکو..... بڑی ضروری بات کرنا ہے تم سے۔ ذرا ادھر آؤ۔“ ملی نے تیز بولتے ہوئے اس کا بازو پکڑا۔

”ارے کیا ضروری بات ہے جو تم ایسے اچانک تیزی سے آئی ہو؟“ جینی کو واقعی حیرت ہو رہی تھی کہ آہستہ آہستہ بولتے ہوئے پرے جانے والی ملی یوں تیزی سے بولتی، بھاگتی کیسے آئی ہے۔

”جینی..... پلیز! میرا ایک کام کر دو۔ تم یہ کر سکتی ہو۔ میں تمہارے اس کام کے بدلے اپنے مزید نوٹس بھی دوں گی..... دیکھو! کارمت کرنا۔“ جینی نے بڑی لجاجت سے کہا۔

”کون سا کام ملی؟ کیا ہے جو میں کر سکتی ہوں اور تم اس کے لیے مجھے مزید نوٹس دینے کو بن کہے تیار ہو گئی ہو؟“

اپنے ڈرائیور کو ذرا رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے جینی نے مزید حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

”جینی! میں اور میری بہن جولی بہت اچھے کیک بناتی ہیں اور یہ بات میں نے تمہیں پہلے بتائی بھی ہے۔“ ملی نے کہا۔

”ہاں، تم نے بتایا تھا۔ مجھے یاد ہے۔“ جینی نے سر ہلایا۔
”میں تو بس ہیلپ کرتی ہوں۔ دراصل سارا کام جولی کا ہوتا ہے۔ وہ بڑی محنت اور نفاست سے انتہائی خوش ذائقہ اور خوب صورت کیک بناتی ہے۔ لوگ مختلف مواقع پر ہم سے کیک تیار کرواتے ہیں۔ ہماری کوئی شاپ وغیرہ نہیں ہے۔ گھر کے چکن میں ہی سارا کام کرتے ہیں لیکن یقین کرو میری بہن کے ہاتھ کا ذائقہ مشہور شاپس والوں سے کہیں بڑھ کر ہے۔“ ملی جلدی جلدی بول رہی تھی۔ جینی کو اس کی بات سمجھ آنے لگی۔

”تو تم یہ چاہتی ہو کہ میری آنٹی کی سالگرہ پر.....“ جینی بول رہی تھی کہ ملی نے بڑے جوش سے بات کالی۔
”تم بالکل ٹھیک سمجھی ہو۔ میں چاہتی ہوں کہ تم اپنی بزنس دوسن آنٹی سے کہو کہ وہ اس خاص و شاندار موقع پر ہم سے کیک بنوائیں۔ یہ ہمارے لیے بڑے اعزاز کی بات ہوگی۔ تم کوئی خدشہ دل میں مت لانا۔ معیار کے اعتبار سے کیک بہت اعلیٰ ہوگا۔“ ملی نے کہا۔

”نہیں، نہیں۔ مجھے کوئی خدشہ نہیں لیکن میری آنٹی میری بات کیسے مانیں گی؟“ جینی نے جواب دیا۔
”اگر تمہاری می ان سے کہیں اور اپنی می کو تم مناؤ تو یہ ناممکن نہیں ہے جینی!“ ملی نے بڑا امید نظروں سے جینی کو دیکھا۔
”میں می سے کہوں؟ لیکن ذرا مشکل ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ اتنے بڑے فنکشن کا اہم آسٹم میرے کہنے پر میری دوست سے بنوانے پر رضامند ہو جائیں۔“ جینی نے معذوری ظاہر کی۔

”جینی! تم کسی طرح یہ کر دو۔ دیکھو، اس سسٹر کے لیے جو نوٹس تمہیں چاہئیں، میں تمہیں دوں گی۔ پلیز جینی!“ ملی نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

”اچھا..... تو تم ایک کام کرو۔“ جینی نے نرمی سے کہا۔
”کیا؟ بتاؤ جلدی۔“ ملی بے تاب سے بولی۔

”یہ لو میرے گھر کا ایڈریس۔“ جینی نے بیگ سے کاپی نکال کر ایک چٹ بنا کر ملی کو تھمائی۔

”کیا کروں اس کا.....؟ اوہ، تو میں تمہارے گھر آ کر تمہاری می سے کہوں۔ کیا وہ ایک عام سی لڑکی کی بات پر

یقین کریں گی؟ نہیں جینی، پلیز! تم خود ہی کچھ کرو۔“ ملی چٹ پکڑے بول رہی تھی۔

”نہیں، تم می سے کچھ نہیں کہو گی۔ بس ایک کام کرنا ہے تم کو۔ دھیان سے سنو۔“ کہہ کر جینی نے ملی کو پوری بات سمجھائی۔ ملی کے چہرے پر مسکراہٹ اور امید نظر آنے لگی۔ جینی بات مکمل کر کے گاڑی کی طرف بڑھ گئی اور ملی نے چٹ کو احتیاط سے بیگ کی جیب میں رکھ لیا۔

☆☆☆

شام کا وقت تھا۔ ملی، جینی کے گھر کے شاندار ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھی۔ ملازمہ اسے بٹھا کر جوس دے گئی تھی۔ جینی نے ملازمہ کو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اس کی ایک دوست آئے گی، اسے اندر لے آنا۔ عالی شان گھر کو دیکھتے دیکھتے ملی ڈرائنگ روم تک گئی تو اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اتنی دولت، اتنا کچھ کسی کے پاس ہو سکتا ہے؟ وہ سوچنے لگی۔ اس کے ذہن میں بار بار یہ خدشہ سراٹھانے لگا کہ اتنے بڑے گھر کی مالکن اتنی چھوٹی اور غریب لڑکی کی بات نہیں سنے گی۔ اضطراب میں اس سے جوس پینا مشکل ہو گیا۔ اتنے میں جینی ایک خاتون کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی۔ ملی جلدی سے کھڑی ہو گئی۔

”می! یہ میری دوست ملی ہے۔ بہت ذہین ہے۔ مجھے اسٹڈیز میں بہت ہیلپ دیتی ہے۔“ جینی تعارف کروانے لگی۔ ملی بس مرعوب سی اس طرح دار عورت کو دیکھ رہی تھی جو ہنسنے ڈریس میں بہت شاندار لگ رہی تھی۔ ملی نے جھجکتے ہوئے بڑی مشکل سے ہیلو ہائے کہا۔

”می! میری دوست اور اس کی بہن بہت اچھا کیک بناتی ہیں۔ میں نے ایک بار ان کے ہاتھ کا بنا کیک کھایا تھا۔ لا جواب ذائقہ تھا۔ یہ ہمارے لیے میری فرمائش پر مجھے کیک دینے آئی ہے۔ پلیز! آپ بھی چکھیں ذرا۔“ جینی نے ہیلو ہائے ہوتے ہی مطلب کی بات کرنا شروع کر دی۔

ملی کو بات کی تھوڑی سی سمجھ آگئی۔ فوراً ساری جھجک بالائے طاق رکھتے ہوئے بولی۔ ”جی میم! جینی کو تو بہت پسند ہے۔ آپ ضرور کھائیں۔ میں اپنی فرینڈ اور آپ کے لیے بڑی محبت سے لائی ہوں۔“ اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ بہت دولت مند ہونے کے باوجود جینی کی می مغرور نہیں ہے اور اسی لیے بیٹی کی مامی دوست کو ملنے ڈرائنگ روم میں آگئی۔

”سوری! میں اس وقت تو نہیں کھا سکتی۔ میرا سارا ڈائنٹ پلان بگڑ کر رہ جائے گا۔“ اسارٹ سی می نے ہلکا سا

مسکرا کر معذرت کی۔ ملی نے جینی کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ پہلا ہی مرحلہ طے نہیں ہو رہا، منزل تک کیسے پہنچا جائے گا۔

”کوئی بات نہیں مئی! میں فریج میں رکھ دیتی ہوں۔ آپ شام کو کھا لیجئے گا۔ چاہے تھوڑا سی لیکن کھانا پڑے گا کیونکہ یہ میری فرمائش پر بنا ہے۔“ جینی نے ماں سے بات کرتے ہوئے ملی کو آس دلائی۔ اس کی ماں نے سر ہلاتے ہوئے اس کا گال تھپتھپایا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد ملی امید اور ناامیدی کے درمیان گھری ہوئی واپس گھر کے لیے روانہ ہو گئی۔

☆☆☆

”بے وقوف لڑکی! خواہ مخواہ خرچہ اور محنت کروائی۔ ہم سے تو عام لوگ کم ہی ایک بنواتے ہیں۔ اتنے بڑے لوگ کیوں ہم سے رجوع کرنے لگے۔“ جولی، ملی کو سمجھاتے ہوئے ہلکا ہلکا ڈانٹ رہی تھی۔ ملی نے اسے سہانے سپنے دکھا کر ایک بنوایا تھا۔ جولی کو غصہ بھی آ رہا تھا اور دکھ بھی ہو رہا تھا کہ ابھی تک آرڈر ملنا تو دور کی بات، ایک چکھا تک نہیں گیا۔ ملی سیل فون سامنے رکھ کر اس کی ڈانٹ سن رہی تھی۔ اسے جینی کی کال کا انتظار تھا۔

”میں ذرا مارکیٹ تک جا رہی ہوں۔ تم انتظار کرو اس کال کا جو کبھی نہیں آئے گی۔“ جولی نے مایوسی کے عالم میں کہا اور باہر نکل گئی۔ ملی نے سیل فون سائڈ پر رکھا اور آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔ چند منٹ گزرے تھے کہ سیل فون بج اٹھا۔ جینی کی کال تھی۔ ملی کی آنکھوں میں چمک آگئی کیونکہ جینی نے اس سے کہا تھا کہ اگر خوشخبری ہوگی تو ہی وہ کال کرے گی۔

”یعنی خوشخبری.....“ ملی نے خوش ہوتے ہوئے فون آن کیا۔

”ملی! مئی کو ایک اتنا پسند آیا کہ میں بتا نہیں سکتی۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ اتنی میلنڈ لڑکیاں اتنا کم کام کیوں کر رہی ہیں۔ انہیں تو وسیع پیمانے پر ایک بنانے چاہئیں۔“ جینی اسے بتا رہی تھی۔

”اچھا..... تو پھر آگے کیا ہوا؟“ ملی کے لہجے میں بے تاب تھی۔

”ہوا یہ کہ میں نے مئی سے کہا ہے کہ آنٹی کی سالگرہ کا ایک بنوانے کی ذمہ داری وہ لے لیں یعنی آنٹی سے کہیں کہ ایک کا انتظام میں کروں گی..... تمہیں مبارک ہو ملی! ساری بات ہو گئی ہے۔ شہر کی معروف بزنس وومن کی سالگرہ

کا ایک تم بنانے والی ہو۔ کتنا بڑا ہونا چاہیے، کس سائز کا ہو؟ یہ میں تمہیں کیسج کر دیتی ہوں۔ پرسوں شام چار بجے تیار ہونا چاہیے۔“ ملی کی آنکھوں میں خوشی کے مارے آنسو آ گئے۔

”جینی! تھینک یو۔ تم نے ہم پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ ایک جہاں پہنچانا ہے، وہاں کا ایڈریس بھی بتا دو۔“ فون بند کر کے وہ جولی کا انتظار کرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد جولی اندر داخل ہوئی تو ملی نے بیڈ سے اچھل کر اسے گلے سے لگالیا۔

”ارے..... ارے..... کیا ہو گیا؟ گراؤ گی مجھے؟“ جولی جھنجھلا سی گئی۔

”میں تو نہیں گراؤں گی لیکن تم میری بات سن کر خود ہی چیرت سے گر پڑو گی۔“ ملی کھل کر مسکراتے ہوئے بول رہی تھی۔ کچھ دیر بعد جولی بھی خوب مسکرا رہی تھی۔

شہر کی بہت بڑی تقریب یعنی مسز تھامسن کی برتھ ڈے ایک کا آرڈر بے گھر، غریب، غیر معروف جولی کو مل گیا تھا۔ ایک کا سائز کافی بڑا تھا۔ پیسے خوب ملنے تھے اور..... دونوں بہنوں نے تقریب میں شرکت بھی کرنا تھی۔ جینی نے ایک لے کر آنے والی اپنی دوست اور اس کی بہن کو بھی مہمانوں کی فہرست میں شامل کروالیا تھا۔ مسز تھامسن کی پُروکار و امیرانہ تقریب کی یہ غریب ترین مہمان تھیں۔

جولی نے اپنی تمام تر صلاحیتیں اس ایک پر لگا دیں۔ کافی زیادہ کام تھا کیونکہ بہت بڑے سائز کا ایک بنانا تھا۔ جولی اور ملی نے بڑی محنت و جانفشانی سے کام مکمل کیا۔ دونوں بہت خوش، بہت پُرجوش تھیں۔ جولی اور ملی اب تقریب میں جانے کی تیاری کرنے لگیں۔ دو چار کپڑوں میں سے ڈھونڈ کر مناسب لباس نکالے۔ ملی بال بنا رہی تھی، جولی شیمپو کر رہی تھی۔ وہ دونوں اپنے آپ کو اچھے سے اچھا بنانے میں لگی ہوئی تھیں۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ کیلے بالوں میں تولیہ مار گڑھے ہوئے جولی نے ملی سے سوال کیا جو اپنی تیاری مکمل کر کے کھڑکی میں کھڑی نہ جانے کن خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔

”آں..... ہاں..... کچھ نہیں، کچھ نہیں..... جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ہمیں ٹائم پر پہنچنا ہے۔“ ملی تیزی سے چونک کر مڑی۔

”ویسے ملی اتم ہو کمال کی لڑکی۔ تمہاری ذہانت نے بڑا کام دکھایا ہے۔ تم محنت سے لوٹس بناتی تھیں۔ انہی لوٹس کی بدولت تم نے ایک امیر ترین لڑکی کو فرینڈ بنا لیا اور دیکھو، آج بات کہاں تک جا پہنچی۔ وہ غریب لڑکیاں جن کو سیکے

ماتھا کھل ڈھکا ہوا تھا اور منہ پر ماسک بھی تھا۔ حلیے اور اسٹائل سے وہ کوئی ملازم ٹائپ لڑکا لگ رہا تھا۔

”ایک اہم بات بتانا تھی۔ ادھر آؤ۔“ لڑکے نے ملازم کا بازو پکڑ کر دھیمی آواز میں کہا اور بغیر کوئی تمہید باندھے کہنے لگا۔ ”تم لوگوں کو معلوم نہیں کہ تمہارے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ مسز تھامسن کے برتھ ڈے ایک میں زہر ملا یا گیا ہے تاکہ ان کی اور ان کے گھر آئے مہمانوں کی جان لے کر یا کم از کم بری طرح حالت خراب کر کے ان کی صحت دسا کھ کو متاثر کیا جاسکے۔ یہ کام مسز تھامسن کے مخالف بزنس گروپ کا ہے۔ انہوں نے ایک بنانے والوں کو بھاری معاوضہ دے کر

ماں باپ رکھنے کو تیار نہیں، آج ایسی جگہ مدعو ہیں جہاں جانا کئی لوگوں کا خواب ہے۔“ بالوں میں برش پھیرتے ہوئے جولی نے بہن کی تعریف کی۔ ہلکی سی جھالروالے نیلے فرائک میں وہ سادہ سی اور بہت معصوم لگ رہی تھی۔ اس کے سنہری کھلے بال کھڑکی سے آتی ہوا میں اڑ رہے تھے۔ بس..... وہ اتنی ہی تیاری کر سکتی تھی۔

”میری ذہانت نے تو بس ایک حد تک کام کیا ہے۔ اصل بات تو تمہارے ہاتھ کے ڈانٹے اور شاندار سجاوٹ کی ہے جس نے جینی کی مٹی کو ہمیں کیک کا آرڈر دینے کا فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ سچی بات یہی ہے کہ یہ سب تمہارا کمال ہے۔“ ملی نے کھلے دل سے سارا کریڈٹ جولی کو دیتے ہوئے کہا۔ گلابی فرائک اور اپنے پسندیدہ ہیز اسٹائل میں وہ کافی اچھی لگ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد دونوں کیک کے ساتھ مسز تھامسن کی رہائش گاہ کے لیے روانہ ہو گئیں۔

وہاں پہنچ کر دونوں کی آنکھیں ٹھل گئیں۔ اعلیٰ رہائش گاہ، اعلیٰ کپڑے، خوشبوئیں، اعلیٰ ترین انتظام..... وہ تو بس آنکھیں پھاڑے دیکھ رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد ملی، جینی کے ساتھ کچھ اور دوستوں سے ملنے کے لیے چلی گئی۔ جولی ایک سائیڈ پر جھجکی سی کھڑی ماحول کو دیکھ رہی تھی۔ کافی دیر گزر گئی تھی اور اب کیک کٹنے کا ٹائم قریب آ گیا تھا۔ سارے مہمان اور میڈیا والے پہنچ چکے تھے۔ رہائش گاہ کا وسیع و عریض خوبصورت لان بڑے دلکش انداز میں سجایا گیا تھا۔ یہیں پر تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ مسز تھامسن تیار ہو کر باہر آ چکی تھیں۔ خوبصورت ڈریس میں وہ انتہائی حکمت سے لوگوں سے مل رہی تھیں۔ بے چاری غریب جولی مزید سمٹ کر اور زور سے ہو کر ایک سائیڈ پر کھڑی ہو گئی۔ ویسے بھی مسز تھامسن کون سا اس تک پہنچنے والی تھیں۔ انہوں نے بس چند لوگوں سے ہیلو ہائے کی اور باقیوں کی طرف مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلایا اور اس ٹیبل کی جانب بڑھ گئیں جہاں جولی اور ملی کے ہاتھ کا بنا کیک رکھا ہوا تھا۔ کچھ اہم مہمان ابھی نہیں آئے تھے اس لیے وہ ٹیبل کے نزدیک موجود ایک کرسی پر بیٹھ گئیں۔

☆☆☆

”سنو“ ایک دھیمی سی سرگوشی تھامسن ہاؤس کے ملازم کو سنائی دی۔ ٹرے اٹھائے ہوئے وہ چونک گیا۔ ”کون؟ کیا بات ہے؟“ اس نے کہا۔ اسے ستون کے پاس ایک دبلا پتلا سالز کا نظر آیا۔ اس لڑکے نے ڈھیلی سی شرٹ اور جینز پہنی ہوئی تھی۔ سر پر کیپ اس طرح تھی کہ

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں

جاسوسی، ڈائجسٹ، سپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ایک سال کے لیے 12 ماہ کا سالانہ بشمول بھرتی خراج پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 2000 روپے

بیرون ممالک کے لیے 25,000 روپے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں

رابطہ:

مرزا اشرف عباس: 0301-2454188

سرکولیشن مینیجر سید حسین: 0333-3285269

محمد شہزاد خان: 0333-2256789

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز 11 ایکسپریس ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی

مین کورنگی روڈ۔ کراچی

کام کر دیا ہے۔ پلیز! تم جلدی جا کر سب کو بتا دو اور اس فنکشن میں ہونے والے موقع نقصان کو روک لو۔“

ملازم کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ”تم کون ہو.....؟“

اور یہ سب کیسے جانتے ہو؟ میں کیسے تمہارا یقین کر لوں؟“

اس نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

”میں ایک بیکری پر ملازم ہوں۔ مجھے کیسے پتا چلا، یہ میں تمہیں کچھ دیر بعد بتاتا ہوں۔ میں یہیں کھڑا ہوں۔ تم پہلے ان لوگوں کو بتا دو۔ فکر نہ کرو، میں کہیں نہیں جا رہا۔ میں پوری تفصیل بتا کر اور اپنا انعام لے کر ہی جاؤں گا۔“

پلیز! تم بھاگو جلدی۔“

☆☆☆

سب مہمان آچکے تھے۔ کیک کٹنے کا وقت ہو گیا تھا۔ مسز تھامسن ٹیبل کے قریب پہنچ گئی تھیں۔ مسٹر تھامسن، جینی، جینی کی مٹی اور فیملی کے چند اور افراد بھی ہمراہ تھے۔ ہلکا ہلکا سا میوزک چل رہا تھا۔ بڑا پُر روشنی و دلکش ماحول تھا۔ جولی ایسے سب کچھ دیکھ رہی تھی جیسے یہ کوئی خواب ہو۔

”ہمارے لیے یہ بہت بڑا اعزاز ہے کہ اس تقریب میں ہمارا بنایا گیا کیک رکھا ہوا ہے۔“ مٹی کی آواز سن کر وہ چونک گئی۔

”ارے، تم کب آئیں؟“ اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

”بہت دیر سے آئی ہوئی ہوں۔ تم اتنا کھوٹی ہوئی تھیں کہ تمہیں پتا ہی نہ چلا۔“ مٹی مسکرا کر بولی۔

مسز تھامسن نے کیک کاٹنے کے لیے چھری اٹھائی ہی تھی کہ ان کا ایک ملازم تیزی سے تقریباً بھاگتا ہوا ان تک پہنچا۔ ”زکیے میم.....! آپ..... کو ایک بات بتانا ہے۔“

اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور آواز کانپ رہی تھی۔ مسز تھامسن نے اس کے انداز اور یوں نکل ہونے پر انتہائی ناگواری سے دیکھا۔ ان کے پردقار چہرے پر ٹکٹیں پڑ گئیں۔ باقی لوگوں کا بھی کم و بیش یہی حال تھا۔

”کیا بات ہے.....؟ کون سی اہم بات ہے جس کے لیے تم نے یہ حرکت کی ہے کہ تقریب رکوا دی؟“ مسٹر تھامسن گھورتے ہوئے غصے سے لیکن سچی آواز میں ملازم سے مخاطب ہوئے۔ جواب میں اس نے جو بتایا، اسے سن کر فیملی ممبر کا رنگ تو بدلا ہی، قریب کھڑے مہمان بھی اس کے خوفزدہ ہو گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں کھانا سب کچھ کھائی۔ سب ایک دانی میز سے یوں دور جانے لگے جیسے قریب رہے تو کیک کا ٹکڑا ان کے منہ میں چلا جائے گا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ مٹی نے حیران سی ہو کر جولی سے

کہا۔ وہ بہت فاصلے پر تھیں۔ ان تک ابھی خبر نہیں پہنچی تھی۔

”معلوم نہیں۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے کوئی مسئلہ ہو گیا ہے۔ دیکھو ذرا تھامسن فیملی اور کئی لوگوں کے چہرے عجیب سے لگ رہے ہیں جیسے ڈر رہے ہوں اور بہت پریشان ہوں۔“ ابھی اس کی بات مکمل ہی ہوئی تھی کہ جینی بھاگتی ہوئی ان کے قریب آ گئی۔

”کیا ہوا ہے جینی؟ تقریب رک کیوں گئی ہے؟ اور..... یہ سب لوگ گھبرائے ہوئے کیوں لگ رہے ہیں؟“ مٹی نے جینی پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ جواب میں جینی سے جو کچھ سنا، اس کے بعد دونوں بہنوں کی حالت غیر ہو گئی۔

”یہ..... یہ کیسے ہو سکتا ہے..... نہیں جینی! ضرور کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے..... میں نے..... میں نے اور مٹی نے اس کیک کو بنانے میں اپنی ساری صلاحیتیں لگا دیں۔ ہم بھلا کیوں یہ مجرمانہ کام کریں گے..... پلیز جینی! کچھ کرو۔ اس غلط فہمی میں ہمارے ساتھ کچھ بُرا نہ ہو جائے۔“ جولی رک رک کر صفائیاں دے رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ مٹی نے جولی کا بازو سختی سے پکڑ لیا تھا۔ اس کے چہرے پر بھی رنگ آ جا رہے تھے۔

”یقین تو مجھے بھی نہیں آ رہا..... لیکن دیکھو.....“ اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ ان دونوں بہنوں کو کمرے کے سامنے آنے کا کہا جا رہا تھا جنہوں نے مسز تھامسن کے لیے کیک بنایا تھا اور وہ تقریب میں موجود بھی تھیں۔ مائک میں اعلان کیا جا رہا تھا۔ تمام داخلی دروازے بند کر دیے گئے تھے۔ مٹی کانپ رہی تھی۔ جولی کو لگ رہا تھا جیسے اس کے پیروں کے نیچے زمین نہیں اور آسمان اس پر ٹوٹ پڑا ہے۔ وہ کچھ بولنے اور چلنے کے قابل بھی نہیں رہی تھی۔ جینی نے سب کو ان کی جانب متوجہ کر دیا تھا۔ جینی کی آنکھوں میں اپنی دوست اور اس کی بہن کے لیے مکمل اعتبار تھا۔ وہ چاہ رہی تھی کہ جلدی دونوں بہنیں اپنی صفائی ثبوت کے ساتھ دے کر بے گناہ ثابت ہو جائیں۔ اس کے کہنے اور سفارش پر جولی کو کیک بنانے کا کہا گیا تھا اس لیے جینی اپنے لیے بھی پریشان تھی کہ پوری فیملی اسے بھی لعن طعن کرے گی۔

چند ہی لمحوں بعد مٹی اور جولی اس طرح کھڑی تھیں کہ تقریب کے سب مہمانوں کی آنکھیں ان پر تھیں۔ سارے کمرے ان کے چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھے۔ میڈیا والے مسز تھامسن کو بھول کر کیک بنانے والیوں پر تو چہ مرکز کیے ہوئے تھے۔ اپنے چہرے کے قریب بہت سے مائک جولی کو بھیا تک ہتھیار لگ رہے تھے۔ مٹی اس کے ساتھ

چکی کھڑی تھی۔

”کس بیکری سے آپ کا تعلق ہے؟ پہلے تو آپ کا نام نہیں سنا گیا۔“

”آپ کو کس نے سیک زہر آلود کرنے کا کہا؟“

”کیا بتایا گیا تھا کہ وہ کون لوگ ہیں؟“

”کتنی رقم کے عوض یہ کام کیا؟“

”اس عمر میں ایسی مجرمانہ سرگرمی؟ کیوں کیا ایسا؟“

میڈیا والوں کے تیز سوالات جاری تھے۔ جولی چپ کھڑی تھی۔ کسی بھی سوال کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ اچانک پڑنے والی افتاد نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

”ایسا..... کچھ نہیں ہے..... ہم نے کچھ..... نہیں

کیا..... ہم پر یقین کریں پلیز!“ اس نے بہ مشکل چند لفظ ادا کیے۔ آنسو اس کے گالوں پر بہہ رہے تھے۔ اس کا معصوم سا چہرہ رونے سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس کا جملہ کھل ہوتے ہی جینی کی مٹی آگے بڑھیں۔ ان کا غصہ چہرے پر عیاں تھا۔

”بڑے دکھ کی بات ہے لڑکیو! میں نے تمہاری معصوم شکل اور غربت کو دیکھتے ہوئے تم پر یقین کر لیا لیکن تم نے دکھادی ٹانج ذہنیت۔ اب دیکھنا قانون کیسے تمہاری ذہنیت ٹھیک کرتا ہے۔“ وہ باقاعدہ چلا رہی تھیں۔

اچانک مٹی نے جولی کا بازو چھوڑا اور کیک والی میز کی طرف تیزی سے جانے لگی۔ سارے کمرے اس پر تھے۔ وہ کیک کے قریب پہنچی، چھری اٹھا کر اس کا ایک بڑا سا ٹکڑا کاٹا اور اس سے پہلے کہ کوئی اسے روکتا تو کتا، اس نے منہ کھولا اور انتہائی تیزی سے کیک کا وہ ٹکڑا کھالیا۔ سب ششدد تھے اور خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ جولی اسی طرح کھڑی اپنی بہن کو دیکھ رہی تھی جس طرح وہ پہلے.... کھڑی تھی۔ اسے لگ رہا تھا، اسے کچھ بھی محسوس نہیں ہو رہا۔ سناٹی نہیں دے رہا اور نہ ہی بولا جا رہا ہے۔

”میں نے آپ سب کے سامنے کیک کھایا ہے جو اس بات کا پکا ثبوت ہے کہ ہم نے زہر نہیں ملا یا۔ اگر ملایا ہوتا تو میں کیک کیوں کھاتی؟“ مٹی نے سب کے چہروں کے تاثرات بدلتے دیکھے۔

”آپ کچھ دیر انتظار کریں اور دیکھیں کہ مجھے کچھ ہوتا ہے۔ یعنی ہو سکتا ہے زہر کچھ دیر بعد اثر کرے، ہے نا؟ تو ٹھیک ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے۔ میری حالت خراب ہونے کی صورت میں آپ اسپتال کے بجائے ہم دونوں بہنوں کو پولیس کے حوالے کر دینا۔“ مٹی کے لہجے میں اب خوف، گھبراہٹ نہیں تھی۔ وہ بڑے اعتماد سے ٹیبل کے

ایک کونے کو پکڑے کھڑی سب کی طرف دیکھ رہی تھی۔

جولی کی حالت کچھ کچھ سنسنی خیز لگتی تھی۔ ”ہم غیر معروف حامی لڑکیوں کے ساتھ کس کو اتنی دشمنی ہو گئی کہ ہمیں یوں پھنسانے کی کوشش کر رہا ہے؟“ وہ سوچے جا رہی تھی۔ ادھر مٹی سب کی توجہ کا مرکز بنی کھڑی تھی۔ کیمروں کے سامنے دو ہی چیزیں تھیں، مٹی اور ان کے ہاتھوں کا بنا ہوا خوبصورت، ڈانکے دار کیک..... کہیں سے نہیں لگ رہا تھا کہ یہ تھامسن فیملی کا فنکشن ہے۔ جولی، مٹی اور ان کا کیک ہی سب کی نگاہوں میں تھا۔

”کسی نے انتہائی گھٹیا مذاق کیا ہے۔“ اچانک جولی کی آواز ابھری۔ وہ بھی مٹی کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

”مسز تھامسن کے مخالف گروپ تو کیا، ہماری تو اس شہر میں کسی بھی خاص گروپ سے جان پہچان نہیں ہے۔ ہم کچھ عرصہ پہلے ہی یہاں آئے ہیں اور صرف چند لوگوں کے لیے ہی کیک بنائے ہیں۔ کوئی ہمیں جانتا نہیں اسی لیے بڑی مشکل سے تھوڑا بہت کام ملتا ہے۔ جینی، جو کہ آئرلینڈ سے تھامسن کی بھانجی ہیں، وہ مٹی یعنی میری اس چھوٹی بہن کی کلاس فیلو ہے۔ اس کی سفارش کروا کر ہم نے اس کیک کو بنانے کا آرڈر لیا تھا۔ کیک کی تیاری سے لے کر یہاں لانے تک کوئی بھی غیر متعلقہ شخص اس کیک کے قریب نہیں بھٹکا یا ہم سے ملا۔ ہم دونوں بہنوں کی نظر اس سے ایک ہل نہیں نہیں ہٹی تو پھر کیسے کہا جاسکتا ہے کہ ہمیں غلط کام کرنے کا کہا گیا یا اس امکان کو سامنے رکھا جائے کہ شاید کوئی اور نہ یہ کام کر گیا ہو..... ہم پر یقین کریں، ایسا کچھ بھی نہیں..... اگر ایسا کچھ ہوتا تو مٹی آپ کو یقین دلانے کے لیے کیک کھاتی کیا؟ اور اب دیکھیں کتنی دیر ہو گئی ہے، مٹی کو کچھ بھی نہیں ہوا جو ہماری بے گناہی اور کیک کے بے ضرر ہونے کا پکا ثبوت ہے۔ اس کے باوجود آپ کسی میڈیکل ٹیم کو بلوا کر بھی چیک کر داسکتے ہیں۔“ مٹی کے جرات مندانہ قدم نے جولی کو بھی اہمیت دی اور اس نے بڑے اعتماد سے کیمروں کے سامنے آ کر اپنی بات کر ڈالی۔

سب کو ان کی بات کا یقین آنے لگا۔ سب مہمانوں کو بیٹھنے کا کہا گیا اور جھوٹی خبر دینے والے لڑکے کی تلاش شروع ہو گئی۔ لڑکے کا کہیں اتنا پتا نہ ملا۔ نہ جانے کیوں ایسی خبر پھیلا کر وہ غائب ہو گیا تھا۔ غالباً اسے بھی پتا چل گیا تھا کہ سچ سامنے آنے پر اس کی درگت بن جائے گی۔

کیک چیک کر دیا گیا۔ مٹی کے کیک کھانے کے بعد یقین تو پہلے ہی آ گیا تھا، اب اس سچ پر مہر لگ گئی۔ مٹی اور

جولی سے باقاعدہ معذرت کی گئی اور وعدہ کیا گیا کہ جلد اس لڑکے کو تلاش کر کے اس کو سزا دی جائے گی جس نے ایک طرف تو لوگوں کو خوفزدہ کیا، دوسری جانب دو معصوم لڑکیوں کو پھنسانے کی کوشش کی۔

کیک کا ٹا گیا۔ اب سب مہمانوں کی توجہ صرف کیک پر ہی تھی۔ سب نے اس کے ذائقے کو نوٹس کیا اور دونوں بہنوں کی مہمانوں نے کافی تعریف کی۔ تقریبات میں کیک بنانے والوں کی کبھی یوں خصوصی تعریف نہیں کی جاتی لیکن یہاں معاملہ الگ تھا۔ ملی اور جولی الزام سے بری ہو جانے کے بعد سب سے تعریف سمیٹ رہی تھیں۔ ان کو غصے اور نفرت سے دیکھنے والے معذرت کر رہے تھے۔ ایک کونے کے بجائے اب وہ تھامسن فیملی کے قریب موجود تھیں۔ سب اچھا اچھا ہو رہا تھا۔ جینی پرسکون تھی کہ اس کا کیا ہوا کام خراب نہیں ہوا۔

☆☆☆

”واقعی..... ملی! یہ سب تم نے کیا؟“ جولی کی آنکھیں کھل گئیں۔

”ہاں جولی! اپنے ہی خلاف میں نے خود سازش تیار کی۔ تمہیں جینی کے پاس چھوڑ کر لان کی ایک سائڈ پر جا کر پکڑے بدلے لڑکوں والی وگ لگائی، کیپ اور ماسک سے منہ ڈھانپا اور سب کر ڈالا..... دراصل مجھے ایڈورٹائزمنٹ کا یہی ایک طریقہ سوچا تھا۔ دیکھا تم نے کیسے سارا میڈیا ہماری طرف متوجہ ہو گیا۔ ہمارا اور ہمارے کیک کا کتنا چرچا ہوا اور ہماری کتنی شہرت پھیل گئی۔“ ملی نے مسکراتے ہوئے بہن سے کہا۔ وہ تقریب سے واپس آچکی تھیں اور آرام کرنے کے لیے جونہی لیٹیں، ملی نے دھماکا کر دیا یہ کہہ کر کہ آج ہم پر جو الزام لگا تھا، وہ میں نے خود ہی لڑکا بن کر ہم دونوں پر لگایا تھا۔ جولی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ملی سے ساری تفصیل اس نے بڑی حیرانی سے سنی۔

”تمہیں کیسے یقین تھا کہ یہ بات ہمارے لیے بہتر ہی ثابت ہوگی؟“ اس نے ملی کا ہاتھ پکڑتے ہوئے پوچھا۔ وہ اس ہنگی پر حیران ہو رہی تھی جس نے چند ہی منٹ میں دونوں بہنوں اور پروفیشن کو اس طرح مشتہر کیا کہ انتہائی کر دی۔

”کیوں یقین نہ ہوتا..... ظاہر ہے ہم نے کون سا کیک میں زہر ملا یا تھا جو بات ہماری مخالفت میں جاتی۔ میں نے خود ہی بات اڑائی اور خود ہی جا کر کیک کھایا اور چند منٹوں میں بات کہاں سے کہاں پہنچادی۔“ ملی اس کی جانب مڑ کر سمجھا رہی تھی۔

”گیٹ اپ بدلنے والا سامان تم کیسے لے کر گئیں اور اب واپس بھی لے آئیں؟ میں نے تو دیکھا نہیں تھا۔“ جولی نے سوال کیا۔

”یہ کون سا بڑا کام تھا۔ لباس، وگ، کیپ اور ماسک میں نے پیکٹ بنا کر ان پھولوں اور تحفے کے ساتھ رکھ لیے تھے جو مسز تھامسن کے لیے ہم نے لیے تھے۔ یاد ہے، میں نے ضد کی تھی کہ سارے رستے یہ میں ہی پکڑے رکھوں گی اور اب واپس آتے ہوئے تم نے خوشی خوشی میں غور ہی نہیں کیا کہ میں نے وہ پیکٹ پکڑا ہوا ہے۔ تم کیا، کسی کی توجہ بھی اس پر نہیں گئی کیونکہ میں نے واپس آتے ہوئے بڑی خاموشی سے لان کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے وہاں سے اٹھالیا تھا جہاں میں نے کچھ دیر پہلے چھپایا تھا۔“ جولی نے تفصیلاً بتایا۔

”لیکن اگر یہ پیکٹ پکڑا جاتا تو؟“ سب ٹھیک ہو جانے کے باوجود جولی نے خدشہ ظاہر کیا۔

”میری احمق بہن! اگر کیک زہر آلود ہوتا تو ہی باقی کی پوچھ گچھ، تفتیش اور ہمارے ہاتھوں میں موجود سامان کے بارے میں سوال ہوتے۔ جب کچھ ہوا ہی نہیں تو پھر کیوں پیکٹ یا ہم پکڑے جاتے۔“ ملی نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو جولی نے یوں اطمینان سے سر ہلایا جیسے خطرہ ابھی ابھی ملا ہو۔

دونوں لیٹ گئیں اور اپنی اپنی جگہ سوچنے لگیں کہ بھرپور ”ایڈورٹائزمنٹ“ کے بعد اب آرڈر کب ملنا شروع ہوں گے۔

☆☆☆

”جینی! ذرا اپنی اس دوست کا نمبر دینا جس نے میرا برتھ ڈے کیک بنایا تھا۔“ مسز تھامسن فون پر جینی سے پوچھ رہی تھیں۔ اگر جولی اور ملی موقع پر موجود ہوں تو خوشی سے پاگل ہو جاتیں کہ ان کے بارے میں کون بات کر رہا ہے۔

”کیا بات ہے آنٹی؟ کیا کہنا ہے اس سے؟“ جینی تشویش سے بولی۔

”مسز مار تھا کی شادی کی سالگرہ ہے اور وہ انہی سے کیک بنوانا چاہتی ہیں۔ ایک دو اور لوگوں نے بھی نمبر مانگا ہے۔“ مسز تھامسن بولیں۔ جینی نے نمبر بتا دیا۔

☆☆☆

صبح اٹھتے ہی پانچ برتھ ڈے کیک اور دو شادی سالگرہ کیک کا آرڈر مل چکا تھا اور وہ بھی معروف، امیر ترین لوگوں کی طرف سے۔ جولی اور ملی خوشی سے پاگل ہو گئیں۔

ان کے پاس تو مہینے میں اتنا بڑا کام نہیں آتا تھا۔

”آج تم ہیلپ کرواؤ، یعنی صرف آج اسکول سے چھٹی کرلو۔ میں شام تک کسی ہیلپر کا انتظام کرلوں گی تاکہ تمہاری پڑھائی کا حرج نہ ہو۔“ جولی نے ملی سے کہا۔ تھوڑی دیر بعد دونوں کام میں جت گئی تھیں۔

چند ہی دن میں ملی اور جولی کے دن پھر گئے۔ سز تھامسن کے گھر آئے ہوئے میڈیا نے ان کو اتنا دکھا دیا کہ ان کی خوب تشہیر ہو گئی۔ دو معصوم، کم عمر، حالات کی ستانی ہوئی باصلاحیت لڑکیاں سب کی توجہ کا مرکز بن گئیں۔ مکان مالکن نے بڑی خوشی سے نہ صرف انہیں وہاں مستقل رہنے کی اجازت دے دی بلکہ بڑھتے کاروبار کے پیش نظر ایک اور پورشن بھی ان کو دے دیا۔ ان کو کئی ہیلپر رکھنے پڑے۔ ملی دن میں پڑھائی کرتی اور شام اور رات میں ”ملی اینڈ جولی کیک شاپ“ پر کام کرتی۔ حالات بدل گئے تھے اس لیے سگے دوستیلے والدین کے رویے بھی بدل گئے۔ وہ جوان دونوں کو ان کی بے چارگی، بے بسی کی حالت میں پاس رکھنے سے کتراتے تھے، ان پر ظلم کرتے تھے، انہیں معافیاں مانگنے کا کہتے تھے، اب بار بار فون کر کے رشتہ جتا رہے تھے لیکن ملی اور جولی نے بالکل منہ نہ لگایا۔ وہ کیسے بھول سکتی تھیں کہ ان کے ساتھ ماضی میں سگے دوستیلے رشتے کیا کچھ کرتے رہے ہیں۔ اب انہوں نے خود کو پیروں پر کھڑا کر لیا تھا۔ اب انہیں کسی کی ضرورت نہیں تھی۔ زندگی میں آسانی آگئی تھی۔ اب وہ ان سے تعلق نہیں رکھنا چاہتی تھیں جنہوں نے ان کی زندگی مشکل کر رکھی تھی۔ ہاں..... جینی سے ان کا تعلق اٹوٹ رشتے اور مستقل دوستی میں ڈھل چکا تھا کیونکہ اسی کے ذریعے تو ”ایڈورٹائزمنٹ“ ممکن ہوئی تھی۔

☆☆☆

ریٹورنٹ کا ماحول بڑا دلکش تھا۔ ہلکی ہلکی موسیقی نے ماحول کو پُر لطف بنا دیا تھا۔ ملی اور جولی لہجے کرنے کے لیے آئی ہوئی تھیں۔ یہاں آنے کے لیے بڑی مشکل سے جولی نے ایک گھنٹا لگا لیا تھا۔

”تم لوگ کام جاری رکھو، بس میں جلد آتی ہوں۔“ اس نے اپنے درکرز کو ہدایت دیتے ہوئے کہا تھا۔ ہر کیک کی تیاری میں وہ خود حصہ لیتی یا کڑی نگرانی کرتے ہوئے بنوائی اسی لیے معیار و ذائقہ دن بدن بڑھتے جا رہے تھے اور کسٹمرز بھی۔

”تمہارے ایگزام ختم ہو گئے ہیں۔ اب جو چند دن فری ہیں، شاپ میں کام کرو۔“ جولی نے مسکراتے ہوئے

بہن کو حکم دیا۔

”بالکل..... بالکل، ضرور کروں گی۔ میں نے خود پہلے سے ہی یہ سوچا ہوا تھا کہ.....“ اس کا موبائل بجنے لگا۔ ”کس کا فون ہے؟“ جولی آگے کو جھکی تاکہ اسکرین پر نمبر دیکھ سکے۔ ان کی ماں کا فون تھا۔

”کال اینڈ کرنے کو جی نہیں چاہ رہا۔ تم سن لو۔“ ملی نے بڑے سرد لہجے میں کہا۔

”موبائل آف کر دو۔ کچھ عرصہ انگور کریں گے تو جان چھوڑ دیں گے یہ لوگ۔“ جولی بھی اسی کے انداز میں بولی۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔ کھانا سرو کیا جا رہا تھا۔

”ہماری حالت اب بالکل سیٹ ہو چکی ہے۔ اب ہمیں کسی کی ضرورت نہیں۔ اب ان چاروں کی ہماری زندگی یا گھر میں کوئی گنجائش نہیں۔“ ملی نے جتنی انداز میں کہا۔

”ہاں..... بس اب ہمارے گھر اور زندگی میں صرف تین افراد کی ہی گنجائش ہے۔“ جولی نے کہا۔

”کون تین؟“ ملی حیران تھی۔

”میں، تم اور..... وہ لڑکا جس نے جھوٹی خبر پھیلا کر ہماری ایڈورٹائزمنٹ کرنے میں مدد دی۔“ جولی بڑے دلکش انداز میں مسکرائی۔ جواب ملی بھی کھل کر مسکرائی اور کھانا پلیٹ میں ڈالنے لگی۔

”ویسے ملی! تم نے کیا شاندار اور باکمال کام کیا۔ جس کام پر لوگ بے تحاشا خرچہ کرتے ہیں، وہ تم نے مفت کر ڈالا۔ یعنی بغیر خرچے کے اتنی اعلیٰ ایڈورٹائزمنٹ۔“ سلا دہنی پلیٹ میں منتقل کرتے ہوئے جولی آہستگی سے بولتے ہوئے تھی۔

”کیا کہا تم نے..... مفت ایڈورٹائزمنٹ؟ ارے میرا خرچہ ہوا ہے۔“ ملی کھانا کھاتے ہوئے رک کر بڑی حیرانی و سنجیدگی سے بولی۔

”کیا مطلب؟ کون سا خرچہ؟“ جولی کو تعجب ہوا۔

”دیکھو بھئی..... لباس، وگ، کپ اور ماسک خریدنا تھا میں نے تو اس پر پیسے لگے تھے۔ ٹھیک کہا میں نے کہ خرچہ تو ہوا ہے۔ ظاہر ہے بغیر پیسہ خرچ کیے ایڈورٹائزمنٹ کہاں ہو سکتی ہے۔“ ملی نے میز پر ہاتھ رکھتے ہوئے ”اخراجات“ کی تفصیل بتائی تو حیران بیٹھی جولی بے اختیار ہنس دی۔

”ٹھیک کہا تم نے۔ ایسا ہی ہوا ہے۔“ جولی نے اعتراف کیا اور دونوں کھانا کھانے میں مصروف ہو گئیں۔



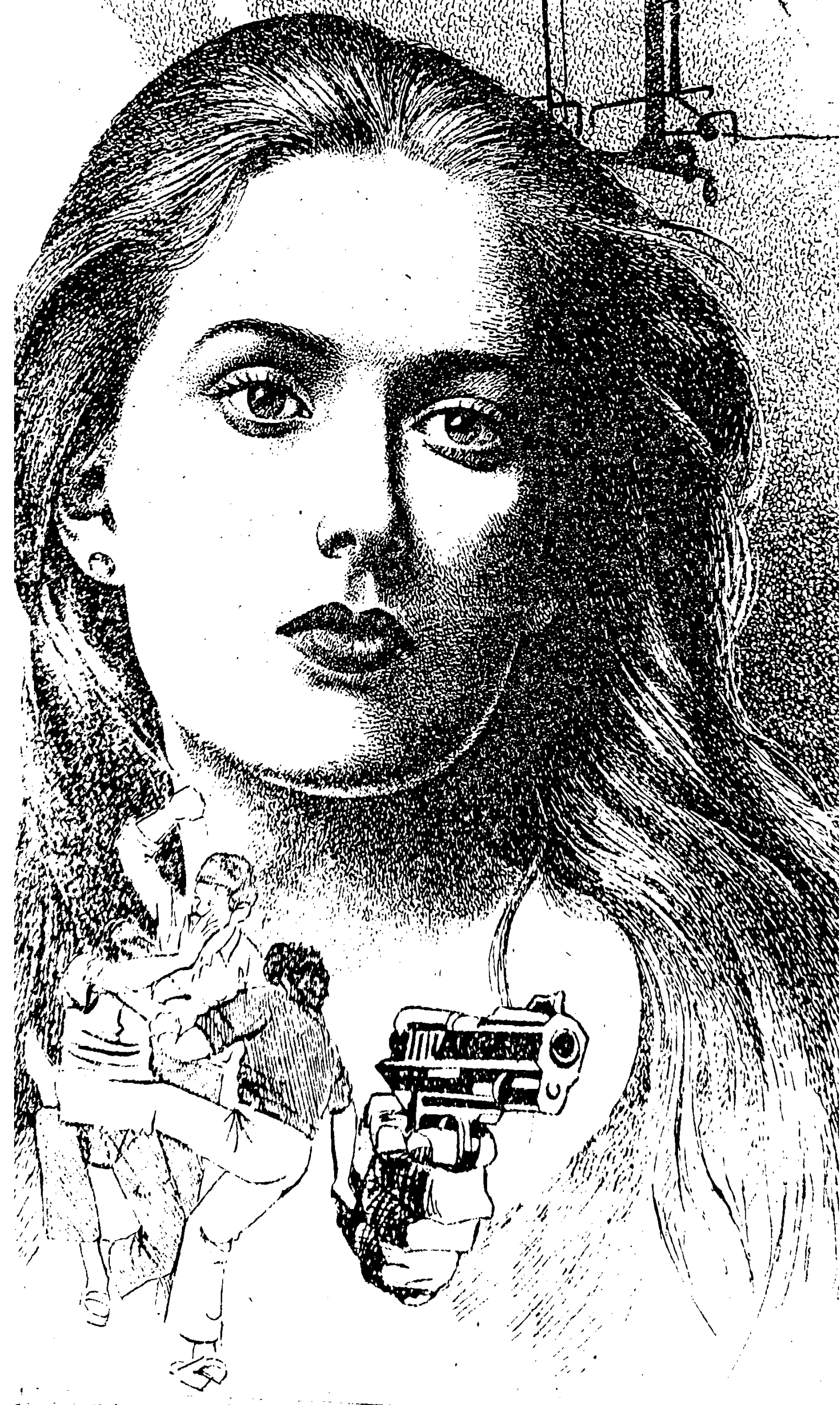
قسط نمبر: 35

شہزادہ زورنگ

استاد رقی

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تندوتیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابل شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پُر عزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جارہے تھے... اس کی زندگی جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... یہ خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی یہ قرار یوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تار عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ وارداتِ قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہو سکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نو جوان کی تحیر انگیز داستان



کئی سند افساط کا خلاصہ

معاذ ایک ذہین لیکن متلون مزاج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جو ان کی کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ انسٹی ٹیوٹ سے واپس آ رہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو مرکز پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی بڑی فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشری نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بشری ماس کمیونی کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم وغیرہ لکھتی ہے۔ اس ویران جگہ بھی وہ ایک زیر تعمیر رہائشی منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی آئی تھی۔ معاذ بشری کو بہ حفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو کفر اموش کر دیتا ہے لیکن جن رئیس زادوں سے اس نے ان کا شکار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو کفر اموش نہیں کرتے اور موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ یہ موقع انہیں یونیورسٹی ٹرپ کی صورت میں مل جاتا ہے اور ایک دن جنگل کی سیر کے دوران وہ نوٹو گرافی کے شوق میں سب سے الگ تھلک ہو جانے والے معاذ کو بے خبری میں گھیر کر بری طرح زد و کوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دے دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس نہ آنے پر انتظامیہ کے افراد، پولیس اور ریسیکيو ذرائع کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جگہ کی جمو پڑی میں پاتا ہے۔ اپنی حالت سے اسے اپنے شدید زخمی ہونے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ جوگی اپنی خاص جزی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ معاذ کا سوا بال جنگل میں ہی کہیں گر جاتا ہے اور جوگی کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا جس سے باہر کی دنیا سے رابطہ کیا جاسکے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے، جوگی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نوازا کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے پراسرار علم سکھانے کی ہامی بھر لیتا ہے اور معاذ واقعی اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ادھر جائے وقوع سے ملنے والے معاذ کے کمرے سے جب تصویریں نکلوا لی جاتی ہیں تو بہت سے قدرتی مناظر کی تصویروں میں سے ایک ایسی تصویر بشری کی نظر میں آ جاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پروجیکٹ کے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشری تحقیق کر رہی تھی۔ بشری کے اپنے والد جرنلٹ ہوتے ہیں اور حق گوئی ان کے خون میں شامل تھی۔ اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشری کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ صدمے سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باذل نامی غنڈے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشری انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دلوں میں ہی معاذ واپسی کا ارادہ کرتا ہے تاہم ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا عرفان اللہ اور یزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو وقاص نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باذل اچانک بشری کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر دیتا ہے۔ معاذ کو واپس لانے کے لیے اوجھے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اسے واپس آنے کا پیغام دیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کر کے اسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات لی جاتی ہیں، نہ بتانے پر اس کے بھائی کا ایک گردہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشری بھی انتقام کی آگ میں جلتی ہوئی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہو جاتی ہے۔ معاذ کے دوست عالم شاہ کے بہنوئی کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ کئی فنون میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے ہناتا کر کے اس کے دماغ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ فیصلو سے حاصل انوکھے علم کی بدولت ان کا معمول نہیں بنتا۔ عالم شاہ اور اس کا نوکر سرد باذل کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ عالم کی بہن بیکل شاہ کے نو مولود بیٹے کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اغوا کا الزام لطیف سومرو پر آتا ہے۔ عالم شاہ، باذل کی قید میں موجود ایک زخمی شخص کی مدد سے وہاں سے فرار ہو جاتا ہے۔ ادھر بشری دینی کالج جاتی ہے۔ وہاں وقاص اسے باربی کے روپ میں پہچان لیتا ہے اور ان دونوں کے درمیان اعتماد کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ وہ سلطان کو مارنا چاہتی ہے تاہم وقاص اسے ایسا کرنے سے روکتا ہے۔ ادھر عالم شاہ، باذل کی قید سے نکل کر اس کا پیچھا کرتا ہے تاہم وہاں اچانک فائرنگ اور دھماکے ہونے لگتے ہیں۔ وہ وہاں معاذ کو دیکھتا ہے۔ صداقت شاہ، لطیف سومرو کو گھیرنے کے لیے اس کی خفیہ بیوی اور بچے کا کھوج لگاتے ہیں اور بچے کو اغوا کر لیتے ہیں۔ لطیف سومرو مجبور ہو جاتا ہے۔ معاذ کو اس کے گھر والوں سے ملنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ عالم شاہ کو اس کے والد انڈیا وائی کا مندریدیتے ہیں۔ ادھر معاذ بھی ایک مشن پر سونیا کے ساتھ انڈیا روانہ ہوتا ہے تاہم کچھ لوگ سکھ یا تریوں سے بھری بس کو یرغمال بنا لیتے ہیں۔ معاذ اور سونیا تھانے کے تمام افراد کو ہٹکانے لگا دیتے ہیں تاہم باہر موجود دیگر اغوا کاروں سے مقابلہ ہوتا ہے اور معاذ زخمی ہو جاتا ہے۔ صداقت شاہ کے انڈیا میں موجود رشتے دار کے ہاں شادی ہوتی ہے۔ عالم شاہ، بیکل اور سرد انڈیا روانہ ہو جاتے ہیں۔ ان رپورٹ سے گھر روانگی پر راستے میں کچھ لٹیرے انہیں لوٹ لیتے ہیں۔ عالم شاہ ایکشن میں آنا چاہتا ہے تاہم اجالا نامی عالم شاہ کی کزن اس کا راستہ روک لیتی ہے۔ گھر پہنچنے پر پولیس کی ریڈ ہوتی ہے اور وہ عالم شاہ اور سرد کو لے جاتے ہیں۔ ادھر بشری اور وقاص باذل کو اسپتال میں مارنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ فوجی جاتا ہے۔ معاذ اور سونیا پناہ کی تلاش میں ہوتے ہیں اور بالآخر اپنے سہولت کاروں سے مل جاتے ہیں۔ عالم شاہ اور سرد کو تشدد کا نشانہ بنا کر ویرانے

میں پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ واپس اپنے میزبانوں کے ہاں پہنچ جاتے ہیں۔ شادی کے دوران انہیں پتا لگتا ہے کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں اجالا اور اس کا عاشق شامل ہوتے ہیں۔ وہ چھپ کر ان کی باتیں سن رہا ہوتا ہے کہ اسے چھاپ لیا جاتا ہے۔ تاہم وہاں مارا ماری ہوتی ہے اور اجالا کا عاشق مارا جاتا ہے۔ پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ ان کے کزن انہیں اپنے دوسرے خفیہ ہنگامے پر پہنچا دیتے ہیں جہاں کچھ نوک ان پر حملہ کر دیتے ہیں۔ وہ وہاں سے بچھاؤ نکل جاتے ہیں۔ ادھر معاذ کو سونیا اپنے ساتھ نئے مشن پر لے کر جاتی ہے جس میں ایک ریلوے لائن کو دھماکے سے اڑانا ہوتا ہے۔ معاذ ایسا نہیں چاہتا اس لیے وہ ٹرین کی آمد سے قبل بارودی دھماکا کر دیتا ہے۔ وہ زخمی ہو جاتا ہے اور اسے ہندو سا دھواہنی کشیا میں لے جاتا ہے جہاں اس کی اچھی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ سونیا کے آدمی معاذ کو تلاش کرتے ہیں مگر ناکام ہو جاتے ہیں۔ ادھر عالم شاہ اور سرمد خفیہ ذریعے سے بارڈر پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ دھریے جاتے ہیں اور ”را“ کی قید میں پہنچ جاتے ہیں۔ انہیں تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ادھر بشری باذل کو مارنے کی کوشش میں خود نشانہ بن جاتی ہے۔ معاذ سا دھو کی مدد سے ایک انڈین ہیروئن کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ وہیں اسے عالم اور سرمد کی گرفتاری کا پتا چلتا ہے۔ ادھر سبیل کو اس کا شوہر ذہنی اذیت دیتا ہے۔ معاذ ڈاکٹر فردوس سے ملتا ہے اور اسے سبیل کی مدد کرنے کا کہتا ہے۔ عالم اور سرمد قید سے فرار کا سوچتے ہیں اور دھریے جاتے ہیں جس کی پاداش میں انہیں مزید تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ علیہ اور وقاص وغیرہ کو لالہ بھٹی ملک سے باہر نکال دیتا ہے اور ہر ممکن احتیاط کی ہدایت کرتا ہے۔ لیکن علیہ پاکستان میں ٹوبہ سے رابطہ کرتی ہے جو ان کے لیے مصیبت بن جاتا ہے۔ ٹوبہ پر تیزاب پھینک دیا جاتا ہے۔ وقاص، علیہ اور اس کے گھروالوں کو مار دیا جاتا ہے۔ معاذ سمجھاں نامی شخص کے خلاف کارروائی کرتا ہے تاہم وہ مارا جاتا ہے اور معاذ بھی زخمی ہو جاتا ہے اور اپنا نشان وہاں چھوڑ دیتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس معاذ کو دیوانا نامی شخص سے مدد لینے کا کہتی ہے۔ معاذ اس کے ساتھ مل کر موہن نامی ”را“ کے ایجنٹ کو اغوا کر لیتا ہے۔ معاذ اپنے کزن کو پاکستان کال کرتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ اس کے گھروالوں کو مار دیا گیا ہے۔ وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کی ٹھان لیتا ہے۔ ادھر ڈاکٹر فردوس کو اس کے سسرال والے سبیل کو بھگانے کی پاداش میں تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ معاذ، عالم اور سرمد کی رہائی کے لیے کارروائی کرتا ہے اور انہیں ”را“ کی قید سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ لیکن عالم اور سرمد کو دیوا کے آدمی کسی دوسری جگہ پہنچا دیتے ہیں۔ سونیا معاذ کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتی ہے اور اسے اپنے تعاون اور مدد کی یقین دہانی کرواتی ہے۔ ادھر باذل ایک جگہ لالہ بھٹی کی موجودگی پر کارروائی کرتا ہے تاہم لالہ خود کو گولی مار کر ختم کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس کا انتقال ہو جاتا ہے۔ دیوا گینگ ڈاکٹر فردوس کی میت اٹھنے پر وہاں فائرنگ کر دیتے ہیں۔ شکیل اور جلیل مارے جاتے ہیں اور فیصل اور پانڈے زخمی ہو جاتے ہیں۔ پولیس دیوا کو گھیر لیتی ہے۔ معاذ دیوا اور اس کے آدمیوں کو نکالنے کے عوض عالم کا پتا معلوم کر لیتا ہے۔ سونیا اور معاذ حیدر آباد نواب بدرالدین کی حویلی پہنچ جاتے ہیں۔ تاہم کالے خان اور رادھا دیوی کو میڈم ایکس کے شکنجے سے چھڑانے کے لیے انہیں واپس آنا پڑتا ہے، کالے خان کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ نواب صاحب کی حویلی میں عالم اور سرمد کی رہائی کے لیے کارروائی کرتا ہے مگر نواب صاحب کا بیٹا ان کے سامنے آ جاتا ہے۔ وہ سبیل کو بھی اغوا کر کے حویلی لے آتا ہے۔ تاہم وہ لوگ عبید کو قبضے میں کر کے وہاں سے نکل جاتے ہیں۔ وہ لوگ نئے ٹھکانے پر پہنچتے ہیں تو وہاں معاذ سے ملنے جا رو نامی شخص آتا ہے۔ اسے معاذ نے ”را“ کی قید سے نکالا ہوتا ہے۔ ادھر سبیل کا بیٹا غنیم اپنی ناک میں پتھر پھنسا لیتا ہے۔ جا رو اور معاذ، سبیل سمیت اسپتال جاتے ہیں اور پچان لیے جانے پر پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ پولیس سے مقابلے کے بعد وہ ایک بستی میں پناہ کے لیے گھس جاتے ہیں اور دو لوگوں کو یرغمال بنا کر ان کی جمو نیڑی میں قیام کرتے ہیں۔ ادھر سونیا عالم وغیرہ سمیت سب کو ٹھکانا بدلنے کا کہہ کر معاذ کی تلاش میں نکلتی ہے اور اسے بستی میں پہنچنے پر معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ معاذ اور جا رو وغیرہ نواب نامی شخص کے ساتھ اس کے مالک کے ہنگامے میں قیام کرتے ہیں۔ سونیا بھی معلومات حاصل کرتی ہوئی مذکورہ ہنگامے تک پہنچ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور سرمد بھی سونیا کا پیچھا کرتے ہوئے وہیں پہنچ جاتے ہیں۔ ادھر وقاص، علیہ و دیگر لوگ زندہ ہوتے ہیں۔ وقاص حلیہ بدل کر گلوکا ہاڈی گاڑ دیتا ہے۔ وہ معاذ کو تلاش کرنے کے لیے انڈیا روانہ ہوتا ہے۔ وہاں اس کی گل خان سے ملاقات ہوتی ہے اور معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ سونیا، معاذ اور دیگر ساتھیوں سے مل جاتی ہے تاہم وہ جس ہنگامے میں ہوتے ہیں وہ دھم کا ہوتا ہے۔ وقاص بھی معاذ کو ڈھونڈتا ہوا وہیں پہنچ جاتا ہے۔ دشمن سب کو بے ہوش کر کے کہیں لے جا رہے ہوتے ہیں کہ ان کی گاڑی کو حادثہ پیش آ جاتا ہے۔ ان سب کو چینی بمکشولٹی امداد دیتے ہیں اور ان سے پوچھ گچھ کی جاتی ہے۔ سبیل کی حالت تشویشناک ہوتی ہے اور اسے وہاں موجود ایک ویدو دیکھتا ہے اور اس کے دماغ میں رسولی کی موجودگی کا پتا چلتا ہے۔ ادھر لالہ واپس اپنے لوگوں میں پہنچ کر ایکشن میں آ جاتا ہے اور حامد کو اغوا کر دیتا ہے۔ میڈم ایکس کو شک ہو جاتا ہے کہ لالہ زندہ ہے۔ لالہ میڈم ایکس کے ٹھکانے کی نگرانی کر دیتا ہے۔ ادھر سونیا پر تشدد کر کے اس سے معلومات لی جاتی ہیں تاہم وہ اپنے گلے پر ٹخمر پھیر لیتی ہے۔ باذل، معاذ وغیرہ کے ٹھکانے سے باخبر ہو جاتا ہے۔ ادھر لالہ کے آدمی میڈم ایکس کی نگرانی کے چکر میں مارے جاتے ہیں۔ لالہ اپنے آدمیوں کو انڈیا گراؤنڈ کر دیتا ہے۔ معاذ وغیرہ جہاں ہوتے ہیں وہاں دھم حملہ کر دیتا ہے اور کافی مارا ماری ہوتی ہے۔ اصغر لالہ بھٹی کو عرفان اللہ سے سفید فام عورت کی خفیہ ملاقات کے بارے میں آگاہ کرتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیں

اصغر نے لالہ بھٹی کو ہول پہنچنے والی اس سفید فام عورت کے بارے میں تمام تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے مزید کہا۔

عورت کے بارے میں تمام تفصیلات سے آگاہ کرتے ”خوشی تو نظر آرہی ہے عرفان اللہ کے چہرے پر۔“

ابھی ابھی اس نے پریس کانفرنس کر کے اعلان کیا ہے کہ شہر کی دس غریب بستیوں میں ایسے اسکول قائم کیے جائیں گے جہاں غریب بچوں کو بہترین ماحول میں معیاری تعلیم فراہم کی جائے گی اور اس سب کی کوئی فیس نہیں ہوگی۔“ لالہ نے موبائل کی اسکرین پر نظریں جمائے جمائے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

”سارے سیاسی گروہیں جو عرفان اللہ ماضی میں بھی استعمال کرتا رہا ہے۔ ایک بزنس مین سے سیاست دان ایسے ہی تو نہیں بن گیا وہ۔“ اصغر نے سن کر تمبرہ کیا۔

”تمہاری بات ٹھیک ہے لیکن میں اس پریس کانفرنس کی ٹائمنگ اور شرکاء پر غور کر رہا ہوں۔ پریس کانفرنس بہت اچانک اناؤنس کی گئی تھی یعنی صبح والی ملاقات کے بعد اس کا انتظام کیا گیا اور میں یہ دیکھ کر حیران ہوں کہ اس پریس کانفرنس میں سائیکس صداقت شاہ اس کے برابر میں بیٹھا ہوا تھا اور لوگوں کو یقین دلایا تھا کہ اس نیک کام میں عرفان اللہ کی ہر ممکن مدد کرے گا۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ ایک پارٹی سے تعلق رکھنے کے باوجود ان دونوں میں کبھی اچھے تعلقات نہیں رہے۔ صداقت شاہ کا بیٹا عالم شاہ، معاذ کا دوست ہے اور دوستی نبھانے کے لیے اس نے عرفان اللہ اور یزدانی کو باقاعدہ زک پہنچائی تھی۔ عرفان اللہ نے صداقت شاہ کو دھمکیاں وغیرہ دے کر بیٹے کو پیچھے ہٹانے پر مجبور کیا تھا۔ اگلوتے بیٹے کی سلامتی کے لیے صداقت شاہ نے اسے روک تو لیا تھا لیکن عرفان اللہ کے ساتھ اس کے تعلقات کبھی خوشگوار نہیں ہو سکے اور اس وقت وہ اس کا دوست بن کر بیٹھا ہوا ہے۔“ لالہ باریک بینی سے اس ساری صورت حال کا جائزہ لے رہا تھا۔

”ہو سکتا ہے پارٹی لیڈر شپ نے صداقت شاہ کو مجبور کیا ہو۔“ اصغر نے اندازہ لگایا۔

”ایسا نہیں ہو سکتا۔“ لالہ نے اس کی رائے مسترد کی۔

”جب سے صداقت شاہ کے بیٹے کا معاملہ ہوا ہے، اسے سیاست سے مطلب ہی نہیں رہا ہے۔ میں ہر طرح کی سیاسی اور غیر سیاسی سرگرمیوں پر نظر رکھتا ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ صداقت شاہ کے اس عمل کے پیچھے سیاسی وجوہات نہیں ہیں۔“ لالہ کی نظریں اب بھی اسکرین پر تھیں اور صداقت شاہ کے چہرے پر نظریں جمائے اپنی ماہرانہ رائے دے رہا تھا۔

”یہ کنفیوز ہے۔ اس کی آنکھوں میں خوف اور بے بسی ہے۔ صاف پتا چل رہا ہے کہ اس کے اس فعل کے پیچھے اس

کی خواہش نہیں، کوئی مجبوری ہے۔“

”کیا ہمیں صداقت شاہ کے اس رویے کی وجہ معلوم کرنے کی کوشش کرنا چاہیے؟“ لالہ کی گہری دلچسپی دیکھتے ہوئے اصغر نے اس سے سوال کیا۔

”تم رہنے دو ابھی۔ میں خود بعد میں دیکھ لوں گا۔“

لالہ نے پُرسوج لہجے میں اسے جواب دیا اور کچھ یاد آ جانے پر چونک کر پوچھا۔

”حامد کے بارے میں کیا خبر ہے؟“

”اس کے بارے میں آپ کا اندازہ درست تھا۔ شہر کی ایک ویران سڑک پر اس کی لاش ملی ہے۔ اسے داراب خان کے سیکرٹری کی حیثیت سے شناخت بھی کر لیا گیا ہے اور دبی دبی چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں کہ بندہ جس دھندے میں تھا، اس کا بھی انجام ہونا تھا۔“

”مجھے معلوم تھا کہ میڈم ایکس اس کے ناکارہ وجود کو قبول نہیں کرے گی۔ جرم کی دنیا میں کسی بھی فرد کی بس اسی وقت تک اہمیت ہوتی ہے جب تک وہ کام آتا رہے۔ ناکارہ ہو جانے والوں کے وجود سے جان چھڑانے میں زیادہ دیر نہیں لگائی جاتی۔“ اصغر کی دی اطلاق اس کے اندازے کے عین مطابق تھی۔ اصغر خود بھی اس طرح حقیقت سے واقف تھا چنانچہ جواب دے بغیر خاموش کھڑا رہا۔ اس خاموشی کو موبائل فون کی ٹھنکی نے توڑا۔

”ایو۔۔۔۔۔ لگتا ہے ہمارا کام ہو گیا ہے۔“ لالہ نے ایک جوش سے کال ریسیو کی۔ ایک آدھ رگی جملے کے بعد ان کے درمیان اصل معاملے پر گفتگو ہونے لگی۔ یکطرفہ گفتگو سننے والے اصغر نے لالہ کی پیشانی پر پھیلتی شکنوں کی تعداد سے اندازہ لگایا کہ دوسری طرف سے کوئی اچھی خبر نہیں دی جا رہی۔

”یہ کون سی تھرڈ پارٹی کوڈ پڑی ہے بیچ میں؟ کل خان کا پتا کرو دیو۔ مجھے وہ ہر حال میں چاہیے۔“ لالہ بے قرار تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے فون بند کیا تو خود ہی اصغر کو بتانے لگا۔

”دیو! کے آدمیوں نے کل خان کو پولیس کے زمرے سے نکال ہی لیا تھا کہ کوئی اچانک ان سے خان کو جھپٹ کر لے گیا۔ ڈرائیور سمیت دو بندے مارے گئے ہیں دیو! کے۔“

”مگر کسی کو ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“ اصغر نے اعتراض کیا۔

”جب انسان کی انا کو نہیں پہنچے تو وہ کسی معمولی شخص پر اپنا غصہ نکال کر بھی انا کی تسکین کا سامان کر لیتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ نواب اینڈ فیملی یہی کام کر رہی ہے۔“

کام لے کر گلو استاد کے پاس چلا آیا۔ جس دن یہ سب ہوا، اسی رات باذل نے دھمکی آمیز کال کی اور گلو استاد نے مجھے بھارت بھجوانے کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے لگتا ہے میرے بھارت میں قیام کے دوران باذل میرے پیچھے رہا ہے اور کسی نہ کسی طرح یہاں تک پہنچنے میں بھی کامیاب ہو گیا ہے۔“ وکی نے اپنے اندازوں پر مبنی بھرپور تجزیہ پیش کیا۔

”تو کیا اس کے ساتھ حملے میں شامل لوگ بھی میڈم ایکس کے ساتھی ہیں؟ اس مقام پر اتنے منظم حملے کے لیے بھرپور وسائل کی ضرورت ہے اور یہ تو طے ہے کہ باذل ذاتی حیثیت میں یہ سب نہیں کر سکتا۔“ معاذ نے ذہن میں اٹھنے والے سوالوں کو زبان دی۔

”یقیناً ایسا ہی ہے۔ میڈم ایکس کی طاقت صرف پاکستان تک تو محدود نہیں ہے۔ ہم حیدر آباد کے ان دو جنگلوں میں بہت کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں۔ وہاں میڈم ایکس کے تسلسل کے طور پر ڈیوڈ کا سیٹ اپ موجود تھا اور شاید باذل کا بھی اس سے کوئی تعلق قائم تھا۔“ عالم شاہ نے بھی گفتگو میں اپنا حصہ ڈالا۔

”یہ سب باتیں ہم جانتے ہیں لیکن معلوم نہیں کہ چینی ان سے قابل ہوں گے بھی یا نہیں۔ ہمارا واسطہ باذل جیسے مکار اور فتنہ پرور شخص سے ہے اور اس نے پہلے مرحلے میں ہی چینیوں کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔“ معاذ نے تشویش کا اظہار کیا اور یہ بات وہ دونوں بھی جانتے تھے کہ معاذ کی تشویش غلط نہیں ہے۔ ان سب نے ہی کسی نہ کسی مرحلے پر باذل کی مکار اور سفاک فطرت کو سہا تھا اور وہ اس سے کوئی اچھی امید نہیں رکھ سکتے تھے۔

”اگر چینی آپ کو وضاحت کے لیے بلائیں تو آپ مجھے بھی ساتھ لے چلے گا۔ ہو سکتا ہے میری کوئی دلیل کام کر جائے۔“

”صرف تم کیوں، میں بھی اس شخص کے خلاف گواہی دینے چلوں گا۔“ وکی سے یہ بات کہتے ہوئے عالم شاہ کے دماغ میں یزدانی ہاؤسنگ اسکیم کے تہ خانے میں گزرے اذیت ناک شب و روز کسی ویڈیو کی طرح گھوم گئے۔ اس تہ خانے میں ایک مظلوم نوجوان نقیب لاشاری نے ذہنی و جسمانی اذیتوں سے ہار کر ان کی نظروں کے سامنے ہی دم توڑا تھا۔ بھوک، اندھیرا، غلاظت..... کئی طرح کے عذاب تھے جو اس نے اور سرمد نے اس قید خانے میں جھیلا تھے۔ نقیب مرنے سے پہلے انہیں فرار کی راہ نہ دکھایا ہوتا تو وہ بھی اسی کی طرح وہاں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتے۔ نقیب کا

”اتنے بڑے نواب ہو کر اتنی چھوٹی سی عقل؟“ اصغر نے منہ بنایا۔

”ہو سکتا ہے کہ وہ اب بھی اس گمان میں ہوں کہ گل خان کے ذریعے معاذ اور اس کے دیگر ساتھیوں تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔“

”خاما پبلی کی انا ہے ان لوگوں کی۔ جو ہو گیا، سو ہو گیا۔ ختم کریں اس قصبے کو اور مٹی ڈال کر آرام سے رہیں۔ اپنی تو سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ لوگ اتنی دولت ہوتے ہوئے سکون سے کیوں نہیں رہتے۔“ اصغر کو شدید اعتراض تھا۔

”دولت مندی اور فراغت مشاغل مانگتی ہے۔ اپنی انا کو سر بلند رکھنا ان کا مشغلہ سمجھ لو۔“ لالہ نے اسے سمجھایا لیکن خود وہ الجھا ہوا تھا۔ گل خان وہ آخری فرد تھا جس سے وکی کی ملاقات ہوئی تھی اور وہ اس کو کھو بیٹھا تھا۔ مطلب وکی تک پہنچنے کی واحد امید بھی بجھ گئی تھی۔

☆☆☆

”مجھے لگتا ہے باذل میرا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک پہنچا ہے۔“ وکی کی پُر سوچ انداز میں دی گئی رائے نے معاذ اور عالم شاہ دونوں کو اس کی طرف دیکھنے پر مجبور کیا۔ اس وقت وہ تینوں باذل کی یہاں موجودگی پر ہی قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔ معاذ نے خود انہیں اس معاملے سے آگاہ کیا تھا اور اس بارے میں ان کی رائے مانگنی تھی۔

”تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے؟“

”آپ دونوں عرصے سے انڈیا میں تھے اور اس سارے عرصے میں باذل پاکستان میں ہی موجود رہا تھا۔ یہاں تک کہ میری پاکستان سے روانگی سے ایک آدھ دن پہلے بھی وہ وہیں تھا اور مجھ سے بہت خار کھایا ہوا تھا کہ میں نے اس کی ایک مشکوک ویڈیو میڈم ایکس تک پہنچا دی تھی۔ اس نے مجھے جو آخری کال کی تھی، اس میں یہ ظاہر کیا تھا کہ اس ویڈیو کی وجہ سے میڈم ایکس اس کی دشمن بن گئی ہے اور اسے اپنی جان بچانا مشکل ہو رہا ہے۔ اس وقت تو مجھے اس کی بات پر کوئی شک نہیں ہوا تھا لیکن اب حالات کا تجزیہ کروں تو احساس ہوتا ہے کہ باذل کو پھنساتے پھنساتے میں خود ان کے چکر میں آ گیا تھا۔“

”کیسا چکر؟“

”میں نے میڈم ایکس پر یہ ثابت کرنے کے لیے کہ باذل ان لوگوں کے ساتھ قلعے نہیں ہے، باذل اور گلو استاد کی ملاقات کی ایک ویڈیو میڈم کو بھجوائی تھی۔ ویڈیو بھجوانے کے بعد باذل منظر سے غائب ہو گیا اور حامد سونیا کی تلاش کا

یہ احسان اتارنے کے لیے عالم نے بعد میں اس کی بیوہ ماں اور بہن کی بھرپور مالی معاونت کی تھی لیکن یہ بات وہ بھی جانتا تھا کہ مال، جان کا نعم البدل نہیں تھا۔ زندگی کی ساری آسودگیوں کے باوجود نقیب کی ماں اور بہن کو ساری زندگی اس کی جدائی پر تڑپنا تھا۔

اس گفتگو کے بعد انہوں نے کافی وقت اضطراب میں گزارا۔ زخمیوں کی خدمت میں مصروف جا رہے کچھ دیر بعد ان کے ساتھ آٹا تھا اور اسے بھی انہوں نے مختصر حالات سے باخبر کر دیا تھا۔ اس نے بھی تشویش کے باوجود انہیں تسلی دی تھی اور خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گیا تھا۔ اس خاموشی کے نتائج بعد میں ظاہر ہوئے۔

”وہ زانگ تاؤ سے گفتگو کر رہا ہے اور اس کی پوری کوشش ہے کہ ان لوگوں کے دل و دماغ میں تم لوگوں کے خلاف شکوک و شبہات پیدا کر دے۔“ جاوے اچانک ہی بولنا شروع کیا تو پہلے وہ سب چونک گئے پھر خیال آیا کہ جاوے طویل فاصلے کی آوازیں بھی اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے سن لینے پر قادر ہے۔ اس کی اس صلاحیت سے وہ اب تک یہاں کوئی فائدہ اس لیے نہیں اٹھا سکے تھے کہ یہاں زیادہ تر گفتگو چینی زبان میں ہوتی تھی اور جاوے اس زبان کو سمجھنے سے قاصر تھا لیکن ظاہر ہے باذل سے گفتگو کے لیے انہیں وہی زبان استعمال کرنا تھی جو وہ سمجھ سکتا تھا۔

”وہ انہیں بتا رہا ہے کہ میڈم سونیا اس کی اور تم سب کی پاس ہیں اور سب اس کے حکم پر عمل کرتے ہیں۔“ اس سے ملتی جلتی بات باذل نے معاذ کے سامنے بھی زانگ سے کی تھی۔

”اس کا کہنا ہے کہ وہ اور اس کے ساتھی بیک اپ میں اس گاڑی کے پیچھے موجود تھے جسے حادثہ پیش آیا۔ دراصل حادثے والی جگہ پر ہی انہیں ایک دوسرے سے ملنا تھا لیکن جب وہ وہاں پہنچے تو چینی زخمیوں کو وہاں سے لے جا چکے تھے۔ انہوں نے چینیوں کا پیچھا کیا اور ان کا ٹھکانا دیکھنے کے بعد اپنے ساتھیوں کو چھڑانے کے لیے منظم حملے کا انتظام کیا لیکن بد قسمتی سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔“ باذل جانتا تھا کہ ایک حملہ آور کی حیثیت سے اسے وہاں کوئی رعایت نہیں دی جائے گی اس لیے اس کا سارا زور خود کو بچانے سے زیادہ ان کو پھنسانے پر تھا۔

”زانگ نے اس سے پوچھا ہے کہ اگر سونیا اور ہاتی لوگ اپنی مرضی سے وہاں آ رہے تھے تو حادثے کا شکار ہونے والے ٹرک میں ان کی حیثیت قیدیوں کی سی کیوں تھی؟“

یہ وہ سوال تھا جو کوئی معمولی فہم و فراست والا آدمی بھی لازماً اٹھاتا۔ وہ انتظار کرنے لگے کہ باذل کے پاس اس سوال کا کیا جواب ہے۔

”باذل کہہ رہا ہے کہ وہ لوگ قیدی نہیں تھے بلکہ طویل سفر میں آرام کے خیال سے نیند کی دوا لی ہوئی تھی اور بندھے ہوئے اس لیے تھے کہ سوتے میں جھٹکا لگنے سے بستر سے گر نہ جائیں۔ اگر وہ محض قیدی ہوتے تو نیند کے دوران ان کی توانائی بحال رکھنے کے لیے انہیں طاقت کے انجکشن نہیں لگائے جا رہے ہوتے۔“

”ویری اسمارٹ۔“ باذل کی دلیل سن کر بے ساختہ ہی معاذ کے منہ سے نکلا۔

”زانگ اس سے پوچھ رہا ہے کہ ان سب کی یہاں آمد کا مقصد کیا تھا اور ان کی منزل کیا تھی؟“ جاوے کوئی الجھال اس طرف ہونے والی کسی بات سے کوئی غرض نہیں تھی اور وہ نظریں مسلسل ایک سمت لگائے اس معمول کے انداز میں بولتا جا رہا تھا جو اپنے عامل کے حکم کی پیروی میں کسی آن دیکھے منظر میں داخل ہو کر اسے بیان کر رہا ہو۔

”باذل کا کہنا ہے کہ اسے مقصد کے بارے میں علم نہیں البتہ اس نے اتنا ضرور سنا تھا کہ اس بار ان کا جینیوں سے واسطہ پڑ سکتا ہے اس لیے بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ بیک اپ میں ٹیم بھی اسی لیے رکھی گئی تھی کہ کسی مشکل کی صورت میں ان کی مدد کر سکے۔“ اس کے پاس اپنے ہر جھوٹ کے حق میں دلائل تھے۔

”اس کبخت نے تو ساری گندہی ہمارے سر ڈال دی ہے۔“ وکی نے یہ سن کر دانت پیسے۔

”کوئی بات نہیں۔ بولنے دو اسے جھوٹ۔ ہمارے دفاع کے لیے ہمارا سچ کافی ہے۔“ معاذ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر دھیمی آواز میں اسے تسلی دی اور دوبارہ جاوے کی طرف متوجہ ہوا کہ شاید وہ کچھ اور کہے لیکن جاوے نے کچھ دیر مزید خاموشی اختیار کرنے کے بعد اپنی پلکیں جھپکیں اور جسم ڈھیلا چھوڑ کر بیٹھ گیا۔

”کیا ہوا؟“ وکی نے بے تاب سے پوچھا۔

”ملاقات ختم ہو گئی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ باذل کے بیان کی جانچ پڑتال کرنے کے بعد کوئی حتمی فیصلہ کریں۔“ جاوے نے اشارے سے اپنے لیے پانی طلب کیا اور ساتھ ساتھ جواب بھی دیا۔

”یہ شخص اپنی ہر نئی خباثت کے ساتھ خود کو بدترین انجام کا مستحق ثابت کرتا جا رہا ہے۔ مجھے انسانی خون سے

”مجھے بھی کافی بہتری لگ رہی ہے۔ تکلیف بھی بہت کم ہو گئی ہے ورنہ سچ پوچھو تو میں خوفزدہ تھا کہ اس دیرانے میں یہ جڑی بوٹیوں سے علاج کرنے والے میرے زخم کو بگاڑ ہی نہ دیں۔ ساری عمر کی معذوری کا سوچ کر ہی دل کانپ جاتا تھا۔“ عالم شاہ نے پہلی بار ان خدشات کا اظہار کیا جن سے وہ گزرتا رہا تھا۔

”یہ دنیا عجیب و غریب لوگوں سے بھری پڑی ہے۔ دیرانوں میں ایسے نابغہ روزگار لوگ مل جاتے ہیں کہ ہماری جدید دنیا کے ماہرین ان کے آگے پانی بھرتے محسوس ہوتے ہیں۔ یوان منگ بھی مجھے انہیں چنیدہ لوگوں میں سے محسوس ہوتا ہے۔“ معاذ نے شعوری طور پر اسے حوصلہ دینے کی کوشش کی۔

”شاید وہ ہو لیکن میری خواہش ہے کہ اس نے سب کے متعلق جو انکشاف کیا ہے، وہ غلط ثابت ہو۔“ عالم شاہ کی آنکھوں میں نہ چاہتے ہوئے بھی نمی دوڑ گئی۔ معاذ نے تسلی دینے والے انداز میں اس کے بازو پر ہاتھ رکھا اور بولا۔

”اللہ سب بہتر کرے گا۔ تم حوصلہ رکھو بلکہ میری مانو تو ایک بار اس سے ملاقات کر کے اس کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کرو۔“

”وہ مجھ سے اعظم کے متعلق پوچھے گی تو میں کیا کروں گا؟“ عالم شاہ بہن کا سامنا کرنے سے خوفزدہ تھا۔

”حوصلہ دینا کہ ہم اسے اس کا اعظم ضرور واپس لا کر دیں گے۔ اس کام کو ہونے میں کچھ دیر ضرور لگ سکتی ہے لیکن یہ ممکن نہیں کہ ہم اعظم کو بھول کر آگے بڑھ جائیں۔“

”کیا ہم ایسا کر سکیں گے؟“ عالم شاہ بے یقینی کا شکار تھا۔

”ہمیں ایسا کرنا ہے۔ تم بھائی ہو اس کے اور بھائی بہنوں کا مان ہوتے ہیں۔“

”میں بھائی ہونے کا حق ادا ہی کہاں کر سکا ہوں۔ میری خاطر میری بہن نے بہت دکھ اٹھائے ہیں۔“ عالم شاہ ڈپریشن کا شکار ہو رہا تھا۔

”نصیب کا لکھا بدلنے پر کوئی قادر نہیں لیکن کوشش کرنا انسان کا فرض ہے۔ جو کچھ ہوا، اس میں تمہاری کوئی شعوری غلطی شامل نہیں اس لیے خود کو مجرم سمجھنا بند کر دو اور اس بات پر فوکس کرو کہ اب تم کیا کر سکتے ہو جو بگڑے حالات کو سدھار دے۔“

”میں سب سے پہلے اس فیصل کو قتل کروں گا جس نے میری پھولوں جیسی بہن کی زندگی میں کانٹے بھر دیے۔“ عالم شاہ طیش میں آیا۔

ہاتھ رنگنا کبھی بھی پسند نہیں رہا لیکن یہ دنیا کا واحد شخص ہے جس کا خون میں ہر وقت خود پر جائز سمجھتا ہوں بلکہ میرا خیال ہے کہ اس فتنے کو دنیا سے ختم کر دینا عین انسانیت کی خدمت ہوگی۔“ معاذ، باذل کے لیے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے تھوڑا سا جذباتی ہو گیا۔ باذل کا ہر جرم دوسرے سے بڑھ کر تھا اور فیصلہ نہیں ہو پاتا تھا کہ اسے کس جرم میں زیادہ بڑی سزا سنائی جائے۔ اس ذلیل انسان نے بشری اور اس کی باپردہ ماں عائشہ کی عزت کی دھجیاں بکھیری تھیں۔ اس کے عزیز دوست جنین کو بدترین تشدد کر کے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ سرکس کے شہزادے موسیٰ کو اس حال تک پہنچا دیا تھا کہ وہ اب بھی موت کے کنوئیں میں موٹر سائیکل چلانے کے لائق نہیں رہا تھا۔ خوبصورت و ذہین بشری آج جو اذیت بھری زندگی گزار رہی تھی، اس کا ذمے دار بھی مکمل طور پر باذل تھا اور اب وہی باذل ان کی راہ میں بھی کانٹے بچھانے کے لیے آگیا تھا۔

”آپ ٹینشن نہ لیں۔ ان شاء اللہ یہ شخص اپنے انجام کو ضرور پہنچے گا۔“ وکی نے اسے تسلی دی۔

”سرمد.....!“ ان کے درمیان گفتگو جاری تھی کہ عالم شاہ نے آہستہ سے سرمد کو پکارا پھر خود ہی یکدم چپ ہو گیا۔ اسے یاد آگیا تھا کہ کل سے سرمد کو شدید بخار ہے اور وہ بستر سے اٹھنے کے لائق بھی نہیں ہے۔ طبیعت کی اس شدید خرابی کے باعث وہ اتنے ہنگامے کے باوجود کسی کام میں شریک نہیں ہو سکا تھا اور آنکھیں بند کیے بستر پر ہی پڑا رہا تھا۔ اس وقت بھی وہ کسی دوا کے زیر اثر گہری نیند سو رہا تھا ورنہ یہ ممکن نہیں تھا کہ عالم شاہ اسے پکارتا اور وہ چراغ کے جن کی طرح خدمت میں حاضر نہ ہوتا۔

”کوئی کام ہے تو مجھے بتائیں عالم بھائی!“ وکی نے اس کی پکار سن لی تھی چنانچہ مستعدی سے بولا۔

”نہیں، بس وہ پانی چاہیے تھا اور دوا کا وقت بھی ہو گیا تھا۔ یاد نہیں رہا کہ سرمد بیمار ہے اس لیے عادت کے مطابق اسے پکار بیٹھا۔ تم فکر نہ کرو، میں خود لے لوں گا۔“

عالم شاہ نے وضاحت دی۔

”ارے تو میں دے دیتا ہوں۔ یہ کون سا مشکل کام ہے۔“ وکی اس کے منع کرنے کے باوجود حرکت میں آگیا۔

عالم شاہ کے دوا وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد اس کی زخمی ٹانگ کا جائزہ بھی لیا گیا۔

”اب تمہارا زخم کافی بہتر لگ رہا ہے اور امید ہے کہ تم بہت جلد پہلے کی طرح بھاگنے دوڑنے کے لائق ہو جاؤ گے۔“

”یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ فی الحال تمہارا اس سے ملنا اور تسلی دینا سب سے ضروری ہے۔ اسے علاج کے مشکل مرحلے سے گزرتا ہے اور مشکل مرحلے سے گزرنے کے لیے ذہنی سکون بے حد ضروری ہے۔ اس وقت جو حوصلہ اور دلاسا تم اسے دے سکتے ہو، کوئی اور نہیں دے سکتا۔“ معاذ اسے سمجھانے لگا۔ وہ کی اور جار اس موقع پر خود ہی ان سے الگ ہو کر بیٹھ گئے تھے تاکہ عالم شاہ کسی قسم کی جھجک اور شرمندگی محسوس نہ کرے اور دونوں دوستوں کے درمیان کھل کر گفتگو ہو سکے۔

”میری بات سمجھ رہے ہو نا عالم؟ میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ جو تم کر سکتے ہو، وہ میں یا کوئی اور نہیں کر سکتا۔“ عالم شاہ کو خاموش پا کر اس نے اپنی بات دہرائی۔

”میں پوری کوشش کروں گا۔“ بالآخر اس نے ہامی بھر لی۔
”میں زانگ سے بات کروں گا کہ تم دونوں کی ملاقات کروائی جائے۔“ معاذ نے اسے یقین دہانی کروائی اور یہ اتفاق ہی تھا کہ اس کے جملے کے اختتام کے ساتھ ہی زانگ تاؤ اندر داخل ہوا۔

”مجھے کس سلسلے میں یاد کیا جا رہا ہے؟“ اس نے معاذ کی زبان سے اپنا نام سن لیا تھا۔

”یہ میرا دوست اپنی بہن سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔“
”اچھی بات ہے۔ ویسے بھی میں تمہیں یہی اطلاع دینے آیا تھا کہ بیجنگ روانگی کا فیصلہ کر لیا گیا ہے اور سب سے پہلے دونوں خواتین کو ہی روانہ کیا جائے گا۔ ہو سکتا ہے اسے بھی ساتھ ہی بھجوا دیا جائے۔ ہمیں آگے جن حالات کا سامنا کرنا ہے، ان سے پہلے کمزور افراد کو محفوظ مقام تک پہنچا دینا بہت ضروری ہے۔“

”کیا مطلب؟“ زانگ کی بات نے اسے الجھا دیا۔
”ہم نے خود پر حملہ کرنے والوں پر پلٹ کر وار کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“ زانگ پر اسرار انداز میں مسکرایا۔

”پوری بات بتاؤ۔“ زانگ کا مطلب اب بھی اسے سمجھ نہیں آیا تھا۔

”قیدیوں میں سے ایک کی زبان کھلوائی گئی ہے اور اس سے بہت سی جانکاری ملتی ہے۔“

”واقعی.....!“ معاذ نے ہیک وقت حیرت اور خوشی کا اظہار کیا۔

”وہ جس ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کر رہے تھے، مجھے امید نہیں تھی کہ تم لوگ اتنی جلدی ان میں سے کسی کی زبان کھلوا سکو گے۔“

”ہمیں ضرورت پڑے تو زبان کیا، پورا بندہ ہی

کھول کر رکھ دیتے ہیں اور اس وقت تو یوان منگ ہمارے ساتھ تھے تو کام اور بھی آسان ہو گیا۔“ زانگ نے جو کہا، اسے اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ یوان منگ ہناؤم کا ماہر تھا۔ یقیناً قیدیوں کو پہلے تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا اور پھر ان میں سے سب سے کمزور محسوس ہونے والے کو یوان کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ ذہنی اور جسمانی ٹوٹ پھوٹ کے شکار کسی شخص کی زبان کھلوانا کسی علم تویم کے ماہر کے لیے بڑی بات نہیں تھی۔ وہ خود بھی ماضی میں ایسے چند تجربات کر چکا تھا۔

”کیا بتایا اس شخص نے اپنے بارے میں؟“

”وہ پہاڑوں میں ہی ایک کیمپ میں رہتے ہیں جہاں انہیں اسلحے وغیرہ کے استعمال کی تربیت دینے کے ساتھ مخصوص نظریات ذہن نشین کروائے جاتے ہیں۔ جس بندے سے ہم نے بات کی ہے، وہ اپنے کرتا دھرتاؤں کے بارے میں زیادہ جانکاری نہیں رکھتا لیکن اس نے یہ بتایا ہے کہ کچھ دن پیچھے انہیں سندیس ملا تھا کہ تربیت کے لیے کیمپ بھجوائے جانے والے کچھ افراد غائب ہو گئے ہیں، انہیں تلاش کیا جائے۔ تلاش کرنے پر انہیں حادثے کا پتا چلا اور ساتھ ہی یہ اندازہ بھی ہو گیا کہ زندہ رہنے والے افراد کو بھکشو یعنی ہم اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔“ زانگ نے اس سوالی کے جواب میں انکشافات کرنے شروع کیے تو اسے زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ باصلاحیت افراد کو اپنا منطج بنا کر اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کرنا میڈم ایکس اور اس کے آقاؤں کا پرانا دتیرہ تھا۔ ماضی میں وہ ان مراحل سے گزر چکا تھا لیکن بہت کچھ کر گزرنے کے باوجود وہ اس کے دماغ کو زیر نہیں کر سکے تھے چنانچہ شاید یہی سبب کسر پوری کرنے کے لیے یہ قدم اٹھایا تھا اور اس بار سونیا اور دیگر ساتھیوں کو بھی اس کے ساتھ شامل کر دیا گیا تھا۔

”اس شخص کے انوسار، انہیں اوپر سے کہیں سے حکم ملا کہ بھکشوؤں کو تلاش کیا جائے۔ وہ لوگ اسی تلاش میں برف میں بھٹکتے پھر رہے تھے کہ انہیں باڈل نامی شخص ملا۔ اسے وہ اپنے ساتھ اپنے کیمپ لے گئے اور ہائی کمان سے اس کی بات کروائی۔ اس بات چیت کے بعد ہی ہمارے اس ٹھکانے پر حملے کا فیصلہ کیا گیا تاکہ تم لوگوں کو چھڑوا کر کیمپ میں لے جایا جائے لیکن قسمت سے وہ اپنے مقصد میں ناکام رہے۔“ یہ عجیب ہی معاملہ ہوا تھا کہ وہ لوگ یہاں باڈل کی پھیلائی بدگمانی دور کرنے کے لیے سوچ بچار کرتے رہے تھے اور ادھر سب کچھ خود بخود ہو گیا تھا۔

اس سے ایک تو اسے ڈھارس رہے گی، دوسرے ڈاکٹر کو بھی پیشینہ ہسٹری لینے میں آسانی رہے گی۔“ اس نے اپنے دلائل سے ایک لمحے میں عالم شاہ کا اعتراض دور کر دیا۔

”ٹھیک ہے، جیسے تم کہو۔“ عالم نے ہتھیار ڈال دیے۔

”آؤ پھر ملاقات کے لیے چلتے ہیں۔ پرسکون سفر کے لیے روانگی سے قبل تمہیں محل کو اعتماد میں لے کر اسے سمجھانا بھجانا پڑے گا اور اس کے لیے خود تمہیں اپنے جذبات پر قابو رکھنا ہوگا۔“ معاذ نے اسے سمجھایا۔

”میں خیال رکھوں گا۔“ عالم شاہ نے اسے یقین دہانی کروائی۔ اس کے بعد وہ ملاقات کے لیے روانہ ہوئے۔

فاصلہ مختصر تھا لیکن عالم کی زخمی ٹانگ کی وجہ سے وہی اور معاذ اسے سہارا دے کر وہاں لے گئے تھے۔

”تم بھی میرے ساتھ اندر چلو۔“ یوان منگ کے لیے مخصوص غار تک اسے پہنچا کر معاذ اور وہی پلٹنے لگے تھے کہ عالم نے معاذ کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے روک لیا۔

”یہ... یہ مناسب نہیں ہوگا۔“ معاذ نے پہلو تہی کرنا چاہی۔

”تمہارے ہونے سے مجھے ڈھارس رہے گی اور میں محل کو زیادہ بہتر طور پر تسلی دے سکوں گا۔“ عالم نے اس کا ہاتھ نہ چھوڑا۔ مجبوراً اسے اس کی پیروی میں قدم آگے

”کیا تمہیں ہم پر اعتبار ہے؟“ معاذ نے براہ راست اس سے پوچھا۔

”تمہیں یہ سوال پوچھنے کی ضرورت کیوں پڑی؟“

زانگ نے اناس سے سوال کر ڈالا۔

”بازل کی وجہ سے۔ اس نے میرے سامنے تم سے ایسی باتیں کی تھیں کہ تم میرے متعلق شک میں پڑ سکتے تھے۔“

”ہم صرف باتوں پر نہیں چلتے۔“ زانگ نے بے نیازی سے جواب دیا اور موضوع بدلتے ہوئے بولا۔

”تم اپنے ساتھی کی اس کی بہن سے ملاقات کروادو پھر باقی کی بات چیت کرتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ معاذ نے مختصر جواب دیا۔

”میں عورتوں کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ میں یہاں تم لوگوں کے ساتھ رہ کر کچھ کرنا چاہتا ہوں۔“ زانگ کے جانے کے بعد عالم شاہ نے احتجاجی لہجے میں کہا۔

”میرے خیال میں تمہیں جانا چاہیے۔ بے شک چینیزوں کا سلوک ہمارے ساتھ مناسب ہے لیکن بہتر ہوگا کہ خواتین کے ساتھ ہم میں سے کوئی رہے اور تمہارا رہنا سب سے بہتر ہے۔ محل تمہاری بہن ہے۔ اس کے علاج کے مراحل میں کوئی خونی رشتہ اس کے قریب رہے، یہ ضروری ہے کیونکہ

پاکین

قارئین کے لیے خوش خبری

مشہور و معروف ایڈیٹر مصنفہ

رفعت سراج

کے قلم کا شاہکار قسط وار ناول

جلدی پاکیزہ کے صفحات کی زینت بننے جا رہے ہیں

انسانی نفسیات کس پیچیدگیوں کو نہایت سہارت سے اپنے قلم کس نوک سے سلجھانے والی قلم کار کس ایک اور شاندار تحریر

آج کی نوجوان نسل کے وہ نفسیاتی مسائل جو شاید ابھی تک زیر بحث نہیں لائے گئے

قارئین! قلم کار اس تحریر کو برسوں یاد رکھیں گے

بڑھانے پڑے۔ وکی باہر ہی رک گیا۔ اندر داخل ہوتے ہی سب سے پہلے یوان منگ سے ان کا سامنا ہوا۔ اس نے منکراتے لبوں سے ان کا استقبال کیا۔

”زامگ نے ابھی ابھی مجھے اطلاع دی ہے کہ تم لوگ ملاقات کے لیے آرہے ہو۔ اگر وہ کچھ دیر پہلے مجھے بتا دیتا تو میں مریضہ کو تھوڑا ٹھہر کر دوا پلاتا۔ اب دوا دے دینے کے باعث وہ زیادہ دیر تم لوگوں سے بات نہیں کر سکے گی۔ تم جانتے ہی ہو کہ زیادہ تر درد کش دوائیں نشہ آور ہوتی ہیں۔“ اس کا نرم لہجہ وضاحتی تھا۔

”آپ پریشان نہ ہوں۔ ہم آپ کی مریضہ کو زیادہ ڈسٹرب نہیں کریں گے۔“ معاذ نے اسے تسلی دی اور عالم شاہ کو غار کے اس حصے کی طرف متوجہ کیا جہاں سبیل کا بستر لگا تھا۔ عالم شاہ نے اس کے بازوؤں کا سہارا چھوڑے بغیر اس جانب پیش قدمی کی۔ معاذ کو چارونا چاراس کا ساتھ دینا پڑا۔ وہ کسی کملائے ہوئے زرد پھول کی طرح بستر پر دراز تھی۔

”سبیل!“ عالم شاہ نے بے تابی سے اسے پکارا تو اس نے آہستہ سے آنکھیں کھول دیں۔ ایک پل کے لیے اس کی آنکھوں کے تاثرات اتنی ہی رہے لیکن پھر آہستہ آہستہ ان میں پہچان کے رنگ بھرنے لگے۔

”ادا سائیں!“ اس کے ہونٹوں سے ایک کراہی نکل۔ ”میری دھی رانی!“ عالم شاہ نے بے ساختہ ہی اسے صداقت شاہ کے انداز میں پکارا اور اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔ سبیل کی آنکھوں سے آنسو نکل کر دائیں بائیں کنپٹیوں پر بہہ گئے۔

”آپ کہاں تھے ادا سائیں؟ دیکھیں میں بالکل خالی ہاتھ رہ گئی۔ ظالموں نے میرے اعظم کو بھی مجھ سے چھین لیا۔“ اس شکوے میں جو تڑپ تھی، وہ کسی بھی صاحبِ دل کا سینہ چیر سکتی تھی۔ معاذ نے عالم شاہ کے کپکپاتے وجود کو سہارا دینے کے لیے اس کی پشت پر اپنا ہاتھ رکھا۔ یہ اور بات تھی کہ عالم کی پشت پر رکھا اس کا اپنا ہاتھ بھی لرزش کا شکار تھا۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا میری پیاری بہن! ہم جلد از جلد اعظم کو ڈھونڈ کر تم تک پہنچا دیں گے۔“ ”میں اسے دیکھے بغیر مر گئی تو میری روح بھی بے سکون رہے گی۔“

”میں نے کہا نا کہ ان شاء اللہ جلد اعظم تمہیں مل جائے گا پھر یہ مرنے مرنے کی باتیں کیوں کر رہی ہو۔ تمہیں ابھی بہت سا جینا ہے اور اپنے ہاتھوں سے اپنے بچے کی

پرورش کرنا ہے۔“ عالم نے اسے ٹوکا۔ ”مجھے برین ٹیومر ہے ادا سائیں.....! اور یہ بات مجھے دہلی میں ہی فردوس بھابی نے بتادی تھی۔“ اس نے جیسے عالم شاہ کو جتانے کی کوشش کی کہ اس کی طویل زندگی کی امید رکھنا بیکار ہے۔

”کاش آپ نے اتنی بڑی بات مجھ سے چھپائی نہ ہوتی۔“ اب تک خاموشی اختیار کیے رکھنے والے معاذ نے بے ساختہ اس سے شکوہ کیا۔

”بتا کر آپ کو پریشان کرنے کے سوا کچھ حاصل نہ ہوتا۔“ اس نے آہستہ سے جواب دیا اور آنکھیں موند لیں۔ ”برین ٹیومر آج کے دور میں کوئی ناقابلِ علاج مرض نہیں رہا ہے۔ میرے اپنے کئی جاننے والوں کو اس مرض سے شفا ملی ہے اور تم تو خوش قسمت ہو کہ پیچنگ جیسے بڑے اور ترقی یافتہ شہر میں تمہارا علاج ہونے جا رہا ہے۔“ عالم شاہ نے اسے مایوسی کے اندھیروں سے نکالنے کی کوشش کی لیکن شاید اسے اونگھ آگئی تھی اس لیے نہ آنکھیں کھولیں اور نہ ہی جواب دیا۔

”اللہ تمہیں صحت اور سکون دے میری بہن!“ عالم شاہ نے اس کی پیشانی کو چھو کر اس کے لیے دعا کی تو پیچھے کھڑے معاذ نے صدقِ دل سے آمین کہا۔

”اعظم.....!“ اسی وقت سبیل نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں اور بے قراری سے بیٹے کو پکارنے لگی۔

”حوصلہ کرو سبیل! میں نے کہا ہے نا کہ ہم جلد اعظم کو ڈھونڈ کر لے آئیں گے۔“ عالم شاہ نے اضطرابی کیفیت میں اس کے کبل سے باہر آنکھنے والے ہاتھوں کو تھام کر اسے دلاسا دینے کی کوشش کی۔

”اعظم کہاں ہو میری جان! جلدی سے ماما کے پاس آ جاؤ۔ ماما مجھے لے کر تمہارے بغیر۔“ اس نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر لی تھیں اور ڈوبتی آواز میں بڑبڑاتے ہوئے بول رہی تھی۔ یقیناً دوا نے اثر کرنا شروع کر دیا تھا۔

عالم شاہ نے اس کے بے جان ہوتے بازوؤں کو محسوس کیا تو آہستہ سے انہیں کبل کے اندر کر کے کبل اس کے اوپر ٹھیک کرنے لگا۔ سبیل نے معمولی وقفے سے بند آنکھوں کے ساتھ ہی چند سسکیاں لیں پھر خاموش ہو گئی۔ اب وہ دوا کے زیر اثر مکمل غنودگی میں جا چکی تھی۔ معاذ جو اس ساری صورتِ حال پر خود شدید دلبرداشتہ تھا، کسی طرح ہمت کر کے عالم شاہ کو سہارا دے کر اس کے بستر سے دور لے آیا۔

”اس کے لیے دعا کرو۔ اگر کوئی چیز اسے موت کے

ہے۔“ تماشا دیکھنے والے مرد کو گل خان کی کارکردگی نے لطف اندوز کیا۔

”کہو تو بھالو کی طرح تارہ کر بھی دکھائے گا۔“ ساتھ کھڑی عورت نے مسکرا کر دعویٰ کیا۔

”سیرِ سیلی؟“

”یس، آف کورس!“ عورت اترائی اور پھر گل خان کو بھالو کی طرح ناچنے کی ہدایت دینے لگی۔ گل خان نے اس ہدایت پر بھی عمل کیا۔

”تم نے تو کمال کر دیا لارا۔“ اس بار مرد نے اسے سراہا۔

”تم نے اس کمال کے لیے ہی میرا انتخاب کیا تھا۔“ اس نے ایک ادا سے اپنے بال جھٹکے۔

”میں تو اس کی یہاں آمد کا پہلا دن یاد کر رہا ہوں۔ ایک طوفان مچا رکھا تھا اس شخص نے۔ نہ اسلحے سے ڈر رہا تھا اور نہ ہی مار پیٹ سے۔“

”وہ اس لیے کہ ڈر اس کے اندر تھا ہی نہیں۔ میرے ٹرینٹ نے اسے ڈرنا سکھایا ہے اور اس کے اندر شدت سے یہ احساس پیدا کیا ہے کہ جب کوئی مارتا ہے تو انسان کو بہت درد ہوتا ہے۔ اب اس کی ذہنی حالت ایسی ہے کہ تم اسے سوئی بھی چھوؤ گے تو اسے بھالے کی طرح لگے گی اور یہ اس کی تکلیف سے بچنے کے لیے کسی پالتو کتے کی طرح تمہارے قدموں میں لوٹ کر تم پر اپنی وفاداری ثابت کرے گا۔“ لارا بہت فخر سے اسے گل خان کی ذہنی حالت کے بارے میں بتا رہی تھی اور سننے والا مرد سر کو کھینچی انداز میں حرکت دے رہا تھا۔

”تم اس سے کیا کام لینا چاہتے ہو؟ آئی مین کہ اگر تم مجھے گائیڈ کر دو تو میں اس حساب سے اس کی ذہن سازی کر پاؤں گی۔“

”سچ پوچھو تو یہ میرے لیے کوئی اہم آدمی نہیں ہے۔ میں نے اسے بس اپنا غصہ نکالنے کے لیے اٹھوایا تھا اور ساتھ ہی اس کے ہمدردوں کو باور کروانا چاہتا تھا کہ میرے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔ آج بھی اس کے ہمدردوں کے کرائے کے ٹٹو اس کی تلاش میں ٹاک ٹوئیاں مارتے پھر رہے ہیں لیکن انہیں کمان بھی نہیں ہے کہ یہ میرے پاس ہے۔“ اس کا انداز لطف لینے والا تھا اور اس لطف میں اس وجہ سے مزید اضافہ ہو رہا تھا کہ نئی ہدایت نہ ملنے کے باعث گل خان مسلسل بھالو ناچ پیش کرنے میں مصروف تھا۔ مسلسل حرکت نے اس کی حالت تپلی کردی تھی اور جسم سے پسینا پانی کی دھاروں کی طرح بہہ رہا تھا۔ حقیقتاً اب اس کے قدم بھی جم

منہ سے واپس کھینچ سکتی ہے تو وہ صرف اور صرف دعا ہے۔“ یوان منگ نے ان کے سستے ہوئے چہروں کو دیکھ کر ہمدردی سے کہا لیکن وہ دونوں ہی کوئی جواب دیے بغیر باہر نکل گئے۔ باہر نکلتے ہی عالم شاہ کا ضبط جواب دے گیا اور وہ زمین پر بیٹھ کر دھاڑیں مارنے لگا۔ معاذ اور وکی نے یہ مشکل اسے سنبھالا۔ بہت ساروں نے پر عالم کے دل کا غبار کچھ کم ہوا تو اس نے خاموشی اختیار کر لی۔ اس موقع پر معاذ نے اس کے دونوں ہاتھ تھامے اور مضبوط لہجے میں بولا۔

”خود کو کبھی تنہا نہ سمجھنا دوست.....! اور سب سے بھرا کہنا کہ اگر اسے اس کا بیٹا واپس نہ دلا سکا تو زندگی میں کبھی اسے اپنی شکل نہیں دکھاؤں گا۔“

وہ اپنے ارادے میں کتنا پختہ ہے، اس کا اندازہ اس کے لہجے ہی سے لگایا جاسکتا تھا۔

☆☆☆

خالی کمرے کے فرش پر سکرسمٹ کر سوائے گل خان کے چہرے پر انجانا سا خوف ثبت تھا اور وہ حالت نیند میں بھی پُرسکون محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے جسم پر موجود لباس بے حد گندا ہو رہا تھا اور کئی جگہ سے پھٹ بھی چکا تھا۔ اس کی صحت بھی پہلے کے مقابلے میں کافی گری ہوئی دکھائی دے رہی تھی اور اسے ایک نظر دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ مشکل حالات سے گزر رہا ہے۔ نیند میں بھی اس کے حلق سے وقفے وقفے سے ڈری ڈری آوازیں نکل جاتی تھیں۔ وہ جس کمرے میں سویا ہوا تھا، اس کا دروازہ اچانک آواز کے ساتھ کھلا تو وہ نیند سے اچھل کر بیٹھ گیا اور گھکیائے ہوئے لہجے میں بولا۔

”ام کو مت مارو۔ ام تمہارا ہر بات مانے گا۔ تم جو بولو گے سب کرے گا۔“

”کئی بات ہے، سب کرو گے؟“ کھلے دروازے سے اندر آنے والے دو افراد میں سے ایک نے مسکراتے لہجے میں پوچھا۔

”ہاں، ہاں۔ سب کرے گا۔“ گل خان نے زور زور سے سر ہلاتے ہوئے یقین دہانی کروائی۔

”ٹھیک ہے تو پھر بندر کی طرح ناچ کر دکھاؤ۔“ فرمائش کی گئی اور گل خان مداری کے بندر کی طرح ہدایت ملتے ہی حرکت میں آ گیا۔ وہ واقعی کسی بندر ہی کی طرح ناچ رہا تھا۔ قلابازیاں، اچھل کود اور طرح طرح کی شکلیں بنانا اس ناچ کا خصوصی حصہ تھے۔

”ہا ہا ہا..... یہ تو جیج کی کسی بندر کی طرح پر فارم کر رہا

کر زمین پر نہیں پڑ رہے تھے اور وہ ہانپتا کانپتا بس کسی نہ کسی طرح خود کو حرکت میں رکھے ہوئے تھا۔

”ٹھیک ہے۔ تم نے جو چاہا، وہ ہو گیا لیکن آئی تھنک تم تنظیم کے وسائل کو صرف اپنی انا کی تسکین کے لیے تو ضائع کرنا پسند نہیں کرو گے۔ اس بندے پر خرچ کیا ہے تو اس سے کوئی فائدہ بھی اٹھاؤ۔“ لارا کا انداز معنی خیز تھا۔

”تمہارے ذہن میں کیا ہے؟“ وہ چونکا۔

”کوئی بم بلاسٹ، کوئی ٹارگٹ کلنگ..... کچھ تو ہونا چاہیے۔ اس کے کیس کا آئی او پہلے ہی اس کے اور معاذ وغیرہ کے درمیان لنک ڈھونڈ چکا تھا۔ اگر تم اسے کورٹ سے اٹھوانہ لیتے تو ابھی اس کے خلاف دہشت گردوں کی معاونت کے جرم میں کیس شروع ہو چکا ہوتا۔“

”ہاں، لیکن اس کا ہمیں کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ سارا کریڈٹ بھارتی سرکار خود لے لیتی۔“ اس نے منہ بنایا۔

”اب تو ہم فائدہ اٹھا سکتے ہیں ڈیوڈ.....! تم سرکار سے ڈیل تو کرو۔ پاکستان کو بدنام کرنے کے لیے وہ اس نئی ڈیل سے بالکل انکار نہیں کریں گے۔“ لارا نے اسے مشورہ دیا۔

”نہیں، ابھی نہیں۔ اس صورت میں بھارتی سرکار سمجھ جائے گی کہ اسے ہم ہی نے کورٹ سے اغوا کروایا تھا۔ ہمیں اس لقمے کو ٹھنڈا کر کے کھانا ہوگا۔“ ڈیوڈ نے انکار میں سر ہلایا اور عین یہی لمحہ تھا جب گل خان کی ہمت جواب دے گئی اور وہ چکرا کر دھب کی زوردار آواز کے ساتھ نیچے گرا۔ گرنے کے بعد اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن جسم میں جان ہی نہیں رہی تھی اس لیے وہ اٹھتے اٹھتے پھر گر گیا۔

”ٹھنڈا کرنے کے چکر میں ہم اسے کہاں سنبھال کر رکھیں گے۔ حیدر آباد والا سیٹ اپ ویسے ہی تباہ ہو گیا ہے اور بہت ضروری ہے کہ ہمارے جو ٹھکانے محفوظ ہیں، وہاں کوئی مشکوک سرگرمی نظر نہ آئے۔“ لارا اس کے فیصلے سے متفق نظر نہیں آرہی تھی اور اس اختلاف کے اظہار کے لیے نظروں میں بے حد حقارت لیے گل خان کو گھورنا شروع کر دیا تھا۔

”یہ یہاں نہیں رہے گا۔ اسے میں اس کے ساتھیوں کے پاس بھجوادوں گا۔ وہاں یہ ان کے ساتھ ٹریننگ حاصل کرے گا اور وقت آنے پر ان ہی کے ساتھ انجام کو پہنچے گا۔“ ڈیوڈ نے اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔

”وہاں سے ابھی تک کوئی رپورٹ نہیں آئی آپریشن کی کامیابی کی؟“ لارا نے قدرے تشویش سے پوچھا۔

”آجائے گی رپورٹ۔ وہ کوئی شہری علاقہ نہیں ہے کہ گاڑی میں بیٹھ کر گئے اور گھنٹوں، منٹوں میں کام نمٹا کر واپس آ گئے۔ طویل فاصلے، دشوار راستے اور خراب موسم سمیت بہت سے مسائل ہوتے ہیں جن کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کام پورا ہوتے ہی کیپ سے مجھے رپورٹ بھیج دی جائے گی۔“ وہ پُر اعتماد تھا۔

”اور اس کے ساتھ ہی تم مجھے وہاں روانہ کر دو گے۔“ لارا نے منہ بنایا۔

”وہ تو لازمی بات ہے۔ تم جانتی ہو کہ تمہارا اصل سلیکشن انہی لوگوں کے لیے ہوا ہے۔ یہ بندہ تو بس ایک ٹرائل کیس تھا۔“ ڈیوڈ نے زمین پر گر کر ہانپتے گل خان کی طرف اشارہ کیا۔

”میں جس طرح اس ٹرائل میں کامیاب ہوئی ہوں، وہاں بھی ناکام نہیں رہوں گی۔“ لارا نے دعویٰ کیا۔

”آئی ویش کہ ایسا ہی ہو۔ مجھے سب سے زیادہ فکر اس لڑکے معاذ کو کنٹرول کرنے کی ہے۔ اگر وہ کنٹرول میں آ گیا تو میں اور والدوں پر ثابت کردوں گا کہ رائیل جتنی بھی ذہین اور انیکٹو تھی، میرے تجربے کے آگے اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔“ ڈیوڈ کے لہجے میں میڈم ایکس کے لیے رقابت تھی۔

”بلیوی، ایسا ہی ہوگا۔“ لارا نے اس کے بازو پر دباؤ ڈالتے ہوئے یقین دہانی کروائی۔

”یہ دعویٰ کرتے ہوئے تمہیں اس بات کو نہیں بھولنا چاہیے کہ رائیل کو پروفیسر وکٹر کا تعاون حاصل تھا اس کے باوجود بھی وہ ناکام رہی۔“ ڈیوڈ نے اسے تنبیہ کی۔

”وکٹر کا انتخاب رائیل کی ایک بڑی غلطی تھی۔ مرد جتنی آسانی سے صنف مخالف کے ہاتھوں زیر ہوتے ہیں، اتنی آسانی سے ہم صنف سے دھوکا نہیں کھاتے۔ میں ثابت کر دوں گی کہ میرا سلیکشن کر کے تم نے کوئی غلطی نہیں کی ہے۔“ وہ بہت پُر اعتماد تھی۔

”ٹھیک ہے تو پھر میں تمہیں، تمہارے اس ہنڈر کے ساتھ آج ہی یہاں سے روانہ کر دیتا ہوں تاکہ تم فوری طور پر اپنے آبجیکٹ پر کام شروع کر سکو۔“ منٹوں میں فیصلہ کر لینا ڈیوڈ کی عادت تھی اور لارا جانتی تھی کہ وہ اپنے فیصلے بدلنے کا عادی نہیں چنانچہ بے چون و چرا کے اس کے حکم کے آگے سر جھکا دیا۔

☆☆☆

لالہ عیسیٰ کئی گھنٹوں تک شہر میں مڑمڑت کرتا رہا تھا۔

کا کہنا ہے کہ صرف اعلان نہیں ہے، اسکول قائم بھی ہوں گے اور ایسے ہوں گے کہ دیکھنے والے دیکھتے رہ جائیں گے۔
 ”اباں یار جانے دو۔ یہ اسکولوں والی خبر تو پرانی ہو گئی ہے۔ میرے پاس اندر کی خبر ہے کہ دو چار دن میں عرفان اللہ شہر کے مختلف حصوں میں مفت دسترخوان لگانے کا بھی اعلان کرنے والا ہے اور اس کے لیے کسی سے چندہ نہیں مانگا جائے گا۔ ہاں، جو خوشی سے دے دے، اس کے لیے خاموشی سے چندہ باکس لگا دیا جائے گا۔“ ایک جونیئر صحافی نے سگریٹ کا گہرا کش لے کر دھواں ہوا میں چھوڑا اور نیوز بریک کی۔

”لگتا ہے بندہ کوئی اونچا گیم کھیلنے جا رہا ہے۔“
 ”ہے تو ایسا ہی۔ پارٹی لیڈر شپ بھی پریشان ہے کہ کہیں وہ انہیں ہی باکی پاس نہ کر دے۔“ دسترخوان والی خبر بریک کرنے والے نے ایک ادا سے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے انکشاف کیا۔

”کون ہے اس کے پیچھے..... اسٹیبلشمنٹ یا بیرونی طاقتیں؟“ یہ سوال اٹھنا جاتا ہی تھا۔

”سب کچھ بڑا چوری چوری چل رہا ہے اور ابھی تک کوئی نام سامنے آیا نہیں ہے لیکن خیر، دیکھ لیتے ہیں کہ کب تک یہ پردہ داری چلے گی۔ دائی سے بھی کبھی پیٹ چمکا ہے۔ ایک دن اپنی برادری حقیقت کھوج ہی ڈالے گی۔“
 ظاہری طور پر لالہ کھانے سے بھرپور انصاف کر رہا تھا لیکن اس کی بھرپور توجہ ہونے والی گفتگو پر تھی۔ وہ ان لوگوں کی آراء سے مکمل اتفاق رکھتا تھا۔ اس کے ذہن میں بنی اور موجود کے ذریعے موصول ہونے والی یہ خبر بھی موجود تھی کہ عرفان اللہ نے کسی عورت سے خفیہ ملاقات کی ہے۔ وہ عورت کون تھی اور کس کی نمائندگی کر رہی تھی؟ یہ معلوم ہو جاتا تو بہت سی الجھنیں دور ہو جاتیں لیکن ان صحافیوں کی گفتگو سے اندازہ ہو رہا تھا کہ انہیں اس ملاقات کی سرے سے خبر ہی نہیں ہے۔

اس نے کچھ دیر اس سلسلے میں سوچا اور حتمی نتیجے پر پہنچنے کے بعد بیرے سے نوٹ پیڑا اور قلم طلب کر کے اس پر ایک نوٹ لکھنے لگا۔ بائیں ہاتھ سے لکھے اس نوٹ کی لکھائی اچھی نہیں تھی لیکن ایسی ضرور تھی کہ پڑھی جاسکے۔ اس کی وہاں سے روانگی کے بعد اس سے ہر نوٹ وصول کرنے والا بیرا اس نوٹ کو اس جونیئر صحافی کے ہاتھ میں تھما رہا تھا جو سگریٹ کو سگریٹ سمجھ کر نہیں، آرٹ کی ایک قسم سمجھ کر پیتا تھا اور توڑا سا سر پھرا تھا۔ اس سر پھرے نے اب اس وقت

آج کل وہ اپنے حلیے میں تبدیلی کے لیے خصوصی محنت کر رہا تھا اور کافی تیزی سے اپنا وزن کم کیا تھا۔ وزن کی کمی کے ساتھ ڈاڑھی، مونچھوں اور سر کے بالوں کی لمبائی میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان کا رنگ بھی تبدیل کر لیا تھا۔ ڈارک براؤن کلر میں رنگی گھنی ڈاڑھی، بل دی ہوئی بڑی بڑی مونچھیں اور پونی ٹیل کی شکل میں بندھے سر کے لمبے بال دیکھ کر کون گمان کر سکتا تھا کہ وہ لالہ عیسیٰ ہے۔ بالوں کی طرح اس کی آنکھوں کی رنگت بھی ڈارک براؤن ہو چکی تھی۔ یہاں تک کہ پلکوں اور بھودوں کے بالوں کو بھی تبدیلی کے اس عمل سے گزرا گیا تھا اور یہ سب اتنی نفاست سے ہوا تھا کہ کوئی بھی شے اس کی شخصیت کے مخالف نہیں لگ رہی تھی۔ نہ ہی اس پر مصنوعی پن کا گمان ہو رہا تھا۔ اپنی شخصیت کی اس تبدیلی کی جانچ کے لیے اس نے محض آئینے کی گواہی پر انحصار نہیں کیا تھا اور گھنٹوں شاپنگ مالز، ہوٹلوں اور چائے خانوں میں گھومتا لوگوں کی نظروں کے تاثر سے خود کو جانچتا رہا تھا۔ وہ اس حقیقت سے واقف تھا کہ اگر کوئی شخص اپنے حلیے کے اعتبار سے عجیب محسوس ہو تو ہمارے لوگوں کی نفسیات میں اسے نظر انداز کرنا شامل نہیں ہے۔ سرگوشیوں میں تبصرے، معنی خیز مسکراہٹیں یا کم سے کم آنکھوں میں حیرت کے تاثر سے تو ہمارے لوگ اگلے کو جتا ہی دیتے ہیں کہ تم ہمارے درمیان عجیب و غریب نمونہ لگ رہے ہو۔ وہ اپنے حلیے کی تبدیلی کو لوگوں کے چہروں اور آنکھوں کے تاثرات میں پڑھنے کی کوشش کرتا رہا تھا اور اسے یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ اسے اس حلیے کے ساتھ عجیب نہیں سمجھا جا رہا تھا۔ سارے شہر میں مڑگشت کرنے کے بعد وہ آخر میں پریس کلب گیا تھا اور وہاں کے کیفے ٹیریا میں اچھے سے کھانے کا آرڈر دے کر ایک ایسی میز پر جم گیا تھا جس کی قریب ترین میز پر کچھ صحافی براجمان چائے اور سگریٹ سے مشغول کرتے آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔

”عرفان اللہ کا کچھ پتا ہے کہ آج کل کن ہواؤں میں ہے؟“ چکن کڑاہی کا لقمہ حلق سے نیچے اتارتے یہ فقرہ لالہ کی سماعتوں میں پڑا تو اس کے کان کھڑے ہو گئے۔

”بزنس مین ہے سالا اور بزنس ہی کر رہا ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ آج کل سیاست میں انویسٹمنٹ کرنے پر زیادہ زور ہے۔“ دوسرے نے معصکھ اڑانے والے انداز میں تبصرہ کیا۔

”انویسٹمنٹ بھی معمولی نہیں ہے یار! اکٹھے دس ماڈل اسکول قائم کرنے کا اعلان کر دیا ہے اور اس کے قریبی ساتھیوں

تک چین سے نہیں بیٹھنا تھا جب تک وہ یہ معلوم نہ کر لیتا کہ شہر کے مہنگے ترین ہوٹل میں عرفان اللہ سے خفیہ ملاقات کرنے والی عورت کون تھی۔

ادھر لالہ اپنے ٹھکانے پر واپس پہنچا تو اصغر عالم اضطراب میں اپنا منتظر نظر آیا۔

”کہاں چلے گئے تھے آپ؟ فون بھی ساتھ نہیں لے گئے تھے۔“ اسے دیکھتے ہی اصغر لپک کر آیا اور شکوہ کیا۔

”بہت دن ہوئے گدی پر بیٹھے بیٹھے حکمرانی کرتے۔“

اپنے ہاتھ پیر چلانا بھول گیا تھا۔ اپنے انہی رنگ آلود ہاتھ پیروں کو رواں کرنے کے لیے باہر نکلا تھا اور سارے سہارے پیچھے ہی چھوڑ گیا تھا۔ آج برسوں بعد میں نے اس فیلنگ کا مزہ اٹھایا ہے کہ اگر کہیں کوئی گڑبڑ ہوگئی تو اس سے مجھے خود غمنا ہوگا۔ کوئی نہیں ہوگا جو مجھے اس مشکل سے نکالنے آئے۔“ لالہ اطمینان سے بولتا ہوا ایک صوفے پر براجمان ہو گیا اور اصغر کے تے ہوئے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”تو کیوں بوتا تھا لگا کر گھوم رہا ہے؟“

”میرے پاس کچھ اہم خبریں ہیں جنہیں سنانا ضروری ہے۔“

”سنا۔“ لالہ نے سائیڈ ٹیبل پر رکھے کیس سے اپنے لیے ایک سگار منتخب کرتے ہوئے کہا۔ آج وہ جو کچھ پیچھے چھوڑ گیا تھا، ان میں سے ایک شے سگار بھی تھی۔

”آپ کو بچے کی وہ تصویر یاد ہوگی جو پرویز نے مرنے سے پہلے مجھے بھجوائی تھی؟“

”ہاں، ہاں۔ یاد ہے۔ کچھ پتا چلا اس کا کہ وہ بچہ کس کا ہے؟“ لالہ نے سگار سلگاتے ہوئے پوچھا۔

”میں نے وہ تصویر اپنے سارے آدمیوں کو سینڈ کر دی تھی کہ جسے بھی اس بچے کے بارے میں کچھ پتا چلے، مجھے بتادے۔“

”پھر.....؟“

”پھر یہ کہ آپ کے جانے کے بعد بنی کی طرف سے اطلاع آئی تھی۔ وہ اور موجود، عرفان اللہ کی آج کی پریس کانفرنس میں موجود تھے اور بنی بالکل عرفان اللہ کی کرسی کے پیچھے کھڑا تھا۔“

”ایک باڈی گارڈ کے لیے وہیں جگہ بنتی ہے۔“

”صداقت شاہ، عرفان اللہ کے بالکل برابر میں بیٹھا ہوا تھا اس لیے جب اس نے اپنا موبائل نکال کر آن کیا تو بنی کی اس پر نظر پڑ گئی اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ صداقت شاہ نے وال پیپر پر وہی تصویر لگائی ہوئی ہے جو

میں نے اسے بھیجی تھی۔“ لالہ کے تہرے کو نظر انداز کرتے اصغر نے اسے پوری تفصیل سنائی اور اس بار لالہ بھی اپنی بے نیازی قائم نہیں رکھ سکا۔

”مطلب بچے کی تصویر.....؟“ لہجے میں حیرت لیے اس نے استفسار کیا جس کے جواب میں اصغر نے محض سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

”یہ تو کمال ہی ہو گیا۔ کون ہو سکتا ہے وہ بچہ صداقت شاہ کا؟ کہیں اس کا نواسا تو نہیں؟“ لالہ اب تیزی سے سوچ رہا تھا۔

”لیکن اس کا نواسا تو اس کی بیٹی کے ساتھ ہی انڈیا میں ہے۔“

”جو بندے کے بندے ادھر ادھر کر دیتے ہیں، ان کے لیے ایک چھوٹے سے بچے کو انڈیا سے یہاں لانا کون سا مشکل کام ہے۔“ لالہ نے سگار کی راکھ جھاڑتے ہوئے اسے جواب دیا پھر مضطربانہ بولا۔

”اوہ مائی گاڈ.....! میں سمجھ گیا کہ صداقت شاہ کو کون سی مجبوری عرفان اللہ کی حمایت کرنے پر مجبور کر گئی ہے۔ یقیناً اسے اس کے نواسے کے ذریعے بلیک میل کیا جا رہا ہے۔“

”لیکن وہ بچہ عرفان اللہ کے نہیں بلکہ میڈم ایکس کے قبضے میں ہے۔“ اصغر نے اعتراض کیا۔

”اور میڈم ایکس اچھی طرح جانتی ہے کہ کب کس مہرے کو استعمال کرنا ہے۔ مجھے شک ہو رہا ہے کہ ہوٹل میں عرفان اللہ سے خفیہ ملاقات کرنے والی عورت میڈم ایکس ہی تھی۔ اسی نے سائیں صداقت شاہ کو نواسے کے حوالے سے بلیک میل کر کے عرفان اللہ کے ساتھ بیٹھنے پر مجبور کیا ہوگا۔“ لالہ کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔

”شاید ایسا ہی ہے۔ بنی نے مجھے جو آخری اطلاع دی ہے، اس کے مطابق عرفان اللہ کے باڈی گارڈز اچانک بدل دیے گئے ہیں اور بنی اور موجود سمیت کسی کو بھی عرفان اللہ کے قریب جانے کی اجازت نہیں ہے۔ بنی بتا رہا تھا کہ سننے میں آ رہا ہے کہ باڈی گارڈز سمیت تمام ملازمین کی اچھی طرح جانچ پڑتال کی جائے گی پھر ہی فیصلہ ہوگا کہ کس کی ملازمت باقی رہے گی اور کس کی نہیں۔“ اصغر کے پاس ایک اور نئی خبر موجود تھی۔

”ان حالات میں بنی اور موجود کا وہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ اگر میرا اندازہ ٹھیک نکلا اور اس سب کے پیچھے میڈم ایکس کا ہی ہاتھ ہوا تو ان دونوں کی خیریت خطرے میں پڑ جائے گی۔ عرفان اللہ ان کے بارے میں پھوٹ دے گا

ہدایت کے برخلاف مجھے میٹنگ کے دوران ڈسٹرب کرنے پر مجبور ہو گیا۔

”مجبور آپن بھی تھا عرفان اللہ! ورنہ ایسا فارغ آپن بھی نہیں کہ ایویں ہیلو ہائے کرنے کو کسی کو کال ملا کر بیٹھ جائے۔“ اصغر نے اس کی خفگی کو خاطر میں لائے بغیر درستی سے جواب دیا۔

”کیا مسئلہ ہے، بول دو تاکہ میں بھی آگے سے اپنا کام نمٹا سکوں۔“ عرفان اللہ کے لہجے میں محسوس کی جانے والی بیزاری تھی۔

”بہنی اور موجود کہاں ہیں؟“ اصغر کو اس کے لہجے نے مزید طیش میں مبتلا کیا۔

”کیوں..... کیا وہ ابھی تک تمہارے پاس واپس نہیں پہنچے؟“ اس کے سوال کے جواب میں عرفان اللہ کے لبوں پر بھی سوال ہی تھا۔

”کیا مطلب، میرے پاس واپس نہیں پہنچے؟ انہیں میرے پاس کیوں واپس آنا تھا؟“ اصغر نے چونک کر پوچھا۔

”میں ان کی طرف سے زیادہ مطمئن نہیں تھا۔ آج ہی میں نے اپنے لیے باڈی گارڈز کی نئی پروڈیکشن ٹیم ہار کی تو انہیں فارغ کر دیا۔ وہ میرے پاس سے اپنا حساب لے کر نکلے تھے۔ تمہیں معلوم ہے کہ ایسے لونڈوں کی جیب بھری ہو تو ہواؤں میں اڑنے لگتے ہیں۔ رک گئے ہوں گے کہیں موج مستی کرنے۔ تھوڑا انتظار کر لو۔ جیب خالی ہوگی تو خود پہنچ جائیں گے تمہارے پاس۔“ عرفان اللہ نے اپنی کہہ کر اس کے جواب کا انتظار نہیں کیا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

”وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ بہنی اور موجود کے ساتھ ضرور کچھ بڑا ہو چکا ہے۔“ اصغر کی طرح لالہ کو بھی اس کہانی پر یقین نہیں تھا۔ غصے اور صدمے سے اس کی آنکھوں کی لالی میں اضافہ ہو گیا تھا۔

”اگر ہمارے آدمیوں کے ساتھ بڑا ہوا ہے تو اچھا عرفان اللہ کے ساتھ بھی نہیں ہوگا۔“ اصغر جذباتی ہو رہا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ جو بڑا کھیل شروع ہو چکا ہے، اس میں بہنی اور موجود جیسے چھوٹے کھلاڑیوں کو آؤٹ کر دینے کا کوئی حساب کتاب نہیں رکھا جاتا۔

☆☆☆

برف میں نو عدد ڈنڈے گاڑ کر ان کے ساتھ قیدیوں کو باندھا گیا تھا۔ بندھے ہوئے افراد میں ہاڈل بھی شامل تھا اور پرجس لگا ہوں سے آس پاس دیکھ رہا تھا۔ یقیناً اس کو یہ جاننے کی بے چینی تھی کہ اس سب کا کیا مقصد ہے لیکن وہاں

کہ ان کا تعلق ہم۔ یہ ہے۔“ لالہ تشویش کا شکار ہوا۔

”واپس بلوالے ان دونوں کو وہاں سے۔“

”میرا ان سے رابطہ نہیں ہو رہا لالہ! میں پہلے ہی کئی بار کوشش کر چکا ہوں لیکن ان کی طرف سے خاموشی ہے۔“

اصغر نے سہمے چہرے کے ساتھ اطلاع دی۔ لالہ کے تجزیے کے بعد بہنی اور موجود سے رابطہ نہ ہو سکنے کی پریشانی اچانک ہی کئی گنا زیادہ ہو گئی تھی۔

”ایک بار پھر کوشش کر کے دیکھ۔ اگر پھر بھی بات نہ بنے تو ڈائریکٹ عرفان اللہ سے بات کر کے ان کا پوچھ۔“

لالہ نے اسے حکم دیا۔ اصغر حکم کی تعمیل میں مصروف ہو گیا لیکن نتیجہ پہلے والا ہی تھا۔ ناچار اسے عرفان اللہ کو کال ملانا پڑی۔ یہ سیدھی سادی موبائل کے ذریعے کی جانے والی کال نہیں تھی۔ جب سے میڈم ایکس سے کھل کر کھراؤ ہوا تھا، اس سلسلے میں احتیاط کی جانے لگی تھی۔ انہوں نے اپنے ساتھ ایک ایکسپرٹ بٹھالیا تھا جو کمپیوٹر کے ذریعے ایسے کال ملا کر دیتا تھا کہ کال کی صحیح لوکیشن ٹریس نہیں ہو پاتی تھی۔ بہنی اور موجود سے بھی اسی پیچیدہ طریقہ کار کے مطابق رابطہ رہتا تھا۔ خود انہیں بات کرنا ہوتی تھی تو ای میل بھیجتے تھے پھر یہاں سے انہیں کال کی جاتی تھی۔

”اصغر بات کر رہا ہوں۔ عرفان اللہ سے بات کرواؤ۔“ رابطہ مل گیا تو اس نے کال ریسیو کرنے والے کو سخت لہجے میں حکم دیا۔

”سوری سر! وہ اس وقت اہم میٹنگ میں ہیں اور کسی سے بات نہیں کر سکتے۔“ دوسری طرف سے مصنوعی اخلاق کے ساتھ معذرت کی گئی۔

”بات کرواؤ میری ورنہ کسی سے بات کرنا تو دور کی بات، وہ سانس بھی نہیں لے سکے گا۔“ اصغر حلق کے بل غرایا۔

”یہ..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سر؟“ وہ شخص بوکھلا گیا۔

”صرف کہہ نہیں رہا، عمل بھی کر گزروں گا۔ بہتر ہے تو میری اپنے پاس سے بات کرادے۔“ اصغر کا پارہ اس وقت چڑھا ہوا تھا۔

”میں..... میں کوشش کرتا ہوں۔“ اس نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا پھر یوں محسوس ہونے لگا کہ وہ مائیک پر ہاتھ رکھے کسی سے دبے دبے لہجے میں بات کر رہا ہے۔ چند ثانیے کے وقفے سے ہی عرفان اللہ کی ہیلو اس کے کان میں گونجی اور وہ خفا سے بچے میں بولا۔

”میں بہت اہمورث میٹنگ میں تھا لیکن تم نے میرے سیکریٹری کو اس قدر ہراساں کر دیا کہ وہ میری

موجود ہر فرد ان کی طرف سے بے نیاز اپنے اپنے کام میں مصروف تھا۔ آہستہ آہستہ وہاں لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ آنے والے ان نو افراد کے سامنے خاصے فاصلے سے آکر کھڑے ہو رہے تھے اور ان کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ کوئی تماشا دیکھنے کے منتظر ہیں۔ باڈل نے ان تماشاچیوں میں معاذ اور اس کے کچھ ساتھیوں کو بھی دیکھا۔ ایک بار اس کی معاذ سے نظریں بھی ملیں اور اس موقع پر معاذ اس انداز میں مسکرایا کہ اس نے اپنے اندر خطرے کی گھنٹی بجتی محسوس کی لیکن وہ بھی ڈھٹائی اور ہٹ دھرمی میں پہلے نمبر پر تھا اس لیے اپنے اندر کی کیفیات کو چہرے پر نہیں آنے دیا اور خود بھی جواباً دانت کھونسنے لگا۔ معاذ نے سر جھٹک کر اسے نظر انداز کیا اور اس سمت دیکھنے لگا جہاں سے ڈھول بجنے کی آواز آرہی تھی۔ باڈل بھی اسی سمت متوجہ ہو گیا۔

وہاں چھوٹے قد کا ایک بھکشو گلے میں ڈھول لٹکائے اسے انگلیوں سے بجا رہا تھا۔ بلند آہنگ میں بجتے ڈھول کی آواز میں ایک وحشت سی تھی لیکن بجانے والے کا چہرہ بالکل ساٹھا تھا۔ ایسا ہی ساٹھا پن اس کے پیچھے چلتے افراد کے چہروں پر بھی تھا۔ وہ کل تین افراد تھے اور ان کے چہرے کسی کے لیے انجان نہیں تھے۔ اجنبیت تھی تو ان کے حلیوں میں۔ درمیان میں چلتے یوان منگ نے سنہری کنارے سے مزین سیاہ لمبا لبادہ پہن رکھا تھا۔ اس کے سر پر رکھی گول ٹوپی بھی سنہری کنارے کے ساتھ سیاہ رنگت کی تھی جبکہ اس کے دائیں بائیں چلتے زانگ تاؤ اور خیمین یاہی نے بھی یوان کی طرز کا ہی لمبا لبادہ اور ٹوپیاں پہن رکھی تھیں۔ فرق صرف رنگت میں تھا۔ ان کے لبادوں کی رنگت زرد لیکن کنارے سنہری ہی تھے۔ وہ تینوں نئی ہوئی گردنوں اور سیدھے ہوئے شانوں کے ساتھ بہت باوقار انداز میں چلتے اس طرف آرہے تھے۔ درمیانی فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ بندھے ہوئے قیدیوں کے صحن سامنے آئے اور نظروں ہی نظروں میں انہیں تولنے لگے۔ اس کارروائی کے دوران ڈھول والا ایک جانب کھڑا ڈھول بجاتا رہا۔ آخر زانگ نے ہاتھ اٹھا کر اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ ڈھول بجنے کا شور بند ہوا تو درمیان میں کھڑے یوان منگ نے تمام قیدیوں کے چہروں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور صاف آواز میں بولنا شروع کیا۔

”تم لوگ جانتے ہو کہ تمہارا جرم کیا ہے۔ تم لوگوں نے رات کی تاریکی میں ہم پر شب خون مارا ہے اور اس حملے میں ان افراد کو ہلاک اور زخمی کیا ہے جن میں سے کسی نے تمہارا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ اپنے ان بے قصور ساتھیوں کا بدلہ

لینے کے لیے ہم تمہیں سزائے موت سناتے ہیں۔“ قطعیت سے سنائے گئے اس فیصلے پر بحث کرنے یا اس کے خلاف دلائل دینے کے لیے وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔ یوان منگ اپنا فیصلہ سنا کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے باقی دونوں ساتھیوں نے بھی اس کی پیروی کی۔ ان کے وہاں سے ہٹتے ہی ہاتھوں میں گٹھیاں اٹھائے نو افراد قطار میں مارچ کرتے ہوئے وہاں آئے اور ایک ایک قیدی کے سامنے گن تان کر کھڑے ہو گئے۔ یہ پہلا موقع تھا جب باڈل کے چہرے پر بے چینی دکھائی دی اور اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن اس کی آواز ایک بار پھر بجنے والے ڈھول کی تیز آواز میں دب کر رہ گئی۔ اس بار ڈھول کی آواز پہلے سے اور بھی زیادہ تیز تھی اور اس میں صاف موت کا نغمہ گونجتا سنائی دے رہا تھا۔ زانگ کے اشارے پر ایک بار پھر ڈھولچی کے ہاتھ ساکت ہوئے اور موت کے سکوت کے درمیان نو گنوں کے سینٹی کیچ بٹائے جانے کی آوازیں صاف سنائی دیں۔ موت کے خوف سے سفید پڑ چکے قیدیوں کی ویران آنکھوں نے یوان منگ کا ہاتھ بلند ہوتے اور اس کے ہاتھ میں موجود گن سے شعلہ نکلنے دیکھا۔ قائر کی آواز کے ساتھ ہی گن برداروں کی انگلیوں نے حرکت کی اور فضا بیک وقت کئی دھماکوں سے گونج اٹھی۔ ان دھماکوں کے ساتھ ہی سفید برف پر جگہ جگہ سرخ دھبے پھیل گئے اور مضبوط ڈنڈوں کے ساتھ بندھے قیدیوں کی گردنیں ڈھلک گئیں۔

ڈھلکی گردنوں والی ان لاشوں کی قطار میں نو اسی قیدی آنکھیں پھاڑے ساکت کھڑا تھا اور یک ایک اس گن بردار کو دیکھ رہا تھا جس کی گن سے اس کے نام کی گولی نہیں نکلی تھی۔ گن بردار اس کی حیرت سے بے نیاز اپنی گن سمیت دائیں جانب گھوما اور جس طرح وہ سب ایک قطار میں مارچ کرتے ہوئے وہاں آئے تھے، اسی طرح واپس بھی چلے گئے۔ تماشا ختم ہوتے ہی ہر فرد وہاں سے رخصت ہونے لگا اور صرف تین لوگ رک کر لاشوں کو کھولنے اور گھسیٹ کر وہاں سے لے جانے میں مصروف ہو گئے۔ ان تینوں کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیتے باڈل نے اپنے قریب قدموں کی چاپ سنی تو احساس ہوا کہ ایک چوتھا فرد بھی وہاں موجود ہے۔ اس نے گردن گھما کر آواز کی سمت دیکھا تو معاذ کو اپنی نظروں کے سامنے پایا۔

”شاید تمہیں لگتا ہو کہ تمہاری کسی اہمیت کی وجہ سے تمہاری موت کا فیصلہ روک دیا گیا ہے لیکن یقین جانو، ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔ تمہاری موت کو صرف اور صرف میری

خواہش پر مؤخر کیا گیا ہے۔“ ایک ایک لفظ کو چیا کر بولتے معاذ کا لہجہ اسے اس کیفیت سے باہر لے آیا جو یقینی موت کو سامنے دیکھ کر اس پر یکدم طاری ہو گئی تھی۔

”تمہاری اس مہربانی کے پیچھے یقیناً کوئی خاص وجہ ہوگی۔“ ایک ایک لفظ پر زور دیتے اس نے معاذ کے چہرے کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کی۔

”وجہ پاکستان میں تمہاری داشتہ کے اپارٹمنٹ میں بیٹھی ہے۔ میں اس مظلوم لڑکی کے لیے کچھ نہیں کر سکا لیکن شاید تمہیں اپنے ہاتھ سے موت کے گھاٹ اتار کر اس کے دل کو تھوڑا سا سکون مل جائے۔“

”بشریٰ گلزار.....!“ معاذ کے جذباتی الفاظ سن کر وہ طنز سے بولا اور ایک استہزائیہ قہقہہ لگایا۔ معاذ نے غصے سے اس کے منہ پر ایک گھونسا جڑ دیا لیکن باذل کی خباثت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی اور سرگوشیاں لہجے میں بولا۔

”بہت بھیا تک شکل ہو گئی ہے سالی کی۔ ساتھ لولی لنگڑی بھی ہو گئی ہے۔ مجھ جیسا عورت کا رسیا بھی اس کی طرف دیکھ کر تھوکتا پسند نہیں کرتا۔ تم کل کے لونڈے کہاں عشق نبھاتے پھر رہے ہو۔ چھوڑو، نہ لو اس کی خاطر مجھے زندہ رکھنے کا رسک۔ یہ نہ ہو کہ کل کو پچھتا نا پڑے۔“ کوئی اور ہوتا تو جان بچ جانے پر شکر کا کلمہ پڑھتا لیکن وہ باذل تھا، الٹی کھوپڑی کا۔ معاذ کو اس کے فیصلے پر اشتعال دلانے لگا۔ ”تو سمجھ لے کہ مجھے بد صورتی سے عشق ہو گیا ہے اور

میں اپنے ارد گرد کی ہر شے کو بد صورت دیکھنا چاہتا ہوں۔ تجھے بھی.....“ اپنا جملہ مکمل کرتے ہی معاذ نے پے درپے اس کے منہ پر نئے برسنا شروع کر دیے۔ بندھا ہوا ہونے کے باعث باذل مزاحمت کے لائق نہیں تھا اور معاذ کے مسلسل ٹکوں نے چند لمحوں میں ہی اس کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کے ناک اور منہ سے خون بہنے لگا تھا اور دائیں آنکھ بھی سو جنا شروع ہو گئی تھی۔

لاشوں کو ٹھکانے لگانے والوں نے یہ منظر دیکھا ضرور لیکن کوئی مداخلت نہیں کی۔ غصے میں بھرے معاذ نے صرف اس پر نئے برسائے پر اکتفا نہیں کیا اور برف میں سے ایک ڈنڈا اکھاڑ کر پوری قوت سے باذل کی ٹانگ پر مارا۔ انسانی بوجھ کو سہار لینے والے شہیر نما بھاری ڈنڈے کی ضرب نے یقیناً ٹانگ کی ہڈی چٹا کر رکھ دی تھی جب ہی باذل کے حلق سے ایک چیخ برآمد ہوئی۔ اس چیخ کے ساتھ ہی وقاص بھاگتا ہوا وہاں پہنچ گیا اور معاذ کے ہاتھ سے ڈنڈا چھیننے کی کوشش کی۔

”چھوڑ دو مجھے۔ آج میں اس خبیث کی ساری ہڈیاں

توڑ دوں گا تاکہ اسے پتا چل سکے کہ زندگی صرف دوسروں کی اذیت سے لطف کشید کرنے کا نام نہیں ہے۔ ایک وقت آتا ہے کہ یہ زندگی ظالم سے بھی حساب لیتی ہے۔“ وہ اتنا جذباتی ہو رہا تھا کہ وقاص (وکی) کے روکنے پر بھی قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ دور سے دیکھتے جا رو کو جب اندازہ ہو گیا کہ اسے سنبھالنا اکیلے وکی کے بس کی بات نہیں ہے تو خود بھی وہاں چلا آیا۔ دونوں نے مل کر کسی نہ کسی طرح اسے قابو کیا اور وہاں سے دور لے گئے۔ اس موقع پر باذل نے عقل مندی سے کام لیا اور اس کو مزید اشتعال دلانے کی کوشش نہیں کی۔

”غصے میں آ جانا کوئی غیر فطری فعل نہیں لیکن کامیاب انسان وہ ہوتا ہے جو کسی کے اکسانے کے بجائے اپنی مرضی سے جذبات کا اظہار کرے۔ ہمارا غم، غصہ، محبت اور نفرت..... سب ہمارے کنٹرول میں ہونا چاہیے۔“ وہ وکی اور جا رو کے سمجھانے بجھانے پر ٹھنڈا ہو کر سب کے درمیان پہنچا تو یوان منگ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے شفقت سے کہا۔ معاذ نے سن کر شرمندہ سے انداز میں سر جھکا لیا۔

”میں تمہیں شرمندہ نہیں کرنا چاہتا لڑکے۔ مجھے تم پسند ہو اور میں چاہتا ہوں کہ تم آنے والے وقت میں دیے ہی ثابت ہو جیسا میرا تمہارے متعلق گمان ہے۔“ یوان منگ نے اس کی شرمندگی دور کرنے کی کوشش کی پھر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔

”یہاں سے ہمارے راستے وقتی طور پر جدا ہو رہے ہیں لیکن امید ہے کہ ہم جلد دوبارہ ملیں گے۔“

”اس کا بہت خیال رکھنا یوان..... اسے کچھ ہو گیا تو میں خود کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گا۔“ اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے معاذ نے دھیمی سی سرگوشی میں اس سے التجا کی۔

”بے فکر رہو۔ قدرت کے فیصلے کے علاوہ ایسی کوئی شے نہیں ہوگی جو اس کے علاج کی راہ میں رکاوٹ بن سکے۔“ یوان منگ سمجھ گیا تھا کہ وہ کس کی بات کر رہا ہے اس لیے مضبوط لہجے میں اسے تسلی دی۔ اس گفتگو کے بعد الوداعی مرحلہ شروع ہو گیا۔ سونیا، سبیل، عالم شاہ اور سرمد بیچنگ کے لیے روانہ ہونے والے قافلے کے ساتھ جا رہے تھے۔ عالم شاہ ساتھیوں کو چھوڑ کر جانے پر اداس تھا لیکن جانا مجبوری تھی۔ سبیل پچھلے کئی روز کی طرح آج بھی غنودگی میں تھی اور اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ حیرت انگیز طور پر سونیا نے بھی کوئی رد عمل نہیں دیا تھا۔ وہ بالکل چپ ہو کر رہ گئی تھی اور خاموشی سے خود کو دی جانے والی ہدایات پر عمل کرتی تھی۔ اس وقت بھی وہ بالکل خاموشی سے روانہ

ہو گئی تھی۔ اس کی خاموشی معاذ کو چھٹی تھی لیکن وہ اس سے کچھ نہیں کہہ سکا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہنے کے لیے کچھ ہے ہی نہیں۔

☆☆☆

برف پر چلتے چلتے ٹانگیں شل ہو گئی تھیں اور گرم لباس کے باوجود سردی مزاج پوچھ رہی تھی۔ ہوش و حواس میں اس دشوار گزار راستے پر سفر کرتے ہوئے انہیں احساس ہو رہا تھا کہ بے ہوشی کی حالت میں انہیں یہاں سے لے جانے والوں نے کمال کیا تھا۔ ویسے کمال کے ان بندوں کی حالت اب بھی بالکل نارمل تھی اور وہ یوں ان راستوں سے گزرتے چلے جا رہے تھے جیسے وہ شہروں میں واکنگ ٹریک پر چلتے تھے۔

”مجھے تو لگتا ہے ان برقی علاقوں میں رہتے رہتے ان کے اندر کسی برقی آدمی یا برقی چیتے کی روح حلول کر گئی ہے جو انہیں کوئی تکلیف ہی محسوس نہیں ہوتی اور بندروں کی طرح اچھلتے کودتے مشکل ترین مقام سے بھی آسانی سے گزر جاتے ہیں۔“ ایک چڑھائی طے کرنے کے بعد وہی نے ناراض سے لہجے میں چینی بھکشوؤں کے متعلق تبصرہ کیا۔ ویسے اس وقت وہ بھکشوؤں والے مخصوص چلے میں نہیں تھے اور برقی پس منظر سے ہم آہنگ ہونے کے لیے انہی جیسے لباس پہنے ہوئے تھے۔

”لگتا ہے بلندی تمہارے دماغ پر اثر انداز ہو رہی ہے جو تم ایک ہی وقت میں انہیں جیتا اور بندر ڈکلیئر کر رہے ہو۔ اللہ کے بندے، دونوں چیزوں میں زمین آسمان کا فرق ہے اور تم دونوں کو آپس میں ملا کر برقی چیتے جیسے شاندار جانور کی بے عزتی نہیں کر سکتے۔“ کشمیر کے پروردہ جارو کی حالت ان کے مقابلے میں بہت بہتر تھی اس لیے اس میں ہمت تھی کہ ان حالات میں بھی مزاح کر سکے۔

”اس میں بے عزتی کی کیا بات ہے۔ ہیں تو دونوں ہی جانور اور جانوروں کو عزت بے عزتی سے کوئی مطلب نہیں ہوتا۔“ وہی اس کے اعتراض کو خاطر میں نہیں لایا۔

”جانوروں کو مطلب ہونا ہو، مجھے مطلب ہے اور میں تمہیں ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا کہ ایک نایاب اور قیمتی جانور کو بندر جیسی مخلوق کے ساتھ ملاؤ۔“ جارو پوری سنجیدگی سے اس بحث کو جاری رکھنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اصل میں مسلسل سفیدی دیکھتے دیکھتے طبیعت بیزار ہو گئی تھی اور انہیں اپنا دھیان بٹانے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

”میں بھی اس بات کو برداشت نہیں کر سکتا کہ تم بندر جیسے بے ضرر اور تفریح فراہم کرنے والے جانور کو چیتے جیسے خونخوار دہشت پھیلانے والے جانور سے کمتر تصور کرو۔“

وہی نے پوری سنجیدگی سے بندر کے حق میں دلیل دی اور پھر معاذ کو اپنے حق میں بولنے کے لیے راضی کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

”کیوں معاذ بھائی! آپ کیا کہتے ہیں؟ آپ کے خیال میں ایک بے ضرر اور لوگوں میں خوشیاں بانٹنے والا انسان بہتر ہے یا فرعون فطرت دوسروں کے حقوق غصب کرنے والا انسان؟“

”لیکن یہاں انسانوں کی تو بات ہو ہی نہیں رہی تھی۔“ معاذ نے بوکھلا کر اعتراض کیا۔

”انسان اور جانور سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دونوں ہی جاندار ہیں اور ہمیں کسی بھی جاندار کے رویے پر بات کرنی چاہیے۔“ وہی کی سنجیدگی کو دیکھتے ہوئے حتیٰ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ وہ مذاق کر بھی رہا تھا یا نہیں۔ معاذ نے اپنی مسکراہٹ دبا کر جارو کی طرف دیکھا کہ اب اس کی طرف سے کیا دلیل آئی ہے لیکن وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ وہ رک گیا تھا اور ایک جگہ نظریں مرکوز کیے بالکل ساکت کھڑا تھا۔

معاذ نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کچھ بولنے کے لیے منہ کھولتے وہی کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور خود گردن گھما کر ارد گرد دیکھنے لگا مگر آس پاس کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔

☆☆☆

”اس حرکت کے بعد عرفان اللہ نے اپنے لیے رعایت کی ہر گنجائش ختم کر لی ہے۔“ اصغر کی زخمی درندے کی طرح کمرے میں ادھر ادھر ٹپل رہا تھا۔ عم و غصے کی زیادتی کے باعث اس کی آنکھوں کے ساتھ ساتھ چہرے پر بھی سرخی تھی۔ اس کی اس کیفیت کی وجہ بنی اور موجودگی طے والی تشدد شدہ لاشیں تھیں۔ ان دونوں کو مرنے سے پہلے اتنی اذیت دی گئی تھی کہ ان کے چہرے نیلے پڑ گئے تھے۔ دونوں کی کلائیوں اور پسلیوں سمیت جسم کی متعدد ہڈیاں ٹوٹی ہوئی تھیں اور کئی اگلیوں کے ناخن غائب تھے۔ لاوارث طے والی ان کی لاشوں کی جو پوسٹ مارٹم رپورٹ انہوں نے حاصل کی تھی، اس میں درج موت کا امکانی وقت صاف بتا رہا تھا کہ عرفان اللہ نے اس کے ساتھ دروغ گوئی سے کام لیا تھا۔ اس نے اصغر کو بتایا تھا کہ بنی اور موجودگی اس نے ان کا حساب دے کر فارغ کر دیا ہے اور اب وہ اس کے پاس نہیں ہیں لیکن وہ یقیناً وہیں تھے اور عرفان اللہ کے ارد گرد پائے جانے والے میڈم ایکس کے آدمی ان سے معلومات کے حصول کے لیے انہیں بدترین تشدد کا نشانہ بناتے رہے تھے۔

”میں اپنے آدمیوں کو کال دے رہا ہوں۔ عرفان اللہ کی اب اس زمین کے اوپر جگہ ختم ہو گئی ہے۔ اس..... کو اپنے اعمال کا حساب دینے اور پر جانا ہوگا۔“ ٹپٹے ٹپٹے اصغر رکا اور عرفان اللہ کو گالی سے نوازتے، صوفے پر براجمان لالہ کو اپنا فیصلہ سنایا۔

”جذبائی پن چھوڑ اور آنکھیں کھول کر حقیقت کو دیکھ۔ عرفان اللہ اب چند دن پہلے والا وہ عام بزنس مین اور سیاست دان نہیں رہا ہے جس کے پاس معمولی سیکورٹی تھی اور جسے تھوڑی سی کوشش سے ٹارگٹ کلنگ کا شکار کیا جاسکتا تھا۔ میڈم ایکس کے آشیر باد کے بعد اب وہ ہواؤں میں اڑ رہا ہے اور اتنی بلندی پر پہنچ چکا ہے کہ فی الحال ہم اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے۔“

”ایسی بھی کیا توپ چیز بن گیا ہے وہ؟“ اصغر سے لالہ کی بات ہضم نہ ہو سکی اور حیرت سے دریافت کیا۔ ”کل ہی اس نے ایک پریس کانفرنس میں یہ اعلان کیا ہے کہ اس کے رفاہی و فلاحی کام ملک دشمن عناصر سے برداشت نہیں ہو رہے ہیں اور چونکہ انہیں اندازہ ہو گیا ہے کہ عوام کی فلاح و بہبود کے لیے اٹھ کھڑے ہونے والے شخص کے لیے عوام کے دل میں عزت اور پیار پیدا ہو رہا ہے اس لیے اسے دھمکیاں دی جا رہی ہیں اور مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنے قدم پیچھے ہٹا لے اور وہ سب نہ کرے جو کر رہا ہے ورنہ اس کی جان لے لی جائے گی۔“

”مطلب اس نے حکومت سے اپنے لیے سیکورٹی مانگ لی ہے۔“ اصغر ایک تجربہ کار شخص تھا جس نے لالہ کی سنگت میں بے شمار تماشے دیکھ رکھے تھے اس لیے اندازہ لگانے میں غلطی نہیں کی۔

”بالکل مانگ لی ہے اور حکومت سے بھی پہلے ایک مشہور بزنس ٹائیکون اپنی بزنس کیونٹی سے اظہار یکجہتی کے لیے میدان میں کود پڑا ہے۔ اس نے عرفان اللہ کے لیے خصوصاً ایک بلٹ پروف گاڑی بھجوانے کا اعلان کیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ گاڑی اب تک عرفان اللہ تک پہنچ بھی چکی ہوگی۔“ لالہ نے اس کے خیال کی تصدیق کرنے کے ساتھ مزید معلومات فراہم کیں۔

”یقیناً یہ وہی..... ہوگا جو خود سب سے بڑا لینڈ مافیا اور اسمگلر ہے لیکن عوام میں اپنے نیکو کار ہونے کا پرچار کرتا پھرتا ہے۔“ اصغر نے ایک اور درست اندازہ لگایا۔ اس وقت چونکہ وہ شدید غصے میں تھا اس لیے لالہ کی موجودگی کے باوجود ہرجملے میں گالی ٹانکنے والی عادت پر قابو نہیں رکھ پا رہا تھا۔

”بالکل وہی ہے اور اس کے اس کھیل میں شامل ہونے کے بعد مجھے کوئی شک نہیں رہا ہے کہ عرفان اللہ کو مہرہ بنا کر کوئی نیا کھیل کھیلنے کی تیاری کی جا رہی ہے۔“ ”کیسا کھیل؟“

”یہ تو معلوم کرنا پڑے گا۔ تم میری اس صحافی سے بات کرو اور جسے میں نے میڈم ایکس اور عرفان اللہ کی ملاقات کی ٹپ دی تھی۔“ لالہ نے اس سے فرمائش کی تو اس بار اصغر نے بغیر کسی بحث و مباحثے کے کال ملا کر اسے فون پکڑا دیا۔

”طاہر بیگ اسپیکنگ۔“ دو تین گھنٹوں کے بعد کال وصول کر لی گئی اور دوسری طرف سے ایک سنجیدہ آواز سنائی دی۔ ”میں وہ ہوں جس نے پریس کلب کیفے ٹیریا میں تمہیں ویٹر کے ذریعے ایک اہم ٹپ دی تھی۔“ لالہ نے اس سے اپنا تعارف کروایا تو وہ چونک گیا۔

”اوہ..... آپ! آپ نے اپنا کوئی نام پتا نہیں چھوڑا تھا ورنہ میں آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے رابطہ ضرور کرتا۔“ ”رابطہ میں نے خود کر لیا ہے لیکن شکریہ وصول کرنے کے لیے نہیں، میں تم سے چند اہم باتیں کرنا چاہتا ہوں لیکن ان باتوں کے لیے فون مناسب ذریعہ نہیں۔ تم مجھ سے کہیں ملاقات کرو۔“ لالہ فوراً اپنے مدعے پر آ گیا۔ ”آپ جگہ اور وقت بتادیں، میں پہنچ جاؤں گا۔“ اس نے بلا تردد ملاقات کی ہامی بھر لی۔

”ایک گھنٹے بعد اپنے دفتر کے قریب کوئٹہ سمندری ہوٹل پر ملو۔“ لالہ کی ایما پر اصغر اسے طاہر بیگ کے بارے میں ساری اہم معلومات حاصل کر کے دے چکا تھا اس لیے وقت اور جگہ کا تعین کرنے میں اسے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔

”ٹھیک ہے، میں پہنچ جاؤں گا۔“ طاہر بیگ اندازہ لگا سکتا تھا کہ جس شخص کو اس کا فون نمبر معلوم ہے، اس کے لیے دفتر کا پتا لگانا کیا مشکل ہو سکتا ہے اس لیے اس سلسلے میں کسی حیرت کا اظہار کیے بغیر ہامی بھر لی۔

”کیا آپ اس آدمی پر بھروسہ کر سکتے ہیں؟“ لالہ نے سلسلہ منقطع کرنے کے بعد فون اصغر کی طرف بڑھایا تو وہ اسے تھامتے ہوئے مضطرب سا پوچھنے لگا۔

”تم نے خود اس شخص کے بارے میں ساری معلومات جمع کی ہیں اور تم ہی مجھ سے پوچھ رہے ہو کہ میں اس پر بھروسہ کر سکتا ہوں یا نہیں۔“

”رپورٹ تو اچھی ہے اس کے بارے میں لیکن پھر بھی کسی کا کیا بھروسہ۔ یہاں بڑے بڑے ناموں کو ایک لفافے

پر جکتے دیکھا ہے میں نے۔“ اصغر مطمئن نہیں ہو پا رہا تھا۔
 ”میں کوئی بچہ تو نہیں ہوں جو آدمی کی پہچان نہ کر سکوں۔ اگر پھر بھی تیرا دل مطمئن نہیں ہے تو اپنے ایک دو لونڈے حفاظت کے لیے بھیج دینا۔“ لالہ نے چڑنے کے باوجود محل کا مظاہرہ کیا۔

”میں ایسا ہی کروں گا۔“ اصغر نے اس کی ناراضی کی پروا کیے بغیر اپنے عزم کا اظہار کیا۔ اصل میں پچھلے دنوں وہ اتنا نقصان اٹھا چکے تھے کہ اب وہ کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھا۔

”اپنے ان لونڈوں کو میرا حلیہ بتا دینا لیکن یہ نہ بتانا کہ کس کی حفاظت کرتا ہے۔“ لالہ نے بڑی محنت سے اپنی شخصیت کو تبدیل کیا تھا اس لیے نہیں چاہتا تھا کہ کوئی بھی اسے لالہ عیسیٰ کی حیثیت سے اس حلیے میں جان سکے۔

”اپن سمجھتا ہے لالہ! آپ بے فکر ہو کر جاؤ۔ کسی کو بھنک بھی نہیں پڑے گی آپ کے بارے میں۔“ اصغر نے اسے تسلی دی۔ کچھ دیر میں لالہ، طاہر بیگ سے ملاقات کے لیے روانہ ہو گیا۔

کوئٹہ سمندری ہوٹل، اخبار کے اس دفتر کے قریب جہاں طاہر بیگ ملازمت کرتا تھا، ایک عوامی ہوٹل تھا جہاں سارا وقت دیکچے میں چائے ابلتی رہتی، تو بے پرکھی میں ترتر پراٹھے تلے جاتے، رکابیوں میں نہاری، دال گوشت اور انڈے چھولے کا سالن گردش کرتے اور تندور سے گرم گرم نان کچے نکتے رہتے۔ یہ بھی وہاں کام کرنے والوں کی ایک خصوصی مہارت تھی کہ فل والیوم میں چلتے گانوں کے باوجود ہر گاہک کا آرڈر سن کر آگے پہنچاتے اور پھر بغیر کسی غلطی کے وہ آرڈر گاہک کی میز پر بھی پہنچ جاتا۔ لالہ کھانے پینے کی اشیا اور سگریٹ کے دھوئیں کی ملی جلی خوشبوؤں سے بو بھل فضا میں اطمینان سے چلتا ایک خالی میز پر آ بیٹھا۔ ابھی ایک گھنٹا پورا ہونے میں کچھ وقت باقی تھا اور طاہر بیگ وہاں نہیں پہنچا تھا۔ لالہ اپنی جگہ پر بیٹھا اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ تین بجنے والے تھے۔ ہوٹل پر دو پہر کا کھانا کھانے والوں کا زور ٹوٹ چکا تھا لیکن اب بھی کچھ لوگ کھانا کھا رہے تھے، کچھ چائے کی چسکیوں کے ساتھ ساتھ سگریٹ کے کش بھی لگانے میں مصروف تھے۔ لالہ کی نظروں نے دائیں اور بائیں جانب کی دو میزوں پر ان دو افراد کو تاڑ لیا جو بظاہر تو چائے پینے میں مصروف تھے لیکن ان کی نظریں مشاقی سے ارد گرد کے لوگوں کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔ لالہ کو کوئی شک نہیں تھا کہ وہ اصغر کے بجوائے ہوئے بندے ہیں جو پوری

ہوشیاری سے اس کی حفاظت کر رہے ہیں اور کسی غیر معمولی صورت حال میں حرکت میں آنے کے لیے پوری طرح تیار ہیں۔

”ہیلو مسٹر ایکس وائے زی!“ وہ ان دونوں افراد کی طرف متوجہ تھا کہ کوئی اس کی میز کے قریب آ کھڑا ہوا اور خوش دلی سے اسے پکارا۔ لالہ نے نظروں کا رخ پھیر کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ طاہر بیگ ہی تھا اور ٹھیک تین بجے وہاں پہنچا تھا۔

”ہیلو مسٹر بیگ! آپ کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔“ اس نے باقاعدہ کھڑے ہو کر طاہر بیگ کا استقبال کیا اور گرجوٹی سے اس سے ہاتھ ملایا۔ طاہر بیگ کے بارے میں جو معلومات حاصل ہوئی تھیں، ان کے مطابق یہ شخص ان چند گنے چنے لوگوں میں سے ایک تھا جنہیں اپنے پیٹھے سے عشق ہوتا ہے اور ان کی ایمانداری انہیں کسی کے ہاتھ کا کھلونا نہیں بننے دیتی۔ اس کے بارے میں یہ معلومات حاصل ہونے پر لالہ کو خوشی ہوئی تھی کہ اس نے بندے کو پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کی تھی اور ایک ایسے شخص کا انتخاب کیا تھا جو کسی لالچ کے بغیر بھی درست سمت میں کام کرنے کی اہلیت رکھتا تھا۔

”آپ کو میرا زیادہ دیر انتظار تو نہیں کرنا پڑا۔“ طاہر نے لالہ کے مقابل کرسی سنبھالتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔

”بالکل بھی نہیں۔ تم بالکل ٹھیک وقت پر پہنچے ہو۔“ لالہ نے اسے جواب دیا اور آرڈر کے لیے سر پر آ کھڑے ہونے والے ہوٹل کے چھوٹے پراچیتی ہوئی نگاہ ڈال کر طاہر کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ہوٹل کا چھوٹا پہلے بھی آرڈر لینے اس طرف آیا تھا لیکن لالہ نے اسے دور سے ہی روک دیا تھا اور اشارہ کیا تھا کہ کچھ دیر بعد آنا۔ ایسی جگہوں پر ملازمت کرنے والے اپنی کم عمری کے باوجود بھی ہوشیار ہوتے ہیں۔ اس لڑکے نے بھی سمجھ لیا تھا کہ لالہ کو کسی کا انتظار ہے چنانچہ طاہر کی آمد کے ساتھ ہی حاضر ہو گیا تھا۔

”میرے لیے دال گوشت اور دو نان لے آؤ۔“ طاہر نے چھوٹے کو براہ راست مخاطب کر کے اپنا آرڈر نوٹ کر دیا اور پھر لالہ کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔

”آپ کیا لینا پسند کریں گے سر؟ یہاں کی نہاری بہت ٹیسی ہوتی ہے۔“

”میرے لیے ایک کپ چائے بغیر مینی کے۔“ لالہ نے اپنا آرڈر نوٹ کر دیا۔ وہ اپنا وزن کم کرنے کے لیے آج کل کیوڈائٹ پر تھا اور اس ہوٹل میں کپکنے والا کوئی بھی پکوان کھانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

”مجھے امید تھی کہ پہلی ملاقات کے باوجود تم سیدھے

مجھ تک پہنچ جاؤ گے۔“ چھوٹا آڈر لے کر چلا گیا تو لالہ، طاہر کی طرف دیکھتے ہوئے شرارت سے بولا۔
”یہ بالکل سامنے کی بات ہے۔ میں نے آپ کی طرف سے ملنے والی چٹ کے بعد ہی پریس کلب کے سی سی ٹی وی کیمروں کی فوٹیجنگلو کر چٹ لانے والے ویڈیو دکھائی تھیں اور اس نے ان فوٹیج میں آپ کی نشاندہی کر دی تھی۔ مجھے اعتراف ہے کہ ان فوٹیج کی مدد سے میں آپ کے بارے میں جاننے کی کوشش بھی کرتا رہا لیکن فی الحال مجھے کامیابی حاصل نہیں ہو سکی ہے۔“ طاہر نے آرام سے اعتراف کر لیا۔

”میرے بارے میں جان کر تمہیں کچھ فائدہ نہیں ہوگا اس لیے بہتر ہوگا کہ اپنی توانائیاں اس کلیو پر صرف کرو جو میں نے تمہیں دیا تھا۔“ لالہ نے اس سے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا پھر سرسری سے انداز میں پوچھا۔
”اب تک کوئی نتیجہ نکلا یا نہیں؟ تم نے معلوم تو کرنے کی کوشش کی ہوگی کہ عرفان اللہ سے فائیو اسٹار ہوٹل میں خفیہ ملاقات کرنے والی وہ عورت کون تھی اور اس ملاقات کا مقصد کیا تھا؟“

”آپ یہ سب کیوں جاننا چاہتے ہیں؟ یقیناً ان معلومات کے حصول سے آپ کو کوئی فائدہ اٹھانا مقصود ہوگا۔“ طاہر کی نظروں میں شک تھا۔

”میرا اصل مقصد یہ جاننا ہے کہ عرفان کو مہرہ بنا کر میرے وطن کو کیا نقصان پہنچانے کی سازش کی جا رہی ہے۔ میں بہت گناہ گار اور چھوٹا آدمی ہوں لیکن وطن کی سالمیت کے خلاف کسی سازش کا حصہ بھی نہیں بنا اور اب جبکہ عمر کے اس حصے میں پہنچ چکا ہوں جب مادی آسائشیں انسان کے لیے بے معنی ہونے لگتی ہیں تو میرا دل چاہتا ہے کہ میں اپنے وطن کے لیے ایسا کچھ کروں جو میرے دامن پر لگے داغوں کو کسی حد تک دھو دے۔“ لالہ نے نہایت دلسوزی سے اس کے سوال کا جواب دیا۔

”آپ بڑی جلدی توبہ کی طرف چلے آئے۔ میں نے تو اقتدار اور اختیار کے زعم میں یہاں ستر، اسی کی دہائی میں موجود لوگوں کو بھی یوں ہوس میں مبتلا دیکھا ہے جیسے انہیں یقین ہو کہ موت کبھی ان کے قریب بھی نہیں پہنچے گی۔“ اس کے لہجے میں ہلکی سی طنز کی آمیزش تھی جس کا لالہ نے برانہ مانا اور دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

”سمجھو کہ مجھ پر رب کا کرم ہو گیا ہے جو اس نے میرے دل میں توبہ کا خیال ڈال دیا ہے۔ شاید اس میں

میری غرض بھی شامل ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اپنی نسل کے لیے پیچھے ایک ایسا جہنم چھوڑ کر جاؤں جو انہیں جلا کر راکھ کر دے۔“ لالہ کے لہجے میں کچھ ایسا ضرور تھا جس نے طاہر بیگ کو متاثر کیا۔ یقیناً سچائی کی طاقت میں کسی اور کو نہ سہی، ایک ایماندار شخص کو متاثر کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اس بار نہ وہ کوئی سوال کر سکا اور نہ ہی طنز۔ بس خاموش بیٹھا ہوٹل کے چھوٹے کواپنے آگے کھانا لگاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ لالہ کی چائے بھی وہ ساتھ ہی لایا تھا اور اسے لالہ کے سامنے رکھ دیا تھا۔

”میں دو بجے تقریباً روزانہ ہی اس ہوٹل میں دوپہر کا کھانا کھاتا ہوں۔ یہاں میرا کھانا کھلا ہوا ہے جس کا حساب میں تنخواہ ملنے پر بے باق کر دیتا ہوں۔ کھانے کا ڈانٹہ اچھا ہے اور مالک بامروت۔ تنخواہ ملنے میں کچھ دن اوپر بھی ہو جائیں تو تقاضا نہیں کرتا۔“ لالہ نے گرم چائے کا کپ اپنے ہونٹوں سے لگایا تو اس نے بھی نوالہ توڑا اور اسے سائٹن میں بھگوتے ہوئے بتانے لگا پھر کچھ چونک کر بولا۔
”شاید میں غیر ضروری طور پر آپ کو یہ سب کچھ بتا رہا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ میرے بارے میں یہ سب معلومات پہلے ہی آپ کے پاس ہوں گی۔“

”تمہارا اندازہ غلط نہیں ہے۔ میں تمہارے معمولات سے بھی واقف ہوں، نیٹلی بیگ گراؤنڈ سے بھی اور نظریات سے بھی، اسی لیے اس اہم کام کے لیے تمہارا انتخاب کیا ہے۔“ لالہ نے اس کے خیال کی تردید نہیں کی۔
”جس شخص نے اتنا ٹھوک بجا کر میرا انتخاب کیا ہے، وہ چاہتا ہے کہ میں اس پر اندھا اعتماد کر لوں۔“ طاہر بیگ نے ٹھکوتہ کیا۔

”یہ سوچ کر کر لو کہ اس معاملے میں تم جو کچھ بھی معلوم کرو گے اس پر ایکشن لینے کے لیے کسی مخلص بندے تک رسائی حاصل نہیں کر سکو گے۔ تم محنتی اور ایماندار سہی لیکن ایک چھوٹے ادارے سے وابستہ جو نیر صحافی ہو اور ہمارے صاحب اختیار و اقتدار لوگ تم جیسوں کو لفٹ نہیں کرواتے۔“ لالہ کی بیان کردہ تلخ سچائی نے طاہر کے ماتھے پر ٹھکنیں ڈال دیں۔

”آئی ایم سوری! میرا مقصد تمہاری انسلٹ کرنا نہیں ہے۔ میں بس تم سے حقائق پر بات کر رہا ہوں۔“ لالہ نے اس کے تاثرات دیکھ کر معذرت کی۔

”آپ کچھ غلط نہیں کہہ رہے ہیں۔ میرے لیے واقعی بڑے لوگوں کو اپروچ کرنا آسان نہیں ہے اور ایسا کر بھی لوں

تو وہ ٹھوس ثبوت نہیں ہیں جنہیں اپنی سچائی ثابت کرنے کے لیے پیش کر سکوں۔“ اس کے چہرے کے تاثرات معمول پر آگئے اور کچھ شکست خوردہ سے انداز میں اعتراف کیا۔
”مجھے لگتا ہے کہ تمہیں کچھ ایسا معلوم ہوا ہے جس نے تمہیں پریشان کر دیا ہے۔“ لالہ کی زیرک نگاہوں نے بھانپ لیا۔

”عرفان اللہ اپنے قریبی ساتھیوں سے کہتا پھر رہا ہے کہ اس بار کے الیکشن میں وہ وزیر اعلیٰ منتخب ہو جائے گا اور اگلی بار وزیر اعظم۔ کچھ لوگ اس کی ان باتوں کو دیوانے کی بڑبڑ سمجھ کر مذاق اڑا رہے ہیں لیکن حالات کو دیکھتے ہوئے مجھے یہ سب سچ لگ رہا ہے۔ آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ کیسے ایک عام سیاست دان ہوتے ہوئے وہ دنوں میں لائٹ لائٹ میں آ گیا ہے۔ اس کی شہرت کا گراف بلند کرنے کے لیے باقاعدہ ایک منظم میڈیا سٹریٹجی کر رہا ہے۔ سوشل میڈیا کے پلیٹ فارم سے اسے ہیرو بنانے کی جو کوششیں کی جا رہی ہیں وہ اپنی جگہ، ایک دو نیشنل چینلز نے بھی اس کے گن گانے شروع کر دیے ہیں اور اس کے اٹھائے فلاحی اقدامات کو یوں سراہ رہے ہیں گویا وہ چاند یا مریخ پر پہنچ گیا ہو۔ یہ سب نشانیاں ظاہر کر رہی ہیں کہ کوئی بڑی طاقت اسے اوپر پہنچانے کے لیے کوشاں ہو چکی ہے اور یہ تو ہم سب سمجھ سکتے ہیں کہ جب بڑی طاقتیں ایسا کرتی ہیں تو ایسے مہروں سے وہ کام بھی لیتی ہیں جن کی قیمت ہمیشہ اس ملک کے عوام کو ادا کرنا پڑتی ہے۔“ طاہر بیگ یکدم ہی پھٹ پڑا اور اسے سب کچھ بتا ڈالا۔

”مجھے اسی قسم کے خدشات تھے اور اسی لیے میں نے تمہیں عرفان اللہ کی اس عورت سے ملاقات کی ٹپ دی تھی۔ یہ جو کچھ ہوا ہے اور ہو رہا ہے، اس میں اس ملاقات کا بہت عمل دخل ہے۔“ لالہ نے سن کر تبصرہ کیا۔

”اس عورت کے بارے میں، میں باوجود کوشش کے اب تک کچھ نہیں جان سکا ہوں۔ کہیں کوئی سی سی ٹی وی فوٹیج یا آڈیو ٹیپ ریکارڈ موجود نہیں ہے جس کے ذریعے اندازہ لگایا جاسکے کہ وہ کون تھی۔“ اس نے لالہ کو اپنی ناکامی سے آگاہ کیا۔

”میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے لیکن مجھے اندازہ ہے کہ وہ عورت کون تھی۔“

”پلیز مجھے بتائیں وہ کون تھی؟“ لالہ کے انکشاف پر وہ چونک گیا اور ہاتھ میں پکڑا ہوا لالہ منہ میں رکھنا بھول کر جوش و خروش سے فرمائش کی۔

”جے اینڈ جے کمپنی کی سی ای او۔“
”آپ کا مطلب ہے میڈم رائیل؟“ طاہر کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ لالہ نے محض سرکواشات میں جنبش دے کر تصدیق کی۔

”لیکن ایک ملٹی نیشنل کمپنی کی سی ای او کو ہمارے ہاں کی سیاست سے کیا غرض ہو سکتی ہے؟ کہیں آپ کو کوئی غلط فہمی تو نہیں ہو رہی۔“

”تم یہ غور کرو کہ اس عورت کا تعلق کس سازشی قوم سے ہے تو کبھی میری اس بات پر حیرت محسوس نہیں کرو گے۔“
”مائی گاڈ.....! آپ کا مطلب ہے کہ عرفان اللہ کے پیچھے یہودی لابی کام کر رہی ہے۔“ اس بار اس نے کھانے سے ہاتھ ہی ہٹا لیا۔

”بالکل یہی بات ہے ورنہ ضرورت تو اس بات کی بھی کوئی نہیں ہے کہ ایک مشہور ملٹی نیشنل کمپنی کی سی ای او یہاں پاکستان میں بیٹھی رہے۔ کسی اور کمپنی کو ایسا کرتے دیکھا ہے تم نے؟ سب باہر بیٹھ کر ہی اپنا کام چلا رہے ہوتے ہیں۔“
”لیکن.....“

”لیکن ویکن کچھ نہیں میاں۔ میں اس عورت کے ایک دوسرے رخ سے بھی واقف ہوں۔ بہت عرصے تک یہ عورت ایک پراسرار کردار کی حیثیت سے مجھ سمیت کئی لوگوں کو اپنی انگلیوں پر نچاتی رہی ہے۔ میں بہت کوشش کر کے اس کے اصل تک پہنچا ہوں اور اب ہمارے درمیان ایک کھلی جنگ شروع ہو چکی ہے۔“

”اور آپ مجھے اس جنگ کا ایندھن بنانا چاہتے ہیں؟“ طاہر بیگ تڑخ کر بولا۔

”ہرگز بھی نہیں۔ میں نے تمہارا انتخاب صرف اس لیے کیا ہے کہ میں جانتا ہوں وطن کی حفاظت کی ذمہ داری صرف ایک سچے اور محب وطن شہری کے شانے ہی اٹھا سکتے ہیں۔“
”آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟“ طاہر بیگ نے جیسے ہتھیار ڈال دیے۔

”تم اس عورت پر کام کرو۔ ایک صحافی جو اسٹوریز نکال کر لاسکتا ہے، وہ کسی بڑے سے بڑے جنگجو کے بس کی بات نہیں لیکن خیال رکھنا کہ اپنی معمولی سی بھی پکڑائی نہ دو۔ ان لوگوں نے تمہاری بو بھی پالی تو وحشی کتوں کی طرح تمہیں بھنبھوڑ ڈالیں گے۔ میں خود اپنے کئی ساتھیوں کو اس عورت کے مقابلے پر گنوا چکا ہوں۔“ لالہ نے اسے تنبیہ کی اور پھر جیب سے ایک بھاری لفافہ نکال کر اس کے سامنے رکھا۔
”یہ رکھ لو، تمہیں ضرورت پڑے گی۔“

”میں رشوت لے کر کوئی کام نہیں کیا کرتا۔“ اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

”یہ رشوت نہیں ہے۔ اس کیس پر کام کرنے کے لیے تمہیں وسائل کی ضرورت ہوگی اور ظاہر ہے نہ تم اتنی حیثیت رکھتے ہو اور نہ ہی تمہارا اخبار تم سے مالی تعاون کرے گا۔۔۔۔۔۔ تو یہ بس ان اخراجات کے لیے ہے جو تمہیں لازماً کرنا پڑیں گے۔“ لالہ نے اسے سمجھایا تو اس کے چہرے کے تنے ہوئے نقوش ڈھیلے پڑ گئے۔

”اس اسٹوری پر کام کرنے کے لیے میں تمہارے لیے ایک اہم کلیو بھی لایا ہوں۔“ لالہ نے اسے نرم پا کر بات آگے بڑھائی۔

”میں ضرور جانتا چاہوں گا۔“ اس نے ہونٹ کے چھوٹے ٹوکے ہاتھ سے کھانے کے برتن اٹھا لینے کے لیے اشارہ کیا۔ چھوٹا آکر برتن سمیٹنے لگا۔ اس دوران لالہ اپنے موبائل کے ساتھ مصروف رہا۔

”یہ دیکھو۔“ چھوٹا چلا گیا تو اس نے اسکرین ظاہر کے سامنے کی۔

”یہ بچہ کون ہے؟“ وہ اسکرین پر موجود تصویر دیکھ کر حیران ہوا۔

”یہ صداقت شاہ کا نواسا ہے اور صداقت شاہ صرف اور صرف اس لیے عرفان اللہ کے ساتھ کھڑا ہے کہ یہ بچہ میڈم رائیل کے قبضے میں ہے۔“

”اوہ مائی گاڈ! میں واقعی حیران تھا کہ عرفان اللہ اور سائیں صداقت شاہ کا یہ گھڑ جوڑ ہوا کیسے؟ ورنہ ماضی میں تو یہ دہلی دہلی چہ میگوئیاں بھی سنائی دیتی رہی تھیں کہ دونوں کے بیٹوں کے درمیان کوئی گڑبڑ چل رہی ہے۔“

”مجبوریاں انسان سے بہت کچھ کروالیتی ہیں ورنہ ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ آج سائیں صداقت شاہ کا بیٹا جس مصیبت میں گرفتار ہے، اس مصیبت کا آغاز عرفان اللہ اور اس کے جگر کی دوست حیات یزدانی سے ہی ہوا تھا۔“ لالہ نے اسے اختصار کے ساتھ معاذ اور عالم کی دوستی اور پھر اب تک گزرے سارے واقعات سے آگاہ کیا۔

”ہوں۔۔۔۔۔۔ یعنی یزدانی اور عرفان اللہ بھی میڈم رائیل ہی کے مہرے تھے جنہوں نے لوجوالوں کی لڑائی کو ہوادے کر معاملے کو اس طرح الجھایا کہ دوسروں کے ساتھ ساتھ اپنی اولاد کا بھی نقصان کر بیٹھے۔“ سارا قصہ سن کر طاہر بیگ نے تبصرہ کیا۔

”بات کچھ ایسی ہی ہے لیکن ان عقل کے اندھوں کو

سمجھ نہیں آرہی۔ یزدانی تو پھر بھی اکلوتے بیٹے کو گوانے کے غم میں سب کچھ ترک کر کے ایک طرف ہو بیٹھا ہے لیکن عرفان اللہ کی آنکھوں پر اب بھی ہوس و اقتدار کی ہٹی بندھی ہوئی ہے۔ اصولاً اسے اپنے بیمار بیٹے کے علاج کے لیے اس کے ساتھ ہونا چاہیے تھا لیکن وہ یہاں سیاست کے میدان میں ڈٹا ہوا ہے اور اونچی اڑان بھرنے کے چکر میں ہے۔“ لالہ نے افسوس بھرے انداز میں اس کی تائید کی۔

”یہ اڑان اگر وہ اپنے زور بازو پر اور نیک نیتی کے ساتھ بھر رہا ہوتا تو اس میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں تھی لیکن وہ جن کے آشیر باد سے یہ سب کچھ کر رہا ہے، وہ ہمارے لیے خطرے کی گھنٹی ہے۔ جب سے یہ ملک بنا ہے، یہود اور ہنود کی سازشوں کا شکار ہے۔ عرفان اللہ جیسے بندے کو اوپر لا کر اقتدار کے ایوانوں میں پہنچانے والے اپنی اس خدمت کی جو قیمت وصول کریں گے، وہ اصل میں عرفان اللہ نہیں بلکہ پوری قوم کو ادا کرنا پڑے گی۔ میرا جہاں تک بس چلے گا، میں اس سازش کے خلاف کام کروں گا۔ کامیابی یا ناکامی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔“ طاہر بیگ نے اپنے عزم کا اظہار کیا تو لالہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس جنگ میں طاہر بیگ جیسے پُر عزم اور دیانت دار سپاہی کی شمولیت ایک بڑی کامیابی تھی۔

☆☆☆

”کیا ہوا؟“ معاذ کو ادھر ادھر نظر دوڑانے پر بھی کچھ نظر نہ آیا تو سرگوشی میں جارو سے پوچھا۔

”وہاں کوئی موجود ہے۔ مجھے کسی مرد اور عورت کے بولنے کی آوازیں صاف سنائی دے رہی ہیں۔“ جارو کی دی اطلاع اہم تھی۔ اس اطلاع کا مطلب تھا کہ وہ دشمنوں کے بہت قریب پہنچ چکے ہیں کیونکہ اس علاقے میں ان کے سوا کسی اور کی موجودگی کا امکان تو نہ ہونے کے ہی برابر تھا۔

”میں زانگ کو اس بارے میں بتاتا ہوں پھر حالات دیکھ کر فیصلہ کریں گے کہ کیا کرنا ہے۔“ معاذ نے دھیمی آواز میں اس سے کہا اور خود بہ احتیاط زانگ کی طرف بڑھ گیا۔ دشمن کے قریب ہونے کے احساس نے اسے حد درجہ محتاط کر دیا تھا اور کوشش کر رہا تھا کہ کوئی معمولی سی بھی کوتاہی نہ ہو کہ ان کی توجہ اس طرف مبذول ہو جائے۔

”میں اور میرے ساتھی آگے رہیں گے۔ تم لوگ پیچھے رہ کر ہمیں کور دینا۔ صورت حال دیکھ کر ہی کوئی ایکشن لینے کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔“ اس نے پہلے زانگ کو جارو کے شک سے آگاہ کیا پھر اپنے لائحہ عمل کے بارے میں بتانے لگا۔

”ٹھیک ہے، میں باقی ساتھیوں کو ہوشیار کر دیتا ہوں۔“ زانگ نے اس سے اختلاف نہیں کیا۔ اسی کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد معاذ اپنے ساتھیوں کی طرف واپس پلٹا۔

”میرے اندازے کے مطابق وہاں صرف دو ہی افراد ہیں۔ اگر کوئی تیسرا موجود بھی ہے تو اس نے مکمل خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔“ جارو نے اسے دیکھتے ہی سرگوشی میں آگاہ کیا۔

”چلو، چل کر دیکھتے ہیں۔“ معاذ نے کہا۔

وہ تینوں احتیاط سے قدم اٹھاتے جارو کی بتائی ہوئی سمت میں آگے بڑھنے لگے۔ برف پر قدم بچانا آسان نہیں تھا لیکن اب انہیں اس کی خاصی مشق ہو چلی تھی اور جارو تو تھا ہی کشمیر کا شہزادہ۔ اس کے لیے ایسے راستے اور موسم کوئی انہونی بات نہیں تھی۔

”شش.....“ انہوں نے کم و بیش دس منٹ کا فاصلہ طے کیا تھا کہ جارو نے انہیں رکنے کا اشارہ کیا۔

”وہ بہت نزدیک ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق ہم اس چٹان کے پیچھے سے جھانکیں گے تو وہ ہمیں دکھائی دے جائیں گے۔“ اس نے دھیمی سرگوشی میں انہیں آگاہ کیا۔ اب وہ پہلے سے بھی زیادہ ہوشیاری سے آگے بڑھنے لگے۔ جارو کے اندازے کی تصدیق چٹان کے پیچھے سے جھانکتے ہی ہو گئی اور نظر آنے والے منظر نے ششدر کر دیا۔ اس منظر میں کل دو نفوس شامل تھے۔ ایک مرد اور ایک عورت۔ عورت نے سردی سے بچنے کے لیے بھاری گرم لباس پہن رکھا تھا۔ وہ ایک قبول صورت اور دیکھنے میں تیس سے پینتیس سال کی عورت تھی۔ اس کا چہرہ کچھ سردی سے اور کچھ ہنسی ضبط کرنے کی کوشش میں سرخ ہوا جا رہا تھا۔ اس کی ہنسی کا سبب بننے والا منظر معاذ کے اندر طیش کی شدید لہر دوڑا گیا۔

بلاشبہ وہ گل خان تھا جو اپنے روایتی لباس میں ملبوس ایک چھوٹے سے پتھر پر کھڑا بری طرح کانپ رہا تھا۔ یقینی طور پر اس کا لباس اس علاقے کی سردی کو برداشت کرنے کے لیے قطعی ناموزوں تھا لیکن اس کی کپکپاہٹ کا سبب صرف کپڑوں کی ناموزونیت نہیں تھا۔ وہ اس شدید خوف کے زیر اثر بھی کپکپا رہا تھا جو کسی دہم کی طرح اس کے دل میں ڈالا جا رہا تھا۔ ہنسی ضبط کرتی عورت اس سے کہہ رہی تھی۔

”بالکل بھی مت ہلو خان! اگر تم ہلے تو اس پتھر

سے گر جاؤ گے اور تمہیں پتا ہے تاکہ اس پتھر کے ساتھ ہی ایک گہری کھائی ہے۔ تم پتھر سے لڑکھکے تو سیدھے اس کھائی میں جا کر گر دو گے اور تمہارا جسم اتنے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے گا کہ ہم ان ٹکڑوں کو جمع بھی نہیں کر سکیں گے۔“

وہ سب دیکھ سکتے تھے کہ ان الفاظ کے اثر سے خان کے جسم پر طاری کپکپاہٹ میں مزید اضافہ ہو گیا تھا اور وہ آنکھیں بند کیے خوفزدہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”خدا کا واسطہ، ام کو اس پتھر پر سے اتارو۔ امارا ٹانگ کانپ رہا ہے۔ اب ام ادھر اور نہیں کھڑا ہو سکتا۔ تم ام کو کوئی اور سزا دینا چاہتا ہے تو دے لو پر اس مصیبت سے نجات دلاؤ۔ ام یہاں سے گر کر مر گیا تو امارا چھوٹا چھوٹا بچہ یتیم ہو جائے گا۔“ کمال کی بات یہ تھی کہ وہ جس پتھر پر کھڑا تھا، وہ بالکل مسطح برف کی تہ پر رکھا تھا اور اس کے آس پاس تو کیا، دور دراز بھی کسی کھائی کا نام و نشان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

”اسے کیا ہو گیا ہے؟ یہ کیوں ایسے آلو کا چرخابنا ہوا ہے؟“ گل خان کو اس حالت میں دیکھ کر وہی نے معاذ کے کان میں حیرت سے سرگوشی کی۔

”میں بھی اس بات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ معاذ کے ماتھے پر ڈھیروں ہل نمودار ہو چکے تھے۔

”یہ تمہاری غلطی ہے خان کہ تم نے چھوٹا چھوٹا بچہ پیدا کیا۔ تمہیں چاہیے تھا کہ تم بڑا بڑا بچہ پیدا کرتا تو آج اتنی پریشانی میں مبتلا نہ ہوتا۔“ عورت کے لہجے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اس کی حالت سے بھرپور لطف اٹھا رہی ہے۔

”بالکل امارا غلطی ہے۔ ام کو اس غلطی کی مائٹھی دے دو۔ آئندہ کے لیے ام اپنا دونوں گھر والی سے کہہ دے گا کہ امارے کو بڑا بڑا بچہ پیدا کر کے دے۔ ان میں سے جس نے امارا بات نہیں مانا، ام اس کو طلاق دے دے گا۔“ عورت کی بے تکی بات پر وہ جس فرمانبرداری اور سنجیدگی سے بات کر رہا تھا، وہ خود اپنی جگہ پر بڑا مضحکہ خیز تھا۔

”نہینا ٹزم..... اسے ہینا ٹاڑڈ کیا گیا ہے اور اس کا دماغ اس کے قابو میں نہیں ہے۔“ اس بار معاذ نے فوراً ہی اندازہ لگالیا۔

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نو جوان
کی داستان جو غلط کاروں کے لیے
غضب ناک تھا باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیے

لا علمی

عیوق بخاری

اکثر معاملات میں باخبری انسان کی نیندیں بھی رادیتی ہے لیکن کبھی کبھی لا علمی میں اتنے بڑے بڑے کارنامے انجام دے لیے جاتے ہیں جن کا گمان کرنا بھی مشکل ہو... بہر حال یہ کارنامہ اس نے بھی انجام دے لیا تھا مگر یہ خبری جب باخبری میں بدلی تو مانو جسم میں جیسے کرنٹ دوڑ گیا ہو۔ پر اب سوائے صبر اور احتیاط کے کوئی راستہ بھی تو نہ تھا۔

انجانے رستوں پر بھٹکنے والے ایک نوجوان کی بے پروائی کا انجام



تیز موسیقی ماحول میں خوب شور مچا کر ہوئے تھے۔ ریٹورنٹ میں خوب رش تھا۔ رات کا پہلا حصہ شروع ہوا تھا، سب میزیں بھری ہوئی تھیں۔ کوئی کھانا کھا رہا تھا، کوئی گپ شپ میں مصروف تھا۔ ایک سائڈ پر کاؤنٹر تھا، خوب کہا گئی تھی۔ اسی دوران ایک اسمارٹ، خوش شکل لڑکا ریٹورنٹ میں داخل ہوا۔ اس نے ارد گرد کا جائزہ لیا اور ایک سائڈ پر پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ بار بار دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے کسی کا انتظار ہو۔ نیلی جینز اور نیلا

ہی جیکٹ پہنے وہ نو جوان کافی حیرت سے ریسٹورنٹ میں موجود لوگوں اور ماحول کو دیکھ رہا تھا۔ ایک دو بار اس کے چہرے پر ایسے تاثرات بھی آئے تھے جیسے کچھ باتیں اسے ناگوار گزر رہی ہوں۔

”کیا چاہیے سر؟“ وہ ایک بار پھر دروازے کی جانب دیکھ رہا تھا کہ ویٹر نے آکر پوچھا۔

”کافی چاہیے۔“ اس نے مختصر اُ کہا۔ ویٹر آرڈر لے کر چلا گیا۔ وہ کافی پی رہا تھا کہ ایک آدمی اندر داخل ہوا۔ وہ شخص شکل سے پڑھا لکھا، شائستہ اطوار لگ رہا تھا۔ وہ آکر اس سے چند ٹیبل چھوڑ کر بیٹھ گیا۔ نیلی جیکٹ والے کے چہرے پر اطمینان آ گیا۔ اس کا مطلوبہ شخص آچکا تھا لیکن جیسا کہ دونوں میں طے ہو چکا تھا، انہوں نے آپس میں کوئی ہیلو ہائے نہیں کی، نہ اپنے کسی انداز سے شناسائی کا اظہار ہونے دیا۔

نیلی جیکٹ والے نے کافی کا کپ میز پر رکھا اور سیل فون نکال کر میسج ٹائپ کرنے لگا۔ چند ٹیبل چھوڑ کر جو اس کا مطلوبہ شخص بیٹھا تھا، اس کو میسج کیا۔

”بتاؤ مجھے، کیا وہ شخص آچکا ہے یہاں؟“ نیلی جیکٹ والے نے پوچھا۔

”نہیں، ابھی نہیں آیا لیکن کچھ دیر میں آجائے گا۔ اس کا ایک مخصوص ٹائم ہے یہاں آنے کا۔“ جواب ملا۔

”اوکے..... جو نبی آئے، مجھے بتا دینا۔“ اس نے کہا ساتھ ہی ریسٹورنٹ کا داخلی دروازہ زور سے کھلا اور ایک قوی بیکل آدمی اندر داخل ہوا۔ باڈی بلڈر ٹائپ اس شخص کا چہرہ زخموں سے بھرا ہوا اور انتہائی خوفناک تھا۔ وہ اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ میسج آ گیا۔

”یہ جو باڈی بلڈر آیا ہے، یہی ہے وہ شخص۔ جلدی کر لو اپنا کام۔“

نیلی جیکٹ والا میسج پڑھ کر اس آدمی کو بغور دیکھنے لگا۔ کافی کا کپ اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ باڈی بلڈر بڑے کروڑ سے ایک ٹیبل کی جانب بڑھا اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ اپنی دونوں ٹانگیں اس نے بڑی بدتمیزی سے ٹیبل پر رکھ لیں۔ اس کا چہرہ سخت کھردرا اور زخموں سے بھرا ہوا تھا۔ کافی خوفناک شکل اور ڈرا دینے والی باڈی تھی۔ آنکھیں سرخ اور چہرے پر اکڑی نظر آرہی تھی۔ مختصر الفاظ میں ایک خوفناک انسان نما چیز ریسٹورنٹ میں موجود تھی۔

”جلدی کرو، بیٹھے کیوں ہو؟“ نیلی جیکٹ والا کافی ختم کر کے اس خوفناک آدمی کا جائزہ لے رہا تھا کہ اس کو پھر

میسج آیا۔ وہ جلدی سے اٹھا اور باڈی بلڈر کی جانب بڑھنے لگا۔ وہ نہایت بے خوفی اور عام سے انداز میں اس کے قریب پہنچا اور اس کے قریب جا کر بولا۔

”ادھر دیکھو۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے باڈی بلڈر کا کندھا بڑی بے تکلفی سے تھپتھپایا۔ ارد گرد بیٹھے لوگ تو حیرت کے مارے اسے دیکھ ہی رہے تھے، خود اس شخص کا چہرہ بھی شدید حیرانی دکھا رہا تھا۔ وہ اس کی جانب مڑا اور پھنکارا۔

”کیا ہے لڑکے؟ کون ہو تم؟“ ابھی اس کا سوال مکمل ہوا ہی تھا کہ نیلی جیکٹ والے نے اس کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر اس کا چہرہ اوپر کیا اور دوسرے ہاتھ سے زانے دار تھپڑ رسید کر دیا۔

ریسٹورنٹ میں سناٹا چھا گیا۔ سب کی سانسیں حلق میں اٹک گئیں اور آنکھیں یوں کھل گئی تھیں جیسے ناقابل یقین منظر دیکھ رہے ہوں۔

لڑکے کے باڈی بلڈر کے قریب آ کر تھپڑ مارنے میں محض چند سیکنڈز لگے تھے۔ تھپڑ کھانے والے کے چہرے پر زلزلے کے سے تاثرات اور آنکھوں میں شعلے تھے۔ مشروب کی ٹرے اٹھائے پاس کھڑا بیڑا اپنی جگہ پر جم کر کھڑا تھا۔

تھپڑ مارنے کے بعد نیلی جیکٹ والے نے اس کی ٹرے سے ایک گلاس اٹھایا اور وہ بھی باڈی بلڈر کے منہ پر انڈیل دیا۔ وہ جو حیرت اور توہین کے صدمے میں سے نکل کر کھڑا ہونے والا تھا، منہ پر مشروب گرنے سے ٹھم گیا اور آنکھوں کو ملنے لگا۔ ارد گرد والے سانس روک کر یہ سب دیکھ رہے تھے کہ بے تکلفی سے کندھے پر ہاتھ مارنا پھر تھپڑ رسید کرنا اور اب منہ پر مشروب پھینک دینا۔ کیا اس کے بعد نیلی جیکٹ والا بھی انک انجام سے بچے گا؟

”جہیں گمان تھا نا کہ تمہارے منہ پر کوئی طمانچہ نہیں مار سکتا۔ لو دیکھو، میں نے یہ کر ڈالا۔“ نیلی جیکٹ والا مسکرا رہا تھا۔ خوف و دہشت میں ڈوبے ریسٹورنٹ میں موجود لوگ اس کی دماغی حالت پر شبہ کرنے لگے تھے۔ اچانک کاؤنٹر کے پیچھے سے ایک شخص لکلا اور بھاگتا ہوا نیلی جیکٹ والے کے پاس پہنچا۔

”تم نے..... تم نے رالف..... رالف کو تھپڑ مارا..... ہے؟“ اس نے حیرت و خوف بھرے لہجے میں سوال کیا۔ رالف اب اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔

اب کیا ہونے والا ہے؟ سب کے ذہنوں میں سوال تھا۔ رالف بڑے خوفناک انداز میں اس لڑکے کی جانب بڑھا جس نے اسے سب کے سامنے بری طرح ذلیل کیا تھا۔

”رکو رالف.....!“ اچانک ایک آواز ابھری۔ سب آواز کی جانب دیکھنے لگے۔ آواز دینے والا وہی آدمی تھا جو نیلی جیکٹ والے سے موبائل پر میسج کر رہا تھا۔ سب کی گردنیں ادھر مڑ گئیں۔

”تم کچھ نہیں کرو گے۔ تمہارا اور میرا سب کے سامنے معاہدہ ہوا تھا۔ اب تم وہ کرو گے جو طے ہوا تھا۔“ روکنے والا آدمی جو ڈاکٹر ڈیرن تھا، نے آہستہ آہستہ قریب آتے ہوئے کہا۔ رالف منہ کھولے اسے دیکھنے لگا۔

”آؤ ڈینی! چلتے ہیں۔“ ڈاکٹر ڈیرن نے نیلی جیکٹ والے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

ڈینی اب تھوڑا سا گھبرا گیا تھا۔ اسے صاف لگ رہا تھا کہ بات وہ نہیں جو اسے بتائی گئی ہے۔ ڈیرن نے اس کا ہاتھ پکڑا اور باہر نکل گیا۔

”کیا واقعی رالف اس لڑکے کو کچھ نہیں کہے گا؟“ ایک نے دوسرے سے سرگوشی میں سوال کیا۔

”معلوم نہیں..... لیکن رالف فی الحال کھڑا ہے، ان کے پیچھے نہیں گیا۔ دیکھتے ہیں، کیا ہوتا ہے۔“ جواباً کہا گیا۔

رالف ہونٹ بھیچے بار بار مٹھیاں کھول اور بند کر رہا تھا۔ وہ تیز سانس لے رہا تھا۔ وہ ابھی تک بیرونی دروازے کو دیکھ رہا تھا جہاں سے ڈاکٹر ڈیرن اور ڈینی باہر نکلے تھے۔

☆☆☆

”ڈاکٹر پلیز! مجھے بتاؤ کہ اصل معاملہ کیا ہے کیونکہ مجھے تو کہیں سے یہ عام بات یا دوستوں کی شرط وغیرہ نہیں لگی۔ ایک غنڈا اور ڈاکٹر دوست کیسے ہو سکتے ہیں؟ یہ میں نے کیوں نہیں سوچا..... چلو مجھے اصل بات بتاؤ۔“ ڈینی، ڈاکٹر کے سامنے بیٹھا تیز لہجے میں اس سے پوچھ رہا تھا۔

”بتاتا ہوں..... بتاتا ہوں لیکن تمہیں کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا۔“ ڈاکٹر ڈیرن نے باہر بیٹھے اپنے مریضوں کو شیشے میں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”نہیں..... انتظار نہیں، ابھی بتاؤ۔“ ڈینی نے اصرار کیا۔

”ڈینی! دیکھو، میرے مریض بیٹھے ہیں۔ وہ کافی دیر سے میرا انتظار کر رہے ہیں۔ ریسٹورنٹ میں میرا جانا اشد ضروری تھا ورنہ میں کبھی کلینک ٹائم میں کہیں نہیں گیا۔ مجھے اپنا کام نمٹانے دو۔ پرامس کرتا ہوں، سونے سے پہلے تمہیں ساری بات پتا چل جائے گی۔“ ڈاکٹر ڈیرن نے اپنی مجبوری اور کام بتا کر اسے سمجھایا۔

”اچھا مختصر آتا بتا دو کہ بات جو مجھے بتائی گئی، وہی ہے یا کچھ اور؟“ ڈینی معاملہ جاننے کے لیے بضد تھا۔ اس کو

کہہ کر ایک خوفناک آدمی کو ذلیل کر دیا گیا تھا۔ اور جہاں یہ ہوا تھا، وہاں کے لوگوں کے چہروں کی حالت اور تاثرات بھی بہت چونکا دینے والے تھے۔ وہ حقیقت معلوم کرنے کے لیے بے چین تھا۔

”پیشنت کو اندر بھیجو۔“ اس کے سوال کو انور کر کے ڈاکٹر ڈیرن نے انٹرکام پر حکم دیا۔

”یعنی بات کچھ اور ہی ہے، اتنا تو میں سمجھ ہی گیا ہوں۔“ ڈینی اٹھتے ہوئے بولا۔ وہ کلینک کے اوپر بنے ہوئے کمرے میں جانے کے لیے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

ساتھ ہی وہ یہ سوچتا جا رہا تھا کہ ڈاکٹر ڈیرن کے کہنے پر جو کیا ہے، کیا مناسب ہے اور اس عمل سے اسے کوئی نقصان پہنچے گا تو خدشہ نہیں؟ وہ اوپر جا کر اس کمرے میں چلا گیا جو ڈاکٹر ڈیرن نے اسے رہنے کے لیے دیا تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور پانی کا گلاس منہ سے لگایا۔ دفعتاً اس کو رالف کے چہرے کے نشانات کا خیال آیا۔ ایسے نشانات تو لڑائی، مار کٹائی کرنے، جیلیں کاٹنے والے مجرموں کے چہروں پر ہوتے ہیں۔ اسے پھندا لگتے لگتے بچا۔ اس نے بہ مشکل دو تین گھونٹ حلق سے اتارے۔ وہ اس آدمی کے بارے میں مزید سوچنے لگا جس کے منہ پر اس نے تھپڑ مارا تھا اور مشروب کا گلاس بھی نہایت بدتمیزی سے انڈیل دیا تھا۔ جوں جوں وہ سوچتا جا رہا تھا، اس کی آنکھیں خوف سے پھیلتی جا رہی تھیں۔

’وہ آدمی بڑے کروفر سے چل رہا تھا۔ بڑے رعب سے کرسی پر بیٹھ کر ٹانگیں پھیلائی تھیں اور ارد گرد والے پرے ہٹ گئے تھے..... اس کی باڈی خوب بنی ہوئی ہے..... اس کی آنکھوں میں خوفناک حد تک سرخی ہے اور چہرہ بہت ہیبت ناک۔ سوچتے سوچتے اس نے کرسی کے ہتھے اتنی زور سے پکڑ لیے تھے کہ اس کی ہتھیلیاں سرخ ہو گئی تھیں۔

’جب میں نے اس کے منہ پر تھپڑ مار کر گلاس انڈیل دیا تو پورا ریسٹورنٹ کیسے خاموش ہو گیا تھا۔ لوگوں کی حالت غیر سی ہو گئی تھی..... ایک آدمی نے کیسے اٹک اٹک کر پوچھا تھا۔ ”تم نے رالف کو مارا ہے؟“ اس کی آنکھیں کیسے پھیل گئی تھیں جیسے کچھ بہت بڑا اور ناقابل یقین ہوا ہو۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

’مجھے لگتا ہے، میں نے کچھ بہت خطرناک کر ڈالا ہے۔ کتنا احمق ہوں میں۔ اپنی ضرورت کی خاطر نہ جانے کیا کر ڈالا۔ اب کیا ہوگا؟ اوہ، ڈیرن نے یہ کیوں کہا تھا کہ تم اب وہ کرو گے جو تمہارے اور میرے درمیان طے ہوا تھا.....؟ خدایا! کیا کر بیٹھا ہوں میں.....؟ کیا مجھے فوراً شہر

چھوڑ کر واپس اپنے گھر چلے جانا چاہیے؟ اس نے گھبرا کر سوچا اور پھر بیڈ پر ڈھسے سا گیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اس پر تھکاوٹ کی وجہ سے نیند غالب آنے لگی۔ اس حالت میں بھی اس کے سامنے رالف کا ڈراؤنا چہرہ اور ریسٹورنٹ کا ماحول تھے۔

☆☆☆

رالف ایک بہت بڑا غنڈا تھا۔ اپنی مجرمانہ سرگرمیوں کی وجہ سے آئے روز جیل جاتا رہتا لیکن جلد ہی باہر آ کر لوگوں کو پریشان کرتا۔ پہلے کہیں اور رہتا تھا لیکن ایک سال سے وہ ڈاکٹر ڈیرن کے کلینک سے کچھ فاصلے پر موجود ایک فلیٹ میں رہنے لگا تھا۔ ڈاکٹر ڈیرن کو اپنا قصبہ چھوڑے اور یہاں آئے چار سال ہو چکے تھے۔ وہ بہت سکون اور اطمینان کی زندگی گزار رہا تھا۔ ارد گرد کا ماحول بھی اسے خوب راس آ یا۔ جلد ہی اس کی شہرت علاقے بھر میں پھیل گئی۔ وہ اپنے کام سے مطلب رکھنے والا سلجھا ہوا انسان تھا۔ سارا وقت کلینک یا پھر کلینک کی بالائی منزل پر بنے دو کمروں کے فلیٹ میں گزارتا۔ اس کا ناشتا پھلوں، جوس وغیرہ پر مشتمل تھا۔ بیچ اور رات کا کھانا وہ باہر کھاتا۔

رالف کے ڈاکٹر کی کانوٹی میں آنے کے چند دن بعد کی بات ہے۔ ڈیرن ریسٹورنٹ (جس میں تھپڑ والا واقعہ رونما ہو چکا تھا) میں بیٹھا تھا۔ کہیں اور بیچ کر کے آتے ہوئے اچانک اس کی نظر اپنے کئی واقف کار پر پڑی تو وہ کوئی ضروری بات کرنے ریسٹورنٹ کے اندر چلا گیا۔ دونوں دوست باتیں کرنے لگے۔ ڈیرن وہاں بیٹھنا نہیں چاہ رہا تھا۔ اس کی پہلی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک مصروف ڈاکٹر تھا جو زیادہ دیر کہیں بیٹھ نہیں سکتا تھا اور دوسرا وہ یہاں کے ماحول کو کچھ خاص پسند نہیں کرتا تھا جو کہ رالف کے آنے کے بعد بہت بگڑ گیا تھا۔ وہ جلدی لکنا چاہتا تھا لیکن بات کرتے کرتے کچھ منٹ لگ ہی گئے۔ اسی دوران رالف اپنے چند کمرگوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی ڈاکٹر ڈیرن کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھر آئے۔

”تم میری طرف آ جانا، باقی بات وہیں کریں گے۔“ دوست سے کہہ کر ڈیرن جلدی سے وہاں سے نکل آیا۔ رالف نے واضح طور پر محسوس کیا کہ ڈاکٹر اس جیسے غنڈے کی موجودگی کو ناپسند کر کے گیا ہے۔ وہ طیش میں آنے لگا کہ لوگ اس سے ڈرنے، دہنے لگے ہیں جبکہ یہ ڈاکٹر اسے انگور کرتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد رالف کلینک میں تھا۔ نہایت بدتمیزی سے دروازے کو لات مار کر وہ گویا

کلینک پر حملہ کرنے لگسا۔ ڈاکٹر جو مریض کو چیک کر رہا تھا، چونکا کہ اتنی آواز پیدا کر کے کون آرہا ہے؟ رالف آیا اور کرسی گھسیٹ کر اس پر پھیل کر بیٹھ گیا۔ پورے کلینک میں خوف سا پیدا ہو گیا۔ لوگ گھبرانے لگے کیونکہ رالف جب سے آیا تھا، اپنا رعب جمانے کی خاطر لڑائی، مار کٹائی، توڑ پھوڑ کرتا۔ انتہائی جاہل بدتمیز تھا جسے انسانیت چھو کر نہیں گزری تھی۔ بے چارے مریض ڈرے سے بیٹھے تھے اور وہ کام رکوا کر ڈاکٹر کو سرخ سرخ آنکھوں سے گھور رہا تھا۔

”ڈاکٹر اتم مجھے بہت ناپسند کرتے ہو۔ یہ میں نے کئی بار نوٹس کیا ہے۔ وجہ بتانا پسند کرو گے؟“ بڑی کھردری آواز میں اس نے یوں پوچھا جیسے خود اپنی شخصیت کے بارے میں کچھ نہ جانتا ہو۔

”ہاں، میں تمہیں پسند نہیں کرتا۔“ ڈاکٹر ڈیرن نے اطمینان سے کہا۔ وہ بالکل نہیں ڈرا تھا۔

”وجہ؟“ رالف غرایا۔

”اوہ..... تو تمہیں وجہ کا پتا نہیں.....؟ لو میں بتا دیتا ہوں۔ تم بہت بڑے غنڈے ہو..... منشی سرگرمیوں میں ملوث ہو..... اپنے مقصد کے حصول کے لیے معصوم لوگوں کو تنگ کرتے ہو..... متعدد مرتبہ جیل کاٹ چکے ہو۔ لوگوں کا بیٹا و دبھر کر رکھا ہے۔ میرا خیال ہے اتنی وجوہات کافی ہیں تمہیں ناپسند کرنے کی۔“ ڈاکٹر نے اسے اس کے کروتے بتائے۔

”تم مجھے انگور کرتے ہو۔“ رالف دہاڑا۔

”کیونکہ تم اسی لائق ہو۔“ ڈاکٹر پر دہاڑنے کا کوئی اثر نہ ہوا۔

”تم جانتے نہیں ہو ڈاکٹر کہ میں کیا چیز ہوں اور میرے ایک اشارے پر کیا کیا ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر اسب مجھے ہلک کر پلٹے ہیں۔ مجھ سے ڈرتے ہیں۔ جانتے ہوتا، کتنا رعب ہے میرا اس کا لونی پر؟“ رالف آگے جھک کر گویا اسے پیچھے ہوئے سمجھا رہا تھا۔

”ہوں، جانتا ہوں کیا ہو تم..... غنڈا گردی کر کے معصوم لوگوں کو ڈرانے والے۔ لگتا ہے پہلے علاقے والوں نے تمہارا رعب ماننے سے انکار کر دیا تھا اس لیے اب یہاں آ گئے ہو۔“ ڈاکٹر طنزیہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ رالف ایک جھٹکے سے کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور میز پر ہاتھ مار کر سب چیزیں گرا دیں۔ اس نے اپنے دو ساتھیوں کو اشارہ کیا اور تڑپھوڑ شروع ہو گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں جاہل شخص نے یہ حالت کر دی کہ سارے مریض

ڈر کر بھاگ چکے تھے اور کلینک کا عملہ بے بسی سے کلینک کی دیگر گوں حالت دیکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی لیکن ناکام رہا۔

”آئندہ مجھ سے تمیز سے پیش آنا ورنہ..... ٹوٹنے کی اگلی باری تمہاری ہوگی۔“ تباہی مچا کر دمکی دیتے ہوئے رالف باہر نکل گیا اور ڈاکٹر ڈیرن خاموشی سے کرسی پر بیٹھ کر اپنے نقصان کا جائزہ لینے لگا۔ کئی دن لگ گئے پہلی پوزیشن میں واپسی کے لیے۔ ڈیرن کو شدید تاء تھا۔ وہ رالف کو سبق سکھانا چاہتا تھا لیکن وہ پولیس کی مدد نہیں لینا چاہتا تھا۔

وہاں جا کر یہ پھر واپس آئی جاتا ہے۔ میں خود ہی اسے سیدھا کروں گا۔ یہ میرا خود سے وعدہ ہے۔ کھولتے خون کے ساتھ وہ سوچ رہا تھا۔ اسے وہ طریقہ چاہیے تھا جو رالف کو ذلیل کر ڈالے۔ کچھ دن گزرے تھے کہ ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہوئے ایک سحر شاعر کی طبیعت خراب ہو گئی۔ ڈاکٹر ڈیرن کو فون کیا گیا۔ ڈاکٹر ریسٹورنٹ پہنچا اور مریض کو چیک کر کے اسے فوری اسپتال پہنچانے کا کہہ کر باہر نکلنے والا تھا کہ رالف آگیا۔

”کیوں ڈاکٹر! کیسے ہو؟ مریضوں کو تو ٹھیک کر لیتے ہو۔ تم سناؤ، اس دن کے ”علاج“ کے بعد تمہاری طبیعت کچھ ٹھیک ہوئی؟“ انتہائی جاہلانہ انداز میں رالف ڈاکٹر سے کہہ رہا تھا۔

”رالف! میرے منہ مت لگو۔ مجھے بہت کام ہے۔“ غصہ پیٹتے ہوئے ڈیرن نے کہا اور اپنا بیگ اٹھا لیا۔ ”رکو..... تم مجھے نظر انداز کر رہے ہو اور یہی بات مجھے غصہ دلاتی ہے۔“ رالف کو تو بہن کا احساس پھر سے ہونے لگا۔

”میں نہیں رک سکتا۔ تم کرتے رہو غصہ..... یا پھر میرے کلینک میں آ کر توڑ چھوڑ کر لینا۔“ نہایت سنجیدگی سے ڈیرن نے کہا۔ اسے ان لوگوں پر طیش آ رہا تھا جنہوں نے ڈر ڈر کر رالف کو سرچھا لیا تھا۔

”اگر میں یہ کہوں کہ مجھے چیک کرو اور دوا دو تو بھی نہیں رکو گے؟“ رالف سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ کیم کیم خوفناک رالف عام جملہ بول رہا تھا مگر وہ پھنکار رہا تھا اور ڈیرن نے یہ بات واضح محسوس کی۔

”میں خراب دماغ اور بیمار ذہنیت کا علاج نہیں کرتا۔“ ڈیرن نے کہا۔ اسے یہ خدشہ ستانے لگا تھا کہ رالف اس کے ساتھ کوئی بد تمیزی نہ کرے۔ اس نے بیگ

اٹھا کر چلنا شروع کیا۔ وہ مزید بد مزگی نہیں چاہ رہا تھا۔ ”ڈاکٹر! یہ تو طے ہے کہ ایک دن تم بھی مجھے یہاں کا حاکم سمجھو گے اور میری طاقت کے سامنے جھک جاؤ گے پھر اس روز میں تمہیں کہوں گا کہ کیونکہ تم اب مجھ سے ڈر گئے ہو۔ اس لیے میرے عتاب سے بچنے کے لیے 24 گھنٹے میں یہ علاقہ چھوڑ دو۔“ رالف نے بڑے غرور سے کہا۔ ڈیرن کے بڑھتے قدم رک گئے۔ وہ مڑا اور اس سے مخاطب ہوا۔

”اور تم کس طریقے سے 24 گھنٹے کے اندر اندر یہ جگہ چھوڑ دو گے؟“ ڈیرن نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

”اوہ..... تمہاری اتنی ہمت ہو گئی کہ رالف سے یہ سوال کر رہے ہو؟ ڈاکٹر! تمہاری قسمت اچھی ہے کہ آج میں ہڈیاں توڑنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔“ رالف چلا یا۔ ڈیرن کی متانت و بے خوفی نے اسے اس پر حملہ کرنے سے ہمیشہ روکا تھا۔

”اگر تم واقعی مرد ہو تو میری بات کا جواب دو۔“ ڈاکٹر نے چیلنج کیا۔ ریسٹورنٹ میں موجود لوگ سانس روکے دونوں کی گفتگو سن رہے تھے اور ڈر رہے تھے کہ نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔

”تو پھر کسی کو میرے منہ پر تھپڑ مارنا پڑے گا۔“ رالف نے شہر ٹھہر کر کہا۔ سب نے آنکھیں پھیلا کر اسے دیکھا۔

”اگر کوئی اتنی ہمت دکھائے تو میں 24 گھنٹے نہیں، فوراً یہ علاقہ چھوڑ دوں گا..... لیکن ڈاکٹر! مجھے یقین ہے کہ میں ہمیشہ تمہارے سر پر مسلط رہوں گا کیونکہ کسی میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ رالف..... ”دی رالف“ کے منہ پر تھپڑ مار سکے۔“ رالف نے اپنی بھاری آواز میں بات مکمل کی۔ ڈیرن اپنے کلینک کے لیے نکل آیا۔

☆☆☆

”مورس انکل! آپ پریشان نہ ہوں، میں کچھ نہ کچھ کر لوں گا۔“ ڈاکٹر ڈیرن اپنے باپ کے دوست سے فون پر بات کر رہا تھا۔

”تو پھر میں اپنے بیٹے کو تمہارے پاس بھجوا دوں؟ تم اس کے لیے ملازمت وغیرہ کا بندوبست کر لو گے نا؟“ مورس انکل نے پوچھا۔

”جی، جی..... ضرور بھیجیں۔ ادھر کچھ ایسی جابز ہیں جو اسے مل سکتی ہیں۔“ ڈیرن نے پھر یقین دہانی کروائی۔ ”اس کے باوجود کہ اس نے اپنی تعلیم مکمل نہیں کی اور

دیے بھی کافی سادہ لوح ہے..... بالکل احمق ہے۔“ مورس انکل نے کہا۔

”کہانا مجھ پر یقین رکھیں اور کل ہی اسے بھجوا دیں۔“ ڈیرن نے جلدی بات ختم کی اور مریض چیک کرنے لگا۔ اگلی صبح اس کے سامنے ڈینی کھڑا تھا..... مورس انکل کا بیٹا۔ وہ لمبا سفر کر کے آیا تھا۔ بہت تھکا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے اس کا کمراد کھاتے ہوئے آرام کرنے کا کہا اور خود اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

”ڈاکٹر صاحب! اس دن کے بعد رالف سے پھر تو سامنا نہیں ہوا؟“ ایک مریض جو قریب ہی کار ہائٹی تھا، نے چیک اپ کرواتے ہوئے ڈیرن سے پوچھا۔

”کس دن سے؟“ ڈیرن چونکا اور پھر خود ہی یاد آ جانے پر بولا۔ ”نہیں، ابھی تک تو اس سے سامنا نہیں ہوا لیکن میں اس روز سے اس شخص کی تلاش میں ہوں جو اسے تھپڑ مارے۔ میں کئی لوگوں سے ملا۔ ایسے لوگوں سے جو تھوڑی بہت رقم لے کر یہ کام کر سکتے ہیں لیکن کوئی بھی رالف کا نام سن کر مانا نہیں۔ سب اس سے بے تحاشا ڈرتے ہیں، خوفزدہ ہیں۔“ ڈیرن ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

”تو آپ کو یقین ہے کہ تھپڑ پڑنے کی صورت میں وہ واقعی ہماری اور اس علاقے کی جان چھوڑ دے گا ڈاکٹر ڈیرن! آپ اس مجرم کی بات کو اتنا سنجیدہ لے گئے ہیں، مجھے تو ایسا بالکل نہیں لگتا۔ ہاں..... یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ جو بے چارہ تھپڑ مارے گا، وہ اس کے عتاب کا نشانہ بن جائے۔“ ڈیرن کے مریض نے کہا۔

”نہیں، بالکل نہیں..... ہو ہی نہیں سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ رالف یہاں بالکل نہیں ٹھہرے گا اگر اس کے منہ پر ہاتھ جڑ دیا جائے۔ اس نے پورے ریٹورنٹ کے سامنے بات کی ہے۔ وہ کیسے کر سکتا ہے؟ میں ایسے لوگوں کی نفسیات جانتا ہوں۔ چاہے جتنے بڑے مجرم یا ظالم ہوں، اگر ایسی بات کہیں تو نہ چاہتے ہوئے بھی پورا اترتے ہیں۔ اسی لیے میں تھپڑ مارنے والے کی تلاش میں ہوں۔“ ڈیرن نے کہا اور اگلے مریض کو بلا لیا۔ اسے پشیمانی سی ہوئی کہ ایک مجرم کی بات کرتے ہوئے وہ اپنے فرائض بھول گیا اور خواہ مخواہ طویل گفتگو کر ڈالی۔ بھلا وہ مریض اس کی کیا مدد کر سکتا تھا جو وہ اس سے بات کرنے لگا۔

ڈیرن نے ایک دو بار سوچا کہ خود ہی رالف کو طمانچہ دے مارے لیکن پھر اسے اپنے پروٹیشن کا خیال آ گیا کہ میڈیکل کے شعبے سے وابستہ شخص ایسی حرکت کرتا بالکل اچھا

نہیں لگتا۔ رالف نے جان بوجھ کر ایسا چیلنج دیا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کوئی بھی ایسا نہیں کر پائے گا لیکن میں ضرور کچھ نہ کچھ کروں گا۔ بہت تنگ کیا تم نے مجھے اور میرا نقصان بھی کیا ہے۔ نیچ بریک کے لیے اٹھتے ہوئے ڈاکٹر نے سوچا۔ اس کا اٹھنے کا تو کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن اس وقت مریض نہ ہونے کے برابر تھے۔ دوسرا وہ ڈینی کے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہتا تھا۔

”آؤ ڈاکٹر! میں نے نیچ بتا لیا ہے۔“ ڈیرن اوپر پہنچا ہی تھا کہ کچن سے ڈینی کی آواز آئی۔

”ارے..... تم نے یہ کیا کیا۔ میں تو تمہیں کسی ہوٹل میں لے جانے کے لیے آیا تھا۔“ ڈیرن حیران اور خوش سا ہو کر بولا۔

”کوئی بات نہیں۔ میں سو کر اٹھا تو پانی پینے کے لیے کچن میں آیا۔ تمہارا کچن بہت پیارا لگا۔ میں نے سوچا چلو کچھ پکاتا ہوں۔ بس پھر نیچ بتا لیا۔“ ڈینی سادگی سے بولا۔ ڈیرن کو وہ کافی معصوم لگا۔ کافی عرصے پہلے جب ڈیرن نے اسے دیکھا تھا تو وہ چھوٹا تھا، اب نوجوان بن چکا تھا لیکن اس کے چہرے پر معصومیت ویسی کی ویسی ہی تھی۔

دونوں کھانا کھانے لگے۔ باتوں کے دوران ڈاکٹر نے سوال کیا۔ ”اچھا تو کیا کام کر سکتے ہو تم؟“

”میں نے چھوٹے موٹے کئی کام سیکھے ہیں۔ ایک دو جگہ چھوٹی موٹی جاب بھی کی ہے۔ مجھے لگتا ہے میں جو بھی ذمے داری طے، وہ نبھاسکتا ہوں۔ یعنی فیوچر کے لیے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔“ ڈینی نے بڑے ارادے سے کہا۔ اس کا انداز معصوم سا تھا۔

”کچھ بھی کر سکتا ہوں۔“ سن کر ڈیرن کے ذہن میں جھماکا ہوا۔ اس نے بڑی مسکراتی نظروں سے ڈینی کی طرف دیکھا۔

”ڈینی! میں تمہیں تمہارا فیوچر سنوارنے میں بھرپور مدد دوں گا۔ تم نے کہانا کہ تم کچھ بھی کر سکتے ہو تو پلیز میرا ایک کام کر دو۔ میں تمہاری زندگی سنوار دوں گا۔“ ڈیرن کو ڈینی میں اس کا لونی کا نجات دہندہ نظر آیا۔

”کیا کام؟“ ڈینی نے سوال کیا۔

”نیچ ختم کرو، بتاتا ہوں۔“ ڈیرن نے کہا۔ وہ نیچ کرنے کے دوران سوچنے لگا کہ یہ بہت اچھی بات ہے کہ ڈینی کافی دور سے آیا ہے اور رالف کے بارے میں ہرگز نہیں جانتا۔ اس لیے وہ اس سے ڈرے بغیر اس کے منہ پر تھپڑ مار سکتا ہے۔ وہ نیچ کے بعد ڈینی سے کرنے والی گفتگو کو ترتیب دینے لگا۔

”آج ہی یہ کام کروالیتا ہوں۔ اس کے بعد تو یہ ممکن ہی نہیں رہے گا کیونکہ باہر جاتے ہی رالف کے بارے میں اسے کسی نہ کسی طرح پتا چل جائے گا۔“ ڈیرن نے سوچا۔ اس نے شکر کیا کہ وہ نچ کے لیے باہر نہیں گئے اور ڈینی جب سے آیا تھا، کمرے میں تھا۔

”سنو ڈینی! تم نے جو کام کرنا ہے، وہ آج ہی کرنا ہوگا۔ کام بہت معمولی سا ہے لیکن میرے لیے بہت خاص بن چکا ہے۔“ ڈیرن نے کھانا ختم کرتے ہی بولنا شروع کر دیا۔

”معمولی کام..... خاص بن گیا ہے..... کیا مطلب ڈاکٹر؟“ ڈینی نے سوال کیا۔

”بتاتا ہوں سب۔ تم دھیان سے سن لو۔ بات یہ ہے کہ میرا ایک دوست باڈی بلڈر ہے اور کبھی کبھی شوقیہ غنڈوں جیسا روپ بھی دھار لیتا ہے۔ میں نے ایک روز اس سے کہا کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے تو وہ کہنے لگا کہ کبھی کبھی لوگوں پر رعب ڈالنے کو دل کرتا ہے اس لیے میک اپ کے ذریعے اور غنڈوں جیسے کپڑے، بالیاں، رنگ وغیرہ پہن لیتا ہوں اور پھر لوگ جو مجھے نہیں جانتے، مجھ سے مرعوب اور ڈرے ڈرے سے رہتے ہیں۔ میں نے اپنے باڈی بلڈر دوست کی بات کو ماننے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ ضروری تو نہیں کہ جو تمہارا ناواقف ہو، وہ تمہیں بہت بڑا غنڈا سمجھ کر تم سے ڈرے۔ اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے۔ اس بات پر ہماری ہلکی پھلکی بحث ہونے لگی۔ میں نے ہنستے ہوئے اس سے کہا کہ اگر کوئی ناواقف اچانک آکر اس کے منہ پر تھپڑ مار کر کہے کہ یہ کیا حلیہ ہے اور تم ہو کون؟ یہاں کیوں بیٹھے ہو؟ وغیرہ تو..... جواب میں اس نے کہا کہ اگر ایسا ہو جائے تو وہ مجھے اور تھپڑ مارنے والے کو منہ مانگا انعام دے گا۔“ ڈیرن نے اتنی ہی بات کی تھی کہ ڈینی بول اٹھا۔

”تم نے یہ معمولی کام کروانا ہے مجھ سے کہ میں تمہارے دوست کے منہ پر تھپڑ ماروں؟“ اسے فوراً ہی سمجھ آگئی تھی۔

”ہاں..... بالکل۔ میں یہی چاہتا ہوں۔ آج رات کو ہم وہاں جائیں گے جہاں میرا دوست اکثر آتا جاتا ہے۔ میں تمہیں وہاں لے جاؤں گا۔ تم بیٹھ جانا۔ میں تم سے کچھ فاصلے پر بیٹھ جاؤں گا تاکہ کسی کو پتا نہ چلے۔ بالخصوص میرے فریڈ کو کہ میں اور تم اکٹھے ہیں۔ اس طرح وہ چوکنا ہو سکتا ہے کیونکہ اسے معلوم ہے کہ میں اس

کا چیلنج پورا کرنے میں بہت دلچسپی لے رہا ہوں۔ اگر آج وہ اپنے پسندیدہ حلیے میں یعنی غنڈا بن کر آیا تو میں تمہیں اشارہ کر دوں گا۔ تم یہ کام کر دینا۔ ٹھیک ہے؟“ ڈاکٹر نے بات مکمل کی۔

”ٹھیک ہے۔ یہ تو بہت پُر لطف کام ہے۔ میں ضرور کروں گا۔“ ڈینی نے بڑے مزے سے مسکراتے ہوئے کہا۔ لگ رہا تھا کہ وہ تھپڑ مارنے کے لیے بہت بے چین ہے۔ رات کو دونوں ریسٹورنٹ میں داخل ہونے ہی والے تھے کہ ڈیرن کو کوئی ضروری کال آگئی۔

”تم اس سامنے والی ٹیبل پر بیٹھو، میں آتا ہوں۔“ کہہ کر ڈاکٹر نے ڈینی کو اندر بھیج دیا اور کچھ دیر بعد خود بھی آگیا۔ اس کے بعد بڑی آسانی سے ساڈا کام ہو گیا۔ رالف کے منہ پر تھپڑ مارا گیا۔ اس کے چہرے پر مشروب انڈیلا گیا اور ڈاکٹر اور ڈینی دونوں واپس آ گئے۔

☆☆☆

”ڈاکٹر! میری بات سنو۔“ ڈیرن اپنے بیڈروم میں داخل ہونے ہی والا تھا کہ ڈینی کی تیز آواز سنائی دی۔ وہ رک گیا۔

”ڈینی! میں بہت تھک چکا ہوں۔ صبح ساری تفصیل بتاؤں گا۔“ ڈیرن نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

”نہیں..... ابھی اور اسی وقت۔“ سادہ سا ڈینی ڈٹ گیا۔ ”مجھے سب بتاؤ، کون ہے یہ رالف؟ اس کی اور تمہاری دراصل کیا بات ہوئی تھی؟ تم نے یہ کیوں کہا تھا کہ تم کچھ نہیں کرو گے بلکہ اس معاہدے پر عمل کرو گے جو میرے اور تمہارے درمیان سب کے سامنے ہوا تھا۔ ڈاکٹر! یقیناً یہ کوئی دوستوں والی بات تو ہو نہیں سکتی۔ اس رالف کے تہور اور خوفناک چہرے کے بہت بگڑے تاثرات تو کوئی اور ہی کہانی سنا رہے تھے اور..... ڈاکٹر ڈیرن! مجھے یہ کیوں لگ رہا ہے کہ اس نے یہ روپ دھارا نہیں بلکہ یہ اس کا اصل روپ ہے۔“ ڈینی نے اسے کھینچ کر کرسی پر بٹھایا اور خود پاس بیٹھ کر تباہ توڑ سوال کرنے لگا۔ ڈینی سادہ تھا لیکن اتنا چبھی نہیں کہ بہت کچھ دیکھنے کے بعد بھی کچھ نہ سمجھ سکے۔ ڈیرن اس کی جانب کچھ دیر دیکھتا رہا اور پھر اسے ساری بات بتادی۔

”ڈاکٹر ڈیرن! تم نے خود کو اور مجھے بہت بُرا پھنسا لیا ہے۔“ پہلے سے گھبرائے ہوئے ڈینی نے مزید گھبراتے ہوئے کہا۔

”ہم بالکل نہیں پھنسے۔ بے فکر رہو، کچھ نہیں ہوگا۔“

ڈیرن نے اسے تسلی دی۔

”ڈینی! رالف نے اپنا کہا نبھایا اور شرمندہ ہو کر علاقہ چھوڑ گیا ہے۔“ ڈاکٹر نے ڈینی کے قریب آ کر کہا۔
ڈینی کا منہ کھل گیا۔ ”کیا واقعی؟ تم نے کچھ غلط تو نہیں سن لیا ڈاکٹر؟“

ڈیرن مسکرایا۔ ”ڈینی! تمہارا یہاں آنا ہمارے لیے بہت اچھا ثابت ہوا۔ تم نے بہت اچھا کام کیا اور..... یہ صرف تم ہی کر سکتے تھے کیونکہ تم اس رالف کی غنڈا گردی، دہشت، رعب سے لاعلم تھے۔ تم بالکل نہیں جانتے تھے کہ بات کیا ہے۔ جو جانتے تھے، وہ تو بڑی سے بڑی رقم لے کر بھی یہ کام کرنے کو تیار نہ تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ جان چلی جانے یا بہت سی ہڈیاں ٹوٹ جانے کے بعد رقم یا کوئی خوشی کس کام کی؟“

”تمہارا اس رالف سے، اس کی زندگی اور ہماری پر اہلم سے لاعلم ہونا ہمارے کام آ گیا۔ تم بڑے سکون سے بغیر ڈرے، بغیر جھکے یا گھبرائے اس کے پاس گئے اور ایک دوست کا دوست سمجھتے ہوئے بڑی بے تکلفی سے اس کے منہ پر تھپڑ جڑو دیا..... اس رالف کے منہ پر جس کی طرف دیکھتے ہوئے اکثر لوگ ڈرتے تھے اور جسے گمان تھا کہ اس کے چہرے تک بھی کسی کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ واہ! کیا بات ہے..... دیکھا تم نے ڈینی کہ لاعلمی، کسی چیز کو نہ جانتا انسان کو پریشان کرتا ہے لیکن یہاں پر اسی نہ جاننے نے کتنا بڑا سکون دیا ہے۔“

اب ڈینی بھی مسکرانے لگا تھا کیونکہ وعدے کے مطابق اسے ڈاکٹر ڈیرن سے انعام ملنا تھا اور خوف بھی دور ہو گیا تھا۔

”میں نے پر اس کیا تھا کہ تمہارے لیے اچھا کروں گا۔ میں نے سوچا ہے اس عفریت سے جان چھوٹ جانے کی خوشی میں تمہاری ادھوری تعلیم مکمل کرواؤں۔ یہ سارا خرچ میں اٹھاؤں گا اور تمہارے لیے پارٹ ٹائم جاب کا بھی بندوبست کردوں گا۔“ ڈاکٹر ڈیرن نے ڈینی کو خوشخبری سنائی۔

”تھینک یو ڈاکٹر! میں تعلیم مکمل کروں گا اور ہاں، اگر کوئی چیلنج پورا کرنا ہو یا کسی دوست سے شرط لگائی ہو تو مجھے بتانا۔ میں ہیلپ کروں گا۔“ ڈینی نے کہا۔ وہ خوف سے نکلنے کے بعد مکمل کرنس رہا تھا۔ جو اب ڈاکٹر نے بھی قہقہہ لگایا۔

”علم بڑی اچھی چیز ہے لیکن بعض اوقات لاعلمی بھی بڑے فوائد دے جاتی ہے۔“ توس پر مکھن لگاتے ہوئے ڈاکٹر ڈیرن سوچ رہا تھا۔

”ڈاکٹر! وہ مجرم ہے۔ اس کے لیے مارنا، کاٹ دینا کوئی بڑی بات نہیں۔ تمہیں کیا سوچھی کہ یہ کر بیٹھے۔ مجھ سے غلط بیانی کر کے کتنا خطرناک کام کروالیا اور ابھی تک اس خوش فہمی میں ہو کہ وہ شریفوں کی طرح وعدہ نبھائے گا..... اوہ گاڈ! میں یہاں آیا ہی کیوں؟ تم میرا مستقبل سنوارنے کی بات کر رہے تھے۔ میرا تو حال ہی بگڑ کر رہ گیا ہے۔ ڈاکٹر! تم نے کس بات کا بدلہ لیا مجھ سے؟“ ڈینی احتجاج کیے جا رہا تھا۔ ڈیرن نے اسے یہ مشکل اس کے کمرے میں بھیجا اور خود بیڈ پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔

”رالف علاقہ چھوڑ جائے گا یا ڈینی کے ساتھ ساتھ مجھے رالف کے رومل سے بچنے کے لیے یہاں سے جانا ہو گا؟“ ڈینی کی باتیں سن سن کر ڈیرن خدشات میں گھر گیا تھا۔ وہ واضح طور پر پچھتا رہا تھا۔

☆☆☆

صبح طلوع ہوئی اور بہت پیارا پیغام لیے جو ڈیرن کو فون پر اس کے دوست نے دیا۔

”ڈاکٹر! رالف چلا گیا۔“ وہ نیند میں تھا کہ اسے کال آئی۔ اس نے بند آنکھوں سے ”ہیلو“ کہا تھا۔ دوسری جانب سے بات سن کر وہ اچھل کر اٹھ بیٹھا۔ اس کی ساری نسلندی دور ہو گئی۔

”کیا کہا تم نے.....؟ واقعی رالف چلا گیا ہے؟“ اس نے یقین نہ کرنے والے انداز میں سوال کیا۔

”ہاں، میرے دوست! تمہارے تھپڑ کے چیلنج کے پورا ہوتے ہی وہ غنڈا رالف رات ہی علاقہ چھوڑ کر چلا گیا۔ لوگوں کے مطابق اس کا کہنا تھا کہ میں کسی سے ڈرتا نہیں لیکن اب اس جگہ نہیں رہ سکتا جہاں سب کے سامنے رالف ذلیل ہوا ہو..... وہ جا چکا ہے۔ سنا تم نے ڈاکٹر! رالف جا چکا ہے..... ہمیشہ کے لیے۔ ویل ڈن، مان گئے تمہیں اور تمہارے اس دوست کو جس نے ایک ہاتھ مار کر برائی کو ختم کر دیا۔“

ڈاکٹر ڈیرن بھاگتا ہوا بیڈ روم سے باہر آیا۔ ڈینی مکن میں ناشتا بنا رہا تھا۔ اس نے ڈیرن کو ناراض سی نظروں سے دیکھا۔

”ڈینی! لگتا ہے تمہیں کلنگ پسند ہے اس لیے میں نے سوچا ہے کہ تم جو بھی جاب کرو گے، پارٹ ٹائم میرے لیے کھانا بنانے کا کام تمہارے پاس ہی رہے گا۔“ ڈیرن بڑی خوش دلی سے بول رہا تھا۔ ڈینی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ غصے میں تھا کہ کیسے یہاں آتے ہی رالف جیسے بد معاش سے اس کی دشمنی کروادی گئی۔

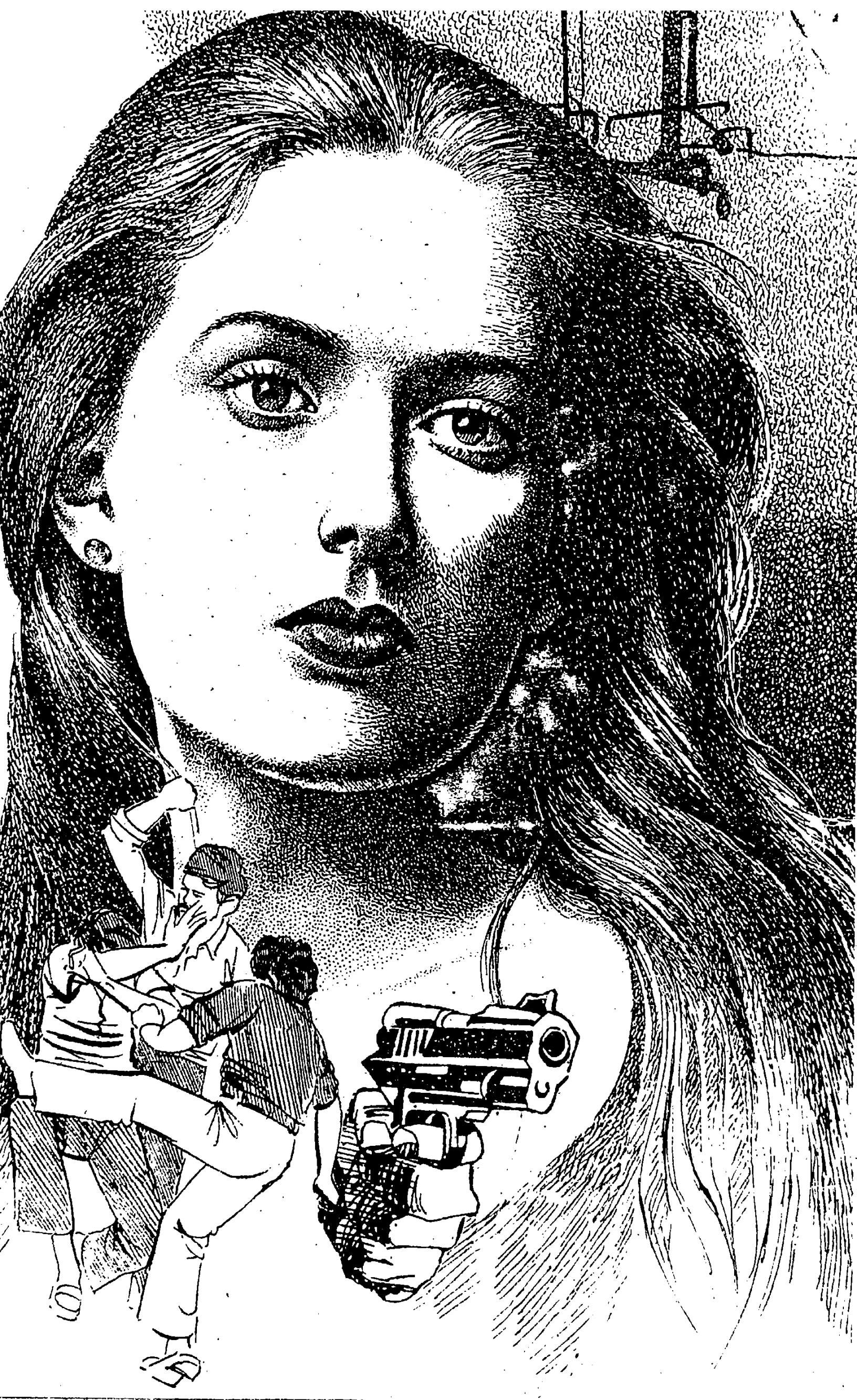
قسط نمبر: 36

ساز و ساز

استوری

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ تاہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تند و تیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابل شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پُر عزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جا رہے تھے... اس کی زندگی جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قراریوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تار عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا ٹوڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ وارداتِ قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہو سکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تحیر انگیز داستان



معاذ ایک ذہین لیکن متکون مزاج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جوائن کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ انسٹی ٹیوٹ سے واپس آ رہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو سڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی غر فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشری نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بشری ماس کیونی کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم وغیرہ لکھتی ہے۔ اس ویران جگہ بھی وہ ایک زیر تعمیر ہائٹی منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی آئی تھی۔ معاذ بشری کو بہ حفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کر دیتا ہے لیکن جن رئیس زادوں سے اس نے ان کا شکار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ایک دن جنگل کی سیر کے دوران وہ فوٹو گرافی کے شوق میں سب سے الگ تھلک ہو جانے والے معاذ کو بے خبری میں گھیر کر بری طرح زد و کوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دے دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس نہ آنے پر انتظامیہ کے افراد، پولیس اور ریسکیو ذرائع کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جوگی کی جھونپڑی میں پاتا ہے۔ جوگی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ معاذ کا موبائل جنگل میں ہی کہیں گر جاتا ہے اور جوگی کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا جس سے باہر کی دنیا سے رابطہ کیا جاسکے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے، جوگی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نوازا کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے پراسرار علم سکھانے کی ہامی بھر لیتا ہے اور معاذ واقعی اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ادھر جائے وقوعہ سے ملنے والے معاذ کے کمرے سے جب تصویریں نکلوا لی جاتی ہیں تو ایک ایسی تصویر بشری کی نظر میں آ جاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پروجیکٹ کے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشری تحقیق کر رہی تھی۔ بشری کے اپنے والد جرنلسٹ ہوتے ہیں اور حق گوئی ان کے خون میں شامل تھی۔ اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشری کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ صدمے سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باذل نامی شخص کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشری انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دنوں میں ہی معاذ واپسی کا ارادہ کرتا ہے تاہم ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا عرفان اللہ اور یزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو وقاص نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باذل اچانک بشری کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر دیتا ہے۔ معاذ کو واپس لانے کے لیے اوجھے جھککنڈے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اسے واپس آنے کا پیغام دیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کر کے اسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات لی جاتی ہیں، نہ بتانے پر اس کے بھائی کا ایک گردہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشری بھی انتقام کی آگ میں جلتی ہوئی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہو جاتی ہے۔ معاذ کے دوست عالم شاہ کے بہنوئی کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ کئی فنون میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے پہناؤ کر کے اس کے دماغ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ فیضو سے حاصل انوکھے علم کی بدولت ان کا معمول نہیں بنتا۔ عالم شاہ اور اس کا نوکر سرد، باذل کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ عالم کی بہن نجل شاہ کے نومولود بیٹے کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اغوا کا الزام لطیف سومرو پر آتا ہے۔ عالم شاہ، باذل کی قید میں موجود ایک زخمی شخص کی مدد سے وہاں سے فرار ہو جاتا ہے۔ ادھر بشری دئی پہنچ جاتی ہے۔ وہاں وقاص اسے باربی کے روپ میں پہچان لیتا ہے اور ان دونوں کے درمیان اعتماد کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ وہ سلطان کو مارنا چاہتی ہے تاہم وقاص اسے ایسا کرنے سے روکتا ہے۔ ادھر عالم شاہ، باذل کی قید سے نکل کر اس کا پیچھا کرتا ہے تاہم وہاں اچانک فائرنگ اور دھماکے ہونے لگتے ہیں۔ وہ وہاں معاذ کو دیکھتا ہے۔ صداقت شاہ، لطیف سومرو کو گھیرنے کے لیے اس کی خفیہ بیوی اور بچے کا گھونج لگاتے ہیں اور بچے کو اغوا کر لیتے ہیں۔ لطیف سومرو مجبور ہو جاتا ہے۔ معاذ کو اس کے گھر والوں سے ملنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ عالم شاہ کو اس کے والد انڈیا روانگی کا عندیہ دیتے ہیں۔ ادھر معاذ بھی ایک مشن پر سونیا کے ساتھ انڈیا روانہ ہوتا ہے تاہم کچھ لوگ سکھ یا تریوں سے بھری بس کو یرغمال بنا لیتے ہیں۔ معاذ اور سونیا نہ خانے کے تمام افراد کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔ صداقت شاہ کے انڈیا میں موجود رشتے دار کے ہاں شادی ہوتی ہے۔ عالم شاہ، نجل اور سرد انڈیا روانہ ہو جاتے ہیں۔ اتر پورٹ سے گھر روانگی پر راستے میں کچھ ٹیرے نہیں لوٹ لیتے ہیں۔ عالم شاہ ایکشن میں آتا چاہتا ہے تاہم اجالا نامی عالم شاہ کی کزن اس کا راستہ روک لیتی ہے۔ گھر پہنچنے پر پولیس کی ریڈ ہوتی ہے اور وہ عالم شاہ اور سرد کو لے جاتے ہیں۔ ادھر بشری اور وقاص باذل کو اسپتال میں

مارنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ بچ جاتا ہے۔ معاذ اور سونیا اپنے سہولت کاروں سے مل جاتے ہیں۔ عالم شاہ اور سرمد کو تشدد کا نشانہ بنا کر ویرانے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ واپس اپنے میزبانوں کے ہاں پہنچ جاتے ہیں۔ شادی کے دوران انہیں پتا لگتا ہے کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں اجالا اور اس کا عاشق شامل ہوتے ہیں۔ وہ چھپ کر ان کی باتیں سن رہا ہوتا ہے کہ اسے چھاپ لیا جاتا ہے۔ تاہم وہاں مارا ماری ہوتی ہے اور اجالا کا عاشق مارا جاتا ہے۔ پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ ان کے کزن انہیں اپنے دوسرے خفیہ ہنگامے پر پہنچا دیتے ہیں جہاں کچھ لوگ ان پر حملہ کر دیتے ہیں۔ وہ وہاں سے بحفاظت نکل جاتے ہیں۔ ادھر معاذ کو سونیا اپنے ساتھ نئے مشن پر لے کر جاتی ہے جس میں ایک ریلوے لائن کو دھماکے سے اڑانا ہوتا ہے۔ معاذ ایسا نہیں چاہتا اس لیے وہ ٹرین کی آمد سے قبل بارودی دھماکا کر دیتا ہے۔ وہ زخمی ہو جاتا ہے اور اسے ہندو سادھو اپنی کتیا میں لے جاتا ہے جہاں اس کی اچھی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ سونیا کے آدمی معاذ کو تلاش کرتے ہیں مگر ناکام ہو جاتے ہیں۔ ادھر عالم شاہ اور سرمد خفیہ ذریعے سے بارڈر پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ دھریے جاتے ہیں اور ”را“ کی قید میں پہنچ جاتے ہیں۔ ادھر بشری باذل کو مارنے کی کوشش میں خود نشانہ بن جاتی ہے۔ معاذ سادھو کی مدد سے ایک انڈین ہیروئن کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ وہیں اسے عالم اور سرمد کی گرفتاری کا پتا چلتا ہے۔ معاذ ڈاکٹر فردوس سے ملتا ہے اور اسے سب کی مدد کرنے کا کہتا ہے۔ عالم اور سرمد قید سے فرار کا سوچتے ہیں اور دھر لے جاتے ہیں جس کی پاداش میں انہیں مزید تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ علینہ اور وقاص وغیرہ کو لالہ عیسیٰ ملک سے باہر نکال دیتا ہے اور ہر ممکن احتیاط کی ہدایت کرتا ہے لیکن علینہ پاکستان میں ٹوبہ سے رابطہ کرتی ہے جو ان کے لیے مصیبت بن جاتا ہے۔ ٹوبہ پر تیزاب پھینک دیا جاتا ہے۔ وقاص، علینہ اور اس کے گھروالوں کو مار دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس معاذ کو دیوانی شخص سے مدد لینے کا کہتی ہے۔ معاذ اپنے کزن کو پاکستان کال کرتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ اس کے گھروالوں کو مار دیا گیا ہے۔ وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کی ٹھان لیتا ہے۔ ادھر ڈاکٹر فردوس کو اس کے سسرال والے بھل کو بھگانے کی پاداش میں تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ معاذ، عالم اور سرمد کی رہائی کے لیے کارروائی کرتا ہے اور انہیں ”را“ کی قید سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن عالم اور سرمد کو دیوا کے آدمی کسی دوسری جگہ پہنچا دیتے ہیں۔ سونیا معاذ کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ ادھر باذل ایک جگہ لالہ عیسیٰ کی موجودگی پر کارروائی کرتا ہے تاہم لالہ خود کو گولی مار کر ختم کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس کا انتقال ہو جاتا ہے۔ دیوا گینگ ڈاکٹر فردوس کی میت اٹھنے پر وہاں فائرنگ کر دیتے ہیں۔ پولیس دیوا کو گھیر لیتی ہے۔ معاذ دیوا اور اس کے آدمیوں کو نکالنے کے عوض عالم کا پتا معلوم کر لیتا ہے۔ سونیا اور معاذ حیدر آباد نواب بدرالدین کی حویلی پہنچ جاتے ہیں۔ تاہم کالے خان اور رادھا دیوی کو میڈیم ایکس کے شکنجے سے چھڑانے کے لیے انہیں واپس آنا پڑتا ہے، کالے خان کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ نواب صاحب کی حویلی میں عالم اور سرمد کی رہائی کے لیے کارروائی کر کے انہیں رہا کر لیتا ہے۔ وہ لوگ نئے ٹھکانے پر پہنچتے ہیں تو وہاں معاذ سے ملنے جا روئی نامی شخص آتا ہے۔ اسے معاذ نے ”را“ کی قید سے نکالا ہوتا ہے۔ ادھر بھل کا بیٹا اعظم اپنی ناک میں پتھر پھنسا لیتا ہے۔ جا رو اور معاذ، بھل سمیت اسپتال جاتے ہیں اور پہچان لیے جانے پر پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ پولیس سے مقابلے کے بعد وہ ایک بستی میں پناہ کے لیے گھس جاتے ہیں اور دو لوگوں کو یرغمال بنا کر ان کی جھونپڑی میں قیام کرتے ہیں۔ ادھر سونیا عالم وغیرہ سمیت سب کو ٹھکانا بدلنے کا کہہ کر معاذ کی تلاش میں نکلتی ہے اور اسے بستی میں پہنچنے پر معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ معاذ اور جا رو وغیرہ انوپ نامی شخص کے ساتھ اس کے مالک کے ہنگامے میں قیام کرتے ہیں۔ سونیا بھی معلومات حاصل کرتی ہوئی مذکورہ ہنگامے تک پہنچ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور سرمد بھی سونیا کا پیچھا کرتے ہوئے وہیں پہنچ جاتے ہیں۔ ادھر وقاص، علینہ و دیگر لوگ زندہ ہوتے ہیں۔ وقاص حلیہ بدل کر گلو کا باڈی گارڈ بناتا ہے۔ وہ معاذ کو تلاش کرنے کے لیے انڈیا روانہ ہوتا ہے۔ وہاں اس کی گل خان سے ملاقات ہوتی ہے اور معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ سونیا، معاذ اور دیگر ساتھیوں سے مل جاتی ہے تاہم وہ جس ہنگامے میں ہوتے ہیں وہ دشمن کا ہوتا ہے۔ دشمن سب کو بے ہوش کر کے کہیں لے جا رہے ہوتے ہیں کہ ان کی گاڑی کو حادثہ پیش آ جاتا ہے۔ ان سب کو چینی بمکشوٹھی امداد دیتے ہیں اور ان سے پوچھ گچھ کی جاتی ہے۔ بھل کی حالت تشویشناک ہوتی ہے اور اسے وہاں موجود ایک وید دیکھتا ہے۔ ادھر لالہ واپس اپنے لوگوں میں پہنچ کر ایکشن میں آ جاتا ہے اور حامد کو اغوا کر دیتا ہے۔ لالہ میڈیم ایکس کے ٹھکانے کی نگرانی کرواتا ہے۔ ادھر سونیا پر تشدد کر کے اس سے معلومات لی جاتی ہیں تاہم وہ اپنے گلے پر خنجر پھیر لیتی ہے۔ باذل، معاذ وغیرہ کے ٹھکانے سے باخبر ہو جاتا ہے۔ ادھر لالہ کے آدمی میڈیم ایکس کی نگرانی کے چکر میں مارے جاتے ہیں۔ لالہ اپنے آدمیوں کو انڈر گراؤنڈ کر دیتا ہے۔ معاذ وغیرہ جہاں ہوتے ہیں وہاں دشمن حملہ کر دیتا ہے اور کافی مارا ماری ہوتی ہے۔ باذل، معاذ کا پیچھا کرتا ہے اور چینیوں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ معاذ چینیوں کے ساتھ مل کر دشمنوں کے خلاف کارروائی کرتا ہے۔ اس دوران اسے گل خان نظر آتا ہے مگر گل خان کی حالت اچھی نہیں ہوتی۔ اسے پھانسا کر کیا گیا تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

معاذ نے صورت حال کا درست اندازہ کرتے ہوئے کہا کہ گل خان پر ہٹائز م کیا گیا ہے جسے سن کر سب چونک گئے تھے۔
”اوہ مان گاڈ! میں بھی کہوں کہ اس اچھے بھلے بندے کو کیا ہو گیا ہے۔“ وہی نے سن کر افسوس کا اظہار کیا۔

”اب کرنا کیا ہے؟“ اب تک خاموشی اختیار کیے رکھے جارہے تھے سنجیدگی سے سوال کیا۔

”ارد گرد کا جائزہ لو پھر اس عورت کو ٹریپ کرتے ہیں۔ معلوم تو ہو کہ یہ سارا کیا چکر ہے اور خان کیسے ان کے ہاتھ لگا۔“ معاذ نے اس سے کہا اور پھر خود زانگ تاؤ سے رابطہ کرنے لگا۔

”مجھے اپنا ایک ساتھی، ایک اجنبی عورت کے ساتھ دکھائی دیا ہے۔ ہم انہیں اپنے قبضے میں لینا چاہتے ہیں۔ تم چیک کرو کہ آس پاس سب کلینٹر ہے یا نہیں۔ اور۔“

”اوکے۔ ہم چیک کرتے ہیں۔ اور۔“ زانگ تاؤ نے جواب دیا۔ چارو اس کے کہنے پر پہلے ہی حرکت میں آچکا تھا اور امید تھی کہ تھوڑی ہی دیر میں آس پاس کی مکمل صورت حال سامنے آجائے گی۔ صورت حال سامنے آنے تک وہاں جاری ٹانگ دیکھنا ان کی مجبوری تھی۔ عورت کی گل خان سے چھیڑ چھاڑ اور انکھیلیاں مسلسل جاری تھیں جس کے باعث اس کے ہر اس میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔

”اچھا ایک بات بتاؤ خان! اگر ابھی یہاں کوئی برفانی چینا آجائے تو تم مر کر اس کے پیٹ میں جانا پسند کرو گے یا جان بچانے کے لیے کھائی میں چھلانگ لگا دو گے؟“

”کھائی میں چھلانگ لگانے سے جان کیسے بچے گا؟ تم نے ابھی تو ام کو بتایا تھا کہ کھائی اتنا گہرا اور خطرناک ہے کہ گرنے والا چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ جائے گا۔“ خوف کے باوجود خان کا جواب اس کی شخصیت کے عین مطابق تھا جسے سن کر عورت زور سے ہنسی اور پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔

”واقعی، میرا سوال غلط تھا۔ مجھے تم سے پوچھنا چاہیے تھا کہ تم برفانی چیتے کے ہاتھوں مرنا پسند کرو گے یا کھائی میں گر کر؟“

”ام کو تو لگتا اے کہ ام ان دونوں باتوں سے پہلے سردی سے جم کر ای مر جائے گا۔“ خان کے دانت باقاعدہ بجھنے لگے تھے اور لہجے میں محسوس کی جانے والی بے بسی تھی۔ اس کی بے بسی نے عورت کو کسی لطیفے کی طرح لطف دیا اور وہ زور سے کھلکھلا کر ہنس دی۔ اس کی ہنسی پر معاذ کا خون کھول اٹھا۔

”دنیا کی کوئی عورت ہنستی ہوئی اتنی بری بھی لگ سکتی ہے، یہ آج مجھے پہلی بار معلوم ہوا ہے۔“ وکی نے بھی یقیناً وہی کچھ محسوس کیا تھا جو اس نے، اس لیے تلخ لہجے میں

بڑبڑایا۔ اسی وقت اپریٹس پر اشارہ موصول ہونے لگا۔ ”آل از کلینٹر۔ اوپر ایک آدمی تھا گن کے ساتھ۔ اسے خاموش کر دیا ہے۔ اور۔“ زانگ تاؤ کی آواز نے اس کے قدموں میں پڑی زنجیریں کھول دیں۔ وہ یکدم ہی اوٹ سے نکل کر عورت کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ وہ ہڑبڑا کر کھڑی ہوئی اور اپنے بھاری اونٹنی کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالنا چاہے۔

”ہاتھ اوپر۔“ معاذ اپنی گن کا رخ اس کی پیشانی کی طرف کرتے ہوئے غرایا۔ وہ ساکت ضرور ہو گئی لیکن ہاتھ اوپر نہیں کیے۔

”میری بات ماننے میں ایک سیکنڈ مزید لگا یا تو تم خود اوپر چلی جاؤ گی۔“ اس کے لہجے میں اتنی قطعیت تھی کہ وہ مزید مزاحمت نہیں کر سکی اور جلدی سے دونوں ہاتھ اوپر کر دیے لیکن ساتھ ہی اس نے ایک عجیب حرکت کی۔ وہ بلند آواز میں گل خان کو پکارنے لگی۔

”خان..... خان.....! دیکھو یہ دشمن آگیا ہے۔ مجھے اس سے بچاؤ۔“

”ام کیسے بچائے؟ ام اس پتھر سے اترے گا تو کھائی میں گر جائے گا۔“ خان کے معصومیت سے دیے گئے جواب پر معاذ کا زوردار تہقہہ لگانے کا دل چاہا جبکہ وہ عورت براہیختہ ہو گئی اور طیش سے بولی۔

”کچھ نہیں ہوگا اسٹوپیڈ! میرا حکم ماننا ہر حال میں.....“ ابھی اس کا جملہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ معاذ نے گولیاں چلا دیں۔ خاموش ہتھیار سے نکلی ہوئی بے آواز گولیاں سن سن کرتی عورت کے دونوں کانوں کے پاس سے گزریں۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے اور خوفزدہ نظروں سے معاذ کی طرف دیکھنے لگی۔ وکی جواب تک آڑ میں ہی کھڑا رہا تھا، اس مرحلے پر باہر نکل آیا اور پتھر پر متذبذب کھڑے خان کا ہاتھ پکڑ کر اسے نیچے اتارا۔ وہ قدم زمین پر پڑتے ہی پہلے چینا پھر حیرت سے یوں ارد گرد گھوم کر دیکھنے لگا جیسے گمان کر رہا ہو کہ وہاں موجود کھائی کسی معجزے کے اثر سے غائب ہو گئی ہو۔

”یہاں کوئی کھائی نہیں ہے میرے بھائی! وہ عورت تم سے جھوٹ بول رہی تھی۔“ وکی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے ہمدردی سے سمجھایا۔ اس کی بات پر گل خان نے پہلے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا پھر عورت اور معاذ کی طرف متوجہ ہوا۔ معاذ عورت کے دونوں ہاتھ پشت پر باندھ رہا تھا۔

ارسال کردی گئی ہوں۔

زانگ کی راہنمائی میں مذکورہ غار میں پہنچ کر ان سب کو ہی خوشگواریت کا احساس ہوا۔ غار اندر سے صاف ستھرا بھی تھا اور وہاں درجہ حرارت بھی واضح طور پر باہر کے مقابلے میں مختلف تھا۔ اگرچہ وہ کئی دنوں سے اس برف زار میں مقیم تھے اور انہیں مناسب گرم لباس بھی فراہم کر دیے گئے تھے لیکن شدت کی سردی مزاج پر اثر انداز ہوتی تھی اور کبھی کبھی توانائی کی کمی کا احساس ہونے لگتا تھا۔ ہاں، زانگ اور اس کے ساتھیوں کی بات مختلف تھی۔ ان کے جسم برہوں سے اس علاقے میں قیام کے باعث موسم اور ماحول سے ہم آہنگ ہو گئے تھے اور سردی اس طرح سے نہ ستاتی تھی جیسے معاذ اور اس کے ساتھیوں کو۔ ان کے حساب سے اس غار کا ایک مثبت پہلو یہ بھی تھا کہ اس کا دہانہ مختصر تھا اور بوقت ضرورت ایک بڑے پتھر سے بند کیا جاسکتا تھا۔

”میرے ساتھی آس پاس پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ یہاں کی نگرانی کا کام بھی کریں گے اور ان کے کیمپ کے بارے میں ضروری معلومات کا حصول بھی۔ تم اس دوران اس عورت سے جتنی کام کی باتیں اگلا سکتے ہو، اگلا لو۔“ وہ سب غار میں پہنچ کر ریلیکس ہو گئے تو زانگ نے معاذ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”سب سے پہلے تو ہمیں اس کی تلاشی لینا ہوگی۔“ معاذ نے پُرخیال نظروں سے لارا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اسے خدشہ تھا کہ اس کے پاس ہتھیار کے علاوہ کوئی ایسا آلہ بھی ہو سکتا ہے جو اس کے ساتھیوں کو اس کی لوکیشن سے آگاہ کر دے۔

”بالکل لو تلاشی۔ یہ تو سب سے ضروری کام ہے۔“ زانگ نے اس کے خیال کی تائید کی۔

”سوال یہ ہے کہ یہ کام کرے گا کون؟“ معاذ نے اصل مسئلہ بیان کیا۔ وہ عورت دشمنوں کی ساتھی سہی لیکن اس میں اور اس کے ساتھیوں میں ایک فطری جھجک تھی جو ایک عورت کی جامہ تلاشی لینے میں خارج تھی۔

”یہ کوئی ایسے وچار کی بات نہیں۔ میرا کوئی بھی ساتھی کر دے گا یہ کام۔“ زانگ اس کا مسئلہ سمجھ کر اطمینان سے بولا اور اپنے ساتھ موجود اپنے ساتھی کو اشارہ کیا۔

”میرے ساتھ یہ سلوک تمہیں بہت مہنگا پڑے گا۔ تم زیادہ دیر تک اپنے اس بل میں چھپے نہیں رہ سکو گے۔“ لارا، زانگ کے ساتھی کو تلاشی کے لیے اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر دھمکی آمیز لہجے میں بولی۔

”کیا کرتی اے تم لوگ؟ یہ امارا لارا میم کو کیوں باندھتی اے تم؟“ وہ اس منظر کو دیکھ کر بدک ہی گیا اور ان دونوں تک پہنچنے کی کوشش کی۔ وکی نے جھپٹ کر اس کی بغلوں کے نیچے ہاتھ ڈال کر اسے پشت پر سے جکڑ لیا۔ گل خان خود کو اس کی گرفت سے آزاد کرنے کے لیے اپنا پورا زور لگانے لگا۔ وکی کے لیے اسے سنبھالنا دشوار ہو گیا۔ اگر مقابل کوئی دشمن ہوتا تو اسے ایک آدھ ضرب لگا کر قابو کیا جاسکتا تھا۔ گل خان کے ساتھ ایسا سلوک کرنے کو اس کا دل بھی نہیں مان رہا تھا۔ اس کی یہ مشکل جارو کی آمد پر آسان ہوئی۔

”خاموش۔ اگر اب آواز نکالی یا کوئی اور الٹی سیدھی حرکت کی تو پہلی گولی تمہاری اس میڈم کو ماروں گا اور دوسری تمہیں۔ اگر اپنی اور اپنی میڈم کی سلامتی چاہتے ہو تو وہی کرو جو کہا جائے۔“ جارو کی کٹپٹی پر گن رکھ کر دی گئی یہ دھمکی پُر اثر ثابت ہوئی۔ گل خان نے دھمکی سن کر لارا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ خود مشکل میں پڑی ہوئی تھی اس لیے سر کی جنبش سے گل خان کو بات مان لینے کا اشارہ کیا۔ اس کا اشارہ ملتے ہی گل خان نے کسی پالتو جانور کی طرح گردن جھکا دی۔

”لگتا ہے میڈم نے خان کی گھومی ہوئی کھوپڑی کو بالکل ہی گھما دیا ہے۔ ظالم ہم میں سے کسی کو پہچان تک نہیں رہا ہے۔“ وہ لوگ لارا اور گل خان کو ہتھیاروں کی زد میں لے کر ایک طرف بڑھے تو وکی نے دھیرے سے جارو کے کان میں سرگوشی کی۔

”مجھے تو بیچارے پر رحم آرہا ہے۔ بیچارہ پٹھان اپنی آن پر جان دینے کا حوصلہ رکھتا تھا اور ظالموں نے اسے مداری کا بندر بنا کر رکھ دیا ہے۔“ جارو متاسف تھا۔

”اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ وکی ہمیشہ پُر امید رہنے والا بندہ تھا اور شاید یہ اس جیسے خوش امیدوں کی امید قائم رکھنے کا سلسلہ تھا کہ اللہ تعالیٰ بدترین حالات میں بھی آسانی کا کوئی نہ کوئی انتظام کر دیتا تھا۔ اب بھی زانگ نے معاذ کو اطلاع دی کہ اس کے ساتھیوں نے ایک ایسا قدرتی غار تلاش کر لیا ہے جہاں کچھ افراد آسانی سے روپوش رہ سکتے ہیں۔ ان لوگوں کے پاس قیام کے لیے خیمے موجود تھے لیکن اب جبکہ وہ دشمنوں کے کیمپ سے اس قدر قریب تھے، خیمے لگانا مناسب نہ ہوتا۔ خصوصاً معاذ اور اس کے ساتھیوں کا سامنے آنا بالکل مناسب نہیں تھا کہ اس بات کا بہت زیادہ امکان تھا کہ ان کی تصاویر پہلے ہی وہاں

”ہم اب تک سارے مہنگے سودے ہی کرتے رہے ہیں۔ یہ ایک اور سہی۔ بس تم خیال رکھنا کہ تم کوئی ایسی حرکت نہ کرو کہ مجھے تم پر گولی چلانا پڑے۔ مجھے ایک عورت کی جامہ تلاشی لینے میں بے شک عار ہے لیکن میری گن تمہارے وجود میں روشن دان کھولنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرے گی۔“ معاذ کا لہجہ اس سے بھی زیادہ سنگین ہو گیا۔ لارا ایک ماہر نفسیات تھی اور اچھی طرح اس لہجے کو پہچان سکتی تھی کہ وہ جو کہہ رہا ہے، اس پر عمل کرنے کا پورا پورا ارادہ بھی رکھتا ہے۔ جان کی سلامتی کے لیے وہ طوعاً و کرہاً لب بھینچ کر خاموشی اختیار کر گئی لیکن اچانک ہی وہاں چھوٹا سا ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ ابھی زانگ کے ساتھی نے اس کا کوٹ اتارنے کے بعد بندشوں کو کاٹا ہی تھا کہ گل خان کسی بگولے کی طرح اس سے جا کر ٹکرایا۔

”دور ہو خانہ خراب۔ امارے ہوتے تم امارا میڈم کو ہاتھ نہیں لگا سکتی۔“ وہ بڑی بیدردی سے تلاشی کا ارادہ رکھنے والے آدمی کو رگید رہا تھا۔ اس آدمی نے بھی زچ ہو کر اس پر ہاتھ اٹھا دیا۔

”اسے مارنا نہیں۔ یہ ہمارا ساتھی ہے لیکن اس وقت مینٹلی ان لوگوں کے کنٹرول میں ہے۔“ گل خان کو پہلی ضرب لگتے ہی معاذ بے قراری سے چلایا۔

یہ وہ لمحہ تھا جب لارا نے محسوس کیا کہ اس کی توجہ اس پر سے ہٹ چکی ہے۔ اس نے موقع کا فائدہ اٹھانے کا سوچا اور اپنی گن نکالنے کے لیے جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ یہ اس کی بد قسمتی تھی کہ معاذ کو فوری طور پر اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ اس نے لارا کے متحرک ہاتھ کو دیکھا اور بلا تکلف گولی چلا دی۔

لارا کا ہاتھ ابھی کوٹ کی جیب سے فاصلے پر ہی تھا کہ اس کی کلائی میں ایک سوراخ ہو گیا اور خون کی سرخی تیزی سے اس کی آستین پر پھیلنے لگی۔ اس سرخی کے نمودار ہونے سے قبل اس کے حلق سے ایک بھیا نک چیخ برآمد ہو چکی تھی۔ اس کی چیخ اور خون کی سرخی نے گل خان کو مزید براہیختہ کر دیا اور اس نے گالیاں دیتے ہوئے معاذ پر حملہ آور ہونا چاہا۔ اب اسے مزید ڈھیل دینے کی گنجائش نہیں تھی۔ جارو اور وکی بیک وقت حرکت میں آئے اور اس کے معاذ تک پہنچنے سے قبل ہی اسے چھاپ لیا۔ وہ جس جنون میں مبتلا تھا، اس کے تحت ان دونوں پر بھی تابڑ توڑ کے برسائے کی کوشش کی لیکن وکی اور جارو بہر حال لڑنے بھڑنے کے فن میں اس سے زیادہ ماہر تھے۔ ان دونوں نے مل کر جلد ہی اسے قابو

کر لیا اور مجبوری کے تحت ہی سہی، اس کے ہاتھ پیر باندھ کر اسے بے بس کرنے کے ساتھ منہ میں بھی کپڑا ٹھونس دیا۔ ادھر لارا اپنی زخمی کلائی کو دوسرے ہاتھ سے تھامے کراہے جارہی تھی۔ اس کا سارا تئنا ایک گولی کھا کر ہی ختم ہو گیا تھا۔ اسے اپنے اندازے کی درستگی کا ثبوت مل چکا تھا کہ وہ سر بھرا اپنی ہر دھمکی کو عملی جامہ پہنانے کی نیت ہی نہیں، ہمت بھی رکھتا ہے۔

”لینا کوٹ اتار کر پھینک دو۔“ معاذ نے اس کی کراہوں کو قطعی نظر انداز کرتے ہوئے سخت لہجے میں حکم دیا۔ تکلیف میں مبتلا ہونے کے باوجود لارا نے خاموشی سے اس کے حکم کی تعمیل کی لیکن یہ عمل اس کے لیے حد درجہ تکلیف دہ ثابت ہوا اور کوٹ کے جسم سے الگ ہونے تک کراہوں اور خون کے اخراج میں مزید تیزی آگئی۔

”اس کا کوٹ چیک کر دو کی اور تم اس کی جامہ تلاشی لو۔“ معاذ نے وکی کے ساتھ ساتھ گل خان کی مداخلت کے باعث تلاشی لینے سے رک جانے والے آدمی کو بھی حکم دیا۔ ”پہلے میرے زخم کی بینڈج تو کرواؤ۔ اگر اسی طرح خون بہتا رہا تو میں مر جاؤں گی۔“ لارا نے کراہتے ہوئے احتجاج کیا۔

”تلاشی کا عمل پورا ہونے سے پہلے تمہیں کوئی سہولت نہیں دی جائے گی۔ اب تم فیصلہ کر لو کہ تم کتنی دیر تک اپنے زخم سے خون بہنا فوراً کر سکتی ہو۔“ معاذ اسے کوئی رعایت دینے کے لیے تیار نہیں تھا کہ ایک تو وہ ان لوگوں کی ساتھی تھی جنہوں نے اس سمیت کئی لوگوں کی زندگیاں برباد کر کے رکھ دی تھیں۔ دوسرے کچھ دیر قبل وہ جس سفاکانہ انداز میں گل خان کا استحصال کر رہی تھی، وہ منظر بھی پوری طرح اس کے ذہن میں تھا اور وہ نہیں سمجھتا تھا کہ ایسی سفاک عورت کسی رو رعایت کی حقدار ہو سکتی ہے۔

”او کے۔“ لارا کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ کچھ دیر میں اس کی جامہ تلاشی کا عمل مکمل ہوا تو ایک چھوٹا لیڈر پٹل اور پنڈلی سے بندھا پتلی دھار کا خنجر مزید برآمد ہو گیا۔ ہتھیاروں کے علاوہ انہوں نے اس کے جسم پر موجود چند ایک زیورات بھی اتروا لیے تھے۔ کوٹ کی جیبوں سے برآمد ہونے والی اشیاء الگ تھیں۔ ان اشیاء میں ایک تیس بور کا پٹل اور ٹرینگ ڈیوائس قابل ذکر تھیں۔

”اس سارے سامان کو یہاں سے لے جاؤ اور لے جا کر کسی کھائی یا گڑھے میں پھینک دو۔“ زانگ تاؤ نے حکم دیا تو اس کا ساتھی فوراً حرکت میں آ گیا۔ ٹرینگ ڈیوائس کا

یہاں موجود رہنا سب سے زیادہ خطرناک تھا۔ اگر دشمنوں کو اس کی وجہ سے ان کی لوکیشن پتا چل جاتی تو ان کے ہاتھ سے اتنا محفوظ مقام نکل جاتا۔ اس کام کے ساتھ دوسرا کام لارا کی زخمی کلائی پر بینڈیج کرنے کا کیا گیا۔

”مجھے کوئی پین کلر بھی دو۔ میرے زخم میں شدید تکلیف ہو رہی ہے۔“ بینڈیج ہو چکنے کے بعد لارا نے کراہتے ہوئے مطالبہ کیا۔

”اس کے لیے تمہیں قیمت ادا کرنا پڑے گی۔“ معاذ نے مسکراتے ہوئے ایسے اسے جواب دیا جیسے کوئی کاروباری معاہدہ کر رہا ہو۔

”کیسی قیمت؟“ وہ سن کر جزبہ ہوئی۔

”تمہیں میرے سوالوں کے جواب دینا ہوں گے۔“ اس نے اپنا مطالبہ پیش کیا۔

”تم پوچھو، میرے لیے جس سوال کا جواب دینا ممکن ہو، دے دوں گی۔“ اس کی رنگت زردی مائل ہو رہی تھی۔

ایک طرف تکلیف شدید تھی تو دوسری طرف خون بھی اچھا خاصا بہہ گیا تھا تو نفاہت تو ہونی تھی۔

”ناممکن کو ممکن بنانا میری ذمہ داری ہے۔ مجھے اچھی طرح سکھایا گیا ہے کہ جب کسی زخم کو بالخصوص اگر وہ گولی سے لگا ہو اور اس نے ہڈی کو متاثر کیا ہو تو کہاں اور کیسے ضرب لگانی ہے کہ آ بجیکٹ کو زیادہ سے زیادہ تکلیف پہنچے اور وہ بلبلا اٹھے۔“ سرد لہجے میں دیے گئے اس کے جواب نے لارا کا چہرہ دھواں دھواں کر دیا۔

”اپنا مکمل تعارف کرواؤ۔“

”میرا نام لارا ہے اور میں ایک ماہر نفسیات ہوں۔ میں امریکن نیشنلسٹی ہولڈر ہوں اور پہاڑوں میں گھومنا پھرنا پسند کرتی ہوں۔ یہ شخص جسے تم نے باندھ رکھا ہے، اسے میں نے بطور پورٹراپے لیے ہار کر رکھا ہے۔“

”صرف اپنے بارے میں بات کرو۔ یہ شخص کون ہے، اسے ہم تم سے بہتر جانتے ہیں۔“ معاذ نے اس کے جھوٹ پر اسے غرا کر ٹوکا تو وہ تھوڑی سی کھسیانی ہو گئی لیکن اپنے بیان میں کوئی ترمیم نہیں کی۔

”ڈیوڈ نے تمہیں اور گل خان کو کیپ کیوں بھجوا دیا ہے؟“ معاذ نے بھی باقی ساری باتیں چھوڑ کر اس سے براہ راست یہ اہم سوال کیا۔ لارا نے جس قدر گرم لباس پہن رکھا تھا، اسے دیکھ کر وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ اس ماحول اور موسم کی عادی نہیں ہے اور اسے یہاں آئے ہوئے تھوڑا ہی عرصہ گزرا ہے۔

”کک..... کون ڈیوڈ؟“ وہ شاید فوری طور پر اس سوال کی توقع نہیں کر رہی تھی اس لیے تھوڑی سی ہڑبڑا گئی مگر اگلے ہی لمحے اس کے حلق سے ایک دردناک چیخ بلند ہوئی۔ مجروح کلائی پر معاذ کی جوتے کی ٹوہ سے لگائی گئی ٹھوکر نے اسے لرزا کر رکھ دیا تھا۔ حقیقتاً وہ زندگی میں پہلی بار ایسی تکلیف سے گزر رہی تھی۔

”میں اس ڈیوڈ کی بات کر رہا ہوں جو بھارت میں تمہاری شیطانی تنظیم کا نمائندہ ہے اور اپنی شیطانی تنظیم کے لیے وہاں سے چیلے جمع کرتا رہتا ہے۔ اگر اب بھی اس کے سلسلے میں تمہاری یادداشت واپس نہ آئی ہو اور اس کی مزید سروس کی ضرورت ہو تو مجھے بتاؤ۔ میں تمہارا مکمل علاج کر دوں گا۔“ اس نے اپنی ٹانگ کو جنبش دی تو لارا خوفزدہ ہو گئی۔

”نہیں..... پلینز نہیں۔“

”تو میرے سوالوں کا فوری اور درست جواب دو۔“ معاذ کے لہجے کی سختی کم نہیں ہوئی۔

”میں اس شخص کو اچھی طرح نہیں جانتی۔ مجھے حال ہی میں امریکا سے ہار کر کے یہاں لایا گیا ہے۔ معاوضہ اتنا پرکشش تھا کہ میں انکار نہیں کر سکی۔ پہلی اسائنمنٹ کے طور پر اس شخص کو میرے حوالے کیا گیا تھا اور مجھے اس کے دماغ میں ہر چیز کے خلاف خوف پیدا کرنا تھا۔ ایسا خوف جو اس کی قوت عمل کو ختم کر دے۔ کچھ دیر پہلے شاید تم نمونہ دیکھ ہی چکے ہو۔“ اس نے معاذ کو وہ منظر یاد دلایا جسے وہ بھولا ہی نہیں تھا اور جس نے پہلی بار میں ہی اس کے دل میں لارا کے لیے نفرت بھردی تھی۔

”تم سچ نہیں بول رہی ہو۔ تم مجھ سے اپنی حقیقت چھپا رہی ہو۔“ وہ شدید طیش کے عالم میں اس کی طرف بڑھا۔ لارا نے بے ساختہ ہی اپنا مجروح کلائی والا ہاتھ پیچھے کیا۔ حرکت کرنے سے اسے ہاتھ میں شدید تکلیف محسوس ہوئی لیکن یہ تکلیف بہر حال کلائی پر ٹھوکر کھانے کے مقابلے میں کم تھی۔ مگر اس بار معاذ کا نشانہ اس کا ہاتھ تھا ہی نہیں۔

اس نے بالکل اچانک جھپٹ کر لارا کے جڑوں کو یوں اپنے مضبوط ہاتھ کی گرفت میں لے لیا تھا کہ ایک طرف سے انگلیوں اور دوسری طرف سے انگوٹھے نے اندر تک کھب کر اس کا منہ کھول ڈالا تھا۔ اس کھل جانے والے منہ میں ہاتھ ڈال کر اس نے باہر نکالا تو اس کی انگلیوں کی گرفت میں ایک چھوٹا سا کیپسول دکھائی دے رہا تھا۔

”کیا تم مجھے بتاؤ گی کہ امریکا میں پریکٹس کرنے والی

ایک سیدھی سادی ڈاکٹر کی ڈاڑھ میں یہ زہر کا کپسول کیوں موجود تھا؟“ اس نے کپسول کو لارا کی آنکھوں کے سامنے نہچایا۔

”میں..... میں نہیں جانتی۔“ اس کے پاس نظریں چرانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

”لیکن میں جانتا ہوں۔ یہ کپسول تمہاری شیطانی تنظیم کے لیے کسی مشن پر جانے والے ہر شخص کے دانت میں رکھا جاتا ہے اور حکم ہوتا ہے کہ جب تم مخالفین کے قصبے میں خود کو بالکل بے بس پاؤ تو اس کپسول کو چبا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لو۔ تمہاری یقیناً ابھی یہ امید باقی تھی کہ کچھ دیر میں کیمپ سے کوئی تمہیں ڈھونڈتا ہوا یہاں آجائے گا اور تم بچ جاؤ گی اس لیے تم نے اس کپسول کے استعمال میں تاخیر کر دی۔“ معاذ کی ہر بات ٹھیک تھی۔ لارا نے کسی قسم کی تائید یا تردید نہیں کی اور ٹھکست خوردہ انداز میں سر جھکا لیا۔

”تو پھر اب..... تم میرے سوالوں کے جواب دو گی یا مجھے اس کے لیے مزید محنت کرنا ہوگی؟“ معاذ نے طنز سے پوچھا۔

”تم مجھے گولی مار دو۔“ لارا نے جواب دیا۔ ابھی اس کا جملہ مکمل ہوا ہی تھا کہ معاذ نے گولی چلا دی۔ اس بار گولی نے اس کی دوسری کلائی کو نشانہ بنایا تھا۔ لارا کی چیخ نے غار کی محدود فضا کو لرزا کر رکھ دیا۔ یہ اچھا تھا کہ غار کے دہانے کو پتھر سے بند کر دیا گیا تھا ورنہ یہ چیخ دور تک جا کر اس کے ہمدردوں کو اس کی طرف متوجہ کر سکتی تھی۔

”میں تمہاری فرمائش پوری کرنے کے لیے تمہیں اتنی گولیاں ماروں گا کہ تمہارے ہاتھ پیروں میں شہد کے چھتے کی طرح سوراخ ہو جائیں گے لیکن پھر بھی تم موت کو ترسو گی۔“ وہ اتنی بے رحمی سے لارا کو اپنے لائحہ عمل سے آگاہ کر رہا تھا کہ غار میں موجود اس کے ساتھی بھی جھرجھری لے کر رہ گئے۔

”پلیز! مجھے جان سے مار دو۔“ وہ گڑ گڑائی۔

”میرے سوالوں کے جواب دو پھر مر جانا۔“ اس کا لہجہ بے لک تھا۔

”نہیں دے سکتی۔ میں نے مقدس کتاب پر ہاتھ رکھ کر قسم اٹھائی تھی۔“ وہ درد سے تڑپ رہی تھی لیکن قسم توڑنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

”قسم کا کفارہ آسان ہوتا ہے لیکن اپنے ہاتھ پیر کھونے کے بعد کی زندگی بہت مشکل ہوتی ہے۔“ ماہر نفسیات وہ تھی لیکن اس وقت وہ اسے نفسیاتی دباؤ میں لے

چکا تھا۔ وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے دوسری کلائی سے نکلنے خون کو دیکھ رہی تھی۔

”ڈرینگ کرو میڈم کے زخم کی۔“ جس آدمی نے پہلے زخم کی ڈرینگ کی تھی، اسے حکم دیتے ہوئے معاذ کے کنبے میں تھوڑا بدلاؤ آیا۔ شاید اسے لارا پر رحم آ گیا تھا لیکن پھر نظریں زمین پر پڑے گل خان سے جا ٹکرائیں۔ بندھا ہوا ہونے کی وجہ سے وہ کچھ بھی کرنے سے قاصر تھا لیکن مستقل محلے جا رہا تھا کہ کسی طرح اپنی بندشیں کھول کر لارا کی مدد کے لیے میدان میں اتر جائے۔ دوستوں کو چھوڑ کر دشمن سے ہمدردی کرنے جیسا انقلاب بپا کرنا اس عورت کا کارنامہ تھا جو اس وقت اس کے سامنے قابل رحم حالت میں موجود تھی۔

”تو پھر کیا فیصلہ کیا تم نے؟“ ڈرینگ کا عمل مکمل ہو گیا تو وہ ایک بار پھر لارا کے سامنے جا ڈٹا۔ اب تک زانگ سمیت کسی نے بھی اس کے کام میں مداخلت نہیں کی تھی اور صبر سے نتیجہ برآمد ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔

”تم کیا جانا چاہتے ہو؟“

”ج..... بغیر کسی جھوٹ کی ملاوٹ کے۔“

”ڈیوڈ نے مجھے اس لیے یہاں بھیجا تھا کہ جیسے ہی تم لوگوں کو گرفتار کر کے کیمپ پہنچایا جائے، ویسے ہی میں گل خان کی طرح تمہارے دماغوں کو بھی اپنے کنٹرول میں لے لوں۔ تمہارے دماغوں پر کنٹرول حاصل کرنے کے بعد تمہاری مخصوص انداز میں تربیت کی جاتی اور پھر اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا۔“ یقیناً اس کے لیے تکلیف ناک قابل برداشت ہو گئی تھی اس لیے مزید مزاحمت کیے بغیر ج بولنا شروع کر دیا۔

”اس کا مطلب ہے تم مجھے اور میرے ساتھیوں کو پہچانتی ہو۔“

”مجھے تم لوگوں کی تصاویر دکھائی گئی تھیں۔“ اس نے اعتراف کیا۔

”یقیناً کیمپ میں اس بات کا انتظار ہو رہا ہوگا کہ تمہارے ساتھی ہم لوگوں کو گرفتار کر کے لے آئیں؟“

”ہاں بلکہ اب تھوڑی پریشانی بھی شروع ہو گئی تھی کہ اس کام کے لیے جانے والی ٹیم لیٹ کیوں ہو گئی ہے۔ کل ڈیوڈ سے اس سلسلے میں بات بھی ہوئی تھی۔ اس نے ایک دو دن انتظار کرنے کو کہا کیونکہ یہ تو سب جانتے ہیں کہ پہاڑوں میں موسم طے شدہ شیڈول کو برباد کر کے رکھ دیتا ہے۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ کیمپ میں اب اتنے لوگ نہیں بچے ہیں کہ

تھلک ہے اور اسی خوبی کی وجہ سے ابھی تک کسی کی نظر میں نہیں آئی ہے۔ ڈیوڈ غیر معمولی خصوصیات رکھنے والا شخص ہے۔ جوانی میں اس نے ان پہاڑوں میں بہت سفر کیا ہے۔ کیمپ کا علاقہ اس کی ذاتی دریافت ہے۔ پہلے اس نے میدانی علاقے میں ہی کیمپ بنا رکھا تھا لیکن وہاں تک کوئی نہ کوئی رسائی حاصل کر لیتا تھا یا پھر زیر تربیت افراد میں سے بھی کسی کو بھاگنے کا موقع مل جاتا تھا۔ اس نے یہ جگہ دریافت کی تو اس کے دل کو بھاگئی۔ یہاں سے کسی کے بھاگ نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ ہر ایک جانتا ہے کہ اس نے ایسی کوشش کی تو پہاڑوں میں بھٹک کر سردی اور بھوک سے ہی مر جائے گا۔ اس نے معاذ کے سوال کا اچھا خاصا تفصیلی جواب دیا۔ اس کے بعد وہ اس سے کیمپ میں موجود افراد کی تعداد، سہولیات اور دیگر تفصیلات کرید کرید کر معلوم کرتا رہا۔ ان معلومات کو زانگ سمیت ان سب نے ذہن نشین کر لیا۔

”ہمیں حیدر آباد کے مضافاتی علاقے میں ڈیوڈ کے جس پتیلے میں بیہوش کیا گیا، وہاں ہمارے ساتھ ایک بچہ بھی موجود تھا۔ کیا تم اس بچے کے بارے میں کچھ جانتی ہو کہ وہ کہاں ہے؟“ ساری ضروری معلومات حاصل کرنے کے

انہیں پہلی ٹیم کی تلاش میں بھیجا جاسکے۔ اگر ایسا کیا جاتا تو یہاں کی حفاظت اور نگرانی کے لیے لوگوں کی کمی ہو جاتی۔“ ”کیا جانے والی ٹیم سے رابطے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا؟“

”یہاں سیٹلائٹ فون ہی رابطے کا واحد ذریعہ ہے۔ کیمپ میں موجود دو میں سے ایک سیٹ خراب پڑا ہوا تھا اور باقی بچ جانے والا ایک سیٹ ڈیوڈ سے رابطے کے لیے لازمی تھا اس لیے جانے والی ٹیم کو ایسے ہی جانا پڑا۔ کیا تم بتاؤ گے کہ ان کے ساتھ کیا ہوا؟“ اس کے سوال کا جواب دینے کے ساتھ ہی لارا نے تجسس سے پوچھا۔

”سارے کے سارے جہنم چلے گئے۔“ اس نے بے رحمی سے جواب دیا تو لارا کو چپ لگ گئی۔ اپنے جانبازوں کی موت کی خبر فطری طور پر اس کے لیے دکھ کا باعث تھی۔

”یہ بتاؤ کہ ساری دنیا چھوڑ کر تم لوگوں نے اپنا تریقی کیمپ اس سرد جہنم میں کیوں قائم کیا جہاں آمد و رفت بھی مشکل ہے اور بچا بھی؟“

”میری معلومات کے مطابق ایسا اس لیے کیا گیا ہے کہ یہ جگہ کسی کی بھی عملداری سے بہت دور بالکل الگ

ریگ رولز

اس دوشیزہ کے عزم و حوصلے کی طویل سرگزشت جس نے اپک عالم کو چونکایا۔ جہد مسلسل کی ایک ناقابل فراموش داستان۔ ان لہو رنگ واقعات کو کہانی کی شکل دی ہے

ساحر قلم غلام قادر نے

سرگزشت شمارہ مارچ 2023ء ابھی سے نزدیکی بک اسٹال پر مختص کرالیں

بعد اس نے لارا سے اعظم کے متعلق سوال کیا تو اس نے فوری جواب دینے کے بجائے خاموشی اختیار کر لی۔

”کہاں ہے وہ بچہ؟ کہیں تم لوگوں نے اسے قتل تو نہیں کر دیا؟“ اسے لارا کی خاموشی چبھی اور جذبات میں اس کا بازو پکڑ کر زور سے ہلایا۔ یوں بازو ہلانے سے اس کی کلائی کے زخم میں درد کی ٹیسیں اٹھیں تو وہ کراہنے لگی پھر آہستہ سے بولی۔

”وہ زندہ ہے۔ پہلے ڈیوڈ کا ارادہ اسے خود پالنے اور تربیت دینے کا تھا لیکن پھر اسے پاکستان بھجوا دیا۔“

”پاکستان..... پاکستان میں کس کے پاس؟“ وہ بیتاب ہوا۔

”میڈم ایکس کے پاس۔“

”مگر کس لیے؟“

”میڈم ایکس کو زیر بار کرنے کے لیے اور تنظیم کے بڑوں کو یہ باور کروانے کے لیے کہ وہ تنظیم سے اتنا مخلص ہے کہ تنظیم کے مفاد میں کسی سے اپنی مسابقت کو بھی اہمیت نہیں دیتا۔“

”مطلب اس کی میڈم ایکس سے مسابقت ہے؟“

”ہاں۔“ لارا نے محض ایک لفظی جواب دیا۔

”میڈم ایکس، اعظم کا کیا کرے گی؟“

”یہ مجھے نہیں معلوم۔ بس اتنا پتا ہے کہ پاکستان میں اس کے لیے حالات زیادہ مرسکون نہیں ہیں۔ کچھ انتظامی مسائل ہیں اور کچھ مخالفین سے ٹکراؤ۔“

”کون مخالفین؟“ معاذ حیران ہوا۔

”میں نہیں جانتی۔ مجھے ہر بات کی تفصیل معلوم نہیں ہوتی ہے۔“ اس نے بیزاری سے جواب دیا اور پھر التجائیہ لہجے میں بولی۔

”پلیز! مجھے کوئی پین کلر دو۔ میرے لیے یہ تکلیف ناقابل برداشت ہوتی جا رہی ہے۔“

”اوکے، دے دیتے ہیں۔“ وہ پیچھے ہٹ گیا اور زانگ کو اشارہ کیا کہ لارا کو یہ سہولت دے دی جائے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ حقیقتاً بہت تکلیف میں ہے اور اسے باقاعدہ علاج کی ضرورت ہے۔ یہاں اس کے زخموں پر جو بینڈیج کی گئی تھی، وہ محض ایک عارضی انتظام تھا۔

ابھی لارا کو پین کلر دیا ہی جا رہا تھا کہ ہلکے ہلکے دھماکوں کی آوازیں سنائی دیں۔ وہاں موجود ہر شخص ہی تجربہ کار تھا اس لیے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ گولیاں چلنے کی آوازیں تھیں جو بند غار میں ہونے کے باعث مدہم سنائی

دے رہی تھیں۔ زانگ تاؤ جلدی سے باہر موجود اپنے ساتھیوں سے رابطہ کرنے لگا۔ گفتگو چینی زبان میں تھی۔ زانگ بات کر کے فارغ ہوا تو سب کی سوالیہ نظریں خود پر اٹھی ہوئی دیکھیں۔

”ایک ٹولی شاید ان دونوں کی تلاش میں نکلی تھی۔ ان کی ہمارے آدمیوں سے مدد بھیڑ ہو گئی ہے اور اب ان کے درمیان فائرنگ ہو رہی ہے۔“ اس نے لارا اور گل خان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے صورت حال سے آگاہ کیا۔

”ہمیں ان کی مدد کے لیے جانا چاہیے۔ میں اور جارو جائیں گے۔“ معاذ نے فوری فیصلہ سنایا۔

”میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ چلتا ہوں۔“ وکی کی بے چین ہڈی بے قرار ہوئی۔

”نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تم یہیں رکو۔“ معاذ نے تحکمانہ لہجے میں اس سے کہا اور ساتھ ہی آنکھ سے خفیف سا اشارہ کیا۔

”جیسی آپ کی مرضی۔“ وکی مایوسی کی اداکاری کرتے ہوئے ڈھیلا پڑ گیا لیکن اس نے معاذ کا مطلب سمجھ لیا تھا۔ وہ گل خان اور لارا کو زانگ اور اس کے ساتھی کے ساتھ تنہا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ ان لوگوں کے ساتھ کام کرنے کی ہامی بھر لینے کے باوجود وہ محتاط تھا اور کسی بھی معاملے میں ان پر اندھا اعتماد نہیں کرتا تھا۔

”اسے بھی ساتھ لے جاؤ۔ یہ تمہاری مدد کرے گا۔“ زانگ نے اپنے ساتھی کو بھی ان کے ساتھ کر دیا۔ وہ لوگ غار کا پتھر ہٹا کر باہر نکلے اور ایک بار پھر راستے کو بند کر دیا۔ باہر نکلتے ہی فائرنگ کی آوازیں تیز ہو گئی تھیں جس سے انہیں سمت کا اندازہ کرنے میں آسانی رہی۔ دونوں گروہ بڑے پتھروں اور چھوٹی چٹانوں کی آڑ لیے ایک دوسرے کے مقابل ڈٹے ہوئے تھے اور دونوں ہی طرف سے شدت سے فائرنگ کی جا رہی تھی۔

”ہم وہاں اوپر چڑھ کر دیکھتے ہیں۔ یہاں سے تو صحیح سے اندازہ بھی نہیں ہو رہا کہ ہمارے ساتھی کس طرف ہیں اور مخالفین کس طرف؟“ جارو نے تجویز پیش کی جو معاذ کو پسند آئی۔ ان دونوں نے تیز لیکن محتاط قدموں سے قریب موجود ایک نسبتاً اونچی پہاڑی کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ ان کا تیسرا ساتھی بھی ان کے ساتھ ہی تھا۔ وہ چھوٹی سی پہاڑی زیادہ دشوار گزار نہیں تھی اس لیے وہ جلد ہی اوپر پہنچ گئے۔ اوپر پہنچ کر معاذ اپنی راکفل پر فٹ دوربین سے اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ کھلے میں مقابلے کے پیش نظر اس

نے دور مار رائل کے استعمال کا فیصلہ کیا تھا اور چھوٹی گن ہولٹر میں رکھ لی تھی۔

”ہمارے ساتھی دائیں طرف ہیں اور دشمن بائیں طرف۔ میرے خیال میں ہم یہاں سے انہیں بہ آسانی نشانہ بنا سکتے ہیں۔“ جارو نے جو اس کے ساتھ ہی جائزہ لینے میں مصروف تھا، صورت حال واضح ہونے پر جوش سے بول پڑا۔ معاذ نے زانگ کے ساتھی کے بازو پر ہاتھ مار کر اسے بھی اشارے سے بتایا کہ کس سمت فائر کرنا ہے اور پھر شست باندھتے ہوئے اللہ کا نام لے کر پہلا فائر کیا۔ اس کا نشانہ ایک بڑے پتھر کے پیچھے موجود ادنیٰ ٹوپے والا سر تھا۔ گولی نے سائیں کی آواز کے ساتھ کسی طائر برقی رفتار کے مانند اس سر تک کا سفر طے کیا اور سر یکدم ہی نظروں کے سامنے سے غائب ہو گیا۔ سفید برف پر گرے خون کی سرخی نے نشانہ لگانے والے کو اس کا نشانہ سچا ہونے کی نوید دی۔ باقی دو نشانچوں کے نشانے بھی خطا نہیں گئے تھے۔ اچانک گرنے والی تین لاشوں نے مخالفین کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ بوکھلاہٹ میں ان سے غلطیاں ہوئیں۔ دو افراد نے شاید اپنی موجودہ کمین گاہ کو غیر محفوظ سمجھتے ہوئے پوزیشن بدلنے کی کوشش کی اور صرف اسی وجہ سے نظروں میں آ گئے۔ ایک نے فائرنگ کی سمت کا تعین کر کے بغیر سوچے سمجھے جوش میں اپنی رائل کارخ اس طرف کر کے اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ ان غلطیوں کا انہیں بھاری خمیازہ بھگتنا پڑا۔ پوزیشن تبدیل کرنے کی کوشش کرنے والوں کو معاذ اور جارو کی رائل سے نکلے گولیوں نے دوسری پوزیشن تک پہنچنے سے پہلے ہی چاٹ لیا۔ دوسری طرف جب دائیں جانب موجود ان کے ساتھیوں کو مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تو وہ دلیری سے آگے بڑھے اور منٹوں میں ہی وہاں کا نقشہ بدل کر رہ گیا۔ وہ تینوں اوپر سے نیچے اترے تو دشمن کی لاشیں گنی جا رہی تھیں اور ایک زندہ بچ جانے والے شخص کی مشکلیں کس دی گئی تھیں۔ انہوں نے اس شخص کو بھی اپنے ساتھ فار میں لے جا کر اس سے پوچھ گچھ کرنے کا فیصلہ کیا۔ غیر متوقع طور پر دریافت کیا گیا وہ غار ان کے لیے نعمت ثابت ہوا تھا اور کسی آپریشن کنٹرول روم جیسی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔

”میرے خیال میں اب ہمیں کیمپ پر فیصلہ کن حملہ

کرنے میں بھی تیزی دکھانا ہوگی۔ اس جھڑپ نے ہماری یہاں موجودگی کا راز پوری طرح کھول کر رکھ دیا ہے۔ ہم نے حملے میں دیر کی تو انہیں اپنے دفاع کے لیے بہتر حکمت عملی طے کرنے کا موقع مل جائے گا۔“ معاذ کے لیے موجودہ کامیابی سے زیادہ اصل ٹارگٹ کی اہمیت تھی۔ زانگ بھی اس بات کو سمجھ گیا اور ایک بار پھر اپریش پر اپنے ساتھیوں کو احکامات جاری کرنے لگا۔ معاذ کو اس کی جتنی بات سمجھ آئی، اس سے یہی اندازہ ہوا کہ وہ انہیں آگے بڑھنے کے لیے تیار رہنے اور اسلحہ و بارود کو سنبھالنے کی تاکید کر رہا ہے۔

”اس کا کیا کرنا ہے؟“ اپنے کام سے فارغ ہو کر زانگ نے ساتھ آئے قیدی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ چھوٹے قد کا سانولا سا آدمی تھا اور ایک تک بندھی ہوئی حالت میں پڑے گل خان اور زخمی لارا کو دیکھ رہا تھا۔

”باس کی بات نہ مان کر تم نے اچھا نہیں کیا۔ اگر تم بات مان لیتیں اور کیمپ سے باہر نہ نکلتیں تو ہم سب اس مصیبت میں گرفتار نہ ہوتے۔“ اس نے اپنے متعلق زانگ کے سوال کو نظر انداز کیا اور نفرت بھرے لہجے میں لارا سے مخاطب ہوا۔ اس کا طعنہ سن کر لارا کے پاس نظریں جھکا لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

”عورت ہمیشہ اپنے ساتھ مصیبت لاتی ہے۔ میں اس کی آمد کے ساتھ ہی کسی مصیبت کا انتظار کرنے لگا تھا۔“ اس شخص کے الفاظ اس کی بگ نظری کا اظہار کر رہے تھے۔ بہر حال وہاں کسی کو اس کی ذاتی سوچ سے کچھ لینا دینا نہیں تھا اس لیے کسی نے اس کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ البتہ معاذ ایک نتیجے پر پہنچ گیا اور گلا کھٹکھارتے ہوئے اس شخص سے مخاطب ہوا۔

”تم مجھے خاصے عقلمند آدمی لگتے ہو اس لیے میں امید کرتا ہوں کہ ان میڈم کی طرح اپنا سرمہ بنوا کر زبان کھولنے کے بجائے آرام سے ہمارے ساتھ تعاون کرو گے اور ہمیں ہماری مطلوبہ معلومات فراہم کر دو گے۔“

”کیا پوچھنا چاہتے ہو؟“ اس نے ہاں یا نہ کہے بغیر سنجیدگی سے پوچھا۔

”یہاں سے کیمپ تک کا مختصر ترین راستہ اور کیمپ پر موجود تمہارے ساتھیوں کی تعداد؟“

”اس کے بدلے مجھے کیا ملے گا؟“ وہ باقاعدہ سودے بازی کی کوشش میں تھا۔

”تم کیا چاہتے ہو؟“ معاذ نے الٹا اسی سے پوچھا۔

”اپنی زندگی کی ضمانت اور کسی محفوظ مقام تک پہنچنے

کے لیے زادراہ۔“ اس نے اپنا دونکاتی مطالبہ پیش کیا تو معاذ نے زانگ تاؤ کی طرف مشورہ طلب نظروں سے دیکھا۔ اس نے سر کی خفیف سی جنبش سے اسے ہامی بھر لینے کا اشارہ دیا۔

”ٹھیک ہے۔ ہم راضی ہیں۔ اب تم بتاؤ جو بتا سکتے ہو۔“
”اس وقت کیمپ کی حفاظت کے لیے صرف پانچ بندے موجود ہیں۔ رہی کیمپ تک کے مختصر فاصلے کی بات تو وہاں تک میں خود تمہاری راہنمائی کر دوں گا۔“ اس کا اس قدر تعاون بھی انہیں مشکوک کر رہا تھا۔

”کتنے گھٹیا ہونے لگا ہے جو اپنے مفاد کے لیے اتنی آسانی سے بک گئے ہو۔“ سب سنی لارا کا ضبط جواب دے گیا تو اس نے اس شخص کو طعنہ دیا۔

”تشد کے آگے ٹوٹ پھوٹ کر زبان کھولنے والوں کو بھی اعلیٰ ہونے کا سرٹیفکیٹ نہیں دیا جاسکتا۔“ شرمندہ ہونے کے بجائے اس نے لارا پر جوابی وار کیا اور جتا دیا کہ کیسے بھی سہی، زبان اس نے بھی کھولی ہے۔

”مجبوری اور مفاد پرستی میں بہت فرق ہوتا ہے۔“
لارا ترخنی۔

”مجبور ہو کر گھٹنے ٹیک دینے کے مقابلے میں سے پر سودے بازی کر لینا دانائی ہے۔ تم جسے مفاد پرستی کہہ رہی ہو، میرے نزدیک وہ دانائی ہے۔“ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ لارا نے جواب میں کچھ کہنے کے لیے لب کھولے لیکن زانگ تاؤ نے بلند آواز میں اسے روک دیا۔
”بند کرو تم دونوں اپنی بک بک۔ ہمارے پاس یہ ساری بکواس سننے کا سے نہیں ہے۔“ اس نے دونوں کو مشترکہ ڈانٹ پلائی پھر نئے قیدی کی طرف رخ کر کے پوچھا۔
”تمہارا نام کیا ہے؟“

”رادھے۔۔۔۔۔ رادھے موہن!“

”ہاں تو رادھے! تم ہمیں کیمپ تک مختصر اور سرکشت راستے سے لے کر جاؤ گے۔ یہ بتاؤ کہ کیا اس راستے کو طے کرنے کے لیے کسی خاص چیز کی ضرورت پڑے گی؟“

”نہیں۔ بس بندے فٹ اور ایکٹیو ہوں تو کافی ہے۔“ رادھے کا جواب ان کے لیے اطمینان بخش تھا۔ ان سب میں ایک جارو بھی تھا جس کا بازو باذل اینڈ ٹیم کے حملے میں کچھ مجروح ہوا تھا لیکن اس نے ریکور کر لیا تھا اور اس سارے سفر کے دوران کسی تکلیف کی شکایت نہیں کی تھی۔

”پھر کیا سوچنا ہے، سفر شروع کریں؟“ اس بار زانگ، معاذ سے مخاطب ہوا۔

”بالکل۔ بغیر کوئی وقت ضائع کیے۔“ اس نے جواب دیا تو وہاں ایک اچھل سی مچ گئی۔ زانگ اپریٹس پر اپنے ساتھیوں کو ایک جگہ جمع ہونے کی ہدایت کرنے لگا۔ معاذ اور اس کے ساتھیوں کی ترجیح اپنے لیے موزوں اسلحہ بارود کا انتخاب تھا۔

”لارا اور گل خان کا کیا کریں گے؟ انہیں چھوڑ کر جانا ہے یا اپنے ساتھ لے جائیں گے؟“ دستی بموں کو اپنی جیکٹ کی جیبوں میں منتقل کرتے ہوئے وکی نے سرگوشی میں معاذ سے دریافت کیا۔

”تم کیا کہتے ہو؟“ معاذ نے اس کی رائے طلب کی۔
”اگر ان لوگوں کو یہاں چھوڑا تو ہم میں سے کسی ایک کو لازماً یہاں رکنا پڑے گا اور میں سمجھتا ہوں کہ ہمارا آپ کے ساتھ جانا زیادہ ضروری ہے۔“ وکی نے کھل کر اپنی رائے دی۔

”ٹھیک ہے، میں زانگ سے بات کرتا ہوں۔“
معاذ نے اس سے کہا اور خود زانگ کی طرف بڑھ گیا۔

”ساتھ لے جانے میں یہ دونوں ہمارے لیے مسئلہ نہ بن جائیں۔ لارا زخمی ہونے کی وجہ سے بقا بہت کا شکار ہے اور یہ آدمی کسی بے نتیجے نیل کی طرح بدکا ہوا ہے۔“
زانگ نے اس کی بات سن کر تشویش کا اظہار کیا۔

”ان دونوں کی نگرانی کے لیے کسی کو یہاں چھوڑ کر ہم اپنی افرادی قوت کم نہیں کر سکتے۔ رادھے نے ہمیں کیمپ پر پانچ آدمیوں کی موجودگی کا بتایا ہے لیکن یقین نہیں کیا جاسکتا کہ وہ سچ بول رہا ہے۔ ایسے میں ہماری اپنی نفری پوری ہونی چاہیے۔“ اس کی دلیل بھی زانگ کے نزدیک درست تھی۔

”لارا اور گل خان کے مسئلے کا حل میں نکالتا ہوں۔“
اس نے زانگ کو تسلی دی اور خود لارا کی طرف بڑھ گیا۔ وہ نڈھال سی غار کی ایک دیوار سے پشت نکائے نیم وا آنکھوں سے اپنے ارد گرد جاری سرگرمی کو دیکھ رہی تھی۔

”ہم تمہیں اور گل خان کو بھی اپنے ساتھ کیمپ تک لے کر جائیں گے اس لیے خود کو چلنے کے لیے ذہنی طور پر تیار رکھو۔“ اس نے لارا کو اطلاع دی۔

”میں بہت وینٹس ٹیل کر رہی ہوں۔ مجھ سے اب اتنا نہیں چلا جائے گا۔ بہتر ہے تم لوگ مجھے یہیں چھوڑ دو۔“
لارا کا جواب اس کے لیے خلاف توقع نہ تھا۔

”اس صورت میں تمہیں یہاں اکیلا رہنا پڑے گا اور حالات کا کچھ پتا نہیں ہے کہ ہم لوٹ کر اس طرف آ بھی

چنانچہ فوراً ہی صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گئی اور مری ہوئی آواز میں بولی۔

”مجھے تمہاری شرط منظور ہے لیکن اس کام کے لیے مجھے تنہائی کی ضرورت ہوگی۔“

”نو پر اہلم۔ ابھی یہ غار مکمل خالی ہو جاتا ہے۔“ معاذ نے اسے جواب دیا۔

زانگ آگے کی حکمت عملی طے کرنے اور اپنے ساتھیوں کو ہدایات دینے کے لیے پہلے ہی رادھے سمیت باہر جا چکا تھا۔ وکی بھی اس کے پیچھے ہی گیا تھا اس لیے وہاں اب صرف جارو اور زانگ کے دو آدمی موجود تھے۔ وہ تینوں اس کی ایما پر باہر جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

”جانے سے پہلے اس کا منہ کھول دینا۔“ لارا کی یہ فرمائش گل خان کے لیے تھی۔ اس کی بات پر عمل کرتے ہوئے جیسے ہی گل خان کے منہ میں ٹھنسا کپڑا نکالا گیا، پہلے تو وہ تھوڑا سا کھانا پھر مغلطات بکنے لگا۔ اتنی دیر بے بسی سے بندھے رہنے کے بعد اس کے اندر جو غصہ جمع ہو گیا تھا، اس کے اخراج کے لیے گالیوں سے بڑھ کر کوئی اور ذریعہ نہیں تھا۔ معاذ نے خود بھی ان گالیوں کے لیے اپنے کان لپیٹ لیے اور باقیوں کو بھی ایسا ہی کرنے کا اشارہ کیا۔ ویسے بھی چینیوں کے لیے وہ گالیاں قابل فہم نہیں تھیں اور وہ صرف خان کے تاثرات سے ہی اندازہ لگا سکتے تھے کہ وہ انہیں برا بھلا کہہ رہا ہے۔ ایک ایک کر کے وہ سب غار سے باہر نکل گئے اور وہاں کو پتھر سے بند کر دیا۔ باہر نکلنے کے بعد معاذ نے چینیوں کو زانگ کے پاس جانے کا اشارہ کیا۔ ان میں سے ایک تو چلا گیا لیکن دوسرا وہیں رکا رہا یعنی جیسے وہ ان پر مکمل اعتماد نہیں کر رہے تھے، وہ بھی ان پر مکمل اعتبار کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ معاذ نے رکنے والے سے کوئی تعرض کرنے کے بجائے جارو کا ہاتھ پکڑ کر اس پر دباؤ ڈالا اور سرگوشی میں اس سے بولا۔

”دھیان سے سنو کہ لارا، گل خان کو کیا عجیب مشورے رہی ہے۔“ جارو نے سرکواشات میں جنبش دی اور اپنی توجہ اس جانب مبذول کر لی۔ کچھ دیر بعد وہ اپنی اس کیفیت سے باہر آیا اور ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔

”بہت فتنہ عورت ہے۔ ان حالات میں بھی اپنی فتنہ طرازی سے باز نہیں آئی ہے۔ اس نے گل خان کو ہدایت دی ہے کہ کیمپ تک پہنچنے تک وہ بالکل پرسکون رہے گا اور چاہے کوئی بات ناگوار بھی گزرے تو رد عمل ظاہر نہیں کرے گا لیکن جیسے ہی فائرنگ اور ہنگامہ شروع ہو، اسے موقع کا فائدہ

سکیں یا نہیں۔ ایسی صورت میں تم یہاں بھوکی پیاسی مرجائو گی اور یقیناً یہ ایک دردناک موت ہوگی۔“ اس نے ایسا سفاکانہ رخ پیش کیا کہ لارا کانپ کر رہ گئی پھر مایوسانہ لہجے میں بولی۔

”میرا کوٹ تم لوگوں نے پھنکوا دیا ہے۔ اتنی خراب جسمانی حالت میں، میں گرم کوٹ کے بغیر اس علاقے میں کیسے سروائیو کروں گی؟“

”تمہیں طاقت کا انجکشن اور گرم کوٹ فراہم کر دیا جائے گا لیکن اس کے بدلے تمہیں بھی ایک کام کرنا ہوگا۔“ معاذ نے مشروط پیشکش کی۔

”کیسا کام؟“

”تمہیں گل خان کو جیش دینا ہوگی کہ وہ میری ہدایات پر عمل کرے اور ایسی کوئی حرکت نہ کرے جو ہمارے لیے مسئلہ پیدا کرے۔“

”یہ کریک دماغ کا بندہ ہے۔ اس کے بارے میں کوئی گارنٹی کیسے دی جاسکتی ہے۔“ چور چوری سے جاتا ہے، ہیرا پھیری سے نہیں۔ لارا نے بھی خود کو انجان اور معصوم ظاہر کر کے معاذ کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کی۔ معاذ کو اس کی اس حرکت پر اتنا شدید غصہ آیا کہ اس کے بال اپنی مٹھی میں جکڑ کر ایک زوردار جھٹکا دیا اور دانت کچکچاتے ہوئے بولا۔

”مجھے دھوکا دینے کی کوشش مت کرو۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ تمہارا معمول ہے اور اس وقت صرف تم ہی ہو جو اس کے دماغ میں کوئی بات بٹھا سکتی ہو۔“

”تمہارے اس سلوک کے بعد میں تمہاری بات ماننے سے انکار بھی کر سکتی ہوں۔“ زیادہ تر لوگ غار سے باہر نکل چکے تھے لیکن جو چند رہ گئے تھے، ان کی موجودگی میں اپنے ساتھ اس سلوک پر لارا کو غصہ آ گیا۔ شاید پین کلر مل جانے کے بعد وہ پرسکون تھی اس لیے انا کے سر اٹھانے کی گنجائش نکل آئی تھی۔

”میں تمہارے انکار پر کوئی اعتراض نہیں کروں گا۔ میرے پاس تمہیں یہاں بے یار و مددگار چھوڑ جانے اور خان کو باندھ کر اپنے ساتھ لے جانے کا آپشن موجود ہے۔ میرے پاس تھوڑا مشکل سہی، حل موجود ہے لیکن تمہارے پاس اس حالت میں یہاں اکیلے سروائیو کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔“ معاذ نے اس کے بال چھوڑ دیے اور نہایت ٹھنڈے لہجے میں حالات کی سنجیدگی کا احساس دلایا۔

لارا خود بھی کوئی جذباتی اور نا سمجھ عورت نہیں تھی

اٹھانے کی کوشش کرنا ہے اور کوئی ہتھیار حاصل کر کے ہم لوگوں کو جن جن کرٹھکانے لگانا ہے۔ ساتھ ہی اس نے خان کو اپنی خصوصی حفاظت کا خیال رکھنے کی بھی ہدایت کی ہے۔

”ناٹ بیڈ۔ میرے لیے اتنا بھی کافی ہے کہ خان راستے میں کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرے گا۔ باقی ہم کارروائی شروع کرنے سے پہلے اس کا انتظام کر دیں گے۔“ معاذ کو لارا سے کسی نہ کسی شریپندی کی امید بھی اس لیے جارو کی اس رپورٹ نے زیادہ تشویش میں مبتلا نہیں کیا۔ کچھ دیر بعد لارا نے دہانے کے قریب آکر پکارا تو وہ لوگ پتھر ہٹا کر دوبارہ غار میں آگئے۔

”کام ہو گیا؟“

”چیک کر لو۔ اب وہ تمہیں دیکھ کر بھڑکے گا نہ حملہ کرنے کی کوشش کرے گا۔“ لارا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ وہ خوش دکھائی دے رہی تھی۔ ان کے خلاف ایک سازش تیار کر لینے پر اس کا خوش ہونا بھی تھا۔

”ہیلو گل خان!“ معاذ گویا اس کے کہے کو چیک کرنے کے لیے گل خان تک جا پہنچا۔ گل خان نے اس کی آواز پر رد عمل ظاہر نہیں کیا اور سر جھکائے بیٹھا رہا۔

”تمہیں میڈم نے بتا دیا ہے نا کہ اب تم اور ہم ایک ٹیم ہیں اور ساتھ مل کر کام کریں گے۔ کیا تم میری ہدایات پر عمل کرنے کو تیار ہو؟“ گل خان کی طرف سے رد عمل نہ دیے جانے کے باوجود وہ اس سے مخاطب رہا اور بالآخر ایک ایسا سوال کیا جس کے جواب میں خان بے نیازی کو قائم نہ رکھ سکا اور سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ لب اب بھی خاموش تھے لیکن نگاہوں میں اس کے لیے نفرت اور مخالفت لکھی تھی۔ معاذ کے دل کو دھچکا پہنچا۔ معصوم سی فطرت رکھنے والا گل خان جو کبھی اس سے بہت محبت کرتا تھا، آج نفرت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”ٹھیکس۔ تم نے اپنا کہا پورا کیا۔ اب ہماری وعدہ پورا کرنے کی باری ہے۔ تمہارے لیے طاقت کا انجکشن اور گرم جیکٹ فراہم کی جا رہی ہے۔“ وہ مزید گل خان کو نفرت بھری نظروں میں نہیں دیکھ سکتا تھا اس لیے رخ موڑ لیا اور چہرے پر جبری مسکراہٹ سجا کر لارا سے کہا۔ جو اب وہ بھی خوش دلی سے مسکرا دی۔

اس معاملے سے نمٹ کر وہ سب باہر زانگ اور اس کے ساتھیوں کے درمیان پہنچے تو وہ لوگ تیار ہو چکے تھے اور ان کے بیک بیک ان کے شانوں سے لٹکے ہوئے تھے۔ ایک بیک بیک رادھے کے شانوں پر بھی دکھائی دے رہا

تھا یعنی حسب وعدہ اسے زائد فراہم کر دیا گیا تھا۔

”ہم نے خیمے اور کھانے کا اضافی سامان ایک جگہ محفوظ کر دیا ہے۔ بیک بیک میں کیول تھوڑے سے انرجی بسکٹس رکھے گئے ہیں جو ایمرجنسی سچویشن میں کام آئیں گے۔ کامیابی کی صورت میں ہم اپنا محفوظ ذخیرہ نکال کر واپسی کا سفر آرام سے طے کر سکتے ہیں۔“ معاذ کے قریب پہنچتے ہی زانگ تاؤ نے اسے اب تک کی کارگزاری سے آگاہ کیا۔

”بہترین۔ میرے خیال میں اب ہمیں سفر کا آغاز کر دینا چاہیے۔“ معاذ نے اسے سراہنے کے ساتھ ہی اگلی بات کی۔

”پہلے تم لوگ کچھ کھا پی لو۔ ہم سب نے کچھ نہ کچھ لے لیا ہے۔ صرف تم لوگ رہ گئے ہو یا تمہارا یہ ساتھی۔“ زانگ نے اپنے ساتھ موجود کی کی طرف اشارہ کیا۔

”ہم راستے میں ہی کھالیں گے۔ اب مزید وقت ضائع کرنا مناسب نہیں ہے۔“ اسے فکر تھی کہ دن نہ ڈھل جائے۔ اس صورت میں زانگ اور اس کے ساتھیوں کو تو ان راستوں کے شکار ہونے کی وجہ سے زیادہ دشواری نہیں ہوتی لیکن وہ اور اس کے ساتھی مشکل میں پڑ جاتے۔

”ٹھیک ہے، جیسے تم کہو۔“ زانگ نے اپنی بات پر اصرار نہیں کیا اور رہ جانے والوں میں ان کے حصے کا کھانا تقسیم کرنے کی ہدایت کی۔ یہ کھانا ڈبل روٹی اور گوشت کے بنے ٹن پیک کبابوں پر مشتمل تھا جنہیں بے شک گرم نہیں کیا جاسکا تھا لیکن اس حالت میں بھی خوش ذائقہ محسوس ہو رہے تھے۔ شاید اس لیے بھی کہ انہیں خاصے طویل وقفے کے بعد کھانا میسر آیا تھا۔ رادھے کی راہنمائی میں آگے بڑھتے وہ اپنے اس کھانے سے بھی لطف اندوز ہوتے رہے۔ لارا اپنے زخمی ہاتھوں کی وجہ سے خود کھانا کھانے کی اہل نہیں تھی اس لیے معاذ نے وہی کوڑے داری سوپ دی تھی کہ وہ اپنے ساتھ ساتھ اسے بھی کھلاتا رہے۔ گل خان بھی لارا کے قریب ہی چل رہا تھا اور سر جھکائے خاموشی سے کھاتا جا رہا تھا۔ اس پر نظر رکھنے کے لیے جارو اس کے بالکل پیچھے تھا۔

”خوب پیٹل کیا ہے تم نے ان دونوں کو۔“ زانگ نے لارا اور گل خان کی شرافت کو دیکھتے ہوئے معاذ کو سراہا۔

”یہ پوری دنیا سودے بازی پر چل رہی ہے۔ ہم لوگوں سے ان کی شرائط پر سودا طے کر لیں تو وہ ہم سے خوش بھی رہتے ہیں اور ہمارے فرمانبردار بھی۔“

”بالکل ٹھیک۔ پر تو ایک اچھا بزنس مین سودا طے

اشارہ کیا۔ پہلی نظر میں کچھ محسوس نہ ہوا پھر احساس ہوا کہ سامنے غاروں کا وہ سلسلہ ہے جسے کیمپ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ غاروں کا یہ طویل سلسلہ ان لوگوں کے لیے ایسی قدرتی پناہ گاہ ثابت ہوا تھا جہاں وہ کئی برسوں کے قیام کے باوجود کسی کی نظر میں نہیں آسکے تھے اور مزے سے اپنے کام کو جاری رکھے ہوئے تھے۔

”جارو! گل خان کو سوئچ آف کر دو۔“ معاذ دھیمی آواز میں بڑبڑایا۔ اس حکم کو دینے کے لیے اس نے جارو کو اپنی آواز پر دھیان رکھنے کی ہدایت کی تھی۔ ویسے جارو کی یہ خصوصیت جتنی کارآمد تھی، اتنی خطرناک بھی تھی۔ اس سے کوئی راز، راز میں رکھنا بہت مشکل تھا لیکن اچھی بات یہ تھی کہ وہ مخلص اور وفادار آدمی تھا۔

”میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ اب مجھے یہاں سے جانے دو۔“ پیچھے اگر جارو کی طرف سے گل خان کو قاتل بو میں کرنے کی کارروائی جاری تھی تو یہاں کھڑا رادھے، زانگ کو اس کا وعدہ یاد دلانا تھا۔

”تم جاسکتے ہو لیکن خیال رہے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی غلطی نہ کرنا۔ اگر تم نے ایسا کیا تو میرا شوٹر تمہیں شوٹ کر دے گا۔“ زانگ نے اسے اجازت دینے کے ساتھ سخت لہجے میں تنبیہ کی۔

”نہیں کرے گا مائی باپ! بالکل نہیں کرے گا۔“ اس نے خوشامدانہ وعدہ کیا اور اس بات سے بے خبر کہ اس کی موت اس کے ساتھ اس کے بیگ میں بند ہو کر جا رہی ہے، تیزی سے وہاں سے دور ہٹا چلا گیا۔

”اب.....؟“ کچھ لمبا خاموشی سے گزرے پھر معاذ نے زانگ سے پوچھا۔

”رادھے نے جو جانکاری دی تھی، اس کے انوسار کیمپ کے چار داخلی راستے ہیں یعنی اس سے ہر راستے پر کیول ایک ہی پہریدار ہو سکتا ہے۔ پانچواں یا تو آرام کر رہا ہوگا یا کیمپ کے دوسرے معاملات دیکھ رہا ہوگا۔“

”ہو سکتا ہے ہنگامی حالات کے پیش نظر انہوں نے زیر تربیت افراد میں سے بھی کچھ کو اپنے ساتھ شامل کر لیا ہو۔ جن لوگوں کی برین واشنگ کر کے وہ انہیں دنیا کے خلاف استعمال کر سکتے ہیں، انہیں کیمپ کی حفاظت کے لیے کیوں نہیں استعمال کر سکتے؟“ معاذ نے نکتہ اٹھایا۔

”کیمپ کا ماحول اتنا سخت ہے کہ ہر فرد یہاں سے فرار چاہتا ہے۔ وہ یہاں جو کچھ سیکھتے ہیں، وہ صرف اس لیے سیکھتے ہیں کہ انہیں باور کرایا گیا ہے کہ اسے سیکھ کر جنت کی

کرتے ہوئے اپنے فائدے کو ہمیشہ اوپر رکھتا ہے۔“ زانگ نے بتایا۔

”وہ بھی اس انداز میں کہ اگلی پارٹی کو پتا ہی نہیں چل پاتا کہ بزنس میں اس سے کیا کیا فائدہ اٹھا چکا ہے۔ وہ صرف اس بات پر خوش رہتے ہیں کہ ڈیل ان کی شرائط پر ہوئی ہے۔“ معاذ نے گویا اس کی بات مکمل کی۔

”بہت بڑھیا۔ یوان منگ کی رائے تمہارے بارے میں غلط نہیں تھی۔ تم سچ سچ ایک ہیرا ہو۔“ زانگ کو اس کے جواب نے خوش کر دیا۔

”تم نے اس شخص کی شرائط جتنی آسانی سے قبول کر لیں، وہ میرے لیے حیرت انگیز ہے۔ میں ایک دشمن کو صحیح سلامت جانے کی اجازت دینے کی شرط قبول کرنے میں کافی ہچکچاہٹ محسوس کرتا۔“ اس کا اشارہ راہنمائی کے لیے آگے چلتے رادھے کی طرف تھا۔ بظاہر رادھے آزادانہ چل رہا تھا لیکن زانگ نے اس کے ساتھ اپنے بہترین شوٹر لگا رکھے تھے جو اس کی طرف سے ذرا سی گڑبڑ کی صورت میں اس کا کام تمام کر سکتے تھے۔

”میں نے اسے صحیح سلامت جانے دینے کی ڈیل کی ہے۔ یہ وجہ بالکل نہیں دیا ہے کہ وہ آگے بھی صحیح سلامت رہ سکے گا۔“ زانگ معنی خیزی سے مسکرایا۔

”مطلب؟“ معاذ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”اسے کھانے کا جو سامان دیا گیا ہے، وہ زہریلا ہے۔ ہم سے الگ ہو کر جوں ہی وہ کچھ کھائے گا، وہ اس کے جیون کا آخری کھانا ہوگا۔“ زانگ نے سرگوشی نما آواز میں اسے آگاہ کیا تو وہ سر ہلا کر رہ گیا۔ چینی واقعی بہت تیز اور چالاک تھے۔

”فائرنگ کے رد عمل میں جس طرح کوئی ایکٹیوٹی دکھائی نہیں دی اور کوئی نہیں آیا، اس سے مجھے رادھے کی یہ بات سچ لگتی ہے کہ کیمپ کی نگرانی کے لیے صرف پانچ لوگ رہ گئے ہیں اور ان پانچ افراد نے کیمپ چھوڑنا مناسب نہیں سمجھا ہوگا۔“

”مجھے بھی یہی لگتا ہے پھر بھی سز کی تیاری کے دوران میں نے دو تین اونچے پوائنٹس پر نگرانی کے لیے بندے بٹھا کر رکھے ہوئے تھے۔ ان میں سے بھی کسی نے آس پاس کسی کو نہیں دیکھا۔“ زانگ نے اس کی رائے سے اتفاق کیا۔ اسی وقت آگے چلا رادھے رک گیا۔

”کیا بات ہے؟“ زانگ لپک کر اس کے قریب پہنچا۔ اس نے زبان سے کچھ کہنے کے بجائے انگلی سے

راہ پر جا سکیں گے لیکن یہاں رہنا کوئی نہیں چاہتا اور جہاں آدمی رہنا نہ چاہتا ہو، اس جگہ کی حفاظت کیوں کرے گا؟“ زانگ نے رادھے سے خاصی معلومات حاصل کر لی تھیں اس لیے مطمئن تھا کہ مقابلہ صرف پانچ سے کرنا ہے لیکن معاذ کا دل پوری طرح مطمئن نہیں ہو پا رہا تھا۔

”حملے کے لیے تمہارے ذہن میں کیا حکمت عملی ہے؟“

”ہم اگر دو سے تین آدمی بھی ایک راستے کے لیے بھیجیں تو وہ کافی ہوں گے۔ اندھا دھند فائرنگ اور دستی بموں کی برسات کسی پھریدار کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دے گی۔“ زانگ کا منصوبہ بالکل سادہ تھا۔

”میرے خیال میں اس منصوبے پر عمل کرنے کے لیے ہمیں دن کے مکمل ڈھلنے کا انتظار کرنا چاہیے۔ پھریداروں کی تعداد کم سہی لیکن وہ بند اور محفوظ جگہ پر ہیں۔ ہمارے ساتھی کھلے میں فوراً نشانہ بن جائیں گے۔“ دور بین آنکھ سے لگائے اس نے زانگ کو مشورہ دیا۔ وہ جس جگہ کھڑے تھے وہ نسبتاً بلند تھی اور یہاں سے صرف ایک داخلی راستہ ہی دکھائی دے رہا تھا۔ باقی تین راستے پہلو میں تھے لیکن ان تک پہنچنے کے لیے بھی یہیں سے گزرنا تھا۔ کہیں اور سے گھوم کر جانے کی کوئی راہ ہی نہیں تھی۔

”ٹھیک ہے۔ ہم اندھیرا ہونے کا انتظار کر لیتے ہیں۔ ہمارے آدمیوں کے پاس نائٹ ویژن گاگنز ہیں۔ انہیں رات میں حملہ کرنے سے کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔“ زانگ کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔

”میں کچھ اور اقدامات بھی کرنا چاہتا ہوں لیکن معلوم نہیں ہمارے پاس اس کے لیے انتظامات ہیں یا نہیں؟“ معاذ کا اضطراب کسی طور ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

”تم بتاؤ، ہو سکتا ہے کہ ہم تمہاری ڈیمانڈ پوری کر سکتے ہوں۔“ زانگ نے سرسری سے لہجے میں اسے جواب دیا۔ معاذ نے اسے اپنی ضرورت سے آگاہ کر دیا۔

”کوئی مشکل نہیں۔ ابھی سب ہو جاتا ہے۔“ زانگ نے اسے جواب دیا اور قریب کھڑے ایک ساتھی کو کچھ ہدایات دینے لگا۔ اس شخص نے اس کی بات سن کر سر کو اثبات میں جنبش دی اور پیچھے کی طرف چلا گیا۔ یقیناً وہ کسی تک زانگ کا پیغام لے کر گیا تھا۔ کیمپ کے قریب آنے کے بعد سے زانگ نے اپریش کا استعمال نہیں کیا تھا۔ یقیناً اسے خدشہ ہوگا کہ فریکوئنسی پکڑے جانے کی صورت میں ان کا کوئی راز، راز نہیں رہے گا۔

”کیمپ میں سیٹلائٹ فون موجود ہے۔ یہاں

والوں نے اب تک ڈیوڈ کو اس بگڑی صورت حال کی خبر تو دے دی ہوگی۔“ ایک کام مرضی کے مطابق ہونے جا رہا تھا تو معاذ کو دوسری فکر لاحق ہو گئی تھی۔

”برابر دے دی ہوگی پر وہ کیا کر سکے گا؟ جب تک اس کی طرف سے کوئی کمک آئے گی، ہم اپنا کام پورا کر کے نکل چکے ہوں گے۔“ زانگ کا استدلال ٹھیک تھا۔ اس جگہ کیمپ ہونے سے جہاں ڈیوڈ کو یہ فائدہ تھا کہ دنیا کی اس کیمپ تک رسائی نہیں تھی، وہیں یہ نقصان بھی تھا کہ وہ خود بھی فوری وہاں تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

☆☆☆

”آپ کے لیے دوا ہم اطلاعات ہیں۔“

”گڈ! میں سننا چاہوں گا۔“ لالہ عیسیٰ نے طاہر بیگ کی کال سن کر خوشی محسوس کی۔

”عرفان اللہ کے لیے نئی پی اے بھرتی کی جا رہی ہے اور اس لڑکی کا جو ریکارڈ میرے سامنے آیا ہے وہ بہت انٹرٹیننگ ہے۔“

”تم کہہ رہے ہو تو یقیناً ہوگا۔“

”لڑکی کا باپ ایک سابق جج ہے۔ اس نے زمانہ طالب علمی میں ایک یہودی لڑکی سانٹھا سے شادی کی تھی اور اسے اپنے ساتھ پاکستان لے آیا تھا۔ اہل کتاب عورت سے شادی کی اجازت کا فائدہ اٹھا کر اس کو دائرۃ اسلام میں لانا ضروری نہیں سمجھا گیا تھا۔ سانٹھا شادی کے ڈھائی تین سال تک پاکستان میں ہی رہی تھی لیکن پھر ایڈ جسٹ نہ ہونے کا بہانہ بنا کر واپس امریکا چلی گئی تھی۔ اس کے ساتھ اس کی ایک سالہ بیٹی صوفیہ بھی تھی۔ صوفیہ کی ساری تعلیم و تربیت سانٹھا کے زیر نگرانی امریکا میں ہی ہوئی لیکن دونوں ماں بیٹی کا وقتاً فوقتاً پاکستان آنا جانا لگا رہتا تھا۔ کچھ سال قبل سانٹھا کی موت کے بعد صوفیہ باپ کی خواہش پر مستقل طور پر پاکستان منتقل ہو گئی اور جے اینڈ جے کمپنی میں ملازمت کرنے لگی۔“

”اوہ.....“ تفصیلات سن کر لالہ کے منہ سے بے اختیار ہی نکلا۔

”جی ہاں..... اور اب جے اینڈ جے کی ملازمہ صوفیہ کا عرفان اللہ کی پی اے کی حیثیت سے انتخاب ہو گیا ہے۔“

”یہ تو تم نے واقعی بہت دلچسپ خبر دی ہے۔“

”اس خبر نے آپ کے اس خیال کو بھی کنفرم کر دیا ہے کہ اس روز ہوٹل میں عرفان اللہ سے خفیہ ملاقات کرنے والی عورت جے اینڈ جے کمپنی کی سی ای اور ایمل ہی تھی اور

شہر کے ہر مشہور شریف اور بد معاش آدمی کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلومات حاصل تھیں۔

”جی، جی۔ اسی مجاہد کمال کی بات کر رہا ہوں میں۔ بہن کے اصرار پر نہ چاہتے ہو۔ نہ بھی میں اس کے ساتھ اس کی بچی کو دکھانے مجاہد کمال کے کلینک لے گیا تھا اور اتفاق کی بات وہاں مجھے سائمن صداقت شاہ کا نواسا دکھائی دے گیا۔“ طاہر بیگ کی اتنی لمبی تفصیل میں سے آخر کار کام کی بات نکل ہی آئی۔

”میں نے بچے کو دیکھا تو بہن کی ڈیوٹی لگادی اس کے بارے میں کھوج لگانے کی۔“

”بہت خوب!“ لالہ نے اسے داد دی۔ اسے اپنے ہاں کی دیسی خواتین کا مزاج معلوم تھا کہ ویٹنک روم میں بیٹھ کر دوسرے مریض کے ساتھ آئے بیمار دار کا شجرہ نسب بھی اس خوبی سے کھنگال ڈالتی تھیں کہ اسے پتہ نہ چلے۔

”اعظم کو جو عورت چیک اپ کے لیے کلینک لے کر آئی تھی، وہ اسے آذر کے نام سے پکار رہی تھی۔ میری بہن کے مطابق بچہ بیمار ہونے کے ساتھ ساتھ خاصا چڑچڑا بھی دکھائی دے رہا تھا۔“

”تم اس دوران کہاں تھے؟“

”میں باہر پارکنگ ایریا میں ہی رکا ہوا تھا۔ ڈاکٹر مجاہد کے بہت سے اصولوں میں سے ایک اصول یہ بھی ہے کہ وہ مریض بچے کے ساتھ صرف، ایک شخص کو اندر آنا الاؤ کرتے ہیں۔ ہاں اگر ضرورت محسوس ہو تو بچے کے باپ کو کال کر لیا جاتا ہے۔ اتنے نخروں اور اصولوں کے باوجود لوگ اپنے بچوں کو اس کے پاس لے جانا صرف اور صرف اس لیے منظور کر لیتے ہیں کہ اللہ نے اس کے ہاتھ میں کمال کی شفا دی ہے۔ بڑے سے بڑے اسپتال کے علاج سے مایوس ہو جانے والے بچے کو اس کے ہاتھ سے شفا مل جاتی ہے۔“ طاہر نے ایک بار پھر تفصیلی جواب دیا۔

”اعظم اور وہ عورت کس کے ساتھ اسپتال آئے تھے؟“ لالہ نے پوچھا۔

”گاڑی میں ڈرائیور اور دو گارڈز تھے۔ میں نے چپکے سے نمبر پلیٹ سمیت گاڑی اور گارڈز وغیرہ کی تصویریں اتار لی تھیں۔ ابھی آپ کو سینڈ کر دیتا ہوں۔“

”ہاں، کر دو۔“ لالہ نے بے دلی سے کہا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ ثبوت بیکار ہیں۔ اس بات کا علم اسے تو کیا، صداقت شاہ کو بھی تھا کہ بچہ کن لوگوں کے پاس ہے لیکن اس کے حصول کے لیے کوئی قدم اٹھانا ممکن نہیں دکھائی دے رہا تھا۔

عرفان اللہ کے سیاسی کیریئر نے جو ایک دم اسپید پکڑی ہے، اس کے پیچھے رانٹل کا ہی ہاتھ ہے۔ یقیناً اس نے عرفان اللہ پر چیک رکھنے اور اسے اپنے زیر اثر رکھنے کے لیے صوفیہ کو اس کے قریب ایڈ جسٹ کروایا ہے۔

”صوفیہ کا مذہبی اسٹیشن کیا ہے؟“

”بظاہر تو مذہب کے خانے میں اسلام ہی لکھا ہوا ہے لیکن واضح طور پر کچھ کہنا اس لیے مشکل ہے کہ اس کے باپ زاہد کی فیملی ایک الٹرا ماڈرن فیملی ہے اور ایسی فیملیز میں ویسے بھی مذہب کا زیادہ عمل دخل دکھائی نہیں دیتا۔ صوفیہ کی تو پرورش ہی خاندان سے ہٹ کر یہودی ماں کے ہاتھوں ہوئی ہے۔“ طاہر بیگ نے اس کے سوال کا جواب دینے کے ساتھ ساتھ اپنا تجربہ بھی پیش کیا۔

”عورتوں کے ذریعے مسلمان مردوں کے دماغ کو اپنے قابو میں رکھنا اور ان سے اپنی مرضی کے کام لینا یہودیوں کا پرانا ہتھکنڈا ہے۔ عرفان اللہ کے نزدیک صوفیہ کی موجودگی کو قطعی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔“ لالہ نے تشویش کا اظہار کیا۔

”جیسے تو سہی لیکن فی الحال ہم کچھ نہیں کر سکتے۔“ طاہر کے لہجے میں ہلکی سی مایوسی تھی۔

”اچھا چھوڑو اس بات کو اور یہ بتاؤ کہ دوسری اہم اطلاع کیا ہے؟“ لالہ نے موضوع بدلا۔

”دوسری اطلاع حاصل کرنے میں میری کوشش کے بجائے قسمت کا دخل ہے اور معلومات کے حصول کا سارا کریڈٹ میری بہن کو جاتا ہے۔“

”ارے واہ..... وہ کیسے؟“ لالہ نے دلچسپی ظاہر کی۔

”میری بہن کی ایک ہی بیٹی ہے جو اللہ نے اسے شادی کے بارہ سال بعد دی ہے۔ بچی کے بارے میں بہن اتنی حساس ہے کہ اسے چھینک بھی آجائے تو ڈاکٹر کی طرف بھاگتی ہے۔ کچھ دنوں سے بچی کی طبیعت خراب رہ رہی تھی تو بہن نے فیصلہ کیا کہ اس کے سابقہ ڈاکٹر کو چھوڑ کر کسی دوسرے اچھے چائلڈ اسپیشلسٹ کو دکھایا جائے۔ اس کی کسی سہیلی نے اسے ڈاکٹر مجاہد کمال کا نام بتادیا۔ آپ جانتے ہوں گے نا مجاہد کمال کو؟“ تفصیلات بتاتے بتاتے طاہر بیگ نے لالہ سے سوال کیا۔

”ہاں، نام سنا ہے اور ساتھ یہ بھی کہ بہت غریب ڈاکٹر ہے۔ کبھی کسی مریض کو اس کے گھر دیکھنے نہیں جاتا اور کلینک پر چاہے وزیر اعظم کا بچہ بھی علاج کے لیے آجائے تو اسے اصول کے مطابق اپنی باری کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔“ لالہ کو

”سب سے اہم بات تو میں نے آپ کو ابھی تک بتائی ہی نہیں۔“ اس بار طاہر بیگ کے لہجے میں دبا دبا جوش تھا۔
”وہ کیا؟“ لالہ چونکا۔ جواب میں طاہر نے جو کچھ بتایا اور جو مشورہ دیا، اسے سن کر لالہ کھل اٹھا۔

”جیو میرے شیر! یہ تو تم نے بہت ہی زبردست کام کر دکھایا ہے۔“ اپنی خوشی کے اظہار میں لالہ نے کسی کنجوسی کا مظاہرہ نہیں کیا۔

”لیکن خیال سے۔ میں نہیں چاہتا کہ کسی بے قصور کو کوئی نقصان پہنچے۔“ طاہر کو خود کو سراہے جانا اچھا لگا لیکن ساتھ ہی تنبیہ کرنا نہیں بھولا۔

”فکر نہ کرو بچے! جتنی احتیاط ممکن ہے، ہماری طرف سے ضرور کی جائے گی۔“ لالہ نے اسے تسلی دی پھر بولا۔

”میں تمہاری بہن کو اس کے اس تعاون پر انعام دینا چاہتا ہوں۔ تم انکار مت کرنا۔“

”انعام کیسا؟ اس نے یہ کام آپ کے لیے نہیں، میرے لیے کیا تھا اور میں کہہ چکا ہوں کہ میں اس کام کا کوئی معاوضہ نہیں لوں گا۔ اخراجات کے لیے تو ابھی وہی رقم کافی ہے جو آپ نے مجھے دی تھی۔ وہ ختم ہوگئی تو اور مانگ لوں گا۔“ طاہر کا لہجہ بے چلک تھا۔

”بہت ضدی ہو یار! ٹھیک ہے، خود نہ لو لیکن بہن بیٹیوں کا تو حق بتا ہے۔“ اسے معلوم تھا کہ طاہر کا تعلق سفید پوش گھرانے سے ہے اس لیے کسی نہ کسی طور اس کی مدد کرنا چاہتا تھا۔

”آپ کا بہت شکریہ لیکن یقین جانے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میری بہن کا شوہر ایک خوشحال آدمی ہے اور وہ اپنے گھر میں ہم سے زیادہ آسودہ زندگی گزار رہی ہے۔“ طاہر کو اس کی نیت سمجھنے میں دشواری پیش نہ آئی اور صاف طور پر بتا دیا کہ اسے اس کی طرف سے کوئی مدد قبول نہیں ہے۔

”چلو، جیسی تمہاری مرضی۔“ لالہ کو مزید بحث مناسب معلوم نہ ہوئی اور چند اختتامی الفاظ کے ساتھ سلسلہ منقطع کر دیا۔ فون سے فارغ ہونے کے بعد اسے اصغر کی کمی کا احساس ہوا۔ کافی دیر سے وہ اسے دکھائی نہیں دیا تھا۔ اسے ڈھونڈتے ہوئے وہ کمپیوٹر روم میں جا پہنچا۔ اصغر اتنا مصروف تھا کہ اسے اس کی آمد کی خبر ہی نہیں ہو سکی۔

”کیا کرتا پڑا ہے اصغر؟“ لالہ نے پوچھا تو اس کا استغراق ختم ہوا اور چونک کر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

”آپ کیوں آگئے لالہ؟ کوئی کام تھا تو مجھے بلا لیا ہوتا۔“
”کوئی فرق نہیں پڑتا یار اور ویسے بھی چلتے پھرتے

رہنے سے آدمی کے بدن کی چربی پگھلتی ہے۔“ لالہ نے اسے جواب دیا اور پھر اسکرین پر نظر آنے والے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”تو کر کیا رہا ہے؟“
”غدار کی تلاش۔“ اصغر نے ہونٹ بھینچتے ہوئے جواب دیا۔

”کیا مطلب؟“ لالہ کی سوالیہ نظریں ہنوز اس پر جمی رہیں۔
”ادھر شفٹ ہونے سے پہلے میں نے اڈے پر خفیہ کیمرے لگوائے تھے۔ اپنے کو خشک تھا نا کہ کوئی اپنے اندر کا بندہ ہے جو باہر خبریں پہنچا رہا ہے۔ وہ تھا یہ حرام کا جنا..... بس اس کی قسمت اچھی تھی کہ کیمرے لگوانے کے بعد سے کچھ ایسی گڑبڑی رہی کہ اپنے کو اس طرف دھیان دینے کا موقع ہی نہیں ملا۔ آج تھوڑی فرصت تھی تو وہاں سے آیا ریکارڈ نکلوایا اور یہ خبیث نظر میں آ گیا۔“

اصغریوں تو لالہ کے سامنے اپنی گالی دینے کی عادت پر قابو رکھنے کی کوشش کرتا تھا لیکن جب شدید غصے میں ہوتا تھا تو اس کا خود پر سے کنٹرول ختم ہو جاتا تھا۔

”دیکھ لینا اس کا حساب کتاب بھی۔ دوسرے کے دسترخوان سے کھانے والے کی زندگی نری شرمندگی ہوتی ہے۔ نکال دینا اسے اس شرمندگی سے۔“ لالہ نے سرد مہر لہجے میں غدار کے لیے حکم صادر کیا اور پھر موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ ”مجھے تجھ سے ایک اہم کام تھا، اسی لیے یہاں آیا تھا۔“
”حکم کرو لالہ!“ اصغر فوراً قدموں میں بچھنے کے لیے تیار ہو گیا۔ لالہ نے اسے طاہر بیگ سے حاصل شدہ معلومات اور اپنے پروگرام سے آگاہ کیا تو اس کی آنکھیں جھمکنے لگیں۔ اتنے دنوں سے نقصانات اٹھاتے اٹھاتے ایک نفع کی صورت دکھائی دی تھی تو اس کا خوش ہونا بتا بھی تھا۔

☆☆☆

”مجھے بخار ہو رہا ہے۔“ وہ ٹھٹھا ہوا چھپے موجود اپنے ساتھیوں تک پہنچا تو لالہ نے اس سے شکایت کی۔

”زخموں اور خون کی کمی کی وجہ سے بخار تو ہونا ہی ہے۔ میں تمہارے لیے درد اور بخار کی کوئی دوا منگوا دیتا ہوں۔“

”مجھے اینٹی بائیوٹک دو۔ اس کے بغیر میرے زخم خراب ہو جائیں گے۔“ لالہ نے مطالبہ کیا۔

”سوری! ہمارے پاس اینٹی بائیوٹکس کی محدود مقدار ہے اور انہیں اپنے ساتھیوں کے لیے سنبھال کر رکھنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ہم یہاں پتک منانے کے لیے تو آئے نہیں ہیں۔ تمہیں معلوم ہے کہ یہاں جلد ایک معرکہ ہونے

والا ہے اور معرکے میں ہار جیت جس کی بھی ہو، نقصان تو بہر حال دونوں طرف ہوتا ہے۔“ معاذ نے اسے صاف گوئی سے جواب دیا۔

”اس پتھارے کو اس طرح باندھ کر کیوں ڈال دیا ہے؟ میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ اب یہ تمہاری مکمل فرمانبرداری کرنے کا۔“ ایک معاملے میں انکار سن کر لارا اس سے دوسرے معاملے میں الجھنے لگی۔

”آدمی جب حالت جنگ میں ہو تو اسے کسی پر بھی مکمل اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔ میں بھی نہیں کر سکتا۔“ اس کی طرف سے ایک بار پھر صاف گوئی کا مظاہرہ ہوا۔ لارا محض منہ بنا کر رہ گئی۔

”ویسے تم عجیب ہو کہ اس ویرانے میں خان کو اپنے ساتھ لے کر اتنی دور جانکی تھیں۔“

”تو مجھے کیا معلوم تھا کہ وہاں تم لوگ ٹپک پڑو گے۔“ وہ معاذ کے پوچھنے پر چڑی۔ تکلیف اور نقاہت دھیرے دھیرے اس پر غالب آتے جا رہے تھے اور اسے اس وقت اس کے سوال جواب اچھے نہیں لگ رہے تھے۔

”میرے خیال میں تم اس امید پر اتنی دور تک جانکی تھیں کہ تمہیں امید تھی کہ آج ہماری گرفتاری کے لیے جانے والے باذل اور اس کے ساتھی ہمیں واپس لے کر لوٹ آئیں گے اور تم ہمیں خان کی بے بسی کا تماشا دکھا کر ذہنی اذیت دے سکو گی۔“

”تمہاری مرضی ہے جو چاہے سمجھتے رہو۔ میں تمہیں تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گی۔“ اس نے بیزاری کا اظہار کیا۔

”اچھا یہ تو بتا دو کہ جب تمہیں اور خان کو یہاں پہنچایا گیا تو اس وقت تم دونوں کے ساتھ اور کون کون آیا تھا؟“

”کیا مطلب، کون کون آیا تھا؟ بس ہم دونوں ہی تھے۔“ وہ پہلے سوال سن کر چونکی پھر کسی اور کے ساتھ آنے سے صاف انکاری ہوئی۔

”میں نہیں مان سکتا۔ یہاں تک پہنچنے کے لیے اچھا خاصا خرچہ کرنا پڑتا ہے تو یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ صرف دو بندوں پر ڈیوڈ اتنا خرچہ کرے۔“

”ہم سامانِ رسد کے ساتھ آئے تھے۔“ لارا نے بحالت مجبوری جواب دیا۔

”اور اس سامان کو کیمپ تک کیسے لے جایا گیا؟ کیا یہ کارنامہ بھی تم دو بندوں نے انجام دیا؟“ معاذ نے طنز سے پوچھا۔

”نہیں، اس کے لیے ایک خاص پوائنٹ پر کیمپ

سے بندے آئے تھے۔“

”میں اب بھی بہت الجھن میں ہوں کہ ڈیوڈ نے اس علاقے میں اپنا کیمپ کیوں بنایا۔ ٹھیک ہے یہ جگہ محفوظ ہے لیکن اس سب کو میسج کرنا بہت مشکل ہے۔ اس جگہ کیمپ کو چلانے کے لیے مالی وسائل اور افرادی قوت دونوں کی ضرورت ہے۔ جن دنوں موسم خراب ہو تب تو کھانے پینے کا سامان پہنچانا بہت ہی مشکل ہو جاتا ہوگا۔ ایسے میں اتنے لوگوں کا کھانا پینا کیسے چلتا ہوگا؟“ وہ اپنے ذہن میں موجود سوال لارا کے سامنے اٹھا رہا تھا۔

”میں کیا بتا سکتی ہوں۔ میں تو خود حال ہی میں یہاں آئی تھی۔“ اس نے تنک کر جواب دیا۔ معاذ کو مزید سوال اٹھانے کا موقع اس لیے نہیں ملا کہ اسے زانگ کا ایک آدمی بلانے آ گیا تھا۔

”رات ہونے میں زیادہ دیر نہیں ہے۔ اندھیرا پھیلنے ہی زانگ حملے کا فیصلہ سنا دے گا۔ تم دونوں نے گل خان کی حفاظت کرنا ہے۔ بہتر ہے اسے کسی محفوظ آڑ میں پہنچا دو۔ خود تم دونوں کے لیے بھی میری یہ نصیحت ہے کہ حملہ آوروں کی پہلی صف میں شامل نہیں ہونا۔ میں زانگ سے بھی اس سلسلے میں بات کر لوں گا۔“

”لیکن یہ بہت عجیب بات ہے معاذ بھائی کہ ہم ان کے ساتھ ہوتے ہوئے اس طرح پیچھے رہ کر بزدلی کا مظاہرہ کریں۔“ وہی کو اس کا حکم بہت عجیب لگا تھا۔

”اس میں بزدلی کی کوئی بات نہیں ہے۔ عقب کا خیال رکھنے کے لیے کسی کو موجود ہونا چاہیے۔ سارے لوگ آگے لڑنے کے لیے چلے جائیں اور پیچھے کوئی گڑبڑ ہو جائے تو پھر کیا کرو گے تم لوگ؟“ معاذ نے ذرا سخت لہجے میں سمجھایا اور اس کا شانہ تھپک کر آگے بڑھنا چاہا۔

”معاذ بھائی!“ وہی کی آواز نے اس کے قدم پکڑ لیے۔ ”آپ خود کیا کرنے جا رہے ہیں؟“ اس نے تشویش زدہ لہجے میں پوچھا۔

”کیا مطلب، کیا کرنے جا رہا ہوں؟ میں بھی تم سب کی طرح اس جنگ کا حصہ ہوں۔“

”لیکن آپ کے انداز سے مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ آپ ہم سب سے الگ کچھ کرنے جا رہے ہیں۔“ وہی کو اس کے جواب نے مطمئن نہیں کیا۔

”تم خواخواہ ٹینشن لے رہے ہو۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ وہ وہی کو ٹال کر آگے بڑھ گیا۔ جا رہی وہاں موجود تھا لیکن اس نے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

ہونے کی رفتار اس سے بھی زیادہ تھی۔ آخر کار مناظر دھندلے ہوتے ہوتے بالکل معدوم ہی ہو گئے اور مجبوراً اسے اپنی ہیڈ ٹارچ جلا نا پڑی۔

دل میں ایک اندیشہ سا بھی تھا کہ کہیں اس ٹارچ کی روشنی کسی کو اس کی طرف متوجہ نہ کر دے لیکن یہ خطرہ مول لیے بغیر گزارہ بھی نہیں تھا کہ دوسری صورت میں تاریکی اس سے بھی بڑی قاتل ثابت ہو سکتی تھی۔ اس کے لیے اس وقت سب سے اہم بات یہ تھی کہ آہستہ آہستہ ہی سہی، منزل قریب آتی جا رہی تھی۔ محض چند قدم کا فاصلہ ہی رہ گیا تھا جب اس کے کانوں نے ہتھیار چلنے کی آوازیں سنیں۔ یعنی زانگ اپنے کہے کے مطابق ٹھیک وقت پر حملہ کروا چکا تھا۔ اس نے اپنی رفتار مزید بڑھا دی۔ اوپر پہنچ کر وہ ابھی اپنی رائفل کے حصے جوڑ ہی رہا تھا کہ اس کے حساس کانوں نے نیچے جاری ہنگامے سے ہٹ کر گولیاں چلنے کا شور سنا۔ ماضی میں شاید اس سے اس آواز کو شناخت کرنے میں کوئی غلطی ہو جاتی لیکن اتنا عرصہ ہتھیاروں کے ساتھ گزارنے کے باعث اسے ہیوی مشین گن کی آواز پہچاننے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ اس گن کی تباہ کاری سے واقف تھا اور اندازہ لگا سکتا تھا کہ کہیں بلندی پر موجود اس گن نے گولیوں کی بوچھاڑ کی صورت نیچے موجود افراد کی زندگیوں کا نشانہ شروع کر دی ہیں۔

☆☆☆

”ہمارا بندہ سانٹے والی بلڈنگ میں پوزیشن لیے ہوئے ہوگا۔ اسے اچھی طرح بریف کر دیا ہے کہ کب اور کس کس پر گولی چلانا ہے۔ پارکنگ میں دو گاڑیاں بالکل ریڈی کھڑی ہوں گی اور پہلے فائر کے ساتھ ہی اشارت ہو جائیں گی۔ دو آدمی اور مناسب پوزیشن پر فکس کر دیے ہیں۔ کسی گڑبڑ کی صورت میں وہ بھی فوراً حرکت میں آجائیں گے۔“ لالہ کو بریفنگ دیتے اصغر کو اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کی اتنی منصوبہ بندی کے باوجود لالہ پوری طرح مطمئن نہیں ہے۔

”آپ کو کوئی کمی لگتی ہے تو بولو لالہ!“ لالہ کو غیر مطمئن پا کر وہ زیادہ دیر خود کو روک نہ سکا۔

”سب ٹھیک ہے یار ابس مجھے اس لیے فکر ہو رہی ہے کہ اصل ذمے داری نیلی کے سر ہے۔ اسے بے حد پھرتی اور چالاکی سے کام لینا ہوگا۔ اگر اس سے ذرا سی بھی غلطی ہوگئی تو ہمارا منصوبہ ناکام ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی جان کے بھی لالے پڑ جائیں گے۔“ لالہ نے اپنے خدشات

”تمہارا مطلوبہ سامان آگیا ہے۔ ایک سے ڈیڑھ گھنٹے کا وقت ہوگا تمہارے پاس۔ اس کے بعد ہم حملہ کر دیں گے۔“ وہ زانگ کے پاس پہنچا تو وہ ایک بیگ لیے اس کا منتظر تھا۔

”بے فکر رہو۔ اس وقت تک میں اپنی پوزیشن سنبھال چکا ہوں گا۔“ اس نے اپنے سامنے پھیلے پہاڑوں پر نظر دوڑائی۔ کیمپ والا سارا حصہ ان بلند و بانگ پہاڑوں سے اس طرح گھرا ہوا تھا کہ کسی کی نظر میں آنا مشکل تھا۔ ان پہاڑوں کے درمیان سے صرف ایک درے نما راستہ ہی کیمپ تک جاتا تھا۔ وہ لوگ اس وقت اسی راستے پر ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔

”تمہارا خدا تمہیں سہل کرے۔“ زانگ نے اسے دعا دی۔ وہ شانوں سے بیگ لٹکائے مسکراتا ہوا اس سے ہاتھ ملا کر تیز تیز قدموں سے اس جگہ سے دور ہوتا چلا گیا اور جب سب کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو اس پہاڑ کے قریب ہوتا چلا گیا جو بلندی کے اعتبار سے تو شاید کسی شمار میں نہ آتا ہو لیکن اس کی بناوٹ کی وجہ سے اس پر چڑھنا آسان نہیں تھا۔ معاذ نے فیصلہ کیا تھا کہ اس پہاڑ پر چڑھ کر اوپر سے اپنے ساتھیوں کی حفاظت کرے گا۔ پہاڑ کی مشکل چڑھائی کی وجہ سے اس نے زانگ سے کوہ پیما کے سامان کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ خوش قسمتی سے یہ سامان ان کے ساتھ موجود تھا۔

پہاڑ پر چڑھتے ہوئے ابتدا میں اسے اس سامان کو استعمال کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی لیکن تھوڑا سا اوپر جا کر ہی پہاڑ اپنا رنگ دکھانے لگا اور اسے اوپر چڑھنے کے لیے باقاعدہ سامان کا استعمال کرنا پڑا۔ کہیں چھوٹی دستی کلہاڑی برف میں دھنسا کر اپنے آپ کو اوپر لے جانے کے لیے سہارا دینا پڑ رہا تھا تو کہیں باقاعدہ میخیں ٹھوک کر ان پر اپنے قدم جما نا پڑ رہے تھے۔ ایک بار تو وہ بڑی طرح پھسل ہی گیا لیکن جسم سے بندھی رسی کی وجہ سے بچت ہوگئی۔ اس کے پاس ایک آدھ بار تفریحا بیس کیمپس تک جانے کا تجربہ ضرور تھا لیکن وہ کوئی تجربہ کار کوہ پیما نہیں تھا اور اس وقت خود کو بے حد خطرے میں ڈالے صرف اس لیے اوپر جا رہا تھا کہ اپنے ساتھیوں کو اس خطرے سے بچا سکے جس کا اس کی چھٹی حس مسلسل اسے اشارہ دے رہی تھی۔ بیگ میں پڑی بھاری اسٹاپر گن کا وزن اس کے کام کو مزید مشکل بنا رہا تھا لیکن وہ ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھا۔ وہ مستقل مزاجی سے مسلسل آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا لیکن روشنی کے غائب

بیان کیے۔ ”آپ فضول میں فکر کر رہے ہو۔ میں نے دیکھ لیا ہے کہ لڑکی جی دار اور پھرتیلی ہے۔ بھلا سرکس میں تنے ہوئے رستے پر چلنے اور موت کے کنوئیں میں موٹر سائیکل پر بیٹھنے والی کی جرأت اور پھرتی پر بھی کوئی شک کر سکتا ہے؟“

”کسی نے اس کا بہروپ پہچان کر پہلے ہی سے گڑبڑ کو بھانپ لیا تو پھر.....؟“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مومی دبلا پتلا اور تھوڑے چھوٹے قد کا لڑکا ہے۔ عبا یا بہمن کر، منہ پر نقاب لگائے مزے سے عورتوں کے حصے میں ٹھس جائے گا۔ پہلے اسے اس انداز میں استعمال کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن اس نے خود پیشکش کی ہے کیونکہ وہ بھی یہی سمجھتا ہے کہ کسی مشکل کے وقت نیلی کی مدد کے لیے کسی کو وہاں موجود ہونا چاہیے۔“

”ان دونوں کا خصوصی خیال رکھنا۔ انہیں کوئی نقصان پہنچ گیا تو میں وکی سے نظریں نہیں ملا سکوں گا۔“ لالہ نے تاکید کی۔

”بالکل ایسا ہی ہوگا لالہ!“

”اصغر کے پاس بھی محض تسلیاں ہی تھیں۔ جانتے وہ دونوں ہی تھے کہ ایسے معاملات میں کبھی بھی کنٹرول آپ کے ہاتھ سے نکل سکتا ہے۔ یہ سارا کھیل اصل میں طاہر بیگ کی دی گئی رپورٹ کے بعد شروع کیا گیا تھا۔ طاہر نے انہیں اطلاع دی تھی کہ اعظم کا ڈاکٹر مجاہد کمال کے ہاں دوسرا وزٹ کس دن ہے اور لالہ نے طے کر لیا تھا کہ اس دن اعظم کو میڈم ایکس کے قبضے سے نکال لیا جائے۔ اس طرح وہ ایک تو صداقت شاہ کو اس کا مہرہ بننے سے بچا سکتے تھے، دوسرے صداقت شاہ کے ساتھ اچھے تعلقات استوار کر کے انہیں بہت سی مدد بھی مل سکتی تھی۔ اعظم کو کلینک میں داخل ہونے کے بعد اس کو لانے والی عورت سے چھیننا تھا اس لیے انہیں نیلی کی مدد کی ضرورت پڑی تھی۔ پورا منصوبہ تیار تھا اور اعظم کے چیک اپ والے دن ہی دو بچوں کے لیے الگ الگ ڈاکٹر مجاہد سے وقت لے لیا گیا تھا۔ مریضوں کا احتیاطا دیے گئے وقت سے قبل کلینک پہنچنا اور وینٹگ ایریا میں اپنی باری کا انتظار کرنا ایک معمول کی بات تھی اس لیے نیلی اور مومی کا اعظم کے طے شدہ وقت سے قبل وہاں پہنچ جانا کوئی چونکا دینے والی بات نہ ہوتی۔ اصغر اپنی منصوبہ بندی سے پوری طرح مطمئن تھا پھر بھی لالہ کی تسلی کے لیے اس نے نیلی اور مومی کو پہلے سے اپنے پاس بلوایا تھا۔“

”کسی طرح کی گھبراہٹ یا پریشانی تو نہیں ہے؟“

”روانگی سے قبل اس نے نیلی سے پوچھا۔“

”بالکل نہیں۔“ نیلی نے بھرپور اعتماد سے جواب دیا

اور گلابی رنگ کے بستر میں لیٹے بچے کے سر پر ٹوپی درست کی۔ ٹوپی کی ڈیزائننگ اور بچے کے کپڑوں کے نظر آنے

”کھیل تماشے کی جرأت مندی اور تیزی طراری کی اور بات ہے اصغر! یہاں سفاک و بے رحم مجرموں سے مقابلہ کرنا ہے۔ ذرا سی چوک ہو گئی تو اس کے ساتھ بُرا ہو جائے گا۔“ لالہ کو نیلو فر عرف نیلی کی فکر تھی۔ یہ وہی نیلی تھی جو وکی کے عزیز دوست معمر عرف مومی کی منگیتر ہوا کرتی تھی۔ مومی، وکی سے دوستی نبھاتے نبھاتے اتنا شدید زخمی ہوا تھا کہ اسے سرکس کی دنیا کو خیر باد کہنا پڑا تھا۔ نیلی نے اس مشکل وقت میں مومی کا ساتھ چھوڑنے کے بجائے اپنے رشتے کو مزید مضبوط کرتے ہوئے اس سے شادی کر لی تھی اور وہ دونوں ساتھ رہ کر زندگی کے سرد گرم کا سامنا کر رہے تھے۔ مومی کے سلسلے میں وکی کی خاص ہدایات رہی تھیں اس لیے اس کے پیچھے بھی مومی اور نیلی کا ممکنہ خیال رکھا جاتا رہا تھا۔ اس خیال داری کے پیچھے کوئی غرض نہیں تھی لیکن اب جبکہ انہیں اپنے کام کے سلسلے میں ایک عورت کی ضرورت تھی تو دھیان خود بخود نیلی کی طرف چلا گیا تھا۔ نیلی نے بھی انہیں مایوس نہیں کیا تھا اور فوراً ہی مدد کرنے کے لیے آمادہ ہو گئی تھی لیکن لالہ کو اب بھی تحفظات تھے۔

”آدمی میں جان کی بازی لگانے کی جرأت ہو تو بڑے بڑے مجرموں کو بچھاڑ دیتا ہے۔ نیلی ساری زندگی جان کی بازی لگا کر رزق کماتی آئی ہے۔ وہ یہ کام بھی کر گزرے گی۔ آپ کی تسلی کے لیے میں یہ بھی بتا دوں کہ وہ وہاں اکیلی نہیں ہوگی۔ وہاں کوئی اور بھی اس کی مدد کے لیے اس کے ساتھ موجود ہوگا۔“ لالہ کو تسلی دیتے دیتے اصغر پر اسرار انداز میں مسکرایا۔

”کون..... کون ہوگا..... کیا مومی خود؟“ لالہ اس کے انکشاف پر چونکا اور پھر فوراً ہی اندازہ لگا لیا۔

”بالکل ٹھیک سمجھے آپ۔“ اصغر نے مسکراتے ہوئے اثبات میں گردن ہلائی۔

”لیکن وہ کیسے؟ زنانہ وینٹگ ایریا میں تو صرف

خواتین ہی جاسکتی ہیں نا۔“

”اب سرکس کا بندہ اتنا سا بہروپ بھی نہ بھر سکے گا

کیا؟“ مسکراہٹ اصغر کے ہونٹوں سے چمکی ہوئی تھی۔

والے حصے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ لڑکی ہے لیکن وہ لڑکی نہیں تھی۔ حقیقت میں وہ انسانی بچے کے روپ میں ایک گڑیا تھی جسے اتنی فنکاری سے بنایا گیا تھا کہ ایک نظر دیکھنے میں اس پر اصل بچے ہی کا گمان ہوتا تھا۔ ایسا ہی ایک مصنوعی بچہ مومی کے پاس بھی موجود تھا۔ وہ اس بچے کو ایک جانب رکھے جدید تراش خراش کا سیاہ عبا یا اپنے جسم پر سیٹ کرنے میں مصروف تھا۔ یہ عبا یا اس انداز کا تھا کہ آنکھوں اور ہاتھ پیروں کے سوا اس میں سے اس کے جسم کا کوئی حصہ دکھائی نہیں دے سکتا تھا۔ ہاتھوں کا مردانہ پن چھپانے کے لیے اس نے ان پر باریک جالی کے سیاہ دستانے چڑھا رکھے تھے۔ پیروں میں بھی سیاہ جرابیں اور زنانہ طرز کے بند جوتے تھے۔ دور سے دیکھنے پر اس پر کسی خوشحال مذہبی گھرانے کی خاتون کا گمان ہو رہا تھا اور اس تاثر کو مضبوط کرنے کے لیے اس کے پاس ایک مہنگا لیدر بیگ بھی موجود تھا۔

”کلینک میں گھسنے سے پہلے ہر شخص کو میٹل ڈیٹیکٹر کی مدد سے چیک کیا جاتا ہے اس لیے ہتھیار تم لوگ ساتھ لے جا نہیں سکتے۔ جو کچھ کرنا ہے، خالی ہاتھوں سے کرنا ہے۔ کر لو گے نا؟“

”یہ سب آپ ہمیں پہلے بھی بتا چکے ہیں اصغر بھائی! اب بار بار بتا کر ٹینشن دینے کا کیا فائدہ؟“ نیلی نے اسے ٹوکا۔ ”نہیں، نہیں..... ٹینشن نہیں دے رہا، بس سمجھا رہا ہوں۔“ اصغر اس کے ٹوکے پر جھینپا۔

”سمجھنے سمجھانے کا وقت گزر چکا۔ اب تو بس آپ ہمارا ایکشن دیکھیے گا۔ ہم وکی کے دوست ہیں۔ اپنے ایکشن سے آپ کو وکی کی یاد نہ دلا دی تو نام بدل دیجیے گا۔“ نیلی بہت ریلیکس تھی۔ اس نے کھلے پانچوں کے ٹراؤزر کے ساتھ گھٹنوں سے اونچی اوپن شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے سنہری رنگ سے رنگے بال ایک جدید تراش کے ہیئر اسٹائل کے ساتھ اس کے شانوں اور پشت پر گول گول چھلوں کی صورت میں بکھرے ہوئے تھے اور آنکھیں بھی تقریباً بالوں کی ہم رنگ ہو رہی تھیں۔ اس نے نہایت نفاست سے لومیک اپ لک دینے والا میک اپ کر رکھا تھا اور ایک چھوٹے بچے کی جوان اور امیر ماں کے روپ میں بچ رہی تھی۔

”ٹھیک ہے تو پھر اب نکل پڑو۔ تم دونوں کا ٹائم پر وہاں ہونا ضروری ہے۔“ اصغر کو بھی احساس ہو گیا کہ وہ بلاوجہ کی الجھن میں گرفتار ہو رہا ہے۔ اس کا اشارہ ملتے ہی وہ دونوں حرکت میں آ گئے۔ دونوں کو لے جانے کے لیے

باہر ڈرائیور سمیت گاڑیاں موجود تھیں۔ گاڑیاں ایک ساتھ روانہ ہوئیں لیکن دونوں نے ڈاکٹر مجاہد کے کلینک جانے کے لیے الگ الگ راستہ اختیار کیا۔ نیلی کی گاڑی کا راستہ مختصر تھا اس لیے وہ پہلے کلینک پر پہنچی۔ باوردی ڈرائیور نے پارکنگ میں گاڑی روکی اور پھر نی سے نیچے اتر کر پچھلی جانب کا دروازہ کھولا۔ نیلی نے نیچے اترنے سے قبل اس کو ایک کیری کوٹ تھمائی۔ خوبصورت جالی منڈھی کیری کوٹ میں سوئی ہوئی نیکی کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ جالی کی وجہ سے نیکی اتنی صاف دکھائی نہیں دے رہی تھی کہ اس کے اصلی یا نقلی ہونے کا اندازہ لگایا جاسکے۔

”ٹھیک ہے، اب تم واپس جاؤ۔“ پارکنگ سے لے کر استقبال تک ڈرائیور کیری کوٹ تھامے اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ استقبال پر پہنچ کر اس نے ڈرائیور کے ہاتھ سے کیری کوٹ لے لی اور اس سے تحکمانہ لہجے میں بولی تو ڈرائیور مؤدبانہ سر کو خم دے کر وہاں سے چلا گیا۔ جس وقت وہ پارکنگ میں پہنچا، مومی والی گاڑی اندر داخل ہو رہی تھی۔ عبا یا پوش مومی نے نیلی کے برخلاف گاڑی سے اسٹرالر خود باہر نکالا تھا اور خود اسے دھکیلتا ہوا استقبال تک پہنچا تھا۔ اس کی گاڑی کے ڈرائیور نے ڈرائیونگ سیٹ نہیں چھوڑی تھی اور وہیں بیٹھا اپنی ڈیوٹی انجام دے رہا تھا۔

”میم! بچے کا ویت کروالیں۔“ مومی اسٹرالر کو دھکیلتا ویننگ روم میں داخل ہو رہا تھا جب اس نے پہلے سے نشست پر بیٹھی نیلی سے زس کو بولتے ہوئے سنا۔

”ریڈی۔“ نیلی، زس کی بات کے جواب میں کوئی رد عمل ظاہر کرتی، اس سے قبل ان دونوں نے اپنے کان میں سرگوشی سنی۔ انہوں نے بے ساختہ ایک دوسرے پر نظر ڈالی۔ اس ایک لفظ کا مطلب تھا اعظم اپنی دیکھ بھال کرنے والی عورت کے ساتھ وہاں پہنچ چکا ہے۔

”میم! میں آپ سے کہہ رہی ہوں کہ نیکی کا ویت کروالیں۔“ زس نے نیلی کی طرف سے اپنی بات پر رد عمل نہ ظاہر ہونے پر اسے بلند آواز میں ٹوکا۔

”جی، مین لار ہی ہوں۔“ اس نے ساتھ والی نشست پر رکھے کیری کوٹ پر پھیلی جالی کو دھیرے سے ہٹانا شروع کیا۔ اسی وقت اس کے کانوں میں قدموں کی چاپ گونجی۔ یہ چاپ مومی نے بھی سنی۔ ان کے درمیان ایک بار پھر نظروں کا لمحاتی تبادلہ ہوا۔ عبا یا پوش مومی اسٹرالر کو ایک طرف کرتے ہوئے دانستہ داخلی دروازے سے قریب ترین رکھی نشست پر ٹپک گیا۔

”فائر۔“ آنے والی نے ویٹنگ روم میں پہلا قدم رکھا تھا کہ ان دونوں کے کان میں بیک وقت یہ لفظ گونجا۔ وہ دونوں اس لفظ کا مطلب سمجھتے تھے۔ باہر کام شروع ہو گیا تھا۔ وہ اعظم کو لے کر باہر نکلتے تو انہیں میدان صاف ملا۔ دونوں ہی ایشن میں آنے کے لیے اچھل کر اپنی نشستوں سے کھڑے ہوئے۔ ان کے انداز کا یہ غیر معمولی پن آنے والی نے محسوس کیا اور بھڑک کر واپس پلٹنے کی کوشش کی لیکن وہاں مومی ایک عبا یا پوش عورت کے روپ میں اس کی راہ روکے کھڑا تھا۔

”بچے کو میری ساتھی کے حوالے کر دو ورنہ جان سے جاؤ گی۔“ مومی نے اپنی بیلٹ کے ساتھ اٹکا ایک کھلونے نما لکڑی کا ٹکڑا نکال کر اسے جھٹکا دیا تو اس کی تہیں ٹھٹھکی چلی گئیں اور ایک ایسی چپٹی اسکیل نما ڈنڈی ترتیب پا گئی جس کا ایک سرا بالکل کسی نیزے کی طرح تھا۔ کسی دھات کے استعمال کے بغیر بھی اس لکڑی کے نیزے کو اتنی مہارت سے تراشا گیا تھا کہ آرام سے انسانی جسم میں اتر سکتا تھا۔ مومی نے اپنے اس نیزے کی انی کو سیدھا اعظم کو گود میں اٹھائے کھڑی عورت کے زرخ سے پر رکھا تھا۔ وزن کرنے والی مشین کے قریب کھڑی نرس حیرت سے منہ کھولے یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔

”کون ہو تم؟“ کھال میں اترتی لکڑی کی تیز نوک کے باوجود عورت نے مومی کے حکم کی تعمیل نہیں کی اور سخت لہجے میں سوال کیا۔

”ہم اس کے سگے ہیں اور اسے تجھ جیسی ڈائن کے قبضے سے نکالنا چاہتے ہیں۔“ نیلی نے آگے بڑھ کر اسے دو ہتھ رسید کیا اور اعظم کو اس کی گود سے چھیننے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں وہ گھبرا کر رونے لگا۔ نیلی کے درمیان میں آ جانے کی وجہ سے مومی کا دھیان بھی تھوڑا سا بٹ گیا۔ اس موقع کا اس عورت نے فائدہ اٹھاتے ہوئے خود کو دو قدم پیچھے ہٹانے کی کوشش کی اور ساتھ ہی نیلی کو نشانہ بنانے کے لیے اپنی ٹانگ بھی چلائی۔ رد عمل نیلی اور مومی دونوں کی طرف سے آیا۔ مومی کا ہاتھ خود کار انداز میں اس پر حملہ آور ہوا اور تیز دھار لکڑی کے نیزے کی انی اس کے گلے میں پھوست ہو گئی۔ یہ جھٹکا اس لیے بھی زوردار تھا کہ عین اسی وقت نیلی نے بھی عورت کا بازو غصے سے کھینچا تھا۔ اس کھنچاؤ نے عورت کو آگے کی طرف جھکایا تو اس کے اپنے وزن نے بھی انی کو اندر تک پیوست ہونے میں مدد دی۔ تکلیف کی شدت کے باعث عورت کے ہاتھ کی گرفت اعظم پر کمزور ہو گئی اور وہ اس کے ہاتھ سے پھسل کر نیچے گر گیا۔ وہ پہلے ہی

گھبرا کر رو رہا تھا۔ گرنے سے چوٹ لگی تو مزید حلق پھاڑنے لگا۔ ممکن تھا کہ اس شور پر کلینک کا عملی متوجہ ہو کر صورت حال معلوم کرنے کے لیے اس طرف کا رخ کرتا لیکن اندر جاری ہنگامے سے زیادہ شدید ہنگامہ باہر برپا ہو چکا تھا۔ مسلسل فائرنگ کے ساتھ ڈرائیور اور گارڈز کی گرنے والی لاشوں نے ایک دہشت اور افراتفری کی صورت حال پیدا کر دی تھی۔ حملہ آور کو کسی نے نہیں دیکھا تھا لیکن کلینک کے اپنے گارڈز نے بوکھلا کر خود فائرنگ شروع کر دی تھی۔ اس فائرنگ نے آس پاس موجود لوگوں کو خوفزدہ کر دیا تھا۔ کوئی پناہ کے لیے بھاگ رہا تھا تو کوئی لاشوں کو دیکھ کر ایسے ہی چیخے چلے جا رہا تھا۔

”تم لوگ جلدی نکلو۔ میں ایک گاڑی کو بہت تیزی سے اس طرف آتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے وہ ان ہی کے مددگار ہوں۔“ کان میں ہدایات دینے والا چیخا تو وہ دونوں عورت کی خون آگلی لاش کی وجہ سے لگنے والے جھٹکے سے سنبھلے۔ نیلی نے بچے کو اٹھایا اور بانہوں میں بھر کر تیزی سے باہر کی جانب لپکی۔ مومی نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ کلینک کی پوری فضا میں سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی۔ باہر سے بھی شور اندر آرہا تھا۔ ایسے میں کون غور کرتا کہ اندر سے برآمد ہونے والیوں کی گود میں وہ بچے نہیں تھے جنہیں وہ کچھ دیر قبل لے کر یہاں آئی تھیں۔ لوگوں کی اس حواس باختگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ دونوں تیزی سے باہر کی طرف لپکے۔

”اوئے، رو کو انہیں۔ کہاں جا رہی ہیں یہ۔“

”بہن جی! کہاں جا رہی ہیں آپ دونوں؟ کیا سنائی نہیں دے رہا کہ باہر گولیاں چل رہی ہیں۔“

”لگتا ہے مرنے کا ارادہ ہے بیچاروں کا۔“ گیٹ کے قریب پہنچنے پر انہیں پیچھے سے کئی آوازیں سنائی دیں لیکن انہوں نے اپنے قدم نہیں روکے۔ وہ صرف اس کی سن رہے تھے جو چھوٹے سے اتر فون کے ذریعے مسلسل ان کی راہنمائی کر رہا تھا۔

”تم دونوں نیلی والی گاڑی میں پہنچو۔ دوسری گاڑی تمہیں کور دینے کے لیے پیچھے رہے گی۔“ باہر نکلتے ہی انہیں اپنے ہی خون کے تالاب میں پڑی گارڈز اور ڈرائیور کی لاشیں اور ٹوٹے بکھرے شیشے دکھائی دیے۔ وہ ہدایت کے مطابق پارکنگ کی طرف لپکے تو پہلے ہی سے اسٹارٹ گاڑی غرا کر ان کی طرف لپکی۔ وہ اس کے کھلے ہوئے دروازوں سے اندر گھسے تو گاڑی ایک ہل کی بھی تاخیر کیے بغیر ہوا کی رفتار سے آگے بڑھی۔

مومی کو یہاں لانے والی گاڑی ان کے پیچھے ہی تھی۔ دونوں پہلی بار قدرے اطمینان محسوس کرتے ہوئے سکون سے بیٹھے اور نیلی نے روتے ہوئے اعظم کو چوم کر سینے سے لگایا۔ سہا ہوا بچہ اس کے وجود کی گرمی سے تھوڑا پُر سکون ہوا لیکن پھر فضا میں گونجنے والی فائرنگ کی آواز نے اعظم سمیت ان دونوں کو بھی ہلا ڈالا۔

”میرا شک درست تھا۔ گاڑی مجاہد کمال کے کلینک کی طرف ہی آرہی تھی اور اب تم لوگوں کے پیچھے ہے لیکن فکر نہ کرو، ہم ان سے نمٹ لیں گے۔“ انہیں تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کیا گیا۔ ساتھ ہی گاڑی کی رفتار بھی بڑھ گئی۔ کچھ لمحوں میں وہ اس سارے ہنگامے سے دور نکل چکے تھے۔ نیلی کی محبت بھری تھکیوں نے اعظم کو بھی پُر سکون کر دیا تھا اور وہ اسے سینے سے لگائے سکون سے نشست گاہ سے پشت ٹکائے بیٹھی تھی۔

”کیا تھک گئی ہو؟“ مومی نے اسے یوں بیٹھے دیکھ کر محبت سے پوچھا۔ وہ عبایا کا اوپر والا حصہ اتار کر ایک طرف رکھ چکا تھا اور اب ہاتھ میں پہنے دستانے کھینچ کر اتار رہا تھا۔

”اونہوں۔“ نیلی نے دھیرے سے گردن کو نئی میں جنبش دی اور چمکتی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”آج بہت دنوں بعد اس سرور کو محسوس کیا ہے جو موت کے کنوئیں میں تمہارے پیچھے موٹر سائیکل پر بیٹھ کر محسوس ہوتا تھا۔“ جواباً مومی اسے دیکھ کر رہ گیا۔ سرکس سے دوری کو صرف وہی نہیں، نیلی بھی محسوس کرتی تھی۔

☆☆☆

ہیوی مشین گن کی آواز سننے ہی اس نے اپنی ہیڈ ٹارچ بجھادی تھی اور اب اندھیرے میں کسی شکاری درندے کی طرح ساکت بیٹھا اپنی حیات سے ماحول کو پڑھتے ہوئے سارے حساب کتاب لگا رہا تھا۔ دوسرا راونڈ شروع ہوتے ہی اس کے دماغ نے سمت اور فاصلے کا تعین کرنا شروع کر دیا اور وہ بہت جلد اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ حملہ آور اس کے دائیں جانب موجود پہاڑ پر موجود ہے۔ بہت جلد اس کی نائٹ ویژن نے اسے سبز دھبے کی صورت تلاش کر لیا۔ وہ مشین گن کو اسٹینڈ پر ٹکائے پورے ردھم کے ساتھ فائرنگ کر رہا تھا۔ معاذ نے اپنی اسٹائپر گن کا رخ اس کی طرف کیا اور بدن کو بالکل ساکت کر کے نشانہ باندھنے لگا۔ ہوا کی رفتار، روشنی، درجہ حرارت، درمیانی فاصلہ..... یہ سارے حساب کتاب اس وقت صرف جبلت کے سہارے ہو رہے تھے اور وہ بھی کسی

سپر کمپیوٹر کی رفتار سے زیادہ تیزی سے۔ پتھر کی طرح ساکت ہوئے جسم کی صرف ایک انگلی کو حرکت کا اذن ہوا۔ ٹریگر دبا اور گولی نکل کر سیدھی اس سبز دھبے کی طرف بڑھی جو نیچے موجود اس کے ساتھیوں میں موت بانٹ رہا تھا۔ بس ایک پل کی بات تھی۔ اس نے سبز دھبے کو ایک جھٹکے سے گرتے اور غائب ہوتے دیکھا۔ پتا نہیں وہ وہیں کہیں گرا ہوا تھا یا نیچے لڑھک گیا تھا۔ اس کے اطمینان کے لیے بس اتنا کافی تھا کہ موت کا قہقہہ لگاتی مشین گن غائب ہو گئی تھی۔ یقیناً یہ مشین گن ہی کیمپ والوں کے لیے ترپ کا پتا تھی اور انہیں اطمینان تھا کہ کم نفری کے باوجود وہ اپنا بہترین دفاع کر سکیں گے۔ ان کا یہ اطمینان غلط بھی نہیں تھا۔ اگر معاذ کی چھٹی حس اسے خطرے کا احساس نہ دلاتی اور وہ حملے کے دوران بلندی سے نگرانی پر اصرار نہ کرتا تو وہ شخص اس کی نظر میں ہی نہیں آتا۔ وہ جس پوزیشن پر تھا، وہاں اسے نیچے سے نشانہ بھی نہیں بنایا جاسکتا تھا۔ دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کرتا وہ کچھ دیر یونہی سینے کے بل لیٹا سن گن لیتا رہا۔ امکان کم تھا لیکن پھر بھی اطمینان کرنا ضروری تھا کہ اس کا کوئی دوسرا ساتھی تو موجود نہیں ہے۔ تھوڑی دیر میں یہ تسلی بھی ہو گئی۔ اس کے کان سن سکتے تھے کہ اوپر سے برستی گولیوں سے گھبرا کر پسا ہو جانے والے اس کے ساتھی ایک بار پھر میدان میں اتر آئے ہیں اور اس بار ان کی کامیابی یقینی تھی۔ یقینی کامیابی کا اطمینان ہو جانے کے بعد اس نے پہاڑ سے نیچے اترنا شروع کر دیا۔ یہ کام چڑھنے کے مقابلے میں مزید دشوار تھا۔ بار بار پاؤں پھسل رہے تھے لیکن وہ کسی جلد بازی کا مظاہرہ کیے بغیر دھیرے دھیرے اترتا چلا گیا۔ اترنے کا یہ مرحلہ طے ہونے میں اتنی تھکن ہو گئی تھی کہ وہ فوراً باقی لوگوں کے درمیان جانے کے بجائے کچھ دیر وہیں لیٹ گیا۔ لیٹے لیٹے اس کی نظر آسمان پر پڑی۔ وہاں باریک سا چاند چند تاروں کے جھرمٹ میں کچھ اداس سا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا ذہن خود بخود سچل کی طرف چلا گیا۔ وہ بھی یونہی اداس تھی اور آہستہ آہستہ گھلتی جا رہی تھی۔ ایک طرف بیماری اس کے جسم میں سے زندگی کو نچوڑ رہی تھی تو دوسری طرف بیٹے کی جدائی نے زندہ رہنے کی لگن کو بجھا دیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اگر کسی طرح اعظم کو اس تک پہنچا دیا جاتا تو وہ اپنی بیماری سے لڑ سکتی تھی۔

**ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نوجوان
کی داستان جو غلط کاروں کے لیے
غضب ناک تھا باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیے**



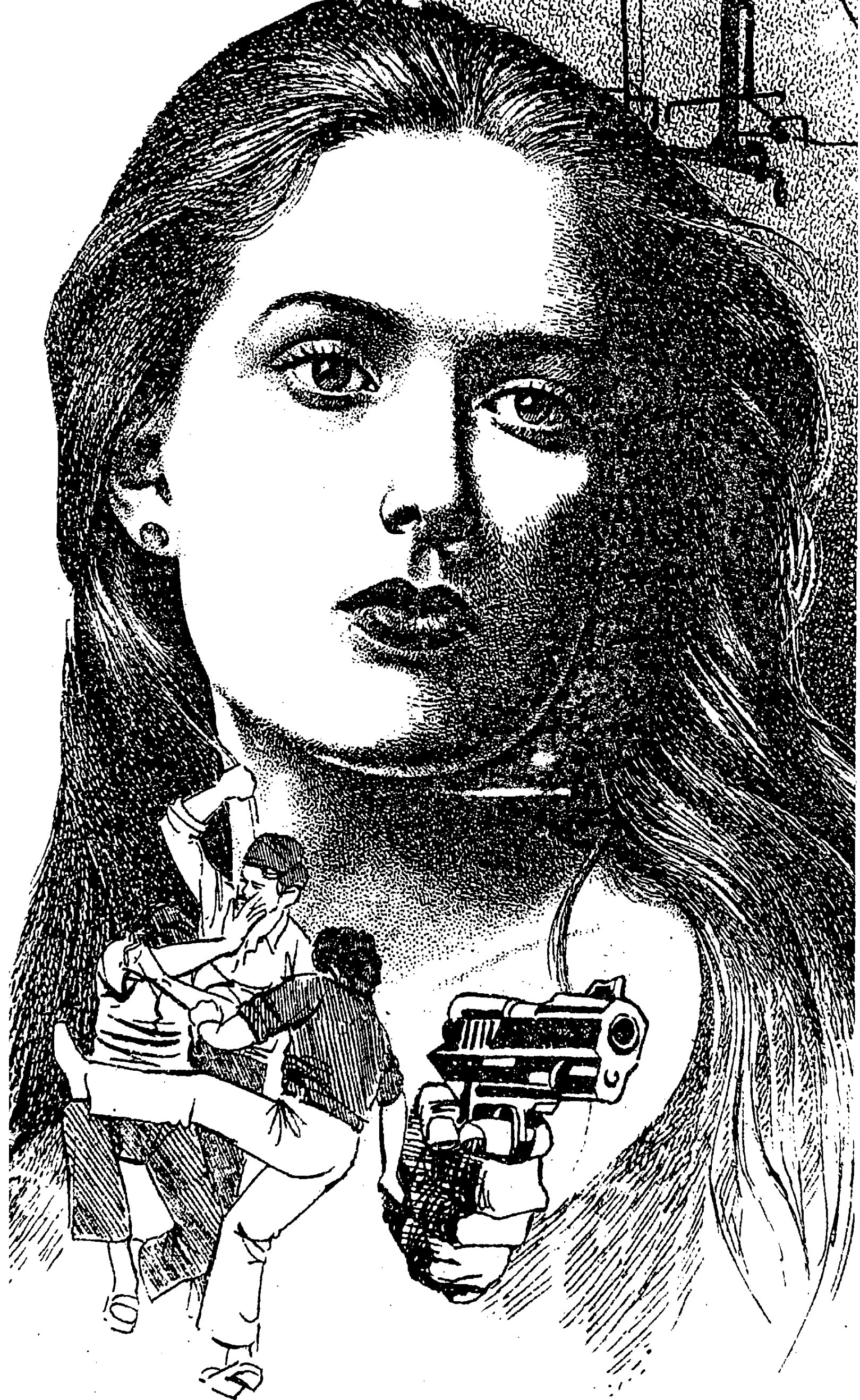
قسط نمبر: 37

سپنس ڈائجسٹ

استادری

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تند و تیز اندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابل شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پُر عزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جا رہے تھے... اس کی زندگی جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... یہ خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی یہ قرار یوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تار عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ وارداتِ قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہوسکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تحیر انگیز داستان



معاذ ایک ذہین لیکن متلون مزاج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جو اُن کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ انسٹی ٹیوٹ سے واپس آ رہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو بڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی بڑ رفترت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشری نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بشری ماس کیونی کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم وغیرہ لکھتی ہے۔ اس ویران جگہ بھی وہ ایک زیر تعمیر رہائشی منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی آئی تھی۔ معاذ بشری کو بہ حفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کر دیتا ہے لیکن جن رئیس زادوں سے اس نے ان کا شکار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ایک دن جنگل کی سیر کے دوران وہ فوٹو گرافی کے شوق میں سب سے الگ تھلک ہو جانے والے معاذ کو بے خبری میں گھیر کر بری طرح زد و کوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دے دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس نہ آنے پر انتظامیہ کے افراد، پولیس اور ریسکیو ذرائع کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جوگی کی جمونپڑی میں پاتا ہے۔ جوگی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ معاذ کا موبائل جنگل میں ہی کہیں گر جاتا ہے اور جوگی کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا جس سے باہر کی دنیا سے رابطہ کیا جاسکے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے، جوگی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نواز کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے پراسرار علم سکھانے کی ہامی بھر لیتا ہے اور معاذ واقعی اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ادھر جائے وقوعہ سے ملنے والے معاذ کے کمرے سے جب تصویریں نکلوائی جاتی ہیں تو ایک ایسی تصویر بشری کی نظر میں آ جاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پروجیکٹ کے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشری تحقیق کر رہی تھی۔ بشری کے اپنے والد جرنلسٹ ہوتے ہیں اور حق گوئی ان کے خون میں شامل تھی۔ اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشری کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ مددے سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باذل نامی غنڈے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشری انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دنوں میں ہی معاذ واپسی کا ارادہ کرتا ہے تاہم ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا عرفان اللہ اور یزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو وقاص نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باذل اچانک بشری کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر دیتا ہے۔ معاذ کو واپس لانے کے لیے اوجھے ہشکنڈے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اسے واپس آنے کا پیغام دیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کر کے اسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات لی جاتی ہیں، نہ بتانے پر اس کے بھائی کا ایک گردہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشری بھی انتقام کی آگ میں جلتی ہوئی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہو جاتی ہے۔ معاذ کے دوست عالم شاہ کے بہنوئی کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ کئی فنون میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے پہتا کر کے اس کے دماغ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ لمبھو سے حاصل انوکھے علم کی بدولت ان کا معمول نہیں بدلتا۔ عالم شاہ اور اس کا نوکر سرد، باذل کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ عالم کی بہن بجل شاہ کے نومولود بیٹے کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اغوا کا الزام لطیف سومرو پر آتا ہے۔ عالم شاہ، باذل کی قید میں موجود ایک زخمی شخص کی مدد سے وہاں سے فرار ہو جاتا ہے۔ ادھر بشری دعویٰ پہنچ جاتی ہے۔ وہاں وقاص اسے باربی کے روپ میں پہچان لیتا ہے اور ان دونوں کے درمیان اعتماد کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ وہ سلطان کو مارنا چاہتی ہے تاہم وقاص اسے ایسا کرنے سے روکتا ہے۔ ادھر عالم شاہ، باذل کی قید سے نکل کر اس کا پیچھا کرتا ہے تاہم وہاں اچانک فائرنگ اور دھماکے ہونے لگتے ہیں۔ وہ وہاں معاذ کو دیکھتا ہے۔ صداقت شاہ، لطیف سومرو کو گھیرنے کے لیے اس کی خلیہ بیوی اور بچے کا کھوج لگاتے ہیں اور بچے کو اغوا کر لیتے ہیں۔ لطیف سومرو مجبور ہو جاتا ہے۔ معاذ کو اس کے گھر والوں سے ملنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ عالم شاہ کو اس کے والد انڈیا روٹنگی کا عندیہ دیتے ہیں۔ ادھر معاذ بھی ایک مشن پر سونیا کے ساتھ انڈیا روانہ ہوتا ہے تاہم کچھ لوگ سکھ یا تریوں سے بھری بس کو یرغمال بنا لیتے ہیں۔ معاذ اور سونیا تھ خانے کے تمام افراد کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔ صداقت شاہ کے انڈیا میں موجود رشتے دار کے ہاں شادی ہوتی ہے۔ عالم شاہ، بجل اور سرد انڈیا روانہ ہو جاتے ہیں۔ انرپورٹ سے گھر روانگی پر راستے میں کچھ لٹیرے انہیں لوٹ لیتے ہیں۔ عالم شاہ ایکشن میں آتا چاہتا ہے تاہم اجالائی عالم شاہ کی کزن اس کا راستہ روک لیتی ہے۔ گھر پہنچنے پر پولیس کی ریڈ ہوتی ہے اور وہ عالم شاہ اور سرد کو لے جاتے ہیں۔ ادھر بشری اور وقاص باذل کو اسپتال میں مارنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ فحش جاتا ہے۔ معاذ اور سونیا اپنے سہولت کاروں سے مل جاتے ہیں۔ عالم شاہ اور سرد کو تشدد کا نشانہ

ہٹکھڑانے میں چینک دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ واپس اپنے میزبانوں کے ہاں پہنچ جاتے ہیں۔ شادی کے دوران انہیں پتا لگتا ہے کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں اجالا اور اس کا عاشق شامل ہوتے ہیں۔ وہ چھپ کر ان کی باتیں سن رہا ہوتا ہے کہ اسے چھاپ لیا جاتا ہے۔ تاہم وہاں مارا ماری ہوتی ہے اور اجالا کا عاشق مارا جاتا ہے۔ پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ ان کے کزن انہیں اپنے دوسرے خفیہ ہنگامے پر پہنچا دیتے ہیں جہاں کچھ لوگ ان پر حملہ کر دیتے ہیں۔ وہ وہاں سے بھگت لکھ جاتے ہیں۔ ادھر معاذ کو سونیا اپنے ساتھ نئے مشن پر لے کر جاتی ہے جس میں ایک ریلوے لائن کو دھماکے سے اڑانا ہوتا ہے۔ معاذ ایسا نہیں چاہتا اس لیے وہ ٹرین کی آمد سے قبل بارودی دھماکا کر دیتا ہے۔ وہ زخمی ہو جاتا ہے اور اسے ہندو سادھو اپنی کتیا میں لے جاتا ہے جہاں اس کی امچی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ سونیا کے آدمی معاذ کو تلاش کرتے ہیں مگر ناکام ہو جاتے ہیں۔ ادھر عالم شاہ اور سرد خفیہ ذریعے سے بارڈر پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ دھریے جاتے ہیں اور ”را“ کی قید میں پہنچ جاتے ہیں۔ ادھر بشری ہاڈل کو مارنے کی کوشش میں خود نشانہ بن جاتی ہے۔ معاذ سادھو کی مدد سے ایک انڈین ہیروئن کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ وہیں اسے عالم اور سرد کی گرفتاری کا پتا چلتا ہے۔ معاذ ڈاکٹر فردوس سے ملتا ہے اور اسے سبھل کی مدد کرنے کا کہتا ہے۔ عالم اور سرد قید سے فرار کا سوچتے ہیں اور دھریے لیے جاتے ہیں جس کی پاداش میں انہیں مزید تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ علیہ اور وقاص وغیرہ کو لالہ عیسیٰ ملک سے باہر نکال دیتا ہے اور ہر ممکن احتیاط کی ہدایت کرتا ہے لیکن علیہ پاکستان میں ٹوبہ سے رابطہ کرتی ہے جو ان کے لیے مصیبت بن جاتی ہے۔ ٹوبہ پر تیزاب پھینک دیا جاتا ہے۔ وقاص، علیہ اور اس کے گھروالوں کو مار دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس معاذ کو دیوانامی شخص سے مدد لینے کا کہتی ہے۔ معاذ اپنے کزن کو پاکستان کال کرتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ اس کے گھروالوں کو مار دیا گیا ہے۔ وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کی ٹھان لیتا ہے۔ ادھر ڈاکٹر فردوس کو اس کے سسرال والے سبھل کو بھگانے کی پاداش میں تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ معاذ، عالم اور سرد کی رہائی کے لیے کارروائی کرتا ہے اور انہیں ”را“ کی قید سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن عالم اور سرد کو دیوا کے آدمی کسی دوسری جگہ پہنچا دیتے ہیں۔ سونیا معاذ کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ ادھر ہاڈل ایک جگہ لالہ عیسیٰ کی موجودگی پر کارروائی کرتا ہے تاہم لالہ خود کو گولی مار کر ختم کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس کا انتقال ہو جاتا ہے۔ دیوا گینگ ڈاکٹر فردوس کی میت اٹھنے پر وہاں فائرنگ کر دیتے ہیں۔ پولیس دیوا کو گھیر لیتی ہے۔ معاذ دیوا اور اس کے آدمیوں کو نکالنے کے عوض عالم کا پتا معلوم کر لیتا ہے۔ سونیا اور معاذ حیدر آباد نواب بدرالدین کی حویلی پہنچ جاتے ہیں۔ تاہم کالے خان اور راجا دیوی کو میڈم ایکس کے ٹھکانے سے چھڑانے کے لیے انہیں واپس آنا پڑتا ہے، کالے خان کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ نواب صاحب کی حویلی میں عالم اور سرد کی رہائی کے لیے کارروائی کر کے انہیں رہا کر لیتا ہے۔ وہ لوگ نئے ٹھکانے پر پہنچتے ہیں تو وہاں معاذ سے ملنے جا روٹا نامی شخص آتا ہے۔ اسے معاذ نے ”را“ کی قید سے نکالا ہوتا ہے۔ جا رو اور معاذ، سبھل سمیت اسپتال جاتے ہیں اور پہچان لیے جانے پر پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ پولیس سے مقابلے کے بعد وہ ایک بستی میں پناہ کے لیے گھس جاتے ہیں اور دو لوگوں کو یہ غمال بنا کر ان کی جھوپڑی میں قیام کرتے ہیں۔ ادھر سونیا عالم وغیرہ سمیت سب کو ٹھکانا بدلنے کا کہہ کر معاذ کی تلاش میں نکلتی ہے اور اسے بستی میں پہنچنے پر معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ معاذ اور جا رو وغیرہ الوپ نامی شخص کے ساتھ اس کے مالک کے ہنگامے میں قیام کرتے ہیں۔ سونیا بھی معلومات حاصل کرنی ہوئی مذکورہ ہنگامے تک پہنچ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور سرد بھی سونیا کا پیچھا کرتے ہوئے وہیں پہنچ جاتے ہیں۔ ادھر وقاص، علیہ وغیرہ لوگ زندہ ہوتے ہیں۔ وقاص حلیہ بدل کر گلوکا باڈی گارڈ بنتا ہے۔ وہ معاذ کو تلاش کرنے کے لیے انڈیا روانہ ہوتا ہے۔ وہاں اس کی گل خان سے ملاقات ہوتی ہے اور معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ سونیا، معاذ اور دیگر ساتھیوں سے مل جاتی ہے تاہم وہ جس ہنگامے میں ہوتے ہیں وہ دشمن کا ہوتا ہے۔ دشمن سب کو بے ہوش کر کے کہیں لے جا رہے ہوتے ہیں کہ ان کی گاڑی کو حادثہ پیش آ جاتا ہے۔ ان سب کو چینی بمکشو طبعی امداد دیتے ہیں اور ان سے پوچھ گچھ کی جاتی ہے۔ سبھل کی حالت تشویشناک ہوتی ہے اور اسے وہاں موجود ایک وید دیکھتا ہے۔ ادھر لالہ واپس اپنے لوگوں میں پہنچ کر ایکشن میں آ جاتا ہے اور حامد کو اغوا کر دیتا ہے۔ لالہ میڈم ایکس کے ٹھکانے کی نگرانی کر داتا ہے۔ ادھر سونیا پر تشدد کر کے اس سے معلومات لی جاتی ہیں تاہم وہ اپنے گلے پر خنجر پھیر لیتی ہے۔ باڈل، معاذ وغیرہ کے ٹھکانے سے باخبر ہو جاتا ہے۔ ادھر لالہ کے آدمی میڈم ایکس کی نگرانی کے چکر میں مارے جاتے ہیں۔ لالہ اپنے آدمیوں کو انڈیا گراؤنڈ کر دیتا ہے۔ معاذ وغیرہ جہاں ہوتے ہیں وہاں دشمن حملہ کر دیتا ہے اور کافی مارا ماری ہوتی ہے۔ باڈل، معاذ کا پیچھا کرتا ہے اور چینیوں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ معاذ چینیوں کے ساتھ مل کر دشمنوں کے خلاف کارروائی کرتا ہے۔ اس دوران اسے گل خان نظر آتا ہے۔ اسے پھانسا کر کیا گیا تھا۔ وہ لارانا می عورت کو بھی گرفت میں لے لیتے ہیں اور اسی سے معلومات لیتے ہیں۔ ادھر لالہ عیسیٰ، اعظم کو دشمن کی گرفت سے نکالنے کے لیے کارروائی کر داتا ہے اور مومی اور نیلی، اعظم کو نکالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

اب مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

معاذ دشمنوں سے نمٹنے کے بعد سبھل کے بارے میں سوچ رہا تھا اور چاہتا تھا کہ اس کے بیٹے کو اس تک پہنچائے تاکہ وہ زندگی کی طرف لوٹ سکے۔ ”مجھے چائینز کی جتنی باتیں ماننا تھیں، مان لیں۔ اب میں ان سے صاف الفاظ میں پاکستان جانے کا مطالبہ کروں گا۔ میڈم ایکس کی قید سے اعظم کو چھڑا کر سبھل تک پہنچانا اب میری پہلی ترجیح ہوگی۔“ اس نے وہیں لیٹے لیٹے.....

فیصلہ کیا اور پھر اٹھ کر چل پڑا۔ ابھی درے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ دو کی سے سامنا ہو گیا۔
 ”میں آپ ہی کی راہ دیکھ رہا تھا۔“ وہ جذباتی سے انداز میں اس کے گلے لگ گیا۔
 ”سب ٹھیک ہے؟“ معاذ نے اس کی پیٹھ ٹھکے ہوئے پوچھا۔

”اب تو ٹھیک ہی ہو گیا ہے لیکن حملے کا پہلا لمحہ.....“
 دو کی نے ایک جھرجھری سی لی۔ ”ہم آپ کی ہدایت پر پیچھے رہے تھے شاید اسی لیے فوج بھی گئے ہیں۔ آگے والوں پر تو گویا آسمان سے موت برس رہی تھی۔ زانگ کے پانچ آدمی فوری طور پر مارے گئے۔“

”میری چھٹی حس ایسے ہی کسی خطرے کی نشاندہی کر رہی تھی۔ شکر ہے کہ اللہ نے تم لوگوں کو محفوظ رکھا۔“
 ”آپ کی وجہ سے۔“ دو کی بے ساختہ بولا۔

”رب کا حکم ہو جائے تو وجہ کوئی بھی بن سکتی ہے۔ اسی نے میرے دل میں یہ بات ڈالی تھی کہ اوپر جاؤں ورنہ جتنی مشکل ان پہاڑوں کی چڑھائی ہے، سو چاہی بھی نہیں جاسکتا کہ اوپر کوئی مشین گن لیے گھات میں بیٹھا ہوگا۔“

”وہ مشین گن والا ہی کیمپ کا واحد دفاع تھا۔ اس کے راستے سے ہٹتے ہی سارا کام آسان ہو گیا۔ اب سب کچھ ہمارے قبضے میں ہے۔ زخیبوں کی مرہم پٹی اور کیمپ کی تلاشی کا کام جاری ہے۔ مجھے آپ کی فکر ہو رہی تھی اس لیے آپ کو ڈھونڈنے نکلا تھا۔“ دو کی نے اسے بتایا۔

”آؤ، چل کر زانگ سے ملتے ہیں۔“ وہ قدرتی غاروں پر مشتمل اس کیمپ کی طرف بڑھا جہاں ڈیوڈ نے انہیں قیدی کے طور پر پہنچانے کی اپنی سی بڑی کوشش کی تھی لیکن وہ اس حیثیت سے وہاں پہنچے تھے کہ یہ کیمپ ان کے ہاتھوں زیر ہو چکا تھا۔

”معاذ!“ کشادہ غار کے اندر زانگ نے گرجوٹی سے اس کا استقبال کیا۔

”فتح مبارک ہو زانگ۔ مجھے تمہارے ساتھیوں کا افسوس ہے۔“

”ہریدہ خون مانگتا ہے، پرتو! میں تمہارا دمنیو اد کرتا ہوں کہ تمہارے کارن ہمیں یہ سمھتا (کامیابی) ملی۔“
 زانگ مطمئن تھا۔

”یہ ہماری بھی کامیابی ہے۔ ہمارا اور تمہارا دمنیو ایک ہے۔“

”بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ آؤ، میں تمہیں دکھاؤں کہ

یہاں کیا حالات ہیں۔“ زانگ اسے بازو سے پکڑ کر اپنے ساتھ لے گیا۔ شاخ در شاخ غاروں کا یہ سلسلہ حیرت انگیز تھا۔ جگہ جگہ روشنی کے انتظام کے لیے سولر لائٹس لگی ہوئی تھیں جو اس وقت بیٹری کی مدد سے جل رہی تھیں۔ دن میں یقیناً سولر پنل کی مدد سے بیٹریوں کو چارج کیا جاتا ہوگا۔ اچھا خاصا سیٹ اپ تھا جو حیرت انگیز طور پر کسی کی نظروں میں نہیں آیا تھا۔ شاید پہاڑوں نے اس انداز سے اس سارے حصے کو گھیر رکھا تھا کہ کسی سیاح کی کبھی نگاہ ہی نہیں پڑی تھی۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ عموماً سیاح اور کوہ پیما بھگتنے سے بچنے کے لیے لگے بندھے راستوں پر سفر کرتے ہیں اور یہ نکلنا کسی روایتی راستے سے ہٹ کر تھا۔

”اتنے لوگ، وہ بھی اتنے بُرے حال میں؟“
 زانگ اسے ایک سلاخ دار غار کے سامنے لے کر پہنچا تو وہ حیران رہ گیا۔ سلاخوں کی مدد سے بند کیے گئے اس غار کو دیکھ کر کسی ایسی جیل کا گمان ہو رہا تھا جس میں ضرورت سے زائد قیدی بھر دیے گئے ہوں۔

”ہمیں باہر نکالو۔“ انہیں دیکھتے ہی قیدیوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ وہ سب کے سب سر، ڈاڑھی اور مونچھوں کے بڑھے ہوئے بالوں والے ایسے انسان تھے جن کے جسموں پر میل کی تہ اور آنکھوں میں وحشت تھی۔ جسم پر موجود لباس بھی بوسیدہ سا تھا۔ یہ غار قدرتی طور پر اتنے گرم تھے کہ باہر کی سردی کا یہاں کوئی اثر محسوس بھی نہیں ہو رہا تھا اس لیے عام کپڑے میں تو کوئی حرج نہیں تھا لیکن اتنے لوگوں کی صفائی کے ایسے ناقص انتظام کے ساتھ موجودگی قابلِ افسوس تھی۔

”ہم نے اس شرط پر اس درندے کو تمہارے حوالے کیا تھا کہ تم ہمیں آزاد کر دو گے پر اب لگتا ہے کہ تم اپنے وعدے سے پھر گئے ہو۔“ ایک جوشیلا اور غصہ ور نوجوان شور مچاتے لوگوں میں سے آگے آیا اور زانگ کی طرف دیکھتے ہوئے نکتے بتاتا کر اپنے غصے کا اظہار کرنے لگا۔

”تم غلط سمجھ رہے ہو میرے مترا میں نے کیوں تمہاری بھلائی کے لیے ہی تمہیں یہاں روکا ہوا ہے۔“
 زانگ نے دونوں ہاتھ بلند کر کے ان لوگوں سے شور کم کرنے کی درخواست کی پھر نہایت بیٹھے لہجے میں نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے سمجھایا۔

”کیسی بھلائی؟ کسی انسان کو جانوروں کی طرح قید کر کے رکھنے میں اس کی کیا بھلائی ہو سکتی ہے؟“ نوجوان چلا یا۔

”پرنتو! تمہیں میں نے یہاں قید نہیں کیا ہے۔“

”پر آزاد بھی تو نہیں کر رہے ہو۔“ نو جوان، زانگ

کے مصدومیت سے دیے جواب پر غصے سے چلا یا۔

”اگر میں اسی حال میں تمہیں آزاد کر کے باہر نکال

دوں تو اس کا صاف صاف مطلب تمہاری موت ہوگا۔ کیا تم

ان کپڑوں میں باہر پھیلے برفستان کی سردی کا مقابلہ

کر سکو گے؟ کیا تمہارے پاس برف پر چلنے والے جوتے

ہیں؟ تمہارے پاس راستے کا ایسا کوئی خاکہ ہے جس پر چل

کر آبادی تک پہنچ سکو؟ کھاؤ گے کیا اور راتیں کس چھت تلے

گزارو گے؟“ زانگ نے وہ سوال اٹھائے جن کو سن کر ان

سب کو سانپ سونگھ گیا۔ اس غار کی قید و بند سے آزادی کا

امکان نظر آتے ہی وہ ان کی حقائق اور مسائل کو بھول بیٹھے

تھے جو اس محفوظ غار سے باہر منہ پھاڑے کھڑے تھے۔

”تمہیں اس سلسلے میں ہماری مدد کرنا ہوگی۔“ کچھ

دیر کی خاموشی کے بعد جو شیلے نو جوان نے مطالبہ کیا۔

”براہر کریں گے لیکن اس کے لیے تمہوڑا سہ لگے گا۔

پہلے ہمیں یہاں کے معاملات دیکھنے دو پھر ہم تمہیں بتائیں

گے کہ ہم تمہارے لیے کیا کر سکتے ہیں۔“ زانگ نے نرمی

سے انہیں سمجھایا۔

”ٹھیک ہے، لیکن ابھی ہمیں کھانے کے لیے دو۔ ہم

نے صبح سے کچھ نہیں کھایا ہے۔“ نو جوان کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا

اور اس نے پست لہجے میں مطالبہ کیا۔

”مل جائے گا۔“ زانگ نے سنجیدہ لہجے میں اسے

جواب دیا اور معاذ کا ہاتھ تمام کروہاں سے واپس پلٹ گیا۔

”وہ لوگ کس درندے کو تمہارے حوالے کرنے کی

بات کر رہے تھے؟“ وہ لوگ وہاں سے بٹے تو معاذ نے

ذہن میں انکا سوال زانگ کے سامنے رکھا۔

”ابھی جانکاری نہیں۔ ہم یہاں پہنچے تو قیدیوں والی

غار سے چیخ و پکار کی آوازیں آرہی تھیں۔ جا کر دیکھا تو

سارے قیدی مل کر ایک آدمی کو بڑی طرح مار پیٹ رہے

تھے۔ ہم نے مشکل سے اسلحے کے زور پر اسے ان سے

چھڑوایا۔ ابھی تک اس کے بارے میں صرف اتنی جانکاری

ملی ہے کہ وہ پروفیسر اینڈریو ہے اور خود کو ہم سے چھپائے

رکھنے کے لیے قیدیوں کے بیچ جگہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا

لیکن قیدی اس سے اتنی نفرت کرتے ہیں کہ موقع ملے ہی

اسے جان سے مارنے پر تل گئے تھے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ ہمیں اس پروفیسر اینڈریو کا

انٹرویو کرنا پڑے گا۔“ معاذ نے پُر سوچ انداز میں اپنی

راے دی۔

”وہ تو ہے پر ابھی میں قیدیوں کے لیے بھوجن کا کچھ

انتظام کر داتا ہوں۔ انہیں بھوجن نہ ملا تو ناراض ہو کر ہنگامہ

کر سکتے ہیں۔“ زانگ بولتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ اس کے

جانے کے بعد معاذ خاموش کھڑے وکی کی طرف متوجہ ہوا۔

”لارا اور گل خان کہاں ہیں؟“

”یہیں ہیں لیکن لارا کی حالت اچھی نہیں ہے۔ وہ

بڑی طرح بخار میں پھنک رہی ہے اور کبھی کبھی غشی میں چلی

جاتی ہے۔“

”دیکھو، اگر یہاں دوائیں مل جائیں تو اس کو

ٹریٹمنٹ دینے کی کوشش کرو۔“ اس نے ایک گہری سانس

خارج کرتے ہوئے وکی کو ہدایت کی اور خود زانگ کی تلاش

میں نکل گیا۔ غاروں کے اس جال میں گھومتے ہوئے اسے

ایک جگہ سے چیخنے چلانے کی آوازیں آئیں۔ اس نے آگے

بڑھ کر تجسس سے اس غار میں جھانکا۔ وہاں اسے دو آدمی

رسیوں سے بندھے ہوئے زمین پر پڑے دکھائی دیے۔

ان میں سے ایک الجھے ہوئے سفید بالوں والا گم صم سامر د تھا

جس کو فی الحال کچھ نہیں کہا جا رہا تھا لیکن اس کے قریب ہی

بندھے پڑے جوان کو الٹا لٹا کر اس کی پشت پر خوب

کوڑے برسائے جا رہے تھے۔ بالآخر جوان کا ضبط جواب

دے گیا اور التجا آمیز انداز میں چلا یا۔

”مت مارو۔ تم جو پوچھو گے، سب بتاؤں گا۔“ اس

کے ان الفاظ کے ساتھ ہی زانگ کے ہاتھ کا اشارہ ہوا اور

کوڑے برسائے والے کا ہاتھ رک گیا۔ زانگ نے چینی

زبان میں کچھ کہا تو اس جوان کو سیدھا کر کے بٹھا دیا گیا۔

”بولو..... اور ایک شبد بھی جھوٹ نہ بولنا ورنہ یہ

اس سے تک تمہیں مارتے رہیں گے جب تک تمہارے شریر

سے آتما نہیں نکل جاتی۔“ زانگ نے سخت لہجے میں جوان کو

ہدایت کی۔ معاذ کو اب مزید باہر کھڑے رہ کر یہ سب سننا

مناسب نہیں لگا چنانچہ قدم اٹھاتا اندر داخل ہو گیا۔

”معاذ.....! اچھا ہوا تم آگئے۔ میں یہی سوچ رہا تھا

کہ تم میرے واپس نہ آنے پر پریشان ہو گے۔ میرے

ساتھیوں کو ہندی بھاشا نہ آنے کے کارن مشکل ہو جاتی

ہے۔ اس آدمی سے پوچھنا ضروری تھی اس لیے مجھے

یہاں رکنا پڑا۔“ معاذ کو ہلکا سا شک تھا کہ زانگ اس

معاملے کو اس سے پوشیدہ رکھنا چاہتا ہے لیکن اس کے الفاظ

نے یہ شک دور کر دیا۔

”کون ہیں یہ لوگ؟“ اس نے دونوں بندھے

ہوئے افراد پر ایک نظر ڈالتے ہوئے سوال کیا۔
 ”وہ پروفیسر اینڈریو ہے۔“ اس نے سفید بالوں
 والے مرد کی طرف اشارہ کیا پھر جوان کی طرف دیکھتے
 ہوئے بولا۔

”یہ اس کیمپ کے محافظوں میں سے زندہ ہاتھ آنے
 والوں میں سے ایک ہے۔ اس کا دوسرا ساتھی زخمی حالت
 میں ہے۔ کچھ کہا نہیں جاسکتا کہ زندہ بچ گیا یا نہیں۔“
 ”تم اس سے کیا معلوم کرنے کی کوشش کر رہے ہو؟“
 ”اس کیمپ کا اصل راز..... ہمیں اس بات پر
 دشواں نہیں ہے کہ یہ کیمپ صرف لوگوں کی شکشا اور برین
 واشنگ کے لئے بنایا گیا ہے۔ ہمیں شک ہے کہ یہاں کچھ
 اور بھی ہو رہا ہے اور اس کا ثبوت بھی ملا ہے۔“
 ”کیسا ثبوت؟“ معاذ چونکا۔

”یہاں ایک میڈیکل لیب بنائی گئی ہے جو عام
 لیبارٹریز سے تھوڑی ہٹ کر ہے۔ مجھے دشواں ہے کہ یہ
 پروفیسر اس لیب میں انسانوں پر تجربات کر رہا ہے۔“
 زانگ کے الفاظ نے معاذ کے جسم میں پھریری سی
 دوڑادی۔ شکوک اس کے دل و دماغ میں بھی تھے لیکن یہ
 بات سامنے آنے پر کہ یہاں زندہ انسانوں پر گنی ٹکس کی
 طرح تجربات کیے جا رہے ہیں، بحیثیت انسان اسے تکلیف
 پہنچی تھی۔

”تم بولو، کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟ یہاں انسانوں
 پر تجربات ہو رہے ہیں نا؟“ زانگ اس بار گرفتار جوان سے
 مخاطب ہوا۔

”آپ ٹھیک سمجھے ہو مہاراج پر تو! ہمارا اس سے کچھ
 لینا دینا نہیں ہے۔ ہم صرف کیمپ کی رکھشا کا کام کرتے
 ہیں۔“ جوان نے فوراً اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

”کیا کرتے ہیں یہ لوگوں کے ساتھ؟“
 ”ہم نہیں جانتے۔ ہمارا کام بس ان کی پستد کے
 بندے کو لیب میں لے جا کر اسے اسٹریچر پر باندھنے تک کا
 ہے۔ آگے جو کرنا ہو، پروفیسر صاحب خود کرتے ہیں۔“ وہ
 بولتے ہوئے نظریں چراہا تھا۔

”بکو اس نہ کرو۔ تم نے بہت کچھ دیکھا ہوگا۔ یہ بتاؤ
 کہ جو لوگ لیب میں لے جائے جاتے ہیں، ان کا انت کیا
 ہوتا ہے؟“ زانگ نے اسے ڈپٹا۔

”کچھ فوراً مر جاتے ہیں، کچھ تھوڑے دن جی کر
 مرتے ہیں۔ میرا اور میرے ساتھیوں کا کام بس اتنا ہے کہ
 ہم لاشیں لے جا کر باہر برف میں اسٹور کر دیتے ہیں۔“ اس

نے جھکی نظروں سے بتایا۔
 ”یعنی سارے کے سارے مر جاتے ہیں۔ وہ
 سارے لوگ جو اس کیمپ میں لائے جاتے ہیں ان کا
 نصیب موت ہے؟“ معاذ کو اس کے انکشاف سے صدمہ ہوا
 تھا چنانچہ بے ساختہ ہی درمیان میں بول پڑا۔
 ”نہیں، سب نہیں۔ کچھ کو الگ کر کے لڑنے بھڑنے
 اور دوسرے کاموں کی سیکھ دی جاتی ہے۔ ان کو لیب میں
 نہیں لے جایا جاتا بلکہ پروفیسر کا اسسٹنٹ الگ سے برین
 واشنگ کرتا ہے۔“

”پروفیسر کا اسسٹنٹ؟ کہاں ہے اسسٹنٹ؟ ہمیں تو
 یہاں ایسا کوئی شخص نہیں ملا۔“
 ”پہلے والے کو باڈ کینسر ہو گیا تھا تو اسے علاج کے
 لیے واپس بھجوانا پڑا۔ اس کی جگہ لینے کو اب میڈم لارا کو بھیجا
 گیا تھا۔“ اس نے انکشاف کیا۔

”یعنی لارا لیب میں پروفیسر کی مدد کرنے کے ساتھ
 ساتھ دہشت گردی کی تربیت لینے والوں کی برین واشنگ کا
 کام بھی کر رہی تھی؟“

”ابھی وہ صرف لیب میں کام کر رہی تھی۔ پچھلا
 گروپ تربیت کے بعد یہاں سے جا چکا ہے۔ سنا تھا کوئی نیا
 گروپ لایا جانے والا ہے جس کو میڈم لارا دیکھے گی پر اس
 کی نوبت ہی نہیں آئی۔“ وہ یقیناً انہی لوگوں کے حوالے سے
 بات کر رہا تھا۔ ڈیوڈ کا پروگرام تھا کہ اس کیمپ میں انہیں
 رکھ کر اس کی مرضی کے مطابق ان کی ذہن سازی کی جائے
 اور پھر ان سے اپنے مطلب کے کام لیے جائیں۔

”تم ڈیڈ باڈیز ٹھکانے لگاتے ہو۔ کچھ تو اندازہ ہوا
 ہوگا جنہیں کہ ان باڈیز کے ساتھ کیا، کیا جاتا ہے۔ چیر پھاڑ
 کی جاتی ہے ان کی، اعضا نکالے جاتے ہیں یا کوئی دوسرا
 خطرناک تجربہ کیا جاتا ہے؟ کیسے مرتے ہیں وہ.....؟ کسی
 زہر، الیکٹرک شاک یا کسی اور غیر انسانی طریقے سے؟“
 معاذ نے ایک بار پھر جذباتی انداز میں سوال کیا۔

”مجھے ٹھیک ٹھیک نہیں معلوم سراسر ہاڈی الگ الگ
 حالت میں ہوتی ہے۔ ہاں پر.....“ وہ بولتے بولتے خاموش
 ہوا اور ایک نظر پروفیسر پر ڈالی۔ وہ اب بھی سب سے بے
 نیاز یوں تم صم بیٹھا تھا جیسے اسے کسی بات سے کوئی غرض نہ
 ہو۔

”کیا پر.....؟ بولو، چپ کیوں ہو گئے؟“ معاذ کو اس
 کا خاموش ہونا کھٹکا۔

”پر یہ جی کہ مجھے نہیں لگتا۔ پروفیسر صاحب خود کسی کو

قیدیوں میں سے ایک آدھ سے الگ سے بات کرنا ہوگی۔ وہ یہاں رہ رہے ہیں۔ انہیں بھی بہت کچھ معلوم ہوگا۔“

”ہاں، یہ تو ہے۔ میرے خیال میں وہ جوشیلا نوجوان ہی ٹھیک رہے گا۔ ایسے جذباتی لوگ جذبات کی رو میں سب کچھ اگل دیتے ہیں۔“ معاذ نے تائید کرنے کے ساتھ ساتھ مشورہ بھی دیا۔

”ایسا کرتے ہیں، ابی بلوایتے ہیں۔ جتنی جلدی یہاں کے معاملات نمٹ جائیں، اچھا ہے۔ ہمیں واپس جا کر رپورٹ بھی کرنا ہے۔ اس بات کا فیصلہ تو اوپر والے کریں گے کہ اسرائیلیوں کے اس کارنامے کو دنیا کے سامنے لانا بھی ہے یا نہیں۔“

تھوڑی دیر میں وہ نوجوان ان کے سامنے تھا جس نے تھوڑی دیر پہلے اپنے ساتھیوں کی ترجمانی کرتے ہوئے ان سے مذاکرات کیے تھے۔ حلیہ تو ظاہر ہے اس کا اب بھی وہی تھا جو تھوڑی دیر پہلے لیکن چہرے پر سے ہشت کم ہوئی تھی۔ شاید یہ بھرے پیٹ کا کمال تھا۔ بھوک دنیا کی بڑی تلخ حقیقت ہے۔ لمبے عرصے تک بھکتی پڑے تو انسان کی پوری شخصیت الٹ کر رکھ دیتی ہے۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”سورج۔“ اس نے شائستگی سے جواب دیا۔

”کب سے ہو یہاں؟“

”ایک سال دو مہینے ہونے کو آئے ہیں۔ گھر سے کالج کے لیے نکلا۔ دوبارہ گھر جانا ہی نصیب نہیں ہوا۔“ اس کی آنکھوں میں گہری اسی اتر آئی۔

”یعنی اتنے عرصے سے یہاں اس کال کوٹھڑی میں رہ رہے ہو؟ پھر تو بہت کچھ جانتے ہو گے یہاں کے بارے میں؟“

”آپ کو کیا جانتا ہے؟“ اس نے اپنی فطری طراری سے پوچھا۔

”سب کچھ۔ جو تم بتا سکو۔“

”میں تو بس اتنا ہی کہوں گا کہ یہ لوگ درندوں سے بھی بدتر ہیں۔ آدمی کو آدمی نہیں، چہا بکھتے ہیں بلکہ شاید اس سے بھی کمتر۔ بھوک، مار، گندگی، بیماری، رنجش..... سارے ستم سب ہیں یہاں۔ تمہیں بتاؤں کہ جب قیدیوں کی تعداد زیادہ ہو جائے تو ہماری کوٹھڑی میں اتنی جگہ نہیں رہتی کہ ہم سب رات کو ایک ساتھ سو سکیں۔ ہم باری باری سفین لگا کر سونے کے لیے آوے لوگ لیٹتے ہیں اور آدھوں کو اتنے سے کے لیے بیٹھ کر رات گزارنا پڑتی ہے۔“

مارتے ہیں۔ یہ جو آپ کے دماغ میں زہر اور الیکٹرک شاک وغیرہ کی بات آرہی ہے نا، یہ ٹھیک نہیں ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ جب بھی کوئی بندہ مرتا تھا، پروفیسر صاحب بہت ادا اس ہو جاتے تھے۔“ اس کے لہجے میں سچائی ضرور تھی لیکن یہ محسوس کیا جاسکتا تھا کہ اس نے عین وقت پر بات بدلی ہے۔

”مجھے وہ لاشیں دیکھنا ہیں۔ مجھے بتاؤ کہاں دفن کرتے ہو تم انہیں؟“

”ابھی کیسے دیکھیں گے سر! ابھی رات ہو گئی ہے۔ باہر اندھیرا اور سردی دونوں ہیں۔“ اگرچہ اس کا انداز ٹالنے والا تھا لیکن بہر حال وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ اس وقت باہر جا کر کھدائی کرنا اور لاشوں کا جائزہ لینا مشکل کام ثابت ہوتا۔

”ٹھیک ہے، صبح تک کا انتظار کر لیتے ہیں۔“

”صبح پر یاد آیا، میں نے دیکھا ہے کہ یہاں کھانے پینے کا سامان بہت کم ہے۔ مطلب جتنے لوگ یہاں موجود ہیں، اس میں تو اتنی خوراک تھوڑے دنوں میں ہی ختم ہو جائے گی۔“ زانگ کو تشویش تھی۔

”یہاں زیادہ خوراک اسٹور کرنے کی جگہ نہیں ہے۔ ٹرک آتا ہے تو خوراک لے آتا ہے۔“

”اگر کبھی نہ آئے؟ یہاں موسم خراب ہوتے کب پتا چلتا ہے۔ موسم خراب ہو تو سارے راستے بند ہو جاتے ہوں گے۔ ایسے میں اتنے آدمیوں کا گزارہ کیسے ہوتا ہے؟“

”کسی نہ کسی طرح ہو ہی جاتا ہے۔“ جوان نے ایک بار پھر آنکھیں ملائے بغیر جواب دیا۔

”قیدیوں کو بھوکا رکھتے ہوں گے۔ آج بھی بے چارے صبح سے بھوکے تھے۔“ زانگ نے اندازہ لگایا۔

جواباؤہ خاموش رہا۔

”مجھے نہیں لگا کہ اس شخص نے ہمیں سب کچھ صاف صاف بتایا ہے۔ وہ کافی کچھ ہم سے چھپا رہا ہے۔“ وہ لوگ وہاں سے بٹے تو معاذ نے زانگ کے سامنے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

”میں بھی اس بات کو سمجھتا ہوں پر ایک دم سے زیادہ زور ڈالنا بھی ٹھیک نہیں ہے۔ پروفیسر کو بھی اسی کارن ڈھیل دے رکھی ہے ورنہ میں جانتا ہوں کہ سب سے زیادہ جانکاری تو اسے ہی ہوگی۔“ زانگ نے تدبیر سے جواب دیا اور بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”دھیرے دھیرے سارے راز کھل جائیں گے۔“

”ابھی تو تم لوگ اتنی زیادہ تعداد میں دکھائی نہیں دیے۔ شاید اس لیے کہ کچھ کو ٹریننگ دے کر یہاں سے روانہ کر دیا گیا ہے۔“

”ٹریننگ لینے والوں کا ہم سے کوئی واسطہ نہیں۔ ان کو تو شروع ہی سے الگ کر کے رکھتے ہیں۔ ہماری تعداد تو نئی کھپ آنے پر بڑھتی ہے۔ اس بار بہت دنوں سے کوئی نیا پیچی نہیں آیا ہے اور ہم کم ہوتے ہوتے اتنے رہ گئے ہیں کہ اب آرام سے پیر پھیلا کر سو سکتے ہیں۔“ اس کے لہجے میں محسوس کی جانے والی کاٹ تھی۔

”تم کم کیسے ہو گئے ہو؟“ زانگ نے لہجے میں تجسس سمو کر سرگوشی میں پوچھا۔

”بالکل ویسے جیسے مرغی والے کے لوہے کے منجرے میں رکھی مرغیاں ایک ایک کر کے کم ہوتی جاتی ہیں۔ وہ منجرے میں ہاتھ ڈال کر اپنی مرضی کی مرغی دیوچ کر باہر نکالتا ہے اور پھر وہ مرغی بھی اپنے ساتھیوں کے بیچ واپس نہیں لوٹتی۔“

”کیا تمہیں شک ہے کہ تمہارے وہ ساتھی قتل ہو چکے ہیں۔ ہو سکتا ہے انہیں کسی دوسری جگہ بھیج دیا گیا ہو۔“

”کسی دوسری جگہ.....!“ وہ استہزاء سے ہنسا۔

”پروفیسر کی لیب سے صرف پر لوگ کو راستہ جاتا ہے۔ اس جہلی بڑھے کے دماغ میں پتا نہیں شیطان نے کیا بات ڈال دی ہے کہ انسانوں پر انسان مار کر بھی اس کا خط ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا۔ مجھ سے پہلے اور میرے بعد آنے والے جانے کتنے لوگ اس کے جنون کی بھیشت چڑھ گئے ہیں۔“ سورج رنج و غم کی شدت سے پھٹ پڑا۔

”تم اتنے دشواں سے یہ سب کیسے کہہ سکتے ہو؟“ زانگ نے اسے ٹوکا۔

”میں نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ایک دن ہمیں ورزش اور حاجت کے لیے باہر لے گئے تھے تو میں واپسی میں چپکے سے دوسرے غار میں سرک گیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہاں پروفیسر کی لیب ہے۔ پروفیسر اس سے اپنے اسسٹنٹ کے ساتھ لیب میں مصروف تھا اور دو دن پہلے ہمارے درمیان سے لے جایا جانے والا قیدی ان کے سامنے آپریشن ٹیبل پر اس حال میں پڑا تھا کہ اس کی کھوپڑی کا آدھا حصہ ہٹا ہوا تھا اور اس میں سے اس کا دماغ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے پورے جسم سے تاریں جڑی ہوئی تھیں اور وہ لوگ کمپیوٹر کی اسکرین پر جانے کیا دیکھ رہے تھے۔ ساتھ ساتھ پروفیسر جھنجھلائے ہوئے

لہجے میں اپنے اسسٹنٹ سے کہہ رہا تھا کہ میری تھیوری غلط نہیں ہے بس بد قسمتی یہ ہے کہ ہمیں تجربے کے لیے مضبوط دماغ نہیں مل رہے ہیں۔ جس روز ایسا کوئی بندہ مل گیا جس کا دماغ ہمارے مطلب کا ہوا، میری تھیوری ثابت ہو جائے گی اور ساری دنیا پر پروفیسر اینڈریو کی دھماک بیٹھ جائے گی۔ میں لوگوں کو سپر کمپیوٹر بھلوا دوں گا۔ وہ اور بھی پتا نہیں کیا کیا کہہ رہا تھا۔ مجھ میں مزید وہاں کھڑے ہو کر اس کی باتیں سننے کی ہمت نہیں تھی اس لیے واپس اپنی کوشٹری کی طرف چلا گیا۔ اس روز میں نے یوں غائب ہو جانے پر جو مار کھائی اس کی اذیت اس ذہنی اذیت سے کم تھی جو لیب کا منظر دیکھ کر مجھے پہنچی تھی۔“ اس بات کے اختتام پر سورج نے ایک زوردار جھرجھری سی لی۔ دم بخود تو وہ دونوں بھی تھے۔ پروفیسر اینڈریو زندہ انسانوں کے دماغ پر نہ جانے کون سا تجربہ کر رہا تھا کہ اب تک کئی زندگیاں نگل چکا تھا۔

”میں تمہیں ایک بات اور بتاؤں؟“ سورج نے پراسرار لہجے میں پوچھا۔

”ہاں، بتاؤ۔“ وہ اس کے لہجے کا غیر معمولی پن محسوس کر کے پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

”یہ لوگ خوراک پوری کرنے کے لیے قیدیوں کو مر جانے والے ساتھیوں کا گوشت کھاتے ہیں۔“ اس کے انکشاف نے انہیں اچھلنے پر مجبور کر دیا۔

”یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ مردہ انسانوں کا گوشت؟“ بات مبہم نہیں ہو رہی تھی۔

”میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ جن دنوں موسم شدید ہو اور سامان والا ٹرک نہ آئے، قیدیوں کو کھانے میں زیادہ سے زیادہ گوشت دیا جانے لگتا ہے۔ اب یہ سوچنے کی بات ہے نا کہ ان دنوں میں یہاں اتنا گوشت کہاں سے آتا ہے؟ حکام تو ملنے سے رہا نہیں یہاں۔“ اس کی دلیل میں دم تھا مگر تسلیم کرنے پر بھی طبیعت مائل نہیں ہو رہی تھی۔

”تم اتنے عرصے سے کیوں بچے ہوئے ہو؟ تمہارا نمبر کیوں نہیں آیا ابھی تک؟“ نجاہ نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

”میں نے اپنی چالاکی سے خود کو بچایا ہوا ہے۔ جب سے معلوم ہوا ہے کہ پروفیسر اینڈریو کو اپنے تجربے کے لیے مضبوط اور طاقتور دماغ پسند ہے، میں نے تھوڑے تھوڑے دنوں بعد ایسا ڈراما کرنا شروع کر دیا ہے جس سے یہ لگتا ہے کہ مجھے دماغی دورے پڑتے ہیں۔“ وہ یوں مسکرایا جیسے اپنی اس چالاکی پر داد چاہتا ہو۔

”تم نے اپنے ساتھیوں میں سے کسی کو یہ سب باتیں بتائی تھیں؟“
”نہیں۔“ اس نے زور سے لٹی میں سر ہلایا۔
”کیوں؟“

”مجھے ڈر تھا کہ میں اگر کسی کو بتاؤں گا تو وہ چپ بیٹھنے کے بجائے یا تو شور مچا دے گا یا ادوروں کو بتا دے گا۔ دونوں صورتوں میں میری جان مشکل میں پھنسی اس لیے میں چپ رہا اور آج جب پروفیسر ہمارے درمیان چھپنے کے لیے آیا تو تب ہی زبان کھولی۔“ اس کے پاس اپنے ہر عمل کے پیچھے ایک ٹھوس وجہ موجود تھی۔ یقیناً وہ ایک سمجھ دار لڑکا تھا جس نے ان حالات میں اپنے حواس قائم رکھتے ہوئے اپنی زندگی بچائے رکھی تھی۔

”تم لوگوں نے ہمارے بارے میں کیا سوچا ہے؟“
کچھ دیر ان کی طرف سے کوئی سوال نہیں ہوا تو اس نے پوچھا۔
”ابھی ہم کوئی فیصلہ نہیں کر سکے ہیں۔ حالات تمہارے سامنے ہیں۔ خوراک کی کمی ہے۔ ہم اس خوراک میں سے کچھ نہیں لیں گے تب بھی مشکل سے تم لوگوں کے حصے میں دو سے تین دن کا راشن آئے گا۔ مان لیا کہ کم راشن کے ساتھ تم لوگ کسی نہ کسی طرح گزارہ کر لو گے لیکن لباس اور جوتوں کا کیا؟ اس غار سے باہر موسم اتنا سخت ہے کہ ان دونوں چیزوں کے بغیر سردی ہی تمہیں مار دے گی اور یہاں مشکل سے کپڑوں اور جوتوں کے اتنے سیٹ ہیں کہ تم میں سے شاید آدھوں کو ہی مل سکیں۔ کھلے میں رات گزارنے کے لیے کیمپ، سیلینگ بیگز اور سمت کے ٹین کے لیے جی پی ایس وغیرہ کی الگ ضرورت ہوگی۔“ یہ سارے وہ مسائل تھے جو اس کے اور زانگ کے درمیان پہلے ہی زیر بحث آچکے تھے۔ سورج ان باتوں پر فوری رد عمل دینے کے بجائے سوچ میں ڈوب گیا مگر تھوڑی دیر بعد سر اٹھا کر بولا۔
”کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا۔ ہم حرکت میں نہ آئے اور یہیں رہ کر رہے تب بھی بھوکے مریں گے۔ بغیر ہاتھ پیر ہلائے مرنے سے بہتر ہے یہاں سے نکلنے کی کوشش کی جائے۔ کوشش میں زندہ رہنے کا کچھ نہ کچھ تو چانس ہے نا۔ بس ہم اسی چانس کو اوہل کریں گے۔“

”کیا پلان ہے تمہارے ذہن میں؟“

”ہم میں سے کچھ لوگ یہاں سے جائیں گے۔ جتنے بھی لوگوں کے لیے سامان کا انتظام ہو سکا، اتنے لوگ جائیں گے اور آبادی میں پہنچ کر باقی رہ جانے والوں کے لیے مدد لائیں گے۔“

جاسوسی ڈائجسٹ



ہمراہ جاڑے کا سفر ہے

جنوری 2023ء کہانیوں

سے جاسوئے کا نگر ہے

اولین صفحات

موت کی ہولناکی کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب زندگی ساتھ چھوڑ رہی ہو..... سنسنی خیز ناول کے ڈرامائی موڑ..... **امجد رئیس** کے قلم سے

شعلہ زن

بے بسی کے اندھیروں میں ڈوبتی لڑکی کی دردناک داستان حیات.....
روبینہ رشید کے قلم کی جادوگری

داہر

دنیا مجبور کرتی ہے کہ ان پر قہر بن کر ٹوٹ پڑو..... ایک ایسے ہی نوجوان کی کوچہ گردی..... زندگی اس کے لیے خالی شکلوں کے مانند تھی..... **حسام بیٹ** کے قلم سے نئی سلسلے دار کہانی۔

سورج کے رنگ

پہلا رنگ

طاقت کے بل بوتے پر محبت کا حصول ممکن ہے..... **اسما قادری** کا سرورق
دوسرا رنگ

محبت دوبارہ مل جاتی ہے..... مگر عزت نہیں.....
ایک لڑکی کا امتحان۔ **ایچ اقبال** کی قلم کاری

چلتی نکتہ چینی

آپ کے تھرے... مشورے... محبتیں...
شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کتنا میں

”اتنا آسان نہیں ہوگا۔ ہر شخص جانا چاہے گا۔ کسی کو یقین نہیں آئے گا کہ پہلے جانے والا بعد میں اس کے لیے مدد لے کر آئے گا۔“ معاذ کو ایک بڑا جھٹکا کھڑا ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

”اس کے لیے تم لوگوں کو ہماری مدد کرنا ہوگی۔ تم یہ سچویشن کنٹرول کر سکتے ہو۔“
”وہ کیسے؟“

”تم جانے والوں کا سلیکشن کرنا بلکہ سلیکشن کرنے کے بعد ہی سب کو اس بارے میں بتانا۔ جب تک جانے والے چلے نہیں جاتے، باقیوں کو قید میں ہی رکھنا ہوگا ورنہ سب ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑیں گے۔“
”ٹھیک ہے۔ ایسے ہی کر لیں گے۔ ابھی تم جا کر سو جاؤ۔“ معاذ نے اسے رخصت کر دیا اور خود زانگ کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے گنگو کے اس حصے میں حصہ نہیں لیا تھا اور کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا نظر آ رہا تھا۔

”کیا سوچ رہے ہو؟“
”ہم الجھتے جا رہے ہیں۔ ہمیں یہاں لمبے سے کے لیے نہیں رکھنا ہے لیکن اگر ہم یہ سب دیکھیں گے تو ہمیں رکنا پڑے گا۔“

”یہ کئی انسانوں کی زندگی کا معاملہ ہے زانگ! ہم ان سب کو یہاں مرنے کے لیے نہیں چھوڑ کر جاسکتے۔“
”شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن ابھی چھوڑ دو ان سب باتوں کو۔ ابھی تھوڑی دیر آرام کر لیتے ہیں۔ صبح سب دیکھیں گے۔“ زانگ اب بھی الجھا ہوا لگتا تھا لیکن اس نے اختلاف کا اظہار کر کے بات نہیں بڑھائی تھی۔ معاذ نے بھی فی الحال خاموشی مناسب سمجھی۔ انہیں واقعی آرام کی ضرورت تھی۔

☆☆☆

”موی!“

”جی لالہ!“

”ہائی دے سے پہلے گاڑی چنچ کرنا ہوگی۔ ابھی تو بیچھا کرنے والوں کو مار کر بھاگ دیا ہے لیکن وہ اتنی آسانی سے ہار نہیں مانیں گے۔“
”ہم تیار ہیں لالہ!“

”میں نے تجھے اس لیے کال کی ہے کہ جہاں سے گاڑی بدلی جائے گی، تو اور نیلی چاہیں تو وہاں سے واپس پلٹ سکتے ہیں۔ آگے میرے بندے سنبھال لیں گے۔“
”اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے لالہ! میں بچے کو اس کی منزل پر پہنچا کر ہی واپس آؤں گا۔“ اس نے لالہ کی

پیشکش مسترد کر دی۔

”اچھا تو پھر نیلی کو واپس بھیج دے۔ ہمارا اصل مسئلہ حل ہو گیا ہے۔ خواہ اس کو سفر کے چکر میں ڈال کر تھکانے سے کیا فائدہ۔“

”میں اس سے کہہ دوں گا۔ آگے اس کی مرضی۔“
اس نے جواب دیا۔

”کیا کہہ رہے تھے لالہ؟“ اعظم کو سینے سے لگائے بیٹھی نیلی نے کال ختم ہونے کے بعد موی سے دریافت کیا۔
”کہہ رہے تھے، یہ گاڑی نظروں میں آگئی ہے۔ ہائی دے سے پہلے اسے تبدیل کرنا ہوگا۔“

”بالکل ٹھیک..... لیکن اس کے علاوہ بھی تو کوئی بات تھی نا؟“ وہ بیکٹریز گنگو سے تھوڑا بہت اندازہ لگا چکی تھی۔
”کہہ رہے تھے تمہیں لمبے سفر کی تکلیف میں ڈالنے کے بجائے واپس بھجوا دوں۔ کیا کہتی ہو تم؟ کیا واپس گھر جانا پسند کرو گی؟“

”ہرگز نہیں۔ میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔ ویسے بھی اس کو سنبھالنے کے لیے عورت کی ضرورت ہے۔ راستے میں کوئی مسئلہ ہو گیا تو تم مرد لوگ کیسے منج کر دو گے؟ میرے ساتھ یہ جتنا پرسکون ہے، ایسے کسی اور کے ساتھ نہیں ہوگا۔“
اس نے اپنے سینے کے ساتھ لگ کر نیند کے مزے لوٹتے اعظم کے سر کو محبت سے سنبھال دیا۔ گاڑی میں پہلے ہی بچوں کی ضرورت کی اشیا کا ایک بیگ تیار کر کے رکھا گیا تھا۔ نیلی نے خوف سے روتے اعظم کو بہلا کر پہلے ایک بسکٹ کھلایا تھا اور پھر دودھ پینے کے لیے دیا تھا۔ دودھ پی کر وہ سو گیا تھا اور ہنوز سو ہی رہا تھا۔

”شاید لالہ کو ڈر ہے کہ راستے میں کوئی گڑبڑ ہوگی اس لیے تمہیں واپس بھجوانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے تو مجھ سے بھی کہا تھا کہ اگر میں چاہوں تو واپس لوٹ سکتا ہوں۔“

”ہونے دو گڑبڑ۔ جب ہم نے ایک ذمے داری لی ہے تو اسے پورا بھی کریں گے۔ یوں راستے سے واپس لوٹ جانا تو بہت عجیب بات ہے۔“ نیلی کا لہجہ اٹل تھا۔

”ٹھیک ہے بھئی، جیسی تمہاری مرضی۔“ موی نے اس کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔

”بچے بہت نازک ہوتے ہیں موی! انہیں بہت محبت اور توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ بس کو پہچانتے ہیں کہ کس بس میں محبت ہے اور کس میں اجنبیت اور ٹھنڈی پن۔ تم مانو یا نہ مانو، یہ جب سے میری گود میں آیا ہے، پرسکون ہو گیا ہے۔ وہ جو اس کی آیا اس کو کلینک پر لے کر آئی تھی، اس کے

ساتھ تو یہ بالکل بھی خوش نہیں لگ رہا تھا۔

”تمہاری والی بات بھلا کی اور میں کہاں؟ میں بھی تو بس تمہارے ساتھ ہی خوش رہتا ہوں۔“ مومی شوخی سے ہنسا اور اپنا سر اس کے شانے پر رکھ دیا۔

”فضول میں فری نہ ہو۔ میں تو بس اس کی بات کر رہی تھی۔“ نیلی نے اسے گھور کر آنکھوں ہی آنکھوں میں احساس دلایا کہ آگے ڈرائیور بھی موجود ہے جو بے شک ان سے لائق بیٹھا ہوا تھا لیکن تھا تو بہر حال جیتا جاگتا انسان جو سب دیکھ اور سن رہا تھا۔

”میں بھی اس کی خوش قسمتی پر رشک کر رہا تھا۔“ مومی نے منہ بنایا اور اپنا سر اس کے شانے سے ہٹالیا۔ نیلی نے سر جھکا کر اعظم کے رخسار پر بوسہ دیا۔

”اب تو تم مجھے باقاعدہ اس سے حسد کرنے پر مجبور کر رہی ہو۔“

”جو اس معصوم فرشتے سے حسد کرے وہ شیطان کا دوست ہی ہو سکتا ہے۔“ وہ اس کے احتجاج کو خاطر میں نہ لائی۔ مومی نے اس کے وار پر تڑپ کر کچھ کہنا چاہا لیکن پھر خاموش ہو گیا۔ ڈرائیور نے گاڑی ایک جانب لگادی تھی اور فوراً ہی پچھلی گاڑی میں موجود لالہ کے آدمیوں نے بھاگ کر ان کی گاڑی کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔ اس گاڑی سے دوسری گاڑی میں منتقلی کا عمل بہت تیزی سے مکمل ہوا اور ایک بار پھر سفر شروع ہو گیا۔ ہائی وے کا سفر پرسکون اور تیز رفتار تھا۔ لالہ کے آدمیوں سے بھری گاڑی مسلسل حفاظت کے لیے ان کے ساتھ ساتھ تھی۔ وہ دونوں جو شہر میں اپنے اندر بے چینی سی محسوس کر رہے تھے، خاصی حد تک مطمئن ہو گئے تھے کہ دشمنوں کی پہنچ سے دور نکل آئے ہیں۔

”اس کے دادا اور نانا، نانی اسے دیکھیں گے تو کتنے خوش ہوں گے نا؟“ نیلی نے اعظم کی پیشانی پر آئے بال نرمی سے سمیٹتے ہوئے خیال ظاہر کیا۔

”لازمی سی بات ہے۔ اولاد ویسے ہی آنکھ کا تارا ہوتی ہے اور یہ تو جانے کتنے جتنوں کے بعد انہوں میں جا رہا ہے۔“

”اللہ ایسے ہی باقی سب کو بھی انہوں سے ملادے۔“ سچ کہوں تو میری اپنی آنکھیں دکی بھائی کو دیکھنے کو ترس رہی ہیں۔ وہ ہمارے درمیان ہوتے تھے تو مجھے بھی انہوں کی کی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ ہمیشہ بگے بھائی سے بڑھ کر مان دیا ہے انہوں نے مجھے۔“ نیلی کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

”تم سمیت بہت سوں کی دعائیں ہیں اس کے ساتھ۔ اللہ نے چاہا تو اس کی زندگی کے سارے مسئلے ایک

دن ختم ہو جائیں گے اور وہ سب کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی گزارے گا۔“ مومی نے استغلی وی۔ ایسی ہی ہلکی پھلکی باتوں کے درمیان ان کا سفر کتار رہا۔ درمیان میں اعظم جاگ گیا تو نیلی اس کے ساتھ لگ گئی۔ مومی ہونٹوں پر مسکراہٹ لیے اس کا یہ متا بھرا روپ دیکھتا رہا۔ ان کی شادی کو ابھی چند ماہ ہی ہوئے تھے اور ابھی کسی خوشخبری کے آثار نہیں تھے لیکن نیلی کا رویہ دیکھ کر اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ بہت شدت سے ماں بننے کی خواہشمند تھی۔ شاید ہر عورت ہوتی ہے۔ بچے کے بغیر عورت کو اپنا آپ مکمل ہی نہیں لگتا اور نیلی تو تھی بھی بنا خاندان کی لاوارث بچی جسے سرکس والوں ہی نے پالا پوسا اور زندگی جینے کا ہنر سکھایا۔ بلندی پر تنے رستے پر بے خوف و خطر، بنا سہارے چلنے والی وہ لڑکی بظاہر غیر معمولی تھی لیکن اپنے گھر اور خاندان کی خواہش بالکل عام عورت جیسی ہی تھی۔ گھر اس نے مومی کے ساتھ مل کر بنالیا تھا لیکن اس کا گھر اور خاندان اسی وقت مکمل ہوتا جب اس کی گود بچے سے بھرتی۔

کچھ باتوں اور سوچوں کے ساتھ سفر جاری رہا۔ اب وہ ہائی وے کو چھوڑ کر گاؤں عالم شاہ جانے والے راستے پر مڑ چکے تھے۔ راستہ ہائی وے جیسا ہموار اور کشادہ نہیں تھا اس لیے رفتار بھی پہلے کے مقابلے میں کم ہو گئی تھی۔ ہلکے ہلکے جھٹکے بھی لگ رہے تھے پھر ایک زور کا جھٹکا لگا اور یوں محسوس ہوا کہ گاڑی ڈرائیور کے قابو سے باہر ہو گئی ہو لیکن پھر اس نے قابو پا ہی لیا اور گاڑی اٹھنے سے بچ کر کچے میں اتر کر کھڑی ہو گئی۔ یکدم ہی بہت زوردار فائرنگ ہونے لگی۔

”نیلی! اسے لے کر اتر اور درختوں میں چھپ جا۔“ گاڑی رکنے کے بعد ڈرائیور کی کوشش کے باوجود دوبارہ اسٹارٹ نہیں ہو رہی تھی اور مومی نے اس گاڑی کو دیکھ لیا تھا جس نے اچانک ہی سامنے آ کر ان کی راہ روکنے کی کوشش کی تھی۔ اب اس گاڑی کے سواروں اور لالہ کے ساتھیوں کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ ہو رہا تھا۔ مومی کو ظاہر ہے اس لڑائی میں حصہ لیتا تھا جب ہی نیلی کو اعظم سمیت چھپ جانے کی نصیحت کی تھی۔

”تم بھی ہمارے ساتھ آؤ۔“ گاڑی سے اترنے سے قبل نیلی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

”نہیں، مجھے ان کا ساتھ دینا ہوگا۔ تم بس بچے کی حفاظت کرو۔ یہ ہمارے پاس امانت ہے۔“ مومی نے اسے سمجھایا اور خود ڈرائیور سے گاڑی میں اسلحے کی موجودگی کے بارے میں استفسار کرنے لگا۔ ڈرائیور جس کا ماتھا

اچانک جھٹکا لگنے کے باعث ڈیش بورڈ سے ٹکرا گیا تھا اور لگنے والے جھوٹے سے گھاؤ سے خون بھی بہہ رہا تھا، اسے اسلحہ دکھانے لگا۔ اس نے ایک چھوٹا سا ہسٹل نیلی کو چھایا۔ اعظم کی حفاظت کے لیے اس کے پاس بھی کوئی ہتھیار ہونا چاہیے تھا۔ نیلی نے کانپتے ہاتھ سے ہسٹل لے لیا اور پھر اعظم کو گود میں اٹھا کر گاڑی سے نیچے اتر گئی۔ درختوں کا وہ جھنڈ جہاں چھپنے کا موی نے اسے مشورہ دیا تھا، زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ فائرنگ کے شور سے گھبرا کر رونا شروع کر دینے والے اعظم کو لے کر اس جھنڈ میں گھس گئی۔ جھنڈ میں ٹھنڈک اور سایہ تھا۔ اعظم کو سینے سے لگائے وہ کافی اندر تک گھس گئی۔ فائرنگ کا سلسلہ شدت سے جاری تھا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ کون سا فریق غالب رہے گا۔

”یا اللہ! میرے موی اور اس معصوم جان کی حفاظت کرنا۔“ نیلی نے کانپتے ہونٹوں سے دعا کی۔

”نہ رو میری جان! کچھ بھی ہو جائے، میں اپنی آخری سانس تک تمہیں چھپانے والوں تک پہنچانے کی کوشش کروں گی۔“ وہ چھوٹا سا بچہ اس کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکتا تھا پھر بھی وہ اس سے وعدہ کر رہی تھی اور ساتھ ساتھ اسے بہلانے کی کوششیں بھی جاری تھیں لیکن شاید یہ اس کی گرفت کی سختی اور اندر کا اضطراب تھا جو اعظم کو بھی پرسکون نہیں ہونے دے رہا تھا اور وہ مسلسل ہچکیوں کے ساتھ روئے جا رہا تھا۔ یہ افتاد جاری تھی کہ ایک نئی مصیبت نازل ہوگئی۔

وہ دو آوارہ کتے تھے جو بالکل اچانک ہی سامنے آگئے تھے اور جارحانہ انداز میں بھونکنے لگے تھے۔ نیلی کوئی گھر کی چار دیواری میں مل کر بڑی ہونے والی لڑکی نہیں تھی جو آوارہ کتوں کو سامنے پا کر بوکھلا جاتی لیکن ان کتوں کے انداز میں جو جارحیت تھی، وہ اسے پریشان کر رہی تھی۔ اس نے زمین پر پڑے ایک دو پتھر ان کی طرف اچھال کر انہیں بھگانا چاہا۔ کتے ڈر کر لمبے بھر کے لیے تھوڑا سا پیچھے تو ہٹے لیکن پھر دوبارہ پہلے سے زیادہ شدت سے بھونکنے لگے۔ ان میں سے ایک کتا زیادہ ہی جارحیت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس نے توجہ دی تو اندازہ ہوا کہ دراصل وہ کتیا ہے۔ وہ جانتی تھی کہ کتیا عموماً اسی وقت زیادہ جارحیت کا مظاہرہ کرتی ہے جب اس نے بچے دیے ہوئے ہوں اور اسے اپنے بچوں کے لیے کوئی خطرہ محسوس ہو رہا ہو۔ اپنے اندازے کی تصدیق کے لیے اس نے کتیا کے بچوں کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ اس جگہ میں اس کی توجہ کتیا

پر سے ذرا سی ہٹ گئی۔ کتیا نے اس موقع کا فائدہ اٹھایا اور اس پر حملہ آور ہوئی۔ نیلی کو عین وقت پر اس کی حرکت کا اندازہ ہوا اور بچاؤ کے لیے تیزی سے ایک طرف ہٹی لیکن جم کر اپنی جگہ کھڑی نہیں ہو سکی۔ وہ کوئی نرم اور بھلی سی شے تھی جو اس کے پیر کے نیچے آگئی تھی اور چپاؤں چپاؤں کرنے لگی تھی۔ پہلی بار اسے اندازہ ہوا کہ وہ جس جگہ کھڑی تھی، اس کے دائیں جانب ایک چھوٹا سا گڑھا تھا جس میں کتیا نے بچے دیے ہوئے تھے۔ اس کے پیر کے نیچے آنے والی نرم چیز کتیا کا بچہ تھا جو نہ جانے کس طرح گڑھے سے باہر نکل آیا تھا۔ بچے کے اس کے پیر کے نیچے آجانے پر پہلے ہی جارحیت پر اتری کتیا کے تیور مزید بگڑ گئے اور وہ بالکل ہی مرنے مارنے پر آمادہ دکھائی دینے لگی۔ نیلی کی گود میں اعظم نہ ہوتا تو بھاگ کر کسی درخت پر چڑھ جاتی لیکن بچے کو گود میں اٹھا کر ایسی افراتفری میں درخت پر چڑھنا بھی آسان نہیں تھا۔ اس نے بوکھلا کر بھاگنے پر ہی اکتفا کیا۔ درختوں کی بہتات کی وجہ سے تیزی سے بھاگنا بھی ممکن نہیں تھا۔ دوسری مصیبت یہ تھی کہ اعظم مسلسل گلا پھاڑ کر روئے جا رہا تھا۔ اس کے اس طرح رونے سے اس کے اوسان مزید خطا ہوئے جا رہے تھے اور وہ اس ہسٹل تک کو فراموش کر بیٹھی تھی جو موی نے گاڑی سے نکلنے وقت اس کے حوالے کیا تھا۔ ہسٹل کا خیال اسے اس وقت آیا جب قریب سے گولی چلنے کا دھماکا سنائی دیا اور پیچھے پڑی کتیا اچھل کر نیچے گری۔

نیلی نے حیرت سے زمین پر لوٹ پوٹ ہوئی کتیا کو دیکھا۔ اس کے جسم سے نکلنے والا خون زمین میں جذب ہو رہا تھا۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے کتیا نے دم توڑ دیا۔ ساتھ ہی وہ پھڑکتی مستابھی دم توڑ گئی جو اپنے بچوں کے تحفظ کے لیے کسی سے بھی ٹکر لینے کو تیار تھی۔ دم بخود سی کتیا کے مرنے کا منظر دیکھتی نیلی منظر میں داخل ہونے والے ہسٹل بردار شخص کو دیکھ کر چونکی اور اعظم کو مزید سختی سے اپنے ساتھ چمٹالیا۔ اعظم جو گولی چلنے کی آواز اور کتیا کے مرنے کا منظر دیکھ کر رونا بھول کر گرم مسم سا ہو گیا تھا، خود بھی اس کے ساتھ مضبوطی سے چپک گیا۔

”لاؤ، بچے کو میرے حوالے کر دو۔“ اس نے ہاتھ میں موجود ہسٹل لہراتے ہوئے نیلی سے مطالبہ کیا۔ اوپر سڑک کی طرف سے فائرنگ کی آوازیں اب بھی آرہی تھیں لیکن جانے وہ بندہ کیسے اس کے پیچھے اس جھنڈ میں آگیا تھا۔

”تم نے سنا نہیں لڑکی! میں نے تم سے کیا کہا ہے؟“ نیلی کی طرف سے حکم کی ٹھیک نہ ہونے پر اس نے رعب سے ڈپٹا۔

”نہیں، میں نہیں دوں گی۔“ نیلی نے اس کے رعب میں آئے بغیر انکار کیا۔
 ”لگتا ہے تمہیں زندگی پیاری نہیں ہے؟“ وہ اس کے انکار پر جھنجھلایا۔
 ”اتنی بھی پیاری نہیں ہے کہ ایک معصوم اور مظلوم بچے کو اس کی خاطر قربان کر دوں۔“ نیلی نے اسے دوبارہ جواب دیا۔

”یعنی تم سیدھی شرافت سے بات نہیں مانو گی۔“ اس نے نیلی کی طرف قدم بڑھائے۔ وہ کسی خوفزدہ ہرنی کی طرح سہمے ہوئے انداز میں دو قدم پیچھے ہٹ کر ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ اس کے ڈرنے پر ہنسا۔
 ”جب ہمت نہیں ہے تو انکار کیوں کرتی ہو؟“ نیلی نے جواب نہیں دیا اور اعظم کو سینے سے لگائے ایک ٹک اسے دیکھتی رہی۔ اس شخص کو اس کے خوف نے لطف دیا اور مزید ڈرانے کے لیے ہٹل کا رخ اس کے پیروں کے قریب زمین کی طرف کرتے ہوئے ایک فائر کیا۔ نیلی یوں ہڑبڑا کر اچھلی جیسے بری طرح ڈر گئی ہو اور ڈر سے ہی شپٹا کر بھاگ کھڑی ہوئی ہو۔ وہ شخص اصل بات سمجھتا اور رد عمل دیتا، اس سے قبل ہی وہ پھرتی سے درخت کے موٹے تنے کے پیچھے سٹ چکی تھی۔ وہیں سے ہاتھ نکال کر اس نے ایک فائر کیا۔ بغیر نشانے کے اندھا دھند کیے گئے اس فائر نے غیر متوقع کامیابی دلائی۔ فائر سیدھا اس شخص کے پیٹ میں جا کر لگا اور وہ ڈکراتا ہوا نیچے گر گیا۔ اصل میں اسے نیلی کے پاس ہٹل کی موجودگی کا علم ہی نہیں تھا اس لیے بلا خوف و خطر اس کے پیچھے آیا تھا اور نشانہ بن گیا۔ نیلی نے بس ایک نظر اس کے گرنے اور تڑپنے کے منظر کو دیکھا اور روتے ہوئے اعظم کو سینے سے لگائے جھنڈ میں مزید اندر کی طرف بڑھ گئی۔ وہ شخص تکلیف سے تڑپ کر جس طرح آہیں اور کراہیں خارج کر رہا تھا، اسے برداشت کرنا اس کے اعصاب کے لیے ایک امتحان تھا۔

آگے ایک چوڑے تنے کے درخت کے پیچھے بیٹھتے ہوئے اس کا دل پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ وہ مضبوط اعصاب کی لڑکی تھی لیکن یہ احساس کہ اس کے ہاتھوں کسی شخص کی جان پر بن گئی ہے، اس کے لیے نہایت اعصاب شکن تھا۔ وہ مرتے ہوئے شخص کی آہوں اور کراہوں کی رسائی سے دور آگئی تھی لیکن فائرنگ کے شور کے باوجود اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اس کی آوازیں اس تک پہنچ رہی ہوں۔ اپنی اس کیفیت میں اسے اعظم کو چپ کروانے کا بھی

ہوش نہیں تھا۔ بس اسے سینے سے لگائے خود کار انداز میں تھکتی جا رہی تھی۔ ہاں، ایک بات اس نے ضرور محسوس کی تھی کہ فائرنگ کا شور پہلے سے کئی گنا زیادہ بڑھ گیا ہے۔ یہ صورت حال بس دو چار منٹ ہی رہی پھر دھیرے دھیرے فائرنگ کا سلسلہ آہستہ ہوتے ہوئے ختم ہی گیا۔ فائرنگ رکنے کا مطلب تھا معرکے کا فیصلہ ہو چکا لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ فیصلہ کس کے حق میں ہوا ہے۔

”مجھے اسے لے کر یہاں سے نکل جانا چاہیے۔“ یکدم ہی اس پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی اور دل میں اس اندیشے نے سراٹھایا کہ اگر مخالفین کامیاب ہو چکے ہیں تو اعظم کے لیے خطرہ ہے۔ اسے اس خطرے کی حد سے دور لے جانے کے لیے وہ یکدم ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اعظم بھی روتے روتے شاید تھک گیا تھا جو بنا چپ کروائے بھی خود ہی خاموش ہو گیا تھا۔

”نلی.....!“ وہ قدم آگے بڑھاتی، اس سے قبل ہی مومی کی آواز سنائی دی۔ وہ اسے پکار رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے مل سکی نہ اسے پلٹ کر جواب دے سکی، بس دھپ سے وہیں واپس بیٹھ گئی۔

”نلی.....! کہاں ہو تم؟ پلیز مجھے جواب دو۔“ اس بار مومی کی آواز میں واضح پریشانی تھی۔ اس نے کوشش کی کہ اپنے سوکھ جانے والے حلق کو لعاب نکل کر تر کرے اور اسے جواب دے سکے لیکن اس کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ ایک بار پھر رونے کا آغاز کر دینے والے اعظم کی آواز نے خود ہی مومی کی راہنمائی کر دی۔

”یا میرے خدایا! تم یہاں چھپی بیٹھی ہو۔ میں تو پیچھے کا منظر دیکھ کر ڈر رہی گیا تھا۔“ مومی دوڑتا ہوا آواز کی سمت آیا اور اسے اعظم کے ساتھ صحیح سلامت بیٹھے دیکھ کر سکھ کی سانس لیتے ہوئے جلدی جلدی بولا۔
 ”کیا وہ مر گیا مومی؟“

”کون؟“ مومی ایک لمحے کے لیے اس کے سرگوشی میں کیے گئے سوال کا مطلب ہی نہ سمجھا پھر جیسے اسے نیلی کی کیفیت کی وجہ سمجھ آگئی۔ اس نے آگے بڑھ کر اسے نرمی سے اپنے قریب کیا اور ٹھوس لہجے میں بولا۔

”انسان کو بچانے کے لیے خونخوار درندوں کو مارنا ہی پڑتا ہے۔ مجھے فخر ہے کہ تم نے ہمت سے کام لیا اور اس معصوم کو ظالموں کے پنجے سے بچانے میں کامیاب رہیں۔“ اس نے اعظم کے سر پر محبت سے ہاتھ بھیرا۔ حیرت انگیز طور پر اس کے ہاتھ کے لمس سے روتا ہوا اعظم خاموش ہو گیا۔

کے چہرے بھول گئے تھے۔ جتنا سب اس کو گود میں لیتا اور پیار کرنا چاہ رہے تھے، اتنا ہی وہ گھبرا کر رو رہا تھا۔ نیلی کے معاملے میں اس کا رویہ البتہ مختلف تھا۔ وہ یوں اس کی طرف لپک رہا تھا گویا اس ہجوم میں صرف وہی اس کی اپنی ہے۔ اس کے اس رویے کی وجہ سے صورت حال عجیب ہو گئی تھی اور نیلی اور مومی کا واپس لوٹنا مشکل ہو گیا تھا۔

”اگر کوئی مجبوری نہ ہو اور آپ لوگوں کا شہر لوٹنا بہت ضروری نہ ہو تو آپ کچھ دن یہیں رک جائیں۔ بچے کی طبیعت پہلے ہی ٹھیک نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کے چلے جانے سے اور بھی زیادہ بگڑ جائے۔ کچھ دن میں یہ ہم لوگوں سے مانوس ہو جائے گا تو ہم بہ خوشی آپ کو جانے کی اجازت دے دیں گے۔“ اعظم کا رویہ دیکھتے ہوئے صداقت شاہ نے ان دونوں سے درخواست کی تو مومی نے نیلی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ خود بھی ان چند گھنٹوں میں اس کے ساتھ بہت گہری وابستگی محسوس کر رہی تھی اس لیے انکار نہیں کر سکی اور عجیب سے لہجے میں بولی۔

”اس کی خاطر تو میں نے کسی کی جان لے لی ہے۔ یہاں رکنا تو بہت معمولی سی بات ہے۔“

”اس بات کو بھول جاؤ بابا! وہ سارا معاملہ ہم نے سنبھال لیا ہے۔ تھانے میں رپورٹ کر دی ہے کہ حویلی آتے ہوئے ہمارے مہمانوں پر ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا تھا۔ دفاع میں ہتھیار نکلے اور کچھ ڈاکو مارے گئے۔ تھانیدار ہماری عزت کرتا ہے۔ ایک لفظ بھی ہماری اجازت کے بغیر نہیں لکھے گا اور آپ کا نام آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ واقعہ ہماری حدود میں ہوا ہے، ہم ہی اسے سنبھالیں گے۔“ صداقت شاہ نے اسے بھرپور تسلی دی۔

”بہت شکریہ شاہ صاحب! لیکن مجھے تو اعظم کی بھی فکر ہو رہی ہے۔ جو لوگ اس کے پیچھے ہیں، وہ بہت طاقتور ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ اب بھی چین سے نہیں بیٹھیں گے۔“ نیلی نے خدشے کا اظہار کیا۔

”اس بارے میں آپ بے فکر رہو۔ ہم اعظم کی حفاظت کا ایسا انتظام کریں گے کہ یہاں پر اندہ بھی پر نہ مار سکے گا۔“ اس بار صداقت شاہ کے بجائے قربان شاہ کی طرف سے جواب آیا۔ پوتے کو سامنے پا کر وہ نئے سرے سے جی اٹھے تھے اور اس کی حفاظت کے لیے پوری طرح پرعزم نظر آ رہے تھے۔

☆☆☆

اس نے پہلے پھاوڑے کی مدد سے برف کی تہ صاف

”کیا تم لوگ حملہ آوروں پر قابو پانے میں کامیاب رہے؟“ اس نے اگلا سوال داغا تو مومی کے ذہن میں ہونے والے تصادم کے سارے مناظر گھوم گئے۔ حملہ بہت اچانک اور جارحیت سے کیا گیا تھا اور اسلحہ بھی بہترین استعمال ہوا تھا۔ سچ بات یہ تھی کہ پہلے مرحلے میں تو انہوں نے انہیں بالکل بے بس ہی کر دیا تھا۔ ایسے نازک وقت میں اس نے لڑنا چھوڑ کر لالہ کو کال ملا دی تھی۔

”تم لوگ کسی طرح تھوڑی دیر انہیں روکے رکھو۔ میں کچھ کرتا ہوں۔“ لالہ نے اسے جواب دیا تھا۔ وہ اور لالہ کے جاں نثار، لالہ کی ہدایت پر حملہ آوروں کے مقابلے پر ڈٹ گئے تھے۔ اسے سب سے زیادہ اطمینان اس بات کا تھا کہ نیلی اور اعظم پہلے ہی گاڑی سے نکل کر درختوں کے جھنڈ میں پناہ لے چکے ہیں۔ اسے قطعی علم نہیں تھا کہ حملہ آوروں میں سے کوئی نیلی کے پیچھے جھنڈ میں پہنچ چکا تھا۔ انہیں تو خود اپنا دفاع کرتے دانتوں پسینا آ گیا تھا اور یہ صورت حال اس وقت تک رہی تھی جب تک مدد نہیں آگئی تھی۔ حملہ آوروں میں سے چند کی لاشیں گرنے اور باقیوں کے فرار ہونے کے بعد انہیں پتا چلا تھا کہ مدد کے لیے آنے والے سائیکس صداقت شاہ کے بندے تھے جنہیں نوا سے کی آمد کے منتظر صداقت شاہ نے لالہ کے کہنے پر مدد کے لیے بھیجا تھا۔

”سب ٹھیک ہو چکا ہے۔ بس اب ہم اسے، اس کے نانا کے پاس پہنچانے جارہے ہیں۔“ اس نے تفصیل میں جائے بغیر نیلی کو تسلی دی پھر نرمی سے بولا۔

”آؤ، ہم چل کر اسے اس کے ورثا کے حوالے کر آئیں تاکہ ہمارا فرض ادا ہو جائے۔“

”ہاں، چلو۔“ وہ خود کو بہتر حالت میں ثابت کرنے کے لیے مسکرائی۔ مومی اس کے شانوں کے گرد بازو پھیلائے اسے جھنڈ سے باہر لے جانے لگا۔ اس نے واپسی کی راہ اختیار کرتے ہوئے خیال رکھا تھا کہ اس مقام سے نہ گزرے جہاں نیلی کے ہاتھوں مارے جانے والے کی لاش پڑی تھی۔

صداقت شاہ کی حویلی میں انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ عرصے بعد ان لوگوں کو کوئی خوشی ملی تھی اس لیے سب کے چہرے کھلے ہوئے تھے۔ صداقت شاہ نے قربان شاہ کو بھی اس اہم موقع پر بلا رکھا تھا۔ وہ اپنے پوتے کو دیکھ کر بہت خوش تھے لیکن اعظم کا معاملہ ان سب سے مختلف تھا۔ وہ اتنے وقفے کے بعد ان سب کے درمیان آیا تھا کہ اسے ان

کی اور پھر برف کی تہ کے نیچے سے برآمد ہونے والے سلیب کو زور لگا کر ایک طرف ہٹایا۔ سلیب ہٹتے ہی ایک مستطیل شکل کا گڑھا نمودار ہوا۔ گڑھے کے نمودار ہوتے ہی معاذ نے دو قدم آگے بڑھ کر اس کے اندر جھانکا اور دم بخود رہ گیا۔

گڑھے میں بے لباس انسانی لاشیں نہایت ترتیب سے ایک کے اوپر ایک تہ لگا کر رکھی گئی تھیں اور پہلی نظر میں ہی نظر آ رہا تھا کہ ان لاشوں کو آلائشوں سے صاف کر کے وہاں رکھا گیا ہے۔ یہ کسی بڑے ریسٹوران کے ڈیپ فریزر میں صاف کر کے رکھی گئی مرغیوں کا سا منظر تھا۔ معاذ کو سورج کی بات یاد آئی۔ اس نے خدشہ ظاہر کیا تھا کہ غذائی قلت کے عرصے میں قیدیوں کو انسانی گوشت کھلایا جاتا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر اسے سورج کے خدشات بالکل درست محسوس ہوئے۔ لاشوں کو محض ٹھکانے لگانا مقصود ہوتا تو انہیں یونہی گڑھا کھود کر جوں کا توں اس میں پھینک دیا جاتا لیکن یہاں باقاعدہ ڈیپ فریزر والی ترتیب قائم کی گئی تھی اور اس بات کا اہتمام کیا گیا تھا کہ لاشیں آلائشوں سے پاک، صاف ستھری حالت میں یہاں رکھی جائیں۔ اس اہتمام کا وہی ایک سبب سمجھ آ رہا تھا جو سورج انہیں پہلے ہی بتا چکا تھا۔

”لاشوں کی آلائشیں کیوں صاف کی گئی ہیں؟“ اس نے یہ منظر ظاہر کرنے والے شخص کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

”معلوم نہیں صاحب! ہمارا کام تو بس اتنا ہے کہ لاشوں کو لا کر اس گڑھے میں ترتیب سے رکھ دیں۔“ اس نے جس طرح نظریں چرا کر جواب دیا اس سے ظاہر ہو گیا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔

”بند کر یہ معصومیت کے ڈرامے۔“ اس نے غصے سے اس شخص کا گریبان پکڑ لیا۔ ”کل سے میں تیری یہ مصنوعی معصومیت دیکھ رہا ہوں۔ سب جانتا ہے تو کہ یہاں کیا کچھ اور کس لیے کیا جا رہا ہے۔“ اس نے صرف اس شخص کا گریبان ہی نہیں پکڑا، اس کے منہ پر تابڑ توڑ کے بھی برسانے شروع کر دیے۔ دائیں ہاتھ سے برسائے جانے والے ان مسلسل مکوں نے یقینی طور پر اس شخص کا جبر اہلا کر رکھ دیا تھا اور وہ درد کی شدت سے بلبلانے لگا تھا۔

”معاف کر دو صاحب! اب آپ سے جھوٹ نہیں بولیں گے اور آپ جو پوچھو گے، سب سچ بتائیں گے۔“ آخر کار اس نے ہار تسلیم کر لی اور بتانے لگا۔

”پروفیسر اینڈریو کی لیب میں دوران تجربات مرنے والوں کی لاشوں کے لیے حکم تھا کہ ان کی آلائشیں صاف

کرنے کے بعد دھو دھلا کر اس گڑھے میں اسٹور کیا جائے۔ برف کا یہ گڑھا کسی بڑھیا ڈیپ فریزر سے بھی زیادہ ٹھنڈا رہتا ہے اس لیے اس میں لاشیں خراب ہونے کی لوبت نہیں آتی اور.....“ وہ کہتے کہتے رک گیا۔

”اور کیا؟“ معاذ نے اس کے گریبان کو زور سے جھٹکا دیا۔

”اور..... اور یہ صاحب کہ جب ضرورت پڑتی ہے تو ان لاشوں کا گوشت بھی پکانے کے لیے استعمال کر لیا جاتا ہے۔“ اس نے اٹک اٹک کر اس بات کی تصدیق کر دی جس کا اظہار پہلے ہی سورج کر چکا تھا۔ اس کا اعتراف سن کر معاذ کو اتنی شدت سے غصہ آیا کہ اس کا گریبان چھوڑا اور اسے اتنی زور سے لات رسید کی کہ وہ کھلے گڑھے میں لاشوں کے اوپر جا گرا۔

”اسے چھوڑ دو۔ یہ صرف حکم کا غلام ہے۔“ زانگ تاؤ پتا نہیں کب وہاں آ گیا تھا۔

”انسانیت کی اتنی تذلیل۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ خود انسان نہیں ہیں۔“

”جو لوگ زندہ انسانوں کو اپنے تجربات کے لیے استعمال کر سکتے ہیں، ان سے کسی بھی بات کی امید رکھی جاسکتی ہے۔“ زانگ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے حقیقت کا احساس دلایا۔

”اس سب کو چھوڑو اور اندر چلو۔ ابھی ہمیں اور بھی بہت سے معاملات دیکھنے ہیں۔“ وہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے غار کے اندر لے گیا۔ قیدیوں والے حصے میں سورج اور باقی قیدی ان کے منتظر تھے۔

”مجھے بھیجیو یہاں سے۔ میں سب سے زیادہ تیز رفتار ہوں۔“

”میں جاؤں گا۔ میں جوان اور طاقتور ہوں۔“

”نہیں میں.....“

”میں..... میں..... میں.....“

ان سب نے ان کی شکلیں دیکھتے ہی شور مچانا شروع کر دیا تھا۔ بڑی مشکل سے انہیں خاموش کروایا گیا۔ وہ چپ ہوئے تو معاذ نے بولنا شروع کیا۔

”آپ سب کو قسمت کے پھیر نے اس جہنم میں پہنچایا ہے۔ اس پھیر سے نکلنے کے لیے بھی آپ کو قسمت کا لکھا قبول کرنا پڑے گا۔ آپ سب کے نام پر چپوں پر لکھ کر قرعہ اندازی کی جائے گی۔ جس جس کے نام قرعہ اندازی میں لکھیں گے، وہ یہاں سے جائے گا اور باقیوں کو یہاں رک کر مدد آنے کا انتظار کرنا ہوگا۔ کیا آپ لوگوں کو میرا یہ فیصلہ منظور ہے؟“ جواب میں وہاں خاموشی چھا گئی۔

”خاموشی یا خود غرضی سے مسئلے کا حل نہیں نکلتے گا۔“
آپ سب جانتے ہیں کہ ہمارے وسائل محدود ہیں اور ان
وسائل میں صرف چند لوگوں کے ہی یہاں سے جانے کا
انتظام ہو سکتا ہے۔ وہ چند لوگ کون ہوں گے، اس کا فیصلہ
قسمت کو کرنے دیں۔ اسی میں سب کی بھلائی ہے۔“ ان کو
خاموش پا کر معاذ نے انہیں سمجھایا۔

”میں آپ کے فیصلے کو سونپنا کر رہا ہوں۔“ سب سے
پہلے سورج نے اس کی بات تسلیم کی پھر آہستہ آہستہ سب
مانتے چلے گئے۔ چند ایک کو اختلاف تھا بھی تو اکثریت کی
رائے کے سامنے اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔

”آپ اس کام کو مکمل کروائیں۔ میں اتنی دیر میں
دوسرے معاملات دیکھتا ہوں۔“ وہ زانگ کو وہاں مصروف
چھوڑ کر خود دوسری طرف چلا گیا۔ یہاں اس کی وکی اور جارد
سے ملاقات ہو گئی۔

”لارا کی حالت بہت خراب ہے اور ہمیں نہیں لگتا کہ وہ
اب زیادہ دیر زندہ رہ سکے گی۔“ وکی نے اسے اطلاع دی۔
”آؤ، چل کر دیکھتے ہیں۔“ وہ ان کے ساتھ چل
پڑا۔ لارا سگری سٹی ایک کونے میں پڑی تھی اور اس کے منہ
سے کراہیں خارج ہو رہی تھیں۔

”اسے بے حد تیز بخار ہے۔ ہم نے کچھ دوائیں دی
تھیں لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔“ جارد نے اس کی
معلومات میں مزید اضافہ کیا۔ معاذ نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں
کیا۔ حقیقتاً اسے لارا سے کوئی ہمدردی محسوس نہیں ہو رہی
تھی۔ وہ عورت ان لوگوں کا حصہ تھی جنہیں انسانیت کا
مطلب ہی نہیں پتا تھا۔

”میرے سر یا دل میں گولی مار کر میرا قصہ ختم کر دو۔
میں اس اذیت کو مزید نہیں سہہ سکتی۔“ معاذ کو سامنے پا کر
اس نے دہائی دی تھی۔

”میرے خیال میں یہ اذیت اس اذیت سے کم ہی
ہوگی جو تم لوگوں کے ہاتھوں تجربات سے گزرتے بے گناہ
انسانوں کو اب تک برداشت کرنا پڑی ہے۔“

”ظلمت کرو۔ ہم جو کچھ کر رہے تھے، اس میں
انسانیت کی بھلائی تھی۔ تم لوگوں نے سارا سیٹ آپ تہا
کر کے انسانیت کا بہت بڑا نقصان کیا ہے۔“ وہ ٹوٹی طاقت
کے باوجود پرجوش ہو کر اپنا دفاع کرنے لگی۔

”کیسی بھلائی؟ جتنے کیلئے انسانوں کو ان کی ہستی بستی
زندگی سے نکال کر اس دیرانے میں لا کر قید کر دینا، انہیں
حقیر جانوروں کی طرح تجربات میں استعمال کرنا، ان کو

موت کے گھاٹ اتارنا اور مرنے کے بعد بھی ان کے جسم
سے گوشت اتار لینا..... ان میں سے آخر کون سا فعل ایسا
ہے جسے تم انسانیت کی بھلائی قرار دے سکتی ہو؟“ معاذ کو اس
کی ڈھٹائی پر غصہ آیا۔

”عظیم مقاصد کے لیے ہمیشہ کچھ لوگوں کو قربانی دینا
پڑتی ہے۔ یہ لوگ جو یہاں مرے ہیں اگر وہ تیس، چالیس یا
پچاس برس اور جی لیتے تو اس سے دنیا کو کیا فرق پڑتا۔ تم یہ
سمجھو کہ ان کی زندگیاں زیادہ بہتر مقصد میں استعمال
ہو گئیں۔“ وہاں کوئی شرمندگی نہیں تھی۔

”دنیا کو کوئی فرق پڑے نہ پڑے، ان کے اپنوں کو
فرق پڑا ہوگا۔ ماں، بہن، بیوی، بیٹی، باپ، بھائی اور
دوست آج بھی راہ دیکھتے ہوں گے کہ وہ جو اچانک ان کی
زندگیوں سے غائب ہو گیا ہے شاید کسی روز اچانک ہی
واپس لوٹ آئے۔ انہیں تو کبھی معلوم ہی نہیں چل سکے گا کہ
ان کا وہ پیارا کب اور کیسے مارا گیا؟ ان کی تسلی کے لیے تو قبر
سکی مٹی یا چٹا کی راکھ بھی نہ چھوڑی تم لوگوں نے۔“ معاذ کو
اب تک یہ بات ہضم نہیں ہو رہی تھی کہ یہاں غذائی
ضرورت پوری کرنے کے لیے مرنے والوں کی لاشوں کو
استعمال کیا جاتا تھا۔

”احتمالاً جذباتی باتیں۔“ وہ سن کر بڑبڑائی۔

”جس میں جذبات ہی نہ ہوں بھلا وہ انسان ہی کیا۔“

”جس کی زندگی انسانیت کی بھلائی کے کام نہ آئی ہو،
اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ لارا نے طنز کیا۔

”یوں سب سے الگ ٹھلگ اور چوری جیسے رہ کر
خدمت نہیں، جرائم کیسے جاتے ہیں۔ تم لوگ بھی یقیناً یہی کچھ
کر رہے تھے۔“ معاذ اس کی بات سے ذرا متاثر نہیں ہوا
لیکن اب کی بار اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ دیکھنے
پر معلوم ہوا کہ وہ غنودگی میں چلی گئی ہے۔ اصل میں وہ بھتی
تھی جو بھتیجے سے پہلے پورے زور سے پھڑپھڑاتی تھی۔

”عظیم اسرائیل ایک دن ساری دنیا پر حکمرانی کرے
گا۔ ہمیں خدا نے حکمرانی ہی کے لیے بنایا ہے۔“ جارد نے
اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے اور کچھ پانی اس کے
منہ میں بھی ڈالا تو وہ ہوش میں آ کر آہستہ سے بڑبڑائی۔

”اس خواب کو اپنے دل میں لیے تمہاری قوم کا ایک
ایک فرد جہنم میں چلا جائے گا لیکن تمہیں کامیابی نہیں ملے
گی۔“ اس کی بُری حالت کے باوجود معاذ اسے جواب دے
بغیر نہ سکا۔

”انہی اس کے حال پر چھوڑ دیں معاذ بھائی! کچھ

پاس واپس پہنچا۔ زانگ قرعہ اندازی کا عمل مکمل کروا کر قاریغ ہو چکا تھا۔ اس نے معاذ کو منتخب افراد کی فہرست دکھائی۔
”کیا جانے والوں میں سورج کا نام بھی شامل ہے؟“ فہرست ہندی زبان میں تھی اس لیے اسے زانگ سے پوچھنا پڑا۔

”نہیں۔ اس کا نام نہیں ہے۔“ زانگ نے انکار کیا۔
”اوہ..... اس کا نام شامل ہوتا تو اچھا ہوتا۔ وہ اچھی فطرت کا انسان ہے۔ اس سے امید کی جاسکتی تھی کہ وہ دوسروں کے لیے کچھ کرنے کی کوشش کرے گا۔“ سورج کا نام شامل نہ ہونے پر اسے افسوس ہوا۔

”اس کے یہاں رہنے میں بھی بہتری ہے۔ وہ یہاں کے انتظامی معاملات بہتر طریقے سے چلا سکتا ہے۔“ زانگ مطمئن تھا۔

”اگر ہمارے یہاں سے جانے کے بعد ڈیوڈ کے لوگ یہاں آگئے تو کیا ہوگا۔ یہ حال سے بے حال لوگ جن میں سے شاید ہی کسی کو اسلحے کا استعمال آتا ہو، اپنا دفاع تک نہیں کر سکیں گے۔“ معاذ نے بڑی دیر سے ذہن میں مچلتا سوال زانگ کے سامنے رکھا۔

”وہ نہیں آئیں گے۔ انہیں ہماری یہاں آمد کا علم ہو چکا ہوگا۔ یہاں ہمارے قدم پڑنے کے بعد ان کے لیے یہ جگہ بیکار ہو چکی ہے اس لیے اب بھی وہ یہاں کا رخ نہیں کریں گے۔“ زانگ نے پورے وثوق سے دعویٰ کیا۔

”میں حیران ہوں کہ وہ اتنے عرصے سے یہ سارا سیٹ اپ کیسے چلا رہے تھے۔ لوگوں کا اغوا، تسلسل سے راشن کی سپلائی، گاڑیوں کا آنا جانا..... کچھ بھی بھارتی حکومت کی نظروں میں نہیں آیا۔“

”یہ سب کچھ ان کی نظروں میں ہوگا بلکہ ان کی اجازت سے ہی ہو رہا ہوگا۔ دنیا کی کوئی بھی حکومت اپنے ملک میں ہونے والی ایسی کارروائیوں سے بے خبر نہیں ہوتی۔ یہ اور بات کہ وہ خود کو جان بوجھ کر انجان ظاہر کرتی رہے۔ بھارتی حکمرانوں کا تو ویسے بھی یہود سے پرانا گٹھ جوڑ ہے۔“ زانگ نے اسے جواب دیا پھر موضوع بدلتے ہوئے بولا۔

”اب ہمیں بھی یہاں سے روانگی کی تیاری کرنا ہے۔ کیمپ کا سارا راز ہم پر مکمل چکا ہے اور جو نہیں معلوم ہو سکا، اسے معلوم کرنے کے لیے ہم پروفیسر اینڈریو کو اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں۔ ہماری رپورٹ اور پروفیسر سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں اوپر والے خود فیصلہ کریں

لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کا جینا مرنا سب شر پر ہی ہوتا ہے۔“ وکی نے اس کا ہاتھ آہستہ سے دبایا۔

”تم ان لوگوں کی سوچ دیکھو یا راہیہ اپنے سوا دنیا کے سب انسانوں کو حقیر سمجھتے ہیں اور کسی سدھائے ہوئے جانور کی طرح نہ صرف انہیں اپنے تابع رکھنا چاہتے ہیں بلکہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ جانوروں ہی کی طرح جب چاہیں انہیں چیر پھاڑ کر کھا جائیں اور پھر الزام ہم مسلمانوں پر ہے کہ ہم بنیاد پرست اور دہشت گرد ہیں۔ تم بتاؤ مجھے کہ جو کچھ یہاں ہو رہا تھا، وہ دہشت گردی نہیں تو اور کیا ہے؟“ وہ جذباتی ہو گیا۔

”بنیادی انسانی حقوق کی پامالی جو بھی کرے، وہ قابلِ مذمت ہے۔ نہ مسلمانوں کو یہ حق حاصل ہے کہ دوسرے مذاہب کے لوگوں کو اپنے نظریات و عقائد کی بحیثیت چڑھائیں اور نہ ہی یہودیوں کو کہ اپنی نسلی برتری کے زعم میں دوسروں کو صفحہ ہستی سے ہی مٹاتے چلے جائیں۔“ وکی نے رسان سے اس کی بات کا جواب دیا۔
لارا پر اب مکمل غنودگی طاری ہو گئی تھی۔ اس لیے وہ اس گفتگو کو سننے اور کوئی جواب دینے سے قاصر تھی۔

”حق نہیں پھر بھی وہ پوری بے شری اور ڈھٹائی سے یہ کام کر رہے ہیں۔ فلسطینیوں کی نسلوں کی تسلیں مٹا کر رکھ دی ہیں انہوں نے لیکن کوئی نہیں جو مکمل کر ان کی مذمت کرے، ان کے خلاف کوئی پابندی عائد کرے۔ بس سارے اصول اور پابندیاں ہم مسلمان ممالک کے لیے ہیں۔“

”معیشت بھائی صاحب معیشت۔ اس وقت پوری دنیا اس ایک حقیقت پر کھڑی ہوئی ہے۔ آپ کمزور معیشت کے مالک ہیں تو مطلب ہے آپ کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور بے حیثیت لوگوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔ ہم مسلمان اس وقت اپنا کیا دھرا ہی بھگت رہے ہیں۔ ہم نے فضول مذہبی مباحث اور عیاشیوں سے ہٹ کر اگر ہوا کا رخ دیکھتے ہوئے اپنی ملک و قوم کے لیے کچھ کیا ہوتا تو آج یوں ذلیل و خوار نہیں ہوتے۔“ وکی اس وقت جذباتیت کے بجائے حقیقت پسندی سے کام لے رہا تھا۔

”میرے خیال میں یہ وقت ان سب باتوں کا نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ ہم سب اپنے اپنے حصے کے کام دیکھیں۔“
اب تک خاموش کھڑے چارو نے درمیان میں دخل دے کر اس گفتگو کو ختم کرنا مناسب سمجھا۔

”ہاں ٹھیک ہے۔ میں زانگ کے پاس واپس جا کر اس سے آئندہ کے لائحہ عمل کے متعلق پوچھتا ہوں۔“ معاذ کو اس کی بات سمجھ آ گئی اور وہاں سے نکل کر سیدھا زانگ کے

کے کہ آگے نہیں کیا کرنا ہے اور کیا نہیں۔“

”تمہارے تاثرات سے مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے تم یہ سب ہی دیکھنے کی توقع کر رہے تھے۔ تم مجھے کسی بھی لمحے حیران نظر نہیں آئے۔“ معاذ نے اپنے دل میں آئے خیال کا اس سے اظہار کیا۔

”بالکل یہ سب نہیں پر تو! میں ایسا ہی کچھ دیکھنے کی امید کر رہا تھا۔ اس ویرانے میں اتنی لاگت لگا کر یہ کیمپ بلاوجہ تو نہیں چلایا جا رہا تھا۔ ایسی ہر شے کے پیچھے کوئی بڑا مقصد ہوتا ہے۔“

”تم لوگوں کا کیا مقصد ہے؟“ اس کا جواب سن کر معاذ نے بے ساختہ پوچھا تو زانگ ساکت رہ گیا۔

”اب یہ نہ کہنا کہ یہ بھکشوؤں کا طرز زندگی ہے۔ وہ ایسے طرز زندگی اور تپسیاؤں کو پسند کرتے ہیں۔ تمہارا بھی سارا سیٹ اپ اتنا ہی منظم ہے جتنا اس کیمپ کا۔ ترک دنیا کر دینے والے سادھو اور بھکشوؤں لوگوں کی طرح جدید اسلحے اور آلات کے ساتھ نہیں رہتے۔ تم مانویانہ مانو، تم لوگ بھی کسی خاص مقصد کے تحت وہاں رہ رہے ہو۔“ وہ بولنے پر آیا تو بولتا چلا گیا۔

”تم چل رہے ہو نا ہمارے ساتھ بیٹنگ۔ اپنے ہر سوال کا جواب وہاں پہنچ کر حاصل کر لیتا۔“ زانگ نے اس سے بحث کرنے کے بجائے ایک سادہ سا جواب دے کر بات ختم کر دی تو معاذ کو بھی ایک گہری سانس لے کر خاموشی اختیار کرنا پڑی۔

☆☆☆

”بچہ مد فیڈ لیتا ہے؟“ اعظم کے معائنے کے لیے حویلی آئی ہوئی ڈاکٹر نے سوال کیا۔

”جی نہیں ڈاکٹر!“ جواب نیلی نے دیا کہ اعظم اسی کی گود میں تھا۔

”کیوں؟“ ڈاکٹر نے اسے کڑے تیوروں سے گھورا۔

”جی، وہ.....“ اس سے فوری طور پر جواب نہ بن پایا۔

”دیکھیں میڈم! آپ دنیا کا اعلیٰ ترین دودھ بھی بچے کو دے دیں تو وہ ماں کے دودھ کا نعم البدل نہیں ہو سکتا۔ دو

سال تک ماں کا دودھ بچے کا حق ہے۔ اسے اس کا یہ حق دینے سے نہ صرف اس کی صحت کا بھلا ہے بلکہ آپ کا بھی بھلا

ہے۔ اس سلسلے میں محکمہ صحت آگاہی مہم بھی چلاتا رہتا ہے۔

کیا آپ نے کبھی اس بارے میں کچھ نہیں سنا؟“ ڈاکٹر

بولنے پر آئی تو بولتی چلی گئی۔ بے چاری نیلی اس دوران کچھ

بولنے کی کوشش میں منہ ہی کھولتی رہ گئی۔ بالآخر جب ڈاکٹر

خاموش ہوئی تو اسے موقع ملا اور جھینپے ہوئے لہجے میں بولی۔
”میں اس کی ماں نہیں ہوں ڈاکٹر صاحبہ! اس کی ماں کوئی اور ہے۔“

”اوہ، تو پھر بچے کی ماں کو بلائیے نا۔ بچے کے سلسلے

میں ماں سے زیادہ بہتر نہ تو کوئی بتا سکتا ہے، نہ ہی سمجھ سکتا

ہے۔“ ڈاکٹر اس کا جواب سن کر خود بھی تھوڑی سی شرمندہ

ہوئی لیکن کوشش کی کہ شرمندگی ظاہر نہ ہوئے پائے۔

”وہ اس وقت موجود نہیں ہیں۔ آپ کو جو کچھ کہنا ہے،

مجھ سے کہیں۔ میں آپ کی ہدایات پر پورا پورا عمل کروں

گی۔“ نیلی نے یقین دہانی کروائی۔ ساتھ بیٹھا موسیٰ ڈاکٹر

کے ہاتھوں اس کی یہ درگت بننے دیکھ کر بہ مشکل اپنی ہنسی

روک رہا تھا۔

اس وقت کمرے میں ان دونوں میاں بیوی کے

علاوہ بس ایک ملازمہ موجود تھی۔ صداقت شاہ کو لالہ کی زبانی

معلوم ہوا تھا کہ اعظم کو ایک ڈاکٹر کے کلینک سے لایا جا رہا

ہے اس لیے انہوں نے اس کے پہنچنے سے پہلے ہی چائلڈ

اسپیشلسٹ کا انتظام کر کے رکھا ہوا تھا۔ اب یہ اتفاق تھا کہ

جب معائنہ شروع ہوا تو قربان شاہ اٹھ کر اندر زنانے میں

چلے گئے اور صداقت شاہ کو کوئی اہم فون کال آگئی جسے سننے

کے لیے انہوں نے کمرے سے باہر جانا مناسب سمجھا۔

”ہدایات پر تو آپ عمل کر لیں گی لیکن ماں کی کمی کیسے

پوری کریں گی؟ میں نے بچے کا بہت اچھی طرح معائنہ کیا

ہے۔ یہ بالکل ٹھیک ہے۔ مجھے اس کے ساتھ صحت کا کوئی

ایشیو نظر نہیں آ رہا ہے۔ ہاں کچھ بے چمک اور چڑچڑاہٹ محسوس

ہو رہا ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ اس کی وجہ ماں سے دوری

ہے۔ چھوٹے بچے زبان سے اظہار نہیں کر سکتے لیکن یہ ماں

کی کمی شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ زیادہ حساس ہوں تو

بیمار بھی پڑ جاتے ہیں۔“ ڈاکٹر اسے سمجھانے لگی۔

”میں آپ کی بات سمجھ رہی ہوں ڈاکٹر صاحبہ! لیکن

مسئلہ یہ ہے کہ فی الحال ہم اسے اس کی ماں فراہم نہیں

کر سکتے۔ آپ پلیر کوئی ایسی دوا دیں کہ یہ پُر سکون

ہو جائے۔“

”ایک تو یہ خانگی لڑائی جھگڑے۔ لوگ سمجھتے ہی نہیں

کہ ان جھگڑوں سے بچے ڈسٹرب ہوتے ہیں۔“ بڑبولی

ڈاکٹر اپنے اندازے کی بنیاد پر بلند آواز میں بڑبولی لیکن

غیبت یہ ہوا کہ ساتھ ہی وہ جھک کر پرچے پر نسخہ تجویز

کرنے لگی۔

”جی ڈاکٹر صاحبہ! دیکھ لیا آپ نے میرے لوا

جاؤ۔ ہم نے اس کی ٹانی اور خالہ کو پہلے سے اس کی آمد کی خبر نہیں دی تھی۔ اب ادا قربان شاہ نے بتا دیا ہوگا اور وہ اس سے ملنے کے لیے بے چین ہوں گی۔“

”جی، ٹھیک ہے شاہ صاحب!“ نیلی فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ اعظم اس کی بانہوں میں تھا۔

”لائیں مجھے دے دیں بی بی!“ حویلی کی وقار ملازمہ نے اعظم کو اس کی گود سے لیتا چاہا۔ وہ فوراً چیخ کر رونا شروع ہو گیا۔

”تم رہنے دو۔ میں خود اسے سنبھال لوں گی۔“ نیلی نے اسے نرمی سے سمجھایا اور اعظم کو اپنے ساتھ لگا کر چپ کروانے لگی۔ جب تک وہ لوگ سکینہ شاہ کی خواب گاہ تک پہنچے، وہ خاصی حد تک چرسکون ہو چکا تھا۔

”میری سہیل کے جگر کا ٹکڑا، میری جان، میرا شہزادہ..... اسے مجھے دو۔ میں اس میں اپنی سہیل کی خوشبو سونگھ لوں۔“ سکینہ شاہ، اعظم کو دیکھتے ہی رُپ اٹھیں۔ اعظم کو ان کی گود میں دیا گیا تو انہوں نے اسے اپنے ساتھ بچھین لیا اور دیوانہ وار چومنے لگیں۔ ان کی اس قدر وارفتگی پر اعظم گھبرا گیا اور چیخ چیخ کر رونے لگا۔

”اماں سائیں! آرام سے۔ اعظم گھبرا رہا ہے۔“ مول نے ماں کو زور دیا۔

”مجھ بد نصیب ماں کو اپنا کلیجہ ٹھنڈا کرنے دے مول! یہ میری سہیل کے وجود کا حصہ ہے۔ اسے سینے سے لگا کر مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میری سہیل آگئی ہو۔ ہائے میری بد نصیب بچی..... اعظم کیا دنیا سے میری بچی کی زندگی سے سکھ ہی اٹھ گیا۔“ وہ اعظم کو سینے سے لگائے بلکنے لگیں۔

”حوصلے سے کام لو سکینہ! اللہ صبر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔“ قربان شاہ نے بہن کو سمجھایا۔

”کیسے صبر سے کام لوں، ادا سائیں! میرا گھبرا جڑ گیا ہے۔ میری سہیل..... میرا عالم شاہ..... ہائے میرے دل کے ٹکڑے نہ جانے کہاں بھٹکتے پھر رہے ہیں اور کن ٹکینوں سے گزر رہے ہیں۔ اپنے بچوں کی تکلیف کا سوچ کر مجھے نہ رات کو نیند آتی ہے، نہ دن میں چھین مٹا ہے۔“ اعظم کے ملنے کی خوشی اپنی جگہ تھی لیکن وہ اپنی دو جوان، پٹیا پٹائی اولادوں کو کیسے بھول سکتی تھیں۔

”رب سائیں نے جہاں اتنی مہربانی کی ہے کہ اعظم کو ہم سے ملوایا ہے تو آگے بھی وہ ہم پر اپنا کرم کرنے لگا اور ابن شاہ اللہ بہت جلد ہم سہیل اور عالم کو بھی یو بکی اپنے درمیان دیکھیں گے۔“ قربان شاہ، بہن کے قریب بیٹھ کر

کو طبیعت زیادہ خراب تو نہیں ہے اس کی؟ اگر کوئی مسئلہ محسوس ہو رہا ہے تو صاف بتادیں۔ اصل میں مجھ سے بھی زیادہ اس کے دادا سائیں بے چین ہیں۔ یہ ان کا اکلوتا وارث ہے تا تو وہ اس کے لیے ضرورت سے زیادہ حساس ہیں۔“ ڈاکٹر نسیم لکھری بھی تھی کہ صداقت شاہ واپس آگئے اور یہ لٹے ہوئے ڈاکٹر کے سامنے صوفے پر جگہ سنبھال لی۔

”میں نے سب کچھ اس لڑکی کو سمجھا دیا ہے اور یہ کچھ دوا میں بھی لکھ دی ہیں۔ دوا میں بھی کیا، بس ایک طاقت کا سیرپ اور فوڈ سیلمنٹس ہیں۔ آپ بچے کو پابندی سے استعمال کروائیں۔ اللہ نے چاہا تو اچھے نتائج برآمد ہوں گے۔“ ڈاکٹر صاحبہ جو کسی خانگی جھگڑے کا اندازہ لگا چکی تھیں، دادا اور نانا کے ایک بیچ پر ہونے کا سن کر کچھ غل سی ہو گئیں اس لیے اس بار کوئی اضافی بات کیے بغیر پیشہ ورانہ انداز میں جواب دیا۔

”تھینک یو سو مچ ڈاکٹر صاحبہ! ہم آپ کی آمد اور تعاون پر آپ کے شکر گزار ہیں۔ ہمارے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیے۔“ صداقت شاہ کے اشارے پر ملازم نے ڈاکٹر صاحبہ کو ایک بھاری لفافہ تھمایا اور خود انہوں نے نہایت اخلاق سے ڈاکٹر صاحبہ کا شکریہ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ عاجزی سے پوچھا۔

”آپ کی کرم فرمائی کا شکریہ شاہ صاحب! مجھے بس اب آپ اجازت دیجیے۔ میرے کلینک پر بھی مریض میرے منتظر ہوں گے۔“ وہ اب وہاں سے روانگی کے لیے پرتول رہی تھی۔

”جی ضرور۔ ہمیں آپ کے وقت کے قیمتی ہونے کا احساس ہے۔“ صداقت شاہ نے انہیں اجازت دی تو وہ وہاں سے روانہ ہو گئیں۔ وہ فہمی ضبط کرتی نیلی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

”شاہ صاحب! ڈاکٹر نے کہا ہے کہ اعظم بالکل ٹھیک ہے۔ انہوں نے بس اسے کچھ طاقت وغیرہ کی دوا میں لکھ کر دی ہیں۔“ مومی نے نیلی کے پیر پر آہستہ سے اپنا پائوں مارا اور اس کے بجائے خود جواب دیتے ہوئے نسیم صداقت شاہ کے حوالے کیا۔

”اللہ سائیں کا احسان ہے۔ ہم ابھی کسی کو بھیج کر یہ دوا میں منگوا لیتے ہیں۔“ صداقت شاہ نے اطمینان کا سانس لیا: برنسہ کسی ملازم کے حوالے کرنے سے قبل نیلی کو مخاطب کرتے ہوئے بولے۔

”بیٹی! تم ملازمہ کے ساتھ اعظم کو زانے میں لے

انہیں تسلی دلا سادینے کی اپنی سی کوشش کر رہے تھے۔ اس کوشش کے دوران ہی انہوں نے نیلی کو اشارہ کیا کہ وہ اعظم کو ان کی گود سے لے لے۔ نیلی ہچکچاتی ہوئی آگے بڑھی۔ اسے ڈر تھا کہ سکینہ شاہ اس بات کو پسند نہیں کریں گی کہ ان کے نواسے کو ان کی گود سے لے لیا جائے لیکن اس کے اندازے کے برخلاف انہوں نے بالکل بھی مزاحمت نہیں کی۔ شاید وہ بڑھاپے کی حالت میں مزاحمت کی ہمت ہی نہیں تھی۔ نیلی نے نرمی سے اعظم کو ان کی گرفت سے نکال کر اپنی گود میں لے لیا۔

”اللہ اپنے بندوں کو آزماتا ہے سکینہ! تم اللہ سامنے سے دعا کرو کہ وہ تمہیں اس آزمائش سے گزرنے کا حوصلہ دے۔ کچھ بھی سہی، تمہارے پاس کم سے کم امید تو ہے۔ تم اللہ سامنے سے یہ دعا تو مانگ سکتی ہو کہ وہ تمہیں تمہاری اولاد سے ملوادے۔ مجھے اور اپنی بھر جانی کو دیکھو، ہم تو اپنے اکلوتے پٹ کی ہمیشہ کی جدائی کا دکھ سہہ رہے ہیں۔ جب سے معظم گیا ہے، ہم نہ زندوں میں ہیں، نہ مردوں میں۔“ قربان شاہ انہیں تسلی دیتے دیتے اپنے دکھوں کو رونے لگے۔ ”معظم کے جانے کا دکھ مجھے کم ہے کیا ادا سامیں! ایک طرف وہ میرا خون تھا تو دوسری طرف میری دہی کے سر کا سامیں۔ اس کا جانا ہی تو ہمارے خاندان کی ساری خوشیوں کو کھا گیا ہے۔“ وہ ایسے رونے لگیں جیسے معظم شاہ کا جنازہ سامنے ہی رکھا ہو۔ اعظم جو پہلے ہی خاموش نہیں ہو رہا تھا، ان کے بین سن کر مزید گھبرا گیا اور اس کے رونے میں اور بھی شدت آگئی۔

”بتول! انہیں دوسرے کمرے میں لے جا۔ میں ابھی آتی ہوں۔“ مول نے اعظم اور اسے سنبھالنے میں نڈھال ہوتی نیلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ملازمہ کو حکم دیا تو ملازمہ ان دونوں کو ساتھ لے کر ایک دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ یہاں اس نے نیلی کو کچھ کھلونے اور کھانے پینے کی اشیاء بھی فراہم کر دیں۔ آخر کار نیلی، اعظم کو بہلانے میں کامیاب ہوئی گئی۔ اعظم کھلونوں کے ساتھ مصروف ہوا تو اس نے اسے کھیل ہی کھیل میں کیلا اور دو بسکٹ کھلا ڈالے پھر کچھ دیر بعد فیڈر دے کر سلا دیا۔ ابھی وہ سوئے ہوئے اعظم کو گود سے اتار کر بستر پر لٹا رہی تھی کہ دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر مول اندر آگئی۔

”سو گیا یہ، چلو شکر ہے ورنہ میں تو پریشان ہی ہوگئی تھی کہ رو رو کر بچے کی طبیعت ہی نہ بگڑ جائے۔“ اعظم کو سوئے ہوئے دیکھ کر اس نے اطمینان کا اظہار کیا۔

”ماں سے بچھڑ کر بے چارہ پہلے ہی اسپتال ہے۔ اس پر سے حالات بھی نارمل نہیں ہیں۔ اتنی سی جان گولیوں کے دھماکے سنتے ہوئے یہاں پہنچا ہے۔ ابھی رشتوں کو بھی نہیں پہچانتا اس لیے بڑی تنگ صدمہ کے رونے پر زیادہ ہی گھبرا گیا تھا۔“

”میں سمجھتی ہوں اس بات کو لیکن اماں سامیں بھی مجبور ہیں۔ ادی تھل اور ادا سامیں کی جدائی کے دکھ نے انہیں اندر سے کھوکھلا کر رکھ دیا ہے۔ ان میں اب کچھ بھی سہنے کی ہمت نہیں رہی ہے۔ اب مجھ میں بڑی مشکل سے انہیں بہلا پھسلا کر اور سمجھا بجا کر دوا کھلا کر سلانے میں کامیاب ہوئی ہوں۔“ مول کے چہرے پر گہرا دکھ تھا۔ اس خاندان پر اتنے عرصے میں جو کچھ بیتا تھا اور مشکل بیت رہا تھا، اس سے خاندان کا کوئی بھی فرد متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا تھا۔ معاملہ بھی تو خون کے رشتوں کا تھا۔ ان رشتوں میں قدرتی طور پر ایسی محبت ہوتی ہے کہ لامحالہ ایک کا دکھ دوسرے کو محسوس ہوتا ہے۔

”اللہ آپ کے خاندان کو اس غم سے نجات دلائے اور جلد از جلد آپ کے اپنے آپ سے آن لیں۔ آپ کی طرح ہم بھی اپنی ایک بہت پیاری ہستی کے لیے تڑپ رہے ہیں۔ ان سے ہمارا خون کا رشتہ تو نہیں لیکن تعلق اتنا ہی گہرا ہے کیونکہ ہم نے خون کے رشتے دیکھے ہی نہیں۔ ہمارے لیے جو کچھ ہیں، وہ یہی گنتی کے چند تعلق دار ہیں جن کو ہم زبان سے جو کچھ کہہ کر بیکارتے ہیں وہی دل سے تسلیم بھی کرتے ہیں۔“ نیلی اس غم کو کیوں نہیں سمجھتی جو اس کا اپنا جانا پہچانا تھا۔

”کس کی بات کر رہی ہو تم؟“ مول نے چونک کر اس سے پوچھا۔

”ہے ایک وقاص عرف دکی بھائی جو یاروں سے یاری نبھانے کے لیے اپنا آپ داؤ پر لگا بیٹھا ہے۔ یہ اس کے حصے کی محبتیں ہی ہیں جو میں، مونی اور لالہ عیسیٰ تمہارے ہیں۔ اعظم کو آپ لوگوں تک پہنچانے کے لیے ہم نے اپنی جان جو کھوں میں ڈالی ہے تو صرف اس لیے کہ اس کے آگے سرخرو ہو سکیں۔“

”میں تم سے تمہارے دکی بھائی کے بارے میں تفصیل سننا پسند کروں گی لیکن پہلے چل کر کھانا کھا لو۔ مہمان نوازی اس حویلی کی روایت ہے لیکن حالات ہی کچھ ایسے ہیں کہ ہم تمہاری خاطر تواضع پر ڈھنگ سے توجہ نہیں دے پارہے ہیں۔“ مول کچھ شرمندہ سی تھی۔

”جیسی آپ کی مرضی۔“ نیلی کو کیا اعتراض ہوتا۔

”میں خود یہاں رک جاتی لیکن آج رات مجھے اماں
سائیں کے ساتھ سونا پڑے گا۔ وہ نیند کی دوا کھا کر سوئی ہیں
لیکن جس کیفیت میں سوئی ہیں، مجھے اندیشہ ہے کہ رات
درمیان میں ہی ان کی آنکھ کھل جائے گی۔ ایسے میں مجھے ان
کو سنبھالنے کے لیے ان کے پاس رہنا چاہیے۔“ اس نے
مزید وضاحت دی۔

”آپ بے فکر ہو کر جائیں۔ اعظم کو میں سنبھال لوں
گی۔“ نیلی نے اسے تسلی دی۔ اس کے جانے کے بعد وہ
اعظم کے قریب جا کر لیٹی تو خود بھی حیران تھی کہ ایک دن میں
اس کا اس بچے کے ساتھ کیسے اتنا گہرا تعلق بن گیا ہے کہ نہ
صرف وہ اس کے ساتھ پُر سکون ہے بلکہ وہ بھی اس کے لیے
ایسے ممتا بھرے جذبات محسوس کر رہی ہے جیسے وہ اسی کی
اولاد ہو۔

”سارے رب کے کھیل ہیں۔ اسے اپنی دنیا چلانے
کو سارے انتظام آپ کرنے آتے ہیں۔“ سونے سے
پہلے یہ حتمی نتیجہ تھا جو اس نے اخذ کیا تھا۔

☆☆☆

رات کے آخری پہر بجتی فون کی گھنٹی کی آواز پر
صداقت شاہ کی آنکھ کھلی تو ایک لمحے کے لیے وہ کچھ سمجھ ہی
نہیں پائے۔ رات کو پولیس تھانے کے معاملات نمٹاتے
نمٹاتے ویسے ہی سونے میں بہت دیر ہو گئی تھی۔ معاملہ کسی
عام سی پارٹی کا ہوتا تو وہ اتنی فکر نہیں کرتے لیکن یہاں
مقابلین عیار و چالاک ہی نہیں، پہنچ والے بھی تھے۔ ایک
ایک مرنے والے کی شناخت اور معلومات ضروری تھیں کہ
اگر ان میں سے کوئی ایک بھی معزز اور رسائی والا بندہ نکل
آتا تو اسے ڈکیتوں کے کھاتے میں ڈالنا مہنگا پڑ جاتا۔ ایک
طرف جذباتی بحران تھا تو دوسری طرف یہ ذہنی و جسمانی
مشقت۔ اسی لیے وہ بہت تھک کر سوئے تھے اور ایک دم
سے آنکھ کھلنے پر ان کا دماغ فوری کام کرنے سے قاصر تھا۔
بچ بچ کر بند ہو جانے والی فون کی گھنٹی معمولی سے وقفے کے
بعد دوبارہ بجنے لگی تو انہوں نے کال ریسیڈ کی۔

”ہیلو شاہ صاحب! میں بات کر رہا ہوں۔“ کال
موصول کرتے ہی انہوں نے دوسری طرف سے الالہ میسج کی
تیز آواز سنی۔

”آپ اور اس وقت..... سب خیر تو ہے؟“ نالہ کی
آواز سنتے ہی وہ فطری پریشان ہو گئے۔
”سب ٹھیک نہیں ہے شاہ صاحب! رات ہی رات

”آپ شرمندہ نہ ہوں۔ ہم بڑی ریف اینڈ لف سی
زندگی گزارنے والے سادہ سے لوگ ہیں۔ ہم دو ایک وقت
کا فائدہ جھیل کر بھی مزے سے منس سکتے ہیں۔“

”لیکن یہاں تو تم ہماری ذمے داری ہو اور ہمارے
ہاں مہمانوں کو بھوکا نہیں رکھا جاتا اس لیے اب باتوں میں
وقت ضائع نہیں کرو اور چل کر کھانا کھاؤ۔ اعظم کے پاس
بتول رک جائے گی۔“ مول نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے کھڑا
کیا اور کمرے سے باہر نکلتے نکلتے واپس مڑ کر اعظم کے پاس
آئی۔ جھک کر اس کا ماتھا جو ما اور نرم آنکھوں سے مسکرائی۔

”اماں سائیں بالکل ٹھیک کہتی ہیں۔ اس کے وجود
میں سے ادنیٰ سہل کی خوشبو آتی ہے۔“
”ان کا خون جو ہوا۔“

”ہاں، یہی بات ہے۔ خیر، چھوڑو ان باتوں کو اور
چل کر کھانا کھاؤ۔ یہ صاحب جاگ گئے تو تمہیں اپنے ساتھ
بڑی کر لیں گے۔“ مول اس کا ہاتھ تھام کر اسے کمرے سے
باہر لے گئی۔ پُر تکلف کھانے کے دوران بھی ان کے
درمیان گفتگو ہوتی رہی۔ مردانہ، زمانہ الگ ہونے کی وجہ
سے نیلی امید نہیں کر سکتی تھی کہ مومی اس کے ساتھ کھانے میں
شریک ہو سکے گا چنانچہ اسے موبائل پر پیغام بھیج کر اپنے
بارے میں بتا دیا۔ اس نے بھی جوابی پیغام میں بتایا کہ وہ
بھی مردوں کے ساتھ طعام کر رہا ہے۔ اس کی طرف سے
مسکین وہ مول سے باتیں کرتی رہی۔ باتوں باتوں میں یہ
بھی طے ہو گیا کہ وہ اعظم کے ساتھ زمانہ حصے میں رکھے گی
جبکہ مومی کا قیام مہمان خانے میں رہے گا۔

کھانے کے بعد بھی مول بہت دیر تک اس کے ساتھ
رہی اور کرید کرید کر نیلی کو معلوم باتیں پوچھتی رہی۔ اس کے
قیام میں معلومات کے حصول کے ساتھ ساتھ اعظم کی کشش
بھی شامل تھی۔ کبھی وہ نظروں سے اس کی بلائیں لیتی اور کبھی
بے ساختہ ہی چوم لیتی۔ اعظم کی نیند خراب ہونے کے
خدشے کے باوجود اس کے والہانہ پن کے باعث نیلی نے
اسے نہیں ٹوکا۔ ویسے بھی اسے معلوم تھا کہ چھوٹے بچے رات
بھر تسلسل کے ساتھ نہیں سوتے اور اپنی ضروریات کے تحت
وقفے وقفے سے جاگتے رہتے ہیں۔ وہ ذہنی طور پر نیند کی
اس خرابی کے لیے تیار تھی۔

”بتول رات کو تمہارے ساتھ اس کمرے میں ہی
سو جا۔ بچی۔ تم تھکی ہوئی ہو نا تو اچھا رہے گا کہ بتول، اعظم
کی دیکھ بھال میں مدد کے لیے یہاں رہے۔“ کافی دیر گئے
مول کمرے سے جاتے جاتے اس سے بولی۔

میں آپ کے خلاف سازش تیار کر لی گئی ہے اور اب آپ پر دھادہ بولنے کی تیاری ہے۔“

”میں کچھ سمجھا نہیں سائیں! آپ کھل کر بتاؤ۔“ وہ پریشانی سے بولے۔

”مجھے اپنی ایک سوری سے پتا چلا ہے کہ آپ کے خلاف ایٹمی کرپشن والے کارروائی کرنے جا رہے ہیں۔ انہوں نے آپ کی وزارت کے عرصے میں کی جانے والی نہ جانے کون کون سی بے ضابطگیاں اور کرپشن ڈھونڈ نکالی ہیں اور اب آپ کے خلاف کارروائی کرنے آرہے ہیں۔“ لالہ نے انہیں اطلاع دی۔

”میں نے کبھی ایک دھیلے کی کرپشن نہیں کی۔ میری ذاتی جائیداد اتنی ہے کہ میری سات نسلیں بیٹھ کر کھا سکتی ہیں۔“ صداقت شاہ کو الزام سن کر غصہ آ گیا۔

”یہ سب آپ بعد میں عدالت کے ذریعے ثابت کرتے رہیے گا لیکن اس وقت تو ان کا مقصد کچھ اور ہے۔“

”کیا مقصد ہے ان کا؟“

”آپ کی حویلی کی تلاشی لے کر اسے بازیاب کروانا جسے کل وہ پوری کوشش کر کے بھی حاصل کرنے میں ناکام رہے۔“ لالہ نے اعظم کا نام لیے بغیر بتایا۔

”لیکن کیوں؟ وہ کیسے اسے لے جاسکتے ہیں؟ وہ کوئی چوری کا مال نہیں، میرا خون ہے..... وہ بھی معصوم اور بے گناہ۔ اسے آخر کس فردِ جرم کے تحت مجھ سے چھین کر لے جایا جاسکتا ہے۔“

”وہ آپ سے وضاحت مانگیں گے کہ وہ آپ تک کیسے پہنچا؟ آپ بھول رہے ہیں کہ وہ کیسے اور کن حالات سے گزرا اور کہاں آپ سے گم ہوا۔ وہ ایک ایک بات میں بال کی کھال نکالیں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ پر ملک دشمن عناصر سے تعلق رکھنے کا الزام لگ جائے۔ امکانات بہت سارے ہیں۔ میں فون پر نہ تو کھل کر بتا سکتا ہوں، نہ اتنا وقت ہے۔ میری اطلاع ہے کہ وہ لوگ فجر کے آس پاس آپ تک پہنچ جائیں گے۔ آپ کو جو کچھ کرنا ہے، اسی مختصر وقت میں کرنا ہے۔ غائب کر دیں اسے حویلی سے۔ بھیج دیں کسی محفوظ مقام پر۔“ لالہ نے ان پر صورتِ حال واضح کی۔

”ٹھیک ہے، میں کرتا ہوں کچھ انتظام۔“ صداقت شاہ نے لالہ کو جواب دے کر فون بند کیا اور خود ملازم کو بلانے کے لیے گھنٹی بجائی۔

”حکم سائیں!“ دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر بوتل کے جن کی طرح حاضر ہونے والا کھل تھا۔ سرد کا جوڑی

دار۔ کئی دن ہوئے صداقت شاہ نے اسے شہر سے گاؤں بلوایا تھا اور اب وہ ان کی خدمت میں حاضر رہتا تھا۔

”مجھے اپنا موبائل دے سچل اور وہ جولا کا مہمان خانے میں ٹھہرا ہوا ہے، اسے اٹھا کر ہمارے پاس بھیج دے۔“

”جی سائیں!“ اس نے بنا کسی سوال جواب کے موبائل نکال کر اس کا لاک کھولا اور ان کے حوالے کیا پھر اسی پھرتی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

صداقت شاہ کی انگلیوں نے موبائل کی اسکرین پر حرکت کی لیکن پھر وہ کچھ سوچ کر رک گئے اور انٹرکام کا ریسپور اٹھا کر ایک نمبر دیا۔ کچھ لمحے بعد ہی انہیں مول کی نیند سے بوجھل آواز سنائی دی۔

”ہم نے بے وقت تمہاری نیند خراب کر دی بیٹا لیکن مجبوری تھی۔“

”آپ حکم کریں بابا سائیں! سب خیر ہے نا؟“ مول اس پہر ان کی آواز سن کر پریشان ہو گئی لیکن بات کرتے ہوئے اس نے اس بات کا دھیان رکھا تھا کہ اس کی آواز بلند نہ ہو۔ وہ سکینہ شاہ کی چمارداری کے لیے ان کے کمرے میں سو رہی تھی اور ان کے نیند کی دوا کے زیر اثر ہونے کے باوجود محتاط تھی۔

”ہمیں کچھ ایسی اطلاعات ملی ہیں جن کے مطابق اعظم کا حویلی میں رہنا مناسب نہیں ہے۔ چنانچہ ہم نے اسے ابھی اور اسی وقت کسی محفوظ مقام پر منتقل کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ آپ نیلوفر بیٹی کو جگا دیجیے اور اعظم کا ضروری سامان پیک کروانے میں ان کی مدد کیجیے۔ ہم تھوڑی دیر میں آپ سے دوبارہ بات کرتے ہیں۔“

صداقت شاہ نے اسے ہدایات دے کر ریسپور واپس رکھا اور دوبارہ موبائل پر نمبر ملانے لگے۔ دو تین گھنٹیاں بجنے کے بعد کال ریسپو کی گئی۔

”یہ ہم بات کر رہے ہیں، ادا قربان شاہ!“ انہوں نے اپنا نام نہیں لیا لیکن جانتے تھے کہ قربان شاہ انہیں شناخت کر لیں گے۔

”ادا سائیں آپ..... لیکن یہ تو آپ کا نمبر نہیں ہے۔“ قربان شاہ ایک وقت حیران و پریشان ہوئے۔ وہ رات کافی دیر سے ہی حویلی سے رخصت ہوئے تھے۔

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نوجوان
کی داستان جو فطرت کاروں کے لیے غضب
ناک تھا باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیے



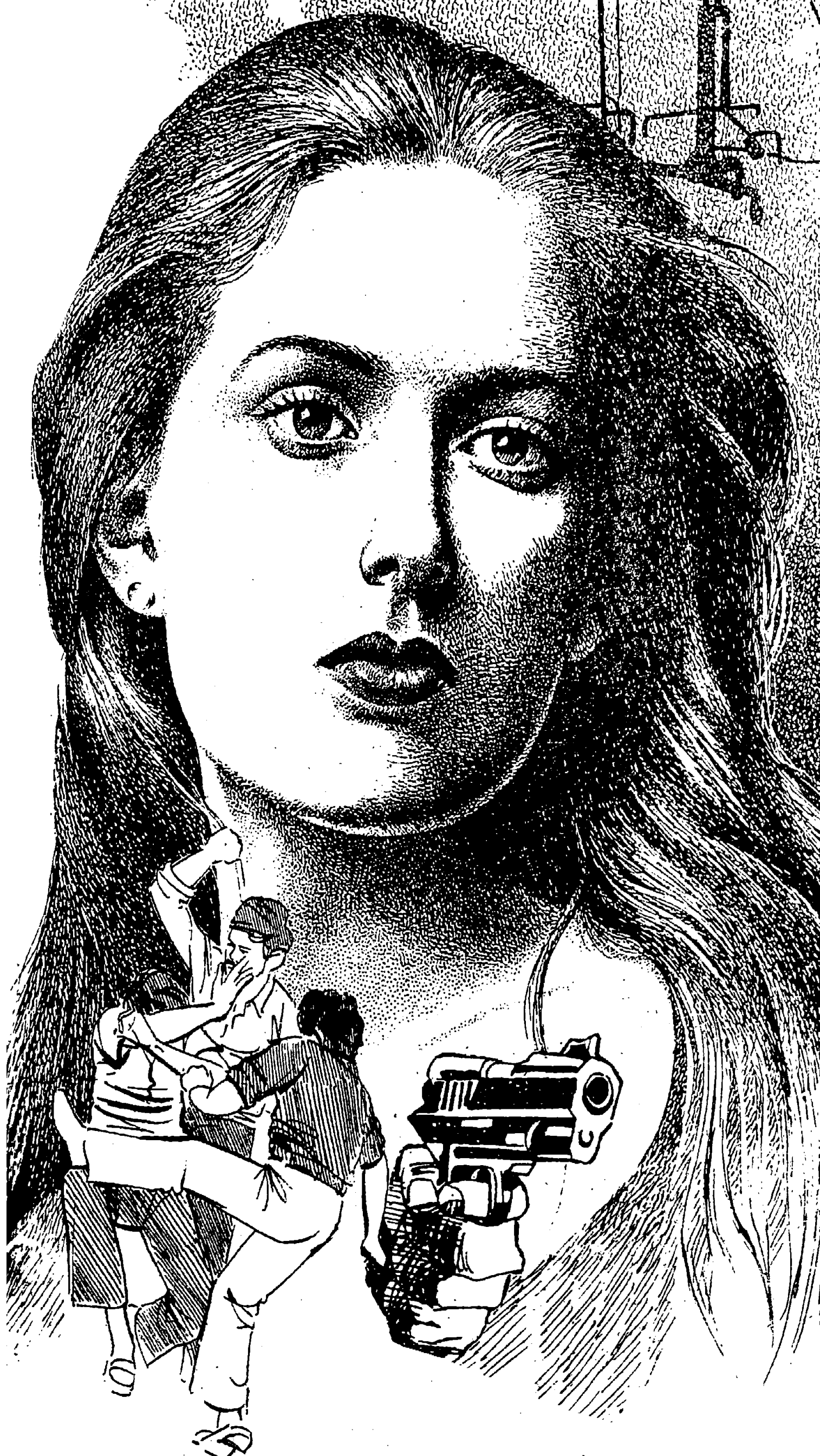
قسط نمبر: 38

سہ ماہی
نور

سماء قادری

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تند و تیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابل شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پُر عزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جا رہے تھے... اس کی زندگی جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قراریوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تاری عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ وارداتِ قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہو سکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تحیر انگیز داستان



معاذ ایک ذہین لیکن سٹون مزاج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے ہا قاعدہ ایک ادارہ جوائن کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور انھیں عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ انسٹی ٹیوٹ سے واپس آ رہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو سڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی نڈر فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشری نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بشری ماس کمیونی کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم وغیرہ لکھتی ہے۔ اس دوران جگہ بھی وہ ایک زیر تعمیر رہائشی منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی آئی تھی۔ معاذ بشری کو بہ حفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کر دیتا ہے لیکن جن ریکس زادوں سے اس نے ان کا شکار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ایک دن جنگل کی اسیر کے دوران وہ فوٹو گرافی کے شوق میں سب سے الگ تھگ ہو جانے والے معاذ کو بے خبری میں گھیر کر بری طرح زد و کوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دے دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس نہ آنے پر انتظامیہ کے افرانہ پولیس اور انسپکٹوریٹ کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جوگی کی جھوپڑی میں پاتا ہے۔ جوگی اپنی خاص جزی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ معاذ کا موبائل جنگل میں ہی کہیں گر جاتا ہے اور جوگی کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا جس سے باہر کی دنیا سے رابطہ کیا جاسکے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے، جوگی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نواز کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے پراسرار علم سکھانے کی ہامی بھر لیتا ہے اور معاذ واقعی اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ادھر جائے وقوعہ سے ملنے والے معاذ کے کیمچے سے جب تصویریں نکلائی جاتی ہیں تو ایک ایسی تصویر بشری کی نظر میں آ جاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانک رہا نظر آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کاہران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پردیگٹ کے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشری تحقیق کر رہی تھی۔ بشری کے اپنے والد جرنلسٹ ہوتے ہیں اور حق گوئی ان کے خون میں شامل تھی۔ اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشری کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ صدمے سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باڈل نامی شخص کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشری انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دنوں میں ہی معاذ واقعی ایسی کاررواہ کرتا ہے تاہم ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا عرفان اللہ اور یزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو وقاص نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باڈل اچانک بشری کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر دیتا ہے۔ معاذ کو واپس لانے کے لیے اوجھے جھنگلڈے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اسے واپس آنے کا پیغام دیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کر کے اسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات لی جاتی ہیں، نہ بتانے پر اس کے بھائی کا ایک گردہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشری بھی انتقام کی آگ میں جلتی ہوئی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہو جاتی ہے۔ معاذ کے دوست عالم شاہ کے بہنوئی کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ کئی فنون میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے پہنا کر کر کے اس کے دماغ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ فیضو سے حاصل انوکھے علم کی بدولت ان کا معمول نہیں جاتا۔ عالم شاہ اور اس کا نوکر سرمد، باڈل کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ عالم کی بہن محل شاہ کے نو مولود بیٹے کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اغوا کا الزام لطیف سومرو پر آتا ہے۔ عالم شاہ، باڈل کی قید میں موجود ایک دشمن شخص کی مدد سے وہاں سے فرار ہو جاتا ہے۔ ادھر بشری بھی ملوث جاتی ہے۔ وہاں وقاص اسے باربی کے روپ میں پہچان لیتا ہے اور ان دونوں کے درمیان اعتاد کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ وہ سلطان کو مارنا چاہتی ہے تاہم وقاص اسے ایسا کرنے سے روکتا ہے۔ ادھر عالم شاہ، باڈل کی قید سے نکل کر اس کا پیچھا کرتا ہے تاہم وہاں اچانک فائرنگ اور دھماکے ہونے لگتے ہیں۔ وہ وہاں معاذ کو دیکھتا ہے۔ صداقت شاہ، لطیف سومرو کو گھیرنے کے لیے اس کی خفیہ بیوی اور بیٹے کا کھوج لگاتے ہیں اور اپنے کو اغوا کر لیتے ہیں۔ لطیف سومرو مجبور ہو جاتا ہے۔ معاذ کو اس کے گمراہیوں سے ملنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ عالم شاہ کو اس کے والد انڈیا روانہ کیے کا عندیہ دیتے ہیں۔ ادھر معاذ بھی ایک مشن پر سونیا کے ساتھ انڈیا روانہ ہوتا ہے تاہم کچھ لوگ سکھ یا تریوں سے ہماری بس کو یرغمال بنا لیتے ہیں۔ معاذ اور سونیا خانے کے تمام افراد کو لٹکانے لگا دیتے ہیں۔ صداقت شاہ کے انڈیا میں موجود رشتے دار کے ہاں شادی ہوتی ہے۔ عالم شاہ، محل اور سرمد انڈیا روانہ ہو جاتے ہیں۔ امر پورٹ سے گھر روانہ ہوتے ہیں کچھ لٹیرے انہیں لوٹ لیتے ہیں۔ عالم شاہ ایک مشن میں آنا چاہتا ہے تاہم اجالا نامی عالم شاہ کی کزن اس کا راستہ روک لیتی ہے۔ گھر پہنچنے پر پولیس کی ریلہ ہوتی ہے اور وہ عالم شاہ اور سرمد کو لے جاتے ہیں۔ ادھر بشری اور وقاص باڈل کو اسپتال میں مارنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ نفع جاتا ہے۔ معاذ اور سونیا اپنے سہولت کاروں سے مل جاتے ہیں۔ عالم شاہ اور سرمد کو تشدد کا نشانہ بنا کر دیرانے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ واپس اپنے میزبانوں کے ہاں ملتی جاتے ہیں۔ شادی کے دوران انہیں پتا لگتا ہے کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں اجالا اور اس کا

عاشق شامل ہوتے ہیں۔ وہ چھپ کر ان کی باتیں سن رہا ہوتا ہے کہ اسے چھاپ لیا جاتا ہے۔ تاہم وہاں مارا ماری ہوتی ہے اور اجالا کا عاشق مارا جاتا ہے۔ پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ ان کے کزن انہیں اپنے دوسرے خفیہ ہنگامے پر پہنچا دیتے ہیں جہاں کچھ لوگ ان پر حملہ کر دیتے ہیں۔ وہ وہاں سے بھگت نکلتے جاتے ہیں۔ ادھر معاذ کو سونیا اپنے ساتھ نئے مشن پر لے کر جاتی ہے جس میں ایک ریلوے اسٹیشن کو دھماکے سے اڑانا ہوتا ہے۔ معاذ ایسا نہیں چاہتا اس لیے وہ ٹرین کی آمد سے قبل بارودی دھماکا کر دیتا ہے۔ وہ زخمی ہو جاتا ہے اور اسے ہندو سادھو اپنی کنیٹھا میں لے جاتا ہے جہاں اس کی اچھی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ سونیا کے آدمی معاذ کو تلاش کرتے ہیں مگر نام کام ہو جاتے ہیں۔ ادھر عالم شاہ اور سرد خفیہ ذریعے سے بارڈر پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ دھریے جاتے ہیں اور ”را“ کی قید میں پہنچ جاتے ہیں۔ ادھر بشری باذل کو مارنے کی کوشش میں خود نشانہ بن جاتی ہے۔ معاذ سادھو کی مدد سے ایک انڈین ہیروئن کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ وہیں اسے عالم اور سرد کی گرفتاری کا پتا چلتا ہے۔ معاذ ڈاکٹر فردوس سے ملتا ہے اور اسے سبھل کی مدد کرنے کا کہتا ہے۔ عالم اور سرد قید سے فرار کا سوچتے ہیں اور دھریے جاتے ہیں جس کی پاداش میں انہیں مزید تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ علیہ اور وقاص وغیرہ کو لالہ عیسیٰ ملک سے باہر نکال دیتا ہے اور ہر ممکن احتیاط کی ہدایت کرتا ہے لیکن علیہ پاکستان میں ٹوبہ سے رابطہ کرتی ہے جو ان کے لیے مصیبت بن جاتا ہے۔ ٹوبہ پر تیزاب پھینک دیا جاتا ہے۔ وقاص، علیہ اور اس کے گھروالوں کو مار دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس معاذ کو دیوانی شخص سے مدد لینے کا کہتی ہے۔ معاذ اپنے کزن کو پاکستان کال کرتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ اس کے گھروالوں کو مار دیا گیا ہے۔ وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کی ٹھان لیتا ہے۔ ادھر ڈاکٹر فردوس کو اس کے سسرال والے کیل کو بھگانے کی پاداش میں تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ معاذ، عالم اور سرد کی رہائی کے لیے کارروائی کرتا ہے اور انہیں ”را“ کی قید سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن عالم اور سرد کو دیوانے کے آدمی کسی دوسری جگہ پہنچا دیتے ہیں۔ سونیا معاذ کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ ادھر باذل ایک جگہ لالہ عیسیٰ کی موجودگی پر کارروائی کرتا ہے تاہم لالہ خود کو گولی مار کر ختم کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس کا انتقال ہو جاتا ہے۔ دیوانے کی ڈاکٹر فردوس کی میت اٹھنے پر وہاں فائرنگ کر دیتے ہیں۔ پولیس دیوانے کو گھیر لیتی ہے۔ معاذ دیوانے اور اس کے آدمیوں کو نکالنے کے عوض عالم کا پتا معلوم کر لیتا ہے۔ سونیا اور معاذ حیدر آباد نواب بدر الدین کی حویلی پہنچ جاتے ہیں۔ تاہم کالے خان اور رادھا دیوی کو میڈم ایکس کے ہنگامے سے چھڑانے کے لیے انہیں واپس آنا پڑتا ہے، کالے خان کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ نواب صاحب کی حویلی میں عالم اور سرد کی رہائی کے لیے کارروائی کر کے انہیں رہا کر لیتا ہے۔ وہ لوگ نئے ٹھکانے پر پہنچتے ہیں تو وہاں معاذ سے ملنے جا رہی تھی مختص آتا ہے۔ اسے معاذ نے ”را“ کی قید سے نکالا ہوتا ہے۔ جا رہا اور معاذ، سبھل سمیت اسپتال جاتے ہیں اور پہچان لیے جانے پر پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ پولیس سے مقابلے کے بعد وہ ایک بستی میں پناہ کے لیے گھس جاتے ہیں اور دو لوگوں کو یرغمال بنا کر ان کی جھونپڑی میں قیام کرتے ہیں۔ ادھر سونیا عالم وغیرہ سمیت سب کو ٹھکانا بدلنے کا کہہ کر معاذ کی تلاش میں نکلتی ہے اور اسے بستی میں پہنچنے پر معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ معاذ اور جا رہا وغیرہ انوپ نامی شخص کے ساتھ اس کے مالک کے ہنگامے میں قیام کرتے ہیں۔ سونیا بھی معلومات حاصل کرتی ہوئی مذکورہ ہنگامے تک پہنچ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور سرد بھی سونیا کا پیچھا کرتے ہوئے وہیں پہنچ جاتے ہیں۔ ادھر وقاص، علیہ و دیگر لوگ زندہ ہوتے ہیں۔ وقاص حلیہ بدل کر گلو کا باڈی گارڈ بن جاتا ہے۔ وہ معاذ کو تلاش کرنے کے لیے انڈیا روانہ ہوتا ہے۔ وہاں اس کی گل خان سے ملاقات ہوتی ہے اور معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ سونیا، معاذ اور دیگر ساتھیوں سے مل جاتی ہے تاہم وہ جس ہنگامے میں ہوتے ہیں وہ دشمن کا ہوتا ہے۔ دشمن سب کو بے ہوش کر کے کہیں لے جا رہے ہوتے ہیں کہ ان کی گاڑی کو حادثہ پیش آ جاتا ہے۔ ان سب کو چینی بھکشیو طبی امداد دیتے ہیں اور ان سے پوچھ گچھ کی جاتی ہے۔ سبھل کی حالت تشویشناک ہوتی ہے اور اسے وہاں موجود ایک دید دیکھتا ہے۔ ادھر لالہ واپس اپنے لوگوں میں پہنچ کر انکیشن میں آ جاتا ہے اور حامد کو اغوا کر دیتا ہے۔ لالہ میڈم ایکس کے ٹھکانے کی نگرانی کر داتا ہے۔ ادھر سونیا پر تشدد کر کے اس سے معلومات لی جاتی ہیں تاہم وہ اپنے گلے پر خنجر پھیر لیتی ہے۔ باذل، معاذ وغیرہ کے ٹھکانے سے باخبر ہو جاتا ہے۔ ادھر لالہ کے آدمی میڈم ایکس کی نگرانی کے چکر میں مارے جاتے ہیں۔ لالہ اپنے آدمیوں کو انڈیا رگراؤنڈ کر دیتا ہے۔ معاذ وغیرہ جہاں ہوتے ہیں وہاں دشمن حملہ کر دیتا ہے اور کافی مارا ماری ہوتی ہے۔ باذل، معاذ کا پیچھا کرتا ہے اور چینیوں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ معاذ چینیوں کے ساتھ مل کر دشمنوں کے خلاف کارروائی کرتا ہے۔ اس دوران اسے گل خان نظر آتا ہے۔ اسے پہچاننا نہ کیا گیا تھا۔ وہ لالہ نامی عورت کو بھی گرفت میں لے لیتے ہیں اور اسی سے معلومات لیتے ہیں۔ ادھر لالہ عیسیٰ، اعظم کو دشمن کی گرفت سے نکالنے کے لیے کارروائی کر داتا ہے اور موی اور نیلی اعظم کو نکالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ معاذ دشمنوں کے کیمپ پر حملہ کر کے وہاں قبضہ کر لیتا ہے۔ موی اور نیلی کی گاڑی پر حملہ ہوتا ہے تاہم مارا ماری کے بعد وہ صداقت شاہ کے پاس پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ لالہ عیسیٰ صداقت شاہ کو حویلی پر ریڈ کا بتاتا ہے۔ صداقت شاہ اعظم کے محفوظ ٹھکانے کے لیے قربان شاہ کو فون کرتے ہیں۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیں

قربان شاہ سے بات کر کے وہ کسی فکر میں مبتلا مسئلے کا حل سوچ رہے تھے۔ اچانک آنے والوں کو صداقت شاہ نے روکا بھی تھا لیکن وہ نہیں رکے تھے۔ قربان شاہ کا کہنا تھا کہ وہ اس اتنی بڑی خوشخبری کو احتیاط سے اعظم کی دادی یعنی اپنی بیگم کو سنائیں گے اور اپنی حویلی میں اعظم کے استقبال کی تیاری کریں گے۔

”مجھے ڈر ہے کہ حویلی کے لینڈ لائن نمبرز اور میرے موبائل پر نگاہ رکھی جا رہی ہوگی اس لیے احتیاطاً سچل کے نمبر سے آپ کو کال کر رہا ہوں۔“

”سب خیر تو ہے نا؟“ وہ فطری طور پر پریشان ہو گئے۔

”اطلاع ملی ہے کہ ہمارے تختہ جگر کو بازیاب کروانے کے لیے بہانے سے حویلی پر ریڈ کیا جانے والا ہے۔ ہمارے خیر خواہ دوست نے ہمیں مشورہ دیا ہے کہ فی الحال اسے کہیں اور منتقل کر دیا جائے۔“ صداقت شاہ نے مسئلے کی نوعیت سے آگاہ کیا۔

”اسے فوری طور پر ہماری طرف روانہ کر دیں بلکہ میں خود اسے لینے آتا ہوں۔ دیکھتا ہوں کس مائی کے لال میں اتنی ہمت ہے کہ میری جان کو مجھ سے چھین کر لے جاسکے۔“ قربان شاہ مسئلے کی نوعیت سن کر پریشان ہوا ٹھے اور جذباتی لہجے میں بولے۔

”یہ وقت جوش کے بجائے ہوش سے کام لینے کا ہے۔ ہمیں کوئی اچھا حل سوچنا ہوگا۔ پہلے میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ اسے آپ کی طرف روانہ کر دوں لیکن دشمن کے لیے بھی یہ ایک سامنے کی بات ہے اس لیے اب سوچ رہا ہوں کہ اسے آپ کی حویلی کے بجائے کہیں اور بھجوانا ہوگا۔“ صداقت شاہ کا انداز سمجھانے والا تھا۔

”میرے ذہن میں ایک محفوظ جگہ ہے۔ آپ ان لوگوں کو حویلی سے روانہ کریں۔ میرے گارڈز راستے میں انہیں مل جائیں گے۔“ انہوں نے بات کو سمجھا اور احتیاطاً جگہ کا نام نہیں لیا۔

”تیاری کی جا رہی ہے۔ بس تھوڑی دیر میں ہی روانگی عمل میں آجائے گی۔ ان لوگوں کے روانہ ہوتے ہی میں آپ کو اطلاع دے دوں گا۔“ انہوں نے رابطہ منقطع کیا۔ اسی وقت سچل کے ساتھ مومی وہاں پہنچ گیا۔ وہ پوری طرح تیار دکھائی دے رہا تھا۔

”لالہ نے مجھے کال کر کے سب بتا دیا ہے۔ آپ بس مجھے حکم دیں۔ میں ہر حکم پر عمل کرنے کے لیے پوری طرح تیار ہوں۔“ صداقت شاہ کے کچھ بھی کہنے سے قبل وہ ان سے بولا تو وہ محض سر ہلا کر رہ گئے۔ وہ ایک لمبے عرصے سے مشکلات کا شکار تھے اور اعظم کی شکل میں جو خوشی زندگی میں آئی تھی، اس کے یوں جھلک دکھا کر غائب ہو جانے پر اعصابی کشیدگی کا شکار ہو رہے تھے لیکن کوشش کر رہے تھے کہ ان کی یہ کیفیت کسی پر ظاہر نہ ہو سکے۔ اب بھی بہت

حوصلے سے بولے۔

”سچل گاڑیاں اور گارڈز تیار کروانے جا رہا ہے۔ تم چاہو تو اس کے ساتھ رہو، چاہو تو آرام سے بیٹھ کر انتظار کرو۔ ہم ذرا تھوڑی دیر کے لیے زنان خانے میں جا رہے ہیں۔“

”میں سچل کے ساتھ رہوں گا۔“

”جیسی تمہاری مرضی۔“ وہ غائب دماغی سے مومی کو جواب دے کر خود زنان خانے کی طرف بڑھ گئے۔ اعظم اور نیلی کے لیے مختص کیے گئے کمرے کے باہر ہی مول انہیں مل گئی۔

”سلام بابا سائیں!“ اس کا چہرہ اتر ا ہوا تھا۔

”جیتی رہو بیٹا! روانگی کی ساری تیاری ہو گئی؟“

انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے نرمی سے پوچھا۔

”جی، نیلی خود تیار ہے اور اعظم کی ضرورت کی چیزیں دیکھ رہی ہے۔ میں نے ملازماؤں کو راستے کے لیے چائے، کافی اور ہلکی پھلکی کھانے کی چیزیں تیار کرنے پر لگا دیا ہے۔ آپ بتائیں کہ کتنی دیر میں روانگی ہے؟“ مول کی اندرونی کیفیت اس کے لہجے سے بھی جھلک رہی تھی۔

”حوصلے سے بیٹا! صبح سمجھیں اپنی اماں سائیں کو بھی سنبھالنا اور سمجھانا ہے۔“ صداقت شاہ نے اسے سمجھایا لیکن رد عمل ان کی نصیحت کے برعکس ظاہر ہوا اور وہ یکدم ان کے سینے سے لگ کر رونے لگی۔

”وہ کیوں جا رہا ہے بابا سائیں؟ ابھی تو ہم نے اسے دل بھر کر دیکھا بھی نہیں۔“

”اس کی حفاظت کے لیے اسے یہاں سے بھیجنا ضروری ہے بیٹا! پر آپ فکر نہ کرو۔ اللہ سائیں کے حکم سے وہ جلد ایک بار پھر ہمارے درمیان ہوگا۔ تم نے اس وقت تک خود بھی صبر سے رہنا ہے اور اپنی اماں سائیں کا حوصلہ بھی بڑھاتے رہنا ہے۔“ وہ بوڑھے اور کمزور ہو چکے تھے اور اس وقت انہیں اپنا گبرو جوان بیٹا بڑی شدت سے یاد آ رہا تھا۔ وہ یہاں ہوتا تو اس وقت ان کے شانے سے شانہ ملا کر کھڑا ہوتا جیسے کہ سچل اور معظم شاہ کے ڈاکوؤں کے ہاتھوں اغوا ہونے کے بعد کھڑا ہوا تھا لیکن اب وہ نہیں تھا اور خاندان کے سربراہ کی حیثیت سے انہیں ہی سارے معاملات دیکھنا تھے۔

”اعظم کو سامنے دیکھ کر ادی کی جدائی کا غم تھوڑا ہلکا محسوس ہو رہا تھا لیکن اللہ سائیں نے یہ خوشی بھی اتنی جلدی ہم سے چھین لی۔“ مول کو صبر نہیں آ رہا تھا۔

”ایسی باتیں نہ کرو جن سے شکوہ جھلکے۔ شکوہ ناشکری کی ایک شکل ہے اور ہم نہیں چاہتے کہ جس رب نے اتنا

بانہوں میں بھر کر اسے بے تحاشا پیار کرنے لگی۔
 ”بس کر دو بیٹا! دیکھو بچے کی نیند خراب ہو رہی ہے۔
 جاگ گیا تو راستے میں ان لوگوں کو پریشان کرے گا۔“
 صداقت شاہ نے اسے سمجھایا۔

”سوچا تھا اب تو یہ یہیں ہمارے پاس رہے گا اور یہ
 سوچ کر اسے ٹھیک سے پیار بھی نہیں کر سکتی تھی۔ مجھے کیا
 معلوم تھا کہ یہ آکر اتنی جلدی واپس بھی چلا جائے گا۔“ وہ
 ایک بار پھر اداس ہونے لگی تھی۔

”ان شاء اللہ یہ جلد دوبارہ آپ لوگوں کے پاس
 آئے گا اور یہ جدائی عارضی ثابت ہوگی۔“ نیلی نے اسے
 تسلی دی۔ آخر کار ان لوگوں کی وہاں سے روانگی عمل میں
 آہی گئی۔ سچل کو صداقت شاہ نے ان کی والی گاڑی میں
 ڈرائیور کے ساتھ اگلی نشست پر بٹھوادیا تھا جبکہ گارڈز
 سے بھری دوسری گاڑی ساتھ ساتھ تھی۔ سچل پوری طرح
 چوکنا تھا اور اس کی نظریں اندھیرے میں بھی اطراف کا
 جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔ کچھ ہی کیفیت نیلی کے
 ساتھ پچھلی نشست پر بیٹھے مومی کی تھی۔ اندیشوں اور
 خدشات کے برعکس نہ تو کوئی ان کے تعاقب میں آیا اور نہ
 ہی راستے میں کوئی دوسری رکاوٹ آئی اور وہ گاؤں کی
 حدود سے باہر نکلتے چلے گئے۔ سچل کا قربان شاہ کے
 بندے سے مسلسل رابطہ تھا اور وہ اسی کی راہنمائی میں
 آگے بڑھ رہے تھے۔ جیسے جیسے فاصلہ طے ہو رہا تھا،
 خدشات کم ہوتے جا رہے تھے اور تنے ہوئے اعصاب
 ڈھیلے پڑنے لگے تھے۔ منزل کے بے حد قریب جبکہ وہ
 سب کافی مطمئن ہو چلے تھے اور تھرماس سے نکلی کافی کے
 ساتھ سینڈویچز کا لطف لیا جا رہا تھا، یکدم زوردار دھماکے کی
 کئی آوازوں کے ساتھ گاڑی بری طرح لہرائی۔

”نیچے..... نیچے ہو جاؤ نیلی!“ مومی زور سے چیخا
 اور ہاتھ میں پکڑا کافی کا کپ باہر اچھال کر اپنی گن
 سنجالی۔ نیلی بری طرح دھڑکتے دل کے ساتھ اعظم کو
 سینے سے لگائے نشست سے نیچے کھسک گئی۔ گولیوں کی
 تڑتڑاہٹ کے ساتھ گھبرا کر رونا شروع کر دینے والے
 اعظم کی آواز ایک بار پھر اس کے اعصاب کی مضبوطی کا
 امتحان لے رہی تھی۔

☆☆☆

ایشی کرپشن والے ساری حویلی میں دھماکے
 پھر رہے تھے۔ ان کے انداز کی درستی اور رعیت صداقت
 شاہ کا خون کھول رہی تھی لیکن اس کے باوجود وہ نہایت ضبط

نوازا ہے، اس کی ناشکری کریں۔ جو کچھ ہمارے ساتھ بیت
 رہا ہے، ہم نے اسے اپنے رب کی طرف سے آزمائش سمجھ کر
 قبول کر لیا ہے۔ تمہارے لیے بھی بہتر ہے کہ رب کو
 ناراض کرنے والے کلمات زبان سے نہ نکالو۔“ اس بار ان
 کے لہجے میں ہلکی سی سختی تھی جسے محسوس کر کے موہل نے خود کو
 سنبھال لیا اور آہستہ سے بولی۔

”معافی چاہتی ہوں، بابا سائیں!“
 ”آؤ، اندر چل کر نیلوفر اور اعظم سے الوداعی
 ملاقات کرتے ہیں۔“ ان کا لہجہ ایک بار پھر نرم ہو گیا۔

دونوں باپ بیٹی دستک دے کر اندر داخل ہوئے۔
 نیلی پوری طرح تیار تھی اور اعظم کو بستر میں لیٹ رہی تھی۔
 درمیان میں کچھ دیر جاگ کر سو جانے والا اعظم اس وقت
 گہری نیند میں تھا جبکہ اس کے سامان سے بھرا بیگ بھی
 بالکل تیار سامنے ہی بند پڑا تھا۔ بیگ کو دیکھ کر صداقت شاہ
 کے دل کو کچھ ہوا لیکن انہوں نے خود کو سنبھال لیا اور مسکرا کر
 نیلی سے مخاطب ہوئے۔

”ہمیں افسوس ہے کہ ہم آپ کی خاطر خواہ تواضع نہ
 کر سکے اور آپ کو یوں اچانک حویلی چھوڑ کر جانا پڑ رہا ہے۔“
 ”کوئی بات نہیں شاہ صاحب! ہم جلد اعظم سمیت
 دوبارہ یہاں لوٹ کر ضرور آئیں گے۔ اس وقت آپ ساری
 کسر پوری کر لیجئے گا۔“ نیلی حساس اور سمجھ دار لڑکی تھی اور اس
 وقت ان لوگوں کی کیفیت کو اچھی طرح سمجھ رہی تھی اس لیے
 ہمت سے مسکرائی اور حوصلہ بڑھانے والی بات کی۔

”اللہ سائیں وہ وقت لائے تو یقیناً ہماری طرف سے
 کوئی کسر نہیں چھوڑی جائے گی۔“ صداقت شاہ نے اسے
 جواب دیا اور پھر موبائل فون کی تھنٹی بجنے پر اس کی طرف
 متوجہ ہو گئے۔ کال سچل کی طرف سے تھی۔

”سب تیار ہے سائیں! آپ جب حکم دیں، روانگی
 ہو جائے گی۔“ اس نے انہیں اطلاع دی۔

”ملازمائیں سامان لے کر آرہی ہیں، پہلے وہ رکھواؤ
 پھر باقی لوگ بھی آتے ہیں۔“ صداقت شاہ نے اسے
 جواب دے کر موہل کی طرف دیکھا۔ وہ ان کا اشارہ سمجھ کر
 جلدی سے باہر نکلی۔ کچھ دیر میں ملازمائیں خور و نوش کی اشیاء
 سمیت سارا سامان باہر منتقل کر چکی تھیں۔

”بس، اب زیادہ دیر نہ کرو۔ وقت تیزی سے
 گزر رہا ہے۔“ انہوں نے نیلی کو مخاطب کیا تو اس نے اعظم
 کو بستر سے اٹھانے کے لیے قدم آگے بڑھائے لیکن موہل
 نے اس سے زیادہ تیزی دکھائی اور سوئے ہوئے اعظم کو

سے کام لے رہے تھے۔

”سب جانتے ہیں کہ صداقت شاہ نے کبھی ایک پیسے کی کرپشن نہیں کی اور جب بھی وزارت ملی، اپنے علاقے کے لوگوں کی بہتری کے لیے کام کرنے کی کوشش کی لیکن آج جبکہ میں حکومت میں نہیں ہوں، تم مجھ پر جھوٹے الزامات لگا کر یہاں آپہنچے ہو۔“ ضبط کرتے کرتے بھی انہوں نے چھاپا مارنے والی ٹیم کے انچارج سے شکوہ کر ہی دیا۔

”ہم صرف اپنی ڈیوٹی کر رہے ہیں۔“ اس نے روکھے لہجے میں جواب دیا۔

”یہ ڈیوٹی کرنا تمہیں اس وقت یاد نہیں آیا جب لطیف سومرو نے اندھیر بجائی ہوئی تھی۔ ہر طرح کا دو نمبر کام کر رہا تھا وہ شخص لیکن تمہیں اس کے متعلق کوئی خبر نہیں ملی۔“ انہوں نے طنز کیا۔

”جی ہاں، نہیں ملی۔ ملی ہوتی تو ہم اس کے خلاف بھی کارروائی کرتے۔“

”مل بانٹ کر کھانے والے کیا خاک کارروائی کریں گے۔“ انہیں اس کے اتنے صاف جھوٹ نے طیش دلایا اور بہ آواز بلند بڑبڑائے۔

”آپ ہماری توہین کر رہے ہیں شاہ صاحب!“ اس کا چہرہ سرخ ہوا۔

”اور تم لوگوں نے تو اس وقت ہماری حویلی پر چھاپا مار کر ہماری بہت عزت افزائی کی ہے؟“ انہوں نے دوبارہ جواب دیا۔

”ہم آپ کی عزت کے خیال سے ہی اس وقت آئے ہیں۔ اگر دن کی روشنی میں آئے ہوتے تو دور دور تک آپ کی بدنامی ہوتی۔“ وہ ان کے ساتھ گفتگو کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے آدمیوں کی نگرانی بھی کر رہا تھا۔ وہ ہر چیز کے ساتھ اکھاڑ پھاڑ کر رہے تھے اور ذرا سی دیر میں انہوں نے سبکی سبکی حویلی کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ صداقت شاہ ان کے اشارے کنائے سب دیکھ رہے تھے۔ یقیناً وہ اعظم کو حویلی میں نہ پا کر مایوس ہو رہے تھے اور اسی مایوسی میں بے دھڑک زنان خانے میں بھی جا گھسے تھے۔

”اگر آپ کو زنان خانے کی تلاش لینا تھی تو لیڈی پولیس کو ساتھ لانا چاہیے تھا۔“ صداقت شاہ نے احتجاج کیا۔

”آئندہ آئے تو خیال رکھیں گے۔“ افسر کا لہجہ تمسخرانہ تھا۔

”ہمارے ہاتھ صاف ہیں اس لیے ہم نے بادل ناخواستہ ہی سہی، تمہارا اطمینان کرنے کی اجازت

دے دی ہے۔ آئندہ اس حویلی کا رخ بھی کیا تو ہمارے گارڈز تمہارے قدم روکنے کو کافی ہوں گے۔“ انہوں نے اسے دھمکی دی لیکن وہ انہیں جواب دینے کے بجائے اپنے موبائل کی بجتی کھنٹی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”ٹھیک ہے۔ جیسا آپ کا حکم۔“ خاموشی سے دوسری طرف کی بات سننے کے بعد اس نے یہ مختصر جواب دیا اور اپنے عملے کے دو آدمیوں کے قریب جا کر انہیں سرگوشی میں ہدایت دینے لگا۔ تلاشی لیتے لیتے کچھ دیر میں وہ اس کمرے میں پہنچ گئے جس میں اعظم اور نبلی کو ٹھہرایا گیا تھا۔

”آپ کے ہاں تو کوئی چھوٹا بچہ نہیں ہے شاہ صاحب! پھر یہ بچے کے کپڑے کہاں سے آئے؟“ عجلت میں اعظم کا ایک جوڑا وہیں رہ گیا تھا جسے چکیوں میں اٹھائے وہ صداقت شاہ سے پوچھ رہا تھا۔

”کیا چھوٹے بچے کے کپڑے کرپشن کے مال میں شامل ہیں؟“ صداقت شاہ، اعظم کی موجودگی کا ثبوت اس کے ہاتھوں میں دیکھ کر تھوڑے جزبہ تو ہوئے لیکن اس پر اپنی کمزوری ظاہر نہ ہونے دی۔

”میں نے یونہی ایک سوال کیا تھا۔ اگر آپ جواب نہیں دینا چاہتے تو آپ کی مرضی۔“ اس نے بے نیازی کے اظہار کے لیے شانے اچکائے۔

”یہ ہمارے نواسے کے کپڑے ہیں جو اس کی غیر موجودگی کے باعث ایک ملازمہ کے بچے کو دے دیے گئے ہیں۔ آپ تو جانتے ہی ہوں گے ہمارے نواسے کے متعلق؟“ انہوں نے اسے جواب دیتے دیتے اچانک ایک سوال کیا۔

”جی..... جی نہیں۔“ وہ اقرار کرتے کرتے انکار کر گیا۔

”حیرت ہے۔ ہمارے ساتھ جیتی کو تو پرنٹ میڈیا کے علاوہ الیکٹرانک میڈیا نے بھی خوب کوریج دی ہے پھر آپ کیسے بے خبر رہ گئے ہمارے ساتھ جیتی سے۔ سنا ہے اینٹی کرپشن والے جب کسی کے گھر کا رخ کرتے ہیں تو سب کچھ اگلا پچھلا معلوم کر کے آتے ہیں۔ آپ لگتا ہے یہاں کچھ عجلت میں آ گئے ہیں۔“ انہوں نے اس پر طنز کیا۔

”شاہ صاحب! میرے خیال میں بہتر ہوگا کہ آپ ایک جگہ سکون سے بیٹھ جائیں اور ہمیں ہمارا کام کرنے دیں۔“ وہ جھنجھلا یا۔

”ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس وقت آپ ہماری حویلی کے زنان خانے میں کھڑے ہیں جہاں خواتین کے علاوہ

الزام تو مختلف ترقیاتی پروژیکٹس میں ہیرا پھیری اور گھوسٹ ملازمین کی بھرتی کا ہے۔“ اپنی کرپشن آفیسر نے گویا ان کی حالت سے حلقہ اٹھایا۔

”سب جھوٹ کا پلندہ اور بکواس۔“

”یہ تو آپ عدالت میں ثابت کیجیے گا۔ فی الحال تو ہم آپ کو اریسٹ کر کے لے جا رہے ہیں۔“ اس کے الفاظ پر سکینہ شاہ اور مول کے ہونٹوں سے دہی دہی چیخیں نکل نکلیں۔ صداقت شاہ نے ہاتھ اٹھا کر انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا تو انہوں نے اپنی چیخوں کو حلق میں ہی گھونٹ لیا۔

”تو پھر چلیں شاہ صاحب؟“ آفیسر نے دریافت کیا۔

”ضرور، لیکن یاد رکھنا کہ تم بہت زیادہ دن ہمیں

روک نہیں پاؤ گے۔“

”یہ فیصلہ کرنے والا میں کون ہوتا ہوں؟ مجھے گرفتاری

کا حکم ملا، گرفتار کر لیا۔ چھوڑنے کا ملے گا تو چھوڑ دوں گا۔“

اس نے بے نیازی سے کندھے اچکائے۔

”ہم جانتے ہیں کہ تمہاری حیثیت ڈگڈگی پر تاجے

والے بندر سے زیادہ نہیں۔“ انہوں نے اسے جواب دیا

اور از خود باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔

”اتنی جلدی کیا ہے شاہ صاحب! ابھی تو کچھ اور

مہمان بھی آنے ہیں۔“ آفیسر نے انہیں ٹوکا تو وہ الجھ کر

اسے دیکھنے لگے لیکن یہ الجھن اس وقت فوراً ہی حل ہو گئی

جب انہوں نے کمرے اٹھائے میڈیا کے افراد کو اندر

داخل ہوتے دیکھا۔

”آپ دونوں دوسرے کمرے میں چلی جائیں۔“

وہاں جو کچھ ہو رہا تھا، کوئی انوکھی بات نہیں تھی لیکن وہ زندگی

میں پہلی بار اس صورت حال سے گزر رہے تھے اس لیے

انہیں بے حد سکی محسوس ہو رہی تھی۔ خصوصاً ان لوگوں کی

زبان خانے میں مداخلت تو انہیں بہت ہی زیادہ محسوس ہوئی

تھی۔ اب بھی میڈیا والوں کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر انہوں

نے فوراً سکینہ شاہ اور مول کو وہاں سے جانے کا اشارہ کیا۔

وہ دونوں جو اپنے چہرے پہلے ہی چادر کے پلو سے ڈھانپ

چکی تھیں، ان کی طرف سے حکم ملتے ہی تیزی سے باہر نکل

گئیں۔ میڈیا والے اپنا کام کرنے لگے۔ چند ایک نے ان

سے بھی بات کرنے کی کوشش کی لیکن وہ کچھ بولنے کے موڈ

میں نہیں تھے۔ کچھ دیر بعد سارا تماشا سنا تو سرکاری

گاڑیوں میں ان کی وہاں سے روانگی عمل میں آئی۔

”آپ کے لیے ایک کال ہے شاہ صاحب!“ ابھی

وہ لوگ گاڑی کی حدود سے نہیں لکھے تھے کہ انہیں موبائل

ہمارے پشتی ملازمین بھی بنا اجازت قدم نہیں رکھتے۔ آپ کے اس جھسے کی تلاشی لینے تک ہم آپ کے ساتھ ہی رہیں گے۔“ انہوں نے دو ٹوک جواب دیا جس پر کوئی رد عمل ظاہر کے بغیر اس نے سکینہ شاہ کی خواب گاہ کا رخ کیا۔ سکینہ شاہ مسلسل چہل پہل اور آوازوں کی وجہ سے جاگ گئی تھیں اور تکیوں کے سہارے بیٹھی نا سمجھی سے سب کچھ دیکھ رہی تھیں لیکن غائب دماغی کی اس کیفیت میں بھی انہوں نے اپنے پردے کا خیال رکھا تھا۔ کچھ ہی حال مول کا بھی تھا۔ وہ بھی خود کو بڑی سی چادر میں چھپائے نظریں پچی کیے ماں کے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔

”اس لا کر کو کھولیں۔“

”اس میں ہمارے خاندانی زیورات اور تھوڑی سی رقم کے سوا کچھ نہیں ہے۔“

”میں نے کہا، اسے کھولیں۔“ وہ خواجواہ ان کے ساتھ تلخ ہوا۔ سکینہ شاہ اور مول نے سرایمہ نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

”گھبراؤ مت۔“ انہوں نے دونوں کو تسلی دی اور لا کر کھول دیا۔ لا کر کھولتے ہی تین چار افراد نے اس کے گرد گھیرا ڈال لیا۔

”یہ سب کیا ہے سائیں! کون ہیں یہ لوگ جو آپ کے ہوتے میرے کمرے تک آ رہے ہیں۔ کیا ابھی کوئی اور بھی تکلیف ہے جو مجھے پہنچنے سے روک رہی ہے؟“

اس سارے منظر کو کسی ڈراؤنے خواب کی طرح دیکھتی سکینہ شاہ نے وہائی دی تو وہ ان کی طرف متوجہ ہو گئے اور قریب بیٹھ کر انہیں تسلی دینے لگے۔ تسلی نشینی کے چند بولوں سے وہ تھوڑی سی سنبھلی ہوئی تھیں کہ مول نے انہیں پکارا۔

”بابا سائیں!.....!“ اس کے لہجے کے واضح خوف نے انہیں چونک کر اس کی طرف دیکھنے پر مجبور کیا لیکن اس کی نظریں ان کے بجائے کہیں اور دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”یہ..... یہ.....“ ان کی نظریں سامنے میز پر ڈھیر ہوتی غیر ملکی کرنسی اور سونے کے بسکٹس پر جمی تھیں۔ ان جیسی حیثیت کے شخص کے لیے اتنی مالیت کی رقم یا سونے کی کوئی حیثیت نہیں تھی لیکن وہ حیران اس لیے تھے کہ یہ چیزیں ان کے لا کر میں موجود ہی نہیں تھیں۔

”یہ کیا بے ہودگی ہے؟“ ان کی حیرت غصے میں ڈھلی۔

”یہ تو معمولی چیزیں ہیں شاہ صاحب! آپ پر اصل

فون تھمایا گیا۔ خود ان کا فون تو وہ لوگ پہلے مرحلے میں ہی اپنے قبضے میں لے چکے تھے۔

”ہیلو!“ انہوں نے موبائل تھام کر فقط اتنا ہی کہا۔ انہیں پوری طرح اندازہ نہیں تھا کہ دوسری طرف کون ہوگا لیکن یہ طے تھا کہ جو بھی ہوا، مخالفین میں ہی سے ہوگا۔

”ہماری پیٹھ میں چھرا گھونپنے کا انجام دیکھ لیا صداقت شاہ! تم سے کہا تھا کہ ساتھ مل کر چلو۔ تمہارے سارے مسئلے بھی ایک ایک کر کے حل ہو جائیں گے اور تم عیش بھی کرو گے لیکن تم نے اس دو ٹکے کے غنڈے کو ہم پر ترجیح دی۔“ دوسری طرف سے آتی عرفان اللہ کی آواز پہچاننے میں انہیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

”مم..... میں..... میں سمجھا نہیں کہ آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟“ اس کے لہجے اور الفاظ پر ان کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔

”جو کچھ سمجھنے کو رہ گیا ہے، وہ نواسے کو ہمیشہ کے لیے کھودینے اور جیل میں چکی پینے کے بعد اچھی طرح سمجھ آ جائے گا۔“ وہ نفرت سے پھنکارا۔

”میری بات سنو عرفان اللہ! تمہیں یقیناً کوئی غلط فہمی.....“ ان کے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے اور عرفان اللہ نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ باقی ساری صورت حال اپنی جگہ تھی لیکن نواسے والی دھمکی نے انہیں لرزاکر رکھ دیا تھا۔ عرفان اللہ کے الفاظ نے انہیں اعظم کی طرف سے اندیشوں میں مبتلا کر دیا تھا اور وہ یوں محسوس کر رہے تھے جیسے دشمنوں نے اس تک رسائی حاصل کر لی ہو۔ شدید ذہنی دباؤ نے ان کے پہلے ہی سے کمزور دل پر یلغار کی اور سینے میں بائیں جانب درد کی ایک لہری اٹھی۔ ان کے ہاتھ سے موبائل فون چھوٹ گیا اور وہ اپنے عرق آلود وجود کے ساتھ ایک جانب جھکتے چلے گئے۔

☆☆☆

اعظم کو بانہوں میں لیے دیکھی بیٹھی نیلی کے لب مسلسل قرآنی دعاؤں کا ورد کر رہے تھے۔ مسلسل سے برستی گولیوں کی آوازیں اعصاب شکن تھیں تو اعظم کا مسلسل رونا دل کے لیے باعث تکلیف۔ وہ اندازہ لگا سکتی تھی کہ جو پہلا دھماکا سنائی دیا تھا وہ گاڑی کا ٹائر پھٹنے کے سبب ہوا تھا لیکن یہ ٹائر ان کے بجائے شاید گارڈز والی گاڑی کا پھٹا تھا کیونکہ ان کی گاڑی تو کچے راستے پر اچھلتی کودتی مسلسل آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ دھماکے کی آواز پر ڈرائیور ایک پل کے لیے ہٹنا گیا تھا اس لیے ان کی گاڑی ذرا دیر کو لہرائی تھی لیکن پھر

ڈرائیور نے اس پر قابو پالیا تھا اور اب پوری مہارت سے گاڑی کو آگے بڑھائے لیے جا رہا تھا۔ اس کی برابر والی نشست پر بیٹھا سچل موبائل پر مصروف تھا۔ اس کے جوالفاظ اس شور میں اس کے کانوں میں پڑ رہے تھے، ان سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ قربان شاہ سے بات کر رہا ہے۔

”میں دیکھ رہا ہوں سائیں! پیچھے کوئی نہیں آ رہا۔ لگتا ہے گارڈز کے ساتھ الجھ گئے ہیں۔“ اس نے یہاں کی رپورٹ دی پھر ان کے پوچھنے پر اپنی پوزیشن بتانے لگا کہ حملہ کس مقام پر ہوا ہے۔ گاڑی جوں جوں آگے بڑھتی جا رہی تھی، فائرنگ کا شور بھی دھیمّا پڑتا جا رہا تھا لیکن یہ طے تھا کہ پیچھے ابھی ہنگامہ جاری ہے۔

”ہاں، تو بس پھر آپ کے بندے بالکل قریب ہی ہیں۔ آپ ان کو ہمارے ساتھیوں کی مدد کرنے کا حکم دیں۔ میں منزل پر پہنچ کر آپ کو خبر کرتا ہوں۔“ سچل کی یکطرفہ گفتگو اب واضح سنائی دے رہی تھی۔ اعظم بھی کسی نہ کسی طرح رونا بند کر چکا تھا۔

”کیا میں واپس سیٹ پر آ جاؤں؟“ نیلی نے گن ہاتھ میں دبوچے چوکس نظروں سے ارد گرد کا جائزہ لیتے ہوئے سے پوچھا۔

”میرے خیال میں اب تھوڑا سا ہی فاصلہ رہ گیا ہے، تو بہتر ہے احتیاطاً وہیں بیٹھی رہو۔“ موی نے اسے جواب دیا اور پھر سچل سے تائید چاہی۔

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا دوست؟“

”ہم پہنچ گئے ہیں جی۔ وہ دیکھیں سائیں سائیں انور کے فارم ہاؤس کا گیٹ نظر آ رہا ہے۔“ سچل نے اشارہ کیا تو موی نے اس طرف نظر ڈالی۔ بڑے سے گیٹ کے دونوں ستونوں پر نصب لمپس کی روشنی میں وہ آس پاس متحرک انسانوں کو بھی صاف دیکھ سکتا تھا۔ وہ بھی گاڑی کی آواز اور ہیڈ لائٹس کی وجہ سے ان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ ڈرائیور نے گاڑی ان کے قریب لے جا کر روکی تو انہوں نے تیزی سے گاڑی کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ سچل کو دیکھ کر اور اس سے چند باتیں کر کے وہ مطمئن ہو گئے تو بڑا سا پر شکوہ گیٹ ان کی گاڑی کے لیے کھول دیا گیا۔ گاڑی گیٹ سے اندر ہوئی تو نیلی بھی سکون کا سانس لیتے ہوئے اعظم سمیت نشست پر آ بیٹھی۔

”آپ لوگوں کے لیے کمرے کھول دیے ہیں سائیں! خاطر خدمت کا بھی پورا انتظام ہے۔ بس آپ حکم کریں، ہم حاضر ہیں۔“ اندر احاطے میں گاڑی رکھتے ہی

رک گیا تھا۔

ایک شخص جو شلوار قمیص اور ویسٹ کوٹ میں ملبوس تھا، دوڑا آیا اور عاجزی سے ان سے مخاطب ہوا۔

”سب سے پہلے سیکورٹی پر توجہ دو اور اپنے بندوں سے کہو کہ بالکل چوکے رہیں۔ چڑیا کا بچہ بھی ان کی نظر میں آنے بغیر اندر نہیں آنا چاہیے۔“ جواب سچل نے دیا۔

”بے فکر ہو ادا۔ آپ سائیں انور سولنگی کے مہمان ہیں اور ہم اپنے سائیں کی آن کے لیے اپنی جان دے دیں گے پر آپ پر آج نہیں آنے دیں گے۔“ اس شخص نے انہیں اطمینان دلایا اور پھر اپنی راہنمائی میں اندر لے گیا۔

”آپ لوگ تازہ دم ہو جاؤ پھر میں ناشتا لگواتا ہوں۔“ کمروں تک راہنمائی کر کے اس نے ان لوگوں سے کہا تو وہ سر ہلا کر رہ گئے۔ کہنے کو مول نے کھانے پینے کا بہت سا سامان گاڑی میں رکھوایا تھا کہ سفر طویل ہو تو ان کے کام آسکے لیکن انہیں تو ہاتھ میں پکڑی کافی بھی ختم کرنے کا موقع نہیں ملا تھا اور دشمن کی طرف سے حملہ ہو گیا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ سب پھر ڈائننگ ٹیبل پر جمع تھے جہاں ان کے لیے پُر تکلف ناشتا چن دیا گیا تھا۔ سچل کے جھجکنے کے باوجود انہوں نے اسے اپنے ساتھ ہی رکھا تھا جبکہ ڈرائیور از خود اندر نہیں آیا تھا اور باہر ملازمین کے ساتھ

”سائیں قربان شاہ اور ان کے ساتھی نہیں پہنچے ابھی تک؟“ ناشتا شروع کرنے سے قبل سچل نے دریافت کیا۔

”سائیں کی کال آئی تھی۔ انہوں نے کہا ہے کہ وہ تھانے پولیس کے معاملات نمٹا کر فارغ ہو جائیں تو یہاں آتے ہیں۔ تب تک آپ ناشتا کر لیں اور چاہیں تو کچھ دیر آرام بھی۔“ انور سولنگی کے آدمی نے اسے جواب دیا۔ اس کے بعد انہوں نے اس سے مزید کوئی سوال کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ رات نیند پوری نہیں ہوئی تھی اس لیے پیٹ بھرتے ہی نیند کا خمار طاری ہونے لگا تھا۔

”آپ دونوں جا کر آرام کریں۔ سائیں قربان شاہ آئے اور انہوں نے آپ سے ملنے کا بولا تو میں آپ کو جگا دوں گا۔“ سچل نے نیلی اور مومی سے کہا تو انہوں نے تکلف سے کام نہیں لیا۔ یہاں انہیں کمرابھی ساتھ ملا تھا اور خوش قسمتی سے اعظم بھی سوچکا تھا اس لیے وہ دونوں بھی اطمینان سے سو گئے۔ دوبارہ آنکھ شور کی آواز پر کھلی۔

”کک..... کیا ہوا ہے؟“ گہری نیند سے جاگنے کے باعث نیلی کو شور کی نوعیت کے بارے میں اندازہ نہیں ہو سکا تھا اور اس نے گہرائے ہوئے لہجے میں خود سے پہلے جاگ

ماہنامہ پاکیزہ کی دیرینہ پرستار

کا
نیاناو

شرعی مسرور

یہ ناز
ناولنگار

حوصلہ شرط و فائز ہوا

مصنفہ کے قلم کا شاہکار مرقع

حیات انسان کے مختلف پہلوؤں کو نہایت

اسہارت و خوب صورتی سے اجاگر کرتا دلچسپ ناول

جلد ہی پاکیزہ قارئین کی بصارتوں کی نذر

بھی آسان نہیں ہوتا۔ ایک عام شہری تو کیا، میدان جنگ میں اترنے والا سپاہی بھی مسلسل بہتا خون دیکھ کر ایب نارمل ہونے لگتا ہے اور اسے جنگ کے خاتمے کے بعد معمول کی زندگی میں واپس آنے میں وقت لگ جاتا ہے۔ بعض لوگوں کو تو باقاعدہ نفسیاتی معالج کی حاجت پیش آ جاتی ہے۔ تو یہ تھا کہ اب نیلی بھی اعصاب زدہ ہو رہی تھی۔ وہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینے والی لڑکی ضرور تھی لیکن اس نے بھی یوں انسانوں کو ایک کے بعد ایک قتل ہوتے نہیں دیکھا تھا۔

”فائرنگ میں انور سولنگی کے دو بندے بھی زخمی ہوئے ہیں جن میں سے ایک کی حالت ذرا زیادہ سیریس ہے۔ دونوں کو اسپتال لے کر گئے ہیں۔ ان لوگوں نے پکڑے گئے بندے کو چھپر کر کے پولیس کو قوعہ کی اطلاع دے دی ہے۔ پولیس والوں سے نمٹنے کے لیے انور سولنگی خود یہاں آ رہا ہے۔“ مومی اس کی کیفیت کو محسوس کیے بغیر اسے معلومات فراہم کرتا جا رہا تھا۔

”اور سائیں قربان شاہ..... وہ نہیں پہنچے ابھی تک؟“ نیلی نے اپنے خشک حلق کو تر کرتے ہوئے پوچھا۔

”انہیں انور سولنگی نے فی الحال آنے سے روک دیا ہے۔ انور سولنگی کا خاص کارندہ بتا رہا تھا کہ سائیں کا کہنا ہے پہلے ہی قربان شاہ حملے اور قتل و غارت کے ایک معاملے میں الجھ چکا ہے۔ پولیس نے اسے یہاں دیکھ لیا تو دونوں واقعات کا آپس میں ربط ڈھونڈنے کی کوشش کرے گی۔ بہت ممکن ہے کہ یہی الزام لگا دے کہ دونوں واقعات قربان شاہ کی دشمنی کا شاخسانہ ہیں۔ ایسے میں ڈاکوؤں کے حملے والا بیانیہ کمزور پڑ جائے گا اور دونوں طرف کے کارندوں کی جان مشکل میں پڑ جائے گی۔“

”پتا نہیں کون ظالم ہیں جو اس معصوم کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہیں اور اسے حاصل کرنے کے لیے خون کی ندیاں بہانے پر تلے ہوئے ہیں۔“ نیلی نے اعظم کے ماتھے پر نرمی سے بوسہ دیتے ہوئے دکھ سے تمبرہ کیا۔ وہ اس کی گود میں ہی دوبارہ گہری نیند سوچکا تھا۔

”بھئی بھئی بڑوں کی لڑائی میں معصوم بچوں کو بھی پڑا پڑتا ہے۔ تمہیں معلوم ہے جو بندہ پکڑا گیا ہے، اس کے پاس سے بے ہوش کرنے والی گیس کے گولے ملے ہیں۔ لگتا ہے ان کا منصوبہ تھا کہ سب کو بے ہوش کر دیں اور اسے خاموشی سے اٹھا کر لے جائیں۔“

”اللہ ضرور اس کی حفاظت کرے گا۔ میں تو بار بار

جانے والے مومی سے پوچھا تھا۔“ تم اعظم کا خیال رکھو، میں دیکھتا ہوں۔“ مومی اس کے سوال کا واضح جواب دیے بغیر باہر کی طرف بھاگا تو وہ نیند سے جاگ کر کسمساتے ہوئے اعظم کی طرف متوجہ ہو گئی لیکن دماغ باہر کی طرف ہی لگا ہوا تھا۔ باہر سے لوگوں کے اونچا اونچا بولنے اور للکارے مارنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اسے یہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ کچی پکی نیند میں اس نے فائرنگ کی آوازیں بھی سنی تھیں۔ وہ اعظم کو سینے سے لگائے دھڑکتے دل کے ساتھ باہر کی آوازوں پر کان دھرے بیٹھی رہی۔

اڑتے اڑتے الفاظ تھے جن سے وہ کوئی حتمی نتیجہ اخذ نہیں کر پا رہی تھی لیکن اتنا اندازہ ہو رہا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہوئی تھی جس پر قابو پایا گیا تھا۔ دھیرے دھیرے آوازیں کم ہوتی چلی گئیں۔ وہ خواہش کے باوجود اپنی جگہ سے ہلی نہ کسی کھڑکی کے قریب جا کر باہر جھانکنے کی کوشش کی۔ اعظم اس کی گود میں تھا اور وہ ایسا کچھ کر کے اس کے لیے خطرہ پیدا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ انتظار کے وہ چند لمحوں بڑی مشکل سے گزرے اور آخر کار مومی واپس آیا۔

”کیا ہوا؟ کوئی مسئلہ پڑ گیا ہے کیا؟“ مومی کو دیکھتے ہی اس نے بے چینی سے پوچھا۔

”بس اللہ نے بچت کر دادی اور انور سولنگی کے بندوں کی ہوشیاری نے کام دکھا دیا تھا ورنہ دشمن کا داؤ چل گیا تھا۔“ مومی نے آرام سے بیٹھتے ہوئے اسے بتایا۔

”کیوں، کیا ہوا تھا؟“ اس نے فکر مند ہی سے پوچھا۔

”دو بندے پتا نہیں کیسے نظر بچا کر اندر آ گئے تھے اور گھنے درختوں کی شاخوں میں چھپے بیٹھے تھے۔ وہ تو ایک کو اتفاق سے چھینک آئی اور قریب سے گزرتے ایک کارندے نے آواز سن لی تو شور مچایا۔ کارندوں نے اسے پکڑنے کی کوشش کی تو اس نے فائرنگ شروع کر دی۔ دوسرے کسی درخت پر چھپا بیٹھا اس کا ساتھی بھی شامل ہو گیا لیکن ایک تو انور سولنگی کے کارندوں کی تعداد زیادہ تھی، دوسرے وہ سب ہیں بھی مار دھاڑ والے بندے تو انہوں نے اچھا مقابلہ کیا۔ دونوں میں سے ایک مارا گیا اور دوسرا بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔“ مومی نے اسے ساری تفصیل سنائی۔

”ایک اور قتل.....! نیلی کراہی۔ جب سے وہ اس کام میں شامل ہوئی تھی، مسلسل قتل و غارت دیکھ رہی تھی اور اچھے خاصے مضبوط اعصاب کی مالک ہونے کے باوجود یہ سب اس پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ انسانوں کو مرتے دیکھنا بھی

قرآنی دعائیں پڑھ کر اس کے گرد حصار باندھتی رہتی ہوں۔
اللہ نے چاہا تو کسی کے ہاتھ نہیں پہنچ سکیں گے اس تک۔“
نبی نے اعظم کو زور سے اپنے ساتھ بھیج لیا جس پر وہ
کسم نے لگا۔

”کیا کرتی ہو، بچے کی نیند خراب ہو رہی ہے۔“ مومی
نے اسے ٹوکا تو وہ جھینپ گئی۔

”آرام سے لٹا دو اسے بستر پر۔“

”پتا نہیں کیوں اتنے تھوڑے سے وقت میں یہ مجھے
اتنا پیارا ہو گیا ہے کہ اس کے ساتھ کچھ برا ہو جانے کے خیال
سے میرا دل ڈوبنے لگتا ہے۔ دل چاہتا ہے اسے سارا وقت
اپنے کلیجے سے لگا کر رکھوں۔“ مومی کے ٹوکنے پر اس نے
اعظم کو دوبارہ بستر پر تو لٹا دیا لیکن نرم ہاتھوں سے اسے تھپکتے
ہوئے محبت پاش لہجے میں بولی۔

”یہ بھی اللہ کی طرف کے معاملات ہیں۔ ظالموں
نے اسے ماں کی آغوش سے نکال کر ممتا سے محروم کرنے کی
سازش کی تو اللہ نے تمہارے دل میں اس کے لیے وہی محبت
پیدا کر کے تلافی کر دی۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ خود بھی
تمہارے ساتھ بہت سکون میں ہے اور اس کی طبیعت میں
کوئی خرابی بھی محسوس نہیں ہو رہی ورنہ پہلے تو ایسے ڈاکٹروں
کی ضرورت پڑی ہوتی تھی۔“ مومی کی توجہ ہلکی تھی جسے نبی
رد نہیں کر سکی۔ اعظم کی طرف جس شدت سے اس کا دل مائل
ہوا تھا، وہ قدرت کے اشارے کے بغیر ممکن ہی نہیں تھا۔

”سوچتی ہوں جب یہ ساری بھاگ دوڑ ختم ہو جائے
گی اور یہ کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچ جائے گا یا اس کی ماں اسے
مل جائے گی تو میں کیا کروں گی؟ میرا تو دل ہی نہیں مانے گا
اسے چھوڑنے کو۔“ اب اس کے لہجے میں ہلکا سا خوف تھا۔

”اپنے نہیں، اس کے بارے میں سوچو اور دعا کرو
کہ یہ محفوظ ہو کر نازل زندگی گزار سکے۔ اگر تم اس کے لیے
ممتا کے جذبات محسوس کر رہی ہو تو یاد رکھو کہ ممتا تو نام ہی
قربانی کا ہے۔“ مومی کے الفاظ ایک بار پھر قائل کر لینے
والے تھے۔ تائیدی انداز میں سر ہلاتی نبی جواب میں کچھ
کہہ پاتی، اس سے قبل ہی دروازے پر دستک ہوئی۔

”سائیں انور سونگلی تشریف لے آئے ہیں اور آپ کو
یاد کر رہے ہیں۔“ آنے والا ایک ملازم تھا جو پیغام لے کر
آیا تھا۔

”ٹھیک ہے، تم چلو میں آتا ہوں۔“

”تھوڑی جلدی کریں سائیں۔ باہر پولیس آئی بیٹھی
ہے پروڈے سائیں پولیس والوں سے پہلے آپ سے ملنا

چاہتے ہیں۔“

”اچھا تو پھر چلو۔“ اس نے نبی کو اعظم کے پاس ہی
ٹھہرے رہنے کا اشارہ کیا اور خود ملازم کے پیچھے چل پڑا۔
انور سونگلی کڑکڑاتے ہوئے کلف لگے کاٹن کے سفید شلوار
قمیص پر مخصوص سندھی اجرک پہنے اور سر پر سندھی ٹوپی
لگائے اس کا منتظر بیٹھا تھا۔ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے اس نے مومی
سے سلام لیا اور بارعب لہجے میں بولا۔

”ہم نے تمہیں صرف یہ ہدایت دینے کے لیے بلایا
ہے کہ پولیس کے سامنے ہم تمہیں اپنے کارندے و فاعلی کا
مہمان ظاہر کریں گے جو فارم ہاؤس دیکھنے کے شوق میں
اپنی بیوی کے ساتھ یہاں آیا ہوا ہے۔ پولیس کے سامنے تم
ہر بات سے لاعلمی کا اظہار کرنا اور یہی بیان دینا کہ تم اور
تمہاری بیوی سوئے ہوئے تھے۔ شور اور فائرنگ کی
آوازوں سے آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ ڈاکوؤں نے فارم
ہاؤس میں گھسنے کی کوشش کی تھی جسے فارم ہاؤس کے ملازم
نے ناکام بنا دیا۔“

”جیسی آپ کی مرضی۔“ مومی نے اس کی ہدایات
توجہ سے سنیں اور یقین دہانی کرائی۔

”بچے کو پولیس کی موجودگی میں نیچے تہ خانے میں
رکھنا پڑے گا۔ پولیس والوں کا کچھ پتا نہیں ہوتا کہ کب بال
کی کھال نکالنے بیٹھ جائیں۔ انہوں نے تمہارا آگاہ چچا
معلوم کرنے کے لیے تفتیش کی تو جان لیں گے کہ بچہ تمہارا
نہیں ہے اس لیے بہتر ہے بچے کو سامنے نہ لایا جائے۔“
انور سونگلی کی اس بات نے ظاہر کر دیا کہ وہ اسے اپنے
بچائے کارندے کا مہمان کیوں قرار دے رہا ہے۔ پولیس
تحقیق کرتی تو واضح ہو جاتا کہ وہ ایسی حیثیت کا بندہ نہیں ہے
کہ اس کی دوستی انور سونگلی جیسے بڑے زمیندار سے ہو سکتی
اس لیے اسے اپنے خاص ملازم و فاعلی کا مہمان قرار دینا ہی
مناسب تھا۔

”نی الحال سچل کو بھی تم لوگوں کی گاڑی سمیت یہاں
سے ہٹا دیا ہے۔ حالات کا تقاضا ہے کہ اس وقت یہاں
قربان شاہ یا صداقت شاہ میں سے کسی کا ذکر بھی نہ ہو۔“
انور سونگلی نے اسے مزید ہدایات دیں۔

”میں پورا پورا خیال رکھوں گا۔“ مومی نے اسے
یقین دہانی کروائی۔

”اپنی گھر والی کو بھی سمجھا دو۔“

”جی بہتر۔“

”وفا۔۔۔!“ انور سونگلی نے مودب کھڑے اپنے

خاص ملازم کو پکارا۔

”حکم سائیں!“

”بچے کو زانی سے لے کر نیچے تہ خانے میں بھجواؤ پھر پولیس والوں کو بھیجو۔“

”جو حکم سائیں!“ وفا علی فوراً حرکت میں آ گیا۔ نیلی کو اعظم کو خود سے الگ کرنے میں تامل تھا لیکن حالات کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے یہ کڑوا گھونٹ بھرنا پڑا۔ وفا علی نے احتیاطاً اعظم کا سارا سامان بھی وہاں سے ہٹوا دیا۔ اس دوران مومی، نیلی کو مختصر انور سوئنگی کی دی گئی ہدایات سے آگاہ کرتا رہا۔ سب کچھ حسب منشا ہونے کے بعد وفا علی نے باہر منتظر بیٹھے پولیس والوں کی طرف رخ کیا۔

”آجائیں تھانیدار صاحب! سائیں یاد کر رہے ہیں آپ کو۔“

”بڑا انتظار کروایا سائیں نے۔ مجھے تھانے واپس جا کر رپورٹ بھی تیار کرنا ہے۔ آج کا تو دن ہی خراب ہے۔ سویرے سورج چڑھنے سے پہلے ہی چاند چڑھنے شروع ہو گئے ہیں۔ مجھ جیسے چھوٹے بندے کی تو شامت ہی آجانی ہے۔“ تھانیدار پریشان بھی تھا اور اس لمبے انتظار سے خفا بھی دکھائی دے رہا تھا۔

”اتنا شور کیوں کر رہے ہو تھانیدار صاحب! سائیں سفر کر کے آئے ہیں۔ آدمی سفر سے آتا ہے تو تازہ دم ہونے کے لیے تھوڑا وقت تو چاہیے ہوتا ہے یا نہیں؟“ وفا علی نے تھانیدار کو تقریباً جھاڑ کر رکھ دیا۔ گاؤں، دیہاتوں میں بڑے زمینداروں کے سامنے تھانیدار کی اتنی مجال نہیں ہوتی کہ وہ ان سے ٹکر لے سکے۔ وہ شخص بھی وفا علی کی ذرا سی تیز آواز پر دھیمپا پڑ گیا اور پست لہجے میں بولا۔

”خفانہ ہوا! آج کام کا پوجہ بڑا ہے۔ پیچھے سائیں قربان شاہ کے بندوں پر بھی منہ اندھیرے ڈاکوؤں نے حملہ کیا تھا۔ نیند سے جاگ کر بڑی دیر تک اس معاملے کو نمٹاتا رہا۔ تھوڑی فرصت ملی تو یہاں کی خبر آگئی۔ آج تو تھانے میں صبح کا ناشتا بھی کرنے کی مہلت نہیں ملی۔“

”کیوں خمیسو! تھانیدار صاحب کو ناشتے پانی کا نہیں پوچھا تو نے؟ یہ اور ان کے بندے اتنی دیر سے یہاں سوکھے منہ پیٹھے ہوئے ہیں۔“ وفا علی ملازموں کو وہاں سے خالی برتن اٹھا کر لے جاتے ہوئے دیکھ چکا تھا پھر بھی گرج کر وہاں خدمت پر متعین ملازم سے پوچھا۔

”نہ نہ۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تو بھلا کھانا دور ہوا تھا۔ یہاں تو میری بہت اگلی خاطر خدمت ہوئی۔“

”ہے۔“ تھانیدار جلدی سے بول پڑا۔

”چلیں تو پھر چل کر سائیں سے مل لیں۔ انہیں آگے بھی بڑی مصروفیت ہے۔“ وفا علی نے یوں بتایا جیسے تھانیدار کی انور سوئنگی سے ملاقات کروا کر اس پر کوئی احسان کر رہا ہو۔ تھانیدار تھوڑا دبا دبا سا اس کے ساتھ ملاقات کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ اس کا نائب بھی اس کے ساتھ تھا جبکہ باقی سپاہی وہیں بیٹھے رہ گئے تھے۔ انور سوئنگی کی خدمت میں پہنچ کر تھانیدار نے اس سے سلام دعا کی پھر قوسے پر گفتگو کا آغاز ہوا۔ ابھی گفتگو شروع ہی ہوئی تھی کہ وفا علی کا فون بجا۔ اس نے کال ریسیو کی اور ملنے والی اطلاع پر بھویں چڑھا لیں۔

”ڈی ایس پی صاحب تشریف لائے ہیں۔“ کال بند کر کے اس نے آہستہ آواز میں حاضرین کو آگاہ کیا۔ خبر سن کر تھانیدار اور اس کے نائب کی رنگت اڑ گئی جبکہ انور سوئنگی کی پیشانی پر ایک موٹا سائل پڑ گیا۔ وفا علی کو خبر میں گیٹ سے ملی تھی جہاں سے رہائشی عمارت کا فاصلہ اچھا خاصا تھا لیکن جیپ کے لیے اس فاصلے کی کیا اہمیت۔ دو منٹ بعد ہی باہر سے جیپ کے انجن کی آواز سنائی دی۔ وفا علی لپک کر باہر نکلا۔ تھانیدار اور اس کا نائب تو اطلاع سنتے ہی اپنے افسر کے استقبال کے لیے باہر پہنچ چکے تھے۔ چہرے پر نہایت سنجیدہ تاثرات لیے ڈی ایس پی بغل میں چھڑی دبائے اس استقبالیہ ٹیم کو زیادہ گھاس ڈالے بغیر ملاقات کے کمرے میں انور سوئنگی تک پہنچا، تب بھی اس کے تاثرات میں زیادہ تبدیلی نہیں آئی تھی۔

”اچھا ہوا ڈی ایس پی صاحب! آپ خود آگئے۔ اب آپ خود دیکھ لیجیے کہ آپ کی سرکار میں لوہے کی ہاتھیں آگئی ہے کہ ڈاکوؤں نے ہاڑے میرے فارم ہاؤس میں گھسنے کی ہمت کر بیٹھے۔“ اس کے تاثرات دیکھ لینے کے باوجود انور سوئنگی نے بے تکلفی اپنی اور مصالحتی وغیرہ کے مرحلے سے گزر کر مان بھرے لہجے میں شکوہ کیا۔

”میں آیا نہیں، بھیجا گیا ہوں سوئنگی صاحب! اوپر والوں کو اس سارے علاقے کے حالات پر سخت تشویش ہے اس لیے انہوں نے میری ذمہ داری لگائی ہے کہ میں اپنی نگرانی میں سارے معاملات دیکھوں۔“ ڈی ایس پی نے سنجیدہ تاثرات کے ساتھ اس کی بات کا جواب دیا۔

”کیا مطلب۔۔۔ کیا میں اور بھی گزیر ہوئی ہے؟“

”انور سوئنگی نے کہا ہے کہ اس کا سہارا۔“

”کمال ہے سوئنگی صاحب! آپ اس معاملے کی

”ہمیں اصل تشویش ہلاکتوں پر ہے۔ تینوں وارداتوں میں اسلحے کا کھلا استعمال ہوا ہے۔“ ڈی ایس پی نے بتایا۔

”اپنے تحفظ کے لیے اسلحہ استعمال کرنا ہمارا حق ہے۔ کوئی آکر حملہ کرے تو ہم خود کو لٹنے یا مرنے کے لیے تو پیش نہیں کر سکتے نا اور نہ ہی پولیس کا انتظار کر سکتے ہیں جو واردات کے بھی کئی گھنٹے بعد موقع پر پہنچتی ہے۔“ انور سولنگی نے اپنا دفاع کرنے کے ساتھ ساتھ پولیس کو بھی رگید دیا جس پر ڈی ایس پی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

”قربان شاہ اور صداقت شاہ صاحب سے آپ کے کیسے تعلقات ہیں سولنگی صاحب؟“ ڈی ایس پی نے ذرا سا آگے کو ہوتے ہوئے انور سولنگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا۔

”قربان شاہ اور ہماری گہری دوستی ہے اور ان ہی کے حوالے سے سائیکس صداقت شاہ سے بھی اچھے مراسم ہیں۔ قربان شاہ کی درخواست پر ہم الیکشنز میں بھی ہمیشہ سائیکس صداقت شاہ کی حمایت کرتے ہیں۔“ انور سولنگی کو احساس تھا کہ ڈی ایس پی گفتگو کو کس رخ پر لے جانے کی کوشش کر رہا ہے پھر بھی اس نے اپنی اور قربان شاہ کی دوستی کا اعتراف کر لیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کے انکار کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ ڈی ایس پی یا تو پہلے سے یہ بات جانتا ہوگا یا پھر معمولی سی نفیثش کے بعد جان لے گا۔

”ایسا تو نہیں سولنگی صاحب کہ یہ ڈاکوؤں کے بجائے آپ تینوں کے کسی مشترکہ دشمنوں کی حرکت ہو؟ کوئی ایسا دشمن جس کے مفادات پر آپ تینوں کا اتحاد گراں گزر رہا ہو یا پھر وہ کچھ ایسا حاصل کرنا چاہتا ہو جس کے بارے میں اسے یقین ہو کہ وہ اسے آپ تینوں میں سے کسی ایک سے مل سکتا ہے اس لیے اس نے سب سے پہلے آپ تینوں پر ہی حملہ کر دیا۔“ ڈی ایس پی نے اس بار ذرا سا سائل کر سوال کیا۔

”اب یہ معلوم کرنا تو آپ کے محکمے کا کام ہے ڈی ایس پی صاحب کہ وہ کون ہے جس نے علاقے کا امن و امان تباہ کر دیا ہے۔ مشترکہ دشمن والی عبوری پر تو اسی وقت سوچا جاسکے گا جب میری قربان شاہ اور صداقت شاہ سے ملاقات ہوگی۔ ابھی تک تو مجھے کوئی خبر ہی نہیں تھی کہ ان کے ساتھ بھی یہ سب ہوا ہے۔ ابھی تو بس اتنا جانتا ہوں کہ یہاں جو بندہ مارا گیا ہے، اسے شاہ صاحب نہیں کیا جاسکا۔ آپ اس کا کوئی کھوج کر لیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس کا ہمارے کیا کام ہے۔“ انور سولنگی نے ایک بار

باثر شخصیات میں سے ایک ہیں اور آپ کو کچھ خبر ہی نہیں ہے۔“ ڈی ایس پی نے طنزیہ لہجہ اپنایا۔

”میں دو دن سے علاقے سے باہر تھا۔ آج ہی واپس آیا ہوں۔ راستے میں مجھے اطلاع ملی کہ میرے فارم ہاؤس پر ڈاکوؤں کا حملہ ہوا تھا تو میں کونٹھی پر جانے کے بجائے سیدھا یہاں آ گیا۔ آپ بتائیں کہ ایسی کون سی خبریں ہیں جنہیں سن کر سرکار نے آپ کی دوڑ لگوا دی ہے۔“ انور سولنگی نے نکل سے اس کے طنز کا جواب دیا۔

”دو دن کے اندر علاقے میں ڈاکے کی تین بڑی وارداتیں ہوئی ہیں۔ تینوں وارداتوں میں بندے قتل بھی ہوئے ہیں اور زخمی بھی اور تینوں وارداتوں میں آپ سمیت علاقے کے بڑے زمینداروں کو نشانہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔“ اس بار ڈی ایس پی نے بھی نکل کا مظاہرہ کیا اور تفصیل بتانی شروع کی۔

”میرے سوا باقی دو زمیندار کون ہیں بابا! اصل میں ان دونوں میں خبروں سے ذرا دور رہا ہوں تو مجھے معلوم نہیں کہ میرے پیچھے علاقے میں کیا کیا ہوتا رہا ہے۔“ انور سولنگی اپنی لاعلمی کی اداکاری پر قائم رہا۔

”ایک تو سائیکس صداقت شاہ ہیں اور دوسرے ان ہی کے رشتے دار قربان شاہ۔ ان دونوں کے آدمیوں پر ڈاکوؤں نے راستے میں حملہ کیا اور فائرنگ کے تبادلے میں دونوں ہی طرف کے لوگوں کو نقصان اٹھانا پڑا۔ اب جب تیسری واردات آپ کے فارم ہاؤس پر ہونے کی اطلاع ملی تو اوپر والوں میں کھلبلی مچ گئی اور مجھے حکم ہوا کہ ”اصل“ صورت حال معلوم کرنے کی کوشش کروں۔“ ڈی ایس پی نے لفظ ”اصل“ پر خصوصی زور ڈالا جسے انور سولنگی نے نظر انداز کر دیا اور لہجہ میں تشویش سمیٹ کر بولا۔

”یہ تو آپ نے بڑی پریشانی والی خبریں سنائی ہیں بابا! کچھ معلوم ہوا کہ اس سب کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے اور کس مائی کے لال میں اتنی ہمت پیدا ہو گئی ہے کہ ہم جیسے لوگوں پر ہاتھ ڈال رہا ہے؟“

”اب تک جتنے بھی آدمی قتل ہوئے ہیں، ان میں سے کسی کا بھی تعلق ڈاکوؤں کے مقامی گروہوں سے نہیں ہے۔ ہم ان کی شناخت کے سلسلے میں کام کر رہے ہیں۔“

”ذرا تیزی سے کام کریں ڈی ایس پی صاحب! کیونکہ جتنی عبوری ہے وہ لوگ وارداتیں کر رہے ہیں، لگتا ہے علاقے میں کوئی شخص محفوظ نہیں رہے گا۔“ انور سولنگی نے تشویش کا اظہار کیا۔

ساری ذمے داری اس پر ڈال دی۔

”ٹھیک ہے سونگٹی صاحب! ہم اس پر تفتیش کرتے ہیں لیکن اس کے لیے آپ کو بھی ہمارے ساتھ تعاون کرنا ہوگا۔“ ڈی ایس پی نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

”کیوں نہیں بابا! آپ جیسا چاہو گے، ہم تعاون کریں گے۔“ انور سونگٹی نے پورے جوش و خروش سے یقین دہانی کروائی۔

”ابھی تو میری ٹیم پورے فارم ہاؤس کا اندر باہر سے جائزہ لے گی تاکہ ڈاکوؤں کے متعلق شواہد اکٹھے کیے جاسکیں۔ ان کا کھوج کھرانکے گا تو پتا چلے گا کہ وہ کیوں ہاتھ دھو کر آپ دوستوں کے پیچھے لگ گئے ہیں۔“

”آپ کو جو کرنا ہے کرو بابا! میرے لوگ آپ سے پورا تعاون کریں گے۔“ ڈی ایس پی کے لہجے کا شک انور سونگٹی سے چھپا ہوا نہیں تھا اس لیے وہ جان بوجھ کر بے نیازی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

”تم نے زخمی ڈاکو کا بیان لیا نیاز علی؟ اس نے کچھ بتایا اپنے بارے میں؟“ ڈی ایس پی نے اچانک ہی تھانیدار کی طرف رخ کر کے اس سے سوال کیا۔ وہ جو اس ساری گفتگو کے دوران ہاتھ باندھے مؤدب کھڑا رہا تھا، اس اچانک سوال پر گڑبڑا گیا۔

”زخمی ڈاکو.....؟ زخمی ڈاکو تو کوئی نہیں پکڑا گیا سر! بس ایک کی لاش ملی ہے۔“

”کمال ہے۔ مجھے تو اطلاع ملی تھی کہ سونگٹی صاحب کے بندوں نے ایک ڈاکو کو زخمی حالت میں پکڑ رکھا ہے۔“ ڈی ایس پی کی گردن گھوم کر پھر انور سونگٹی کی طرف ہو گئی۔

”مجھے تو ایسی کوئی اطلاع نہیں۔ کیوں بابا وفا علی! کیا کوئی بندہ پکڑا بھی گیا ہے؟“ سونگٹی نے اپنا رخ وفا علی کی طرف کر لیا جو تھانیدار ہی کی طرح ہاتھ باندھے باادب بالملاحظہ کھڑا ہوا تھا۔

”نہیں سائیں! پکڑا جاتا تو میری مجال تھی بھلا کہ آپ کو خبر نہ کرتا۔ بس وہی بندہ ہے جو گولی کھا کر مرا۔ باقی تو فرار ہو گئے تھے۔“ وفا علی نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے عاجزی سے جواب دیا۔

”آپ کو کوئی غلطی لگ گئی ہے ڈی ایس پی صاحب! ادھر تو نہ آپ کے بندے کو کچھ خبر ہے نہ میرے بندے کو۔“ انور سونگٹی نے ڈی ایس پی کو مخاطب کر کے اس سے کہا لیکن وہ جان بوجھ کر اسے نظر انداز کر گیا اور تھانیدار کی طرف رخ کرنے کے اس سے بولا۔

”میری ٹیم باہر انتظار میں بیٹھی ہے نیاز علی! تم جاؤ اور ان کی ہیلپ کرو۔“

”جی سر!“ وہ سیلیوٹ مار کر تیزی سے باہر نکل گیا۔ ”کوئی چا پانی نہیں پلاؤ گے وفا علی؟ ہم اور ڈی ایس پی صاحب لمبے سفر سے آئے ہیں بابا! کچھ تو خاطر خدمت کرو ہماری۔“ انور سونگٹی نے صوفے پر پھیل کر بیٹھتے ہوئے اپنے خادم خاص سے کہا۔ وہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ ڈی ایس پی شواہد جمع کرنے کے نام پر فارم ہاؤس کی تلاشی لینا چاہتا ہے لیکن وہ مطمئن تھا۔ اسے اپنے بندوں کی کارکردگی پر بھروسہ تھا کہ وہ ہرگز بھی پولیس والوں کو اس تہ خانے تک نہیں پہنچنے دیں گے جہاں زخمی قیدی اور اعظم موجود تھے۔

”چائے تیار ہے سائیں! بس ڈی ایس پی صاحب کے فارغ ہونے کا انتظار تھا۔“ وفا علی نے مؤدبانہ جواب دیا۔ ”ارے بابا! کام کاج چلتے رہتے ہیں۔ اس کے لیے بھلا کھانا پینا کون روکتا ہے۔ جاؤ، ٹفٹ چائے لگواؤ۔“ ”جو حکم سائیں!“ وہ باہر نکل گیا۔

”ایکسکیوز می، سونگٹی صاحب! میں ابھی آتا ہوں۔“ ڈی ایس پی نے بھی باہر کا رخ کیا۔ باہر جا کر وہ تھانیدار کو ٹھونکنے کی کوشش کر رہا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ عام طور پر یہ تھانیدار علاقے کے بڑے زمینداروں کے نمک خوار ہوتے ہیں اور ان کے اشارے پر بہت سے حقائق پر خوبصورتی سے پردہ ڈال دیتے ہیں۔ حقیقتاً تھانیدار نیاز علی بھی ایسا ہی ایک بندہ تھا لیکن اس کیس میں اس کی اپنی معلومات بھی بہت کم تھیں۔ وہ یہ تو بتا سکتا تھا کہ ہر کیس میں ڈاکوؤں کے حملے کا ذکر ہے اور اس پر اسی حوالے سے رپورٹ درج کرنے کے لیے دباؤ ڈالا گیا ہے لیکن وہ اس سب کے پیچھے موجود عوامل اور مقاصد سے اتنا ہی بے خبر تھا جتنا کہ اور لوگ۔ ڈی ایس پی اس صورت حال پر بیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔

”اسٹو پڈ! تھانیدار تو وہ بندہ ہوتا ہے جس کے علاقے میں پتا بھی کھڑے تو اسے اس کی وجہ معلوم ہوتی ہے اور تم اتنے عقل و غارت کے باوجود انجان اور بے خبر بیٹھے ہو۔“ اس نے اپنا سارا غصہ تھانیدار پر نکال دیا۔ وہ کان دبا کر سنتا رہا۔ افسر کی ڈانٹ کھا لینا آسان تھا کہ افسر زیادہ سے زیادہ اس کی نوکری پر اثر انداز ہو سکتا تھا جبکہ زمیندار سے دشمنی مول لینے کا مطلب تھا اپنی جان، مال اور عزت سمیت ہر شے کو داؤ پر لگانا۔

”میرے پاس کئی خبر ہے کہ مرنے والے کا ایک

ساتھی اور تھا جسے ممکنہ طور پر ان لوگوں نے پکڑ کر قید کر لیا ہے لیکن اب منہ سے بھاپ نہیں نکال رہے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ تم بھی ان کے ساتھ شامل ہو۔“ جھنجھایا ہوا ڈی ایس پی، تھانیدار پر الزام لگانے سے بھی گریز نہیں کر رہا تھا۔
”قسم لے لیں سر! مجھے ایسی کوئی اطلاع نہیں ملی۔ آپ مجھے اپنی خبر کا سورس بتائیں تو میں سچ اگلوانے کے لیے ان لوگوں پر دباؤ ڈال سکتا ہوں۔“

”تم صرف اتنا کرو کہ آنکھیں کھول کر فارم ہاؤس کی تلاشی کے کام کی نگرانی کرو اور دیکھو کہ یہاں کوئی خفیہ خانہ وغیرہ تو نہیں ہے جہاں انہوں نے ہمارا مطلوبہ بندہ چھپا رکھا ہے۔“ ڈی ایس پی نے اسے ڈپٹا اور واپس اندر چلا گیا جہاں اس کی عدم موجودگی میں میز پر لوازمات کا ڈھیر لگ چکا تھا اور انور سوگنی پورے جوش و خروش سے اس کی میزبانی پر تلا بیٹھا تھا۔ حقیقت میں وہ دونوں ہی اس بات کو جانتے تھے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ مکمل سچ نہیں بول رہے ہیں لیکن انہیں آپس میں تعاون کی اداکاری بھی کرنا بھی سو یہ اداکاری جاری تھی۔ ڈی ایس پی لذت کام وہ بن اور گفتگو کے سلسلے کے ساتھ ساتھ مسلسل موبائل پر بھی مصروف تھا۔ اچانک ہی اس نے سر اٹھایا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

”خبر ملی ہے کہ سائیں صداقت شاہ کو کرپشن کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا ہے۔ آج سویرے سویرے اینٹی کرپشن والوں نے حویلی پر ریڈ کر کے بہت سا مال ضبط کر لیا ہے اور ان کی وزارت کے دنوں میں کی جانے والی بے ضابطگیوں کی جانچ پڑتال کی جا رہی ہے۔“

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ سائیں صداقت شاہ تو بہت اچھی شہرت کے مالک ہیں۔“ سوگنی کو شدید حیرت ہوئی۔

”بندہ اینٹی کرپشن والوں کے ریڈار پر آجائے تو ساری نیک نامی دھری رہ جاتی ہے۔“ ڈی ایس پی نے ایک بڑا سا گلاب جامن اپنے منہ کی طرف لے جاتے ہوئے تبصرہ کیا۔ اس تبصرے میں ایک غیر محسوس سی تنبیہ بھی تھی جس کو محسوس کیے بغیر سوگنی اپنے موبائل پر مصروف ہو چکا تھا۔

”خبروں میں تو ایسی کسی بات کا ذکر نہیں ہے۔“ مطلوبہ خبر نہ ملی تو سر اٹھا کر سوالیہ نظر سے ڈی ایس پی کو دیکھا۔

”ابھی اس خبر کو میڈیا پر آنے سے روکا گیا ہے۔ میں تو آپ کو اندر کی خبر دے رہا ہوں اور یقین جانے، مجھے ملنے والی اندر کی خبریں بالکل سچ ہوتی ہیں۔“ اس نے معنی خیز لہجے میں سوگنی کو جواب دیا۔ اس بار سوگنی نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ صداقت شاہ اس کے مقابلے میں بڑے زمیندار

تھے اور ان کا سیاسی اثر رسوخ بھی اچھا خاصا تھا اس کے باوجود ان کے ساتھ یہ سب ہو گیا تھا تو اس کا اپنے لیے فکر مند ہونا تو بیجا تھا۔

”سر! یہ دونوں میاں بیوی یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ وفا علی کے مہمان ہیں اور کل سے فارم ہاؤس پر رکے ہوئے ہیں۔ میں انہیں آپ کے پاس لے آیا ہوں کہ اگر آپ ان سے کچھ پوچھنا چاہیں تو پوچھ لیں۔“ کمرے کی سرد اور بوجھل فضا کو تھانیدار کی آواز نے توڑا۔ وہ اپنے افسر کو کارکردگی دکھانے کے چکر میں نیلی اور مومی کو وہاں لے آیا تھا۔

”سلام صاحب!“ دونوں نے ڈی ایس پی کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر سلام کیا لیکن وہ یہ دیکھ کر تھوڑی سی تشویش میں مبتلا ہو گئے تھے کہ ان پر نظر پڑتے ہی ڈی ایس پی کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ پھر اس کی طرف سے تباہ توڑ سوالات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ نام، پیشہ، رہائش، وفا علی سے دوستی کی مدت اور یہاں آنے کی وجوہات تک سب پوچھ ڈالا اس نے۔ دونوں سنبھل کر ہر سوال کا طے شدہ جواب دیتے چلے گئے۔

”بچے گتے ہیں تم دونوں کے؟“ کئی سوالوں کے بعد اس نے یہ سوال کیا۔

”بچے نہیں ہیں۔ اصل میں ابھی ہماری شادی کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔“ جواب مومی نے دیا۔

”بچے نہیں ہیں تو تم دونوں کراچی میں ڈاکٹر مجاہد کمال کے کلینک پر کیا کر رہے تھے؟“ ڈی ایس پی نے ان کے قدموں کے نیچے سے زمین کھینچی۔

”آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہم کسی ڈاکٹر مجاہد کمال کو نہیں جانتے۔ نہ ہی ہمارا بھی ان کے کلینک پر جانا ہوا ہے۔“ مومی نے ساتھ کھڑی نیلی کا ہاتھ تھام کر تسلی دینے والے انداز میں دبایا اور ڈی ایس پی کی بات سے صاف انکار کر دیا۔

”پولیس کے پاس فوجی ہیں تمہاری۔“ وہ انکار کے باوجود مصر رہا۔

”سوال ہی نہیں پیدا ہوتا سر! ایک جگہ جہاں ہم کبھی گئے ہی نہیں، وہاں سے ہماری فوجی کیسے مل سکتی ہیں۔“ مومی کا مضبوط لہجہ نیلی کا بھی حوصلہ بڑھا گیا اور اسے یاد آ گیا کہ جب وہ اعظم کے حصول کے لیے کلینک پر گئے تھے تو اس کا حلیہ یکسر مختلف تھا اور مومی نے تو عبا پانی بہن رکھا تھا اس لیے فوجی والی بات جھوٹ کے سوا کچھ نہیں اور یہ پولیس افسر

انہیں بلف کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کی اس حرکت سے یہ بات بھی واضح ہو گئی تھی کہ وہ محض اپنی ڈیوٹی پوری کرنے نہیں آیا ہے بلکہ ان لوگوں کی ایما پر آیا ہے جو ہر حال میں اعظم کا حصول چاہتے ہیں۔

”نیا زعلی! تمہیں خیال رکھنا ہوگا کہ اوپر سے کلیئرنس ملے بغیر یہ دونوں میاں بیوی یہاں سے نہیں اور نہ جاسکیں۔ ان کے اصرار کی وجہ سے فی الحال میں ان کی گرفتاری کا آرڈر نہیں دے رہا ہوں لیکن تصدیق ہونے تک انہیں ہمارا پابند رہنا ہوگا۔“ بظاہر اس نے مومی کی بات پر اعتبار نہیں کیا لیکن فوری گرفتاری کا حکم نہ دینے کا یہی مطلب تھا کہ اس کے پاس اپنی بات ثابت کرنے کے لیے کوئی ثبوت موجود نہیں تھا اور صرف ایک ٹکا ہی لگا یا تھا۔ اس کے بعد وہ ان دونوں سے ڈاکے سے متعلق بھی سوال کرتا رہا۔ ان دونوں نے بھی وہی جوابات دیے جو اب تک دیگر افراد نے دیے تھے۔

ڈی ایس پی فارم ہاؤس پر اچھا خاصا وقت گزار کر واپس لوٹا تو کچھ جھنجھلایا ہوا تھا۔ اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کہیں سے کوئی کھوج کھرا ملنے پر یہاں آیا ہے لیکن یہاں تک پہنچنے کے بعد گویا ساری نشانیاں گم ہو گئی تھیں۔ اس کے آدمی کسی خفیہ تہ خانے یا مقام کو ڈھونڈنے میں قطعی ناکام رہے تھے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ انور سو لنگی نے وہ تہ خانہ بہت محفوظ بنوایا تھا۔ صداقت شاہ اور قربان شاہ سے خوشگوار تعلقات اپنی جگہ لیکن مزاج و کردار کے اعتبار سے وہ ان دونوں سے خاصا مختلف تھا اور اس کے اندر عام جاگیرداروں اور زمینداروں والی خوبو پائی جاتی تھی۔ وہ اپنے مخالفین و معتبیین کو خفیہ تہ خانے میں قائم کردہ قید خانے اور ٹارچر سیل کی سیر کرواتا رہتا تھا لیکن وہ سارے کے سارے لوگ آنکھوں پر پٹی باندھ کر یا بے ہوشی کی حالت میں وہاں لے جائے جاتے تھے اس لیے کسی کو تہ خانے کے محل وقوع کا کچھ پتا نہیں تھا۔ تہ خانے کا دوسرا مقصد عیاشی تھا۔ انور سو لنگی کے سالے بڑے گٹھے تھے جو خود تو ہر قسم کی عیاشی کرتے تھے لیکن انہیں بہنوئی کی اپنی اکلوتی بہن سے بے وفائی منظور نہ تھی اور وہ اس پر کڑی نگاہ رکھنا اپنا حق سمجھتے تھے۔ اپنے ان خوفناک سالوں سے محفوظ رہنے کے لیے وہ تہ خانے کا استعمال کرتا تھا۔ یوں اسے زیادہ سے زیادہ محفوظ بنانا اس کی اہم ضرورت تھی۔

ڈی ایس پی کی ٹیم کی ناکامی کی ایک وجہ وفا علی کی چالاکی بھی تھی۔ وہ اس طرح سے انہیں چکر دیتا رہا تھا کہ وہ

اندازہ ہی نہیں لگا پائے تھے کہ تہ خانے تک پہنچنے کا راستہ کس جگہ ہو سکتا ہے۔ اس نے ٹیم کے ہر رکن پر پُر تکلف خاطر مدارت اور بھاری لفافوں کا ایسا بار ڈال دیا تھا کہ انہوں نے بھی بس ڈیوٹی ہی بھگتائی تھی۔

”آپ کا بہت شکریہ سو لنگی صاحب! امید ہے کہ آئندہ بھی آپ اسی طرح قانون سے تعاون کرتے رہیں گے۔“ روا لنگی سے قبل اس نے بادل ناخواستہ سو لنگی کا شکریہ ادا کیا۔

”بالکل بابا بالکل۔ قانون کی خدمت کرنا ہمارا فرض ہے۔“ سو لنگی نے سینے پر ہاتھ رکھ کر جس معنی خیز انداز میں یقین دہانی کر دئی، اسے وہی لوگ سمجھ سکتے تھے جن کی جبین اس کی طرف سے عطا کردہ لفافوں کے بوجھ سے بھاری ہو رہی تھیں۔ پولیس والوں کے جاتے ہی اس نے قربان شاہ کا نمبر ملایا۔

”سب خیر ہے دوست؟“ قربان شاہ نے اس کی کال وصول کی اور بے قراری سے پوچھا۔

”ابھی تو سب خیر ہے اور مصیبت ٹل گئی ہے لیکن لگتا نہیں ہے کہ وہ لوگ پیچھا چھوڑیں گے۔ صاف ظاہر ہے کہ ان کے پاس کچھ خبر ہے۔ اور تو اور، ڈی ایس پی ان دونوں میاں بیوی پر بھی شک ظاہر کر گیا ہے۔“ اس نے قربان شاہ کو پوری تفصیل سنائی۔

”مطلب کہ ان لوگوں کو وہاں سے بھی نکالنا پڑے گا۔“ قربان شاہ بڑبڑائے۔

”یہی ٹھیک رہے گا کیونکہ جب تک دوسرے لوگوں کی بات تھی، میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میں جان مال سب خرچ کر کے ان کا مقابلہ کر سکتا تھا لیکن سرکار سے ٹکر لینا میرے بس کی بات نہیں ہے۔“

”گھبراؤ مت۔ میں تھوڑی دیر میں کوئی انتظام کرتا ہوں۔“ اس کے معذوری ظاہر کرنے پر قربان شاہ نے اسے تسلی دی۔

”میں نے سائیں صداقت شاہ کے بارے میں بھی ایک اڑتی اڑتی خبر سنی ہے کہ انہیں اینٹی کرپشن والوں نے گرفتار کر لیا ہے۔ کیا یہ خبر سچ ہے؟“ اس نے اس خبر کی تصدیق چاہی جس نے اصل میں اسے کمزور کر دیا تھا۔

”یقین تم پہلے ہی کر چکے ہو۔ اب تصدیق یا تردید سے کیا حاصل۔“ قربان شاہ کو فوراً ہی اس کے پیچھے ہٹنے کی وجہ سمجھ آ گئی لہذا خشک لہجے میں کہتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔ انور سو لنگی نے کھسائی ہوئی کیفیت میں فون ہاتھ

سے رکھ دیا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ دوستی کی آزمائش ہار گیا ہے لیکن کسی مسلسل آزمائش میں پڑنے کے مقابلے میں اس کے لیے یہ ہار قابل قبول تھی۔

☆☆☆

بغیر برف زار میں زندگی کے کئی دن گزارنے کے بعد بیجنگ جیسے مصروف اور چرہنگام شہر کی صبح میں آنکھ کھولنا بھی زندگی کا ایک انوکھا تجربہ تھا۔ اگرچہ انہوں نے اس برف زار سے سیدھے بیجنگ لینڈ نہیں کیا تھا اور راستے میں کچھ مقامات پر رکتے ہوئے یہاں پہنچے تھے لیکن ان مقامات اور بیجنگ میں بہت فرق تھا۔ پھر وہ کسی بھی جگہ محض چند گھنٹوں کے آرام کے لیے رکتے تھے۔ انہیں نہ تو اس جگہ کو دیکھنے کا موقع ملا تھا، نہ مقامی آبادی سے بات چیت اور میل جول کی نوبت آئی تھی مگر اب بیجنگ کی بات الگ تھی۔ وہ دنیا کی سب سے بڑی آبادی رکھنے والے دارالحکومت میں موجود تھے اور امکان تھا کہ اب کئی دن تک یہیں قیام کریں گے۔ اس قیام کے عرصے میں بہت کچھ دیکھنے اور جاننے کا بھی موقع مل سکتا تھا اس لیے اس شہر میں آنکھ کھولنا اسے ایک مختلف کیفیت سے دوچار کر گیا تھا۔ کچھ دیر بستر پر لیٹے لیٹے اس کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے اس کی آنکھوں کے سامنے سبیل کا چہرہ لہرایا تو شعور نے پہلی بار تسلیم کیا کہ یہ جو بیجنگ میں آنکھ کھولنا سب سے الگ محسوس ہو رہا ہے تو اس کی بنیادی وجہ بیجنگ نہیں بلکہ بیجنگ میں سبیل کی موجودگی ہے۔ سبیل کا خیال آتے ہی اس کی طبیعت بری طرح بے چین ہو گئی۔ یوان منگ کے اندازے کے مطابق اسے برین ٹیومر تھا جس کی تصدیق ظاہر ہے کسی اسپتال میں ہی ہو سکتی تھی۔ سبیل کو دیگر افراد کے ساتھ بیجنگ آئے ہوئے اچھے خاصے دن ہو گئے تھے اس لیے یہ تو طے تھا کہ سارے ضروری ٹیسٹ انجام پا چکے ہوں گے اور یوان منگ کے اندازے کی تصدیق یا تردید بھی ہو چکی ہوگی لیکن اسے ابھی تک اس بارے میں کوئی اطلاع نہیں مل سکی تھی۔ جہاں تک اس کی اپنی بات تھی تو اسے اپنے اندر سے کچھ اچھے اشارے نہیں مل رہے تھے۔

”نہیں، وہ ٹھیک ہوگی۔ اسے کچھ نہیں ہوگا۔ یہ صرف میرے اند کا ڈر ہے جو مجھے وہم میں مبتلا کر رہا ہے۔ اگر کوئی مسئلہ ہوا بھی تو ٹھیک ہو جائے گا۔ چینی ہر طرح کی ٹیکنالوجی میں ہم سے بہت آگے ہیں۔ اگر سبیل کو ٹیومر ہوا بھی تو یہاں اس کا بہترین علاج ہو جائے گا۔“ خود اپنے آپ سے سوال جواب کرتے اور الجھتے سلیختے اس نے بستر چھوڑ دیا۔

”مجھے شین یا ای یا یوان منگ میں سے کسی سے رابطہ کر کے سبیل کے بارے میں معلوم کرنا چاہیے۔ بلکہ سیدھے اسپتال جانے کا مطالبہ کرنا چاہیے۔“ سبیل خانہ میں دانتوں کو برش کرتے ہوئے وہ اپنا آئندہ کا پروگرام طے کر رہا تھا۔ اس پروگرام کو طے کرتے ہوئے اسے اس اسٹارٹ سے لڑکے کا خیال آیا جو اسے اس کمرے میں چھوڑ کر گیا تھا اور جس کا کہنا تھا کہ وہ بیجنگ میں ان کا مہمان ہے۔

”کیا نام تھا اس کا؟“ اس نے کلی کرتے ہوئے یاد کرنے کی کوشش کی لیکن کچھ یاد نہ آیا کہ اس وقت ٹھکن اتنی زیادہ تھی کہ کسی سے کچھ کہنے سننے کا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا لہذا اس نے اپنے میزبان کی بھی کوئی بات توجہ سے نہیں سنی تھی۔ ”پہلے دکی اور جازو کو چیک کرتا ہوں پھر اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کروں گا۔“ منہ ہاتھ دھو کر تویا سے صاف کرتے ہوئے اس نے طے کیا اور آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر بال سنوارنے لگا۔ آئینے میں دکھائی دینے والا اپنا خود کا عکس اسے خاصا کمزور اور سنولا یا ہوا محسوس ہوا۔ حالات کی سختی نے اس کی شخصیت پر کافی اثر ڈالا تھا اور یونیورسٹی کے زمانے کا بے پردا سماج کہیں کھوسا گیا تھا۔ وہ اس زمانے کی یادوں میں گھومتا، اس سے قبل ہی انٹرکام کی آواز نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

”السلام علیکم جناب! میں آپ کا میزبان یوسف مافوسائی ہوں اور جانا چاہتا ہوں کہ اگر آپ جاگ گئے ہیں تو ناشتا کب تک کرنا پسند کریں گے؟“ دوسری طرف سے سنائی دیتے شستہ اور مہذب لہجے نے اسے یاد دلایا کہ رات اسے اس کمرے تک پہنچانے والے نوجوان کا نام یوسف مافوسائی تھا۔

”میں ریڈی ہوں اور ناشتے کے لیے باہر آ رہا ہوں۔ براہ مہربانی میرے ساتھیوں کو بھی جگا دو۔“ ”وہ آل ریڈی ناشتے کی ٹیبل پر موجود ہیں اور آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ آپ اپنے کمرے سے نکل کر دائیں جانب موجود سیڑھیوں سے نیچے آ جائیں۔ ہم سب وہیں لاؤنج میں آپ کو اپنے منتظر ملیں گے۔“ یوسف نے اسے اطلاع دی۔

”اوکے۔“ اس نے مختصر جواب دے کر ریسیور رکھ دیا اور ایک بار پھر آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ وہ ابھی تک اسی لی شرٹ اور ٹراؤزر میں تھا جنہیں سونے کے لیے استعمال کیا تھا لیکن دیکھنے میں یہ کپڑے بُرے نہیں لگ رہے تھے اور انہیں پہن کر سب کے ساتھ ناشتے میں شریک ہوا جاسکتا تھا۔

”صبح بخیر جناب!“ وہ ناشتے کی میز پر پہنچا تو سب سے پہلے یوسف مافوسائی اس کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ مسکراتے چہرے والا ایک خوش شکل نوجوان تھا جس کا قد اور آنکھیں عام چینیوں کے مقابلے میں بڑی تھیں اور وہ بہت شستہ اردو بولتا تھا۔

”صبح بخیر! میں معذرت چاہتا ہوں کہ میری وجہ سے آپ سب کو انتظار کی زحمت اٹھانا پڑی۔“ وہ چینی باشندہ ہو کر اتنی اچھی اردو میں بات کر رہا تھا تو اس کا بھی فرض بنتا تھا کہ خالصتاً اپنی ہی زبان کا استعمال کرے۔

”اتنے تکلف میں بھی نہ پڑیں کہ ہمیں لگے کہ ہم بیجنگ کے بجائے لکھنؤ میں ہیں۔“ برابر میں بیٹھے وکی نے اس کے کان میں سرگوشی کی لیکن یہ سرگوشی اتنی بلند تھی کہ یوسف تک بھی اس کی بات بہ خوبی پہنچ گئی اور وہ دھیرے سے ہنس کر بولا۔

”آپ کا یہ خادم بھی نصف لکھنوی ہی ہے۔“
”مطلب؟“ وکی نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”میری والدہ کا تعلق لکھنؤ سے ہے۔ وہ یہاں اپنی تعلیم کے لیے آئی تھیں۔ میرے والد اور ان کے دل آپس میں مل گئے تو دونوں نے شادی کر لی۔ یوں وہ ہمیشہ کے لیے یہیں رہ گئیں۔“ اس کے جواب نے اس کی اچھی اردو اور عام چینیوں سے قدرے مختلف دکھائی دینے کی وجہ واضح کر دی۔

”یعنی ہمیں آپ کی موجودگی میں چینی کے ساتھ ساتھ لکھنوی آداب کو بھی ملحوظ خاطر رکھنا پڑے گا۔“ وکی نے اس انداز میں یہ جملہ کہا کہ جیسے وہ یوسف سے بہت زیادہ مرعوب ہو گیا ہو۔ یوسف اس کے اس انداز پر ایک بار پھر ہنس پڑا اور بولا۔

”آپ کو ایسا کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ بس اپنی تہذیب کے مطابق رہیے گا۔ بطور میزبان مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

”دیکھ لو بیٹا وقاص! بہت بھاری ذمے داری ڈال دی ہے تم پر میاں یوسف نے۔ اب تم جو کچھ بھی ارشاد فرماؤ گے، وہ تمہاری تہذیب میں شمار ہوگا۔“ معاذ نے وکی کو احساس دلایا۔

”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ یہاں پر اگر کراچی والا ہے، تہہ، جگر، سالاد وغیرہ پھسل گیا زبان سے تو اپنے وطن کی بہت بے عزتی ہو جائے گی۔“ اس بار وکی کی

سرگوشی سچ سچ سرگوشی تھی اور وہ پریشانی سے سر پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ اس کے عین مقابل بیٹھا جارو جو کہ ساری گفتگو خاموشی سے سنتا رہا تھا، اس کی اس حالت پر شرارت سے مسکرا رہا تھا۔

”میرے خیال میں باتیں تو چلتی رہیں گی اس لیے ہمیں پہلے ناشتا کر لینا چاہیے۔ میرے والد فرماتے ہیں کہ رزق کو انتظار نہیں کروانا چاہیے۔“ یوسف نے وکی کی سرگوشی کو نظر انداز کرتے ہوئے ان کی توجہ ناشتے کی طرف مبذول کی۔

”چین میں بھی والد اس طرح کی نصیحتیں کرتے ہیں؟ ہم تو سمجھتے تھے کہ یہ شعبہ صرف ہمارے ہاں کے اباؤں نے سنبھال رکھا ہے۔“ وکی کہاں خاموش رہ سکتا تھا۔ اس کی زبان میں خارش ہوئی اور بے ساختہ ہی بول پڑا۔

”یہ بھی تو دیکھو کہ حضرت طویل عرصے سے ایک ہندوستانی خاتون کے ساتھ رہ رہے ہیں۔ یقینی طور پر کچھ عادتیں وہاں سے بھی منتقل ہوئی ہوں گی۔“ جارو نے تکتہ پیش کیا جسے سن کر وکی یوں سر ہلانے لگا جیسے پسندیدہ ترین کلام سن کر مردھن رہا ہو۔ یوسف نے بھی سمجھ لیا کہ گفتگو کا یہ سلسلہ رکنے والا نہیں اس لیے آداب میزبانی نبھاتے ہوئے انہیں ناشتے کے لوازمات پیش کرنے لگا۔ ہلکی پھلکی گپ شپ کے دوران آخر کار ناشتہ ختم ہی گیا۔ ناشتے کے بعد وہ لوگ ڈائننگ کے ساتھ ہی متصل سنگ، ایریا میں آ بیٹھے۔

”میرے کچھ ساتھی مجھ سے قبل بیجنگ پہنچ گئے تھے۔ کیا آپ ان کے بارے میں مجھے کچھ بتا سکتے ہیں؟ خاص طور پر یہ کہ ہماری ان سے ملاقات کب تک ممکن ہو سکے گی؟“ معاذ کا دھیان ناشتے کے دوران بھی بھٹکتا رہا تھا اس لیے اب مزید صبر نہیں کر سکا۔

”مجھے آپ کے ساتھیوں کے بارے میں آگاہ کیا گیا ہے۔ ان میں سے مس سونیاسے تو آپ فوری ملاقات نہیں کر سکیں گے البتہ باقی دو سے میں آج آپ کو بعد از نماز جمعہ ملوانے لے چلوں گا۔“

”نماز جمعہ.....؟“ اس کی بات سن کر ان تینوں کو ہی جھٹکا لگا۔ اتنے عرصے سے وہ جس بھاگ دوڑ میں وقت گزار رہے تھے، اس میں نماز کے لیے تو پھر بھی مہلت نکل آتی تھی لیکن اس طرح کی اجتماعی عبادات تو بالکل جھوٹ ہی مگنی تھیں۔

”جی، نماز جمعہ۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ آپ لوگ مسلمان ہیں تو اس لیے میں نے یہ پروگرام ترتیب دے لیا تھا۔ اگر

داری صرف آپ لوگوں کا خیال رکھنے کی ہے۔“ اس نے نرم لہجے میں انہیں آگاہ کیا اور شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ انہیں جو ناشا فراہم کیا گیا تھا، وہ اسی نے تیار کیا تھا اور ناشے کے جہ ڈش وائر میں برتنوں کی صفائی بھی اسی نے انجام دی تھی۔

”اور ہاں، ایک بات اور.....“ وہ جاتے جاتے رکا۔
”آپ میں سے کوئی بھی اکیلا باہر نکلنے کی غلطی نہ کرے۔ آپ سب غیر مقامی ہیں اور دوری سے الگ پہچانے جاتے ہیں۔ اگر کہیں بھی قانون نافذ کرنے والے اداروں میں سے کسی فرد نے روک لیا تو قانونی دستاویزات کی عدم موجودگی کے باعث آپ مشکل میں پڑ سکتے ہیں۔“ وہ تنبیہ کرنے کے بعد وہاں سے روانہ ہو گیا تو وہ تینوں ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے لگے۔

”کیا یہاں ہماری حیثیت قیدی کی ہے؟“ سب سے پہلے وکی نے لب کشائی کی۔

”میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ قیدیوں کو اتنی سہولیات کوئی نہیں دیتا۔“ جارو نے اس کی تردید کرتے ہوئے دلیل دی۔

”سنا ہے اے کلاس میں قیدیوں کو ساری سہولیات فراہم کی جاتی ہیں۔“ وکی کہتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کر باہر نکل گیا۔ ون یونٹ جھگڑے کے طرز پر بنا ہوا وہ گھر بہت زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس نے مین گیٹ جا کر چیک کیا تو پتا چلا کہ گیٹ لاک ہے اور وہ اپنی مرضی سے باہر نہیں جاسکتے۔ وہ تھوڑا تپا ہوا سالان کے درمیان داخل آیا۔

”میں نے کہا تھا کہ یہاں ہماری حیثیت اے کلاس قیدی کی ہے۔ موصوف جاتے ہوئے گیٹ لاک کر کے گئے ہیں اور گھر کی تعمیر اس نوعیت کی ہے کہ گیٹ کے سوا باہر جانے کا کوئی دوسرا راستہ موجود نہیں ہے۔“

”تمہیں جانا کہاں ہے جو اتنے بے چین ہو رہے ہو؟“ معاذ نے ٹھنڈے ٹھارے لہجے میں اس سے پوچھا تو وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

”جانا تو کہیں نہیں ہے لیکن پھر بھی اس طرح لاک کر کے جانا نسلٹنگ ہے۔“ اس نے منہ بنا کر جواب دیا اور جادو کے برابر میں دھپ سے بیٹھ گیا۔ جادو اس کے مقابلے میں پرسکون تھا اور اب تک ایک بار بھی نہ تو کسی چیز پر اعتراض کیا تھا نہ ہی ٹھک دھبے کا اظہار۔

”انسٹنٹک.....!“ معاذ اس کے الفاظ کے انتخاب پر ہنسا۔

”تم تو یوں کہہ رہے ہو جیسے پاکستان سے کسی سفارتی

آپ لوگ اسے پسند نہیں کرتے تو میں پروگرام میں آپ کی حسبِ منشا تبدیلی کر دوں گا لیکن یہ واضح رہے کہ نماز کے اوقات میں آپ کو میری خدمات دستیاب نہیں ہوں گی۔“ یوسف نے اس کے انداز سے کوئی اور ہی نتیجہ اخذ کر لیا۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے میرے بھائی! میں تو بس اس لیے ٹھنک گیا تھا کہ کافی طویل عرصے بعد ہمیں یہ موقع ملنے جا رہا ہے کہ ہم باقاعدہ نماز جمعہ ادا کرنے کی سعادت حاصل کر سکیں گے۔“ معاذ نے اسے وضاحت دی پھر فرمائشی لہجے میں بولا۔

”کیا یہ ممکن ہے کہ ہم نماز جمعہ مسجد نیوجیہ میں ادا کر سکیں؟“

”بالکل، آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ ہم نماز کے لیے مسجد نیوجیہ ہی جانے والے ہیں لیکن وہاں تک جانے کے لیے آپ لوگوں کو کافی پہلے تیار ہونا پڑے گا۔ مسجد یہاں سے لگ بھگ ایک گھنٹے کے فاصلے پر ہے اور میں چاہوں گا کہ ہم نماز سے قبل وہاں قائم فوڈ اسٹریٹ کے کسی ریستورانٹ میں لچ کریں۔ وہاں کئی اچھے حلال فوڈز کے ریستورانٹ بھی موجود ہیں جہاں سے چاہیں تو پاکستانی اور ہندوستانی کھانا بھی مل سکتا ہے۔“ یوسف نے پوری تفصیل سے آگاہ کیا۔

”قرمت کرو۔ ہم بالکل وقت پر تیار ہو جائیں گے۔“ معاذ نے اسے یقین دہانی کروائی اور تائیدی نظروں سے اپنے ساتھیوں کو دیکھا۔

”کیوں نہیں۔ ہم اس موقع کو ہرگز بھی ضائع کرنا پسند نہیں کریں گے۔“ وکی نے جلدی سے کہا جبکہ جادو نے محض تائید میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

”اس وقت تک آپ لوگ چاہیں تو آرام کریں یا پھر ٹی وی وغیرہ دیکھ کر وقت گزار لیں۔ مجھے اس دوران کچھ دوسرے کام انجام دینا ہیں اس لیے اس عرصے میں، میں آپ کی خدمت سے معذور ہوں گا۔“ یوسف نے معذرت خواہانہ لہجے میں انہیں بتایا۔

”اس کا کوئی مسئلہ نہیں لیکن کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اگر میں مسٹر شین یا ہی یا یوان منگ سے رابطہ کرنا چاہوں تو اس کا کیا ذریعہ ہوگا؟“ اسے اور اس کے ساتھیوں کو چین تو لے آیا گیا تھا لیکن ابھی تک یہ واضح نہیں تھا کہ ان کی یہاں آمد کا کیا مقصد تھا اس لیے وہ اس سلسلے میں کسی ذمے دار سے دو لوگ بات کرنا چاہتا تھا۔

”ان میں سے جو آپ سے بات کرنے کی ضرورت محسوس کرے گا، خود آپ سے رابطہ کر لے گا۔ میری ذمے

وفد کے ساتھ چین آئے ہو اور تمہیں حسب مرتبہ پروٹوکول نہ دیا جا رہا ہو۔“

”آپ بھی نا.....“ وہی اس کی بات پر جھینپ گیا۔ بعد کا سارا وقت پھر سکون سے گزرا۔ معاذ نے یہ سارا وقت اپنے لیے فراہم کردہ کمرے میں گزارا۔ کرنے کے لیے اس کے پاس بھی کچھ نہیں تھا اس لیے ماضی کو دہراتا رہا اور غور کرتا رہا کہ اس سے کہاں کہاں اور کون کون سی غلطی ہوئی ہے۔ اس سارے حساب کتاب میں اچھا خاصا وقت گزر گیا پھر اس نے اٹھ کر نماز کے لیے تیاری شروع کر دی۔ ملبوسات کے بارے میں رات ہی یوسف نے بتا دیا تھا کہ ان میں سے ہر ایک کے سائز کے لباس ان کے کمروں کی وارڈروب میں موجود ہیں۔ اس نے الماری کھول کر دیکھی تو استری شدہ دو تین جوڑے الماری میں ٹنگے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک جوڑا ہلکے نیلے رنگ کی شلوار قمیص کا بھی تھا۔ اس نے وہی منتخب کیا اور غسل کے لیے چلا گیا۔ پورے اطمینان سے نماز کے لیے تیاری کرنے کا موقع عرصے بعد اس کی زندگی میں آیا تھا۔ اس ساری الجھن میں پڑنے سے پہلے بھی وہ اپنی روزمرہ کی مصروفیت میں اتنا مگن رہتا تھا کہ اس طرح اہتمام کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ ہاں عیدین پر امی اتنی محبت سے ساری تیاری کرتی تھیں کہ وہ بھی اپنی بے پروائی چھوڑ کر ان کے حکم کی تعمیل میں اچھی طرح تیار ہو کر ابو اور سعد کے ساتھ نماز عید کے لیے چلا جاتا تھا۔

عید کے دن کی یاد کے ساتھ ہی یادوں کی ایک برات سی اتر آئی۔ عید کے دن کی رونق، امی کے ہاتھ کے تیار کردہ لذیذ پکوان، علیینہ کی لباس سے لے کر چوڑی، چپل اور مہندی تک ایک ایک شے کے لیے فکر مندی، ابو کی طرف سے بغیر مطالبہ کیے بھاری عیدی کی ادائیگی، دن بھر مہمانوں کی آمد و رفت..... اور نہ جانے کیا کیا تھا جو یاد آنا شروع ہوا تو آتا چلا گیا اور پھر یوسف کی واپسی پر ہی یہ سلسلہ ٹوٹ سکا۔

”بہت اچھی بات ہے کہ آپ لوگ پہلے ہی سے تیار ہیں۔ اب ہمیں چلنا چاہیے۔“ وہ ان تینوں کو تیار پا کر خوش ہو گیا۔ خود وہ صبح سے ہی تک سب سے تیار تھا۔ اس لیے اسے کسی قسم کی تیاری کی ضرورت نہیں تھی۔ ایک آرام دہ گاڑی میں ان کے سفر کا آغاز ہوا۔ گاڑی یوسف خود ڈرائیو کر رہا تھا۔ سڑکوں پر ان کی گاڑی کے ساتھ ساتھ چھوٹی بڑی بے شمار گاڑیوں کا سیلاب بہہ رہا تھا اس کے باوجود سائیکل سواروں کے لیے الگ سے ٹریک موجود تھا۔ راستے میں یوسف ان کی مختلف مقامات کے بارے میں بتاتا رہا۔

”مسجد نیوجیہ ڈوان دو کے علاقے میں ہے۔ اس علاقے میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو وہاں جا کر اپنایت کا احساس ہوگا۔“ یوسف نے انہیں بتایا تو وہ سر ہلا کر رہ گئے۔ اچھا خاصا طویل فاصلہ طے کر کے وہ ڈوان دو کے علاقے میں داخل ہوئے تو یوسف سیدھا انہیں اس جگہ لے گیا جہاں مختلف ریسٹورنٹس اور کھانے پینے کی دکانوں کی وجہ سے فوڈ اسٹریٹ کا سماں تھا۔ یوسف نے گاڑی جس ریسٹوران کے آگے روکی، اس پر آویزاں ہوٹل کے نام کے بورڈ پر ایک جانب عربی زبان میں ”مؤتمر اسلامی“ لکھا ہوا تھا جس کا مطلب تھا کہ مسلمان اس ریسٹورنٹ میں بلا تہجک حلال کھانا کھا سکتے ہیں۔ ریسٹورنٹ میں اطمینان سے خوش ذائقہ کھانا تناول کرنے کے بعد انہوں نے مسجد نیوجیہ کا رخ کیا اور یوسف ایک اچھے میزبان کی طرح انہیں مسجد کے بارے میں معلومات فراہم کرنے لگا۔ اس نے بتایا۔

”مسجد نیوجیہ کی بنیاد 996ء میں ایک عرب عالم نصرتین نے رکھی تھی۔ اس وقت سے اب تک چین میں مختلف افراد کی حکمرانی رہی اور متعدد بار مسجد کی تعمیر اور تزئین و آرائش کا کام سرکاری خرچ پر ہوا۔ یہاں تک کہ جمہوریہ چین کے قیام کے بعد بھی تین بار مسجد کی بھرپور تزئین و آرائش کا کام ہو چکا ہے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ چینی حکمران ہر دور میں روشن خیال تھے اور مذہبی رواداری و آزادی کا خیال رکھتے تھے۔“ وہی نے اس کی بات سن کر تبصرہ کیا۔ جب سے وہ رہائش گاہ سے نکلے تھے، گفتگو کی زیادہ ذمہ داری اسی نے سنبھال رکھی تھی کیونکہ وہ دیکھ رہا تھا کہ معاذ پر عجیب سی کیفیت طاری ہے اور وہ بولنے کے موڈ میں نہیں ہے۔ چارو ویسے ہی کم کم بولتا تھا تو اسے ہی اخلاقیات نبھانی پڑ رہی تھی۔

”ہم چینی عمومی طور پر روشن خیال لوگ ہیں اور کسی بھی انسان سے محض مذہب کی بنیاد پر نفرت نہیں کرتے۔“ یوسف نے تاخیرانہ لہجے میں اس کے سوال کا جواب دیا۔ وہ اپنے اس دعوے میں کتنا درست تھا، اسے پرکھنے کا تو موقع نہیں تھا لیکن یہ بات قابل قدر تھی کہ اسے اپنے چینی ہونے پر فخر تھا اور وہ اپنے ہم وطنوں کے لیے بھی مثبت سوچ رکھتا تھا ورنہ پاکستانیوں کی عمومی کیفیت تو یہ ہے کہ وطن کے مستقبل سے ناامید ہیں اور ہم وطنوں کو ملک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ ان کے کردار و اخلاق میں کچھ ٹھیک نہیں ہے۔

”مذہب کی بنیاد پر کسی سے نفرت کرنا صحت مندانہ

لیے دعا مانگتا چلا گیا اور دعا مانگتے مانگتے میرا دل ٹھہر سا گیا۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسے اب علیہ ٹھیک ہو۔ اسی لیے میں کہہ رہا ہوں کہ اگر کہیں کچھ غلط تھا بھی تو ٹھیک ہو گیا ہے۔“ اس کی بتائی تفصیل نے معاذ کو دم بخود کر دیا اور وہ سکتہ زدہ سا اس کی طرف دیکھتا رہا۔

”میرے ساتھ بھی ابھی ایسا ہی کچھ ہوا تھا۔ دعا مانگتے ہوئے علیہ کا چہرہ بار بار میری نظروں کے سامنے آ رہا تھا تو میں نے اس کے لیے خصوصی دعا مانگی۔“ سب کا نام حذف کر کے اس نے وہی کے ساتھ خود پر ہتی کا اشتراک کیا۔

”ہم دو افراد کا بیک وقت ایک جیسی کیفیت سے دو چار ہونا ظاہر کر رہا ہے کہ معاملہ صرف وہم کا نہیں ہے۔ کچھ نہ کچھ تھا جس نے ہم دونوں کو علیہ کی طرف سے تشویش میں مبتلا کیا اور ہمارے دل اس کے لیے خصوصی دعا مانگنے پر مائل ہوئے۔“

”کیا وہ کسی مصیبت میں ہے؟“ وہ وہی کا تجزیہ سن کر ڈر گیا۔

”میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ وہ جس مشکل یا تکلیف میں تھی، اس سے نکل گئی ہے۔ آپ نے سنا ہو گا نا کہ دعا مومن کا ہتھیار ہے اور یہ بھی کہ دعا انسان پر آنے والی مصیبت کی راہ میں حائل ہو کر اسے ٹال دیتی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ علیہ کو بھی میری اور آپ کی دعاؤں نے مشکل سے نکال لیا ہے اور اب وہ بالکل ٹھیک ہے۔“ وہی بہت مطمئن تھا۔

”کہیں ایسا تو نہیں کہ دشمنوں کو اس کی کوئی بھٹک پڑ گئی ہو؟“ معاذ اب بھی تشویش محسوس کر رہا تھا۔

”ان شاء اللہ ایسی کوئی بات نہیں ہوگی بلکہ شاید کوئی خوشی کی خبر ہو۔“ وہی کے چہرے پر چمک سی آگئی۔

”خوشی کی خبر.....؟“ معاذ کو اس کی ذہنی حالت پر شک ہوا۔

”وہ ایک سپیکٹ کر رہی تھی۔ مجھے لگتا ہے اللہ نے اسے وقتی تکلیف سے گزار کر خوشی سے نوازا ہے۔“ وہی نے کچھ شرمائے ہوئے سے انداز میں اپنی بات کی وضاحت کی تو معاذ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”کیا سچ سچ.....؟“ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ علیہ جو ابھی تک اس کے لیے خود بخود تھی، کسی بچے کی ماں بن چکی ہوگی۔

”مان لیں معاذ بھائی کہ ان شاء اللہ العزیز آپ ماموں جان بن چکے ہیں۔“ وہی کو اس کی بے یقینی پر ہنسی آنے لگی تھی۔

رجحان ہے بھی نہیں۔ انسان کو صرف اس کے ذاتی کردار کی بنیاد پر پرکھنا چاہیے۔ اگر کوئی انسان دوسرے انسانوں کے لیے ضرر رساں نہیں ہے اور کسی بھی بنیاد پر ان کے جذبات کو ٹھیس نہیں پہنچاتا ہے تو ہمیں بھی اس کی چھوٹی موٹی خامیوں سے صرف نظر کرنا چاہیے۔“ وہی نے یوسف کی تائید میں اظہار خیال کیا تو وہ خوش ہو گیا۔

باتوں باتوں میں وہ مسجد پہنچ گئے تو یہ دیکھ کر سب کو خوشی ہوئی کہ وہاں اچھی خاصی رونق تھی اور چینی مسلمانوں کی خاصی تعداد مسجد میں آئی ہوئی تھی۔ ان میں عورتیں بھی تھیں جن کے لیے مسجد میں ایک الگ حصہ مقرر تھا۔ مسجد چینی اور اسلامی طرز تعمیر کا ملاپ تھی اور اس میں ایک عدد میوزیم بھی تھا جس میں مسجد سے متعلق نوادرات رکھے گئے تھے۔ چونکہ خطبہ شروع ہونے والا تھا تو طے پایا کہ میوزیم بعد از نماز دیکھا جائے گا۔

نماز کے بعد دعا کا مرحلہ آیا تو معاذ نے اپنا دل بھاری ہوتا محسوس کیا۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو اپنے سارے پیاروں کی شبیہات ایک ایک کر کے آنکھوں کے سامنے آنے لگیں۔ خصوصاً علیہ اور سبیل کے لیے اس کا دل کچھ زیادہ ہی تڑپ رہا تھا۔ وہ ان دونوں کے لیے بہت دیر تک خصوصی دعائیں مانگتا رہا۔ دعا سے فارغ ہو کر دیکھا تو نمازیوں کی اکثریت جا چکی تھی۔ جارو اور یوسف ایک جانب بیٹھے ان کے منتظر تھے جبکہ وہی اس کے برابر میں بیٹھا اب بھی دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے دعا میں مصروف تھا۔ وہ دعا سے فارغ ہوا تو معاذ نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی اور غیر معمولی سرخی ہے۔

”کیا بات ہے وقاص! تم ٹھیک تو ہو؟“ اس نے وہی کے شانے پر ہاتھ رکھ کر فکر مندی سے پوچھا۔

”جی، سب ٹھیک ہے۔ اگر کہیں کچھ غلط تھا بھی تو مجھے یقین ہے کہ اب ٹھیک ہو گیا ہوگا۔“ وہ نم آنکھوں کے ساتھ مسکرایا۔

”میں کچھ سمجھا نہیں۔ تھوڑی دیر پہلے تم بالکل ٹھیک تھے لیکن اب تمہاری آنکھیں اور تاثرات دیکھ کر لگتا ہے کہ تم کسی بڑے کرب سے گزر رہے ہو۔“ وہ وہی کے جواب سے مطمئن نہ ہو سکا اور جواب پر اصرار کیا تو وہی نے بھی ہتھیار ڈال دیے اور بتانے لگا۔

”مجھے اچانک ہی بے چینی محسوس ہونے لگی تھی اور بار بار علیہ کا چہرہ نظروں کے سامنے آ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ شدید تکلیف میں مبتلا ہو۔ اسی لیے میں نے جب دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے تو بس دل کی گہرائیوں سے اسی کے

”اللہ تمہارے وجدان کو سچ ثابت کرے۔ میرا تو دل چل رہا ہے کہ کسی طرح اڑ کر پاکستان پہنچوں اور اس خوشی کو مجسم اپنی آنکھوں سے دیکھ سکوں۔“ وہ اتنا پرجوش ہوا کہ دکی کو گلے لگا لیا۔ دکی کے چہرے پر بھی ایک روشن مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”یہ آپ دونوں نے دن دھاڑے کون ساعید کا چاند دیکھ لیا ہے جس کی خوشی میں یوں ایک دوسرے سے گلے ملا جا رہا ہے۔“ جارو اور یوسف ان سے بہت پہلے نماز سے فارغ ہو کر ان دونوں کے انتظار میں ایک جانب بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں طویل دعا کے بعد ایک دوسرے سے گفتگو میں مصروف ہو گئے تو انہوں نے مداخلت مناسب نہ سمجھی اور دور بیٹھے ان کے فارغ ہونے کا انتظار کرتے رہے لیکن ان دونوں کو خوشی خوشی ایک دوسرے سے گلے ملتے دیکھا تو جارو سے مزید برداشت نہیں ہوا اور اٹھ کر ان کے قریب آ گیا۔

”خوش ہونے کے لیے عید کا چاند نظر آنا ضروری تو نہیں ہے۔ کبھی کبھی دل کو ملنے والے کسی خوش کن اشارے پر بھی انسان خوش ہو جاتا ہے۔“ معاذ کو معلوم تھا کہ بے شک وہ دور کی آوازیں سن لینے پر بھی قادر ہے لیکن اس نے اخلاقاں کی گفتگو کا کوئی لفظ نہیں سنا ہوگا۔

”میں سمجھا نہیں۔“ اس کے جواب نے جارو کی الجھن دور نہیں کی۔

”یہ معرفت کی باتیں ہیں میاں جارو! ان کو سمجھنے کے لیے بڑے چلے کاٹنے پڑتے ہیں اس لیے ابھی آپ اس بات کو چھوڑیں اور مسٹر یوسف مافوسائی کے پاس چلیں جو ہمارے انتظار میں سوکھتے جا رہے ہیں۔“ جو کچھ تھا، اس کے دل کا وجدان تھا اس لیے دکی نے اسے کچھ بتانے کے بجائے ٹال دینا مناسب سمجھا۔ جارو نے بھی جواب حاصل کرنے پر اصرار نہ کیا۔

وہ نماز کے وسیع و عریض ہال سے باہر نکلے تو یوسف انہیں مسجد اور مسجد سے ملحقہ مختلف حصوں کی زیارت کروانے لگا۔ اس نے مسجد سے ملحق خانقاہ، درس گاہ، حمام و وضوخانہ اور پولیٹین وغیرہ دکھائے۔ ساتھ ساتھ وہ ان کے بارے میں کچھ نہ کچھ بتاتا بھی جا رہا تھا لیکن معاذ کی کیفیت میں دوبارہ ایک اضطراب سا پیدا ہو گیا تھا اور وہ ایک بار پھر چپ سا دھ کر بے دھیانی سے یوسف کی باتیں سن رہا تھا۔ سب سے آخر میں انہوں نے میوزیم کی سیر کی۔ یہاں مختلف ممالک کی جانب سے بھیجے گئے قرآنی نسخے اور دیگر نوادرات محفوظ کیے گئے تھے۔ یوسف ان کی تفصیل بتاتے

ہوئے بہت شوق سے بتانے لگا۔

”حکومت چین 1988ء میں مسجد نیوجیہ کو اہم ثقافتی ورثہ قرار دے کر اسے اپنی نگہداشت اور تحفظ میں لے چکی ہے اور آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ یہاں کا سارا نظام کتنی خوبصورتی سے جاری و ساری ہے۔“

”آپ کے ہاں تو ہر شعبے کا نظام ہی بہت خوب ہے۔ پاکستان کے بعد قائم ہونے کے باوجود چین نے جو حیرت انگیز ترقی کی ہے، وہ پوری دنیا کے لیے ایک مثال ہے۔“ دکی نے مرعوبیت سے تھرہ کیا۔

”یہ صرف اس لیے ہے کہ ہم نے اپنے وطن سے زبانی محبت کے دعوے کرنے کے بجائے عملی طور پر انتھک محنت کر کے اس محبت کو ثابت کیا ہے۔“ یوسف کے لہجے میں وہ فخر تھا جو کسی بھی زندہ قوم کے فرد میں ہو سکتا ہے۔ وہ انہیں جتنا نہیں رہا تھا لیکن شرمندگی تو بہر حال محسوس ہو رہی تھی کہ اپنے جس واحد پڑوسی سے ہم بے حد محبت اور انسیت کے دعویدار ہیں، ان سے ہم نے یہ تک نہیں سیکھا کہ وطن کی محبت کے کیا تقاضے ہوتے ہیں۔ وطن صرف گولی کھا کر سینے سے ابلتا لہو نہیں مانگتا، یہ خون جگر بھی مانگتا ہے۔ محبت صرف جان دینے سے ثابت نہیں ہوتی۔ اسے ثابت کرنے کے لیے اپنی پوری جان بھی لگانا پڑتی ہے۔ چینوں نے یہی کیا تھا۔ انہوں نے اپنے وطن کی تعمیر کے لیے اپنی پوری جان لگا دی تھی۔

”ہم اسپتال کب چلیں گے؟“ معاذ جو پہلے ہی بے چین تھا، اس شرمندگی کو سہار نہ سکا اور بے تابی سے پوچھا۔

”شیڈول کے مطابق ہمیں یہاں سے سیدھا وہیں جانا تھا لیکن میرے پاس مسٹریوان منگ کا پیغام آیا ہے۔ ان کی خواہش ہے کہ اسپتال جانے سے پہلے آپ ان سے ملاقات کر لیں۔ بہت ممکن ہے کہ اس ملاقات میں مسٹر شین یا بی بھی شامل ہوں۔“ یوسف نے رمان سے اسے بتایا۔

”کیا اس میٹنگ میں میرے ساتھی بھی شامل ہوں گے؟“ وہ کچھ بے آرام سا ہوا۔

”مجھے صرف آپ کے حوالے سے پیغام ملا ہے۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے ساتھی بھی اس موقع پر آپ کے ساتھ موجود ہوں؟“ یوسف نے بتانے کے ساتھ ہی پوچھا۔

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نوجوان
کس داستان جو غلط کاروں کے لیے غضب
ناک تھا باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیے



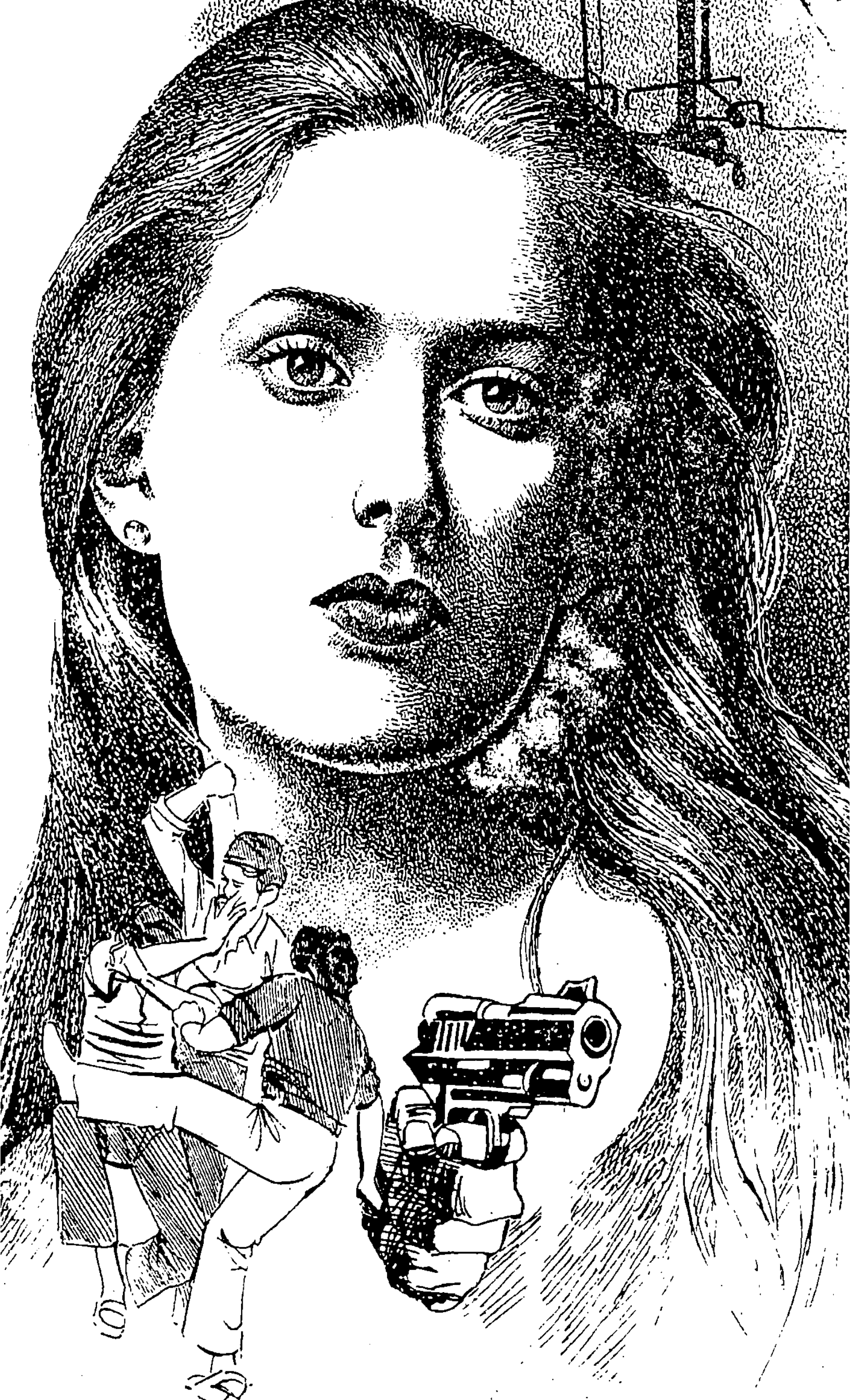
قسط نمبر: 39

شہزادہ زولایا

اسماء قاری

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں عداوت نہ ہو۔ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تند و تیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر باتھوں نے اسے ناقابل شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف غم بغاوت بلند کرنے والے س پُر عزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جا رہے تھے... اس کی زندگی جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... یہ خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتا رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی یہ قرار یوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تار عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ وارداتِ قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہو سکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تھرا نگیز داستان



معاذ ایک ذہین لیکن متلون مزاج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جوائن کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ انسٹی ٹیوٹ سے واپس آ رہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو سڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی نڈر فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشری نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بشری ماس کمیونی کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم وغیرہ لکھتی ہے۔ اس دوران جگہ بھی وہ ایک زیر تعمیر رہائشی منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی آئی تھی۔ معاذ بشری کو بہ حفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کر دیتا ہے لیکن جن رئیس زادوں سے اس نے ان کا شکار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ایک دن جنگل کی سیر کے دوران وہ فوٹو گرافی کے شوق میں سب سے الگ تھلک ہو جانے والے معاذ کو بے خبری میں گھیر کر بری طرح زد و کوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دے دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس نہ آنے پر انتظامیہ کے افراد، پولیس اور ریسکیو ذرائع کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جوگی کی جھونپڑی میں پاتا ہے۔ جوگی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے، جوگی بھی اسے پسند کرتے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نواز کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے پراسرار علم سکھانے کی ہامی بھر لیتا ہے اور معاذ اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ادھر جائے وقوعہ سے ملنے والے معاذ کے کمرے سے جب تصویریں نکلوائی جاتی ہیں تو ایک ایسی تصویر بشری کی نظر میں آ جاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پروجیکٹ کے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشری تحقیق کر رہی تھی۔ بشری کے اپنے والد جرنلسٹ ہوتے ہیں۔ اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشری کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ مدد سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باذل نامی غنڈے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشری انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دنوں میں ہی معاذ واپس کا ارادہ کرتا ہے تاہم ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا عرفان اللہ اور یزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو دقاص نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باذل اچانک بشری کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر دیتا ہے۔ معاذ کو واپس لانے کے لیے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اسے واپس آنے کا پیغام دیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کر کے اسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات، نہ بتانے پر اس کے بھائی کا ایک گروہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشری بھی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہو جاتی ہے۔ معاذ کے دوست عالم شاہ کے بہنوئی کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ کئی فنون میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے پہنانا سز کر کے اس کے دماغ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ فیضو سے حاصل انوکھے علم کی بدولت ان کا معمول نہیں بنتا۔ عالم شاہ اور اس کا نوکر سرد، باذل کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ عالم کی بہن سبیل شاہ کے نومولود بیٹے کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اغوا کا الزام لطیف سومرو پر آتا ہے۔ عالم شاہ، باذل کی قید میں موجود ایک زخمی شخص کی مدد سے وہاں سے فرار ہو جاتا ہے۔ ادھر بشری دعئی پہنچ جاتی ہے۔ وہاں دقاص اسے باربی کے روپ میں پہچان لیتا ہے۔ وہ سلطان کو مارنا چاہتی ہے تاہم دقاص اسے ایسا کرنے سے روکتا ہے۔ ادھر عالم شاہ، باذل کی قید سے نکل کر اس کا پیچھا کرتا ہے۔ وہ وہاں معاذ کو دیکھتا ہے۔ صداقت شاہ، لطیف سومرو کو گھیرنے کے لیے اس کی خفیہ بیوی اور بچے کا کھوج لگاتے ہیں اور بچے کو اغوا کر لیتے ہیں۔ لطیف سومرو مجبور ہو جاتا ہے۔ معاذ کو اس کے گھر والوں سے ملنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ وہ ایک مشن پر سونیا کے ساتھ انڈیا روانہ ہوتا ہے تاہم کچھ لوگ سکھ یا تریوں سے بھری بس کو یرغمال بنا لیتے ہیں۔ معاذ اور سونیا خانے کے تمام افراد کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔ صداقت شاہ کے انڈیا میں موجود رشتے دار کے ہاں شادی ہوتی ہے۔ عالم شاہ، سبیل اور سرد انڈیا روانہ ہو جاتے ہیں۔ اتر پورٹ سے گھر روانگی پر راستے میں کچھ لٹیرے انہیں لوٹ لیتے ہیں۔ عالم شاہ ایکشن میں آنا چاہتا ہے تاہم اجالا نامی عالم شاہ کی کزن اس کا راستہ روک لیتی ہے۔ گھر پہنچنے پر پولیس کی ریڈ ہوتی ہے اور وہ عالم شاہ اور سرد کو لے جاتے ہیں۔ ادھر بشری اور دقاص باذل کو اسپتال میں مارنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ فوج جاتا ہے۔ معاذ اور سونیا اپنے سہولت کاروں سے مل جاتے ہیں۔ عالم شاہ اور سرد کو تشدد کا نشانہ بنا کر ویرانے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ واپس اپنے میزبانوں کے ہاں پہنچ جاتے ہیں۔ شادی کے دوران انہیں پتا لگتا ہے کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں اجالا اور اس کا عاشق شامل ہوتے ہیں۔ وہ چھپ کر ان کی باتیں سن رہا ہوتا ہے کہ اسے چھاپ لیا جاتا ہے۔ تاہم وہاں مارا ماری ہوتی ہے اور اجالا کا عاشق مارا جاتا ہے۔ پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ ان کے کزن

انہیں اپنے دوسرے خفیہ ہنگامے پر پہنچا دیتے ہیں جہاں کچھ لوگ ان پر حملہ کر دیتے ہیں۔ وہ وہاں سے بھگت لگ جاتے ہیں۔ ادھر معاذ کو سونیا اپنے ساتھ نئے مشن پر لے کر جاتی ہے جس میں ایک ریلوے لائن کو دھماکے سے اڑانا ہوتا ہے۔ معاذ ایسا نہیں چاہتا اس لیے وہ ٹرین کی آمد سے قبل بارودی دھماکا کر دیتا ہے۔ وہ زخمی ہو جاتا ہے اور اسے ہندو سادھو اپنی کنیٹھا میں لے جاتا ہے جہاں اس کی اچھی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ سونیا کے آدمی معاذ کو تلاش کرتے ہیں مگر ناکام ہو جاتے ہیں۔ ادھر عالم شاہ اور سرد خدیوہ ریلوے سے بارڈر پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ دھر لیے جاتے ہیں اور ”را“ کی قید میں پہنچ جاتے ہیں۔ ادھر بشری باؤل کو مارنے کی کوشش میں خود نشانہ بن جاتی ہے۔ معاذ سادھو کی مدد سے ایک انڈین ہیروئن کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ وہیں اسے عالم اور سرد کی گرفتاری کا پتا چلتا ہے۔ معاذ ڈاکٹر فردوس سے ملتا ہے اور اسے سہل کی مدد کرنے کا کہتا ہے۔ عالم اور سرد قید سے فرار کا سوچتے ہیں اور دھر لیے جاتے ہیں۔ علیہ اور وقاص وغیرہ کو لالہ عیسیٰ ملک سے باہر نکال دیتا ہے اور ہر ممکن احتیاط کی ہدایت کرتا ہے لیکن علیہ پاکستان میں ٹوبہ سے رابطہ کرتی ہے جو ان کے لیے مصیبت بن جاتا ہے۔ ٹوبہ پر تیزاب پھینک دیا جاتا ہے۔ وقاص، علیہ اور ان کے گھر والوں کو مار دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس معاذ کو دیوانامی شخص سے مدد لینے کا کہتی ہے۔ معاذ اپنے کزن کو پاکستان کال کرتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ اس کے گھر والوں کو مار دیا گیا ہے۔ وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کی ٹھان لیتا ہے۔ ادھر ڈاکٹر فردوس کو اس کے سسرال والے سہل کو بھگانے کی پاداش میں تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ معاذ، عالم اور سرد کی رہائی کے لیے کارروائی کرتا ہے اور انہیں ”را“ کی قید سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن عالم اور سرد کو دیوانامی شخص نے قتل کر دیا ہے۔ سونیا معاذ کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ ادھر باؤل ایک جگہ لالہ عیسیٰ کی موجودگی پر کارروائی کرتا ہے تاہم لالہ خود کو گولی مار کر ختم کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس کا انتقال ہو جاتا ہے۔ دیوانامی ڈاکٹر فردوس کی میت اٹھنے پر وہاں فائرنگ کر دیتے ہیں۔ پولیس دیوانامی گھیر لیتی ہے۔ معاذ دیوانامی شخص کے آدمیوں کو نکالنے کے عوض عالم کا پتا معلوم کر لیتا ہے۔ سونیا اور معاذ حیدر آباد نواب بدرالدین کی حویلی پہنچ جاتے ہیں۔ تاہم کالے خان اور رادھا دیوی کو میڈم ایکس کے کھنچے سے چھڑانے کے لیے انہیں واپس آنا پڑتا ہے، کالے خان کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ نواب صاحب کی حویلی میں عالم اور سرد کی رہائی کے لیے کارروائی کر کے انہیں رہا کر لیتا ہے۔ وہ لوگ نئے ٹھکانے پر پہنچتے ہیں تو وہاں معاذ سے ملنے جا روٹا میٹھی آتا ہے۔ اسے معاذ نے ”را“ کی قید سے نکالا ہوتا ہے۔ جارو اور معاذ، سہل سمیت اسپتال جاتے ہیں اور پہچان لیے جانے پر پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ پولیس سے مقابلے کے بعد وہ ایک بستی میں پناہ کے لیے گھس جاتے ہیں اور دو لوگوں کو گرفتار بنا کر ان کی جموہوری میں قیام کرتے ہیں۔ ادھر سونیا معاذ کی تلاش میں نکلتی ہے اور اسے بستی میں پہنچنے پر معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ معاذ اور جارو وغیرہ انوپ نامی شخص کے ساتھ اس کے مالک کے ہنگامے میں قیام کرتے ہیں۔ سونیا بھی معلومات حاصل کرتی ہوئی مذکورہ ہنگامے تک پہنچ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور سرد بھی سونیا کا پیچھا کرتے ہوئے وہیں پہنچ جاتے ہیں۔ ادھر وقاص، علیہ و دیگر لوگ زندہ ہوتے ہیں۔ وقاص علیہ بدل کر گلوکا باؤی گارڈ بن جاتا ہے۔ وہ معاذ کو تلاش کرنے کے لیے انڈیا روانہ ہوتا ہے۔ وہاں اس کی گل خان سے ملاقات ہوتی ہے اور معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ سونیا، معاذ اور دیگر ساتھیوں سے مل جاتی ہے تاہم وہ جس ہنگامے میں ہوتے ہیں وہ دشمن کا ہوتا ہے۔ دشمن سب کو بے ہوش کر کے کہیں لے جا رہے ہوتے ہیں کہ ان کی گاڑی کو حادثہ پیش آ جاتا ہے۔ ان سب کو چینی بھکشو طبی امداد دیتے ہیں اور ان سے پوچھ گچھ کی جاتی ہے۔ سہل کی حالت تشویشناک ہوتی ہے اور اسے وہاں موجود ایک وید دیکھتا ہے۔ ادھر لالہ واپس اپنے لوگوں میں پہنچ کر ایکشن میں آ جاتا ہے اور حامد کو اغوا کر لیتا ہے۔ لالہ میڈم ایکس کے ٹھکانے کی نگرانی کر دیتا ہے۔ باؤل، معاذ وغیرہ کے ٹھکانے سے باخبر ہو جاتا ہے۔ ادھر لالہ کے آدمی میڈم ایکس کی نگرانی کے چکر میں مارے جاتے ہیں۔ لالہ اپنے آدمیوں کو انڈیا رگراؤنڈ کر دیتا ہے۔ معاذ وغیرہ جہاں ہوتے ہیں وہاں دشمن حملہ کر دیتا ہے اور کافی مارا ماری ہوتی ہے۔ باؤل، معاذ کا پیچھا کرتا ہے اور چینیوں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ معاذ چینیوں کے ساتھ مل کر دشمنوں کے خلاف کارروائی کرتا ہے۔ اس دوران اسے گل خان نظر آتا ہے۔ اسے پتا ناگزیر کیا گیا تھا۔ وہ لالہ نامی عورت کو بھی گرفت میں لے لیتے ہیں اور اسی سے معلومات لیتے ہیں۔ ادھر لالہ عیسیٰ، اعظم کو دشمن کی گرفت سے نکالنے کے لیے کارروائی کر دیتا ہے اور موسیٰ اور نیلی، اعظم کو نکالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ معاذ دشمنوں کے کیمپ پر حملہ کر کے وہاں قبضہ کر لیتا ہے۔ موسیٰ اور نیلی کی گاڑی پر حملہ ہوتا ہے تاہم مارا ماری کے بعد وہ صداقت شاہ کے پاس پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ لالہ عیسیٰ صداقت شاہ کو حویلی پر پڑکا جاتا ہے۔ صداقت شاہ اعظم کے محفوظ ٹھکانے کے لیے قربان شاہ کو فون کرتے ہیں۔ اعظم کو وہاں سے نکال لیا جاتا ہے اور دوسری جگہ منتقل کر دیا جاتا ہے۔ ادھر معاذ بیٹنگ پہنچ جاتا ہے اور جلد از جلد وہاں کے کرتا دھرتاؤں سے بات کرنے کا متمنی ہوتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیں

معاذ سہل کی بیماری کی وجہ سے جلد از جلد اسپتال پہنچنا چاہتا تھا اور اسی سلسلے میں چین میں موجود معاذ و دیگر کے معاون یوسف کے ساتھ ان کی گفتگو جاری تھی۔

”نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اس کے مقابلے میں آرام کرنے یا کوئی تفریحی فلم دیکھنے میں زیادہ خوش محسوس کریں گے۔“ معاذ کے جواب دینے سے سہل کی

بول پڑا۔ معاذ نے اسے تشکرانہ نظروں سے دیکھا۔ اسے آہستہ آہستہ اندازہ ہوتا جا رہا تھا کہ بظاہر وہ کی جتنا غیر سنجیدہ اور کھلنڈرا تھا، اندر سے اتنا ہی حساس اور معاملہ فہم بھی تھا۔
”ٹھیک ہے، جیسا آپ پسند کریں۔ ہم آپ دونوں کو ڈراپ کرتے ہوئے اپنی اگلی منزل کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔“ یوسف نے بنا کسی حیل و حجت کے آگے کا پروگرام ترتیب دے دیا۔

”ہماری طرف سے بھی سبیل جی کی خیریت معلوم کر لیجئے گا۔ ہم ان شاء اللہ اگلی بار ان کی مزاج پرسی کے لیے ساتھ چلیں گے۔“ وہی نے آگے کا پروگرام بھی واضح کر دیا کہ وہ لوگ نہ صرف میٹنگ بلکہ اسپتال کے دورے میں بھی ان کے ساتھ شامل نہیں ہوں گے۔ اس بار معاذ نے اسے ذرا غور سے دیکھا۔ کیا وہ کچھ سمجھ گیا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ سبیل سے اکیلے میں ملاقات کر سکے؟

وہی نے اس کا یوں غور سے دیکھنا محسوس کیا لیکن چہرے سے کچھ ظاہر نہ ہونے دیا اور ہونٹوں پر احمقانہ مسکراہٹ سجائے کھڑا رہا۔

”تو پھر چلیں۔“ یوسف کی مداخلت نے زیادہ غور کرنے کی مہلت بھی نہیں دی۔ پروگرام ترتیب پا چکا تھا چنانچہ وہ سب مسجد سے باہر نکلے اور یوسف کی میزبانی میں واپسی کا سفر شروع کیا۔ وہی اور چارو کو رہائش گاہ پر اتار کر وہ اپنی اگلی منزل کی طرف روانہ ہوئے۔

”مجھے اوزمیر سے ساتھیوں کو لاک لگا کر کیوں رکھا جا رہا ہے؟ کیا ہماری حیثیت قیدیوں کی ہے؟“ وہ یوسف کا ٹیٹ لاک کرنا ٹوٹ کر چکا تھا اس لیے اس بار خود کو سوال کرنے سے نہ روک سکا۔

”میں ملنے والی ہدایات پر عمل کرنے کا پابند ہوں البتہ آپ لوگوں کو دیے جانے والے پروٹوکول کو دیکھ کر یہ رائے دے سکتا ہوں کہ یہ صرف ایک احتیاطی تدبیر ہے۔“ یوسف کے نہایت رساں سے دیے گئے جواب کے بعد اس نے خاموشی اختیار کرنا ہی مناسب سمجھا۔ تقریباً پینتیس منٹ کے سفر کے بعد وہ اپنی منزل پر پہنچ چکے تھے۔ کثیر الحرمہ دفتری عمارت کے داخلی و خارجی راستے پر لوگوں کا آنا جانا لگا ہوا تھا۔ زیادہ تر کوتاہ قدمگر اسمارٹ اور فٹ چینی مرد اور عورتیں تھیں۔ کئی عورتوں نے مغربی لباس پہن رکھے تھے لیکن اپنے مخصوص نقوش اور انداز کے باعث مغربی عورتوں سے مختلف ہی دکھائی دے رہی تھیں۔ بالکل چینی کی گڑیاؤں سی نازک اور

ڈرکشش..... چینی مرد و زن کے درمیان کچھ غیر ملکی چہرے بھی الگ سے شناخت ہو رہے تھے۔ اسے ان میں اکاؤنٹا یا کستانی بھی دکھائی دیے۔ ان چہروں کی دید نے دل میں وطن کی یاد کی چمکی بھری لیکن صبر کے سوا چارہ ہی کیا تھا سو، دل پر صبر کا بھاری ہتھر رکھ کر یوسف کے سنگ شین یا ہی سے ملاقات کے لیے جا پہنچا۔

”مسٹر شین یا ہی سے تو آپ واقف ہی ہیں۔ ان سے ملیے، یہ ہیں میڈم زن ہو۔“

یوسف اسے ساتویں منزل کے جس دفتر میں لے کر گیا، وہاں شین یا ہی کے ساتھ ایک خاتون بھی موجود تھیں۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں، قدرے چھٹی ناک، پتلے ہونٹوں اور گوری رنگت والی اس بوٹے سے قد والی اسمارٹ خاتون کا تعارف کرواتے ہوئے یوسف کے لہجے میں حد درجہ احترام تھا۔

”تھینک یو مسٹر ما فو سائی! تم ویٹنگ روم میں انتظار کرو۔ جب تمہاری ضرورت محسوس ہوگی، میں تمہیں کال کر لوں گی۔“ عورت جس کی عمر معاذ کے اندازے کے مطابق پینتیس سے چالیس سال کے درمیان تھی، شستہ انگریزی میں یوسف سے مخاطب ہوئی۔

”جو حکم مادام!“ یوسف بنا حیل و حجت کے پلٹ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

”تشریف رکھیے مسٹر معاذ!“ وہ اپنے سیاہ ٹولڈر کٹ بالوں کو غیر ارادی طور پر دھیرے سے جھٹک کر معاذ سے مخاطب ہوئی تو اس نے خاموشی سے اس کے مقابل کرسی سنبھال لی۔ میز کی دوسری طرف میڈم زن ہو کے ساتھ ہی شین یا ہی بیٹھا ہوا تھا۔ زن ہو کے برابر بیٹھے ہونے کے باوجود وہ اس کے سامنے دبا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

”مجھے تمہارے متعلق تمام چھوٹی بڑی معلومات پہنچادی گئی ہیں۔ تمہاری تعلیم، خاندان، مشاغل، حالات زندگی اور یہاں تک پہنچنے کی ساری تفصیلات مجھے معلوم ہیں۔ ان ساری معلومات کی روشنی میں، میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ اگر میں تمہیں اپنے ساتھ مل کر کام کرنے کی پیشکش کروں تو تم انکار نہیں کرو گے۔“ وہ بہت رواں انگریزی اور پُر اعتماد لہجے میں اس سے مخاطب تھی۔

”آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟“ معاذ نے محتاط لہجے میں پوچھا۔

”وہ میں تمہیں بتاتی ہوں لیکن تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے چینی زبان کا جو ادھورا کورس کیا تھا، کیا اس میں سے کچھ

تمہارے ذہن میں ہے؟“

باتیں سیکھنا ہوں گی۔“

”مطلب میرے ساتھیوں کو بھی.....؟“

”یہ ضروری ہے۔ اس کے بغیر آپس میں یا ہم سے محفوظ رابطہ ممکن نہیں ہو پائے گا۔“ زن نے تصدیق کی۔
”اوکے۔ سمجھیں کہ ہم نے زبان سیکھ لی..... پھر اس کے بعد؟“

”اس کے بعد تم اسرائیل جاؤ گے۔“ زن نے اس کے سر پر دھماکا کیا۔

”کس لیے؟“ اس کی زبان سے سوال پھلا۔

”کیا تم نہیں جانا چاہتے؟ میرے خیال میں تو یہ تمہاری حب الوطنی کا بھی تقاضا ہے اور مسائل کا واحد حل بھی۔“ زن نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہ صرف اس سے جوابی سوال کیا بلکہ بتایا کہ یہ تو خود اس کی اپنی ضرورت ہے۔

”اوکے۔ میں مانتا ہوں کہ آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ اب یہ بتائیے کہ ہمیں وہاں کیا کرنا ہوگا اور ہم وہاں کیسے جائیں گے کیونکہ پاکستانی پاسپورٹ پر تو وہاں جانا کسی صورت ممکن نہیں ہے۔“

”سارے انتظامات ہمارے ذمے ہیں۔ تم بس ہمارا پلان سنو اور فیصلہ کرو کہ کیا تم اور تمہارے ساتھی خود کو خطرے میں جھونکنے کے لیے تیار ہو؟“ وہ اسے سمجھانے لگی کہ ان کا منصوبہ کیا ہے۔

”اس پر کام ہو سکتا ہے لیکن اس کے لیے سوینا سب سے بہترین ساتھی ثابت ہوگی۔ وہ اس خطے سے تعلق رکھتی ہے اور وہاں کے سارے مسائل کو بہتر طور پر ہینڈل کر سکتی ہے۔ عمومی طور پر بھی دیکھا جائے تو عورت کی موجودگی کسی کوشش کی زد سے دور رکھنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔“

”وہ ہماری قومی مجرم ہے اور بہت ممکن ہے کہ اس کے لیے اس ہفتے کے آخر تک کسی سخت سزا کا اعلان کر دیا جائے۔“ زن کے چہرے کے تاثرات سوینا کے ذکر پر سخت ہو گئے۔ شین یا ہی جوبلوں کو آپس میں پیوست کیے اب تک بالکل خاموش بیٹھا رہا تھا، اس موقع پر حرکت میں آیا اور جگ میں سے پانی انڈیل کر زن کے سامنے رکھا۔ وہ ایک سانس میں سارا پانی پی گئی۔

”کیا میں سوینا کے جرم کی نوعیت پوچھ سکتا ہوں؟“
”برسوں پہلے وہ یہاں ہونے والے ایک بم بلاسٹ کی ذمے دار ہے۔ اس نے اور اس کی ٹیم نے ایک ایسے

”جی، تھوڑا بہت۔“ اس نے شین یا ہی سے نظریں چراتے ہوئے جواب دیا۔ برف زار میں قیام کے عرصے میں اس نے اپنی چینی زبان سے معمولی واقفیت کو کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا تھا اس لیے اب شرمندہ ہو رہا تھا کہ وہ لوگ تو الف سے لے تک اس کے متعلق سب کھال کر بیٹھے ہوئے ہیں۔

”ہم تم سے جو کام لینا چاہتے ہیں اس کے لیے تمہیں چین کی ایک مخصوص زبان تھوڑی سی سیکھنا پڑے گی تاکہ کسی قسم کی پیغام رسانی میں افشائے راز کا خدشہ کم سے کم ہو۔“
”میں کوشش کروں گا۔“ اس نے جھپکتے ہوئے جواب دیا۔ کام کی نوعیت سامنے آئے بغیر وہ کسی قسم کا وعدہ کیسے کر سکتا تھا۔

”تم ذہین نوجوان ہو۔ اگرچہ وہ زبان کچھ مشکل ہے لیکن تم سیکھ جاؤ گے، وہ بھی بہت جلد۔“ زن نے اس کے اوپر اعتماد کا اظہار کیا۔

”وہ کون سی زبان ہے؟“

”نیو شیو..... یہ ایک نہایت قدیم زبان ہے جو چین کے بھی مخصوص حصے میں بولی جاتی تھی، وہ بھی صرف عورتوں کے درمیان۔“

”صرف عورتوں کے درمیان؟“ وہ حیران ہوا۔
”اسے تم ایک طرح کی خفیہ زبان سمجھ لو۔ یہ زبان ان شادی شدہ خواتین کی سہولت کے لیے ایجاد کی گئی تھی جو شادی ہو کر سرال چلی جاتی تھیں اور وہاں کے دکھ سکھ بیان کرنے کے لیے کوئی خفیہ ذریعہ چاہتی تھیں۔“ زن نے اسے تھوڑی سی وضاحت دی۔

”اوہ..... مجھے یاد آرہا ہے کہ میں نے اس سلسلے میں سرسری سا کوئی کالم پڑھا تھا۔ اس کالم کے مطابق تو وہ کوئی بہت مشکل زبان ہے جسے آج کل زندہ کرنے اور سیکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ میرے خیال میں ایسی صورت میں وہ زبان خفیہ پیغام رسانی کے لیے مفید ثابت نہیں ہوگی۔ دنیا کا کوئی نہ کوئی ماہر اسے ڈی کوڈ کر لے گا۔“

”یہ باتیں ہمارے بھی ذہن میں ہیں اور اس پر ہمارے ماہرین نے کام بھی کیا ہے۔ تم چونکہ اس زبان کے بارے میں جانتے ہو تو یہ بھی جانتے ہو گے کہ یہ عام بول چال کی زبان نہیں ہے۔ یہ صرف تحریری شکل میں علامات کے طور پر لکھی جاتی ہے۔ ہمارے ماہرین نے ان علامات کو نسبتاً آسان بنایا ہے۔ یوں بھی تم لوگوں کو بس چند موٹی موٹی

ہے۔“ اس نے دو ٹوک الفاظ میں اپنا فیصلہ سنایا تو کمرے کی فضا میں سناٹا سا چھا گیا۔

”ہم اس پر غور کریں گے۔“ آخر کار کچھ دیر بعد زن ہونے لب کشائی کی۔

”لیکن مادام.....!“ شین یاہی نے اعتراض کرتا چاہا۔ زن نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا۔

”مسٹر معاذ کی بات معقول ہے شین! ہمیں کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے سونیا کے حالات پر غور کرنا چاہیے اور یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ اب اس کا کردار کیا ہے۔“

”ہو سکتا ہے وہ ہم سب کو دھوکا دینے کی کوشش کر رہی ہو۔“

”کیا ہم کسی کے جھوٹ اور فریب کو پرکھنے کی صلاحیت سے محروم ہیں؟ میں نے معاذ سے اس معاملے پر غور کرنے کا وعدہ اسی بنیاد پر کیا ہے کہ ہم سونیا کے بچ اور جھوٹ کو پرکھنے کے بعد کوئی فیصلہ کر سکیں۔“ زن نے شین کے سارے اعتراض دور کر دیے پھر معاذ کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولی۔

”میرے بیٹے نے انسانی زندگیوں اور اپنے ملک کے عزت و وقار کو بچانے کے لیے اپنی زندگی کی قربانی دی تھی۔ اگر سونیا ہماری جانچ میں کامیاب ہوگئی تو میں بھی انہی وجوہات کی بنیاد پر اسے اپنے بیٹے کا خون معاف کر دوں گی۔“

”بہت شکریہ مادام کہ آپ نے میری بات سمجھی۔ میں آپ پر واضح کرنا چاہتا ہوں کہ ذاتی حیثیت میں مجھے سونیا کی زندگی بچانے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے لیکن ایک تو میں ممکنہ حد تک لوگوں کو رعایت دینے کا قائل ہوں، دوسرے سونیا کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے اس لیے میں آپ سے اس کی سفارش کر رہا ہوں۔“

”میں تمہاری بات سمجھ گئی ہوں اس لیے مزید صفائی دینے کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے پُر وقار لہجے میں جواب دیا پھر کھڑے ہو کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی۔

”امید ہے ہماری دوسری ملاقات جلد ہوگی۔ اس عرصے میں تم اور تمہارے ساتھی پوری محنت سے وہ اشاراتی زبان سیکھتے رہو جو آگے چل کر تمہارے بہت کام آنے والی ہے۔“

”آپ بے فکر رہیں۔ ہم پوری کوشش کریں گے۔“ معاذ جو خود بھی اپنی جگہ چھوڑ کر کھڑا ہو چکا تھا، اس سے مصافحہ کرتے ہوئے گرم جوشی سے بولا۔ زن جو اب اس کی مسکرائی اور پھر پُر وقار قدم اٹھاتے ہوئے باہر نکل گئی۔

”ڈاکٹر یوان منگ اپنے دفتر میں تم سے ملاقات کے

ہوٹل میں جہاں بڑی تعداد میں غیر ملکی سیاح ٹھہرے ہوئے تھے، بم نصب کیا تھا۔ ہمارے ایک بہادر نوجوان کی قربانی سے ہم بڑے نقصان سے محفوظ رہے لیکن وہ نوجوان اپنی جان سے چلا گیا۔“ اس بار جواب دینے کی ذمہ داری شین یاہی نے نبھائی۔ وہ زن ہو کی طرح روانی سے انگریزی نہیں بولتا تھا لیکن اتنی استعداد ضرور تھی کہ اپنی بات بیان کر سکے۔

”وہ جوان، مادام زن ہو کا بیٹا تھا۔“ شین کے بتانے پر اس نے بے ساختہ زن ہو کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

”کیا یہ بات کنفرم ہے کہ سونیا ہی ذمہ دار تھی؟“ اس نے دھیرے سے پوچھا۔

”ہوٹل کے سی سی ٹی وی کیمرے نے اس کا عکس محفوظ کر لیا تھا۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس فنگر پرنٹس کے نمونے بھی موجود ہیں۔ سونیا خود اعتراف بھی کر چکی ہے کہ وہ اس کام میں ملوث تھی۔“ شین یاہی کی بیان کردہ تفصیل سن کر وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا پھر گلا کھٹکھٹا کر بولنا شروع ہوا۔

”میں جانتا ہوں کہ ایسے کسی مجرم کو رعایت دینا مشکل ہوتا ہے لیکن اپنی ضرورت اور اس کے حالات کو دیکھتے ہوئے آپ اس کے لیے رعایت کی گنجائش نکال سکتے ہیں۔ وہ بے شک مجرم ہے لیکن ایسی مجرم جسے اس کی مرضی کے خلاف ایسی عمر میں جرم کی تربیت دی گئی جب وہ کسی احتجاج یا مزاحمت کے لائق نہیں تھی۔ اس نے بچپن سے لے کر اب تک بہت تکلیف اور جبر میں زندگی گزاری ہے۔

آپ نے مجھے بتایا کہ یہ حادثہ برسوں پہلے پیش آیا تھا۔ یقیناً اس وقت سونیا بہت کم عمر ہوگی اور اسے زبردستی اس کام میں ملوث کیا گیا ہوگا۔ اس کے اس وقت کے جرم کی سزا آج ایسے وقت میں دینا جبکہ وہ ان لوگوں سے منحرف ہو چکی ہے اور ہمارے لیے بہت کارآمد ثابت ہو سکتی ہے، کوئی عقلمندانہ فیصلہ نہیں ہوگا۔“

”ہم مجرموں کو معاف کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ اگر مجرموں کو رعایت دی جائے تو جرم کا سلسلہ کبھی نہیں رکتا۔“

شین یاہی نے سپاٹ لہجے میں اسے صاف انکار پکڑایا۔

”تو آپ مجھے سونیا کا متبادل عنایت کر دیں۔ اس کے جیسی بہادر، پھر تیلی، باصلاحیت اور سب سے بڑھ کر اسرائیل سے واقف کوئی اور خاتون اگر آپ کے پاس ہے تو ٹھیک ہے، میں اس مشن پر اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہوں ورنہ دوسری صورت میں مجھے اس مشن پر جانے سے ہی انکار

فرصت میں اضافہ ہوا تو تحقیقی کام پر مکمل توجہ دی اور آج میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے بڑی بڑی میڈیکل یونیورسٹیز سے وہ علم حاصل نہیں کیا جو مجھے اپنی اس تحقیق سے حاصل ہوا ہے۔“ یوان منگ نے ایک ہی بار میں اس کی ساری الجھن دور کر دی۔

”بہت خوب۔ یعنی میں امید رکھ سکتا ہوں کہ آپ کا یہ دو آتشہ علم سب کے لیے مفید ثابت ہوا ہوگا اور وہ رو بہ صحت ہوگی۔“

”انسانی علم تقدیر پر کبھی حاوی نہیں ہو سکتا۔ جس جگہ آکر دنیا کے قابل ترین لوگ بے بس ہو جائیں، وہاں اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ کوئی ہے جو انسانوں کی تقدیر لکھتا ہے اور اس تقدیر کو بدلنے کی طاقت کسی انسان میں نہیں ہوتی۔“ وہ معاذ کی بات سن کر سنجیدہ اور اداس سا ہو گیا۔

”آپ کا مطلب ہے سب کے لیے!.....“ معاذ کا دل بری طرح سکڑا۔

”مجھے افسوس ہے کہ اس کے متعلق میرا اندیشہ درست ثابت ہوا۔ اسے سچ مچ برین ٹیومر ہے۔“ یوان نے اس کے سر پر ہم پھوڑ دیا۔

”علاج.....؟ اب تو میڈیکل سائنس بہت ترقی کر چکی ہے۔ کیا سرجری کر کے اس کا ٹیومر ریموڈ نہیں کیا جاسکتا؟“ وہ امید و بیم کی کیفیت میں تھا۔

”ٹیومر بہت بڑا اور خطرناک پوزیشن میں ہے۔ ہم نے سرجری کر کے اسے نکالنے کی کوشش کی تو فوری موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔ کم سے کم نقصان بھی ہمیشہ کی معذوری کی صورت میں سامنے آئے گا۔“ یوان کے جواب نے اس کی ساری امیدیں توڑ دیں اور وہ سن سا بیٹھا اس کی شکل دیکھتا رہا۔

”مجھے معلوم ہے کہ تمہارے لیے یہ بہت تکلیف دہ ہے لیکن اس وقت صرف تم لوگوں کے ہمت اور حوصلے ہی کی ضرورت ہے۔ میں نے اس کے بھائی کو بھی یہ بات سمجھائی ہے اور تمہیں بھی سمجھا رہا ہوں کہ اگر تم لوگ حوصلے سے کام لو گے تو ہی وہ اس تکلیف سے گزر سکے گی۔ اس کے سامنے ماتمی شکلیں لے کر جانے کا مطلب ہوگا، اسے وقت سے پہلے مار دینا۔ جیتے جی اپنے پیاروں کی آنکھوں میں اپنی موت دیکھنا بہت تکلیف دہ ہوتا ہے معاذ! میری تم سے درخواست ہے کہ اسے بس ٹیومر کی تکلیف سے ہی گزرنے دو۔ کسی اور تکلیف میں مبتلا نہ کرو۔“ یوان وہ شخص تھا جو بہت پہلے ہی سب کے لیے اس کے دلی جذبات کو بھانپ گیا تھا اس لیے اس وقت بہت شفقت سے اسے سمجھا رہا تھا۔

منتظر ہیں۔ میں یوسف سے کہتا ہوں کہ تمہیں وہاں پہنچا دے۔“

”ڈاکٹر یوان منگ..... مطلب یوان منگ ڈاکٹر ہے؟“ بوڑھے طبیب کے لیے ڈاکٹر کا لفظ اسے چوکا گیا۔

”کوئی عام ڈاکٹر نہیں بلکہ ٹاپ کے نیوروسرجن ہیں۔“ شین نے اس کی حیرت سے لطف اٹھایا۔

”حیرت انگیز۔ میں حیران ہوں کہ ایک نیوروسرجن اس برف زار میں بھکشوؤں کے ساتھ کیا کر رہا تھا اور ڈگری ہولڈر ہوتے ہوئے کیوں قدیم اطباء کا طریقہ علاج اپنا رکھا تھا۔“

”تمہارے سارے سوالوں کے جواب وہ خود دے سکتے ہیں۔ بہتر ہے تم ان سے ملاقات کر لو۔“ شین نے اندر داخل ہوتے یوسف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ شاید اسے زن نے اندر بھیجا تھا۔

”کیوں نہیں۔ مجھے تو ہر صورت ہی ان سے ملاقات کرنا ہے۔“ اس کی نظروں کے سامنے سب کی تصویر لہرائی۔ یوان منگ سے سب سے اہم کام تو سب کے طبیعت سے متعلق معلومات حاصل کرنے کا ہی تھا۔ شین سے رخصت ہو کر وہ یوسف کی راہنمائی میں اسی منزل کے ایک دفتر میں جا پہنچا۔ بوڑھے طبیب نے ایک مشفقانہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ آج وہ نارنجی رنگ کے بھکشوؤں والے لہادے کے بجائے ٹوپیں سوٹ میں ملبوس تھا اور اس کی میز پر وہی روایتی سامان رکھا تھا جو کسی ڈاکٹر کے آگے رکھی میز پر پایا جاتا ہے۔

”تو یہ ہے آپ کی اصلیت۔“ معاذ نے گردن گھما کر پورے کمرے کو دیکھا۔ دیواروں پر انسانی دماغ کی مختلف انداز کی تصویریں آویزاں تھیں۔

”جو پہلے دیکھ چکے ہو، وہ بھی نقلی نہیں تھا بس یہ کہہ سکتے ہو کہ وہ میری زندگی کا ایک رخ تھا اور یہاں تم دوسرا رخ دیکھ رہے ہو۔“

”لیکن کیوں؟ آپ اپنی اچھی بھلی زندگی چھوڑ کر ویرانوں میں کیوں بیٹھتے پھرتے ہیں؟“

”اپنے علم میں اضافے اور انسانیت کی فلاح کے لیے۔ مجھے ابتدا ہی سے طب کے شعبے سے دلچسپی تھی چنانچہ اس شوق کی تکمیل کے لیے میں میڈیکل کی فیلڈ میں آ گیا اور اتنی محنت کی کہ ملک کے چوٹی کے نیوروسرجنز میں شمار ہونے لگا لیکن اس سب کے باوجود میری قدیم طب سے دلچسپی ختم نہیں ہوئی۔ میں جب اور جہاں سے ممکن ہوا، اس علم کو بھی حاصل کرتا رہا۔ سرکاری ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد

”کیا کسی اور ڈاکٹر سے رائے لی جاسکتی ہے؟ شاید دنیا میں کہیں کسی دوسری جگہ اس کا علاج ممکن ہو۔“

”تم اپنی تسلی کے لیے جسے دکھانا چاہتے ہو، دکھا لو۔ میں ذاتی طور پر اپنے شعبے کے ہر ماہر ڈاکٹر سے دنیا میں رابطہ کر چکا ہوں۔ سبیل کی رپورٹس انہیں میل کر کے میں نے ان کی جو رائے حاصل کی، اس کا خلاصہ وہی ہے جو میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔ سچ یہی ہے کہ ہم اسے نہیں بچا سکتے۔ ہم صرف اس کی تکلیف کی شدت کو کم کر سکتے ہیں اور جہاں تک ممکن ہو اسے خوش رکھ کر اس کے آخری وقت کو اچھا بنا سکتے ہیں۔“ یوان اسے سمجھا رہا تھا لیکن اس کی زبان سے نکلتے آخری وقت کے الفاظ نے معاذ کے دل پر ایک گھونسا سا مارا تھا۔

”میں فوری طور پر اس سے ملنا چاہتا ہوں۔“ وہ اپنی سرخ ہوتی آنکھوں کے ساتھ یکدم نشست چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ یوان نے اس پر ایک تاسف بھری نظر ڈالی اور رمان سے بولا۔

”ٹھیک ہے۔ میں یوسف سے کہہ دیتا ہوں۔ وہ تمہیں لے جائے گا لیکن پلیز! وہاں میری باتوں کو یاد رکھنا۔“

”میں خیال رکھوں گا۔“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ سچ تو یہ تھا کہ اس وقت وہ کسی چھوٹے بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتا تھا لیکن اپنے مرد ہونے کا بھرم رکھنے کی بھی مجبوری تھی۔

یوان نے اسے شانے پر ایک حوصلہ افزا تھپکی دیتے ہوئے یوسف کے ساتھ اسپتال کے لیے روانہ کیا۔ بیجنگ جو چند گھنٹے قبل اسے بہت متاثر کن لگ رہا تھا، اب کھلی آنکھوں کے باوجود دکھائی نہ دے رہا تھا کہ آنکھوں کے آگے تو وہی چہرہ تھا جسے اس نے پہلی بار عنابی چادر کے پلو کے پیچھے چھپا رکھا تھا اور جب وہ پلو ذرا کی ذرا اس کے رخ سے ہٹا تھا تو اس کے سینے میں دھڑکتے دل کی ہر دھڑکن میں سبیل کا نام لکھا جا چکا تھا۔ وہ دولت حسن پر کسی دربان کی طرح پہرا دیتے سیاہ تل کی کشش سے کبھی خود کو آزاد ہی نہیں کروا سکا تھا۔ آزاد کرانا بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس اسیری میں بڑا سرور تھا۔

یوسف اسے بیجنگ کے جس جدید ترین اسپتال میں لے کر گیا، وہ یقیناً بہت شاندار تھا لیکن اس کی دماغی کیفیت ایسی تھی کہ وہ ارد گرد کے ماحول سے بالکل کٹ چکا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اس کے سارے حواس کام کرنا چھوڑ چکے ہیں اور وہ صرف ایک روبوٹ ہے جو اپنے اندر فیڈ کیے پروگرام کے مطابق بنا سوچے سمجھے عمل کیے جاتا ہے۔

”آپ اندر جا کر ملاقات کر لیں۔ میں باہر ہی آپ

کا انتظار کروں گا۔“ تیسری منزل کے ایک ایسے دروازے کے سامنے رک کر جس کے آگے یاوردی گارڈ بیٹھا ہوا تھا، یوسف نے اس سے کہا۔ یقیناً یوسف گارڈ کے لیے جانا بیچنا فرد تھا اس لیے اس نے کسی قسم کا تعرض نہیں کیا لیکن اندر داخلے سے پہلے اس کے متعلق ضروری معلومات حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی مدد سے اس کے فنگر پرنٹس لینے میں کسی تساہل سے کام نہ لیا۔

دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی اس کی نظر سب سے پہلے عالم شاہ پر پڑی۔ وہ جائے نماز پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ دعا کے لیے اٹھے ہوئے تھے۔ وہ بے آواز لبوں سے اپنے رب کے حضور دعا گو تھا لیکن اس کی بند آنکھوں سے نکل کر رخساروں پر بہتے آنسو صاف بتا رہے تھے کہ وہ اپنے رب سے کیا مانگ رہا ہے۔ معاذ اس کے خشوع و خضوع میں دخیل ہوئے بغیر خاموشی سے وہاں رکھے صوفہ کم بیڈ پر ٹک گیا۔ کمر از یادہ بڑا نہیں تھا لیکن وہاں ضرورت کی تمام اہم اشیاء موجود تھیں۔ جس صوفہ کم بیڈ پر وہ بیٹھا تھا، وہ یقیناً سونے اور آرام کرنے کے لیے عالم شاہ کے زیر استعمال رہتا تھا۔ اس صوفے کے علاوہ وہاں دو کرسیاں مزید موجود تھیں جن کے آگے شیشے کی ایک چھوٹی سی میز رکھی ہوئی تھی۔ ایک دیوار کے ساتھ سامان رکھنے کا چھوٹا سا ریک اور روم ریفریجریٹر موجود تھا۔ دیوار میں دو دروازے نظر آرہے تھے۔ ایک کا دروازہ مکمل بند تھا جس کے بارے میں اس کا قیاس تھا کہ وہ متصل غسل خانہ ہوگا جبکہ دوسرا دروازہ جو کہ نیم دا تھا، اس سے وہ مریضوں کے مخصوص بستر کا ایک پایہ دیکھ سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا اس بستر پر وہ عورت اپنی زندگی کے دن پورے کر رہی تھی جس کا نام لے لے کر اس کا دل دھڑکتا تھا لیکن اس کا تصور اسے یہ منظر دکھانے کو تیار نہیں تھا۔ وہ جو دور رہ کر بھی اسے اپنے خواب و خیال میں واضح دکھائی دیتی تھی، اب چند فٹ کے فاصلے پر ہوتے ہوئے بھی تصور سے باہر تھی۔

”معاذ!“ وہ نیم دا دروازے سے نظر آتے مختصر سے منظر میں ایسا کھویا تھا کہ عالم شاہ کی طرف سے بے خبر ہو گیا تھا۔ اس نے دعا سے فارغ ہونے کے بعد اسے وہاں بیٹھے دیکھا تو تیزی سے اس کی طرف آیا اور اسے پکارا۔ وہ عالم کی پکار پر متوجہ ہوا اور ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ ایک دوسرے سے بغل گیر ہو چکے تھے۔ یہ ملاقات دو دوستوں کی عام ملاقات نہیں تھی۔ یہ دو ایسے مردوں کی ملاقات تھی جو موت کے شکنجے میں کسی اس عورت سے بے

تھا سو ہو کر رہا۔ تم، تمہارے ماں باپ یا کوئی بھی دوسرا چاہے والا اس کی قسمت کے اس فیصلے کو بدل نہیں سکتا تھا۔“ عالم شاہ سے تسلی کے یہ کلمات کہتے ہوئے اس کا اپنا دل غم سے پھٹ رہا تھا۔

”آؤ، یہاں بیٹھو۔“ اس نے عالم کا ہاتھ پکڑ کر اسے صوفے پر بٹھایا اور میز پر پڑے ٹشو پیپر کے ڈبے سے کچھ ٹشو کھینچ کر اس کے حوالے کیے۔ وہ اپنے بھیگے رخسار اور ناک وغیرہ صاف کرنے لگا لیکن حالت ابھی تک سنبھلی نہیں تھی۔ رہ رہ کر آنکھوں سے آنسو اڑ جاتے تھے۔

”اس بد بخت نے بڑا ظلم کیا میری معصوم بہن پر۔“ لوگ سمجھتے ہیں ہم زمینداروں کے ہاں عورتوں پر بہت سختی ہوتی ہے، ان پر زندگی کی ہر نعمت اور خوشی حرام کر دی جاتی ہے لیکن میں تمہیں بتاؤں کہ بابا سائیں نے اپنی دونوں بیٹیوں کو بہت پیار سے پالا۔ انہیں ہمیشہ بہت مان اور عزت دی۔ ہاتھ اٹھانا تو دور کی بات، کبھی تیز آواز میں بھی شاید ہی بات کی ہو اور اس ظالم نے میری ناز و پلہ بہن پر باقاعدہ تشدد کیا۔ مار مار کر اس کی اتنی بری حالت کر دی کہ اسے اسپتال میں داخل کروانے کی نوبت آگئی۔ تم اگر اسے اسپتال سے نکال کر محفوظ مقام پر نہ رکھتے تو شاید اب تک وہ وہیں پر مر چک چکی ہوتی۔“ وہ اپنے ہی نہیں، اس کے زخموں کو بھی کرید رہا تھا۔

”مجھ سے بھی دیر ہو گئی۔ کاش کہ میں پہلے ہی کچھ کر گزرا ہوتا۔“ وہ سارا عرصہ اس کی یادداشت میں بالکل تازہ تھا جب بہت کوششوں کے بعد وہ سبھل کی جیٹھانی ڈاکٹر فردوس تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکا تھا۔ نیک فطرت فردوس نے اپنی بساط سے بڑھ کر سبھل کا ساتھ دیا تھا لیکن اس جرم کی پاداش میں اپنی زندگی کھو بیٹھی تھی۔ اس بے چاری کی اپنی تین عدد بیٹیاں تھیں جن کا معلوم نہیں ماں کے بعد کوئی پرسان حال تھا بھی یا نہیں۔

”تم نے جو کچھ کیا، وہ بھی بہت زیادہ تھا۔ ایک ایسے شخص سے دوستی کا حق ادا کیا تم نے جو تمہاری مصیبت کے وقت میں بابا کی ایموشنل بلیک میلنگ کی وجہ سے پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس وقت کے لیے میں نے خود پر سیکڑوں بار لعنت بھیجی ہے پھر بھی کبھی خود کو معاف نہیں کر پایا۔“

”ان باتوں کو جانے دو۔ ان کا کوئی فائدہ نہیں ہے اور نہ ہی مجھے تم سے کوئی شکوہ ہے۔ میں حالات کے جس گرداب میں پھنسا تھا، تم چاہ کر بھی میرے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔“ اس نے عالم کو تسلی دی پھر ذرا سا توقف

پناہ محبت کرتے تھے جو فی الحال تو ان سے چند فٹ کے فاصلے پر موجود تھی لیکن اس کا دور دیس جانا طے پا چکا تھا۔ ان دونوں مردوں میں اگر کوئی فرق تھا تو وہ یہ تھا کہ ان میں سے ایک کے پاس محرم رشتہ ہونے کا مان تھا اور اس مان کے سہارے وہ کھل کر اپنے غم کا اظہار کر سکتا تھا جبکہ دوسرا صرف دل کے رشتے سے بندھا تھا۔ دل کا رشتہ جو دنیا کا سب سے گہرا رشتہ ہوتا ہے لیکن اس رشتے کی کوئی شرعی و سماجی حیثیت نہیں ہوتی۔ اس رشتے سے بندھے لوگ تنہائی میں تو گریہ و ماتم کر سکتے ہیں لیکن ان کے پاس سب کے سامنے کھل کر اپنے غم کو رونے کی گنجائش نہیں ہوتی۔

عالم بھی بھائی ہونے کے ناتے کھل کر زور رہا تھا۔ اس کے رونے میں اتنی شدت تھی کہ باقاعدہ ہچکیاں بندھ گئی تھیں اور بدن پر لرزہ سا طاری ہو گیا تھا۔ ضبط کی کوشش کے باوجود معاذ کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔ غم سے جلتی آنکھوں کے لیے یہ نمی ایسی تھی جیسے جلتے توڑے پر پانی کی چند بوندیں۔ ان چند بوندوں نے تڑپتے ہوئے دل کو ہلکا کیا کرنا تھا، الٹا سینے میں دھواں سا بھر گیا اور اسے سانس لینا مشکل ہونے لگا۔

”حوصلے سے کام لو عالم! تم یوں ضبط کھو بیٹھو گے تو سبھل کو کون سنبھالے گا۔ اسے اس تکلیف دہ دور سے گزرنے کے لیے تمہارے حوصلے اور ہمت کی ضرورت ہے۔“ اسے خود تسلی و دلا سے کی ضرورت تھی لیکن جانتا تھا کہ اس کے پاس یہ حق موجود نہیں ہے اس لیے اپنی تمام تر ہمت کو مجتمع کر کے عالم کو سنبھانے لگا۔

”میں بابا سائیں اور اماں سائیں دونوں کو کیا جواب دوں گا معاذ! میں کیسے ان کے سامنے یہ حقیقت تسلیم کروں گا کہ میں بھائی ہونے کا حق ادا نہ کر سکا اور میری کمزور و نازک سی بہن مجھ پر اپنا آپ قربان کر گئی۔“ ڈاکٹر کا خیال تھا کہ ٹیوٹر عرصے سے خاموشی کے ساتھ سبھل کے دماغ میں موجود تھا لیکن پچھلے کچھ عرصے میں اس کی بہت تیزی سے گرتھ ہوئی تھی اور اس نے اپنی موجودگی کا احساس دلانا شروع کر دیا تھا۔ شاید فیصل کے ساتھ بیٹے ذہنی و جسمانی تکلیف کے دن اس کے مرض کو بڑھانے کا محرک بنے تھے۔ وجہ کیا تھی، حتمی طور پر کچھ بھی کہنا مشکل تھا لیکن عالم شاہ کو رہ کر یہی خیال آتا تھا کہ اگر سبھل اس کے تحفظ کی خاطر فیصل سے نکاح کے فیصلے کو قبول نہ کرتی تو کچھ اور ہوتا یا نہ ہوتا، اس کی زندگی کی بساط اتنی تیزی سے لپٹنا شروع نہ ہوتی۔

”خود پر اس طرح بوجھ نہ لا دو۔ انسان تقدیر کو بدلنے پر قادر نہیں۔ سبھل کے نصیب میں یہ موذی مرض لکھا

کر کے بولا۔

سب کر لی گئی تھی۔

”جتنی جلدی ہو سکے، کر لیتا۔ میں چاہتا ہوں کہ میری بہن کی زندگی کے جتنے دن باقی رہ گئے ہیں، وہ سکھ میں گزریں۔“ عالم کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو چکے۔

”میں نے کہا ہے تاکہ فکر نہ کرو۔ نہ صرف تمہارے گھر والے بلکہ اللہ نے چاہا تو اعظم بھی سبیل کی نظروں کے سامنے ہوگا۔“ اس نے عالم کو تسلی دی تو اس نے آستین سے اپنی آنکھیں صاف کیں اور مسکراتے ہوئے بولا۔

”جب سے آئے ہو، میں بس اپنی ہی بولے جا رہا ہوں۔ تم سے تو پوچھا ہی نہیں کہ ہمارے یہاں آنے کے بعد تم لوگوں کے ساتھ کیا جیتی؟“

”بھی فرصت میں سناؤں گا۔ داستان طویل ہے لیکن سب سے اچھی بات یہ ہے کہ ہم سب بخیریت یہاں پہنچ گئے ہیں۔“

”باقی لوگ کہاں ہیں؟“

”جاریہ اور وکی تو میرے ہی ساتھ ٹھہرے ہوئے ہیں البتہ گل خان کو علاج کے لیے دوسری جگہ پر رکھا گیا ہے۔“

”گل خان کو کیا ہوا؟“ عالم نے تشویش سے پوچھا۔

”اس کے دماغ کے ساتھ کھیلایا گیا ہے۔ وہ ٹرانس میں ہے اور یہاں دواؤں اور تھراپی کے ذریعے اس کا

علاج کیا جا رہا ہے۔“ اس نے افسردگی سے بتایا۔

گل خان کے معاملے کو اس نے خود حل کرنے کی

کوشش کرنے کے بجائے ڈاکٹروں کے حوالے کر دینا زیادہ

مناسب سمجھا تھا کہ ایک طرف مسلسل کئی دن برف زار کے

قیام اور وہاں پیش آنے والے واقعات نے اسے ذہنی و

جسمانی طور پر تھکا دیا تھا تو دوسری طرف وہ کھلے عام اپنی

پناہ کی صلاحیت کو استعمال کر کے دوسروں کو چونکا نا نہیں

چاہتا تھا۔ ایک صرف یوان تھا جو اپنی بے پناہ روحانی

صلاحیتوں کی وجہ سے اس کے بارے میں بہت کچھ جان گیا

تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ علم والوں کا ظرف بھی بڑا ہوتا ہے۔

یوان کسی کے سامنے اس کا راز افشا نہ کرے گا۔

”اللہ اسے جلد از جلد صحت دے۔ بہت سادہ اور

مخلص انسان ہے اور تم سے تو بے تحاشا محبت کرتا ہے۔“

”اس میں تو کوئی شک نہیں۔ میری خواہش ہے کہ

صحت مند ہونے کے بعد اسے اس کی فیملی کے پاس واپس

بھیج دوں۔ وہ بیوی بچوں والا آدمی ہے۔ اسے ان کی

کفالت کے لیے ان کے پاس ہونا چاہیے۔“

”وہ شاید ہی تمہیں چھوڑ کر جانے پر راضی ہو۔“ عالم

نے گل خان کی اس کے لیے محبت کے پیش نظر اندازہ لگایا۔

”اصل اہمیت اس بات کی ہے کہ اب ہم سبیل کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟ ڈاکٹر کی رائے جو بھی ہے، ہم یوں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر اس کے مرنے کے انتظار میں تو نہیں بیٹھ سکتے۔“ ہزار احتیاط کے باوجود وہ خود کو جذباتی ہونے سے نہیں روک سکا تھا۔

”میڈیکل شاید ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ یوان نے دنیا بھر کے ڈاکٹرز سے رائے لیتے ہوئے مجھے بھی اعتماد میں لیا تھا۔ یوں سمجھو کہ میں اس پورے پردس میں اس کے ساتھ ساتھ رہا ہوں اور سچ یہی ہے کہ ہمیں کہیں سے امید کی کوئی کرن نہیں دکھائی دی۔“ عالم شاہ نے اس کی ہر امید توڑ دی ورنہ یوان سے سب کچھ جاننے کے بعد بھی اس کے ذہن کے کسی نہ کسی گوشے میں یہ بات موجود تھی کہ دنیا کے کسی ڈاکٹر کے پاس تو سبیل کے مرض کا علاج ہوگا۔

”اس وقت سبیل کے لیے سب سے زیادہ اہم یہ ہے کہ اس کے پیارے اس کے قریب موجود ہوں۔ وہ بابا

سائیں، اماں اور مول کو بہت یاد کرتی ہے۔ سب سے بڑھ

کر اعظم کی جدائی اسے مار رہی ہے۔ کسی تسلی اور دلا سے

سے اسے کوئی فرق نہیں پڑ رہا ہے۔“

”پڑ بھی نہیں سکتا۔ اعظم تو پھر چھوٹا سا نا سمجھ بچہ ہے۔

جن ماؤں کے بچے جوان ہو کر اپنے پاؤں پر کھڑے

ہو جائیں، وہ بھی ان کی جدائی نہیں سہہ پاتیں اور ان کے غم

میں ہوش و حواس کھو بیٹھتی ہیں۔“ اسے اپنی والدہ سعیدہ بیگم

کا خیال آ گیا۔ انہوں نے زندگی کا وہ بدترین وقت دیکھا تھا

جب وہ اور سعد دونوں ہی میڈم ایکس کی قید میں تھے اور وہ

اس وقت کی سختی سے اس حال کو پہنچ گئی تھیں کہ پھر بات ان

کی زندگی کے اختتام پر ہی ختم ہوئی تھی۔

”میں جانتا ہوں کہ اعظم کو واپس لانا اتنا آسان کام

نہیں ہے لیکن باقی لوگوں کو تو کم از کم سبیل سے ملوایا جاسکتا ہے

لیکن اس معاملے میں یہاں کوئی میرا ساتھ نہیں دے رہا۔

یہاں تک کہ ابھی تک بابا سائیں کو ہمارے زندہ ہونے کی

اطلاع بھی نہیں دی گئی ہے۔ جب بھی پاکستان میں بابا

سائیں سے بات کرنے کی درخواست کروں، یہی جواب ملتا

ہے کہ سیکورٹی ایشوز کھڑے ہو جائیں گے۔“ عالم شاہ کے

لہجے میں شکوہ تھا۔

”تم فکر نہ کرو، میں بات کرتا ہوں کسی سے۔“ معاذ

نے دھمے لہجے میں اسے تسلی دی لیکن اندر ہی اندر اس کا

مزاج برہم ہو رہا تھا۔ سیکورٹی کے نام پر ان کی آزادی

”اگر وہ نہیں گیا تو اس کی فیملی کی کفالت کے لیے کوئی نہ کوئی بندوبست کروانا پڑے گا۔“ اس نے تفکر سے جواب دیا پھر ہلکی سی دستک کے ساتھ دروازہ کھلنے پر اس طرف متوجہ ہو گیا۔ ایک نرس کھلے دروازے سے اندر داخل ہوئی۔

”کیا پوزیشن ہے پیشنہ کی۔ پُرسکون نیند آئی ہے یا نہیں؟“ اس نے عالم کی طرف دیکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔ وہ انگریزی بول رہی تھی جو بری نہیں تھی لیکن لہجہ زیادہ رواں نہیں تھا۔

”اللہ کا شکر ہے کہ وہ ابھی تک بہت سکون سے سو رہی ہے۔“ عالم نے جواب دیا۔

”میں ایک بار چیک کر لیتی ہوں۔“ وہ نیم وا دروازے کی طرف بڑھ گئی اور اندر داخل ہونے کے لیے دروازے کو مزید کچھ اور کھولا۔ ادھورا منظر کچھ اور واضح ہوا اور بستر پر کبیل اوڑھے لیٹے وجود کی جھلک دکھائی دی۔ اس نے جلدی سے اپنی نظروں کا رخ پھیر لیا اور عالم کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”وکی اور جارد میرے ساتھ یہاں نہیں آسکے لیکن انہوں نے سبیل کے لیے دعائیں اور نیک تمنائیں بھیجی ہیں اور پیغام دیا ہے کہ بہت جلد وہ خود اس کی عیادت کے لیے اسپتال آئیں گے۔“

”میری طرف سے ان کا شکریہ ادا کرنا۔ وہ یہاں آئیں گے تو مجھے اچھا لگے گا اور یقیناً سبیل کو بھی۔ یہاں ہمیں ہر طرح کی سہولت اور آرام میسر ہے لیکن جو سکون کسی اپنے کو دیکھ کر ملتا ہے، اس کی بات ہی الگ ہے۔ یقیناً جانو، میں خود کو اتنا تنہا محسوس کر رہا تھا جس کی کوئی حد نہیں تھی۔ تمہارے آنے سے مجھے ایک سہارا سا مل گیا ہے اور وہ کندھا بھی جس پر سر رکھ کر میں اپنے آنسو بہا سکوں۔“

”اللہ نے چاہا تو جلد تمہارے اپنے خون کے رشتے تمہارے ساتھ ہوں گے۔“ اس نے عالم کا بازو تھپتھپایا۔

”یہی تسلی سبیل اٹھ جائے تو اس سے مل کر اسے بھی دے دینا۔“

”نہیں، میں اس سے نہیں ملوں گا۔“ اس نے اتنی قطعیت سے انکار کیا کہ عالم شاہ حیرت سے اس کی شکل دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

”لوجی سنے میاں! ایک بار پھر ہم فرار کی راہ پر ہیں۔“ نیلی نے اعظم کو چومتے ہوئے کہا اور بلاوجہ ہی ہنس دی۔ اسے ہنستے دیکھ کر وہ بھی کھلکھلایا۔

”موصوف کے پیروں میں ابھی سے اتنا چکر ہے۔ لگتا ہے بڑے ہو کر اس نے البیرونی اور ابن بطوطہ کے پائے کا سیاح بننا ہے۔“ مومی نے ان دونوں کے ہنستے ہوئے چہروں پر نظر ڈالی اور گفتگو میں حصہ ڈالا۔ حقیقتاً اس وقت وہ اعصابی کشیدگی کا شکار تھے۔ اعظم کو ساتھ لے کر باہر نکلنے کا نتیجہ ہر بار برائے نکلا تھا اور ہر بار انہیں انسانی لاشوں کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ لاشیں بھلے مخالفین کی تھیں لیکن ان کے اعصاب کے لیے امتحان ثابت ہوئی تھیں۔ وہ کھیل تماشے کے ذریعے لوگوں کا دل بہلانے اور انہیں سستی تفریح فراہم کرنے والے لوگ تھے۔ ان کے لیے اس طرح گولیوں کی برسات میں سفر کرنا اور انسانوں کی لاشیں گرتے دیکھنا ایک نہایت ناخوشگوار تجربہ تھا۔

”کیا معلوم وزیر خارجہ لگ جائے۔ پلے سے کچھ بھی خرچ کیے بغیر سرکاری خرچے پر مزے سے ملکوں ملکوں گھومتا رہے۔“ نیلی دور کی کوڑی لائی۔

صورت حال جو بھی تھی، وہ خود بھی اسے ڈسکس نہیں کرنا چاہتے تھے اس لیے ہلکا پھلکا انداز اختیار کر رکھا تھا۔

”خیال تو اچھا ہے۔ ہو سکتا ہے یہی اپنے نانا کی سیاست کو آگے بڑھائے اور اس میدان میں ان سے زیادہ نام کمائے۔“

”نانا بے چارے تو اپنی شرافت کی وجہ سے مارے گئے ہیں ورنہ یہاں ان سے چھوٹے جاگیردار اور بزنس مین سیاست میں کھس کر بڑے بڑے اڈے بن گئے ہیں۔“ مومی نے اس کی بات پر تبصرہ کرتے ہوئے باہر نظر ڈالی۔ ہر طرف سنائے اور خاموشی کا راج تھا۔ کہیں دور دور تک ان کی اور آگے پیچھے چلتی گاڑیوں کے سوا کسی گاڑی کا نام و نشان نہیں تھا لیکن دل میں یہ خدشہ مسلسل موجود تھا کہ کسی بھی لمحے کہیں سے کوئی نمودار ہوگا اور ہتھیاروں کے زور پر اعظم کو ان سے جھٹکنے کی کوشش کرے گا۔ اگلی نشست پر تن کر بیٹھے سبیل کی بھی کچھ ایسی ہی کیفیت تھی۔ ہتھیار پر ہاتھ رکھے وہ کسی عقاب کی طرح اطراف پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

”سانے سے پولیس کی جیپیں آرہی ہیں۔“ یکا یک اگلی گاڑی کی گاڑی سے اطلاع دی گئی۔

”پولیس.....!“ سبیل کے ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔ انور سولنگی کے فارم ہاؤس سے روانہ ہونے کے بعد سے وہ سب مسلسل کسی بھی بات کے لیے تیار تھے لیکن یوں اس طرح براہ راست پولیس سے سامنا ہو جانے کا تو گمان ہی نہیں تھا۔

”اللے ہاتھ پر لے لو۔“ اسے فوری طور پر یہی حل بھائی دیا کہ راستہ بدل لے کیونکہ اس بات کو تو وہ بھی سمجھتا تھا کہ اوروں کی طرح پولیس سے براہ راست تصادم نہیں کیا جاسکتا۔

”تم لوگ سیدھے چلتے رہو اور پولیس والوں کو اپنے ساتھ باتوں میں الجھانے کی کوشش کرو۔ اتنے میں ہم یہاں سے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔“ اس نے دوسری ہدایت آگے گاڑی والوں کے لیے جاری کی تھی۔ نیلی اور مومی دم سادھے اس ساری صورت حال کو دیکھ رہے تھے۔ وہ اس خوش گمانی میں مبتلا نہیں ہو سکتے تھے کہ پولیس والے کسی اور مقصد کے تحت نکلے ہیں اور اتفاقاً ان کے راستے میں آگئے ہیں۔ انور سو لگی کے فارم ہاؤس پر جو کچھ ہوا تھا اور جس طرح کے رویے کا اچانک وارد ہونے والے ڈی ایس پی نے مظاہرہ کیا تھا، اس کے بعد اس خوش فہمی کی گنجائش ہی نہیں تھی۔

”پولیس والے راہ میں آگئے ہیں سائیں! ہم راستہ کاٹ کر نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ اب وہ قربان شاہ کو اطلاع دے رہا تھا۔

”پوری کوشش کرو کہ براہ راست سامنا نہ ہو۔ اگر نوبت آجائے تو ہتھیار مت نکالنا۔“ انہوں نے ہدایت دی۔ ”جو حکم سائیں!“ سچل خود ان معاملات کو سمجھتا تھا اور اسے بھی معلوم تھا کہ اسے قانونی پیچیدگیاں پیدا نہیں کرنا ہیں۔ ”پولیس والوں نے ہمیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ شمال کی طرف نکل گئے ہیں۔“ گارڈز کی اگلی گاڑی سے پھر اطلاع دی گئی تو سچل نے بے ساختہ ہی رخ موڑ کر ان کی طرف دیکھا۔ خود ان کی گاڑی بھی شمال کے رخ جارہی تھی۔ ”میں اور نیلی، اعظم کو لے کر گاڑی سے اتر جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر کھیتوں میں چھپے رہیں گے۔ پولیس والے مطمئن ہو کر چلے جائیں تو دوبارہ سوار ہو جائیں گے۔“ مومی نے تجویز پیش کی جسے ذرا بے تذبذب کے بعد سچل نے قبول کر لیا اور گاڑی روک کر ان تینوں کو کھیتوں کے پاس اتار دیا۔ پیچھے آنے والی گارڈز کی گاڑی انہیں رستے دیکھ کر رک گئی تھی۔ سچل نے ہاتھ کے اشارے سے اسے آگے بڑھ جانے کی ہدایت کی۔ دونوں گاڑیاں فرار لے بھرتے ہوئے آگے نکل گئیں۔ جاتے ہوئے ان کا پولیس کی گاڑیوں سے سامنا ہوا لیکن پولیس والوں نے ان سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ سچل کو اچھا سا ہوا اور دل میں خیال گزرا کہ پولیس ان کے پیچھے ہے ہی نہیں۔

”لیکن پھر وہ اتنی صبح صبح دو دو گاڑیوں میں کیوں نکلے

ہوئے ہیں اور اب اچانک عام روٹ سے ہٹ کر اس طرف کیا کر رہے ہیں؟“ فاصلے کے ساتھ ساتھ الجھن بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ اتفاق سے موڑ بھی جلدی آ گیا تھا اور وہ عقبی آئینے میں نہ تو ان کھیتوں کو دیکھ سکتا تھا جہاں نیلی اور مومی، اعظم کو لے کر اترے تھے اور نہ ہی پولیس کی گاڑیوں کو۔

”بس، واپس لے لو۔“ بے چینی نے اسے زیادہ آگے نہیں جانے دیا۔ ڈرائیور نے اس کے حکم پر فوراً ہی گاڑی روکی لیکن کچے اور تنگ راستے پر اسے تیزی سے واپس موڑنا مشکل تھا۔ گارڈز والی گاڑی کو بھی اسی مشکل سے گزرنا پڑا۔

”ہم لوگ گاؤں سے باہر نکل گئے ہیں۔ اب کیا کریں؟“ اسی وقت پہلی والی گارڈز کی گاڑی سے رابطہ کر کے پوچھا گیا۔

”وہیں رک کر انتظار کرو۔ ہم بس آرہے ہیں۔“ اس نے جواب دے کر رابطہ منقطع کیا ہی تھا کہ ان کے ساتھ موجود گاڑی جو واپس پلٹتے ہوئے اب ان سے آگے تھی، سے رابطہ کیا گیا۔

”آگے پولیس کی گاڑیاں رکی نظر آرہی ہیں۔ پولیس والے کھیتوں میں گھیسے ہوئے ہیں۔“ اطلاع دینے والے کے لہجے میں سراسیمگی تھی۔

”تیز چلاؤ۔“ سچل اسے جواب دینے کے بجائے اپنے ڈرائیور پر چلا یا۔ موڑ سے گزرتے ہی جونہی پولیس کی گاڑیوں پر نظر پڑی، اس کے کانوں میں پہلا فائر گونجا۔ اس کے بعد لگاتار تین فائر ہوئے تھے۔ پولیس اور اپنے ساتھی گارڈز کے پیچھے ان کی گاڑی رکی تو فضا پر ایک محسوس ہونے والا سناٹا طاری ہو چکا تھا اور مشرق سے بلند ہوتے سورج کی روشنی میں سرخی سی کھلی ہوئی تھی۔ وہ گن ہاتھ میں لیے بری طرح دھڑکتے دل کے ساتھ گاڑی سے باہر نکلا۔ اگلی گاڑی سے نکلنے والے گارڈز بھی اپنے ہتھیاروں سمیت نیچے اتر چکے تھے لیکن ان کے انداز میں ایک تذبذب سا تھا۔ اس نے سامنے کے منظر پر نظر ڈالی۔

ایک پولیس والا اعظم کو گود میں لیے کھڑا تھا۔ اس کے برابر میں ڈی ایس پی کھڑا اپنے ریوالور کی ٹال پر یوں پھونکیں مار رہا تھا گویا اس کے سوا اسے کوئی اور کام ہی نہیں ہے اور نہ ہی اسے وہ سب اپنے سامنے کھڑے نظر آرہے ہیں۔ اس کے اس قدر اطمینان اور بے نیازی کے پیچھے اس کے وہ مسلح سپاہی تھے جو گارڈز کی طرف اپنی بندوقیں تانے کھڑے تھے۔ ان مسلح سپاہیوں کے پس منظر میں آج کے

دن کا سب سے خوفناک منظر دکھائی دے رہا تھا۔ دو سپاہی خون میں تر بر موی کوزمین پر گھسٹتے ہوئے کھیتوں سے باہر لارے تھے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور جسم میں ایسی کوئی جنبش دکھائی نہیں دے رہی تھی جس سے اس کے زندہ ہونے کی امید کی جاتی۔

”پولیس کو بہت دنوں سے اس اغوا کار جوڑے کی تلاش تھی۔ آج ہم بڑی مشکل سے ان تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے لیکن انہوں نے بجائے گرفتاری دینے اور بچہ پولیس کے حوالے کرنے کے، فائرنگ شروع کر دی۔ مجبوراً پولیس کو بھی جوابی فائرنگ کرنا پڑی۔ تھینک گاڈ! فائرنگ کے اس تبادلے میں بچہ محفوظ رہا۔“ ڈی ایس پی کو جب اندازہ ہو گیا کہ سچل اس کے عقب میں کیا دیکھ رہا ہے تو اس کی طرف متوجہ ہوا اور بناوٹی لہجے میں اسے آگاہ کیا۔ اس کا جھوٹ اس کے چہرے پر درج تھا لیکن سچل کی اتنی اوقات نہیں تھی کہ اسے جھوٹا قرار دے سکتا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ ان کی نظروں میں سوال تھا۔ اگر وہ اشارہ کرتا تو وہ کسی بات کی برواکیے بغیر پولیس والوں پر ٹوٹ پڑتے لیکن قتل و غارت گری سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں تھا۔ لہذا ان سب سمیت اعظم کی زندگی بھی داؤ پر لگ جاتی۔

اس نے سر کو آہستہ سے نفی میں جنبش دیتے ہوئے ان سب کو کچھ بھی کرنے سے روکا اور خود رخ موڑ کر قربان شاہ کا نمبر ملانے لگا۔

☆☆☆

”تو یہ تمہارا حتمی فیصلہ ہے؟“

”بالکل۔ یہ میرا حتمی فیصلہ ہے کہ پہلے میں پاکستان جا کر اعظم کو تلاش کر کے سچل کے پاس لاؤں گا پھر کوئی اور کام کروں گا۔ یہ بات میں براہ راست شین یا زن ہو سے بھی کہہ سکتا تھا لیکن آپ سے اس لیے کہہ رہا ہوں کہ آپ اسے بہتر طور پر سمجھ بھی سکتے ہیں اور انہیں سمجھا بھی سکتے ہیں۔“ اس نے قطعیت سے یوان کو جواب دیا۔

”یہ کام ہم اپنے لوگوں کے ذریعے بھی کر دے سکتے ہیں۔“ یوان نے پیشکش کی۔

”آپ لوگ کروانا چاہتے تو اب تک کروا چکے ہوتے۔ آپ لوگوں نے تو اتنا بھی نہیں کیا کہ سچل کے گھر والوں کو ہی اس سے ملوادیے۔“ وہ سخت ہوا۔

”ایسا صرف رازداری کے خیال سے کیا گیا۔ اگر ان لوگوں کو یہاں بلوایا جاتا تو لامحالہ ان کے دشمن اس طرف

متوجہ ہو جاتے۔“

”پلیز!“ اس نے ہاتھ اٹھا کر یوان کو بولنے سے روک دیا۔ ”آپ مجھ سے بچکانہ باتیں مت کریں۔ آپ اتنے کمزور نہیں ہیں کہ ان کی حفاظت نہ کر سکتے ہوں۔ سچ بس اتنا ہے کہ یہ سب کرنا آپ کی ترجیحات میں شامل نہیں ہے۔“

”میں متعلقہ لوگوں سے بات کر کے دیکھتا ہوں۔“

”صرف بات نہیں کرنی، انہیں سمجھانا ہے کہ اس کے بغیر بات نہیں بنے گی۔ میں اپنے اس ارادے میں کتنا پختہ ہوں، اس بات کا اندازہ اس بات سے کر لیجیے کہ میں نے قسم کھائی ہے کہ جب تک اعظم کو سچل سے نہیں ملوادیتا، خود اس سے ملاقات نہیں کروں گا۔“ اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے یوان پر اپنی شرط کی اہمیت واضح کی۔

”خود پر قابو رکھو نو جوان! بے شک تم بہترین ہو لیکن یہاں کسی کو اپنی مجبوری نہیں بنایا جاتا اور بہت جلد متبادل ڈھونڈ لیا جاتا ہے۔“ یوان نے اسے تنبیہ کی۔

”ذرا سوچو کہ اگر انہوں نے تمہارا متبادل ڈھونڈ لیا تو تمہارا کیا ہوگا؟“

”میں موت قبول کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن جیوں گا اپنی شرائط پر۔“ اس نے اٹل لہجے میں جواب دیا تو یوان ایک ہل کے لیے اس کی شکل دیکھتا رہ گیا۔

”صرف اعظم کی تلاش کا معاملہ ہی نہیں ہے۔ میں ایک دوسرے اہم معاملات بھی اپنے اسی چکر میں نمٹا لیتا چاہتا ہوں۔ آپ لوگ جس مشن پر مجھے بھیجنا چاہتے ہیں، اس میں زندگی اور موت کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ میری زندگی کے کچھ حساب کتاب ایسے ہیں جنہیں بے باقی کے بغیر میں موت کو قبول کرنا بھی منظور نہیں کر سکتا۔“

”تم ایک ساتھ ہی مجھے اپنے سارے مطالبات نوٹ کروادو تا کہ میں اپنا لائحہ عمل طے کر سکوں۔“ یوان کے انداز سے واضح نہیں تھا کہ وہ نارمل موڈ میں ہے یا خراب موڈ کے ساتھ اس نے یہ بات کہی ہے۔

”زیادہ کچھ نہیں۔ بس اتنا کہ پاکستان واپسی کے سفر میں میرے ساتھی وقاص کے ساتھ ساتھ باذل بھی میرے ساتھ ہوگا اور ضرورت پڑنے پر وہاں بھی آپ لوگوں کو میری مدد کرنا ہوگی۔۔۔۔۔ اور ہاں۔۔۔۔۔ باقی ہر کام سے پہلے سچل کے والدین کو یہاں بلوا کر ان کی سچل سے ملاقات کروائیں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ ایسا کام ہے جس میں آپ لوگوں کو کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا اس لیے اسے فوری طور پر ہی کرنا ہوگا۔“ وہ اپنے مطالبات پیش کرنے

میں پوری طرح سنجیدہ تھا۔ یوان اسے کچھ دیر دیکھتا رہا پھر مسکرا دیا اور دھیرے سے بولا۔

”میں تمہیں پسند کرتا ہوں اور پوری کوشش کروں گا کہ تمہیں ضائع نہ ہونے دوں۔“

”میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں گا۔“ وہ چینیوں کے روایتی انداز میں یوان کے سامنے احتراماً جھکا۔ ملاقات ختم ہوئی اور یوسف جو اس کی درخواست پر اسے ملاقات کے لیے یہاں لایا تھا، اسے واپس پہنچانے کے لیے حاضر ہو گیا۔

اپنی قیام گاہ پر واپس پہنچ کر اس نے انتظار کا سارا وقت بہت خاموشی اور صبر سے گزارا۔ کسی کو اپنے احساسات میں شریک کرنا اسے گوارا نہیں تھا چنانچہ بس اللہ کے حضور ہی ہر معاملے کی بہتری کے لیے دعا گورہا۔ ساتھی بن کہے بھی بہت کچھ سمجھ رہے تھے اس لیے انہوں نے خود بھی اسے نہیں چھیڑا۔ البتہ وہ خود یوسف کے ساتھ جا کر سبیل سے ملاقات کر آئے تھے۔ واپس آنے کے بعد وقاص کافی دیر تک سبیل کے حوصلے کی تعریف کرتا رہا تھا کہ وہ بہت صبر سے اپنی جان لیوا بیماری سے لڑ رہی تھی اور شدید تکلیف کے باوجود اس کے لبوں پر کوئی شکایت نہیں تھی۔ وہ وقاص کی اس بات پر کوئی تبصرہ نہیں کر سکا۔ کہتا بھی تو کیا کہتا۔ کیا یہ بتاتا کہ سبیل کو ساری شکایتیں اور درد صرف اس سے کہنے آتے تھے۔ وہ روز اس کے خوابوں میں آتی تھی اور درد اور شکایت بھری نظروں سے اسے دیکھتی رہتی تھی۔ اپنی تکلیف اور اپنا دکھ کہنے کے لیے اس نے کبھی لبوں کا سہارا نہیں لیا تھا۔ بس اس کی کھیل سی آنکھیں تھیں جو سب کچھ کہتی رہتی تھیں۔

”آج آپ کی میڈم زن ہو کے ساتھ میٹنگ ہے۔“ یوان سے ملاقات کے بعد اسے زیادہ طویل انتظار نہیں کرنا پڑا تھا اور یوسف اس کے لیے پیغام لے آیا تھا۔ اس روز وہ یوسف کے ساتھ زن ہو سے ملاقات کے لیے پہنچا تو وہ اکیلی ہی اس کی منتظر تھی۔

”مجھے افسوس ہے کہ تمہیں انتظار کی زحمت اٹھانا پڑی لیکن میری خواہش تھی کہ تم سے اسی وقت ملاقات کروں جب اس ملاقات کو کارآمد بنانے کے لیے کچھ موجود ہو۔“ زن ہونے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے خوشگوار لہجے میں کہا تو اس نے امید بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”مجھے خوشی ہے کہ نیوشیو کے حوالے سے جوابدہائی مواد تمہیں بھجوایا گیا تھا، اس میں تم اور تمہارے ساتھی دلچسپی لے رہے ہیں اور تم نے اپنی چائیز بولنے کی صلاحیت کو بھی

امپروو کرنے کی کوشش شروع کر دی ہے۔“ وہ جو سننا چاہتا تھا، وہ بتانے کے بجائے زن پر انٹری اسکول کے بچوں کی طرح اس کی حوصلہ افزائی کر رہی تھی۔ اس کے پاس موجود رپورٹ یقیناً یوسف کی فراہم کردہ تھی کیونکہ وہ قیام گاہ پر یوسف کی موجودگی کا فائدہ اٹھا کر اس سے اس کام کے لیے مدد لیا کرتا تھا۔

”ہمارے ماہرین نے سو نیا پر اپنا کام مکمل کر لیا ہے اور وہ اتنی سے نوٹے فیصد پریقین ہیں کہ وہ اپنے متعلق جو کچھ ظاہر کر رہی ہے، وہ سچ ہے اور اس بات کے امکانات بہت کم ہیں کہ وہ تمہارے ساتھ ہوتے ہوئے ہمیں کسی قسم کا دھوکا دے۔ بالفرض وہ کسی موقع پر ایسا کرنے کی کوشش کرتی ہے تو اسے سنبھالنا تمہاری اپنی ذمہ داری ہوگی۔“

”بالکل۔ میں اسے بہت آسانی سے ہینڈل کر سکتا ہوں۔“ اس نے اطمینان دلایا۔

”تمہارے ساتھی گل خان کی حالت بھی بہت بہتر ہے۔ اسے اپنا ماضی، گھر اور بیوی بچے یاد آنے لگے ہیں اور مجھے امید ہے کہ وہ اب تمہارے کہنے پر گھر واپس جانے کے لیے تیار ہو جائے گا۔“

”گڈ! اچھی خبر سناؤ آپ نے مجھے۔“ اس نے سبھاؤ سے جواب دیا لیکن اس کا اصل سوال تو بڑا بڑا اس کے چہرے پر لکھا تھا۔

”ہم نے پاکستان سبیل کے والدین سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن.....“ اس بار زن اس کی مرضی کے موضوع پر آئی ضرور پر بات ادھوری چھوڑ دی۔

”لیکن کیا؟“ وہ بے قرار ہوا۔

”فی الحال سبیل کے والد صداقت شاہ سے ہمارا رابطہ نہیں ہو سکا۔“

”وہ کیوں؟“ اس نے زن ہو کے چہرے کو غور سے دیکھا کہ آیا وہ اس سے کوئی بہانہ بنانے کی کوشش تو نہیں کر رہی ہے۔

”انہیں اپنی کرپشن کی طرف سے گرفتار کر لیا گیا ہے اور فی الحال تو کسی کو یہ بھی نہیں بتایا جا رہا کہ انہیں کہاں رکھا گیا ہے۔“

”مائی گاڈ!“ وہ خبر سن کر کراہا۔

”ابھی کوئی مستند اطلاع نہیں ملی ہے لیکن سننے میں آرہا ہے کہ کسی بچے کا بھی معاملہ ہے اور بچہ مبینہ طور پر ان کا نواسا یعنی سبیل کا بیٹا ہی ہے۔“

”بچے کا کیا معاملہ؟ کیا کہا جا رہا ہے بچے کے

متعلق؟“ وہ جاننے کو بے چین ہوا۔

”مجاہد کمال نامی ڈاکٹر کے کلینک سے خاصی ہنگامہ آرائی کر کے بچے کو اغوا کیا گیا تھا۔ سننے میں آیا کہ بچے کو اغوا کر کے صداقت شاہ کی حویلی پہنچایا گیا لیکن حویلی سے کوئی بچہ بازیاب نہیں ہوا۔ بس ہمیں شک ہے کہ وہ بچہ ان کا نواسا ہی تھا۔ اگر تم ہمیں تھوڑا نام دو تو بچے کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کر کے تمہیں دے دی جائیں گی۔“

زن نے ملائمت سے درخواست کی۔

”اس کے مقابلے میں، میں فوری طور پر وہاں پہنچ کر اعظم کو محفوظ کرنا زیادہ مناسب سمجھتا ہوں۔ اگر اس کے لیے وہاں کسی قسم کی کھینچا تانی شروع ہو چکی ہے تو اس سے اسے نقصان پہنچنے کا بھی اندیشہ ہے۔“ اس نے زن کی درخواست قبول کرنے کے بجائے اپنا حتمی فیصلہ سنایا۔

”ٹھیک ہے۔ تم اپنی بات منوالو لیکن پھر اس کے بعد تمہیں ہماری ہر شرط پوری کرنا ہوگی۔“ زن نے آخر ہتھیار ڈال دیے۔

”مجھے منظور ہے۔“ اس کے لیے سودا مہنگا نہیں تھا۔

”کب جانا پسند کرو گے؟“

”ابھی۔“

وہ اس بے ساختگی سے بولا کہ زن ہنس پڑی پھر تحمل سے بولی۔ ”بالکل ابھی تو نہیں لیکن بہت جلد تم اپنے وطن میں ہو گے۔“

”میں پوری بے قراری سے اس لمحے کا انتظار کروں گا۔“ اس نے اپنی بے چینی چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ کچھ دیر ان کے درمیان معاملات طے ہوتے رہے۔ وہ زن سے ملاقات کر کے واپس قیام گاہ پر پہنچا تو پُر جوش تھا۔ وہ اور چار کو بھی فوراً اس بارے میں آگاہ کیا۔ وہی سن کر خصوصاً پُر جوش ہو گیا۔

”کیا وہاں ہمیں کوئی مدد مل سکے گی؟“ اس نے وہی سے پوچھا۔

”لالہ عیسیٰ ہے نا۔“ وہی جانتا تھا کہ لالہ کبھی اسے کسی بات کے لیے انکار نہیں کرے گا۔

”اس سے رابطے کا ذریعہ ہے نا تمہارے پاس؟“

”اگر وہ اب تک وہیں ہوا جہاں میں اسے چھوڑ کر آیا تھا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔“ وقاص کی نگاہوں میں وہ پھولوں بھری سرسبز و شاداب وادی لہرائی جہاں وہ علیہ، خاور احمد، سعد اور لالہ کو چھوڑ کر آیا تھا۔

”یعنی اگر وہ وہاں نہ ہوا تو مسئلہ ہوگا؟“

”تب بھی نہیں ہوگا۔ لالہ نے اپنا ایک خفیہ ای میل

ایڈریس ذہن نشین کر دیا تھا مجھے۔ ہم اس کے ذریعے لالہ سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ اگر تم کہو تو میں ابھی کوشش کروں؟“ اس نے وہاں موجود کمپیوٹر کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

”نہیں۔ ابھی نہیں۔ یہاں سے مناسب نہیں ہے۔“

اس نے وہی کو روک دیا۔ جو کچھ کرنا تھا اب پاکستان پہنچ کر ہی کرنا تھا۔ انتظار کا وہ وقفہ طویل ثابت نہیں ہوا۔ زن ہونے اپنے وعدے کے مطابق بہت جلد سارے انتظام کروا دیے۔

تحقیق کے زیر اثر فرمانبراری کا مظاہرہ کرتے باذل سمیت جس رات وہ آخری پہر چین سے پاکستان کے لیے روانہ ہوئے، اس رات کی صبح وہ بھی جب اعظم محبت کرنے والوں کی پناہ سے نکل کر ظالموں کے قبضے میں پہنچ چکا تھا۔

☆☆☆

”سارا محنت غارت ہو گیا۔ اپنے کو اس معاملے سے

الگ ہونے کا ہی نہیں تھا۔ یہ سالا کمینہ لوگ، شریفوں کے بس کی بات ہی نہیں تھا۔“ اصغر غصے میں بولتا جا رہا تھا لیکن لالہ کی زبان سے ایک لفظ نہیں نکل رہا تھا۔ وہ کنبھیر خاموشی کے ساتھ اپنی جگہ پر ساکت بیٹھا ہوا تھا۔ مومی اور نیلی کے مسکراتے چہرے مسلسل اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہے تھے۔ وہ دونوں صرف وہی سے اپنی دوستی نبھانے کے لیے اس کے کہنے پر اس جنگ میں اترے تھے۔ انہیں اپنے مقصد کے تحت استعمال کرتے ہوئے اسے پوری امید تھی کہ وہ محفوظ رہیں گے لیکن وہ نہیں رہ سکے تھے۔

”کاش کہ وہ دونوں اعظم کو حویلی پہنچانے کے بعد وہاں رکنے کے بجائے فوراً واپس آ جاتے۔“ اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے دل میں سوچا۔ وہ دونوں اعظم کی نیلی کے لیے وابستگی دیکھ کر اپنی صوابدید پر وہاں رک گئے تھے لیکن خود اس نے بھی ان کو منع نہیں کیا تھا۔ یہی گمان تھا کہ صداقت شاہ کی اونچی دیواروں والی حویلی کے اندر وہ بالکل محفوظ ہیں لیکن وہاں تو خود صداقت شاہ محفوظ نہیں رہ سکے تھے اور انہیں قانون کی بیڑیاں پہنا کر پابند سلاسل کر دیا گیا تھا۔

”میں نے تو سوچا تھا کہ وہی آئے گا تو اسے سنانے

کے لیے میرے پاس دنیا کی سب سے بڑی خوشخبری ہوگی

لیکن دوست کے غم کے ساتھ اسے بھلا دنیا کی کون سی خوشی

مزہ دے سکے گی۔“ اس کا دھیان وہی کے دنیا میں وارد

ہونے والے بچے کی طرف چلا گیا۔ بچے کی پیدائش اگرچہ

غیر متوقع طور پر وقت سے کچھ قبل عمل میں آگئی تھی لیکن خوش

ہوئے

میں نے تو سوچا تھا کہ وہی آئے گا تو اسے سنانے

کے لیے میرے پاس دنیا کی سب سے بڑی خوشخبری ہوگی

لیکن دوست کے غم کے ساتھ اسے بھلا دنیا کی کون سی خوشی

مزہ دے سکے گی۔“ اس کا دھیان وہی کے دنیا میں وارد

ہونے والے بچے کی طرف چلا گیا۔ بچے کی پیدائش اگرچہ

غیر متوقع طور پر وقت سے کچھ قبل عمل میں آگئی تھی لیکن خوش

ہوئے

میں نے تو سوچا تھا کہ وہی آئے گا تو اسے سنانے

کے لیے میرے پاس دنیا کی سب سے بڑی خوشخبری ہوگی

قسمتی سے کوئی مسئلہ نہیں بنا تھا اور اس چھوٹے سے گاؤں میں ہی سب کچھ بخیر و خوبی انجام پا گیا تھا۔ لالہ نے جب سے خاور صاحب کی زبانی یہ خوشخبری سنی تھی، خود وہاں جانے کے لیے بے تاب تھا لیکن یہاں کی ہنگامہ آرائیوں کی وجہ سے موقع ہی نہیں مل سکا تھا اور یہ مومی اور نیلی والا معاملہ..... اس دکھ نے تو خود اس کی خوشی کو کبر لگا دیا تھا۔

”میں کہتا ہوں لالہ! بس بہت ہو گیا صبر۔ اب ہمیں ان کو سبق سکھانا ہی ہوگا۔ خاص طور پر ان سالے پولیس والوں کو جو مجرموں اور ملک دشمنوں کی گود میں جا بیٹھے ہیں۔“ اصغر کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کیا کر گزرے لیکن لالہ کی طرف سے مسلسل خاموشی تھی۔ اس خاموشی کو فون کی کھنٹی کی مداخلت نے توڑا۔

”ہاں طاہر! بولو، کیا اطلاعات ہیں؟“
”لڑکا مر چکا ہے لیکن لڑکی زندہ ہے۔ اسے گولی لگی ہے اور خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے حالت سیریس ہے لیکن بہر حال زندہ ہے۔“ طاہر نے اطلاع دی۔
”اور اعظم.....؟“

”اس کے بارے میں کوئی خبر باہر نہیں نکالی جا رہی ہے۔ بازیابی کی کوئی رپورٹ تیار نہیں کی گئی ہے بلکہ ایسا لگتا ہے کہ پولیس اس پورے کے پورے وقوعہ کو ہضم کر جانے کے چکر میں ہے۔“

”ایسا نہیں ہونا چاہیے۔“ لالہ تیز لہجے میں بولا پھر اس سے پوچھا۔

”میری بھیجی ہوئی تصویریں دیکھ لیں تم نے؟“
”جی جناب! تصویریں تو بالکل واضح ہیں اور صاف دیکھا جاسکتا ہے کہ اعظم کو پولیس کا ایک سپاہی گود میں لیے کھڑا ہے۔ ڈی ایس پی کی شکل بھی بالکل صاف آئی ہے۔“
طاہر بیگ نے جواب دیا۔

”بس تو پھر تم یہ اسٹوری ڈسکلوز کرو۔ موقع پر موجود آدمیوں کے بیانات بھی تمہیں مل جائیں گے۔ میری قربان شاہ سے بات ہوگئی ہے۔ ساری گواہیاں بالکل نیلی ہوں گی۔ وہ خود اپنے پوتے کی حوالگی سے متعلق دعویٰ بھی دائر کرنے جا رہے ہیں۔“ لالہ نے طاہر بیگ کو ہدایات جاری کیں۔ اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے موقع کی تصاویر لینے کا کارنامہ سچل کے سامنے ڈرائیور نے انجام دیا تھا اور یہی تصاویر اب ان کے کام آنے والی تھیں۔

”میں اسٹوری تیار کرتا ہوں لیکن اخبار کے مالک سے بھی بات کرنا ہوگی۔ سامنے والے طاقتور ہوں تو ہماری

سوکالڈ آزاد صحافت بھی لنگڑانے لگتی ہے۔“ طاہر بیگ خدشات کا شکار تھا۔

”اس کی تم فکر نہ کرو۔ میں قربان شاہ کے ذریعے یہ بات تمہارے مالک سے منوالوں گا۔ جیب بھاری ہونے کے ساتھ ساتھ ایک انوکھی اسٹوری سامنے لانے کا موقع نہیں گنوائے گا تمہارا مالک بلکہ ایسا کرو کہ خود یا اپنے کسی ساتھی کے ذریعے سامعین صداقت شاہ کی گرفتاری پر بھی کالم چھپواؤ۔ سوال اٹھاؤ کہ ایک نیک نام سیاست دان کے ساتھ اچانک ہی امتیازی سلوک کیوں برتا جا رہا ہے؟ ان کے مسائل کے حل کے لیے حکومت کوئی کردار کیوں ادا نہیں کر رہی اور انہیں کرپشن کے مقدمات میں پھنسانے کی سازش کس کی ہے؟“ لالہ جانتا تھا کہ طاہر خود بھی اس حقیقت سے واقف ہے کہ صداقت شاہ کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا، وہ ایک سازش کے سوا کچھ نہیں تھا اسی لیے اسے اس طرح کی ہدایات دے رہا تھا۔ ورنہ طاہر کا شمار ان صحافیوں میں نہیں ہوتا تھا جو بغلافہ لے کر کسی کی ہدایات پر اپنے قلم کو حرکت دیں۔

”آپ بے فکر رہیں۔ میں اپنا کام بہت اچھے طریقے سے انجام دوں گا۔ میں نے اسپتال میں زیر علاج نیلی کی تصویر بھی حاصل کر لی ہے لیکن.....“
”لیکن کیا؟“

”معمر کی لاش کا کیا ہوگا؟ کیا آپ اسے لاوارث چھوڑ دیں گے؟“

”ہر گز بھی نہیں۔“ لالہ تڑپ اٹھا۔ ”نہ اسے لاوارث چھوڑا جائے گا اور نہ ہی پولیس سمیت کسی کو اس کا خون معاف ہوگا۔ فی الحال میں خود سامنے نہیں آسکتا لیکن جس سرکس کمپنی میں مومی اور نیلی کام کرتے تھے، اس کے مالک سے بات ہوگئی ہے میری۔ وہ جائے گا مومی کی لاش کی وصولی کے لیے۔ بس پولیس کو یہ باور ہو جائے کہ وہ اس قتل کو چپ چپاتے ہضم نہیں کر سکتی۔ پولیس مقابلے میں ہی سہی، انہیں مومی کی ہلاکت کی ذمہ داری قبول کرنا ہوگی۔“
”پھر تو الیکٹرانک میڈیا زیادہ بہتر رہے گا۔ نی دی پر بریکنگ نیوز چلتے ہی ہر طرف شور مچ جائے گا۔“

”اس کے لیے تم انتظامات کرو۔ جہاں پیسا خرچ کرنا ہوا، وہاں قربان شاہ پیچھے نہیں ہٹے گا۔ یہ اس کے اکلوتے پوتے کی بقا کا بھی مسئلہ ہے۔“ اس نے طاہر کے مشورے کو پسند کیا۔

”میرے پاس کچھ اطلاعات عرفان اللہ کے حوالے سے بھی ہیں۔“

امید تو اسی انجام کی تھی لیکن اتنی تیزی کی بھی توقع نہیں تھی اس کی طرف سے۔ ”لالہ نے حیرت کا اظہار کیا پھر پوچھا۔
”صوفیہ کا کیا رد عمل ہے؟“

”اس کی طرف سے شادی کے لیے مثبت جواب نہیں دیا گیا ہے لیکن امید ہے کہ وہ بن بیاہی بیوی کی تمام ذمے داریاں آرام سے سنبھال لے گی۔ قانونی بیوی بن کر رہنے میں یہ نقصان ہوگا کہ عرفان اللہ کو شرمناک آڈیو اور ویڈیوز کے جال میں پھانس کر بلیک میل نہیں کیا جاسکے گا۔“
”چلنے دو اس سلسلے کو بھی پھر دیکھیں گے کہ کیسے لگا میں کھینچی جائیں۔“ یہ واضح تھا کہ دولت اور عورت کے ذریعے عرفان اللہ کو اپنی راہ پر چلانے کی پوری تیاری تھی میڈم ایکس کی طرف سے۔

”بس تو پھر فی الحال مجھے اجازت دیں۔ اگر ضرورت پڑی تو پھر رابطہ کروں گا۔“ طاہر بیگ نے اجازت چاہی۔
”بندے لگا دے اسپتال میں جو نیلی کی خیر خبر بھی دیتے رہیں اور اس کی حفاظت بھی کریں۔ صاف بتا دینا ان کو کہ اگر نیلی کا بال بھی بیکا ہوا تو ان کے جسموں پر ان کی کھال موجود نہیں رہے گی۔“ فون سے فارغ ہوتے ہی اس نے اصغر کو اسپتال کا نام بتاتے ہوئے پہلی ہدایت نیلی کے سلسلے میں دی۔

”کہہ دوں گا لالہ! کہہ دوں گا۔“ اصغر اس کا موڈ دیکھ کر جلدی سے بولا اور اپنے فون پر مصروف ہو گیا۔ لالہ بھی اپنے فون پر مصروف ہو گیا۔ وہ خبریں دیکھ رہا تھا۔ خبروں میں وہی سیاست دانوں کے جھگڑے، روز بروز بڑھتی مہنگائی اور بے روزگاری کے مسائل، کھیلوں کی دنیا میں اپنے کھلاڑیوں کی خراب کارکردگی وغیرہ جیسے مسائل تھے اور کہیں کوئی ایسی خبر نہیں تھی جو دل کو خوشی دے سکے۔
ہاں، عرفان اللہ اور اس کے فلاچی کاموں کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا تھا اور کوئی بھی عقل مند شخص اس بات کو سمجھ سکتا تھا کہ میڈیا کی اتنی مہربانی کے پیچھے کسی کا آشیر باد ہے۔ بے دلی سے ان خبروں کو دیکھتے لالہ کی نظر آنے والی ایک ای میل کے اشارے پر پڑی تو بیزار کن خبریں ہٹا کر وہ ای میل کھول لی اور پھر اگلے ہی لمحے گنگ رہ گیا۔

”بندے لگا دیے ہیں لالہ! بس دس منٹ میں وہ اسپتال میں ہوں گے۔“ اصغر اپنی کال نمٹا کر اسے اطلاع دینے کے لیے اس کی طرف پلٹا تو اسے ایک ٹک اسکرین کو گھورتے دیکھ کر چونک گیا۔

”لالہ.....!“ اس نے آہستہ سے پکارا لیکن لالہ نے

”کیسی اطلاعات؟“ گو اس کے لیے اس وقت درپیش معاملات ترجیحی حیثیت رکھتے تھے لیکن عرفان اللہ کے معاملات سے بھی باخبر رہنا ضروری تھا۔

”عرفان اللہ، یزدانی کی ذہنی حالت کا فائدہ اٹھا کر اس کی پراپرٹی پر قابض ہونے کی فکر میں ہے۔ عملی طور پر تو ویسے بھی معاملات اس کے ہاتھ میں ہی ہیں لیکن وہ قانونی طور پر بھی سب اپنے نام کرنے کے چکر میں ہے تاکہ آگے یزدانی یا اس کی بیوی کے خاندان سے کوئی اس کا نفاذ پر اپنا حق نہ جتا سکے۔“

”مار آئستین۔“ خبر سن کر لالہ نے بے ساختہ تبصرہ کیا۔
”ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یزدانی نے ساری عمر جو بویا تھا، وہی کاٹنے والا ہے۔ عرفان اللہ جیسے شخص سے دوستی کرنے اور اس کے ساتھ مل کر ملک کی جزیں کاٹنے والے شخص کو یہ امید نہیں رکھنا چاہیے کہ ایسا شخص کبھی اس کے ساتھ مخلص ثابت ہوگا۔“ طاہر نے سنجیدگی سے اپنی رائے پیش کی۔

”چلو، جو بھی ہے، تمہارے ہاتھ تو ایک اور زبردست اسٹوری آگئی ہے۔ لگتا ہے جلد صحافت کے میدان میں تمہارا ستارہ بہت بلند ہونے والا ہے۔“ لالہ نے اسے داد دی۔
”مجھے شہرت سے زیادہ اپنے پیسے سے انصاف کی فکر رہتی ہے۔ میرے لیے یہ اطمینان کافی ہے کہ میں اپنا کام پورے خلوص اور ایمان داری سے کر رہا ہوں۔ آپ کا ساتھ مجھے اس لیے دے رہا ہوں کہ آپ جو کچھ کر رہے ہیں، اس میں ملک کو نقصان پہنچانے کی نیت نہیں ہے۔“ طاہر اپنی طرز کا ایک الگ شخص تھا اور لالہ کو اعتراف تھا کہ وہ اس کی اس درجہ ایمان داری سے متاثر ہوتا ہے۔

”میں تمہاری نیت کو اچھی طرح جانتا ہوں ینگ مین لیکن یاد رکھو کہ شہرت بھی کوئی بری شے نہیں۔ مشہور آدمی ایک عام آدمی کے مقابلے میں زیادہ تعلقات رکھتا ہے اور بہت سے کام اپنی شہرت کے سہارے بھی نکلوا سکتا ہے اس لیے اگر کبھی شہرت کی دیوی تم پر مہربان ہو تو اس سے کئی کترا کر نکلنے کی کوشش مت کرنا۔“ لالہ نے اسے مشورہ دیا۔

”میں آپ کی اس نصیحت کو یاد رکھوں گا۔ فی الحال تو آپ عرفان اللہ کے حوالے سے دوسری خبر بھی سنیں۔“
”میں ہمہ تن گوش ہوں۔“

”عرفان اللہ اپنی نئی پی اے صوفیہ پر بری طرح عاشق ہو گیا ہے اور بھند ہے کہ صوفیہ اس سے شادی کر لے۔“

”صرف چار دن کے ساتھ میں شادی کا مطالبہ.....“

جنبش نہ کی۔

”خیر تو ہے لالہ؟“ اس بار اس نے ذرا جرأت سے کام لے کر لالہ کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

”میرا دکی واپس آ گیا ہے اصغر! یہ دیکھو، یہ اس کی ای میل آئی ہے۔ وہ..... وہ اس وقت اپنے ہی شہر میں ہم سے تھوڑی دور موجود ہے اور مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔“ ذفر جذبات سے لالہ کی آواز کانپ گئی۔ اتنے عرصے سے اس کے پاس دکی کی کوئی خیر خبر نہیں آئی تھی۔ ایسے میں اس ای میل کے آنے پر لالہ کا جذباتی ہونا جتنا تھا۔

”کہیں کوئی دھوکا تو نہیں ہے۔ ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ آپ کو سامنے لانے کے لیے کسی نے یہ چال چلی ہو۔“ اصغر نے خدشے کا اظہار کیا۔

”اپنا یہ ای میل ایڈریس میں نے خود ایمرجنسی کے لیے دکی کو بتایا تھا لیکن ہونے کو تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ دشمن کے عقوبت خانوں میں ہاتھ آئے شکار کی زبان کھلوانے کے بہت ہتھکنڈے ہوتے ہیں۔“ لالہ کا جوش ماند پڑا۔

”ضروری نہیں کہ یہ کوئی چال ہی ہو۔ آپ مجھے دکی بھائی کا بھیجا ہوا ایڈریس دے کر خود آرام کریں۔ میں خود تصدیق کرتا ہوں کہ یہ ای میل سچی ہے یا نہیں۔“ اصغر نے لالہ کو تسلی دی۔

☆☆☆

”وکیلیم بیک مائی بوائے!“ جذبات کا ایک سمندر تھا جو دکی کو اپنے سامنے زندہ سلامت دیکھ کر لالہ کے اندر موجزن ہوا تھا لیکن حسب عادت اس نے اپنی کیفیات کو چھپاتے ہوئے ایک باوقار مسکراہٹ کے ساتھ دکی کا استقبال کیا تھا۔

”یقیناً آپ کو میری واپسی کی کم ہی امید رہی ہوگی۔“ دکی خود آگے بڑھ کر اس سے گرم جوش سے گلے ملا۔ لالہ کے سینے میں ٹھنڈ پڑ گئی۔

”کم ہی سہی، امید باقی ہو تو آدمی دعا کے سہارے ناممکن کو ممکن بنوا لیتا ہے۔“ لالہ نے مسکراتے ہوئے اس کی بات کا جواب دیا۔

”آپ نے میری واپسی کی دعا کی تھی؟“ دکی کو خوشگوار سی حیرت ہوئی۔

”اپنی خاطر نہیں، اس جھل کے لیے جسے تو اپنے نام پر چھوڑ کر گیا تھا اور اس بلوگڈے کے لیے بھی جس کو اس دنیا میں سب سے زیادہ تیری ضرورت ہے۔“ لالہ کے لہجے میں شوخی تھی۔

”بلوگڈا.....؟“ دکی اس کی بات پر ٹھنکا۔

”ذرا پیچھے ہٹ تو میں دوسروں سے بھی ملوں۔“ لالہ نے اسے ہاتھ سے ایک طرف کیا اور معاذ کی طرف بڑھا۔ معاذ نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن لالہ نے اسے کھینچ کر گلے سے لگا لیا۔

”مبارک ہو معاذ میاں! آپ ایک عدد بھانجے کے ماموں بن گئے ہیں اور شنید ہے کہ بچہ آپ پر گیا ہے اس لیے بہت خوبصورت ہے۔ باپ پر جاتا تو ایویں منجھو ہی نکلتا۔“ معاذ سے گلے ملتے ہوئے اس نے جو خوشخبری سنائی، اسے سن کر نہ صرف معاذ کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا بلکہ دکی کا چہرہ بھی ہزار دہلیز کے بلب کی طرح جگمگانے لگا۔ فوراً ہی وہاں مبارک سلامت کا شور مچ گیا۔ معاذ کے ساتھ ساتھ جارا اور اصغر نے بھی دکی کو گلے لگا کر مبارک باد دی۔ ماحول بے حد خوشگوار ہو گیا۔ ایک دوسرے سے کیا بیٹی کیا نہیں، پوچھنا بھول کر اس خوشی کو منایا جانے لگا۔ لالہ نے جان بوجھ کر مومی اور نیلی کا ذکر نہ چھیڑا کہ پہلے دل کھول کر خوش ہولینے دیا جائے۔ فوری طور پر سٹیلائٹ فون کے ذریعے علینہ اور خاور صاحب سے رابطہ کیا گیا۔ علینہ کا اصرار تھا کہ دکی اور معاذ بغیر کسی تاخیر کے سیدھے ان کے پاس چلے آئیں۔ کچھ ایسی ہی خواہش خاور صاحب کی بھی تھی۔ علینہ کو بہلایا گیا۔ تسلی اور تشفی کے الفاظ کہہ کر جلدی آنے کے وعدے وعید کیے گئے۔ خاور صاحب کو البتہ اشارہ دے دیا گیا کہ ابھی راہ میں کچھ رکاوٹیں حائل ہیں۔

”کوشش کرنا بیٹا کہ مرنے سے پہلے اس بوڑھے باپ کو اپنی ایک جھلک ضرور دکھا جاؤ۔ یہ نہ ہو کہ تمہاری ماں کی طرح میں بھی تمہاری راہ دیکھتا مایوس اس دنیا سے چلا جاؤں۔“ وہ بھی اتنے زیادہ جذباتی آدمی نہیں رہے تھے لیکن حالات کے مسلسل پھیڑوں اور اولاد کی اندیشوں سے پُر لہجی جدائی نے انہیں کمزور کر دیا تھا۔

”ایسی باتیں نہ کریں ابو! میں جو حالات سے لڑ رہا ہوں تو صرف اس اطمینان کے سہارے کہ ہمارے بچے کچھے خاندان کے سر پر آپ کا سایہ موجود ہے اور دنیا کے کسی پرسکون گوشے میں آپ لوگ اپنے حصے کی خوشیاں پارہے ہیں۔“

”ہماری ہر خوشی تمہارے بغیر ادھوری ہے بیٹے!“

خاور صاحب کر لائے۔

”کچھ والدین کے حصے میں ادھوری ہی خوشیاں آتی ہیں کیونکہ انہیں یہ اعزاز حاصل ہونا ہوتا ہے کہ ان کی اولاد وطن کا دفاع کرنے اور حق کے لیے لڑنے والوں میں شامل

استعمال کیا ہے، اس سے ان کی بے خونی اور اختیارات بالکل واضح ہیں۔“ لالہ کے لہجے میں حقیقی شرمندگی تھی۔ وکی سن کر تڑپ گیا اور غمزدہ لہجے میں بولا۔

”اصل میں تو وہ مجھ پر قربان ہوا ہے۔ یارنی نبھانے میں اتنا کیا تھا کہ کبھی کسی بات کو انکار نہیں کیا۔ میری خاطر اپنی صحت گنوا کر پہلے سرکس کی دنیا سے دور ہوا اور اب بھی میرے لیے ہی اس آگ میں کود کر اپنی جان گنوا دی لیکن میں اس کے قاتلوں کو بالکل بھی معاف نہیں کروں گا۔ انہیں موتی کے خون کے ایک ایک قطرے کا حساب دینا ہوگا۔“ غم، غصہ، بے بسی، سب کچھ ایک ساتھ حملہ آور ہوئے تھے۔

”معافی تو میں نے بھی نہیں دینی کسی کو۔ پولیس والوں کا ناطقہ بند کرنے کا انتظام کر لیا ہے میں نے۔ یہ دیکھو، یہ بریکنگ نیوز چل رہی ہے لی وی پر۔“ لالہ نے لی وی آن کر کے انہیں بریکنگ نیوز دکھائی۔ ظاہر نے کم وقت میں اچھا کام کیا تھا۔ اعظم کی پولیس والے کی گود میں تصویر اور موقع پر موجود سچل اور گارڈز کے بیانات نے خبر کو خاصا جاندار بنا دیا تھا۔ مصلحتاً موتی اور نیلی سے تعلق کو ظاہر کیے بغیر اس واقعے کو صرف عینی شاہد کی حیثیت سے اٹھایا گیا تھا اور اصل مدعا یہ رکھا گیا تھا کہ قربان شاہ اور صداقت شاہ کے ملازمین اتفاقاً اس واقعے کے گواہ بن گئے تھے۔ انہوں نے فائرنگ کی آوازیں سنیں اور جب موقع پر پہنچے تو مرد اور عورت کے زخمی جسموں کے علاوہ جو سب سے اہم شے دیکھی تھی، وہ اعظم کی موجودگی تھی۔ سچل اور کئی ملازمین نے اعظم کو شناخت کیا اور قربان شاہ کو اس کے بارے میں اطلاع دی۔ اب قربان شاہ کا مطالبہ تھا کہ ان کے پوتے کو ان کے حوالے کیا جائے۔ انہوں نے شکایت کی تھی کہ بچے کی بازیابی پر پولیس نے ان سے از خود رابطہ کرنا تو دور کی بات، انہیں اس سارے وقوعے سے آگاہ تک کرنا گوارا نہیں کیا۔ وہ اس معاملے کو اوپر تک لے کر گئے تھے اور مسلسل اعظم کی حوالگی کے لیے شور مچا رہے تھے۔

”یہ اچھا کام ہو رہا ہے لیکن ہمیں نیلی کے لیے کچھ کرنا ہوگا۔ سچائی چھپانے کے لیے وہ اس کی جان بھی لے سکتے ہیں۔“ وکی نے سرخ آنکھوں کے ساتھ نیلی کے لیے اپنی فکرمندی کا مظاہرہ کیا۔

”میرے ذہن میں بھی یہ بات تھی اس لیے میں نے اپنے آدمی نیلی کی حفاظت پر لگا رکھے ہیں۔ ڈاکٹر کو بھی ہم نے اپنے اعتماد میں لے لیا ہے۔ نیلی کی حالت اسٹبل ہو جائے تو اسے اسپتال سے کسی دوسرے محفوظ مقام پر شفٹ

ہو جائے۔ آپ کو ساری زندگی مجھ سے یہ شکوہ رہا ہے نا ابو کہ میں نے اپنی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال نہیں کیا تو اب میں آپ کا یہ شکوہ دور کرنے جا رہا ہوں۔ مجھے اپنی خوشیوں میں شامل ہونے کا حق معاف کر دیں، ابو!“

”معاذ.....!“ وہ کچھ ایسے لہجے میں بولا کہ خاور صاحب گنگ رہ گئے۔

”کوئی سوال نہ کیجیے ابو! بس اتنی تسلی رکھیں کہ آپ کا بیٹا ایسا کچھ نہیں کرے گا جس سے آپ کا سر جھک جائے۔“ اس نے انہیں ٹوک دیا۔

”اللہ کی امان میں بیٹا!“ خاور صاحب بس اتنا ہی کہہ سکے۔ ان سے یہ گفتگو کرنے کے بعد معاذ کا اپنا دل بوجھل ہو گیا تھا لیکن وکی کی خوشی کی خاطر اس نے اپنی کیفیت کو چھپا کر لبوں پر مسکراہٹ سجائے رکھی۔ کھانے پر خاصا اہتمام تھا۔ کھانا خوشگوار ماحول میں کھایا گیا۔ کھانے کے دوران وکی نے مسائل پر ہلکی پھلکی گفتگو کرنے کی کوشش بھی کی لیکن لالہ نے اسے ٹوک دیا کہ بعد میں اطمینان سے بات کریں گے۔ وہ خود البتہ درمیان میں ایک بار اٹھ کر باہر گیا تھا۔ معاذ نے محسوس کیا کہ لالہ کے بظاہر پُرسکون رویے کے پیچھے پریشانی پوشیدہ ہے۔ تصدیق تھوڑی دیر بعد اس وقت ہو گئی جب کھانے سے فارغ ہونے کے بعد لالہ نے ہر بات تفصیل سے بتانا شروع کی۔ اعظم کے حصول کی داستان سے لے کر اس کے بچاؤ کے لیے کی جانے والی ساری جدوجہد اور اس ساری کارروائی میں موتی اور نیلی کے کردار کو بیان کرتے ہوئے جب اس نے اعظم کے پولیس کسٹڈی میں جانے، نیلی کے زخمی ہونے اور موتی کی ہلاکت کے بارے میں آگاہ کیا تو وکی اور معاذ دونوں کو شدید شاک لگا۔ موتی کی موت کا سن کر وکی پر خصوصاً قیامت گزر گئی۔ بچپن کا پیارا دوست، جس کے ساتھ مل کر بے شمار خوشی اور غم کے لمحات بتائے تھے، یوں کسی کی بربریت کا شکار ہو گیا تو یہ کوئی معمولی صدمہ تو نہیں تھا۔

”میں تجھ سے معافی چاہتا ہوں لاڈلے کہ اتنے خطرناک کام میں تیرے دوست کو گھسیٹ لیا۔ سوچا تھا بس بچے کو کلینک سے نکالنے تک ان دونوں میاں بیوی سے کام لیتا ہے۔ آگے سامیں صداقت شاہ خود سب کچھ دیکھ لے گا لیکن بچہ، نیلی سے اچھ ہو گیا اور وہ لوگ وہاں سے نکل ہی نہیں سکے۔ دوسرے مخالفین نے ایک ہل کے لیے پیچھا نہ چھوڑا اور سازشوں کے جال پر جال بنتے چلے گئے۔ اپنے مقصد کے حصول کے لیے جس طرح انہوں نے پولیس کا

کر دیا جائے گا۔ اس کی مکمل ذمہ داری اب ہماری ہے۔
 مومی کے بعد اب تو اور میں اس کے والی وارث ہیں۔“
 ”مومی کا جنازہ.....؟“ وہ کی آواز اس کے حلق میں
 پھنس گئی۔

”سب اچھی طرح ہوگا۔ سرکس کمپنی کا مالک سامنے
 رہے گا لیکن سب کچھ ہم خود ہی دیکھیں گے۔“ لالہ نے اسے
 تسلی دی۔

”جو ہوا، بہت بُرا ہوا لیکن اب ہمیں خود پر قابو پا کر
 آگے کی حکمت عملی تیار کرنا ہوگی۔ ہمارے سامنے فی الحال
 جو کرنے کے کام ہیں، ان میں سے سرفہرست صداقت شاہ
 اور اعظم کی پولیس سے بازیابی، مومی کی تدفین اور نیلی کی
 حفاظت کے کام ہیں۔ دوسرے مرحلے میں ہم دشمنوں کی بیخ
 کنی اور دوستوں کے ساتھ ہونے والے ظلم کا حساب لینے
 کے کام انجام دیں گے۔ یہ سب کرنے کے لیے ہمیں خود کو
 ذہنی اور جذباتی طور پر مضبوط کرنے کی ضرورت ہے اس
 لیے بی اسٹرائٹک!“ اس بار معاذ نے گفتگو میں دخل دیا اور
 آخر میں وہی کے شانے کو تھپتھپاتے ہوئے اسے سمجھایا۔

”معاذ کا کہنا ٹھیک ہے۔ جو کچھ ہوا، ہمیں اس کا دکھ
 ہے اور اس دکھ میں ہم تمہارے ساتھ کھڑے ہیں۔ ہمارا
 وعدہ ہے کہ کسی بھی مقام پر تم خود کو تنہا نہیں پاؤ گے۔“ جارو...
 کم گو تھا اور بہت کم ہی کسی بات میں دخل دیتا تھا لیکن اس وقت
 اس نے بھی وہی کو اپنے ہونے کا احساس دلا کر اس کا حوصلہ
 بڑھانے کی کوشش کی۔ اس کے اس غلوں پر وہی کی آنکھیں
 بھیگ گئیں اور اس کا ہاتھ تمام کر جذباتی لہجے میں بولا۔

”میں خوش قسمت ہوں کہ اپنا سب سے پرانا دوست
 کھونے کے بعد بھی تمی دامن نہیں ہوا اور اللہ نے مجھے ایسے
 ساتھی دیے جنہوں نے غم کی اس گھڑی میں مجھے بکھرنے
 سے بچالیا۔“

”جب تک دم میں دم ہے، ہم اسی طرح ایک
 دوسرے کا ساتھ نبھاتے رہیں گے۔“ معاذ نے بھی جارو
 کے ہاتھ پر رکھے اس کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ کر اسے
 یقین دہانی کروائی اور پھر جارو اور اس نے بیک وقت دونوں
 طرف سے اسے اپنے بازوؤں کے گھیرے میں لے لیا۔ یہ
 ایک لازوال لمحہ تھا جس میں ان کی دوستی کا باب نئے سرے
 سے رقم ہونے جا رہا تھا۔

☆☆☆

”میں نے آپ سے کہا تھا کہ اسے ہوش آرہا ہے۔
 دیکھیں یہ بار بار اپنی پلکیں جھپک رہی ہے لیکن ایسا لگ رہا

ہے کہ ابھی اپنے حواسوں میں نہیں ہے اور ارد گرد کے ماحول
 کو پوری طرح سمجھ نہیں پا رہی ہے۔“ ڈاکٹر کو اپنے ساتھ نیلی
 کے کمرے میں لے کر آنے والی نرس پُر جوش لہجے میں اسے
 بتا رہی تھی لیکن اچھی بات یہ تھی کہ جوش میں بھی اسے آواز
 دہمکی رکھنے کا ہوش رہا تھا۔

”ٹھیک ہے سسٹرا میں خود انہیں دیکھ لوں گا۔ آپ
 باہر جائیں اور پلیز ان فی الحال کسی اور کو اس کے ہوش میں
 آنے کی اطلاع مت دیجیے گا۔“ ڈاکٹر نے اپنے نرم لہجے کو
 آخر میں تنبیہی کر لیا۔

”میں نے کیوں بتانا ہے جی۔ میں کوئی پاگل تھوڑی
 ہوں۔“ نرس بولتے ہوئے باہر چلی گئی اور یہ ٹھیک تھا کہ وہ
 اتنی سانی تو تھی کہ جس زبان بندی کے لیے اسے باقاعدہ رقم
 فراہم کی گئی تھی، اسے قائم رکھتی ڈاکٹر کا تعاون بھی لالہ نے
 خریدا تھا اور وہ سرکار سے تنخواہ لینے کے بعد سرکاری وردی
 والے کی صین ٹاک کے نیچے، لالہ سے لی ہوئی رقم حلال
 کرنے کے لیے کمر بستہ تھا۔ دیے سرکاری وردی والے کا
 بھی فی الحال دور دور تک کچھ پتا نہیں تھا۔ اسے یہاں کچھ
 دیا لو دوست مل گئے تھے جو وقتاً فوقتاً چائے کھانے کے لیے
 اسے اپنے ساتھ قریبی ہوٹل لے جاتے تھے۔ سپاہی کو منظر
 سے غائب رکھنے والے لالہ ہی کے گھر گئے تھے۔

”آنکھیں کھولو بی بی! ہوش میں آؤ اور بتاؤ کہ تمہارا
 کیا حال ہے؟“ ڈاکٹر نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کیا
 اور نیلی کے قریب کھڑے ہو کر اس کے رخسار تھپتھپاتے
 ہوئے اسے دہمکی آواز میں پکارنے لگا۔

”مم..... میں کہاں ہوں؟“ اس نے اجنبی نظروں سے
 سب کچھ دیکھا اور الجھے ہوئے لہجے میں ڈاکٹر سے پوچھا۔
 ”تم اسپتال میں ہو۔ تمہیں گولی لگی تھی اور تم خون
 زیادہ بہہ جانے سے بے ہوش ہو گئی تھیں۔ اب تم اپنی
 طبیعت کیسی محسوس کر رہی ہو؟“ ڈاکٹر نے محتاط لہجے میں اس
 سے دریافت کیا۔

”میں.....“ اس نے سوچنے والے انداز میں اپنی
 آنکھ کی پتلیاں سکیڑیں پھر کچھ یاد آ جانے پر گھبرا کر پکاری۔
 ”مومی..... مومی کہاں ہے؟ وہ ٹھیک تو ہے نا؟ اسے
 بھی گولیاں لگی تھیں۔“

”وہ ٹھیک ہے اور ادھر مردانہ وارڈ میں داخل ہے۔ تم
 اٹھنے بیٹھنے کے لائق ہو جاؤ گی تو تمہیں اس سے ملوانے لے
 چلیں گے۔“ ڈاکٹر کو مومی کے سلسلے میں پہلے ہی بریف کر دیا
 گیا تھا کہ وہ کون ہے اور نیلی کے اس کے بارے میں کوئی

سوال کرنے پر اس کے متعلق کیا جواب دینا ہے۔

”اس کو متنی گولیاں لگی ہیں؟ اس کی حالت خطرے سے باہر تو ہے نا؟“ اس نے اپنی نظروں کے سامنے معمر کو گولیاں کھا کر نیچے گرتے ہوئے دیکھا تھا اس لیے ڈاکٹر کی طرف سے تسلی دیے جانے کے باوجود مطمئن نہیں ہو پارہی تھی۔

”میں اسے ٹریمنٹ نہیں دے رہا اس لیے مجھے اس کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں۔“ ڈاکٹر سے مزید جھوٹ نہ بولا گیا تو بات بنادی اور پھر اسے متوجہ کرتے ہوئے گمبھیر لہجے میں بولا۔

”تم پولیس کیس میں یہاں آئی ہو اور پولیس کی طرف سے ہمیں حکم ہے کہ تمہارے ہوش میں آتے ہی انہیں اطلاع دی جائے تاکہ تمہارا بیان ریکارڈ ہو سکے لیکن تمہارے کچھ ہمدردوں نے مجھے ایسا کرنے سے منع کیا ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ پولیس کو بیان دے کر تم کسی مصیبت میں پھنسو۔“

”کون ہمدرد؟“ نیلی کا دماغ سیدھا لالہ کی طرف ہی گیا لیکن عقل مند کی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کا نام لینے کے بجائے سوال کیا۔

”ٹھیک سے مجھے بھی نہیں پتا لیکن تمہاری بات کروانے کی کوشش کرتا ہوں۔“ اس نے خود کو فراہم کیے جانے والے ایک نمبر پر کال کی۔ فوراً ہی کال ریسیو کر لی گئی۔ ڈاکٹر نے نیلی کے ہوش میں آ جانے کی اطلاع دی۔

”فون بند کرو۔ ابھی تمہارے فون پر دوبارہ کال آئے گی۔ اس کال پر لڑکی سے بات کروانا۔“ دوسری طرف سے ہدایت دے کر کال کاٹ دی گئی۔ کچھ ثانیے بعد گھنٹی بجنے پر ڈاکٹر نے اپنے موبائل کی اسکرین دیکھی تو کسی نام یا نمبر کے بغیر اسکرین پر ان لون کال لکھا ہوا آ رہا تھا۔ اس نے کال ریسیو کی۔

”نیلوفر سے بات کرواؤ۔“ کال کرنے والے نے بغیر کسی تمہید کے اسے حکم دیا۔ اس نے خاموشی سے اپنا فون بستر پر دراز نیلی کی طرف بڑھا دیا۔

”ہیلو، کون؟“ اس نے محتاط لہجے میں پوچھا۔
”نیلی..... ایہ میں ہوں۔ کیسی ہو تم؟“ دوسری طرف سے دکی کی جذبات میں ڈوبی آواز سنائی دی تو وہ بہ مشکل خود کو اچھلنے سے باز رکھ سکی۔

”تم..... تم کب آئے؟“ اس نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔
”نزیادہ وقت نہیں ہوا۔ کاش کہ پہلے آ جاتا۔“ وہ اداس تھا۔

”کوئی بات نہیں۔ اب تو آگئے ہوتا۔ ساری مشکلیں

دور ہو جائیں گی۔“ اسے دکی کی آواز سن کر بہت حوصلہ ملا تھا۔
”ضرور دور ہو جائیں گی۔ بس تمہیں حوصلے سے میری ہر ہدایت پر عمل کرنا ہے اور ڈاکٹر کی بھی۔“

”کر لوں گی بابا! لیکن کچھ اپنے دوست کی بھی تو خبر لو۔ ان ظالم اسپتال والوں نے ہم دونوں میاں بیوی کو ایک دوسرے سے ایسے دور دور رکھا ہوا ہے کہ ہم ایک دوسرے کی شکلیں بھی نہیں دیکھ سکتے۔“ اس نے بیک وقت فرمائش و شکایت کی۔

”فکر مت کرو۔ میں مومی کے پاس ہی ہوں اور اسے اچھی طرح دیکھ رہا ہوں۔“ نیلی کو یہ بتاتے ہوئے دکی کی آواز ذرا سی لڑکھرائی کیونکہ اس وقت وہ سچ سچ مومی کے سرہانے کھڑا ہوا تھا اور اس کے بند آنکھوں والے چہرے کو نظروں میں سمورہا تھا۔

”ذرا بات تو کرواؤ اس سے میری۔“ نیلی کو دکی کی مومی کے پاس موجودگی سے خاصا اطمینان محسوس ہوا تھا اس لیے اس کے لہجے کی تبدیلی کو محسوس کیے بغیر لاڈ سے فرمائش کی۔

”نہیں، ابھی نہیں۔ ابھی وہ آرام کر رہا ہے۔ تم میری ڈاکٹر سے بات کرواؤ تاکہ میں اس کو تمہیں یہاں بھجوانے کے سلسلے میں کچھ ہدایات دے سکوں۔“ دکی نے اسے ٹال دیا۔ اس نے بھی مزید بحث کیے بغیر ڈاکٹر کو اس کا موبائل واپس تھما دیا۔

”مریضہ کو سی ٹی اسکین کے لیے قریبی پرائیویٹ اسپتال منتقل کروادو۔ اس سلسلے میں تمہیں اپنے سینئر کی تحریری ہدایت مل جائے گی۔ متعلقہ اسپتال میں اسکین کی پوری تیاری ہوگی۔ تمہیں کوئی پریشانی نہیں اٹھانا پڑے گی۔ جاتے وقت مریضہ کے ساتھ ایسولینس میں جانا لیکن واپسی میں کسی بہانے وہیں رک جانا۔“ دکی نے ہدایات دیں تو ڈاکٹر کے وجود میں ایک سنسناسٹ سی دوڑ گئی اور اسے اندازہ ہو گیا کہ کیا ہونے جا رہا ہے لیکن اب وہ پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا اس لیے ”یس“ کہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

”بس تو پھر روانہ ہو جاؤ۔ ڈیوٹی پر موجود پولیس والوں کو ہمارے آدمی دیکھ لیں گے۔“ دکی نے کہہ کر فون بند کر دیا اور مومی کے چہرے کو دیکھ کر دلار سے بولا۔

”لینے جا رہا ہوں تیری دلربا کو۔ معلوم ہے وہ الوداع کہنے نہیں آئی تو تجھے مجھ سے شکایت رہے گی۔“ لاش بھلا کیا جواب دیتی لیکن جو اس لاش کے سرہانے کھڑا جیتے جی مرا جا رہا تھا، اسے تو اپنی تسلی بخشی کے لیے سب کچھ کرنا تھا۔

اعظم والے معاملے کی تفصیلات سن کر ان سب نے

مشترکہ طور پر اندازہ لگایا تھا کہ اعظم کے جسم میں کوئی ڈیوائس رکھی گئی تھی جس کا مدد سے ہر بار اسے ٹریس کر لیا گیا تھا۔ خصوصاً پولیس واسطے تو کسی گانڈ ڈیزائن کی طرح اس تک پہنچتے تھے اور انہوں نے کچل وغیرہ کی گاڑیوں تک کو نظر انداز کر کے سیدھے کھیتوں میں معمر اور نیلی کو اعظم سمیت گھیرا تھا۔ اعظم کے سلسلے میں پیدا ہونے والے اس شک کے بعد وہ نیلی کو اپنے پاس بلوانے سے پہلے شک دور کر لینا چاہتے تھے کہ کہیں اسپتال میں قیام کے دوران اسے بھی ایسے کسی تجربے سے تو نہیں گزارا گیا ہے۔ اسکین سے شک بھی دور ہو جاتا اور نیلی کو سرکاری اسپتال سے باہر نکالنے کا جواز بھی مل جاتا کیونکہ اسپتال کی اپنی مشین تو خراب پڑی ہوئی تھی۔

ڈاکٹرز نے اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے فوری طور پر نیلی کی وہاں سے منتقلی کے انتظامات کیے۔ اپنے سینئر کا ہدایت نامہ، پروانہ نجات کے طور پر اس کے پاس موجود تھا۔ اسے اطمینان تھا کہ کچھ بھی ہوا تو سوال اس سے نہیں، اس کے سینئر سے ہوگا اور سینئر ثابت کر سکتا تھا کہ اس نے جو کچھ کیا، صرف اور صرف مریضہ کی بہتری کے لیے کیا۔ درمیان میں جو بھی پیش آتا، اس کی ذمہ داری اسپتال کے بجائے پولیس کے اس ٹائل سپاہی پر ہوتی جو اپنی ڈیوٹی ڈھنگ سے انجام نہیں دے پایا۔

سارا کام نہایت صفائی سے ہوا۔ سی ٹی اسکین کے بعد نیلی کو ایسبولینس میں دوبارہ سرکاری اسپتال منتقل کرنے کے لیے لے جاتے ہوئے راستے میں ایسبولینس رکوائی گئی۔ ڈرائیور اور ایک عیدگار ڈکی لالہ کے مسلح مگروں کے مقابلے میں بھلا کیا حیثیت تھی۔ نیلی کو ایسبولینس سے دوسری گاڑی میں منتقل کیا گیا اور وہاں پہنچا دیا گیا جہاں وہی پہلے ہی مومی کی لاش کے ساتھ موجود تھا۔ جنازہ براہ راست اس جگہ سے نہیں اٹھنا تھا لیکن نیلی کو مومی کا آخری دیدار کروانے کے لیے یہ خصوصی انتظام کیا گیا تھا کہ غسل اور تکفین کے بعد لاش وہاں لائی گئی تھی۔

”مومی کہاں ہے؟“ نیلی کو وہیل چیئر پر بٹھا کر اندر لایا گیا تو وہ وہی کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر بری طرح ٹھٹھک گئی اور اسے یہ خیال نہیں آیا کہ اتنے عرصے بعد ملنے والے وہی کا حال احوال پوچھے۔

”تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ آؤ، اس سے آخری ملاقات کرو۔“ وہی نے نمناک آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو پہلے اس کی آنکھوں میں بے یقینی اتری پھر وہ ہسٹریائی انداز میں چلائی۔

”یہ کیا بکواس کر رہے ہو۔ تمہیں شرم نہیں آتی اتنا بے ہودہ مذاق کرتے ہوئے۔ جو بندہ تم پر اپنی جان چھڑکتا ہے، اس کے لیے تم نے اپنی زبان سے ایسے الفاظ نکالے بھی کیسے؟“

”کاش، میری زندگی میں یہ منحوس وقت کبھی نہیں آتا کہ مجھے تم سے یہ تکلیف دہ الفاظ کہنے پڑتے لیکن سچ یہی ہے نیلی کہ ہمارا مومی ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلا گیا ہے۔“ وہ مجرموں کی طرح سر جھکائے نڈھال سا اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

”نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔ مومی کبھی بھی اس طرح مجھے اکیلا چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔ مومی..... مومی.....!“ اس نے بے یقینی سے کہا اور مومی کو پکارتے ہوئے خود وہیل چیئر سے کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ وہی نے مشکل سے اسے دونوں بازوؤں سے تھام کر اس حرکت سے باز رکھا۔

”پلیز، ایسا مت کرو نیلی! تمہارے زخم کچے ہیں۔ اس طرح کرنے سے بڑا نقصان ہو جائے گا۔“ وہ بھی ہوا۔ ”نقصان تو میرا جو ہوتا تھا، ہو گیا۔ مومی کے بنا جی کر بھلا میں کیا کروں گی۔“ وہ اونچا اونچا رونے لگی۔ وہی نے اسے رونے دیا بلکہ خود بھی ساتھ ساتھ آنسو بہاتا رہا۔ پھر کسی نے آکر ان دونوں کو پانی پلایا تو وہی نے خود کو سنبھالا اور بولا۔

”آؤ، میں تمہیں اس سے ملواتا ہوں۔“ وہ اس کی وہیل چیئر دھکیلتا ہوا اس جگہ تک لے گیا جہاں مومی اپنے آخری سفر پر جانے کے لیے کفن میں لپٹا بالکل تیار تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی نیلی ایک بار پھر دھاڑیں مارنے لگی۔ اس نے مومی کے ماتھے پر کئی بوسے دیے۔ شکوہ کرتی رہی کہ وہ اسے یوں بچ سفر میں اکیلا چھوڑ کر کیوں جا رہا ہے لیکن جانے والا تو خود بے اختیار تھا۔ اس موقع پر وہی ہی ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے نیلی کو سنبھالتا اور سمجھاتا رہا لیکن جب اسے اندازہ ہو گیا کہ معاملہ صرف سمجھانے سے نہیں حل ہوگا تو نیلی کے لیے مستقل طور پر ملازمت پر رکھی جانے والی نرس کو اشارہ کیا۔ نرس نے اسے سکون آور دوا کا انجکشن لگایا اور وہی کی مدد سے بستر پر منتقل کیا۔

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نوجوان
کی داستان جو غلط کاروں کے لیے غضب
ناک تھا باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیے



قسط نمبر: 40



اسماء قادری

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہو اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تند و تیز اندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابل شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے والے اس پُر عزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جا رہے تھے... اس کی زندگی جیو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قراریوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تار عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ وارداتِ قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہو سکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نو جوان کی تحیر انگیز داستان



معاذ ایک ذہین لیکن متون مزاج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جوائن کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ انسٹی ٹیوٹ سے واپس آ رہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو سڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی نڈر فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشری نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بشری ماس کمیونی کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم وغیرہ لکھتی ہے۔ اس دوران جگہ جگہ بھی وہ ایک زیر تعمیر رہائشی منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی آئی تھی۔ معاذ بشری کو یہ حفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کر دیتا ہے لیکن جن رئیس زادوں سے اس نے ان کا شکار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ایک دن جنگل کی سیر کے دوران وہ فوٹو گرافی کے شوق میں سب سے الگ تھلگ ہو جانے والے معاذ کو بے خبری میں گھیر کر بڑی طرح زد و کوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دے دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس نہ آنے پر انتقامیہ کے افراد، پولیس اور انسکیو ذرائع کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جگہ کی جھونپڑی میں پاتا ہے۔ جوگی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے، جوگی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نواز کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے پراسرار علم سکھانے کی ہامی بھر لیتا ہے اور معاذ اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ادھر جانے وقوع سے ملنے والے معاذ کے کسرے سے جب تصویریں نکلوائی جاتی ہیں تو ایک ایسی تصویر بشری کی نظر میں آ جاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانکنا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پردجیکٹ کے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشری تحقیق کر رہی تھی۔ بشری کے اپنے والد جرنلسٹ ہوتے ہیں۔ اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشری کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ صدمے سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باذل نامی خنڈے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشری انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دنوں میں ہی معاذ واپسی کا ارادہ کرتا ہے تاہم ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا عرفان اللہ اور یزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو وقاص نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باذل اچانک بشری کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر دیتا ہے۔ معاذ کو واپس لانے کے لیے اوجھے، جھکندے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اسے واپس آنے کا پیغام دیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کر کے اسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات کے نہ بتانے پر اس کے بھائی کا ایک گروہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشری بھی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہو جاتی ہے۔ معاذ کے دوست عالم شاہ کے بہنوئی کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ کئی ٹون میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے پہانا کر کے اس کے دماغ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ فیضو سے حاصل اتو کے علم کی بدولت ان کا معمول نہیں جتا۔ عالم شاہ اور اس کا نوکر سرد، باذل کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ عالم کی بہن بھل شاہ کے نو مولود بیٹے کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اغوا کا الزام لطیف سومرو پر آتا ہے۔ عالم شاہ، باذل کی قید میں موجود ایک زخمی شخص کی مدد سے وہاں سے فرار ہو جاتا ہے۔ ادھر بشری دعائیہ بنی جاتی ہے۔ وہاں وقاص اسے باربی کے روپ میں پہچان لیتا ہے۔ وہ سلطان کو مارنا چاہتی ہے تاہم وقاص اسے ایسا کرنے سے روکتا ہے۔ ادھر عالم شاہ، باذل کی قید سے نکل کر اس کا پیچھا کرتا ہے۔ وہ وہاں معاذ کو دیکھتا ہے۔ صداقت شاہ، لطیف سومرو کو گھیرنے کے لیے اس کی خفیہ بیوی اور بچے کا کھوج لگاتے ہیں اور بچے کو اغوا کر لیتے ہیں۔ لطیف سومرو مجبور ہو جاتا ہے۔ معاذ کو اس کے گھر والوں سے ملنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ وہ ایک مشن پر سونیا کے ساتھ انڈیا روانہ ہوتا ہے تاہم کچھ لوگ سکھ یا تریوں سے بھری بس کو یرغمال بنا لیتے ہیں۔ معاذ اور سونیا خانے کے تمام افراد کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔ عالم شاہ، بھل اور سرد انڈیا روانہ ہو جاتے ہیں۔ ان پورٹ سے گھر واپسی پر راستے میں کچھ لٹیرے انہیں لوٹ لیتے ہیں۔ گھر پہنچنے پر پولیس کی ریڈ ہوتی ہے اور وہ عالم شاہ اور سرد کو لے جاتے ہیں۔ ادھر بشری اور وقاص باذل کو اسپتال میں مارنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ بچ جاتا ہے۔ معاذ اور سونیا اپنے سہولت کاروں سے مل جاتے ہیں۔ عالم شاہ اور سرد کو تشدد کا نشانہ بنا کر ویرانے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ واپس اپنے میزبانوں کے ہاں پہنچ جاتے ہیں۔ انہیں پتا لگتا ہے کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں اجالا اور اس کا عاشق شامل ہوتے ہیں۔ وہ چھپ کر ان کی باتیں سن رہا ہوتا ہے کہ اسے چھاپ لیا جاتا ہے۔ تاہم وہاں مارا ماری ہوتی ہے اور اجالا کا عاشق مارا جاتا ہے۔ پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ ان کے کزن انہیں اپنے دوسرے خفیہ منظم پر پہنچا دیتے ہیں۔ وہ وہاں سے بھگت لے لے جاتے ہیں۔ ادھر معاذ کو سونیا اپنے ساتھ نئے مشن پر لے کر جاتی ہے جس میں ایک ریلوے لائن کو دھماکے سے اڑانا ہوتا ہے۔ معاذ ایسا نہیں چاہتا اس لیے وہ ٹرین کی آمد سے قبل ہارودی دھماکا کر دیتا ہے۔ وہ

زخمی ہو جاتا ہے اور اسے ہندو سا دھواہی کٹیا میں لے جاتا ہے جہاں اس کی اچھی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ سونیا کے آدمی معاذ کو تلاش کرتے ہیں مگر ناکام ہو جاتے ہیں۔ ادھر عالم شاہ اور سرد خفیہ ذریعے سے بارڈر پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ دھریے جاتے ہیں اور ”را“ کی قید میں پہنچ جاتے ہیں۔ ادھر بشری باڈل کو مارنے کی کوشش میں خود نشانہ بن جاتی ہے۔ معاذ سا دھو کی مدد سے ایک انڈین ہیروئن کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ وہیں اسے عالم اور سرد کی گرفتاری کا پتا چلتا ہے۔ معاذ ڈاکٹر فردوس سے ملتا ہے اور اسے سبیل کی مدد کرنے کا کہتا ہے۔ علیہ اور وقاص وغیرہ کو لالہ عیسیٰ ملک سے باہر نکال دیتا ہے اور ہر ممکن احتیاط کی ہدایت کرتا ہے لیکن علیہ پاکستان میں ثوبیہ سے رابطہ کرتی ہے جو ان کے لیے مصیبت بن جاتا ہے۔ ثوبیہ پر تیزاب پھینک دیا جاتا ہے۔ وقاص، علیہ اور اس کے گھر والوں کو مار دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس معاذ کو دیوانامی شخص سے مدد لینے کا کہتی ہے۔ معاذ اپنے کزن کو پاکستان کال کرتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ اس کے گھر والوں کو مار دیا گیا ہے۔ وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کی ٹھان لیتا ہے۔ ادھر ڈاکٹر فردوس کو اس کے سسرال والے سبیل کو بھگانے کی پاداش میں تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ معاذ، عالم اور سرد کی رہائی کے لیے کارروائی کرتا ہے اور انہیں ”را“ کی قید سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن عالم اور سرد کو دیوا کے آدمی کسی دوسری جگہ پہنچا دیتے ہیں۔ سونیا معاذ کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ ادھر باڈل ایک جگہ لالہ عیسیٰ کی موجودگی پر کارروائی کرتا ہے تاہم لالہ خود کو گولی مار کر ختم کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس کا انتقال ہو جاتا ہے۔ دیوا گینگ ڈاکٹر فردوس کی میت اٹھنے پر وہاں فائرنگ کر دیتے ہیں۔ پولیس دیوا کو گھیر لیتی ہے۔ معاذ دیوا اور اس کے آدمیوں کو نکالنے کے عوض عالم کا پتا معلوم کر لیتا ہے۔ سونیا اور معاذ حیدر آباد نواب بدرالدین کی حویلی پہنچ جاتے ہیں۔ تاہم کالے خان اور رادھا دیوی کو میڈم ایکس کے کھنچے سے چھڑانے کے لیے انہیں واپس آنا پڑتا ہے، کالے خان کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ نواب صاحب کی حویلی میں عالم اور سرد کی رہائی کے لیے کارروائی کر کے انہیں رہا کر لیتا ہے۔ وہ لوگ نئے ٹھکانے پر پہنچتے ہیں تو وہاں معاذ سے ملنے جا رونا می شخص آتا ہے۔ اسے معاذ نے ”را“ کی قید سے نکالا ہوتا ہے۔ جاو اور معاذ، سبیل سمیت اسپتال جاتے ہیں اور پہچان لیے جانے پر پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ پولیس سے مقابلے کے بعد وہ ایک بستی میں پناہ کے لیے کھس جاتے ہیں اور دو لوگوں کو یرغمال بنا کر ان کی جھونپڑی میں قیام کرتے ہیں۔ ادھر سونیا معاذ کی تلاش میں نکلتی ہے اور اسے بستی میں پہنچنے پر معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ معاذ اور جاو وغیرہ انوپ نامی شخص کے ساتھ اس کے مالک کے بنگلے میں قیام کرتے ہیں۔ سونیا بھی معلومات حاصل کرتی ہوئی مذکورہ بنگلے تک پہنچ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور سرد بھی سونیا کا پیچھا کرتے ہوئے وہیں پہنچ جاتے ہیں۔ ادھر وقاص، علیہ و دیگر لوگ زندہ ہوتے ہیں۔ وقاص حلیہ بدل کر گلو کا باڈی گارڈ بنتا ہے۔ وہ معاذ کو تلاش کرنے کے لیے انڈیا روانہ ہوتا ہے۔ وہاں اس کی گل خان سے ملاقات ہوتی ہے اور معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ سونیا، معاذ اور دیگر ساتھیوں سے مل جاتی ہے تاہم وہ جس بنگلے میں ہوتے ہیں وہ دشمن کا ہوتا ہے۔ دشمن سب کو بے ہوش کر کے کہیں لے جا رہے ہوتے ہیں کہ ان کی گاڑی کو حادثہ پیش آ جاتا ہے۔ ان سب کو چینی بجک شیطانی امداد دیتے ہیں اور ان سے پوچھ گچھ کی جاتی ہے۔ سبیل کی حالت تشویشناک ہوتی ہے اور اسے وہاں موجود ایک وید دیکھتا ہے۔ ادھر لالہ واپس اپنے لوگوں میں پہنچ کر ایکشن میں آ جاتا ہے اور حامد کو اغوا کر دیتا ہے۔ لالہ میڈم ایکس کے ٹھکانے کی نگرانی کر داتا ہے۔ باڈل، معاذ وغیرہ کے ٹھکانے سے باخبر ہو جاتا ہے۔ ادھر لالہ کے آدمی میڈم ایکس کی نگرانی کے چکر میں مارے جاتے ہیں۔ لالہ اپنے آدمیوں کو انڈیا رگراؤنڈ کر دیتا ہے۔ معاذ وغیرہ جہاں ہوتے ہیں وہاں دشمن حملہ کر دیتا ہے اور کافی مارا ماری ہوتی ہے۔ باڈل، معاذ کا پیچھا کرتا ہے اور چینیوں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ معاذ چینیوں کے ساتھ مل کر دشمنوں کے خلاف کارروائی کرتا ہے۔ اس دوران اسے گل خان نظر آتا ہے۔ اسے پہچاننا نہ کیا گیا تھا۔ وہ لالہ نامی عورت کو بھی گرفت میں لے لیتے ہیں اور اسی سے معلومات لیتے ہیں۔ ادھر لالہ عیسیٰ، اعظم کو دشمن کی گرفت سے نکالنے کے لیے کارروائی کر داتا ہے اور مومی اور نیلی، اعظم کو نکالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ معاذ دشمنوں کے کیمپ پر حملہ کر کے وہاں قبضہ کر لیتا ہے۔ مومی اور نیلی کی گاڑی پر حملہ ہوتا ہے تاہم مارا ماری کے بعد وہ صداقت شاہ کے پاس پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ لالہ عیسیٰ صداقت شاہ کو حویلی پر ریڈ کا بتاتا ہے۔ صداقت شاہ اعظم کے محفوظ ٹھکانے کے لیے قربان شاہ کو فون کرتے ہیں۔ اعظم کو وہاں سے نکال لیا جاتا ہے اور دوسری جگہ منتقل کر دیا جاتا ہے۔ ادھر معاذ بیجنگ پہنچ جاتا ہے اور وہاں کے کرتا دھرتاؤں سے بات کر کے پاکستان پہنچنے کی اجازت چاہتا ہے۔ ادھر مومی اور نیلی کو پولیس گھیر لیتی ہے اور فائرنگ میں مومی مارا جاتا ہے۔ وہ اعظم کو لے جاتے ہیں اور نیلی زخمی حالت میں ان کے قبضے میں آ جاتی ہے۔ معاذ اور وی وغیرہ پاکستان پہنچ جاتے ہیں اور اعظم کی بازیابی کے لیے کارروائی کے لیے منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ وی، نیلی کو مومی کا آخری دیدار کراتا ہے اور بے قابو ہونے پر اسے سکون اور انجکشن لگا دیا جاتا ہے۔

اب میری واقعات ملاحتساب مابین

مومی کی تدفین سے پہلے وی، نیلی کو آخری دیدار کے لیے لایا۔۔۔ تو وہ بے قابو ہونے لگی۔ اسی لیے نرس نے اسے مینڈکا انجکشن دیا۔

اپنی زندگی کے سب سے بڑے دکھ سے گزر رہی ہے۔ وی نے نرس کو بطور خاص تاکید کی اور مومی کی میت کی منتقلی کی جانے لگی۔ اس موقع پر وی لالہ کی ہدایت کے مطابق ان لوگوں سے الگ ہو گیا لیکن وہ اس بڑے سے میدان میں ضرور پہنچا جہاں سرکس کا میلہ سجتا تھا

”اس کا بہت زیادہ خیال رکھنا سسر! اس وقت میری یہ بہن

اور موی اس میلے کی جان ہوا کرتا تھا۔ میدان لوگوں سے کچھ کچھ بھرا ہوا تھا۔ پولیس کی طرف سے موی کے اغوا کی واردات میں ملوث ہونے کا الزام عائد کیے جانے کے باوجود کوئی ماننے کو تیار نہیں تھا کہ وہ اتنا نیک فطرت لڑکا ایسی کسی واردات میں ملوث ہو سکتا ہے۔ کسی کو خاموش آنسو بہاتے تو کسی کو دھاڑیں مار مار کر ہلکتے وکی نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس نے خود اس طرح جنازے کو کندھا دیا کہ سر پر بندھا رومال ماتھے کو ڈھانپ رہا تھا۔ آنکھوں پر رنگین شیشوں والا چشمہ تھا اور باقی کا چہرہ ماسک میں چھپا ہوا تھا۔ موی کو قبر میں بھی اس نے اپنے ہاتھوں سے اتارا لیکن جب قبر پر مٹی ڈالنے کا مرحلہ آیا تو اس کی ہمت جواب دے گئی اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وہاں سے بھاگ نکلا۔ جسے آج قبر میں اتارا تھا، وہ اپنے وجود ہی کا ایک حصہ لگتا تھا اور اسے معلوم تھا کہ آج کے بعد وہ زمین پر ادھورے پن کے احساس کے ساتھ ہی زندہ رہے گا۔

☆☆☆

”پارٹی سے وفاداری اپنی جگہ لیکن پارٹی کبھی ملک سے اوپر نہیں ہو سکتی۔ میں مانتا ہوں کہ میرا اور صداقت شاہ کا تعلق ایک ہی پارٹی سے ہے لیکن پارٹی کی خاطر بھی میں اس شخص کی حمایت نہیں کر سکتا جس نے اپنا اصل چہرہ ایک عرصے تک دھوکے اور مکاری سے چھپائے رکھا اور لوگوں پر اپنے نیک ہونے کی دھاک بٹھائے رکھی۔ ناجائز مال کے ڈھیر، سرکاری ٹھیکوں میں کرپشن، اپنے ہاریوں پر ظلم و ستم..... یہ سب جو تھا سو تھا، بیٹے نے بھی دیار غیر جا کر ملکی مفاد کو نقصان پہنچایا۔ پڑوسی ملک آج تک اس کے اس بھگوڑے بیٹے کو رو رہا ہے جس نے وہاں مجرمادہ کار روائیاں کر کے پاکستان کے مفاد کو سخت نقصان پہنچایا ہے اور عالمی برادری میں پاکستان کی بدنامی کا سبب بنا ہے۔ آج میں آپ سب کے سامنے پارٹی چیئرمین سے درخواست کرتا ہوں کہ صداقت شاہ کی پارٹی رکنیت معطل کی جائے اور تازہ زندگی اسے پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑنے کے لیے نااہل قرار دیا جائے۔“

وہ کوئی سیاسی جلسہ نہیں تھا بلکہ اس اسکول کی از سر نو ترتیب اور آرائش کے کام کا آغاز ہونے جا رہا تھا جسے عرفان اللہ نے اپنی نگرانی میں لے کر ایک ماڈل اسکول بنانے کا اعلان کیا تھا۔ افتتاحی تقریب کے بعد صحافی اس کے گرد جمع ہو گئے تھے اور بات عرفان اللہ کے فلاحی کاموں سے لکل کر صداقت شاہ تک چلی گئی تھی۔ ایسے موقع پر اس موضوع کو چھیڑنے والا صحافی یقیناً عرفان اللہ کا ہی وظیفہ

خوار تھا جس نے اسے یہ جذباتی تقریر کرنے کا موقع فراہم کر دیا تھا۔

”مگر سر! قربان شاہ اور صداقت شاہ کے دیگر حمایتیوں کی طرف سے تو یہ بیان دیا جا رہا ہے کہ یہ سب کچھ صداقت شاہ کے خلاف ایک سازش ہے جو ان کے دشمنوں نے ان کی نیک نامی کو زک پہنچانے کے لیے تیار کی ہے۔“ اس کی تقریر میں وقفہ آیا تو ایک ہوشیار صحافی نے سوال جڑ دیا۔

”دنیا کے کسی چور نے آج تک تسلیم کیا ہے کہ وہ چور ہے؟ صداقت شاہ کے چیلے چانٹے بھی شور مچا کر اس کی چوری چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ عرفان اللہ کے لہجے میں صداقت شاہ کے لیے واضح نفی تھی۔

”یہ سائیکس صداقت شاہ کے نواسے اور قربان شاہ کے پوتے کا کیا قصہ ہے جناب! ایک چیمبل پر شور مچا ہوا ہے کہ پولیس نے ایک جوڑے کو جعلی پولیس مقابلے میں مار کر بچہ ان کے قبضے سے اپنے قبضے میں لے لیا ہے لیکن اب قبول کرنے سے انکاری ہے۔“

”پولیس کے معاملات پولیس جانے۔ میں البتہ اتنا ضرور پوچھوں گا کہ جو بچہ بقول صداقت شاہ، انڈیا میں گم ہوا تھا، وہ اچانک پاکستان میں کیسے نمودار ہو گیا؟ اگر بچہ آیا ہے تو اس کا مطلب ہے اس کی وہاں غائب ہونے والی ماں اور ماموں بھی آئے ہوں گے۔ پولیس کا کام ہے کہ ان دونوں کو بھی باز یاب کر دے اور ملک کی بدنامی کا سبب بننے پر کڑی تنقید بھی کرے۔“ وہ صداقت شاہ سے اپنی پرانی دشمنی بھی نبھار رہا تھا اور میڈم ایکس کے دیے ہوئے نوٹ بھی حلال کر رہا تھا۔

”لیکن پولیس تو ایسے کسی دعوے سے ہی انکاری ہے۔ تصویر کو فوٹو شاپ قرار دے کر صداقت شاہ کے نواسے کی بازیابی کو مجموعی خبر قرار دیا جا رہا ہے۔ کسی گرفتاری یا ہلاکت کا بھی کوئی ذکر نہیں۔ ہاں، یہ ضرور کہا جا رہا ہے کہ پچھلے دنوں گاؤں عالم شاہ اور اس کے اطراف میں ڈکیتی کی متعدد وارداتیں ہوئیں جن میں مقامی زمینداروں کے ملازمین اور ڈاکوؤں، دونوں کو نقصان اٹھانا پڑا۔ یہاں ایک سرکس میں کام کرنے والے لڑکے کے بارے میں بھی کہا جا رہا ہے کہ وہ ڈاکوؤں میں شامل تھا اور فائرنگ کے تباہی میں مارا گیا۔“ صحافی کے پاس پولیس کی فراہم کردہ تفصیلات تھیں۔

”تو بھائی میں پولیس کو تو جھوٹا قرار نہیں دے سکتا۔ پولیس کہہ رہی ہے کہ تصویر فوٹو شاپ ہے تو پھر ہوگی۔ آپ لوگ

مجھے کیوں گھیر رہے ہیں؟“ اس نے فوراً اپنا پیٹریٹر ابدل لیا۔

”آپ سیاست کا بڑا نام بن چکے ہیں عرفان اللہ صاحب! پھر سائیکس صداقت شاہ سے آپ کے اختلافات کی وجہ سے بھی آپ کی رائے اس معاملے میں اہمیت رکھتی ہے۔“

”میری رائے تو بس یہی ہے کہ میرے نزدیک سائیکس صداقت شاہ ایک ناقابل اعتبار آدمی ہے اور میں اس جھوٹے انسان کی کسی بات کا یقین نہیں کر سکتا۔ قانون کی ذمہ داری ہے کہ اس شخص اور اس کے حواریوں سے آہنی ہاتھوں سے نئے درندہ آگے بھی یہ اور اس جیسے لوگ ملک کی بدنامی کا سبب بنتے رہیں گے۔“ عرفان اللہ کا لفظ لفظ زہر میں بجھا ہوا تھا۔

”مجھے یقین ہو گیا ہے کہ باذل اسی ملعون کی اولاد ہے۔ اتنے گھٹیا بندے کی اولاد باذل جتنی ہی گھٹیا ہو سکتی ہے۔“ وکی نے ٹی وی کی آواز بند کی اور دانت کچکچاتے ہوئے تبصرہ کیا۔

”مجھے تو اس صورت حال کو دیکھ کر اعظم کے سلسلے میں سخت تشویش ہو رہی ہے۔ جس طرح پولیس اس کی بازیابی سے مکر رہی ہے، اس کو دیکھتے ہوئے تو یہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ لوگ اعظم کو میڈم ایکس کے حوالے کر چکے ہیں یا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ تم نے دیکھا ہے نا کہ میڈیا بھی اس معاملے میں کیسے خاموش تماشا کی بن گیا ہے اور سوائے اس چینل کے جسے ظاہر نے اپروچ کیا تھا، کسی نے اس سلسلے میں کوئی آواز نہیں اٹھائی۔“ معاذ نے تشویش کا اظہار کیا۔

”ہمارا نام نہاد آزاد میڈیا ہمیشہ ایسا ہی کرتا ہے۔ ان کی آزادی کی حقیقت بس اتنی ہے کہ یا تو یہ ڈنڈا پیر کی مانتے ہیں یا پھر پیسا پیر کی۔ اس کے علاوہ ان کا کوئی دین ایمان نہیں ہے۔“ وکی بہت تپا ہوا تھا۔

”ان حالات میں ہم یہ امید نہیں رکھ سکتے کہ قانونی طور پر اعظم کا حصول ممکن ہو سکتا ہے۔ ہمیں خود اس کے حصول کے لیے کوئی عملی قدم اٹھانا ہوگا۔“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ کرتے ہیں کچھ پلان۔“ وکی فوراً تیار ہو گیا۔

”ہمیں سب سے پہلے تو یہ کھوج لگانا ہوگی کہ اعظم ہے کہاں؟“

”اس..... ڈی ایس پی کی گردن پکڑتے ہیں۔ وہی کم ظرف بتائے گا کہ بچے کو کہاں غائب کیا ہے۔“ وکی نے ڈی ایس پی کے لیے گالی نکالی۔

”لالہ سے کہو کہ اس کی ریکی کروائے پھر ہم خود اس

پر ہاتھ ڈالتے ہیں۔“ جارو نے مشورہ دیا۔

”کس کی ریکی کروانے کی بات ہو رہی ہے؟“ لالہ خود وہاں چلا آیا اور جارو کا جملہ سن کر استفسار کیا۔

”ڈی ایس پی کی، جس نے موی کا ان کا ڈنٹر کیا اور اعظم پر قبضہ کیے بیٹھا ہے۔“ وکی نے اس کے سوال کا جواب دیا۔

”ڈی ایس پی ظہیر خان..... اس پر تو میں نے پہلے ہی بندے لگائے ہوئے ہیں۔ اس کے منٹ منٹ کی رپورٹنگ ہو رہی ہے ہمیں۔“ لالہ نے مزے سے بتایا۔

”لو یو لالہ! ایسے تو گرو نہیں مان رکھا ہم نے تمہیں۔“ لالہ کے جواب پر وکی کا چہرہ کھل اٹھا اور اسے سراہنے کے بعد فخر سے معاذ اور جارو کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”تو پھر کریں پلان؟“

”بالکل۔“ معاذ مسکرایا۔

”اس سے پہلے ذرا اس باذل کے بچے کا بھی حساب کتاب کر دو۔ بہت ہنگامہ بچا رکھا ہے اس نے ہوش میں آنے کے بعد سے۔ سازاد ننگی گالیاں دیتا رہتا ہے۔ اصغر کا دماغ گھوم گیا تو ٹیٹو ادا دے گا اس کا۔“ لالہ نے ان کی توجہ باذل کی طرف مبذول کر دئی۔

”اس کا فیصلہ بشریٰ نے کرنا ہے۔ میں اسے صرف اور صرف بشریٰ کی خاطر جگہ جگہ ڈھونڈتا پھر رہا ہوں ورنہ اس سے بہت پہلے نجات حاصل کر چکا ہوتا۔“

”تو پھر بلو الیتے ہیں بشریٰ کو۔ اس کو یہاں لانا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔“ لالہ نے اس کا جواب سن کر فوراً پیشکش کی۔

”بس تو پھر بلو ابی لو اسے تاکہ ڈی ایس پی پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے یہ قصہ منٹ جائے۔“ وکی نے تجویز دی۔

”کیوں معاذ؟“ ساتھ ہی معاذ کی رائے بھی لی۔

”بالکل بلو الو۔“ معاذ نے بھی تائید کی تو لالہ نے

اصغر کو اس سلسلے میں ہدایات جاری کر دیں۔ بشریٰ کی آمد تک وہ ڈی ایس پی ظہیر کے متعلق رپورٹ کی روشنی میں اس پر ہاتھ ڈالنے کے سلسلے میں لائحہ عمل طے کرتے رہے۔ تقریباً

سوا گھنٹے بعد بشریٰ کو وہاں لایا گیا تو معاذ اسے دیکھ کر پوری جان سے کانپ گیا۔ یہ وہ خوش شکل اور چمکتی بلبل سی بشریٰ تو تھی ہی نہیں جو اس کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھا کرتی تھی۔

وہ بشریٰ تو مشرق و مغرب کے حسن کا بہترین امتزاج تھی۔

اس کی گوری رنگت، بھوری آنکھیں اور جیسے نقوش دیکھنے والے کو دوبارہ پلٹ کر دیکھنے پر لازماً مجبور کرتے تھے۔

پلٹ کر لوگ شاید اب بھی دیکھتے ہوں لیکن اب دیکھنے والی آنکھوں میں ستائش کے بجائے ترحم یا کراہیت کے سوا بھلا

کیا ہوتا ہوگا۔ اس کا داغ دار چہرہ، لقوے کے مریض کی طرح ٹیڑھا منہ، دائیں ہاتھ کی ٹیڑھی میڑھی انگلیاں اور لنگڑا ہٹ زدہ چال..... ہر ہر تبدیلی نے معاذ کے دل کو تڑپا کر رکھ دیا۔ وہ بے ساختہ ہی اس کا نام پکارتا ہوا اس کی طرف لپکا۔ بشری بھی اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکی اور تڑپ کر اس کے سینے سے لگ گئی۔ معاذ کی کیرتھر میں کشدگی کے بعد وہ اس سے پہلی بار مل رہی تھی اور اس عرصے میں وہ بے تحاشا آزمائشوں اور تکالیف سے گزری تھی۔ اس نے اپنے عزیز والدین کو کھویا تھا، باذل کی ہوس کا نشانہ بنی تھی، ایک شریف اور باوقار لڑکی سے بارہا جیسی کلب گزل بننے پر مجبور ہوئی تھی اور آخر کار باذل کے ہاتھوں ایسی زک اٹھائی تھی کہ اپنا روپ، صحت اور آزادی سب کھودی تھی۔ ان سب تکالیف سے گزرتے ہوئے وہ غصے اور انتقام کی آگ سے تو بھرتی رہی تھی لیکن اب وہ ہمکسار شانہ نہیں ملا تھا جس پر آنسوؤں کی صورت لینا غم بہا سکتی۔ آج میسر آیا تو وہ اتنا ٹوٹ کر روئی کہ معاذ کی قمیص اس کے آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ اس کا ہر آنسو تیزاب کی طرح معاذ کے سینے پر گر رہا اور وہ اتنی شدید اذیت سے گزرا کہ خود پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔

”آؤ میرے ساتھ۔“ غم و غصے کی انتہا پر پہنچ کر اس نے روتی ہوئی بشری کو خود سے الگ کیا اور اس کا ہاتھ تمام کر اسے اپنے ساتھ لیے اس سمت بڑھا جہاں باذل کو قید میں رکھا گیا تھا۔ وہی اس کا انداز دیکھ کر اس کے پیچھے ہی لپکا تھا۔ اس کے اشارے پر وہ خانے کا راستہ کھولا گیا اور معاذ اور بشری سمیت وہ بھی نیچے پہنچا۔ یہاں ایک چھوٹے سے حصے میں سلاخیں لگا کر باذل کو زنجیروں سے باندھ کر رکھا گیا تھا۔ معاذ، بشری کا ہاتھ چھوڑ کر اس حصے میں گھسا اور بندھے ہوئے باذل پر ٹوٹ پڑا۔ باذل اس اچانک ٹوٹنے والی آفت پر بوکھلا کر رہ گیا۔ بندھے ہوئے ہونے کی وجہ سے بچاؤ کی ویسے ہی کوئی گنجائش نہیں تھی اوپر سے معاذ کا حصہ بھی انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ ایک ڈیڑھ منٹ میں ہی اس کی ناک اور ہونٹوں سے خون بہتا ہوا دکھائی دینے لگا۔

”باندھ کر مارنے کو ہیرو گیری سمجھتا ہے۔ اتنا زور ہے بازوؤں میں تو مجھے کھول کر مجھ سے مقابلہ کر۔“ باذل کی نظر سلاخوں کے پار کھڑی بشری پر بڑی تو ساری صورت حال سمجھ گیا اور کیلپے لہجے میں۔ ”معاذ کو چیلنج کیا۔“

”کھولو، کھولو اسے۔ میں بتاتا ہوں اسے کہ کمزور عورتوں کو زیر کرنے اور کسی مرد سے مقابلہ کرنے میں فرق

ہوتا ہے۔“ معاذ، وہی کی طرف دیکھ کر زور سے چیخا۔ وہی اس حکم کو ماننے میں ذرا سامتا مل ہوا لیکن پھر اس نے وہاں ڈیوٹی پر موجود شخص کو باذل کی زنجیریں کھول دینے کا اشارہ کیا۔ جب تک وہ شخص زنجیریں کھول رہا، معاذ قدرے فاصلے پر کھڑا باذل کو کینہ تو زنجیروں سے گھورتا رہا۔ سلاخوں سے باہر بشری بھی دم بخود کھڑی سرخ آنکھوں سے اس شخص کو دیکھ رہی تھی جس سے اس نے دنیا میں سب سے زیادہ نفرت کی تھی۔

جیسے ہی زنجیریں کھلیں، باذل نے سب سے پہلے زنجیریں کھولنے والے شخص کو اپنی لپیٹ میں لینے کی کوشش کی۔ معاذ کے لیے اس کی یہ حرکت غیر متوقع نہیں تھی۔ اس نے اپنی لات گھما کی اور اس زور سے باذل کے منہ پر رسید کی کہ وہ جا کر سلاخوں سے ٹکرا گیا۔ ایک طرف منہ پر پڑنے والی لات نے اس کے جڑے کو ہلا کر رکھ دیا تو دوسری طرف سلاخوں سے ٹکرانے کے باعث اس کی گٹھنی پر نیل پڑ گیا لیکن وہ باذل تھا، کوئی عام آدمی نہیں جو چوٹ کھا کر ڈھے جاتا۔ وہ زور سے دھاڑا اور تڑپ کر معاذ پر جوابی حملہ کیا۔ وہ اپنے سر کی ٹکر سے معاذ کے پیٹ کو نشانہ بنانا چاہتا تھا۔ معاذ نے صرف اتنا کیا کہ عین وقت پر پھرتی سے ایک طرف ہو گیا۔ باذل اپنے ہی زور میں سلاخوں سے جا کر ٹکرایا تو اس کا سر گھوم کر رہ گیا۔ معاذ نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے اس کی پسلیوں میں ایک زوردار ٹھوکر لگائی۔ ٹھوکر اتنی شدید تھی کہ باذل کے پوزے وجود میں درد کی لہر دوڑ کر رہ گئی اور وہ مغالقات پر اتر آیا۔

”جس دہانے سے ہر وقت گٹر اہلتا رہتا ہے، اسے بند کر دینا ہی مناسب ہے۔“ معاذ فرمایا اور پے در پے کئی گھونے اس کے منہ پر رسید کر ڈالے۔ ان گھونسوں کے نتیجے میں جانے کتنے دانت ٹوٹے اور کہاں کہاں سے زبان کٹی۔ اس کا منہ خونم خون ہو گیا۔ باذل نے اس موقع پر اپنے دفاع کے لیے ہاتھ ہیر چلانے کی کوشش کی لیکن معاذ اس وقت جس طرح سراپا قہر بنا ہوا تھا، اس پر کسی چیز کا اثر نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے بدن پر پڑنے والی باذل کی ضربات کو ایک بے حس سے انداز میں سہا اور پھر باذل کا گریبان پکڑ کر اس زور سے کھینچا کہ وہ پھٹتا ہی چلا گیا۔ اگلے چند ثانیوں میں وہ باذل کی قمیص اس کے جسم سے الگ کر چکا تھا۔ اس پھٹی ہوئی قمیص کا اس نے ایک گولا سا بنایا اور باذل کو زمین پر گرا کر اس کے سینے پر گھسٹوں کے بل سوار ہو گیا۔ اس کے وزن سے باذل کا دم سینے میں گھسٹنے لگا اور اس نے زور مارا کہ معاذ

”میں اس دھرتی کو اس کے بوجھ سے نجات دلائے بغیر بس نہیں کروں گا۔“ اس نے ماتھے پر آئے سینے کے قطرے بازو سے صاف کرتے ہوئے وحشت زدہ لہجے میں جواب دیا۔

”اس نے سب سے زیادہ ظلم میرے ساتھ کیا ہے اور اس کے لیے سزا کے تعین کا حق سب سے زیادہ مجھے حاصل ہے۔“ بشریٰ نے رمان سے کہا۔

”ٹھیک ہے، تم دے لو اسے سزا لیکن اس کی جان بخشی کی بات نہ کرنا۔ نہ ہی اس کے لیے آسان موت تجویز کرنا۔“ وہ اس وقت ہٹ دھرم ہو رہا تھا۔

”میں اس کو سزائے موت نہیں دینا چاہتی۔“ بشریٰ نے ایک ایک لفظ ٹھہر ٹھہر کر ادا کرتے ہوئے اپنا فیصلہ سنایا۔

”لیکن یہ اسی کا حقدار ہے۔“ معاذ کا لہجہ احتجاجی تھا۔

”موت اس کو ایک جھٹکے میں ساری تکالیف سے نجات دے دے گی۔ میں چاہتی ہوں کہ یہ زندہ رہے لیکن اس صورت کہ ہر لمحے اپنے لیے موت کی تمنا کرے اور موت اس پر مہربان نہ ہو۔“ اس بار نفرت کا ایک طوفان تھا جو اس کے لہجے میں کروٹیں لے رہا تھا۔

”کیا چاہتی ہو؟“ معاذ نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔

”سب سے پہلے تو اس سے اس کی اس مردانگی کا زخم چھین لو جو اسے شریف عورتوں کی عزتیں پامال کرنے پر اکساتا ہے۔“ اس نے فرمائش کی تو ایک ہل کے لیے معاذ سمجھا نہیں پھر سمجھ کر دم بخود رہ گیا۔ باذل جیسے غلطہ حرام کے لیے واقعی یہی سزا بنتی تھی۔

”اس کے بعد اسے ہاتھ پیروں اور زبان سے معذور کر کے شہر کے ایسے حصے میں پھینکنا جہاں عورتوں کا بہت گزر ہو۔ یہ اپنے آس پاس سے عورتوں کو گزرتا دیکھے لیکن اس میں اتنی اہمیت نہ ہو کہ انہیں انگلی بھی لگا سکے۔ اسے دیدہ و عبرت بنا دو لیکن اس لائق نہ چھوڑو کہ یہ اپنا دکھ درد کسی سے کہہ سکے۔“ بشریٰ کے اندر کی نفرت پوری طرح باہر نکل گئی اور باذل کے لیے اس سزا کا تعین کیا تھا جو واقعی موت سے بدتر تھی۔

☆☆☆

”آج چارنج کر پندرہ منٹ پر ظہیر خان ایک مینٹگ میں شرکت کے لیے اپنے دفتر سے نکلے گا۔ مینٹگ کے لیے اسے اس جگہ پہنچنا ہے۔“ لالہ کے آدمیوں کی فراہم کردہ رپورٹ کی روشنی میں وکی گوگل میپ نکال کر بیٹھا ہوا تھا اور نقشے پر ایک جگہ انگلی رکھتے ہوئے مینٹگ کے مقام کی

کو اپنے سینے سے گرا دے لیکن معاذ اس وقت ایسا عفریت بنا ہوا تھا کہ باذل جیسا جنونی بھی اس سے مقابلہ کرنے میں ناکام ہو رہا تھا۔ اس کی تمام تر کوشش کے باوجود معاذ نہ صرف اس کے سینے پر سوار رہا بلکہ اس کا جبراً چیر کر اس کے منہ میں کپڑے کا وہ گولا بھی ٹھونس دیا جسے اس نے باذل کی قمیص سے ہی بنایا تھا۔ اس گولے کے ٹھونسنے جانے کے بعد وہاں موجود افراد کی سماعتیں باذل کے منہ سے اگلنے والی غلاظت سے محفوظ ہو گئیں۔

”میں سمجھتا تھا کہ دنیا کے بُرے سے بُرے انسان میں بھی اچھائی کی کوئی نہ کوئی رمت تو ہوتی ہے لیکن تو نے اپنے اعمال سے ثابت کر دیا کہ تجھ جیسے حرام کی پیداوار کی رگ رگ میں صرف خباثت بھری ہوئی ہے اور اس خباثت کا اس کے سوا کوئی علاج نہیں کہ اس دنیا کو تجھ جیسے غلیظ انسان سے نجات دلا دی جائے۔“ اس نے پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ باذل کے ساتھ اپنی نفرت کا اظہار کیا اور ایک بار پھر اس پر ٹوٹ پڑا۔ اب وہ اس کے جوڑوں پر وار کر رہا تھا۔ گھٹنے، ٹخنے، کہنی..... ہر ہر جوڑ پر لگنے والی یہ ضربیں ایسی تھیں کہ بندے کی روح کانپ جائے لیکن بدن کا نفس توڑ کر آزاد نہ ہو سکے۔ یہ سب کچھ اسے دشمنوں ہی نے سکھایا تھا۔ وہ تو پڑھنے لکھنے، طرح طرح کے ہنر سیکھنے اور نئے نئے تجربات کرنے والا ایک مستون مزاج لڑکا تھا جسے رنگوں، پھولوں، موسیقی اور انسانوں سے محبت تھی۔ اس نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ کبھی یوں تشدد کو اپنا شیوہ بنائے گا۔ اس نے کسی حد تک لڑائی بھڑائی سے متعلق فنون سیکھے بھی تھے تو محض ایک کھیل کے طور پر لیکن زندگی آج اسے اس مقام پر لے آئی تھی کہ وہ اپنے ہاتھوں سے ایک انسان کے ساتھ غیر انسانی سلوک کر رہا تھا کیونکہ اس انسان نے خود ثابت کیا تھا کہ وہ انسان کہلانے کے لائق ہے ہی نہیں۔

”معاذ!“ چونکہ منہ میں کپڑا ٹھنسنے ہونے کے باعث باذل کی چیخیں اس کے حلق میں ہی دم توڑ دیتی تھیں تو وہ بدترین تشدد کے باوجود صرف تڑپ پھڑک سکتا تھا، شور نہیں مچا سکتا تھا اس لیے تہ خانے کی فضا میں مجموعی طور پر خاموشی ہی تھی۔ اس خاموشی کو بشریٰ کی آواز نے توڑا۔ وہ معاذ کے بالکل قریب کھڑی اس کا بازو دھکا ہے اسے پکار رہی تھی۔ اس کے لمس اور پکار نے معاذ کو اپنی جنونی کیفیت سے نکال کر اس کی طرف دیکھنے پر مجبور کیا۔

”بس کر دو۔“ اسے اپنی طرف متوجہ ہوتے دیکھ کر بشریٰ نے اس سے آہستہ سے کہا۔

نشانہ ہی کی تھی۔

طرح بے قصور لوگوں کو بلا تفریق اڑا کر رکھ دوں۔“ اس نے شدت سے وکی کے منصوبے کی مخالفت کی۔

”بات تو بالکل ٹھیک ہے۔ اگر کسی ملک کے شہری ہی اپنی املاک اور افراد کو نقصان پہنچانے لگیں تو وہ ملک تو بالکل تباہ ہو کر رہ جائے گا۔“ جارد نے معاذ سے اتفاق کیا۔

”یہاں آل ریڈی ہی یہ کام ہو رہا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہم اس ڈی ایس پی کے اغوا کی منصوبہ بندی ہی کیوں کر رہے ہوتے۔ یہ شخص کرپٹ ہے اور اپنی وردی اور اختیارات کو مظلوم کے حق میں استعمال کرنے کے بجائے ظالم کے حق میں استعمال کر رہا ہے تاکہ اپنے عہدے کی قیمت کھری کر سکے۔ میں تو کم از کم اپنے دل میں ایسے شخص کے لیے کوئی ہمدردی نہیں رکھتا۔“ وکی نے منہ بناتے ہوئے قدرے تلخ لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا۔

”فرد واحد کے عمل کا بدلہ بے قصور لوگوں سے نہیں لیا جاسکتا۔ ڈی ایس پی ظہیر کرپٹ ہے تو ہمیں صرف اسی کا احتساب کرنا ہوگا۔“

”مگر کیسے؟ وہ تو اپنے محافظوں کی فوج کے بغیر کھتا ہی نہیں ہے۔“ وکی جربز ہوا۔

”ہم اس کو اس کے گھر پر گھیریں گے۔“ معاذ نے فیصلہ سنایا۔

”گھر پر؟ لیکن وہاں تو اور بھی زیادہ سکیورٹی کے انتظامات ہوں گے۔“ وکی حیران اور معترض ہوا۔

”اس کا ہم انتظام کر لیں گے۔ بہتر ہے کہ تم لالہ کو اس میٹنگ میں شامل کر لو تاکہ میں اس سے پوچھ سکوں کہ وہ ہمیں کیا کچھ فراہم کر سکتا ہے اور کیا نہیں۔“ معاذ نے اپنا فیصلہ سنایا۔ تھوڑی دیر میں لالہ ان کے درمیان موجود تھا اور معاذ کا تجویز کردہ منصوبہ توجہ سے سن رہا تھا۔

”یہ ایک اچھا منصوبہ ہے جس پر ہم تھوڑی سی تہدیلی کے ساتھ عمل کر سکتے ہیں۔“ اس نے اپنی رائے دی۔

”کیسی تہدیلی؟“ معاذ نے سوال کیا۔

”ڈی ایس پی کے گھر میں بے ہوش کرنے والی گیس کا دخول اور ہم لوگوں کا ماسک پہن کر اندر داخل ہونا عملی طور پر اتنا سادہ نہیں ہے۔ گھر اچھے خاصے وسیع رقبے پر قائم ہے اور ہم اتنی بڑی مقدار میں نہ تو بے ہوش کرنے والی گیس حاصل کر سکتے ہیں اور نہ ہی کامیابی سے اسے پورے گھر پر اٹلائی کر سکتے ہیں۔ خاص طور پر وہ ملازمین جو رات کی ڈیوٹی پر اوپن ایر میں گھومتے رہتے ہیں یا اپنے کوارٹرز میں سوئے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کا اس سے کچھ نہیں بگڑے

”اپنے دفتر سے نکل کر وہ جو بھی روٹ اختیار کرے، یہ طے ہے کہ منزل پر پہنچنے کے لیے اسے اس ندی والے پل پر سے ضرور گزرنا پڑے گا۔ پل کے فوراً بعد جو سڑک ہے، اس کی حالت زیادہ اچھی نہیں ہے کیونکہ انڈسٹریل ایریا سے نکلنے والے لوڈرز اور کنٹینرز کا لوڈ ہمارے ایمپائر ٹھیکیداروں کی بنائی سڑکیں سہاڑ ہی نہیں سکتیں۔ اس سڑک پر رش صرف صبح اور شام کے اوقات میں ہوتا ہے یا رات کو ہیوی ٹریفک کا زور ہوتا ہے۔ ظہیر خان اس جگہ سے متوقع طور پر ساڑھے چار سے پونے پانچ کے دوران گزرے گا یعنی رش آدرا شروع ہونے سے یہی کوئی بیس پچیس منٹ پہلے۔ اس لیے ہمارے پاس گنجائش ہے کہ ہم اسے اس مقام پر گھیر لیں۔“ وکی نقشے پر ایک سڑک کی نشان دہی کرتے ہوئے روانی سے بولتا جا رہا تھا۔

”ٹھیک ہے، جگہ کا تعین ہو گیا۔ اب ٹیم اور طریقہ کار کا تعین کرو۔“ معاذ نے گویا اس کے منصوبے کی منظوری دیتے ہوئے بات آگے بڑھائی۔

”ٹیم میں ہم تینوں تو لازمی ہوں گے۔ اس کے علاوہ چار سے پانچ ماہر اور بے جگر بندے ہمیں اصغر سلیکٹ کر کے دے گا۔ گاڑیاں، اسلحہ اور بارود سب اسے دن کو الٹی کا استعمال ہوگا۔“

”بارود.....؟“ معاذ چونکا۔

”بارود تو استعمال کرنا پڑے گا معاذ بھائی! ڈی ایس پی ظہیر خان کی گاڑی کے ساتھ سکیورٹی کے لیے الگ سے پولیس مو بائل ہوگی۔ ہمیں زیادہ الجھن میں پڑنے سے بچنے کے لیے مو بائل کو اڑانا پڑے گا۔“

”لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ہم ایسا نہیں کر سکتے۔“ معاذ نے سر کو زور سے کئی میں جنبش دی۔

”یہ تو ہمیں کرنا پڑے گا۔ اس کے بغیر ہمارے لیے ظہیر خان تک رسائی ممکن نہیں ہوگی۔“ وکی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”میں ہرگز بھی اس بات کی منظوری نہیں دے سکتا“ وقاص ایہ پولیس والے ہمارے ہم وطن ہیں جو روزی روٹی کے لیے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر دی آکی پیز کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہ بے چارے مرجائیں گے تو پیچھے ان کے گھر والوں کا کوئی والی وارث نہیں ہوگا۔ حالات کچھ بھی ہوں، میں ہر صورت میں اپنے وطن سے محبت کرتا ہوں اور کسی طرح اس بات کو قبول نہیں کر سکتا کہ دہشت گردوں کی

گا۔“ لالہ نے انہیں منصوبے کے کمزور پہلو سے آگاہ کیا۔
”دوسری صورت میں ہمیں وہی روایتی طریقہ اختیار کرنا پڑے گا کہ ڈی ایس پی کے کسی ملازم کو توڑیں اور کھانے یا کسی مشروب میں خواب آور دوا ملا کر تمام کمینوں اور ملازمین کے بے ہوش ہونے کا انتظام کریں۔“ معاذ نے مضطرب سے انداز میں پلان بی پیش کیا۔

”یہی مناسب رہے گا۔“
”لیکن اس پر فوری طور پر عمل کرنا مشکل ہوگا۔ ملازمین میں سے ایسے فرد کو منتخب کرنا جو اس کام کو انجام دے سکے اور لالچ کے تحت ٹوٹ بھی جائے اپنی جگہ ایک وقت طلب کام ہے۔“ لالہ نے منظوری دی تو وکی نے اعتراض اٹھایا۔

”یہ تو وکی ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہمارے پاس وقت ضائع کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ پہلے ہی ہمیں کچھ تاخیر ہو چکی ہے اور مجھے ڈر ہے کہ مزید تاخیر کی صورت میں ہمارے لیے اعظم تک رسائی مشکل نہ ہو جائے۔“ معاذ کے لہجے میں اندیشے بول رہے تھے۔

”صرف ایک دن کا انتظار کر لو۔ کل رات تک میں سارے انتظامات مکمل کر لوں گا۔“ لالہ نے یقین دہانی کروائی تو اسے نہ چاہتے ہوئے بھی ایک دن کی تاخیر پر آمادہ ہونا پڑا۔ انتظار کا یہ سارا وقت انہوں نے اپنے منصوبے کی خامیاں ڈھونڈتے ہوئے گزارا۔ وارم اپ کے لیے ورزش اور جاگنگ وغیرہ بھی کرتے رہے۔ وکی، نیلی کی عیادت کے لیے بھی گیا۔ اسے علاج اور خدمت کے لیے بہترین سہولیات فراہم کی گئی تھیں اس لیے زخم بہترین حالت میں تھے لیکن جذباتی طور پر وہ اب بھی بُرے حال میں تھی۔ مومی کی دائمی جدائی کے صدمے نے اسے بالکل چھوڑ کر رکھ دیا تھا اور وہ غم و اندوہ کی تصویر نظر آتی تھی۔ وکی اس سے ملنے پہنچا تو وہ اسے بنا کچھ کہے خالی نظروں سے ٹکتی رہی۔

”کچھ تو بولو، نیلی!“ وکی اکیلے بولتے بولتے تھک گیا تو اس سے التجا کی۔

”بولنے کو کچھ رہا ہی نہیں۔ میں تو بس اس بات پر حیران ہوں کہ اس کے بغیر میری سانسیں کیسے چل رہی ہیں۔“ اس کے لہجے میں ایسی کرلاہٹ تھی کہ وکی کو اپنا دل کٹتا ہوا محسوس ہوا اور ایسا لگا کہ تسلی کے سارے لفظ کہیں کھو گئے ہوں۔

”اس روز جب وہ اور میں کھیتوں میں پیچھے ہوئے تھے اور پولیس ہمیں ڈھونڈتی ہوئی وہاں پہنچ گئی تھی تو پتا ہے

کیا ہوا تھا؟ پولیس والوں کی نظر اس پر نہیں پڑی تھی۔ وہ سیدھے مجھ تک پہنچے تھے اور وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر چھپا ان کی نظروں سے بالکل محفوظ تھا لیکن مجھے پولیس والوں کی نظروں میں آتے دیکھ کر اس سے برداشت نہیں ہوا اور خود کی پروا کیے بغیر مجھے تحفظ دینے کے لیے میرے سامنے آ گیا۔ ان ظالموں نے اسے میرے سامنے پھلنی کر ڈالا لیکن میں اس خوش فہمی میں مبتلا رہی کہ جیسے میں ایک بھکی ہوئی گولی کھا کر بھی زندہ رہتی ہوں، وہ بھی بچ گیا ہوگا۔ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود میرا دل نہ اس وقت اس کی موت قبول کرنے کے لیے تیار ہوا تھا اور نہ ہی اب ہوتا ہے۔ میں ہر وقت اپنے ارد گرد اس کی خوشبو محسوس کرتی ہوں اور ہر بار سونے کے لیے آنکھیں بند کرتے ہوئے میرے دل میں یہ خیال ہوتا ہے کہ جب دوبارہ آنکھیں کھولوں گی تو وہ میرے سامنے ہوگا لیکن وہ نہیں ہوتا اور اس وقت میرا دل چاہتا ہے کہ اپنا سر دیواروں سے ٹکرا کر اپنی جان دے دوں۔“ وہ بولنے پر آئی تو بولتی چلی گئی۔ اس کا ہر لفظ وکی کے دل پر تازیا نہ بن کر لگا لیکن وہ ضبط کیے اسے ستارہا کہ جانتا تھا اگر وہ نہ بولی تو اس کا دل صدمے سے پھٹ جائے گا یا وہ سوچتے سوچتے پاگل ہو جائے گی۔

”میں نے بنا ماں باپ کے تپسی کی حالت میں بیرونی پائی اور دنیا کے بہت سے سرد گرم دیکھے اس لیے میں سمجھتی تھی کہ میں دنیا کی دوسری لڑکیوں کے مقابلے میں زیادہ مضبوط ہوں۔ مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ مجھ جیسی مضبوط لڑکی کو توڑنے کے لیے قسمت میں اتنا بڑا امتحان لکھا ہوا تھا۔“ اس کی آنکھوں سے آنسو پھسل کر اس کے ہاتھوں پر گرنے لگے۔ اس موقع پر وکی خود پر قابو نہیں پاسکا اور اس کے دلوں ہاتھ تھام کر جذباتی لہجے میں بولا۔

”نیلی، میری بہن! مجھے تمہارے آنسوؤں کی قسم ہے کہ میں مومی کے قاتلوں کو ہرگز بھی معاف نہیں کروں گا اور وہ میرے ہاتھوں کتے کی موت مرے گا۔“

”شاید اس سے میرے دل کو تھوڑا سا سکون مل جائے لیکن یہ سوال تو اپنی جگہ ہے نہ کہ میں مومی کے بغیر کیسے جیوں؟ میں نے تو اس کے بغیر کبھی زندگی کا تصور ہی نہیں کیا۔“ اس کے لبوں پر ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب وکی کے پاس بھی نہیں تھا۔

”مجھے اس کی قبر پر لے چلو وکی! میں وہاں اس کے پاس بیٹھ کر اس سے کچھ دیر باتیں کروں گی تو شاید میرے دل کو تھوڑا سا سکون مل جائے گا۔“ وہ بڑے دلگیر لہجے میں

لتی ہوئی تو وہ اس کی شکل دیکھتا رہ گیا۔

”پلیز وکی!“ اس نے اصرار کیا۔

”ابھی تمہاری حالت ٹھیک نہیں ہے نیلی! بستر سے اٹھ کر قبرستان آنے جانے میں تمہارے زخم خراب ہو سکتے ہیں۔“ اس نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”میں اگر وہاں نہیں گئی تو میرا دل پھٹ جائے گا وہی! میں تو آخری بار بھی اسے دل بھر کر نہیں دیکھ سکی تھی۔ اب کم از کم اس کی قبر کی مٹی کو چھو کر اسے محسوس کرنے کا موقع تو دے دو۔“ اس کے لہجے میں ایسا درد تھا جس نے وہی کے دل پر لگے زخموں کو نئے سرے سے تازہ کر ڈالا۔ موی کی تدفین کے بعد وہ خواہش کے باوجود دوبارہ اس کی قبر پر نہیں جاسکا تھا کہ لالہ کی طرف سے اسے اس کی اجازت ہی نہیں ملی تھی لیکن اب اسے لگ رہا تھا کہ اس کا وہاں جانا ناگزیر ہے۔ نیلی کے ساتھ ساتھ اسے بھی موی کی قبر کی مٹی کے لمس کی ہڑک ہونے لگی تھی۔

”ٹھیک ہے۔ چلتے ہیں۔ میں نرس کو بھیجتا ہوں۔ تم اس کی مدد سے جانے کی تیاری کر لو۔“ وہ کمرے سے باہر نکل گیا اور نرس کو اس کے پاس بھجوا دیا۔

”میڈم ریڈی ہیں سر، بٹ.....!“ تھوڑی دیر میں نرس اس اطلاع کے ساتھ واپس آئی اور ہچکچاتے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”ہم سے کہا گیا تھا کہ میڈم اس صبح سے باہر نہیں جائیں گی۔ اگر طبیعت زیادہ خراب محسوس ہو تب بھی صرف ڈاکٹر کو کال کیا جائے گا۔“

”ہم صرف تھوڑی دیر کے لیے باہر جا رہے ہیں اور یہ میری ذمہ داری ہے کہ میں آپ کی پیشین گوئی پر حفاظت یہاں پہنچاؤں گا۔“ اس نے نرم لہجے میں نرس کو جواب دیا تو وہ خاموشی اختیار کر گئی۔

”میں تمہارے کہنے پر تمہیں موی کے پاس لے کر جا رہا ہوں لیکن تم مجھ سے وعدہ کرو کہ وہاں خود پر قابو رکھو گی اور ایسا کچھ نہیں کرو گی جو موی کی روح کو تکلیف دے۔“ اس نے نرس کی مدد سے نیلی کو وہیل چیئر پر بٹھا کر اپنی گاڑی میں منتقل کیا اور پھر وہیل چیئر ڈکی میں رکھ کر خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے نیلی سے وعدہ چاہا۔ اصل میں اسے ڈر تھا کہ موی کی لحد پر جا کر وہ اسے منوں مٹی تلے دبا دیکھے گی تو خود کو بکھرنے سے نہ بچا سکے گی اور اس کے لیے اسے سنبھالنا مشکل ہو جائے گا اس لیے احتیاطی تدابیر کے طور پر اس سے یہ وعدہ لے رہا تھا۔

”میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہارے لیے کوئی مشکل

نہیں کھڑی کروں گی۔“ نیلی نے بات کی تہ تک پہنچ کر اسے یقین دہانی کروائی۔

”اپنے پیاروں کو تکلیف میں دیکھنا دنیا کی سب سے بڑی مشکل ہوتی ہے نیلی! میں تم سے بالکل ویسی ہی محبت کرتا ہوں جیسی محبت مجھے اپنی مری ہوئی بہن سے ہے۔ برسوں گزرنے کے بعد میں اس کا غم آج تک نہیں بھولا تو سوچو تمہیں تکلیف میں کیسے دیکھ سکتا ہوں۔ تمہارا ہر آنسو میرے دل پر کسی بھاری پتھر کی طرح گرتا ہے اور میں جتنا کرتا ہوں کہ کاش موی کی جگہ میں جان سے چلا گیا ہوتا تو مجھے یہ وقت تو نہ دیکھنا پڑتا۔“ اس کے لہجے میں موجود گہرے دکھ نے نیلی کو تڑپا دیا اور اسٹیرنگ پر رکھے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر بولی۔

”اسی باتیں مت کرو وہی! جو قسمت میں لکھا تھا، وہ ہو گیا۔ موی کی جگہ تم ہوتے تو کیا مجھے کم غم ہوتا۔ وہ شوہر تھا تو تم بھائی ہو اور بھائیوں میں تو بہنوں کی جان ہوتی ہے۔“

”میں جانتا ہوں کہ میری بہن مجھ سے بہت محبت کرتی ہے اور اسی محبت کے ناتے مجھ سے بان ہے کہ تم مجھے تکلیف سے بچانے کے لیے موی کے غم کو حوصلے سے برداشت کرنے اور بھولنے کی کوشش کرو گی۔“ وہ ہر صورت اسے زندگی کی طرف واپس لانا چاہتا تھا۔

”میں کوشش کروں گی۔ تم دعا کرنا کہ خدا مجھے اس کوشش میں کامیاب کرے۔“ اس نے کوشش کی کہ مسکرا سکے لیکن بس لب مہنچ کر رہ گئے۔ وہی نے اس منظر کو دیکھ کر لب مہنچ لیے لیکن پھر اسے بہلانے کے لیے موضوع بدل کر ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ قبرستان تک کا راستہ جلد ہی کٹ گیا۔ اس نے گاڑی روک کر ڈکی سے وہیل چیئر نکالی اور اسے اس پر بٹھاتے ہوئے بولا۔

”قبرستان کی زمین ہموار اور پکی نہیں ہے اس لیے موی کی قبر تک پہنچتے پہنچتے تمہیں جھکے لگ سکتے ہیں۔ میں جتنا ممکن ہوا، تمہیں آرام سے وہاں تک لے جاؤں گا۔ بس تم کرسی کے میڈلز مضبوطی سے تھام کر خود کو اس پر اچھی طرح جمائے رکھنا۔“ ساتھ ہی اس نے وہیل چیئر کے ساتھ منسلک حفاظتی بیلٹ بھی اس کی کمر اور پیٹ کے گرد کس دی اور وہیل چیئر کو سچ سج... آگے بڑھایا۔ مٹی زمین میں تھوڑی سی نمی بھی تھی جس کی وجہ سے پہیوں کو حرکت کرنے میں مشکل پیش آرہی تھی۔ ایک آدھ جگہ تو پیسے پھنس ہی گئے لیکن وہی کسی نہ کسی طرح انہیں نکالنے میں کامیاب ہوئی گیا۔ مٹی زمین کے علاوہ دوسری مشکل راستے کی تنگی تھی۔ قبریں ہر طرف

اس طرح پھیلی ہوئی تھیں کہ ان کے درمیان سے وکیل جیڑ کو گزarna مشکل ہوا جا رہا تھا۔ احتیاط کے باوجود ایک بار دائیں جانب کے پیچھے ایک اندر کو بیٹھ چکی کچی قبر پر سے گزر گئے۔ اس نے دل ہی دل میں قبر میں دفن مردے سے معافی مانگی اور شکر ادا کیا کہ نیلی کو اس بات کا پتا نہیں چل سکا۔ اللہ کر کے وہ کسی نہ کسی طرح مومی کی قبر پر پہنچ ہی گئے۔ قبر کی مٹی گیلی تھی اور اس پر پڑے گلاب کے پھولوں کی چٹیاں بھی تازہ تھیں۔ اس نے اندازہ لگایا کہ یہ سرکس کمپنی کے مالک یا کسی سانھی کی محبت کا اظہار ہے۔ مومی دوستانہ مزاج کا لڑکا تھا اور اس کے ساتھ کام کرنے والے تمام افراد اس سے محبت کرتے تھے۔ جب وہ سرکس میں کام کے لائق نہیں رہا تھا تب بھی اس کے سانھی در کر اس کے ساتھ دوستی نبھانے کے لیے اس سے ملاقات کرنے آتے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اس کی عدم موجودگی میں نیلی کا بھی بہت خیال رکھا تھا تو قیاس بالکل درست تھا کہ اس کی لحد پر بکھرے پھول ان ہی کی محبت کا اظہار ہے۔

”ایک بات کہیں وکی!“ اس نے قبر کے قریب وکیل جیڑ کھڑی کی ہی تھی کہ نیلی اس سے مخاطب ہوئی۔

”ضرور کہو۔“ اس نے نیلی کے ضبط سے سرخ پڑتے چہرے سے نگاہ چراتے ہوئے اسے اجازت دی۔

”میرا مومی اعظم کو بچاتے ہوئے اپنی جان سے گیا ہے۔ اس کی یہ قربانی رائیگاں نہ جانے دینا اور اعظم کو اس کی ماں تک ضرور پہنچانا۔ یقین کرو، اعظم وہ بچہ ہے جو بتا ماں بنے ہی میرے اندر ماما کا احساس جگا گیا تھا۔ میں اسے اس کے دشمنوں کے درمیان تصور کرتی ہوں تو میرا کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔“

”تم فکر مت کرو۔ ہم سب مل کر اعظم کی بازیابی کے لیے اپنی بہترین کوششیں کر رہے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو جلد وہ ہمارے پاس ہوگا۔ تب تم خود اسے لے کر اس کی ماں کے پاس جانا اور اسے بتانا کہ بے شک تم نے اس بچے کو جنم دیا ہے لیکن میری ماما میں بھی کوئی کمی نہیں ہے۔“

”ہو سکتا ہے اسے بُرا لگے اور وہ سوچے کہ یہ کون ہوتی ہے چار دن کے ساتھ میں میری برابری کرنے والی۔“ اس نے وکی کا مشورہ سن کر خدشے کا اظہار کیا۔

”نہیں، اسے برا نہیں لگے گا بلکہ شاید سکون محسوس ہو کہ اس کے بعد کوئی اسی کی طرح اس کے بچے سے محبت کرنے والی ہستی موجود ہے۔“ وکی نے یاسیت سے جواب دیا تو وہ ایک ہل کے لیے ساکت ہو گئی۔ موت نے اس

سے اس کے مومی ہی کو نہیں چھینا تھا، وہ ایک معصوم سے اس کی ماں کو چھین کر لے جانے کے لیے بھی گھات لگائے بیٹھی تھی۔ موت اس چیز کا نام تھا جو ہر روز اس کائنات میں بے شمار المیوں کو جنم دیتی تھی۔ اس کے آس پاس دور تک پھیلی قبروں میں دفن مردے اپنے پیچھے جانے کس کس کو بلکتا چھوڑ کر آئے تھے۔ نہ جانے والوں کو رکھنے کا اختیار تھا، نہ پیچھے رہ جانے والوں کے آنسو زنجیر بن کر ان کے قدموں میں لپٹنے کی قدرت رکھتے تھے۔ مالک کے فیصلے تھے جن کے آگے جلد یا بدیر سب کو سر جھکانا تھا۔ جو پہلے مرحلے میں سر تسلیم خم کر دیتا، اس کے لیے صبر کا اجر تھا۔ صبر نہ کرنے اور رونے پٹنے سے بھی قدرت کا فیصلہ تو تبدیل نہ ہوتا، بس صبر کا اجر چلا جاتا اور گریہ و زاری کرنے والا مالک کے پسندیدہ بندوں کی فہرست میں جگہ نہ بنا پاتا۔ جو خود پسندیدہ افراد کی فہرست میں شامل نہ ہو اس کی اپنے پیاروں کے حق میں کی گئی دعا کی قبولیت کی بھلا کیا ضمانت ہو سکتی تھی۔

خیالات کا ایک ریلا سا تھا جو اس کے دماغ سے گزرتا چلا گیا تھا۔ وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ ان خیالات کی حیثیت کیا ہے لیکن بس ایک دم سے اس کا دل ٹھم سا گیا تھا اور وہ جو کہ ٹھان کر رہی تھی کہ وکی سے وعدہ کرنے کے باوجود مومی کی قبر پر پہنچ کر اپنا ضبط کھودے گی، حالت صبر میں آگئی تھی۔ اسی حالت میں اس نے دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے اور پورے خشوع و خضوع سے مومی سمیت تمام مسلمان بہن بھائیوں کی مغفرت طلب کرنے لگی۔ وکی نے بھی خاموشی سے دعا کے لیے ہاتھ بلند کر دیے اور دونوں ہر طرف سے کٹ کر دعا مانگنے میں مستغرق ہو گئے۔ بہت دیر بعد سر اٹھایا تو وکی کی پہلی نظر ایک ہتھیار بدست بندے کی طرف اٹھی۔ وکی سے نظریں ملنے پر وہ خباثت سے مسکرایا۔ وکی نے اضطرابی طور پر اپنی گن نکالنے کی کوشش کی لیکن اس نے اس کے بالکل قریب ایک ہوائی قارٹر کیا اور زہر خند لہجے میں بولا۔

”ایسی دیسی کوئی غلطی کرنے کی کوشش مت کرنا میری جان، ورنہ میں بلا تکلف تمہارے جسم میں سے جان نکال لوں گا۔“

”کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو؟“ وکی نے اسے خشکیں لگا ہوں سے گھورتے ہوئے دریافت کیا۔

”ہمارا ایک شکار تم ہمارے پنجوں سے نکال کر لے گئے تھے۔ بس اسی کی داہنسی جانتے ہیں۔ ویسے داد ہے اس ذہین دماغ کو جس نے اس قبر کی نگرانی کا مشورہ دیتے ہوئے

”میرے ہوتے تم اسے انگلی بھی نہیں لگا سکتے۔“ وہ کی سن کر غرایا۔

”میں بغیر کسی مزاحمت کے اس شرط پر تم لوگوں کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوں کہ اسے کچھ نہ کہو اور صحیح سلامت یہاں سے جانے دو۔“ نیلی نے اس موقع پر حیرت انگیز ٹھہراؤ کا مظاہرہ کیا اور مضبوط لہجے میں اس شخص سے مخاطب ہوئی۔

”ایسا بالکل نہیں ہو سکتا۔ میں لعنت بھیجتا ہوں ایسی

☆☆☆

”تو نے میرے لاڈ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہمیشہ اپنی من مانی کی ہے اور کبھی نہیں سوچا کہ تجھے کچھ ہوا تو

”نیلی کی ضد پر ہی اسے لے کر گیا تھا لالہ امومی کی قبر پر جانے کے لیے بہت بے چین ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا پانچ منٹ کے لیے لے جاتا ہوں۔ شاید اس کے دل کو قرار آ جائے۔“ وہی نے پہلی بار منمناتے ہوئے اپنی صفا کی دینے کی کوشش کی۔

سپنس ڈائجسٹ ﴿ 78 ﴾ جون 2023ء

قاتلوں کو بدترین انجام سے دو چار کیا تھا میں نے اور اس کے بعد ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ تجھے منہ بول اور ملتا تو رہنا ہے تاکہ تو اس دنیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جی سکے۔
تو نے کبھی مجھے مایوس بھی نہیں کیا لیکن تیرے باپ کا خون رنگ دکھاتا ہے تجھ میں۔ تو اسی کی طرح جذباتی اور نرم و نازک احساسات کا مالک ہے اور اکثر اسی کی طرح دماغ کے بجائے دل سے سوچنے لگتا ہے۔“ لالہ بولنے پر آیا تو بولنا چلا گیا۔

”مجھ سے اپنا رشتہ کیوں چھپایا؟“ وہ لالہ کے سینے کے گھٹنوں کے بل آ بیٹھا۔

”کہا نا کہ اپنی دشمنیوں سے بچانے کے لیے۔ دشمنوں کو خبر ہو جاتی کہ تو میرا بھتیجا ہے تو مجھے توڑنے کے لیے تجھے نشانے پر رکھ لیتے۔“

”بے شک ایسا ہو جاتا لیکن میں تیری کسی عینیت کے اتنے مکمل احساس کے ساتھ تو نہ جیتا۔ مجھے اطمینان ہوتا کہ میرے سر پر باپ نہ سکی، باپ کے بھائی کا ہاتھ ہے۔“ وہ کی نے ہلکے کہا۔
”میں نے تیرا خیال رکھنے میں کوئی کسر تو نہیں چھوڑی۔“

”کسر تو رہ گئی لالہ! میں تیری کسی عنایت کو اپنا حق سمجھ کر وصول نہ کر سکا۔ ساری زندگی احسان کا قرض چڑھتا رہا میرے سر پر۔“ اس کے لہجے کے درد نے لالہ کو تڑپا دیا اور اس کے دونوں ہاتھ تمام کر دیے لہجہ میں بولا۔

”بس یہ سوچ کر معاف کر دے کہ میری نیت بُری نہیں تھی۔ جو کیا، تیرے بھلے کے لیے کیا۔“

”معافی مانگ کر گناہ گار کرتے ہو۔ بیٹا کہہ کر سینے سے کیوں نہیں لگاتے۔“ وہ خفا ہو گیا تو لالہ نے سچ کرا سے سینے سے لگا لیا۔ اس جذبات سے بھرپور لمحے میں دونوں ہی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ایک طرف اپنے کو اپنا کہہ کر سینے سے لگانے کی خوشی تھی تو دوسری طرف ان اپنوں کا غم جنہیں آنکھیں باقیامت نہیں دیکھ سکتی تھیں۔

☆☆☆

”کیا پوزیشن ہے؟“

”تمام سیکورٹی کمرے آؤٹ آف ورک ہو چکے ہیں۔ آپ لوگ آرام سے اندر جا سکتے ہیں۔“ اپنے سوال کے جواب میں کالوں میں گونجنے والی آواز نے معاذ کو خاصا مرسکون کر دیا۔ ڈی ایس پی ظہیر خان نے اپنے گھر پر سیکورٹی کے اچھے خاصے انتظامات کر رکھے تھے اور انہیں ہر انتظام کا ”انتظام“ کرنا پڑا تھا۔

تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ ایک ایسا نازک لمحہ تھا جس میں معاذ نے اپنی بے پناہ مہارت سے بے مثال نشانہ لگا کر وہ کی کی طرف بڑھنے والی موت کو پچھاڑ دیا تھا۔ اگر وہ شخص معاذ کی گولی کا نشانہ نہ بنتا تو موسیٰ کی قبر پر اس کے بجائے وہ کی کے خون کے چھینٹے پڑے ہوتے۔

”جو ہوتا تھا، وہ ہو گیا اور اللہ کی مہربانی سے ہم محفوظ بھی رہے لیکن اب تو مجھے اپنے بچنے پر افسوس ہو رہا ہے۔ نہ بچتا تو کم از کم اس وقت اس طرح ذلیل تو نہ ہو رہا ہوتا۔“ وہ کی نے دیکھا کہ لالہ کا غصہ کسی طرح کم نہیں ہو رہا ہے تو منہ لٹکا کر دکھی سے لہجے میں بولا۔

”ہاں، مر جا سالے! پہلے تیرا باپ تجھے چھوڑ کر مر گیا تھا۔ اب تو اپنے بیٹے کو چھوڑ کر مر جا۔ میں تو پتھر کے دل کے ساتھ قیامت کے بورے سمیٹ کر آیا ہوں تاکہ ایک ایک کر کے میرے اپنے مجھے چھوڑ کر جاتے رہیں گے اور میں پیچھے بیٹھا تیشیوں کو ماتا رہوں گا۔“ اس کی بات کے جواب میں لالہ جس غصے اور کرب کی شدت کے ساتھ بولا، اس نے وہ کی کو تنگ کر دیا۔ لالہ خود بھی اپنے الفاظ پر تنگ رہ گیا۔ ساری زندگی جو بات اس نے ظاہر نہیں ہونے دی تھی، وہ اچانک ہی لبوں پر آ گئی تھی۔

”کیا..... کیا تعلق ہے تمہارا میرے باپ سے؟“
لالہ لاکھ دعائیں کرتا کہ وہ کی اس کی بات پر غور نہ کرے لیکن وہ اس کے الفاظ کو پکڑ چکا تھا۔

”کون ہوں میں تمہارا اور کیا رشتہ ہے میرے تمہارے بیچ؟ کیا وجہ ہے کہ تم مجھے اس دیوانگی سے چاہتے ہو کہ مجھ پر اپنا سب کچھ ٹاٹا کرنے کے لیے تیار رہتے ہو؟“
اس کے سوالوں نے لالہ کے لیے راہ فرار نہیں چھوڑی تھی۔ وہ جو ابھی تک کھڑا کھڑا کی کو ڈانٹنے ڈپٹنے میں مصروف تھا، تھکے تھکے انداز میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

”آج سچ بول ہی دو لالہ! میں نے ہمیشہ محسوس کیا ہے کہ تمہارے اور میرے بیچ کوئی خاص تعلق ہے۔ ادب اور احترام نے کبھی مجھے تم سے سوال کرنے کی ہمت نہیں دی لیکن آج سوال میرے لبوں پر آ گیا ہے تو جواب دے ہی دو۔“ وہ کی نے اس سے التجا کی۔

”تو میرا بھتیجا ہے۔ میرے سکے بھائی کا بیٹا۔ میں نے کبھی تم لوگوں سے اپنے تعلق کو ظاہر نہ ہونے دیا کہ کہیں میری دشمنیاں تمہارے حصے میں نہ آ جائیں لیکن قسمت کے لکھے نے تجھے میری ہی گود میں لا ڈالا۔ پہلے بھائی کیا اور پھر بھابھ اور بیٹی بھی اس ظالم دنیا کی بھیٹ چڑھ گئی۔ ان کے

”ٹیلی فون کے مارکٹ گئے وکی؟“ اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد اس نے وکی سے رابطہ کیا۔
”کٹ گئے ہیں اور جبر بھی کام کر رہا ہے۔“

”گڈ!“ وکی کی رپورٹ سنتے ہی اس نے بے ساختہ داد دی۔ لینڈ لائن کے علاوہ موبائل فونز کو ناکارہ بنانے کے لیے انہیں جبر کا بندوبست کرنا پڑا تھا اور اب خود آپس میں رابطے کے لیے وکی ٹاکی استعمال کر رہے تھے۔ اندر کے ایک ملازم کو توڑ کر کمینوں اور ملازمین کو بے ہوش کرنے کا کام پہلے ہی کیا جا چکا تھا۔ پروگرام کے مطابق مذکورہ ملازم نے چائے، کافی یا دودھ (گھر والے سونے سے پہلے جس بھی مشروب کا استعمال کرتے) میں بے ہوشی کی دوا ملا کر سب کو دینے کے ساتھ ساتھ خود بھی پی لی تھی تاکہ شک سے محفوظ رہے۔ اندر موجود افراد کا یہ بندوبست کرنے کے ساتھ ساتھ اب وہ سیکورٹی کے دوسرے انتظامات کو ٹیل کرنے میں مصروف تھے تاکہ سارا کام خاموشی اور صفائی سے انجام دیا جاسکے۔

”دونوں گارڈز کو آف کر دیا۔“ وہ وکی سے فارغ ہوا ہی تھا کہ چار وکی طرف سے رابطہ کیا گیا۔ ڈی ایس پی جس ہاؤسنگ سوسائٹی میں رہتا تھا اس کا اپنا بھی ایک حفاظتی انتظام تھا۔ سوسائٹی میں داخلے اور اخراج کے صرف ایک راستے کو کھلا رکھا جاتا تھا اور وہاں پرائیویٹ سیکورٹی ادارے کے تعاون سے ہر قاعدہ ایک چیک پوسٹ بنائی گئی تھی۔ دن کے اوقات میں بھی سوسائٹی میں داخل ہونے کے خواہش مند ہر باہر کے فرد کو تفتیش سے گزرنا پڑتا تھا اور اس کی طرف سے یہ نشاندہی ہونے کے بعد کہ وہ کس کا ملاقاتی ہے، پہلے اس متعلقہ کمین سے تصدیق کی جاتی تھی پھر اس شخص کو داخلے کی اجازت ملتی تھی۔ رات میں ظاہر ہے یہ احتیاط اور بھی زیادہ بڑھ جاتی تھی اور وہ لوگ تو رات کے جس پہر وہاں آئے تھے اس نے چیک پوسٹ پر موجود گارڈز کو مزید چوکنا کر دیا تھا لیکن انہوں نے یہ چالاکی کی تھی کہ سب کے سب ایک ساتھ وہاں نہیں ٹھک پڑے تھے۔ معاذ اور لالہ کا ایک ساتھی بائیک پر وہاں پہنچے تھے جبکہ باقی ساتھیوں نے اپنی گاڑیاں کچھ فاصلے پر روک کر پیدل پیشرفت کرنے کے بعد ارد گرد پوزیشن سنبھال لی تھی۔ ”کس سے ملنا ہے؟“ جب معاذ اور اس کا ساتھی چیک پوسٹ پر آ کر رہے تھے تو ایک گارڈ نے انہیں نہایت مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے روکے لہجے میں پوچھا تھا۔ اس ہاؤسنگ سوسائٹی میں جس طبقے کے لوگ رہتے تھے

وہ یا ان کے ملنے جلنے والے عموماً بائیک استعمال نہیں کرتے تھے۔ کچھ شوقین نوجوان استعمال کرتے بھی تھے تو وہ عام بائیکس نہیں ہوتی تھیں۔ وہ کم از کم بھی اس قیمت کی بائیکس ہوتی تھیں جس میں ایک متوسط طبقے کا شخص سیکنڈ ہینڈ کار خرید سکتا تھا تو یوں تھا کہ معاذ اور اس کے ساتھی کی عام سی بائیک نے سیکورٹی والوں کے لیے ان کی حیثیت کا تعین کرنے میں آسانی کردی تھی اور وہ ان سے ان کی حیثیت کے مطابق پیش آرہے تھے۔

”ہمیں ڈی ایس پی ظہیر خان صاحب سے ملنا ہے۔“ انہوں نے خود ہمیں بلایا ہے۔“ معاذ نے کسی نیم خواہ مخواہ کے انداز میں گارڈ کے سوال کا جواب دیا تھا۔
”اتنی رات کو؟“ اس کا جواب سن کر گارڈ نے حیرت کا اظہار کیا تھا۔

”اب یہ تو صاحب کو معلوم ہے۔ انہوں نے ہمیں ابھی آرڈر کیا ہے تو ہم ابھی آگئے ہیں۔“ اسے جواب دیتے ہوئے معاذ کے لہجے میں بے نیازی تھی بلکہ اس نے اس بے نیازی کے واضح اظہار کے لیے اپنے شانے بھی اچکائے تھے۔

”ٹھیک ہے، ادھر ہی رکو۔ پہلے ہم ڈی ایس پی صاحب سے تصدیق کر لیں۔“ اس کے اعتماد نے گارڈ کو تھوڑا سا نرم کیا اور وہ لکڑی کے کمین میں بیٹھے اپنے ساتھی کی طرف پلٹا تاکہ اس سے اس سلسلے میں بات کر سکے۔ طریقہ کار یہی تھا کہ کمین میں بیٹھ کر ڈیوٹی دینے والے کے پاس سوسائٹی کے تمام کمینوں کے رابطہ نمبر موجود ہوتے تھے اور وہ ہی ضرورت پڑنے پر ان سے رابطہ کرتا تھا۔

”ایک منٹ بات سنو۔“ معاذ نے اسے ہکا اور جیسے ہی وہ پلٹا، معاذ کے ہاتھ میں موجود اسپرے کی بوتل سے ایک پھوار نکل کر سیدھی اس کے چہرے پر پڑی تھی۔ اس سے پہلے کہ کوئی کچھ سمجھ سکتا، معاذ کے ساتھ موجود شخص اور اندھیرے میں ادھر ادھر جیسے ساتھی حرکت میں آگئے۔ پھرتی اور مہارت سے سیکورٹی گارڈز کو غیر فعال کرتے ہوئے انہوں نے اس بات کا دھیان رکھا تھا کہ ان میں سے کسی کو ناقابلِ تلافی نقصان نہ پہنچ سکے۔ وہ سب بے چارے روزی روٹی کے چکر میں کم سہولیات کے ساتھ کم تنخواہوں میں سیکورٹی گارڈ کا یونیفارم پہن کر دوسروں کی حفاظت کے لیے اپنا آپ داد پر نگاہ دینے والے وہ لوگ تھے جنہیں کچھ ہو جاتا تو پیچھے ان کے اہل خانہ کو پوچھنے والا کوئی نہیں تھا۔ چیک پوسٹ پر موجود ان تین عدد گارڈز کو بنا

”کس سمت سے آواز سنائی دی ہے؟“ اس نے تشویش اور بے چینی سے پوچھا۔

”ایک ہی شخص تھا اور مجھے بالکل ایسا لگا تھا جیسے کوئی تیز تیز چلتا ہوا ہماری ہی سمت بڑھ رہا ہو لیکن آواز دور کی تھی۔ شاید وہ اوپری منزل پر ہے۔“ اس نے گردن اٹھا کر بالائی منزل کی کھلی کھڑکی کی طرف دیکھا۔ وہاں اندھیرا تھا لیکن اسے ایسا لگا جیسے اس اندھیرے میں سے کوئی ان کی جانب دیکھ رہا ہے۔

”کیا ہوا جارو؟“ معاذ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے مخاطب کیا۔

”شش!“ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر معاذ کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اپنی سماعت کو پوری طرح اس سمت مرکوز کر دیا جہاں اس نے آخری بار حرکت محسوس کیا تھا۔ اندھیرے کے باعث نظر کچھ نہیں آ رہا تھا لیکن اس کے حساس کانوں نے کھڑکی کا شیشہ سرکنے کی آواز سنی اور اس سے اگلی آواز خوفناک تھی۔ کسی ہتھیار کا سیٹھی کچھ ہٹایا گیا تھا۔ ”ڈاؤن۔“ وہ تیز لہجے میں بولا اور معاذ کو اپنے ساتھ لیتا ہوا نیچے گر گیا۔ نیچے گرتے گرتے معاذ کھڑکی سے لپکتا شعلہ دیکھ چکا تھا۔ یعنی جارو کی سماعت نے بالکل سچی گواہی دی تھی اور اندر کم از کم کوئی ایک فرد ایسا تھا جو نہ صرف ہوش میں تھا بلکہ ان سے مقابلے پر بھی آمادہ تھا۔ موجودہ صورت حال میں صرف ایک بات ان کے حق میں جاتی تھی اور وہ یہ کہ فائرے آواز ہتھیار سے کیا گیا تھا جس کی وجہ سے ارد گرد والے اب بھی بے خبر تھے۔

فائرنگ کا شور ہوتا اور ہاؤسنگ سوسائٹی کے کسین جاگ جاتے تو ان کے پاس فرار کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا۔ ”سب لوگ احتیاط کریں۔ اندر ایک شخص ہوش میں ہے اور ہم پر فائر کر رہا ہے۔“ معاذ نے نیچے پڑے پڑے سب سے پہلے اپریٹس پر اپنے ساتھیوں کو ہوشیار کیا پھر جارو سے مخاطب ہو کر بولا۔

”کیا کہتے ہو۔ وہ اکیلا ہی ہے یا اس کا ساتھ دینے کے لیے کوئی اور بھی موجود ہے؟“

”مجھے صرف ایک شخص کے حرکت کرنے کی آواز سنائی دی تھی۔ اگر کوئی اور بنا حرکت کیے بالکل خاموشی سے موجود ہے تو میں اندازہ نہیں لگا سکتا۔“ جارو نے اسے جواب دیا۔ وہ دونوں اب تک دیوار کی جڑ کے پاس اسی جگہ موجود تھے جہاں فائر سے بچنے کے لیے گرے تھے۔ کھڑکی

گولی چلائے بے ہوش کرنے میں کامیاب ہو جانے کے بعد ان کے لیے ڈی ایس پی کے گھرنک رسائی زیادہ مشکل نہیں تھی۔ معاذ اور وہی نے اپنے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ڈی ایس پی کے گھرنک کی طرف پیش قدمی کی تھی جبکہ جارو اس کے ساتھی کے ساتھ ان دو سیکورٹی گارڈز کو سنبھالنے کی ڈیوٹی سونپی گئی تھی جو سوسائٹی کی چار دیواری کے اندر وقفے وقفے سے راؤنڈ لگا کر مینیوں کی اس تسلی کا انتظام کرتے تھے کہ ہم جاگ رہے ہیں اس لیے آپ بے فکری سے سوکتے ہیں۔

انہوں نے اپنے دو ساتھی احتیاطاً چیک پوسٹ پر بھی چھوڑ دیے تاکہ اگر کوئی بھی غیر معمولی صورت حال پیش آئے تو اسے سنبھالا جاسکے۔ اتنے سارے انتظامات کے بعد اب وہ ڈی ایس پی ظہیر خان کے گھر کے باہر موجود تھے اور ہر طرف سے قابل اطمینان رپورٹس سننے کے بعد بس اب اندر جانے کے لیے تیار ہی تھے۔

”تم اپنے ساتھی کے ساتھ یہاں میرے پاس آ جاؤ۔“ معاذ نے دیکھا کہ اس کا ساتھی بجلی کے وہ تار کاٹ چکا ہے جو حفاظتی نیٹنگ نظر سے گھر کی باؤنڈری وال پر بچھائے گئے تھے۔ اپنے ساتھی کو اس کام پر اشارے سے داد دیتے ہوئے اس نے جارو کو ہدایت کی تھی۔

”اوکے۔ ہم آرہے ہیں۔“ اس نے جواب دیا اور عین اس وقت پر اس کے پاس پہنچ گیا جب وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ بس اندر داخل ہونے ہی کو تھا۔

”میں اور وہی اپنی اپنی ٹیم کے ساتھ اندر داخل ہوں گے۔ تم اپنی ٹیم کے ساتھ احتیاطاً باہر موجود رہنا۔“ اس نے جارو کو ہدایت دی اور کچھ کہنے کے لیے اپنے ساتھی کی طرف مڑا۔ وہ لوگ آپس میں مختلف ذمے داریاں بانٹ کر دو دو افراد کی ٹیم کی صورت میں کام کر رہے تھے جبکہ پورے مشن کو لیڈ کرنے کی ذمہ داری معاذ کے سر تھی۔ اس کا انتخاب لالہ نے خود کیا تھا۔

”ایک منٹ معاذ! ذرا رکو۔“ وہ اندر داخلے کے لیے دیوار پر چڑھنے ہی لگا تھا کہ جارو نے اسے روک لیا۔

”کیا ہوا؟“ معاذ اس کی طرف پلٹا۔

”مجھے اندر سے کسی کے چلنے کی آواز سنائی دی ہے۔“ جارو نے مضطرب سے لہجے میں اسے آگاہ کیا تو وہ ٹھنک گیا۔ اس کے حساب سے اندر موجود ہر شخص کو بے ہوش ہونا چاہیے تھا لیکن جارو بتا رہا تھا کہ اسے اندر سے کسی کے چلنے پھرنے کی آواز سنائی دی ہے۔ وہ جلد ہی غیر معمولی سماعت سے واقف تھا اس لیے اس بات کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

سے اس جگہ تک فائر کے لیے زاویہ نہیں بننا تھا اس لیے وہ بالکل محفوظ تھے اور یقیناً یہی وجہ تھی کہ دوسرا فائر نہیں کیا گیا تھا۔

”اس سے پہلے کہ یہ شخص ہمارے لیے مسئلہ بنے، ہمیں اندر داخل ہو کر اس پر قابو پانا ہوگا۔“ معاذ بڑبڑایا اور پھر اپنے ساتھیوں کو اندر داخل ہونے کے سلسلے میں ہدایات دینے لگا۔ چونکہ وہ تین ٹولیوں میں تھے اس لیے بیک وقت تین مختلف مقامات سے بہ احتیاط اندر داخل ہونے کا فیصلہ کیا گیا۔

”ہم اسے اپنے ساتھ اٹھج رکھیں گے تاکہ باقی لوگوں کو اندر داخل ہونے کا موقع مل سکے۔“ اس نے جارو سے سرگوشی میں کہا۔ اس وقت ٹیموں کی ترتیب تھوڑی سی بدل گئی تھی۔ جارو کو اس نے اپنے ساتھ رکھا تھا جبکہ اس کے اوزار اپنے ساتھی کی ایک ٹولی بنا کر انہیں دائیں جانب سے اندر داخل ہونے کی ہدایت کی تھی۔ وکی کو اپنے ساتھی کے ساتھ بائیں سمت سے کوشش کرنا تھی جبکہ وہ اور جارو عقب میں موجود تھے۔

”میں دیوار پھلانگوں گا۔ تم مجھے کور دینا۔“ اس نے جارو کو ہدایت دی۔

”ہم اندر داخل ہونے لگے ہیں۔“ اس کی ہدایت کے مطابق دونوں ٹولیوں کی طرف سے آخری لمحات میں اطلاع دی گئی۔

”اوکے۔ پانچ تک گنتی گنو پھر محب کر جانا۔“ اس نے ہدایت دی اور جارو کو اشارہ کر کے خود کسی بندر کی سی پھرتی کے ساتھ دیوار پر چڑھ گیا۔ جارو نے اس جانب فائر کیا جہاں ایک کھڑکی سے انہیں نشانہ بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ ان کے پاس موجود ہتھیار بھی بے آواز تھے اس لیے فائرنگ کا شور ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ دوسری احتیاط اس نے یہ کی تھی کہ براہ راست کھڑکی کا نشانہ لینے کے بجائے دیوار کا نشانہ لیا تھا۔ فائر سے کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا تو رات کے سناٹے میں آواز دور تک جاتی اور شور کسی طور ان کے حق میں نہیں تھا۔

معاذ اندر پہنچ گیا تو اس نے جارو کے اندر داخل ہونے کے لیے اسے کور دیا۔ جارو بھی بہ خیر و عافیت اندر پہنچ گیا۔ اس دوران حیرت انگیز طور پر ان پر ایک بھی فائر نہیں کیا گیا۔

”ہم اندر پہنچ چکے ہیں۔“ باقی دونوں ٹولیوں کی طرف سے بھی انہیں باری باری اطلاع دی گئی۔

”ابھی اپنی جگہ رکھ رہو۔“ اس نے انہیں حکم دیا اور خود جارو کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

”کچھ کہنا مشکل ہے۔ شاید اس نے ہمارے اندر داخل ہونے کے دوران اپنی جگہ بدل لی ہے لیکن میں اب اندازہ نہیں لگا پا رہا کہ وہ کس جگہ موجود ہے۔“ اس نے بے بسی سے جواب دیا۔

”کوئی بات نہیں۔“ اسے احساس ہوا کہ وہ جارو کی صلاحیت پر ضرورت سے زیادہ انحصار کر رہا ہے اس لیے اس کا شانہ چھپک کر اسے ریلیکس کیا اور خود اندر داخل ہونے کے سلسلے میں ساتھیوں کو ہدایات دینے لگا۔ چار دیواری سے اصل عمارت کے درمیان گھاس کے قطعات تھے۔ انہوں نے رینگتے ہوئے درمیانی فاصلہ طے کیا اور اپنے اپنے طور پر اندر داخل ہونے کا راستہ تلاش کرنے لگے۔ اس نے اور جارو نے عقبی حصے میں موجود ایک کھڑکی کا شیشہ کاٹ کر اندر جانے کا راستہ بنایا۔ وکی نے اپنی درختوں اور دیگر اونچے مقامات پر چڑھنے کی صلاحیت کا استعمال کیا اور رسی لگا کر سیدھا چھت پر پہنچ گیا۔ وہاں سے سیڑھی کے راستے اندر پہنچا اس کے لیے چنداں مشکل نہیں تھا۔ ان کے ساتھیوں کی تیسری ٹیم نے نسبتاً آسان راہ اختیار کی تھی اور گھوم کر مرکزی دروازے پر پہنچ گئے۔ دروازے کا لاک توڑ کر داخل ہونا خاصا آسان تھا۔ تینوں ٹولیاں ایک ایک کر کے گھر کے لاکچ میں جمع ہو گئیں۔ پورے گھر میں اندھیرے اور سناٹے کا راج تھا اور انہیں روشنی کے لیے ٹارچیں جلا نا پڑی تھیں۔

”سارے کمروں کو چیک کرو لیکن احتیاط سے۔“ یہاں کم از کم ایک مسلح فرد چھپا ہوا ہے اور کسی بھی سمت سے ہم پر فائر کر سکتا ہے۔“ اپنے ساتھیوں کو ہدایت دے کر معاذ خود ایک سوئچ بورڈ کی طرف بڑھا اور ایک ایک کر کے سارے بٹن دبا ڈالے۔ نہ کوئی پتکھا چلا اور نہ روشنی ہوئی۔ اس طرح اس کے اس اندازے کی تصدیق ہو گئی کہ گھر کا مین سوئچ جان بوجھ کر آف کر دیا گیا تھا۔ جس شخص نے یہ حرکت کی تھی، ظاہر ہے وہ ان کے مقابلے میں اس گھر سے اچھی طرح واقف تھا اور اندھیرے میں بھی آسانی سے حرکت کر سکتا تھا۔ وہ سب ہی ہوشیاری سے گھر کا جائزہ لینے لگے۔ علیے سے ملازمہ دکھائی دینے والی ایک عورت باورچی خانے میں رکھی چھوٹی ڈائننگ ٹیبل پر سر رکھے سوتی دکھائی دی۔ ایک ملازم لاکچ کے قالین پر ہی لمبا لیٹا ہوا تھا۔ ایک کمرے میں دو نوجوان لڑکیاں یوں ایک دوسرے کے

شانے پر سر رکھے سو رہی تھیں جیسے ہاتھ کرتے کرتے اچانک شدید نیند آگئی ہو۔ اگلے کمرے میں لڑکیوں سے عمر میں کچھ بڑا دکھائی دینے والا لڑکا رائٹنگ ٹیبل پر سر رکھے سو رہا تھا اور اس کا لپ ٹاپ سامنے کھلا رکھا تھا۔ ایک خواب گاہ میں درمیانی عمر کی خاتون سر سے پیر تک چادر اوڑھے محو خواب تھی۔ حقیقت میں گھر سوئے ہوئے محل کا منظر پیش کر رہا تھا یعنی ان کے لیے کام کرنے والے بندے نے پوری طرح کام انجام دیا تھا اور کہیں کوئی نہیں جاگ رہا تھا لیکن نہیں..... اس گھر میں ایک شخص ایسا تھا جو جاگ رہا تھا اور ان کی یہاں آمد سے واقف بھی تھا۔

”وہ ڈی ایس پی ظہیر خان ہے۔“ جائزہ لینے کے بعد انہیں اس شخص کا نام بھی پتا چل گیا تھا اور بالائی منزل کے اس کمرے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے جس میں اس نے خود کو بند کر رکھا تھا۔ اس سے قبل کہ وہ اس تک پہنچنے کی تدبیر کرتے، پولیس کی گاڑیوں کا ہوٹل سنائی دیا۔ وہ بھڑک کر کھڑکیوں کی طرف لپکے۔ باہر گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس چمک رہی تھیں۔

☆☆☆

وہ کسی زخمی درندے کی طرح فرش پر پڑا ہانپ رہا تھا۔ اسے اپنے یوں بے بس کر کے قید کر دیے جانے پر بہت طیش تھا اور چاہتا تھا کہ سامنے آنے والے ہر شخص کو چیر پھاڑ کر رکھ دے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا کہ اس کے ہاتھ پیروں میں بیڑیاں ڈال کر اسے کچھ بھی کرنے کے لائق نہیں چھوڑا گیا تھا۔

”مجھے معلوم ہے کہ تم اس حال میں خوش نہیں ہو۔ اپنا بے بس ہو جانا کسی کو بھی خوش نہیں کر سکتا لیکن تمہارے جیسا شخص جو ہمیشہ دوسروں کو بے بس کر کے ان کی بے بسی سے لطف اٹھاتا رہا ہو، اس تجربے کا حق دار ہے۔ یاد رکھنا میں تمہیں بے بسی کی اس انتہا پر لے جاؤں گا جہاں پہنچ کر تم ان سب مظلوموں کی تکلیف محسوس کر سکو جن پر تم نے اپنے شوق تماشا میں بے پناہ مظالم ڈھائے تھے۔“

اسے اس حال میں یہاں ڈالتے ہوئے یہ الفاظ معاذ نے ادا کیے تھے۔ وہ ان الفاظ کو بھول بھی جاتا تو بشری کی نفرت بھری نگاہوں کو نہیں بھول سکتا تھا۔ ان نظروں میں انتقام کی وہ چاہ تھی جو اس جیسے شخص کا دل بھی ایک پل کے لیے لرزا کر رکھ دیتی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ ان میں سے کسی کے بھی کام کا نہیں ہے۔ آپ اپنے دشمن کے لیے کارآمد نہ ہوں اور وہ پھر بھی آپ کو زندہ رکھے تو اس کا صاف مطلب

ہوتا ہے..... وہ آپ کے روز جینے اور روز مرنے کا لطف لینا چاہتا ہے۔ وہ ایک دفعہ مرنے کو تیار تھا لیکن اس اذیت سے گزرنے کے لیے راضی نہیں تھا۔ اس نے اتنی بار انسانوں کو اپنی اذیت پسندی کی بمینٹ چڑھایا تھا کہ اسے ان کے سارے رد عمل حفظ ہو گئے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اذیت سے گزرتے انسانی جسم کیسے ایٹھتے ہیں، کیسے انہیں جھٹکے لگتے ہیں۔ کیسے وہ اپنے آپ میں سکڑ کر بجنے کی کوشش کرتے ہیں، کیسے دم گھٹنے پر آنکھیں باہر کو نکلتی ہیں، کیسے حلق سے چیخیں برآمد ہوتی ہیں اور کیسے درد کے ناقابل برداشت ہو جانے پر ہوش و حواس ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ سب جانتا تھا کیونکہ اس نے کسی عام مجرم کی طرح لوگوں کو صرف ڈرانے، سزا دینے یا ان کی زبان کھلوانے کے لیے تشدد کا نشانہ نہیں بنایا تھا، وہ ان کی بے بسی اور تکلیف سے لطف کشید کرنے کے لیے انہیں اذیت کے مراحل سے گزارتا تھا۔ تو یہ تھا کہ وہ جانتا تھا کہ اذیت سے گزارتا انسانی جسم کن مراحل سے گزارتا ہے اور وہ خود کو ان مراحل سے گزارنے کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے کسی شکاریوں کے نرغے میں آئے ہوئے چالاک درندے کی طرح اس نرغے سے نکل جانے کی تدبیر سوچتا رہتا تھا۔ بہت سوچنے پر بھی اب تک اسے ایسی کوئی تدبیر نہیں سوچھی تھی جو محفوظ ہو اور چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ انجام قریب، بہت ہی قریب ہے اس لیے اس نے رسک لینے کا فیصلہ کر لیا اور اب وہ اپنا داد کھیلنے کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا۔ اس قید میں اسے چوبیس گھنٹوں میں صرف ایک بار خوراک مہیا کی جاتی تھی اور اس کی بائیلوجیکل کلاک خوراک دے جانے والے اس مخصوص وقت کے ساتھ ہم آہنگ ہو چکی تھی اس لیے وہاں کسی گھڑی کی موجودگی کے بغیر بھی اسے اندازہ ہو جاتا تھا کہ خوراک فراہم کیے جانے میں کتنا وقت باقی ہے۔

اس مخصوص وقت کے آنے میں اندازاً آدھا گھنٹا باقی تھا جب اس نے اپنے منصوبے پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ وہ بیڑیاں جو اسے قید کیے ہوئے تھیں، اس کی آزادی کی جدوجہد کا حصہ بن گئیں۔ ان کی نپلی ضربات سے اس نے خود کو زخمی کرنا شروع کر دیا۔ اپنے آپ کو زخمی کرنا آسان نہیں تھا لیکن خود کو اس سے بڑی اذیت سے بچانے کے لیے وہ اس مرحلے سے گزر رہا تھا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ اس حد تک کامیاب ہو گیا کہ چھوٹے چھوٹے زخموں سے نکل کر بننے والا خون اس کے چہرے کو تر کرنے لگا۔ اس نے اس خون کو اپنے ہاتھوں سے چہرے پر پھیلا کر مزید نمایاں

کیا اور پھر کسی مُردہ چھٹکی کی طرح ہاتھ پیر پھیلا کر یوں فرش پر لیٹ گیا جیسے جسم سے جان نکل چکی ہو۔ اس حالت میں پڑے کچھ دیر گزری تھی کہ اس کے حساس کالوں نے آہٹ سنی۔ پھر کوئی آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترنے لگا۔

”ہائے اور بابا یہ کیا ہوا؟“ سیڑھیاں اترنے والا یقیناً حسب معمول سلاخوں کے پاس آکھڑا ہوا تھا اور وہیں سے ہاتھ ڈال کر خوراک کا پیکٹ اندر رکھنے لگا تھا جب اس کی نظر باذل کے خون آلود چہرے پر پڑی اور گھبرا کر بے ساختہ بولا۔ باذل نے خود کو اس حد تک ساکت کر لیا کہ اپنی سانس بھی روک لی۔

”کہیں یہ مر رہا تو نہیں گیا۔ اگر ایسا ہوا تو لالہ میری کھال کھینچ لے گا۔“ اس نے بلند آواز میں خود کلامی کی۔ ساتھ ہی باذل کو اس کے متحرک قدموں کی آواز سنائی دی۔ اس کے دل میں اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں وہ صورتِ حال کی آگاہی کے لیے کسی کو بلانے والی ادھر نہ چلا جائے۔ ایسا ہوتا تو اس کے لیے اپنے منصوبے پر عمل کرنا مشکل ہو جاتا۔ پلکوں میں احتیاط سے جھری بنا کر اس نے اس شخص کی طرف دیکھا تو یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ وہ دوبارہ اوپر جانے کے بجائے وہیں ایک کونے میں رکھا ڈنڈا اٹھائے واپس سلاخوں کی طرف آ رہا ہے۔ اس کا مقصد سمجھتے ہوئے اس نے دوبارہ اپنی آنکھیں موند لیں۔ حسب توقع اس کے بدن سے ڈنڈا آ کر ٹکرایا۔ یقینی طور پر اس شخص کو اس کے متعلق خصوصی ہدایات دی گئی تھیں اس لیے وہ بھی سلاخوں کا تالا کھول کر اندر نہیں آتا تھا۔ اب بھی وہ باہر کھڑا اس کے بدن کو لمبے ڈنڈے سے چھو چھو کر اس کے بارے میں اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”رب جانے مر گیا ہے یا صرف بے ہوش پڑا ہے۔“ باذل نے اپنے جسم کو بالکل کسی مُردے کے جسم کی طرح اٹھا لیا تھا اس لیے وہ اس کے بارے میں کوئی حتمی نتیجہ قائم نہ کر سکا اور تذبذب کی کیفیت میں وہیں کھڑا رہا۔ اس کا یوں کھڑا رہنا باذل کے لیے معنی خیز تھا۔ اصولاً اسے اس واقعے کی اطلاع دینے اور پر جانا چاہیے تھا لیکن وہ نہیں گیا تھا تو اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی تو سبب تھا۔ اس سبب پر غور کرنے سے زیادہ وہ اس وقت اس شخص کے رد عمل پر توجہ مرکوز کیے ہوئے تھا چنانچہ جیسے ہی لوہے سے لوہا ٹکرانے کی اہلی سی ٹھکننا ہٹ کالوں میں اتری، دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اس شخص نے اوپر جا کر کسی کو مطلع کرنے کے بجائے خود اندر آ کر اسے چیک کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ درندہ فوراً الارٹ ہو گیا اور

اس کی اندھیرے میں شکار پر جھپٹ پڑنے کی ساری صلاحیتیں جاگنے لگیں۔ بند آنکھوں کے باوجود صرف آوازوں کے بل بوتے پر وہ تصور کی آنکھ سے سب دیکھ رہا تھا۔ تالے کے سوراخ میں چابی گھمائے جانے کی آواز، کٹھڑے سے تالا نکالے جانے کی آواز، کٹڈی کھولنے جانے کی آواز، سلاخوں والا دروازہ دھکیلے جانے کی آواز اور کسی کے اپنی جانب بڑھتے قدموں کی آواز۔ ہر آواز ایک مکمل تصویر تھی جس نے اس کے لیے پورا منظر واضح کر دیا تھا تب ہی تو جیسے ہی وہ شخص اس کے قریب آ کر اس پر جھکا، اس نے اس بلا کی طرح آنکھیں کھول دیں جو صدیوں سے اپنے معبد میں بند کسی ایسے لمحے کی منتظر ہوتی ہے جب کسی کی غلطی اسے موت کی تاریکی سے نکال کر زندگی کی روشنی عطا کر دے اور وہ اپنے خونی پنجوں کی گرفت سے لوگوں میں خوف اور موت بانٹنے لگے۔

یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ اس پر جھکے شخص نے اس کے اچانک آنکھیں کھول دینے پر یکدم گھبرا کر پیچھے ہٹنا چاہا لیکن اسے موقع نہیں ملا اور بلا کو آزاد ہونے کا موقع فراہم کرنے کی غلطی کا خمیازہ اس طور بھگتنا پڑا کہ اس کی گردن باذل کی دونوں ہتھکڑیوں کے درمیان موجود زنجیر کی جکڑ میں اس طرح پھنسی کہ اس کا جسم پھڑک پھڑک گیا لیکن گردن کو اس وقت تک آزادی نہ ملی جب تک جسم پھڑکنا چھوڑ کر بے جان نہیں ہو گیا۔ اس کے بے جان لاشے کو فرش پر ڈال کر باذل نے جلدی سے اس ساری جدوجہد کے دوران نیچے گر جانے والا چابیوں کا گچھا اٹھایا اور اپنی بیڑیاں کھولنے لگا۔ اگلا مرحلہ یہاں سے باہر نکلنے کا تھا۔ اس نے مردہ بڑے شخص کے جوتے اتار کر اپنے پیروں میں پہنے اور اس کی قمیص سے اپنے خون آلود چہرے کو کسی حد تک صاف کر کے اس جانب بڑھا چھاں اس تہ خانے سے باہر لے جانے والی سیڑھیاں موجود تھیں۔ بیڑیاں بطور ہتھیار اس کے ہاتھ میں تھیں۔ مرجانے والے شخص کے نرم سول کے جوتوں نے اس کے قدموں کی احتیاط کے ساتھ مل کر اسے بالکل بے آواز اوپر تک پہنچا دیا۔ ایک ایک آواز پر کان دھرتا وہ خود بے آواز قدموں سے آگے بڑھتا چلا گیا۔ مرنے والے کے جوتے اس کے پیروں میں ایسے فٹ آئے تھے کہ لگتا تھا اسی کے ہوں۔ یہ آرام دہ جوتے اسے بڑی کامیابی سے لمحہ بہ لمحہ آزادی کے نزدیک لے جا رہے تھے۔ چند قدم مزید چل کر اسے احساس ہوا کہ وہاں کوئی ذی روح موجود نہیں ہے اور شاید یہی وجہ تھی کہ مرنے والا کسی سے مدد طلب کرنے اور

نہیں آیا تھا۔

سے خارج ہونے لگی۔ اس نے صافی کے طور پر استعمال ہونے والا ایک کپڑا اور چولہا جلانے کے لیے استعمال ہونے والا لائٹر اٹھایا اور کچن سے باہر آ گیا۔ گیس اتنی تیزی سے خارج ہو رہی تھی کہ کچن کے باہر بھی اس کی بو محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے لائٹر سے کپڑے میں آگ لگائی اور اسے وہیں کھڑے کھڑے کچن میں اچھال کر خود تیزی سے باہر نکل گیا۔ دروازہ بند کر کے مین گیٹ کی طرف بڑھتے ہوئے اسے یقین تھا کہ اس بند عمارت میں خارج ہوئی گیس آگ کے ساتھ ملنے پر اس پوری عمارت کو خاکستر کیے بغیر نہیں رہے گی۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ رات کے اس پہر آس پاس والوں کو آگ لگنے کی خبر فوری طور پر ہونا مشکل تھا۔ وہ جوں جوں قدم اٹھاتا دور جا رہا تھا، اس کے دل میں اس خیال سے ٹھنڈک پڑتی جا رہی تھی کہ اتنے دنوں کی تکلیف کا اچھا بدلہ اتار کر جا رہا ہے۔

”ناظم آباد چلو گے؟“ کافی آگے جا کر اسے ایک چوک پر ٹیکسی میں ادگھتا ڈرائیور دکھائی دیا تو اس کا شانہ جھنجھوڑ کر اس سے پوچھا۔

”چلوں گا پر کرایہ میٹر سے دو گنا ہو گا۔“ ڈرائیور حلفاً تھا کہ رات کے اس پہر سفر کے خواہشمند کی کوئی مجبوری ہوگی اس لیے منہ پھاڑ کر مطالبہ کیا۔

”بے فکر رہو۔ مجھ سے تمہیں وہ ملے گا جو آج تک کسی نے نہیں دیا ہو گا۔“ وہ پچھلا دروازہ کھول کر نشست پر بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے اندرونی بتی جلائی۔ عقب نما آئینے میں اسے ایک ایسا شخص دکھائی دیا جس کے سر کے بال اچھے ہوئے بے ترتیب تھے اور شیوہ خود رجھاڑیوں کی طرح بے تحاشا بڑھی ہوئی تھی۔ ان دونوں چیزوں کو اس نے نیم تاریکی میں بھی محسوس کیا تھا اور نظر انداز کر گیا تھا لیکن اب روشنی میں ان دونوں چیزوں کے ساتھ ساتھ باذل کے چہرے پر اب بھی کہیں کہیں لکے خون کے داغ اور پوری طرح چھائی دھشت نمایاں ہوئی تھی تو ٹیکسی ڈرائیور نے اپنے اندر خوف کی ایک لہری دوزی محسوس کی تھی۔

”ناظم آباد میں کہاں پہنچاؤں آپ کو؟“ اسے اپنی ٹیکسی سے اتارنے کا کوئی بہانہ ڈھونڈنے کے لیے اس نے سوال داغا۔

”کہیں بھی نہیں۔“ باذل جو اس کے خوف اور تذبذب کو پا چکا تھا، اطمینان سے بولا۔

”کیا مطلب؟“ وہ حیران پریشان ہوا۔

عمارت میں کسی کی بھی غیر موجودگی کا یقین ہو جانے کے باوجود وہ دے قدموں چلتا خارجی راستے کی طرف بڑھا اور دروازہ ذرا سا کھول کر باہر جھانکا۔ باہر کم پادور کا سیورجل رہا تھا اور اس کی روشنی میں گیٹ کے قریب کرسی پر بیٹھا مسخ چوکیدار صاف نظر آ رہا تھا۔ یہ عمارت اس طرز کی بند عمارتوں میں سے تھی جن میں آمد و رفت کے لیے بیرونی گیٹ کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں ہوتا اس لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ چوکیدار سے سامنا کیے بغیر باہر نکل سکے۔ چوکیدار سے نمٹنے کے لیے اس نے دماغ لڑایا اور اپنے ہاتھوں میں موجود بیڑیوں کو زور سے زمین پر پھینکا۔ شور اٹھا تھا کہ گیٹ کے قریب بیٹھے چوکیدار کے کانوں تک بخیر و خوبی پہنچ گیا۔

”کیا کرتا پڑا ہے رو کی استاد؟“ اس نے وہیں سے آواز لگا کر پوچھا۔ رو کی یقیناً اسی شخص کا نام تھا جو تہ خانے میں مردہ حالت میں پڑا تھا اور جس کے جوتے اس کے پیروں کو آسودگی بخشتے تھے۔

”ذرا ادھر آ کر میری مدد تو کر۔“ اس نے کوشش کی کہ اس کے حلق سے رو کی سے ملتی جلتی آواز نکل سکے۔ اس کی کوشش اس لیے بھی کامیابی سے ہمکنار ہوئی کہ باہر بیٹھے چوکیدار کو ایک فیصد بھی وہاں رو کی کے سوا کسی کی موجودگی کا گمان نہیں تھا۔

”آ رہا ہوں استاد!“ اس نے اپنی بندوق وہیں کرسی کے ساتھ ٹکائی اور ڈھیلے ڈھالے انداز میں اندر کی طرف بڑھا۔ باذل دروازے کی آڑ میں اس کا منتظر تھا۔ جیسے ہی چوکیدار نے قدم اندر رکھے، اس کی گردن بھی رو کی کی طرح جکڑی گئی لیکن وہ رو کی کے مقابلے میں زیادہ طاقتور اور جسم تھا۔ آزاد ہونے کے باوجود باذل کو اس کو ٹھنڈا کرنے میں زیادہ جدوجہد کا سامنا کرنا پڑا۔ جب تک وہ شخص بے جان ہو کر زمین پر گرا، خود اس کا دم پھول چکا تھا۔ چند گہری سانسیں لے کر وہ خود کو معمول پر لایا اور اس کی کمر سے بندھے ہوئے لٹری سے ریوالور کھینچ کر اپنی کمر میں اڑس لیا۔ اب وہ یہاں سے جانے کے لیے بالکل آزاد تھا لیکن جب قسمت کی دیوی مہربان تھی تو دشمن کو بھاری زک پہنچائے بغیر ایسے ہی چلے جانے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کے شیطانی دماغ کی منصوبہ ساز فیکٹری سے فوری طور پر ایک منصوبہ برآمد ہوا اور وہ ڈھونڈتا ہوا اس عمارت کے کچن میں پہنچ گیا۔ اگلے لمحے وہ چولہے کی طرف جاتا گیس کا پائپ کھینچ کر نکال چکا تھا۔ پائپ نکلتے ہی گیس ایک شوکتی ہوئی آواز کے ساتھ تیزی

”مطلب یہ کہ میں نے تمہارے ساتھ جانے کا فیصلہ تبدیل کر لیا ہے۔“ اس کا جواب تو ٹیکسی ڈرائیور کے لیے اطمینان بخش تھا لیکن ہونٹوں پر دوڑتی پراسرار مسکراہٹ پریشان کن تھی۔ پریشانی پر خوف اس وقت غالب آیا جب باڈل نے ریوالور نکال کر یکدم ہی اس کی گتھی پر رکھ دیا۔

”اب تم میرے ساتھ نہیں جاؤ گے، صرف تمہاری ٹیکسی جائے گی۔ چلو اتر دینچے۔“

”رحم کرو صاحب! میرے پاس روزگار کا صرف یہی ایک ذریعہ ہے۔“ مجبوری نے خوف کے باوجود اسے منت سماجت پر آمادہ کیا اور اس کے آگے ہاتھ جوڑنے لگا۔

”آج کے بعد تمہیں کمانے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔“ اس کے لہجے کی پراسراریت بڑھتی جا رہی تھی۔

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے صاحب! جینے کے لیے کمانا تو پڑتا ہے۔“ غریب کے لیے اس کی باتیں سمجھنا مشکل تھا۔

”نیچے اتر دو ورنہ گولی مار دوں گا۔“ اس بار وہ اپنے مخصوص انداز میں غرایا۔ ارد گرد اگرچہ سناٹا تھا لیکن بہت دیر تک اس تماشے کو جاری رکھنا پھر بھی مناسب نہیں تھا۔ ڈرائیور بے حد مجبوری کے عالم میں ٹیکسی سے باہر نکلا اور ابھی نکلا ہی تھا کہ زوردار دھماکے کے ساتھ اس کا بھیجاڑ گیا۔

”جینے کے لیے کمانا پڑتا ہے۔ جب جیتا ہی نہیں ہے تو کمانے کا شفا کس لیے؟“

اس نے ریوالور کو واپس اڑسا اور اگلی نشست پر منتقل ہوتے ہوئے انجن اسٹارٹ کر دیا۔ گولی چلنے کی آواز پر متوجہ ہو کر کوئی اس طرف آ کر بے چارے ڈرائیور کی لاش تک پہنچتا، اس سے قبل ہی ٹیکسی کو اس علاقے سے دور نکل جاتا تھا۔

☆☆☆

”پھنس گئے۔ تم سالے سب کے سب چھوہے دان میں پھنس گئے۔ تمہاری ہوشیاری نے خود ہی تمہیں یہاں لا پھنسا یا ہے۔“ وہ پولیس کی گاڑیوں کا سائرن سن کر ابھی کھڑکیوں کی طرف بھاگے ہی تھے کہ بند دروازے کے پیچھے سے ڈی ایس پی ظہیر خان کے چلانے اور تعجب لگانے کی آوازیں آنے لگیں۔

”تم لوگ پوزیشنز سنبھالو لیکن میری طرف سے اشارہ ملنے سے قبل فائر نہ کرنا۔“ معاذ نے ظہیر خان کے الفاظ سنے تھے لیکن فی الحال انہیں نظر انداز کر کے اپنے ساتھیوں کو ہدایت دینے لگا تھا۔ وہ اس وقت ایک حرام خور اور ملک دشمن پولیس والے کے گھر میں موجود تھا لیکن اپنے

ہی ملک کے کسی ادارے کے خلاف گولی چلانے میں جھجک کا شکار تھا۔

”تم کیا ظہیر خان کو تر لوالہ سمجھ کر یہاں دوڑے آئے تھے۔ کیا تم نے سمجھ لیا تھا کہ میرا کوئی پرسان حال نہیں ہے یا میں بے وقوف ہوں جو اپنے دشمنوں کی طرف سے چوکنا نہیں رہوں گا۔ ارے جاہلو! یہاں گاڑیوں سے ہر گھنٹے بعد میرے دفتر کال جاتی ہے کہ یہاں سب ٹھیک ہے۔ کال نہ جائے تو مطلب گڑبڑ ہے۔ تم نے میرے گاڑی زسیت سب کو بے ہوش کرنے کا انتقام کرتے ہوئے سوچا بھی نہیں ہوگا کہ اس سے آگے میرا اپنا انتقام کام کرنا شروع کر دے گا۔“ ظہیر خان جواب تک کسی ڈرے ہوئے چوہے کی طرح گھر کے کونے کھدروں میں چھپتا پھر رہا تھا، اپنے حواریوں کی آمد پر شیر ہو کر بڑکیں مارنے لگا تھا لیکن اس شیر میں اب بھی اتنی اہمیت نہیں تھی کہ دروازہ کھول کر بات کر پاتا۔

”جیمز بند کرواؤ۔“ معاذ نے ایک نظر بند دروازے کی طرف دیکھا اور اپنے پاس موجود اپریش سے حکم صادر کیا۔ موجودہ حالات میں کوئی بھی قدم اٹھانے سے قبل وہ ایک بار لالہ کو آگاہ کرنا ضروری سمجھ رہا تھا۔ اس آپریشن کی اہمیت اور نزاکت کے پیش نظر لالہ اپنی ایک ٹیم کے ساتھ بالکل تیار ایک قریبی ٹھکانے پر موجود تھا تا کہ کسی ایمر جنسی کی صورت میں ان کی مدد کے لیے پہنچ سکے اور وہ ایمر جنسی آگئی تھی اس لیے اس کا لالہ سے رابطہ کرنا ضروری تھا۔

”ہاں پول، کیا مسئلہ ہے؟“ دوسری طرف سے لالہ نے پہلی گھنٹی مکمل ہونے سے بھی پہلے کال ریسیو کر لی اور اس لہجے میں پوچھا کہ جیسے اسے تسلی دے رہا ہو کہ مسئلہ ہے بھی تو کوئی بات نہیں، وہ سارے مسئلے حل کر سکتا ہے۔

”باہر پولیس آگئی ہے اور انہوں نے ہر طرف سے ہمیں گھیر لیا ہے۔“ اس نے باہر سے سنائی دیتے ہوئے زور اور ناچتی روشنیوں کی وحشت کو پرے دھکیلتے پرسکون لہجے میں لالہ کو اطلاع دی۔

”تم لوگ قہم کر رہو۔ میں بس پہنچ رہا ہوں۔“ لالہ نے مختصر ہدایت دے کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ اسی وقت باہر سے لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کیا جانے لگا۔

”تم لوگوں کو خبردار کیا جاتا ہے کہ پولیس نے تمہیں چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ تم لوگ اپنے ہتھیار پیچیک کر اور ہاتھ اٹھا کر باہر آ جاؤ ورنہ دوسری صورت میں پولیس تمہارے خلاف کارروائی کرے گی۔“ پولیس کی آمد سے جو

آواز بلند جواب دیا تو اسے لگا کہ باہر یکدم سناٹا سا چھا گیا ہو۔ ادھر معاذ اور وکی اندر داخل ہو کر ڈی ایس پی کو قابو کر چکے تھے۔
”یہ سب تمہیں بہت مہنگا پڑے گا۔“ وہ دھمکیوں پر اتر آیا۔

”ہم سے زیادہ تمہاری پوزیشن نازک ہے ظہیر خان! تم ہماری فکر نہ کرو۔ ہم تو نکلے ہی مرنے یا مار دینے کا سوچ کر ہیں لیکن تم اپنے بیوی بچوں کا سوچو جو تمہاری حرکتوں کی وجہ سے آج اپنے گھر کی چار دیواری میں محفوظ نہیں۔“

”ہاتھ مت لگانا میرے بیوی بچوں کو۔ ان کا اس ساری لڑائی سے کوئی تعلق نہیں۔“ معاذ کی جوابی دھمکی ایسی نہیں تھی کہ ظہیر خان خود کو پُر سکون رکھ سکتا۔

”عورتوں اور بچوں کا عموماً لڑائی سے تعلق نہیں ہوتا لیکن یہ ہم مرد ہی ہوتے ہیں جو انہیں اپنی لڑائی میں گھسیٹ لاتے ہیں۔ اب تم خود کو ہی دیکھ لو۔ ایک معصوم بچے کو اس کے گھر کی امان سے نکال کر اپنے قبضے میں لے لیا ہے اور چاہتے ہو کہ تمہارے بچوں کو کوئی کچھ نہ کہے۔“

”کون بچہ.....؟ میرے پاس کوئی بچہ نہیں ہے۔“ اس نے ڈھٹائی کا مظاہرہ کیا۔

”سائیکس صداقت شاہ کے نواسے اعظم شاہ کو بھول گئے ہو ڈی ایس پی؟“ معاذ نے اس کی ٹھوڑی پر پھسل کی نال کا دباؤ ڈالا۔

”وہ میرے پاس نہیں ہے۔ میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“

”کیا یہ بھی نہیں جانتے کہ اسے کس کے حوالے کیا تھا؟“ اندر ڈی ایس پی ظہیر خان سے یہ گفتگو جاری تھی تو باہر پولیس والوں کے ساتھ بھی کشمکش چل رہی تھی۔ کچھ پولیس والوں نے کوشش کی تھی کہ چوڑی جیسے مکان کے اندر داخل ہو سکیں لیکن وہ جس طرف سے آگے بڑھتے تھے، وہاں قریب میں کوئی گولی آ کر گرتے ہوئے انہیں باور کروا دیتی تھی کہ اندر محصور ہو جانے والے پوری طرح چوکنے ہیں اور گھر جانے کے باوجود اتنے بے بس نہیں ہوئے ہیں کہ خود تک انہیں آسانی سے رسائی دے دیں۔

”بولو، کس کے حوالے کیا ہے اعظم کو؟“ وہ اس ایک سوال کے جواب کے حصول کے لیے جنونی ہو رہا تھا کہ ہرگز رتادن سہل کی زندگی کی مہلت کو مختصر کرتا جا رہا تھا اور وہ ہر صورت مرنے سے قبل اسے اس کے بیٹے کی شکل دکھانا چاہتا تھا۔

ہلچل مچی تھی، اس نے آس پاس کے مکینوں کو بھی نیند سے جگا دیا تھا جس کے باعث کئی گھروں کی بتیاں روشن ہونے لگی تھیں۔ یہ روشنیاں ظہیر خان کے تاریک گھر کو تو روشن نہیں کر سکتی تھیں لیکن باہر موجود پولیس والوں کی حرکات و سکنات نظر میں آنے لگی تھیں۔

”تم لوگ کیسے ہو؟“ معاذ کو اپنے ان دو ساتھیوں کی فکر ہوئی جنہیں وہ سوسائٹی کی چیک پوسٹ پر چھوڑ آیا تھا چنانچہ ان سے رابطہ کر کے ان کا احوال جاننے کی کوشش کی۔
”ہم ایک قریبی گھر میں گھس گئے ہیں اور اس کے لان میں پناہ لیے ہوئے ہیں۔ ہمارے لیے کوئی حکم ہے تو بتائیں۔“ وہاں سے نکلنے والا جواب اطمینان بخش تھا۔

”فی الحال انتظار کرو۔“ انہیں ہدایت دے کر اس نے ایک بار پھر اس بند دروازے پر نگاہ ڈالی جس کے پیچھے خود کو محفوظ تصور کرتا ظہیر خان مسلسل کچھ نہ کچھ بکواس کیے جا رہا تھا۔

”وکی!“ اس نے کچھ سوچتے ہوئے وکی کو پکارا اور اس کے قریب آنے پر اسے سرگوشی میں کچھ ہدایات دیں۔ اگلے لمحے اس نے جو کیا، وہ اندر بند ڈی ایس پی اور باہر موجود پولیس والوں دونوں کے لیے ایک شاک تھا۔ گولیوں کی تڑخاہٹ نے صرف لاک نہیں توڑا تھا، کل دو فریقین کو لرزا کر بھی رکھ دیا تھا۔ ڈی ایس پی کی طرف سے تو فوری رد عمل بھی آیا اور اس نے خود جواباً ایک ساتھ کئی فائر جھونک دیے لیکن وہ لوگ اس کے لیے تیار تھے۔ ان کی طرف سے جواباً اس نے بھی زیادہ شدید فائرنگ کی گئی۔ اس فائرنگ کا مقصد ظہیر خان کو ہلاک یا زخمی کرنا نہیں، بلکہ محدود کرنا تھا۔ وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب رہے۔ اس کا ثبوت یہ تھا کہ ظہیر خان کی طرف سے کوئی رد عمل نہیں آیا۔ یقیناً وہ خود کو کسی اندھی گولی کا شکار ہونے سے بچانے کے لیے کہیں کونے کھدے میں دبک گیا تھا۔ اس موقع کا فائدہ اٹھا کر معاذ کمرے میں داخل ہونے میں کامیاب رہا تھا جبکہ وکی مسلسل اسے کور دے رہا تھا۔

”اندر کیا ہو رہا ہے؟ اگر کسی بھی شخص کو کوئی نقصان پہنچا تو تم لوگوں کو اس کا سخت خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔“ پولیس پارٹی کا لیڈر فائرنگ کی آوازوں سے گھبرا کر انہیں دھمکیاں دے رہا تھا۔

”اگر پولیس ایک انچ بھی آگے بڑھی تو ڈی ایس پی اور اس کی فیملی کے افراد کی لاشیں ایک ایک کر کے تمہارے سامنے ڈھیر کر دی جائیں گی۔“ اس اعلان کا جارو نے بہ

”میرے ساتھ یہ سلوک کر کے تم کچھ حاصل نہیں کر پاؤ گے۔ جلد یا بدیر پولیس اندر آ جائے گی اور تم سب کے سب یا تو مارے جاؤ گے یا زندگی بھر کے لیے جیل کی سلاخوں کے پیچھے سڑو گے۔“ اپنے جڑے پر پے در پے اس کے کئی مکے کھانے کے بعد بھی ظہیر خان میں اتنا زعم تھا کہ انہیں دھمکیاں دے رہا تھا۔

”یہ ایسے نہیں مانے گا۔ میں اس کے بیٹے کو لے کر آتا ہوں۔ اس کے سامنے بیٹھ کر اس کے بیٹے کا ایک ایک ریشہ الگ کریں گے تو یہ خود ہی اپنی زبان کھولنے پر مجبور ہو جائے گا۔“ اب تک خاموش وکی نے بھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا تو ظہیر خان کی رنگت زرد پڑ گئی اور وکی کے کمرے سے باہر نکلنے سے قبل ہی اس نے ہتھیار ڈال دیے۔

”مجھے اس کام کے لیے عرفان اللہ نے کہا تھا اور میں نے بچہ اسی کے حوالے کیا ہے۔“

”اس نے بچے کا کیا کیا؟“

”میں نہیں جانتا۔ میری اتنی حیثیت نہیں کہ ایسے سوال جواب کر سکوں۔“

”جتنا پروٹوکول تمہیں ملا ہوا ہے، اسے دیکھ کر تو تمہاری حیثیت کے بہت اونچا ہونے کا اندازہ ہو رہا ہے۔ اتنی تام جھام سے کوئی عام ڈی ایس پی تو نہیں رہ سکتا۔“ معاذ نے اس کا جواب سن کر طنز کیا۔

”میری جتنی دشمنیاں ہیں اس کے حساب سے سیکورٹی کا تھوڑا انتظام کرنا پڑتا ہے لیکن آج کل تم لوگوں کے چکر میں اسپیشلی زیادہ انتظام کیا گیا ہے۔ یہ ہر کھٹے بعد کال والا سلسلہ بھی حال ہی میں شروع ہوا ہے۔“ وہ یقیناً کمزور شخصیت کا مالک تھا جو بتانے پر آیا تو پھر سب کچھ ہی بتاتا چلا گیا تھا۔ ایسے لوگ دوسروں پر ظلم کرنے میں بہت آگے ہوتے ہیں لیکن جب خود پر اور اپنے اہل خانہ پر بات آتی ہے تو ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔

”یعنی تم لوگوں کو اندازہ تھا کہ ہم یہاں آئیں گے؟“

”بالکل، ویسے ہی جیسے یہ معلوم تھا کہ نیلی، معمر کی قبر پر ضرور آئے گی اور اس کے ساتھ تم میں سے کوئی نہ کوئی ضرور ہوگا۔“

”ہاں گھات لگا کر بیٹھنے کا فائدہ تو نہیں حاصل کر سکے تھے تم لوگ۔“

”ہاں، میں مانتا ہوں کہ تم ہم سے زیادہ اسرار ثابت ہوئے تھے لیکن دیکھو ایک بار پھر تم جال میں آ پھنسے ہو۔ سمجھنے والے سمجھتے تھے کہ اعظم تک پہنچنے کے لیے میں ہی

تمہارے پاس واحد ذریعہ ہوں اس لیے تم میرے پیچھے ضرور آؤ گے اور تم آ گئے۔ اب یہ سوچو کہ باہر اتنی فورس کے ہوتے ہوئے تم یہاں سے نکلو گے کیسے؟ آخر کار اونٹ پہاڑ کے نیچے آ ہی گیا ہے۔“ اسے ایک اطمینان سا تھا کہ وہ لوگ کچھ بھی کر لیں، آخر کار پکڑے جائیں گے۔

”تم باقی لوگوں کی طرح بے ہوش کیوں نہیں ہوئے تھے؟“ باہر سے وقفے وقفے سے آوازیں آرہی تھیں جن سے اندازہ ہو رہا تھا کہ جارو اینڈ کمپنی پولیس والوں کی دھمکیوں اور اعلانات کے جواب میں مناسب رد عمل دے رہے ہیں اور انہوں نے ابھی تک پولیس کو ایسا کوئی موقع فراہم نہیں کیا ہے کہ وہ اندر تک رسائی حاصل کر سکے۔ اس طرف سے اطمینان ہونے کے باعث وہ آرام سے ظہیر خان سے سوال جواب کر رہا تھا۔

”دیے تو مجھے اس اتفاق نے بچایا کہ میں ایک فائل کی اسٹیڈی میں مصروف ہونے کی وجہ سے خود کو سرو کی جانے والی کافی پینا بھول گیا اور کافی یونہی رکھی رکھی ٹھنڈی ہو گئی۔ کافی دیر بعد میں نے دوسری کافی کے لیے انٹرکام پر کچن سے رابطہ کرنا چاہا تو وہاں سے کسی نے جواب نہیں دیا۔ میں کچھ غصے میں اپنی اسٹیڈی سے باہر نکلا تو مجھ پر انکشاف ہوا کہ اس وقت پورے گھر میں صرف میں ہوں جو اپنے ہوش و حواس میں ہوں اور باقی سارے لوگ بے ہوش پڑے ہیں۔ قدرتی طور پر میں نے سب سے پہلے فون پر مدد کے لیے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن نہ لینڈ لائن نمبر کام کر رہا تھا اور نہ ہی مجھ سمیت کسی کا موبائل فون۔ میں گھر سے باہر نکل پاتا اس سے قبل بجلی بھی منقطع کر دی گئی اور مجھے اندازہ ہو گیا کہ گھر کے باہر کچھ لوگ موجود ہیں جو گھر میں گھسنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کے بعد میں نے جو کچھ کیا، وہ تم لوگ جانتے ہی ہو۔“ اس نے ایک سوال کے جواب میں پوری کہانی سنا ڈالی۔

”تم نے کہا ویسے تو..... اس دیے تو کا کیا مطلب ہے؟“ معاذ نے اپنے ذہن میں اس کے انک جانے والے الفاظ کا مطلب پوچھا۔ یوں بھی لالہ کی طرف سے کوئی پیغام آنے تک ان کے پاس وقت تھا اور اس وقت کو سوال جواب میں گزارا جاسکتا تھا۔

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نوجوان
کس داستان جو غلط کاروں کے لیے غضب
ناک تھا باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیے



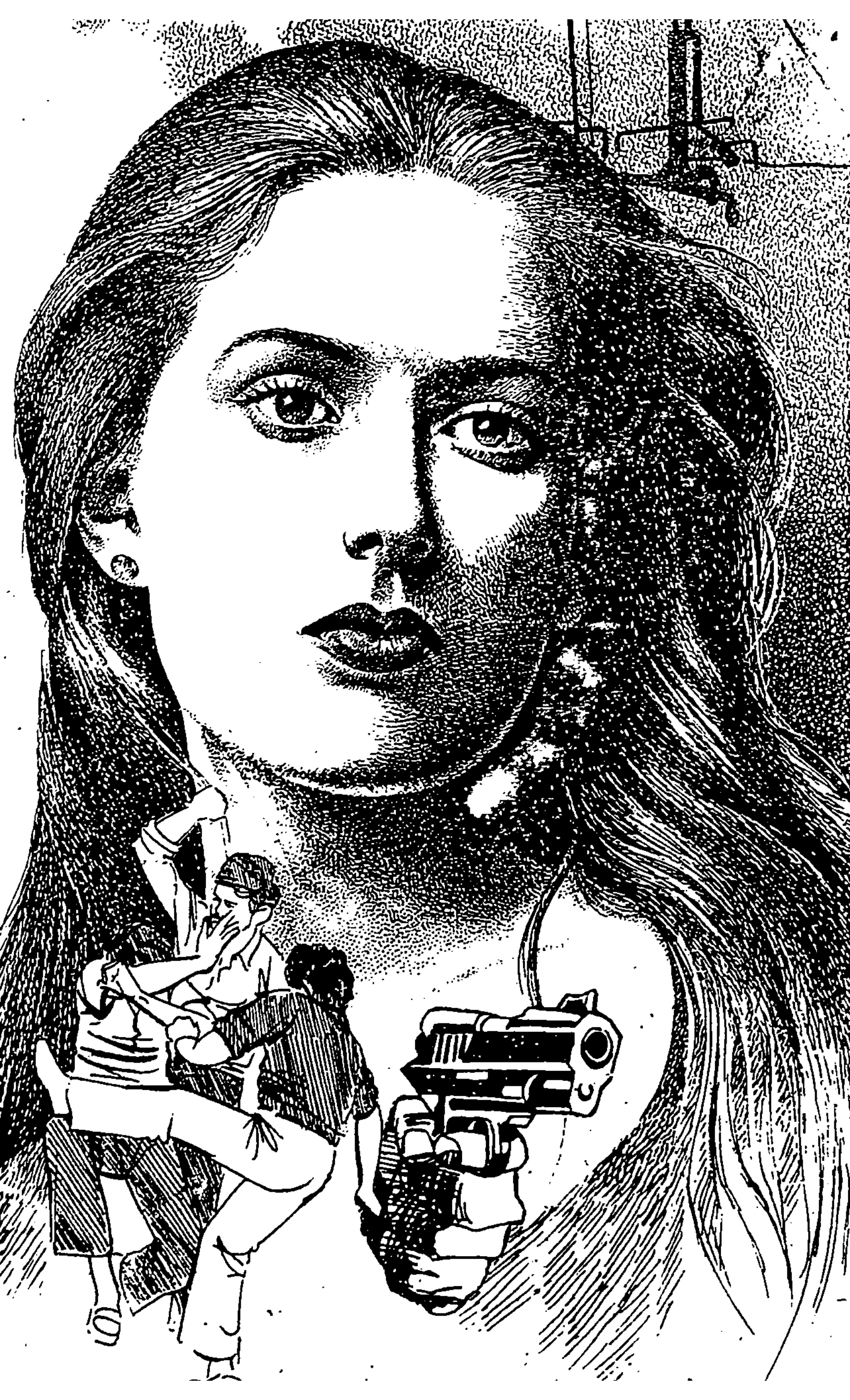
قسط نمبر: 41

سب سے بڑا راز

اسماء قادری

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تندوتیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابل شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پُر عزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جارہے تھے... اس کی زندگی جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قراریوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تار عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ وارداتِ قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہو سکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نو جوان کی خیر انگیز داستان



معاذ ایک ذہین لیکن مستون مزاج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹس سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جمائے کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ انسٹی ٹیوٹ سے واپس آ رہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو سڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی بڑی فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشری نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بشری ماس کمیونی کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم وغیرہ لکھتی ہے۔ اس دوران جگہ جگہ وہ ایک زیر تعمیر رہائشی منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی آئی تھی۔ معاذ بشری کو بہ حفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کر دیتا ہے لیکن جن رئیس زادوں نے اس نے ان کا شکار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ایک دن جنگل کی سیر کے دوران وہ فوٹو گرافی کے شوق میں سب سے الگ تھلک ہو جانے والے معاذ کو بے خبری میں گھر کر رہی طرح زد و کوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دے دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس نہ آنے پر انتظامیہ کے افراد، پولیس اور ریسکیو ذرائع کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جگہ کی جمو پڑی میں پاتا ہے۔ جوگی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے، جوگی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نواز کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے پراسرار علم سکھانے کی ہائی بھر لیتا ہے اور معاذ اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ادھر جائے وقوعہ سے ملنے والے معاذ کے گھر سے جب تصویریں نکلوا لی جاتی ہیں تو ایک ایسی تصویر بشری کی نظر میں آ جاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پروجیکٹ کے فیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشری تحقیق کر رہی تھی۔ بشری کے اپنے والد جرمنٹ ہوتے ہیں اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے اس کی پاداش میں بشری کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ مدد سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باذل نامی فنڈے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشری انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دنوں میں ہی معاذ واپسی کا ارادہ کرتا ہے تاہم ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا عرفان اللہ اور یزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو دو قاص نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باذل اچانک بشری کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر دیتا ہے۔ معاذ کو واپس لانے کے لیے اچھے جھکندے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اسے واپس آنے کا پیغام دیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کر کے اسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات کے بندہ بتانے پر اس کے بھائی کا ایک گروہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشری بھی سونیائے خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہو جاتی ہے۔ معاذ کے دوست عالم شاہ کے بہنوئی کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ کئی فنون میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے پتانا کر کے اس کے دماغ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ لیفٹو سے حاصل انوکھے علم کی بدولت ان کا معمول نہیں بنتا۔ عالم شاہ اور اس کا نوکر سرد، باذل کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ عالم کی بہن کل شاہ کے نو مولود بیٹے کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اغوا کا الزام لطیف سومرو پر آتا ہے۔ عالم شاہ، باذل کی قید میں موجود ایک زخمی شخص کی مدد سے وہاں سے فرار ہو جاتا ہے۔ ادھر بشری بھی پہنچ جاتی ہے۔ وہاں دو قاص اسے باری کے روپ میں پہچان لیتا ہے۔ وہ سلطان کو مارنا چاہتی ہے تاہم دو قاص اسے ایسا کرنے سے روکتا ہے۔ ادھر عالم شاہ، باذل کی قید سے نکل کر اس کا پیچھا کرتا ہے۔ وہ وہاں معاذ کو دیکھتا ہے۔ صداقت شاہ، لطیف سومرو کو گھیرنے کے لیے اس کی خفیہ بیوی اور بچے کا کھوج لگاتے ہیں اور بچے کو اغوا کر لیتے ہیں۔ لطیف سومرو مجبور ہو جاتا ہے۔ معاذ کو اس کے گھر والوں سے ملنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ وہ ایک مشن پر سونیا کے ساتھ انڈیا روانہ ہوتا ہے تاہم کچھ لوگ سکھ یا تریوں سے بھری بس کو یرغمال بنا لیتے ہیں۔ معاذ اور سونیائے خانے کے تمام افراد کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔ عالم شاہ، کل اور سرد انڈیا روانہ ہو جاتے ہیں۔ ان رپورٹ سے گھر روگلی پر راستے میں کچھ ٹھیرے انہیں لوٹ لیتے ہیں۔ گھر پہنچنے پر پولیس کی ریڈ ہوتی ہے اور وہ عالم شاہ اور سرد کو لے جاتے ہیں۔ ادھر بشری اور دو قاص باذل کو ہسپتال میں مارنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ بچ جاتا ہے۔ معاذ اور سونیائے خان سہولت کاروں سے مل جاتے ہیں۔ عالم شاہ اور سرد کو تشدد کا نشانہ بنا کر ویرانے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ واپس اپنے میزبانوں کے ہاں پہنچ جاتے ہیں۔ انہیں پتا لگتا ہے کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں اجالا اور اس کا عاشق شامل ہوتے ہیں۔ وہ چھپ کر ان کی باتیں سن رہا ہوتا ہے کہ اسے چھاپ لیا جاتا ہے۔ تاہم وہاں مارا ماری ہوتی ہے اور اجالا کا عاشق مارا جاتا ہے۔ پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ ان کے کزن انہیں اپنے دوسرے خفیہ ہنگامے پر پہنچا دیتے ہیں۔ وہ وہاں سے بحفاظت نکل جاتے ہیں۔ ادھر معاذ کو سونیائے خان کے ساتھ نئے مشن پر لے کر جاتی ہے جس میں ایک ریلوے لائن کو دھماکے سے اڑانا ہوتا ہے۔ معاذ ایسا نہیں چاہتا اس لیے وہ ٹرین کی آمد سے قبل بارودی دھماکا کر دیتا ہے۔ وہ زخمی ہو جاتا ہے اور اسے ہندو سادھو اپنی کنیا میں لے جاتا ہے جہاں اس کی اچھی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ سونیائے خان کے آدنی معاذ کو تلاش کرتے ہیں مگر ناکام ہو جاتے ہیں۔ ادھر عالم شاہ اور سرد خفیہ ذریعے سے بارڈر پار

کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ دھریے جاتے ہیں اور "را" کی قید میں پہنچ جاتے ہیں۔ ادھر بشری ہاؤس کو مارنے کی کوشش میں خود نشانہ بن جاتی ہے۔ معاذ ساہوکی مدد سے ایک انٹرین ہیرون کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ وہیں اسے عالم اور سرد کی گرفتاری کا پتا چلتا ہے۔ معاذ ڈاکٹر فردوس سے ملتا ہے اور اسے کھل کی مدد کرنے کا کہتا ہے۔ علیہ اور وقاص وغیرہ کو لالہ میمنی ملک سے باہر نکال دیتا ہے اور ہر ممکن احتیاط کی ہدایت کرتا ہے۔ لیکن علیہ پاکستان میں ٹوبہ سے رابطہ کرتی ہے جہاں کے لیے مصیبت بن جاتا ہے۔ ٹوبہ پر تیزاب پھینک دیا جاتا ہے۔ وقاص علیہ اور اس کے گھر والوں کو مار دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس معاذ کو دیوانی شخص سے مدد لینے کا کہتی ہے۔ معاذ اپنے کزن کو پاکستان کال کرتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ اس کے گھر والوں کو مار دیا گیا ہے۔ وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کی ٹھان لیتا ہے۔ ادھر ڈاکٹر فردوس کو اس کے سرسرا ل والے ٹکڑے کو ہانکے کی پاداش میں تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ معاذ، عالم اور سرد کی رہائی کے لیے کارروائی کرتا ہے اور انہیں "را" کی قید سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ لیکن عالم اور سرد کو دیو کے آدمی کی دھمکی جگہ پہنچا دیتے ہیں۔ سونیا معاذ کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ ادھر ہاڈل ایک جگہ لالہ میمنی کی موجودگی پر کارروائی کرتا ہے تاہم لالہ خود کو گولی مار کر ختم کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس کا انتقال ہو جاتا ہے۔ دیو ایکٹ ڈاکٹر فردوس کی میت اٹھنے پر وہاں فائرنگ کر دیتے ہیں۔ پولیس دیو کو گھیر لیتی ہے۔ معاذ دیو اور اس کے آدمیوں کو نکالنے کے عوض عالم کا پتا معلوم کر لیتا ہے۔ سونیا اور معاذ حیدر آباد لوہا بدرالدین کی حویلی پہنچ جاتے ہیں۔ تاہم کالے خان اور راجا دیو کی کمیزم ایکس کے فکٹے سے چھڑانے کے لیے انہیں والہس آنا پڑتا ہے، کالے خان کو ٹکڑے کر دیا جاتا ہے۔ معاذ لوہا صاحب کی حویلی میں عالم اور سرد کی رہائی کے لیے کارروائی کر کے انہیں رہا کر لیتا ہے۔ وہ لوگ نئے ٹھکانے پر پہنچے ہیں تو وہاں معاذ سے ملنے جا رہی تھی۔ آج اسے معاذ نے "را" کی قید سے نکالا ہوتا ہے۔ جاو اور معاذ، مکمل سمیت اسپتال جاتے ہیں اور پہچان لینے جانے پر پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ پولیس سے مقابلے کے بعد وہ ایک بستی میں پناہ کے لیے گھس جاتے ہیں اور دو لوگوں کو یرغمال بنا کر ان کی جھونپڑی میں قیام کرتے ہیں۔ ادھر سونیا معاذ کی تلاش میں نکلتی ہے اور اسے بستی میں پہنچنے پر معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ معاذ اور جاو وغیرہ لوہا صاحب کیساتھ اس کے مالک کے بنگلے میں قیام کرتے ہیں۔ سونیا بھی معلومات حاصل کرتی ہوئی مذکورہ بنگلے تک پہنچ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور سرد بھی سونیا کا پیچھا کرتے ہوئے وہیں پہنچ جاتے ہیں۔ ادھر وقاص علیہ و دیگر نوک زندہ ہوتے ہیں۔ وقاص علیہ بدل کر لوکا ہاڈی گاڑ جاتا ہے۔ وہ معاذ کی تلاش کرنے کے لیے انڈیا بارادہ ہوتا ہے۔ وہاں اس کی گل خان سے ملاقات ہوتی ہے اور معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ سونیا معاذ اور دیگر ساتھیوں سے مل جاتی ہے تاہم وہ جس بنگلے میں ہوتے ہیں وہ دشمن کا ہوتا ہے۔ دشمن سب کو بے ہوش کر کے کھینچ لے جا رہے ہوتے ہیں کہ ان کی گاڑی کو حادثہ پیش آ جاتا ہے۔ ان سب کو چینی بکشتو طبعی امداد دیتے ہیں اور ان سے پوچھ گچھ کی جاتی ہے۔ مکمل کی حالت تشویشناک ہوتی ہے اور اسے وہاں موجود ایک ویدک کھتا ہے۔ ادھر لالہ والہس اپنے لوگوں میں پہنچ کر ایکشن میں آ جاتا ہے اور حادثہ کو ختم کر دیتا ہے۔ لالہ میمنی ایکس کے ٹھکانے کی نگرانی کر دیتا ہے۔ ہاڈل، معاذ وغیرہ کے ٹھکانے سے باخبر ہو جاتا ہے۔ ادھر لالہ کے آدمی میڈم ایکس کی نگرانی کے حکم میں مارے جاتے ہیں۔ لالہ اپنے آدمیوں کو انڈیا رگراؤنڈ کر دیتا ہے۔ معاذ وغیرہ جہاں ہوتے ہیں وہاں دشمن حملہ کر دیتا ہے اور کافی ماماری ہوتی ہے۔ ہاڈل، معاذ کا پیچھا کرتا ہے اور چینیوں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ معاذ چینیوں کے ساتھ مل کر دشمنوں کے خلاف کارروائی کرتا ہے۔ اس دوران اسے گل خان نظر آتا ہے۔ اسے ہتھکڑیاں لگا کر لالہ والہس کی گرفت میں لے لیتے ہیں اور اسی سے معلومات لیتے ہیں۔ ادھر لالہ میمنی، اعظم کو دشمن کی گرفت سے نکالنے کے لیے کارروائی کر دیتا ہے اور موسیٰ اور نیلی، اعظم کو نکالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ معاذ دشمنوں کے کیمپ پر حملہ کر کے وہاں قبضہ کر لیتا ہے۔ موسیٰ اور نیلی کی گاڑی پر حملہ ہوتا ہے تاہم ماماری کے بعد وہ صدقات شاہ کے پاس پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ لالہ میمنی صدقات شاہ کو حویلی پر ریڈ کاہتا ہے۔ صدقات شاہ اعظم کے محفوظ ٹھکانے کے لیے قربان شاہ کو فون کرتے ہیں۔ اعظم کو وہاں سے نکال لیا جاتا ہے اور دوسری جگہ نقل کر دیا جاتا ہے۔ ادھر معاذ بیجنگ پہنچ جاتا ہے اور وہاں کے کرتا دھرتاؤں سے بات کر کے پاکستان پہنچنے کی اجازت چاہتا ہے۔ ادھر موسیٰ اور نیلی کو پولیس گھیر لیتی ہے اور فائرنگ میں موسیٰ مارا جاتا ہے۔ وہ اعظم کو لے جاتے ہیں اور نیلی زخمی حالت میں ان کے قبضے میں آ جاتی ہے۔ معاذ اور دیو وغیرہ پاکستان پہنچ جاتے ہیں اور اعظم کی بازیابی کے لیے کارروائی کے لیے منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ دیو، نیلی کو موسیٰ کا آخری دیدار کرتا ہے اور بے قابو ہونے پر اسے سکون آو اور انکشن لگا دیا جاتا ہے۔ موسیٰ کی تدفین ہو جاتی ہے۔ دیو، نیلی کو قبرستان لے کر جاتا ہے تاہم وہاں کچھ لوگ حملہ کر دیتے ہیں لیکن لالہ کے آدمی انہیں بچا لیتے ہیں۔ ادھر ہاڈل، لالہ کی قید سے بھاگ جاتا ہے۔ معاذ، ڈی ایس پی ظہیر کے بنگلے پر حاد اہوتا ہے اور ڈی ایس پی کو قابو کرنے کے بعد اس سے معلومات لیتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

نشہ آور کالی ٹھنڈی ہو جانے کے بعد گرم کالی کے لیے ملازمین کو بلانے کے باوجود جب کوئی نہ آیا تو ڈی ایس پی خود باہر نکل آیا اور تمام لوگوں کو بے ہوش پا کر معالے کی سینی کا احساس ہوتے ہی وہ ہوشیار ہو گیا تھا مگر معاذ کی پھرتی اور

بروقت کارروائی نے ڈی ایس پی کو بالآخر قابو کر ہی لیا جس کے بعد معاذ کے سامنے اس کی ساری ہوشیا ریاں ڈھیر ہو گئیں اور اس نے فر فر تمام حقیقت اگل دی لیکن معاذ کا دماغ اس کے ایک جملے پر انک گیا جس کی تشریح ضروری تھی۔ ڈی ایس

پی نے کہا تھا۔ ”ویسے تو مجھے اس اتفاق نے بچایا تھا کہ میں وہ کافی پیٹا بھول گیا تھا۔“ اور جب معاذ نے اس ”ویسے تو.....“ کا مطلب پوچھا تو اس نے بھی تفصیل بتانے میں کوئی عار محسوس نہیں کیا۔

”میرے ملازمین میری اس عادت سے واقف نہیں ہیں لیکن میں نے یہ اصول بتا رکھا ہے کہ جب بھی مجھے سب سے الگ کوئی کھانے پینے کی چیز دی جائے تو میں اس چیز کو اپنے پالتو طوطے یا بلی کو چکھا کر یہ اطمینان ضرور کرتا ہوں کہ اس میں کچھ ملایا تو نہیں گیا ہے۔ میں دشمن دار آدمی ہوں مسٹر! مجھے زندگی احتیاط سے گزارنے کی عادت ہے۔“

”کتنی مجبور زندگی ہے تمہاری۔ ہر لمحہ موت کے ڈر کے ساتھ جیتے ہو۔“ اس نے اپنی عادت کو بہت فخر سے بیان کیا تھا لیکن معاذ نے کچھ ایسے انداز میں اس پر تبصرہ کیا جیسے اس کی ایسی زندگی پر طنز اور اسوس کر رہا ہو۔

”موت تو سب ہی کو آتی ہے۔“ اسے معاذ کا انداز برا لگا۔

”یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ موت تو سب کو آتی ہے لیکن اس کے آنے کے ڈر سے یوں نفسیاتی مریض بن کر جینے والا شخص وہی ہوتا ہے جس کا اعمال نامہ سیاہیوں سے بھرا پڑا ہو۔“ اس نے ایسا جواب دیا کہ ظہیر خان کا منہ ہی بند ہو گیا۔ اسی اثنا میں لالہ کی کال آنے لگی۔

”ہم یہاں پہنچ کر پوزیشن سنجال چکے ہیں۔ اب تم پولیس سے باقاعدہ بات چیت کا آغاز کرو اور انہیں سمجھاؤ کہ اگر انہوں نے تم لوگوں کو محفوظ راستہ نہیں دیا تو ڈی ایس پی اور اس کی فیملی کے ساتھ ساتھ خود پولیس کا اپنا بہت نقصان ہو جائے گا۔“ کوشش کرنا کہ معاملات بہت تیزی سے طے پائیں۔ دیر ہونے کی صورت میں انہیں مزید فورس جمع کرنے کا موقع مل جائے گا اور اگر وہ تم لوگوں کی گرفتاری کے لیے ڈی ایس پی کی قربانی دیئے کے لیے تیار ہو گئے تو ہمارے لیے مقابلہ بہت مشکل ہو جائے گا کیونکہ بہر حال ہم ریاست کے ایک ادارے کی بھرپور طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔“ لالہ کے لہجے کی کبھیر تانے اس کے وجود میں سنسناہٹ پیدا کر دی۔ اس بات کا واقعی امکان تھا کہ جو قوتیں ان کے پیچھے تھیں، وہ اپنی مطلب براری کے لیے ایک ڈی ایس پی کی قربانی دینے کو زیادہ اہم نہ سمجھیں۔

”تمہارا موبائل کہاں ہے؟“ لالہ کی کال سے قارغ ہو کر اس نے ظہیر خان سے سوال کیا۔

”وہیں اسٹڈی میں پڑا ہوگا۔ کام نہیں کر رہا تھا اس لیے میں اسے وہیں چھوڑ کر آیا تھا۔“

”میں لے کر آتا ہوں۔“ ادھر ظہیر خان کے منہ سے جواب نکلا، ادھر وہی اس کا موبائل لینے کے لیے دوڑا۔

”اس پر تو بہت ساری مسڈ کالز آئی ہوئی ہیں۔ کچھ دیر پہلے بھی انسپکٹر ثاقب کے نام سے محفوظ ایک نمبر سے کئی کالز کی گئی ہیں۔“ وہی موبائل کا جائزہ لیتا ہوا ہی واپس آیا تھا اس لیے آنے کے ساتھ اسے بتانے لگا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے ظہیر خان کی طرف دیکھا۔

”انسپکٹر ثاقب میرا وفادار ماتحت ہے۔ اس نے صورت حال جاننے کے لیے مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی ہوگی۔“ اس نے شرافت سے جواب دیا۔ شاید وہ یہ بات سمجھ گیا تھا کہ وہ لوگ اس سے اپنے ہر سوال کا جواب ضرور لیں گے اس لیے اس کے حق میں یہی بہتر ہے کہ جتنا ممکن ہو، انہیں ان کے سوالوں کے جواب دے دیے جائیں۔

”اسے باقاعدہ دو، پھر ہم اس کے اس وفادار سے بات کرتے ہیں۔“ معاذ نے دکی کو حکم دیا اور خود ڈی ایس پی کے موبائل سے ہی انسپکٹر ثاقب کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

”آپ کہاں ہیں سر! آپ ٹھیک تو ہیں؟ میں اتنی دیر سے آپ سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن آپ میری کال اٹھائی نہیں رہے تھے۔“ دوسری طرف سے پہلی ٹھنٹی پر ہی کال ریسیو کر لی گئی اور پھر بنا کچھ سنے تیز گام چھٹی رفتار سے بیک وقت سوالات و شکایات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

”بات کچھ یوں ہے بیٹا جی کہ تمہارے سر جی ہماری خاطر مدارات میں مصروف تھے اور ان کے پاس بالکل بھی وقت نہیں تھا کہ تم جیسے چھوٹے موٹے افسر سے بات کر کے اسے ضائع کیا جائے۔ اس لیے انہوں نے تمہاری کال ریسیو نہیں کی۔“

”کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو؟ ڈی ایس پی صاحب کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے تم نے؟“ اسے جیسے ہی یہ پتا چلا کہ لائن پر اس کے افسر کے بجائے ان میں سے کوئی ہے جنہوں نے اس کے افسر کے لیے نازک صورت حال پیدا کر رکھی ہے، اس کی ٹون بدل گئی اور عاجزی و لگرمندی کی جگہ غصے نے لے لی۔

”تم سے تو ہم کچھ نہیں چاہتے البتہ اگر تم اپنے پاس اور اس کی فیملی کو سلامت دیکھنا چاہتے ہو تو ہماری راہ میں آنے کی غلطی کیے بغیر ہمیں یہاں سے جانے دو۔“ معاذ نے فوراً ہی اپنا مطالبہ پیش کیا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ہم تم جیسے خطرناک مجرموں کو اتنی آسانی سے فرار ہونے کی اجازت کیسے دے سکتے ہیں۔ ایسی کسی حماقت کے بارے میں سوچو بھی نہیں اور خود کو قانون کے حوالے کر دو۔“ اس نے دھونس جمانے کی کوشش کی۔

”دوسرے الفاظ میں تم یہ کہہ رہے ہو کہ تمہیں ڈی ایس پی ظہیر خان اور اس کی فیلڈ کی کوئی پروا نہیں ہے اور تم ان کے سروں کی قیمت پر ہماری گرفتاری چاہتے ہو۔“

”میں نے ایسا کب کہا؟“ جہاں وہ معاذ کی بات پر بوکھلایا، وہیں ظہیر خان کے چہرے پر بھی تاریک سا سایہ لہرا گیا۔ ”جب تم نے میری اس بات پر غور نہیں کیا کہ اگر تم ان سب کی سلامتی چاہتے ہو تو ہمیں یہاں سے نکلنے کا راستہ دے دو تو اس کا یہی مطلب نکلتا ہے کہ تمہیں ان کی زندگیوں سے کوئی غرض نہیں ہے۔“ وہ جان بوجھ کر ایسے الفاظ استعمال کر رہا تھا جن سے ظہیر خان کو دھچکا لگے اور وہ سمجھ سکے کہ اس کھیل میں اس جیسے مہرے کی کیا حیثیت ہے۔

”تم ذرا صبر سے کام لو۔ میں اوپر کسی سے رابطہ کر کے صورت حال بتاتا ہوں اور پھر تمہیں جواب دیتا ہوں۔“ اس نے وقت حاصل کرنے کے بہانے گھڑنا شروع کر دیے تھے ورنہ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ اب تک اوپر والوں کو اس صورت حال سے آگاہ نہ کیا گیا ہو۔

”ہمیں تمہارے جواب کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہیں صرف یہ اطلاع دے رہا ہوں کہ ہم ظہیر خان اور اس کی فیلڈ کے ساتھ یہاں سے جا رہے ہیں۔ ہمارا راستہ روکنے کی ہمت کرنے والا اپنے انجام کا خود ذمے دار ہوگا۔“ اس نے اپنا فیصلہ سنایا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

”تمہاری گاڑیوں کی چابیاں کہاں ہیں؟“ اب وہ ظہیر خان سے مخاطب تھا۔

”ایک سیٹ ڈرائیور کے پاس ہوتا ہے، دوسرا تمہیں میری اسٹڈی ٹیبل کی دراز سے مل جائے گا لیکن کیا تم سنجیدہ ہو کہ پولیس کے گھیرے کی پروا کیے بغیر یہاں سے نکل جاؤ گے؟“ ظہیر خان کا خون خشک ہو رہا تھا۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ جب وہ لوگ چاہے اس کی گاڑیوں کے ذریعے ہی سہی، یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کریں گے تو پولیس کی طرف سے قارئین ہوگی اور گولی بھی کسی کا نام پوچھ کر اسے نہیں لگتی۔ وہ اور اس کے بیوی بچے ان کے ساتھ گاڑیوں میں ہوئے تو انہیں بھی گولیاں لگنے کا اتنا ہی احتمال ہوتا جتنا ان مجرموں کو۔

”ظاہری بات ہے۔ اگر میں نے یہاں سے نکلنے

کے سنجیدہ اقدامات نہیں کیے تو پولیس مجھے اور میرے ساتھیوں کو گرفتار کرنے کے معاملے میں سنجیدہ ہو جائے گی اور ایسا مجھے منظور نہیں۔“

”تم پولیس والوں سے مذاکرات کر کے تو دیکھو۔ ہو سکتا ہے کوئی درمیان کی راہ نکل آئے۔“ ظہیر خان اسے قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”میرے پاس سیدھی راہ موجود ہے تو مجھے اتنی دھمت اٹھانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ بس اب چلنے کی تیاری کرو۔“ اس نے ظہیر خان کو جواب دیا اور خود باہر نکل کر اپنے ساتھیوں کو ہدایات دینے لگا۔ انہوں نے پورچ میں کھڑی ظہیر خان کی دونوں گاڑیوں کے ذریعے وہاں سے نکلنے کا فیصلہ کیا تھا اور دونوں ہی بڑی گاڑیاں تھیں۔ جن گاڑیوں میں وہ یہاں آئے تھے، انہیں لے جانے کی فکر یوں بھی نہیں تھی کہ وہ چوری کی گاڑیاں تھیں اور اسی مہم کے لیے حاصل کی گئی تھیں۔

”ایک گاڑی میں ظہیر خان کو بٹھاؤ اور دوسری میں اس کے بیٹے کو۔ خواتین کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ یہاں ہدایات جاری کرنے کے ساتھ ساتھ لالہ کے ساتھ بھی مسلسل رابطے میں تھا اور اسے یہاں کے پل پل کی خبریں دے رہا تھا۔ ساتھ ہی اس نے ایک ایسی تاریک کھڑکی بھی سنبھال لی تھی جہاں سے پولیس والوں کی نقل و حرکت دیکھی جاسکتی تھی۔ اس کی طرف سے فرار کی دھمکی ملنے کے بعد ان میں بے چینی پھیل گئی تھی اور وہ کوئی ایکشن لینے کے لیے تیار نظر آ رہے تھے۔ اس نے مدھم روشنی میں ایک پولیس والے کو رینگ کر اس دیوار کی طرف بڑھتے دیکھا جسے پھاند کر وہ خود اندر آئے تھے۔ فوراً ہی کھڑکی کی چوکت سے نکلی اس کی گن کی ٹال سے ایک گولی نکلی اور اس پولیس والے کے قریب سے سائیکس کی آواز کے ساتھ گزری۔ اس نے اضطراری طور پر اپنا سر بالکل زمین کے ساتھ چپکا لیا۔

”یہ نہ سمجھنا کہ میرا نشانہ اچھا نہیں ہے لیکن میں خواخواہ خون کی ہوئی کھیلنا پسند نہیں کرتا۔ اس پہلی سہلت کو غنیمت جانو اور اپنے آدمیوں کو دور رکھو۔“ ظہیر خان کا موبائل ابھی تک اس کے پاس تھا۔ اس نے اسپیکر تاقب کا نمبر ڈائل کر کے اسے تنبیہ کی اور اس کا جواب سننے بغیر لائن کاٹ دی۔ رنرمل میں یکدم ہی باہر اندھیرا چھا گیا۔ اب صرف ظہیر خان کے گھر کی روشنیاں گل نہیں تھیں بلکہ پوری سوسائٹی پر اندھیرا چھا گیا تھا۔ صورت حال ایسی تھی کہ ہر گھر کے کمینوں کے دل یقیناً

سب سے ہوئے ہوں گے اور وہ بھی ان ہی کی طرح اپنے مکالوں کے اندر کچھ دیکھنے کے لیے موبائل ٹارچز کا سہارا لینے پر مجبور ہو گئے ہوں گے۔ پولیس والے شاید اس تاریکی کا سہارا لے کر گھر میں گھسنے کی فکر میں تھے۔

”بس اب نکل چلو۔“ اس نے ایک طرف لالہ سے مذاکرات کیے تو دوسری طرف اپنے ساتھیوں کو پکارا۔ انہیں اب بس یہاں سے نکلنے کی فکر کرنا تھی۔ پولیس والوں کو سنبھالنا لالہ کا کام تھا۔

”اے اتار دو۔“ وہ گاڑیوں میں بیٹھ رہے تھے کہ گاڑی کی اندرونی روشنی میں ظہیر خان کے لوجوان بیٹے کو دیکھ کر وہ ٹھٹھک گیا اور یکدم ہی اسے ساتھ نہ لے جانے کا فیصلہ کیا۔ ظہیر خان کتنا ہی بڑا آدمی تھا، اس میں اس کے بیٹے کا کوئی قصور نہیں تھا۔ اس کی بے لگاری کے دلوں میں اسے کسی لڑائی میں گھسیٹ لینا اس کے ساتھ زیادتی تھی تو اس نے اس لڑکے کو گاڑی سے اتاروا دیا۔ جس لمحے دونوں گاڑیاں اشارت ہوئیں، فضا میں فائرنگ کی اتنی زبردست آوازیں گونجیں کہ گاڑیوں کے اشارت ہونے کی آوازیں ان آوازوں میں دب گئیں۔ یہ لالہ اور اس کے ساتھیوں کا کارنامہ تھا۔ آس پاس کی محفوظ پوزیشنز پر چبھے وہ پولیس کی توجہ بنانے کے لیے یہ ہوائی فائرنگ کر رہے تھے جس نے پولیس والوں کو یہ تاثر دیا کہ جیسے ان پر پیچھے سے حملہ کر دیا گیا ہو۔ وہ بولکھلا کر اس فائرنگ کا جواب دینے کی کوشش کرنے لگے اور اسی دوران دونوں گاڑیاں مکمل بند روشنیوں کے ساتھ گیٹ سے نکل کر باہر کی طرف دوڑیں۔ پولیس والوں کو ان کے فرار کا اندازہ ہوا تو اندھیرے میں ہی گاڑیوں کو نشانہ بنانے کی کوشش کرنے لگے۔ مجبوراً انہیں بھی جوابی فائرنگ کرنا پڑی لیکن یہ ایک محدود وقت کے لیے تھا۔ گاڑیاں سوسائٹی کے گیٹ سے نکلیں تو فائرنگ سے جان چھوٹ گئی۔ تعاقب کا اندیشہ اس لیے نہیں تھا کہ جس وقت وہ ظہیر خان کے ساتھ پوچھ تاجھ میں مصروف تھا، جارجاؤنڈ سکھنی ٹانک تاک کر پولیس کی گاڑیوں کے ٹائروں کو نشانہ بنا چکی تھی۔ اگر کوئی گاڑی ٹھیک حالت میں تھی بھی تو اس کی راہ روکنے کے لیے لالہ اور اس کے ساتھی موجود تھے۔

”ان گاڑیوں میں ٹرکیر لگا ہوگا۔ ہم ان میں اپنے ٹھکانے تک نہیں جاسکتے۔“ تھوڑا فاصلہ طے ہوا تو وہ کی نے اہم مسئلے کی طرف توجہ دلائی۔

”لالہ سے بات کرتا ہوں۔“ اس نے جواب دیا اور ابھی رابطہ کرنے ہی جا رہا تھا کہ خود لالہ کی کال آگئی۔ وہ

انہیں بتا رہا تھا کہ انہیں ٹھکانے پر جانے کے بجائے کس جگہ رک کر گاڑیاں تبدیل کرنا ہیں۔ ساتھ ہی بڑی شاہراہوں کو چھوڑ کر سڑک کرنے کی ہدایت بھی تھی تاکہ پولیس کی پیٹرولنگ گاڑیوں سے سامنا نہ ہو سکے۔

”لالہ کبھی کسی پہلو کو نظر انداز نہیں کرتا۔ جوابات مجھے سوجھی ہے، اس کے دماغ میں بھی فوراً ہی آگئی ہوگی۔“ دکی نے اس حکم کو سن کر چپکے ہوئے تبصرہ کیا۔ اگرچہ ابھی وہ پوری طرح محفوظ نہیں تھے لیکن پولیس کا گھیراؤ ڈر کر نکل آنے سے دباؤ کافی حد تک کم ہوا تھا اور اتنی گنجائش نکل آئی تھی کہ ایسی گفتگو کی جاسکتی تھی۔ جلد ہی وہ لالہ کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ گئے۔ یہاں ان کو لینے کے لیے دو گاڑیاں پہلے سے موجود تھیں۔ یہاں انہوں نے اس مہم کے دوران استعمال ہونے والے اپنے اپنے موبائل فون جو صرف اسی مہم کے لیے حاصل کیے گئے تھے، ضائع کیے اور ظہیر خان سمیت دوسری گاڑیوں میں منتقل ہو گئے۔ اس ساری مہم کے دوران لالہ سمیت ان سب نے جو موبائل اور سمر استعمال کی تھیں، ان میں سے کچھ بھی ان کے نام رجسٹرڈ نہیں تھا اس لیے ان کا ریکارڈ یا سی ڈی آر وغیرہ نکالنے سے پولیس کو ان تک رسائی حاصل کرنے میں کوئی کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔

”اے شٹ ڈاؤن کرنا ہوگا۔“ نئی گاڑیوں میں سفر کا آغاز ہوا ہی تھا کہ ڈرائیور نے دکی اور معاذ کے درمیان پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے ظہیر خان کی طرف اشارہ کیا۔ ”نہیں، مجھے مت مارو۔ دیکھو میں تم لوگوں کے ساتھ پورا پورا تعاون کر رہا ہوں۔“ وہ سمجھا کہ اس کی موت کا حکم صادر کر دیا گیا ہے اس لیے خوفزدہ ہو کر چیخنے چلانے لگا۔ اس کے اس شور شرابے کو معاذ کی پھٹکی کے ایک دار نے بند کر دیا اور وہ مرجھائی ہوئی توری کی طرح نشست پر اس طرح ڈھیلا ہو کر بیٹھا رہ گیا کہ اس کا سر دکی کے کاندھے پر ٹکا ہوا تھا۔

”یہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟“ سفر کچھ اور طے ہوا تو انہیں اندازہ ہوا کہ گاڑیاں اس سمت میں رواں نہیں ہیں جہاں لالہ کا وہ محفوظ ٹھکانا موجود تھا جہاں وہ اب تک قہیم رہے تھے اور جہاں لوٹ کر جانا طے تھا۔

”جہاں لالہ کا حکم ہے۔“ ڈرائیور نے والے نے اس کے سوال کا مختصر جواب دیا۔ صورت حال میں اس تبدیلی نے ان سب کو ہی کچھ نہ کچھ تشویش میں مبتلا کیا لیکن ایک خیال یہ بھی تھا کہ یہ صرف ایک احتیاطی تدبیر ہے۔ گاڑیاں نیلی کی موجودہ قیام گاہ پر پہنچیں تو ایک اور خیال

نے معاذ کے دماغ پر دستک دی۔ ”ظہیر خان کو نیلی کے سامنے حساب کے لیے پیش کرنے لایا گیا ہے۔“ اور وہ اپنے اس خیال میں اس لیے بھی درست تھا کہ ظہیر خان سے ضروری معلومات تو وہ اس کی رہائش گاہ پر ہی حاصل کر چکے تھے اس لیے ضروری نہیں تھا کہ اس کو یہاں تک اپنے ساتھ لایا جاتا۔ وہ تو ڈھال کی حیثیت سے بھی استعمال نہیں ہو سکا تھا۔ بہر حال جو بھی بات تھی، اسے لالہ کے آنے پر ہی واضح ہونا تھا اور لالہ کا دور دور تک کچھ پتا نہیں تھا۔ ہاں، ایک پیغام مل گیا تھا۔

”آپ لوگ فی الحال آرام کریں۔ لالہ کی آمد پر آپ کو مطلع کر دیا جائے گا۔“

نظارہ سب ٹھیک تھا لیکن چھٹی حس کسی گڑبڑ کی نشاندہی کر رہی تھی۔

☆☆☆

نیند مہناز کی آنکھوں سے بہت دور تھی۔ بستر پر کروٹیں بدلتی وہ اپنی زندگی کے نشیب و فراز کے متعلق سوچ رہی تھی۔ ایک چھوٹے شہر کی لڑکی جو اپنی اور اپنے گھر والوں کی زندگی بنانے کے لیے اس بڑے شہر میں آئی تھی اور پھر اس بڑے شہر نے اسے اس طرح سے نگل لیا تھا کہ وہ کبھی اپنی زندگی نہیں جی سکی تھی۔ ہاں یہ ضرور ہوا تھا کہ اس کے پاس پیسا بہت آگیا تھا اور اس پیسے نے اس کے گھر والوں کی زندگی بدل دی تھی۔ ترس ترس کر زندگی گزارنے والے اس کے خاندان کے لیے یہ خوشحالی اتنی کشش رکھتی تھی کہ اگر انہیں اس کی زندگی کے بارے میں کوئی شک تھا بھی تو انہوں نے اس کے سامنے کوئی سوال نہیں اٹھایا تھا۔ وہ ہر ماہ اس سے موٹی رقم وصول کرنے کے علاوہ صرف اپنی اپنی کسی اضافی فرمائش کے حصول کے لیے رابطہ کرتے تھے۔ اس سے آگے انہیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ یہاں تک کہ وہ عید بقرعید پر پارلر میں کام کا زیادہ دباؤ ہونے کا بہانہ بنا کر گھر نہیں جا پاتی تھی تو کوئی اس سے آنے کا اصرار نہیں کرتا تھا اور نہایت مدبر بن کر کہہ دیا جاتا تھا کہ ہم تمہاری مجبوری کو سمجھتے ہیں۔

وہ لوگ خاک اس کی مجبوری کو سمجھتے تھے۔ انہیں قطعی اندازہ نہیں تھا کہ ان کے عیش و عشرت کی قیمت وہ خود کو سونے کے ایک ایسے پنجرے میں قید کر کے ادا کر رہی ہے جہاں اس کے لیے بے شمار اذیت ہے۔ اسے باذل جیسے نفسیاتی مریض کی پسندیدہ عورت ہونے کا اعزاز حاصل تھا اور وہ ذہنی مریض اپنی اذیت پسند طبیعت کی تسکین کے لیے

اکثر ہی اس کو ایسے تجربات سے گزارتا تھا کہ وہ تڑپ کر رہ جاتی تھی۔ بعض اوقات تو کئی کئی دن بستر سے اتر کر کام کاج کرنے کے لائق نہیں رہتی تھی لیکن اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس عالم کی قید سے نکل بھاگنے کی تدبیر کرتی۔ وہ اسے اس سارے ظلم و ستم کی قیمت ادا کرتا تھا اور وہ نفسیاتی طور پر اس طرح اس کی غلام بن چکی تھی کہ اس کے اندر سے آزادی کی خواہش ہی ختم ہو گئی تھی لیکن اب بشری کو دیکھ دیکھ کر اس کے اندر ایک لہری پیدا ہونے لگی تھی۔ وہ حیران ہوتی تھی کہ اس لڑکی نے اتنے دکھ اور تکالیف برداشت کرنے کے باوجود کبھی ذہنی طور پر باذل کی غلامی کو قبول نہیں کیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اپنا سب کچھ گنوانے کے بعد ایک بد صورت اور بد حیثیت وجود کے طور پر اس کے گھر میں رہنے پر مجبور ہو گئی تھی تب بھی مہناز کو اس کے اندر بدلے کی ایک آگ سی لپکتی محسوس ہوتی تھی۔ وہ جس عرصے میں اپنی یادداشت کھوجانے کی اداکاری کرتے ہوئے ایک بے بس ملازمہ کی حیثیت سے اس کے ساتھ رہ رہی تھی، اس وقت بھی مہناز اندر نہیں یہ بات جانتی تھی کہ یہ سب سچ نہیں ہے۔ بظاہر بشری سے ہمدردی میں اس نے اسے اپنے ساتھ رکھا ہوا تھا لیکن اس ہمدردی سے ہٹ کر بھی ایک وجہ تھی۔ بشری کے اندر ہمہ وقت جلتی آن دیکھی آگ کی تپش اسے یقین دلاتی تھی کہ اس کے پیروں میں بڑی باذل نام کی زنجیر کاٹنے میں یہی کمزور اور بے بس لڑکی کوئی کردار ادا کرے گی اور اب وہ وقت آگیا تھا۔

باذل کی طویل غیر حاضری کے عرصے میں غیر محسوس طور پر اس کی بشری سے قربت بڑھ گئی تھی۔ وہ اس کے وکی اور لالہ کے آدمیوں سے رابطوں سے بھی واقف ہو گئی تھی لیکن ہر شے سے صرف نظر کیا تھا۔ کبھی کبھی موقع ملنے پر وہ بشری کو اپنے حالات زندگی بھی سنانے لگی تھی اور باذل کی اذیت پسند فطرت کی کہانیاں بھی۔ کائناتوں بھری راہ پر عرصے سے ننگے پیر چلتی اس لڑکی کو بشری کی صورت ایک ایسی سامع میسر آ گئی تھی جس سے اسے افشائے راز کا کوئی خدشہ نہیں رہا تھا۔ اگرچہ اس کے دل کو ہر لمحہ باذل کے لوٹ آنے کا درد کا لگا رہتا تھا لیکن اس کے لیے اس کی طویل غیر حاضری کے دن بڑے پرسکون تھے۔ وہ ہمہ وقت ایک عفریت کو خوش اور مطمئن رکھنے کی فکر سے آزاد تھی اور دعا کرتی تھی کہ وہ اب کبھی لوٹ کر نہ آئے لیکن اسے لگتا تھا کہ اس کی یہ دعا قبول نہیں ہوئی ہے اور وہ لوٹ آیا ہے۔ بشری نے اسے کچھ بھی نہیں بتایا تھا لیکن ایک روز وہ لالہ کے آدمی کے ساتھ

کہیں گئی تھی اور جب واپس آئی تھی تو بہت بدلی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس پر ہمہ وقت طاری رہنے والا اضطراب دور ہو چکا تھا اور وہ یوں پرسکون تھی جیسے زندگی کا مقصد پورا ہو گیا ہو۔ مہناز نے اس سے اس کی اس تبدیلی کا سبب پوچھا تو اس نے کھل کر کچھ نہیں بتایا اور ذرا سا مسکرا کر بس اتنا بولی۔
”میرے اور تمہارے سارے دلدر دور ہونے کا وقت آ گیا ہے اور ایک ایسا منظر ہمارا منتظر ہے جو روح تک کو سرشار کر دے گا۔“

اس کے بعد وہ اپنے والدین کی قبروں پر جانے کا بتا کر گھر سے نکلی تھی تو واپس نہیں آئی البتہ اس کا فون آ گیا تھا کہ اس کی ایک پرانی سہیلی مل گئی ہے جس کے اصرار پر وہ ایک رات کے لیے اس کے گھر رکنے آ گئی ہے۔ تو یہ تھا کہ بشری آج کی رات اپنی پرانی سہیلی کے گھر کی ہوئی تھی اور اسے اپنے ہی گھر میں خواہ مخواہ خوف محسوس ہو رہا تھا۔

خوف کیوں محسوس ہو رہا تھا، اس کا جواب بنجنے والی اطلاعی کھنٹی نے دے دیا۔ وہ دل ہی دل میں خیر کی دعا مانگتے ہوئے دروازے کی طرف گئی لیکن ڈور آئی سے جھانکنے پر اسے جو چہرہ دکھائی دیا، اس نے اسے بتا دیا کہ یہ قبولیت کی گھڑی نہیں تھی۔ اس کا دل جاہا دروازہ نہ کھولے لیکن یہ ممکنات میں سے نہیں تھا۔ وہ ایسی جرأت کر بھی لیتی تو اسے روکنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ بہر صورت اندر آتا اور اس وقت وہ اس کے غضب کا سامنا نہ کر سکتی۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے دروازہ کھول دیا۔ وہ کسی بھڑکے ہوئے ہمینے کی طرح اندر داخل ہوا اور اسے ایک طرف دھکیلتے ہوئے سیدھا اندر کی طرف بڑھ گیا۔

”کہاں ہے وہ، کہاں ہے وہ حرام.....“ مختلف دروازے کھول کر اندر جھانکتے وہ دہاڑ رہا تھا اور منہ سے مغلطات کی بارش ہو رہی تھی۔ ایک دیوار کے ساتھ پشت ٹکائے کھڑی مہناز کی ہمت نہیں تھی کہ اسے مخاطب کر سکتی۔

”کہاں..... کہاں چھپا رکھا ہے اسے؟“ آخر وہ خود ہی اپنی تلاش میں ناکام ہو کر اس کی طرف پلٹا اور اس کے بازو میں سختی سے انگلیاں بہمت کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”کک..... کون..... کس کی بات کر رہے ہو تم؟“ یہاں تو میرے سوا کوئی نہیں ہے۔“ وہ سمجھ گئی تھی کہ وہ کسے تلاش کر رہا ہے پھر بھی انجان بن گئی۔

”وہی تیری سگی جسے اس کی ماں نے شاید تیرے باپ کے ساتھ سو کر پیدا کیا تھا جو تیرے دل میں ہر وقت اس سے ہمدردی کے ابال اٹھتے رہتے تھے۔“ وہ اس وقت

کٹر کا ڈھکن بنا ہوا تھا جس سے غلاظت اگلی پڑ رہی تھی۔ مہناز بھی ہنسی نہیں تھی۔ بشری نے اگرچہ اسے واضح طور پر کچھ نہیں بتایا تھا لیکن باذل کی حالت اور غصہ دونوں اسے سمجھانے کے لیے کافی تھے کہ بشری جس خوشخبری کا ذکر کر گئی تھی، اس کا تعلق باذل سے تھا۔ شاید باذل اس کے ہمدردوں کی گرفت میں آ گیا تھا لیکن ابھی یہ بلا آ رہی تھی۔
”وہ..... وہ نہیں ہے۔ اسے کچھ لوگ اپنے ساتھ لے گئے تھے۔“

”کون لوگ؟“ وہ اس کا جواب سن کر چونکا۔
”شاید لالہ عیسیٰ کے آدمی تھے۔“ اس نے بظاہر جھجکتے ہوئے خوف سے جواب دیا لیکن درحقیقت وہ باذل کو باور کروا رہی تھی کہ اب بشری محفوظ ہاتھوں میں ہے۔
”لالہ کے لوگ کیسے پہنچے اس تک؟“ اس کی گرفت مہناز کے بازو پر اتنی سخت ہو گئی تھی کہ اسے اپنی ہڈیاں ٹوٹی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

”مجھے صحیح سے نہیں پتا لیکن مجھے لگتا ہے کہ جب تمہاری گلو استاد سے ڈیٹنگ چل رہی تھی، ان ہی دنوں ان لوگوں نے اسے پہچان کر یہاں سے نکال لے جانے کا منصوبہ بنالیا تھا۔“ تکلیف سے اس کی سسکیاں نکل رہی تھیں لیکن وہ باذل کو باور کروانے میں کامیاب ہو گئی تھی کہ لالہ کے آدمیوں کو بشری تک رسائی دینے میں اس کی اپنی غلطی کا دخل تھا چنانچہ رد عمل میں اس کے بازو پر باذل کی گرفت ذرا نرم ہوئی تھی۔

”تم اتنے دنوں کہاں غائب رہے؟ کوئی اطلاع بھی نہیں دی۔ میڈم کو بھی تمہاری فکر تھی۔“ اب وہ اسے دلار سے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور اس کو اس کی ماں تاجور بائی عرف میڈم تاجور کے بارے میں بتایا تھا لیکن اسے نہیں معلوم تھا کہ یہ حوالہ اسے مزید بھڑکا دے گا۔

”نام مت لو اس عورت کا میرے سامنے۔ یہ اس عورت کا قصور ہے کہ میں ایک بے حس اور خود غرض آدمی کا غلام بنا دنیا میں ٹھوکریں کھاتا پھر رہا ہوں۔ اس نے اپنی قانونی اولاد کو تو عیش و عشرت سے پالا اور مجھے ایک کتے کی طرح اپنے تلوے چاٹنے اور اپنے اشارے پر کسی پر بھی جھپٹ پڑنے پر لگا دیا۔ میں اس دنیا میں جتنی بھی دشمنیاں بھگت رہا ہوں، وہ اس شخص نے میرے حصے میں لگائی ہیں اور تو کہتی ہے کہ مجھے اس شخص کی غلامی میں رہنے والی عورت کو میری فکر ہے۔“ وہ جس معاشرے کا حصہ تھا، وہاں نطفہ حرام ہونا اتنی معمولی بات نہیں تھی جس نے اس کی زندگی کو متاثر نہ



گرم ترین جون 2023

کے جاں فزا شمارے

کی ایک جھلک

شیطان سیبتھیار

میں جوں کے بھیس میں درندہ صفت انسانی دشمنوں کا لکھنا و ناظر یہ واردات۔ ایک انوکھے ہتھیار سے پھیلنے والی ہلاکت خیزی کے سنسنی خیز واقعات۔ امجد و نیس کے قلم سے

شعلہ زن

بے بسی کے اندھیروں میں ڈوبتی لڑکی کی دردناک داستان حیات۔

روبینہ رشید کے قلم کی جادوگری

ذہر

دنیا مجبور کرتی ہے کہ ان پر قہر بن کر ٹوٹ پڑے۔ ایک ایسے ہی نوجوان کی کوچہ گردی۔ زندگی اس کے لیے خالی کشتیوں کے مانند تھی۔ حسام بیٹ کے قلم سے نئی سلسلے دار کہانی۔

سورق کے رنگ

پہلا رنگ

عزت کے لیے سب کچھ داؤ پر لگایا جاسکتا ہے۔ ایک غیرت مند نوجوان کی عزت کا معاملہ

دوسرا رنگ

شکاریوں کو دھوکا دے کر بچ نکلنے والے شکار کی جدوجہد

چلتی لکت چلتی

آپ کے تہرے... مشورے... محبتیں... شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کھائیں

کیا ہو۔ وہ جانتا تھا کہ بظاہر سب اس سے ڈرتے ہیں اور اس کے حکم سے سرتابی کی جرأت نہیں رکھتے لیکن اس کے پیچھے ان میں چپکے چپکے اس کے عرفان اللہ کی ناجائز اولاد ہونے کی بات چلتی رہتی ہے۔ لاکھ تاجور باکی نے اس کی ولدیت کے خانے میں اپنے شوہر شوکت عرف شو کے کا نام لکھوایا تھا لیکن جاننے والے بہت کچھ جانتے تھے اور ایسی باتیں کبھی جھپی نہیں رہتیں۔ سرگوشیوں اور چہ میگوئیوں کی صورت آگے بڑھتی رہتی ہیں۔ ان سرگوشیوں اور چہ میگوئیوں نے باذل کی نفسیات میں ایسی پیچیدگی پیدا کی تھی کہ وہ انسان سے زیادہ جانور بن گیا تھا اور اس جانور کو اپنا غصہ نکالنے کے لیے کوئی نہ کوئی چاہیے ہوتا تھا۔ اس وقت وہ ”کوئی“ اسے مہناز کی صورت میں آگیا تھا چنانچہ باسی پر پل پڑا۔

”میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہو؟ میرا کوئی قصور نہیں ہے۔“ خود کو بچانے کی کوشش کرتے ہوئے وہ اسے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”کسے تیرا قصور نہیں ہے۔ تیرا فرض تھا کہ میرے پیچھے میرے گھر کی حفاظت کرنی لیکن تو نے اس کو فرار کر دیا۔“ وہ بڑی طرح اسے رگید رہا تھا۔

”میں نے نہیں کر دیا۔ لالہ کے آدمی اسے لے گئے۔ میں ان غنڈوں کا مقابلہ کیسے کر سکتی تھی۔“ اپنے دونوں ہاتھ آگے کر کے اپنے چہرے کو اس کی پہنچ سے بچانے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے دہائی دی۔

”تو مقابلہ نہیں کر سکتی تھی لیکن میرے آدمیوں کو تو اطلاع دے سکتی تھی۔ دی تو نے انہیں اطلاع؟“ وہ چلایا اور اس بار مہناز کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ یہ تو واقعی ممکن نہیں تھا کہ اتنے بڑے واقعے کے بعد وہ باذل کے ساتھیوں کو مطلع نہیں کرتی۔ باذل کی وفادار کی حیثیت سے اسے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا لیکن وہ ایسا تو اس صورت میں کرتی نا جبکہ وہ کچھ ہوا ہوتا جو اس نے باذل کو باور کروانے کی کوشش کی تھی۔ وہ اپنے ہی جھوٹ کے جال میں پھنس گئی تھی۔

”تو نے فرار کر دیا ہے نا اسے؟ تو شامل ہے اسے یہاں سے بھگانے میں۔“ باذل نے اس کا خاموش ہونا بھی محسوس کیا اور نتیجہ بھی اخذ کر لیا۔

”نہیں۔ میں نے نہیں کر دیا۔“ وہ جھوٹ نہیں بول رہی تھی لیکن اسے سچ بھی نہیں بتا رہی تھی اور یہ بات باذل کے اشتعال کو ہوا دینے کے لیے کافی تھی۔ وہ بھول گیا کہ وہ اس کی پسندیدہ ترین عورت ہے۔ زرد کو ب وہ اسے پہلے ہی

کر رہا تھا، اب جنون مزید بڑھ گیا تھا۔

”بتا کہاں گئی ہے وہ..... کہاں چھپایا ہے تُو نے اسے؟“ اس کی زبان اتنی تیزی سے سوال نہیں کر رہی تھی جتنی تیزی سے ہاتھ ہیر چل رہے تھے۔

”مجھے نہیں معلوم۔“ باذل کی ہر ضرب اسے چیخنے اور کراہنے پر مجبور کر رہی تھی لیکن ضد سوار ہو گئی تھی کہ اس کے سوال کا جواب نہیں دینا۔ شاید اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ کتنی ہی وفاداری کا مظاہرہ کرتی، آخر کار اس نے وحشی درندے کی طرح اسے چیر پھاڑ ہی دینا تھا۔ تو بس جو ہوتا تھا، وہ آج ہی ہو جاتا۔ درد کی انتہا پر پہنچ کر ہوش و حواس سے بیگانہ ہونے تک وہ اپنی ضد سے پیچھے نہیں ہٹی تھی۔ درندہ جانتا تھا کہ وہ زیادہ دیر یہاں نہیں رک سکتا کہ اس کے فرار کی خبر ہونے کے بعد اس کی تلاش میں دوڑنے والے سب سے پہلے یہیں آئیں گے چنانچہ اسے نیم جان مہناز کو اس کے حال پر چھوڑ کر وہاں سے جانا پڑا لیکن اس کا غصہ اور وحشت اپنی جگہ پر قائم تھے۔

☆☆☆

”یہ تو بہت بڑا نقصان ہو گیا۔“

”ہاں، بہت بڑا نقصان۔“ لالہ عیسیٰ کچھ کم صمنی کیفیت میں تھا۔ دراصل وہ اس لمحے میں تھا جب اصغر کے پاس اس کمپیوٹر کے ماہر لڑکے کی کال آئی تھی جسے وہ اس کے ایک نائب کے ساتھ اپنے ٹھکانے پر چھوڑ کر آئے تھے۔ وہ دونوں لڑکے ایک ساؤنڈ پروف کمرے میں بیٹھے اپنے فرائض ادا کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے ان کے مشن میں اپنا اہم کردار ادا کیا تھا۔ ڈی ایس بی ظہیر خان کے سکیورٹی کیمروں کو ہیک کرنا انہی کا کارنامہ تھا لیکن اس لمحے وہ لڑکا ہراساں سا چہرہ رکھ رہا تھا۔

”یہاں آگ لگ گئی ہے اصغر استاد اور ہمیں باہر نکلنے کا راستہ نہیں مل رہا۔“

”آگ..... آگ کیسے لگ گئی؟“ اصغر سن کر حیران ہوا۔

”مجھے کچھ نہیں معلوم۔ بس کچھ دیر پہلے عذیم نے باہر والے کیمرے میں کسی کو باہر جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس وقت اس نے دھیان نہیں دیا کہ شاید کام والا لڑکا ہے لیکن لگتا ہے وہی آگ لگا کر نکلا ہے۔ سارے گھر میں دھواں، کیس کی بو اور آگ پھیلی ہوئی ہے اور ہمیں باہر نکلنے کا راستہ نہیں مل رہا۔“ وہ بولنے کے ساتھ ساتھ بڑی طرح کھانسنے بھی رہا تھا۔ زندہ جل کر مرجانے کا خوف اس کی آواز میں وحشت بھر رہا تھا۔

”فائر بریگیڈ..... فائر بریگیڈ کو کال کی تُو نے؟“ اصغر نے بھی چیخے ہوئے اس سے پوچھا۔

”وہاں کوئی کال نہیں اٹھا رہا۔“ فون کرنے والے کے لیے بولنا مشکل ہونے لگا تھا۔ دراصل انہیں خبر اتنی دیر سے ہوئی تھی کہ آگ بے تحاشا پھیل چکی تھی۔

”تو فکر نہ کر، میں کچھ کرتا ہوں۔“ اصغر نے دھواں دھواں چہرے کے ساتھ اسے نسل دی اور خود فائر بریگیڈ سے رابطے کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔

یہ وہ لمحہ تھا جب ڈی ایس بی ظہیر خان کے گھر پر کھیلے جانے والا کھیل اپنے پورے کلائیکس پر تھا اور لالہ عیسیٰ بہ لمحہ معاذ کے ساتھ رابطے میں تھا۔ اصغر نے مختصر اُسے دعوے سے آگاہ کیا اور چند ساتھیوں کے ساتھ خود اپنے ٹھکانے کی طرف دوڑ لگائی۔ لالہ کو وہاں موجود آگ میں ٹھمرنے اپنے لوگوں کی فکر تھی لیکن وہ اس نازک وقت میں معاذ اور اس کے ساتھیوں کو بھی بے یار و مددگار چھوڑ کر نہیں جاسکتا تھا۔ وہ اپنی پوری اعصابی مضبوطی کے ساتھ مشن میں شامل رہا تھا لیکن اس دوران اس کا بہت بڑا نقصان ہو گیا تھا۔ تمام سہولیات سے ایس ایک محفوظ ٹھکانا جو ہاتھ سے نکلا تھا سو نکلا تھا، کچھ وفادار بھی اذیت ناک موت سے دو چار ہو گئے تھے۔ فائر بریگیڈ اور اصغر کے وہاں تک پہنچنے تک کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا۔ کم از کم زندگی نہیں بچی تھی۔ موت تو شاید دم گھٹنے سے ہی واقع ہو گئی ہوگی۔ بے قابو آگ نے گوشت اور ہڈیوں کو بھی راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دیا تھا۔ عمارت کے سوختہ ڈھانچے سے کئی گھنٹوں بعد چار عدد دلاشیں نکلی تھیں اور ایک لاش کے قریب پڑی بیڑیوں نے بتا دیا تھا کہ عمارت میں جو پانچواں موجود تھا، وہ ان چاروں کو موت کے حوالے کر کے خود فرار ہو چکا تھا۔

عفریت ایک بار پھر آزاد ہو چکا تھا اور اس نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ اس کے بھاگ نکلنے کا علم ہوتے ہی انہوں نے مہناز کے اپارٹمنٹ کا رخ کیا تھا۔ وہاں مہناز نیم جان حالت میں ملی تھی اور بشری غائب تھی۔ اس کا نمبر بھی مسلسل بند تھا اس لیے اندیشہ یہی تھا کہ اسے باذل اپنے ساتھ لے گیا ہوگا لیکن اپارٹمنٹ بلڈنگ کے سکیورٹی کے عملے سے جو معلومات حاصل ہوئی تھیں ان کے مطابق باذل اکیلا ہی وہاں آیا تھا اور اکیلا ہی واپس بھی گیا تھا۔ ایسے میں بشری کو زمین کھا گئی تھی یا آسمان نکل گیا تھا، کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی اور سارا انحصار اس بات پر تھا کہ مہناز کو ہوش آجائے تو وہ اس بارے میں کچھ بتائے۔

دروازے سے کچھ ہی فاصلے پر تھا کہ وہ کی، نیلی کو مضبوطی سے پکڑ کر کھینچ کر باہر لانا دکھائی دیا۔

”تم اسے نہیں بچا سکتے۔ تم میرے موی کے قاتل کو نہیں بچا سکتے۔ میں اس کے کٹے کٹے کر کے چیل کوڈوں کے آگے ڈالوں گی۔ وہ اس سے کہیں زیادہ اذیت سے گزرے گا جس سے موی گزرا اور جس سے میں دن رات گزر رہی ہوں۔“ وہ حلق کے بل چبچ رہی تھی اور خود کو وہ کی گرفت سے چھڑانے کی جنونی کوشش کر رہی تھی۔ معاذ نے اس کے ہاتھوں اور کپڑوں پر لگا خون دیکھا تو اندازہ ہوا کہ وہ کسی حد تک اپنے ارادے میں کامیاب رہی ہے۔

”جو تم چاہو گی، ویسا ہی ہوگا لیکن ابھی تھوڑے صبر سے کام لو۔“ وہ کی اسے ہکا بکا کر سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ کچھ سمجھنے کو تیار نہیں تھی اس لیے بدلجامی سے بولی۔

”صبر..... تم کر سکتے ہو اپنے اس دوست پر صبر جو تمہارے بسنے پر اپنا خون گرانے کو تیار رہتا تھا لیکن میں ایسا بالکل بھی نہیں کر سکتی۔ میرے لیے کسی بھی مفاد اور مصلحت سے بڑھ کر ہے موی کے قاتل سے بدلہ لینا۔ جب تک یہ ملعون جہنم رسید نہیں ہوگا، نہ تو قبر میں موی کو چین آئے گا، نہ زمین کے اوپر مجھے۔“ وہ وہ کی گرفت سے لگی لگی جا رہی تھی۔ معاذ نے دیکھا کہ اس کے الفاظ نے وہ کی کے چہرے کا سارا خون نچوڑ لیا۔ نیلی نے اس پر جو الزام لگایا تھا، اسے سہنا اس کے لیے بہت مشکل تھا۔

”یہ ہسٹریا کے دورے کا شکار ہے۔ اس وقت اسے سمجھانے سے زیادہ ذہنی سکون کی ضرورت ہے۔“ لالہ جو اس کے پیچھے ہی اٹھ کر وہاں چلا آیا تھا، نیلی کی کیفیت کو دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا اور ایمر جنسی میڈیکل کٹ اٹھائے مذکورہ کمرے کی طرف جاتے اپنے کارندے کو روک کر اس کٹ میں سے ایک انجکشن نکال کر معاذ کے حوالے کیا۔ معاذ اس کی بات سمجھ گیا تھا چنانچہ شیشے کی چھوٹی سی بوتل میں موجود مملول ایک سرخ میں بھرا اور وہ کی کو آنکھ سے اشارہ کیا۔ وہ کی نے اس کا مطلب سمجھ کر نیلی کو پوری قوت سے جکڑ لیا۔ سرخ میں موجود مملول نیلی کے بازو میں منتقل ہونے کے چند لمحوں بعد ہی اس کی مزاحمت نے دم توڑنا شروع کر دیا۔ وہ کی اسے کسی کانچ کی گڑیا... کی طرح سنبھال کر اس کے زیر استعمال کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں وہ وفادار نرس شرمندہ سی موجود تھی جس کے ذمے نیلی کی دیکھ بھال تھی۔

”میں داش روم میں تھی سر! مجھے نہیں پتا چلا کہ یہ کب

”میں جانتا ہوں جو کچھ ہوا، اس کے لیے افسوس کے الفاظ بہت معمولی ہیں لیکن واقعی مجھے اس سب پر دلی دکھ ہوا ہے۔“ کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا لیکن جو کچھ ہوا تھا اس پر کچھ تو کہنا ہی تھا۔

”جو ہو گیا، اسے بدل نہیں جاسکتا۔ اپنے کو اب اصل فکر بشری کی ہے۔ اس جنگی نے بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ اس کے ساتھ مزید کوئی ظلم نہیں ہونا چاہیے۔ اگر وہ باذل کے ہاتھ لگ گئی ہوگی تو وہ اس کے ساتھ درندگی کی انتہا کر دے گا۔“ لالہ نے اپنا دکھ چھپاتے ہوئے بشری کے لیے تشویش کا اظہار کیا۔ وہ ایسا ہی تھا۔ اسے اپنے نقصان پر بات کرنے کی عادت ہی نہیں تھی۔

”ہمیں مہناز کے اپارٹمنٹ بلڈنگ کے سکیورٹی کیمروں کی فوج نکھوانی چاہیے۔ بشری کوئی کمی تو ہے نہیں کہ کیمروں کی زد میں آئے بغیر باہر نکل جائے گی۔ وہ خود کہیں گئی ہے یا اسے لے جایا گیا ہے، دونوں صورتوں میں ریکارڈنگ تو ہونی چاہیے۔“

”اس سلسلے میں پہلے ہی کوشش کی جا چکی ہے۔ وہاں کے سکیورٹی افسر کا کہنا ہے کہ بلڈنگ کے مین گیٹ کے کیمرے میں خرابی کے باعث وہ مرمت کے لیے گیا ہوا تھا اس لیے ان کے پاس کل پورا دن اور رات کی کوئی ریکارڈنگ موجود نہیں ہے۔“

”یہ بہت عجیب اتفاق ہے۔ کہیں کمرے کی خرابی کی آڑ میں کسی سچ پر پردہ ڈالنے کی تو کوشش نہیں کی جا رہی۔“ لالہ کا جواب سن کر اس نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

”اس بات کا امکان موجود ہے لیکن فی الحال ہم سکیورٹی افسر پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے۔ وہ اگر باذل کے کہنے پر یہ جھوٹ بول رہا ہے تو باذل کی اس پر نظر بھی ہوگی۔“

”نظر ہم بھی رکھ سکتے ہیں۔“ معاذ نے تجویز دی۔

”یقیناً اور ہم ایسا ہی کر رہے ہیں۔“ لالہ کا اپنا ایک عمر کا تجربہ تھا اس لیے وہ اس کی ہر تجویز پر پہلے ہی میل بھرتا تھا۔

”مجھے بشری کی بہت زیادہ فکر ہو رہی تھی لیکن آپ کے ان اقدامات کے بعد امید ہے کہ جلد ہم اس تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔“ معاذ کے ہونٹوں پر پہلی بار ہلکی سی مسکراہٹ نے چھب دکھائی لیکن یہ مسکراہٹ فوراً ہی ماند پڑ گئی۔ وجہ اچانک ہی اٹھنے والا وہ شور تھا جس میں نیلی کی آواز سب سے نمایاں تھی۔ وہ فوراً ہی آوازوں کی سمت بھاگا۔ آوازیں اس اسٹوڈیو کمرے سے آئی تھیں جس میں ڈی ایس پی ٹھیکر خان کو رکھا گیا تھا۔ وہ کمرے کے

اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئیں۔“ وہ دکی کے سامنے وضاحتیں پیش کرنے لگی۔

”اُس اد کے! اب آپ ان کا بہت خیال رکھیے گا۔“ وہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا اور اس کمرے کا رخ کیا جہاں ظہیر خان شدید زخمی حالت میں موجود تھا اور جارد ایک شخص کے ساتھ مل کر اس کی مرہم پٹا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب اس کوشش میں معاذ بھی ان کے ساتھ شامل ہو چکا تھا لیکن ظہیر خان کے لباس، بستر اور کمرے کے فرش پر پھیلا بے تحاشا خون گواہی دے رہا تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہیں۔ بستر پر پڑا ظہیر خان کا جسم کسی ذبح کیے جانے والے بکرے کی طرح تڑپ اور پھڑک رہا تھا اور اس کے ذیدے الٹ چکے تھے۔

”کوئی فائدہ نہیں ہے۔ زخم بہت گہرا ہے اور زرخہ کٹ چکا ہے۔ اب ہم تو کیا، کوئی ماہر سے ماہر ڈاکٹر بھی اس کی جان نہیں بچا سکتا۔“ جارد جو کشمیر کی آزادی کی جنگ لڑتے زخمیوں کو فرسٹ ایڈ دینے کا طویل تجربہ رکھتا تھا، بالآخر مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے پیچھے ہٹنے کے ایک ڈیڑھ منٹ کے اندر ہی ظہیر خان کے جسم کا تڑپنا پھڑکنا ختم ہو گیا اور وہ ایک خون آلود لاش کی حیثیت سے بستر پر پڑا رہ گیا۔

”کشمیر کر دسب کچھ اور پارسل تیار کرو اس کا۔“ لالہ جو ایک دیوار سے پشت لگائے کھڑا سارا منظر دیکھ رہا تھا، سنجیدہ لہجے میں بولا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

ان تینوں کے پاس بھی اب وہاں کھڑے رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا اس لیے وہ بھی لالہ کے پیچھے پیچھے ہی کمرے سے باہر نکل آئے۔ معاذ کے صرف ہاتھوں پر خون لگا ہوا تھا اس لیے صرف ہاتھ دھونے سے ہی اس کا کام بن گیا لیکن جارد جو ابتدا سے ظہیر خان کو طبی امداد دینے کی کوشش کرتا رہا تھا اور اس کے زرخہ سے کسی فوارے کی طرح پھوٹے خون کی زد میں آ گیا تھا، اچھے خاصے بُرے حال میں تھا۔ اس نے ان کے پیچھے جانے کے بجائے غسل کر کے اپنے حلیے کی درنگ کی نیت سے اپنی سمت تہدیل کر لی اور ایک کامن ہاتھ روم میں گھس گیا۔

”یہ سب کیسے ہوا؟“ وہ لوگ واپس لالہ کے آکر بیٹھے تو معاذ نے دکی سے پوچھا۔

”نیلے نے شاید ہماری باتیں سن لی تھیں یا خود ظہیر خان کو دیکھ لیا تھا اس لیے وہ اس کی تاک میں تھی۔ کچھ دیر پہلے نرس داش روم میں گئی تو اسے یہ موقع مل گیا۔ اس نے

کچن سے گوشت کاٹنے کی بڑی چھری لی اور اس سے ظہیر خان پر حملہ کر دیا۔ بندھا ہوا ہونے کی وجہ سے وہ مزاحمت بھی نہیں کر سکا۔ جب تک شور سن کر ہم لوگ وہاں پہنچے، نیلی اپنا کام کر چکی تھی۔“ دکی نے تفصیل بتائی۔

”محبوب کو کھودینے کا غم معمولی نہیں ہوتا۔ ہو سکتا ہے انتقام لے لینے کے بعد نیلی کو قرار آجائے۔“ معاذ اپنی رائے دیتے بیچک کے اس اسپتال میں پہنچ گیا جہاں ایک بستر پر لیٹی نیچل کے پاس زندگی کی مہلت ہر لمحے کم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ جو جیتی تھی تو بس اس آس میں جیتی تھی کہ ایک بار اپنے بیٹے کو دیکھ سکے، اسے اپنی بانہوں میں لے کر پیار کر سکے اور وہ تھا کہ اس کی یہ واحد خواہش بھی پوری نہیں کر پا رہا تھا۔

”ہو سکتا ہے ایسا ہو جائے لیکن اس کی اس حرکت سے فی الحال تو نقصان ہی ہوا ہے۔ ہمیں تو ظہیر خان سے پوچھ گچھ کا موقع بھی نہیں ملا۔“ دکی نے افسوس کا اظہار کیا۔ رات کو بہت زیادہ دیر ہو گئی تھی اور ظہیر خان بھی بے ہوش تھا تو انہوں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا اور اس سے معلومات حاصل کرنے کا کام صبح تک موقوف کر دیا تھا لیکن صبح ہی یہ حادثہ پیش آ گیا۔

”چھوڑو یار! میرے خیال میں تو ظہیر خان ہمیں جو کچھ بتا سکتا تھا، بتا چکا تھا۔ بنیادی طور پر تو ہم اسے ڈھال بنا کر ساتھ لائے تھے۔“ معاذ نے ناک پر سے ٹکسی اڑائی۔

”پھر اب..... اب ہمارا اگلا قدم کیا ہوگا؟“ ظہیر خان نے بتایا تھا کہ اس نے اعظم کو عرفان اللہ کے سپرد کیا ہے۔ اب ہمیں اس کو چیک کرنا ہوگا۔“ ”اس سے تمہارا روٹ لبا ہونے کے سوا کچھ نہیں ہوگا جنگ میں!“ اب تک خاموش بیٹھے لالہ نے گفتگو میں دخل دیا۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ ہم اپنے سارے وسائل جمونک کر عرفان اللہ تک پہنچیں گے تو آگے سے وہ کہہ دے گا کہ اس نے بچہ میڈم ایکس کے حوالے کر دیا ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ تمہارا اصل دشمن کون ہے تو پھر ادھر ادھر ٹانگ ٹوئیاں مارتے پھرنے کا کیا فائدہ۔ سیدھا اس پر ہاتھ ڈالو۔“

”کیسے ہاتھ ڈالیں؟ وہ تو قلعہ بند ہو کر بیٹھی ہوئی ہے۔ تم خود بتا رہے تھے کہ اس تک پہنچنے کی کوشش میں تمہیں کتنا نقصان اٹھانا پڑا ہے۔“ لالہ اور اس کے آدمیوں کی کوشش سے سب سے بڑا کام یہ ہوا تھا کہ میڈم ایکس کی

دھوپ میں کھڑا محسوس کرتی تھیں۔

”اے اللہ! میرے باپ سے کوئی گناہ، کوئی لغزش ہوگئی ہو تو، تو انہیں معاف کر دینا اور انہیں اپنے پاس بہت پیار سے رکھنا۔“ پہلی لڑکی کے ذہن میں یہ دعا مانگتے ہوئے کچھ باتیں گردش کر رہی تھیں اور اسے خوف محسوس ہو رہا تھا کہ بے شک اس کے والدین نے جو کچھ کیا، اس کے بھلے کے لیے کیا لیکن وہ صلہ رحمی کے خلاف تھا اور کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ بہت بخشنے والا، اس چھوٹی سی بات پر ان کی گرفت کر لیتا۔ بہت دیر والدین کے حق میں دعائے مغفرت کرنے کے بعد اس نے غم آنکھوں سے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیر اور پھولوں کی پتیوں سے بھری وہ اضافی تھیلی اٹھائی جسے وہ ہر بار یہاں آتے ہوئے ضرور ساتھ لاتی تھی۔ اس تھیلی میں موجود پھولوں کی پتیاں ان دو قبروں کے لیے ہوتی تھیں جن کے سرہانے وہ دوسری لڑکی کھڑی ہوئی تھی۔ اس لڑکی کو اس نے دور سے ہی دیکھ لیا تھا اور حیران ہو رہی تھی کہ وہ بگڑی ہوئی جسمانی وضع، لقوہ زدہ منہ اور سنولائی ہوئی رنگت والی لڑکی کون ہے۔ اس لڑکی میں کچھ بھی تو اس کا جانا پہچانا نہیں تھا لیکن پھر کبھی ایک شناسائی کا احساس تھا۔ جلد ہی اس احساس کی وجہ اس کی نظروں کی گرفت میں آگئی۔ یہ اس کے دوپٹے سے نکل کر رخسار پر آگرنے والی بھورے بالوں کی لٹ تھی جو اگرچہ اب باغی کی طرح اس چہرے کی دکھائی میں اضافہ نہیں کر رہی تھی لیکن خود اپنے اصل میں قائم تھی۔

”بشری!.....“ اس کے لبوں سے ایک سرگوشی سی برآمد ہوئی اور وہ بھاگتے ہوئے اس کی جانب بڑھی۔ اگرچہ اس کی راہ میں کئی قبریں آئیں جن سے بچ کر نکلنے میں اسے دشواری پیش آئی لیکن پھر بھی وہ بھاگ کر ہی بڑھی کہ اسے اندیشہ تھا کہ دیر ہو جانے کی صورت میں وہ غائب ہو جائے گی۔

”بشری!.....!“ اس کے قریب پہنچ کر اس نے اسے پکارا تو وہ چونک کر مڑی اور ایک ہل ساکت سی اسے دیکھتی رہی۔

”بشری، میری جان! کہاں کھو گئی تھیں تم؟“ لڑکی نے خود ہی شدید جذباتی انداز میں آگے بڑھ کر اسے گلے لگالیا۔

”تو یہ تم تھیں۔ میں قبروں پر پھولوں کی سوکھی پتیاں دیکھ کر سوچ ہی رہی تھی کون ہے جو یہاں آتا ہے۔“ اس نے اپنی پرانی سیکلی کے گرد اپنے بازو پھیلا کر اس کے والہانہ پن کا جواب دیا اور آہستہ سے بولی۔ اس کے ہاتھ میں موجود پھولوں کی پتیوں سے بھری تھیلی پہلے ہی اس کی نظروں میں آچکی تھی۔

شخصیت پر پڑے پردے اتر گئے تھے۔ وہ جو ایک عرصے تک ان کے لیے پراسرار کردار بنی رہی تھی، اب کم از کم اس کا اسرار ختم ہو گیا تھا اور وہ جانتے تھے کہ میڈم ایکس جے اینڈ جے کمپنی کی سی ای او ہے۔ اس کا دفتر، دفتر نہیں، ایک قلعہ تھا جہاں اس کی مرضی کے بغیر پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا اور جب کبھی وہ اس قلعے سے باہر نکلتی تھی تو اپنی بلٹ پروف گاڑی میں سیکورٹی گارڈز کے ایک جتے کے ساتھ نکلتی تھی۔ یہ وہ معلومات تھیں جو سونیا نے بھی اسے نہیں دی تھیں۔ اس نے اسے اپنے اور اپنی ماں کے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا لیکن اس کی شخصیت پر پڑا پردہ نہیں اٹھایا تھا۔ شاید رشتے کی محبت نے اسے ایسا نہیں کرنے دیا تھا اور اس پر معاذ کو اس سے شکوہ نہیں تھا۔ خونی رشتوں کی محبت فطری طود پر آدمی کے اندر ہوتی ہے اور اکثر حالات میں وہ انہیں پہچانے کی کوشش کرتا ہے۔

”نقصان تو اٹھانا پڑا ہے لیکن ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بھی تو نہیں بیٹھ سکتے۔ کوئی راہ تو نکالنا پڑے گی۔ ہماری سب سے بڑی کمزوری ٹیکنالوجی میں ان سے پیچھے ہونا ہے۔ اگر ہمارا یہ مسئلہ حل ہو جائے تو ہم آرام سے مقابلہ کر سکتے ہیں۔“

”اس مسئلے کے حل کے لیے کیا ہے تمہارے ذہن میں؟“

اس نے محسوس کیا کہ لالہ کی خام سمت میں موج رہا ہے۔

”چینیوں سے مدد لے۔ وہ ڈوریں ہلایں گے تو جبل میں پڑا صداقت شاہ بھی باہر آجائے گا اور ہمارا یہ ٹیکنالوجی والا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔“ لالہ اپنے دل کی بات زبان پر لایا تو معاذ بھی سوچنے پر مجبور ہو گیا۔

☆☆☆

اس وقت قبرستان میں دو لڑکیاں ساتھ ساتھ بنی دو ایسی قبروں کے سرہانے کھڑی دعائے مغفرت میں مصروف تھیں جن میں ان کے والدین دفن تھے۔ وہ دونوں الگ الگ قبروں کے سرہانے کھڑی تھیں لیکن ان کا غم یکساں تھا۔ دونوں نے اپنے سب سے قیمتی رشتوں کو ایک ساتھ کھونے کا غم اٹھایا تھا۔ ہوتا ہے نا کہ ماں چلی جائے تو باپ بچوں کے سر پر دستِ شفقت رکھ کر انہیں دلاسا دیتا ہے کہ میں تو ہوں نا۔ میں اب بھی ہوں جو کڑے سے کڑے وقت میں تمہارا ساتھ دوں گا۔ باپ چلا جائے تو ماں اولاد کو اپنے آئینہ میں سمیٹ کر احساس دلاتی ہے کہ میں کمزور سہی پر اپنی ممتا کی طاقت سے تمہاری طرف بڑھنے والے ہر طوفان کا رخ موڑ دوں گی لیکن ان دو لڑکیوں سے بیک وقت ہی یہ دونوں رشتے چھن گئے تھے اور وہ سائبان سے محروم خود کو کڑی

”مئی پاپا کے بعد اکثر میرا یہاں آنا ہوتا ہے تو اکل اور آنٹی کی قبروں پر بھی ضرور آتی ہوں۔“

”تمہارا مطلب ہے اکل اور آنٹی.....“ بشریٰ نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”ہاں، وہ نہیں رہے۔ ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں دونوں ایک ساتھ چلے گئے اور مجھے تنہا چھوڑ دیا۔“ عزیز سہیلی کا شانہ میسر آیا تو آلسو آنکھوں سے یوں الم پڑے تھے جیسے ماں باپ کے جنازے سامنے رکھے ہوں۔

”مجھے سن کر بہت افسوس ہوا یا رات تمہارے اس غم کو میں نہیں سمجھوں گی تو کون سمجھے گا۔“ اس کی نظریں اپنے والدین کی قبروں کا طواف کرنے لگیں۔

”کاش، مئی پاپا نے بھی اس وقت تمہارے غم کو سمجھا ہوتا اور تمہیں سہارا دیا ہوتا۔“ اس کے لہجے میں گہرے دکھ اور شرمندگی کی جھلک تھی۔

”انہوں نے غلط نہیں کیا تھا راحیلہ! میں جن حالات میں گھری تھی ان میں جو بھی میرا ساتھ دیتا اسے نقصان پہنچنے کا احتمال تھا۔ اکل آنٹی نے تمہیں مجھ سے دور رکھ کر کوئی زیادتی نہیں کی بلکہ وہی کیا جو ان کی محبت کا تقاضا تھا۔“ اس نے اس کی شرمندگی دور کرنے کی کوشش کی۔

”جو بھی ہے، مجھے ہمیشہ افسوس رہے گا کہ میں تمہارے مشکل وقت میں تمہارے کام نہیں آسکی۔ وہ دوست ہی کیا جو وقت پڑنے پر دوستی نہ نبھائے۔“

”پرانی باتیں جانے دو یا راجتا ان باتوں کو یاد کر دو گی، اتنی ہی تکلیف ہوگی۔“ بشریٰ نے اسے ٹوکا۔

”تکلیف کا لفظ بہت معمولی ہے بشریٰ! تمہیں اس حال میں دیکھ کر میرے دل چھو جو گزر رہی ہے، اسے لفظوں میں بیان کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔“ اسے اپنی خوبصورت دوست کو جس پر یونیورسٹی کے کئی لڑکے فدا تھے، اس حال میں دیکھ کر واقعی شدید رنج ہوا تھا۔ اس کے سامنے جو بدحیثیت وجود موجود تھا اس میں سے پرانی بشریٰ کو تلاش کرنے کے لیے بہت محنت کرنا پڑی تھی تب جا کر اس کی کوئی معمولی سی جھلک دکھائی دیتی تھی اور یہ چیز راحیلہ کو اتنی اذیت دے رہی تھی کہ بار بار اس کی آنکھیں چمکتی رہی تھیں۔

”جب ہم عالم کے خلاف کھڑے ہوتے ہیں تو وہ پوری قوت سے ہم پر حملہ آور ہوتا ہے کہ ہماری آواز کو دبا سکے۔ حق کا علم بلند کرنے والوں کو ہمیشہ زخم کھانے پڑتے ہیں۔ مجھے بھی اپنے سچ اور حق کے بدلے میں بہت کچھ سہنا پڑا لیکن میں اسے بھی اپنی بڑی کامیابی سمجھتی ہوں کہ میں

نے اپنے والدین کی تربیت کے مطابق ظلم کے مقابلے میں ہتھیار نہیں ڈالے۔ میں مشکل سے مشکل حالات میں بھی اپنے عزم سے محروم نہیں ہوئی اور اللہ کا شکر ہے کہ آج اس مقام پر ہوں کہ مجھے عالم کا انجام صاف دکھائی دے رہا ہے۔“ اس نے راحیلہ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں اس کی کوئی کوتاہی نہیں بلکہ یہ حالات کا جبر تھا جس سے اسے ہر حال میں گزرنا پڑا۔

”کہاں رہ رہی ہو آج کل؟“ راحیلہ نے اس سے پوچھا۔

”بس ملا ہوا ہے ایک ٹھکانا۔ بالکل اسی طرح جیسے اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کے سب سے بڑے دشمن فرعون کے محل میں دیا ہوا تھا۔“

اس کے سوال نے اسے خود بھی اپنے رب کی اس مہربانی کا پہلی بار احساس دلایا۔ یہ کتنا عجیب تھا کہ وہ شخص جو اس کا سب سے بڑا دشمن تھا اور جس سے وہ سب سے زیادہ نفرت کرتی تھی، اسی شخص کے ایک ٹھکانے پر اسے پناہ ملی ہوئی تھی اور زندگی کی تمام بنیادی ضروریات میسر آتی رہی تھیں۔ مہناز نے ترس کھا کر جس وقت اسے اپنے ساتھ اپنے اپارٹمنٹ میں رکھا تھا، اس وقت وہ بہت کمزور اور بے بس تھی۔ اسے وہاں رہ کر نہ صرف خود کو سنبھالنے کا موقع ملا بلکہ اس نے اپنی بدلی ہوئی جسمانی ہیئت کے ساتھ جینے کا ہنر بھی سیکھا۔ اگر مہناز اسے اپنے ساتھ اپنے اپارٹمنٹ میں نہ رکھتی تو باذل سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ اسے بھیک مانگنے کے لیے کسی چوک پر بٹھا دیتا لیکن وہ ایسا نہیں کر سکا کہ ہر وقت کا فرعون قدرت کے فیصلوں کے آگے بے بس ہوتا ہے۔ وہاں رہنے کا اسے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا تھا کہ اس کا دشمن ہمیشہ اس کی نظروں کے سامنے رہا تھا اور اسے اس بات کی فکر نہیں رہی تھی کہ اس سے اپنا انتقام لینے کے لیے اسے اس کو تلاش کرنا پڑے گا۔ وکی سے رابطہ ہونے کے بعد وہ اپنی بساط بھر ان لوگوں کو باذل کے متعلق معلومات بھی فراہم کرتی رہی تھی اور اپنے اس سارے صبر کا صلہ اس نے اس صورت دیکھا تھا کہ باذل بے بسی کی حالت میں مجرموں کی طرح اس کے سامنے پیش کیا گیا تھا اور اسے یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ اس کو اس کے جرائم کی سزا سنا سکے۔

”کس سوچ میں ڈوب گئی ہو؟“ راحیلہ نے اسے بہت دیر تک چپ کھڑے دیکھ کر ٹوکا۔

”کچھ نہیں۔ تم اپنی سناؤ کیسی ہو اور آج کل کیا کر رہی ہو؟“ اس نے سر جھٹک کر سارے خیالات کو بھی ذہن سے جھٹکا اور مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے اس سے

پوچھا۔ یہ قسمت کا بہت بڑا ستم تھا کہ جب وہ مسکراتی تھی تو ماضی کی طرح مسکراہٹ اس کے چہرے کو روشن نہ کرتی تھی بلکہ ٹیڑھا ہو جانے والا منہ مزید ٹیڑھا ہو جاتا تھا۔

”یہاں قبرستان میں کھڑے کھڑے کیا سناؤں۔ میرے ساتھ میرے گھر چلو۔ وہاں بیٹھ کر اطمینان سے باتیں کریں گے۔ کچھ میں اپنی کہوں گی، کچھ تم اپنی سناؤ۔ کوئی دو چار دن کا قصہ تو ہے نہیں کہ لکھوں میں بیان ہو جائے۔“

”تمہارے گھر.....؟“ راحیلہ کی پیشکش نے اسے تذبذب میں ڈال دیا۔

”انکار مت کرنا ورنہ مجھے ایسا لگے گا کہ می پاپا نے تمہارے ساتھ جو رویہ روا رکھا تھا، تم نے اسے معاف نہیں کیا۔“ راحیلہ اسے تذبذب میں دیکھ کر جلدی سے بولی۔

”معافی کیسی؟ میں نے تو اس وقت بھی انہیں غلط نہیں سمجھا تھا لیکن خیر..... تمہاری تسلی اسی طرح ہوتی ہے تو میں چلتی ہوں تمہارے ساتھ تمہارے گھر۔“ بشریٰ نے آخر کار ہتھیار ڈال دیے۔ راحیلہ اس کے اس فیصلے پر کھل اٹھی اور وہ دونوں اس حال میں قبرستان سے باہر آئیں کہ راحیلہ نے بڑی محبت سے اس کا ہاتھ تھاما ہوا تھا اور بہت دھیمی رفتار سے چلتی تھی کہ کہیں بشریٰ کو اپنے لنگ کی وجہ سے اس کی تیز رفتاری کا ساتھ دینے میں مشکل نہ پیش آئے۔

”نئی گاڑی لی ہے؟“ وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتی قبرستان کے باہر کھڑی ایک چمکتی ہوئی کار تک پہنچیں تو بشریٰ نے چونک کر پوچھا۔

”زندگی میں بہت کچھ تبدیل ہو کر نیا آ گیا ہے۔ ان میں سے ایک یہ گاڑی بھی ہے۔“ بشریٰ کو اس کی مسکراہٹ میں ہلکی سی یاسیت کے ساتھ کوئی بھید بھی چھپا ہوا محسوس ہوا لیکن اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔ جب وہ اس کے ساتھ جاری تھی تو پھر ہر سوال کا جواب بھی مل جاتا تھا۔

”میں اکثر ان قبروں پر آتی رہتی ہوں لیکن عجیب اتفاق ہے کہ پہلے کبھی تم سے سامنا ہی نہیں ہوا۔ تم بھی تو آتی رہتی ہوگی نا یہاں؟“ وہ دونوں گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوئیں تو راحیلہ نے اپنی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے اس سے استفسار کیا۔

”نہیں۔ میں نہیں آتی تھی۔ میں آج ہی آئی ہوں۔“ ”واقعی؟“ راحیلہ مزید حیران ہوئی۔

”ہاں، ایسا ہی ہے کیونکہ اب سے پہلے میرے پاس نہ مہلت تھی نہ موقع۔“ اس کے انداز میں ایک محسوس کیا

جانے والا کرب تھا۔ راحیلہ مزید کوئی سوال نہ کر سکی۔ اس کے بعد گھر تک کا درمیانی راستہ خاموشی ہی میں کٹا۔ بشریٰ نے لوٹ کر لیا تھا کہ وہ جن راستوں سے گزر رہی ہے، وہ ان راستوں سے مختلف ہیں جو کبھی راحیلہ کے گھر کی طرف جایا کرتے تھے لیکن اس نے سوال نہیں کیا کہ وہ پہلے ہی اسے بتا چکی تھی کہ زندگی میں بہت کچھ تبدیل ہو کر نیا آ چکا ہے۔ راحیلہ نے گاڑی جس گھر کے گیٹ کے سامنے روک کر ہارن دیا، وہ اس کے ساتھ گھر سے زیادہ خوبصورت اور شاندار تھا اور دیکھنے ہی سے اندازہ ہو رہا تھا کہ نئی تعمیر ہے۔ گیٹ ایک ملازم نے کھولا اور راحیلہ نے بڑی شان سے گاڑی لے جا کر پورچ میں روک دی۔

”روبو کہاں ہے؟ اسے بھیجو میرے پاس۔“ وہ گاڑی کا انجن بند کر کے جب تک باہر نکلی، ملازم گیٹ بند کر کے اس طرف آ چکا تھا۔

”جی میڈم!“ وہ فوراً وہاں سے چلا گیا۔ ”بڑی بیگم صاحبہ بن گئی ہو۔“ بشریٰ نے محسوس کیا کہ صرف اس کی گاڑی اور گھر ہی تبدیل نہیں ہوئے تھے بلکہ وہ خود بھی خاصی بدلی بدلی سی نظر آ رہی تھی۔

”میں کیا بنی ہوں، بس وقت نے بنا دیا ہے۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا پھر پہلے کی طرح اس کا ہاتھ تھام کر اندر کی طرف بڑھ گئی۔ ابھی وہ دونوں اندر جا کر بیٹھی تھیں کہ ایک پینتیس چھتیس سالہ چست سی عورت چلی آئی۔

”ہاں بھی ربو اب بات یہ ہے کہ یہ ہیں ہماری سب سے پیاری اور پکی سہیلی مس بشریٰ! ان کے لیے تمہیں بہت شاندار سا کھانا تیار کرنا ہے۔“

”بن جائے گا میڈم! آپ بتائیں کیا کیا بنانا ہے؟“ اس نے مستعدی سے پوچھا۔

”وہاٹ کڑا ہی، فرائیڈ رائس، شامی کباب، مکس سبزی، رشمن سلاد، ملائی.....“

”روکو بہن! رکو..... تم یہ اس بیجاری کو ایک وقت کے کھانے کا میو بتا رہی ہو یا خود کسی ہوٹل کی ویٹر بن گئی ہو جو نان اسٹاپ کھانوں کے نام گنوا تی ہی جا رہی ہو۔“ بشریٰ نے اس کی لسٹ کو طویل ہوتے دیکھ کر درمیان میں ٹوکا۔

”اتنے عرصے بعد ہم ایک دوسرے کے ساتھ کھانا کھا میں گے۔ میرا دل چاہ رہا ہے تمہاری پسند کی ساری ڈشز بنالوں۔“ اس نے ہنس کر جواب دیا۔

”اپنے دل کی ماننے میں کچھ خیال اس بیجاری کا بھی کرو۔ اتنا سب کچھ ایک ساتھ بنانے میں تو وہ کھب جائے گی۔“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے جی، میں بتاؤں گی جو جو میڈم کہیں گی۔ آج پہلی بار تو یہ اتنی خوش نظر آرہی ہیں اور پہلی بار ہی اتنی ساری فرمائشیں کی ہیں۔“ جس بیچاری پر رحم کھایا جا رہا تھا، اس نے بھی اپنی مالکین کی ہی حمایت کی۔

”چلیں جی، آپ کو اپنے اوپر رحم نہیں آتا تو نہ سہی، پر مجھ پر تو رحم کریں۔ میرا معدہ یہ اتنا سب کچھ ایک ساتھ کھانے کا تحمل نہیں ہو سکتا۔ بس فرائیڈ رائس اور ساتھ کوئی ایک سالن بنالیں۔“ اس نے اپنا فیصلہ سنایا۔

”ساتھ دھانٹ پاستا اور سویوں کا زردہ ضرور بنالینا۔ بشریٰ کو بہت پسند ہے۔“ راحیلہ نے جلدی سے اس مختصر میلو میں اضافہ کیا۔ روبو فرمانبرداری سے سر ہلا کر سامنے سے ہٹ گئی۔

”میں تو بھول ہی چکی تھی اپنی پسند ناپسند کو۔ آج بڑے دنوں بعد یاد آیا کہ کبھی کبھار پسند بھی ہوا کرتا تھا۔ تم نے خوب یاد رکھا ہوا ہے میری ایک ایک پسند کو۔“

”جیسے تم کبھی نہیں بھولیں ویسے ہی تمہاری پسندیدہ چیزیں بھی کبھی ذہن سے نہیں نکل سکتیں۔ آؤ میرے ساتھ میرے بیڈ روم میں چلو۔ میں تمہیں کچھ دکھانا چاہتی ہوں۔“

”چلو بھی، چلتے ہیں۔ تمہارے گھر تمہارے رحم و کرم پر ہیں۔ تم جو بھی حکم دو گی، ہم عمل کرتے جائیں گے۔“

”اتنی فرمانبرداری کا مظاہرہ کر رہی ہو تو میرا یہ حکم بھی مان لو کہ کم از کم آج کی رات تمہیں میرے ساتھ میرے گھر پر ضرور رکنا ہے۔“

”لیکن.....“

”کوئی لیکن دیکھ نہیں۔ اتنے عرصے کی جدائی کا اتنا مداوا تو ہونا چاہیے کہ ہم رات بھر ساتھ بیٹھ کر گپیں مار سکیں۔“ اس کے لہجے میں وہ استحقاق تھا جو ایک دوست دوسرے دوست پر جتا سکتا ہے۔ بشریٰ نے اس کے اس حق کو تسلیم کیا اور ہتھیار ڈالتے ہوئے بولی۔

”ٹھیک ہے بابا۔ جیسے تم کہو لیکن پہلے ذرا میں مہناز کو تو اطلاع دے دوں۔“ اس نے بیگ میں سے اپنا موبائل نکالا اور مہناز کا نمبر ملائے لگی۔

راحیلہ نے نوٹ کیا کہ وہ اپنی اگلیوں کے ٹیڑھے پن کے باوجود یہ کام خاصی مہارت سے کر رہی تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ ایسے ہی کام کرنے کی عادی ہے۔ سبیلی کی اس حالت نے ایک بار پھر اسے تکلیف دی لیکن ضبط سے کام لے گئی اور جیسے ہی وہ کال سے فارغ ہوئی، مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”یہ مہناز کون ہے؟“

”جبر کی ایک اور داستان جو بظاہر بہت ٹپ ٹپ میں

دکھائی دیتی ہے لیکن اندر سے بُری طرح زخمی ہے۔ میں آج کل اسی کے ساتھ رہ رہی ہوں۔“

”کسی دن ملو نا مجھے اس سے۔ میں مل کر اس کا شکریہ ادا کروں گی اور کہوں گی کہ ہم تو حق دوستی نبھانہ سکے۔ تمہاری بہت مہربانی کہ مشکل وقت میں ہماری سبیلی کا سہارا بنیں۔“

راحیلہ کے اندر کا گلٹ بار بار ظاہر ہو جاتا تھا۔

”اب تم نے اس طرح کی کوئی بات کی تو میں یہاں سے فوراً چلی جاؤں گی۔ جب میں نے ایک بار کہہ دیا ہے کہ مجھے تم سے یا کسی سے بھی کوئی شکایت نہیں ہے تو پھر ایسی باتوں کا کیا مطلب؟“

”اچھا بابا! اب نہیں کروں گی ایسی کوئی بات۔ تم اپنا موڈ ٹھیک کر لو۔“ وہ بشریٰ کی ناراضی محسوس کر کے گھبرا گئی۔

”اب چل کر دکھا دو کہ کیا دکھانا چاہتی تھیں؟“ بشریٰ نے بھی فوراً بات کو ختم کر دینا مناسب سمجھا۔

”ہاں، آؤ چلو میرے ساتھ۔“ راحیلہ نے بھی جلدی سے اپنی جگہ چھوڑ دی پھر کچھ خفیف سی ہو کر بولی۔

”اوپر فرسٹ فلور پر ہے میرا بیڈ روم۔ تمہیں سیزدھیاں چڑھنے میں کوئی دشواری تو نہیں ہوگی؟“

”بالکل بھی نہیں، بلکہ چاہو تو میرے ساتھ ریس لگا لو۔ میں تم سے زیادہ تیزی سے اوپر پہنچ جاؤں گی۔“

”دافنی!“ راحیلہ کو خوشگوار سی حیرت ہوئی۔

”ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ ابھی لگا لوریس۔“ بشریٰ نے چیلنج کیا۔

”نہیں، رہنے دو۔“ وہ اب بھی جھجک کا شکار تھی۔

”ایسے کیسے رہنے دو۔ تمہیں میرا چیلنج قبول کرنا پڑے گا۔“ بشریٰ بغض ہوئی تو اسے ہتھیار ڈالنا پڑے۔

دونوں اوپر جاتی چوڑی سیزدھیوں کے ایک ایک جانب کھڑی ہو گئیں اور باقاعدہ غنٹی گن کر ریس کا آغاز کیا۔ شروع کے دو تین قدموں تک تو راحیلہ کا دھیان ریس جیتنے سے زیادہ بشریٰ کی طرف ہی رہا کہ آیا وہ سیزدھیاں چڑھ بھی پائے گی یا نہیں لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران ہو گئی کہ وہ نہ صرف سیزدھیاں چڑھ رہی تھی بلکہ اتنی زیادہ تیزی سے چڑھ رہی تھی کہ اس سے دو تین قدم پچھے آگے نکل چکی تھی۔ اس نے یکدم ہی بشریٰ سے حقیقی مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا اور خود بھی اپنے قدموں کی رفتار بڑھا دی۔ بشریٰ نے اسے ایسا کرتے دیکھا تو کچھ اور تیزی دکھائی اور اگلا لمحہ ایسا تھا کہ راحیلہ کی جان حلق میں آ گئی۔ اس نے تیز رفتاری سے اوپر چڑھتی بشریٰ کا پیر رہنے سے توازن بگڑتے دیکھا تو بے ساختہ اس کے حلق

میں ڈھونڈ نکالنے والی۔" بشری ہنس دی۔
 "تمہیں اس سائنس کا نہیں معلوم ہے۔ کھانے پینے
 سے بندے کا دھیان بٹ جاتا ہے اور فینشن کم ہو جاتی ہے۔"
 "فینشن کم کہاں ہوتی ہے۔ پھر تم اس فکر میں مبتلا
 ہو جاتی ہو کہ وزن دن بدن بڑھنے سے سارے نئے اور
 اسٹائلش کپڑے تنگ ہو رہے ہیں۔ پھر جم اور فٹنس کلب
 کے چکر لگنے شروع ہو جاتے ہیں۔"

"اب ایسا نہیں ہوتا میری جان! اب میں روز کے
 روز واک اور ایکسرسائز کے ذریعے اپنا وزن مینٹین رکھتی
 ہوں اس لیے سب کچھ کھاپی کر بھی اسارٹ ہی ہوں۔" اس
 نے اپنی خواب گاہ کا دروازہ کھولتے ہوئے فرضی کار
 جھاڑے تو بشری کو ماننا پڑا کہ وہ درست کہہ رہی ہے کیونکہ
 ماضی میں فربہ بی مائل رکھنے والا اس کا جسم اب بہت اسارٹ
 ہو چکا تھا۔

"ارے..... یہ تم ہو۔" کمرے میں قدم رکھتے ہی
 اس کی نظر سب سے پہلے دیوار پر لگی انٹارچ تصویر
 پر پڑی۔ تصویر میں وہ دلہن کے روپ میں سبھی سنوری کھڑی
 گہرے کی طرف دیکھ رہی تھی اور شیروانی میں ملبوس
 دولہا ہونٹوں پر شوخ سی مسکراہٹ لیے اسے والہانہ نظروں
 سے دیکھ رہا تھا۔ وہ لپک کر تصویر کے قریب پہنچی۔

"اچھا تو یہ ہے وہ سر پر اتر جسے دکھانے کے لیے تم
 مجھے یہاں لائی ہو۔ اف..... تم دلہن بن کر کتنی شدید
 خوبصورت لگ رہی ہو۔ مجھے تو امید ہی نہیں تھی کہ تم ایسی
 پیاری دلہن بھی لگ سکتی ہو اور یہ..... یہ کون ہے؟ شکل تو جانی
 پہچانی سی لگ رہی ہے۔" وہ جو زندگی کی تکلیفوں سے گزر کر بنا
 ضرورت بولنا ہی بھول چکی تھی، ایک بار پھر پرانی بشری کی
 طرح چپک رہی تھی۔

"ذہن پر زور دو تھوڑا سا۔"

"ارر..... رے۔ یہ تمہارے وہ کزن تو نہیں ہیں جو
 بقول تمہارے تم پر مرتے تھے اور تم اس وجہ سے ان سے
 اری ٹیٹ ہوتی تھیں کہ جہاں ملاقات ہو، موصوف کی نظریں
 تم سے چپک جاتی ہیں۔" آخر اس نے تصویر میں موجود
 راحیلہ کے چچا زاد کزن کو شناخت کر لیا۔
 "وہی ہیں۔" راحیلہ نے اعتراف کیا۔

"حیرت ہے۔ تم تو اچھا خاصا چڑتی تھیں ان سے پھر
 شادی کے لیے ہاں کیسے کر دی۔" بشری اب بھی تصویر کا
 جائزہ لے رہی تھی۔

"مئی پاپا کے بعد ایک دم سے خود کو بہت تنہا محسوس

سے ایک چیخ بلند ہوئی۔ اس چیخ میں بشری کے ہاتھ سے
 چھوٹ کر سنگ مرمر کے پختہ فرش پر گر کر ٹکرانے والے
 موبائل کا ہلکا سا شور بھی شامل تھا۔ ان آوازوں کو سن کر کچن
 میں کام کرتی ملازمہ جب تک دوڑ کر وہاں پہنچی، بشری
 سیزھیوں کی رینگ کو مضبوطی سے تھام کر خود کو نیچے گرنے
 سے محفوظ کر چکی تھی۔

"تم..... تم ٹھیک تو ہونا بشری؟" راحیلہ نے پھرتی
 سے درمیانی فاصلہ طے کیا اور اسے دونوں ہاتھوں سے سہارا
 دے کر فکر مندی سے پوچھا۔

"میں تو ٹھیک ہوں لیکن میرا موبائل مرحوم ہو چکا
 ہے۔" اس نے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ سا کر شوخی کا
 مظاہرہ کرنا چاہا لیکن حقیقت یہ تھی کہ ایک ہل کے لیے اس کا
 اپنا دل بھی سہم گیا تھا۔ وہ پہلے ہی نیم معذوری کی زندگی
 گزار رہی تھی۔ سیزھیوں سے پختہ فرش پر جا گرتی تو جانے
 کیا نتیجہ نکلتا۔

"ہونے دو موبائل کو مرحوم۔ سمجھو تمہاری جان کا
 صدقہ نکلا۔" راحیلہ کا دل ابھی تک بڑی طرح دھڑک رہا تھا
 اور اندر ہی اندر وہ خود کو ملامت کر رہی تھی کہ بشری کی جسمانی
 حالت کو دیکھنے کے باوجود وہ اس بچکانہ حرکت کے لیے تیار
 ہی کیوں ہوئی تھی۔

"بی بی! یہ موبائل۔" ربو نے موبائل اس کے علیحدہ
 ہو جانے والے کورسیت لاکر راحیلہ کے ہاتھ میں تھما دیا۔
 "ہاں ٹھیک ہے۔ تم ذرا ملک ٹیک بنا کر میرے بیڈ
 روم میں پہنچا دو۔" راحیلہ نے بے نیازی سے موبائل تھام کر
 اسے حکم دیا۔

"ملک ٹیک کی کیا ضرورت ہے۔ وہ جو تم اتنا دعوتی
 سا کھانا بنا رہی ہو، اس کے لیے پیٹ میں جگہ نہیں رکھنی ہے
 کیا۔" بشری نے سن کر احتجاج کیا۔

"چپ رہو۔ یہ جو ابھی جان حلق میں آگئی تھی نا، اس
 نے ساری توانائی نچوڑ لی ہے۔ اختلاج قلب الگ ہو رہا
 ہے۔ فوری توانائی کی بحالی کا انتظام نہ ہوا تو ہارٹ ایک بھی
 ہو سکتا ہے۔ ویسے بھی ابھی کھانے کا وقت ہونے میں کافی
 دیر ہے۔ جب تک کھانا لگے گا، پتا بھی نہیں لگے گا کہ ملک
 ٹیک کا یا ایک عدد گلاس کدھر گیا۔"

اس نے بشری کو ڈپٹ کر رکھ دیا اور باقی کی سیزھیوں
 اس کا ہاتھ تھام کر طے کرنے لگی۔ ملازمہ رہو پہلے ہی انہیں
 آپس میں بحث کرتا چھوڑ کر کچن کی طرف جا چکی تھی۔

"ابھی تک ویسی ہی ہو۔ ہر مسئلے کا حل کھانے پینے

کرنے لگی تھی۔ اس جان لیوا تنہائی کے دلوں میں ہی مجھے آصف کے رویے سے احساس ہوا کہ وہ بہت خیال رکھنے والے انسان ہیں۔ کچھ پاپا کی مرنے سے تھوڑا عرصہ پہلے کی جانے والی گفتگو کا بھی اثر تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں تمہیں تمہاری زندگی سے متعلق فیصلہ لینے کے حق سے محروم نہیں کرنا چاہتا لیکن یہ مشورہ ضرور دینا چاہتا ہوں کہ جیون سا بھی جتنے وقت ایک بار آصف کے بارے میں غور ضرور کرنا۔ تعلیم، ملازمت اور گلس کے حوالے سے اس کی جو خوبیاں ہیں سو ہیں، وہ دل کا بہت اچھا ہے اور میں یہ اس لیے نہیں کہہ رہا ہوں کہ وہ میرا عزیز بھتیجا ہے بلکہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ برسوں کے تجربے کے بعد مجھے بندے کی کچھ نہ کچھ تو پہچان ہو ہی گئی ہے۔

”یعنی تم نے انکل کی خواہش کے آگے ہتھیار ڈال دیے؟“
 ”ایسا ہی ہے لیکن میں اپنی اس ہار سے خوش ہوں۔“
 می پاپا کے بعد کا وقت ایسا تھا کہ مجھے شادی کا فیصلہ لینا ہی تھا۔ نہ تو میں ملازموں کے ساتھ گھر میں اکیلی رہ سکتی تھی اور نہ ہی دوسرے معاملات ہینڈل کر سکتی تھی۔ تو میں نے اس شخص کو چن لیا جس کے لیے میرے باپ نے مجھ سے سفارش کی تھی۔ یقین کرو آصف اتنے اچھے شوہر ثابت ہوئے ہیں کہ میں اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ میں نے پاپا کی خواہش مان کر اپنے حق میں بہت اچھا کیا۔“ راحیلہ کی آنکھوں میں اپنے شوہر کے لیے محبت اور احترام تھا۔
 ”بہت مبارک ہو۔ میں بہت خوش ہوں کہ تمہاری زندگی کو کوئی کنارہ مل گیا۔“ بشری نے اسے گرجوٹی سے گلے لگاتے ہوئے خلوص دل سے مبارک باد دی۔

”ہاں، لیکن پڑھائی ادھوری رہ گئی ہے نا۔“
 ”پڑھائی تو تم اب بھی کر سکتی ہو۔ تمہیں کون سا چولہا، چوکی کرنا ہے۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ ہر کام کے لیے ملازم موجود ہیں اور تم بیگم صاحبہ بنی صرف حکم چلائی رہتی ہو۔“
 ”کام کاج کا مسئلہ نہیں یا! کوئی اور بات ہے۔“

”کہیں تمہارے میاں کی طرف سے تو پابندی نہیں؟“ بشری نے اندازہ لگایا۔
 ”ان کی طرف سے تو نہیں لیکن ساس یعنی میری چچی کی طرف سے ہے۔“ اس نے منہ بنایا اور پھر دستک پر دروازے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ آنے والی ربو بھی اور ان کے لیے ملک شیک بنا کر لائی تھی۔

”تم دونوں میاں بیوی بھی شیک پی لینا۔ آج دیے ہی میں نے تمہیں بہت کام دے دیا ہے۔“ ربو جوس رکھ کر

جانے لگی تو اس نے اسے تاکید کی۔

”کام کا کوئی مسئلہ نہیں میڈم! ہم کام کے ہی تو پیسے لیتے ہیں اور آپ تو اتنی اچھی ہیں کہ میں دعا کرتی ہوں کہ اللہ سب کو آپ جیسی ہی مالکین دے۔“ ربو نہایت عقیدت سے جواب دے کر باہر نکل گئی لیکن بشری کے ہونٹوں سے ہنسی پھوٹ پڑی۔

”یہ تو بالکل ایسے کہہ کر گئی ہے جیسے خواتین کسی لڑکی کو اچھا بر ملنے پر دعا کرتی ہیں کہ باقی سب لڑکیوں کو بھی ایسا ہی اچھا بر ملے۔“

”ہاں، عموماً تو ایسا ہی ہوتا ہے لیکن سچ یہی ہے کہ ہمیں ہر جگہ اچھے لوگوں سے واسطہ پڑنے کی ہی دعا کرنا چاہیے۔“ اس کے لہجے میں کچھ ادا سی سی تھی۔

”کیا کوئی مسئلہ ہے؟“ بشری اس کے لیے متکڑ ہوئی۔

”نہیں، کوئی مسئلہ نہیں۔ آؤ ملک شیک پیتے ہیں۔“

اس نے بشری کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے ساتھ بیڈ کے مقابل رکھے کاؤچ پر بٹھالیا۔

”تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو۔“

”جہیں، کچھ نہیں چھپا رہی۔ بس چھوٹی سی بات ہے۔“

اصل میں مسئلہ یہ ہے کہ آصف کی بھابی یعنی میری جیٹھائی در رنگ دیکھن ہیں۔ انہوں نے شادی کے بعد بھی ملازمت جاری رکھی اور خدا کا کرنا یہ ہوا کہ پہلی پرنسپلنسی میں ہی ان کے ساتھ مسئلہ ہو گیا۔ وہ آفس میں تھیں اور لفٹ خراب ہونے کی وجہ سے سیزھیوں سے اوپر جا رہی تھیں کہ پیر پھسل گیا۔ اس حادثے میں انہوں نے اپنا بے بی کھودیا اور بد قسمتی سے اتنے برس گزر جانے کے بعد اب تک دوبارہ خوشخبری نہیں ملی تو بس چچی تھوڑی دہی ہو گئی ہیں۔ انہوں نے مجھ سے صاف کہہ دیا ہے کہ پہلے مجھے پوتے یا پوتی کا

حفہ چاہیے، پی ایچ ڈی کرنی رہنا۔ اب ان کی اس شرط کو پورا ہونے تک میں یونیورسٹی نہیں جاسکتی۔“

”یہ تو بہت عجیب شرط رکھ دی انہوں نے۔ حادثہ ہونا

ہو تو خدا نا خواستہ گھر میں بھی ہو سکتا ہے۔ آصف بھائی کو

چاہیے تھا کہ اس احمقانہ شرط کے خلاف اسٹینڈ لیتے۔“

تفصیل سن کر بشری نے اپنی رائے دی۔

”وہ ایسا کرنے جا رہے تھے لیکن میں نے روک دیا۔“

”وہ کیوں؟“

”میں نہیں چاہتی کہ میرے معاملے میں آصف ہر

وقت اپنی والدہ کے مقابل کھڑے ہوں۔ پہلے ہی انہوں

نے مجھے ان کی مرضی کے خلاف جوائنٹ فیملی کے بجائے

یہاں الگ گھر میں رکھا ہوا ہے جبکہ بڑے بھائی اور بھابی ابھی تک ان کے ساتھ ہی رہتے ہیں۔ اب ایک اور معاملے میں ان کی حکم عدولی کر کے میں ان کا دل دکھانے کا سبب نہیں بننا چاہتی۔“

”پاکل ہو تم جو اس انداز میں سوچتی ہو۔ اپنا حق حاصل کرنا کوئی ایسی غلط بات نہیں ہے جس سے کسی کی دل آزاری ہو۔“ اس کی بتائی ہوئی وجہ سن کر بشری نے اسے سمجھایا۔

”پاکل پن ہی سمجھ لو لیکن می پاپا اور چچا کے بعد چچی ہی ہمارے خاندان کی واحد بزرگ بنتی ہیں اور میرا دل چاہتا ہے کہ ان کی فرمانبرداری کر کے میں ان کی دعائیں لوں۔ زندگی میں دعا دینے والوں کا ہونا بہت ضروری ہوتا ہے۔“

”ہاں یہ تو ہے۔ دعائیں دینے والے باقی نہ رہیں تو زندگی ویران ہو جاتی ہے۔“ وہ گہری اداسی میں ڈوب گئی۔ شفیق والدین کی دردناک جدائی کا غم تو نس نس میں آگ بن کر دوڑتا تھا کہ ان کے بعد زندگی کا ہر دن گویا جلتے ہوئے صحرا میں گزرتا تھا۔

”باتوں باتوں میں، میں تمہیں وہ دوسرا سر پرانہ دینا تو بھول ہی گئی جس کے لیے خاص طور پر تمہیں یہاں لائی تھی۔“ راحیلہ نے اس کی اداسی کو محسوس کر لیا اور فوراً ہی موضوع بدل کر الماری کی طرف بڑھی۔ کچھ دیر وہاں مصروف رہنے کے بعد واپس پلٹی تو اس کے ہاتھ میں ایک لمبوتری شکل کا خوبصورت گنٹ پیک موجود تھا۔ اس نے وہ گنٹ پیک بشری کے ہاتھوں میں تھمایا۔ بشری نے کچھ نا سمجھی کی کیفیت میں گنٹ پیک کے اوپر لگاوش کارڈ کھول کر اس پر لکھے الفاظ پڑھے۔ لکھا تھا۔

”پہلی برتھ ڈے ٹویو مائی ڈیرسٹ فرینڈ! آئی مس یوسو مچ!“ ان الفاظ کے نیچے بشری کی تاریخ پیدائش درج تھی۔

”میں تمہاری برتھ ڈے پر تمہیں بہت مس کر رہی تھی۔ بہت روئی بھی تھی۔ پھر پتا نہیں کیا سوچھی کہ تمہارے لیے یہ گنٹ خرید لائی۔ دل کو ایک آس سی تھی کہ بھی نہ بھی تم مجھے ضرور ملو گی اور اس دن میں تمہیں یہ دے سکوں گی اور دیکھو، اللہ نے تمہیں مجھ سے ملوایا دیا۔“ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ کچھ بھی کیفیت بشری کی بھی تھی۔

”کھول کر تو دیکھو۔ مجھے یقین ہے تمہیں میرا تحفہ ضرور پسند آئے گا۔“ راحیلہ کے لہجے میں بچوں جیسی ایکساٹمنٹ تھی۔ بشری نے آنکھوں میں اشتیاق لیے بڑی

احتیاط سے گنٹ کی پیکنگ کھولی۔ اندر ایک خوبصورت ساڈبا تھا۔ ڈبے کا ڈھکن کھولنے پر نظروں کے سامنے نقری رنگت کا قلم چمکا۔ قلم کے ڈھکن پر نیلے رنگ کے بے انتہا باریک اور چمک دار ٹکینے ایک خاص ترتیب سے چوست تھے۔ وہ کچھ دیر مبہوت سی بیٹھی اس خوبصورت قلم کو دیکھتی رہی پھر سر زدہ سی کیفیت میں قلم کو ڈبیا سے باہر نکال کر اس کا ڈھکن کھولا۔ قلم کی نقری نب کی چمک نے اس کی آنکھوں میں چمک بھردی۔ کتنا عرصہ ہو گیا تھا کاغذ قلم سے اس کا رشتہ ٹوٹنے ہوئے۔ زندگی اتنے طوفانوں سے گزری تھی کہ اسے خود بھی نہیں پتا چلتا تھا کہ وہ کیا سے کیا ہو چکی ہے۔

”مجھے لکھنے کے لیے کچھ دو۔“ وہ راحیلہ سے مخاطب تھی لیکن دیکھ صرف اور صرف قلم کو رہی تھی۔

”ابھی دیتی ہوں۔“ راحیلہ نے جلدی سے کہیں سے رائٹنگ پیڈ اور دو ات برآمد کر کے اس کے سامنے رکھی۔ بشری نے بڑی نزاکت سے ڈھکن کھول کر قلم میں سیاہی بھری۔ یہ سب کرتے ہوئے اگرچہ اس کی بدہیت ہو جانے والی انگلیاں کانپ رہی تھیں لیکن انداز میں ایک ردھم تھا، اس ماہر رقاص کی طرح جس کے اعضا بھی غلط رخ پر حرکت نہیں کرتے۔ اگرچہ جدید دور کے تقاضے کے مطابق وہ بھی لکھنے کے لیے کمپیوٹر اور لپ ٹاپ وغیرہ کثرت سے استعمال کرتی رہی تھی لیکن کاغذ قلم سے عشق اس کے خون میں رچا ہوا تھا۔ اس کے والد..... نے خود اسے قلم پکڑ کر موتیوں جیسی لکھائی میں لکھنا سکھایا تھا۔ سو، یہ تھا کہ چاہے دنیا جتنی بھی جدید ہو گئی تھی، کاغذ قلم سے ان باپ بیٹی کا ناتا نہیں ٹوٹتا تھا۔ قلم ہاتھ میں آتا تھا تو انگلیاں کاغذ پر لفظ اتارنے کے لیے ایسے بے چین ہو جاتی تھیں جیسے روح کی گہرائیوں سے ناپنے والا رقاص موسیقی کی آواز پر اپنے بدن کی حرکت کو روکنے پر قادر ہی نہ ہو۔ وہ بھی اپنی عزیز سہیلی کے دے نقری قلم سے کاغذ پر موتی بکھیر رہی تھی۔ راحیلہ نے یہ منظر دیکھا اور چپکے سے باہر نکل گئی کہ اسے یہاں اپنا وجود بالکل ویسے ہی اضافی لگ رہا تھا جیسے محب و محبوب کی ملاقات میں تیسرا۔

دوبارہ ان کی ملاقات کھانے کی میز پر ہی ہوئی۔ بشری اس دوران مسلسل لکھتی رہی تھی اور اس وقت اس کے چہرے پر ہلکی سی ٹھنکن کے آثار کے ساتھ ڈیروں سرشاری دکھائی دے رہی تھی۔

”اتنی دیر لکھتی رہیں۔ لگتا ہے کچھ خاص لکھ ڈالا۔“

راحیلہ نے اس کی طرف چادلوں کی ڈش بڑھاتے ہوئے

اشتیاق سے کہا۔

کت کر آخری پہر تک پہنچ گئی، خبر ہی نہیں ہوئی۔ آخر راحیل نے ہی کہا۔

”میرے خیال میں کچھ دیر کے لیے سو جاتے ہیں تاکہ صبح ناشتے پر آصف سے ملاقات ہو تو ہم ان کے سامنے بیٹھ کر جمائیاں نہ لے رہے ہوں۔“

”میں نہیں لوں گی۔ میری گارنٹی ہے لیکن تمہارا کوئی بھروسہ نہیں۔“ بشری جانتی تھی کہ وہ غینہ کی جہی ہے اس لیے اسے چھیڑا۔ وہ بھی بُرا مانے بغیر ہنس دی اور تھوڑی دیر میں وہی ہوا۔ بشری پلکوں پر غینہ اترنے کی منتظر تھی کہ وہ سو بھی گئی۔ بشری کافی دیر تک یادوں کے جنگل میں بھٹکتی رہی۔ سچ یہ تھا کہ راحیل سے ہونے والی ملاقات نے جہاں عرصے بعد کسی اپنے سے ملنے کی خوشی بخشی تھی وہاں کئی زخم اُدھر بھی گئے تھے اور دل ان دنوں کی یادوں میں کر لانے لگا تھا جب وہ اپنے ماں باپ کی شفقت کے سائے میں رہتی تھی اور دوستوں کے ساتھ زندگی کا لطف کشید کرتی تھی۔

جن کے دل کراتے ہوں، ان کی آنکھوں پر غینہ بڑی مشکل سے مہربان ہوتی ہے۔ اسے بھی سونے میں کافی دیر لگ گئی لیکن صبح جلدی جانے کی عادت کی وجہ سے پہلے ہی آنکھ کھل گئی۔ راحیل اتنی گہری نیند سو رہی تھی کہ اس کے

باتھ روم آنے جانے اور کمرے میں چلنے پھرنے کی آہٹوں کا بھی اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ اسے نیند پوری کرنے کا موقع دے کر خود کا ڈیج پر آگئی اور ایک سائڈ لیپ روشن کر کے اپنی کل لکھی گئی تحریر کے اوراق اٹھالے۔ ان اوراق کے برابر میں ہی اس کا مرحوم ہو چکا موبائل بھی پڑا تھا جس پر ہلکی سی تاسف کی نظر ڈال کر وہ محویت سے اپنی تحریر میں گم ہو گئی۔ کافی دیر بعد راحیل کی تھیرزدہ آواز نے اسے اس کیفیت سے نکالا۔

”او مائی گاڈ! اتنی دیر ہو گئی اور میری آنکھ ہی نہیں کھلی۔ تم کب سے جاگ کر اکیلی بور ہو رہی ہو؟ مجھے آواز ہی دے لیتیں۔“ دو جھلوں میں حیرت، ہدامت اور شکایت، سب کا اظہار کر کے اس نے بشری کی طرف سے جواب کا انتظار بھی نہیں کیا اور ایٹر کام کا بٹن دبایا۔

”ہاں رہو! ناشا تیار ہے نا؟“ اب وہ اپنی ملازمہ سے استفسار کر رہی تھی اور بشری دلچسپی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”ناشا بالکل تیار ہے میڈم! اور صاحب بھی بڑی دیر سے آئے آپ لوگوں کا انتظار کر رہے ہیں۔“ اس نے اطلاع دی۔

”او ہو، تو تم مجھے جگادیتی نا۔“ وہ سمجھ گئی کہ بشری کی

”لکھنے والا تو ہمیشہ خاص لکھنے کی نیت سے ہی قلم اٹھاتا ہے لیکن یہ اس کا نصیب ہوتا ہے کہ قلم پر وہ مہربان ہو اترے کہ وہ کاغذ پر کچھ خاص بھٹک کر سکے۔ میں نے بھی کچھ درد سپردِ قلماس کیے ہیں۔ کچھ خواہشوں کو کاغذ پر سانس لینے کے لیے آزاد چھوڑ دیا ہے۔ امید کے چند جگنوؤں کو روشنی بکھیرنے کے واسطے اکٹھا کرنے کی کوشش کی ہے اور ردِ بلا کے لیے دعاؤں کی حصار بندی کی ہے۔“ اس نے بہت ٹھہر ٹھہر کر اس کے سوال کا جواب دیا۔

”اف مائی گاڈ، بشری! جس تحریر کا تعارف اتنا خوبصورت ہے، وہ خود کتنی شاندار ہوگی۔“ راحیل نے بے ساختہ اسے داد دی۔

”تمہارا حسنِ ذوق ہے بس۔“ وہ عاجزی سے مسکرائی اور رشین سلاڈ میں سے انناس کا ایک ٹکڑا چن کر کانٹے کی مدد سے منہ میں ڈالا۔ سچ یہ تھا کہ اس کی انگلیاں اتنی تھک چکی تھیں کہ اب چمچے اور کانٹے کو پکڑنا بھی ایک مشقت سی لگ رہی تھی لیکن میزبان کے خلوص کا بھی خیال رکھنا تھا۔

”تمہارے ہسینڈ نہیں آئے، کیا وہ بہت دیر سے گھر آتے ہیں؟“ کھانا کھاتے ہوئے اسے خیال آیا کہ اپنی سہیلی کے شوہر سے اب تک ملاقات نہیں ہو سکی ہے۔

”اوہ..... میں تمہیں بتانا بھول گئی۔ اصل میں آصف کا فون آگیا تھا کہ وہ ایک کام میں پھنس گئے ہیں اس لیے ان کا آج رات گھر آنا ممکن نہیں ہوگا۔ میں نے انہیں تمہارے متعلق بھی بتایا تھا۔ جانتے تو ہیں ہی وہ تمہیں لیکن کبھی براہِ راست ملاقات نہیں ہوئی ہے تو بہت مشتاق ہیں تم سے ملنے کے۔ خاص تاکید کی ہے مجھے کہ ان کی واپسی تک تمہیں جانے کی اجازت نہ دوں۔“ راحیل نے اس کے سوال کا جواب دینے کے ساتھ ساتھ میاں صاحب کا ہدایت نامہ بھی سنایا۔

جواباً بشری لبوں پر ایک مسکراہٹ بکھیر کر رہ گئی۔ کل کی کس نے دیکھی تھی کہ کیا حالات ہوں گے۔

کھانے کے بعد دونوں سہیلیاں ایک بار پھر خواب گاہ میں آگئیں۔ آصف کی غیر موجودگی کے باعث طے یہ ہوا تھا کہ بشری گیسٹ روم کے بجائے اس کے بیڈ روم میں ہی ٹھہرے گی اور دونوں سہیلیاں خوب دل بھر کر باتیں کریں گی۔ باتیں بھی کیا تھیں، بس درد کے کچھ قصے تھے جو ایک دوسرے کو سنا کر اپنے اپنے دلوں کا بوجھ ہلکا کرنا تھا۔

پچھڑے ہوؤں نے اپنی اپنی داستان چھیڑی تو رات کیسے

کھانے کے بعد دونوں سہیلیاں ایک بار پھر خواب گاہ میں آگئیں۔ آصف کی غیر موجودگی کے باعث طے یہ ہوا تھا کہ بشری گیسٹ روم کے بجائے اس کے بیڈ روم میں ہی ٹھہرے گی اور دونوں سہیلیاں خوب دل بھر کر باتیں کریں گی۔ باتیں بھی کیا تھیں، بس درد کے کچھ قصے تھے جو ایک دوسرے کو سنا کر اپنے اپنے دلوں کا بوجھ ہلکا کرنا تھا۔

پچھڑے ہوؤں نے اپنی اپنی داستان چھیڑی تو رات کیسے

کھانے کے بعد دونوں سہیلیاں ایک بار پھر خواب گاہ میں آگئیں۔ آصف کی غیر موجودگی کے باعث طے یہ ہوا تھا کہ بشری گیسٹ روم کے بجائے اس کے بیڈ روم میں ہی ٹھہرے گی اور دونوں سہیلیاں خوب دل بھر کر باتیں کریں گی۔ باتیں بھی کیا تھیں، بس درد کے کچھ قصے تھے جو ایک دوسرے کو سنا کر اپنے اپنے دلوں کا بوجھ ہلکا کرنا تھا۔

موجودگی کے خیال سے آصف نے خواب گاہ کا رخ نہیں کیا تھا اور خود بے آرام ہو رہا تھا۔

”صاحب نے منع کر دیا تھا۔ کہہ رہے تھے دونوں سہیلیاں عرصے بعد ملی ہیں۔ رات یقیناً دیر سے سوئی ہوں گی۔ انہیں بے آرام نہ کرو اور نیند پوری کرنے دو۔“ ربو نے آصف کا لفظ لفظ دہرایا۔

”آصف بھی مابس.....“ وہ شخص ہمیشہ ہی اسے لاجواب کر دیتا تھا۔ اب بھی اسے کہنے کے لیے کچھ نہیں سوچا تو بات بدل دی۔

”اچھا تم اچھی طرح نیل سیٹ کرو۔ ہم ابھی پندرہ بیس منٹ میں لیجے آتے ہیں۔“

”جی ٹھیک ہے۔“ ملازمہ کو تو یہی کہنا تھا لیکن بشری نے اسے حیرت سے گھورا۔

”پندرہ بیس منٹ.....! جانے کب سے خوار ہوتے بندے کو تم پندرہ بیس منٹ مزید انتظار کرواؤ گی۔ بندہ ذرا پھرتی سے کام لے تو پانچ منٹ میں بھی فریش ہو سکتا ہے۔“

”ہاں، ہو سکتا ہے لیکن اتنا نہیں جتنا میں آصف کو گلنا چاہتی ہوں۔ ایسا عاشق شوہر چوبیس گھنٹوں سے زائد وقت کے بعد بیوی کو دیکھنے والا ہو تو بیوی کا فرض بنتا ہے کہ اسے ایسے روپ میں ملے کہ وہ دیکھتا کا دیکھتا ہی رہ جائے اور یہ پندرہ بیس منٹ کا وقت تو میں نے ایسے ہی بتا دیا ہے۔ ہو سکتا ہے دس پندرہ منٹ اوپر ہی لگ جائیں۔“ کیا شان بے نیازی تھی۔ بشری اس کی شکل دیکھتی رہ گئی پھر جھنجھلا کر بولی۔

”یہ سب تو ٹھیک ہے ملکہ عالیہ لیکن یہ کینز کیا کرے جو پہلے ہی بہت دیر سے اکیلی بیٹھی خوار ہو رہی ہے اور آپ کی طرف سے جسے مزید خواری کا نوٹس مل گیا ہے۔“

”تم اس سے اپنا دل بہلاؤ۔“ اس نے اپنا موبائل ان لاک کر کے بشری کے حوالے کیا اور خود باتھ روم میں گھس گئی۔ بشری کے پاس وقت گزارنے کی یہی سبیل تھی کہ یوٹیوب پر خبریں لگا کر حالات حاضرہ کی خبر لے۔ راحیلہ کی خواب گاہ میں لی وی نہیں تھا۔ بقول اس کے آصف کو پسند نہیں تھا کہ وہ ایک دوسرے کے لیے خالص وقت کو اسکرین کی نذر کریں اس لیے لی وی کو بس لی وی لاؤنچ تک ہی محدود رکھا گیا تھا۔

اس نے بہت زیادہ دلچسپی کے بغیر محض وقت گزاری کے لیے ایک معروف چینل پر چلنے والی لائیو نیوز لگائیں۔

خبر نامہ شروع ہوئے خاصی دیر ہو چکی تھی اور بین الاقوامی و ملکی سطح کی تمام اہم خبریں دے دیے جانے کے بعد مقامی خبریں دی جا رہی تھیں۔ شہر میں ہونے والی لوٹ مار، قتل و غارت گری اور حادثات کی معمول کی خبروں کے بیچ دی جانے والی آتش زدگی کی ایک خبر نے اسے چونکا دیا۔ علاقے کا نام اور کمرے کی آنکھ سے دکھایا جانے والا مقام، دونوں اس کے لیے آشنا تھے لیکن کوئٹہ ہوئی اس عمارت کو پہچاننا مشکل ہوا جا رہا تھا جس میں وہ اپنے سب سے عزیز دوست اور سب سے بدترین دشمن کو چھوڑ کر آئی تھی۔ عمارت کے گرد فائر بریگیڈ کے عملے کے علاوہ بھی بہت سارے لوگ جمع تھے اور ایک ایک کرچ کر آگ لگنے کی وجوہات پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ فائر بریگیڈ کی کارکردگی پر بھی سوالات اٹھا رہا تھا۔ اس سب کے بیچ کوئی نہیں تھا جو اسے معاذ اور باذل کی کوئی خبر لا کر دے سکے۔ دوست تو دوست تھا اس کی سلامتی کے لیے تو اسے فکر مند ہونا ہی تھا لیکن اسے دشمن کا مرنا بھی منظور نہ تھا۔ دشمن مرجاتا تو اسے اس کو روز روز مارنے کی خواہش سے دستبردار ہونا پڑتا۔

☆☆☆

”یقین کر دیا را میں خود تمہارے پاس آنے اور اپنے شہزادے کو دیکھنے کے لیے بے چین ہوں لیکن یہاں کے حالات ہی ایسے ہیں کہ مل بھی سکوں۔“

”آؤں گا بابا، آؤں گا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ تم سے ملنے نہ آؤں لیکن صبر تو تمہیں کرنا پڑے گا۔“

”ہاں ہاں، بھی تمہارے بھائی صاحب کو بھی لے کر آؤں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ ان کے بغیر آپ سرکار ہمیں قبول کرنے والی نہیں لیکن ایسے حالات تو بننے دو کہ میں ان سے آنے کی بات کر سکوں۔“

”ارے نہیں بابا! کوئی خطرہ خطرہ نہیں ہے۔ نہ گولیاں اور بم چل رہے ہیں، نہ پولیس چھپے لگی ہے لیکن کچھ مسائل ہیں جنہیں حل کرنا ضروری ہے۔ وہ حل ہو جائیں تو ہم سیدھا تمہارے پاس ہوں گے بلکہ لالہ کو بھی ساتھ لائیں گے۔ سب سے زیادہ تو انہیں اشتیاق ہے اپنے پوتے کو دیکھنے کا۔“

وکی کی ایک طرف گفتگو مسلسل اس کے کانوں میں پڑ رہی تھی۔ وہ واش روم میں اس کی موجودگی سے بے خبر زور و شور سے فون پر مصروف تھا اور یہ سمجھتا تو معاذ کے لیے قطعی مشکل نہیں تھا کہ وہ علینہ سے بات کر رہا ہے۔

”لالہ بھی ٹھیک ہے اور تمہارے بھائی صاحب بھی

بلکہ صرف ٹھیک نہیں، اچھے خاصے بٹے کئے ہیں۔ اگر تم کہو تو میں روز کے روز تمہیں ان کے قد، وزن وغیرہ کا ڈیٹا تیار کر کے بھیجا کروں تاکہ تمہاری تسلی رہے۔ کمال ہے یار! شوہر فون کر رہا ہے لیکن مجال ہے جو شوہر کے بارے میں ایک بار بھی فکر مندی کا اظہار کیا ہو۔ جتنی فکریں ہیں ساری یا تو سر صاحب کے لیے ہیں یا پیارے بھائی کے لیے۔ مطلب ہم تو کسی گنتی شمار میں ہی نہیں ہیں۔“ اب کی بار اس کے لہجے میں ہلکی سی خفگی تھی۔

”میں اور لالہ قد بڑھنے کی عمر سے نکل گئے ہیں اس لیے صرف وزن کا ڈیٹا بنا کر بھیج دینا کافی ہوگا۔“ معاذ نے دانش روم کا دروازہ کھول کر باہر نکلتے ہوئے اسے سنجیدگی سے مشورہ دیا تو پہلے تو وہ اس کی موجودگی پر ہی اچھل پڑا پھر جھینپ مٹانے کے لیے اشارے سے پوچھا کہ آیا وہ علیہ سے بات کرنا چاہتا ہے۔ اس نے اشارے میں ہی منع کر کے جلدی کال ختم کرنے کا حکم صادر کیا جس پر ظاہر ہے وہ کی کو عمل کرتا تھا۔

”بشری کے بارے میں کوئی خبر؟“ وہ کال ختم کر کے اس کی طرف متوجہ ہوا تو اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”نہیں، ابھی تک کچھ پتا نہیں چلا۔ اس کا فون ہنوز بند جا رہا ہے اور دوسرے بھی کسی ذریعے سے کوئی معلومات حاصل نہیں ہوئی ہیں۔“ وہ کی نے مایوسانہ انداز میں سر کوٹنی میں جنبش دیتے ہوئے اسے اطلاع دی۔

”چیف سیکوریٹی آفیسر سے کچھ معلوم کیا جاسکا؟“
”وہ ایک بار جو بتا چکا اس کے بعد بھلا کیا بتائے گا۔ ہاں، ہمارا ارادہ تھا کہ چھٹی کر کے گھر جائے گا تو راستے میں اٹھالیں گے لیکن وہ تو مسلسل وہیں لٹکا ہوا ہے اور وہاں اس پر ہاتھ ڈال کر ہم اگلے بندے کو ہوشیار نہیں کر سکتے۔“ انہیں ٹھک تھا کہ مہناز والی بلڈنگ کے چیف سیکوریٹی آفسر کو کچھ نہ کچھ معلوم ہے لیکن وہ بندہ ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔

”مہناز نے ہوش میں آ کر کوئی بیان دیا؟“
”نہیں۔ ڈاکٹرز نے فی الحال اس سے ملنے کی اجازت ہی نہیں دی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ بہت اسٹریس کا شکار ہے اس لیے ہوش میں آ جانے کے باوجود وہ اسے سکون آور دوا میں دے کر غنودگی میں رکھ رہے ہیں۔“ وہ یوں شرمندہ شرمندہ سا اس کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا جیسے بشری کا پتا نہ چل سکنے میں اسی کا قصور ہو۔
”اچھا ٹھیک ہے۔ اس کے بارے میں کچھ پتا چلے تو مجھے ضرور بتانا۔“ وہ سوال جواب ترک کرے بیزار سا

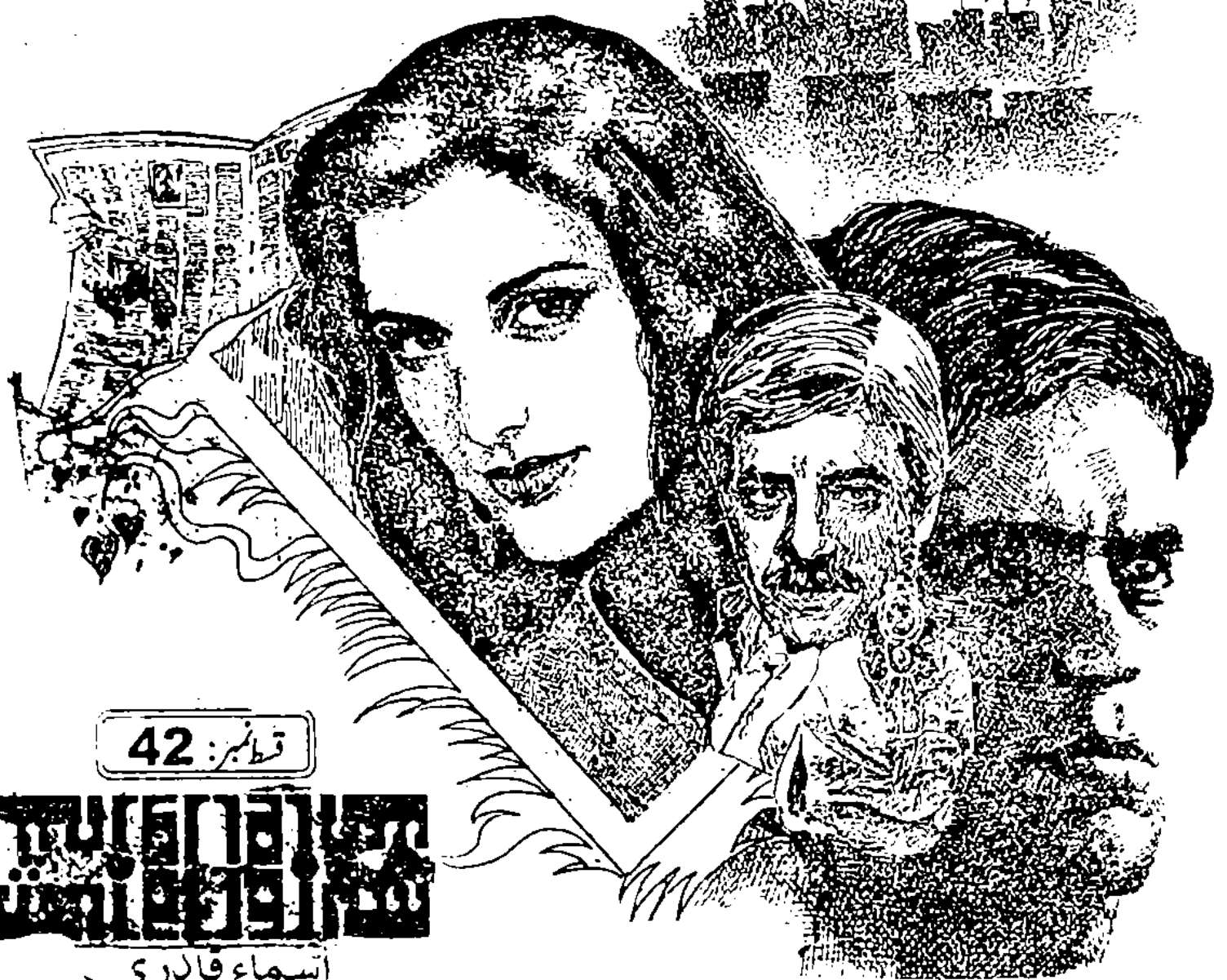
کمرے سے باہر نکل گیا اور ادھر ادھر ٹھہرنے لگا۔ اعظم تک پہنچنے میں مسلسل تاخیر اور ناکامی کا بوجھ ہی کم نہیں تھا کہ بشری کے غیاب نے اعصاب کو جھنجھٹا کر رکھ دیا تھا۔ اس کے معاملے میں پہلے ہی اس کے دل پر بڑا بوجھ تھا اور مسلسل یہ خیال کچھ کے لگا تار رہتا تھا کہ بشری پر جو کچھ جیتی اس کی بڑی ذہنات میں سے سب سے بڑی وجہ وہ خود تھا۔ یہ اس کی دوستی تھی جو بشری کو اس مقام تک لے آئی تھی۔ خیال تھا کہ باذل کو اس کے حسب خواہش سزا مل جائے گی تو اس کے نقصانات کا مداوا ہونہ ہو، دل کو ایک تسلی مل جائے گی لیکن یہ بھی ممکن نہ ہو سکا تھا اور باذل ان کی گرفت سے نکل بھاگا تھا۔

اصل میں جو کچھ بشری چاہتی تھی، وہ اتنا سیدھا کام نہیں تھا۔ بندے کو جان سے مارنا آسان ہوتا ہے لیکن نشانِ عبرت بنا کر زندہ رکھنا، وہ بھی اس انداز میں جیسا کہ بشری کی خواہش تھی، ایک ٹیکنیکل کام تھا اسی لیے تھوڑے قحط کا شکار ہو گیا تھا اور اسی قحط نے باذل کو موقع فراہم کر دیا تھا۔

”یہ بھی تو ممکن ہے کہ باذل نے میڈم ایکس سے کوئی گتہ جوڑ کر لیا ہو اور اس وقت بشری اس کی گرفت میں ہو۔“ انسان اگر ایک ہار انڈیشوں کا شکار ہو جائے تو پھر ذہن سے نئے دواہے میں مبتلا کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہو رہا تھا اور دماغِ اعظم، بشری اور سبیل کے خیالات کے درمیان چھلانگیں مارتا پھر رہا تھا۔ سبیل کے پاس مہلت کم تھی اور اعظم کو جلد از جلد اس کے پاس ہونا چاہیے تھا لیکن ایسا ہو نہیں پارہا تھا۔

”ایسا کیوں نہیں ہو پارہا معاذ احمد اچھی طرح جانتے ہو، تم ہتھیار ڈال دو تو سارا جھگڑا ہی ختم ہو جائے گا۔“ اس کے اندر سے کسی نے سرگوشی کی تو وہ ٹھہلنا بھول کر ٹھنک کر رک گیا۔ جس جگہ وہ رکا، اس کے عین سامنے اس کمرے کی کھڑکی تھی جس میں نیلی کا قیام تھا۔ اس وقت وہ ادھ کھلی کھڑکی میں کھڑی کہیں آسمان کی دستوں کو گھورتی دکھائی دے رہی تھی۔ اسے دیکھ کر اس کے دماغ میں ایک خیال کوندا جس پر فوری عمل درآمد کا پروگرام بنا کر وہ نیلی سے مدد طلب کرنے کا فیصلہ کر بیٹھا۔

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نوجوان
کی داستان جو غلط کاروں کے لیے غضب
ناک تھا باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیے



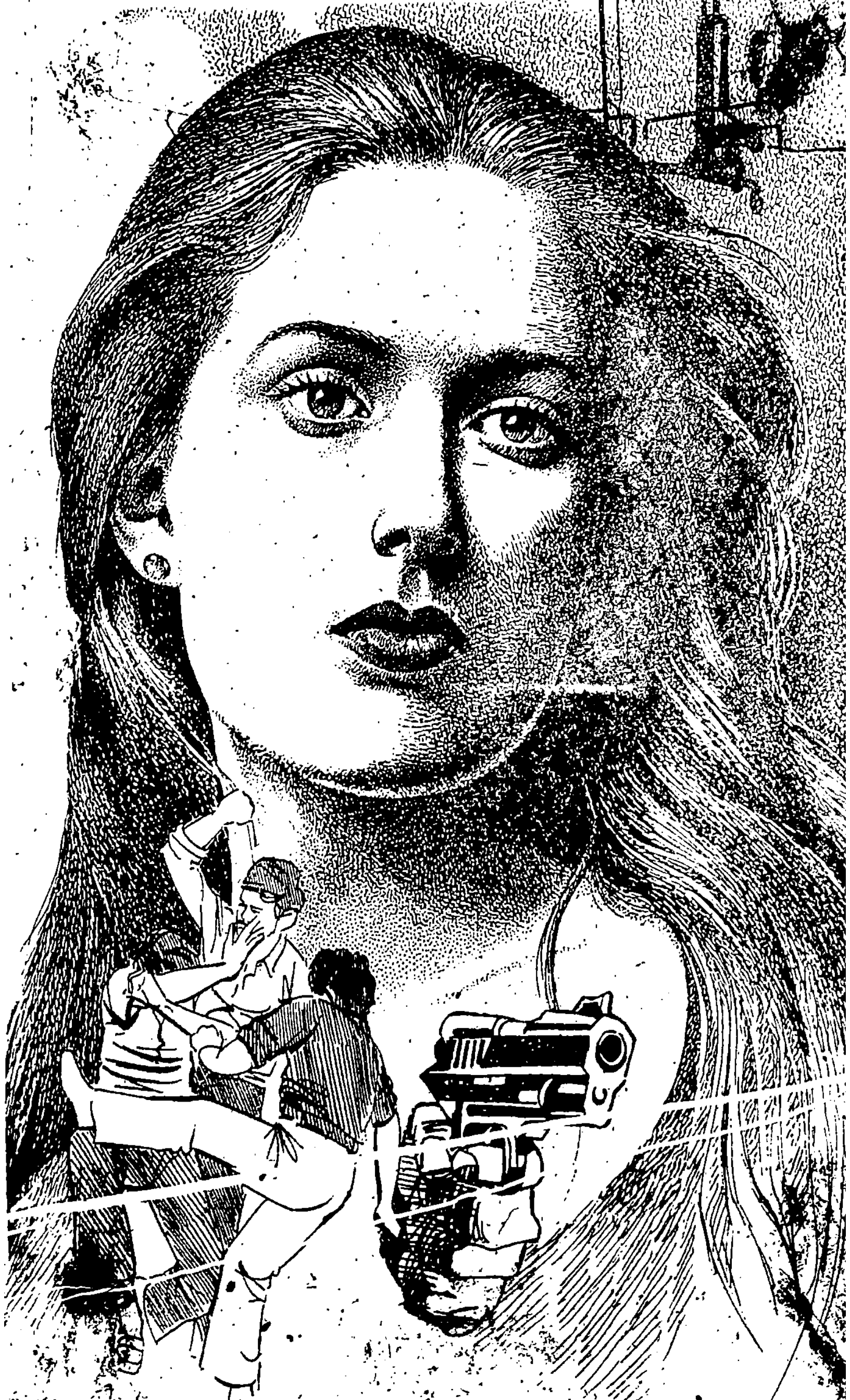
قسط نمبر: 42



اسماء قادری

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں قاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تندوتیز اندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا۔ ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابل شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پُر عزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جا رہے تھے... اس کی زندگی جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... یہ خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قراریوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تار عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ وارداتِ قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہوسکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تھیر انگیز داستان



معاذ ایک ذہین لیکن مستون مزاج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جوائن کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ انسٹی ٹیوٹ سے واپس آ رہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو سڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی نڈر فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشری نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بشری ماں کیونی کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم وغیرہ لکھتی ہے۔ اس ویران جگہ بھی وہ ایک زیر تعمیر رہائشی منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی آئی تھی۔ معاذ بشری کو یہ حفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو کفر اموش کر دیتا ہے لیکن جن رئیس زادوں سے اس نے ان کا شکار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو کفر اموش نہیں کرتے اور موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ایک دن جنگل کی سیر کے دوران وہ فوٹو گرافی کے شوق میں سب سے الگ تھلگ ہو جانے والے معاذ کو بے خبری میں گھر کر بری طرح زد و کوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دے دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس نہ آنے پر انتظامیہ کے افراد، پولیس اور ریسیکوز رائج کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جوگی کی جھونپڑی میں پاتا ہے۔ جوگی اپنی خاص جزی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے، جوگی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نواز کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے پراسرار علم سکھانے کی ہامی بھر لیتا ہے اور معاذ اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ادھر جانے وقوعے سے ملنے والے معاذ کے کمرے سے جب تصویریں نکھوائی جاتی ہیں تو ایک ایسی تصویر بشری کی نظر میں آ جاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پروجیکٹ کے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشری تحقیق کر رہی تھی۔ بشری کے اپنے والد جرنلسٹ ہوتے ہیں۔ اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشری کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ مدد سے جان دے دیتا ہے۔ اس سبب میں باذل نامی غنڈے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشری انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دنوں میں ہی معاذ واپس کا ارادہ کرتا ہے تاہم ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا عرفان اللہ اور یزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو وقاص نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باذل اچانک بشری کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر دیتا ہے۔ معاذ کو واپس لانے کے لیے اوچھے چھکنڈے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اسے واپس آنے کا پیغام دیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کر کے اسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات کے نہ بتانے پر اس کے بھائی کا ایک گردہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشری بھی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہو جاتی ہے۔ معاذ کے دوست عالم شاہ کے بہنوئی کو مل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ کئی فنون میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے ہٹانا کر کے اس کے دماغ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ فیضو سے حاصل انوکھے علم کی بدولت ان کا معمول نہیں بنتا۔ عالم شاہ اور اس کا نوکر سرمد باذل کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ عالم کی بہن بجل شاہ کے لومو لوڈ بیٹے کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اغوا کا الزام لطیف سومرو پر آتا ہے۔ عالم شاہ، باذل کی قید میں موجود ایک زخمی شخص کی مدد سے وہاں سے فرار ہو جاتا ہے۔ ادھر بشری دینی کانچ جاتی ہے۔ وہاں وقاص اسے باربی کے دھوپ میں پہچان لیتا ہے۔ وہ سلطان کو مارنا چاہتی ہے تاہم وقاص اسے ایسا کرنے سے روکتا ہے۔ ادھر عالم شاہ، باذل کی قید سے نکل کر اس کا پیچھا کرتا ہے۔ وہ وہاں معاذ کو دیکھتا ہے۔ صداقت شاہ، لطیف سومرو کو گھیرنے کے لیے اس کی خفیہ بیوی اور بچے کا کھوج لگاتے ہیں اور بچے کو اغوا کر لیتے ہیں۔ لطیف سومرو مجبور ہو جاتا ہے۔ معاذ کو اس کے گھر والوں سے ملنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ وہ ایک مشن پر سونیا کے ساتھ انڈیا روانہ ہوتا ہے تاہم کچھ لوگ سکھ یا تریوں سے بھری بس کو یرغمال بنا لیتے ہیں۔ معاذ اور سونیا خانے کے تمام افراد کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔ عالم شاہ، بجل اور سرمد انڈیا روانہ ہو جاتے ہیں۔ ان پورٹ سے گھر روانگی پر راستے میں کچھ لیرے انہیں لوٹ لیتے ہیں۔ گھر پہنچنے پر پولیس کی ریڈ ہوتی ہے اور وہ عالم شاہ اور سرمد کو لے جاتے ہیں۔ ادھر بشری اور وقاص باذل کو اسپتال میں مارنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ بچ جاتا ہے۔ معاذ اور سونیا اپنے سہولت کاروں سے مل جاتے ہیں۔ عالم شاہ اور سرمد کو تشدد کا نشانہ بنا کر ویرانے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ واپس اپنے میزبانوں کے ہاں پہنچ جاتے ہیں۔ انہیں پتا لگتا ہے کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں اجالا اور اس کا عاشق شاس ہوتے ہیں۔ وہ چھپ کر ان کی باتیں سن رہا ہوتا ہے کہ اسے چھاپ لیا جاتا ہے۔ تاہم وہاں مارا ماری ہوتی ہے اور اجالا کا عاشق مارا جاتا ہے۔ پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ ان کے کزن انہیں اپنے دوسرے خفیہ ہنگامے پر پہنچا دیتے ہیں۔ وہ وہاں سے بحفاظت نکل جاتے ہیں۔ ادھر معاذ کو سونیا اپنے ساتھ نئے مشن پر لے کر جاتی ہے جس میں ایک ریلوے لائن کو دھماکے سے اڑانا ہوتا ہے۔ معاذ ایسا نہیں چاہتا اس لیے وہ ٹرین کی آمد سے قبل بارودی دھماکا کر دیتا ہے۔ وہ زخمی ہو جاتا ہے اور اسے ہندو سا دھواہنی کنیا میں لے جاتا ہے جہاں اس کی اچھی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ سونیا کے آدمی معاذ کو تلاش کرتے ہیں مگر ناکام ہو جاتے ہیں۔ ادھر عالم شاہ اور سرمد خفیہ ذریعے سے ہارڈ پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ دھریے جاتے ہیں اور ”را“ کی قید

میں پہنچ جاتے ہیں۔ بشری باذل کو باونے کی کوشش میں خود نشانہ بن جاتی ہے۔ معاذ سادھو کی مدد سے ایک انڈین ہیروئن کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ وہیں اسے عالم اور سرد کی گرفتاری کا پتا چلتا ہے۔ معاذ ڈاکٹر فردوس سے ملتا ہے اور اسے کل کی مدد کرنے کا کہتا ہے۔ علینہ اور وقاص وغیرہ کو لالہ عیسیٰ ملک سے باہر نکال دیتا ہے اور ہر ممکن احتیاط کی ہدایت کرتا ہے۔ لیکن علینہ پاکستان میں ٹویہ سے رابطہ کرتی ہے جو ان کے لیے مصیبت بن جاتا ہے۔ ٹویہ پر تیزاب پھینک دیا جاتا ہے۔ وقاص، علینہ اور اس کے گھر والوں کو مار دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس معاذ کو دیوانی شخص سے مدد لینے کا کہتی ہے۔ معاذ اپنے کزن کو پاکستان کال کرتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ اس کے گھر والوں کو مار دیا گیا ہے۔ وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کی ٹھان لیتا ہے۔ ادھر ڈاکٹر فردوس کو اس کے سسرال والے کھل کو بھگانے کی پاداش میں تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ معاذ، عالم اور سرد کی رہائی کے لیے کارروائی کرتا ہے اور انہیں "را" کی قید سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ لیکن عالم اور سرد کو دیوانے کے آدمی کسی دوسری جگہ پہنچا دیتے ہیں۔ سونیا معاذ کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ ادھر باذل ایک جگہ لالہ عیسیٰ کی موجودگی پر کارروائی کرتا ہے تاہم لالہ خود کو گولی مار کر ختم کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس کا انتقال ہو جاتا ہے۔ دیوانے کیگ ڈاکٹر فردوس کی میت اٹھنے پر وہاں فائرنگ کر دیتے ہیں۔ پولیس دیوانے کو گھیر لیتی ہے۔ معاذ دیوانے اور اس کے آدمیوں کو نکالنے کے عوض عالم کا پتا معلوم کر لیتا ہے۔ سونیا اور معاذ حیدر آباد نوپ بدرالدین کی حویلی پہنچ جاتے ہیں۔ تاہم کالے خان اور رادھا دیوی کو میڈم ایکس کے کھنچے سے چھڑانے کے لیے انہیں واپس آنا پڑتا ہے، کالے خان کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ نوپ صاحب کی حویلی میں عالم اور سرد کی رہائی کے لیے کارروائی کر کے انہیں رہا کر لیتا ہے۔ وہ لوگ نئے ٹھکانے پر پہنچتے ہیں تو وہاں معاذ سے ملنے جار دنا می شخص آتا ہے۔ اسے معاذ نے "را" کی قید سے نکالا ہوتا ہے۔ جار د اور معاذ، کھل سمیت اسپتال جاتے ہیں اور پہچان لیے جانے پر پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ پولیس سے مقابلے کے بعد وہ ایک بستی میں پناہ کے لیے گھس جاتے ہیں اور دو لوگوں کو یرغمال بنا کر ان کی جمو پٹری میں قیام کرتے ہیں۔ ادھر سونیا معاذ کی تلاش میں نکلتی ہے اور اسے بستی میں پہنچنے پر معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ معاذ اور جار د وغیرہ انوپ نامی شخص کے ساتھ اس کے مالک کے بنگلے میں قیام کرتے ہیں۔ سونیا بھی معلومات حاصل کرتی ہوئی مذکورہ بنگلے تک پہنچ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور سرد بھی سونیا کا پیچھا کرتے ہوئے وہیں پہنچ جاتے ہیں۔ ادھر وقاص، علینہ و دیگر لوگ زندہ ہوتے ہیں۔ وقاص حلیہ بدل کر گلو کا باڈی گارڈ بنتا ہے۔ وہ معاذ کو تلاش کرنے کے لیے انڈیا روانہ ہوتا ہے۔ وہاں اس کی گل خان سے ملاقات ہوتی ہے اور معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ سونیا، معاذ اور دیگر ساتھیوں سے مل جاتی ہے تاہم وہ جس بنگلے میں ہوتے ہیں وہ دشمن کا ہوتا ہے۔ دشمن سب کو بے ہوش کر کے کھس لے جا رہے ہوتے ہیں کہ ان کی گاڑی کو حادثہ پیش آ جاتا ہے۔ ان سب کو چینی بمکشو طبعی امداد دیتے ہیں اور ان سے پوچھ گچھ کی جاتی ہے۔ کھل کی حالت تشویشناک ہوتی ہے اور اسے وہاں موجود ایک وید دیکھتا ہے۔ ادھر لالہ واپس اپنے لوگوں میں پہنچ کر ایکشن میں آ جاتا ہے اور حامد کو اغوا کر لیتا ہے۔ لالہ میڈم ایکس کے ٹھکانے کی نگرانی کر دیتا ہے۔ باذل، معاذ وغیرہ کے ٹھکانے سے باخبر ہو جاتا ہے۔ ادھر لالہ کے آدمی میڈم ایکس کی نگرانی کے چکر میں مارے جاتے ہیں۔ لالہ اپنے آدمیوں کو انڈیا رگراؤنڈ کر دیتا ہے۔ معاذ وغیرہ جہاں ہوتے ہیں وہاں دشمن حملہ کر دیتا ہے اور کافی مارا ماری ہوتی ہے۔ باذل، معاذ کا پیچھا کرتا ہے اور چینیوں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ معاذ چینیوں کے ساتھ مل کر دشمنوں کے خلاف کارروائی کرتا ہے۔ اس دوران اسے گل خان نظر آتا ہے۔ اسے پہنا مار کر کیا گیا تھا۔ وہ لالہ نامی عورت کو بھی گرفت میں لے لیتے ہیں اور اسی سے معلومات لیتے ہیں۔ ادھر لالہ عیسیٰ، اعظم کو دشمن کی گرفت سے نکالنے کے لیے کارروائی کر دیتا ہے اور موسیٰ اور نیلی، اعظم کو نکالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ معاذ دشمنوں کے کیمپ پر حملہ کر کے وہاں قبضہ کر لیتا ہے۔ موسیٰ اور نیلی کی گاڑی پر حملہ ہوتا ہے تاہم مارا ماری کے بعد وہ صداقت شاہ کے پاس پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ لالہ عیسیٰ صداقت شاہ کو حویلی پر ریڈ کا بتاتا ہے۔ صداقت شاہ اعظم کے محفوظ ٹھکانے کے لیے قربان شاہ کو فون کرتے ہیں۔ اعظم کو وہاں سے نکال لیا جاتا ہے اور دوسری جگہ منتقل کر دیا جاتا ہے۔ ادھر معاذ بیجنگ پہنچ جاتا ہے۔ بیجنگ والوں کے کرتاھر تاؤں سے بات کر کے پاکستان پہنچنے کی اجازت چاہتا ہے۔ ادھر موسیٰ اور نیلی کو پولیس گھیر لیتی ہے اور فائرنگ میں موسیٰ مارا جاتا ہے۔ وہ اعظم کو لے جاتے ہیں اور نیلی زخمی حالت میں ان کے قبضے میں آ جاتی ہے۔ معاذ اور وی وغیرہ پاکستان پہنچ جاتے ہیں اور اعظم کی بازیابی کے لیے کارروائی کے لیے منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ موسیٰ کی تدفین ہو جاتی ہے۔ وی، نیلی کو قبرستان لے کر جاتا ہے تاہم وہاں کچھ لوگ حملہ کر دیتے ہیں لیکن لالہ کے آدمی انہیں بچا لیتے ہیں۔ ادھر باذل، لالہ کی قید سے بھاگ جاتا ہے۔ معاذ، ڈی ایس پی ظہیر کے بنگلے پر دھاوا بولتا ہے اور ڈی ایس پی کو قابو کرنے کے بعد اس سے معلومات لیتا ہے۔ وہ لوگ ظہیر خان کو لے کر وہاں سے نکل جاتے ہیں۔ باذل قید سے نکل کر مہناز کے پاس پہنچتا ہے اور اسے تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ نیلی قید میں موجود ظہیر کو ٹھکانے لگا دیتی ہے۔ بشری قبرستان جاتی ہے۔ وہاں اس کی دوست ملتی ہے اور وہ اس کے ساتھ چلی جاتی ہے۔ ادھر معاذ سارے معاملوں کو جلد حل کرنے کے لیے دشمن کے آگے ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔

"اگر تم نے میری کال ریسو نہیں کی تو میں خود تمہارے گھر آ جاؤں گی اور وہ بھی اکیلی نہیں، میڈیا کے ساتھ۔ پھر جو تماشا لگے گا، اسے تم اور تمہارے ووٹرز دونوں عرصے تک بھلا نہیں سکیں گے۔" عرفان اللہ کئی بار بجنے والی فون کی کھنٹی کو کار کا نام دیکھ کر نظر انداز کر چکا تھا لیکن رد عمل میں جو پیغام موصول ہوا تھا، اس نے اسے اپنے ہونٹ بھیج لینے پر مجبور کر دیا تھا۔

"یہاں مصیبتوں پر مصیبتیں نازل ہو رہی ہیں اور یہ

عورت چاہتی ہے کہ میں نوجوانی کی طرح اس کی ایک پکار پر دوڑا چلا جاؤں۔“ وہ غصے اور جھنجھلاہٹ سے بڑبڑایا اور بستر سے اتر کر کھڑکی تک گیا۔ اس کھڑکی کا شیشہ بلٹ پروف تھا جسے کھولے بغیر وہ اطمینان سے باہر جھانک سکتا تھا۔ باہر صبح کی ہلکی ہلکی روشنی پھیل چکی تھی اور وہ دیکھ سکتا تھا کہ اس وقت بھی اس کے گھر کی حفاظت پر مامور گارڈز بالکل چاق و چوبند اپنی ڈیوٹی انجام دے رہے تھے۔ یہ فرض شناس گارڈز اسے دشمنوں کی گولیوں سے بچانے کے لیے اپنی جان پر کھیل سکتے تھے لیکن تاجور کی صورت میں نازل ہونے والی بدنامی کا بھلا کیا کرتے۔ یوں تو اس کے نام کے ساتھ تاجور کا نام ہمیشہ ہی جوڑا جاتا رہا تھا لیکن آج کل وہ جس مقام کے حصول کے لیے جدوجہد کر رہا تھا اس کا تاجور سے دور رہنا ہی بہتر تھا۔ یہ دوری اختیار کرنا اس لیے مشکل نہیں تھا کہ تاجور تمام تر کوشش کے باوجود عمر کے اس حصے میں آکر اس کے لیے اپنی ساری کشش کھو چکی تھی اور اس پر سونے پر سہا گا یہ کہ صوفیہ کی صورت ایسی حسین اور جوان سال پل اے میسر آگئی تھی جس کے ساتھ ہر دن عید کا دن تھا۔

”ایک بار بات کر کے اس کا دماغ درست کر دوں پھر نمبر ہی ہلاک کر دوں گا۔“ واپس بستر پر بیٹھتے ہوئے اس نے ایک بار پھر تاجور کا پیغام کھول کر پڑھا اور غصے سے بڑبڑایا۔ جس نمبر پر تاجور کی کال آئی تھی وہ اس کا پرسنل نمبر تھا جو چند بہت قریبی اور خاص لوگوں ہی کو دیا گیا تھا اور اس نمبر پر آنے والی کالز عموماً وہ خود وصول کرتا تھا۔

”مل گئی فرصت مجھ سے بات کرنے کی؟ اگلیاں کھس گئیں میری آپ کا نمبر ڈیٹا بن کر رہ گیا ہے تو جیسے ابھی سے ملک کے وزیراعظم بن گئے ہیں جو اس حقیر بندی سے بات کرنے کے لیے وقت ہی نہیں نکال رہے۔“ دوسری طرف سے تاجور نے کال ریسیو کرتے ہی نان اسٹاپ بولنا شروع کر دیا۔

”ایسی کیا مصیبت ٹوٹ پڑی ہے تم پر کہ مجھ سے بات کیے بنا گزارہ نہیں ہو رہا۔ اچھی طرح جانتی ہو کہ اس وقت میں اپنے سیاسی کیریئر کے سب سے اہم دور سے گزر رہا ہوں۔ تمہارا کام ہے کہ مجھے سپورٹ کرو لیکن سپورٹ کرنا تو دور کی بات ہم میں تو اتنا بھی سلیس نہیں کہ اگر میں کال ریسیو نہیں کر پا رہا تو یہ سوچ کر مہر کر جاؤ کہ میں کہیں مصروف ہوں گا اور فرصت ملنے پر خود تم سے رابطہ کر لوں گا۔“ عرفان اللہ نے بھی جواباً اسے جھاڑا۔

”میں جانتی ہوں کہ آج کل جتنی خوبصورت

مصروفیت آپ نے پال رکھی ہے، آپ کو فرصت کی صورت نہیں ملنے کی اسی لیے اگلیاں ٹیڑھی کرنی پڑیں۔“

”کیا بکواس ہے۔ یہ کون سی بے ہودہ الزام تراشیاں کر رہی ہو۔“ عرفان اللہ بوکھلا گیا۔

”الزام تراشی کیسی؟ آپ کے پہلو میں چلتی حسین قیامت ایک کھلی سچائی ہے اور مجھ سے بڑھ کر کون جان سکتا ہے کہ ایسی حسین عورت قریب ہو تو آپ کی نیت اور عمل دونوں کا کیا حال ہوتا ہے۔“ تاجور نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

”میرے پاس تمہاری بکواس سننے کی فرصت نہیں ہے۔ صاف صاف بتاؤ کیوں کال کی ہے۔“ عرفان اللہ جربز ہوا اور اس کی سچائی کو اپنے غصے کی تیزی سے دبانے کی کوشش کی۔

”اس بد نصیب کے بارے میں جانتا چاہتی ہوں جس کی ولدیت کے خانے میں شوکت کا نام لکھا کر آپ اس سچ کو بھول ہی گئے ہیں کہ وہ آپ کا خون ہے۔“

”میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ نہ میں نے اسے کہیں بھیجا ہے اور نہ وہ مجھے بتا کر گیا ہے۔ ایسے میں، میں تمہیں اس کے بارے میں کوئی خبر کہاں سے لا کر دے سکتا ہوں؟“

”کیوں نہیں لا کر دے سکتے آپ کوئی خبر؟ اتنے تعلقات ہیں آپ کے۔ بڑے بڑے پولیس افسروں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہے۔ آپ کے ایک اشارے پر بہت کچھ اوپر نیچے ہو جاتا ہے لیکن آپ اپنے بیٹے کی خبر نہیں لاسکتے۔“ وہ غصے اور جھنجھلاہٹ کا شکار مگی۔

”کیا بیٹے بیٹے کی رٹ لگا رہی ہے۔ بیٹا صرف اسے مانا جاتا ہے جس کی ماں کے ساتھ کھلے بندو نکاح پڑھوایا ہو۔ طوائف اپنی اولاد کسی کے سر قموپنے کی کوشش کرے تو اس کے دعوے کو کوئی تسلیم نہیں کرتا۔“ عرفان اللہ کے بے رحمی سے دیے گئے جواب نے تاجور کو ہلکا بھرنے کے لیے گنگ کر دیا لیکن پھر تھلا کر تیز لہجے میں بولی۔

”وہ زمانے گزر گئے عرفان اللہ صاحب، جب سچ جھوٹ کو ثابت کرنا مشکل تھا اور دنیا بس اسے سچ مانتی تھی جو آپ جیسے نام نہاد عزت داروں کی زبان سے نکلتا تھا۔ اب تو ایک ڈی این اے ٹیسٹ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر ڈالتا ہے۔ کہیں تو اپنا سچ دنیا کو ثابت کر کے دکھا دوں؟“ اس بار گنگت ہونے کی باری عرفان اللہ کی تھی۔

شوکت کا ایک مختصر سا وقفہ گزرا پھر وہ لہجے کو نرم بنا کر بولا۔

”ممتا کے جذبات میں بہہ کر میرے اور اپنے تعلق کی خوبصورتی کو کیوں داد پر لگا رہی ہو؟ تم مجھے عزیز ہو اور وہ

اس لیے کہ اس نے تمہاری کوکھ سے جنم لیا ہے۔ دنیا داری کی مصلحتوں کو تم مجھ سے بڑھ کر جانتی ہو درجہ سچ تو یہی ہے کہ میں بھی اس کے لیے پریشان ہوں اور اپنے طور پر اسے تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ جیسے ہی کوئی خبر ملی، سب سے پہلے تمہیں اطلاع دوں گا۔ تمہیں یوں بان بارفون کر کے مجھے یاد دہانی کروانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔“

”آپ میرے جذبات کو نہیں سمجھ سکتے عرفان اللہ صاحب! مانا کہ بہت مضبوط اعصاب کی عورت ہوں اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے کے بعد عام عورتوں جیسی جذباتیت نہیں رہی ہے مجھ میں لیکن یہ جو کجخت متا ہے نا، اس کے جذبات سارے جذبات سے الگ ہوتے ہیں۔ لاکھ دھیان بٹاؤں لیکن اس بد نصیب کا چہرہ آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔“ عرفان اللہ کی حکمت عملی کامیاب رہی اور تاجور کا دل پیچنے کے ساتھ ساتھ لہجہ بھی نرم پڑ گیا۔

”میرے ہوتے تمہیں فکریں پالنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کرتا ہوں میں کچھ نہ کچھ۔“ وہ بظاہر تاجور کو تسلیاں دے رہا تھا لیکن دماغ اس کی دھمکی میں الکا ہوا تھا اور ذہن میں مسلسل یہ خیال کلبلارہا تھا کہ اس سے قبل کہ تاجور اپنی اس دھمکی کو دہرائے، اس کا کوئی نہ کوئی مستقل حل نکالنا ہوگا۔

”آپ کی تسلی کے بھروسے اپنی متا کو سمجھا رہی ہوں۔ خیال رکھیے گا کہ مجھے باپوسی کا منہ نہ دیکھنا پڑے۔“ ادھر تاجور اس کی سوچ سے بے خبر بالکل ہتھیار ڈال چکی تھی۔ اس نے بڑے صلح جو انداز میں اسے بائے کہہ کر سلسلہ منقطع کیا تو یکدم سامنے آکھڑے ہونے والے یاڈل کو دیکھ کر ششدر رہ گئی۔

”کب آئے تم؟“ خیرت کی شدت سے سنبھلی تو اسے گلے لگاتے ہوئے جذباتی انداز میں پوچھا۔

”اس وقت جب آپ ہمیشہ کی طرح اس خود غرض اور اناک آدمی کے ہاتھوں بے وقوف بن رہی تھیں۔“ اس نے غی سے جواب دیا۔

”کیوں ایسا سوچتے ہو؟ وہ خود تمہارے لیے فکرمند تھے اور بتا رہے تھے کہ مسلسل تمہیں تلاش کروانے کی کوششیں کر رہے ہیں۔“

”مجھے وہ صرف اس وقت یاد کرتے ہیں جب ان کے پاس میرے لائق کوئی خدمت ہو اور سنا ہے کہ آج کل ان کے گرد بڑے خدمت گزار جمع ہو گئے ہیں۔“ اس پر ماں کی نصیحت کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ تاجور خود ہی بات بدلتے ہوئے بولی۔

”چھوڑو اس بات کو اور یہ بتاؤ کہ اتنے عرصے کہاں رہے؟ کم از کم کوئی پیغام ہی بھجوا دیتے۔ کچھ اندازہ بھی ہے کہ میں تمہارے لیے کتنی پریشان رہی۔ دیکھو صحت کتنی خراب ہو گئی ہے تمہاری اور برکت بھی مجلس گمنی ہے۔“

”جنہم میں رہ کر انسان جھلٹا ہی ہے لیکن میرا بھی وعدہ ہے کہ خود کو اس اذیت سے گزارنے والوں سے ایک ایک تکلیف کا پورا پورا حساب لوں گا۔“ اس کے لہجے میں ایسی تپش تھی کہ تاجور نے ایک مضبوط عورت ہونے کے باوجود اپنے جسم میں پھریری سی محسوس کی۔

”ایسا کرو تم نہادھو کر فریش ہو جاؤ۔ میں تمہارے لیے کچھ کھانے پینے کو منگواتی ہوں۔“ بات بدل دینا ہی اس وقت سب سے بہترین حل تھا۔

”ٹھیک ہے، لیکن خیال رہے کہ ابھی ادھر میرے آنے کی اطلاع نہیں کرنی ہے۔ میں پہلے اپنے ذاتی کام نمٹا لوں پھر دیتا ہوں اس دربار میں حاضری۔“ اس نے ماں کو نصیحت کی۔

”اچھا ٹھیک ہے۔ جیسے تم کہو۔“ تاجور کے پاس ہامی بھرنے کے سوا کوئی دوسرا انتخاب نہیں تھا۔ وہ اس کا بیٹا تھا لیکن کبھی کبھی وہ خود اس کی وحشت سے ڈر جاتی تھی۔

”ذرا میرے لیے ایک کپ اسٹرائنگ سی کافی بنوادیں۔ میں اتنی دیر میں ہاتھ لے کر چیخ کر لوں۔“ وہ کہتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ اپنے ہاتھ میں موجود موبائل اس نے وہیں ایک سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔ تاجور بھی اس کے پیچھے ہی کمرے سے باہر نکل گئی تھی چنانچہ جب موبائل پر کال آنا شروع ہوئی تو اسے سننے والا کوئی نہیں تھا۔

☆☆☆

”تم سکون سے تو بیٹھو۔ اللہ نے چاہا تو سب خیر ہوگی۔“ راحیلہ نے بے قراری سے غہلٹی بشری کو تسلی دینے کی اپنی سی کوشش کی۔

”کیسے بیٹھوں سکون سے۔ وہاں معاذ تھا اور وہ سارے لوگ تھے جنہوں نے معاذ کی خاطر مشکل حالات میں میری ہر ممکنہ مدد کی۔“ اس کی آنکھیں اگرچہ خشک تھیں لیکن ان میں اتنا کرب تھا کہ راحیلہ کا اپنا دل تڑپ اٹھا۔ وہ بشری کے قریب گئی اور اس کے دونوں ہاتھ تھام کر رسانیات سے بولی۔

”تم تو اتنی بہادر ہو۔ تم نے اتنے بڑے بڑے صدموں کو بہادری سے جھیلا ہے پھر ایک ایسے حادثے پر کیوں اتنی پریشان ہو رہی ہو جس میں امکان ہے کہ کچھ لوگ

محفوظ بھی رہے ہوں گے۔ تم دیکھنا کہ ان محفوظ رہنے والوں میں معاذ بھی شامل ہوگا۔“ راحیلہ اس کی دوست تھی اور ماضی میں معاذ کے لیے اس کے جذبات کو سمجھ چکی تھی اس لیے اس وقت اسے خاص اسی کے حوالے سے تسلی دے رہی تھی۔

”بہادر ہوں لیکن سینے میں پتھر کا دل لیے تو نہیں پھرتی کہ ہر دکھ، ہر صدمے کو سستی ہی چلی جاؤں۔ میں بتا رہی ہوں تمہیں کہ معاذ کو کچھ ہوا تو مجھ سے بالکل بھی برداشت نہیں ہوگا۔“ اس کی آنکھوں کا کرب مزید بڑھ گیا۔ ”ان شاء اللہ کچھ نہیں ہوگا۔ اسے۔ آصف کو شش کر رہے ہیں اپ ڈیٹ لینے کی۔ اللہ نے چاہا تو اچھی ہی خبر ملے گی۔ تم یہاں بیٹھو اور خوب دل لگا کر دعا کرو۔ دعا کی طاقت بڑے بڑے طوفانوں کا رخ بدل دیتی ہے۔“ راحیلہ نے زبردستی اسے ایک صوفے پر بٹھایا۔ اسی وقت اس کا شوہر آصف اندر داخل ہوا۔

”کچھ معلوم ہوا؟“ راحیلہ نے بے چینی سے پوچھا۔ بشری کی آس بھری نظریں بھی اس کی طرف اٹھیں۔ ”آگ گیس پتھ سے لگی تھی۔ فائر بریگیڈ کو دیر سے اطلاع دی جا سکی اس لیے آگ پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔ پوری عمارت راکھ ہو گئی ہے اور.....“ آصف بولتے بولتے رک گیا۔

”اور..... اور کیا؟“ بشری نے بے تابی سے پوچھا۔ ”وہاں چار افراد کی سوختہ لاشیں ملی ہیں۔ لاشیں بالکل ناقابل شناخت ہیں۔ ڈی این اے یا ڈیٹیل اینگریمنشن سے ہی انہیں شناخت کیا جاسکے گا۔“ آصف نے آہستہ آواز میں بتایا۔

”چار افراد..... چار افراد کی لاشوں کا مطلب ہے کہ بہت سے لوگ بچ گئے ہیں۔ ہوسکتا ہے یاد آئے کے وقت وہ لوگ کہیں باہر ہوں۔“ راحیلہ نے بشری کی تیزی سے زرد پڑتی رنگت دیکھی تو تسلی دینے والے انداز میں بولی۔ اس کی بات کا بشری پر خاطر خواہ اثر ہوا اور چہرے پر امید کی کرن چمکی۔

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میرا خیال ہے مجھے معاذ سے رابطہ کرنا چاہیے۔“

”نمبر یاد ہے تو میرے فون سے ہی کال ملا لو ورنہ میں تمہاری سم اپنے موبائل میں لگا دیتی ہوں۔“ راحیلہ نے اسے پیشکش کی۔

”سم لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے نمبر یاد ہے۔“ بشری کو مناسب نہ لگا کہ اس کے موبائل میں اپنی سم لگا کر اسے زحمت دے۔

”چلو ٹھیک ہے، جیسی تمہاری مرضی۔“ راحیلہ نے اپنا موبائل ان لاک کر کے اس کے حوالے کر دیا۔ اس نے اپنے ذہن میں محفوظ کیا گیا معاذ کا نمبر ڈائل کیا اور دھڑکتے دل سے دوسری طرف کے رد عمل کا انتظار کرنے لگی۔ کوئی نتیجہ ظاہر نہیں ہوا۔ اس نے دوبارہ اور سہ بارہ کوشش کی۔ ہر بار ایک جیسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔

”کیا ہوا۔ کال ریسیو نہیں ہو رہی؟“ راحیلہ نے اس کے چہرے کی مایوسی دیکھ کر پوچھا۔

”کوئی رسپانس ہی نہیں ہے۔“ اس نے اسے موبائل واپس پکڑانا چاہا۔

”اسے اپنے پاس ہی رکھو۔ دوبارہ ٹرائی کر لیتا۔“ راحیلہ نے اس سے موبائل نہیں لیا اور آصف کی طرف رخ کر کے بولی۔

”بشری کا موبائل میری غلطی سے گر کر ٹوٹ گیا ہے۔

آپ اس کے لیے دوسرا موبائل سیٹ لاد دیجیے گا۔“

”اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں اسی کو ریپئر کروالوں گی۔“ بشری نے جلدی سے انکار کیا۔

”میں نے جو کہا ہے، آپ وہی کریں۔ اس کی کسی بات پر کان دھرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ راحیلہ نے تیز لہجے میں میاں پر حکم چلایا۔

”یہ زیادتی ہے راحیلہ! ایک تو میرے فون کے گرنے اور ٹوٹنے میں تمہاری کوئی غلطی نہیں تھی اور اگر ہوتی بھی تو کیا میں تم سے ہر جانہ لوں گی؟ جو ہوا سو ہوا۔ میں نے کہہ دیا ہے آصف بھائی! آپ اس کی یہ بے تکی فرمائش ہرگز بھی پوری نہیں کریں گے۔“ وہ راحیلہ سے بات کرتے کرتے اچانک آصف سے مخاطب ہوئی۔

”وہ بات یہ ہے کہ میری بیگم بالکل بھی بے تکی باتیں نہیں کرتی اور اگر کرتی بھی ہوتی تو مجھ میں ان کے حکم سے سرتابی کی مجال نہیں تھی۔“ آصف نے راحیلہ کو فدا ہنہ چانے والی نظر سے دیکھتے ہوئے اسے جواب دیا تو جو ابادہ شرمانے اور مسکرانے لگی۔

”دونوں میاں بیوی نے اچھی نوٹسکی لگا رکھی ہے۔“ بشری جھنجھلا کر زیر لب بڑبڑائی اور ایک بار پھر معاذ کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ نتیجہ حسب سابق تھا۔

”مہناز سے بات کر کے دیکھتی ہوں۔“ اس کے دل میں خیال آیا تو مہناز کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ حالات نے اس میں کئی جسمانی نقائص پیدا کر دیے تھے لیکن خوش قسمتی سے دماغی صلاحیتیں اب بھی پوری طرح بیدار تھیں اور کئی ضروری

”کہاں ہو یار؟ میں تمہیں کال کر رہی تھی لیکن تم نے

ریسیو ہی نہیں کی۔ میرے پاس ایک بہت ہی بری نیوز ہے۔ لالہ عیسیٰ کے ٹھکانے پر رات پتا نہیں کس طرح آگ بھڑک اٹھی تھی۔ سب کچھ جل کر خاکستر ہو گیا۔ مجھے معاذ اور باقی لوگوں کی بہت فکر ہو رہی ہے۔ اگر تم کچھ معلوم کر سکتی ہو تو معلوم کر کے مجھے حالات سے آگاہ کرو۔“ اس نے دوسری طرف سے کچھ کہے جانے کا انتظار کیے بغیر بولنا شروع کیا تو ایک تسلسل سے بولتی ہی چلی گئی لیکن پھر احساس ہوا کہ دوسری طرف سے کوئی آواز یا رد عمل نہیں ہے۔

”ہیلو مہناز! تم نے سنا کہ میں کیا کہہ رہی ہوں؟ تمہیں میری آواز آرہی ہے نا؟“ اس نے مہناز کو پکارا لیکن اس بار بھی خاموشی ہی رہی پھر لائن کٹ گئی۔

”کیا ہوا؟“ اس کے چہرے پر الجھن دیکھ کر راحیلہ نے دریافت کیا۔

”پتا نہیں، شاید سگنلز کا مسئلہ ہے۔ مہناز نے کال تو ریسیو کی تھی لیکن کوئی بات ہی نہیں ہو سکی۔ مجھے اس کی آواز ہی سنائی نہیں دی۔“

”دوبارہ نمبر ملا لو۔“ راحیلہ نے مشورہ دیا۔

”ہاں، یہی کرتی ہوں۔“ اس نے دوبارہ نمبر ڈائل کیا لیکن اب دوسری طرف سے موبائل بند ہونے کی اطلاع مل رہی تھی۔

”سگنلز کا ہی ایشو ہوگا۔ تم پریشان نہ ہو اور آ کر کچھ کھا پی لو۔ دیکھو آصف نے بھی تمہارے انتظار میں ابھی تک کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔“ راحیلہ نے کہا تو اسے احساس ہوا کہ واقعی اس کے میزبان اس کی خاطر ابھی تک بھوکے ہیں۔ اخلاقاً اسے ان کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھنا پڑا لیکن دل میں ایک کھٹک سی تھی جسے وہ خود بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ اسی کیفیت میں اس نے راحیلہ اور آصف کا ساتھ دینے کے لیے ان کے اصرار پر تھوڑا بہت کھایا پھر چائے پینے لگی۔ ابھی مشکل سے دو گھونٹ ہی لیے تھے کہ مہناز کے نمبر سے تحریری پیغام وصول ہوا۔ لکھا تھا۔

”میرے موبائل میں کچھ خرابی ہو گئی ہے۔ صحیح طرح آواز نہیں آرہی اور مائیک تو بالکل ہی کام نہیں کر رہا۔ تم آؤ تو آئے سانسے بیٹھ کر سکون سے بات کرتے ہیں۔“

”اوہ! میں یہی پریشان ہو رہی تھی۔“ اس نے اس بات کا جواب کیوں نہیں دے رہیں۔ ٹھیک ہے پھر میں واپس آتی ہوں تو اطمینان سے بات کرتے ہیں۔“ اس نے پیغام پڑھا تو اطمینان کا سانس لیتے ہوئے اسے جوابی پیغام

فون نمبر وہی کی یادداشت میں محفوظ تھے۔

”کمال ہے، یہ بھی کال ریسیو نہیں کر رہی۔“ دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی لیکن کال ریسیونہ کی گئی تو وہ حیرت سے بڑبڑائی۔ اسے معلوم تھا کہ مہناز ان لوگوں میں سے تھی جو اپنے فون سے کبھی غافل نہیں رہتے اس لیے اس کا کال ریسیونہ کرنا اسے حیرت میں مبتلا کر رہا تھا۔

”پریشان نہ ہو، میں اور آصف تمہیں وہاں لے چلیں گے۔ تم خود مہناز سے مل کر اپنی تسلی کر لیتا۔“ راحیلہ نے اس کی پریشانی کا حل پیش کیا۔

”ایسے تو ہم وہاں لالہ کے ٹھکانے پر بھی جاسکتے ہیں۔“ اسے خیال سوچا۔

”میرے خیال میں یہ مناسب نہیں ہوگا۔ جس قسم کے حالات آپ لوگوں کو درپیش ہیں، ہم اس امکان کو رد نہیں کر سکتے کہ آتشزدگی کا واقعہ محض حادثہ نہیں تھا اور آگ کسی نے لگائی تھی۔“ آصف نے اس موقع پر گفتگو میں دخل دیا اور بشریٰ کے خیال کی مخالفت کی۔

”واقعی اگر ایسا ہے تو تم کسی کی نظر میں بھی آ سکتی ہو۔“ راحیلہ نے بھی تشویش کا اظہار کیا۔

”پھر تو مجھے مہناز کے پاس ہی جانا چاہیے۔ ہو سکتا ہے وہاں سے مجھے کوئی سن گن مل جائے۔“ وہ ان دونوں میاں بیوی کے لیے خطرات پیدا کرنے کے حق میں نہیں تھی اس لیے فوراً ہی اپنی خواہش سے دستبردار ہو گئی۔

”مہناز کے پاس بھی میں آپ کو صرف اس صورت میں لے کر جاؤں گا جب آپ اچھی طرح کھاپی کر خود کو ریفریش کر لیں گی۔“ آصف نے فٹ سے شرط رکھ دی۔

”آصف ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ جب سے جاگی ہو، اسی مسئلے میں الجھی ہوئی ہو۔ اس طرح کھائے بے بغیر خود کو ہلکان کرتی رہو گی تو بیمار پڑ جاؤ گی۔“ راحیلہ نے جھٹ اپنے میاں کی تائید کی۔

”تم دونوں میاں بیوی نے شاید شادی سے پہلے کامیاب ازدواجی زندگی کا کوئی کوریو کیا تھا جس کا پہلا سبق یہی تھا کہ ہر حال میں ایک دوسرے کی ہاں میں ہاں ملاتے رہنا ہے۔“ اس نے راحیلہ کے یوں تائید کرنے پر پھبتی کسی جس پر شرمندہ ہونے کے بجائے دونوں نے خوش دلی سے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ اس قہقہے کو راحیلہ کے موبائل فون کی گھنٹی نے بریک لگائے۔ فون ابھی تک بشریٰ کے پاس ہی تھا۔ اس نے اسکرین پر جھگکاتا مہناز کا نمبر دیکھا اور جلدی سے کال ریسیو کر لی۔

بھیجا۔
 ”کب تک آؤ گی؟ ایسا نہ ہو کہ تمہارے آنے تک میں پارلر کے لیے نکل جاؤں۔“
 ”نہیں، اتنی دیر نہیں لگاؤں گی۔ بس زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹا ہی لگے گا۔ راحیلہ اور اس کا شوہر مجھے چھوڑنے کے لیے آرہے ہیں۔“ اس نے جواب دیا جس کے رد عمل میں مہناز کی طرف سے ”ادکے“ کہہ کر بات ختم کر دی گئی۔ اس نے راحیلہ اور آصف کو اس ساری بات چیت سے آگاہ کیا تو وہ میاں بیوی بھی مطمئن ہو کر جلدی ناشتے سے فارغ ہونے کی کوشش کرنے لگے۔

☆☆☆

”کیا واقعی اعظم واپس آسکتا ہے؟“
 ”بالکل آسکتا ہے اور تم اسے اپنے ساتھ اس کی ماں تک بھی لے جاسکتی ہو۔“ اس نے حیرت کی تصویر بنی نیلی کو یقین دہانی کروائی۔

”اگر ایسا ہے تو میں آپ کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں۔ آپ بتائیں کہ مجھے اس سلسلے میں کیا کرنا ہوگا؟“ نیلی کے اداس چہرے پر جوش دکھائی دینے لگا۔ معاذ اس کی اعظم کے لیے جذباتیت کی بنیاد پر ہی اس سے مدد مانگنے پہنچا تھا۔ نتیجہ حسب مرضی نکلا تو متانت سے مسکرایا اور رسان سے بولا۔
 ”اس بار ہم لڑائی جھگڑے یا مار دھاڑ کے زور پر اعظم کو حاصل کرنے کی کوشش کرنے کے بجائے مذاکرات کے ذریعے معاملہ سدھارنے کی کوشش کریں گے۔ یہ مذاکرات بھی میں خود ہی کروں گا۔ تمہیں بس میرا ساتھ دینا ہوگا اور خاص طوڑ پر اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ یہاں کسی اور کو اس سب کی خبر نہ ہو۔“

”وہ کیوں؟“ وہ معاذ کی تاکید پر ابھی۔

”بس ہے کوئی وجہ۔ تم یہ بتاؤ کہ میری یہ بات مان سکتی ہو یا نہیں؟“

”اعظم کی خاطر مان سکتی ہوں لیکن پتا نہیں کیوں مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ آپ کوئی ایسی خطرناک حرکت کرنے جارہے ہیں جس سے آپ کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔“ نیلی ایک ذہین لڑکی تھی اس لیے اسے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ معاذ کچھ ایسا کرنے جارہا ہے جس سے اسے نقصان پہنچنے کا احتمال ہے اور اسی وجہ سے وہ اپنے ساتھیوں سے بھی یہ بات چھپا رہا ہے۔

”جب میں کہہ چکا ہوں کہ کوئی لڑائی جھگڑا نہیں ہوگا تو پھر کسی نقصان کا کیا سوال۔ بس بات صرف اتنی ہے کہ

میں یہ کام بغیر کسی ہنگامے کے خاموشی اور سکون سے کرنا چاہتا ہوں اور اسے انجام تک پہنچانے کے لیے مجھے ایک ساٹھی کی ضرورت ہے جو اعظم کی حفاظت کر سکے۔ تمہاری اعظم کے لیے محبت کے باعث میں نے تمہارا انتخاب کیا ہے۔ اگر تم کسی اندیشے کے سبب میرا ساتھ دینے سے انکار کر دو تو میں کسی دوسرے ساٹھی سے بات کروں گا لیکن ہوگا بس کوئی ایک ہی تاکہ میں اپنے حسبِ مشاکم کر سکوں۔“ اس نے بڑے مضبوط لہجے میں نیلی کو یقین دہانی کروانے کی کوشش کی۔

”ٹھیک ہے۔ اعظم کی خاطر میں تیار ہوں۔ آپ بتائیں کہ کب اور کیا کرنا ہے؟“ نیلی نے بے نیازی کے اظہار کے لیے شانے جھٹکے اور اپنی رضا مندی دے دی۔

”فی الحال تمہیں اپنا حلیہ درست کرنا ہے اور باہر جانے کے حساب سے ڈریس اپ ہونا ہے۔“ معاذ نے اس کے بے ترتیب بالوں اور ٹکجے کپڑوں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے اسے ہدایت دی۔

”باہر کہاں؟“ نیلی نے پوچھا اور پھر وضاحت کرنے والے انداز میں بولی۔ ”میں اس لیے پوچھ رہی ہوں کہ جہاں جانا ہے، اسی اعتبار سے تیار ہوں۔“
 ”سمجھو کوئی بزنس میٹنگ انینڈ کرنی ہے۔“ معاذ نے اسے سنجیدگی سے بتایا اور کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔

”امید ہے تم رازداری کا پورا خیال رکھو گی۔“
 ”آپ بالکل بے فکر رہیں۔“ نیلی نے اسے یقین دہانی کروائی تو وہ مطمئن ہو کر باہر نکل گیا۔

”آپ ذرا نیلی کی مدد کروادیں۔ میں کچھ دیر کے لیے اسے اپنے ساتھ باہر لے جانا چاہتا ہوں۔“ باہر نکل کر اس نے لاؤنج میں منتظر بیٹھی نرس سے کہا تو وہ یس سر کہتی ہوئی نیلی کے زیر استعمال کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

معاذ نے کچھ ضروری کام نمٹائے اور خود بھی تیار ہونے لگا۔ تیار ہونے کے بعد اس نے ایک ضروری کال نمٹائی اور موبائل جیب میں ڈال کر نیلی کے لیے مخصوص کمرے کی طرف بڑھا۔ پچھلے فون ضائع ہونے کے بعد لالہ نے ان لوگوں کے لیے نئے موبائل سیٹس اور سمر کا انتظام کر دیا تھا۔ اس نے اپنے تمام رابطہ نمبر گوگل اکاؤنٹ کی مدد سے ریکور کر لیے تھے اس لیے اس حوالے سے کوئی پریشانی نہیں تھی البتہ بشرطی سے رابطہ نہ ہوسکنے کے باعث مسلسل فرمند تھا۔ اس حوالے سے ذہن میں بہت سے خدشات تھے۔ ہاں ایک امید ضروری کہ بچہ کو مارنے جارہا

کٹا۔ نیلی رنج موڑے کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی اور وہ اپنے موبائل کی اسکرین پر جھکا کچھ ضروری پیغامات لکھتا رہا۔ آخر کار نیکی نے انہیں ایک مشہور اور مہنگے ہوٹل کے سامنے اتار دیا۔

”روم نمبر 121 اور 122۔“ استقبالیہ پر پہنچ کر اس نے وہاں ڈیوٹی پر موجود شخص سے کہا اور آن لائن بکنگ کی تصدیق کرنے کے لیے اپنی موبائل اسکرین اس کے سامنے کی۔ اس نے چابیاں نکال کر کاؤنٹر پر معاذ کے سامنے رکھ دیں۔

”تھینک یو۔“ اس نے رسی سے انداز میں شکریہ ادا کر کے چابیاں اٹھالیں اور اوپری منزل تک لے جانے والی لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔ ان کے پاس ایسا کوئی سامان تھا نہیں کہ جسے اٹھانے کے لیے کسی کی مدد کی ضرورت پڑتی چنانچہ دونوں آرام سے ٹپلتے ہوئے جا کر لفٹ میں سوار ہوئے اور اپنی مطلوبہ منزل پر اتر گئے۔

”تم اس کمرے میں جا کر دروازہ اندر سے لاک کر لو۔ میری ہدایت کے بغیر نہ تم نے دروازہ کھولا۔ یہ اور نہ ہی کوئی کال ریسیو کرنی ہے۔ یہاں تک کہ لالہ اور وہی میں سے بھی کسی سے اس وقت تک بات نہیں کرنی جب تک میں نہ کہوں۔“ کمر نمبر 121 کے دروازے پر کھڑے ہو کر اس نے نیلی کو تاکید کی تو وہ اثبات میں سر ہلا کر کمرے کے اندر داخل ہو گئی۔ معاذ نے دونوں کمروں کے دروازوں پر ڈونٹ ڈسٹرب کی تختی لگائی اور خود کمر نمبر 122 میں براجمان ہو کر ایک نمبر اکل کرنے لگا۔

”ویکم ٹو۔“ اینڈ ہے۔“ کال ملتے ہی ایک مشینی آواز سنائی دی اور ساتھ ہی ہدایات دی چائے نکلیں کہ کس مطلوبہ جگہ بات کرنے کے لیے کون سا کوڈ نمبر ملانا ہوگا۔ اس نے آپریٹر سے بات کرنے کا انتخاب کیا کیونکہ دیے گئے انتخاب میں کہنی کی سی ای او سے بات کرنے کے لیے کوئی انتخاب موجود نہیں تھا۔

”مجھے آپ کی سی ای او میڈم رائیل سے بات کرنی ہے۔“ جیسے ہی دوسری طرف سے کال ریسیو کی گئی، اس نے اپنا مدعا بیان کر دیا۔

”کیا میں جان سکتی ہوں کہ آپ کون صاحب بات کر رہے ہیں؟“ آپریٹر نے ششہ انگریزی اور مہذب لہجے میں پوچھا لیکن اس کے لہجے سے یہ ظاہر تھا کہ وہ کسی غیر اہم شخص سے اپنی سی ای او کی بات ہرگز نہیں کر دئے گی۔

”میرا نام معاذ ہے، آپ کی سی ای او کو مجھ سے بات

ہے، اس کے بعد بشری کو باز یاب کر دانا زیادہ دشوار ثابت نہیں رہے گا۔

”میں ٹھیک تیار ہوئی ہوں نا؟“ نیلی سے سامنا ہوا تو اس نے قدرے کنفیوز سے انداز میں پوچھا۔

”بہترین۔“ اس نے ایک لفظ میں اسے مطمئن کیا اور پھر نرس سے مخاطب ہو کر بولا۔

”اگر کوئی پوچھے تو بتا دینا کہ میں نیلی کو اپنے ساتھ باہر لے کر گیا ہوں۔ تھوڑی دیر میں واپسی ہو جائے گی۔“

”اوکے سر!“ نرس، نیلی کے باہر جانے پر تذبذب کا شکار تھی لیکن اعتراض کی ہمت نہیں کر سکی تھی۔ نیلی کے سامنے البتہ اس نے دبے الفاظ میں تھوڑا بہت اعتراض کیا تھا لیکن نیلی نے کسی نہ کسی طرح اسے مطمئن کر دیا تھا۔ یہ اتفاق تھا کہ لالہ اور وہی کسی کام کے لیے باہر نکلے ہوئے تھے اور جارج و سوراہا تھا اس لیے کسی کے ہوالات کا سامنا کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔

”ڈر تو نہیں لگ رہا؟“ اس نے آن لائن نیکی منگوائی تھی اور اب اس کی پچھلی آشت پر نیلی کے ساتھ بیٹھا اس سے دھیمی آواز میں دریافت کر رہا تھا۔

”ساری زندگی تنے ہوئے رستے پر چلتے یا موت کے کنوئیں میں مومی کے پیچھے موٹر سائیکل پر بیٹھے گزری ہے، ایسے میں ڈر کیا ہوتا ہے، کبھی خبر ہی نہیں ہو سکی۔ ہاں، بس ایک بات سے ڈر لگتا تھا کہ مومی کو نہ کھودوں۔ اب اس ڈر سے بھی گزر گئی ہوں تو سب ختم ہو گیا ہے۔ ڈر بھی اور زندہ رہنے کی تمنا بھی۔ جنہیں زندگی پیاری نہ رہے، وہ پھر کسی چیز سے نہیں ڈرتے۔“ اس کی آنکھوں اور لہجے دونوں میں دیرانی تھی۔

”آئی ایم سوری! مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ تم عدت میں ہوگی۔“ مومی کی موت کا ذکر آیا تو اسے اس بات کا خیال آیا جسے پہلے سوچا ہی نہیں تھا۔

”عدت.....!“ وہ عجیب سے انداز میں ہنسی۔

”میرے ایسے حالات ہی کہاں ہیں کہ میں عدت کر سکوں۔ جو میرا دنیا میں واحد محرم تھا، وہ چلا گیا۔ میں تو رہ بھی نامحرموں کے ساتھ رہی ہوں پھر ایسے میں عدت کا اہتمام کیا خاک کروں گی۔“ اس کے رخسار نے معاذ کو خاموشی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ اندر ہی اندر اسے یہ شرمندگی تھی کہ چاہے بشری اور ٹوبیہ ہوں، چاہے حسین اور مومی..... سب کے سب اس چکر کی لپیٹ میں آ گئے تھے جس میں وہ خود پھنس گیا تھا۔ باقی کا راستہ خاموشی سے ہی

کر کے یقیناً خوشی ہوگی۔“

”سوری سر! پلیز، ریفرنس کے ساتھ اپنا تعارف کروائیں۔ میں ہر کال پر میڈم سے رابطہ کروانے کی مجاز نہیں ہوں۔“ آپ ریٹر نے اپنی معذوری ظاہر کی۔

”یقیناً آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ آپ غیر اہم کالز ملانے کی مجاز نہیں ہیں لیکن یاد رکھیں کہ میں میڈم رائیل کے لیے اتنا اہم فرد ہوں کہ اگر ان کو علم ہو گیا کہ آپ نے میرا ان سے رابطہ کروانے میں اتنی تاخیر کی ہے تو آپ کو ان کی ناراضگی کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔“ اس کے لہجے کے اعتماد نے آپ ریٹر کو متزلزل کر دیا۔

”پلیز، آپ ہولڈ کریں سر!“ وہ خود لائن پر سے غائب ہو گئی اور اسپیکر سے موسیقی کی آواز ابھرنے لگی۔ معاذ کو زیادہ دیر انتظار کی زحمت نہ اٹھانی پڑی اور میڈم رائیل عرف میڈم ایکس کی مخصوص آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

”تو آخر کار تم نے ہار مان ہی لی۔“
”تمہیں یہ سوچ کر ہی خوشی ہوتی ہے تو خوش ہو لو۔ میں بہر حال سیدھا معاملے کی بات کرنا چاہتا ہوں۔“ معاذ نے سرد لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا۔
”تو کہو۔“

”اعظم کی واپسی اور سائیں صداقت شاہ کی رہائی۔“

”کیا قیمت دو گے اس کی؟“

”معاذ احمد!“ اس نے بغیر جھکے جواب دیا۔

”اور سونیا.....؟“

”وہ میرے پاس نہیں ہے۔“

”کیا مطلب ہے اس بات کا؟ وہ تمہارے لیے ہم سے بغاوت کر کے ہمیں چھوڑ گئی اور تم کہہ رہے ہو وہ تمہارے پاس نہیں ہے؟“ میڈم ایکس براہم ہوئی۔

”جو سچ تھا، میں نے بتا دیا۔ مطلب میں نہیں بتا سکتا۔ اگر تمہیں میری بتائی ہوئی قیمت پر سودا منظور ہے تو ٹھیک ہے ورنہ جیسے پہلے ایک بار اعظم کو تمہارے قبضے سے نکالا جا چکا ہے، دوبارہ بھی نکالا جاسکتا ہے۔“ اس نے سبیل کی خاطر گھٹنے ٹیک دیے تھے لیکن میڈم ایکس پر اپنی کمزوری ظاہر بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”اگر ایسا ہے تو یاد رکھو کہ جیسے پہلے دو بار ہم تمہیں اپنے قبضے میں لے چکے ہیں، تیسری بار بھی لے سکتے ہیں۔“
میڈم ایکس نے بھی اسی کے لہجے میں جواب دیا۔

”اس غلط فہمی کو دماغ سے نکال دو۔ پہلے کی بات اور تھی۔ پہلے میں شہا اور کمزور تھا۔ اب میری پشت پر بہت

طاقتور لوگ موجود ہیں۔ اگر تم اس خیال میں ہو کہ اس فون کال کے ذریعے میری لوکیشن نکال کر مجھے چھاپ سکتی ہو تو یہ صرف تمہارا ایک خواب ہی ہوگا۔ میں احمق نہیں ہوں کہ اپنی سیکورٹی کا انتظام کیے بغیر ہی تم سے سودے بازی کرنے بیٹھ جاؤں۔ میری مرضی کے بغیر تم میری گرد کو بھی نہیں پاسکتیں۔“ وہ اس کے ساتھ ہلکے سے ہاتھ لگایا لیکن لہجہ اتنا مضبوط تھا کہ سامنے والے کو اس کی سچائی پر شک بھی نہ گزرے۔

”لالہ عیسیٰ جیسے عام سے غنڈے کے بل پر اتنا اچھل رہے ہو حالانکہ اس کی حیثیت بس اتنی ہے کہ ہمارے حوالے سے اسے بزنس ملتا تھا تو اس کا خرچہ پانی چلتا تھا۔“
میڈم ایکس نے اس پر طنز کیا۔

”یوں تو لالہ عیسیٰ جیسا بقول تمہارے عام سا ”غنڈا“ بھی کئی بار تم لوگوں کو دھول چٹا چکا ہے لیکن میں واضح کر دوں کہ میری پشت پر اس سے بھی کہیں زیادہ طاقتور پارٹی ہے۔ اتنی طاقتور پارٹی کہ تمہارے سائنسی شعبہ دوں سے لیس تلخے کے سارے حفاظتی انتظامات کو ناکارہ کر کے تمہارے سر پر پہنچ جاؤں اور تم خود اپنے ہاتھوں سے اعظم کو میرے حوالے کر دین میں اس سب میں صرف اور صرف اس لیے نہیں پڑنا چاہتا کہ میرے پاس وقت کی کمی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اعظم یا سائیں صداقت شاہ سے تمہارا کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ تم نے ان پر ہاتھ مجھ پر قابو پانے کے لیے ڈالا ہے تو بس جب میں خود کو تمہارے حوالے کر رہا ہوں تو ختم کر دینا سارا کھڑا لگ اور پالو اپنا مقصد۔“ وہ بغیر کسی لاگ لپیٹ کے بالکل سیدھی بات کر رہا تھا اور جو کہہ رہا تھا اس میں کوئی جھوٹ بھی نہیں تھا۔ اگر لالہ کے مشورے پر وہ اپنے چینی مہربانوں سے رابطہ کر کے ان سے مدد طلب کرتا تو سچ کچ اس سب پر عمل ہو سکتا تھا لیکن وقت شاید کچھ زیادہ لگ جاتا اور وہ وقت بچانے کا خواہاں تھا۔

”اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ اس لین دین میں ہمارے ساتھ دھوکا نہیں ہوگا؟ ہو سکتا ہے اپنے مطالبات پورے کروانے کے بعد تم فرار ہو جاؤ۔“ میڈم ایکس کی طرف سے ظاہر کیے گئے خدشے نے واضح کر دیا کہ وہ کافی حد تک اس کی بات ماننے کے لیے تیار ہو چکی ہے۔

”گارنٹی میری زبان ہے۔ میں کہہ رہا ہوں کہ میں اعظم کے بدلے خود کو تمہارے حوالے کر دوں گا تو یقین رکھو کہ ایسا ہی ہوگا لیکن تم چاہو تو سائیں صداقت شاہ کی پولیس کی حراست سے رہائی کو میرے خود تک پہنچنے تک منووف کر دو۔ اس طرح دونوں طرف سے ہی دھوکے کا احتمال نہیں

رہے گا۔“ اس نے حل پیش کیا۔

”ٹھیک ہے، ڈن۔ اب تم بتاؤ کہ اس تبادلے کا طریقہ کار کیا ہوگا؟“ آخر کار میڈم ایکس نے اس کی بات ماننے کا عندیہ دے دیا۔

”پہلے اعظم کو میرے ساتھیوں کے حوالے کیا جائے گا اور جب وہ بحفاظت نکل جائے گا تو میں خود کو تمہارے حوالے کر دوں گا۔ میں کہاں ہوں، یہ تو اب تک تم نے کھوج ہی لیا ہوگا۔ بے شک اس جگہ کو اپنے گھرے میں لے لو لیکن دھوکا کرنے کی حماقت ہرگز نہیں کرنا۔“ اس نے ایک بار پھر تنبیہ کرنا ضروری سمجھا۔

”اعظم کو کہاں پہنچانا ہوگا؟“ میڈم ایکس نے اس کی تنبیہ کے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے معاملے کی بات کی۔

”یہ میں کچھ دیر میں بتاؤں گا۔“ اس نے کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ اب اسے وہی یا لالہ عیسیٰ میں سے کسی سے بات کرنی تھی لیکن ان سے پہلے اس نے نیلی کا نمبر ملایا۔

”تم ٹھیک ہو؟ کسی قسم کی کوئی پریشانی تو نہیں؟“

”میں بالکل ٹھیک ہوں لیکن بار بار وہی بھائی کی کال آرہی تھی۔ میں نے کال ریسیو نہیں کی تو ان کا پیجج آ گیا۔ شاید آپ نے ان کو صورت حال سے آگاہ کرنے کے لیے کوئی پیغام بھیجا تھا تو وہ پریشان ہو رہے تھے اور جاننا چاہ رہے تھے کہ ہم دونوں اس وقت کہاں ہیں۔ آپ نے منع کیا تھا اس لیے میں نے اس پیغام کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اب آپ دیکھ لیں کہ کیا کرنا ہے۔“ نیلی نے اس کی بات کا جواب دیا۔

”تم فکر نہ کرو اور اگر بور ہو رہی ہو تو کوئی مودی وغیرہ لگا کر دیکھ لو۔ وہی سے میں خود بات کر لیتا ہوں۔“ اس نے نیلی کو تسلی دی اور سلسلہ منقطع کرنے کے بعد پہلے وہی اور لالہ کا نمبر ان بلاک کیا۔ راستے میں انہیں پیغام بھیجنے کے بعد اس نے ان کے نمبر جان بوجھ کر بلاک کر دیے تھے کہ ان کے سوالوں کے جواب نہ دینے پڑیں اور خود سکون سے میڈم ایکس سے بیانات کر سکے۔ اب جبکہ سب کچھ اس کی مرضی کی ترتیب سے چل رہا تھا، لالہ یا وہی سے رابطہ کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ اس نے نیلی کے پاس آئے پیغام کی وجہ سے وہی سے رابطہ کرنا مناسب سمجھا۔

”آپ کہاں ہیں معاذ بھائی اور کیا کرتے پھر رہے ہیں؟ میں اور لالہ آپ کے لیے بہت پریشان ہیں۔“ وہی نے پہلی ہی کھٹی پر کال ریسیو کر لی اور بے چینی سے بولا۔

”سوال جواب کا نام نہیں ہے وہی! تم صرف وہ کرو

جو میں کہوں۔“

”پھر بھی.....“ وہی نے کچھ کہنا چاہا۔

”سب چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ تم نے میری ہدایت کے مطابق بندے اور ہتھیار تیار کر لیے ہیں؟“ اس نے وہی کو ٹوک کر اپنی ہی بات کی۔

”جی، سب ریڈی ہے۔ آپ بتائیں کہ کہاں پہنچنا ہے؟“

”میں لوکیشن بھیجتا ہوں لیکن خیال رہے کہ تم لوگوں نے خود کو ظاہر نہیں ہونے دینا ہے اور صرف اس وقت مداخلت کرنا ہے جب دیکھو کہ معاملات خراب ہو رہے ہیں۔ پُر سکون ماحول میں تم لوگوں کا کام صرف یہ ہوگا کہ نیلی اور اعظم کو پک کر دو اور بحفاظت کسی محفوظ مقام تک پہنچا دو۔ اس سے آگے کیا کرنا ہے وہ میں بعد میں تمہیں بتاؤں گا۔“

”جانے کیوں مجھے لگ رہا ہے کہ آپ خود کو کسی خطرے میں ڈال رہے ہیں۔“ وہی نے اگرچہ اس کی ہر ہدایت غور سے سنی لیکن آخر میں تشویش کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکا۔

”خطرے میں، میں ایک زمانے سے ہوں لیکن تم دیکھ ہی رہے ہو کہ حفاظت کرنے والی ذات نے ہر قسم کے حالات میں میری پوری حفاظت کی ہے۔ آگے کے لیے بھی اس سے پوری طرح پُر امید ہوں۔“ اس نے وہی کو تسلی دی پھر لہجے کو ذرا سخت بناتے ہوئے بولا۔

”اچھا اب فون بند کر دو تاکہ میں کچھ کام کر سکوں۔“

اس نے وہی سے کہا ضرور لیکن اس سے پہلے خود ہی سلسلہ منقطع کر کے اسے اپنی لوکیشن بھیج دی۔ اسے وہی پر اعتماد تھا کہ لوکیشن سے واقف ہو جانے کے بعد بھی وہ اس کی ہدایات پر عمل کرے گا اور غیر ضروری مداخلت سے اجتناب کرے گا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد اس نے نیلی کو اپنی آمد سے آگاہ کیا اور خود چل کر اس کے کمرے تک پہنچا۔

”پریشان تو نہیں ہو؟“ سامنا ہونے پر اس نے ایک بار پھر نیلی سے پوچھا۔

”بالکل بھی نہیں۔ آپ بتائیں، وہی سے بات ہوگئی آپ کی؟“

”ہاں، ہوگئی ہے۔ وہ ہونٹ کے باہر موجود رہے گا۔ تم اور اعظم اسی کے ساتھ یہاں سے جاؤ گے۔“

”اور آپ؟“ نیلی نے بے ساختہ پوچھا۔

”میرے لیے کسی نہ کسی سواری کا انتظام ہو ہی جائے گا۔“ وہ پچکا سا مسکرایا اور پھر بات بدلتے ہوئے بولا۔

”میں یہاں اس لیے آیا تھا کہ تمہیں یہ دے سکوں۔“ اس نے ایک پتلی سی پٹی نما کپڑے میں بندھی کوئی شے نیلی کی طرف بڑھائی۔

”یہ کیا ہے؟“ نیلی نے کسی تعویذ گنڈے کی طرح دکھائی دیتی اس شے کو الٹ پلٹ کر دیکھا تو اسے پٹی میں بندھی بھوری سی شے کی جھلک دکھائی دی۔ اس نے اسے چھوا تو احساس ہوا کہ وہ کوئی پتھر ہے۔

”یہ کرشماتی خصوصیات رکھنے والا پتھر مجھے ایک مہربان سادھو نے دیا تھا۔ اس پتھر کو اگر جسم سے مس کرتے ہوئے پہنا جائے تو یہ پہننے والے کے جسم سے خارج ہونے والی ہر قسم کی لہروں اور گرمی وغیرہ کو خود میں جذب کر کے آگے جانے سے روک دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کو پہننے والے کے قریب کوئی کیڑا مکوڑا تک نہیں آتا۔ جو حالات میرے علم میں آئے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ پچھلی بار اعظم کے حصول کے باوجود اس کی حفاظت اس لیے نہیں کی چاسکی کہ اسے چھپانے کے لیے جہاں بھی لے جایا جاتا تھا، دشمن فوراً ہی اس کے پیچھے وہاں پہنچ جاتے تھے اور ایسا صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ انہیں اعظم کے جسم سے کوئی سنگل ملتا رہا ہو ورنہ باقی تو لالہ کے انتظامات پورے تھے۔“ اس نے پتھر کے بارے میں پوری تفصیل سے نیلی کو آگاہ کیا تو اس کی آنکھیں چمکنے لگیں اور خوش ہو کر بولی۔

”یہ تو بہت زبردست چیز ہے۔ آپ سچ کہہ رہے ہیں کہ پچھلی بار ہم اتنی بھاگ دوڑ کے باوجود اعظم کو محفوظ رکھنے میں اسی لیے ناکام رہے تھے کہ ہر بار دشمنوں کو ہمارے ٹھکانے کا پتا چل جاتا تھا۔ خود مومی نے بھی ایک بار اس خدشے کا اظہار کیا تھا کہ اعظم کے جسم میں کوئی ایسی ڈیوائس فٹ کی گئی ہے جو دشمن کو اس کی لوکیشن سے آگاہ کر دیتی ہے لیکن بد قسمتی سے یہ اندازہ لگانے میں بہت دیر ہو گئی پھر ہمارے پاس موقع ہی نہیں رہا کہ کسی طرح اس ڈیوائس کو کھوج کر اعظم کے جسم سے الگ کر سکیں۔“ اس کی خوشی اپنی بات کے اختتام تک ایک آہ میں ڈھل گئی کہ مومی کے ذکر کے ساتھ ہی اسے اس کی دردناک موت یاد آ گئی تھی۔

”جو ہوا سو ہوا۔ اب ہمیں آگے کے معاملات دیکھنے ہیں اور پورا پورا خیال رکھنا ہے کہ اعظم کی حال میں دوبارہ ان غاصبوں کے ہاتھ نہ لگ سکے۔ اس کے لیے تمہیں سب سے ضروری کام یہی کرنا ہے کہ جیسے ہی وہ تم تک پہنچے تم اس پتھر کو اس طرح اعظم کے بازو کے ساتھ باندھ دو کہ پتھر کی سطح اس کی جلد سے لازماً مس ہوتی رہے۔ کر لو گی نا یہ

کام؟“ اسے خود بھی معلوم تھا کہ مومی کا ذکر نیلی کے لیے کتنا تکلیف دہ ہے اس لیے اس بات کو وہیں ختم کیا اور سادھو کے دیے پتھر کے متعلق نیلی کو ہدایات دیتے ہوئے آخر میں اس سے توثیق بھی چاہی۔

”جی، بالکل کر لوں گی۔“ اس نے بھی خود کو سنبھال کر یقین دہانی کروائی۔ اس کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد معاذ واپس اپنے والے کمرے میں آ گیا اور بے خیالی میں بازو کو اس مقام پر چھو کر دیکھا جہاں اتنے عرصے سے وہ بھورا پتھر بندھا ہوا تھا۔ طویل مدت بندھے رہنے کی وجہ سے وہ پتھر گویا اس کے جسم کا ہی ایک حصہ بن گیا تھا اور اب الگ کیے جانے پر وہ اس کی کمی محسوس کر رہا تھا لیکن اطمینان تھا کہ جو کیا، درست کیا۔ اب جبکہ وہ خود کو میڈم ایکس کے حوالے کرنے جا رہا تھا، اسے اس پتھر کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ ہاں، اعظم کی حفاظت میں وہ پتھر اہم کردار ادا کر سکتا تھا۔ یوں بھی سب کے حوالے سے اسے اعظم اتنا پیارا تھا کہ اگر اسے ضرورت بھی ہوئی تو اعظم کی خاطر اپنی ذات کی قربانی دے دیتا۔

”اعظم کو لے کر ہوٹل پہنچ جاؤ۔“ اپنی تیاریوں سے کافی حد تک مطمئن ہونے کے بعد اس نے میڈم ایکس سے رابطہ کیا۔

”کون سے ہوٹل؟“ اس نے پوچھا۔

”اتنی معصوم مت بنو۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم اب تک ہوٹل کا نام تو کیا، میرا روم نمبر بھی معلوم کر چکی ہو گی۔“

”کچھ زیادہ ہی اہم سمجھ لیا ہے تم نے مجھے۔“ وہ اترا کر بولی۔

”میں خود کو تم لوگوں کے حوالے اس وقت کروں گا جب اعظم کسی محفوظ مقام پر پہنچ جائے گا اور صداقت شاہ کی جیل سے رہائی کے کاغذات پر دستخط ہو چکے ہوں گے۔“ اس نے میڈم ایکس کی بات پر کوئی رد عمل ظاہر کیے بغیر اپنے مطالبات پیش کیے۔

”اتنی شرائط رکھو جنہیں پورا کروانے کی تمہارے اندر طاقت ہو۔“ وہ سن کر تلخ ہوئی۔

”اگر میری شرائط پوری نہیں ہوئیں تو تمہارے ہاتھ بھی کچھ نہیں آئے گا۔ میں تمہارے اختیارات اور انتظامات سے اچھی طرح واقف ہوں۔ ہو سکتا ہے اب تک تم نے ہوٹل کی چھت پر ہیلی کاپٹر اتارنے سے لے کر مجھے اپنے ساتھ لے جانے تک کا پورا منصوبہ بنالیا ہو لیکن یاد رکھنا کہ ایسی کوشش کا

نے تاکید کی اور اپنی بات میں مزید زور پیدا کرنے کے لیے بولا۔

”اس سے زیادہ وقت لگنے کی صورت میں، میں اپنی جگہ چھوڑ دوں گا اور تمہیں اس بات کا تجربہ ہے کہ جب میں غائب ہو جاؤں تو تمہارے لوگ مجھے کھوج نہیں پاتے۔“

”سب کچھ تمہاری مرضی کے مطابق ہوگا۔“ آواز سے صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ جواب دیتے ہوئے میڈم ایکس نے اپنے دانت کچکپائے ہیں۔

”گڈ!“ مجاز نے چڑانے والے انداز میں اس کے فیصلے کو سراہا اور پھر سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولا۔

”میرے فون بند کرتے ہی تمہارا وقت شروع ہو جائے گا۔ ٹھیک بیس منٹ بعد مجھے اعظم کے یہاں پہنچنے کی اطلاع ملنی چاہیے۔ دوسری صورت میں اکیسواں منٹ ختم ہونے سے پہلے پہلے میں یہاں سے جا چکا ہوں گا۔“ یہ الفاظ کہنے کے بعد اس نے دوسری طرف کا جواب سننے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا اور خود کی کو کال ملائی۔

”کیا رپورٹ ہے؟“

”ہم یہاں پہنچ چکے ہیں اور پوزیشنز سنبھال لی ہیں۔ زمین سے لے کر فضا تک ہر طرف ہماری نظریں ہیں۔ کوئی کہیں سے بھی آئے، ہماری زد سے دور نہیں ہوگا۔“

”کوئی مشکوک سرگرمی؟“ اس نے وکی کی رپورٹ پر اطمینان محسوس کرتے ہوئے اگلا سوال کیا۔

”تین عدد گاڑیوں اور دو موٹر سائیکل سواروں پر ہمیں شک ہے کہ وہ نگرانی کر رہے ہیں۔ ان سے کوئی چھیڑ چھاڑ کیے بغیر ہم نے ان پر نظر رکھی ہوئی ہے۔“ وکی نے بتایا۔

”بالکل ٹھیک۔ اب آگے کی پلاننگ سنو۔ اب سے ٹھیک اٹھارہ منٹ بعد نیلی ہوٹل سے باہر نکلے گی۔ وہ باہر نکلے تو تمہاری گاڑی اسے پک کرنے کے لیے موجود ہونی چاہیے۔ وہ جب تک گاڑی میں بیٹھی گی، ان شاء اللہ اعظم پہنچ جائے گا۔ اسے نیلی کے حوالے کیے جاتے وقت تم لوگوں کو بے حد چوکنا رہنا ہے۔ اعظم کو نیلی کے حوالے کیے جانے پر جیسے ہی گاڑی حرکت میں آئے، تمام مشکوک گاڑیوں اور موٹر سائیکلوں کے ٹائر برسٹ کر دینا۔ نشانہ تو اچھا ہے نا تمہارے آدمیوں کا؟ میں کسی عام آدمی کو تمہاری اندھی گولیوں کا نشانہ بننے ہوئے ہرگز بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔“

”بے فکر رہیں۔ ہم ہر کام بہت صفائی سے کرنے کی کوشش کریں گے۔“ وکی نے اسے یقین دہانی کروائی۔

”تعاقب کا پورا پورا خیال رکھنا۔ ایک بار اعظم کسی

نتیجہ تمہیں میری لاش کی صورت میں ہی مل سکتا ہے۔“

”تمہیں کیوں لگتا ہے کہ تم ہمارے لیے اتنے قیمتی ہو کہ صرف تمہیں پانے کے لیے ہم تمہاری ہر شرط مانتے چلے جائیں گے؟“ اس کی دھمکی کا جواب طنز سے آیا۔

”میں تم لوگوں کے لیے قیمتی ہوں، اس بات کو مجھے میرے ماضی کے تجربے نے باور کروایا ہے لیکن اگر میں ماضی کو نظر انداز بھی کر دوں تو حال کی یہ حقیقت نہیں جھٹلائی جاسکتی کہ اپنی بیٹی کے بارے میں کوئی سن گن لینے کے لیے تمہارے پاس میرے سوا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ میں یہ تو سوچ ہی نہیں سکتا کہ میرے ایک بار کے انکار پر تم نے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ تم صرف اور صرف اس بات کی منتظر ہو کہ میں تم تک پہنچوں تو تم کسی بھی طرح میرے حلق سے ساری معلومات اگلاؤ۔“ وہ اتنی حقیقت پسندی سے حالات کا تجزیہ کر رہا تھا کہ میڈم ایکس کے لیے اسے جھٹلانا ممکن نہیں رہا اور دوسری جانب سے اس پر حملہ کرتے ہوئے بولی۔

”میں نے تو سنا ہے کہ تمہارے مذہب میں خودکشی حرام ہے اور تم اتنے نیک لڑکے ہو کہ مجھے اس حرام کام کی دھمکی دے رہے ہو۔“

”ہمارے ہاں حالت جنگ میں جسم سے بم باندھ کر ٹینکوں کے آگے لیٹ جانے کی مثالیں بھی موجود ہیں۔ سپاہی جب جنگ کے میدان میں ہو تو اس کے دل میں صرف ایک جذبہ ہوتا ہے۔ اپنے مقابل کو زیر کرنے کا جذبہ..... کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر میں زیر ہو گیا تو دشمن کی فوجیں میرے پورے قہن کو اجاڑ ڈالیں گی۔ میں بھی حالت جنگ میں ہوں اور حالات کے مطابق کچھ بھی کر گزرنے کے لیے تیار ہوں اس لیے میری مالتو تو مجھے دھوکا دینے کی حماقت نہ کرنا۔ دیتے خودکشی میرے پاس آخری آپشن ہوگا۔ پہلے نمبر پر تو ہم تمہیں تمہاری چالوں کا جواب دیں گے اور اپنی ہر اینٹ کے جواب میں تمہیں ہمارا ہتھر ضرور کھانا پڑے گا۔“ وہ کسی طور میڈم ایکس کے قابو میں آنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

”ٹھیک ہے، نہیں ہوگا دھوکا لیکن جوابا تمہیں بھی ایسی ہی ایمانداری کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔“ میڈم ایکس نے ہامی بھرنے کے ساتھ ساتھ شرط بھی رکھی۔

”اس کی میں پہلے ہی ضمانت دے چکا ہوں۔“

”بس تو پھر میں اعظم کو تمہارے پاس بھجوا رہی ہوں۔“

”بیس منٹ سے زیادہ کا وقت نہیں لگنا چاہیے۔“ اس

محفوظ مقام پر پہنچ جائے تو پھر وہ لوگ اس تک رسائی حاصل نہیں کر سکیں گے۔“ اس نے ایک بار پھر وہی کوہدایت دی۔ اصل میں اسے خود بھی احساس تھا کہ اس نے یہ سارا منصوبہ بہت عجلت میں تیار کیا ہے اور مختصر نوٹس پر حرکت میں آنے والے وہی کو بالکل بھی تیاری کا موقع نہیں مل سکا ہے اس لیے بار بار اسے ہدایات دے رہا تھا۔

”میں ہر بات کا خیال رکھوں گا لیکن آپ اپنا تو بتائیں کہ آپ کیسے نکلیں گے وہاں سے؟“ وہی کو ان ساری باتوں کے بیچ بھی اس کی فکر لاحق تھی۔

”میں بچہ نہیں ہوں وہی! مجھے کہاں اور کیسے جانا ہے، یہ میں پہلے ہی ڈیسا بند کر چکا ہوں۔ تم میری فکر میں وقت ضائع کرنے کے بجائے صرف اس پر فوکس کرو جو تمہیں کرنا ہے۔“ حسب سابق اپنے معاملے میں اس نے وہی کو زیادہ بات نہ کرنے دی اور سخت لہجہ اختیار کر کے اسے مجبور کر دیا کہ وہ صرف اس موضوع پر بات کرے جس پر وہ چاہتا ہے۔

”جیسی آپ کی مرضی۔“ وہی اس کے انداز پر سمجھ سا گیا لیکن اس نے نظر انداز کر دیا کہ اس وقت وہی کی دلجوئی سے زیادہ اعظم کی سلامتی کے لیے متفکر تھا۔

”میں تمہیں کچھ کوڈ ورڈز بھیج رہا ہوں۔ جلد اعظم کے سلسلے میں کوئی اہم سے رابطہ کرے گا۔ اس سے ان کوڈ ورڈز کے تبادلے کے بعد تم اس پر اعتماد کر سکتے ہو۔ وہ شش خود پلان کر لے گا کہ اعظم کو سبیل تک کس طرح پہنچایا جائے۔

اعظم کو اس شخص کے حوالے کرنے کے بعد تمہاری ذمہ داری ختم ہو جائے گی البتہ نیلی کو اعظم کے ساتھ ہی رہنا ہوگا۔ اعظم اس کے ساتھ مانوس ہے اس لیے وہ اس کا بہت اچھی طرح خیال رکھ سکتی ہے۔“ اسے اندازہ نہیں ہو سکا کہ اس کی ان آخری ہدایات پر وہی کا دل دھک سے رہ گیا ہے اور اسے یقین ہو چکا ہے کہ اس کی طرف کوئی گڑبڑ ہے ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اعظم کے آگے کے معاملات مکمل طور پر اس کے سپرد کر دیتا اور آگے کی کارروائی میں خود اس کا اپنا ذکر تک نہ ہوتا۔ وہی کو کسی سوال کا موقع دیے بغیر سلسلہ منقطع کر کے اسے متذکرہ کوڈ ورڈز بھیجنے میں مصروف ہو گیا تھا۔ اس کے بعد اس نے مادام زن ہو کے دیے گئے اس نمبر پر ایک قدرے طویل پیغام بھیجا تھا جو چین سے واپس

پاکستان آتے ہوئے اسے کسی ایمر جنسی کی صورت میں رابطہ کرنے کے لیے فراہم کیا گیا تھا۔ یہ سب کچھ بہت تیزی سے نمٹانے کے باوجود پندرہ منٹ گزر چکے تھے اور اب اسے نیلی کو ہدایات دینی تھیں۔ اس مقصد کے لیے اسے کال

کرنے کے بجائے وہ خود اس کے کمرے میں گیا اور آگے کی کارروائی سے جامع الفاظ میں آگاہ کرنے لگا۔ نیلی نے ہر لفظ پوری توجہ سے سنا اور عمل کے لیے تیار ہو گئی۔ معاذ کو یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ اس کے کہے بغیر بھی اس نے اپنا چہرہ ماسک سے کور کر لیا تھا۔ ہوٹل کے اندر آتے ہوئے وہ دونوں ہی اپنے چہروں پر ماسک لگا کر آئے تھے اور واپسی میں ماسک کا استعمال کر کے نیلی نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ ایک حاضر دماغ اور ذہین لڑکی ہے۔

نیلی چلی گئی تو وہ اپنے کمرے میں واپس جانے کے بجائے اسی کمرے کی ایک کھڑکی میں آنکھڑا ہوا۔ یہ لکسڈ گلاسز والی کھڑکی تھی جسے کھولا نہیں جاسکتا تھا لیکن اس کے شفاف شیشے سے باہر کا منظر صاف دیکھا جاسکتا تھا۔ خود اس کے اپنے کمرے میں بھی یہ سہولت موجود تھی اور دونوں میں سے کسی بھی کمرے کو استعمال کرنے میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اس نے الگ الگ کمرے صرف اس لیے حاصل کیے تھے کہ نیلی کو اس کی میڈم ایکس سے ہونے والی گفتگو کا علم نہ ہو سکے۔ علم ہونے کی صورت میں وہ اسے روکنے کی کوشش کرتی جو اسے منظور نہیں تھا۔

اس نے جس لمحے نیلی کو گاڑی میں بیٹھے دیکھا، اسی لمحے ایک دوسری گاڑی وہاں آ کر رکی اور اس میں سے ایک شخص اعظم کو گود میں لیے برآمد ہوا۔

”اپنے آدمی سے کہو کہ بچے کو اپنے آگے کھڑی نیلی گاڑی میں موجود لڑکی کے حوالے کر دے۔“ وہ جانتا تھا کہ میڈم ایکس چاہے براہ راست میدان میں نہ اتری ہو لیکن اپنے آدمیوں سے مسلسل رابطے میں ہوگی اس لیے اس تک اپنا مطالبہ پہنچایا۔ اس مطالبے کو فوراً ہی پورا ہوتا دیکھ کر اسے اپنے اندازے کی تصدیق بھی ہو گئی۔

”میں صرف دو منٹ کے وقفے سے نیچے آ جاؤں گا۔ میرے خیال میں اعظم کو لانے والی گاڑی ہی مجھے لے جانے کے لیے بھی مناسب رہے گی۔“ اس نے سلسلہ منقطع نہیں کیا تھا چنانچہ نیلی والی گاڑی کو حرکت میں آتے دیکھ کر آگے کا پروگرام بتایا۔

”جیسی تمہاری مر.....“ میڈم ایکس کا جواب ابھی ادھورا تھا کہ فضا میں فائرنگ کی تیز آوازیں گونجیں۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیا تم میرے ساتھ دھوکا کر رہے ہو؟“ میڈم ایکس زور سے چلائی۔

”ایسا کچھ نہیں ہے۔ صرف ان گاڑیوں کے باز برسٹ کیے گئے ہیں جو خواجواہ اعظم کا تعاقب کرنے کی

بھائی! آپ نے غلط ٹرن لے لیا ہے۔“ وہ آصف اور راحیلہ کی معیت میں مہناز کی رہائش گاہ کی طرف گامزن تھی۔ آصف نے مہناز کی رہائشی اپارٹمنٹ بلڈنگ کا نام سن کر اس سے واقفیت کا اظہار کیا تھا لیکن منزل کے قریب پہنچ کر وہ راستہ بھٹک گیا تھا جس پر پچھلی نشست پر براجمان بشری کو اسے ٹوکنا پڑا تھا۔

”اوہو..... واقعی یہ تو میں نے غلط ٹرن لے لیا۔ اصل میں دماغ بیگم صاحبہ کی اہم باتوں میں مصروف تھا تو راستے کا خیال نہیں رکھ سکا۔ خیر، آگے سے یوٹرن لے لیتے ہیں۔“ آصف نے ہلکے پھلکے انداز میں جواب دیا تو بشری بے ساختہ ہی ہنس پڑی۔ وہ راحیلہ کی جس گفتگو کو اہم قرار دے رہا تھا وہ دراصل ایک لپ اسٹک کی خریداری کے متعلق تھی جس کا شیڈ راحیلہ کے مطابق وہ نہیں نکلا تھا جو اسے اسکرین پر دیکھنے میں محسوس ہوا تھا اور اب وہ آن لائن شاپنگ کی قباحتوں پر دھواں دھار تقریر کرتے ہوئے مسلسل آصف سے تائید چاہ رہی تھی۔

بشری ہنسی تو آصف بھی اس کے ساتھ ہنس پڑا۔ راحیلہ نے اپنا مذاق اڑانا محسوس کر کے اس کے کندھے پر زوردار دھپ رسید کی۔ یکدم ہی گاڑی لہرائی۔

”ارے ارے، سنبھل کر۔“ راحیلہ گھبرا کر چلائی۔

”اس کو کہتے ہیں کہ ماریں بھی اور رونے بھی نہ دیں۔ مطلب پہلے ایک ڈرائیو کرتے ہوئے جندے پر آپ حملہ بھی کرو اور یہ بھی چاہو کہ گاڑی بالکل ٹھیک ٹھاک اور رواں چلے۔“ آصف نے دہائی دی۔

”اوہو، میں نے کون سا آپ پر توپ داغ دی تھی۔ ایک ہلکا پھلکا مٹکا ہی تو رسید کیا تھا، بس۔“

”تم نے سنا نہیں ہے، وہ اپنے علامہ صاحب کہہ گئے ہیں کہ پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے پیرے کا جگر..... تو یہی حال ہمارا ہے۔ مٹکا تو بڑی چیز ہے، اگر تم مجھ غریب کو ایک گھوڑی بھی ڈال دو تو میرا پتا پانی ہو سکتا ہے۔“ وہ یوٹرن لے کر واپس اس مقام پر آچکا تھا جہاں سے انہیں مہناز کی رہائش گاہ کے لیے بائیں جانب مڑنا تھا۔

”ایسے ہی تو جو رو کے غلام ہیں آپ۔“ راحیلہ نے بُرا مان کر منہ پھلایا۔

”چاہو تو اپنی ساس سے تصدیق کر لو۔ انہیں تو پورا یقین ہے کہ تم نے کالا جادو کر کے ان کے بیٹے کو اپنے قابو میں کیا ہوا ہے۔“ وہ صرف راحیلہ کو چھیڑنے کے لیے ادھر ادھر کی ہانک رہا تھا۔ بشری جسے عرصے بعد ایسا دوستانہ

زحمت کرتیں۔“ اس نے سرد لہجہ میں جواب دے کر کمرے سے باہر کا رخ کیا۔ یہاں آتے ہوئے وہ اپنے ساتھ کوئی خاص سامان لے کر نہیں آیا تھا اس لیے واپسی میں کچھ بھی سمیٹنے کی ضرورت نہیں تھی۔ استقبال پر دونوں کمروں کی چابیاں واپس لوٹا کر چیک آؤٹ کرنے میں اسے مشکل سے ایک منٹ ہی لگا ہوا۔ باہر نکلنے تک دو منٹ کا وقت پورا ہو چکا تھا۔

”اتنے لاڈ میں نے شاید ہی کسی کے اٹھائے ہوں۔ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو اتنی آسانی سے مجھ سے اپنی بات نہ منوا سکتا۔“ وہ مذکورہ گاڑی میں بیٹھ رہا تھا تب میڈم انیس نے اس ساری صورت حال پر تبصرہ کیا۔

”یہ لاڈ نہیں، مفاد کی بات ہے۔ اعظم تمہارے کسی کام کا نہیں تھا۔ اناتھیں اس کی دیکھ بھال میں مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا۔ اس کے بدلے میرا حصول تمہارے لیے ایک سودمند سودا ہے۔“ اس نے متاثر ہوئے بغیر جواب دیا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔ فوراً ہی وکی کی کال آنے لگی۔

”آپ کہاں جا رہے ہیں معاذ بھائی؟ آپ ان لوگوں کی گاڑی میں کیوں بیٹھے ہیں؟“ وکی کی آواز معمول سے بہت بلند اور وحشت زدہ تھی۔

”میں نے میڈم انیس سے ڈیل کر لی ہے۔ اب تمہاری ذمہ داری ہے کہ میں نے تمہیں جو ہدایات دی تھیں، انہیں یاد رکھو اور ان پر عمل کرو۔“ وکی کی وحشت کے مقابلے میں وہ بہت پُر سکون تھا۔

”لیکن معاذ بھائی.....!“ وکی نے کچھ کہنا چاہا۔

”اللہ حافظ!“ اس نے اس کی مزید سننے بغیر سلسلہ

منقطع کر دیا اور موبائل آف کر کے پہلے اس میں سے سم

نکال کر توڑی پھر ٹوٹی ہوئی سم کو موبائل سمیت گاڑی سے

باہر اچھال دیا۔ گاڑی میں ڈرائیور کے علاوہ وہ شخص بھی

موجود تھا جس نے اعظم کو نیلی کے حوالے کیا تھا لیکن اب

تک اس کی طرف دزدیدہ نظروں سے دیکھنے کے سوا اس

نے کسی قسم کی مداخلت نہیں کی تھی۔ اس کے اشارے پر

گاڑی چل پڑی۔ معاذ نے بھی اس شخص کو مکمل طور پر نظر

انداز کیا اور خود نشست کی پشت گاہ سے ٹیک لگا کر آنکھیں

بند کر لیں۔ خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑنے کے بعد

اسے یہ جاننے میں ذرا بھی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی کہ وہ لوگ

اسے کہاں لے جا رہے ہیں۔

☆☆☆

”اونہوں..... رائٹ نہیں، لیفٹ مڑنا تھا آصف

ماحول میسر آیا تھا، مسلسل اس کی باتوں پر ہنس رہی تھی۔ راحیلہ کو اسے یوں ہنسنے دیکھنا بہت اچھا لگ رہا تھا چنانچہ اس نے بھی جان بوجھ کر آصف سے ناراضگی کا ڈراما جاری رکھا ہوا تھا۔ خوشگوار ماحول میں جاری اس ہلکی پھلکی گفتگو میں گم گاڑی میں موجود وہ تینوں ہی افراد ارد گرد کے ماحول سے قدرے بے پروا ہو گئے تھے اس لیے انہوں نے اس گاڑی کو نوٹس نہیں کیا جو تیزی سے انہیں اوور ٹیک کر کے آگے نکل گئی تھی۔ ہوش اس وقت آیا جب وہ گاڑی آگے جا کر ترچھی ہوئی اور ان کی راہ میں حائل ہو گئی۔ آصف نے بدقت تمام بریک لگا کر تصادم سے بچاؤ کیا۔ اچانک لگائے جانے والے بریکس کے شدید جھٹکے سے سنبھل کر جب تک وہ تینوں سیدھے ہوتے، کچھ مسخ افراد ان کی گاڑی کو اپنے گھیرے میں لے چکے تھے۔

”کون..... کون ہو تم لوگ اور کیا چاہتے ہو؟ ہمارے پاس بس تھوڑا سا کیش اور یہ موبائل فونز ہیں۔ تم یہ لے لو اور ہمیں خاموشی سے جانے دو۔“ آصف کو لگا کہ وہ بھی راہزنی کی اس واردات کا شکار ہوئے ہیں جس سے آئے دن اس لاوارث شہر کے شہریوں کا واسطہ پڑتا رہتا ہے اس لیے فوری طور پر اپنا والٹ بلکہ ڈیش بورڈ پر پڑا اپنا موبائل فون بھی اٹھا کر اپنے دائیں جانب کھڑے ہتھیار بردار شخص کی طرف بڑھائے۔ راحیلہ کا فون بشری کے پاس تھا کیونکہ بشری کے لیے موبائل کی خریداری سردست نہیں ہو سکی تھی کہ کھانے پینے سے فارغ ہو کر وہ فوری طور پر گھر سے روانہ ہو گئے تھے اور بشری نے راستے میں کسی موبائل مال پر رکنے کی اس کی خواہش کو یہ کہہ کر رد کر دیا تھا کہ فی الحال وہ فوری طور پر مہناز سے ملنا چاہتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کا یہ بھی کہنا تھا کہ مہناز کے ایارٹمنٹ میں اس کا ایک پرانا موبائل سیٹ اضافی طور پر رکھا ہوا تھا اور وہ اس سے بھی اپنا کام چلا سکتی تھی۔

”آرام سے منہ بند کر کے بیٹھ۔ زیادہ ٹرٹن یا ہلنے جلنے کی کوشش کی تو ہمیں ڈھیر کر دوں گا۔“ آصف کے تعاون کے جواب میں اس شخص نے اس کے شانے پر زور سے اپنی گن کا دستہ رسید کیا۔ آصف کے ہونٹوں سے ہلکی سی سکاری جبکہ راحیلہ کے حلق سے تیز چیخ بلند ہوئی۔ ان میاں بھئی کے ساتھ جاری اس ساری صورت حال کے دوران ایک شخص پچھلا دروازہ کھول چکا تھا۔ دروازہ کھولتے ہی اس نے ساکت بیٹھی بشری کا بایاں ہاتھ تمام کر اسے باہر کی طرف کھینچا۔

”اے..... اے۔ یہ کیا کر رہے ہو تم؟“ آصف

اگرچہ شانے پر لگنے والی زوردار ضرب کے اثر سے نہیں نکل سکا تھا پھر بھی اس منظر کو دیکھ کر بے ساختہ احتجاجی انداز میں چلا آیا۔ ”بولتا تھا منہ بند کر کے بیٹھ لیکن تجھے میری بات سمجھ نہیں آئی۔ اب دیکھ کیسے میں ہمیشہ کے لیے تیرا منہ بند کرتا ہوں۔“ اس کے سر پر سوار شخص کو اس کی یہ بے ساختہ مداخلت اتنی گزراں گزری کہ ایک جھٹکے سے اس کی جانب کا دروازہ کھول کر اپنی گن کی نال اس کے منہ میں گھسادی۔ اس حرکت پر جہاں آصف کی آنکھیں ایک دم سے ابل پڑیں، وہیں راحیلہ بھی خزاں رسیدہ چہ کی طرح کانپتی زار و قطار رونے لگی۔

”گن نکالو ان کے منہ سے ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔“ بشری پہلی بار مشکل حالات کا شکار نہیں ہوئی تھی اس لیے بے خوف تھی اور اس بے خونی کے ساتھ ساتھ اس کے بچے میں شدید سختی بھی در آئی تھی۔

”اتنا بھرم۔ بھلا کیا کر سکتی ہے تو؟“ اس کا ہاتھ کھینچ کر باہر کھینچنے والے نے اس کی دھمکی پر تمسخر کیا۔

”اس کا استعمال۔“ بشری نے یکدم دوپٹے کے پلو میں پوشیدہ اپنا دایاں ہاتھ باہر نکال کر لہرایا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا لیڈر پستل صاف دکھائی دے رہا تھا۔ یہ پستل اس نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے دوپٹے کے نیچے سے ہی اپنے پرس سے نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا اور کسی کو علم نہ ہو سکا تھا۔

”یہ تو ہاتھی کو چیونٹی کے للکارنے والی بات ہے۔ جب تک تم اس کھلونے سے ایک گولی چلاؤ گی، ہم تمہیں بھون کر رکھ دیں گے۔“ وہ شخص پھر تمسخر سے ہنسا۔

”تمہیں یہ زحمت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود یہ کام کر سکتی ہوں۔“ بشری نے یکدم ہی پستل اپنی کپٹی پر رکھ دیا۔ اس کی اس حرکت پر نہ صرف اپنی ہی گاڑی میں یرغمال بنے آصف اور راحیلہ سن پڑ گئے بلکہ انہیں گھیرنے والے بھی دم بخود رہ گئے۔

”کیا مقصد ہے اس حرکت کا؟“ اب تک اس سے مذاکرات کرتے شخص نے جھنجھلا کر پوچھا اور ایک نظر راستے کے دونوں جانب ڈالی۔ اگرچہ یہ کوئی پُرہجوم سڑک نہیں تھی لیکن وقفے وقفے سے گاڑیاں اور موٹر سائیکلیں گزرتی ہی رہتی تھیں۔ اس وقت ایسی تمام سواریاں ہتھیار بند افراد کو سڑک پر قابض پاکر دور ہی سے ہٹتی جا رہی تھیں لیکن اس بات کا تو امکان تھا کہ پلٹنے والوں میں سے کوئی پولیس کو مطلع کر دیتا اور انہیں خواہواہ تصادم کا شکار ہونا پڑتا۔

”اب تم بھی بیٹھو گاڑی میں لیکن پہلے یہ پہل میرے حوالے کر دو۔“ آصف کی گاڑی آگے جا چکی تو بشری سے فرمائش کی گئی جو اس نے بنا حیل و حجت قبول کر لی۔ اسے معلوم تھا کہ اس بات کو مان کر وہ موت سے بدتر زندگی کا انتخاب کر رہی ہے لیکن اول یہ کہ وہ خودکشی کرنا ہی نہیں چاہتی تھی اور دوم یہ کہ اسے باذل کو اس کے انجام تک پہنچانے تک زندہ رہنے کی چاہ تھی۔ چنانچہ فوراً ہی پہل سے دستبردار ہو کر راہ میں مزاحم ہونے والی گاڑی کی جانب بڑھ گئی۔ جیسے ہی گاڑی حرکت میں آئی، وہ دوسری گاڑی بھی پیچھے چل پڑی جس نے عقب سے نہ صرف ان کا بلکہ پیچھے سے آنے والی ٹریفک کا بھی راستہ روک رکھا تھا۔

☆☆☆

آرام دہ گاڑی بے حد ہموار انداز میں چلتی تیزی سے سڑک پر دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ گاڑی میں بیٹھنے سے قبل اس کی تلاشی لی گئی تھی اس کے باوجود نشست پر اس کے ساتھ بیٹھے اور آگے ڈرائیور کے ساتھ براجمان دونوں افراد بے حد چوکے تھے اور ان کے انداز سے ایسا لگتا تھا کہ انہیں کسی بھی لمحے اس کی طرف سے حملے کا خدشہ ہو۔ یقیناً بھیجنے والوں نے انہیں سخت ہدایات کے ساتھ بھیجا تھا اور اس کے بارے میں جانے کیا کچھ کہا تھا کہ وہ اسے انسان سے زیادہ کوئی چھلاوا تصور کر رہے تھے۔ اس کی ذات کے لیے یہ سارا اہتمام کرنے کے ساتھ ساتھ تعاقب اور کسی حملے سے بچنے کے لیے دو موٹر سائیکلوں اور ایک گاڑی پر سوار نصف درجن کے قریب محافظ بھی ہوئے سے اگلے چوڑا ہے پر ان کے ساتھ شامل ہو گئے تھے۔ ذہن کو پرسکون رکھنے کی خاطر آنکھیں موند کر بیٹھے معاذ کو ان کے ان اقدامات کی کوئی پروا نہیں تھی۔ ہاں، آگے پیش آنے والی صورت حال کے بارے میں اس کا دماغ خود بخود ہی سوچتا چلا جا رہا تھا۔ پہلے اور اب میڈم ایس کے قبضے میں جانے میں بہت فرق تھا۔ پہلے محض اس کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھا کر اپنے مقاصد کے حصول کے لیے اسے استعمال کرنا مقصود تھا۔ اب وہ اس کے ہاتھوں بہت زیادہ زک اور خفت اٹھانے کے بعد یقیناً جھنجھلائی ہوئی طیش زدہ ہوگی۔ اس کا سب سے بڑا نقصان تو یہ ہوا تھا کہ برسوں کی محنت سے اپنے ڈھب پر تربیت دی ہوئی بیٹی باغی ہو گئی تھی۔ اسے اپنی بیٹی کو بھی واپس لانا تھا اور معاذ پر کی جانے والی انویسٹمنٹ بھی وصول کرنا تھی۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے معاذ کے اندازے کے مطابق اس کے پاس تشدد کے سوا کوئی راستہ نہیں بچا تھا کیونکہ پہلے

”میرے دوستوں کو صحیح سلامت یہاں سے جانے دو۔“ ورنہ تم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکو گے اور یہاں میری صرف لاش ہی ملے گی۔“ وہ ذہین قدرتی طور پر تھی اور پھر چھوٹی عمر میں بڑے تجربات سے حالات نے گزار دیا تھا اس لیے یہ تجزیہ کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی کہ یہ سارا انتظام اسے اغوا کرنے کے لیے ہے۔ اغوا کا رٹا ہر ہے وہی تھا جس کا مہناز کے فون پر قبضہ تھا اور جس نے اس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اسے اپنے جال میں پھنسانے کا یہ سارا انتظام کیا تھا۔ اس شخص کا نام بھی اس کے دماغ میں روشن ہو چکا تھا اور وہ جان گئی تھی کہ لالہ عیسیٰ کے ٹھکانے پر لگنے والی آگ نے اس کے سب سے بڑے دشمن کو آزاد کر دیا تھا۔ وہ اس دشمن کی فطرت سے بھی اچھی طرح واقف تھی اس لیے جانتی تھی کہ وہ اسے مارنے سے زیادہ اپنی قید میں لے کر ذہنی و جسمانی اذیت سے گزارنے کا خواہاں ہوگا اس لیے اس دھمکی کا استعمال کیا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ لیکن خیال رہے کہ تمہارے دوستوں کی طرف سے بھی کوئی ایسی سیدھی حرکت نہ ہو۔“ اس نے بس ایک ہلکا سا ہی توقف کیا اور بشری کی بات ماننے کا عندیہ دے دیا۔

”کچھ نہیں کریں گے یہ۔ بس تم انہیں جانے دو۔“ اس نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

”نہیں۔ میں ایک بار پھر تمہیں مشکل حالات میں بیچ راستے چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔“ اس کی بات سن کر راحیلہ جذباتی ہو گئی اور گاڑی کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی جسے اس جانب کھڑے ہتھیار بردار نے ناکام بنا دیا۔

”اس جذباتیت کا کوئی فائدہ نہیں راحیلہ! تم یہاں رک کر مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتیں۔ ہاں اگر تم دونوں کو کوئی نقصان پہنچا تو میرے دل پر بہت بوجھ آ جائے گا اس لیے پلیز یہاں سے جاؤ۔“ اس نے قدرے سخت لہجے میں راحیلہ کو سمجھایا پھر آصف سے مخاطب ہو کر بولی۔

”آپ ہی کچھ سمجھداری سے کام لیں آصف بھائی اور اسے لے کر یہاں سے جائیں۔“ آصف نے زبان سے کچھ کہنے کے بجائے سر کو محض اثبات میں جنبش دی اور گاڑی کا انجن اشارت کر دیا۔ راستے میں حائل گاڑی ہٹا لی گئی اور آصف کی گاڑی یوں آگے بڑھی کہ راحیلہ مسلسل گردن موڑ کر کپٹی پر پہلے رکھے کھڑی بشری کو دیکھ رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو کی سیل رواں کی طرح بہتے چلے جا رہے تھے۔

وہ اسے اس کے جن پیاروں کے حوالے سے بلیک میل کرتی تھی، وہ سب تو اس کی پہنچ سے دور ہو گئے تھے اور یہی بات خود معاذ کے لیے تقویت کا باعث تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ آخری حد تک اپنے ضبط کو آزمائے گا اور ہر قسم کے تشدد کے سامنے بھرپور مزاحمت کرے گا۔

’اب تمہارا سامنا ایک مجبور اور نا تجربہ کار لڑکے سے نہیں، ایک آزاد اور اپنے ہی ہاتھوں تربیت دیے ہوئے معاذ احمد سے ہوگا میڈم ایکس..... اور میرا وعدہ ہے کہ میں تمہیں ناکوں جتنے چوہا دوں گا۔ بہت کچھ سوچتے وہ تصور میں ہی میڈم ایکس کو چیلنج کر رہا تھا کہ گاڑی کو لگنے والے جھٹکے پر آنکھیں کھولنے پر مجبور ہو گیا۔ گاڑی جھٹکا کھا کر رک کی نہیں تھی بلکہ ڈرائیور اسے لہراتا ہوا تیزی سے آگے نکال لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔

’ہم پر حملہ ہوا ہے میڈم! ہمارے دونوں موٹر سائیکلسٹ گولیوں کا نشانہ بن کر سڑک پر گرے ہیں اور پیچھے والی گاڑی بھی رک گئی ہے۔ شاید اس کے ٹائر برسٹ ہو گئے ہیں۔‘ معاذ جو سڑک پر پھیلی افراتفری کو محسوس کر چکا تھا، اگلی نشست پر موجود شخص کی بات سن کر چونکا۔ اس وقت ان لوگوں پر حملے کا مطلب تھا کہ اس کے حمایتی میدان میں اتر چکے ہیں لیکن کیوں؟ وہ حیران تھا۔ اس نے وکی کو ایسی کسی بھی حرکت سے منع کیا تھا اور قطعی امید نہیں تھی کہ وہ اس کے حکم سے سر تابی کرے گا۔

’جو نشانہ بن گئے ہیں فی الحال ان کی فکر چھوڑو اور خود نکلنے کی کوشش کرو۔ تمہارے پاس بلٹ پروف شیشوں اور ٹائروں والی گاڑی ہے۔ تمہیں نشانہ بنانا آسان نہیں ہوگا۔ خود کو ہرگز بھی گھیرے میں مت آنے دینا۔‘ بات کرنے والے نے جانے انجانے میں فون کا اسپیکر کھول دیا تھا جس کے باعث وہ بھی میڈم ایکس کی آواز صاف سن سکتا تھا۔

’ہم یہی کر رہے ہیں میڈم! میں نے بس آپ کو صورت حال سے آگاہ کرنے کے لیے کال کی تھی۔‘ اس نے جواب دیا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔ اسی وقت ان کی گاڑی نے غلت میں راستہ بنانے کی کوشش کرتے ہوئے ایک موٹر سائیکل کو سائڈ مار دی۔ موٹر سائیکل توازن بگڑنے سے سڑک پر پھسل گئی اور اس کا سوار اچھل کر فٹ پاتھ کے قریب اس طرح گرا کہ اس کا سر فٹ پاتھ کے کنارے سے لکرایا۔ اس کے سر سے ابل کر سڑک پر پھیلنے والے خون کی سرخی گردن موڑ کر پیچھے کا منظر دیکھتے معاذ کی آنکھوں کے سامنے لہرائی۔

’یہ کیا کر رہے ہو؟ انسانیت سے گاڑی چلاؤ۔‘ معاذ نے بے ساختہ ہی ڈرائیور کو ٹوکا۔

’تم منہ بند کرو۔ یہ سب تمہارے ہی حمایتیوں کی وجہ سے ہو رہا ہے۔‘ اس کے ساتھ بیٹھے شخص نے غصے سے پھر کر اپنی گن اس کی کینٹی سے لگا دی۔

’او خانہ خراب..... اب یہ کیا ہے؟‘ اگلی نشست پر موجود شخص کی حیرت اور کچھ خوف میں ڈوبی آواز نے معاذ کو اپنی کینٹی پر رکھی گن کی نال کو بھلا کر سامنے دیکھنے پر مجبور کیا۔ گاڑی کے بالکل سامنے ایک عجیب و غریب شکل کا ڈرون اڑ رہا تھا۔ اس کی بلندی بہت کم تھی اس لیے آرام سے نظروں میں آ گیا تھا۔

’ہٹ کرو..... اسے ہٹ کرو۔‘ معاذ کے ساتھ بیٹھا شخص چلایا لیکن اس سے قبل کہ کوئی عملی قدم اٹھایا جاتا، ڈرون سامنے سے ہٹ کر عین گاڑی کی چھت کے اوپر پہنچ گیا۔

’اور تیز چلاؤ۔‘ ان لوگوں کو اپنے اگلے اقدام کے بارے میں کچھ بھائی نہیں دیا تو چیخ کر ڈرائیور کو ہدایت دی۔ اس ساری افراتفری اور سراسیمگی کے دوران معاذ بالکل مختلف زاویے سے سوچ رہا تھا۔ میڈم ایکس اور اس کے ساتھیوں کو شک تھا کہ یہ اس کے ساتھی تھے جو اسے ان کے قبضے سے نکالنے کے لیے میدان میں اتر آئے تھے لیکن اب وہ ان کے اس خیال سے بالکل بھی متفق نہیں رہا تھا۔ یہ لالہ اور اس کے لوگوں کے کام کرنے کا انداز نہیں تھا، نہ ہی اسے لالہ کے پاس ایسے کسی ڈرون کی موجودگی کا علم تھا۔ یہاں صورت حال یہ تھی کہ اسے لے جانے والے اپنے محافظوں سے محروم ہو گئے تھے اور یہ کارروائی کرنے والے ہنوز نظروں سے اوجھل تھے۔ اب بھی چند لمحوں کے لیے نظروں کے سامنے آنے والے ڈرون کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیا تھا اور اندازہ تھا کہ مذکورہ ڈرون اس وقت گاڑی کی چھت کے اوپر اڑ رہا ہے۔ گاڑی کی چھت سے کوئی شے ٹھک کر کے پتھر کی طرح ٹکرائی تو وہ سب کے سب یکبارگی اچھل ہی پڑے۔ آگے والے نے بے اختیار ہی ایک بار پھر میڈم ایکس کا نمبر ملا لیا اور جلدی جلدی اسے سب کچھ بتانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کوشش کے دوران انہوں نے چھت کی جانب سے ایسی آوازیں سنیں جیسے اسے ڈرل کیا جا رہا ہو۔ ان کی نظریں چھت کی طرف اٹھ گئیں۔ واضح طور پر وہاں ایک سوراخ نمودار ہو رہا تھا۔

’میڈم سے بات کرو۔‘ معاذ کی نظریں چھت پر ہی تھیں کہ آگے والے نے درشت لہجے میں بولتے ہوئے اپنا

موبائل اس کے حوالے کیا۔

”یہ سب کیا ہو رہا ہے معاذ؟ تم ہمارے ساتھ وعدہ خلافی کر رہے ہو۔ یقیناً تم نے پہلے سے ساری پلاننگ کر رکھی تھی۔“

”تم شاید یقین نہ کرو لیکن میرے لیے بھی یہ سب اتنا ہی حیران کن ہے جتنا تم لوگوں کے لیے۔“ اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”میں کیسے یقین کر لوں؟“ وہ تیز لہجے میں بولی۔

”نہ کرو یقین مگر جان لو کہ یہ سب جو ہو رہا ہے، اس کے آگے میں بھی اتنا ہی بے بس ہوں جتنا کہ تم لوگ۔ تم اسے روکنے کے لیے شاید کچھ کرنے کے لائق ہو، میں تو اس کا بھی اختیار نہیں رکھتا۔“ اس کا جواب سچ پر مبنی تھا جس پر میڈم ایکس نے ایک زور کا ہنکارا بھرا اور غصے سے بولی۔

”تمہیں اس کے نتائج سمجھنے پڑیں گے۔“

”میں تیار ہوں۔“ اس نے اطمینان سے جواب دیتے ہوئے ایک بار پھر چھت پر نظر ڈالی۔ وہاں بننے والے سوراخ سے اب ایک گن کی نال جھانک رہی تھی۔

”روکو، گاڑی روکو۔“ اس کے ساتھ ہی نشست پر براجمان شخص بھی اس سارے منظر کو دیکھ رہا تھا۔ گن کی نال نمودار ہوتے ہی وہ زور سے چلا یا۔ ڈرائیور جو پہلے ہی سراسیمگی کا شکار ہو چکا تھا، ایمر جنسی میں بریک لگائے۔ گاڑی کے رکنے سے پہلے ہی وہ شخص دروازہ کھول چکا تھا۔

چلتی سڑک پر یوں اچانک دروازہ کھولنے پر پیچھے سے آتی ایک گاڑی زور سے کھلے دروازے سے ٹکرائی۔ ان کی گاڑی کا ڈرائیور اس عرصے میں گاڑی روک چکا تھا لیکن اس سے قبل کہ وہ شخص جان بچا کر نیچے کود پاتا، چھت کے سوراخ سے جھانکتی گن کی نال کا رخ اس کی طرف ہوا اور گولی سیدھی اس کی پیٹھ میں گھس گئی۔ وہ کسی ذبح کیے جانے والے جانور کی طرح ڈکرا کر دوبارہ نشست پر گر گیا۔ گن کی نال فوراً ہی گھومی اور اگلی نشست پر بیٹھے شخص کو نشانہ بنایا۔ ادھر سڑک پر بھی کوئی اچھی صورت حال نہیں تھی۔ گاڑی کے دروازے سے ٹکرا کر حادثے کا شکار ہونے والی چھوٹی کار ترچھی ہو کر رک گئی تھی جس کے باعث پیچھے سے آنے والا ٹریفک تعطل کا شکار تھا۔ حقیقتاً دو گاڑیوں کے یوں سچ سڑک پر رک جانے کے باعث بہت کچھ درہم برہم ہو گیا تھا لیکن ابھی تک کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ وہاں کیا کچھ ہو چکا ہے۔ گولیوں کے بے آواز ہونے کے باعث دو بندوں کی گاڑی میں موت بھی ابھی تک صیغہ راز میں تھی لیکن بات کھلنے میں بس کچھ ہی وقت لگنا تھا کہ پیچھے رکنے والی گاڑیوں کے سوار صورت حال

کا جائزہ لینے کے لیے اپنی گاڑیوں سے اترنے لگے تھے۔ معاذ کے پاس اس ساری صورت حال کی کوئی وضاحت نہیں تھی اس لیے اس نے موقع سے ہٹ جانے کو ہی مناسب جانتے ہوئے دروازہ کھولنے والا مٹن پش کیا۔ بالکل یہی کام اس سے پہلے ڈرائیور کر رہا تھا اور اس پھرتی کی وجہ سے ہی اپنے ساتھیوں کے مقابلے میں خوش قسمت ٹھہرا تھا کہ اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

”یہاں آ جائیں سہرا“ ابھی معاذ نے گاڑی سے نیچے قدم رکھا ہی تھا کہ چست لی ٹرٹ اور ٹراؤزر میں ملبوس ایک پستہ قد شخص نے اسے مؤدبانہ مخاطب کیا۔ اس شخص نے ماتھے پر کافی جھکی پی کیپ کے ساتھ ساتھ سیاہ سن گلاسز اور ماسک کا استعمال کر رکھا تھا اس لیے معاذ اس کا چہرہ دیکھنے سے قاصر تھا البتہ لہجے نے چغلی کھائی تھی کہ اردو بولنے کے باوجود وہ شخص اردو دان نہیں ہے۔

”کون ہو تم؟“ اس کے مؤدبانہ لہجے کے باوجود معاذ نے اس کی بات ماننے کے بجائے سخت لہجے میں سوال کیا۔ جواباً اس نے ایک لفظ ادا کیا۔ اس لفظ کو سن کر معاذ دم بخود رہ گیا۔ یہ انہی کو ڈور ڈوز میں سے ایک تھا جو اس نے وکی اور زن ہو کے نمائندے کے درمیان طے کیے تھے۔

”پلیز سہرا ہری اپ۔“ اس نے معاذ کو مزید سوچنے کا موقع دینے کے بجائے اصرار کیا کہ اب لوگ وہاں تک پہنچ چکے تھے لیکن فطری طور پر ان کا رخ بائیں جانب حادثے کا شکار ہونے والی گاڑی کی طرف تھا جبکہ معاذ گاڑی کے دائیں جانب کھڑا تھا۔

”اوکے۔“ وہ ایک گہری سانس لیتے ہوئے اس شخص کے اشارے پر قریب کھڑی گاڑی کے کھلے دروازے سے اندر بیٹھ گیا۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ اس طرح غیر متوقع طور پر اس معاملے میں ٹانگ اڑانے والے کون لوگ تھے؟

☆☆☆

”پلیز راحیلہ اردو بات تو بند کرو۔“ جائے وقوعہ سے کچھ دور جانے کے بعد آصف نے گاڑی ایک جانب کر کے روکی اور مسلسل آنسو بہاتی راحیلہ سے عاجزانہ لہجے میں بولا۔

”کیسے بند کروں؟ آج پھر میں اپنی سہیلی کو سچ منہ حار میں چھوڑ کر آگئی ہوں۔ کیسی دوست ہوں میں کہ مشکل میں بھی دوست کے کام نہیں آپائی۔“ وہ خاموش ہونے کے بجائے اور بھی شدت سے رونے لگی۔

”انسان کے اختیارات محدود ہیں۔ تم اس کی مدد اس

لیے نہیں کر سکیں کہ یہ تمہارے بس میں ہی نہیں تھا۔ آدمی جہاں خود بے بس ہو، وہاں بار بار خود کو مورد الزام ٹھہرا کر خواہ مخواہ کے گلت کا شکار کیوں ہو۔“ آصف نے اسے سمجھایا۔

”مجھے یہ سب باتیں سمجھ نہیں آرہیں آصف! مجھے بس یہ پتا ہے کہ میں اپنی سہیلی کو موت کے منہ میں چھوڑ کر خود کو محفوظ کر چکی ہوں۔“ وہ واقعی اپنے احساسِ ندامت سے جان چھڑانے میں ناکام تھی۔

”وہاں رک کر بھی تم اپنی جان قربان کرنے سے زیادہ کوئی کارنامہ انجام نہیں دے سکتی تھیں۔ اب کم از کم اسے بچانے کی کوشش تو کر سکتی ہو۔“

”وہ کیسے؟“ اس نے جلدی سے آصف کی طرف رخ موڑ کر دیکھا۔ آنسوؤں سے تر رخسار، بھیگی بھیگی پلکیں اور رونے سے سرخ پڑی ناک دیکھ کر آصف نے ایک سرد آہ بھری۔

”مجھے تو تمہاری سہیلی سے جیسی فیل ہو رہی ہے۔ مطلب میری بیگم کو مجھ سے بھی زیادہ کسی سے اتنی شدید محبت ہے۔“

”یہ خواہ مخواہ کا تقابل ہے۔ انسان کی زندگی میں صرف ایک شخص نہیں ہوتا کہ وہ بس اسی سے محبت کرتا جائے۔ آپ بھی تو مجھ سے ہٹ کر اپنے والدین اور بہن بھائیوں سے محبت کرتے ہیں یا نہیں؟“ وہ رونا بھول کر اس سے لڑنے کو تیار ہو گئی۔ آصف نے اس کی اس ادا پر زور سے قہقہہ لگایا۔

”میری سہیلی اغوا ہو گئی ہے اور آپ کو ہنسی آرہی ہے۔“ راحیلہ نے مزید بُرا منایا۔

”میری ایسی مجال۔ میں تو بس ذرا تمہیں اس رونے دھونے سے نکال کر دوسرے ٹریک پر ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دیکھو، یوں تیوریاں چڑھائے لڑاکا بیوی کے روپ میں کتنی اچھی لگ رہی ہو۔“

”اب میں لڑاکا بھی ہو گئی۔ کل تک تو آپ کہتے تھے کہ راحیلہ مجھے تم سب سے زیادہ اس لیے پسند ہو کہ سارے خاندان میں تم سے زیادہ سادہ لوح اور صبر جوڑ کی نہیں دیکھی میں نے۔“ راحیلہ کو اپنے بارے میں دی جانے والی رائے پسند نہیں آئی اور باقاعدہ بحث پر اتر آئی۔

”بے شک تم لڑاکا بیوی کے روپ میں اچھی لگ رہی ہو لیکن اب مزید وقت ضائع کیے بغیر کام کی بات کرتے ہیں۔“ آصف نے یکدم سنجیدگی اختیار کر لی۔

”کیا مطلب؟“ راحیلہ اس کی بات پر چونکی۔

”تمہارا موبائل کہاں ہے؟“ آصف نے جواب

دینے کے بجائے اس سے سوال کیا۔

”وہ.....“ راحیلہ نے اپنا ہنڈ بیگ کھولا لیکن پھر ٹھٹک کر رک گئی۔

”میرا موبائل تو بشری کے پاس ہی تھا۔ میں نے یہ سوچ کر اس کے پاس رکھوا دیا تھا کہ اسے راستے میں ضرورت ہوگی تو استعمال کر لے گی۔“

”تمہیں یاد ہے کہ تمہارے موبائل پر ٹریکر لگا ہوا ہے؟“

”اوہ مائی گاڈ! اس کا مطلب ہے کہ میرے موبائل کے ذریعے بشری کو ٹریس کیا جاسکتا ہے۔“ راحیلہ یکدم جذباتی ہو گئی اور آصف کا بازو جھنجھوڑتے ہوئے جوش سے بولی۔

”پلیز آصف! اس کی لوکیشن ٹریس کریں اور چلیں اسے بچانے۔“

”میں کوئی جینز ہونڈ یا ایجنٹ زیر و زبرو سیون نہیں

ہوں کہ خود میدانِ عمل میں اتر کر کشتوں کے پٹھے لگا دوں

گا۔ ہم تھانے چل رہے ہیں۔ وہاں رپورٹ کریں گے۔

آگے پھر جو کرنا ہوا، وہ پولیس کرے گی۔“ آصف نے

اسے سمجھایا۔

راحیلہ ماضی میں پولیس کے کردار کی وجہ سے زیادہ

مطمئن تو نہیں تھی لیکن اس کی عقل میں آصف کی دلیل آگئی تھی

کہ واقعی وہ ایک عام سا شہری بشری کو لے جانے والے

خطرناک جرائم پیشہ افراد کے خلاف خود سے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ تھانے ہی چلتے ہیں۔ کیا پتا اللہ سبب بنا

ہی دے۔“ امید و بیم کی ملی جلی کیفیت میں اس نے آصف کی

تائید کی تو اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ تھانے پہنچنے پر

انہیں سیدھا اندر لے جانے کے بجائے ہیڈ مقرر کے کمرے

کے باہر برآمدے میں انتظار کے لیے بٹھا دیا گیا۔ وہاں

بیٹھے انہیں اندر ہونے والی گفتگو صاف سنائی دے رہی تھی۔

کوئی کہہ رہا تھا۔

”دیکھو امیر استاد! ہم بھی جانتے ہیں اور تم بھی

جانتے ہو کہ معاملہ اتنا سیدھا نہیں ہے، جتنا تم بیان کر رہے

ہو۔ یہ کیس کیس اور اتفاقی حادثے وغیرہ کی کہانی میڈیا کے

لیے رہنے دو اور ہمارے سامنے سچ اگلو۔ اگر تم نے سچ نہ اگلا

تو ہم اگل دیں گے کہ وہاں تہ خانے میں تم لوگوں نے خفیہ

قید خانہ بنا رکھا تھا اور ممنوعہ ہتھیار بھی چھپایا ہوا تھا۔“

ابتدائی جملے ہی اتنے چونکا دینے والے تھے کہ ان کی پوری

توجہ اندر جاری گفتگو کی طرف مبذول ہو گئی۔

”کیسے اگلو گے سچ؟ تمہارا منہ بند کرنے کی قیمت ادا

کر رکھی ہے میں نے۔“ یہ یقیناً امیر استاد تھا جس نے طیش

کھائی۔

زودہ لہجے میں دھمکی کا جواب دیا تھا۔

”صاحب کا خیال ہے کہ منہ بند رکھنے کی وہ قیمت ناکافی ہے۔“ یقیناً وہ ہیڈ محرر ہی تھا جو افسر استاد نامی شخص سے ”معاملات“ طے کر رہا تھا۔

”لالہ کے ہوتے تم لوگوں کی ہمت نہیں تھی کہ ایک بار بات طے ہونے کے بعد دوبارہ زبان کھول سکو لیکن اب جب دیکھو، تب منہ کھولے بیٹھے ہوتے ہو۔“ اصغر نے شکوہ کیا۔

”لالہ، لالہ تھا اصغر استاد! کیا تم لالہ کی برابری کا دعویٰ کر سکتے ہو؟“

”یہ دعویٰ کروں تو بے فضول..... لیکن تم بھی یاد رکھو کہ لالہ کا شاگرد اتنا ہلکا نہیں ہے کہ تم جب چاہو اسے اپنی انگلیوں پر نچانے لگو۔ اپنے صاحب کو بولنا کہ ہاتھ ہولا رکھے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک دن پچھتا پڑے۔“ پولیس والے کی بات کا جواب دیتے ہوئے اصغر استاد کی آواز بتدریج بلند ہوتی چلی گئی تھی اور پھر اندر سے ایسی آواز آئی تھی جیسے کوئی زور سے کرسی کھسکا کر اپنی جگہ سے حرکت میں آیا ہو۔ اگلے ہی لمحے ایک شخص گبولے کی طرح ہیڈ محرر کے کمرے سے برآمد ہوا۔ آصف فوری طور پر فیصلہ لیتے ہوئے اس کے پیچھے لپکا۔

”ایکسیکو زنی ا“ اصغر کے پیچھے دوڑتے ہوئے اس نے اسے پکارا۔

”کیا ہے؟“ وہ پہلے ہی غصے میں تھا، ایک اجنبی کو اپنے سر پر سوار دیکھ کر مزید جھنجھلایا اور کاٹ کھانے والے لہجے میں بولا۔

”مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے لیکن وہ بات یہاں نہیں ہو سکتی۔“ آصف نے اپنی آواز دبا کر مدعا بیان کیا جس پر اصغر نے اسے گھور کر دیکھا اور ساتھ ہی ایک نظر راحیلہ پر ڈالی جو خود بھی آصف کے پیچھے وہاں تک چلی آئی تھی۔

”ٹھیک ہے۔ باہر میری گاڑی میں آ جاؤ لیکن یاد رکھنا فضول بات نہیں کرنے کا۔ اپنا دماغ سالا پہلے ہی بہت شارٹ ہے۔“ اس نے مشروط اجازت دے دی جس پر وہ دونوں شکر ادا کرتے ہوئے اس کے پیچھے چل پڑے۔ باہر آ کر وہ اس بڑی سی گاڑی کی طرف بڑھا جسے وہ لوگ تھانے میں داخل ہوتے وقت بھی دیکھ چکے تھے۔ گاڑی میں ڈرائیور موجود تھا اور ایک دوسرا شخص بھی۔ وہ شخص اصغر استاد کو آتے دیکھ کر پھرتی سے نیچے اتر اور پچھلا دروازہ کھولا۔ اس کے بغلی ہولسر اور مخصوص چال ڈھال سے ظاہر تھا کہ وہ

اصغر کے گاڑی گارڈ کے فرائض انجام دے رہا ہے۔

”تم دونوں اندر بیٹھو۔“ اصغر نے خود گاڑی میں بیٹھنے کے بجائے ان دونوں میاں بیوی کو اشارہ کیا اور خود گھوم کر اگلی پسجر سیٹ کی طرف کھلنے والے دروازے تک پہنچا۔

”تو نیچے اتر خیر! مجھے ان دونوں سے کچھ بات کرنی ہے۔“ دروازہ کھول کر نشست سنبھالتے ہوئے اس نے ڈرائیور کو حکم دیا جس کی ظاہر ہے اسے تعمیل کرنی تھی۔ وہ گاڑی سے باہر نکلا اور گاڑی گارڈ کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔ ان دونوں میں سے کسی نے کوئی سوال نہیں کیا تھا لیکن پوری طرح چوکنا ارد گرد کے ماحول پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ ان کی نظروں میں کچھ کچھ راحیلہ اور آصف کے لیے شک بھی لہرا رہا تھا لیکن وہی بات تھی کہ وہ اصغر سے کچھ کہنے سے قاصر تھے۔

”اب بول۔“ اصغر اپنے ساتھیوں کی فکر مندی سے بے نیاز آصف سے مخاطب تھا۔

”آپ لالہ عیسیٰ کے ساتھی ہیں؟“ آصف نے بات کرنے سے پہلے ایک بار تصدیق کر لینا مناسب سمجھا۔

”اپن کالے چور کا ساتھی ہے۔ تجھ کو اپنے سے جو بات کرنی ہے کر در نہ ٹھٹ یہاں سے۔“ اصغر کا مزاج ابھی تک پوری طرح اعتدال پر نہیں آیا تھا۔

”میں بشری گلزار کی سہیلی راحیلہ اور یہ میرے شوہر آصف ہیں۔ ہمیں بشری کی زبانی علم ہوا تھا کہ لالہ عیسیٰ اس کے اور معاذ بھائی کے مسائل حل کرنے کے لیے ان کی مدد کر رہے ہیں۔ تھانے میں ہم نے آپ کی اور ہیڈ محرر کی گفتگو سنی تو ہمیں اندازہ ہوا کہ آپ کا تعلق لالہ عیسیٰ سے ہے اس لیے ہم نے مناسب سمجھا کہ جس مسئلے پر مدد طلب کرنے تھانے آئے ہیں، وہ آپ سے بیان کر دیا جائے تو زیادہ بہتر نتائج نکل سکتے ہیں۔“ اس بار راحیلہ نے ہمت کر کے گفتگو میں حصہ لیا اور اپنا تعارف کروانے کے ساتھ ساتھ بہت کچھ بولتی چلی گئی۔

”بشری سے کب ملاقات ہوئی آپ کی؟“ اصغر نے ساری بات سنی تو چونک کر بے تابی سے پوچھا۔ راحیلہ نے حوالے ہی ایسے دیے تھے کہ وہ اپنا سارا غصہ اور جھنجھلاہٹ بھول کر تجسس میں مبتلا ہو گیا تھا۔

”کل سے لے کر اب سے کچھ دیر پہلے تک وہ ہمارے ہی ساتھ تھی لیکن.....“

”میرے خدا.....! کل سے ہم یاگوں کی طرح اسے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں اور وہ اپنی سہیلی کے پاس

”کیا مطلب؟ کیا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ بشری کو اغوا

کر لیا گیا ہے؟“

”بالکل، یہی بات ہے۔ ہم اسی حادثے کی رپورٹ درج کرانے تھانے آئے تھے کہ اتفاقاً آپ سے سامنا ہو گیا اور ہم نے سوچا کہ پولیس کے مقابلے میں آپ سے مدد طلب کرنا زیادہ سودمند ہوگا۔“

”یہ تو سب سے پہلے بتانے والی بات تھی یا! اب تک تو جانے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا گیا ہوگا۔“ اصغر نے ماتھے پر سے پسینا پونچھتے ہوئے پریشانی کا اظہار کیا۔

”ہمارے پاس اس تک پہنچنے کا ایک کلیو ہے۔ راحیلہ کا موبائل بشری کے پرس میں ہے اور موبائل پر ٹریکر لگا ہوا ہے۔ ٹریکر کی مدد سے آپ کو اس تک پہنچنے میں مدد مل سکتی ہے۔ آئی ایم سوری.....! میں ایک عام سا انسان ہوں اس لیے خود ایسی کوشش نہیں کر سکا اور پولیس کی مدد کے لیے دوڑا آیا۔“ آصف نے بات کے آخر میں ندامت کا اظہار کیا۔

”کوئی مسئلہ نہیں یا! تم جو کلیو لے کر آئے ہو، وہی بہت زبردست ہے۔“ اصغر نے بے تکلفی سے اسے سلی دی اور مزید بولا۔

”ایسا کرو، تم لوگ میرے ساتھ چلو۔ ٹریکر وغیرہ کی تفصیل تم بتانا، بشری کو بازیاب کروانے کی کارروائی ہم کریں گے۔“

”جیسی آپ کی مرضی۔“ آصف اگرچہ ساری زندگی غنڈے بد معاشوں سے دور رہا تھا لیکن اس وقت انکار کی منجائش نہیں تھی۔

”اپنی گاڑی کی چابی دو۔“ اصغر نے پیچھے کی طرف جھک کر آصف کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ آصف نے جیب سے چابی نکال کر اس کی آغوش پر دکھ دی۔ اصغر نے اشارے سے ڈرائیور کو قریب بلایا اور چابی اسے تھماتے ہوئے بولا۔

”ان کی گاڑی لے کر تم اور ظفر پیچھے آؤ۔ میں انہیں اپنے ساتھ لے کر جا رہا ہوں۔“ ساتھ ہی وہ خود کھسک کر ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔ ڈرائیور چابی انکیشن میں ہی لگی چھوڑ گیا تھا۔ اسے تھماتے ہی گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہو گیا۔ گاڑی چلتی، اس سے پہلے ہی ڈرائیور اپنے ساتھی کو آواز دیتے ہوئے آصف کی گاڑی کی طرف دوڑا۔ اس کی اور باڈی گاڑی کی بھاگ دوڑ سے بے نیاز اصغر نے گاڑی آگے بڑھادی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ دونوں سائے کی طرح اس کے پیچھے تک آئیں گے۔

☆☆☆

تھی۔“ اصغر تو بلبلایا ہی اٹھا۔

”لیکن اس کا فون کیوں بند تھا؟ معاذ اور لالہ نے کتنی بار اس کا نمبر ٹرائی کیا لیکن کوئی رسپانس ہی نہیں آیا۔“ پہلے رد عمل کے بعد اس نے فوری طور پر ذہن میں موجود اہم ترین سوال داغا۔

”اس کا فون گر کر ٹوٹنے کی وجہ سے ناکارہ ہو گیا تھا۔ اس نے کوشش کی کہ میرے فون سے کال کر کے معاذ سے بات کر سکے لیکن رابطہ ہی نہیں ہو سکا۔ وہ صبح خبروں میں آپ لوگوں کی رہائش گاہ پر آگ لگنے کی خبر سن کر بہت پریشان ہو گئی تھی اور سب کی خیریت جاننا چاہتی تھی۔ شاید وہ جذبات میں سیدھی آتشزدگی کا شکار ہونے والی آپ کی رہائش گاہ پر ہی پہنچ جاتی لیکن آصف نے روکا کہ اس میں خطرہ ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ واپس مہناز کے پاس چلی جائے تو شاید اس کے ذریعے کچھ خیر خبر مل سکے۔ اس سلسلے میں اس کی مہناز سے بات بھی ہوئی تھی۔“ راحیلہ نے اسے تفصیل سے آگاہ کیا۔

”مہناز سے بات ہوئی تھی..... کب، کس وقت؟“ اصغر کے لیے یہ ایک اور چونکا دینے والی بات تھی۔

”مشکل سے دوڑ حائی گھنٹے ہی گزرے ہوں گے۔“ لیکن مہناز تو آج صبح سے اسپتال میں داخل ہے۔

کسی نے اس کے اپارٹمنٹ میں کھس کر اسے بری طرح تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔ اس بیچاری کی ذہنی حالت تو اتنی خراب ہے کہ ڈاکٹر اسے ہم میں سے بھی کسی سے بات کرنے کی اجازت نہیں دے رہے۔“ اصغر کا یہ انکشاف راحیلہ کے لیے ہولادینے والا تھا۔

”پھر وہ کون تھا جس سے بشری مہناز سمجھ کر میسج پر بات کرتی رہی۔ اس نے بشری کو بتایا تھا کہ اس کے موبائل کا مائیک خراب ہو گیا ہے اس لیے وہ کال پر بات نہیں کر سکتی۔ بشری نے اسے اپنی لیپارٹمنٹ پر واپسی کے بارے میں بھی آگاہ کیا تھا۔“ اس نے زبردگت کے ساتھ ساری بات بتائی۔

”بات بالکل صاف ہے راحیلہ! مہناز کا فون کسی اور کے قبضے میں ہے۔ اس نے چالاکی سے کام لے کر بشری کو اس بات سے آگاہ نہیں ہونے دیا۔ یوں اسے آسانی سے معلوم ہو گیا کہ بشری کب اور کس کے ساتھ آ رہی ہے۔ اسی لیے تو ان لوگوں نے مکمل پلاننگ سے گھات لگا کر اسے اتنی آرام سے چھاپ لیا۔“ یہ تجزیہ کرنے والا آصف تھا جسے سن کر اصغر اچھل ہی پڑا۔

خواہش پر پاکستان بھجوا یا ضرور تھا لیکن تمہیں نہیں بھولنا چاہیے تھا کہ تم ہمارے ساتھ ایک اہم مشن کی کمانڈ کر چکے ہو۔ ”زن ہو اسے تشبیہ کر رہی تھی۔

”آئی ایم سوری اداقی میں فراموش کر بیٹھا تھا لیکن آپ میری کیفیت کو نہیں سمجھ سکتیں کیونکہ آپ میری جگہ نہیں ہیں اور آپ کو اس آزمائش سے نہیں گزرنا پڑا جس سے مجھے گزرنا پڑا ہے۔ انسان کی عزیز ترین ہستی موت کے منہ میں ہو تو اس کے سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں جواب دے جاتی ہیں۔ ”وہ اب بھی اپنے عمل کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”بے شک میں تمہاری جگہ نہیں ہوں لیکن یہ مت کہو کہ مجھے آزمائش سے نہیں گزرنا پڑا۔ دنیا میں اپنی اولاد کو کھودینے کی آزمائش سے بڑھ کر کوئی آزمائش نہیں ہوتی۔

میں اس آزمائش سے گزری ہوں اور پھر میرے اوپر یہ آزمائش بھی آئی ہے کہ اپنے بیٹے کے قتل میں اہم ترین کردار ادا کرنے والی مجرمہ کو سزا دلوانے کے بجائے اس بات پر غور کروں کہ اس مجرمہ کو اس کے جرم کی سزا دلوانے

سے زیادہ ملک اور انسانیت کا مفاد اہم ہے۔ ”زن ہونے کا تو معاذ کو یاد آ گیا کہ زن ہو کا بیٹا، سونیا اور اس کی ٹیم کے ایک چینی ہوٹل میں پلانٹ کیے گئے بم سے ہوٹل کو بچانے کے لیے اپنی جان ہار گیا تھا۔ سونیا کے خلاف ان لوگوں کے پاس ٹھوس ثبوت موجود تھے لیکن تب اس نے اصرار کیا تھا کہ وہ اسرائیل کے مشن پر سونیا کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتا

ہے۔ اس نے سونیا کے حق میں دلائل دیتے ہوئے ان لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ نہایت کم عمری میں مخصوص انداز سے تربیت پانے کے باعث سونیا وہ جرائم کرنے پر

مجبور ہو گئی تھی جو آج خود اس کے لیے باعث شرم ہیں۔ اس نے سونیا کے نائب ہو جانے اور اسرائیل کی سرزمین پر کارآمد ثابت ہونے تک کے بھی دلائل دیے تھے اور اس

وقت زن ہونے جذباتی ہو کر یہ نہیں کہا تھا کہ وہ ہر حال میں اپنے بیٹے کی موت کی ذمے دار مجرمہ کو سزا دلوانا چاہتی ہے۔

اس نے سوچنے اور اس معاملے کو پرکھنے کے لیے وقت لیا تھا۔ اس میٹنگ میں شین یا ہی بھی ان کے ساتھ موجود تھا اور شین نے سونیا کو معافی دینے کی شدید مخالفت کی تھی لیکن زن

ہونے اسے یہ کہہ کر خاموش کر دیا تھا کہ پہلے اس بات کی پرکھ کی جائے گی کہ سونیا میں آنے والا انقلاب حقیقی ہے یا وہ دروغ گوئی سے کام لے رہی ہے پھر ہی اس کے بارے

میں کوئی حتمی فیصلہ کیا جائے گا۔

”آپ یہاں؟“ اگرچہ وہ اندازہ لگا چکا تھا کہ اسے نوں میڈم ایکس کی گرفت میں جانے سے قبل ہی اچک لینے والے لوگ کون تھے لیکن اس بات کی قطعی امید نہیں تھی کہ یہاں پاکستان میں اچانک زن ہو سے ملاقات ہو جائے گی۔

”میں ایک سرکاری دورے پر سفارتی وفد کے ساتھ آئی ہوں۔ وہ وفد جس ایجنڈے کے ساتھ آیا ہے، اس میں تو میرا زیادہ کردار نہیں لیکن میری حکومت نے مجھے کچھ اہم

معاملات طے کرنے کی ذمے داریاں ضرور سونپی ہیں اور تم بھی ہمارا ایک اہم معاملہ ہی ہو۔ ”زن ہونے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنی یہاں موجودگی کی وضاحت دی۔

”میرے لیے یہ قطعی غیر متوقع ہے۔ خصوصاً جس طرح آپ کے آدمیوں نے منظم کارروائی کر کے مجھے میڈم ایکس کے آدمیوں کی تحویل سے نکالا ہے، میں دور دور تک

اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔“

”شاید اس لیے کہ تم ذہنی طور پر شکست تسلیم کر کے ہتھیار ڈالنے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔“ زن ہو کے لہجے میں ہلکی سی طنز کی آمیزش تھی۔

”ہر گز نہیں۔“ معاذ اس بات پر تڑپ اٹھا۔ ”میں نے شکست تسلیم نہیں کی تھی، بس اعظم کے حصول کے لیے ایک شارٹ کٹ کا انتخاب کیا تھا کیونکہ میں

جانتا ہوں کہ ابھی ہمیں میڈم ایکس اور اس کے سرپرستوں سے ایک طویل جنگ لڑنی ہے اور کل اس طویل جنگ کے اختتام کا انتظار شاید نہ کر سکے۔ وہ جس کنڈیشن میں ہے،

اسے اس وقت میں سب سے بڑا ریلیف بھی دے سکتا تھا کہ اس کے بیٹے کو اس تک پہنچانے کا انتظام کر دوں اور وہ ہو گیا ہے۔“ اس نے زن ہو کو اپنے عمل کی وضاحت دی۔

”ہمارے حساب سے یہ جذباتی اقدام تھا۔ اپنی اس حرکت کے نتیجے میں تم غیر معینہ مدت کے لیے بھی میڈم ایکس کی گرفت میں جاسکتے تھے۔ ایسا ہونے کی صورت میں

ایک بڑا اور اہم مشن التوا کا شکار ہو جاتا۔“ زن ہونے اس کی وضاحت پر اپنی رائے دی۔

”میرے لیے اعظم کو اس کی ماں سے ملانا ہی سب سے اہم مشن تھا۔“ اس نے دھیمی آواز میں اعتراف کیا۔

”میں تمہاری کیفیت سمجھ رہی ہوں لیکن یاد رکھو کہ جب ہم بڑے کام کرتے ہیں تو ہمیں اپنی ترجیحات کا تعین کرتے وقت غیر جذباتی ہو کر عقلی بنیاد پر سارا حساب کتاب کرنا پڑتا ہے۔ ایک فرد جو ہمیں کتنا ہی عزیز ہو، اس کی خاطر پوری قوم کے مفاد کو داؤ پر نہیں لگایا جاسکتا۔ ہم نے تمہاری

”آئی ایم سوری!“ سامنے سے دلیل ایسی آئی تھی کہ اس کے پاس سر جھکا کر معافی مانگ لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

”اُس اوکے۔ میرا مقصد تمہیں شرمندہ کرنا نہیں تھا۔ میں تو تمہیں یہ بتانا چاہتی تھی کہ ہم نے سونیا کی پرکھ کے مراحل طے کر لیے ہیں اور ہمارے ماہرین میں سے اکثریت کی رائے ہے کہ سونیا کی طرف سے ہمیں دھوکا دیے جانے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اس اہم ترین مرحلے کے طے ہونے کے بعد ہماری خواہش ہے کہ جلد از جلد مشن پر کام شروع کر دیا جائے اور ظاہر ہے وہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ تم یہاں کی الجھنوں سے اپنی جان چھڑا کر واپس چین آؤ اور مشن پر جانے کی تیاری کرو۔ تم اگر میڈم ایکس کے قبضے میں چلے جاتے تو معاملات بہت زیادہ الجھ جاتے اسی لیے ہمارا دخل دینا ناگزیر ہو گیا تھا۔“

”وہ سمجھے گی کہ میں نے اس سے وعدہ خلافی کی ہے اور اعظم کو آزادی دلانے کے بعد خود کو بھی اپنے آدمیوں کے ذریعے آزاد کروا لیا ہے۔“

”اس کے کچھ بھی سمجھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم جانتے ہو کہ تم نے دھوکا نہیں کیا۔ بس اتنا کافی ہے۔ انسان کو دوسروں سے زیادہ اپنی نظروں میں شفاف ہونا چاہیے۔“

زن ہونے اسے زندگی کا ایک اور سبق دیا۔

”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔“ وہ مطمئن ہو کر مسکرایا پھر استفسار کیا۔

”اعظم کب تک سبیل کے پاس پہنچ جائے گا؟“

”بہت جلد۔ تمہارے دوست وکی سے ہمارا رابطہ ہو چکا ہے اور اس وقت وکی سے اعظم کو اپنی تحویل میں لینے کا مرحلہ طے ہو رہا ہے۔“

”لیکن سائیں صداقت شاہ کی رہائی کا معاملہ تو کھٹائی میں پڑ گیا ہوگا۔ میں چاہتا تھا کہ اعظم کے علاوہ سبیل کی اپنے دیگر گھروالوں سے بھی ملاقات ہو جائے۔ ایک ایسی مریضہ جسے ڈاکٹر زجواب دے چکے ہوں، آخری وقت میں اپنوں کے قریب رہے تو یہ اس کے لیے اچھا ہے۔“ یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کی آواز کانپنے لگی تھی لیکن حقیقت سے نظریں تو بہر حال نہیں چرائی جاسکتی تھیں۔

”اب ہم نے اپنا ہاتھ اس معاملے میں ڈال دیا ہے تو سمجھو سارے مسئلے حل ہو گئے ہیں۔ پہنچ جائیں گے صداقت شاہ بھی اپنی بیٹی کے پاس۔“ زن ہونے اسے تسلی دی۔

”تھینک یو سو مچ۔ جتنا کچھ آپ نے کیا ہے اس کے

بعد سمجھ لیں کہ میں آپ کا بے دام غلام ہوں اور وہ سب کرنے کے لیے تیار ہوں جو آپ چاہیں۔“ وہ زن ہو کی بات سن کر جذباتی ہو گیا لیکن پھر کچھ یاد آئے پر بولا۔

”میرے یہاں کچھ اہم کام باقی ہیں۔ بشریٰ اور اس کے مجرم باڈل کو تلاش کر کے باڈل کو بشریٰ کے حسب خواہش سزا دینی ہے اور جانے سے پہلے ایک بار اپنے گھر والوں سے بھی ملنا ہے کہ معلوم نہیں دوبارہ ہمارا ملنا ممکن ہو بھی یا نہیں۔“

”ہو جائے گا یہ سب بھی۔ ہم نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ پاکستان میں تمہارے مسائل حل ہونے کے بعد ہی تمہیں کوئی ذمہ داری سونپیں گے تو اطمینان رکھو کہ ہم اپنا وعدہ پورا بھی کریں گے۔“ زن ہونے اسے اطمینان دلایا اور پھر ہونٹوں پر ایک پراسرار سی مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولی۔

”یہاں تمہارے کاموں کو آسان بنانے کے لیے ہم نے تمہارے لیے ایک مدد کا انتظام کیا ہے۔ میں چاہتی تو رہائی دلوانے کے بعد تمہیں تمہارے موجودہ ٹھکانے پر جانے کی اجازت دے دیتی لیکن یہاں بلائے کا بنیادی مقصد یہی تھا کہ میں تمہاری کسی سے ملاقات کروانا چاہتی تھی۔“

”وہ کون ہے؟“ معاذ تجسس ہوا۔

”چند منٹ ہی کی بات ہے۔ وہ پہنچ جائیں تو آسنے سامنے دونوں کا تعارف کروادوں گی۔“ زن ہونے ایک بار پھر اپنی بھید بھری مسکراہٹ کا جادو جگایا۔ معاذ کو اگرچہ تجسس تھا لیکن اس نے اصرار نہیں کیا۔ مشکل سے چند منٹ ہی گزرے تھے کہ زن ہو کو مہمان کی آمد کی اطلاع دی گئی۔

”آؤ، چل کر مہمان کا استقبال کرتے ہیں۔“ زن ہو نے اپنی نشست چھوڑ دی اور معاذ سے مخاطب ہوئی۔ معاذ پُر جوش سا اس کے پیچھے ہولیا۔ جب تک وہ لوگ باہر برآمدے تک پہنچے، مہمان اپنی گاڑی سے اتر چکا تھا۔ ٹوپیں سوٹ میں ملبوس، پروتار شخصیت کے مالک اس درمیانی عمر کے شخص نے پہلی نظر میں ہی معاذ کو متاثر کیا۔ وہ نے تلتے قدموں سے چلتے ان کی طرف بڑھے تو معاذ نے کچھ مانوسیت محسوس کی۔

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نوجوان
کی داستان جو غلط کاروں کے لیے غضب
ناک تھا باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیے

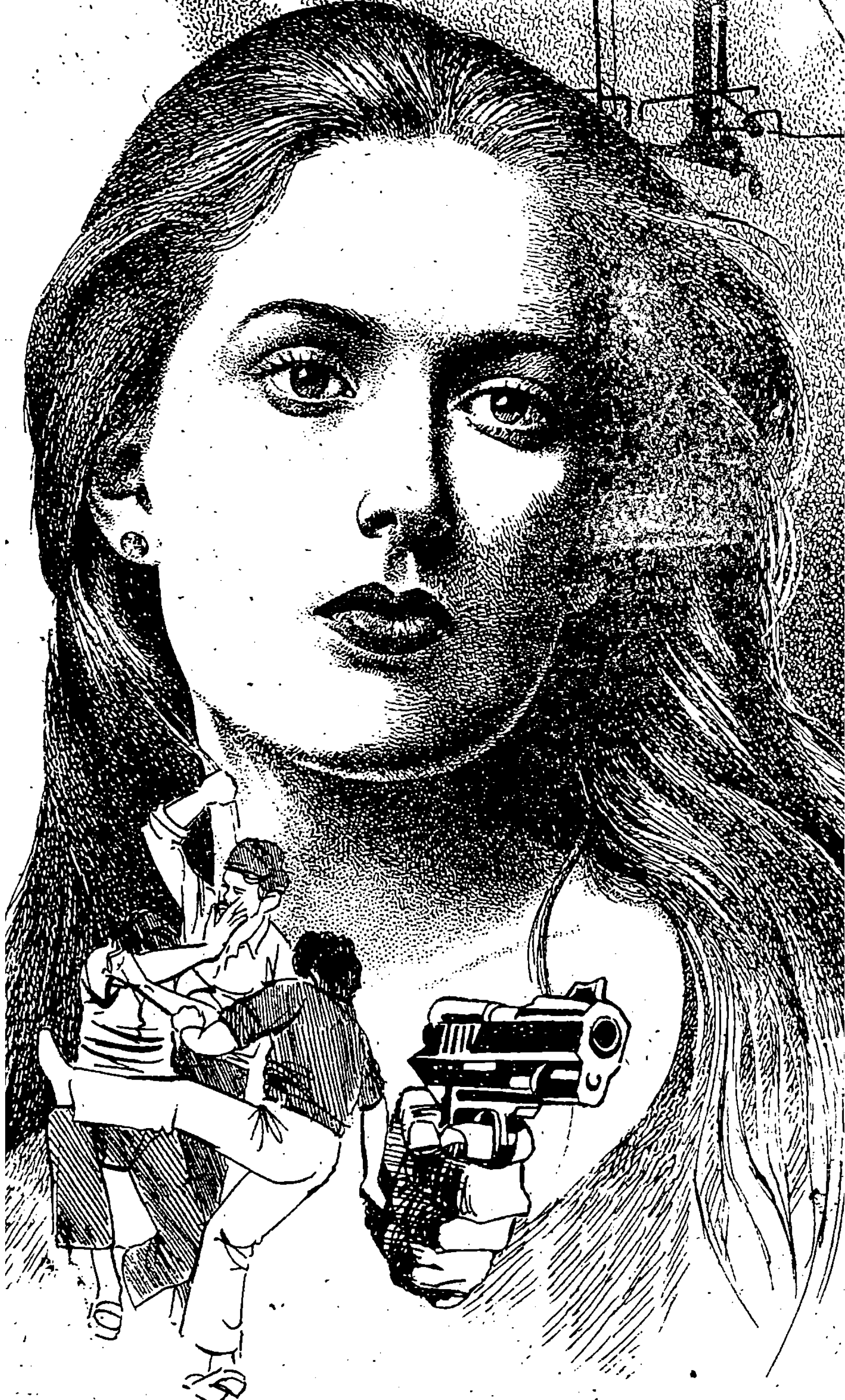


قسط نمبر: 43

اسماء قادری

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تند و تیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابل شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پُر عزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جا رہے تھے... اس کی زندگی جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قراریوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تار عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ وارداتِ قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہو سکی...

بچے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تحیر انگیز داستان



معاذ ایک ذہین لیکن متلون مزاج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جوائن کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ انسٹی ٹیوٹ سے واپس آ رہا تھا تو وہ چھ لڑکوں کو سڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی بڑی فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشری نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بشری ماس کیونی کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم وغیرہ لکھتی ہے۔ اس ویران جگہ بھی وہ ایک زیر تعمیر رہائشی منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے آئی تھی۔ معاذ بشری کو بہ حفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کر دیتا ہے۔ لیکن جن ریکس زادوں سے اس نے ان کا شکار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور سوتے کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ایک دن جنگل کی سیر کے دوران وہ فوٹو گرافی کے شوق میں سب سے الگ تھلگ ہو جانے والے معاذ کو بے خبری میں گھیر کر بری طرح زد و کوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دے دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس نہ آنے پر انتظامیہ کے افراد، پولیس اور ریسکیو ذرائع کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جگہ کی جھونپڑی میں پاتا ہے۔ جوگی اپنی خامن جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے، جوگی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نواز کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے پڑا سر اڑھم سکھانے کی ہامی بھر لیتا ہے اور معاذ اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ادھر جانے وقوعہ سے ملنے والے معاذ کے کمرے سے جب تصویریں نکلوائی جاتی ہیں تو ایک ایسی تصویر بشری کی نظر میں آ جاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پروجیکٹ کے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشری تحقیق کر رہی تھی۔ بشری کے اپنے والد جرنلسٹ ہوتے ہیں۔ اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشری کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ صدمے سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باذل نامی غنڈے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشری انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دنوں میں ہی معاذ واپسی کا ارادہ کرتا ہے تاہم ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا عرفان اللہ اور یزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو وقاص نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باذل اچانک بشری کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر دیتا ہے۔ معاذ کو واپس لانے کے لیے اوجھے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اسے واپس آنے کا پیغام دیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کر کے اس کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات کے نہ بتانے پر اس کے بھائی کا ایک گروہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشری بھی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہو جاتی ہے۔ معاذ کے دوست عالم شاہ کے بہنوئی کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ کئی فنون میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے پہنا کر کر کے اس کے دماغ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ فیضو سے حاصل انوکھے علم کی بدولت ان کا معمول نہیں جتا۔ عالم شاہ اور اس کا نوکر سرد، باذل کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ عالم کی بہن نکل شاہ کے نومولود بیٹے کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اغوا کا الزام لطیف سومر پر آتا ہے۔ عالم شاہ، باذل کی قید میں موجود ایک زخمی شخص کی مدد سے وہاں سے فرار ہو جاتا ہے۔ ادھر بشری دعویٰ کرتی جاتی ہے۔ وہاں وقاص اسے بارہی کے روپ میں پہچان لیتا ہے۔ وہ سلطان کو مارنا چاہتی ہے تاہم وقاص اسے ایسا کرنے سے روکتا ہے۔ ادھر عالم شاہ، باذل کی قید سے نکل کر اس کا پیچھا کرتا ہے۔ وہ وہاں معاذ کو دیکھتا ہے۔ صداقت شاہ، لطیف سومر کو گھیرنے کے لیے اس کی خفیہ بیوی اور بچے کا کھوج لگاتے ہیں اور بچے کو اغوا کر لیتے ہیں۔ لطیف سومر مجبور ہو جاتا ہے۔ معاذ کو اس کے گھر والوں سے ملنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ وہ ایک مشن پر سونیا کے ساتھ انڈیا روانہ ہوتا ہے تاہم کچھ لوگ سکھ یا تریوں سے بھری بس کو یرغمال بنا لیتے ہیں۔ معاذ اور سونیا خانے کے تمام افراد کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔ عالم شاہ، نکل اور سرد انڈیا روانہ ہو جاتے ہیں۔ اتر پورٹ سے گھر روانگی پر راستے میں کچھ لٹیرے انہیں لوٹ لیتے ہیں۔ گھر پہنچنے پر پولیس کی ریڈ ہوتی ہے اور وہ عالم شاہ اور سرد کو لے جاتے ہیں۔ ادھر بشری اور وقاص باذل کو اسپتال میں مارنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ قتل ہو جاتا ہے۔ معاذ اور سونیا اپنے سہولت کاروں سے مل جاتے ہیں۔ عالم شاہ اور سرد کو تشدد کا نشانہ بنا کر دیرانے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ واپس اپنے میزبانوں کے ہاں پہنچ جاتے ہیں۔ انہیں پتا لگتا ہے کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں اجالا اور اس کا عاشق شامل ہوتے ہیں۔ وہ چھپ کر ان کی باتیں سن رہا ہوتا ہے کہ اسے چھاپ لیا جاتا ہے۔ تاہم وہاں مارا ماری ہوتی ہے اور اجالا کا عاشق مارا جاتا ہے۔ پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ ان کے کزن انہیں اپنے دوسرے خفیہ ہنگلے پر پہنچا دیتے ہیں۔ وہ وہاں سے بحفاظت نکل جاتے ہیں۔ ادھر معاذ کو سونیا اپنے ساتھ نئے مشن پر لے کر جاتی ہے جس میں ایک ریلوے لائن کو دھماکے سے اڑانا ہوتا ہے۔ معاذ ایسا نہیں چاہتا اس لیے وہ ٹرین کی آمد سے قبل بارودی دھماکا کر دیتا ہے۔ وہ زخمی ہو جاتا ہے اور اسے ہندو سادھو اپنی کنیا میں لے جاتا ہے جہاں اس کی اچھی دیکھ بھال

ہوتی ہے۔ سونیا کے آدمی معاذ کو تلاش کرتے ہیں مگر ناکام ہو جاتے ہیں۔ ادھر عالم شاہ اور سرمد خفیہ ذریعے سے بارڈر پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ دھریے جاتے ہیں اور ”را“ کی قید میں پہنچ جاتے ہیں۔ بشری باذل کو مارنے کی کوشش میں خود نشانہ بن جاتی ہے۔ معاذ سادھو کی مدد سے ایک انڈین ہیروئن کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ وہیں اسے عالم اور سرمد کی گرفتاری کا پتا چلتا ہے۔ معاذ ڈاکٹر فردوس سے ملتا ہے اور اسے کھل کی مدد کرنے کا کہتا ہے۔ علیہ اور وقاص وغیرہ کو لالہ عیسیٰ ملک سے باہر نکال دیتا ہے اور ہر ممکن احتیاط کی ہدایت کرتا ہے لیکن علیہ پاکستان میں ٹوبہ سے رابطہ کرتی ہے جو ان کے لیے مصیبت بن جاتا ہے۔ ٹوبہ پر تیزاب پھینک دیا جاتا ہے۔ وقاص، علیہ اور اس کے گھردالوں کو مار دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس معاذ کو دیوانامی شخص سے مدد لینے کا کہتی ہے۔ معاذ اپنے کزن کو پاکستان کال کرتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ اس کے گھردالوں کو مار دیا گیا ہے۔ وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کی ٹھان لیتا ہے۔ ادھر ڈاکٹر فردوس کو اس کے سسرال والے کھل کو بھگانے کی پاداش میں تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ معاذ، عالم اور سرمد کی رہائی کے لیے کارروائی کرتا ہے اور انہیں ”را“ کی قید سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن عالم اور سرمد کو دیوا کے آدمی کسی دوسری جگہ پہنچا دیتے ہیں۔ سونیا معاذ کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ ادھر باذل ایک جگہ لالہ عیسیٰ کی موجودگی پر کارروائی کرتا ہے تاہم لالہ خود کو گولی مار کر ختم کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس کا انتقال ہو جاتا ہے۔ دیوا گینگ ڈاکٹر فردوس کی میت اٹھنے پر وہاں فائرنگ کر دیتے ہیں۔ پولیس دیوا کو گھیر لیتی ہے۔ معاذ دیوا اور اس کے آدمیوں کو نکالنے کے عوض عالم کا پتا معلوم کر لیتا ہے۔ سونیا اور معاذ حیدر آباد نواب بدرالدین کی حویلی پہنچ جاتے ہیں۔ تاہم کالے خان اور رادھا دیوی کو میڈیم ایکس کے شکنجے سے چھڑانے کے لیے انہیں واپس آنا پڑتا ہے، کالے خان کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ نواب صاحب کی حویلی میں عالم اور سرمد کی رہائی کے لیے کارروائی کر کے انہیں رہا کر لیتا ہے۔ وہ لوگ نئے ٹھکانے پر پہنچے ہیں تو وہاں معاذ سے ملنے جا رہے تھے۔ سونیا معاذ کے لیے قید سے نکالا ہوتا ہے۔ جارو اور معاذ، کھل سمیت اسپتال جاتے ہیں اور پہچان لیے جانے پر پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ پولیس سے مقابلے کے بعد وہ ایک بستی میں پناہ کے لیے گھس جاتے ہیں اور دو لوگوں کو یرغمال بنا کر ان کی جھونپڑی میں قیام کرتے ہیں۔ ادھر سونیا معاذ کی تلاش میں نکلتی ہے اور اسے بستی میں پہنچنے پر معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ معاذ اور جارو وغیرہ نوب نامی شخص کے ساتھ اس کے مالک کے بنگلے میں قیام کرتے ہیں۔ سونیا بھی معلومات حاصل کرتی ہوئی مذکورہ بنگلے تک پہنچ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور سرمد بھی سونیا کا پیچھا کرتے ہوئے وہیں پہنچ جاتے ہیں۔ ادھر وقاص، علیہ و دیگر لوگ زندہ ہوتے ہیں۔ وقاص حلیہ بدل کر گلوکا باڈی گاڑ دیتا ہے۔ وہ معاذ کو تلاش کرنے کے لیے انڈیا روانہ ہوتا ہے۔ وہاں اس کی گل خان سے ملاقات ہوتی ہے اور معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ سونیا، معاذ اور دیگر ساتھیوں سے مل جاتی ہے تاہم وہ جس بنگلے میں ہوتے ہیں وہ دشمن کا ہوتا ہے۔ دشمن سب کو بے ہوش کر کے کہیں لے جا رہے ہوتے ہیں کہ ان کی گاڑی کو حادثہ پیش آ جاتا ہے۔ ان سب کو چینی بمکشوٹھی امداد دیتے ہیں اور ان سے پوچھ گچھ کی جاتی ہے۔ کھل کی حالت تشویشناک ہوتی ہے اور اسے وہاں موجود ایک وید دیکھتا ہے۔ ادھر لالہ واپس اپنے لوگوں میں پہنچ کر ایکشن میں آ جاتا ہے اور حامد کو اغوا کر دیتا ہے۔ لالہ میڈیم ایکس کے ٹھکانے کی نگرانی کر دیتا ہے۔ باذل، معاذ وغیرہ کے ٹھکانے سے باخبر ہو جاتا ہے۔ ادھر لالہ کے آدمی میڈیم ایکس کی نگرانی کے چکر میں مارے جاتے ہیں۔ لالہ اپنے آدمیوں کو انڈیا رگراؤنڈ کر دیتا ہے۔ معاذ وغیرہ جہاں ہوتے ہیں وہاں دشمن حملہ کر دیتا ہے اور کافی مارا ماری ہوتی ہے۔ باذل، معاذ کا پیچھا کرتا ہے اور چینیوں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ معاذ چینیوں کے ساتھ مل کر دشمنوں کے خلاف کارروائی کرتا ہے۔ اس دوران اسے گل خان نظر آتا ہے۔ اسے پہنا تاڑ کیا گیا تھا۔ وہ لارانا نامی عورت کو بھی گرفت میں لے لیتے ہیں اور اسی سے معلومات لیتے ہیں۔ ادھر لالہ عیسیٰ، اعظم کو دشمن کی گرفت سے نکالنے کے لیے کارروائی کر دیتا ہے اور مومی اور نیلی، اعظم کو نکالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ معاذ دشمنوں کے کیمپ پر حملہ کر کے وہاں قبضہ کر لیتا ہے۔ مومی اور نیلی کی گاڑی پر حملہ ہوتا ہے تاہم مارا ماری کے بعد وہ صداقت شاہ کے پاس پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ لالہ عیسیٰ صداقت شاہ کو حویلی پر ریڈ کا بتاتا ہے۔ صداقت شاہ اعظم کے محفوظ ٹھکانے کے لیے قربان شاہ زن کرتے ہیں۔ اعظم کو وہاں سے نکال لیا جاتا ہے اور دوسری جگہ کھل کر دیا جاتا ہے۔ ادھر معاذ بیجنگ پہنچ جاتا ہے اور وہاں کے کرتا دھرتاؤں سے بات کر کے پاکستان پہنچنے کی اجازت چاہتا ہے۔ ادھر مومی اور نیلی کو پولیس گھیر لیتی ہے اور فائرنگ میں مومی مارا جاتا ہے۔ وہ اعظم کو لے جاتے ہیں اور نیلی زخمی حالت میں ان کے قبضے میں آ جاتی ہے۔ معاذ اور وی وغیرہ پاکستان پہنچ جاتے ہیں اور اعظم کی بازیابی کے لیے کارروائی کے لیے منصوبہ بناتے ہیں۔ مومی کی تدفین ہو جاتی ہے۔ وی، نیلی کو قبرستان لے کر جاتا ہے تاہم وہاں کچھ لوگ حملہ کر دیتے ہیں لیکن لالہ کے آدمی انہیں بچا لیتے ہیں۔ ادھر باذل، لالہ کی قید سے بھاگ جاتا ہے۔ معاذ، ڈی ایس پی ظہیر کے بنگلے پر دھاوا بولتا ہے اور ڈی ایس پی کو قتل کرنے کے بعد اس سے معلومات لیتا ہے۔ وہ لوگ ظہیر خان کو لے کر وہاں سے نکل جاتے ہیں۔ باذل قید سے نکل کر مہناز کے پاس پہنچتا ہے اور اسے تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ نیلی قید میں موجود ظہیر کو ٹھکانے لگا دیتی ہے۔ بشری قبرستان جاتی ہے۔ وہاں اس کی دوست ملتی ہے اور وہ اس کے ساتھ چلی جاتی ہے۔ بشری اپنی دوست کے ساتھ جارہی ہوتی ہے کہ باذل کے آدمی اسے اغوا کر لیتے ہیں۔ ادھر معاذ سارے مناظروں کو جلد مل کرنے کے لیے دشمن کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے مگر اس کے خیر خواہ اسے میڈیم ایکس کے شکنجے سے نکال لیتے ہیں اور اعظم کو بھی بازیاب کر لیتے ہیں۔ زن ہوا سے اپنے ساتھ لے جاتی ہے اور وہاں ایک خاص مہمان کی آمد کا بتا کر معاذ سے استقبال کا کہتی ہے۔ معاذ مہمان کو دیکھ کر مالموسیت سی محسوس کرتا ہے۔

”خوش آمدید مسٹر سکندر بخت! مجھے بہت خوشی ہے کہ آپ نے میری دعوت قبول کی۔“ زن ہونے کی بجائے مصافحہ کرنے ہوئے آنے والے سے خیر مقدمی کلمات ادا کیے۔

”دوستوں کے لیے ہم ہر وقت حاضر ہیں۔“ انہوں نے سر کو ذرا سا خم دے کر خوش دلی سے جواب دیا۔

”ان سے ملیے۔ یہ معاذ احمد ہیں۔“ زن ہونے فوراً ہی انہیں معاذ کی طرف متوجہ کیا تو انہوں نے اس سے بھی ایک گرجوش مصافحہ کیا اور مسکرا کر بولے۔

”تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی یک میں!“

”مجھے بھی خوشی ہوئی ہے سر!“ کہنے کو معاذ نے جواب میں ایک رسمی جملہ ہی ادا کیا لیکن یہ حقیقت تھی کہ اسے اس اجنبی شخص سے مل کر خوشگواریت کا احساس ہوا تھا۔

”آئیے، اندر چلتے ہیں۔“ زن نے آداب میزبانی نبھاتے ہوئے اندر آنے کی دعوت دی۔ اس دوران معاذ

جاڑہ لے چکا تھا کہ اگرچہ آنے والا بظاہر سادہ سے چلیے میں اکیلا ہی اندر آیا تھا اور اس کی گاڑی میں ایک ڈرائیور کے سوا کوئی نہیں دکھائی دے رہا تھا لیکن اس کی آمد کے ساتھ ہی ماحول یکسر بدل گیا تھا اور خود اپنی آمد کے وقت اس نے اس کوشی میں جتنا حفاظتی عملہ دیکھا تھا، اس کی تعداد یکدم گنی سے بھی زیادہ ہو گئی تھی۔ اسے فضا میں ایک ڈرون کیمرہ بھی اڑتا ہوا دکھائی دے رہا تھا اور کچھ بعید نہیں تھا کہ جتنے پہریدار کوشی کے اندر دکھائی دے رہے تھے، باہر بھی کم و بیش اتنے ہی موجود ہوں۔

”معاذ کو آپ کے بارے میں میں نے تجس میں رکھا تھا تو بہتر ہے پہلے آپ کا اس سے تعارف کروادیتی ہوں۔“ وہ واپس اس آفس نما کمرے میں نہیں آئے تھے جہاں اس کی زن ہو سے ملاقات ہوئی تھی۔ اب وہ جس کمرے میں موجود تھے وہ سادہ مگر قیمتی ساز و سامان سے سجا ایک پُر وقار سا ڈرائنگ روم تھا۔

”جیسی آپ کی مرضی۔“ سکندر بخت نے مسکرا کر جواب دیا۔

”معاذ.....! یہ کرل سکندر بخت ہیں۔ تمہارے ہاں کے ایک خفیہ ادارے کے سربراہ۔ انہیں ہمارے ایک نمائندے نے تمہارے متعلق رپورٹ دی تو انہوں نے خود تم سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔“ آنے والے کا تعارف کروایا گیا تو معاذ کو اندازہ ہوا کہ اسے ان کے لیے مانوسیت کا احساس کیوں ہوا تھا۔ اصل میں یہ احساس ان کی ذات نہیں بلکہ ادارے کے لیے تھا۔ سادہ لباس میں ہونے

کے باوجود وہ اپنی چال ڈھال اور بالوں کے انداز سے ایک فوجی ہی محسوس ہو رہے تھے لیکن وہ یقین نہیں کر پاتا تھا کہ ایک اعلیٰ فوجی افسر بطور خاص اس سے ملاقات کے لیے وہاں آیا تھا۔

”اتنے حیران کیوں ہو رہے ہو یک میں! تمہارے بارے میں جو کچھ میں نے جانا، اس کے بعد تم سے یہ ملاقات ضروری ہو گئی تھی۔ ایک محب وطن پاکستانی کی حیثیت سے میں اپنے وطن کے ہر اس فرد کا قدر دان ہوں جو اس وطن کا وفادار ہو اور اس کی خاطر قربانی دینے کا جذبہ رکھتا ہو۔“ انہوں نے اس کی کیفیت بھانپ کر اسے ٹوکا۔

”میں وطن کے لیے کہاں کچھ کر سکا ہوں سر! میں تو بس اپنی بقا کی جنگ ہی لڑتا پھر رہا ہوں۔ ہاں، بس یہ کوشش ہوتی ہے کہ خود کو اپنے وطن کے خلاف استعمال نہ ہونے دوں۔“ اس نے عاجزی سے جواب دیا۔

”یہ بھی بہت بڑی بات ہے کہ اتنا ستائے جانے کے باوجود تم نے اپنے وطن کو نقصان سے بچانے کی بھرپور کوشش کی ورنہ یہاں تو یہ حال ہے کہ لوگ معمولی مفادات کی خاطر وطن کی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہیں۔ ایک معمولی پھل فروش سے لے کر بڑے تاجر اور چھوٹے سے کلرک سے لے کر اعلیٰ سرکاری عہدیدار تک جس کو جہاں موقع ملتا ہے، بے ایمانی اور بددیانتی سے کام لیتا ہے۔ جس قوم کے لوگوں میں بے ایمانی اور بددیانتی رواج پا جائے، وہ قوم بھی ترقی نہیں کر سکتی کیونکہ ان کے اس مزاج کی وجہ سے دنیا ان سے اپنے معاملات کرنا بند کر دیتی ہے۔ آج نہ تو کوئی ہمارے ہاں سرمایہ کاری کرنا پسند کرتا ہے اور نہ ہی ہمارے لوگوں کو اپنے ہاں اچھے عہدوں پر ملازم رکھنا پسند کرتا ہے۔ ہم دن بہ دن تنزلی کا شکار ہیں۔“ وہ وہی رونا روٹنے لگے جو تقریباً ہر فرد کی زبان پر رہتا ہے۔

”بہر حال میں اس موضوع پر زیادہ وضاحتیں نہیں دینا چاہتا۔ ہم یہاں تم سے تمہارے بارے میں گفتگو کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔“

”میں حاضر ہوں سر!“ معاذ نے جھکے سر کے ساتھ انہیں جواب دیا۔

”پہلے تو یہ بتاؤ کہ تمہارا فراز سے کیا تعلق ہے؟“

”فراز.....! وہ تو میرا پھوپھی زاد بھائی ہے۔ آپ اسے کیسے جانتے ہیں؟“

”وہ میرے سب سے چھوٹے بھائی کا دوست ہے۔ کچھ عرصہ پہلے اس کی زبانی مجھے تمہارا بہت تمہارے بارے

شہریت درج نہیں ہے۔ وہ اسی ملک کی شہری ہے جس کی کمپنی کی سی ای او کی حیثیت سے کام کر رہی ہے اور یہ بات تم بھی جانتے ہو کہ ہم اس ملک سے تعلقات خراب کرنے کے محمل نہیں ہو سکتے۔“ ان کا جواب اس کے لیے مایوس کن تھا۔

”اس کا مطلب ہے کہ وہ اسی طرح ہمارے سروں پر دندناتی رہے گی۔“

”فی الحال تو برداشت کرنا ہوگا لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ ہم جان بوجھ کر اپنی آنکھیں بند کر لیں گے۔ ہمیں اس معاملے کو بہت طریقے سے ہینڈل کرنا ہوگا۔ کوشش کریں گے کہ سانپ بھی مر جائے اور لالھی بھی نہ ٹوٹے۔“ انہوں نے اس پر اپنی حکمت عملی ظاہر کی تو وہ افسوس سے ہاتھ ملنے لگا۔

”کتنے مجبور ہیں ہم تیسری دنیا کے لوگ کہ لوگ ہمارے گھر میں گھس کر ہمیں مار رہے ہیں اور ہم ان کے خلاف اس لیے کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے کہ ہم معاشی طور پر کمزور ہیں۔“

”معاشی استحکام ہی آج کی دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ بد قسمتی سے اس ملک کو بہت کم مخلص لوگ میسر آئے ہیں جس کی وجہ سے ہر طرح کی نعمت اور ٹیلنٹ دستیاب ہونے کے باوجود ہم آج تک وہ معاشی خود مختاری حاصل کرنے سے محروم ہیں جس کی بنیاد پر کوئی ملک دنیا میں سر اٹھا کر کھڑا ہو پاتا ہے۔“ انہوں نے ایک اداس مسکراہٹ کے ساتھ اس کی تائید کی پھر سر اٹھا کر ذرا جوش سے بولے۔

”جب تک اس ملک کو تمہارے جیسے نوجوان میسر ہیں، میں اس کے مستقبل سے ناامید نہیں ہوں۔ کبھی نہ کبھی وہ وقت ضرور آئے گا جب ہم اس دنیا میں سر اٹھا کر جی سکیں گے۔“

”اللہ آپ کی یہ خواہش پوری کرے سر! اس دور میں جبکہ دنیا گلوبل ویج بن چکی ہے اور ہم ساری دنیا سے رابطے میں ہیں، دیگر اقوام کے درمیان اپنا مذاق بننے دیکھ کر بہت شرمندگی ہوتی ہے۔“ وہ اگرچہ خاصا میچور تھا لیکن تھا تو اسی نسل کا جوان جسے حالات نے فرسٹریشن کا شکار کر دیا تھا۔

”ان شاء اللہ یہ وقت بھی گزر جائے گا۔ تم یہ بتاؤ کہ مادام زن ہونے جو منصوبہ تمہارے سامنے رکھا ہے، اس پر کام کرنے کے لیے تیار ہو یا نہیں؟“ انہوں نے نسلی کے چند لفظ کہہ کر گفتگو کا رخ بدل دیا۔

”بالکل تیار ہوں سر! مجھے معلوم ہے کہ جب تک ہم ظلم کا راستہ نہیں روکیں گے، اپنا بچاؤ نہیں کر سکیں گے۔“

”بس تو پھر اپنی سادی توجہ اس معاملے پر فوکس کر لو

میں پتا چلا تھا لیکن پھر میں ایک اہم مشن میں مصروف ہو گیا اور تمہارا خیال میرے ذہن سے محو ہو گیا۔“ انہوں نے بتایا تو اسے یاد آیا کہ فراز نے اپنے دوست کے کنٹرل بھائی سے اس کے معاملے میں مدد لینے کا ذکر کیا تھا لیکن اس زمانے میں پھپھو کا گھر بگڑا تھا اور میڈم ایکس کو فوری طور پر اس کے اس ارادے کی خبر ہو گئی تھی۔ رد عمل میں اس نے شدید خطرناک نتائج کی دھمکی دے کر اس ارادے سے باز رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اب اتنے عرصے بعد جبکہ حالات قدرے تبدیل ہو گئے تھے، شاید فراز نے ہمت کر لی تھی اور اپنے دوست کو یہ قصہ سنا دیا تھا۔

”شاید میری اور میرے خاندان کی قسمت میں ٹھوکریں کھانا لکھا تھا کہ ہم بھی چاہتے ہوئے آپ سے رابطہ نہیں کر سکے اور جب آپ تک بات پہنچی تو آپ نے بھی توجہ نہیں کی۔“

”میری طرف سے جو کوتاہی ہوئی اس کے لیے میں شرمندہ اور معذرت خواہ ہوں۔“ انہوں نے بڑے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”ارے نہیں سراپلیز، آپ ایسی باتیں نہ کریں۔ ہم پر جو کچھ گزری اس کے لیے مجھے کسی سے شکوہ نہیں ہے۔“

”یہ تمہارا ظرف ہے لیکن میں غلطی تسلیم نہ کر کے ڈھٹائی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا۔“ انہوں نے ایک بار پھر وسیع القلبی کا مظاہرہ کیا۔ اس ساری گفتگو کے دوران زن ہونے کوئی دخل نہیں دیا تھا اور انہیں کھل کر بات کرنے کا موقع دے کر خود ایک طرف خاموشی سے بیٹھی ہوئی تھی۔

”جو ہوا، سو ہوا۔ اب تو آپ کو ہر بات کھل کر پتا چل چکی ہے۔ اب آپ میڈم ایکس اور اس کے حواریوں کے خلاف کوئی سخت ایکشن لینے کے لیے تیار ہیں؟“ معاذ نے سوال کیا تو انہوں نے نفی میں سر ہلایا اور بولے۔

”ہم اس طرح براہ راست ایک بڑی غیر ملکی فرم کی سی ای او کے خلاف ایکشن نہیں لے سکتے۔ ہمارے پاس اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔ تم سے جو کچھ ہمارے علم میں آیا ہے، اس کی حیثیت ایک زبانی داستان سے زیادہ نہیں ہے جسے بہت آسانی سے جھٹلایا جاسکتا ہے۔“

”لیکن وہ اسرائیلی شہری اور موساد کی ایجنٹ ہے۔“ معاذ تڑپ کر بولا۔

”یہ بھی صرف ایک زبانی دعویٰ ہے۔ ہم نے اپنے ذرائع سے اس کے کاغذات کی جانچ کروائی ہے۔ وہ مذہباً بے شک یہودی ہے لیکن اس کے پاسپورٹ پر اسرائیلی کی

جسم کے ریٹے ریٹے کو اپنے خیمے کی آگ سے دھکا ڈالے اور پھر واقعی اس نے ایسا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے حکم پر بشری کے ہاتھ چار عدد رسیوں سے جکڑ کر اس طرح دیواروں میں پیوست کٹھڑوں سے باندھ دیے گئے کہ اس کا جسم بڑی طرح اکڑ کر رہ گیا اور ذرا بھی ادھر ادھر حرکت کرنے کی گنجائش باقی نہ رہی۔ جس دوران اسے باندھا جا رہا تھا، اسی دوران باذل کے حکم پر ایک انجینیٹری میں کوئلہ دھکا کر اس پر لوہے کی سلاخیں بھی گرم کرنے کے لیے رکھ دی گئی تھیں۔

”انسانی گوشت جلنے کی بو سے زیادہ منفرد بو کوئی اور نہیں۔ اس بو کے ساتھ تمہاری چیخوں کا میوزک بھی شامل ہو گیا تو سمجھو زندگی کا لطف آجائے گا۔“ اس نے ایک سلاخ تمام کریوں چٹا کر لیا جیسے کوئی من پسند کھانے کی چیز سامنے آگئی ہو۔ بشری نے دھک کر سرخ ہوئی سلاخ کو ایک نظر دیکھا اور دانت پر دانت جما کر آنکھیں میچ لیں۔ وہ جانتی تھی کہ باذل جیسے درندے سے رحم کی اپیل کرنا اس کی اذیت پسند فطرت کو مزید ہمیز کرنے کا سبب بنے گا۔ ابھی وہ اپنے جسم کو اس اذیت سے گزرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار کر رہی تھی کہ باہر تاروں کی زوردار چرچاہٹ کے ساتھ گاڑیاں رکنے کی آوازیں سنائی دیں۔

”کون ہے، دیکھو۔“ باذل چلایا۔ اسی وقت باہر سے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ بشری نے بھی جنس کے مارے آنکھیں کھول دیں۔

☆☆☆

”مشورہ لینا تو دور کی بات، کسی نے مجھے کچھ بتانے کی بھی زحمت نہیں کی۔“ لالہ جیسی کرپے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ٹہل لگا تا اپنی جگہ کا اکتھار کر رہا تھا۔ اصل میں وہ اور وہی گھر سے تو ایک ساتھ نکلے تھے لیکن کچھ دیر بعد ہی وہ کسی خاص شخص سے ملاقات کے لیے چلا گیا تھا اور وہی کو وہاں بھیج دیا تھا۔ اب کافی دیر بعد وہیں لوٹا تھا تو یہاں کا یاہی پلٹ چکی تھی۔

”بتایا نا لالہ کہ وقت بہت کم تھا۔ معاذ بھائی نے بالکل شارٹ نوٹس پر مجھے بلا لیا تھا۔ اتنی ہی سرین سارے انتظام کے ساتھ وہاں پہنچنے کی فینش اتنی زیادہ تھی کہ مجھے کچھ اور سمجھائی ہی نہیں دیا۔“ وہی حضرت خواہانہ انداز میں اپنی سنائی پیش کر رہا تھا جبکہ جاوہر خاموشی سے ایک طرف مٹھانے ساری گفتگو سن رہا تھا۔ اسے افسوس تھا کہ جب معاذ بھائی کو یہاں سے لے کر گیا تو اسے علم نہ ہوا کہ وہ وہاں سے اس کے

اور یہاں کے سارے مسائل مجھ پر اور میری ٹیم پر چھوڑ دو۔ یہاں ہم تمہارے دوستوں کا پورا پورا خیال رکھیں گے۔“ انہوں نے اسے یقین دہانی کروائی تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔ یہ حقیقت تھی کہ ایک منظم ادارہ ان کے مقابلے میں ان کے دشمنوں سے زیادہ بہتر طور پر نمٹ سکتا تھا لیکن سوال یہ بھی پیدا ہوتا تھا کہ کیا وہ اپنے دوستوں کی طرف سے حملہ اطمینان ہوئے بغیر کہیں جاسکتا تھا؟ خصوصاً اسے بشری کی بہت فکر تھی جس کی پوری زندگی اس پر غار ہو گئی تھی۔ اس نے اس کی خاطر جتنی تکالیف اٹھائی تھیں، وہ اس بات کی حقدار تھی کہ وہ خود اس کے درد کا درماں بنے۔ وہ یکدم ہی ایک ایسے دوراہے پر آکھڑا ہوا جہاں کوئی فوری فیصلہ کرنا آسان نہیں تھا۔

☆☆☆

”بہت خوب..... بہت ہی خوب۔ جیسی خوشی مجھے تمہیں یہاں دیکھ کر ہو رہی ہے، ایسی خوشی تو کبھی مس ورلڈ کو دیکھ کر بھی نہیں ہو سکتی تھی۔“ وہ باذل کے سامنے کھڑی تھی اور وہ اپنے مخصوص عامیانہ انداز میں اس کے چہرے کو چھوتے ہوئے نہایت خباثت سے بول رہا تھا۔ بشری اس کے اس انداز پر زبان سے کچھ نہیں بولی لیکن اپنی نفرت اور بیزاری کے اظہار کے لیے زور سے اس کا ہاتھ جھک دیا۔

”بڑا مانتی ہے سالی..... اچھے تو خوش ہونا چاہیے کہ تیری اس مکروہ صورت کے باوجود کوئی مرد تیرے قریب کھڑا ہے ورنہ تو، تو اس لائق ہے کہ بندہ تجھے دیکھ کر کراہیت سے الٹی کر دے۔“ بشری کے رد عمل نے اس کے پیش میں اضافہ کر دیا اور اپنی انگلیاں اس کے بازو میں پیوست کرتے ہوئے نہایت حقارت آمیز لہجے میں بولا۔

”تو مرد نہیں، گندگی کا ڈمیر ہے۔ ایسا ڈمیر جس سے ہر وقت نقصان اٹھتا رہتا ہے۔“ بازو میں شدید تکلیف محسوس کرنے کے باوجود وہ اس سے اپنی نفرت کا اظہار کرنے سے باز نہ رہ سکی۔

”گندگی کا ڈمیر اور نقصان زدہ تو میں تجھے بتاؤں گا۔ بہت شوق ہو رہا تھا نا تجھے، مجھے معذور بنا کر کسی ایسے جگہ پر ڈلوانے کا جہاں ہر وقت عورتوں کا آنا جانا ہو۔ اب دیکھتا میں تجھے ایسی جگہ ڈلواؤں گا جہاں ادارہ کے حیرانہ جسم لوگوں کے اور لوگ تیری بدبو سے گھبرا کر اپنی ناک پر ہاتھ رکھ کر گزریں گے۔“ وہ پہلے ہی متحدہ طبیعت کا مالک تھا۔ اس پر بشری کے لالہ جیسی کے ٹھکانے پر رد عمل نے اس میں حرید آگ بھردی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ بشری کے

وکی بے ساختہ بول اٹھا۔ لالہ کے چہرے پر البتہ سنجیدگی تھی اور یوں اصغر کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے اس کی بات پوری ہونے کا منتظر ہو۔

”کچھ ہوا ہے کیا؟“ اصغر نے پہلی بار محسوس کیا کہ وہاں موجود تمام نفوس کے چہروں پر گھبرتا اثرات ہیں۔

”جو ہوا وہ بعد میں بتاتا ہوں، پہلے تم اپنی بات پوری کرو۔“ وکی نے اسے ٹالا۔

”ہوا یہ ہے شہزادے کہ ہمارے نصیب میں ایک بھی اچھی خبر نہیں ہے۔ یہ جو راحیلہ صاحبہ ہیں، انہوں نے بتایا ہے کہ یہ دونوں میاں بیوی بشری کو مہناز کے اپارٹمنٹ پر چھوڑنے جا رہے تھے کہ راستے میں کسی نے ان کی گاڑی روک لی اور بشری بی بی کو اپنے ساتھ لے کر چلے گئے۔“

”اوہ خدایا! کون تھے وہ لوگ؟“ اصغر کی دی گئی اطلاع سن کر وکی کرا رہا۔

”تفصیلات آپ کو یہ دونوں میاں بیوی بتائیں گے۔“ اصغر نے راحیلہ اور آصف کی طرف اشارہ کیا تو وہ دونوں وکی کے سوال کرنے سے قبل خود ہی شروع ہو گئے۔

”تیار کر دو۔ ہم ابھی ابھی بشری کو چھڑانے کے لیے نکلتے گے۔“ لالہ نے یہ سب سنا تو فیصلہ کرنے میں دیر نہ لگائی۔ اس کا فیصلہ سن کر راحیلہ کے چہرے پر اطمینان در آیا۔

☆☆☆

”عرقان اللہ صاحب آئے ہیں۔“ دوڑ کر اندر آنے والے نے اطلاع دی تو باذل کے چہرے پر بیزاری پھیل گئی۔

”وہ کہاں سے آگئے اس وقت؟“ وہ بڑبڑایا۔

”میری چھوڑ دو اور اپنی بتاؤ کہ تم کہاں غائب رہے اتنے عرصے تک۔ تمہاری ماں نے اس عرصے میں تمہارا پوچھ پوچھ کر میرا جینا حرام کر دیا تھا۔ اسے شک تھا کہ میں نے اپنے کسی کام سے تمہیں کہیں بھجوا رکھا ہے۔“ عرقان اللہ اطلاع دینے والے کے پیچھے ہی اندر داخل ہوا اور اس کی بڑبڑاہٹ سن کر قدرے سخت لہجے میں بولا۔

”ان کی آپ فکر نہ کریں۔ میں ان سے مل کر انہیں مطمئن کر چکا ہوں۔“ اس نے بھی رکھائی سے جواب دیا۔

”اس کے اطمینان کی چھوڑ دو اور مجھے بتاؤ کہ تم بغیر کوئی اطلاع دیے اتنے عرصے کہاں غائب تھے؟“ عرقان اللہ کو اس کا لہجہ چھا اور پہلے سے زیادہ سختی سے پوچھا۔

”ابھی اس بات کو رہنے دیں۔ یہ بہت لمبی تفصیل ہے جسے سنانے کی فی الحال میرے پاس فرصت نہیں ہے۔“ عرقان اللہ کے انداز پر ایک ہل کے لیے باذل کی تیوری پر

ارادے سے باز رکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرتا۔ معاذ کے یہاں نہ ہونے سے وہ بہت عجیب سا بھی محسوس کر رہا تھا کیونکہ یہ معاذ ہی تھا جس کی وجہ سے وہ اپنی اصل ڈگر چھوڑ کر اس سارے چکر میں ملوث ہو گیا تھا اور اب معاذ ہی غائب تھا۔

”اب یہ بھی نہیں پتا کہ تُو نے نیلی اور بچے کو جن لوگوں کے حوالے کیا ہے، وہ صحیح بندے تھے بھی یا نہیں۔ اگر دھوکے سے کوئی اور پارٹی لے گئی ہو انہیں تو پھر کیا کریں گے ہم؟“ لالہ نے فکر مندی کا اظہار کیا۔

”اب وہم میں تو نہ ڈالو۔ معاذ بھائی نے جو کوڈورڈز بتائے تھے، میں نے انہی کی بنیاد پر نیلی اور اعظم کو ان کے ساتھ بھیجا ہے پھر آنے والے تھے بھی چینی اس لیے مجھے مزید تسلی ہو گئی۔“ وکی نے وضاحت دی اور پھر تائید کے لیے جارو کو مخاطب کیا۔

”کیوں جارو! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا۔ وہ چینی ہی تھے نا؟“

”چینی کے بچے..... وہ جو تو معاذ کو دشمنوں کے ہتھکنچے میں چھوڑ آیا ہے، اس کے بارے میں کچھ سوچا ہے کہ اپنی جورو کو کیا جواب دے گا؟ معاف نہیں کرے گی وہ تجھے تیری اس حرکت کے لیے۔“ لالہ نے جارو کی تصدیق میں ہلکی گردن کی طرف دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی اور اسے ٹھور کر بولا۔

”اب اس کا بھائی ہی سر پھرا ہے تو میں کیا کروں؟“ وکی جواباً منمنایا۔

”سالے صاحب کو واپس لانے کی کوشش کر اور کیا۔“ لالہ نے اسے ڈپٹا پھر جیب سے موبائل نکالا ہوا بولا۔ ”ایک تو یہ اصغر جانے کہاں جا کر مر گیا ہے۔ اسے بلواتا ہوں پھر کرتے ہیں کوئی پلاننگ۔“ ابھی اس کے الفاظ منہ میں ہی تھے کہ بیرونی دروازہ کھلنے اور کسی کے اندر آنے کی آوازیں سنائی دیں۔ اگلے ہی لمحے اصغر مرد دوزن کے ایک جوڑے کے ساتھ ان کے سامنے تھا۔ ان دونوں ہی نے اندر داخل ہوتے وقت کسی کو بطور خاص مخاطب کیے بغیر آہستہ سے سلام کیا۔

”یہ راحیلہ بی بی اور ان کے شوہر آصف ہیں۔ راحیلہ بی بی، بشری گلزار کی سہیلی ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ کل سے بشری گلزار انہی کے گھر میں تھیں۔“ اصغر نے سب کی سولہ نظروں کو محسوس کر کے ان دونوں کا تعارف کروانے کے ساتھ ساتھ اطلاع دی۔

”شکر خدا کا۔ کم از کم کوئی ایک تو اچھی خبر سننے کو ملی۔“

مل پڑے لیکن پھر اس نے خود کو سنبھال لیا اور لہجہ کو معتدل رکھتے ہوئے جواب دیا۔

”یہ کون ہے؟“ عرفان اللہ نے اس کے جواب پر اسے تیز نظروں سے گھورا ضرور لیکن جواب کے لیے اصرار نہیں کیا اور بندھی ہوئی بشری کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔
”ہے ایک دشمن کی دھمکی رگ جسے میں اتنی اذیت دوں گا کہ میرا دشمن بلبلا اٹھے گا۔“ باذل کی آنکھوں میں نفرت ہی نفرت تھی۔

”دشمنوں سے نمٹنے کے لیے ساری زندگی پڑی ہے۔ فی الحال تو دوستوں کی خبر لو۔ دوست آنکھیں پھیر لیں تو وہ دشمن سے زیادہ خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔“
”کیا مطلب؟“ باذل چونکا۔

”یزدانی کا دماغ پھر گیا ہے۔ بیٹے کی موت کے بعد وہ دنیا سے بیزار ہو گیا ہے اور اس پروجیکٹ کو کسی دوسری پارٹی کو بیچنے کے چکر میں ہے۔ سوچو اگر ایسا ہو گیا تو ہمارے ہاتھ سے اتنا بڑا اور محفوظ ٹھکانا نکل جائے گا۔“ عرفان اللہ کی دی اطلاع خود باذل کے لیے بھی تشویشناک تھی۔ عرفان اللہ کے کاموں کے علاوہ وہ اپنے بیشتر غیر اخلاقی مشاغل کے لیے بھی اسی زیر تعمیر ہاؤسنگ سوسائٹی کو (جس میں تعمیراتی کام ایک عرصے سے رکا ہوا تھا) استعمال کرتا تھا۔
”اگر ایسا ہے تو آپ خود اس پروجیکٹ کو خرید لیں۔“ باذل نے مشورہ دیا۔

”مجھے اس وقت پورا فوکس سیاست پر رکھنا ہے اس لیے میں اتنی بڑی رقم اس پروجیکٹ پر انویسٹ نہیں کر سکتا۔
کر بھی دوں تو اس سے میری سیاسی ساکھ کو نقصان پہنچے گا کیونکہ اول تو یہاں تعمیراتی کام میں پہلے ہی بہت کھلے گئے ہیں، دوسرے خریدار کو طے شدہ وقت پر مکان تیار کر کے دینے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ پہلے ہم دھونس دھاندلی سے بشری گلزار کی آواز دبانے میں کامیاب ہو گئے تھے لیکن اب تو میرے سیاسی مخالفین ہی ایسے انویسٹی گٹر صحافیوں کو میرے خلاف اٹھا کر کھڑا کر دیں گے۔ ابھی تو انہیں اس لیے موقع نہیں مل پارہا ہے کہ اس پروجیکٹ میں میرے تمام تر عمل دخل کے باوجود قانونی طور پر میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“ عرفان اللہ بولا جا رہا تھا اور باذل، بشری کے چہرے کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ حیرت انگیز طور پر وہ پرسکون تھی اور کسی بات پر کوئی رد عمل ظاہر نہیں کر رہی تھی۔

”میرے خیال میں یہاں کھڑے کھڑے ساری باتیں

کر لینے کے بجائے آرام سے آفس میں چل کر بیٹھتے ہیں۔“
اگرچہ بشری اس کی قید میں، اس کے رحم و کرم پر بھی پھر بھی اسے لگا کہ انہیں اس کے سامنے احتیاط سے کام لینا چاہیے۔

”نہیں، میرے پاس زیادہ دیر رکنے کا وقت نہیں ہے۔ وہ تو میں یہاں سے گزر رہا تھا تو سوچا کہ دیکھتا ہوا چلوں کہ تم واپس آ گئے ہو یا نہیں۔“ عرفان اللہ کا انداز گو سرسری تھا لیکن باذل سمجھ سکتا تھا کہ وہ یوں اتفاقاً وہاں نہیں آیا ہے اور یہاں سے ہی کسی نے مخبری کی ہے۔

”میں چاہتا ہوں کہ تم ذرا یزدانی پر نظر رکھو۔ اس کے بارے میں سننے میں آیا ہے کہ وہ اس پروجیکٹ کو کسی نیک نام بلڈر کے حوالے کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور اپنے اندرونی حلقوں میں یہ بات کہہ رہا ہے کہ چاہے مجھے مالی نقصان اٹھانا پڑے، میں اس پروجیکٹ کو کسی دو نمبر آدمی کے حوالے نہیں کروں گا۔ آج کل ایمانداری، خوف خدا اور جذبہ ترحم جیسے جذبات کا بھوت چڑھا ہوا ہے اسے اور تمہیں یہ بھوت اتارنا ہے۔“ عرفان اللہ نے ابھی اپنی بات ختم نہیں کی تھی کہ بشری نے ایک زوردار ہتھکڑی لگایا۔ اس کی اس حرکت پر عرفان اللہ نے اسے حیرت سے دیکھا۔

”آپ اسے پہچانے نہیں ہیں؟ یہ بشری گلزار ہے۔“ باذل نے عرفان اللہ کی حیرت دور کی۔
”اسے کیا ہوا؟“ عرفان اللہ نے آنکھیں پھاڑ کر بشری کو دیکھا۔

”اس نے باذل سے ٹکرانے کا نتیجہ بھگتا تھا لیکن سالی نے پھر بھی نصیحت نہیں پکڑی اور ایک بار پھر میرے خلاف سازشیں کرنے کھڑی ہو گئی۔ اب میں اس کا وہ حال کروں گا کہ یہ تو یہ، اس کے ہوتے سوتے بھی بلبلا اٹھیں گے۔“

باذل کے لہجے میں ایسی سفاکی تھی کہ عرفان اللہ جیسا بندہ بھی ایک لمحے کے لیے کانپ گیا۔

”تو جتنا چاہے ظلم کر لے، حساب لینے والی ہستی سب دیکھ رہی ہے۔ ایک دن میرا رب تجھ سے تیرے کیے کا وہ بدلہ لے گا کہ تو اپنے جیسوں کے لیے نشان عبرت بن کر رہ جائے گا۔“ بشری نے نفرت سے چور لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا۔

”میری بات سنو باذل!“ عرفان اللہ نے باذل کو جواباً کچھ بھی کہنے کا موقع نہیں دیا اور اس کا ہاتھ تھام کر باہر لے گیا۔

”کیا کوئی خاص بات ہے؟“ باذل نے ارد گرد ایک طائرانہ نظر ڈالی اور دریافت کیا۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ عرفان

اللہ کی گاڑی کے پیچھے ایک اور گاڑی بھی کھڑی ہے۔ دونوں گاڑیوں کے آس پاس کئی مستعد و چونکے گاڑیوں کے ڈرائیور دکھائی دے رہے تھے جس سے ظاہر تھا کہ عرفان اللہ اپنی حفاظت پر خصوصی توجہ دے رہا ہے۔

”آپ تو سچ بچ بڑے سیاست دان بننے کی تیاری میں ہیں۔“ باذل کہے بغیر نہ رہ سکا۔

”اسے چھوڑ دو اور میری بات غور سے سنو۔“

”ایسی کیا خاص بات ہے۔“ باذل نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔

”اس لڑکی بشری کو میڈم ایکس کے حوالے کر دو۔“

”نہیں..... یہ میرا شکار ہے۔ اس کا حساب کتاب

میں خود کروں گا۔“ باذل بدکا۔

”بات سمجھا کرو۔ میڈم ایکس اس وقت معاذ ابنہ

کپہنی کے خلاف پوری طرح ایکشن میں ہے۔ بشری اس

کے ہاتھ آگئی تو اس کی پوزیشن بہت مضبوط ہو جائے گی۔“

”اس سے ہمیں کیا فائدہ ہوگا؟“ باذل نے منہ بنایا۔

”تم عرصے سے منظر سے غائب ہو اس لیے تمہیں

یہاں کے حالات کا علم نہیں ہے۔ میڈم ایکس ”دشمن کا دشمن

دوست ہوتا ہے“ والے مقولے پر عمل کرتے ہوئے میری

طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا چکی ہے اور اس حد تک مجھے سپورٹ

کر رہی ہے کہ آنے والے ایکشن میں میرا وزیر اعلیٰ بننا طے

پا چکا ہے۔“ عرفان اللہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”ابھی ایکشن میں بہت وقت پڑا ہے۔ ابھی تو آپ ایم

این اے کی سیٹ کو ہی انجوائے کیجیے۔“ باذل نے منہ بنایا۔

”بیوقوفی کی باتیں مت کرو۔ ہمارے ملک میں کون

سا اسمبلیاں بھی اپنی مدت پوری کرتی ہیں۔ آئندہ ایکشن

زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو سال کی دوری پر ہیں اور اس

عرصے میں مجھے ہر طرح سے اپنی پوزیشن مضبوط کرنی ہے۔

مضبوط پوزیشن کے لیے پشت پر مضبوط ہاتھ ضروری ہے۔ تم

اور میں اچھی طرح جانتے ہیں کہ زیر زمین دنیا کو کنٹرول

کرنے والوں میں میڈم ایکس کیا حیثیت رکھتی ہے اور اس

ملک میں حکومتیں بنانے اور بگاڑنے میں ایسے لوگوں کا کتنا

بڑا کردار ہوتا ہے۔ مخالفین سے نمٹنے اور بھاری سرمایہ کاری

کرنے میں یہ لوگ جو کردار ادا کر سکتے ہیں، وہ کسی اور کے

بس کی بات نہیں۔“ وہ باذل کو قائل کرنے کی پوری کوشش

کرنے لگا اور پھر آواز کو ذرا دبا کر بولا۔

”میڈم ایکس نے تو مجھ سے یہاں تک وعدہ کیا ہے

کہ وہ مجھے وزیر اعظم کی کرسی تک بھی پہنچا دے گی لیکن ظاہر

ہے یہ سب کچھ دو اور کچھ لوکی پالیسی کے تحت ہی ہوگا۔“

”یہ سب جو آپ نے گنویا ہے، یہ سب آپ کے

ذاتی فائدے ہیں۔ اس سب میں، میں یا میری ماں تو کہیں

بھی نہیں ہیں۔“ باذل قطعی متاثر نہیں ہوا۔

”کیسے نہیں ہو؟ کیا اب تک میں تم دونوں کو نوازتا

نہیں رہا ہوں؟ کیا شو کے کے بیٹے کی حیثیت سے تم وہ

زندگی گزار سکتے تھے جو میں نے تمہیں دی ہے؟“ عرفان

اللہ کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ اپنے حق میں جو دلائل دے رہا

ہے، وہ باذل کے اندر بھٹی سی دھکا کر اس کا فشارِ خون بلند

کرتے جا رہے ہیں۔

”جیسے آج تم ماں بیٹا عیش کر رہے ہو، کل میں مزید

ترقی کروں گا تو میرے ساتھ مزید عیش کرو گے۔“

”کیا ہم آپ کے وزیر اعظم بننے کے بعد آپ کے

ساتھ وزیر اعظم ہاؤس میں رہ سکیں گے؟“ باذل نے سرد

لہجے میں سوال کر کے اس کی بولتی بند کر دی۔ ”مجھے اور میری

ماں کو یہ طفیلیوں والے عیش منظور نہیں ہیں۔ کبھی سوچا ہے

آپ نے کہ آپ کو کچھ ہو گیا تو ہمارا کیا ہوگا؟ ہم تو بالکل

سڑک پر آجائیں گے۔“

”اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔ تمہاری ماں شہر کا مہنگا

ترین بیوٹی سیلون چلا رہی ہے جس سے اسے لاکھوں کی

آمدنی ہوتی ہے اور یہ تو تمہیں پتا ہی ہوگا کہ اس بیوٹی سیلون

کے لیے تمام تر سرمایہ کاری میں نے کی تھی۔“ عرفان اللہ

نے ناگواری سے اس کے اعتراضات کا جواب دیا۔

”بیوٹی سیلون.....؟“ باذل نے طنز سے ہنکارا

بھرا۔ ”اس بیوٹی سیلون سے میری ماں کے اخراجات ہی

پورے ہو جائیں تو بڑی بات ہے۔ وہ اس کی آمدنی میں

سے مجھے ایک کوڑی بھی نہیں دے گی۔“

عرفان اللہ کو خبر بھی کہ وہ جو کہہ رہا ہے، بالکل درست

ہے۔ تاجور جیسی سوشل عورت کے ذاتی اخراجات ہی بہت

زیادہ تھے۔ مہنگے ملبوسات، بیوٹی ٹریٹمنٹس، سرجریز،

بیرون ملک کے دورے اور پارٹیز وغیرہ کے ہی اتنے

اخراجات تھے کہ وہ بہترین آمدنی کے باوجود ان کے

سامنے پیسے کی تنگی کا رونا روٹی تھی۔ ایسے میں بیٹے کو کہاں

سے کچھ دیتی اور بیٹا کون سا خرچ کرنے کے معاملے میں کم

تھا۔ وہ ماں سے چار ہاتھ آگے ہی تھا۔

”میں تمہیں کوئی بزنس سیٹ کروا دوں گا۔“

”بزنس.....!“ وہ ہنسا۔ اس کی ہنسی زہر میں بھی

ہوئی تھی۔ ”آپ کے خیال میں، میں کون سا بزنس کر سکتا

ہوں؟ وہ کون سا بزنس ہے جس میں مجھ کو اب تک دی گئی غنڈا گردی اور دادا گیری کی تربیت کام آ سکتی ہے؟“
 ”تم چاہتے کیا ہو؟“ عرفان اللہ کو اس کے مسلسل طنزیہ لہجے نے جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیا۔
 ”آپ کی وراثت میں حصہ۔“

”کیا تم کو اس کر رہے ہو۔ ایسا کیسے ممکن ہے؟“
 عرفان اللہ اچھل پڑا۔

”آپ میری ماں سے نکاح کر لیں تو بہت کچھ ممکن ہو سکتا ہے۔ آپ وزیر اعظم بنیں گے تو میری ماں خاتون اول کہلائے گی اور میں آپ کے نہ سہی، خاتون اول کے بیٹے کی حیثیت سے وزیر اعظم ہاؤس میں رہ سکوں گا۔ وراثت میں بھی میری ماں کا حصہ ہوگا اور ماں کا تو میں ہی واحد وارث ہوں نا۔“ اس نے اپنے مطالبے سے عرفان اللہ کو ششدر کر دیا۔

”اس بیہودہ خیال کو اپنے دماغ سے نکال دو۔ جس عورت سے میں نے جوانی کے جوش میں بھی نکاح نہیں پر دھوایا، اسے اپنے کیریئر کے اس اسٹیج پر گلے کا ڈھول بناؤں گا۔ ایسا بھول کر بھی مت سوچنا۔“ حیرت کو غصے میں ڈھلنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔

”تو آپ بھی بھول کر مت سوچیے گا کہ آپ کی ترقی کے سفر میں باذل کوئی کردار ادا کرے گا۔“ اس نے بھی بے مروتی کی انتہا کر دی۔

”مجھے ضرورت بھی نہیں ہے تمہاری۔ میرے پاس تمہارے جیسے بہت ہیں۔“ عرفان اللہ کا پارہ ہائی ہوا۔

”ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کا ڈی این اے آپ کے ڈی این اے سے میچ کر جائے۔“ اس کے سرد اور پتھر یلے لہجے کے اندر چھپی دھمکی نے عرفان اللہ کو سن کر دیا۔

”تاج..... در..... کت.....“ اس نے دانت کچکچاتے ہوئے تصویر ہی میں تاجور کو زیر لب گالی دی اور پیر پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ اسے آتے دیکھ کر مستعد گارڈز میں سے ایک نے جلدی سے آگے بڑھ کر گاڑی کا دروازہ کھولا جبکہ باقی جلدی جلدی پچھلی کھلے کھین والی گاڑی میں سوار ہونے لگے۔ اگلے ہی لمحے وہاں گاڑیوں کے پیہوں سے اٹھنے والی دھول اڑ رہی تھی۔ باذل ایک پل کے لیے وہاں کھڑا اس دھول کو دیکھتا رہا پھر تیزی سے مڑ کر اندر چلا گیا۔

”پیک کر دسب کچھ۔ اسے بھی کھولو۔ ہمیں ابھی ابھی یہاں سے نکلنا ہے۔“ اس نے بشری کی طرف اشارہ کرتے

ہوئے حکم دیا تو اس کے ساتھی تیزی سے حرکت میں آ گئے۔
 افراتفری میں ضروری سامان سمیٹ کر وہاں سے نکلتے ہوئے وہ بشری کا پرس وہیں بھول گئے تھے۔ بھول باذل کچھ اور بھی گیا تھا۔ کچھ ایسا جو آگے جا کر اسے ناقابل حلانی نقصان پہنچانے والا تھا۔

☆☆☆

”یزدانی ہاؤسنگ اسکیم!“ نیلے رنگ کے بورڈ پر سفید لکھائی میں درج الفاظ مشکل سے پڑھے جا رہے تھے کہ بورڈ بری طرح دھول مٹی میں اٹا ہوا تھا۔ اندر جانے والا بڑا سا پھانک بھی بند تھا اور بنگ آفس بھی۔ یہاں تک کہ آفس پاس کوئی چوکیدار یا نگران بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔
 ”یہ جگہ تو بالکل ویران ہے۔“ وکی کے برابر میں بیٹھے چارو نے اس منظر کو دیکھ کر تبصرہ کیا۔

”یہ علاقہ ویسے ہی شہر سے کافی ہٹ کر ہے۔ تھوڑی بہت رونق کام کرنے والے مزدوروں یا ویزٹرز کی وجہ سے ہوتی ہے تو صاف نظر آ رہا ہے کہ بنگ آفس بھی بند ہے اور تعمیراتی کام بھی، ایسے میں ویزانی تو ہونی ہی ہے۔“ وکی نے جوابی تبصرہ کیا اور گاڑی کو پھانک سے آگے گزار کر لیتا چلا گیا۔ لالہ اور اصغر دو مزید لوگوں کے ساتھ دوسری گاڑی میں تھے اور پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت دائیں پہلو کی باؤنڈری وال کی طرف مڑ گئے تھے۔

”باذل کو تلاش کرتے وقت پتا نہیں کیوں یہ بات ذہن سے نکل گئی تھی کہ ایک بار یہ جگہ بھی چیک کروالی جائے۔ معاذ بھائی اور عالم شاہ کی زبانی جو قصے میں نے سنے ہیں، ان کے مطابق بھی باذل اس جگہ کو اپنی مجرمانہ سرگرمیوں کے لیے استعمال کرتا رہا ہے بلکہ کہانی تو شروع ہی یہاں سے ہوئی تھی۔ بشری یہاں تعمیراتی کام میں بے ضابطگیوں کا پتا چلنے پر تحقیق کرنے آئی تھی تو بنگ آفس میں بیٹھے کامران اور سلطان کی اس پر نیت خراب ہو گئی تھی اور خدا کی قدرت دیکھو کہ اس موقع پر معاذ بھائی نے کسی فلمی ہیرو کی طرح انٹری مار کر بشری کو بچایا تھا اور پھر دشمنی کے لائحہ عمل کے تحت چلے گئے تھے۔“ ماضی کو دہراتا وکی، چارو کی معلومات میں اضافہ کرتا چلا گیا۔

”اللہ، معاذ کی مدد کرے۔ وہ دوستوں، گھروالوں اور وطن سب سے بہت محبت کرنے والا بندہ ہے اور شاید اسی وجہ سے امتحان سے گزر رہا ہے۔“

”بالکل، قدرت بھی اسی کی آزمائش کرتی ہے جو اس میں پورا اترنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔“ وکی نے اس سے

اتفاق کیا اور ایک مناسب جگہ دیکھتے ہوئے باؤنڈری کے ساتھ گاڑی روکی، ساتھ ہی لالہ کو اطلاع دی۔

”ہم اندر جانے کے لیے تیار ہیں۔“ اس طرف سے بھی گرین سگنل دے دیا گیا۔

”اندر کوئی آواز نہیں ہے۔ ایسا لگتا ہے کوئی ذی روح موجود ہی نہیں ہے۔“ جارو جو اس سے پہلے ہی گاڑی سے اتر کر اندر کی سرنگن لینے کی کوشش کر رہا تھا، اس کے قریب آنے پر قدرے تشویش سے اسے بتانے لگا۔

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ ٹریکر بتا رہا ہے کہ راحیلہ کا موبائل یہیں موجود ہے۔ موبائل کی موجودگی کا مطلب ہے بشری بھی یہیں ہے اور جب بشری یہاں ہے تو اور کچھ نہ سہی، اس کی نگرانی کے لیے ایک آدھ بندہ تو موجود ہونا چاہیے۔“ وکی اس کے سننے کی غیر معمولی صلاحیت سے واقف ہونے کے باوجود اس کی بات ماننے میں متامل ہوا۔

”ہو سکتا ہے بشری بیہوش ہو اور نگران بھی خاموشی سے کہیں پڑا آرام کر رہا ہو۔“ جارو نے اس کے اختلاف کا برامانے کے بجائے خیال آرائی کی۔

”مطلب کہ ہمیں اندر کچھ خاص مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔“ وکی مسکرایا اور اپنی عادت کے مطابق بندروں کی سی پھرتی سے دیوار پر چڑھ گیا۔ جارو کو وہیں رک کر اس کا انتظار کرنا تھا چنانچہ وہ وہیں گاڑی کے بونٹ سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور وکی کو دوسری طرف چھلانگ لگاتے دیکھتا رہا۔

وکی دوسری طرف پہنچ کر محتاط قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔ اگرچہ اب تک اسے وہاں کسی دوسرے انسان کی شکل دکھائی نہیں دی تھی لیکن خدشہ تو تھا کہ اچانک ہی کہیں سے کوئی نکل کر سامنے آجائے گا۔ آدمی ادھوری عمارتوں میں جھانکتا وہ آگے بڑھتا چلا گیا لیکن خدشے کے خلاف کسی سے سامنا نہیں ہوا۔

”اُلٹے ہاتھ کی تیسری قطار میں آ جاؤں ہم بھی یہیں ہیں۔“ جبکہ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ جارو صحیح کہہ رہا تھا کہ یہاں کوئی موجود نہیں ہے۔ اسی وقت اس کے پاس اصغر کی کال آ گئی۔ وہ اس کی ہدایت کے مطابق مذکورہ قطار میں پہنچا تو اصغر اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک مکان کے سامنے کھڑا نظر آیا۔

”کیا ہوا، کیا وہ نہیں ہے؟“ اس نے اصغر کے چہرے کے نایوسانہ تاثرات دیکھتے ہوئے تشویش سے پوچھا۔ جواب اس نے نفی میں سر ہلا کر تصدیق کر دی اور آہستہ

سے بولا۔

”اندر صرف اس کا پرس پڑا ہے اور پرس میں موبائل موجود ہے۔“

”مطلب ہمیں دھوکا دینے کی کوشش کی گئی ہے۔“ وکی نے رائے دی پھر چونک کر بولا۔

”کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ ہمیں برباد کرنے کے لیے کوئی چال ہو۔“

”مجھے ایسا نہیں لگتا۔ تم میرے ساتھ اندر چل کر دیکھو تو خود بھی اس بات کو مان جاؤ گے۔“ اصغر نے کہا تو وہ اس کے ساتھ اندر چل پڑا۔ اندر ایک کونے میں بشری کا پرس پڑا ہوا تھا جبکہ دیوار میں پیوست کندوں سے لٹکتی رسی کے علاوہ رسی کے کچھ ٹکڑے فرش پر بھی بکھرے ہوئے تھے اور صاف لگ رہا تھا کہ ان رسیوں سے بندھے کسی شخص کو غلت میں وہاں سے لے جایا گیا ہے کیونکہ اگر اطمینان سے یہ کام کیا جاتا تو رسیاں کاٹنے کے بجائے گرہیں کھول کر لے جایا جاتا۔

”یہ بھی دیکھو۔“ اصغر نے اسے ایک کونے میں رکھی انگلیٹھی کی طرف متوجہ کیا۔ انگلیٹھی میں موجود کوئلے اب بھی ہلکے ہلکے دھک رہے تھے اور اس پر دھری سلاخ سرخ ہو رہی تھی۔

”میرے خدا! کیا وہ لوگ اسے تشدد کا نشانہ بنا رہے تھے۔“ موسم آگ سینکنے والا نہیں تھا اور سلاخ کی موجودگی بھی معنی خیز تھی اس لیے وکی نے یہ لرزہ خیز اندازہ لگاتے ہوئے پھریری نہی لی۔

”میرے خیال میں انہیں اس کا موقع نہیں ملا۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ سلاخ اتنی صاف نہیں ہوتی اور یہاں گوشت جلنے کی بو بھی محسوس ہوتی۔“ اصغر نے منطقی انداز میں صورستہ حال کا تجزیہ کر کے اسے اطمینان دلایا۔

”مجھے لگتا ہے کسی ایمر جنسی کی وجہ سے انہیں بہت غلت میں یہاں سے فرار ہونا پڑا ہے۔“ ان کے تیسرے ساتھی نے پہلی بار گفتگو میں دخل دیا۔

”کہیں کوئی تیسری پارٹی تو بیچ میں نہیں کود پڑی؟ ہونے کو تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی انہیں یہاں سے اٹھا کر لے گیا ہو۔“ وکی ہر امکان پر غور کر رہا تھا۔

”ایسا لگتا تو نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو یہاں دھینکا مٹی کی کچھ نشانیاں ہوتیں، گولیاں شولیاں چلنے کے آثار بھی مل سکتے تھے لیکن ایسا کچھ نہیں ہے۔“ اصغر نے ایک بار پھر اس سے اختلاف کیا پھر گاڑی کے انجن کی آواز سن کر باہر کی طرف لپکا۔ وکی نے بھی اس کی پیروی کی۔ آنے والا لالہ تھا

جو اصغر کی طرف سے یہاں کی رپورٹ سن کر سیدھا گیٹ کے راستے یہاں پہنچا تھا۔ اس نے خود صورت حال کا جائزہ لیا اور اصغر کی آراء سے اتفاق کیا۔

”باہر گاڑیوں کے ٹائروں کے بھی نشان ہیں اور دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ تازہ ہی ہیں۔ مطلب انہیں یہاں سے گئے بہت زیادہ دیر نہیں گزری۔“ اصغر نے اپنی رائے کے حق میں ایک اور دلیل دی۔

”آخر وہ اتنی عجلت میں یہاں سے گئے کیوں ہیں؟“

وکی نے تشویش کا اظہار کیا۔

”سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب ہم بشریٰ کو کہاں تلاش کریں گے۔ وہ جس بھی وجہ سے یہاں سے گئے ہیں، ہم اس کا سراغ کھو چکے ہیں اور یہی سب سے تشویش ناک بات ہے۔“ لالہ نے اپنی رائے دی۔

”میرے خیال میں ہمیں اس جگہ کی مکمل تلاش لینا چاہیے۔ ہو سکتا ہے ہمیں کوئی کلیوٹل ہی جائے۔“ وکی نے رائے دی تو اس سے اتفاق کرتے ہوئے سب اس کام میں جت گئے۔ جارو کو بھی وہیں بلوایا گیا۔ تلاشی کے عمل کے دوران انہوں نے وہ تہ خانہ دریافت کر لیا جس میں کسی وقت عالم شاہ اور سرمد کو قید کیا گیا تھا اور جہاں ان کی نقیب لاشاری جیسے مظلوم کردار سے ملاقات ہوئی تھی۔

”میرے خدا! یہ تو کوئی عتوبت خانہ لگتا ہے۔“ تنگ و تاریک تہ خانے کا جائزہ لیتے ہوئے انہیں وہاں تشدد کے کئی آلات بھی دکھائی دیے اور دیواروں پر موجود خون اور گولیوں کے نشانات بھی۔

”سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے بشریٰ کو اس محفوظ تہ خانے کے بجائے اوپر ہی کیوں رکھا ہوا تھا؟“ وکی نے قیدیوں کے لیے اتنے مکمل اور پُر ہول انتظامات دیکھ کر تبصرہ کیا۔

”شاید تعمیراتی کام کے جاری رہتے ہوئے وہ اس تہ خانے کو استعمال کرتے ہوں۔ اب تو یہاں اس لوگوں کے سوا کوئی اور تھا ہی نہیں اور دور دور تک آبادی کے آثار بھی نہیں تو انہیں تہ خانہ استعمال کرنے کی حاجت ہی محسوس نہیں ہوئی ہوگی۔“ لالہ نے ایک معقول توجیہ پیش کی۔ گفتگو کے دوران تہ خانے کی تلاشی کا عمل مسلسل جاری تھا۔ فرش پر باریک مٹی کی موٹی تہ دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ تہ خانہ کافی عرصے سے استعمال نہیں ہو رہا تھا۔ شاید تہ خانے کی اس حالت کی وجہ سے بھی بشریٰ کو وہاں نہ رکھا گیا ہو۔ باذل خود کافی عرصے سے غائب تھا۔ ایسے میں بھی یہاں سرگرمیاں

معتدل ہوں گی اور اس کے آدمیوں نے تہ خانے کی طرف توجہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی ہوگی۔

”لالہ.....! ادھر اس ساتھ والے کمرے میں اسلحے اور بارود کا ڈھیر جمع ہے۔“ وہ ابھی قیدیوں کو رکھے جانے والے کمرے میں ہی کھڑے تھے کہ تہ خانے کے دوسرے حصوں کا جائزہ لینے کے لیے نکل جانے والے ان کے ساتھیوں میں سے ایک نے آکر پُر جوش سنجے میں اطلاع دی۔ وہ لوگ اطلاع سن کر تیزی سے باہر نکلے۔ مذکورہ کمرے کا تالا توڑا گیا اور اطلاع کے مطابق واقعی اس میں اسلحے اور بارود سے بھری پیٹیاں رکھی ہوئی تھیں۔ دو دیواروں کے ساتھ ان پیٹیوں کی مکمل قطاریں موجود تھیں جبکہ ایک دیوار کے ساتھ گنتی کی چند ہی پیٹیاں موجود تھیں جس کو دیکھ کر یہی اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اس دیوار کے ساتھ رکھی گئی باقی پیٹیاں کہیں اور منتقل کر دی گئی ہیں۔

”یہ سارے کا سارا ممنوعہ اسلحہ ہے۔“ چند پیٹیوں کا جائزہ لے کر لالہ نے انکشاف کیا۔

”اتنا قیمتی اور حساس مال چھوڑ کر وہ لوگ یہاں سے چلے کیسے گئے؟“ وکی نے سوال اٹھایا۔

”شاید مصیبت بہت بڑی تھی یا پھر انہیں اعتماد ہوگا کہ کوئی اس ذخیرے کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔“ اس بار جواب جارو کی طرف سے آیا۔

”یہی تو سمجھ نہیں آ رہا کہ آخر مسئلہ کیا ہے؟ باذل کا ہمارے سوا ایسا کون سا دشمن ہے جس سے وہ اس حد تک خائف تھا کہ مقابلے کے لیے رکنے کے بجائے فرار کو مناسب سمجھا۔“ وکی الجھا۔

”ادھر قیدیوں والے کمرے کے ساتھ جو باتھ روم ہے، اس کی دیوار ٹوٹی ہوئی ہے اور وہاں ایک سرنگ نما راستہ دکھائی دے رہا ہے۔“ ابھی کوئی اس کے سوال کا جواب نہیں ڈھونڈ پایا تھا کہ دوسرا بندہ اس اطلاع کے ساتھ چلا آیا۔ وہ سب اس طرف دوڑے اور سرنگ دیکھ کر دنگ رہ گئے۔

”یہ سرنگ بنانے کا کیا مقصد تھا؟“

”شاید وقت ضرورت فرار کے خفیہ راستے کے طور پر یا پھر اس اسلحے کی آمد و رفت کے لیے جسے ہم ابھی دیکھ کر آ رہے ہیں۔“ وکی نے اندازہ لگایا پھر لالہ کی طرف اجازت طلب کرنے والے انداز میں دیکھتے ہوئے بولا۔

”میرے خیال میں، میں اور جارو جا کر اس سرنگ کا جائزہ لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ یہ کہاں نکلتی ہے۔“ لیکن.....! لالہ تھوڑا احتدب نظر آیا۔

”ہوسکتا ہے دوسری طرف پہنچ کر ہمیں باذل کے بارے میں کھوج لگانے میں بھی مدد مل جائے۔“ وکی نے اسے قائل کرنے کے لیے کہا اور پھر باقاعدہ جواب کا انتظار کیے بغیر جار کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

”احتیاط سے۔“ لالہ خود کو ہدایت دینے سے نہ روک سکا۔ دن رات خطروں کا سامنا کرنے کا عادی ہونے کے باوجود وہ وکی کے معاملے میں دن بہ دن حساس ہوتا جا رہا تھا۔ بھتیجا ہونے کی حیثیت سے وہ پہلے بھی اسے عزیز تھا لیکن جب سے اس کی فیملی بنی تھی، اسے زیادہ فکر رہنے لگی تھی کہ وکی پر کوئی آنچ نہ آئے اور وہ اپنی بیوی بچے کے ساتھ ایک پرسکون زندگی گزار سکے۔

”میں خیال رکھوں گا۔“ وکی اس کے اندیشوں کو سمجھتے ہوئے دھیرے سے مسکرایا اور جار کو ساتھ آنے کا اشارہ کرتے ہوئے ٹوٹی ہوئی دیوار سے گزر کر سرنگ میں داخل ہو گیا۔ باقی لوگ پیچھے ہٹ گئے کہ وہاں جو ناقابل برداشت بو پھیلی ہوئی تھی، اس کی موجودگی میں اتنی دیر کھڑے رہنا بھی بڑے دل گردے کا کام تھا۔ گسندگی کی اس بو کو عالم شاہ اور سرمہ نے بھی سہا تھا لیکن اس وقت ان کے پاس اپنی زندگیاں بچانے کے لیے یہاں سے فرار کا یہی واحد آپشن تھا اس لیے انہوں نے سب کچھ سہہ لیا تھا۔

”یہاں گھٹن بالکل نہیں ہے۔ لگتا ہے اس سرنگ کو بہت پلاننگ سے بنایا گیا ہے۔“ ادھر کشادہ سرنگ میں وکی کے ساتھ آگے بڑھتا جار داس سے مخاطب تھا۔

”ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مجھے لگتا ہے انہوں نے یہ سرنگ لمبے عرصے استعمال کے خیال سے بنائی ہے۔ اسلحے کے ذخیرے اور اپنی دیگر غیر قانونی سرگرمیوں کے لیے یہ ان کا ایک محفوظ ٹھکانا ہوگا۔ اول تو اس قسم کی ہاؤسنگ سوسائٹی کے پربلیکس مکمل ہونے اور آباد ہونے میں ہی برسوں لے لیتے ہیں اس لیے اس عرصے میں ان کا کام بہ آسانی چلا رہتا۔ آبادی ہو جانے کے بعد بھی یہ لوگ بظاہر شریف بن کر رہ لیتے اور غیر قانونی سرگرمیوں کے لیے سرنگ کا استعمال کرتے رہتے۔“ وکی نے تجزیہ کیا۔

”لیکن جس طرح یہ لوگ اپنے اسلحے کا ذخیرہ بغیر کسی حفاظتی انتظام کے چھوڑ کر چلے گئے ہیں، اس پر میں حیران ہوں۔ اتنا قیمتی مال اس طرح کون چھوڑ کر جاتا ہے۔“ جارو نے نکتہ اٹھایا۔

”اسی سے تو اندازہ ہو رہا ہے کہ وہ بہت عجلت میں یہاں سے گئے ہیں۔ ہمارے بارے میں تو انہیں گمان بھی

نہیں ہوگا کہ ہم یہاں پہنچ سکتے ہیں۔ ہوسکتا ہے جن کی آمد کا اندیشہ ہو، ان سے صرف اپنی جان کا خطرہ ہو اور اسلحے وغیرہ کی انہیں کوئی پروا نہ ہو۔“ وکی نے ایک اور بہترین اندازہ لگایا۔ اس گفتگو کے دوران وہ پوری سرنگ پار کر چکے تھے اور سامنے سپاٹ دیوار آ جانے پر ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے کہ اس سے آگے کہاں جائیں۔

”یقیناً یہاں سے باہر نکلنے کا کوئی خفیہ راستہ ہوگا۔“ وکی نے کہا اور ہاتھ سے دیوار کو ٹٹولنے لگا۔ ابھی اسے یہ عمل کرتے چند سیکنڈ ہی گزرے تھے کہ جارو نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ایسا کرنے سے روک دیا اور سرگوشی میں بولا۔

”مجھے اوپر کچھ لوگوں کے چلنے پھرنے اور بولنے کی آوازیں آرہی ہیں۔ ذرا سا صبر سے کام لو اور مجھے توجہ سے سننے دو۔“ اس کی اس ہدایت پر وکی نے دم سادھ لیا اور سرنگ کی اختتامی دیوار کے ساتھ پشت ٹکا کر کھڑا ہو گیا۔ جارو نے اپنی پوری توجہ آوازوں پر مرکوز کر لی۔ کچھ دیر وہ آوازیں سناتا رہا پھر جوش بھری سرگوشی میں بولا۔

”کچھ لوگ نیچے آرہے ہیں۔“

”ٹھیک ہے، ہم ان سے نمٹ لیں گے۔“ وکی نے اپنی گن کو تھپکی دی۔

”نہیں، لالہ کو اطلاع دو۔ وہ اسلحے والے کمرے میں جائیں گے جہاں انہیں آسانی سے گھیرا جاسکتا ہے۔“ جارو نے مشورہ دیا جو وکی کو مناسب لگا اور جلدی سے لالہ سے رابطہ کر کے اسے مختصر حالات سے آگاہ کیا۔ ابھی وہ اس کام سے فارغ ہی ہوا تھا کہ اوپر سے ہلکی سی سرسراہٹ سنائی دی۔ دونوں نے ہی بیک وقت سر اٹھا کر اوپر دیکھا تو سرنگ کی چھت کا اوپری حصہ کسی لفٹ کی طرح حرکت کر کے نیچے آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ دونوں تیزی سے سرنگ کے کونوں میں سمٹ گئے اور اس لفٹ کو نیچے آتا ہوا دیکھتے رہے۔ لفٹ جیسے جیسے نیچے آرہی تھی، آوازیں بھی سنائی دینے لگی تھیں۔ کوئی کہہ رہا تھا۔

”تیزی سے کام نمٹانا ہے۔ دیر ہونے کی صورت میں باذل صاحب کے غصے کا تم لوگوں کو پتا ہی ہے۔“

”ہم کوشش کریں گے سر! لیکن آپ یہ بھی تو دیکھیں کہ ہم صرف تین ہی بندے ہیں۔“ اب وہ لفٹ نمٹنے پر تیزی سے نیچے آچکی تھی اور ساتھ ہی بولنے والے بھی نیچے آگئے تھے۔ ان کی ساری توجہ آگے کی طرف تھی اس لیے انہوں نے پچھلی دیوار کے کونوں میں دبکے وکی اور جارو کی موجودگی کو محسوس نہیں کیا تھا اور اپنی ہی گفتگو میں مصروف تھے۔

”بندوں کی کمی نہیں لیکن تم جانتے ہو کہ اعتماد کے بندے گنتی کے ہی ہیں اور اس وقت ان بندوں میں بس تم تینوں ہی دستیاب ہو۔ تم جتنی جلدی ممکن ہو، کام نمٹاؤ۔ میں باذل صاحب سے سفارش کر کے تمہیں اسپیشل انعام دلواؤں گا۔“ انہوں نے تین مضبوط کاٹھی کے افراد کے ساتھ آگے بڑھنے والے سوئٹ بویٹ شخص کو بولتے سنا۔ لفٹ انہوں نے واپس نہیں بھجوائی تھی جس سے ظاہر تھا کہ وہ عجلت کا شکار ہیں۔ وکی نے اس بار پیغام ٹائپ کر کے لالہ کو بھیج کر ان کے بارے میں آگاہ کیا۔ کچھ دیر بعد وہ اور جار واپس جگہ دیکھے ان لوگوں کے دور نکل جانے کا انتظار کرتے رہے پھر جب نظروں کی حد سے آگے نکل گئے تو دونوں احتیاط سے لفٹ کی طرف بڑھ گئے۔ یہ عام لفٹ سے مختلف ایک کتابوں کی الماری سے ملتی جلتی شے تھی جس میں تختے اس طرح جوڑے گئے تھے کہ سیزھیاں سی بن گئی تھیں۔ وہ ان سیزھیوں کو چڑھ کر اوپر پہنچے تو سامنے ایک اسٹور نما بڑا سا کمرہ تھا جس کا دروازہ اس وقت اندر سے بند تھا۔ وکی نے دروازہ کھول کر معمولی سی جھری پیدا کی اور باہر کا جائزہ لینے لگا۔ وسیع و عریض عمارت کی ساخت اور ماحول کے ساتھ مشینیں چلنے کی آوازیں نے اسے بتایا کہ وہ کسی مل وغیرہ میں موجود ہیں۔

”یہ تو کوئی مل لگتی ہے۔“ اس نے سامان کا جائزہ لیتے جار کو مخاطب کیا۔

”ایسا ہی ہے۔ میں مشینیں چلنے کی آوازیں سن سکتا ہوں۔ لو، یہ بھی دیکھو۔“ جارو نے کپڑے کا ایک رول کھینچ کر سامنے کیا۔ وہ رجبیکوڈ کپڑا لگتا تھا لیکن بہر حال اس کے کنارے پر اسٹیمپ موجود تھی۔

”یہ تو عرفان اللہ کی مل ہے۔“ وکی نے نام پڑھ کر کہا۔ اسی وقت لالہ کی کال آنے لگی۔

”کہاں رہ گئے ہو تم دونوں۔ ہم نے ان لوگوں کو قابو کر لیا ہے اور اب یہاں سے نکلنے لگے ہیں۔“

”ہم بس آرہے ہیں۔“ وکی نے عجلت میں جواب دیا اور جارو کے ساتھ واپسی کے راستے پر چل پڑا۔ واپسی میں انہیں باتھ روم کی اس ٹوٹی دیوار والے راستے کو استعمال نہیں کرنا پڑا کیونکہ ایک دوسرا راستہ پہلے ہی کھلا ہوا تھا اور اس راستے پر اصغر ان کا خطر کھڑا تھا۔

”جلدی آجاؤ۔ باقی سب گاڑیوں میں بیٹھ چکے ہیں۔“ اصغر انہیں دیکھتے ہی بولا۔ وہ دونوں اس کے پیچھے کھلے راستے سے اندر داخل ہوئے تو سامنے وہی کمرہ تھا

جہاں اسلحہ ذخیرہ کیا گیا تھا۔ اس کمرے کے فرش پر انہوں نے تینوں مزدور ٹائپ کے آدمیوں کو بیہوش پڑا دیکھا۔ پینٹ کوٹ والا البتہ غائب تھا۔ یعنی لالہ نے ساتھ لے جانے کے لیے اس کا انتخاب کیا تھا۔ وہ لوگ باہر آ کر گاڑی میں بیٹھے تو معلوم ہوا کہ لالہ نے اپنے دو آدمیوں کو وہیں چھوڑ کر جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ وہ دونوں سامنے والی زیر تعمیر عمارت میں رہ کر خاموشی سے نگرانی کا کام کرتے اور کوئی وہاں آتا تو رپورٹ کر دیتے۔

وہ لوگ بیہوش قیدی کے ساتھ اپنے ٹھکانے پر پہنچے تو اس کی جامہ تلاشی لے کر فون اور والٹ سمیت سب چیزیں اپنے قبضے میں لے لیں اور اسے دسیوں سے باندھ کر ہوش میں لے آئے۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ کچھ دیر تو نا سمجھی کی کیفیت میں ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر کچھ دیر بعد اس کے چہرے پر خوف کے تاثرات دکھائی دینے لگے۔ یقیناً اسے وہ صورت حال یاد آگئی تھی جس میں اسے بیہوش کر کے یہاں لایا گیا تھا۔

”کک..... کون ہو تم لوگ؟“

”ہم موت کے فرشتے ہیں۔ اس سے آگے ہمارا تعارف مانگنے کے بجائے فر فر اپنے بارے میں بتانا شروع کر دو۔“ وکی اس کے سر پر سوار ہو کر خوفناک لہجے میں بولا۔

”مم..... میں نذر ہوں..... نذر حسین!“ اس نے کچھ ڈرے ڈرے انداز میں بتایا۔ سرنگ میں وہ اپنے ساتھ موجود تینوں افراد سے جس بارعب انداز میں بات کر رہا تھا اس وقت اس کی جھلک بھی نہیں دکھائی دے رہی تھی۔

”عرفان اللہ اور باذل سے کیا تعلق ہے تمہارا؟“

”میں عرفان اللہ صاحب کی ٹیکسٹائل مل میں منیجر ہوں۔ باذل صاحب ان کے رائٹ وینڈ ہیں تو ان سے بھی واسطہ پڑتا رہتا ہے۔“ اس نے جواب دیا لیکن لہجہ اب بھی سہا ہوا ہی تھا۔

”صرف واسطہ پڑتا ہے یا اس کے حکم پر ہر قانونی اور غیر قانونی کام کرنے کے لیے تیار رہتے ہو؟“ وکی نے طنزیہ لہجے میں پوچھا جس پر اس کی نظریں جھک گئیں۔

”عورتوں کی طرح ادا میں دکھانے کے بجائے منہ سے جواب دو۔“ وکی نے اس کے بازو کو جھٹکا دیا۔

”کیا جواب دوں۔ تنخواہ دار ملازم ہوں، جو بھی حکم ملے، اس پر عمل کرنا پڑتا ہے۔“ اس نے ہلکے سے کراہتے ہوئے جواب دیا۔

”تنخواہ دار ملازم اگر غیر قانونی اسلحے کی دیکھ بھال اور

نقل و حمل کے دوران پکڑا جائے تو اس کو چھوٹ نہیں مل جاتی ہے۔ کچھ اندازہ ہے کہ انہیں اگر اس کیس میں گرفتار ہو گئے تو لمبے عرصے کے لیے جیل کی سلاخوں کے پیچھے سڑد گئے۔

”آپ لوگ پولیس والے ہو؟“

”میں اپنا تعارف کروا چکا ہوں کہ ہم موت کے فرشتے ہیں۔ اگر تم نے میرے سوالوں کا جواب دینے کے بجائے خود سوال جواب کرنے میں زیادہ انٹرسٹ لیا تو تمہاری زندگی موت کا فیصلہ بھی ابھی کے ابھی ہو سکتا ہے۔“

وکی نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ کم از کم ان لوگوں میں سے نہیں ہے جو خود جرم کی دنیا میں اتر کر ہر طرح کے حالات کو فیس کرتے ہیں۔ وہ ایک قدرے بزدل شخص محسوس ہوتا تھا جس کے منہ سے ادا ہونے والے اگلے الفاظ نے اس اندازے کی تائید بھی کر دی۔

”پلیز سرائی مجھ پر رحم کریں۔ میں سچ سچ صرف ایک معمولی ملازم ہوں جسے اپنی نوکری بچانے کے لیے طے لٹنے والے ہر حکم کی تعمیل کرنی پڑتی ہے۔“ اس نے ذہنی طور پر انہیں سرکاری آدمی تسلیم کر لیا تھا اس لیے اس لب و لہجے میں بات کر رہا تھا۔

”اسلمے کے کام میں کون ملوث ہے..... ہاذل یا عرفان اللہ؟“

”عرفان اللہ صاحب نے کبھی خود کوئی حکم نہیں دیا۔ ہمیشہ ہاذل ہی آرڈر دیتا ہے لیکن عرفان اللہ صاحب کا حکم ہے کہ ہر آرڈر پورا کیا جائے۔ ایک آدمہ ہار میں نے اشارے کنائے میں انہیں آگاہ کرنے کی کوشش بھی کی لیکن انہوں نے کوئی توجہ ہی نہیں دی تو مجھے خاموشی اختیار کرنا پڑی۔“ وہ خود کو بچانے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔

”اب بھی تم ہاذل کے کہنے پر اسلمہ شفٹ کروانے آئے تھے؟“ وکی تنہا سوال جواب کر رہا تھا اور باقی لوگ دوسرے کمرے میں بیٹھے اس گفتگو کو سن رہے تھے۔

”جی، ایسا ہی ہے۔“ اس نے فوراً تسلیم کر لیا۔ اسلمے سے لاطعلقی ظاہر کرنا اس کے لیے ممکن بھی نہیں تھا کہ وہ سرنگ سے اسلمے کے ذخیرے تک پہنچتا رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔ اب اس کے لیے سب سے بہترین حل یہی تھا کہ وہ سارا ملبا ہاذل پر ڈال دے اور خود کو بچالے۔ اس نے تو یہ بھی نوبت نہیں آنے دی تھی کہ جواب دینے میں آنا کافی کر کے خود کو تشدد کا شکار بنوائے۔

”اسلمہ، مل کے اسٹور روم میں مستقل تو نہیں رکھا جاسکتا تھا۔ یقیناً وہاں سے کہیں اور شفٹ کیا جاتا تھا۔ کیا تم

جانتے ہو کہ کہاں؟“

”یہ تو مجھے نہیں معلوم۔ ہاذل نے مجھ سے کہا تھا کہ سارا مال اسٹور روم میں شفٹ ہونے کے بعد میرا اطلاع کر دوں۔ آگے میرا خود سارا انتظام کر لے گا۔“

”یہ میرا کون ہے؟“

”ہاذل کے خاص آدمیوں میں سے ہے۔“

”کیا وہ جانتا ہوگا کہ ہاذل کہاں ہے؟“

”میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ ویسے ہاذل شہر میں ہوتا اکثر اپنی رکھیل مہناز کے اپارٹمنٹ پر رات گزارتا ہے یا پھر مس سیکسی کے ساتھ۔“

”یہ مس سیکسی کون ہے؟“ مہناز کے بارے میں تو وکی جانتا تھا کہ وہ اسپتال میں ہے اس لیے فوراً سامنے آنے والے دوسرے نام کو پکڑا۔

”ایک ناکام ماڈل گرل جو ہاذل جیسے پیسے بنانے والوں کو ادا نہیں دکھا کر مال بناتی ہے۔“ وہ اس حقیقت کو چھپا گیا کہ ہاذل سے مس سیکسی کو متعارف کروانے والا وہ خود تھا کیونکہ ہاذل جیسی بلا کے عتاب سے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے اسے یہی ایک راستہ دکھائی دیتا تھا۔

”مس سیکسی کا ایڈریس بتاؤ۔“ ابھی اس نے سوال کیا ہی تھا کہ برابر والے کمرے سے موبائل کی رنگ ٹون سنائی دی جسے سن کر نذر بے چین ہو گیا۔

”یہ تو میرا موبائل بج رہا ہے۔“ ابھی اس کے الفاظ منہ میں ہی تھے کہ جارج موبائل لے کر وہاں چلا آیا۔ اسکرین پر ”عرفان اللہ کالنگ“ کے الفاظ جھلک رہے تھے۔ وکی کے موبائل تھامتے ہی موبائل بجنا بند ہو گیا۔

”عرفان اللہ کی کال تھی۔“ اس نے نذر کو آگاہ کیا۔

”وہ بہت کم مجھے کال کرتے ہیں۔ پتا نہیں اس وقت کیوں کر رہے تھے۔“ وہ تشویش میں مبتلا ہوا۔

”کال بیک کر کے معلوم کر لو لیکن خبردار جو اسے ہمارے ہارے میں کوئی ہینک بھی پڑنے دی۔ کسی کو تمہاری مدد کے لیے یہاں پہنچنے میں بہت وقت لگے گا لیکن تم یہاں سے عالم بالا کا سفر ایک منٹ میں طے کر لو گے۔“ وکی نے مشورہ دینے کے ساتھ ساتھ اسے دھمکا یا بھی۔ دھمکی سن کر اس کے چہرے کی رنگت زرد پڑ گئی اور کچھ کہنے کے لیے ہونٹ نیم دا ہوئے لیکن اسی وقت دوبارہ موبائل بجنے لگا۔ اب بھی عرفان اللہ ہی کال کر رہا تھا۔ وکی نے کال ریسیو کی اور اسپیکر آن کر کے فون اس کے کان سے لگا دیا۔

”ہے... لو!“ اس کے منہ سے ٹوٹ ٹوٹ کر بڑی

مشکل سے الفاظ نکلے۔

”کہاں ہو تم، میرا فون کیوں نہیں اٹھا رہے تھے؟“
عرفان اللہ اس کی آواز سن کر دھاڑا۔

”مم..... میں واش روم میں تھا سر!“ اس نے بہانہ بنایا۔
”واش روم کے بچے..... تم اپنے دفتر میں کیوں نہیں ہو؟“ عرفان اللہ غرایا۔ یقیناً اسے کسی سے اطلاع مل گئی تھی کہ وہ اسٹور روم میں جانے کے بعد غائب ہے۔

”مم..... میں باذل صاحب کا کام کر رہا ہوں سر! انہوں نے مجھے مال اوپر شفٹ کروانے کا حکم دیا ہے۔“
عرفان اللہ کی ایک ہی دھاڑ سن کر اس نے سچ اگل دیا جس پر وکی کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔

”مال اوپر شفٹ کروانے کے بعد آگے کے لیے کیا حکم دیا ہے اس نے؟“ عرفان اللہ کا لہجہ اس بار قدرے نرم تھا۔ وکی نے سرگوشی میں جنبش دیتے ہوئے نذر کو سچ نہ بتانے کا اشارہ کیا۔

”ابھی کچھ نہیں کہا سر! کہہ رہے تھے پہلے مال اوپر شفٹ کروالو پھر بعد میں آگے کا پروگرام بتاؤں گا۔“ اس نے اشارہ سمجھتے ہوئے عرفان اللہ کے سامنے بہانہ بنا دیا۔

”اس کا جو بھی پروگرام ہو، مجھے ضرور آگاہ کرنا اور ہاں..... اسے پتا نہیں چلنا چاہیے کہ میں نے تمہیں ایسا کچھ کرنے کا حکم دیا ہے۔“

”جیسی آپ کی مرضی سر!“ اس نے جواباً فرمانبرداری کا مظاہرہ کیا۔

”میری مرضی پر چلنے میں ہی تمہاری بھلائی ہے ورنہ یاد رکھنا کہ مالک وہ نہیں، میں ہوں۔“ اس کی فرمانبرداری کے باوجود عرفان اللہ نے اسے تڑی لگانا ضروری سمجھا۔

”میں سمجھ گیا سر!“ اس نے تھوک نکل کر اپنا حلق تر کیا۔ ہاتھ کھلے ہوتے تو شاید ماتھے پر پھوٹنے والا پسینا بھی صاف کرتا۔ دوسری طرف سے عرفان اللہ نے سلسلہ منقطع کر کے اس کی مشکل آسان کر دی۔ وکی نے موبائل اس کے کان سے ہٹا لیا۔

”تم عرفان اللہ کے حکم پر کچھ حیران اور پریشان دکھائی دے رہے ہو؟“ وکی نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے نکال گایا۔

”بات ہی ایسی ہے۔ عرفان اللہ صاحب، باذل کو اپنے سگے بیٹے سلطان پر ترجیح دیتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ سلطان لاہالی لڑکا ہے۔ میں اسے خرچے پانی کی تنگی نہیں ہونے دیتا لیکن یاد رکھنا کہ انتظامی امور میں اس کا کوئی حکم

میری یا باذل کی رائے لیے بغیر ہرگز نہیں ماننا۔ باذل کے لیے ایسا کوئی حکم پہلے کبھی انہوں نے نہیں دیا۔“ اس نے وجہ بتانے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا۔

”وقت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ بہر حال..... فی الحال تو تم آرام کرو۔ میں دیکھتا ہوں کہ تمہارے بارے میں کیا فیصلہ ہوا ہے۔“ وکی اس کا شانہ تھپک کر دروازے کی طرف بڑھا۔
”پلیز، مجھے چھوڑ دو۔ میں نے کچھ نہیں کیا ہے اور تمہیں ہر بات سچ سچ بتادی ہے۔“ پیچھے سے نذر اسے آوازیں دینے لگا لیکن وہ سنی ان سنی کر کے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

”معاذ بھائی!“ نیلی نے اسے دیکھا تو اس کی طرف لپکی۔ اگرچہ وکی نے مکمل تصدیق کر کے اسے اور اعظم کو آنے والوں کے ساتھ روانہ کیا تھا اور ان لوگوں کا اس کے ساتھ سلوک بھی بہت احترام اور عزت والا تھا، اس کے باوجود وہ اجنبیوں میں خود کو غیر آرام دہ محسوس کر رہی تھی اور معاذ کو دیکھتے ہی بڑی بے قراری سے اس کے قریب آئی تھی۔

”کیسی ہو نیلی! یہاں آنے میں کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟“ معاذ نے اس کی کیفیت کو محسوس کیا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے شفقت سے پوچھا۔ اس پل اسے بے ساختہ ہی اپنی زندگی کا وہ دور یاد آیا جب وہ اپنی افتاد طبع کے ہاتھوں مجبور ہو کر آئے دن نئے تجربات کرتا تھا اور ابو سے اپنے اس لاابالی پن پر باتیں سنتا تھا۔ بے فکری اور لاابالی پن کا وہ دور بڑی جلدی گزر گیا تھا اور وقت ایسے مقام پر لے آیا تھا کہ اب اسے خود بڑا بنتا پڑتا تھا۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں اور پریشانی بھی کوئی نہیں پھر بھی مجھے یہاں کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔ سارے اجنبی لوگ ہیں۔“ نیلی نے اپنا مسئلہ بیان کیا۔

”مجھے اسی لیے تم سے ملاقات کے لیے بھیجا گیا ہے۔“ معاذ ایک بار پھر مسکرایا اور اس کی گود میں موجود اعظم کے رخسار کو نرمی سے چھوا۔ اس کے اس دوستانہ لمس کو اعظم نے خوشی سے قبول کیا اور اس کی انگلیاں اپنی ٹٹھی میں جکڑ لیں۔

”لیکن آپ یہاں آئے کیسے؟ آپ کو تو.....“ نیلی کو یاد آ گیا کہ وہ اعظم سمیت لالہ کے ٹھکانے پر پہنچی تھی تو وہاں سب کو معاذ کے لیے پریشان پایا تھا۔

”سمجھو اللہ نے غیبی مدد بھیج کر سب بگڑے معاملات سنبھال لیے۔ اب تم اعظم کے ساتھ بیٹنگ پہنچ جاؤ تو میں مکمل پرسکون ہو جاؤں گا۔“ اس نے تفصیل میں جانے کے بجائے اس کے ادھر سے سوال کا مختصر جواب دیا۔

خواہش کی تھی، یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ نہا فرشتہ اس کی طرف مائل نہ ہو۔

”کہو، خالہ امی! ہم طوطا چشم نہیں ہیں۔ بس آپ کی صحت کا خیال ہے کہ آپ ہمیں گود میں لیے لیے تھک گئی ہوں گی۔ اب ایسا کریں کہ آپ کچھ دیر آرام کر لیں۔ ہم اتنے میں لان دیکھ کر آتے ہیں۔“ اعظم کی جگہ جواب دینے کی ذمہ داری اس نے نبھائی اور اسے اٹھا کر ہستا ہوا باہر نکل گیا۔

اعظم باہر لان میں آ کر کھل اٹھا اور گود سے اترنے کے لیے مچنے لگا۔ معاذ نے اسے گھاس پر چھوڑ دیا۔ نرم مٹلیں گھاس پر دوڑتا بھاگتا وہ کھلا جا رہا تھا اور اسے خوش دیکھ کر معاذ سوچ رہا تھا کہ ان چہکاروں کی اس وقت سب سے زیادہ اس کی ماں کو ضرورت ہے۔ ہو سکتا ہے یہ موہنی صورت، یہ چمکتی آواز، یہ شوخ ہنسی اسے موت کے منہ سے واپس کھینچ لائے اور وہ جو ہر لمحہ اپنی بیماری سے ہار رہی جا رہی ہے، موت کو شکست دے کر واپس زندگی کی طرف لوٹ آئے۔ کاش ایسا ہو جائے۔

”ایسا ہو جائے تو بھی تمہیں کیا حاصل ہوگا۔ چلو حاصل کی بات چھوڑو، یہ بتاؤ کہ تم اسے کیا دے سکو گے؟ تم بس بستر مرگ پر نہیں لیٹے ہو ورنہ تو موت ہر لمحہ تمہارے تعاقب میں ہے۔ شالوں پر ایسی نئی ذمے داریوں کا بار آچکا ہے کہ کسی کے سنگ زندگی جینے کا خواب دیکھنے کی بھی گنجائش نہیں۔“ خواہش کے آگے بہت سے سوال اور حقائق تھے جو خواہش کا گلا گھونٹ دیتے تھے۔

”میری محبت حاصل اور لا حاصل کی بحث سے آزاد ہے۔ میرے لیے بس اتنا ہی کافی ہے کہ وہ زندہ رہے اور اپنے بچے کے ساتھ زندگی کی بہت سی خوشیاں دیکھے۔“ اس کی شفاف محبت نے بہت دیر تک دل و دماغ کو جنگ کی کیفیت میں نہ رہنے دیا اور ایک دو ٹوک جواب سے سارے دماغوں اور اندیشوں کو دور دھکیل دیا۔ دل و دماغ پر انگدگی سے لکھے تو وہ دوبارہ اعظم کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ بھاگتے بھاگتے ایک جمولے کے پاس جا کر رک گیا تھا اور اسے مخاطب کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ معاذ اس کے قریب گیا تو اس نے اشارے سے سمجھایا کہ وہ اس جمولے پر بیٹھنا چاہتا ہے۔ معاذ نے اسے گود میں اٹھا کر نرمی سے چوما اور جمولے پر بٹھا کر آہستہ آہستہ جھلانے لگا۔ اچھا خاصا وقت اعظم کی سنگت میں گزر گیا۔ جب اسے محسوس ہوا کہ اب وہ تھک چکا ہے تو واپس اندر لے گیا۔ نیلی ان کی منتظر تھی۔

”سب لوگ آپ کے لیے بہت پریشان تھے اور مسلسل فکر مندی کا اظہار کر رہے تھے کہ میڈم ایکس جانے آپ کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ سچ پوچھیں تو میں خود اندر ہی اندر نادام ہو رہی تھی کہ آپ کی بات مان کر میں نے کوئی غلطی تو نہیں کر دی۔“

”انسان کی نیت اچھی ہو تو اللہ تعالیٰ غلطیوں کو بھی سدھار دیتا ہے۔ اس وقت ہمارے ساتھ یہی معاملہ ہوا ہے۔ اللہ نے ہماری بگڑی بنا دی ہے۔“ وہ بہت پرسکون تھا۔

”ہم بیچنگ کب روانہ ہوں گے؟“ اس کے اتنے اطمینان نے نیلی کی بھی تسلی کر دائی اور اس نے آگے کے پردگراں کے متعلق پوچھا۔

”ہو سکتا ہے کچھ دن لگ جائیں لیکن جتنی جلدی ممکن ہو، یہ کام ہو جائے گا۔ سفر کو محفوظ اور خفیہ رکھنے کے لیے ضروری اقدامات لازم ہیں۔ ممکن ہے تمہارے حلیے میں تھوڑی بہت تبدیلی کی جائے، نئے شناختی اور سفری کاغذات بھی تیار ہونے ہوں گے۔ مجھے بہت زیادہ تفصیلات تو معلوم نہیں ہیں لیکن اتنا اندازہ تو ہے کہ جس انداز میں تمہیں اور اعظم کو وہاں پہنچانے کی کوشش کی جا رہی ہے، اس کے لیے خصوصی انتظامات ضروری ہیں۔“ وہ اس کے ساتھ گفتگو کرنے کے ساتھ ساتھ مسلسل اعظم کے ساتھ بھی لگا ہوا تھا اور اعظم اس کی چھپر چھاڑ پر خوشگوار رد عمل دے رہا تھا۔

”سبیل کی فیملی بھی تو اس سے ملنے جانے والی تھی۔“ نیلی کو یاد آیا۔

”ہاں، وہ لوگ بھی جائیں گے لیکن انہیں تم سے الگ اور مختلف طور پر سفر کرنا ہوگا۔ ہو سکتا ہے وہ یہاں سے پہلے دہلی یا شارجہ وغیرہ جائیں پھر وہاں سے چین کا سفر کریں۔“ اس نے نیلی کے سوال کا جواب دیا اور پھر بے ساختہ ہی اعظم کی طرف دونوں ہاتھ پھیلاتا ہوا بولا۔

”لاؤ، اسے میری گود میں دے دو۔ میں کچھ دیر کے لیے اسے لان میں لے جاتا ہوں۔“ جواباً نیلی نے اسے بتانا چاہا کہ اعظم اس کے پاس سے بہ مشکل ہی کسی کی گود میں جاتا ہے لیکن اگلا ہل اس کے لیے حیران کن تھا۔ اعظم اس کی گود سے نکل کر معاذ کی پھلی ہوئی بانہوں میں جانے کے لیے زور لگا رہا تھا۔

”کمال ہے بھی! بہت طوطا چشم ہو تم۔ باہر لان کی سبر کا سن کر فوراً پارٹی بدل لی۔“ وہ ہنس کر بولی اور از خود اعظم کو اس کے حوالے کر دیا۔ جواباً وہ اسے بتا نہیں سکا کہ اس نے جس شدت کی چاہت سے اعظم کو گود میں لینے کی

”لگتا ہے خوب مزے کر کے آرہے ہیں جناب!“
 نیلی نے اعظم کو اپنی ہانہوں میں بھرتے ہوئے اندازہ لگایا۔ اس کے لہجے میں رچی ممتا نے معاذ کو احساس دلایا کہ اعظم محض سبیل کو پیارا نہیں ہے بلکہ اس مظلوم لڑکی کے بھی جینے کا سہارا بن چکا ہے۔

”مزے کیے ہیں اور خامے تھک گئے ہیں صاحبزادے۔ میرے خیال میں تو اب نیند آنے لگی ہیں انہیں۔“ معاذ نے اس کی تائید کرنے کے ساتھ اپنی رائے دی۔
 ”میں اسے فیڈر دے کر سلا دیتی ہوں۔“ نیلی فوراً حرکت میں آئی۔

”ٹھیک ہے۔ میں بھی اب چلتا ہوں۔“ معاذ واپسی کے لیے مڑا لیکن کچھ یاد آنے پر دوبارہ اس کی طرف رخ کیا اور بولا۔

”میں آج کسی وقت یہاں سے چلا جاؤں گا۔ معلوم نہیں دوبارہ ہماری ملاقات ہو یا نہ ہو لیکن تم پریشان نہ ہونا اور جو کچھ یہ لوگ کہیں، اس پر عمل کرتی رہنا۔ اللہ نے چاہا تو جلد تم اور اعظم بہ حفاظت سبیل تک پہنچ جاؤ گے۔“

”آپ بے فکر رہیں۔ آپ کو یہاں دیکھ لینے کے بعد میں ان لوگوں کی طرف سے پوری طرح مطمئن ہو گئی ہوں۔“ نیلی نے اعتماد سے جواب دیا تو وہ بھی مطمئن ہو کر دوبارہ کمرے سے باہر نکلنے کے خیال سے پلٹا۔

”معاذ بھائی!“ اس بار نیلی نے پکار کر اس کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روک لیا۔

”ہاں، بولو۔“ وہ سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا لیکن نیلی کچھ متذبذب دکھائی دے رہی تھی اور ایسا لگ رہا تھا کہ جو کہنا چاہتی ہے اسے کہنے کی ہمت نہیں کر پا رہی۔

”جو بھی کہنا چاہتی ہو، بلا جھجک کہہ ڈالو۔ میں بھی وہی کی طرح ہی تمہارا بھائی ہوں اور بھائی سے بھلا کیسی جھجک۔“ اس نے نیلی کا حوصلہ بڑھایا۔

”سبیل کے لیے کوئی پیغام نہیں دیں گے آپ؟“ نیلی نے اس سے ایک ایسی بات کہی جس کا اسے وہم و گمان بھی نہیں تھا۔

”مجھے بھلا اسے کیا پیغام دینا ہے؟“ آخر خود کو سنہال کر پھیکا سا مسکرایا اور بے نیازی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی۔

”کوئی ایسی بات جو آج تک آپ اس سے کہہ نہ پائے ہوں۔“ نیلی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

بولی۔ جواباً وہ خاموش رہا۔

”ضروری نہیں ہے کہ انسان دل کی بات کہنے کے لیے ہمیشہ وقت اور حالات کے موافق ہونے کا انتظار کرتا رہے۔ کبھی کبھی موافق وقت کے انتظار میں وقت ہاتھ سے ہی نکل جاتا ہے۔“ وہ ذہین لڑکی تھی اور سرکس کی دنیا میں زندگی گزارنے کے باعث انسانوں کو پڑھنے کا ہنر بھی جانتی تھی اس لیے معاذ کی دل کی گلی کو سمجھنے میں اسے زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔

”تم اعظم کو دیکھو۔“ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ نیلی کو کیا جواب دے۔ اعظم نے عین وقت پر رو کر اس کی مشکل آسان کر دی۔ نیلی کو اس کی طرف متوجہ کرنا وہ تیزی سے باہر نکل گیا لیکن اس کی باتیں مسلسل دماغ میں اٹکی ہوئی تھیں۔

”نہیں پیاری لڑکی! میری محبت اظہار کی محتاج نہیں کیونکہ میں مان ہی نہیں سکتا کہ میرے سینے میں پوری شدت سے دہکتی محبت کی آگ کی تپش اس تک نہیں پہنچی ہوگی۔ میرا یقین ہے کہ وہ سب جانتی ہے پھر اظہار کر کے اسے کسی آزار میں کیوں مبتلا کروں۔ وہ جن مجبور یوں میں جکڑی ہے، اس کے پاس میری محبت کا جواب دینے کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ جنہیں چاہا جائے، انہیں آزمائش میں نہیں ڈالا جاتا۔“ وہ نیلی کو براہ راست جو جواب نہیں دے سکا تھا، وہ اب تصور میں دے رہا تھا۔

☆☆☆

”بازل نے جس نمبر سے نذر حسین کو کال کی تھی، وہ مسلسل بند ہے اور ٹریس کرنے پر بھی اس کی لوکیشن شو نہیں ہو رہی۔“

”مطلب وہ خطرے میں ہے اور بہت محتاط ہے۔“ اصغر کی دی ہوئی رپورٹ سن کر وہی نے تبصرہ کیا پھر لالہ کی طرف رخ کر کے بولا۔

”موجودہ صورت حال میں ہمارے پاس دو آپشنز ہیں۔ آپشن نمبر ایک یہ کہ نذر سے میر ونامی اس بندے کو کال کروائیں جس کے بارے میں بازل نے اسے ہدایت دی تھی۔ کال کے بعد یقیناً وہ مال منتقل کرنے کے لیے ٹیکسٹائل مل کا رخ کرے گا جہاں ہم یا تو اسے براہ راست چھاپ کر اس سے بازل کا پتا اٹھا سکتے ہیں یا پھر دوسرا طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ جب وہ مال لے کر جانے لگے تو اس کا تعاقب کریں اور اس کے پیچھے پیچھے بازل تک پہنچ جائیں۔“

”بازل جیسے شخص کا رائٹ ہینڈ سمجھا جانے والا بندہ اتنا ہلکا نہیں ہوگا کہ تھوڑے سے تشدد سے زبان کھول

وہ۔ ایسے لوگ بہت سخت جان ہوتے ہیں اور کبھی کبھی ٹوٹنے میں کئی کئی دن لگا دیتے ہیں۔ وہ منظر سے غائب ہوگا تو باذل جو پہلے ہی بہت چوکنا ہے، چونک جائے گا اور اپنا ٹھکانا بدل لے گا۔ ایسے میں میری زبان کھلوانے کی مشقت بیکار چلی جائے گی۔“

”تو پھر تعاقب کرنا ہی ٹھیک رہے گا۔“ اس نے لالہ کی رائے سن کر دوسرے طریقے کو فائل کیا۔

”لیکن ضروری نہیں ہے کہ وہ مال لے کر سیدھا باذل تک جائے بلکہ زیادہ امکان یہی ہے کہ وہ وہاں نہیں جائے گا اور کسی دوسرے محفوظ مقام پر پھنسل کر دے گا۔ باذل اس وقت بھڑکا ہوا ہے اس لیے اس کی کوشش ہوگی کہ کم سے کم لوگ اس کے قریب آئیں۔“ لالہ نے یہاں بھی کچھ اختلافی نکات اٹھا دیے۔

”تو پھر؟“

”تو پھر یہ کہ تعاقب تو ہوگا ہی ہوگا۔ ہم میری نمبر آبرز رویشن پر ہونے کا بھی فائدہ اٹھائیں گے۔ اسلحے کا معاملہ معمولی نہیں ہے۔ باذل کتنا ہی محتاط رہے، اس سے رابطہ ضرور کرے گا۔ ہم وہاں سے اس تک پہنچنے کی راہ نکالیں گے۔“ لالہ نے تجویز دی۔

”یہ لمبا چکر پڑے گا۔ پتا نہیں اس طرح ہمیں اس تک پہنچنے میں کتنا وقت لگ جائے۔ جتنا زیادہ وقت لگے گا، بشری کے لیے خطرات بڑھتے جائیں گے۔ باذل ویسے ہی جنونی فطرت کا مالک ہے اور اس وقت تو چوٹ بھی کھایا ہوا ہے۔ ہمارے پاس قید میں اس نے جتنی تکلیف اور ذلت اٹھائی ہے، اس سب کا بدلہ بشری سے لینے کی کوشش کرے گا۔“ وہی نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

”کہہ تو، تو ٹھیک رہا ہے لیکن ہمارے پاس کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں ہے۔ تو جانتا ہے کہ موبائل کمپنی کے بندے سے یہ کام لینے کے لیے میں اسے کتنا بھاری معاوضہ دے رہا ہوں اور ایسا اسی لیے ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ بشری تک پہنچنے کا یہ کلیو ہمارے ہاتھ سے نکلے۔“

نذر حسین سے باذل اور میری نمبرز کے نمبرز لینے کے بعد سب سے پہلا کام ان نمبرز کو آبرز رویشن پر لگوانے اور ان کا کال ڈیٹا حاصل کرنے کا ہی کیا گیا تھا جس میں باذل کے نمبر سے تو کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہوا تھا اور اس نمبر سے جو آخری کال کی گئی تھی وہ یزدانی ہاؤسنگ اسکیم کے قریبی ٹاور سے ٹریس ہوئی تھی۔ اس کے بعد سے نمبر کا کوئی اتنا پتا نہیں تھا۔ میری نمبر پر البتہ کئی کالز کا ان کمنگ اور آؤٹ کوٹنگ

ریکارڈ ملا تھا لیکن ان نمبروں میں باذل کا وہ نمبر شامل نہیں تھا جو انہیں نذر سے ملا تھا۔

”میں مس سیدی کو چیک کرنے کے آپشن پر بھی غور کر رہا ہوں۔ نذر کا کہنا ہے کہ باذل کی اس سے دوستی عرفان اللہ کو بھی علم نہیں تھا تو ہو سکتا ہے وہ سیدی کے گھر کو محفوظ ٹھکانا سمجھتے ہوئے وہاں کا رخ کر لے۔“

”جو کر سکتے ہو، ضرور کرو۔ ہم اس وقت معمولی سے معمولی امکان کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔“ لالہ نے اسے اجازت دی پھر بولا۔

”اس نذر کو تو واپس بھجواؤ۔ اگر یہ مل میں نظر نہیں آیا تو وہاں کھلبلی مچ جائے گی۔ عملے کے علاوہ عرفان اللہ، باذل اور میری میں سے کسی کے لیے بھی اس موقع پر اس کا غیاب قابل قبول نہیں ہوگا۔“

”جی، وہ اوز جا رہا ہے روانہ ہونے لگے ہیں۔ جا رہا مال اٹھانے والے مزدور کے روپ میں اس کے آس پاس رہے گا تاکہ عین موقع پر وہ ہمیں دھوکا نہ دے سکے۔“ وہی نے اطلاع دی اور پھر اصغر سے مخاطب ہو کر اس سے پوچھا۔

”جن لوگوں کو ہم یزدانی ہاؤسنگ اسکیم پر چھوڑ کر آئے تھے، ان سے رپورٹ لے رہے ہو؟“

”بالکل لے رہا ہوں شہزادے! لیکن ان کا یہی کہنا ہے کہ وہاں مسلسل ہوکا عالم ہے اور ابھی تک کسی آدم زاد کی شکل دیکھنے کو نہیں ملی۔“

”کسی کو آنا دانا نہیں تھا تو وہ باذل کا بچہ کیوں ایمر جنسی میں بزدل چوہے کی طرح بھاگ نکلا؟“ وہی نے غصہ آمیز جھنجھلاہٹ کا مظاہرہ کیا۔ ظاہر ہے باذل وہاں مل جاتا تو اب تک معاملہ ایک طرف ہو چکا ہوتا اور وہ یوں معمولی سے معمولی امکان کے پیچھے نہ بھاگ رہے ہوتے۔

”ہو سکتا ہے اس کے وہاں سے بھاگ نکلنے کی مغبری ہو گئی ہو۔“ لالہ نے اپنے تجربے کی روشنی میں رائے دی جو وہی کے دل کو لگی لیکن یہ سوال ہنوز اپنی جگہ تھا کہ ان کے علاوہ آخر ایسا کون ہے جس سے باذل بھاگتا پھر رہا ہے۔ یہ سوال اس نے نذر سے بھی کیا تھا لیکن نذر کو کوئی آئیڈیا نہیں تھا۔ لے دے کر عرفان اللہ کے قدرے بدلے ہوئے انداز کی وجہ سے اس پر ہلک جارا تھا لیکن اس نے بھی باذل کے لیے کوئی سخت حکم جاری نہیں کیا تھا۔ بہر حال ان کے پاس اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کا وقت نہیں تھا اس لیے سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے تھے۔ جاتے جاتے لالہ نے نذر سے مس سیدی کا نمبر لے کر اسے بھی

آبزرویشن پر لگوادیا تھا۔ اگر باذل اس سے رابطہ کرتا تو تب بھی انہیں علم ہو جاتا۔ باذل جیسے دشمن تک پہنچنے کے لیے انہیں یہ چوکھی لڑائی لڑنی ہی تھی۔

☆☆☆

وہ اسلحے کے ذخیرے والے کمرے میں پہنچے تو وہاں رسیوں سے بندھے پڑے تینوں افراد نے انہیں دیکھ کر چلنا شروع کر دیا۔ وہ تینوں ہی ہوش میں آچکے تھے لیکن رسیوں میں جکڑے ہاتھوں چروں اور کپڑاٹھنسنے منہ کی وجہ سے مجبور تھے اور اب تک اپنی رہائی کے لیے کچھ نہیں کر سکے تھے۔ نذر حسین کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں امید کی جوت جاگی تھی لیکن جب نذر ان سے نظر چرا کر جادو کے ساتھ کھلے راستے سے سرنگ میں داخل ہو گیا تو پہلے وہ حیران ہوئے پھر پہلے سے زیادہ شدت سے اپنی آزادی کے لیے مچلنے لگے۔ جادو نے ان کے کسی رد عمل کی فکر نہیں کی کہ وہ نگرانی کے لیے وہاں چھوڑے گئے دونوں افراد میں سے ایک کو ان کے سر پر کھڑا کر کے آیا تھا۔ وہ خود کو آزاد کروانے میں کامیاب ہو جاتے تو وہ ان سے نمٹ لیتا۔

”جانے تم لوگ کون ہو اور تمہارے کیا مقاصد ہیں لیکن یہ طے ہے کہ تمہاری وجہ سے میں مارا جاؤں گا۔ عرفان اللہ اور باذل میں سے کوئی بھی مجھے میرے اس جرم کے لیے معاف نہیں کرے گا۔“ نذر اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر تو خاموشی سے آگے بڑھ آیا تھا لیکن اب سرنگ میں جادو کے ساتھ چلتا ہوا اس سے شکوہ کر رہا تھا۔

”تم ہماری نہیں، اپنی وجہ سے مارے جاؤ گے۔ جرائم پیشہ افراد کے آلہ کار بننے وقت تمہیں اپنا یہ انجام ذہن میں رکھنا چاہیے تھا۔“ جادو نے بغیر لگی پٹی کے اسے آئینہ دکھایا۔ ”میں تو اپنی ڈگری کے مطابق ایک سیدھی سادی جاب کر رہا تھا۔ جاب کرتے وقت مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ لوگ بظاہر معزز بزنس مین ہونے کے ساتھ ساتھ جرائم پیشہ بھی ہیں۔“ اس نے یوں منہ بسور کر جواب دیا جیسے نئی بیاہتا لڑکی سسرال کے عیب گنوار ہی ہو۔

”یہ بات تم سے زیادہ عرصے چھپی نہیں رہی ہوگی۔ جب پہلی بار تمہارے سامنے ان کے کردار کی کوئی گنجی آئی تو تم نے اسی وقت ملازمت کیوں نہیں چھوڑ دی؟ اگر تم ایک ایماندار اور محب وطن شہری ہوتے تو آج اس پوزیشن پر نہیں ہوتے کہ وہ تمہیں باقاعدہ اپنے جرائم میں حصہ دار بنا ڈالتے۔ آج اگر یہ سارا سیٹ اپ پکڑا جاتا ہے تو تم خود کو ہرگز بھی نہیں بچا سکو گے۔“ جادو نے اس بار بھی صاف گوئی

کا مظاہرہ کیا جس پر نذر کا منہ بن گیا لیکن پھر چہرے پر مظلومانہ تاثرات سجاتے ہوئے بولا۔

”میرے ماں باپ نے بہت جتنوں سے مجھے ڈگری دلوائی تھی کہ میں اپنی چھ عدد بہنوں کو اچھے جہیز کے ساتھ ان کے گھروں کا کر سکوں۔ میں ایمان داری کے چکر میں پڑ کر نوکری چھوڑتا تو بہنیں گھر بیٹھے بیٹھے بوڑھی ہو جاتیں۔ یہاں مجھے زبان بند رکھنے اور چھوٹی موٹی خدمات کے بدلے اتنی بھاری تنخواہ اور بونس ملتے ہیں کہ دو سال کے عرصے میں چار بہنوں کو دھوم دھام سے بیاہنے کے ساتھ پانچویں کی بہت اچھے گھرانے میں منتقلی کر چکا ہوں۔ ارادہ تھا کہ اس سال کے آخر تک آخری دو کو بیاہنے کے بعد ماں باپ کو اس لڑکی کے گھر رشتے کے لیے لے کر جاؤں گا جو زمانہ طالب علمی سے اس انتظار میں بیٹھی ہے کہ میں اپنی ذمہ داریوں سے فارغ ہوں تو ہم ایک ساتھ زندگی کا سفر شروع کریں۔“

”مطلب تمہاری اب تک شادی نہیں ہوئی؟“ جادو نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ دیکھنے میں کسی طور پینتیس سال سے کم نہیں لگتا تھا۔

”ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ ماں باپ نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ ہم اپنی ساری جمع پونجی تمہاری اچھی تعلیم پر خرچ کر رہے ہیں اس لیے تمہارا فرض بنتا ہے کہ اپنے بارے میں کچھ سوچنے سے پہلے بہنوں کی ذمہ داریوں سے فارغ ہو جانا تاکہ ہمیں یہ فینشن نہ ہو کہ آنے والی تمہیں اپنے قابو میں کر کے بہنوں کے فرض سے غافل کر دے گی۔ اب یہ میری قسمت تھی کہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد کافی عرصے تک کوئی ڈھنگ کی نوکری نہ ملی۔ ایسے میں تم ہی بتاؤ کہ میں ایمان داری دکھانے کے چکر میں بڑی مشکل سے ملنے والی اس اچھی تنخواہ کی نوکری کو کیسے چھوڑتا؟“ اس کے جواب میں پورے سماجی ڈھانچے کا نوحہ تھا۔ جو رسم و رواج برصغیر میں رائج ہیں واقعی ان کے ہوتے ایک سفید پوش گھرانے کے لیے چھ بیٹیوں کو بیاہنا بہت دشوار تھا۔ ایسے میں والدین بیٹے پر سرمایہ کاری کر کے اسے بہنوں کا فریضہ ادا کرنے کے لیے تیار نہ کرتے تو اور کیا کرتے؟ عرفان اللہ یا باذل نے بھی اسے ملازمت پر رکھتے ہوئے اس کی ڈگری اور قابلیت کے ساتھ ساتھ ان مجبوریوں کو بھی مد نظر رکھا ہوگا۔ ان جیسے گھاگ سرمایہ داروں سے بہتر کون اس حقیقت سے واقف ہو سکتا ہے کہ کسی کی مجبوریوں کا کیسے سودا کیا جاتا ہے۔

”اب تم میرا کو کال کر کے اطلاع دے دو کہ سارا مال اوپر شفٹ ہو چکا ہے۔ وہ بندے بھیج کر اسے

طریقے سے لوڈنگ کرواؤں گا کہ بھلے سے مال کو سرحد پار بھی لے جائیں تو کسی کو اس پر شک نہیں گزرے گا۔“
”خوشامد چھوڑ کر کام پر توجہ دو تو یہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہوگا۔“ میرو اس کی اتنی خوش اخلاقی سے بھی متاثر نہیں ہوا اور اسے جھڑک کر رکھ دیا۔

”دیکھا تم نے۔ کتاب بندھا ہوا ہے ان سب کے منہ کے آگے۔ آدمی کتنی ہی اپنی جان لڑا دے، یہ لوگ بھونکنے سے باز نہیں آتے۔“ وہ فون بند کر کے شکایت آمیز لہجے میں جارو سے بولا تو اس کا چہرہ توہین کے احساس سے دھک رہا تھا۔
”تم نے اس سے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ وہ خود ساتھ آ رہا ہے یا نہیں؟“ جارو نے اس صورت حال پر تبصرہ کرنے کے بجائے اپنے مطلب کا سوال کیا۔

”جواب میں وہ مجھ پر بھونکا کہ تمہارے ابدی کامن سینس نہیں ہے۔ جب میں کہہ رہا ہوں کہ بندے بھجوا رہا ہوں تو اس کا صاف مطلب ہے کہ میں ساتھ نہیں آ رہا۔“ اس نے کچھ ایسے انداز میں جواب دیا کہ جارو جھینپ گیا۔ واقعی یہ تو واضح تھا کہ میرو خود ساتھ آنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔
”اچھا ٹھیک ہے، لیکن یہ ضرور معلوم کر لینا کہ وہ یہ مال لے کر کہاں جائیں گے؟“

”کون سا مال؟ تم لوگوں نے ہمیں مال اسٹور روم میں منتقل کرنے کا موقع ہی کہاں دیا تھا۔“ اس بار نذر پھٹ پڑا۔
”کوئی مسئلہ نہیں ہے یا را آنے والوں نے کون سا چیکنگ کرنی ہے۔ تم ہوشیاری سے کوئی بھی بیکار پڑا مال لوڈ کر دانا۔ آج کے بعد بدل تو سب کچھ جانا ہے اس لیے اس بات کی پروا نہ کرو کہ یہ تمہیں کوئی نقصان پہنچا سکیں گے۔ اللہ نے چاہا تو خود ان کا وہ حال ہوگا کہ اپنی جائیں بچانا مشکل ہو جائے گا۔“ جارو نے اسے راہ بھی بھائی اور آگے کے لیے تسلی بھی دی۔ نذر مرتا کیا نہ کرتا کہ مصداق اس کی ہدایات پر عمل کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ وہ اب تک اس غلط فہمی کا شکار تھا کہ کسی خفیہ ادارے کے ہتھے چڑھ چکا ہے اس لیے مزاحمت نہیں کر رہا تھا ورنہ اس کے لیے کیا مشکل تھا کہ جارو کو مل میں پہنچ کر وہاں موجود مسلح گارڈز کی مدد سے قابو میں کر لیتا۔ تنہا جارو ایک پستل کی مدد سے کیا کر لیتا لیکن وہ جارو سے نہیں، اس کی پشت پر موجود ادارے سے ڈر رہا تھا اور دل ہی دل میں ٹھان چکا تھا کہ معاملہ بگڑنے پر وہ وعدہ محاف گواہ بن کر اپنی خلاصی کر دالے گا۔

نذر کی تسلی کے بعد وہ سرنگ سے نکل کر اسٹور روم کے راستے مل میں پہنچ گئے۔ کچھ ہی دیر میں لوڈنگ ٹرک کے

اٹھوالے۔“ وہ لفٹ نما سیڑھیوں تک پہنچ چکے تھے اس لیے جارو اس کے حالات پر کوئی تبصرہ کرنے کی زحمت سے بچ گیا اور اپنی جیب سے اس کا موبائل نکال کر اس کے حوالے کیا۔ نذر حسین نے بادل نا خواستہ موبائل اس کے ہاتھ سے لیا اور ایسی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے نمبر ڈائل کیا جیسے بکر اقربان ہونے سے پہلے تھائی کے ہاتھ میں موجود چھری کو دیکھتا ہے۔ بس فرق یہ تھا کہ یہاں جارو کے ہاتھ میں چھری کے بجائے جدید ساخت کا پستل تھا اور نذر کی قمیص کے نیچے بنیان پر ایسا مائیک فٹ کیا گیا تھا جس کی مدد سے یہاں ہونے والی ساری گفتگو جارو کے مددگاروں کو بھی سنائی دے رہی تھی۔ ایک طرف اگر اسے عرفان اللہ اور باذل کے زیر عتاب آنے کا ڈر تھا تو یہاں بھی کسی صورت جان بچتی دکھائی نہیں دے رہی تھی اس لیے جارو ناچار ان کے ہر حکم کی تعمیل کرتا جا رہا تھا۔ اس وقت بھی اس نے شرافت سے میرو کو کال کر ڈالی۔ وہ اس کی آواز سنتے ہی سخت ستانے لگا کہ ایک تو اس نے کام نمٹانے میں اتنی زیادہ تاخیر کر دی ہے، دوسرے اس کی مسلسل کالز پر کوئی رسپانس بھی نہیں دیا۔ (عرفان اللہ کی کال کے بعد لالہ نے اسے کوئی بھی کال ریسیو کرنے کی اجازت نہیں دی تھی)۔

”بندے کم تھے جناب اور ان میں سے بھی ایک کی اچانک ناف ہٹ گئی تھی تو صرف دو بندوں کی مدد سے بڑی مشکل سے کام کو نمٹایا ہے۔ مجھے خود بھی ساتھ لگنا پڑا تھا۔ رہی کالز ریسیو نہ کرنے کی بات، تو آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہاں سرنگ میں سگنلز اچھے نہیں آتے۔ آج تو بالکل ہی نہیں آ رہے تھے اس لیے آپ کی کوئی کال میرے پاس آئی ہی نہیں۔“ اس نے بہانہ بنا کر میرو کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

”دفع کرو۔ مجھے معلوم ہے کہ تم جیسے کام چوروں کے پاس ہمیشہ بہترین بہانے موجود ہوتے ہیں۔ اب بس اتنی مہربانی کرو کہ میرے بندے وہاں پہنچیں تو اپنی نگرانی میں سارا مال حفاظت سے لوڈ کر دادو۔ اب یہ تو بتانے کی ضرورت نہیں ہے تاکہ مال کو چھپانے کے لیے کیا طریقہ کار استعمال کرنا ہوگا؟“ میرو جو یقیناً کوئی غنڈا ہی تھا، اس ڈگری یافتہ شخص سے جو کہنے کو ایک بڑی ٹیکسٹائل مل کا منیجر تھا، نہایت توہین آمیز لہجے میں بات کر رہا تھا اور وہ جواباً اس کے ساتھ خوش خلقی سے پیش آنے پر مجبور تھا۔ اس وقت بھی ماتھے پر شکن لائے بغیر بولا۔

”آپ فکر نہ کریں۔ میں اپنی نگرانی میں اتنے اچھے

جارو نے بھی کسی مزدور کی طرح سر جھکا کر اسے جواب دیا اور آگے بڑھ گیا۔ لوڈنگ کا کام تقریباً مکمل ہو گیا تھا اور غنّی کے چند کارٹن ہی باقی رہ گئے تھے جب اچانک ہی کہیں سے تین چار چھپیں نمودار ہوئیں اور اس میں سوار بندوں نے قازمگ کرتے ہوئے لوڈنگ ٹرک کے گرد گھیرا ڈالنا شروع کر دیا۔ اتفاق سے اس وقت جارو اور نذر دونوں ہی اندرونی حصے کے قریب تھے۔ جارو نے نذر کا بازو پکڑا اور اس طرف دوڑ لگا دی جہاں اسٹور روم موجود تھا۔

”یہ عرفان اللہ صاحب کے آدمی تھے۔ میں نے ان میں سے ایک بندے کو پہچان لیا ہے۔ وہ ان کے باڈی گارڈز میں سے ہے۔“ اسٹور کے دروازے کو اندر سے بند کر کے وہ سانس لینے کو رکے تھے کہ نذر نے لرزتی ہوئی آواز میں اسے بتایا۔

”اس کا مطلب ہے کہ یہاں اس کا کوئی مخبر موجود ہے جس نے تمہارے اطلاع نہ دینے کے باوجود اسے یہاں کے بارے میں خبری کر دی ہوگی چنانچہ اس نے عین وقت پر مال پکڑنے کے لیے یہاں چڑھائی کرادی۔ اگر تم اس کے ہاتھ لگ جاتے تو تمہاری خیریت نہیں ہوتی۔ اچھا ہوا میں تمہیں لے کر یہاں آگیا ہوں۔ یہاں سے ہم سرنگ کے راستے باہر نکل جائیں گے اور اس معاملے کے حل ہونے تک تم ہماری حفاظت میں رہو گے۔“ جارو نے اس کے سامنے حالات کا جو نقشہ پیش کیا، اسے سن کر نذر کا چہرہ زرد پڑ گیا لیکن اب اس کے پاس اس تجویز پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

☆☆☆

”مس سیما بڈر!“ وکی نے اس چھوٹے سے مگر خوبصورت سنگل اسٹوری بنگلے کے گیٹ پر لگی نیم پلیٹ پر لکھا نام دیکھا اور بغیر رکے موٹر سائیکل آگے بڑھتا ہوا گیا۔ مس سیما بڈر عرف سیکی کے بنگلے کے گیٹ پر اسے کوئی چوکیدار تو دکھائی نہیں دیا تھا لیکن سیکورٹی کیمرہ ضرور موجود تھا۔ نذر سے جو معلومات حاصل ہوئی تھیں ان کے مطابق بھی سیکی کے بنگلے پر چوکیدار سمیت کوئی مرد ملازم موجود نہیں تھا۔ بس چالیس پینتالیس سال کی ایک پختہ عمر عورت تھی جو تنہا اندر باہر کے سارے کام انجام دیتی تھی۔ ان کاموں میں سیکی کے کلائنٹس کو ڈیل کرنا بھی شامل تھا اور بظاہر ملازمہ ہونے کے باوجود سب اس کے ساتھ عزت و احترام سے پیش آتے تھے کیونکہ سیکی کی یہی خواہش تھی۔ بہر حال ملازمہ اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھی۔ اسے

ساتھ میرو کے آدمیوں کے پہنچنے کی اطلاع مل گئی۔ نذر نے جانے کس سلسلے میں پیک کیے گئے کارٹن اٹھوا کر لوڈ کر دانے شروع کر دیے۔ جارو جو مزدوروں والے طبقے میں تھا، دوسروں کے ساتھ مل کر لوڈنگ کا کام کرنے لگا۔ خاموشی سے کام نمٹاتے اس کے کان آس پاس کی گفتگو پر لگے ہوئے تھے۔ ساتھ ساتھ وہ کام کی نگرانی کرتے نذر کو بھی نظروں میں رکھے ہوئے تھا۔ ابھی تک اس نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی تھی جسے مشکوک قرار دیا جاسکتا۔ میرو کے آدمیوں میں سے انچارج کے طور پر ہدایات جاری کرنے والا نذر کے قریب آ کر کھڑا ہوا تو جارو کے کان مزید کھڑے ہو گئے۔

”کیا بات ہے سر جی! آج بیوی سے لڑ کر آئے ہو کیا جو اس نے جوڑا استری کر کے نہیں دیا۔“ نذر کا لباس پچھلے چند گھنٹوں میں پیش آنے والی سرگرمی کی وجہ سے مسل سا گیا تھا اور اس نے اسی کے حوالے سے سوال کیا تھا۔

”بیوی ہوگی تو لڑائی ہوگی نا۔ یہ سارا حلیہ تو یہاں کے دھندوں میں بگڑا ہے۔ خاص مزدور کم تھے تو مال اوپر لانے کے لیے مجھے خود ساتھ میں لگنا پڑا۔“ نذر نے بیزار سے انداز میں اس کی بات کا جواب دیا۔

”میز کرسی پر بیٹھ کر کام کرنے والوں کے لیے واقعی یہ بڑا دکھا کام ہے۔ خیر میں میرو کو آپ کی یہ کارکردگی بتا کر آپ کے نمبر بڑھادوں گا اس کے سامنے۔ بڑی تپ چڑھ رہی تھی اسے کہ جلدی کے حکم کے باوجود آپ نے کام نمٹانے میں اتنی دیر کر دی۔“ اس نے نذر کو بتایا۔

”میرد خود کہاں ہے؟ میں تو اس کے تم لوگوں کے ساتھ آنے کا منتظر تھا۔“ نذر نے موقع دیکھ کر میرو کا کھوج لگانے کی کوشش کی۔ جارو کے بھی کان کھڑے ہو گئے۔

”یہ تو مجھے نہیں معلوم، بس فون پر آرڈر دیا تھا کہ یہاں سے مال اٹھا کر چادلوں والے گودام میں پہنچا دو۔“ اس کا جواب خاصا مایوس کن تھا اور یہ واضح ہو گیا تھا کہ ان لوگوں کے ذریعے میرو دیا باڈل تک نہیں پہنچا جاسکتا۔

”عرفان اللہ کی بار بار کال آرہی ہے۔“ صورت حال واضح ہونے کے بعد جارو اپنے اگلے اقدام کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ نذر ٹھہلا ہوا اس کے قریب آیا اور اس انداز میں اسے اطلاع دی جیسے کام کے سلسلے میں کوئی ہدایت دے رہا ہو۔

”اے نظر انداز کر دینا ہی بہتر ہے۔ یہ لوگ چلے جائیں تو ہم بھی یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ فی الحال تمہارا منظر سے غائب ہو جانا ہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔“

لمحے جیسے کسی شکنجے میں جکڑا گیا۔ گرفت اتنی مضبوط تھی کہ اسے اپنا دم گھٹنا محسوس ہو رہا تھا۔ بے ساختہ ہی خود کو اس گرفت سے نکالنے کے لیے زور لگایا۔

”تھوڑا سکون کرو میاں ورنہ شہ رگ کٹ جائے گی۔“ قدرے بھاری نسوانی آواز کے ساتھ جہاں اس نے اپنے گلے پر کسی تیز دھار آلے کی ہلکی سی چبھن محسوس کی، وہیں پشت پر مخصوص نسوانی گداز بھی محسوس ہوا۔

”کون ہو تم؟“ وہ حیرت سے پوچھنے پر مجبور ہو گیا۔
”یہ تو تمہیں بتانا ہے۔“ اس نے مضبوط لہجے میں بتایا پھر ہلکا سا ٹھوکا دیتے ہوئے بولی۔

”اندر چلو پھر تفصیل سے بات کرتے ہیں۔“

وکی اس کے اشارے پر چل پڑا۔ اسے اپنے بھاری بازو کے حصار میں لیے وہ بھی ساتھ ساتھ تھی۔ کچن سے باہر نکلتے نکلتے اس نے کوئی سوچ دیا یا تو سارا لاؤنج روشنی میں نہا گیا۔ یہ خوبصورت اور قیمتی آرائشی اشیاء سے سجا چھا خاصا وسیع لاؤنج تھا۔ کم از کم بیچلے کے رقبے کے حساب سے تو وسیع ہی تھا۔
”کہاں رہ گئی ہو فیضی، ذرا جلدی کرو۔“ انہی وہ

روشن کمرے کے بند دروازے کے قریب ہی تھے کہ ایک سریلی آواز نے پکارا۔

”بس آگئی ہوں بے بی! یہ لو تمہارا مہمان بھی حاضر ہے۔“ فیضی کے نام سے پکاری جانے والی نے پیر کے دھکے سے دروازے کا پٹ کھولا اور اسے اپنے ساتھ دھکیلتی ہوئی اندر لے گئی۔ اندر وکی کا سامنا سنگار میز کے سامنے کھڑی ایسی جواں سال عورت سے ہوا جس نے خاصا بے باک لباس پہن رکھا تھا اور چہرے پر میک اپ کی تہ جمائے آرائش کی سو کر رہی تھی۔

”تمہیں معلوم ہے فیضی کہ اس وقت ہم خود کسی کے مہمان بننے جا رہے ہیں پھر کسی مہمان کو کیوں لے آئیں؟“ وہ وکی کو دیکھ کر بالکل بھی نہیں چونکی تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ پہلے ہی سے اس کی آمد سے واقف تھی۔

”یہ بن بلائے مہمان ہیں بے بی جو دیوار پھاند کر اندر آئے ہیں۔ میں نے سوچا انہیں لاک واک توڑنے کی زحمت دینے کے بجائے خود ہی اندر بلا لوں تاکہ کل مجھے مرمت کا کام کم از کم نہ انجام دینا پڑے۔“ وہ دونوں مل کر اس کی بے بسی کا لطف اٹھا رہی تھیں لیکن اس گفتگو سے وکی کو یہ سمجھ آگئی تھی کہ اسے کسی کمرے کی مدد سے دیکھا گیا ہے اور دیکھنے کے بعد باقاعدہ ٹرینپ لگا کر جکڑا گیا ہے۔

”ٹھیک ہے، لاک کی مرمت سے بچ گئی ہو تو بندے

اعتماد تھا کہ اول تو دونوں عورتیں کوئی مسئلہ پیدا کر ہی نہیں سکیں گی لیکن اگر کوئی مسئلہ ہو ہی گیا تو وہ سنبھال لے گا۔ اپنے اسی اعتماد کے سبب وہ کسی کو ساتھ بھی نہیں لایا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اصل افرادی قوت کی اصغر کو ضرورت تھی جو میر وکی لوکیشن ٹریس ہونے کے بعد اس کی طرف روانہ ہونے والا تھا۔ یہی کے بارے میں اس کے پاس حتمی رپورٹ تھی کہ وہ بس ایک ملازمہ کے ساتھ تنہا رہتی ہے جبکہ میر جیسے غنڈے اپنے ساتھ دو چار حالی موالی ضرور رکھتے ہیں۔ ان سے نمٹنے کے لیے اصغر کے ساتھ نفری ہونا ضروری تھا۔

”میں آرہا ہوں مس سہی!“ بیچلے کی پشت پر پہنچ کر وہ زیر لب بڑبڑایا اور اپنی مخصوص بندروں والی پھرتی کے ساتھ دیوار چڑھ کر دوسری طرف کود گیا۔ بیچلے کے اندر خاموشی تھی۔ اگر اس نے پورچ میں کھڑی گاڑی نہ دیکھی ہوتی تو یہی گمان کرتا کہ مس سہی کہیں باہر گئی ہوئی ہیں۔

وہ پچھلی طرف کی کھڑکیوں کو ٹوٹا اندر جانے کا راستہ تلاش کرنے لگا لیکن کھڑکیوں پر اندر کی طرف لوہے کی مضبوط گرل لگی ہوئی تھی۔ وہ پچھلی دیوار کے ساتھ چلتا ہوا پہلو میں آگیا اور وہاں یکدم اسے ایک چھوٹا دروازہ نظر آیا۔

یہ شاید کچن کا دروازہ تھا جو اس وقت بند تھا لیکن دروازے پر آٹومیک لاک کی موجودگی نے اسے خوش کر دیا۔ جن دروازوں پر اس قسم کے لاک لگے ہوں، ان کو عموماً اندر سے کھنڈی نہیں لگائی جاتی اور وہ لاک آرام سے کھول سکتا تھا۔ اسی ارادے سے اس نے جیب سے ایک تار برآمد کر کے تالے کے سوراخ میں ڈالنا چاہا لیکن اگلے ہی لمحے وہ چونک گیا۔ اس کا ہاتھ لگنے سے دروازہ ذرا سا اندر کی طرف دب گیا تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ سرے سے لاک ہی نہیں تھا۔ شاید اکیلی ہر کام انجام دینے والی ملازمہ سے غفلت ہو گئی تھی۔ کام کا بوجھ زیادہ ہو تو ایسی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔

ملازمہ کی اس غلطی نے اس کے کام کو مزید آسان کر دیا تھا۔ دروازے کو احتیاط سے بے آواز دھکیل کر وہ ایک لمحے کو رکا۔ اندر تار کی تھکی اس لیے واضح طور پر کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن اتنا بہر حال پتا چل رہا تھا کہ وہ کچن ہے جس سے آگے شاید لاؤنج تھا اور اس وقت وہ بھی تاریک پڑا تھا۔ بس آگے کسی کمرے کے بند دروازے کی چمکی درز سے گزر کر معمولی سی روشنی باہر آرہی تھی۔ یہی روشنی تھی جس نے لاؤنج اور کچن کے ماحول کو مکمل تاریکی میں ڈوبنے سے بچا کر دھندلے سے خاکے ابھار رکھے تھے۔ وہ کھلے دروازے سے گزر کر بے خوف اندر داخل ہو گیا اور اگلے ہی

یہاں کے حالات کو اپنے قابو میں کرنا چاہتا تھا اس لیے فیضی سے مقابلے کو طول دینے کے بجائے یہ ترکیب لڑائی تھی۔ فیضی کی حرکات و سکنات سے ظاہر تھا کہ اسے لڑنے بھڑنے میں خاصی مہارت حاصل ہے۔ وہ بھی کم نہیں تھا لیکن مقابلے کی صورت میں وقت کے زیاں کا خدشہ تھا۔

”لڑکی کا سہارا لے کر میدان سے کیوں بھاگ رہا ہے؟ ہمت ہے تو مجھ سے مقابلہ کر۔“ اگرچہ یہی کو اس کے رحم و کرم پر پا کر فیضی کا چہرہ ست گیا تھا لیکن اس نے وکی کو للکار کر اسے جوش دلانے کی کوشش کی تھی۔

”یہ کوئی فلم کا سین نہیں ہے اور نہ ہی کسی ٹی وی چینل پر لائیو مقابلہ دکھایا جا رہا ہے جو میں تمہارے بھڑکانے پر جوش میں آ جاؤں گا۔ میں اپنا کام کرنے آیا ہوں اور جو اس کام میں رکاوٹ ڈالے گا، اس کا انجام بُرا ہوگا۔“ جواباً وہ غرایا۔

”کیسا کام..... کیا چاہتے ہو تم؟“ فیضی نے تھوک نکل کر اپنا گلہ تر کیا۔ اس کے مقابلے میں وکی کی گرفت میں جکڑی مس سہی زیادہ پرسکون محسوس ہو رہی تھی۔

”میرا جو بھی کام ہے، اس میں تم دونوں کو کوئی نقصان پہنچانے کی نیت شامل نہیں ہے۔ اگر تم چاہتی ہو کہ تم اور تمہاری مالکن محفوظ رہیں تو میرے ساتھ تعاون کرو۔“ اس بار اس نے اپنا لہجہ قدرے نرم کر لیا۔

”کیسا تعاون؟“

”مداخلت یا مزاحمت نہ کرو۔ میں بس کچھ دیر اس گھر میں رکوں گا اور یہی کے یہاں سے روانہ ہوتے ہی خود بھی چلا جاؤں گا۔“ اس نے اپنا مطالبہ اور پروگرام دونوں اس کے سامنے رکھے۔

”لیکن اس کے پیچھے مقصد کیا ہے؟“ فیضی نے حیرت کا اظہار کیا۔

”یہی کو لینے گا ڈی کب تک آئے گی؟“ اس نے فیضی کے سوال کو نظر انداز کر کے اپنے مطلب کا سوال کیا۔

”تم باذل کے پیچھے ہو؟“ فیضی نے یہ سوال کر کے ثابت کر دیا کہ وہ صرف لڑنے بھڑنے کے فن میں طاق نہیں ہے بلکہ اپنی مضبوط کھوپڑی کے پیچھے دماغ بھی رکھتی ہے۔

”تم اس چکر میں نہ پڑو۔ کم سے کم جاننا تمہارے اپنے حق میں بہتر ہے۔“ وکی نے اسے نصیحت کی۔

کی مرمت کر ڈالو تاکہ میں باذل صاحب کی گاڑی آنے سے پہلے پہلے اس کے شجرے سے تو واقف ہو جاؤں۔“ وہ اس کے اس طرح شکار کر لیے جانے سے محفوظ ہو رہی تھی۔ وکی پر اس کی ان منہجیوں کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا لیکن باذل کے نام نے سارے بدن میں برقی دوڑا دی۔ باذل کے بندے کے یہاں پہنچنے سے پہلے پہلے اسے صورت حال کو اپنے قابو میں کرنا تھا چنانچہ فیضی پانی عورت اپنی مالکن کے حکم پر حرکت میں آئی۔ اس سے قبل ہی وہ حرکت میں آ گیا اور بیک وقت اپنی داہنی کہنی اور دائیں پاؤں کو حرکت دے کر اس کی دائیں پسلیوں اور گھٹنے کو نشانہ بنایا۔ اس کے اب تک کسی قسم کی مزاحمت نہ کرنے پر فیضی تھوڑی سی ڈھیلی پڑ گئی تھی اس لیے یہ وار کار گر ثابت ہوا اور وہ ایک ہی جھٹکے میں اس کی گرفت سے باہر نکل آیا۔

”سارے.....!“ فیضی کے منہ سے مغلظات کا ڈھیر ابل پڑا اور وہ کسی چیل کی طرح وکی پر جھپٹی۔ اپنے بھاری تن و توش کے باوجود اس کی حرکات میں پھرتی اور تیزی تھی۔ وکی اگر عین وقت پر اپنی جگہ نہ چھوڑ دیتا تو اپنے دائیں پہلو پر اس کی زوردار لات کھانی پڑتی۔ ابھی تو وہ اپنے ہی زور میں آگے گئی اور یوں ڈریسنگ ٹیبل پر جا کر گری کہ اس پر سبھی بیش قیمت پر فیوم اور کاسٹیکس کی بوتلیں لڑھک کر فرش کی جانب لپکیں اور چھنا کے کی آواز کے ساتھ ہی کمرے میں بہت سی ملی جلی خوشبوئیں بکھر گئیں۔ اس صورت حال پر اب تک اطمینان سے کھڑی سارا تماشہ دیکھتی سہی نے ایک سر۔ بلی سی چیخ ماری۔ پتا نہیں اسے فیضی کو چوٹ لگنے کا غم تھا یا اپنی قیمتی کاسٹیکس کے ضائع ہونے سے صدمہ ہوا تھا۔

”بہت ہو گئی تیرے ساتھ رعایت۔ اب دیکھنا میں تیرا کیا حشر کرتی ہوں۔“ فیضی کے ماتھے پر ہلکا سا کٹ لگ گیا تھا جس سے خون بہہ کر اس کے چہرے پر آ رہا تھا۔ شدید غصے اور خون کے باعث اس کا اچھا خاصا چہرہ بھیانک لگنے لگا تھا۔ وکی نے اس دھمکی کے جواب میں اس کی طرف ایک تمسخرانہ مسکراہٹ اچھالی اور اپنی جگہ سے حرکت میں آیا۔ آگے جو ہوا وہ فیضی اور یہی دونوں کے لیے غیر متوقع تھا۔ وکی نے فیضی کے بجائے یہی کا رخ کیا تھا۔

”اب اگر تم نے ذرا سی بھی الٹی سیدھی حرکت کی تو میں اس کی گردن توڑ دوں گا۔“ وہ یہی کے گرد بازو لیے سنگین لہجے میں فیضی کو دھمکا رہا تھا۔ دراصل اس کے ذہن میں یہی کا فیضی سے کہا ہوا جملہ موجود تھا۔ اس جملے سے ظاہر تھا کہ باذل کی بھوائی گاڑی یہی کو لینے آرہی ہے۔ وہ کسی کی آمد سے قبل

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر ہو جوان
کی داستان جو غلط کاروں کے لیے غضب
ناک تھا باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیے



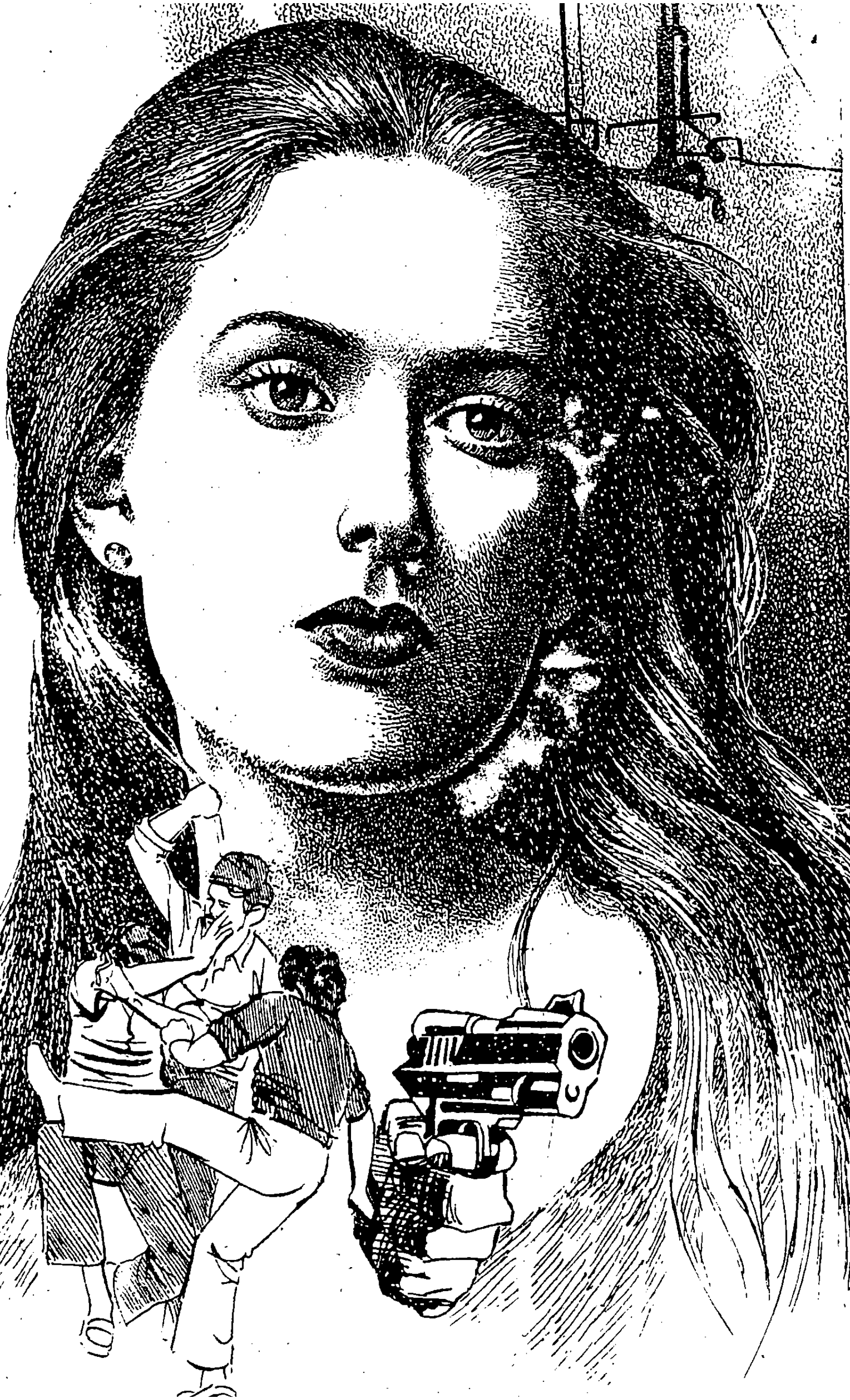
44



اسماء قادری

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں وعدہ شرد ناپتو رہوں
 کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی
 سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں نا انصافیوں کی تندو تیز
 اندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون
 حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابل شکست بنایا تو دوسری
 طرف ظالم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پُر عزم
 نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جا رہے
 تھے... اس کی زندگی جو العیور کا شکار... اندھیروں کے قریب اور
 روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو
 اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے
 طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک
 تھی... اس کی بے قرار یوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار
 اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار
 مان لیتا... اگرچہ تاری عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چور
 لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا تڑکرتا حق و باطل کی
 ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ وارداتِ قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں
 حائل نہ ہو سکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تحریر انمیز داستان



معاذ ایک ذہین لیکن متکون مزاج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جو ان کیاء ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ انسٹی ٹیوٹ سے واپس آ رہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو سڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی غر فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشری نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بشری ماس کمیونی کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم وغیرہ لکھتی ہے۔ اس ویران جگہ بھی وہ ایک زیر تعمیر رہائشی منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی آئی تھی۔ معاذ بشری کو بہ حفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کر دیتا ہے لیکن جن رئیس زادوں سے اس نے ان کا شکار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ایک دن جنگل کی سیر کے دوران وہ فوٹو گرافی کے شوق میں سب سے الگ تھلگ ہو جانے والے معاذ کو بے خبری میں گھیر کر بڑی طرح زد و کوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دے دیتے ہیں۔ معاذ کے دماغ میں نہ آنے پر انتظامیہ کے افراد، پولیس اور ریسکیو ذرائع کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جوگی کی جھونپڑی میں پاتا ہے۔ جوگی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے، جوگی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نواز کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے پر لہر اڑ غم سکھانے کی ہامی بھر لیتا ہے اور معاذ اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ادھر جانے وقوعہ سے ملنے والے معاذ کے کمرے سے جب تصویریں نکلوائی جاتی ہیں تو ایک ایسی تصویر بشری کی نظر میں آ جاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پروجیکٹ کے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشری تحقیق کر رہی تھی۔ بشری کے اپنے والد جرنلست ہوتے ہیں۔ اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشری کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ مدد سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باذل نامی غنڈے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشری انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دنوں میں ہی معاذ واپسی کا ارادہ کرتا ہے تاہم ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا عرفان اللہ اور یزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو وقاص نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باذل اچانک بشری کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر دیتا ہے۔ معاذ کو واپس لانے کے لیے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اسے واپس آنے کا پیغام دیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کر کے اسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات کے نہ بتانے پر اس کے بھائی کا ایک گروہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشری بھی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہو جاتی ہے۔ معاذ کے دوست عالم شاہ کے بہنوئی کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ کئی فنون میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے پہنانا سڑ کر کے اس کے دماغ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ فیضو سے حاصل انوکھے علم کی بدولت ان کا معمول نہیں بنتا۔ عالم شاہ اور اس کا نوکر سرد، باذل کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ عالم کی بہن بجل شاہ کے نومولود بیٹے کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اغوا کا الزام لطیف سومرو پر آتا ہے۔ عالم شاہ، باذل کی قید میں موجود ایک زخمی شخص کی مدد سے وہاں سے فرار ہو جاتا ہے۔ ادھر بشری دینی پہنچ جاتی ہے۔ وہاں وقاص اسے باربی کے روپ میں پہچان لیتا ہے۔ وہ سلطان کو مارنا چاہتی ہے تاہم وقاص اسے ایسا کرنے سے روکتا ہے۔ ادھر عالم شاہ، باذل کی قید سے نکل کر اس کا پیچھا کرتا ہے۔ وہ وہاں معاذ کو دیکھتا ہے۔ صداقت شاہ، لطیف سومرو کو گھیرنے کے لیے اس کی خفیہ بیوی اور بچے کا کھوج لگاتے ہیں اور بچے کو اغوا کر لیتے ہیں۔ لطیف سومرو مجبور ہو جاتا ہے۔ معاذ کو اس کے گھر والوں سے ملنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ وہ ایک مشن پر سونیا کے ساتھ انڈیا روانہ ہوتا ہے تاہم کچھ لوگ سکھ یا تریوں سے بھری بس کو یرغمال بنا لیتے ہیں۔ معاذ اور سونیا تہ خانے کے تمام افراد کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔ عالم شاہ، بجل اور سرد انڈیا روانہ ہو جاتے ہیں۔ اتر پورٹ سے گھر روانگی پر راستے میں کچھ لٹیرے انہیں لوٹ لیتے ہیں۔ گھر پہنچنے پر پولیس کی ریڈ ہوتی ہے اور وہ عالم شاہ اور سرد کو لے جاتے ہیں۔ ادھر بشری اور وقاص باذل کو اسپتال میں مارنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ بچ جاتا ہے۔ معاذ اور سونیا اپنے سہولت کاروں سے مل جاتے ہیں۔ عالم شاہ اور سرد کو تشدد کا نشانہ بنا کر ویرانے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ واپس اپنے میزبانوں کے ہاں پہنچ جاتے ہیں۔ انہیں پتا لگتا ہے کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں اجالا اور اس کا عاشق شامل ہوتے ہیں۔ وہ چھپ کر ان کی باتیں سن رہا ہوتا ہے کہ اسے چھاپ لیا جاتا ہے۔ تاہم وہاں مارا ماری ہوتی ہے اور اجالا کا عاشق مارا جاتا ہے۔ پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ ان کے کزن انہیں اپنے دوسرے خفیہ ہتھکے پر پہنچا دیتے ہیں۔ وہ وہاں سے بحفاظت نکل جاتے ہیں۔ ادھر معاذ ایک مشن میں زخمی ہو جاتا ہے اور اسے ہندو سادھو اپنی کنیا میں لے جاتا ہے جہاں اس کی اچھی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ سونیا کے آدمی معاذ کو تلاش کرتے ہیں مگر ناکام ہو جاتے ہیں۔ ادھر عالم شاہ اور سرد خفیہ ذریعے سے بارڈر پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ دھریے جاتے

ہیں اور ”را“ کی قید میں پہنچ جاتے ہیں۔ بشری باذل کو مارنے کی کوشش میں خود نشانہ بن جاتی ہے۔ معاذ سادھو کی مدد سے ایک انڈین ہیروئن کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ وہیں اسے عالم اور سرمد کی گرفتاری کا پتا چلتا ہے۔ معاذ ڈاکٹر فردوس سے ملتا ہے اور اسے سبیل کی مدد کرنے کا کہتا ہے۔ علیہ اور وقاص وغیرہ کو لالہ عیسیٰ ملک سے باہر نکال دیتا ہے اور ہر ممکن احتیاط کی ہدایت کرتا ہے لیکن علیہ پاکستان میں ٹوبہ سے رابطہ کرتی ہے جو ان کے لیے مصیبت بن جاتا ہے۔ ٹوبہ پر تیزاب پھینک دیا جاتا ہے۔ وقاص، علیہ اور اس کے گھروالوں کو مار دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس معاذ کو دیوانی شخص سے مدد لینے کا کہتی ہے۔ معاذ اپنے کزن کو پاکستان کال کرتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ اس کے گھروالوں کو مار دیا گیا ہے۔ وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کی ٹھان لیتا ہے۔ ادھر ڈاکٹر فردوس کو اس کے سرال والے سبیل کو بھگانے کی پاداش میں تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ معاذ، عالم اور سرمد کی رہائی کے لیے کارروائی کرتا ہے اور انہیں ”را“ کی قید سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن عالم اور سرمد کو دیوا کے آدمی کی دوسری جگہ پہنچا دیتے ہیں۔ سونیا معاذ کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ ادھر باذل ایک جگہ لالہ عیسیٰ کی موجودگی پر کارروائی کرتا ہے تاہم لالہ خود کو گولی مار کر ختم کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس کا انتقال ہو جاتا ہے۔ دیوا گینگ ڈاکٹر فردوس کی میت اٹھنے پر وہاں فائرنگ کر دیتے ہیں۔ پولیس دیوا کو گھیر لیتی ہے۔ معاذ دیوا اور اس کے آدمیوں کو نکالنے کے عوض عالم کا پتا معلوم کر لیتا ہے۔ سونیا اور معاذ حیدر آباد نواب بدرالدین کی حویلی پہنچ جاتے ہیں۔ تاہم کالے خان اور رادھا دیوی کو میڈیم ایکس کے شکنجے سے چھڑانے کے لیے انہیں واپس آنا پڑتا ہے، کالے خان کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ نواب صاحب کی حویلی میں عالم اور سرمد کی رہائی کے لیے کارروائی کر کے انہیں رہا کر لیتا ہے۔ وہ لوگ نئے ٹھکانے پر پہنچے ہیں تو وہاں معاذ سے ملنے جا رہی تھی۔ اسے معاذ نے ”را“ کی قید سے نکالا ہوتا ہے۔ جارو اور معاذ، سبیل سمیت اسپتال جاتے ہیں اور پہچان لینے جانے پر پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ پولیس سے متاثرہ کے بعد وہ ایک بستی میں پناہ کے لیے گھس جاتے ہیں اور دو لوگوں کو زیرِ غلام بنا کر ان کی جھونپڑی میں قیام کرتے ہیں۔ ادھر سونیا معاذ کی تلاش میں نکلتی ہے اور اسے بستی میں پہنچنے پر معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ معاذ اور جارو وغیرہ انوپ نامی شخص کے ساتھ اس کے مالک کے بنگلے میں قیام کرتے ہیں۔ سونیا بھی معلومات حاصل کرتی ہوئی مذکورہ بنگلے تک پہنچ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور سرمد بھی سونیا کا پیچھا کرتے ہوئے وہیں پہنچ جاتے ہیں۔ ادھر وقاص، علیہ جو دیگر لوگ زندہ ہوتے ہیں۔ وقاص حلیہ بدل کر گلو کا باڈی گارڈ بنتا ہے۔ وہ معاذ کو تلاش کرنے کے لیے انڈیا روانہ ہوتا ہے۔ وہاں اس کی گل خان سے ملاقات ہوتی ہے اور معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ سونیا، معاذ اور دیگر ساتھیوں سے مل جاتی ہے تاہم وہ جس بنگلے میں ہوتے ہیں وہ دشمن کا ہوتا ہے۔ دشمن سب کو بے ہوش کر کے کہیں لے جا رہے ہوتے ہیں کہ ان کی گاڑی کو حادثہ پیش آ جاتا ہے۔ ان سب کو چھٹی بھکشو طبی امداد دیتے ہیں اور ان سے پوچھ گچھ کی جاتی ہے۔ سبیل کی حالت تشویشناک ہوتی ہے اور اسے وہاں موجود ایک وید دیکھتا ہے۔ ادھر لالہ واپس اپنے لوگوں میں پہنچ کر ایکشن میں آ جاتا ہے اور حامد کو اغوا کر لیتا ہے۔ باذل، معاذ وغیرہ کے ٹھکانے سے باخبر ہو جاتا ہے۔ ادھر لالہ کے آدمی میڈیم ایکس کی نگرانی کے چکر میں مارے جاتے ہیں۔ لالہ اپنے آدمیوں کو انڈیا گراؤنڈ کر دیتا ہے۔ معاذ وغیرہ جہاں ہوتے ہیں وہاں دشمن حملہ کر دیتا ہے اور کالی مارا ماری ہوتی ہے۔ باذل، معاذ کا پیچھا کرتا ہے اور چینیوں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ معاذ چینیوں کے ساتھ مل کر دشمنوں کے خلاف کارروائی کرتا ہے۔ اس دوران اسے گل خان نظر آتا ہے۔ اسے پہنا مار کر کیا گیا تھا۔ وہ لالہ کی عورت کو بھی گرفت میں لے لیتے ہیں اور اسی سے معلومات لیتے ہیں۔ ادھر لالہ عیسیٰ، اعظم کو دشمن کی گرفت سے نکالنے کے لیے کارروائی کر دیتا ہے اور موسیٰ اور نیلی، اعظم کو نکالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ معاذ دشمنوں کے کیمپ پر حملہ کر کے وہاں قبضہ کر لیتا ہے۔ موسیٰ اور نیلی کی گاڑی پر حملہ ہوتا ہے تاہم مارا ماری کے بعد وہ صداقت شاہ کے پاس پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ لالہ عیسیٰ صداقت شاہ کو حویلی پر ریڈ کا بتاتا ہے۔ صداقت شاہ اعظم کے محفوظ ٹھکانے کے لیے قربان شاہ کو فون کرتے ہیں۔ اعظم کو وہاں سے نکال لیا جاتا ہے اور دوسری جگہ منتقل کر دیا جاتا ہے۔ ادھر معاذ بیجنگ پہنچ جاتا ہے اور وہاں کے کرتا دھرتاؤں سے بات کر کے پاکستان پہنچنے کی اجازت چاہتا ہے۔ ادھر موسیٰ اور نیلی کو پولیس گھیر لیتی ہے اور فائرنگ میں موسیٰ مارا جاتا ہے۔ وہ اعظم کو لے جاتے ہیں اور نیلی زخمی حالت میں ان کے قبضے میں آ جاتی ہے۔ معاذ اور وی وغیرہ پاکستان پہنچ جاتے ہیں اور اعظم کی بازیابی کے لیے منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ موسیٰ کی تدفین ہو جاتی ہے۔ وی، نیلی کو قبرستان لے کر جاتا ہے تاہم وہاں کچھ لوگ حملہ کر دیتے ہیں لیکن لالہ کے آدمی انہیں بچا لیتے ہیں۔ ادھر باذل، لالہ کی قید سے بھاگ جاتا ہے۔ معاذ، ڈی ایس پی ظہیر کے بنگلے پر دھاوا بولتا ہے اور ڈی ایس پی کو قابو کرنے کے بعد اس سے معلومات لیتا ہے۔ وہ لوگ ظہیر کو خان کو لے کر وہاں سے نکل جاتے ہیں۔ باذل قید سے نکل کر مہناز کے پاس پہنچتا ہے اور اسے تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ نیلی قید میں موجود ظہیر کو ٹھکانے لگا دیتی ہے۔ بشری قبرستان جاتی ہے۔ وہاں اس کی دوست ملتی ہے اور وہ اس کے ساتھ چلی جاتی ہے۔ بشری اپنی دوست کے ساتھ جارہی ہوتی ہے کہ باذل کے آدمی اسے اغوا کر لیتے ہیں۔ ادھر معاذ سارے معاملوں کو جلد حل کرنے کے لیے دشمن کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے مگر اس کے خیر خواہ اسے میڈیم ایکس کے شکنجے سے نکال لیتے ہیں اور اعظم کو بھی باز پاب کر لیتے ہیں۔ زن ہوا سے اپنے ساتھ لے جاتی ہے اور وہاں کرنل سکندر بخت سے ملاقات ہوتی ہے۔ معاذ انہیں دشمنوں کے خلاف کارروائی کرنے کا کہتا ہے۔ باذل، بشری کو لے کر انڈیا گراؤنڈ ہو جاتا ہے۔ ادھر وقاص باذل کا پتا چلانے کے لیے ایک کال گرل سی کی کے گھر کارروائی کرتا ہے۔ تھوڑی دھینکا مشتی کے بعد وی اسے قابو کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

بازل تک پہنچنے کے لیے وکی نے سیسی نامی لڑکی کے بیچلے پرکارروائی کی جو بازل کی منظور نظر تھی۔ وکی نے سیسی کو قابو کر لیا تھا۔ سیسی کی ملازمہ نے وکی سے کہا۔
 ”ٹھیک ہے۔ تم جو چاہو کرو لیکن بے بی کو چھوڑ دو۔“
 فیضی نے گویا ہلکتے تسلیم کر لی۔

”صرف اتنا کافی نہیں ہوگا محترمہ! تمہیں اپنی مالکن کے لیے کچھ قربانی مزید دینا پڑے گی۔“ وکی نے مطالبہ کیا۔
 ”یہ میری ملازمہ نہیں، بڑی بہن ہے۔“ یکدم ہی سیسی نے اسے ٹوکا۔

”واقعی؟“ وکی حیران ہوا۔ سیسی اور فیضی میں کچھ بھی مشترک نہیں تھا۔ جتنی سیسی نرم و نازک تھی، فیضی اتنی ہی سخت جان اور بھاری تن و توش کی مالک تھی۔ نین نقش کا بھی ایسا ہی کچھ حساب کتاب تھا۔ فیضی اگرچہ بد صورت نہیں تھی لیکن سیسی والی بات بھی نہیں تھی۔

”یہ میری ماں کے پہلے شوہر سے ہے۔ میں اپنی ماں جیسی ہوں اور یہ اپنے باپ جیسی۔“ سیسی نے اس کی ابھمن دور کر دی۔

”لیکن لوگ تو اسے تمہاری ملازمہ ہی سمجھتے ہیں۔“
 ”میں نے کبھی کسی سے ایسا نہیں کہا لیکن چونکہ فیضی نے سارا گھر سنبھال رکھا ہے تو لوگ خود ہی یہ بات فرض کر لیتے ہیں۔ فیضی کسی کے سامنے تردید نہیں کرتی لیکن اگر کوئی میرے سامنے اسے ملازمہ کہے تو میں حقیقت ضرور بتاتی ہوں۔“

”اچھی بات ہے۔“ وکی نے مختصر تبصرہ کیا۔
 ”میں تو چاہتی ہوں کہ گھر کے کام کاج کے لیے کوئی ملازمہ رکھ لی جائے لیکن فیضی نہیں مانتی۔“ سیسی نے بات کو مزید آگے بڑھایا۔

”ملازمہ رکھنے کا مطلب ہوتا ہے اپنے راز کسی اور کے حوالے کرنا۔ میں اچھی طرح گھر سنبھال بھی سکتی ہوں اور گھر کی حفاظت بھی کر سکتی ہوں تو خواہ مخواہ کی بیخ لگانے کی کیا ضرورت ہے۔“ فیضی نے بھی مسکراتے ہوئے گفتگو میں حصہ لیا۔ مسکرانے سے اس کے چہرے کے کرخت تاثرات پر فرق پڑا تھا اور سیسی کے لیے ممتا کی جھلک دکھائی دی تھی۔
 ان دونوں بہنوں کی یقیناً کوئی کہانی تھی جسے سننے کی فی الحال اس کے پاس فرصت نہیں تھی چنانچہ موضوع بدل کر پوچھا۔

”بازل کی بھجوائی گاڑی کب تک یہاں پہنچے گی؟“
 ”بس آتی ہی ہوگی۔“ سیسی نے وال کلاک پر نظر ڈالی۔
 ”میں نے ہمیشہ اسے اس شخص سے دور رہنے کا

مشورہ دیا ہے۔ بہت خبیث آدمی ہے۔ میری نازک کلی سی بہن کا وہ حال کر دیتا ہے کہ دو دن تک بستر سے اٹھ نہیں پاتی۔“ فیضی کے چہرے پر بازل کے لیے ناگواری تھی۔

”اسے انکار کرنا خود کو مصیبت میں ڈالنے کے مترادف ہے۔ ویسے بھی وہ اتنا ہاتھ کھول کر نوازتا ہے کہ ہر چیز کی سلامتی ہو جاتی ہے۔“ سیسی کا جواب ایسے کچے کاروباری کا ساتھ جو ہر صورت کاروبار میں منافع کو ہی اوپر رکھتا ہے۔

”تم اپنی تیاری کو فائل کرو۔ میں اور فیضی اتنی دیر میں باہر کا چکر لگا کر آتے ہیں۔“ وکی نے وقت کو سرکٹا دیکھ کر ان کی گفتگو میں دخل دیا اور سیسی سے بولا۔ اس کا میک اپ تو ٹھیک تھا لیکن ہیز اسٹائل خراب ہو گیا تھا۔
 ”باہر کہاں لے جا رہے ہو فیضی کو؟“ وہ ذرا تشویش میں مبتلا ہوئی۔

”یہیں گھر کے آس پاس رہیں گے ہم۔ گاڑی آنے پر تم روانہ ہو جانا۔“

”مگر.....“ سیسی نے کوئی اعتراض کرنا چاہا۔
 ”اگر مگر کچھ نہیں۔ میں نے وعدہ کر لیا ہے کہ تم لوگوں کو نقصان نہیں پہنچاؤں گا تو یقین کر لو کہ ایسا ہی ہوگا لیکن یاد رکھنا کہ ایسا اسی صورت میں ہوگا کہ تم مجھے نقصان پہنچانے کی غلطی نہ کرو۔ ایسا بالکل نہیں ہونا چاہیے کہ ہمارے نکلنے ہی تم بازل کا نمبر ملا کر اسے میرے بارے میں بتا دو۔“

”میں اسے نہیں بتاؤں گی۔ ویسے بھی میرے پاس اس کا فون نمبر نہیں ہے۔ اس نے خود مجھے کال نہیں کی تھی۔ اس کے ایک آدمی میرے مجھ سے رابطہ کیا تھا۔“ سیسی نے جلدی سے جواب دیا۔

”بس تو پھر ہم جاتے ہیں۔ تم اپنا کام نمٹالو۔“ اس نے سیسی کے گرد لپٹا بازو ہٹا لیا لیکن فوراً ہی اس کے ہاتھ میں گن دکھائی دینے لگی۔ اس گن کی جھلک نے ان دونوں کے دل بے مزاحمت کی رہی سیسی خواہش بھی ختم کر ڈالی۔ سیسی چپ چاپ آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی جبکہ فیضی نے اس کے اشارے پر باہر کا رخ کیا۔

”تم کچھ بھی کرو، خیال رکھنا کہ ہاتھیوں کی لڑائی میں ہم بیچارے سیدھے سادے اپنا کام دھندا کرنے والے نہ پس جائیں۔ ہماری تو کسی سے دشمنی ہے نہ دوستی۔ ہم تو اس دکاندار کی طرح ہیں جو ہر دام دینے والے کو سودا بیچ دیتا ہے۔ گا ہک کہاں سے آیا ہے اور کون ہے، اس سے ہمیں مطلب نہیں ہوتا۔“ وہ لوگ کچن کے راستے ہی باہر نکلے تھے اور اس دوران فیضی نے اپنا راگ الاپنا شروع کر دیا تھا۔

اس کی اس بے وقت کی راگنی نے وکی کو پوری طرح سمجھا دیا کہ دونوں بہنوں کی اصلیت کیا ہے۔

”یہ ادھر دیوار کے ساتھ کیا پڑا ہے؟“ جو کچھ اس نے کہا، اس پر تبصرہ کیے بغیر وہ اچانک ہی بولا تو فیضی نے جلدی سے گردن گھما کر اس کے اشارے کی سمت دیکھا۔ بس یہی ایک لمحہ وکی کے لیے کافی تھا۔ اس کا گن والا ہاتھ بلند ہوا اور دستے کی زوردار ضرب سے فیضی بری طرح تیور کر گرنے لگی۔ وکی نے گرنے سے پہلے ہی اسے سنبھال کر آرام سے زمین پر لٹا دیا۔ اس وقت وہ گھر کے عقبی حصے میں تھے اور فیضی اس عمارت اور چار دیواری کے درمیان موجود چوڑی گلی جیسی جگہ پر آرام سے سا گئی تھی۔ اس کی نبض اور سانسوں کی رفتار سے یہ اندازہ لگالینے کے بعد کہ وہ کم از کم بھی ڈیڑھ دو گھنٹے سے پہلے ہوش میں نہیں آئے گی، وہ جس طرح دیوار پھلانگ کر اندر آیا تھا، اسی طرح باہر چلا گیا۔ اس کی موٹر سائیکل اپنی جگہ موجود تھی۔ اسے اشارت کیے بغیر یونہی چلاتے ہوئے وہ عقب سے گھوم کر بیچلے کے پہلو میں آیا اور ایسی پوزیشن پر کھڑا ہو گیا کہ وہ خود تو مین گیٹ پر آنے والے کسی فرد یا گاڑی کو دیکھ سکے لیکن کسی کی اس پر نظر نہ پڑے۔ یہیں کھڑے کھڑے اس نے وائس میسج کے ذریعے لالہ کو اب تک کی صورت حال کی خبر دینے کے ساتھ تاکید کی کہ بندوں کو الٹ رکھے تاکہ جیسے ہی وہ باذل کے ٹھکانے پر پہنچ کر لوکیشن بھیجے، وہ لوگ اس کی مدد کے لیے آسکیں۔

ابھی وہ اس کام سے فارغ ہوا تھا کہ ایک سرخ شیراڑ آتی دکھائی دی اور حسب توقع یہی کے بیچلے کے گیٹ پر رک گئی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص نے گاڑی سے اتر کر کھٹی کا مٹن دبایا۔ اندر سے شاید یہی نے جواب دیا۔ وہ سر ہلاتا ہوا گاڑی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ ذرا دیر میں یہی باہر آئی اور گردن گھما کر ادھر ادھر دیکھا۔ یقیناً وہ فیضی کو تلاش کر رہی تھی۔ اپنی اس کوشش میں ناکام ہونے پر اس کے چہرے پر مایوسی دکھائی دی لیکن خیر گزری کہ اس نے اپنی زبان بند رکھی اور چپ چاپ گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ ڈرائیور نے اس کے لیے گاڑی کا دروازہ کھولا اور اس کے بیٹھنے کے بعد خود گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔ اس کے گاڑی اشارت کرنے کے ساتھ ساتھ وکی نے بھی اپنی بائیک کو کک لگائی اور جیسے ہی گاڑی تھوڑی سی آگے گئی، اس کے پیچھے چل پڑا۔ یہ کم سے کم بھی پون گھنٹے کا سفر تھا جس میں خود کو ڈرائیور کی نظروں سے بچائے رکھنے کے لیے اسے بہت احتیاط کرنا پڑی تھی۔

تعاقب کا یہ سلسلہ شہر کے آخری سرے پر ایک ایسی بستی میں جا کر برکا جہاں زیادہ تر غیر مقامی افراد آباد تھے۔ بستی میں زیادہ تر مکانات چھوٹے اور ایک منزلہ تھے اور چند ہی دو یا سہ منزلہ مکانات دکھائی دے رہے تھے۔ ان مکانات کو بناتے ہوئے کسی ترتیب کا خیال نہیں رکھا گیا تھا جس کے باعث گلیاں ٹیڑھی میڑھی تھیں اور ان کی حالت سے مکینوں کے طرز زندگی کا بھی اندازہ ہو رہا تھا۔

ادھر ادھر اڑتی پلاسٹک کی تھیلیاں، کچرے کے ڈھیر اور اچلتے گٹر صاف بتا رہے تھے کہ ان کی زندگیوں میں صحت و صفائی کے کسی اصول کا عمل دخل نہیں تھا۔ اگر دن کا وقت ہوتا تو شاید اس سب کے ساتھ گلیوں میں کھیلنے ننگ دھڑنگ بچے بھی دکھائی دے جاتے لیکن اس وقت ذرا سناٹا سا تھا اور ایک چائے کے ڈھابے اور گنی چنی کھلی دکانوں کے سوا کاروبار زندگی رکا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ روشنی بھی بہت کم تھی۔ اسٹریٹ لائٹس کا تو کچھ اتنا پتا ہی نہیں تھا۔ بس کچھ مکانوں کے باہر روشن بلب اور کھلے ڈھابے اور دکانوں کی روشنیوں نے اندھیرے کو ماحول پر مکمل طور پر حاوی ہونے سے روک رکھا تھا۔

یہی کو لے جانے والی گاڑی ایک سہ منزلہ مکان کے سامنے جا کر رکی اور ڈرائیور نے زور سے ہارن بجایا تو فوراً ہی مکان کا دروازہ کھل گیا۔ ڈرائیور نے گاڑی سے نکل کر پچھلا دروازہ کھولا۔

”یہ تم مجھے کس جگہ لے آئے ہو؟“ یہی کی آواز کافی بلند تھی اس لیے کچھ فاصلے پر موجود وکی تک بھی پہنچ گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ یہی تھوڑی سی پریشان ہے۔ ہائی سوسائٹی میں متحرک وہ رنگین تیلی جواب تک رنگ و نور کی دنیا سے لطف اندوز ہوتی رہی تھی اور اپنے قدردانوں کے ساتھ بڑی بڑی کوٹھیوں یا پر تعیش ہوٹلوں میں قیام کرتی رہی تھی، یقیناً اس ماحول میں آ کر پریشان ہو گئی تھی۔

”مجھے آپ کو جہاں پہنچانے کا حکم ملا تھا، وہیں لے کر آیا ہوں بی بی!“ ڈرائیور نے اکھڑے لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا۔

”تمہارا مطلب ہے باذل یہاں موجود ہے؟“ وہ بے یقین سی تھی۔

”کون کہاں ہے، مجھے نہیں معلوم۔ مجھے بس آپ کو یہاں لانے کا حکم ملا تھا۔“ اس کا لہجہ اب بھی پہلے جیسا تھا۔

”آئی ڈونٹ بلیواٹ کہ باذل مجھے ایسی جگہ بلوا سکتا ہے۔“ یہی اب بھی گاڑی سے نیچے اترتے ہوئے ہچکچا رہی

تھی۔ اسی وقت وکی نے مکان کے کھلے دروازے سے ایک دراز قد اور مضبوط جسم کے آدمی کو باہر آتے دیکھا۔ آدمی کے بال دراز تھے اور اس وقت ایک پونی ٹیل کی شکل میں جکڑے ہوئے تھے۔

”میرا تم.....؟“ وہ آدمی ڈرائیور کے برابر میں جا کر کھڑا ہوا تو وکی نے اسے پہچان کر حیرت کا اظہار کیا۔

”ہاں میں، اب تو تمہیں یقین آ جانا چاہیے کہ تم غلط جگہ پر نہیں آئی ہو۔“

”ہاں، لیکن میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو؟“ اس بار وہ گاڑی سے نیچے اتر آئی اور بولتی ہوئی میرو کے ساتھ مکان کے کھلے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ ان دونوں کے اندر داخل ہوتے ہی دروازہ بند ہو گیا۔ ایک اندھیرے کونے میں دیکے وکی کے وجود میں اس گفتگو نے سنسنی سی پھیلا دی تھی۔

”میں باذل کے قریب پہنچ چکا ہوں۔“ اس نے پیغام کے ساتھ ساتھ لالہ کو لوکیشن بھی بھجوائی۔

”اصغر اپنے آدمیوں کے ساتھ وہیں آ رہا ہے۔ میرو کے موبائل کی لوکیشن بھی اسی علاقے میں نکلی ہے۔“ لالہ کا جواب اس کے لیے تسلی بخش تھا۔ شاید موبائل کمپنی کے بندے نے میرو کا نمبر ٹریس کر کے لوکیشن بھیجنے میں سستی سے کام لیا تھا اسی لیے اصغر کی روانگی میں تاخیر ہو گئی تھی لیکن یہ اچھی بات تھی کہ وہ اسی طرف آ رہا تھا۔ ایک ایسی جگہ جہاں باذل اپنے آدمیوں کی نامعلوم تعداد کے ساتھ موجود تھا، اس کا اکیلے کوئی قدم اٹھانا ممکن نہیں تھا۔

اسے انتظار کرتے ابھی مشکل سے چند منٹ ہی گزرے تھے کہ ارد گرد سرگرمی سی محسوس ہوئی۔ آنے والے تین گاڑیوں میں آئے تھے اور سیاہ و چست لباسوں میں تاریکی کا حصہ بنے بہت خاموشی سے گلی میں پھلتے جا رہے تھے۔ ان کے قدم اتنے بے آواز تھے کہ گلی میں طاری سناٹا جوں کا توں قائم تھا اور یہاں سے کافی فاصلے پر موجود کھلے چائے کے ڈھابے پر بچتے گانے کی آواز ہنوز سنائی دے رہی تھی۔ فاصلے کی وجہ سے گانے کے بول سمجھ نہیں آ رہے تھے لیکن لے کانوں میں پڑ رہی تھی۔ اگر دن کا وقت ہوتا اور یہاں آوازیں ہوتیں تو یہ لے بھی محسوس نہیں ہوتی۔

گلی میں جتنے لوگ موجود تھے، اس حساب سے تو اس وقت بھی یہ لے سنائی نہیں دینی چاہیے تھی لیکن آنے والوں کی منظم اور پنی تلی حرکات نے سناٹے کو ٹوٹنے ہی نہیں دیا تھا۔ وکی جو پہلے لمحے پر انہیں اپنے ساتھی سمجھ کر اپنی کمین گاہ

سے نکلنے لگا تھا، ایک بار پھر واپس واپس گیا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے کام کرنے کے انداز سے واقف تھا اس لیے جان گیا تھا کہ آنے والے اجنبی ہیں۔ ایسے اجنبی جن کا مارگٹ وہی تھا۔ اس نے فوری طور پر کوئی ایکشن لینے کے بجائے خاموشی سے صورت حال کا جائزہ لینے کا فیصلہ کیا اور چپکے سے اصغر کو چند ہدایات بھیج دیں۔

☆☆☆

”کسی غلطی کی گنجائش نہیں۔“

”نہیں ہوگی میڈم! آپ بالکل بے فکر رہیں۔“

”کیسے بے فکر رہوں؟ ہر روز مجھے زک پر زک پہنچ رہی ہے۔ برسوں کا بتایا سیٹ اپ بگڑنے لگا ہے اور تم کہتے ہو بے فکر رہوں۔“ وہ جو مضطرب سی کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہل رہی تھی، تسلی دینے والے پرالٹ پڑی۔

”وہ کل کالز کا معاذ جسے میں نے ہر طرح سے بے بس کر دیا تھا، آئے دن مجھے کوئی نئی چوٹ دے جاتا ہے۔ اب تک میں خود کو یہ تسلی دیتی تھی کہ جو کچھ ہوا، میری نظروں سے دور کہیں کسی اور جگہ ہوا اور اس ہونے میں دوسروں کی نااہلی شامل ہے لیکن اس بار.....“ اس نے زور سے اپنی مٹھیاں بھیجنیں۔

”اس بار تو وہ براہ راست مجھے دھوکا دے کر نکل گیا اور تم نے دیکھا کہ کس طریقے سے نکلا کہ ہمارا سارا انتظام دھرے کا دھرا رہ گیا۔“ وہ تاؤ پڑتاؤ کھا رہی تھی۔

”وہ اس کام میں تنہا نہیں تھا میڈم! اسے کوئی بہت طاقتور سپورٹ حاصل تھی۔ اس کو فرار کروانے کے لیے جو ڈرون استعمال کیا گیا، اس کی تو پاکستان میں موجودگی کی ہی ہمارے پاس کوئی اطلاع نہیں۔ یہ کوئی اور طاقت ہے جو اس کا ساتھ دے رہی ہے۔ آپ دیکھیں کہ کمال تو یہ ہوا ہے کہ اس پوری سڑک پر ہمیں کسی ایک سکیورٹی کمرے کی ریکارڈنگ نہیں مل سکی ہے۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک مشہور اور معروف سڑک پر نصب سارے کے سارے کمرے بیک وقت آڈٹ آف آرڈر ہو جائیں۔ یہ سب جان بوجھ کر کیا گیا ہے تاکہ ہمارے ہاتھ کوئی کلیو نہ لگ سکے۔“ وہ دلائل سے میڈم ایکس کا صدمہ کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”خیر، جو ہوا اسے بدلاتو نہیں جاسکتا لیکن اب جو ہمیں ایک سنہری موقع ملا ہے اس سے فائدہ اٹھانا ضروری ہے۔ معاذ کی دوست بشری کا ہاتھ آ جانا اعظم کو کھودینے کی طمانی بن سکتا ہے۔ تم لوگوں کو اسے ہر حال میں یہاں لانا ہے۔ کسی نقصان، کسی جوابدہی کی پروا کیے بغیر ہر حد سے

کمین گاہ کے بارے میں آگاہ کر دیا تھا اور اس بار عرفان اللہ نے براہ راست باذل سے الجھنے کے بجائے میڈم ایکس کو اس کے ٹھکانے کے بارے میں آگاہ کر دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جب باذل، میڈم ایکس جیسی طاقتور عورت سے شکست کھائے گا تو اس کا دماغ خود بخود ٹھکانے پر آجائے گا۔

ان لوگوں کو عرفان اللہ کے مقاصد سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ انہوں نے بشریٰ تک پہنچنے کے لیے فوری طور پر اپنی منصوبہ بندی شروع کر دی تھی۔ ان کے آدمی سبز مین کے روپ میں اس پورے علاقے کو اچھی طرح دیکھ آئے تھے۔ جدید ٹیکنالوجی سے جو مدد ملی گئی تھی وہ اپنی جگہ تھی۔ باذل کی مذکورہ کمین گاہ اور اس کے آس پاس کے سارے علاقے کے بارے میں ممکنہ معلومات حاصل کرنے کے بعد اب وہ لوگ کارروائی کے لیے بالکل تیار تھے۔ میڈم ایکس اس موقع پر عملی طور پر ان کے ساتھ شامل نہیں ہو سکتی تھی اس لیے سختی سے ہدایات دینے کا سلسلہ جاری تھا۔ آخر یہ کام مکمل ہوا اور تین گاڑیوں میں سوار اس کے ہر کارے کسی ناگہانی آفت کی طرح باذل پر ٹوٹ پڑنے کے لیے روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

”سیسی..... مائی ڈارلنگ! میں کتنی شدت سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ تمہارے بغیر آج کی رات کا لطف ادھورا رہ جاتا۔“ میرد کی معیت میں جیسے ہی سیسی کمرے میں داخل ہوئی، باذل نے اسے دیکھ کر ہانک لگائی اور گلے لگا کر پرتپاک استقبال کیا۔

”کیسے ادھورا رہ جاتا؟ تمہاری پکار پر سیسی تمہاری خدمت میں حاضر نہ ہوتی، یہ تو ممکن ہی نہیں تھا۔“ وہ اگرچہ اندر سے پریشان تھی لیکن اس کے کاروبار کا اصول تھا کہ اپنی پریشانی کو خود تک محدود رکھ کر گاہک کو ہر حال میں خوش رکھا جائے۔

”تمہاری یہی ادا تو مجھے بار بار تمہاری یاد دلاتی ہے ورنہ یہاں تو سالی ایسی عورتیں بھی ہیں جنہیں آساکشوں سے لادو پھر بھی آپ کی وفادار نہیں بنتیں۔“ اسے مہناز یاد آگئی تو تلخ لہجے میں بولا۔ دنیا کی بے شمار عورتوں کو چھک لینے کے باوجود اس کے لیے مہناز ہمیشہ خاص عورت رہی تھی۔ وہ ساری دنیا کے تجربات کرنے کے بعد پلٹ کر اس کی طرف ضرور جاتا تھا اور اس کے خاص ہونے کے انعام کے طور پر اسے بے تحاشا نوازا جاتا تھا لیکن یہ بات کبھی نہیں سمجھ سکا تھا کہ اس کا اور مہناز کا تعلق ضرورت اور مجبوری کا تھا۔ اسے اپنی تسکین کے لیے مہناز کی ضرورت تھی تو مہناز بھی اپنے

آگے نکل جانا لیکن اس لڑکی کو مجھ تک ضرور پہنچانا۔ میں معاذ کو بتانا چاہتی ہوں کہ میرے ساتھ کیے ہوئے دھوکے کا کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔“ وہ ایک چوٹ کھائی ہوئی ناگن تھی جسے ہر حال میں معاذ کو زک پہنچانی تھی۔ معاذ اس کے پورے کیریئر پر ایک بدنما داغ تھا۔ وہ اس پر خاصی سرمایہ کاری کرنے کے باوجود اس سے مطلوبہ فوائد حاصل کرنے میں ناکام رہی تھی۔ ہر فہم ایک صدمہ کم نہیں تھا کہ اس نے سونیا کو اس سے چھین لینے کی جسارت بھی کر ڈالی تھی۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ اس کا اپنا خون اسے دھوکا دے گیا۔ باوجود اس کے کہ اس نے اس کی پرورش کرنے میں مخصوص ماحول کا انتظام کیا تھا اور اسے ایسے لوگوں میں رکھا تھا جو پوری محنت سے اسے اسرائیل کا وفادار و جاں نثار بنانے کی جدوجہد کرتے رہے تھے۔ یہ ساری محنت ایک لڑکے کی محبت میں رائیگاں چلی گئی تھی اور وہ دن رات یہ سوچ کر پاگل ہوتی رہتی تھی کہ کبھی اگر سونیا اس کے مد مقابل آگئی تو وہ اس کے ساتھ کس طرح پیش آئے گی۔

”اس بار ہم اسے سبق ضرور دیں گے۔ میرا آپ سے وعدہ ہے کہ جلد بشریٰ یہاں آپ کے سامنے حاضر ہوگی لیکن میری آپ سے استدعا ہے کہ ایک بار اس بات کی کھوج ضرور لگائیں کہ معاذ کے پیچھے کون ہے؟ اس کی طاقت توڑنے کے لیے ہمارے لیے اس کے سپورٹرز کے بارے میں جاننا ضروری ہے۔“ اس شخص نے میٹلم پر زور دیا۔

”میں خود بھی اس بات کو سمجھتی ہوں۔ میرا بھی یہ اندازہ ہے کہ یہ سپورٹ اسے انڈیا کے منظر سے غائب ہونے کے بعد کہیں سے ملی ہے۔ وہ اور اس کے ساتھی اس درمیانی عرصے میں غائب رہے ہیں۔ یقیناً اپنے سپورٹرز کے زیر سایہ رہے ہوں گے اور اب اسی کے سہارے یہاں پہنچے ہیں۔ کسی حد تک مجھے ان سپورٹرز کے بارے میں اندازہ بھی ہے لیکن کوئی قدم اٹھانے سے پہلے ٹھوس ثبوت حاصل ہونا ضروری ہے۔“ وہ بات کرتے کرتے گہری سوچ میں چلی گئی۔

”آپ نے ہمیشہ بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس بار بھی کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔ مجھ سمیت آپ کے سارے وفادار آپ کی پوزیشن برقرار رکھنے کے لیے اپنی جان لڑا دیں گے۔“ وہ میڈم ایکس کے قریبی لوگوں میں سے ایک تھا اور اسے اپنی وفاداری کی یقین دہانی کروا رہا تھا۔ وہ اس وقت سے معروف تھا جب عرفان اللہ نے کال کر کے بشریٰ کی باذل کے پاس موجودگی کا انکشاف کیا تھا۔ باذل کے لوگوں میں شامل عرفان اللہ کے ممبر نے اسے باذل کی موجودہ

معاشی مسائل حل کرنے کے لیے اسے برداشت کرنے پر مجبور تھی۔ ضرورت اور مجبوری کے اس سنگم میں بھلاؤ فاداری کا کیا ذکر تھا اور ایسے میں مہنازا سے چھوڑ کر کسی مظلوم کے ساتھ کھڑی ہو گئی تھی تو یہ کوئی غیر متوقع یا تعجب خیز بات نہیں تھی۔

”کسی بے وفا کو یاد کرنے میں اپنا وقت کیوں برباد کرتے ہو۔ بس اسے دیکھو جو تمہیں اہمیت دیتا ہے۔“ سبکی کے لیے عورت کی بے وفائی کا رونا روتا مرد کوئی انوکھا تجربہ نہیں تھا۔ اسے ایسے بے شمار مرد ملے تھے جو کسی کی بے وفائی کا غم بھلانے کے لیے اس کی بانہوں کا سہارا لیتے تھے۔ ایسوں کا غم غلط کرتے ہوئے وہ ہر بار دل میں ہنستی تھی کہ محبوب کی بے وفائی کا شکوہ کسی عورت کی بانہوں میں کرنے والا خود وفا کے کس درجے پر ہوتا تھا۔

”دیکھ رہا ہوں اور پوری رات دیکھوں گا لیکن پہلے اس پدی کا تو شور بابتادوں جو باذل کو نیست و نابود کرنے کا خواب دیکھ رہی تھی۔“ اس نے سبکی کی ٹھوڑی کے نیچے دو انگلیاں رکھ کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ یہ وہی ہوس اور غلاطت سے بھری ہوئی آنکھیں تھیں جن سے شریف زادیاں تو شریف زادیاں، سبکی جیسی کال گرل بھی خائف ہو جاتی تھی۔

”میں سمجھی نہیں۔“ سبکی نے اس کے چہرے پر موجود پراسرار مسکراہٹ کو الجھ کر دیکھا۔

”وہ دیکھو۔“ باذل نے اس کے شانے تمام کر اس کا رخ بدلا۔ وہ جو کمرے میں داخل ہوتے ہی باذل کی طرف متوجہ ہو گئی تھی اور ارد گرد کا جائزہ لینے کی زحمت نہیں کی تھی، مشکل سے اپنی چیخ روک سکی۔

”یہ..... یہ کون ہے؟“ اس نے ایک رسی کی مدد سے چھت سے الٹے لٹکتے اس نیچے سے وجود کی طرف اشارہ کیا جس کا چہرہ اچھا خاصہ بد صورت تھا۔

”یہ وہ جیونٹی ہے جو باذل کو کانٹے کے شوق میں سلی گئی ہے پھر بھی اپنے شوق سے دستبردار نہیں ہوئی۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آج اس کا کافی دشانی علاج کر دیا جائے۔“ وہ طنز سے بولا۔ جواب میں سبکی نے الٹے لٹکے وجود کی آنکھوں میں گہری نفرت اٹھائی دیکھی۔ اگر اس کے منہ کو پکڑا ٹھونس کر بند نہ کر دیا گیا ہوتا تو یقیناً وہ اس نفرت کا اظہار الفاظ میں بھی کرتی۔ سبکی اس صورت حال پر ایک جھرجھری سی لے کر رہ گئی لیکن باذل کو اس کی کیفیت کا اندازہ نہ ہوا اور اس کی کمر کے گرد اپنا بازو لپیٹتے ہوئے بولا۔

”کم آن بے بی! اس رات کو مزید پُر لطف بنانے

کے لیے پہلے لال پری سے دل بہلاتے ہیں۔“ وہ اسے اپنے ساتھ لگائے اس صوفے تک لے گیا جس کے سامنے پڑی میز پر پینے پلانے کے لوازمات، بھنے گوشت کے پارچے اور خشک میوہ جات سجے تھے۔

”دیکھ رہی ہو یہ نعمتیں؟ یہ سب میرے وفادار میر و کا بندوبست ہے۔ ہم مرد عورتوں کی طرح بے وفا نہیں ہوتے کہ ذرا سے حالات بدلتے ہی اپنی وفاداریاں بدل لیں۔ ہم ساتھ نبھاتے ہیں۔ میر و بھی ایک ایسے وقت میں میرا ساتھ دے رہا ہے جبکہ میرے حالات مکمل طور پر بدل چکے ہیں۔ دیکھو، اس کمرے کو غور سے دیکھو۔ کیا باہر سے گزرتا کوئی شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس پھلچر محلے کے اس معمولی سے مکان میں باذل کو ایسا شاندار سجا سجا یا کرا اور ایسی شاندار نعمتیں مل سکتی ہیں۔“ اس نے کمرے میں موجود قیمتی اشیاء کی جانب ہاتھ گھماتے ہوئے آخر میں میز پر سجے لوازمات پر لا کر روکا۔ اس موقع پر سبکی کو پہلی بار احساس ہوا کہ باذل ذہنی طور پر ڈسٹرب ہے اور پہلے سے ہی اچھا خاصا پیے ہوئے ہے۔ وہ حالات سے واقف نہیں تھی کہ زبان سے اسے تسلی دیتا چنانچہ اپنے ہاتھ کی گردش سے اس کے تناؤ کو کم کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

”جام بناؤ۔“ باذل نے اسے حکم دیا تو ہونٹوں پر ایک مصنوعی مسکراہٹ سجائے وہ اس کام میں جت گئی۔ گھر پر جو کچھ اس کے اور فیضی کے ساتھ جیتا، اس کا ذکر باذل کے سامنے کرنے کا جو تھوڑا بہت خیال دل میں موجود تھا، وہ بھی نکل گیا۔ باذل کا کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ سب سن کر اپنے خراب موڈ کا سارا نزلہ اسی پر گرا دیتا۔

”باس!“ ابھی سبکی نے جام تیار کر کے باذل کے ہونٹوں سے لگایا ہی تھا کہ میر و جو سبکی کو یہاں چھوڑنے کے بعد واپس چلا گیا تھا، کچھ گھبرایا ہوا سا وارد ہوا۔

”کیا بات ہے بے، یہ تیرے چہرے پر ہوئیاں کیوں اڑ رہی ہیں؟“ باذل نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔

”حسن کی کال آئی ہے۔ وہ آپ کے حکم پر چاول کے گودام میں پہنچنے والا مال وہاں سے شفٹ کروانے گیا تھا۔ پیکنگ دیکھتے ہی اسے شک ہو گیا کہ یہ وہ مال نہیں ہے جو ہونا چاہیے تھا۔ اس نے کاؤنٹر کھلوا کر دیکھے تو اندر سے کپڑا، دھواگا اور دوسری الابلانگی۔ اب وہ پوچھ رہا ہے کہ آگے کیا کرنا ہے؟“ میر و نے ایک سانس میں ساری بات بتا ڈالی۔

”کیا کرنا ہے، مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟ تم لوگوں میں

خود عقل نہیں کہ اس سارے فیروز حسن کی گردن دبوچو۔ اس وقت اس کے سوا ہمارے ساتھ یہ دھوکا کوئی اور کر ہی نہیں سکتا۔“ باذل، یہی کو پر نے دھکیل کر دھاڑتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ اس کے اس اچانک رد عمل پر نہ صرف یہی صوفے پر لڑھک گئی بلکہ اس کے ہاتھ میں موجود جام بھی الٹ گیا جس سے بہنے والے مشروب نے صوفے کے ساتھ ساتھ قالین کے کچھ حصے کو بھی خراب کر ڈالا تھا۔

”میں..... میں دیکھتا ہوں۔“ میرا باہر کی طرف دوڑا۔ ”باذل کو اس طرح کوئی نہیں ہراسکتا۔ میں دیکھ لوں گا۔ میں اپنے ایک ایک دشمن کو دیکھ لوں گا۔“ وحشت زدہ سا باذل بلند آواز میں چیخا اور جنوبی سی کیفیت میں چھت سے الٹی لنگی بشری کی طرف بڑھا۔ یہی نے یہ دیکھ کر اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا کہ اس کے ہاتھ میں تیز دھار والا ایک چھوٹا سا چاقو دبایا ہوا ہے۔ اس نے اس چاقو سے بشری کے بازو پر ایک زوردار وار کیا۔ منہ بند ہونے کی وجہ سے وہ چیخ تو نہ سکی لیکن اس کا پورا جسم بری طرح پھڑک کر رہ گیا۔ یہی نے خوف کے عالم میں ایک زوردار چیخ ماری۔ ابھی اس کی چیخ کی گونج تھی نہیں تھی کہ نضا فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔

☆☆☆

وکی کے دیکھتے ہی دیکھتے گلی میں گھومتے اجنبی سارے باذل کی کمین گاہ کو گھیر چکے تھے اور اب اس پر حملہ آور ہونے کے لیے پوری طرح تیار نظر آرہے تھے۔ اس نے اپنی ہدایت پر کچھ دور رک جانے والے اصغر اور اس کے ساتھیوں کو الٹ رہنے کا پیغام دیا اور جیسے ہی نضا میں پہلی گولی کی آواز گونجی، انہیں بھی حرکت میں آنے کا حکم دے ڈالا۔ یہ اس کے حکم کا نتیجہ تھا کہ حملہ آوروں کی گاڑیوں پر اچانک ہی دھاوا بول دیا گیا۔ گاڑیوں میں موجود افراد کی توجہ کا اصل مرکز اپنے ساتھیوں کی کارروائی تھی چنانچہ اصغر اینڈ کمپنی کا حملہ ان کے لیے قطعی غیر متوقع ثابت ہوا۔ اصغر اور اس کے ساتھیوں نے بھی کچھ ایسی تیزی دکھائی کہ انہیں سنبھلنے اور کچھ سمجھنے کا موقع ہی نہیں ملا اور پہلے ہی تلے میں وہ ریت کی بھر بھری دیوار کی طرح ڈھے گئے۔

وکی اس ساری کارروائی سے قبل حملہ آوروں کے ساتھ ہی شامل ہو کر مکان میں داخل ہونے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اب مکان کے اندر موجود افراد کی طرف سے بھی رد عمل میں فائرنگ کی جارہی تھی لیکن وہ اس جوابی کارروائی میں تاخیر کا شکار ہو گئے تھے۔ یہ ان کی حماقت تھی کہ باذل کی یہاں موجودگی کے باوجود پہرے اور حفاظت کا ایسا کوئی

خاطر خواہ انتظام نہیں کیا تھا کہ علاقے اور گلی میں ہونے والی مشکوک حرکات و سکنات سے پیشگی آگاہ ہو کر کوئی موثر کارروائی کر پاتے۔ اپنی اس غفلت کا انہیں بھیا تک نتیجہ بھگتنا پڑ رہا تھا۔ حملہ آور خطرناک ہتھیاروں اور پوری تیاری کے ساتھ آئے تھے اور منٹوں سیکنڈوں میں چھا بھی گئے تھے لیکن ان کے لیے بھی باہر ہونے والی فائرنگ ایک غیر متوقع صورت حال تھی۔

”باہر کیا ہو رہا ہے؟ میں باہر موجود ساتھیوں سے رابطے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن ان کی طرف سے کوئی جواب نہیں مل رہا۔“ وکی جس نے ان لوگوں کے ساتھ شامل ہو کر اندر داخل ہونے کے سوا کسی کارروائی میں عملی حصہ نہیں لیا تھا اور وہیں چلی منزل پر ہی ایک محفوظ گوشے میں دبک گیا تھا، اپنے قریب سے سنائی دینے والی سرگوشی پر متوجہ ہوا۔ دو سیاہ پوش اس کے بہت قریب موجود تھے لیکن چلی منزل کی روشنیاں بجھا دیے جانے کے باعث وہ پہلے انہیں نہیں دیکھ سکا تھا۔

”شاید ان کے کچھ ساتھی باہر کہیں چھپے ہوئے تھے جن کی موجودگی کا ہمیں علم نہیں ہو سکا اور اب انہوں نے ہی ہمارے ساتھیوں کے خلاف کارروائی شروع کر دی ہے۔ ہمیں باہر جا کر اپنے ساتھیوں کی مدد کرنی ہوگی۔“ دوسرے سارے کے لہجے میں بھی فکر تھا۔

”یہاں کے معاملات باقی ساتھی سنبھال لیں گے۔ ہم باہر جا کر دیکھتے ہیں۔“ پہلے والے نے تجویز دی تو دونوں نے باہر کی طرف پیش قدمی کی۔ یہی موقع تھا جب وکی نے اپنی گن نکالی اور ان پر فائرنگ کر دی۔ ایک کی پشت اور دوسرے کے کولہے میں گولیاں پھوست ہوئیں اور دونوں چیختے ہوئے زمین بوس ہو گئے۔

”کیا سچویشن ہے؟“ اوپری منزل سے ہنوز فائرنگ اور چیخ پکار سنائی دے رہی تھی۔ وکی نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر سیریزھوں پر نظر رکھتے ہوئے باہر موجود اصغر سے رابطہ کیا۔

”سب کنٹرول میں ہے۔“ اس نے رپورٹ دی۔

”کچھ ساتھیوں کو باہر نگرانی پر چھوڑ کر اندر آؤ۔“ اس نے حکم جاری کیا۔ اسی وقت سیریزھوں پر ایک سایہ لہرایا۔ اس نے ہاتھ سیدھا کیا اور اس طرف ایک فائر جھونک دیا۔ سایہ ایک کر یہہ چیخ کے ساتھ لڑکھڑاتا ہوا سیریزھوں سے نیچے آ رہا۔ نیچے گرنے کے بعد اس نے حرکت نہیں کی لیکن پہلے گولی کھا کر گرنے والوں میں سے وہ جس کے کولہے میں

اس کے بس میں نہیں تھا۔

”تم لوگ اسے لے کر جاؤ اور راستے میں لالہ کو فون کر کے اطلاع دو تا کہ تمہارے اسپتال پہنچنے سے پہلے وہاں سب انتظام موجود ہو۔“ اس نے جلدی جلدی ہدایات جاری کیں اور پھر باقی کے چار ساتھیوں کے ساتھ اوپری منزل کی طرف پیش قدمی کی۔ وہی کو جس حالت میں اسپتال روانہ کیا تھا، اس نے اسے اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ لالہ کے نزدیک وہی کی کیا اہمیت ہے اور اس خبر کو سن کر وہ کس جذباتی صدمے سے دوچار ہوگا اسی لیے خود سے اسے یہ خبر دینے کی بھی ہمت نہیں کر سکا تھا۔ پھر یہاں فرصت بھی کہاں تھی۔ فائرنگ کی آوازوں سے کان سنسنائے جا رہے تھے لیکن یہ بہر حال محسوس ہو رہا تھا کہ اوپر اب مزاحمت دم توڑ رہی ہے۔

وہ ایک دوسرے کو کور دیتے ہوئے اوپر پہنچے۔ لینڈنگ پر پہنچنے ہی ان پر گولیاں برسائی جانے لگیں۔ اصغر نے نیچے بیٹھ کر خود کو ان گولیوں کی زد میں آنے سے بچایا۔ اس دوران وہ دیکھ چکا تھا کہ فائرنگ کرنے والا سیرھیوں کے اختتام پر بائیں جانب موجود ہے اور اس نے وہیں سے نکل کر ان پر فائر کیا تھا۔ وہی کو گولی لگنے کے بعد سے اس کے دماغ میں پہلے ہی چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ اس وقت غم و غصے نے مل کر اسے جنون میں مبتلا کر دیا اور نتائج کی پروا کیے بغیر کسی بگولے کی طرح باقی رہ جانے والے چند قدمے طے کر کے اوپر پہنچا اور دوبارہ فائر کرنے کی حسرت دل میں لے کر اپنی کمین گاہ سے نکلنے والے دشمن کو گولیوں سے بھون کر دکھ دیا۔ اس کے ساتھی جو اس کی اس جنونی پیش قدمی پر لمحہ بھر کے لیے دم بخود رہ گئے تھے، تیزی سے حرکت میں آئے اور خود بھی جارحانہ انداز اختیار کیا۔ ان کی اس تیزی اور جارحیت نے پھر کسی کو ان کے سامنے ٹکنے نہیں دیا۔ لمحوں میں میدان صاف کر کے وہ بالائی منزل کا جائزہ لینے لگے۔ وہاں زیادہ تر لاشیں تھیں یا چند ایک انتہائی زخمی افراد۔ باذل کا کہیں کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ ایک کمرے میں داخل ہو کر اصغر دھک سے رہ گیا۔ اس کے سامنے بشری چھت سے بندھی سی سے الٹی لگی تھی اور اس کے عین نیچے کارپٹ پر خون کا بڑا سا دھبا دکھائی دے رہا تھا۔ یہ خون بشری کے جسم سے بہتا ہوا نیچے گر رہا تھا اور بالکل ایسا منظر تھا جیسے کسی بکرے کو کھال اتارنے کے لیے لٹکایا گیا ہو۔ اس نے پھرتی سے آگے بڑھ کر اس کے لٹکے ہوئے جسم کو تمام لیا۔ اس کا پس پا کر بشری نے آنکھیں کھولیں تو اسے تھوڑا سا

گولی لگی تھی، کچھ دیر بے حس و حرکت پڑے رہنے کے بعد خود پر قابو پا چکا تھا۔ اپنی جگہ پڑے پڑے اس نے وہی کی کمین گاہ کا بھی اندازہ لگالیا تھا اور اب چپکے سے نیچے گر جانے والی اپنی گن ٹول کر اپنے قبضے میں کر لینے کے بعد اس کو نشانہ بنانے کی تاک میں تھا۔ اس کی مجبوری تھی کہ وہ جس جگہ گرا ہوا تھا، اس جگہ پڑے پڑے درست نشانہ لگانا ممکن نہیں تھا چنانچہ زخم سے انتہی شدید ٹیسوں کو ہونٹ بھیج کر برداشت کرتے ہوئے اپنے جسم کو ذرا سا اوپر اٹھایا۔

وہی کو داخلی راستے سے اپنے ساتھیوں کے سوا کسی کی آمد کا خدشہ نہیں تھا اس لیے اپنی ساری توجہ سیرھیوں اور اوپر سے آتی آوازوں پر مرکوز کر رکھی تھی۔ اسے قطعی علم نہیں تھا کہ اس پر کون سی آفت ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار ہے۔ علم اس وقت ہوا جب فائر کی تیز آواز اور اپنی پشت میں اترنے والے دھکتے لوہے کی تکلیف یکجان ہوئی۔ نیچے گرنے سے قبل وہ صرف یہ دیکھ سکا کہ اس کے ساتھی مکان کے کھلے دروازے سے اندر داخل ہوئے ہیں اور انہوں نے اسے نشانہ بنانے والے کو سر میں گولی مار کر جہنم رسید کر دیا ہے۔ جب تک اصغر اس تک پہنچا، اس کا سانس سینے میں اٹکنے لگا تھا۔

”شہزادے.....!“ اصغر روشنی کی کمی بلکہ تقریباً تاریکی کے باوجود سیدھا لپک کر اس کی طرف آیا اور اس کے نیچے گرے ہوئے وجود کو اپنی بانہوں میں سمیٹنے کی کوشش کی۔ اس کے ہاتھوں نے فوراً اس کے جوان خون کی گرمی اور چیچھاہٹ کو محسوس کیا۔

”روشنی کرو اوئے.....“ نتائج کی پروا کیے بغیر وہ حسبِ عادت جملے میں ایک عدد گالی ٹانگتے ہوئے پوری شدت سے دھاڑا۔ فوراً ہی ایک ٹارچ روشن ہوئی اور اس سے نکلنے والی روشنی کے حلقے نے تیزی سے بہتے خون اور وہی کی الٹی آنکھوں کو اپنی گرفت میں لیا۔ اصغر کے دل کو کسی نے منہی میں بھیج لیا۔

”اسپتال..... اسپتال لے کر چلو اسے۔“ وہ بھی بھی آواز میں چلا آیا۔ کئی ہاتھ اس کی مدد کو لپکے۔ کسی نے خون کا بہاؤ کم کرنے کے لیے اپنی قمیص اتار کر اس کے زخم پر رکھی، کسی نے اس کے ڈھیلے پڑتے جسم کو اپنے ہاتھوں میں سنبھالا۔ یوں اس کو وہاں سے اٹھا کر باہر لے جایا جانے لگا۔ اصغر بھی بے خودی کی کیفیت میں ان لوگوں کے ساتھ شامل ہونے لگا تھا کہ فائرنگ کی تیز آوازوں نے اسے ایک جھٹکا سا لگایا اور اسے اس حقیقت کا ادراک ہوا کہ وہ یہاں ایک مشن پر آیا تھا اور اس مشن کی تکمیل تک یہاں سے ہلنا

اطمینان ہوا کہ وہ زندہ ہے۔

صورت حال کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مسلسل برستی گولیوں میں کسی کی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ زور سے سانس بھی لے سکے۔

”چلو۔“ اس کے دونوں ساتھی لڑکی سمیت گاڑی کی پچھلی نشست پر بیٹھ ہی رہے تھے کہ دور سے پولیس کی گاڑی کا سائرن سنائی دیا جسے سن کر اس نے اضطرابی لہجے میں حکم دیا اور ساتھ ہی پولیس کی کارکردگی کے بارے میں بھی سوچا۔ جب تک وہاں ہنگامہ برپا رہا تھا، پولیس کا نام و نشان نہیں تھا اور اب خاموشی چھاتے ہی وہ شور مچاتے ہوئے فرض کی بجائے آوری کے لیے نکل پڑے تھے۔

”نام کیا ہے تمہارا؟“ اس نے اپنی آستین اور قیص کے دامن پر لگے دکی کے خون کے دھبوں سے نظر جراتے ہوئے عقب نما آئینے میں نظر آتی لڑکی سے سوال کیا۔

”سیکی!“ اس نے اٹھیاں مروڑتے ہوئے مختصر جواب دیا۔

”بازل سے کیا تعلق ہے تمہارا؟“

”دوست سمجھ لو۔“ اس نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا تو اصغر کو خود بخود اس کی حیثیت کا ادراک ہو گیا۔

”یہاں اس جگہ کیوں اس سے ملنے آئی تھیں؟“ گلیوں میں چکراتے وہ اس علاقے سے کچھ دور نکل آئے تھے لیکن اب بھی پولیس موبائل کے سائرن کی ہلکی آواز کانوں تک پہنچ رہی تھی بلکہ اب اس آواز میں ایسولینس کا سائرن بھی شامل ہو گیا تھا۔ وہ جرم کی دنیا کا فرد تھا اور بغیر دیکھے بھی جائے وقوعہ کا منظر جانتا تھا۔ افسران کی تیز آوازیں، کچے کچے ماہرین کی کارروائیاں، فون کی بجتی گھنٹیاں، میڈیا کی بھاگ دوڑ، لاشوں اور زخمیوں کی جائے وقوعہ سے منتقلی، آس پاس والوں کے بیانات اور دوسری دسیوں پنچائیتیں..... جس کا کہیں کوئی نتیجہ نہیں لکھتا تھا۔

”روزی روٹی کا معاملہ ہے۔ جہاں سے بھی بلاوا آئے، پہنچ جاتے ہیں۔“ اس کے جواب نے اصغر کے اندازے کی تصدیق کر دی۔

”تمہارا ہونٹ کیسے پھٹا؟“ اصغر کو اس کے متعلق معلومات حاصل کرنے سے اتنی دلچسپی نہیں تھی جتنا وہ سوال جواب کے اس سلسلے میں الجھ کر اپنا دھیان بٹانے کی کوشش کر رہا تھا پھر بھی رہ رہ کر اس کی نظر اپنے لباس پر موجود خون کے دھبوں پر چلی جاتی تھی اور جتنی بار ایسا ہوتا تھا، اس کا دل پوری شدت سے سکڑ کر پھیلا تھا۔ وہ جولالہ کی ناک کا بال اور ان سب کی آنکھوں کا تارا تھا جس طرح رکتی سانسیں

”وہ چھت کے راستے سے بھاگا ہے، میں نے سنا تھا۔ وہ اور میری چھت پر جانے کی بات کر رہے تھے۔“ اس نے بہت دھیمی آواز میں انک انک کر اصغر کو بتایا تو وہ اس کے نام لیے بغیر ہی سمجھ گیا کہ وہ بازل کی بات کر رہی ہے۔

”بازل اور اس کے ساتھی کو اوپر چھت پر دیکھو۔“ اسے امید نہیں تھی کہ بازل اب اسے مل سکے گا پھر بھی اپنے دو آدمیوں کو اوپر دوڑایا اور خود دو افراد کے ساتھ مل کر بشری کو نیچے اتارنے لگا۔ اس دوران اس نے جائزہ لے لیا تھا کہ گولی اس کے کندھے میں لگی ہے اور زخم سے زیادہ خون کا وہ بہاؤ خطرناک ہے جس نے اس کے چہرے کو زرد کر ڈالا ہے۔ نیچے اتارنے کے مختصر سے عرصے میں وہ دوبارہ آنکھیں بند کر چکی تھی اور اصغر کا اندازہ تھا کہ وہ بے ہوش ہے۔ اس نے اسے بھی اسی اسپتال منتقل کرنے کا حکم جاری کیا جہاں دکی کو لے جایا گیا تھا۔ وہ سب ممکنہ تیزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گاڑیوں میں منتقل ہوئے۔

”یہ کون ہے؟“ ابھی بشری کو اسپتال کے لیے روانہ کیا ہی گیا تھا کہ اس کے ساتھی اوپر چھت پر جانے والی سیر دیووں سے ایک طرح دار لڑکی کو دھکیلے ہوئے نیچے لے کر آئے۔ لڑکی جی سنوری تھی لیکن اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور نچلا ہونٹ بھی پھٹا ہوا تھا۔ اصغر نے اس لڑکی کے بارے میں اپنے ساتھیوں سے استفسار کیا تھا۔

”یہ اوپر چھت پر چھپی ہوئی تھی۔ اس نے ہمیں بتایا کہ بازل اور اس کا قریبی ساتھی میری فائرنگ شروع ہونے کے تھوڑی دیر بعد ہی اوپر چھت سے پیچھے والے گھر کی چھت پر کود کر فرار ہو گئے ہیں۔ بازل اسے بھی ساتھ لے جانا چاہتا تھا لیکن دونوں گھروں کی چھتوں کا درمیانی فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ یہ ہمت نہیں کر سکی۔“ ان میں سے ایک نے اس کے سوال کا تفصیلی جواب دیا تو وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ خدشات کے عین مطابق بازل چھت کے راستے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

”اسے گاڑی میں بٹھاؤ۔ اس کا تفصیلی تعارف ٹھکانے پر پہنچ کر حاصل کریں گے۔“ ہدایات دے کر وہاں رکے بغیر وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ باہر اب ان کی صرف ایک گاڑی باقی رہ گئی تھی۔ ڈرائیور کے ساتھ والی نشست پر بیٹھے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ اب تک مردوں کی طرح خاموشی سے اپنے گھروں میں دبکے آس پاس کے مکین دروازوں کی درز اور نیم وا کھڑکیوں سے باہر جھانک کر

کے ساتھ اسپتال کے لیے روانہ کیا گیا تھا، اسے سوچ سوچ کر اسے اپنی سائیں رکتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ وہ چاہتا تھا کہ فون کر کے کسی سے اس کا حال دریافت کر لے لیکن ہر بار ہمت ٹوٹ جاتی تھی کہ جانے دوسری طرف سے کیا سننے کو مل جائے۔ ایسے میں موبائل تھر تھرایا تو وہ لرز ہی گیا اور یوں پھٹی پھٹی نظروں سے اسکرین کی طرف دیکھنے لگا جیسے کسی عفریت کو دیکھ لیا ہو۔

”میں نے باذل کے کہنے پر چھت پر سے کودنے سے انکار کیا تھا تو اس نے غصے میں مجھے زور سے دھکا دے دیا تھا۔ میں جا کر ایک دیوار سے ٹکرائی اور میرا ہونٹ پھٹ گیا۔“ یہی اس کی کیفیت سے بے خبر اسے اس کے سوال کا جواب دے رہی تھی لیکن وہ سن ہی کہاں رہا تھا۔ اندیشوں اور وسوسوں میں ڈوبا اس کا دماغ اس وقت فون کی اسکرین کے سوا باقی پوری دنیا سے کٹ چکا تھا۔

☆☆☆

”معاذ.....!“ لالہ کے ٹھکانے پر پہنچ کر معاذ کا سب سے پہلے جارو سے سامنا ہوا اور اس نے اسے دیکھتے ہی خوشگوار حیرت کے ساتھ گلے لگا لیا۔

”کہاں چلے گئے تھے یار! ہم سب یہ سوچ سوچ کر تمہارے لیے اتنے پریشان تھے کہ تم نے اپنے ہاتھوں سے خود کو میڈم ایکس کے حوالے کر دیا ہے اور اب وہ جانے تمہارے ساتھ کیسا سلوک کر رہی ہوگی۔“ اسے گلے سے لگائے لگائے جارو نے بولنا شروع کیا تو جذباتی انداز میں بولتا ہی چلا گیا۔

”آرام سے یار! سب کے ساتھ مل کر بیٹھتے ہیں تو میں ایک ساتھ ہی سب کو ساری تفصیل سنا دیتا ہوں۔“ معاذ کا مزاج کافی حد تک خوشگوار تھا کہ کرنل سکندر بخت سے ہونے والی ملاقات نے اس کے ذہن کو ہلکا پھلکا کر دیا تھا اور بہت سے مسائل میں گھبرے ہونے کے باوجود زندگی میں کچھ آسانی محسوس ہونے لگی تھی۔

”اس وقت تو میرے اور لالہ کے سوا کوئی قریبی ساتھی موجود ہی نہیں ہے۔“ جارو نے کچھ ڈھیلے ڈھالے انداز میں اسے اطلاع دی۔

”کیوں، کہاں گئے سب؟“ وہ اس کے ساتھ اندر کی طرف جاتے ہوئے ٹھکا۔

”بس نکلے ہوئے ہیں کسی نہ کسی کام سے۔“ جارو کو خیال آیا کہ وہ خود جانے کن حالات سے گزر کر یہاں پہنچا ہے۔ ایسے میں ایک دم سے اسے یہاں درپیش مسائل سے

آگاہ کرنا مناسب نہیں اس لیے بات کو ٹال گیا۔
”بشریٰ کا کچھ پتا چلا؟“ اس کے ٹالنے سے کیا ہوتا تھا۔ معاذ نے سب سے پہلا سوال ہی وہ کیا جو سب سے نازک تھا۔

”میں کہہ رہا ہوں مجھے یہاں سے جانے دو، تم نہیں جانتے کہ وہ کتنے سفاک لوگ ہیں۔ میری غلطی کی سزا وہ میرے گھر والوں کو دیں گے۔“ اس کی سماعتیں ابھی جارو کے جواب کی منتظر تھیں کہ لاؤنج میں داخل ہوتے ہی ایک حواس باختہ شخص سے سامنا ہو گیا۔ بظاہر وہ شخص قیمتی لباس میں تھا اور چہرے مہرے سے پڑھا لکھا بھی دکھائی دے رہا تھا لیکن ایک عجیب سی بے چینی نے اس کی پوری شخصیت کو گھیر رکھا تھا اور اسی بے چینی کو لہجے میں سموئے وہ جارو سے مخاطب ہوا تھا۔ اس نے جارو کے ساتھ اس کی موجودگی کو یوں نظر انداز کر دیا تھا جیسے اسے دیکھا ہی نہ ہو۔

”میں تمہاری، تمہارے گھر والوں سے بات کروا چکا ہوں اور تم انہیں کسی محفوظ مقام پر منتقل ہونے کی ہدایت کر چکے ہو پھر اتنی بے چینی کیوں؟“ جارو نے اسے گھورا۔

”پتا نہیں انہیں حالات کی سچائی کا صحیح سے احساس ہوا بھی ہے یا نہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ قیمتی ساز و سامان کو ساتھ سمیٹ کر لے جانے کی فکر میں وہ لوگ وقت ضائع کر دیں۔“ اس کی پریشانی ہنوز برقرار تھی۔ اگر اس کے دونوں بھرا ایک کرسی کے پائے سے جکڑ کر نہ بٹھایا گیا ہوتا تو شاید وہ اٹھ کر یہاں سے بھاگنے کی کوشش کرتا۔

”ٹھیک ہے، میں ایک بار پھر انہیں تمہاری طرف سے پیغام بھجوا دیتا ہوں۔“ جارو نے اسے تسلی دی اور موبائل پر کسی سے رابطہ کرنے لگا۔

”تم مجھے ان کے پاس کیوں نہیں جانے دیتے۔ میں خود انہیں کسی محفوظ مقام پر منتقل کروں گا تو مجھے اطمینان ہوگا۔“ وہ کسی طور راضی ہونے کو تیار نہیں تھا۔

”وہ لوگ تمہیں ڈھونڈنے سب سے پہلے تمہارے گھر ہی جائیں گے اور یہ تو تم بھی جانتے ہو کہ تمہارے گھر والوں کے ساتھ وہ شاید کوئی رعایت کر دیں لیکن تمہیں تو دیکھتے ہی چیر پھاڑ کر رکھ دیں گے۔“ اس بار جارو نے قدرے برہمی سے اسے سمجھایا۔

”لیکن.....!“

”کوئی لیکن دیکھ کچھ نہیں۔ اگر اب تم نے مجھے تنگ کیا تو میں تمہیں اس آرام دہ اور صاف ستھری جگہ سے اٹھوا کر کسی اسٹور روم میں بند کر دوں گا، وہ بھی منہ میں کپڑا

بشریٰ کو مہناز کے اپارٹمنٹ پر چھوڑنے جا رہے تھے، راستے میں گھات لگا کر بشریٰ کو اغوا کر لیا گیا۔“

”مطلب بشریٰ اس وقت باذل کے قبضے میں ہے۔“

معاذ بے قراری سے بولا۔

”ایسا ہی ہے۔“

”کیا بشریٰ کو بھی اسی ہاؤسنگ اسکیم میں رکھا گیا تھا؟“ معاذ نے اندازہ لگایا۔

”ہاں، لیکن جب تک ہم وہاں پہنچے باذل، بشریٰ اور اپنے ساتھیوں سمیت وہاں سے غائب ہو چکا تھا۔ البتہ ہم نے خفیہ سرنگ اور اسلحے کا ذخیرہ دریافت کر لیا۔“ جارو اسے تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا۔

”لالہ نے اپنے کچھ آدمی نگرانی کے لیے ہاؤسنگ اسکیم پر چھوڑ دیے ہیں لیکن اس معاملے میں کنفیوز ہے کہ اس اسلحے کے بارے میں کس ادارے کو اطلاع دے۔ پولیس کی طرف سے وہ مطمئن نہیں ہے۔“

”یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں ابھی یہ پریشانی دور کر دیتا ہوں لیکن پہلے لالہ سے مل لوں۔“

”ہاں آ جاؤ۔ وہ بھی تمہیں دیکھ کر خوش ہوگا۔“ جارو نے جواب دیا اور دونوں ساتھ ساتھ چلتے لالہ کے پاس پہنچ گئے۔ لالہ اسے دیکھ کر واقعی خوش ہو گیا لیکن اس سے کوئی استفسار نہیں کیا کہ وہ اب تک کہاں تھا اور کیسے واپس آیا؟

”جارو بتا رہا تھا کہ آپ یزدانی ہاؤسنگ اسکیم سے ملنے والے اسلحے کے بڑے ذخیرے کی بابت پریشان ہیں کہ اسے کس حکومتی ادارے کے حوالے کیا جائے؟ میرے پاس آپ کے اس مسئلے کا حل موجود ہے۔“ اس نے لالہ کو گرنل سکندر بخت اور ان کے خفیہ ادارے کے بارے میں آگاہ کیا۔

”اگر تم مطمئن ہو تو ضرور انہیں اطلاع دو اور ان سے جلد از جلد ایکشن لینے کے لیے کہو کیونکہ کچھ بتا نہیں کہ کب باذل کو اس بات کی خبر ہو جائے کہ اسلحہ خانے سے نکال کر اس کی بتائی ہوئی جگہ پر منتقل نہیں کیا گیا ہے اور ہنوز وہیں موجود ہے۔ اگر ایسا ہوا تو وہ اس کے حصول کے لیے اپنے آدمی دوڑا دے گا اور میرے پاس فی الحال اتنے آدمی نہیں ہیں کہ اس کے آدمیوں کا مقابلہ کر سکیں۔“ لالہ کے لہجے میں پریشانی سی تھی۔

”کیا کوئی مسئلہ ہے؟ کوئی ایسی بات جسے مجھ سے چھپایا جا رہا ہو؟“ اس نے باری باری جارو اور لالہ کے چہروں کو دیکھا۔

”ٹھوس کر۔“ جارو نے اسے بولنے کا موقع نہیں دیا اور جھنجھلا کر دھمکی دی۔

”ٹھیک ہے۔ میں خاموش ہو جاتا ہوں لیکن کچھ بُرا ہو گیا تو ذمے دار تم ہو گے۔“

”نہیں، ذمے دار ہر صورت تم خود ہو گے کیونکہ تمہاری چوائس تھی کہ اپنی زندگی کے مسائل کو شارٹ کٹ کے ذریعے حل کرنے کے لیے جرائم پیشہ لوگوں کے آلہ کار بن جاؤ۔“ جارو نے اسے سختی سے جواب دیا اور معاذ کو بازو سے تھام کر دوسرے کمرے میں لے گیا۔

”یہ کون تھا؟“ معاذ نے استفسار کیا۔

”عرفان اللہ کی ایک کمپنی کا منیجر۔ تمہارے لیے شاید یہ اطلاع دلچسپ ہو کہ یزدانی ہاؤسنگ اسکیم سے ایک سرنگ قریب ہی واقع عرفان اللہ کی ایک ٹیکسٹائل مل تک جاتی ہے اور اس سرنگ کے راستے غیر قانونی اسلحے کی بڑی کھیپ کو ہاؤسنگ اسکیم کے ایک تہ خانے میں ذخیرہ کیا جاتا ہے۔ یہ شخص جس کا نام نذر حسین ہے، اپنی نگرانی میں یہ سارا کام کر داتا تھا لیکن آج ہماری زد میں آ گیا۔“

”مجھے یاد آرہا ہے کہ عالم شاہ نے بھی اس بارے میں مجھے کچھ تفصیل سنائی تھی لیکن اس وقت ہم بالکل مختلف حالات میں تھے تو اس بات کی کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔ جب سے پاکستان واپس آئے ہیں، حالات مسلسل الجھے ہوئے ہیں اس لیے مجھے اس معاملے کا خیال ہی نہیں آیا۔ تم بتاؤ، تم لوگ کیسے پہنچ گئے وہاں تک؟“ معاذ نے اس کا جواب سن کر دلچسپی سے پوچھا۔ اس کے بعد اس سیدھے سادے سوال کا جواب دینا جارو کے لیے قدرے مشکل تھا۔

”کیا کوئی مسئلہ ہے؟“ معاذ نے اس کی ہچکچاہٹ کو محسوس کر لیا۔

”تمہارے جانے کے بعد ہمیں بشریٰ کے بارے میں خبر مل گئی تھی۔ ہمارے اندیشوں کے برخلاف وہ کسی مشکل میں نہیں بلکہ اپنی ایک پرانی سہیلی راحیلہ کے گھر تھی۔“

”یہ تو اچھی بات ہے۔ میں جانتا ہوں راحیلہ کو۔ وہ بشریٰ کے ساتھ یونیورسٹی میں بھی تھی۔“

”وہ وہاں تھی لیکن پھر.....“

”لیکن پھر کیا؟“ معاذ اس کے انداز پر بے چین ہوا۔

”راحیلہ اور اس کے شوہر آصف کی زبانی ہمیں جو معلومات حاصل ہوئی ہیں، ان کے مطابق مہناز کا موبائل فون باذل کے ہاتھ لگ گیا تھا، اس نے اس موبائل فون کے ذریعے بشریٰ کو ٹریپ کیا اور جس وقت راحیلہ اور آصف

”میں تمہیں تفصیل بتاتا ہوں لیکن پہلے تم اپنے کرل صاحب سے بات کرلو اور ضروری تفصیلات بھی طے کرلو تاکہ میں ہاؤسنگ اسکیم میں موجود اپنے بندوں کو ان لوگوں کی آمد کے متعلق آگاہ کر سکوں۔“

”ٹھیک ہے۔ جیسا آپ چاہیں۔“ اس نے لالہ سے بحث نہیں کی اور طے شدہ طریقہ کار کے مطابق کرل صاحب سے رابطہ کرنے لگا۔ رابطہ ہو گیا تو انہیں مختصراً کال کرنے کے مقصد سے آگاہ کیا۔ انہوں نے اسے تیز ترین کارروائی کا یقین دلانے کے ساتھ کچھ ضروری ہدایات جاری کیں۔ جتنی دیر میں وہ اس کال سے فارغ ہوا، لالہ بھی کہیں بات کرنے میں مصروف رہا۔ اس نے اسے کرل صاحب کی ہدایات کے بارے میں آگاہ کیا۔

”ٹھیک ہے، میں اپنے آدمیوں کو بتا دیتا ہوں۔“ لالہ نے فوراً ایک اور کال لگالی۔ وہ اس کال سے فارغ ہوا تو معاذ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”بشریٰ کو وہ مردود باذل اپنے ساتھ کسی ٹھکانے پر لے گیا ہے۔ اس وقت اصغر اور وکی کے ساتھ ہمارے لوگ اسے چھڑوانے کے لیے گئے ہوئے ہیں۔ دونوں طرف کے لوگوں کا ٹکراؤ ہو چکا ہے بلکہ وکی نے مجھے بتایا تھا کہ کوئی تیسری پارٹی بھی میدان میں موجود ہے۔ تم خود ہی اندازہ لگا سکتے ہو کہ کتنا زبردست معرکہ چھڑا ہوا ہوگا۔ بس اسی لیے میں تھوڑا سا پریشان ہوں۔“ لالہ نے اسے آگاہ کیا۔

”وہ لوگ کہاں ہیں؟ میرے خیال میں مجھے بھی وہاں جانا چاہیے۔“ معاذ مضطرب سا اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

”میں وقفے وقفے سے رپورٹ لے رہا ہوں۔ اصغر اور وکی سے تو فی الحال بات نہیں ہو سکتی لیکن باہر موجود ایک بندے نے سب ٹھیک چلنے کا اشارہ دیا ہے۔“ لالہ نے اسے آگاہ کیا۔ اسی وقت اس کے سامنے میز پر رکھے مختلف موبائل فونز میں سے ایک فون بجنے لگا۔ لالہ نے ایک نظر اسکرین پر ڈالی اور بڑبڑایا۔

”علینہ..... اس نے اس وقت کیسے کال کر لی؟“ ”کیا حال ہے بیٹا! آج اس وقت کیسے یاد آگئی؟“ ڈین الجھا ہوا ہونے کے باوجود اس نے علینہ کی کال ریسیو کر لی اور لہجہ کو بشاش بناتے ہوئے اس سے مخاطب ہوا۔ ”بس دل میں آیا کہ بات کی جائے تو کال ملائی۔“ علینہ نے لاڈ سے جواب دیا۔

”اور وہ ہمارا شیر پتر کیسا ہے؟ تمہیں زیادہ تنگ تو

نہیں کرتا؟“ لالہ کی پوری کوشش تھی کہ اس سے معمول کے انداز میں بات کی جائے۔

”ویسے تو تنگ نہیں کرتا لیکن آج بہت سارا ہے۔ صبح سے پتا نہیں کیوں روئے جا رہا ہے۔ ابو، حکیم صاحب کے پاس بھی لے گئے تھے۔ انہوں نے دیکھ کر کہا کہ کوئی جسمانی مسئلہ نہیں ہے۔ شاید کسی وجہ سے نیند خراب ہو گئی ہے یا کسی آواز وغیرہ سے ڈر گیا ہے جو گھبرا کر رو رہا ہے۔ تھوڑا بہلائیں اور بچے کو ماں کے ساتھ رکھیں تو پُرسکون ہو جائے گا لیکن پتا نہیں کیوں اسے فرق نہیں پڑ رہا۔ ذرا دیر کے لیے چپ ہوتا ہے پھر دوبارہ رونا شروع کر دیتا ہے۔ ٹھیک سے فیڈنگ نہیں کر رہا۔“ لالہ کے چھوٹے سے سوال کے جواب میں علینہ بتانے پر آئی تو ایک سانس میں بتاتی چلی گئی اور آخر میں روہانسی ہو گئی۔

”صبر سے بیٹا! چھوٹے بچے بعض اوقات ایسے ہی تنگ کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے اسے نظر لگ گئی ہو۔ تم اسے کسی سے دم کروالو۔“ لالہ نے اسے تسلی دینے کے ساتھ ساتھ مشورہ بھی دیا۔

”جی، ابو بھی یہی کہہ رہے تھے۔ ابھی ابھی وہ اسے امام صاحب سے دم کروانے کے لیے ہی لے کر نکلے ہیں لیکن میرا دل بری طرح گھبرا رہا تھا تو میں نے سوچا آپ کو کال کر لوں۔“

”چلو اچھا کیا۔ اس طرح تمہارا دھیان بھی بٹ جائے گا۔“ لالہ نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا لیکن خود اس کا اپنا دل ایک ہل کے لیے زور سے سکڑا تھا۔ وہ جی دار آدمی تھا اور ہمیشہ زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جیتا تھا لیکن آج ایک غیر محسوس کن گھبراہٹ اس پر بھی طاری تھی جسے وہ مسلسل نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”واقص کہاں ہیں؟ میری ان سے بات کروا دیں۔“ علینہ نے کچھ جھجکتے ہوئے خواہش ظاہر کی۔

”وہ تو کہیں باہر گیا ہوا ہے، لوتم اپنے بھائی سے بات کرلو۔“ لالہ نے فون معاذ کو تھما دیا۔ معاذ تھوڑی دیر اس کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کر کے اسے بہلاتا رہا۔ جلد ملاقات کے لیے آنے کا وعدہ بھی کیا اور جب لگا کہ وہ تھوڑی سی پُرسکون ہو گئی ہے تب جا کر سلسلہ منقطع کیا۔

”کوئی خبر؟“ کال سے فارغ ہونے کے بعد اس نے لالہ سے دریافت کیا۔ جواباً اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”میرے خیال میں مجھے وہاں جانا چاہیے۔ آپ مجھے لوکیشن.....“

وہ لالہ سے کہہ ہی رہا تھا کس پاس کال آنے لگی۔ لالہ نے لپک کر کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے کیا کہا گیا، معاذ اور جارو نہ سن سکے لیکن انہوں نے لالہ کے تیزی سے زرد پڑتے ہوئے چہرے کو دیکھ کر اندازہ لگایا کہ دوسری طرف سے کوئی سنگین اطلاع دی گئی ہے۔ ایسی اطلاع جس نے لالہ جیسے آدمی کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔

”تم لوگ پہنچو، میں کال کر کے سارے انتظامات کرواتا ہوں۔“ اس نے جس انداز سے یہ جملہ کہا، اس سے صاف پتا چلا کہ وہ ضبط کی بے پناہ منزلوں سے گزرا ہے۔

”کیا ہوا؟“ معاذ کے ہونٹوں سے سوال پھسلا لیکن لالہ دوسری کال پر مصروف ہو چکا تھا۔

”میرا پیشٹ پہنچ رہا ہے۔ گولی لگی ہے اور حالت نازک ہے۔ کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے ورنہ میں تم سمیت تمہارے پورے اسپتال کو آگ لگا دوں گا۔“ وہ دوسری طرف موجود شخص کو سنگین لہجے میں دھمکا رہا تھا لیکن لہجے کی اس سنگینی کی تہ میں جو ہلکی سی لرزش تھی، وہ معاذ کے دل کو لرزا رہی تھی۔ جو یکطرفہ گفتگو سننے کو ملی تھی اس سے اتنا تو اندازہ ہو گیا تھا کہ کسی کو گولی لگ گئی ہے۔ گولی کسے لگی ہے، اس بات کا جو اشارہ لالہ کی حالت سے مل رہا تھا، اسے سمجھ کر ہی معاذ کا اپنا دل لرز رہا تھا۔

”وکی کو گولی لگی ہے اور اس کی حالت نازک ہے۔“ آخر لالہ کال سے فارغ ہوا اور ان لوگوں کو اطلاع دی تو گویا ہر بھیانک اندیشے کی تصدیق ہو گئی۔

”کک..... کہاں ہے وہ؟ کون سے اسپتال لے گئے ہیں اسے؟“ وکی اپنی ذاتی حیثیت میں تو اسے عزیز تھا ہی، علینہ کے شوہر کی حیثیت سے عزیز تر ہو گیا تھا اور اس کے بارے میں ایسی اندوہناک خبر سن کر خود اس کے لیے ضبط کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ اس کے بچے کی بے چینی، وہ علینہ کی گھبراہٹ..... کچھ بھی تو بے سبب نہیں تھا۔ جن کے دل کے رشتے تھے، ان کے دلوں نے پہلے ہی کچھ برا ہو جانے کے اشارے موصول کرنا شروع کر دیے تھے۔

”آؤ میرے ساتھ..... ہم اسپتال چلتے ہیں۔“ وقاص کے آگے لالہ کے لیے کسی شے کی اہمیت نہیں تھی۔ وہ سب بھول کر اس کے پاس جانے کے لیے بے چین ہو گیا۔

کچھ ملن میں ہی وہ اسپتال کی جانب اڑے جارہے تھے۔ ضبط کی کوشش کے باوجود لالہ کا بار بار پہلو بدلتا اور رومال سے ماتھے پر پھوٹنے والا پسینا پونچھتا اس کی اندرونی حالت کی غمازی کر رہا تھا۔ بے چینی کی اس کیفیت میں وہ

پہلے ہی بہت تیز گاڑی چلاتے ڈرائیور پر دھاڑا۔

”تیز چلاؤ..... یہ کیا گدھا گاڑی کی طرح چلا رہے ہو۔“

”جج..... جی لالہ!“ ڈرائیور بے چارہ گھبرا گیا۔

”ریلیکس۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

معاذ خود اندر سے گھبرایا ہوا تھا لیکن اس وقت اس نے محسوس کیا کہ لالہ کو اس سے کئی گنا زیادہ تسلی کی ضرورت ہے۔ چنانچہ آہستہ سے کہتے ہوئے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا۔ بوڑھے شیر کا ہاتھ بالکل ٹھنڈا پڑا ہوا تھا اور اس میں ہلکی سی لرزش تھی جو ثابت کر رہی تھی کہ جب کسی اپنے کی جان پر بن جائے تو پہاڑ جیسا حوصلہ رکھنے والے بھی ہل کر رہ جاتے ہیں۔

☆☆☆

”آپ سکون سے بیٹھ جائیں سر! اس طرح ٹہل ٹہل کر تو آپ بُری طرح تھک جائیں گے۔“ عرفان اللہ کی منظور نظر سیکریٹری صوفیہ کچھ دیر تو اسے ادھر سے ادھر چکر کاٹتا دیکھتی رہی پھر آخر کار نرمی سے ٹوک دیا۔

”کیسے بیٹھ جاؤں سکون سے؟ تم نے سنا نہیں کہ اس خبیث باذل کے آدمی میرے آدمیوں کو پچھاڑ کر مال لے جانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔“ عرفان اللہ کا پارہ چڑھا ہوا تھا۔

”کوئی بات نہیں۔ مال جہاں بھی جائے گا، آپ کو اطلاع تو مل ہی جائے گی اور نہ بھی ملے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ صرف کچھ ہی گھنٹوں کی بات ہے پھر باذل ہمارے قبضے میں ہوگا اور ہم اس سے جو چاہے معلوم کر لیں گے۔“ صوفیہ نے اسے پُرسکون رکھنے کی کوشش جاری رکھی۔

”میڈم سے کہنا کوشش کریں کہ اسے نقصان نہ پہنچے۔ اس سے جو کچھ بھی حساب کتاب کرنا ہوا، میں خود کر لوں گا۔“ یوں تو عرفان اللہ کو باذل پر اتنا غصہ تھا کہ ایک دفعہ تو اسے ختم کر دینے کا ہی فیصلہ کر لیا تھا لیکن پھر تاجور کا خیال آیا کہ وہ بیٹے کی موت پر بہت داویلا کرتی اور اگر ذرا بھی بھٹک پڑ جائی کہ اس کام کے پیچھے عرفان اللہ کا ہاتھ تھا تو طوفان ہی لے آتی۔ اپنے سیاسی کیریئر کے اس اہم موڑ پر اسے کسی پنڈت درابا کس کا کھٹنا منظور نہیں تھا۔ اس کے علاوہ شاید تھوڑا بہت خون نے بھی جوش مارا تھا کہ اس نے باذل کو ایک موقع دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

”جیسی آپ کی مرضی سر! لیکن میں آپ کو بتا دوں کہ یہ شخص آگے بھی بار بار آپ کے لیے مسئلہ بنائے گا۔ تنظیم آپ کو جس مقام تک پہنچانا چاہتی ہے، اس تک پہنچنے کی راہ

ہموار کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ آپ اپنے آپ کو ہر طرح کے اسکینڈل سے دور رکھیں۔ ”صوفیہ نے اسے سمجھایا۔
”میں اس بات کو سمجھتا ہوں اسی لیے تو تم سے شادی کے مطالبے سے بھی فی الحال دستبردار ہو گیا ہوں۔“ عرفان اللہ نے صوفیہ کے پُرکشش سراپا پر ایک حسرت بھری نظر ڈالتے ہوئے اسے جواب دیا۔

”آپ نے یہ فیصلہ کر کے عقلمندی کا ثبوت دیا ہے۔ اگر آپ اپنی ضد پر اڑے رہتے تو یہ بھی ہو سکتا تھا کہ تنظیم کے بڑے آپ کی جگہ کسی اور کا انتخاب کر لیتے۔ میرا کیا ہے، میں تو بغیر شادی کے بھی ہر وقت آپ کی دسترس میں ہوں۔“ صوفیہ کے ہونٹوں پر بڑی دلکش مسکراہٹ تھی۔ اس مسکراہٹ سے شہ پا کر عرفان اللہ کا خراب موڈ فوراً دوسرے ٹریک پر آ گیا اور موقع غنیمت جان کر اس نے پیش قدمی کرنی چاہی لیکن فون کی گھنٹی کی آواز نے اسے رکنے پر مجبور کر دیا۔ صوفیہ نے شرارت سے مسکراتے ہوئے کال ریسیو کی۔ کچھ دیر بات کرنے کے بعد اس نے دوسری طرف موجود شخص کو ہولڈ کرنے کا کہا اور پھر عرفان اللہ کو اطلاع دی۔

”مل ایریا کا ایس ایچ او ہے۔ آپ کی مل کے باہر جو فائرنگ ہوئی ہے اس کے حوالے سے آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔“

”لاؤ دو مجھے۔“ عرفان اللہ نے منہ بناتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر اس سے فون لے لیا اور بیزاری سے ”ہیلو“ بولا۔ دوسری طرف سے ایس ایچ او نے واقعے کے حوالے سے بات چیت شروع کی۔

”دیکھیے ایس ایچ او صاحب! جو کچھ ہوا اس حوالے سے میرا اسٹاف آپ کو تفصیلات فراہم کر چکا ہے۔ یہ سیدھی سادی ڈاکا زنی کی واردات تھی جسے میرے گارڈز نے ناکام بنا دیا۔ اس واردات کے حوالے سے میں آپ کو اپنے اسٹاف سے بہتر معلومات فراہم نہیں کر سکتا کیونکہ مجھے بھی جو کچھ معلوم ہوا ہے، انہی کی زبانی معلوم ہوا ہے۔“ اس نے ایس ایچ او کی بات پوری سنے بغیر اس پر واضح کیا۔

”جی نہیں، یہ کسی دشمنی کا شاخسانہ نہیں ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ طرمان کو کسی ذریعے سے مال کی رداگی کی اطلاع مل گئی تھی اس لیے انہوں نے موقع کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔“ ایس ایچ او کی طرف سے کسی مشتبہ شخص کا نام پوچھے جانے پر اس نے اسے جواب دیا لیکن ایس ایچ او مزید بال کی کھال نکالنے کے موڈ میں تھا۔

”میں معذرت چاہتا ہوں۔ میرا آج کا شیڈول بہت بھل ہے اور میں آپ کو زیادہ ٹائم نہیں دے سکتا۔ آپ کو جو کچھ معلوم کرنا ہے، اسٹاف ہی سے معلوم کریں اور جلد از جلد میرے میجر کو بھی تلاش کریں۔ مجھے تشویش ہے کہ ان لوگوں کی قید میں اس بے چارے کے ساتھ کوئی برا سلوک نہ کیا جا رہا ہو یا وہ لوگ اسے مارمور کر رہے اور اُدھر نہ پھینک دیں۔“ پولیس کے سامنے نذر کی غیر موجودگی کا جواز پیش کرنے کے لیے یہ جھوٹ بولا گیا تھا کہ ڈاکو اپنی جان بچانے کے لیے نذر کو یرغمال بنا کر لے گئے ہیں۔ اس نے اسی حوالے سے ایس ایچ او کو پولیس کی نااہلی جتائی اور مصروفیت کا بہانہ بنا کر سلسلہ جلد منقطع کر دیا۔

”آپ کو سارا الزام ڈاکوؤں کے سر ڈالنے کے بجائے اشارے کنائے میں ایس ایچ او کو جتنا چاہیے تھا کہ یہ آپ کے سیاسی مخالفین کی حرکت ہو سکتی ہے جنہوں نے اس حرکت سے آپ کا ذہنی سکون برباد کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ کہ ایسی حرکتیں کر کے وہ آپ کو سیاسی سرگرمیوں سے دور کر کے دوسرے معاملات میں الجھانا چاہتے ہیں۔“ صوفیہ نے کال بند ہونے کے بعد اسے مشورہ دیا۔

”کوئی بات نہیں۔ میڈیا سے بات ہونے پر میں ان کے سامنے یہ نکتہ اٹھا دوں گا۔ یہ ایس ایچ او تو ویسے بھی میرے سیاسی مخالفین کا پٹھو ہے۔“ عرفان اللہ مطمئن تھا۔

”یہ بات ہے تو ٹھیک ہے۔ میں ایسا کرتی ہوں کہ فوری طور پر ایک پریس کانفرنس ارنج کرتی ہوں۔ اس میں آپ اس واقعے کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے مخالفین کو بھی رگید ڈالے گا۔“ صوفیہ نے فوری طور پر پروگرام ترتیب دے ڈالا۔ عرفان اللہ کا دھیان میڈم ایکس کے آدمیوں کے باڈل کے موجودہ ٹھکانے پر کیے جانے والے حملے کی طرف لگا ہوا تھا لیکن صوفیہ کو اس ختمے پر دو گرام سے نہ روک سکا۔ صوفیہ نے اپنا اثر رسوخ استعمال کر کے ایک ڈیڑھ گھنٹے میں پریس کانفرنس کا سارا انتظام کر لیا۔ اس پریس کانفرنس میں عرفان اللہ کو کیا کہنا ہے، وہ بھی اس نے لکھ کر دیا۔ چنانچہ جب عرفان اللہ نے میڈیا والوں کے سامنے بات کی تو سننے والوں کو ایسا ہی محسوس ہوا جیسے واقعی ایک بے حد محب وطن شخص کو جو ایک کامیاب بزنس مین کی حیثیت سے پہلے ہی ملک کی ترقی میں موثر کردار ادا کر رہا ہے اور اب اپنے ہم وطنوں کی بھلائی کے لیے سیاست کے خارزار میں بھی اتر چکا ہے..... اس میدان سے باہر دھکیلنے کی سازشیں کی جا رہی ہیں تاکہ ملک کی

باگ ڈور انہی پرانے پاپیوں کے ہاتھ میں رہے جو اتنے برسوں سے ملک و قوم کو لوٹنے میں مصروف ہیں۔ اس موقع پر عرفان اللہ نے چند ایسی باتیں بھی کیں جن سے اشارہ ملا کہ وہ جلد ہی موجودہ پارٹی چھوڑ کر اپنی ذاتی سیاسی پارٹی کی بنیاد رکھنے جا رہا ہے۔

اس کی اس پریس کانفرنس کے بعد مختلف چینلز پر تبصروں اور تجزیوں کا سیلاب سا آ گیا اور ایسا لگنے لگا کہ اس وقت ملک کا سب سے اہم مسئلہ عرفان اللہ کی سیاست میں کردار ہی ہے۔ کئی اینکرز نے اس کی تعریفوں کے پل باندھ ڈالے۔ اس کی کاروباری کامیابیوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا، فلاح و بہبود کے کاموں کی یوں تعریف کی گئی گویا وہ ایدھی کا جانشین ہو۔ یہ ثابت کرنے کے لیے بھی ایڑی چوٹی کا زور لگایا گیا کہ پچھلی بار وہ جس حلقے سے ایم این اے منتخب ہوا تھا، سب سے زیادہ ترقیاتی کام اسی حلقے میں ہوئے۔ ظاہر ہے ان اینکرز کی زبان سے یہ قصیدے جاری کروانے کے لیے انہیں بھاری لفافے ارسال کیے گئے تھے لیکن عرفان اللہ خوش تھا کہ اس کی شخصیت ایک دم بہت اوپر اٹھ گئی ہے اور اس کے وزیراعظم کی کرسی تک پہنچنے کی راہیں تیزی سے ہموار ہو رہی ہیں۔ اس خوشی نے اسے باذل والے معاملے کی طرف سے بھی غافل کر دیا تھا۔ یہ معاملہ اسے اس وقت دوبارہ یاد آیا جب باذل کے ساتھیوں میں موجود اس کے مخبر نے اسے اطلاع دی کہ میر و نے چاولوں کے گودام میں جو مال خنقل کر دیا تھا، اس میں اسلحہ شامل نہیں ہے۔ اس اطلاع نے اس کی ساری خوشی غارت کر دی اور صوفیہ کے سامنے پھنکارنے لگا۔

”مجھے اپنا مال ہر حال میں واپس چاہیے۔ ابھی تک تو میں مطمئن تھا کہ باذل ہاتھ آئے گا تو ساتھ میں وہ مال بھی واپس مل جائے گا لیکن یہاں تو باذل کے ساتھ ہی ہاتھ ہو گیا ہے۔“

”مجھے لگتا ہے کہ آپ کے فیجر نے مال یزدانی ہاؤسنگ اسکیم سے خنقل ہی نہیں کر دیا تھا۔ اس نے آپ کو اور باذل دونوں کو ڈبل کر اس کیا ہے اور کسی تیسری پارٹی کے ساتھ مل گیا ہے۔“ صوفیہ نے اندازہ لگایا۔

”شاید ایسا ہی ہے کیونکہ نہ اس کا کچھ اتا پتا ہے اور نہ ہی اس کی فیملی کا۔ میرے آدمی اس کے گھر گئے تھے لیکن وہاں تالا لگا ہوا تھا۔“ عرفان اللہ نے اس کی رائے سے اتفاق کیا پھر بے چینی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔

”میرا خیال ہے ہمیں ایک بار یزدانی ہاؤسنگ اسکیم میں چیک کروانا چاہیے۔ ہو سکتا ہے مال اب بھی وہیں موجود ہو۔“

”میں آپ کو اس بات کا مشورہ نہیں دوں گی کیونکہ زیادہ امکان یہ ہے کہ وہاں کوئی ٹریپ لگا کر آپ کو پھانسنے کی کوشش کی جائے۔ بہتر ہے آپ پہلے آج والے مشن کو کامیاب ہونے دیں پھر اس معاملے کو دیکھیں۔“ صوفیہ نے اسے کسی بھی اقدام سے روک دیا۔ اس کے بعد کان کا سارا وقت انتظار میں گزرا۔ باذل کی پناہ گاہ پر جاری آپریشن میں عملی طور پر شامل نہ ہونے کے باعث انہیں صورت حال کی کوئی خبر نہیں تھی، نہ ہی صوفیہ یا عرفان اللہ میں سے کسی کی ہمت تھی کہ اس موقع پر میڈیم ایکس سے رابطہ کر کے اس سے کچھ پوچھ سکیں۔ عرفان اللہ کا اپنے مخبر سے بھی رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ کچھ تھوڑی بہت سن گن ملی تھی تو خبروں سے جن میں صرف اتنا بتایا گیا تھا کہ شہر کے فلاں علاقے میں شدید فائرنگ کی آوازیں سنی گئی ہیں۔

”سر! میرا خیال ہے آپ کچھ دیر آرام کر لیں۔ جو صورت حال ہوگی، صبح تفصیلات مل جائیں گی۔ ٹاکا کی کا تو ویسے بھی کوئی امکان نہیں۔“ رات گئے صوفیہ نے عرفان اللہ کو نصیحت کی۔

”تم باذل کو نہیں جانتیں صوفی ڈارلنگ! اس خبیث کے اندر کسی شیطان کی روح ہے۔ میں نے اسے بُرے سے بُرے حالات میں بھی بچ کر نکلتے ہوئے دیکھا ہے۔ بچ پوچھو تو اس کے نہ ہونے سے میری طاقت آدمی رہ گئی ہے۔ اس میں اتنی صلاحیت ہے کہ مشکل سے مشکل معاملے کو بھی چٹکیوں میں حل کر دیتا ہے۔ اس کی انہی خوبیوں کی وجہ سے میں اسے کھونا نہیں چاہتا۔“ عرفان اللہ کا ذہن منتشر تھا۔ ایک طرف وہ باذل سے خوفزدہ تھا تو دوسری طرف اسے بچانا بھی چاہتا تھا۔

”میڈیم ایکس کا تعاون ملنے کے بعد باذل جیسے گلی کے غنڈے کے بارے میں اس انداز میں سوچنا ایک طرح سے میڈیم کی توہین ہے۔“ صوفیہ نے منہ بنایا۔

”نہیں نہیں..... میرا یہ مقصد نہیں ہے۔ میڈیم کا تو ظاہر ہے بہت اونچا مقام ہے اور میں جانتا ہوں کہ باذل کا میڈیم سے کوئی مقابلہ ہی نہیں ہے لیکن بس اتنے عرصے سے وہ سب کچھ سنبھال رہا ہے تو مجھے اس کی عادت ہو گئی ہے۔“ صوفیہ کا منہ بننا دیکھ کر عرفان اللہ جلدی جلدی وضاحت دینے لگا کہ کامیابی کے جس افق پر پہنچنے کے ان لوگوں نے خواب دکھائے تھے، انہیں ناراض کر کے وہ ان خوابوں سے دستبردار نہیں ہونا چاہتا تھا۔

”عادتیں تو ہوتی ہی بدلنے کے لیے ہیں۔ اب یہی

دیکھ لیں کہ آپ نے برسوں اپنی بیوی کے ساتھ گزارے اور اب وہ آپ سے دور ہیں تو آپ کو ان کا خیال بھی نہیں آتا۔“ جسے تم جیسا متبادل مل جائے، وہ اپنی باسی کڑھی جیسی بیوی کو خاک یاد کرے گا۔“ عرفان اللہ کا موڈ فوراً ہی بدل گیا۔ صوفیہ نے اس کے اس بدلے ہوئے موڈ کا بھرپور ساتھ دیا۔ عرفان اللہ وہ شخص تھا جسے اپنی مشوہ و غزروں سے قابو میں رکھنا ایک طرف اس کی ذمہ داری تھی تو دوسری طرف یہ لالچ بھی تھا کہ مستقبل میں وہ شخص جس مقام پر پہنچایا جانے والا تھا، موجودہ تعلق کی بنیاد پر وہ اس سے تنظیم کے مقاصد کے علاوہ ذاتی مفادات بھی حاصل کر سکتی تھی۔

ہوس اور لالچ کے گٹھ جوڑ سے بننے والے تعلق کے شوریدہ سر جذبات ذرا سرد ہوئے تو وہ دونوں تھک کر نیند کی وادی میں اتر گئے۔ ابھی غیند بہت گہری نہیں ہوئی تھی کہ زوردار دھماکے کے ساتھ دروازہ کھولنے کی آواز ایک جھٹکے سے ہوش و حواس کی دنیا میں واپس لے آئی۔ کھلی آنکھوں نے جس چہرے کو سامنے دیکھا، اسے دیکھ کر پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

☆☆☆

”کیسا..... کیسا ہے وکی؟“ اسپتال پہنچتے ہی ان کا لالہ کے ایک آدمی سے سامنا ہوا۔ پورے راستے خود پر بند باندھے معاذ کا صبر اس موقع پر جواب دے گیا اور اسے تقریباً جھنجھوڑتے ہوئے وکی کی بابت دریافت کیا۔

”آپریشن تھیر میں ہے۔ خون بہت زیادہ بہہ گیا ہے۔ ڈاکٹر نے بڑی مقدار میں خون جمع کرنے کو کہا ہے۔“ اس شخص کا سا ہوا چہرہ بتا رہا تھا کہ معاملہ کافی گڑبڑ ہے۔

”تو جمع کرواد خون۔ شہر میں اتنے بلڈ بینک ہیں۔ کیا ان سے میرے لاڈلے کے لیے چند بوتلیں خون نہیں مل سکتا۔ اگر نہیں مل سکتا تو آگ لگا دو سب کو۔“ لالہ کسی غضب ناک شیر کی طرح دھاڑا۔

”ہم کوشش کر رہے ہیں لالہ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ وکی بھائی کا بلڈ گروپ او نیکیو ہے اور اس گروپ کا ڈونر بہت مشکل سے ملتا ہے۔“ اس شخص نے دھیمی آواز میں لالہ کو جواب دیا۔ حالات کی سنگینی کے اس ادراک نے معاذ کے قدموں تلے سے زمین کھینچ لی۔ وکی اسے اتنا عزیز تھا کہ اس کی زندگی بچانے کے لیے رگیں نچوڑ کر اپنے خون کا آخری قطرہ تک اسے دے سکتا تھا لیکن یہاں بات جذبات کی نہیں، حقائق کی تھی۔ قدرت کی مرضی کے آگے وہ بے بس تھے۔

”ہمارے لوگ شہر کے سارے بلڈ بینکس سے رابطہ کر رہے ہیں۔ سوشل میڈیا پر بھی ہماری انعام کے اعلان

کے ساتھ ڈونر کے لیے اپیل کر دی ہے۔ اللہ نے چاہا تو کچھ نہ کچھ.....“ وہی شخص انہیں اپنے اقدامات سے آگاہ کر رہا تھا لیکن لالہ اس کی بات مکمل ہونے سے قبل بھا تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا آگے بڑھ چکا تھا۔

”لالہ.....!“ معاذ اسے آواز دیتا ہوا اس کے پیچھے لپکا لیکن اس کے قریب پہنچنے سے قبل ہی لالہ ڈاکٹر زروم میں پہنچ چکا تھا۔

”وقاص احمد کے لیے جتنا خون درکار ہے، میرے جسم سے نکال لیں۔ اگر وہ نہ بچ سکا اور میرے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی بچ گیا تو تم میں سے کسی کی خیر نہیں ہوگی۔“ آنکھوں سے اگر خون ابلا پڑ رہا تھا تو لہجے میں غیظ کی چنگاریاں تھیں۔ اس کے اس انداز پر بنگ ڈاکٹر کا چہرہ سرخ پڑ گیا اور پُر طیش لہجے میں بولا۔

”پہلے آپ جا کر اپنا بلڈ ٹیسٹ کروائیں پھر آگے بات ہوگی۔ یہ کوئی انڈین مووی نہیں ہے کہ جذباتی بھڑکیں مار کر مریض کی جان بچائی جاسکے۔“

ایک تو وہ لالہ کی دنیا سے باہر کا شخص ہونے کی وجہ سے اسے جانتا ہی نہیں تھا، دوسرے سامنے والے کے جاہل ہونے کا یقین اور اپنی ڈگری کا زعم بھی تھا اس لیے لہجے کی ترشی بہت بڑھ گئی تھی۔ تجربے کی کمی نے اسے یہ اندازہ بھی نہیں لگانے دیا تھا کہ اس کے مقابل کھڑا شخص اندر سے کیسے کسی آتش فشاں کی طرح ابل رہا ہے۔

”میرا خون، میرے جگر کا ٹکڑا ہے وہ۔ میرا بلڈ گروپ اس سے میچ نہیں کرے گا تو پھر کس کا کرے گا؟ او ٹیکیو ہوں میں بھی اور یہ بات اس لیے اچھی طرح جانتا ہوں کہ تیری ڈگریوں سے کہیں زیادہ زخم سچے ہیں میرے بدن پر۔ ایک بار نہیں پچاسیوں بار ٹیسٹ ہوا ہے میرا بلڈ گروپ۔“ لالہ نے اس زور سے اس کا گریبان پکڑا کہ اس کی سانس رک گئی اور آنکھیں ابل پڑیں۔

”لالہ پلیز..... پلیز ریلیکس لالہ.....!“ معاذ نے تیزی سے آگے بڑھ کر ہٹا کر اس کی گرفت سے نجات دلوائی۔

”اللہ سب ٹھیک کرے گا۔ کچھ نہیں ہوگا ہمارے وکی کو۔ آپ خود پر قابو رکھیں اور ڈاکٹر کو ان کا کام کرنے دیں۔“ اس نے لالہ کو اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے کر ایک کرسی پر بٹھایا اور ڈاکٹر سے درشت لہجے میں بولا۔

”جیسا آپ سے کہا گیا ہے، ویسا کریں اور پلیز، خیال رکھا کریں کہ سامنے کون ہے؟ ہر آدمی کو ایک ہی لالچی سے ہانکنے کی کوشش میں کسی دن آپ اپنا منکا تر واثی نہیں گے۔“

ساتھ لے گیا۔ لالہ کے جانے کے بعد وہ خود اس کی جگہ کرسی پر بیٹھ گیا اور میز پر سر رکھ کر خاموشی سے آنسو بہانے لگا۔ ان آنسوؤں کے ساتھ بے تحاشہ دعائیں بھی تھیں کہ وہ کی جیسے اچھے انسان، مخلص دوست اور سب سے بڑھ کر اپنی بہن کے سہاگ کو کسی صورت کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اسے دعا کرتے کرتے علیحدہ کی فون کال یاد آتی تھی تو گھبراہٹ ہی ہونے لگتی تھی۔ یہاں سے اتنی دور بیٹھ کر بھی جیسے کسی انجان ذریعے سے وہاں تک مشکل کی خبر پہنچ گئی تھی جب ہی تو وہ ماں بیٹا بے چین دے قرار تھے۔ کیا کوئی انہونی ہونے کو تھی؟ کوئی بڑا نقصان، کوئی دائمی دکھ لگات میں تھا؟ سولالات دماغ میں اٹھتے تھے تو دل ڈوب ڈوب جاتا تھا۔ ابھی وہ اپنی اس کیفیت سے لڑ ہی رہا تھا کہ باہر کچھ شور سانسائی دیا۔ وہ گھبرا کر جلدی سے باہر نکلا۔

”کیا..... کیا ہوا ہے؟“ اس نے وہاں موجود نالہ کے آدمیوں میں سے ایک سے پوچھا۔ خود اسے تو ایک بند ہوتے دروازے کے پیچھے کم ہوتے ہوئے اسٹریچر کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیا تھا۔

”بشریٰ صاحبہ کو لایا گیا ہے۔ ان کے شانے میں گولی لگی ہے۔“ اس شخص نے پست آواز میں اطلاع دی تو معاذ نے بے ساختہ ہی خود کو سہارا دینے کے لیے قریبی دیوار سے ٹیک لگالی۔ شاید آج کے دن ایک بھی اچھی خبر نہیں ملنے والی تھی۔

☆☆☆

”تم..... تم یہاں کیسے آئے، تمہیں اندر کس نے گھسنے دیا؟“ عرفان اللہ پہلے تو باذل کو اپنے سر پر کھڑا دیکھ کر بُری طرح گھبرا گیا پھر غصے سے چیخنے لگا۔ اس کے ساتھ موجود صوفیہ البتہ خاموش تھی اور خاموشی ہی سے بیڈ کراؤن سے پشت لگا کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ نیم عریاں تھی اور اپنی بے ستری کو چھپانے کے لیے چادر کندھوں تک کھینچ لی تھی۔

”اندر کس نے گھسنے دیا؟ کیا مطلب؟ کیا آپ نے میرے یہاں آنے پر پابندی لگا رکھی تھی؟ اگر ایسا تھا تو یقین کریں آپ کا اسٹاف شدید نکما ہے۔ اگر آپ کو موقع ملے تو پہلی فرصت میں اس اسٹاف کو فارغ کر دیجیے گا۔“ ”اگر“ پر خاصا زور دیتے ہوئے اس کا لہجہ خاصا طنزیہ تھا۔ عرفان اللہ کو یکدم ہی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اپنے تئیں باذل کا انتظام کر چکنے کے باعث اسے خیال ہی نہیں آیا تھا کہ اس کے سلسلے میں سیکورٹی اسٹاف کو کسی قسم کی خصوصی ہدایت دے سکے۔ باذل کا ہمیشہ سے اس کے گھر میں بے

ڈاکٹر نے جو موت کے منہ سے واپس آیا تھا، خاموشی سے اس کی بات سنی اور باہر کی طرف دوڑا۔ اسٹاف کے کچھ اور لوگ بھی جو آوازیں سن کر وہاں آگئے تھے، خاموشی سے پلٹ گئے تھے۔ یہ ایک نجی اسپتال تھا جہاں لائے جانے والے اس خاص مریض کی تفصیلات سے آگاہ نہ ہوتے ہوئے بھی انہیں یہی معلوم تھا کہ انہیں مریض کے ساتھ موجود افراد کے ساتھ بھرپور تعاون کرنا ہے اور مریض کی جان بچانے کے لیے اپنی جان لڑا دینی ہے۔ مریض کی اہمیت کا اندازہ تو اس بات سے بھی لگایا جاسکتا تھا کہ رات کے اس پہر اسپتال کا سب سے تجربہ کار اور قابل سرجن اپنے معاونین کے ساتھ مل کر اس کی جان بچانے کے لیے آپریشن تھیمز میں مصروف تھا لیکن اس نئے اپائنٹ ہونے والے احق ڈاکٹر نے صورتِ حال کی نزاکت کو سمجھے بغیر مسئلہ کھڑا کر دیا تھا۔

”پانی پیئیں۔“ ارد گرد کی پروا کیے بغیر وہ لالہ کو پُرسکون کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”اس کے باپ اور اپنے عزیز از جان بھائی کو نہیں بچا سکا تھا میں۔ میری بہن بھی بھیڑیوں کے ہتھے چڑھ گئی تھی اور بھادج بھی بے بسی کی موت مری تھی۔ میں نے ہر بار دشمن کے خون سے اپنے انتقام کی آگ بجھانے کی کوشش کی تھی لیکن سچ بتاؤں تو میرے اندر آج بھی سلگن ہے۔ اپنے چلے جائیں اور ایسے ظالمانہ طریقے سے چلے جائیں تو اس دکھ اور جلن کو مٹانے کے لیے کوئی طریقہ کامیاب نہیں رہتا۔ خود کو شراب میں ڈبوئے پر یہ دکھ رگوں کو کاٹتا رہتا ہے۔ میں اس دکھ کی اذیت سے اچھی طرح واقف ہوں اس لیے اب کسی صورت دوبارہ اس سے نہیں گزرنا چاہتا، ہرگز نہیں گزرنا چاہتا۔“ لالہ نے پانی سے بھرا گلاس تھامنے کے بجائے بھرائی ہوئی آواز میں بولنا شروع کر دیا۔ کب اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے، اسے خود بھی خبر نہ ہو سکی۔

”حوصلے سے لالہ! حوصلے سے..... کچھ نہیں ہوگا ہمارے دکی کو۔ آپ کو شاید نہیں معلوم لیکن میں جانتا ہوں کہ اس کے ساتھ بے شمار دعائیں ہیں۔ وہ اپنوں اور غیروں کے دکھ بانٹنے والا اور مشکل میں لوگوں کا ساتھ دینے والا ہے۔ ایسے شخص کو اس کے مشکل وقت میں اللہ تنہا چھوڑ دے، یہ ممکن ہی نہیں ہے۔“ لالہ جیسے شخص کو یوں ٹوٹے دیکھنا بہت تکلیف دہ عمل تھا۔ معاذ نے بہ مشکل خود کو چھلکنے سے روکا اور بہت است سے لالہ کا حوصلہ بندھاتا رہا۔ یہاں تک کہ اسپتال کا عملہ خون لینے کے لیے اسے اپنے

تکلفانہ آنا جانا تھا اور صرف اتنا ہی نہیں تھا، اسے انتظامی معاملات میں بھی خصوصی اختیارات حاصل تھے اور وہ چاہتا تھا تو سیکورٹی سے متعلق از خود بہت سی تبدیلیاں کر کے محض اطلاع دے دیتا تھا۔ اس کی اس حیثیت کے بعد بھلا کس کی مجال تھی کہ اس کو رات کے اس پہر ہی سہی، اندر آنے سے روکتا۔ میڈم ایکس کے آدمی گھر کے سیکورٹی اسٹاف میں شامل نہیں تھے۔ انہیں اس نے صرف باہر کی سرگرمیوں کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ اگر ان میں سے کوئی موجود ہوتا تو کم از کم صوفیہ کو ہی اطلاع دے دیتا۔ پرانے اسٹاف نے تو باذل کو پرانا پروٹوکول دیتے ہوئے آرام سے اندر آنے دیا تھا۔

”کیوں آئے ہو تم یہاں؟“ عرفان اللہ اگرچہ اندر سے گھبرا چکا تھا پھر بھی لہجے میں رعب لانے کی کوشش کی۔

”آپ میرے اوپر فوجیں چڑھا کر مجھے اپنے پاس بلوانے کی زحمت کر رہے تھے تو میں نے سوچا آپ کو اس مشکل سے بچالوں اور خود آپ کی خدمت میں حاضری دے دوں۔“ اس کے لہجے میں موجود طنز کی کاٹ کے ساتھ ساتھ عرفان اللہ نے کہیں تہہ میں بل کھاتے غصے کو بھی محسوس کیا تو اندر ہی اندر کانپ کر رہ گیا لیکن پھر خود کو سنبھالتے ہوئے بولا۔

”تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہیں۔ اگر مجھے ختمیں بلوانا ہوتا تو کوئی بھی الٹی سیدھی حرکت کرنے کے بجائے ڈائریکٹ فون کر کے یہاں بلوا سکتا تھا۔“

”ہونے کو تو بہت کچھ ہو سکتا تھا۔ آپ میری ماں سے نکاح پڑھوا سکتے تھے، مجھے اپنا لیبی نہ سہی، قانونی بیٹا تسلیم کر سکتے تھے، مجھے ایک غنڈے بد معاش کی جگہ اپنا سیاسی جانشین بنا سکتے تھے لیکن آپ وہ سانپ ثابت ہوئے جو اپنے ہی بچوں کو کھا جاتا ہے۔“ باذل کے لہجے میں ایک پھنکاری تھی۔

”کیا بکواس کیے جا رہے ہو۔ اپنی ان فضولیات پر بات کرنے کے لیے تمہیں رات کا آخری پہر ہی ملا تھا؟“ عرفان اللہ نے اسے ڈپٹا۔

”ہاں، یہی پہر ملا تھا اور میں نے اسی کو غنیمت جانا کیونکہ ہونے کو تو یہ بھی ہو سکتا تھا کہ میں اس پہر خود پر چڑھائی کرنے والوں میں سے کسی کی گولی کا نشانہ بن کر ہمیشہ کی نیند سو جاتا اور آپ اس عمر میں اس جل پری کے ساتھ دادِ بیش دیتے رہ جاتے۔“ اس نے بستر پر لب بستہ بیٹھی صوفیہ پر ایک تعجب آمیز نظر ڈالی۔

”تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“ عرفان اللہ نے تموک نکل کر خشک ہو جانے والے گلے کو تر کرنے کی کوشش کی۔

”ہمارے درمیان ہونے والی آخری ملاقات کے بعد ہی کسی غلط فہمی کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ تابوت میں آخری کیل آپ کے مخبر کے پکڑے جانے سے ٹھک گئی۔ میرے نے خود آپ کی اور اس کی گفتگو سنی تھی، باقی سچ بھی اس کی زبان گدی سے کھینچ کر اگلا لیا گیا ہے اور میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ آپ نے کب، کہاں اور کیسے مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہے۔“ وہ اطمینان سے بستر کے مقابل رکھے ایک سنگل صوفے پر جم کر بیٹھ گیا اور اپنے ہاتھ میں موجود خطرناک گن کو یوں نمایاں کر کے رکھا کہ عرفان اللہ کا خون خشک ہو جائے۔ وہ جانتا تھا کہ عرفان اللہ جوڑ توڑ اور چار سو بیسی میں کتنا ہی ماہر سہی، خود سے لڑنے بھڑنے والا آدمی نہیں ہے۔ اسے صرف حکم دینے اور اپنے پالتو غنڈوں کے ذریعے مخالفین کو ٹھکانے لگانے کی عادت نے ہاتھ پیر چلانے کے لائق ہی نہیں چھوڑا تھا۔

”میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ میں تو بس تم سے بات چیت کرنا چاہتا تھا تا کہ تمہیں سمجھا سکوں کہ ہم اب بھی پہلے کی طرح ایک ٹیم بن کر کام کر سکتے ہیں۔“ عرفان اللہ کو اس کے تیور گھبراہٹ میں مبتلا کر رہے تھے۔

”ٹھیک ہے۔ کرتے ہیں بات چیت لیکن یاد رکھیں کہ ہماری پوری بات چیت کی بنیاد میری اس شرط کو مان لینے پر ہوگی کہ آپ مجھے اپنا بیٹا تسلیم کر لیں۔“ وہ ٹانگ پر ٹانگ جما کر بیٹھ گیا اور عرفان اللہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا۔

”تمہاری سوئی اسی ایک بات پر کیوں انک گئی ہے۔ تمہاری یہ بے صبری میرا سیاسی کیریئر داؤ پر لگا دے گی۔“

”اور میں جو بچپن سے اب تک رسوائی سہتا آرہا ہوں، اس کا کچھ نہیں۔ آپ ساری زندگی ایک غلام کی طرح مجھے استعمال کرتے رہے ہیں۔ اب مجھے اپنی رسوائی اور غلامی دونوں کا مداوا چاہیے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو میں سب کچھ تمہیں نہیں کر کے رکھ دوں گا۔“ عرفان اللہ کے جواب نے اس کے غصے کو سوانیزے پر پہنچا دیا اور وہ ایک دم جل کھا کر کھڑا ہوا تو گن کا رخ عرفان اللہ کی طرف تھا۔ غصے کی شدت نے اس سے گولی بھی چلوادی۔

گولی عرفان اللہ کے جسم کے کون سے حصے پر لگی، وہ دیکھ نہیں سکا کیونکہ یکدم ہی صوفیہ کا چادر کے نیچے چھپا ہاتھ باہر آیا تھا اور اس نے اپنے بائیں جبڑے سے دائیں جبڑے کے درمیان آگ کی ایک لہری گزرتی ہوئی محسوس کی تھی۔ تکلیف کی شدت کے باوجود اس نے گن ہاتھ سے نہ

چھوڑی اور ایک فائر صوفیہ کی طرف جمونک دیا۔ اسی وقت باہر سے میرو نے پکارا۔

”باس! نکلنے کی کرو۔ پولیس کی گاڑیاں اس طرف آ رہی ہیں۔“ وہ تکلیف سے جلتے گال پر ہاتھ رکھ کر باہر کی طرف دوڑا۔ تکلیف اتنی زیادہ تھی کہ اسے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہو رہا تھا لیکن اپنی مضبوط قوتِ ارادی کے سہارے وہ نہ صرف اپنے پیروں پر کھڑا تھا بلکہ دوڑ بھی رہا تھا۔ اگر وہ اس وقت آئینہ دیکھ سکتا تو دیکھتا کہ اس کا چہرہ کتنا بھیاںک ہو چکا ہے۔ دونوں رخسار اس بری طرح جلتے تھے کہ آریار چھید ہو گیا تھا اور اس چھید سے ہڈیوں کے ساتھ ساتھ جلی ہوئی زبان بھی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے پاس اس وقت واحد پلس پوائنٹ یہ تھا کہ وہ اس گھر کے چپے چپے سے اچھی طرح واقف تھا اور سیکورٹی گارڈز سے سامنا کیے بغیر بھی بہ آسانی باہر نکل سکتا تھا۔ میرو اور اس کا دوسرا ساتھی شاید گارڈز کے ساتھ الجھ گئے تھے اس لیے فائرنگ کی تیز آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ جیسے ہی باہر نکلا، ایک زوردار دھماکا سنائی دیا اور ساتھ ہی زمین اتنے زور سے لرزی کہ وہ قدم اکھڑنے سے زمین پر گر گیا۔ ایک ہل کے لیے اس کی آنکھوں کے آگے دھند چھا گئی۔

دھند کے اس بار اس نے اکھڑا ہوا گیٹ اور داخلی راستے پر بھڑکتے شعلے دیکھے۔ شعلوں کے پیش منظر میں سرپٹ دوڑتا میرو اور اس کا ساتھی دکھائی دے رہے تھے۔ یقیناً انہوں نے سیکورٹی گارڈز سے جان چھڑانے کے لیے ہینڈ گرنیڈ کا استعمال کیا تھا لیکن دوسری مصیبت اس پولیس موہائل کی صورت ان کے سر پر سوار تھی جو ابھی ابھی وہاں آکر رکی تھی اور جس کا چنگھاڑتا سائرن ماحول کو مزید بھیاںک بنا رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ اس موہائل سے کوئی پولیس والا برآمد ہوتا یا ان کی طرف سے کوئی ایکشن لیا جاتا، دوڑتے ہوئے میرو نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک اور ہینڈ گرنیڈ برآمد کیا اور دانت سے اس کی پن پھینچ کر موہائل کی طرف اچھال دیا۔ متوقع دھماکے کے پیش نظر باذل نے فوراً ہی اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے۔ یہ دھماکا پہلے والے دھماکے سے بھی زیادہ شدید تھا۔ پولیس موہائل کو کسی کھلونا گاڑی کی طرح اچھلتے اور پھر شعلوں کی زد میں آتے اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ زمین کی لرزش بھی اس بار پہلے سے زیادہ ہی محسوس ہوئی لیکن وہ خود کو سنبھال کر اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی گاڑی کی طرف دوڑا۔ میرو اور دوسرا ساتھی اس سے آگے تھے۔ فضا میں ایک اور پولیس

موہائل کی آواز گونجنے لگی تھی اور وہ امید نہیں کر سکتا تھا کہ ان حالات میں میرو کو اسے اپنے ساتھ لے جانے کا خیال آئے گا۔ وہ اپنی دنیا کی سفاکیت سے اچھی طرح واقف تھا۔ ایسے نازک حالات میں ہر ایک کی پہلی ترجیح اپنی جان کا تحفظ ہوتی تھی چنانچہ اسے بھی اپنی جان بچانے کے لیے خود ہی کوشش کرنی تھی۔ وہ گرتا پڑتا گاڑی کے قریب پہنچا تو میرو پچھلی نشست پر بیٹھ چکا تھا جبکہ اس کے ساتھی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔

”جلدی..... جلدی کرو باس!“ میرو اسے دیکھ کر چیخا اور گردن گھما کر موقع پر وارد ہونے والی پولیس موہائل کو دیکھا۔ باؤل جس کا جسم پوری کوشش کے باوجود اس وقت مکمل ردھم میں نہیں تھا، گاڑی کے کھلے دروازے سے اندر داخل ہونے ہی لگا تھا کہ موہائل میں سوار پولیس والوں میں سے کسی نے اندر بیٹھے بیٹھے گولی چلائی۔ اب پتا نہیں اس کا نشانہ ہی بہت اچھا تھا یا باؤل کی گردش میں آئی قسمت تھی جس نے اس پر ایک اور وار کیا اور گولی سیدھی اس کی کمر میں کھستی چلی گئی۔ اس کے حلق سے تیز خراہٹ نما آواز نکلی اور جسم جھٹکا کھا کر یوں گاڑی کی نشست پر گر ا کہ محض ٹانگیں ہی باہر رہ گئیں۔ پچھلی نشست پر موجود میرو نے اس پر بس ایک نظر ڈالی اور نئی وارد ہونے والی پولیس موہائل سے نمٹنے کے لیے تیسرے ہینڈ گرنیڈ کا استعمال کیا۔ اس کام کے لیے اسے گاڑی کی کھڑکی سے اپنا اگلا دھڑا دھڑے سے زیادہ باہر نکالنا پڑا تھا۔ یہاں اس نے ہینڈ گرنیڈ موہائل کی طرف اچھالا وہاں ایک سنسنائی ہوئی گولی آکر اس کے بازو سے ٹکرائی۔ اس کے منہ سے تیز چیخ نکلی لیکن یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ موہائل اور موہائل والے اس لائق نہیں رہے تھے کہ ان کے تعاقب میں آسکتے۔

”نکلو یہاں سے۔“ اس نے ڈرائیونگ سیٹ پر موجود ساتھی کو چیخ کر حکم دیا اور خود باؤل کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کا آدھ سے زیادہ جسم گاڑی کے اندر تھا اس کے باوجود اپنے زخمی بازو کے ساتھ اسے اندر کھینچنے میں اسے دانتوں پسینا آگیا۔ مجروح بازو سے بھی خون مزید تیزی سے بہنے لگا۔ ادھر باذل بالکل بے سدھ تھا اور اس میں اتنی طاقت اور ہمت ہی نہیں تھی کہ خود کو ہلا جلا سکے۔ وہ اسی طرح گاڑی کے پچھلے حصے میں پڑا تھا کہ اوپری جسم نشست پر تھا اور ٹانگیں نیچے گاڑی کے فرش پر تھیں۔

میرو نے ایک نظر اس کی کمر سے ابلتے خون کو دیکھا پھر اپنے بازو کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جائزہ لینے پر اسے

ان حالات میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے۔“ میرد خود تناؤ کا شکار تھا لیکن وہ یہ بالکل صحیح کہہ رہا تھا کہ ان حالات میں اس کے بس میں اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں تھا۔ عرفان اللہ کی چھپر چھاؤں سے نکلنے کے بعد وہ پہلے ہی بے آسرا ہو گئے تھے اور اب یہ بھی نہیں پتا تھا کہ کتنے ساتھی زندہ ہیں اور کتنے مارے جا چکے ہیں۔ زندہ بچ جانے والوں میں سے کچھ ادھر ادھر بکھر جاتے اور کچھ پولیس کے ہتھے چڑھ جاتے۔ پولیس کے ہتھے چڑھ جانے والے خطرہ ثابت ہو سکتے تھے کہ ان کے ذریعے بچے کچھ ٹھکانے بھی پولیس کی نظر میں آ جاتے۔ اس لیے بہتر یہی تھا کہ پہلے اپنی بقا کی فکر کی جاتی۔

”اس روٹ پر کوئی سرکاری اسپتال تو نہیں پڑے گا، ہاں ایک پرائیویٹ اسپتال ہے۔ کیا وہاں گاڑی روک لوں؟“ ڈرائیور نے پوچھا۔

”روک لینا۔ جب قسمت کو ہی آزمانا ہے تو کیا سرکاری، کیا پرائیویٹ۔“ میرد نے ایک آہ سی بھری اور باذل کے چہرے پر نظر ڈالی۔ جس زخم نے اس کے چہرے کو اتنا بھیاںک بنا دیا تھا وہ اس کی نوعیت نہیں سمجھ سکا تھا۔ رخسار اور جڑے کی ہڈی اس طرح چھدی ہوئی تھی جیسے کوئی گولی آر پار ہو گئی ہو لیکن گولی کے زخم کی طرح متاثرہ حصوں سے خون نہیں بہہ رہا تھا اور جلنے جیسے آثار تھے۔ اس کی زندگی ہتھیاروں کے ساتھ گزری تھی لیکن اس نے کبھی ایسا کوئی ہتھیار نہیں دیکھا تھا جس کا زخم اس نوعیت کا ہو۔ ہاں لیزر گن وغیرہ کے بارے میں سنا ضرور تھا اور اس زخم کو دیکھ کر یہی سوچ رہا تھا کہ باذل پر ایسا ہی کوئی ہتھیار استعمال کیا گیا ہے۔ عرفان اللہ کی کوٹھی میں ایسا انوکھا ہتھیار کس کے پاس ہوگا؟ اس کے لیے یہ سوال اپنی جگہ ایک معما تھا کیونکہ وہ صوفیہ اور اس کی اصلیت سے واقف ہی نہیں تھا۔

”تیار ہو جاؤ۔ اسپتال بس آ گیا ہے۔ میں اسپتال کے گیٹ کے قریب اسپید کم کردوں گا۔ تم جلدی سے اپنا کام نمٹالینا۔“ ڈرائیور سیٹ پر موجود شخص کی آواز نے اس کی توجہ باذل پر سے ہٹائی اور ایک ہنکارا بھر کر خود چوکن ہو بیٹھا۔ دروازے کا لاک بھی پہلے سے ہی کھول لیا۔

اطمینان ہوا کہ گولی محض گوشت پھاڑتی ہوئی باہر نکل گئی ہے اور ہڈی بالکل سلامت ہے۔ اس نے گاڑی میں پڑا ایک کپڑا اٹھا کر کسی نہ کسی طرح اسے مضبوطی سے اپنے بازو کے گرد باندھا۔ گاڑی جس رفتار سے جارہی تھی اس کے باعث یہ کام خاصا مشکل ثابت ہوا تھا۔ اس مرحلے سے گزرنے کے بعد اس نے ایک بار پھر باذل کا جائزہ لیا۔ اس کی کمر کے زخم سے خون کا بہاؤ ہنوز جاری تھا اور آنکھیں بند تھیں لیکن وہ دھیرے دھیرے سانس لے رہا تھا۔ میرد نے اس کی نبض چیک کی۔ نبض کی رفتار بھی بے حدست تھی۔

”راستے میں کوئی اسپتال پڑے تو اس پر گاڑی روک لینا۔“ کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے اس نے ڈرائیورنگ کرنے والے کو حکم دیا۔ اس وقت ان کی سب سے بڑی خوش قسمتی یہ تھی کہ ان کا تعاقب نہیں کیا گیا تھا اور وہ اطمینان سے سفر کر رہے تھے۔

”اسپتال.....؟“ ڈرائیور کو شاید ملنے والے حکم کا یقین نہیں آیا اس لیے حیرت سے سوالیہ لہجے میں پوچھا۔

”ہاں اسپتال.....“ باس کی حالت بہت خراب ہے۔ کسی اسپتال پہنچ گیا تو شاید بچ جائے ورنہ ہم تو کچھ نہیں کر پائیں گے۔“ میرد نے اسے جواب دیا اور خود ہونٹ چبانے لگا۔ اسے اس لمحے پر افسوس تھا جب وہ باذل کا حکم مان کر اس کے ساتھ عرفان اللہ کے گھر چل پڑا تھا۔ وہ لوگ اچھے بھلے حملہ آوروں سے بچ کر محفوظ ٹھکانے پر پہنچ گئے تھے۔ بہتر یہی تھا کہ حالات سازگار ہونے تک وہیں دبکے رہتے اور پھر موقع دیکھ کر جو کچھ کرنا ہوتا، کرتے لیکن غصے میں پاگل ہوتا باذل کچھ سننے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔ وہ فوری طور پر عرفان اللہ سے حساب کتاب کرنا چاہتا تھا۔ ابتدا میں سب کچھ آسان بھی ثابت ہوا تھا لیکن پھر اچانک معاملات بگڑ گئے تھے اور وہ یہ مشکل ہی وہاں سے اپنی جان بچا کر فرار ہو سکے تھے۔ وہ تو اس بات پر ہی شکر ادا کر رہا تھا کہ اپنے ساتھ وینڈر گرینڈ لے کر نکلا تھا ورنہ کہانی ختم تھی۔

”لیکن اسپتال جا کر تو ہم خود بھی پھنس جائیں گے۔ موجودہ حالات میں تو ہمارے سر پر کسی کا ہاتھ بھی نہیں ہے۔“ ڈرائیور اب بھی ہچکچاہٹ کا شکار تھا۔

”ہم اسپتال نہیں جائیں گے۔ بس باس کو اسپتال کے سامنے ڈال کر خود نکل جائیں گے۔ قسمت اچھی ہوئی تو اسپتال والے رحم کھا کر اس کا ٹریٹمنٹ کر دیں گے۔ ہم

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر ہو جوان
کی داستان جو غلط کاروں کے لیے غضب
ناک تھا باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیے



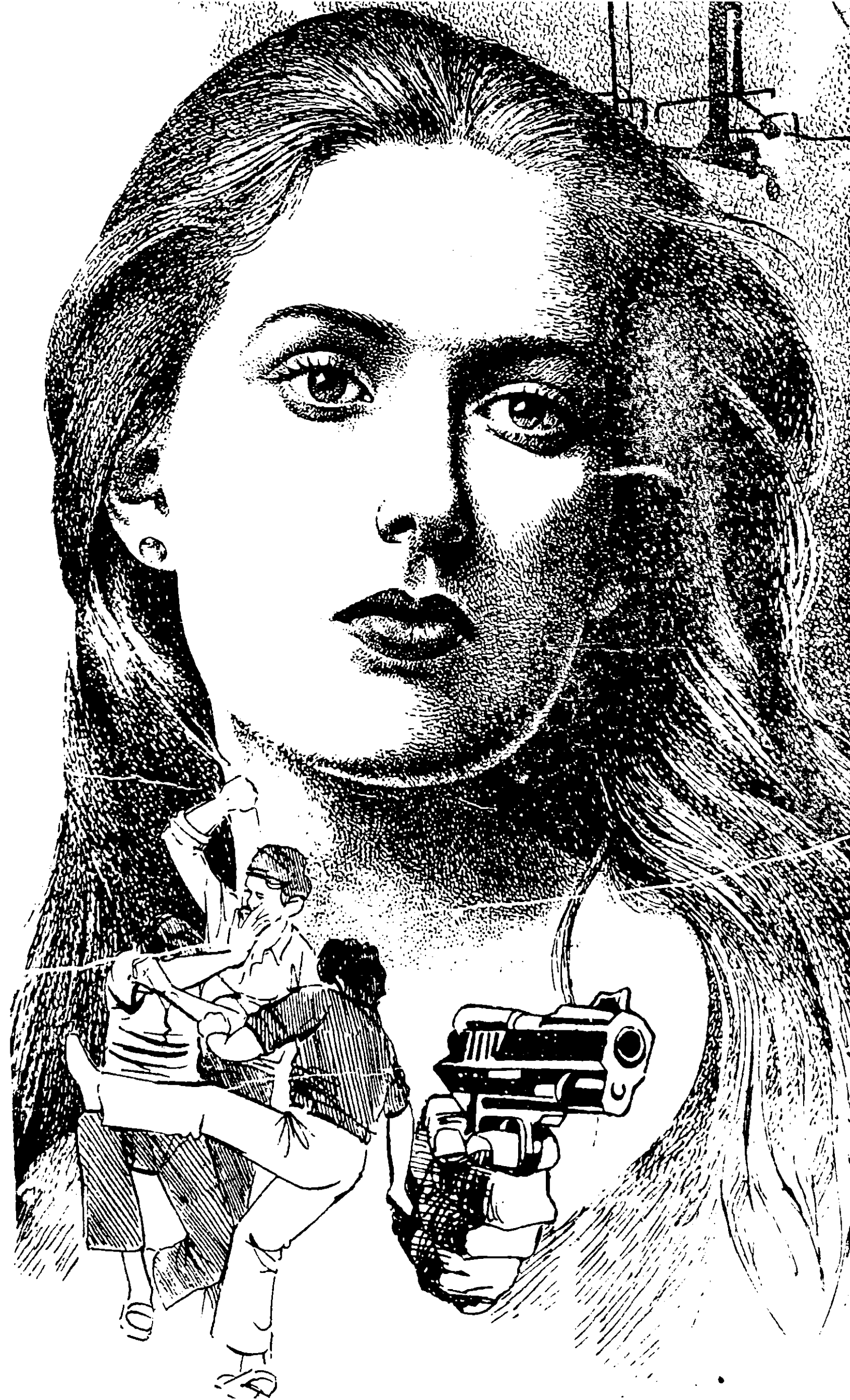
قسم نمبر: 45



اسماء قادری

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تندوتیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابل شکست بنایا تو دوسری طرف ظالم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پُر عزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جا رہے تھے... اس کی زندگی جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قراریوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تار عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ وارداتِ قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہو سکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تحیر انگیز داستان



معاذ ایک ذہین لیکن مستون مزاج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جوائن کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ انسٹی ٹیوٹ سے واپس آ رہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو سڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی نڈر فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشری نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بشری ماس کمیونی کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم وغیرہ لکھتی ہے۔ اس ویران جگہ بھی وہ ایک زیر تعمیر رہائشی منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی آئی تھی۔ معاذ بشری کو یہ حفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کر دیتا ہے لیکن جن رئیس زادوں سے اس نے ان کا شکار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ایک دن جنگل کی سیر کے دوران وہ فوٹو گرافی کے شوق میں سب سے الگ تھلگ ہو جانے والے معاذ کو بے خبری میں گھیر کر بری طرح زد و کوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دے دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس نہ آنے پر انتظامیہ کے افراد، پولیس اور ریسکیو ذرائع کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جگہ کی جمو پٹری میں پاتا ہے۔ جوگی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے، جوگی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نواز کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے پراسرار علم سکھانے کی ہامی بھر لیتا ہے اور معاذ اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ادھر جائے وقوعہ سے ملنے والے معاذ کے کمرے سے جب تصویریں نکلوائی جاتی ہیں تو ایک ایسی تصویر بشری کی نظر میں آ جاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ فانی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پروجیکٹ کے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشری تحقیق کر رہی تھی۔ بشری کے اپنے والد جرنلسٹ ہوتے ہیں۔ اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشری کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ صدمے سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باذل نامی غنڈے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشری انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دنوں میں ہی معاذ واپسی کا ارادہ کرتا ہے تاہم ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا عرفان اللہ اور یزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو وقاص نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باذل اچانک بشری کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر دیتا ہے۔ معاذ کو واپس لانے کے لیے اوجھے جھکنڈے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اسے واپس آنے کا پیغام دیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کر کے اسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات کے نہ بتانے پر اس کے بھائی کا ایک گروہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشری بھی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہو جاتی ہے۔ معاذ کے دوست عالم شاہ کے بہنوئی کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ کئی فنون میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے پہنا تاڑ کر کے اس کے دماغ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ فیضو سے حاصل انوکھے علم کی بدولت ان کا معمول نہیں جتا۔ عالم شاہ اور اس کا نوکر سرد، باذل کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ عالم کی بہن بچل شاہ کے نوسو نو دیئے کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اغوا کا الزام لطیف سومرو پر آتا ہے۔ عالم شاہ، باذل کی قید میں ہی جو ایک زخمی شخص کی مدد سے وہاں سے فرار ہو جاتا ہے۔ ادھر بشری دعویٰ پہنچ جاتی ہے۔ وہاں وقاص اسے باربی کے روپ میں پہچان لیتا ہے۔ وہ سلطان کو مارنا چاہتی ہے تاہم وقاص اسے ایسا کرنے سے روکتا ہے۔ ادھر عالم شاہ، باذل کی قید سے نکل کر اس کا پیچھا کرتا ہے۔ وہ وہاں معاذ کو دیکھتا ہے۔ صداقت شاہ، لطیف سومرو کو گھیرنے کے لیے اس کی خفیہ بیوی اور بچے کا کھوج لگاتے ہیں اور بچے کو اغوا کر لیتے ہیں۔ لطیف سومرو مجبور ہو جاتا ہے۔ معاذ کو اس کے گھر والوں سے ملنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ وہ ایک مشن پر سونیا کے ساتھ انڈیا روانہ ہوتا ہے تاہم کچھ لوگ سکھ یا تریوں سے بھری بس کو یرغمال بنا لیتے ہیں۔ معاذ اور سونیا نہ خانے کے تمام افراد کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔ عالم شاہ، بچل اور سرد انڈیا روانہ ہو جاتے ہیں۔ ان رپورٹ سے گھر روانگی پر راستے میں کچھ لٹیرے انہیں لوٹ لیتے ہیں۔ گھر پہنچنے پر پولیس کی ریڈ ہوتی ہے اور وہ عالم شاہ اور سرد کو لے جاتے ہیں۔ ادھر بشری اور وقاص باذل کو اسپتال میں مارنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ بچ جاتا ہے۔ معاذ اور سونیا اپنے سہولت کاروں سے مل جاتے ہیں۔ عالم شاہ اور سرد کو تشدد کا نشانہ بنا کر ویرانے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ واپس اپنے میزبانوں کے ہاں پہنچ جاتے ہیں۔ انہیں پتا لگتا ہے کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں اجالا اور اس کا عاشق شامل ہوتے ہیں۔ وہ چھپ کر ان کی باتیں سن رہا ہوتا ہے کہ اسے چھاپ لیا جاتا ہے۔ تاہم وہاں مارا ماری ہوتی ہے اور اجالا کا عاشق مارا جاتا ہے۔ پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ ان کے کزن انہیں اپنے دوسرے خفیہ جگہ پر پہنچا دیتے ہیں۔ وہ وہاں سے بحفاظت نکل جاتے ہیں۔ ادھر معاذ ایک مشن پر۔ وہ زخمی ہو جاتا ہے اور اسے ہندو سادھو اپنی کٹیا میں لے جاتا ہے جہاں اس کی اچھی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ سونیا کے آدمی معاذ کو تلاش کرتے ہیں مگر ناکام ہو جاتے ہیں۔ ادھر عالم شاہ اور سرد خفیہ

ذریعے سے ہمارے پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ دھریے جاتے ہیں اور "را" کی قید میں پھنسی جاتے ہیں۔ بشری ہاڈل کو مارنے کی کوشش میں خود نشانہ بن جاتی ہے۔ معاذ سادھو کی مدد سے ایک انٹرین میرٹن کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ وہیں اسے عالم اور سرمد کی گرفتاری کا پتا چلتا ہے۔ معاذ ڈاکٹر فردوس سے ملتا ہے اور اسے کھل کی مدد کرنے کا کہتا ہے۔ علینہ اور وقاص وغیرہ کو لالہ بیٹی ملک سے باہر نکال دیتا ہے اور ہر ممکن احتیاط کی ہدایت کرتا ہے لیکن علینہ پاکستان میں ٹوہیے سے رابطہ کرتی ہے جو ان کے لیے مصیبت بن جاتا ہے۔ ٹوہیے پر حیراب پھینک دیا جاتا ہے۔ وقاص علینہ اور اس کے گھروالوں کو مار دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس معاذ کو دیوانی شخص سے مدد لینے کا کہتی ہے۔ معاذ اپنے کزن کو پاکستان کال کرتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ اس کے گھروالوں کو مار دیا گیا ہے۔ وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کی ٹھان لیتا ہے۔ ادھر ڈاکٹر فردوس کو اس کے سسرال والے کھل کو بھگانے کی یاداش میں تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ معاذ، عالم اور سرمد کی رہائی کے لیے کارروائی کرتا ہے اور انہیں "را" کی قید سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن عالم اور سرمد کو دیوانہ کے آدمی کی دوسری جگہ پہنچا دیتے ہیں۔ سونیا معاذ کو لاہور لے جاتی ہے۔ ادھر ہاڈل ایک جگہ لالہ بیٹی کی موجودگی پر کارروائی کرتا ہے تاہم لالہ خود کو گولی مار کر ختم کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس کا انتقال ہو جاتا ہے۔ دیوانہ گینگ ڈاکٹر فردوس کی میت اٹھنے پر وہاں فائرنگ کر دیتے ہیں۔ پولیس دیوانہ کو گھیر لیتی ہے۔ معاذ دیوانہ اور اس کے آدمیوں کو نکالنے کے عوض عالم کا پتا معلوم کر لیتا ہے۔ سونیا اور معاذ حیدر آباد نواب بدرالدین کی حویلی پہنچ جاتے ہیں۔ تاہم کالے خان اور رادھا دیوی کو میڈم ایکس کے ہتھیاروں سے چھڑانے کے لیے انہیں واپس آنا پڑتا ہے۔ کالے خان کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ نواب صاحب کی حویلی میں عالم اور سرمد کی رہائی کے لیے کارروائی کر کے انہیں رہا کر لیتا ہے۔ وہ لوگ نئے ٹھکانے پر پہنچتے ہیں تو وہاں معاذ سے ملنے جا رہی نامی شخص آتا ہے۔ اسے معاذ نے "را" کی قید سے نکالا ہوتا ہے۔ جاہد اور معاذ، کھل سمیت اسپتال جاتے ہیں اور پہچان لیے جانے پر پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ پولیس سے مقابلے کے بعد وہ ایک بستی میں پناہ کے لیے گھس جاتے ہیں اور وہ لوگوں کو یرغمال بنا کر ان کی جھوپڑی میں قیام کرتے ہیں۔ ادھر سونیا معاذ کی تلاش میں نکلتی ہے اور اسے بستی میں پہنچنے پر معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ معاذ اور جاہد وغیرہ انوپ نامی شخص کے ساتھ اس کے مالک کے ہنگامے میں قیام کرتے ہیں۔ سونیا بھی معلومات حاصل کرتی ہوئی مذکورہ ہنگامے تک پہنچ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور سرمد بھی سونیا کا پیچھا کرتے ہوئے وہیں پہنچ جاتے ہیں۔ ادھر وقاص علینہ و دیگر لوگ زندہ ہوتے ہیں۔ وقاص علیہ بدل کر گلو کا ہاڈی گاڑ دیتا ہے۔ وہ معاذ کو تلاش کرنے کے لیے انٹر یا روانہ ہوتا ہے۔ وہاں اس کی گل خان سے ملاقات ہوتی ہے اور معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ سونیا، معاذ اور دیگر ساتھیوں سے مل جاتی ہے تاہم وہ جس ہنگامے میں ہوتے ہیں وہ دشمن کا ہوتا ہے۔ دشمن سب کو بے ہوش کر کے کہیں لے جا رہے ہوتے ہیں کہ ان کی گاڑی کو حادثہ پیش آ جاتا ہے۔ ان سب کو جینی بکھشو طبی امداد دیتے ہیں اور ان سے پوچھ گچھ کی جاتی ہے۔ کھل کی حالت تشویشناک ہوتی ہے اور اسے وہاں موجود ایک وید دیکھتا ہے۔ ادھر لالہ واپس اپنے لوگوں میں پہنچ کر ایکشن میں آ جاتا ہے۔ ہاڈل، معاذ وغیرہ کے ٹھکانے سے باخبر ہو جاتا ہے۔ ادھر لالہ کے آدمی میڈم ایکس کی گمرانی کے چکر میں مارے جاتے ہیں۔ لالہ اپنے آدمیوں کو انڈر رگراؤنڈ کر دیتا ہے۔ ہاڈل، معاذ کا پیچھا کرتا ہے اور چینیوں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ معاذ چینیوں کے ساتھ مل کر دشمنوں کے خلاف کارروائی کرتا ہے۔ اس دوران اسے گل خان نظر آتا ہے۔ اسے پہنا ناز کیا گیا تھا۔ وہ لالہ کی عورت کو بھی گرفت میں لے لیتے ہیں اور اسی سے معلومات لیتے ہیں۔ ادھر لالہ بیٹی، اعظم کو دشمن کی گرفت سے نکالنے کے لیے کارروائی کر دیتا ہے اور مومی اور نیلی، اعظم کو نکالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ معاذ دشمنوں کے کیمپ پر حملہ کر کے وہاں قبضہ کر لیتا ہے۔ مومی اور نیلی کی گاڑی پر حملہ ہوتا ہے تاہم مارا ماری کے بعد وہ صداقت شاہ کے پاس پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ لالہ بیٹی صداقت شاہ کو حویلی پر ریڈ کاہتا ہے۔ صداقت شاہ اعظم کے محفوظ ٹھکانے کے لیے قربان شاہ کو فون کرتے ہیں۔ اعظم کو وہاں سے نکال لیا جاتا ہے اور دوسری جگہ منتقل کر دیا جاتا ہے۔ ادھر معاذ بیجنگ پہنچ جاتا ہے اور وہاں کے کرتا دھرتاؤں سے ہات کر کے پاکستان پہنچنے کی اجازت چاہتا ہے۔ ادھر مومی اور نیلی کو پولیس گھیر لیتی ہے اور فائرنگ میں مومی مارا جاتا ہے۔ وہ اعظم کو لے جاتے ہیں اور نیلی زخمی حالت میں ان کے قبضے میں آ جاتی ہے۔ معاذ اور وی وغیرہ پاکستان پہنچ جاتے ہیں اور اعظم کی باز یابی کے لیے منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ مومی کی تدفین ہو جاتی ہے۔ ادھر ہاڈل، لالہ کی قید سے بھاگ جاتا ہے۔ معاذ، ڈی ایس پی ظہیر کے ہنگامے پر دھاوا بولتا ہے اور ڈی ایس پی کو قابو کرنے کے بعد اس سے معلومات لیتا ہے۔ وہ لوگ ظہیر خان کو لے کر وہاں سے نکل جاتے ہیں۔ ہاڈل قید سے نکل کر مہناز کے پاس پہنچتا ہے اور اسے تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ نیلی قید میں موجود ظہیر کو ٹھکانے لگا دیتی ہے۔ بشری قبرستان جاتی ہے۔ وہاں اس کی دوست ملتی ہے۔ بشری اپنی دوست کے ساتھ جاری ہوئی ہے کہ ہاڈل کے آدمی اسے اغوا کر لیتے ہیں۔ ادھر معاذ سارے معاملوں کو جلد حل کرنے کے لیے دشمن کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے مگر اس کے خیر خواہ اسے میڈم ایکس کے ہتھیاروں سے نکال لیتے ہیں اور اعظم کو بھی باز یاب کر لیتے ہیں۔ دن ہوا سے اپنے ساتھ لے جاتی ہے اور وہاں کرل سکندر بخت سے ملاقات ہوتی ہے۔ معاذ انہیں دشمنوں کے خلاف کارروائی کرنے کا کہتا ہے۔ ہاڈل، بشری کو لے کر انڈر رگراؤنڈ ہو جاتا ہے۔ ادھر وقاص ہاڈل کا پتا چلانے کے لیے ایک کال کرل سی کے گھر کارروائی کرتا ہے۔ وی اسے قابو کر کے اس کے تعاقب میں ہاڈل کے ٹھکانے پر پہنچ جاتا ہے۔ وہاں وی کے ساتھی اور کوئی اور گروپ حملہ کر دیتے ہیں۔ وی زخمی ہو جاتا ہے۔ ادھر ہاڈل، عرفان اللہ کو گولی مار دیتا ہے اور خود بھی شدید زخمی ہو جاتا ہے۔ ہاڈل کے ساتھی اسے کسی اسپتال کے آگے چھوڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔

عرفان اللہ کی کوشی سے نکلنے وقت باذل شدید زخمی ہو گیا تھا۔ اس کے سامنے کسی اسپتال کے گیٹ پر چھوڑنا چاہتے تھے۔ اتنے میں انہیں ایک اسپتال نظر آ گیا۔
 ”تھری، ٹو، ون.....!“ ڈرائیور نے الٹی ٹنٹی گئی۔
 گاڑی کی رفتار اتنی کم ہو گئی تھی کہ لگتا تھا رکنے لگی ہو لیکن وہ رکی نہیں اور اسپتال کے گیٹ پر تعینات چوکیدار نے بس اتنا دیکھا کہ گاڑی کا پچھلا دروازہ کھلا، اس میں سے کسی کو باہر دھکیلا گیا اور رکتی ہوئی گاڑی یکدم ہی رفتار پکڑ کر تیزی سے آگے نکل گئی۔ چوکیدار بھلا کیسے جان سکتا تھا کہ جس شخص کو اسپتال کے گیٹ پر بیدروی سے دھکیل کر بے یار و مددگار چھوڑا گیا ہے، وہ بھی ان دھکیلنے والوں کا ان داتا ہوا کرتا تھا اور وہ پالتو کتوں کی طرح اس کے قدموں میں لوٹا کرتے تھے۔ وہ یہ بھی نہیں جان سکتا تھا کہ محض اپنی اذیت پسندی کی تسکین کے لیے انسانوں کو درد کی انتہا سے گزارنے والا آج خود وقت کے بھاری پیسے تلے روند ا گیا ہے اور اس پیسے نے آگے اسے مزید روندنا ہے۔

☆☆☆

دو اچھے دوست، دو پیاری ہستیاں بیک وقت بند دروازوں کے پیچھے زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہے تھے اور وہ دیوار کے سہارے بے بس سا کھڑا تھا۔ اسے رہ رہ کر کبھی ان کے ہنستے مسکراتے چہرے یاد آتے تھے تو کبھی وہ احسانات جو کچھ بھی جنائے بنا وہ اس پر کرتے چلے گئے تھے۔ شوخ اور باتونی بشری، ہنستے مسکراتے خوروں میں کود جانے والا وقاص..... یہ دونوں وہ کردار تھے جو بالکل اچانک ہی اس کی زندگی میں وارد ہوئے تھے اور اپنی جگہ بناتے چلے گئے تھے۔ اسے وہ دن اچھی طرح سے یاد تھا جب حسین کے گھر دعوت کھا کر واپس آتے ہوئے اس نے سلطان اور کامی کے زرخے میں گھری بشری کو دیکھا تھا اور انجام کی پردا کیے بغیر اس کی مدد کے لیے کود پڑا تھا۔ اس کے اس احسان کا بدلہ بشری نے یوں دیا تھا کہ اپنے گھر ماں باپ، گھر، عزت اور حسن سب کچھ گنوا دینے کے باوجود بھی پیچھے نہیں ہٹی تھی۔ اس نے تو یہ تک نہیں جتایا تھا کہ وہ اس سے محبت کر بیٹھی ہے اور اس محبت میں اپنا سب کچھ دان کر اب اس کی جوابی محبت کی حقدار ہے۔

ایسے ہی وہی اس سے بالکل اچانک آشیانہ آزادی میں نکل آیا تھا۔ وہ اس پرانی متروک حویلی میں ڈاکوؤں کی قید سے فرار ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ سبیل اور معظم شاہ بھی تھے۔ بندروں کی پھرتی سے درخت اور دیواروں پر چڑھنے

اترنے والی وہی کی ہائیک پر اس نے معظم اور سبیل کو اس قید خانے سے فرار کروا دیا تھا لیکن خود پھنس گیا تھا۔ ڈاکوؤں نے اس کا عرفان اللہ اور یزدانی سے سودا کر لیا تھا اور جب وہ زخمی حالت میں وہاں ایک قید خانے میں پڑا تھا تو تب وہی بالکل اچانک نجات دہندہ بن کر وہاں پہنچ گیا تھا۔ اس نے نہ صرف اسے قید خانے سے رہائی دلوائی تھی بلکہ اپنے پاس پناہ بھی فراہم کی تھی۔ اپنے اس ابتدائی تعاون کے بعد بھی وہ جب جب ضرورت پڑی تھی، اس کا ساتھ دیتا رہا تھا اور اس کا سب سے بڑا تعاون تو یہ تھا کہ اس نے علیہ کو اپنی زندگی کا سامنے بنانے کے بعد علیہ سمیت اس کے پورے خاندان کی حفاظت کو اپنی ذمہ داری بنالیا تھا۔ یہ وہی تھا جس کی وجہ سے آج وہ لوگ لالہ بیسی کی چھپر جھاؤں میں زمانے کے سرد و گرم سے محفوظ ایک بہتر زندگی گزار رہے تھے اور وہ خود ان کی فکر سے آزاد ہو گیا تھا۔

خود کو ایسی بے فکری دینے والا آج موت وزیست کی کشمکش میں مبتلا ایک ایسے بند دروازے کے پیچھے موجود تھا جس کے بارے میں وہ نہیں جانتا تھا کہ دروازہ کھلے گا تو اسے کون سی خبر سننے کو ملے گی۔ اس کا ذہن کسی بری خبر کو سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ جب بھی دل میں کوئی اندیشہ جاگتا تھا، دھڑکنیں رک جاتی تھیں اور دم گھٹنے لگتا تھا۔ اب بھی محض اتنی بڑھی کہ اسے لگا کہ وہ سانس نہیں لے پا رہا ہے۔ کھلی ہوا میں سانس لینے کی خواہش اسے اسپتال سے باہر لے آئی۔ اس کثیر التحولہ نجی اسپتال میں کسی لان وغیرہ کی گنجائش نہیں تھی اور اسپتال کی بند عمارت کا دروازہ پار کر کے آدی سیدھا سڑک پر آ جاتا تھا۔ وہ باہر نکلا تو رات دم توڑ رہی تھی اور صبح کا اجالا پھیلنے کو ہی تھا۔ اسپتال کے مرکزی دروازے پر جلتی جلیاں اس ملکے سے ماحول کو مکمل روشن کرنے میں ناکام تھیں لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ ماحول غیر واضح ہو۔ اس نے ابھی اپنا پہلا قدم ہی دروازے سے باہر رکھا تھا کہ کسی گاڑی کے اجن کی آواز سنائی دی۔ اس نے نظر اٹھا کر آواز کی سمت دیکھا تو آنکھوں کے سامنے کوندالپنے کی تیزی سے ایک منظر نظروں کے سامنے سے گزر گیا۔ آنے والی گاڑی کا دروازہ کھلا، اس میں سے.... کسی کو باہر دھکیلا گیا اور دروازہ بند ہوتے ہوئے گاڑی تیزی سے آگے بھی نکل گئی۔ باہر ڈیوٹی پر تعینات گارڈ کے بعد وہ دوسرا شخص تھا جو اس طرف دوڑا۔
 ”لگتا ہے گولی لگی ہے۔ خون بہت زیادہ بہہ رہا ہے۔“ وہ قریب پہنچا تو ایک گارڈ دوسرے سے کہہ رہا تھا۔
 ”لیکن ہم اس کا کریں کیا؟ وہ کبخت تو ایسے اسپتال

”ایسی کی تھیں پولیس کیس کی۔ تمہارے اس اسپتال میں کتنے قانونی کام ہوتے ہیں وہ میں اچھی طرح جان چکا ہوں۔ سیدھی شرافت سے اسے اندر پہنچاؤ۔ سرجن سے میں خود بات کر لوں گا۔“ اس نے گارڈ کی بات کاٹی اور زور سے بولا۔

”آپ شاید ہمدردی میں ایسا کر رہے ہیں مگر لیکن دیکھیں مجھے لگتا ہے کہ یہ کوئی ڈاکو یا دہشت گرد وغیرہ ہے جسے اس کے ساتھی خود یہاں ڈال کر چلے گئے ہیں۔ اسے اسپتال میں ایڈمٹ کرنا دوطرفہ مصیبت کو آواز دینے کے برابر ہے۔“ گارڈ اس کے رویے کو ہمدردی کا بخار سمجھ کر سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔

”یہ کون ہے، میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم مجھے پکچر دینے کے بجائے بہتر ہو گا اسے اندر شفٹ کرواؤ۔“

”او کے سرا“ اس کے لہجے کی سختی نے گارڈ کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔

”اور ہاں.....“ معاذ نے انگلی اٹھا کر اسے سمجھنے کی۔ ”پولیس یا کسی بھی دوسرے فرد کو اس شخص کے بارے میں کانوں کان بھی خبر ہوئی تو خبر دینے والا انجام کا خود ذمے دار ہو گا۔“

”ٹھیک..... ٹھیک ہے سرا“ وہ پھرتی سے حرکت میں آ گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے باڈل کو اسٹریچر پر ڈال کر اندر شفٹ کیا گیا۔ عملہ فوری آپریشن کی تیاری کرنے لگا۔ معاذ کو اطلاع ملی کہ اس عرصے میں بشری کو گلے والی گولی نکال کر اسے آئی سی یو میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ وہ جلدی سے متعلقہ سرجن کے پاس پہنچا اور اس سے بشری کے بارے میں استفسار کیا۔

”گولی زیادہ خطرناک پوزیشن میں نہیں تھی اس لیے اسے تو معمولی سے آپریشن کے بعد آسانی سے نکال لیا گیا ہے لیکن اصل مسئلہ خاتون کا خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے ہے۔ ہم خون چڑھا رہے ہیں اور ساتھ ساتھ دوسرا ضروری ٹریٹمنٹ بھی کیا جا رہا ہے۔ اللہ نے چاہا تو وہ جلد ٹھیک ہو جائیں گی۔“ ایک کے بعد دوسرے آپریشن کی تیاری کرتے سرجن نے اپنا کام روکے بغیر اسے تسلی کرائی۔

”ابھی جس مریض کو لایا گیا ہے، اسے بچانے کے لیے بھی آپ کو سردھڑکی بازی لگانی ہے۔ چاہے وہ شخص ٹھیک نہ ہو لیکن زندہ ہر صورت رہنا چاہیے۔“ اس نے جہاں بشری کے بارے میں خبر سن کر سکون کا سانس لیا، وہیں باڈل کے متعلق بھی ہدایت دی۔ سرجن نے ایک دم ہی چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنی پریکٹس کے دوران ایسے بہت سے لوگ دیکھے تھے جو اپنے مریض کی کسی معذوری کو

کے سامنے پھینک گئے ہیں جیسے یہاں علاج کروانے کے لیے ان کا باپ بیٹھا ہے۔“ دوسرا گارڈ تھوڑا جھنجھلایا ہوا تھا۔

”یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ یہاں تو ایڈوائس میں پیسے جمع کروائے بغیر مریض کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے ہیں۔ ایسے لاوارث کو کون پوچھے گا۔“ پہلے والے گارڈ کا لہجہ افسوس میں ڈوبا ہوا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اونڈھے منہ گرے شخص کو سیدھا کرنے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ اس کا ساتھی البتہ یونہی سیدھا کھڑا ہوا تھا۔ وہ ادھیڑ عمر شخص تھا اور شاید عرصے سے یہاں ملازمت کر رہا تھا اس لیے اسے معلوم تھا کہ وہ اس زخمی کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ جنہوں نے مدد کرنی تھی، وہ سیجائی کے بجائے تجارت میں مصروف تھے اور صرف انہی کی زندگیاں بچانے میں دلچسپی رکھتے تھے جو زندگی کی قیمت ادا کرنے کے اہل تھے۔

”تمہارے کہنے کا مطلب ہے یہ یہاں پڑے پڑے یونہی مر جائے گا۔“ معاذ نے ان کی گفتگو میں دخل دیا اور بے چینی سے پوچھا۔

”پولیس کیس ہے جناب! کوئی ہاتھ نہیں لگائے گا۔ میں اندر اطلاع کرتا ہوں۔ وہ لوگ پولیس کو کال کریں گے۔ پولیس آئے گی اس کے بعد ہی اس کے متعلق کوئی فیصلہ ہو گا۔“ گارڈ واپس پلٹ گیا تاکہ انٹرکام پر انتظامیہ کے کسی فرد سے رابطہ کر سکے۔ معاذ اسے جتا نہیں سکتا تھا کہ اسی اسپتال میں اس کے دو ساتھی زیر علاج ہیں جن کا کیس بھی پولیس کیس ہے۔ فرق اور وجہ خود جانتا تھا۔ وہ دونوں لالہ میسلی کے حوالے کے ساتھ لائے گئے تھے اور ان کے علاج کے عوض اسپتال کو خطیر رقم حاصل ہونی تھی۔ اندر ہی اندر اس صورت حال پر افسردہ اس نے ایک بار پھر نظریں گھما کر زخمی کی طرف دیکھا اور گنگ ہو کر رہ گیا۔ گارڈ اسے پہلو کے بل لٹانے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اس کا چہرہ اس کی نظروں کے سامنے تھا۔ جلا ہوا اور ہیبت ناک چہرہ جسے پہلی نظر میں پہچاننا بھی آسان نہیں تھا لیکن اس نے اسے پہچان لیا تھا کہ زندگی میں اپنے پیاروں کے ساتھ ساتھ دشمنوں کے چہرے بھی کبھی نہیں بھولتے اور باڈل نامی اس بلانے تو اسے بہت دکھ دیے تھے۔

”اسے اٹھا کر اندر لے چلو۔ اس کے علاج کی ساری ذمہ داری ہماری ہوگی۔“ سخت اور سرد لہجے میں ادا کیا گیا اس کا یہ جملہ اس گارڈ نے بھی سنا جو انٹرکام پر اطلاع دینے کے بعد واپس ان کی طرف آ رہا تھا۔

”لیکن سرا یہ پولیس کیس.....“ اس نے کہنا چاہا۔

مخص یہ سوچ کر قبول کر لیتے تھے کہ بھلے سے ایک نقصان ہو گیا لیکن جان تو سلامت ہے۔ ایسے لوگوں کے انداز میں اپنے پیارے کی جان بچ جانے پر ایک شکر گزاری کا عنصر شامل ہوتا تھا لیکن اسے اپنے سامنے کھڑے جوان کا انداز بہت عجیب لگا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ بین السطور یہ کہنا چاہ رہا ہو کہ مریض بچ تو جائے لیکن ٹھیک ہرگز نہ ہو۔

”آپ اپنا کام کریں، میں جب تک بشری کو دیکھتا ہوں۔“ سرجن کی کیفیت سے بے نیاز وہ آئی سی یو کی طرف بڑھ گیا۔ شیشے کی دیوار کے اس پار بشری مشینوں میں جکڑی سفید براق بستر پر لیٹی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور سانس لینے کے لیے مصنوعی سہارے کی محتاج تھی۔ چہرہ جو اپنا حسن پہلے ہی کھو چکا تھا، خون کی کمی کے باعث زرد پڑا ہوا تھا۔ اس کی کوپورا کرنے کے لیے اس کے نازک سے ہاتھ میں ایک سوئی ٹھونپنی گئی تھی جو سرخ قطروں کی صورت اس کے وجود میں زندگی کو رواں کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اس کی رک رک کر چلتی سانسوں کی گھٹن، وجود میں اتری سویوں کی چھین، شانے کے زخم کی دھن اور روح پر لگے چرکوں کی جلن وہ اپنے رویں رویں میں محسوس کر رہا تھا۔ کیا جرم تھا اس لڑکی کا جسے حق اور سچ کی گھٹی دے کر پروان چڑھایا گیا تھا، جو ایمانداری سے جینا چاہتی تھی، جسے جی جان سے دوستی کا حق ادا کرنے کی عادت تھی، جو خاموش محبت بھی کرتی تھی تو وفا زور و شور سے نبھاتی تھی۔ ستم گرد دنیا نے اتنی خوبیوں کی مالک اس ہیرا لڑکی کے نازک وجود کو اپنے ظلم تلے روند ڈالا تھا اور کہیں نہ کہیں وہ خود کو بھی مجرم سمجھتا تھا کہ اس کی حفاظت کے لیے کچھ نہیں کر سکا تھا۔

”میں تم سے بہت شرمندہ ہوں بشری! اور جانتا ہوں کہ میرے پاس تلافی کے بہت کم امکانات ہیں لیکن تمہارے دل کو سکون دینے کے لیے جو کچھ میرے بس میں ہوا، ضرور کروں گا۔ بس تم ایک بار واپس لوٹ آؤ۔ تم واپس لوٹو گی تو دیکھو گی کہ قدرت نے تمہارے مجرم کو خود تمہارے قدموں میں لا پھینکا ہے۔ وہ ایک بار بچ کر بھاگ نکلا تھا، اس بار چاہے گا بھی تو نہیں بھاگ سکے گا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اللہ اسے تمہارے ساتھ انصاف کے لیے ہی یہاں لے کر آیا ہے۔ بس تم ایک بار آنکھیں کھول دو اور اپنی آنکھوں سے اپنے اللہ کا انصاف دیکھو۔“ اس کے زرد چہرے پر نظر ٹکائے وہ دل ہی دل میں اس سے مخاطب تھا اور دل پر ایسی رقت طاری ہو گئی تھی کہ آنکھوں کا بھیگنا لازم تھا۔ بھیگی آنکھوں کی دھندلاہٹ میں اس نے لالہ کے ایک آدمی کو

اپنی طرف آتے دیکھا تو دل دھک سے رہ گیا۔

”لالہ نے آپ کو بلایا ہے۔“ قریب رک کر اس نے پیغام دیا۔ معاذ اس سے وکی کی حالت کی بابت سوال کرنا چاہتا تھا لیکن ہمت نہ ہوئی اور خاموشی سے اس کے پیچھے چل پڑا۔ لالہ ایک کمرے میں بستر پر ٹکے کے سہارے بیٹھا تھا۔ بوڑھے شیر کی آنکھیں سرخ اور چہرہ زرد تھا۔ معاذ کو دیکھ کر اس کے لب پھڑپھڑائے اور آنکھیں بھیگ گئیں۔ معاذ کے دل نے گویا دھڑکنا چھوڑ دیا اور شدت سے اس خواہش نے سراٹھایا کہ کسی طرح یہاں سے بھاگ کھڑا ہو۔ وہ کتنا ہی بہادر سہی، کمزور یاں ہر شخص میں ہوتی ہیں۔ اس کے پیارے اس کی کمزوری تھے۔

☆☆☆

”بازل وہاں سے فرار ہو کر کہاں گیا ہوگا؟“ اصغر نے یہی کو گھورتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

”میں نہیں جانتی۔“ اس نے نشی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا ہی تھا کہ تڑاخ سے ایک تھپڑ اس کے منہ پر پڑا اور نازک گردن گھوم کر رہ گئی۔

”وہ تجھے اپنے ساتھ لے جانے پر تلا ہوا تھا اور تو کہتی ہے کہ تو نہیں جانتی۔“ اصغر غصے سے دھاڑا۔ اصل میں وہ غصے سے بھی زیادہ کسی اور کیفیت میں تھا۔ وکی اور بشری کے زخمی وجود بار بار اس کی نظروں کے سامنے لہرا رہے تھے اور ذہن میں ایسے اندیشوں کو جنم دے رہے تھے جن کو وہ ہر صورت جھٹک دینا چاہتا تھا۔

”میں سچ سچ نہیں جانتی۔ وہ صرف میرا کسٹر ہے۔ میرا اس کے معاملات سے کوئی لینا دینا نہیں۔“ یہی کے لہجے میں تکلف اور خوف دونوں کی آمیزش تھی۔ اصغر کی غصے سے ابلی آنکھیں اور وحشت زدہ چہرہ اسے اپنے منہ پر لگنے والے تھپڑ سے بھی زیادہ ہولناک محسوس ہو رہا تھا۔

”تجھ جیسی بے حیا عورتوں کو سب معلوم ہوتا ہے۔ باذل جیسے آوارہ گردوں کی جڑوں میں بیٹھی ہوئی تم۔“ اس نے یہی کو ایک بڑی سی گالی سے نوازا۔

”تم خوا خواہ اس کے پیچھے پڑے ہوئے ہو۔ یہ ٹھیک کہہ رہی ہے کہ اسے باذل کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ باذل آوارہ ضرور ہے لیکن اس کی فطرت میں کسی عورت پر بھروسہ کرنا شامل نہیں ہے۔ وہ عورت کو کسی کھلونے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔“ وہیں موجود نذر حسین اس تماشے پر مزید خاموش نہ رہ سکا اور اصغر کو ٹوکا۔

”ٹھیک ہے، اسے نہیں معلوم پرتو، تو اس کا فیجر تھانا

سالے۔ تو بتا کہ باذل وہاں سے بھاگ کر کس بل میں جا کر چھپا ہوگا؟“ نذر کی مداخلت پر اصغر اس پر الٹ گیا۔
”میں..... میں کیسے بتا سکتا ہوں۔ میں تو اتنی دیر سے تمہاری قید میں ہوں۔“ نذر اس کے انداز پر گھبرا گیا۔
حقیقتاً اس وقت اصغر کی ذہنی کیفیت معمول پر نہیں تھی۔ وہ خود کو لالہ کا سامنا کرنے کے لائق نہیں پارہا تھا کہ اگر اس نے پوچھ لیا کہ اصغر تیری موجودگی میں میرا لالہ کیسے اس حال کو پہنچا تو اسے کیا جواب دے گا۔

”اصغر..... اصغر بھائی! آپ میرے ساتھ آؤ۔“
جارو جو اتنی دیر سے خاموشی سے سارا تماشا دیکھ رہا تھا، اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے بولا تو اصغر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”پلیز!“ جارو نے اس سے اصرار کیا تو وہ مزید مزاحمت نہیں کر سکا اور اس کے ساتھ دوسرے کمرے میں آگیا۔ جارو نے ایک گلاس میں ٹھنڈا پانی بھر کر اسے پیش کیا جسے اس نے ایک لمحے تذبذب سے دیکھا پھر غٹا غٹ سا پانی پی کر یوں صوفے کی پشت سے سرٹکایا جیسے میلوں دوڑ لگا کر وہاں پہنچا ہو۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ جارو نے ہمدردی سے اسے تسلی دی۔

”خدا جانے ہوگا کہ نہیں..... ابھی تک کوئی خیر کی خبر نہیں آئی۔“ وہ سخت اعصاب زدہ ہو رہا تھا۔

”ان شاء اللہ آجائے گی۔“ جارو نے ایک بار پھر اسے تسلی دی۔

”تمہیں یقین ہے؟“ وہ کسی بچے کی طرح مچلا۔
”مجھے رب سے امید ہے۔ جس مقام پر آ کر آدمی بالکل بے بس ہو جائے وہاں رب سے امید باندھ کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھا لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔“ جارو نے متانت سے اسے جواب دیا۔

”میرا رُواں رُواں دعا کر رہا ہے۔“ اصغر کی آنکھوں کے گوشے بھیگے۔

”صرف دعا نہیں، ہمت اور کچھ داری سے بھی کام لینا ہوگا۔ تم کوئی عام ہی زندگی گزارنے والے انسان نہیں ہو جسے مشکل حالات کا سامنا کرنے کی عادت نہ ہو۔ مشکلات، حادثات، اموات..... سب کا دلیری سے سامنا کیا ہوگا تم نے۔ اس وقت پہلے سے کہیں زیادہ ہمت اور دلیری کی ضرورت ہے تاکہ ایسے وقت میں جبکہ لالہ کے حواس پوری طرح اس کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں، تم اس کو سہارا دے

سکو۔ کشمیر میں، میں نے سخت سے سخت وقت دیکھا ہے لیکن ہمیشہ اس اصول پر کاربند رہا ہوں کہ بہترین کی امید رکھو اور بدترین کے لیے تیار رہو۔ میں تمہیں امید چھوڑنے کا نہیں کہہ رہا لیکن خود کو بدترین کے لیے بھی تیار رکھو کیونکہ یہ طے ہے کہ کچھ بھی ہو گزرے، دنیا کے معاملات رکستے نہیں ہیں اور ہمیں خود کو گھسیٹ گھساٹ کر ان معاملات و معمولات میں شامل کرنا پڑتا ہے۔“ جارو ایک طرف اسے حوصلہ دے رہا تھا تو دوسری طرف تلخ حقائق سے آگاہ کر کے کسی بڑے وقت کے لیے ذہنی طور پر تیار کرنے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔

”ہو سکتا ہے میری یہ اتنی لمبی تقریر تم پر گراں گزر رہی ہو لیکن میں یہ سب کہنے پر مجبور ہوں دوست! ان حالات میں کچھ لوگ تو ایسے ہونے چاہئیں جو اپنے ہوش و حواس میں ہوں ورنہ سب کچھ بکھر کر رہ جائے گا۔“ وہ اب اصغر کے برابر میں ہی بیٹھ گیا تھا اور بہت دلسوزی سے کہہ رہا تھا۔

”کون سا لالہ بڑا مان رہا ہے تمہاری باتوں کا۔ تم سب ٹھیک کہہ رہے ہو۔ واقعی اپن کو حوصلہ پکڑنا ہوگا۔“ بات اصغر کی سمجھ میں آگئی۔

”بس تو پھر اٹھو اور معاملات دیکھنا شروع کرو۔ میرے سامنے معاذ نے کسی کرٹل صاحب کو کال کر کے یزدانی ہاؤسنگ اسکیم میں موجود اسلحے کے متعلق آگاہ کیا تھا۔ ذرا اپنے آدمیوں سے معلومات تو لو کہ وہاں کوئی ایکشن شروع ہوا یا نہیں؟“ جارو نے اس کی پیٹھ تھپکی اور کام پر بھی لگایا۔

”ٹھیک ہے، میں معلوم کرتا ہوں۔“ اصغر نے فوراً جیب سے موبائل نکالا اور اسکرین روشن ہوتے ہی چونک پڑا۔ جن آدمیوں کو وہاں چھوڑ کر آیا تھا، ان کی پچھلے پندرہ منٹ میں کئی مسڈ کالز موجود تھیں۔ پتا نہیں کیسے اس کا موبائل سائلٹ پر چلا گیا تھا کہ خبر ہی نہیں ہوئی تھی۔

”ہاں بول..... کیا بات ہے؟“ اس نے جھٹ سے ایک کانبرڈ اٹل کیا اور بے چینی سے پوچھا۔

”یہاں کچھ عجیب ہو رہا ہے استاد! پتا نہیں کہاں سے فوج فٹک پڑی ہے اور ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔ ہمارے پاس یہاں سے لکھنے کی بھی گنجائش نہیں۔ ہم دونوں کب سے تم سے اور لالہ سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن کوئی جواب بھی نہیں مل رہا تھا۔“ کال ریسیو کرنے والے نے سرگوشی نما آواز میں اپنا مسئلہ بیان کیا۔ وہ کچھ خوفزدہ بھی لگ رہا تھا کیونکہ زیادہ سے زیادہ باذل یا عرفان اللہ میں سے کسی کے آدمیوں کی آمد کا اندیشہ تھا اور یہاں فوج فٹک پڑی تھی۔

تھی جس کے لیے نفرت کے سوا کوئی جذبہ محسوس ہی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

”ابے یہ کیا.....“ ایک نیوز چینل پر کلک کرتے ہی اس پر چلتی بریکنگ نیوز پر اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”مشہور سماجی رہنما اور سیاست دان عرفان اللہ صاحب پر ان کی رہائش گاہ پر قاتلانہ حملہ۔ عرفان اللہ صاحب کو قریبی اسپتال شفٹ کر دیا گیا ہے جہاں ان کی حالت نازک بتائی جا رہی ہے۔“ نیوز اینکر حسب تربیت بیجانی انداز میں خبر نشر کر رہی تھی۔ جارو بھی اصغر کی طرف ذرا سا جھک کر خبر سننے لگا۔ کچھ دیر میں ان کے سامنے جو تفصیلات آئیں، ان کے مطابق عرفان اللہ رات گئے تک کچھ ضروری امور نمٹانے کے لیے جاگتا رہا۔ مدد کے لیے سیکریٹری بھی وہیں موجود تھی۔ سیکریٹری نے بتایا کہ عرفان اللہ صاحب سونے کے لیے اپنی خواب گاہ میں گئے ہی تھے کہ اس نے ان کے کمرے سے گولی چلنے کی آواز سنی۔ وہ دوڑ کر ان کی خواب گاہ کی طرف گئی تو دیکھا کہ ان کا باذل نامی خاص ملازم ہتھیار بدست دروازے سے باہر نکل رہا ہے اور اس کے تیور جارحانہ ہیں۔ وہ ڈر کر رک گئی اور باذل کے جانے کے بعد خواب گاہ میں داخل ہوئی تو دیکھا کہ عرفان اللہ صاحب خون میں لت پت بستر پر پڑے ہیں۔ وہ فوری طور پر کسی کو مدد کے لیے بھی نہیں بلا سکی کہ وہاں شدید فائرنگ ہو رہی تھی۔ فائرنگ رکی اور پولیس آئی تو عرفان اللہ کو اسپتال منتقل کیا گیا جہاں خون کے زیادہ اخراج کی وجہ سے ان کی حالت نازک بتائی جا رہی ہے۔

خبر میں باذل کے متعلق تھوڑی تفصیل اور سیکورٹی پر مامور افراد کے بیانات کا بھی ذکر تھا۔ عرفان اللہ کی کوششیں اس کے داخلے کے وقت کی سی سی ٹی وی فوٹیج دکھاتے ہوئے بتایا جا رہا تھا کہ باذل، عرفان اللہ کا سب سے خاص ملازم تھا جسے بہت زیادہ اختیارات حاصل تھے اور اس کا دن رات کے کسی بھی حصے میں کوشش پر آزادانہ آنا جانا تھا۔ کبھی وہ ضرورت کے مطابق اپنے ساتھیوں کو بھی ساتھ لاتا تھا اسی لیے رات کے آخری پہر اس کی آمد پر سیکورٹی پر مامور افراد نے کوئی غیر معمولی پن محسوس نہیں کیا۔ گڑبڑ کا اندازہ تو انہیں اس وقت ہوا جب اندر سے گولی چلنے کی آواز سنائی دی اور وہ اپنے ساتھیوں سمیت فائرنگ کرتے ہوئے فرار ہونے لگا۔ اس موقع پر سیکورٹی والوں نے انہیں روکنے کی کوشش کی لیکن اس کے ساتھیوں نے پیئڈ گرینڈ کا استعمال کر کے نہ صرف ان کی کوشش کو ناکام بنا دیا بلکہ موقع پر پہنچنے والی

”پریشان نہ ہو اور نہ ہی وہاں سے بھاگنے کی کوشش کر۔ بس چپکا بیٹھا رہ۔ اگر کوئی تم دونوں تک پہنچ جائے تو اس سے بھی کوئی پنکا نہیں لینے کا ہے۔ بس چپ چاپ گرفتاری دے دینا اور پول دینا کہ معاذ بھائی نے تیرا پی پر بٹھایا ہوا تھا۔“ اصغر دھیرے دھیرے اسے سمجھانے لگا۔ جب تسلی ہو گئی کہ بات سمجھ لی گئی ہے تو سلسلہ منقطع کر دیا اور اسپتال میں موجود ایک ساتھی کو کال کر کے اس سے صورتو حال معلوم کرنے لگا۔

”آپریشن تھیٹر میں ہے اپنا لاڈلا۔ ڈاکٹر صاف تسلی نہیں دے رہے ہیں، بس بڑی مقدار میں خون کا انتظام کرنے کا بولا ہے۔ اپنا لاڈلہ خون دے رہا ہے اور لڑکے مزید خون کی تلاش میں لٹکے ہوئے ہیں۔“ کال سے فارغ ہو کر اس نے سوتے ہوئے چہرے کے ساتھ جارو کو بھی صورتو حال سے آگاہ کیا۔

”اللہ نے چاہا تو سب اچھا ہوگا۔ بس تم حوصلہ پکڑے رہو۔“ جارو نے اس کی ہمت بندھائی۔

”یہ نذر اور سیکی کا کیا کرنا ہے؟ کسی کام کے ہیں نہیں اور خاما پہلی میں نگرانی کرنی پڑ رہی ہے۔“ اس نے ایک بار پھر کچھ جھنجھلاہٹ کا مظاہرہ کیا۔

”آج رات تو رہنے دو۔ کل حالات دیکھ کر چھوڑ دینا۔ ان کا ذاتی کردار جو بھی ہو، ہماری ان سے کوئی تڑائی نہیں۔“ جارو نے اسے سمجھایا تو وہ تقہیبی انداز میں سر ہلانے لگا پھر کچھ سوچ کر بولا۔

”میرے خیال میں نیوز لگا کر دیکھتے ہیں۔ کچھ پتا تو چلے کہ جو ہنگامہ ہوا ہے، اس کی ٹی وی پر کوئی خبر آئی ہے یا نہیں۔ ہم جب وہاں سے لٹکے تو پولیس پہنچ تو چکی تھی وہاں۔“ ”ضرور دیکھو، حالات سے باخبر رہنا بھی ضروری ہے۔“ جارو نے اس کی تائید کی۔ اصغر کا فعال ہونا اس کے لیے خاصا تسلی بخش تھا۔

”وہ..... باذل بزدل پنوہوں کی طرح بھاگ نہ لکھتا تو آج اس کا کام تمام ہو گیا تھا۔“ یولیوب پر اپنے مطلب کا کوئی نیوز چینل سرچ کرتے ہوئے اس نے باذل کے نام کے ساتھ ایک بڑی سی گالی ٹانگ کر بڑبڑانے کے انداز میں کہا پھر کچھ جوش سے بولا۔

”خیر، بکرے کی ماں آخر کب تک خیر منائے گی۔ ایک دن تو سالا چھری تلے آئے گا پھر دیکھنا کیسے ٹکڑے ٹکڑے کرتا ہوں میں اس..... کے۔“ ہر جملے میں گالی ٹانگنا اس کی عادتو ثانیہ تھی اور یہاں تو بات بھی باذل کی ہو رہی

پولیس کی ایک گشتی گاڑی کو بھی نشانہ بنا ڈالا۔

اس بریکنگ نیوز کے بعد اس پہر بھی تبصروں اور تجزیوں کا طور مار کھڑا کر دینے کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ کسی کا خیال تھا کہ باڈل کا ذہنی توازن الٹ گیا تھا، کوئی اس کے مخالفین سے مل جانے کا اندازہ لگا رہا تھا، کسی کا خیال تھا کہ یہ کوئی بین الاقوامی سازش تھی جس کے ذریعے پاکستانیوں کو ایک ابھرتے ہوئے محب وطن سیاسی لیڈر سے محروم کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ کوئی بتا رہا تھا کہ عرفان اللہ صاحب نے جب سے تعلیم اور صحت کے میدان میں بے لوث خدمات انجام دینا شروع کی تھیں، مسلسل دھمکیوں کی زد میں تھے۔ کوئی کھینچ کر اسی روز عرفان اللہ کی ٹیکسٹائل مل کے باہر ہونے والی فائرنگ کی خبر بھی سامنے لے آیا تھا اور ثابت کیا جا رہا تھا کہ عرفان اللہ کی جان و مال کو ناپیدہ دشمنوں سے شدید خطرہ لاحق تھا۔ ایک بندے نے تو حد ہی کر دی تھی اور بیرون ملک زیر علاج سلطان کی حالت کی ذمہ داری بھی ان دشمنوں کے سر ڈال دی تھی جنہوں نے عرفان اللہ کو توڑنے کے لیے ان کے اکلوتے بیٹے کو بھی نہیں بخشا تھا۔

”یہ کتے نے مالک کو کیسے کاٹ لیا؟“ خبر کی پوری تفصیلات لینے کے بعد اصغر نے حیرت سے تبصرہ کیا۔

”شاید کسی وجہ سے پاگل ہو گیا ہے۔“ جارو نے جواباً تبصرہ کیا۔

”ایک پاگل کتے کا شہر میں یوں آزادانہ گھومنا بہت خطرناک ہے۔“ تشویش کا اظہار کرتے اصغر کو اندازہ بھی نہیں تھا کہ ظالم کی رسی کھینچی جا چکی ہے اور وہ اس لائق بھی نہیں رہ گیا کہ بستر پر اپنی مرضی سے حرکت ہی کر سکے۔

”ٹھیک کہتے ہو۔ ہمیں احتیاط کرنی پڑے گی کیونکہ یہ تو طے ہے کہ جب بھی اسے موقع ملا، وہ سب سے پہلے ہمیں کاٹنے کو دوڑے گا۔“ جارو نے اس سے اتفاق کیا۔

ایسی وقت اصغر کے فون کی کھنٹی بجنے لگی۔ کال کرنے والا وہی شخص تھا جسے اصغر نے اسپتال سے خود کو اپ ڈیٹ کرنے کی ذمہ داری سونپ رکھی تھی۔

”ہاں ٹیپو بول۔“ اس نے بے قراری سے کال ریسیو کی۔

”وہ اصغر استاد..... وہ..... وہ اپنا وکی بھائی.....“

بھائی کیفیت میں اس شخص کی زبان سے الفاظ بھی درست نہیں نکل پارہے تھے۔ اصغر کا دل بری طرح ڈوبنے لگا۔

☆☆☆

”کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ باڈل کی اس حرکت کا سبب

کیا ہے؟ وہ تو عرفان اللہ صاحب کا بہت خاص آدمی تھا پھر ایسا کیا ہوا کہ اس نے انہیں قتل کرنے کی کوشش کی؟“

عرفان اللہ کی سیکریٹری کی حیثیت سے صوفیہ کو موجودہ حالات میں آگے آگے رہنا پڑ رہا تھا۔ اس وقت بھی وہ اسپتال میں موجود تھی اور میڈیا کے سوالات کی زد میں تھی۔

”دیکھیں، ابھی واضح طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ میں جتنے عرصے سے عرفان اللہ صاحب کے ساتھ ہوں، میں نے باڈل کو نہیں دیکھا۔ وہ کہاں غائب تھا، یہ عرفان اللہ صاحب کو بھی نہیں معلوم تھا۔ البتہ وہ اس کی طرف سے تشویش میں مبتلا تھے اور انہیں شک تھا کہ وہ کسی غیر قانونی سرگرمی میں ملوث ہو گیا ہے۔ اسی لیے ان سے گریزاں ہے اور ان کا سامنا نہیں کر رہا ہے۔“ وہ بہت ہوشیاری سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ باڈل کا عرفان اللہ سے کوئی تعلق نہیں رہا تھا تا کہ اس کی کسی غیر قانونی سرگرمی پکڑے جانے کی صورت میں عرفان اللہ کا نام بدنام نہ ہو۔

”جب باڈل کے متعلق شکوک و شبہات تھے تو اس کی عرفان اللہ صاحب کی رہائش گاہ پر آزادانہ آمد و رفت پر پابندی کیوں نہیں لگائی گئی تھی؟“ ایک دوسرے صحافی نے نکتہ اٹھایا۔

”باڈل کے مسلسل مظہر سے غائب رہنے کی وجہ سے شاید عرفان اللہ صاحب نے ضرورت ہی محسوس نہ کی ہو۔ یہ میری ذاتی رائے ہے۔ حتیٰ جواب تو ہوش میں آنے کے بعد وہ خود ہی دے سکتے ہیں۔“ اس نے اپنا دامن بچایا۔

”ڈاکٹر زان کی حالت کے بارے میں کیا بتا رہے ہیں؟“ فوراً ہی پوچھا گیا۔

”کرطیک کل کنڈیشن ہے۔ ڈاکٹر زان کی جان بچانے کے لیے پوری کوشش کر رہے ہیں۔ میری عوام سے اپیل ہے کہ وہ بھی عرفان اللہ صاحب کے لیے دعا کریں۔ انہیں کچھ ہو گیا تو یہ ان کی فیملی سے بھی زیادہ عوام کا نقصان ہوگا۔ عوام ایک ایسے قلمصفت شخص سے محروم ہو جائیں گے جو دل و جان سے ان کی بہتری کے لیے کام کرنا چاہتا ہے۔“ اس نے جذبہ بانی ہونے کی اتنی اچھی اداکاری کی کہ آنکھوں میں آنسو تک بھر لائی۔

”کیا ان کی فیملی کو اس حادثے کی خبر دی گئی ہے؟“

صحافی ایک کے بعد ایک سوال کرنے کے لیے چوکس تھے۔

”فی الحال ان سے رابطہ نہیں کیا گیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ عرفان اللہ صاحب کے صاحبزادے سلطان صاحب کی اپنی کنڈیشن بہت خراب ہے اور وہ علاج کے

لیے والدہ کے ساتھ بیرون ملک مقیم ہیں۔ اگر عرفان اللہ صاحب کی حالت اسٹبل ہو جاتی ہے تو ہماری کوشش ہوگی کہ ان کی مسز یہاں واپس آنے کے بجائے بیٹے کے پاس ہی رہیں۔ یہاں عرفان اللہ صاحب کے بہت سے جان نثار ہیں جو ان کی ہر طرح کی خدمت کر سکتے ہیں۔ آپ اب بھی دیکھ سکتے ہیں کہ اس وقت بھی کتنے لوگ ان کی خیریت معلوم کرنے کے لیے جمع ہو چکے ہیں اور خون کے عطیات بھی دے رہے ہیں۔“ اس نے اسپتال میں جمع ہو جانے والے ان لوگوں کی طرف اشارہ کیا جن میں سے بیشتر کو پارٹی ورکرز کے ذریعے متحرک کر کے وہاں لایا گیا تھا۔

”کیا یہ کسی مخالف سیاست دان کی طرف سے کی جانے والی سازش ہو سکتی ہے؟“ وہاں آگ لگا کر تماشا دیکھنے والوں کی بھی کمی نہیں تھی۔

”عرفان اللہ صاحب کی تیزی سے بڑھتی ہوئی عوامی مقبولیت ان کے مخالفین سے ہضم تو نہیں ہو رہی ہے۔ خصوصاً ایسے لوگ زیادہ جیسٹس ہیں جن کی برسوں کی سیاست عرفان اللہ صاحب کے سامنے پانی بھر رہی ہے لیکن آپ خود بتائیں کہ عوام کس شخص کو زیادہ چاہیں گے۔ اسے جو اپنے اکلوتے بیٹے کی سیریس حالت کے باوجود اس کے ساتھ باہر جانے کے بجائے یہاں عوام کے دیکھ درد پانٹنے کے لیے بیٹھا ہوا ہے یا اسے جس کی اولاد ملک کی بدنامی کا سبب بنی ہے اور جسے ایسی اولاد کے غم میں عوام بھول گئے ہیں۔“ اس نے ایک نیا شو شا چھوڑا۔

”آپ کا اشارہ کہیں بے صداقت شاہ کی طرف تو نہیں ہے؟“ میں نے کسی کا نام نہیں لیا ہے لیکن عقل آپ بھی رکھتے ہیں اور عوام بھی۔“ اس نے بڑا ڈپلومیٹک سا جواب دیا۔

”کوٹھی پر پھینکے گئے پنڈ گرینڈ سے ہونے والے مالی اور جانی نقصان کے بارے میں کچھ بتائیے۔“

”نقصان تو خاصا ہوا ہے۔ کوٹھی کی انٹرنس بالکل تباہ ہو گئی ہے لیکن زیادہ افسوس زد میں آنے والوں کے لیے ہے۔ ایک شخص موقع پر ہی ہلاک ہو گیا ہے جبکہ دوشد ید زخمی ہیں۔ پولیس والے بھی نشانہ بنے ہیں لیکن ان کے بارے میں میرے پاس تفصیل نہیں ہے۔“

”سنا ہے باذل کے عرفان اللہ صاحب سے کچھ نہایت ذاتی نوعیت کے ایشوز چل رہے تھے۔ باذل کے ان سے چند مطالبات تھے جنہیں ماننے میں انہیں تامل تھا۔“ یہ سوال اب تک خاموشی سے سب کے سوالات سنتے طاہر بیگ نے کیا تھا۔ عرفان اللہ کے ملازمین میں سے ایک

شخص اس کا دور پرے کا رشتے دار تھا۔ رشتے داری ایسی نہیں تھی کہ وہ شخص اس کی مروت میں طاہر کے لیے کام کرنے لگتا لیکن ماضی میں طاہر اس پر ایک احسان کر چکا تھا۔ اس شخص کی چھوٹی بہن فیس بک دوستی کے ذریعے ایک فراڈیے کے ہتھے چڑھ گئی تھی اور اسے اپنی ذاتی تصاویر بھیجنے کی حماقت کر رہی تھی۔ ان تصاویر کے ذریعے اس نے لڑکی کو بلیک میل کرنا شروع کیا تو وہ بہت پریشان ہوئی لیکن اچھی بات یہ ہوئی کہ اس نے مزید حماقت کرنے کی غلطی نہیں کی اور ماں کو اعتماد میں لے لیا۔ ماں نے بیٹی کو سخت سنائی لیکن معاملہ گھر کے واحد مرد یعنی اپنے بیٹے کے علم میں لے آئی۔ وہ ایک کم پڑھا لکھا اور نسبتاً سادہ آدمی تھا لیکن مسئلہ تو حل کرنا تھا۔ طاہر کے کرائم رپورٹر ہونے کی وجہ سے اس امید پر اس سے ملا کہ وہ مسئلہ حل کرنے میں اس کی مدد کرے گا۔ طاہر نے اسے مایوس نہیں کیا اور سائبر کرائم سیل کے ذریعے اس لڑکے تک پہنچ کر سارا معاملہ سیدھا کر دیا۔ اس واقعے کے بعد سے وہ شخص گویا اس کا مرید بن گیا تھا اور اکثر طاہر سے کہتا تھا کہ اس کے لائق کوئی خدمت ہے تو ضرور بتایا جائے۔ طاہر ہر بار مسکرا کر رہ جاتا تھا۔ اس کے ذہن میں دور دور تک اپنے احسان کا بدلہ لینے کا خیال نہیں تھا لیکن جب عرفان اللہ کی طرف سے شک میں مبتلا ہوا تو آخر کار اس شخص کو استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ احسان کے بدلے نہیں، بلکہ یہ سوچ کر کہ ملک و قوم کے مفاد میں یہ کام کر کے وہ شخص بھی اپنے حصے کا فرض ادا کرے گا۔

”مجھے نہیں پتا کہ آپ کی معلومات کا ذریعہ کیا ہے لیکن یہ خیال ہی احمقانہ ہے کہ کسی ملازم کے ساتھ نہایت ذاتی نوعیت کے ایشوز ہوں۔“ صوفیہ نے اس کی طرف ایک ٹیکھی نظر ڈالی اور طنزیہ لہجے میں جواب دیتے ہوئے مزید بولی۔

”باذل ایک ملازم تھا جسے اس کی خدمات کے بدلے بہترین تنخواہ اور مراعات دی جاتی تھیں۔ اعتبار اور اعتماد کی وجہ سے دوسرے ملازمین اور ورکرز کے مقابلے میں آزادی بھی زیادہ حاصل تھی لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ اس کے اور عرفان اللہ صاحب کے درمیان کچھ ”نہایت“ ذاتی نوعیت کے ایشوز ہو سکتے تھے۔“

”یہ ناممکن بھی نہیں۔ آخر باذل کی والدہ میڈم تاجور عرفان اللہ صاحب کے دوستوں کے حلقے میں شامل ہیں۔“ طاہر پر اس کے لہجے کا اثر نہیں ہوا اور ایک ایسی بات کہی جس پر سب کو سانپ سونگھ گیا۔ تاجور عرف تاج بائی اور عرفان اللہ کے خصوصی تعلقات کی اڑتی اڑتی خبر میڈیا کے

سارے ہی لوگوں کو تھی لیکن یوں سرعام اس پر بات کرنے کی کسی کو جرأت نہیں ہو سکتی تھی۔

”آپ عجیب گھٹیا باتیں کر رہے ہیں۔ ایسے موقع پر جبکہ عرفان اللہ صاحب کی حالت خطرے میں ہے، بجائے ان کے لیے دعائیں کرنے کے آپ ان پر الزام تراشیاں کر رہے ہیں۔“ اس بار صوفیہ بھڑک اٹھی۔

”میں ایسا کچھ نہیں کر رہا ہوں۔ میں صرف اس سبب کو کھوج رہا ہوں جو باذل جیسے وفادار کو بغاوت پر مائل کر گیا۔“ اس نے صوفیہ کے لہجے سے مرعوب ہوئے بغیر اپنی بات جاری رکھی۔

”مس صوفیہ ٹھیک کہہ رہی ہیں طاہر صاحب! آپ کو اس موقع پر ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔“ اب وقت آگیا تھا کہ عرفان اللہ کا دم بھرنے والے لغافہ صحافی میدان میں اتر آئیں۔

”بالکل، کمزوریاں سب میں ہوتی ہیں۔ کسی کی کمزوریوں کو بیچ چوراہے پر وہ بھی ایسے نازک وقت میں چھیڑنا اخلاق سے گری ہوئی حرکت ہے۔“ ایک اور اخلاقیات کے علمبردار نے اسے شرمندہ کرنا چاہا۔

”میں نے سنا ہے کہ جب باذل موقع واردات سے فرار ہوا تو اس کا چہرہ شدید زخمی تھا۔ کیا آپ اس بارے میں کچھ بتا سکتے ہیں؟“ صحافی برادری کے خود پر حملے کی پروا نہ کرتے ہوئے اس نے ایک اور چھلانگ لگائی اور ایسا سوال کیا جس پر ایک ہل کے لیے صوفیہ کے چہرے کی رنگت بدل گئی لیکن اس نے فوراً ہی خود پر قابو پالیا اور سپاٹ لہجے میں بولی۔

”میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

”حالانکہ آپ نے ہی سب سے پہلے باذل کو موقع واردات سے فرار ہوتے ہوئے دیکھا اور شناخت کیا تھا۔“

طاہر نے بھی اس بار طنز کرنے میں حرج نہ جانا۔

”میں اس وقت گھبرا گئی تھی۔“ صوفیہ نے صفائی پیش کی۔

”ایسا ہونا بھی چاہیے تھا۔ ایک ملٹی میشل کمپنی کے اریکٹڈ یسٹڈ روم میں بیٹھ کر جاب کرنے والی لڑکی اچانک ایک متحرک سیاست دان کے ساتھ نتھی ہو جائے تو اس کے لیے وینڈل کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ویسے آپ بتائیں گی کہ آپ نے اپنی ملازمت کیوں تبدیل کی؟“ اس نے صوفیہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا۔ سمجھ تو صوفیہ پہلے بھی رہی تھی لیکن اب مکمل یقین ہو گیا کہ اس صحافی کو بہت سی اندر کی خبریں معلوم ہیں۔ اس سے بعد میں نمٹنے کا فیصلہ کر کے اس نے فی الحال بات ختم کرنے کی کوشش کی اور روکھے لہجے

میں بولی۔

”بہتر ہوگا کہ آپ خود کو عرفان اللہ صاحب کے حادثے تک محدود رکھیں۔ میرے ذاتی معاملات میں دخل دینے کا آپ کو کوئی حق نہیں ہے۔“

طاہر کو تنبیہ کرنے کے بعد اس نے اپنا لہجہ بدلا اور باقی لوگوں کی طرف رخ کرتے ہوئے بولی۔

”فی الحال آپ لوگ مجھے اجازت دیجیے۔ جیسے ہی عرفان اللہ صاحب کے بارے میں کوئی نئی بات معلوم ہوئی، میں آپ لوگوں کو ضرور اپ ڈیٹ کروں گی۔۔۔۔۔ اور ہاں، میری میڈیا کے ذریعے عوام سے اپیل ہے کہ عرفان اللہ صاحب کے لیے دعا کرنے کے ساتھ ساتھ ارد گرد سے بھی ہوشیار رہیں۔ باذل فرار ہونے کے بعد ہمارے ہی آس پاس نہیں چھپا ہوگا۔ اسے گرفتار کروانے میں مدد کریں تاکہ اسے اس کے جرم کی قرار واقعی سزا مل سکے۔ میں یقین دلاتی ہوں کہ اطلاع دینے والے شخص کا نام ہر صورت صیغہ راز میں رکھا جائے گا اور اسے بھاری انعام بھی ملے گا۔“ اس اعلان کے ساتھ اس نے دو فون نمبر بھی بتائے جن پر اطلاع دی جاسکتی تھی۔

جس وقت وہ یہ سب کہہ رہی تھی، تاجور صحافیوں کے پیچھے آکھڑی ہوئی تھی۔ سادہ سے لباس میں بغیر میک اپ والی میڈم تاجور کو لوگوں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ صوفیہ کے اعلان کے بعد اس نے اپنے قدموں کو حرکت دی تو لوگوں نے دائیں بائیں کھسک کر اسے آگے بڑھنے کا راستہ دے دیا۔ وہ عین صوفیہ کے مقابل جا کھڑی ہوئی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

”تم میرے بیٹے کے ساتھ ایسا کچھ نہیں کر سکتیں۔ وہ کسی کا قاتل نہیں ہے، اس نے کسی پر حملہ نہیں کیا ہے۔ وہ صرف اپنے حق کے لیے لڑ رہا تھا۔ اس حق کے لیے جو عرفان اللہ نے بھی اسے اور اس کی ماں کو دیا ہی نہیں۔“

”وہ بے قصور ہے تو آپ اسے قانون کے سامنے پیش کریں اور اسے کہیں کہ وہ عدالت میں خود کو بے گناہ ثابت کرے۔“ صوفیہ نے اس کی باقی باتوں کو نظر انداز کر کے پہلی بات کو پکڑا۔

”میں نہیں جانتی کہ وہ کہاں ہے لیکن جب بھی وہ مجھ سے ملا، میں اس سے کہوں گی کہ کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ساری زندگی عرفان اللہ کی سائڈ پر کھڑی ہو کر میں نے اسے چپ رہنے پر مجبور رکھا لیکن اب ایک ماں اپنے بیٹے کے ساتھ کھڑی ہوئی اور لوگوں کو بتائے گی کہ بھیڑ کی

پہلے ہی اس کے پر قہقہہ کر دیے گئے تھے۔

☆☆☆

”اپن کو معاف کر دو لالہ! اپن سے غلطی ہو گیا۔ اپن شرمندہ ہے کہ اپنے ہوتے گولی سالی اپنے لاڈلے تک پہنچی کیسے؟“ اصغر جس کا اپنے سے نیچے والوں پر بے پناہ رعب تھا، اس وقت کسی ننھے سے بچے کی طرح دھاڑیں مارتا ہوا لالہ کے قدموں میں بیٹھا ہوا تھا اور اس سے معافی مانگ رہا تھا۔ خون کی کمی کے باعث قدرے زرد پڑ جانے والے لالہ کی آنکھوں میں بھی آنسوؤں کی ہلکی سی نمی تھی لیکن لب مسکرا رہے تھے۔ کیوں نہ مسکراتے، ایک ایسے وقت میں جب اس کی سانسیں رکی جاتی تھیں اور دل سہم سہم کر دھڑکتا تھا، اسے خوشخبری دی گئی تھی کہ وکی کی حالت اب خطرے سے باہر ہے۔ اگرچہ وہ اب بھی ہوش میں نہیں تھا اور اسے آکسیجن کی دھاریں بھی رکھا گیا تھا لیکن اس کا آپریشن کامیاب ہو گیا تھا۔ ڈاکٹرز کے مطابق وہ معجزاتی طور پر ہی زندہ بچا تھا۔ پشت پر لگنے والی گولی اگرچہ سنٹی میٹر مزید فاصلہ طے کر لیتی تو دل کو نشانہ بنا لیتی اور کسی کے کچھ کرنے کرانے کی نوبت ہی نہ آتی۔ اب بھی اس گولی نے خاصا کام خراب کیا تھا اور جریان خون کی شدت کے باعث وکی نے موت کی سرحد کو بس چھو ہی لیا تھا۔ ایسے میں اگر لالہ اسے خون نہ دیتا تو اس کی واپسی ممکن نہیں تھی۔

”یقین مانو لالہ! اگر ٹیپو اپن کو اپنے لاڈلے کے بچ جانے کی اطلاع نہ دیتا تو اپن اپنا یہ منحوس بوتھالے کر بھی تمہارے سامنے ہی نہیں آتا۔ اپن گولی مار کر ختم کر لیتا خود کو۔“ اصغر کے لہجے میں ایسی سچائی تھی جس نے سیدھا لالہ کے دل پر اثر کیا اور اس نے اصغر کے شانے پر ہتھکی دیتے ہوئے نرمی سے کہا۔

”چل اب بس کر۔ بچ گیا ہے حیرا وکی بھائی اور یہ ایسی خوشی ہے کہ میں تیری کوتاہی تو کیا، سات خون بھی معاف کر دوں۔“

”تم میری کھال کے جوتے بنوا کر بھی پہن لیتے تو میں اب نہ کرتا۔“ اصغر اب بھی بے حد جذباتی ہو رہا تھا۔

”تو نہیں جانتا اصغر! وکی وہ طوطا ہے جس میں میری جان بند ہے۔ اسے کچھ ہو جاتا تو وہ دن قیامت کا ہوتا۔“ لالہ کی آنکھوں میں ایک ہل کے لیے آتشیں لہریں لپکیں لیکن پھر ان کی جگہ نرمی نے لے لی اور حلاوت سے بولا۔

”اب یہاں بیٹھ کر وقت برباد نہ کر اور سب سے پہلے تو اس خوشی میں غریبوں میں صدقہ خیرات تقسیم کر پھر لگ جا

کھال میں پھرنے والے بھیڑیے کی حقیقت کیا ہے۔“ وہ جو کچھ کہہ رہی تھی، اس سے طاہر بیگ کے کچھ دیر پہلے کیے گئے سوالات ایک بار پھر لوگوں کے ذہنوں میں جاگ گئے تھے۔ ”مجھے تو تم بھی اسی سازشی ٹولے کا حصہ لگتی ہو جو ہر حال میں عرفان اللہ صاحب کی راہ روکنا چاہتا ہے۔ عوام کو چاہیے کہ تم جیسے سازشیوں کے چیتھڑے اڑا کر رکھ دے۔“ صوفیہ کا نہایت نفرت سے دیا گیا یہ جواب محض ایک بات نہیں تھی، یہ ایک اشارہ تھا جسے عین اس کی خواہش کے مطابق موصول کیا گیا اور اسپتال میں جمع ہو جانے والے عرفان اللہ کے حامیوں نے یکدم ہی اشتعال انگیز نعرے بازی کے ساتھ ساتھ کالم گلوچ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ان کے تیور اتنے جارحانہ تھے کہ لگتا تھا تاجور پر پل پڑیں گے۔ اس موقع پر اگر اسپتال کا سیکورٹی پر مامور عملہ اور پولیس والے حرکت میں نہ آتے تو تاجور کی بالکل خیر نہیں تھی۔ اسے مشکل سے ہجوم سے نکالا گیا اور فوراً ہی وہاں سے روانہ کر دیا گیا۔ اس سارے ہنگامے سے گزر کر صوفیہ کو بھی بہت مشکل سے موقع ملا کہ کسی جگہ سکون سے بیٹھ سکے۔ سکون کا یہ وقفہ نہایت مختصر ثابت ہوا اور ملنے والے ایک پیغام نے بے چین کر دیا۔ پیغام تھا۔

”عرفان اللہ سے فوری دور ہو کر خود کو انڈر گراؤنڈ کر لو۔ کھیل بگڑ چکا ہے اور جو نئے کھلاڑی میدان میں آئے ہیں، ہمیں خود کو ان سے بچانا ہے۔“

پیغام میں یہ واضح نہیں تھا کہ کیا ہوا ہے لیکن یہ صاف ظاہر تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اس نے فوراً ہی اپنی جگہ چھوڑ دی اور باہر آ کر ایک سینئر پارٹی ورکر سے بولی۔

”آپ یہاں کے معاملات پر نظر رکھیں قریشی صاحب! میں فریش ہونے کچھ دیر کے لیے گھر جا رہی ہوں۔ جلد واپس آ جاؤں گی۔“ اپنی بات کہہ کر وہ ر کے بغیر تیزی سے خارجی راستے کی طرف بڑھ گئی۔ پو پھٹ چکی تھی اور صبح کی فرحت بخش ہوا اس کے چہرے سے ٹکرا رہی تھی۔ وہ تیزی سے پارکنگ میں کھڑی اپنی گاڑی کی طرف بڑھی اور لاک کھول کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ گاڑی اشارٹ کر کے ابھی اسے چلاتی ہوئی سڑک پر لائی ہی تھی کہ لوہے کا سردلس گردن پر محسوس ہوا اور اس لکس سے بھی زیادہ سرد لہجے میں حکم دیا گیا۔

”گاڑی تم چلاؤ گی لیکن منزل کا تعین میں کروں گا۔ میری ہدایات کے خلاف جانے کی غلطی ہرگز بھی نہیں کرنا۔“ صوفیہ بے بسی سے ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔ پرواز سے

اس..... باذل کی کھوج میں۔ وکی پوری طرح ہوش میں آئے تو باذل کو اس کے سامنے ہونا چاہیے تاکہ وہ اسے اپنی من پسند سزا دے سکے۔ ”لالہ کو عموماً گالیوں کے استعمال کی عادت نہیں تھی لیکن اس وقت اس نے باذل کو ایک موٹی سی گالی دی تھی۔

”آپ بے فکر رہو لالہ! میں اس کے گلے میں رسی ڈال کر کھینچتا ہوں لالہ! گا اپنے لاڈلے کے سامنے۔“ لالہ کے الفاظ ایک طرح سے اس کے لیے معافی کا اعلان تھے اس لیے وہ فوراً ہی پرجوش ہو گیا۔

”ایسا کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ معاذ جو کچھ دیر قبل وکی کی زندگی بچنے کی خوشخبری سن کہ پیدا ہونے والے جذباتی ہیجان سے گزر چکا تھا اور اب اسے اپنی آنکھوں سے آئی سی یو میں دیکھ کر آ رہا تھا، اندر داخل ہوتے ہوئے اصغر کا جملہ سن کر بولا۔

”کیا مطلب..... کیا کہنا چاہتے ہو تم؟“ لالہ نے اس سے حیرت سے پوچھا۔ اصغر کی انہی نظروں میں بھی یہی سوال تھا۔

”باذل کو ڈھونڈنے کے لیے کہیں بھی جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ یہیں اسی اسپتال میں موجود ہے۔“ معاذ کا انکشاف چونکا دینے والا تھا۔ اصغر تو فوراً ہی بھڑک کر کھڑا ہو گیا۔

”کہاں ہے وہ..... کی اولاد۔ اپن اس کے پیچھے اڑا کر رکھ دے گا۔“

”سکون سے بیٹھ جاؤ۔ ابھی تم اسے کچھ بھی نہیں کر سکتے۔“ معاذ نے قہر سے اسے ٹوکا۔

”کیوں نہیں کر سکتا؟ اگر یہ اسپتال ہے تو ہوا کرے۔ میں تو اس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کروں گا۔“ اصغر اپنی جذباتی کیفیت میں اس کے انداز کو سمجھنے سے قاصر تھا لیکن لالہ کی تجربہ کار نگاہوں نے اس کے چہرے کا غیر معمولی پن محسوس کر لیا اور اصغر کو ڈپٹا۔

”تم تھوڑی دیر چپ بیٹھو اصغر اور مجھے وہ سننے دو جو معاذ بتانا چاہتا ہے۔“ اس کا حکم سن کر اصغر فوراً دبک گیا۔

”ہاں بولو بر خوردار! کیا بات ہے؟ تمہارے چہرے سے تو لگتا ہے کہ کوئی خاص خبر ہے تمہارے پاس۔“

”جی، خاص ہی خبر ہے جو میں پہلے ہی آپ کو سنانا چاہتا تھا لیکن پھر وکی کے سلسلے میں خوشخبری سن کر اتنا جذباتی ہو گیا کہ وقتی طور پر بات ذہن سے ہی نکل گئی۔“

”کوئی بات نہیں، اب بتادو۔“ لالہ نے متانت سے کہا۔

”مجھ کے قریب کچھ لوگ ایک کار میں باذل کو شدید زخمی حالت میں اسپتال کے باہر پھینک گئے تھے۔ اس کی حالت بہت خراب تھی لیکن یہاں اسے طبی امداد دینے کے بجائے ضابطے کی کارروائی کی باتیں ہو رہی تھیں۔ مجھے لگا کہ پولیس کے آنے اور کوئی کارروائی ہونے تک وہ مر جائے گا اس لیے مداخلت کرنا پڑی۔ اس وقت وہ آپریشن ٹیبلٹ میں ہے اور میں نے اسپتال انتظامیہ کو سمجھ کر دی ہے کہ اس کی یہاں موجودگی کی خبر کسی صورت لیک نہ ہو۔“

”کیا ضرورت تھی اس..... کو بچانے کی؟ اچھا تھا کہ باہر سڑک پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر کتے کی موت مر جاتا۔“ اصغر کو باذل کا بچایا جانا پسند نہیں آیا اس لیے اس کے نام کے ساتھ ایک بڑی سی گالی ٹانگ کر اپنے غصے کا اظہار کیا۔

”یہ بشری کی خواہش ہے اصغر! ہم سب جانتے ہیں کہ بشری نے اس کے لیے کیا سزا تجویز کی تھی اور مجھے لگتا ہے اس کی خواہش کی تکمیل کے لیے ہی قدرت باذل کو گھیر کھار کر یہاں لائی ہے۔“

”لیکن.....“ اصغر نے اب بھی کوئی اعتراض کرنا چاہا مگر لالہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے کچھ بھی کہنے سے روک دیا۔

”معاذ ٹھیک کہہ رہا ہے اصغر! باذل نے بے شک ہم سب کو نقصان پہنچایا ہے لیکن جو نقصان اس نے بشری کا کیا ہے، وہ سب سے زیادہ ہے اس لیے بشری ہی کو اس کے لیے سزا تجویز کرنے کا سب سے زیادہ حق بھی ہے۔“

”ٹھیک ہے لالہ!“ اصغر نے فوراً ہتھیار ڈال دیے پھر معاذ کی طرف رخ کر کے پوچھا۔

”اب کیسی ہے بشری بی بی؟“

”الحمد للہ! بہتر ہے۔ ڈاکٹرز نے امید دلائی ہے کہ جلدی ریکور کر جائے گی۔“

”یہ باذل اتنا زخمی کیسے ہوا؟ ادھر جہاں تم لوگوں نے چھاپا مارتا تھا وہاں سے تو ٹھیک ٹھاک بچ نکلا تھا۔“ جب تک وکی کی پریشانی تھی، سب اسی میں الجھے ہوئے تھے اس لیے حالات اور خبروں کا کچھ غلم ہی نہیں تھا۔ اب دماغ کچھ سوچنے سمجھنے کے لائق ہوا تھا تو زبان پر سوالات بھی آرہے تھے۔

”خبروں سے پتا چلا ہے کہ باذل نے عرفان اللہ کے گھر میں گھس کر اس پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ خبروں میں اس سلسلے میں تفصیل تو کوئی نہیں تھی لیکن مجھے لگتا ہے کہ وہ وہاں سے فرار ہوتے ہوئے سیکورٹی والوں کے ہاتھوں زخمی ہوا ہوگا اور اس کے ساتھی اپنی جان چھڑانے کے لیے اسے یہاں پھینک گئے ہیں۔“ اصغر نے لالہ کے سوال کا جواب

معجزہ پیش کیا۔

”عرفان اللہ پر قاتلانہ حملہ..... بچ گیا وہ بد معاش یا ابھی زندہ ہے؟“ لالہ کو اس خبر نے حیران کیا۔ معاذ کے لیے بھی یہ ایک انکشاف ہی تھا۔

”میں وکی کی خبر سن کر اسپتال کے لیے نکلا، اس وقت تک تو زندہ تھا لیکن خبروں میں بتا رہے تھے کہ اس کی حالت نازک ہے۔ میں ابھی چیک کرتا ہوں۔“ اصغر نے جلدی سے اپنا موبائل آن کیا۔ اتنی دیر میں معاذ بھی یہ کام کر چکا تھا۔

”مشہور و معروف سیاست دان اور سماجی کارکن عرفان اللہ صاحب جو گزشتہ شب قاتلانہ حملے کے بعد شدید زخمی حالت میں اسپتال لائے گئے تھے، زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے دم توڑ گئے ہیں۔ اسپتال انتظامیہ نے ان کی موت کی تصدیق کر دی ہے اور خبر جاری ہوتے ہی اسپتال میں ان کے کارکنوں اور چاہنے والوں کا رش لگ گیا ہے۔ ہم ایک بار پھر آپ کو بتاتے چلیں کہ.....“ نیوز ایگر حسب معمول خبر سنانے کے بعد ایک بار پھر اسے دہرا رہی تھی۔ اسکرین پر اسپتال کے مناظر اور ٹکرز بھی چل رہے تھے۔ کچھ لوگ زار و قطار رو رہے تھے، کچھ نعرے بازی کر رہے تھے اور کہیں کہیں احتجاج کے نام پر ہنگامہ آرائی بھی کی جا رہی تھی۔

”خس کم جہاں پاک۔“ معاذ شقی القلب نہیں تھا کہ کسی کی موت پر خوشی کا اظہار کرتا لیکن عرفان اللہ جیسے مکار، منافق اور وطن دشمن کی موت کی خبر نے اسے سکون دیا تھا جس کا اظہار زبان سے بھی ہو گیا تھا۔

”یہ تو کوئی بہت ہی عجیب واقعہ ہوا ہے۔“
”نہیں، اتنا بھی عجیب نہیں۔ اندر ہی اندر کچھ تو چل رہا تھا۔ شاید آپس میں ہی ٹھن گئی تھی۔ باذل کا یزدانی ہاؤسنگ اسکیم سے فرار، عرفان اللہ کی مل کے باہر ہونے والا حملہ اور پھر ہمارے ساتھ ساتھ دوسری پارٹی کا باذل کے ٹھکانے پر ریڈ بتا رہا ہے کہ اندرون خانہ کافی گڑبڑ تھی۔“

”آپ طاہر بیگ سے پوچھو لالہ! آج کل وہ عرفان اللہ پر نظریں گاڑ کر بیٹھا ہوا تھا۔ اسے ضرور کچھ نہ کچھ معلوم ہوگا۔“ اصغر نے مشورہ دیا جسے صائب محسوس کرتے ہوئے لالہ نے فوراً ہی طاہر سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی طرف سے کال ریسپونڈ کی گئی۔

”وہ مصروف ہوگا۔ صحافی تو ایسے مواقع پر بہت زیادہ ایکٹو ہو جاتے ہیں۔“ معاذ نے اسکرین اسکرول

کرتے ہوئے طاہر کے کال ریسپونڈ کرنے پر تبصرہ کیا اور یہ اتفاق تھا کہ اسی وقت اس کے سامنے وہ ویڈیو کھل آ گیا جس میں طاہر، صوفیہ سے باذل کے حوالے سے سوالات کر رہا تھا۔ عرفان اللہ کے اندھے عقیدت مند بے شک ان سوالات کا برا مانتے لیکن ان میں سے ہر ایک نے ان سوالات کے پیچھے چھپے سچ کو محسوس کیا اور انہوں نے تسلیم کر لیا کہ باذل کی نفسیاتی اور جذباتی الجھنوں نے عرفان اللہ کی خود غرضی کے رد عمل میں اس سے یہ انتہائی قدم اٹھوایا تھا اور نتیجے میں وہ خود بھی برے حالوں میں اسپتال میں موجود تھا لیکن گنتی کے چند ہی لوگوں کو یہ حقیقت معلوم تھی اور ہر طرف ایک ہی سوال گونج رہا تھا۔

”باذل کہاں ہے؟“

☆☆☆

”صوفیہ زاہد.....!“

”یس صوفیہ زاہد..... ڈاٹر آف جسٹس زاہد حسین، جسے اس طرح غیر قانونی طور پر یہاں لانا آپ کو بہت مہنگا پڑے گا۔“ صوفیہ نے اپنے سامنے بیٹھے کنپٹیوں سے سفید بالوں والے شخص کو غصیلی نگاہ سے دیکھا۔

”ہا ہا.....“ وہ جیسے کوئی لطیفہ سن کر محظوظ ہوا پھر کہنیوں کو میز پر ٹکا کر ذرا سا آگے کی جانب جھکتے ہوئے بولا۔

”ہماری اس غیر قانونی حرکت کو ایسا قانونی تحفظ حاصل ہے میڈم کہ تمہارے فادر کی ساری قانون دانی خرچ ہو جائے گی اور وہ ہماری دھول کو نہیں پہنچ سکے گا۔“

”یعنی میں کسی خفیہ ایجنسی کی تحویل میں ہوں، لیکن کیوں؟“ وہ اب بھی مقابل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر رہی تھی۔

”اس لیے کہ تم صرف ڈاٹر آف زاہد حسین نہیں ہو، تم ڈاٹر آف سانٹھا آئزک بھی ہو۔“ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے جواب دیا گیا۔

”سو واٹ..... ویسے بھی ڈیڈی سے شادی کر کے وہ سانٹھا آئزک نہیں رہی تھیں، فاطمہ حسین ہو گئی تھیں۔“

”بظاہر۔“ بہت ٹھنڈے لہجے میں اس کی بات کاٹی گئی۔

”آپ اس طرح کسی کو جج کرنے کا حق نہیں رکھتے۔“

اس نے طیش کا مظاہرہ کیا لیکن وہ خود جانتی تھی کہ اس کا ہر رد عمل محض اداکاری ہے اور حقیقتاً وہ پھنس چکی ہے۔

”ہم ہی تو یہ حق رکھتے ہیں کیونکہ ہمارے پاس

تمہاری ماں کا مکمل اعمال نامہ موجود ہے۔ م جانتے ہیں کہ

اس نے کتنی بار پاکستان سے امریکا کا سفر کیا اور پھر اپنی

دہری شہریت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کتنی بار امریکن پاسپورٹ پر اسرائیل گئی۔
”اسرائیل جانا کوئی جرم نہیں۔ وہاں ان کے ریلیٹوز رہتے ہیں اور وہ ان سے ملنے وہاں جاتی تھیں۔“ بظاہر اس کا لہجہ اب بھی مضبوط تھا۔

”لیکن ہمارے پاس اس کے چند ایسے رابطوں کے شواہد ہیں جو ہمارے ملکی مفادات کے لیے سوالیہ نشان کی حیثیت رکھتے ہیں۔“

”بکو اس۔“ اس نے شدت سے جھٹلایا پھر لہجے کو تیز کرتے ہوئے بولی۔ ”اگر اس الزام میں حقیقت بھی ہو تو اس کے لیے آپ مجھ سے جواب طلبی نہیں کر سکتے۔ فاطمہ حسین اپنے ہر عمل کے لیے خود جوابدہ تھیں۔ آپ ان کی قبر پر جائیں اور پوچھ لیں جو پوچھنا ہے۔“

”قبر پر جا کر سوال کرنے سے بہتر ہے کہ ہم اس فرد سے سوال کریں جسے وہ وراثت میں اپنا مذہب اور مشن، دونوں سونپ کر گئی ہے۔“ دوسری طرف کا موقف بہت واضح تھا۔

”یہ بے بنیاد الزام تراشی ہے۔“ اس نے احتجاج کیا۔
”بے بنیاد کچھ بھی نہیں ہے۔ اگر تمہیں ایسا لگتا ہے تو ہم جے اینڈ جے کمپنی میں تمہاری ملازمت سے بات شروع کرتے ہیں۔“

”وہاں جاب کرنا کون سا جرم ہے؟ درجنوں پاکستانی لڑکیاں اس کمپنی میں کام کرتی ہیں۔“

”لیکن ان میں سے کوئی بھی رائیل شمعون عرف میڈم ایکس کی رائٹ پیٹنڈ نہیں ہے جس کے ذریعے ایک پاکستانی سیاست دان کو گھیر کر اسرائیل کے مفاد میں استعمال کرنے کی منصوبہ بندی کی گئی ہو۔“ وہ زہر خند ہوئے۔

”یہ سب محض کہانیاں ہیں جن کا تمہارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔“ اس نے شانے جھٹکے۔

”اگر یہ محض کہانیاں ہوتیں تو رائیل عرف میڈم ایکس راتوں رات ملک سے فرار نہ ہو گئی ہوتی۔“ یہ ایک ایسی اطلاع تھی جس نے صوفیہ کو بری طرح چونکا دیا۔

”میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ تمہاری باس رات کے آخری پہر یہاں سے دعویٰ روانہ ہو گئی تھی اور ہماری اطلاع کے مطابق اس وقت وہ نیویارک جانے والی ایک فلائٹ میں موجود ہے۔“

”ایک بڑی کمپنی کی سی ای او کے اس طرح کے سفر معمول کا حصہ ہوتے ہیں۔ آپ کس بنیاد پر اسے فرار قرار

دے رہے ہیں؟“ اس نے سنبھالا لیا۔

”مختلف مجرمانہ کارروائیوں کے تانے بانے جب ایک شخصیت کے ساتھ جاکر جڑ رہے ہوں تو بنیاد تو مل ہی جاتی ہے۔ ایک فائبر اسٹار ہوٹل میں ہونے والی میڈم رائیل اور عرفان اللہ کی خفیہ ملاقات، یزدانی ہاؤسنگ اسکیم سے دریافت ہونے والا اسلحہ، باذل پر حملے میں ملوث گرفتار شدگان اور کچھ مزید ثبوت ہیں ہمارے پاس لیکن ان سارے ثبوتوں پر بھاری ثبوت میڈم رائیل کی اپنی بیٹی کا بیان ہوگا۔ تمہارے خیال میں سونیا کے بیان کے بعد کوئی گنجائش باقی رہ جائے گی؟“

صوفیہ کو لگنے والا یہ جھٹکا پہلے جھٹکے سے بھی زیادہ زوردار تھا۔ ایک پل کے لیے اس کی بولتی بند ہو گئی پھر سنبھل کر بولی۔

”آپ شاید داراب خان کی بیوی سونیا خان کی بات کر رہے ہیں لیکن وہ تو میڈم رائیل کی بیٹی نہیں ہے۔ تھوڑا بہت کاروباری تعلق ہے لیکن بیٹی..... بیٹی کہاں سے ہو گئی وہ؟ داراب خان اسے افغانستان سے شادی کر کے لایا تھا۔“
”میں کاغذات پر بنائی گئی جعلی شناخت کی نہیں، حقیقی شناخت کی بات کر رہا ہوں بے بی.....! صرف ایک ڈی این اے ٹیسٹ ثابت کر دے گا کہ وہ دونوں ماں بیٹی ہیں۔“

”ثابت کر کے بھی کیا حاصل کر لو گے تم لوگ؟ میڈم تو تمہارے ہاتھ سے نکل گئی ہیں اور اتنی تمہاری اوقات نہیں کہ کسی انٹرنیشنل فورم پر کھڑے ہو کر اس معاملے میں احتجاج کر سکو۔ سوچو اگر جے اینڈ جے نے تمہارے ملک سے اپنا کاروبار سمیٹ لیا تو کیا کرو گے تم لوگ؟ تمہاری پہلے سے تباہ شدہ معیشت کے لیے یہ بہت بڑا جھٹکا ہوگا جسے سہنا بہت مشکل ہوگا تمہارے لیے۔“ اس کا لہجہ یکدم ہی بے حد جارحانہ ہو گیا۔

”مجھے تمہاری کسی بات سے انکار نہیں۔ معاشی بد حالی کو بھی قبول کرتا ہوں لیکن اس سب کے باوجود ابھی اتنی بے بسی نہیں ہے کہ تمہیں اور تمہارے آقاؤں کو مکمل چھٹی مل جائے۔ تم لوگوں کو اس سب کا منہ توڑ جواب ضرور دیا جائے گا۔“

”لیٹس سی۔“ اس نے بے پروائی سے شانے جھٹکے۔
”اپنے اس روئے کا اظہار کر کے تم نے بالواسطہ تسلیم کر لیا ہے کہ تم پر لگائے گئے الزامات درست ہیں۔“

”اگر میں تسلیم نہ کروں تو بھی کون سا تم اپنے لگائے گئے الزامات واپس لے لو گے۔“

”یہ تو تم نے ٹھیک کہا۔ جب تک کوئی معاملہ یقین کی

حد تک نہ پہنچ جائے، میرے لوگ اسے مجھ تک پہنچاتے ہی نہیں ہیں۔“ کرنل سکندر بخت اس کا انداز مخاطب اور رویہ بدلنے پر ابھن محسوس کرنے کے باوجود اب بھی پرسکون لہجے میں اس سے مخاطب تھے۔

”نو کمٹس۔“ وہ گویا ان کی ابھن سے جھٹاٹھا رہی تھی اور ان کے پرسکون لہجے کے باوجود وہ جانتی تھی کہ اندر سے انہیں بے سکون کر چکی ہے۔

”شاید تمہیں لگتا ہے کہ کچھ بار سوخ ہاتھ حرکت میں آئیں گے اور تمہیں ہمارے پنجوں سے چھڑا کر لے جائیں گے لیکن یقین کرو کہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ کوئی یہ تک نہیں معلوم کر سکے گا کہ تم ہو کہاں۔ ہم اتنے گئے گزرے ہوتے تو وہ میڈم زائیل یوں راتوں رات بھاگ نہ گئی ہوتی۔“

”میڈم زائیل نے کیا اور کیوں کیا، یہ وہ خود جانتی ہوں گی۔ مجھے صرف اپنے بارے میں پتا ہے کہ مجھے کیا اور کیوں کرنا ہے۔“ لمحہ بہ لمحہ اس کا اطمینان بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ ”تمہاری طرف سے ہماری مطلوبہ معلومات کی فراہمی میں مزاحمت نہ کی گئی تو دونوں طرف کے لوگ تکلیف سے بچ جائیں گے۔ تشدد کے ذریعے سچ اگلوانا وہ بھی ایک خاتون سے..... میرے لیے ایک مشکل کام ہے۔“ وہ بولنے کے ساتھ ساتھ اسے کھوجنے والی نگاہوں سے بھی دیکھ رہے تھے۔ ان کے تجربے کے مطابق کوئی شخص اتنا پرسکون صرف اسی وقت ہوتا ہے جب کچھ کر گزرنے کی ٹھان بیٹھا ہو۔ وہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہ کیا کر سکتی ہے؟ خود کشی کا خیال بار بار ذہن میں آتا تھا لیکن وہ اسے یہ سوچ کر رد کر رہے تھے کہ اس کو ان کے سامنے پیش کرنے سے قبل اس کی مکمل تلاشی لی گئی تھی۔ یہاں تک کہ دانت بھی نہیں چھوڑے گئے تھے کہ کہیں کسی خلا میں کوئی زہریلا کپسول نہ چھپایا گیا ہو جسے وہ خود کشی کے لیے استعمال کر سکے۔

”اگر میں مزاحمت کا اعلان کروں تو پھر؟“ صوفیہ نے چیخ کرنے والے انداز میں ان کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”تو پھر مجھے افسوس ہے کہ ہمارے درمیان یوں اطمینان سے میز کرسی پر بیٹھ کر مذاکرات جاری نہیں رہیں گے اور تمہیں اس کمرے سے باہر کچھ مشکل اور تکلیف دہ مراحل سے گزرنا پڑے گا۔“

”مجھے منظور ہے۔“ اپنے سابقہ رویے کے برعکس وہ بہت مشکل کیس نظر آنے لگی تھی۔ کرنل سکندر بخت نے اس کے ناقابل فہم رویے کے باوجود اس سے مزید گفتگو جاری نہ رکھنے کا فیصلہ کیا اور گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ فوراً ہی ایک شخص

چراغ کے جن کی طرح حاضر ہوا اور مؤدبانہ ”یس سر“ کہا۔ ”مس صوفیہ زاہد کو میڈم سامعہ کے پاس لے جاؤ تاکہ وہ ان کی خاطر خواہ میزبانی کر سکیں۔“ انہوں نے طنزیہ لہجے میں حکم صادر کیا جس کا صوفیہ پر مطلق اثر نہیں ہوا اور وہ ویسی ہی پرسکون دکھائی دی۔ کرنل سکندر بخت نے دل ہی دل میں اس کے مضبوط اعصاب کی داد دی اور قصداً اس پر سے نظریں ہٹالیں لیکن ان کی حیات وہاں ہونے والی حرکات پر مبذول تھیں۔

”اٹھو میڈم!“ بلائے گئے شخص نے صوفیہ پر ہتھیار تان کر اسے تحکمانہ مخاطب کیا تھا۔ صوفیہ بغیر کسی مزاحمت کے خاموشی سے کھڑی ہو گئی اور اس کے اشارے پر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی خارجی راستے کی طرف بڑھی۔ اب کرنل سکندر بخت کی طرف اس کی پشت تھی۔ انہوں نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے دونوں ہاتھ پشت پر جھکڑی میں جکڑے ہوئے تھے اور دونوں پیروں میں بھی بیڑیاں پڑی تھیں جن کے درمیان میں منسلک مختصر سی زنجیر کے باعث وہ بڑے قدم اٹھانے سے قاصر تھی۔ یہ اقدامات اس کی طرف سے کسی حملے کے خدشے کے پیش نظر نہیں کیے گئے تھے بلکہ اس نفیات کے پیش نظر کیے گئے تھے جو کسی سیکرٹ ایجنٹ کی ہوتی ہے۔ ان کا برسوں کا تجربہ تھا کہ جب کوئی سیکرٹ ایجنٹ گرفتاری کے بعد خود کو ہر طرح سے بے بس پاتا تھا اور اس کی حب الوطنی اسے زبان کھولنے اور اعتراف جرم کی اجازت نہیں دیتی تھی تو اس کی پہلی ترجیح خود کشی ہوتی تھی۔ خصوصاً وہ سیکرٹ ایجنٹس جو مذہبی بنیاد پرست ہوتے تھے، اس معاملے میں بہت پھرتی دکھاتے تھے۔ شاید اس یقین کی بنیاد پر کہ وطن کے ساتھ ساتھ مذہب کے لیے دی گئی یہ قربانی انہیں اگلے جہان میں بڑے درجات عطا کرے گی۔ صوفیہ کا معاملہ بھی مذہبی بنیاد پرستی کا تھا۔ ظاہراً مسلمان ہوتے ہوئے بھی وہ پوری طرح اپنی یہودی ماں کے زیر اثر تھی اور اس کے متعلق حاصل ہونے والی معلومات سے اندازہ ہوا تھا کہ وہ پاکستان میں اسرائیلی مفادات کے تحفظ کے لیے ہی کام کر رہی تھی۔ عرفان اللہ کے ساتھ اس کا اچانک منتفی ہو جانا اور اسے اپنے دام میں لے کر طے شدہ ایجنڈے پر چلانا بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی تھی لیکن اب وہ کیا کر سکتی ہے یا کرنے کا ارادہ رکھتی ہے، وہ سمجھنے سے قاصر تھے۔ وہ مذکورہ شخص کی نگرانی میں ان کے کمرے سے باہر نکل گئی اور اس کی پشت پر دروازہ خود کار انداز میں بند ہو گیا تب بھی ان کی یہ ابھن

برقرار تھی۔ اس الجھن نے ہی انہیں لیپ ٹاپ کی ٹیچ اسکرین پر انگلیوں کو حرکت دینے پر مجبور کیا۔ اسکرین پر سیکورٹی کیمروں کا رزلٹ شو ہونے لگا۔ انہوں نے اپنے کمرے سے باہر اس برآمدے کو فوکس کیا جس سے گزار کر اسے میجر سامعہ تک لے جایا جانا تھا۔

وہ بہت خاموشی سے سر اٹھائے برآمدے سے گزر رہی تھی۔ اسے لے جانے والا شخص اس سے دو قدم پیچھے اس پر گن تانے پوری طرح ہوشیار اور چوکنا تھا۔ برآمدے میں دو جگہ سیکورٹی اہلکار تعینات تھے۔ ایک عین ان کے کمرے کے باہر اور دوسرے برآمدے کے اختتام پر اس جگہ جہاں سے سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں۔ صوفیہ کو اس طویل برآمدے کے اختتام تک نہیں جانا تھا۔ اسے ان کے کمرے سے تین کمرے چھوڑ کر چوتھے کمرے میں لے جایا جانا تھا۔ اس وقت وہ دوسرے کمرے کے سامنے سے گزر رہی تھی اور بالکل پرسکون تھی۔ وہ اس پر نظریں جمائے اس کے حرکت کرتے وجود کو دیکھتے رہے۔ دوسرے کمرے کے سامنے والے برآمدے کا حصہ پار کرتے ہی انہیں اس کے جسم میں خفیف سا تناؤ محسوس ہوا اور چال میں بھی ہلکی سی تبدیلی محسوس ہوئی۔ وہ بے ساختہ ہی اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے لیکن انہیں سمجھنے میں معمولی سی تاخیر ہو چکی تھی۔ تیسرے کمرے کے دروازے کے عین سامنے وہ ستون موجود تھا جس کی مرمت کا جاری کام آج بوجہ رکھا ہوا تھا۔ اس ستون کے ساتھ ایک الیکٹرک بورڈ بھی موجود تھا جو اس وقت کھلا ہوا تھا اور اس سے بہت سی تاریں باہر نکل ہوئی تھیں۔ پرانی عمارت کی پرانی تنصیبات کے باعث یہ انتظام موجود نہیں تھا کہ باقی منزل کو برقی رو کی سپلائی منقطع کیے بغیر صرف اس بورڈ کی ترسیل منقطع کی جاسکے اس لیے خطرے کی علامات اور ستون سے دور رہنے کی ہدایات چہاں کر کے تحفظ کا عارضی انتظام کیا گیا تھا۔ کسی قسم کے حادثے کا اس لیے بھی خدشہ نہیں تھا کہ اس منزل پر مخصوص لوگ ہی آتے جاتے تھے اور وہ سب اس مسئلے سے آگاہ تھے۔ شدید تھی کہ کل اس منزل کی بجلی کچھ گھنٹوں کے لیے منقطع کر کے مرمت کا کام مکمل کر لیا جائے گا لیکن جو کچھ اس وقت ہونے جا رہا تھا، اسے روکنے کے لیے انہیں بالکل بھی مہلت نہیں مل سکی۔

شخص کی نگرانی میں چلتی صوفیہ نے اپنے نگران کی توقعات کے بالکل برخلاف چلتے چلتے ذرا سی دائیں جانب جھکائی دی اور کسی تیز رو برآمدے کی سی پھرتی سے بجلی کے کھلے

بورڈ سے جا ٹکرائی۔ اس نے بورڈ سے ٹکراتے ہوئے اس بات کا اہتمام کیا تھا کہ وہ پشت کے بل اس سے ٹکرائے اور اس کے ہاتھ میں موجود لوہے کی ہتھکڑیاں ننگے تاروں کو چھو جائیں۔ بورڈ کی کم بلندی کی وجہ سے وہ اپنی کوشش میں کامیاب رہی۔ اس کا نگران اس کی طرف ہتھیار بلند کیے ہل بھر ہکا بکا سا کھڑا رہ گیا پھر زور سے چیخ کر کچھ بولا۔ شاید اس نے برآمدے کے آخری سرے پر موجود اپنے ساتھیوں کو برقی رو منقطع کرنے کے سلسلے میں ہدایت دی تھی لیکن کرنل سکندر بخت دیکھ سکتے تھے کچھ بھی کرنے کے لیے اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ صوفیہ نے اپنے تربیت یافتہ ایجنٹ ہونے کا ثبوت دے دیا تھا۔ وہ ان تک آتے ہوئے اپنی جان لینے کا مقام اور طریقہ طے کر کے آئی تھی اور انہیں اعتراف تھا کہ اسے یہ موقع ان کے لوگوں کے احساس برتری نے فراہم کیا تھا۔ انہوں نے صوفیہ کے سیکرٹ ایجنٹ ہونے سے زیادہ اس کے عورت ہونے کو دماغ میں رکھا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر ان تک لاتے۔

☆☆☆

”کیسی ہو بشری؟“ معاذ نے بستر پر دراز بشری کے الجھے الجھے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس سے نرمی سے دریافت کیا۔ ڈاکٹر نے اسے مکمل طور پر خطرے سے باہر قرار دینے کے باوجود بہت تھوڑی دیر کے لیے ملاقات کی اجازت دی تھی کہ فی الحال وہ بہت کمزور ہو چکی تھی اور ریکور کرنے کے لیے اسے اچھے علاج کے ساتھ ساتھ بھرپور آرام کی بھی ضرورت تھی۔

”ڈھیٹ ہوں نا اس لیے ایک بار پھر مرنے سے بچ گئی ہوں۔“ بشری کے ہوتوں پر یاسیت بھری مسکراہٹ پھیلی۔

”شش..... ایسی فضول باتیں مت کرو۔ مریں تمہارے دشمن۔“ معاذ نے اسے ٹوکا۔

”دشمن کا مرنا بھی تو مجھے ہی قبول نہیں تھا نا اس لیے اس کے بے بس ہو جانے کے باوجود تمہیں اس کی موت کا پروانہ جاری نہ کرنے دیا۔“ وہ شاید باذل کو زعمہ رکھنے کے اپنے فیصلے پر پچھتا رہی تھی۔

”تم نے بالکل ٹھیک کیا تھا۔ وہ شخص اس لائق تھا بھی نہیں کہ اسے آسان موت دی جاتی۔“

”لیکن اس کے بچنے سے کئی لوگ موت کے منہ میں بھی تو چلے گئے۔ مجھے یاد ہے وہاں اس کے ٹھکانے پر بے تحاشا قاتل بمک ہو رہی تھی۔ وہاں گھسنے والے تم لوگ ہی تھے نا؟“ اس کے لہجے میں گہرا اضطراب تھا۔

اسے بہلاتے بہلاتے بے ساختگی میں ایک ایسی بات کہہ گیا تھا جس نے بشری کے زور و خساروں پر ایک ہل کے لیے گلال سا بکھیر دیا لیکن یہ بس ایک ہل ہی تھا جس سے وہ غیر معمولی لڑکی بہت تیزی سے باہر نکل آئی اور ہنس کر بولی۔

”مجھ سے غیر سائنسی اور غیر منطقی باتیں نہ کرو۔ دنیا کا کوئی بھی نارمل انسان کئی گھنٹوں تک پلکیں جھپکائے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

”کہنے میں کیا حرج ہے۔“ اس نے بھی جواباً بے پروائی سے شانے جھٹکے لیکن حقیقتاً اندر سے وہ اتنا بے پروا نہیں تھا۔ بشری پر گزرنے والا کمزور لمحہ اس کی تیز نظروں کی گرفت میں بھی آیا تھا اور وہ اندر ہی اندر ہل کر رہ گیا تھا کہ اس کے پاس، اس کے اتنے قیمتی جذبے کی پذیرائی کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ وہ تو اتنی مہلت کو بھی غنیمت جان رہا تھا کہ اسے اس کی تیمارداری کا تھوڑا سا موقع مل گیا تھا۔

”حرج ہے پیارے دوست! تم جانتے ہو کہ میں حق گوئی کی یادداشت میں اس حال کو پہنچی ہوں اور مجھے جھوٹ بالکل پسند نہیں۔“ اسے اب بولنے میں ٹھکن محسوس ہو رہی تھی لیکن ظاہر اس لیے نہیں کر رہی تھی کہ محاذ کا اپنے پاس ہونا اور باتیں کرنا اچھا لگ رہا تھا۔

”میں جھوٹ نہیں کہہ رہا ہوں۔ میرے لیے تم آج بھی وہی بشری ہو جو گزرے کل میں اپنے خوبصورت چہرے کے ساتھ تھیں۔ تم کل بھی میری دوست تھیں اور آج بھی بہترین دوست ہو۔ دوست کی دوستی سے مطلب ہوتا ہے، چہرے سے نہیں۔ میں دنیا میں جہاں بھی رہا، تمہاری اس قیمتی دوستی کو کبھی نہیں بھولوں گا۔ تم نے دوستی کے اس رشتے کو نبھاتے ہوئے اتنی زیادہ قربانیاں دی ہیں کہ میرا رُواں تمہارا قرض دار ہو گیا ہے اور میرے پاس اس قرض کو اتارنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔“ وہ بولتے بولتے خاصا جذبہ ہاتی ہو گیا تھا۔

”کیا فضول باتیں کر رہے ہو۔ دوستی میں بھی بھلا حساب کتاب ہوتا ہے؟ خبردار جو آئندہ بھی دوبارہ یہ بات کی۔“ بشری نے اسے ڈپٹا۔

”آئندہ پتا نہیں ایسا کوئی موقع ملے بھی یا نہیں۔“ وہ بے ساختگی میں کہہ گیا۔

”تم کہیں جارہے ہو؟“ بشری چونکی۔

”جانا تو ہے۔ تقدیر نے میرے لیے جو راہ مقرر کر دی ہے، اس پر چلنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔“ وہ جیسے کہیں خلا میں دیکھ رہا تھا۔

”وہ لالہ کے آدمی تھے جن کا بروقت وہاں پہنچنا تمہاری جان بچنے کا سبب بن گیا۔“ اس نے دانستہ اس جملے میں وکی کے زخمی ہونے کا ذکر نہیں کیا۔ اسے اندازہ تھا کہ یہ خبر بشری جیسی حساس لڑکی کے اعصاب کے لیے بوجھ ثابت ہوگی۔

”اور باذل..... وہ پکڑا گیا یا وہاں سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا؟“ باذل کے متعلق سوال کرتے ہوئے اس کے لہجے میں خدشات بول رہے تھے۔

”وہ اس وقت تو بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن رب کی لائمی سے کب تک بچ کر بھاگتا۔ ایک نہ ایک دن تو اسے اس لائمی کی زد میں آنا ہی تھا۔“

”میں سمجھی نہیں۔“ بشری اس کے جواب سے کوئی حتمی نتیجہ اخذ نہیں کر سکی۔

”وہ اس وقت مُردوں سے بھی بدتر حالت میں اسی اسپتال میں موجود ہے۔“ محاذ اسے مختصر حالات سے آگاہ کرنے لگا۔

”ڈاکٹرز کے مطابق ریڑھ کی ہڈی میں لگنے والی گولی نے اس کا جسم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مفلوج کر دیا ہے۔ اسی طرح اس کے جڑے جس انجان ہتھیار کی زد میں آئے ہیں، اس نے جڑوں کے ساتھ ساتھ اس کی زبان کو بھی ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے اور اس بات کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے کہ وہ زندہ بچ بھی جائے تو کچھ بول سکے۔“ وہ ڈاکٹر سے حاصل ہونے والی اطلاعات اسے فراہم کر رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے خود بخود آنسو امدتے چلے جا رہے تھے۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک دن قدرت خود ظالم کو گھیر کر اس طرح بے بس کر دے گی۔

”تم کیوں روتی ہو؟ اب رونے کے دن گزر گئے۔ اب تو تم آرام سے بیٹھ کر خالوں کا انجام دیکھنا۔ یقین کرو، تمہارے ساتھ بُرا کرنے والے سے حساب لینے میں قدرت نے کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ باذل کا چہرہ اتنا بھیاںک ہو گیا ہے کہ ایک کے بعد دوسری نگاہ ڈالنا مشکل ہے۔ ایسا لگتا ہے اس کے اندر کی ساری بد صورتی اس کے چہرے پر آگئی ہو۔“

”چہرہ تو میرا بھی بد صورت ہو گیا ہے۔“ بشری کے کہے ایک جملے نے اس کی جوش سے چلتی زبان کو ہل بھر کے لیے ٹنگ کر دیا لیکن پھر وہ سنبھل گیا اور مسکرا کر محبت سے بولا۔

”مجھے تو تمہارا چہرہ بالکل بھی بد صورت نہیں لگتا۔ دیکھو، میں اتنی دیر سے اس چہرے کو مستقل دیکھ رہا ہوں اور یقین کرو ساری زندگی پلکیں جھپکائے بغیر آرام سے دیکھ سکتا ہوں۔“ وہ

”کاش میں تمہارا ساتھ دے سکتی لیکن اس ٹوٹے پھوٹے وجود کے ساتھ تو میں بس ایک بوجھ ہی ہوں۔“ وہ سمجھدار تھی کہ ”کہاں“ کا سوال نہیں اٹھایا تھا اور صرف اپنی حسرت بیان کی تھی۔

”تم مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھنا۔ میرے لیے یہ ساتھ بھی بہت ہوگا۔“ معاذ نے اس کی دلجوئی کی۔

”صرف تم ہی تو رہ گئے ہو دنیا میں جس کے لیے دل کی گہرائیوں سے دعا کروں۔ تمہیں بھلا میں اپنی دعاؤں میں کیسے بھول سکتی ہوں۔“ کیا کیا نہیں تھا اس کے اس ایک جملے میں۔ معاذ نے اس کی ساری حسرتیں، غم، بے بسی اور ان کبھی محبت کی تکلیف کو اپنے دل پر محسوس کیا لیکن وہ اس کے لیے کر ہی کیا سکتا تھا۔ وہ تو خود حالات اور تقدیر کے آگے بالکل بے بس تھا۔

”آپ ابھی تک یہیں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے تو آپ کو بس تھوڑی دیر ملاقات کی اجازت دی تھی۔“ ڈیوٹی نرس جو کسی کام سے باہر گئی تھی اور واپسی میں تاخیر کا شکار ہو گئی تھی، معاذ کو ابھی تک وہاں موجود پا کر ناراضی کا اظہار کرنے لگی۔ وہ کب اندر آئی تھی، اپنی باتوں میں مگن ان دونوں کو پتا ہی نہیں چل سکتا تھا۔

”سوری سسر! میں بس جا رہا ہوں۔“ اس نے جلدی سے معذرت کی اور بشریٰ کو ہاتھ کے اشارے سے ”بائے“ کرتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا۔ حقیقتاً نرس کی اس وقت آمد اس کے لیے ایک نعمت ثابت ہوئی تھی اور وہ ایک بے بس کر دینے والے لمحے کی زد سے بچ کر نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن نہیں جانتا تھا کہ ایک دریا سے گزرنے کے بعد ایک اور دریا کا سامنا کرنا باقی ہے۔

وہ کسی کا سامنا نہ کرنے اور کچھ دیر تنہا رہنے کے خیال سے بشریٰ کے پاس سے اپنے ساتھیوں کے درمیان واپس نہیں گیا تھا۔ دل میں یہی خیال تھا کہ کچھ دیر اسپتال کے قریبی پارک میں گزار کر خود کو مجتمع کرے گا اور اس کرب سے نکلنے کی کوشش کرے گا جو بشریٰ کی تباہ ہو جانے والی زندگی نے اس کے اندر بھر دیا تھا۔ مگر صدمہ ہی اس کیفیت میں وہ شاید اپنے ارد گرد ٹھیک سے دیکھ بھی نہیں پارہا تھا جو سامنے سے آتے اس شخص سے ٹکرا گیا تھا۔

”آئی ایم سوری! میں ذرا بے دھیانی میں تھا تو.....“ اس نے فوراً ہی تسلیم کر لیا تھا کہ غلطی اسی کی ہے اس لیے اس شخص سے معذرت خواہ ہوا تھا لیکن اس شخص کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اس کے الفاظ نے ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

”اُس اوکے۔ غلطی میری بھی ہے۔ جلدی میں ہونے کے باعث میں بھی آپ کو نہیں دیکھ سکا تھا۔“ اس شخص نے اس کی طرف ڈھنگ سے دیکھا بھی نہیں تھا اور ہاتھ میں موجود اس فائل کو سنبھالنے لگا تھا جس کے اندر موجود صفحات نگر سے بے ترتیب ہو کر باہر نکلنے کو تھے۔

”فراز.....!“ اس نے خود ہی اسے پکارا تو وہ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”کیا مجھے پہچانا نہیں؟“

”پہچان گیا پارا! لیکن تم بہت بدل گئے ہو اور پہلی نظر میں پہچان میں ہی نہیں آرہے۔“ فراز نے یہ الفاظ اسے گلے لگاتے ہوئے ادا کیے تھے۔

”حالات کا کمال ہے سارا۔“ وہ ادا اس سا مسکرایا۔

”جو بھی ہے، تمہیں دیکھ کر خوشی ہوئی ورنہ جس طرح سے تم منظر سے غائب تھے، دل میں وہم آتا تھا کہ جانے ہم دوبارہ تمہیں دیکھ بھی سکیں گے یا نہیں۔“

”میں خود بھی اپنے پیاروں کی صورت کو ترس گیا تھا۔“ اس کے لہجے میں حزن تھا۔

”ماموں جان، سعد اور علیہ کی کوئی خبر.....؟“ فراز نے فوراً ان کی بابت پوچھا جو سب سے زیادہ اس کے اپنے تھے۔

”تفصیلات ہوتی رہیں گی، پہلے یہ بتاؤ کہ تم اسپتال میں کیا کر رہے ہو؟“ وہ اس سوال کے جواب میں سچ نہیں بول سکتا تھا اس لیے فراز کے سوال کو ٹال دیا۔

”ٹوبیہ کو چیک اپ کے لیے لایا تھا۔ کسی نے بتایا تھا کہ کراچی میں ایک بہت اچھے پلاسٹک سرجن ہیں جو خصوصیت سے تیزاب سے برن ہونے والے مریضوں کو دیکھتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ آج وہ اس وقت یہاں اوپن ڈی کرتے ہیں تو میں ٹوبیہ کو لے کر یہاں چلا آیا۔“ فراز نے بتایا تو اس کے دل کا بوجھ مزید بڑھ گیا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ٹوبیہ تیزاب گردی کے جس حادثے کا شکار ہوئی، اس کی بنیاد میں کہیں نہ کہیں اس کی اپنی ذات وجہ تھی۔

”کہاں ہے ٹوبیہ؟“ احساسِ عداوت نے اس کی آواز کو بے حد پست کر دیا تھا۔

”وہ وینٹک ایریا میں بیٹھی ہوئی ہے۔ اس کی فائل گاڑی میں ہی رہ گئی تھی تو میں وہ لینے گیا تھا۔ تم بتاؤ، تم یہاں اسپتال میں کیا کر رہے ہو؟“ فراز نے اس کی بابت استفسار کیا۔

”ایک دوست کی عیادت کے لیے آیا تھا۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔ فراز بلکہ پھپھو کی پوری ٹیلی ہی اس کے لیے قابلِ بھروسہ تھی لیکن تجربات نے اسے سکھایا تھا کہ کسی کا تم

سے کم جانتا ہی اس کے مفاد میں بہتر تھا۔ جو ہٹاؤ اقبہ حال تھا وہ اتنی مشکلات کا شکار تھا۔ اب بھی اس نے ہات بدل دی اور فراز کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

”چلو ثوبیہ کے پاس چلتے ہیں۔ وہ سوچ رہی ہوگی کہ بھائی فائل لینے کہیں لاہور تو نہیں چلے گئے ہیں۔“

”ہاں یار! تمہیں دیکھ کر میں ایسا حیران ہوا کہ اس کا خیال ہی ذہن سے نکل گیا۔ واقعی وہ میری راہ دیکھ رہی ہوگی۔“ فراز نے اپنے قدم آگے بڑھا دیے۔ معاذ اس کے ہم قدم تھا۔ ویٹنگ ایر یا میں کچھ اور لوگ بھی بیٹھے ہوئے تھے لیکن معاذ کی نظروں نے فوراً ہی ثوبیہ کو جالیا۔ اس نے اپنے بے مثال خوبصورت اور لمبے بالوں کو شاید جوڑے کی شکل میں لپیٹ رکھا تھا جو وہ اس کے سر پر موجود اسکارف میں سما گئے تھے اور ان کی معمولی سی جھلک بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کا چہرہ بھی عیس ماسک کے پیچھے چھپا ہوا تھا لیکن وہ اپنی خوبصورت روشن آنکھوں سے پہچانی جا رہی تھی۔ آنکھیں یقیناً فراز کی مختصر داخلی راستے پر ہی جمی ہوئی تھیں جب ہی اس نے فراز کے ساتھ آتے معاذ کو فوری طور پر دیکھ لیا۔ بڑی بڑی آنکھوں میں حیرت کا سمندر اٹھ آیا اور وہ بے اختیار ہی اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ فراز کے ساتھ چلتا معاذ اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

”معاذ..... معاذ! یہ تم ہو۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا۔“ ضبط کے باوجود آنسو آنکھوں سے ٹپک پڑے۔

”شاید تمہیں لگا کہ میں مرکب چکا ہوں۔“ اب وہ مسکراتا تھا تو مسکراہٹ میں حزن لازمی چھلکتا تھا۔

”بالکل نہیں۔“ ثوبیہ نے جلدی سے تردید کی۔

”تمہارے لیے تو میں بہت پُر امید تھی اور ڈھیروں دعا میں بھی کرتی تھی بلکہ سچ پوچھو تو ماموں جان، سعد اور علیہ کے لیے بھی ہر روز دعا کرتی ہوں۔ ان کی موت کی اطلاع کے باوجود میرے دل و دماغ نے کبھی انہیں مردہ تسلیم ہی نہیں کیا اور ہمیشہ یہی لگتا ہے کہ ایک دن اچانک وہ لوگ ہنستے مسکراتے میرے سامنے آ جائیں گے۔“

”ثوبیہ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔ مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے کہ ہمیں ان کی موت کی غلط خبر دی گئی ہے اور وہ لوگ اس دنیا میں ہی کہیں موجود ہیں۔ اسی لیے تو میں نے تم سے ان کی تعزیت کرنے کے بجائے ان سے متعلق کسی خبر کا پوچھا تھا۔“ فراز نے بھی بہن کا ساتھ دیا۔

”ان دعاؤں کو ہمیشہ جاری رکھنا میرے پیارا

دعا میں مجھے دھاتی ہیں اور ہم جن حالات میں گھر گئے ہیں، ان سے لگنے کے لیے مجھ ہی درکار ہے۔“ معاذ نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے ایسا جواب دیا جو ہم ضرور تھا لیکن اس میں مہوٹ شامل نہیں کیا گیا تھا۔ خود سے غلط لوگوں سے مہوٹ بولنا آسان ہوتا بھی نہیں ہے۔

”تم اپنے بارے میں تو کچھ بتاؤ کہ کیسے ہو، کہاں رہ رہے ہو اور ہم سے رابطہ کیوں نہیں کیا؟“ اب وہ تینوں کرسیوں پر براجمان ہو چکے تھے اور دھیمی آواز میں گفتگو کر رہے تھے۔ ڈاکٹر کے کمرے میں موجود مریض کے بعد ایک اور مریض کا نمبر تھا پھر ثوبیہ کی باری آتی۔

”کیسا ہوں، یہ تو تم دیکھ ہی رہی ہو۔ کہاں رہ رہا ہوں، اس کا جواب نہیں دے سکتا البتہ یہ بتا سکتا ہوں کہ تم لوگوں سے ملنے کیوں نہیں آیا۔“

”کیوں نہیں آئے؟“ سوال ایک سرگوشی کی صورت ثوبیہ کے لبوں پر آیا۔

”میری ذات سے میرے پیاروں کو بہت نقصان پہنچ چکا اس لیے اب میں سب کو اپنے سائے سے بھی دور رکھنا چاہتا ہوں۔“

”ایسا کیوں کہہ رہے ہو؟ ایسا مت سوچو معاذ!“ ثوبیہ کو یا تڑپ گئی۔

”وہ چہرہ جس پر پڑنے والی ہر نظر واپس پلٹنا بھول جاتی تھی، اسے اس سرجیکل ماسک کے پیچھے چھپا کر بیٹھی ہو پھر بھی ایسی باتیں کر رہی ہو۔“ معاذ کے اندر کی اذیت و ندامت اس کی زبان پر آ گئی۔ وہ دیکھ سکتا تھا کہ چہرے کا بیشتر حصہ ماسک میں چھپا ہونے کے باوجود دائیں جانب تکیہ کے نیچے سے اس کی کھال جھلکی ہوئی تھی اور یقیناً اس سے نیچے رخسار بھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ یہاں اس انتظار گاہ میں نہ بیٹھی ہوتی اور اس کا چہرہ ماسک کے پیچھے نہ چھپا ہوتا۔

”ہر شخص کو اپنی قسمت میں لکھی تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔ تم خواہو خود کو الزام نہ دو۔“ ثوبیہ نے اسے ٹوکا تو فراز نے بھی اس کا ساتھ دیا اور بولا۔

”ثوبی ٹھیک کہہ رہی ہے۔ ہمیں تم سے کوئی شکوہ نہیں ہے اس لیے بہتر ہے کہ تم بھی خود کو اس سب کے لیے ذمے دار نہ سمجھو۔“

”کیسے نہ سمجھوں؟ یہ سب مجھ سے ہی تو شروع ہوا تھا۔“ وہ خود اذیتی کا شکار ہو رہا تھا۔

”چلو مان لیا کہ تم سے شروع ہوا تھا لیکن اس میں تمہارا کوئی قصور تو نہیں ہے نا۔ تم کوئی آوارہ، بد معاش

لو کے تو نہیں تھے ناجواہنی باہر کی لڑائی گھر لے آئے تو ہم تم سے گلہ کریں۔ تم پر ایک آزمائش آئی ہے جس میں ہم بھی حصے دار بن گئے ہیں۔ کوئی بات نہیں، ہم ایک نیلی ہیں اور فیملی کو وقت پڑنے پر قربانی دینی پڑتی ہے۔“ فراز بہت سلجھا ہوا لڑکا تھا اور اس وقت اپنے رویے سے اس کا ثبوت بھی دے رہا تھا۔

”یہ تو تم لوگوں کی اعلیٰ طرفی ہے جو اس انداز میں سوچے ہو لیکن میرے دل پر اس بات کا بڑا بوجھ ہے کہ میری وجہ سے ثوبیہ کے ساتھ اتنا بُرا ہو گیا۔“ اس نے گویا ثوبیہ کی ماسک کے پیچھے چھپی بد صورتی کو اپنی نظروں سے کھوجا۔ بے عیب حسن کو داغ لگ چکا تھا اور وہ جانتا تھا کہ گزرے کل میں جس لڑکی کے لیے رشتوں کی قطاریں لگی رہتی تھیں، اب مشکل ہی سے اسے کوئی ہم پلہ رشتہ مل سکے گا۔

”کچھ بُرا نہیں ہوا میرے ساتھ۔“ ثوبیہ نے ایک لمحے کی بھی تاخیر کے بغیر سخت لہجے میں اس کی بات کی تردید کی اور پھر قدرے ناراضی سے بولی۔

”تمہیں کیا لگتا ہے کہ کسی کی خوبصورتی کو داغ لگ جانے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی پوری زندگی خراب ہوگئی ہے۔ اگر کہیں ایسا ہوتا بھی ہے تو میرے معاملے میں ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں کل بھی ڈاکٹر بن کر اپنے لوگوں کی خدمت کرنا چاہتی تھی اور آج بھی اس مشن کے لیے پُر عزم ہوں۔“ اس کے لہجے کی مضبوطی معاذ کو حیران کر رہی تھی۔ یہ وہی لڑکی تھی جو اس کے نام سے چھیڑے جانے پر چھوٹی موٹی سی بن جاتی تھی اور اب اس کے لہجے میں پہاڑوں کا ساعزم تھا۔ ثوبیہ نے اس کی کیفیت کو بھانپ لیا اور بولی۔

”حیران نہ ہو۔۔۔ خدا جب کسی کو آزمائش سے گزارتا ہے تو اسے ہمت اور حوصلہ بھی دیتا ہے اور عمل کی نئی راہیں بھی دکھاتا ہے۔ میں نے بھی اس تکلیف سے گزر کر اپنے لیے ایک اہم فیصلہ کیا ہے۔“

”وہ کیا؟“ معاذ نے بے ساختگی سے پوچھا۔

”مجھے پلاسٹک سرجن بننا ہے اور ان لوگوں کو زندگی کی طرف واپس لانا ہے جو مایوسی کے اندھیروں میں ڈوب چکے ہیں۔“

”یہ تو بہت اچھا فیصلہ ہے۔“ معاذ نے اسے سراہا۔

”تمہیں نہیں معلوم معاذ کہ اپنے علاج کے لیے ہماگ دوڑ کرتے ہوئے میں کیسے کیسے لوگوں سے ملی ہوں۔ حادثات کا شکار ہونے والے ایک طرف، بہت بڑی تعداد تو

ان لوگوں کی ہے جو کسی دوسرے کی بھرمانہ ذہنیت، حسد اور انتقام کا نشانہ بن کر اس حال کو پہنچے ہیں۔ ان میں بھی بڑی تعداد عورتوں کی ہے۔ ان عورتوں کی جنہوں نے کسی ناپسندیدہ رشتے سے انکار کر دیا تھا، کسی عالم شوہر سے طلاق لیتا چاہتی تھیں، کسی آوارہ گرد کے منہ پر چھپر دے مارا تھا یا جس کے شوہر کے پاس اپنی مردانگی ثابت کرنے کا بس یہی طریقہ تھا کہ اپنے ساتھ بستی مظلوم عورت کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیں۔“ جوش سے بولتے ہوئے اس کی آواز قدرے بلند ہوئی تھی۔

”یہ فیمسٹ ہوگئی ہے یار! اور اب ہم کو آئے دن ایسی تقریریں سننی پڑتی ہیں۔“ فراز نے بظاہر بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے معاذ کو آگاہ کیا لیکن اس کے لہجے کی تہ میں چھپی شرارت کو معاذ محسوس کر سکتا تھا۔

”یہ جو بھی ہوگئی ہے، مجھے اسے دیکھ کر خوشی بھی ہوئی ہے اور یہ اطمینان بھی حاصل ہوا ہے کہ اب یہ جیمز کسی سہارے کے بھی بہت اچھی اور بامقصد زندگی گزار سکتی ہے۔“ اس کے لہجے میں ثوبیہ کے لیے گہری ستائش تھی۔

ثوبیہ نے اس ستائش کو ایک پُر وقار مسکراہٹ کے ساتھ قبول کیا اور فراز کے ہاتھ سے اپنی میڈیکل رپورٹس پر مشتمل فائل لے کر ڈاکٹر کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کا نمبر آچکا تھا۔

”اگر ہو سکے تو کسی دن گھر پر چکر لگانا۔ ای بہت یاد کرتی ہیں۔“ فراز بھی ڈاکٹر سے ملاقات کرنا چاہتا تھا لیکن معاذ سے الوداعی گفتگو بھی ضروری تھی۔

” وعدہ نہیں کر سکتا کہ عرصہ ہوا فیملے کا اختیار میرے ہاتھ سے نکل چکا ہے اور میں تقدیر کی لہروں کے ساتھ بہتا چلا جا رہا ہوں۔“ وہ کسی کو چھوٹی آس نہیں دلا سکتا تھا۔

”ہم تم سے کوئی شکایت نہیں کریں گے۔ ہاں، اتنا یاد رکھو کہ تمہارے لیے ہمارے گھر کے دروازے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔“ فراز نے اس سے کہا اور گرجوٹی سے اپنے ساتھ بھینچ لیا۔ اس کے وجود سے پھوٹی خلوص اور بے غرضی کی خوشبو نے معاذ کی روح کو مسح کر دیا۔ جب وہ وہاں سے نکلا تو خاصا پرسکون تھا اور یوں لگتا تھا کہ بہت سا بوجھ شانوں سے ہٹ چکا ہے۔

☆☆☆

ہال نما کمرے میں چیدہ چیدہ اخبارات اور میوزک میٹرز کے نمائندے اپنے اپنے کمرائمن کے ساتھ موجود تھے اور پُر تکلف چائے کے ساتھ آپس میں چہ میگوئیوں کا سلسلہ

کہ نوجوان کی آنکھوں کی اس رعونت کے پیچھے یہ زعم تھا کہ وہ حیات یزدانی کا بیٹا ہے۔۔۔۔۔ پیسے اور کچھ والے باپ کا اکلوتا بیٹا جو اپنے ایک اشارے پر دنیا کی ہر نعمت حاصل کر سکتا ہے لیکن ہوا یہ تھا کہ وہ عین جوانی میں اس نعمتوں بھری دنیا کو چھوڑ کر اپنی رعونت زدہ آنکھوں سمیت منوں مٹی تلے جا سو پاتا تھا اور حیات یزدانی کا اکلوتا بیٹا ہونے کا زعم اس کے کسی کام نہیں آیا تھا۔

”سر! وقت ہو گیا ہے اور سارے لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“ اس کے سیکریٹری نے آکر اطلاع دی تو اس نے چونک کر اسکرین پر سے نظریں ہٹائیں۔

”ہوں۔۔۔۔۔ آں۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے، آتا ہوں۔۔۔۔۔ میں آتا ہوں۔“ اس نے بٹن دبا کر موبائل کو آف کیا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔ دو چار قدم چل کر وہ تھوڑا سا ڈگمگایا۔

”آر یو اوکے سر؟“ سیکریٹری نے اسے تشویش زدہ نظروں سے دیکھا اور آگے بڑھ کر سہارا دینے کی کوشش کی لیکن یزدانی نے اسے روک دیا اور بڑبڑانے کے انداز میں بولا۔

”میں ٹھیک ہوں۔۔۔۔۔ بالکل ٹھیک اور باقی سب بھی ٹھیک کر دوں گا۔“ اپنی بات کہہ کر وہ رکنا نہیں اور قدموں کو گھسیٹتا ہوا اس ہال کمرے کی طرف بڑھا جہاں کئی صحافی اس کے خطر بیٹھے تھے۔ تشویش زدہ سا سیکریٹری بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ یزدانی کمرے میں داخل ہوا تو آپس میں خوش گپیاں کرتے صحافی گفتگو چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ یزدانی کسی کی طرف دیکھے بغیر اپنے لیے میز کے پیچھے رکھی گئی کرسی پر جا بیٹھا۔ اس کے عین سامنے میز پر مانگ سیٹ تھے۔ وہ کچھ دیر یونہی سر جھکائے بیٹھا رہا پھر یہاں سے وہاں تک ہال میں نظریں دوڑائیں۔

”ہم منتظر ہیں جناب!“ آخر کار کسی کا حوصلہ جواب دے گیا اور اس نے یزدانی کو اس کی خاموشی پر ٹوکا۔

”آپ سب کی آمد کا بہت شکریہ صاحبو! میں آپ بہت زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ بس کچھ اعترافات ہیں جو آپ کے روبرو کرنے ہیں اور کچھ قرض ہیں جن کا اتارنا بہت ضروری ہے۔“ اس نے بولنے کا آغاز کیا تو تمہیدی جملوں نے ہی سب کو سیدھا ہو کر بیٹھنے اور ہمتن گوش ہونے پر مجبور کر دیا۔

جاری تھا۔ سب اپنے اپنے طور پر اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے کہ مقتول عرفان اللہ کے قریبی ساتھی اور کاروباری شریک حیات یزدانی نے یہ اچانک پریس کانفرنس کس سلسلے میں بلوائی ہے۔ کچھ کا خیال تھا کہ یہ محض دوستی نبھانے کے لیے کی جانے والی ایک ایسی پریس کانفرنس ہے، جس میں حیات یزدانی اپنے دوست کے قتل کی مذمت کرتے ہوئے حکومتی اداروں سے قاتل کو کیفر کردار تک پہنچانے کا مطالبہ کیا جائے گا۔ کچھ کا اندازہ تھا کہ عرفان اللہ کی موت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے حیات یزدانی اس کے بزنس کو فیک اور کرنے کی کوشش کرے گا اور خود اس کے فلاحی ادارے کی باگ ڈور سنبھالنے کا اعلان کرنے کے ساتھ ساتھ شاید سیاست میں آنے کا بھی دھماکا کر دے۔ ان سب میں سے بیشتر کے خیال میں یزدانی کے لیے یہ سیاست کے میدان میں قدم رکھنے کا سنہری موقع تھا۔ وہ دوست کی موت کا فائدہ اٹھا کر لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کر سکتا تھا۔ پارٹی بھی اسے ہاتھوں ہاتھ لیتی کہ عرفان اللہ کے ورثہ میں کوئی ایسا فرد موجود نہیں تھا جو اس کے بعد اس کے کاروبار اور دیگر معاملات کو سنبھال سکتا۔ عملی طور پر سب کچھ یزدانی کے ہاتھ میں ہی آتا تھا چنانچہ پارٹی اس سے بھاری فائدہ حاصل کر سکتی تھی۔

ان اندازہ لگانے والوں میں محدودے چند افراد تھے جنہیں لگتا تھا کہ معاملہ ان اندازوں سے کچھ ہٹ کر ہے اور اس رائے کے پیچھے ان کی یہ دلیل تھی کہ اکلوتے بیٹے کی موت کے بعد یزدانی کسی بھی معاملے میں سرگرم نظر نہیں آیا تھا اور اس میں آدم بیزاری سی آگئی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے عرفان اللہ کے جنازے میں بھی بہت تھوڑی دیر کے لیے شرکت کی تھی۔ ایسے میں اس سے سیاست کے میدان میں قدم رکھنے جتنے بڑے عمل کی امید نہیں رکھی جاسکتی تھی۔

ان اندازہ قائم کرنے والوں سے بالکل الگ تھلک حیات یزدانی ایک قریبی کمرے میں موجود تھا اور اس کے سامنے اس کے موبائل کی اسکرین روشن تھی۔ دیکھنے والوں کو لگ رہا تھا کہ شاید وہ اپنی پریس کانفرنس کے اہم نکات دہرا رہا ہے لیکن ان کے اندازوں کے برخلاف وہ موبائل کی اسکرین پر چمکتی ایک تصویر کو نگے جا رہا تھا۔ خوشحالی بالوں کے ساتھ گوری رنگت والے اس نوجوان نے گلے میں سونے کی زنجیر پہن رکھی تھی اور وہ آنکھوں میں رعونت سی لیے کمرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ حیات یزدانی جانتا تھا

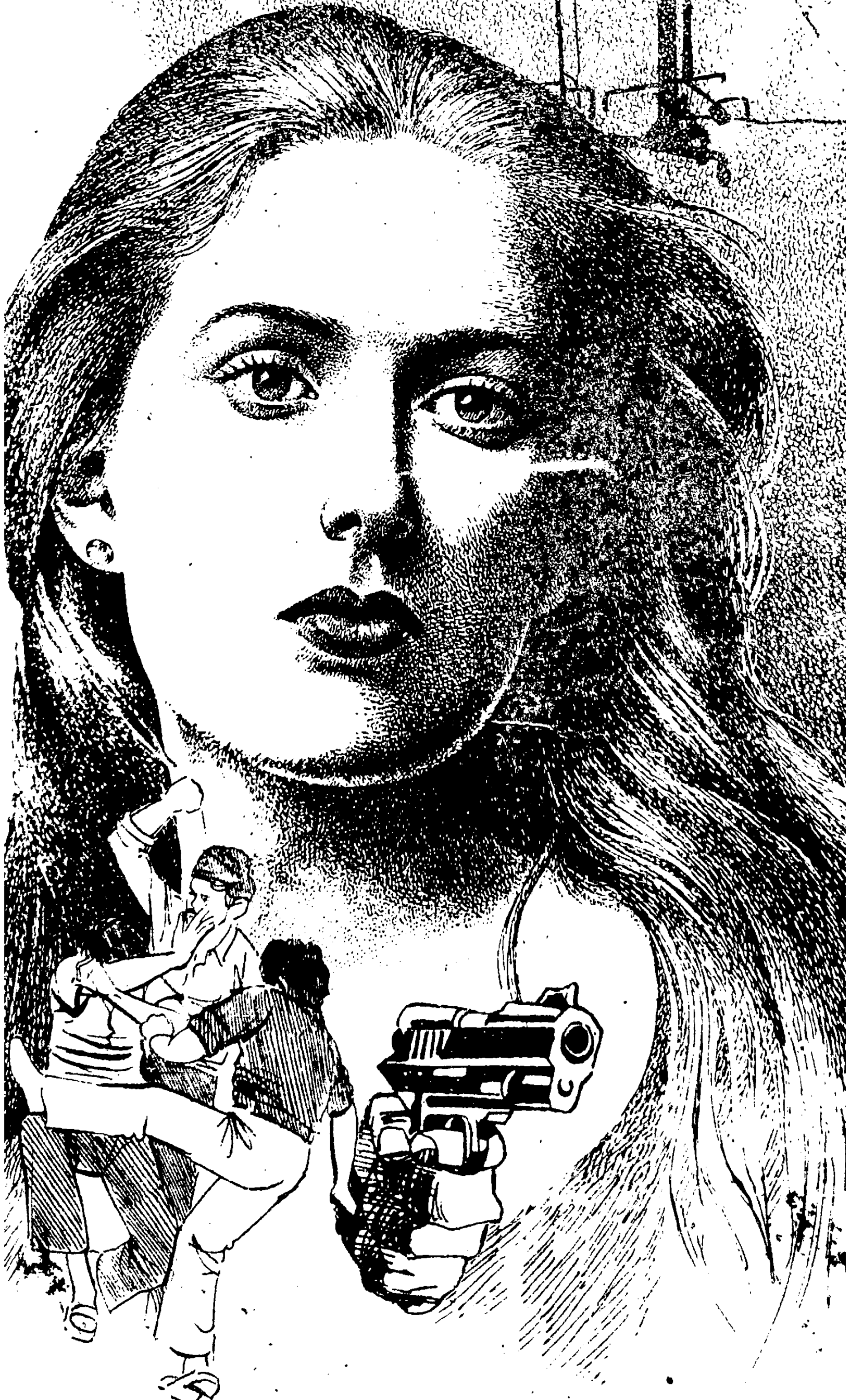
ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نوجوان
کسی داستان جو غلط کاروں کے لیے غضب
ناک تھا باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیے

قسط نمبر: 46



زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی بٹھنے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی فتنہ و تیز اندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابل شکست بنایا تو دوسری طرف ظالم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پُر عزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے جنائے جارہے تھے... اس کی زندگی جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قراریوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تار عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ پروار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ وارداتِ قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی...

پنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تحریر: **میرزا حسن**



معاذ ایک ذہین لیکن متکون مزاج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جوآن کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ انسٹی ٹیوٹ سے واپس آ رہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو مڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی نڈر فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشری نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بشری ماس کمیونی کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم و فیور لکھتی ہے۔ اس ویران جگہ بھی وہ ایک زیر تعمیر رہائشی منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی آئی تھی۔ معاذ بشری کو یہ حفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کر دیتا ہے لیکن جن رئیس زادوں سے اس نے ان کا شکار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ایک دن جنگل کی سیر کے دوران وہ فوٹو گرافی کے شوق میں سب سے الگ تھلک ہو جانے والے معاذ کو بے خبری میں گھیر کر بری طرح زد و کوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دے دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس نہ آنے پر انتظامیہ کے افراد، پولیس اور ریسکیو ذرائع کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جوگی کی جھونپڑی میں پاتا ہے۔ جوگی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے، جوگی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نواز کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے پراسرار علم سکھانے کی ہامی بھر لیتا ہے اور معاذ اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ادھر جائے وقوعہ سے ملنے والے معاذ کے کمرے سے جب تصویریں نکلوائی جاتی ہیں تو ایک ایسی تصویر بشری کی نظر میں آ جاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پروجیکٹ کے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشری تحقیق کر رہی تھی۔ بشری کے اپنے والد جرنلسٹ ہوتے ہیں۔ اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشری کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ مدد سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باذل نامی غنڈے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشری انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دنوں میں ہی معاذ واپسی کا ارادہ کرتا ہے تاہم ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا عرفان اللہ اور یزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو وقاص نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باذل اچانک بشری کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر دیتا ہے۔ معاذ کو واپس لانے کے لیے اوچھے، خشکندے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اسے واپس آنے کا پیغام دیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کر کے اسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات کے نہ بتانے پر اس کے بھائی کا ایک گروہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشری بھی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہو جاتی ہے۔ معاذ کے دوست عالم شاہ کے بہنوئی کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ کئی فنون میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے پہناتا کر کے اس کے دماغ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ فیضو سے حاصل انوکھے علم کی بدولت ان کا معمول نہیں بننا۔ عالم شاہ اور اس کا نوکر سرد، باذل کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ عالم شاہ، باذل کی قید میں موجود ایک زخمی شخص کی مدد سے وہاں سے فرار ہو جاتا ہے۔ ادھر بشری دہلی پہنچ جاتی ہے۔ وہاں وقاص اسے ہاربی کے روپ میں پہچان لیتا ہے۔ وہ سلطان کو مارنا چاہتی ہے تاہم وقاص اسے ایسا کرنے سے روکتا ہے۔ ادھر عالم شاہ، باذل کی قید سے نکل کر اس کا چچا کرتا ہے۔ وہ وہاں معاذ کو دیکھتا ہے۔ معاذ کو اس کے گھر والوں سے ملنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ وہ ایک مشن پر سونیا کے ساتھ انڈیا روانہ ہوتا ہے تاہم کچھ لوگ سکھ یا تریوں سے بھری بس کو یرغمال بنا لیتے ہیں۔ معاذ اور سونیا نہ خانے کے تمام افراد کو کھانے لگا دیتے ہیں۔ عالم شاہ، بکل اور سرد انڈیا روانہ ہو جاتے ہیں۔ اتر پورٹ سے گھر روانگی پر راستے میں کچھ لٹیرے انہیں لوٹ لیتے ہیں۔ گھر پہنچنے پر پولیس کی ریڈ ہوتی ہے اور وہ عالم شاہ اور سرد کو لے جاتے ہیں۔ ادھر بشری اور وقاص باذل کو اسپتال میں مارنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ نفعی جاتا ہے۔ معاذ اور سونیا اپنے سہولت کاروں سے مل جاتے ہیں۔ عالم شاہ اور سرد کو تشدد کا نشانہ بنا کر دیرانے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ واپس اپنے میزبانوں کے ہاں پہنچ جاتے ہیں۔ انہیں پتا لگتا ہے کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں اجالا اور اس کا عاشق شامل ہوتے ہیں۔ وہ چھپ کر ان کی باتیں سن رہا ہوتا ہے کہ اسے چھاپ لیا جاتا ہے۔ تاہم وہاں مارا ماری ہوتی ہے اور اجالا کا عاشق مارا جاتا ہے۔ پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ ان کے کزن انہیں اپنے دوسرے خفیہ ہنگامے پر پہنچا دیتے ہیں۔ وہ وہاں سے بحفاظت نکل جاتے ہیں۔ ادھر معاذ ایک مشن میں زخمی ہو جاتا ہے اور اسے ہندو سا دھواہنی کیا میں لے جاتا ہے جہاں اس کی اچھی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ سونیا کے آدمی معاذ کو تلاش کرتے ہیں مگر ناکام ہو جاتے ہیں۔ ادھر عالم شاہ اور سرد خفیہ ذریعے سے ہارڈ پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ دھریے جاتے ہیں اور "زا" کی قید میں پہنچ جاتے ہیں۔ بشری باذل کو مارنے کی کوشش میں خود نشانہ بن جاتی ہے۔ معاذ سا دھو کی مدد سے ایک انڈین ہیروئن کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ وہیں اسے عالم اور

سردی گرفتاری کا پتا چلتا ہے۔ معاذ ڈاکٹر فردوس سے ملتا ہے اور اسے سبیل کی مدد کرنے کا کہتا ہے۔ علینہ اور وقاص وغیرہ کو لالہ عیسیٰ ملک سے باہر نکال دیتا ہے اور ہر ممکن احتیاط کی ہدایت کرتا ہے لیکن علینہ پاکستان میں ٹوبہ سے رابطہ کرتی ہے جو ان کے لیے مصیبت بن جاتا ہے۔ ٹوبہ پر تیزاب پھینک دیا جاتا ہے۔ وقاص، علینہ اور اس کے گھر والوں کو مار دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس معاذ کو دیوانی شخص سے مدد لینے کا کہتی ہے۔ معاذ اپنے کزن کو پاکستان کال کرتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ اس کے گھر والوں کو مار دیا گیا ہے۔ وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کی ٹھان لیتا ہے۔ ادھر ڈاکٹر فردوس کو اس کے سسرال والے سبیل کو بھگانے کی یادداشت میں تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ معاذ، عالم اور سردی رہائی کے لیے کارروائی کرتا ہے اور انہیں ”را“ کی قید سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن عالم اور سردی کو دیوانہ کے آدمی کی دوسری جگہ پہنچا دیتے ہیں۔ سونیا معاذ کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ ادھر باذل ایک جگہ لالہ عیسیٰ کی موجودگی پر کارروائی کرتا ہے تاہم لالہ خود کو گولی مار کر ختم کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس کا انتقال ہو جاتا ہے۔ دیوانہ ڈاکٹر فردوس کی میت اٹھنے پر وہاں فائرنگ کر دیتے ہیں۔ پولیس دیوانہ کو گھیر لیتی ہے۔ معاذ دیوانہ اور اس کے آدمیوں کو نکالنے کے عوض عالم کا پتا معلوم کر لیتا ہے۔ سونیا اور معاذ حیدر آباد نواب بدرالدین کی حویلی پہنچ جاتے ہیں۔ تاہم کالے خان اور رادھا دیوی کو میڈم ایکس کے شکنجے سے چھڑانے کے لیے انہیں واپس آنا پڑتا ہے، کالے خان کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ نواب صاحب کی حویلی میں عالم اور سردی رہائی کے لیے کارروائی کر کے انہیں رہا کر لیتا ہے۔ وہ لوگ نئے ٹھکانے پر پہنچتے ہیں تو وہاں معاذ سے ملنے جا روٹا میٹھی آتا ہے۔ اسے معاذ نے ”را“ کی قید سے نکالا ہوتا ہے۔ جا رو اور معاذ، سبیل سمیت اسپتال جاتے ہیں اور پہچان لیے جانے پر پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ پولیس سے مقابلے کے بعد وہ ایک بستی میں پناہ کے لیے گھس جاتے ہیں اور دو لوگوں کو یرغمال بنا کر ان کی جھونپڑی میں قیام کرتے ہیں۔ ادھر سونیا معاذ کی تلاش میں نکلتی ہے اور اسے بستی میں پہنچنے پر معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ معاذ اور جا رو وغیرہ انوپ نامی شخص کے ساتھ اس کے مالک کے بنگلے میں قیام کرتے ہیں۔ سونیا بھی معلومات حاصل کرنی ہوئی مذکورہ بنگلے تک پہنچ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور سردی بھی سونیا کا پیچھا کرتے ہوئے وہیں پہنچ جاتے ہیں۔ ادھر وقاص، علینہ و دیگر لوگ زندہ ہوتے ہیں۔ وقاص حلیہ بدل کر گلوکا باڈی گارڈ بن جاتا ہے۔ وہ معاذ کو تلاش کرنے کے لیے انڈیا روانہ ہوتا ہے۔ وہاں اس کی گل خان سے ملاقات ہوتی ہے اور معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ سونیا، معاذ اور دیگر ساتھیوں سے مل جاتی ہے تاہم وہ جس بنگلے میں ہوتے ہیں وہ دشمن کا ہوتا ہے۔ دشمن سب کو بے ہوش کر کے کہیں لے جا رہے ہوتے ہیں کہ ان کی گاڑی کو حادثہ پیش آ جاتا ہے۔ ان سب کو جینی بھکشو طبی امداد دیتے ہیں اور ان سے پوچھ گچھ کی جاتی ہے۔ سبیل کی حالت تشویشناک ہوتی ہے اور اسے وہاں موجود ایک دیدہ دیکھتا ہے۔ ادھر لالہ واپس اپنے لوگوں میں پہنچ کر ایکشن میں آ جاتا ہے۔ باذل، معاذ وغیرہ کے ٹھکانے سے باخبر ہو جاتا ہے۔ ادھر لالہ کے آدمی میڈم ایکس کی نگرانی کے چکر میں مارے جاتے ہیں۔ لالہ اپنے آدمیوں کو انڈیا گراؤنڈ کر دیتا ہے۔ باذل، معاذ کا پیچھا کرتا ہے اور جینیوں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ معاذ جینیوں کے ساتھ مل کر دشمنوں کے خلاف کارروائی کرتا ہے۔ اس دوران اسے گل خان نظر آتا ہے۔ اسے پہنا ٹائر کیا گیا تھا۔ وہ لالہ نامی عورت کو بھی گرفت میں لے لیتے ہیں اور اسی سے معلومات لیتے ہیں۔ ادھر لالہ عیسیٰ، اعظم کو دشمن کی گرفت سے نکالنے کے لیے کارروائی کر دیتا ہے اور موسیٰ اور نیلی، اعظم کو نکالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ معاذ دشمنوں کے کیمپ پر حملہ کر کے وہاں قبضہ کر لیتا ہے۔ موسیٰ اور نیلی کی گاڑی پر حملہ ہوتا ہے تاہم مارا ماری کے بعد وہ صداقت شاہ کے پاس پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ لالہ عیسیٰ صداقت شاہ کو حویلی پر ریڈ کا بتاتا ہے۔ صداقت شاہ اعظم کے محفوظ ٹھکانے کے لیے قربان شاہ کو فون کرتے ہیں۔ اعظم کو وہاں سے نکال لیا جاتا ہے اور دوسری جگہ منتقل کر دیا جاتا ہے۔ ادھر معاذ بھنگ پہنچ جاتا ہے اور وہاں کے کرتا دھرتاؤں سے بات کر کے پاکستان پہنچنے کی اجازت چاہتا ہے۔ ادھر موسیٰ اور نیلی کو پولیس گھیر لیتی ہے اور فائرنگ میں موسیٰ مارا جاتا ہے۔ وہ اعظم کو لے جاتے ہیں اور نیلی زخمی حالت میں ان کے قبضے میں آ جاتی ہے۔ معاذ اور وہاں پہنچ جاتے ہیں اور اعظم کی بازیابی کے لیے منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ موسیٰ کی تدفین ہو جاتی ہے۔ ادھر باذل، لالہ کی قید سے نکال دیتا ہے۔ معاذ، ڈی ایس پی ظہیر کے بنگلے پر دھاوا بولتا ہے اور ڈی ایس پی کو قابو کرنے کے بعد ان سے معلومات لیتا ہے۔ وہ لوگ ظہیر خان کو لے آتے ہیں۔ باذل قید سے نکل کر مہناز کے پاس پہنچتا ہے اور اسے تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ نیلی قید میں موجود ظہیر کو ٹھکانے لگا دیتا ہے۔ بشریٰ قبرستان جاتی ہے۔ وہاں اس کی دوست ملتی ہے۔ بشریٰ اپنی دوست کے ساتھ جا رہی ہوئی ہے کہ باذل کے آدمی اسے اغوا کر لیتے ہیں۔ اور معاذ سارے معاملوں کو جلد حل کرنے کے لیے دشمن کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے مگر اس کے خیر خواہ اسے میڈم ایکس کے شکنجے سے نکال لیتے ہیں اور اعظم کو بھی باز یاب کر لیتے ہیں۔ زن ہوا سے اپنے ساتھ لے جاتی ہے اور وہاں کرل سکندر بخت سے ملاقات ہوتی ہے۔ معاذ انہیں دشمنوں کے خلاف کارروائی کرنے کا کہتا ہے۔ باذل، بشریٰ کو لے کر انڈیا گراؤنڈ ہو جاتا ہے۔ ادھر وقاص باذل کا پتا چلانے کے لیے ایک کال گرل سی کے گھر کارروائی کرتا ہے۔ وہی اسے قابو کر کے اس کے تعاقب میں باذل کے ٹھکانے پہنچ جاتا ہے۔ وہاں وہی کے ساتھی اور کوئی اور گروپ حملہ کر دیتے ہیں۔ وہی زخمی ہو جاتا ہے۔ عرفان اللہ کو گولی مار دیتا ہے اور خود بھی شدید زخمی ہو جاتا ہے۔ باذل کے ساتھی اسے ایک اسپتال کے آگے چھوڑ دیتے ہیں۔ وہیں وہی اور بشریٰ بھی داخل ہوتے ہیں۔ معاذ باذل کو پہچان کر اسے بھی وہیں ایڈمٹ کر دیتا ہے۔ عرفان اللہ جاں بحق ہو جاتا ہے۔ عرفان اللہ کی سیکریٹری صوفیہ کو خفیہ ادارے کے لوگ اٹھا لیتے ہیں لیکن صوفیہ وہاں اپنی جان دے دیتی ہے۔ ادھر عرفان اللہ کا پارٹنر یزدانی پریس کانفرنس بلاتا ہے اور وہ کوئی انکشاف کرنے والا تھا۔

عرفان اللہ کا بزنس پارٹنریز دانی اہم پریس کانفرنس کر رہا تھا۔ وہاں موجود صحافی اس کے بولنے کے منتظر تھے۔
 ”آپ سب جانتے ہیں کہ میں اس شہر کا ایک جانا مانا بلڈر ہونے کے ساتھ ساتھ دیگر بھی کئی طرح کے کاروبار میں ملوث ہوں۔ ان میں اکثریت میں میری عرفان اللہ کے ساتھ سانچے داری بھی ہے اور ماضی میں ہم آپس کے مشوروں اور تجاویز سے کاروبار کو مسلسل وسعت دیتے رہے ہیں لیکن اب صورت حال یہ ہے کہ میرا اکلوتا بیٹا فوت ہو چکا ہے اور میرے بعد اس وسیع کاروبار کو سنبھالنے کے لیے کوئی موجود نہیں ہے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ عرفان اللہ کے ساتھ بھی ہے۔ ان کا بیٹا سلطان لندن میں زیر علاج ہے اور اب تک اس کی صحت یابی کے سلسلے میں کوئی زیادہ امید نہیں بندھی ہے۔ ہو سکتا ہے اسے دوبارہ اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کے لیے ایک طویل عرصہ لگ جائے یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کبھی کھڑا ہی نہ ہو سکے۔“

”کیا آپ کوئی ٹرسٹ قائم کرنے کا سوچ رہے ہیں سر؟“ ایک غلت پسند صحافی نے اپنے قائم کردہ اندازے کے مطابق غلت میں سوال داغا۔ اس کی اس حرکت پر باقیوں نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔ سوال جواب سلسلہ پریس کانفرنس کے اختتام پر سب سے آخر میں طے تھا۔
 ”اپنے اکلوتے بیٹے کی موت کے بعد مجھے اس دنیا کی بے بٹائی کا بہت شدت سے احساس ہوا ہے اور میں نے کچھ اہم فیصلے کیے ہیں جن سے آگاہ کرنے کے لیے میں نے آج آپ کو دعوت دی ہے۔“ صحافی کی مداخلت کا اثر نیچے بغیریز دانی نے اپنی بات کو جاری رکھا۔

”میرا سب سے پہلا فیصلہ تو یہ ہے کہ عرفان اللہ کے جس جس کاروبار میں میری پارٹنرشپ ہے، میں اس سے اپنے شیئرز الگ کر رہا ہوں۔ اس سلسلے میں بہت جلد میرا وکیل کارروائی شروع کر دے گا۔“ اس کا پہلا ہی اعلان چونکا دینے والا تھا۔ سوچنے والے سوچ رہے تھے، کہ وہ عرفان اللہ کے پورے کاروبار پر قبضہ کر لے گا لیکن وہ تو اپنا راستہ ہی الگ کر رہا تھا جس کے نتیجے میں عرفان اللہ کے کاروبار کو شدید دھچکا لگا اور یقیناً اس کی بیوہ کے بس میں نہیں ہوتا کہ وہ اس دھچکے سے سنبھل کر کاروبار کو سنبھال سکے۔

”میرے اس فیصلے کو خود غرضی پر محمول نہ سمجھا جائے۔ اصل بات یہ ہے کہ میں ان سارے منصوبوں سے آزاد ہونا چاہتا ہوں اور یقیناً عرفان اللہ کی بیوہ بھی بزنس سنبھالنے کی اہلیت نہیں رکھتی ہیں تو ان کے لیے بہتر یہی ہوگا کہ اپنے

شیئرز فروخت کر کے سکون سے زندگی گزاریں لیکن بہر حال یہ صرف ایک مشورہ ہے اور اصل فیصلہ وہ اپنی صوابدید پر کرنے کا حق رکھتی ہیں۔“ اس کی اگلی بات نے لوگوں کے ذہنوں میں اٹھنے والے سوالوں کے جواب دے دیے۔

”میرا دوسرا فیصلہ یز دانی ہاؤسنگ سوسائٹی سے متعلق ہے۔ میری عدم توجہ کے باعث یہ پروجیکٹ ادھورا پڑا ہے اور لوگوں کو پریشانی کا سامنا ہے اس لیے میں نے یہ پروجیکٹ بہت اچھی شہرت کے حامل بلڈر فاروق منی تال والا کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس تبدیلی سے لوگوں کو کوئی فرق نہیں پڑے گا اور بنگ کے وقت طے شدہ شرائط کے مطابق ہی نہ صرف انہیں ان کے گھر تیار کر کے دیے جائیں گے بلکہ ان تعمیراتی خامیوں اور نقائص کو بھی حتی الامکان دور کیا جائے گا جن کے سلسلے میں لوگوں میں شکایت اور تشویش پائی جاتی ہے۔“ یہ ایک اور چونکا دینے والا اعلان تھا۔ اس اعلان کے نتیجے میں وہ بالواسطہ اعتراف کر رہا تھا کہ ماضی میں بشری گزار اس پر جو الزامات عائد کرتی رہی، وہ غلط نہیں تھے اور واقعی پروجیکٹ میں نقائص پائے جاتے تھے۔

”میں نے تیسرا فیصلہ اپنی جائداد کے حوالے سے کیا ہے۔ رہائشی مکان، ایک عدد گاڑی، ذاتی استعمال کے زیورات اور ایک فکسڈ ڈپازٹ رقم اپنی بیگم کی گزر اوقات کے لیے مخصوص کر کے میں اپنے سارے اثاثہ جات سرکار کے حوالے کر رہا ہوں تاکہ مجھ سے جو بھی کمی کوتاہی ہوئی ہے، اس کا ازالہ ہو سکے اور یہ رقم میرے وطن اور ہم وطنوں کی ترقی کے لیے استعمال ہو۔“ اس تیسرے اعلان نے لوگوں کو سچ سچ یقین دلادیا کہ حیات یز دانی دنیا تیار گئے والا ہے۔

”سب سے آخر میں، میں یہ اعتراف کرتا ہوں کہ دولت کی ہوس میں، میں نے کئی ایسے ناجائز کام کیے ہیں جن سے عام فرد کو مالی نقصان پہنچنے کے ساتھ ساتھ ملکی سلامتی کو بھی شدید نقصان پہنچا ہے۔ مکافات عمل کا آغاز اکلوتے بیٹے کی ناگہانی موت سے ہو ہی چکا ہے چنانچہ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ قدرت کے انتقام کے ساتھ ساتھ دنیاوی عدالت سے بھی اپنے جرائم کی سزا پا لوں۔ اسی مقصد کے تحت میں آج میڈیا کے سامنے اپنی گرفتاری پیش کر رہا ہوں۔“ کہنے کے ساتھ ہی اس نے اپنا رخ داخلی دروازے کی طرف موڑا اور بلند آواز میں بولا۔

”اعذر تشریف لے آئیں ڈی ایس پی صاحب! آپ کا مجرم گرفتاری پیش کرنے کے لیے تیار ہے۔“

فوراً ہی دروازہ کھلا اور پولیس کی وردی میں چند افراد اندر داخل ہوئے۔ ایک دم سے ہال مچھلی بازار بن گیا۔ حسب وعدہ سوالات کا سیشن نہیں ہوا تھا اور صحافیوں کو اپنے بہت سے سوالات کے جواب درکار تھے۔ خصوصاً وہ ان جرائم کے بارے میں جاننا چاہتے تھے جن کی پاداش میں حیات یزدانی گرفتاری پیش کر رہا تھا لیکن حیات یزدانی کی طرف سے سیشن کے لیے یہ سوال کا جواب نہیں دیا گیا۔

”سرا کم از کم یہ تو بتادیں کہ جس طرح عرفان اللہ صاحب آپ کے بزنس پارٹنر تھے، کیا اسی طرح کرائم پارٹنر بھی تھے؟“ بہت سے سوالوں میں سے یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب دینا حیات یزدانی نے ضروری سمجھا اور پولیس والوں کے ساتھ جاتے جاتے رک کر بولا۔

”عرفان اللہ کا کردار اور اعمال دونوں اس کے ساتھ قبر میں دفن ہو چکے ہیں اس لیے میں اس بارے میں پبلک کے سامنے کسی قسم کا تبصرہ نہیں کروں گا البتہ ملکی مفاد اور سالمیت کے حوالے سے جو کچھ میرے علم میں ہے، اس سے قانون کو آگاہ کرنا میرا فرض ہے اور میں یہ فرض ضرور ادا کروں گا۔“

”یعنی عرفان اللہ صاحب ایسی سرگرمیوں میں ملوث رہے ہیں جو ملکی مفاد اور سالمیت کے لیے خطرہ تھے؟“ وہ صحافی تھے، ہال کی کمال اتارنا جن کی ٹھٹی میں شامل ہوتا ہے اس لیے فوراً ہی ان کی بات سے نتیجہ اخذ کیا گیا۔

”لوگمنٹ۔“ حیات یزدانی نے اپنے ہونٹوں پر مہر لگالی۔ اب یہ زبان صرف وہیں گئی جہاں کھٹے کا کوئی نتیجہ نکلا۔ حوام کو نمبروں، تجزیوں کے لیے ایک موضوع دے دینے سے کچھ حاصل وصول ہونے والا نہیں تھا۔

☆☆☆

”آج تو تم بہت بہتر لگ رہی ہو۔“ معاذ نے اپنے سامنے ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی بشریٰ کو دیکھتے ہوئے تبصرہ کیا۔ وہ اسپتال سے گھر منتقل ہو چکی تھی اور لالہ بیسی کی درہائش گاہ پر ہی مقیم تھی۔ معاذ کا البتہ آنا جانا لگا رہتا تھا اور کچھ معلوم نہ ہوتا تھا کہ وہ کس وقت کہاں موجود ہے۔

”الحمد للہ! میں بالکل ٹھیک ہوں لیکن تم بتاؤ کہ تم کن ہواؤں میں اڑے پھرتے ہو؟“ بشریٰ نے اس کی طرف ہاف فرائی انڈے کی پلیٹ بڑھاتے ہوئے جواب کے ساتھ ہی سوال داغا۔

”میں ناشتا کر چکا ہوں، بس ایک کپ چائے پیوں گا۔“ معاذ نے ہاتھ کے اشارے سے روکا اور اپنی خواہش

ظاہر کی۔

”کون ہے بھی جو تمہیں یوں ناشتے، کھانے کھلا رہا ہے کہ تم دوستوں کی طرف رخ کرنا بھول جاتے ہو؟“ اس نے اپنے سوال کو نئے الفاظ پہنائے۔

”تم تو بالکل بیویوں کی طرح پوچھ گچھ کر رہی ہو۔“ معاذ اس کے انداز پر ہنس پڑا۔

”ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ بیالی میں چائے انڈیلتی بشریٰ نے ہاتھ ڈیرہ لپکا کپ کیا اور آنکھوں نے بیک وقت کئی رنگ بدل ڈالے۔ خجالت، حسرت، تڑپ..... بہت کچھ تھا ان رنگوں میں۔ معاذ کا دل دکھا لیکن وہ اس کے لیے کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا اس لیے بات بدل گیا۔

”میری چھوڑو، اپنی بتاؤ۔ مستقبل کے کیا ارادے ہیں تمہارے؟ جو کچھ بیٹنا تھا، بیت چکا۔ اب تمہیں آگے کی زندگی پلان کرنا ہوگی۔“

”مہناز سے بات ہوئی تھی میری۔ وہ میڈم تاجور کا پارلر چھوڑ کر اپنا ذاتی پارلر بناتی ہے۔ اس نے مجھے آفر کی ہے کہ میں پہلے کی طرح اس کے ساتھ اس کے پارٹمنٹ میں رہوں تاکہ وہ گھر کی فکر سے آزاد رہ کر اپنے کام پر فوکس کر سکے۔ بلے میں وہ مجھے میری تعلیم مکمل کرنے اور لکھنے لکھانے کے کام میں مکمل سپورٹ کرنے گی۔“ بشریٰ نے بھی خود پر تیزی سے قابو پالیا اور اسے مہناز کی پیشکش کے بارے میں آگاہ کیا۔

”بری پیشکش نہیں ہے لیکن تم چاہو تو کسی ہاسٹل میں بھی تمہاری رہائش کا انتظام ہو سکتا ہے۔ اخراجات کا کوئی مسئلہ نہیں، سب کچھ پیچھا ہو جائے گا۔“ چائے کا گھونٹ بھر رہے ہوئے اس نے بشریٰ کی بات غور سے سنی اور اسے ایک اور انتخاب کا موقع دیا۔

”نہیں، مجھے مہناز کی آفر اچھی لگی ہے۔ اپنے مسائل کی وجہ سے وہ ہاؤس کے جال میں پھنس کر مجبور ہو گئی تھی ورنہ خود ذاتی طور پر بری لڑکی نہیں ہے۔ سچ پوچھو تو اگر میں ہاؤس کی رسائی میں ہوتے ہوئے بھی اب تک زندہ رہی تو اس میں مہناز کا بہت ہاتھ تھا۔ میرا دل کہتا ہے کہ میں اس کی پیشکش قبول کر لوں۔“

”اگر دل کہتا ہے تو ضرور کر لو۔“ معاذ سکھایا۔

”کر لوں گی، ویسے بھی بچارے دل کا فرمانیں پوری کرنے کا موقع کم ہی ملتا ہے۔“ اس کی بات نے معاذ کی مسکراہٹ بجا دی۔

”وکی کا بتاؤ وہ کیسا ہے؟ دوبارہ اسے دیکھنے چلنے

کا موقع ہی نہ مل سکا۔“ اسے احساس ہوا کہ وہ ایسی بات کر کے معاذ کے ساتھ کچھ زیادتی کر گئی ہے اس لیے جلدی سے موضوع بدل دیا۔

”وہ بہت بہتر ہے۔ جلد ڈسچارج بھی ہو جائے گا۔ میں یہاں سے اسپتال ہی جاؤں گا۔ تم بھی میرے ساتھ چلو۔“ معاذ نے اسے پیشکش کی۔

”ٹھیک ہے۔ میں ناشتے کے بعد تیار ہو کر آتی ہوں۔ تمہیں ٹائم کا تو ایشیو نہیں ہے؟“ سوچی دیر انتظار کر لو گے میرا۔“

”بالکل کر لوں گا۔ تم ایسا رو کہ اطمینان سے ناشتا کر کے تیار ہو۔ میں اس دوران لالہ سے ملاقات کر لیتا ہوں۔“ معاذ نے اپنی پیالی سے آخری گھونٹ بھر اور لالہ سے ملاقات کے لیے اٹھ گیا۔ لالہ نے بہت خوش دلی سے اس کا استقبال کیا۔

”اب مجھے یہاں، اس سب کے درمیان نہیں رہنا ہے۔ میں جنت میں دن کاٹ کر آیا ہوں اور اب صرف اس انتظار میں ہوں کہ وہی سفر کے لائق ہو جائے تو اسے ساتھ لے کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس جنت میں فٹل ہو جاؤں۔“ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد لالہ نے اسے اپنے پروگرام سے آگاہ کیا تو وہ سمجھ گیا کہ لالہ شمل کے اس گاؤں کا ذکر کر رہا ہے جہاں علیہ سمیت اس کے خاندان کے باقی افراد مقیم ہیں۔

”میری مالتو تو تم بھی چلو ہمارے ساتھ۔ یہاں، اس شہر میں زندگی کے بہت بکھیرے ہیں۔ وہاں ہم تازہ ہوا میں سانس لیتے ایک سادہ اور بے پریاز زندگی کو بہت انجوائے کریں گے۔“ لالہ کی پیشکش میں ایسی سادگی اور مصومیت تھی کہ محسوس ہی نہ ہوتا تھا کہ وہ اتنے عرصے تک اتنا بڑا کینگ چلا تا رہا ہے۔

”جنت اتنی آسانی سے ہر کسی کو کہاں ملتی ہے۔ میں ان خوش نصیبوں میں سے نہیں جو جنت میں رہ سکیں۔ میری ڈیوٹی ان کے اوپر لگ گئی ہے جو دوسروں کے لیے اس دنیا میں جہنم بھڑکاتے رہتے ہیں۔“ اس نے آہستہ سے لالہ کو آگاہ کیا تو وہ کچھ دیر تک اس کی شکل تنکٹا رہا پھر رخصت بھرے لہجے میں بولا۔

”ایسی ڈیوٹیاں خوش نصیبوں کی لگتی ہیں۔ انہوں نے جوانی کا وہ دور جب جسم میں طاقت اور دل میں جرأت تھی، ہم نے جرم کی دنیا میں گزار دیا۔ اب جبکہ احساس ہوتا ہے کہ زندگی کسی اور طور پر بھی گزاری جاسکتی تھی تو پے پیچ کچھ نہیں

رہا۔ ہم اب نہ وطن کی حفاظت کے جوگے رہے ہیں نہ انسانیت کی خدمت کے۔“

”اس طرح نہ کہیں۔ شاید یہ آپ کے حالات تھے جو آپ کو جرم کی دنیا میں لے گئے لیکن پھر بھی آپ کے اندر سے خیر کا پہلو بھی ختم نہیں ہوا۔ یہ آپ کے اندر کی خیر ہی ہے جو آپ نے اتنی آسانی سے اس دنیا کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور اپنی ساری دولتیں فلاحی کاموں کے لیے وقف کر دی

ہے ورنہ آپ چاہتے تو اب بھی دنیا کے کسی خطے میں عیش و آرام کی زندگی گزار سکتے تھے۔“ معاذ نے اس کے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے اسے سراہا تو لالہ مسکرا دیا اور بولا۔

”منصوبہ بندی تو میری کچھ ایسی ہی تھی لیکن خدا نے میرے لیے اس سے بہتر مروج رکھا تھا۔ آج میں جان چکا ہوں کہ کسی خوبصورت دلا میں ملازمین کی فوج کے ساتھ رہنے اور محفل ناؤ سجا کر موج و مستی کرنے کے مقابلے میں وہ زندگی زیادہ خوبصورت اور پرسرت ہے جس میں سادگی اور اپنوں کا پیار شامل ہو۔ میں بھی اپنے بھائی کو مکمل کر پیار نہیں کر سکا، وہی کو سگا بھتیجا ہوتے ہوئے دل بھر کر گلے نہیں لگایا لیکن اب۔۔۔۔۔ اب اپنے پوتے کے ساتھ رج کر پیار کروں گا۔ اسے اپنے کندھے پر بٹھاؤں گا، اس کے ساتھ کھیلوں گا اور۔۔۔۔۔ اور وہ سب کچھ کروں گا جو ایک کینگسٹر ہونے کی وجہ سے نہ کر سکا۔“ اس کی آنکھوں میں ڈھیروں خواب روشن تھے۔

”اللہ آپ کے سارے خواب پورے کرے۔“ معاذ نے اسے دل سے دعا دی۔ ایک ایسا شخص جو عام آدمی کی طرح خواب نہ دیکھ سکتا ہو، دوسروں کو سچے دل سے دعا تو دے ہی سکتا تھا۔

”معاذ! میں تیار ہو گئی ہوں اور باہر تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ جب چلنا ہو تو آجانا۔ اطلاع دینے اس لیے آئی ہوں کہ کہیں مجھ پر الزام نہ دھرو کہ تمہاری وجہ سے لیٹ ہو گئے ہیں۔ ویسے ہی تم مردوں کو ہم خواتین پر الزام لگانے کا بہت شوق ہوتا ہے۔“ بشری کی آمد نے اسے ایک دم سے اس جذباتی لمحے سے نکال دیا اور زوردار تہقہ لگایا۔

”اب میں نے ایسا کون سا لطیفہ سنا دیا ہے؟“ اس نے اس کے ہنسنے کا برا منایا۔

”لطیفہ نہیں، بس آج بہت عرصے بعد تمہیں ماضی کی طرح پٹر پٹران اسٹاپ بولتے سنا تو بہت خوشی ہوئی۔“ یہ خوشی کا اظہار ہو رہا تھا یا تم میرا مذاق اڑا رہے تھے؟“ وہ مشکوک ہوئی۔

ہے۔ تعلق قائم رکھنے کے لیے کسی کو تو کسی کا بننا ہی پڑتا ہے۔“ اس نے بشری کے طعنے کا بڑا مانے بغیر خوش دلی سے جواب دیا۔

”آج کی عورت کو شعور آ گیا ہے جناب! اس لیے آپ مرد اب پہلے کی طرح ہمارے حقوق سلب نہیں کر سکتے۔ آپ کو ہماری آواز سننا ہوگی۔“ اس نے کسی ہچی فیمسٹ کی طرح جوش سے مکالمہ کیا۔

”ہم مردوں نے تو کب کا سر تسلیم خم کر دیا ہے لیکن یہ آپ خواتین ہی ہیں جو ماں بہن کے روپ میں ہوں تو پھر ہم بچاروں کو زن مریدی کا طعنہ دیتی ہیں۔“ اس نے ترکی بہ ترکی بشری کو جواب دے کر اسے ہنسنے پر مجبور کر دیا۔ یونہی ادھر ادھر کی ہانکتے اسپتال تک کا فاصلہ طے ہو گیا۔ وہاں وہی اپنے کمرے میں دنیا سے بیزار بیٹھا ریوٹ سے ٹی وی کے چینل بدل رہا تھا۔

”کیا حال ہے ہیرو؟“

”دنیا سے کٹ کر محتاجوں کی طرح یہاں پڑا ہوں اور سخت بور ہو رہا ہوں۔“ اس نے منہ بتاتے ہوئے جواب دیا۔

”انٹرنیٹ کی سہولت ہوتے ہوئے دنیا سے کٹنے کا شکوہ کرتے ہو، بڑے ناشکرے ہو۔“ بشری نے بے ساختہ اسے ٹوکا۔

”جس تن لاکے وہ تن جانے۔ تمہیں کیا پتا کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔ علینہ سے اپنی حالت چھپانے کے لیے اسے ویڈیو کال تک نہیں کر سکتا۔ بیٹے کی صورت دیکھنے کے لیے آنکھیں ترس رہی ہیں۔ میں وہ بد قسمت باپ ہوں جس کو بیٹے کی پیدائش کے اتنے دن گزر جانے کے باوجود اسے گود میں لینا نصیب نہیں ہوا ہے لیکن تم یہ سب کیسے سمجھ سکتی ہو؟ اس سب سے تم نہیں، میں گزر رہا ہوں۔“ ہمیشہ متحرک زندگی گزارنے کا عادی وہی اس جمود سے چڑچڑے پن کا شکار ہو گیا تھا اس لیے اپنی عادت کے برخلاف اتنا بول گیا۔ اس کے الفاظ پر بشری کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔

”وقاص!“ معاذ نے تڑپ کر وہی کو کچھ کہنا چاہا لیکن بشری نے اسے ہاتھ کے اشارے سے بولنے سے روک دیا اور خود وہی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

”میں یہ سب ایسے سمجھ سکتی ہوں کہ میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے ماں باپ کو بے بسی کی موت مرتے دیکھا ہے۔ میں بے گھری کے عذاب سے گزری ہوں، میں نے اپنی عزت کھوئی ہے، حسن گویا ہے، دشمن کی قید میں جبر اور تنہائی کے شب و روز کا۔“ اس نے اور ایک ایسا

”اس بحث میں الجھے رہے تو ہمیں سچ سچ اسپتال پہنچنے میں دیر ہو جائے گی اور میں تم پر اس تاخیر کا الزام رکھنے میں بالکل حق بجانب ہوں گا۔ کیوں لالہ! ٹھیک کہہ رہا ہوں نا میں؟“ اس نے بشری سے بات کرتے کرتے بالکل اچانک لالہ سے استفسار کیا تو وہ ایک ہل کے لیے گڑبڑا گیا پھر جھل کر بولا۔

”بات یہ ہے برخوردار کہ تم بے شک بہت اسمارٹ ہو لیکن میرا اصول ہے کہ میں کبھی بیٹیوں کے مخالفین کے حق میں گواہی نہیں دیتا تو تم سے بھی معذرت ہے۔“

”یہ تو بڑا بے اصولا اصول ہے۔“ معاذ نے منہ بنا کر احتجاج کیا لیکن بشری بہت خوش تھی اور فرضی کار کھڑے کر کے اسے جتانے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ اس کے مقابلے میں بہت اہم ہے۔

”بس مجھے نہیں رکنا اس جگہ جہاں حق اور سچ کا ساتھ نہیں دیا جاتا۔“ معاذ بظاہر ناراضی دکھاتے ہوئے کھڑا ہو گیا لیکن بشری کو خوش اور ہنستا مسکراتا دیکھ کر وہ اندر سے بہت خوش تھا۔

”تم لوگ جاؤ، کچھ ضروری معاملات نمٹا کر میں بھی تھوڑی دیر میں اسپتال کے لیے نکلوں گا۔“ لالہ دن اور رات میں دوبار اسپتال جاتا تھا اور اپنے وقت کا بیشتر حصہ وہیں گزارتا تھا۔

”ٹھیک ہے تو پھر اجازت دیجیے۔ واپسی میں شاید ملاقات نہ ہو۔ میں بشری کو باہر سے ہی ڈراپ کر کے چلا جاؤں گا۔“ اس نے لالہ کی طرف مصالحتی کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے اپنے پروگرام سے آگاہ کیا۔

”ہم..... ٹھیک ہے۔“ لالہ نے کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ سمجھدار آدمی تھا۔ معاذ اپنے ساتھیوں کو کسی خفیہ ادارے سے ربط ضبط سے متعلق سرسری سا آگاہ کر چکا تھا اور لالہ سمیت سب اس بات کو سمجھتے تھے کہ اس کے لیے تفصیلات بتانا ممکن نہیں ہوگا اس لیے کوئی اسے اس مشکل میں بھی نہیں ڈالتا تھا۔ ہاں بشری تھوڑی چھیڑ چھاڑ کر لیتی تھی۔ اب بھی وہ باز نہیں آئی اور اس کے ساتھ گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھے ہوئے بولی۔

”تمہارا حال تو اس لڑکے کا سا ہو گیا ہے جو مگنی ہوتے ہی سسرال والوں کا ہو جاتا ہے اور سسرال کے پھیروں میں اپنے گھر والوں کو بھول جاتا ہے۔“

”کیا کریں۔ آج کل لڑکیوں میں تو سسرال کا بننے کا رواج ختم ہوتا جا رہا ہے تو ہم لڑکوں نے ہی کپڑا مارتا کر لیا

ٹیڑھے میڑھے اعضا والا جسم لیے پھرتی ہوں جس کے ساتھ کبھی بھی پہلے جیسی نارمل زندگی نہیں گزار سکتی۔ اب تم مجھے بتاؤ کہ تمہارے ساتھ ایسا کون سا مسئلہ ہے؟ ٹھیک ہے، زخمی ہو لیکن ہرگز بڑے زخم کے ساتھ امپروو کر رہے ہو اور ان شاء اللہ جلد پہلے کی طرح زندگی گزارنے کے لائق ہو جاؤ گے۔ بیوی بچہ دور ہیں لیکن الحمد للہ سلامت ہیں، رابطے میں ہیں اور تمہارے پاس ان سے ملنے کی امید بھی موجود ہے۔ تنہائی اور بے عملی کے اس عرصے میں ہر سہولت سے مزین یہ شاندار کمر اٹلا ہوا ہے جہاں تمہارے چاہنے والے پابندی سے تمہاری مزاج پر سی کے لیے آتے ہیں اور تم سے تمہاری تنہائی بانٹتے ہیں لیکن تم عجیب انسان ہو جو نعمتوں کو شمار کرنے کے بجائے بس تکلیف کو یاد رکھے ہوئے ہو اور دوسروں کو بتاتے ہو کہ وہ تمہاری تکلیف کو نہیں سمجھ سکتے۔“ وہ بولنے پر آئی تو بلا تکان بولتی چلی گئی اور وہی کے دماغ کے سارے پیچ کس کر رکھ دیے۔ اس کے پاس اس سچ کی طاقت تھی جس سے وہی خود بھی اچھی طرح واقف تھا۔ چنانچہ خود پر طاری قنوطیت اور خود قریبی کے دورے سے فوراً ہی باہر نکل آیا اور نہایت شرمندگی سے بولا۔

”آئی ایم ریلی سوری بشری! تم تو واقعی ہم سب کے لیے عزم و ہمت کی وہ زندہ مثال ہو جس کے سامنے ہوتے ہوئے ہم میں سے کسی کا شکایت کرنے کا حق ہی نہیں بنتا ہے۔ ہم سب کے حصے میں تمہارے مقابلے میں واقعی بہت کم تکلیف آئی ہیں۔“

”میرا مقصد تمہیں شرمندہ کرنا نہیں تھا واقف! میں بس تمہیں یہ احساس دلانا چاہتی تھی کہ تمہارے پاس اچھے وقت کی امید موجود ہے تو اس امید کے سہارے اس مشکل کو ہنس کر کاٹ لو۔“ بشری نے اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فوراً ہی اس کی معذرت قبول کر لی اور اسے نرمی سے سمجھایا۔ اس موقع پر معاذ نے گفتگو میں دخل دیا اور اطلاع دینے والے انداز میں بولا۔

”بشری بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔ ویسے بھی لالہ نے پروگرام طے کر رکھا ہے کہ تمہارے ٹھیک ہوتے ہی تمہیں لے کر علینہ اور ابو کے پاس شفٹ ہو جانا ہے اور باقی کی زندگی اس پرسکون گاؤں میں گزارنی ہے۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ٹھیک ہے میں علینہ اور اپنے بیٹے سے ملنے کے لیے وہاں جانے کو بے چین ہوں لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں ہمیشہ کے لیے وہاں جا کر بیٹھ جاؤں گا۔ میرا پروگرام آپ کے ساتھ طے ہے اور میں آپ

کے ساتھ ہی جاؤں گا۔ یہ دیکھیے میں آپ کے بھیجے ہوئے نیوشو (چین میں رائج ایک قدیمی زبان) کے اسباق بھی اچھی طرح یاد کر رہا ہوں۔“ اس کی دی گئی اطلاع پر وہی بری طرح چونک گیا اور جلدی جلدی بولتے ہوئے اپنے موبائل پر کوئی چیخ کھول کر اس کے سامنے کیا۔ اس نے اسکرین پر نظر نہیں ڈالی کہ ظاہر ہے وہ سب اس نے ہی وہی کو بھیجا تھا اور اسے اس کو دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن لالہ سے ہونے والی گفتگو کے بعد اس کی سوچ میں تبدیلی آئی تھی اور وہ وہی کو اس حوالے سے سمجھانا چاہتا تھا چنانچہ ہلکا سا کھٹکھٹاتے ہوئے بولا۔

”مجھے لالہ کا پروگرام اچھا لگا ہے۔ تمہیں اس پر غور کرنا چاہیے۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ حیرت سے وہی کا منہ کھل گیا۔

”ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچو تو کچھ غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں نے اپنے لیے جو راہ منتخب کی ہے، وہ بہت کٹھن ہے اور شاید اس سے واپسی کی کوئی گنجائش بھی نہیں تو..... تو میں چاہتا ہوں کہ تم اس راہ پر میرے ساتھ نہ چلو۔“

”نہیں..... میں آپ کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔“ وہی نے سختی سے انکار کیا۔

”اکیلا کہاں ہوں میں۔ میرے ساتھ بہت سے لوگوں..... بہت طاقتور لوگوں کا تعاون ہے۔ میرے لیے ایک کور بنایا جائے گا، آس پاس کئی مددگار ہوں گے۔ معلومات کی فراہمی اور رابطے کے لیے پورا نیٹ ورک ہوگا۔ میری حفاظت کے لیے مناسب انتظام ہوگا اور اتنا سب کچھ ہوتے ہوئے میرا خیال کہ تمہیں میرے لیے پریشان ہونا چاہیے۔“ وہی کو قائل کرنے کے لیے دلائل دینے لگا۔

”اگر سب کچھ اتنا ہی اچھا ہوتا تو آپ یہ نہ کہتے کہ اس راہ سے واپسی کی گنجائش نہیں۔“ وہی قائل نہ ہوا۔ ایک جانب خاموش بیٹھی بشری کی آنکھوں میں بھی تشویش چھلکنے لگی لیکن اس نے گفتگو میں دخل نہیں دیا۔

”وہ تو میں نے اس لیے کہا کہ ایسے کاموں میں بہر حال رسک تو ہوتا ہی ہے لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم میرے سر پرست بن کر میری حفاظت کے لیے ساتھ چل پڑو۔“

”میں سر پرست نہیں، سادھی بن کر ساتھ جاؤں گا اور یہ پہلے سے طے ہے۔ اب آپ اچانک اس پروگرام میں تبدیلی کیسے کر سکتے ہیں؟“ وہی جھنجھلایا۔

”دیکھو یار! بات یہ ہے کہ مجھے کوئی اور بھی ساتھی مل جائے گا لیکن میں چاہتا ہوں کہ میری بہن کا جیون ساتھی زندگی بھر اس کے ساتھ رہے۔“

”لیکن معاذ بھائی!.....!“

”جذباتی ہو کر نہیں، تھوڑے سے حقیقت پسند بن کر سوچو۔“ معاذ نے اس کو کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر اس کی بات کاٹ دی اور سمجھانے کے انداز میں بولا۔

”علینہ ہماری چھوٹی اور بہت لاڈلی بہن ہے جس نے چھوٹی سی عمر میں بہت سی پریشانیاں دیکھ لی ہیں۔ میں چاہتا ہوں اس کی زندگی میں سکھ ہو اور میرے پیچھے تم اسے اور ابو کو سنبھال لو۔ سعد پر میں یہ ذمے داری اس لیے نہیں ڈالنا چاہتا کہ وہ پہلے ہی کتنی بڑی لفٹینشن سے گزرا ہے۔ اس نے اپنا ایک گردہ کھویا ہے۔ اس کا وقت خراب ہوا ہے اور صحت کے بھی ایشوز ہیں تو میں چاہتا ہوں کہ اس پر کم سے کم بوجھ ہو اور وہ سکون سے اپنے کیریئر پر فوکس کر سکے۔“

”میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ کل تک سب کچھ مختلف تھا اور اب آپ مجھ سے نئی امیدیں جوڑ رہے ہیں۔“ وہ کی اچھا خاصا الجھ گیا۔

”اپنی لفٹینشن مت لو۔ ابھی بہت وقت پڑا ہے۔ سب سے پہلے تو اپنی صحت یا بلی کی فکر کرو اس کے بعد چلتے ہیں اپنے پیادوں سے ملنے۔ ان سے مل کر تم فیصلہ کرنا کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔“ معاذ نے اس کی پیٹھ پر ہلکی سی چھکی دی اور پھر اجازت لے کر بشری کے ساتھ باہر نکل گیا۔

”میں تمہاری کامیابی کے لیے بہت ساری دعائیں کروں گی۔“ باہر نکل کر بشری نے اس سے پہلی بات یہ کہی۔

”تھینک یو یار! مجھے اس وقت جذباتیت سے زیادہ دعاؤں کی ہی ضرورت ہے۔ مجھے اچھا لگا کہ مجھے روکنے کی کوشش کرنے یا کسی ڈر اور خوف کا مظاہرہ کرنے کے بجائے تم نے مجھے یہ حوصلہ دیا کہ میرے پیچھے کوئی میرے لیے دعا کرنے والا موجود ہوگا۔“ وہ دل سے بشری کا شکر گزار ہوا۔

”اگر تم کوئی غلط کام کرنے جا رہے ہو تو میں تمہیں روکتی بھی اور اندیشوں کا اظہار بھی کرتی لیکن اس وقت کچھ نہ جانتے ہوئے بھی میں جانتی ہوں کہ تمہاری نیت نیک ہے اور تم ایسا کچھ نہیں کرنے جا رہے جو بعد میں تمہارے ضمیر پر بوجھ بن جائے۔“ کیسا یقین تھا اس کے لہجے میں۔ معاذ کو اپنا دل پھلتا ہوا محسوس ہوا۔ بشری گزار نے ہمیشہ اس پر اعتبار کیا تھا اور ہمیشہ غیر مشروط طور پر اس کا

ساتھ نبھاتی رہی تھی۔ اسے افسوس تھا کہ ایسی بے ریا لڑکی کو دینے کے لیے اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ کچھ ایسا جو اس کی صحرا جیسی زندگی کو نخلستان بنا دیتا۔ ان کے درمیان بس نازک سا ایک خاموشی کا لمحہ آیا اور جیکے سے گزر گیا۔

”یزدانی کی پریس کانفرنس دیکھی تھی تم نے؟ تقریباً اپنے سارے ہی جرائم کا اعتراف کر لیا اس نے۔“ بشری خود ہی بات بدل گئی۔

”خوش نصیب ہے وہ کہ اس نے مرنے سے پہلے اپنے ضمیر کی آواز سن لی ورنہ لوگوں کو مرتے دم تک تو بہت سی توفیق نہیں ہوتی۔“ وہ جانتا تھا کہ یزدانی کس کی تحویل میں ہے اور کون کون سے انکشافات کر چکا ہے۔ ملک دشمن عناصر کی بیخ کنی اور میڈیم ایکس کے نیٹ ورک کو توڑنے کا سلسلہ تو پہلے ہی جاری تھا۔ یزدانی کا تعاون حاصل ہونے سے مزید سہولت ہو گئی تھی۔

”ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔ اب عرفان اللہ کو ہی لے لو۔ یزدانی کو اگر بیٹے کی موت کا جھٹکا لگا تھا تو اس کا بیٹا بھی تو جیتے جی مردوں سے بدتر حالت میں پڑا تھا لیکن اس پر کوئی اثر ہی نہیں ہوا۔“ بشری نے افسوس سے تبصرہ کیا۔

”کچھ لوگوں کے دلوں پر مہر لگ جاتی ہے۔ ایسے لوگ نہ صرف اپنے ساتھ سیاہ اعمال نامہ لے کر جاتے ہیں بلکہ اپنے پیچھے بھی اپنے گناہ کی پیداوار چھوڑ جاتے ہیں۔“ معاذ کے دیرے دیرے آگے بڑھتے قدم رکے اور اس نے ایک جھٹکے سے اپنے دائیں ہاتھ پر موجود کمرے کا دروازہ کھولا۔ کھلے دروازے سے بستر پر لیٹا ایک بھیا نک صورت شخص دکھائی دیا۔

”دیکھو، گناہ کتنے بھیا نک ہوتے ہیں۔“ اس نے بستر پر موجود شخص پر ایک نفرت بھری نگاہ ڈالی۔

”بازل!.....!“ بشری کے لب پھڑپھڑائے۔ چہرے میں بہت سی تبدیلیوں کے باوجود اسے اپنے مجرم کو پہچاننے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔

”اللہ کا تہہ برسا ہے اس شخص پر۔ کل تک یہ لوگوں کی زندگیاں برباد کرتا تھا، آج اس لائق بھی نہیں رہا کہ اپنے جسم پر بیٹھنے والی مٹی کو بھی اڑا سکے۔ ریڈھ کی ہڈی میں لگنے والی گولی نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے معذور کر دیا ہے اسے اور یہ ابھی صرف سزا کا آغاز ہے۔ اپنے کیے کی پوری پوری سزا پائے گا یہ درندہ!.....!“ اس کے لہجے میں بازل کے لیے کوئی رحم نہیں تھا۔

”واپس چلو یہاں سے۔ میں نہیں دیکھنا چاہتی

اسے۔ مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے اسے دیکھ کر۔“ بشری نے اپنا رخ موڑ لیا۔

”کم از کم ایک بار مزید تمہیں اس کا دیدار ضرور کرواؤں گا۔ ہاں، یہ ہو سکتا ہے کہ اس وقت تم تو کیا، اس کی پیدا کرنے والی باں بھی اسے نہ پہچان سکے۔“

باذل وہ شخص تھا جس کے لیے اس کے دل میں نرمی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ ہوتی بھی کیسے کہ وہ جب جب اس شخص کو دیکھتا تھا، باحیا و باپردہ عائشہ (بشری کی والدہ) کی اس بے بسی کا خیال آ جاتا تھا جو انہوں نے مرنے سے پہلے بیٹی اور شوہر کے سامنے ہونے والی آبروریزی پر محسوس کی ہوگی اور بشری تو اس کے ظلم کی زندہ مثال کے طور پر اس کے سامنے تھی۔ اس شخص کے لیے رحم اور معافی کی گنجائش نکلتی بھی تو آخر کیسے؟

☆☆☆

”میرا بیٹا..... میرا شہزادہ..... میری جان کا ٹکڑا..... میں کتنا ترسی ہوں اپنی آنکھوں کی اس ٹھنڈک کے لیے۔ اب تو ایسا لگنے لگا تھا کہ میں اسے دیکھے بغیر ہی قبر کے اندھیروں میں اتر جاؤں گی۔“ اعظم کا چہرہ بے تحاشا چومتے ہوئے وہ آنسو برساتی جا رہی تھی اور ساتھ ساتھ نہایت جذباتی لہجے میں بولتی بھی جا رہی تھی۔ گزرتے شب و روز کے ساتھ جوں جوں اس کی بیماری کی شدت بڑھ رہی تھی، وہ کمزور سے کمزور ہوتی جا رہی تھی لیکن اس وقت اس کے کمزور بازوؤں میں جانے کہاں سے اتنی طاقت آگئی تھی کہ اس نے اعظم کو سختی کے ساتھ پکچھ لیا تھا اور اس پر اپنی ساری شدتیں نچھاور کر رہی تھی۔

”پلیز سبکل! تھوڑا آرام سے۔ دیکھو بچہ پریشان ہو رہا ہے اور گھبرا کر رونے لگا ہے۔“ بیڈ سے کچھ فاصلے پر کھڑے عالم شاہ نے اسے نرمی سے سمجھایا۔

”میں بہت پیاسی ہوں ادا سائیں! آج مجھے میری مٹا کو سیراب کر لینے دیں۔“ بھیگے ہوئے لہجے میں کہہ کر اس نے ایک بار پھر پے درپے اعظم کے رخسار چومے تو وہ مزید گھبرا گیا اور روتے ہوئے قریب کھڑی نیلی کی گود میں جانے کے لیے ہاتھ اٹھا اٹھا کر ہنسنے لگا۔

”عالموں نے اتنے دن اسے مجھ سے دور رکھا ہے کہ یہ مجھے..... اپنی ماں کو بھول گیا ہے۔“ اعظم کا کسی اور کی طرف لپکنا اسے مزید دکھی کر گیا۔

”ایسی بات نہیں ہے اوی..... یہ تو آپ کو بہت یاد کرتا تھا اور اس کی آنکھیں صاف بتاتی تھیں کہ یہ آپ کو

تلاش کر رہا ہے۔ ابھی تو لگتا ہے کہ سفر کی تھکن اور نئے ماحول کی وجہ سے اسے کچھ سمجھ نہیں آ پارہا ہے۔ تھوڑی دیر میں دیکھیے گا کیسے آپ سے لاڈ کرتا ہے۔“ نیلی نے سبکل کے دکھ کو محسوس کر کے اسے سمجھایا۔

”یہ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں سبکل! نا سمجھ بچہ ہے، یہ تمہاری کیفیت کو سمجھ نہیں سکتا جو تمہاری جذباتیت کے جواب میں خود بھی ایسا ہی ری ایکشن دے سکے۔ تم پہلے اسے ریلیکس ہونے اور ماحول سے مانوس ہونے کا موقع دو پھر دھیرے دھیرے تمہیں بھی پہچان لے گا۔“ عالم شاہ نے قریب آ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے سمجھایا پھر مزید بولا۔

”ایسا کرو، ابھی تم اسے مس نیلو فر کے حوالے کر دو۔ یہ اسے بہلا لیں گی تو پھر تم آرام سے لے لینا۔“

”میرا بچہ مجھے بھول گیا ہے ادا سائیں اور میں سامنے ہوتے ہوئے بھی اسے جی بھر کر پیار نہیں کر سکتی۔“ اسے اعظم کا خود کو چھوڑ کر نیلی کی طرف لپکنا بری طرح دل پر لگا تھا اس لیے خود پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”پیار بھی کر لینا لیکن ابھی تو اس بات پر شکر کرو کہ یہ بحفاظت تم تک پہنچ گیا ہے اور یہ سب معاذ کی وجہ سے ممکن ہوا ہے۔ اس نے تم سے وعدہ کیا تھا نا کہ اعظم کو تم تک پہنچا کر دم لے گا، تو دیکھو اس نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔ کیا تم اس کا شکر یہ ادا نہیں کرو گی؟“ عالم شاہ نے اس کی توجہ اعظم سے ہٹا کر دوسری طرف مبذول کرنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں کامیاب رہا۔ سبکل رونا دھونا بھول کر کچھ چوکی ہوئی سی دکھائی دی اور گردن کو دائیں بائیں گھماتے ہوئے متلاشی نظروں سے اس پاس دیکھا۔

”کہاں ہیں معاذ صاحب؟ مجھے تو ان کا شکر یہ ادا کرنا تھا۔“

”وہ ابھی پاکستان میں ہی ہیں اور آپ کے لیے پیغام بھیجا ہے کہ جس طوطے میں آپ کی جان بند تھی، وہ طوطا آپ کے حوالے کر رہا ہوں۔ اب آپ کا بھی فرض بنتا ہے کہ ساری پریشانیاں بھول کر ہمت پکڑیں اور اپنے بیٹے کی خاطر اپنی بیماری سے بھرپور لڑائی لڑیں۔“ نیلی نے غیر محسوس طریقے سے اعظم کو اس کی گود سے لے لیا اور ساتھ ہی معاذ کا پیغام بھی پہنچایا۔

”کون سی بیماری؟ میں تو بھول ہی گئی ہوں کہ مجھے کوئی بیماری بھی ہے۔“ اس نے جلدی جلدی پھٹکی سے اپنے آنسو صاف کیے اور زبردستی مسکرائے لگی۔

داخل ہے۔ وہ سب کے موزی مرض کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھیں۔

”اچھا بابا جو کرنا ہے کر لیتا پر مجھے میری بیٹی سے تول لینے دیں۔ آپ تو اس پر قبضہ ہی کر کے بیٹھ گئی ہیں۔“ صداقت شاہ نے اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہوئے شکوہ کیا۔

”لیں، میں نے کب روکا ہے آپ کو۔ مل لیجیے اپنی بیٹی سے۔“ وہ سب سے تھوڑی دور تھیں اور عالم کو اپنے قریب بلا کر دھیمی آواز میں پوچھنے لگیں۔

”پتر! یہ ادھر چین میں ہمارے دلیکی بادام، اخروٹ اور چار مغز وغیرہ مل جاتے ہیں کہ نہیں؟“

”فکر نہ کریں اماں! یہاں سب ملتا ہے اور نمبرون کو الٹی کا ملتا ہے۔“ عالم شاہ نے انہیں تسلی دی اور کن انکھوں سے صداقت شاہ کی طرف دیکھا۔

یوں تو وہ اپنے سابقہ محروقاں انداز میں ہی سب سے ملے تھے لیکن ان کا اندرونی کرب ان کے چہرے سے جھلک رہا تھا۔ انہیں یہاں آمد سے قبل ہی سب کی بیماری کی تفصیلات سے آگاہ کر دیا گیا تھا اور ایک باپ کی حیثیت سے وہ اپنی جوان بیٹی کو موت کے منہ میں جاتا دیکھ کر اندر ہی اندر تڑپ رہے تھے۔

”کاش آپ ہمیں انڈیا نہ بھجواتے بابا! میں تو ہماری زندگیاں اتنے بڑے بڑے طوفانوں سے دو چار نہ ہوتیں۔“ شکوہ کرنا اس کی خوش نہیں تھی لیکن اس وقت جانے کیسے باپ کے سامنے زبان پر شکوہ آ گیا۔

”میں تجھ سے بہت شرمندہ ہوں میری دھی رانی! میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ عالم اور تمہیں پاکستان کے اس وقت کے حالات سے بچانے کے لیے جو فیصلہ کر رہا ہوں، وہ تم دونوں کے حق میں اتنا بڑا ثابت ہوگا اور تم لوگ پہلے سے بھی بڑی مشکلات میں گرفتار ہو جاؤ گے۔“ صداقت شاہ کے لہجے میں بیک وقت شرمندگی اور ہچکچاہٹ کے رنگ تھے۔

”ایسا کچھ نہیں ہے بابا! میں نے تو ہمارا بھلا ہی چاہا تھا لیکن تقدیر میں جو تکلیف ہو، اس سے کون بچ سکتا ہے۔“ عالم شاہ کو اپنے باپ کے لہجے کے یہ رنگ بالکل نہ بھائے چنانچہ فوراً ہی انہیں اپنی بانہوں کے گھیرے میں لے کر جذباتی سہارا دینے کی کوشش کی۔

”ادا! میں بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں بابا! میں! ہم تو بس بونہی.....“ سب کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

”تمہیں شکوے کا پورا حق ہے بیٹا! تم میری

”اگر ایسی بات ہے تو اس کا مطلب ہے کہ تم ایک اور زبردست سے سر پرانز کا جھٹکا برداشت کر سکتی ہو۔“ عالم شاہ نے شریر سے لہجے میں اس کے اشتیاق کو ابھارا۔ اصل میں ڈاکٹر نے اسے سمجھایا تھا کہ سب کی صحت ایک دم سے بہت سے سر پرانز کی متحمل نہیں ہو سکتی اس لیے کوشش کریں کہ جذباتی کرنے والے ہر معاملے کو درجہ بدرجہ اس کے سامنے لائیں۔ ڈاکٹر کی اسی ہدایت کے سبب سکینہ شاہ اور صداقت شاہ فی الحال اس کے لیے مخصوص کمرے سے باہر ہی ٹھہر گئے تھے۔

”کس سر پرانز کی بات کر رہے ہیں آپ؟“ وہ رونا دھونا سب بھول گئی تھی اور آنکھوں میں تجسس لیے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”بوجھ تو جانیں۔“ عالم شاہ نے اس کے تجسس کو ہوا دی۔

”کیا اماں اور بابا سائیں آئے ہیں مجھ سے ملنے؟“ وہ اصل بات تک پہنچ گئی اور جذبات سے کاٹتی آواز کے ساتھ پوچھا۔

”واہ بھی، تم تو بہت ذہین ہو۔“ عالم شاہ نے اسے سراہا اور ہنستے ہوئے ملحقہ کمرے کے دروازے کی طرف منہ کر کے بلند آواز میں بولا۔

”یہاں آجائے آپ لوگ۔ آپ کی لاڈلی بیٹی نے سر پرانز بوجھ لیا ہے۔“

وہ دونوں بھی جیسے دروازے ہی سے لگے کھڑے تھے کہ فوراً ہی اندر آ گئے۔ ماں باپ کا ایک عرصے بعد اپنی بچھڑی اولاد سے ملنا بہت جذباتی کر دینے والا منظر تھا۔ نیلی کو اس موقع پر اپنی موجودگی مناسب محسوس نہ ہوئی تو اعظم سمیت چپکے سے باہر نکل گئی۔

”کیا حال کر لیا ہے تو نے اپنا؟ تو، تو میری سب سے سونہی دھی تھی۔“ سکینہ شاہ نے پہلے تو بہت جذباتی انداز میں اسے گلے لگا کر پیار کیا پھر اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے آنسوؤں بھری آنکھوں سے شکوہ کیا۔

”آپ سے دور جو چلی گئی تھی، آپ کی طرح بھلا کون خیال رکھتا میرا؟“ اس نے مسکرا کر ماں کو بھلانے کی کوشش کی۔

”اب میں آگئی ہوں نا تیرے پاس۔ دیکھنا دور چار دن میں کیسے تجھے طاقت والی غذا میں کھلا کر چنگا بھلا کرتی ہوں۔ یہ موٹی انگریزی دوائیں تو ویسے بھی انسان کا خون جلا کر رکھ دیتی ہیں۔“ سکینہ شاہ کو محض یہ بتایا گیا تھا کہ سب بیٹے کی جدائی کی وجہ سے بیمار پڑ گئی ہے اور اسپتال میں

فرمانبردار بنی ہو اور تم نے ہمیشہ میرے کہے کا مان رکھا ہے۔ بیٹیاں اتنی فرمانبردار ہوں تو والدین کی ذمہ داری زیادہ بڑھ جاتی ہے اور ان کا فرض ہوتا ہے کہ ان کی خوشیوں اور سکون کا پورا پورا دھیان رکھیں۔“

”آپ نے اپنے فرض کو ادا کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی بابا سائیں! لیکن آپ قسمت کے لکھے کو ٹالنے پر تو قادر نہیں تھے نا۔ جو کچھ ہوا، اسے شاید ایسے ہی ہونا تھا۔“ اب وہ کسی طرح صداقت شاہ کو مطمئن کرنے کی جگ دو دو میں تھی۔

”بھلے سرحدیں الگ تھیں لیکن خون تو ایک تھا۔ میں نے خون کے رشتے کے مان سے ہی ادا نیاز پر بھروسہ کیا تھا۔ میں کیا جانتا تھا کہ خون بھی دھوکا دے سکتا ہے۔“

”چاچا سائیں کا اس سب میں کوئی قصور نہیں تھا بابا سائیں! ان کی اولاد نے تو خود ان کے ساتھ بھی دھوکا کیا اور ان کی آنکھوں میں دھول جھونکتے رہے۔“ ماضی کے کر بناک دن ایک ایک کر کے اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے۔

”ان سب نے پھر اپنے کیے کا انجام بھی دیکھ لیا نا۔ میرے بے قصور اور معصوم بچوں کے ساتھ کی گئی زیادتی کا قدرت نے خود انتقام لے لیا ان سے۔“

”آپ کو کیسے معلوم ہوا؟“ وہ دونوں ہی صداقت شاہ کی بات سن کر چونک گئے۔

”میرے پاس اجالا اور فیصل کے خطوط آئے تھے۔ دونوں نے مجھ سے بہت معذرت طلب کی ہے ان خطوط میں۔ وہ دونوں ان دنوں فردوس کی بچیوں کے ساتھ امریکا میں مقیم ہیں۔ بچیوں کو جو کچھ ہوا، اس کے ثرما سے نکالنے کے لیے وہاں شغلنگ کی ہے انہوں نے۔ بچیوں کا وہاں ایڈمیشن ہو گیا ہے۔ اجالا کہیں جاب کر رہی ہے جبکہ فیصل نے اپنے میڈیکل ایسوز.....“ وہ پوری تفصیل بتانے لگے تھے لیکن سب نے ان کی بات کاٹ دی اور تیز لہجے میں بولی۔

”پلیز بابا سائیں! ہمیں کوئی دلچسپی نہیں ہے ان لوگوں کے بارے میں کچھ بھی جاننے سے۔ ہم اپنی زندگی کی کتاب سے وہ ورق پھاڑ کر پھینک دینا چاہتے ہیں جس پر یہ سارے کردار درج ہیں۔“

”یہ بہت صحیح فیصلہ ہے بیٹا! لیکن اس طرح کے حتمی اقدامات سے پہلے کچھ موضوعات پر نہ چاہتے ہوئے بھی بات تو کرنا پڑتی ہے۔“ صداقت شاہ نے نرمی سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”ہم کوئی بات نہیں کرنا چاہتے بابا سائیں! اپنی زندگی کے اس باب کے حوالے سے ہماری صرف اور صرف ایک خواہش ہے اور یہ کہ ہمارے اور فیصل کے درمیان قائم ہونے والا نام نہاد رشتہ ختم کر دیا جائے۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہم اس دنیا سے جائیں تو ہمارے نام کے ساتھ اس کا نام جڑا ہو۔“ اس نے اپنی خواہش کا اظہار کر ڈالا۔

”کیسی باتیں کر رہی ہے میری دھی! میں تیرے دشمن۔ ابھی تو نے دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے۔ ابھی تو، تو نے اپنے اعظم کو گھر و جوان بننے دیکھا ہے۔ اس کے سر پر سہرا سجا نا ہے۔ اپنے پوتے پوتیوں کو گود میں کھلانا ہے۔“ سکینہ شاہ جوان بیٹی کے منہ سے مرنے کی بات سن کر ٹپ انھیں۔ ”اماں سائیں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں سب! اب بس تم یہ اسپتال کا بستر چھوڑ دو اور یہ سب کرنے کی تیاری پکڑو۔“ عالم اس کی صحت کی صورت حال سے آگاہ تھا اور اس حوالے سے خود بھی بڑی تکلیف اور تشویش میں مبتلا تھا لیکن اس کو بہلانا بھی ضروری تھا۔

”یہ دونوں بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں بیٹا! تم ذہن سے سارے بوجھ ہٹا دو اور ساری توجہ اپنی صحت پر دو۔“ صداقت شاہ نے بھی تائید کی۔

”مجھے آپ کے حکم سے انکار نہیں بابا سائیں لیکن آپ نہیں جانتے کہ وہ رشتہ میرے دل، دماغ اور روح پر کتنا بڑا بوجھ ہے۔ اس بوجھ سے نجات حاصل کیے بغیر مجھے کبھی سکون حاصل نہیں ہو سکتا۔“ وہ پہلی بار عالم کے سامنے یہ بات زبان پر لائی تھی لیکن اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اس معاملے میں کتنی سنجیدہ ہے۔ اسے ٹوٹ کر اپنی بہن پر پیار آیا۔ یہ صرف اور صرف وہ تھا جس کو بچانے کی خاطر سب نے اتنی بڑی قربانی دی تھی اور خود کو ایک ان چاہے رشتے میں باندھ لیا تھا۔

”یہ بوجھ بہت دن ہوئے اتر چکا ہے میری جان! اب تمہارے اوپر ایسے کسی رشتے کا بوجھ نہیں ہے جو تمہیں کھل کر سانس لینے سے روک سکے۔“ گوکہ ڈاکٹر نے اسے اچانک کوئی بھی اچھی بُری خبر دینے سے منع کر رکھا تھا لیکن صداقت شاہ کو محسوس ہوا کہ اسے یہ خبر دینا ضروری ہے تاکہ وہ اس ذہنی دباؤ سے نجات حاصل کر سکے جو فیصل اور اپنے رشتے کے حوالے سے اسے مسلسل ذہنی دباؤ سے دوچار کیے ہوئے تھا۔

”مطلب؟“ وہاں موجود ہر فرد ہی ان کی بات سن کر چونک گیا۔

”لیکن ہٹ.....!“ سکینہ شاہ نے اس کی باتیں سن کر اس سے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن اس نے ان کی بات کاٹ دی۔

”مجھ پر بھروسہ تو کریں اماں! یقین کریں کل جب آپ دوبارہ اس سے ملنے آئیں گی تو وہ خود کو اس واقعے کے اثر سے نکال چکی ہوگی۔“

”کل آنے کا کیا سوال ہے؟ میں یہیں اسپتال میں رکوں گی۔“

”خیر اماں! یہاں اس کی اجازت نہیں ہے۔ آپ سفر کر کے آئی ہیں۔ ابھی آپ میرے ساتھ چلیں اور سفر کی تھکن اتاریں۔ کل ہم پھر کل سے ملنے آجائیں گے۔“ عالم شاہ نے انہیں ان کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔

”عالم بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے سکینہ! ابھی ہم چلتے ہیں۔ آرام کرنے کے بعد کل پھر آجائیں گے۔“ صداقت شاہ جانتے تھے کہ وہ بہن کا مزاج آشنا ہے اور جو کہہ رہا ہے، ویسا ہی ہوگا چنانچہ خود بھی انہیں سمجھانے لگے۔ وہ بادل نا خواستہ جانے کے لیے تیار ہوئیں۔

”آپ کو اور اعظم کو بھی ساتھ چلنا ہوگا مس!“ عالم نے خود کو اس سارے معاملے سے بے نیاز ظاہر کرتی اعظم کے ساتھ مصروف نیلی کو مخاطب کیا تو وہ سر ہلاتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔ اعظم کی ضروریات کے ایک چھوٹے بیگ کے علاوہ ان سب کا سامان پہلے ہی سیدھا ان کی رہائش گاہ پر پہنچایا جا چکا تھا۔ اس لیے اس وقت وہاں سے جاتے ہوئے ایسا کچھ سمیٹنا نہیں تھا کہ روائی میں وقت لگتا لیکن نیلی تذبذب کا شکار ہو گئی۔

”کیا بات ہے، کوئی مسئلہ ہے کیا؟“ عالم نے حیرت سے پوچھا۔

”میرے خیال میں روائی سے قبل ہمیں اعظم کو اس کی ماما سے ملوادینا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ ہمارے جانے کے بعد انہیں اس کا خیال آئے اور کوئی پریشانی کھڑی ہو جائے۔“ اس نے عالم کو اپنے ذہن میں آنے والے خیال سے آگاہ کیا تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔

”کہہ تو آپ ٹھیک رہی ہیں لیکن کل اس وقت۔۔۔“

”کوئی بھی مسئلہ ہو، ایک ماں کے لیے اس کی مولاد سے بڑھ کر کچھ اہم نہیں ہوتا۔ آپ اعظم کو اس کی ماما سے ملنے دیں۔“ اس نے اپنی بات پر اصرار کیا۔

”ٹھیک ہے۔ آپ اعظم کو کل سے ملوا کر لائیں۔“

”فیصل نے معذرت کے لیے بھیجے گئے خط کے ساتھ تمہاری آزادی کا پروانہ بھی بھجوایا تھا۔ وہ خود بھی یہ بات سمجھ گیا تھا کہ تم دونوں کا رشتہ ایک بوجھ کے سوا کچھ نہیں ہے اس لیے اس نے اپنی شرمندگی کو ثابت کرنے کے لیے تمہیں اس بوجھ سے نجات دے دی تھی۔“ انہوں نے کوشش کی کہ اس خبر کو سناتے ہوئے ان کا لہجہ بالکل پرسکون ہوتا کہ وہ بھی پرسکون رہے۔

”شکر ہے اس شخص نے بھی کسی موقع پر انسانیت کا ثبوت دیا۔ بس اب تم مطمئن ہو جاؤ اور ساری توجہ اپنی صحت پر مرکوز کر دو۔ تمہاری دل پاور تمہیں اسپتال کے اس بستر سے نجات دلانے میں سب سے اہم کردار ادا کرے گی۔“ عالم شاہ نے باپ کا مقصد سمجھتے ہوئے خود بھی ہلکا پھلکا انداز اختیار کیا۔

”میں تھک گئی ہوں اور کچھ دیر آرام کرنا چاہتی ہوں۔“ اتنی ساری باتوں کے جواب میں سخل نے صرف ایک جملہ ادا کیا اور نیکی پر سر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔ اس کے اس انداز پر سکینہ شاہ کے چہرے پر اضطراب پھیل گیا اور انہوں نے تشویش زدہ نظروں سے صداقت شاہ کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں بھی انہیں اپنی کیفیت ہی کا عکس دکھائی دیا۔

”پلیز، اماں اور بابا! آپ لوگ باہر چلیں۔ سخل واقعی تھک گئی ہوگی۔ مجھے خیال نہیں رہا ورنہ ڈاکٹر نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ پیشینہ سے زیادہ دیر گفتگو نہیں کرنی ہے۔“ عالم ان دونوں کو اپنے ساتھ لیے باہر وینٹک روم میں آ گیا۔ سکینہ شاہ نے باہر نکلتے نکلتے بھی کئی بار مڑ کر سخل کی طرف دیکھا۔

”نہ پریشان ہوں اماں! میں اس وقت سخل کے لیے دعا کریں۔ اسے اس وقت سب سے زیادہ دعاؤں کی ضرورت ہے۔“

”وہ تو میں ہر وقت کرتی رہتی ہوں بیٹا! لیکن تم مجھے اس کے پاس سے اٹھا کر کیوں لے آئے۔ طلاق کی خبر سن کر مجھ گئی ہے وہ۔ اسے اس وقت میرے سہارے اور توجہ کی ضرورت ہے۔“ انہوں نے اظہار کر ہی دیا کہ اس وقت سخل کے پاس سے ہٹائے جانے کا عمل انہیں پسند نہیں آیا ہے۔

”میں جانتا ہوں اماں! میں سمجھتا ہوں کہ چاہے عورت اپنی خواہش پر ہی طلاق لے لیکن اسے اس لفظ سے جھٹکا ضرور لگتا ہے۔ سخل کو بھی یہ جھٹکا لگا ہے لیکن وہ خود اپنے آپ کو سنبھالے گی۔ ہم میں سے کسی نے اگر ایک لفظ بھی اہم ردی کا ادا کیا تو اسے ناگوار گزرے گا۔“

میں ذرا اتناں اور بابا سائیں کو دیکھتا ہوں۔“ عالم کچھ غلٹ میں کہہ کر تیزی سے باہر نکل گیا کہ سکینہ شاہ اور صداقت شاہ باہر جا چکے تھے اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اجنبی جگہ ہونے کی وجہ سے انہیں کسی قسم کی پریشانی کا سامنا کرنا پڑے۔

”میں اندر آسکتی ہوں؟“ اس کے جانے کے بعد نیلی نے ملحقہ کمرے کے دروازے پر دستک دی اور نرمی سے پوچھا۔ سہل کے پاس انکار کی گنجائش نہیں تھی کہ اس کی گود میں موجود اعظم خود سب سے بڑا اجازت نامہ تھا۔

”آ جاؤ پلیز!“ وہ ذہنی و جسمانی دونوں طور پر تھک چکی تھی اس لیے اٹھ کر بیٹھنے کی توہمت نہیں کر سکی لیکن کوشش کر کے ہونٹوں پر ہنس سجایا۔

”ہم لوگ یہاں سے جا رہے تھے تو میں نے سوچا اعظم کو آپ سے ملوا دوں۔“ نیلی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے اس کے قریب جا پہنچی۔

”اعظم کو کہاں لے جا رہی ہو؟ اسے یہاں میرے پاس ہی رہنے دو نا۔“ سہل بیٹے کے جانے کا سن کر بے چین ہونے لگی۔

”یہاں کسی کو، اسپیشلی بچوں کو رکھنے کی اجازت نہیں ہے نا تو مجبوراً ہمیں اعظم کو لے جانا پڑے گا لیکن آپ فکر نہ کریں۔ کل میں اسے آپ سے ملانے ضرور لاؤں گی۔“ نیلی نے اسے تسلی دی اور اعظم کو اس کے قریب ہی بستر پر بٹھا دیا جس پر اعظم کچھ ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے ٹھنک کر اس سے واپس گود میں لینے کی فرمائش کرنے لگا۔

”اچھا ہے یہ ہمیں بھول کر تم سے مانوس ہو گیا ہے۔ کم از کم ہمارے دنیا سے جانے کے بعد یہ ہماری ممتا کے لیے ہڑکے گا تو نہیں۔“ سہل کے لہجے کی حسرت و یاسیت نے نیلی کے دل پر چرچہ کا سا لگایا۔ وہ دن رات مومی کے جانے کے غم میں اندر ہی اندر سنگتی رہتی تھی اور اسے لگتا تھا کہ دنیا کا کوئی غم اس کے غم سے بڑا نہیں ہے لیکن یہاں ایک ماں جس بے بسی سے دو چار تھی، اس نے اس کے دل پر گہرا اثر کیا۔

”ماپوس نہ ہوں۔ اللہ آپ کو ضرور صحت دے گا اور آپ اپنی آنکھوں سے اپنے بیٹے کی ساری خوشیاں دیکھیں گی۔“ دینے کو تسلی کے سوا اس کے پاس بھی کچھ نہیں تھا۔ سہل اس تسلی پر دھیان دینے کے بجائے اعظم کو پیار کرنے لگی۔ اب وہ ملاقات کے پہلے لمحے کے جذباتی پہچان سے کھل چکی تھی اور قدرے سکون سے اعظم کو پیار کر رہی تھی اس لیے اس کے بازو پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہاں کسی چیز کی موجودگی کو محسوس کر لیا۔

”یہ کیا ہے؟“ اس نے فوراً ہی اعظم کی آستین اوپر کی اور اعظم کے بازو پر تعویذ کے سے انداز میں بندھی کوئی شے دیکھ کر شدید حیرت سے دریافت کیا۔

”یہ معاذ بھائی نے اس کے بازو پر باندھا تھا۔ انہوں نے بتایا تھا کہ اس کپڑے میں ایک حیرت انگیز پتھر سلا ہوا ہے۔ یہ پتھر انہیں کسی ہندو جوگی نے دیا تھا۔ اس پتھر کی خصوصیت یہ ہے کہ اگر کسی شخص کے جسم کو چھو رہا ہو تو اس کے جسم کا کوئی سنگل کہیں نہیں پکڑا جاتا۔ یہاں تک کہ سانپ بچھو اور دیگر کیڑے مکوڑے بھی اس فرد سے دور رہتے ہیں۔“ اس نے معاذ کی فراہم کردہ معلومات سے سہل کو آگاہ کیا۔

”یہ تو کوئی بہت ہی الوکھا اور طلسماتی پتھر ہے۔“ سہل نے سن کر حیرت کا اظہار کیا۔

”کچھ ایسی ہی بات ہے۔ میں آپ کو بتاؤں کہ جب تک یہ پتھر اعظم کے بازو پر نہیں بندھا تھا، ہم اسے لے کر جہاں بھی جاتے تھے، دشمن ہمارے پیچھے پیچھے وہاں پہنچ جاتے تھے لیکن اس کو باندھنے کے بعد سے اتنا سکون ہو گیا ہے کہ ہم اعظم کو لے کر یہاں تک آگئے ہیں اور کسی کو خبر ہی نہیں ہو سکی ہے۔“ نیلی پتھر کی خصوصیات بتا رہی تھی اور سہل کے چہرے پر کئی رنگ آکر گزرتے جا رہے تھے۔

”اس پتھر کو معاذ صاحب خود باندھا کرتے تھے؟“ اس نے اپنے اندازے کی تصدیق کے لیے نیلی سے پوچھا۔ ”بالکل جی۔ معاذ بھائی کے کون سے تھوڑے دشمن ہیں۔ سارا وقت تو جان ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں۔“ نیلی کے روانی سے دیے جواب پر اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ اس شخص کے اپنے لیے ایثار کی حد پر آبدیدہ تھی جس کے لیے اس کے مفاد کے آگے اپنی جان کی بھی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

ایسے کون کسی کو چاہتا ہے؟
اتنی شدت کس کے جذباتوں میں ہوتی ہے؟
کون آن کی محبت کے لیے اس حد تک جاتا ہے؟
ہر سوال کے جواب میں اس کے سامنے بس ایک نام تھا۔ معاذ احمد ولد خاور احمد کا نام۔

☆☆☆

”تو یہ تمہارا حتیٰ فیصلہ ہے؟“ تاجور نے مہناز کی طرف کھوجتی نظروں سے دیکھا۔
”بالکل حتیٰ، قطعی نا قابلِ تہدیل۔“ مہناز نے اٹل لہجے میں اسے جواب دیا۔
”کیا تمہیں یہ لگ رہا ہے کہ اب باذل کبھی واپس

نہیں آئے گا؟“

”مجھے اس کے آنے نہ آنے سے کوئی غرض نہیں ہے۔“
”ادہ.....!“ تاجور نے اپنے ہونٹوں کو گولائی میں
سکیز کر اس کے پورے وجود پر ایک طنزیہ نظر ڈالی۔
”اتنی بہادری..... اتنی بہادری کہاں سے آئی
تمہارے اندر؟“

”بازل ہی کی دین ہے۔ میں نے اس کی رکھیل بننا
اس لیے قبول کیا تھا کہ آوارہ کتوں کے جڑوں تلے
بھنبھوڑے جانے سے بچ کر کسی ایک محفوظ ٹھکانے پر رہ
سکوں لیکن اس نے خود مجھے اس بری طرح بھنبھوڑا کہ میں
جیتے جی موت کا ذائقہ چکھ آئی اور جو موت کا ذائقہ چکھ لیتا
ہے نا..... وہ پھر ہر خوف سے آزاد ہو جاتا ہے۔“ مہناز کی
آنکھوں میں بازل کے لیے واضح نفرت تھی۔

”وہ آخری بار کب آیا تھا تمہارے پاس؟“ تاجور
نے بے بس سے لہجے میں پوچھا تو مہناز نے ہل بھر میں اس
سچی سنوری، طرح دار عورت کو کسی بوسیدہ کنڈر میں ڈھلتے
محسوس کیا۔ کردار و مزاج کیسے ہی سہی، وہ بھی تو ایک عورت
ہی جو بے شک کتنے ہی رنگوں میں پائی جائے، مٹا کارنگ
اس کے ہر رنگ پر غالب رہتا ہے۔

”میں اس کے آنے کو بھول گئی ہوں اور مجھے صرف
یہ یاد ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے میری زندگی سے نکل چکا ہے۔
اگر بھی آپ کی اس سے ملاقات ہو تو اسے یہ بات ضرور
بتا دیجیے گا۔ دوسری صورت میں اب نقصان میرا نہیں، اس کا
ہوگا۔“ بے شک اس ایک ہل میں مہناز نے میڈم تاجور کے
لیے اپنے دل میں ہمدردی محسوس کی تھی لیکن اس کا اظہار غیر
ضروری سمجھا تھا۔ ایک ایسی عورت جو اپنے بیٹے کو معاشرے
کا ناسور بنانے میں پوری طرح ملوث تھی کسی صورت
ہمدردی کے لائق نہیں تھی۔

”کس کی شہ پر اتنا زور دکھا رہی ہو؟“ تاجور نے
اسے تیز نظروں سے دیکھا۔

”میں صرف یہ سمجھ گئی ہوں کہ آپ کا بیٹا کوئی شہ زور
نہیں ہے جو میں اس سے ڈر کر رہوں۔ یہ میری زندگی ہے
اور اسے میں خود گزاریوں گی۔“ آج وہ بھی کسی سے دہنے کے
لیے تیار نہیں تھی۔

”میرے اتنے احسانات کا یہ بدلہ دے رہی ہو تم؟
یاد ہے جب میرے پاس آئی تھیں تو کچھ بھی ڈھنگ سے
نہیں جانتی تھیں۔ یہ میں تھی جس نے تمہیں اتنا گرم کیا کہ تم
ہر کسٹمر کی ڈیمانڈ مین بن گئیں۔“

”سارا اکمال آپ کا ہی تھا تو پھر کیا مسئلہ ہے؟ آپ
کے سیلون میں درجنوں لڑکیاں ہیں۔ کریں انہیں گرم اور
بنادیں سب کو مہناز۔ رہی جہاں تک احسان کی بات، تو مت
بھولیں کہ آپ نے مجھ پر جتنی انو۔ سلیمٹ کی تھی، اس سے کئی
گنا زیادہ پرائفٹ حاصل کر چکی ہیں۔ اس لیے اب میری
طرف آپ کا کوئی حساب نہیں بنتا۔“ مہناز نے بھی اسے
دو ٹوک جواب دیا اور شانے سے بیگ لٹکا کر کھڑی ہو گئی۔

”اگر تم میرے سیلون میں کام جاری رکھو تو میں تمہیں
موجودہ پینچ سے تین گنا زیادہ سٹری دوں گی۔“ تاجور جانتی
تھی کہ اس کے پاس کام کرنے والی لڑکیوں میں جو کوالٹی
مہناز کے کام کی ہے، وہ کسی اور میں نہیں اس لیے ساری اکڑ
چھوڑ کر سودے بازی شروع کر دی۔

”اس قدر دانی کا شکریہ۔“ مہناز کے ہونٹوں پر ایک
طنزیہ سی مسکراہٹ دوڑی۔

”پھر تم کب سے ہمیں دوبارہ جوائن کر رہی ہو؟“
تاجور نے اس کی مسکراہٹ کا مفہوم سمجھے بغیر بے چینی سے
پوچھا اور سگریٹ کیس سے ایک سگریٹ نکال کر لائٹر کی تلاش
میں ادھر ادھر نظر پڑا تو ڈر آنے لگی۔ لائٹر، ایٹش ٹرے کے ساتھ
ہی پڑا تھا لیکن اپنی مضطرب کیفیت کی وجہ سے وہ اسے فوکس
نہیں کر سکی۔ مہناز نے جبکہ کر لائٹر اٹھایا اور اسے جلا کر تاجور
کے ہونٹوں کے بیچ دیا سگریٹ سلگاتے ہوئے بولی۔

”میری طرف سے یہ ہماری آخری ملاقات ہے اور
میری خواہش ہے کہ آئندہ اتفاقاً بھی آپ یا آپ کے بیٹے
سے میرا سامنا نہ ہو۔“ اپنی کہہ کر وہ پٹی اور تیز قدموں
سے باہر کی طرف بڑھ گئی۔ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس وقت
سگریٹ نہیں، میڈم تاجور کو سلگا کر جا رہی ہے۔

”بہت دیر لگا دی واپسی میں۔“ وہ باہر گاڑی میں
بشری کو اپنا خطر چھوڑ کر آئی تھی۔ جیسے ہی دروازہ کھول کر
ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی، بشری بول اٹھی۔

”دیرینہ شناساؤں کو الوداع کہنے میں کچھ وقت تو لگ
ہی جاتا ہے۔“ مہناز کے لبوں پر ایک چمکی سی مسکراہٹ دوڑی۔
اس سے قبل کہ بشری کوئی جوابی جملہ کہتی، اس کا موبائل بجنے
لگا۔ معاذ کی کال آ رہی تھی۔ اس نے کال ریسیو کی۔

”ایک منٹ حریہ وہیں رکی رہو اور اپنے ہاتھیں
جانب دیکھو۔“ معاذ نے بغیر کسی تمہید کے اسے ہدایت دی تو
بے ساختہ اس کی گردن گھوم گئی۔ وہاں ایک بڑی گاڑی آ کر
رکی تھی اور اس کے چاروں دروازے تیزی سے کھلے تھے۔
ان دروازوں نے بیک وقت چار نومند قلاب پوشوں کو اگلا۔

وہ چاروں بائیں جانب کے عقبی دروازے پر جمع ہوئے اور عقبی نشست سے ایک گھڑی سی کھینچ کر نکالنے کے بعد اسے اپنے ہاتھوں پر اٹھائے فٹ پاتھ کی طرف بڑھے۔ گھڑی کو فٹ پاتھ پر رکھ کر وہ واپس پلٹے تو بشری کو پہلی بار اندازہ ہوا کہ فٹ پاتھ پر رکھی جانے والی شے محض گھڑی نہیں ہے۔ وہ ایک انسانی وجود تھا۔ وہ فون کان سے لگائے لگائے ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر نکلی۔ مہناز جو گاڑی اسٹارٹ کر چکی تھی، اس کی اچانک حرکت پر چونک گئی۔

”کہاں جا رہی ہو؟“ اس نے آواز لگا کر پوچھا لیکن بشری کو اسے جواب دینے کی فرصت نہیں تھی۔ اس کی نظریں فٹ پاتھ پر پڑے انسانی وجود اور کان معاذ کی آواز پر لگے تھے۔ یہاں تک کہ اس نے گاڑی میں تیزی سے بیٹھ کر روانہ ہوتے نقاب پوشوں پر بھی دھیان نہیں دیا تھا۔

”تمہاری خواہش بھی نا کہ وہ مردوں سے بدتر حالت میں کسی ایسی جگہ پر پڑا ہو جہاں ہر وقت بہت سی عورتوں کا آنا جانا ہو اور وہ انہیں دیکھ دیکھ کر شدت سے اپنی گناہ آلود زندگی کو یاد کرے۔ لو، تمہاری وہ خواہش پوری ہوئی۔ تمہارا مجرم اپنے بدترین انجام کو پہنچا۔“ معاذ بول رہا تھا اور وہ قدم قدم اس بے جان گھڑی کی طرف بڑھ رہی تھی جس کے پورے وجود میں صرف آنکھیں ہی حرکت کر سکتی تھیں۔ وہ اس گھڑی کے مقابل جا کر کھڑی ہوئی تو کال کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور گھڑی کی آنکھیں گردش کرتی اس کے چہرے پر آٹھہریں۔ بالوں سے بالکل محروم، بالکل انڈے کی طرح چکناس، منہ دل ہوتے زخموں سے بھری پیشانی، سوراخ زدہ چلے ہوئے رخسار جن سے اس کے ٹوٹے ہوئے جڑے بھی صاف دکھائی دے رہے تھے اور قطعی بے حس و حرکت جسم.....

کون کہہ سکتا تھا یہ وہی ہے جو لوگوں کو بدترین اذیت سے گزارنے کی قدرت رکھتا تھا۔ جس کے ایک اشارے پر لوگوں کے جسموں سے روح کھینچ لی جاتی تھی۔ جو طاقت کے زعم میں بے بسوں کو روندنا پھرتا تھا اور جس کی آنکھوں میں ہر وقت شیطانیات ناچتی رہتی تھی۔ وہ نظریں جو کسی نسوانی وجود پر پڑتی تھیں تو بے ساختہ ہی ان کی زد میں آنے والی اپنا جسم چمکانے لگتی تھی، آج اس طرح بشری کے چہرے پر لگی تھیں کہ ان میں بے بسی کے سوا کوئی رنگ نہیں تھا۔ ان نظروں کی بے بسی دیکھ کر اسے وہ وقت یاد آیا جب اس کی پردے دار ماں اس حیوان کی ہوس کی بھینٹ چڑھ رہی تھی اور وہ اور اس کا باپ اپنی جگہ بے بس پڑے بری طرح تڑپ رہے تھے۔

”تھینک یو معاذ!“ وہ زیر لب بڑبڑائی اور زمین پر نفرت سے تھوک کر واپسی کے لیے پلٹی۔

”اوہ مائی گاڈ.....!“ پلٹتے ہی اس نے اپنے پیچھے کھڑی مہناز کو دیکھا جو اس کی بے خبری میں گاڑی سے اتر کر وہاں تک آگئی تھی۔

”کتنی بری حالت ہے اس شخص کی لیکن عجیب سی بات ہے کہ اسے دیکھ کر ترس آنے کے بجائے کراہمت سی محسوس ہو رہی ہے۔“ مہناز نے بولتے بولتے بے ساختہ ہی ایک ابکائی لی۔

”بعض لوگ اپنے کرتوتوں کے سبب برے حالوں کو پہنچتے ہیں اور یہ قدرت کی طرف سے ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں سے ہمدردی کے بجائے نفرت و کراہمت محسوس ہوتی ہے۔“ بشری نے سپاٹ سے لہجہ میں اس کی بات کا جواب دیا۔

”شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن اس سانس لیتے گوشت کے لوتھڑے کو اپنی حاجات پوری کرنے کے لیے کچھ تو چاہیے نا۔“ مہناز نے اپنے بیگ میں ہاتھ ڈال کر چند چھوٹی مالیت کے نوٹ نکالے اور اس کی طرف اچھال دیے۔ یہ تماشا بین کے تماشا بننے کا آغاز تھا۔

”چلو، چلیں یہاں سے۔“ بشری نے مہناز کا بازو پکڑ کر کہا۔

”ہاں چلو، آگے ویسے ہی بہت کام پڑے ہیں۔“ مہناز پر غلٹ سوار ہونے لگی اور وہ بشری سے بھی تیزی سے پلٹ کر گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ بشری نے پلٹ کر ایک بار پھر اس گھڑی کی طرف دیکھا۔ یکدم ہی ایک چھوٹا سا چوہا اس کی نظروں کے حصار میں آیا۔ چوہا اپنے ننھے ننھے دانتوں سے اس کے ہیر کے انگوٹھے کو کتر رہا تھا۔ اسے حین یاد آیا۔ والدین کے اس اکلوتے لخت جگر کو اس وحشی نے بے بس کر کے اس پر چوہے چھوڑ دیے تھے اور وہ بیچارہ معاذ سے دوستی نبھانے کی پاداش میں تڑپ تڑپ کر اپنی جان سے چلا گیا تھا۔ حنین کے علاوہ بھی جانے کتنے مظلوم تھے جو اس انسان نما جانور کی وحشت کی بھینٹ چڑھے تھے اور ان سارے مظلوموں کا حساب لینے کا آغاز ہو گیا تھا۔ وحشی، ناقابل شناخت، بے بس وجود کے ساتھ اپنی ماں کے آرائش حسن کے اڈے کے باہر بے یار و مددگار پڑا تھا اور اس میں سکت نہیں رہی تھی کہ یہاں سے سنور کر جانے والے حسن کو دیکھ کر کچھ فلفل سوچ سکے۔ فیت خراب کرنے کے زمانے لد چکے تھے۔

”آجی جا دیارا“ ذرا نیونگ سیٹ پر بیٹھ چکی مہناز

انکھیلیوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

”ہم بس پہنچنے ہی والے ہیں۔“ ایک چڑھائی چڑھتے ہوئے آگے چلتے سائے نے اسے دھیمی آواز میں آگاہ کیا۔

”ہوں۔“ اس نے محض ہنکارا بھرنے پر اکتفا کیا اور اپنے سفری بیگ کو ایک شانے سے دوسرے شانے پر منتقل کرتے ایک بار پھر ہوا کو سونگھا۔ ہوا میں بسی وہ مہک عجیب سی مانوسیت لیے ہوئے تھی اور راستے کی چڑھائی اسے اس چھوٹے سے گاؤں کی یاد دلاتی تھی جہاں کچھ دن قبل وہ اپنی زندگی کے یادگار اور پرسکون ترین دن گزار کر آیا تھا۔ موسموں میں اگرچہ خاصا فرق تھا اور وہ گاؤں اس وادی جتنا سرسبز و شاداب نہیں تھا لیکن اپنایت کے رشتے نے اس کے لیے دونوں جگہوں کو ایک جیسا کر دیا تھا۔

”بس ہم پہنچ ہی گئے ہیں۔“ پیچھے چھوڑے گئے گاؤں سے واپس یادوں کا دریچہ ذہن میں کھلتا اس سے قبل ہی آگے چلتے شخص کی آواز اسے پوری طرح ماحول میں واپس لے آئی اور اس نے آنکھیں پھاڑ کر اپنے اطراف کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ سورج ابھی نمودار نہیں ہوا تھا لیکن تاریکی پہلے کے مقابلے میں قدرے چھٹ گئی تھی اور غور کرنے پر مکانات کے دھندلے سے ہولے دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے آگے چلتے سائے نے ایک مکان کے بند دروازے پر رک کر دستک دی تو وہ پوری جان سے متوجہ ہو گیا۔ اس دروازے کے کھلنے پر وہ اپنی زندگی کے ایک نئے دور میں داخل ہونے والا تھا۔

”کون؟“ دوسری دستک پر دروازے کے پیچھے سے قدموں کی ہلکی آہٹیں سنائی دیں اور کسی نے نحیف سی آواز میں استفسار کیا۔ اس استفسار میں خوف کی بھی جھلک تھی۔

”دروازہ کھولے چچی جان ایہ میں ہوں جبار علی!“

”جبار علی!“ اندر سے حیرت بھرے انداز میں نام دہرایا گیا اور پھر کھٹ سے دروازہ کھل گیا۔ گھر کے صحن میں ہلکے پاؤں کا بلب جل رہا تھا جس کی روشنی میں انہیں ایک سرخ و سفید لیکن بوڑھی اور کمزور عورت دکھائی دے رہی تھی۔ وہ آنکھوں کو جس طرح سیڑ کر دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی، اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کی بیٹائی کمزور ہے۔

”ہمیں اندر آنے کی اجازت ہے چچی جان؟“ جبار علی نے نرمی سے استفسار کیا تو وہ تھوڑی سی کھسیا لیکن اور پیچھے ہٹتے ہوئے بولیں۔

”کیوں نہیں بیٹا تمہارا اپنا ہی گھر ہے۔ بڑھاپے کی

نے اسے بلند آواز سے پکارا تو وہ چونک کر گاڑی کی طرف چل پڑی۔

”تھینک یو۔“ گاڑی چلی تو اس نے چپکے سے ایک پیغام معاذ کی طرف روانہ کیا۔

”تمہارے پاس کال کس کی آئی تھی؟“ مہناز نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے سرسری لہجے میں اس سے پوچھا۔

”معاذ تھا۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ تمہارے ساتھ میڈم تاجور کے سیلون جارہی ہوں تو بس اسی لیے خیریت پوچھنے کے لیے کال کی تھی۔“ سارے سچ بتانے ضروری نہیں تھے اس لیے اس نے بات بنا دی۔

”میڈم اس بد صورت اور گندے فقیر کو زیادہ دن اپنے سیلون کے سامنے ٹکنے نہیں دے گی اور اٹھا کر کہیں پھینکوا دے گی۔“

”اسی کی گند ہے، جہاں مرضی چاہے پھینکے۔ ہمیں کیا کرنا ہے۔“

”ہیں..... کیا مطلب؟“ مہناز اس کے الفاظ پر چونکی۔

”مطلب وہ اپنے اطراف کی صفائی کے لیے جو مرضی چاہے کرے، ہمیں تو اپنا کام کرنا ہے۔“ وہ جلدی سے بات بنا گئی۔ مہناز نے بھی زیادہ تجسس کا اظہار نہیں کیا۔ وہ دونوں زندگی کو نئے سرے سے شروع کرنے جا رہی تھیں اور ہر بات سے بڑھ کر اسی امر پر توجہ مبذول رکھنی تھی۔

☆☆☆

ابھی صبح کے نمودار ہونے میں کچھ وقت تھا اور وادی پر تاریکی سی چھائی ہوئی تھی۔ اس تاریکی میں دوسائے بہت احتیاط سے دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہے تھے۔ دونوں کے قدموں پر تھے لیکن ایک چھری رے بدن اور دوسرا خاصے بھاری جوتے کا مالک تھا۔ بھاری جوتے والا یوں دو قدم آگے چل رہا تھا جیسے راہنمائی کا فریضہ انجام دے رہا ہو لیکن پیچھے چلتے والے کی چال بھی اعتماد سے خالی نہیں تھی۔ زندگی میں پہلی بار اس سرزمین پر قدم رکھنے کے باوجود وہ اس کے لیے اپنے اندر اجنبیت محسوس نہیں کر رہا تھا۔ ایک گہری اپنایت تھی جو اس کے گرد لپیٹی اسے اس سرزمین کے ساتھ رشتے کا احساس دلارہی تھی اور وہ یوں محسوس کر رہا تھا جیسے وادی میں چلتی خوشبودار ٹھنڈی اور فرحت بخش ہوا اس کے وجود کو چوم چوم کر اسے خوش آمدید کہہ رہی ہو۔ ہوا کی یہ انکھیلیاں اس کے دل کو اتنی بھاری تھیں کہ وہ آگے درپیش صورت حال کی نزاکت کے بارے میں غور کرنے کے بجائے ہوا کی ان

وجہ سے آنکھیں دھندلا گئی ہیں نا اس لیے لوگوں کو پہچاننے میں تھوڑی دقت ہوتی ہے۔“ انہیں اپنے ساتھ اندر کی طرف لے جاتے ہوئے وہ شرمندہ شرمندہ سی وضاحت پیش کر رہی تھیں۔
”کوئی بات نہیں چچی جان! میں آپ کی آنکھوں کی روشنی ساتھ لے کر آیا ہوں۔ ان شاء اللہ اب آپ کو آرام مل جائے گا۔“

”کیا مطلب؟“ انہوں نے اندرونی حصے کا پٹ وا کرتے ہوئے چونک کر جبار علی سے پوچھا۔

”مطلب اندر بیٹھ کر آرام اور سکون سے بتاتا ہوں۔“
”کون ہے زرینہ، کون آیا ہے اس وقت؟“ عورت جبار علی سے مزید کوئی سوال کرتی، اس سے قبل ہی اندر سے کسی نے اسے پکار کر پوچھا۔ پوچھنے والے کی آواز بھاری اور گرج دار تھی اس کے باوجود اس میں بڑھاپے کی جھلک محسوس ہو رہی تھی۔

”اپنا جبار علی ہے۔ کسی دوست کے ساتھ آیا ہے۔“ عورت نے اشارے سے انہیں اپنے ساتھ اندر چلنے کو کہا اور ساتھ ساتھ استفسار کرنے والے کو بھی جواب دیا۔ عورت کی راہنمائی میں اندرونی کمرے میں داخل ہوتے ہی انہیں بڑے سے پتنگ پر بیٹھا کمزور سا بوڑھا دکھائی دے گیا۔ بوڑھے کی بے نور آنکھیں داخلی دروازے پر ہی ٹکی ہوئی تھیں۔ پیدائشی طور پر ٹاپینا ہونے کی وجہ سے اس کی حیات بہت تیز تھیں اور اس نے قدموں کی آہٹ سے ہی ان لوگوں کے اندر داخل ہو جانے کا اندازہ لگالیا تھا چنانچہ بروقت ان کے استقبال کے لیے کھڑا ہو گیا۔ کھڑے ہونے پر اس کی دراز قامتی نمایاں ہو گئی۔

”بہت زمانے بعد چکر لگایا جبار علی! میں تو سمجھا تھا کہ تم ہم بوڑھوں کو بھول گئے ہو۔“ بوڑھے نے جبار علی سے گرجوٹی سے معافہ کرتے ہوئے ہلکا سا شکوہ بھی کیا۔

”یہ کیسے ممکن ہے آغا جان کہ میں آپ کو بھول جاتا لیکن آپ کو میری زندگی کے رنگ ڈھنگ کا اندازہ ہے کہ اس میں کچھ بھی طے شدہ نہیں اور اکثر تو مجھے خود بھی نہیں پتا ہوتا کہ آنے والے دن میں کہاں اور کس جگہ ہوں گا اسی لیے چاہتے ہوئے بھی اپنے پیاروں کی آنکھیں ٹھنڈی نہیں کر پاتا۔“ جبار علی نے بہت نرمی سے بوڑھے کے شکوے کا جواب دیا۔

”اتنے عرصے بعد آیا ہے بچہ، ساتھ میں مہمان بھی ہے اور آپ نے اسے آرام سے بٹھانے کے بجائے شکوے شکایتوں میں الجھالیا ہے۔“ اس موقع پر عورت نے آگے بڑھ کر بوڑھے کو ٹوکا اور پھر ان دونوں سے مخاطب ہو کر بولی۔

”بیٹھو بچو..... یا اگر منہ ہاتھ دھو کر تازہ دم ہونا چاہتے ہو تو ہو جاؤ، میں اتنی دیر میں تم لوگوں کے لیے کچھ کھانے پینے کا انتظام کرتی ہوں۔“

”صرف قہوہ تیار کر لیں چچی جان! ناشتا ہم سوزج نکلنے کے بعد اطمینان سے کریں گے۔“ جبار علی نے ان سے کہا تو وہ سر ہلاتے ہوئی باہر نکل گئیں۔

”چچی جان بہت کمزور ہو گئی ہیں۔“

”بڑھاپے سے زیادہ غم نے من لگا دیا ہے۔ رورو کر آنکھیں بھی کمزور کر لی ہیں۔ بہت سمجھاتا ہوں کہ مجھ پیدائشی اندھے کا تم ہی واحد سہارا ہو لیکن اس کی ممتا کو قرار ہی نہیں آتا۔ عمار کو بس جتنا ہی نہیں تھا اس نے باقی تو ماں ہونے کے سارے فرائض جی جان سے ادا کیے تھے۔ دس سال کی پیاسی ممتا کا سارا پیار اس نے عمار پر انڈیل دیا تھا اور سترہ سال تک یوں سچ سچ اس کی پرورش کی تھی جیسے مرنے اپنے چوزوں کو اپنے پروں میں چھپا کر پالتی ہے لیکن پھر جانے کیسے وہ اس سے چھن گیا۔ پورے چھ سال سے وہ اس کے لیے بن پانی کی پھلی کی طرح ترپ رہی ہے۔“ بوڑھے کے لہجے میں محسوس کیا جانے والا دکھ تھا۔ جبار علی کے پہلو میں بیٹھے جوان نے اسے ترحم آمیز نظروں سے دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔

”چچی جان جیسی عمدہ خاتون کو اس تکلیف سے گزرتے دیکھ کر مجھے بھی بہت دکھ ہوتا ہے۔ مجھے اب تک بچپن کے وہ دن یاد ہیں جب آپ کی ان کے ساتھ شادی ہوئی تھی اور وہ دلوں میں ہم سب بچوں کی سب سے پسندیدہ چچی بن گئی تھیں۔“ جبار علی ماضی میں جھانکتا خود بھی زرینہ بی بی کے لیے اداس ہو گیا۔ اس کی اداسی کو محسوس کر کے بوڑھے نے بات بدل دی۔

”جانے دو بیٹا ان باتوں کو۔ ماضی کو کریدنے سے تکلیف کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ ابھی تو تم مجھے اپنے دوست کے بارے میں بتاؤ۔ بھارہ جب سے آیا ہے، خاموش بیٹھا ہوا ہے۔ تم نے بھی اس کا تعارف نہیں کروایا۔“
”چچی جان آجائیں تو ان کے سامنے ہی تعارف کر داتا ہوں۔ یوں سمجھیں کہ آج میں آیا ہی اس لیے ہوں کہ اسے آپ سے تعارف کروا سکوں۔“

”تم نے تو مجھے تجس میں ہی جتا کر دیا۔“ جبار علی کے معنی خیز لہجے پر بوڑھے نے تبصرہ کیا۔

”سمجھیں آج میں آپ کے لیے ایک سر پرانے لے کر آیا ہوں۔“ جبار علی مسکرایا۔

گئیں۔ ”وہ جھینپے جھینپے سے منے۔

”دس ازناٹ فیئر آغا جان! آپ ہمیشہ چچی جان کو ایسے ہی تنگ کرتے ہیں۔“ جبار علی نے بھی زمینہ بی بی کی سائڈ لی۔
”جانتا ہوں نا کہ کتنا بھی تنگ کروں، یہ مجھ سے تنگ نہیں پڑے گی۔ یہ اس کا ہی حوصلہ ہے کہ اتنے برسوں سے مجھ اندھے سے نبھائے جا رہی ہے ورنہ اسے بھلا کی بھی کوئی۔“
”اچھا، اب فضول مت بولے۔ آپ کو پتا ہے نا کہ مجھے آپ کا خود کو یوں اندھا کہنا اچھا نہیں لگتا۔“ زمینہ بی بی گویا تڑپ گئی تھی۔

”مثالی محبت ہے ہماری چچی جان اور آغا جان کے بیچ۔ خاندان کی حسین ترین لڑکی ہوتے ہوئے انہوں نے بے شمار رشتوں میں سے آغا جان کا انتخاب کیا تھا۔“ جبار علی نے ہنستے ہوئے اپنے ساتھی کو آگاہ کیا۔

”ہماری بات چھوڑو بچے اور ہمیں اپنے دوست کے بارے میں بتاؤ۔ میرا اندازہ ہے کہ تم اتنے عرصے بعد اس کے ساتھ یہاں آئے ہو تو یہ بلا وجہ نہیں ہے۔ کوئی نہ کوئی مقصد ہے تمہارا۔“ زمینہ گل نے خود کو سنبھال کر اسے ٹوکا۔

”آپ بہت ذہین ہیں چچی جان!“
”خوشامد نہیں، سیدھی بات کرو۔“ وہ اپنی تعریف کو خاطر میں نہ لائیں۔

”اس کی داستان یہ ہے کہ یہ جب سترہ سال کا تھا تو ایک رات والدین کے نام خط چھوڑ کر چپکے سے گھر سے نکل گیا۔ خط میں اس نے والدین کو اطلاع دی تھی کہ مجاہدین کے ساتھ شامل ہونے جا رہا ہے لیکن.....“

”لیکن کیا؟“ زمینہ کے چہرے کا رنگ لحوں میں نچڑ گیا تھا اور وہ آنکھیں سکیڑے بہت غور سے جبار علی کے پہلو میں بیٹھے لڑکے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ ان کے ساتھ بیٹھے آغا گل کے چہرے پر بھی حیرت تھی۔

”لیکن یہ کہ اپنی منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی راستے میں اس کے ساتھ حادثہ پیش آ گیا۔ اندھیرے میں ٹھوکر کھا کر پہاڑ سے ایسا گرا کہ خود کو سنبھال ہی نہیں سکا اور سر پر گہری چوٹ کھا بیٹھا۔ صبح لوگوں نے زخمی حالت میں پڑا دیکھا تو اسپتال پہنچایا۔ وہاں علاج سے اس کی جان تونج گئی لیکن یادداشت چلی گئی۔ بس پھر یہ بھول گیا کہ کہاں سے آیا ہے اور کس مقصد کے تحت گھر سے نکلا تھا۔ زندگی کے چھ برس اس نے جگہ جگہ بھٹکتے اور محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتے ہوئے گزارے ہیں۔ بہت سے خالوں کے درمیان اس کا کچھ مہربان لوگوں سے بھی واسطہ پڑا جنہوں نے اس

”کیسا سر پر اثر بھی؟ دیکھو ہم بوڑھوں میں اب کچھ بھی سننے کی ہمت نہیں رہی ہے۔ کچھ ایسا نہ بتانا جسے ہمارے دل سہار نہ سکیں۔“ گول تھالی میں خوشبودار اور بھاپ اڑاتے قہوے کی پیالیاں رکھے اندر آتی زمینہ بی بی نے جبار علی کی بات سن کر اسے تنبیہ کی۔

”آپ کے منہ سے ایسی باتیں جتنی نہیں ہیں چچی جان! آپ تو وہ تھیں جو ہمارے اندر عزم و حوصلہ اور جوش جگایا کرتی تھیں۔ میں اور میرے ساتھ محلے کے جو دو لڑکے آزادی کی جدوجہد کرنے والوں کے ساتھ شامل ہوئے، ہمارے اس عمل کے پیچھے حالات کے بعد سب سے زیادہ دخل آپ کی باتوں کا ہی تو تھا۔“ جبار علی نے ان کے کمرے میں داخل ہوتے ہی ان کے ہاتھ سے تھالی لے لی تھی اور خود باری باری سب کو پیش کر رہا تھا۔

”ٹھیک کہہ رہے ہوں۔ ہمارے وطن کی ماؤں کے پاس تو ہمت اور حوصلے کے سوا کوئی انتخاب ہی نہیں ہے۔ ہمارے جوان بیٹے سر سے کفن باندھ کر آزادی کی جدوجہد کرنے والوں کے ساتھ شامل ہوتے ہیں۔ ہم تب بھی انہیں حوصلے کے ساتھ رخصت کرتے ہیں اور جب وہ اپنے ہی خون سے رنگے سرخ کفن کے ساتھ قبرستان کو روانہ ہوتے ہیں تو تب بھی ہماری ہمت و حوصلے کا امتحان ہوتا ہے۔“ زمینہ گل کی آنکھوں سے چند آنسو لڑھک کر ان کے چہرے کی جھریوں میں گم ہو گئے۔

”یہ کیا باتیں لے بیٹھی ہو زمینہ! دیکھو جبار اپنے ساتھ اپنے دوست کو لایا ہے اور اس کے ساتھ ہمارا تعارف کروانا چاہتا ہے۔“ بوڑھے نے انہیں ٹوکا۔

”سو بسم اللہ! میں تو خود اس کے بارے میں جانتا چاہتی ہوں۔ بڑی جانی پہچانی سی صورت ہے اس کی۔ دل خود بخود اس کی طرف کھینچتا ہے۔“ ان کی نظریں سر جھکائے بیٹھے جوان کے چہرے کو ٹٹولنے لگیں۔

”لو جی، ویسے تو تم روز شکایت کرتی ہو کہ نظریں دن بدن کمزور ہوتی جا رہی ہیں اور کچھ صاف دکھائی نہیں دیتا اور اب اس بھارے کی صورت تمہیں جانی پہچانی دکھائی دینے لگی۔“ بوڑھے نے انہیں چھیڑا۔

”ان نظروں کے ساتھ آپ کو تین ٹائم پکا کر دیتی ہوں اور گھر کے علاوہ باہر کے بھی دس کام کرتی ہوں تو اب اتنی سی بات پر اعتراض کیسا۔ مجھے جو لگا، میں نے بول دیا۔“ انہوں نے خفگی سے میاں کو جواب دیا۔

”میں تو بس تمہیں چھیڑ رہا تھا۔ تم تو بُرا ہی مان

سے اچھا سلوک بھی کیا اور کمپیوٹر وغیرہ بھی سکھایا۔ اسکول تو پہلے ہی پڑھ رکھا تھا اس نے۔“ جبار علی کا انداز استفسار کرنے والا تھا۔

”ہاں، دسویں کر رکھی تھی میرے عمار نے.....“
 زرینہ گل نے یوں جواب دیا جیسے بہت دور کہیں کسی دوسری دنیا میں موجود ہوں۔

”مجھے یہ سری نگر میں ایک دوست کے دفتر میں آفس بوائے کے طور پر کام کرتا ہوا ملا اور میں نے پہچان لیا کہ.....“
 ”تم نے پہچان لیا کہ یہ میرا عمار ہے؟“ زرینہ گل نے جلدی سے اس کی بات کاٹی۔

”جی۔“ جبار علی نے بہت دھیمی آواز میں جواب دیا لیکن زرینہ گل کو اس کا جواب سننے سے دلچسپی بھی نہیں تھی۔ وہ آنکھوں میں آنسوؤں کا آبشار لیے اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی تھیں اور اب سحر زدہ سی اس نوجوان کی طرف بڑھ رہی تھیں جس نے خود بھی اپنا جھکا ہوا سراٹھا لیا تھا اور ایک ٹک ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کے عین سامنے آ کر رہ گئیں تو وہ بھی خود کار سے انداز میں کھڑا ہو گیا۔

”میرا عمار.....“ انہوں نے پہلے انگلیوں سے اس کے چہرے کے نقوش کو ٹٹولا پھر یکدم کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔
 ”میں کتنی ترسی ہوں اپنے بچے کی صورت دیکھنے اور اسے گلے سے لگانے کے لیے۔ مجھے پتا ہوتا کہ یہ یوں ادھر ادھر بھٹکتا پھر رہا ہے تو خود کھل پڑتی اسے تلاش کرنے اور ڈھونڈ کر ہی واپس گھر لوٹتی۔“ نے حد جذباتی لہجے میں بولتی رونے کے ساتھ ساتھ وہ اسے مسلسل پیار بھی کرتی جا رہی تھیں۔ ان کی اس جذباتی کیفیت پر نوجوان کی اپنی پلکیں بھی ہمیک گئیں اور اس نے بہت عقیدت اور احترام سے ان کا ماتھا چومنے کے بعد دونوں شانوں سے تمام کرنزی سے واپس پلنگ پر بٹھا دیا اور خود نیچے فرش پر ان کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

”تم یہاں کیوں بیٹھے ہو بچے؟ وہاں پلنگ پر بیٹھو۔“
 زرینہ گل نے جبار علی کے برابر میں خالی جگہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے ٹوکا۔

”مجھے یہیں بیٹھنے دیں۔ کہتے ہیں نا کہ ماں کے قدموں میں جنت ہوتی ہے تو بس میں اس وقت جنت میں بیٹھا ہوا ہوں۔ ایک عرصے سے ماں سے بچھڑا ہوا بچہ جنت میں بیٹھا ہوا ہے۔“ اس کی بے تحاشا سرخ آنکھیں اس کے اندرونی جذبات کی غماز تھیں۔ زرینہ گل نے بے اختیار جھک کر اس کے بالوں کو چوم لیا اور ممتا سے چہرے میں بولیں۔

”ماں قربان میرے بچے! میں تجھ پر اپنی ممتا کی ایسی بارش کروں گی کہ تیری اتنے دنوں کی پیاسی روح سیراب ہو جائے گی۔“

”میں بھی ایک اچھا بیٹا ہونے کے سارے فرائض ادا کرنے کی کوشش کروں گا۔“

ایک دوسرے کے ساتھ معروف وہ کمرے میں موجود ان دونوں کو بالکل فراموش کر چکے تھے جن میں سے ایک کے چہرے پر اطمینان تو دوسرے کے چہرے اور بے نور آنکھوں میں الجھن ہی الجھن پھیلی ہوئی تھی۔

☆☆☆

اس نے دور تک پھیلے نظروں کو تراوٹ دیتے منظر پر نگاہ ڈالی اور ایک گہرا سانس لے کر اس ساری تازگی کو اپنے اندر اتارا جو یہاں کی خالص اور تھری ہوئی ہوا کا خاص تحفہ تھی۔

”ایسا خالص اور نقرہ استرا سانس بھی میرے رب نے میرے نصیب میں لکھا تھا، یہ تو میں نے بھی سوچا ہی نہیں تھا۔“ اس بار اس نے نگاہ سامنے لہلہاتی فصل سے اٹھا کر آسمان کی طرف کی۔ آسمان شفاف تھا اور اس کی بہت رکلی ہوئی نیلا ہٹ میں کہیں کہیں تیرتے سفید بادل یوں لگ رہے تھے جیسے ندی کے پانی میں سفید سفید بگلے شوخیاں کرتے پھر رہے ہوں۔ آسمان کی ایسی شفاف رنگت کہ اس کے پیش منظر میں موجود ہر شے واضح ہو کر نظروں کے سامنے آ جائے، شہر کی زندگی میں نصیب نہیں ہوتی۔ وہاں انسانی نگاہ اور منظر کے درمیان آلودگی کی وہ تہ آ جاتی ہے جو حضرت انسان کی ترقی کی خواہش نے تان رکھی ہے اور یہ تہ ہر گزرتے دن کے ساتھ دبیر تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔

”بہت سکون ہے نا یہاں؟“

”جی ہاں اور میں خوش ہوں کہ میرے پیارے اس پُر سکون جگہ پر موجود ہیں۔“ وہ اپنی پشت پر قدموں کی آہٹ سن چکا تھا اس لیے بالکل اچانک سناٹی دینے والی آواز پر چونکے بغیر اطمینان سے نظروں کا رخ موڑا اور مسکرا کر پُر سکون لہجے میں جواب دیا۔

”مگر میں پوری طرح خوش نہیں ہوں کہ وہ جو مجھے اپنی اولاد میں سب سے پیارا ہے، ہمیشہ اس منظر میں موجود نہیں ہوگا۔“ خاور احمد اس کے قریب ہی بیٹھ گئے تھے۔

”سب سے پیارا.....!“ وہ بانی سب باتوں کو چھوڑ کر ان تین الفاظ سے پیدا ہونے والی حیرت کے ذریعہ اثر تھا۔

”کہتے تو ہیں کہ انسان کو ساری اولاد ایک جیسی پیاری ہوتی ہے لیکن میں تمہیں بتاؤں کہ یہ جو بڑا بچہ ہوتا

جو کچھ مجھے عطا کیا گیا تھا، اس کے ہوتے میں نے اس کی مخلوق کی فلاح کے لیے کچھ کیوں نہیں کیا۔“

”ملک و قوم کی خدمت یہاں اس گاؤں میں رہ کر بھی تو کی جاسکتی ہے۔ یہاں کوئی اسکول کھول لو اور ان غریب بچوں کو مفت تعلیم دے کر اس لائق بنادو کہ وہ ملک و قوم کی ترقی میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔“ خاور صاحب اسے ہر صورت روک لینا چاہتے تھے۔

”ایسا نہیں ہوتا ابو! ہر شخص کو قدرت کی طرف سے مختلف صلاحیتیں ملتی ہیں اور اس کا دائرہ کار مختلف ہوتا ہے۔ ایدھی صاحب ایٹم بم نہیں بنا سکتے تھے اور ڈاکٹر عبدالقدیر کا میدان سوشل ورک نہیں تھا۔ جذام کے مریضوں کا دکھ پیار سے بانٹ لینے کا ہنر ڈاکٹر رحمہ فاؤ کو ہی ودیعت کیا گیا تھا جبکہ اپنے جسموں سے بم باندھ کر ٹینکوں کے سامنے لیٹ جانے والے لوگ اور تھے۔ سوچیں ذرا اگر کچھ لوگوں میں یہ حوصلہ نہ ہوتا تو آج کیا دھرتی پر ہمارے ملک کا نام و نشان بھی باقی ہوتا؟ ہم تو کب کے دشمنوں کے ہاتھوں نیست و نابود ہو چکے ہوتے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن.....“

”ٹھیک کے آگے کوئی ”لیکن“ نہیں ہوتا ابو! جو

ٹھیک ہوتا ہے وہ بس ٹھیک ہوتا ہے۔ مسئلہ صرف یہ ہے کہ آپ کو اپنی ذات سے تھوڑا اوپر اٹھ کر دیکھنا پڑے گا اور یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس وقت آپ سے زیادہ آپ کے بیٹے کی ضرورت ملک، قوم اور انسانیت کو ہے۔ میں آپ کو بتاؤں ابو کہ ہماری تہذیب اور اغیار کی ترقی کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ وہ اپنے کام سے غفلت ہیں اور قربانی دینا جانتے ہیں جبکہ ہم ان دونوں چیزوں سے ہی بھاگتے ہیں۔“

”ایسی بات نہیں ہے بیٹا!“ خاور احمد تھوڑے سے کھینچ گئے۔

”بات تو کچھ ایسی ہی ہے ابو! جانتے ہیں مجھے ایک ایسے برف زار میں جہاں درجہ حرارت منفی سے بھی کئی ڈگری نیچے ہوتا ہے، ایک کیمپ ملا تھا۔ اس کیمپ میں ایک یہودی ڈاکٹر اینڈریو جو عمر میں آپ سے بھی بہت بڑا تھا، اپنی ٹیم کے ساتھ ریسرچ میں مصروف تھا۔ اس کی ریسرچ بہت عالمانہ تھی جس پر میں بات نہیں کرنا چاہتا لیکن اس کا جذبہ بہر حال قابل ستائش تھا کہ وہ اس عمر میں آرام کرنے کے بجائے مرنے سے پہلے اپنے ملک و قوم کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا۔“

”تم تو مجھے شرمندہ کر رہے ہو بیٹا!“ معاذ کی جذباتی تقریر نے انہیں سچ سچ شرمسار کر دیا تھا۔

ہے، وہ ہمیشہ تھوڑا سا چاہے اتنا سہی لیکن باقی اولاد سے ذرا زیادہ پیارا ہوتا ہے۔“ انہوں نے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کا دائرہ بنایا اور اس دائرے میں چنگی بھر خلا پیدا کر کے اس فرق کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے مزید بولے۔

”یہ جو پھلوٹی کی اولاد ہوتی ہے نا..... اس کی حیثیت پہلے پیار جیسی ہوتی ہے۔ اس اولاد کی پیدائش سے لے کر پرورش تک کے سارے مراحل میں والدین ایک حیرت آمیز مسرت سے گزرتے ہیں۔ انہیں یوں لگتا ہے کہ زندگی اس بچے کی شکل میں ہر روز ان پر ایک نیا انکشاف کر رہی ہے۔“

”مجھے تو بھی اس بات کا اندازہ ہی نہیں ہوا، آپ خفا بھی تو اتنے رہتے تھے نا مجھ سے۔“ وہ ابھی تھوڑا تھوڑا بے یقین تھا۔

”جس سے پیار زیادہ ہو، اس سے توقعات بھی زیادہ ہوتی ہیں۔ تم میرے بچوں میں سب سے زیادہ ذہین تھے تو مجھے لگتا تھا کہ تمہیں اپنی ذہانت کو ضائع کرنے کے بجائے اپنی اسٹریز پر فوکس کرنا چاہیے۔ میں تمہیں کسی اعلیٰ عہدے یا اعلیٰ مقام پر دیکھنا چاہتا تھا لیکن اب.....!“

”اب کیا؟“

”اب ایسا لگتا ہے کہ ہر مقام اور ترقی سے زیادہ یہ اہم ہوتا ہے کہ آپ کی اولاد سلامت رہے اور آپ اسے اپنے سامنے ہنستا بستا دیکھ سکیں۔“ خاور احمد کم صم سی کیفیت میں بولتے جا رہے تھے۔ بولتے بولتے انہوں نے اچانک ہی اس کے دونوں ہاتھ تمام لیے۔

”مت جاؤ نا یارا! ہم یہیں ترقی یافتہ دنیا سے دور اس چھوٹے سے گاؤں میں اپنی چھوٹی سی دنیا بسا کر رہ جاتے ہیں اور ان سارے ہنگاموں کو بھول جاتے ہیں جنہوں نے ہماری زندگی کو ٹپٹ کر کے رکھ دیا ہے۔“ یہ ایک ایسے باپ کی خواہش تھی جس کا ہنستا بستا گھر وقت کی آندھی نے یوں بکھیر کر رکھ دیا تھا کہ اسے خود اپنا آپ بکھا کرنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ معاذ نے اپنے باپ کے کرب کو محسوس کیا اور ان کے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے لگا کر چومتے ہوئے بولا۔

”اگر یہ آپ کا حکم ہے تو میں اسے مان کر اپنی فرمانبرداری کا ثبوت دینے کے لیے تیار ہوں لیکن اس صورت میں میرے دل و دماغ پر ہمیشہ ایک بوجھ رہے گا اور میرا ضمیر اس بات پر مجھے کچھ کے لگا رہے گا کہ میں نے اس دھرتی اور وطن کا حق ادا نہیں کیا جس کی مٹی سے میرا ضمیر اٹھا ہے۔ میں وعدہ کر کے مکر جانے کی شرمندگی سے دوچار رہوں گا اور شاید روزِ حشر خدا کے سامنے بھی جوابدہ ہوں کہ

”سوری ابوا بخدا میرا ایسا کوئی مقصد نہیں تھا۔ میں صرف آپ کو قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا کیونکہ یہ تو طے ہے کہ آپ کی فرمانبرداری مجھ پر لازم ہے۔“ وہ فوراً نرم پڑ گیا۔ ”جیتے رہو بیٹا! تم نے مجھے اتنا مان دے دیا یہ بھی میرے لیے بہت ہے۔ مطمئن رہو، اب میں تمہاری راہ روکنے کی کوشش نہیں کروں گا۔“

”بہت شکریہ ابولیکن پلیز! ذرا مسکرا کر یہ بات کہیں۔“ اس نے ان کے گلے میں ہاتھ ڈال کر چھوٹے بچوں کی طرح لاڈ لکھایا۔

”میں تمہارا نکتہ نظر سمجھ گیا ہوں بیٹا! اس لیے خوشی سے تمہیں اجازت دے رہا ہوں۔“ انہوں نے اسے گلے لگالیا۔ ”لو بھئی، یہاں ابا بیٹے کی محبتیں چل رہی ہیں اور وہاں ہماری بیگم گرم گرم پراٹھے بنا کر ہم پر گرم ہو رہی ہیں کہ پراٹھوں کو ٹھنڈا ہونے سے پہلے پہلے میرے ابو اور بھائی جان کو گھر واپس لے کر آؤ ورنہ تمہیں پراٹھوں کی خوشبو بھی سونگھنے کو نہیں ملے گی۔“ وہی نے آکر مداخلت کی تو وہ باپ بیٹا جذباتی کیفیت سے باہر آ کر اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

”خواخواہ میری معصوم بہن پر الزام نہ لگاؤ، میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ تم ہی ہو جس کے پیٹ میں صبح چوہے دوڑنے لگے ہوں گے اور تم نے میری بیچاری بہن کو چوہے کے آگے بٹھا کر ہماری تلاش میں دوڑ لگادی ہوگی کہ جی میں تو سرالیوں کی خاطر مداخلت کرنا چاہتا تھا ورنہ میں تو بڑا گپ چپ اور صابر منڈا ہوں۔“ معاذ نے فوراً ہی خود کو سنبھال کر اس کے لئے لینے شروع کر دیے۔

”سرالیوں کے ساتھ اپنی بھی پیٹ پوجا ہو جائے گی تو اس میں کوئی برائی تھوڑی ہے۔ ویسے بھی ابھی مجھ میں کمزوری باقی ہے اور ڈاکٹر نے پابندی سے اچھی خوراک لینے کی ہدایت کر رکھی ہے۔“ وہی اور لا جواب ہو جاتا، اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ویسے وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ زخم بھر جانے اور علاج مکمل ہو جانے کے باوجود اسے ابھی خاصی کمزوری تھی اور وہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ دبلا ہو گیا تھا۔

”بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے میرا بیٹا معاذ! اور تمہارا فرض ہے کہ جب تک یہاں ہو، اس کا خوب خیال رکھو۔“ خاور صاحب اب وہی کے قریب جا کھڑے ہوئے تھے اور اس کے شانے پر ہاتھ پھیلائے معاذ کو ہدایت دے رہے تھے۔ ”ارے نہیں اکل! میں تو صرف مذاق کر رہا تھا ورنہ

ایسے کیسے ہو سکتا ہے کہ معاذ بھائی سے کوئی خدمت لوں۔“ وہی جلدی سے سنجیدہ ہوا۔

”جب یہ نہیں تھا تو تم نے ہمارا اتنا ساتھ دیا، دیار غیر میں میرا اور علینہ کا اتنا خیال رکھا تو آج جبکہ اسے موقع ملا ہے تو یہ اس احسان کا بدلہ کیوں نہ دے۔“ خاور صاحب اپنے موقف پر قائم تھے۔

”کوئی احسان نہیں ہے۔ میں نے جو کچھ کیا، اپنی خوشی کے لیے کیا۔ آپ پلیز معاذ بھائی سے کچھ نہ کہیں اور ہاں، اب سچ سچ گھر کی طرف چل پڑیں ورنہ پراٹھے واقعی ٹھنڈے ہو جائیں گے اور میرے لیے یہ غم ناقابل برداشت ہے۔“ وہ حسب عادت شوخی پر اتر آیا تو خاور احمد اور معاذ مسکراتے ہوئے اس کے ساتھ چل پڑے۔

”اتنی دیر کر دی۔“ گھر پر علینہ دسترخوان بچھائے ان کی منتظر تھی۔

”بس واک کرتے کرتے ذرا دور چلا گیا تھا پھر یہاں کی خوبصورتی میں گم ہو کر گھر واپس آنا ہی بھول گیا۔“ معاذ نے وضاحت دی۔

”خوبصورتی تو واقعی بہت ہے یہاں۔ میں تو اتنے دنوں سے رہ رہی ہوں پھر بھی ہر دوسرے دن یہاں کے حسن کے عشق میں مبتلا ہو جاتی ہوں۔“ وہ اب پراٹھوں کے ساتھ ساتھ سب کو آبیٹ بھی پیش کر رہی تھی۔ لالہ کے لیے البتہ اس کی فرمائش پر رات کا سالن گرم کیا تھا۔ معاذ بے ساختہ ہی اسے اتنے ٹکڑا پے سے کام کرتے دیکھ کر ایک ٹک گھورنے لگا۔

”کیا ہوا بھائی جان! ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟“ علینہ نے اس کا دیکھنا محسوس کر لیا۔

”دیکھ رہا ہوں یہ میری وہی چھوٹی موٹی سی بہن ہے جسے بتانا یا پراٹھا کھانا بھی ایک بوجھ لگتا تھا اور آج اس نے اپنے ہاتھوں سے سب کے لیے پراٹھے بنائے ہیں۔“ وہ واقعی حیران تھا اور تھوڑا سا جذباتی بھی ہو گیا تھا۔ حالات نے گھر بھر کی لاڈلی علینہ کو وقت سے کچھ پہلے ہی ذمے داریاں سونپ دی تھیں اور اس وقت وہ اپنی والدہ سعیدہ بیگم کا پر تو محسوس ہو رہی تھی۔

”وقت سب سکھا دیتا ہے۔“ وہ اداس سا مسکرائی۔

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نوجوان
کی داستان جو غلط کاروں کے لیے غضب
ناک تھا باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیے



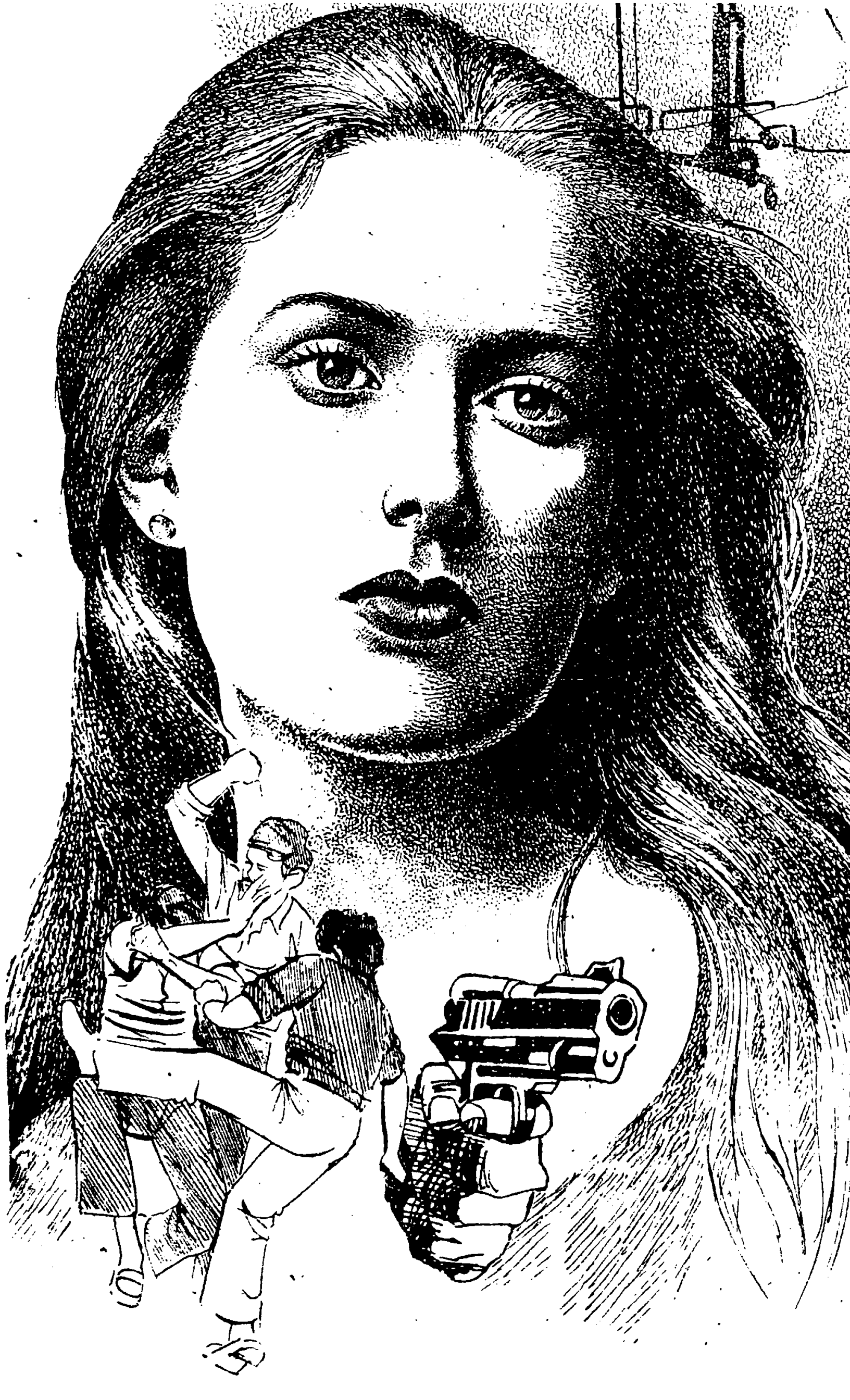
قسط نمبر: 47

شہزادہ زور

اساتذہ

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تندوتیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابل شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پر عزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جا رہے تھے... اس کی زندگی جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قراریوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تار عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ واردات قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہوسکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تحیر انگیز داستان



معاذ ایک ذہین لیکن متلون مزاج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جوائن کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ انسٹی ٹیوٹ سے واپس آ رہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو سڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی غر فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشری نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بشری ماس کیونی کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم وغیرہ لکھتی ہے۔ اس ویران جگہ بھی وہ ایک زیر تعمیر رہائشی منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی آئی تھی۔ معاذ بشری کو یہ حفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کر دیتا ہے لیکن جن رئیس زادوں سے اس نے ان کا شکار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ایک دن جنگل کی سیر کے دوران وہ فوٹو گرافی کے شوق میں سب سے الگ تھلگ ہو جانے والے معاذ کو بے خبری میں گھیر کر بری طرح زد و کوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دے دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس نہ آنے پر انتظامیہ کے افراد، پولیس اور ریسکیو ذرائع کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو موٹو آتا ہے تو وہ خود کو ایک جوگی کی جمونپڑی میں پاتا ہے۔ جوگی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے، جوگی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نواز کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے پراسرار علم سکھانے کی ہامی بھر لیتا ہے اور معاذ اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ادھر جائے وقوعہ سے ملنے والے معاذ کے کمرے سے جب تصویریں نکلوائی جاتی ہیں تو ایک ایسی تصویر بشری کی نظر میں آ جاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پروجیکٹ کے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشری تحقیق کر رہی تھی۔ بشری کے اپنے والد جرنلست ہوتے ہیں۔ اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشری کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ صدمے سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باذل نامی شخص نے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشری انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دلوں میں ہی معاذ واپسی کا ارادہ کرتا ہے تاہم ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا عرفان اللہ اور یزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو وقاص نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باذل اچانک بشری کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر دیتا ہے۔ معاذ کو واپس لانے کے لیے اوچھے محکنڈے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اسے واپس آنے کا پیغام دیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کر کے اسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات کے نہ ہانے پر اس کے بھائی کا ایک گردہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشری بھی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہو جاتی ہے۔ معاذ کے دوست عالم شاہ کے بہنوئی کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ کئی فنون میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے پہناؤ کر کے اس کے دماغ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ فیضو سے حاصل انوکھے علم کی بدولت ان کا معمول نہیں جتا۔ عالم شاہ اور اس کا نوکر سرد، باذل کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ عالم شاہ، باذل کی قید میں موجود ایک ذہنی شخص کی مدد سے وہاں سے فرار ہو جاتا ہے۔ ادھر بشری دہلی پہنچ جاتی ہے۔ وہاں وقاص اسے باربی کے روپ میں پہچان لیتا ہے۔ وہ سلطان کو مارنا چاہتی ہے۔ ادھر عالم شاہ، باذل کی قید سے نکل کر اس کا پیچھا کرتا ہے۔ وہ وہاں معاذ کو دیکھتا ہے۔ معاذ کو اس کے گھر والوں سے ملنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ وہ ایک مشن پر سونیا کے ساتھ انڈیا روانہ ہوتا ہے تاہم کچھ لوگ سکھ یا تریوں سے بھری بس کو یرغمال بنا لیتے ہیں۔ معاذ اور سونیا خانے کے تمام افراد کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔ عالم شاہ، کل اور سرد انڈیا روانہ ہو جاتے ہیں۔ انر پورٹ سے گھر روانگی پر راستے میں کچھ لٹیرے انہیں لوٹ لیتے ہیں۔ گھر پہنچنے پر پولیس کی ریڈ ہوتی ہے اور وہ عالم شاہ اور سرد کو لے جاتے ہیں۔ ادھر بشری اور وقاص باذل کو اسپتال میں مارنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ بچ جاتا ہے۔ معاذ اور سونیا اپنے سہولت کاروں سے مل جاتے ہیں۔ عالم شاہ اور سرد کو تشدد کا نشانہ بنا کر ویرانے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ واپس اپنے میزبانوں کے ہاں پہنچ جاتے ہیں۔ انہیں پتا لگتا ہے کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں اجالا اور اس کا عاشق شامل ہوتے ہیں۔ وہ چھپ کر ان کی باتیں سن رہا ہوتا ہے کہ اسے چھاپ لیا جاتا ہے۔ تاہم وہاں مارا ماری ہوتی ہے اور اجالا کا عاشق مارا جاتا ہے۔ پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ ان کے کزن انہیں اپنے دوسرے خفیہ جگہ پر پہنچا دیتے ہیں۔ وہ وہاں سے بحفاظت نکل جاتے ہیں۔ ادھر معاذ ایک مشن میں زخمی ہو جاتا ہے اور اسے ہندو سادھو اپنی کنیا میں لے جاتا ہے جہاں اس کی اچھی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ سونیا کے آدمی معاذ کو تلاش کرتے ہیں مگر ناکام ہو جاتے ہیں۔ ادھر عالم شاہ اور سرد خفیہ ذریعے سے باڈر پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ دھر لے جاتے ہیں اور "را" کی قید میں پہنچ جاتے ہیں۔ بشری باذل کو مارنے کی کوشش میں خود نشانہ بن جاتی ہے۔ معاذ سادھو کی مدد سے ایک انڈین ہیروئن کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ وہیں اسے عالم اور سرد کی گرفتاری کا پتا چلتا ہے۔ معاذ ڈاکٹر

فردوس سے ملتا ہے اور اسے سبیل کی مدد کرنے کا کہتا ہے۔ علینہ اور وقاص وغیرہ کو لالہ بیٹی ملک سے باہر نکال دیتا ہے علینہ پاکستان میں ٹوبہ سے مدد بل کرتی ہے جو ان کے لیے مصیبت بن جاتا ہے۔ ٹوبہ پر تیزاب پھینک دیا جاتا ہے۔ وقاص، علینہ اور اس کے گھر والوں کو مارا جاتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس معاذ کو دیوانی شخص سے مدد لینے کا کہتی ہے۔ معاذ اپنے کزن کو پاکستان کال کرتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ اس کے گھر والوں کو مار دیا گیا ہے۔ وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کی ٹھان لیتا ہے۔ ادھر ڈاکٹر فردوس کو اس کے سسرال والے سبیل کو بھگانے کی پاداش میں تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ معاذ، عالم اور سرمد کی رہائی کے لیے کارروائی کرتا ہے اور انہیں ”را“ کی قید سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن عالم اور سرمد کو دیوانہ کے آدمی کسی دوسری جگہ پہنچا دیتے ہیں۔ سونیا معاذ کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ ادھر باذل ایک جگہ لالہ بیٹی کی موجودگی پر کارروائی کرتا ہے تاہم لالہ خود کو گولی مار کر ختم کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس کا انتقال ہو جاتا ہے۔ دیوانہ گینگ ڈاکٹر فردوس کی میت اٹھنے پر وہاں فائرنگ کر دیتے ہیں۔ پولیس دیوانہ کو گھیر لیتی ہے۔ معاذ دیوانہ اور اس کے آدمیوں کو نکالنے کے عوض عالم کا پتا معلوم کر لیتے ہیں۔ سونیا اور معاذ حیدر آباد نواب بدرالدین کی حویلی پہنچ جاتے ہیں۔ وہ نواب صاحب کی حویلی میں عالم اور سرمد کی رہائی کے لیے کارروائی کر کے انہیں رہا کر لیتا ہے۔ وہ لوگ نئے ٹھکانے پر پہنچتے ہیں تو وہاں معاذ سے ملنے جا رہی شخص آتا ہے۔ اسے معاذ نے ”را“ کی قید سے نکالا ہوتا ہے۔ جا رہا اور معاذ، سبیل سمیت اسپتال جاتے ہیں اور پہچان لیے جانے پر پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ پولیس سے مقابلے کے بعد وہ ایک بستی میں پناہ کے لیے گھس جاتے ہیں اور دو لوگوں کو یرغمال بنا کر ان کی جمونپڑی میں قیام کرتے ہیں۔ ادھر سونیا معاذ کی تلاش میں نکلتی ہے اور اسے بستی میں پہنچنے پر معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ معاذ اور جا رہا وغیرہ انوب نامی شخص کے ساتھ اس کے مالک کے بنگلے میں قیام کرتے ہیں۔ سونیا بھی معلومات حاصل کرتی ہوئی مذکورہ بنگلے تک پہنچ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور سرمد بھی سونیا کا پیچھا کرتے ہوئے وہیں پہنچ جاتے ہیں۔ ادھر لالہ، وقاص، علینہ وغیرہ لوگ زندہ ہوتے ہیں۔ وقاص حلیہ بدل کر گلوکا باڈی گارڈ بن جاتا ہے۔ وہ معاذ کو تلاش کرنے کے لیے انڈیا روانہ ہوتا ہے۔ وہاں اس کی گل خان سے ملاقات ہوتی ہے اور معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ سونیا، معاذ اور دیگر ساتھیوں سے مل جاتی ہے تاہم وہ جس بنگلے میں ہوتے ہیں وہ دشمن کا ہوتا ہے۔ دشمن سب کو بے ہوش کر کے کہیں لے جا رہے ہوتے ہیں کسان کی گاڑی کو حادثہ پیش آ جاتا ہے۔ ان سب کو چینی بمکشوٹھی امداد دیتے ہیں اور ان سے پوچھ کچھ کی جاتی ہے۔ سبیل کی حالت تشویشناک ہوتی ہے اور اسے وہاں موجود ایک وید دیکھتا ہے۔ ادھر لالہ وہیں اپنے لوگوں میں پہنچ کر ایکشن میں آ جاتا ہے۔ باذل، معاذ وغیرہ کے ٹھکانے سے باخبر ہو جاتا ہے۔ ادھر لالہ کے آدمی میڈم ایکس کی نگرانی کے چکر میں مارے جاتے ہیں۔ لالہ اپنے آدمیوں کو انڈیا گراؤنڈ کر دیتا ہے۔ باذل معاذ کا پیچھا کرتا ہے اور چینیوں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ معاذ چینیوں کے ساتھ مل کر دشمنوں کے خلاف کارروائی کرتا ہے۔ وہ لالہ نامی عورت کو بھی گرفت میں لے لیتے ہیں اور اسی سے معلومات لیتے ہیں۔ ادھر لالہ بیٹی، اعظم کو دشمن کی گرفت سے نکالنے کے لیے کارروائی کرواتا ہے اور موسیٰ اور نیلی، اعظم کو نکالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ معاذ دشمنوں کے کیمپ پر حملہ کر کے وہاں قبضہ کر لیتا ہے۔ موسیٰ اور نیلی کی گاڑی پر حملہ ہوتا ہے تاہم بار بار بار کے بعد وہ صداقت شاہ کے پاس پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ لالہ بیٹی صداقت شاہ کو حویلی پر ریڈ کاٹتا ہے۔ صداقت شاہ اعظم کے محفوظ ٹھکانے کے لیے قربان شاہ کو فون کرتے ہیں۔ اعظم کو وہاں سے نکال لیا جاتا ہے اور دوسری جگہ ٹھکانا کر دیا جاتا ہے۔ ادھر معاذ بیجنگ پہنچ جاتا ہے۔ جا رہا وہاں کے کرتا دھرتاؤں سے بات کر کے پاکستان پہنچنے کی اجازت چاہتا ہے۔ ادھر موسیٰ اور نیلی کو پولیس گھیر لیتی ہے اور فائرنگ میں موسیٰ مارا جاتا ہے۔ وہ اعظم کو لے جاتے ہیں اور نیلی زخمی حالت میں ان کے قبضے میں آ جاتی ہے۔ معاذ اور وی وغیرہ پاکستان پہنچ جاتے ہیں اور اعظم کی بازیابی کے لیے منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ موسیٰ کی تدفین ہو جاتی ہے۔ ادھر باذل، لالہ کی قید سے بھاگ جاتا ہے۔ معاذ، ڈی ایس پی ظہیر کے بنگلے پر دھاوا بولتا ہے اور ڈی ایس پی کو قتل کرنے کے بعد اس سے معلومات لیتا ہے۔ وہ لوگ ظہیر خان کو لے کر وہاں سے نکل جاتے ہیں۔ باذل قید سے نکل کر مہناز کے پاس پہنچتا ہے اور اسے تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ نیلی قید میں موجود ظہیر کو ٹھکانے لگا دیتی ہے۔ بشری قبرستان جاتی ہے۔ وہاں اس کی دوست ملتی ہے۔ بشری اپنی دوست کے ساتھ جا رہی ہوتی ہے کہ باذل کے آدمی اسے اغوا کر لیتے ہیں۔ ادھر معاذ سارے معاملوں کو جلد حل کرنے کے لیے دشمن کے آگے تھمنا ڈال دیتا ہے مگر اس کے خیر خواہ اسے میڈم ایکس کے ہتھے سے نکال لیتے ہیں اور اعظم کو بھی بازیاب کر لیتے ہیں۔ زن ہوا اسے اپنے ساتھ لے جاتی ہے اور وہاں کرنل سکندر بخت سے ملاقات ہوتی ہے۔ معاذ انہیں دشمنوں کے خلاف کارروائی کرنے کا کہتا ہے۔ باذل، بشری کو لے کر انڈیا گراؤنڈ ہو جاتا ہے۔ ادھر وقاص باذل کا پتا چلانے کے لیے ایک کال گرل سی کے گھر کارروائی کر کے باذل کے ٹھکانے پر پہنچ جاتا ہے۔ وہاں وی کے ساتھی اور کوئی اور گروپ حملہ کر دیتے ہیں۔ وی زخمی ہو جاتا ہے۔ عرفان اللہ کو گولی مار دیتا ہے اور خود بھی شدید زخمی ہو جاتا ہے۔ باذل کے ساتھی اسے ایک اسپتال کے آگے چھوڑ دیتے ہیں۔ وہیں وی اور بشری بھی داخل ہوتے ہیں۔ معاذ باذل کو پہچان کر اسے بھی وہیں ایڈمٹ کرا دیتا ہے۔ عرفان اللہ جاں بحق ہو جاتا ہے۔ عرفان اللہ کی سکرٹری صوفیہ کو خبیثہ امداد کے لوگ اٹھا لیتے ہیں لیکن صوفیہ وہاں اپنی جان دے دیتی ہے۔ صداقت شاہ اور ان کی اہلیہ گل کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ عالم، نیلی اور اعظم بھی وہیں ہوتے ہیں۔ سبیل اسپتال میں زیر علاج ہوتی ہے۔ باذل کو معذوری کی حالت میں ایک چوک پر پھینک دیا جاتا ہے۔ معاذ وقاص وغیرہ کے ساتھ علینہ کے پاس پہنچ جاتا ہے اور وہیں کچھ دن گزارتا ہے۔

معاذ اپنے گھر والوں کے ساتھ وقت بتا رہا تھا۔
علینہ کو ذمے داریاں اٹھانا دیکھ کر وہ حیران اور جذباتی ہو گیا
تھا اور علینہ سے مخاطب تھا۔

”مشکل تو ہوتی ہوگی۔ میرا مطلب ہے یہاں جدید
زندگی کی کوئی سہولت نہیں ہے اور نہ ہی کاموں کو آسان
بنانے کے لیے مشینیں..... بلکہ یہاں تو بجلی بھی پورا سال
نہیں ملتی ہے۔ مجھے علم ہوا ہے کہ سردیوں میں جب برف جم
جاتی ہے تو یہاں قائم بجلی گھر کام کرنا چھوڑ دیتا ہے۔“ وہ اس
طرز زندگی کے لیے تھوڑی سی تشویش میں مبتلا تھا۔

”دریا بہنا بند کر دے تو ٹر بائن نہیں چل پاتے نالین
اس سے کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہوتا۔ حالات کے حساب سے
سارے انتظامات کر لیتے ہیں لوگ۔“ علینہ نے گمن سے انداز
میں اسے جواب دیا اور اسی بڑے سے ہال نما کمرے کے ایک
کونے میں رکھے جھولے کی طرف بڑھ گئی۔ جھولے میں سویا
اس کا بچہ کسمارہا تھا۔ وہ اسے تھپکیاں دے کر سلاتے لگی۔

”تم اتنے فکر مند مت بنو میاں! بندہ شروع شروع
جب شہر سے اس طرف آتا ہے تو اسے لگتا ہے کہ یہاں
زندگی بہت مشکل اور سست ہے لیکن پھر آہستہ آہستہ وہ اس
ماحول میں رہنے بسنے لگتا ہے اور اسے اندازہ ہونے لگتا ہے
کہ سادگی میں جتنی سہولت اور آسانی ہے۔ یہاں چند بنیادی
سہولیات کے ساتھ بہت مزے سے گزارہ ہو جاتا ہے۔ کوئی
اسٹیشن کی ریس نہیں ہے اور زندگی کو بہت سکون سے جیا جاتا
ہے۔“ لالہ عیسیٰ نے اس کی کیفیت کو بھانپ لیا کہ وہ باپ
اور بچے کے اس بالکل مختلف اور شیر ترقی یافتہ جگہ پر رہنے
سے کچھ پریشان ہے اس لیے اسے تسلی دینے لگا۔

”یہاں ضرورت سے کچھ زیادہ ہی سادگی ہے۔ مجھے
تو کوئی باقاعدہ بازار تک دکھائی نہیں دیا۔“ وہ حیران تھا کہ
یہاں معاملات کیسے چل رہے ہیں۔

”کیونکہ یہاں اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی
جاتی۔ یہاں ہر شخص اپنا نائی، دھوبی، موچی خود ہے۔ دودھ،
اندو اور گوشت کے لیے جانور خود پالتا ہے، خود سبزیاں
اگاتا ہے۔ اکثر گھروں میں کھڑی پرکڑا بھی بنا جاتا ہے۔ جو
لوگ اپنی ضرورت کی کوئی چیز خود پیدا نہیں کر پاتے وہ اشیاء
کے بدلے اشیاء کے اصول کے تحت معاملات چلا لیتے ہیں
پھر باہر کی دنیا میں جانے اور آنے والے لوگ بھی ہیں جن
سے حسب خواہش اور ضرورت کچھ بھی منگوایا جاسکتا ہے۔“
وہ اسے یہاں کے طرز زندگی سے آگاہ کر رہا تھا۔

”لالہ عیسیٰ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں بیٹا! تم ہمارے

لیے پریشان نہ ہو۔ ہم نے یہاں ایڈ جسٹ کر لیا ہے اور
مزے سے ہیں۔“ اس بار خاور احمد نے بھی لالہ کا ساتھ دیا۔
”مگر ابو..... تعلیم وغیرہ.....!“ وہ اب بھی ہچکچاہٹ کا
شکار تھا۔

”سب ہو جاتا ہے۔ تمہارے خیال میں یہاں کے
سارے لوگ اُن پڑھ ہیں۔ ایسا بالکل بھی نہیں ہے بیٹا۔
یہاں اسکول ہے جسے دو بہت ہی محنتی اساتذہ مل کر چلا رہے
ہیں۔ کچھ عرصے سے میں بھی ان کے ساتھ شامل ہو گیا ہوں
اور مطمئن ہوں کہ یہاں کم از کم اسکول کی سطح پر تو اچھی تعلیم دی
جارہی ہے۔ جن کو آگے پڑھنا ہو، وہ شہروں میں چلے جاتے
ہیں۔ اب ہم نے سعد کو بھی تو بھجوایا ہے نا تعلیم کے لیے۔“

”خاور بھائی ٹھیک کہہ رہے ہیں معاذ! تم ان سب
معاملات کی طرف سے بالکل بے فکر رہو۔ اگر کہیں کوئی کمی
پیشی ہوئی تو میں اسے دیکھ لوں گا۔ دھندا چھوڑ کر یہاں
آ بیٹھا ہوں تو اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے نا کہ بالکل بے
اختیار ہو گیا ہوں۔ اب بھی اتنا دم ہے مجھ میں کہ تمہارا بھانجا
دنیا کے جس بھی اسکول، کالج یا یونیورسٹی میں پڑھنا چاہے گا،
میں اس کا ایڈمیشن وہاں کروادوں گا۔“ لالہ نے بھی خاور
احمد کی تائید کرتے ہوئے اسے یقین دہانی کروائی۔

”شکریہ لالہ! آپ کے ہونے سے بہت تسلی ہے
مجھے۔ یوں تو کچھ اور لوگ بھی ہیں جو یہاں کے معاملات پر
نظر رکھیں گے لیکن آپ کی بات الگ ہے۔“ معاذ کو واقعی
لالہ کی موجودگی سے اطمینان تھا۔

”اصل حفاظت کرنے اور خیال رکھنے والی ذات اللہ
کی ہے۔ باقی بندے تو بس اپنی اپنی ڈیوٹیاں بھگتاتے
ہیں۔ اب چاہے وہ ڈیوٹی دینے والے وردی میں ہوں یا
مجھ جیسے غنڈے موالی۔“ لالہ اپنی بات کہہ کر ذرا سا ہنسنا۔
”خود کو اس طرح انڈرا سٹیٹ نہ کریں۔ میری نظر
میں آپ کی بہت عزت ہے۔ آپ کا شمار ان لوگوں میں ہوتا
ہے جن کی بنیاد میں اچھائی ہوتی ہے۔ ایسے لوگ کچھڑ میں رہ
کر بھی کنول کے پھول کی طرح ہی ہوتے ہیں۔“ اس نے
لالہ کے متعلق جو کچھ کہا تھا، اس سے وہاں موجود ہر فرد کو
اتفاق تھا۔

”بس اب باتیں چھوڑ کر دھیان سے ناشتا کرو۔
میری بیٹی نے اتنی محنت سے ناشتا بنایا ہے اور تم ہو کہ اسے
باتوں میں ٹھنڈا کیے جا رہے ہو۔“ وہاں ہونے والی اس
ساری گفتگو کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ اس میں کسی دن معاذ کے
وہاں سے رخصت ہو جانے کا ذکر چھپا تھا اور خاور احمد جانتے

تھے کہ یہ ذکر علیہ کو افسردہ کر دیتا ہے اس لیے اسے ٹوک کر اس موضوع کو ختم کرنے کا اشارہ دیا۔

”کوئی مسئلہ نہیں ہے ابو! مجھے یقین ہے کہ ٹھنڈا ہو کر بھی یہ ناشتا اتنا ہی لذیذ رہے گا۔ آخر میری بہن نے اتنی محبت سے بنایا ہے اسے اور اس کے ہاتھ میں بالکل امی کے ہاتھ کا ذائقہ ہے۔“ معاذ نے لقمہ بنا کر منہ میں رکھتے ہوئے تعریف کی تو علیہ کا بچھا ہوا چہرہ کھل اٹھا۔ باقی کا ناشتا ہلکی پھلکی خوش گپیوں میں ختم کیا گیا۔ ناشتے کے بعد علیہ برتن سمیٹنے اور صفائی ستھرائی کے کاموں میں مصروف ہو گئی اور وہ سب مرد اٹھ کر باہر آ گئے۔

”اچھا ابھی، میں ذرا اپنی مرغیوں کا حال احوال لوں۔ آج اسکول کی چھٹی ہے تو درجے کی ذرا تفصیلی صفائی کر دوں گا۔“ باہر آ کر خاور احمد یہ کہتے ہوئے مکان کے احاطے میں ہی بنائے گئے مرغیوں کے درجے کی طرف بڑھ گئے۔

”مجھے بھی اپنی کیاریوں کو دیکھنا ہے۔“ لالہ بھی جس نے یہاں آنے کے بعد موسم کی سبزیوں کی نئی پنیریاں لگائی تھیں ان سے الگ ہو گیا۔ وکی کے سفر کے لائق ہونے تک وہ لوگ شہر میں ہی رہے تھے۔ وہاں قیام کے اس عرصے میں معاذ تو زیادہ تر اپنی ٹریننگ میں مصروف رہتا لیکن لالہ نے تو گویا اسپتال میں ہی بوریا بستر لگا لیا تھا اور اسی وقت وہاں سے نکلتا تھا جب وکی کو وہاں سے ڈسچارج کیا گیا تھا۔

”آپ اگلی بار یہاں آئیں گے تو میں بھی آپ کو یہی سب کرتا نظر آؤں گا۔“ وکی نے جو کافی دیر سے مسلسل خاموش تھا، جھلائے ہوئے انداز میں تبصرہ کیا۔

”یہ کوئی بڑے کام تو نہیں ہیں۔ ان کاموں سے زندگی کی بنیادی ضروریات پوری ہوتی ہیں اور مفت کی سائیکو تھراپی الگ ہے۔ اب تو ماہرین خود ایسے مشاغل اختیار کرنے کو انسان کی جسمانی اور ذہنی صحت کے لیے مفید قرار دے رہے ہیں۔“ وہ وکی کی جھلٹ کی وجہ جانتے ہوئے بھی بے نیازی سے بولا اور قدم باہر کی طرف بڑھائے۔ وہ جانتا تھا کہ یہ گفتگو یہیں ختم نہیں ہوگی اور وہ سب کے سامنے وکی سے گفتگو کر کے ان کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”آپ کو شاید ایسا لگتا ہے کہ میں فزیکل فٹ نہیں ہوں اس لیے آپ نے مجھے اپنے ساتھ لے جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے لیکن میرا یقین کریں کہ میں بالکل ٹھیک ہوں اور آپ کا پورا پورا ساتھ دے سکتا ہوں۔“ گاؤں کے کچے پکے راستوں پر چلتے ہوئے وکی نے وہی گفتگو شروع کر دی

تھی جس کی اسے اس سے توقع تھی۔

”نہیں، تم پوری طرح فٹ نہیں ہو۔ تمہارے صرف زخم بھرے ہیں لیکن ڈاکٹر نے صاف بتایا ہے کہ تمہیں لمبے عرصے تک احتیاط کرنا ہوگی۔“

”ڈاکٹر کون ہوتا ہے میرے بارے میں فیصلہ کرنے والا۔ یہ میرا جسم ہے اور میں اس کے بارے میں زیادہ اچھی طرح جانتا ہوں۔“ وکی کے لہجے میں ایک ضدی تھی۔

”تم محض جذباتیت سے کام لے رہے ہو ورنہ تمہاری ساری رپورٹس وہی کہہ رہی ہیں جو ڈاکٹر نے کہا ہے اور اگر طبی وجوہات نہ بھی ہوتیں تو بھی میں تمہیں اپنے ساتھ شامل نہ کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔“

”وہ کیوں؟“ اسے معاذ کے جواب نے دھچکا لگایا۔

”کئی وجوہات ہیں جن میں سے سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ میرے پیچھے خاندان کی دیکھ بھال کرنے کے لیے کوئی موجود ہو۔ یہ ٹھیک ہے کہ ابو اور لالہ یہاں موجود ہیں لیکن علیہ اور تمہارے بچے کے لیے جو تم ہو، وہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ میری بہن کو چھوٹی عمر میں بڑے غموں اور مسائل سے گزرنا پڑا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس کی آگے کی زندگی پرسکون ہو۔“

”لیکن یہ تو خود غرضی ہے۔“ وکی نے احتجاج کیا۔

”کوئی خود غرضی نہیں ہے۔ لازم نہیں ہے کہ ملک کے لیے ساری قربانیاں ایک ہی خاندان دے۔ میرے گھر والوں کا بھی زندگی کی خوشیوں پر حق ہے اور میں تم سمیت کسی کو بھی ان کا یہ حق جھیننے کی اجازت نہیں دوں گا۔“ اس کے دو ٹوک انداز نے وکی کو ہل بھر کے لیے گنگ ہی کر دیا۔ معاذ نے ماضی میں تو کبھی اس انداز سے گفتگو نہیں کی تھی۔

”ایک اور اہم وجہ یہ بھی ہے کہ ہم نے تمہیں اس مشن کے لیے پوری طرح اہل نہیں پایا ہے۔ شیوز بان کو سیکھنا ایک ٹیسٹ تھا اور تم اس ٹیسٹ میں قابل ذکر کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کر سکے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ تم میں نئی زبانوں کو تیزی سے سیکھنے کی صلاحیت موجود نہیں ہے جبکہ یہ بہت اہم ہے۔ کسی نئی جگہ خود کو ایڈجسٹ کرنے اور اپنی ہٹا کی جگہ لڑنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ آپ بہت اچھی طرح نہ سہی، گزارے لائق وہاں کی زبان جانتے ہوں۔“ وہ اس وقت کسی بھی طرح کی مروت سے کام نہیں لے رہا تھا کیونکہ جانتا تھا کہ جہاں نرم بڑا، وہیں وکی کا اصرار زور پکڑے گا۔

”وہ تو میں زخمی ہونے کی وجہ سے پوری طرح فوکس.....“ وکی نے جھینپ کر اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش

کی لیکن معاذ نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا۔
 ”اس کام میں ایسے آرگومنٹس کی گنجائش نہیں ہوتی۔ یہ پورے ہوش و حواس میں رہ کر مرجانے یا مار ڈالنے کا کھیل ہے اور ویسے بھی.....“
 ”ویسے بھی کیا؟“ وہی سے اس کا لمحہ بھر کا توقف بھی برداشت نہیں ہوا۔

”کرنل صاحب خود ٹیم کا انتخاب کر چکے ہیں۔ اس ٹیم میں کتنے اور کون کون لوگ شامل ہیں، یہ میں ابھی نہیں جانتا لیکن یہ طے ہے کہ وہ پروفیشنلز اور بہترین ہوں گے۔“
 یہ آخری بات تھی جس کے بعد وہی کے پاس کچھ بھی کہنے کی گنجائش ختم ہو گئی اور اس کا منہ لگ گیا۔ معاذ کو اسے یوں مایوس اور اداس دیکھنا اچھا نہیں لگا۔ اس لیے چلتے چلتے رک گیا اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے قدرے نرم لہجے میں بولا۔

”تم بہت باصلاحیت اور بہادر جوان ہو کی لیکن یہ ضروری تو نہیں ہے کہ کوئی شخص دنیا کا ہر کام کر سکے۔“
 ”میں آپ کے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔“ وہ بچوں کی طرح بسورا۔

”جدا کی اس کائنات کی اہل حقیقتوں میں سے ایک حقیقت ہے۔ ہم زندگی کے ہر نئے موڑ پر چاہتے یا نہ چاہتے ہوئے اپنی زندگی میں آنے والے کئی کرداروں کو چھوڑنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ میں نے بھی اپنی زندگی میں کئی قیمتی رشتے اور دوست کھوئے ہیں۔ تم بشری ہی کی مثال لے لو۔ کیا کچھ نہیں کیا اس لڑکی نے میرے لیے۔ میرا بہت دل تھا کہ ایسے حالات میں جبکہ وہ اپنا بہت کچھ کھو چکی ہے، میں اس کا سہارا بنوں اور اسے زندگی کی بہت ساری خوشیاں دوں لیکن دیکھ لو کہ میں یہ سب نہیں کر سکا اور اس نے مجھ سے کوئی شکوہ کیے بغیر اپنی زندگی کی نئی راہ کا تعین کر لیا۔ اب میں اس کے لیے صرف یہ دعا کر سکتا ہوں کہ وہ جہاں بھی رہے، محفوظ اور پرسکون رہے۔“ وہ بہت رसान سے اسے سمجھا رہا تھا۔ بالآخر وہی کے چہرے کے تاثرات بدلے اور ایسا لگا کہ وہ قائل ہونے لگا ہے۔

”اگر تم بھی بشری کی طرح مجھے کسی گلت میں ڈالے بغیر ہنس خوشی رخصت کی اجازت دو گے تو میں خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کروں گا۔“ اس نے لوہا گرم دیکھ کر ایک اور ضرب لگائی۔
 ”لیکن میں آپ کو بہت مس کروں گا۔“ وہی بے اختیار نم آنکھوں کے ساتھ اس کے گلے لگ گیا۔

”مس تو میں بھی سب کو کروں گا یار! لیکن اس اطمینان کے ساتھ کہ دنیا کے ایک خطے میں میرا چھوٹا سا خاندان آباد ہے اور اس خاندان کے افراد جب جب دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہیں، ان دعاؤں میں میرا نام ہوتا ہے۔“ اس نے وہی کے خلوص کے جواب میں گرجوٹی کا مظاہرہ کیا۔ قریب سے گزرتی بچوں کی ایک ٹولی نے دلچسپی سے اس منظر کو دیکھا اور بلاوجہ ہی زور سے ہنس دیے۔ ان کے ہونٹوں پر یہ بے فکر ہنسی اسی لیے تھی کہ معاذ اور معاذ جیسے کئی بے نام سپاہی ان کی بقا کے لیے اپنے سروں پر کفن باندھے دشمنوں سے برسرِ پیکار تھے۔

☆☆☆

”بس اب مزید انتظار کی گنجائش نہیں ہے۔ اب کوئی حتمی فیصلہ کرنا ہی ہوگا۔“ سفید بالوں اور سفید ہی بھوؤں والے یوان منگ نے اپنے سامنے بیٹھے عالم شاہ سے کہا تو اس کی آنکھوں میں تشویش کے رنگ تھے۔ آج سب کو پڑنے والے بیہوشی کے دورے کے بعد عالم شاہ کو ڈاکٹر کے کمرے میں بلایا گیا تو اسے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ وہاں اس کی یوان منگ سے ملاقات ہو جائے گی۔

”کیسا فیصلہ؟“ عالم شاہ نے ایسی سہمی ہوئی آواز میں پوچھا جیسے وہ خود اپنے سوال کا جواب نہ چاہتا ہو۔

”تمہاری بہن کی حالت کے بارے میں ہم نے پہلے بھی تمہیں بے خبر نہیں رکھا اور اب بھی تم خود دیکھ رہے ہو کہ اس کی حالت ہر گزرتے دن کے ساتھ بگڑتی جا رہی ہے۔ ورنہ کی شدت بڑھ رہی ہے اور بیہوشی کے درمیانی وقفے گھٹتے جا رہے ہیں۔ بین کلرز نے بھی کام کرنا بند کر دیا ہے اور شاید آنے والے دنوں میں وہ سب کی اذیت کم کرنے میں کوئی مدد نہ کر سکیں۔“ یوان منگ جو کچھ کہہ رہا تھا، وہ سب واقعی اس کے سامنے تھا لیکن اس کی زبان سے سننا زیادہ خوفناک لگ رہا تھا۔

”پھر..... پھر کیا ہو سکتا ہے؟“ الفاظ الٹ الٹ کر اس کے حلق سے برآمد ہوئے۔

”آپریشن ا“ یوان منگ نے یک لفظی جواب دیا۔
 ”لیکن..... لیکن اس میں تو بہت ریسک ہے نا؟“ اس بار بولنے سے پہلے اسے تھوک گل کر اپنا حلق تر کرنا پڑا تھا۔ لاڈلی بہن کے ہاتھ سے زندگی کی ڈور چھوٹی جا رہی تھی اور وہ بے بسی سے یہ سب دیکھنے کے سوا کچھ بھی کرنے سے قاصر تھا۔

”ریسک تو ہے اور تمہیں بھی فیصلہ کرنا ہے کہ اس کے

سک سک کر مرنے کا انتظار کرو گے یا آپریشن کی اجازت دو گے۔ آپریشن کی صورت میں وہ ایک جھٹکے میں مر بھی سکتی ہے اور کوئی طبی معجزہ بھی رونما ہو سکتا ہے۔“ یوان منگ کی صاف گوئی نے اسے سر پکڑ لینے پر مجبور کر دیا۔ اس کے سامنے انتخاب ہی کیا تھا..... موت..... صرف اور صرف موت۔ اذیت بھرے زندگی کے چند دن گزار لینے کے بعد ملنے والی موت یا پھر ایک ہی جھٹکے میں آجانے والی موت۔

”آپریشن کی صورت میں ہمارے سامنے ایک نیا آپشن آیا ہے جس کی وجہ سے ہم کچھ امید باندھ سکتے ہیں لیکن اس آپشن کا استعمال تمہاری مرضی اور اجازت پر منحصر ہوگا۔“ یوان منگ نے ایک مختصر سے وقفے کے بعد جو کہا، اس نے اسے سرائٹھانے پر مجبور کر دیا۔

”اگر کوئی امید موجود ہے تو میں ایسے کسی آپشن کو استعمال کرنے سے کیوں انکار کروں گا؟“ وہ حیران تھا۔

”کیونکہ وہ آپشن خود اپنی جگہ ایک رسک ہے۔“

”پلیز، پہیلیاں نہ بچھو اکیں۔ جو کہنا چاہتے ہیں وہ ایک بار میں ہی کہہ دیں۔“ وہ تھوڑا سا جھنجھلا گیا۔

”اس سرجری کے لیے ہماری نگاہ انتخاب پروفیسر اینڈریو پر جا ٹھہری ہے۔ خاص طور پر مجھے لگتا ہے کہ اینڈریو ہی وہ شخص ہے جو اس خطرناک کام کو کامیابی سے انجام دے سکتا ہے۔“

”آپ کا مطلب ہے وہ..... وہ پروفیسر اینڈریو جسے معاذ اور آپ کے ساتھی گرفتار کر کے لائے تھے اور جو ایک برف زار میں انسانوں پر گنی ٹکس کی طرح تجربات کرتے ہوئے انہیں کسی قصائی سے بھی زیادہ بے رحمی سے موت کے حوالے کر رہا تھا؟“ یوان منگ کے جواب نے اسے حیرت سے بھی زیادہ صدمے میں مبتلا کر دیا اور یوں اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا جیسے اس کی دماغی حالت پر شبہ ہو۔

”اس عرصے میں میری اینڈریو سے کئی ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ اس نے بے شک انسانی اور طبی اخلاقیات کو بری طرح پامال کیا ہے جس کے لیے میں اسے بُری طرح ناپسند بھی کرتا ہوں لیکن اس کی انسانی دماغ کے بارے میں معلومات اور مہارت ناقابل تردید ہے۔ وہ اس موضوع سے دیوانگی کی حد تک محبت کرتا ہے۔ ہمارے ماہرین اس پر ہر طرح کا ذہنی اور جسمانی طور پر تشدد کر کے بھی اسے اس کی مرضی کے خلاف ایک لفظ بولنے پر مجبور نہیں کر پائے لیکن جب میں اس سے انسانی دماغ پر بات کرتا ہوں تو وہ معلومات کے دریا بہا دیتا ہے۔“

”ایسا شخص کتنا ہی لائق اور ماہر ہو، اس پر کسی صورت بھروسہ نہیں کیا جاسکتا اور ہمارا شمار تو ایک طرح سے اس کے دشمنوں میں ہوتا ہے۔ وہ بھلا کیوں ہماری مدد کرے گا؟“

عالم شاہ نے زور زور سے نفی میں سر ہلایا۔ اینڈریو کی جو گھٹاؤنی حرکات اس کے علم میں آئی تھیں، اس کے بعد وہ اس پر بھروسہ کر بھی نہیں سکتا تھا۔

”میں نے اس سے سبیل کا کیس ڈسکس کیا تھا۔ رپورٹیں وغیرہ بھی دکھائی تھیں اور تم اندازہ کرو کہ جس معاملے میں، میں اور میرے دیگر ہم پیشہ نانوے فیصد ناامید ہیں، وہ اس میں تیس فیصد کامیابی کی امید رکھتا ہے۔“ یوان منگ ایک طرح سے اسے قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”اس بات کی کیا ضمانت ہوگی کہ وہ اخلاق سے عاری شخص بددیانتی سے کام نہیں لے گا اور جان بوجھ کر سبیل کو موت کے منہ میں نہیں دھکیلے گا۔“ عالم شاہ کا لہجہ تلخ اور تیز تھا۔

”پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کی سبیل سے براہ راست کوئی دشمنی نہیں ہے جو وہ اس کی جان کے درپے ہو جائے اور دوسری اس سے اہم بات ہے اس کا اپنے کام میں جنون۔ اسے لوگوں کی زندگی اور موت سے بے شک و شبہ نہیں ہے لیکن وہ اپنی پرفیکشن ثابت کرنے کے جذبہ میں مبتلا ہے۔ سبیل کا کیس بھی اس کے لیے ایک چیلنج کی طرح ہے اور وہ خود مجھ سے اس سرجری کے لیے خواہش ظاہر کر چکا ہے۔“

یوان منگ نے پوری صورت حال اس کے سامنے رکھی۔

”میں اکیلا اتنا بڑا فیصلہ نہیں لے سکتا۔ مجھے اس سلسلے میں اپنے والد سے بات کرنا ہوگی۔“ اس نے مہلت چاہی۔

”ضرور، لیکن یاد رکھنا کہ ہر گز رتا لمحہ صورت حال کو مزید خراب اور پیچیدہ کرتا جا رہا ہے۔“ یوان منگ نے مصالحتی کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے اسے جانے کی اجازت دے دی۔ عالم شاہ اعصاب زدہ سی کیفیت میں وہاں سے باہر نکلا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ یوان منگ، پروفیسر اینڈریو والے آپشن کی وجہ سے ہی بطور خاص اس سے ملنے آیا تھا اور پوری طرح قائل نہ کر سکنے کے باوجود اسے بہر حال سوچنے پر مجبور کر چکا تھا۔

”عالم صاحب!“ وہ بے خیالی میں سوچتا ہوا سبیل کے کمرے سے کچھ آگے نکل گیا تھا۔ ایک نسوانی پکار نے اسے پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کیا۔ نیلی ستا ہوا چہرہ لیے اسی کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اماں اور بابا سائیں کو تو وہ ملاقات کے اوقات کے علاوہ اسپتال میں رکنے نہیں دیتا تھا لیکن نیلی کو اعظم کی وجہ سے بطور خاص اجازت ملی ہوئی تھی۔ وہ اعظم کے ساتھ

لمحہ کمرے میں موجود رہتی تھی اور جب جب سبیل، اعظم سے ملنے کی خواہش کا اظہار کرتی تھی، اسے اس سے ملانے لے جاتی تھی۔ یہ ایک مرتے ہوئے انسان کو دی جانے والی خصوصی رعایت تھی۔

”کیا بات ہے نیلو فر! سب ٹھیک تو ہے؟“ کسی انہونی کا احساس اس کے دل کو دھڑکا گیا کہ نیلی کے چہرے پر لکھا اسے اچھے اشارے نہیں دے رہا تھا۔

”سبیل.....“ وہ ایک لفظ ادا کر کے رک گئی۔

”کیا ہوا ہے سبیل کو؟“ اس کے دل نے ایک پل کے لیے دھڑکنے ہی چھوڑ دیا اور یوں لگا کہ جس کے ہو جاتے گا ڈر ہر دم جان کو سولی پر لٹکانے رکھتا ہے، وہ سانحہ ہو گزرا ہے۔

”سبیل کے دائیں ہاتھ نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ ڈاکٹر زکا کہنا ہے کہ ٹیومر نے ان روز کو متاثر کیا ہے جو داغ سے ہاتھ تک پیغام لے کر جاتی ہیں۔“ نیلی نے تفصیل بتائی تو اسے سمجھ نہیں آئی کہ بدترین کے نہ ہونے پر خوش ہو یا جو ہو چکا ہے اس پر افسوس کرتے۔

واقعی اب کوئی حتمی فیصلہ ناگزیر ہو چلا تھا۔

☆☆☆

وہ اپنی جگہ ساکت لیٹی ایک ایک سیکنڈ گن رہی تھی۔ اس کا وجود اتنا ساکت تھا کہ جسم میں سانس لینے کا ارتعاش بھی پیدا نہیں ہو رہا تھا اور وہ دیکھنے میں ایسی تھی گویا کوئی مُردہ وجود لیکن اس مُردے کی ساری جان اس کی سماعتوں میں اتر آئی تھی۔ ایک ایک آہٹ پر کان لگائے وہ آس پاس کی دنیا کو ایسے محسوس کر رہی تھی جیسے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہو۔ سیل کے باہر ٹھٹھا سپاہی دائیں سے بائیں جا رہا ہے یا بائیں سے دائیں، اسے اچھی طرح علم تھا۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ وہ ایک چکر لگانے کے لیے کتنے قدم چلتا ہے اور کتنے سیکنڈز میں یہ فاصلہ طے کرتا ہے لیکن اسے اس سپاہی کے معمول سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ وہ دراصل اس سپاہی کی منتظر تھی جو روزانہ مقررہ اوقات میں اس کے لیے ناشتا، کھانا لے کر آتا تھا۔ آخر کار اس کا یہ انتظار ختم ہوا اور اس نے پہلے سپاہی کے قدموں کی چاپ کے ساتھ آنے والے کی چاپوں کو ملنے سنا۔ یہ نئی چاپ عین اس کے سیل کے دروازے پر آ کر رک گئی اور اس ان بڑیک اسپل شیٹ کی سلائیڈ کے کھسنے کی آواز سنائی دی جو محض 10"x10" کی تھی اور دن میں تین بار مقررہ اوقات میں کھلا کرتی تھی۔ اس دس انچی چوکھٹے کے آگے فابریک ایک مختصر پلیٹ فارم تھا جس پر کھانے کی ٹرے کھکانے کے بعد

سلائیڈ کھٹ سے بند ہو جاتی تھی۔ آج بھی اس معمول کو دہرایا گیا لیکن وہ معمول کے مطابق اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹرے اٹھانے کے لیے نہیں گئی۔

”ماش کی دال اور لوکی کی بھجیا۔“ اس کی تیز قوتِ شامہ نے فوراً خوشبوؤں کا تجزیہ کر کے اسے ٹرے میں موجود کھانے کے بارے میں آگاہ کر دیا۔ رات کے کھانے میں دال سبزی ملنا بھی ایک معمول تھا جو اس کے یہاں قیام کے عرصے میں کبھی نہیں بدلا تھا۔ سرخ گوشت، پھلی یا مرغی پر مشتمل کھانے دوپہر میں فراہم کیے جاتے تھے جبکہ ناشتے میں عموماً ڈبل روٹی، انڈے، مکھن، دودھ اور جیم کو اول بدل کر پیش کیا جاتا تھا۔ قید میں اتنی معیاری اور متوازن غذا کی فراہمی ایک نعمت تھی لیکن یہ نعمت اسے محدود مقدار میں فراہم کی جاتی تھی چنانچہ اس بات کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ وہ موٹی ہو سکے۔ خود اسے بھی اپنی فٹنس کا بہت خیال رہتا تھا اس لیے اس مختصر جگہ پر بھی ممکنہ ورزشیں ضرور کرتی تھی۔

اسے علم تھا کہ جب وہ ورزش کرتی ہے تو باہر ٹھٹھے سپاہی کے قدموں کی رفتار شیٹ کی چوٹھی سلائیڈ کے پاس سے گزرتے ہوئے دھیمی ہو جاتی ہے۔ صبح اور رات کی شفٹ میں ڈیوٹی دینے والے سپاہیوں کے معمول میں کبھی تبدیلی نہیں آتی تھی لیکن سہ پہر سے رات بارہ بجے تک ڈیوٹی دینے والا سپاہی اپنے دونوں ساتھیوں سے مزاجاً مختلف تھا اور جب وہ رات کے کھانے کے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد اپنی معمول کی ہلکی پھلکی ورزشیں شروع کرتی تھی تو اس کے قدموں کی آوازیں واضح طور پر مدھم ہوتی محسوس کرتی تھی۔ سپاہی کی خود میں دلچسپی محسوس کر کے اس نے غیر محسوس طور پر اس سے دوستی کا آغاز کیا تھا۔ پہلے ایک دو دن محض مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا تھا پھر ہلکی پھلکی اشارے بازی ہونے لگی تھی اور آخر کار نوبت یہاں تک آ گئی تھی کہ رات گیارہ سے بارہ کے درمیان جب اس خاموش جگہ کی خاموشی، ویرانی میں بدل جاتی تھی، شیٹے کا چوکھٹا کھسکا تھا اور وہ دونوں اس کے آ رہا کھڑے ہو کر ایک دوسرے سے باتیں کرتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی بے معنی اور بظاہر بے ضرر باتیں..... ان باتوں کے نتیجے میں وہ جانتی تھی کہ اس سپاہی کا نام شفیع محمد تھا۔ وہ پنجاب کے کسی چھوٹے سے گاؤں کا رہنے والا تھا اور اپنے ڈھیر سارے بہن بھائیوں کے درمیان محرومی کی زندگی گزارتا کسی نہ کسی طرح میٹرک کر کے فوج میں آ گیا تھا۔ فوج کی اس معمولی سی ملازمت نے نہ تو اسے آسودہ کیا تھا اور نہ ہی اس کی محرومی کا ازالہ۔ وہ

پچھلے کئی سالوں سے خود بے حد قناعت سے گزارہ کرتا تھا وہ
کا بڑا حصہ گاؤں بھجوا رہا تھا تاکہ وہاں موجود اس کی اوپر
تلے کی بہنیں بیاہی جاسکیں۔ تین بہنوں کو ان کے گھر کا
کردینے کے باوجود اس کی شادی کا مستقبل قریب میں کوئی
امکان نہیں تھا کیونکہ اول ابھی مزید ایک بہن شادی کے لیے
باقی تھی، دوم ماں کی خواہش تھی کہ اس کی شادی سے پہلے گھر
کی مرمت کرنے کے ساتھ ساتھ ایک کمر مزید ڈال لیا
جائے۔ وہ اپنی بے کیف اور بے رنگ زندگی سے بیزار تھا
اور اس کے لیے یہی بہت بڑی بات تھی کہ ایک حسین ترین
عورت کے حسن سے آنکھیں سینکنے کے ساتھ ساتھ اس سے
بات چیت کا موقع بھی مل رہا تھا۔

اس نے شفیع محمد کو اپنے بارے میں جو معلومات فراہم
کی تھیں، ان میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ اسے کسی بڑی
غلط فہمی کے تحت گرفتار کیا گیا ہے ورنہ وہ ایک عام پاکستانی
شہری ہے جس کا اس کے شوہر کی وفات کے بعد کوئی سہارا
نہیں رہا تھا اور وہ شوہر کے بعد اپنے طور پر اس کے
چھوڑے ہوئے کاروبار کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔
اسے اپنی گرفتاری کی جو واحد وجہ سمجھ آتی تھی وہ یہ تھی کہ
شادی سے قبل وہ افغان شہری تھی اور اس کا شوہر اپنے
کاروباری دورے کے دوران اسے افغانستان سے بیاہ کر
لایا تھا۔ شفیع محمد اس کے اس خیال سے اتفاق کرنے کے
ساتھ ساتھ اس کے لیے دل میں ہمدردی بھی محسوس کرنے لگا
تھا اور اس وقت تو بالکل ڈھے جاتا تھا جب وہ آنکھوں میں
آنسو بھر کر بھرائی ہوئی آواز میں کہتی تھی۔

”تمہیں نہیں معلوم شفیع کہ جب وہ مجھے انویسٹی گیشن
روم میں لے جاتے ہیں تو میں کس ذہنی اور جسمانی اذیت
سے گزاری جاتی ہوں۔ کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے کہ خودکشی
کر لوں لیکن یہاں خودکشی کا سامان بھی تو میسر نہیں۔“

”رب سے مایوس نہیں ہوتے جی۔ مجھے پوری امید
ہے کہ وہ آپ بے گناہ کو یہاں سے ضرور رہائی دلانے گا۔“
وہ اس کی خودکشی کی خواہش سن کر ڈر جاتا تھا اور اسے تسلی
دلانے کے ساتھ ساتھ کسانا لے کر آنے والے کو بار بار
یاد دہانی کرواتا تھا کہ کھانے کی ٹرے میں ایسی کوئی شے
موجود نہیں ہونی چاہیے جس سے وہ خود کو کوئی نقصان
پہنچا سکے۔ یہ احتیاط پہلے ہی کی جاتی تھی اور ٹرے سمیت
کھانے کے برتنوں میں کہیں بھی دھات کا استعمال نہیں تھا۔
چھری، کانٹوں کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، چمچے بھی محض
قائمر کے ہی مہیا کیے جاتے تھے۔

ایک روز اس نے کہا۔ ”کبھی کبھی مجھے تم سے بھی ڈر لگتا
ہے شفیع! خیال آتا ہے کہ تمہارے اوپر والوں نے تمہیں
مجھے ٹریپ کرنے کے لیے تعینات کیا ہے۔ شاید وہ سمجھتے ہیں
کہ دوستی کے جال میں پھنس کر میں باتوں ہی باتوں میں
تمہیں اپنے بارے میں کوئی کلیو دے دوں گی لیکن یقین کرو
کہ ایسا کچھ ہے ہی نہیں تو میں بتاؤں گی کیا؟“

”نہ جی نہ۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اوپر والے ہم
عام سپاہیوں کو عقل سے کورا سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہم اس
لائق ہی نہیں ہیں کہ ایسا کوئی مغز ماری کا کام کر سکیں۔ ہمیں
”جاگدے رہنا“ ہو شیار رہنا“ سے آگے اوپر سے کوئی حکم
ہی نہیں ملتا ہے۔“ اس کے شکوک و شبہات سے گھبرا یا شفیع اپنی
صفائی دینے کے چکر میں یہ بھی بھول گیا کہ وہ تو محض تاکہ جھانگی
کرتا تھا۔ اس تاکہ جھانگی میں اشارے بازی شامل کر کے
اسے دوستی تک لانے میں سارا کردار اس کا تھا۔

ایک دن اس نے پوچھا تھا۔ ”کیا یہ ٹھیک ہے شفیع کہ
میرے سیل میں کوئی کیمرہ یا خفیہ مائیک نصب نہیں کیا گیا ہے؟“
”بالکل ٹھیک ہے جی۔ ادھر اول تو عورتیں لائی ہی
بہت کم جاتی ہیں اور کبھی کوئی لائی جائے تو اس پر کیمرہ نہیں
لگاتے جی۔ اوپر والے مزاج کے تھیکے اور سخت بے شک ہیں
پر عورت کا احترام ہر حال میں کرتے ہیں۔“ شفیع نے اپنے
اعلیٰ افسران کی خوبیاں جوش و خروش سے بیان کیں جس کے
جواب میں اس نے اپنی ٹیکسی ناک ایک ادا سے چڑھائی تھی
اور زور کی ”اونہہ“ کرتے ہوئے منہ بنا کر بولی تھی۔

”سب دکھاوا ہے جو تم چھوٹے ریک کے لوگوں کو
متاثر کرنے کے لیے کیا جاتا ہے ورنہ میں جو ہر دوسرے دن
انو۔ٹی کیشن کے نام پر بلائی جاتی ہوں، مجھ سے بڑھ کر ان
کے اخلاق و کردار سے بھلا کون واقف ہو سکتا ہے۔“ اس
کے اس انکشاف پر شفیع کا منہ بہت دیر تک بے یقینی کے
انداز میں کھلا رہا تھا لیکن اس دن کے بعد اس نے دل میں
فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر اسے اس مظلوم لڑکی کو اس قید سے نکالنے
کا موقع ملایا اس نے ایسی کوئی فرمائش کی تو وہ اس کا ہر ممکن
ساتھ دے گا۔

ابھی تک دونوں میں سے کوئی بھی صورت پیش نہیں
آئی تھی اس لیے روزانہ کا معمول اور شفیع کی تاک جھانک
جاری تھی۔ آج بھی کھانا مہیا کرنے والے سپاہی کو وہاں
گئے گھنٹا بھر گزرا ہوگا کہ شفیع کی پُر اشتیاق نظروں نے شیشے
کے چوکٹے سے اندر کا نظارہ کرنے کے لیے بھٹکنا شروع
کر دیا لیکن نظریں پلیٹ فارم پر دھری بھری ہوئی ٹرے

سے ٹکرائیں تو وہ ٹھٹک گیا۔ وہ چاہے کتنی ہی مایوسانہ باتیں کرتی تھی لیکن ایسا ایک بار بھی نہیں ہوا تھا کہ اس نے فراہم کردہ کھانا قبول نہ کیا ہو۔

شفیع کے اندر بہت سے اندیشے جاگے اور اس نے بے قراری سے قریب جا کر شیٹے لگے چوکھے سے اندر جھانکا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ اسے اپنے فرش پر ساکت لیٹی ہوئی دکھائی دی۔ اس کی تشویش میں مزید اضافہ ہو گیا۔ جب سے وہ اس کی پہریداری پر مقرر ہوا تھا، اس نے کبھی اسے یوں بے وقت آرام کرتے نہیں دیکھا تھا۔ کچھ دیر گوگوں کی کیفیت میں رہنے کے بعد اس نے رپورٹ کرنے کا فیصلہ کیا۔ جب تک ایک کیپٹن ڈاکٹر سمیت وہاں پہنچا، شفیع محمد متعدد بار سیل کے اندر جھانک چکا تھا۔ کیپٹن آیا اور سیل کا لاک کھلا تو سب سے پہلے اندر جانے والا شخص سپاہی شفیع محمد تھا۔ اس نے ڈاکٹر سے بھی پہلے اس کا بے جان سا پڑا ہاتھ تمام کر بغض ٹٹولنے کی کوشش کی۔ بغض پر انگلیاں جمتیں اس سے قبل اس کی کپٹی پر جما کر ایک ہاتھ پڑا اور اپنے گھومتے سر کو سنبھالنے کی کوشش میں اسے علم ہی نہیں ہوسکا کہ کب اس کے ہولسٹر سے گن نکل کر اس کے ہاتھ میں چلی گئی ہے اور وہ اسپرنگ کی طرح اچھل کر بستر سے ڈاکٹر تک کا فاصلہ طے کر چکی ہے۔

”کسی نے کوئی غلط حرکت کرنے کی کوشش کی تو ڈاکٹر کی کھوپڑی اس کی گردن پر سلامت نہیں رہے گی۔“ اس کی آواز میں جو غراہٹ تھی، اس نے شفیع کے چکراتے سر کو مزید چکرا کر رکھ دیا۔ کل تک وہ جس کی بے گناہی اور مظلومیت کے قصے سن رہا تھا، آج وہ شیرنی بنی سب کو آنکھیں دکھا رہی تھی۔

”کیا چاہتی ہو تم؟“ سب سے پہلے کیپٹن نے ہی اپنے حواس سنبھالے۔

”سیف ایگزٹ و سواری۔“ اس نے بھی بنا تامل اپنا مطالبہ سامنے رکھ دیا۔

”یہ نہیں ہو سکتا۔ یہاں سے نکلنا اتنا آسان نہیں ہے۔“ کیپٹن نے فوراً انکار کیا۔

”اس صورت میں ڈاکٹر زندہ نہیں رہے گا اور اسے تم میری لاسٹ وارننگ سمجھو۔“ وہ پہلے سے زیادہ خطرناک لہجے میں غرائی۔

”اس طرح تم اپنی مصیبت مزید بڑھا لو گی۔“ کیپٹن اس سے ہر صورت مذاکرات کر کے ہتھیار چھوڑ دینے پر راضی کرنے یا خود جینے کا موقع تلاش کر رہا تھا۔

”میں جن الزامات کے ساتھ یہاں ہوں، اس کے

بعد اپنے لیے کسی آسانی کا سوچ بھی نہیں سکتی۔“ وہ صاف مرنے یا مار دینے پر تلی ہوئی تھی۔

”مجھے اپنے آفیسر سے بات کرنا ہو گی۔“ کیپٹن نے بے بسی کا اظہار کیا۔

”میرے جانے کے بعد کرتے رہنا۔ ابھی میری راہ رو کی تو نہ تم زندہ بچو گے، نہ یہ ڈاکٹر۔“ اس کا لب و لہجہ اور تیور ایسے تھے کہ شفیع ایک کونے میں کھڑا بس ٹکڑا ٹکڑا اس کی شکل ہی دیکھے جا رہا تھا۔

”باہر چلو۔“ اس نے کسی جواب کا انتظار کیے بغیر ڈاکٹر کو شہو کا لگایا۔ اس نے لا چاری سے کیپٹن کو دیکھا اور اس کی آنکھوں میں بھی بے بسی دیکھ کر چپکے سے قدم آگے بڑھا دیے۔ وہ خود کو پوری طرح ڈاکٹر کی آڑ میں چھپائے جس مہارت سے آگے بڑھ رہی تھی، اس سے اس کے مکمل تربیت یافتہ ہونے کا احساس ہو رہا تھا۔ اس عمارت میں بہت زیادہ لوگ نہیں تھے لیکن جو موجود تھے، ان کے لیے بھی کوئی موقع نہیں تھا کہ اسے بے بس کر کے ڈاکٹر کو اس سے نجات دلا سکیں۔ آس پاس بھگدڑ مچی تھی۔ ہاتھوں میں ہتھیار تیار تھے لیکن کسی کو ایسا کوئی زاویہ نہیں مل رہا تھا کہ ڈاکٹر کو زد میں آنے سے بچا کر صرف اور صرف اسے نشانہ بنا سکیں۔

”تمہاری گاڑی کون سی ہے؟“ باہر کھلے میں آ کر اس نے وہاں موجود تین گاڑیوں کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر سے پوچھا۔

”وہ۔“ ڈاکٹر نے ایک سفید ٹویٹا کرولا کی طرف اشارہ کیا۔

”چابی نکالو۔“ اس نے ڈاکٹر کو حکم دیا اور ارد گرد منڈلاتے سائیوں پر ایک نظر ڈال کر بلند آواز میں بولی۔

”میرے پاس موت یا آزادی کے سوا کوئی تیسرا آپشن نہیں ہے لیکن یاد رکھنا کہ اگر مجھے موت کو چننا پڑا تو سب سے پہلے ڈاکٹر کی موت کو یقینی بنا دوں گی۔“

”لاک کھولو۔“ اعلان کر چکنے کے بعد اس نے ڈاکٹر کو نیا حکم دیا اور اس کے لاک کھولنے کے دوران بھی اس کے ساتھ جڑی رہی۔ ہتھیاروں کی لیلی پر انگلی جمائے بیٹھے ہوئے افراد کے لیے اب واحد امید یہی تھی کہ وہ ڈاکٹر کو ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھا کر خود دوسری سمت سے بیٹھنے کے لیے گھوم کر آئے گی تو وہ اسے نشانہ بنا سکیں گے لیکن اس نے یہ موقع بھی فراہم نہیں کیا۔ جیسے ہی ڈرائیونگ سائیڈ کا دروازہ کھلا، وہ ڈاکٹر کو اپنے ساتھ ہی کھینچتی ہوئی اسی جانب سے پہلے خود اندر داخل ہوئی پھر ڈاکٹر کو بھی بٹھالیا۔ یہ کام اس نے اتنی پھرتی سے کیا تھا کہ تاک میں بیٹھے افراد دیکھتے ہی رہ گئے

انسان اگر... تو...

- ☆ محبت کر سکتا ہے..... اگر وہ حسد چھوڑ دے۔
- ☆ مطمئن رہ سکتا ہے..... اگر قناعت کرے۔
- ☆ عزت کروا سکتا ہے..... اگر زبان قابو میں رہے۔
- ☆ انصاف کر سکتا ہے..... اگر موت کو یاد رکھے۔

ہم سے پوچھیے

- ☆ محبوب بے وفا ہو جائے تو کیا کرنا چاہیے؟
- اپنا صدقہ اتارنا چاہیے کہ شیر کی کچھار سے زندہ نکل آئے۔
- ☆ کنواروں کو کرائے کے مکان کیوں نہیں ملتے؟
- تاکہ ارد گرد کے مکان خالی نہ ہو جائیں یا پھر مکان جہیز میں نہ دینا پڑ جائے۔
- ☆ عورت شادی سے پہلے سہنوں کی رانی ہوتی ہے اور بعد میں؟
- کبھی نہ ختم ہونے والی بے سُر کی کہانی۔
- ☆ مرد درویش چھوڑتے ہیں اور عورت؟
- قرضہ۔
- (مرسلہ: محمد انور ندیم۔ اسلام نگر، حویلی لکھنؤ، اڈاکاڑہ)

بونٹ پر جاگرا۔ وہ اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنا چکی تھی اور باقی کام لوگوں کی بوکھلاہٹ نے کر دیا تھا۔ وہاں جو افراد تفری مچی تھی اس کے بعد امید نہیں تھی کہ ان کے تعاقب میں آنے والی گاڑیوں کو آگے آنے کا راستہ مل سکے گا۔

”یہ اچھا نہیں کیا تم نے۔ کئی لوگ زد میں آگئے ہوں گے۔ شاید کوئی مر بھی گیا ہو۔“ ڈاکٹر نے افسوس کا اظہار کیا۔

”اس میں میرا نہیں، تمہارے لوگوں کا قصور ہے۔ اگر وہ میری بات مان لیتے تو اس کی نوبت نہیں آتی۔“ بے نیازی سے جواب دے کر اس نے ڈاکٹر کو سفر کی سمت سے آگاہ کیا۔ اب وہ پہلے کے مقابلے میں کافی ریلیکس تھی۔ اتفاقاً کوئی دیکھ بھی نہیں سکا تھا کہ فائر کس نے کیا ہے اس لیے سفر آرام سے جاری تھا۔

”وہ ٹریڈ کے ذریعے بھی ہماری لوکیشن معلوم کر سکتے ہیں۔“

”اس کے لیے تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ چمکی جسے ڈاکٹر نہیں دیکھ سکا اور اس کی ہدایت کے مطابق سفر جاری رکھا۔ چند منٹوں میں گاڑی ایک ایسی ندی پر بنائے گئے پل پر چڑھ گئی جس میں صاف پانی صرف شدید بارش کے دنوں میں ہی نظر آتا تھا ورنہ سارا سال سیوریج کے پانی کی شمولیت کے باعث آلودہ ہی دکھائی دیتی تھی۔

تھے۔ اس نے ڈاکٹر کو گریبان سے پکڑ کر کچھ اس انداز میں اپنے ساتھ ساتھ اندر گھسیٹا تھا کہ ڈاکٹر کا جسم اس کے لیے ڈھال بن گیا تھا۔ بیٹھنے کے بعد بھی وہ ممکنہ حد تک ڈاکٹر کے قریب رہی تھی اور اس کی کنپٹی پر گن کی نال رکھی ہوئی تھی۔ کنپٹی پر رکھا یہ ہتھیار نہ صرف ڈاکٹر کو ہر ہدایت خاموشی سے ماننے پر مجبور کر رہا تھا بلکہ آس پاس والوں کو بھی تھامے ہوئے تھا۔ وہ سب ہتھیار شناس تھے اور جانتے تھے کہ اگر انہوں نے اسے نشانہ بنایا تو وہ خود گولی نہ بھی چلائے تو گولی لگنے کے نتیجے میں اس کے جسم کو لگنے والے جھٹکے سے بچ کام خود کار طور پر بھی ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر جیسے قابل اور معزز شخص کی زندگی بچانے کے لیے وہ خون کے گھونٹ پینے پر مجبور تھے۔ گیٹ بھی کھولنا پڑا۔ جیسے ہی ٹویوٹا کروڈا گیٹ سے باہر نکلی، انہوں نے وہاں کھڑی باقی دو گاڑیوں کی طرف دوڑ لگائی۔ کھٹا کھٹ گاڑیوں کے دروازے کھلے، انجن غرائے اور تعاقب شروع ہو گیا۔

”موبائل فون سے تمہارے پاس؟“ اس نے اپنے تعاقب میں آتی گاڑیوں کو ایک نظر دیکھا اور پھر ڈاکٹر سے سوال کیا۔ جواب اثبات میں ملا تو اگلا حکم صادر کیا۔

”اپنے کیپٹن کو کال ملاؤ اور فون اسپیکر پر ڈالو۔“

ڈاکٹر کے پاس تعمیل کے سوا کیا چارہ تھا۔ ڈرائیونگ کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے یہ کام بھی سرانجام دیا۔

”اپنی گاڑیاں، ڈاکٹر کی گاڑی سے دور رکھو۔ اگر مجھے کوئی قریب دکھائی دیا تو اس چلتی سڑک پر ایسے گولیاں برسائیں گی کہ انسانی جانیں جانے کے ساتھ ساتھ ہمارا ٹریفک درہم برہم ہو جائے گا اور تمہاری گاڑیوں کو راستہ نہیں ملے گا۔“ دھمکی دے کر اس نے خود ہی سلسلہ منقطع کر دیا۔

فورا ہی فون دوبارہ بجنے لگا۔ اس نے اسے اٹھا کر باہر پھینکا اور پیچھے آتی گاڑیوں کا جائزہ لینے لگی۔ اچھے خاصے ٹریفک کے باوجود وہ اپنی تعاقب کار دونوں گاڑیوں کو پہچان سکتی تھی۔ دونوں گاڑیوں نے فاصلہ کافی بڑھالیا تھا لیکن تعاقب بدستور جاری تھا۔

”تمہاری گاڑی میں ٹریڈر لگا ہے؟“ اس نے ڈاکٹر سے سوال کیا جس کا جواب اس نے محض اثبات میں سر ہلا کر دیا۔

”ٹریڈر لگا ہے، اسٹوڈنٹ پھر بھی پیچھا کر رہے ہیں۔“ وہ بڑبڑائی اور یکدم ہی اپنا اور گن کار رخ بدل کر ایک فائر کیا۔ پیچھے سے آتی ایک تیز رفتار گاڑی نشانہ بن کر بری طرح لہرائی۔ اس کے قریب سے گزرتی بائیک ہٹ ہو کر سڑک پر پھسلی اور بائیکر اچھل کر ایک دوسری گاڑی کے

”یقیناً تم اپنی رہائی کے سلسلے میں سوچ رہے ہو گے؟“

”لازمی سی بات ہے۔“

”زندگی سے رہائی چاہتے ہو یا اس سے؟“ اس نے گن ذرا کی ذرا ڈاکٹر کی نظروں کے سامنے کی۔ سڑک پر آنے کے بعد سے اس نے گن ڈاکٹر کی کپٹی سے ہٹا کر پسلیوں سے لگادی تھی کہ کسی کی نظروں میں نہ آ سکے۔

”کک..... کیا مطلب؟“ ڈاکٹر اس کے سوال پر بوکھلا گیا۔

”سیدھا سا مطلب ہے، میرے ساتھ تعاون کرو گے یا نہیں؟“

”اتنی دیر سے اور کیا کر رہا ہوں۔“ وہ بھنا گیا۔

”اپنی جان بچا رہے ہو۔“ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

”تو آگے بھی میرا خود کشی کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“ ڈاکٹر کا لہجہ جلا کٹا تھا۔

”اچھی بات ہے۔ انسان کو سب سے زیادہ اپنی زندگی کا ہی خیال ہونا چاہیے۔“ اس نے ڈاکٹر کو سراہا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

”ہل سے اترنے کے بعد تم مجھے گاڑی سے اتار دو گے اور خود سیدھے شارع فیصل تک جاؤ گے۔ وہاں پہنچنے سے پہلے تم نے کہیں رکنا نہیں ہے۔ خیال رہے میں پیچھے

رکشے میں تم پر نظر رکھوں گی اس لیے مجھے دھمکا دیتے گی کوشش نہ کرنا۔ شارع فیصل پر پہنچنے کے بعد تم آزاد ہو گے

کہ جس کو چاہو اپنے بارے میں اطلاع دیتے پھر۔“

”جب تمہیں رکشے میں میرے پیچھے پیچھے وہاں تک آنا ہی ہے تو بہتر ہے ساتھ ہی چلی چلو۔“ ڈاکٹر کو اس کا

پروگرام کچھ سمجھ نہیں آیا اور الجھ کر بولا۔

”تم سے تمہاری رائے نہیں مانگی ہے۔“ اس نے روکے لہجے میں جواب دیا اور پھر طالبہ کیا۔

”اپنا والٹ میرے حوالے کر دو۔“ ڈاکٹر کو بادل ناخواستہ یہ مطالبہ بھی پورا کرنا پڑا۔ اس کا پھولا ہوا والٹ

بتا رہا تھا کہ اندر اچھی خاصی رقم موجود ہے۔

”بس، یہیں اتار دو۔“ اس نے ہل ختم ہوتے ہی ایک قطار میں کھڑے رکشے دیکھ کر مطالبہ کیا۔ ڈاکٹر نے فوراً

گاڑی کو ایسے بریک لگائے جیسے جانے کب سے اسی ایک حکم کا منتظر ہو۔ وہ گاڑی سے اتری اور لپک کر ایک رکشے میں بیٹھ گئی۔

”اس سفید کرولا کے پیچھے چلو۔“ ڈاکٹر اسے اتارتے ہی گاڑی آگے بڑھانے لگا تھا۔ اس نے رکشے والے کو تیز لہجے میں حکم دیا۔

”کیا تمہارا بی بی بی؟“ اس نے ٹراؤزر اور ٹی شرٹ میں ملبوس لڑکی کو شک سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کوئی تمہارا نہیں ہے۔ وہ میرا شوہر ہے اور غصے میں مجھے یہاں اتار گیا ہے۔ مجھے اس کے پیچھے جانا ہے۔“

جلدی جلدی بتا کر اس نے والٹ سے ہزار کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا تو رکشے والے نے دانت نکالتے ہوئے نوٹ تھاما اور تیزی سے رکشا آگے بڑھا دیا۔ اسے

گاڑی سے اترتے ہوئے تو بہر حال وہ دیکھ ہی چکا تھا اس لیے اس کے بیان پر زیادہ شک نہیں گزرا تھا۔ اپنے پاس

موجود سب سے مشکوک شے یعنی گن گاڑی سے اترتے ہوئے وہ اتنی ہوشیاری سے گاڑی میں ہی چھوڑ آئی تھی کہ

ڈاکٹر کو خبر بھی نہیں ہو سکی تھی۔

”اس کے بالکل سر پر پہنچنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن اتنے قریب ضرور رہنا کہ اسے مر میں تمہارا رکشا دکھائی دیتا

رہے اور وہ جان لے کہ میں اس کے پیچھے ہوں۔“ سفید کرولا سمیت ہر جانب نگاہ رکھے اس نے اس کی تیز رفتاری

پر ٹوکتے ہوئے مکمل ہدایت دی تو اس نے ایک بار پھر دانت نکالے اور رفتار قدرے کم کر دی۔ آگے وہ ایک ایسی سڑک

پر پہنچ گئے جہاں ٹریفک کا بہت زور تھا اور گاڑیوں کی رفتار خود بخود ہی بہت ہلکی ہو گئی تھی۔

”میں یہاں اتر رہی ہوں لیکن جیسے شارع فیصل تک کرولا کا پیچھا جاری رکھنا ہے۔ بے ایمانی کا سوچنا بھی

نہیں۔ میں نے نمبر نوٹ کر لیا ہے۔ کام پورا نہ ہوا تو تم اور تمہارا رکشا دونوں پولیس اسٹیشن پہنچ جاؤ گے۔“ اس نے

پانچ سو کا نوٹ مزید اسے تھمایا اور ساتھ دھمکی بھی لگائی۔

”آپ بے فکر رہو بی بی! اپنا اپنی رودی حلال کر کے کھاتا ہے۔“ رکشا ڈرائیور نے اسے یقین دہانی

کروائی لیکن وہ اس کی بات پوری سنے بغیر ہی دھیمی رفتار سے چلتے رکشے سے اتر چکی تھی۔ رکشا ڈرائیور کو اس کی پھرتی

نے حیران کیا لیکن پھر وہ سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔ وہ بھی چلتے ٹریفک میں راستہ بتاتی سڑک پر بائیں جانب کھل گئی

اور وہاں سے ایک ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔ کئی سواریاں بدلنے کے بعد وہ ٹھیکروں کی ایک بستی میں داخل ہوئی تو رات اپنا

اچھا خاصا سفر طے کر چکی تھی لیکن بستی میں جگہ جگہ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ لوگ ٹی شرٹ اور ٹراؤزر میں ملبوس اس تھا

تعارف کرواتے تھے اور جب وہ انہیں شناخت کرنے میں کامیاب نہیں ہو پاتا تھا تو مایوس سے ہو جاتے تھے۔

”عمار بیٹا! اندر آؤ۔“ اسے کچھ دیر تک اندر خواتین کے ملنے اور علیک سلیک کی آوازیں سنائی دیتی رہیں پھر زرمینہ گل نے اسے پکارا۔ وہ کلہاڑی ایک جانب رکھ کر ماتھے پر آیا پسینا رومال سے پونچھتا اندر کی طرف بڑھا۔

”حکم بی بی جان!“ خواتین کی پرجسس نگاہوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے زرمینہ بی بی سے پوچھا۔

”حکم کیسا بیٹا! بس تمہیں پری دوش سے ملنے بلایا تھا۔ یاد ہے نا یہ تمہیں؟ اس کے ساتھ تو تم نے اپنے بچپن کا سب سے زیادہ وقت بتایا ہے۔“

”وہ جو بننے کھلتے ہمیشہ مجھ سے جیت جاتی تھی۔“ زرمینہ بی بی کے تعارف کروانے پر وہ بے ساختہ بول پڑا اور اس کے اتنا بولنے پر ہی پری دوش کا چہرہ کھل اٹھا۔

”لو بھئی، تم خواخوہ اداس ہو رہی تھیں کہ عمار تمہیں بالکل بھول گیا ہے۔ اب دیکھ لو، اسے تم یاد ہو کہ نہیں یاد ہو۔“ زرمینہ بی بی نے چپک کر پری دوش کو جتایا تو اس کی مسکراہٹ غریب گہری ہو گئی۔

”تو، تو بڑی خوش نصیب ہے پری دوش! ہم نے تو عمار کو اتنا کچھ یاد کروانے کی کوشش کی تھی لیکن اسے کچھ یاد نہیں آیا تھا۔ تجھے تو فوراً پہچان گیا۔“ عمر میں پری دوش سے چھ سات سال بڑی کچھ اس سے ملتے جلتے نقوش والی جوان العر عورت نے شکوہ کرنے کے انداز میں کہا تو وہ ٹھٹھکا کر ہنس دی۔

”بچپن کے نقوش گہرے بھی تو زیادہ ہوتے ہیں نا پھر تم تو پندرہ برس کی عمر میں شادی ہو کر یہاں سے چلی بھی گئی تھیں۔ تمہارا بھی کبھار کا آنا، نکل گیا ہوگا اس بچارے کے دماغ سے۔“ زرمینہ بی بی صفائیاں پیش کر رہی تھیں اور مسلسل مسکراتی ہوئی پری دوش کو دیکھ کر اس کا بھی ایک صفائی پیش کرنے کا دل چاہ رہا تھا۔ وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ تم میری یادداشت کے کسی خانے میں موجود نہیں ہو اور ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے جس بات کا حوالہ دیا ہے، وہ ان باتوں کی وجہ سے ذہن میں آئی تھی جو یہاں آمد کے بعد سے زرمینہ بی بی اور آغا گل مسلسل کرتے رہے تھے۔ ان چند دنوں میں ماضی کے کئی واقعات اور حوالے دہراتے وہ دونوں گویا اپنے عمار کا بچپن دوبارہ جیتے رہے تھے یا پھر یہ تھا کہ اس بہانے وہ اس کی یادداشت لوٹانے کی کوشش کر رہے تھے۔

عورت کو دیکھ کر چونکے تو ضرور تھے لیکن اس کا بے خوف و بااعتماد انداز انہیں اس کی راہ میں آنے کی ہمت نہیں کرنے دے رہا تھا۔ اس نے بستی کے ایک دروازے پر دستک دی تو تجسس آنکھوں نے جان لیا کہ وہ کیوں اتنی بے خوف دکھائی دے رہی تھی۔ اس دروازے تک آنے والے مہمان کو چھیڑنے کی کسی میں بھی جرأت نہیں تھی۔

☆☆☆

وہ پوری جانفشانی سے ممکن میں رکھے لکڑیوں کے ڈھیر سے نبرد آزما کلہاڑی کی مدد سے انہیں چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹنے میں مصروف تھا۔ مشقت سے اس کے ماتھے پر پسینا چمک رہا تھا اور ہونٹ تھوڑے سے بھیچے ہوئے تھے لیکن وہ ہاتھ روکے بغیر مسلسل اپنے کام میں مصروف تھا۔ اس مصروفیت میں دروازے پر ہونے والی بلند دستک نے خلل ڈالا۔

”بیٹا! دروازے پر دیکھو، کون ہے۔“ باورچی خانے سے زرمینہ گل کی مصروف سی آواز سنائی دی تو اسے مجبوراً کلہاڑی ہاتھ سے رکھ کر دروازہ کھولنے جانا پڑا۔ سامنے خوش رنگ ملبوسات میں دو خواتین کھڑی تھیں۔ ان میں سے ایک خاتون کو وہ پہلے بھی دو ایک بار یہاں آتے ہوئے دیکھ چکا تھا اس لیے بنا کوئی سوال کیے انہیں اندر آنے کا راستہ دے دیا۔

”کون ہے عمار؟“ اندر سے زرمینہ گل نے آواز لگا کر پوچھا۔

”ہم ہیں چچی جان!“ آنے والیوں میں سے ایک نے آواز لگا کر بتایا۔ وہ کسی کی بھی طرف توجہ دے بغیر ایک بار پھر پہلے والی جگہ پر جا کھڑا ہوا اور کلہاڑی اٹھا کر دوبارہ اپنا کام شروع کرنے کا ارادہ کیا لیکن چہرے پر نظروں کی تپش نے اسے نظر اٹھا کر دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اٹھارہ انیس سال کی گلابی رنگت والی ایک لڑکی پرجسس نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ نظریں ملیں تو ایک بل کے لیے تھوڑی سی گڑبڑائی پھر سنبھل کر مسکراتے ہوئے بولی۔

”میں پری دوش ہوں۔“

”جی اچھا۔“ اس نے سنجیدگی سے جواب دیا اور لکڑی کے ایک بڑے ٹکڑے پر کلہاڑی کا دار کیا۔ لڑکی جو شاید تعارف کے بعد اس کی طرف سے کسی خوشگوار رد عمل کی منتظر تھی، اس روکھے لہجے پر تھوڑی سی ہجھ کر رہ گئی اور تیزی سے رخ موڑ کر اندر کی طرف چلی گئی۔ اس نے اس صورت حال پر ایک گہری سانس لی۔ جب سے یہاں آیا تھا کچھ اسی طرح کی صورت حال کا سامنا تھا۔ لوگ آتے تھے، اس سے اپنا

”عمار بیٹا! تم منہ ہاتھ دھو کر آ جاؤ تو پھر کھانا لگاتے ہیں۔ تمہارے آغا جان بھی بس آتے ہی ہوں گے۔“
 زرینہ بی بی اب اس سے مخاطب تھیں۔ وہ زبان سے کچھ کہنے کے بجائے سر ہلا کر خاموشی سے پلٹ گیا۔

”بہت تہدیل ہو گیا ہے عمار!“ پلٹتے ہوئے اس نے پیچھے سے کسی کا تبرہ سنا اور بے ساختہ ہی پوری بات سننے کے لیے دروازے کے باہر رک گیا۔

”وقت کے ساتھ ہر انسان میں تبدیلی آ جاتی ہے اور وہ بیچارہ تو پتا نہیں کن کن حالات سے گزرا ہے۔ ہمیں ہر وقت اس پر تبرے کرنے کے بجائے اس کا ساتھ دینا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ یہاں سب کے درمیان رہتے ہوئے آہستہ آہستہ اسے بہت کچھ یاد آ جائے گا۔“ وہ پری وش بھی جو بہت رمان سے دوسروں کو سمجھا رہی تھی۔

”لڑکی سمجھ دار ہے۔ اس نے دل میں سوچا۔
 ”پری بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔ ویسے بھی میں تمہیں

بتاؤں کہ میرا عمار صرف ظاہری طور پر بدلا ہے، فطرت اس کی وہی پہلے والی نیک ہے۔ جب سے آیا ہے مجھے لگتا ہے وہی پرانے دن لوٹ کر آ گئے ہیں۔ پہلے ہی کی طرح بھاگ بھاگ کر گھر کے سارے کام کرتا ہے۔ سونے سے پہلے میرے اور اپنے آغا جان کے پاؤں دبانے کی عادت ابھی تک قائم ہے۔ آج بھی دیکھو، صبح سے لکڑیاں کاٹ کر رکھ رہا ہے کہ سیزن شروع ہونے سے پہلے سارا انتظام ہو جائے۔“
 زرینہ بی بی کا لہجہ فخر و محبت میں ڈوبا ہوا تھا۔ ان کے اس انداز پر اس کا اینا دل عجیب سا ہونے لگا اور خاموش قدموں سے چلتا وہاں سے دور ہٹ گیا۔ منہ ہاتھ دھو کر تازہ دم ہونے میں خاصا وقت لگا کر واپس آیا تو دسترخوان لگ چکا تھا اور دسترخوان کی رونق بتا رہی تھی کہ زرینہ بی بی کے تیار کردہ کھانے کے علاوہ بھی کافی کچھ موجود ہے۔ شاید وہ لوگ اپنے ساتھ کھانا بنا کر لائی تھیں۔

”آغا جان نہیں آئے ابھی تک؟“ خواتین کے درمیان تنہا بیٹھنے اور موضوع گفتگو بننے کے خیال سے اسے کوفت ہو رہی تھی۔

”لو آ گئے ہیں۔ وہ کبھی اپنے دیے ہوئے وقت سے تاخیر نہیں کرتے، جب ہی تو میں نے دسترخوان لگوایا تھا۔“ اسی لمبے دروازے کی طرف سے کھٹ پٹ سنائی دی تو زرینہ بی بی بول پڑیں۔ وہ جلدی سے باہر کی طرف لپکا اور حسب عادت کچھ ساز و سامان کے ساتھ واپس لوٹنے والے آغا جان کی مدد کرنے لگا۔ چند منٹوں میں ہی وہ اس کی مدد

سے منہ ہاتھ دھو کر تازہ دم ان سب کے درمیان موجود تھے۔ مہمان خواتین نے سلام کیا تو چونک گئے۔
 ”پری وش بیٹی بھی آئی ہے۔“

”جی آغا جان!“ وہ جلدی سے ان کے قریب آئی۔
 ”کالج سے چھٹیاں ہو گئیں کیا؟“ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

”نہیں آغا جان! بھون پر اسے عمار کی واپسی کی اطلاع دی تھی تو بس اس سے صبر نہیں ہوا اور دوڑی چلی آئی۔“ یہ جواب پری وش کی بڑی بہن گل وش کی طرف سے آیا تھا۔

”عمار کہاں بھاگا جا رہا تھا۔ آرام سے بتا دیتیں اسے۔ ایسے بیچ میں چھٹی لے کر آنے سے اس کی تعلیم کا حرج ہوگا۔“ ان کے چہرے پر ناپسندیدگی کے آثار دکھائی دیے۔

”کوئی بات نہیں آغا جان! میں کور کر لوں گی۔“ ان کے تاثرات کی وجہ سے پری وش کی مسکراہٹ سٹ سی گئی تھی۔
 ”ہمیں ڈاکٹرز اور خصوصاً لیڈی ڈاکٹرز کی بہت ضرورت ہے بیٹی اس لیے خیال رکھا کرو کہ تمہاری ذرا سی بے پروائی تمہاری راہ میں رکاوٹ نہ بن جائے۔“ ان کی سنجیدگی اب بھی برقرار تھی۔

”چلیں ہو گئی غلطی۔ آئندہ خیال رکھے گی۔ ابھی کھانا تو کھالیں۔ آپ کے انتظار میں ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“ زرینہ بی بی نے درمیان میں دخل دے کر فضا پر طاری بوجھل پن کم کرنے کی کوشش کی۔

”ہاں بھئی، بھوک تو بہت لگ رہی ہے اور خوشبو میں بتا رہی ہیں کہ گل وش بیٹی نے ہمارے دسترخوان کی رونق بڑھا رکھی ہے۔“ انہوں نے اپنا لہجہ اور موڈ تبدیل کر لیا۔
 ان کے بیٹھے ہی کھانے کا سلسلہ شروع ہوا۔

”یہ جو گل وش ہے نا، یہ کھانا بنانے میں اور پری وش باتیں بنانے میں بہت ماہر ہیں۔ تمہیں تو اب یاد نہیں ہوگا لیکن جب تم لوگ چھوٹے تھے تو یہ شرارتی بی بی باتیں بنا کر تمہارے حصے کی چیزیں بھی کھا جاتی تھی۔“ کھانے کے دوران آغا گل نے ہلکی پھلکی گفتگو کا آغاز کر دیا اور خوشگوار لہجے میں اسے بتانے لگے۔

”آغا جان!.....!“ کیونکہ ان کی گفتگو پری وش کو چھیڑنے والی تھی اس لیے وہ احتجاجاً ذرا سا ٹھنکی۔

”ارے تو عمار سے کیا چھپا ہے؟ یہ بیچارہ تو تمہارا سب سے بڑا شکار تھا۔“ گل وش بھی ان کی شرارت میں شامل ہوئی۔

”پر ابھی تو وہ بھول گیا ہے نا، پھر کیا ضروری ہے اسے یہ سب یاد دلانا۔“ اس نے منہ بسورا۔

”بھئی ہم اس کی یادداشت واپس لانے میں اس کی مدد کر رہے ہیں۔ اس طرح کے واقعات یاد دلانے سے ہو سکتا ہے دوسری باتیں بھی یاد آجائیں۔“ گل دیش اس کی کیفیت سے پورا پورا لطف لے رہی تھی۔

”یاد دلانا ہی ہے تو وہ اپنی مچی مچی ہنڈکیاں یاد دلا دے نا۔ کیسے کیسے تجربے کیسے ہیں تم نے ماضی میں ہم مصوموں پر تمہیں یاد ہے عمار..... ایک بار تو تمہیں اس کا بنایا پلاؤ کھا کر اٹھیاں ہی لگ گئی تھیں۔ مٹھیاں بھر بھر کر تو نمک ڈالا تھا اس نے اس پلاؤ میں۔“ جوش میں وہ براہ راست اس سے مخاطب ہو گئی۔ پہلے تو وہ یوں مخاطب کیے جانے پر ذرا سا گڑبڑایا پھر دھیسے سے مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔

”بس کر دو پری دیش بچے! یہ لوگ جان بوجھ کر تمہیں چھیڑ رہے تھے اور ہر بار کی طرح تم ان کی چڑھائی میں آکر شروع ہو گئی ہو۔“ زرینہ بی بی نے درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے اسے احساس دلایا تو وہ جھینپ سی گئی پھر خجالت مٹانے کے لیے بولی۔

”کیا کروں۔ میں ان کی طرح چالاک جو نہیں ہوں۔ بس جودل میں آئے کہہ ڈالتی ہوں۔“

”ہا..... بد تمیز!“ گل دیش نے حیرت کے اظہار کے لیے پورا منہ کھول دیا۔ ”تم آغا جان کو چالاک کہہ رہی ہو؟“

”کوئی نہیں۔ میں صرف تمہیں کہہ رہی تھی۔“ وہ بوکھلا گئی۔

”لیکن بات تو ہم دونوں کی ہی ہو رہی تھی۔“ گل

دیش بھی اسے بخشنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ زرینہ بی بی اور آغا

گل دونوں بہنوں کی اس بحث سے لطف لیتے کبھی ہنس

پڑتے اور کبھی بات بڑھتی دیکھ کر معاملہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش

کرتے لگتے۔ ایسے ہی ہتے بولتے کھانا ختم کر لیا گیا۔ اس

نے براہ راست ان دونوں بہنوں سے کوئی بات نہیں کی لیکن

مسکراتا ضرور رہا۔ مسکراتے ہوئے اس کی نظر کئی بار پری کی

نگاہوں سے ملی تھی۔ ان نگاہوں میں بڑا شوخ تاثر تھا۔ وہ

ہر بار اس سے نظر چرا گیا۔

”اچھا بھئی اب ذرا آپ خواتین اچھا سا قبوہ تیار

کر لیں۔ ہم اتنی دیر میں کچھ ضروری امور پر تبادلہ خیال

کر لیتے ہیں۔“ دسترخوان سمیٹا جا رہا تھا تب آغا گل نے

اعلان کیا۔

”خفیہ میٹنگ۔“ پری دیش نے فوراً آنکھیں پٹیائیں۔

”نہیں بھئی کوئی خفیہ میٹنگ نہیں ہے۔ بس عمار سے

اس کے مستقبل کے متعلق تھوڑی بات چیت کرنی ہے۔ ظاہر ہے ہمارا گہرو جوان کوئی گھر میں تو بیٹھا نہیں رہے گا۔ اس کی روزی روٹی کا بھی تو کچھ انتظام کرنا ہے تو بس اسی سلسلے میں اس کی رائے لینی ہے۔“ آغا گل نے اسے وضاحت دی پھر عمار کو اپنے ساتھ لیے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ وہ اپنا ہر کام خود کرنے کے عادی تھے لیکن اسے ان کی خدمت کر کے اچھا لگتا تھا اس لیے کمرے میں پہنچ کر انہیں پھرتی اور نرمی سے ٹکیوں کے سہارے بستر پر بٹھایا۔

”بہت شکریہ بیٹا! لیکن یہ سب نہ کیا کرو۔ عادتیں بگڑ گئیں تو آگے زندگی زیادہ مشکل لگے گی۔“ انہوں نے جس انداز سے یہ جملہ ادا کیا، اس کے اندر کرب سا بھر گیا۔

”معذرت چاہتا ہوں۔ میری بات نے شاید تمہیں تکلیف پہنچائی ہے۔“ وہ اس کے چہرے کے تاثرات نہیں دیکھ سکتے تھے لیکن خاموشی سے احساسات بھانپ گئے۔

”بڑا نہیں لگا، بس یہ سوچ کر ادا اس ہو گیا ہوں کہ میں کبھی اپنے سے وابستہ ہو جانے والوں کے لیے وہ نہیں کر پاتا جو کرنا چاہتا ہوں یا جس سے انہیں خوش کر سکتا ہوں۔“ وہ ایک موڑھا کھینٹ کر ان کے سامنے بیٹھ گیا۔

”جس کی منزل متعین ہو، اسے راہ میں آنے والے کسی پڑاؤ پر مستقل قیام کی اجازت نہیں ہوتی۔ تم بھی اپنی منزل پر نظریں جما کر سفر جاری رکھو۔“ انہوں نے اسے نصیحت کی پھر موضوع گفتگو بدلتے ہوئے بولے۔

”آج میں بخاشن سے ملا تھا۔ اس سے تمہاری ملازمت کے لیے بات کر لی ہے۔ نیم رضامند ہے لیکن اتنی شرط رکھی ہے کہ پہلے تمہارا تفصیلی انٹرویو لے گا پھر قابلیت وغیرہ کا اندازہ کرنے کے بعد تنخواہ طے کرے گا۔ دوست ہونے کے ناتے میں اس سے جتنی بات منوا سکتا تھا، منوا چکا ہوں۔ آگے اب سب کچھ تم پر منحصر ہے۔“

”آپ کا اتنا تعاون ہی بہت ہے۔ آگے ان شاء اللہ میں خود سب سنبھال لوں گا۔“ ان کی دی اطلاع اس کے لیے بہت کارآمد تھی جسے سن کر وہ کھل اٹھا۔

”اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو اور کامیابی تمہارے قدم

چومے۔“ انہوں نے بہت خلوص سے اسے دعا دی۔ اسی

وقت فضا میں قبوے کی خوشبو پھیلی اور وہ جھم سے کمرے میں

چلی آئی۔

”آغا جان تو ایسے دعائیں دے رہے ہیں جیسے تمہیں

ملازمت کے بجائے جہاد پر بھیج رہے ہوں۔“ اندر آتے

ہوئے اس نے ان کے الفاظ سن لیے تھے اس لیے ممکن نہیں

تھا کہ ان پر تبصرہ نہیں کرتی۔

”تی زمانہ رزقِ حلال کمانا بھی کسی جہاد سے کم نہیں ہے اس لیے دعا بہت ضروری ہے۔“ آغا گل نے سنجیدگی سے اسے جواب دیا۔

”ہم کشمیریوں کے لیے تو پیدا ہونے، اسکول کالج جانے، روزگار تلاش کرنے، شادی بیاہ کرنے بلکہ سانس لینے تک، ہر کام ایک جہاد ہی ہے جسے نہ جانے کب تک جاری رہنا ہے۔“

پری دیش کی شوخ رنگ شخصیت میں پہلی بار اداسی کے رنگ جھلکے جو اسے بالکل اچھے نہیں لگے اور دل میں تمنا جاگی کہ کاش وہ اس کے لیے کچھ کر پاتا لیکن اس ”کاش“ کے آگے بے بسی کے سوا کچھ تھا ہی نہیں۔

☆☆☆

دروازے کے لاک میں چابی بالکل بے آواز گھومی تھی اور آنے والا کواڑ کو بغیر کسی چرچاہٹ کے دھکیل کر کوئی چاب پیدا کیے بنا ہی برآمدے سے گزر کر باورچی خانے تک آیا تھا لیکن باورچی خانے میں کام کرتی عورت نے تو بے پرواہی سے روٹی کی مہک کے ساتھ گھلتی ملتی اس کی مہک کو اس کے پہلے قدم کے ساتھ ہی محسوس کر لیا تھا اس لیے جونہی وہ اس کی پشت پر آ کر کھڑا ہوا، بنا چوکے مسکراتے لہجے میں بولی۔

”آگئے آپ؟“

”تمہیں بھلا سوال کی کیا ضرورت۔“ وہ اس صورت حال پر بد مزہ ہونے کے بجائے خوش ہو کر مطمئن لہجے میں بولا۔

”سارا آپ کی سنگت کا کمال ہے۔ آپ سے ہی سیکھا ہے کہ مصروف رہتے ہوئے بھی کیسے اپنے سارے حواس کو جگائے رکھنا ہے۔“ اس نے روٹی سینک کر ہاٹ پاٹ میں رکھتے ہوئے جواب دیا۔

”لیکن یہ تو حواسِ خمسہ بلکہ چھٹی حس سے بھی آگے کا معاملہ لگتا ہے۔ یہ تو میں مانوں گا نہیں کہ میں نے کوئی آہٹ پیدا کی ہوگی جس نے تم تک رسائی حاصل کر لی ہو۔“ اس نے سلا کی پلیٹ میں سے کھیرے کا ایک گٹڑا اٹھا کر اپنے منہ میں رکھا۔ اپنی بے حد منظم زندگی میں ان چھوٹی موٹی بے ترتیبیوں کی گنجائش اس نے خود پیدا کی تھی کہ یہ بے ترتیبیاں تعلق کی بے تکلفی کو جنم دیتی ہیں۔

”آپ ان دو کانوں کا امتحان لیتے ہیں جبکہ ہم آپ کو یہاں سے سنتے ہیں۔“ اس نے پہلے اپنے دونوں کانوں کو چھوا پھر سینے پر دل کے مقام پر ہاتھ رکھا۔

”ویری رومانک۔ کاش اس وقت رومانس جھاڑنے کا موقع مل ہوتا۔“ وہ بے حد ٹھنڈی سانس بھر کر بولا تو وہ سانس دی۔ بچوں کے اسکول سے آنے کا وقت ہو چکا تھا اور کوئی دم نہیں جاتا تھا کہ وہ گھر پہنچ جاتے۔

”اچھا ہوا آپ وقت پر گھر پہنچ گئے۔ میں سوچ ہی رہی تھی کہ جانے آپ کتنے پر مجھے اور بچوں کو جوائن کر بھی سکیں گے یا نہیں۔“ تیزی سے کچن کاؤنٹر صاف کرتے ہوئے وہ اس سے گفتگو بھی کرتی جا رہی تھی۔

”سوری یار! آج میں تم لوگوں کے ساتھ لنچ نہیں کر سکوں گا۔“

”وہ کیوں؟ کیا دوبارہ کہیں جانا ہے؟“ وہ اس کا جواب سن کر چونکی اور حرکت کرتے ہاتھ خود بخود ہی رک گئے۔

”کہیں نہیں جانا۔ میرے ساتھ ایک مہمان ہے۔ اسے باہر والی بیٹھک میں بٹھا کر آیا ہوں اور چونکہ کھانے کا وقت ہے تو ظاہر ہے کھانا اسی کے ساتھ کھاؤں گا۔ تم ٹرے تیار کر دو۔“ اس نے اطلاع دینے کے ساتھ ساتھ ہدایت بھی دی تو وہ ہاتھ روک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”کیا کوئی خاص معاملہ ہے؟ آج آپ کی روانگی بھی بغیر کسی پروگرام کے ہوئی تھی اور اب یہ بغیر پیشگی اطلاع کے آنے والا مہمان!“

”تفصیلات بعد میں فرصت سے بتاؤں گا۔ پہلے تم وہ کر دو جو کہا ہے۔“ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ فی الحال کچھ نہیں بتائے گا اس لیے اس نے مزید اصرار نہیں کیا اور وہی کرنے لگی جو اس نے کرنے کو کہا تھا۔ ابھی ٹرے تیار نہیں ہوئی تھی کہ بچے گھر پہنچ گئے۔ ماں باپ سے دعا سلام کر کے وہ حسب معمول اپنے کمرے کا رخ کرتے اس سے پہلے ہی اس نے انہیں مہمان کی موجودگی اور اس کے ساتھ کھانا کھانے کی اطلاع دیتے ہوئے آج لنچ پر ساتھ دینے سے معذرت کر لی۔

”اٹس اوکے بابا!“ انہوں نے سلجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اس دوران وہ ٹرے تیار کر چکی تھی۔ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ٹرے اس کے ہاتھوں سے لے کر وہ باہر نکل گیا تو وہ اپنے اور بچوں کے لیے کھانے کی ٹیبل تیار کرنے لگی۔ اس کے اس کام کو انجام دینے تک بچے فزیش ہو کر آ گئے۔ ان کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے وہ ان سے دن بھر کی روداد بھی سنتی رہی۔ آج کیا پڑھا یا گیا، کون سی نئی بات سیکھی، کسے کتنے اسٹارز ملے یا کس کلاس فیلو کو کس بات پر تمہیہ کی گئی۔ ان کے پاس روزانہ ہی

سنانے کے لیے بے شمار واقعات ہوتے تھے جنہیں وہ دونوں میاں بیوی ہی دلچسپی سے سنا کرتے تھے اور جہاں ضرورت ہوتی تھی وہاں اپنا تجربہ بھی دیتے تھے۔ کبھی کبھی کوئی چھوٹی موٹی نصیحت یا تنبیہ کرنے کی بھی ضرورت پیش آجاتی تھی لیکن مجموعی طور پر بچے بہت مہذب تھے۔

جب اس کی شادی ہوئی تھی تو اس کی تعلیم بھی نسبتاً کم تھی اور وہ طرز زندگی بھی قدرے انجانا تھا جس کا اس کا شوہر عادی تھا۔ اس نے بغیر کسی دباؤ کے بہت محبت سے اس زندگی کو سیکھا تھا اور اپنی تعلیمی استعداد میں بھی بتدریج اضافہ کرتی چلی گئی تھی۔ یہ سب کرنے میں اس کے شوہر نے اس کے ساتھ بھرپور تعاون کیا تھا لیکن ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا تھا کہ اگر وہ یہ سب نہ بھی کرنا چاہے تو اسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا اور وہ اسے جوں کا توں بھی عزت و محبت کے ساتھ قبول کر لے گا۔

وہ اس سے یہ سب نہ بھی کہتا تو وہ اس بات کو جانتی تھی لیکن اسے خود کو اس کے رنگ میں رنگنا خوبصورت لگتا تھا اس لیے سب کچھ کرتی چلی گئی تھی اور آج اس لائق تھی کہ اعلیٰ طبقے کی خواتین کے ساتھ بیٹھ کر گفتگو کرتی تو کوئی محسوس بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ کسی پسماندہ گاؤں میں رہنے والے ان پڑھ والدین کی اولاد ہے بلکہ اسے ان اعلیٰ طبقے کی خواتین پر یہ فضیلت حاصل تھی کہ وہ، کچھ بھی جانتی تھی جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ پھرتی، چستی اور بے خونی میں بھی وہ اس کے پاسنگ نہیں تھیں کیونکہ انہوں نے وہ سب نہیں دیکھا تھا جس سے گزر کر وہ یہاں تک آئی تھی اور نہ ہی انہیں ایسا جیون ساتھی میسر تھا جو نارتھ شدہ میرے کو کسی جوہری کی طرح تراشنے کا ہنر جانتا تھا۔

”امی! بابا کے مہمان کون ہیں؟ کیا وہ ہمیں ان سے ملوا دیں گے؟“ بچوں کے پاس اسکول سے متعلق گفتگو ختم ہوگئی تو دھیان مہمان کی طرف چلا گیا۔

”میں اس بارے میں نہیں جانتی بیٹا! اگر بابا نے مناسب سمجھا اور ضرورت محسوس کی تو آپ کی ان سے ملاقات کروادیں گے۔“ بچوں کے ساتھ مصروف ہونے کے باوجود اس کا اپنا دھیان مہمان میں ہی الٹا ہوا تھا۔ اس کی چھٹی حس اسے بتا رہی تھی کہ یہ کوئی عام مہمان نہیں ہے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کا شوہر بظاہر سب معاملات سے الگ ہونے کے باوجود اس چور کی طرح اپنے مقصد سے جڑا ہوا ہے جو چوری سے تو جاتا ہے لیکن ہیرا پھیری سے نہیں۔ اپنی اس ہیرا پھیری کی عادت کی وجہ سے وہ ظاہری

ریٹائرمنٹ کی زندگی گزارتے گزارتے بھی کئی ایک خطرناک کاموں میں حصہ لے چکا تھا اور دو تین بار تو اس نے بھی اس کے ساتھ عملی طور پر حصہ لیا تھا۔ ایسے ہر مشن کے بعد وہ پوری دلجمعی سے کہتا تھا کہ سپاہی ریٹائر ہو بھی جائے تو آن ڈیوٹی ہی ہوتا ہے اور وطن کی پکار پر لبیک کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس نے اس کی اس بات سے کبھی اختلاف نہیں کیا تھا، نہ کبھی کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ اس لیے اسے معلوم تھا کہ اس کی چھٹی حس غلط اشارے نہیں دے رہی تھی اور آنے والا مہمان اپنے سنگ کوئی ہنگامہ لے کر آیا تھا۔

”میں نے اندر آتے ہوئے بیٹھک کی کھڑکی سے مہمان کی جھلک دیکھی تھی۔ ان کی بہت بڑی بڑی اور زبردست موچیں تھیں۔ بابا نے اگر ان سے ہماری ملاقات کروائی تو میں ان سے ان کی اتنی شاندار موچوں کا راز ضرور پوچھوں گا۔“ یہ چھوٹا حسیب تھا جو ماں کی سوچوں سے بے فکر اپنا پروگرام بتا رہا تھا۔

اس نے حسیب کو محبت پاش نظروں سے دیکھا پھر دونوں بچوں کو کھانا جلدی ختم کرنے کی نصیحت کرنے لگی تاکہ معمول کے مطابق ظہر کی نماز ادا کر کے کچھ دیر آرام کر سکیں۔ شام کے اوقات میں انہیں ہوم ورک اور اسپورٹس دونوں کو منیج کرنا ہوتا تھا۔ بچے اس کی تنبیہ کے بعد جلد ہی کھانا ختم کر کے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ وہ بھی اپنے معمولات سے قانع ہو کر ذرا سناستانے کے لیے لیٹی تو وہ چلا آیا۔

”چلا گیا آپ کا مہمان؟“ اس کی کوشش تھی کہ بہت زیادہ تجسس محسوس نہ ہو اس لیے موبائل اٹھا کر بے وجہ اسکرولنگ کرتے ہوئے بظاہر بے نیازی سے سوال کیا۔

”نہیں، اب وہ یہیں رہے گا۔“ جواب نہیں، دھماکا تھا جس نے اسے تنگ کر دیا۔ ان کے ساتھ گھر کے افراد کے سوا کبھی کوئی مستطاف نہیں رہا تھا۔ یہاں تک کہ ملازمین بھی نہیں۔ گھر کے عام کام کاج میں مدد کرنے والوں سے لے کر مالی تک سب ہی جزوقتی کام کرنے والے تھے۔ یہاں تک کہ چوکیدار کی جگہ بھی خود کار حفاظتی نظام اور اپنی ذات پر انحصار کیا جاتا تھا۔

”لیکن کیوں؟“ مشکل سے سوال اس کے ہونٹوں

سے نکلا۔

”یہ پوچھنے سے پہلے یہ پوچھو کہ آخر وہ ہے کون جسے میں اپنے ساتھ رکھنے پر اتنے آرام سے تیار ہو گیا ہوں۔“ وہ گویا اس کی حالت سے خطا اٹھا رہا تھا۔

”کون ہے وہ؟“ اس کا دل بلاوجہ ہی دھڑکا۔ جواب میں اس نے اسے ایک نام بتایا۔

”خان..... سچ خان آیا ہے آپ کے ساتھ؟“ نام جان کر وہ پُر جوش ہو گئی۔ زمانہ گزر گیا تھا ماضی سے تعلق رکھنے والی جانی پہچانی شکلوں کو دیکھے۔

”کیسے ملا وہ آپ کو؟ کیا اچانک ہی سامنا ہو گیا؟“ ”اچانک سامنا نہیں ہوا۔ میں نے خود اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔“ جواب معنی خیز تھا۔

”لیکن کیوں؟ کیا آپ نے اس سے اپنا تعارف کروایا تھا؟“ جوش میں وہ معمول سے زیادہ سوالات کر رہی تھی ورنہ یہ بات اسے بھی معلوم تھی کہ ضرورت کی ہر بات وہ خود اسے بتائے گا۔

”تعارف کی ضرورت نہیں تھی اور رہی کیوں کی بات تو اس کا جواب ذرا تفصیلی ہے۔“ وہ بے حد سنجیدہ محسوس ہو رہا تھا۔

”اس نے آپ کو پہچانا نہیں؟“ تجسس اور جوش انسان کو بچہ بنادیتے ہیں، وہ بھی بنی ہوئی تھی۔

”وہ پہلے نہیں پہچان سکا تھا تو اتنے برسوں بعد کیسے پہچان جاتا۔ اب تو میں اور بھی زیادہ تہذیبی ہو چکا ہوں۔“ ”لیکن مجھے تو پہچان لے گا۔“ اس نے خدشہ ظاہر کیا۔

”میں نے اسے بتا دیا ہے کہ میری بیوی پردہ کرتی ہے اس لیے اسے احتیاط کرنی ہوگی اور خود کو گھر کے بیرونی حصے تک ہی محدود رکھنا ہوگا۔ وہ وضع دار آدمی ہے اس لیے مجھے معلوم ہے ہر ممکن احتیاط کرے گا۔“ اس نے ذرا سا توقف کیا پھر مزید بولا۔ ”ویسے بھی بس چند دن کی ہی بات ہے پھر میں اور تم بہت مصروف ہو جائیں گے، ہو سکتا ہے آگے جا کر لمبے عرصے تک گھر ہی واپس نہ آ سکیں۔ ایسے میں خان کا یہاں ہونا مجھے مطمئن رکھے گا۔“

”مطلب ہم کسی مشن پر جا رہے ہیں؟“ اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے نتیجہ اخذ کیا۔ جواب اس نے صرف اثبات میں سر ہلایا۔ اس بار وہ بھی کچھ بولنے کے بجائے ماتھے پر ہلکی ہلکی ٹھٹھکیں لیے سوچ میں ڈوبی بیٹھی رہی۔

”اگر تم نہ جانا چاہو تو منع بھی کر سکتی ہو۔“ ”لیکن میں کیوں جانا نہیں چاہوں گی؟“ وہ اس پیشکش پر حیران ہوئی۔

”میں نے سوچا شاید بچوں کی وجہ سے۔“ ”بچوں کے لیے جس نے آج تک اچھا انتظام کیا ہے، آگے بھی وہ سب سنبھال لے گا۔ بچے مجھے عزیز ضرور ہیں لیکن

میں خود کو ان کی یا ان کو خود کی کمزوری نہیں بنانا چاہتی۔ اللہ نے چاہا تو ہمارے پیچھے بھی ان کی اچھی دیکھ بھال ہو جائے گی۔“ وہ درمیان میں ہی اس کی بات کاٹ گئی۔

”میرے ذہن میں بھی یہ بات تھی اس لیے اس حوالے سے بھی کچھ نہ کچھ بندوبست کر آیا ہوں۔ کل ایک خاتون یہاں آئیں گی۔ تم انہیں ضروری ہدایات دے دینا۔ اچھا ہے ہماری روائی سے قبل ان کی ٹریننگ اور بچوں سے انچسٹ دونوں ہو جائیں تاکہ بچے زیادہ ڈسٹرب نہ ہوں۔“ اس کا ہر ایک شے پر دھیان تھا۔

”مشن کے متعلق کوئی تفصیل.....؟“ ”آہستہ آہستہ دورانِ تربیت بریفنگ ملتی رہے گی۔ تم اس بارے میں زیادہ فکر کرنے کے بجائے بچوں کی ذہنی سازی پر توجہ دو۔ ہماری دوری ان کے لیے صدمہ نہیں بنی چاہیے۔“ وہ بچوں کی طرف سے فکر مند تھا۔

”میں انہیں سمجھا دوں گی بلکہ پہلے بھی باتوں باتوں میں کئی بار باور کرا دیا چکی ہوں کہ ہو سکتا ہے کبھی مجھے اور تمہارے بابا کو اعلیٰ تعلیم کے لیے ملک سے باہر جانا پڑ جائے تو تم لوگ اداس نہیں ہونا اور ہماری کامیابی کی دعا کرنا۔“ وہ بے حد اعتماد کا مظاہرہ کر رہی تھی لیکن اندر سے جانتی تھی کہ سب سے مشکل مرحلہ بچوں کو چھوڑ کر جانے کا ہی ہے۔ مشکلیں ان کا اور وہ مشکلوں کا انتخاب کرتے ہی رہتے تھے۔

☆☆☆

سجیل نے اپنے سامنے موجود ایک ایک چہرے کو غور سے دیکھا۔ ماں، باپ، نیلی اور نیلی کی گود میں موجود اس کا اکلوتا لخت جگر اعظم شاہ۔ سب کے چہروں سے پھسلتی اس کی نظریں اعظم کے چہرے پر پڑیں تو جم سی گئیں۔ اس لیے نہیں کہ وہ ان سب چہروں میں اس کو سب سے پیارا تھا بلکہ اس لیے کہ یہ واحد چہرہ تھا جس پر مسکراہٹ کے ساتھ ساتھ بے فکری کے رنگ پھیلے تھے۔ موت کے خوف سے بید ہونے والے چہروں کے درمیان زندگی کے رنگوں سے رنگا یہ چہرہ امید کا استعارہ تھا۔

”اسے مجھے دو۔“ اس نے اپنا واحد حرکت کرنے والا ہاتھ آگے بڑھا کر نیلی سے اعظم کو مانگا۔ نیلی نے بے حد احتیاط سے اعظم کو اس کے حوالے کیا اور مزید احتیاط برتتے ہوئے بیڈ کے قریب ہی کھڑی رہی کہ کہیں وہ شرارت اور اچھل کود میں سبیل کے قابو سے باہر ہو کر نیچے نہ گر جائے۔

”اعظم! ابما کو ایک پارٹی کرو۔“ بیٹے کو گود میں لے کر اس نے پہلے اسے ایک بوسہ دیا پھر اس سے فرمائش کی۔

اعظم کی اس مختصر عرصے میں اس سے کئی ملاقاتیں کروائی گئی تھیں اس لیے اب وہ نہ صرف اسے پہچاننے لگا تھا بلکہ بہت تیزی سے قریب بھی ہوا تھا۔ شاید ماں کی فطری کشش نے خود بخود ہی درمیانی عرصے کا خلا دور کر دیا تھا۔ اب بھی سب کی فرمائش پر اس نے جھٹ اس کے رخسار پر بوسہ دیا اور اپنی توتلی زبان میں کچھ کہنے لگا۔

”اس زندگی میں لاکھ درد سہی پھر بھی یہ خوبصورت ہے کیونکہ اس میں تم ہو۔“ سب نے اس کے چہرے کو نظروں میں سموتے نم پلکوں اور مسکراتے لبوں کے ساتھ سوچا۔ اس کی سوچ کا عکس اس کے چہرے پر اتنا واضح تھا کہ درد سکینہ شاہ کے لیے ناقابل برداشت ہو گیا اور لبوں سے ایک دہلی دہلی سی سکاری نکلی۔ فوراً ہی عالم کا ہاتھ دلا سادینے کے لیے ان کے شانے پر آیا جبکہ صداقت شاہ نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبا کر ایک خاموش تنبیہ کی۔ ان کی بیٹی زندگی کی جنگ لڑنے جا رہی تھی اور وہ چاہتے تھے کہ اس کے پاس ز اوراہ کے طور پر صرف اور صرف ہمت و حوصلہ ہو۔ وہ آنسوؤں کو درمیان میں لا کر اس کی امید کو کم نہیں کرنا چاہتے تھے۔

”میں اعظم سے صرف ایک طرف پیار لے کر جا رہی ہوں اماں سائیں! دوسرے گال پر اس وقت پیار لوں گی جب آپریشن کے بعد آنکھیں کھول کر اس کا چہرہ دیکھوں گی۔“ اس نے سکینہ شاہ کی دہلی دہلی سسکی سن لی تھی اور اب انہیں بڑی حوصلہ دیتی نگاہوں سے دیکھتی دل میں امید جگا رہی تھی۔

”کیوں نہیں دمی رانی! رب سائیں کے حکم سے تیری یہ چاہ ضرور پوری ہوگی۔“ سکینہ شاہ کو اپنی آواز کی بھراہٹ پر قابو پا کر اسے جواب دینے میں خاصی مشکل پیش آئی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ جب سے انہیں اس کی بیماری کی نوعیت اور ڈاکٹرز کے خدشات کا علم ہوا تھا، وہ مسلسل روتی رہی تھیں۔ ان کی طبیعت بھی کافی بگڑ گئی تھی لیکن پھر صداقت شاہ نے انہیں باور کروادیا تھا کہ اگر وہ اسی طرح کے رویے کا مظاہرہ کرتی رہیں تو وہ انہیں واپس پاکستان بھجوا دیں گے اور ظاہر ہے اس صورت میں وہ سب سے دور ہو جائیں اس لیے خاصی حد تک اپنے اعصاب پر قابو پالیا تھا۔

”کاش مول بھی یہاں ہوتی۔“ اسے اس وقت چھوٹی بہن کی کمی بہت محسوس ہوئی۔

”سمجھو بیٹیں!۔ لو اس سے بات کر لو۔“ اپنے سبیل فون پر مسلسل مصروف عالم نے فون کی اسکرین اس کے سامنے کی تو وہ مول کا چہرہ نظروں کے سامنے پا کر کھل اٹھی۔

مول بھی باقی سب کی طرح ادا اس اور پریشان تھی لیکن اس سے اپنے جذبات چھپائے ہلکے پھلکے لہجے میں باتیں کرتی رہی۔ چند منٹ کی اس ویڈیو کال میں اس نے دوبار سب کو ہنسنے پر بھی مجبور کر دیا۔ اس کال کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا تھا کہ کمرے کا ماحول خاصا بدل گیا تھا اور تناؤ میں واضح کمی دیکھی جا رہی تھی۔

کال ختم ہونے کے بعد سب اس سے باری باری ملے اور بہت ساری دعائیں دیں۔ وہ حوصلے سے مسکراتی سب کا پیار اور دعائیں قبول کرتی رہی۔ یہ اس کا ہی حوصلہ تھا کہ جو فیصلہ سارے مل کر نہیں کر پا رہے تھے، اس نے منٹوں میں کر لیا تھا اور اس فیصلے کے نتیجے میں پروفیسر اینڈریو سے اپنا ٹیوٹر آپریٹ کروانے جا رہی تھی۔

”میرے اعظم کا بہت خیال رکھیے گا ادا سائیں!“ جب عالم اس سے ملنے لگا تو اس کی آواز ذرا سی کانپی۔

”بالکل بھی نہیں۔ یہ کام تمہیں خود کرنا ہوگا۔“ ضبط کی کوشش میں عالم کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔

”جو رب سائیں کی رضا۔“ بوڑھے ماں باپ کے کمزور دلوں کا خیال کر کے اس نے خود کو مضبوط کر لیا تھا لیکن مضبوط جوان بھائی کا سر پر رکھا ہاتھ اسے کمزور کرنے لگا تھا۔

”رب سائیں ضرور ہم پر مہربانی کرے گا۔“ عالم نے اسے یقین دلایا اور بے ساختہ گلے سے لگایا۔ سب کی آنکھوں سے کئی آنسو نکل کر اس کے شانے پر گرے۔ صداقت شاہ اس لمحے سے پہلے سکینہ شاہ کو تمام کر کر کے سے باہر لے گئے تھے کہ ان کے لیے اب مزید ضبط سے کام لینا مشکل ہو گیا تھا۔

”اعظم پریشان ہو رہا ہے۔“ نیلی نے دیر سے ان دونوں کی توجہ مبذول کروائی تو وہ خود کو سنبھالنے لگے پھر عالم نے بسورتے ہوئے اعظم کو گود میں لے کر چوما۔

”میں اپنے ہیرد کو لے جا کر چاکلیٹس دلاتا ہوں۔“ موڈ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔

”چاکلیٹس بچوں کے لیے نقصان دہ ہوتی ہیں۔“ نیلی نے اسے ٹوکا۔

”کبھی کبھی کی بے احتیاطی چلتی ہے۔“ وہ ان سنی کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد سب کو آپریشن کے لیے لے جایا جانے والا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ جاتے جاتے وہ اپنے بیٹے کا خوش اور مسکراتا ہوا چہرہ دیکھ کر جائے۔

”آپ بہت لگی ہیں کہ آپ کے مشکل وقت میں آپ کے سارے چاہنے والے آپ کے قریب ہیں۔“

نئی، عالم کے اس انداز پر ہنسی اور سہل سے بولی۔

”سب کہاں؟ کوئی ہے جو قریب نہیں ہے۔“ سہل کی آواز سرگوشی سے بلند نہیں تھی لیکن نیلی چونک سی گئی اور اس کی چھٹی حس نے اسے بتایا کہ وہ اس سے کچھ بہت خاص کہنے جا رہی ہے۔

”کون؟ کس کی بات کر رہی ہیں آپ؟“ تجسس کے باوجود اس نے سوال کرنے میں دھیمے پن سے کام لیا۔

”وہی جو زبان سے جتا نہیں ہے لیکن جس کا اپنے لیے فکر مند ہونا مجھے ہمیشہ محسوس ہوتا ہے۔“

”تعلق گہرا ہو تو زبان سے جتانے کی ضرورت ہی کہاں پڑتی ہے۔“ نیلی دل کے راگ کا شعور رکھتی تھی اس لیے بہت تیزی سے اس کی بات سمجھ گئی۔

”ٹھیک کہا تم نے لیکن ایسا تعلق سامنے والے کو بہت مقروض کر دیتا ہے۔ میرا بھی بال بال قرض میں جکڑا ہوا ہے۔“

”کیا اس قرض کی ادائیگی کی کوئی سبیل نکالنا چاہتی ہیں؟“ اس نے دنیا دیکھی تھی، کیسے نہ سمجھتی کہ سہل شاہ ایک ایسے موقع پر جبکہ موت اس سے چند قدموں کے فاصلے پر ہی کھڑی تھی، کچھ بوجھ اتارنا چاہتی تھی۔

”یہ اس تک پہنچا دینا۔ اعظم اب محفوظ ہاتھوں میں ہے لیکن ان کو ابھی ایک لمبی جنگ لڑنی ہے۔ انہیں اس کی اعظم سے کہیں زیادہ ضرورت ہے۔“ اس نے کپڑے میں لپٹا وہ علساتی ہتھرنیلی کے حوالے کیا جو ایک ہندو جوگی نے معاذ کو دیا تھا اور معاذ نے اعظم کی حفاظت کے خیال سے اپنی پروانہ کرتے ہوئے اسے اعظم کے بارود پر باندھ دیا تھا۔

”بس یہی پہنچانا ہے؟“ نیلی کو کسی ادھورے پن کا احساس ہوا۔

”یہ بھی پہنچا دینا۔“ سہل نے ایک تہ کیا ہوا بند لفافہ کا پتے ہاتھوں سے اس کے حوالے کیا۔ لفافہ کھاتے ہوئے اس کا چہرہ اتنا جھکا ہوا تھا کہ نیلی اس کی آنکھوں میں نہیں دیکھ پا رہی تھی۔

”یہ ایک مناسب فیصلہ ہے سہل جی! لمبی راہ کے مسافر کے پاس کچھ تو زادِ راہ ہونا ہی چاہیے۔“ نیلی نے آہستہ سے اس کا ہاتھ دبایا۔ وہ اندازہ کر سکتی تھی کہ ایک مخصوص ماحول میں پرورش پانے والی لڑکی جو ہمیشہ پردے میں رہی تھی اور جس نے ہمیشہ بڑوں کی مرضی پر اپنا سر جھکایا تھا، اپنے دل کی ذرا سی مان لینے پر کس کیفیت کا شکار ہوگی۔

”میں جانتی ہوں، اسی لیے تو اتنی ہمت کی ہے۔ اب یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ میرے وقار پر کوئی آنچ آئے

بغیر یہ کام انجام دے سکو۔“ عزت و ناموس کی فکر اب بھی دامن گیر تھی۔

”میں سب سمجھتی ہوں۔ آپ نے مجھ پر بھروسہ کیا ہے تو بس بے فکر بھی ہو جائیں۔“ نیلی نے اسے تسلی دی۔ اس کے بعد ان کے درمیان اس موضوع پر مزید گفتگو نہیں ہوئی۔ موقع ہی نہیں ملا کہ عملے کے ایک مرد نے آکر مطلع کر دیا تھا کہ اب نیلی اینڈ فرینڈز سے ملاقات کا وقت ختم ہو چکا ہے اور عملے کو اپنی کارروائی کا آغاز کرنا ہے۔ اس لمحے کے بعد وہ سب بس دور سے ہی اسے آپریشن ٹیبلٹ میں جاتا ہوا دیکھ سکے۔

جدید طرز کے اس آپریشن ٹیبلٹ میں داخل ہونے کے بعد اس نے بھی باہر موجود ہر فرد سے اپنی توجہ ہٹالی۔ اب وہ اپنی ساری توانائیاں موت سے بچنے لڑانے میں صرف کرنا چاہتی تھی۔

”ہیلو بے بی! امید ہے تم خوفزدہ نہیں ہوگی۔“ مستعد عملہ ماہرانہ انداز میں اپنا کام شروع کر چکا تھا۔ اس کے جسم سے کئی ٹالیاں اور مشینوں کے تار منسلک کیے جا چکے تھے جب اس نے انگریزی میں کہا گیا یہ جملہ سنا اور آواز کے ماخذ کی تلاش میں اپنی نظریں ادھر ادھر گھمائی۔

”میں آپ کو ایسٹھسیا دینے لگا ہوں۔ خود کو مکمل پرسکون رکھنے کی کوشش کریں۔“ اس کے سر کی جانب کھڑے شخص نے بھی اسے انگریزی میں ہی مخاطب کیا تھا لیکن لہجہ اور تلفظ بالکل مختلف تھا۔

”سنا ہے سکون صرف قبر میں ملتا ہے۔“ یہ ہنسی ہوئی طنزیہ اور بے رحم آواز وہی پہلے والی تھی۔ اس بار بولنے والا اسے دکھائی بھی دے گیا۔ سرجنز کے مخصوص لباس میں، چہرے پر ماسک لگائے وہ اپنے سفید براق بالوں کو مخصوص کیپ سے ڈھانپ رہا تھا۔ سہل کو ایسا لگا اس نے موت کے فرشتے کو مجسم دیکھ لیا ہو۔ اس نے اس کی گرفت میں آنے سے قبل اٹھ کر بھاگنا چاہا لیکن دماغ پر چھائی دھند نے بے بس کر کے رکھ دیا۔ اسے بے ہوشی کی دوا دی جا چکی تھی اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ داپس ہوش کی دنیا تک کا سفر طے بھی کر سکے گی یا نہیں۔

☆☆☆

وہ دو بچوں کی مسکراتی ہوئی تصویر تھی۔ لڑکا عمر میں بڑا تھا اور تصویر میں بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کے ہاتھ میں کوئی نقص ہے۔ اس کے چہرے کے تاثرات بھی عام بچوں سے قدرے مختلف تھے۔ دراصل وہ ذہنی طور پر پوری طرح

ہوئے اس تک پہنچ جاتے اور اس کی زندگی کا سکون تہ وبالا کر کے رکھ دیتے۔

ماموں، ممانی جنہوں نے ہمیشہ شہریار کے لیے والدین کا کردار ادا کیا تھا، جب تک زندہ رہے خود ہی خاموشی سے آکر ان لوگوں سے مل جاتے تھے۔ مجاہد اور عائشہ میں ان کی جان تھی۔ خصوصاً عائشہ تو زیادہ ہی لاڈلی تھی۔ ماموں بچوں والے حادثے سے پہلے دنیا سے چلے گئے تھے اور ماموں کے بعد ویسے ہی تنہا پڑ جانے والی ممانی نے اس غم کو ایسے سینے سے لگا یا تھا کہ دس دن بھی مشکل ہی سے نئی سکی تھیں۔ جب تک وہ دونوں زندہ تھے، شہریار اور اس کی عدم موجودگی میں بچوں کے پاس رہنے آ جاتے تھے۔ صہیب اور حبیب کی آمد کے بعد سے یہ پہلا موقع تھا کہ شہریار کسی مشن پر ماہ بانو کو اپنے ساتھ لے جا رہا تھا اور اس موقع پر مشاہرم خان کو یہاں لا کر اس نے اہتمام کر لیا تھا کہ بچوں کے پاس کوئی اپنا موجود رہے۔

بچے اتنے نا سمجھ نہیں تھے کہ انہیں اپنے والدین یاد نہ ہوتے۔ ان دونوں نے بھی ایسی کوئی کوشش نہیں کی تھی کہ وہ اپنے والدین کو بھول جائیں۔ وہ بس اس درد اور احساس محرومی کو دور کرنے کی کوشش کرتے رہے تھے جس سے جیم ہو جانے والے بچے گزرتے ہیں۔ صہیب اور حبیب کی پر اعتماد اور نکھری ہوئی شخصیت گواہ تھی کہ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب رہے ہیں۔ ان کا ان بچوں سے لگاؤ کسی صورت اپنے سگے بچوں سے کم نہیں تھا اور اب جبکہ بچوں سے نامعلوم مدت کے لیے بچھڑنے کا وقت آیا تھا تو ماہ بانو ویسے ہی پریشان اور اداس تھی جیسے کوئی بھی ماں اپنے بچوں سے دور ہونے پر ہوتی۔ اس اداسی کے زیر اثر ہی وہ آج بہت دنوں بعد مجاہد اور عائشہ کی تصویریں نکال کر بیٹھ گئی تھی۔ ”ہم اندر آ جائیں امی؟“ دروازے پر ہونے والی دستک کے ساتھ سائی دینے والی حبیب کی آواز نے اسے سوچوں سے نکالا۔

”بالکل آ جاؤ بیٹا!“ اس نے جلدی سے آنکھوں کی نمی صاف کر کے انہیں جواب دیا لیکن البم ہاتھ سے نہیں رکھا۔ بچے اس کی طرف سے اجازت پاتے ہی نیم وا دروازے کو دھکیل کر اندر آ گئے۔ ان کی تربیت اس انداز میں کی گئی تھی کہ چاہے دروازہ کھلا ہوا بھی ہو تو وہ بلا اجازت ان کی خواب گاہ میں داخل نہیں ہوتے تھے۔

”آپ مجاہد اور عائشہ کی تصویریں دیکھ رہی تھیں؟“ صہیب نے اندر آتے ہی اس کے ہاتھ میں موجود البم کو ٹوٹس

ٹارل نہیں تھا لیکن اسے ایک اچھی زندگی دینے کی پوری پوری کوشش کی گئی تھی اور یہ کوشش اس کے صاف سترے لباس اور مسکراہٹ دونوں سے عیاں تھی۔

لڑکے کے مقابلے میں لڑکی زیادہ خوبصورت اور شوخ و چنچل دکھائی دیتی تھی۔ اس کی چمک دار آنکھوں سے ذہانت اور شرارت پھوٹی پڑ رہی تھی۔ صاف محسوس ہوتا تھا کہ اس کے ہونٹوں پر موجود مسکراہٹ اپنی کسی شرارت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے پھوٹی ہے۔

”تم دونوں چند برس کے لیے ہی میرے آنگن میں پھول بن کر رہے لیکن آج بھی میرے روم روم میں تمہاری خوشبو بسی ہوئی ہے۔“ تصویر والا البم ہاتھ میں لیے بیٹھی عورت نے اس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جیسے انگلیوں سے ان بچوں کے نقوش کو چھونے کی کوشش کی۔ وہ عورت ماہ بانو تھی، شہریار عادل کی ماہ بانو..... جس نے ایک طویل دور آشوب کے بعد شہریار کی چھپر چھاؤں میں سکون پایا تھا لیکن وہ شاید ان لوگوں میں سے تھی جنہیں خدا آزمائشوں کے لیے چن لیتا ہے۔

اس کی نئی آزمائش اس حادثے کی صورت آئی تھی جو اس سے مجاہد اور عائشہ دونوں کو چھین کر لے گیا تھا۔ کتنے عرصے تک تو دونوں میاں بیوی کو سمجھ ہی نہیں آ سکا تھا کہ ان کے ساتھ کیا ہو چلا ہے پھر دھیرے دھیرے دونوں نے ایک دوسرے کی خاطر جینا سیکھ لیا تھا۔ ایک دوسرے کو سنبھالتے وہ پہلے سے بھی زیادہ ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے۔ کچھ سہارا ان فلاحی کاموں کی مصروفیات نے دیا تھا جو انہوں نے شادی کے آغاز سے ہی اختیار کر لی تھیں پھر ایک دن شہریار، صہیب اور حبیب کو لے آیا تھا۔ ان دونوں بھائیوں نے اپنے والدین ایک حادثے میں کھو دیے تھے۔ یوں دو ادھورے خاندان مل کر ایک مکمل خاندان بن گئے تھے اور زندگی میں مسکراہٹیں لوٹ آئی تھیں۔ ان مسکراہٹوں کی گہرائی میں جو درد تھا، اسے کوئی بھی نہیں چھیڑتا تھا لیکن بعض اوقات درد کو خود بخود ابھر آنے کا موقع مل جاتا ہے۔ مشاہرم خان کی آمد کے بعد یہی ہوا تھا۔ اس دن شہریار کے ساتھ دوپہر کے کھانے کے وقت گھر آنے والا شخص وہی مشاہرم خان تھا جس نے شہریار کے ساتھ ہمیشہ وفائیں نبھائی تھیں لیکن اپنی بدلی ہوئی زندگی میں وہ اسے شامل نہیں کر سکا۔ اس کے نزدیک شہریار عادل مرچکا تھا۔

جیتے جی خود کو مار لینے کا یہ فیصلہ اس نے وطن کی محبت اور اوپر والوں کے مشورے کے تحت کیا تھا۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو وہ جن مگر محبوں کو زک پہنچا چکا تھا، وہ اس کی بوسہ لگتے

کر لیا۔

”ہاں، سامان کی پیننگ کرتے ہوئے الیم ہاتھ میں آگیا تو دیکھنے لگی۔“ اس نے سرسری لہجے میں جواب دیا اور اپنے قریب ان دونوں کے بیٹھنے کے لیے جگہ بنائی۔ وہ دونوں دسیوں بار اس الیم کو دیکھ چکے تھے لیکن ہر بار اسی ذوق و شوق سے دیکھتے تھے۔ کون سی تصویر مجاہد اور عائشہ کی کون سی سالگرہ کے دن کی ہے، کس میں وہ کس مقام پر پیننگ منانے گئے ہوئے ہیں یا کون سی تصویر اسکول کے کس فنکشن پر لی گئی ہے، انہیں سب از بر تھا۔

”آپ یہ الیم اپنے ساتھ لے کر جائیں گی امی؟“ تصویریں دیکھتے دیکھتے اچانک حسیب نے پوچھا۔

”نہیں..... لیکن آپ کیون پوچھ رہے ہیں؟“

”اس الیم میں آپ کی اور بابا کی بھی تصویریں ہیں نا۔ جب آپ لوگ یہاں نہیں ہوں گے اور آپ کی زیادہ یاد آئے گی تو ہم یہ تصویریں دیکھ لیا کریں گے۔“ اس نے نہایت معصومیت سے جواب دیا تو ماہ بانو نے بے اختیار اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے اس کا ہاتھ چوم لیا۔

”آپ مارے جانے سے اداس ہو رہے ہو؟“

”جی۔“ اس نے ایک لفظی جواب دیتے ہوئے ساتھ میں گردن بھی ہلائی۔

”میں اور بابا بھی آپ لوگوں کو بہت مس کریں گے لیکن کبھی کبھی بڑے مقاصد کے حصول کے لیے تھوڑی قربانی دینا پڑتی ہے اور جو بہادر لوگ ہوتے ہیں نا، وہ قربانی دینے سے نہیں گھبراتے۔ میرے دونوں بیٹے تو بہت بہادر ہیں نا؟“

”جی۔“ دونوں نے ہیک وقت اس کی تائید کی۔

”تو بس پھر بہادروں کی طرح ہنسی خوشی امی اور بابا کو رخصت کرنے کی تیاری کرو اور مجھ سے وعدہ کرو کہ ہمارے پیچھے بھی اسی روٹیں پر چلو گے جو میں نے سیٹ کی ہوئی ہے۔ نماز، ورزش، کھانا پینا اور پڑھائی۔ کسی بھی کام میں کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔ ہماری داپھی تک سائرہ آئی یہاں موجود رہیں گی اور ہر چیز پر چیک رکھیں گی۔“

اس نے ان خاتون کا حوالہ دیا جنہیں ان کی عدم موجودگی میں یہاں رہنا تھا۔ شہریار نے اسے بتایا تھا کہ سائرہ کوئی عام گھریلو ملازمہ نہیں تھی۔ وہ ایک پڑھی لکھی اور تربیت یافتہ عورت تھی جو ہتھیار چلانا بھی جانتی تھی۔ مشاہد خان کی موجودگی کے باوجود ایسی خاتون کا انتظام کرنا شہریار کی محتاط طبیعت اور بچوں کے لیے بے حد فکر کی وجہ سے تھا۔ اگر انہیں جوڑی کی شکل میں جانے کی حاجت نہ ہوتی تو وہ ماہ بانو کو

بچوں کے ساتھ چھوڑنا زیادہ مناسب سمجھتا۔

آپ پریشان نہ ہوں امی! ہم آپ کی ہر بات پر عمل کریں گے۔ آپ چاہیں تو بیچ بیچ میں سائرہ آئی سے کال پر پوچھتی بھی رہے گا۔“ اسے یہ تسلی دینے والا صہیب تھا۔ سائرہ نے چونکہ وہاں آنا شروع کر دیا تھا تو بچے اس سے مانوس ہونے لگے تھے اور وہ بھی ماہ بانو کی زیر نگرانی تیزی سے سیکھ رہی تھی کہ اس گھر کو کیسے چلانا ہے۔

”کال.....“ ماہ بانو کو اچانک ایک سنگین مسئلے کا احساس ہوا۔ پاکستان سے نکلنے کے بعد انہیں پاکستان سے کوئی تعلق نہیں رکھنا تھا اس لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ لوگ یہاں کال کر پاتے۔

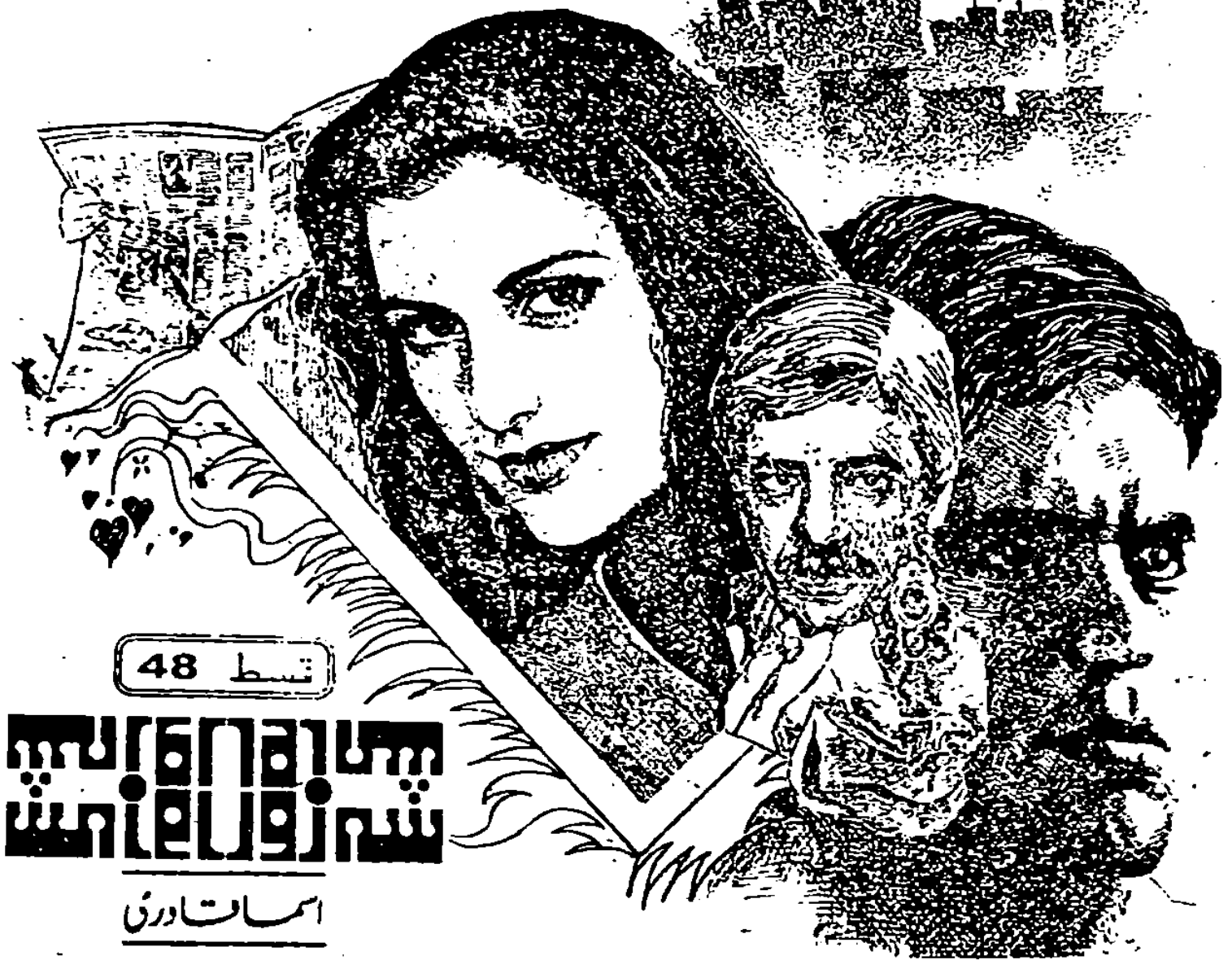
”کیا آپ ہم سے بات کرنے کے لیے ہمیں کال نہیں کریں گی؟“ صہیب چونکا۔

”بات یہ ہے بچوں کہ کچھ مسائل کی وجہ سے ہمارا آپ سے ٹیلی فون پر بات کرنا مناسب نہیں ہوگا لیکن آپ فکر نہ کریں۔ میں آپ کو خط لکھا کروں گی۔ آپ لوگ بھی ہمیں خط لکھا کرنا۔“ اس نے بچوں کو بہلایا۔ حقیقت یہ تھی کہ خطوط کا تبادلہ کسی صورت ممکن نہیں تھا۔ بس اس نے بچوں کی تسلی کے لیے احتیاطاً کچھ خطوط لکھ کر رکھ دیے تھے جو وہ جانے سے پہلے سائرہ کے حوالے کر دیتی۔ اس انتظام کو اب تھوڑا سا اور بڑھانا تھا۔ اسے امید تھی کہ سائرہ اس کی لکھائی کی مشق کر لے گی۔ اس صورت میں وہ بچوں کے لکھے گئے خطوط کا جواب بھی دے سکتی تھی۔

”آپ کس سوچ میں کم ہیں امی؟“ حسیب نے اسے پکار کر اپنی جانب متوجہ کیا۔

”میں سوچ رہی تھی کہ جانے سے پہلے ہم سب مل کر کہیں پیننگ پر چلتے ہیں تاکہ ایک یادگار دن گزار سکیں۔“ اس نے حسیب کو پیار کرتے ہوئے ایسی بات کہی کہ بچے سب کچھ بھول بھال کر اس حوالے سے پلاننگ کرنے لگے۔ ان کی چھکاریں سنتے ہوئے اس نے بہت خاموشی سے الیم بند کر کے الماری میں داپھی رکھ دیا۔ جو دو چلے گئے تھے، یہ دو ان سے کم پیارے نہیں تھے۔ بس فرض پکار رہا تھا اور ذاتی مفاد پر قومی واجتماعی مفاد کو ترجیح دینے کی آزمائش ان کے حصے میں آگئی تھی۔

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نوجوان
کسی داستان جو غلط کاروں کے لیے فضا
ناک تھا باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیے



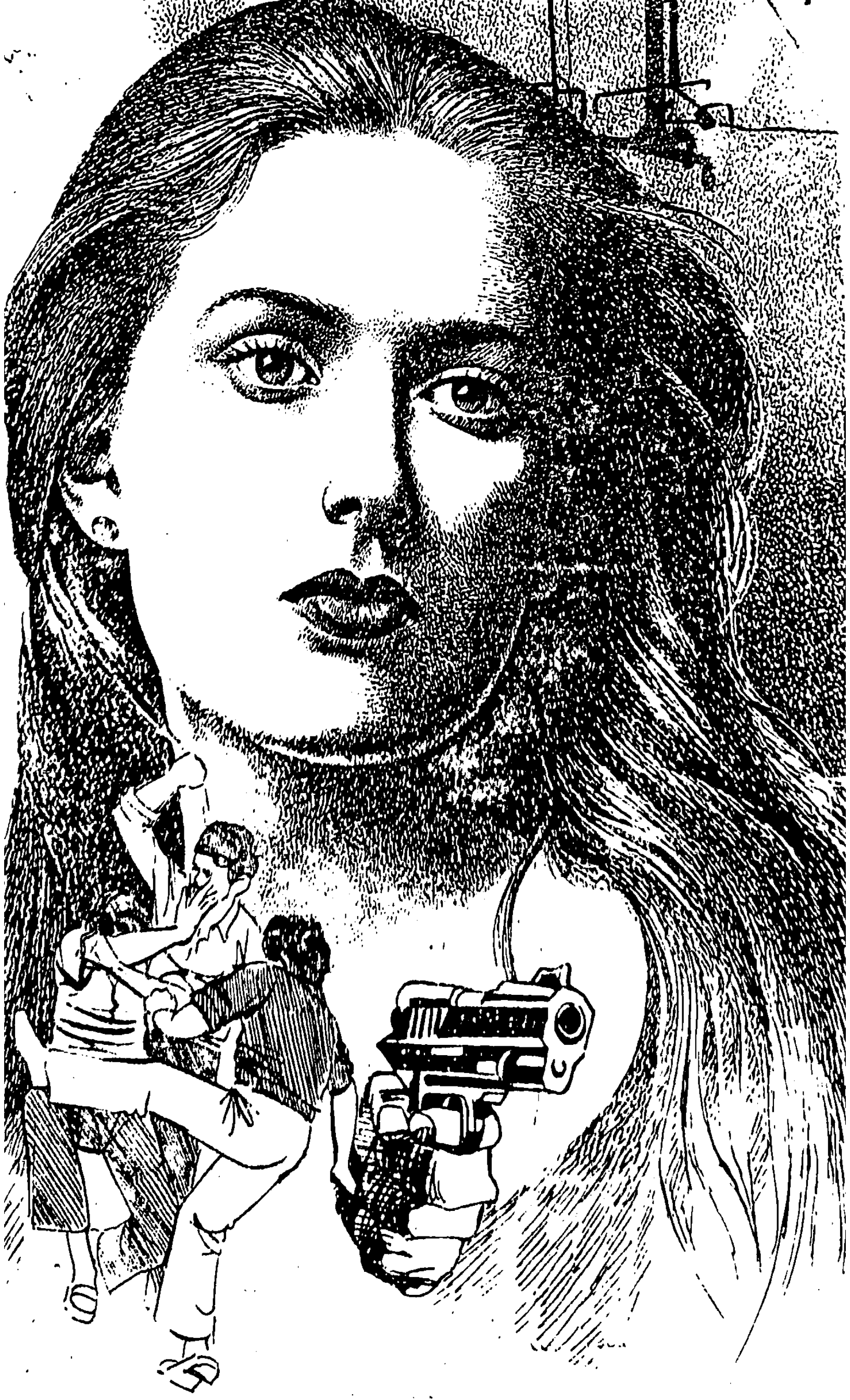
تسط 48

شہزادہ زور

اساتادری

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تندوتیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابل شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پر عزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جارہے تھے... اس کی زندگی جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... یہ خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی یہ قرار یوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تار عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ واردات قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہو سکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تحیر انگیز داستان



معاذ ایک ذہین لیکن متکون مزاج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جوائن کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ انسٹی ٹیوٹ سے واپس آ رہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو سڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی ذہین سے ہے۔ اپنی بڑی فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشری نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بشری ماس کیونی کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم وغیرہ لکھتی ہے۔ اس دوران جگہ بھی وہ ایک زیر تعمیر رہائشی منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی آئی تھی۔ معاذ بشری کو یہ حفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کر دیتا ہے لیکن جن ریکس زادوں سے اس نے ان کا شکار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ایک دن جنگل کی سیر کے دوران وہ فوٹو گرافی کے شوق میں سب سے الگ تھلک ہو جانے والے معاذ کو بے خبری میں گھیر کر بُری طرح زد و کوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دے دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس نہ آنے پر انتقامیہ کے افراد پولیس اور ریسکیو ذرائع کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جوگی کی جھونپڑی میں پاتا ہے۔ جوگی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے، جوگی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نواز کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے پر اسرار علم سکھانے کی ہامی بھر لیتا ہے اور معاذ اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ادھر جائے وقوعہ سے ملنے والے معاذ کے کہہ رہے سے جب تصویریں نکلوائی جاتی ہیں تو ایک ایسی تصویر بشری کی نظر میں آ جاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانک رہا نظر آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پروجیکٹ کے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشری تحقیق کر رہی تھی۔ بشری کے اپنے والد جرنلسٹ ہوتے ہیں۔ اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشری کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ مدد سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باڈل نامی ملندے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشری انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دلوں میں ہی معاذ واپسی کا ارادہ کرتا ہے تاہم ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا عرفان اللہ اور یزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو وقاص نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باڈل اچانک بشری کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر دیتا ہے۔ معاذ کو واپس لانے کے لیے اوتھے جھکنڈے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اسے واپس آنے کا پیغام دیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کر کے اسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات کے نہ بتانے پر اس کے بھائی کا ایک گروہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشری بھی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہو جاتی ہے۔ معاذ کے دوست عالم شاہ کے بہنوئی کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ کئی فنون میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے پہنا تاڑ کر کے اس کے دماغ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ لمبھو سے حاصل انوکھے علم کی بدولت ان کا معمول نہیں جتا۔ عالم شاہ اور اس کا نوکر سرمد، باڈل کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ عالم شاہ، باڈل کی قید میں موجود ایک ذہنی شخص کی مدد سے وہاں سے فرار ہو جاتا ہے۔ ادھر بشری دہلی پہنچ جاتی ہے۔ وہاں وقاص اسے ہار پی کے روپ میں پہچان لیتا ہے۔ وہ سلطان کو مارنا چاہتی ہے۔ ادھر عالم شاہ، باڈل کی قید سے نکل کر اس کا پیچھا کرتا ہے۔ وہ وہاں معاذ کو دیکھتا ہے۔ معاذ کو اس کے گھر والوں سے ملنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ وہ ایک مشن پر سونیا کے ساتھ انڈیا روانہ ہوتا ہے تاہم کچھ لوگ سکھ یا تریوں سے بھری بس کو یرغمال بنا لیتے ہیں۔ معاذ اور سونیا یہ خانے کے تمام افراد کو کھانکے لگا دیتے ہیں۔ عالم شاہ، سبکل اور سرمد انڈیا روانہ ہو جاتے ہیں۔ انڈیا پورٹ سے گھر روانگی پر راستے میں کچھ گھیرے انہیں لوٹ لیتے ہیں۔ گھر پہنچنے پر پولیس کی ریڈ ہوتی ہے اور وہ عالم شاہ اور سرمد کو لے جاتے ہیں۔ عالم شاہ اور سرمد کو تشدد کا نشانہ بنا کر ویرانے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ واپس اپنے میزبانوں کے ہاں پہنچ جاتے ہیں۔ انہیں پتا لگتا ہے کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں اجالا اور اس کا عاشق شامل ہوتے ہیں۔ وہ چھپ کر ان کی ہاتھیں سن رہا ہوتا ہے کہ اسے چھاپ لیا جاتا ہے۔ تاہم وہاں مارا باری ہوتی ہے اور اجالا کا عاشق مارا جاتا ہے۔ پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ ان کے کزن انہیں اپنے دوسرے خفیہ جگہ پر پہنچا دیتے ہیں۔ وہ وہاں سے بحفاظت نکل جاتے ہیں۔ ادھر معاذ ایک مشن میں زخمی ہو جاتا ہے اور اسے ہندو سادھو اپنی کنیہ میں لے جاتا ہے جہاں اس کی اچھی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ سونیا کے آدمی معاذ کو تلاش کرتے ہیں مگر ناکام ہو جاتے ہیں۔ ادھر عالم شاہ اور سرمد خفیہ ذریعے سے بارڈر پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ دھر لے جاتے ہیں اور "را" کی قید میں پہنچ جاتے ہیں۔ بشری باڈل کو مارنے کی کوشش میں خود نشانہ بن جاتی ہے۔ معاذ سادھو کی مدد سے ایک انڈین ہیروئن کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ وہیں اسے عالم اور سرمد کی گرفتاری کا پتا چلتا ہے۔ معاذ ڈاکٹر فردوس سے ملتا ہے اور اسے سبکل کی مدد کرنے کا کہتا ہے۔ حلینہ اور وقاص وغیرہ کو لالہ عیسیٰ

ملک سے باہر نکال دیتا ہے۔ علینہ پاکستان میں ٹوبہ سے رابطہ کرتی ہے جو ان کے لیے مصیبت بن جاتا ہے۔ ٹوبہ پر تیزاب پھینک دیا جاتا ہے۔ وقاص، علینہ اور اس کے گھروالوں کو مار دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس معاذ کو دیوانی شخص سے مدد لینے کا کہتی ہے۔ معاذ اپنے کزن کو پاکستان کال کرتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ اس کے گھروالوں کو مار دیا گیا ہے۔ وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کی ٹھان لیتا ہے۔ ادھر ڈاکٹر فردوس کو اس کے سرسرا والے بھل کو بھگانے کی یاداش میں تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ معاذ، عالم اور سرمد کی رہائی کے لیے کارروائی کرتا ہے اور انہیں ”را“ کی قید سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن عالم اور سرمد کو دیوانہ کے آدمی کسی دوسری جگہ پہنچا دیتے ہیں۔ سونیا معاذ کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ ادھر باذل ایک جگہ لالہ عیسیٰ کی موجودگی پر کارروائی کرتا ہے تاہم لالہ خود کو گولی مار کر ختم کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس کا انتقال ہو جاتا ہے۔ دیوانہ گینگ ڈاکٹر فردوس کی میت اٹھنے پر وہاں فائرنگ کر دیتے ہیں۔ پولیس دیوانہ کو گھیر لیتی ہے۔ معاذ دیوانہ کو اس کے آدمیوں کو نکالنے کے عوض عالم کا پتا معلوم کر لیتا ہے۔ سونیا اور معاذ حیدر آباد لواب بدرالدین کی حویلی پہنچ جاتے ہیں۔ وہ لواب صاحب کی حویلی میں عالم اور سرمد کی رہائی کے لیے کارروائی کر کے انہیں رہا کر لیتے ہیں۔ وہ لوگ نئے ٹھکانے پر پہنچتے ہیں تو وہاں معاذ سے ملنے جا روئی شخص آتا ہے۔ اسے معاذ نے ”را“ کی قید سے نکالا ہوتا ہے۔ جا رو اور معاذ، بھل سمیت اسپتال جاتے ہیں اور پہچان لیے جانے پر پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ پولیس سے مقابلے کے بعد وہ ایک بستی میں پناہ کے لیے گھس جاتے ہیں اور دو لوگوں کو یرغمال بنا کر ان کی جھونپڑی میں قیام کرتے ہیں۔ ادھر سونیا معاذ کی تلاش میں نکلتی ہے اور اسے بستی میں پہنچنے پر معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ معاذ اور جا رو وغیرہ انوپ نامی شخص کے ساتھ اس کے مالک کے بنگلے میں قیام کرتے ہیں۔ سونیا بھی معلومات حاصل کرتی ہوئی مذکورہ بنگلے تک پہنچ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور سرمد بھی سونیا کا پیچھا کرتے ہوئے وہیں پہنچ جاتے ہیں۔ ادھر لالہ، وقاص، علینہ و دیگر لوگ زندہ ہوتے ہیں۔ وقاص حلیہ بدل کر گلوکا باڈی گارڈ بناتا ہے۔ وہ معاذ کو تلاش کرنے کے لیے انڈیا روانہ ہوتا ہے۔ وہاں اس کی گل خان سے ملاقات ہوتی ہے اور معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ سونیا، معاذ اور دیگر ساتھیوں سے مل جاتی ہے تاہم وہ جس بنگلے میں ہوتے ہیں وہ دشمن کا ہوتا ہے۔ دشمن سب کو بے ہوش کر کے کہیں لے جا رہے ہوتے ہیں کہ ان کی گاڑی کو حادثہ پیش آ جاتا ہے۔ ان سب کو جینی بھکشو طبی امداد دیتے ہیں اور ان سے پوچھ گچھ کی جاتی ہے۔ بھل کی حالت تشویشناک ہوتی ہے اور اسے وہاں موجود ایک دید دیکھتا ہے۔ ادھر لالہ واپس اپنے لوگوں میں پہنچ کر ایکشن میں آ جاتا ہے۔ باذل، معاذ وغیرہ کے ٹھکانے سے باخبر ہو جاتا ہے۔ باذل، معاذ کا پیچھا کرتا ہے اور چینیوں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ معاذ چینیوں کے ساتھ مل کر دشمنوں کے خلاف کارروائی کرتا ہے۔ ادھر لالہ عیسیٰ، اعظم کو دشمن کی گرفت سے نکالنے کے لیے کارروائی کر دیتا ہے اور سومی اور نیلی، اعظم کو نکالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ معاذ دشمنوں کے کیمپ پر حملہ کر کے وہاں قبضہ کر لیتا ہے۔ سومی اور نیلی کی گاڑی پر حملہ ہوتا ہے تاہم ہمارا ماری کے بعد وہ صداقت شاہ کے پاس پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ لالہ عیسیٰ صداقت شاہ کو حویلی پر ریڈ کاٹتا ہے۔ صداقت شاہ اعظم کے محفوظ ٹھکانے کے لیے قربان شاہ کو فون کرتے ہیں۔ اعظم کو وہاں سے نکال لیا جاتا ہے اور دوسری جگہ منتقل کر دیا جاتا ہے۔ ادھر معاذ بیجنگ پہنچ جاتا ہے اور وہاں کے کرتا دھرتاؤں سے بات کر کے پاکستان پہنچنے کی اجازت چاہتا ہے۔ ادھر سومی اور نیلی کو پولیس گھیر لیتی ہے اور فائرنگ میں سومی مارا جاتا ہے۔ وہ اعظم کو لے جاتے ہیں اور نیلی زخمی حالت میں ان کے قبضے میں آ جاتی ہے۔ معاذ اور وی وغیرہ پاکستان پہنچ جاتے ہیں اور اعظم کی بازیابی کے لیے منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ سومی کی تدفین ہو جاتی ہے۔ ادھر باذل، لالہ کی قید سے بھاگ جاتا ہے۔ معاذ، ڈی ایس پی ظہیر کے بنگلے پر دھاوا بولتا ہے اور ڈی ایس پی کو تباہ کرنے کے بعد اس سے معلومات لیتا ہے۔ وہ لوگ ظہیر خان کو لے کر وہاں سے نکل جاتے ہیں۔ باذل قید سے نکل کر مہناز کے پاس پہنچتا ہے اور اسے تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ نیلی قید میں موجود ظہیر کو ٹھکانے لگا دیتی ہے۔ بشری قبرستان جاتی ہے۔ وہاں اس کی دوست ملتی ہے۔ بشری اپنی دوست کے ساتھ جا رہی ہوتی ہے کہ باذل کے آدمی اسے اغوا کر لیتے ہیں۔ ادھر معاذ سارے معاملوں کو جلد حل کرنے کے لیے دشمن کے آگے اٹھیا رڈال دیتا ہے مگر اس کے خیر خواہ اسے میڈم ایکس کے ہتھیار سے نکال لیتے ہیں اور اعظم کو بھی بازیاب کر لیتے ہیں۔ زن ہوا اسے اپنے ساتھ لے جاتی ہے اور وہاں کرل سکندر بخت سے ملاقات ہوتی ہے۔ معاذ انہیں دشمنوں کے خلاف کارروائی کرنے کا کہتا ہے۔ باذل، بشری کو لے کر انڈیا گراؤنڈ ہو جاتا ہے۔ ادھر وقاص باذل کا پتا چلانے کے لیے ایک کال گرل عیسیٰ کے گھر کارروائی کر کے باذل کے ٹھکانے پر پہنچ جاتا ہے۔ وہاں وی کی ساتھی اور کوئی اور گروپ حملہ کر دیتے ہیں۔ وی زخمی ہو جاتا ہے۔ ادھر باذل، عرفان اللہ کو گولی مار دیتا ہے اور خود بھی شدید زخمی ہو جاتا ہے۔ باذل کے ساتھی اسے ایک اسپتال کے آگے چھوڑ دیتے ہیں۔ وہیں وی اور بشری بھی داخل ہوتے ہیں۔ معاذ باذل کو پہچان کر اسے بھی وہیں ایڈمٹ کر دیتا ہے۔ عرفان اللہ جاں بحق ہو جاتا ہے۔ عرفان اللہ کی سیکرٹری صوفیہ کو خفیہ ادارے کے لوگ اٹھا لیتے ہیں لیکن صوفیہ وہاں اپنی جان دے دیتی ہے۔ صداقت شاہ اور ان کی اہلیہ بھل کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ عالم، نیلی اور اعظم بھی وہیں ہوتے ہیں۔ بھل اسپتال میں زیر علاج ہوتی ہے۔ باذل کو معذوری کی حالت میں ایک چوک پر پھینک دیا جاتا ہے۔ معاذ... وقاص وغیرہ کے ساتھ علینہ کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ وہاں سے اگلے مشن پر جانا ہوتا ہے۔ سونیا قانون کی قید سے بھاگ نکلتی ہے۔ بھل کی طبیعت بگڑ جاتی ہے۔ یو آن منگ، اینڈریو کے ذریعے بھل کے آپریشن کی تجویز دیتا ہے۔ عالم نہ چاہتے ہوئے بھی راضی ہو جاتا ہے۔

”تسلیمات!“

رکھوں گی، نہ رہی تو آپ میرے لیے دعائے مغفرت کر دیجیے گا اور اس قرض کو بھی معاف کر دیجیے گا جسے میں چاہ کر بھی چکا نہیں سکوں گی۔“

خط جس طرح بغیر کسی مخاطب کے شروع ہوا تھا اسی طرح لکھنے والی کے نام کے بغیر ہی ختم ہو گیا تھا۔ اسے نام کی ضرورت بھی نہیں تھی کہ اس کے لیے یہی کافی تھا کہ اس سے کلام کیا گیا ہے۔ گو اس کلام میں مستقبل کے لیے کوئی امید یا خوشخبری نہیں تھی لیکن یہ بھی کیا کم تھا کہ دوسری طرف سے اس کے جذبات کو سمجھنے کا اعتراف کر لیا گیا تھا۔ وصل تو دیے بھی ایک خواب تھا کہ وہ جس راہ کا راہی تھا، اس راہ پر چلنے والوں کو پلٹنے کا راستہ نہیں ملتا۔ ہاں، زار راہ مل گیا تھا تو امید تھی کہ سفر کچھ آسان ہو جائے گا۔

☆☆☆

”یہاں کیوں آئی ہو؟“ اس سے مخاطب شخص کی رنگت پختہ اور نقوش بھدے تھے لیکن چہرے پر ایسا اعتماد تھا جو ایک بار سامنے والے کو مرعوب ضرور کرتا تھا۔ وہ اپنے جٹاؤں کی شکل میں موجود لمبے اور گندے بالوں میں بے نیازی سے اپنا بھاری سیاہ ہاتھ پھیرتے ہوئے اس سے یوں مخاطب تھا جیسے کہیں کا حکمران ہو اور حالت یہ تھی کہ اس کے بوسیدہ اور میلے لباس سے اٹھنے والی مچھلی کی بساں دھلی بندی کے دماغ میں گھسٹی جا رہی تھی۔

”مجھے یہاں سے لکھنا ہے اور اس کے لیے میں اپنے سوز اس لیے استعمال نہیں کر سکتی کہ ان پر میرے دشمنوں کی نگاہیں پہرہ دے رہی ہیں۔“ وہ مقابل کے رعب داب کا اپنی بے نیازی سے توڑ کر نا جانتی تھی۔ اسے جامی نامی اس پتھر سے کی حقیقت خوب پتا تھی۔ بظاہر وہ ایک اسمگلر تھا جو ادھر کا مال ادھر اور ادھر کا ادھر کرنے میں خوب مہارت رکھتا تھا۔ دونوں طرف اس کے رابطے اور انتظامات اتنے بکے ہوتے تھے کہ آج تک ایک بار بھی نہیں پکڑا گیا تھا۔ وہ اسمگلر سے بڑھ کر بھی کچھ تھا۔ یہ بات کتنی کے چند لوگ ہی جانتے تھے اور ان چند لوگوں میں سے ایک سونا بھی تھی۔

”نکال دیں گے، وہ کوئی بڑی بات نہیں لیکن بھارت ہی کیوں جانا چاہتی ہو؟ کہیں اور بھی تو نکل سکتی ہو؟“ وہ اپنی سرخ آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑے گویا اس کے اندر اتر جانا چاہتا تھا۔

”کہیں اور نہیں۔ میں بہت لمبے کراس سے گزر کر یہاں تک پہنچی ہوں اور مزید کسی مسئلے میں پھنسے بغیر آسان چھٹل سے اپنے لوگوں تک پہنچنا چاہتی ہوں اس لیے

مجھے نہیں معلوم کہ جب آپ کو یہ خط ملے گا تو میں اس دنیا میں موجود ہوں گی یا نہیں۔ حقیقتاً مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ میں آپ کو یہ خط کیوں لکھ رہی ہوں اور بنا کسی تعلق یا رشتے کے آخر اس خط کی کیا گنجائش ہے؟ کہنے کو میں یہ بھی کہہ سکتی ہوں کہ میں نے یہ خط اپنے اس محسن کا شکر یہ ادا کرنے کے لیے لکھا ہے جس نے اپنی جان کی بازی لگا کر میرے لخت جگر کو مجھ تک پہنچایا ہے لیکن یہ کوئی واحد احسان تو نہیں ہے جو آپ نے مجھ پر کیا ہے۔ جب سے آپ میری زندگی میں آئے ہیں مسلسل احسانات ہی کرتے آرہے ہیں۔ ایسی بے غرضی اور بے لوثی میں نے خون کے رشتوں کے علاوہ آج تک کہیں نہیں پائی اور ظاہر ہے ان رشتوں میں تو قدرت کی طرف سے یہ چیز خیر میں گوندھ دی جاتی ہے لیکن آپ نے کیوں کی مجھ پر اتنی مہربانیاں کہ میں آج اپنا بال بال آپ کے قرض میں جکڑا ہوا محسوس کرتی ہوں۔

شاید میں یہ سوال کر کے آپ کے ساتھ زیادتی کر رہی ہوں۔ نہیں، مجھے ایسا کوئی سوال کر کے آپ کے بے لوث جذبات کو ٹھیس نہیں پہنچانی چاہیے۔ میں ایک عورت ہوں، وہ بھی ایسی عورت جو دوسروں کے ساتھ نکاح کے تجربے سے گزر چکی ہے۔ عورت تو خود پر پڑنے والی نظر کے معاملے میں دیے ہی بہت حساس ہوتی ہے اور اگر مجھ جیسی تجربہ کار ہو تو اس کے لیے پرکھ مشکل نہیں رہتی کہ کس کی نظر میں اس کے لیے کیا ہے؟ اس لیے میں یہ نہیں کہوں گی کہ مجھے آپ کی نظروں کی زبان سمجھ نہیں آتی۔ ہاں یہ ضرور کہوں گی کہ آپ مجھ سے بہت زیادہ اچھی لڑکی ڈیزرو کرتے ہیں۔ کوئی ایسی لڑکی جو خود اور اس کے جذبات ان چھوئے ہوں۔ جس کی زندگی میں آپ کا مقام سب سے اوپر ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جو زندگی کے سفر میں آپ کے شانہ بشانہ چل سکے۔ میں تو وہ چراغ ہوں جس کی بجھتی ہوئی لو کو کسی طرح بجھا بھی لیا گیا تو باقی کی ساری زندگی بس اس وجود کو قائم رکھنے میں ہی گزر جائے گی۔ میری ہستی اب کسی کی زندگی میں روشنی نہیں بکھیر سکتی اس لیے میری آپ سے درخواست ہے کہ ایک سراب کے پیچھے بھاگ کر اپنی زندگی کے قیمتی ماہ و سال ہرگز بھی ضائع نہ کیجیے گا۔ کچھ رشتے اور تعلقات اگر بے نام ہی رہیں تو ان کی خوبصورتی سلامت رہتی ہے۔ اس خوبصورتی کو سلامت رکھیں اور خود آگے بڑھ جائیں۔ میں اگر زندہ رہی تو آپ کو ہمیشہ دعاؤں میں یاد

سب سے پہلے سمجھنے کی ہوتی ہے۔" جامی نے اپنے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس پر ایک حریفانہ نگاہ ڈالی۔
 "تم کب تک مجھے یہاں سے نکالنے کا انتقام کر سکتے ہو؟" سونیا نے اس کی بات اور نظروں دونوں سے ہی پہلو تہی کی اور قدرے خشک لہجے میں پوچھا۔
 "تھوڑا دیر کرنا پڑے گا۔ اتنے احمق وہ بھی نہیں ہیں۔ تمہیں، تمہاری طرف نہ پا کر وہ ادھر کا ہی رخ کریں گے۔"
 "تو ان کے یہاں کا رخ کرنے سے پہلے ہی مجھے یہاں سے نکال دوتا۔"

"پاسیبل نہیں ہے۔ دو دن پہلے ہی ڈیلیوری کی ہے۔ اتنی جلدی دوبارہ پھیرا نہیں لگاتے ہیں۔ خرچہ بڑھ جاتا ہے اور رسک بھی۔" جامی کا لہجہ یکدم خشک ہو گیا۔ اس کے پاس صبر کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ تل ایب تک کا سفر بہر حال یہیں سے شروع ہوتا تھا۔ تل ایب..... جس کی فضاؤں سے نکلے ایک عرصہ گزر گیا تھا، اسے پکار رہا تھا۔
 ☆☆☆

"عمار.....!" جھرنے کے شفاف پانی پر نظر لگائے وہ کہیں بہت دور نکلا ہوا تھا کہ ایک نسوانی آواز اسے ماحول میں واپس کھینچ لائی۔ اس نے گردن گھما کر پکارنے والی کی سمت دیکھا۔ اس کے سامنے پری ویش کھڑی مسکرا رہی تھی۔

"میں گھر پر گئی تھی لیکن چچی جان نے بتایا کہ تم صبح ہی گھر سے نکل چکے ہو۔ میں سمجھ گئی کہ تم یہاں ملو گے کیونکہ ابھی بازار کھلنے کا وقت تو ہوا نہیں ہے کہ تم دکان پر جا چکے ہوتے۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں بولتی ہوئی اس سے کچھ فاصلے پر پڑے ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ گئی۔

"ایسا کیا کام پڑ گیا تھا کہ تمہیں صبح میری تلاش میں نکلنا پڑا؟" اس نے رخ موڑ کر دوبارہ سے بہتے پانی پر نظریں جمادیں اور قدرے خشک لہجے میں پری ویش سے دریافت کیا۔ اس لڑکی کی آنکھوں کی چمک اور شوخ مسکراہٹ میں کچھ ایسا تھا جو اول دن سے اسے اس سے جتنا رہنے پر اکساتا تھا لیکن اس کے لیے اس کا گریز جیسے کوئی معنی ہی نہیں رکھتا تھا اور ہر بار اس سے یوں بے تکلفی سے پیش آتی تھی جیسے وہ اس کا ہم جولی ہو۔ بات بھی شاید کچھ ایسی ہی تھی۔ اس نے آغا گل اور زرینہ بی بی سے جتنے قصے سنے تھے، ان سے یہ بات واضح تھی کہ بچپن ہی سے دونوں بہنوں کا ان کے گھر بہت زیادہ آنا جانا تھا۔ گل ویش کم عمری میں شادی ہو کر دور چلی گئی تھی تب بھی اس کی آمد و رفت کا سلسلہ

میرے لیے بھارت ہی سب سے زیادہ سوٹ ایبل ہے۔" جامی کی نظروں سے گھبرائے بغیر وہ اپنے مطالبے پر قائم رہی۔ کل جب وہ یہاں پہنچی تھی اور جامی کے آدمیوں کو کچھ ایسے حوالے دیے تھے جن سے اس کا درست ہونا ثابت ہوتا تھا تو اسے یہاں پناہ تو دے دی گئی تھی لیکن جامی نے اس سے ملاقات نہیں کی تھی۔ اسے یہی بتایا گیا تھا کہ جامی فی الحال موجود نہیں ہے لیکن وہ جانتی تھی کہ وہ اس کے متعلق ساری چھان پھنک کرنے کے بعد ہی اس سے ملے گا۔ یہ اور بات کہ ظاہر نہ کرے۔

"کچھ بتاؤ کہ کن حالات سے گزر کر آرہی ہو تاکہ میرے پاس بھی اوپر والوں کو دینے کے لیے کوئی کارن ہو۔" یہ تجسس مصنوعی تھا لیکن سونیا نے اس کا اظہار نہ ہونے دیا اور سنجیدگی سے اپنے معاذ کے ساتھ برف زار میں پہنچنے سے لے کر چائینز کے ہاتھوں گرفتاری کا احوال مختصر اُسنائے لگی۔
 "تمہیں پاکستان کے حوالے کر کے چینوں نے ایک بار پھر ان سے اپنے بھائی چارے کا پرچار کیا ہے۔" جامی نے ہنکارا بھرا۔

"وہ ایسا کرتے ہی رہتے ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ پاکستان کو تمہارے ویش پر فوقیت دی ہے۔" سونیا نے مزے سے اس کے کمزور پہلو پر ضرب لگائی جو موثر ثابت ہوئی اور جامی کی سیاہ رنگت غصے اور توہین سے مزید سیاہ پڑ گئی۔

"ہمیں ان کی ضرورت ہے بھی نہیں۔ ہمارے دوست ان سے زیادہ طاقتور اور پہنچ والے ہیں۔"
 "بے شک۔" اب وہ تھپڑ مار کر سہلانے کا کام کر رہی تھی۔

"مجھے کل کے ہنگامے کا پتا چلا ہے۔ تم نے ان کی قید سے بھاگ کر بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ سارے اپنے زخموں کو سہلاتے پھر رہے ہیں اور بلبلاہٹ نکالنے کے لیے اس سپاہی شفیق محمد کو گرفتار کر لیا ہے جو تمہارے سیل کے باہر پہرا دیتا تھا۔" جامی کے منہ سے نکلنے والے جملوں نے ثابت کر دیا کہ وہ اس کے فرار سے متعلق تمام باتوں کی تصدیق کرنے کے بعد ہی اس کے سامنے آ کر بیٹھا ہے۔

"حالانکہ اصل سزا کے حقدار وہ ہیں جنہوں نے اس احمق کو ڈیوٹی سونپی تھی۔ شاید انہوں نے سونیا خان کے بارے میں ٹھیک سے معلومات نہیں کی تھیں جو اس کی راہ روکنے کے لیے اس سیل کو کافی سمجھ لیا تھا جہاں ان کے خیال میں کوئی پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔"

"حسین عورت اپنی جگہ خود کتنا بڑا ہتھیار ہے، یہ بات

جاری رہا تھا بلکہ مزید بڑھ گیا تھا اور وہ اپنی تنہائی کو عمار جیسے شریف بچے سے بانٹنے کی کوشش کرتی تھی۔ گل دوش اگر عمر کے تفاوت کی وجہ سے اپنی لاڈلی بہن کو بہت رعایت دیتی تھی تو عمار اپنی سادہ فطرت کی وجہ سے اکثر اس کی بے ایمانیوں اور ہٹ دھرمیوں کو خاموشی سے سہہ جاتا تھا۔

”میں تم لوگوں کو رات کے کھانے کی دعوت دینے آئی تھی۔ تم گھر پر نہیں تھے تو یہاں چلی آئی کہ کہیں ایسا نہ ہو تم بے خبری میں کام سے واپسی میں دیر کر دو اور ہم تمہاری راہ دیکھتے رہ جائیں۔“ اس پر اس کی بے رخی کا کوئی اثر نہیں تھا۔ ”کیسی دعوت؟“ اتنی تفصیل کے جواب میں وہاں محض دو لفظی سوال تھا۔

”تمہارے آنے کی خوشی میں دعوت رکھی ہے بے نے۔ احمد بھائی بھی آنے والے ہیں گل دوش کو لینے کے لیے تو بس سب ایک ساتھ مل بیٹھ کر کھانا کھالیں گے۔“ اس نے دعوت کا سبب بتایا پھر بچوں کی طرح چپکتی ہوئی بولی۔ ”تمہیں پتا ہے بے کھانے میں کیا کیا بنا رہی ہیں؟“ ”مجھے بھلا کیسے پتا ہو سکتا ہے۔“ جواباً اس کے لہجے میں بیزاری تھی۔

”سب تمہاری پسند کے کھانے بنیں گے پلگے۔ پلاؤ، راجما، دم آلو اور گشتابہ۔ گشتابہ تو تمہیں بہت ہی پسند تھا۔ مجھے یاد ہے جب بھی کبھی بے بے گشتابہ بناتی تھیں تو تمہارا حصہ ضرور نکال کر رکھتی تھیں۔“ وہ اسے اس ماضی کا حوالہ دے رہی تھی جس کا کوئی ٹکس اس کی یادداشت میں موجود نہیں تھا۔ ہاں اسلام آباد کے ایک ہوٹل میں کھایا ہوا گشتابہ ضرور اسے یاد آ گیا تھا۔ وہ کوفتے نما ایک ڈش تھی جس کی گریوی بہت لذیذ اور منفرد ذائقے کی حامل تھی۔ اس نے سنا تھا کہ گریوی تیار کرنے کے لیے دودھ اور کھوئے کے ساتھ خاص کشمیری مسالہ جات استعمال کیے جاتے تھے جن کی خوشبو ہی اشتہا بڑھانے کے لیے کافی ہوتی تھی۔

”ویسے پسند تو تمہیں دم آلو بھی بہت تھے اور تم اکثر چچی جان سے فرمائش کر کے بنوایا کرتے تھے۔ وہ اور بات کہ تم سے زیادہ میں کھا جاتی تھی۔“ اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ خود ہی ایک کے بعد دوسری بات نکالتی شوخی سے ہنستی جا رہی تھی۔ ہنسنے سے اس کی رنگت مزید گلابی ہو گئی تھی۔ ”یہ ساری چھ سال پرانی باتیں ہیں۔ اس وقت تم مشکل سے بارہ تیرہ سال کی ہو گی لیکن یاد سب کچھ ایسے رکھا ہوا ہے جیسے کوئی نانی اماں ہو۔“

”ہاں تو یادداشت تمہاری گئی ہے، کوئی میری تھوڑی۔“

اس نے ترنت جواب دیا اور دانی میں مزید بولی۔ ”یوں بھی بارہ تیرہ برس کوئی اتنی چھوٹی عمر بھی نہیں ہوتی۔ گل دوش کی تو پندرہ برس کی عمر میں شادی بھی ہو گئی تھی۔“ ”تو تمہاری شادی کیوں نہیں کی تمہارے گھر والوں نے؟“ وہ بے ساختہ ٹوک بیٹھا۔

”میں راضی ہوتی تو کر دیتے۔ اب بھی برادری کے کئی لوگ بے بے اور ابا کو طعنے دیتے ہیں کہ شادی کی عمر ہونے کے باوجود لڑکی کو ابھی تک گھر بٹھا کر رکھا ہوا ہے۔ وہ دونوں شاید لوگوں کی باتوں سے گھبرا جاتے لیکن آغا جان نے انہیں سمجھایا کہ پری دوش کو پڑھنے دو۔ ہمیں اپنی نسلوں کو سنوارنے کے لیے پڑھی لکھی عورتوں اور خصوصاً لیڈی ڈاکٹرز کی بہت ضرورت ہے۔ دیکھا نہیں تھا میرے بے وقت چھٹی لے کر آنے پر کتنے ناراض ہو رہے تھے۔“

”لیکن تم پر ان کی ناراضی کا کوئی اثر ہوا تو نہیں۔ ابھی تک سیس بیٹھی ہوئی چھٹیوں کے مزے لے رہی ہو۔“ ”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہنگاموں کی وجہ سے کالج بند کر دیا گیا تھا اس لیے میں رک گئی ورنہ آغا جان کی بات تو میرے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہے۔“ اس بار وہ قدرے بُرا مان گئی تھی۔

”تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں کل صبح واپس جا رہی ہوں۔“

”یہ تو اچھی خبر ہے۔ واپس جا کر خوب دل لگا کر پڑھنا۔ یہ نہ ہو کہ چند دن بعد پھر کسی بہانے سے چھٹی لے کر آ جاؤ۔“ ”کیا مطلب ہے تمہارا؟ تمہیں لگتا ہے میں جھوٹے بہانے بناتی ہوں۔“ عمار کی نصیحت اسے غصہ دلا گئی۔

”بناتی ہی ہو گی جب ہی تو آغا جان تمہارے چھٹی لے کر آنے پر خفا ہو رہے تھے۔“ اس پر پری دوش کے غصے کا کوئی اثر نہیں ہوا اور بے نیازی کے اظہار کے لیے پاس پڑا ایک چھوٹا سا چکنا چتر گھما کر پانی میں پھینکا۔

”ایک تو میں تمہارے آنے کا سن کر خاص طور پر تم سے ملنے آئی تھی اور تم ہی مجھے طعنے دینے لگے۔ ٹھیک ہے، اب کل جاؤں گی تو تم سب کے ناک رگڑنے تک دوبارہ ملنے نہیں آؤں گی۔ سمجھ کیا رکھا ہے پری دوش کو۔ میں کوئی نالائق اور فالتو لڑکی ہوں جو بہانے سے پڑھائی سے جان چھڑا کر بھاگ کر گھر آ جاتی ہے۔“ غصے سے اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا لیکن اس نے جواباً کسی معذرت کا اظہار نہیں کیا۔ وہ اٹھی اور پیر پختی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد وہ بھی کچھ اداس اور پشیمردگی کی کیفیات میں گھرا وہاں

”میں ناشتا کر کے آیا ہوں انکل! بی بی مجھے ناشتا کیے بغیر گھر سے نکلنے دے سکتی تھیں؟“ انہیں جواب دیتے ہوئے وہ ہنس پڑا۔

”وہ بیٹے کی محبت میں ترسی ہوئی ماں ہے یگ بوائے! ہمارے مشرق کی ماؤں کے پاس اپنی محبت کے اظہار کا سب سے بڑا ذریعہ یہی ہے کہ اولاد کو مزے مزے کے کھانوں سے آسودہ کرتی رہے۔“

”جی، یہ تو ہے۔“ انکل بنجامن سے اتفاق کرتے ہوئے اس کے ذہن پر کئی یادوں نے دستک دی۔ وہ دوڑ دوڑ کر کام کرتی، ہر بچے کے لیے اس کی پسند کے مطابق صاف ستھرا صحت بخش کھانا تیار کرنے والی ماں بہت دور چلی گئی تھی لیکن یادداشت کے خانے میں اس کے پکائے کھانوں کی خوشبو آج بھی تازہ تھی۔

”تم اپنا کام شروع کرو، میں تمہارے لیے چائے بھجاتا ہوں۔“ انہوں نے نرمی سے اس کا شانہ تھکتے ہوئے کہا تو وہ اپنی مخصوص کرسی پر کمپیوٹر کے سامنے جا بیٹھا۔ دکان کے دیگر ملازمین بھی اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ آہستہ آہستہ وہاں گاہکوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی۔ انکل بنجامن بیٹھے لہجے والے بہت بااخلاق شخص تھے۔ ان کے لیے کوئی گاہک چھوٹا بڑا نہیں تھا۔ لاکھوں کی ڈیل کرنے والے سے لے کر چند سو کی چیز خریدنے والے تک ہر شخص کو ان سے ایسی عزت ملتی تھی کہ جو ایک بار ان سے رابطہ کر لیتا تھا پھر کہیں اور نہیں جاتا تھا۔

دوپہر کے کھانے تک وہ بلا تھقل کام کرتا رہا۔ ٹھیک دو بجے دکان کے باہر ”closed“ کی تختی لگا کر شٹر گرا دیے گئے۔ انکل بنجامن کا اصول تھا کہ کھانے کے وقفے میں کوئی ڈینگ نہیں کرنی۔ ان کا کہنا تھا کہ آدمی روٹی کے لیے تو ساری بھاگ دوڑ کرتا ہے تو کم از کم اسے وہ روٹی تو سکون سے کھانے کے لیے ملے۔ دوپہر کا کھانا پورے اسٹاف کے لیے ان کی طرف سے ہوتا تھا اور وہ سب کے ساتھ مل کر خود بھی وہی کھانا کھاتے تھے۔ آج بھی اسی معمول کو دہرایا گیا اور پھر مسبہ معمول قہوے کے دور کے ساتھ ہی دوبارہ کام شروع ہو گیا۔ وہ خود بھی دوبارہ کمپیوٹر کے سامنے جا بیٹھا۔ موجودہ حساب کتاب دیکھنے میں کوئی مشکل نہیں تھی لیکن پرانا حساب مین مین کرنے میں اسے مشکل کا سامنا تھا۔ زیادہ تر ریکارڈز رجسٹروں پر ہاتھ سے لکھا ہوا تھا اور خاصا جھلک تھا اس لیے کبھی کبھی اسے انکل بنجامن سے مدد لینا پڑتی تھی۔ اس وقت بھی اسے ضرورت پیش آئی

سے اٹھ کر چل پڑا۔ پری دس کا دل دکھا کر اسے اچھا نہیں لگا تھا لیکن یہ ضروری بھی تھا۔ ابھی کل ہی تو یہ بات اس کے علم میں آئی تھی کہ ماضی میں عمار اور پری دس کی نسبت طے کیے جانے پر غور ہوتا رہا تھا۔ نسبت طے پانی اس سے پہلے ہی عمار غائب ہو گیا اور اب اتنے برسوں بعد وہ واپس نہیں آیا تھا تو برادری میں اس معاملے میں چہ میگوئیاں ہونے لگی تھیں۔ کچھ لوگوں نے تو زرینہ بی بی سے براہ راست پوچھ بھی لیا تھا کہ دونوں کی شادی کے متعلق ان کا کیا ارادہ ہے۔ زرینہ بی بی نے سوال کرنے والوں کو فی الحال یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ ابھی پری دس پڑھ رہی ہے اور عمار کو بھی معاشی طور پر سیٹ ہونے کے لیے وقت چاہیے۔

”سوری پری دس! لیکن میرے پاس تمہارا دل دکھانے کے سوا کوئی دوسرا راستہ ہی نہیں ہے۔ میں اس عجیب و غریب قسمت کا مالک شخص ہوں جس کی راہ میں محبت قدم قدم پر بانہیں پھیلائے کھڑی ہوتی ہے لیکن میں خود اس سے دامن جھٹک کر گزر جانے پر مجبور ہوں۔“ وہ دل ہی دل میں پری دس سے معذرت کرتا ہوا کب دکان پر پہنچ گیا، خود اسے بھی پتا نہیں چلا۔

”گڈ مارنگ جنٹلمن! کن خیالوں میں ڈوبے چلے آ رہے ہو؟“ کاؤنٹر پر بیٹھے انکل بنجامن کی آواز نے اسے چونکایا۔

”گڈ مارنگ انکل! میں بس یونہی کچھ سوچ رہا تھا۔“ وہ انہیں اپنی سوچوں کے بارے میں کیا بتاتا۔

”دماغ پر زیادہ زور مت دیا کوو، اس سے اسٹریس بڑھتا ہے۔ تم جیسے ہو، ویسے ٹھیک ہو۔ گاڈ کی مرضی ہوگی تو تمہاری میموری بھی کسی دن خود بخود واپس آ جائے گی۔“

”جی انکل!“ وہ ان کی محبت اور خلوص کے جواب میں اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔ چند دن کے اندر ہی وہ اسے بہت پسند کرنے لگے تھے۔ بقول ان کے، اتنے عرصے سے کاروبار کر رہے تھے لیکن اس جیسا سختی اور ذہین ور کر پہلی بار ملا تھا۔ وہ کشمیری مسالاجات اور خشک میوؤں کے تاجر تھے۔ بازار میں موجود ان کی دکان ایک چھوٹا سیٹ اپ تھا۔ ان کی اصل آمدنی ان اشیاء کی برآمدات سے ہوتی تھی۔ وہ اس سارے سلسلے کے حساب کتاب کو سنبھال رہا تھا اور چند دنوں میں ہی پچھلا ریکارڈ بھی اچھا خاصا مین مین کر دیا تھا۔ انکل بنجامن اس کی کارکردگی سے بہت خوش تھے اور برملا اس کی تعریف کرتے تھے۔

”میں اپنے لیے ناشتا منگوا رہا ہوں، تمہارے لیے بھی منگوا لوں؟“

تو رجسٹراٹھا کر کاؤنٹر پر پہنچ گیا۔ کسی پرانے اکاؤنٹ کا لکھا وہ حساب خاصا عجیبہ تھا۔ انکل بنجامن بھی کچھ دیر کے لیے غور و فکر میں پڑ گئے۔ ان کی طرف سے جواب کا خطرہ وہ ادھر ادھر نظر میں دوڑا رہا تھا کہ دکان کی طرف آنے والے راستے پر آغا گل کو آتے دیکھا۔ وہ اپنی سفید چھڑی کے سہارے خراشاں خراشاں چلے آ رہے تھے۔

”آغا جان.....!“ اس نے ان کے سبز حیاں چڑھ کر دکان تک آنے سے قبل خود نیچے اتر کر انہیں سہارا دیا۔ ”میں کر لیتا ہوں یہ سب بیٹے! تم کیوں میری عادت بگاڑتے ہو؟“ انہوں نے اسے ٹوکا۔

”مجھے آپ کی خدمت کر کے خوشی ملتی ہے آغا جان!“ اس نے ان کا ہاتھ نہیں چھوڑا۔

”لیکن مجھے اس سہارے کی عادت پڑ گئی تو جینا زیادہ مشکل ہو جائے گا۔“ ان کی بات اس کے دل پر لگی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔

”ویکم، ویکم، امائی ڈیٹر فرینڈ ویکم! یہ عمار کے قدموں کی برکت ہے کہ اب مجھے اکثر تمہارا چہرہ دکھائی دینے لگا ہے۔“ بنجامن نے بھی آغا گل کو دیکھ لیا تھا اور بلند آواز میں گرجوٹی سے ان کا استقبال کر رہا تھا۔

”جوان بیٹے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہو جائیں تو بوڑھا باپ ایک بار پھر خود کو جوان محسوس کرنے لگتا ہے۔ میں بھی آج کل ساری کمزوری اور بڑھاپے کو بھولا ہوا ہوں۔“ آغا گل اسے وہیں کھڑا چھوڑ کر آگے بڑھ گئے تھے اور بنجامن سے مخاطب تھے۔

”بیٹا تو تمہارا واقعی ہیرا ہے۔ میں بہت خوش ہوں اس کے کام سے۔“ بنجامن نے پوری دیانت داری سے اسے سراہا پھر اس کی طرف رخ موڑ کر بولا۔

”وہیں کیوں اسٹل ہو گئے ینگ مین؟ اندر آؤ اور اپنے آغا جان کے لیے کچھ قبوے وغیرہ کا انتظام کرواؤ۔“ ”جی ضرور۔“ وہ جلدی سے حرکت میں آیا۔

”سچ سچ بہت میلنڈ بوائے ہے۔ چند دنوں میں ہی میرے کئی بگڑے کام سنوار دیے ہیں۔“

”میلنڈ تو ہے پر ڈگری و ڈگری کوئی نہیں ہے اس کے پاس۔ ڈگری کے بغیر ادھر ادھر سے اپنی ذہانت کے ٹل بوتے پر سیکھا ہوا کام کوئی اچھی نوکری تو نہیں دلا سکتا اسے۔“ بنجامن کی تعریف کے جواب میں آغا گل نے افسوس کا اظہار کیا۔

”کیا مطلب؟ میرے پاس کام کرنے سے تم اس کے فوج سے سیلفائی نہیں ہو؟“ بنجامن کو صدمہ سا ہوا۔

”یہ بات نہیں ہے دوست! میں چاہتا ہوں کہ عمار کو کہیں باہر سیٹل کر دوں۔ یہاں کے حالات تم جانتے ہی ہو۔ بس اب حوصلہ نہیں ہوتا کوئی دکھ اٹھانے کا۔ دل میں یہی خیال ہے کہ بھلے نظروں سے دور رہے لیکن دل کو یہ اطمینان تو ہو کہ صحیح سلامت ہے۔“ دھیمے لہجے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے وہ بنجامن کو کچھ پریشان سے لگے۔

”کوئی پرالہم ہے تو کھل کر بتاؤ آغا! مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ کوئی چیز ہے جو تمہیں اندر سے پریشان کر رہی ہے۔“ اس نے ہمدردی سے پوچھا۔

”تمہیں پتا ہے کہ ہم یہاں اپنی مرضی سے کھل کر سانس بھی نہیں لے سکتے ہیں۔ ہماری ایک ایک جنبش پر نظر رکھی جاتی ہے۔ عمار کی واپسی کی خبر بھی پہنچ چکی ہے ان کے پاس اور چپکے چپکے اس کے بارے میں انویسٹی گیشن کرتے پھر رہے ہیں۔“

”کرنے دو انویسٹی گیشن۔ عمار کون سا کوئی کر منل ہے۔“ بنجامن نے انہیں تسلی دی۔

”کر منل تو وہ سارے بھی نہیں تھے جواب تک تاریک راہوں میں مارے گئے۔ ہمارا سب سے بڑا جرم تو مسلمان ہونا اور اپنی مرضی کی زندگی کی خواہش رکھنا ہے۔“ ان کی آنکھوں میں گہرا کرب تھا۔

”تم کیا چاہتے ہو؟“ بنجامن نے جس وقت یہ سوال کیا، فضا میں قبوے کی خوشبو محسوس ہوئی اور عمار نے بھاپ اڑاتے قبوے کی پیالیاں ان دونوں کے سامنے رکھیں۔

”تم خود کیوں لے کر آئے ینگ مین؟ کسی ملازم سے کہہ دیا ہوتا۔“ بنجامن نے اسے ٹوکا۔

”میں اپنی خوشی سے اپنے ہاتھوں سے بنا کر لایا ہوں۔ آپ دونوں میرے بزرگ ہیں اور مجھے آپ کی خدمت کر کے اچھا لگتا ہے۔“ اس نے ادب سے جواب دیا جسے سن کر بنجامن کا چہرہ کھل اٹھا۔

”گاڈ بلیس یو مائی سن!“ اس نے دل سے دعا دی پھر آغا گل سے مخاطب ہو کر بولا۔

”یہ لڑکا خود ایک پلیسنگ ہے تمہارے لیے۔ تم اس کی فکر نہ کیا کرو۔ وقت خود اس کی راہیں کھولے گا بلکہ سمجھو کھل ہی گئی ہیں۔“

”کیا مطلب؟“ آغا گل حیران ہوئے۔

”تمہیں تو پتا ہے میرے بیٹوں کا کہ اب میرے بزنس میں کوئی دلچسپی نہیں اس لیے ایکسپورٹ پر بہت اثر پڑا ہے۔ میں عمار کو اس سلسلے میں ٹریننگ دینے کا سوچ رہا

ہوں۔ ذہین بچہ ہے، جلد کام سیکھ جائے گا۔ اس کے بعد دیکھتے ہیں کہ اسے صرف وزٹ پر دوسرے کنٹریز میں بھیجا جائے یا مستقل کہیں سیٹل کر کے وہیں سے کام کو چلوائیں۔ میرے چھوٹے والے نے بھی کئی برس کینیڈا میں بیٹھ کر کام دیکھا تھا لیکن اب وہ کہتا ہے پاپا! مجھ پر میرے اپنے کام کا بہت برڈن ہے۔ میں آپ کے بزنس کو ادھر نہیں دیکھ سکتا۔ سوچو ذرا جس بزنس نے انہیں پالا، اب انہیں وہ بیکار لگتا ہے اور چاہتے ہیں کہ میں بھی اب اس کی جھنجٹ سے نکل آؤں۔“ بنجامن کو عمار کے سلسلے میں اپنی منصوبہ بندی بتاتے بتاتے بیٹوں کا رویہ یاد آ گیا تو لہجے میں اداسی ٹھلنے لگی۔ آغا گل کو ان سب باتوں کا علم تھا لیکن ہر بار کی طرح انہوں نے اس وقت بھی بنجامن کا دکھ پوری توجہ سے سنا اور تسلی بھی دی۔

”جانے دو دوست! ہم تم اپنی زندگیاں جی چکے۔ تمہارے لیے یہی شکر کا مقام ہونا چاہیے کہ بیٹے اپنی اپنی زندگیوں میں کامیاب ہیں اور تمہاری محنت رائگاں نہیں گئی ورنہ کتنے ہی والدین اس بات پر آٹھ آٹھ آنسو بہا رہے ہوتے ہیں کہ جس اولاد پر ساری زندگی لگا دی، وہ کسی کام کی نہیں نکلی۔“

”یہ تو ہے۔ آئی ایم تھینک فل ٹو گاڈ کہ اس نے مجھے بیٹوں کی ناکام زندگی کا دکھ نہیں دیا۔“ بنجامن ایسا ہی تھا، جلد بہل جانے اور قائل ہو جانے والا سا۔ مزاج انسان جب ہی تو معاشی تفاوت کے باوجود اس کی آغا گل سے اتنی گہری دوستی تھی۔ یہ دوستی بچپن سے ہی چلی آرہی تھی۔ شاید اس کی ہمدرد فطرت نے اسے آغا گل کی مدد کے خیال سے ان کے قریب کیا تھا پھر آہستہ آہستہ اس پر کھلا کہ ان کی شکل میں بہت اچھا دوست اور سامع میسر آ چکا ہے چنانچہ دوستی ہمدردی سے نکل کر برابری کی بنیاد پر استوار ہو گئی۔

حسب معمول دونوں دوست مل کر بیٹھے تو محفل طویل ہو گئی۔ کاروباری معاملات نمٹاتے گفتگو کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ قبوے کا دور بھی دوبارہ چلایا گیا۔ وہ اپنا کام نمٹاتے گا ہے گا ہے دونوں دوستوں پر بھی نظر ڈالتا رہا۔ جیسے ہی محفل برخاست ہوتی دکھائی دی، تیزی سے اٹھ کر باہر آیا اور دکان کی بلندی کو مڑک سے ملائی گنتی کی ان چند سیڑھیوں کو طے کرنے میں ان کی مدد کرنے لگا۔

”یعنی تم باز نہیں آؤ گے۔“ اس بار وہ اس کی اس حرکت پر ہنس دیے۔

”جب تک موجود ہوں بالکل نہیں۔“ اس نے بھی

قطعیت سے جواب دیا۔

”سارا مسئلہ ہی موجودگی کا ہے۔ جس کے جلد جدا ہو جانے کا ڈر ہو خود کو اس کا عادی بنا لینے سے دل میں اندیشے جاگتے ہیں کہ بعد میں اگر جو یہ میسر نہ ہوا تو ہم کیسے زندگی گزاریں گے۔“ وہ ملول تھے یا شاید حقیقت پسندی سے کام لینا چاہتے تھے۔

”اس طرح کے اندیشوں میں گھرا انسان تو دنیا کی کسی نعمت سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا کیونکہ دنیا کی کسی نعمت کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ وہ ہمارے پاس ہمیشہ رہے گی۔ جب زندگی ساتھ چھوڑ دیتی ہے تو پھر کسی اور شے کا کیا بھروسہ؟“

”سچ کہا تم نے، زندگی بڑی ظالم ہے۔ جب منہ موڑتی ہے تو یہ نہیں دیکھتی کہ کس کس کا کلیجہ نوج کر لے جا رہی ہے۔“ ان کی بے نور آنکھیں دور کہیں کسی خلا میں بھٹک رہی تھیں۔ وہ ان سے کچھ نہ کہہ سکا، بس ان کے ہاتھ پر اپنے ہاتھوں کا دباؤ ڈال کر ایک خاموش دلاسا دیا۔

”میری بنجامن سے بات ہوئی ہے۔“ وہ اپنی ٹرانس جیسی کیفیت سے جلدی سے باہر نکلے اور اسے اپنے اور بنجامن کے درمیان ہونے والی گفتگو سے آگاہ کرنے لگے۔

”بالکل ٹھیک۔ سب کچھ دیا ہی چل رہا ہے جیسا ہم نے سوچا تھا۔“ وہ سن کر اطمینان کا اظہار کرنے لگا۔

”ہاں، لیکن کبھی کبھی میں دوست کو دھوکے سے استعمال کرنے پر شرمندگی محسوس کرتا ہوں۔ اگر اس کام میں انسانیت اور خصوصاً مسلم امہ کی بھلائی کا لالچ نہ ہوتا تو میں ہرگز بھی اس سب کے لیے راضی نہ ہوتا۔“ وہ کچھ کچھ ناخوش بھی تھے۔

”آپ لگن نہ کریں۔ میری پوری کوشش ہوگی کہ میری ذات سے آپ کے دوست کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔“ اس کے پاس بھی فقط تسلیاں ہی تھیں۔

”اچھا چھوڑو ان باتوں کو، یہ بتاؤ حاجی شیر خان کے ہاں آج کی دعوت کا تو علم ہے نا؟ وقت پر پہنچ جاؤ گے دعوت میں؟“ انہوں نے خود ہی موضوع بدل دیا۔ وہ دونوں دکان سے اتر کر ایک فٹ پاتھ پر کھڑے تھے لیکن گفتگو کا سلسلہ تھا کہ طول ہی پکڑتا جا رہا تھا۔

”میں نہیں آؤں گا۔ آپ ان سے کہہ دیجیے گا کہ کام بہت تھا۔ میرا آنا ممکن نہیں ہو سکا۔“

”ان لوگوں نے بہت محبت سے بلایا ہے بیٹے!“

انہوں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”جب ہی نہیں جانا چاہتا۔ وہ سادہ سے لوگ ہیں۔“
 میں دعوت میں شرکت کروں گا تو وہ میری ذات سے جانے
 کون کون سی امیدیں وابستہ کر لیں گے اور آپ جانتے ہیں
 کہ میں ایک بھی امید پر پورا نہیں اتر سکتا۔“
 اس کے جواب نے انہیں ایک ہل کے لیے چپ سا
 کر دیا پھر ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولے۔
 ”ٹھیک کہہ رہے ہوں۔ ٹھیک ہے، تم شریک نہ ہونا،
 میں بہانہ بنا دوں گا۔“ وہ اس کا شانہ چھتپا کر وہاں سے
 رخصت ہو گئے۔ وہ دور تک انہیں سفید چھڑی کے سہارے
 خراماں خراماں جاتے ہوئے دیکھتا رہا تھا۔ زندگی نے اسے
 قدم قدم پر پیار کرنے والوں سے نوازا تھا لیکن ظلم یہ تھا کہ
 وہ اسے اس کے ہر پیارے سے جدا کر دیتی تھی۔ جدا کی اس
 کے مقدر میں لکھ دی گئی تھی۔

☆☆☆

عالم شاہ دونوں ہتھیلیاں آپس میں جوڑے ان پر
 ٹھوڑی ٹکائے بیٹھا تھا، اس کی آنکھوں میں گہرا اضطراب
 کر دہیں لے رہا تھا لیکن لب بالکل ساکت تھے۔ ایک
 قریبی صوفے پر نیلی سر پر دوپٹا اوڑھے ہاتھ میں تسبیح لیے
 بیٹھی تھی اور تسبیح کے گرتے دانوں کے ساتھ اس کے ہونٹ
 مسلسل حرکت کر رہے تھے۔ اعظم کو کچھ دیر قبل اس نے
 سلا دیا تھا اس لیے وہاں کوئی آواز پیدا کرنے والا نہیں تھا۔
 سکینہ شاہ اور صداقت شاہ کو عالم نے خود اسپتال سے رہائش
 گاہ بھجوا دیا تھا۔ صورت حال اتنی سنگین تھی کہ کچھ نہیں کہا
 جاسکتا تھا کہ کب کیا ہو جائے گا۔ کسی بری خبر کے لیے خود کو
 ذہنی طور پر کتنا ہی تیار کرتا، اسے معلوم تھا کہ اگر کوئی بری خبر
 سننی پڑ گئی تو اسے خود اپنے آپ کو سنبھالنے کے لیے بھی
 مہلت درکار ہوگی۔ ایسے میں وہ ان دونوں کو کیسے سنبھالنا
 اس لیے وہی اسپتال کی طرف سے اجازت نہ ہونے کا پرانا
 بہانہ بتا کر انہیں وہاں سے روانہ کر دیا تھا۔

”مما..... ممما“ اعظم سوتے میں بڑبڑایا تو کمرے کی
 خاموش فضا میں ذرا سا ارتعاش پیدا ہوا۔ نیلی جلدی سے اٹھ
 کر اس کے قریب گئی اور پائنتی بیٹھ کر اسے ہولے ہولے
 چھکنے لگی۔ اسی وقت ابلی سی دستک کے ساتھ دروازہ آہستہ
 سے کھلا۔ نیلی اور عالم دونوں نے بیک وقت دروازے کی
 طرف دیکھا۔ انہیں وہاں سفید بالوں اور سفید ہی بھوٹوں
 والے ڈاکٹر یوان منگ کا چہرہ دکھائی دیا۔ چہرے پر گہری
 سنجیدگی طاری تھی۔ وہ دونوں ہی مضطرب سے ہو کر کھڑے
 ہو گئے۔

”سجل.....؟“ نظریں آپس میں ملیں تو عالم شاہ کی
 زبان سے فقط ایک ہی لفظ نکل سکا۔
 ”ہمت سے کام لو۔“ یوان منگ نے اس کے شانے
 پر ہاتھ رکھ کر جیسے ہی یہ سہ حرفی جملہ بولا، اس کے دل نے
 اپنی ایک دھڑکن کھودی۔

”میں سارا وقت آپریشن تھیمز میں موجود تھا اور
 پورے یقین سے اس بات کی گواہی دے سکتا ہوں کہ اس
 آپریشن کو کرتے ہوئے پروفیسر اینڈریو نے اپنا پورا تجربہ
 جھونک دیا تھا لیکن.....“

”میں نے کہا تھا تا کہ وہ انسانیت سے عاری درندہ
 ہے۔“ عالم شاہ کے لیے لیکن سے آگے کی داستان سننا ممکن
 نہیں تھا۔ وہ چیخ پڑا اور اس کے پاؤں لڑکھڑانے لگے۔ نیلی
 بے اختیار اسے سہارا دینے آگے بڑھی۔

”تم غلط سمجھ رہے ہو۔“ یوان منگ کو گڑبڑ کا احساس ہوا۔
 ”کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔ میں نے تم سے پہلے ہی کہا
 تھا کہ جو درندہ اتنے سارے بے گناہ انسانوں کی جان لے
 چکا ہے، وہ میری سبیل کے ساتھ کوئی رعایت کیسے کرے گا۔“
 اس نے اپنے شانے پر رکھا یوان منگ کا ہاتھ جھٹکا۔

”ایسا کچھ نہیں ہوا ہے۔ تمہاری بہن زندہ ہے اور
 اسے آپریشن تھیمز سے آئی سی یو میں منتقل کیا جا رہا ہے۔ نہیں
 فکر صرف یہ ہے کہ اس آپریشن کے بعد اس کی باڈی کیسے
 رسپانس کرے گی۔ اس کا ایک ہاتھ پہلے ہی کام کرنا بند
 کر چکا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہوش میں آنے کے بعد کیا
 نتیجہ سامنے آتا ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی معجزہ ہو جائے، ہو سکتا
 ہے کوئی ایک عضو یا پھر پوری باڈی ہی پیرالائز ہو جائے۔ تم
 لوگوں کو ذہنی طور پر ہر چیز کے لیے تیار رہنا ہوگا۔“ یوان
 منگ نے اپنی بات پوری کی تو عالم شاہ کی رکی ہوئی سانسیں
 بحال ہوئیں اور دل نے بھی ایک بار پھر دھڑکنا شروع
 کر دیا۔ شکرگزاری کا احساس کب اس لیے چوڑے مرد کی
 آنکھوں میں آنسو لے آیا، اسے خود بھی پتا نہیں چل سکا۔

”اللہ نے چاہا تو وہ ٹھیک ہو جائیں گی۔ ان کے
 ساتھ ہم سب کی دعائیں ہیں اور سب سے بڑھ کر اعظم
 ہے۔ اعظم کی محبت انہیں اپنی بیماری کو شکست دینے پر مجبور
 کر دے گی۔“ نیلی جو ڈاکٹر یوان منگ اور عالم شاہ کی گفتگو
 کے دوران دم سادھے کھڑی رہی تھی، اس جذباتی موقع پر
 آگے بڑھی اور عالم کو حوصلہ دیا۔

”ان شاء اللہ!“ وہ جواباً فقط اتنا ہی کہہ سکا۔
 ”تم لوگ ریٹ کرو۔ فی الحال سبیل کو انڈر

آبزرویشن رکھا جائے گا اور کسی کو اس سے ملاقات کی اجازت نہیں ہوگی۔ چاہو تو اس عرصے میں اپنی رہائش گاہ پر بھی جاسکتے ہو۔“ ڈاکٹر یوان منگ کو پاکستان میں رہنے کا تجربہ تھا اور وہ پاکستانی قوم کی جذباتیت سے واقف تھا اس لیے براہ راست اسے اسپتال سے جانے کا کہنے کے بجائے محض مشورہ دینے پر اکتفا کیا۔

”شکریہ ڈاکٹر! میں یہیں رہوں گا۔“

”ایز یوش۔“ چونکہ عالم کا جواب خلاف توقع نہیں تھا اس لیے ڈاکٹر یوان منگ مسکرا کر کہتے ہوئے واپس چلا گیا۔ ”میرے خیال میں تم اعظم کو لے کر رہائش گاہ چلی جاؤ۔ وہاں یہ بھی آرام سے رہے گا اور تم بھی تھوڑا ریلیکس کر لو گی۔“ اسے معلوم تھا اسپتال کا یہ کمر اکتفا ہی آرام وہ سہی، نیلی کو مختلف وجوہات کی بنا پر بندھا بندھا سارہنا پڑتا تھا اور اعظم کو بھی اسپتال کے پروٹوکولز پورے کرنے کے لیے باندھ کر رکھنا پڑتا تھا۔ اس لیے جیسے ہی یہ واضح ہوا کہ ابھی لمبے عرصے تک اعظم کو سرجل کے سامنے لے جانے کی نوبت نہیں آئے گی، نیلی کو مشورہ دیا۔

”کہہ تو آپ ٹھیک رہے ہیں لیکن میرے خیال میں آپ کو بھی ہمارے ساتھ چلنا چاہیے۔“

”نہیں، میں یہیں رہوں گا۔ باہر سرمد موجود ہے۔ تم دونوں اس کے ساتھ چلے جاؤ۔“ اس نے فوراً انکار کر دیا۔ ”ڈاکٹر یوان آپ کو بتا چکے ہیں کہ فی الحال آپ کی یہاں کوئی ضرورت نہیں ہے تو بہتر ہوگا آپ بڑا ہمارے ساتھ چلیں۔ آپ فون پر اپنے والدین کو باخبر کریں، اس کے مقابلے میں اگر خود جا کر انہیں ساری صورتحال بتائیں تو انہیں زیادہ تسلی ہوگی۔“ نیلی آہستہ آہستہ ان لوگوں سے بے تکلف ہوتی جا رہی تھی اس لیے عالم کے انکار کے باوجود اس سے اصرار کی ہمت کر بیٹھی۔

”خدا نخواستہ یہاں کوئی ایمر جنسی ہوگئی تو؟“ وہ متذبذب تھا۔

”تو اسے سنبھالنے کے لیے یہاں ڈاکٹر ز موجود ہیں۔ سرمد کو بھی یہیں رہنے دیجیے گا۔ اللہ نہ کرے کوئی مسئلہ ہو تو رہائش گاہ بھی کوئی اتنی زیادہ دور نہیں ہے کہ پہنچنے میں کھنٹوں لگ جائیں۔ چند منٹ ہی کی تو ڈرائیو ہے۔ یوں چکی بھاتے پہنچ جائیں گے آپ یہاں۔“ اس کے اتنے اصرار کے پیچھے عالم کی ابتر حالت تھی۔ بظاہر اس عرصے میں وہ خود کو سنبھالے رہا تھا لیکن نیلی لوٹ کر رہی تھی کہ وہ بہت تھکا ہوا اور اعصاب زدہ ہے۔ اس کی آنکھوں کی سرخی کو ابھی

ہوم ورک ایک ایسی چیز ہے کہ جب ٹی وی پر بچوں کا پسندیدہ پروگرام آرام ہو تو وہ کہتے ہیں کہ آج اسکول میں ہوم ورک ہی نہیں ملا لیکن جب سونے کا وقت ہو تو کہے تو اپنا کام انہیں یاد آجاتا ہے کہ کس کس شے کی کیا کام دیا تھا۔

باپ (بیٹی سے) کتنی بڑی بات ہے کہ تم ابھی تک اپنی ماں کے کپڑے پہنتی ہو۔ اب تو تمہیں اس کے کپڑے پہننے سے باز آجانا چاہیئے غیس سے تم ایک شوہر کی بیوی بن چکی ہو۔
بیٹی: ”مگر یہ تو سوچیے! شوہر کے کپڑوں میں میں کتنی بھڑکی محسوس کرتی ہوں گی۔“

”بتاؤ مسلم انسان کے جسم کی وہ ہڈی کون سی ہے جس کا بہت کم استعمال ہوتا ہے؟“
”انسان کی کھوپڑی!“

دے رہی تھی کہ وہ مسلسل غنیمت سے محروم رہی ہیں۔ ایسے میں اسے آرام کی اشد ضرورت تھی لیکن اس نے اسے براہ راست آرام کا مشورہ دینے کے بجائے اس سے اس کے والدین کے حوالے سے بات کی تھی۔ ان لوگوں کے ساتھ رہتے ہوئے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اپنے خاندان کے ساتھ کتنی گہری وابستگی رکھتا ہے اور ان کے لیے کس حد تک جاسکتا ہے۔

”کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو لیکن.....“ وہ اب بھی تذبذب کا شکار تھا۔

”ٹھیک بات کو مانا جاتا ہے۔ اس کے آگے لیکن کی گنجائش نہیں ہوتی۔“ نیلی نے ذرا دھونس بھرے لہجے میں کہا تو وہ مسکرا دیا۔ اس لڑکی سے مختصر عرصے میں ان کے خاندان کا اہمیت کا رشتہ بن گیا تھا۔ شاید اس لیے کہ خود اس کا دل زخمی تھا اور وہ دوسروں کے دکھ کو زیادہ بہتر طور پر سمجھنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ اس کے اور اعظم کے سنگ اسپتال سے روانہ ہوا تو ایک حسین چہرے نے یادداشت میں اپنی جھلک دکھائی۔ یہ چہرہ اجالا کا تھا۔ اس خود پسند اور خود مر لڑکی نے زندگی میں پہلی بار اس کے دل کے تاروں کو چھیڑا تھا لیکن حالات ہی ایسے نہیں تھے کہ وہ اس سے حال دل کہہ

پاتا اور اب تو ملاقات کا امکان بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔ بالفرض ملاقات ہو بھی جاتی تو وہ اس سے اپنے دل کا حال نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کا تعلق اس گھرانے سے تھا جس نے سبیل کی زندگی برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ ان میں سے کسی بھی فرد کو دوبارہ سبیل کے سامنے لا کر وہ اس کو دکھ نہیں دے سکتا تھا اس لیے بہتر تھا کہ دل میں پھوٹنے والی اس کرن کو وہیں بچھا کر رکھ کر دیتا۔ شاید وہ لاشعوری طور پر ایسا کر بھی رہا تھا لیکن پھر جانے کیوں آج وہ یاد آگئی تھی۔ کچھ حیرانی سے وجہ کھوجتے ہوئے اس کی نظر ساتھ والی نشست پر بیٹھی نیلی کے چہرے پر پڑی تو ٹھنک گیا۔ اگرچہ وہ لڑکی اجالا کی طرح خوبصورت اور خوش لباس نہ تھی لیکن اس کا دل بہت خوبصورت تھا۔ خوبصورت چہروں کے مقابلے میں خوبصورت دل رکھنے والے لوگ زندگی کے سفر کو آسان بنانے کے لیے زیادہ عمدہ انتخاب ہوتے ہیں۔ یہ خیال بھی اچانک ہی اس کے ذہن میں آیا تھا اور وہ پہلی بار نیلی کو کسی اور زاویے سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی بدلتی سوچ سے بے نیاز وہ کھڑکی سے باہر دیکھتی بے خیالی میں اپنی گود میں سوئے ہوئے اعظم کو گھلتی جا رہی تھی۔ ایک سادہ اور عام سی لڑکی، جس کا اپنا دل زخمی تھا لیکن وہ دوسروں کا درد بانٹنے کا ہنر جانتی تھی۔

☆☆☆

”تم ابھی تک گھر نہیں گئے عمار؟“ بنجاسن کی عادت تھی دکان بند ہونے کے بعد بھی بہت دیر تک وہاں ٹھہرتا تھا۔ حساب کتاب، دکان کی سیٹنگ، ملنے والے آرڈرز کا جائزہ لینا۔۔۔ یہ سارے کام وہ سب کے جانے کے بعد فرصت میں ضرور نمٹاتا تھا اور جس دن، جس سے، جہاں جو غلطی ہوتی تھی اگلے دن اس کی گوشالی بھی ضرور ہوتی تھی۔ شاید یہ اس کے کامیاب کاروباری ہونے کا ایک راز تھا کہ وہ ہمیشہ ”نوازشیں سو سو پر حساب پائی پائی کا“ والے اصول پر عمل پیرا رہتا تھا۔ اس کے ملازمین اس کی سخاوت کے معترف رہتے تھے لیکن انہیں یہ بات بھی اچھی طرح معلوم تھی کہ کام میں کوئی کوتاہی اپنی شامت کو آواز دینے کے مترادف ہوگا۔

”میں بس جانے ہی لگا تھا۔ اصل میں کچھ کام رہتا تھا تو میں نے سوچا مٹا کر ہی جاؤں۔“ وہ بنجاسن کو تعظیم دینے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

”کمال ہے، میں اپنے کام میں اتنا مصروف تھا کہ اندازہ ہی نہیں ہوا۔ تم ابھی تک یہاں موجود ہو۔ وہ تو بس

ابھی دکان کا جائزہ لے رہا تھا تو تمہیں دیکھا۔“ انہیں اس کی اب تک یہاں موجودگی پر حیرت ہو رہی تھی۔ ”یہ غلط بات ہے۔ آغا کیا سوچے گا کہ میں دوستی میں اس کے بیٹے کو رعایت دینے کے بجائے اس سے ضرورت سے زیادہ کام لے رہا ہوں۔“

”آغا جان ایسا کچھ نہیں سوچیں گے۔ انہوں نے خود مجھے سختی سے ہدایت کر رکھی ہے کہ محنت سے دل لگا کر کام کرنا۔ کوئی کمی بیشی ہوئی تو بنجاسن سے پہلے میں تمہارے کان کھینچوں گا۔“ اس نے اتنی سادگی سے یہ بات بتائی کہ بنجاسن ہنس پڑا لیکن پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔

”تمہارے پیرٹنس نے تمہارے بنا بہت لمبا ٹائم کاٹا ہے۔ کوشش کیا کرو کہ انہیں زیادہ ٹائم دو۔“

”جی، مجھے احساس ہے اس بات کا لیکن آج وہ دونوں چاچا شیر خان کے ہاں انوائٹڈ تھے تو مجھے ان کی فکر نہیں تھی۔“ اس نے بنجاسن کی نصیحت کے جواب میں وضاحت پیش کی۔

”حاجی شیر خان کی بات کر رہے ہو نا جس کی ایک بیٹی کسی بڑے شہر میں رہ کر پڑھ رہی ہے؟“ بنجاسن کو آغا گل کے سارے میل جول والوں کا پتا تھا۔

”جی، جی..... وہی۔“ اس نے تصدیق کی۔

”کہیں تمہاری ڈیٹ فکس کرنے تو نہیں گئے وہاں جو تم شرمنا کر یہاں چھپے بیٹھے ہو؟“ بنجاسن واقعی واقف حال تھا چنانچہ مزے سے اسے چھیڑا۔

”ایسا کچھ ہوتا تو آغا جان آپ کو ضرور بتاتے۔ وہ تو بس ان کی بڑی بیٹی سسرال واپس جا رہی تھی تو انہوں نے یونہی دعوت رکھ لی۔“ بنجاسن کی چھیڑ چھاڑ کا اس نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔

”اس یونہی سی دعوت میں تمہاری شرکت پر پابندی تھی کیا؟“ بنجاسن اس کی سنجیدگی کے باوجود باز نہیں آیا تھا۔ ”میں کیا کرتا وہاں جا کر۔ میری عمر کا کوئی لڑکا تو ہے نہیں وہاں۔“ اس نے اپنا انداز برقرار رکھا۔

”ویری بورنگ۔ یونو، جب میری ایجنٹ ہوئی تھی تو میں بہانے بہانے سے میری کے گھر جاتا تھا۔ ہم آج بھی اس دور کو یاد کر کے ہنستے ہیں۔“ انہیں اس سے بات کرنے میں لطف آ رہا تھا۔

”میرے اور آپ کے حالات میں بہت فرق ہے۔ میں کسی عام آدمی کی طرح لائف و انجوائے نہیں کر سکتا۔“ اس کے لہجے میں خود بخود ادا سی گل گئی جسے محسوس کر کے

اسے ایک استقبالی مسکراہٹ سے نوازا پھر اپنے شوہر سے مخاطب ہوئی۔

”مطلب آج ڈنر سرو کرنے کی میری باری ہے؟“

بنجامن نے معصوم سی شکل بنائی۔

”نو ڈارلنگ! ڈنر تو میں ہی سرو کروں گی۔ تمہاری

آج کھانے کے بعد ڈش واشنگ کی ٹرن ہے۔“ ماریا کے

لہجے میں لطف لینے والی کیفیت تھی۔

”کیا سچ مچ؟“ بنجامن نے معصوم شکل بنائی۔

”یونو، میں کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔“ ماریا کی آنکھوں

میں شرارت اور شوخی تھی۔ ان کے ساتھ گزارے سارے

وقت میں وہ ان میاں بیوی کے درمیان جاری نوک جھونک

دیکھتا رہا۔ یہ شاید اپنی تنہائی کو بانٹنے کا ایک طریقہ تھا۔ بیٹوں

کے چلے جانے سے گھر کی جو رونق روٹھ گئی تھی، وہ اسے اپنی

شوخیوں سے بحال کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ بہترین

کھانا اپنی جگہ، اس کو ان کی صحبت نے بہت لطف دیا۔ وہ بھی

اس کی موجودگی سے خوش نظر آتے تھے۔ اس نے ان کے

بہت زود کھنے پر بھی کھانے کے بعد برتن دھونے کی ذمے

داری خود سنبھال کر گویا ان کے دل ہی جیت لیے۔ ان کے

ساتھ بہت خوشگوار وقت گزار کر جب وہ وہاں سے رخصت

ہوا تو ماریا اس سے دوبارہ جلد آنے کا وعدہ لے چکی تھی۔

وہ بہت اچھے موڈ کے ساتھ ان سے رخصت

ہوا۔ وقت اگرچہ کافی زیادہ ہو گیا تھا لیکن اسے پیدل گھر کی

طرف جاتے ہوئے کوئی بوجھ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ بنجامن

نے اسے اپنی گاڑی پر ڈراپ کرنے کی پیشکش بھی کی تھی

لیکن اس نے انکار کر دیا تھا کہ وہ تاخیر سے کھائے گئے

کھانے کے بعد کچھ چھل قدمی کا متہمی تھا اور اس کی اس

خواہش نے بنجامن کو بھی زیادہ اصرار نہیں کرنے دیا تھا اور

اب وہ ٹراماں ٹراماں گھر کی جانب گامزن تھا۔ اپنے رہائشی

علاقے میں پہنچ کر حاجی شیر خان کے گھر کے قریب سے

گزرتے ہوئے اسے وہاں ہونے والی دعوت کا خیال آیا۔

وہ دعوت جس کا مہیج اس کی پسند کو مد نظر رکھتے ہوئے طے کیا

گیا تھا اور جس میں اس نے جان بوجھ کر شرکت نہیں کی تھی۔

اسے معلوم تھا کہ اس کی عدم شرکت سے سب سے زیادہ

پری دش ہرٹ ہوئی ہوگی لیکن وہ کیا کرتا کہ اسے ہرٹ کرنا

ضروری تھا۔ کبھی کبھی کسی کو آگے کی بڑی تکلیف سے بچانے

کے لیے چھوٹی تکلیف سے گزارنا پڑتا ہے۔ اس نے بھی

پری دش کے ساتھ یہی کیا تھا۔

”سوری!“ وہ دل ہی دل میں اس سے کہتا خاموشی

بنجامن تھوڑا سا شرمندہ ہو گیا۔

”سوری مین! واقعی میموری لاس کی وجہ سے تمہارے

لیے کافی مشکل رہتی ہوگی۔ شاید ابھی تو تمہارا دماغ بہت سے

لوگوں اور رشتوں کو ایکسیٹ ہی نہ کر رہا ہو۔“

”اٹس اوکے اٹل! آپ سوری کہہ کر مجھے شرمندہ نہ کریں۔“

”اوکے۔ نہیں کرتا پر ایک شرط پر۔“

”کیسی شرط؟“ وہ حیران ہوا۔

”تم ڈنر میرے ساتھ کرو گے۔ میں ماریا سے اپنی

فیورٹ ڈش کی فرمائش کر کے آیا تھا۔“

”لیکن.....“ وہ تذبذب کا شکار ہوا۔

”کوئی لیکن دیکھ نہیں۔ میری بات ماننا ہے

ورنہ.....“ انہوں نے ورنہ سے آگے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”اچھا چلیں، جیسی آپ کی مرضی۔“ بالآخر اسے

جتھار ڈالنے پڑے۔

بنجامن کا کشادہ سا گھر دکان کے پیچھے ہی تھا اور

دکان کے اندر سے ہی ایک راستہ گھر میں بھی جاتا تھا۔ وہ

اسے اسی راستے سے گزار کر گھر لے گیا۔

”ہم فرسٹ فلور پر رہتے ہیں۔ گراؤنڈ کو میں نے

گودام بنالیا ہے۔ پہلے بیٹے یہاں تھے تو گودام دوسری جگہ

تھا لیکن اب کچھ عرصے سے یہیں شفٹ کر لیا ہے۔ اتنی بڑی

جگہ یونہی بیکار پڑی ہوئی تھی۔“

اسے اپنے ساتھ لے کر سیز میوں کی طرف بڑھتے

ہوئے بنجامن نے اسے آگاہ کیا تو اسے اس بوڑھے کی تنہائی

کا شدت سے احساس ہوا۔ وہ بھی تو اپنے پیچھے ایک ایسے ہی

تنہا اور اداس بوڑھے کو چھوڑ کر آیا تھا۔ بس تسلی تھی تو اتنی کہ جو

کچھ کیا تھا، کسی مادی فائدے کے لیے نہیں بلکہ مقصد کے

لیے کیا تھا اور جب انسان بڑے مقاصد کے حصول کے لیے

کوشاں ہو تو قربانیاں بھی بڑی دینا پڑتی ہیں۔

”یہ لو بھی دیکھو، تمہاری اسٹیل ڈش کے لیے بہت

اسٹیل گیسٹ ساتھ لے کر آیا ہوں۔ اب جلدی سے ڈنر سرو

کر دو تاکہ ہم دو ہنگری مین، اینگری ینگ مین میں تبدیل نہ

ہوں۔“ وہ درمیانی قامت کی بنجامن سے دو چار برس چھوٹی

عورت تھی جو دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی سامنے

آگئی تھی اور بنجامن نے اس پر نظر پڑتے ہی بہت لہک لہک

کر اس سے یہ الفاظ کہے تھے۔

”تم آج لیٹ ہو ڈارلنگ اور سرونٹ آف کر کے

جا چکا ہے۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ ایسی پھویشن میں ہمارے

درمیان کیا ڈیل ہو چکی ہے۔“ سزا ماریا بنجامن نے پہلے

سے اس کے گھر کے آگے سے گزر گیا۔ اب تھوڑا ہی راستہ باقی رہ گیا تھا۔ آخری تاریخوں کے چاند کی وجہ سے آسمان روشن نہیں تھا لیکن کہیں کہیں گھروں سے باہر آئی روشنی نے ماحول کو مکمل تاریک ہونے سے بچایا ہوا تھا۔ وہ اس مدہم روشنی میں مزے سے آگے بڑھتا جا رہا تھا کہ خود سے کافی آگے جاتے ہوئے ایک ہیولے پر نظر پڑی۔ پہلی نظر میں ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کوئی عورت ہے جس نے دونوں ہاتھوں میں کچھ اٹھا رکھا ہے۔ یہاں کی عورتوں کی بہادری اس سے چھپی ہوئی نہیں تھی پھر بھی اس وقت کسی عورت کو تنہا دیکھ کر تھوڑی سی حیرت ہوئی۔ حیرت تجسس میں ڈھلتی، اس سے قبل ہی خاموش ماحول میں کسی موٹر سائیکل کے انجن کی آواز نے ارتعاش پیدا کیا۔ اس آواز نے عورت کو بھی ٹھنکا دیا اور اس نے یوں بے چین ہو کر ادھر ادھر نظریں دوڑائیں جیسے کوئی آڑ یا پناہ گاہ ڈھونڈ رہی ہو لیکن بد قسمتی سے وہ ایسے کھلے حصے میں تھی جہاں قریب میں کوئی مکان وغیرہ نہیں تھا۔ اسے چھپنے کے لیے پیچھے اس طرف آنا پڑتا جہاں وہ موجود تھا لیکن اسے اس کی بھی مہلت نہیں مل سکی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ روشنی میں نہا گئی۔ یہ روشنی اس موٹر سائیکل کی ہیڈ لائٹ کی تھی جس کی آواز پل بھر قبل سنائی دی تھی۔ وہ جو موٹر سائیکل کی آواز پر ہی اضطراری طور پر آڑ میں ہو چکا تھا، روشنی میں نمایاں ہوتی پری دس کو دیکھ کر چونک گیا۔ موٹر سائیکل سواروں کے جسم پر موجود دردی کی وجہ سے ان کی شناخت تو ویسے ہی واضح تھی کہ وہ بھارتی فوج کے سوار ہیں۔

”اے لڑکی! کہاں جا رہی ہے؟“ موٹر سائیکل چلانے والے نے سخت لہجے میں پری دس سے پوچھا جبکہ اس کا پیچھے بیٹھا ساتھی اتر کر پری دس کی طرف بڑھنے لگا۔ یہ منظر دیکھ کر اس کا دل چاہا کہ آڑ سے نکل کر پری دس کے ساتھ جا کھڑا ہو لیکن اسے خود کو ملنے والی ہدایات یاد تھیں۔ اسے حتی الامکان ایسے کسی بھی معاملے میں پڑنے سے بچنا تھا جس میں الجھ کر اپنے مقصد سے دور ہونے کا اندیشہ ہو۔ خود کو قابو میں رکھے وہ اس امید پر ان کے درمیان ہونے والا مکالمہ سننے لگا کہ شاید وہ لوگ معمولی پوچھ گچھ کے بعد پری دس کو جانے کی اجازت دے دیں۔

”بتایا نہیں تو نے، کہاں جا رہی ہے؟“ پری دس نے جواب نہیں دیا تھا اس لیے موٹر سائیکل سے اتر کر اس کے قریب آنے والے نے اپنے ساتھی کا سوال دہرایا۔

”اپنے چچا کے گھر جا رہی ہوں۔“ پری دس کے لہجے سے ظاہر تھا کہ اس نے خود پر بہت جبر کر کے اس کے سوال کا

جواب دیا تھا۔

”اور اس میں کیا ہے؟“ اس نے پری کے ہاتھ میں موجود لفٹن کی طرف اشارہ کیا۔

”لفٹن میں کھانے کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے؟“ نہ نہ کرتے بھی پری کے لہجے میں تلخی آئی گئی۔

”تم لوگ تو کچھ بھی لے جا سکتے ہو۔ کوئی بم، کوئی ہتھیار، کارتوس وغیرہ وغیرہ۔“ جواباً اس کا لہجہ بھی زہریلا ہو گیا پھر اس کے ہاتھ سے لفٹن چھینتے ہوئے بولا۔

”لادے، چیک کروں، تو اس سے کس فوڈ پانڈا سروس پر نکلی ہوئی ہے۔“ پری دس نے ہلکی سی مزاحمت کے بعد لفٹن چھوڑ دیا۔

”ارے واہ، کھشبو (خوشبو) تو بڑی کھترناک (خطرناک) آرہی ہے۔ لگتا ہے کوئی بڑھیا کشمیری پکوان تیار کر کے لے جا رہی ہے اپنے چاچے کے لیے۔“ وہ لفٹن کھولتے ہوئے اسے چڑانے والے انداز میں تبصرہ کر رہا تھا۔ کھل گیا تو دو انگلیاں سالن میں ڈبو کر منہ میں ڈال کر چوسیں اور آنکھیں میچ کر بولا۔

”سوادش ہے، کشمیر کے حسن کے جیسا۔“

”چھوڑ واسے۔ کیوں اپنے ناپاک ہاتھ ڈال کر پلید کرتے ہو کھانا؟“ پری دس تھلا گئی اور اس کے ہاتھ سے لفٹن جھپٹنے کی کوشش کی لیکن ظاہر ہے ایک طاقتور سپاہی کے مقابلے میں اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ پہلے تو اس نے پری دس کو اس کی کوشش میں کامیاب نہیں ہونے دیا پھر لفٹن اٹھا کر نیچے زمین پر پھینک دیا جس سے لازماً سارا کھانا ضائع ہو گیا۔

”کہینے کہیں کے، تم کتوں کو بر بازی پھیلانے کے سوا کوئی کام نہیں ہے۔“ پری دس یکدم ہی آگ بگولا ہو کر سپاہی پر جھپٹی۔ وہ جو آڑ میں کھڑا یہ سارا تماشا دیکھ رہا تھا اور سمجھ چکا تھا کہ اس کی دعوت میں شرکت نہ کرنے کے بعد پری دس یہ کھانا اس کے لیے پیک کر کے لے جا رہی ہے، اس بدلتی ہوئی صورت حال پر یکدم چوکنا ہو گیا اور بے ساختہ ہی اپنی پنڈلی سے بندھا خنجر کھینچ کر نکال لیا۔

”دفع کیوں نہیں ہو جاتے تم یہاں سے؟“ اجاڑ کر رکھ دیا ہے ہماری جنت کو۔“ سپاہی اس کو قابو کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ پھری شیرنی کی طرح اس پر جھپٹے جا رہی تھی۔

”رکھ کر دے ایک سسری کی کپٹی پر اور کندھے پر ڈال کر لے چل۔ پھر ہم اسے بتائیں گے کہ پلید ہونا کیا ہوتا ہے۔“ موٹر سائیکل چلانے والا جواب تک اپنی جگہ بیٹھا

صورت حال سے لطف اندوز ہوتا رہا تھا، پری دس کے

جارحانہ انداز کو زیادہ برداشت نہیں کر سکا اور بلند آواز میں اپنے ساتھی کو مشورہ دیا۔

”کھیلنے میں مجا (مزہ) آ رہا تھا بلبل کے ساتھ پر چل ٹھیک ہے، باقی کا جواب اپنے ٹھکانے پر چل کر ہی کریں گے۔“ پری وش کے ساتھ اچھے سپاہی کے الفاظ نے جہاں پری وش کو ٹھکانا دیا وہیں آڑ میں کھڑا وہ بھی غصے سے مل کھا کر رہ گیا اور خود کو قابو میں رکھنے کے لیے اسے بڑے جبر سے کام لینا پڑا۔

”چپ کیوں ہو گئی میری بلبل! تھوڑا اور چپک لے۔ بستر پر تو ویسے ہی ساری چپکنا بھول جاتی ہیں۔“ سپاہی نے پری وش کے ٹھکانے کو محسوس کر کے اس کا مذاق اڑایا اور پھر پھرتی سے اس کی طرف لپکا۔ اس نے چیخ مارتے ہوئے بھاگنے کی کوشش کی لیکن اس کی تیزی کا مقابلہ نہیں کر سکی۔ آڑ میں کھڑا وہ بھی بس پری وش کو لڑکھڑا کر گرتے ہی دیکھ سکا۔ سپاہی نے اسے کھل زمین بوس ہونے سے پہلے اپنے ہاتھوں میں سنبھالا اور پھر کسی بوری کی طرح کندھے پر لاد کر موٹر سائیکل کی طرف بڑھا۔

بس اب اس سے زیادہ برداشت نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے تاک کر نشانہ لگایا۔ فخر سنسناتا ہوا اڑ کر گیا اور سپاہی کی پشت میں گھس گیا۔ اس نے ایک فلک شکاف چیخ ماری اور پری وش کو چھوڑ کر زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ اب تک وہاں جو ہوتا رہا تھا، مکانات قدرے فاصلے پر ہونے کے باعث سوئے ہوئے کمینوں کو اس کا علم نہیں ہو سکا تھا۔ سپاہی کی بلند چیخ نے ان کی نیندوں میں خلل ڈالا اور اٹاؤ کا مکانات میں بیداری کے آثار نمودار ہوئے۔ ابھی تک موٹر سائیکل پر ہی سوار زخمی سپاہی کے ساتھی نے صورت حال بگڑتے دیکھی تو بوکھلا کر اپنا پٹیل نکالا اور پے در پے کئی فضائی فائر کر ڈالے۔ فائرنگ کی آواز نے باقی ماندہ سوئے ہوؤں کو بھی نیند سے بیدار کر دیا اور بند لائیں، کھڑکیاں اور دروازے کھلنے لگے۔ موٹر سائیکل سوار کو موت سر پر نظر آئی تو زخمی ساتھی کو اس کے حال پر چھوڑ کر موٹر سائیکل کو ریس دی اور وہاں سے رفو چکر ہو گیا۔ اس کے لیے بھی مزید وہاں رکنا ممکن نہیں تھا چنانچہ پلٹا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس مقام سے دور ہٹا چلا گیا۔ پری وش کے بارے میں اسے اطمینان تھا کہ الہی علاقہ خود اسے اس کے گھر پہنچا دیں گے۔

☆☆☆

وہ بہت تیز دوڑ رہی تھی۔ اتنی تیز کہ لگتا تھا پیروں کے

ساتھ پر باندھ لیے ہوں اور یہ پر اسے اڑا کر لے جا رہے ہوں لیکن وہ جا کہاں رہی تھی؟ یہ واضح نہیں تھا۔ اس کے سامنے ایک لامحدود سی وسعت تھی جس کے پار کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ نہ کوئی منزل، نہ منزل کا نشان۔ بس یہ احساس تھا کہ کسی اجنبی اور انجان سرزمین کی طرف سفر جاری ہے اور ایسے سفر تو ہر ایک کے دل میں خدشات پیدا کر دیتے ہیں۔ وہ بھی بری طرح گھبرائی ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود قدموں کو روکنے پر قادر نہیں تھی۔

”بجل.....!“ تیزی سے آگے بڑھتے کسی کی پکار نے اسے ٹھکانا دیا لیکن سزا ب بھی جاری تھا۔

”رک جاؤ بجل! میں تمہیں ہرگز بھی نہیں جانے دوں گا۔“ اس بار آواز مزید قریب سے آئی تھی۔

”میں خود کو روک نہیں سکتی۔ یہ میرے بس میں نہیں ہے۔“ اسے پہلی بار احساس ہوا کہ وہ جس جانب گامزن ہے، خود بھی اس جانب نہیں جانا چاہتی۔

”تم کوشش تو کر کے دیکھو۔“

”کر رہی ہوں کوشش لیکن مجھ سے نہیں ہو پارہا۔“

اس نے بے بسی سے ہاتھ پیر مارے۔

”اچھا تو اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دو۔ میں خود تمہیں روک لوں گا۔“

اتنے یقین سے دعویٰ کیا گیا کہ اس کے پاس انکار کی گنجائش نہیں رہی اور خود کار سے انداز میں اپنا ہاتھ پھیلا دیا۔ فوراً ہی ایک مضبوط مردانہ ہاتھ نے اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ کو تھام لیا۔ ہاتھ کا تھاما جانا تھا کہ دوڑتے قدم رک گئے اور ہر طرف چھائی دھند چھٹنے لگی۔ اس نے نمودار ہونے والی روشنی میں اپنا ہاتھ تھامنے والے کی شکل دیکھنا چاہی لیکن روشنی اتنی تیز تھی کہ اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔

”یہ جاگ رہی ہیں۔ آپ کو ہر طرح کے حالات کے لیے تیار رہنا ہوگا اور خیال رکھنا ہوگا کہ صورت حال جو بھی ہو، آپ کا رد عمل نارمل ہو۔“ یہ ایک ڈاکٹر تھا جو اس کے بیڈ کے قریب کھڑا عالم شاہ کو ہدایت دے رہا تھا۔ اس نے ڈاکٹر کی بات توجہ سے سنی اور بگھنے کے انداز میں سر کو جنبش دی۔

”معاذ.....!“ وہ جو اپنے سر ہانے کھڑے افراد کی گفتگو سے قطعی بے نیاز تھی، اپنی چندھیا جانے والی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر بلند آواز میں پکاری لیکن کچھ دی جانے والی دواؤں کا اثر تھا اور کچھ پیاس سے خشک پڑے حلق اور زبان کے باعث، اس کے ہونٹوں سے برآمد ہونے والا معاذ کا نام کسی کی سمجھ نہیں آیا اور یوں لگا کہ وہ تکلیف سے

چنتی ہو۔

”سجل..... سجل! کیسی ہو میری گڑیا؟ گھبراؤ مت، دیکھو میں تمہارا ادا سائیکس تمہارے پاس ہوں اور سب کچھ بالکل ٹھیک ہے۔ اللہ سائیکس کی مہربانی سے تمہیں ایک نئی زندگی ملی ہے اور تم اپنے موذی مرض سے نجات پا چکی ہو۔“

عالم شاہ بے قراری سے اس پر جھکا بولتا جا رہا تھا۔ الفاظ نے دھیرے دھیرے اس کے دماغ تک رسائی حاصل کی اور بہت دیر تک بند رہنے کے بعد کھلنے والی آنکھیں بھی روشنی کو برداشت کر کے کچھ دیکھنے کے قابل ہونے لگیں۔

”ادا سائیکس!.....!“ اپنے عین سامنے موجود دکھائی دیتے عالم شاہ کے چہرے کو دیکھ کر اس کی آنکھوں سے بھل بھل آنسو بہنے لگے۔

”روٹی کیوں ہو چکی! یہ تو خوشی اور شکر کا مقام ہے۔“

عالم نے اپنی انگلیوں کی پوروں سے اس کے بہتے آنسو پونچھتے ہوئے اسے ٹوکا۔ یہ اور بات تھی کہ ایسا کرتے ہوئے اس کی اپنی آنکھوں میں بھی نمی اتر آئی تھی۔ ہمیشہ سے عزیز بہن اپنے پچھلے عرصے کے صبر، ایثار اور بیماری کی وجہ سے پہلے سے کہیں زیادہ دل کے قریب ہو چکی تھی۔ کوئی اپنا جب ہاتھوں سے نکلنے لگتا ہے تو انسان پر اس کی اہمیت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔ عالم شاہ کو بھی لگ رہا تھا کہ کئی دنوں سے انکی اس کی سائیکس اب جا کر بجال ہوئی ہیں۔

”اب آپ باہر جائیے۔ مریضہ کوئی الحال آرام کی ضرورت ہے۔“ ساتھ کھڑے ڈاکٹر نے اسے ٹوک کر احساس دلانے کی کوشش کی کہ اس قدر جذباتی دباؤ سجل کی صحت کے لیے مناسب نہیں ہے۔

”آئی ایم سوری ڈاکٹر!“ عالم شرمندہ ہوا پھر سجل کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے نرمی سے بولا۔

”ابھی تم آرام کرو۔ میں بعد میں دوبارہ تم سے ملنے آؤں گا اور اماں سائڈ اور بابا سائیکس کو بھی اپنے ساتھ لاؤں گا۔“

”آ..... اعظم!“ اس نے گویا عالم شاہ کو یاد دلایا کہ ملاقاتوں کی فہرست میں اس کے بیٹے کا نام شامل نہیں ہے۔

”اعظم تو یہیں اسپتال میں مس نیلوفر کے ساتھ موجود ہے۔ ڈاکٹر جیسے ہی اجازت دیں گے، ہم اس سے تمہاری ملاقات کروادیں گے۔“ عالم شاہ نے اسے اطمینان دلایا۔

”پلیز مسٹر شاہ! ہمیں ہمارا کام کرنے دیں۔“ ڈاکٹر نے اسے ایک بار پھر ٹوکا تو وہ سجل کو اشارے سے تسلی دیتا ہوا باہر نکل گیا۔ ان کے لیے مخصوص کمرے میں نیلی، اعظم کو کچھ کھلانے کی کوشش کر رہی تھی اور وہ خمرے دکھا رہا تھا۔

”کیسی ہیں سجل..... انہیں مکمل ہوش آ گیا..... کیا کہتے ہیں ڈاکٹر ان کے بارے میں؟“ عالم کی شکل دیکھتے ہی اس نے جس طرح تابڑ توڑ سوالات شروع کیے، اس سے ظاہر تھا کہ وہ بھی مسلسل سجل کے لیے فکر مند رہی ہے۔

”وہ بہتر ہے۔ اسے ہوش آ گیا ہے اور میری اس سے تھوڑی بات چیت بھی ہوئی ہے۔ میرے حساب سے مینٹلی تو وہ بالکل ٹھیک تھی، اب دیکھنا یہ ہے کہ ڈاکٹر مکمل چیک اپ کے بعد کیا رائے دیتے ہیں۔“

”آپ فکر نہ کریں۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہوگا۔“ نیلی نے اس کی فکر مندی دیکھ کر خلوص سے تسلی دی اور ایک بار پھر اپنے سابقہ کام میں مصروف ہو گئی۔ عالم نے اس کی اور اعظم کی بانڈنگ کو دیکھی ہے دیکھا۔ وہ بہت آرام سے اسے بہلا پھسلا کر ایک کے بعد دوسرا نوالہ کھلاتی جا رہی تھی۔

”اعظم بہت زیادہ اٹیچ ہو گیا ہے آپ سے۔“

”بچے بیمار کی زبان سمجھتے ہیں۔ ان کے ساتھ بیمار سے پیش آؤ تو فوراً آپ کے ہو جاتے ہیں۔“ اس نے توجہ اعظم کی طرف ہی مبذول رکھتے ہوئے عالم کی بات کا جواب دیا۔

”پرہیز تو بڑوں کا بھی نہیں بتایا ڈاکٹر نے بیمار سے۔“ وہ جتنی بے ساختگی سے بولا، اتنی ہی تیزی سے نیلی نے سر اوپر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

”مطلب؟“ غیر شعوری طور پر اس کے لہجے میں سختی در آئی تھی۔

”کوئی مطلب نہیں، بس ایسے ہی ایک بات آگئی تھی ذہن میں۔“ وہ تھوڑا سا شیطانی پھر بات بدلتے ہوئے بولا۔

”بابا سائیکس، اعظم اور سجل، دونوں ہی کی طرف سے بہت فکر مند ہو رہے تھے۔ سجل کے بارے میں ڈاکٹر کیا کہتے ہیں اور کیا نہیں، اس سے قطع نظر بھی یہ طے ہے کہ وہ کافی طویل عرصے تک اعظم کی پر اپر دیکھ بھال کرنے کے لائق نہیں ہو سکے گی۔ کہنے کو تو حویلی میں بہت ملازمین ہیں لیکن کوئی ایسا فرد بہت ضروری ہے جو اعظم کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کو سمجھ کر اسے طریقے سے ہینڈل کر سکے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خود اعظم اس فرد کو ماں کے نعم البدل کے طور پر قبول کر لے۔“

”ماں کا نعم البدل ہونے کا دعویٰ تو نہیں اور نہ ہی سجل کے ہوتے ہوئے اس کی ضرورت ہے لیکن اب تک میں یہ سمجھتی رہی ہوں کہ آپ لوگ اعظم کے حوالے سے میری

ذات سے مطمئن ہیں لیکن اس گفتگو کو سن کر مجھے شک ہو رہا ہے کہ مجھ سے اس کے سلیے میں کوئی کوتاہی ہوئی ہے۔“ نیلی دلبرداشتہ دکھائی دینے لگی تھی۔

”ارے نہیں، ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔ ہم سب تو دل سے آپ کے شکر گزار ہیں کہ آپ نے اس عمدگی سے اعظم کی ذمہ داری سنبھال رکھی ہے کہ ہمیں ایک لمحے کے لیے بھی اس کی طرف سے فکر مند نہیں ہونا پڑا لیکن.....“

”لیکن کیا؟“ نیلی کو عالم کا لجاتی توقف بھی بے چین کر گیا۔

”ذہن میں ایک ابہام سا ہے کہ شاید اب آپ یہاں سے واپس نہ جانا چاہیں۔ آئی مین یہاں پاکستان کے مقابلے میں زیادہ سہولیات اور ترقی کے زیادہ مواقع ہیں اور پیچھے آپ کے ایسے رشتے ناتے بھی نہیں جن کی خاطر آپ کا واپس جانا ضروری ہو تو ہو سکتا ہے آپ یہاں سیٹل ہونا پسند کریں۔“

عالم نے ذرا وضاحت کی تو وہ ٹھٹھکا کر ہنس پڑی۔ اسے ہنستے دیکھ کر اعظم بھی اس کے ساتھ ہنسنے لگا۔

”کمال ہی کرتے ہیں آپ کے ماموں سائیں۔ جو بات دور دور تک میرے خیال میں بھی نہیں، یہ بیچارے اس پر جانے کیا کیا سوچ کر ہلکان ہوئے جارہے ہیں۔ ارے انہیں بتاؤ کہ ہمیں کسی کی ترقی اور خوشحالی سے کچھ لینا دینا نہیں۔ ہم تو صرف اور صرف اپنے اعظم کی خاطر یہاں ہیں۔“ وہ مخاطب اعظم سے تھی لیکن سنا عالم کو رہی تھی۔ معصوم بچہ اس کی بات سمجھے بغیر بس اس لیے ہنستے جارہا تھا کہ وہ ہنستی ہوئی اس سے مخاطب تھی۔

”اگر اعظم کے ماموں سائیں آپ سے درخواست کریں کہ آپ تا زندگی اس کے قریب رہیں تو کیا آپ یہ درخواست قبول کر لیں گی؟“ نیلی کی شوخی کے مقابلے میں عالم کا انداز خاصا سنجیدہ تھا۔ وہ کچھ کھٹک سی گئی اور متوجہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”کیا آپ مجھے لائف ٹائم جاب کی آفر کر رہے ہیں؟“ وہ بھی دوا ڈر، سیلری۔“ وہ شریر سا مسکرایا۔

”میں سمجھی نہیں۔“ کھٹک کچھ اور بھی بڑھ گئی۔

”میں آپ کو اپنا فیملی ممبر بنانا چاہتا ہوں۔ فیملی ممبر کو اس کے حقوق دیے جاتے ہیں، سیلری نہیں۔“

”جو کچھ کہنا ہے کل کر کہیں۔ یوں اشاروں کنایوں میں بات کرنا مجھے پسند نہیں۔“ نیلی کے ماتھے پر بل آ گیا۔

”میں آپ کو پروپوز کر رہا ہوں خاتون! دل یو میری می!“ عالم شاہ کو خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ نیلی کو اتنی جلدی

پروپوز کر دے گا۔ ابھی تو اس نے اس کے کردار سے متاثر ہو کر اس کے بارے میں سوچنا ہی شروع کیا تھا اور یوں اچانک بات اس کے لبوں پر آگئی تھی۔

”آپ..... آپ ایسا سوچ بھی کیسے سکتے ہیں؟“

نیلی نے غصے سے ذانت چمکچمکائے۔ چہرہ پہلے ہی سرخ ہو چکا تھا اور یہ سوچ سوچ کر خون کھول رہا تھا کہ موی کی بیوہ کی حیثیت سے واقف ہوتے ہوئے بھی وہ ایسی جرأت کیسے کر سکتا تھا کہ اسے پروپوز ہی کر ڈالے۔

”نہ صرف میں بلکہ کوئی بھی شخص ایسا سوچ سکتا ہے۔ ایسا سوچنے میں کوئی شرعی اور قانونی قباحت نہیں ہے۔“ اس کے مشتعل انداز کے مقابلے میں عالم شاہ کا لہجہ بے حد پرسکون تھا۔

”لیکن میں نہیں سوچ سکتی۔ میری زندگی میں جو مقام موی کا ہے، وہ کسی اور کو نہیں مل سکتا۔“ اس نے تیوری چڑھائی۔

”مجھے اس کی تمنا بھی نہیں۔ کوئی باشعور انسان کسی دوسرے شخص کا مقام چھیننے کی کوشش نہیں کر سکتا لیکن انسانی قلب و ذہن میں اتنی وسعت ہوتی ہے کہ وہاں دوسرے لوگوں کو بھی جگہ دے سکے۔ زندگی کسی ساتھی کے ساتھ گزارنا انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ جو لوگ اس تقاضے کو نظر انداز کرتے ہیں وہ اپنے ساتھ ظلم کرتے ہیں۔“

”میرے سارے تقاضے موی کی ذات کے ساتھ ختم ہو گئے اور ساری تمنائیں اس کے ساتھ ہی قبر میں دفن ہو چکی ہیں۔“ عالم کے دلائل کے جواب میں اس کے پاس ایک بے منی سی تلملاہٹ کے سوا کچھ نہیں تھا۔

”یہ محض ایک جذباتی مکالمہ ہے جو کسی تین گھنٹے کی فلم میں تو ناظرین کو تالیاں بجانے پر مجبور کر سکتا ہے لیکن حقیقی زندگی میں اس پر عمل کرنے کی کوشش کرنے والوں کے حصے میں زخموں اور پچھتاؤں کے سوا کچھ نہیں آتا۔“ عالم شاہ پر اس کے جذباتی رد عمل کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ فضا کچھ ایسی بن گئی تھی کہ نا سمجھ اعظم بھی دم سادھے ٹکڑ ٹکڑیوں کی شکلیں دیکھ رہا تھا۔

”یونہی سہی، لیکن یہ میری زندگی ہے اور مجھے پورا حق ہے کہ اس بات کا فیصلہ کر سکوں کہ مجھے اسے کیسے گزارنا ہے۔“ وہ اپنی ضد پر اڑی ہوئی تھی۔

”مجھے آپ کا حق تسلیم ہے اور میں آپ کے ہر فیصلے کا احترام بھی کرتا ہوں لیکن میری آپ سے گزارش ہے کہ فیصلہ کرنے میں جلد بازی سے کام نہ لیں۔ پہلے اس بارے میں

اچھی طرح غور و خوض کریں اور چاہیں تو اپنے کسی دوست یا خیر خواہ سے مشورہ بھی لے لیں۔“ عالم شاہ کو خود بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ اتنے نخل کا مظاہرہ کرنے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ اس کا نخل ہی تھا کہ نیلی مزید سخت رد عمل کا مظاہرہ نہیں کر سکی۔

”اس موقع پر میں آپ کو اپنے بارے میں یہ وضاحت بھی دینا چاہتا ہوں کہ میرے دل کا کاغذ بھی بالکل کورا نہیں ہے۔ اس کاغذ پر بھی کسی کا نقش ثبت ہوا ہے لیکن زندگی نے مجھے یہ بات سکھائی ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ دل میں جگہ پانے والوں کے لیے زندگی میں بھی جگہ بن سکے۔ وجہ کوئی بھی بن سکتی ہے لیکن جب محبوب سے جدا رہنا مقوم ہو جائے تو عقل کا تقاضا ہے کہ کسی ایسے اچھے انسان کو اپنے لیے چن لیا جائے جو زندگی کی طویل مسافت کو آپ کے لیے آسان بنا دے۔ میں نے آپ کے اندر وہ خوبیاں دیکھی ہیں جو میری زندگی کو آسان کر سکتی ہیں۔ آپ بھی انکار یا اقرار سے پہلے میری ان خوبیوں کو کھوجیں اور پھر کوئی فیصلہ سنائیں۔“ بہت دھیمے لہجے میں اسے یہ سب سمجھا کر وہ اس کے کچھ بھی کہنے سے قبل کمرے سے باہر نکل گیا۔ نیلی گم صمسی دوبارہ اعظم کو کھانا کھلانے لگی۔ وہ اتنی ڈسٹرب بھی کہ عالم کے پروپوزل کے بارے میں کچھ سوچ نہیں پار ہی تھی لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ وہ اب غصے میں نہیں تھی اور یہ بہت اچھی علامت تھی۔ غصہ انسان سے غلط اور جذباتی فیصلے کروانا ہے۔ وہ اپنی موجودہ اسٹیج سے گزر جانے کے بعد جو بھی فیصلہ کرتی، اس میں غلطی کا امکان کم ہوتا۔

☆☆☆

”یہ اچھا نہیں ہوا، بالکل بھی اچھا نہیں ہوا۔“ اس کے پاس اتنی رات گئے بنجامن کے گھر واپس جانے کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ بنجامن جو کہ شب خوابی کا لباس زیب تن کر چکا تھا اور بستر سے اٹھ کر آیا تھا، اسے دوبارہ اپنے دروازے پر دیکھ کر ٹھٹھک گیا تھا لیکن باہر ہی کسی قسم کے سوال جواب کرنے کے بجائے اسے اندر بلا لیا تھا۔ اس نے بنجامن کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر اسے سب کچھ سچ سچ بتا ڈالا جسے سن کر بنجامن پریشانی میں ڈوب گیا۔

”میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اگر میں ایسا نہیں کرتا تو وہ درندے پری وٹس کو اٹھا کر لے جاتے۔“ وہ خود بھی مضطرب تھا۔

”میں سمجھتا ہوں، میں یہ سب سمجھتا ہوں لیکن میں اس ری ایکشن سے ڈر رہا ہوں جو اپنے ایک سپاہی پر حملہ ہونے

کے بعد انڈین آرمی کی طرف سے آئے گا۔ میں اقلیتی آبادی میں سے ہوں اور بائے دا گریس آف گاڈ اچھی پوزیشن پر بھی ہوں اس لیے انڈینز کو مجھ سے کوئی ایٹو نہیں ہے۔ میرے دوستوں میں ہندو اور مسلم دونوں شامل ہیں لیکن میں انصاف سے کام لوں تو یہ بات بالکل صاف ہے کہ انڈین فورسز مسلمانوں پر چڑھائی کا کوئی چانس مس نہیں کرتیں۔ یہ واقعہ بھی انہیں بری طرح بھڑکا دے گا اور وہ ہر ممکن کوشش کریں گے کہ مجرم ان کے ہاتھ آجائے۔“ بنجامن وہاں کارہائشی تھا اور اسے بھارتی فوج کے سارے قلم و ستم کا علم تھا اس لیے اس کی فکر مندی بجاتی تھی۔

”آغا جان میرے لیے پریشان ہو رہے ہوں گے۔ کیا انہیں کال کر کے میری خیریت کی اطلاع دی جاسکتی ہے؟“ تشویش اسے بھی تھی کہ جو کچھ کر آیا تھا اس کی وجہ سے بہت کچھ تباہ ہو سکتا تھا۔ اس کے اس جذباتی رد عمل نے اس سب کو بھی خطرے میں ڈال دیا تھا جس کے لیے پوری پلاننگ کر کے وہ یہاں آیا تھا۔ آغا گل کو فون کرنے کے پیچھے بھی یہ خواہش تھی کہ کوئی رابطہ ہو تو حالات سے آگاہی ہو۔

”بالکل بھی نہیں۔ اگر ہماری کال پکڑی گئی تو تم سیدھے ٹھٹھک کر زد میں آؤ گے۔ آرام سے یہاں بیٹھے رہو۔ کوئی الویسیٹیشن ہوئی تو میں کہہ دوں گا کہ رات بہت دیر ہو گئی تھی اس لیے میں نے تمہیں یہیں روک لیا تھا۔“ بنجامن نے قطعیت سے انکار کر دیا پھر بولا۔

”میں تمہارے لیے گیٹ روم کھول دیتا ہوں۔ سکون سے وہاں سو جاؤ۔ جو ہو گا صبح دیکھا جائے گا۔“

”جیسا آپ کہیں۔“ اس کا ذہن اگرچہ بے شمار سوالات میں الجھا ہوا تھا لیکن بنجامن کو مختصر جواب دینے پر ہی اکتفا کیا۔ بنجامن اسے اپنے ساتھ گیٹ روم میں لے گیا۔ صاف ستھرا آرام دہ گیٹ روم گویا کسی مہمان کی راہ دیکھ رہا تھا۔

”عام ضرورت کا سارا سامان یہاں موجود ہے پھر بھی اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو تم مجھے یا اپنی آنٹی کو بتا سکتے ہو۔“

”تھینک یو اکل ابس رات ہی تو گزارنا ہے اور اس کے لیے ایک عدد بستر کے علاوہ سب کچھ اضافی ہی ہے۔“ اس نے بنجامن کی پیشکش کے جواب میں مسکرا کر کہا لیکن اس کی مسکراہٹ میں پیکا پن تھا۔ ہونے والے واقعے کا رد عمل اس کے دماغ میں اندیشے جگا رہا تھا۔ ایک طرف ان کی اپنی ساری منصوبہ بندی پر پانی پھرنے کا خدشہ تھا تو دوسری طرف پری وٹس سمیت باقی لوگوں کے انجام کی فکر تھی۔

کو خنجر مار کر اسے اس کے مکروہ عزائم سے بچایا تھا۔ وہ شخص منظر پر نہیں آیا تھا اور وہ جانتی تھی کہ اسے آنا بھی نہیں ہے۔ بھارتی فوجیوں کا مسلمانوں کے ساتھ یہاں جو سلوک تھا اس کے بعد اگر کسی نے اتنی بھی اہت کر لی تھی کہ ایک لڑکی کی آبرو بچانے کے لیے حرکت میں آ گیا تھا تو یہ بھی کم نہیں تھا۔ سامنے آ کر اپنی اس جرأت کا اعتراف کرنا خود کو ہلاکت میں ڈالنے کے سوا کچھ نہیں تھا۔

”لگتا ہے یہ مرنے والا ہے۔“ زخمی سپاہی کی چیخ و پکار دھیرے دھیرے دم توڑ گئی تھی اور اب وہ اپنے ہی خون میں لت پت زمین پر بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ کسی نے قریب آ کر اس کا جائزہ لینے کے بعد یہ تبصرہ کیا تھا۔ ایک انڈین سپاہی کی موت کا کیا نتیجہ ہو سکتا ہے، یہ اس سمیت وہاں موجود ہر شخص جانتا تھا۔ قاتل کی تلاش میں وہ زمین و آسمان بھی تہ و بالا کر دیتے تو کم تھا۔

”مجھے اسے بچانا ہوگا۔“ وہ زیر لب بڑبڑائی اور بے جان پڑے سپاہی کی پشت میں گڑا خنجر ہاتھ بڑھا کر کھینچ لیا۔ خنجر کھینچتا تھا کہ اس کے زخم سے پہلے سے کہیں زیادہ تیزی سے خون بہنے لگا۔ اس نے اس بہتے خون کی پروا کیے بغیر خنجر کو اپنی اوڑھنی سے صاف کرنا شروع کر دیا۔ اس کی اوڑھنی پر خون کے دھبے پڑ گئے لیکن ان دھبوں سے بے نیاز وہ خنجر کو رگڑ رگڑ کر صاف کرتی رہی اور اسے اس وقت ہی ہاتھ سے چھوڑا جب یہ اطمینان ہو گیا کہ خنجر سے اجنبی محسن کے فتنہ پرش مٹ چکے ہوں گے۔

”چلو بیٹی! میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آؤں۔ تمہارا مزید یہاں رکنا مناسب نہیں ہے۔“ وہ بزرگ جو پہلے اس سے مخاطب ہوئے تھے، انہوں نے ہی دوبارہ اس سے کہا تو اس بار وہ خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنی اوڑھنی سنبھالتے ہوئے ان کے پیچھے چل پڑی۔ ہجوم بھی چھٹنا شروع ہو گیا۔ وہ سب ہی تشویش کا شکار تھے اور اس واقعے کے سخت رد عمل کے بارے میں سوچ رہے تھے۔

”پری..... پری! کیا ہو گیا بیٹی؟ یہ سب کیا ہو گیا اور تم یہاں کیسے؟“ ابھی اس نے بزرگ کے ساتھ گھر واپسی کا آدھا راستہ ہی طے کیا تھا کہ حاجی شیر خان ایک نوجوان کے ساتھ بدحواسی کے عالم میں تیز تیز چلتا نمودار ہوا اور پری دوش کے دونوں شانے تھام کر پریشانی سے پوچھنے لگا۔

”میں آغا جان کے گھر جا رہی تھی بابا! عمار دعوت میں نہیں آیا تھا تو اس کے لیے کھانا پہنچانے۔“ اس نے باپ کے سوال کا جواب دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”ٹھیک ہے، تم آرام کرو پھر صبح بریک فاسٹ پر ملتے ہیں۔“ بنجامن نے اس کا شانہ تھپک کر باہر جانے کے لیے قدم اٹھائے لیکن دروازے کے قریب جا کر رک گیا۔

”عمار.....!“

”جی انکل۔“

”اس خنجر پر تمہارے فکر پرش بھی تو ہوں گے۔“ بنجامن نے ایک ایسا نکتہ اٹھایا جو شروع ہی سے اس کے ذہن میں موجود تھا۔ وہ موقع ہی ایسا تھا کہ اسے کسی بھی قسم کی احتیاطی تدبیر کا موقع نہیں ملا تھا اور اب خطرے کی گھوڑی سر پر لنگ رہی تھی۔

”یہ بہت برا ہوا۔ اتنے سالڈ ایویڈنس کے بعد ان کے لیے تمہیں پھانسی پر لٹکانا کوئی مسئلہ ہی نہیں ہوگا۔“ اس کی خاموشی نے بنجامن کو جواب دے دیا تھا چنانچہ اس کی تشویش میں مزید اضافہ ہو گیا۔

”کشمیریوں کے خون سے ہاتھ رنگنا ان کے لیے کبھی بھی مسئلہ نہیں رہا۔“ اس نے زخمی سے جواب دیا۔

”ابھی تم آرام کرو۔ صبح حالات دیکھنے کے بعد سوچ سمجھ کر فیصلہ کرتے ہیں کہ کیا کرنا ہے۔“ بنجامن اس تلخی کی وجوہات سے واقف تھا اس لیے بات کو بڑ جانے کے بجائے رسان سے کہتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ اس نے بھی بستر سنبھال لیا لیکن یہ طے تھا کہ آج کی رات اسے نیند نہیں آنے والی تھی۔

☆☆☆

سپاہی کے گرنے سے اس کے کندھے پر لدی پری دوش بھی زمین بوس ہوئی تھی اور ایک پل کے لیے اس کے حواس جواب دے گئے تھے لیکن سپاہی کی چیخ و پکار، اس کے ساتھی کی فائرنگ، کھلنے والے دروازوں، کھڑکیوں کی کھڑکھڑاہٹ اور پھر لوگوں کے بولنے کی آوازوں نے ماحول کو اتنا پر شور کر دیا کہ وہ اپنے حواسوں میں واپس لوٹ آئی۔

”ارے یہ تو حاجی شیر خان کی بیٹی ہے۔“ زخمی سپاہی کا ساتھی موٹر سائیکل دوڑا کر وہاں سے بھاگ نکلا تھا اور آنے والے اس کے اور زخمی سپاہی کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ ان میں سے چند کے ہاتھوں میں ٹارچیں بھی تھیں اور ان ٹارچوں کی روشنی میں کسی نے پری دوش کو شناخت کر لیا تھا۔

”تم اتنی رات کو اکیلی کیا کر رہی ہو بیٹی اور اسے کس نے زخمی کیا ہے؟“ ایک بزرگ نے قریب آ کر اس سے دریافت کیا۔ اس نے ان کے سوال کا جواب تو نہیں دیا لیکن دھیان اس شخص کی طرف چلا گیا جس نے عین وقت پر سپاہی

”مجھ سے کہہ دیا ہوتا بیٹی!“ حاجی شیر خان بیٹی کی اس حماقت پر اسے سرزنش بھی نہیں کر سکا اور بے بس سے انداز میں اتنا ہی کہا۔ وہ ایک باشعور آدمی تھا جس کے لیے سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ یہ ایک کم عمر لڑکی کا جذباتی اقدام تھا جس کے لیے اسے کچھ بھی کہنا بیکار تھا۔

پری دوش کو بھی اب اپنی حماقت کا احساس ہو رہا تھا۔ اصل میں عمار کے دعوت میں شریک نہ ہونے پر وہ بہت رنجیدہ ہوئی تھی۔ تھوڑی سی امید تھی کہ دیر سے ہی سہی، وہ آجائے گا لیکن پہلے گل دوش اور اس کا خاوند اور پھر آغا گل اور زرینہ بی بی رخصت ہو گئے پر عمار نے اپنی جھلک نہ دکھائی۔ مہمانوں کے رخصت ہونے کے بعد اس نے سارا پھیلاوا سمیٹا، برتن دھو دھلا کر باورچی خانہ صاف کیا اور بچے ہوئے کھانے کو محفوظ کرنے کے بعد بستر پر آ لیٹی لیکن نیند کا تو کوئی نام و نشان ہی نہیں تھا۔ دن بھر ماں کے ساتھ مل کر کام نمٹاتے ہوئے کھانے پینے کا ہوش نہیں رہا تھا اور دعوت میں عمار کے آنے کے انتظار میں نہیں کھایا تھا۔ سب کے بلاوے پر بھوک نہ ہونے اور کاموں کا بہانہ بناتی رہی تھی اور اب بستر پر لیٹی تھی تو خالی پیٹ دہائیاں دے رہا تھا۔ پیٹ کی دہائیوں پر دل کی دہائیاں غالب تھیں۔ ناقدری کا احساس بھی آنکھیں بھگو دیتا تھا تو کبھی وجود میں طیش کروٹیں لینے لگتا تھا۔ غم و غصے کی اس ملی جلی کیفیت نے اسے وقت کا خیال کیے بغیر بستر چھوڑ کر کھڑے ہونے اور گھر سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ دعوت میں تیار کیے جانے والے سارے کھانے ایک بڑے سے لفٹن میں پیک کر کے اپنے ساتھ لے گئی تھی کہ انہیں عمار کو پیش کر کے اسے شرمندہ کرے گی اور اسے احساس دلانے کی کہ یہ اتنا سب کچھ جو اس کے لیے بطور خاص تیار کیا گیا تھا، یونہی نہیں بن گیا تھا۔ اس سب کو بنانے میں اس کا بہت وقت اور محنت لگی تھی لیکن اس سب کی نوبت ہی نہیں آ سکی تھی اور راستے میں وہ پیش آ گیا تھا جس کا اس نے گمان بھی نہیں کیا تھا۔

”یہ وقت باتوں کا نہیں ہے حاجی صاحب! میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آپ کو اطلاع دینے اس لیے بھاگا آیا تھا کہ آپ جلد از جلد اپنے بچاؤ کے لیے کوئی قدم اٹھا لیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ کچھ دیر میں یہاں کیا صورت حال ہوگی۔ بہتر ہوگا کہ اس سے پہلے پہلے آپ اپنے گھر والوں کے ساتھ یہاں سے نکل کر کسی محفوظ مقام پر چلے جائیں۔“ حاجی شیر خان کے ساتھ آنے والے جوان نے دونوں باپ بیٹی کے مکالے کو طول نہ پکڑنے دیا اور درمیان میں ہی انہیں

ٹوک دیا۔

”یہ بچہ بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے شیر خان! تم بالکل بھی وقت ضائع نہ کرو اور اس بچی سمیت اپنے سب گھر والوں کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ۔“ پری دوش کے ساتھ آنے والے بزرگ نے بھی نوجوان کی تائید کی۔

”ہاں، ہاں جاتا ہوں میں۔ آؤ پری بیٹی!“ بوکھلایا ہوا شیر خان پری دوش کو لے کر گھر کی طرف چل پڑا۔ گھر میں ماں اور اس کا چھوٹا بھائی پریشان بیٹھے تھے۔

”ہمیں ابھی ابھی گھر چھوڑنا ہوگا۔ سامان سمیٹنے کا وقت نہیں ہے، بس رقم اور سونا ساتھ لے لو تا کہ ضرورت کے وقت کام آسکے۔“ شیر خان نے گھر میں داخل ہوتے ہی اعلان کیا تو ماں حیران پریشان اس کے حکم کی تعمیل کے لیے بھاگی۔ سوال اس لیے نہیں کیا کہ شیر خان کے لہجے سے ظاہر تھا کہ اس کی مہلت نہیں ہے۔ ایسا وقت دادی میں بھی کسی بھی گھرانے پر آ جاتا تھا اس لیے جو کچھ ہو رہا تھا، پریشان کن ضرور تھا لیکن زیادہ انوکھا نہیں۔

وہ لوگ گھر سے نکلے تو ایک آخری حسرت زدہ نظر ڈال کر نکلے۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ دوبارہ اس گھر کو دیکھنا نصیب بھی ہوگا یا نہیں۔

☆☆☆

”میرے خیال میں مجھے گھر جا کر حالات معلوم کرنے چاہئیں۔“ صبح ہوتے ہی وہ گھر جانے کے لیے بے چین ہو گیا تھا۔

”نو..... ابھی تم سکون سے ناشتا کرو اور پھر روٹین کے مطابق اپنے کام پر بیٹھو۔ حالات جو بھی ہوں، خود ہی معلوم ہو جائیں گے۔ یہاں کون سا کوئی بات چھپتی ہے۔“ بنجامن نے اسے واضح طور پر منع کر دیا۔ وہ اس کی بات ماننے کا پابند نہیں تھا لیکن اس لیے مان گیا کہ ایک تو اس کے خلوص پر پورا اعتماد تھا، دوسرا وہاں کا قدیمی رہائشی ہونے کی وجہ سے بنجامن حالات سے اس کی نسبت زیادہ واقف تھا۔

رات کے کھانے کی طرح مار یا بنجامن نے ناشتے پر بھی خاصا اہتمام کیا تھا لیکن اس کا کچھ بھی کھانے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ مشکل سے بس ایک تھوڑے چائے کی مدد سے حلق سے نیچے اتارا اور ہاتھ روک لیا۔

”تم کچھ کھا کیوں نہیں رہے ہو بیک مین؟ میں نے اتنی محبت اور محنت سے تمہارے لیے اتنا کچھ بنایا ہے لاؤ تم نے کسی چیز کو ہاتھ ہی نہیں لگایا۔“ ماریا نے اسے یوں ہاتھ روکتے دیکھا تو ناراضی کا اظہار کرنے لگی۔

فاسٹ؟“ بنجامن نے شوخ لہجے میں ماریا کو جواب دیا تو اس نے محسوس کیا کہ بنجامن کی آواز معمول سے کچھ بلند تھی۔ یکدم ہی اسے احساس ہوا کہ وہ یہ سب کچن اور قریبی کمرے میں کام کرتے ملازمین کے کانوں تک پہنچانے کی کوشش کر رہا تھا اور مقصد یقیناً انہیں گواہ بنانا تھا کہ وہ رات سے یہیں ہے۔

”عمار کو چھوڑو، یہ بیچارہ تو بڑے تکلف سے کھانا پیتا ہے لیکن تم جو رات کے بعد اب بھی ڈٹ کر کھا رہے ہو، تم بتاؤ کہ ڈنر زیادہ ٹیسٹی تھا یا بریک فاسٹ؟“ ماریا نے الٹا بنجامن کو ہی گھیر لیا۔

”ارے مجھ غریب کی کیا پوچھتی ہو۔ میں تو آج تک یہ ڈیسا بڑ نہیں کر پایا کہ تم ویڈنگ ٹائٹ پر زیادہ حسین لگی تھیں یا اس کے بعد آنے والے ہر نئے دن۔“

”تم سے تو بس باتیں بنواؤ۔“ بنجامن کے جواب پر ماریا کا چہرہ گلابی ہو گیا اور کچھ اس ادا سے بولی جو بس اسی کی نسل کی مشرقی خواتین کا خاصہ تھا۔ بدلتی اقدار نے عورتوں کو جہاں پر کینیکل کیا تھا وہیں اس طرح کے رد عمل سے بھی دور کر دیا تھا۔

”تم ہماری گفتگو سے بور تو نہیں ہو رہے عمار؟“ بنجامن، ماریا کے رد عمل پر مسکرایا اور پھر اس سے پوچھا۔

”بور ہونے کے ساتھ ساتھ بیچارے کے سر میں بھی درد ہو گیا ہوگا اور سوچ رہا ہوگا کہ یہ اولڈ مین اور اولڈ لیڈی دن رات چونچیں لڑانے کے سوا کوئی کام نہیں کرتے کیا۔“ اس سے پہلے ماریا نے جواب دیا۔

”بالکل بھی نہیں آنٹی! میں تو رات سے بہت انجوائے کر رہا ہوں۔ آغا جان اور بی بی کے درمیان ایسی مزیدار جھڑپیں نہیں ہوتیں۔ بی بی، آغا جان کا اتنا احترام کرتی ہیں کہ شاید کبھی ان کے سامنے اونچی آواز سے بولی بھی نہ ہوں۔“ اس نے وہاں ایچ ہونے والے ڈرامے میں اپنا کردار کامیابی سے ادا کیا۔ اسے یقین تھا کہ میز پر سے خالی برتن اٹھا کر لے جاتے ملازم نے اس کے الفاظ اچھی طرح سنے ہوں گے۔

”زرمینہ بھابی کا تو اسٹائل ہی الگ ہے۔“ بنجامن نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

”اور ان ہی کو سوٹ بھی کرتا ہے۔ تم اتنی ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھر کر مجھے ان جیسی وائف بننے پر قائل نہیں کر سکتے۔“ ماریا نے فوراً شوہر کو جتایا تو وہ ہنس پڑا۔

خوش کہیوں کے ساتھ ختم ہونے والے ناشتے کے

”سوری آنٹی! رات کو اتنی لیٹ، وہ بھی ہیوی ڈنر کیا تھا تو اب طبیعت کچھ کھانے کی طرف مائل نہیں ہو رہی۔“ اس نے معذرت کی۔

”وہ ہیوی ڈنر تو تمہارے انکل نے بھی کیا تھا لیکن دیکھو اب بریک فاسٹ سے بھی کتنا بھرپور انصاف کر رہے ہیں۔“ ماریا نے بنجامن کی طرف اشارہ کیا۔ وہ اپنے سامنے ایک ساتھ دو پیالیاں رکھے بیٹھا تھا۔ ایک پیالی میں فروٹ سلاد اور دوسرے میں خشک میوہ جات اور دودھ شامل کر کے بنایا گیا جو کا دلیا بھرا ہوا تھا۔ وہ باری باری دونوں پیالیوں سے کھا رہا تھا۔

”میرے کھانے پینے پر نظر نہ رکھا کرو مائی ڈیئر وائف! میری عمر کے بندے کے لیے اچھی اور سہلستھی ڈائٹ بہت ضروری ہے۔ اس عمر میں بندہ ڈائٹ کے زور پر بٹی چلتا ہے۔ ہاں جوانوں کی بات الگ ہے۔ جوانی کا اپنا زور اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ دو چار ٹائم کی فاسٹنگ سے بندے کا کچھ نہیں بگڑتا۔“

”لیکن تم نے تو جوانی میں بھی کبھی کسی ایک ٹائم کا کھانا نہیں چھوڑا۔“ ماریا نے اسے یاد دہانی کروائی۔

”جس کی وائف اتنا ٹیسٹی کھانا بناتی ہو، وہ کوئی آحق ہی ہوگا جو خواہ مخواہ فاقے کرے۔“ جواب حاضر تھا جسے سن کر ماریا ہنس پڑی۔ اس کے ہونٹوں پر بھی ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔

”پہلی لائف گزارنے کی یہ ٹرک سیکھ لو۔ وائف کی تعریف کرتے رہنا بہت ضروری ہے۔ تعریف سے عورتوں کا موڈ ٹھیک رہتا ہے اور شوہر کی لائف سکون میں گزرتی ہے۔“ بنجامن نے اس کی طرف جھک کر سرگوشی میں اسے سمجھایا جس پر اس نے مشکل سے اپنی مسکراہٹ ضبط کی۔

شکر ہے کہ ماریا ان کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ وہ ملازم کو کوئی ہدایت دے رہی تھی۔ باورچی خانے کے کاموں کے علاوہ یہ ملازم دن بھر دیگر چھوٹے بڑے کاموں میں بھی ان کی مدد کرتا تھا۔ صفائی وغیرہ کے لیے البتہ الگ ملازم تھا۔ گھر کے کسی گوشے سے آئی کھٹ پٹ کی آوازوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ملازم بھی آچکا ہے اور گھر میں صفائی سہرائی کا کام جاری ہے۔

”تم نے مجھ سے کچھ کہا؟“ ماریا ملازم سے فارغ ہوئی تو بنجامن سے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔ بس میں عمار سے کہہ رہا تھا کہ بریک فاسٹ کے سارے آئٹم ٹیسٹ کرے اور پھر ڈیسا بڑ کرے کہ کل جو اس نے ڈنر کھایا تھا وہ زیادہ اچھا تھا یا یہ بریک

سلسلے کے بعد وہ اور بنجامن دکان پر پہنچ گئے۔ ابھی دیگر ملازمین نہیں پہنچے تھے۔ بنجامن نے اپنے معمولات کے ساتھ دن کا آغاز کرنے کے بجائے اپنی سیٹ سنبھالی اور اسے پکارا۔

”عمار! یہاں آؤ اور میری بات سنو۔“

”جی اکل!“ وہ جوابی سسٹم آن ہی کرنے لگا تھا، بنجامن کے لہجے کی گھبرنا کو محسوس کر کے فوراً اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”یہاں بیٹھو۔“ بنجامن نے اپنے سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

”کوئی مسئلہ ہے اکل؟“ وہ کرسی پر بیٹھ تو گیا لیکن لہجے میں تشویش تھی۔

”مسئلہ تو ہے۔ تمہارے ہاتھوں زخمی ہونے والا انڈین سولجر کافی سیریس کنڈیشن میں اسپتال میں ہے اور.....“ بنجامن کی زبان لڑکھڑائی۔

”اور کیا؟“ خدشات میں گھرے اس نے اونچی آواز میں پوچھا۔

”انڈین آرمی نے رات ہی تمہارے رہائشی علاقے کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ گھر گھر تلاشی کے دوران کئی جوانوں کو گرفتار کر لیا گیا ہے اور..... اور.....“ بنجامن کی زبان ایک بار پھر کچھ کہنے سے انکاری ہوئی۔ اس نے زبان سے کچھ پوچھنے کے بجائے سوالیہ نظریں اس کے چہرے پر جمادیں۔

”انہوں نے حاجی شیر خان کے گھر کو آگ لگا دی تھی۔ سنا ہے پورا گھر جل کر راکھ ہو گیا ہے۔“

”اور حاجی شیر اور ان کی فیملی؟“ وہ بے چین ہوا۔

”وہ لوگ پہلے ہی نکل گئے تھے۔ اب انڈینز اپنے سپاہی کوزخمی کرنے والے کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کو بھی زور و شور سے تلاش کر رہے ہیں۔ وادی میں کافی ٹینشن پھیلی ہوئی ہے۔“ بنجامن نے ساری صورت حال اس کے سامنے رکھی۔

”آغا جان تو بہت پریشان ہوں گے۔ مجھے گھر جا کر انہیں تسلی دینی چاہیے۔“ وہ وہاں جانے کے لیے پرتولنے لگا۔

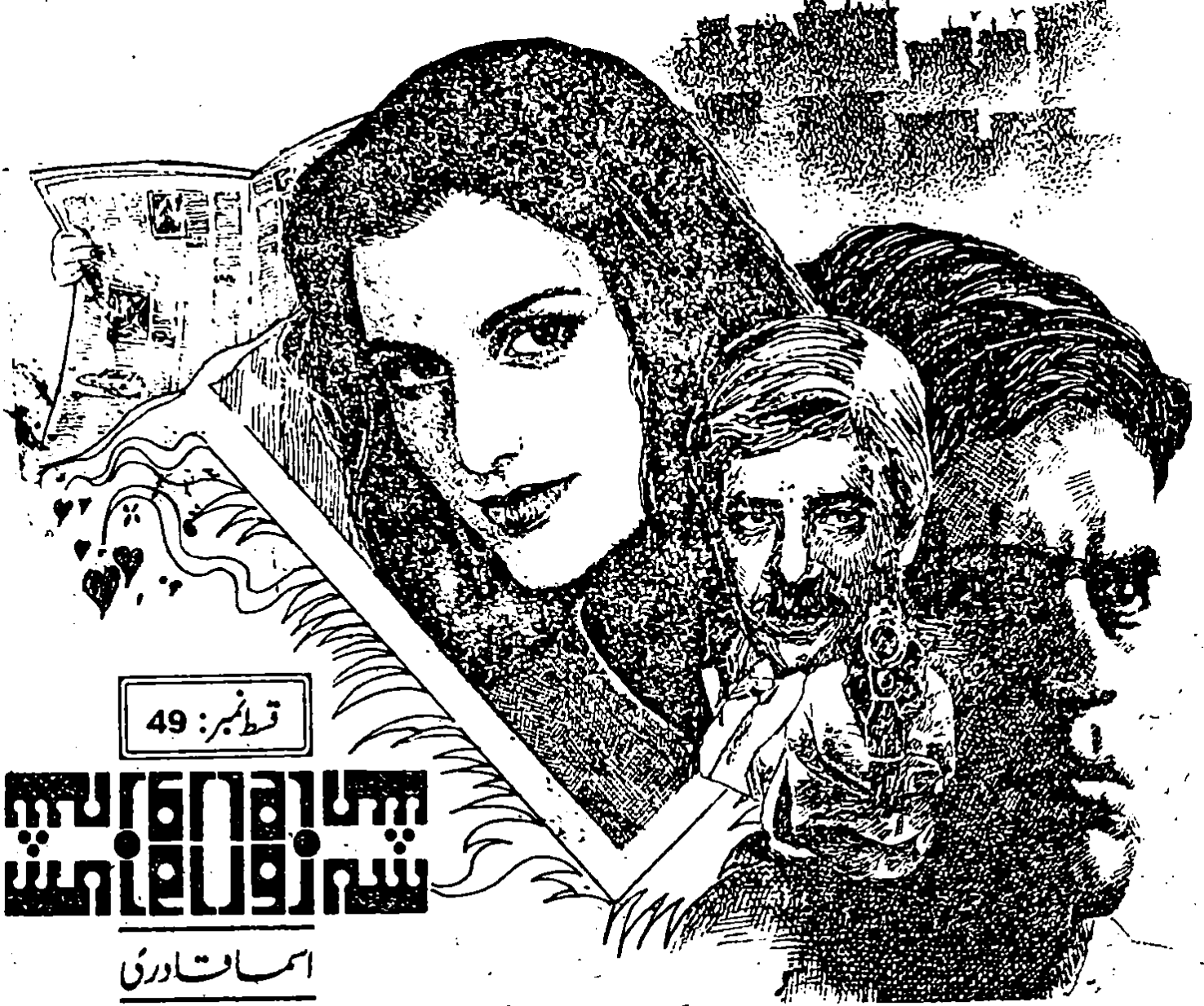
”میں بھی نہیں۔ سچویشن پوری طرح کلیئر ہو جائے۔“

بنجامن نے اسے روکا جس پر اسے نہ چاہتے ہوئے بھی رکنا پڑا۔ کچھ دیر میں دکان پر کام کرنے والے دوسرے ملازمین بھی آنا شروع ہو گئے۔ آنے والوں کے پاس مزید خبریں تھیں۔ سب سے اہم بات جو پتا چلی وہ یہ تھی کہ تاحال وقوعہ والے پورے علاقے میں کرفیو نافذ تھا اور گھر گھر تلاشی کے ساتھ تفتیش و گرفتاریوں کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

کئی بار اس کا دل چاہا کہ اس شخص سے رابطہ کرے جس کے متعلق جبار علی نے اسے خصوصی ہدایات دی تھیں۔ وہ شخص اس کا جبار علی سے رابطہ بھی کر داسکتا تھا اور محسوس جانے کی صورت میں محفوظ راستے سے نکالنے کی کوشش بھی لیکن کوئی چیز تھی جو اسے ایسا کرنے سے روک رہی تھی۔ شاید دل کا وہ تعلق جو قیام کے اس عرصے میں ان لوگوں سے جڑ گیا تھا۔ آغا جان، زرینہ بی بی، حاجی شیر خان اور اس کا خاندان۔ سب ہی لوگ تو اتنے سے عرصے میں بہت پیارے لگنے لگے تھے اور دل نہیں مانتا تھا کہ ان لوگوں کو اس مصیبت میں گھرا چھوڑ کر اپنے لیے کوئی محفوظ راستہ تلاش کرے۔

دوپہر تک کا سارا وقت اسی بے چینی اور پریشانی میں گزرا۔ دکان کے ملازمین میں سے کئی لوگ جانتے تھے کہ وہ اسی علاقے کا رہائشی ہے۔ انہوں نے اس سے اس بارے میں معلومات لینے کی کوشش کی لیکن اس نے ہر ایک کو یہی بتایا کہ وہ رات سے بنجامن کے گھر میں رکھا ہوا ہے اس لیے اسے بھی بس اتنا ہی معلوم ہے جتنا باقی لوگوں کو۔ اس نے آغا جان اور بی بی کے لیے تشویش کا اظہار بھی کیا مگر مسئلہ وہی تھا کہ ان کی خیریت معلوم کرنے یا انہیں اپنے بارے میں تسلی دینے کا کوئی ذریعہ ہی نہیں تھا۔ کرفیو کی وجہ سے کسی کا آنا جانا ممکن نہیں تھا اور فون سروس آرمی والوں نے خود بند کر دی تھی۔ وہ بے دلی سے کی پیڈ پرائنگلیاں چلاتا مارے باندھے معمول کا کام نمٹاتا رہا۔ دوپہر کے کھانے کا وقفہ ہونے میں کچھ دیر ہی باقی تھی کہ پہلے دکان کے باہر ٹائروں کی تیز چرچر اہٹ سنائی دی پھر کھٹا کھٹ گاڑیوں کے دروازے کھلتا شروع ہوئے۔ متاثرہ علاقے میں جو بھی صورت حال تھی سو بھی، عمومی طور پر پوری وادی میں تناؤ کی سی کیفیت تھی اس لیے ان آوازوں کو کوئی بھی شخص معمول کی آوازوں کی طرح نظر انداز نہیں کر سکا۔ جو جہاں تھا اس نے اپنی جگہ چھوڑ کر یا کم سے کم گردن گھما کر ان مخصوص آوازوں کی وجہ جاننے کی کوشش ضرور کی۔ وہ خود ان لوگوں میں شامل تھا بلکہ وجہ جاننے کی کوشش کرنے والوں میں سب سے آگے کھڑا تھا اس لیے اسی نے سب سے پہلے بھارتی سپاہیوں کے یونیفارم کی جھلک دیکھی اور ان کا جارحانہ انداز میں سیڑھیاں چڑھ کر دکان میں داخل ہونا بھی محسوس کیا۔

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نوجوان
کی داستان جو غلط کاروں کے لیے غضب
ناک تھا باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیے



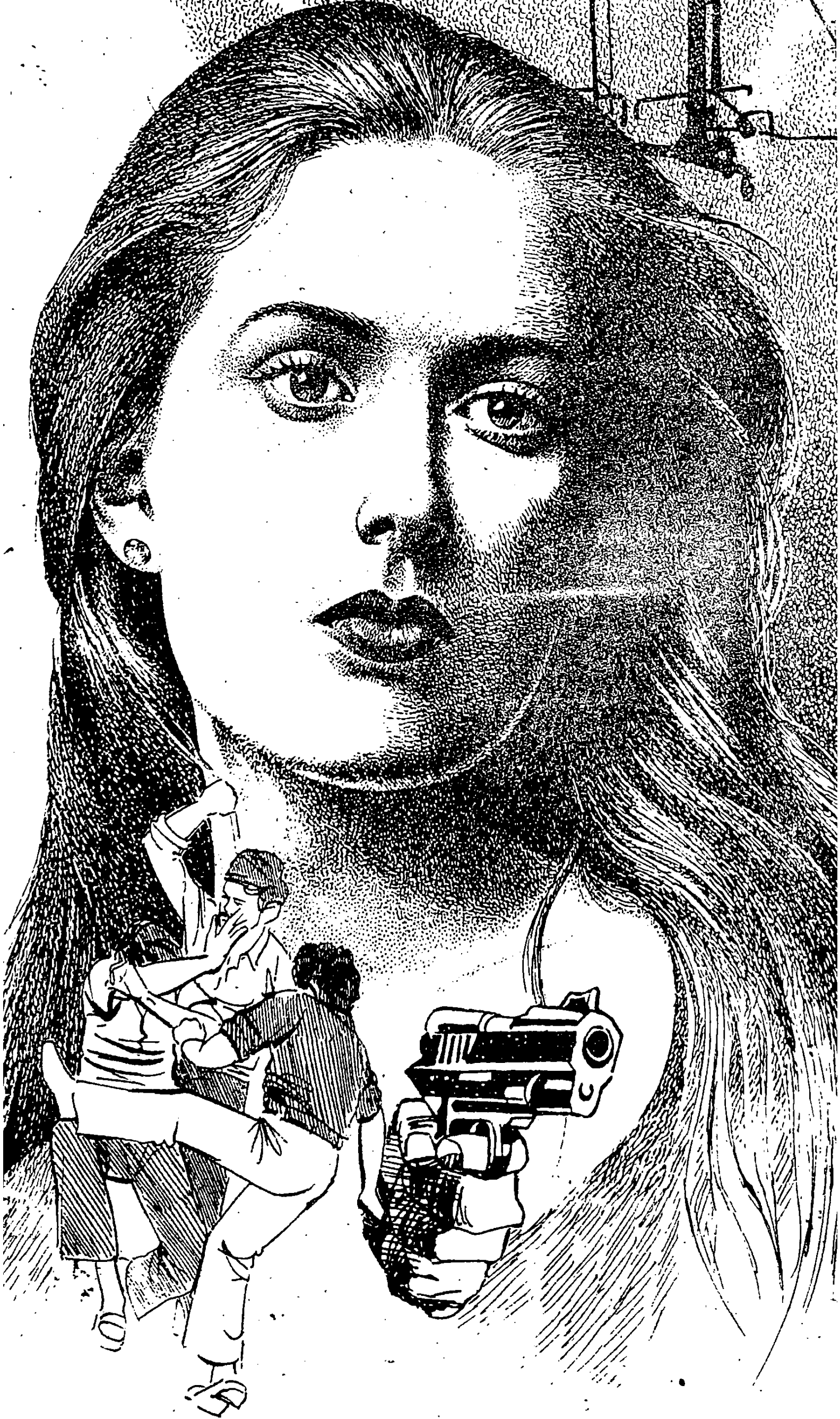
قسط نمبر: 49

شہزادہ زولفکار

اساتذہ

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تند و تیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابل شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پر عزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جا رہے تھے... اس کی زندگی جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جہنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قرار یوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمائے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تار عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ واردات قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہو سکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تحیر انگیز داستان



معاذ ایک ذہین لیکن متلون مزاج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جوائن کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ انسٹی ٹیوٹ سے واپس آ رہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو سڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی نڈر فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشری نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بشری ماس کیونی کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم وغیرہ لکھتی ہے۔ اس ویران جگہ بھی وہ ایک زیر تعمیر رہائشی منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی آئی تھی۔ معاذ بشری کو بہ حفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کر دیتا ہے لیکن جن رئیس زادوں سے اس نے ان کا شکار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ایک دن جنگل کی سیر کے دوران وہ فوٹو گرافی کے شوق میں سب سے الگ تھلک ہو جانے والے معاذ کو بے خبری میں گھر کر بری طرح زد و کوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دے دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس نہ آنے پر انتظامیہ کے افراد، پولیس اور ریسکیو ذرائع کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جوگی کی جھونپڑی میں پاتا ہے۔ جوگی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے، جوگی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نواز کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے پراسرار علم سکھانے کی ہامی بھر لیتا ہے اور معاذ اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ادھر جائے وقوعہ سے ملنے والے معاذ کے کیمرے سے جب تصویریں نکلوائی جاتی ہیں تو ایک ایسی تصویر بشری کی نظر میں آ جاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پروجیکٹ کے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشری تحقیق کر رہی تھی۔ بشری کے اپنے والد جرنلسٹ ہوتے ہیں۔ اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشری کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ صدمے سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باذل نامی شخص نے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشری انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دنوں میں ہی معاذ واپسی کا ارادہ کرتا ہے تاہم ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا عرفان اللہ اور یزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو وقاص نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باذل اچانک بشری کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر دیتا ہے۔ معاذ کو واپس لانے کے لیے اوجھے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اسے واپس آنے کا پیغام دیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کر کے اسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات کے نہ بتانے پر اس کے بھائی کا ایک گروہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشری بھی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہو جاتی ہے۔ معاذ کے دوست عالم شاہ کے بہنوئی کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ کئی ٹھون میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے پہنا تاڑ کر کے اس کے دماغ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ فیصو سے حاصل انوکھے علم کی بدولت ان کا معمول نہیں بنتا۔ عالم شاہ اور اس کا نوکر سرد، ہاذل کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ عالم شاہ، ہاذل کی قید میں موجود ایک زخمی شخص کی مدد سے وہاں سے فرار ہو جاتا ہے۔ ادھر بشری دہلی پہنچ جاتی ہے۔ وہاں وقاص اسے ہاربی کے روپ میں پہچان لیتا ہے۔ وہ سلطان کو مارنا چاہتی ہے۔ ادھر عالم شاہ، ہاذل کی قید سے نکل کر اس کا پیچھا کرتا ہے۔ وہ وہاں معاذ کو دیکھتا ہے۔ معاذ کو اس کے گھر والوں سے ملنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ وہ ایک مشن پر سونیا کے ساتھ انڈیا روانہ ہوتا ہے تاہم کچھ لوگ سکھ یا تریوں سے بھری بس کو یزغال بنا لیتے ہیں۔ معاذ اور سونیا تہ خانے کے تمام افراد کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔ عالم شاہ، سکل اور سرد انڈیا روانہ ہو جاتے ہیں۔ انٹرپورٹ سے گھر روانگی پر راستے میں کچھ لیرے انہیں لوٹ لیتے ہیں۔ گھر پہنچنے پر پولیس کی ریڈ ہوتی ہے اور وہ عالم شاہ اور سرد کو لے جاتے ہیں۔ عالم شاہ اور سرد کو تشدد کا نشانہ بنا کر ویرانے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ واپس اپنے میزبانوں کے ہاں پہنچ جاتے ہیں۔ انہیں پتا لگتا ہے کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں اجالا اور اس کا عاشق شامل ہوتے ہیں۔ وہ چھپ کر ان کی باتیں سن رہا ہوتا ہے کہ اسے چھاپ لیا جاتا ہے۔ تاہم وہاں مارا ماری ہوتی ہے اور اجالا کا عاشق مارا جاتا ہے۔ پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ ان کے کزن انہیں اپنے دوسرے خفیہ ہتھکنڈے پر پہنچا دیتے ہیں۔ وہ وہاں سے بحفاظت نکل جاتے ہیں۔ ادھر معاذ ایک مشن میں زخمی ہو جاتا ہے اور اسے ہندو سادھو اپنی کٹیا میں لے جاتا ہے جہاں اس کی اچھی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ سونیا کے آدمی معاذ کو تلاش کرتے ہیں مگر ناکام ہو جاتے ہیں۔ ادھر عالم شاہ اور سرد خفیہ ذریعے سے بارڈر پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ دھریے جاتے ہیں اور ”را“ کی قید میں پہنچ جاتے ہیں۔ بشری باذل کو مارنے کی کوشش میں خود نشانہ بن جاتی ہے۔ معاذ سادھو کی مدد سے ایک انڈین ہیروئن کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ وہیں اسے عالم اور سرد کی گرفتاری کا پتا چلتا ہے۔ معاذ ڈاکٹر فردوس سے ملتا ہے اور اسے سکل کی مدد کرنے کا کہتا ہے۔ علینہ اور وقاص وغیرہ کو لالہ عیسیٰ ملک سے باہر نکال دیتا ہے۔ علینہ پاکستان میں ٹویپ

سے رابطہ کرتی ہے جو ان کے لیے مصیبت بن جاتا ہے۔ ٹوبہ پر تیزاب پھینک دیا جاتا ہے۔ وقاص، علیہ اور اس کے گھروالوں کو مار دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس معاذ کو دیوانہ نامی شخص سے مدد لینے کا کہتی ہے۔ معاذ اپنے کزن کو پاکستان کال کرتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ اس کے گھروالوں کو مار دیا گیا ہے۔ وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کی ٹھان لیتا ہے۔ ادھر ڈاکٹر فردوس کو اس کے سسرال والے سبیل کو بھگانے کی پاداش میں تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ معاذ، عالم اور سرمد کی رہائی کے لیے کارروائی کرتا ہے اور انہیں ”را“ کی قید سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن عالم اور سرمد کو دیوا کے آدمی کسی دوسری جگہ پہنچا دیتے ہیں۔ سونیا معاذ کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ ادھر باذل ایک جگہ لالہ عیسیٰ کی موجودگی پر کارروائی کرتا ہے تاہم لالہ خود کو گولی مار کر ختم کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس کا انتقال ہو جاتا ہے۔ دیوا گینگ ڈاکٹر فردوس کی میت اٹھنے پر وہاں فائرنگ کر دیتے ہیں۔ پولیس دیوا کو گھیر لیتی ہے۔ معاذ دیوا اور اس کے آدمیوں کو نکالنے کے عوض عالم کا پتا معلوم کر لیتا ہے۔ سونیا اور معاذ حیدر آباد نواب بدر الدین کی حویلی پہنچ جاتے ہیں۔ وہ نواب صاحب کی حویلی میں عالم اور سرمد کی رہائی کے لیے کارروائی کر کے انہیں رہا کر لیتے ہیں۔ وہ لوگ نئے ٹھکانے پر پہنچتے ہیں تو وہاں معاذ سے ملنے جا رہا نامی شخص آتا ہے۔ اسے معاذ نے ”را“ کی قید سے نکالا ہوتا ہے۔ جا رہا اور معاذ، سبیل سمیت اسپتال جاتے ہیں اور پہچان لیے جانے پر پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ پولیس سے مقابلے کے بعد وہ ایک بستی میں پناہ کے لیے گھس جاتے ہیں اور دو لوگوں کو یرغمال بنا کر ان کی جھونپڑی میں قیام کرتے ہیں۔ ادھر سونیا معاذ کی تلاش میں نکلتی ہے اور اسے بستی میں پہنچنے پر معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ معاذ اور جا رہا وغیرہ انوپ نامی شخص کے ساتھ اس کے مالک کے بنگلے میں قیام کرتے ہیں۔ سونیا بھی معلومات حاصل کرتی ہوئی مذکورہ بنگلے تک پہنچ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور سرمد بھی سونیا کا پیچھا کرتے ہوئے وہیں پہنچ جاتے ہیں۔ ادھر لالہ، وقاص، علیہ و دیگر لوگ زندہ ہوتے ہیں۔ وقاص حلیہ بدل کر گلو کا باڈی گارڈ بنتا ہے۔ وہ معاذ کو تلاش کرنے کے لیے انڈیا روانہ ہوتا ہے۔ وہاں اس کی گل خان سے ملاقات ہوتی ہے اور معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ سونیا، معاذ اور دیگر ساتھیوں سے مل جاتی ہے تاہم وہ جس بنگلے میں ہوتے ہیں وہ دشمن کا ہوتا ہے۔ دشمن سب کو بے ہوش کر کے کہیں لے جا رہے ہوتے ہیں کہ ان کی گاڑی کو حادثہ پیش آ جاتا ہے۔ ان سب کو چینی بھکشو طبی امداد دیتے ہیں اور ان سے پوچھ گچھ کی جاتی ہے۔ سبیل کی حالت تشویشناک ہوتی ہے اور اسے وہاں موجود ایک وید دیکھتا ہے۔ ادھر لالہ واپس اپنے لوگوں میں پہنچ کر ایکشن میں آ جاتا ہے۔ باذل، معاذ وغیرہ کے ٹھکانے سے باخبر ہو جاتا ہے۔ باذل، معاذ کا پیچھا کرتا ہے اور چینیوں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ معاذ چینیوں کے ساتھ مل کر دشمنوں کے خلاف کارروائی کرتا ہے۔ ادھر لالہ عیسیٰ، اعظم کو دشمن کی گرفت سے نکالنے کے لیے کارروائی کرواتا ہے اور موسیٰ اور نیلی، اعظم کو نکالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ معاذ دشمنوں کے کیمپ پر حملہ کر کے وہاں قبضہ کر لیتا ہے۔ موسیٰ اور نیلی کی گاڑی پر حملہ ہوتا ہے تاہم مارا ماری کے بعد وہ صداقت شاہ کے پاس پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ لالہ عیسیٰ صداقت شاہ کو حویلی پر ریڈ کا بتاتا ہے۔ صداقت شاہ اعظم کے محفوظ ٹھکانے کے لیے قربان شاہ کو فون کرتے ہیں۔ اعظم کو وہاں سے نکال لیا جاتا ہے اور دوسری جگہ منتقل کر دیا جاتا ہے۔ ادھر معاذ بیجنگ پہنچ جاتا ہے اور وہاں کے کرتا دھرتاؤں سے بات کر کے پاکستان پہنچنے کی اجازت چاہتا ہے۔ ادھر موسیٰ اور نیلی کو پولیس گھیر لیتی ہے اور فائرنگ میں موسیٰ مارا جاتا ہے۔ وہ اعظم کو لے جاتے ہیں اور نیلی زخمی حالت میں ان کے قبضے میں آ جاتی ہے۔ معاذ اور وی وغیرہ پاکستان پہنچ جاتے ہیں اور اعظم کی بازیابی کے لیے منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ موسیٰ کی تدفین ہو جاتی ہے۔ ادھر باذل، لالہ کی قید سے بھاگ جاتا ہے۔ معاذ، ڈی ایس پی ظہیر کے بنگلے پر دھاوا بولتا ہے اور ڈی ایس پی کو قابو کرنے کے بعد اس سے معلومات لیتا ہے۔ وہ لوگ ظہیر خان کو لے کر وہاں سے نکل جاتے ہیں۔ باذل قید سے نکل کر مہناز کے پاس پہنچتا ہے اور اسے تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ نیلی قید میں موجود ظہیر کو ٹھکانے لگا دیتی ہے۔ بشری قبرستان جاتی ہے۔ وہاں اس کی دوست ملتی ہے۔ بشری اپنی دوست کے ساتھ جا رہی ہوتی ہے کہ باذل کے آدمی اسے اغوا کر لیتے ہیں۔ ادھر معاذ سارے معاملوں کو جلد حل کرنے کے لیے دشمن کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے مگر اس کے خیر خواہ اسے میڈم ایکس کے شکنجے سے نکال لیتے ہیں اور اعظم کو بھی بازیاب کر لیتے ہیں۔ دن ہوا اسے اپنے ساتھ لے جاتی ہے اور وہاں کرل سکندر بخت سے ملاقات ہوتی ہے۔ معاذ انہیں دشمنوں کے خلاف کارروائی کرنے کا کہتا ہے۔ باذل، بشری کو لے کر انڈیا گراؤنڈ ہو جاتا ہے۔ ادھر وقاص باذل کا پتا چلانے کے لیے ایک کال گرل سیسی کے گھر کارروائی کر کے باذل کے ٹھکانے پر پہنچ جاتا ہے۔ وہاں ویکی کے ساتھی اور کوئی اور گروپ حملہ کر دیتے ہیں۔ ویکی زخمی ہو جاتا ہے۔ ادھر باذل، عرفان اللہ کو گولی مار دیتا ہے اور خود بھی شدید زخمی ہو جاتا ہے۔ باذل کے ساتھی اسے ایک اسپتال کے آگے چھوڑ دیتے ہیں۔ وہیں ویکی اور بشری بھی داخل ہوتے ہیں۔ معاذ باذل کو پہچان کر اسے بھی وہیں ایڈمٹ کر دیتا ہے۔ عرفان اللہ جاں بحق ہو جاتا ہے۔ عرفان اللہ کی سیکریٹری صوفیہ کو خفیہ ادارے کے لوگ اٹھا لیتے ہیں لیکن صوفیہ وہاں اپنی جان دے دیتی ہے۔ صداقت شاہ اور ان کی اہلیہ سبیل کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ عالم، نیلی اور اعظم بھی وہیں ہوتے ہیں۔ سبیل اسپتال میں زیر علاج ہوتی ہے۔ باذل کو معذوری کی حالت میں ایک چوک پر پھینک دیا جاتا ہے۔ معاذ، وقاص وغیرہ کے ساتھ علیہ کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ وہاں سے اگلے مشن پر جانا ہوتا ہے۔ سونیا قانون کی قید سے بھاگ نکلتی ہے۔ سبیل کی طبیعت بگڑ جاتی ہے۔ یو آن منگ، اینڈریو کے ذریعے سبیل کے آپریشن کی تجویز دیتا ہے۔ عالم نہ چاہتے ہوئے بھی راضی ہو جاتا ہے۔ سبیل کا آپریشن کامیاب رہتا ہے تاہم اس کا ایک ہاتھ اور نچلا دھڑنا کارہ ہو جاتا ہے۔ ادھر معاذ کشمیر پہنچ جاتا ہے۔ ایک کشمیری لڑکی کی مدد کرنے کی پاداش میں بھارتی سپاہی اسے گرفتار کرنے بجائے من کی دکان پر ریڈ کرتے ہیں۔

بھارتی فوجی اپنے سپاہی کے قاتل کی تلاش میں
بنجامن کی دکان تک آگئے تھے۔

”ہیلو سر! کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں؟“
بنجامن جو اس سے بھی پہلے ان لوگوں کے استقبال کے لیے
کھڑا ہو چکا تھا، عاجزی سے پوچھنے لگا۔

”عمار کون ہے تمہارے ایملپلٹر میں؟“ درشت
لہجے میں کیا گیا سوال جہاں اس کی ریڑھ کی ہڈی میں
سنسناہٹ دوڑا گیا وہیں بنجامن کے چہرے کی رنگت بھی
تبدیل ہوئی۔

”میں عمار ہوں۔ فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا
ہوں؟“ اس سے ضبط نہیں ہوا اور دو قدم مزید آگے آیا۔
”خدمت کے بچے! چل کر بیٹھ گاڑی میں۔ آج ہم
خود تیری خدمت کریں گے۔“ اس کا لہجہ مزید جارحانہ
ہو گیا۔

”پر اس نے کیا کیا ہے؟ یہ تو بہت شریف اور کام سے
کام رکھنے والا نوجوان ہے۔“ بنجامن نے ایک بار پھر ان
لوگوں سے بات کرنے کی کوشش کی۔

”پچھتے ہو۔ یہ نہ ہو کہ ایک دہشت گرد کی طرفداری
کرنے کے جرم میں، میں تمہیں بھی اریسٹ کر سکتا ہوں۔“
اس نے بنجامن کو جھڑکا۔ اس کی زبان سے نکلا دہشت گرد کا
لفظ اتنا ہولناک تھا کہ ہر شخص ہی اپنی جگہ لرز کر رہ گیا اور
نہایت ترحم سے اس نوجوان کو دیکھا جو چند دن کے ساتھ
میں ہی اپنا اپنا سا لگنے لگا تھا۔

☆☆☆

”تو تم پاکستان آرمی کی قید سے فرار ہو کر جامی تک
پہنچی تھیں اور اس نے سمندر کے راستے تمہیں غیر قانونی طور
پر یہاں بھجوا دیا؟“ وہ ڈیوڈ کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی اور وہ
اس سے طنز پر لہجے میں مخاطب تھا۔

”کوئی شک؟“ وہ سونیا تھی۔ اس کے لہجے پر کنفیوز
ہوئے بغیر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا۔

”شک تو ہے پر مسئلہ یہ ہے کہ تمہارے پاس خود کو سچا
ثابت کرنے کے لیے ثبوت پورے ہیں۔“ ڈیوڈ نے اپنا
لہجہ تبدیل نہیں کیا۔

”بس تو پھر بہتر ہے کہ تم اپنا منہ بند ہی رکھو۔“ اس
نے ڈیوڈ کی عمر کا لحاظ رکھنا ضروری نہیں سمجھا۔

”نہیں رکھ سکتا میں اپنا منہ بند۔ تم ماں بیٹی کی حماقتوں
کی وجہ سے میرا یہاں بنا بنایا سیٹ اپ تباہ ہو گیا ہے۔ سب
سے بڑھ کر کثیر سرمایہ لگا کر قائم کی جانے والی وہ لیب تباہ ہو گئی

ہے جہاں پروفیسر اینڈریو بے حد اہم تجربے میں مصروف تھا
اور کامیابی کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔“ ڈیوڈ کا چہرہ لال بھوکا
ہو گیا اور اس کے غصے کی وجہ بھی سامنے آگئی۔

”غیر یقینی حالات بھی بھی پیش آسکتے ہیں۔ یہ تمہاری
ذمے داری تھی کہ ہر طرح کے حالات سے نمٹنے کا انتظام
کر کے رکھتے۔“ ڈیوڈ کے غصے کی شدت اس کے اطمینان پر
اثر انداز نہ ہو سکی۔

”یہ تم اور تمہاری ماں تھیں جن کی وجہ سے وہ باسٹرڈ
معاذ یہاں تک پہنچا اور اس نے سب تباہ کر کے رکھ دیا۔ اگر
تمہاری ماں اسے پوری طرح ٹریننگ دینے اور اپنا وفادار
بنانے میں ناکام رہی تھی تو اسے میدان میں کیوں اتارا تھا؟
لیکن وہ کیا خاک اس لڑکے کی تربیت کرتی، اس سے تو اپنی
بیٹی بھی نہ سنبھالی گئی۔ اس لڑکے کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن کر تم
نے تنظیم کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے اور مجھے یقین ہے
کہ تم اب بھی اسی کے ہاتھوں میں کھیل رہی ہو۔“ ڈیوڈ نے
اسے آئینہ دکھانے کی کوشش کی۔

”تم یہ سب کہہ سکتے ہو لیکن جو مجھ پر گزری ہے، وہ
شاید ہی کوئی سمجھ سکے۔ تنظیم سے غداری کا داغ اپنے دامن
پر برداشت کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ وہ بھی اس
صورت میں کہ میری ماں اور میں نے اپنی پوری پوری زندگی
تنظیم کو دی ہے۔ ہماری طرف انگلی اٹھانے سے پہلے تم یہ تو
دیکھ لیتے کہ ہمارا سب کچھ تنظیم کا ہے۔ نہ ہم نے کبھی اپنی
ذات کے لیے کچھ کمایا، نہ دنیا کے کسی حصے میں جائیدادیں
کھڑی کیں، نہ کبھی اپنی خواہش سے کسی تفریح کے لیے گئے،
نہ خود کو محبت کرنے یا اپنی پسند سے شادی کرنے کا حق دیا۔
دیکھو میری طرف.....“ اس نے بلند آواز میں کہتے ہوئے
انگوٹھے سے اپنے سر اپا کی طرف اشارہ کیا۔

”مجھ جیسا حسن دنیا میں کتنی عورتوں کو نصیب ہوتا
ہے؟ میں کسی راستے پر چلوں تو لوگ گردن موڑ موڑ کر میری
طرف دیکھتے ہیں لیکن میں نے صرف اور صرف تنظیم کے
مفادات کی خاطر عین نوجوانی میں اس موڑے، بھدے، کم
عقل، کم شکل اور عمر دراز داراب خان سے شادی کرنا قبول
کر لیا تھا۔“

”اور یقیناً اسی محرومی کو مٹانے کے لیے ایک نوجوان
اور خوب صورت لڑکے پر مرثیں؟“ ڈیوڈ کو ایک بار پھر طنز و
تشنیع کا موقع مل گیا۔

”شٹ اپ!“ سونیا اس کی بات سن کر پہلے غرائی پھر
پست لہجے میں بولی۔

”وہ کوئی عشق و شوق نہیں تھا۔ میں ٹرانس میں تھی۔ اس نے میرے ساتھ کچھ ایسا کیا تھا کہ میرا دماغ میرے بس میں نہیں تھا۔“

”تم کہنا چاہتی ہو کہ وہ کوئی پینٹسٹ یا جادوگر ہے؟“

ڈیوڈ نے اپنی ایک ابرو چڑھائی۔
”مجھے نہیں پتا کہ وہ کیا ہے لیکن کچھ تو ہے جو کبھی کسی کے قابو میں نہ آسکا۔ پروفیسر وکٹر نے اس پر کتنا کام کیا لیکن ہم کبھی اسے اپنی مرضی پر نہ چلا سکے۔ یہاں تک کہ وکٹر کی وہ خاص ڈیوائس بھی اس کے آگے ٹیل ہو گئی جو دماغ کے سگنل وصول کر کے کسی شخص کا کھوج لگانے میں مدد دیتی ہے۔ وہ زندہ تھا اور ہمارے ساتھ ایک ہی شہر میں موجود تھا لیکن اس کے غائب ہونے پر ڈیوائس نے ہمیں کوئی سگنل نہیں دیا۔ ہم اپنے تمام وسائل استعمال کر کے بھی اسے تلاش نہیں کر سکے اور نہ ڈیوائس نے کوئی اشارہ دیا تھا۔ کبھی کبھی تو ایسا لگتا تھا کہ وہ زندہ ہی نہیں ہے لیکن وہ زندہ تھا اور ہمارے خلاف مسلسل کارروائیاں کر رہا تھا۔“ وہ ذرا سانس لینے کو رکھی۔

”اور تم..... تم جو مجھے اتنی باتیں سنارہے ہو، تم اس کے خلاف کیا کر سکتے؟ وہ تمہاری ساری محنت برباد کر کے خود چائنا کی گود میں جا بیٹھا اور تم یہاں اپنے زخموں کو چائے محض مجھ پر طنز اور الزامات کی بوچھاڑ کرنے کے لیے بیٹھے رہ گئے۔“ اس بار اس نے ڈیوڈ کی ٹھیک ٹھاک کلاس لے لی۔

”چائنا کا رویہ بہت عجیب ہے۔ ایک طرف وہ ہمارے ملک سے تجارتی اور کاروباری معاہدے کر رہا ہے تو دوسری طرف ہمارے مخالفین کی پشت پناہی بھی کر رہا ہے۔ لیپ کی تباہی ہمارا بہت بڑا نقصان ہے۔ حالات ایسے ہو گئے تھے کہ جو کچھ بچا، ہمیں خود ختم کرنا پڑا۔ وہ سارے مغوی جوان بر فانی پہاڑی غاروں میں چھپے ہوئے تھے اور وہ جو کمک لینے کے لیے لکے تھے، سب کو جن جن کر ہلاک کرنا پڑا۔ اگر ہم ایسا نہیں کرتے اور وہ ہمارے کسی مخالف یا سرپھرے صحافی سے جا کراتے تو بڑی مشکل ہو جاتی۔ بھارتی سرکار نے تو صاف ہاتھ اٹھا لیتا تھا کہ انہیں ان سارے معاملات کی کوئی خبر نہیں۔“ ڈیوڈ نے اپنے دکھڑے رونے شروع کر دیے۔

”یہی میں تمہیں سمجھانا چاہ رہی ہوں۔ نقصان دونوں کا ہوا ہے تو کیا بہتر نہیں ہے کہ ہم ایک دوسرے کو الزام دینے کے بجائے دشمن کے خلاف مل کر کارروائی کریں؟“

سونیا نے اس بار اپنا لہجہ نرم کر لیا۔

”میں تم لوگوں کو الزام اس لیے دیتا ہوں کہ رائیل سے انتخاب میں غلطی ہوئی ہے۔ اس نے ہم سب کے لیے ایک مصیبت کو جن لیا ہے۔“ ڈیوڈ کو میڈم ایکس سے پرانی پر خاش تھی جو اسے اس کے خلاف بولنے سے روک نہیں پاتی تھی۔

”چنا تو انہوں نے ایک نایاب ہیرا ہی تھا، وہ اور بات کہ ہمارے پاس ایسے قابل جو ہری ہی نہیں تھے جو اسے تراش پاتے۔“

”تم بہت متاثر ہو اس سے؟“ ڈیوڈ کو میڈم ایکس کے حق میں دی گئی دلیل میں بھی اس کا معاذ سے عشق دکھائی دیا۔
”جب تک مخالف کی خوبیوں کو تسلیم نہ کیا جائے، اس سے مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ جب آپ مان لیتے ہیں کہ وہ کس لیول پر کھڑا ہے تب ہی اس کے لیول کے مقابلے کی تیاری کرتے ہیں۔“ سونیا نے اس بار بھی بردباری کا مظاہرہ کیا۔

”شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میں تم سے مزید بحث نہیں کروں گا کیونکہ اصل جوابدہی تو تمہیں تنظیم کے بڑوں کے سامنے ہی کرنی ہے اور اس کے لیے تم جانے ہی والی ہو۔“ ڈیوڈ نے اپنی کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھا۔
”میں تمہاری مشکور ہوں کہ تم نے میری فرمائش پر پہلے ہی سے سارے انتظامات کر رکھے تھے۔“

”اٹس اوکے۔ یہاں کوئی کام انجام دینا میرے لیے اتنا ہی آسان ہے جتنا اپنے ملک میں ہو سکتا ہے۔“ ڈیوڈ نے بے نیازی سے شانے اچکا کر جواب دیا۔ وہ اپنے اس رویے میں حق بجانب تھا۔ سونیا کی آمد سے پہلے اس کے لیے پاسپورٹ، ٹکٹ اور دوسرے سفری دستاویزات کا انتظام اس نے محض چند فون کالز پر ہی کر ڈالا تھا اور اب وہ چند گھنٹوں کے آرام کے بعد مزے سے اڑان بھرنے کے لیے تیار تھی۔

”ایسا ہی سیٹ اپ ہمارا پاکستان میں بھی تھا جسے شدید نقصان پہنچا ہے لیکن خیر، کوئی بات نہیں۔ ہم دوبارہ سب ٹھیک کر لیں گے۔ ہماری جڑیں اب بھی وہاں موجود ہیں۔ ان جڑوں سے تنا، شاخیں اور پھول پتے پھوٹنے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔“ اس نے جانے ڈیوڈ کو تسلی دی یا خود کو۔

”تمہاری فلائٹ کا وقت ہونے والا ہے۔ تمہیں اب ایئرپورٹ کے لیے نکل جانا چاہیے۔“ اس بار ڈیوڈ نے بحث سے گریز کیا اور ایک بار پھر کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے اس سے سنجیدگی سے بولا۔

”او کے..... گڈ بائے۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ڈیوڈ نے اس سے ہاتھ ملایا۔ باہر ڈرائیور گاڑی سمیٹ اس کا منتظر تھا۔ ائرپورٹ کی طرف جاتے ہوئے اسے وہ سارا وقت یاد آیا جو اس نے معاذ کے ساتھ انڈیا میں داخل ہونے کے بعد گزارا تھا۔ اسے اپنے اشاروں پر چلانے کی کوشش، اس کا بار بار جل دے جانا اور پھر گڈھے کے سر پر سے سینک کی طرح غائب ہو جانا۔ اس کے غیاب کے عرصے میں وہ اس کی تلاش میں کیسے ماری ماری پھری تھی۔ اسے سب یاد تھا۔ معاذ کی تلاش کے اس عرصے میں ہی اس نے اس کے لیے اپنے جذبات کو ٹٹولا تھا اور دھیرے دھیرے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا کہ وہ اس کی محبت میں مبتلا ہو گئی ہے۔ موقع ملنے پر وہ اس پر اپنے ان جذبات کو ظاہر بھی کر گئی تھی لیکن معاذ کے پاس جواب میں اس کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ تو اس عورت کے سحر میں مبتلا تھا جو اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھی۔ وہ خود پسندی کو ایک طرف رکھ کر حقائق کی آنکھ سے بھی دیکھتی تو سبیل شاہ کو حسن، تعلیم، ذہانت اور دیگر صلاحیتوں میں خود سے بہت پیچھے پاتی تھی۔

سبیل شاہ میں تھا ہی کیا؟ ایک دولت مند گھرانے کی عام سی لڑکی جسے اس دنیا کے بارے میں ڈھنگ کی معلومات بھی نہیں تھیں۔ جس نے اپنی عمر کا بڑا حصہ چادر اور چار دیواری میں گزارا تھا اور جو کبھی معاذ کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی تھی لیکن معاذ کی آنکھوں میں دیکھو تو بس وہ ہی دکھائی دیتی تھی۔ ایک ایسے نمٹ نقش کی صورت جسے سونیا کا چکا چوند کر دینے والا حسن بھی ماند نہیں کر سکتا تھا۔

”میڈم!“ ائرپورٹ پہنچ کر ڈرائیور نے اسے پکارا تو وہ اپنی سوچوں سے نکل کر ماحول میں واپس آئی۔

”ٹھیک ہے، تم واپس چلے جاؤ۔“ اپنا چھوٹا سا سفری بیگ لے کر گاڑی سے باہر نکلتے ہوئے اس نے ڈرائیور کو حکم دیا۔ اس نے ساری زندگی اسی طرح سفر کیا تھا کہ کبھی کہیں کوئی اپنا اسے رخصت کرنے یا استقبال کے لیے موجود نہیں ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ اس کا نام نہاد شوہر داراب خان بھی نہیں جس نے اس کے بے تحاشا حسن سے متاثر ہو کر اسے اپنی زندگی میں شامل تو کر لیا تھا لیکن اپنی عیاشی کے علاوہ اس کے پاس بھی اتنی فرصت نہیں تھی کہ اس کے اس طرح کے نازنخرے اٹھا سکتا۔

”یہ نازنخرے ایک عام سی گھریلو عورت کے عام سے شوہر ہی اٹھاتے ہیں سونیا بی بی! کسی سیکرٹ ایجنٹ کو یہ سب نہیں ملتا۔ اگر ملے بھی تو اس میں حقیقت سے زیادہ

دکھاوا ہوتا ہے اور دونوں فریقین میں سے کوئی ایک لازماً دوسرے کو دکھ دے رہا ہوتا ہے۔“ کسی نے اس کے اندر سے ہی سرگوشی کر کے اسے آئینہ دکھایا لیکن اس کے پاس سر جھٹک کر آگے بڑھ جانے کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ ائرپورٹ کے جگمگاتے ماحول میں سنہری بالوں والی وہ لڑکی جس نے ہاف آستیموں والے سنہری بلاؤز کے ساتھ سیاہ لانگ اسکرٹ پہن رکھا تھا، حسب معمول کئی نظروں کو اپنی طرف مرکوز کیے ہوئے تھی لیکن حسن کی آنکھوں میں حسب روایت بے نیازی تھی۔ مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے ڈیپارچر لاؤنج کی ایک کرسی پر بیٹھنے تک اس کا یہ انداز برقرار رہا۔ اس کی فلائٹ میں ابھی کچھ وقت تھا۔ اس نے یونہی وہاں موجود افراد پر ایک نظر دوڑائی تو ایک شناسا چہرے نے توجہ کھینچی۔ چونکی یوں کہ چہرہ بے ٹک شناسا تھا پر انداز اجنبی۔

☆☆☆

”سنا ہے تم کئی برس پہلے اپنے گھر سے غائب ہو گئے تھے اور اب واپس آئے ہو تو تمہاری یادداشت غائب ہو چکی ہے۔ تمہیں اپنے بارے میں کچھ بھی ٹھیک سے یاد نہیں ہے۔“ اسے بنجامن کی دکان سے گرفتار کر کے آرمی کے ایک مرکز میں لایا گیا تھا اور آنے کے ساتھ ہی ہتھکڑیوں میں جکڑے ہاتھوں کے ساتھ ایک جوان افسر کے سامنے پیش کر دیا گیا تھا۔ افسر کے پاس اس سے متعلق تفصیلات پہلے ہی موجود تھیں جن کی روشنی میں وہ اس سے مخاطب تھا۔

”جو کچھ آپ فرما رہے ہیں، مجھے بھی اپنے بارے میں یہی معلوم ہے۔“

”مطلب؟“ اس کی بے نیازی سے دیے جواب پر آفیسر نے ایک آئی برو اچکائی اور وضاحت طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”مطلب یہ کہ مجھے اپنے ماضی کے متعلق کچھ یاد نہیں ہے۔ مجھے اپنے بارے میں بس اتنا یاد ہے کہ میں زندگی گزارنے کے لیے محنت مزدوری کرتا تھا اور رزق کی تلاش میں ایک جگہ سے دوسری جگہ بھٹکتا پھرتا تھا۔ خانہ بدوشی کی اس زندگی میں ایک دن مجھے ایک اچھا آدمی مل گیا۔ اس آدمی کو بھی جانے مجھ میں ایسا کیا نظر آیا کہ وہ مجھ پر مہربان ہو گیا۔ اس نے مجھے اپنے پاس ملازمت بھی دی اور تعلیم اور ہنر بھی۔ مجھے اپنے بارے میں جس تو تھا کہ میں کون ہوں؟ میرا گھر کہاں ہے، ماں باپ کون ہیں؟ وغیرہ وغیرہ..... لیکن میں اس شخص کی ملازمت میں خوش تھا۔ ایک دن اتفاق سے

وہاں جبار علی نامی ایک شخص آیا اور مجھے کافی دیر گھور گھور کر دیکھنے کے بعد مجھ سے پوچھا کہ تم عمار ہونا؟ میں کیا جواب دیتا۔ مجھے تو خود اپنے بارے میں کچھ یاد نہیں تھا لیکن میں سمجھ گیا کہ وہ کوئی ایسا شخص ہے جو مجھے اور میرے ماضی کو جانتا ہے۔ ”وہ سانس لینے کے بہانے رکا اور دزدیدہ نظروں سے آئینہ کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ وہ بہت محل سے اس کی داستان سن رہا تھا اور ابھی تک کسی جارحانہ رویے کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ اسے گرفتار کر کے لانے والے سپاہیوں کا رویہ البتہ معاندانہ رہا تھا اور گرفتاری کے وقت اس کی طرف سے کسی مزاحمت کا مظاہرہ نہ ہونے کے باوجود انہوں نے اسے راستے میں زد و کوب کرنے کی کوشش کی تھی لیکن چونکہ وہ خاموش رہا تھا اور جواب میں کسی رد عمل کا مظاہرہ نہیں کیا تھا تو ان کے غصے کو ہوا نہیں مل سکی تھی اور وہ اسے صحیح سلامت یہاں تک لے آئے تھے۔

”میں نے جبار علی کو صاف بتا دیا کہ میں اپنی یادداشت کھو چکا ہوں اور مجھے بالکل یاد نہیں کہ میں عمار ہوں یا کوئی اور۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ تم عمار ہی ہو جو ایک دن اچانک اپنے والدین کو چھوڑ کر چلے گئے تھے اور تب سے اب تک ان پیاروں کو تمہاری کوئی خبر نہیں ہے۔ پھر وہی مجھے آغا جان اور بی بی کے پاس لے کر آیا۔ ان دونوں کے خلوص اور پیار نے مجھے یقین دلادیا کہ میں ان کا کھویا ہوا بیٹا عمار ہی ہوں۔ فرض کریں کہ اگر میں عمار نہیں بھی ہوں تو مجھ جیسے بے گھر اور بے نشان شخص کے لیے کیا برا ہے کہ اسے ایک گھر اور چاہنے والے ماں باپ مل گئے ہیں۔“ اس نے بے حد سادگی سے اپنی پوری داستان کہہ سنائی۔

”یہ جبار علی کون ہے؟“ افسر کا یہ سوال ایک ہل کے لیے اسے خاموش کر دیا لیکن پھر متانت سے بولا۔

”مجھے معلوم ہے کہ اس سوال کا درست جواب میرے حق میں نہیں ہے لیکن میں آپ کو وہی بتاؤں گا جو سچ ہے۔ جبار علی، آغا جان کے پرانے جاننے والوں میں سے ہے۔ شاید کوئی رشتے داری بھی ہے لیکن آغا جان نے مجھے بتایا کہ وہ بہت عرصے بعد ان سے ملنے آیا تھا اور انہیں اس کی آمد حیران کر گئی تھی کیونکہ اس کے متعلق انہیں یہی خبر ملی تھی کہ وہ حریت پسندوں میں شامل ہو گیا ہے۔ بہر حال اس نے مجھے آغا جان کے حوالے کیا اور پہلے ہی کی طرح پھر غائب ہو گیا۔“ وہ جانتا تھا کہ وہ لوگ اس کے متعلق ساری معلومات جمع کر کے بیٹھے ہوں گے اس لیے اسے اپنے متعلق وہی بتایا تھا جو بہت سے دوسرے لوگ بھی جانتے تھے۔

”سنا ہے تم بھی ان آئنگ بادیوں میں شامل ہونے کی نیت سے ہی گھر سے بھاگے تھے اور پھر تمہاری کوئی خبر نہیں ملی تھی؟“ اس سوال کو کرتے ہوئے افسر کے خاص طور پر اپنی نظریں اس کی نظروں میں گاڑ دی تھیں۔ یوں جیسے اس کے اندر کی گہرائیوں سے کچھ کھوج لائے گا۔

”آپ کی طرح میں نے بھی یہ بات بس سنی ہی ہے۔ مجھے خود تو اپنے بارے میں جتنا یاد ہے، وہ یہی ہے کہ میں سر کی چھت اور روٹی کے لیے بھاگ دوڑ کرتا ایک بے نام و نشان انسان تھا جسے ایک بھلے آدمی نے سہارا دے کر اس کی زندگی کو آسان بنا دیا۔“

”اس بھلے آدمی کا نام؟“

”مسٹر جونا تھن..... دہلی کے ایک کاروباری آدمی ہیں اور کاروبار کے سلسلے میں ان کا یہاں بھی آنا جانا لگا رہتا ہے۔“ اس نے بتایا تو افسر نے گردن کو یوں جنبش دی جیسے وہ یہ بات پہلے سے ہی جانتا ہو اور یقیناً وہ جانتا تھا۔ اس کے بعد بھی اس نے اس کے متعلق کئی ایک سوال کیے جن کے جوابات وہی تھے جو پہلے ہی ہر ایک کے علم میں تھے۔

”اوکے۔ میں مانتا ہوں کہ تم نے میرے کسی سوال کے جواب میں جھوٹ نہیں بولا۔“ اٹکل بنجامن نے تمہاری سفارش کی ہے اور اس بات کا دشا اس دلایا ہے کہ رات کو تم ان کے گھر ہی تھے اور جو کچھ پیش آیا، اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔“ وہ کچھ الجھا الجھا سا تھا۔

”اٹکل بنجامن میرے بابا کے اچھے دوست ہیں اور یہ انہی کے کارن ہے کہ تمہیں یہاں لانے کے ساتھ ٹارچر سیل میں بھجوانے کے بجائے میں نے اپنے پاس بلوایا ہے۔ ظاہر ہے تم سچے بھی ہو اور تمہارے ہر سچ کا ثبوت بھی ہے پر جانے کیوں کچھ ایسا ہے جو من میں کھٹکتا ہے اور تمہیں سچا ماننے سے روک رہا ہے۔“ اس کی ابھمن کی وجہ سامنے آ گئی۔

”میں آپ کی حراست میں ہوں۔ آپ اپنا پورا اطمینان کر لیں۔“ اس نے سکون سے جواب دیا لیکن دل ہی دل میں اس شخص کی چھٹی حس کو داد دے رہا تھا کہ وہ سکا جو سب ٹھیک نظر آتے ہوئے بھی اس کے اندر کی گڑبڑ کو بھانپ گیا تھا۔

”ہمیں جو کرنا ہے وہ کر لیں گے، پر ابھی تم یہ بتاؤ کہ حاجی شیر خان کی بیٹی سے تمہارا کیا سبب بندھ ہے؟“

”کون..... پری وٹ؟“ اس نے افسر کے اچانک موضوع بدلنے پر گویا چونک کر سوال کیا۔

”ہاں، شاید یہی نام ہے اس لڑکی کا۔“ اس نے

سامنے بڑے کاغذات پر ایک نظر ڈال کر خود کو انجان ظاہر کرنے کی کوشش کی حالانکہ یہ طے تھا کہ جس کے پیچھے یہ سارا ہنگامہ ہوا تھا، اب تک انہیں اس کا نام کیا، پورا تجربہ نسب معلوم ہو چکا ہوگا۔

”میں نے سنا ہے کہ ماضی میں میرے اور پری دیش کے رشتے کی بات چلی تھی۔ میری آمد کے بعد آغا جان اور بی بی دوبارہ سے یہ بات چھیڑنا چاہتے تھے لیکن میں نے انہیں روک دیا تھا۔“

”کیوں، کیا تمہیں وہ لڑکی پسند نہیں تھی؟“

”پسند کی بات نہیں ہے۔ میرا ماننا ہے کہ آدمی شادی جب کرے جب وہ اچھی طرح سیٹ ہو اور بیوی بچوں کو اچھی زندگی دے سکے۔ میری ابھی نئی نئی نوکری لگی ہے۔ سیرلی اتنی زیادہ نہیں ہے۔ مجھے پہلے گھر کی مرمت کروانی ہے۔ ساتھ آمدنی بڑھانے کے لیے ہاتھ پیر مارنے ہیں۔ ایسے میں، میں شادی کا ڈھول کیسے گلے میں ڈالوں؟“ اس نے اپنی شادی نہ کرنے کی وجوہات بیان کیں۔

”ہوں..... یہ تو ٹھیک سوچ رہے ہو تم۔“ افسر نے اس کی تائید کی لیکن انداز سے ظاہر تھا کہ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا ہے۔

”ٹھیک ہے، ابھی تم ویٹ کرو۔ اکل بنجامن وکیل کو تمہاری نیل کے پیر زدے کر بیچنے والے ہوں گے۔ وہ پہنچ جائیں تو پھر تم یہاں سے جاسکتے ہو۔“ سوچ بچار کے بعد اس نے جو فیصلہ سنایا، اسے سن کر اس کا دل چاہا کہ ایک زوردار ”یا ہو“ کا نعرہ لگائے۔ ایک مشکل ترین مرحلے سے وہ اتنی آسانی سے گزر جانے کی امید نہیں کر رہا تھا۔

”لیکن یاد رہے کہ یہ تمہاری ٹیمپری نیل ہے۔ ہمیں اطلاع دیے بغیر تمہیں شہر سے باہر جانے کی اجازت نہیں ہوگی۔“ افسر کی زبان سے نکلا اگلا حکم اس کی مسکراہٹ کو سکیر گیا۔

☆☆☆

”اعظم، اعظم..... رک جاؤ بیٹا! بہت شرارتی ہو گئے ہو آپ۔“ نیلی کھٹکھٹا کر ہنستے اعظم کے پیچھے آوازیں دیتے ہوئے جاری تھی اور وہ شرارت میں مزید تیز جیز بھاگتا جا رہا تھا۔

”بس پکڑے گئے بچو! اب نہیں بھاگ سکتے۔“ آخر کار نیلی نے اسے جالیا اور اس کی دونوں بظلوں میں ہاتھ ڈال کر اسے گود میں اٹھالیا۔

”وہ..... وہ۔“ گود میں آنے کے بعد اس نے نیچے اترنے کی کوشش نہیں کی اور انگلی سے ایک سمت اشارہ کرنے

لگا۔ نیلی نے دیکھا کہ وہ ایک پاپ کارن کا اسٹال تھا جہاں سے کئی بچے بھی پاپ کارن لے رہے تھے۔

”ٹھیک ہے۔ چلو دلاتے ہیں آپ کو۔“ وہ اسے لیے ہوئے اسٹال کی طرف چلی گئی۔ وہ لوگ اس وقت ایک پبلک پارک میں آئے ہوئے تھے۔ سب کے اسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد آج پہلی بار اعظم کو گھمانے کے بہانے باہر نکلا گیا تھا ورنہ اب سے پہلے تو بس اسپتال اور قیام گاہ کے درمیان ہی چکر لگتے رہتے تھے۔

”چلو آؤ۔ اب آپ کی ماما کے پاس چلتے ہیں۔ اتنی دیر سے وہ اکیلی بیٹھی ہوئی ہیں۔“ پاپ کارن لینے کے بعد وہ اعظم کو لیے پارک کے اس گوشے میں پہنچ گئی جہاں سبیل ایک وکیل چیئر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ہاں اب وہ وکیل چیئر پر تھی۔ وہ نازک آپریشن جس میں اس کی جان چلی جانے کا اندیشہ تھا، اس کی جان تو بخش گیا تھا لیکن نچلے دھڑ کی معذوری ہمیشہ کے لیے معذور ہو گئی تھی۔ البتہ وہ ہاتھ جو آپریشن سے پہلے ہی ناکارہ ہو چکا تھا، اس کے سلسلے میں ڈاکٹر نے امید دلائی تھی کہ دواؤں اور فزیو تھراپی کی مدد سے حرکت کرنے کے قابل ہو جائے گا۔

”کیا سوچ رہی ہیں؟“ وہ سبیل کے قریب پہنچے تو اسے اپنے آپ میں کم پا کر نیلی نے اسے متوجہ کرنے کے لیے اس سے پوچھا۔

”بس یونہی تمہاری اور اعظم کی ہانڈنگ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ تمہارا ہماری زندگی میں آنا ہمارے لیے ایک نعمت ثابت ہوا ہے۔ اعظم تمہارے ساتھ اتنا مالوس ہو گیا ہے کہ مجھے اس بات کی فکر نہیں ہوتی کہ میں اپنے بیٹے کی ضرورتیں اور خواہشیں پوری نہیں کر سکتی۔ تم کسی ماں کی طرح ہی قدم قدم پر اس کے ساتھ موجود ہوتی ہو۔ سبیل تو اب یہ مجھ سے زیادہ تم سے مالوس ہو گیا ہے۔“ سبیل نے پاپ کارن کھانے میں مگن اعظم پر ایک محبت بھری نگاہ ڈالتے ہوئے اسے جواب دیا۔

”ماں کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔ جو کچھ میں کر رہی ہوں، وہ تو کوئی بھی تنخواہ دار ملازمہ کر سکتی ہے۔“ نیلی نے بے پروائی سے اس کی بات کا جواب دیا۔

”فضول مت بولو۔ ملازمہ خدمت بے شک کر سکتی ہے لیکن اتنی محبت نہیں کر سکتی جتنی تم اعظم سے کرتی ہو۔ تمہارے ہونے سے میری معذوری اور بے بسی کا احساس مائل پڑ جاتا ہے۔“ اس بار سبیل کے لہجے میں ہلکی سی یاسیت تھی۔ اس نے اپنی معذوری کو بہت صبر کے ساتھ قبول کیا تھا

کی خاطر کیا تھا اس نے۔ یہ اور بات کہ دوسری طرف سے اس رشتے کو نبھانے کی نیت ہی نہیں تھی۔
”اعظم کا تو میں ایسے بھی ساری زندگی خیال رکھ سکتی ہوں۔“ وہ سچل کے ساتھ اس لب و لہجے میں نہیں بول پارہی تھی جس میں عالم سے پیش آئی تھی۔

”لیکن ہم تمہیں ایک حیثیت دینا چاہتے ہیں۔ ایسی حیثیت جس میں تمہاری خوشیوں کی بھی ضمانت ہو۔ میرے ادا سائیکس بہت نیک دل انسان ہیں نیلی! میں ان کی بہن بن کر نہیں بلکہ تمہاری دوست بن کر تمہیں مشورہ دے رہی ہوں کہ ایسے شخص کو رد نہ کرو۔“

”دل کے تو معاذ بھائی بھی بہت اچھے ہیں۔ اگر وہ واپس آجائیں تو کیا آپ انہیں قبول کر لیں گی؟“ نیلی نے جواباً اس سے ایک ایسا سوال کر ڈالا جس پر وہ ایک پل کے لیے سناٹے میں آگئی پھر سنبھل کر بولی۔

”اگر میں اس وکیل چیئر پر نہ بیٹھی ہوتی تو ان کا ساتھ میرے لیے باعثِ فخر ہوتا لیکن اب اس ادھورے وجود کے ساتھ میں ایک بوجھ کے سوا کچھ نہیں ہوں۔“

”محبت کرنے والے محبوب کا بوجھ بھی خوشی سے اٹھاتے ہیں۔ میں نے مومی کو اس دور میں سنبھالا تھا جب وہ بالکل معذور ہو کر بستر پر لیٹ گیا تھا۔“

”ایسا ہے تو میں بھی تمہارے معاذ بھائی کی محبت کو آزما کر دیکھ لوں گی لیکن ابھی تو تم اپنی بات کرو کہ تمہیں اعظم کے ماموں جان قبول ہیں یا نہیں؟“ معاذ کے ذکر نے اگرچہ اسے اداس کر دیا تھا لیکن لہجے کو بٹاش رکھ کر ہی نیلی سے مخاطب تھی۔

”آپ کا اتنا اصرار ہے تو آزما ہی لیتے ہیں آپ کے بھائی کو۔“ اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

”بندہ آزمائش پر پورا اترنے کی ضمانت دیتا ہے۔“ عالم شاہ پتا نہیں کب وہاں آیا تھا۔ اچانک مداخلت کی تو اسے اس کی موجودگی کا علم ہوا اور بے نیازی کی جگہ ایک مدہم شرمیلی سی مسکراہٹ نے لے لی۔

☆☆☆

”اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو آپ رادھا دیوی ہیں؟“ اس نے کچھ دیر دھلے ہوئے بالکل سادہ چہرے، عام سے ہیرا سٹائل اور سفید قمیص شلوار پر سفید ہی دوپٹا لیے عورت کو جانچتی نظروں سے دیکھا اور بالآخر خود کو اس سے مخاطب ہونے سے نہ روک سکی۔ کون یقین کر سکتا تھا کہ چہرے پر حزن لیے، یہ بہاؤں جیسے حلیے والی عورت بھارت

اور اب پورے وقار کے ساتھ خود کو اس کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن ایک چلتے پھرتے انسان کے لیے وکیل چیئر پر آ بیٹھنا معمولی صدمہ تو نہیں تھا جس پر وہ اداس بھی نہ ہوتا۔

”آپ اداس اور فکر مند نہ ہوں۔ میں جب تک ممکن ہوں، اعظم کا اسی طرح خیال رکھوں گی۔ میں نے اسے جہنم تو نہیں دیا لیکن مجھے لگتا ہے کہ اگر میری کوئی اولاد ہوتی تو مجھے اس سے زیادہ پیاری نہ ہوتی جتنا مجھے اعظم پیارا ہے۔“ سچل کی اداسی نے اس سے اعتراف کر دیا۔ اب وہ اعظم کو ایک بیچ پر بٹھا کر خود بھی اس کے قریب ہی بیٹھ گئی تھی۔ وہ پاپ کارن کے ساتھ ساتھ پارک میں کھیلتے بچوں کو دیکھ کر بھی خوب لطف اندوز ہو رہا تھا۔

”میں نے تمہاری آنکھوں میں اعظم کے لیے ممتا کے جذبات دیکھے ہیں اسی لیے میری خواہش ہے کہ میں رہوں نہ رہوں، تم ضرور میرے بیٹے کے پاس موجود رہو۔“ سچل کے اتنے اصرار نے اسے تھوڑا سا چونکا دیا اور اسے محسوس ہوا کہ سچل اس سے کسی خاص موضوع پر بات کرنا چاہتی ہے۔

”مجھے ادا سائیکس نے اپنی خواہش اور تمہارے انکار دونوں کے بارے میں بتایا تھا۔ میں نے سوچا کیوں نہ ایک بار میں بھی تم سے بات کر کے دیکھ لوں۔ ہو سکتا ہے تم ادا سائیکس کے خلوص سے نہ سہمی، میری بے بسی سے ہی متاثر ہو کر ہاں کر دو۔“

”سچل!.....“ نیلی کو اس کے الفاظ نے تھیف دی تو بے ساختہ اسے ٹوک بیٹھی۔

”میں غلط نہیں کہہ رہی ہوں نیلی! تمہاری موجودگی مجھے اپنے بیٹے کی خوشی اور اچھی تعلیم و تربیت کے لیے لازم و ملزوم محسوس ہوتی ہے۔ تم اسے میری خود غرضی کہہ لو کہ ادا سائیکس کی خواہش پوری ہونے میں مجھے اپنا بھی بھلا دکھائی دیتا ہے۔“

”لیکن میں!.....“

”اس لیکن سے آگے کی ساری باتوں کا مجھے علم ہے۔ ٹھیک ہے، تم مومی سے محبت کرتی ہو اور تمہیں لگتا ہے کہ تم اسے بھی بھلا نہیں سکتیں تو کوئی مسئلہ نہیں۔ کوئی تمہیں ایسا کرنے کو کہہ بھی نہیں رہا ہے لیکن یہ تو طے ہے نا کہ مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں جاتا اور بہتر یہی ہوتا ہے کہ انسان اپنی ذات سے ان کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کرے جو زندہ ہیں۔“ سچل جو کہہ رہی تھی، اس نے وہ خود کر کے دکھایا تھا۔ اعظم کے بعد فیصل سے شادی کا فیصلہ صرف اور صرف عالم

کی ٹاپ ایکٹریس تھی جو سولہ تو کیا، بتیس سنگار کیے لوگوں کو اسکرین پر تھرکتی دکھائی دیتی تھی تو تماشا بین جھوم اٹھتے تھے۔ سیٹوں، تالیوں اور نعروں کا شور ایسے اٹھتا تھا کہ لگتا تھا سنیما کی چھت اڑ جائے گی۔ وہ ایسے اداکاری کرتی تھی تو تماشا بینوں کی آہوں اور سسکیوں سے ساری فضا ہی غمزہ ہو جاتی تھی۔ اس کے ایکشن سین لہو کو گرمادیتے تھے۔ اس کے صرف نام کے ساتھ دیوی نہیں لگا ہوا تھا۔ اس کے چاہنے والے اسے دیوی ہی کی طرح پوجتے تھے۔

”سوری! آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“ اس نے اتنی رکھائی سے جواب دیا کہ سونیا کا یقین متزلزل ہونے لگا۔

”میں سونیا ہوں، معاذ کی دوست۔“ وہ تھوڑی دیر اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ بے شک وہ اس وقت اسکرین کے مقابلے میں بہت مختلف دکھائی دے رہی تھی لیکن اسے بھی اپنی یادداشت پر ناز تھا اس لیے اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی ایک کوشش اور کی۔ یہ کوشش نتیجہ خیز ثابت ہوئی اور رادھا دیوی جس نے ابھی تک اس کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا، چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

”میں تمہیں دیکھ کر بیک وقت حیرت اور خوشی محسوس کر رہی ہوں۔“ رادھا کی آنکھوں میں شناسائی کی رمت تھی اس لیے اس نے اس کی زبان سے تصدیق کا انتظار نہیں کیا اور بے تکلفی سے مخاطب ہوئی۔

”حیرت کیسی؟ یہ انرپورٹ ہے اور یہاں مسافروں کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔“ اس کا لہجہ ایک ایسے انسان کا لہجہ تھا جس کی دنیا میں دلچسپی ختم ہو چکی ہو اور جس کے لیے لوگوں سے بات کرنا بھی ایک بوجھ ہو۔

”میں تمہاری یہاں موجودگی پر حیران نہیں ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ تم بھارت کی ٹاپ ایکٹریس ہو اور تمہارے لیے انٹرنیشنل سفر کرنا ایک معمول کی بات ہے۔ میں حیران اس بات پر ہوں کہ تم ان سارے لوازمات کے بغیر کیوں ہو جو تمہارے پروفیشن کا لازمی حصہ ہیں۔“ سونیا نے اس کے لہجہ کا ٹراٹھانے بغیر سادگی سے وضاحت دی۔

”اور خوشی..... خوشی کا کیا کارن ہے؟“ وہاں لہجے میں اب بھی وہی رکھائی تھی۔

”وہ بس ایسے ہی ہے۔“ سونیا ہنس دی۔ وہ اسے کیا بتاتی کہ اس وقت اس کا دل کسی نین امیر لڑکی کی طرح جذباتی کیفیت کا شکار ہے جسے محبوب کو چھو کر آنے والی ہوا بھی پیاری لگتی ہے۔ رادھا دیوی وہ ہستی تھی جس نے سادھو کی عقیدت میں ایک ایسے وقت میں معاذ کو اپنے گھر میں

پناہ دی تھی جب اس پر سارے راستے تنگ ہو گئے تھے اور یہ پناہ صرف ایک چھت مہیا کر دینے کی حد تک نہیں تھی۔ وہاں معاذ کو نہ صرف ہر ممکنہ سہولت حاصل تھی بلکہ رادھا نے خود کو خطرے میں ڈال کر بھی اس کی خاطر بہت کچھ کیا تھا۔ اس کو پہنچنے والے نقصان کا بھی سونیا کو علم تھا۔

”ویسے تم سے مل کر تو ایک دنیا خوش ہوتی ہے بلکہ ملنا تو بہت بڑا اعزاز ہے۔ تمہارے فینز تو تمہاری ایک جھلک دیکھنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہوں گے۔“ وہ ایک حقیقت بیان کر رہی تھی۔

”لیکن تم تو میری فین نہیں ہو۔“ رادھا نے بھی ایک بڑی حقیقت اس کے سامنے رکھ دی۔ سونیا ایک پل کے لیے ششدر ہوئی پھر زور سے ہنس دی۔

”مطلب صرف حسن نہیں ہے تمہارے پاس، ذہین بھی خوب ہو۔“

”صرف حسن کبھی کامیابی کی ضمانت نہیں ہوتا۔ حسین عورت کے پاس تھوڑا سا دماغ اور کوئی ٹیلنٹ بھی ہونا چاہیے تب ہی وہ اپنے حسن سے فائدہ اٹھا سکتی ہے۔“ وہ روکھے اور سپاٹ لہجے میں بول رہی تھی لیکن یہ بھی غنیمت تھا کہ اس کی طرف سے جواب تو آ رہا تھا۔

”ویل سیڈا“ سونیا نے اس سے اتفاق کیا۔

”حسین تو تم بھی کم نہیں ہو۔“ رادھا نے اس کے آنکھوں کو چکا چوند کر دینے والے سراپا کو گہری نظر سے دیکھا۔

”جو حسن آپ کی من پسند ہستی کی نظروں کو نہ ہاندھ سکے وہ حسن کس کام کا۔“ اس کے دل کا درد زبان پر آ گیا۔

اس کا عموماً جن لوگوں سے واسطہ رہتا تھا، ان کے سامنے اپنی دلی کیفیت بیان کرنا یا تو ممکن نہیں تھا یا اسے معیوب لگتا تھا اس لیے نہ جانے کیسے ایک ایسی ہستی کے سامنے زبان کھل گئی تھی جس سے بظاہر تعلق ہی نہیں تھا۔

”حسن من پسند ہستی کی نظروں کو ہاندھ بھی لے تو جس کے نصیب میں ہجر لکھا ہو، وہ محروم ہی رہتا ہے۔“ اس کے لہجے کی کرلاہٹ نے سونیا کے دل کو جھڑ لیا۔

”کیا ہوا ہے تمہارے ساتھ؟“ اس نے بے ساختہ ہی رادھا کا ہاتھ تھام کر ہمدردی سے پوچھا۔

”مرے تھے جن کے لیے وہ رہے وضو کرتے۔“

رادھا کہہ کر طنز یہ ہنسی۔

”مطلب؟“ سونیا نے اس سے پوچھا اور پھر خود ہی اس کے دماغ میں کچھ کلک ہوا۔

”کالے خان.....!“ اسے رادھا اور کالے خان

کے درمیان موجود عجیب سا تعلق یاد آ گیا۔

”وہ جس نے رادھا کو اتنی دیوانگی سے پوجا تھا کہ عام سی رادھا دیوی کو سچ سچ کی دیوی بنا دیا تھا، وہ نہیں رہا تو رادھا کیسے رادھا دیوی رہتی۔ اسے تو اپنا سنگھاسن چھوڑنا ہی تھا۔“ وہ جو کہہ گئی تھی اس نے سونیا کے پورے وجود کو سن کر ڈالا۔ اس نے اگر خود مئے عشق نہ چکھی ہوتی تو شاید رادھا کے جذبات کو سمجھنے میں مشکل ہوتی لیکن اب وہ جانتی تھی کہ دنیا میں ایک طاقتور ترین جذبہ ایسا ہے جو انسان کو اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دینے کے لیے راضی کر لیتا ہے۔ وہ اپنی ماں سے باغی ہو گئی تھی۔ اس نے وہ سارے عہد توڑ دیے تھے جن سے اسے کسی میں باندھا گیا تھا۔ وہ اس تربیت کو فراموش کر چکی تھی جو اسے اسرائیل کی خدمت کے لیے برسوں دی گئی تھی تو پھر رادھا دیوی کا اپنے سنگھاسن کو ٹھوکر مار دینا بھلا کیا حیثیت رکھتا تھا۔ وہ اس کے مقابلے میں تو خاصی آزاد عورت تھی اور اپنی زندگی کے فیصلے خود کر سکتی تھی۔

”دنیا اس کی شکل و صورت کو دیکھتی تھی۔ وہ خود بھی میرے اور اپنے بیچ شکل کے فرق کو لے کر ڈرتا تھا اور اس کے اس ڈرنے مجھے بھی دنیا کے سامنے اپنی محبت کا اعتراف نہیں کرنے دیا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ میری محبت صرف ایک جذباتیت یا پھر احسان مندی ہے۔ اسے کبھی یہ بات سمجھ ہی نہیں آئی کہ وہ محبت رادھا کے ساتھ بل کر جو ان ہوئی ہے اور خون ہی کی طرح رگوں میں دوڑتی پھرتی ہے۔ تم ہی بتاؤ، خون کو رگوں سے نکال کر بھی بھلا کوئی جیا ہے؟“ اس نے اپنی سرخ پڑتی آنکھوں کے ساتھ سونیا سے سوال کیا۔ سونیا جواب نہیں دے سکی۔ اسے بھی یقیناً جواب درکار نہیں تھا۔ وہ تو بس اس کے اندر کا سچ تھا جو زبان پر آ گیا تھا۔

”رادھا دیوی نے فلمی دنیا سے ریٹائرمنٹ لے لی، یہ خبر تو بھارت کے ہر نیوز پیپر اور نیوز چینل نے دے دی لیکن رادھا دیوی جیتے جی مر گئی، اس کی کسی کو خبر نہ ہو سکی۔ وہ تو اس سے ہی موت کا اعلان کرتے ہیں نا جب یہ مٹی کا ڈھیر شہر برسانوں کے پوجھ سے آزاد ہوتا ہے۔“ وہ اپنے اندر کی ٹھن بہا ہر لاری بھی اور سونیا کے پاس اس کے ہاتھوں کو تمام کر خاموش دلاسا دینے کے سوا کوئی حل نہیں تھا۔ بعض زخم اتنے گہرے ہوتے ہیں کہ سامنے والے کے لیے ان پر مرہم رکھنا ممکن نہیں ہوتا۔

”فلم انڈسٹری نے مجھے بہت شہرت اور پیسہ دیا لیکن میرے من کی خوشی تو اس کی خوشی میں تھی۔ میں اس کے لیے، اس کی خوشی کے لیے ناچتی تھی، گاتی تھی، سنکار کرتی تھی۔ اب

وہ نہیں رہا تو پھر میں یہ سب کیوں کروں؟ مجھے تو بس اس سنسار میں اپنے دن پورے کرنے ہیں تاکہ وہاں..... وہاں آسمانوں میں اس سے مل سکوں۔“ وہ اس انتہا پر تھی جہاں محبوب سے آگے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ سونیا کو اس کی بھری جوانی پر ترس آنے لگا اور سمجھانے کے انداز میں بولی۔

”نانا تمہارا غم بہت بڑا ہے لیکن جب تک سانسیں ہیں جینا تو پڑتا ہے، تو کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ کسی بہتر ڈھنگ سے جیا جائے۔“

”بھگوان کے واسطے مجھے کوئی نصیحت نہ کرنا۔ میں ان نصیحتوں سے گھبرا کر ہی انڈیا سے بھاگ رہی ہوں۔“ رادھا نے فوراً اسے ٹوک دیا۔

”میں نے بہت کوشش کی کہ انڈیا میں ہی چھپ کر گمنامی کی زندگی جی سکوں لیکن یہاں آئے دن کوئی نہ کوئی کھوج لگاتا ہوا مجھ تک پہنچ جاتا تھا اور مجھے سمجھانے لگتا تھا کہ اپنے کیریئر کی پیک پر فلم انڈسٹری کو چھوڑنے کا فیصلہ میری بہت بڑی نادانی ہے۔ میں ایسے سارے لوگوں سے بچنے کے لیے انڈیا سے بھاگ رہی ہوں۔“ اس کے لہجے میں ہلکا سا جھڑپا سن در آیا تھا۔

”لیکن میں تمہیں فلم انڈسٹری دوبارہ جوائن کرنے کا مشورہ نہیں دے رہی ہوں۔ میں تمہیں زندگی کو ڈھنگ سے جینے کا مشورہ دے رہی ہوں۔ زندگی کو خود پر بوجھ بنانے کے بجائے اگر دوسروں کا بوجھ اٹھانے والی بن جاؤ گی تو تمہارا امتحان تھوڑا آسان ہو جائے گا۔“ اس کے نرمی سے دیے گئے جواب نے رادھا کو توجہ دینے پر مجبور کر دیا۔

”کیا کہنا چاہتی ہو؟“

”بہت کمایا ہے نا تم نے فلم انڈسٹری سے تو اب یہ کمائی انہیں لوٹا دو جو جانے کہاں کہاں سے بچت کر کے فلم کے لیے ٹکٹ خریدتے ہیں اور درحقیقت جن کے دم پر یہ بلین بلین کی انڈسٹری کھڑی ہے۔ غربت کے مارے ایسے لاکھوں لوگ ہیں تمہارے دیس میں جن کی واحد تفریح فلم دیکھنا ہے لیکن جو زندگی کی بنیادی سہولتوں سے محروم ہیں۔ کچھ کر ڈالو ان لوگوں کے لیے، تمہارا سفر آسان ہو جائے گا۔“ اس نے حیران سی رادھا دیوی کے سامنے اپنی بات کی وضاحت کی اور سیٹ چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ہو سکے تو مجھے اور ان سارے لوگوں کو معاف کر دینا جو ایک ایسی جنگ کے سپاہی ہیں جو ہم پر زبردستی مسلط کی گئی ہے اور ہماری خاطر تم بھی جس کی زد میں آ گئی ہو۔“ رادھا کے کندھے کو آہستہ سے چھو کر اس نے کہا اور اس کے جواب کا

انتظار کے بغیر چل پڑی۔ اس کی فلائٹ کا اعلان ہو رہا تھا۔

☆☆☆

”یہ ہے یروشلم The City of faith“ مرد نے اپنی دونوں ہاتھیں پھیلا کر سرشاری کی کیفیت میں کہا۔ ”اور یہاں ہوتے ہوئے بھی مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا کہ ہم یہاں موجود ہیں۔“ لائٹ کوٹ پر سیاہ اسکارف لیے عورت کی آنکھوں میں بھی جگنو چمک رہے تھے اور وہ بچوں کے سے جس سے اپنے سامنے موجود دمشق گیٹ (Damascus gate) کو دیکھ رہی تھی۔ انسانوں کا ایک جھوم تھا جو اس دروازے سے گزر کر اندر جا رہا تھا۔

”یہ سب کتنا اپنا اپنا سا ہے نا۔“ اس نے گیٹ کے باہر کھڑا بچائے اس پر سبزیاں رکھ کر چیتی عورتوں کو دیکھتے ہوئے تبصرہ کیا۔ ان عورتوں نے مختلف رنگوں کے گاؤں پہن رکھے تھے اور ان کے سر اسکارف سے ڈھکے ہوئے تھے۔ وہ واضح طور پر مسلمان عورتیں تھیں۔ یہ مسلمان اکثریتی علاقہ ہی تھا اور اس گیٹ سے گزر کر وہ قدیم یروشلم کے شمالی مسلمان علاقے میں پہنچنے والے تھے۔

”آپ کا دھیان کہاں ہے؟“ اپنی بات کا جواب نہ پا کر عورت نے مرد کو ٹوکا اور اس کے دائیں ہاتھ کی آستین کھینچنے ہوئے بولی۔

”چلیں، اندر چلتے ہیں۔“

”ہاں چلو۔“ مرد جو کہ دائیں جانب موجود فوجی چوکی کا جائزہ لے رہا تھا، اس کے ساتھ چل پڑا۔ اسے چوکی پر سپاہیوں کی اچھی خاصی نفری محسوس ہوئی تھی۔ اس کی معلومات کے مطابق اگر حالات معمول پر ہوں تو چوکی پر سپاہیوں کی تعداد کم ہوتی تھی ورنہ زیادہ۔ اس وقت زیادہ تعداد نظر آنے کا مطلب تھا فضا میں کشیدگی ہے لیکن بازار کی گہما گہمی میں کوئی کمی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی جس نسبتاً پتلی گلی میں داخل ہوئے تھے وہاں مردوں، عورتوں اور بچوں کی ایک تسلسل سے آمد رفت جاری تھی۔

”یہ تو کچھ ہمارے عوامی بازاروں جیسا ہی ہے۔“ دونوں اطراف موجود دکانوں، اسٹالز اور چھوٹے مکانات کو دیکھتے ہوئے عورت نے رائے دی۔

”صفائی کے فرق کے ساتھ۔“ مرد نے گرہ لگائی اور یہ حقیقت تھی کہ تنگ گلی اسٹالز اور افراد کی زیادتی کے باوجود بالکل صاف ستھری دکھائی دے رہی تھی۔ نہ تو دیواروں پر

چانگ تھی، نہ ہی نیچے نیچے پتھر کے فرش پر کوئی کوڑا کرکٹ دکھائی دے رہا تھا۔

”میں اس کی ویڈیو بناتی ہوں۔“ عورت اس کے تبصرے کو نظر انداز کر کے اس پر رونق بازار کی ویڈیو بنانے لگی۔ کپڑے، پھل، سبزیاں اور مٹھائیاں..... وہاں وہی سب بک رہا تھا جو عموماً بازاروں میں بکنا ہے اور دوزمرہ کی ضروریات پوری کرنے کے لیے لازم ہوتا ہے لیکن ہر شے میں صفائی اور ترتیب کے خاص تناسب نے جگہ کی سطح کے باوجود منظر کو خوبصورت بنا رکھا تھا۔

”مجھے یہ کھانی ہے۔“ ایک دکان کے سامنے لگے اسٹال کے قریب سے گزرتے ہوئے اشتہا انگیز خوشبو نے اس کے قدم جکڑے اور وہ فوراً تلوں سے سجے پٹکے بیضوی سلائسوں والی اس بریڈ کی طرف متوجہ ہوئی جس کی تازگی اور خشکی دیکھنے سے ہی حیاں ہو رہی تھی۔

”یہ طبون ہے۔“ مرد نے اس کی فرمائش پر وہ بریڈ خرید کر اسے تھامتے ہوئے مسکرا کر بتایا۔ چھوٹے پردہ گرم تھے اور یوں لگتا تھا کہ ابھی ابھی ہی خور سے نکل کر وہاں پہنچے ہوں۔ ”طبون۔“ وہ بریڈ کا ایک حصہ اسے توڑ کر دیتے ہوئے مسکرائی۔

”مجھے معلوم ہے کہ آپ یہاں آنے سے قبل یہاں کی ایک ایک چیز کے بارے میں معلومات حاصل کر کے نکلے ہوں گے۔“

”ایک اچھے سیاح کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔“ مرد نے جوابی مسکراہٹ اچھالتے ہوئے جواب دیا اور بریڈ کا لقمہ منہ میں ڈال کر چباتے ہوئے دل ہی دل میں اس کے خوش ذائقہ ہونے کا بھی اعتراف کیا۔

”سیاح۔“ وہ اس کے منہ سے نکلنے والا لفظ سن کر مسکرائی اور اس کے پیچھے اپنے قدموں کو آگے بڑھایا۔ بازار میں بطور خاص کوئی بھی ان کی طرف متوجہ نہیں تھا لیکن ان کی طرف سے مکمل احتیاط برتی جا رہی تھی۔ وہ آہستہ میں گفتگو بھی انگریزی میں کر رہے تھے تاکہ اگر کوئی سن رہا ہو تو اسے بات سمجھ آئے اور وہ ان کو مشکوک نہ گرا دے۔

”اب ہم Trifurcation of faith پر موجود ہیں۔“ گلی میں سیدھے چلتے چلتے وہ ایک سہ راہے پر پہنچ کر رک گئے اور مرد نے اسے اطلاع دی۔

”مطلب؟“ اس نے دلچسپی سے دائیں، بائیں اور سامنے نکلنے راستوں کو دیکھا۔

”مطلب یہ کہ ہم ایک ایسے مقام پر کھڑے ہیں جہاں

سوال اٹھا اس کا جواب وہ خود بھی جانتا تھا اور ایک ایک کر کے ماضی کے وہ کردار یاد آتے جا رہے تھے جنہوں نے پاکستان میں اپنی سازشوں کا جال بچھانے کے لیے بہت خوبصورت بہروپ بھر کر اسے بھی نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ خدا کے فضل و کرم اور اپنی نیک نیتی کے سہارے نہ صرف ان سازشوں سے محفوظ رہا تھا بلکہ ان دشمنوں کو فاش شکست بھی دی تھی۔ مارکھا کر بھی وہ سازشی ٹولا اپنی حرکتوں سے باز نہیں آیا تھا بلکہ پہلے سے بھی زیادہ طاقت کے ساتھ مقابل آکھڑا ہوا تھا۔ اس لیے اسے اپنی گوشہ نشینی ترک کر کے ایک بار پھر مقابلے کے لیے میدان میں اترنا پڑا تھا اور وہ جی جان سے اس منصوبے میں شامل ہو گیا تھا جس میں سازشیوں کو ان کے گھر میں گھس کر سبق سکھانے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔

”قتبہ الصخرہ Dome of Rock“ اپنی سوچوں میں گھرے چلتے اسے ماہ بانو کی آواز نے متوجہ کیا۔ وہ داخلے کے بارہ دروازوں میں سے ایک دروازے سے گزر کر اب Mount of temple کی حدود میں داخل ہو چکے تھے اور سامنے ہی وہ سنہری گنبد نظر آ رہا تھا جس کی خوبصورتی اور شکوہ نے عرصے سے اس مقام کو Photograph building کا درجہ دے رکھا تھا اور کہا جاتا تھا کہ دنیا میں سب سے زیادہ تصاویر اسی کی لی جاتی تھیں۔ سونے سے بنے اس گنبد نے اس کی نظروں کو بھی باندھ لیا۔ اموی بادشاہ عبدالملک کا تعمیر کروایا گیا یہ شاہکار اگرچہ مسجد اقصیٰ نہیں تھا لیکن اس کی اپنی ایک اہمیت تھی۔ ”میں یہاں لو اقل ادا کروں گی۔“ ماہ بانو ہل گئی۔ اس وقت اسے اپنی اسرائیل آمد کا اصل مقصد یاد نہیں تھا۔ بس ذہن میں یہ تھا کہ وہ اس ارض مقدس پر ہے جس کے چپے چپے پر انبیاء کے نقش قدم ثبت تھے۔ سوائے بھی اس مقام پر سجدہ کرنا تھا جو بے شک مسجد نہیں تھا لیکن اس کے لیے مقدس بہر حال تھا۔

”بالکل ادا کرو بلکہ میں بھی تمہارا ساتھ دوں گا۔“ اس نے فوراً ماہ بانو کی تائید کی۔ وہ آخر اس جگہ کیوں نہ سجدہ کرتا جو اس چٹان پر تعمیر کی گئی تھی جہاں سے روایات کے مطابق نبی کریم ﷺ براق پر سوار ہو کر معراج کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ ویسے یہود کے نزدیک بھی یہ مقام مقدس ہے اور وہ اس چٹان کو Foundation stone کا نام دیتے ہیں۔ ان کے مطابق یہ پہلا مادہ (Matter) ہے جو اللہ نے بنایا اور حضرت آدم علیہ السلام

سے اگر بالکل سیدھے چلتے چلے جائیں تو Western wall یعنی دیوار گریہ تک پہنچ جائیں گے۔ سیدھے ہاتھ پر Church of Holy Sepulchur جانے کا راستہ ہے جہاں عیسائی عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مصلوب کیا گیا تھا جبکہ بائیں ہاتھ پر.....“

”بائیں ہاتھ پر مسجد اقصیٰ کو جانے والا راستہ ہے۔“

اس نے مرد کی بات مکمل نہیں ہونے دی اور بے پناہ جوش سے پوچھی۔ ہر مسلمان کی طرح اسے بھی اس مقدس مقام سے محبت تھی اور دل میں کہیں یہ خواہش بھی کہ اس مقدس سرزمین پر سجدہ کرنے کا موقع مل جائے۔ قدرت نے بغیر کسی کوشش کے یہ موقع فراہم کر دیا تھا تو اس کا جوش میں آنا تو بنتا تھا۔

”ہاں، مسجد اقصیٰ۔“ مرد مسکرایا۔

”آؤ، چلتے ہیں۔“ یہ سوال کرنے کی تو ضرورت ہی نہیں تھی کہ اس سہرا ہے پر انہیں تینوں میں سے کس راستے پر جانا ہے۔ وہ دونوں سرشار سے بائیں راستے پر چل پڑے۔ خوش دونوں ہی تھے لیکن مرد اظہار کم کرتا تھا۔

”نام؟“ یہاں انہیں ایک چھوٹی سی پولیس چوکی پر روک لیا گیا اور ایک پولیس والے نے دریافت کیا۔

”مراد اور یہ میری وائف تانیہ!“ اس نے سکون سے جواب دیا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ معمول کی کارروائی ہے اور اگر انہوں نے کسی قسم کی گھبراہٹ کا مظاہرہ کر کے خود کو مشکوک نہ بنایا تو بہت آرام سے اس پولیس چوکی سے گزر جائیں گے۔

”مسلم؟“

”ہیں۔“

”ٹورسٹ؟“

”ہیں۔“ اس نے ایک بار پھر اثبات میں جواب دیتے ہوئے اپنا پاسپورٹ نکال کر سامنے رکھ دیا۔ یہ گرین پاسپورٹ نہیں تھا۔ گرین پاسپورٹ پر اسرائیل کا ویزا لگ ہی نہیں سکتا تھا کہ پاکستان نے باوجود اس کے کہ کئی بڑے اسلامی ممالک اسرائیل سے دوستی کا بندھن باندھ چکے تھے، قیام سے لے کر اب تک اسرائیل کے وجود کو تسلیم نہیں کیا تھا۔

”اوکے۔“ پولیس مین نے پاسپورٹ پر سرسری سی نظر ڈالی اور انہیں آگے جانے کی اجازت دے دی۔

”اگر یہ جان لیں کہ ہم مراد اور تانیہ نہیں بلکہ شہریار عادل اور ماہ بانو ہیں اور ماضی میں ان کے سوراخوں کو خاک چٹا چکے ہیں تو یہ ہمارے ساتھ کیا سلوک کریں؟“ پاسپورٹ جیب میں رکھ کر آگے بڑھتے ہوئے اس کے ذہن میں جو

وہ دونوں چونکہ با وضو ہو کر ہی اپنی رہائش گاہ سے
 چلے تھے اس لیے نوافل کا ارادہ باندھتے ہی عمل میں تاخیر
 نہیں کی۔ خوش قسمتی سے رش کے باوجود انہیں آسانی سے
 جگہ مل گئی۔

”ضرور جانا لیکن پہلے میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں ایک اور چیز بھی دکھانا چاہتا ہوں۔“ شہر یار نے کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھا اور نرمی سے اس کا ہاتھ تھام کر رسان سے بولا۔ وہ ماہ بانو کی جذباتی کیفیت کو سمجھ رہا تھا اس لیے ایک بار بھی اسے نہیں ٹوکا تھا۔

”وہ دیکھو، وہ گولڈن گیٹ ہے۔“ وہ اسے ایک دیوار تک لے گیا اور اوپر سے ہی کھڑے ہو کر ایک جانب اشارہ کیا۔ وہ حرم شریف کے بارہ ابواب میں سے وہ دروازہ تھا جس کے بارے میں تاریخ بتاتی تھی کہ اسے بادشاہ سلیمان مالیشان نے چنوا کر بند کر دیا تھا۔ اب بھی اس دروازے کو بند ہی رکھا جاتا تھا۔

”کہتے ہیں پہلے یہ ایک ہی دروازہ تھا جس کے دو پٹ تھے۔ داہنی پٹ باب رحمہ (Gate of mercy) اور بائیں پٹ باب توبہ (Gate of repentance)۔“ وہ ماہ بالو کو بتا رہا تھا کہ وہاں فوٹو گرافی کرنا ایک سیاح بہترین زادیہ بنانے کے چکر میں کھسکتا کھسکتا اس سے آکر لپا۔

”اٹس اوکے۔“ اس نے خوش دلی سے اس کی معذرت قبول کی اور ایک بار پھر مڑ کر ماہ بانو کے ساتھ اپنی گفتگو میں مصروف ہو گیا۔

8 سہنس ڈالجسٹ

”میں نے یہاں آنے سے پہلے خود بھی تھوڑی بہت معلومات حاصل کی تھیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ مسجد اقصیٰ کے کپاؤنڈ میں ہی مولانا محمد علی جوہر کا دفن بھی ہے۔“ ماہ بانو کی یادداشت نے بھی کام کیا۔

”یہ بھی ٹھیک ہے۔ پہلے ایک جگہ کو اچھی طرح دیکھ لیتے ہیں۔“ وہ فوراً راضی ہو گئی۔

”اس طاق کے اندر ہاتھ ڈالو ذرا۔“ شہریار نے اسے چٹان کے ساتھ ہی ایک طاق کی طرف متوجہ کیا۔ وہاں کچھ اور خواتین اور بچے بھی طاق کے اندر ہاتھ ڈال ڈال کر باہر نکال رہے تھے۔

”وہ کیا ہے؟“
”تم ہاتھ ڈال کر تو دیکھو۔“ شہر یار نے اصرار کیا۔

مارچ 2024ء

جس میں کچھ غیر معمولی صلاحیتیں ضرور تھیں لیکن یہ جادوگری وغیرہ..... لونو..... نو۔ میرا ذہن اسے قبول نہیں کر رہا۔ میں نے اسے منتخب کرنے کے بعد اس کے بارے میں اچھی طرح ساری معلومات کروائی تھیں۔ اسے نئی نئی چیزیں سیکھنے اور ایڈونچر کا شوق ضرور تھا لیکن اس کے ریکارڈ میں ایسا کچھ شامل نہیں ہے جس سے معلوم ہو کہ وہ جادو یا برسرار علوم حاصل کرنے میں دلچسپی رکھتا ہو۔ اس کا فیل بیک گراؤنڈ بھی تعویذ گنڈوں یا جھاڑ پھونک والا نہیں تھا پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اس طرح کے کسی علم کا مالک ہو؟“ میڈم ایکس کو اس کی بات ماننے میں تامل تھا اور وہ مسلسل نفی میں سر ہلا رہی تھی۔

”اگر آپ کو میری بات کا یقین نہیں تو ذرا بتائیں کہ وہ کیا سبب تھا جس نے اس کے دماغ پر پروفیسر وکٹر جیسے قابل انسان کا زور نہیں چلنے دیا۔ معاذ ان کی تمام تر کوششوں کے باوجود کبھی ہمارا مطیع نہیں بنا اور ہر بار اپنی مرضی چلاتا رہا اور اس کا وہ غائب ہو جانا..... اسے بھول گئی ہیں آپ؟ ہم اتنی ایڈوانس ٹیکنالوجی کے باوجود اسے ٹریس نہیں کر سکے اور وہ ہماری ناک کے نیچے جو چاہے وہ کرتا رہا۔“ سونیا کے پاس بھی بہت سے دلائل تھے۔

”ٹھیک ہے مان لیا کہ وہ بہت بڑا جادوگر ہے تو پھر یہ بتاؤ کہ تم اس کے ٹرائس سے باہر کیسے نکلیں اور کیسے تمہیں خیال آیا کہ تمہیں اپنے اصل کی طرف پلٹ جانا چاہیے؟“ میڈم ایکس نے اسے ٹھہرا۔

”اس کے لیے ہمیں چائنا والوں کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ جب میں ان کی حراست میں آئی اور انہوں نے پہچان لیا کہ میں ان کے ہاں ماضی میں ہونے والے ایک بم بلاسٹ کا حصہ رہی ہوں تو انہوں نے مجھے معاذ اور اس کے ساتھیوں سے الگ کر کے بالکل الگ سیل میں رکھ دیا۔ وہ مجھ سے کئی دن تک انویسٹی گیشن کرتے رہے لیکن چونکہ میرا دماغ پوری طرح کام نہیں کر رہا تھا تو میں ان کے سوالوں کے جواب نہیں دے پاتی تھی لیکن بعد میں سوچتی ضرور تھی کہ وہ جن جرائم کو اتنے وثوق سے میرے سر قیوب رہے ہیں، آخر وہ مجھے یاد کیوں نہیں ہیں۔ کئی دن بعد آہستہ آہستہ مجھے ٹکڑوں ٹکڑوں میں گزری باتیں یاد آنے لگیں لیکن اس وقت تک چائیز مجھ سے مایوس ہو کر پاکستان کے ساتھ میری واپسی کا معاہدہ کر چکے تھے۔ شاید انہوں نے سوچا ہو کہ میں ان کے اور تو کسی کام کی ہوں نہیں تو کیوں نہ مجھے پاکستان سے اپنی دوستی مضبوط کرنے کے لیے استعمال کریں۔ انہیں پتا ہی نہیں چل سکا کہ وہ ایک ایسے موقع پر یہ

”یا اللہ! یہ تو خوشبو سے مہک رہا ہے۔“ ماہ بانو نے ہاتھ ڈال کر باہر نکالا اور دوسروں کی پیروی میں سونگھ کر دیکھا تو خوشی سے چیخ پڑی۔ وہ لوہان سے ملتی جلتی خوشبو تھی۔

”روایت ہے کہ آقا کریم علیہ السلام کے چند بال اس چٹان میں دب گئے تھے اسی لیے اس طاق میں ہاتھ ڈالنے سے ہاتھ خوشبو میں بس جاتا ہے۔“ شہریار نے بتایا تو اس کی مسرت کا رنگ ہی بدل گیا۔ اس بار اس نے اپنے ہاتھ کو سونگھا نہیں بلکہ بڑی محبت اور عقیدت سے آنکھوں اور ہاتھوں سے لگا کر چوم لیا۔

”میں اس مقدس مقام پر آپ کو گواہ بنا کر کہہ رہی ہوں کہ اگر مجھے اپنی زندگی سے نہیں کوئی معمولی سا شکوہ تھا بھی تو آج حاصل ہونے والی نعمتوں کے بعد ختم ہو گیا۔ آج اس وقت میں اس روئے زمین کی سب سے زیادہ خوش نصیب انسان ہوں جسے اس کی اوقات سے بہت زیادہ نواز دیا گیا ہے۔“ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں آنسو تھے۔ شہریار نے اس کے شانوں کو نرمی سے تھپکتے ہوئے اسے جذباتی سہارا دینے کی کوشش کی اور طاق کے قریب سے خواتین کا رش ختم ہونے پر خود بھی اپنا ہاتھ اندر ڈال دیا۔ قدرت نے اس کے اس ارض مقدس پر آنے کے اسباب پیدا کیے تھے تو وہ کیوں نہ اس نعمت سے فیض یاب ہوتا۔ یوں بھی کیا خبر تھی کہ شاید یہ ان کی زندگی کا آخری مشن ہی ہوتا۔

☆☆☆

”تم نے ہمیں ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے سونیا! اگر تم نے معاذ کا ساتھ نہ دیا ہوتا تو آج ہم ان حالات میں نہ ہوتے۔“ رائیل عرف میڈم ایکس آنکھوں میں ناراضگی لیے اس سے مخاطب تھی۔

”میں شرمندہ ہوں لیکن میں مجبور تھی کہ میرا دماغ میرے اپنے کنٹرول میں نہیں تھا۔“ اس نے اپنی معذوری کا اظہار کیا۔

”کیا وہ لڑکا کوئی جادوگر ہے؟“ رائیل چڑسی گئی۔

”جادوگر سے کم بھی نہیں ہے۔ میں نے اپنی نظروں سے لوگوں کو منٹوں میں اس کا مطیع بننے دیکھا ہے۔ اگر آپ کو میری بات کا یقین نہ آئے تو حیدر آباد کے نواب صاحب کے ہاں پیش آنے والے واقعات کی تفصیل کسی سے معلوم کروا لیجیے گا۔ اس کے علاوہ بھی میں کئی جگہ پر اس کی ساحری کے ثبوت دے دوں گی۔“

”مجھے یقین نہیں آرہا۔ وہ تو بس ایک اسٹوڈنٹ تھا

کام کر رہے ہیں جبکہ میری یادداشت بحال ہونے لگی ہے۔ اس ساری صورت حال سے میں نے اندازہ لگایا کہ معاذ مجھ پر وقتے وقتے سے مسلسل عمل کرتا تھا جس کا اسے میرے قید میں ہونے کی وجہ سے علم نہیں ہو سکا اور میں دھیرے دھیرے اس کے اثر سے باہر آ گئی۔“ اس نے بہت تفصیل سے صورت حال کا تجزیہ کیا۔

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تم اب بھی معاذ کے زیر اثر ہو اور اس کے کسی خاص ایجنڈے پر کام کرنے کے لیے ہمارے درمیان واپس آئی ہو؟“

”بالکل نہیں۔“ اس نے شدت سے میڈم ایکس کے الزام کو رد کیا اور پھر شکایتی لہجے میں بولی۔

”آپ مجھ پر شک کر رہی ہیں؟ مجھ پر..... میں جو آپ کے ایک اشارے پر اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا کرتی تھی، کیا اسی کی حقدار ہوں کہ آپ مجھ پر شک کریں؟“

”حالات نے مجھے اس پر مجبور کر دیا ہے۔ تم جتنا نقصان کر چکی ہو اس کے بعد اس سوال کی گنجائش بنتی نہیں ہے۔ تم نے اپنی حرکتوں سے مجھے تنظیم کے بڑوں کے آگے جتنا شرمندہ کر دیا ہے اس کے بعد یہ ان کا احسان ہی ہے کہ اب بھی انہوں نے مجھے ہی تمہیں ڈیل کرنے کے لیے آگے رکھا ہے ورنہ ہونے کو تو یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ کسی اور سے یہ کام لیتے۔“ میڈم ایکس پر اس کے لہجے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اسے آج بھی اس سے بڑھ کر اپنی تنظیم کی فکر تھی۔

”ٹھیک ہے، تو پھر آپ جیسے چاہیں اپنی تسلی کر لیں۔“ اس نے پھولے ہوئے منہ کے ساتھ پیشکش کی۔

”وہ تو میں ضرور کروں گی اور ثابت کر دوں گی کہ ہم اسرائیل کے سامنے سبکی اولاد بھی میرے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتی ہے۔“ میڈم ایکس نے اسے بے نیازی سے جواب دیا اور پھر انٹرکام پر کسی کو وہاں آنے کے لیے کہا۔ چند ثانیوں میں ایک لمبا ترنگا اور خوب کسے ہوئے جسم کا نوجوان اس کے سامنے کھڑا تھا۔

”اسے لے جاؤ اور اس کی زبان کھلوانے کے لیے جو حربہ استعمال کرنا چاہو کرو۔ سچ تک پہنچنے کے لیے تمہیں اس کے جسم کا ایک ایک ریشہ بھی الگ کرنا پڑے تو رعایت نہیں کرنا۔ اگر یہ اسرائیل کے مفادات کے خلاف ہے تو اس سے میرا کوئی رشتہ نہیں ہے۔“ میڈم ایکس کے لہجے کی سختی نے اسے یقین دلادیا کہ وہ عورت اسے اس دنیا میں لانے کی ذمہ دار تو بے شک ہے لیکن اس کا اپنے وطن کے علاوہ کسی سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔

”سوری ڈارلنگ! لیکن کیا کروں۔ تمہاری رگوں میں دوڑتا تمہارے مسلمان باپ کا خون مجھے بھی تم پر پورا بھروسہ نہیں کرنے دیتا۔“ میڈم ایکس نے اس کی اندرونی کیفیت کو بھانپ لیا اور نہایت صاف گوئی سے اپنے عمل کی توجیہ پیش کی۔ اس نے جواب میں کچھ نہیں کہا اور خاموشی سے اس شخص کے ساتھ چل پڑی جو موت کے فرشتے کی طرح اس کے سر پر سوار تھا۔

☆☆☆

”کہاں چھپایا ہے انہیں، جلدی بتا کہاں چھپایا ہے ورنہ میں تیرا کھون پی جاؤں گا۔“ باہر کو ابلتی سرخ آنکھوں کے ساتھ وہ شخص گل و ش کے خاندان کبیر کا گریبان پکڑے اسے بری طرح جھنجھوڑ رہا تھا۔ گل و ش اور کبیر کی ماں بند قوتوں کے سائے میں ایک طرف سہمی ہوئی کھڑی تھیں۔ انہیں گہری نیند سے جگایا گیا تھا اور اب وہ بے بسی سے سچے سنورے گھر میں دندناتے بھارتی سپاہیوں کو اپنی من مانی کرتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔

”کک..... کون؟ آپ کس کی بات کر رہے ہیں جناب؟“ کبیر بھی نیند سے جگائے جانے پر شٹاپا ہوا تھا۔

”تیرے ماں کے خصم کی، سالانا کک بازی کرتا ہے ہمارے ساتھ۔“ غصے سے اچلتے اس شخص نے کبیر کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ دے مارا۔ کبیر کا چہرہ طمانچے سے زیادہ اس کے الفاظ کی شدت پر سرخ پڑ گیا لیکن مجبوری تھی کہ پلٹ کر جواب نہیں دے سکتا تھا۔

”میرا یقین کرو، میں نہیں جانتا تم کسے تلاش کر رہے ہو۔ میرے گھر میں تو بس ہم تین ہی لوگ ہیں۔“

”انجان جتنا ہے سالانا! جس بات کی ساری وادی کو کبھر (خبر) ہے تو..... حاجی شیر خان کا بھائی ہو کر اس سے انجان بن رہا ہے۔ سالی کے کوئل ہاتھوں کی روٹیاں کھانے والے کو کبھر ہی نہیں ہے سالی کے کارناموں کی۔“ اس نے کبیر کو ایک بڑی سی گالی دیتے ہوئے واضح کر دیا کہ وہ کس کی تلاش میں وہاں آیا ہے۔

”وہ لوگ یہاں نہیں آئے۔ انہیں معلوم ہوگا کہ تم لوگ انہیں ڈھونڈتے ہوئے سب سے پہلے یہیں آؤ گے اس لیے انہوں نے یہاں کا رخ نہیں کیا۔“ ماں اور بیوی کے سامنے مسلسل ہونے والی توہین پر کبیر کی رگوں میں خون ابل رہا تھا لیکن حالات کو بدترین ہونے سے بچانے کے لیے اسے تحمل کا مظاہرہ کرنا پڑ رہا تھا۔

”بکواس مت کر۔ ہمارے کھوجیوں کو ان کے اس

تماشا کی بنے ہوئے تھے، انہیں ان کی ایسی کسی کوشش میں کامیاب نہیں ہونے دے رہے تھے اور ہر بار بے دردی سے پیچھے دھکیل دیتے تھے۔

”کوئی تو آؤ مدد کو۔ یہ عالم میرے بچے کو مار ڈالیں گے۔“ بے بس ماں کی پکار اس پاس کے کئی لوگوں نے سنی تھی لیکن اپنے آپ میں شرمندہ اس پکار پر آنسو بہانے سے زیادہ کچھ بھی کرنے سے قاصر تھے۔ بھارتی سپاہیوں نے شہد کی کھبوں کی طرح کبیر کے گھر کو اپنے گھرے میں لے رکھا تھا۔ ایسے میں کسی کی ذرا سی مداخلت سے بات بہت زیادہ بگڑ جاتی۔ وہ سب عام بے لوگ تھے اور مسلح سپاہیوں سے لڑنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔

”آخری بار پوچھ رہا ہوں، بتادے کہ اپنے سرالیوں کو کہاں چھپایا ہے۔ تو اگر سمجھ رہا ہے کہ زبان بند رکھ کر انہیں بچالے گا تو یہ ہوتی نہیں سکتا۔ میرا نام مشرا ہے اور میں اپنے بھائی کے قاتلوں کو ہاتھ سے بھی ڈھونڈ لگاؤں گا۔“ مار کھا کھا کر کبیر ادھ مو ا ہو گیا تو اس نے اپنا ہاتھ روک لیا اور کبیر کی گردن پر پھر رکھ کر اپنے بھاری بوٹ سے اس کا نرخرہ دباتے ہوئے بولا۔ دباؤ اتنا زیادہ تھا کہ کبیر کا سانس رکنے لگا اور اس کے حلق سے خرخر اہٹ کی آوازیں نکلنے لگیں۔ یہ وہ نازک مقام تھا جہاں آکر اس کی ماں کی برداشت جواب دے گئی اور زور سے چینی۔

”وہ باغ میں ہیں۔ باغ میں اوزار وغیرہ رکھنے کے لیے جو کمر بنایا ہوا ہے، اس کے نیچے ایک تہ خانہ بھی ہے۔ وہ لوگ اسی تہ خانے میں ہیں۔“

اس موقع پر گل دوش نے اذیت سے اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے چہرے کو ڈھانپ لیا۔ اسے ساس کے ہمت ہار جانے پر شکوہ نہیں تھا۔ ایک ماں اپنے ضبط کو جہاں تک آزما سکتی تھی، انہوں نے آزمایا تھا لیکن وہ کیا کرتی کہ اس کا وجود تو نر از د کے دو پلڑوں کے بیچ بٹا ہوا تھا۔ ایک پلڑے میں شوہر کی محبت تھی تو دوسرے میں چار چار خونی رشتے۔ ماں، باپ، بہن، بھائی..... سب کچھ داؤ پر لگ گیا تھا۔

”دھیواد مائی! تو نے اپنے بیٹے کی مشکل آسان کر دی۔“ اس نے پاؤں کا پورا وزن کبیر کے نرخرے پر ڈال دیا۔ وہ اگرچہ پٹ پٹ کر نڈھال ہو گیا تھا لیکن ایک جوان صحت مند جسم میں سے روح نکلنے کا عمل آسان نہیں ہوتا۔ اس کا پورا جسم بن پانی کی پھلی کے مانند اس بری طرح ٹپنے اور پھڑکنے لگا کہ مشرا کے لیے اس کے نرخرے

طرف آنے کے صاف اشارے ملے ہیں۔“ اس نے غصے میں کبیر کو ایک اور طمانچہ رسید کیا۔

”اگر وہ یہاں آتے تو اب تک تمہیں مل چکے ہوتے۔ تمہارے ساتھیوں نے میرا پورا گھر ادھیڑ ڈالا ہے۔ اگر وہ یہاں ہوتے تو تمہیں مل نہ جاتے۔“ اس بار کبیر کی آواز معمولی سی تیز ہو گئی۔

”بھونکتا ہے..... مجھ پر بھونکتا ہے، سالا کتا۔ میں تیرا یہ منہ ہی تو زردوں کا جس سے تو مجھ پر بھونکنے کی جرأت کر رہا ہے۔“ اس نے کبیر کے منہ پر لگا تار کٹی کے دے مارے۔ کتے اتنے زوردار تھے کہ اس کے ہونٹ پھٹنے کے ساتھ ساتھ سامنے کے دانت بھی مل گئے اور منہ سے خون اہل کر ٹھوڑی سے بہتا ہوا زمین پر پھینکے لگا۔ اس منظر کو دیکھ کر گل دوش اور کبیر کی ماں کے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔ ماں نے تو بے اختیار آگے بڑھنے کی کوشش بھی کی کہ بیٹے کو اس بے دردی سے مارنے والے کا ہاتھ پکڑ سکے لیکن چونکے کھڑے سپاہیوں میں سے ایک نے اسے اس زور کا دھکا دیا کہ وہ توازن کھو کر نیچے گر پڑی۔ گل دوش خاوند کو بھول کر ساس کو سنبھالنے کے لیے لپکی۔

”ابھی صرف تیرا گھر ادھیڑا ہے۔ زبان نہیں کھولے گا تو گھر کے ساتھ ساتھ تیری کھال بھی ادھیڑ کر رکھ دوں گا۔“ خونخوار آنکھوں والا کتے مارنا چھوڑ کر اب کبیر کے جڑوں کو اپنی آہنی انگلیوں میں جکڑے اسے دھمکا رہا تھا۔

”مجھے نہیں معلوم وہ لوگ کہاں ہیں۔“ مار کھا کر بھی کبیر انکار پر قائم تھا۔

”اور میں معلوم کیے بنا تیری جان نہیں چھوڑوں گا۔ جو مرا ہے وہ صرف انڈین آرمی کا سپاہی نہیں تھا، وہ میرا سگا بھائی تھا اور میں اپنے بھائی کے کھونیوں (خونیوں) کو نرک میں پہنچائے بنا چین سے نہیں بیٹھوں گا۔“ اس بار اس نے راکٹل کو نال کی طرف سے پکڑا اور اس کے بٹ سے کبیر کو بے دردی سے پیٹنے لگا۔ ہر ضرب زوردار تھی اور مارنے والا غصے میں اتنا پاگل ہو رہا تھا کہ مارتے ہوئے یہ تک نہیں دیکھ رہا تھا کہ سامنے والے کو کس جگہ چوٹ لگ رہی ہے۔ چند منٹوں میں ہی کبیر زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگا اور اس کے حلق سے دردناک چیخیں بلند ہونے لگیں۔ اس کی ہر بلند ہوتی چیخ کے ساتھ گل دوش اور اس کی ساس کی چیخیں بھی شامل ہو جاتی تھیں۔ وہ بھی اس ظالم سے فریادیں کرنے لگتی تھیں اور بھی اس ظلم پر چین۔ انہوں نے متعدد بار کبیر تک پہنچنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن ظالم کے معاونین جو دیے تو خاموش

پر پاؤں جمائے رکھنا مشکل ہو گیا۔ اس موقع پر اس کے حواری آگے بڑھے اور کبیر کی دونوں ٹانگیں مضبوطی سے جکڑ لیں۔ اب مشرک کا کام آسان ہو گیا تھا لیکن گل و شاد اور اس کی ساس کو قابو کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

”چھوڑ دے عالم! چھوڑ دے میرے بچے کو۔ تجھ پر خدا کا قہر نازل ہو اور تیرے بھائی کی طرح تُو اور تیرا سارا خاندان بھی کتے کی موت مارا جائے۔“ وہ اسے بددعا میں اور گالیاں دیتی ہوئی جنونی انداز میں اس کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ان کے جنون کے آگے بند باندھنا سپاہیوں کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔

”گولی مار دو سالیوں کو۔ میرے پر یوار کو شواب دینے والوں کو اس زمین پر رہنے کا ادھیکار نہیں ہے۔“ مشرک نے حکم صادر کیا۔ کبیر کے جسم نے آخری جھٹک لیا تو گل و شاد اور اس کی ساس بھی جسم میں پیوست ہونے والی گولیوں کے باعث جھٹکا کھا کر زمین پر گر چکی تھیں۔ کشمیر میں ہر روز رپا ہونے والے ظلم کی داستانوں میں ایک اور داستان کا اضافہ ہو گیا تھا۔

☆☆☆

”ہم جانتے ہیں کہ تم مسافر ہو اور تمہیں ہمارے پاس کچھ عرصے ہی مہمان رہنا ہے پھر بھی ہم تم سے اپنا دل لگا بیٹھے ہیں اور ہمیں سچ کچھ بھی لگتا ہے کہ ہمارا عمار واپس لوٹ آیا ہے۔“ شفاف پانی کے جھرنے کے قریب بیٹھے آغا جان اس سے بہت محبت اور اپنائیت سے مخاطب تھے۔

”زیر مینہ کہتی ہے تمہارا ہر نقش عمار جیسا ہے۔ اگر آج ہمارا عمار ہمارے پاس ہوتا تو بالکل تم جیسا ہی ہوتا۔“

”مجھے بھی آپ لوگوں سے بہت اپنائیت محسوس ہوتی ہے۔“ اس نے آغا جان کے ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام کر نرمی سے دبائے۔

”کاش میں بھی آپ کا عمار بن کر ہمیشہ آپ کے پاس رہ سکتا لیکن میں تو ان کے پاس بھی نہ رہ سکا جن کے دل بھی ہر پہل اسی طرح میرے لیے تڑپتے ہیں جس طرح آپ اور بی بی کے اپنے عمار کے لیے۔“

”لیکن ہمیں اس بات پر خوشی بھی ہے کہ ہم تم جیسے قابلِ فخر بیٹوں کے باپ ہیں۔“ آغا جان نے اس کے لہجے میں کھلی اداسی کو محسوس کر کے اسے گویا حوصلہ دیا۔

”عمار تو بے شک قابلِ فخر ہے کہ اس نے اپنی دھرتی کے لیے اپنی جان قربان کر ڈالی۔ آپ میرے لیے بھی دعا کیجئے گا کہ پھر زندگی اگر خرچ ہو تو عمار کی طرح کسی بلند مقصد

کے حصول کے لیے ہی خرچ ہو۔“ اس نے اپنی دلی خواہش بیان کی۔

”اللہ تمہیں تمہارے نیک مقاصد میں کامیاب کرے اور ان ظالموں کو نیست و نابود کر دے جو مظلوموں کی لاشوں پر اس دنیا میں اپنی جنت تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔“ ”آمین!“ اس نے آغا جان کی دعا پر بڑے دل سے کہا۔

وہ جبار علی عرف جبار کی تجویز پر کشمیر میں موجود تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ اس کے ایک عزیز عمار سے حیرت انگیز مشابہت رکھتا ہے اور جو تھوڑا بہت فرق موجود ہے، اسے اس لیے آرام سے نظر انداز کیا جاسکتا ہے کہ عمار اپنے جان پہچان والوں کے لیے گزشتہ چھ برس سے گمشدہ ہے۔ چھ برسوں میں انسان یوں بھی اچھا خاصا تبدیل ہو جاتا ہے اور ایک بڑھتی ہوئی عمر کے نوجوان میں تو یہ تبدیلی اور بھی زیادہ نمایاں ہوتی ہے اس لیے اسے عمار کی حیثیت سے بہ آسانی قبول کر لیا جائے گا۔ جبار علی کی یہ بات درست ثابت ہوئی تھی اور واقعی ارد گرد والوں نے ایک حیرت انگیز مسرت کے ساتھ اسے قبول کر لیا تھا۔

”مجھے جبار نے عمار کی شہادت کے کچھ عرصے بعد ہی اطلاع دے دی تھی لیکن میں زیر مینہ کو یہ خبر نہیں دے سکا۔ وہ اس آس پر جیتی ہے کہ ایک دن اس کا عمار واپس لوٹ آئے گا۔ مجھے لگتا ہے جس دن اس کی یہ آس ٹوٹ گئی، اس کی سانسوں کی ڈور بھی ٹوٹ جائے گی۔“ ان کی بے نور آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی۔

”مجھے جبار علی نے عمار کے بارے میں بتایا تھا۔ مجھے اس کے جذبے نے بہت متاثر کیا۔ اس طرح اپنے پیار کرنے والے ماں باپ اور گھر کے آرام کو چھوڑ کر گمنامی کی زندگی اختیار کر لینا اور گمنامی میں رہ کر ہی آزادی کے لیے جان نچھاور کر دینا معمولی قربانی نہیں ہے۔“ اس کے لہجے میں عمار کے لیے بے حد ستائش تھی۔

”یہ سب تو تم بھی کر رہے ہو۔“ آغا جان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی۔

”میں تو اس طرف دھکیلا گیا ہوں۔ عمار کی طرح میں نے خود سے اپنے لیے اس راہ کا تعین کہاں کیا تھا۔“

”تم منتخب کیے گئے ہو معاذ احمد! اس راہ کے مسافر کہیں بہت اوپر سے منتخب کیے جاتے ہیں۔ مجھ جیسوں پر تمہاری نگریم فرض ہے۔“ آغا جان نے اس کے بازو پر دباؤ ڈال کر اسے تعین دہانی کروائی۔

”آپ تو مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔“ وہ جھینپ سا گیا۔
”نہیں۔ میں تمہیں سراہ رہا ہوں اور تم پر رشک کر رہا ہوں۔“ آغا جان بر جستگی سے بولے۔ ”کاش، میری معذوری میری راہ میں رکاوٹ نہ بنتی تو میں بھی تم لوگوں کے ساتھ ہوتا۔“ ایک حسرت سی تھی ان کے لہجے میں۔

”ساتھ تو آپ اب بھی دے رہے ہیں۔ عمار کی تربیت آپ کے اور بی بی جان کے ہاتھوں نہ ہوئی ہوتی تو بھلا اس کے دل میں ایسا جذبہ پیدا ہوتا؟“ اس کے لیے وہ بوڑھا اور ناپیدائش سچ سچ قابل ستائش تھا۔

”آپ میری مدد کر کے بھی تو کتنی جرأت اور کشادہ دلی کا ثبوت دے رہے ہیں حالانکہ میں جس مقصد کے حصول کے لیے جدوجہد کر رہا ہوں، اس کا آپ کی جدوجہد آزادی سے براہ راست کوئی تعلق بھی نہیں ہے۔“

”امت مسلمہ کی بھلائی سے تو ہے نا۔“
”جی، وہ تو ہے۔“

”بس تو پھر کیا فرق پڑتا ہے کہ تم پاکستانی اور میں کشمیری۔ ہمارے دل تو ایک ہی ہیں نا اور ہم ایک ہی کلمے کی ڈور سے بندھے ہوئے ہیں۔“ آغا جان سچ سچ بہت کشادہ دل کے مالک تھے۔

”میں نے بنجامن سے بات کی تھی۔ موجودہ حالات بے شک پریشان کن ہیں لیکن میرے لیے ان حالات کی وجہ سے ہی بنجامن سے بات کرنا مزید آسان ہو گیا۔ میں نے اس سے کہا ہے کہ میں ان حالات میں عمار کو کشمیر میں رکھنا مناسب نہیں سمجھتا اس لیے بہتر ہے کہ تم اسے کہیں باہر بھجوادو۔ تمہیں تو معلوم ہے کہ اس کا زیادہ کاروبار مشرق وسطیٰ میں ہے تو تمہارا کام آسان ہو جائے گا۔“

”یہ بہت اچھا کام کیا آپ نے۔ میں براہ راست اسرائیل نہ بھی جاسکا اور کسی قریبی ملک میں بھی پہنچ گیا تو آگے کی راہ نکال لوں گا۔“ وہ سن کر خوش ہو گیا۔

”تمہارا پاسپورٹ تو بنا ہوا ہے نا؟“

”جی بالکل۔ ہمارے انڈیا میں اچھے کانٹیکٹس ہیں اس لیے اس طرح کے سارے کام آسانی سے ہو جاتے ہیں۔ جاردو، میرا مطلب ہے جبار علی نے جب عمار بننے کی تجویز دی تو اس تجویز کو قبول کرنے کی بڑی وجہ ہی یہ تھی کہ یہاں سے سارے انتظامات کرنا ہمارے لیے نسبتاً آسان تھا۔ پھر مسٹر جونا تھن کی مدد شامل ہونے سے مزید آسانی ہو گئی۔“ وہ جھرنے کے پانی پر نظریں جمائے ان کے سوال کا جواب دینے لگا۔ مشکل حالات کے باوجود کشمیر کا بے

مثال حسن بار بار اس کی نظروں کو باندھ لیتا تھا۔

”ہاں، مسٹر جونا تھن ہمارے لیے اللہ کا بہت بڑا انعام ہیں۔ جبار علی نے مجھے بتایا تھا کہ انہوں نے عمار کو بھی بہت سپورٹ کیا۔ عمار کی شہادت کے بعد وہی تھے جنہوں نے اتنی خاموشی سے اس کی تدفین کروائی کہ کسی کو کانوں کان اس کی حقیقت کا پتا نہیں چل سکا۔“ عمار کے ذکر پر ہر بار ان کی آنکھوں میں کرب کروٹیں لیتا تھا۔

”ایک غیر مسلم ہو کر مسلمانوں سے اتنی ہمدردی حیرت انگیز ہے۔“ اس کی حیرت لیوں پر آگئی۔

”انسانیت سب سے بڑا مذہب ہے لیکن جبار علی نے مجھے بتایا تھا کہ مسٹر جونا تھن عرصہ ہوا اسلام قبول کر چکے ہیں۔ شروع میں ڈر کر اظہار نہیں کیا پھر مصلحت آڑے آگئی کیونکہ یہ تو طے ہے نا کہ جونا تھن کی حیثیت سے وہ شکوک و شبہات سے بالاتر ہو کر جتنا عمدہ کام کر سکتے ہیں، کسی مسلمان شناخت کے ساتھ نہیں کر سکتے۔“

”لیکن اس طرح ان کو اپنی نجی زندگی میں تو کافی مشکلات پیش آتی ہوں گی؟“

”زیادہ نہیں۔ ان کی بیوی ایک کشمیری مسلمان ہی ہے۔ درحقیقت انہیں اس لڑکی کی محبت نے ہی اسلام کی طرف راغب کیا تھا۔ اسی کی وجہ سے وہ خفیہ طور پر مسلمان بھی ہو گئے تھے۔ اعلان کرنا اس لیے ضروری نہیں تھا کہ انڈیا ایک سیکولر ملک ہے اور وہاں ہندو مسلم شادی اتنا بڑا ایشو نہیں ہے۔ جبار علی کے مطابق ان کی بیوی ایسی باکمال عورت نکلی کہ اندر سے انہیں بدل کر رکھ دیا اور آج وہ ہم کشمیریوں کے سب سے بڑے ہمدرد ہیں۔“ انہوں نے اسے تفصیلات سے آگاہ کیا۔

”اللہ کا اذن شامل ہو تو مشکلات اسی طرح آسان ہوتی ہیں۔“ وہ بے اختیار بول اٹھا۔

”بے شک۔“ آغا جان نے اس کی تائید کی۔

”چاچا شیر خان اور ان کے خاندان کی کوئی خبر؟ مجھے ان کی فکر ہو رہی ہے کہ کہیں وہ لوگ انڈین آرمی کے ہتھے نہ چڑھ جائیں۔“

”اللہ ان کی مدد فرمائے۔ کاش مجھے بروقت اطلاع مل جاتی تو میں ان کو کسی مناسب جگہ بھجوا دیتا۔ حاجی شیر خان بے چارہ سیدھا سادہ آدمی ہے۔ ان حالات میں خاندان کو لے کر نہ جانے کہاں بھٹکا پھر رہا ہوگا۔“ وہ خود ان لوگوں کے لیے پریشان تھے۔

”آپ نے اپنے طور پر معلومات حاصل کرنے کی

کوشش نہیں کی؟“

”میرا آج کل زیر نگرانی ہونا یقینی ہے اس لیے میں اپنے سارے رابطوں سے لا تعلق بنا ہوا ہوں اور کسی طرح کی معلومات حاصل نہیں کر سکتا۔“ انہوں نے اپنی مجبوری بتائی۔ معاذ بھی اس بات کو سمجھتا تھا۔ بنجامن کی ضمانت اور گواہی اسے سلاخوں سے باہر تو لے آئی تھی لیکن وہ شکوک و شبہات کی زد میں تھا اور اس کی وجہ سے آغا گل بھی۔ اسے اس وقت مجبوریوں اور مصلحتوں میں جکڑے کشمیریوں کی بے بسی کا حقیقی ادراک ہوا۔

☆☆☆

اس بنگ و تارک اور سلین زدہ تہ خانے میں موجود ان چار نفوس کے لیے کھل کر سانس لینا بھی محال تھا۔ وہاں ایک ٹھن ٹھن جھونک میں بیزاری پیدا کرتی تھی اور سلین اور تارکی کی وجہ سے قوطیت میں تبدیلی ہو جاتی تھی۔ تہ خانے میں بجلی کا کنکشن تھا لیکن کبیر نے انہیں بلب روشن کرنے سے منع کیا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ اگر کسی درز سے روشنی باہر چلی گئی تو کسی کو ان کی وہاں موجودگی کا شک ہو جائے گا۔ وہ محض زیرو کے بلب کی روشنی میں گزارہ کر رہے تھے اور اتنی احتیاط سے چلتے پھرتے تھے کہ کوئی آہٹ پیدا نہ ہو۔

”مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی اچھی میزبانی نہیں کر سکوں گا اور آپ کو یہاں تھوڑی سی ترشی میں گزارہ کرنا پڑے گا۔“ کبیر نے انہیں یہاں ٹھہراتے ہوئے واضح الفاظ میں بتا دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اسے اشیائے ضرورت کے ساتھ اس طرف آتا جاتا دیکھ کر کوئی کھوج میں پڑ جائے اس لیے ہر ممکن احتیاط سے کام لے رہا تھا لیکن ممکنہ حد تک انہیں سہولیات بھی فراہم کی تھیں۔ بستر، ضرورت کے کچھ برتن، خشک میوہ جات اور پانی..... یہ وہ بنیادی ضرورت کی چیزیں تھیں جو اس نے کسی نہ کسی طرح انہیں فراہم کر دی تھیں۔ موقع پا کر گل دس کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا بھی ان تک پہنچا دیتا تھا لیکن تین وقت کا تازہ کھانا کھانے کی عیاشی باقی نہیں رہی تھی۔

”انتی چھوٹی سی جگہ پر رہتے رہتے میری ٹانگیں اکڑنے لگی ہیں۔ مجھے تھوڑی دیر باہر جا کر کھیلنے دیں نا۔ میں باہر جا کر تازہ ہوا میں سانس لینا چاہتا ہوں اور روشنی میں چیزوں کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس تارکی میں رہ رہ کر تو مجھے ایسا لگنے لگا ہے جیسے میں اندھا ہو چکا ہوں۔“ کل ان کا چھوٹا بھائی بہرام ضد پر اڑ گیا تھا۔ ماں نے بڑی مشکل سے اسے

سمجھا بجا کر ضد سے باز رکھا لیکن یہ سوال تو سب ہی کے ذہن میں تھا کہ آخر وہ کب تک اس جگہ پر یوں قیدیوں کی طرح رہ سکتے ہیں۔ باہر اگر جان جانے کا خطرہ تھا تو یہاں بھی گھٹ گھٹ کر دم نکل جانے کا اندیشہ پیدا ہو چلا تھا۔ کبیر کے سامنے اس مسئلے کو رکھا گیا تو وہ بولا۔

”آپ کی بات بالکل درست ہے۔ واقعی اس جگہ کی کا زیادہ دن رہنا بہت مشکل ہے لیکن مجبوری یہ ہے کہ گھر پر آپ لوگ محفوظ نہیں رہیں گے اور میرے پاس اس کے سوا کوئی اور ٹھکانا موجود نہیں ہے۔“ وہ چاروں ہی جانتے تھے کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔

”میں کوشش کرتا ہوں کہ میرا کسی حریت پسند تحریک کے دوست سے رابطہ ہو جائے۔ عام آدمی کی نسبت ان کے پاس پھر بھی تھوڑے بہت وسائل ہیں اور وہ آپ لوگوں کے لیے کسی محفوظ مقام کا انتظام کر سکتے ہیں۔“ وہ انہیں ایک آس سی دلا کر چلا گیا تھا اور آج دوپہر میں بس ذرا کی ذرا کھانا پہنچانے ہی آیا تھا۔ اس کا پہنچایا ہوا کھانا ٹھنڈا ہی سمی، پر اتنا تھا کہ رات کو بھی شکم سیری کے کام آ گیا تھا۔ صرف پری دس تھی جس نے روٹی نہیں کھائی تھی اور بھوک نہ ہونے کا بہانہ کر کے چند خشک خوبانوں پر گزارہ کر لیا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کے حصے کی روٹی صبح بہرام کے کام آ جائے۔ وہ ویسے ہی اس جبراً اختیار کی جانے والی قید سے بیزار تھا۔ ایسے میں بھوک کے عفریت کا شکار ہو جاتا تو ان کے لیے اسے بہلانا اور بھی مشکل ہو جاتا۔ دو بیٹیوں کے بعد خاصے وقفے سے پیدا ہونے والے بہرام کو یوں بھی ہتھیلی کے چمالے کی طرح پالا گیا تھا اس لیے وہ کچھ نازک مزاج بھی تھا۔

”میری ذرا سی جذباتیت نے میرے پورے خاندان کو مشکل میں ڈال دیا ہے۔“ پری دس ہاں کے ساتھ بستر پر لیٹی اس وقت کے لیے بچھتا رہی تھی جب وہ جذبات میں اندھی ہو کر رات گئے عمار کے لیے کھانا لے کر آغا گل کے گھر کی طرف چل پڑی تھی۔ ایک تو غیر یقینی حالات سے پیدا ہونے والا ذہنی دباؤ تھا، دوسرے خالی پیٹ بھی پریشان کر رہا تھا اس لیے نیند اس کی آنکھوں سے دور تھی اور وہ بہت کچھ سوچتی جا رہی تھی لیکن اس کیفیت میں بھی اسے اس بات کا خیال تھا کہ اس کی اندرونی بے چینی ظاہر نہ ہونے پائے۔ وہ ماں کی نیند خراب ہونے کے خیال سے آنکھیں موندے بالکل ساکت لیٹی ہوئی تھی۔ یوں تو اس تہ خانے میں دن رات تقریباً برابر ہی تھے لیکن قدرت کے عطا

زیادہ آگے نکل جائے۔“ چھوٹے بھائی کے خیال نے اسے فکر میں مبتلا کیا تو سب بھول بھال کر اس کی تلاش میں قدم آگے بڑھائے۔ چڑھتا چاند تھا اس لیے رات کا وقت ہونے اور کوئی مصنوعی روشنی نہ جلنے کے باوجود اتنا گھپ اندھیرا نہیں ہو رہا تھا کہ کچھ دکھائی نہ دے۔ اس کی نظروں نے جلد ہی بہرام کو جالیا۔ وہ باغ کے پھانک کی طرف جا رہا تھا۔

”مجھے اسے روکنا ہوگا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ باہر نکل کر کسی مشکل میں گھر جائے۔“ وہ دل ہی دل میں سوچتی اس کے پیچھے لگی۔ دائیں بائیں ایک خاص ترتیب میں لگے سیب کے پیڑوں نے حسرت سے اس دھرتی کی بیٹی کو دیکھا جس کی مٹی میں وہ تاثیر تھی کہ اس کا تقابل صرف جنت سے ہی کیا جاسکتا تھا۔ روئے زمین پر دوسرا کوئی خطہ بھلا کشمیر کی مثل کہاں تھا۔ اس دھرتی سے جنم لینے والا حسن بے مثال تھا تو نمونہ پانے والے ذائقے لا جواب۔

لا جواب ذائقے والے سیبوں کے وہ بیڑا اگر بول سکتے تو اپنی دھرتی کی بیٹی کو پکار کر یہاں سے کہیں دور بھاگ جانے کا مشورہ دیتے لیکن چونکہ وہ بول نہیں سکتے تھے تو ان کے نصیب میں بے بسی سے سب دیکھتے رہنا ہی لکھا تھا۔

”بہرام!“ اپنی جانب بڑھتے خطرے کی بوسو گھمے بغیر ہی پری دوش نے دلی آواز میں بہرام کو پکارا لیکن اس کی پکار بہرام تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ وہ ان گاڑیوں کے غراتے انجنوں کی آواز میں کم ہو گئی تھی جو ابھی ابھی وہاں پہنچی تھیں اور جن سے بھارتی سپاہی اچھل اچھل کر باہر کور ہو رہے تھے۔

پری دوش کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ بہرام بھی ان آوازوں کو سن چکا تھا اور ٹھٹھک کر اپنی جگہ رک گیا تھا۔

”بھاگو بہرام! بھاگو اور ان پیڑوں کے درمیان کہیں جا کر چھپ جاؤ۔“ وہ جواب تک بہرام کو لا علم رکھنے کی خاطر اس کے پیچھے بہت احتیاط سے آرہی تھی۔ پوری رفتار سے دوڑ کر اس تک پہنچی اور اضطراری لہجے میں اس سے کہا۔

”پہلے دیکھنے تو دیں آپا کہ کون ہے؟“ وہ مضطرب تھا لیکن پری دوش جتنا نہیں۔

”دیکھنا کیا ہے میرے بھائی! میں ان بھیڑیوں کی بو کو یہاں سے بھی محسوس کر سکتی ہوں۔“ باہر سرچ لائٹیں روشن ہونا شروع ہو گئی تھیں اور کوئی دم نہیں جاتا تھا کہ وہ پھانک توڑ کر اندر کھس آتے۔

”آپ..... آپ بھی میرے ساتھ چلیں آپا!“ بہرام نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ سمجھنے لے جانے کی کوشش کی۔

”نہیں، تم جاؤ۔ میں جا کر اماں اور بابا کو خبر دیتی

کر رہا تھا اور خود اپنے برسوں کے معمول کے باعث وہ لوگ مقررہ اوقات میں سونا جاگنا اور کھانا پینا انجام دیتے رہتے تھے۔ اب بھی قدرت کی طرف سے جسم میں چلتی حیاتیاتی گھڑی نے طے شدہ معمول کے مطابق سب کو سونے کے لیے لٹا دیا تھا اور اس تہ خانے میں موجود چاروں نفوس میں سے صرف وہی تھی جو اس پہر جاگ رہی تھی۔

اجانک ہی آہٹ ہوئی تو وہ چونک گئی اور پٹ سے آنکھیں کھول کر اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ کپڑوں کی ہلکی سی سرسراہٹ نے اسے بتایا کہ اس کے علاوہ بھی کوئی ہے جو اس وقت جاگ رہا ہے۔

”کون؟“

سوال کا جواب زیادہ مشکل نہیں تھا۔ اپنے ساتھ سوئی ماں کی گہری سانسیں تو وہ سن ہی رہی تھی اور باپ کا معلوم تھا کہ وہ اتنی گہری نیند سونے کے عادی تھے کہ اگر انہیں جگا یا نہ جائے تو فجر سے پہلے درمیان میں کسی صورت نہیں اٹھتے تھے۔

”بہرام!“ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے سے اسے اندھیرے میں بھی بالآخر اٹھنے والے کا ہیولا دکھائی دے ہی گیا۔

”یہ اس وقت چپکے چپکے کہاں جا رہا ہے؟“ بہرام بے حد احتیاط سے بالکل دبے قدموں حرکت کر رہا تھا اس لیے وہ یہ نہیں سمجھ سکتی تھی کہ وہ کسی حاجت کے باعث اٹھا ہے۔ یوں بھی اس کا رخ تہ خانے کے ایک کونے میں بنے بیت الخلا کے بجائے اس جانب تھا جہاں تہ خانے سے اوپر جانے والی سیڑھیاں موجود تھیں۔

”اوہ میرے خدایا! اس کے دماغ سے باہر جا کر کھلی فضا میں سانس لینے کی بات نکلی نہیں ہے اور یہ اس وقت چپکے سے باہر جا رہا ہے۔“ اسے معاملہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی لیکن اس نے بہرام کو روکنا اور ٹوکنا بھی مناسب نہیں سمجھا اور چپ چاپ اپنی جگہ پڑی اسے دیکھتی رہی۔ وہ اتنی احتیاط سے کام لے رہا تھا کہ اگر وہ جاگ نہ رہی ہوتی تو اسے اس کے اس طرح جانے کا پتا بھی نہیں چلتا۔ وہ زینہ طے کر کے تہ خانے کا راستہ کھول کر باہر نکل گیا تو وہ خود بھی اسی کی طرح احتیاط سے بستر سے اٹھی اور اوڑھنی کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹے ہوئے زینہ چڑھ گئی۔ تہ خانہ اوزاروں والے کمرے میں کھل رہا تھا اور کمرے کا دروازہ بہرام کھلا چھوڑ گیا تھا۔ وہ بھی کھلے دروازے سے باہر چلی آئی۔ باہر آتے ہی ٹھنڈی اور تازہ ہوا کا جھونکا جسم سے ٹکرایا تو اسے بہت اچھا لگا اور بے اختیار ہی اس نے ایک گہری سانس لی۔

”یہ بہرام کہاں چلا گیا، اسے دیکھتی ہوں، ایسا نہ ہو کہ

ہوں۔“ اس نے بہرام کو دائیں جانب دھکیلا اور خود جس راستے پر چل کر یہاں آئی تھی، اسی پرواہیں دوڑ گئی۔ یہی وہ وقت تھا جب ایک بڑی گاڑی نے لکڑی کے پھانک کو ٹکڑا ماری۔ کمزور سا پھانک پہلی ہی ٹکڑ میں اپنے قبضوں سے اکھڑ کر زمین بوس ہو گیا۔ گاڑی غراتی ہوئی اندر داخل ہوئی اور اس کی طاقتور ہیڈ لائٹس کی روشنی نے فوراً ہی دوڑتی ہوئی پری دوش کو جالیا۔ ایک ساتھ کئی گولیاں چلیں اور اس کے دائیں بائیں سے سنسناتی ہوئی گزرتیں۔ گھبراہٹ میں اسے ٹھوکر لگی اور لڑکھڑا کر زمین پر گر گئی۔ گولیاں چلانے والے اس منظر کو دیکھ کر وحشیانہ انداز میں قہقہے لگانے لگے۔ وہ چڑیا کو دبوچنے سے پہلے اس کے پھڑپھڑانے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

”مر جانا ہے مگر ان کے ہاتھ نہیں آتا۔“ بیچے گری پری دوش کے سامنے بربریت کی بے شمار داستانیں تھیں اس لیے اسے فیصلہ کرنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگا۔ وہ گاڑی کے اپنے قریب پہنچ کر رکنے سے قبل ہی اٹھی اور ایک جانب دوڑ پڑی۔ فوراً ہی ایک بار پھر گولیاں برسیں اور اس کے آس پاس سے گزرتیں۔ وہ جانتی تھی کہ بھارتی سپاہیوں کا نشانہ اتنا کچا نہیں کہ اسے نشانہ نہیں بنا سکیں۔ وہ صرف اسے ڈر رہے تھے اور اس کے ڈر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ انہیں اس بات کا ادراک نہیں تھا کہ ایک آبرو مند لڑکی کے لیے اس کی آبرو زندگی سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ وہ بھی موت کے ڈر سے بے نیاز اپنی آبرو کی حفاظت کے لیے سرپٹ دوڑ رہی تھی۔ یہ باغ اس کے بہنوئی کا تھا۔ وہ یہاں بے شمار بار آئی تھی اس لیے اسے اچھی طرح علم تھا کہ اس وقت باغ کا کون سا گوشہ اسے پناہ دے سکتا ہے۔

”پکڑو سالی کو، بھاگنے نہ پائے۔“ گاڑی رک چکی تھی اور اس میں سے بھارتی سپاہی اچھل اچھل کر باہر نکل رہے تھے۔ یہ مشرق تھا جو چلائی گئی گولیوں کو بے اثر جاتا دیکھ کر زور سے چلایا تھا۔ اس کے سامنے اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی پری دوش کے پیچھے دوڑ گئے۔

گولیوں کی آوازوں نے تہ خانے میں سوتے ہوئے حاجی شیر خان اور اس کی بیوی کو بھی نیند سے جگا دیا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھے تھے اور فوراً ہی انہیں اپنے بچوں کی غیر موجودگی کا ادراک ہو گیا تھا۔

”بہرام نہیں ہے، بہرام کی ماں!“

”پری بھی غائب ہے۔“ ماں کی آواز اندیشوں سے لرز رہی تھی۔

”اس طرح چپ چاپ رات گئے وہ کہاں اور کیوں گئے؟“ حاجی شیر خان کو اپنے سوال کا جواب تو نہیں ملا لیکن باہر چلتی گولیوں کی آواز نے ایک بار پھر دل کو لرزادیا۔

”میرے بچے۔“ ممتا تڑپ کر پکاری اور دنیا کے ہر خوف کو پس پشت ڈال کر ایک ماں کو اوپر کی طرف دوڑایا۔ حاجی شیر خان جس کا سب کچھ داؤ پر لگ چکا تھا، اب وہاں ٹھہر کر کیا کرتا۔ وہ بھی بیوی کے پیچھے ہی بھاگا۔ تہ خانے کا کھلا راستہ اور اس سے آگے کمرے کا چوہٹ کھلا دروازہ سب گواہی دے رہے تھے کہ اندر کے جس اور اندھیرے سے گھبرائے ان کے بچے کھلی فضا کی خواہش میں باہر نکلے تھے اور.....

اس اور سے آگے سوچنے کا انہیں حوصلہ نہیں تھا لیکن جو سوچا نہیں جاسکتا تھا وہ حقیقت کے روپ میں ان کے سامنے تھا۔ کھلے دروازے سے باہر تیز روشنی اور اس روشنی میں دکھائی دیتی ایک کے پیچھے ایک کھڑی فوجی گاڑیاں۔ ان دونوں کے دل اس منظر کو دیکھ کر بری طرح ڈوب گئے اور انہوں نے وہاں موجود بھارتی سپاہیوں کے ہجوم میں پری دوش اور بہرام کو تلاش کرنے کی کوشش کی۔ وہ دونوں ہی وہاں موجود نہیں تھے۔ ایک طرف اطمینان ہوا تو دوسری طرف دماغ میں سوال بھی گونجنے لگے کہ آخر وہ دونوں کہاں ہیں؟

”ہینڈز اپ۔“ یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ ان خونی بھیڑیوں کی نظروں میں آنے سے محفوظ رہتے۔ ایک ساتھ کئی بندوقین ان کے اوپر تن گئیں۔

”بزدل چوہے بل میں چھپ کر بیٹھے تھے۔ کیا سمجھ رہے تھے تم کہ بھارت ماتا کے سپوت کو مار کر خود قتل جاؤ گے۔“ مشرق کا غصہ ان پر ٹکنے لگا اور اس نے بلا تکلف حاجی شیر خان کو رائفل کے کئی بٹ دے مارے۔

”ہم نے کسی کو نہیں مارا ہے۔ اس خبیث کو اس کے کرموں کا بدلہ دینے کے لیے اللہ نے ہمارے لیے فرشتہ بھیجا تھا۔ ہم بے گناہ تو بس تم ظالموں کے ظلم سے بچنے کے لیے چھپتے پھر رہے تھے۔“ اب کچھ نہیں رہا تھا جسے بچانے کی آس میں اپنی آواز کو گھونٹا جاتا۔ بھارتی درندوں کے نرغے میں آنے کے بعد رحم کی امید رکھنا خود کو دھوکا دینے کے برابر تھا اس لیے زبان پر پڑا نقل کھل گیا۔

”اس فرشتے کو بھی ہم ڈھونڈ نکالیں گے لیکن پہلے ان زبانوں کو تو بند کر دیں جو ہمارے خلاف بھونکتی رہتی ہیں۔“ اس نے رائفل کی نال جارحانہ انداز میں پری دوش کی ماں کے منہ میں گھسائی اور گولی چلا دی۔ گولی کا زاویہ کچھ ایسا بنا کہ وہ تالو کو پھاڑتی ہوئی کھوپڑی سے باہر نکل گئی اور نشانہ ا

بہترین تحریریں، لاجواب زوداد اور
اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

کراچی
سرگزشت
ماہنامہ

شمارہ مارچ 2024ء
کی جھلکیاں

نوائے حیات

زویا صفوان کے قتل سے ایک
معروف ادیب کی سوانح حیات

کاروان زیست

معروف تملکار طاہر جاوید مغل
کی روداد حیات

غاطی

احمد نعمان شیخ کی دلچسپ
تحریر کہ غاطی سے قتل ہوا

بیروشن

معروف اداکار محمد علی کی
ہسپروئٹوں کا تذکرہ حنا ص

البرجنوں

احمد سلیم سلیم کی لہو گرما
دینے والی طویل ترین تحریر

عزت دار

فوج انیس کے قتل کی سحر
آفرینی ایک پُر سوچ سچ بیانی

الذی کے علاوہ

بہت سی سچ بیانیاں، سچے قصے، تاریخی واقعات

بننے والی مظلوم عورت کو دوسری سانس لینا بھی نصیب نہ ہوا۔
”بزدلو! ایک عورت کو گولی مار کر کون سی بہادری کا
ثبوت دیا ہے تم نے۔ ماں کا دودھ پیا ہے تو آؤ اور ہتھیار
پھینک کر کسی مرد سے لڑو۔“ زندگی کی سانسی کو یوں پل بھر
میں اپنی نظروں کے سامنے دم توڑتے دیکھ کر شیر خان کا
دماغ صدمے سے الٹ گیا اور وہ سب کچھ بھول بھال کر
لڑنے مرنے پر اتر آیا۔ اس کے اس بے بس اظہار پر ان
لوگوں نے زوردار قہقہہ لگایا پھر مشرا اس کے صین سامنے کھڑا
ہو کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

”سنا ہے بچنے سے پہلے چراغ خوب پھڑکتا ہے۔ تیرا
بھی کچھ وہی حال ہے۔ چل پھڑکنا چھوڑ، ہم تجھے بھی وہیں
پہنچا دیتے ہیں جہاں تیری مٹی اور باقی کا پر یوار موجود ہے۔“
اس نے رائفل کی نال جامی شیر خان کے سینے پر رکھ دی۔
”کیا مطلب؟ کیا کیا ہے تم نے میرے بچوں کے
ساتھ؟“ شیر خان رونے والا ہو گیا۔

”ہم سے غداری کی سزا بھگتی ہے حرام زادوں نے۔
ہمارے مجرموں کو پناہ دی گئی تا تیری بیٹی، داماد نے۔ لے پھر
ان کے لیے دھرتی پر کہیں کوئی پناہ نہیں رہی۔ مار آئے ہیں
ان فداوروں کو اور اب تمہاری باری ہے۔“ مشرانے دیوالگی
کے عالم میں اس کے چہرے پر رائفل کے کئی بٹ مارے۔
شیر خان کو اگرچہ دو سپاہیوں نے جکڑا ہوا تھا پھر بھی وہ پھر گیا
اور خود کو ایک جگہ سے چھڑاتے ہوئے مشرا کا گلا پکڑ لیا۔

”خون پی جاؤں گا میں تیرا۔ لسلوں سے تم ہمیں ڈس
رہے ہو، اب تمہاری باری ہے۔“ دیوالگی میں وہ اس زور
سے مشرا کا گلا گھونٹ رہا تھا کہ لکھوں میں اس کے ہاتھ پیر
ڈھیلے پڑ گئے تھے اور حلق سے خرخرات کی آوازیں نکلنے لگی
تھیں۔ مٹی سپاہیوں نے زور لگا کر اسے مشرا سے الگ کرنے
کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ یہ جبر کی استقامت کہ
ایک سید حاسادہ آدمی مقابلے پر اتر آیا تھا۔

”گولی مار دو اسے۔“ مشرا کی جان پر بننے دیکھ کر حکم
صادر کرنا پڑا۔ گولی شیر خان کی کھوپڑی میں اتری تو مشرا کے
زخروں پر جیسے اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیل پڑ گئی اور وہ
کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح زمین بوس ہو گیا۔

ادھر مشرا گلے پر دباؤ ڈالنے سے ایک بار پھر جی اٹھا اور کسی
ہانپے ہوئے کتے کی طرح منہ کھول کر لمبے لمبے سانس لینے لگا۔
ذرا حالت سنبھلی تو شیر خان کے مردہ وجود کو گھوم کر مار کر چمکا۔

”کہاں ہے اس کی لوٹڈیا؟ جلدی سے لے کر آؤ
اسے۔ اس کی لاش پر لٹا کر اس کی لوٹڈیا کا بلاتے کار نہیں کیا تو

نہیں ہے۔“ سہل کی سولی اپنی جگہ لگی تھی۔

”جار ہے ہیں نا ہم اس کے پاس۔ ان شاء اللہ اس کے آپریٹ سے پہلے ہی اس کے پاس پہنچ جائیں گے۔“ اس بار عالم نے بحث کرنے کے بجائے رسان سے جواب دیا۔ انہیں بہت اچانک ہی مول کی بیماری کی خبر ملی تھی۔ اس کے پتے میں پتھری ہو گئی تھی۔ ڈاکٹرز کے مطابق ایسا کافی عرصے سے تھا لیکن مول نے سب سے یہ بات چھپائی اور دواؤں کی مدد سے اپنی تکلیف کو دباتی رہی۔ شاید حویلی میں پھیلتی لینش کی وجہ سے اس نے ایسا کیا تھا۔ اسے خیال ہو گا کہ اتنی پریشانی میں ماں باپ کے لیے ایک اور پریشانی کیا بڑھائے لیکن اس کے اس طرز عمل کا نتیجہ اس طور سامنے آیا تھا کہ ڈاکٹرز نے فوری آپریشن کو ناگزیر قرار دے دیا تھا۔ اتنا بڑا کام ملازمین کے سہارے انجام نہیں پاسکتا تھا اس لیے اطلاع ان لوگوں تک پہنچادی گئی تھی۔ اس اطلاع کو سن کر صداقت شاہ نے کہا تھا۔

”میں اور تمہاری اماں سائون پاکستان واپس چلے جاتے ہیں۔ تم دونوں، بہن بھائی، نیلی اور اعظم کے ساتھ بیٹن رہو۔ سہل ٹھیک ہو جائے تو پھر وطن واپسی کا پروگرام بنالیتا۔“ لیکن اس موقع پر سہل ضد پر اڑ گئی تھی اور بہن کے پاس واپس جانے کی رٹ لگاتی تھی۔ ہمیشہ کی مفاہمت پسند سہل کا یہ انداز سب کے لیے نیا تھا لیکن پھر کوئی اس سے رک جانے پر زیادہ اصرار بھی نہیں کر سکا تھا۔ وہ بہت نازک وقت سے گزری تھی اور اب بھی معذوری کا بوجھ اٹھائے تھیں طور پر شدید ذہنی دباؤ سے گزر رہی تھی اس لیے اس کو کسی ایسی بات کے لیے مجبور نہیں کیا جاسکتا تھا جس سے اس کے ذہنی دباؤ میں اضافہ ہو جائے۔ مجبوراً ہی سہی، اس کی بات مان لی گئی تھی اور وہ سب وطن جانے والی فلائٹ میں سوار تھے۔

سہل کی حالت کے پیش نظر عالم شاہ بطور خاص اس کے ساتھ بیٹھا تھا اور اس کی اضطراری حالت کو دیکھ کر اپنے طور پر اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ کچھ سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہے اور نہ ہی اسے مول کے سوا کچھ بھائی دے رہا ہے۔

”کتنی دیر اور لگے گی؟“ وہ اڑ کر ہی بہن کے پاس جارہی تھی لیکن چاہتی تھی کہ کچھ ایسا ہو جائے کہ پلک جھپکنے میں اس تک پہنچ جائے۔

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نوجوان
کی داستان جو غلط کاروں کے لیے غضب
ناک تھا باقی واقعات آیتہ ماہ پڑھیے

میرا نام بھی مشرانہیں۔“ جس وقت وہ یہ الفاظ کہہ رہا تھا، پری وٹس کے پیچھے دوڑنے والے اس کے سپاہی پری کے سر پر پہنچ چکے تھے اور یوں لگتا تھا کہ اگلے ہی لمب وہ ان کی گرفت میں ہوگی لیکن پھر پل میں ہی بازی پلٹ گئی۔ سپاہیوں کے ہاتھ اس کے جسم کو چھو پاتے، اس سے پہلے وہ باغ کی پرلی جانب اس کنویں کی منڈیر پر پھیر جما چکی تھی جسے اپنی آخری پناہ گاہ تصور کر کے اس طرف دوڑی آئی تھی۔

”رک جا، میں کہتا ہوں اسے لڑکی رک جا۔“ ایک سپاہی زور سے چلایا اور اضطراری طور پر اس پر رائل تان لی لیکن پھر اسے خود ہی احساس ہو گیا کہ جو خود ہی مرنے کی ٹھانے بیٹھا ہو، اسے موت سے نہیں ڈرایا جاسکتا۔ رائل نیچے جھک گئی اور پری وٹس نے ایک فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ کنویں میں چھلانگ لگا دی۔

☆☆☆

”فکرمات کرو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ عالم شاہ نے مسلسل تسلی گھماتی سہل کی نقاب سے جھانکتی فکرمند آنکھوں پر ایک نظر ڈالی اور اسے تسلی دی۔

”ان شاء اللہ!“ جواب میں وہ دل کی گہرائیوں سے بولی پھر اپنی پریشانی کی وضاحت دیتے ہوئے بولی۔

”مول چھوٹی ہے۔ اس پر کبھی کوئی ذمے داری نہیں رہی اس لیے مجھے فکر ہو رہی ہے کہ وہ تنہا اس مشکل اور تکلیف دہ وقت سے کیسے گزر رہی ہوگی۔ اسے تنہا نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔ آپ، اماں یا بابا سائیں میں سے کوئی ایک تو اس کے پاس رک جاتا۔“

”حالات تمہارے سامنے ہیں۔ تم جس حالت میں تھیں، یہ کیسے ممکن تھا کہ ہم میں سے کوئی ایک بھی تم سے دور ہونا منظور کر لیتا۔“

”ہاں، لیکن مول.....“

”تم مول کو انڈر اسٹیمٹ کر رہی ہو۔“ عالم نے اسے بات مکمل نہیں کرنے دی۔ ”ادا معظم شاہ کی وفات سے لے کر اب تک بے شمار مشکلات آئی ہیں اور ہر مشکل وقت میں یہ مول ہی تھی جس نے بہت حوصلے سے کام لیا ہے۔ اماں سائون کو پرسکون رکھنا۔ انہیں سنبھالنا، حویلی کا نظم و نسق دیکھنا اور بابا سائیں کو تسلی اور حوصلہ دینا۔ یہ ساری وہ ذمے داریاں تھیں جو مول کی عمر سے بہت بڑی تھیں لیکن اس نے انہیں ایسے سنبھالا کہ کسی کو احساس بھی نہیں ہونے دیا کہ وہ کوئی بڑا یا مشکل کام انجام دے رہی ہے۔“

”لیکن اس وقت وہ مشکل اور تکلیف میں ہے تو ہم میں سے کوئی اسے سنبھالنے کے لیے اس کے فریب موجود



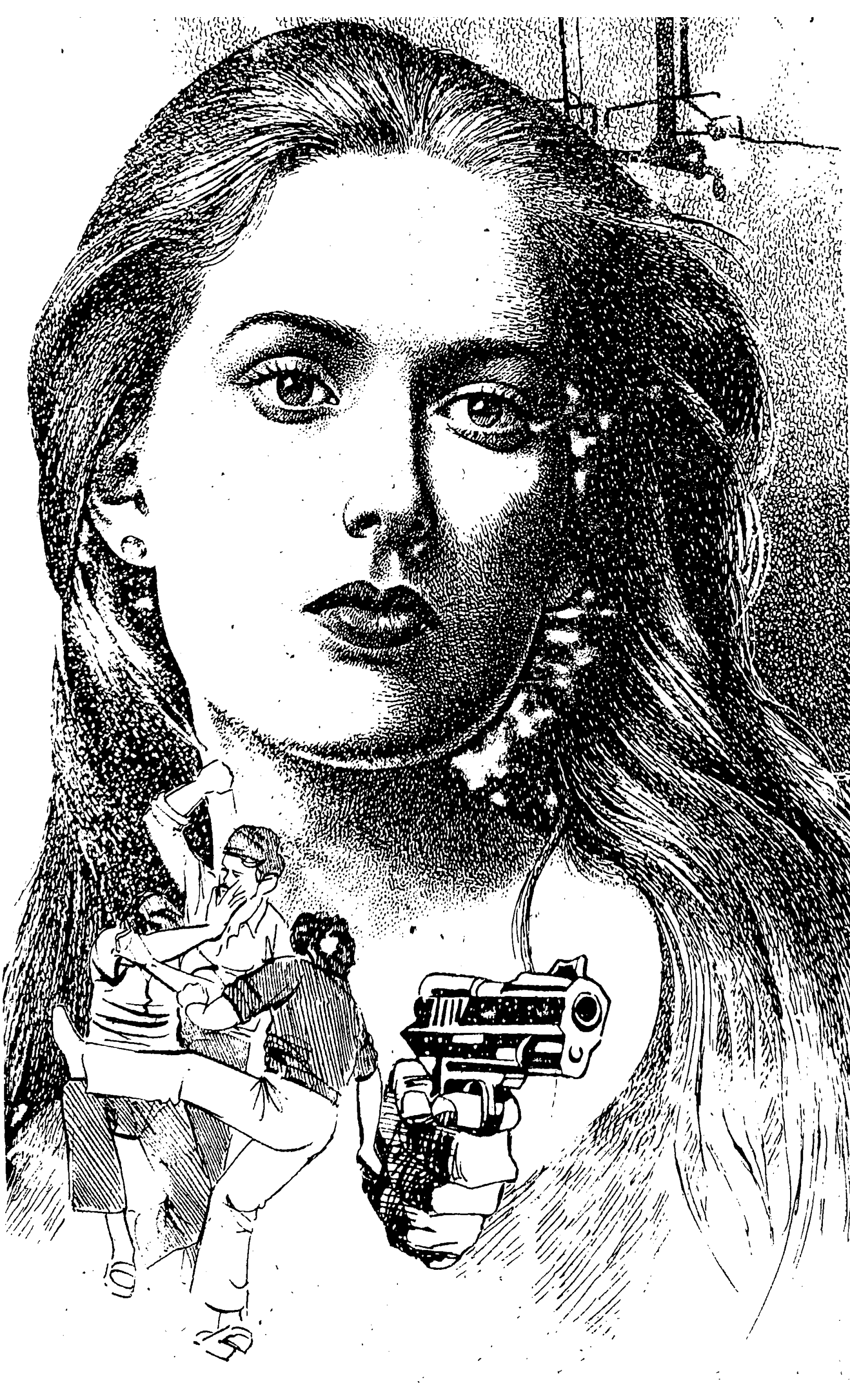
قسط نمبر: 50

شہ زولایا

اسات اور

زندگی پیار کا کیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تندوتیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابل شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پر عزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جارہے تھے... اس کی زندگی جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قراریوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تار عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ واردات قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہو سکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تحیر انگیز داستان



معاذ ایک ذہین لیکن متلون مزاج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جوائن کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ انسٹی ٹیوٹ سے واپس آ رہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو سڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی نڈر فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشری نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بشری ماس کمیونی کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم وغیرہ لکھتی ہے۔ اس ویران جگہ بھی وہ ایک زیر تعمیر رہائشی منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی آئی تھی۔ معاذ بشری کو بہ حفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کر دیتا ہے لیکن جن رئیس زادوں سے اس نے ان کا شکار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ایک دن جنگل کی سیر کے دوران وہ فوٹو گرافی کے شوق میں سب سے الگ تھلک ہو جانے والے معاذ کو بے خبری میں گھیر کر بڑی طرح زد و کوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دے دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس نہ آنے پر انتظامیہ کے افراد، پولیس اور ریسکیو ذرائع کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جوگی کی جھونپڑی میں پاتا ہے۔ جوگی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے، جوگی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نواز کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ نے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے پراسرار علم سکھانے کی ہامی بھر لیتا ہے اور معاذ اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ادھر جانے وقوع سے ملنے والے معاذ کے کمرے سے جب تصویریں نکلوائی جاتی ہیں تو ایک ایسی تصویر بشری کی نظر میں آ جاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پروجیکٹ کے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشری تحقیق کر رہی تھی۔ بشری کے اپنے والد جرنلسٹ ہوتے ہیں۔ اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشری کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ صدمے سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باذل نامی غنڈے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشری انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دنوں میں ہی معاذ واپسی کا ارادہ کرتا ہے تاہم ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا عرفان اللہ اور یزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو وقاص نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باذل اچانک بشری کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر دیتا ہے۔ معاذ کو واپس لانے کے لیے اوجھے جھکٹڈے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کر کے اسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات کے نہ بتانے پر اس کے بھائی کا ایک گروہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشری بھی سونیہ خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہو جاتی ہے۔ معاذ کے دوست عالم شاہ کے بہنوئی کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ کئی فنون میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے پھانسا کر کے اس کے دماغ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ فیمو سے حاصل انوکھے علم کی بدولت ان کا معمول نہیں جتا۔ عالم شاہ اور اس کا نوکر سرد، باذل کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ عالم شاہ، باذل کی قید میں موجود ایک زخمی شخص کی مدد سے وہاں سے فرار ہو جاتا ہے۔ ادھر بشری دینی پلنگی جاتی ہے۔ وہاں وقاص اسے ہاربی کے روپ میں پہچان لیتا ہے۔ وہ سلطان کو مارنا چاہتی ہے۔ ادھر عالم شاہ، باذل کی قید سے نکل کر اس کا پیچھا کرتا ہے۔ وہ وہاں معاذ کو دیکھتا ہے۔ معاذ کو اس کے گھروالوں سے ملنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ وہ ایک مشن پر سونیہ کے ساتھ انڈیا روانہ ہوتا ہے تاہم کچھ لوگ سکھ یا تریوں سے بھری بس کو یرغمال بنا لیتے ہیں۔ معاذ اور سونیہ خانے کے تمام افراد کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔ عالم شاہ، بھل اور سرد انڈیا روانہ ہو جاتے ہیں۔ اتر پورٹ سے گھر روانگی پر راستے میں کچھ لٹیرے انہیں لوٹ لیتے ہیں۔ گھر پہنچنے پر پولیس کی ریڈ ہوتی ہے اور وہ عالم شاہ اور سرد کو لے جاتے ہیں۔ عالم شاہ اور سرد کو تشدد کا نشانہ بنا کر ویرانے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ واپس اپنے میزبانوں کے ہاں پہنچ جاتے ہیں۔ انہیں پتا لگتا ہے کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں اجالا اور اس کا عاشق شامل ہوتے ہیں۔ وہ چھپ کر ان کی باتیں سن رہا ہوتا ہے۔ تاہم وہاں مارا ماری ہوتی ہے اور اجالا کا عاشق مارا جاتا ہے۔ پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ ان کے کزن انہیں اپنے دوسرے خفیہ ہنگلے پر پہنچا دیتے ہیں۔ وہ وہاں سے بحفاظت نکل جاتے ہیں۔ ادھر معاذ ایک مشن میں زخمی ہو جاتا ہے اور اسے ہندو سادھو اپنی کٹیا میں لے جاتا ہے۔ سونیہ کے آدی معاذ کو تلاش کرتے ہیں مگر ناکام ہو جاتے ہیں۔ ادھر عالم شاہ اور سرد خفیہ ذریعے سے ہارڈ پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ دھڑلے جاتے ہیں اور ”را“ کی قید میں پہنچ جاتے ہیں۔ بشری باذل کو مارنے کی کوشش میں خود نشانہ بن جاتی ہے۔ معاذ سادھو کی مدد سے ایک انڈین ہیروئن کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ وہیں اسے عالم اور سرد کی گرفتاری کا پتا چلتا ہے۔ معاذ ڈاکٹر فردوس سے ملتا ہے اور اسے بھل کی مدد کرنے کا کہتا ہے۔ علیہ اور وقاص وغیرہ کو لالہ عیسیٰ ملک سے باہر نکال دیتا ہے۔ علیہ پاکستان میں ٹویپ سے رابطہ کرتی ہے جو ان کے لیے

مصیبت بن جاتا ہے۔ ثوبیہ پر تیزاب پھینک دیا جاتا ہے۔ وقاص، علیہ اور اس کے گھر والوں کو مار دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس معاذ کو دیوانی شخص سے مدد لینے کا کہتی ہے۔ معاذ اپنے کزن کو پاکستان کال کرتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ اس کے گھر والوں کو مار دیا گیا ہے۔ وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کی ٹھان لیتا ہے۔ ادھر ڈاکٹر فردوس کو اس کے سرال والے بھل کو بھگانے کی پاداش میں تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ معاذ، عالم اور سرمد کی رہائی کے لیے کارروائی کرتا ہے اور انہیں "را" کی قید سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ لیکن عالم اور سرمد کو دیوانے کی دوسری جگہ پہنچا دیتے ہیں۔ سونیا معاذ کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ ادھر باذل ایک جگہ لالہ عیسیٰ کی موجودگی پر کارروائی کرتا ہے تاہم لالہ خود کو گولی مار کر ختم کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس کا انتقال ہو جاتا ہے۔ دیوانے ڈاکٹر فردوس کی میت اٹھنے پر وہاں فائرنگ کر دیتے ہیں۔ پولیس دیوانے کو گھیر لیتی ہے۔ معاذ دیوانے کے آدمیوں کو نکالنے کے عوض عالم کا پتا معلوم کر لیتا ہے۔ سونیا اور معاذ حیدر آباد نواب بدرالدین کی حویلی پہنچ جاتے ہیں۔ وہ نواب صاحب کی حویلی میں عالم اور سرمد کی رہائی کے لیے کارروائی کر کے انہیں رہا کر لیتے ہیں۔ وہ لوگ نئے ٹھکانے پر پہنچتے ہیں تو وہاں معاذ سے ملنے جا رو نامی شخص آتا ہے۔ اسے معاذ نے "را" کی قید سے نکالا ہوتا ہے۔ جار اور معاذ، بھل سمیت اسپتال جاتے ہیں اور پہچان لیے جانے پر پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ پولیس سے مقابلے کے بعد وہ ایک بستی میں پناہ کے لیے کھس جاتے ہیں۔ ادھر سونیا معاذ کی تلاش میں نکلتی ہے اور اسے بستی میں پہنچنے پر معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ معاذ اور جار وغیرہ انوپ نامی شخص کے ساتھ اس کے مالک کے بنگلے میں قیام کرتے ہیں۔ سونیا بھی معلومات حاصل کرتی ہوئی مذکورہ بنگلے تک پہنچ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور سرمد بھی سونیا کا پیچھا کرتے ہوئے وہیں پہنچ جاتے ہیں۔ ادھر لالہ، وقاص، علیہ و دیگر لوگ زندہ ہوتے ہیں۔ وقاص حلیہ بدل کر گلو کا باڈی گارڈ بن جاتا ہے۔ وہ معاذ کو تلاش کرنے کے لیے انڈیا روانہ ہوتا ہے۔ وہاں اس کی گل خان سے ملاقات ہوتی ہے اور معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ سونیا، معاذ اور دیگر ساتھیوں سے مل جاتی ہے تاہم وہ جس بنگلے میں ہوتے ہیں وہ دشمن کا ہوتا ہے۔ دشمن سب کو بے ہوش کر کے کہیں لے جا رہے ہوتے ہیں کہ ان کی گاڑی کو حادثہ پیش آ جاتا ہے۔ ان سب کو چینی بکسٹو طبی امداد دیتے ہیں اور ان سے پوچھ گچھ کی جاتی ہے۔ بھل کی حالت تشویشناک ہوتی ہے اور اسے وہاں موجود ایک وید دیکھتا ہے۔ ادھر لالہ واپس اپنے لوگوں میں پہنچ کر ایکشن میں آ جاتا ہے۔ باذل، معاذ وغیرہ کے ٹھکانے سے باخبر ہو جاتا ہے۔ باذل، معاذ کا پیچھا کرتا ہے اور چینیوں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ معاذ چینیوں کے ساتھ مل کر دشمنوں کے خلاف کارروائی کرتا ہے۔ ادھر لالہ عیسیٰ، اعظم کو دشمن کی گرفت سے نکالنے کے لیے کارروائی کر دیتا ہے اور مومی اور نیلی، اعظم کو نکالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ معاذ دشمنوں کے کیمپ پر حملہ کر کے وہاں قبضہ کر لیتا ہے۔ مومی اور نیلی کی گاڑی پر حملہ ہوتا ہے تاہم مارا ماری کے بعد وہ صداقت شاہ کے پاس پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اعظم کو وہاں سے نکال لیا جاتا ہے اور دوسری جگہ منتقل کر دیا جاتا ہے۔ ادھر معاذ بیجنگ پہنچ جاتا ہے اور وہاں کے کرتا دھرتاؤں سے بات کر کے پاکستان پہنچنے کی اجازت چاہتا ہے۔ ادھر مومی اور نیلی کو پولیس گھیر لیتی ہے اور فائرنگ میں مومی مارا جاتا ہے۔ وہ اعظم کو لے جاتے ہیں اور نیلی زخمی حالت میں ان کے قبضے میں آ جاتی ہے۔ معاذ اور وی وغیرہ پاکستان پہنچ جاتے ہیں اور اعظم کی بازیابی کے لیے منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ ادھر باذل، لالہ کی قید سے بھاگ جاتا ہے۔ معاذ، ڈی ایس پی ظہیر کے بنگلے پر دھاوا بولتا ہے اور ڈی ایس پی کو قتل کرنے کے بعد اس سے معلومات لیتا ہے۔ وہ لوگ ظہیر خان کو لے کر وہاں سے نکل جاتے ہیں۔ باذل قید سے نکل کر مہناز کے پاس پہنچتا ہے اور اسے تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ نیلی قید میں موجود ظہیر کو ٹھکانے لگا دیتی ہے۔ بشری قبرستان جاتی ہے۔ وہاں اس کی دوست ملتی ہے۔ بشری اپنی دوست کے ساتھ جارہی ہوتی ہے کہ باذل کے آدمی اسے اغوا کر لیتے ہیں۔ ادھر معاذ سارے معاملوں کو جلد حل کرنے کے لیے دشمن کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے مگر اس کے خیر خواہ اسے میڈم ایکس کے شکنجے سے نکال لیتے ہیں اور اعظم کو بھی بازیاں کر لیتے ہیں۔ دن ہوا سے اپنے ساتھ لے جاتی ہے اور وہاں کرمل سکندر بخت سے ملاقات ہوتی ہے۔ معاذ انہیں دشمنوں کے خلاف کارروائی کرنے کا کہتا ہے۔ باذل، بشری کو لے کر انڈیا گراؤنڈ ہو جاتا ہے۔ ادھر وقاص باذل کا پتا چلانے کے لیے ایک کال گرل عیسیٰ کے گھر کارروائی کر کے باذل کے ٹھکانے پر پہنچ جاتا ہے۔ وہاں وی کے ساتھی اور کوئی اور گروپ حملہ کر دیتے ہیں۔ وی زخمی ہو جاتا ہے۔ ادھر باذل، عرفان اللہ کو گولی مار دیتا ہے اور خود بھی شدید زخمی ہو جاتا ہے۔ باذل کے ساتھی اسے ایک اسپتال کے آگے چھوڑ دیتے ہیں۔ وہیں وی اور بشری بھی داخل ہوتے ہیں۔ معاذ باذل کو پہچان کر اسے بھی وہیں ایڈمٹ کر دیتا ہے۔ عرفان اللہ جاں بحق ہو جاتا ہے۔ صداقت شاہ اور ان کی اہلیہ بھل کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ عالم، نیلی اور اعظم بھی وہیں ہوتے ہیں۔ بھل اسپتال میں زیر علاج ہوتی ہے۔ باذل کو معذوری کی حالت میں ایک چوک پر پھینک دیا جاتا ہے۔ معاذ، وقاص کے ساتھ علیہ کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ اسے اگلے مشن پر جانا ہوتا ہے۔ سونیا قانون کی قید سے بھاگ نکلتی ہے۔ بھل کی طبیعت بگڑ جاتی ہے۔ یو آن منگ، اینڈریو کے ذریعے بھل کے آپریشن کی جویز دیتا ہے۔ عالم نہ چاہتے ہوئے بھی راضی ہو جاتا ہے۔ بھل کا آپریشن کامیاب رہتا ہے تاہم اس کا ایک ہاتھ اور نچلا دھڑنا کارہ ہو جاتا ہے۔ ادھر معاذ کشمیر پہنچ جاتا ہے۔ ایک کشمیری لڑکی کی مدد کرنے کی پاداش میں بھارتی سپاہی اسے گرفتار کرنے بغا من کی دکان پر ریڈ کرتے ہیں۔ تاہم بغا من کی وجہ سے اس پر سختی نہیں کرتے اور پوچھ گچھ کے بعد اسے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ادھر بھل کو خبر ملتی ہے کہ اس کی بہن کا پتہ آپریشن ہے۔ وہ وطن جانے کے لیے فلاح میں ہوتے ہیں تاہم وہ بے گینی سے وطن واپسی کی منتظر ہوتی ہے۔

صد اقت شاہ اپنی بیوی اور عالم و سبیل وغیرہ کے ہمراہ وطن واپسی کے لیے فلائٹ میں تھے۔ سبیل کو بہن کے آپریشن کے وقت اسپتال پہنچنے کی جلدی تھی۔ عالم شاہ اسے مطمئن کر رہا تھا۔

”بس ہم دس منٹ میں پہنچنے والے ہیں۔ ایئرپورٹ سے اسپتال پہنچنے میں لگ بھگ آدھا گھنٹا مزید لگ جائے گا پھر ہم موٹل کے پاس ہوں گے۔“ موٹل کو طبیعت کی خرابی کے باعث کب کا گاؤں سے شہر منتقل کیا جا چکا تھا۔ وہ شہر کے ایک بڑے اسپتال میں داخل بھی جہاں اس کے سارے ضروری ٹیسٹ ہو چکے تھے اور آپریشن کے لیے بس ان لوگوں کی واپسی کا انتظار تھا۔ یہ واپسی کتنی مشکل سے انجام پائی تھی، اس سے سبیل کو کوئی غرض نہیں تھی۔ حالات کے تحت ان کے واپسی کے فیصلے کو قبول تو کر لیا گیا تھا لیکن دونوں طرف ہی بہت سے خدشات تھے۔ دونوں طرف کے ذمے داران کو فکر تھی کہ خفیہ طور پر چین پہنچنے والے ان سارے لوگوں کے بارے میں کسی کو کوئی ثبوت مل گیا تو سب سے پہلے بھارت ہنگامہ کھڑا کرے گا اور ان کے لیے عالمی برادری کا سامنا کرنا مشکل ہو جائے گا۔ بھارت کے پاس بہر حال ثبوت تھے کہ عالم شاہ اور سرمد دہشت گردی کے الزام میں گرفتار ہو کر ان کی قید میں تھے اور اپنے مددگاروں کے ذریعے اس قید سے فرار ہو گئے تھے۔ فرار کے بعد بھی ان کے کھاتے میں کئی جرائم ڈالے گئے تھے۔ اس لیے بھارت کے پاس پورا پورا موقع تھا کہ عالم اور سرمد کے منظر عام پر آتے ہی عالمی عدالت میں ان کی حوالگی کا مقدمہ دائر کر دے۔ اس مسئلے سے بچنے کے لیے فی الحال تو یہی انتظام کیا گیا تھا کہ عالم اور سرمد کے حلیوں میں خاطر خواہ تبدیلی کر دی گئی تھی۔ انہیں غور سے دیکھنے پر بھی آسانی سے پہچاننا ممکن نہیں تھا لیکن کچھ معلوم نہیں تھا کہ دشمن کہاں کہاں گھات لگائے بیٹھا ہے اس لیے خدشات کسی طور ختم نہیں ہو رہے تھے۔

عالم کے سامنے یہ پروپوزل بھی رکھا گیا تھا کہ وہ فیملی کو جانے دے اور خود اپنے ملازم سرمد کے ساتھ وہیں رک جائے لیکن جب سب گھر والے واپس جا رہے تھے تو وہ کیسے رک سکتا تھا۔ اچھا برا جو بھی پیش آتا، وہ سب کے ساتھ بھگتنے کے لیے تیار تھا اور یہ تو ممکن نہیں تھا کہ وہ خطرے کے منہ میں پھر رکھتا اور سرمد پیچھے رہ جاتا۔ وہ عالم کے پسینے پر اپنا خون بہانے والا بندہ تھا۔ وہ کسی صورت اسے نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ عالم نے بھی اس کے ساتھ زبردستی نہیں کی تھی۔ آخر اس کا بھی خاندان اور کچھ رشتے تھے پاکستان میں جن سے جدائی کی وہ شکایت نہیں کرتا تھا لیکن انہوں کی یاد آنا تو ایک

فطری بات تھی۔

”سیٹ بیلٹ بندھو الو سبیل!“ پائلٹ منزل مقصود پر پہنچنے کی اطلاع دیتے ہوئے مسافروں سے اپنی سیٹ بیلٹس باندھنے کی درخواست کر رہا تھا لیکن زیر لب کچھ بڑھتی سبیل متوجہ نہیں ہوئی تھی۔ عالم نے اس کی یہ غائب دماغی دیکھی تو خود اس کام پر کمر بستہ ہو گیا۔ یوں بھی سبیل کا ایک ہاتھ ابھی تک صبح سے حرکت کرنے کے قابل نہیں ہوا تھا۔ دواؤں اور فزیو تھراپی سے فرق تو پڑا تھا لیکن ڈاکٹرز نے واضح کر دیا تھا کہ ایک دم سے کچھ نہیں ہونے والا۔ آہستہ آہستہ ہی فرق پڑتا ہے لیکن اب وہ علاج درمیان میں ادھورا چھوڑ کر پاکستان آگئی تھی۔

”تم اماں اور بابا سائیں کے ساتھ جاؤ، میں سبیل کو لے کر آتا ہوں۔“ جہاز کے لینڈ کرنے کے بعد مسافروں نے اترنا شروع کیا تو عالم نے سرمد سے کہا۔ سبیل اپنی معذوری کے باعث عام مسافروں میں شامل نہیں ہو سکتی تھی۔

”جو حکم سائیں!“ سرمد نے حسب عادت اس کے آگے سر جھکا یا اور تعمیل حکم کے لیے قدم اٹھائے۔

”ایکسیکوزی مسٹر!“ ابھی وہ درمیان میں ہی تھا کہ ایئر ہوسٹس تیز تیز چلتی ہوئی اس کے قریب آئی اور اسے مخاطب کیا۔

”آپ کو اور مسٹر مائیکل کو رکنا ہوگا۔“ (سرمد اور عالم اپنے اصل ناموں سے سفر نہیں کر رہے تھے اور سفری کاغذات میں ان کے فرضی نام درج تھے)۔

”واٹ ڈیو میں؟“ سرمد نے قدرے تیز لہجے میں پوچھا۔

”آپ دونوں کو پلین سے اترنے کی اجازت نہیں ہے۔“ ایئر ہوسٹس نے اپنی پیشہ ورانہ تربیت کے مطابق ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت دی۔

”لیکن کیوں؟“ ان سب کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

سارے مسافر جہاز سے اتر چکے تھے اور صرف وہی لوگ وہاں رہ گئے تھے۔

☆☆☆

”بابا، اماں..... بچاؤ..... بچاؤ۔“ چیخوں سے پورا گھر گونج رہا تھا۔ اس کا لکڑیاں کاٹا ہوا کھڑا رکا اور پھر وہ کلہاڑی پھینک کر تیزی سے اندر کی طرف بڑھا۔ اندر کا منظر کسی بھی صاحب دل کو تڑپانے کے لیے کافی تھا۔ نو عمر بہرام، زرینہ بی بی کے سینے سے لگا بری طرح کانپ رہا تھا اور وہ اپنے کمزور بازوؤں سے اسے جکڑے دلاسا دینے کی کوشش کر رہی تھیں۔

”میر کر میرے بچے، میر کر۔“ زرمینہ بی بی آنکھوں میں نمی لیے اسے ہولے ہولے تھپک رہی تھیں۔

”خون ہے..... خون ہے۔ ہر جگہ خون ہے۔ ابا..... ابا..... ابا کے سینے سے خون نکل رہا ہے۔ اماں..... وہ دیکھو، اماں بھی گولی کھا کر گر گئی ہیں۔“ وہ جیسے اس سارے منظر کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا تھا اور اس وقت کی تکلیف اب بھی اس کے وجود میں اتری اس کے جسم میں کچاؤ پیدا کر رہی تھی۔

”بھول جا میرے بچے، بھول جا سب کچھ۔“ زرمینہ بی بی کے اپنے آنسوؤں میں روانی آگئی تھی اور وہ اسے زور سے اپنے سینے میں بچنے کو یا اس منظر اور اس کی تکلیف سے بچانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

”آپا..... آپا رک جاؤ، مت کرو آپا، خدا کے لیے مت کو دو۔“ وہ اپنے موجودہ مقام پر موجود ہی نہیں تھا۔ اسے نہ زرمینہ بی بی کی آواز سنائی دے رہی تھی، نہ ان کی آغوش کی گرمی کو محسوس کر پا رہا تھا۔ وہ اس تاریک اور ویران باغ میں کھڑا تھا جہاں اس نے اپنی آنکھوں سے قیامت دیکھی تھی اور اس قیامت کے زیر اثر اس کا جسم بری طرح کانپ رہا تھا اور کانپتے کانپتے جسم کو جھٹکے لگنے لگے تھے۔

”بہرام، بہرام..... میرے بچے!“ زرمینہ بی بی اسے سنبھالنے میں نڈھال ہونے لگیں۔ اس ساری صورت حال کو ہونٹ بھینچے دیکھتا معاذ پہلے ہی انجکشن تیار کرنا شروع کر چکا تھا۔

”اسے بستر پر لٹا کر مضبوطی سے پکڑ لیں بی بی!“ انجکشن تیار کر کے اس نے زرمینہ سے کہا اور خود بھی ان کی مدد کرنے لگا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ بہرام کو انجکشن لگانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ انجکشن کے اثر کرنے تک زرمینہ بی بی مسلسل بہرام کے بالوں کو سہلاتی رہیں اور معاذ آہستہ آہستہ اس کے اکڑے ہوئے ہاتھ پیروں کو دبا رہا۔ کچھ دیر میں وہ پرسکون ہو کر گہری نیند میں ڈوب گیا تو ان دونوں نے اپنے ہاتھ پیچھے ہٹا لیے۔ معاذ نے اسے سینے تک چادر اوڑھادی۔

”خدا جانے یہ معصوم کب اور کیسے خود پر گزرنے والی اس قیامت کو بھول پائے گا۔“ زرمینہ بی بی اپنی آنکھیں پونچھتی ہوئی غمزہ لہجے میں بڑبڑائیں۔

”ایک آدھ دن دیکھتے ہیں۔ اگر اس کی حالت میں فرق نہ آیا تو پھر ہا قاعدہ کسی نفسیاتی معالج سے اس کا علاج کروانا پڑے گا۔“ معاذ کے چہرے پر بھی غم و غصہ طاری تھا۔ جب سے بہرام یہاں آیا تھا، اس کی یہی حالت تھی۔

دواؤں کے زیر اثر کچھ گھنٹوں کے لیے سوتا تھا، جاگنے کے بعد تھوڑی دیر اس کی حالت بہتر رہتی تھی۔ اس عرصے میں زرمینہ بی بی اسے کوشش کر کے تھوڑا بہت کھلا پلا دیتی تھیں۔ وہ کم صم سی کیفیت میں لیٹا بیٹھا تھوڑی دیر تو سکون سے رہتا تھا پھر بتدریج اس کی حالت بگڑنے لگتی تھی اور گزرے واقعات ذہن میں آنے پر اس کا خود پر سے کنٹرول ختم ہونے لگتا تھا۔ اس قسم کی ایمر جنسی کے لیے ڈاکٹر نے سکون آور انجکشن لکھ کر دے رکھا تھا۔ اس کی رائے تھی کہ آہستہ آہستہ بچہ شاک سے باہر آجائے گا اور حقیقت کو قبول کر کے نارمل ہونے لگے گا لیکن ابھی تک کوئی بہتری نظر نہیں آئی تھی اور وہ اسی حالت میں تھا جس حالت میں باغ کا رکھوالا اسے یہاں پہنچا گیا تھا۔ رکھوالے نے ہی انہیں اس رات کے بارے میں تفصیلات سے آگاہ کیا تھا۔

جس رات یہ ظلم توڑا گیا، وہ اپنی کوٹھری میں سو گیا تھا لیکن گاڑیوں کی آوازوں نے اسے نیند سے جگا دیا۔ جاگنے پر وہ صورت حال معلوم کرنے باہر نکلا تو اس وقت تک کھل شروع ہو چکا تھا۔ درختوں کے پیچھے چھپا بہرام اس کی نظروں میں آ گیا اور وہ خود بھی اس کے قریب آکھڑا ہوا۔

اس کی وہاں موجودگی ہی بہرام کی زندگی بچانے کا سبب بنی۔ جب پہلی بار گولیاں چلیں تو بہرام کے منہ سے چیخ نکل گئی تھی۔ اللہ کی مہربانی سے گولیوں کی گونج میں وہ پہلی چیخ کسی نے نہیں سنی۔ اس کے بعد رکھوالے نے بہرام کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اس کی ساری چیخوں کو گھونٹ دیا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو بھارتی درندے اسے بھی ڈھونڈ نکالتے۔ جب انہوں نے حاجی شیر خان اور اس کی بیوی کو گولیاں ماریں تو رکھوالا بہرام کو زبردستی کھینچتا ہوا وہاں سے دور لے گیا۔ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ اگر اسے اپنی اور اس بچے کی زندگیاں بچانی ہیں تو اس باغ سے دور جانا ہوگا۔ سوئے اتفاق مرکزی دروازے سے ہٹ کر باغ سے باہر جانے کا جو ایک دوسرا راستہ تھا، اس کے راستے میں وہ کنواں پڑتا تھا جس میں چھلانگ لگا کر پری ویش نے اپنی عزت بچانے کا فیصلہ کیا تھا۔ تعاقب کرتے بھارتی درندوں اور بہن کے کنوئیں میں کودنے کے منظر کو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ایک کے بعد ایک بچنے والے صدمے کے اثر سے بے ہوش ہو گیا۔ رکھوالا اسے کندھے پر لاد کر بمشکل..... باغ سے باہر نکلا۔ وہ باغ سے نکل کر تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ باغ میں آگ بھڑک اٹھی۔ انسانی خون سے ہولی کھیلنے والے ان درندوں کی انتقام کی پیاس اتنا خون بہا کر بھی نہیں بجھی تھی سو

انہوں نے باغ کو آگ لگا کر اپنا دل ٹھنڈا کرنے کا یہ انتظام کیا تھا۔

رکھوالا، کبیر کا پرانا ملازم تھا۔ اس کا کبیر کے ساتھ کئی بار حاجی شیر خان کے گھر آنا جانا بھی ہوا تھا۔ وہ ان کے رشتے داروں اور تعلق داروں سے اچھی طرح واقف تھا اس لیے اس نے بہرام کو سیدھا آغا گل کے گھر پہنچا دیا۔ بہرام جب سے وہاں آیا تھا، اس کی حالت خراب تھی۔ صدمے نے اس کا خود پر سے کنٹرول ختم کر دیا تھا۔ اسے وقفے وقفے سے دورے پڑ رہے تھے جس پر قابو پانے کے لیے اسے انجکشن لگانا پڑتا تھا۔

”تم اس کے پاس بیٹھو، میں ذرا باورچی خانے کا تھوڑا کام نمٹا لوں۔“ بہرام سکون سے سو گیا تو زرمینہ بی بی کہتی ہوئی وہاں سے اٹھ گئیں۔ وہ وہاں بیٹھا دکھ سے بہرام کو دیکھتا رہا۔ اپنوں کو کھونے اور بچھڑنے کا دکھ اس نے اپنی جان پر سہا تھا اس لیے محسوس کر سکتا تھا کہ یہ بچہ کس کرب سے گزرا ہوگا۔ بہرام کا کرب اس کے دل کو جلا رہا تھا۔ ایک آگ سی تھی جو بھڑک بھڑک کر اسے ظالموں کو نیست و نابود کرنے پر اکسار رہی تھی۔

”کن سوچوں میں گم ہو؟“ آغا گل باہر سے آئے تو اس کی خاموشی کو محسوس کر کے پوچھا۔

”بہرام کے متعلق ہی سوچ رہا تھا۔ اس بچے کا دکھ مجھے چین نہیں لینے دے رہا۔ حاجی شیر خان کے خاندان پر جو ظلم توڑا گیا ہے، اس نے میرے سینے میں آگ بھڑکادی ہے۔ دل چاہ رہا ہے ایسا کرنے والے ایک ایک ظالم کو جہنم واصل کر دوں۔“ اس نے اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا۔

”یوں صدی کے اس عرصے میں اس جیسی اتنی ظلم کی داستانیں رقم ہوئی ہیں کہ ہمیں تو کتنی بھی یاد نہیں۔“ آغا گل کی بے نور آنکھیں بظاہر خشک تھیں لیکن ان خشک آنکھوں کے پیچھے غم کا جو سمندر موجزن تھا، اسے کوئی بھی صاحب دل دیکھ سکتا تھا۔

”کچھ معلوم ہوا کہ کون تھے وہ لوگ؟“

”ہاں۔“ انہوں نے ایک سرد آہ بھری۔

”تھے تو وہ انڈین آرمی کے سورما ہی لیکن پیش پیش پری دیش کے ہاتھوں مرنے والے سپاہی نریندر کا بھائی مہندر تھا۔ اس نے اپنے بھائی کی موت کا انتقام لینے کے لیے پورے خاندان کو نیست و نابود کر ڈالا۔ مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں وہ اس بچے کی جان کے درپے بھی نہ ہو جائے۔“ ان کا اشارہ بہرام کی طرف تھا۔

”میں اسے اس لائق ہی نہیں رہنے دوں گا۔ آپ بس مجھے اس کے متعلق ضروری معلومات فراہم کر دیں۔“ اس نے تیز لہجے میں آغا گل سے مطالبہ کیا۔

”نہیں، نہیں۔ تم ان معاملات میں نہ پڑو۔ تمہیں خود کو بالکل کلیئر رکھنا ہے تاکہ اپنے اصل مقصد کو حاصل کر سکو۔ اگر تم یہاں کے معاملات میں الجھ گئے تو اپنے معاملات کیسے دیکھو گے؟“ انہوں نے شدت سے نفی میں سر ہلایا۔

”یہ بھی میرا ہی معاملہ ہے آغا جان! مجھے احساس ہے کہ جو کچھ ہوا، اس میں کہیں نہ کہیں میری ذات انوالو تھی۔ اگر اس روز میں دعوت میں چلا جاتا تو شاید وہ سب نہ ہوتا جو ہوا۔“ وہ مجرم نہیں تھا لیکن خود کو مجرم محسوس کر رہا تھا۔

”شاید نصیب میں یہی لکھا تھا۔“ آغا گل نے ایک سرد آہ بھری۔

”ہر ظلم کو نصیب کا لکھا سمجھ کر قبول نہیں کیا جاسکتا۔ ظلم ہوا ہے تو ظالم کو اس کا حساب بھی دینا پڑے گا۔“

”لیکن ویکن کچھ نہیں آغا جان! میں کوئی آپ لوگوں سے الگ نہیں ہوں۔ ہم نے تو پاکستان میں رہتے ہوئے بھی ہمیشہ آپ لوگوں کا دکھ اپنے دل میں محسوس کیا ہے اور اب جبکہ میں یہاں ہوں اور یہ سب میری نظروں کے سامنے ہوا ہے تو کیسے ممکن ہے کہ میں محض خاموش تماشا بنی رہوں۔“ اس نے انہیں بات مکمل نہیں کرنے دی۔

”اچھا تم تھوڑا صبر کرو پھر میں کوئی انتظام کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔“ انہیں بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اپنے ارادے میں پختہ ہے اس لیے مزید سمجھانے بجھانے کی کوشش ترک کر کے وعدہ کر لیا۔

☆☆☆

”کیا ہمیں گرفتار کیا جا رہا ہے؟“ عالم شاہ نے تحمل کے ساتھ انٹر ہوسٹس سے سوال کیا۔

”آئی ڈونٹ نو۔“ اس نے شانے اچکائے پھر دلاسا دینے والے انداز میں بولی۔

”میرا خیال ہے ایسا نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اس وقت یہاں میری جگہ کوئی پولیس مین کھڑا ہوتا۔“

”شی از رائٹ۔ ہم آپ کو گرفتار کرنے نہیں آئے بلکہ ہم آپ کو اپنی حفاظتی تحویل میں لے رہے ہیں۔“ اچانک ہی وہاں سادہ لباس والے چلے آئے۔

”اس کی ضرورت کیوں پیش آئی؟“ عالم شاہ یہ سن کر

چونکا۔

”تفصیلات میں آپ کو بعد میں بتاتا ہوں۔ فی الحال آپ سے جیسا کہا جا رہا ہے، ویسا ہی کریں۔“ اس شخص نے آنکھوں سے اتر ہوئیں کی طرف غیر محسوس سا اشارہ کیا۔
”اوکے۔ جیسے آپ کی مرضی۔“ اس نے سمجھ کر فوراً ہتھیار ڈال دیے پھر محل کی طرف جھک کر بولا۔

”تم اماں اور بابا سائیں کے ساتھ اسپتال پہنچو۔ میں اور سرمد بھی یہ معاملہ نمٹا کر وہاں پہنچتے ہیں۔“

”لیکن.....“ سب کو اس کا حکم ماننے میں تامل تھا۔

”کوئی لیکن دیکھ نہیں۔ جو کہا ہے، وہی کرو۔“ عالم نے اسے ٹوکا اور نیلی کی طرف رخ موڑ کر اس سے مخاطب ہوا۔

”آپ کو ان لوگوں کے ساتھ ساتھ ہی رہنا ہے۔“

آپ کی موجودگی سے مجھے ذرا بے فکری رہے گی۔“

”آپ اطمینان رکھیں۔ میں خیال رکھوں گی۔“ نیلی نے تسلی دی۔

”آپ جائیں اماں سائیں! یہاں کوئی فکر مندی کی بات نہیں ہے۔“ اسے خود کو خاموشی سے سختی ماں کو بھی تسلی دینا پڑی۔ آہستہ آہستہ سب جہاز سے اترتے چلے گئے۔

صداقت شاہ نے جاتے جاتے اس کا شانہ تھپک کر ایک خاموش تسلی دی۔

”آپ ہمارے ساتھ آئیے۔“ سب کے رخصت ہو جانے کے بعد سادہ لباس والے عالم اور سرمد سے مخاطب ہوئے تو وہ ان کے پیچھے چل پڑے۔ وہ دونوں انہیں عام راستے سے ہٹ کر دوسرے راستے سے بہت تیزی سے اتر پورٹ کی عمارت سے باہر لے آئے اور رنگین شیشوں والی ایک گاڑی میں بٹھا کر کسی نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

”ہمیں کہاں لے جایا جا رہا ہے؟“

”یہ تو آپ کو پہنچ کر ہی پتا چلے گا۔“ وہ مسکرا کر عالم کے سوال کو ٹال گیا۔

”ہمارا تعاقب ہو رہا ہے سرا“ اچانک ہی ڈرائیور نے اطلاع دی۔

”میں دیکھ چکا ہوں۔“ ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر براجمان سادہ لباس شخص نے بیک ویو مرر پر نظریں جمائے جمائے اسے جواب دیا۔

”بڑی جلدی کھیل شروع ہو گیا۔“ سادہ لباس والا جو عالم اور سرمد کے ساتھ پچھلی نشست پر بیٹھا تھا، اس نے طنزیہ لہجے میں تبصرہ کیا۔

”دادو دشمنوں کے حاسوسی کے نظام کو۔ ہم انہیں عام راستے کے بجائے ایٹم بلیٹ سے نکال کر لائے ہیں

تب بھی وہ ہمارے پیچھے ہیں۔“ اس کے ساتھی نے بھی تائیدی تبصرہ کیا اور پھر اپنے فون پر مصروف ہو گیا۔ اس کے جو الفاظ ان کے کانوں میں پڑے، اس سے اندازہ ہوا کہ وہ اپنی ٹیم کو کال کر رہا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی نوٹس کر لیا کہ گاڑی اب مصروف سڑکوں کو چھوڑ کر ان راستوں کی طرف جارہی ہے جو عموماً سنسان پڑے ہوتے ہیں۔ جیسے ہی ان راستوں پر سفر شروع ہوا، تعاقب کار گاڑی... نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

”وہ سمجھ گئے ہیں کہ ہم ان کے تعاقب سے واقف ہو گئے ہیں۔“ گاڑی کے غائب ہونے پر ان کے ساتھ پچھلی نشست پر براجمان شخص نے تبصرہ کیا۔

”برا ہوا، میں تو انہیں گھیرنے کا پلان بنا رہا تھا۔“ آگے والے کی طرف سے افسوس کا اظہار ہوا۔

”چھوڑو، ویسے بھی وہ کوئی کرائے کے ٹٹو ہوں گے۔ ہمارے اصل دشمن اتنے چالاک ہیں کہ جہاں پکڑے جانے کا خدشہ ہو، وہاں بھی خود سامنے نہیں آتے۔“ ان لوگوں کے درمیان گفتگو کا سلسلہ جاری تھا۔ عالم اور سرمد درمیان میں دخل دیے بغیر بس خاموشی سے حالات کا تجزیہ کرنے پر اکتفا کر رہے تھے۔ دس تھا کہ وہ آتے کے ساتھ ایسے معاملات میں اصرار کیا تھا کہ موٹل کی حمارداری تو دور کی بات، ایک جھلک دیکھنے سے بھی محروم رہا تھا۔

”بھرے خیال میں اب سیدھے راستے پر لے لو۔“ آپس پاس سب ٹھیک دیکھ کر ابھی ڈرائیور کو یہ ہدایت دی ہی گئی تھی کہ ایک کوسٹران کے دائیں جانب سے آندھی طوفان کی طرح برآمد ہوئی۔ گاڑی میں تیز میوزک لگا ہوا تھا اور عجیب و غریب چلیے والے لڑکے کھڑکیوں سے آدھے آدھے باہر نکلے الٹی سیدھی حرکتیں کر رہے تھے۔ کوئی زور زور سے گارہا تھا تو کوئی بلاوجہ ہی وحشیانہ تہمت لگا رہا تھا۔ ایک صاحبزادے رنگ برنگے بلبلے بنا کر فضا میں اڑانے کا شوق پورا کر رہے تھے تو ایک کو چلتی گاڑی میں پتنگ بازی کا شوق چرایا تھا۔

”کالج کے لونڈے۔“ ان لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے ڈرائیور نے ہنس کر تبصرہ کیا۔

”یہ ہمارے مستقبل کے معمار ہیں جنہوں نے اپنے ہی نقشے بگاڑ رکھے ہیں۔“ پچھلی نشست والے کی طرف سے ناگواری کا اظہار ہوا۔ واقعی ان لڑکوں کے چلیے کسی سنجیدہ مزاج شخص کے لیے قابل برداشت نہیں ہو سکتے تھے۔ کسی نے اپنی لمبی زلفوں کو بے شمار مینڈھیاں باندھ کر رنگ برنگے مینڈز سے جکڑ رکھا تھا، کسی کے چہرے پر رنگ

ملے ہوئے تھے، کسی کے بال اتنے رنگوں میں رنگے تھے کہ شمار مشکل تھا۔ کوئی ملک کاروپ دھارے گلے میں موٹے موٹے منکوں کے ہار پہنے ہوئے تھا۔

”جائے دو یار! ان کی موج مستی کی عمر ہے۔ تھوڑا وقت گزرے گا تو سنجیدہ ہو کر ذمے داریاں سنبھال لیں گے۔“ آگے والے غنّے نئی نسل کا دفاع کرنے کی کوشش کی۔ عالم ان کی آپس کی گفتگو سننا اپنی گاڑی سے کچھ فاصلے پر چلتی کوسٹر اور اس میں سوار نو جوانوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے بارے میں کسی بھی طرح کی رائے سے بے نیاز اپنی موج میں مست تھے۔ شاید ان کا شہر سے باہر کسی تفریحی مقام پر پکنک منانے کا پروگرام تھا اور وہ راستے میں کھیل تماشے کرتے ہوئے جا رہے تھے۔

”اللہ کرے یہ ذمے داریاں سنبھالنے کے اہل ہو جائیں ورنہ اس ملک کا اللہ ہی حافظ ہے۔ خیر، انہیں جانے دو ان کے راستے، ہم چلتے ہیں اپنے راستے پر۔“ عالم کے ساتھ بیٹھے شخص نے اپنے ساتھی کو جواب دیا اور ڈرائیور نے اس کا اشارہ پا کر گاڑی کا رخ بدل لیا۔ ابھی گاڑی بائیں جانب والے ذیلی راستے پر مڑی ہی تھی کہ عالم کی نظر بلبلے بناتے لڑکے کی طرف اٹھی۔ وہ صحیح سے نہیں دیکھ سکا لیکن اس نے محسوس کیا کہ لڑکے کے ہاتھ میں بلبلے بنانے کے لیے استعمال ہونے والے مڑے ہوئے تار کی جگہ کچھ اور موجود ہے۔ اس ”کچھ اور“ کا تجزیہ ہو پاتا، اس سے پہلے ہی ایک کان پھاڑ دھماکے کے ساتھ ان کی گاڑی بری طرح لہرائی۔

”اوہ شٹ! ٹائر برسٹ ہو گیا۔“ ڈرائیور نے تبصرہ کیا۔ اس نے جس ذیلی راستے پر گاڑی ڈالی تھی، وہ ہموار نہیں تھا اس لیے اسے یہی گمان گزرا تھا کہ ٹائر کسی سخت ٹکیلی شے کی زد میں آ گیا ہے۔

”در فٹے منہ۔“ ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے شخص نے ناگواری کا اظہار کیا۔ وہ ٹائر برسٹ ہونے کو ایک اتفاقی حادثہ سمجھ رہے تھے لیکن عالم کی نظریں کوسٹر پر جمی ہوئی تھیں۔ اصولاً اسے اپنے راستے پر سیدھے نکل جانا چاہیے تھا لیکن ان کی گاڑی کے مڑتے ہی وہ رک گئی تھی اور اب اس طرف ہی آرہی تھی۔

”وہ دیکھو۔“ اس نے اپنے ساتھ بیٹھے شخص کو اس طرف متوجہ کیا۔ اس شخص نے چونک کر گردن موڑی اور بے ساختہ ہی چیخے ہوئے اپنی گن لوڈ کی۔ اس کے ساتھی بھی چوکے ہو گئے لیکن اس اثنا میں کوسٹر ان کے سروں پر پہنچ چکی

تھی اور اس میں موجود لڑکے چھلانگیں لگا کر نیچے آرہے تھے۔ ان سب کے ہاتھوں میں خطرناک ہتھیار دکھائی دے رہے تھے اور اب ان کی چال ڈھال میں کہیں سے بھی لاابالی ”کالج کے لونڈوں“ کا رنگ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

”ہتھیار پھینک دو ورنہ ہم اس گاڑی کو ہی تمہارا قبرستان بنادیں گے۔“ کوسٹر کے اندر سے کسی نے چیخ کر حکم دیا۔ آواز کی سمت دیکھنے پر انہیں ایک کھڑکی سے جھانکتی مشین گن کی خوفناک جھلک دکھائی دے گئی۔ بظاہر وہ اپنی گنوں سے کوسٹر سے اترتے لڑکوں کو نشانہ بنا سکتے تھے لیکن یہ حقیقت بالکل عیاں تھی کہ مشین گن کا ایک برسٹ ہی گاڑی سمیت ان سب کو چھلنی کر کے رکھ دے گا۔

”کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو؟“ فوری طور پر ہتھیار ڈال دینے میں تو ہین تھی اس لیے سوال اٹھایا گیا۔

”ہتھیار پھینکو اور گاڑی سے باہر آؤ۔ تمہارے پاس ہم سے سوال جواب کی کوئی گنجائش نہیں۔“ سخت اور سرد لہجے میں جواب دیا گیا اور ساتھ ہی ان کی گاڑی کی دائیں جانب ایک برسٹ مارا گیا جس کے نتیجے میں کئی پتھر اور بہت سی دھول اڑی۔ کچھ پتھر ان کی گاڑی سے بھی آ کر ٹکرائے۔

”ان کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔“ آگے والی سیٹ پر براجمان شخص نے ہونٹ بھیج کر کہا۔ وہ خطرہ سر پر دیکھتے ہی اپنی بیک اپ ٹیم کو لوکیشن اور مدد کا پیغام بھیج چکا تھا لیکن بہت زیادہ پر امید نہیں تھا کیونکہ تعاقب کار گاڑی کے غائب ہوتے ہی اس نے انہیں اپنے محفوظ ہونے کا پیغام بھیجنے کے ساتھ اس گاڑی کو ٹریس کرنے کی ذمے داری سونپ دی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ ٹریفک کے ازدحام میں اس گاڑی کو تلاش کرتی اس کی ٹیم کو اس ویرانے تک آنے میں جتنا وقت لگے گا، اگلے اپنی کارروائی مکمل کر چکے ہوں گے۔

”اگر میرے تین گننے تک تم لوگ گاڑی سے باہر نہیں آئے تو پھر اپنی موت کے ذمے دار تم سب خود ہو گے۔“ دوسری طرف سے انہیں سوچنے سمجھنے کی مہلت نہیں دی جا رہی تھی۔

”ایک، دو.....“ گنتی شروع ہوئی۔ تین بولنے سے پہلے ہی وہ سب گاڑی ان لاک کر کے ایک ایک کر کے باہر آنے لگے۔ اندر بیٹھے رہنے میں یقینی موت تھی جبکہ باہر آنے میں زندگی کی کچھ نہ کچھ امید رکھی جاسکتی تھی کہ اگر اگلوں کا مقصد مارنا ہی ہوتا تو وہ اتنا انتظار نہیں کرتے۔

”تم دونوں اس طرف آ جاؤ۔“ ان کے ہتھیار پھینک کر باہر نکلتے ہی ہتھیار بردار لڑکوں نے انہیں گھیر لیا تھا اور

”سنا نہیں، کپڑے اتار دو۔“ حکم ملتے ہی دو لڑکے ہتھیار تان کر ان کے سر پر سوار ہو گئے۔ یہ ایک ہلکے آمیز حکم تھا جس کی تعمیل کے خیال سے عالم شاہ کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ اس کی سرمد پر نظر اٹھی تو وہ بھی لڑنے مرنے پر آمادہ دکھائی دیا۔ سرمد کی اس کیفیت نے اسے اپنا دماغ ٹھنڈا رکھنے پر اکسایا۔ اگر وہ ذرا سی بھی مزاحمت کرتا تو سرمد اس کی خاطر ایک بار پھر ان لوگوں سے بھڑ جاتا اور یہ تو بالکل واضح تھا کہ وہ دونوں مل کر موجودہ صورت حال میں ان لوگوں سے مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ سرمد جو پہلے ہی اچھی خاصی مار کھا چکا تھا، مزاحمت پر مزید پٹتا۔ سرمد کے خیال نے اسے اپنا دماغ ٹھنڈا کر لینے پر مجبور کر دیا اور خود ہی ہنسنے لگا۔ کراہتی نہیں اتار دی۔ اسے ایسا کرتے دیکھ کر سرمد کو بھی عمل کرنا پڑا۔ ایک ایک کر کے سوائے زیر جامہ کے، ان کے سارے کپڑے اتار دے لیے گئے۔ پیروں میں جوتے بھی نہیں چھوڑے گئے۔ اس دوران کو سرمد وہاں کی نہیں رہی تھی۔ اس نے اپنا سفر شروع کر دیا تھا۔

”ان کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ دو اور ان کے کپڑے ادھر لے آؤ۔“ پیچھے سے ایک اور حکم جاری کیا گیا اور اس حکم کی بھی سابقہ احکامات کی طرح سرعت سے تعمیل ہوئی۔ اندھوں کی طرح کوچ کی الگ الگ نشستوں پر بیٹھے ہوئے عالم شاہ اور سرمد کو کچھ نہیں معلوم تھا کہ کوچ کس سمت جا رہی ہے یا کوچ کے اندر کیا کارروائی جاری ہے۔

”یہ کپڑے، جوتے اور باقی سامان اٹھا کر باہر پھینک دو۔“ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہی آواز گونجی جو احکامات صادر کرتی تھی۔ شاید ان لوگوں کو خدشہ تھا کہ کپڑوں یا جوتوں میں کچھ ایسا چھپایا گیا ہوگا جس سے ان کی لوکیشن معلوم کی جاسکے۔ اس لیے یہ ساری کارروائی کی تھی۔ اس کارروائی کے بعد کافی دیر خاموشی چھائی رہی۔ انہیں صرف یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ کوچ مسلسل سفر میں ہے۔ آخر کار یہ سفر بھی ختم ہوا اور کوچ ایک جھٹکے سے رک گئی۔

”نیچے اترو۔“ کسی نے عالم کے کندھے پر ٹھوکا دے کر سخت لہجے میں کہا اور پھر ہاتھ پکڑ کر کھڑا بھی کر دیا۔ وہ اسی شخص کے سہارے کوچ سے نیچے اترا۔ یقیناً سرمد کے ساتھ بھی یہی کارروائی ہوئی تھی۔ اس موقع پر انہیں لباس پہنائے گئے پھر چلنے کا حکم ملا۔

”بیٹھو۔“ چند قدم چلنے کے بعد اسے آہستہ سے ایک جانب دھکیلا گیا۔ وہ ایک بار پھر ان لوگوں کی راہنمائی میں ان کی بتائی ہوئی جگہ پر بیٹھ گیا۔ یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا

اب رنگ برنگے بالوں والا عالم اور سرمد کی طرف اشارہ کر کے انہیں حکم دے رہا تھا۔ ان دونوں کو چارونا چار اس کے حکم کی تعمیل کرنی پڑی۔ جیسے ہی وہ اپنے باقی تین ساتھیوں سے الگ ہو کر ایک طرف ہوئے، فضا کو یوں کی آواز سے گونج اٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے تین صحت مند اور توانا وجود اپنے خون میں نہائے خاک میں لوٹنے لگے۔

”کوستر میں بیٹھو۔“ تین زندگیوں کا چراغ گل کرنے والے اپنی کارروائی سے بے نیاز ان دونوں کو حکم دینے لگے۔ ”یہ..... یہ کیا کیا تم نے؟“ عالم شاہ نے حکم کی تعمیل کرنے کے بجائے غصے سے پوچھا۔ وہ جوان کو تحفظ دینے کے لیے اتر پورٹ سے سیدھا نکال لائے تھے، اب خود نہیں رہے تھے تو یہ اس کے لیے ایک بڑا شاک تھا۔

”ہماری راہ میں آنے والوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔“ سیدھی طرح گاڑی میں بیٹھو ورنہ تمہارا حشر اس سے بھی زیادہ برا ہوگا۔“ زمین بالوں والے نے سخت لہجے میں جواب دیا اور ساتھ ہی عالم کو دھکا دینے کی بھی کوشش کی۔

”ہاتھ مت لگانا سائیکل کو، میں تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔“ سرمد کی وفاداری اس کی یہ جسارت کہاں برداشت کر سکتی تھی۔

”چل تو پہلے تجھے ہی دیکھ لیتے ہیں۔“ وہ اپنے ایک ساتھی کے ساتھ سرمد پر پل پڑا۔

عالم شاہ اپنے جاں نثار کے ساتھ یہ سلوک کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ وہ بھی اس لڑائی میں کود پڑا۔

”بس!“ اچانک ہی ایک دھاڑی ہوئی آواز ان کی سماعتوں سے ٹکرائی اور خود کار ہتھیاروں کی ٹالیں ماتھے سے آگئیں۔

”بیٹھو گاڑی میں۔“ یہ حکم دینے والا وہ تھا جس کو عالم راستے میں پہلے بنا کر ہوا برد کرتا دیکھتا رہا تھا لیکن اسے اس بات کا بھی یقین تھا کہ اس نے پہلے جو دھاڑ سنی تھی وہ اس لڑکے کی نہیں تھی۔ بہر حال اس وقت وہ اپنے مقابلین کو کینہ تو ز نظروں سے گھورتے ہوئے کوستر میں سوار ہو گیا۔ سرمد بھی باجھوں سے بہتے خون کو آستین سے صاف کرتا ہوا اس کے پیچھے کوچ میں چڑھ گیا۔ کوچ کی پچھلی نشستوں پر ایک شخص مٹین گن کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا لیکن چہرے پر منڈھے نقاب کی وجہ سے وہ اسے پہچاننے سے قاصر تھا۔

”ان دونوں کے کپڑے اترا کر باہر پھینک دو۔“ نقاب پوش نے حکم صادر کیا۔ اس کی آواز سنتے ہی انہیں اندازہ ہو گیا کہ یہ وہی ہے جس کی دھاڑ انہوں نے سنی تھی۔

کہ انہیں کسی دوسری گاڑی میں منتقل کیا جا رہا ہے اور یہ گاڑی کوئی لگژری کار ہے۔ گاڑی نے سفر شروع کیا تو اس کی آرام دہ نشستوں، بے آواز انجن اور بغیر جھٹکے کے ہموار ڈرائیو نے اندازے کی تصدیق کر دی۔ اس بار سفر آرام دہ لیکن طویل تھا۔

☆☆☆

”ہاں بھی ہیرو! کیا حال ہے؟ آج تو بڑی کٹ شٹ میں دکھائی دے رہے ہو۔“ اس نے کھانے کی ٹرے سمیت بہرام کے قریب بیٹھتے ہوئے اسے ہلکے پھلکے لہجے میں مخاطب کیا۔ وہ کچھ دیر قبل ہی سوکراٹھا تھا اور زرینہ بی بی نے اسے نہلا دھلا کر صاف ستھرا لباس پہنانے کے ساتھ ساتھ اس کے بال وغیرہ بھی سنوار دیے تھے اس لیے اس کی حالت کافی بہتر محسوس ہو رہی تھی۔

”یہ سب بی بی نے کیا ہے۔ میرے لیے یہ نئے کپڑے بھی انہوں نے ہی منگوائے ہیں۔“ بہرام نے شرمائے ہوئے لہجے میں اسے جواب دیا۔

”بی بی نے بہت اچھا کام کیا ہے۔ آئندہ بھی اسی طرح ہیرو بن کر رہنا۔ کپڑوں، جوتوں وغیرہ کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ وہ مزید بھی آجائیں گے۔“ اس نے نرمی سے بہرام کو جواب دیا۔ اس وقت بہرام جو کپڑے پہنا ہوا تھا، ان کے علاوہ بھی وہ اس کے لیے چند جوڑے خرید کر لایا تھا۔ اس بے چارے بچے کا کل سامان تو گھر اور باغ کے ساتھ جل کر خاکستر ہو گیا تھا اس لیے اس کے استعمال کی ہر چیز نئی خریدنا ناگزیر تھا۔

”آپ بہت اچھے ہیں۔ کاش دنیا میں سب لوگ آپ جیسے ہوتے۔“ بہرام نے خواہش ظاہر کی لیکن معاذ اپنی تعریف پر خوش ہونے کے بجائے اس کے لہجے کی حسرت و یاس کو محسوس کر کے دکھی ہو گیا۔ چھوٹی عمر کے بڑے دکھ نے اسے نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ دن کے مختلف حصوں میں اسے دورے پڑنے لگتے تھے۔ زرینہ بی بی سارا دن اس کا دھیان رکھتی تھیں پھر بھی کوئی بھول چوک ہو جاتی تھی۔ کل بھی وہ دورے کے دوران اپنے ہاتھ پر چوٹ لگوا بیٹھا تھا۔

”دنیا میں اچھے اور بُرے، دونوں طرح کے لوگ ملتے رہتے ہیں۔ ہمارا کام ہے اچھے لوگوں کی قدر کریں اور بُرے لوگوں کو اپنی زندگی سے نکال دیں۔“ اس نے بہرام کو نصیحت کی اور پلیٹ میں موجود چاولوں پر سالن ڈالا۔

”لیکن.....“ بہرام نے کچھ کہنا چاہا۔

”لیکن ویکن سب بعد میں، پہلے یہ کھانا کھاؤ جو بی بی

نے بڑی محبت سے اسپیشلی تمہارے لیے بنایا ہے۔“ اس نے بہرام کو مزید بولنے سے روک دیا۔ اسے ڈر تھا کہ گنگو کے اس نازک موڈ پر کہیں اس کی ذہنی رو بہک نہ جائے۔ وہ تکلیف دہ باتوں کے متعلق سوچنا شروع کر دیتا تو نتیجہ دورے کی شکل میں بھی نکل سکتا تھا۔

”بی بی بتا رہی تھیں کہ تمہیں اگلے ہوئے چاولوں کے ساتھ راجما (سرخ لوبیا) کا سالن بہت پسند ہے اس لیے آج انہوں نے خاص طور پر تمہارے لیے یہ کھانا بنایا ہے۔“ اس نے ایک چمچ بھر کر بہرام کے منہ کی طرف بڑھاتے ہوئے بتایا۔

”بی بی ایسی ہی ہیں۔ ان کی ہمیشہ سے عادت ہے کہ جب بھی راجما بناتیں، میرے لیے ضرور بھیجتی تھیں۔“

”یعنی مجھے تم سے جیلس ہونا چاہیے۔ تم میری بی بی کے پیار میں زبردستی کے حصے دار بنے بیٹھے ہو۔“ وہ نہیں چاہتا تھا کہ بہرام ماضی کے بارے میں سوچے اس لیے اسے کھانا کھلانے کے ساتھ ساتھ ایک کے بعد ایک بات نکالتا جا رہا تھا۔

”نہیں، نہیں۔ ایسا بالکل بھی نہیں ہے عمار بھائی! آپ سے بڑھ کر تو بی بی کو کسی سے پیار ہو ہی نہیں سکتا۔“ بہرام نے جلدی سے وضاحت دی جس پر وہ ہنس دیا۔

”مجھے معلوم ہے یار لیکن کیا کریں کہ تم ہو ہی اتنے پیارے بچے کہ بی بی تو بی بی، میں بھی تم سے پیار کرنے پر مجبور ہوں۔ بالکل ایسا لگتا ہے جیسے اللہ نے مجھے چھوٹا بھائی دے دیا ہے۔“ بہرام کی اداسی دور کرتے کرتے وہ خود اداسی کی لپیٹ میں آ گیا اور دل پر دور بیٹھے سعد کی یاد نے دستک دی۔ اس پر بڑی افتاد سعد کے لیے سب سے بڑا امتحان لے کر آئی تھی۔ اغوا، ایک گردے سے محرومی، داؤ پر لگا کیریئر اور در بدری سمیت بہت کچھ سہا تھا اس بے چارے نے۔ سعد کو اس سب سے ٹکالنے کے لیے اس نے اپنی ذات پر بہت کچھ سہا تھا لیکن جانتا تھا کہ جو کچھ گزر چکا، سعد اس کے اثرات سے اگلے کئی برسوں تک نہیں نکل سکے گا۔ بہرام بھی کچھ اس طرح کی تکلیف سے گزر رہا تھا اور اس نے اپنے دل میں عزم کر لیا تھا کہ اسے نارمل کرنے کے لیے جو کچھ بس میں ہو ضرور کرے گا۔

”مطلب آپ مجھ سے جیلس نہیں ہیں۔“ بہرام ہلکا سا مسکرایا۔ اتنے دنوں میں یہ پہلی بار تھا کہ وہ نہ صرف ہلکے پھلکے موڈ میں بات کر رہا تھا بلکہ مسکرایا بھی تھا۔

”بالکل بھی نہیں ہوں لیکن اب تم باتیں کم کرو اور کھانا

زیادہ کھاؤ ورنہ کھانا ٹھنڈا ہو کر اپنا مزہ کھودے گا اور بی بی ناراض ہوں گی کہ میں نے تمہیں باتوں میں لگا کر ان کی ساری محنت ضائع کر دی۔“ معاذ نے اسے ٹوکا اور ساتھ ہی گھڑی پر بھی نظر ڈالی۔

”یہ بی بی کے ہاتھ کا راجما ہے ہمار بھائی! یہ ٹھنڈا ہو کر بھی اپنا مزہ نہیں کھوسکتا۔“ بہرام کوچ کوچ کر مینہ بی بی کے ہاتھ کا بناراجما بہت پسند تھا اس لیے پورے وثوق سے دعویٰ کیا۔

”مان لیا بھی کہ بی بی دنیا کے بڑے سے بڑے شیف کو مات دے سکتی ہیں لیکن بات یہ ہے کہ کھانے کے بعد تمہیں میرے ساتھ ایک جگہ چلنا ہے اور وہاں ہمارا وقت پر پہنچنا بہت ضروری ہے۔“ اس نے بہرام کو اصل بات بتائی۔

”کہاں، کہاں جانا ہے ہمیں؟“ بہرام تھوڑا سا بے چین دکھائی دینے لگا۔

”ہے ایک جگہ جہاں تمہیں ایک اچھے انسان سے ملوانا ہے، تم ان صاحب سے ملو گے تو تمہیں مل کر بہت اچھا لگے گا اور تمہاری صحت پر بھی اس کا بہت اچھا اثر پڑے گا۔“

”ہم کسی ڈاکٹر کے پاس جا رہے ہیں؟“ بہرام نے فوراً اندازہ لگالیا۔

”ہاں۔“ اسے اعتراف کرنا پڑا پھر اسے ذہنی طور پر آمادہ کرنے کے لیے نرمی سے بولا۔

”جس طرح ہمارے جسم کے کسی حصے میں تکلیف ہو تو ہمیں ڈاکٹر کے پاس جانا پڑتا ہے، اسی طرح جب دماغ کسی وجہ سے ڈسٹرب ہو جائے اور تکلیف میں چلا جائے تو اس کا علاج بھی بہت ضروری ہے۔ جسمانی طور پر الحمد للہ تم بالکل فٹ ہو لیکن تمہارا ذہنی دباؤ تمہاری زندگی کو بری طرح متاثر کر رہا ہے۔ آج ہم جن ڈاکٹر صاحب کے پاس جانے والے ہیں وہ اس مشکل سے نکلنے میں تمہاری مدد کریں گے۔“

”کیا میں بالکل ٹھیک ہو جاؤں گا؟“ بہرام نے بے یقینی سے پوچھا۔

”کیوں نہیں۔ ان شاء اللہ بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔“

اس نے پورے وثوق سے جواب دیتے ہوئے گلاس میں تھوڑا سا پانی نکال کر اس کے ہاتھ میں تھمایا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے دو گھونٹ پانی پیا اور گلاس اسے واپس پکڑا دیا۔

”کیا اس کے بعد مجھے وہ ڈراؤنے خواب آنے بند ہو جائیں گے؟“ اس کا لہجہ سہما ہوا تھا۔

”ضرور۔“ معاذ نے ایک بار پھر اسے یقین دہانی

کر دئی پھر مزید حوصلہ بڑھانے کے لیے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر نرمی سے دباؤ ڈالتے ہوئے بولا۔

”انسانوں کی زندگی میں مشکلات اور تکالیف آتی رہتی ہیں۔ کچھ تکالیف ایسی ہوتی ہیں جنہیں سہناؤقی طور پر ہمیں ناممکن لگتا ہے لیکن یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ کسی کو بھی اس کی برداشت سے زیادہ تکلیف میں مبتلا نہیں کرتا۔ جو اللہ کے نیک بندے ہوتے ہیں، وہ اول وقت میں اس تکلیف پر صبر کر کے اجر کے حقدار قرار پاتے ہیں۔ باقیوں کو بھی شور، شکوہ اور واویلا کرنے کے بعد بالآخر ہار ماننا ہی پڑتی ہے تو پھر کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ اول وقت میں صبر کر لیا جائے اور سوچا جائے کہ اپنے اس غم کے مداوے کی کیا صورت نکالی جاسکتی ہے۔ خود کو غم میں غرق کر لینا ناشکری ہے۔ ناشکرا انسان نہ تو اللہ کو پسند ہوتا ہے اور نہ اپنے لیے مفید۔“

”مگر میں..... میں کیسے جیوں گا اپنے گھروالوں کے بغیر؟ میں تو ابھی اتنا بڑا بھی نہیں ہوا کہ خود اپنے لیے کچھ کر سکوں۔“ وہ ایک طرف اپنے پیاروں کی جدائی کے غم سے نڈھال تھا تو دوسری طرف اسے مستقبل کے اندیشے ڈرا رہے تھے۔

”کیا شیر خوار حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھی چھوٹے ہو؟ کیا تم نہیں جانتے کہ جب حضرت موسیٰ کو ان کی والدہ نے فرعون سے بچانے کے لیے ایک صندوق میں ڈال کر دریا میں بہا دیا تھا تو نہ صرف اللہ نے ان کی حفاظت فرمائی بلکہ ایسا انتظام بھی کر دیا کہ ان کی پرورش ان کے سب سے بڑے دشمن کے محل میں ہی کروا ڈالی۔ ہم سوچ بھی کیسے سکتے ہیں کہ جس رب نے یہ کائنات بنائی ہے، وہ اس کا انتظام سنبھالنے سے قاصر ہوگا۔ وہ تو بس ہمارے ایمان کی آزمائش کے لیے ہمیں ایسے امتحانات میں مبتلا کرتا ہے ورنہ کائنات کا بڑے سے بڑا کام اس کی محض ”کن“ کا منتظر ہے۔ وہ چاہے تو ایک لمحے میں اس دنیا سے ظلم کا خاتمہ کر کے یہاں امن قائم کر دے لیکن وہ ایسا نہیں کرے گا کیونکہ اس نے اس دنیا کو ہمارے لیے امتحان گاہ کے طور پر بنایا ہے اور ہم میں سے ہر ایک کو لازماً اپنے اپنے طرف کے مطابق آزمایا جائے گا۔“ اس کے دلائل ایسے تھے کہ بہرام کو قائل ہو کر خالص اختیار کرنی پڑی لیکن یہ بھی طے تھا کہ محض ان چند باتوں سے اس کا علاج ممکن نہیں تھا۔ ایسے اس ٹراما سے نکلنے کے لیے کسی مستند ڈاکٹر کی مدد درکار تھی اور آج وہ اسی مقصد سے اسے اپنے ساتھ لے جانے والا تھا۔

”تم ریڈی رہو، میں یہ برتن بی بی کو دے کر آتا ہوں

پھر ہم نکلتے ہیں۔“ اس نے بہرام کا شانہ چھتھپایا اور ٹرے اٹھا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ ابھی وہ ٹرے باورچی خانے میں رکھ کر پلٹ ہی رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے جا کر دیکھا تو بنجامن کا ڈرائیور تھا۔ بہرام کو ماہر نفسیات کے پاس لے جانے کا پروگرام سن کر بنجامن نے خود انہیں گاڑی مع ڈرائیور فراہم کرنے کی پیشکش کر دی تھی جسے اس کے خلوص کے باعث رد کرنا ممکن نہیں تھا۔

”بس دو منٹ رکو، میں بہرام اور آغا جان کو لے کر آتا ہوں۔“ سلام دعا کے بعد اس نے ڈرائیور سے کہا اور واپس اندر چلا گیا۔

”کون ہے؟ کیا ڈرائیور آگیا ہے؟“ آغا گل جو بالکل تیار اپنے کمرے سے باہر آچکے تھے، اس کے پلٹتے قدموں کی چاپ سن کر پوچھنے لگے۔

”جی، ڈرائیور آگیا ہے۔ آپ چلیں، میں بہرام کو لے کر آتا ہوں۔“ اس نے انہیں جواب دیا اور اس کمرے کی طرف بڑھ گیا جہاں بہرام موجود تھا۔ اب وہاں زرینہ بی بی بھی موجود تھیں اور بہرام پر سے صدقے کے پیسے دار رہی تھیں۔

”آجاؤ بہرام! ہمیں لے جانے کے لیے گاڑی آگئی ہے۔“ اس نے پکارا۔

”جاؤ میرے بہادر بچے! اللہ تمہارا ہامی و ناصر ہوگا۔“ زرینہ بی بی نے دعاؤں کے ساتھ اسے رخصت کیا۔ معاذ اس کا ہاتھ تمام کمرے سے باہر لے آیا۔ بہرام کا ہاتھ بالکل سرد ہو رہا تھا جسے وہ اپنی گرمجوش گرفت میں لیے اسے حوصلہ دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

باہر آ کر اس نے بہرام کو پچھلی نشست پر اپنے اور آغا گل کے درمیان بٹھایا اور سفر شروع ہو گیا۔ آغا گل نے بہرام کو بھلائے رکھنے کے لیے اس سے ہلکے پھلکے موضوعات پر گفتگو شروع کر دی۔ وہ ان کی باتوں پر زیادہ نہ سہی، کچھ نہ کچھ رد عمل دیتا رہا اور اتنا بھی کافی تھا کہ ان کا اصل مقصد بس اس کا دھیان بٹا کر اسے پرسکون رکھنا تھا۔ معاذ جواب تک اس کا ہاتھ تھامے ہوئے تھا، محسوس کر رہا تھا کہ آہستہ آہستہ اس کا تناؤ کم ہو رہا ہے اور وہ آغا گل کی باتوں میں دلچسپی لے رہا ہے۔

”تمہیں بتاؤں کہ جب میں تمہاری عمر کا تھا تو میرا پسندیدہ کھیل کون سا تھا؟“ ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے انہوں نے اچانک اس سے کہا۔

”کون سا تھا؟“ اس نے تجسس سے پوچھا۔

”کرکٹ۔ میں کرکٹ کھیلتا تھا اور اپنی ٹیم کا کپتان تھا۔“ انہوں نے فخر سے بتایا۔

”کیا واقعی آغا جان؟“ بہرام کو گویا یقین نہیں آیا۔

”اور نہیں تو کیا۔ تم کیا سمجھتے ہو یہ اندھا بالکل ناکارہ ہے کیا؟“ انہوں نے بھی جیسے بُرا مان لیا تھا۔

”نہیں آغا جان! میں یہ تو نہیں کہہ رہا۔ بس مجھے حیرت ہو رہی ہے کہ آپ کیسے کھیل لیتے تھے۔“ وہ شرمندہ شرمندہ سا وضاحت دینے لگا۔

”ہم اسپیشل لوگوں کی ایک ٹیم تھی اور ہم اپنے لیے بنائے گئے قاعدے قوانین کے تحت کھیلتے تھے۔ تم بتاؤ، تمہیں کرکٹ پسند ہے؟“ انہوں نے گفتگو کا رخ اس کی ذات کی طرف موڑ دیا۔

”جی، بہت پسند ہے لیکن میں زیادہ اچھی کرکٹ نہیں کھیل پاتا۔ اکثر تو لڑکے مجھے ٹیم میں شامل ہی نہیں کرتے کہ تمہاری وجہ سے ہم میچ ہار جاتے ہیں۔“ اس نے جھینپے ہوئے انداز میں بتایا۔

”ایسا اس لیے ہے کہ تم نے درست کھیل کا انتخاب نہیں کیا ہے۔ تم فٹ بال کھیل کر دیکھو۔ اس میں یقیناً کامیاب رہو گے۔“

”آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟“ وہ ان کے مشورے پر حیران ہوا۔

”تمہاری ٹانگوں کی مضبوطی کی وجہ سے۔ یہ لمبی اور مضبوط ٹانگیں ایک فٹ بالر کی ہیں۔“ انہوں نے اپنے ہاتھ سے اس کی ٹانگ کو دبایا۔

”شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں کبھی کبھی دوستوں کے ساتھ فٹ بال کھیلتا تھا تو وہ یہی کہتے تھے کہ تمہارے پاس بال چلی جائے تو تم اسے گول کرنے سے پہلے چھوڑتے ہی نہیں ہو۔“ ماضی کی خوشگوار یاد نے اس کی جھجھی ہوئی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے چمک سی دوڑادی پھر کچھ مایوسی سے بولا۔

”لیکن لڑکے زیادہ فٹ بال کھیلتا پسند ہی نہیں کرتے۔ کہتے ہیں ہمارے خطے میں فٹ بال کا کوئی اسکوپ نہیں ہے۔“

”کھیل خود کو جاق و چوبند اور ٹینشن فری رکھنے کے لیے ہوتے ہیں ہیرو! جو کوئی ٹیم کھیلتے ہیں، وہ اپنے بچپن اور جوانی کو انجوائے کرتے ہیں۔ ہر ایک پروفیشنل کھلاڑی بن جائے یہ ضروری نہیں ہوتا۔ کیریئر بنانے کے لیے انسان کوئی اور فیلڈ بھی چن سکتا ہے۔ گیارہ افراد کی ٹیم میں اتنی بڑی

انسانی آبادی میں سے بھلا کس کس کو شامل کیا جاسکتا ہے۔“ اس بار معاذ نے گفتگو میں حصہ لیا اور اسے سمجھانے لگا۔ اس کی بات سن کر بہرام نے سر کو تقیبی انداز میں جنبش دی اور کچھ کہنے کے لیے رخ موڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگا لیکن یکدم ہی اس کی زبان گنگ ہو گئی اور آنکھیں پھیلنے کے ساتھ ساتھ جسم میں تناؤ کی کیفیت بھی پیدا ہو گئی۔ اس کی اس بدلتی کیفیت نے معاذ کو بھی رخ بدل کر دیکھنے پر مجبور کیا۔ وہ ایک جیب مٹی جو ان کی گاڑی کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی اور اس جیب میں بیٹھے انڈین آرمی کے سپاہیوں کو صاف دیکھا جاسکتا تھا۔ ان سو رماؤں کے ظلم کا نشانہ بننے والے بہرام کی حالت کا انہیں دیکھ کر بگڑ جانا ایک فطری سی بات تھی۔

”ادھر مت دیکھو بہرام! آغا جان کی طرف دیکھو۔ دیکھو، آغا جان تم سے کیا کہہ رہے ہیں۔“ اس نے بے اختیار ہی بہرام کی توجہ ان لوگوں کی طرف سے ہٹانے کی کوشش کی۔

”بہرام! کیا بات ہے، یہاں دیکھو میری طرف۔“ آغا گل دیکھ نہیں سکتے تھے لیکن معاذ کے لہجے کی بے قراری نے کسی غیر معمولی صورت حال کا احساس دلادیا اور وہ بے حد محبت اور فکر مندی سے بہرام کو پکارنے لگے لیکن وہ ان کی طرف متوجہ نہیں ہوا اور پتھرائی ہوئی نظروں سے اسی سمت دیکھتا رہا جس سمت وہ جیب جاتی دکھائی دے رہی تھی۔

”کچھ نہیں ہوا، سب ٹھیک ہے۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں اور تمہیں کچھ نہیں ہونے دیں گے۔“ معاذ اس کے اکڑتے ہاتھ پیروں کو سیدھا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اسے دلاسا دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ آغا گل بھی شفقت سے اس کی پیٹھ سہلاتے ہوئے اسے سنبھالنے کی اپنی سی کوشش کر رہے تھے لیکن بہرام ان کے تسلی دلاؤں سے بہت دور جا چکا تھا۔ وہ کبیر کے اس باغ میں پہنچ گیا تھا جہاں ابلیس نے اس کی آنکھوں کے سامنے موت کا وحشی رقص کیا تھا۔ ان لمحات کی ساری وحشت اس کے وجود میں اتر آئی تھی۔ اس وحشت کا شکار اب وہ منہ سے عجیب و غریب آوازیں نکال رہا تھا۔

”گاڑی تیز چلاؤ۔“ معاذ کو اندازہ ہو گیا کہ معاملہ ان کے بس سے باہر ہے اور بہرام کے حق میں یہی بہتر ہے کہ اسے جلد از جلد کلینک پہنچا دیا جائے۔ اس کے کہنے پر ڈرائیور نے گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔ وہ فوجی جیب جو اس سارے انتشار کا سبب بنی تھی، ایک موڑ مڑنے کے بعد نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔

”یا اللہ! اس بچے پر رحم فرما اور اس کڑی آزمائش سے نکال کر ایک بار پھر بالکل تندرست کر دے۔“ بہرام کی حالت پر پریشان آغا گل بہت رقت سے اس کے لیے دعا مانگ رہے تھے۔ ساتھ ساتھ اس پر قرآنی دعائیں پڑھ کر پھونکنے کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

”بس ہم پہنچ گئے ہیں۔“ ڈرائیور نے تسلی دینے والے انداز میں اطلاع دی۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ پوری قوت لگانے کے باوجود معاذ کے لیے بہرام کی وحشت کو قابو کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ چیخا چلاتا عالم جنوں میں گاڑی سے نکل بھاگنے کی کوشش میں تھا اور معاذ نے اس کی اس کوشش کو ناکام بنانے کے لیے اسے مضبوطی سے اپنے بازوؤں کے حلقے میں جکڑ رکھا تھا۔

”اللہ کا شکر ہے۔“ معاذ نے ڈرائیور کی اطلاع پر سر اٹھا کر سامنے دیکھا تو متعلقہ ڈاکٹر کے کلینک کا بورڈ دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی۔ بہرام کو کی دشمن ہوتا تو وہ اسے دڈ چار ہاتھ لگا کر خاموشی سے بیٹھنے پر مجبور کر دیتا لیکن وہ تو خود مظلوم تھا جس کے ساتھ کسی سختی کا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

”میں اندر اطلاع کرتا ہوں۔“ گاڑی کلینک کے سامنے روک کر ڈرائیور کہتا ہوا تیزی سے نیچے اتر اور کلینک کے کھلے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ ویسے وہ کہنے ہی کو کلینک تھا ورنہ وسعت کے حساب سے اسے چھوٹا موٹا اسپتال سمجھا جاسکتا تھا۔ ڈرائیور کے اندر جانے کے ایک ڈیڑھ منٹ بعد ہی اندر سے چار کیم خیم آدمی برآمد ہوئے اور سیدھے ان کی گاڑی کی طرف چلے آئے۔

”آپ لوگ اندر وینٹ ایریا میں جا کر بیٹھیں، پیشٹ کو ہم خود دیکھ لیں گے۔“ ان میں سے ایک نے معاذ اور آغا گل کو مخاطب کر کے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا تو وہ دونوں گاڑی سے نیچے اتر آئے لیکن چیختے چلاتے بہرام کو چھوڑ کر جانے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا۔

”پلیز، آپ لوگ اندر وینٹ ایریا میں جا کر بیٹھیں اور ہمیں ہمارا کام کرنے دیں۔“ کہنے کو اب بھی درخواست ہی کی گئی تھی لیکن انداز میں ایک قطعیت سی تھی۔

”آئیں آغا جان! ہم اندر چلتے ہیں۔“ وہ تربیت یافتہ لوگ تھے۔ معاذ نے مناسب سمجھا کہ ان کا کام انہی پر چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ آغا گل کا ہاتھ تھام کر انہیں اپنے ساتھ اندر لے گیا۔

بہرام کے لیے اپائنٹمنٹ پہلے ہی لیا جا چکا تھا۔ استقبالیہ پر رسمی سی کارروائی کے بعد انہیں انتظار گاہ میں

بٹھا دیا گیا۔ وہاں بیٹھے معاذ کی نظر بس بار بار داخلی دروازے کی طرف اٹھتی رہیں لیکن حیرت انگیز طور پر بہرام کو لینے جانے والے وہاں سے آتے دکھائی نہ دیے۔ یہاں تک کہ انہیں ایک کمرے میں جانے کے لیے کہا گیا۔ اس کمرے میں دو جوئیر ڈاکٹرز موجود تھے جنہوں نے ان دونوں کو سامنے بٹھا کر بہرام کے کیس کی تفصیلات بتانے کی درخواست کی۔

”ایکسکوز می ڈاکٹر! میں کچھ بھی ڈسکس کرنے سے پہلے اپنے مریض کے متعلق جاننے، بلکہ اسے ایک نظر دیکھنے کی خواہش رکھتا ہوں۔“ اسے بہرام کے بارے میں جاننے کی بے چینی تھی اس لیے ہر طرح کی مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر سیدھی بات کی۔

”وہ اب پہلے سے بہتر ہے۔ تسلی کے لیے ہم آپ کو دکھا بھی دیتے ہیں۔“ ڈاکٹرز میں سے ایک نے بڑا مانے بغیر نرمی سے اسے جواب دیا اور اپنے سامنے رکھے لیپ ٹاپ پر چند بار انگلیاں چلا کر اسکرین کا رخ اس کی طرف کر دیا۔ وہاں ایک چھوٹے سے لیکن صاف سترے کمرے کا منظر تھا جس میں اجلی چادر والے بستر پر لیٹا بہرام صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وحشت کے رنگ چھٹ جانے کے بعد اس کا چہرہ بہت معصوم اور بھولا بھالا لگ رہا تھا۔

”کیا اسے ٹرکولائزر دی گئی ہے؟“ معاذ نے بہرام کے بالوں کو انگلیوں سے سنوارتے میل نرس کو ایک نظر دیکھا اور سامنے بیٹھے ڈاکٹر سے سوال کیا۔

”مجبوری تھی۔ پیشینہ جس ابتر حالت میں تھا، اگر ایسا نہ کیا جاتا تو اس کو مزید نقصان پہنچ سکتا تھا لیکن آپ فکرنہ کریں۔ یہاں رہ کر اس کا ٹریٹمنٹ ہوگا تو آہستہ آہستہ یہ نارمل لائف کی طرف واپس آجائے گا۔“ ڈاکٹر نے اسے نرمی سے وضاحت دی۔

”یعنی آپ بہرام کو ایڈمٹ کر لیں گے؟“ ڈاکٹر کی وضاحت نے اسے سوال کرنے پر مجبور کیا۔

”اسے اس کی ضرورت ہے۔ مرض کی شدت کم ہو تو ہم خود بھی مریض کو اس کے الہی خانہ کے درمیان رکھنا پسند کرتے ہیں لیکن بہرام کی جو حالت ہے وہ بتا رہی ہے کہ اسے مسلسل انڈر آبزرویشن رکھنا ہوگا اور ظاہر ہے اس کے لیے ہمیں اسے ایڈمٹ کرنا پڑے گا۔“ ڈاکٹر نے اپنی بات کے اختتام پر کندھے اچکائے۔

”اگر آپ کی تسلی ہوگئی ہو تو اب ہمیں چند سوالوں کے

جواب دے دیں۔“ اس بار دوسرا ڈاکٹر معاذ سے مخاطب ہوا۔ ”جی ضرور۔“ معاذ نے اسے جواب دیا پھر وہ اور آغا گل کافی دیر تک ان کے سوالوں کے جوابات دیتے رہے۔

”تھینک یو سوچ! اب آپ لوگ کچھ دیر وینٹنگ روم میں بیٹھیں۔ ہم نے ہسٹری لے لی ہے۔ کچھ دیر میں ڈاکٹر بٹ خود آپ کو کال کریں گے۔“ تمام معلومات حاصل کرنے کے بعد انہیں ایک بار پھر انتظار گاہ میں بھیج دیا گیا۔ وہاں ان جیسے چند مزید افراد بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ اپنے پیاروں کی بیماری سے ان کے ساتھ ساتھ خود بھی لڑتے ان افراد کے چہروں پر تھکن اور پریشانی کے آثار تھے۔ سیاہ چادر میں لپٹی ایک درمیانی عمر کی عورت سراپا غم بنی بیٹھی تھی۔ آنسو بار بار ہلکوں کی سرحد پار کر کے اس کے رخساروں پر پھسل جاتے تھے۔ وہ انہیں ہاتھ میں پکڑے ٹشو پیپر سے صاف کرتی تھی لیکن اگلے ہی لمحے پھر رخسار گیلے ہو جاتے تھے۔ اس کے ساتھ بیٹھی ایک دوسری عورت اس کا یہ حال دیکھ کر ہمدردی سے اس سے استفسار کرنے لگی جس کے جواب میں اس کے رونے میں مزید شدت آگئی پھر پانی پلائے جانے پر مشکل سے ہچکیوں پر قابو پا کر بتانے لگی۔

”چوبیس سالہ اکھوتا بیٹا ہے۔ ساتھ پڑھنے والی کسی مسلمان لڑکی سے عشق کر بیٹھا تھا۔ لڑکی کے گھر والوں کو ایک ہندو سے اپنی بیٹی بیاہنا منظور نہ تھا۔ انہوں نے تعلیم چھڑوا کر اسے اپنے پر یوار میں ہی کہیں بیاہ دیا۔ بس تب سے یہ دیوانہ ہوا پھرتا ہے۔ تین بار آتما ہتھیا کی کوشش کر چکا ہے۔ تینوں بار بڑی مشکل سے بچایا گیا۔ میری اور اس کے پتا کی نیندیں حرام ہوگئی ہیں۔ دن رات اس کی نگرانی کرتے رہتے ہیں اور اس ڈر سے سو نہیں پاتے کہ جانے کب وہ اپنے ہاتھوں سے اپنی جان لے لے گا۔ پہلے بھی کئی ڈاکٹروں سے علاج کروا چکے ہیں لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ صاف کہتا ہے، آپ لوگ کتنی بھی نگرانی کر لو، میں اپنی جان لے کر رہوں گا۔ میرے پاس اپنی پریمیکا کے بنا جینے کا کوئی کارن ہی نہیں ہے۔“ عورت اپنی پتا سنا کر ایک بار پھر رونے لگی۔ احوال جاننے کے لیے سوال کرنے والی عورت اسے دلا سا دینے لگی۔

”میرے بچے کو کسی نے ڈاکٹر بٹ کے بارے میں بتایا تھا کہ بہت گیانی ڈاکٹر ہیں۔ ان کے کلینک پر آنے والا کوئی پیشینہ بھی فائدہ اٹھائے بنا واپس نہیں لوٹا تو ہم اپنے بیٹے کو بھی یہاں لے آئے۔“

”یہ آپ نے بہت اچھا کیا۔ خدا نے چاہا تو آپ کا

لیٹی مول کے بالوں میں نرمی سے انگلیاں چلاتے ہوئے اسے محبت سے ٹوکا۔ مول کو انتہائی نگہداشت میں رکھا گیا تھا اور ایک ایک کر کے ہی سب کو ملاقات کی اجازت دی جارہی تھی۔ سکینہ شاہ اور صداقت شاہ اس سے ملاقات کر کے آچکے تھے اور اب سبیل کی باری آچکی تھی۔ نبی اس کی وکیل چیئر کو مول کے بیڈ کے قریب چھوڑ کر خود باہر نکل گئی تھی اور اب دونوں بہنیں وہاں تنہا تھیں۔

”یہ سوال تو مجھے آپ سے کرنا چاہیے ادی! اس حال میں تو ہم نے آپ کو پاکستان سے روانہ نہیں کیا تھا۔“ مول نے اس سے گلہ کیا تو اس کی آنکھوں میں بہن کے لیے گہرا دکھ تھا۔ وہ کیسے سوچ سکتی تھی کہ ایک دن بہن کو یوں حال سے بے حال وکیل چیئر کا محتاج دیکھے گی۔

”زندہ واپس آگئی ہوں، اس پر شکر ادا کرو ورنہ برین ٹیومر نے جس طرح اپنے بچے گاڑے تھے، قابل ترین ڈاکٹر ز میری زندگی سے مایوس ہو چکے تھے۔ میرا زندہ بچ جانا میرے رب کی قدرت کا ایک کرشمہ اور پیار کرنے والوں کی دعاؤں کا ثمر ہے۔“ سبیل نے مسکرا کر اسے بتایا۔

”آپ میں سے کسی نے بھی مجھے آپ کی بیماری کے بارے میں زیادہ تفصیل سے نہیں بتایا تھا۔ گھر کی چھوٹی ہوں تو سب نے مجھے بالکل بچہ ہی سمجھ لیا ہے۔“ مول نے منہ بنا کر شکوہ کیا۔ ڈاکٹر ز نے اسے پین کمر کی بھاری مقدار دی تھی اس لیے اس وقت وہ اس لائق تھی کہ اپنے پیاروں سے آرام سے ملاقات کر رہی تھی۔

”تم دادی، نانی بھی بن جاؤ تو ہمارے لیے بچی ہی رہو گی۔ پتا نہیں تمہیں یاد بھی ہے کہ نہیں کہ کیسے میں اور ادا سامیں تمہیں گود میں اٹھائے پھرتے تھے۔ ادا سامیں کو تو تم جب چاہے گھوڑا بنا کر ان کی پیٹھ پر سواری کرنے بیٹھ جاتی تھیں۔“ یامی کی خوشگوار یادیں سبیل کی آنکھوں میں جھللا رہی تھیں۔

”کیسے بھول سکتی ہوں میں آپ دونوں کا وہ لاڈ پیار۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ نے اور ادا سامیں نے اماں اور بابا سامیں سے بڑھ کر میرے لاڈ اٹھائے ہیں۔“ مول کے نقاہت زدہ چہرے پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی پھر ذرا چونک کر پوچھنے لگی۔

”یہ ادا سامیں کہاں ہیں؟ میرے پاس آئے کیوں نہیں؟“

”بس آتے ہی ہوں گے۔ انہیں ائر پورٹ سے ہی ایک ضروری کام سے روانہ ہونا پڑا تھا لیکن فکر نہیں کرو، وہ بس پہنچے ہی ہوں گے۔ انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ تمہارا

بیٹا جلد شفا یاب ہو جائے گا۔ ڈاکٹر بٹ واقعی بہت قابل ڈاکٹر ہیں بلکہ سچ کہوں تو وہ قابل سے زیادہ اللہ والے ہیں۔ اللہ کے بھروسے پر بگڑے سے بگڑا کیس لے لیتے ہیں اور پھر اللہ ہی کے سہارے مریض شفا یاب بھی ہو جاتا ہے۔ میرا اپنا بھائی.....“ عورت اب اپنا قصہ شروع کر چکی تھی۔ لاشعوری طور پر وہاں جاری یہ گفتگو سنتے معاذ اور آغا گل کا دھیان اپنے نام پکارے جانے پر اس گفتگو کی طرف سے ہٹ گیا۔ انہیں ڈاکٹر ناصر بٹ کے کمرے میں جانے کا کہا جا رہا تھا۔ وہ دونوں جلدی سے متعلقہ کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

”السلام علیکم!“ سادہ لیکن بے حد صاف سحرے کمرے میں قدم رکھتے ہی انہیں سلام کی آواز سنائی دی۔ سامنے ہی گھومنے والی کرسی پر چالیس بیالیس کے قریب ایک روشن چہرے والا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی ذہین آنکھیں براہ راست ان دونوں کے چہروں پر ٹکی ہوئی تھیں اور ہونٹوں پر بہت دھیمی سی خیر مقدمی مسکراہٹ تھی۔ مجموعی طور پر وہ ایسی شخصیت کا مالک تھا کہ دیکھنے والا پہلی نظر میں ہی اس کے لیے ایک خوشگواریت ہی محسوس کرتا تھا۔

”وعلیکم السلام!“ معاذ اور آغا گل نے بیک وقت گرجوٹی سے ڈاکٹر بٹ کے سلام کا جواب دیا پھر ان کے اشارے پر کرسیوں کی طرف بڑھے۔ معاذ، آغا گل کو کرسی پر بٹھا کر اپنے لیے کرسی کھسکا رہا تھا کہ ڈاکٹر بٹ کے ہاتھ اٹھا کر روکنے پر ٹھنک کر رک گیا۔

”بہرام کے سلسلے میں مجھے جو کچھ ڈسکس کرنا ہوگا، آغا صاحب سے کر لوں گا۔ یہ ساتھ ریٹ روم میں ایک صاحب ملاقات کے لیے آپ کے منتظر ہیں۔ بہتر ہوگا آپ ان سے ملاقات کر لیں۔“ ڈاکٹر بٹ کے الفاظ اس کے لیے حیرت انگیز تھے۔

”آغا جان.....!“ اس نے بے ساختہ ہی مستفسرانہ انداز میں آغا گل کو پکارا۔

”وقت ضائع نہ کرو برخوردار! تمہاری ضد پوری کرنے کے لیے ہم سے جو کچھ بن پڑا ہے، کر گزرو گے ہیں۔“ انہوں نے شفیق سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی پکار کا جواب دیا تو وہ بھی کھل کر مسکرایا اور چیز سے اس بند دروازے کی طرف بڑھ گیا جس کی طرف ڈاکٹر بٹ نے نظروں سے اشارہ کیا تھا۔

☆☆☆

”کیا حال کر لیا ہے اپنا؟“ اس نے بستر پر نڈھال

آپریشن کتنے بجے شروع ہوتا ہے۔ تمہارے آپریشن تھیر میں جانے سے پہلے پہلے وہ یقیناً پہنچ جائیں گے۔“ سکل کو خود بھی عالم شاہ اور سرمد کی طرف سے پریشانی تھی لیکن مول کو تسلی دیتی رہی۔

”وہ ادا سائیں کارائٹ ہیڈ سرمد بھی انہی کے ساتھ گیا ہے کیا؟“ مول نے اچانک پوچھا۔
”یہ تو طے شدہ ہے۔ جانتی ہونا کہ وہ کبھی ادا سائیں کو اکیلا نہیں چھوڑتا۔“

”لیکن احمق کسی اور کو تو تنہا چھوڑ گیا تھا۔“
”کس کی بات کر رہی ہو؟“ سکل نے نا سمجھی سے پوچھا۔
”سرمد کی منگیتر کی۔ بے چاری دو تین بار بہانے سے اس کی خیریت معلوم کرنے حویلی آئی تھی۔ بڑی پیاری لڑکی ہے۔ سرمد کے لیے بہت ادا اس اور پریشان تھی۔ میں نے اسے تسلی دی کہ فکر نہ کرو، سرمد صحیح سلامت آجائے گا اور جب آجائے گا تو ہم سب سے پہلا کام ان دونوں کے بیاہ کا کریں گے۔“ مول نے شوخی سے مسکراتے ہوئے بتایا۔

”تم خدیجہ کی بات کر رہی ہونا؟ وہی جو لطیف سومرو کی حویلی میں کام کرتی تھی اور جس نے سرمد کے کہنے پر ہمیں بعض اہم معلومات بھی فراہم کی تھیں۔“ سکل نے استفسار کیا۔

”ہاں ہاں، وہی خدیجہ! آئی تھی تو بتا رہی تھی کہ سومرو خاندان کا بہت برا حال ہے۔ باپ بیٹے کو قدرت کی جو مار پڑی سو پڑی، باقی خاندان کو بھی بھگتنا پڑ رہا ہے۔ ان کے ہاں کوئی بالغ مرد نہیں ہے جو جائیداد اور حویلی کے معاملات کی نگرانی کر سکے۔ موقع کا فائدہ اٹھا کر سومرد کا ایک کزن مدد کے بہانے ہر شے پر قابض ہو گیا ہے اور حویلی کی عورتوں اور بچوں کو اپنی ضروریات کے لیے ترس ترس کر کچھ مل پاتا ہے۔“ مول نے اسے سومرد خاندان کے حالات سے آگاہ کیا۔

”اللہ رحم کرے ان پر۔ انسان طاقت کے نشے میں بھول جاتا ہے کہ اس کے اعمال کی فصل اس کے ساتھ ساتھ اس کی آل اولاد کو بھی کاٹنا پڑے گی۔“ دشمنوں کا بُرا حال جان کر اس کے دل کو کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی بلکہ اندر ایک اداسی ہی اتر آئی تھی۔

”ادا سائیں آئے نہیں ابھی تک؟“ مول کو پھر بھائی کی یاد نے ستایا۔

”معلوم کرتی ہوں۔“ سکل ہاتھ میں پکڑے موبائل کی طرف متوجہ ہوئی لیکن اسی وقت ایک نرس اور نیلی آگے

پچھے کمرے میں داخل ہوئیں۔

”نام ہو گیا ہے۔ ہمیں پیشنت کو ادنیٰ میں لے جانے کے لیے تیار کرنا ہے۔“ نرس نے اطلاع دی۔

”ادا سائیں.....؟“ مول نے گویا سوال کیا۔ سکل کی سوالیہ نظر سبھی تیلی کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ جواباً صرف سر کو نفی میں جنبش دے کر رہ گئی۔

”کوئی بات نہیں۔ تم اللہ کا نام لے کر آپریشن کے لیے جاؤ۔ ادا سائیں یقیناً کہیں پھنس گئے ہوں گے۔ ان شاء اللہ تمہارا آپریشن ہونے تک واپس آجائیں گے پھر تم ان سے مل لیگا۔“ اندر سے اس کا اپنا دل عالم شاہ کے نہ پہنچے پر گھبرار ہا تھا لیکن مول کو تسلی، دلا سے دے کر آپریشن کے لیے جانے پر آمادہ کر لیا۔ اس صورت حال میں خاموش کھڑی نیلی اس کی طرف سے اشارہ ملنے پر اس کی وکیل چیئر دھکیل کر باہر لے آئی۔

”میرا دل بہت گھبرار رہا ہے نیلی! ادا سائیں کو اب تک آجانا چاہیے تھا۔“ باہر نکلنے کے بعد اس نے نیلی کے سامنے اپنے خوف کا اظہار کیا۔

”اللہ سب خیر کرے گا، بس اللہ سے دعا کریں۔ شاہ سائیں کئی بار ان سے رابطے کی کوشش کر چکے ہیں لیکن کال نہیں لگ رہی۔“ نیلی اصل میں خود تشویش میں مبتلا تھی۔

”یارب! ہم تیرے بڑے حقیر اور کمزور بندے ہیں۔ ہم پر رحم کر اور ہمیں مزید آزمائش سے بچالے۔“ سکل نے دل ہی دل میں بڑی رقت سے رب کو پکارا اور خود بخود ہی دل پر سکینٹ سی اترتی محسوس کی۔ اس کیفیت کا ہی اثر تھا کہ جب وہ اماں اور بابا سائیں کے پاس پہنچی تو اس کے چہرے کے تاثرات بالکل نارمل تھے۔

”مول کو ادنیٰ میں لے جا رہے ہیں۔ معمولی سا آپریشن ہے۔ ان شاء اللہ جلدی نمٹ جائے گا۔“ اس نے اطلاع کے ساتھ ساتھ انہیں تسلی بھی دی۔

”اللہ سائیں خیر رکھے اور میرے بچوں کو آزمائشوں سے نکال لے۔“ سکینہ شاہ نے بھیگی ہوئی آواز میں دعا مانگی۔
”آمین یارب العالمین!“ قربان شاہ نے ان کی دعا پر سب سے پہلے یہ آواز بلند کہا۔ وہ ملازمین کی طرف سے اطلاع ملنے پر ان لوگوں سے پہلے اسپتال پہنچے ہوئے تھے اور ان لوگوں کے ساتھ اپنے پوتے اعظم کو دیکھ کر نہال ہو گئے تھے۔ اعظم بھی حیرت انگیز طور پر فوراً ہی ان کے ساتھ مکمل مل گیا تھا اور اس وقت بھی انہی کی گود میں بیٹھا ہوا تھا۔

”میں دوبارہ عالم کا نمبر ملاتا ہوں۔“ صداقت شاہ

”انسان کی فطرت میں اتنی صلح جوئی ہو تو پھر جھگڑا کس بات کا۔ یہ ہماری ”میں“ ہی تو ہے جس نے زمین پر فساد برپا کر رکھا ہے۔“

”یہ تو ہے۔“ ماہ بانو نے اس کی تائید کی اور پُر اشتیاق نظروں سے ارد گرد دیکھنے لگی۔ ہر طرف انسانوں کا ایک ہجوم سا تھا۔

”بہت رش ہے، کیا یہاں ہمیشہ ہی اتنا رش ہوتا ہے؟“

”آج شبات یعنی یوم سبت ہے اور اہل یہود کی اکثریت اس دن کا زیادہ حصہ دیوارِ گریہ پر گزارنا پسند کرتی ہے۔“ شہریار نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔ ماہ بانو کے مقابلے میں اسے معلومات عامہ سے زیادہ دلچسپی تھی اور موقع ملنے پر وہ یہ معلومات اس سے شیئر بھی کرتا تھا، اب بھی بتانے لگا۔

”شبات تقریباً 26 گھنٹوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ جمعے کو سورج ڈھلنے پر اس کا آغاز ہوتا ہے اور ہفتے کی رات آسمان پر تین ستاروں کے نظر آنے تک جاری رہتا ہے۔ اس روز اہل یہود کا دیوارِ گریہ نہیں کرتے۔ پیسوں کا لین دین کرنا تو دور، ذکر بھی نہیں کرتے۔ گھر کی بتیاں جو جل رہی ہوں، انہیں بجھاتے نہیں اور جو بجھی ہوئی ہوں، انہیں جلاتے نہیں۔ اس روز گھر کا چولہا بند رہتا ہے۔ سفر نہیں کرتے اور سر پر کپاہ پہنے زیادہ تر وقت عبادت میں گزارتے ہیں۔“

”مگر ہمارے میزبان مسٹر ایڈمنڈ تو یہ سب کرتے دکھائی نہیں دیے۔ آج یہاں آنے سے پہلے بھی انہوں نے ہمیں خاصا پُر تکلف ناشتا کروا کر بھیجا ہے اور یقیناً اس کی تیاری کے لیے انہیں چولہا جلانا پڑا ہوگا۔“

”بھئی باغی اور مگر تو ہر مذہب کے پیروکاروں میں ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں ہی دیکھ لو کہ کتنے لوگ بنا کسی شرعی عذر کے نماز اور روزے چھوڑ دیتے ہیں بلکہ بعض تو اتنے ڈھیٹ ہوتے ہیں کہ رمضان میں بھی سرعام کھانے پینے کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں۔“ شہریار پہلے اس کی بات سن کر ہنسا پھر دلیل دی۔

”یہ بھی ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔“ وہ فوراً قائل ہو گئی۔

”میں زیادہ تر ٹھیک ہی کہتا ہوں۔“ اس نے خواخواہ کا لڑکھڑے کیے۔

”لیکن سب کچھ نہیں کہتے۔“ ماہ بانو نے اسے کن انکھوں سے دیکھا۔

”کیا مطلب؟“ اس نے حیرانی ظاہر کی۔

”جیب سے اپنا موبائل نکالا۔ پاکستان کی حدود میں قدم رکھتے ہی ان سب کے سابقہ نمبر ایکٹو ہو گئے تھے اس لیے کال کرنے میں کوئی دشواری نہیں تھی۔“

”پتا نہیں کہاں ہے؟ بیل جا رہی ہے لیکن کال ریسیو نہیں کر رہا۔“ نمبر ملانے کے بعد وہ کچھ دیر موبائل کان سے لگائے بیٹھے رہے پھر مایوس ہو کر کال کاٹ دی۔ اسی وقت ان کے موبائل پر کال آنے لگی۔ نامانوس نمبر سے آنے والی کال ریسیو کرتے ہوئے جانے کیوں ان کے ہاتھ لرزنے لگے۔ دوسری طرف سے کال کرنے والے نے پہلے اپنا تعارف کروایا پھر ان کے بارے میں تصدیق چاہی کہ آیا وہ عالم کے والد صداقت شاہ ہیں یا نہیں؟ ان کی طرف سے تصدیق کیے جانے پر دوسری طرف سے جو اطلاع دی گئی، وہ لرزادینے والی تھی۔

☆☆☆

”اور یہ ہے دیوارِ گریہ یا Western Wall جسے ہم مسلمان دیوارِ براق بھی کہتے ہیں۔“ آج وہ لوگ Trifurcation of faith سے بالکل سیدھے چلتے چلے آئے تھے اور نتیجتاً دیوارِ گریہ تک پہنچ گئے تھے۔ ان کے سامنے یہود کی ایک کثیر تعداد اپنے سروں پر مخصوص ٹوپی کپاہ (kipah) اور بازوؤں میں ٹفلن (Tefflin) پہنے عبادت میں مصروف تھی۔ کوئی دیوار پر ہاتھ رکھے گریہ و زاری کر رہا تھا تو کوئی اپنے سامنے رکھی تورات اور تالمود کو اہل بل کر پڑھنے میں مصروف تھا۔

”یہ کتنی عظیم الشان دیوار ہے اور بے شک میں یہودی نہیں ہوں لیکن اس کے لیے دل میں ایک عقیدت سی محسوس کر رہی ہوں۔“ ماہ بانو بڑے بڑے پتھروں سے تعمیر کی گئی دیوار پر اپنی پُر اشتیاق نظریں جمائے بے ساختہ ہی بولی تو شہریار مسکرا دیا اور نرمی سے بولا۔

”عقیدت تو محسوس ہونی ہی ہے۔ آخر ہمیں بھی تو نسبت ہے اس دیوار سے۔ روایات کے مطابق معراج کے وقت نبی کریم ﷺ اپنے براق کے ساتھ یہاں اترے تھے اور یہیں براق کو باندھا تھا۔“

”کاش ہم ایک دوسرے کے عقائد کا احترام کرتے اور کوئی ایسی صورت نکال لیتے کہ آپس میں الجھے بغیر اپنے اپنے مقدس مقامات پر آزادانہ آجاسکیں۔“ وہ اپنی نظروں سے دیوار کی طوالت ناپتے ہوئے حسرت سے بولی۔ یہ دیوار 485 میٹر طویل تھی اور اس کی بلندی 19 سے 40 میٹر کے درمیان تھی۔

”ہم روزانہ اٹھ کر گھومنے کیوں نکل کھڑے ہوتے ہیں؟“ وہ واقعی ابھمن میں تھی کہ ابھی تک انہوں نے کوئی ایسا اقدام کیوں نہیں کیا تھا جس سے ان کی یہاں آمد کا مقصد پورا ہوتا یا کم از کم کوئی پیش رفت ہی ہو پاتی۔

”ہم یہاں گھومنے ہی تو آئے ہیں۔ کام دھام کے لیے تو زندگی پڑی ہے۔“ شہریار کا جواب اس کے لیے قطعی غیر متوقع تھا۔

”لیکن.....“

”کوئی لیکن ویکن نہیں یار! ہم نے اتنی زندگی کمانے اور محنت کرنے میں گزاری ہے۔ میں چاہتا ہوں ہم یہ ٹرپ ریلیکس رہ کر بالکل کسی آزاد سیاح کی طرح انجوائے کریں۔ میں صبح اٹھ کر چند shekel (اسرائیلی کرنسی) کمانے کے لیے محنت مزدوری نہیں کرنا چاہتا۔“ شہریار نے اسے ”لیکن“ کے آگے کچھ نہیں بولنے دیا تو اسے یکدم ہی احساس ہوا کہ وہ ایک بڑی غلطی کرنے جا رہی تھی۔

”ٹھیک ہے جناب! یہاں آپ باس ہیں۔ یہاں آپ جو کہیں گے وہی ہوگا لیکن واپس جا کر میں چارج دوبارہ اپنے ہاتھوں میں لے لوں گی اور بچت کے سارے طریقے استعمال کروں گی پھر شکایت مت کیجیے گا کہ میں کھانے میں گوشت کم اور گھاس پھوس زیادہ کھلاتی ہوں۔“ اب وہ اپنی غلطی کو کور کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”واپس جا کر کیا ہوگا، یہ تو واپس جا کر ہی دیکھیں گے۔ فی الحال تو آؤ اس یادگار دیوار کے سامنے ایک سیلفی بناتے ہیں۔“ اس نے ماہ بانو کو اپنے ساتھ کھڑا کر لیا اور سیلفی لینے لگا۔

”مزہ نہیں آرہا یار! اس جگہ تو فل پکچر ہونی چاہیے۔“ ایک دو سیلفیز لینے کے بعد اس کا موڈ بدل گیا اور یوں نظریں ادھر ادھر گھمانے لگا جیسے تصویر کھنچوانے کے لیے کوئی موزوں بندہ تلاش کر رہا ہو۔

”ایکسیکوزی!“ آخر کار اس نے کیاہ پہنے ایک پینتیس چالیس سالہ شخص کو منتخب کر کے اسے مخاطب کر ہی لیا۔

”آپ مجھ سے کچھ کہہ رہے ہیں؟“ وہ شخص کچھ حیران سا ان کی طرف متوجہ ہوا۔

”جی..... میں چاہتا ہوں اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو آپ ہم میاں بیوی کی ایک مکمل اور اچھی سی فوٹو بنادیں۔“ اس نے اس شخص سے اپنا مدعا بیان کیا۔

”اوہ، ضرور۔ کیوں نہیں۔“ وہ فوراً راضی ہو گیا اور اس کے ہاتھ سے موبائل لے کر ان کے پسندیدہ زاویے

سے تصویر بنانے لگا۔

”میرے خیال میں ایک اچھی پکچر بن چکی ہے۔ آپ چیک کر لیں۔ اگر آپ کو پسند نہیں آئی تو میں دوسری بنادوں گا۔“ تصویر لینے کے بعد اس نے موبائل اسکرین ان دونوں کے سامنے کی۔

”بہت عمدہ۔ یہ ایک خوبصورت تصویر ہے۔ میں آپ کو مشورہ دینا چاہوں گا کہ آپ جو بھی کام کرتے ہیں، اسے چھوڑ کر فوٹو گرافی شروع کر دیں۔ آپ اپنی موجودہ فیلڈ کے مقابلے میں اس فیلڈ میں زیادہ کامیاب رہیں گے۔“ شہریار نے ہاتھ بڑھا کر اس شخص سے موبائل لے لیا اور ایک عام سی تصویر کی یوں تعریفیں کرنے لگا جیسے کوئی شاہکار تخلیق یا گیا ہو۔ اس کی اس حرکت پر ماہ بانو کے لیے ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ وہ شخص کون ہے۔

”تھینک یو سوچ۔ میں آپ کے اس مشورے کو یاد رکھوں گا اور مستقبل میں کبھی جاب چھینچ کرنے کا ارادہ ہوا تو اسے ضرور آزماؤں گا۔“ وہ خوش مزاجی سے بولا اور پھر بڑے دوستانہ انداز میں مسکراتے ہوئے اپنا تعارف کرواتے ہوئے بولا۔

”میں جی ہوں، جی واکر! میرے خیال میں آپ سیاح ہیں۔ اگر آپ جاہل تو میں ایک مقامی ہونے کی حیثیت سے یروشلیم ایگسپلور کرنے میں آپ کی بھرپور معاونت کر سکتا ہوں۔“

”تھینک یو سوچ جی! یہ آفر تو ہمیں ہمارے میزبان کی طرف سے بھی حاصل ہے لیکن ایک اچھا سیاح ہمیشہ مقامات کو خود ایگسپلور کرنے میں خوشی محسوس کرتا ہے۔“ اس نے بہت سلیقے سے اس کی پیشکش کو رد کر دیا۔

”اوہ..... یعنی میں ایک اچھا دوست بنانے کا موقع گنوا رہا ہوں۔“ اس نے بھی بہت طریقے سے نیا جال پھینکا۔

”میرے والد صاحب کی نصیحت تھی کہ سفر میں دوست اور دشمن دونوں ہی مت بنانا ورنہ تکلیف ہوگی۔ ان کے مطابق سفر بس اس لیے ہوتا ہے کہ آپ کچھ خوشگوار یادیں اپنی یادداشت میں جمع کر سکیں۔ اس میں نہ دشمنی کی تلخی ہونی چاہیے اور نہ ہی بچھوڑے کا غم۔“ وہ اس کے جال میں پھنسنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

”اوکے، ایز یو ڈش۔ بہر حال آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔“ آخر کار اسے ہتھیار ڈالنا پڑے اور شہریار سے مصافحہ کر کے وہاں سے ہٹ گیا۔

”ایڈیٹ!“ اس کے دور چلے جانے کے بعد شہریار

جانے والا واحد معصوم و مظلوم بچہ اس حالت میں ہے کہ اسے دیکھ کر میرادل خون کے آنسو روتا ہے۔ تم یقین کرو، بہرام کو انصاف دلائے بغیر میں چین کی نیند نہیں سو سکتا۔

”یہ کام تو ہم بھی کر سکتے ہیں۔“

”بے شک کر سکتے ہو لیکن اس طرح مجھے اپنے کندھوں پر چڑھے قرض کو اتارنے کا موقع نہیں ملے گا، نہ ہی وہ گھٹن کم ہوگی جس نے مجھے جیتے جی مار دیا ہے۔“ اس پر واقعی بہت بوجھ تھا اور یہ بات ذہن سے نکلتی ہی نہیں تھی کہ پریوش کے خاندان کی تباہی میں کہیں نہ کہیں اس کی ذات ملوث ہے۔ یہ وہ تھا جس کی خاطر اس رات پریوش گھر سے باہر نکلی تھی اور اس وحشیانہ کھیل کا آغاز ہوا تھا جس میں کئی افراد کی ہلاکت کے باوجود کھیل ابھی تک ختم نہیں ہوا تھا۔

”اتنی حساسیت اچھی نہیں ہوتی دوست!“ جارو نے ایک سرد آہ بھری۔

”بے حسوں میں شامل ہونے کے مقابلے میں یہ کہیں بہتر ہے۔“

”کیا کرنا چاہتے ہو تم؟“ جارو نے اسے غور سے دیکھا۔

”عالم کے ہاتھ توڑنا۔“

”تمہاری یہی ضد ہے تو تیاری پکڑ لو۔ ہم بہت جلد مہندر سنگھ کو اس کے انجام تک پہنچانے والے ہیں۔ سارا منصوبہ تیار ہے، بس عملدرآمد ہونا باقی ہے۔“ جارو ہنسی آواز میں اسے تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا۔

”منتظر رہنا، ہم آج ہی کی رات اس خبیث کو اس کے انجام تک پہنچا دیں گے۔“ ساری تفصیل بتا چکنے کے بعد جارو روانگی کے لیے تیار دکھائی دینے لگا اور اس سے مصافحہ کر کے ایک اندرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے اس دروازے کے پیچھے غائب ہونے کے بعد معاذ بھی اٹھ کر ڈاکٹر بٹ والے کمرے میں واپس آ گیا۔ ڈاکٹر بٹ نے اس کی طرف خوشدلانہ مسکراہٹ اچھالی اور دوبارہ آغا گل کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

”آپ بے فکر ہو جائیں بڑے صاحب! ان شاء اللہ آپ کا بچہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا لیکن آپ کو کچھ دن اسے یہاں داخل کرنا پڑے گا اور اس کی دیکھ بھال کے لیے ایک انٹینڈنٹ کو بھی یہاں چھوڑنا ہوگا۔“

”اس کا کوئی مسئلہ نہیں ڈاکٹر صاحب! میں رک جاؤں گا بہرام کے ساتھ۔“

”بہت شکریہ مسٹر عمار! اصل میں ہمارے کچھ اسٹاف ممبران دنوں چھیٹوں پر ہیں اس لیے ہمیں آپ کو زحمت دینا

زیر لب بڑبڑایا۔
”کر لیتے دوستی۔ بے چارہ سہولت سے ساتھ ساتھ رہ لیتا۔“ ماہ بانو نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے معصومیت سے کہا۔
”جس کے ساتھ تم ہو، اسے کسی دوست یا دشمن کی بھلا کیا ضرورت۔“ شہریار نے اس سے بھی زیادہ معصومیت کا مظاہرہ کیا اور اس کا ہاتھ تھام کر ہجوم میں آگے بڑھ گیا۔ اب وہ مغرب کی طرف ایک تنگ راستے کی جانب بڑھ رہے تھے اور اس گلی میں جانے کا ارادہ رکھتے تھے جسے مسلمان البراق ایلی کے نام سے پکارتے ہیں۔ دیوار گریہ کے سامنے مناجات اور آہ و زاری کرتے، اس کی درزون میں اپنی حاجات پر مشتمل کاغذ اڑتے، اہل یہود سمیت وہ جاسوس بھی کچھ رہ گیا تھا جو ایک مسلمان جوڑے کی یروشلم میں موجودگی کی ”اصل“ وجہ کھوجنے کے لیے ان کے پیچھے تھا۔

☆☆☆

”جارو!“ ریٹ روم میں ملاقات کے لیے موجود شخص کو دیکھ کر وہ بیک وقت حیرت و مسرت کا شکار ہوا۔
”تم اتنی شدت سے مجھے یاد کر رہے تھے تو مجھے ملاقات کے لیے آنا ہی پڑا۔“ کیم تخیم جبار علی عرف جارو نے مسکراتے ہوئے اسے گلے لگا لیا۔ اس نے اپنی ڈاڑھی اور مونچھوں کو ترشوا کر ترتیب میں کر لیا تھا اور اس معمولی سی تبدیلی سے اس کی شخصیت کا تاثر بدل گیا تھا۔ اس تبدیلی میں آنکھوں پر لگی سنہری فریم والی نفیس سی مینک کا بھی خاصا دخل تھا۔ اس پر پہلی نظر پڑتے ہی کسی بڑھے لکھے معزز آدمی کا گمان ہوتا تھا اور کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ شخص ایک ایسا خطرناک لڑاکا ہے جو کسی جنگلی جانور کی سی خوبور کھتا ہے۔ اس کی غیر معمولی سماعت کا معاذ خود گواہ تھا۔ غیر معمولی قوت سماعت کے ساتھ ساتھ جارو غیر معمولی قوت برداشت کا بھی مالک تھا اور جسمانی تشدد کے ساتھ ساتھ موسم اور ماحول کی سختیاں جھیلنے کی بھی بے پناہ صلاحیت رکھتا تھا۔

”بروقت آمد کا شکریہ۔ یقین کرو اگر تم نہیں آتے تو میرے اندر کی گھٹن میرے ضبط کو توڑ دیتی اور میں کوئی ایسا قدم اٹھانے پر مجبور ہو جاتا جس کے نتائج یقیناً اچھے نہ نکلتے۔“
”تمہیں اس جذباتیت سے گریز کرنا چاہیے۔ تم جانتے ہو کہ تمہاری منزل کوئی اور ہے۔“ جارو نے اسے سمجھایا۔

”طریقہ کوئی بھی ہو، اصل مقصد تو امت مسلمہ کے کام آنا ہی ہے نا۔ یہاں میری موجودگی میں ایک بے گناہ خاندان کو صوفہ ہستی سے مٹا دیا گیا ہے اور اس خاندان کا بیج

پڑ رہی ہے۔“ ڈاکٹر کا انداز معذرت خواہانہ تھا۔ معاذ نے اسے رشک سے دیکھا۔ وہ جتنا اچھا ڈاکٹر تھا، اتنا ہی اچھا ایکٹر بھی تھا اور بہت خوبصورتی سے اس کے وہاں رکنے کا جواز تراش لیا تھا۔

☆☆☆

”ہیلو سوئی!“ سنائی دینے والی اس مردانہ پکار پر اس نے بڑی جدوجہد کے بعد اپنی گردن کو جنبش دی اور رخ موڑ کر اس مرد کی طرف دیکھا جس کے ہاتھوں میں آج کل اس کی زندگی کا چارج تھا۔

”کیا ہوا، مجھے پہچانا نہیں؟ میں جارج ہوں، تمہارا سابق عاشق اور موجودہ میزبان۔“ اس کی آنکھوں میں اجنبیت کا تاثر دیکھ کر وہ اپنا بڑا سامنے پھاڑ کر زور سے ہنسا اور اپنا تعارف کروانے لگا۔

”میں بیٹھنا چاہتی ہوں۔“ جارج کی کسی بھی بات کا جواب دیے بغیر اس نے اپنی خواہش بیان کی۔ اس وقت وہ اسٹریچر نما سخت بستر پر لیٹی ہوئی تھی اور اس کے ہاتھ پیر اسٹریچر کے ساتھ منسلک چڑے کی بیٹوں سے بندھے ہوئے تھے۔ اسے اس بستر پر ایک ہی حالت میں لیٹے ہوئے گھنٹوں گزر چکے تھے لیکن وہ کروٹ لینے جیسی معمولی خواہش پوری کرنے سے بھی قاصر تھی۔

”وائے ناٹ ڈارلنگ! مجھے تمہاری خدمت کر کے خوشی محسوس ہوگی۔“ جارج کا انداز چسکا لینے والا تھا اور وہ گویا اس کی بے بسی سے لطف لے رہا تھا۔ اس نے جواباً کچھ نہیں کہا اور ہونٹ بھیجنے خاموش بیٹھی رہی۔ کسی کم ظرف کو جواب دینے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

”تمہاری ٹانگیں آج بھی اتنی ہی خوبصورت ہیں کہ کسی کا بھی ایمان خراب کر سکتی ہیں۔“ ٹانگوں پر بندھی بیلٹ نکھولنے کے بعد اس کی بے جان ہو جانے والی ٹانگوں کا مساج کرنے کے بہانے اس نے انہیں خوب اچھی طرح ٹٹولا۔ اسے جدید انداز کے جس تشدد سے گزارا گیا تھا، یہ بے جان ٹانگیں اس کا تحفہ تھیں۔ دیکھنے میں اس کے جسم پر ایک خراش تک نہیں تھی لیکن یہ صرف وہی جانتی تھی کہ میڈم انیس کے منتخب کردہ اس وحشی نے اس کی زبان کھلوانے کے لیے کتنی بربریت کا مظاہرہ کیا تھا۔ شاید اصل مقصد زبان کھلوانا تھا بھی نہیں اور وہ موقع ملنے پر ماضی کی اس بے عزتی کا بدلہ لے رہا تھا جو اس نے سونیا کے ہاتھوں رد ہونے کے باعث اٹھائی تھی۔

”کتنی مغرور ہوا کرتی تھیں تم نو جوانی میں۔ کسی حقیر

کتے کی طرح تم نے میری محبت کو ٹھکرا دیا تھا۔ آج اپنا حال دیکھو۔ کسی بے بس چوہا کی طرح میرے سامنے پڑی ہو۔ میں اگر چاہوں تو تمہارے ساتھ کچھ بھی کر سکتا ہوں۔“

”نی الحال تو تم مجھے اٹھا کر بٹھا دو۔“

”آج بھی وہی طغیان ہے۔“ سونیا کے بیزار لہجے پر اسے غصہ آنے لگا تاہم اس نے اسے سہارا دے کر بٹھا دیا۔

”میں آج بھی ہولی گولڈن اسٹار کی رکن ہوں اور میری ماں تنظیم کے سرکردہ لوگوں میں سے ایک ہے اس لیے میرا یہ انداز جائز ہے۔“ بے شک وہ اپنی مرضی سے حرکت کرنے کے قابل نہیں تھی لیکن لہجہ مضبوط اور باوقار تھا۔

”معتوب رکن..... جسے اس کی ماں نے خود زبان کھلوانے کے لیے میرے حوالے کیا ہے۔“ جارج استہزائیہ ہنسا۔

”بہی کبھی انسان کو آزمائش سے گزرنا پڑتا ہے۔ مجھ پر بھی یہی وقت آیا ہوا ہے لیکن تم دیکھنا کہ میں اس دور سے گزر جاؤں گی اور جلد وہ وقت دوبارہ آجائے گا جب تم جیسے میرے حکم پر دم ہلاتے پھریں گے۔“ اس کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا۔

”یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔“

”نہیں، خود پر یقین۔“ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

”میری مانو تو میرے ساتھ ڈیل کرلو۔“

”کیسی ڈیل؟“ وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور اسے گھورا۔

”میری خواہش پوری کر دو، میں تمہارے لیے اوکے کی رپورٹ دے دوں گا۔“ جارج کی آفر پر اس کا دل بری طرح دھڑکا۔ یہ بات اس کے ذہن میں بھی تھی۔ ماضی میں وہ اپنے حسن و جوانی کے بدلے کئی کامیاب سودے بھی کر چکی تھی۔ اس کے حسن کی قیمت پر بڑے بڑے مسائل چکی بجاتے حل ہو جاتے تھے۔ وہ جانتی تھی جارج سے بھی یہ سودا ہو سکتا ہے۔

”کیا کہتی ہو؟“ جارج اس کے چہرے کے تاثرات کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔

”نہیں.....“ سونیا نے پہلے ایک گہرا سانس لیا پھر گردن نفی میں ہلاتے ہوئے صاف انکار کر دیا۔ اس پر ابھی ابھی یہ انکشاف ہوا تھا کہ اب وہ ایسا کچھ نہیں کر سکتی۔ جب وہ تنظیم کے مفاد میں یہ سب کر گزرتی تھی تو اس کے ذہن میں یہ بات ہوتی تھی کہ وہ اپنی جاب کر رہی ہے اور کسی بڑے

مقصد کے حصول کے لیے یہ چھوٹی سی قربانی دی جاسکتی ہے لیکن یہ تب کی بات تھی جب اس کا دل کسی کا اسیر نہیں تھا۔ دل اسیر ہو جائے تو انسان پر کچھ پابندیاں خود بخود ہی نافذ ہو جاتی ہیں۔ اس کے دل نے بھی اسے بتا دیا تھا کہ بے شک معاذ احمد اس کے لیے قابل حصول نہیں ہے لیکن اسے چاہنے کے بعد خود وہ بھی کسی کو ”حاصل“ نہیں رہی ہے۔ محبت سب سے پہلے انسان کو وفاداری سکھاتی ہے اور اس کی ساری وفاداریاں بھی اب معاذ کے ساتھ تھیں۔

”سوچ لو، میں یہ آفر دوبارہ نہیں کروں گا۔“ جارج کو اس کے انکار نے حیران کیا تھا۔

”یہ آفر میں اس صورت میں قبول کرتی جب میں نے کچھ غلط کیا ہوتا۔ اس وقت میرے ساتھ سچ کی طاقت ہے۔ میں جانتی ہوں کہ میں نے تنظیم کے ساتھ کوئی دھوکا، کوئی غداری نہیں کی۔ مجھ سے جو بھی غلطیاں ہوئیں، وہ غیر ارادی تھیں اور صرف اور صرف اس وجہ سے سرزد ہوئیں کہ میرا دماغ میرے اپنے کنٹرول میں نہیں تھا۔“

”تمہارا تو دل بھی تمہارے کنٹرول میں نہیں تھا اور تم اس یونیورسٹی کے لڑکے پر فدا ہو چکی تھیں۔“ جارج کے پاس اس کے متعلق ساری معلومات تھیں چنانچہ آرام سے طنز کیا۔

”مجھے اس بات سے انکار نہیں ہے کہ میرے دل میں معاذ کے لیے فیلنگز تھیں لیکن فیلنگز ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں اس کی خاطر تنظیم سے غداری کر جاتی۔ تنظیم ہر صورت میرے لیے پہلے نمبر پر ہے۔ مجھ پر میری فیلنگز کے حوالے سے طنز کرتے ہوئے یہ بات یاد رکھو کہ ماضی میں، میں تنظیم کی خاطر اپنا آپ ان لوگوں کے حوالے بھی کر چکی ہوں جن سے مجھے کراہیت محسوس ہوتی تھی۔ داراب خان سے میری شادی یاد ہے تمہیں.....؟ کوئی بھی کیسے یہ بات بھول سکتا ہے کہ صرف اور صرف تنظیم کے مفادات کی خاطر میں نے اس موٹے، بھدے اور عمر دراز گینڈے کی بیوی بننا قبول کر لیا تھا۔“ بولتے بولتے وہ خاصی جذباتی ہو گئی تھی۔

”جب اس گینڈے کو برداشت کر لیا تھا تو مجھے کیوں قبول نہیں کر سکتیں؟ صرف چند گھنٹوں کے عوض میں تمہیں آزادی کی آفر کر رہا ہوں۔“ جارج اپنے مطالبے پر اڑا ہوا تھا۔ ”کیونکہ داراب کو میں نے تنظیم کی خاطر قبول کیا تھا اور تم مجھ سے جو مطالبہ کر رہے ہو، وہ ہم دونوں کو تنظیم کا غدار بنادے گا۔ یاد رکھو، میں موقع ملنے پر کسی ذمے دار سے تمہاری اس حرکت کی شکایت ضرور کروں گی۔ تم جیسی کالی بھیڑوں کی نشاندہی بہت ضروری ہے۔ جو شخص اپنی ایک

خواہش کے حصول کے لیے اس حد تک جاسکتا ہے، وہ آئندہ تنظیم کو کوئی بڑا نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔“ وہ جارج کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بولتی جا رہی تھی اور جارج کا چہرہ لمحہ بہ لمحہ سرخ پڑتا جا رہا تھا۔ آخر کار اس کا ضبط جواب دے گیا اور اس نے پوری قوت سے سونیا کے چہرے پر ایک زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔ تھپڑ اتنا زوردار تھا کہ اس کے ہونٹ کے کنارے سے خون کی لکیر سی بہہ نکلی۔

”اب تمہارے ساتھ جو کچھ ہوگا، اس کی ذمے دار صرف اور صرف تم ہوگی۔“

”بے فکر رہو، تم سے شکوہ نہیں کروں گی۔“ وہ جارج کی دھمکی سے خوفزدہ ہونے کے بجائے بے خونی سے مسکرائی۔ رخسار پر چھپے انگلیوں کے نشانات، ایک باجھ سے بہتا خون اور ہونٹوں کی بے خوف مسکراہٹ کا یہ امتزاج اس کے چہرے کو ایسا تاثر دے رہا تھا جسے لفظوں میں بیان کرنا مشکل تھا۔

”میں تمہیں شکوہ کرنے کے قابل چھوڑ دوں گا بھی نہیں۔“ مشتعل جارج نے اسے اسٹریچر سے گھسیٹا اور فرش پر گھسیٹتے ہوئے ہی اسی کمرے کے ایک کونے میں بنے گلاس چیمبر میں لے جا پھینکا۔ سونیا جانتی تھی کہ یہ چھوٹا سا چیمبر صرف ایک بٹن دبانے پر سرد جہنم میں تبدیل ہو جائے گا۔ وہ خود کو اس عذاب سے گزرنے کے لیے ذہنی طور پر آمادہ کرتی ہوئی گھنٹوں میں سردے کر بیٹھ گئی۔ عشق کیا تھا تو عشق کا امتحان تو دینا ہی تھا۔

”اب تم اپنی زبان کھولو گی یا یہیں فریز ہو کر مر جاؤ گی۔“ چیمبر کے اندر کسی گوشے میں لگے اسپیکر پر اس نے جارج کی سخت آواز سنی۔

”جہنم میں جاؤ تم۔“ وہ آہستہ سے بڑبڑائی لیکن سر اٹھا کر اس کی طرف نہیں دیکھا۔

آہستہ آہستہ چیمبر کا درجہ حرارت گرنا شروع ہو گیا۔ ہلکی ٹھنڈک سے شروع ہونے والا یہ سلسلہ کہاں تک جائے گا، وہ خوب واقف تھی۔ جلد ہی وہ مرحلہ آگیا جب اس کا جسم کانپنے لگا اور دانت بجنے لگے۔ جسم کو سکیرتے سکیرتے اس کی یہ حالت ہو گئی گویا کوئی گیند ہو لیکن جتنا وہ خود کو اپنے آپ میں چھپاتی تھی، سردی کی شدت اتنی ہی بڑھتی جاتی تھی۔ اگر اس کی ٹانگوں میں جان ہوتی تو وہ چیمبر کے اندر تھوڑی سی اچھل کود کر کے ہی اپنے جسم کو گرما ہٹ دینے کی کوشش کرتی لیکن بے بسی کی انتہا تھی کہ وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ ویسے بھی اسے معلوم تھا کہ ایسا کرنا بھی بس ایک ناکام

کوشش ہی ہوتی۔ اس چیمبر میں آنے والوں کو ان ساری کوششوں کے باوجود بھی آخر کار ناکام ہو کر ہتھیار ڈالتے اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

”میں مر کر اسی چیمبر میں منجمد ہو جاؤں گی لیکن یہ طے ہے کہ کوئی میری قوت ارادی کو نہیں توڑ سکے گا۔“ وہ اپنے خیال میں میڈم ایکس کا چہرہ لائی اور ضدی سے انداز میں اسے باور کروایا۔

”میں منجمد ہو کر کیسی لگوں گی؟ کیا اس سلیپنگ بیوٹی کی طرح جو ایورسٹ کی بلندیوں پر سالہا سال سے سو رہی ہے اور عورت کے عزم و حوصلے کی علامت بنی ہوئی ہے۔“ اس کی دماغی رو بہنگی اور اسے شیشے کے اس چیمبر سے نکال کر ہمالیہ کی بلندیوں پر لے گئی۔ اصل میں یہ صرف ضد اور ارادے کی مضبوطی تھی جس نے اسے لیوں کو کھولنے نہیں دیا تھا ورنہ ٹھنڈک اب اس اتہا پر تھی کہ جسم کے ساتھ ساتھ اس کا دماغ بھی سن ہونے لگا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے ہر طرف دھند ہی دھند ہے اور وہ ایک برقی چوٹی پر ”سلیپنگ بیوٹی“ کے قرب میں ہی کہیں پڑی ہوئی ہے۔ یہ خیال اتنا قوی تھا کہ اسے باقاعدہ اپنے چہرے پر برف کے گالے گرتے ہوئے محسوس ہوئے۔ آہستہ آہستہ ان کے گرنے کی رفتار بڑھتی چلی گئی اور اس کا وجود اس برف کے نیچے دبنا شروع ہو گیا۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور بند ہونے کو بھی برف نے ڈھانپ دیا۔ بس یہ آخری احساس تھا جو اس کے تصور نے اسے محسوس کروایا۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو اس کے ہر طرف سفیدی ضرور تھی لیکن اس سفیدی کے بوجھ تلے اس کا وجود باقی نہیں جا رہا تھا۔

”گڈ مارننگ مادام!“ اپنے قریب سے سنائی دینے والی آواز نے اسے احساس دلایا کہ وہاں اس کے علاوہ بھی کوئی موجود ہے۔ اس نے نظریں گھما کر آواز کی سمت دیکھا۔ نرس کے مخصوص یونیفارم میں ایک نوجوان لڑکی اس کی طرف دیکھتے ہوئے پیشہ ورانہ انداز میں مسکرا رہی تھی۔

”آپ کیسا محسوس کر رہی ہیں؟“ سونیا کو اپنی طرف متوجہ پا کر اس کی مسکراہٹ مزید گہری ہوئی۔

”میرا جسم ٹھیک سے حرکت نہیں کر پا رہا ہے۔“ نرس کے سوال پر اس نے پہلی بار اپنی حالت پر غور کیا۔ اسے شدید نفاہت محسوس ہو رہی تھی اور ہاتھ پیروں میں اکڑاؤ سا تھا۔ حقیقتاً ابھی اس کا دماغ پوری طرح کام نہیں کر رہا تھا اور وہ سب یاد نہیں آیا تھا جس سے گزر کر وہ یہاں تک پہنچی تھی۔

”ڈونٹ وری! آہستہ آہستہ آپ پوری طرح ٹھیک

ہو جائیں گی۔“ نرس نے اسے تسلی دی اور اس کی ڈرپ میں انجکشن شامل کرنے لگی۔

”لیکن مجھے ہوا کیا ہے؟“ اس نے سوال کرنے کے ساتھ ساتھ خود بھی یاد کرنے کی کوشش کی لیکن عین اسی وقت دروازے کی طرف سے سنائی دینے والی چاپ نے اس کی توجہ کھینچ لی۔

”کیا تمہیں واقعی یاد نہیں کہ تمہیں کیا ہوا ہے؟“ وہ میڈم ایکس تھی جو ہمیشہ کی طرح تازہ دم و چاق و چوبند اس کی طرف چلی آرہی تھی۔ اسے دیکھ کر سونیا کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا اور وہ سب کچھ یاد آ گیا جو اس کے ساتھ ہوا تھا۔ بے ساختہ ہی اس کے ہاتھوں کی مٹھیاں بچھ گئیں۔

”جو کسی کار کے ساتھ جڑے ہوں، انہیں کبھی بھی سخت آزمائش سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ تم اپنے حصے کی آزمائش سے سرخرو ہو کر نکل آئی ہو۔“ میڈم ایکس نے اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات سے اس کی کیفیت کا اندازہ لگالیا اور نرم لہجے میں بولی۔ ساتھ ہی اس نے نرس کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔

”کیا سچ مچ؟“ اس نے نرسی سے پوچھا۔

”ہاں، اگر تم جارج کی آفر قبول کر لیتیں تو آج اس بستر کے بجائے قبر میں لیٹی ہوتیں۔“ میڈم ایکس کے جواب نے اس کے دماغ کی ساری بتیاں جلا دیں اور سمجھ گئی کہ ماضی کے حوالے سے جارج کی وہ ساری گفتگو اور واہیات پیشکش وغیرہ سب کے پیچھے پوری پلاننگ تھی۔ میڈم ایکس کو اس کی اس عادت کا اچھی طرح پتا تھا کہ جہاں مسئلے کا حل نہ مل رہا ہو، وہاں وہ اپنا جسم استعمال کر کے مطلب نکال لیتی ہے۔ وہ جارج کے تشدد پر نہیں ٹوٹی تھی تو اسے اس طرح آزمانے کی کوشش کی گئی تھی۔ ان کے خیال میں اگر وہ جھوٹی ہوتی تو جارج کو رشوت دے کر جان چھڑا لیتی۔ میڈم ایکس کو لگ رہا تھا کہ وہ سچی ہونے کی وجہ سے ایسا نہیں کر پائی تھی لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ اسے محبت نے ماضی کی روش چھوڑنے پر مجبور کیا تھا۔ اس کا دل اڑ گیا تھا کہ جو اس دل کا مالک ہے، اس کے سوا کسی کو جسم تک رسائی نہیں دینی ہے۔

”تمہارے ساتھ ساتھ میں بھی کڑی آزمائش سے گزری ہوں۔ میرا دل ہر ملن یہ دعا کرتا رہا ہے کہ خداوند تمہیں اس آزمائش میں ناکام نہ ہونے دے۔“ اس کی سوچوں سے بے نیاز میڈم ایکس اپنی ہی بولتی جارہی تھی لیکن سونیا کو اس کے ان دو جملوں نے چوکا دیا۔ ماں کا یہ روپ اس نے کہاں دیکھا تھا؟ اسے بے چینی سی ہونے لگی

نظروں سے گھورتی رہی پھر پلٹ کر باہر نکل گئی۔ اس کے جانے کو محسوس کر کے سونیا نے آنکھوں پر سے بازو ہٹالیا۔ اس کی آنکھوں کے گوشے بھیجے ہوئے تھے۔ یہ اس کی زندگی کا المیہ تھا کہ وہ جن لوگوں سے محبت کے حصول کی خواہشمند تھی، ان کے پاس اس کے کاسے میں ڈالنے کے لیے چند ٹیٹھے بول بھی نہیں تھے۔ آنکھوں کے ٹھکین پانی میں بیک وقت معاذ اور میڈم ایکس کے چہرے جھلملا رہے تھے۔

☆☆☆

”اوہ انکل بنجامن آپ؟ آپ کیسے آگئے یہاں؟“ اس نے دروازے سے اندر داخل ہوتے بنجامن کو دیکھ کر بیک وقت خوشی اور حیرت کا اظہار کیا۔

”یہاں سے واپسی میں آغا گل میرے پاس آیا۔ یہ ہوتا ہوا گھر گیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس بچے کو ایڈمٹ کر لیا گیا ہے اور تم ایز آئیڈنٹس یہاں ٹھہرے ہوئے ہو تو میں نے سوچا کہ میں بھی وزٹ کر لوں۔“ انہوں نے بستر پر سوئے ہوئے بہرام پر ایک نظر ڈالتے ہوئے اس کے سوال کا جواب دیا اور اپنے ہاتھ میں موجود بڑا سانا شتے دان ایک میز پر رکھ کر خود بھی صوفے پر ٹپک گئے۔

”جی، میں نے ہی کہا تھا آغا جان سے کہ آپ کو مطلع کر دیں کہ شاید ایک دو دن میں اپنی جاب پر نہیں آسکوں گا۔ اصل میں یہاں ایڈنٹس کا مسئلہ ہے اور بہرام کی حالت ایسی نہیں کہ اسے اکیلا چھوڑا جاسکے اس لیے میرا یہاں رہنا ضروری ہے لیکن آپ فکر نہ کریں۔ میں یہاں رہ کر بھی کام کرتا رہوں گا۔ میں نے آغا جان سے کہا تھا کہ آپ سے کہیں کہ مجھے یہاں ایک عدد لیپ ٹاپ بھجوادیں۔ بس اس کے بعد آگے کی ساری ذمہ داری میری ہے کہ کیسے کام چلانا ہے۔“

”آغا نے مجھے تمہارا میسج کنوے کر دیا تھا لیکن اس ٹائم میں تمہیں لیپ ٹاپ پہنچانے نہیں بلکہ تمہاری آنٹی کے ہاتھ کا بنا کھانا پہنچانے آیا ہوں۔ کام کا کیا ہے، کام ساری زندگی ہوتے رہتے ہیں۔ ابھی تم اس بچے پر فوکس کر دو۔ یہ یہاں سے ڈسچارج ہو جائے تو بعد میں آرام سے کام نمٹا لینا۔“ بنجامن کے لہجے میں بڑی اپنائیت تھی۔

”تھینک یو سوچ انکل! آنٹی کو بھی میری طرف سے اپیل ٹھیکس کیسے گا لیکن اس تکلیف کی ضرورت نہیں تھی۔ کھانا یہاں مل جاتا ہے۔“

”بر میری ڈیئر وائف کے ہاتھ سے بنے کھانے جیسا ڈیشیس تو نہیں ہو سکتا۔“ بنجامن نے چیخ کرنے والے انداز

کہ اس کی ماں نے اس کے لیے دعا کی تھی۔

”تم اس آزمائش میں ناکام ہو جاتیں تو میرے ماتھے پر ہمیشہ کے لیے داغ لگ جاتا۔ تنظیم کے بڑے کہتے کہ رائیل نے اپنی بیٹی کی تربیت ٹھیک نہیں کی اور اس کی تربیت پر مسلمان باپ کا خون غالب آ گیا۔“ میڈم ایکس کے اگلے الفاظ نے اس کی ساری خوش فہمیوں پر پانی پھیر دیا۔ وہ ایک ماں کی حیثیت سے پریشان نہیں تھی۔ وہ ہولی گولڈن اسٹار کی کارکن کی حیثیت سے پریشان تھی کہ کہیں اس کی وفاداری پر کوئی الزام نہ آجائے۔

”کیا خدا آپ کے سینے میں ایک ماں کا دل رکھنا بھول گیا تھا؟“ اسے رائیل کے الفاظ پر اتنا غصہ آیا کہ چڑ کر سوال کر بیٹھی۔

”اس سینے میں صرف اسرائیل کی اس بیٹی کا دل ہے جس نے عہد دے رکھا ہے کہ دنیا کے ہر قائدے اور محبت کا نمبر اسرائیل کے بعد آئے گا۔“ اس پر سونیا کے لہجے کا کوئی اثر نہیں ہوا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔

”میری قوم نے ماضی میں بہت دکھ اٹھایا ہے، در بدری کے عذاب سے گزری ہے۔ دنیا کی ہر قوم کے ہاتھوں رسوا ہوئی ہے تب کہیں جا کر ہمیں زمین کا یہ ٹکڑا نصیب ہوا ہے۔ اس مقدس سرزمین پر اپنا حق قائم رکھنے کے لیے ہم وہ سب کچھ کریں گے جو کیا جاسکتا ہے۔ اس زمین پر اپنا حق ملکیت برقرار رکھنا اور یوری دنیا میں قوم یہودی اجارہ داری قائم کرنا ہمارا وہ نصب العین ہے جسے ہم ہمیشہ سب سے اوپر رکھتے ہیں۔ اولاد کی محبت سے بھی اوپر۔۔۔۔۔“

”تو میرے ساتھ یہ سب کرتے ہوئے آپ کم از کم اسی بات کا لحاظ کر لیتیں کہ میں نے اپنی اب تک کی ساری زندگی صرف اور صرف اسرائیل کے مفاد کی خاطر جی ہے۔“ اس نے اپنے شکستہ وجود کی طرف اشارہ کیا۔

”کچھ نہیں ہوا ہے تمہیں۔ بس تھوڑی سی ویکینس اور فٹنس کے مسائل ہیں۔ بہترین کیئر اور علاج سے چند دنوں میں ہی بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔“ میڈم ایکس نے گویا کان پر سے بھی اڑائی پھر مزید بولی۔

”اچھا ہے، اس بہانے تم کچھ عرصہ آرام بھی کر لو گی۔ کئی برسوں سے مسلسل کام کر رہی ہو۔ یہ بریک تمہیں دوبارہ تازہ دم کر دے گا۔“

”مجھے نیند آرہی ہے۔“ اسے ان ساری تسلیوں کی ضرورت نہیں تھی اس لیے بیزاری سے بولی اور آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔ میڈم ایکس کچھ دیر وہاں کھڑی اسے جانچتی ہوئی

میں کہا تو وہ بے ساختہ ہنس دیا پھر تائید کرتے ہوئے بولا۔
 ”اس میں تو کوئی شک نہیں۔ مجھے کشمیر کے حسن کے
 بعد جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے، وہ آنٹی کے
 ہاتھ کا ذائقہ ہی ہے۔“

”بس تو پھر کھولو لٹن۔ میں نے بھی تمہارا ساتھ دینے
 کے خیال سے گھر پر ڈنر نہیں کیا تھا۔“

”کئی بات ہے نا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ میرے ساتھ
 آپ دوسری شفٹ لگا رہے ہوں۔“ اس نے بنجامن کو چھیڑا۔

”وہ جو تمہاری آنٹی ہے نا، وہ مجھے بہت اچھی طرح
 جانتی ہے۔ اس نے مجھے گھر پر ڈنر کرنے ہی نہیں دیا کہ

اے معلوم تھا میں نے یہاں تمہارے ساتھ شفٹ ضرور لگانی
 ہے۔“ بنجامن نے بھولی صورت بنا کر سچائی اگل دی جس پر

وہ خوب کھلکھلا کر ہنسا۔
 ”آہستہ ہنسو، کہیں بچے کی نیند خراب نہ ہو جائے۔“

بنجامن نے ناراض سے انداز میں اسے ٹوکا۔
 ”اس کی فکر نہ کریں۔ یہ دوا کے زیر اثر گدھے

گھوڑے سب بیچ کر سو رہا ہے۔ میری ہنسی تو کیا، توپ کی
 آواز سے بھی نہیں جاگے گا۔ اسی لیے تو میں آپ سے اصرار

کر رہا ہوں کہ مجھے یہاں لیپ ٹاپ بھجوادیں۔ یہاں فارغ
 بیٹھ کر دیواروں کو گھورتے رہنے کے بجائے میں کچھ کام

کریوں گا تو آگے میرے لیے آسانی رہے گی۔“
 ”اوکے۔ تم اتنا انسٹ کر رہے ہو تو میں واپس

جا کر ڈرائیور کے ہاتھ تمہیں لیپ ٹاپ بھجوادوں گا۔ ابھی تو تم
 کھانا نکالو ورنہ میرے پیٹ کے چوہے بھوک سے بے چین

ہو کر میرے سارے اینٹزل آرگن کو کھا جائیں گے۔“
 بنجامن نے اپنی توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دہائی دی تو وہ

ہنس کر ناشتے دان کھولنے لگا۔ کئی خالوں پر مشتمل ناشتے
 دان کے ہر ڈبے میں انواع و اقسام کے کھانے بھرے

ہوئے تھے اور ناشتے دان کھلتے ہی سارے کمرے میں
 خوشبو بھری گئی تھی۔

”اب تو مجھ سے بھی صبر نہیں ہو رہا۔“ وہ ہونٹوں
 پر زبان پھیرتے ہوئے ندیدے پن سے بولا۔

”اور اڑاؤ میرا مذاق۔ اصل نصیحت تو تمہیں آفٹر
 میرج ہوگی۔ میری دعا ہے کہ تمہیں بھی میری وائف جیسا

ٹیسٹی فوڈ تیار کرنے والی وائف ملے۔“ بنجامن نے اس کی
 کیفیت سے حفا اٹھاتے ہوئے لقمہ منہ میں ڈالا۔

”ہمارے ایسے نصیب کہاں؟ ہمیں تو شاید کنوارا ہی
 اس دنیا سے رخصت ہونا پڑے۔“ بے اختیار ہی سچل کا چہرہ

اس کی آنکھوں کے سامنے لہرا گیا اور ساتھ ہی اس کا وہ خط
 بھی جس میں اس نے اس کے جذبات کو سمجھنے کا ذکر کرنے

کے ساتھ ساتھ واضح کر دیا تھا کہ ان کا ساتھ کبھی ممکن نہ
 ہو سکے گا۔ اسے ایک طرف اپنا آپ معاذ کے قابل نہیں لگتا

تھا تو دوسری طرف اپنی زندگی کی طرف سے یہی مایوسی اور
 بے یقینی تھی۔ کچھ بھی کیفیت معاذ کی اپنی بھی تھی۔ وہ نہیں

جانتا تھا کہ وہ لوٹ کر کبھی وطن واپس جا بھی سکے گا یا نہیں۔
 ”کہاں کھو گئے بیگ مین! نہ کھانا کھا رہے ہو، نہ

میری بات کا جواب دے رہے ہو۔“ وہ جو سچل کا خیال آنے
 پر ارد گرد سے کٹ گیا تھا، بنجامن کے شانہ بہلانے پر ماحول

میں واپس آیا اور کھیانی سی ہنسی کے ساتھ بولا۔
 ”بس ایسے ہی کچھ یاد آ گیا تھا۔ آپ بتائیں، آپ

کیا کہہ رہے تھے؟“
 ”میں پوچھ رہا تھا کہ تمہیں اپنے کنوارے ہی مر جانے کا

شک کیوں ہے؟“ بنجامن نے اپنا سوال دہرایا۔
 ”تو کون کرے گا مجھ سے شادی؟ میں نہ تو عام

کشمیری مردوں جتنا خوبصورت ہوں، نہ میرے پاس زیادہ
 تعلیم یا روپیہ پیسا ہے اور تو اور، یادداشت بھی سلامت

نہیں۔ لوگوں نے مجھے جو بتایا، وہ میں نے خود کو تسلیم کر لیا۔
 اب ضروری تو نہیں کہ سامنے والے بھی اسی طرح مجھے تسلیم

کر لیں۔“ اس نے بات بتائی۔
 ”ان باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تمہارے معتبر

ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ آغا گل جیسے صاحب کردار
 انسان نے تمہیں اپنا بیٹا تسلیم کیا ہے اور پھر تمہارا اپنا

کیریئر۔۔۔۔۔ آئی سوئیر! اگر میری کوئی بیٹی ہوتی تو میں ریجن
 کا ڈائریکٹر ہونے کے باوجود اس کے ساتھ تمہاری شادی

بنا دیتا۔“ بنجامن کے لہجے میں سچائی تھی۔
 ”تمہیںک یو سوچ اٹکل! اپنے لیے آپ کی اتنی اچھی

رائے نے مجھے آپ کا مقروض کر دیا ہے۔“ معاذ کوچ کوچ
 اس کے خلوص نے متاثر کیا۔

”تم یہ ڈیزر د کرتے ہو بیگ مین! بہر حال ابھی یہ
 ایموشل باتیں چھوڑو اور اپنی آنٹی کے ہاتھوں کی بنی پڈنگ

کھاؤ۔ بلیوی، یہ پڈنگ صرف دنیا کے خوش قسمت ترین
 لوگوں کو ہی ملتی ہے۔“ بنجامن نے بڑے طریقے سے گفتگو کا

موضوع بدلا اور اسے پڈنگ پیش کی۔
 ”یہ واقعی ورلڈز بیسٹ پڈنگ ہے۔ آپ اس کے

لیے آنٹی کو میرا سوشل میڈیا بولے گا۔“ معاذ نے پڈنگ
 چمکی اور دل کھول کر اس کی تعریف کرنے لگا۔ بنجامن اس

کچھ کے ساتھ انٹینڈنٹ ہوتے تھے اور کچھ کو اس کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔

”بیک بیک۔“ سنائے میں کمرے کے دروازے پر ہونے والی ہلکی سی دھمکی بھی اسے واضح سنائی دی۔ وہ جلدی سے اٹھ کر دروازے کی طرف گیا اور عطا لہجے میں پوچھا۔
”کون؟“

”مددگار۔“ دھمکی آواز میں طے شدہ کوڑا ادا کیا گیا۔
”آپ کی آمد کا شکریہ۔“ اس نے جوابی کوڑا دہراتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ وہ ایک نوجوان تھا جس نے اپر کا ہڈسر پر اوڑھ رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر ماسک تھا اور ہاتھ میں چائے کا تھرماس تھا ہوا تھا۔ معاذ اسے دیکھ کر مسکرا دیا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ باہر سکیورٹی پر مامور لوگوں سے یہ کہہ کر آیا ہوگا کہ مسٹر عمار کورات بھر جاگ کر اپنا کچھ اہم کام نمٹانا ہے اس لیے انہوں نے اپنے لیے چائے منگوائی ہے۔

”ٹائم زیادہ نہیں ہے۔ آپ کو فوری طور پر یہاں سے نکلنا ہوگا۔“ تھرماس میز پر دھرتے ہوئے اس نے پیغام دیا تو معاذ نے نوٹ کیا کہ اس کے ہاتھوں میں دستانے تھے یعنی وہ اپنے فنگر پرنٹس کے معاملے میں محتاط تھا۔

”ٹھیک ہے، پھر تو ہم چینیج کر لیتے ہیں۔“ لمبی چوڑی گفتگو کرنے کے بجائے معاذ نے بھی فوری عمل کرنا مناسب سمجھا۔ چند منٹوں میں ہی وہ ایک دوسرے کے لباس میں کھڑے دکھائی دے رہے تھے۔ دونوں کا قد و قامت تقریباً یکساں تھا اس لیے لباس پورا آیا تھا۔ بس معاذ کو اس کی لمبی تھوڑی سی ٹنگ ہو رہی تھی لیکن اوپر پر ہونے کی وجہ سے دیکھنے والوں کو محسوس نہیں ہو سکتا تھا۔

”ماسک اور دستانوں کی اضافی جوڑی اپر کی جیب میں موجود ہے۔“ لباس کی تبدیلی کے بعد اس نے معاذ کو آگاہ کیا۔ کمرے کے اندر آنے کے بعد بھی اس نے اپنے چہرے سے ماسک نہیں اتارا تھا اور دستانے بھی ظاہر ہے وہ اتارنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

”تھینک یو۔“ معاذ نے جیبوں میں ہاتھ ڈال کر ماسک اور دستانوں کی ویسی ہی جوڑی برآمد کر لی جو وہ نوجوان پہنا ہوا تھا۔ ان دونوں چیزوں کو پہننے کے بعد وہ باہر جانے کے لیے بالکل تیار تھا۔ ہڈ کو اس نے سر پر اس حد تک آگے کھسکالیا تھا کہ چہرہ بھی اچھا خاصا چھپ گیا تھا۔

”فی امان اللہ!“ وہ دروازے سے نکلنے لگا تو پیچھے

تعریف پر ایسے خوش ہو گیا جیسے خود اس کی تعریف ہو رہی ہو۔ بہت خوشگوار ماحول میں کھانا ختم کرنے اور کشمیری چائے کا ایک کپ پینے کے بعد بنجامن وہاں سے رخصت ہو گیا تو معاذ سوئے ہوئے بہرام کے پاس آ کر کھڑا ہوا۔ وہ اتنی گہری نیند سو رہا تھا کہ اس کی اور بنجامن کی گفتگو اور قہقہوں سے بھی نہیں جاگا۔ معاذ نے اس کے ماتھے پر آئے بالوں کو سمیٹا اور وہاں محبت سے ایک بوسہ دیا۔

”پیشینٹ کو جگادیں، اس کے کھانے اور دوا کا وقت ہو گیا ہے۔“ اسٹاف کا ایک لڑکا دستک دے کر اندر آیا اور اسے مخاطب کیا۔

”میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ یہ اتنی دیر سے بغیر کچھ کھائے پیے مسلسل سوئے جا رہا ہے، اس طرح تو اسے کمزوری ہو جائے گی۔“

”اس کی آپ فکر نہ کریں۔ ڈرپ کے ذریعے انہیں طاقت مل رہی ہے لیکن فی الحال ذہنی سکون اور آرام زیادہ ضروری ہے۔ ہم آہستہ آہستہ خود ہی ان کی نیند کا دورانیہ کم کر کے فزیکل ایکٹیویٹیز بڑھاتے جائیں گے۔“ اس نے رمان سے معاذ کی تشویش دور کی۔ معاذ بھی مطمئن سا ہو کر بہرام کو جگانے لگا۔ تھوڑی سی کوشش سے وہ جاگ گیا اور اس کے اصرار پر فرمانبرداری سے کھانا اور دوا میں بھی کھالیں۔ اس سارے عمل کے دوران وہ کچھ کھویا کھویا سا تھا۔ کوئی ہنگامہ کرنا تو دور کی بات، کسی قسم کی گفتگو بھی نہیں کی تھی۔ معاذ نے چند ایک سوال کیے تو ان کا جواب بھی ہنس ہاں ہوں میں ہی دیا اور پھر تھوڑی ہی دیر میں دوبارہ سو گیا۔

اس کے چاگنے سونے کے اس درمیانی عرصے میں بنجامن کا ڈرائیور اسے لیپ ٹاپ پہنچا گیا تھا۔ وہ لیپ ٹاپ لے کر بیٹھ گیا اور آن لائن ہو کر بنجامن کا شکریہ ادا کیا اور کام پر ایک سرسری سی نظر ڈالی۔ وہ آج رات اس کام کو کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا لیکن خود کو آن لائن ظاہر کرنا ضروری تھا۔ دیرے دیرے وقت آگے بڑھنے لگا۔ اسپتالوں کے عمومی ماحول کی طرح جلد ہی سناٹا چھا گیا اور اندازہ ہونے لگا کہ مریضوں اور ان کے حیارداروں کی اکثریت سوچکی ہے۔ اسٹاف کے بارے میں بھی یہی قیاس کیا جاسکتا تھا کہ ان کی اکثریت سونے یا کم از کم اونگھنے میں مصروف ہوگی۔ یہ کوئی جزل اسپتال تو تھا نہیں کہ رات میں بھی ایمر جنسی کیسز آتے رہتے۔ یہ لوگوں کے نفسیاتی علاج کا اسپتال تھا جہاں لوگ مقررہ اوقات میں ہی معائنے کے لیے آتے تھے اور صرف چند مخصوص مریضوں کو داخل کیا جاتا تھا۔ ان میں سے

سے نوجوان کی دھیمی سی آواز سنائی دی۔ وہ ذرا سا ٹھنکا لیکن پھر رک کر کوئی جواب دیے بغیر باہر جانے والے راستے کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے بہرام یا کسی اور حوالے سے بھی اس نوجوان کو کوئی ہدایت نہیں دی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اسے سب کچھ سمجھا بچھا کر بھیجا گیا ہے اور وہ معاملات کو بہترین طریقے سے سنبھال لے گا۔ سیکورٹی کیمروں اور گارڈز دونوں کی نظروں کی زد میں آنے سے بچنے کے لیے وہ تیزی سے سر جھکائے بیرونی گیٹ سے باہر نکل گیا اور بائیں جانب کا رخ کیا۔ بائیں جانب سے چکر کاٹ کر جیسے ہی وہ عقبی حصے میں پہنچا وہاں تاریکی میں ایک جیب کا ہیولا دکھائی دیا۔ احتیاط کے باعث جیب کی ساری لائشیں بند تھیں۔ اس کے قریب پہنچتے ہی اسے پچھلی نشستوں کی جانب سے پکارا گیا۔

”یہیں آ جاؤ دوست! یہاں تمہارے لیے بہت جگہ ہے۔“ جبار علی کی آواز پہچانتا اس کے لیے قطعی مشکل نہیں تھا چنانچہ بلا جھجک جیب میں سوار ہو گیا۔ اس کے بیٹھتے ہی جیب ہلکی سی غراہٹ کے ساتھ اسٹارٹ ہو گئی اور ایک جھٹکے سے آگے بڑھی۔ اس کی اندر باہر کی لائشیں اب بھی بند تھیں۔ ”سب تیاری مکمل ہے؟“ اس کی بے چینی نے اس سے سوال کر دیا۔

”بے فکر ہو، سب ریڈی ہے۔ میرے بندے مجھے مسلسل مہندر کی لوکیشن سے آگاہ کر رہے ہیں۔ آج کا دن اس نے اپنی رکھیل کے لیے مخصوص کر رکھا ہے اور اس وقت گھر سے وہیں جانے کے لیے نکلا ہوا ہے۔ ہم بہت جلد اس تک پہنچ جائیں گے۔“ جبار علی نے اسے آگاہ کیا تو وہ ایک ہنکارا بھر کر نشست پر سیدھا ہو کر بیٹھا اور ٹانگوں کو ذرا سا پھیلا دیا۔ اس کی ٹانگ نشست کے ساتھ کھڑی کسی شے سے ٹکرائی۔ اس سے قبل کہ وہ شے گرجاتی، اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے سنبھال لیا۔ مخصوص ساخت اور سرد لمس نے اسے آگاہ کر دیا کہ وہ کیا شے ہے۔

”ڈریکنو ہے۔“ جبار علی نے اس کے رائفل کو چھونے کو محسوس کر لیا۔

”اوہ، عمدہ رائفل ہے۔“ وہ اس روسی ساختہ اسلحہ رائفل سے اچھی طرح واقف تھا۔ یہ عمومی اسلحہ رائفلز کے مقابلے میں سی سی آٹومیک رائفل تھی جسے ہر بار قاتل کے بعد کاک نہیں کرنا پڑتا تھا اور اس کی رینج ہزار میٹر تھی۔

”استعمال کی ہے؟“ جبار علی نے پوچھا۔
”اچھی خاصی مشق ہے لیکن ذاتی طور پر مجھے بیرٹ

ایم 107 زیادہ پسند ہے۔“ وہ ٹیونگ کلب کا ممبر رہا تھا۔ اسے شروع سے اسلحے میں دلچسپی تھی پھر میڈم ایکس کی قید میں دی جانے والی تربیت نے اسے ان معاملات میں مزید طاق کر دیا تھا۔

”تم اس امریکن رائفل کی بات کر رہے ہو جس کی کارگر رینج ساڑھے اٹھارہ سو میٹر ہے؟“ جبار علی نے چونک کر اس سے پوچھا۔

”ہاں وہی، اس کے میگزین میں بھی ڈریکنو کی طرح دس گولیاں لگتی ہیں لیکن ایک تو اس کی رینج زیادہ ہے، دوسرے میرا ہاتھ بھی اس پر زیادہ صاف ہے اس لیے مجھے وہ زیادہ پسند ہے۔“ اس نے بتایا۔

”میرے لیے یہ بہت اہم خبر ہے۔ اصل میں بھارتیوں کے ساتھ ایک ٹاکرے میں بیرٹ ایم 107 اچھے خاصے میگزینز کے ساتھ ہمارے ہاتھ لگی تھی لیکن افسوس ہمارے ساتھیوں میں سے کوئی بھی اسے اس کی اصل افادیت کے ساتھ استعمال کرنے کا اہل نہیں ہے۔“

”اگر موقع ملا تو میں اس سلسلے میں تم لوگوں کی مدد ضرور کروں گا اور کوشش کروں گا کہ ایک دو بندوں کو بیرٹ کے استعمال میں طاق کر دوں۔“ اس نے جبار علی کی بات سن کر پیشکش کی۔

”ابھی تو اس معاملے کو دیکھتے ہیں۔ ہو سنا ہو، ہم اپنے ٹارگٹ سے قریب ہیں اور اب ہمیں حرکت میں آنا ہے۔“ جبار علی نے اسے آگاہ کیا۔ ذرا سی دیر میں ان کی جیب درختوں کے ایک جمند کی آڑ میں رک چکی تھی۔

”مہندر کو اپنی رکھیل کے گھر پہنچنے کے لیے اس سڑک سے لازمی گزرنا پڑتا ہے اس لیے ہم نے اس کے لیے یہاں گھات لگا رکھی ہے۔“ جبار علی نے جیب سے اترتے ہوئے اسے آگاہ کیا۔ پتلی سی اس پہاڑی سڑک کے دونوں اطراف میں گھنے درختوں کا سلسلہ تھا اور وہ اپنے ہاتھوں میں رائفلز سنبھالے ان درختوں کی آڑ میں ہی کھڑے ہوئے تھے۔ ڈرائیور البتہ حسب حکم اپنی نشست پر ہی جما ہوا تھا۔

”وہ بس پہنچ گیا ہے۔“ جبار علی کے کان میں یقیناً کوئی آلہ لگا ہوا تھا اور اسے اس کے سامنے ہر لمحے کی خبر دے رہے تھے۔

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نوجوان
کی داستان جو غلط کاروں کے لیے غضب
ناک تھا باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیے



قسط نمبر: 51

شہ زولایا

اساتذہ

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تندوبانی آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابل شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پر عزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹاتے جانے کے منصوبے بنائے جارہے تھے... اس کی زندگی جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کا لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قراریوں کو قرار دینے کے لیے اس کا دل، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانہ سی چیرہ دستوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تاریک عبوت نے طاقت اور گھمنڈ نشے میں چور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ پروار کا نوڑکی حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ واردات قلب بھی اس کے ہضم کی راہ میر، حائل نہ ہو سکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والا... ایک سراپا انتقام نوجوان کی تحریکات



معاذ ایک ذہین لیکن متلون مزاج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جوائن کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ انسٹی ٹیوٹ سے واپس آ رہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو سڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی بڑی فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشری نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بشری ماس کمیونی کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم وغیرہ لکھتی ہے۔ معاذ بشری کو یہ حفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کر دیتا ہے لیکن جن رئیس زادوں سے اس نے ان کا شکار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ایک دن وہ معاذ کو بے خبری میں گھیر کر بری طرح زد و کوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دے دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس نہ آنے پر انتظامیہ کے افراد، پولیس اور ریسکیو ذرائع کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جوگی کی جھونپڑی میں پاتا ہے۔ جوگی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے، جوگی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نواز کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے پراسرار علم سکھانے کی ہامی بھر لیتا ہے اور معاذ اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ادھر جائے وقوعہ سے ملنے والے معاذ کے کسرے سے جب تصویریں نکلوانی جاتی ہیں تو ایک ایسی تصویر بشری کی نظر میں آ جاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پروجیکٹ کے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشری تحقیق کر رہی تھی۔ بشری کے اپنے والد جرنلٹ ہوتے ہیں۔ اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشری کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ صدمے سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باذل نامی غنڈے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشری انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دنوں میں ہی معاذ واپسی کا ارادہ کرتا ہے تاہم ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا عرفان اللہ اور یزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو وقاص نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باذل اچانک بشری کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر دیتا ہے۔ معاذ کو واپس لانے کے لیے اوجھے جھکنڈے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کر کے اس کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات کے نہ بتانے پر اس کے بھائی کا ایک گروہ نکال لیا جاتا ہے۔ اوجھے، جادو سب بتاتا پڑتا ہے۔ ادھر بشری بھی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہو جاتی ہے۔ معاذ کے دوسرے عالم شاہ کے بہنوئی کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ کئی فنون میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے پہتا تاز کر کے اس کے دماغ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ فیضو سے حاصل انوکھے علم کی بدولت ان کا معمول نہیں جتا۔ عالم شاہ اور اس کا نوکر سردہ باذل کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ عالم شاہ، باذل کی قید میں موجود ایک زخمی شخص کی مدد سے وہاں سے فرار ہو جاتا ہے۔ ادھر بشری دینی پہنچ جاتی ہے۔ وہاں وقاص اسے باربی کے روپ میں پہچان لیتا ہے۔ وہ سلطان کو مارتا چاہتی ہے۔ ادھر عالم شاہ، باذل کی قید سے نکل کر اس کا پیچھا کرتا ہے۔ وہ وہاں معاذ کو دیکھتا ہے۔ معاذ کو اس کے گمروالوں سے بدلتی اجازت دے دی جاتی ہے۔ وہ ایک مشن پر سونیا کے ساتھ انڈیا روانہ ہوتا ہے تاہم کچھ لوگ سکھ یا تریوں سے بھری بس کو زیرِ غل بنا لیتے ہیں۔ معاذ اور سونیا تہ خانے کے تمام افراد کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔ عالم شاہ، سکل اور سردہ انڈیا روانہ ہو جاتے ہیں۔ گھر پہنچنے پر پولیس کی رپورٹ ہے اور وہ عالم شاہ اور سردہ کو لے جاتے ہیں۔ عالم شاہ اور سردہ کو تشدد کا نشانہ بنا کر ویرانے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ واپس اپنے جڑواؤں کے ہاں پہنچ جاتے ہیں۔ انہیں پتا لگتا ہے کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں اجالا اور اس کا عاشق شامل ہوئے ہیں۔ وہ چھپ کر ان کے پیچھے رہا ہوتا ہے۔ تاہم وہاں مارا ماری ہوتی ہے اور اجالا کا عاشق مارا جاتا ہے۔ پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ ان کے کزن انہیں اچھا سرے خفیہ جگہ پر پہنچا دیتے ہیں۔ وہ وہاں سے بحفاظت نکل جاتے ہیں۔ ادھر معاذ ایک مشن میں زخمی ہو جاتا ہے اور اسے ہندو سادھو کے کٹیا میں لے جاتا ہے۔ سونیا کے آدمی معاذ کو تلاش کرتے ہیں مگر ناکام ہو جاتے ہیں۔ ادھر عالم شاہ، سردہ خفیہ ذریعے سے ہارڈر کے ذریعے کوشش کرتے ہیں مگر وہ دھر لے جاتے ہیں اور "را" کی قید میں پہنچ جاتے ہیں۔ بشری باذل کے لئے کی کوشش میں خود نشانہ بن جاتی ہے۔ معاذ سادھو کی مدد سے ایک انڈین ہیروئن کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ وہیں اسے عالم اور سردہ کی گرہنی کا پتا چلتا ہے۔ معاذ ڈاکٹر فردوس سے ملتا ہے اور اسے سکل کی مدد کرنے کا کہتا ہے۔ علینہ اور وقاص وغیرہ کو لالہ عیسیٰ ملک سے باہر بھاڑ دیتا ہے۔ علینہ پاکستان میں ٹوبہ سے رہا ہوا ہے جو ان کے لیے مصیبت بن جاتا ہے۔ ٹوبہ پر حیزاب پھینک دیا جاتا ہے۔ وقاص، عینہ اور اس کے گمروالوں کو مار دیا جاتا ہے۔ معاذ کو دیوا

نامی شخص سے مدد لینے کا کہتی ہے۔ معاذ اپنے کزن کو پاکستان کال کرتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ اس کے گھر والوں کو مار دیا گیا ہے۔ وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کی ٹھان لیتا ہے۔ ادھر ڈاکٹر فردوس کو اس کے سرسرا لے کر لے کر بھگانے کی پاداش میں تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ معاذ، عالم اور سرد کی رہائی کے لیے کارروائی کرتا ہے اور انہیں ”را“ کی قید سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن عالم اور سرد کو بوا کے آدمی کسی دوسری جگہ پہنچا دیتے ہیں۔ سونیا معاذ کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ ادھر باذل ایک جگہ لالہ عیسیٰ کی موجودگی پر کارروائی کرتا ہے تاہم لالہ خود کو گولی مار کر ختم کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس کا انتقال ہو جاتا ہے۔ دیوا گینگ ڈاکٹر فردوس کی میت اٹھنے پر وہاں فائرنگ کر دیتے ہیں۔ پولیس دیوا کو گھیر لیتی ہے۔ معاذ دیوا اور اس کے آدمیوں کو نکالنے کے عوض عالم کا پتا معلوم کر لیتا ہے۔ سونیا اور معاذ حیدر آباد نواب بدر الدین کی حویلی پہنچ جاتے ہیں۔ وہ نواب صاحب کی حویلی میں عالم اور سرد کی رہائی کے لیے کارروائی کر کے انہیں رہا کر لیتے ہیں۔ وہ لوگ نئے ٹھکانے پر پہنچتے ہیں تو وہاں معاذ سے ملنے جا رو نامی شخص آتا ہے۔ اسے معاذ نے ”را“ کی قید سے نکالا ہوتا ہے۔ جارو اور معاذ، کل سمیت اسپتال جاتے ہیں اور پہچان لیے جانے پر پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ پولیس سے مقابلے کے بعد وہ ایک بستی میں پناہ کے لیے کھس جاتے ہیں۔ ادھر سونیا معاذ کی تلاش میں نکلتی ہے اور اسے بستی میں پہنچنے پر معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ معاذ اور جارو وغیرہ انوپ نامی شخص کے ساتھ اس کے مالک کے بنگلے میں قیام کرتے ہیں۔ سونیا بھی معلومات حاصل کرتی ہوئی مذکورہ بنگلے تک پہنچ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور سرد بھی سونیا کا پیچھا کرتے ہوئے وہیں پہنچ جاتے ہیں۔ ادھر لالہ، وقاص، علیہ و دیگر لوگ زندہ ہوتے ہیں۔ وقاص علیہ بدل کر گلو کا ہاڈی گاڑ دیتا ہے۔ وہ معاذ کو تلاش کرنے کے لیے انڈیا روانہ ہوتا ہے۔ وہاں اس کی گل خان سے ملاقات ہوتی ہے اور معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ سونیا، معاذ اور دیگر ساتھیوں سے مل جاتی ہے تاہم وہ جس بنگلے میں ہوتے ہیں وہ دشمن کا ہوتا ہے۔ دشمن سب کو بے ہوش کر کے کہیں لے جا رہے ہوتے ہیں کہ ان کی گاڑی کو حادثہ پیش آ جاتا ہے۔ ان سب کو چینی بھکشو طبی امداد دیتے ہیں اور ان سے پوچھ گچھ کی جاتی ہے۔ کل کی حالت تشویشناک ہوتی ہے اور اسے وہاں موجود ایک وید دیکھتا ہے۔ ادھر لالہ واپس اپنے لوگوں میں پہنچ کر ایکشن میں آ جاتا ہے۔ باذل، معاذ کا پیچھا کرتا ہے اور چینیوں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ معاذ چینیوں کے ساتھ مل کر دشمنوں کے خلاف کارروائی کرتا ہے۔ ادھر لالہ عیسیٰ، اعظم کو دشمن کی گرفت سے نکالنے کے لیے کارروائی کرواتا ہے اور موسیٰ اور نیلی، اعظم کو نکالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ موسیٰ اور نیلی کی گاڑی پر حملہ ہوتا ہے تاہم مارا ماری کے بعد وہ صداقت شاہ کے پاس پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اعظم کو وہاں سے نکال لیا جاتا ہے اور دوسری جگہ قتل کر دیا جاتا ہے۔ ادھر معاذ پیچک پہنچ جاتا ہے اور وہاں کے کرتا دھرتاؤں سے بات کر کے پاکستان پہنچنے کی اجازت چاہتا ہے۔ ادھر موسیٰ اور نیلی کو پولیس گھیر لیتی ہے اور قارئنگ میں موسیٰ مارا جاتا ہے۔ وہ اعظم کو لے جاتے ہیں اور نیلی زخمی حالت میں ان کے قبضے میں آ جاتی ہے۔ معاذ اور وی وغیرہ پاکستان پہنچ جاتے ہیں اور اعظم کی بازیابی کے لیے منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ ادھر باذل، لالہ کی قید سے بھاگ جاتا ہے۔ معاذ، ڈی ایس پی ظہیر کے بنگلے پر دھاوا بولتا ہے اور ڈی ایس پی کو قابو کرنے کے بعد اس سے معلومات لیتا ہے۔ وہ لوگ ظہیر خان کو لے کر وہاں سے نکل جاتے ہیں۔ باذل قید سے نکل سکے منظر کے پاس پہنچتا ہے اور اسے تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ نیلی قید میں موجود ظہیر کو ٹھکانے لگا دیتی ہے۔ بشری قبرستان جاتی ہے۔ وہاں اس کی دوست ملی ہے۔ سسرال ہسپتال کے ساتھ جاری ہوتی ہے کہ باذل کے آدمی اسے اغوا کر لیتے ہیں۔ ادھر معاذ سارے معاملوں کو جلد حل کرنے کے لیے دشمن کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے مگر اس کے خیر خواہ اسے میڈم ایکس کے ہتھکنے سے نکال لیتے ہیں اور اعظم کو بھی بازیاب کر لیتے ہیں۔ زن ہوا سے اپنے ساتھ لے جاتی ہے اور وہاں کرنل سکندر بخت سے ملاقات ہوتی ہے۔ معاذ انہیں دشمنوں کے خلاف کارروائی کرنے کا کہتا ہے۔ باذل، بشری کو لے کر انڈیا گراؤنڈ ہو جاتا ہے۔ ادھر وقاص باذل کا پتا چلانے کے لیے ایک کال گرل سیکی کے گھر کارروائی کر کے باذل کے ٹھکانے پر پہنچ جاتا ہے۔ وہاں وی کی ساتھی اور کوئی اور گروپ حملہ کر دیتے ہیں۔ وی زخمی ہو جاتا ہے۔ ادھر باذل، عرفان اللہ کو گولی مار دیتا ہے اور خود بھی شدید زخمی ہو جاتا ہے۔ باذل کے ساتھی اسے ایک اسپتال کے آگے چھوڑ دیتے ہیں۔ وہیں وی اور بشری بھی داخل ہوتے ہیں۔ معاذ باذل کو پہچان کر اسے بھی وہیں ایڈمٹ کرا دیتا ہے۔ عرفان اللہ جاں بحق ہو جاتا ہے۔ صداقت شاہ اور ان کی اہلیہ کل بھی پاس پہنچ جاتے ہیں۔ عالم، نیلی اور اعظم بھی وہیں ہوتے ہیں۔ کل اسپتال میں زیر علاج ہوتی ہے۔ باذل کو معذوری کی حالت میں ایک ایبلیٹریک دیا جاتا ہے۔ معاذ، وقاص کے ساتھ علیہ کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ اسے اگلے مشن پر جانا ہوتا ہے۔ سونیا قانون کی قید سے رہائی ملتی ہے۔ کل کی طبیعت کھل جاتی ہے۔ یو آن منگ، ایڈیٹر پو کے ذریعے کل کے آپریشن کی تجویز دیتا ہے۔ کل کا آپریشن کامیاب رہتا ہے۔ اس کا ایک ہاتھ اور نچلا دھڑناکھ ہو جاتا ہے۔ ادھر معاذ کشمیر پہنچ جاتا ہے۔ ایک کشمیری لڑکی کی مدد کرنے کی پاداش میں بھارتی سپاہی لہجہ کو کرنے بغاوت کی دکان پر ریڈ کر کے کھسکا تاہم پوچھ گچھ کے بعد اسے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ادھر کل کو خبر ملتی ہے کہ اس کی بہن کا پتہ کا لکھنؤ۔ وہ سب وطن واپس آ جاتے ہیں۔ عالم اور دیگر کو محفوظ مقام پر قتل کیا جا رہا ہوتا ہے کہ کچھ لوگ انہیں یہ غماں بنا لیتے ہیں، ادھر کل کو جانچنے کے لیے عظیم کے لوگ اسے مار چکے تھے تاہم وہ اس آزمائش میں پوری اترتی ہے۔ معاذ پری ویش کے اہل خانہ کے ساتھ لے کر جارو کے ساتھ منصوبہ بندی کرتا ہے اور وہ لوگ، کل کو گھیرنے کے لیے کھات لگا لیتے ہیں۔

اپنی تدابیرات ملاحظہ فرمائیے

جاء اور معاذ پری وٹ اور اس کے اہل خانہ کے قاتل مہندر کو... چھاپنے کے لیے ایک جگہ موجود تھے جادو کے ساتھی نے اطلاع دی تو وہ معاذ کو لے کر گئے بڑھا۔ ”آؤ۔“ وہ اسے لے کر سڑک کے مزید قریب ہو گیا لیکن تھے وہ اب بھی آڑ میں ہی۔ چند ثانیے مزید گزرے تو معاذ کو تاریکی اور سناٹے میں کسی جیب کے انجن کی مدھم سی آواز سنائی دی۔ جبار علی یقیناً اپنی غیر معمولی سماعت کے باعث یہ آواز پہلے ہی سن چکا ہوگا۔ سماعت سے بصارت کا سفر تیزی سے طے ہوا اور سڑک پر متحرک روشنی دکھائی دینے لگی۔ اس روشنی میں معاذ کو سڑک پر پڑے وہ بھاری پتھر دکھائی دیے جن کو ہٹائے بغیر وہاں سے گزرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ مہندر کی جیب کافی قریب پہنچ گئی تھی جب اس نے ان پتھروں کو دیکھا اور تیزی سے بریک لگا کر جیب روکی۔ جیب بس چند انچ کے فاصلے سے ہی رکی تھی۔ اگر اسے ذرا سی بھی مزید تاخیر ہو جاتی تو تصادم اور تصادم کے نتیجے میں خوفناک حادثہ لازمی تھا۔ مہندر کی پیشانی سے موسم ٹھنڈا ہونے کے باوجود پسینا پھوٹ پڑا اور غصے میں اس کے ہونٹوں سے چند بھاری بھر کم گالیاں برآمد ہوئیں۔ خوف اور طیش کی ان کیفیات سے گزر کر وہ اپنا اگلا لمحہ عمل طے کر پاتا، اس سے قبل ہی معاذ اور جبار علی اس کے سر پر پہنچ چکے تھے۔

”کون ہو تم اور تمہیں ہمت کیسے ہوئی ایک آرمی آفیسر کا راستہ روکنے کی؟“ وہ یقینی طور پر گھبرا چکا تھا لیکن اس افسرانہ اکڑ کا مظاہرہ کرنے سے باز نہیں آیا جو چھوٹے افسران میں ضرورت سے ذرا زیادہ ہی موجود ہوتی ہے۔

”ہمارا تعارف حاصل کرنے کے لیے تمہیں ہمارے ساتھ چلنا پڑے گا۔“ معاذ اور جبار علی اچھل کر اس کی جیب میں چڑھ گئے۔

”میں کیوں جاؤں گا تمہارے ساتھ؟ اترو میری جیب سے۔“ وہ اکڑ دکھانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔

”ہمارے ساتھ نہیں جاؤ گے تو سنسار چھوڑ کر نرک جانا پڑے گا۔ اب فیصلہ کر لو کہ کدھر جانا ہے۔“ معاذ جو اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا، راکفل کی نال اس کی گردن سے لگا کر خوفناک لہجے میں بولا۔

”لے..... لے..... لیکن.....“ وہ ہکلا یا۔

”کوئی لیکن ویکن نہیں۔ تمہارا انکار، تمہارے ساتھ ساتھ تمہارے گھر والوں کی زندگی بھی خطرے میں ڈال دے گا۔“

”کیا مطلب؟“ جبار علی کی دھمکی پر وہ اچھل پڑا۔

”مطلب یہ کہ اس وقت تمہارے بیوی بچے بلکہ تمہاری محبوبہ کا جل بھی ہمارے رحم و کرم پر ہیں۔ اب گاڑی اسٹارٹ کرو اور چپ چاپ ہم جہاں نہیں، وہاں چلو۔“

جبار علی کے سنگین لہجے کے ساتھ ساتھ اسے جیب کے سامنے سے پتھر ہٹاتے لوگوں نے بھی اس کی بات ماننے پر مجبور کیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اسے باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے گھیرا گیا ہے۔

”یہاں سے ٹرن لے کر واپس اوپر چلو۔“ مہندر سنگھ نے حسب حکم جیب اسٹارٹ کر کے آگے بڑھائی تو جبار علی نے نیا حکم صادر کیا۔ معاذ اس دوران گلو و کمپارٹمنٹ کی تلاشی لے کر اس کا پتلا اپنے قبضے میں لے چکا تھا۔ اسے وہاں بنت انگور سے بھری ایک چھٹی سی بوتل بھی ملی تھی۔

”آخر تم چاہتے کیا ہو؟“ مہندر اس کے حکم کی تعمیل تو کر رہا تھا لیکن ساتھ ساتھ اس پر جھنجلاہٹ بھی طاری تھی۔

”میرے ساتھ کچھ غلط کر کے تم بچ نہیں سکو گے۔ میں انڈین آرمی سے ہوں اور ہم اپنے ساتھیوں پر وار کرنے والوں کو کبھی شام نہیں کرتے۔“

”تمہاری بہادری، کمزور عورتوں اور سیدھے سادے شہریوں پر ہی کام کرتی ہے۔ ہم جیسوں کی تو دھول تک بھی نہیں پہنچ سکیں گے تمہارے بھائی بند۔“ جبار علی نے تڑپے اسے جواب دیا۔ معاذ نے بھی بے اختیار اس کا گز بڑھ کر راکفل کا دباؤ بڑھا دیا۔ پری وٹ اور اس کے خاندان کی دردناک موت کا دکھ قاتل کو سامنے پا کر مزید ناقابل برداشت ہو رہا تھا۔

”بائیں طرف سے اوپر لے لو۔“ خاصا فاصلہ طے کر چکنے کے بعد جبار علی نے اسے حکم دیا۔

”وہ کیوں؟“ سڑک سے ہٹنے کا حکم سن کر وہ بدھکا اور جیب روک لی۔

”کیوں کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہو تم۔ اپنی جان بچاؤ فکر کرو گے تو اپنے پیاروں کی جان کھو دو گے۔“ جبار علی اسے یاد دلایا کہ اس کے پیارے ان کے قبضے میں ہیں۔

”تم مجھے بھگ کر رہے ہو۔ میں ابھی تھوڑی دیر ہی گھر سے نکلا ہوں۔ کاجل سے بھی گھٹنا بھر پہلے آئی تھی۔ اتنی جلدی تم کیسے ان سب کو بندی بنا سکتے ہو؟“

نے اپنے شک کا اظہار کیا۔

”ہاتھ نکٹن کو آرسی کیا، ابھی صبح والی دلا دیتے ہیں۔“ جبار علی نے لفظ و شو اس پر بول دیا۔

طرف اشارہ کر کے پاٹ لہجے میں بولا۔ مہندر کو بھی گویا اشارے ہی کا انتظار تھا۔ اس نے جھپٹ کر بوتل اٹھائی اور ایک سانس میں ہی آدمی خالی کر دی۔ وہ یقیناً عادی شرابی رہا ہوگا جو ایک ساتھ اتنی پی کیا تھا۔

”اب بولو کیا چاہتے ہو؟“ شراب نے اسے سہارا دیا تھا اور اس بار قدرے سکون سے ان سے سوال کر رہا تھا۔ ”پری دس اور اس کے خاندان کی بربادی کا حساب۔“ اس بار معاذ نے اسے جواب دیا۔

”پری دس؟“ وہ چونکا۔ ”یہ وہی لڑکی ہے نا جس نے میرے بھائی نریندر کی جان لی تھی؟“

”اس نے نہیں، میں نے لی تھی اور اب میں تمہارے سامنے کھڑا ہوں تو جو بگاڑ سکتے ہو، میرا بگاڑ لو۔“

”تم..... تم نے قتل کیا تھا میرے بھائی کو..... لیکن کیوں؟ کیا بگاڑا تھا اس نے تمہارا؟“ مہندر نے اندھیرے کے باوجود اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی۔

”بگاڑا تو پری دس نے بھی اس کا کچھ نہیں تھا جو وہ اپنے آوارہ ساتھی کے ساتھ اسے اٹھا کر لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اسے اور اس جیسوں کو سبق دیا تھا کہ کشمیر کی بیٹیوں کی عزت اتنی قیمتی ہے کہ اس کی طرف ہاتھ بڑھانے کا ہرجانہ انہیں اپنے خون سے بھرنا پڑے گا۔“

”تو ہم نے بھی پھر بتا دیا کہ وردی والے کی جان کی قیمت کیا ہوتی ہے۔ حساب برابر ہو گیا۔“ شراب نے اس کا احتیاط ضرورت سے زیادہ ہی بحال کر دیا تھا جب ہی اس نے یوں آرام سے اپنے ہاتھ جھٹکے تھے جیسے وہ حمل بھاڑ رہا ہے۔

”حساب تو برابر ہو ہی نہیں سکتا، بس ہم کچھ نہ کچھ مددے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ روز حشر ان مظلوموں کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑے کہ ہم نے ان کے قاتل کو آزادی سے دینے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔“ مہندر دیکھ سکتا تو دیکھتا کہ معاذ کی آنکھوں میں رنج سے سرخی اترنے لگی ہے۔

”تو پھر ٹھیک ہے، کر دو مدد، مار دو مجھے گولی۔“ مہندر نے بہادر بننے کی کوشش کی۔

”اتنی زندگیوں کے بدلے میں تیری ایک جان، وہ بھی گولی کی آسان موت سے، بھلا ایسے مدد کیسے ہوگا؟“

”پھر..... پھر کیا چاہتے ہو تم؟“ مہندر کے لہجے سے خوف چھلکا۔

”ہم تیری پریمیکا اور بیوی بچوں کو ویڈیو کال پر لیتے ہیں۔ پکی گولی تیری پریمیکا کو ماریں گے، پھر تیری بیوی اور بچوں کو۔ وہ سب مدد کے لیے تجھے پکاریں گے، اپنی

کہا اور پھر اپنے موبائل پر کال ملانے لگا۔ کال اس نے اسپیکر پر ڈال رکھی تھی اس لیے کھنٹی بجنے اور پہلی ہی کھنٹی پر کال وصول کیے جانے کی آواز سب نے سنی۔

”ییس باس؟“ ”ذرا مہندر کی اس کی بیوی شالنی سے بات کر دو۔“ جبار علی نے حکم دیا۔

”اوکے باس!“ دوسری طرف سے مؤدبانہ جواب دیا گیا اور معمولی سے وقفے سے اسپیکر پر ایک عورت کی چیخ چلاتی آواز سنائی دی۔

”مہندر..... کہاں ہو تم مہندر؟ ان لوگوں نے بچوں کو ایک کمرے میں بند کر دیا ہے اور دھمکی دے رہے ہیں کہ اگر تم نے ان کے ساتھ کوآپریشن نہیں کیا تو وہ بچوں کو اور مجھے مار ڈالیں گے۔“ وہشت سے عورت کی آواز پھٹی جا رہی تھی اور ہچکیوں اور سسکیوں کے درمیان اس نے بہت مشکل سے اپنی بات مکمل کی تھی۔

”اپنے بچے کو بولو کہ تم سے اور بچوں سے اپنی محبت کا ثبوت دے اور شرافت سے وہ سب مان لے جو ہم اس سے کہہ رہے ہیں۔“ جبار علی، مہندر کو بات کرنے کا موقع دے بغیر عورت سے خود مخاطب ہوا۔

”بھگوان کے لیے ان کی بات مان لو مہندر! میرے بچوں کو کچھ ہوا تو میں مرجاؤں گی۔“ عورت کے رونے میں مزید شدت آگئی۔ وہ ہشت میں ڈوبی آواز میں کہے گئے اس کے الفاظ بھی ڈھنگ سے سمجھ نہیں آ رہے تھے۔

”تم چنانہ کرو شالنی اور خود کو اور بچوں کو سنبھالو۔ یہاں میں سب سنبھال لوں گا۔“ مہندر کے پسینے چھوٹ گئے تھے لیکن بیوی کے آگے اپنا بھرم قائم رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”اگر اب بھی تمہیں دشواں نہ ہوا ہو تو تمہاری معشوقہ کا جل سے بھی بات کر دواتا ہوں لیکن اس کا کچھ پتا نہیں کہ فری لے نہ لے۔ وہ کیا ہے نا کہ اس جیسی عورتوں کا کچھ بھروسہ نہیں ہوتا۔ اپنی چھتھر آنے والے ہر مرد کو گاہک سمجھ کر

لے لگتی ہیں۔“ جبار علی کمرے کے لہجے میں مہندر سے مخاطب ہوا۔ مہندر نے اس کی بات کا مکمل جواب دینے کے بجائے خاموشی سے دوبارہ جیب اسٹارٹ کر دی اور اس کی بتائی جگہ پر ہاتھ ڈالا۔ سڑک چھوڑ کر کپے کے راستے پر جا کر

خپ ہو گئے تھے لیکن مہندر اچھا ڈرائیور تھا اور آگے سب کو بلندی تک لے گیا تھا۔

”تمہاری سی پی لو، تمہارے زورس ریلیکس ہو جائیں گے۔“ کال زیادہ تر خاموش بیٹھا رہا تھا، چٹائی بوتل کی

زندگیوں کے لیے ہمارے آدمیوں کے سامنے گڑبڑائیں گے تو تجھے ان مظلوموں کی تکلیف کا احساس ہوگا جن پر تو نے ظلم کے پہاڑ توڑے تھے۔“ معاذ لہجے میں سفاکی بھرے اسے اپنے پورے منصوبے سے آگاہ کر رہا تھا۔

”تم..... تم لوگ ایسا نہیں کر سکتے۔“ مہندر نے خوف سے خشک ہو جانے والے گلے کو تر کرنے کے لیے تھوک نکالا۔

”ہم ایسا ہی کریں گے بلکہ یہ سب کرنے کے بعد دونوں گھروں میں آگ بھی لگا دیں گے، بالکل اسی طرح جیسے تو نے حاجی شیر خان کے گھر اور کبیر کے باغ میں لگوائی تھی۔“ چارو نے اسے یقین دہانی کروائی۔

”نہیں، بھگوان کے لیے نہیں۔ وہ سب زدویش ہیں۔ تم میرے پاؤں کی سزا ان معصوموں کو نہیں دے سکتے۔“ مہندر کی برداشت جواب دے گئی۔

”جنہیں تم نے مارا، وہ سب بھی مظلوم اور معصوم تھے۔ یہاں تک کہ ان کے خاندان کے کسی شخص نے تمہیں یا تمہارے خاندان کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائی تھی۔ جب تم ان پر ظلم کر سکتے ہو تو ہم ان کا بدلہ لینے کے لیے بقول تمہارے، تمہارے معصوم خاندان کو نشانہ کیوں نہیں بنا سکتے۔ تم انہیں اپنے سامنے تڑپ تڑپ کر مرتا دیکھو گے تو تب ہی تو اس تکلیف کو محسوس کرو گے جس سے اسپتال میں پڑا وہ معصوم بچہ گزر رہا ہے جسے پروان چڑھنے کے لیے ابھی اپنے باپ کے سائے اور ماں کی محبت کی ضرورت تھی۔ ذرا سوچو کہ وہ کس اذیت میں ہے کہ دوا کے بغیر سوئیں سکا اور جب ہوش میں آجائے تو اپنے خاندان کی موت کے دردناک مناظر اسے ہوش و حواس سے بیگانہ کر کے چیخنے چلانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ تم نے تو جرم کیا ہے لیکن بتاؤ اس معصوم نے کس گناہ کی سزا پائی؟ اس کا جرم صرف یہی ہے تاکہ وہ ایک کشمیری ہے اور تم کشمیریوں کے خون سے ہولی کھیلنا اپنا حق سمجھتے ہو۔“ جبار علی کے آنکھ دیتے لہجے میں وہ ساری تکلیف موجود تھی جو وہ بچپن سے لے کر اب تک دیکھے جانے والے مظالم کے نتیجے میں اپنے اندر جمع کرتا رہا تھا۔

”خدا خالم کی رسی ایک حد تک دراز کرتا ہے، سمجھو آج تمہاری رسی کھینچے جانے کا وقت آگیا ہے۔“ معاذ نے جبار علی کی بات آگے بڑھائی۔

”نہیں، بھگوان کے لیے نہیں۔ تم میرے گلوے گلوے کر دو لیکن میرے پر یوار کو چھوڑ دو۔“ وہ گڑبڑا نے لگا کہ جائے فرار تو کوئی بھی نہیں۔

”ایک شرط پر۔“

”کیسی شرط؟ تم مال دولت، روپیہ پیسا جو کھو گے میں تمہیں سب دوں گا، بس تم میرے پر یوار کو چھوڑ دو۔“ معاذ کے الفاظ نے اس کے اندر امید جگا کر لہجے میں جوش بھرا۔

”روپیہ پیسا.....!“ جبار علی طنزیہ ہنسا۔

”تمہاری سرکار تمہیں اتنی بیکار تو نہیں دیتی کہ اس سے تم جیسا چھوٹا افسر روپیہ پیسا اور مال و دولت جمع کر سکتے۔ تم نے جو کچھ مال پائی بنایا ہے، وہ ہم کشمیریوں کی یوٹیاں نوج کر ہی بنایا ہے اور اب ہمیں اسی سے ہمارے خون کی قیمت ادا کر۔ نہ چلے ہو۔“ بولتے بولتے اس کے لہجے میں قہر اترنے لگا۔

”پھر کیا چاہتے ہو تم؟“ مہندر نے بے بسی سے پوچھا۔

”خودکشی۔“

”خودکشی..... مطلب؟“ مہندر، معاذ کے سپاٹ لہجے میں کیے گئے مطالبے پر حیران ہوا۔

”خودکشی مطلب آتما تھتھا..... تم اس پہاڑی سے اپنی جیب نیچے گرا کر خود اپنی جان لو گے۔“

”مگ..... مگ..... مگر ایسے کیسے ہو سکتا ہے؟“ مہندر ہکلا یا۔

”بالکل ویسے ہی جیسے پری دیش نے کبیر کے باغ میں تم جیسے بھیڑیوں سے بچنے کے لیے کونکس میں کلو کر اپنی جان لی تھی۔ سوچو کیا گزری ہوگی اس اٹھارہ انیس سال کا، لاکی پریوں اپنی جان لیتے ہوئے۔ ابھی تو اسے بہت جینا تھا، ڈاکٹر بننے کے خواب دیکھا کرتی تھی وہ اور.....“ معاذ کا گلارندہ ہنسنے لگا۔

”تم نے..... تم نے صرف اور صرف اپنے بدکردار بھائی کا انتقام لینے کے لیے اس چراغ کو بجھنے پر مجبور کر دیا تھا مگر جلتا رہتا تو بہت سے۔۔۔۔۔ لوگوں کی زندگیوں میں روشنی بکھر جاتی۔ وہ اپنے لوگوں کی خدمت کرتی، دھکی انسانیت کے کام آتی لیکن تم نے..... تم نے سب ختم کر ڈالا۔ اب اس میں چاہتا ہوں کہ تم بھی اپنے ہاتھوں سے اپنی جان لیتے ہوئے چھہل کے لیے اسی اذیت سے گزر دو جس سے پری دیش گزری ہوگی۔“ وہ اس وقت خاصا جذباتی ہو رہا تھا۔

”تمہاری زندگی میں بھی تو بہت سے خواب ہوئے۔ تم بھی خواہش کرتے ہو گے کہ ایک دن جیو۔ تمہارے کندھے سے کندھا ملا کر آری یونہی فارم لکھ کر نظروں کے سامنے ہو۔ تمہاری بیٹی سرخ جوٹھ لکھ کر سے وداع ہو تو تم اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے جی کے لیے شہد کا منادوں کے ساتھ اپنا آئینہ وادہ کر دے تو

کمل کی بی تھی کہ جیب کا انجن اسٹارٹ ہوا اور جیب ایک جھٹکے سے آگے بڑھی۔

”کود جاؤ۔“ جبار علی زور سے چلایا اور خود چلتی جیب سے چھلانگ لگا دی۔ معاذ نے بھی تاخیر نہیں کی لیکن جیب جس رفتار سے آگے بڑھی تھی، اس میں چھلانگ لگانا ایک خطرناک عمل تھا۔ اس کا جسم جیب سے اچھل کر لگنے کے بعد جیسے ہی زمین سے ٹکرایا، اچھی خاصی زوردار چوٹ لگی اور جسم ڈھلان پر دوڑنے لگا چلا گیا۔ اس سب کے باوجود اس نے ہاتھ سے رائفل گرنے نہیں دی تھی۔

”تم ٹھیک ہو؟“ جبار علی بھاگتا ہوا اس کے پاس آیا۔ وہاں اچھا خاصا اندھیرا تھا لیکن جبار علی عرف جبارو کی غیر معمولی سماعت نے اس کی راہنمائی کی تھی۔

”ہاں، میں ٹھیک ہوں۔ آؤ اس خبیث کا انجام دیکھتے ہیں۔“ وہ ہاتھ بڑھاڑتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ پیر میں لگنے والی چوٹ نے اس کی چال میں ہلکی سی ٹکڑا ہٹ پیدا کر دی تھی لیکن وہ کسی قسم کی تکلیف کا اظہار کیے بغیر جبارو کے ساتھ اوپر کی سمت بڑھتا جا رہا تھا۔ آخر کار وہ اس مقام پر پہنچ گئے جہاں سے جیب نیچے گئی تھی۔

”خس کم جہاں پاک۔“ جبار علی نے نیچے بہت گہرائی میں پڑی چلتی جیب کو دیکھ کر تبصرہ کیا۔

”مردود مرتے مرتے ہمیں بھی ساتھ لے کر مرنا چاہتا تھا۔“ معاذ نے اپنے پاس موجود مہندر کا بطل گہرائیوں کے حوالے کیا۔

”جن کی فطرت میں ہی خباثت اور چالبازی ہو، وہ آخری سانس تک اس سے کام لینے کی کوشش کرتے ہیں۔“ جبارو نے نفرت سے تبصرہ کیا۔

”ہاں، لیکن یہاں تو چوروں کو مور پڑنے والی بات ہوگئی۔ تمہارے اس بمک نے بڑا کمال دکھایا۔ عورت کی آواز کی اتنی زبردست نقالی کی کہ مہندر کو خشک ہی نہیں ہوا کہ دوسری طرف اس کی بیوی نہیں ہے۔“ اس نے ہنس کر جبارو کے سامنے کی کارکردگی کو سراہا۔

”وہ پینک تھا، آواز کی تھوڑی بہت جھولی محسوس ہوئی بھی ہوگی تو بیوی کے دہشت زدہ ہونے کے خیال سے اس نے ٹوٹ نہیں کی ہوگی۔ ہم نے انسانی نفسیات کے ان پھلوؤں کو سامنے رکھ کر ہی یہ ساری پلاننگ کی تھی ورنہ ہمارے پاس تو اس کی بیوی یا محبوبہ میں سے کسی کی آواز کا نمونہ بھی موجود نہیں تھا۔“ وہ بلندی سے دائیں نیچے کی طرف جاتے ہوئے آپس میں یہ گفتگو کر رہے تھے۔

اس کی ارٹھی کو اپنے ہاتھ سے اگنی دو، ماں کو گنگا اشان کے لیے لے جاؤ۔۔۔۔۔ بولو ہے نا تمہارے یہ سارے خواب۔۔۔۔۔؟“ وہ جذبات میں مہندر پر زور سے چیخا۔

”ہاں، میں۔۔۔۔۔ یہ سارے سچے میرے من میں ہیں۔“ مہندر کی آواز بہت ہلکی تھی لیکن محسوس کیا جاسکتا تھا کہ اب وہ رو رہا ہے۔

”بس تو اپنے ان سارے خوابوں سمیت موت کو گلے لگا لو جیسے بریوش لگانے پر مجبور ہوگئی تھی۔“

”اگر میں تمہاری بات نہ مانوں تو؟“

”تو مرنا تمہیں پھر بھی پڑے گا لیکن اپنے ہر پیارے کی خون میں ڈوبی ہوئی لاش دیکھ کر۔ یہ فیصلہ تمہیں کرنا ہے کہ صرف تم۔۔۔۔۔ یا پھر تمہارے سمیت تمہارے سارے اپنے۔“ معاذ کے سہجے میں اس کے لیے کہیں کوئی نرمی نہیں تھی۔

”یہ سب کس کے تم بچے کے نہیں۔ دونوں صورتوں میں اعلیٰ پیمانے پر انویسٹی لیٹن ہوگی اور سارا کچا چٹھا کھل جائے گا۔“ وہ خود ڈر چکا تھا، اس کے باوجود انہیں دھمکانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”وہ سب ہمارے مسئلے ہیں۔ اپنے مسئلوں کو ہم خود دیکھ لیں گے۔ تم بس اپنا فیصلہ سناؤ۔“

”کیا کروں میں بھگوان؟ یہ کس مشکل میں ڈال دیا ہے تو نے مجھے۔“ معاذ کے اٹل لہجے نے مہندر کو سر کے بال لوج لینے پر مجبور کر دیا۔

”کال لگاؤ جبارو یہ شخص اپنی آنکھوں سے اپنے پیادوں کی لاشیں گرتے دیکھنے کا خواہشمند ہے۔“ معاذ نے سرد اور سپاٹ لہجے میں جبار علی کو مخاطب کیا۔ اس وقت اس کے دل پر اتنی سخت طاری تھی کہ مہندر سنگھ کا رونا ترہنا اسے موم نہیں کر رہا تھا۔ اسے بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے پریوش کی روح اپنے ساتھ ہونے والے انصاف کا منظر دیکھنے اس کے پہلو میں کہیں تک کھڑی ہوئی ہے اور اگر وہ مہندر پر ذرا سا بھی رحم کھائے گا تو وہ دھمی روح مزید دھمی ہو جائے گی۔

”اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ تم میرے بعد میرے پیادوں کے ساتھ کچھ بڑا نہیں کرو گے؟“

”گارنٹی کے نیچے یہی کافی ہے کہ ہم تمہارے جیسے بدخلست نہیں ہیں۔“ اس بار جواب جبار علی نے دیا اور پھر اسے ٹھوکا دیتے ہوئے بولا۔

”بس اب عمل کر گزرو ورنہ ہم حرکت میں آجائیں گے اور پھر کچھ بھی رک نہیں سکے گا۔“ ابھی اس نے اپنی بات

”اتنے مختصر وقت میں اس سے عمدہ پلاننگ ہو بھی نہیں سکتی تھی۔“ اس نے جارو کی کارکردگی کو سراہا۔

”ہم اس سب کے عادی ہیں یارا“ جارو ہنسا۔ وہ مہندر کو انجام تک پہنچا کر خوش تھا۔ باتوں باتوں میں وہ اس مقام تک پہنچ گئے جہاں ان کا ساتھی جیب سمیت ان کا خطر تھا۔

”مشن مکمل۔ سب اپنے اپنے محفوظ ٹھکانے پر لوٹ جاؤ۔“ جبار علی نے اپنے ان مددگاروں کو پیغام دیا جو یقیناً کسی گڑبڑ کی صورت میں ان کی مدد کے لیے ارد گرد ہی چھپے ہوئے تھے۔

”شکریہ دوست! مجھے معلوم ہے کہ اس مشن کو مکمل کرنے کے لیے تمہیں میری مدد کی ضرورت نہیں تھی لیکن تم نے اس میں مجھے شامل کر کے مجھے میرے دل پر پڑا بوجھ اتارنے میں بہت مدد دی۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ آج پری وشن مجھ سے خوش ہوگی۔“ جو کچھ ہوا تھا اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا لیکن اپنی حساسیت کے باعث وہ ہمیشہ شرمندہ رہا تھا۔

”مین آئیڈیا تو تمہارا ہی تھا۔ مہندر کی موت کو حادثے کا روپ دینے سے ہماری بچت ہو جائے گی۔ اگر ہم ڈائریکٹ ایکشن لیتے تو پھر اس کا خمیازہ بھی بے قصور شہریوں کو بھگتنا پڑتا۔ اب اس کے مددے میں موجود اہل مکمل کی مقدار اس شک کو قوی کر دے گی کہ وہ نشے میں بہک کر حادثے کا شکار ہوا ہے۔“ جارو نے بھی اسے سراہنے میں کنجوسی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ویسے وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ آئیڈیا معاذ کا ہی تھا جس کی لوک پلک اس نے اپنی ٹیم کے ساتھ مل کر سنواری تھی۔

”اللہ حافظ! موقع ملا تو دوبارہ ملیں گے۔“ صبح کے ۵:۲۰ قریب تھے جب جیب اسی مقام پر واپس آ کر رکی جہاں سے انہوں نے اسے لیا تھا۔

”موقع تو نکالنا پڑے گا۔ تمہارے اسٹائیز کو ہیروٹ ایم 107 چلانے کی مشق بھی تو کروانی ہے۔“

”ہاں، وہ تو ہے۔ دیکھو کیا صورت نکلتی ہے۔“ جبار علی تذبذب میں تھا کہ اسے کسی مشکل میں ڈالے بھی یا نہیں۔

”مت الجھو، اللہ خود راستے نکالے گا۔“ معاذ نے اسے تسلی دی اور اس کا شانہ چیتھا کر جیب سے اتر گیا۔ پہلو سے گھوم کر اسپتال کے مرکزی دروازے تک پہنچے تک اس نے اپنی چال کی ٹیکڑا ہٹ کو خاصا قابو کر لیا تھا۔ رات بھر کی ڈیوٹی سے تھکے گاڑی نے منہ اندھیرے چائے کے برتن لینے آنے کا سن کر منہ تو بنایا لیکن اسے روکا نہیں۔ کمرے میں

جبار علی کا بھیجا بندہ اس کا منتظر تھا اور لیپ ٹاپ بھی آن تھا۔ کسی وجہ سے مہندر کی موت کی گفتیش کرنے والے اس تک پہنچ بھی جاتے تو بنجاسن گواہی دیتا کہ وہ رات بھر آن لائن رہا تھا اور اسپتال کے کمرے سے دفتری کام نمٹاتا رہا تھا۔

☆☆☆

”کون ہو تم اور ہمیں اس طرح اغوا کر کے یہاں لانے کا کیا مقصد ہے؟“ عالم شاہ نے اپنے سامنے موجود بدمعے نقوش اور پختہ رنگت والے شخص کو گھورتے ہوئے سخت لہجے میں پوچھا۔ اسے وہ شخص پہلی نظر میں ہی اچھا نہیں لگا تھا۔ بدصورتی کا مسئلہ نہیں تھا کہ شکل و صورت خدا کی دین تھی لیکن اس شخص کا حلیہ بھی طبیعت پر ناگوار گزرنے والا تھا۔ اس نے نہایت بوسیدہ اور میلا لباس پہنا ہوا تھا اور سر کے میلے لمبے بال جٹاؤں کی شکل میں لنگ رہے تھے۔ شاید وہ کئی ہفتوں سے نہیں نہایا تھا جو اس کے وجود سے اٹھتا بسا ندفاصلے سے بھی طبیعت کو متلازعہی تھی۔

”انٹرسٹنگ کونین۔“ اس نے اپنے آدمی کے ہاتھ سے جلتا ہوا سگریٹ لے کر بڑے اسٹائل سے ایک کش لیا اور طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ یو بتا رہی تھی کہ وہ جو سگریٹ پی رہا ہے وہ سادہ نہیں ہے بلکہ اس میں چرس بھری ہوئی ہے۔ اصل میں وہ پورا ماحول ہی بہت گندا اور بدبودار تھا۔ اس بدبودار شخص سے ملاقات سے قبل انہوں نے قید میں جو وقت گزارا تھا وہ بھی سخت ہیزار کن تھا۔ نیکی چھت اور ادھر دے پلستر والے کاٹھ کہاڑ سے بھرے اس بند اور جس زدہ کرنے میں جانے کہاں سے وہ بدبو کی لپٹیں آتی تھیں جو سانسوں کے ساتھ بدن میں سرایت کر کے معدے میں عجیب سا بھونچال پیدا کر دیتی تھیں۔ کتنی ہی بار وہ الٹی کرنے سے رہ گیا۔ یہاں تک کہ باڈل کی قید میں گزارا وہ وقت بگا یاد آنے لگا جو انہوں نے پڑدانی پاؤسنگ سوسائٹی کے ایک دہ خانے میں گزارا تھا۔ گند کی، تار کی اور گھٹن کی وہ اذیت آج بھی انہیں یاد تھی۔ بگڑی ہوئی لفٹیں والا باڈل انسانوں کو انسان کے درجے سے گرا کر ان کی حالت سے لطف کشید کرنے کا مادی تھا اور گلتا تھا اب پھر اس کے کمر بھائی بند سے واسطہ پڑ گیا تھا۔

”اپن جابی ہے اور یوں سمجھو کہ اپنے ہاتھ میں سنا کے راستوں کی چابی۔ مال، بندہ، انفارمیشن سب اپن کا ایک اشارے پر ”شوں“ کر کے سمندر کے اس طرف گھا جاتا ہے۔“ اس نے ہاتھ جو جہاز کا اشارہ دیا۔

”مطلب اسمگلر ہو، لیکن کسی اسمگلر سے ہمارا

واسطے؟“ عالم شاہ نے اطمینان سے نتیجہ اخذ کیا۔ سرمد حسب عادت اس کے ساتھ موجود ہونے کے باوجود خاموش تھا۔
 ”واسطے بھی پتا چل جائے گا جب تم ادھر سے ادھر اسمگل ہوگا۔“ وہ خباثت سے مسکرایا۔
 ”کدھر؟ تم ہمیں کہاں اسمگل کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟“ عالم شاہ بری طرح چونک گیا۔ سرمد کے چہرے پر بھی اضطراب پھیلا۔

”وہیں، جدھر سے تم رستے تزا کر بھاگ نکلے تھے۔ تم کیا سمجھتے ہو، ہماری سرکار کسی پاکستانی جاسوس کو اتنی آسانی سے ہاتھ سے نکلنے دے گی؟“ جامی نے صورت حال سے لطف اٹھایا۔

”ہم جاسوس نہیں ہیں۔ ہمیں پھنسا یا گیا تھا۔“
 ”یہ ثابت کرنا ہماری سرکار کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ بس اس بار پھندا ذرا ٹائٹ لگائیں گے تاکہ تم نکل کر بھاگ نہ سکو۔“ جامی کا اطمینان قابل دید تھا۔ عالم شاہ نے اپنے وجود میں خوف کی ایک لہری دوڑتی محسوس کی۔ سچ یہی تھا کہ اب وہ دوبارہ اس گورکھ دھندے میں نہیں پھنسا چاہتا تھا۔
 ”یہ نہیں ہو سکتا۔ تم ہمارے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے۔“ وہ بڑبڑانے کے انداز میں بولا۔

”کیوں نہیں کر سکتا۔ اپن سب کر سکتا ہے۔ ابھی ٹھوڑے دن پہلے ہی تو اسونیا میڈم کو ادھر سے ادھر پہنچایا ہے۔“ اس کا انکشاف چونکا دینے والا تھا۔ عالم کو حاصل شدہ معلومات کے مطابق تو وہ چینیوں کی قید میں تھی۔

”تم جھوٹ بول رہے ہو۔ اگر سونیا بھارتیوں کے ہاتھ لگ گئی ہوتی تو وہ ساری دنیا میں شور مچا دیتے کہ دیکھو یہ ہے پاکستانی جاسوسوں کی ساتھی اور اب اس سے ہم اس کے باقی ساتھیوں کا پتا اگلا میں گے۔“

”ہا ہا ہا.....“ جامی گلا بھاڑ کر ہنسا۔ ”تم کو کچھ خبر ہی نہیں ہے جو تیلے بادشاہ اسامی وہ تمہاری نہیں بلکہ ان کی ہے جنہوں نے بکھن کے تیل کی طرح اسے تمہارے اداروں کی قید سے نکال کر اپنی پٹا میں لے لیا ہے۔ ہو سکتا ہے اب تک وہ اپنے دیش کی اور اڑ چکی ہو۔“ جامی کے انکشافات اس کے لیے حیران کن ہی تھیں، ناقابل فہم بھی تھے۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کب سونیا چین سے پاکستان پہنچی اور پھر یہاں سے تجارت اسمگل کر دی گئی۔

”دشواس نہیں ہوتا ہے نا، پر ہو جائے گا۔ اس سے ہو جائے گا جب تم اور تمہارا یہ سامی خود دوسری طرف اسمگل ہوئے“ جامی نے اس کی بے بسی کو بھانپ لیا۔

”ادھر تم ملنا سونیا میڈم سے۔ مل کر تمہیں پتا چلے گا کہ را اور موساد کا یا رانہ کتنا پکا ہے اور دونوں کیسے سے پر ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔“ وہ ان کی پریشانی سے بہت خوش تھا۔ کچھ سرور چرس نے بھی چڑھایا تھا اس لیے بڑھ چڑھ کر خود ہی بتاتا چلا جا رہا تھا۔

”را کو تم چاہیے ہو اور موساد کو تم سے معاذ کا پتا۔ اب تم ادھر سے ادھر پھنچو گے تو دونوں کا ہی بھلا ہو جائے گا۔“
 ”کیوں، سونیا نے معاذ کے بارے میں کوئی انفارمیشن نہیں دی؟“ وہ چونکا۔

”کہاں سے دیتی؟ وہ پہلے چینیوں پھر پاکستانیوں کی قید میں تھی۔ اسے کس نے بتانا تھا کہ معاذ کدھر ہے اور کس چکر میں ہے۔“ کہنے کو وہ اسمگلر تھا لیکن اس کے پاس معلومات اچھی خاصی تھی۔

”معلوم تو مجھے بھی کچھ نہیں ہے۔“ وہ بے خیالی میں بولا۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ وہ سب کی بیماری کے معاملات میں الجھا رہا تھا اور معاذ کے معاملات سے کافی حد تک الگ ہو گیا تھا۔ کچھ دوسری طرف سے بھی پردہ داری کی گئی تھی۔

”کوئی کتنا ہی نہیں نہیں کرے، انہیں بندے کے اندر سے سب اگلوانا آتا ہے۔ نکالنے کو اپن بھی تیرے اندر سے سارا سچ نکلوالے پر اپن کو یہ ڈیوٹی ملی نہیں اور جامی ڈیوٹی سے بڑھ کر کام کرنے کو خواہ مخواہ کا پنکا سمجھتا ہے۔ اس لیے ابھی اپنے اس پٹھو کے ساتھ مل کر انتظار کر۔ جلد تم دونوں کی روانگی ہے۔“ اس نے انہیں اطلاع دی اور ختم ہو جانے والا سگریٹ فرش پر پھینک کر جوتے سے سلطے ہوئے اپنے آدمی سے مخاطب ہو کر بولا۔

”لے جا کر بند کر دے انہیں اور ہاں، ان کے لیے کپڑوں کا بندوبست کر دینا۔ ایسے ننگے بچوں کو تو نہ بٹھائے گا اپن اپنی بوٹ میں۔“ وہ اپنی بات سے خود ہی لطف لے کر زور سے ہنسا۔ احساس ذلت سے عالم شاہ کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ انہیں اغوا کر کے یہاں لاتے وقت زیر جا۔ م کے سوا ان کے سارے کپڑے اتر والے گئے تھے۔ یہاں تک کہ پیروں میں جوتے بھی نہیں تھے اور اب یہ گندافض ان کا مذاق اڑا رہا تھا لیکن برداشت کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا کہ اول تو بندھے ہوئے ہاتھ پیروں کے ساتھ کچھ کیا نہیں جاسکتا تھا، دوم اس سے الجھنے سے کچھ حاصل بھی نہیں ہونے والا تھا۔ انہیں جو کچھ کرنا تھا، دماغ کو ٹھنڈا رکھ کر بہت سوچ سمجھ کر کرنا تھا۔

☆☆☆

دلچسپی کا سوال کیا۔

”جرمنی..... ہم جرمنی گئے تھے۔ سون کی خواہش تھی کہ وہ اپنے اجداد کے اس ساتھ ملک کو دیکھے جہاں ایڈولف ہٹلر نے انہیں اس عبرتناک ظلم کا نشانہ بنایا تھا جس کا زخم وہ آج تک نہیں بھول سکے۔“

”بہت خوب! تو پھر کیسا پایا آپ نے جرمنی کو؟“
 ”ویسا ہی جیسے آج کی دنیا کے سارے ترقی یافتہ ممالک ہیں۔ ایسی جگہوں پر سیاح کی آنکھوں کو تراوٹ دینے کے لیے اتنے خوبصورت مناظر اور تفریح کے اتنے مواقع ہوتے ہیں کہ دل و جگر کو پیٹنے کی فرصت بالکل نہیں ملتی۔ ہم بھی جرمنی کا ٹرپ انجوائے کر کے ہنسی خوشی واپس آ گئے ہیں۔“ ڈاکٹر لیف نے اسی سادگی سے جواب دیا جو اس کی شخصیت کا ایک لازمی حصہ تھی۔

”انسان کی نیت ہونا بھی شرط ہے صاحبزادے! تمہیں شروع سے یہ جاننے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ ہولوکاسٹ میں یہودیوں کے ساتھ کیا ہوتا۔“ ایڈمنڈ نے اسے چھیڑا۔

”یقیناً یہی سچ ہے۔ ہم سفاردی یہود ظلم کی اس داستان سے جو ہم نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھی، دیکھا دلچسپی نہیں رکھتے جیسی تشویش ہمیں یون صدی سے زائد عرصے سے اس خطے میں جاری اس ظلم و ستم پر ہے جو ہمارے اجداد اور ہم اپنی آنکھوں سے مسلسل دیکھ رہے ہیں۔“ لیف کے الفاظ ان کے لیے دلچسپ تھے۔ سفاردی ہی تھی، وہ ایک یہودی تھا لیکن جس طرح بنا کسی لاگ لپیٹ کے وہ وہاں جاری بربریت کو تنقید کا نشانہ بنا رہا تھا، تسلیم کہ جاسکتا تھا کہ اس کے اندر کا انسان زندہ ہے۔

”یہاں جو کچھ ہوتا رہا ہے اور اب بھی ہو رہا ہے ہمیں بھی اس پر افسوس بلکہ شرمندگی ہے۔ تم یوں ہمیں ہمارے اٹکے نازی ہونے کا طعنہ نہیں دے سکتے ڈارلنگ!“ سون نے فوراً شوہر کے سامنے احتجاج کیا۔

(فرانس، ہالینڈ، بیلجیم، جرمنی اور پولینڈ وغیرہ سے آکر آباد ہونے والے یہودیوں کو اٹکے نازی کہا جاتا ہے۔ گوری رنگت والے یہ یہود اپنی نسلی برتری کے حوالے سے عموماً بہت تکبر ہوتے ہیں اور اسلئے اور پر نکال سے نکالے گئے یہود کے علاوہ بھی ہر اس یہودی کے لیے سفاردی کا لفظ استعمال کرتے ہیں جو اٹکے نازی نہ ہو۔)

”بالکل نہیں۔ میں تمہیں ایسا طعنہ دینے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ میری اور تمہاری کیمسٹری ایک ہے اور میں جانم

”ہیلو۔“ شہر یار اور ماہ بانو باہر جانے کے ارادے سے اپنے کمرے سے باہر آئے تھے لیکن ایڈمنڈ کے ساتھ لاؤنج میں موجود اجنبی چہروں کو دیکھ کر ٹھٹھک گئے۔

”اوہ پلیز! آئیے مسٹر ایڈمنڈ مسز مراد! آج میں آپ کو اس دنیا کی سب سے پیاری لڑکی سے ملواتا ہوں۔“ ایڈمنڈ کی آواز میں خوشی کی چکار تھی اور اس نے بہت محبت سے اپنے برابر بیٹھی ہوئی لڑکی کی طرف دیکھا تھا۔

”اوہ ڈیڈ! آپ بھی بس جد کر دیتے ہیں۔ میں نے کوئی مس ورلڈ کا ٹائٹل جیت رکھا ہے جو آپ مجھے دنیا کی سب سے خوبصورت لڑکی قرار دے رہے ہیں۔“ اجلی سفید رنگت پر نمایاں ہوتی نیلی آنکھوں اور سنہری زلفوں والی حسینہ نے لاڈ سے اپنا سر ایڈمنڈ کے شانے پر ٹکا دیا۔

”مس ورلڈ میری بیٹی کے آگے پانی بھرتی ہے۔“ ایڈمنڈ بے ساختگی سے بولا پھر باقاعدہ تعارف کروانے لگا۔

”یہ میری بیٹی سون ہے، ڈاکٹر سون اور ساتھ اس کا شوہر ڈاکٹر لیف الفرائیم ہے۔ یہ دونوں چھٹیاں گزارنے ملک سے باہر گئے ہوئے تھے اور کل رات ہی واپس آئے ہیں۔“

”آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔“ شہر یار اور ماہ بانو گر بخوشی سے ان دونوں سے ملنے لگے۔ دونوں نے ہی یہ بات نوٹ کی تھی کہ سون کا شوہر اس کی نسبت بالکل مختلف شخصیت کا مالک تھا۔ ڈاکٹر لیف گندی رنگت اور سیاہ بالوں والا ایک اوسط شخصیت کا مالک شخص تھا اور سون اس کے سامنے کچھ زیادہ ہی جگمگاتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

”یہ مسز مراد اور ان کی سز تانیہ ہیں۔ میرے دور طالب علمی کے بہت ہی اچھے دوست سائنس نے مجھے ان سے متعارف کروایا ہے۔ یہ لوگ اسرائیل گھومنے آئے ہیں اور آقا زیدو ظلم سے کیا ہے۔“ اب وہ بیٹی اور داماد سے شہر یار اور ماہ بانو کا تعارف کروا رہا تھا۔

”آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی مسٹر ایڈمنڈ مسز مراد! مجھے اور سون کو دنیا دیکھنے کا بہت شوق ہے اس لیے ہم ان لوگوں کو بہت پسند کرتے ہیں جو ایک مخصوص دائرے میں مسلسل گھومتے رہنے کے بجائے اپنے لیے کچھ وقت نکالتے ہیں اور وہ کرنے نکل کھڑے ہوتے ہیں جو انہیں پسند ہو۔ جو ان کے دل اور روح کو خوش کر دے۔“ لیف کا لہجہ سادہ اور پُر خلوص تھا۔

”تو پھر آپ اپنے دل اور روح کو خوش کرنے کہاں کی عیادت کے لیے گئے تھے؟“ شہر یار نے جو ماہ بانو کے ساتھ ان کے مقابل ایک صوفے پر بیٹھ چکا تھا، اس کی

ہوں کہ تم بھی چیزوں اور محاطات کو اسی زاویے سے دیکھتی ہو جس زاویے سے میں دیکھتا ہوں۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو ہم ایک دوسرے کے لائف پارٹنر کیسے ہو سکتے تھے۔“ لیف نے فوراً ہی وضاحت پیش کی لیکن سون اب کسی اور موڈ میں آچکی تھی۔ اس لیے اس کی دلیل سے قائل ہونے کے بجائے بحث کرنے کے انداز میں بولی۔

”لائف پارٹنر ہونے کے لیے زاویہ نگاہ ایک ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ میرے گرینڈ پا اور گرینڈ ما کی مثال میرے سامنے ہے۔ گرینڈ پاپا اگلے نازی اور گرینڈ ماسفاردی یہودی تھیں۔ گرینڈ پاپا اپنے اگلے نازی ہونے پر بہت غرور تھا لیکن پھر بھی انہوں نے گرینڈ ماسفاردی سے صرف اس لیے شادی کر لی کہ وہ ان کی محبت میں مبتلا ہو گئے تھے۔“

”انہیں نہیں کرنی چاہیے تھی۔ تم خود بتاتی رہی ہو کہ ان کا سلوک تمہاری گرینڈ ما کے ساتھ جک آمیز تھا اور وہ اکثر اپنی نسلی برتری کے غرور میں انہیں کوئی نہ کوئی طعنہ دیتے رہتے تھے۔ لائف پارٹنرز کے بیچ میں ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ ایسی محبت بے فیض ہوتی ہے جس میں عزت شامل نہ ہو۔“ ڈاکٹر لیف نے ایک بار پھر صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

”لیف بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ کسی بھی رشتے میں محبت سے زیادہ عزت اور احترام زیادہ ضروری ہے۔ جب کسی کو بے عزت کیا جائے، اس کی انا کو بار بار کچلا جائے تو درمیان سے محبت خود بخود ہی نکل جاتی ہے۔“ ایڈمنڈ کی آنکھوں میں ہرخی سی دوڑنے لگی۔

”اوہ ڈیڈ.....! پلیز بھول جائیں ماضی کو۔ گرینڈ ما کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں تھا۔“ سون نے باپ کی بدلتی ہوئی جذباتی کیفیت کو محسوس کر کے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے تسلی دینے کی کوشش کی۔

”کاش یہ میرے اختیار میں ہوتا۔“ ایڈمنڈ کے ہونٹوں پر ایک زخمی سی مسکراہٹ نے جھلک دکھائی پھر اچانک ہی اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔

”ایڈمنڈ! میں کچھ دیر کے لیے کچن میں جانا چاہتا ہوں۔ پھر رے پیارے جی داماد اتنے دن بعد مجھ سے ملنے آئے ہیں۔ لازم ہے کہ میں انہیں اپنے ہاتھ سے کچھ پیش بنا کر کھلاؤں۔“

”واؤ..... تو بہت زبردست آفر ہے۔“ سون نے خوشی کا اظہار کیا اور اس ساری صورت حال پر خاموشی اختیار کر لینے والے شہر یاہو اور ماہ بانو کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔

”میرے ڈیڈ بہت اچھے شیف ہیں۔ آپ کا آج جو بھی

پروگرام ہے، اسے ملتوی کر دیں اور لچ ہمارے ساتھ کریں۔“ ”بہت شکریہ لیکن اچھا نہیں لگتا کہ ہم اپنی شمولیت سے آپ کے فیملی ٹائم کو خراب کریں۔“ جواب ماہ بانو نے ہچکچاتے ہوئے دیا۔

”ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اگر ہمیں محسوس ہوتا کہ آپ دونوں کی وجہ سے ہم ڈسٹرب ہوں گے تو میں آپ کو یہ آفر کرتی ہی نہیں۔ کیوں ڈیڈ! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟“ سون نے ماہ بانو کی تسلی کرواتے کرواتے آخر میں باپ سے بھی تائید چاہی۔

”بالکل۔ سون ٹھیک کہہ رہی ہے۔ تم دونوں ہمارے ساتھ شامل ہو گے تو ہمیں بہت خوشی ہوگی۔ اس ٹینشن کو چھوڑ دو کہ تمہاری وجہ سے ہمیں کوئی ایٹو ہوگا البتہ اگر.....“ ایڈمنڈ نے ذرا سا توقف کر کے ان دونوں کی طرف غور سے دیکھا۔

”اگر ہمیں جوائن کرنے سے تمہارا پروگرام خراب ہو رہا ہو تو تم بخوشی جاسکتے ہو۔ ہم اپنی دعوت قبول نہ کیے جانے پر بالکل برا نہیں مانیں گے۔“ ایڈمنڈ نے اپنی بات مکمل کی۔

”بہت شکریہ۔ پروگرام خراب ہونے کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ہمیں تو گھومنا پھرنا ہی ہے تو ابھی نہ سہی، شام میں چلے جائیں گے۔ ویسے بھی کسی جگہ کو ایکسپلور کرنے میں صرف عمارتوں یا مناظر کو دیکھنا شامل نہیں ہوتا بلکہ وہاں کے مقامی افراد سے ملنا اور ان کی سوچ اور فکر سے آگاہ ہونا بھی ضروری ہوتا ہے۔“ شہریار نے گویا ان کی دعوت قبول کر لی۔ ایڈمنڈ اس کا شانہ ہولے سے تھپتھپاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

”مائی سویٹ ڈیڈ!“ سون آنکھوں میں ڈھیروں محبت لیے مسکائی۔ وہ ایڈمنڈ کی اکلوتی اولاد تھی اور باپ بیٹی دونوں کے رویے سے ظاہر تھا کہ وہ ایک دوسرے پر جان چمڑکتے ہیں۔

”تھوڑے بہت سویٹ ہم بھی ہیں۔ کچھ نظر کرم ہماری طرف بھی ہو۔“ لیف نے اسے چھیڑا پھر شہریار سے تصدیق چاہی۔

”کیوں مسٹر مراد اظہار تو نہیں کہہ رہا ہوں میں؟“ شہریار جواب میں محض ہنس کر رہ گیا۔

”تم تھوڑے نہیں، بہت سارے سویٹ ہو۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو میں تم سے محبت کیوں کرتی۔“ سون نے بے تکلفی سے لیف کا رخسار چوم لیا۔ وہ مشرق میں رہنے کے

باوجود سر سے پیر تک مغرب کے رنگوں میں رنگی ہوئی تھی۔ شکل و صورت سے لے کر پہتاوے اور عادت و اطوار تک ہر شے سے اس کے مغرب سے تعلق رکھنے کا گمان ہوتا تھا۔
”آپ دونوں سوچ رہے ہوں گے کہ ہم آپ کو ٹائم دینے کے بجائے مسلسل اپنے ذاتی معاملات میں ہی الجھے ہوئے ہیں۔“ سون اب معذرت خواہانہ انداز میں مسکراتے ہوئے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”بالکل نہیں بلکہ ہمیں تو اپنایت کا احساس ہو رہا ہے۔“ ماہ بانو نے فوراً جواب دیا اور اپنی بات میں اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

”مسٹر ایڈمنڈ بہت نفیس اور پر خلوص انسان ہیں۔ ان کی بیٹی کو آپ جیسا ہی ہونا چاہیے تھا۔“

”بے چارے ڈیڈی..... میں نے خواجواہ انہیں اداس کر دیا۔“ باپ کا ذکر ہونے پر سون کے چہرے پر تاسف پھیل گیا۔

”یہ تمہاری غلطی نہیں ہے۔ اصل میں یہ ان کی زندگی کا وہ المیہ ہے جسے وہ کبھی بھلا ہی نہیں پاتے اور ذرا سی ٹھیس لگنے پر پیمانہ چھلک پڑتا ہے۔“ لیف اسے تسلی دینے لگا۔

”جو بھی ہے، مجھے اس موضوع کو چھیڑتے ہوئے احتیاط کرنی چاہیے تھی۔“ سون کا تاسف ختم نہیں ہو رہا تھا۔ اپنی اسی کیفیت میں اس نے بھی ہوئی مسکراہٹ سے ان دونوں کی طرف دیکھا اور پھر خود ہی بتانے لگی۔

”اہل میں میرے گریڈ پا کو اپنے اٹکے نازی ہونے کا بہت غرور تھا اور یہ غرور ان کی تربیت کا حصہ تھا۔ انہوں نے محبت کی وجہ سے پیرٹس سے ضد کر کے گریڈ ما سے شادی تو کر لی لیکن انہیں کبھی اپنے برابر کا مقام نہیں دے سکے۔ اس میں بڑا ہاتھ ان کے پیرٹس کا بھی تھا۔ انہیں اپنی سفاردی بہو بھی پسند نہیں آسکی اور وہ ہمیشہ انہیں تنقید کا نشانہ بناتے رہے۔“

”Huberistic behaviour“ لیف نے اس کی بات میں دخل دیا۔

”وہ ہیو برس (Hubris) کے مریض تھے۔ حد سے بڑھے ہوئے تکبر، خود اعتمادی اور دوسروں کے لیے نفرت کا یہ مرض انسان کو وہی بنادیتا ہے جو تمہارے گریڈ پا اور ان کے پیرٹس بن چکے تھے۔“

”شاید۔“ سون نے مختصر جواب دیا۔
”شاید نہیں، یقیناً۔ ہماری قوم کا المیہ رہا ہے کہ ماضی میں گزرے مصائب نے ہماری اکثریت کو یا تو sheer

paranoia (دوسروں کو اپنا دشمن سمجھنے کا خبط) میں مبتلا کر دیا یا پھر ہیو برس میں اور ان دونوں ہی رویوں کے ساتھ آپ دنیا کے ساتھ کس نہیں ہو سکتے۔ دنیا میں کسی کو یہ بات پسند نہیں ہوتی کہ اس پر خواجواہ شک کیا جائے۔ اسے اپنا دشمن سمجھا جائے یا خود کو اس سے برتر سمجھا جائے۔“ لیف نے یہودی قوم کی نفسیات کا اتنا بھرپور تجربہ کیا کہ شہر یا راش اس کراٹھا۔

”جو بھی ہے، گریڈ ما کو اپنے شوہر اور ان لاز کے ان رویوں نے بری طرح ہرٹ کیا۔ ان کا خاندان عرصے سے یہاں رہ رہا تھا۔ ان کا مسلمانوں کے ساتھ ساتھ عیسائیوں سے بھی میل جول تھا اور وہ سب اپنے اپنے مذاہب کی حدود میں رہتے ہوئے ایک دوسرے کی خوشی غمی میں شریک ہوتے تھے۔ گریڈ پا اور ان کے پیرٹس نے جاہا کہ وہ نہ صرف یکدم ان سب دوستوں سے تعلقات منقطع کر لیں بلکہ ان ہی کی طرح ان لوگوں سے نفرت بھی کرنے لگیں۔“ وہ عورت پر ہونے والی اس جبر کی داستان سن رہی تھی جس سے برصغیر میں تو ہر دوسری عورت کسی نہ کسی صورت گزر رہی ہوتی ہے۔

”اب آپ لوگ ہی بتائیں کہ ایک عاقل اور بالغ عورت کو یہ ڈکٹیشن دینا کہ اسے کس سے ملنا چاہیے اور کس سے نہیں، اس کی شخصی آزادی کو چھیننے اور ان کی نفسیات کو توڑ پھوڑ کر رکھ دینے کی مذموم حرکت یہ ہے یا نہیں؟“ سون نے تائید طلب نظروں سے حاضرین کو دیکھا۔
”انہیں یہ جبر سہنے کے بجائے علیحدگی کا فیصلہ کر لینا چاہیے تھا۔“ لیف نے صاف گوئی سے کہا۔

”انہیں اس کا موقع نہیں مل سکا۔ وہ شادی کے ابتدائی چند ماہ بعد ہی حاملہ ہو گئیں اور بہت سی عورتوں کی طرح انہوں نے فرض کر لیا کہ اولاد ہونے کے بعد معاملات ٹھیک ہو جائیں گے لیکن افسوس.....“ سون جتنے ایک پُر تاسف گہرا سانس خارج کیا۔

”افسوس کہ ایسا کچھ نہیں ہوا اور صورتحال حال پہلے سے بھی زیادہ بدتر ہو گئی۔ ماں ہونے کے باوجود انہیں ان کے بچے سے دور رکھا جاتا تھا۔ بچے کی پرورش اس کے گریڈ پیرٹس نے اپنے ہاتھوں میں لے لی اور اس کے دماغ میں وہی نفرت اور اشتعال انگیز خیالات بھرتے رہے جو خود ان کے اپنے دل و دماغ میں دبائے ہوئے تھے۔ ایک ماں اپنے سامنے اپنے بچے کو جاؤ بیٹے ہوئے دیکھتی رہی لیکن اس تباہی کو روکنے کے لیے چند کمزور کوششوں کے سوا

عہد تربیت کی تھی لیکن یہاں یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ کیا آپ کے گریڈ پانے انہیں یہ سب آسانی سے کرنے دیا تھا؟ ان کے پیرٹس بے شک دنیا میں نہیں رہے تھے لیکن خود ان کی سوچ تو وہی تھی نا جوان کے پیرٹس کی تھی۔“

”آپ نے بالکل صحیح سوال اٹھایا ہے۔ گریڈ پا واقعی گریڈ ما سے بہت ناراض رہتے تھے اور موقع ملنے پر انہیں بے عزت کرنے اور جلی کٹی سنانے سے باز نہیں آتے تھے لیکن ان کی مجبوری تھی کہ اتنے چھوٹے بچے کو ماں کی گود سے نکال کر کسی اور کے حوالے کرنے کے لیے ان کے پاس کوئی آپشن نہیں تھا۔ کچھ بڑے ہونے کے بعد انہوں نے ڈیڈی کو بورڈنگ بھیجنے کی کوشش کی لیکن ڈیڈی کی سخت مزاحمت نے انہیں اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہونے دیا۔ ڈیڈ، اکل ڈیلرٹ کی طرح ضدی اور جارج نہیں تھے لیکن ان کے کھانا پینا چھوڑ کر بیمار ہو جانے نے گریڈ پا کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ ان کی ایک مجبوری یہ بھی تھی کہ ملازمت کی نوعیت انہیں تک کر کسی ایک مقام پر رہنے نہیں دیتی تھی اس لیے وہ خود ڈیڈ کی برین واشنگ کرنے سے محروم تھے۔ اپنی جھلاہٹ وہ گریڈ ما سے بدسلوکی کر کے نکالتے تھے۔ ڈیڈ نے اپنی ماں کے ساتھ ہونے والی وہ ساری زیادتی خود دیکھی ہے۔ اس لیے وہ اتنا وقت گزر جانے اور کہانی کے اصل کرداروں کے دنیا سے چلے جانے کے باوجود خود کو اس تکلیف سے نکال نہیں سکے ہیں۔“ سون نے ایڈمنڈ کے روپے کی ساری گرہیں کھول دی تھیں اور اب وہ سب خاموش بیٹھے جیسے برسوں پہلے بیٹے الیسے کا پُرسہ دے رہے ہوں۔ اس خاموشی کو لیف کے سیل فون کی گھنٹی نے توڑا۔

”ہسپتال سے کال ہے۔ مجھے جانا ہوگا۔“ کال سننے کے بعد اس نے اطلاع دی۔

”لیکن ابھی تو تمہاری چھٹیاں باقی ہیں۔“ سون نے سن کر اعتراض کیا۔

”وہاں میری ضرورت ہے اور وہ لوگ جانتے ہیں کہ میں واپس آچکا ہوں۔“ لیف نے جو اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا، سنجیدگی سے اس کے اعتراض کا جواب دیا اور بے لے ڈگ بھرتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ سون اس کے پیچھے دروازے تک گئی۔

”کیا ہوا ہنی! یہ لیف کہاں چلا گیا؟“ ایڈمنڈ نے شاید وہاں ہونے والی معمولی سی پہل محسوس کر لی تھی جو اچرن باندھے کچن سے باہر نکل آیا تھا۔

”اس کے لیے ہسپتال سے کال تھی اور آپ جانتے

کچھ نہیں کر سکی۔ کرتی بھی کیسے؟ اس کے سر پر طلاق اور بچہ چھین لیے جانے کی دھمکیاں کسی تلوار کی طرح جو لگی ہوئی تھیں۔“ سون کی آنکھوں میں دکھ سے نمی تیرنے لگی۔ لیف نے اسے خود سے لگا کر خاموش لپی دی۔

”بیٹے پر اختیار نہیں تھا لیکن گریڈ ما صرف اور صرف اس لیے جبر کی زندگی گزارتی رہیں کہ وہ ان کی نظروں کے سامنے تو تھا۔ وہ کسی ملازمہ کی طرح اس کی خدمت کر کے اپنی ممتا کی تسکین کرتی رہیں۔ بیٹے نے بھی انہیں ملازمہ سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ جس بچے کو آنکھ کھولتے ہی اپنی ماں سے ایک حقیر اور ناقص العقل شخصیت کے طور پر متعارف کروایا گیا ہو، وہ بچہ ماں کی عزت کرتا بھی کیونکر۔ اوپر سے اس کے مزاج میں پیدا کی گئی شدت پسندی نے بھی ایسی کسر بھی پوزی کر دی۔ وہ تشدد کی اسی راہ پر چل رہا تھا جس پر اس سرزمین کو مسیہون (کلیتا یہودی ملک جہاں کوئی غیر یہود نہ ہو) بنانے کے خواہش مندوں کی اکثریت گامزن تھی۔ اسے امن، درگزر اور بھائی چارے جیسے الفاظ سے نفرت تھی اور نصیحت سننے کو اپنی توہین سمجھتا تھا۔ ان تکلیف دہ حالات میں خدا کو گریڈ ما پر رحم آیا اور برسوں بعد وہ ایک بار پھر ماں بننے کے تجربے سے گزریں۔ ڈیڈ کو خدا نے انہیں زخموں کے لیے مرہم کے طور پر عطا کیا اور ساتھ ہی ایک مہربانی یہ بھی کی کہ ان کے ساس سر کو تھوڑے ہی عرصے میں وقفے وقفے سے اپنے پاس واپس بلوالیا۔“ سون کے الفاظ نے ماہ بانو کو لرزاکر رکھ دیا۔ اس دنیا میں کچھ لوگ دوسروں کے لیے اس قدر باعث آزار ہوتے ہیں کہ ان کا واپس جانا کسی الیسے سے زیادہ نعمت لگتا ہے۔

”ڈیڈ کے ساتھ گریڈ ما کو پہلی بار اپنے ماں ہونے کا مان ملتا۔ انہوں نے اپنے سارے اربان، ساری خواہشات پوری کیں اور ڈیڈ کو وہ سب کچھ سکھایا جو اکل ڈیلرٹ کو نہیں سکھاسکی تھیں۔ یہ سب میری گریڈ ما کی تربیت کا اثر ہے کہ ڈیڈ سفاردی، مزارعی، فلاشیا اٹکے نازی یہود میں سے کسی کو کسی سے کمتر یا برتر نہیں سمجھتے بلکہ یہودی کیا، دنیا کے کسی بھی مذہب اور مصلے سے تعلق رکھنے والے انسان ان کے لیے ایک برابر ہیں۔ اگر وہ ایسے نہ ہوتے تو آج ایک مسلم جوڑا اس گھر میں بطور مہمان موجود نہیں ہو سکتا تھا۔“ اپنے آخری جیلے پر سون نے یہ مسکرائی تو ماہ بانو اور شہریار بھی بے ساختہ مسکرا دیے پھر ماہ بانو بولی۔

”آپ کی گریڈ ما کا کردار واقعی قابلِ فخر ہے اور ہمیں اعتراف ہے کہ واقعی انہوں نے اپنے بیٹے کی بہت

ہیں کہ وہ موت کے فرشتے کو تو ٹال سکتا ہے لیکن اسپتال کی کال کو نہیں۔“ سون نے منہ بنا کر اس کے سوال کا جواب دیا تو ایڈمنڈ منس پڑا پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔

”مجھے فخر ہے کہ میرا دادا ایک انسان دوست ڈاکٹر ہے اور اپنے پیشے کی اخلاقیات کو بہت اچھی طرح سمجھتا ہے۔“

”اس میں تو کوئی شک نہیں اور سچ پوچھیں تو مجھے بھی سب سے پہلے اس کی اسی خوبی نے متاثر کیا تھا۔“ اب سون بھی فخر یہ مسکرا رہی تھی۔ ماہ بانو اور شہریار کے لیے یہ سب متاثر کن تھا۔

”اب لےج پر اس کا ہمیں جوائن کرنا تو مشکل ہی ہوگا۔ تم ایسا کرنا کہ جاتے ہوئے اس کے لیے کھانا پیک کر کے لے جانا۔“ ایڈمنڈ نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے سون کو ہدایت کی۔

”وہ تو میں آپ کے کہے بغیر بھی لے کر جاؤں گی۔ آپ کو پتا ہے نا کہ لیف کو آپ کے ہاتھ کا کھانا کتنا پسند ہے۔“ سون نے اسے جواب دیا اور ماہ بانو اور شہریار کی طرف رخ کرتے ہوئے بولی۔

”ڈیڈ نے کھانا بنانا گریڈ ما سے سیکھا تھا اور کچھ مخصوص ڈشز تو اتنی لذیذ بناتے ہیں کہ بندے کا پیٹ بھر جائے پھر بھی نیت نہیں بھریاتی۔ ابھی کچھ دیر میں کھانا لگے گا تو آپ لوگ خود میری بات کی تائید کریں گے۔“

”تم کرو تعریفیں، میں تو لگتا ہوں اپنے کام میں۔“ ایڈمنڈ بیٹی پر محبت بھری نظر ڈال کر واپس مچن کی طرف بڑھا لیکن اوپری منزل سے سٹائی دینے والے زوردار چھٹا کے نے اسے ٹھٹک جانے پر مجبور کر دیا۔

”انکل ڈیلیٹ؟“ سون اضطراری طور پر اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی۔

”آج ایسی نہیں آئی ہے۔ میں انہیں ناشتے اور میڈیسن کے بعد سلا کر نیچے آگیا تھا۔“ ایڈمنڈ نے بچھے ہوئے چہرے کے ساتھ اسے جواب دیا۔ اسی اثنا میں اوپر سے ایک اور چھٹا کا سٹائی دیا۔

”میں دیکھتا ہوں جا کر۔“ ایڈمنڈ بیٹیوں کی طرف بڑھا۔ ”نہیں، آپ اپنا کام کریں، میں دیکھ لوں گی۔“ سون نے اسے روکا اور پھر نا بھی اور تذبذب کی کیفیت میں بیٹھے شہریار اور ماہ بانو کی طرف رخ کر کے بولی۔

”کیا آپ دونوں میری مدد کرنا پسند کریں گے؟“ ”شیور!“ شہریار نے جواب دیا اور دونوں میاں بیوی فوراً ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”انکل ڈیلیٹ فالج کی وجہ سے بستر پر ہیں اور صرف اپنے دائیں ہاتھ پر اور زبان کو ہی حرکت دے سکتے ہیں۔ انہیں اکثر پینک انجکس آتے ہیں جنہیں ان کی ڈیوٹی نرس کنٹرول کر لیتی ہے لیکن آج وہ چھٹی پر ہے۔“ بیڑھیاں چڑھتے چڑھتے اس نے ان دونوں کو مختصراً آگاہ کیا۔ اس دوران مزید دو ہلکے ہلکے دھماکے سٹائی دے چکے تھے۔

”دفع ہو جاؤ۔ کیوں روز روز تم لوگ مجھے تنگ کرنے آ جاتے ہو۔ دفع ہو جاؤ ورنہ میں تمہاری نسلوں تک کو مٹا دوں گا۔“ سون نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا تو اندر سے دھاڑ سٹائی دی۔ ان دونوں کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتی ہوئی سون اندر داخل ہو گئی۔

کمرے کے فرش پر ٹیبل لیپ، دواؤں کی شیشیاں، ٹیٹورول اور دیگر چہ اسی نوعیت کی چھوٹی موٹی اشیاء بکھری ہوئی تھیں۔ واضح تھا کہ یہ سب سامان سائڈ ٹیبل پر سے پھینکا گیا ہے۔

”دیکھو، دیکھو، وہ فاطمہ، وہ یوسف، وہ سارہ، ابو ہریرہ، موسیٰ، الیاس..... وہ سب کے سب مجھے تنگ کر رہے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں ہتھر ہیں۔ وہ ان ہتھروں سے مجھے ہلاک کر دینا چاہتے ہیں۔ ان کے ہتھر ہمارے ٹینکوں کو تباہ کر دیں گے لیکن میں انہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔ میں انہیں ان کے گھروں سمیت بلڈوز کر دوں گا۔“ سون کے چہرے پر نظر پڑتے ہی بستر پر پڑے بوڑھے نے ہذیانی لہجے میں بولنا شروع کر دیا تھا۔ سفید براق بالوں والے اس بوڑھے کے نقوش میں ایڈمنڈ کی جھلک تھی۔ وہ اپنے جسم کو باقاعدہ حرکت نہیں دے پا رہا تھا لیکن شدید تباہی کے باعث اسے جھٹکے سے لگ رہے تھے اور واحد فعال ہاتھ مسلسل اس طرح حرکت کر رہا تھا جیسے وہ کسی شے کو اپنی گرفت میں لینا چاہتا ہو لیکن اس کی رسائی کی حد میں موجود سائڈ ٹیبل پر رکھا سارا سامان پہلے ہی زمین بوس ہو چکا تھا اس لیے وہ اپنی کوشش میں ناکام تھا۔

”اس گندی، کالی، بد صورت صوفیہ کو دیکھو۔ وہ مجھ پر انگلیاں اٹھا رہی ہے اور بد دعا میں دے رہی ہے کہ جس طرح میں نے اس کے خاندان کو ملیا میٹ کیا ہے، خداوند میرے خاندان کو بھی مٹا دے گا۔ پوچھو، پوچھو..... اس گھٹیا عورت سے، اس حقیر چوہا سے کتنی تیری اور اس کی کیا برابری ہے؟“

وہ بستر پر پڑے پڑے ہی طرح مل کھا رہا تھا۔ سون اس کی باتوں پر توجہ دینے کے بجائے سائڈ ٹیبل کی

مخفی دراز کھولے اس میں کچھ تلاش کر رہی تھی۔

”کوئی بتائے اس حقیر چوہیا کو کہ اس کا کیڑے کوڑوں جیسا خاندان اور میرا اعلیٰ نسب، خداوند کا چھوٹا، یہودی خاندان ایک برابر نہیں ہیں۔ خداوند اپنے لاڈلوں کے مقابلے میں اس کی بددعائیں کبھی نہیں سنے گا۔“ وہ شخص Hubris (حد سے بڑھا ہوا تکبر) کا مریض تھا جو اس حالت بے بسی میں بھی اپنے غرور و تکبر کے اظہار سے باز نہیں آ رہا تھا۔

”آپ دونوں کو انکل ڈیلبرٹ کو مضبوطی سے پکڑنا پڑے گا تاکہ میں انہیں یہ انجکشن لگا سکوں۔“ سون دراز میں سے ایک سرج اور وائل نکال کر انجکشن تیار کر چکی تھی۔ ان دونوں نے اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ڈیلبرٹ کو مضبوطی سے جکڑ لیا۔ سون نے دوا اس کے بازو میں انجیکٹ کر دی۔

”تم اس طرح مجھے بے بس کر کے زہر کا انجکشن نہیں لگا سکتے۔ میں اسرائیلی فوج کا افسر ہوں۔ میرا بدلہ لینے کے لیے اسرائیلی آرمی تمہارے گھروں کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گی۔ میرا اٹھنے نازی خون اتنا سستا نہیں ہے کہ تم جیسے کیڑے کوڑے مجھے صفحہ ہستی سے مٹا دیں گے۔“ وہ مزاحمت کی کوشش کے ساتھ ساتھ مسلسل بدزبانی بھی کر رہا تھا۔ دوا جسم میں گئی تو مزاحمت کے دم توڑنے کے ساتھ ساتھ آواز بھی معدوم ہوتی چلی گئی۔

”شوٹا! انکل ڈیلبرٹ کے کمرے کی صفائی کر دو۔“ سون نے انٹرکام کے ذریعے گمریلو ملازمہ کو ہدایت دی اور ان دونوں کو اپنے ساتھ لیے نیچے چلی آئی۔

”سب ٹھیک ہے؟“ ایڈمنڈ ان کے قدموں کی آواز سن کر کچن سے باہر آیا۔

”انجکشن دے دیا ہے۔ اب شام تک آرام سے سوتے رہیں گے۔“ سون نے اطلاع دی تو ایڈمنڈ نے سکون کا سانس لیا۔

”ٹھیک ہے، تم لوگ بیٹھو۔ میں بس پندرہ منٹ میں کھانا ٹیبل پر لگاتا ہوں۔“

”میں آپ کی ہیلپ کرواؤں؟“ سون نے پوچھا۔

”تم بس میرے مہمانوں کو وقت دو تو یہی کافی ہے۔“

ویسے ہی آج بے چارے خواجہ انجکشن میں آگئے ہیں۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے مسٹر ایڈمنڈ! چھوٹے موٹے مسائل اور پریشانیاں تو ہر گھر میں ہوتے ہیں۔“ ماہ بانو نے فوراً اسے تسلی دی۔

”جینٹلس۔“ ایڈمنڈ اسے مختصر جواب دے کر کچن میں چلا گیا اور وہ سب واپس اپنی نشستوں پر آ بیٹھے۔

”ڈیڈ، انکل ڈیلبرٹ کی وجہ سے نیشن میں آ جاتے ہیں۔ خصوصاً جس دن ایکی ڈیوٹی پر نہ ہو، کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ ایکی انکل کو اچھی طرح سمجھنے لگی ہے تو انہیں کنٹرول کر لیتی ہے۔“ سون نے انہیں ڈیوٹی نرس کے بارے میں بتایا۔

”یقیناً ایسا ہی ہے۔ ہمیں اپنے قیام کے عرصے میں آج پہلی بار ہی ایسی سچویشن دیکھنے کو ملی ہے۔“ شہریار نے گفتگو میں اپنا حصہ ڈالا۔ اصل مقصد اپنے میزبانوں کو خجالت سے بچانا تھا۔

”میں تو بچپن سے ہی بہت کچھ دیکھتی آرہی ہوں۔ انکل ڈیلبرٹ نے اپنی جوانی میں جو کچھ بویا تھا، اسے ذہنی اذیت کی صورت میں کاٹ رہے ہیں۔“ سون کے لہجے میں محسوس کیا جانے والا غم و غصہ تھا۔

”اگر مناسب لگے تو آپ ہم سے شیئر کر سکتی ہیں۔“ ماہ بانو نے خلوص سے کہا۔

”سب کچھ سامنے ہی ہے۔ میں نے آپ کو انکل ڈیلبرٹ کے ذہنی رجحان کے بارے میں بتایا تھا۔ بس وہی ذہنی رجحان انہیں آرمی میں لے گیا۔ ایک شخص جو تندرست پسند ہو اور مقامی افراد سے نفرت کرتا ہو جب اختیار حاصل کر لے تو سخت خطرناک ہو جاتا ہے۔ انکل ڈیلبرٹ نے بھی ڈیوٹی ادا کرنے کے نام پر خوب ظلم کا بازار گرم کیے رکھا۔ ان کے ہاتھ بے شمار بے گناہوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں جسے ہماری حکومت نے فرائض کی بخوبی بجا آوری کے نام پر خوب سراہا۔ انکل نے ڈھیروں تھپے تو ضرور حاصل کر لیے لیکن ذہنی سکون اور قلبی اطمینان سے محروم ہو گئے۔

بیماری کے بعد سے ان کا احساس جرم ڈراؤنے خوابوں کی شکل میں انہیں ڈرانے لگا ہے۔ وہ ان سارے لوگوں کو جو ان کے ظلم کا شکار ہوئے، اپنے خوابوں میں اکثر دیکھتے رہتے ہیں اور جب بھی ایسا ہوتا ہے، ان کی حالت بگڑنے لگتی ہے۔ نرس موجود ہوتی ہے تو دورے کے ابتدائی آثار دیکھ کر ہی میڈیسن دے دیتی ہے لیکن آج وہ نہیں تھی اور ڈیڈ ہمارے ساتھ مصروف ہو گئے تو یہ صورت حال پیدا ہو گئی۔“ سون نے اس کے سوال کا تفصیلی جواب دے ڈالا۔ جواب سن کر ماہ بانو اور شہریار دونوں ہی اداس ہو گئے۔ ظلم اور نفرت کے ٹھیل میں صرف مظلوم ہی کا نقصان نہیں ہوتا۔ ظالم بھی کسی نہ کسی صورت مکافات عمل سے گزرتا ہے۔

”عمار!“ وہ گہری نیند سویا ہوا تھا کہ زرمینہ بی بی نے اس کا شانہ ہلاتے ہوئے دھیمی آواز میں پکارا۔
”کیا ہوا بی بی؟“ وہ بی بی سے تین گھنٹے بعد جگائے کلا کہہ کر سویا تھا اور اپنی کیفیت سے اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ انہوں نے اسے طے شدہ دورانیے سے بہت پہلے جگادیا ہے۔

”کوئی تم سے ملنے آیا ہے۔“
”کون؟“ اس نے محسوس کیا کہ بی بی کے لہجے میں پریشانی سی ہے۔

”اپنا نام دے جے کانت بتا رہا تھا۔ وردی میں تو نہیں ہے لیکن وضع قطع اور چال ڈھال سے فوجی لگتا ہے۔“ ان کی پریشانی کی وجہ سامنے آگئی

”وے کانت، او ہو..... یہ تو وہی ہے اکل بنجامن کے دوست کا بیٹا۔ وہی جس نے میرے گرفتار ہونے کے بعد مجھ سے پوچھ گچھ کی تھی اور اکل کی ضمانت پر رہا بھی کر دیا تھا۔“ اس نے بستر پر سے اترنے کے لیے پاؤں نیچے لٹکائے تو بائیں ٹانگ میں درد کی ایک لہری اٹھی۔ رات گئے والی جس چوٹ کو اس نے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی، اب وہ سو کر اٹھنے کے بعد تکلیف دے رہی تھی۔

”میں دیکھتا ہوں، آپ پریشان نہ ہوں۔“ اس نے بی بی کو تسلی دی لیکن اندر سے وہ خود تشویش میں مبتلا تھا۔ ایک ایسے موقع پر جبکہ رات ہی انہوں نے مہندر کو اس کے انجام تک پہنچایا تھا، وجہ کی آمد معنی خیز تھی۔

باہر کل کر اس نے منہ پر پانی کے چند چھپاکے مارے اور انگلیوں سے بالوں کو سنوارتا ہوا بیٹھک میں داخل ہو گیا۔

”گڈ مارنگ سر! آپ نے کیسے زحمت کی۔ کوئی کام تھا تو مجھے کال کر لیتے۔“ پینٹ شرٹ میں اہتمام سے تیار وجہ سے گرجوش مصافحہ کرتے ہوئے اس نے اخلاق بگھارا۔

”زحمت کا مسئلہ نہیں۔ میں یہاں سے گزر رہا تھا تو سوچا تم سے ملتا ہوا چلوں لیکن لگتا ہے میں نے تمہیں ڈسٹرب کیا۔“ معاذ کی آنکھوں میں دوڑتی سرخی مچی نیند سے اٹھائے جانے کی چغلی کھا رہی تھی۔

”نہیں، کوئی بات نہیں۔ اصولاً یہ کوئی سونے کا وقت ہے بھی نہیں۔ وہ تو میں کل رات بھر بہرام کے ساتھ اسپتال میں تھا اور سو نہیں سکا تھا تو اس وقت تھوڑی دیر آرام کرنے کے لیے لیٹ گیا تھا۔“

”کیسی طبیعت ہے بہرام کی؟“ وجہ نے سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

”ابھی تو ٹریٹمنٹ اسٹارٹ ہوا ہے۔ دو چار دن بعد

ہی کوئی نتیجہ برآمد ہوگا۔“

”یہ تم لکڑا کیوں رہے تھے؟ پیر میں کوئی چوٹ لگی ہے کیا؟“ وجہ کی تیز نظروں سے اس کی چال کی ہلکی سی لکڑاہٹ چھپی نہیں رہ سکی تھی۔

”صبح با تھ روم میں سلب ہو گیا تھا اس وقت محسوس نہیں ہو سکا لیکن اب سو کر اٹھا ہوں تو ٹانگ درد کر رہی ہے۔“ اس نے سادگی سے اس کے سوال کا جواب دیا لیکن وہ محسوس کر رہا تھا کہ وجہ کی آنکھوں میں کھوج ہے۔

”تمہیں کچھ معلوم ہے کہ مہندر کے ساتھ کیا ہوا؟“ وجہ نے اس سے اچانک پوچھا۔

”کون مہندر؟“ معاذ نے چونکنے کی اداکاری کی۔ کچھ کچھ اندازہ تو وہ پہلے ہی لگا چکا تھا کہ وجہ کو مہندر کی موت یہاں لائی ہے۔

”مہندر سنگھ، جس کا بھائی نریندر سنگھ کسی نامعلوم ہتھیارے کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔“

”ایک محسوم خاندان کا قاتل..... کیا ہوا اس عالم کے ساتھ؟ مجھے لگتا ہے آپ مجھے کوئی اچھی خبر سنانے جا رہے ہیں۔“ اس نے مہندر کے لیے اپنی نفرت کو چھپانے کی کوشش نہیں کی۔

”کھائی سے اس کی لاش ملی ہے۔ بظاہر تو یہی لگتا ہے کہ شراب کے نشے میں وہ جیب پر کنٹرول نہیں رکھ سکا اور جیب سمیت کھائی میں گر کر موت کا ٹھکار ہو گیا لیکن میری چھٹی حس اس سامنے کی بات کو سچ نہیں مان رہی ہے۔“ وجہ نے اپنی آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑ دیں۔

”وہ جس قسم کا عالم انسان تھا، اس کو اگر کسی نے قتل بھی کر دیا ہو تو مجھے اس پر کوئی حیرت نہیں ہوگی۔“ معاذ نے بھی اپنی ہلکوں کو جھپکنے نہیں دیا کہ اب اعصاب کی جنگ چھڑ چکی تھی۔

”تم اس سے بہت نفرت کرتے ہو؟“
”عالم سے کوئی بھی ایسا شخص محبت نہیں کر سکتا جس کے اندر انسانیت کی ہلکی سی بھی رمت باقی ہو۔“ اس نے ایک بار پھر صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

”یعنی تمہیں موقع ملتا تو تم بھی اسے قتل کر سکتے تھے؟“ وجہ نے اسے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

”کاش مجھے کوئی ہتھیار چلانا آتا تو میں کب کا یہ کام کر چکا ہوتا۔“ اس نے انکار نہیں کیا۔

”مہندر کو ہتھیار سے ہلاک نہیں کیا گیا۔ اس کی جیب

کو حادثہ پیش آیا ہے۔“ وجہ نے جیسے اس کی تصحیح کی۔
”حادثہ پیش آیا ہے تو پھر آپ اس کو حادثہ مان کیوں نہیں رہے ہیں؟“ اس نے انجمن زدہ لہجے میں سوال کیا۔
”مجھے یہ بات کھٹک رہی ہے کہ اس پورے ایریا میں صرف دو سیکورٹی کیمرے تھے اور وہ دونوں کے دونوں کام نہیں کر رہے تھے حالانکہ ایک دن پہلے تک ان کیمروں میں کوئی خرابی نہیں تھی۔“

”یہ تو واقعی مشکوک صورت حال ہے۔“ معاذ نے اس کے اٹھائے نکتے کو رد کرنے کے بجائے اس کی تائید کی۔

”کیا تم رات بھر سچ مچ اسپتال میں تھے؟“ وجہ نے اس سے اچانک پوچھا۔

”بالکل۔ میں اسپتال میں تھا اور وہاں بیٹھ کر اپنا کام نمٹاتا رہا تھا۔ آپ کو انکل بنجامن اور اسپتال کے اسٹاف سے اس بات کی گواہی مل سکتی ہے۔“

”یہی تو مسئلہ ہے۔“ وجہ نے اپنے ایک ہاتھ کا مکا دوسرے ہاتھ پر مارا۔

”جہاں ثبوت اور گواہ اتنے کچے ہوں، وہاں شک زیادہ ہونے لگتا ہے۔“

”کیا آپ مہندر کی موت کا الزام میرے سر رکھنا چاہ رہے ہیں؟“ معاذ نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا۔

”میں کیوں اپنا شک دور کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

”میرے لائق کوئی خدمت؟ میں اس سلسلے میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟“ وجہ کی صاف گوئی کے جواب میں اس نے لہجہ کو سرد کر لیا۔

”رات کو تم نے اسپتال میں چائے کیوں منگوائی تھی؟“ وہ بھی پیچھا چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔

”مجھے جاگ کر کام کرنا تھا اس لیے اپنے دماغ کو چاق و چوبند رکھنے کے لیے چائے منگوائی۔ کیا اس پر پابندی عائد تھی؟“

”جائے اسپتال سے بھی مل سکتی تھی۔“

”مجھے بتایا گیا تھا کہ رات کے کھانے کے بعد کیٹین بند ہو جاتی ہے اور صبح ناشتے کا وقت ہونے تک وہاں کچھ دستیاب نہیں ہوتا۔“

”چائے لانے والے لڑکے نے خود کو اتنا چھپا کیوں رکھا تھا؟“ وجہ نے ایک اور سوال داغا۔ اس سوال سے واضح ہو گیا کہ وہ اس پر ابتدا سے شک کر رہا ہے اور یہاں آنے سے پہلے اپنا ہوم ورک کر کے آیا ہے۔

”مجھ پر دوسروں کے اعمال کی ذمہ داری عائد نہیں

ہوتی۔ آپ کو یہ سوال اسی لڑکے سے کرنا چاہیے تھا۔ میں تو صرف آن لائن چائے کا آرڈر کرنے کا خطاوار ہوں۔“

”وہاں سے میں پہلے ہی معلومات لے چکا ہوں۔ ہوسٹل کے مالک کا کہنا ہے کہ وہ لڑکا کل صبح کام کی تلاش میں اس کے پاس آیا تھا۔ اسے رات کے لیے اضافی مہیگر کی ضرورت تھی اس لیے اس نے لڑکے کو رکھ لیا لیکن وہ لڑکا صبح ہوتے ہی غائب ہو گیا۔“ وجہ نے تقریباً دانت چکپکاتے ہوئے ساری تفصیل بتائی۔

”مالک نے اس کے شناختی کاغذات وغیرہ بطور ضمانت نہیں رکھے تھے کیا؟“ معاذ نے نکتہ اٹھایا۔ ویسے وہ اس وقت دل ہی دل میں جارو کو دوا دے رہا تھا جس نے ہر چھوٹی بڑی بات کا دھیان رکھا تھا۔

”برابر رکھے تھے لیکن وہ حرام کا پلا جاتے جاتے گلے سے رقم چرانے کے ساتھ ساتھ اپنے کاغذات بھی نکال کر لے گیا۔“ وجہ نے اس نا معلوم شخص کو گالی سے نوازا۔

”مطلب وہ کوئی نوسرباز تھا اور چوری کی نیت سے ہی وہاں آیا تھا اسی لیے اس نے اپنا منہ بھی چھپا کر رکھا ہوا تھا۔“ معاذ نے فوراً نتیجہ اخذ کیا۔

”بھگوان جانے ایسا ہی تھا یا اس چھوٹی چوری کے ذریعے اس نے کسی کے بڑے جرم پر پردہ ڈالنے کا انتظام کیا تھا۔“ وجہ نے برا سامنہ بنایا۔

”مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ آپ مجھ پر الزام تراشی کی کوشش کر رہے ہیں۔ کہیں آپ اس بہانے مجھے دوبارہ اریسٹ تو نہیں کرنا چاہتے؟“

”بہانہ..... مجھے بہانے کی کیا ضرورت ہے؟ میں جب چاہوں تمہیں بغیر کسی بہانے کے بھی گرفتار کر سکتا ہوں۔“ معاذ کے الفاظ نے اسے مشتعل کر دیا۔

”شاید اکل بنجامن کی وجہ سے پہلی بار آپ مجھے مجبوراً رہا کر بیٹھے تھے اور اس واقعے نے آپ کو میری گرفتاری کا موقع فراہم کر دیا ہے۔“

”اگر ایسا ہوتا تو میں سادہ لباس کے بجائے یونیفارم میں سپاہیوں کے ساتھ یہاں آتا۔ یہ صرف اکل بنجامن کا ہی لحاظ ہے کہ تمہیں مشکوک محسوس کرنے کے باوجود میں تمہیں اریسٹ نہیں کر رہا ہوں اور چاہتا ہوں کہ تم سچ اگل دو۔ سچ سامنے آ جانے کی صورت میں، میں تمہارا نام سچ میں سے نکال دوں گا اور اس گھنٹا کے پیچھے موجود اصل مجرموں پر ہاتھ ڈال دوں گا۔ یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ اتنی بڑی اور منظم کارروائی تمہارے اکیلے کے بس کا رنگ نہیں ہے۔“

2024

وہ بہت ہوشیاری سے اسے گھیرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”میں آپ کی بات بالکل بھی نہیں سمجھ پا رہا ہوں۔ جو سچ تھا، وہ میں نے آپ کو بتا دیا ہے۔ آپ اپنے شک کی وجہ سے جو کہانیاں بنا رہے ہیں، ان کا حقیقت سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں ایک سفید پوش گھرانے کا عام سا لڑکا ہوں جو معاشی طور پر مضبوط ہو کر اپنے والدین کے بڑھاپے میں تھوڑا سا آرام پہنچانا چاہتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ میری ذات سے ان کو خوشیاں ملیں کیونکہ دکھ تو وہ پہلے ہی بہت دیکھ چکے ہیں۔“ اس بار اس نے اپنے لہجے میں تھوڑی عاجزی اور بے بسی کو سمولیا۔

”آئی دس کہ تمہاری ساری باتیں سچ ثابت ہوں۔“ وجے کانت اچانک ہی جانے کے لیے کھڑا ہو گیا اور اس کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

”ایسے کیسے سر! کوئی چائے پانی وغیرہ تو پی کر جاتے۔“ معاذ بھی بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔

”سوری! ہم مسلمانوں کے گھر کھاتے پیتے نہیں ہیں۔ ہمارا دھرم بھرٹ ہو جاتا ہے۔“ وہ نخوت سے کہہ کر باہر کی طرف بڑھا۔ معاذ اس کے پیچھے پیچھے اسے بیرونی دروازے تک چھوڑنے گیا۔

”خبیث!“ وہ چلا گیا تو دروازہ بند کرتے ہوئے معاذ بڑبڑایا۔ ”مسلمانوں کے برتنوں میں کھانے پینے سے ان کا دھرم بھرٹ ہو جاتا ہے اور جواتے برسوں سے اس ریاست کو ہڑپ کرنے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں، اس سے ان کے دھرم کا کچھ نہیں بگڑتا۔“

”جانے دو بیٹا! یہ دھرم سے زیادہ نیتوں کا معاملہ ہے ورنہ دنیا کا کوئی مذہب خواخواہ کسی کو ستانے کا سبق نہیں دیتا۔“ زرینہ بی بی جو چپکے سے اس کے پیچھے آکھڑی ہوئی تھیں، اس کے شانے کو تسلی دینے والے انداز میں چپکتے ہوئے دھیمے پن سے بولیں۔

”آپ لوگ بہت ہمت اور حوصلے والے ہیں بی بی جواتے برسوں سے خود پر یہ جبر سہہ رہے ہیں۔ میرا تو چند دنوں میں ہی خون کھولنے لگا ہے۔“

”جوان خون ایسے ہی جوش مارتا ہے لیکن ہماری عمر کے لوگوں کو سوچ سمجھ کر ہر قدم اٹھانا پڑتا ہے۔ میں اور تمہارے آقا جان تو دیسے ہی کچھ کرنے جو گئے نہیں رہے ہیں۔ اب اس عمر میں تو یہی تمنا رہ گئی ہے کہ جو تھوڑے دن رہ گئے ہیں، وہ سکھ چین سے گزر جائیں۔“ وہ دونوں دروازے سے پلٹ کر مچن میں آگئے تھے اور زرینہ بی بی

تھکی تھکی سی ایک موڑے پر ٹپک گئی تھیں۔

”آپ پریشان نہ ہوں بی بی! سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ اس نے انہیں تسلی دی۔

”تم کیوں چلے آئے بیٹا! ہم نے تو اپنے عمار پر رو دھو کر صبر کر ہی لیا تھا لیکن اب لگتا ہے ایک نیا دکھ ہماری راہ دیکھ رہا ہے۔ تم نہیں جانتے ان ظالموں کو۔ یہ ذرا سے شک پر نو جوانوں کی زندگیاں اجاڑ دیتے ہیں۔“ ان کی آنکھیں دکھ سے بھر آئیں۔

”میں نے کہا نا کہ آپ پریشان نہ ہوں۔ اللہ سب بہتر کرے گا۔ بلکہ میں ایسا کرتا ہوں کہ انکل بنجامن سے مل کر انہیں ساری صورت حال بتاتا ہوں۔ ہو سکتا ہے وہ کچھ کر سکیں۔“ اس نے دوبارہ سونے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے نیا پروگرام ترتیب دیا ورنہ طے یہ ہوا تھا کہ وہ سہ پہر تک دکان پر جائے گا اور وہاں دو تین گھنٹے گزارنے کے بعد اسپتال چلا جائے گا تا کہ آغا گل جو کہ دن کے اوقات میں بہرام کی تیمارداری کا فریضہ انجام دے رہے تھے، گھر آ کر آرام کر سکیں۔

”ہاں، یہ ٹھیک رہے گا۔ وہ تعلقات والے آدمی ہیں۔ یقیناً کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکالیں گے۔“ انہوں نے فوراً اس کی تائید کی۔

”بس تو پھر آپ ذرا میرے لیے ایک کپ گڑا گرم چائے بنا دیں۔ میں تب تک تیار ہو جاتا ہوں۔“ وہاں سے کہہ کر خود تیار ہونے چلا گیا۔ تیار ہو کر آیا تو چائے تیار تھی اور ساتھ ہی ایک کھانے کا ڈبا بھی۔

”یہ کیا ہے بی بی؟“ ”کھانا ہے۔ خود بھی کھانا اور اپنے انکل بنجامن کو بھی کھانا۔ میں نے شلیم گوشت بنایا ہے جو تمہارے انکل بنجامن کو بہت پسند ہے۔“ انہوں نے اسے بتایا تو اس نے اعتراض مناسب نہیں سمجھا اور چائے پی کر ڈبے سمیت گھر سے روانہ ہو گیا۔

”عمار..... بیک ہوائے اتم سوئے نہیں جواتی جلدی چلے آئے؟“ بنجامن نے اسے دیکھا تو بہت اپنائیت سے پوچھا۔

”بس کچھ کرم فرماؤں کی مہربانی ہے جو سکون سے سونے بھی نہیں دیتے۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

”یہ کس کا ذکر ہو رہا ہے؟“ بنجامن نے اپنی ایک بھوں اچکا کر پوچھا۔

”عزت مآب وجے کانت صاحب!“ ”وجے.....! کیا وجے نے تمہیں بلوایا تھا؟“

”اللہ نے چاہا تو سب خیر ہوگی۔ آپ بس دعا کرتی رہیں۔“ نیلی خود بھی پریشان تھی لیکن اسے تسلی دی۔ اس خاندان نے اسے بہت سہارا دیا تھا۔ وہ جو موی کے بعد اپنی زندگی کو بالکل بے کار اور بے مقصد سمجھنے لگی تھی، ان لوگوں کے درمیان رہ کر خصوصاً اعظم کی وجہ سے بہت بہل گئی تھی۔ عالم شاہ کا پروپوزل بھی اس کے سامنے تھا۔ موی کی جگہ کسی اور کو دینا اس کے لیے بہت ٹھن تھا لیکن یہ تو تسلیم کرنا پڑتا تھا کہ عالم شاہ ایک اچھا اور مہذب انسان ہے جس کا ساتھ کسی بھی لڑکی کے لیے خوش قسمتی سمجھا جاتا۔

”مولیٰ بھی آپریشن تھیر میں جاتے جاتے ادا سائیں کا پوچھتی رہی تھی۔ بعد میں تو دواؤں کے اثر سے اسے کسی بات کا ہوش نہیں رہا لیکن پوری طرح سے ہوش میں آئے گی تو لازماً ادا سائیں کو پوچھے گی۔“

”اللہ نے چاہا تو اس وقت تک وہ لوگ واپس آجائیں گے۔“ خوش امید سے دل کو بہلانے کے سوا اور کیا کیا جاسکتا تھا۔

”ان شاء اللہ!“ سبل نے دل کی گہرائی سے کہا پھر اس سے بولی۔

”ذرا مجھے سہارا تو دو۔ مجھ سے لینا نہیں جا رہا۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔“

”جی اچھا۔“ نیلی فوراً اس کی مدد کے لیے کمر بستہ ہو گئی۔

”بہت شکریہ۔ تمہارے آنے سے زندگی بہت آسان ہو گئی ہے۔ تب ہی تو ہم سب چاہتے ہیں کہ تم ہمیشہ ہمارے ساتھ رہو۔“ بستر پر تکیوں کے سہارے بیٹھتے ہوئے اس نے اپنی پرانی خواہش دہرائی۔

”آپ کو خدمت گاروں کی کیا کمی۔ ایک اشارے پر دسیوں لوگ خدمت کے لیے تیار کھڑے ہوتے ہیں۔ اسپتال میں دیکھا تھا میں نے خدیجہ کو۔ مولیٰ کو کسی کالج کی گڑیا کی طرح سنبھال رہی تھی۔“ اس نے سرمد کی مگیٹر کا حوالہ دیا۔

”خدمت گاروں کی بات الگ ہوتی ہے اور فیملی ممبر کی بات اور۔ بے شک ہمارے ملازمین کی اکثریت بہت وفادار ہے لیکن تمہیں تو ہم فیملی ممبر بنانا چاہتے ہیں نا۔ اب تم اسے میری خود غرضی ہی سمجھ لو لیکن اعظم کے لیے جیسی محبت میں نے تمہاری آنکھوں میں دیکھی ہے، میری خواہش ہے کہ تم ہمیشہ اس سے قریب رہو۔“ اس نے لجاجت سے نیلی کا ہاتھ تھام لیا۔

بنجامن نے حیرت سے پوچھا۔

”خود بنفس نفیس تمہرے تشریف لائے تھے۔“ اس نے اطلاع دی اور پھر اپنی اور وجے کی ملاقات کی ساری تفصیل کہہ سنائی۔

”لگتا ہے دماغ خراب ہو گیا ہے اسٹوڈنٹ کا۔ میرے پاس بھی کال آئی تھی اس کی۔ میں سمجھا ایسے ہی روٹین کی کارروائی کر رہا ہے۔ مجھے معلوم ہوتا کہ تم پر شک کر رہا ہے تو اسی وقت جھاڑ کر رکھ دیتا۔“ بنجامن کو غصہ آیا۔

”آپ دیکھ لیں اس معاملے کو۔ بی بی بہت پریشان ہو گئی تھیں اس لیے میں آپ کے پاس چلا آیا۔“

”بہت اچھا کیا۔“

”بی بی نے آپ کے لیے یہ شلجم گوشت بھی بھجوا دیا ہے۔“ اس نے کھانے کا ڈبا بنجامن کے حوالے کیا۔

”رشوت تو بہت زبردست بھجوائی ہے بھابی نے۔ اب تو میں وجے کا دماغ بالکل ٹھکانے پر لے آؤں گا۔“ کھانے پینے کا شوقین بنجامن ڈبا دیکھ کر ہل اٹھا۔ معاذ اس کے اس انداز پر مسکراتا ہوا اپنے کیمین کی طرف بڑھ گیا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے بعد بنجامن نے اسے دوبارہ اپنے پاس بلا لیا۔

”ہو گئی ہے بات میری۔ مہندر کی موت پر کہیں کسی کو کوئی تشویش نہیں۔ حادثے کو حادثہ ہی سمجھا گیا ہے لیکن وہ اسٹوڈنٹ وجے ایفی شینسی دکھا کر اعلیٰ افسروں کی نظروں میں نمبر بڑھانے کے چکر میں تھا اس لیے بال کی کھال نکالنے بیٹھا ہوا تھا۔ اب تمہیں تنگ نہیں کرے گا۔“

بنجامن کی طرف سے دی گئی یہ اطلاع اگرچہ تسلی بخش تھی لیکن وہ سمجھتا تھا کہ فی الحال اس کا محتاط رہنا ضروری ہے۔ غالب امکان تو یہی تھا کہ بنجامن کو مطمئن کر دیا گیا ہو لیکن کچھ خفیہ سائے مستقل اس کی نگرانی کرتے رہیں۔

☆☆☆

”آپ سوئیں نہیں ابھی تک؟“ اعظم کے سر کے نیچے تکیہ درست کرتے ہوئے نیلی نے محسوس کیا کہ اپنے بستر پر لیٹی ٹھل جاگ رہی ہے تو اسے مخاطب کیا۔

”ان حالات میں نیند آ بھی کیسے سکتی ہے۔ میرا تو یہ سوچ سوچ کر دل ڈوبا جا رہا ہے کہ جانے ادا سائیں اور سرمد کہاں اور کس حال میں ہوں گے۔“ سبل کا لہجہ بچھا ہوا تھا۔ اس کی طبیعت کے پیش نظر اس کے اصرار کے باوجود اسے مولیٰ کے ساتھ اسپتال میں نہیں رکھ دیا گیا تھا اور محافظوں کی اچھی خاصی بڑی تعداد کے ساتھ وہ لوگ حویلی پہنچا دیے گئے تھے۔

”آپ لوگوں کے خلوص اور اعظم کی محبت نے مجھے اس حوالے سے سوچنے پر راضی تو کر لیا ہے لیکن کبھی کبھی لگتا ہے ایسا سوچ کر میں مومی کے ساتھ بے وقائی کر رہی ہوں۔“ اس کے انداز میں بے چارگی تھی۔

”یہ کوئی بے وقائی نہیں ہے نیلوفر! مجھے یقین ہے کہ مومی کی روح بھی تمہیں آسودہ دیکھ کر خوش ہوگی۔ محبت کرنے والے کبھی خود غرض نہیں ہوتے۔ ان کی سب سے پہلی ترجیح اپنے محبوب کی خوشی ہوتی ہے۔“ نکی نے اسے سمجھایا۔ وہ جواب دینے کے بجائے موضوع بدل گئی۔

”یہ سب چھوڑیں اور مجھے بتائیں کہ آپ نے اپنے بارے میں کیا سوچا ہے؟ اب ہمیں رہیں گی یا موٹل کی طبیعت ٹھیک ہونے کے بعد باقی علاج کے لیے چین واپس جائیں گی؟“

”میں تو مستقل یہیں رہنا چاہتی ہوں۔ ایک خواب ہے میرے دل میں کہ اپنے گاؤں میں اسکول کے ساتھ ساتھ کالج بھی بنواؤں تاکہ یہاں آس پاس کے بچوں کو آسانی ہو جائے اور پڑھنے کے لیے شہر نہ جانا پڑے۔“

”یہ تو بہت اچھا خیال ہے۔“ نکی نے اسے براہ۔ ”بس دعا کرو کہ پورا بھی ہو سکے اور تقدیر مجھے کہیں اور اڑا کر نہ لے جائے۔ کیا کیا نہیں دیکھ لیا میں نے بچپلے کچھ عرصے میں۔ ان برف زاروں میں بھی رہ آئی ہوں جہاں جانے کا کبھی تصور نہیں کیا تھا۔“ اس کے ذہن میں بھکشوؤں کے ٹھکانے کی تصویریں گردش کرنے لگیں اور پھر ایک ایسی تصویر یادداشت میں ابھری کہ اس پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔

”کیا ہوا؟ آپ ٹھیک تو ہیں نا؟“ نکی نے اس کے اندر آنے والی تہدیلی کو محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

”میں تمہیں ایک بات بتانا چاہتی ہوں۔ پتا نہیں تمہیں سن کر یقین آئے گا یا نہیں۔“

”کیوں نہیں آئے گا یقین۔ آپ بتائیں تو سہی۔“

”جب ہم اس برف زار میں پھنسے ہوئے تھے اور میں شدید بیمار حالت میں ڈاکٹر یوان سنگ کے زیر علاج تھی تو میں نے وہاں اس غار میں بہت عجیب سی چیز دیکھی تھی۔ سچ بتاؤں تو میں آج تک کنفیوز ہوں کہ جو میں نے دیکھا، وہ کوئی حقیقت تھی بھی یا صرف میرا وہم یا بیماری میں دکھائی دینے والا کوئی بھیا تک خواب تھا۔“ کم مسمی بولتی نکی نے نکی کو جھس میں جھلا کر دیا۔

”آخر ایسا کیا دیکھا تھا آپ نے وہاں؟“ اس نے

کچھ بے قراری سے پوچھا۔

”برقانی آدمی!“

”برقانی آدمی۔ مطلب جی؟“ نکی کا منہ کھل گیا۔

”ہاں۔“ نکی نے اثبات میں سر ہلایا۔

”وہ برقانی آدمی ہی تھا۔ قد قامت اور جتنے میں عام

آدمیوں سے کہیں زیادہ لمبا چوڑا اور بھاری بھر کم۔ اس کے جسم پر ہلکے بھورے اور سرخی مائل سے لے لے بال تھے۔“

”ہو سکتا ہے وہ گوریلا، مین مانس یا اسی طرح کا کوئی دوسرا جانور ہو۔“ نکی نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

”نہیں۔“ نکی نے سر کو فٹی میں حرکت دی اور زور دے کر بولی۔

”وہ برقانی آدمی ہی تھا۔ وہاں اس کے لیے کسی نے

جی کا لفظ بھی استعمال کیا تھا۔ وہ بالکل اچانک ہی میرے

سامنے آ گیا تھا۔ سب سمجھ رہے تھے کہ میں غنودگی میں ہوں

لیکن میں نے اسے واضح طور پر دیکھا تھا اور ڈاکٹر یوان

سنگ کو بھکشوؤں کو ڈانٹتے ہوئے بھی سنا تھا۔ ان کی زبان تو

مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی لیکن اتنا اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ جی کے

اس طرح نکل آ جانے پر ناراض ہو رہے ہیں۔“

”اف میرے خدا! مجھے تو یقین نہیں آ رہا کہ برقانی

آدمی سچ سچ وجود رکھتا ہے۔ میں تو اسے بس قلموں اور

کہانیوں کا ایک گھڑا ہوا کردار ہی سمجھتی تھی۔“ نکی کے

چہرے پر اس کی دی اطلاع نے حیرت اور بے یقینی کے

رنگ بکھیر دیے تھے۔

”میرا بھی ایسا ہی کچھ خیال تھا۔ اسی لیے کبھی کسی سے

ذکر نہیں کیا۔ اب خیال آتا ہے، کم از کم اداسا میں یا سکاڈ کو تو

بتانا چاہیے تھا۔ آخر کوئی تو وجہ ہوگی جہینوں کے یوں خیر طور

پر جی کو اپنے پاس رکھنے کی۔“

”میں نے اس بارے میں کہیں ایک آرٹیکل پڑھا

تھا۔ اس آرٹیکل میں لکھا تھا کہ بت کی دور دراز خانقاہوں

میں جی جیسے الماء، مٹی، کانک می یا میگو وغیرہ بھی کہا جاتا ہے

کے حلقے کچھ ثبوت موجود ہیں۔ کہا جاتا ہے ان خانقاہوں

میں جی کے مختلف اعضا اور کھالیں وغیرہ محفوظ ہیں لیکن وہاں

موجود راہب کی کو ان تک رسائی نہیں دیتے۔ ان کے

نزدیک وہ مقدس چیزیں ہیں جن تک عام آدمی کو رسائی دینا

یا سائنس دانوں کو ان کے تجزیے کا موقع دینا بے ادبی میں

شمار ہوتا ہے اس لیے یہ معاملہ ابھی تک تاریکی میں ہی ہے۔

شاید راہبوں کے اس رویے کی وجہ سے ہی ڈاکٹر یوان سنگ

اور ان کی ٹیم نے اپنے پاس جی کی موجودگی کو خیر رکھا ہو۔

نا قابل برداشت بنارہا تھا، اس پر سے فضا میں بسی مچلی کی
بُو۔ اس بُو نے تو طبیعت میں تلاہٹ ہی پیدا کر دی تھی۔
”یہاں سے نکلنے کی کوئی ترکیب تو مسلسل سوچ رہا
ہوں۔ کچھ کچھ بات ذہن میں آئی بھی ہے۔ بس اللہ سائیں
کامیابی دے دے۔“

”کیا سوچا ہے؟“ سرد کے جواب نے اسے خوش
کر دیا اور دبے دبے جوش سے پوچھا۔ گفتگو ان کی بہت
دھیمی سرگوشیوں میں ہو رہی تھی۔ اگر باہر کوئی شخص کان لگا کر
سن رہا ہوتا یا کمرے میں کوئی خفیہ مائیکروفون لگا ہوتا تو تب
بھی ان کی گفتگو سنی نہیں جاسکتی تھی۔

”سب سے پہلے تو ہمیں خود کو کھولنا ہوگا۔“ سرد اسے
سرگوشی میں بتانے لگا کہ وہ کس ترکیب سے خود کو آزاد
کر داسکتے ہیں۔

”یہ تو بہت سامنے کی بات تھی یا راہمیں پہلے کیوں
نہیں سوچیں۔“ ترکیب سن کر عالم شاہ نے افسوس کا اظہار کیا
جس پر سرد محض مسکرا کر رہ گیا۔

”چلو پھر شروع کرتے ہیں۔ پہلے ہی بہت وقت
ضائع ہو گیا ہے۔“ عالم شاہ پر جوش تھا۔

طے شدہ طریقہ کار پر عمل کرنے کے لیے دونوں فرش
پر لیٹے لیٹے اس انداز میں گھومنے لگے کہ دونوں کی پشتیں
ایک دوسرے کے مقابل آجائیں۔ دونوں کے دونوں ہاتھ
پشت پر بندھے تھے اور دونوں پیر بھی رسیوں سے جکڑے
تھے اس لیے یہ چھوٹا سا کام بھی تھوڑا سا دشوار ثابت ہوا لیکن
بہر حال وہ کامیاب ہو گئے۔

”پہلے میں تمہارے ہاتھ کھولوں ہوں۔“ عالم شاہ نے
فیصلہ سنایا تو سرد کو خاموشی اختیار کرنا پڑی۔ بغیر دیکھے بہت
تکنیک سے لگائی گئی مضبوط گرہوں کو انگلیوں سے ٹٹول کر
محض اندازے کی بنیاد پر کھولنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔
عالم شاہ کانٹوں کو ٹٹول رہا لیکن کوئی سراہا تھ نہ آیا۔

”یہ تو کچھ پہلے ہی نہیں پڑ رہا یا را“ اسے اعتراف کرنا پڑا۔
”مجھے کوشش کرنے دیں سائیں!“ سرد نے
درخواست کی۔ اصل میں جابی سے ملاقات کے وقت جب
ان کے پیر آزاد کر کے انہیں اس کے پاس لے جایا گیا تھا تو
وہ عالم شاہ سے چند قدم پیچھے کھڑا رہا تھا اور اس وقت اس
نے ری کو لگائی گئی کانٹوں کو ٹٹولنے دیکھا تھا۔

”چلو تم ہی کوشش کر دیکھو۔“ عالم شاہ نے اسے موقع
دیا۔ سرد کی انگلیاں فوراً حرکت میں آئیں۔ انگلیوں کی
پوروں سے کانٹوں کو ٹٹولتے وہ اپنی یادداشت پر بھی زور

ہوسکتا ہے وہ وہاں رہ کر اس پر خفیہ تحقیق اور تجربات کر رہے
ہوں۔“ نیلی نے اپنی معلومات کا اظہار کرتے ہوئے بہت
ذہانت سے ساری صورت حال کا تجزیہ کیا۔

”واقعی، ایسی کوئی بات ہوسکتی ہے۔ ادا سائیں
واپس آجائیں تو میں ان سے اس بات کا ذکر کروں گی۔“
سجل فوراً ہی اس سے متفق ہو گئی۔

”بالکل سچے گالیکن فی الحال تو سو جائیں۔ رات کافی
زیادہ ہو گئی ہے۔ آپ کا اس طرح جاتے رہنا اور پراپر
آرام نہ کرنا آپ کی صحت کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔“ نیلی
نے اسے ٹوکا۔

”ابھی سو جاتی ہوں۔ تم ذرا خدیجہ کو کال تو ملاؤ۔ میں
اس سے مول کی خیریت معلوم کر لوں۔“

”رات کافی زیادہ ہو گئی ہے۔ ہوسکتا ہے خدیجہ سو گئی
ہو۔“ نیلی جھجکی۔

”نہیں سوئی ہوگی۔ وہ خدیجہ ہے، سرد کی پسند اور
سرد کی پسند سرد سے کم جان نثار نہیں ہوسکتی۔ تمہیں معلوم
ہے یہ جو خدیجہ ہے نا، یہ ہماری جدی پشتی ملازمہ نہیں ہے۔ یہ
تو لطیف سومرو کی حویلی میں ملازمت کرتی تھی۔ صرف سرد کی
خاطر ہمارے پاس آگئی ہے اور دل و جان سے ہماری
خدمت کرتی ہے۔“ سجل کے لہجے میں بھرپور اعتماد تھا۔ نیلی کو
کال ملانا ہی پڑی۔ خدیجہ نے دوسری ہی ٹھنی پر کال ریسیو
کر لی۔ آواز کی مستعدی سے ظاہر تھا کہ وہ جاگ رہی تھی۔

”بی بی سجل شاہ سے بات کرو۔“ اس نے فون سجل کو
تھما دیا۔ وہ اس سے مول کی خیریت لینے لگی۔ ابھی بات
کر کے موبائل ہاتھ سے رکھا ہی تھا کہ کھٹی بجنے لگی۔ رات
کے اس پہر نامانوس نمبر سے آنے والی کال نے دونوں کو ہی
ٹھٹکا دیا۔ نیلی نے سجل کے اشارے پر دھڑکتے دل سے
کال ریسیو کر لی۔

☆☆☆

”کیا کرنا ہے یا را؟ اگر یونہی ہاتھ پر ہاتھ دھرے
بیٹھے رہے تو یہ گھٹیا اسٹریمر ہمیں انڈیا پنچادے گا اور یہ طے
ہے کہ اس بار ہم ان کے ہاتھ لگ گئے تو انہوں نے کسی
صورت ہماری جان نہیں بخشنی ہے۔“ جابی سے ملاقات کے
بعد وہ اپنے نفس میں واپس آگئے تھے اور انہیں لباس بھی
فراہم کر دیے گئے تھے جس سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ اب
ان کی روانگی کا وقت قریب ہے۔ کمرے کی درزوں سے
آنے والی روشنی تو ویسے ہی بہت دیر غائب ہو گئی تھی اور کم
پاور کا بجلی روشنی والا بلب گندے سندے ماحول کو اور بھی

دے رہا تھا۔ عالم شاہ کے بندھے ہوئے ہاتھوں کا نقش ایک طرح سے اس کے دماغ پر ثبت تھا اور وہ اسی نقش کو پیش نظر رکھ کر انگلیوں کو حرکت دے رہا تھا۔ آخر کار اس کی انگلیوں نے اس پہلی گانٹھ کو پکڑ ہی لیا جس کے کھلتے ہی باقی ساری گانٹھیں یوں کھلتی چلی گئیں جیسے کسی نے انہیں کھل جاسم سم کے جادو کی الفاظ سے کھول دیا ہو۔

”تم نے تو کمال ہی کر دیا یارا!“ آزاد ہو جانے والے ہاتھوں کو ہلا جلا کر خون کی گردش کو رواں کرتے عالم شاہ نے پہلے سرمد کو سراہا پھر اس کے ہاتھ کھولنے لگا۔ چونکہ اب وہ دیکھ سکتا تھا تو اس بار کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ ہاتھ آزاد ہونے کے بعد دونوں نے اپنے اپنے پاؤں خود کھول لیے اور ان کا سن پن دور کرنے کے لیے پہلے ہاتھوں سے مساج کیا پھر دو چار بار پنجوں کے بل اچھل کر اطمینان کر لیا۔ یہ ساری کارروائی انہوں نے اتنی خاموشی سے انجام دی تھی کہ باہر معمولی سی آہٹ بھی سنائی نہیں دی تھی۔ خود کو جسمانی طور پر فٹ کر لینے کے بعد وہ آگے کی کارروائی کے لیے تیار تھے۔ عالم شاہ نے سرمد کے ہاتھ پیروں کے گرد سی کو اس طرح لپیٹا کہ پہلی نظر میں وہ بندھے ہوئے نظر آئیں لیکن ضرورت پڑنے پر ایک ہی جھٹکے سے آزاد بھی کیے جاسکیں۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے زور زور سے پکارنا شروع کر دیا۔

”کوئی ہے..... کوئی ہے تو ہماری مدد کرو۔ دیکھو یہ میرے ساتھی کو کیا ہو گیا ہے۔ خالو! کوئی تو آؤ اور آکر اسے سنبھالو۔ جانے تم نے اس غریب کو کھانے میں کیا کھلادیا ہے کہ جب سے کھانا کھایا ہے، پیٹ درد کر رہا ہے اور اب التلیاں بھی شروع ہو گئی ہیں۔“ عالم شاہ واویلا کر رہا تھا اور سرمد دروازے کی طرف پشت کیے فرش پر گھٹنوں کے بل آگے کی طرف جھکا حلق سے ایسی آوازیں نکال رہا تھا جیسے اسے زوردار التلیاں ہو رہی ہوں۔

”کیا ہو گیا ہے بے؟ کس کی ماں مر گئی ہے؟“ ان کا شور سن کر باہر سے کسی نے بدتمیزی سے پوچھا۔

”تیری ماں مر گئی ہے۔ آکر لاش اٹھالے۔“ عالم شاہ نے اسے مشتعل کرنے کے لیے روانی میں ایک ساتھ کئی گالیاں دے ڈالیں۔ اصل میں وہ ایک بالکل بند ڈبے نما کمرہ تھا جس سے اخراج کے لیے دروازے کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ اس دروازے کو طاقت کے بل پر توڑ کر باہر نکلنے کی پوزیشن میں نہیں تھے اس لیے واحد حل یہی تھا کہ کسی تدبیر سے دروازہ کھلوا یا جاتا اور پھر موقع کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جاتی۔

”بکو اس کرتا ہے..... میں تیری آنے والی نسلوں کو بھی مٹا دوں گا۔“ حسب توقع مخاطب مشتعل ہو گیا۔ یہ تو وہ لوگ پہلے ہی نوٹ کر چکے تھے کہ وہاں موجود سارے لوگ نہایت گھٹیا درجے کے غنڈے موالی ہیں جنہیں جس کے سونے لگا کر مار دھاڑ کرنے اور دو نمبریاں کرنے کے سوا کچھ نہیں آتا۔ وہاں اصل منصوبہ بندی کرنے والا بندہ جامی تھا اور ظاہر ہے وہ اس طرح کے معاملات نہیں دیکھتا تھا۔

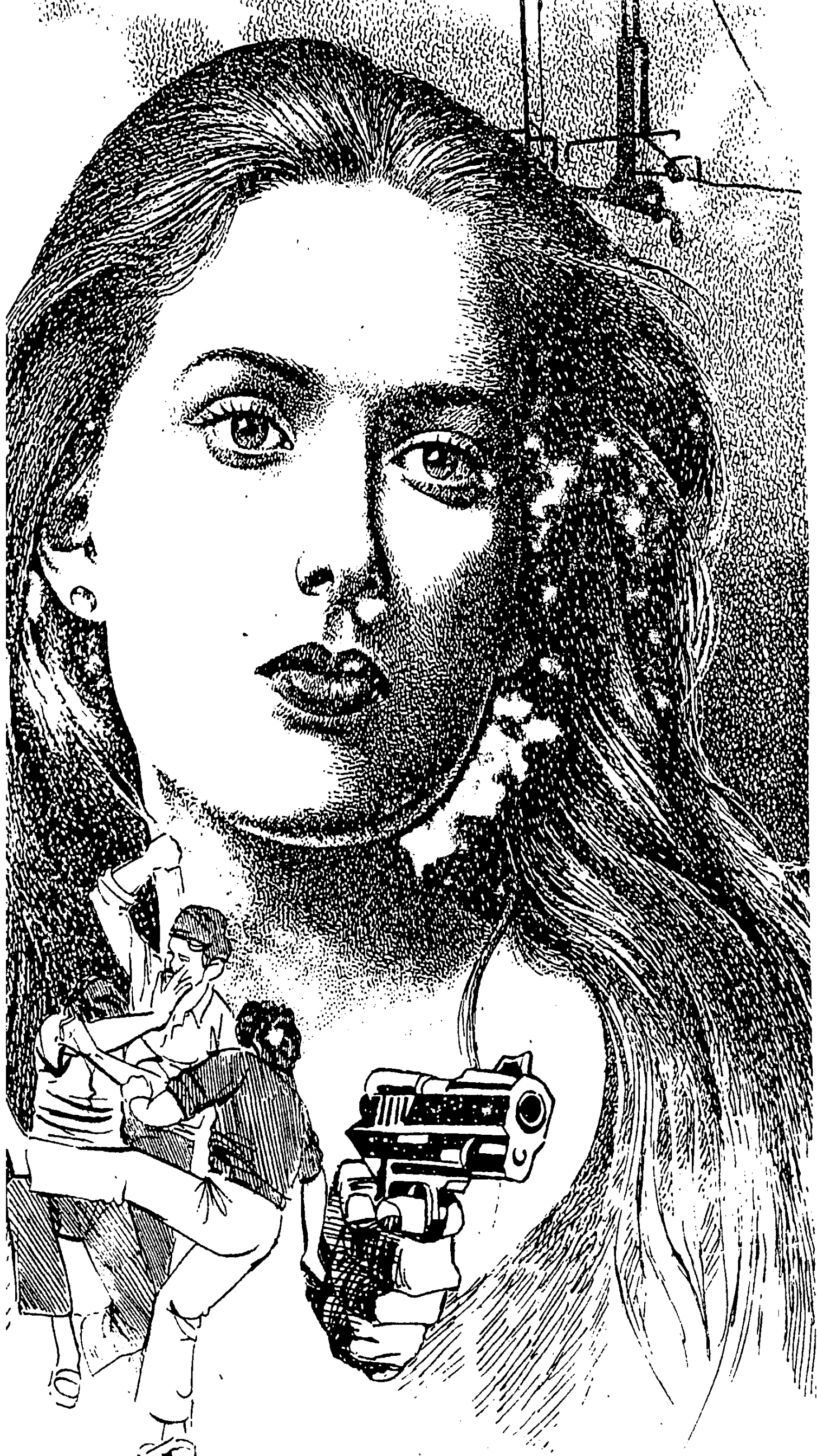
”نسلوں کو بعد میں مٹانا پہلے اس گندگی کو صاف کر اور میرے ساتھی کو کوئی دوا دار دے ورنہ یہ ادھر ہی ٹپس ہو جائے گا اور تمہاری ڈیل ادھوری رہ جائے گی۔“ اس نے احساس دلایا کہ انہیں جو بتو ق ستر کرنا ہے اس کے لیے صحت کتنی ضروری ہے۔ آخر کار حسب توقع نتیجہ برآمد ہو ہی گیا اور دروازے پر کھٹ پٹ سنائی دی۔ وہ دروازے کی بائیں جانب کسی چپتے کی طرح چو کنا گھات لگا کر کھڑا ہو گیا۔ جیسے ہی دروازہ کھلا اور آنے والے نے اندر قدم رکھا، اس نے وہی رسی جسے ان کے ہاتھ پیر باندھنے کے لیے استعمال کیا گیا تھا، اس کی گردن میں ڈال دی۔ اس نے بھڑک کر خود کو بچانے اور جوابی وار کرنے کی کوشش کی لیکن عالم شاہ کی مضبوط گرفت میں پھڑپھڑا کر رہ گیا اور اس کی گن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گئی۔ اپنی جگہ چوکس سر با فوراً گن پر چھپا لیکن یہاں ان سے اندازے کی ایک غلطی ہو گئی تھی۔ انہیں یہی لگا تھا کہ آنے والا اکیلا ہے لیکن وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے پیچھے اس کا ایک ساتھی بھی موجود تھا۔ اس نے گڑبڑ ہوتی دیکھ کر فوراً ہی اپنی گن سیدھی کی اور فائر مار دیا۔ اگر سرمد نے اپنی جگہ چھوڑ نہ دی ہوتی تو اس فائر کی زد میں آ جاتا۔ اب اس نے فوراً ہی باہر موجود شخص پر جوابی فائر جھونکا۔ اس شخص نے ایک طرف ہو کر خود کو بچالیا اور آڑ میں رہتے ہوئے دو تین مزید فائر کیے۔ گولیاں کھلے دروازے سے اندر آئیں ضرور لیکن سرمد اور عالم دونوں ہی ایسے مقام پر تھے کہ گولیوں کی ان تک رسائی ممکن نہیں تھی۔ اسی طرح وہ خود بھی باہر موجود شخص کو نشانہ نہیں بنا سکتے تھے۔ ویسے ابھرنے والی آوازوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ باہر اب وہ شخص اکیلا ہے بھی نہیں۔ فائرنگ کی آوازیں کر یقیناً اس کے ساتھی دوڑے چلے آئے تھے۔

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نوجوان
کی داستان جو غلط کاروں کے لیے فضب
ناک تھا باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیے



زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تندوتیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابل شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پر عزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جا رہے تھے... اس کی زندگی جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... یہ خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی یہ قرار یوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تار عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ واردات قلب بھی اس کے فرض کی راہ دیر، حائل نہ ہوسکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تحیر انگیز داستان



معاذ ایک ذہین لیکن متکون مزاج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جوائن کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ انسٹی ٹیوٹ سے واپس آ رہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو سڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی نڈر فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشری نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بشری ماس کمیونی کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم وغیرہ لکھتی ہے۔ معاذ بشری کو بہ حفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کر دیتا ہے لیکن جن رئیس زادوں سے اس نے ان کا شکار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ایک دن وہ معاذ کو بے خبری میں گھر کر بری طرح زد و کوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دے دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس نہ آنے پر انتقامیہ کے افراد، پولیس اور ریسیکوریڈز کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جوجی کی جھونپڑی میں پاتا ہے۔ جوجی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ وہاں رہتے ہوئے جوجی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے، جوجی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نواز کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے پراسرار علم سکھانے کی ہامی بھر لیتا ہے اور معاذ اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ادھر جائے وقوعہ سے ملنے والے معاذ کے کمرے سے جب تصویریں نکلوائی جاتی ہیں تو ایک ایسی تصویر بشری کی نظر میں آ جاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانکنا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پروجیکٹ کے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشری تحقیق کر رہی تھی۔ بشری کے اپنے والد جرنلسٹ ہوتے ہیں۔ اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشری کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ مدد سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باذل نامی غنڈے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشری انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دنوں میں ہی معاذ واپسی کا ارادہ کرتا ہے تاہم ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا عرفان اللہ اور یزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو وقاص نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باذل اچانک بشری کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر دیتا ہے۔ معاذ کو واپس لانے کے لیے اس کے بھائی کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کر کے اسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات کے نہ بتانے پر اس کے بھائی کا ایک گروہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشری بھی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہو جاتی ہے۔ معاذ کے دوست عالم شاہ کے بہنوئی کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ کئی فنون میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے پہنا کر کر کے اس کے دماغ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ فیضو سے حاصل انوکھے علم کی بدولت ان کا معمول نہیں بنتا۔ عالم شاہ اور اس کا نوکر سرد، باذل کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ عالم شاہ، باذل کی قید میں موجود ایک زخمی شخص کی مدد سے وہاں سے فرار ہو جاتا ہے۔ ادھر بشری دئی پہنچ جاتی ہے۔ وہاں وقاص اسے باربی کے روپ میں پہچان لیتا ہے۔ وہ سلطان کو مارنا چاہتی ہے۔ ادھر عالم شاہ، باذل کی قید سے نکل کر اس کا پیچھا کرتا ہے۔ وہ وہاں معاذ کو دیکھتا ہے۔ معاذ کو اس کے گھروالوں سے ملنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ وہ ایک مشن پر سونیا کے ساتھ انڈیا روانہ ہوتا ہے تاہم کچھ لوگ سکھ یا تریوں سے بھری بس کو پرغمال بنا لیتے ہیں۔ معاذ اور سونیا خان کے تمام افراد کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔ عالم شاہ، کل اور سرد انڈیا روانہ ہو جاتے ہیں۔ گھر پہنچے پر پولیس کی ریڈ ہوتی ہے اور وہ عالم شاہ اور سرد کو لے جاتے ہیں۔ عالم شاہ اور سرد کو تشدد کا نشانہ بنا کر ویرانے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ واپس اپنے میزبانوں کے ہاں پہنچ جاتے ہیں۔ انہیں پتا لگتا ہے کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں اجالا اور اس کا عاشق شامل ہوتے ہیں۔ وہ چھپ کر ان کی باتیں سن رہا ہوتا ہے۔ تاہم وہاں مارا ماری ہوتی ہے اور اجالا کا عاشق مارا جاتا ہے۔ پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ ان کے کرن انہیں اپنے دوسرے خفیہ ہنگامے پر پہنچا دیتے ہیں۔ وہ وہاں سے بحفاظت نکل جاتے ہیں۔ ادھر معاذ ایک مشن میں زخمی ہو جاتا ہے اور اسے ہندو سادھو اپنی کتاب میں لے جاتا ہے۔ سونیا کے آدمی معاذ کو تلاش کرتے ہیں مگر ناکام ہو جاتے ہیں۔ ادھر عالم شاہ اور سرد خفیہ ذریعے سے بارڈر پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ دھریلے جاتے ہیں اور ”را“ کی قید میں پہنچ جاتے ہیں۔ بشری باذل کو مارنے کی کوشش میں خود نشانہ بن جاتی ہے۔ معاذ سادھو کی مدد سے ایک انڈین ہیروئن کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ وہیں اسے عالم اور سرد کی گرفتاری کا پتا چلتا ہے۔ معاذ ڈاکٹر فردوس سے ملتا ہے اور اسے کل کی مدد کرنے کا کہتا ہے۔ علینہ اور وقاص وغیرہ کو لالہ عیسیٰ ملک سے باہر نکال دیتا ہے۔ علینہ پاکستان میں ٹوبہ سے رابطہ کرتی ہے جو ان کے لیے مصیبت بن جاتا ہے۔ ٹوبہ پر تیزاب پھینک دیا جاتا ہے۔ وقاص، علینہ اور اس کے گھروالوں کو مار دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس معاذ کو دیوانائی شخص سے مدد لینے

کا کہتی ہے۔ معاذ اپنے کزن کو پاکستان کال کرتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ اس کے گھر والوں کو مار دیا گیا ہے۔ وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کی ٹھان لیتا ہے۔ ادھر ڈاکٹر فردوس کو اس کے سسرال والے کل کو بھگانے کی پاداش میں تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ معاذ، عالم اور سرمد کی رہائی کے لیے کارروائی کرتا ہے اور انہیں ”را“ کی قید سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن عالم اور سرمد کو دیو کے آدمی کسی دوسری جگہ پہنچا دیتے ہیں۔ سونیا معاذ کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ ادھر باذل ایک جگہ لالہ عیسیٰ کی موجودگی پر کارروائی کرتا ہے تاہم لالہ خود کو گولی مار کر ختم کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس کا انتقال ہو جاتا ہے۔ دیو گینگ ڈاکٹر فردوس کی میت اٹھنے پر وہاں فائرنگ کر دیتے ہیں۔ پولیس دیو کو گھیر لیتی ہے۔ معاذ دیو اور اس کے آدمیوں کو نکالنے کے عوض عالم کا پتا معلوم کر لیتا ہے۔ سونیا اور معاذ حیدر آباد نواب بدرالدین کی حویلی پہنچ جاتے ہیں۔ وہ نواب صاحب کی حویلی میں عالم اور سرمد کی رہائی کے لیے کارروائی کر کے انہیں رہا کر لیتے ہیں۔ وہ لوگ نئے ٹھکانے پر پہنچتے ہیں تو وہاں معاذ سے ملنے جا رہی ٹیم بھی آتا ہے۔ اسے معاذ نے ”را“ کی قید سے نکالا ہوتا ہے۔ جا رہا اور معاذ، کل سمیت اسپتال جاتے ہیں اور پہچان لیے جانے پر پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ پولیس سے مقابلے کے بعد وہ ایک بستی میں پناہ کے لیے کھس جاتے ہیں۔ ادھر سونیا معاذ کی تلاش میں نکلتی ہے اور اسے بستی میں پہنچنے پر معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ معاذ اور جا رہا وغیرہ انوپ ٹائی فکس کے ساتھ اس کے مالک کے بنگلے میں قیام کرتے ہیں۔ سونیا بھی معلومات حاصل کرتی ہوئی مذکورہ بنگلے تک پہنچ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور سرمد بھی سونیا کا پیچھا کرتے ہوئے وہیں پہنچ جاتے ہیں۔ ادھر لالہ، وقاص، علیہ و دیگر لوگ زخمی ہوتے ہیں۔ وقاص حلیہ بدل کر گلو کا باڈی گارڈ بن جاتا ہے۔ وہ معاذ کو تلاش کرنے کے لیے انڈیا روانہ ہوتا ہے۔ وہاں اس کی گل خان سے ملاقات ہوتی ہے اور معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ سونیا، معاذ اور دیگر ساتھیوں سے مل جاتی ہے تاہم وہ جس بنگلے میں ہوتے ہیں وہ دشمن کا ہوتا ہے۔ دشمن سب کو بے ہوش کر کے کہیں لے جا رہے ہوتے ہیں کہ ان کی گاڑی کو حادثہ پیش آ جاتا ہے۔ ان سب کو جینی بھکشو طبی امداد دیتے ہیں اور ان سے پوچھ گچھ کی جاتی ہے۔ کل کی حالت تشویشناک ہوتی ہے اور اسے وہاں موجود ایک وید دیکھتا ہے۔ ادھر لالہ واپس اپنے لوگوں میں پہنچ کر انکیشن میں آ جاتا ہے۔ باذل، معاذ کا پیچھا کرتا ہے اور چینیوں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ معاذ چینیوں کے ساتھ مل کر دشمنوں کے خلاف کارروائی کرتا ہے۔ ادھر لالہ عیسیٰ، اعظم کو دشمن کی گرفت سے نکالنے کے لیے کارروائی کر دیتا ہے اور موسیٰ اور نیلی، اعظم کو نکالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ موسیٰ اور نیلی کی گاڑی پر حملہ ہوتا ہے تاہم مارا ماری کے بعد وہ صداقت شاہ کے پاس پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اعظم کو وہاں سے نکال لیا جاتا ہے اور دوسری جگہ منتقل کر دیا جاتا ہے۔ ادھر معاذ بیجنگ پہنچ جاتا ہے اور وہاں کے گرتا دھرتاؤں سے بات کر کے پاکستان پہنچنے کی اجازت چاہتا ہے۔ ادھر موسیٰ اور نیلی کو پولیس گھیر لیتی ہے اور فائرنگ میں موسیٰ مارا جاتا ہے۔ وہ اعظم کو لے جاتے ہیں اور نیلی زخمی حالت میں ان کے قبضے میں آ جاتی ہے۔ معاذ اور وی وغیرہ پاکستان پہنچ جاتے ہیں اور اعظم کی بازیابی کے لیے منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ ادھر باذل، لالہ کی قید سے بھاگ جاتا ہے۔ معاذ، ڈی ایس پی ظہیر کے بنگلے پر دھاوا بولتا ہے اور ڈی ایس پی کو قابو کرنے کے بعد اس سے معلومات لیتا ہے۔ باذل قید سے نکل کر مہناز کے پاس پہنچتا ہے اور اسے تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ نیلی قید میں موجود ظہیر کو ٹھکانے لگا دیتی ہے۔ بشریٰ کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور معاذ سارے معاملوں کو جلد حل کرنے کے لیے دشمن کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے مگر اس کے خیر خواہ اسے میڈم ایکس کے شکنجے سے نکال لیتے ہیں اور اعظم کو بھی بازیاب کر لیتے ہیں۔ زن ہو اسے اپنے ساتھ لے جاتی ہے اور وہاں کرنل سکندر بخت سے ملاقات ہوتی ہے۔ معاذ انہیں دشمنوں کے خلاف کارروائی کرنے کا کہتا ہے۔ باذل، بشریٰ کو لے کر انڈیا گراؤنڈ ہو جاتا ہے۔ ادھر وقاص باذل کا پتا چلانے کے لیے ایک کال گرل عیسیٰ کے گھر کارروائی کر کے باذل کے ٹھکانے پر پہنچ جاتا ہے۔ وہاں وی کے ساتھی اور کوئی اور گروپ حملہ کر دیتے ہیں۔ وی زخمی ہو جاتا ہے۔ ادھر باذل، عرفان اللہ کو گولی مار دیتا ہے اور خود بھی شدید زخمی ہو جاتا ہے۔ باذل کے ساتھی اسے ایک اسپتال کے آگے چھوڑ دیتے ہیں۔ وہیں وی اور بشریٰ بھی داخل ہوتے ہیں۔ معاذ باذل کو پہچان کر اسے بھی وہیں ایڈمٹ کر دیتا ہے۔ عرفان اللہ جاں بحق ہو جاتا ہے۔ صداقت شاہ اور ان کی اہلیہ کل کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ عالم، نیلی اور اعظم بھی وہیں ہوتے ہیں۔ کل اسپتال میں زیر علاج ہوتی ہے۔ باذل کو معذوری کی حالت میں ایک چوک پر پھینک دیا جاتا ہے۔ معاذ، وقاص کے ساتھ علیہ کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ اسے اگلے مشن پر جانا ہوتا ہے۔ سونیا قانون کی قید سے بھاگ نکلتی ہے۔ کل کی طبیعت بگڑ جاتی ہے۔ یو آن منگ، اینڈریو کے ذریعے کل کے آپریشن کی تجویز دیتا ہے۔ کل کا آپریشن کامیاب رہتا ہے تاہم اس کا ایک ہاتھ اور نچلا دھڑ ناکارہ ہو جاتا ہے۔ ادھر معاذ کشمیر پہنچ جاتا ہے۔ ایک کشمیری لڑکی کی مدد کرنے کی پاداش میں بھارتی سپاہی اسے گرفتار کرنے بنجاسن کی دکان پر ریڈ کرتے ہیں۔ تاہم پوچھ گچھ کے بعد اسے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ادھر کل کو خبر ملتی ہے کہ اس کی بہن کا پتہ کا آپریشن ہے۔ وہ سب وطن واپس آ جاتے ہیں۔ عالم اور سرمد کو محفوظ مقام پر منتقل کیا جا رہا ہوتا ہے کہ کچھ لوگ انہیں یرغمال بنا لیتے ہیں، ادھر سونیا کی سچائی جانچنے کے لیے تنظیم کے لوگ اسے مار چر کرتے ہیں تاہم وہ اس آزمائش میں پوری اترتی ہے۔ معاذ پری دس کے اہل خانہ کے کل کا بدلہ لینے کے لیے جا رہا ہے ساتھ منصوبہ بندی کرتا ہے اور وہ لوگ مہندر سنگھ قتل کر دیتے ہیں۔ عالم اور سرمد کو اغوا کرنے والے انہیں انڈیا کے حوالے کرنا چاہتے ہیں۔ عالم اور سرمد وہاں سے نکلنے کے لیے منصوبہ بناتے ہیں اور ان کے ساتھی کو نشانہ بناتے ہیں تاہم ان کے مزید ساتھی انہیں گھیر لیتے ہیں۔

عالم اور سرد انخوا کاروں سے فرار کے لیے ان کے ایک ساتھی کو نشانہ بنا چکے تھے اور اب انہیں گھیرنے والے انہیں خبردار کر رہے تھے۔

”تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ ہتھیار ڈال کر خود کو ہمارے حوالے کر دو۔ تمہارے پاس صرف ایک گن ہے اور اس کے زور پر تم ہم سے مقابلہ نہیں کر سکو گے۔“ باہر سے بلند آواز میں وہ حقیقت بیان کی گئی جو خود ان کے اپنے ذہنوں میں بھی تھی۔ وہ وہاں پھنس چکے تھے اور ان کے پاس مقابلے کے لیے ایک عدد گن کے علاوہ بس ان کا نیم بے ہوش ساتھی ہی موجود تھا۔ وہ اپنے قبضے میں آئے اس شخص کو ڈھال بنا کر نکلنے کی کوشش کرتے تو کامیابی کے امکانات کے بارے میں اندازہ نہیں لگا سکتے تھے۔ عموماً اس طرح کے آدمیوں کی زندگی کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی اور یہی تصور کیا جاتا ہے کہ یہ وقت پر کام آنے کے لیے ہی تھے۔ اٹک شوکی کے لیے زیادہ سے زیادہ گھر والوں کو تھوڑی رقم بھجوانا کافی سمجھا جاتا ہے۔

”مقابلہ نہ بھی کر سکے تو تمہیں تمہارے ارادوں میں کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔ ہمیں تم سے لڑ کر مرنا قبول ہے لیکن یہ منظور نہیں کہ تم ہمیں بھارت کے حوالے کر کے ہمارے ملک کی بدنامی کا سامان کر سکو۔“ اپنے قدموں میں پڑے ان کے ساتھی پر ایک نظر ڈال کر عالم شاہ نے مخاطب کو زد و نوک جواب دیا۔ وہ حقیقت میں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ بے شک موت آجائے لیکن اب بھارتیوں کے ہتھے نہیں چڑھتا ہے۔

”بس تو پھر مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔“ باہر سے جھلا کر خوفناک لہجے میں کہا گیا اور ایک دم ہی گولیوں کی بوچھاڑ اندر آئی۔ ان میں سے کچھ گولیاں دیواروں میں پھوست ہو گئیں اور کچھ کمرے میں رکھے کاٹھ کباڑ میں گھس گئیں۔ وہ دونوں ایک تو آڑ میں تھے، دوسرے گولیاں چلانے والوں کی انہیں نشانہ بنانے کی نیت بھی نہیں تھی۔ وہ صرف انہیں نفسیاتی دباؤ میں لینے کی کوشش کر رہے تھے اور اس تیز فائرنگ کی آڑ میں اندر آگستا چاہتے تھے۔ خود پر بے حد کنٹرول رکھنے والے سرد نے اس ساری صورت حال کو اچھی طرح سمجھا اور پوری طرح چوکنا داخل دروازے پر نظریں گاڑے رہا۔ جیسے ہی پہلے آدمی کی جھلک دکھائی دی، اس کی گن سے گولی نکلی اور وہ شخص الٹ کر پیچھے گر گیا۔ فوراً ہی دوبارہ گولیاں چلنے کی آواز سنائی دی۔

لیکن یہ کیا؟ کمرے میں تو کوئی گولی آئی ہی نہیں تھی۔

یکدم ہی انہیں احساس ہوا کہ یہ گولیاں ان کے مقابلین نے نہیں چلائیں بلکہ گولیوں کی آواز مکان کے باہر سے آئی ہے۔ جامی کے غنڈوں کو یہ احساس ان سے بھی پہلے ہو گیا تھا اور ان کے درمیان عجیب الجھل اور بھگدڑ سی کچ کچی تھی۔ مکان میں بھاگنے، دوڑنے، ایک دوسرے کو پکارنے اور ہدایتیں دینے کی آوازیں گونج رہی تھیں۔

”میں باہر نکل کر دیکھو سائیں؟“ دوطرفہ فائرنگ کی آوازوں سے کان پھٹ رہے تھے۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ جامی کے اس ٹھکانے پر کسی نے حملہ کر دیا ہے۔ بیرونی حملہ آوروں سے نمٹنے کے چکر میں وہ لوگ ان دونوں کو بھول گئے تھے اسی لیے سرد کے دل میں یہ خیال آیا تھا۔

”احتیاط سے۔ کچھ نہیں معلوم کہ اب بھی کوئی باہر گھات لگائے بیٹھا ہو۔“ عالم شاہ نے اسے تنبیہ کی اور خود اپنے قریب پڑے نیم بے ہوش شخص کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ اب کافی سنبھلا ہوا نظر آ رہا تھا اور شاید موقع کی تلاش میں ابھی تک دم سادھے پڑا تھا۔

”میں اس کو باندھتا ہوں، تم دروازے کی طرف توجہ رکھو۔“ اس نے جس رسی کو اس کے گلے میں ڈال کر اسے قابو میں کیا تھا، اسی کو کھینچا۔ اس موقع پر اس شخص نے مزاحمت کی کوشش کی اور اس پر ہاتھ ڈالنا چاہا۔ جواب میں عالم شاہ نے اس کی ٹھوڑی پر اتنی زوردار لات رسید کی کہ وہ کراہ کر رہ گیا۔ دوسری بار پوشش کا موقع دیے بغیر عالم شاہ نے ایک ٹھوک اس کی کٹھنی پر بھی رسید کر دی۔ وہ ٹن ہو گیا لیکن مزید دوسری سے بچنے کے لیے عالم نے اسے باندھ دینا ہی مناسب سمجھا۔ مجبوراً ہتھیار اٹھانا ان کی مجبوری تھی لیکن جان بوجھ کر انسانی خون سے ہاتھ رنگنے سے ہر موقع پر ہی گریز بھی کرتے تھے۔

جس دوران وہ یہ سب کر رہا تھا، باہر فائرنگ شد و مد سے جاری تھی اور مکان کے در و دیوار لرز رہے تھے۔ دوسری طرف سرد نے بھی اپنی پوزیشن سنبھالی ہوئی تھی اور مستقل دروازے پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

”تم لوگوں کو تنبیہ کی جاتی ہے کہ قانون نافذ کرنے والے اداروں نے تمہیں ہر طرف سے گھیر لیا ہے۔ ہماری طرف سے تمہیں پانچ منٹ کی مہلت دی جا رہی ہے۔ اس عرصے میں جو لوگ ہتھیار ڈال کر گرفتاری دے دیں گے، ان کے ساتھ خصوصی رعایت برتی جائے گی۔ دوسری صورت میں انجام بھانک ہوگا۔“ اچانک ہی فائرنگ کا سلسلہ رکا اور لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کیا جانے لگا۔ اس اعلان کو سن کر عالم اور سرد کے

ایک خستہ حال چہونکال کسر لے آیا۔ اس کے بعد اس نے بے ہوش پڑے آدمی کی قمیص کھینچ کر اتاری اور اسے چہو کے ایک سرے پر لٹاتے ہوئے بولا۔

”میں اسے ہاتھ بڑھا کر باہر کی طرف کھسکاؤں گا۔ باہر موجود شخص انسان کے دھوکے میں اس پر فائر کرے گا۔ بس تمہیں اسی وقت کام دکھانا ہے۔ اس کی پوزیشن کا تو تمہیں پہلے ہی اندازہ ہے۔“

”ٹھیک ہے سائیں!“ سرمد فوراً مستعد ہو گیا۔

”اپنی سیفٹی کا پورا خیال رکھنا۔“ وہ جانتا تھا کہ اس کے حکم کی تعمیل کے لیے سرمد سردھڑکی بازی لگا دے گا اس لیے اسے تنبیہ کرنا ضروری سمجھا۔

”میں خیال رکھوں گا سائیں!“ سرمد نے اسے یقین دہانی کروائی تو اس نے اپنے منصوبے پر عمل شروع کیا۔ قمیص تنگا چہو جس تیزی سے باہر دھکیلا گیا، اسی تیزی سے اس پر فائر کیا گیا۔ سرمد نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی اور اس تیزی سے فائر کیا کہ اس کے کیے فائر کی آواز پہلے فائر کی آواز کے ساتھ مدغم ہو گئی۔ فائرنگ کے شور میں زمین پر دھڑام سے کچھ گرنے کی آواز اگرچہ مدہم تھی لیکن ان دونوں نے سن لی۔

”لگتا ہے کام ہو گیا۔“ عالم شاہ نے تائیدی نظروں سے سرمد کو دیکھا۔

”بالکل سائیں!“ سرمد جو سر نکالے باہر جھانک رہا تھا، خوشی سے بھرپور لہجے میں بولا۔ اب ان کے پاس اس کمرے میں رکے رہنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ دونوں تیزی سے باہر نکلے۔ سامنے مرنے والے کی لاش پڑی تھی۔ حسن اتفاق سے گولی سیدھی اس کی کھوپڑی میں مچی تھی جب ہی اسے آواز نکالنے کا بھی موقع نہیں ملا تھا۔ عالم شاہ نے اس کے قریب گری اس کی گن اٹھالی۔

”میرے خیال میں اس طرف سے چلتے ہیں۔“ سرمد نے دائیں جانب جاتی ایک راہداری کی طرف اشارہ کیا۔ فائرنگ اب پھر شدت سے جاری تھی اور انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ اندر سے جواب دینے والوں کی زیادہ تعداد اس طرف ہے۔

”ٹھیک ہے، آجاؤ۔“ عالم نے جواب دیا اور وہ دونوں گرجہ چال چلتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ فوراً ہی انہیں تین شوٹر دکھائی دے گئے۔ وہ باقاعدہ ریت بھرے بوروں کے مورچے میں چھپ کر فائرنگ کر رہے تھے۔ یقیناً اپنے غیر قانونی دھندوں کی وجہ سے انہیں ہر وقت پولیس کے ریڈ کاڈر رہتا ہوگا اس لیے اس طرح کے انتظامات پہلے

چہروں پر رونق دوڑ گئی۔ اب تک وہ اس کشمکش میں تھے کہ حملہ آور جامی کا کوئی مخالف گروہ ہے یا قانون کے رکھوالے۔ اب یہ بات صاف ہو گئی تھی کہ قانون حرکت میں تھا اور وہ اپنے لیے مدد کی امید رکھ سکتے تھے۔

”یہاں سب حلال کی اولاد ہیں۔ ان میں سے کوئی تمہارا پڑھایا لالچ کا سبق سیکھ کر جامی سے غداری نہیں کرے گا۔“ اعلان کے فوراً بعد ہی انہیں جامی کی آواز سنائی دی۔ اس کی طرف سے بھی لاؤڈ اسپیکر ہی کا استعمال کیا گیا تھا۔ اس گندی سندی بستی میں بظاہر عام سے مکان میں رہنے والے جامی کے پاس یقیناً وسائل کی کوئی کمی نہیں تھی۔ حقیقتاً اس نے اپنے عام ہونے کا بہروپ بھرا ہوا تھا ورنہ وہ اس جگہ کا بے تاج بادشاہ تھا۔

”جس کو حرام موت مرنے کا شوق ہو، اس کے لیے ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ بہر حال ہماری طرف سے پانچ منٹ کی مہلت برقرار ہے۔ جو شخص چاہے اس سے اب بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔“ دوسری طرف سے نہایت سنجیدہ اور باوقار لہجے میں جو جواب دیا گیا، اسے سن کر عالم کو مزہ آ گیا۔ البتہ جامی کو یقیناً غصہ آیا تھا جیسا اس کی طرف سے دوبارہ فائرنگ کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ دوسری طرف بھی کوئی اصلی ونسلی بندہ بیٹھا ہوا تھا جس نے جامی کی اس حرکت پر اشتعال میں آ کر فائرنگ کا حکم نہیں دیا اور اپنی زبان پر قائم رہا۔

”میرا خیال ہے ہم کچھ کر سکتے ہیں۔“ سرمد نے عالم کے کان میں کہا اور تھوڑا آگے ہو کر بہت احتیاط سے باہر جھانکا۔ فوراً ہی اس پر فائر کیا گیا۔ اس نے جلدی سے سر کو پیچھے کر لیا لیکن بچ نکلنے میں اس کی پھرتی سے زیادہ قسمت کا دخل تھا۔ گولی بس چھ سینٹی میٹر کے فرق سے ہی اس کے قریب سے گزری تھی۔

”کیا کر رہے ہو یا ر! خیال کرو اپنا۔“ عالم شاہ نے گھبرا کر اسے ڈانٹا۔

”جی..... جی سائیں!“ سرمد کی فرمانبرداری ہر موقع پر قائم رہتی تھی۔

”کچھ دیکھا تھا کہ باہر کتنے لوگ ہیں؟“ اس بار اس نے نرمی سے پوچھا۔

”صرف ایک آدمی ہے سائیں! باقی تو یقیناً باہر والوں سے نمٹنے میں لگے ہیں۔“

”ٹھیک ہے تو پھر منٹ لیتے ہیں اس سے۔“ عالم شاہ نے کباڑ کو گھورتے ہوئے کہا اور پھر اگلے لمحے اس میں سے

سے کر رکھے تھے۔

”راکت لانچر مار کا کے! ان کی گاڑیاں اڑا دے۔“
دو چار راکٹ لانچر گریں گے اور فضا دھواں دھواں ہوگی تو ہمیں یہاں سے نکلنے کا موقع ملے گا۔“ یہ جابی کی آواز تھی جو انہیں قریبی کمرے کی کھڑکی سے سنائی دی تھی۔ جس کو ہدایت دی جا رہی تھی، اس نے یقیناً کانوں میں ائرفون قسم کی کوئی شے لگائی ہوئی تھی جب ہی وہ کمرے میں بیٹھے بیٹھے اسے ہدایت دے رہا تھا۔ عالم شاہ نے محتاط انداز میں کھڑکی کی طرف دیکھا۔ اس کا ایک ہٹ معمولی سا کھلا ہوا تھا۔ وہ دونوں اگر پورے قدم سے کھڑے ہو کر چل رہے ہوتے تو اندر سے دیکھنے والوں کی نظروں میں آجاتے۔ اس وقت وہ کھڑکی والی دیوار کے ساتھ بالکل لگ کر پنجنوں کے بل بیٹھے ہوئے تھے اور اندر سے انہیں صرف اسی صورت میں دیکھا جاسکتا تھا کہ دیکھنے والا سر باہر نکال کر پنچے کی طرف جھکا تا۔ برستی گولیوں میں ایسا کرنے کی جرأت کس میں تھی۔

”سیدھے ہاتھ پر کھڑا پہلا بندہ راکٹ لانچر چلانے کی تیاری کر رہا ہے۔“ سرمد نے بالکل اس کے کان میں گھس کر اسے آگاہ کیا تو اس نے توجہ دی۔ واقعی ایک بندہ راکٹ لانچر کو اپنے کندھے پر رکھ رہا تھا۔

”ختم۔“ اس نے صرف ایک لفظ کہا اور گولی چلانے کے لیے اپنا ہاتھ سیدھا کر لیا۔ سرمد نے بھی اس کی بات سمجھ لی۔ دونوں نے یکے بعد دیگرے تین گولیاں چلائیں۔ کس کی کون سی گولی ضائع گئی اور کس نے کام دکھایا، فی الحال یہ حساب کتاب لگانے کا وقت نہیں تھا۔ بس کام کی بات یہ تھی کہ ان کی چلائی گئی چند گولیوں نے کام دکھایا تھا اور اپنی پشت کی طرف سے بالکل بے فکر مورچے میں موجود تینوں افراد نیچے گر کر ترپنے لگے تھے۔

”بیچھے چلو۔“ عالم شاہ چلا یا اور جس تیزی سے انہوں نے کارروائی ڈالی تھی، اسی تیزی سے بیچھے ہٹ گئے۔ کسی نے کھڑکی میں سے ہاتھ باہر نکال کر انہیں نشانہ بنانے کی کوشش کی لیکن وہ پہلے ہی بیچھے ہٹ چکے تھے اور بیچھے ان کے پاس اس جگہ کے سوا جہاں سے وہ باہر نکلے تھے، واپس جانے کے لیے کوئی دوسری جگہ موجود ہی نہیں تھی۔ انہوں نے اندر گھس کر دروازہ بند کرنے کی کوشش کی لیکن ان کے کامیاب ہونے سے پہلے ہی اندرونی طرف سے کوئی بھاگتا ہوا آیا اور شدید طیش کے عالم میں ان پر اپنی سیسی آٹومیک مشین گن کا فائر کھول دیا۔ ایک ہی برست میں کئی گولیوں کی

بوچھاڑ ہوئی۔ سرمد جو خود کار طور پر ٹریگر پر انگلی کا دباؤ ڈال چکا تھا، اس کی گن سے آخری گولی نکلی اور حملہ آور کے سینے میں گھس گئی لیکن اس کا چلایا ہوا برست اپنا کام دکھا چکا تھا۔ کچھ گولیاں سرمد کے پیٹ اور کچھ عالم شاہ کے پچھلے دھڑ میں ٹھکتی چلی گئیں۔ اذیت کی انتہا پر ہوش و حواس کم ہونے سے قبل انہوں نے دائیں جانب سے ابھرتی بھاری بوٹوں کی آوازیں سنیں۔ انہوں نے دائیں جانب کا مورچا خالی کر دیا کر آنے والوں کے لیے راہ ہموار کر دی تھی۔

☆☆☆

”اوہو، کیا پڑھا جا رہا ہے شہزادے!“ وہ کمرے میں داخل ہوا اور بستر پر بیٹھ کر کسی کتاب کی ورق گردانی کرتے بہرام کو دیکھ کر اسے مخاطب کیا۔
”ڈاکٹر بیٹ نے میرے لیے کچھ کہانیوں کی کتابیں بھجوائی تھیں، بس وہی دیکھ رہا تھا۔“

بہرام نے کتاب پر سے نظریں ہٹاتے ہوئے اسے بتایا۔ اسپتال میں مستقل قیام سے اس کی صحت پر اچھا اثر پڑا تھا اور دورے پڑنے کا سلسلہ رک گیا تھا۔

”بہرام نے ان کتابوں سے مجھے دو کہانیاں بھی پڑھ کر سنائیں۔ واہ بھی واہ، کیا مزے کی کہانیاں تھیں۔ مجھے اپنا بچپن یاد آ گیا۔“ آغا جان جو ایک کاؤچ پر بیٹھے ہوئے تھے، مسکرا کر اسے بتانے لگے۔ وہ دن کے اوقات میں کچھ گھنٹوں کے لیے اسپتال آجاتے تھے اور محاذ کو زبردستی آرام کے لیے گھر بھجوا دیتے تھے۔ کہنے کو وہ دیکھ نہیں سکتے تھے لیکن ان کی موجودگی اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ دیکھ بھال تو اسپتال کا عملہ بھی کر لیتا تھا لیکن وہ سب سے اہم کام بہرام کے مزاج کو سنبھالنے کا کرتے تھے۔ ان کی محبت اور شفقت سے وہ بھل جاتا تھا اور دواؤں کے بے جا استعمال کی نوبت نہیں آتی تھی۔

”واہ بھی واہ۔ آپ کے تو خوب مزے رہے۔ اب میں بھی بہرام سے کہانیاں سن کر اپنے بچپن کو یاد کروں گا۔ کیوں بہرام اسناؤ گے نا مجھے کہانی؟“
”جی عمار بھائی! ضرور سناؤں گا۔“ بہرام نے شرمیلے لہجے میں اسے جواب دیا۔

”بس تو پھر ٹھیک ہے آغا جان! آپ بنجاسن انکل کو بتا دیجیے گا کہ آج ان کے کام کی باری بعد میں آئے گی، پہلے میں اور بہرام مزے کریں گے۔“

”تمہیں ہماری سفارش کی کیا ضرورت ہے میاں! ہم سے زیادہ تو اب تمہارے بنجاسن انکل تمہارا دم بھرتے

ہیں۔“ آغا جان بھی خوشگوار موڈ میں تھے۔

”بہرام.....!“ معاذ، بہرام کے بستر پر جا کر ٹکا اور بلند سرگوشی میں اس سے بولا۔

”مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ یہاں کوئی مجھ سے جیلس ہو رہا ہے؟“

”بس اب یہی وقت آتا رہ گیا تھا کہ والدین اولاد سے جیلس ہوا کریں گے۔“ آغا جان نے مصنوعی خفگی کا مظاہرہ کیا۔

”عمار بھائی آپ سے مذاق کر رہے ہیں آغا جان!“

بہرام سمجھا کہ وہ سچ سچ ناراض ہو گئے ہیں اس لیے غبرا کر خود وضاحت دینے لگا۔

”میں جانتا ہوں میرے بچے! بس ایسے ہی ذرا اسے چھیڑ رہا تھا۔“ آغا جان نے بہرام کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی۔

”یہ چھیڑ چھاڑ چھوڑیں اور اب گھر روانہ ہو جائیں۔ وہاں بی بی جان آپ کی راہ دیکھ رہی ہوں گی۔ یہ نہ ہو کہ دیر ہونے پر گھر جا کر جنگ چھڑ جائے۔“

معاذ اس بار بھی انہیں تنگ کرنے سے باز نہیں آیا۔ حقیقتاً اسے خود ان کی فکر تھی اور نہیں چاہتا تھا کہ وہ اندھیرا ہونے کے بعد گھر جائیں۔ بے شک ان کے لیے ہر وقت ہی ہر سواندھیرا رہتا تھا لیکن زرینہ بی بی کی تسلی اسی میں ہوتی تھی کہ وہ رات گہری ہونے سے پہلے گھر واپس آ جائیں۔

”جار ہا ہوں میاں! مجھے سب پتا ہے کہ تم اپنی ماں کی ہمدردی میں میری فکر میں دبلے ہوئے جا رہے ہو۔“ آغا جان جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے لیکن جاتے جاتے اسے جتا کر گئے۔

”کتنے اچھے ہیں نا آغا جان اور بی بی ان کی شفقت کی چھاؤں میں رہنا بہت بڑی خوش قسمتی ہے اور دیکھو یہ خوش قسمتی اب تمہارے حصے میں آئی ہے۔“ معاذ اب بہرام سے مخاطب ہوا۔ وہ زبان سے کچھ نہ بولا۔ صرف سر کو اثبات میں ہلا دیا۔ معاذ اس کی کیفیت سمجھ سکتا تھا۔ اس کو جو کچھ گنوا کر آغا جان اور بی بی کا ساتھ ملا تھا، وہ اتنا قیمتی تھا کہ اگر اسے ہفت اکلیم کی چابیاں بھی دے دی جاتیں تو اسے سودا منگائی لگتا۔

”انکل بنجامن مجھے اپنے کام کے سلسلے میں کشمیر سے باہر بھجوا رہے ہیں۔ مجھے بہت فکر تھی کہ آغا جان اور بی بی میرے پیچھے ایک بار پھر اکیلے ہو جائیں گے لیکن منع بھی نہیں کر پا رہا تھا کہ یہ آغا جان کی اپنی خواہش تھی۔ اب تم ہو تو

مجھے یہ تسلی رہے گی کہ ان دونوں کا خیال رکھنے کے لیے کوئی موجود ہے۔“ وہ جانتا تھا کہ آغا گل اور زرینہ عرصے سے اکیلے رہ رہے ہیں اور اس کا یہاں مختصر قیام ہے لیکن اب جبکہ یہاں سے جانے کے دن قریب آرہے تھے، اسے ان کی تنہائی کا سوچ کر تکلیف ہوتی تھی۔

”آپ بالکل بے فکر ہو کر جائیں عمار بھائی! میں آپ کے پیچھے آغا جان اور بی بی کا پورا پورا خیال رکھوں گا۔“ بہرام نے اسے تسلی دی۔

”صرف ان دونوں کا نہیں، اپنا بھی پورا پورا خیال رکھنا ہے اور خوب دل لگا کر پڑھنا ہے۔ تم اچھی طرح رہو گے تو ان دونوں کو خوشی ہوگی ورنہ وہ تمہاری فکر میں گھلتے رہیں گے۔“ اس نے اسے نصیحت کی۔

”میں ایسا ہی کروں گا بلکہ میں نے سوچ لیا ہے کہ میں پری دوش باجی کا خواب پورا کرنے کے لیے خود ڈاکٹر بنوں گا اور اپنے لوگوں کی خدمت کروں گا۔“ بہرام نے اپنے عزم کا اظہار کیا تو وہ سن کر خوش ہو گیا۔

”شاباش! یہ تو تم نے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے۔“ اس نے بہرام کی پیٹھ تھپتھپائی۔

”آپ مجھے میری کامیابی پر گفت بھجوا کر گئے؟“ بہرام کا یکدم کیا سوال اسے ٹھنکا گیا۔

”کیوں نہیں۔“ چہرے پر پھمکی سی مسکراہٹ سجائے وہ بہت مشکل سے بول سکا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اس سے ایک جھوٹا وعدہ کر رہا ہے لیکن جھوٹ کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ بہرام مزید کوئی مشکل سوال کرتا، دروازے پر ہونے والی دستک نے اس کی مشکل آسان کر دی۔

”پیشنت کی میڈیسن کا ٹائم ہو گیا ہے۔“ اس کے ”یس“ کے جواب میں ایک نرس دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوئی اور اسے اطلاع دی۔

”جی بہتر۔“ وہ بہرام کے بستر سے اٹھ گیا۔

”ڈاکٹر بٹ نے آپ کو اپنے روم میں بلایا ہے۔ وہ پیشنت کی کنڈیشن آپ سے ڈسکس کرنا چاہتے ہیں۔“ نرس نے مسکراتے ہوئے اسے دوسری اطلاع دی۔

”اوہ..... ڈاکٹر بٹ آج ابھی تک اسپتال میں موجود ہیں؟“ وہ اس اطلاع پر چونکا۔

”جی، کبھی کبھار خلاف معمول دیر تک بیٹھ کر پیشنت کی فائلز ڈیٹیل سے اسٹڈی کرتے ہیں اور گھروالوں سے ملاقات بھی کرتے ہیں۔“

”دیری گڈ!“ اس نے ڈاکٹر ناصر بٹ کو سراہا پھر

بولاً۔ ”میں ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کر کے آتا ہوں۔ پلیز، اتنی دیر کے لیے آپ میرے بھائی کا خیال رکھیے گا۔“
 ”ڈونٹ وری۔ ہم اسی کام کے لیے یہاں موجود ہیں۔“ نرس نے بے ساختگی سے اسے جواب دیا تو وہ مطمئن سا سر ہلا کر باہر نکل گیا۔ ڈاکٹر ناصر بٹ اپنے کمرے میں اسی کے منتظر تھے۔

”میں آج خاص طور پر تمہارے لیے یہاں رکا ہوں جوان!“ سلام دعا کے بعد انہوں نے اسے آگاہ کیا۔
 ”خیریت؟ کوئی خاص بات ہے کیا؟“ وہ چونکا۔
 ”ہمارے لیے یہ باتیں عام ہی ہو گئی ہیں۔ شاید تمہیں بھی اندازہ ہو لیکن میں نے سوچا کہ تمہیں مطلع ضرور کر دوں۔“
 ”ایسا کیا ہو گیا سر؟“ ڈاکٹر بٹ کی بات نے اسے الجھا دیا۔

”جس کمرے میں بہرام کو رکھا گیا ہے، اسے بگڑ گیا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے ایسا عملے کے کسی فرد کے ذریعے کیا گیا ہو یا کسی وزیر کو استعمال کیا گیا ہو۔ ہم چونکہ ایسے معاملات میں محتاط رہتے ہیں اور ہفتے میں ایک دو بار اسپتال کے ہر کمرے کو باقاعدہ چیک کیا جاتا ہے اس لیے یہ معاملہ ہماری نظر میں آ گیا۔“
 ”وجہ کانت.....“ ڈاکٹر بٹ کی بات سن کر اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔
 ”مطلب؟“

”یہ انڈین آرمی کا ایک آفیسر ہے جسے کسی وجہ سے شک ہو گیا ہے کہ مہندر سنگھ کی موت حادثاتی نہیں تھی، اسے قتل کیا گیا ہے اور وہ اس قتل کا شک مجھ پر کرتے ہوئے آج کل میرے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ آج کل مجھ پر مستقل نظر رکھی جا رہی ہے۔ بہرام کے کمرے کو بگڑ کرنا بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ مجھے اس سے ایسی ہی کسی حرکت کی توقع تھی اس لیے شروع سے محتاط ہوں اور آغا جان کو بھی اس حوالے سے متنبہ کر دیا تھا اس لیے امید ہے کہ وجہ کے ہاتھ ایسا کچھ نہیں آیا ہوگا کہ وہ مجھ پر شک کو مزید جاری رکھ سکے۔“ اس نے تفصیل ڈاکٹر بٹ کے گوش گزار کی جسے سن کر انہوں نے ایک زوردار ہچکارا بھرا پھر بولے۔

”مجھے اپنے ذرائع سے جتنی معلومات حاصل ہوئی ہیں، وہ تو یہی بتاتی ہیں کہ مہندر سنگھ کی موت پر کسی کو کوئی تشویش نہیں ہے اور اس کی موت کو بہت آسانی سے ایک حادثہ تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اس کی بیوی نے بھی اس بات کی

تصدیق کی ہے کہ گھر سے روانہ ہونے وقت وہ ٹھیک ٹھاک پی کر نکلا تھا اس لیے اس بات کا پورا پورا امکان ہے کہ نشتے کی زیادتی حادثے کا سبب بنی ہو۔“
 ”وجہ کانت بھی سرف اپنی چھٹی حس کی وجہ سے ٹھٹکا ہوا ہے اور تھوڑا شک اس رات کیمروں کی خرابی کی وجہ سے بھی ہے اسے۔“

”بس تو تم زیادہ سے زیادہ محتاط رہو۔ جب تمہاری طرف سے اسے کچھ نہیں ملے گا تو شک بھی خود بخود ہی ختم ہو جائے گا۔ اسی وجہ سے میں نے بہرام کا کمر بھی کلیر نہیں کر دیا ہے۔ جو جیسا ہے، چلنے دو، مایوس ہو کر وہ خود بخود ہی پیچھا چھوڑ دے گا۔“ انہوں نے اسے مشورہ دیا۔
 ”جی، یہ سوچا ہوا ہے میں نے بھی۔“ اس نے انہیں جواب دیا اور پھر سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔
 ”مزید کوئی بات؟“

”میری بات تو ختم ہو گئی ہے لیکن تمہارا ایک ملاقاتی پہنچنے والا ہے۔ تم ساتھ والے کمرے میں اس کا انتظار کرو۔ میں اس دوران نماز پڑھ لیتا ہوں۔“ انہوں نے مسکرا کر بتایا تو وہ سمجھ گیا کہ جارو آنے والا ہے۔ ڈاکٹر ناصر بٹ کو اس ملاقات کو دوسروں کی نظروں سے پوشیدہ رکھنے کے لیے یہی ظاہر کرنا تھا کہ وہ ان کے ساتھ میٹنگ میں ہے اس لیے اس عرصے میں وہ نہ تو خود کمرے سے باہر نکل سکتے تھے اور نہ ہی کسی اور کو ملاقات کے لیے اندر بلا سکتے تھے۔

”بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب!“ وہ اٹھ کر اس کمرے کی طرف بڑھ گیا جہاں پہلے بھی جارو سے ملاقات ہو چکی تھی۔ جس وقت دروازہ کھول کر کمرے کے اندر داخل ہوا، ٹھیک اسی وقت جارو نے بھی دوسرے دروازے سے قدم اندر رکھا۔ دونوں نے نہایت گرمجوشی سے ایک دوسرے سے معافہ کیا۔

”میں اس وقت تمہاری آمد کی بالکل بھی امید نہیں کر رہا تھا۔“ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تو اس نے جارو سے کہا۔
 ”ارادہ تو میرا بھی یہی تھا کہ اب تم سے دور رہتا ہے لیکن کام ایسا آن پڑا کہ ملاقات ضروری ہو گئی۔“
 ”میں ہر وقت حاضر ہوں لیکن کچھ پتا بھی چلے کہ کام کیا ہے؟“

”کام بھی بتاتا ہوں لیکن پہلے تم یہ بتاؤ کہ تمہارے یہاں سے نکلنے کا کیا ہوا؟..... کوئی ڈیٹ وغیرہ کنفرم ہوئی کہ کب جانا ہے؟“ جارو نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے خود پوچھنا شروع کر دی۔

اسے اوپن ایریا میں بھیج کرنا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ان تین تاریخوں میں سے کوئی ایک تاریخ تمہاری یہاں سے روائی کی تاریخ سے صحیح کر جائے تاکہ تم کام کرتے ہی یہاں سے نکل جاؤ۔“ جارو نے اسے بتایا۔

”تم مجھے پورا پلان بتاؤ پھر میں کچھ کرتا ہوں۔“ جارو نے اتنے مواقعوں پر اس کا ساتھ دیا تھا کہ وہ اسے ذاتی حیثیت میں بھی انکار نہیں کر سکتا تھا اور یہاں تو معاملہ اپنے کشمیری بھائیوں کی مدد کرنے کا تھا۔

”جو کچھ ہم نے سوچ رکھا ہے، وہ اپنی جگہ ہے لیکن میری سب سے بڑی ترجیح یہ ہے کہ تم کام ہوتے ہی یہاں سے نکل جاؤ۔ میں نہیں چاہتا کہ معمولی سے شک کی وجہ سے بھی تمہیں کسی تفتیش میں شامل کیا جائے اور تمہارا اپنا پروگرام خراب ہو۔“ جارو خود غرض نہیں تھا۔

”ٹھیک ہے پھر میں انکل بنجامن سے اپنی روائی کی ڈیٹ کنفرم کر کے تمہیں بتاتا ہوں۔“ وہ خود بھی اپنے اس مشن کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا جس کے لیے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وطن سے نکلا تھا۔

”جو بھی بات ہو، ڈاکٹر بٹ کو بتا دینا۔ ان کے ذریعے مجھے اطلاع مل جائے گی اور میں مناسب وقت دیکھ کر تم سے ملنے آ جاؤں گا۔“ جارو اب روائی کے لیے پرتول رہا تھا۔ وہ جانے کن کن مشکلات سے گزر کر یہاں تک پہنچتا تھا۔ اس وقت بھی اس نے ایک الیکٹریشن کا بہروپ بھر رکھا تھا جو اپنے ٹولز کا تھیلا سنبھالے کسی خراب سوچ بورڈ کو ٹھیک کرنے کے بہانے وہاں آیا تھا۔

”اور ہاں.....“ جارو جاتے جاتے رکا۔ ”اس وجہ کانت کی بھی فکر نہیں کرنا۔ اسے بھی وقت آنے پر سنبھال لیں گے۔“

”مجھے یقین ہے۔“ معاذ مسکرایا اور اسے گلے مل کر رخصت کیا۔ واپس بہرام کے کمرے میں پہنچا تو وہ اس کا منتظر تھا۔

”آپ نے بہت دیر لگا دی معاذ بھائی!“ اس نے اسے دیکھتے ہی شکوہ کیا۔

”ہاں بھئی۔ ڈاکٹر صاحب ذرا تفصیل سے تمہارے بارے میں بتا رہے تھے پھر کچھ ادھر اُدھر کی باتیں بھی نکل آئیں تو وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔“ اس نے خوشگوار موڈ میں بہرام کو جواب دیا۔

”کیا کہہ رہے تھے ڈاکٹر صاحب میرے بارے میں؟ وہ مجھے چھٹی کیوں نہیں دے رہے ہیں؟“ بہرام نے

”کارروائی جاری ہے۔ انکل بنجامن کے مطابق اس مہینے کے آخر تک روائی ہو سکتی ہے لیکن تم اس چکر میں کیوں پڑے ہو؟ تم اپنا کام بتاؤ۔“ اس نے اصرار کیا۔

”اس کے پیچھے ایک خاص وجہ ہے جو میں تمہیں ابھی بتاتا ہوں لیکن پہلے تم مجھے برٹ ایم 107 پر اپنی مہارت سے متعلق بتاؤ۔ تم اس دن ذکر کر رہے تھے تاکہ یہ تمہاری پسندیدہ رائل ہے اور تم میرے ساتھیوں کو اسے چلانے کی ٹریننگ دے سکتے ہو۔“

”مجھے اچھی طرح اپنا وعدہ یاد ہے لیکن ایک تو تم نے رابطہ نہیں کیا، دوسرے مجھے بھی کسی وجہ سے محتاط رہنا پڑا تو یہ بات آگے بڑھ ہی نہیں سکی۔“ وہ اسے دجے کانت کے شک اور اپنی نگرانی کے متعلق بتانے لگا۔

”یہ تو کام خراب ہو گیا۔“ جارو کے ماتھے پر شکنوں کا جال پھیلا۔

”اس کے لیے اتنے فکر مند نہ ہو۔ مجھے امید ہے کہ دو چار دن میں وہ جھک ہار کر بیٹھ جائے گا پھر میں موقع نکال کر تمہارے ساتھیوں کی ٹریننگ کے لیے آ جاؤں گا۔“ اس نے جارو کو تسلی دی۔

”بات ساتھیوں کی ٹریننگ کی نہیں ہے۔ اس کا تو ہم کوئی نہ کوئی بندوبست کر ہی لیں گے مگر.....“

”مگر کیا؟“ اسے جارو کے انداز میں کچھ غیر معمولی پن محسوس ہوا۔

”اس وقت ہمیں اس رائل کے استعمال کے لیے ایک بہت اچھے تربیت یافتہ شخص کی ضرورت ہے۔ ایسا شخص جو زیادہ فاصلے سے اتنا ماہرانہ فائر کر سکے کہ جس پر گولی چلائی جائے وہ یقینی موت کا شکار بھی ہو اور شکاری بھی حفاظت سے نکل سکے۔“

”شکار کون ہوگا؟“ اس نے اپنے اندر ایک سنسنی سی محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

”ہے ایک شیطان جو ہم کشمیریوں کی تقدیر کے فیصلے کرتے ہوئے اپنے دل کی پوری سفاکی سے کام لیتا ہے اور ہمیں اسے بلکہ اس کے آقاؤں کو بتانا ہے کہ وہ جتنا چاہے ہمیں ظلم کی چکی میں پینے کی کوشش کریں، ہم اپنی آزادی کی چاہ سے پیچھے ہٹنے والے نہیں ہیں۔“ جوش سے جارو کا چہرہ ہلکا سا سرخ پڑ گیا۔

”کب کرنا ہے یہ کام؟“ معاذ نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر مضبوط لہجے میں پوچھا۔

”ہمارے پاس تین مواقع ہیں۔ ان تین مواقع پر

بے چینی سے پوچھا۔

”وہ تمہاری پروگریس سے بہت خوش ہیں اور انہوں نے کہا ہے کہ بس تھوڑے دن کی بات ہے اور پھر ہم بہرام کو چھٹی دے دیں گے۔“ حقیقتاً اب بہرام کو مزید وہاں رکھنے کی زیادہ ضرورت نہیں تھی لیکن جارو سے ملاقات کے لیے ایک محفوظ مقام کے طور پر اسے اس جگہ کی ضرورت تھی۔

”انہیں کہیں مجھے جلدی چھٹی دے دیں۔ مجھے بی بی جان کی یاد آرہی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں کہہ دوں گا لیکن ابھی تو تم مجھے کہانی سناؤ۔“ اس نے بہرام کو بہلا کر اس کی توجہ دوسری طرف مبذول کروادی لیکن خود اس کا ذہن بہت الجھا ہوا تھا۔

☆☆☆

”کیا سرلی آواز ہے اور کیا ہی شاندار عورت ہے۔“ ماننا پڑے گا کہ اس شو کے لیے جو کھڑکی توڑ رش لگا ہوا ہے، وہ بالکل جائز ہے۔“ اسٹیج پر نغمہ سرا لے قدم اور سیاہ بالوں والی عورت کی طرف دیکھتے ہوئے ماہ بانو نے بے ساختہ ہی اسے سراہا۔ عورت نے قدرے کشادہ گلے والا ٹخنوں تک جاتا سنہری گاؤن پہن رکھا تھا۔ اس کے کانوں، گلے اور ہاتھوں میں لباس سے میچ کرتے ہوئے نہایت نازک اور قیمتی زیورات جگمگا رہے تھے۔ وہ بے حد ڈوب کر گارہی تھی اس کے باوجود اپنے فن کے مداحوں سے بے نیاز نہیں تھی۔ اس کی مسکراہٹ سے جگمگاتی آنکھیں اور ہونٹ دونوں اپنے مداحوں سے ہمکلام تھے اور شاید آواز کے بعد بھی اس کی سب سے بڑی خوبی تھی جس نے مداحوں پر وجد سا طاری کر دیا تھا۔

”اس میں کچھ خاص ہے جیسی تو ہم آپ کو اصرار کر کے یہ شو دکھانے کے لیے لے کر آئے تھے۔“ ماہ بانو کے ساتھ بیٹھی سون نے اس کا تبرہ سنا تو خوش ہو کر بولی۔

”یہ واقعی بہت شاندار ہے۔ میں اگرچہ اس کے گانے کے بول پوری طرح نہیں سمجھ سکتی لیکن آواز اور لے میں ایسی کشش ہے کہ دل بے ساختہ ہی داد دینے کو مچتا ہے۔“ ماہ بانو اپنے سامنے نغمہ سرا گلوکارہ کو دل سے سراہ رہی تھی۔

”لیلیٰ وہی کا ایک زمانہ عاشق ہے محترمہ! یہ اور بات کہ موسیقی سے زیادہ شغف نہ ہونے کے باعث آپ اس شاندار گلوکارہ سے نا آشنا تھیں۔“ اس کی اس قدر تعریفیں سن کر شہر یار نے اسے جتایا۔

”مسٹر مراد بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ لیلیٰ کی یہاں آمد کی اطلاع ملنے پر ہنٹوں پہلے اس کے شوز کے لیے ٹکٹ

بک ہو جاتے ہیں۔ وہ بھی اتنی بڑی تعداد میں کہ اس کے بعد منجائش ختم ہو جاتی ہے لیکن بنگ کے خواہش مندوں کا رش ختم نہیں ہوتا۔“ سون نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

”یا اللہ! پھر یہ خوش قسمتی ہمارے حصے میں کیسے آگئی؟“ اپنے ارد گرد لوگوں کا ہجوم تو ماہ بانو خود بھی دیکھ رہی تھی اس لیے حیرت سے سوال کیا۔ شہر یار بھی سوالیہ نظروں سے سون کی طرف دیکھنے لگا۔

”لیف کی وجہ سے۔ لیلیٰ، لیف کو اپنا دوست اور محسن مانتی ہے اور یہ ممکن نہیں تھا کہ لیف کہے اور ہمارے لیے اس شو کے چار ٹکٹ بھی نہ نکل سکیں۔“ سون نے مسکرا کر جواب دیتے ہوئے اپنے ساتھ خالی پڑی نشست پر ایک نظر ڈالی۔ وہ اس معمول کی عادی تھی کہ کہیں بھی جانا ہو تو لیف کا اچانک پروگرام میں شامل ہونا کینسل ہو جاتا تھا۔

”زبردست۔ جس کا ایک زمانہ پرستار ہو، وہ کسی کو اس قدر اہمیت اور عزت دے تو اس شخص کا باکمال ہونا تو طے ہے۔“ اس بار سراہنے کا فریضہ شہر یار نے انجام دیا۔

”ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو لیکن میں خود بھی فیصلہ نہیں کر سکتی کہ لیلیٰ اور لیف میں سے کون زیادہ باکمال ہے۔ لیف اپنے پیٹھے کو عبادت کی طرح لیتا ہے اور آؤٹ آف داوے جا کر بھی انسانی زندگی بچانا پڑے تو بچانے سے باز نہیں آتا۔ ادھر لیلیٰ کا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے۔ رہتی ملک سے باہر ہے لیکن دل اس کا یہیں پر دھڑکتا ہے اور اپنی آمدنی کا بڑا حصہ اپنے ہم وطنوں کی فلاح و بہبود پر خرچ کرتی ہے۔ خوراک، لباس، علاج جو جو جس حد تک فراہم کر سکتی ہے، ہر حال میں کرتی ہے۔“ سون بہت دھیمی آواز میں انہیں لیلیٰ سے متعلق آگاہ کر رہی تھی۔

”لیف سے اس کی دوستی کی بنیاد میں بھی دونوں کی انسانیت دوستی ہے۔ ایک یار لیلیٰ اپنی ذاتی گاڑی میں ایک ایسے زخمی بچے کو لے کر آئی تھی جو بارودی سرنگ کی زد میں آگیا تھا اور جس کی جان بچنا مشکل بلکہ ناممکن لگ رہا تھا۔ لیف کی شفٹ ختم ہو چکی تھی اور وہ گھر کے لیے نکل رہا تھا لیکن بچے کی حالت دیکھ کر وہ رک گیا اور خود اس کی سرجری کی۔ لیف بتاتا ہے کہ جب وہ آپریشن تھیر سے باہر نکلا تو اسے پتا چلا کہ بچے کو لانے والی لڑکی کا اپنا زورس پر یک ڈاؤن ہو چکا ہے۔ اس وقت لیلیٰ آج جتنی مشہور نہیں تھی کہ کوئی ڈاکٹر اس کا علاج کرنے کو اپنی خوش قسمتی سمجھتا۔ بہر حال، لیف تو لیف ہے۔ اس نے لیلیٰ کو ٹریٹمنٹ دیا اور بعد میں بھی اس وقت تک لیلیٰ اور اس بچے کی خبر گیری کرتا رہا

اس کے ذہن پر نقش ہو گیا تھا۔ اس دکھ اور تکلیف کے احساس کو کم کرنے کے لیے اس سے جہاں جہاں جو ہوسکا، اس نے کیا اور کر رہی ہے اور جواب میں قدرت اسے مزید شہرت اور دولت سے نوازیتی جا رہی ہے۔ ”سوں نے لیلیٰ کے ماضی کا ایک اور باب کھول کر ان کے سامنے رکھا۔ اچانک ہال میں شور بے پناہ بڑھ گیا اور لوگ دیوانہ وار تالیاں اور سیٹیاں بجانے لگے۔ ان تینوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ لیلیٰ اپنی شاندار شخصیت کے ساتھ ایک بار پھر اسٹیج پر جلوہ افروز ہو چکی تھی۔ وہ نغمہ سرا ہوئی تو ہال میں ایک سماں سا بندھ گیا۔ یہی وہ وقت تھا جب لیف، سوں کے پہلو میں آکر بیٹھا۔

”لیلیٰ کی کشش تمہیں آپریشن تھیٹر سے نکال ہی لائی۔“ سوں نے اسے چھیڑا۔

”معاملہ جلدی سنہیل گیا تو میں سب کچھ جونیرز کے حوالے کر کے آنے میں کامیاب ہو گیا۔ بندہ ہمیشہ تو بیوی کو ناراض نہیں کر سکتا۔“ لیف نے اپنا بازو اس کے شانوں پر پھیلا دیا۔ لیلیٰ کی خوبصورت آواز ماحول کو رومان پرور بنا رہی تھی لیکن پھر دھیرے دھیرے فضا نے اپنا رنگ بدلنا شروع کر دیا۔ آواز کے کوچ میں حزن شامل ہوا اور شوخی کی جگہ کراہٹ نے لے لی۔ اب وہ اپنے وطن کا دکھ گارہی تھی۔ ان ہری بھری بستیوں کا دکھ جو جلا کر خاکستر کر دی گئیں۔ ان لاشوں کا دکھ جس سے کنوؤں کو پاٹ دیا گیا، ان بچوں کا دکھ جن کے سروں سے باپ کا سایہ چھین لیا گیا۔ جو غربت، بھوک اور افلاس کے ہاتھوں زندہ درگور ہو گئے اور ان بچوں کا دکھ جنہیں ماؤں کی کوکھ سے باہر آنے تک کا موقع نہیں دیا گیا۔ ان عورتوں کا دکھ جنہیں سمجھ نہیں آتی تھی کہ پہلے سہاگ اجڑنے کا ماتم کریں یا گودا جڑنے پر بین.....

وہ گارہی تھی اور بھرے ہال میں اس کی آواز کے سوا اگر کوئی آواز تھی تو صرف گھٹی گھٹی سسکیوں اور آہوں کی آواز تھی۔ وہ جو کچھ دیر پہلے جوش میں چنچ چلا رہے تھے، اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے آپے سے باہر ہوئے جارہے تھے، نناک آنکھوں کے ساتھ یوں اپنی نشستوں پر سر نہوڑائے بیٹھے تھے جیسے غم نے ان سے حرکت کرنے کی سکت ہی چھین لی ہو۔ غم بھی اتنا سحر انگیز ہوتا ہے انہیں اس بات کا تجربہ پہلی بار ہوا۔ اس ہال میں کسی ایک مذہب یا قوم کے لوگ موجود نہیں تھے لیکن اس وقت سب کے سب جذبات کے ایک چمے دھارے میں بہہ رہے تھے۔ اس کیفیت میں ڈوبے انہیں احساس ہی نہیں ہوسکا کہ کب لیلیٰ

جب تک وہ دونوں مکمل صحت یاب نہیں ہو گئے۔ وہ وقت لیف اور لیلیٰ کی دوستی اور لیلیٰ کی شہرت و مقبولیت کا نقطہ آغاز ثابت ہوا۔ اس واقعے کے بعد لیلیٰ نے دیکھتے ہی دیکھتے دنیا میں اتنی شہرت حاصل کی کہ ایسی شہرت کم کم ہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ ”سوں ان کی معلومات میں اضافہ کر رہی تھی۔ اس وقت لیلیٰ اسٹیج پر موجود نہیں تھی۔ وہ کچھ دیر کے لیے پردے کے پیچھے چلی گئی تھی اور اسٹیج پر سازندوں نے ہلکے سروں میں موسیقی چھیڑ رکھی تھی۔

”لیلیٰ..... لیلیٰ.....“ ہال میں اس کے مداح اسے اسٹیج پر واپس بلانے کے لیے دیوانہ وار چیخ رہے تھے۔ ”ویری انٹرٹنگ! میں نے بھی لیلیٰ کے سوشل ورک کے بارے میں کافی سن رکھا ہے بلکہ اس کے نوجوان لے پالک بیٹے کو بھی دیکھا ہے۔ کیا یہ وہی زخمی لڑکا ہے؟“ شہریار نے اندازہ لگایا۔

”بالکل وہی ہے۔ بچے کا سارا خاندان ختم ہو گیا تھا اس لیے لیلیٰ نے اسے ایڈاپٹ کر لیا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب لیلیٰ کی اپنی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اب یہ خدا کی قدرت ہے کہ شادی کے بعد لیلیٰ کا شوہر چند سال ہی زندہ رہا اور ان کی کوئی اولاد بھی نہیں ہوئی تو لیلیٰ نے اس بچے کو ہی اپنا سب کچھ مان لیا۔“ سوں نے اس کے اندازے کی تصدیق کرتے ہوئے کچھ مزید معلومات فراہم کیں۔

”اس نے دوسری شادی کیوں نہیں کی؟ وہ اب بھی خوبصورت اور جوان لگتی ہے۔ کچھ سال پہلے تو مزید شاندار رہی ہوگی۔“ ماہ بانو نے وہ سوال کیا جو مشرق کی کوئی عورت ہی کر سکتی ہے۔ سوں اس کا سوال سن کر مسکرا دی اور بغیر کسی منفی رد عمل کے بتانے لگی۔

”لیلیٰ کا کہنا ہے کہ دوسری شادی کر کے گلے میں ڈے داریوں کا ڈھول ڈالنے کے بجائے وہ یہ مناسب سمجھتی ہے کہ انسانیت کے کام آئے اور مظالم سب سے اپنے ہم وطنوں کے لیے جو کچھ کر سکتی ہے، کر ڈالے۔“

”بہت مضبوط موقف ہے اور کوئی ایسی ہستی ہی اختیار کر سکتی ہے جو خود بہت مضبوط شخصیت کی مالک ہو۔“ شہریار نے بے ساختہ لیلیٰ کو سراہا۔

”جنہوں نے اپنی جان پر دکھ جھیلے ہوں، ان میں دوسروں کا دکھ سمجھنے اور اسے بانٹنے کی اہلیت بڑھ جاتی ہے۔ لیلیٰ کا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ لیلیٰ کا اپنا بھائی لبنان حملوں میں ہلاک ہو گیا تھا۔ لیلیٰ خود تو اس وقت چھوٹی تھی لیکن اپنی ماں کو جس طرح اس نے غم میں تڑپتے دیکھا، وہ

کی آواز خاموش ہوئی اور وہ اسٹیج کے پیچھے گم ہو گئی۔ جب احساس ہوا تو علم ہوا کہ شو کا مقررہ وقت ختم ہو چکا تھا۔ لوگ ٹشو پیپر ز اور رد مالوں سے اپنی آنکھوں کی نمی صاف کرتے ہوئے آہستہ آہستہ نشستوں سے اٹھنے لگے۔ وہ چاروں بھی ایسا ہی کرنے لگے تھے کہ انتظامیہ کا بیج لگائے ایک شخص تیز تیز قدموں سے ان کی طرف آیا۔

”مسٹر لیف؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے لیف کی طرف دیکھا۔

”یس۔“ لیف اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”میڈم لیلی وہی آپ اور آپ کے ساتھیوں سے ملنا چاہتی ہیں۔“ اس نے ادب سے اطلاع دی۔

”اوہ.....“ لیف نے فقط اتنا کہا اور سوالیہ نظریں یوں شہریار پر ڈالیں جیسے اس سے اس کی مرضی دریافت کر رہا ہو۔

”کیوں نہیں، ضرور۔“ شہریار نے مسکرا کر رضامندی ظاہر کی۔ اگلے لمحے وہ چاروں انتظامیہ کے اس آدمی کے ساتھ لفٹ میں ساتویں منزل پر واقع ایک پُرعیش سویٹ میں پہنچ چکے تھے۔ لیلی وہاں اکیلی نہیں تھی۔ وہاں اس کے ساتھ گندمی رنگت والا ایک نوجوان لڑکا بھی موجود تھا۔ اس نے لیلی کے ساتھ مل کر ان کا استقبال کیا لیکن اس کے انداز میں کچھ بے چینی سی تھی۔

”یہ میرا بیٹا الیا ہے جسے ہم پیار سے ایللی کہتے ہیں۔“ لیلی نے ان سے لڑکے کا تعارف کروایا۔ جواب میں لیف بھی شہریار اور ماہ بانو کو بطور مراد اور تانیہ متعارف کروانے لگا۔

”ایکسکوز می! میں ذرا جلدی میں ہوں۔ میرے دوست میرا انتظار کر رہے ہیں اس لیے میں آپ لوگوں کو ٹائم نہیں دے سکوں گا۔“ ایللی جس کی حرکات و سکنات سے پہلے ہی عجلت کا مظاہرہ ہو رہا تھا، تعارف کے سلسلے کو دراز ہونے سے پہلے ہی معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ لیلی نے اسے اس کی اس حرکت پر تنبیہ نظروں سے گھورا لیکن زبان سے کوئی سخت لفظ ادا کرنے کے بجائے مسکرا کر بولی۔

”او کے ہنی! تم جاؤ اور دوستوں کی کہنی انجوائے کرو۔“ چھینکس مام! اس نے جلدی سے لیلی کے رخسار پر ایک بوسہ دیا پھر کچھ جھجکتے ہوئے بولا۔

”لیکن وہ.....“

”او کے۔“ لیلی نے اس کی ادھوری بات سمجھ لی اور پرس کھول کر اپنا کریڈٹ کارڈ اس کے حوالے کیا۔

”یور آر دی ورلڈ بیسٹ مام!“ وہ ایک بار پھر لیلی کا رخسار چوم کر ان سب کو بائے بائے کرتا، خوشی خوشی وہاں سے روانہ ہو گیا۔ یہ ایک دولت مند ماں کے اکلوتے بیٹے کا عمومی رویہ تھا لیکن شہریار کو اس لڑکے کی باڈی لینگویج میں کچھ خاص محسوس ہوا۔ کچھ ایسا جسے وہ اس وقت سمجھ نہیں پا رہا تھا لیکن جس کے ہونے کا احساس بہت طاقتور تھا۔

☆☆☆

”میں صداقت شاہ بات کر رہا ہوں بیٹا! میرے موبائل کی چارجنگ ختم ہو گئی ہے اور سکیئر اپنا موبائل جانے کہاں رکھ کر بھول گئی ہیں اس لیے میں ہوٹل کی لینڈ لائن سے تمہیں کال کر رہا ہوں۔“ نیلی کے کال وصول کرتے ہی دوسری طرف سے صداقت شاہ کی آواز سنائی دی۔ آواز میں کوئی ایسی غیر معمولی بات تھی جسے محسوس کر کے نیلی کا دل دھڑک اٹھا۔

”سلام سائیں! خیریت تو ہے؟ آپ نے اس وقت کیسے کال کی؟“

”عالم اور سرمد کا پتا چل گیا ہے۔ انہیں پھیروں کی ایک بستی سے باز یاب کروایا گیا ہے۔“ خود کو مضبوط ظاہر کرنے کی کوشش کے باوجود صداقت شاہ کی آواز کانپ رہی تھی۔

”یہ تو اچھی خبر ہے سائیں۔“ نیلی نے جانے خود کو تسلی دی یا ساتھ موجود اس گفتگو پر کان لگائے بیٹھی سچل کو۔

”اس اچھی خبر کے ساتھ ایک بری خبر بھی جڑی ہے۔“ صداقت شاہ کے اندر یکدم ہی سب کچھ بتا دینے کا یارا نہ تھا۔

”کیسی خبر؟“ نیلی کے دل کی دھڑکن مزید تیز ہوئی۔

”وہ دونوں جن اسمگلرز کے قبضے میں تھے، انہوں نے بھرپور مزاحمت کی تھی۔ دونوں پارٹیوں کے درمیان شدید فائرنگ کا تبادلہ ہوا اور وہ دونوں بھی اس فائرنگ کی زد میں.....“ صداقت شاہ سے جملہ مکمل نہ ہو سکا۔

”اب..... اب کیسے ہیں وہ دونوں؟“ نیلی نے مشکل سے خود کو سنبھال کر اگلا سوال کیا۔

”سرمد.....“ صداقت شاہ کی آواز آنسوؤں میں بھیگ گئی۔

”سرمد چلا گیا اور عالم بھی شدید خطرے میں.....“

”میں شہر آ رہی ہوں بابا سائیں! میں اپنے ادا سائیں کے پاس آ رہی ہوں۔“ سچل کے ضبط کی حد ختم ہو گئی اور نیلی کے ہاتھ سے موبائل چھین کر خود ان سے بات کرنے لگی۔

آرام ہوتا رہے گا۔“ وہ نیلی کو اپنے ساتھ لے جانے کے حق میں نہیں تھی جس پر نیلی کا چہرہ اتر گیا۔
 ”آئی ایم سوری نیلی! لیکن مجھے لگ رہا ہے کہ اپنے مسائل کی وجہ سے میں اعظم کے ساتھ بہت زیادتی کر رہی ہوں۔ یہ چھوٹا سا بچہ میری وجہ سے بہت خوار اور بے آرام ہوتا ہے۔ اگر موٹل حویلی میں ہوتی یا یہاں کوئی اور فرد ایسا ہوتا جو اعظم کو بہلا سکتا تو میں تمہیں ہرگز منع نہیں کرتی۔“ سبیل اس کی کیفیت کو محسوس کر کے اس سے معذرت کرنے لگی۔
 ”اٹس اوکے۔ میں دیکھ لوں گی۔ بس آپ وہاں پہنچ کر مجھے حال احوال بتاتی رہیے گا۔“ نیلی کو مانتے ہی پڑی۔
 ”بالکل، میں تمہیں ہر لمحے کی خبر دوں گی۔“ سبیل نے اس سے وعدہ کیا۔

”میں جا کر ملازمین کو جگاتی ہوں اور آپ کے لیے گاڑی بھی تیار کرواتی ہوں۔“ نیلی نے باہر کا رخ کیا۔
 ”ماروی کو بھیجنا میرے پاس، اسے کہنا اسے میرے ساتھ شہر جانا ہے۔“ اسے یاد آگیا کہ خدیجہ کے خاندان کی یہ چھتیس سینتیس سالہ عورت ساتھ لے جانے کے لیے موزوں ہوگی۔

”ٹھیک ہے، بھیجتی ہوں۔“ نیلی جواب دے کر باہر نکل گئی۔ اس کے بعد اس کا ایک ایک لمحہ مصروفیت کا تھا۔ سبیل کی رودانگی کے معاملات سے لے کر آیت کریمہ کے دھوکے کے لیے عورتوں کو جمع کر کے بٹھانے تک کا ہر کام اس نے خود دیکھا۔ خود بھی دعائیں کرتی رہی۔ اعظم نیند سے جاگا تو اس کے ساتھ مصروف ہونا پڑا لیکن طبیعت پر بے چینی سی طاری تھی۔ اس بے چینی کا ہی نتیجہ تھا کہ فون کی ٹھنڈی بجی تو اس نے کالر کا نام دیکھے بغیر کالر وصول کر لی۔ کالر کرنے والے نے کیا کہہ کر اپنا تعارف کروایا، اسے دھیان نہیں رہا کیونکہ اصل دھیان تو بس اس میں الٹا تھا جس کے لیے حویلی کے درود یو آر آیت کریمہ کے ورد سے گونج رہے تھے۔

”سائیکس عالم شاہ کا کیا حال ہے؟“ وہ اگلے کی سنے بغیر اس سے بے قراری سے پوچھ رہی تھی۔ جواب میں اس کے پاس جو خبر تھی، اس نے حویلی کے در و بام کو اس کے سامنے گھما کر رکھ دیا۔ یہ حویلی اجڑ چکی تھی۔

☆☆☆

”گھر میں کوئی آیا ہوا ہے کیا؟“ وجے کی تیز نظروں نے گاڑی سے اترتے ہی ڈرائنگ روم کے بیرونی دروازے کے باہر موجود فٹ میٹ پر رکھے زمانہ جوتوں کے جوڑوں کو تاڑ لیا اور اپنے استقبال کے لیے آنے والے

”اس کی ضرورت نہیں بیٹا! یہاں میں اور تمہارے ماموں جان موجود ہیں۔ ہم مل کر سب سنبھال لیں گے۔ تم لوگوں کو کال صرف اس لیے کی ہے کہ اس نازک وقت میں سب سے زیادہ ضرورت دعا کی ہے۔ خود بھی دعا کرو اور گوٹھ والوں کو بھی دعا کے لیے جمع کرو۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہمارے نمک خوار اس نازک وقت میں، دن رات کی پروا کیے بغیر جمع ہو جائیں گے۔“ انہوں نے اسے سمجھایا۔

”یہاں میرے بغیر بھی سارے انتظامات ہو جائیں گے بابا سائیکس لیکن مجھے وہاں اپنے ادا سائیکس کے پاس آنا ہے۔ میں جب تک ان کی صورت نہیں دیکھوں گی، مجھے چین نہیں آئے گا اور پھر وہ خدیجہ..... خدیجہ بھی تو ہے وہاں۔ اسے بھی تو سنبھالنا ہوگا نا! کیسے ہے گی وہ سرمد کے جانے کا دکھ؟ یہاں تو خود مجھے اپنا دل پھٹتا محسوس ہو رہا ہے۔ کتنا وفادار اور جاں نثار انسان تھا وہ..... وہ ہوتا تھا ادا سائیکس کے ساتھ تو یقین ہوتا تھا کہ انہیں کچھ نہیں ہوگا۔ ادا سائیکس کی طرف آنے والی ہر مصیبت کو وہ خود پر لے لے گا۔“ وہ بولنے کے ساتھ ساتھ روئی بھی جاری تھی۔

”لے تولی اس نمک حلال نے اپنی جان پر اپنے چھوٹے سائیکس کی مصیبت۔“ اس بار صداقت شاہ کے لیے بھی ضبط مشکل ہو گیا۔

”بس تو پھر آ رہی ہوں میں اس نمک حلال کی منگیتر کو سنبھالنے۔ مجھے مت روکیں بابا سائیکس!“
 ”مگر تمہاری اپنی طبیعت.....“

”کچھ نہیں ہوگا مجھے۔ بہت سخت جان ہوں میں۔“
 اس نے صداقت شاہ کی بات درمیان میں ہی کاٹ دی۔
 ”اللہ ہم سب پر رحم کرے۔“ وہ ایک سرد آہ بھر کر رہ گئے۔
 ”آپ میری فکر چھوڑ کر بس ادا سائیکس کا خیال رکھیں۔ میں کوشش کرتی ہوں کہ اپنے ساتھ خدیجہ کے خاندان کی کسی سمجھ دار عورت کو لیتی ہوئی آؤں۔“ اس بار اس نے قدرے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بات کی۔

”جو تمہیں بہتر لگے کرو۔ میں اب جا کر تمہاری اماں سائڈن کو دیکھتا ہوں۔ انہیں بتانے سمجھانے کی ذمہ داری تمہارے ماموں سائیکس کے ذمے لگا کر خود فون کرنے میں مصروف ہو گیا تھا۔“ انہوں نے اس سے اجازت لے لی۔

”میں بھی آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔“ ساری گفتگو سنی نیلی اس کے فون بند کرتے ہی اس سے مخاطب ہوئی۔

”پلیز، تم یہیں رہو نیلی! اعظم سو رہا ہے۔ نیند سے اٹھانے پر ڈسٹرب ہوگا اور وہاں بھی ہمارے ساتھ بے

بیٹ مین سے پوچھا۔

”جی، میڈم کی کوئی مسلم فرینڈز ہیں۔ لگ بھگ آدھا گھنٹا پہلے آئی ہیں۔“ اس نے مستعدی سے جواب دیا۔

”اوہ.....!“ وجے کے ماتھے پر ہل پڑے لیکن زبان سے اس ایک لفظ کے سوا کچھ نہیں نکلا۔ اس کی بیوی رجنی کشمیر میں ہی پل بڑھ کر جوان ہوئی تھی اور اس کی سابقہ ہم جماعت لڑکیوں میں سے کئی مسلمان لڑکیوں سے بھی دوستی تھی۔ وہ کھلے دماغ کی عورت تھی اور لوگوں سے دوستیاں بناتے ہوئے قوم یا مذہب سے بڑھ کر ذہنی موافقت کو ترجیح دیتی تھی۔ وجے کو بھی سوکا لڈ لبرل ہونے کا دعویٰ تھا اس لیے اندر ہی اندر رجنی کی اس عادت کو نا پسند کرنے کے باوجود وہ کبھی اسے ٹوک نہیں سکا تھا۔ اب بھی وہ خاموشی سے اپنے بیڈروم میں چلا گیا۔ فریش ہو کر چیخ کرنے میں دس پندرہ منٹ لگے۔ اس کا خیال تھا کہ گاڑی کی آواز سے رجنی کو اس کی آمد کی خبر ہوگئی ہوگی اور حسب معمول وہ اس کا استقبال نہ کرنے پر معذرت کرتی اس سے اس کی ضروریات کا پوچھنے آئے گی یا کم از کم اسے اپنی دوستوں سے ملانے لے جائے گی جیسا کہ اس کا معمول تھا لیکن خلاف معمول ان میں سے ایک بھی بات نہیں ہوئی تھی۔

”آپ کے لیے چائے وغیرہ لے کر آؤں سر؟“ رجنی تو نہیں آئی لیکن بیٹ مین اپنی ڈیوٹی انجام دینے آ گیا۔ ”میڈم کی فرینڈز کو چائے سرو کر دی ہے؟“ اس نے سوچتے ہوئے پوچھا۔

”میڈم کا آرڈر ہے کہ مجھ سمیت تمام سروس ڈرائنگ روم سے دور رہیں۔ ان کی فرینڈز کو کوئی پردے شردے کا ایٹو ہے۔ ویسے میں نے چائے اور اسٹیکس ریڈی کر لیے ہیں۔ جیسے ہی میڈم کا آرڈر ملا، میں سرو کر دوں گا۔“ بیٹ مین نے مکمل رپورٹ پیش کی تو اس کی آنکھوں میں الجھن دوڑنے لگی۔ وہ اب تک رجنی کی جتنی مسلمان دوستوں سے ملا تھا، وہ فیشن ایبل عورتیں تھیں اور ان میں پردے کا رجحان نہیں تھا۔

”اورا جے؟“ اب اس نے بیٹے کی بابت دریافت کیا۔ ”وہ بھی میڈم کے ساتھ ڈرائنگ روم میں ہی ہیں۔“ ”اوکے، میڈم کو میرے آنے کی اطلاع دو۔“ اس نے بیٹ مین کو حکم دیا۔ ابھی بیٹ مین حکم کی تعمیل کے لیے پلٹ ہی رہا تھا کہ اس کے موبائل پر رجنی کی کال آنے لگی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے بیٹ مین کو روکا اور خود کال ریسیو کی۔

”ڈرائنگ روم میں آ جاؤ ڈرائنگ! میں تمہیں اپنی فرینڈز سے ملوانا چاہتی ہوں۔“ اسے کسی بھی دوسری بات کا موقع دیے بغیر رجنی نے اس سے فرمائش کی۔ ”اوہ..... لیکن میں نے تو سنا ہے کہ وہ پردہ دار عورتیں ہیں اور تم نے سارے سروسٹس کو ڈرائنگ روم سے دور رہنے کا آرڈر دیا ہے۔“

”ہاں، پر تم سے تو ملوانا ہے انہیں۔ وہ ہماری شادی پر بھی نہیں آئی تھیں اس لیے انہیں تم سے ملنے کا بہت شوق ہے۔“ ”اوکے، میں آتا ہوں۔“ اس نے جواب دیا پھر بیٹ مین کی شکل پر سوال دیکھ کر پوچھا۔

”چائے کتنی دیر میں سرو کرنی ہے؟“

”پہلے آپ آکر ان سب کو مل تو لیں پھر چائے وائے بھی آتی رہے گی۔“ رجنی کے لہجے میں جھنجھلاہٹ سی تھی۔ وہ کچھ عجیب سی کیفیت کا شکار ہو گیا۔ رجنی پرانی ہتی ورتا عورتوں کی طرح ہر وقت شوہر کی جی حضوری کرنے والی عورت نہیں تھی لیکن وہ اس لب و لہجے کی بھی عادی نہیں تھی۔ اس نے بیٹ مین کو مزید انتظار کرنے کا حکم دیا اور خود کچھ عجیب سا محسوس کرتے ہوئے پٹل جیب میں ڈال لیا۔

”ہینڈز اپ!“ ڈرائنگ روم کے اندرونی دروازے پر دستک دے کر اس نے اسے دھکیل کر کھولا اور اندر قدم رکھا۔ اس کے قدم رکھتے ہی کسی نے دروازہ بند کر دیا اور اس کے سر سے گن کی نال لگا کر سرد لہجے میں بولا۔ بلاشبہ یہ ایک مردانہ آواز تھی۔

”کون ہیں یہ لوگ؟“ اس نے سامنے کھڑی ہونٹ چباتی رجنی کے سراسیمہ چہرے پر ایک نظر ڈال کر تعجب سے پوچھا۔ رجنی کے پیچھے نیچے کارپٹ پر ان کا دو سالہ بیٹا راہول بیٹھا اپنے کھلونوں سے کھیل رہا تھا اور اس کے قریب ہی ایک لڑکی ہاتھ میں گن لیے بیٹھی تھی۔ اپنے بیٹے سے اتنی قریب ایک ہتھیار بند لڑکی کو دیکھ کر اسے اتنا خوف محسوس ہوا جس کے سامنے اپنی کھوپڑی سے لگی گن کی نال کی کوئی حقیقت نہیں تھی۔

”ادھر جا کر دھیرج سے بیٹھو پھر ہم خود تم سے اپنا تعارف کروا دیں گے۔“ اس کے پیچھے کھڑے مسلح شخص نے دھیمی مگر سرد آواز میں اسے حکم دیتے ہوئے ہلکا سا ٹھوکا بھی دیا۔ چارونا چاراسے تعمیل کرنا پڑی۔

”بہی چوڑی بات نہیں کریں گے ہم۔ بس اتنا جان لو کہ اس پل سے تمہیں وہی کچھ کرنا ہے جس کا حکم ہم تمہیں دیں گے۔ انکار کا سوچنے سے پہلے یہ دیکھ لو۔“ اب وہ شخص اس

ہوئے لہجے میں بولا۔

”تمہیں ٹھونسنے تو ٹھونسو لیکن مجھے صرف یہ بتاؤ کہ تم

لوگ یہاں کیوں موجود ہو اور کیا چاہتے ہو؟“

”ساتم نے، شریمان جی اچھے میزبان کی طرح پہلے ہماری مہمان نوازی کرنا چاہتے ہیں۔ تم بھی تکلف نہ کرو اور کچھ کھاؤ۔ ویسے بھی ہو سکتا ہے ہمیں لمبے سے تک ایک دوسرے کے ساتھ رہنا پڑے۔“ وجے کے لہجے کو خاطر میں لائے بغیر وہ اپنی ساتھی لڑکی سے بولا۔ لڑکی کمرے کے ماحول سے بے نیاز بچے کے ساتھ کھینے میں مصروف تھی اور اس نے بچے کو اپنے ساتھ خاصا مانوس کر لیا تھا۔ اب بھی اس نے پلیٹ میں سے ایک بسکٹ اٹھا کر بچے کے ہاتھ میں تھا دیا جسے وہ مزے سے کھانے لگا۔ خود لڑکی نے ایک سینڈویچ اور چائے کا کپ اٹھا لیا۔

”اب کرنا تم کو یہ ہے کہ اے ٹوڈی، سارے سروٹس سے بولو کہ تمہارا کوئی دوست یا رشتے دار مر گیا ہے اور تمہیں اس کا کریا کر م کرنے دوسرے شہر جانا ہے اس لیے سب کے سب چار دن کے لیے چھٹی کرو۔“ اس نے اپنے چہرے پر منڈھانقاب ہٹا دیا تھا اور ٹرائی سے ایک آلویٹر اٹھا کر کھاتے ہوئے ہدایت دے رہا تھا۔

”اگر میں تمہاری بات نہ مانوں تو؟“ وجے نے اسے تیز نظروں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

”تو یاد رکھو کہ ہم سر پر کفن باندھ کر ہی اپنے گھروں سے نکلے ہیں۔ ہاں، البتہ تم صرف اور صرف اپنی بے وقوفی کے ہاتھوں پر یوار سمیت مارے جاؤ گے۔“ اس نے اپنی خود کش جیکٹ کو نمایاں کرتے ہوئے بہت پرسکون لہجے میں وجے کے سوال کا جواب دیا۔

”اور میری جاب؟“

”ادھر بھی یہی بی بیج بیج دو۔ ہمیں خبر ہے کہ سینٹرز سے تمہارے اچھے تعلقات ہیں۔ ار جٹ چھٹی کی ریکویسٹ پر کوئی آجیکشن نہیں لگے گا۔“

”پر مرداؤں کے؟ میری فیملی ہے، ماما، پتا، بھائی، سب اسی شہر میں رہتے ہیں۔ وہ بھی تو پوچھیں گے نا کہ ایسا کون مر گیا ہے جس کے کریا کر م کے لیے ہم ار جٹنی جا رہے ہیں اور وہ اسے نہیں جانتے۔“

”کہہ دینا جتنی کی بیسٹ فرینڈ ہے۔ بیاہ کر چھوٹے گاؤں میں گئی تھی۔ ڈیلیوری میں مر گئی۔ جتنی کی ضد ہے کہ اس کے کریا کر م میں ضرور جانا ہے۔ ساتھ یہ بھی بتا دینا کہ وہاں موبائل کے سگنل نہیں آتے اس لیے ان چار دنوں میں

کے سامنے آ گیا تھا۔ چھوٹے قد کے اس دبیلے پتلے مرد نے اپنا چہرہ اب بھی ماسک کے پیچھے چھپا رکھا تھا لیکن برقع نہیں پہنا ہوا تھا۔ اس کا اتارا ہوا برقع ایک صوفے پر پڑا دکھائی دے رہا تھا۔ وجے کو صورت حال سمجھ آنے لگی۔ مرد وزن پر مشتمل یہ جوڑا عورتوں ہی کے گیٹ اپ میں اس کے گھر میں گھسنا تھا۔ مرد کی جسامت کی وجہ سے باہر سکیورٹی پر تعینات افراد کو اندازہ ہی نہیں ہو سکا ہو گا کہ برقع میں کون ہے۔ یقیناً سکیورٹی والوں کے سوال جواب کا سامنا لڑکی نے کیا ہو گا اور یوں وہ آسانی سے اندر آ گئے ہوں گے۔ رجنی کے پاس مہمانوں کا آنا جانا معمول تھا اور وہ سرکاری رہائش گاہ کے بجائے رجنی کو جہیز میں ملے مکان میں رہتے تھے۔ اس لیے ان کے ہاں بہت سخت سکیورٹی تھی بھی نہیں۔

”گئے وقتوں میں ہمارے اسلاف پیٹ پر ہتھ باندھ کر جنگیں لڑتے تھے۔ تم جیسے گھٹیا دشمنوں نے ہمیں پیٹ پر یہ باندھ کر لڑنے پر مجبور کر دیا ہے۔“ وہ کیا سوچ رہا ہے اور کیا نہیں، اس سے بے نیاز اس دبیلے پتلے مرد نے بولتے ہوئے پیٹ پر سے اپنی فیص اوپراٹھا دی۔ وجے اس کے جنم پر موجود خود کش جیکٹ دیکھ کر کانپ اٹھا۔ اس کمرے میں اس کے ساتھ اس کی محبوب بیوی اور دو سالہ بیٹا موجود تھا اور انہیں ایک خود کش بمبار کا سامنا تھا۔

”کیا چاہتے ہو تم؟“ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی آواز لرز رہی تھی۔

”سب سے پہلے تو اپنا ہتھیار نکال کر ہمارے حوالے کر دو۔“ اس نے وجے کی جیب کی طرف اشارہ کیا۔ کوئی بھی جہاندیدہ شخص وہاں ہتھیار کے ابھار کو محسوس کر سکتا تھا۔ وجے نے خاموشی سے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ حقیقتاً اس کا دماغ اسے مشورہ دینے سے قاصر تھا کہ اسے اس وقت کیا کرنا چاہیے۔

”بیٹھ جاؤ۔“ اگلا حکم ملا جس کی بھی اس نے تعمیل کی۔ ”اب آپ ہمارے لیے چائے منگوائیں دیوی جی لیکن خیال رہے کہ ٹرائی دروازے سے ہی وصول کر لینی ہے، کوئی ملازم اندر داخل نہ ہو۔“ اب وہ رجنی سے مخاطب تھا۔ وہ سر ہلا کرتے ہوئے چہرے کے ساتھ اظہار کام کی طرف بڑھی اور ریسور اٹھا کر بٹن دباتے ہوئے احکامات جاری کرنے لگی۔ تھوڑی دیر میں چائے اور لوازمات سے سچی ٹرائی ڈرائنگ روم میں موجود تھی۔

”ٹھکے ہارے آئے ہو شریمان! تھوڑا بھوجن کر لو۔“ نقاب پوش مرد وجے سے مخاطب ہوا تو وہ تپ گیا اور تپے

کسی سے کوئی ٹکٹ نہ ہو سکے تو پریشان نہ ہوں۔“ اس نے مزے سے وجہ کے اٹھائے مسئلے کا حل پیش کر دیا۔
”تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟ اس کے پیچھے تمہارا کیا گول ہے؟“

”تم کو اپنے سارے سوالوں کے جواب سے کے ساتھ خود ملتے جائیں گے پر ابھی ہمارا ٹائم ویسٹ مت کرو۔ ابھی تمہیں صرف وہ کرنا ہے جو ہم کہیں۔“ سٹریٹس کے چائے پیتے اس نے وجہ کو جواب دیا پھر ذرا سخت لہجے میں بولا۔
”حجت بازی بہت ہو گئی، اب جیسا بولا ہے، کرتے جاؤ۔ اسٹارٹ اپنے سروٹس سے لو۔“

”اوکے..... میں جاتا ہوں۔“ وجہ نے گویا ہتھیار ڈال دیے۔

”کوئی چھوٹی سی بھی گڑبڑ کی تو یاد رکھنا یہاں آنے والی قیامت کی ساری ذمے داری تمہارے اپنے اوپر ہوگی۔ اندر بے شک ہم دو ہیں لیکن تمہارا مکان ہمارے آدمیوں کی سخت نگرانی میں ہے۔ یہاں سے ایک کبھی بھی ہماری مرضی کے خلاف اڑی تو ہم تباہی مچا دیں گے۔“ اس نے وجہ کو سنگین نتائج سے آگاہ کرنا ضروری سمجھا۔

”ڈونٹ وری۔ میں تمہاری مرضی کے خلاف کچھ نہیں کروں گا۔“ وجہ نے اسے یقین دہانی کروائی۔ وہ اس کے تیسرے دیکھ کر خود بھی یہ بات سمجھ چکا تھا کہ کسی قسم کی دھوکا دہی خود اس کے لیے نقصان کا باعث ہوگی۔

”گڈ! اب جاؤ اور کام سے لگ جاؤ۔“ اس نے مطمئن ہوتے ہوئے وجہ کو جانے کی اجازت دے دی۔
”اور ہاں سنو.....!“ ابھی وہ دروازے کے قریب ہی پہنچا تھا کہ اسے روک لیا۔

”سب کے ساتھ ڈرائیور کو بھی چھٹی دے دینا۔ پولنا مرنے والی رجنی کے ساتھ ساتھ مہمان عورتوں کی بھی سہیلی تھی اس لیے وہ یعنی ہم دونوں بھی تمہارے ساتھ ہی وہاں جا رہی ہیں۔ گاڑی میں جگہ کی تنگی کی وجہ سے تم ڈرائیور کو ساتھ نہیں لے جاؤ گے اور گاڑی خود ڈرائیور کو روکے۔“

”اوکے۔“ وجہ نے بنا بحث کے اس کی یہ بات بھی مان لی۔

”گڈ بوائے۔ ایسے ہی ہماری بات مانتے رہے تو اپنا سب کچھ بچا لو گے۔“ وہ اٹھ کر وجہ کے قریب آیا اور یوں اس کی قمیص کا کالر پکڑ کر مسلا جیسے یہ اس کے شاباش دینے کا انداز ہو لیکن وجہ نے ایک چھوٹی جھنجھٹ سے اس کے کالر پر چپکے ہوئے دیکھ لیا۔ وہ ایک ننھا کیرا اور مانیکرڈ فون تھا یعنی

اس کے پاس کہیں کوئی منجائش نہیں تھی۔ وہ ایک ٹھنڈی سالن لیتے ہوئے دروازہ کھول کر ڈرائنگ روم سے باہر نکل گیا۔ اس کے نکلنے ہی سے بچے کے ساتھ کھیتی لڑکی نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر موبائل فون نکالا اور کان میں بلیو ٹوتھ فکس کرنا لگی۔ اب وہ وجہ کی ہر حرکت دیکھنے کے ساتھ ساتھ اسے سننے کی بھی اہل تھی۔ مرد اس کی طرف سے مطمئن رجنی کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔

”پرسکون رہے شرمیتی جی! اگر آپ کے پتی نے کوئی شرارت نہیں کی تو ہم سے آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ ہم بھارتی فوج کے سورما نہیں ہیں جو جب بھی کسی کشمیری کے گھر میں قدم رکھتے ہیں تو ان کی گندی نگاہیں سب سے پہلے ہماری عورتوں کی عزت کو داغدار کرنے کی نیت سے انہیں تارنے لگتی ہیں۔“

”کشمیری تو میں بھی ہوں۔“ رجنی نے تھوک نکلے ہوئے اسے بتایا۔

”لیکن مسلمان نہیں۔“ اس نے ترنت جواب دیا۔
”میرے پتی انڈین آرمی میں ضرور ہیں لیکن وہ صرف اپنی جاب کرتے ہیں۔ انہوں نے کبھی کسی عورت کی عزت پر نظر نہیں ڈالی۔“ شاید وہ اس کے دل میں اپنے اور وجہ کے لیے نرم گوشہ پیدا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔
”اگر ایسا ہے تو اس کے ساتھ بھی کچھ بُرا نہیں ہوگا۔“ اس نے بات ختم کر دی۔ دو تین منٹ مزید گزرے تو وجہ واپس لوٹ آیا۔

”میں نے ملازمین سے کہہ دیا ہے کہ وہ ابھی چھٹی پر چلے جائیں۔ ہم بھی آدھے گھنٹے میں اپنا سامان پیک کرنے کے بعد گھر لاک کر کے روانہ ہو جائیں گے۔“ اس نے آکر اپنی کارکردگی بیان کی۔

”اب آپ کو تھوڑی زحمت کرنی ہوگی شرمیتی جی! آپ اندر جائیے اور سفر کے لیے ایک چھوٹا بیگ پیک کیجیے۔ یہ میری سائنٹی اس کام میں آپ کی ہیلپ کرے گی۔“ وہ وجہ کو کوئی جواب دیے بغیر رجنی سے مخاطب ہوا۔

”آپ ہمیں کہاں لے جانا چاہتے ہیں؟“ وجہ نے بے چین ہو کر پوچھا۔

”کہیں نہیں۔“ اس نے اطمینان سے جواب دیا اور اپنی ساتھی کو آٹھ سے اشارہ کیا کہ وہ رجنی کو اندر لے جائے۔
”بیگ پیک ہوگا تو ہی ملازمین کو یقین آئے گا کہ تم لوگ کہیں جا رہے ہو۔“ وہ دونوں چلی گئیں تو اس نے وجہ پر واضح کیا۔ اس کی ساتھی لڑکی جاتے جاتے بچے کو بھی گود

ہاں، تمہارے ساتھ ساتھ تمہارے وہ تین ساتھی بھی اپنی جان سے جائیں گے۔ ہم بے وجہ خون بہانا پسند نہیں کرتے لیکن تم ہمیں اس پر مجبور کر دو گے تو آخری حل کے طور پر یہ بھی کر گزریں گے۔“ اس نے وجے پر واضح کر دیا کہ اس کے پاس انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ شکست خوردہ وجے کو اس کا حکم ماننا ہی پڑا۔

”اب؟“ اس کام کو کر ڈالنے کے بعد اس نے سوالیہ نظروں سے خود کش جیکٹ والے کو دیکھا۔

”اب کچھ نہیں، اب بس ہم تمہارے مہمان ہیں جو زیادہ سے زیادہ چار دن تک تمہارے مکان میں رہیں گے۔ ہمارے ایک دو بندے اور یہاں آجائیں گے۔ بھابی جی کو ہمارے اور ان کے بھوجن کا بندوبست کرنا ہوگا۔ زیادہ گھبرانے کی بات نہیں ہے، میری ساتھی ان کی ہیلپ کر دے گی۔ اسے ہم نے اس کام میں شامل ہی اس لیے کیا ہے کہ بھابی جی ریلیکس رہ سکیں۔“ وہ دوستانہ انداز میں بول رہا تھا جبکہ وجے کا دماغ اس سوچ میں اٹکا تھا کہ اگلے چار دن میں کشمیر میں کون سا طوفان آنے والا ہے؟

☆☆☆

ایک، دو، تین..... حویلی کے گیٹ سے ایک ایک کر کے ایسبیلینسز اندر داخل ہو رہی تھیں۔ اعظم کو سینے سے لگائے کھڑی نیلی نے پتھرائی ہوئی نظروں سے ان ایسبیلینسز کو اپنے سامنے رکھتے اور ان سے اترتے تابوتوں کو دیکھا۔ وہ پورے پانچ تابوت تھے جنہیں اس کے دیکھتے ہی دیکھتے ایک قطار میں رکھا جانے لگا۔ تابوتوں کی آمد نے گزشتہ رات کے آخری پہر سے حویلی میں جاری گریہ وزاری کو یکدم ہی بہت بلند کر دیا تھا۔ کل سورج طلوع ہونے کے ساتھ ہی حویلی میں تعزیت کے لیے آنے والوں کا تاننا بندھ گیا تھا۔ حویلی کے پرانے نمک خوار ملازمین روتے دھوتے حویلی کی روایات کے مطابق آنے والے مہمانوں کے قیام اور طعام سمیت دیگر ضروریات کو پورا کرنے میں لگے ہوئے تھے اور نیلی کل سے اسی طرح اعظم کو سینے سے لگائے جامد دماغ کے ساتھ ایک ایک مہر کو دیکھ رہی تھی۔ کل سے اس نے چند گھنٹہ پانی کے سوا ملحق سے کچھ بھی نیچے نہیں اتارا تھا البتہ اعظم کو ملازموں کی فراہم کردہ غذا کھلاتی پلاتی رہی تھی۔ وہ حویلی میں اتنے بہت سارے اجنبی چہروں کی آمد اور رونے دھونے کی آوازیوں سے سراسیمہ تھا اور سارا وقت اس کے ساتھ چٹا رہتا تھا۔ اس حویلی پر ایسا سانحہ ہوتا تھا جس نے ہر آنکھ اٹھکار

میں اٹھا کر لے گئی تھی۔ کمرہ چھوڑنے سے پہلے وہ اپنے چہرے پر نقاب لگانا نہیں بھولی تھی۔

”مطلب ہمیں چار دن تک یہیں اسی گھر میں رہنا ہے؟“ وجے نے فوراً نتیجہ اخذ کیا۔

”بالکل۔ ہم بے گھری کا دکھ جانتے ہیں اس لیے کسی کو بے گھر کرنے کے قائل نہیں ہیں۔“ وہ موقع ملنے پر کوئی چبھتا ہوا جملہ کہنے سے گریز نہیں کرتا تھا۔

”لیکن.....“ وجے نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا۔

”باقی باتیں بعد میں، پہلے کام نمٹاؤ۔“
”کیسا کام؟“

”اپنے دفتر اور گھر والوں کو اپنی روانگی کی اطلاع دو۔“ اس نے وجے کو حکم دیا اور خود اس کے عین عقب میں آکھڑا ہوا۔ اب وہ اس کے موبائل پر چھٹی کے لیے لکھی جانے والی ای میل پڑھ سکتا تھا۔

”کل منتری جی یہاں پہنچ رہے ہیں۔ ایسے میں، میری یہ اچانک چھٹی میرے ریکارڈ پر ایک داغ ثابت ہوگی۔“ ای میل بھیجنے کے بعد وجے ماتھے کو پریشانی سے مسلتے ہوئے بڑبڑایا۔

”تو عملے کے وہ لوگ جنہیں فضول کاموں پر لگایا ہوا ہے، انہیں واپس بلواؤ تاکہ وہ کوئی ڈھنگ کا کام کر سکیں۔“

”کیا مطلب؟“ اس کے دے شورے پر وجے چوٹا۔

”ارے بھئی، وہ جو تین بندوں کی خواہ مخواہ عمار کے پیچھے شفٹوں میں ڈبوئی لگائی ہوئی ہے، ان کی بات کر رہا ہوں۔ واپس بلواؤ انہیں۔ کیوں بیکار میں شریف شہریوں کو پریشان کرتے ہو۔“ اس نے یوں سرسری لہجے میں کہا جیسے موسم پر تبصرہ کر رہا ہو لیکن وجے بڑی طرح چونک گیا۔

”عمار..... اودہ مائی گاڈا عمار ہے تمہارے پیچھے۔ مجھے تو پہلے ہی شک تھا کہ اس لڑکے میں کچھ گڑبڑ ہے۔“

”گڑبڑ اس میں نہیں، گڑبڑ تم لوگوں میں ہے۔ تم لوگ جو ہمارے بنیادی انسانی حقوق سلب کر کے بیٹھے ہوئے ہو، کیسے کسی اور کو قتل کہہ سکتے ہو۔“ وہ وجے کی بات سن کر جذباتی ہو گیا اور یکدم ہی لہجے کو درشت کرتے ہوئے حکم دیا۔

”کالو آرڈر اپنے بندوں کے لیے۔“

”اور اگر میں ایسا نہ کروں؟“ وجے نے اٹرنے کی

کوشش کی۔
”گلتا ہے بھارت ماما پر اپنا آپ اور اپنا پر یوار دان کرنے کا سوچ رہے ہو، پر اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔“

لے کر اس کا ماتھا چوم لیا۔ اس موقع پر اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ حویلی کے وارث کے آنسو حویلی میں طوفان لے آئے۔ نمک خوار ملازمین دھاڑیں مار مار کر رونے ہوئے سینہ کو پی کرنے لگے۔ ایسے میں مول کی آمد نے مزید قیامت ڈھادی۔ وہ بھائی کے ساتھ لگ کر ایسا روئی کہ پتھروں کے بھی دل لرز گئے۔ مول کے ساتھ خدیجہ بھی گئی۔ بن بیا ہے بیوہ ہو جانے والی اس لڑکی کو دکھ نے سکتے زدہ کر دیا تھا۔ سرمد کے نام کی مالا جب کر زندہ رہنے والی کو اس کی موت پر کھل کر بین کرنے کا حق حاصل نہیں تھا کہ وہ صرف مگیتر تھی اور اس کے ساتھ کسی قانونی یا خونی رشتے میں نہیں جڑی تھی۔

”میں آج تک اپنے دکھ کو روٹی رہی لیکن یہ وقت ان کے دکھ کو بانٹنے کا ہے جو مجھ سے بھی بڑے سانچے سے گزر رہے ہیں۔“ نیلی پر یہ خیال کسی الہام کی طرح اتر اور وہ ایک نئی توانائی کے ساتھ ان کے دکھ بانٹنے کے لیے پرعزم ہو گئی۔

☆☆☆

رات کا جانے کون سا پہر تھا۔ اس کی آنکھ یکدم کھل گئی اور ایسا لگا کہ دل بہت تیز رفتاری کے ساتھ دوڑ رہا ہو۔ اس اجنبی کیفیت پر پریشان اس نے سائڈ میں رکھا موبائل اٹھا کر اس پر وقت دیکھا۔ وہ الارم لگا کر سویا تھا لیکن ابھی اس الارم کے بجنے میں بہت وقت پڑا تھا۔

”کیا میں نے کوئی بُرا خواب دیکھا تھا؟“ وہ اپنی کیفیت اور بلا وجہ آنکھ کھل جانے کی وجہ تلاش کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ عام طور پر اس طرح آنکھ کھلنے اور طبیعت کے بے چین ہونے کے پیچھے کوئی بُرا خواب ہی ہوتا ہے لیکن اسے ذہن پر بہت زور دینے پر بھی کوئی اچھا بُرا خواب یاد نہیں آرہا تھا۔ دماغ کی تنگی کو یا بالکل خالی پڑی تھی لیکن کچھ تھا جو دل کو بے چین کر رہا تھا۔

”کیا یہ اس کام کی وجہ سے ہے جسے آج میں کرنے جا رہا ہوں؟“ اس نے خود سے سوال کیا۔

”نہیں، میں نے اس کام کو بہت سوچ سمجھ کر کرنا قبول کیا ہے۔ اس میں جتنا رسک ہے، اتنی ہی اچھی منصوبہ بندی بھی کی گئی ہے اس لیے میرے دل میں ناکامی کا کوئی ڈر نہیں ہے۔“ جواب نفی میں ہی آیا۔

”شاید یہ آغا جان اور بی بی کو چھوڑ کر جانے کی تکلیف ہے۔ ان چند دنوں میں، میں ان لوگوں سے بالکل اپنے خونی رشتوں کی طرح ہی جڑ گیا ہوں اور کبھی کبھی مجھے ایسا لگا

کر دی تھی۔ سرمد کی موت اور عالم کے زخمی ہونے کی اطلاع سن کر حویلی سے روانہ ہونے والی سبیل اور ہوٹل سے اسپتال کے لیے نکلنے والے صداقت شاہ، سکینہ شاہ اور قربان شاہ پر گھات میں بیٹھے ہوئے دشمنوں کی طرف سے شدید حملہ ہوا تھا۔ حملہ آوروں نے اتنی شدید فائرنگ کی تھی کہ گاڑیوں سمیت انسانی وجود چھلنی ہو کر رہ گئے تھے اور کوئی ایک بھی زندہ اسپتال نہیں پہنچ سکا تھا۔ عالم شاہ کو ہوش میں آنے کے بعد علم ہوا تھا کہ جس وقت آپریشن تھیٹر میں اس کے جسم سے گولیاں نکالی جا رہی تھیں، عین اسی وقت اس کے پیاروں کے جسموں سے ان کی رو میں بھی نکالی گئی تھیں۔ پوسٹ مارٹم کا صبر آزما مرحلہ گزرنے تک ڈاکٹروں نے اس کی ذہنی حالت کو اتار ہونے سے بچانے کے لیے اسے زیادہ مسکن دواؤں کے زیر اثر رکھا تھا۔

صداقت شاہ، سکینہ شاہ، قربان شاہ اور سرمد کے تابوتوں کے پاس سے ایک ایک کر کے گزرتی وہ سبیل کے تابوت کے سامنے آ کر رک کر تو اعظم بے چین ہو کر رونے لگا۔ اس نے تابوت کے چوکھٹے شیشے سے نظر آنے والا سبیل کا چہرہ نہیں دیکھا تھا لیکن ماں کی فطری کشش نے اسے بے قرار ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ نیلی اسے بہلاتی ہوئی تابوت سے دور ہٹی تو اس نے چھٹی ایسبولینس کو حویلی کے احاطے میں داخل ہوتے دیکھا۔ وہ وہیں رک کر اس ایسبولینس کی طرف دیکھنے لگی۔ ایسبولینس کا دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک اسٹریچر اتارا جانے لگا۔ اسٹریچر کے ساتھ ہی فولڈنگ ویل چیز بھی تھی۔ مستعد عملے نے ویل چیز کو کھولا اور احتیاط سے اسٹریچر پر لیٹے شخص کو اٹھا کر اس ویل چیز پر منتقل کرنے لگے۔ منتقلی کے اس عمل کے دوران نیلی نے اس شخص کا چہرہ دیکھا۔ وہ عالم شاہ تھا جس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور آنکھوں میں ویرانی رہی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر ز اسے اسپتال سے ڈسچارج کرنے کے لیے تیار نہیں تھے لیکن اس کے لیے اس نازک وقت میں اسپتال میں پڑے رہنا ممکن نہیں تھا۔ وہ زبردستی اصرار کر کے حویلی آیا تھا اور اندر سے کتنا شکستہ تھا، اس کا اندازہ نیلی اس کی ویران آنکھوں سے لگا سکتی تھی۔ اس نازک موقع پر اسے دلاسا دینے کے لیے وہ اور تو کچھ نہیں کر سکتی تھی، خاموشی سے اعظم کو لے کر اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اعظم کو دیکھ کر عالم شاہ کی آنکھوں میں نمی چمکی اور اس نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا۔ اس کا مقصد سمجھتے ہوئے نیلی، اعظم سمیت نیچے کی جانب جھکی۔ عالم شاہ نے پہلے اس کے سر پر ہاتھ رکھا پھر اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں

کے دل پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی اور پورا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا۔ اس نے چاہا کہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو جائے لیکن ٹانگیں بالکل بے جان ہو رہی تھیں۔

”کیا بات ہے بیٹا! اس وقت یہاں کیوں بیٹھے ہوئے ہو؟“ وہ اپنے آپ میں الجھا ہوا تھا، آغا گل کب آکر اس کے پہلو میں بیٹھ گئے، اسے پتا ہی نہیں چلا۔ اب بھی اس نے انہیں جواب نہیں دیا۔ وہ جواب دینے کے قابل ہی نہیں تھا۔ ”معاذ!“ انہوں نے اسے تشویش سے پکارتے ہوئے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تو انہیں احساس ہوا کہ وہ بری طرح کانپ رہا ہے۔

”کیا ہوا ہے بیٹا! تم ٹھیک تو ہو؟“ غیر معمولی پن کا احساس ہونے پر انہوں نے اسے اپنے کمزور بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔ اسے اس وقت کسی سہارے کی ہی ضرورت تھی۔ وہ بے اختیار ہی ان کے سینے سے لگا اور کسی چھوٹے بچے کی طرح سسک سسک کر رونے لگا۔ آغا گل دم بخود رہ گئے۔ وہ حساس طبیعت کا مالک ہے، اس بات کا اندازہ انہیں اس کے یہاں قیام کے عرصے میں ہو گیا تھا لیکن اس کی یہ کیفیت پہلی بار ان کے سامنے آئی تھی۔

انہوں نے کچھ دیر اسے بغیر کچھ کہے یونہی رونے دیا اور تسلی دینے کے انداز میں آہستہ آہستہ اس کی پیٹھ سہلاتے رہے۔ کچھ دیر روتے رہنے کے بعد اس کے وجود کی کپکپاہٹ کم ہونا شروع ہو گئی اور سسکیاں بھی دم توڑنے لگیں۔ آغا گل اس کی پیٹھ تھپتھا کر کھڑے ہوئے اور گلاس میں پانی بھر لائے۔ بصارت سے محرومی کے باوجود وہ اپنی حیات کے سہارے ایسے تمام کام بخیر و خوبی انجام دینے کی اہلیت رکھتے تھے۔

”لو، پانی پی لو۔“ انہوں نے محبت سے کہتے ہوئے اسے گلاس چھمایا۔

”میں نے آپ کو زحمت دی آغا جان!“ دو گھونٹ پانی پی کر اس کی طبیعت ذرا سنبھلی تو شرمندہ سا ہو کر بولا۔ ”اپنے بچوں کو آرام پہنچانے میں ماں باپ کو بھی زحمت نہیں ہوتی۔ ہاں، البتہ.....“ انہوں نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”البتہ کیا؟“

”البتہ یہ کہ اگر اولاد کسی تکلیف میں ہو تو ماں باپ کو اس کی تکلیف اس سے زیادہ محسوس ہوتی ہے اور وہ اس وقت تک سکون محسوس نہیں کرتے جب تک اس تکلیف کا سدباب نہ ہو جائے۔“ ان کے لہجے میں اس کے لیے بے

ہے کہ میں معاذ نہیں بلکہ سچ سچ عمار ہی ہوں۔“ دماغ ایک اور توجیہ ڈھونڈ لایا تھا جسے وہ مکمل طور پر رد نہیں کر سکا۔ بہر حال وجہ جو بھی تھی، اب آنکھ کھل چکی تھی اور یہ طے تھا کہ دوبارہ نیند نہیں آئے گی۔ اس لیے بستر پر لیٹ کر خواہ مخواہ وقت برباد کرنے اور کروٹیں بدلتے رہنے کے بجائے وہ اٹھ کر کمرے سے باہر آ گیا۔ کھلے محن میں رکھا سامان تاروں کی مدھم روشنی میں دھندلا سا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ایک چارپائی سیدھی کر کے اس پر بیٹھ گیا اور آنکھیں آسمان پر لٹکادیں۔ جلد ہی اس نے تاروں بھرے آسمان پر سب سے روشن ستارہ ڈھونڈ لیا اور کیرتھر کی پہاڑیوں میں بسنے والے فیضو سے سیکھا کھیل کھیلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ ستارہ بینی کی مشق اس کے معمول کا وہ حصہ تھا جسے اس نے مشکل حالات میں بھی وقتاً فوقتاً جاری رکھا تھا اور اسے اعتراف تھا کہ اس مشق نے اسے بے حد ذہنی مضبوطی بخشی تھی۔

”دیکھتے ہیں آج تم مجھے کس جہان کی سیر کراتے ہو۔“ وہ آسمان کے اس سب سے روشن ستارے سے مسکرا کر مخاطب ہوا اور اس پر اپنی نظریں گاڑ دیں۔ تھوڑی ہی دیر میں ستارے کی روشنی نے پھیلنا شروع کر دیا اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس روشنی کے ساتھ ساتھ خوشبو کی لپٹیں بھی اس تک آرہی ہیں۔ روشنی بہت تیز اور سرخ تھی اور آہستہ آہستہ پھیلتی جا رہی تھی۔ پھیلتے پھیلتے اچانک اس نے کوئی شکل لینی شروع کر دی۔ شروع میں تو اسے کچھ سمجھ نہیں آئی لیکن پھر واضح ہونے لگا کہ روشنی نے سرخ عروسی جوڑے میں ملبوس ایک دو شیزہ کا بہرہ پ دھار لیا ہے۔ اس دو شیزہ کا چہرہ گھونگھٹ سے ڈھکا ہوا تھا اور وہ اس گھونگھٹ کے نیچے سے صرف ان گلابی پتھریلوں سے لیوں کو دیکھ سکتا تھا جن کے بائیں کونے پر پیرا دیتا موٹا سیاہ تل اس کے دل کو اپنی طرف کھینچتا تھا۔

”سجمل.....“ اسے اس دو شیزہ کی شناخت کے لیے اس کی بس اتنی جھلک ہی کافی تھی، سو بے قراری سے پکار اٹھا۔ اس کی پکار کے جواب میں گلابی ہونٹ مسکرانے کے انداز میں پھیلے اور بائیں جانب موجود تل کسی ستارے کی طرح جھلک لایا۔ اس نے بے اختیار ہی اس ستارے کو چھونے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا لیکن وہ اس سے دور ہونے لگا۔ ہوتے ہوتے اتنا دور ہوا کہ پہلے دھندلایا، پھر نظروں سے غائب ہو گیا۔

”سجمل.....!“ اس نے گھبرا کر زور سے پکارا لیکن اب نہ وہاں کوئی ستارہ تھا نہ عروسی لباس میں ملبوس سجمل۔ اس

انتہا خلوص تھا۔ معاذ کی آنکھیں ایک بار پھر بھیگنے لگیں۔
 ”آغا جان.....!“ وہ بھیگتی ہوئی آواز میں محض ان کا نام پکار کر رہ گیا۔

”مجھے بتاؤ بیٹا کہ کیا ہوا ہے جو تم رات کے اس پہر یوں یہاں بیٹھ کر آنسو بہا رہے ہو؟“ انہوں نے نہایت محبت سے اس کے رونے کا سبب پوچھا۔

”مجھے نہیں پتا آغا جان کہ کیا ہوا ہے لیکن بس کچھ ہو گیا ہے، کچھ ایسا جو میرا دل سہہ نہیں پارہا اور بُری طرح بے قرار ہو گیا ہے۔“ اس نے نہایت سچائی سے انہیں اپنے دل کی کیفیت سے آگاہ کیا۔

”ہوں۔“ انہوں نے فوری طور پر اسے جواب دینے کے بجائے ایک ہنکارا بھرا۔ وہ زمانے کے نشیب و فراز سے گزر رہے ہوئے انسان تھے اور ان کا تجربہ کہتا تھا کہ دل کی اس طرح کی گواہی کبھی بے وجہ نہیں ہوتی۔ انسان کا دل اُن دیکھے تاروں کے ذریعے اپنے پیاروں سے جڑا ہوتا ہے اور یہ تار بڑی مستحی سے ان کی خوشی غمی کی خبریں دل تک پہنچاتے ہیں۔

”آپ دعا کریں آغا جان کہ سب ٹھیک ہو۔“ وہ جانتا تھا کہ آغا گل معمول کے مطابق تہجد کی نماز پڑھنے رات کے اس پہر جاگے ہوں گے اس لیے ان سے التجا کی۔
 ”میں کروں گا بیٹا دعا، تم خود بھی وضو کر کے نوافل پڑھو اور سب خیر کی دعا مانگو۔ اس سے تمہارے دل کی بے قراری کو بھی قرار ملے گا۔“ انہوں نے اسے نصیحت کی۔

”لیکن مجھے لگتا ہے کہ کچھ ہو گیا ہے اور اب دعا لا حاصل ہے۔“ اس نے کسی سہمے ہوئے بچے کی طرح اپنا اندیشہ بیان کیا۔

”دعا بھی لا حاصل نہیں ہوتی۔ جو ہو چکا، اسے بے شک ہم بدلنے پر قادر نہیں لیکن اللہ سے اس تکلیف میں سے بھلائی تو طلب کر سکتے ہیں نا۔ معبود کو اپنے بندوں کا اپنے سامنے جھکتا اور طلب کرنا پسند ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ہماری دعائیں رانگاں چلی جائیں۔ دعاؤں کا بدلہ دنیا یا آخرت کی بھلائی کی صورت میں ضرور بالضرور ملتا ہے میرے بیٹے۔“ انہوں نے اسے سمجھایا۔ وہ خود بھی یہ بات جانتا تھا لیکن بے چینی نے بچپن سے پڑھے اس سبق کو بھلا دیا تھا۔ اب آغا جان نے یاد دلایا تو کچھ شرمندہ سا ہو کر اٹھ گیا اور وضو کرنے لگا۔

”اے اللہ! میرے سارے معاملات تیرے حوالے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ تجھ سے بڑھ کر کوئی رحم و کرم

کرنے والا نہیں ہے۔ اگر ظاہر میں ہمارے ساتھ کچھ بُرا ہو بھی جائے تو یہ تیرا ہم پر ظلم نہیں ہوتا بلکہ تیرے ہر عمل کے پیچھے کوئی نہ کوئی حکمت پوشیدہ ہوتی ہے۔ مجھے اپنی حکمت پر بھروسہ رکھنے والا بنا اور مجھ سے صرف اور صرف وہ عمل کروا جو تیری رضا مندی کا ذریعہ ہو۔ میں دنیا کی ساری نعمتیں اور محبتیں تیری رضا پر قربان کرنے کا وعدہ کرتا ہوں۔ بس تو بھی مجھ پر ایک احسان کرنا۔ میری اس زندگی کو رانگاں نہ جانے دینا اور مجھ سے وہ عمل کروانا جو میرے دل کو اطمینان سے بھر دے۔“ جائے نماز پر کھڑے ہو کر بہت اٹھاک سے تہجد کے نوافل ادا کرنے کے بعد اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو نہایت خشوع و خضوع سے وہ مانگتا چلا گیا جو شاید ہمیشہ سے دل میں تو تھا لیکن کبھی یوں زبان پر نہیں آیا تھا۔ اپنے رب کے حضور یہ سب مانگتے ہوئے اس کی آنکھوں سے مسلسل خاموشی کے ساتھ آنسو بھی بہہ رہے تھے لیکن ان آنسوؤں اور کچھ دیر قبل بہائے گئے آنسوؤں میں فرق تھا۔ اُن آنسوؤں میں بے قراری، بے صبری اور تکلیف تھی اور یہ آنسو عاجزی، انکساری اور خود سپردگی لیے ہوئے تھے۔ یہ آنسو جیسے جیسے بہتے جا رہے تھے، وہ اپنے دل میں ایک سکون اور ٹھنڈک سی اترتی ہوئی محسوس کر رہا تھا۔ حضوری کی اس کیفیت میں اسے خبر نہیں تھی کہ جائے نماز پر بیٹھے کتنی دیر گزر چکی ہے۔

”بس اب آجاؤ بیٹا! تمہاری بی بی جان قہوہ تیار کر کے تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔“ آغا جان نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے آہستہ سے پکارا تو وہ ماحول میں واپس آیا۔ زرینہ بی بی واقعی قہوہ تیار کیے اس کی خنجر تھیں۔ فجر سے پہلے آغا گل کے لیے قہوہ تیار کرنا ان کے معمولات کا حصہ تھا۔

”میں دنیا کے کسی بھی حصے میں ہوا، اس قہوے کو ہمیشہ مس کروں گا۔“ خوشبودار قہوے کا پہلا گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے وہ زرینہ بی بی سے مخاطب ہوا۔
 ”ہم بھی ہمیشہ تمہیں یاد کریں گے اور عمار کی طرح تمہاری یاد بھی ہمیں رلایا کرے گی۔“ زرینہ بی بی کی چٹکیں بھیگنے لگیں۔

”مجھے آنسوؤں میں نہیں، دعاؤں میں رخصت کریں بی بی جان! مجھے اس وقت آپ کی ہمت اور حوصلے کی ضرورت ہے اور کشمیر کی ماؤں کا حوصلہ تو ایک مثال ہے۔ یہ کشمیری ماؤں کی ہی ہمت ہے کہ لسلوں سے اپنے جوان بیٹوں کو خون میں نہاتا دیکھ رہی ہیں لیکن کبھی انہیں بزدلی کا

دو ہستیاں تھیں جن سے اپنے والدین کے بعد وہ بے انتہا
انیت محسوس کرنے لگا تھا اور شدت سے خواہش مند تھا کہ
ان دونوں کا بڑھاپا چین سے گزر جائے۔

”میں وعدہ کرتا ہوں کہ انہیں بالکل بھی نہیں ستاؤں
گا۔“ بہرام بھی جذباتی ہو رہا تھا۔ اس نے اسے ہچکی دی اور
باہر نکل گیا۔ ایک بار پھر آغا جان اور زرینہ بی بی سے ملنے
کے بعد گھر سے نکلا تو قدم مسجد کی مخالف سمت میں اٹھ رہے
تھے۔ کچھ دور اسے لینے کے لیے آنے والے ایک جیب
میں اس کے منتظر تھے۔ اس نے جیب میں بیٹھتے ہوئے بے
اختیار اپنے عقب میں دیکھا۔ کئی روز بعد آج وہ دن آیا تھا
کہ اس کے عقب میں کوئی تعاقب کار موجود نہیں تھا۔

”سوری بنجامن انکل!“ وہ زیر لب بڑبڑایا اور جیب
میں بیٹھ گیا۔ اس سارے قصبے میں ایک بنجامن ہی تھا جس
کے خلوص کا اس نے کچھ ناچار فائدہ اٹھایا تھا۔

”راستے میں کسی مناسب جگہ نماز کے لیے روک
لیتا۔“ جیب چلی تو اس نے ڈرائیور سے کہا۔ آج دل کی کچھ
ایسی کیفیت تھی کہ بار بار اپنے رب کے حضور سجدہ ریز
ہونے کے لیے ٹھل رہا تھا اور یہ تو پھر فرض نماز تھی۔ قوم اور
وطن کا حق ادا کرنے سے پہلے رب کائنات کا حق ادا کرنا
ضروری تھا۔

☆☆☆

”آل کلیئر!“ اس نے سامنے رکھی کافی کا مک اٹھا کر
ایک گھونٹ بھرا اور طریہ مسکراہٹ کے ساتھ بڑبڑائی۔

اس کا بچ جاننے کے لیے اسے سخت جسمانی تشدد میں
جلا کرنے والوں نے اپنی مکمل نسل کے لیے آج اسے ذہنی
جانچ کے مرحلے سے گزارا تھا۔ ماہر ترین پٹاٹ نے اس
پر اپنی پٹاٹزم کی صلاحیتیں آزمائی تھیں اور ان سوالوں کے
جواب جانا چاہے تھے جو وہ اس پر جسمانی تشدد کر کے
حاصل نہیں کر سکے تھے۔

معاذ کی فیملی کہاں ہے؟

معاذ کا چین سے کیا معاہدہ ہوا ہے؟

وہ معاذ کے ساتھ زیادہ وقار دار ہے یا عظیم ہے؟

کیا اس کے دل میں معاذ کے لیے آج بھی کوئی نرم
کوشش ہے؟

یہ اور اس جیسے کئی سوالات تھے جو اس سے سیشن کے
دوران پوچھے جاتے رہے تھے۔ یہ مرحلہ آئے گا، اس سے
اس سمیت سب ہی واقف تھے اس لیے ابتدا میں ہی اس
کے ذہن میں ان سوالات کے جوابات راسخ کر دیے گئے

سبق نہیں پڑھائیں۔“ اس نے محبت سے زرینہ بی بی کے
دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے ان سے درخواست کی۔

”میری دعا میں تمہارے ساتھ ہیں میرے بچے! جاؤ
اور ہم مسلمانوں کو پسا کرنے کی سازش کرنے والوں کے
خلاف سینہ سپر ہو جاؤ۔ اللہ نے چاہا تو تم ضرور سرخرو رہو
گے۔“ زرینہ بی بی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔
اسی وقت قریبی مسجد سے فجر کی اذان بلند ہونے لگی۔

”میری روائگی کا وقت ہو گیا ہے۔“ اس نے آہستہ
سے کہا تو آغا گل اور زرینہ بی بی کے چہرے ایک پل کے
لیے زرد پڑ گئے۔

”اللہ کی امان میں بیٹا!“ آخر آغا گل نے ہی پہلے
ہمت کی اور اسے اپنے سینے سے لگایا۔ انہیں ایسا لگ رہا تھا
کہ آج ایک بار پھر ان کا عماران سے رخصت ہو رہا ہو۔

”اجازت دیں بی بی جان!“ ان سے ملنے کے بعد
وہ زرینہ بی بی کے آگے جھکا۔

”اللہ سوہنا ٹھنڈی چھاؤں میں رکھے۔“ انہوں نے
اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

ان دونوں سے مل کر وہ اپنے زیر استعمال کمرے
میں گیا تاکہ ضرورت کا سامان اٹھاسکے۔ اس کمرے میں
بہرام جوکل ہی اسپتال سے ڈسچارج ہو کر آیا تھا، بھی سویا ہوا
تھا۔ اس کے پیگ کھسکانے پر اس کی آنکھ کھل گئی۔

”آپ ہمیں جارہے ہیں عمار بھائی؟“ اس کے ہاتھ
میں بیگ دیکھ کر وہ تیزی سے اٹھ بیٹھا۔

”تمہیں بتایا تھا کہ مجھے جانا ہے۔ اب تم مجھے ہنسی
خوشی رخصت کرو اور مجھ سے وعدہ کرو کہ میرے پیچھے بی بی
جان اور آغا جان کا خیال رکھو گے اور ایسی نوبت نہیں آنے
دو گے کہ انہیں تم سے کوئی شکایت ہو۔“ اس کے پاس وقت
کم تھا اس لیے بغیر کسی تمہید کے اس سے سیدھی بات کی۔

”لیکن اتنی جلدی..... ابھی تو میں پوری طرح ٹھیک
بھی نہیں ہوا۔“ بہرام کو اس کے جانے کی خبر پسند نہیں آئی تھی۔
”نہیں، تم اب ٹھیک ہو بس اپنی دوا میں پابندی سے
کھاتے رہنا اور ڈاکٹر صاحب کی ہدایات پر پوری طرح
عمل کرنا۔“ اس نے بہرام کو سمجھایا اور پھر اپنے سینے سے
لگا لیا۔

”میں آپ کو بہت یاد کروں گا عمار بھائی!“ وہ
روہانسی آواز میں بولا۔

”جتنا مجھے یاد کرو، اتنا ہی بی بی اور آغا جان کا خیال
رکھنا۔“ اس نے اسے صحت کی۔ زرینہ بی بی اور آغا گل وہ

زندگی کی واحد اور آخری غلطی کے طور پر لیتی تھی لیکن تم.....“
اس نے گہرا سانس لیا۔

”تم میرے لیے، میرے کیریئر کی سب سے بڑی آزمائش ثابت ہوئی ہو۔ پچھلا کچھ عرصہ میں نے کس قدر ذہنی اذیت میں گزارا ہے، تم اسے سمجھ ہی نہیں سکتیں لیکن کم از کم مجھے یہ حق تو دو کہ اپنے سارے بوجھ اترنے کے بعد میں تھوڑا سا خوش ہو سکوں۔“

”میں نے آپ کو خوش ہونے سے روکا تو نہیں ہے لیکن یہ تو لازم نہیں ہے کہ آپ کے ساتھ میں بھی خوش ہوؤں۔“ اس کے چہرے پر اب بھی ناراضگی تھی۔

”تم اپنے رویے میں درست نہیں ہو۔ تمہارا مسئلہ یہ ہے کہ تم مجھ سے ایک عام ماں جیسی جذباتیت کی طلب گار ہو لیکن میں نے جو بھاری ذمے داریاں اپنے شانوں پر اٹھا رکھی ہیں، وہ مجھے اجازت نہیں دیتی ہیں کہ میں اس طرح کے رویے کا اظہار کروں۔ تمہاری تربیت کرتے ہوئے بھی میں نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ تم ایک عام بچے کے انداز میں نہ سوچو اور تمہیں ہمیشہ اس بات کا احساس رہے کہ تمہاری ماں کے ساتھ ساتھ تم پر بھی بہت سی ذمے داریوں کا بوجھ ہے۔“ اس بار میڈم ایکس نے اسے ایک لپکھردے ڈالا۔

”ہم مشین نہیں ہیں مام جو ہمیشہ بس ایک طے شدہ کام کرتی چلی جائے۔ ہم انسان ہیں اور انسان کے ساتھ جذبات و احساسات جڑے ہوتے ہیں۔“

”مجھے انکار نہیں ہے۔ بس تم یہ سمجھ لو کہ میری زندگی میں حب الوطنی کا جذبہ سب سے اوپر ہے اور ہمیشہ ایسا ہی رہے گا۔“ رائیل نے اپنی ہمیشہ کی بات دہرائی تو اسے گویا ہار مانتے ہی بنی اور پست لہجے میں بولی۔

”یہ بات جانے کیوں مجھے بار بار بھول جاتی ہے۔“
”حالانکہ بھولنی نہیں چاہیے۔“

”آئندہ خیال رکھوں گی۔“ اس نے اپنی ہلکتا ہوا لہجہ میں کہا۔

”تمہاری ان احمقانہ باتوں میں الجھ کر وہ اہم باتیں تو رہ ہی گئیں جن کے لیے میں تمہارے پاس آئی تھی۔“
”تو اب کر لیں۔“ وہ عجیب مردم بیزاری ہو رہی تھی۔

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر ہو جوان
کسی داستان جو غلط کاروں کے لیے غضب
ناک تھا باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیے

تھے۔ یہ کام یوان منگ نے خود کیا تھا اور یہ طے تھا کہ حیرت انگیز شخصیت رکھنے والا وہ بوڑھا چینی اس علم میں اتنا ماہر تھا کہ کسی اور کے لیے اس کے عمل کا توڑ کر کے حقیقت تک رسائی ممکن نہیں تھی اور کچھ باتیں تو تھیں ہی ایسی جن کا اسے سچ مچ علم نہیں تھا۔ مثلاً وہ نہیں جانتی تھی کہ معاذ کی ٹیلی کہاں ہے اور اس کا ان سے رابطہ ہے یا نہیں؟ وہ معاذ کے موجودہ پتے سے بھی واقف نہیں تھی۔ بس اسے یہ معلوم تھا کہ وہ کسی دن اسرائیل آئے گا اور خود اس سے رابطہ کرے گا۔ اس سلسلے میں ایک طریقہ کار بھی طے کیا گیا تھا اور مزے کی بات یہ تھی کہ وہ ان معلومات کو ماہر تخویم سے چھپا کر اسے جل دینے میں کامیاب ہو کر اکابرین کے سامنے سرخرو ہو چکی تھی۔

”ہم اس دھوکے میں ہیں کہ ہم علم اور ترقی کی انتہا پر ہیں لیکن یہ سچ نہیں ہے۔ انفرادی سطح پر ہی سہی لیکن دنیا میں ایسے لوگ موجود ہیں جن کے پاس ہمارے ذہین ترین دماغوں سے زیادہ صلاحیتیں موجود ہیں۔“ بہت لمبی سے سوچتے ہوئے وہ تلخ کافی گھونٹ گھونٹ کر کے اپنے حلق سے نیچے اتار رہی تھی کہ دروازے پر ہونے والی ہلکی سی دستک نے اسے اس طرف متوجہ کیا۔

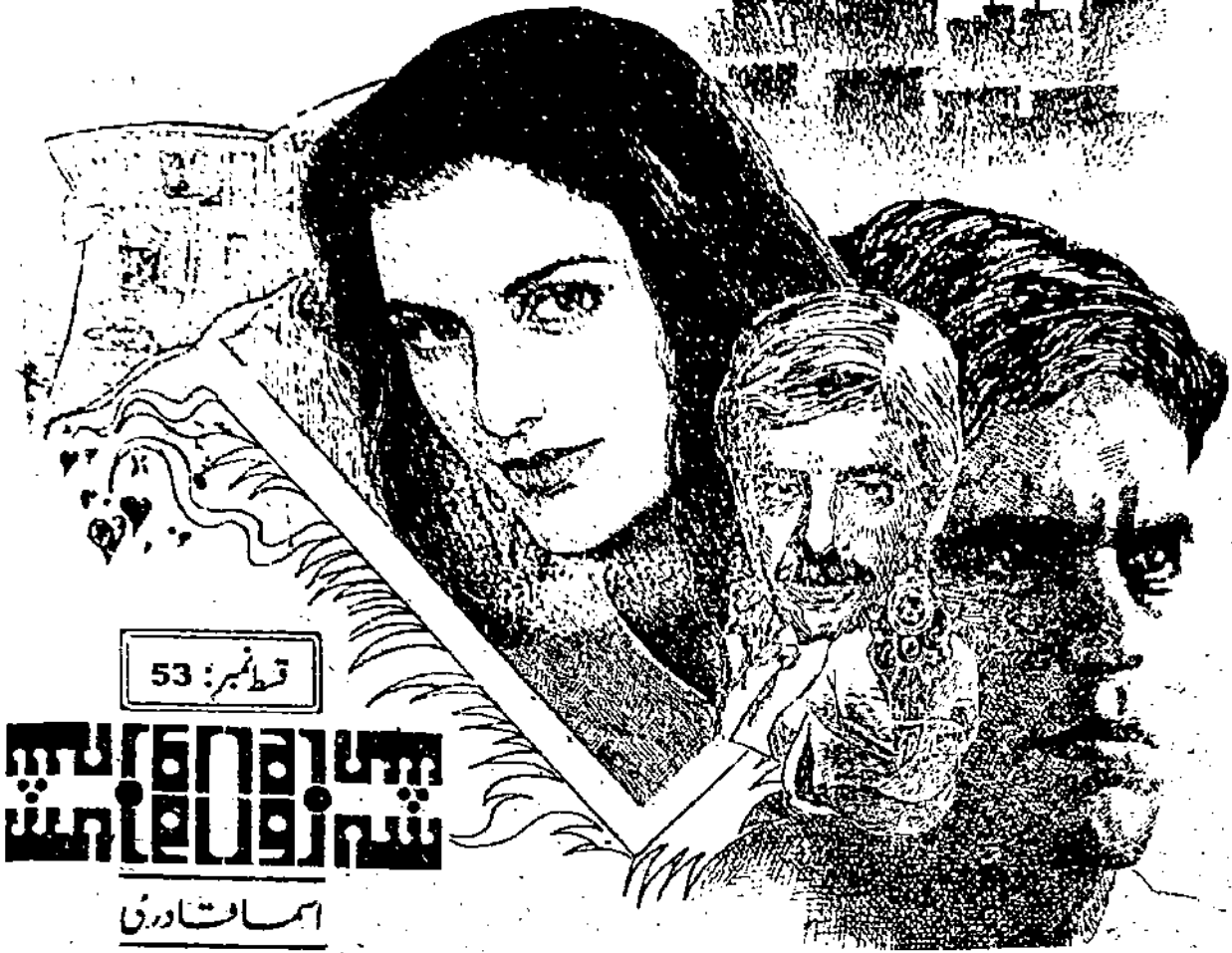
”میں اندر آ سکتی ہوں؟“ دستک کے فوراً بعد دروازہ کھلا اور رائیل مسکرا کر پوچھتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اس کا موڈ خاصا خوشگوار محسوس ہو رہا تھا۔

”آپ آل ریڈی اندر آ چکی ہیں اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ میڈم ایکس کو اپنی ایک ادنیٰ سی درکر کی اجازت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے اپنے اندر کی مٹتی کو ظاہر ہونے سے بالکل نہیں روکا۔ نتیجے میں رائیل کی مسکراہٹ سکڑ گئی اور قدرے مفاہمانہ انداز میں بولی۔

”میں آج بہت خوش ہوں ہنی! اتنی لمبی کا اظہار کر کے میری خوشی کو برباد نہ کرو۔“

”خوش تو آپ نے ہونا ہے۔ آخر کو آپ کو یہ سرٹیفکیٹ مل گیا ہے کہ آپ کا خون اسرائیل کا خدائے نہیں ہے اور آگے بھی جیسے چاہے آپ مجھے استعمال کر سکتی ہیں۔“ اس کا لہجہ اب بھی بہت روکھا تھا۔

”تم نہیں جانتیں کہ یہ میرے لیے کتنا اہم ہے۔ ہم نسلوں سے اسرائیل سے اپنی وفاداری کو ثابت کرتے آ رہے ہیں۔ میں، میرے باپا اور چچا..... ہم سب نے اپنی زندگیاں لگائی ہیں اس ملک کو مضبوط کرنے اور دنیا میں اپنا لوہا منوانے کے لیے۔ تمہارے باپ سے شادی کو میں اپنی



قسط نمبر: 53

شہزادہ شاہ

اساتذہ

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تند و تیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابل شکست بنایا تو... سری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پر عزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جا رہے تھے... اس کی زندگی جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... یہ خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی یہ قرار یوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تاریکیوں نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ واردات قلب بھی اس کے فرض کی راہ دیر، حائل نہ ہو سکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تحریکیز داستان

سونا کو تعلیم کی جانب سے "ظہیر" قرار دے دیا گیا تھا۔ راتل اس سے ملنے آئی تھی اور اہم باتیں کر رہی تھی۔
 "ایک تو اہم خبر ہے جو پاکستان سے آئی ہے اور اس نے میرے دل میں گھنٹک ڈال دی ہے۔"
 "اچھا، وہ کیا؟" سونا کا دل اچھل کر قلع میں آیا تھا لیکن اس نے اپنے لہجے کو سرسری ہی رکھا۔
 "معاذ کے عزیز دوست عالم شاہ کی پوری فیملی کو قتل کر دیا گیا ہے۔"

"پوری فیملی.....؟" خبر سن کر اس کا دل اندر ہی اندر سکڑا۔ عالم شاہ کی فیملی میں سبب بھی تھی اور سبب معاذ کے لیے کیا ہے، وہ جانتی تھی۔
 "عالم شاہ اور اس کی چھوٹی بہن بیج گئے ہیں لیکن یہ طے ہے کہ عالم شاہ اب شاید ہی بھی وکیل چیئر سے اٹھ سکے۔"
 "لیکن وہ لوگ تو جانتا میں تھے نا؟"

"چھوٹی بہن مولیٰ کی بیماری کی وجہ سے انہیں واپس آنا پڑا تھا۔ ایسے کسی موقع کی تلاش میں تاک لگائے بیٹھے ہمارے دوست حرکت میں آئے اور سب کچھ آنا فانا کر ڈالا۔ اگرچہ نقصان ان کا بھی ہوا ہے لیکن یہ بھی ایک بڑی اچیومنٹ ہے کہ ہم نے ان کے اداروں کی چھاؤں میں موجود لوگوں کی یہ درگت بنا کر انہیں ان کی اوقات یاد دلادی ہے۔" راتل کے لہجے میں تکبر تھا۔

"آئی ایم سوری! لیکن یہ کوئی اچیومنٹ نہیں، صرف اور صرف انتقامی کارروائی تھی۔ کیا اس سے ہمیں کچھ حاصل ہوا؟ معاذ تک رسائی، ان کی منصوبہ بندی سے آگاہی..... کچھ بھی ایسا جو ہمیں آگے کا لائحہ عمل طے کرنے میں مدد دے سکے؟" اس نے صاف گوئی سے صورت حال کا تجزیہ کیا۔ وہ ہونے والے نقصان پر اپنے غم و غصے کا اظہار نہیں کر سکتی تھی لیکن میڈیم ایکس کی خوشی کو تو کم کیا جاسکتا تھا۔

"بھی کبھی اپنا مورال بلند کرنے کے لیے ایسی انتقامی کارروائیاں لازم ہو جاتی ہیں۔" خلاف توقع میڈیم ایکس کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا۔

"اونے۔ یہ تو ہوگئی ایک خبر، آگے سنائیں۔" وہ جو ہمیشہ بہت فرمانبردار اور تابعدار رہی تھی، موجودہ حالات میں اس لائق ہوگئی تھی کہ تنظیم کی ایک کارکن کی طرح صرف مؤدبانہ رویہ اختیار نہ کرے بلکہ ایک بیٹی کی حیثیت سے ماں کے سامنے تھوڑا ترش اور تلخ بھی بول سکے۔
 "دوسری اچھی خبر یہ ہے کہ میں نے تمہیں گراؤنڈ ہونے سے بچالیا ہے۔ میرے بہت سے بدخواہوں اور

ماسدین کی خواہش تھی کہ اب تعلیم تم سے کوئی عملی کام نہ لے اور زیادہ سے زیادہ کوئی دفتری ذمے داری دے کر فائیکس میں سرکھپانے کے لیے چھوڑ دے لیکن میں نے اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ مل کر تمہارے حق میں فائیکس کی اور یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہوگئی کہ تم باغی کی طرح آج بھی کارآمد ہو۔" میڈیم ایکس کے الفاظ نے اسے بتایا کہ اس کا اپنی ماں کے بارے میں افسانوی تجویز بالکل درست تھا۔ وہ خود اس حقیقت سے واقف تھی کہ اس کی ذات جس طرح کے الزامات کی زد میں ہے، کئی طرف سے اس پر سوالات اٹھائے جا رہے ہیں اور اس کی رکنیت منسوخ کرنے کی سفارشات پیش ہوں گی لیکن اس کی ماں یہ سب نہیں ہونے دے گی کیونکہ اگر ایسا ہو جاتا تو اس کے دامن پر ایسا داغ لگ جاتا جسے وہ کبھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

"اس ایک فیور کی وجہ سے میں آپ کی پچھلی ساری کوتاہیاں بھلا سکتی ہوں۔" اس بار وہ اپنے موڈ میں تبدیلی لائی اور خوشی کا اظہار کیا۔

"میں نے یہ جو چند دن بے عملی میں گزارے ہیں، انہوں نے مجھے بیزار کر کے رکھ دیا ہے۔ میں تو تصور ہی نہیں کر سکتی کہ کسی دفتر میں کمپیوٹر اور فائیکس کے درمیان رہوں۔" اس نے جمر جمری سی لے کر کہا تو راتل مسکرا دی۔
 "میں یہ بات جانتی ہوں اور دیکھو، تمہاری یہ بیزاری دور کرنے کے لیے فوراً تمہارے لیے ایک کام بھی نکال لیا ہے۔"
 "وہ کیا؟" وہ تجسس ہوئی۔

"بہت زیادہ بھاگ دوڑ والا کام نہیں ہے لیکن حساس نوعیت کا ہے۔"

"کیا آپ کو لگتا ہے کہ ابھی میں نے پوری طرح ریکور نہیں کیا ہے؟" اس نے راتل کی تمہید سن کر سوال اٹھایا۔

"انہی بات نہیں ہے۔ ڈاکٹرز نے مجھے رپورٹ دی ہے کہ تمہاری جسمانی حالت بالکل ٹھیک ہے اور اب تم ہر طرح کی ایکٹیوٹی میں حصہ لے سکتی ہو لیکن میں خود فی الحال تمہیں خود سے قریب رکھنا چاہتی ہوں تاکہ تم براہ راست میرے انڈر رہو اور کسی دوسرے کو تم پر انگلی اٹھانے کا موقع نہ ملے۔"

"یعنی میں اب بھی مشکوک ہوں؟" اس نے منہ بتایا۔
 "یہ صرف ایک احتیاط ہے۔ دیر سے دیر سے سب نارمل ہو جائے گا۔" میڈیم ایکس نے اسے تسلی دی اور مزید بولی۔
 "ویسے مشکوک والی بات اس لیے بھی درست نہیں

ہے کہ تمہیں ایک اہم اسے داری سوچی جا رہی ہے۔ تم
 پروفیسر اینڈ ریوی کی سیکورٹی کو لیز کر دو گی۔
 "پروفیسر اینڈ ریوی" وہ نام سن کر ہونگی۔ "یہ تو وہی
 وہی ناچو چاناکا کی لڑکی تھی۔ وہ یہاں کیسے؟"
 "آج کی دنیا میں سب کچھ ممکن ہے۔ مشترکہ
 معاہدات دو مخالف قوتوں کو بھی باہم کر دیتے ہیں۔" میڈم
 ایکس کا چہرہ ایک بڑی کامیابی پر جھلک رہا تھا۔
 "کیا معاذ اور اس کے ہمدردوں کو اس اتنی بڑی خبر کا علم
 ہے؟" بچہ جلد فکرمندی سے سوچتی وہ اندر سے بے چین ہو گئی۔

☆☆☆

"میں جانتا ہوں کہ اس سے آپ کے نقصان کا ازالہ
 نہیں ہو سکتا لیکن میں اس وقت بطور خاص آپ لوگوں سے
 معذرت کرنے آیا ہوں۔ آپ سب کی سیکورٹی کی ذمہ
 داری ہماری تھی لیکن ہم سے چوک ہو گئی اور ہم اندازہ ہی
 نہیں کر سکے کہ دشمن اتنا اوچھا وار کرے گا۔" حویلی کے وسیع
 و عریض صہبان خانے میں کرنل سکندر بخت، عالم کے روبرو
 بیٹھے تھے اور اس سے اپنی شرمندگی کا اظہار کر رہے تھے۔
 وہ ان کی اس معذرت کے جواب میں زبان سے کچھ نہیں
 بولا اور بس شکوہ کنال نظروں سے ان کی طرف دیکھتا رہا۔
 "مجھے اعتراف ہے کہ دشمن ہم سے تیز چلے۔ ہم نے
 جابی کی نگرانی اور اس کے ٹھکانے سے تمہاری بازیابی کو کافی
 سمجھ کر مزید احتیاطی تدابیر نہیں کیں اور یہی سمجھا کہ جب
 جابی ہماری کسٹڈی میں ہے تو پچھے شرارت کرنے کے لیے
 کوئی باقی نہیں بچا ہے اور یہ ہماری وہ غلطی ہے جس کی ہم کوئی
 جملانی نہیں کر سکتے۔"

"شاید یہ ہمارے نصیب میں تھا اور نہ دونوں حملوں
 کے وقت ہمارے ذاتی سیکورٹی گارڈز تو موجود تھے نا۔
 دشمن کا وار ہی اتنا سخت تھا کہ وہ بے چارے بھی اپنی جان
 سے جانے کے سوا کچھ نہ کر سکے۔" کرنل سکندر بخت کے
 بے حد شرمندہ لہجے نے اسے مجبور کیا کہ وہ چند ایسے الفاظ ادا
 کرے جس سے ان کی شرمندگی کم ہو سکے۔

"نہ ہمارے بدقسمتی ہے کہ دشمن ہمارے اندر اس طرح
 سراپت کر چکا ہے کہ ہمارے لیے اسے پہچاننا مشکل ہو گیا
 ہے۔ جب ہم سمجھتے ہیں کہ ہم انہیں جڑ سے اکھاڑ کر پھینک
 چکے ہیں تب ہی وہ نئے سرے سے کہیں نہ کہیں سے سر اٹھاتا
 ہے لیکن خیر، ہم بھی ہار ماننے والے نہیں۔ اس وقوعہ کے
 سارے ذمے داروں کو ڈھونڈ کر رہیں گے اور انہیں ان کے
 بدترین انجام تک پہنچائیں گے۔" انہوں نے اپنے عزم کا

اظہار کیا۔
 "سب کچھ ہو گا لیکن وہ نقصان نہ بھربائے گا جس
 سے ہم دوچار ہوئے ہیں۔" نہ چاہتے ہوئے بھی عالم شاہ
 کے ہونٹوں سے شکوہ پھسل گیا۔

"اس کے لیے میرا سر پیش شرم سے ہمارا ہے گا۔"
 "میرا مقصد آپ کو شرمندہ کرنا نہیں ہے سرائیکین
 آپ غور کریں کہ کہیں نہ کہیں تو ہمارے اداروں کی کمزوری
 ہے جو دشمن اتنے طاقتور ہو گئے ہیں کہ ہمارے گھر میں گھس
 کر ہمیں مار دیتے ہیں اور اداروں کی طرف سے ہر بار بس
 چند گھسے پٹے بیانات دے کر کام چلا لیا جاتا ہے۔" اس نے
 اتنی بڑی چوٹ کھائی تھی کہ اس کے لہجے میں تلخی نہ آتی، یہ ممکن
 نہیں تھا۔

"مجھے ہر الزام تسلیم ہے اور ایسا ہر الزام مجھے جیسے محب
 وطن آرمی افسر کے لیے ایک تازیانہ ہے۔ ہم نے اپنی
 زندگیاں وطن کے لیے وقف کر دی ہیں لیکن ہمیں اکثر اوپر
 سے نیچے تک بھری ان کالی بھیڑوں کی وجہ سے ذلت اٹھانی
 پڑتی ہے جن کا دین و ایمان صرف چسپا ہے۔ سونے کے
 بچھڑے کے یہ بھاری اپنی قبروں کو آگ سے بھرنے کے
 ساتھ ساتھ ہماری نیک نامی کو بھی کھا گئے ہیں۔" ان کے
 لہجے میں موجود کھمبوس کیا جاسکتا تھا۔ اس ملاقات میں اب
 تک خاموش کردار کی طرح موجود تیلی کو ان پر رحم آیا اور
 بول پڑی۔

"سرا ہمیں آپ پر اعتبار ہے اور اس بات کا بھی
 یقین ہے کہ بے ایمان اور بدخواہ کتنی بھی سازشیں کر لیں،
 جب تک آپ جیسے ایماندار افسر موجود ہیں، ہمارا وطن
 سلامت رہے گا۔"

"بہت شکریہ۔" وہ اس کی بات سن کر چپکا سا
 مسکرائے پھر عالم شاہ کی طرف متوجہ ہو کر بولے۔

"اگر میرے لائق کوئی خدمت ہے تو ضرور بتائیں۔"
 "میں نے پاکستان چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

میرے پاس جو میرے تھوڑے سے پیارے بچے ہیں،
 انہیں سمیٹ کر کسی محفوظ مقام پر منتقل ہونا چاہتا ہوں۔

میرے اندر فی الحال مزید کوئی جنگ لڑنے کی ہمت نہیں ہے
 اس لیے مہربانی کر کے آپ چائنا ہی میں ہمارے مستقل قیام
 کا انتظام کر دیں۔ یہاں ہماری جتنی غیر متعلقہ جائیداد موجود
 ہے، اسے میں ٹرسٹ کے حوالے کر دوں گا۔ اس ٹرسٹ کے
 تحت ہمارے علاقے میں اسکول اور اسپتال چلائے جائیں
 گے۔ آپ کی ذمہ داری بس یہ ہوگی کہ اس نیک کام میں کسی

کرپشن کو شامل نہ ہونے دیں۔“ اس کے الفاظ نے نیلی کو چوکا دیا اور اس نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اس نے یہ فیصلہ ابھی ابھی اچانک نہیں کیا ہے بلکہ پہلے سے ہی اس پر سوچ رہا تھا۔

”شاید یہی بہتر ہے۔ بہر حال آپ بے فکر رہیں۔ میں سارے انتظامات کر دوں گا۔“ کرنل سکندر بخت نے اس کے فیصلے سے اختلاف نہیں کیا اور اپنے تعاون کی یقین دہانی کر دیتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گئے۔

”کیا یہ آپ کا حتمی فیصلہ ہے؟“ کرنل صاحب کے رخصت ہونے کے بعد نیلی اس کے روبرو آئیشی اور قدرے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں۔“ اس نے ایک سرد آہ بھری۔ ”میں محاذ نہیں ہوں جو اپنا سب کچھ گنوا کر بھی مقابلے پر ڈٹا رہوں۔ میں نے جو نقصان اٹھایا ہے، اس نے میری کمزور کر رکھ دی ہے اور مجھے یہ بھی سمجھ آ گئی ہے کہ جینے کے لیے انہوں کا ساتھ بہت ضروری ہے۔ میں انہوں سے الگ رہ کر کوئی جنگ نہیں لڑ سکتا۔ لڑنا بھی چاہوں تو یہ معذوری میری راہ کی رکاوٹ بن جائے گی۔“ اس نے غم آنکھوں سے چادر سے ڈھکی اپنی ٹانگوں اور وہیل چیئر کو دیکھا۔

”یہ سب ہمیشہ ایسا نہیں رہے گا۔ اللہ نے چاہا تو ایک دن آپ اپنی ٹانگوں پر ضرور کھڑے ہوں گے۔“ نیلی نے تڑپ کر اسے دلاسا دیا۔

”اللہ جانے وہ دن کب آئے۔ میں تو بس آج کی حقیقت کے مطابق فیصلے کر رہا ہوں۔“

”میں آپ کے ہر فیصلے میں آپ کے ساتھ ہوں۔“

”واقعی؟“ اس نے نیلی کو بے یقینی سے دیکھا۔

”ہاں۔“ اس نے سر کو اثبات میں جنبش دی۔

”رحم کھار ہی ہو مجھ پر؟“

”نہیں۔ یہ فیصلہ پہلے ہی ہو چکا تھا، بس کہنے کا موقع اب ملا ہے۔“

”بعض خوشیاں انسان کو ایسے وقت ملتی ہیں جب اس میں خوش ہونے کی سکت ہی باقی نہیں رہتی۔“ وہ یاسیت سے مسکرایا۔

”زخم گہرا ہو تو انسان کی یہی کیفیت ہوتی ہے لیکن مجھے زندگی نے سکھایا ہے کہ یہ سب وقت پر چھوڑ دینا چاہیے۔ وقت خود زخموں کو مندمل کرتا ہے۔“ گزرے کل میں اس کے پاس کچھ ایسے دوست تھے جنہوں نے مایوسی اور غم کی انتہا پر اس کا درد بانٹا تھا اور اسے نئے سرے سے

جینے کی ہمت دلائی تھی۔ آج وہ کسی کے درد کا درماں بننے کی کوشش کر رہی تھی۔

”یہاں رلو کا بہت کام ہے، فائفرز میں ذہنی، جسمانی اور جذباتی کسی بھی اعتبار سے اس لائق نہیں ہوں کہ اپنے ساتھ زندگی میں شریک ہونے والی کسی ہستی کو بچھو دے سکوں۔ مجھے ڈر ہے کہ میری رلو گزری کرتے کرتے تمہاری انگلیاں ٹکار ہو جائیں گی۔“

”میں ٹوٹ کر جرنے کے عمل کی ایک ایک نزاکت سے واقف ہوں۔ میں یہ کام بخوبی انجام دے لوں گی، آپ میری فکر نہ کریں۔“

”کیسے نہ کروں؟“ اس نے بے بسی سے وہیل چیئر کے ہتھے پر ٹکا مارا۔ ”گزرنے کے کل میں جب میں تمہارا طلب گار تھا تو مجھے لگتا تھا میرے پاس تمہیں دینے کے لیے بہت کچھ ہے اور میں تمہیں اتنی خوشیاں دے سکتا ہوں کہ تم اپنا ہر پچھلا غم بھلا دو لیکن اب..... اب تو میں بالکل جی دامن ہوں۔ اب میں تمہیں اپنی زندگی میں شامل کروں گا تو یہ میری خود غرضی ہوگی۔“ عالم شاہ کے دل و دماغ نیلی کو کسی امتحان میں ڈالنے کے لیے راضی نہیں تھے۔

”اب آپ کے پاس مجھ سے فرار کی گنجائش نہیں ہے۔ عالم شاہ صاحب! آپ مجھے موی کی یادوں کی دنیا سے بچا کر باہر لائے تھے۔ آپ نے مجھے مجبور کیا تھا کہ میں اپنی بے رنگ دنیا میں نئے رنگ بھردوں، آپ نے میرے دل کو ایک نئی لے پر دھڑکنا سکھایا تھا لہذا اب آپ مجھ سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ آپ کی دنیا میں میری گنجائش نہیں رہی ہے، اس لیے مجھے اس دنیا سے نکل جانا چاہیے۔“ وہ لہجے میں تھوڑا سا غصہ سموئے اس سے مخاطب تھی۔ عالم شاہ کو لگا کہ اس کے پاس اس کی بات کا کوئی جواب نہیں ہے۔

”آئیں، میں آپ کو آپ کے کمرے میں چھوڑ دوں۔ آپ کے لیے اتنی دیر بیٹھے رہنا مناسب نہیں ہے۔“ نیلی نے اس سے جواب مانگا بھی نہیں اور خطی سے کہتی اس کی وہیل چیئر کے پیچھے آکھڑی ہوئی۔ مرنے والوں کی تدفین کے بعد وہ اور موٹل دونوں ہی اسپتال واپس نہیں گئے تھے۔ دونوں کی دیکھ بھال کے لیے حویلی میں ہی کل وقتی نرسز کا انتظام کر لیا گیا تھا اور ایک ڈاکٹر روزانہ صبح شام دونوں کے معائنے کے لیے حویلی آتا تھا۔ اس بہترین دیکھ بھال نے دونوں ہی بہن بھائی کی صحت کو بہتر کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا لیکن عالم اپنی صحت کے حوالے سے کچھ مایوسی کا شکار تھا اور اسے یہ واہمہ ہو گیا تھا کہ اب وہ کبھی وہیل چیئر سے

کھڑا نہیں ہو سکے گا۔ اس واسطے کے پیچھے ڈاکٹرز کے خدشات تھے لیکن نیلی کسی خدشے، کسی رائے کو خاطر میں لانے کے لیے تیار نہیں تھی اور اس نے عزم کر لیا تھا کہ اس شخص کو ہر حال میں اس کے قدموں پر کھڑا کرنا ہے۔

”شاید اعظم دروہا ہے۔“ وہ جو اس کی بات کا جواب دینے کے لیے الفاظ ترتیب نہیں دے سکا تھا، حویلی کے اندرونی حصے سے سنائی دیتی سچے کے رونے کی آواز نے اسے بات کرنے کا موقع فراہم کیا۔ اسی اثنا میں ملازمہ اعظم کو گود میں لیے پریشان سی دہاں چلی آئی۔

”اعظم سائیں اٹھ گئے ہیں بی بی! اور جب سے اٹھے ہیں، آپ کو پکار رہے ہیں۔“ لگتا تھا اس بے چاری کو اعظم نے خوب پریشان کیا ہے۔

”اسے مجھے دے دو اور تم جاؤ۔“ اس نے ملازمہ کی گود سے اعظم کو لے لیا۔ اعظم اس کی گود میں آتے ہی رونا بھول کر پُرسکون ہو گیا۔

”مجھے اپنی زندگی میں شامل رکھنے کی اگر ساری وجوہات ختم ہو چکی ہیں تو بھی یہ ایک دجہاتی مضبوط ہے کہ آپ اسے نظر انداز نہیں کر سکتے۔“ ملازمہ دہاں سے چلی گئی تو وہ اعظم کا رخسار چومتے ہوئے جتانے والے انداز میں عالم سے بولی۔ عالم کے پاس جواب میں سر جھکا لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

☆☆☆

”تو جناب ہم موجود ہیں بیٹنگ گارڈن آف حیفہ (Hanging gardens of Haifa) یہاں گارڈن میں۔“ شہر یار نے ماہ بانو کا ہاتھ تھام کر بیڑھیاں طے کرتے ہوئے ہلکے پھلکے لہجے میں اس سے کہا۔

”بے شک یہ بہت خوبصورت اور قابل دید ہے۔“ ماہ بانو نے حدنگاہ تک دکھائی دیتے سرسبز و شاداب منظر پر نگاہ ڈالتے ہوئے متاثر کن لہجے میں کہا۔ کارمل (Carmel) پہاڑ پر تعمیر کیا گیا یہ باغ واقعی انسانی محنت کا ایک شاہکار تھا۔

”دنیا کے تقریباً تمام مذہبی مراکز خوبصورت اور قابل دید ہی ہوتے ہیں۔ یونیسکو نے اس گارڈن کو جولائی 2008 میں عالمی ثقافتی مرکز کا درجہ بھی دیا ہے۔“ شہر یار نے اسے بتایا۔

”ظاہر ہے ہر مذہب کے ماننے والوں کے دلوں میں اپنے مرکز کے لیے خصوصی لگاؤ ہوتا ہے اور وہ اپنے مذہبی مرکز کو اعلیٰ اور منفرد دیکھنا چاہتے ہیں اس لیے عوام سے لے

کر حکمرانوں تک سب ہی دل کھول کر اس کی تعمیر میں حصہ لیتے ہیں۔“ ماہ بانو نے اس کی بات پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنا تجویز بھی پیش کیا پھر کچھ بے نیازی سے بولی۔

”ویسے مجھے یہاں مذہب کے بارے میں کچھ خاص علم نہیں ہے۔ کبھی واسطہ ہی نہیں پڑا اس مذہب کے پیروکاروں سے۔“

”وہ اس لیے کہ ہماری اب تک جن ملازموں میں رہائش رہی ہے، وہاں یہاں مذہب کے پیروکاروں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی لیکن بہر حال پاکستان کے تمام بڑے شہروں میں ان کے پیروکار اور مذہبی مراکز موجود ہیں۔“

”کون ہیں یہ لوگ؟“ وہ دونوں اطراف پر نظر دوڑاتے بیڑھیاں چومتے ہوئے گفتگو کا سلسلہ بھی جاری رکھے ہوئے تھے۔

”کہا جاتا ہے کہ اس مذہب نے ایران میں جنم لیا اور اس کا بانی سید علی محمد شیرازی نامی ایک شخص تھا جو خود کو باب (دروازہ) کہلاتا تھا۔ جیسے ہم حضرت علی کو باب العلم (علم کا دروازہ) کہتے ہیں۔ اس شخص کی تعلیمات میں کئی اچھی باتیں بھی تھیں لیکن عقیدہ ختم نبوت سے متصادم ہونے کی وجہ سے عام مسلمانوں کے لیے یہ سب قابل قبول نہیں تھا۔ شیرازی یعنی باب کو اس دور کی حکومت نے ہزائے موت دی اور اس کے بعد اس کے ایک پیروکار مرزا حسین علی نوری نے اس کی جگہ سنبھال لی۔ مرزا نے اپنے لیے نبی اللہ کا لقب منتخب کیا اور بانیوں کے وہ پیروکار جو نبی اللہ کی پیروی کرتے ہیں، یہاں کہلانے لگے۔ نبی اللہ کے بیٹے اور پھر پوتے نے ہی اس گارڈن کی تعمیر کروائی۔ گارڈن 19 مئی 1907 پر مشتمل ہے جس کے مرکزی ٹیرس پر Shrine of Bab یعنی باب کا مزار موجود ہے۔ دنیا بھر سے عقیدت مند اور سیاح اس باغ اور مزار کا وزٹ کرنے جہد آتے ہیں۔ جہد جو کہ اسرائیل کا تعمیر ابراہیم شہر ہے، اپنے سی پورٹ اور یہائیوں کے اس اہم مرکز ”بیت العدل“ کی وجہ سے بھی نمایاں پہچان رکھتا ہے۔“

”کیا یہ لوگ مزار میں عام مسلمانوں کو داخل ہونے کی اجازت دیتے ہیں؟“ ماہ بانو نے تجسس سے پوچھا۔

”بالکل۔ اصل میں یہاں دنیا کے کسی بھی مذہب کا انکار نہیں کرتے اور اپنے پیروکاروں کو دوسرے مذاہب کے مطالعے کی ترغیب دیتے ہیں اس لیے انہیں اپنی عبادت گاہوں میں کسی بھی مذہب کے افراد کی آمد و رفت پر قطعی اعتراض نہیں ہوتا البتہ میں نے یہ ضرور سنا ہے کہ مزار کے

کچھ مخصوص حصے ہیں جہاں بہائوں کے علاوہ کسی کو آنے کی اجازت نہیں ہے۔

”ہم.....“ ماہ بانو نے اس کی فراہم کردہ معلومات پر کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے محض ہنکارا بھرنے پر اکتفا کیا۔
”لگتا ہے تم تھک گئی ہو۔“ شہریار نے فوراً اندازہ لگایا۔
”جھننے سے زیادہ بیدار ہو گئی ہوں۔ آخر کتنی سیزھیاں چڑھیں گے ہم؟“

”یہ پورے پندرہ سو قدم بچے ہیں۔“ شہریار نے اسے آگاہ کیا۔

”یا اللہ.....! اور مجھے لگتا ہے کہ آپ نے یہ تمام ایک ساتھ طے کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے لیکن میں ایسا بالکل نہیں کر سکتی۔“ وہ وہیں ایک سیزھی پر بیٹھ گئی۔ شہریار مسکرا کر اس سے ایک اسٹیپ اوپر بیٹھ گیا۔ ان کے قریب سے کئی مقامی اور غیر مقامی افراد سیزھیاں چڑھتے اترتے رہے۔ وہ عموماً خوش حال چہروں اور مقبول لباس والے افراد تھے۔ شاید ایک مذہبی مرکز کے احترام میں لباس کے معاملے میں احتیاط کا مظاہرہ کیا گیا تھا۔

”یہ لو، پانی پی لو۔“ شہریار نے اپنے بیگ سے پانی کی بوتل نکال کر اس کی طرف بڑھائی جسے اس نے شکریے کے ساتھ قبول کرتے ہوئے چند گھونٹ حلق سے اتارے۔

”ہم ایک ساتھ بہت ساری سیزھیاں چڑھ گئے ہیں اس لیے تھکن ہو گئی ہے۔ ہمیں چاہیے تھا کہ آرام سے رک رک کر اوپر جاتے۔ اس طرح ہم اس خوبصورت بارش کا دیدار بھی اچھی طرح کر لیتے۔“ بوتل کا ڈھکن بند کر کے اسے واپس تھماتے ہوئے اس نے ایک جھینپی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ گویا وضاحت دی۔

”اگر ہم سچ سچ سیاح ہوتے تو ایسا ضرور کر سکتے تھے لیکن ہم یہاں ایک مشن پر آئے ہوئے ہیں اور ہمیں اسی حساب سے چلنا ہے۔“ شہریار نے کلائی میں پہنی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے اسے یاد دہانی کروائی تو وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

”سوری..... لیکن سچ یہ ہے کہ ہم جس طرح یہاں جگہ جگہ گھومتے پھر رہے ہیں مجھے اکثر یہ بات بھول جاتی ہے کہ ہم ڈیوٹی پر ہیں۔ یقین کریں اب بھی میرے دل میں بار بار یہ خیال آ رہا تھا کہ کاش سوسن اور لیف کی اسپتال کی مصروفیت نہ ہوئی اور وہ بھی ہمارے ساتھ یہاں آ جاتے تو ہم اس ٹرپ کو زیادہ انجوائے کرتے۔“ اتنی سادگی سے اعتراف کیا گیا کہ شہریار اس کی شکل دیکھتا رہ گیا۔

”اپنے کیا دلچسپ رہے ہیں؟“ وہ سارا سی۔
”نیلھی چہرہ قدر سے اوپر کی طرف اٹھاتے اس سے لگتا ہے مصروف تھی، اس کے کندھینے کے انداز پر مزہ نہاس ہوا۔
”دیکھ رہا ہوں کہ میں نے تمہیں چاٹا لک اور ہوا۔
”باتنے کی اتنی کوشش کی۔ تمہیں وہ سب کچھ کھلایا جس کا وہ عام گھریلو صورت تصور بھی نہیں کر سکتی۔ اس کے ہاد و عشاں تمہاری فطری سادگی کا کچھ نہیں ہکا ل سکتا۔ وہ اب بھی روز اول کی طرح قائم ہے۔“

”کیا ملتا ہے؟“
”نہیں۔“ شہریار نے ایک گہرا سانس لیا۔ ”شاید تمہاری فطرت کی سادگی ہی ہے جس نے روزِ اول کی طرح آج بھی مجھے تمہارا اسیر کر رکھا ہے۔“

”اچھا، یہ کوئی جگہ نہیں ہے عشق جھانڈنے کی۔ اٹھیں، بہت ہو گیا آرام۔“ اس کا اعتراف ماہ بانو کے رخساروں پر سرخی بن کر چھلکا لیکن اس نے جان بوجھ کر بے نیازی کا مظاہرہ کیا اور کھڑی ہو گئی۔ شہریار نے بھی جیتے ہوئے اس کی تقلید کی۔ آخر کار وہ گرتے گرتے اس مقام تک پہنچی جہاں سونے کا پانی چڑھے گنبد والا باب کا حرار اپنی شان و شوکت کے ساتھ موجود تھا۔ وہ حرار کے اندر جانے یا نہ جانے کا فیصلہ کرتے، اس سے پہلے ہی ایک نوجوان ان کے سامنے آکھڑا ہوا۔ نوجوان کا نصف چہرہ ماسک میں چھپا ہوا تھا۔
”ایکسیکو زی سرا!“ وہ مہذب لہجے میں شہریار سے مخاطب ہوا۔

”یہ آپ کی نوٹ بک پیچھے گر گئی تھی۔“ اس نے ایک پاکٹ سائز نوٹ بک شہریار کی طرف بڑھائی۔ وہ نوٹ بک ماہ بانو کے لیے بالکل اجنبی تھی اس لیے اسے لگا کہ نوجوان کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے لیکن اس کی توقع کے بالکل برخلاف شہریار نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر نوٹ بک تمام لی اور نہایت ممنونیت سے بولا۔

”بہت بہت شکریہ۔ یہ میری بڑی قیمتی نوٹ بک ہے۔ کبھی کبھی جب موبائل اور آئی پیڈ جیسے جدید آلات ساتھ چھوڑ دیتے ہیں تو یہ اولڈ فیشن چیز کام آتی ہے۔“

”پھر تو میں نے اسے آپ تک پہنچا کر بہت اچھا کیا۔“ نوجوان یقیناً ماسک کے پیچھے مسکرایا تھا جب ہی اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں اور اس چمک میں ہلکا سا طعنے چھپا ہوا تھا۔ وہی طعنے جس کا ہر نئی نسل اپنی پچھلی نسل کو حق دار سمجھتی ہے۔

”اب یہ کیا تھا؟“ لڑکا انہیں ”بائے“ کہہ کر تیزی سے وہاں سے ہٹ گیا تو ماہ بانو نے شہریار کو تیز نظروں سے

کو تحریر کی شکل میں جتنے پیغامات ملتے تھے، وہ ایک ہی مخصوص روشنی سے تحریر کیے جاتے تھے۔ اس روشنی کی خصوصیت تھی کہ ایک بار لکھ کر کاغذ کو جب تک بند رکھا جائے، تحریر محفوظ رہتی تھی لیکن کاغذ کو لے کر جوئی ہلاتی، چند منٹوں میں روشنی اڑنے سے تحریر غائب ہو جاتی۔ شہریار کو اسرائیل آمد کے بعد سے اب تک جتنے بھی پیغام ملے تھے، اسی روشنی سے تحریر کیے گئے تھے۔

”جب سے پیغام ملا ہے، آپ کچھ چپ سے ہو گئے ہیں۔“ ریکی طور پر حزار پر حاضری لگا کر باہر نکلنے کے بعد واپسی کے راستے میں ماہ بانو نے شہریار سے پوچھا۔ حزار دیکھنے کے دوران ہی شہریار نے مزید آگے جانے کا ارادہ ملتوی کر کے اسے واپسی کے پروگرام سے آگاہ کر دیا تھا۔ اس لیے واپس پلٹنے پر اس نے سوال نہیں اٹھایا تھا۔

”مجھے تشویش ہے کہ کوئی نہ کوئی شیطانی منصوبہ زیر غور ہے۔ اسرائیل کا ہمارے قریبی پڑوسی سے گھ جڑ ہمارے لیے کوئی نیک شگون نہیں ہے۔“ اس نے فکر مندی کا اظہار کیا۔

”اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم جس کام کے لیے آئے ہیں اس کے ساتھ ساتھ اس مسئلے کو بھی نمٹا کر جائیں گے۔ ہم اسرائیل یا دنیا کے کسی بھی دوسرے ملک کو اس بات کی اجازت نہیں دے سکتے کہ وہ ترقی کے نام پر ہماری بربادی کا سامان کر سکے۔“ ماہ بانو نے اسے حوصلہ دیا تو وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

”کیا ہم سوئیا سے رابطہ کر سکتے ہیں؟ وہ پروفیسر کی چیف سیکورٹی افسر مقرر ہوئی ہے تو یقیناً اس کے پاس موقع ہوگا اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا۔“

”ہم دونوں ہی کو اس سلسلے میں کوڑ ورڈ دیے گئے ہیں۔ ضرورت پڑنے پر ہم ایک دوسرے سے رابطہ کر سکتے ہیں لیکن فی الحال میں خود سوئیا سے دور رہنا چاہتا ہوں۔ وہ جن حالات میں اسرائیل واپس لوٹی ہے، مجھے نہیں لگتا کہ اسے یہاں آسانی سے قبول کر لیا گیا ہوگا۔ کم از کم اس کی نگرانی تو ضرور ہو رہی ہوگی۔“

”ہاں، یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ اس نے شہریار کے خیال کی تائید کی اور مقامی لڑکوں کے اس چھوٹے سے گروپ پر نظر ڈالی جو آپس میں خوش گپیاں کرتا ہوا اوپر چڑھ رہا تھا۔ گروپ میں موجود ایک شہساز چہرے نے فوراً اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کی۔

”رکومت۔“ شہریار نے اس کا ہاتھ تھام کر آہستہ

گھورتے ہوئے پوچھا۔
”پیغام۔“ نوٹ بک کے صفحات کو پلٹتے شہریار نے سنجیدگی سے اس کی بات کا جواب دیا تو اسے اندازہ ہو گیا کہ کوئی خاص اطلاع ملی ہے۔ مزید کوئی سوال کرنے کے بجائے وہ خاموشی سے اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگی۔
”پروفیسر اینڈریو یہاں حیدر شہر میں موجود ہے اور سوئیا کو اس کی چیف سیکورٹی افسر مقرر کیا گیا ہے۔“ شہریار نے نوٹ بک جیب میں رکھتے ہوئے عام سے لہجے میں اسے خاص اطلاع دی۔

”پروفیسر اینڈریو..... وہ تو چین میں تھا نا؟“ وہ حیران ہوئی۔ ”وہ کیسے چینوں کی قید سے نکل کر یہاں پہنچ گیا؟“
”اسی قسمی کو تو سلجھانا ہے۔ ہمارے مددگار ہمیں صرف سامنے کی چھوٹی موٹی اطلاعات فراہم کر سکتے ہیں۔ اہم معاملات ہمیں خود سلجھانا ہوں گے۔“

”اور وہ معاذ.....! وہ کہاں رہ گیا ہے؟ آپ نے تو کہا تھا کہ اصل مشن اسی نے سنبھالنا ہے۔ ہماری حیثیت بس مددگار کی سی ہوگی۔“ شہریار کا جواب سن کر اس نے سوال اٹھایا۔

”سوئیا منظر عام پر آگئی ہے تو اس کا مطلب ہے معاذ بھی بس آیا ہی چاہتا ہے۔ اس کے آنے کی اطلاع ہمیں جلد مل جائے گی لیکن پہلے میں پروفیسر اینڈریو کی یہاں موجودگی کا سبب تو معلوم کروں۔“ اس کی آنکھوں میں فکر کے رنگ تھے۔

”اس کا سبب تو چین سے آفیشلی بھی معلوم کیا جاسکتا ہے۔ ہماری ان سے اتنی گہری دوستی آخر کس کام آئے گی؟“
”ممالک کے درمیان دوستیاں بس نام نہاد ہی ہوتی ہیں، اصل چیز وہ مفادات ہوتے ہیں جن کی بنیاد پر ممالک ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں۔ یہاں بھی ایسا ہی کچھ ہوا ہے اور ہمارا ملک اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ چین سے اس طرح کے سوال جواب کر سکے۔“ شہریار نے ایک تلخ حقیقت بیان کی پھر سر جھٹک کر مزار کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”آؤ، یہ فارمیٹی بھی پوری کر دیں۔“

ماہ بانو نے سر ہلاتے ہوئے اس کی تقلید کی۔ آج کل انہیں اپنے آس پاس کسی جاسوس کی موجودگی کا احساس نہیں ہو رہا تھا لیکن احتیاط تو بہر حال کرنا تھی۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ اطلاعات کے حصول کا یہ پرانا طریقہ بھی احتیاط کے طور پر ہی اختیار کیا گیا ہے۔ رابطے کے جدید آلات بشمول موبائل جتنے باسہولت اور تیز رفتار ہیں، اتنی ہی آسانی سے ان کے ذریعے ہونے والی چیٹ پکڑی جاسکتی ہے۔ شہریار

سے کہا اور اسے لیے میز حیاں اترتا چلا گیا۔ وہ لڑکوں کے اس گروپ کو کمر اس کرتے ہوئے پچھتائی گئی۔

”یہ الیاس تھا نا، لیلی وہی کا بیٹا؟“ اس نے بہت اوپر پانچ چھ لڑکوں کے اس گروپ کی طرف دیکھتے ہوئے شہریار سے تائید چاہی۔

”وہی ہے اور مجھے ڈر ہے کہ یہ لڑکا مشکوک سرگرمیوں میں ملوث ہے۔“

”کیسی مشکوک سرگرمیاں؟“ وہ چونکی۔

”پتا نہیں۔“ شہریار نے اپنے کندھے اچکائے۔ ”بس کچھ ایسا ہے جو مجھے ٹھنکتا ہے اور میری چھٹی حس مجھے اشارہ دیتی ہے۔“

جواب دیتے ہوئے اس کے انداز میں الجھن تھی۔ الیاس عرف ایلی نے اسے الجھا دیا تھا۔

☆☆☆

”تو تم ہو میری چیف سکیورٹی آفیسر؟“ سفید بالوں والے اینڈریو نے سر سے ہیر تک سونیا کا جائزہ لیا اور عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

”ہیں۔“ سونیا نے سپاٹ تاثرات کے ساتھ اسے ایک لفظی جواب دیا۔ وہ اس وقت جینز کی نیلی پینٹ پر سفید بش شرٹ پہنے ہوئے تھی۔ بیروں میں جاگرتے تھے اور بالوں کو سمیٹ کر جوڑے کی شکل دی گئی تھی۔ میک اپ کے نام پر اس نے لب گلو کے علاوہ کچھ نہیں لگایا تھا۔ یعنی گل ملا کردہ بالکل سادہ سے حلیے میں تھی لیکن قدرت نے ہی حسن کے معاملے میں اسے اتنی فیاضی سے نوازا تھا کہ سادگی میں بھی اس کے حسن کی شعاعیں پھوٹی پڑ رہی تھیں۔

”تم جیسی حسین عورت کو تو خود اپنے ساتھ سکیورٹی لے کر چلنا چاہیے اور یہاں تم دوسروں کو سکیورٹی دیتی پھر رہی ہو۔“ اینڈریو کی آنکھوں میں جو کچھ لکھا تھا، اسے سونیا بہ آسانی پڑھ سکتی تھی اس لیے سر دھچکے میں بولی۔

”مجھے جس کام کے لیے اپائنٹ کیا گیا ہے، میں اس کی پوری پوری صلاحیت رکھتی ہوں۔ کسی عورت کی ظاہری نزاکت اور خوبصورتی کو دیکھ کر اسے ترنوالہ سمجھ لینے والے نرے احمق ہوتے ہیں۔“

یہ جواب ایسا تھا کہ اینڈریو کا چہرہ توہین کے احساس سے سرخ پڑ گیا۔ وہ جو اپنے علم اور مرتبے کے اعتبار سے اسرائیل کے بے حد خاص لوگوں میں شمار ہوتا تھا، وہ اسے اس کے منہ پر احمق قرار دے چکی تھی۔

”تمہارے جیسے بڑبولے لوگوں کو میں نے عموماً

اورور کا نفیڈس کا شکار پایا ہے اور اورور کا نفیڈس انسان بہت آسانی سے غلطیاں کر جاتا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ تمہارا یہ رویہ اسرائیل کے بڑے نقصان کا سبب بن جائے۔ تمہیں شاید اندازہ نہ ہو لیکن اس وقت میرا تحفظ اسرائیل کی سالمیت میں نہایت اہم کردار رکھتا ہے اور اس معاملے میں معمولی سی کوتاہی ناقابلِ حثانی ہو سکتی ہے۔“ اپنی تعجب کا بدلہ لینے کے لیے ایک طرف اس نے سونیا کو ڈی گریڈ کرنے کی کوشش کی تو دوسری طرف اپنی شان جتانے لگا۔

”اپنے اپنے میدان کو ہم دونوں بہتر جانتے ہیں اور وہ بھی جنہوں نے ہمیں یہ ذمے داریاں تفویض کی ہیں اس لیے بہتر ہوگا کہ ہم اپنی اپنی ذمے داریاں نبھائیں اور فضول لینشن کو دماغ سے جھٹک دیں۔“ سونیا نے دھمکے لہجے میں اسے سمجھایا اور پھر ذرا جتانے والے لہجے میں بولی۔

”آپ کے لیے تو دیسے ہی لینشن بالکل اچھی چیز نہیں ہے کیونکہ ایک تو آپ دماغی کام کرتے ہیں، دوسرے آپ کی عمر بھی ایسی ہے کہ کسی قسم کا ذہنی یا جذباتی دباؤ آپ کی صحت کے لیے نقصان دہ ہو سکتا ہے۔“

”شٹ اپ..... جاؤ، جا کر اپنا کام کرو۔“ اینڈریو کا پارہ چڑھ گیا۔

”میں وہی کر رہی تھی سر! آپ کے بلاؤے پر مجھے اپنا کام چھوڑ کر آنا پڑا۔“ اس کی آواز بلند نہیں تھی لیکن وہ اینڈریو کی ہر بات کا ترکی بہ ترکی جواب دے رہی تھی۔

”وہ تو تمہیں ہمیشہ آنا پڑے گا، چاہے میں دن رات کے جس بھی حصے میں تمہیں کال کروں۔“ اینڈریو کا معنی خیز لہجہ اس کے تن بدن میں آگ لگا گیا اور دل چاہا کہ قبر میں پاؤں لٹکائے اس بڑھے کی گردن مروڑ کر رکھ دے لیکن مجبوری تھی اور ضبط سے کام لیتا ہی تھا اس لیے خود کو قابو میں رکھ کر بولی۔

”شیدر سر! آپ کو جب بھی سکیورٹی کا کوئی ایئر محسوس ہو، آپ مجھ سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ میں اس وقت یہاں موجود نہیں ہوں تو میرا کوئی اسٹاف ممبر آپ کا مسئلہ حل کر دے گا۔“

”لیکن میں صرف.....“ اینڈریو نے کچھ کہنا چاہا۔

”ایک سکیورٹی میسر! میری ٹیم میرا انتظار کر رہی ہے۔ مجھے انہیں کچھ ضروری ہدایات دینا ہیں اس لیے بہتر ہوگا کہ میں اس وقت یہاں کے بجائے وہاں وقت دوں۔“ اس نے اینڈریو کو اپنی بات مکمل کرنے کا موقع نہیں دیا اور اپنی کہہ کر تیزی سے باہر نکل گئی۔

سے اتنی لمبی تقریر کے جواب میں خاموشی پر میڈم اکیس نے جھنجھلا کر اسے نکارا۔

”سن بھی رہی ہوں اور اچھی طرح سمجھ بھی رہی ہوں۔“ اس نے کم صم سی کیفیت میں جواب دیا۔

”گڈ ایجے تم سے یہی امید تھی۔ اب میرے کہے پر عمل کرو اور اعلیٰ مقام پر پہنچ کر ان سب کے منہ بند کر دو جو تم پر اور تمہارے ساتھ ساتھ مجھ پر بھی انگلیاں اٹھاتے رہے ہیں۔“ اسے ہمیشہ کی طرح آج بھی خشم میں اپنے مقام اور نیک نامی کی فکر تھی۔ ساتھیوں کے ساتھ مسابقت میں وہ کب کی بیٹی کو ہار چکی تھی، اسے اندازہ ہی نہیں تھا۔

☆☆☆

”قائم پر سب سے زیادہ ہوا اثر انداز ہوتی ہے۔ ایک اچھے استاد کے لیے ہوا کی نوعیت کو سمجھنا بہت ضروری ہے کہ آیا وہ ہلکی ہے، تیز ہے یا درمیانی۔ ہوا کے بعد دوسرے فیکٹر جیسے دھوپ، دھند، نمی اور درجہ حرارت وغیرہ کی طرف توجہ دی جاتی ہے۔ رائل ہاتھ میں لے کر اندھا دھند قائم کوئی بھی مار سکتا ہے لیکن اس قائم کے ہدف تک پہنچنے کی کوئی گارنٹی نہیں ہوتی۔ کامیاب ہدف کے حصول کے لیے قائم کی پوری سائنس کو سمجھنا ضروری ہوتا ہے۔“

”اس کے لیے ہمارے پاس وقت ہی کہاں ہے؟“ معاذ کی بات کو توجہ سے سنا جا رہا تھا چھٹی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ اس وقت وہ ایک زیر تعمیر ہوٹل کے تہ خانے میں موجود تھے۔ کسی کی نظروں میں آئے بغیر اس تہ خانے میں پہنچنے کی خاطر کارروائی کے اصل وقت سے بہت پہلے وہ صبح سویرے یہاں پہنچے تھے اور معاذ کچھ مدد کے جذبے کے تحت اور کچھ فراغت کی یوریت سے پہنچنے کی خاطر جبار علی عرف جبار کی معلومات میں اضافے کی کوشش کر رہا تھا۔

”استاد ماہر اور شاگرد محنتی ہو تو کم وقت میں بھی بہت کچھ سیکھا سکھایا جاسکتا ہے۔ میرا تو ویسے بھی تم سے وعدہ تھا کہ تمہیں اور تمہارے اساتذہ کو بیرٹ چلانا ضرور سکھاؤں گا۔“

”تم ہمارے لیے اتنا بڑا کام کرنے جا رہے ہو کہ ہم تمہیں ایسے دس وعدوں کو توڑنے پر معاف کر سکتے ہیں۔“ جبار نے جذباتی لہجے میں کہا۔

”لیکن میں تمہیں معاف کرنے کے لیے تیار نہیں۔ ہمیں ابھی جتنی بھی فرصت میسر ہے، ہم اس کا استعمال کریں گے اور میں ممکنہ معلومات تمہیں منتقل کر دوں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ میرے اس لیکچر کی عملی مشق کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں ہے لیکن اگر عملی مشق کرتے ہوئے تم نے اور

”ضرر کی بڑھا۔“ باہر نکل کر اس نے گالی دینے کے انداز میں یہ دو لفظ ادا کیے۔ پاکستان میں قیام کے باعث وہ اس طرح کی اصطلاحات کے استعمال سے بہ خوبی واقف تھی۔ اس وقت بھی یہ الفاظ ادا کر کے اسے ایک سکون سا محسوس ہوا اور وہ خود کو کول ڈاؤن کرتی ہوئی اپنے اسٹاف کے درمیان واپس آ گئی۔ ان کے ساتھ تفصیلی میٹنگ میں ساری ضروری ہدایات جاری کرنے میں اچھا خاصا وقت لگ گیا۔ ابھی اس کام سے فارغ ہی ہوئی تھی کہ میڈم اکیس کی کال آ گئی۔ وہ اس سے آج کے دن کی رپورٹ مانگ رہی تھی۔ اس نے اسے اپنی کارروائیوں سے آگاہ کیا۔

”گڈ ایجے جاری ہو۔ بس خیال رہے کہ پروفیسر کو تم سے کوئی شکایت نہ ہو۔“

”یعنی انہوں نے میری کوئی شکایت کی ہے؟“ وہ فوراً بھانپ گئی۔

”ان کا خیال ہے کہ تم ایک اکھڑ اور بد مزاج شخصیت ہو۔“

”اپنی خوبصورتی پر رال ٹپکانے والے کے لیے میرے پاس اس سے بہتر رویہ نہیں تھا۔“ اس نے رکھائی سے جواب دیا۔

”فضول اور بچکانہ باتیں نہ کرو۔ خوبصورت عورتوں پر رال ٹپکانا مردوں کی عادت ہوتی ہے تمہیں جواب میں نہیں ایجنڈہ کی طرح بی بیو کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔“

رائٹل نے اسے جھڑک کر رکھ دیا۔

”میں اس کی چیف سیکورٹی آفیسر ہوں اور وہ بڑھا کبلی ملاقات میں ہی مجھے اپنے بیڈ روم تک لے جانے کے خواب دیکھ رہا تھا۔“ اسو نیا کا لہجہ آج دینے لگا۔

”یہ نہ تو ایسی کوئی خاص بڑی بات ہے اور نہ ہی تمہارے لیے نئی۔ اپنے مقصد کے حصول کے لیے تم خود کوئی

بار مردوں کو بیڈ روم تک لے کر گئی ہو۔ اب اگر پروفیسر اینڈریو جیسے بڑے آدمی کا دل خوش کرنے کے لیے ایسا

کر لو گی تو تمہاری شان میں کوئی فرق نہیں پڑ جائے گا بلکہ میرا تو مشورہ ہے کہ تمہیں پروفیسر کو خود اپنی طرف راغب کرنا

چاہیے۔ اس جیسا اثر رسوخ رکھنے والا بندہ تمہاری منہ می

آ گیا تو تم پر ہر بندہ رواں دواڑہ کھل جائے گا۔“ میڈم اکیس ایک

نی سائنس میں بولتی گئی اور وہ دم بخود سی سنتی رہی۔ اس کی

زندگی میں یہ وقت بھی آنا تھا کہ اس کی اپنی ماں اسے اس کی

سابقہ زندگی کا طعنہ دیتی۔ اس سابقہ زندگی کا جو اس نے ماں کے اشاروں پر ہی ناچے ہوئے گزارا تھا۔

”تم میری بات سن رہی ہو سو نیا؟“ اس کی طرف

تمہارے ساتھیوں نے میرے بتائے ہوئے ان چند اصولوں کو یاد رکھا تو مجھے امید ہے تمہارے درمیان چند ایک اچھے اسٹائپر ضرور پنپ جائیں گے اور یہ بہت ضروری ہے۔ یاد رکھو، یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر بار قسمت تمہارا اس طرح سے ساتھ دے کہ باہر سے ایک اچھا اسٹائپر تمہیں میسر آجائے۔“ جادو کو قدرے غیر مستحیدہ یا کراس نے اسے اچھا خاصا پتھر دے ڈالا۔ جادو یہ پتھر سن کر شرمندہ سا ہو گیا اور شرمسار لہجے میں بولا۔

”تم بالکل درست کہہ رہے ہو دوست! میں تمہیں اس لیے نال رہا تھا کہ مجھے لگ رہا تھا کہ مجھ میں اتنی جلدی ایک اتنے پیچیدہ کام کو سیکھنے کی اہلیت نہیں ہے لیکن کوشش کروں گا تو کچھ نہ کچھ سیکھ ہی لوں گا۔“

”یہ ہوئی نابات۔ آدپھر شروع کرتے ہیں۔ تم بس یہ نیت رکھنا کہ آج میں تمہیں جو سیکھ دوں گا، اسے پوری دیانت داری اور کوشش سے اپنے دماغ میں رکھنا ہے۔ آگے مزید اللہ کا کوئی بندہ مل جائے گا جو تمہارے علم میں اضافہ کرے گا۔ وہ کہتے ہیں نا کہ نیت صاف منزل آسان..... تو بس اس بات کو ہی ذہن میں رکھنا۔“ اس نے سامنے پڑے بیگ کو کھولا۔ بیگ میں بیرٹ ایم 107 اور اس کے معلقات موجود تھے۔

”اسے اسبل کرو۔“ اس نے رائفل کے کھڑوں کی طرف اشارہ کیا۔ اسے معلوم تھا کہ جادو اور اس کے ساتھی ڈریکو اسٹائپرک رائفل استعمال کرتے رہے ہیں اس لیے جادو کے لیے بیرٹ کے کھڑوں کو جوڑ لینا مشکل نہیں ہوگا۔ وہ خود اپنی یہاں آمد کے بعد سب سے پہلے یہ کام کر کے دیکھ چکا تھا اور ایک ایک چیز کا جائزہ لے کر اپنی تسلی کرنے کے بعد سب کچھ دوبارہ بیگ میں پیک کر دیا تھا۔

اس کے کہنے پر جادو نے رائفل کے مختلف حصوں کو جوڑنا شروع کر دیا۔ معاذ نے بس ایک آدھ بار ٹوک کر اسے یہ سمجھایا کہ کیا طریقہ استعمال کیا جائے کہ وہ یہ کام جلد از جلد اور زیادہ پر یکھیں سے کر سکے۔ اصل میں جبار علی عرف جادو اسلحہ استعمال تو کرتا تھا لیکن اس نے یا اس کے ساتھیوں نے اس کے پیچھے چھپی سائنس نہیں سیکھی تھی۔ ان بے چاروں کو مواقع ہی نہیں ملے تھے۔ وہ تو زبردستی اس جنگ میں جھونک دیے گئے جبکہ معاذ کا معاملہ یہ تھا کہ اسلحہ سے اپنی ذاتی دلچسپی کے باعث وہ اس کے متعلق مختلف آرٹیکلز باندی سے پڑھتا رہتا تھا۔ شوق ہی شوق میں شوٹنگ کلب کی ممبر شپ بھی لے لی تھی جہاں سے کافی کچھ سیکھنے کو ملا

تھا اور اس کے بعد میڈم ایکس کی قید میں ملنے والی تربیت نے سونے پر سہاگا کا کام کیا تھا۔ چنانچہ وہ اس لائق تھا کہ اپنے پاس موجود علم سے دوسروں کو بھی مستفید کر سکے۔

”ڈریکو کی طرح بیرٹ کے میگزین میں بھی دس گولیاں ہی پڑتی ہیں لیکن دونوں میں کافی فرق بھی ہے۔ ڈریکو روسی ساختہ ہے جبکہ بیرٹ ایم 107 امریکا کی ایجاد کردہ اعلیٰ کوالٹی کی اسٹائپر رائفل ہے۔ ڈریکو کی ریج ہزار میٹر ہے جبکہ بیرٹ کی کارگر ریج ساڑھے اٹھارہ سو میٹر ہے۔ خیر، یہ تو تمہیں بھی معلوم ہے اس لیے تم نے اپنے اس مشن کے لیے بیرٹ اور مجھے منتخب کیا ہے۔“ جبار علی چونکہ ڈریکو سے آشنا تھا اس لیے وہ بیرٹ کو سمجھانے کے لیے اس کا ڈریکو سے تقابل پیش کرتا جا رہا تھا۔

”میں نے تمہیں منتخب نہیں کیا بلکہ تم نے میری درخواست قبول کر کے ہم پر ایک بڑا احسان کیا ہے۔“ جبار علی فوراً عاجزی سے بولا۔

”یہ احسان و حسان کی باتیں چھوڑو اور فی الحال وہ غور سے سنو جو میں بتا رہا ہوں۔“ اس نے فوراً اسے ٹوکا اور بیگ سے دو برین، لیزر ریج فاسٹرز، ونڈ میٹر، کمپاس، جی پی ایس اور ٹائٹ ویژن سائٹ جیسی اشیاء نکال کر ان کی افادیت اور استعمال کا درست طریقہ سمجھانے لگا۔

”یاد رکھو، اسٹائپرک میں ٹیلی اسکوپ کی اپنی ایک خاص اہمیت ہے۔ انسانی آنکھ کسی ذریعے کے بغیر تین سو سے چار سو میٹر تک ہی درست نشانہ لگا سکتی ہے البتہ ہتھیار کے ساتھ ٹیلی اسکوپ سائٹ یا ٹائٹ ویژن سائٹ لگا دی جائے تو اس کی کارگر ریج کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ اس لیے ایک اچھے اسٹائپر کو ٹیلی اسکوپ کا درست استعمال ضرور آنا چاہیے۔“ وہ اسے اس حوالے سے باریکیاں سمجھانے لگا۔ ساتھ ہی دوسرے فیکٹرز کے اثرات بھی اس کے دماغ میں بٹھانے کی کوشش کی۔

”میں پہلے تھوڑا بہت کنفیوز تھا لیکن اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ آج ہمیں ہمارا ہدف حاصل کرنے سے کوئی نہیں روک سکے گا اور ہمارے وطن پر قابض خبیثوں کے منہ پر ایک ایسا زوردار طمانچہ پڑے گا جس کی جلن وہ مدتوں یاد رکھیں گے۔“ وہ معلومات کا ایک ڈھیر جادو کے دماغ میں انڈیل کر خاموش ہوا تو وہ متاثر کن لہجے میں بول اٹھا۔

”اللہ کی رضا شامل رہی تو ان شاء اللہ ایسا ہی ہوگا لیکن انسان کو ناکامی کے چند فیصد امکانات کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیے تاکہ کوئی نئی حکمت عملی بھی تیار کر سکے اور خود کو

لگنے والے جذباتی جھٹکے سے بھی سنبھل سکے۔

”تم سیدھے اس خبیث کی کھوپڑی میں گولی مارنا تاکہ کھوپڑی اڑے اور اس کے بیچنے کا ایک فیصد بھی امکان باقی نہ رہے۔“ اس کی نصیحت کے جواب میں جبار علی نے جس جذباتی انداز میں اس سے فرمائش کی، اس کا دل چاہا اپنا سر پیٹ لے لیکن محض اسے گھورنے پر اکتفا کر کے رہ گیا۔

”کیا میں کچھ غلط کہہ گیا؟“ جبار علی نے اس کے گھورنے پر سادگی سے پوچھا۔

”تمہاری فرمائش کے متعلق سوچ رہا ہوں۔ تمہیں کچھ اندازہ بھی ہے کہ جس بلندی اور فاصلے سے فائر کیا جائے گا، وہاں سے چھانچ کے انسانی سر کو نشانہ بنانے کی کوشش کرنے کا مطلب ہوگا کامیابی کے امکانات کو کم سے کم کر دینا۔“

”تو پھر تم اس کے جسم کے کس حصے کو نشانہ بناؤ گے؟ میں اسے صرف زخمی نہیں، ہر حال میں مردہ دیکھنا چاہتا ہوں۔“ جادو پریشان ہو گیا۔

”سر کے بجائے چھاتی زیادہ واضح ہدف ثابت ہوگی۔ چھاتی پر لگنے والی گولی سیدھی دل میں گھسے گی تو اس کے بیچنے کا امکان بہت ہی کم ہوگا۔ احتیاطاً میں اسے ایک گولی اور ماروں گا تاکہ تمہارے سارے خدشات دور ہو جائیں۔“ معاذ نے قدرے وضاحت سے اسے اپنے پروگرام سے آگاہ کیا تو اس نے مطمئن سا ہو کر سر ہلا دیا۔

”اب یہ سب سمیٹو۔ میں تھوڑی دیر آرام کروں گا تاکہ کام کے وقت دماغ فریش ہو۔“ وہ رات ڈھنگ سے نیند نہیں لے سکا تھا اور یہاں فرصت بھی میسر تھی تو کچھ دیر آرام کا ارادہ ظاہر کیا لیکن جادو کی طرف سے کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا۔ وہ بالکل دم سادھے اس طرح چپ چاپ بیٹھا ہوا تھا جیسے سماعت پر زور دے کر کچھ سننے کی کوشش کر رہا ہو۔

”کیا ہوا؟“ معاذ نے فکر مندی سے پوچھا۔

”شش!“ اس نے منہ پر انگلی رکھ کر اسے بولنے سے روکا اور پھر سرگوشی میں بولا۔ ”باہر کوئی ہے۔ ممکنہ طور پر پولیس۔“ کیونکہ ان میں سے ایک دوسرے کو سر جی کہہ کر پکار رہا ہے۔

جادو کی دی اس اطلاع نے اس کے جسم میں تناؤ کی سی کیفیت پیدا کر دی۔ اگر پولیس کے گھیرے میں آکر وہ یہاں سے نکلنے میں کامیاب نہ ہو پاتا تو آگے ساری منصوبہ بندی ہی برباد ہو جاتی اور وہ جس مقصد کے لیے انہوں کو چھوڑ

کر نکلا، وہ حاصل نہ ہو پاتا۔ چھتا اپنے ہدف سے دور اس زیر تعمیر کثیر العزلہ عمارت کے انتخاب کی بڑی وجہ یہی تھی کہ فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے اسے باقاعدہ سیکورٹی کے دائرے میں شامل نہیں کیا گیا تھا اور اس روز وہاں تعمیری کام روکنے اور کسی قسم کی آمدورفت پر پابندی لگا کر عمارت کے مرکزی دروازے کو بند رکھنے کی ہدایات پر ہی اکتفا کر لیا گیا تھا۔ ایسے میں پولیس والوں کی وہاں آمد باعث تشویش ہی تھی۔ اس نے بے ساختہ ہی قریب بڑے گلاک کی طرف ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھایا اور اس کا سیٹھی کچھ کھینچا۔ جادو نے جو کسی جنگلی جانور کی طرح کان کھڑے کیے سماعت کو کہیں دور مرکز کیے ہوئے تھا، اسے ایسا کرتے دیکھ کر ہاتھ کے اشارے سے صبر کرنے کو کہا۔ معاذ اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے خود بھی کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا لیکن چند ایک آہٹوں کے سوا اسے کچھ سنائی نہیں دیا۔ جادو کے بارے میں البتہ اسے یقین تھا کہ اپنی غیر معمولی سماعت کے باعث سب کچھ سن رہا ہوگا۔

”گدھے۔“ چند منٹ گزرے تو جادو سر جھٹک کر بڑبڑایا۔

”کیا ہوا؟“ معاذ نے تجسس سے پوچھا۔ ویسے جادو کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر اسے یہ اطمینان تو ہو گیا تھا کہ کوئی تشویش ناک بات نہیں ہے۔

”ڈیوٹی پر موجود پولیس والے تھے۔ ڈیوٹی کے دوران سوئے لگانے کی خواہش ہوئی تو بڑے افسروں کی نظر سے بچ کر طلب پوری کرنے کے لیے راز ٹر لگانے کے بہانے چھوٹا افسر اور اس کا منہ چڑھانا تحت ڈیوٹی ایریا چھوڑ کر یہاں آئے، اب واپس جارہے ہیں۔“

”اسے کہتے ہیں کھودا پہاڑ، نکلا چوہا۔“ معاذ گلاک کو ہاتھ سے رکھتے ہوئے آہستہ سے ہنسا۔

”چوہوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ کبھی کبھی یہ چوہے بڑی بڑی عمارتوں کی بنیادوں کو بھی کھوکھلا کر دیتے ہیں۔“

”تمہاری اس بات پر تمہیں داد بعد میں دوں گا، پہلے کچھ دیر ریست کر لوں۔“ صورت حال کو پرسکون پا کر اسے ایک بار پھر اپنا آرام یاد آ گیا۔

”تم آرام کرو، میں ذرا ان گدھوں کی خبر لے لوں کہ مجھے پولیس والوں کی اندر آمد کی اطلاع کیوں نہیں دی۔“

جادو نے اپنے پاس موجود آبی کام نکالا۔ یہاں وہ اپنے ساتھ کوئی موبائل فون نہیں لائے تھے اور باہر مامور ساتھیوں سے رابطے کے لیے محدود ریج کے آبی کام سیٹ

وہ تھیں، اب بھی ان کے حسن کے آگے مشکل ہی سے کسی کا چراغ جلتا ہے۔ ”یہ کوئی انتہائی کارردائی تھی یا وہ پروفیسر کی توجہ خود پر سے ہٹا کر میڈم ایکس کی طرف مبذول کروا کر اپنی بچت کا سامان کو رہی تھی، خود اسے بھی ڈھنگ سے علم نہیں تھا۔

”ہا ہا..... ٹھیک کہا تم نے۔ ایکچو ٹیلی برسوں پہلے میں نے جس آخری عورت کی قربت میں وقت گزارا تھا، وہ تمہاری ماں راتیل ہی تھی۔“ پروفیسر نے ہستے ہوئے اس کی معلومات میں اضافہ کیا پھر قدرے سنجیدگی سے بولا۔

”ویسے تم نے یہ غلط کہا کہ تمہاری ماں آج بھی تم سے زیادہ خوبصورت ہے۔ تم بے شک اپنی ماں کی کاپی ہو لیکن بالکل ایسے جیسے کسی تصویر پر فیلٹر لگا دیا جائے۔ تمہاری ماں کے حسن کے ساتھ تمہارے باپ کی وجاہت نے شامل ہو کر تمہیں دو آتشہ بنا دیا ہے۔ کیا ہی شاندار جوان تھا تمہارا باپ۔ بس افسوس ہم میں سے نہیں تھا۔“

”کیا آپ میرے باپ کو جانتے ہیں؟ آپ ملے تھے ان سے؟“ وہ پروفیسر کی بات سن کر بے قرار ہوئی۔

”میں تمہارے نانا کے قریبی دوستوں میں سے تھا اس لیے تمہارے باپ سے بھی واقف ہوں۔ مجھے اعتراف ہے کہ وہ بہت خوبصورت، ذہین اور مہذب جوان تھا اور شاید اس کی یہی خصوصیات تھیں جو راتیل جیسی لڑکی غلطی کر بیٹھی تھی۔ جذبات میں اس نے تحقیق ہی نہیں کی تھی کہ وہ جس شخص سے شادی کرنے جا رہی ہے اس کا تعلق کس مذہب سے تھا۔“

”ایسی شادیاں کوئی انوکھی بات تو نہیں۔ میں نے کتنے ایسے کیسز دیکھے ہیں جن کا تعلق الگ الگ مذاہب سے تھا پھر بھی وہ ساری زندگی ساتھ رہے۔“ ہر انسان کی طرح اس کے اندر بھی کہیں یہ خواہش تھی کہ کاش وہ کسی تارمل فیملی میں مل بڑھ کر جوان ہوئی ہوتی تاکہ اس کی زندگی میں بھی سب کچھ تارمل ہوتا۔

”راتیل اور تمہارے نانا کے لیے یہ ناقابل قبول تھا۔ ہر معاشرے میں ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کے اندر اپنے مذہب اور وطن کے لیے شدت پائی جاتی ہے۔ راتیل کو تو پھر یہ شکوہ بھی تھا کہ تمہارے باپ نے جان بوجھ کر اس سے اپنی حقیقت چھپائی تھی۔ راتیل نے جو کچھ کیا، اس کے لیے میں اسے حق پر سمجھتا ہوں۔ اس کی اسرائیل کے لیے محبت اور قربانی ہم سب کے لیے قابلِ قدر ہے۔ اسی لیے اگر کبھی اس سے کہیں کو تباہی ہو بھی جائے تو اس کے ساتھ

استعمال کیے جا رہے تھے۔ رنج محدود ہونے کی وجہ سے ان سٹیس پر ہونے والی گفتگو پکڑے جانے کے امکانات کم تھے۔ کہیں کسی چھپیل پر پکڑی بھی جاتی تو اسے ناقابلِ فہم بنانے کے لیے انہوں نے کوڈ ورڈز طے کر رکھے تھے۔

”میری مالتو تو جانے دو۔ آگے سے تمہارے ساتھی کے پاس حاجت کے لیے جانے وغیرہ جیسا کوئی معقول جواز ہو گا لیکن تم دونوں کی گفتگو سننے جانے کا رسک پیدا ہو جائے گا۔ کسی ایمر جنسی یا شدید ضرورت کے بغیر یہ رسک مت لو۔“ معاذ نے اسے اس کے ارادے سے باز رکھنے کے لیے سمجھایا۔ جارو کو اس کی بات سمجھ آگئی اور آئی کام ہاتھ سے رکھ دیا۔ اب وہاں خاموشی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ معاذ نے سکون سے آنکھیں بند کر لیں۔ بند آنکھوں کے پیچھے چہم سے وہ اتر آئی جیسے کبھی اس نے نظر بھر کر دیکھنے کی جرأت نہیں کی تھی۔

”میرا وجدان کہتا ہے کہ کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے۔ کوئی ایسا حادثہ جو میرے سینے کے بائیں حصے میں بار بار درد کی ایک تیز لہر دوڑا دیتا ہے لیکن میرا خود سے اپنے وطن سے اور سب سے بڑھ کر اپنے رب سے وعدہ ہے کہ مجھ پر کتنا ہی بڑا دکھ کا پہاڑ کیوں نہ ٹوٹ پڑے، مجھے اپنے قدم پیچھے نہیں ہٹانے ہیں۔ میرا رب صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے اور میں نے صبر کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے۔“ وہ تصور میں اس سے مخاطب تھا اور بند آنکھوں کے گوشوں سے چپکے سے نمکین پانی نکل کر کنپٹیوں پر بہنے لگا تھا۔ یکدم اسے لگا کہ کوئی اپنی نرم پوروں سے ان آنسوؤں کو صاف کر رہا ہے۔ اس نے اپنی آنکھیں نہیں کھولیں۔ اگر یہ خواب تھا تو وہ کچھ دیر اس خواب میں جینا چاہتا تھا جس میں کسی کے وجود کی خوشبو اور لمس کی تاثیر کھلی ہوئی تھی۔

☆☆☆

”ویسے تو میں اتنا مصروف آدمی ہوں کہ مجھے عورتوں کے لیے بالکل فرصت نہیں ملتی اور نہ ہی خواہش ہوتی ہے لیکن تمہارے جیسی بھرپور عورت برسوں بعد میرے سامنے آئی ہے اور سچ کہوں تو برسوں بعد میرا دل کسی عورت کی قربت کا خواہشمند ہوا ہے۔“ وہ اس وقت ایک خوبصورت ریشمی لمبا دے میں ہلکے پھلکے میک اپ اور خوبصورت ہیز اسٹائل کے ساتھ پروفیسر اینڈریو کی خواب گاہ میں موجود تھی اور پروفیسر اس کی طرف نہایت پرشوق نظروں سے دیکھتا ہوا اسے اپنی کیفیت سے آگاہ کر رہا تھا۔

”میں اپنی ماں کی کاپی ہوں۔ جوانی میں وہ جو تھیں،

آپ کو آرام اور سیر و تفریح کے مواقع ملنے چاہیے تھے۔“
اب وہ اینڈریو کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس سے التفات کا اظہار کر رہی تھی اور اسے سے اظہار پر ہی وہ جذبات سے کانپنے لگا تھا۔

”میں نے اپنی آخری سانس تک اپنی قوم کی خدمت کرتے رہنے کا عہد کر رکھا ہے اور یہ تو وہ کام ہے جس کے لیے میں نے اپنی زندگی کے کئی قیمتی برس برف زاروں کی سختیاں کاٹتے ہوئے گزارے ہیں۔“

”یہ تو مجھے بھی سمجھ نہیں آئی کہ آخر آپ ایسا کیا کر رہے تھے جس کے لیے آپ نے اتنی پُر مشقت زندگی کو قبول کیا۔“
سو نیا اس سے مزید قریب ہوئی اور اس بار جام اپنے ہاتھوں سے اس کے ہونٹوں تک پہنچایا۔

”ہے ایک کام، ایسا منفرد کام جس میں کامیابی مجھے تحقیق کے میدان میں امر کر دے گی۔“ اینڈریو کی بوڑھی مگر ذہانت سے بھرپور آنکھیں چمکنے لگیں۔

”یعنی آپ مجھے بتانا نہیں چاہتے؟“ وہ خفگی کے اظہار کے لیے اس سے دوز دہلی۔

”کوئی بھی سائنس دان اپنی تحقیق کو اسی وقت دنیا کے سامنے لانا پسند کرتا ہے جب وہ مکمل کامیابی حاصل کر چکا ہو اور دنیا کو حیران کر دینے والی پوزیشن میں ہو۔“ اینڈریو نے اسے سمجھانے کی کوشش کی اور بے چینی سے بولا۔ ”یہ تم آگ بھڑکا کر مجھ سے دور کیوں چلی گئی ہو؟“

”میں سمجھتی ہوں کہ مجھ جیسی حسین عورت کا حق ہے کہ جب وہ کسی سے کوئی سوال کرے تو پھر اسے کسی عام فرد کی طرح ٹالنا نہ جائے۔ ٹالنا، مطلب میرے حسن کی توہین کرنا ہے۔“

”یہ بہت عجیب سوچ ہے۔“ پروفیسر جھنجھلایا۔

”عجیب ہی سہی پر یہ سوچ میری فطرت کا حصہ ہے۔“

اگر میرا دماغ کہیں الجھ جائے تو جسم مطلوبہ رد عمل دینے سے قاصر رہتا ہے۔ میں آپ کو انکار نہیں کر سکتی کیونکہ سچ یہ ہے کہ

اب آپ کو مجھ سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔“ وہ دیکھ رہی تھی کہ

نئے اور جذبات کی زیادتی نے اینڈریو کو عجیب و غریب

کیفیت میں مبتلا کر دیا ہے اور وہ اس انتہا پر ہے جہاں اپنی

طلب پوری کرنے کے سوا کچھ سمجھائی نہیں دیتا۔ اس لیے

ضرب پر ضرب لگاتی جا رہی تھی۔ ویسے اسے شک ہی تھا کہ

وہ بوڑھا پروفیسر موقع مل جانے پر کچھ کارکردگی دکھائے گا۔

”اگر ایسا ہے تو آؤ میرے ساتھ۔“ وہ اچانک ہی

اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

”کہاں؟“ وہ حیران ہوئی۔

خصوصی رعایت برقی جاتی ہے۔“ اینڈریو کے الفاظ بتا رہے تھے کہ وہ خود بھی اسی مکتبہ فکر سے تعلق رکھتا ہے جن کے اندر انتہا پسندی پائی جاتی ہے اور جو اپنے نسلی امتیاز کے دم میں دنیا کے دوسرے انسانوں کو کسی لائق نہیں سمجھتے۔

”آپ میرے نانا کے دوست تھے۔ آپ کو عجیب نہیں لگا اپنے دوست کی بیٹی کو اپنے بستر پر لے آنا؟“ اندر سے جھلبلائی وہ اور کچھ نہ کر سکی تو اینڈریو پر طنز ہی کر دیا۔

”کم آن۔“ وہ اس کی بات پر زور سے ہنسا اور اپنے

سامنے رکھے جام سے ایک گھونٹ پھرتے ہوئے بولا۔ ”وہ

دوست کی بیٹی تھی، میری نہیں پھر وہ میری زندگی میں آئی بھی

تمہارے نانا کی ڈیڑھ کے بعد تھی اور اس نے بہت خوشی

سے اس چیز کو قبول کیا تھا۔ وہ اس بات کو سمجھتی تھی کہ میں نے

وطن کے لیے جتنی بڑی قربانیاں دی ہیں اس کے بعد میرا حق

بتا تھا کہ میری اس طرح کی چھوٹی موٹی خواہشات خوشی سے

پوری کی جائیں۔“

”کیسی قربانیاں؟“ وہ مستفسر ہوئی۔

”تمہارے خیال میں ایک عام انسانی زندگی سے

کٹ کر دن رات کسی لیبارٹری کی چار دیواری میں قید رہ کر

تحقیق اور مطالعے میں جتنے رہتا کوئی آسان بات ہے؟ میں

نے شادی نہیں کی، اپنی کوئی فیملی نہیں بنائی، خاندان اور

دوست احباب سے دور رہا، محفلوں میں شرکت نہیں کی،

تفریح گاہوں کا رخ نہیں کیا اور دن رات جس اس ایک

مقصد میں جتا رہا کہ نئی نئی تحقیقات سے اسرائیل کا قد دنیا

میں بلند کرتا رہوں۔ یہ جو دنیا بھر کی میڈیسن کمپنیوں اور

ایجادات پر ہماری قوم کی اجارہ داری ہے، اس کے پیچھے مجھ

جیسے ہی لوگوں کا تو ہاتھ ہے۔“ اس نے کہتے ہوئے فخر سے

اپنی گردن اٹرائی اور اس کی طرف معنی خیز نظروں سے

دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کیا تمہارے خیال میں مجھ جیسے قوی ہیروز کو اس

بات کا حق نہیں کہ قوم ہماری خدمت کرے؟“

”بالکل ہے۔ آپ کے اس حق کو تسلیم کر کے ہی تو

میں یہاں تک آئی ہوں۔“ سو نیانے اس کا خالی ہو جانے والا

جام دوبارہ بھرا اور خود پر جبر کر کے اس کے تھوڑا قریب ہوئی۔

”اپنی ماں کی طرح ہی سمجھ دار ہو۔“ اینڈریو اس کی

پیش رفت پر محل اٹھا۔

”ویسے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اب اس عمر میں

آپ نے خود کو کس مشقت میں ڈال دیا ہے۔ کہہ چکے آپ

پوری زندگی اسرائیل کی خدمت۔ اب اس عمر میں تو کم از کم

"اب سوال نہیں۔ بس میرے ساتھ آؤ۔" اینڈریو نے اسے سختی سے جواب دیا اور خود کمرے سے باہر جانے کے لیے قدم اٹھائے۔ اس بار وہ خاموشی سے اس کے پیچھے چل پڑی۔ جس جگہ اینڈریو کو رکھا گیا تھا، یہ کوئی بہت وسیع و عریض عمارت نہیں تھی۔ بس ایک تھوڑا کشادہ سا سنگل اسٹوری مکان تھا جس کے دوسرے میں اینڈریو کی رہائش تھی جبکہ اوپر سونیا اور اس کی ٹیم کے افراد اس انداز میں مقیم ہو گئے تھے جیسے وہ جگہ کوئی نئی ہاسٹل ہو جس کے کمرے انہوں نے کرائے پر لے رکھے ہوں۔ عمارت نئی نہیں تھی اور باغیچہ میں بھی خفیہ سرگرمیوں کے لیے استعمال ہوتی رہی تھی لیکن چونکہ ہاسٹل میں رہنے والوں کے چہرے بدلتے رہتے تھے اس لیے اگر کسی کو کوئی شک بھی تھا تو تصدیق کے مواقع میسر نہیں آتے تھے۔ ویسے بھی عوام کے ذہن میں یہ بات بھڑائی گئی تھی کہ اگر انہیں کبھی کچھ مشکوک لگ بھی رہا ہے تو انہیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جو کچھ کیا جا رہا ہے، اسرائیل اور یہود کے مفاد میں کیا جا رہا ہے اس لیے عوام کے لیے بہتر یہی ہے کہ ایسے معاملات میں خاموشی اختیار کیے رکھیں۔

"میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں سر؟" ابھی وہ کمرے سے باہر ہی نکلے تھے کہ دن رات پروڈیوسر کی خدمت پر مامور ملازم جو اسی کی طرح اس عمارت سے باہر نہیں جاتا تھا، چراغ کے جن کی طرح حاضر ہو گیا۔

"دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ مجھے ضرورت ہوئی تو میں خود جہیں بلا لوں گا۔" پروڈیوسر غصے سے دھاڑا۔ یہ اور بات کہ اس کا لہجہ نشے کی زیادتی کی وجہ سے لڑکھڑاہٹا تھا۔ ملازم نے اس کی طرف تشویش بھری نظروں سے دیکھا اور حکم کی تعمیل میں متاثر دکھائی دیا۔

"ڈونٹ وری، میں سنبھال لوں گی۔" سونیا نے اسے تسلی دی تو وہ قدرے متذبذب سا واپس پلٹ گیا کہ اسے بہر حال چیف سکیورٹی آفیسر پر تو بھروسہ کرنا تھا۔

"اسٹو پڈ! سمجھتا ہے کہ میری ہر خدمت بھالانا اس کے بس میں ہے۔ کوئی پوچھے اس سے کہ کیا یہ بستر پر تم جیسی حسین عورت کی جگہ لے سکتا ہے؟" اینڈریو کا دماغ ایک مخصوص ٹریک پر چل پڑا تھا جو اسے کچھ اور بھائی نہیں دینے دے رہا تھا۔ شاید ہر ذہن آدمی کا یہ ایسا ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی ایک خاص نکتے پر اس کی عقل گھاس چرنے چلی جاتی ہے۔ پرموں کے پیاسے اینڈریو کے دماغ پر بھی سونیا سوار ہو چکی تھی۔ وہ اسے اپنی رہائش گاہ کے مختلف حصوں سے گزارتا ہوا ایک کشادہ اسٹور نما حصے میں لے آیا۔ یہ اسٹور

اینڈریو کی لیب سے حاصل تھا۔ سکیورٹی کے آلات نصب کرتے ہوئے سونیا نے اس جگہ کو دیکھا تھا۔ یہاں کچھ کیمیکلز کے ڈبے، عموماً لیبارریوں میں استعمال ہونے والے آلات اور خالی کاغذ و فیپرہ وغیرہ کیے گئے تھے۔ دیوار میں ایک الماری بھی نصب تھی اور اس میں کتابوں کے ساتھ مختلف قسمی آلات خصوصاً سرجری سے متعلق آلات رکھے ہوئے تھے۔

اینڈریو نے فیبر ضروری قرار دیتے ہوئے اسے اس اسٹور میں کیمرا نصب کرنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ سونیا نے بھی اصرار نہیں کیا تھا کہ انہیں اندر سے زیادہ باہر سکیورٹی انتظامات کرنے کی ضرورت تھی۔ اندر جو واحد ملازم موجود تھا، اسے بہت ٹھونک بھا کر رکھا گیا تھا اور اس کی فیملی کو زیر نگرانی رکھنے سمیت کچھ ایسے اقدامات کیے گئے تھے جن کے باعث وہ بے چارہ دھوکا دہی کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

"یہ جیکٹ اور دوسری گرم چیزیں پہن لوں" پروڈیوسر نے الماری کھول کر اس کے ایک خانے سے گرم بلیوساٹ برآمد کیے اور ایک لباس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے دوسرا خود پہننے لگا۔

"یہ کس لیے؟" اسے لگا کہ نشہ پروڈیوسر کے دماغ کو چڑھ گیا ہے جب ہی وہ یہ احمقانہ حرکت کر رہا ہے۔

"سوال نہیں کرو اور جو کچھ کہہ رہا ہوں، اس پر عمل کرو۔ اپنے ہر سوال کا جواب جہیں خود ہی مل جائے گا۔"

اینڈریو نے اسے سنجیدگی سے جھڑکا تو اسے یقین آیا کہ وہ اتنا بھی بہکا ہوا نہیں ہے جتنا وہ گمان کر رہی ہے۔ اس بار اس نے اینڈریو کے حکم کی تعمیل کی اور اس کی تقلید کرتے ہوئے اپنے لباس پر ہی وہ گرم لباس پہن لیا۔ لباس کے ساتھ ہی گرم ٹوپا اور جوتے وغیرہ بھی تھے۔ جوتے اگرچہ اس کے سائز سے کچھ بڑے تھے لیکن مولے موزے پہننے لگا بعد کسی نہ کسی حد تک استعمال کے لائق ہو ہی گئے۔

"اب ہم ایک دوسری دنیا میں جانے کے لیے تیار ہیں۔" اس کی اور اپنی تیاری سے مطمئن پروڈیوسر نے اعلان کیا اور ہاتھ بڑھا کر کھلی الماری کے ایک حصے پر دباؤ ڈالا۔

یقیناً اس جگہ کوئی خفیہ جن نصب تھا۔ دباؤ ڈالتے ہی الماری کا اندرونی حصہ سامان سمیت کسی سلائیڈ کی طرح کھسک گیا اور پیچھے لوہے کی چادر سی دکھائی دینے لگی۔ یہاں بھی اس نے ایک جگہ کو اپنی انگلی سے دباؤ ڈالا تو وہ چادر کھسک گئی اور ایک کشادہ سا مستطیل ڈبا دکھائی دیا۔ وہ اچانک تو تھی نہیں کہ سمجھ نہ پاتی کہ وہ ایک عدد دفٹ ہے اور یہاں لفٹ کی موجودگی کا

حد تک غالب تھا کہ اینڈریو کا ہاتھ تھا منہ محسوس بھی نہیں ہوا اور خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑی۔ چلتے ہوئے ان کے ہر وہاں پھیلی معنوی برف میں دھنسنے جا رہے تھے اور دماغ مسلسل یہ سوچ رہا تھا کہ بے تحاشا لاگت سے قائم کردہ یہ سیٹ اپ جس کو مستقل قائم رکھنے کے لیے کثیر رقم صرف کرنا پڑ رہی ہوگی، آخر کس مقصد کے لیے لگایا گیا تھا؟

”یہاں کون قید ہے؟“ ذرا سا آگے بڑھتے ہی اس کی نظروں میں جیلوں میں بنائے گئے سلاخ دار بیرکس جیسے بیرکس آ گئے۔ فرق صرف یہ تھا کہ ان بیرکس پر لگائی گئی سلاخوں پر بھی سفید براق پینٹ کیا گیا تھا جس کی وجہ سے وہ ماحول سے ہم آہنگ دکھائی دے رہی تھیں۔

”قیدی نہیں، میری برسوں کی محنت ہے۔ یوں سمجھو، برسوں پہلے میں نے ایک یو ڈا لگایا تھا۔ اب وہ تناور درخت بن چکا ہے اور وہ وقت دور نہیں جب ہم اس درخت کا پھل کھا سکیں گے۔“ اینڈریو بہت خوش تھا اور اس خوشی میں اسے شامل کرنے کے لیے سلاخوں کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا۔ اس طرف آتے ہوئے اس کو ایک ناگوار سی بو محسوس ہوتی رہی تھی۔ سلاخوں کے سامنے کھڑے ہو کر یہ بو بے حد تیز ہو گئی۔ یہ بو بالکل ویسی ہی تھی جیسے چڑیا گھر میں جالوروں کے ہنجروں کے پاس محسوس ہوتی ہے۔ بو کے ساتھ گہری گہری سانس لینے کی آوازیں بھی تھیں۔ ان آوازوں کے تعاقب میں نظریں دوڑاتے ہوئے اس کی نگاہ بائیں جانب اٹھی تو اٹھی ہی رہ گئی اور ہونٹ حیرت کی شدت سے نیم وا ہو کر رہ گئے۔

☆☆☆

اس کثیر الطورہ عمارت کی سب سے بلند منزل پر موجود وہ کمزکی کے قریب کھڑا احتیاط سے باہر جھانک رہا تھا۔ عمارت کا ڈھانچا مکمل طور پر تیار تھا لیکن پلاستک، رنگ و روغن، کمزکی، دروازوں کی تنصیب وغیرہ جیسے بے شمار کام باقی تھے۔ وہ جس کمزکی کے ساتھ کھڑا تھا، اس میں بھی صرف کمزکی کا فریم ہی تیار تھا، پٹوں اور شیشوں وغیرہ کی تنصیب کا کام باقی رہتا تھا اور یہ صین ممکن تھا کہ اگر علاقے کا فضائی جائزہ لیا جائے تو اس کھلے چوکے سے اندر کا منظر صاف دکھائی دے۔ اس خطرے سے بچنے کے لیے جارو نے کمزکی پر ایک شیا لے سے رنگ کا پردہ کیلوں کی مدد سے ٹھونک دیا تھا اور وہ اس پردے میں بنائے گئے سوراخ کے ساتھ ٹیلی اسکوپ لگائے ارد گرد کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ جلسہ گاہ جہاں اسے اپنے مطلوبہ ہدف کو نشانہ بنانا

مطلب تھا کہ وہ جس تہ خانے میں کھڑے ہیں، اس کے نیچے بھی کوئی منزل ہے۔

”آئی۔“ پروفیسر نے لفٹ کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے اسے بھی پکارا۔ وہ اس کی پیروی کرتے ہوئے لفٹ میں داخل ہو گئی۔ پروفیسر نے ٹین دبا یا۔ لفٹ کا دروازہ بند ہوا اور وہ حرکت میں آ گئی۔ چند سیکنڈوں بعد وہ رکی اور اس کا دروازہ کھلا تو سونیا کے چہرے سے ٹھنڈی ہوا کا جھوکا سا ٹکرایا۔ یہ جھوکا اتنا سرد تھا کہ اسے بے اختیار برف زار میں معاذ اور دیگر ساتھیوں کے ساتھ گزارا وقت یاد آ گیا۔ کچھ کچھ حیران وہ اینڈریو کے ساتھ لفٹ سے باہر آئی۔ وہ جگہ واقعی بے حد سرد ہو رہی تھی۔ اتنی سرد کہ گرم لباس کے باوجود اسے ہلکی چوٹی سی محسوس ہوئی۔

”یہ ہم کہاں آ گئے ہیں؟“ اس جگہ چونکہ اندھیرا تھا اور آنکھیں کچھ بھی دیکھنے سے قاصر تھیں اس لیے اسے اینڈریو سے پوچھنا پڑا۔

”ونڈر لیٹ۔“ اینڈریو نے کسی نیچے کی طرح ٹھٹھکلاتے ہوئے اس کے کان میں سرگوشی کی اور پھر شاید کوئی ٹین دبا یا کہ ٹچ کی آواز کے ساتھ وہاں روشنی پھیل گئی۔ گہرے اندھیرے میں یکدم پھیلنے والی اس تیز روشنی نے ایک لمبے لمبے سوئیا کی آنکھیں چند سیکنڈوں میں لیکن پھر فوراً ہی وہ اپنے ارد گرد کا منظر دیکھنے کے لائق ہو گئی۔

”اوہ بائی گاڈ!“ جو دکھائی دے رہا تھا اس نے اس کی آنکھیں پھیلا دیں۔

”یہ سب کیوں اور کس لیے؟“ اس نے وہاں پھیلی برف کو دیکھ کر شدید حیرت سے پوچھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی فلم کے سیٹ پر آ گئی ہو جہاں کسی سین کو پکچرائز کرنے کے لیے برف زار کا سیٹ اپ لگایا گیا ہو یا پھر وہ گرم ممالک کے لوگوں کی تفریح کے لیے بنائے گئے کسی پلے ایریا جیسا تھا۔ دینی کا اسکی دینی اس کی بہترین مثال تھا۔ ایک بڑے مال میں قائم کیے گئے اس تفریحی مقام پر بچے اور بڑے دینی کے آگے آگئے سورج کو بھول کر کچھ دیر ہم کے بدلے کسی بل اسٹیشن جیسا لطف لے لیتے تھے لیکن یہاں اس تہ خانے میں بنائے گئے اس خفیہ برف زار کا تو یہ مقصد بھی نہیں تھا کہ عوام کی اس تنگ رسائی تو دور کی بات، انہیں اس کی سن کن بھی نہیں تھی۔

”اپنے اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے تمہیں چند قدم مزید چلنا ہوا۔“ اینڈریو نے کہا اور اس کا نرم و بلام تھام اپنے استخوانی ہاتھ میں لے لیا۔ اس پر محسوس اس

وہ ڈریکو استعمال کرتے رہے تھے اور ڈریکو کی کارگر رینج ہزار میٹر سے زائد نہیں ہوتی۔ ان حالات میں معاذ کا میسر آ جانا ان کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں تھا اور جارو بطور خاص اس کی معاونت کے لیے ساتھ موجود تھا۔

”رائفل مجھے دو۔“ جارو کی بات پر کوئی تبصرہ کیے بغیر معاذ نے اس سے فرمائش کی۔ رائفل ہاتھ میں آگئی تو اس کے ساتھ ٹیلی اسکوپ سائٹ فٹ کر کے لیزر رینج فائنڈر کی مدد سے اس کرسی تک کا فاصلہ ناپ کر ایلیوشن ٹاپ پر مطلوبہ رینج لگائی۔ جس کرسی پر رام نکل کو بیٹھنا تھا یہ تقریباً سولہ سو اسی میٹر بن رہی تھی اور اسے امید تھی کہ وہ اس فاصلے سے بہترین نشانہ لینے میں کامیاب ہو جائے گا۔ خوش قسمتی سے اس وقت ہوا کی رفتار بھی خاصی کم تھی اور یہ ایک انسائپر کے لیے آئیڈیل صورت حال تھی۔

”میگزین میں گولیاں بھر دی ہیں؟“ ہر طرف سے ایک اطمینان محسوس کرتے ہوئے اس نے جارو سے پوچھا۔

”ہاں۔ اگر تم کہو تو میں اسے رائفل سے جوڑ دوں؟“ جارو نے پوچھا۔

”مجھے دو۔ میں خود کر لیتا ہوں۔“ معاذ نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ میگزین فٹ کر کے اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ انہیں جو شیڈول ملا تھا اس کے مطابق رام لعل کے جلسہ گاہ میں آنے میں صرف پانچ منٹ ہی رہ گئے تھے۔

”ہوا کی رفتار چیک کرو۔“ اس نے جارو سے فرمائش کی۔ وہ فوراً ونڈ میٹر پر جھک گیا اور اسے مطلوبہ ڈیٹا لیکھن بتائی۔ معاذ کو مزید اطمینان ہوا۔ ہوا کی رفتار میں کوئی تغیر نہیں آیا تھا۔ یعنی سب کچھ ٹھیک جارہا تھا، بس واحد چیز جو اس کے لیے معمولی سی پریشانی کا باعث تھی، وہ یہ تھی کہ اس نے اب تک لیٹی پوزیشن میں یہ رائفل چلانے کی مشق کی تھی لیکن یہاں چھت چھوڑ کر ٹاپ فلور کی کھڑکی سے فائر کرنے کے لیے اسے کھڑی پوزیشن اختیار کرنا پڑ رہی تھی۔

”وہ آگیا ہے۔“ درمیانی پانچ منٹ سست روی سے ہی سہی، گزر گئے اور رام لعل اپنے سکیورٹی گارڈز کے حصار میں اس پر چڑھتا دکھائی دیا۔ سفید کرتہ پاجامہ پہنے ادھیڑ عمر رام لعل چوڑے حلقے جسم کا مالک تھا لیکن اسے بے ڈھب نہیں کہا جاسکتا تھا بلکہ ایسا لگتا تھا کہ وہ باقاعدگی سے ورزش کرنے کا عادی ہے۔ وہ یہاں سے آوازیں نہیں سن سکتا تھا ورنہ سننا کہ رام لعل کی آمد کے ساتھ ہی جلسہ گاہ پر زور و نفروں سے گونجنے لگی ہے۔ اس پر میزبانی کے فرائض انجام دینے والا نوجوان جھوم کوجوش دلانے اور نعرے بازی پر ابھارنے

تھا، اس عمارت سے کم و بیش پندرہ سو میٹر کے فاصلے پر تھی۔ جلسہ گاہ اور اس عمارت کے درمیان کئی دوسری عمارتیں بھی آتی تھیں لیکن ان سب کی بلندی اس عمارت کے مقابلے میں کم تھی۔ صرف جلسہ گاہ کے دائیں جانب تقریباً تین سو میٹر کے فاصلے پر ایک اسی جتنی بلندی رکھنے والی عمارت موجود تھی لیکن وہ عمارت اپنی پوزیشن کی وجہ سے اس کے اور ہدف کے درمیان حائل نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ دیکھ سکتا تھا کہ اس عمارت پر قانون نافذ کرنے والے اداروں کی خاصی توجہ ہے اور عمارت کی چھت پر باقاعدہ انسائپرز تعینات کیے گئے ہیں۔ پہلے انہوں نے بھی چھت پر پوزیشن لینے کا سوچا تھا لیکن پھر فضائی سکیورٹی کا سوچ کر ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔

”کیا صورت حال ہے؟“ جارو نے رائفل ہاگس سے رائفل کے مختلف حصے نکال کر جوڑتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”لوگ اچھی خاصی بڑی تعداد میں جمع ہو چکے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ تمہارے وزیر موصوف بھی ٹھیک وقت پر آجاتے ہیں یا نہیں۔“ اس نے ٹیلی اسکوپ پر سے آنکھ ہٹائے بغیر جواب دیا۔

”وہ ہمارے ہاں موت کے فرشتے کے نام سے مشہور ہے اور تمہیں معلوم ہے کہ موت کا فرشتہ کبھی لیٹ نہیں ہوتا۔“ جارو نے اسے جواب دیا تو اس کے لیے میں مذکورہ وزیر کے لیے نفرت کی آج تھی اور کیوں نہ ہوتی کہ رام لعل نامی اس وزیر نے بھارت کے دفاع کے نام پر بے شمار مظلوموں کا ناحق خون بہایا تھا۔ کتنے کشمیری نوجوان ایسے تھے جو کسی معمولی شک پر گرفتار کیے گئے تھے لیکن رام لعل کی وضع کردی پالیسیوں میں ان نوجوانوں کے لیے کسی قسم کی نرمی یا رعایت نہیں تھی۔ ان میں سے کچھ کو گرفتاری کے وقت موقع پر ہی ہلاک کر دیا جاتا تھا اور کچھ جیل کی صعوبتوں کے باعث یا تو مر جاتے تھے یا پھر ہمیشہ کے لیے کسی ذہنی یا جسمانی معذوری کا شکار ہو جاتے تھے۔ رام لعل کے کشمیر آنے اور جلسے سے خطاب کرنے کا پروگرام پتا چلتے ہی جارو اور اس کے ساتھیوں نے اس سے نجات کی منصوبہ بندی شروع کر دی تھی اور آخر کار اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ بلندی اور فاصلے سے نشانہ لینا سب سے محفوظ ہوگا۔ اس کام کے لیے انہوں نے یہ عمارت بھی موزوں ترین کمین گاہ کے طور پر ڈھونڈ لی تھی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ان کے پاس اتنے فاصلے سے کامیاب نشانہ لینے والے انسائپرز موجود تھے نہ بیرٹ ایم 107 جیسی لانگ رینج رائفل کو استعمال کرنے کا تجربہ۔

کی شناخت ہو سکے۔

عمارت کے کونے پر پہنچنے ہی دو گاڑیاں آگے پیچھے وہاں آکر کھیں اور وہ دونوں الگ الگ گاڑیوں میں سوار ہو گئے۔ رائفل والا بیک جادو کے پاس تھا جسے وہ اپنے قریبی ٹھکانے پر چھپا کر آگے نکل جاتا۔ خوش قسمتی سے سارے کام طے شدہ ترتیب سے انجام پا رہے تھے اور قوی امید تھی کہ فائر کی سمت اور مقام کا تعین کر کے جب تک سیکورٹی ادارے اپنی تلاش کا دائرہ وسیع کرتے، وہ اس علاقے سے نکل جانے میں کامیاب ہو جاتے۔ اس کی گاڑی کو چلانے والا ڈرائیور بھی بہت مشاق تھا۔ گاڑی کی تیز رفتاری کے باوجود اسے جھٹکے نہیں لگ رہے تھے اور جلد ہی وہ اسے بڑی سڑکوں سے نکال کر آبادی میں لے آیا تھا۔ یہاں وہ ایک مکان کے سامنے اترے۔ مکان میں اس کا لباس، موبائل اور دیگر سامان موجود تھا۔ لباس اور جوتے تبدیل کر کے اس نے ان تمام چیزوں سے نجات حاصل کی جو ہدف کے حصول کے دوران اس کے پاس موجود تھیں۔ اب وہ عام سے حلیے میں اپنا آگے کا سفر کرنے کے لیے تیار تھا۔ یہ سفر ایک آن لائن ٹیکسی کے ذریعے ہوتا تھا۔ یہ اور بات کہ ٹیکسی ڈرائیور بھی انہی کا ساتھی تھا۔ اس کے ساتھ شیخ العالم انٹرنیشنل ایئرپورٹ جسے بڑا کام اتریں بھی کہا جاتا ہے، کی طرف سفر کرتے ہوئے راستے میں چیکنگ کے خدشات کے باوجود وہ پُر امید تھا کہ دہلی جانے والی فلائٹ میں سوار ہو سکے گا۔ دہلی سے اگلی فلائٹ میں بھی اس کی سیٹ بک تھی اور یہ بھی بالکل واضح تھا کہ وہ کاروباری مقصد سے انڈیا کے پیارے دوست ملک اسرائیل جا رہا ہے۔

☆☆☆

”میرے خیال میں یہاں، اس جگہ ایک اچھی سی فوٹو گراف بنواتے ہیں۔“ Bat Galim کے ریٹیلے ساحل پر چھل قدمی کرتے ہوئے شہریار نے اچانک ہی یہ خواہش ظاہر کی تو ماہ بانو اس دی۔

”لگتا ہے آپ نے اسے اپنا اپنی مون ٹرپ سمجھ لیا ہے۔“ سمجھنے میں حرج ہی کیا ہے۔ اتنے عرصے بعد گھر اور بچوں کی مصروفیات سے ہٹ کر ایک دوسرے کے ساتھ تنہا وقت گزارنے کا موقع ملا ہے۔ اس نے ہلکے پھلکے لہجے میں ماہ بانو کی بات کا جواب دیا لیکن نظر میں اس کے بجائے ساحل پر ہر طرف پھیلے لوگوں پر جمی ہوئی تھیں۔ موسم خوشگوار تھا اور وہاں کافی زیادہ لوگ موجود تھے۔ ان میں مقامی بھی تھے اور بہت سے سیاح بھی۔ ہر ایک دوسرے سے بے

میں اپنا بھرپور زور لگا رہا تھا۔ کلین شیڈ رام لعل جس نے اپنی گردن میں بھارتی پرچم کے رنگوں پر مشتمل منظر ڈال رکھا تھا، مسکراتے ہوئے بھی دونوں ہاتھ جوڑ کر تو بھی لہرا کر ان خیر مقدمی نعروں کا جواب دے رہا تھا۔ معاذ اللہ کی ٹیلی اسکوپ سائٹ سے یہ سارے مناظر بخوبی دیکھ رہا تھا۔ اس کی انگلی گولی چلانے کے لیے ٹریگر پر بے تاب جمی ہوئی تھی لیکن رام لعل کے متحرک ہونے کی وجہ سے اسے صبر سے کام لیتا پڑ رہا تھا۔ ایک وجہ وہ مقامی لیڈر بھی تھے جو رام لعل کے استقبال کے لیے اپنی نشستوں سے اٹھ کر اس کے ارد گرد جمع ہو گئے تھے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ گولی چلائے اور عین وقت پر ان میں سے کوئی سامنے آ کر رام لعل کی موت کو اپنے نام لکھوائے۔ وہ استقبالی لمحات سٹ روکی سے گزر رہے اور خدا خدا کر کے رام لعل اپنے لیے مخصوص اس نشست تک پہنچا جو سب سے زیادہ بلند اور نمایاں تھی۔ اس نشست پر مسکراتے ہوئوں کے ساتھ سیٹھ پھلائے بیٹھا وہ اپنے انجام سے بے خبر تھا۔

معاذ نے اللہ کا نام لے کر سانس روکی اور عین دل کے مقام کا نشانہ لیتے ہوئے ٹریگر دبا دیا۔ ہلکے سے دھماکے کے ساتھ گولی منزل سے نکلے اور اپنے کندھے کو لگنے والے جھٹکے کے ساتھ ہی اس نے رام لعل کے سینے پر ایک سرخ نقطہ ابھرتا دیکھا۔ وہ گرتا، اس سے مل ہی وہ دوسرا فائر بھی داغ چکا تھا۔

”جیو میرے دوست! تم نے کر دکھایا۔“ جادو نے خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے اسے گلے سے لگا لیا۔

”ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔“ چشم تصور سے جلسہ گاہ کی جھلک ڈال کر سیکورٹی اداروں کی پھرتیاں دیکھتے ہوئے اس نے جادو کو اجاس ڈلایا۔ وہ فوراً اس سے الگ ہو گیا اور پھرتی سے رائفل اور اس کے متعلقات کو سمیٹ کر بیک میں واپس رکھنے میں اس کی مدد کرنے لگا۔ سیکنڈوں میں یہ کام نمٹا کر وہ پھرتی سے لفٹ کے ذریعے نیچے پہنچے اور عمارت سے باہر نکل کر پیدل عمارت کی دائیں جانب چلنے لگے۔ چلتے چلتے اس نے اپنے ہاتھوں پر چڑھے ربر کے دستانے اتار کر جادو کے حوالے کئے۔ جادو خود بھی اپنے دستانے اتار چکا تھا۔ اس عمارت میں گزرے عرصے میں انہوں نے ایک لمحہ بھی ان دستانوں کے بغیر نہیں گزرا تھا۔ اس کے علاوہ عمارت سے باہر نکلتے ہوئے بھی پی کیپ اور ماسک کا استعمال کیا تھا۔ اس لیے اس بات کا امکان بہت کم تھا کہ اگر وہ اس پاس لگے کسی کیمرے کی زد میں آ بھی جائیں تو ان

پر وہ اپنی سستی میں مست نظر آ رہا تھا۔

”لیکن میں بچوں کو مس کر رہی ہوں۔ خصوصاً حبیب کا بار بار خیال آتا ہے کہ ہمارے لیے اداس ہوتا ہوگا۔“ وہ خود اداس دکھائی دینے لگی۔

”فکرت کرو۔ مشاہیرم اور آمنہ نے مل کر انہیں اچھی طرح سنبھال لیا ہوگا۔ مشاہیرم کا تو جمہیں پتا ہی ہے کہ کتنا ایماندار اور وفادار آدمی ہے۔ اس کے وہاں ہوتے مجھے بالکل بھی فکر نہیں ہے۔“ شہریار نے اس کے شانوں پر بازو پھیلاتے ہوئے اسے تسلی دی تو وہ مسکراتے لگی۔

”ہاں، یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ مشاہیرم خان پر تو مجھے خود بھی اپنے خون کے رشتوں سے زیادہ بھروسہ ہے۔ میں وہ وقت بھی نہیں بھول سکتی جب اس نے مشکل حالات میں مجھے اپنے لوگوں کے درمیان پناہ دی تھی اور ہر ممکن حفاظت بھی کرتا رہا تھا۔“ ماضی آج بھی اسے جزئیات کے ساتھ یاد تھا کہ اس ماضی میں سارے ناقابل فراموش واقعات ہی پیش آئے تھے۔

”سب سے زیادہ بھروسہ تو اپنے رب کی ذات پر ہے جو سب سے بڑھ کر اپنے بندوں کی مدد کرنے والا ہے۔ یہ اس رب کی مدد ہی تو تھی کہ ضرورت کے وقت مشاہیرم خان کا ساتھ میسر آ گیا۔“ شہریار کے لہجے میں شکرگزاری تھی۔ ساحل پر رش تو تھا لیکن ان کے آس پاس کوئی موجود نہیں تھا اس لیے وہ مکمل کربا نہیں کر رہے تھے۔

”بالکل ایسا ہی ہے۔“ ماہ بانو نے اس کی تائید کی پھر چونک کر بولی۔

”آپ تو تصویر کھنچوانے کی بات کر رہے تھے نا؟“

”اب بھی اپنی بات پر قائم ہوں۔“

”چلیں پھر سیٹھی لیتے ہیں۔“ اس نے موبائل نکالنے کے لیے لباس پر پہنے منی کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔

”سیٹھی نہیں لینی، کسی سے پوری کچھ کھنچوانی ہے۔“

وہ شرارت سے بولا اور اپنے عقب میں آٹھ دس قدم کے فاصلے سے کھڑے اس شخص کی طرف پیٹرنٹ کی جو بڑا سا ہیٹ لگائے تھا انہیں ہارتے سمندر کی طرف رخ کیے موجوں پر سرٹک کرتے افراد کو دیکھتی سی دیکھ رہا تھا۔

”ایکسکوز می!“ اس سے دو قدم کے فاصلے پر کھڑے ہو کر اس نے اسے پکارا۔

”نیں!“ آنکھوں میں ہلکی سی حیرت لیے وہ شخص اس کی طرف پلٹا۔ اب حیران ہونے کی باری شہریار کی تھی۔

”مسٹر جمی واکر..... میں آپ کو پہچاننے میں غلطی تو

نہیں کر رہا ہوں نا؟“ اس نے اس آدمی سے تصدیق چاہی۔

”بالکل نہیں لیکن میں اس اتفاق پر حیران ہوں کہ ہم ایک بار پھر مل رہے ہیں۔“ جمی کے لہجے میں دبا دبا سا جوش تھا۔

”وہ اس لیے کہ آج پھر آپ میری، میری پارٹنر کے ساتھ ایک خوبصورت اور یادگار تصویر بنائیں۔“

”اوہ، شیوہ راجھے خوشی ہوگی آپ کے لیے یہ خدمت انجام دے کر۔“ اس نے خوشدلی سے جواب دیا۔

”آج اتنا تانیہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمیں آج ایک بار پھر یادگار فوٹو گراف بنانے کے لیے مسٹر جمی واکر جیسے عمدہ فوٹو گرافر میسر آ گئے ہیں۔“ شہریار نے ماہ بانو کو آواز دے کر قریب بلایا۔

”ہیلو مسٹر واکر!“ اس نے قریب آ کر تکلف سے جمی واکر کو مخاطب کیا۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ شہریار نے اس کی اپنے قریب موجودگی کو محسوس کر کے ہی تصویر بنوانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔

”آپ سے دوبارہ مل کر خوشی ہوئی خاتون۔“ اس نے اپنا ہیٹ اتار کر ماہ بانو کو تعظیم دی اور خوشدلی سے بولا۔

”سیم ہیئر!“ ماہ بانو نے ایک بار پھر مکی جملہ ادا کیا۔

”باجنیں تو ہوتی رہیں گی، پہلے کچھ بنوا لیتے ہیں۔“ شہریار نے یوں کہا جیسے اس وقت یہی سب سے اہم کام ہو۔

شاید وہ جمی واکر کو باور کروانا چاہتا تھا کہ واقعی اس کے لیے ایک یادگار فوٹو بنانا بہت اہم ہے۔

”ایک کپ کافی کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ جمی واکر ان کی تصویر بننا کر فارغ ہوا تو شہریار نے اسے پیشکش کی۔

”کیوں نہیں، لیکن یہ کافی میری طرف سے ہوگی۔“ آخر آپ میرے وطن میں مہمان ہیں۔“ جمی نے خوشدلی سے ہائی بمرتے ہوئے شرط رکھی۔

”اگر یہ آپ کی خوشی ہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔“ کیوں تانیہ؟“ شہریار نے اس کی پیشکش قبول کرتے ہوئے

ماہ بانو کی بھی رائے لی۔

”بالکل۔“ وہ مختصر جواب دیتے ہوئے مسکرائی۔ ذرا

دیر میں وہ تینوں ایک ساحلی ریسٹوران میں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔

”ہم سیاح ہیں اور یردشلم کے بعد ہمارا حیفہ ایکسپلور کرنے آنا سمجھ آتا ہے لیکن آپ کو یہاں دیکھ کر مجھے جج جج حیرت ہوئی ہے۔ یہ ایک حیرت انگیز اتفاق ہے۔“ جمی کافی

کا آرڈر دے چکا تو اس کے بعد شہریار نے اس سے اپنی

”آپ کا دریہ معاش کیا ہے مسز ڈاکر؟“ شہریار نے مڑھوے بدلا۔

”مرداری ملازمت ہے۔ ہمارا ٹکڑا اہم تاریخی اور تفریحی عمارات کی دیکھ بھال کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ میں حیفہ ملازمت سے متعلق ہی ایک ڈسے داری ادا کرنے کے لیے آیا تھا۔“

”ویری انٹرنسٹنگ۔ اگر مجھے آپ کی ملازمت کی نوعیت کا علم ہوتا تو اپنے باپ کی صحت کو بھول کر یروٹلم میں ہی آپ کی دوستی کی پیشکش قبول کر لیتا۔“ شہریار نے جیسے کف افسوس ملا۔ جی ڈاکر اس کے اس بے ساختہ اظہار پر پہلے قہقہہ لگا کر ہنسا پھر خوشدلی سے بولا۔

”میری پیشکش محدود مدت کے لیے نہیں تھی۔ جب ایک خوبصورت اتفاق نے ہمیں دوبارہ ملائی دیا ہے تو ہم دوستی کا رشتہ استوار کرنے کے بارے میں غور کر سکتے ہیں۔“

”میرے خیال میں تو غور و خوض کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ہم جس طرح بے تکلفی سے گفتگو کرتے ہوئے ساتھ کافی گواٹھائے کر رہے ہیں، یہ رشتہ خود بخود ہی استوار ہو چکا ہے۔“ ماہ بانو نے سنجیدگی سے احساس دلایا تو وہ اور شہریار دونوں ہنس پڑے۔

”والتی خاتون ٹھیک کہہ رہی ہیں۔“

”میرا ماننا ہے کہ خواتین ہمیشہ ٹھیک ہی کہتی ہیں۔“

شہریار نے جی کی بات پر تہمرہ کیا۔

”ایک کامیاب ازدواجی زندگی کا راز یہی مانتے میں پوشیدہ ہے۔“ جی نے آنکھ مار کر کہا تو شہریار ہنس دیا البتہ ماہ بانو نے یوں منہ پھلایا جیسے اسے ان دونوں کی باتیں ناگوار گزر رہی تھیں۔

”آپ لوگوں کا مزید کتنے دن حیفہ میں قیام رہے گا؟ یہاں سے آپ یروٹلم واپس جائیں گے یا پھر کسی اور شہر کا قصد ہے؟“

”نی الحال تو ہم حیفہ ایکسپلور کر رہے ہیں۔ ٹریڈر گائیڈز کے مطابق تو اس شہر کو ایکسپلور کرنے کے لیے تین دن کافی ہوتے ہیں لیکن ہم ایک پورا دن بھائی گارڈن پر لگا چکے ہیں اور آج دن کا اچھا خاصہ حصہ یہاں گزر چکا ہے تو ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ ہمارے لیے تین دن نا کافی ہوں گے۔“ شہریار نے اس کے سوال کا ہم سا جواب دیا۔

”اس طرح آپ کے اخراجات حد سے تجاوز بھی کر سکتے ہیں۔“ جی نے اسے متنبہ کیا۔

”اسے کنٹرول کرنے کے لیے ہم دوسری چیزوں

حیرت کا اظہار کیا۔

”والتی یہ حیرت انگیز ہے۔ میں بھی یہاں آئے ہوئے سوچ نہیں سکتا تھا کہ یہاں ایک بار پھر آپ سے ملاقات ہو جائے گی۔“ جی نے اس کی تائید کی

”ویسے یہ بدذوقی نہیں کہ انسان Bat Galim پر کسی پارنٹر کے بغیر اکیلا ہی گھومتا پھرے۔“ شہریار نے اسے مزید کریداً جس پر وہ زور سے ہنسا پھر بولا۔

”اب ہر کوئی آپ جیسا خوش قسمت تو نہیں ہو سکتا کہ قدم قدم پر اپنی خوبصورت پارنٹر کا ساتھ مہر ہو۔“ اس کی تعریف پر ماہ بانو ذرا سا جھینپ گئی۔ شہریار کے ساتھ رہ کر بہت کچھ سیکھنے لپنے کے باوجود وہ اس ماحول کی عادی نہیں تھی جہاں کوئی غیر مردشوہر کی موجودگی میں بر ملا بیوی کے حسن کی تعریف کر سکے۔

”ویسے میں یہاں اکیلا نہیں آیا تھا۔ میری گرل فرینڈ بھی میرے ساتھ تھی لیکن پھر ہمارا کسی بات پر جھگڑا ہو گیا اور وہ مجھ سے ناراض ہو کر واپس چلی گئی۔“ اب جی ڈاکر اپنی وہاں تنہا موجودگی کا جواز پیش کر رہا تھا۔

”اسی لیے میں بیوی کو ایک اچھی چوائس سمجھتا ہوں۔ چاہے جتنا بھی لڑے جھگڑے، رہتی ساتھ ہی ہے۔“ شہریار نے ہنس کر تہمرہ کیا۔

”میری اپنی بیوی سے علیحدگی ہو چکی ہے۔ شادی میرے لیے ایک مصیبت تھی اس لیے میں کوئی دوسرا تجربہ کرنے کے بجائے یونہی آوارہ گردی کرتا پھرتا ہوں۔ بغیر ڈسے داری اٹھائے خوشگوار ساتھ میرا آجائے تو اسے انجوائے کرتا ہوں۔ کوئی میٹرمی چیز ٹکرا جائے تو اسے آرام سے گڈ بایے کہہ کر اکیلا ہی اپنا ٹائم سپینڈ کر لیتا ہوں۔ سچ کج زندگی۔“ جی فری ہو گئی ہے۔ وہ والتی متکبرانہ نظر آتا تھا۔

”یہ فیئشن فری لائف پس اس وقت تک ہے جب تک آپ کی جوانی اور جیب میں رقم موجود ہے۔ بڑھاپے میں جب انسان کمزور اور محتاج ہو جاتا ہے تو صرف بیوی ہی تنہائی کی ساتھی اور ٹھکانہ ہوتی ہے۔“ ماہ بانو بے ساختہ اسے ٹوک بیٹھی۔

”بڑھاپے کے مسائل کے ڈر سے میں اپنی جوانی کیوں برباد کروں؟ بڑھاپا جانے آئے بھی یا نہ آئے۔ بالفرض آگیا تو کسی رفاہی ادارے میں بھی گزر ہی جائے گا۔“ اس کی سوچ کا زاویہ بالکل مختلف تھا جس پر ماہ بانو نے مزید تہمرہ نہیں کیا اور ابھی ابھی سرو کی جانے والی کافی کا کپ اٹھا کر لیوں سے لگا لیا۔

میں کٹوتی کر لیتے ہیں جیسا کہ آج ہم نے یہاں آنے کے لیے ٹیکسی کے سہائے بس کا انتخاب کیا۔ اپنی رہائش گاہ سے واک کرتے ہوئے بس اسٹیشن گئے، وہاں سے بس نمبر ۱۰۰ پر پکڑ کر آدمی گھنٹے میں Bat Galim beach کے اسٹاپ پر اترے اور پھر وہاں سے واک کر کے سیدھے بیچ میرا مانتا ہے کہ ایک اچھے سیاح کے پاس مضبوط جوتوں کی جوڑی اور اس سے مضبوط ٹانگوں کی موجودگی بہت ضروری ہوتی ہے۔“

”غالبا آپ لوگ جرمن کالونی میں رہائش پذیر ہیں۔“ جی نے اندازہ لگایا۔

”جی ہاں۔ جرمن کالونی، حدید گیٹ ہاؤس میں۔ وہاں سے بہائی گارڈن کا بہت خوبصورت منظر دیکھنے کو ملتا ہے۔“

”بڑا انتخاب نہیں۔ میں سرکاری خرچے پر ہوں تو دی کالونی ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں۔“

”ہم سیاح ایسے لکھنوی ہوٹل کہاں انورڈ کر سکتے ہیں۔“ شہر یار نے حسرت ظاہر کی۔

”میں بھی اپنی جیب سے نہیں کر سکتا۔ یہ تو بس سرکار کی فراہم کردہ سہولیات ہیں۔“ اس نے کندھے اچکاتے ہوئے جواب دیا پھر بولا۔

”اگر آپ لوگ چاہیں تو میں واپسی پر آپ کو آپ کے ہوٹل ڈراپ کر سکتا ہوں۔“

”کیوں نہیں لیکن اگر آپ ابھی روانہ ہو رہے ہیں تو ہم ہوٹل کے بجائے سٹی میوزیم پر اترنا پسند کریں گے۔ اس طرح ہمارا آج کا دن زیادہ کارآمد ہو جائے گا۔“ شہر یار نے اس کی پیشکش قبول کرنے میں دیر نہیں کی۔ ماہ بانو نے البتہ خاموشی اختیار کیے رکھی۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ شہر یار اب خود اس شخص سے جس پر انہیں جاسوس ہونے کا شک تھا، قریب ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔

”سٹی میوزیم.....!“ جی سوچ میں پڑ گیا۔

”وہاں جانا تو اس وقت تقریباً یکا رہی ہوگا۔ میوزیم

چار بجے بند ہو جاتا ہے۔ ہم جب تک یہاں سے وہاں پہنچیں گے، چار بجتے میں کچھ ہی وقت رہ جائے گا۔“

”اوہ، پھر تو ہمیں کچھ اور پلان کرنا پڑے گا۔“ شہر یار نے افسوس زدہ لہجے میں کہا۔

”اگر میوزک میں انٹرسٹ ہو تو میں ایک آفر کر سکتا

ہوں۔ آج رات یہاں سٹی وہی کا ایک شو ہے۔ شاید تم نے

اسے سنا ہو۔ جن دنوں تم یروشلم میں تھے، وہ بھی وہیں تھی

اور وہاں اس نے شو کیے تھے۔“ جی کی یہ پیشکش اور اس کا

”شاید“ خامسا معنی خیز تھا۔ یقیناً اسے علم تھا کہ وہ لوگ یروشلم میں سٹی کے شو میں شریک ہوئے تھے اور اس سے ملاقات بھی کی تھی۔

”یہ تو بہت ہی اچھی آفر ہے۔ ہم نے اسے یروشلم میں نہ صرف سنا تھا بلکہ اپنے میزبان کے بیٹی اور داماد کی وساطت سے اس سے ملاقات کرنے کا موقع بھی ملا تھا۔ اچھی شخصیت ہے۔“ اس نے خود ہی سٹی سے ملاقات کا ذکر کر دیا۔

”عرب اسے پسند کرتے ہیں مگر حکومتی حلقوں میں وہ

ایک متنازع اور مشکوک شخصیت سمجھی جاتی ہے۔ اس کے

بارے میں شبہ ہے کہ وہ عرب دہشت گردوں کو نڈتہ کرتی

ہے لیکن ایک تو کبھی کوئی ثبوت نہیں ملا۔ دوسرے وہ بین

الائوامی شہرت رکھنے والی گلوکارہ ہے اس لیے اس کی یہاں

آمد پر کبھی پابندی نہیں لگائی جاسکتی۔“ جی کے اس بیان میں

عربوں سے مطلب یقیناً فلسطینی ہی تھے لیکن ہر قبضہ کار

یہودی کی طرح وہ شعوری طور پر فلسطین اور فلسطینیوں کے

وجود سے انکاری تھا۔

”ہمارے لیے وہ صرف ایک فنکارہ کی حیثیت سے

پسندیدہ ہے۔ باقی وہ اپنی ذاتی زندگی میں کیا کرتی ہے اور کیا

نہیں، ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں۔ ہم سیاح ہیں، کسی بھی

جگہ کے مناظر، آرٹ اور فوڈ کو اپیلور کر کے خود کو خوش کرنے

سے زیادہ ہمیں کسی چیز میں دلچسپی نہیں۔ میرا مانتا ہے کہ یہ

زندگی ہمیں مختصر مدت کے لیے ملی ہے۔ اس مدت کو تازعات

میں ضائع کرنے کے بجائے فیس بھل کر گزارنا چاہیے۔“

”بہت اچھی سوچ ہے۔ کاش یہاں سب اسی انداز

میں سوچیں تو سارا فساد ہی ختم ہو جائے۔“ جی نے اس کے

خیالات کو سراہا۔

”کسی کے وطن پر قبضہ کر کے اسے فساد سے دور رہنے

کا مشورہ صرف ایک یہودی عیادے سکتا ہے۔“ ماہ بانو تپ

کر زیر لب بڑبڑائی۔

”آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟“ جی نے الجھ کر پوچھا۔

”میں کہہ رہی تھی کہ یہاں بیٹھ کر باتیں کرنے سے

بہتر ہے کہ ہم واپسی کے لیے روانہ ہو جائیں تاکہ شام کے شو

کے لیے فریش ہو سکیں۔“ اس نے جلدی سے بات بتائی۔

”بات تو بالکل ٹھیک ہے۔ میرے خیال میں ہمیں

اب نکلنا چاہیے۔“ جی نے اس کی تائید کی اور مل کی رلم کے

ساتھ ٹپ کے بیس شیکل (shekel) بھی میز پر رکھ

دیے۔ انہوں نے کل ملا کر اٹھارہ شیکل فی کپ کے حساب

سے صرف چوں شیکل (54 shekels) کی کافی پی

افرنری پھیلی ہوئی تھی اور اسٹیج پر سیکورٹی اہلکار ایک طرف عوام کو اوپر آنے سے روکنے کے لیے حفاظتی حصار بنا رہے تھے تو دوسری طرف چوڑے چکے جسم والے اس شخص کو جس کا سفید لباس اپنے ہی خون میں تر ہوتا تھا، اسٹریچر پر منتقل کیا جا رہا تھا۔ اس منظر کو پچھلی نظروں سے دیکھتے ہوئے اس نے ایک شخص کو ترنگے کے رنگوں پر مشتمل منظر کو اٹھا کر اس خون میں نہائے ہوئے شخص کے سینے پر ڈالتے ہوئے دیکھا۔ منظر کے رنگوں میں سرخ رنگ کے علاوہ ہر رنگ خون کے ساتھ مل کر اپنا اصل کھو چکا تھا۔

”بھارتی وزیر دفاع مسٹر رام لعل سینہ پر گولیاں لگنے سے قاتلانہ حملے میں ہلاک۔ ماہرین کے اندازے کے مطابق گولیاں کسی اسٹاپر رائل سے چلائی گئی تھیں جن کے سیدھے دل میں بیوست ہونے کی وجہ سے مسٹر رام لعل کو اسپتال لے جا کر ٹریسٹ دینے جتنی مہلت بھی نہ مل سکی۔“ نیوز ایگرواحات کی ممکنہ تفصیل بیان کر رہی تھی۔ ساتھ ہی اسکرین پر چلتا منظر بھی بدل چکا تھا۔ اب یہ ایک اسپتال کے باہر کا منظر تھا جہاں لوگوں کا جم غفیر لگا ہوا تھا۔ لوگ نعرے بازی کر رہے تھے اور ان کے انداز میں اشتعال تھا۔

”تو وہ اسٹاپر تھا اور تم نے اسے اس قتل کا موقع فراہم کرنے کے لیے مجھے کسی حقیر چوہے کی طرح یہاں قید کر رکھا تھا۔“ وجے نے غصے کی شدت سے اپنی مٹھیاں پیچ لیں اور سرخ آنکھوں سے ان لوگوں کی طرف دیکھ کر چیخا۔ اس وقت تینوں کے تینوں ہی جاگ رہے تھے اور کھانے کے بعد فراہم کیے جانے والے قبوے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

”ہم کچھ نہیں جانتے۔ ہماری ڈیوٹی یہاں لگی ہوئی ہے اور ہم صرف اپنی ڈیوٹی پوری کر رہے ہیں۔“ ان میں سے ایک نے سنجیدگی سے اس کے الزام کا جواب دیا۔ ”یاد رکھنا، یہ خون تمہیں بہت مہنگا پڑے گا۔“ وجے نے انگلی اٹھا کر انہیں دھمکا دیا۔

”ہمیں یہ مہنگی قیمتیں ادا کرتے سات عشروں سے زائد وقت ہو چکا ہے۔ یہ تم لوگ ہو جو ذرا سی چوٹ لگنے پر ادارہ کتوں کی طرح نیاؤں نیاؤں کرنے لگتے ہو۔“ وجے کے جارحانہ لہجے نے دوسرے فریق کو بھی زبان کھولنے پر مجبور کیا۔

”بھگتا پڑے گا۔ تم لوگوں کو اس کا انجام بھگتا پڑے گا۔“ وہ فی الحال ان کا کچھ بگاڑ تو نہیں سکتا تھا اس لیے دھمکیاں دیتے ہوئے دوبارہ فی وی اسکرین کی طرف متوجہ

تھی۔ اس اعتبار سے یہ ایک اچھی ٹپ تھی اور کوئی ایسا ہی شخص دے سکتا تھا جو خود خوشحال ہو یا پھر اس کے بل کہیں اور سے ادا کیے جا رہے ہوں۔

☆☆☆

وجے کے ڈرائنگ روم میں دو مزید افراد کا اضافہ ہو چکا تھا۔ اسی طرح رجنی کی خواب گاہ میں بھی اس کے ساتھ پہلے والی لڑکی کے علاوہ ایک اور لڑکی موجود تھی۔ ان لوگوں کی یہاں موجودگی کو کم و بیش چوبیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ ان چوبیس گھنٹوں میں انہوں نے وجے اور اس کی بیوی رجنی کو مستقل اپنی نگرانی میں رکھا ہوا تھا۔ وہ سو بھی باری باری رہے تھے۔ ایک سوتا تھا تو باقی پہرے کے لیے جاگتے رہتے تھے۔ ایسے میں وجے یا رجنی کو کچھ بھی کرنے کا موقع نہیں مل پاتا تھا۔ گھر کے مین گیٹ پر لگا تالا، بند ہو بائل فونز، دفتر اور اعزہ کو اپنی غیر حاضری سے متعلق بھیجے گئے پیغامات..... ان سب نے مل کر انہیں گھر اور شہر میں موجود ہوتے ہوئے بھی سب کے لیے غیر حاضر کر دیا تھا اور یہ امید نہیں کی جاسکتی تھی کہ کوئی ان کے لیے متفکر ہو کر ان کی خیریت معلوم کرنے کی کوشش کرے گا۔

وجے کو اس بات کا اعتراف تھا کہ سخت نگرانی کے علاوہ ان لوگوں کا رویہ اس کے اور اس کی بیوی بچے کے ساتھ مہذب تھا۔ رجنی کو نہ تو کوئی غلط نظروں سے دیکھا تھا نہ کسی قسم کی خش کوئی کرتا تھا۔ بچے کے ساتھ ان کا رویہ مشفقانہ تھا اور ان چوبیس گھنٹوں میں وہ ان کے ساتھ مانوس ہو گیا تھا بلکہ خواتین کے ساتھ تو اس نے دوستی ہی کا ٹھہ لی تھی۔ کبھی ایک کے ہاتھ سے کچھ کھا رہا ہوتا تو کبھی دوسری کی گود میں سو رہا ہوتا۔ کھانا پکانے اور دیگر امور میں بھی انہوں نے سارا بوجھ رجنی پر نہیں ڈال رکھا تھا اور اس کے ساتھ اچھی خاصی معاونت کرتی تھیں لیکن اس سب کے باوجود وجے انہیں اپنا دوست یا خیر خواہ تصور نہیں کر سکتا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ ان لوگوں کے اسے اس طرح یہاں گھیر کر بیٹھنے کا مطلب تھا کہ کہیں کچھ بہت غلط ہو رہا ہے یا ہونے جا رہا ہے۔ اس غلط سے باخبر رہنے کے لیے وہ ان لوگوں کی اجازت سے فی وی پر ہلکی آواز میں وقفے وقفے سے خبر نامہ دیکھ رہا تھا۔ ابھی تک سب ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا لیکن وہ قطعی مطمئن نہیں تھا۔ رات کے کھانے کے بعد اس نے ایک بار پھر خبر نامہ لگا یا تو اس کے بدترین خدشات کی تصدیق ہو گئی۔

اسکرین پر ایک جلسہ گاہ کا منظر تھا جہاں ہر طرف

ہو گیا تھا۔ وہاں بریکنگ میوز کے طور پر چلنے والی اس خبر کی تفصیلات کو بار بار جزییات کے ساتھ دہرایا جا رہا تھا۔ رام لعل کے جلسہ گاہ میں داخل ہونے، عوام کا جو شیلے لہروں سے اس کا سواگت، اس کی طرف سے جوانی کرٹوشی کا اظہار اور گولی کھا کر گرنے کے مناظر..... سب کچھ کیمرے کی آنکھ نے قید کر لیا تھا۔ ساتھ ساتھ سیکورٹی کے انتظامات کے متعلق بھی تفصیل بتائی جا رہی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ رام لعل کے گرد بہت زبردست حفاظتی حصار قائم کیا گیا تھا لیکن کسی کا کمال تھا کہ دو گولیاں اس حفاظتی حصار کو توڑ کر بھی رام لعل تک موت کا پیام لے کر آئی تھیں۔

یہ کیسے کیا گیا تھا، یہ بھی اگلے ایک آدھ گھنٹے میں واضح ہو گیا۔ تلاش کا دائرہ وسیع کرنے پر قانون نافذ کرنے والے ادارے اس زیر تعمیر کثیر الطور شاہک مالی کی عمارت تک پہنچ گئے تھے جس کی سب سے بالائی منزل کی ایک کھڑکی سے رام لعل کا نشانہ لیا گیا تھا۔ لگ بھگ سترہ سو میٹر کے فاصلے سے لگائے گئے نشانے کی درستگی نے سب کو انگلیاں منہ میں داب لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ ایک نہیں، دو گولیاں رام لعل کے سینے میں اتاری گئی تھیں اس لیے نشانے باز کی کامیابی کو محض اتفاق قرار نہیں دیا جاسکتا تھا۔ مذمتی بیانات میں بھی کہیں نہ کہیں نشانے باز کے لیے ستائش جھلک رہی تھی جسے سن سن کر وہ بچے کا خون کھول رہا تھا۔ اسے رہ رہ کر افسوس ہو رہا تھا کہ عمار کو مشکوک محسوس کرنے کے باوجود اس نے اس کے ساتھ سختی کیوں نہیں برتی تھی اور یہ جاننے کے باوجود کہ اکل جیٹس ایک نرم اور سادہ طبیعت آدمی ہیں، ان کی ضمانت پر کیوں اسے رہا کر دیا تھا۔

اس رات وہ سونے کے لیے لیٹا تو اس سے سویا نہیں گیا۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ اپنے سر پر مسلط ان پہریداروں کو گولی مار کر وہاں سے بھاگ نکلے اور اپنے افسران کو بتائے کہ رام لعل کی ہلاکت میں کس شخص کا ہاتھ ہے۔ اسے یقین تھا کہ اگر عمار سری نگر سے بھاگ نکلے میں کامیاب بھی ہو چکا ہے تو اس کی نشاندہی کے بعد قانون نافذ کرنے والے ادارے اسے تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ وہ لوگ بھی یقیناً یہ سب باتیں اور اس کے جذبات اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ جب ہی بستر پر کروٹیں بدلتا وہ جب بھی آنکھیں کھول کر دیکھتا ان میں سے دو لازماً منکر نکیر کی طرح اپنے سر پر مسلط دکھائی دیتے۔ وہ اتنے چوکنا تھے کہ اسے شبہ تھا کہ وہ بالکیں بھی جھپکتے ہیں یا نہیں۔ اس رات کی صبح بہت مشکل سے ہوئی۔ صبح وہ ان

لوگوں کی زیر نگرانی حوائج سے فارغ ہو کر ناشتے کے لیے بیٹھا تو اچھی طرح منہ ہاتھ دھوئے اور سر پر پانی ڈال لینے کے باوجود خود کو تازہ دم محسوس نہیں کر رہا تھا۔ رجنی ان کی سادھی عورت کے ساتھ ناشتے کر آئی تو بھی اس نے سر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ رجنی اس کے آگے ناشتے کے برتن رکھ کر پلٹنے لگی تو ذرا سا لاکھڑا گئی۔ اگر وہ اسے سنبھال نہ لیتا تو شاید وہ اس پر گر ہی پڑتی۔

”کیا بات ہے رجنی! طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری؟“ اس نے فکر مند ہی سے اس سے سوال کیا۔

”میں ٹھیک ہوں۔ آپ بھون کر رہیں۔“ رجنی نے نقاہت زدہ آواز میں اسے جواب دیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک اشارہ سا تھا جسے وہ فوری طور پر سمجھ نہیں سکا لیکن اتنا اسے اندازہ ہو گیا کہ جیسے وہ ہر بار رجنی سے سامنا ہونے پر آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے کسی طرح اپنی مدد کرنے پر اکساتا ہے، ویسے ہی رجنی اسے کوئی پیغام دینے کی کوشش کر رہی تھی۔

”شریستی جی کو لے جاؤ، بہن اور انہیں آرام کرواؤ۔ اب ان سے کوئی کام نہ لیتا۔“ سب سے پہلے اپنی سادھی لڑکی کے ساتھ عورت کے روپ میں وہ بچے کے کمر میں وارد ہونے والے شخص نے اپنی سادھی سے کہا تو وہ رجنی کا ہاتھ تھام کر اسے سہارا دیتی ہوئی ڈرائنگ روم سے باہر لے گئی۔ دونوں خواتین کے باہر جانے کے بعد ناشتے کا سلسلہ شروع ہوا۔ رجنی کی آنکھوں کی تحریر کو دل ہی دل میں ڈی کوڈ کرنے کی کوشش کرتے وہ بچے نے بھی ست روی سے ناشتے کی تھالی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ تھالی میں پوریاں، آلو کی ترکاری اور سوہی کا حلوا سلیتے سے پروسا گیا تھا اور بہت اشتہا انگیز خوشبو اٹھ رہی تھی لیکن اس کی بھوک مر چکی تھی۔ ایک فوجی کی حیثیت سے اس سے برداشت نہیں ہو رہا تھا کہ وہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں غفلت کا مرتکب ہوا ہے۔

”کھالو مہاشے! تمہارے سوگ میں بھوکے رہنے سے رام لعل واپس نہیں آجائے گا۔“ ان میں سے ایک نے چپکٹی آواز میں اسے چھیڑا۔ وہ لوگ جتنی طور پر خوش تھے اور خود کو انجان ظاہر کرنے کے باوجود اس خوشی کو چھپانے میں ناکام تھے۔

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نو جوان
کسی داستان جو غلط کاروں کے لیے غضب
ناک تھا باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیے



اساتاری

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تندوتیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابل شکست بنایا تو... سری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پر عزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جارہے تھے... اس کی زندگی جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قراریوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تاریک عبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ واردات قلب بھی اس کے فروغ کی راہ میں حائل نہ ہو سکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تحریک انگیز داستان

ملا۔ انہوں نے کہا کہ یہ بڑا بڑا کام ہے۔
وہ دیکھ کر غصہ ہوا۔ یہ تو مال بٹا رہا تھا۔
"ہم نے یہاں ہاٹ میں ان سے وال کیا۔ تمہارا
کام ہو گیا پھر میں تم لوگ اہی میں نہ سے کہہ چکا۔
کر کے ایسے ہوا کہ کچھ ہوتا ہے۔ وہم آئیں کہ لائیں۔ وہ اور
میری بی بی کا کہیں بڑا۔ اذان ہو جائے۔ تم میں اور اہی
الساہت ہوئی تو تم ازم ایک موصف اور سنہ کو آہستہ خبر کا
لٹاؤ نہیں بناتے۔" وہ تو پہلے ہی ہیرا بیٹھا تھا۔ اس شخص نے
دراستہ پھیلنے پر ہنست پڑا۔

"انہی ہانپیں کرتے ہوئے تمہیں اس سلوک کو یاد
رکھنا چاہیے جو تم ہماری عورتوں اور معصوم بچوں کے ساتھ روا
رکھتے ہو۔ ہم نے تو تم لوگوں کے ساتھ ہر ممکن نرمی برتی
ہے۔ رہی ہمارے یہاں سے جانے کی بات تو وہ ہم یہاں
اپنی مرضی سے آئے ہیں اور نہ ہی مرضی سے واپس جانے کا
اختیار رکھتے ہیں۔ ہمیں جیسے ہی اوپر سے حکم ملے گا، ایک
لمحے کی بھی تاخیر کیے بغیر یہاں سے چلے جائیں گے۔" وہ
فحش جو بھی جواب دے رہا تھا، وہ ہے کی تو جہاں اس کی طرف
مہذول نہیں تھی۔ وہ اپنی تھالی کے نیچے سے ہماگٹی اس تھولی
سی لوک کو دیکھ رہا تھا جو یقیناً اس تھولی سی تیز دھار والی
چھری کی تھی جس کا دستہ عرصہ ہوا ٹوٹ کر الگ ہو چکا تھا۔
رجنی اس چھری کی عمدہ کارکردگی کا ذکر کرتے ہوئے کئی بار
دوسرا دستہ لگوانے کا مطالبہ کر چکی تھی لیکن وہ اپنی مصروفیات
میں اس کا یہ چھوٹا سا کام انجام دے ہی نہیں سکا تھا۔ رجنی پتا
نہیں کتنے جتن سے بغیر دستے کی وہ چھری اس کی تھالی کے
نیچے چپکا کر لانے میں کامیاب ہو سکی تھی اور اب اسے اس
چھری کو اپنے قبضے میں لینا تھا۔

دل پر جبر کرتے ہوئے اس نے تھالی کی طرف ہاتھ
بڑھائے اور پوری کا ایک ٹوالہ توڑا۔ ٹوالے کو آلو کی ترکاری
میں ڈبوئے ہوئے اس کا ذہن چھری کو اپنے قبضے میں لینے کی
تدبیر سوچ رہا تھا۔

"ناشہ بہت عمدہ تیار کیا ہے شریستی جی نے۔" وہ
تینوں بھی اس کے ساتھ ہی ناشہ شروع کر چکے تھے اور ان
میں سے ایک نے بڑا سالقمہ لگتے ہوئے یہ تبصرہ کیا تھا۔
"لے تو پھر تو ہی کھالے سارا۔" وجے نے یکدم ہی
اپنی تھالی اٹھائی اور نہایت پھرتی سے آٹے کے چھوٹے سے
بیڑے کی مدد سے تھالی کے پیچھے چپکائی گئی چھری کھینچ کر
اپنے قبضے میں لیتے ہوئے تھالی اس کے منہ پر دے ماری۔
اس کے اب تک متعاون روپے کے بعد یہ رد عمل بالکل

لگاؤ تھا۔

ان سے پہلے والی ایسی تھی کہ وہ اپنے
دستے کی تھالی کو دھو بیٹی۔ اپنی کڑکٹ میں لیے اور
وہ تھالی اپنی کھانسی سے تھالی کی چٹا تھا جس سے وہ
تھالی ماری گئی تھی۔ یہاں والی والی تھالی ماری گئی تھی اس کی
آٹھواں میں گئی تھی اس لیے وہ وہاں اپنے ہاتھ لگا تھا۔
اور والی والی نہ دسنے کی تھکنیں ایک ساتھ ہی اس نے ڈال
ہو گئی تھیں۔ ایسے میں وہ ہے بس نہ ہوتا تو کیا ہوتا لیکن اس
کے سامنے بھی تیز دھار والی نہیں دے سکے تھے۔ ہاتھ میں
پکڑنے لگا۔ لہذا یہ ایک کر تھمارا تھا جسے تک دے ہے ہے بس
ہو جانے والے ساتھی کے متنب میں غلطی کر اس کی شدت کے
چھری کی دھار رکھ چکا تھا۔ بغیر دستے کی پتلے سے پھل والی
چھری پر اس کی حرکت اتنی سخت تھی کہ خود اس کی بندھلی سے
بھی خون رسنے لگا تھا۔

"اپنے ہتھیار پھینک دو ورنہ میں اس کی شدت کاٹ
دوں گا۔" اس کا دھمکی زدہ لہجہ کسی درندے کی خراہٹ سے
مشابہ تھا۔

"اس صورت میں بھی تم بچی نہیں پاؤ گے۔ یہ مرے گا
تو ساتھ تمہاری موت کے پر دانے پر بھی دھچکا ہوں گے۔"
ان دونوں نے اس کی دھمکی کے باوجود فوری طور پر ہتھیار
نہیں پھینکے تھے اور ایک نے اپنے ہتھیار کو مزید نمایاں
کرتے ہوئے اسے بتایا تھا۔

"آئی ڈیم کیڑا میں مروں گا تو اپنے من میں یہ غر
لے کر تو مروں گا کہ سنسار سے جاتے جاتے اپنے دیش کے
ایک دشمن کو نرک پہنچا کر گیا ہوں۔" وہ سمجھنے سمجھانے کی حدود
سے باہر نکل چکا تھا۔ ان دونوں نے مشورہ کرنے والے
انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ وہ ویسے بھی خون
خرا بے سے بچنے کے احکامات ساتھ لے کر آئے تھے اور
یہاں تو ان کے اپنے ساتھی کی جان داؤ پر لگی ہوئی تھی۔

"ٹھیک ہے، ہم ہتھیار پھینک رہے ہیں لیکن تم
ہمارے ساتھی کو چھوڑ دو۔" ان دونوں نے اپنے ہتھیار خود
سے تھوڑے فاصلے پر پھینک دیے لیکن دھیان رکھا کہ وہ
وجے کی پہنچ سے دور رہیں۔

"میری بھتی اور بچے کو یہاں بلواؤ۔" پہلا مطالبہ پورا
ہونے پر وجے کے تناؤ میں کچھ کمی واقع ہوئی تھی اور دوسرا
مطالبہ کرتے ہوئے اس نے غیر ارادی طور پر اپنے شکار کی
گردن پر چھری کا دباؤ کافی کم کر دیا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ میں اپنی ساتھی کو آواز دیتا ہوں۔"

ان میں سے ایک نے ڈرائنگ روم کو ہاتی گھر سے جوڑنے والے دروازے کی طرف اپنا رخ موڑ کر منہ کھولا لیکن اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ کوئی برق کوندی تھی یا شرارہ لپکا تھا، کچھ سمجھ نہیں آیا۔ اس نے دیکھا تو بس نیچے دیکھا کہ وجے کی پیشانی پر ایک سوراخ نمودار ہوا اور وہ آنکھوں میں دنیا جہاں کی حیرت اور بے یقینی لیے الٹ کر پیچھے جاگرا۔ اس کے ہاتھ میں دبی بغیر دستے کی چھری بھی چھوٹ کر تھوڑے فاصلے پر جاگری۔

”سوری! مجبوری تھی۔“ دروازے میں اپنا ساٹلسر چڑھا پٹل لیے کھڑی ان کی ساتھی نے یوں معذرت کی جیسے محض فارمیٹی پوری کر رہی ہو۔

”دروازہ بند کر کے واپس چلی جاؤ لیکن فی الحال اس کی بیوی کو کچھ معلوم نہ ہونے دینا۔“ ٹیم لیڈر نے اسے ہدایت دی اور دروازہ بند ہونے کے بعد کمرے پر ایک نگاہ ڈالی۔ وجے کے حملے کا نشانہ بننے والا ساتھی خود کو مصیبت سے نکالنے کے لیے ملحقہ غسل خانے کی طرف دوڑ لگا چکا تھا جبکہ دوسرا وجے کی لاش کے قریب کھڑا بغیر اسے ہاتھ لگائے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ یقینی طور پر زندگی کی بازی ہار چکا تھا اس لیے تصدیق کی تو کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔

”ہم اس کو مارنے کے حق میں نہیں تھے لیکن درحقیقت اس کا مرنا ہمارے حق میں تھا۔ اس کی بیوی کچھ نہیں جانتی کہ ہم یہاں کیوں اور کس مقصد سے آئے تھے اس لیے راز، راز ہی رہنے کی امید رکھی جاسکتی ہے۔ ہمیں مزید یہاں رکنے کی ضرورت نہیں ہے۔ چند گھنٹوں میں ہم یہ جگہ چھوڑ دیں گے۔ امید ہے اس وقت تک ہمارا دوست بھی محفوظ مقام پر پہنچ چکا ہوگا۔“ قدرے توقف سے ٹیم لیڈر نے فیصلہ سنا دیا۔ یہ فیصلہ غسل خانے سے نکلتے ان کے تیسرے ساتھی نے بھی سنا۔ اس کے بعد وہ تینوں وہاں کی صفائی میں مصروف ہو گئے۔ انہوں نے ممکنہ احتیاط کی تھی پھر بھی جانے سے پہلے اس بات کو یقینی بنانا چاہتے تھے کہ ان کے فنکر پرنٹس یا کوئی دوسرا ایسا کلیو وہاں نہ رہ جائے جسے پکڑ کر ان تک رسائی حاصل کی جاسکے۔ وہ جانتا تھا کہ بغیر ہدایت ملے اس کی ساتھی خواتین بھی یہ کام شروع کر چکی ہوں گی۔

☆☆☆

”یہ.....“ طویل قد، بھاری بھر کم وجود، جسم پر لمبے بال، انسان سے مشابہ لیکن بہت بھاری اور مضبوط ہاتھ پاؤں..... اس کے سامنے برف کے فرش پر جو مخلوق گہرے سانس لیتے ہوئے ہاتھ پاؤں پھیلا کر سو رہی تھی، اسے دیکھ کر اس کے منہ سے حیرت کے مارے بس بھی ایک لفظ نکل سکا تھا۔

”مادہ ہیں۔ کافی کم عمر تھیں جب میرے ہاتھ لگی تھیں۔ اب بالغ ہو چکی ہیں۔“ پروفیسران کی طرف یوں محبت سے دیکھ کر مسکرا رہا تھا جیسے وہ اس کی اولاد ہو۔

”یہ جتنی ہیں نا؟“ سونیا نے تصدیق چاہی۔

”سو فیصد۔“ وہ ایک بار پھر مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ میں فخر سا تھا۔

”ان بلیو-ہیل..... مجھے تو حقیقت میں ان کے وجود کا یقین ہی نہیں تھا۔ ان کے ذکر کو ہمیشہ کوئی قصہ کہانی یا لوگوں کی بڑی ہی سمجھا۔“ وہ بہت غور سے پہلو پہ پہلو سونے ان پرانی انسانوں کو جو بقول اینڈریو کے مادہ تھیں، دیکھے جا رہی تھی۔ اپنے کانوں میں ان کی سانسوں کی تیز آوازیں سننے کے ساتھ ساتھ وہ سلاخوں کے اس طرف ہونے کے باوجود شخص کے دوران خارج ہونے والی حرارت کو بھی محسوس کر رہی تھی۔ تیز حیوانی بو کا تو کوئی حساب ہی نہیں تھا۔ اس جگہ اس کے جیسے مضبوط اعصاب کی عورت کے بجائے کوئی عام سی لڑکی کھڑی ہوتی تو اس بدبو کی وجہ سے ہی چکر کھا کر گر جاتی یا ابکاٹیاں لے رہی ہوتی۔

”ہمالیہ کے برف زاروں میں بہت سے راز پوشیدہ ہیں۔ ان میں سے ایک راز یہ بھی ہے۔ ایک ایسا کردار جو حقیقی سے زیادہ افسانوی نظر آتا ہے اور بس چند خوش قسمت ہی جانتے ہیں کہ یہ سچ سچ ایک حقیقت ہے۔“ وہ سوئی ہوئی برفانی انسان کی ماداؤں کو بہت پیار سے دیکھتا ہوا اسے بتا رہا تھا۔

”کیا آپ اتنے برسوں سے ان کی خاطر اس برف زار میں رہ رہے تھے؟“

”میری بنیادی ریسرچ تو کچھ اور تھی اور میں نے وہاں قیام اس لیے کیا تھا کہ ایک تو مجھے دنیا سے دور رہ کر نیکوئی سے کام کرنے کے لیے ایک محفوظ ٹھکانا مل گیا تھا۔ دوسرے اپنے تجربات کے لیے خام مال کی دستیابی بھی عمدہ تھی۔ خام مال سے میری کیا مراد ہے، تم سمجھ رہی ہو نا؟“

بتاتے بتاتے اس نے سونیا سے استفسار کیا۔

”زعمہ انسان.....!“ سونیا کو اپنی سرسراتی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ اینڈریو کے ٹھکانے پر معاذ اور دیگر لوگوں کے ساتھ نہیں گئی تھی لیکن اس بات کا اسے علم تھا کہ وہاں کیا پیش آیا تھا۔

”ہاں، اتنی بڑی آبادی والے ہندوستان میں جہاں

بے شمار لوگ غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزار رہے ہوں اور حصولِ رزق کے لیے آئے دن اپنی جان کو خطرے میں ڈالتے رہتے ہوں، وہاں چند لوگوں کا خفیہ طور پر غائب ہو جانا کسی کے لیے معنی نہیں رکھتا۔ غائب ہونے والے کے لواحقین کے پاس عقل ہوتی ہے نہ اتنے وسائل کہ اپنے گمشدہ بندے کی بازیابی کے لیے مؤثر قدم اٹھا سکیں۔ وہ چند دن کی ناکام کوششوں کے بعد ایک بار پھر زندہ رہنے کی جنگ میں شامل ہو جاتے ہیں اور ہم جیسوں کا کام چلتا رہتا ہے۔“

”آپ کی ریسرچ میں یہ کب اور کیسے شامل ہوئے؟“ سونیا کے پاس اخلاقیات اور انسانی حقوق پر پچھر دہائی کی کوئی گنجائش نہیں تھی اس لیے اگلا سوال کیا۔

”چند برس پہلے یہ اتفاقی ہمارے ہاتھ آگئی تھیں۔ پہلے میرا دل چاہا کہ انہیں دنیا کے سامنے لے آؤں پھر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا اور انہیں بھی اپنی ریسرچ کا حصہ بنالیا۔ ان کے مشاہدے سے مجھے یہ بات سمجھ آگئی تھی کہ بے شک ان میں بولنے کی صلاحیت نہیں لیکن یہ اچھی خاصی ذہین مخلوق ہے اور باتوں اور ہدایات کو سمجھ سکتی ہے۔ میں نے ان کے دماغ کے چند نازک آپریشن کر کے ان کی صلاحیت میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تربیت کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ اب یہ اس لائق ہیں کہ صرف بولنے سے ہی میری ہدایات کو اچھی طرح سمجھ لیتی ہیں اور اپنی بے تحاشا طاقت کے باعث ایک وقت میں کئی انسانوں کے برابر کام انجام دے سکتی ہیں۔“ اینڈریو نے اس کے سوال کا تفصیلی جواب دیا۔ اصل میں اس کی حالت اس شخص جیسی تھی جو اپنے شاہکار کے سامنے کھڑا ہوا وہ اسے اس شاہکار کو کسی کے سامنے پیش کرنے کا موقع مل گیا ہو۔

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہمارے پاس ایسی بے شمار مشینیں ہیں جو آل ریڈی ایک وقت میں کئی انسانوں کے برابر کام کر سکتی ہیں اور پھر یہ ہیں بھی صرف دو جو لازمی بات ہے اپنی طبی عمر تک پہنچ کر ایک دن ختم ہو جائیں گی تو پھر ان پر اس قدر سرمایہ کاری کیوں؟“ اس نے وہاں لگے سیٹ اپ کی طرف اشارہ کیا۔

”پہلی بات تو یہ کہ مشینیں کتنی بھی ایڈوانس ہو جائیں، اس دنیا میں انسان کا کردار یکسر ختم نہیں کیا جاسکتا۔ کسی فوجی کی ہی مثال لے لو۔ حکم ملنے پر یہ فوجی پہاڑ، سمندر، صحرا، جنگل اور برف پوش چوٹیوں سمیت ہر جگہ ڈیوٹی دینے پہنچ جاتے ہیں۔ ایسی جگہوں پر مشینیں ان کی معاون ضرور ہوتی ہیں لیکن ان کے بغیر خود کچھ نہیں ہوتیں۔ اب سوچو اگر کسی

برف زار میں قائم فوجی کیمپ میں انسان کے بجائے یہ مخلوق ڈیوٹی دینے لگے تو کیا انقلاب آجائے گا۔ انہیں عام انسانوں کی طرح اس ماحول میں سردائیوں کا کوئی مسئلہ ہی نہیں تو وہ سارے اخراجات بچ جائیں گے جو وہاں انسان کی بقا پر خرچ کرنے پڑتے ہیں۔“

”لیکن یہ صرف دو.....“ سونیا نے دوبارہ اپنا اعتراض یاد دلانا چاہا لیکن پروفیسر نے اس کی بات کاٹ دی۔

”تم یہ کیوں سوچ رہی ہو کہ یہ صرف دو ہی رہیں گی۔ یہ بھی تو تمام جانداروں کی طرح اپنی نسل میں اضافہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔“

”ان دو ماداؤں سے نسل کیسے آگے بڑھے گی؟“ اسے پروفیسر کی عقل پر شبہ ہونے لگا۔

”میں اتنے عرصے سے ان کا تلاش کرنے کی ہی کوشش کر رہا تھا اور خوش قسمتی سے میری یہ تلاش مکمل ہو چکی ہے۔“

”مطلب، ہمارے پاس ان کا زرموجود ہے؟“ سونیا بھی تھوڑی سی ایکساٹنڈ ہوئی اور گردن گھما کر یوں ادھر ادھر دیکھا جیسے کسی دوسرے سیل میں نر کے نظر آ جانے کی کوشش کر رہی ہو۔

”ابھی وہ یہاں نہیں ہے لیکن بہت جلد پہنچ جائے گا۔“ پروفیسر نے اس کا مقصد سمجھتے ہوئے مسکرا کر اسے اطلاع دی۔

”کہاں سے آجائے گا؟ کیا آپ کے ساتھیوں نے اسے تلاش کر لیا ہے؟ لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے، وہاں برف زار میں قائم آپ کا سارا سیٹ اپ تباہ ہو گیا تھا۔“ وہ پرجوش ہونے کے ساتھ ساتھ تھوڑی سی الجھ بھی گئی تھی۔

”چین ہمیں نر جی بھجوا رہا ہے۔ میرا چینوں کے ساتھ معاہدہ ہو گیا ہے۔“

”کیا؟“ اینڈریو کی دی اطلاع نے سونیا کی آنکھیں پھیلا دیں۔

”چینی بہت پر اسرار قوم ہیں۔ میرے پاس سن گن تھی کہ اگر ہمیں کوئی تیل مل سکتا ہے تو صرف اور صرف چینوں کے پاس سے۔ ان کے ہتھیاروں اور تیل ہی راہنماؤں کے پاس تیل کے خطوط شدہ جسموں اور اعضا کی موجودگی کے بارے میں بہت سے لوگ جانتے ہیں۔ اس حقیقت کو لے کر ہی میں یقین تھا کہ ان کے پاس کوئی زندہ تیل بھی لازماً موجود ہوگا اور دیکھو میرا یہ تیرنٹا نے پر لگ گیا۔“ اس نے کسی بچے کی طرح قلقاری ماری۔ سلاخوں کے پیچھے سوئی مادادوں میں سے ایک اس آواز پر تھوڑی سی ڈسٹرب ہوئی

بھی کرنا تھا تو میں نے انہیں یہاں شفٹ کر دیا تھا۔ یہاں میری ایک جینیاتی ماہر سے بھی بات چیت چل رہی تھی اور ہم ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے تجربے کے لیے متعلق ہو چکے تھے۔
”ٹیسٹ ٹیوب بے بی..... وہ بھی نرکی موجودگی کے بغیر؟“ وہ حیران ہوئی۔

”نر صرف جینیاتی ہی ہو، یہ ضروری تو نہیں۔ کچھ جینیاتی تہذیبوں کے ساتھ کسی انسان کے اسپرمز بھی تو استعمال ہو سکتے تھے۔ کچھ اس طرح جیسے پودوں میں نئی اقسام کے حصول کے لیے گرافٹنگ وغیرہ کی جاتی ہے۔“ پروفیسر اینڈریو کی آنکھوں میں ایک انوکھی سی چمک تھی۔

”مائی گاڈ!“ سونیا نے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ لیا۔

”میرے ساتھی کے ابتدائی تجربات اگرچہ ناکام رہے تھے لیکن ہم مکمل طور پر ناامید بھی نہیں تھے لیکن فی الحال یہ زیادہ اچھا کام ہو گیا ہے کہ جینیاتی ہمارے ساتھ اپنے نر جینی کو شہر کرنے پر راضی ہو گئے ہیں“ وہ اپنی کامیابی سے پوری طرح مطمئن تھا۔

”جینیاتی کن شرائط پر اتنی بڑی بات ماننے کے لیے تیار ہوئے ہیں؟“ اس نے ذہن میں اٹھاتا جینیادی سوال کیا۔
”دیکھو یہ کیسی ہے اور وہ شیلی!“ اس نے انگلی سے دونوں سوئی ہوئی ماداؤں کی طرف اشارہ کیا۔

”کیلی جینیوں کی ہے۔ مطلب، کیلی کے بطن سے جتنے بچے جنم لیں گے وہ ان کے ہوں گے اور شیلی کے ہمارے۔ آگے بھی بہت سی شرائط اور باریکیاں ہیں لیکن بنیادی شرط یہی ہے۔“ اس کے الفاظ سونیا کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بج رہے تھے اور وہ ایسا محسوس کر رہی تھی کہ چین اور اسرائیل کے درمیان ہونے والے اس سمجھوتے میں معاذ اور اس کے ساتھی پس کر رہ جائیں گے۔ دو طاقتور ممالک کے اپنے مفادات کے لیے اکٹھے ہونے کا مطلب تھا تیسری دنیا کے ساتھ ہاتھ ہو جانا۔

”تمہیں ایک مزے کی بات بتاؤں۔ جب تمہیں اس برف زار نے چین منتقل کیا جا رہا تھا تو وہ نر جینی بھی تمہارا ہم سفر تھا۔“ اس کی کیفیت سے بے خبر پروفیسر اینڈریو اسے بتا رہا تھا۔

”مجھے اس بارے میں کچھ نہیں پتا۔ میری آنکھوں پر تو وہ لوگ پٹی باندھ کر رکھتے تھے۔“ اینڈریو کو یہ جواب دیتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ کہیں چین نے دوستی اور اعتماد کی پٹی باندھ کر معاذ اور پاکستانی اداروں کو بھی تو اماندہ نہیں بنا رکھا تھا۔

لیکن پھر روٹ بدل کر سو گئی۔

”سجل شاہ کے برین ٹیومر کی سرجری کے لیے جس وقت ہر چینی ماہر نے ہاتھ اٹھالیا تھا، اس وقت ڈاکٹر یوان منگ میرے پاس آیا اور مجھ سے مدد کی درخواست کی۔ جواب میں، میں نے اس سے نر جینی کی فرمائش کر دی۔ اپنی اور اس کی لمبی چوڑی گفتگو کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ بس تمہارے لیے اتنا جان لینا کافی ہے کہ میں نے اپنے پاس ماداؤں اور اس نے اپنے پاس نرکی موجودگی کا اعتراف کر لیا۔ اصل میں چینی بھی کچھ میرے والے خطوط پر ہی سوچ رہے تھے لیکن ان کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ مذہبی طبقہ تھا اور وہ اپنے لوگوں سے بھی اپنے پاس جینی کی موجودگی چھپانے پر مجبور تھے۔ بد قسمتی سے انہیں ایک نر کے علاوہ کوئی دوسرا جینی مل بھی نہیں سکا تھا اس لیے ان کے پاس ریسرچ میں آگے بڑھنے کے امکانات مزید کم تھے۔ یوان منگ اور اس کے ساتھیوں کے برف زار میں اس کیپ کے قیام کا بنیادی مقصد ہی جینی خصوصاً مادہ جینی کی تلاش تھا۔ اس مقصد کے لیے وہ اپنے پاس موجود نر کو بھی استعمال کر رہے تھے۔ ٹریکر اور پاؤں میں لمبی زنجیروں کے ساتھ وہ اسے برف زار میں محدود وقت کے لیے چھوڑ دیتے تھے کہ شاید وہ خود اپنے کسی ساتھی کو تلاش کر لے لیکن انہیں اس کوشش میں کامیابی نہیں مل سکی تھی۔“ کیسے کیسے انکشافات ہو رہے تھے آج کی رات اس پر۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ میڈم ایکس کو فون کر کے اس کا خصوصی شکر ادا کرے جس نے اسے اینڈریو کا مطالبہ تسلیم کرنے کا سختی سے حکم دیا تھا۔ اگرچہ اس حکم پر من و عن عمل کرنے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن اس حکم کے سبب ہی وہ اینڈریو کی خواب گاہ میں پہنچ کر اس کو اس انتہا پر لانے میں کامیاب ہو گئی تھی کہ وہ اس پر پوری طرح کھل گیا تھا اور اب ایک الگ ہی رو میں بہتا ہوا اپنی خواہش کو بھی فراموش کر چکا تھا۔ اس سانس کی کڑے کے لیے دنیا میں ہر جذبے اور ضرورت سے اہم اس کا تحقیقی کام تھا اور اب اس کام پر گفتگو کرتے ہوئے وہ سب کچھ فراموش کر چکا تھا۔

”جب معاذ اور چینیوں نے مل کر آپ کے ٹھکانے پر حملہ کیا تھا تو اس وقت یہ دونوں کہاں تھے؟“ اس نے سوئی ہوئی ماداؤں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

”خوش قسمتی سے میں کچھ عرصہ قبل ہی انہیں وہاں سے روانہ کر چکا تھا۔ میں وہاں ان کے سلسلے میں اپنے سوا کسی اور پر مشکل ہی سے بھروسہ کر سکتا تھا اور مجھے اپنا دوسرا تحقیقی کام

”آپ لوگوں نے چیٹیوں سے معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی کہ وہ معاذ اور اس کے ساتھیوں کی کیوں اور کس قسم کی مدد کر رہے ہیں؟“ ذہن میں پیدا ہونے والے ٹکڑے اسے پروفیسر کو کریدنے پر مجبور کیا۔

”مجھے سیاسی اور دفاعی معاملات سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ میں اپنے کام پر فوکس رکھنے کو ملک کی اصل خدمت سمجھتا ہوں۔ مجھے سرسری طور پر بس اتنا معلوم ہے کہ چین نے کہا ہے کہ پاکستان سے دوستی کے ناتے وہ معاذ وغیرہ کی بس اس حد تک مدد کرے گا کہ ان لوگوں کو خیر و عافیت سے واپس پاکستان پہنچا دے یا اگر وہ خواہش رکھتے ہوں تو انہیں چین میں ہی کہیں سیٹل ہونے کا موقع فراہم کر دے۔ دوسری پارٹی نے کون سی کنڈیشن قبول کی، مجھے اس کا علم نہیں ہے۔“ پروفیسر اینڈریو کے جواب نے اس پر واضح کر دیا کہ چین دونوں طرف کے لوگوں سے ہی بنا کر رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ شاید یہ بین الاقوامی سیاست کی چالوں میں سے ہی ایک چال تھی کہ طاقتوروں کا ساتھ بھی نہ چھوڑا جائے اور کمزور دوستوں کو بھی بہلا کر ان سے کام نکلوا یا جاتا رہے۔

”میں تھک گیا ہوں اور چند گھنٹوں کے لیے سونا چاہتا ہوں تاکہ کل فریش موڈ میں اپنا ریسرچ ورک کر سکوں۔“ سونیا کے اندر ہوتی پکڑ دھکڑ سے بے خبر وہ اپنی کہہ رہا تھا۔ ”اوہو، چلیں واپس چلتے ہیں۔ یوں بھی مجھے لگ رہا ہے کہ آپ کی کیلی اور شیلی لائٹ اور باتوں کی آواز سے ڈسٹرب ہو رہی ہیں۔“ اس نے بار بار کروٹیں بدلتی ماداؤں کو دیکھتے ہوئے پروفیسر سے کہا۔

”واقعی مجھے دھیان نہیں رہا تھا۔ اصل میں یہ سونے کے لیے مکمل تاریکی کو پسند کرتی ہیں۔“ پروفیسر نے اسے جواب دیا اور فوراً واپسی کے لیے پلٹ گیا۔ لائٹیں بند کر کے وہ لوگ جس طرح لفٹ کی مدد سے وہاں آئے تھے، اسی طرح واپس اوپر پہنچ گئے اور اپنے اپنے گرم لباس سے چھٹکارا حاصل کیا۔

”گڈ نائٹ ڈارلنگ اب میں تمہیں مزید وقت نہیں دے سکتا۔ مجھے شدید نیند آرہی ہے۔“ وہ پروفیسر کو ہاتھ تمام کر اس کی خواب گاہ تک لے کر گئی تو وہ بستر پر گرے ہوئے بو جھل لہجے میں بولا۔

”کوئی بات نہیں پروفیسر! آپ جب بلا میں گے، میں آپ کو خدمت کے لیے حاضر ملوں گی۔“ وہ ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے وہاں سے پلٹ گئی۔ وہ پروفیسر سے

معلومات کا ایک ڈمیر لے کر وہاں سے جاری تھی اور پروفیسر اس سے کچھ بھی حاصل نہ کر سکا تھا۔

☆☆☆

”ادہ ہوائے اتم ٹھیک ہوا اور خیریت سے اپنی منزل پر پہنچ گئے ہوں؟“ اسپیکر سے ابھرتی بنجامن کی آواز اس کے اسی ازلی خلوص میں ڈوبی ہوئی تھی جس میں معاذ نے کبھی کی نہیں پائی تھی۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں اکل! آپ میری فکر نہ کریں اور اپنے اور آنٹی کے متعلق بتائیں کہ آپ لوگ کیسے ہیں؟“ اس نے بھی جواباً خلوص کا مظاہرہ کیا۔ بنجامن جیسے شخص کو اپنے مطلب کے لیے استعمال کرنے پر اسے اندر سے تھوڑی سی شرمندگی بھی تھی لیکن کیا کرتا کہ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

”ہم بالکل ٹھیک ہیں اور پہلے ہی کی طرح لڑ بھڑک پی لائف گزار رہے ہیں۔“ بنجامن نے مزے سے جواب دیا تو وہ ہنس پڑا۔

”تمہاری آنٹی شکایت کر رہی تھیں کہ عمار نے خواخوہ میں انرپورٹ ساتھ چلنے سے منع کر دیا ورنہ اس بہانے ایک ملاقات اور ہو جاتی۔“

”انرپورٹ تو میں آغا جان اور بی بی کو بھی ساتھ نہیں لے گیا تھا۔ آپ میں سے کوئی بھی ساتھ چلتا تو میرا دل زیادہ اداس ہو جاتا۔“ اس نے بات بتائی۔

”ایک طرح سے جو ہوا، ٹھیک ہی ہوا۔ بعد میں ٹر کے جو حالات ہو گئے تھے ساتھ جانے والوں کو واپسی میں بہت پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا۔“

”میں نے انرپورٹ پر نیوز سن کر یہی سوچا تھا۔ کتبہ میں انڈین ڈیفنس منسٹر کی ٹارگٹ کلنگ نے تو وہاں بہت آفت ڈھائی ہوگی۔“ اس نے محاذ انداز میں اس ذکر کو چھیڑا۔

”کچھ مت پوچھو ڈیئر۔ سمجھو پورے شہر میں بھومچال، آگیا تھا۔ گھروں پر ریڈ، گرفتاریاں اور سرچ آپریشن، جانے کیا کچھ ہوا ہے اور اب بھی حالات پوری طرح معمول پر نہ آئے ہیں۔ شہر میں فورسز بڑھادی گئی ہیں۔ جگہ جگہ ٹکے ہیں اور ہر دوسرے شخص کو روک کر اس کی اور اس کی گاڑی کی تلاشی جا رہی ہے۔“ بنجامن نے افسوس سے بتایا۔

”اتنے بڑے واقعے کے بعد اتنا رد عمل تو جتا ہے اکل!“

”ہاں، لیکن لوگوں کی پریشانی پر افسوس ہوتا ہے۔ مسلمان مردوں کو خاص طور پر تنگ کیا جاتا ہے۔“ بنجامن کی ایک بڑی خوبی اس کی غیر جانبداری بھی تھی۔

”ہماری قوم اس روئے کو سہتے سہتے سخت جان ہو گئی ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔ وہ لوگ اس بُرے دور کو بھی جھیل لیں گے۔“ اس نے جواباً حقیقت بیان کی جس پر بنجامن نے بھی اتفاق کیا۔

”آپ یہ بتائیں کہ شپ منٹ کب تک پہنچ جائے گی؟ یہ کام ہو جائے تو پھر اسی حساب سے میں یہاں اپنے بائیرز سے معاملات طے کروں گا۔“

”بس دودن کی بات اور ہے۔ تم کام کی زیادہ ٹینشن مت لو اور آرام سے گھوم پھر کر انجوائے کرو۔ کام تو انسان ساری زندگی کرتا ہی رہتا ہے۔ اب ایک نئے ملک اور نئے شہر گئے ہو تو اسے ایک پلور بھی کرو۔ تمہاری تو ویسے بھی عمر ہے انجوائے منٹ کی۔“ بنجامن اسے مشورہ دینے لگا جسے سن کر وہ ہنس پڑا۔

”ہنس کر ٹالنا نہیں ہے، میری بات پر عمل بھی کرنا ہے۔ میں تمہاری طرف سے بھیجے جانے والے خوبصورت فوٹو گرافس کا انتظار کروں گا۔ تم میرے سب سے اچھے دوست کے بیٹے ہو یگ مین! میں چاہتا ہوں کہ تمہاری خوشیوں کی خبریں اس تک پہنچیں تاکہ یہاں وہ اور تمہاری ماں سکون سے رہ سکیں۔“ بنجامن نے کہا تو اس کے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی۔ آغا گل اور زرینہ بی بی کو چھوڑ کر آنا خود اس کے لیے دوسری بار گھر اور گھر والوں کو چھوڑنے کے دکھ جیسا تھا۔

”آپ ان لوگوں کا بہت خیال رکھیے گا انکل! بے ساختہ ہی اس نے بنجامن سے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

”ایڈیٹ! یہ بھی کوئی کہنے کی.....“ بنجامن نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ پس منظر میں وہ مسز بنجامن کی تیز آواز سن سکتا تھا۔ ان کے الفاظ اسے سمجھ نہیں آرہے تھے لیکن اتنا اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ سخت ہچان زدہ ہیں۔ وہ سلسلہ منقطع کیے بغیر صبر سے انتظار کرنے لگا۔ اسے معلوم تھا کہ کال ختم کرنے سے پہلے بنجامن اسے صورت حال ضرور بتائے گا۔ ایسا ہی ہوا۔

”ایک بیڈ نیوز ہے یار! مجھے فوراً گھر سے لکھنا ہوگا۔ باقی باتیں ہم بعد میں کریں گے۔“ بنجامن نے ایک بار پھر لائن پر آتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں اسے آگاہ کیا۔

”لیکن ہوا کیا ہے؟“ اس نے دھڑکتے دل سے سوال کیا۔

”وہ وجہ نہیں تھا، میرے دوست کا بیٹا جو انڈین آرمی میں ملازمت کرتا تھا، اسے کسی نے قتل کر دیا ہے۔“

”لیکن کیوں؟“ اس نے بے ساختہ پوچھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وجے کا قتل منصوبے کا حصہ نہیں تھا۔

”ڈشیل نہیں معلوم ہے۔ بس اتنا بتا چلا ہے کہ اسے اس کے گھر میں ہی قتل کیا گیا ہے۔ اس کی وائف بے چاری فی الحال ٹراما میں ہے تو ٹھیک سے کچھ نہیں بتا رہی۔“

”چلیں ٹھیک ہے۔ آپ اس معاملے کو دیکھیں۔ ہم پھر دوبارہ کبھی بات کر لیں گے۔“ اس نے کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔ اتنا اسے اندازہ تھا کہ وجے کا قتل کسی ناگزیر درجے سے ہی ہوا ہوگا اور اس کے لیے وہ وجہ جانتا ضروری نہیں تھی۔ اسے اپنا سارا فوکس اب یہاں رکھنا تھا۔ اس خیال کے ساتھ ہی اس نے اپنی میز کی دراز سے ایک فولڈ کیا ہوا پوسٹر نکال کر اپنے سامنے پھیلا دیا۔ پوسٹر پر ایک سنہری سی موم جتنی جتنی ہوئی تھی جس سے روشن شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ ان شعاعوں کا سائز مختلف تھا لیکن ان میں سے ہر ایک کے سرے پر ایک انگریزی حرف تھی درج تھا۔ ان حروف کو ملا کر پڑھنے پر ویلکم کا لفظ بن رہا تھا۔ اس نے پوسٹر اٹھایا اور دفتر سے باہر نکل کر شیشے کے دروازے پر چسپاں کر دیا۔ بظاہر یہ ایک عام سالن تھا جو کسی بھی کاروباری دفتر کے باہر آنے والے گاہکوں کے لیے لکھا جاسکتا تھا لیکن اس نے اس پوسٹر کو یہاں گاہکوں کے بجائے اپنے دوستوں کے لیے لگایا تھا۔ اس نے انہیں اطلاع دے دی تھی کہ وہ اسرائیل کے شہر حیفہ میں موجود ہے۔

☆☆☆

سمندر کے شور کے ساتھ لیلیٰ وہی کے اونچے ٹرل کر الگ۔ ہی سماں باندھ رہے تھے۔ وہ جتنے جذب سے گارہی تھی، سننے والے بھی اتنا ہی ڈوب کر سن رہے تھے۔ سمندر کی خم ہوا میں گویا سیکڑوں پیمانے الٹ دیے گئے تھے جو حاضرین کو مدھوش کیے دے رہے تھے۔ شہر یار اور ماہ بانو پر ماحول اور لیلیٰ کی آواز مل کر اثر انداز ہو رہے تھے لیکن وہ باقی حاضرین و سامعین کی طرح مدھوش ہونے کے لیے نہیں آئے تھے۔ انہیں اپنا طے شدہ پروگرام کرنا تھا اور شاید جی واکر کا بھی کوئی پروگرام تھا جو یوں ان کی میزبانی پر مل گیا تھا جیسے وہ اس کی دعوت پر ہی تو اسرائیل آئے تھے۔ اب بھی وہ بہت ذمے داری سے انہیں ان کی قیام گاہ سے یہاں تک لایا تھا اور اب خود گانے کے بولوں پر سر دھن رہا تھا۔

”میرے پیٹ میں شدید درد ہو رہا ہے۔“ محفل کا رنگ بہت گاڑھا ہو چکا تھا جب اچانک ماہ بانو نے شہر یار کا شانہ ہلا کر اسے بتایا۔ شور کی وجہ سے اسے اپنی آواز خاصی

بلند رکھنا پڑی تھی۔

”ارے وہ کیوں؟ کیا کچھ التاسیدھا کھالیا تھا؟“ وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔ فکر مندی سے پوچھا۔

”مجھے لگتا ہے وہ فلافل جو ہم نے شام میں کھائے تھے، شاید وہ مجھے مہم نہیں ہو سکے۔“ اس نے تکلیف میں ڈوبی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

”میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ فلافل کے بجائے کچھ اور کھا لو لیکن تمہاری ہی مندی کی فلافل ہی کھانے ہیں۔“ شہریار کے لہجے میں محسوس کی جانے والی بیزاری تھی۔

”آپ مجھے طعنے ہی دیتے رہیں گے یا مرض کا علاج بھی ڈھونڈیں گے۔“ ماہ بانو نے اس کے چہرے کے تاثرات دیکھتے ہوئے خفگی کا اظہار کیا۔

”اب اس اجنبی شہر میں، میں تمہیں رات کے اس وقت علاج کے لیے کہاں لے کر جاؤں؟“ اس نے جھنجھلاہٹ کا مظاہرہ کیا۔ صاف لگ رہا تھا کہ اسے یہ خوبصورت محفل چھوڑ کر کہیں جانے کے خیال سے کوفت ہو رہی ہے۔

”ایکسکوزی! کیا میں آپ لوگوں کی کوئی مدد کر سکتا ہوں؟“ جی جو کہ بظاہر موسیقی میں گم تھا، اچانک ان کی طرف رخ کر کے مخاطب ہوا۔

”جی، نہیں وہ..... شکریہ۔“ شہریار نے اس کے یوں مخاطب ہونے پر گڑبڑاہٹ کا مظاہرہ کیا۔

”میں آپ لوگوں کی مدد کر سکتا ہوں۔ یہاں قریب میں ہی ایک اچھا اسپتال ہے۔ میں آپ کو وہاں لے چلتا ہوں۔“ اس نے پیشکش کی۔

”نہیں، نہیں۔ آپ ہمیں اسپتال کا نام اور لوکیشن بتادیں۔ ہم خود وہاں چلے جائیں گے۔“ شہریار جلدی سے بولا۔

”تکلف کی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ دونوں ہمارے ملک میں مہمان ہیں اور مجھے آپ کی مدد کر کے خوشی ہوگی۔“

”لیکن مجھے آپ کو اتنی خوبصورت محفل سے اٹھا کر لے جانا مناسب نہیں لگ رہا۔“ شہریار نے تذبذب کا مظاہرہ کیا۔ ماہ بانو ان کی آپس کی بحث سے بے نیاز پیٹ پر ہاتھ رکھے آہستہ آہستہ کراہ رہی تھی۔

”کوئی بات نہیں۔ کوئی بھی تفرق کسی انسان کی صحت سے بڑھ کر اہم نہیں ہو سکتی۔“ جی نے رسان سے جواب دیا اور پھر حتیٰ لہجے میں بولا۔

”آئیے میرے ساتھ۔“

”ٹھیک ہے، ہم چلتے ہیں لیکن اس شرط پر کہ آپ

ہمیں اسپتال تک پہنچا کر خود واپس یہاں آجائیں گے۔ اگر آپ نے ایسا نہیں کیا تو ہمیں گت رہے گا کہ ہماری وجہ سے آپ کی تفرق خراب ہوگی۔“

”اگر آپ کی یہی خدشہ ہے تو چلیں، ہم ایسا ہی کر لیں گے لیکن پلیز، اب چلیں تو سہی۔ مجھے لگ رہا ہے خاتون کی تکلیف بڑھتی جا رہی ہے۔“ اس نے ماہ بانو کے چہرے کے بگڑتے زاویوں سے نیچہ اخذ کیا۔ اس بار شہریار بنا کسی دباؤ و جھجکاؤ کے تیار ہو گیا اور ماہ بانو کو سہارا دے کر پارکنگ میں کھڑی جی کی گاڑی تک لے گیا۔ وہاں سے اسپتال تک راستہ چند منٹ سے زیادہ کا نہیں تھا۔

”تھینک یو سوچ مسٹر واکر!“ گاڑی Rambam اسپتال کے سامنے رکی تو شہریار نے مسکراتے ہوئے جی کی شکر یہ ادا کیا۔ وہ اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھا تھا جبکہ ماہ بانو پچھلی نشست پر تھی۔

”اُس ادا کے دوست! اگر تم چاہو تو میں تم لوگوں کے فارغ ہونے تک یہاں انتظار کر سکتا ہوں۔“ جی نے ایڈ پیشکش دہرائی۔

”بالکل نہیں۔“ شہریار نے پُر جوش لہجے میں کہتے ہوئے خواہ مخواہ ہی ڈیش بورڈ پر مکا مارا۔ مکا خاص زاویے سے مارا گیا تھا جس کے نتیجے میں گلوو کمپارٹمنٹ ایک جھٹکے سے کھل گیا اور اندر رکھا ہوا ریوالور نیچے پھسلا۔

”یہ.....“ شہریار نے یوں اچھلنے کی اداکاری کی جیسے ریوالور کے بجائے سانپ برآمد ہو گیا ہو۔

”یہ تو بس ایسے ہی۔“ جی نے جھک کر ریوالور اٹھانے کی کوشش کی لیکن شہریار زیادہ پھرتیلا ثابت ہوا۔

”خاصا مہنگا لگتا ہے۔“ ریوالور کو الٹ پلٹ کر دیکھنے اس نے ستائشی لہجے میں تبصرہ کیا۔

”ہاں، بس شوق تھا تو خرید لیا۔ اسے اندر رکھ دو۔ پولیس کی کوئی پیٹرولنگ کار اس طرف آنکلی تو بلا وجہ اسلے کی نمائش پر ایڈوبن جائے گا۔“ جی کے انداز میں ہلکی گھبراہٹ تھی۔

”اور چونکہ یہ اسلحہ میرے ہاتھ میں ہے تو میں ہی پھنسون گا۔ خطرناک.....“ شہریار نے کہتے ہوئے جلدی سے ریوالور کو واپس اس کی جگہ پر رکھ دیا۔

جی نے بے ساحتہ ہی ایک اطمینان بھری سانس لی اور یہی وہ لمحہ تھا جب اس کی پوری توجہ شہریار پر مبذول پا کر ماہ بانو نے پیچھے سے اس پر حملہ کیا۔ کلوروفام میں بھیجا ہوا رومال اس کی ناک پر رکھ کر اسے دنیا و مافیہا سے بے خبر

افاقہ

یوگا، کمر کے درد کے علاج میں معالجی طریقوں سے زیادہ موثر ثابت ہو سکتا ہے۔ خاص طور پر کم آمدنی والے طبقے میں جو غربت کی وجہ سے علاج کرانے سے قاصر ہوتے ہیں۔ یہی لوگ کمر کے درد کی اذیت زیادہ برداشت کرتے ہیں۔ یوشن یونیورسٹی اسکول آف میڈیسن اور یوشن میڈیکل سینٹر کے ریسرچرز نے اس تحقیق کے سلسلے میں کمر کے درد میں جھلا پرانے مریضوں کو شریک کیا جن کا تعلق یوشن کی کم آمدنی والے علاقوں سے تھا۔ ان لوگوں میں سے کچھ کو 12 ہفتے پر مشتمل ”ہاتھا یوگا“ کی 75 منٹ کی کلاسوں میں مشقیں کرائی گئیں جبکہ باقی ماندہ مریضوں کو حسب معمول ڈاکٹری معائنے اور دواؤں کے ذریعے علاج کی سہولت فراہم کی گئی۔ اس تجربے کے نتیجے میں یوگا کے شرکا کے درد کی شدت ایک تہائی کم ہو گئی تھی جبکہ دوا میں استعمال کرنے والوں نے صرف 5 فیصد درد کم ہونے کا اعتراف کیا۔ یہ بھی دیکھا گیا کہ کنٹرول گروپ کے افراد نے دواؤں کے استعمال میں کوئی کمی نہیں کی تھی جبکہ یوگا میں شریک افراد نے درد دور کرنے والی دوا میں 80 فیصد کم استعمال کی تھی۔

دوسری اٹالیا کی تحقیق میں یہ انکشاف کیا گیا ہے کہ جو لوگ ٹی وی سامنے رکھ کر یوگا کی مشقیں کرتے ہیں انہیں بجائے فائدہ کے نقصان ہو سکتا ہے۔ کیونکہ یوگا میں بہت قریبی توجہ کی ضرورت ہوتی ہے اور اس مشق کے لیے دو طرفہ ابلاغ بہت اہم ہے اس لیے یوگا کے آسنوں پر عمل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کے لیے استاد یا سکھانے والے کی رہنمائی حاصل کی جائے۔

پیدا ہو سکتے ہیں۔ آرٹھروپڈک سرجن کا کہنا ہے کہ ٹی وی دیکھ کر یوگا کی مشقوں کی نقل کرنے والوں کی بڑی تعداد زخمی ہو کر علاج کے لیے ہمارے پاس آرہی ہے کیونکہ ٹی وی دیکھ کر انہیں یہ اندازہ نہیں ہو پاتا کہ جسم کو کس حد تک چلک دینا یا پھیلا نا اور سیکڑنا ہے۔

درد محسوس ہوا۔ جی اصرار کر کے انہیں اسپتال لے کر گیا لیکن اسپتال پہنچنے تک درد خود بخود ٹھیک ہو چکا تھا۔ اس نے اور جی نے اصرار کیا کہ بے شک درد ختم ہو گیا ہے لیکن مناسب ہوگا کہ ایک بار معائنہ کروالیا جائے۔ تاہم راضی نہیں ہوئی۔ اس

کرنے کے بعد اس نے ایک نظر گاڑی سے باہر ڈالی۔ رات کا وقت ہونے کی وجہ سے باہر زیادہ رش نہیں تھا لیکن روشنی اچھی خاصی ہو رہی تھی۔ جی کی گاڑی کے شیشے رنگین نہ ہوتے تو گاڑی میں ہونے والی کارروائی باہر کسی کی نظر میں آ جاتی۔ اصل میں گاڑی کے شیشے ٹنڈ ہونے کی وجہ سے ہی انہوں نے یہ منصوبہ بنایا تھا اور اس کے پہلے مرحلے سے بخیر و خوبی گزر رہی گئی تھی۔

”آؤ، اب اندر چلتے ہیں۔ باقی کی کارروائی کرنے والے خود کر لیں گے۔“ شہریار نے پہلے جی کے بے ہوش ہونے کا اطمینان کیا پھر ریو اور نکال کر اس پر سے اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کرنے کے بعد اسے واپس اس کی جگہ پر رکھ دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے اپنے ہاتھوں میں باریک جھلی نما دستانے چڑھائے اور جی کو ڈرائیونگ سیٹ سے کھینچ کر ہٹانے کے بعد خود اس کی جگہ لے لی۔ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے یہ کام انجام دینا مشکل تھا لیکن کسی نہ کسی طرح انجام پائی گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہی اس نے گاڑی دوڑا دی کیونکہ اندیشہ ہو چلا تھا کہ اتنی دیر ہسپتال کے باہر کسی گاڑی کے کھڑے رہنے پر سکیورٹی سٹاف میں سے کوئی متوجہ نہ ہو جائے۔

وہاں سے روانگی کے پانچ منٹ بعد ہی اسے ایک لیے مقام پر جہاں سناٹا بھی تھا اور کیمروں کی غیر موجودگی کا اطمینان بھی، اس نے گاڑی روک دی اور تین بار بہت مختصر نما ہارن دیا۔ نتیجے میں اندھیرے سے ان کا ایک مقامی دنگر برآمد ہوا اور مودبانہ حکم کا انتظار کرنے لگا۔

”پہلے تو اسے سیٹ سے ہٹا کر پیچھے شفٹ کرنا ہے۔“ شہریار نے اسے بتایا پھر خود بھی مدد کے لیے نیچے اتر آیا۔ جی کو پچھلی سیٹ کے پائیدان میں فکس کر کے شہریار نے پہلے کی طرح فرنٹ پینجر سیٹ سنبھالی اور اس کا نووارد دنگر ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھ گیا۔ گاڑی کا رخ ان کی قیام گاہ کی طرف تھا۔ گاڑی انہیں وہاں اتار کر آگے بڑھ گئی۔ انہوں نے جاتی ہوئی گاڑی کی طرف دیکھ کر یوں ہاتھ ہلائے جیسے کسی اچھے دوست کو رخصت کر رہے ہوں۔ انہیں معلوم تھا کہ یہ منٹر کیمرے کی قید میں آجائے گا اور جی ان کا مقصد تھا۔ جی وا کر کی تلاش شروع ہوئی اور ڈھونڈنے والے ان تک پہنچے تو ان کے پاس سنانے کے لیے ایک سادہ کہانی موجود تھی۔

میوزیکل شو کے دوران تانیہ (ماہ بانو) کو پیٹ میں

کا استدلال تھا کہ یہ معمولی کیسٹرک چن تھا جو شاید قحطی کھانے کی وجہ سے ہو گیا تھا۔ اب وہ بالکل ٹھیک تھی اور اسے علاج کی قطعاً ضرورت نہیں تھی۔ جی اور وہ اسے کچھ دیر تک سمجھاتے رہے کہ احتیاطاً ایک بار ڈاکٹر کو دکھالیا ہی مناسب ہو گا لیکن وہ دودھ مار کر بھی اکیلی خاتون کو قائل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ Rambam اسپتال کے باہر اتنی دیر تک گاڑی کھڑی رہنے کا یہ ایک اچھا جواز تھا۔

آگے جی اور اس کی گاڑی کے ساتھ کیا کیا جاتا، جی سے صف و شہان کے متعلق کیسے معلومات حاصل کی جاتیں، یہ ان کا مسئلہ نہیں تھا۔ انہیں بس ہر حاصل شدہ معلومات سے فائدہ اٹھا کر اپنا کام انجام دیتے رہتا تھا۔

☆☆☆

”سنہری موم جی نے روشن ہو کر خوش آمدید کا پیغام دے دیا ہے۔“ سونیا نے کوریٹر سے موصول ہونے والا لفاظہ کھول کر اس میں موجود وہ شدہ کاغذ نکال کر کھولا تو پورے ورق پر لکھا یہ اکلوتا جملہ پڑھ کر اس کا دل دھڑک اٹھا۔ وہ آگیا تھا، وہ بالآخر آگیا تھا جس کا انتظار اس نے اپنوں کے ہاتھوں بے پناہ شدہ دہستے ہوئے بھی ترک نہیں کیا تھا۔

”سنہری موم جی۔“ لٹنے والے پیغام سے حاصل ہونے والی خوشی کو ایک بار پھر محسوس کرنے کے لیے اس نے دوبارہ پیغام کو پڑھنا چاہا لیکن اب حرف منہ شروع ہو چکے تھے۔ وہ ایک گہری سانس لے کر رو گئی۔ اس جادو کی روشنائی کی خصوصیات سے وہ اچھی طرح واقف تھی۔ یہ روشنائی پاکستان کے ایک نوجوان سائنس دان نے ایجاد کی تھی۔ خفیہ مراسلات کی ترسیل اور شیوہوں کو ضائع کر دینے کے حوالے سے یہ ایک زبردست شے تھی۔ رابطوں کے جدید طریقوں کے درمیان یہ قدیم اعزاز کی ایجاد اس اعتبار سے بہت انوکھی اور مفید تھی کہ جدید رابطوں کو پکڑنے کے لیے جدید طریقہ کار موجود تھے جبکہ اس روشنائی کی یہ خصوصیت تھی کہ ایک بار تحریر منٹے کے بعد دوبارہ کسی طور نہیں پڑھی جاسکتی تھی۔ کاغذ پر سے اس کا وجود ہی ختم ہو جاتا تھا۔ اسی خصوصیت کی وجہ سے اس ایجاد کو پبلک نہیں کیا گیا تھا۔

”یہ کون سا لو لیٹر لے کر بیٹھی ہوئی ہو تم؟“ ابھی وہ لٹنے والے پیغام کے زیر اثر دھڑکتوں کی اچھل پھٹل ہی سنہال رہی تھی کہ آہٹ سی محسوس ہوئی اور میڈم ایکس اندر داخل ہوئی۔ اس کی تیز نظروں نے سونیا کے ہاتھ میں موجود کاغذ اور میز پر پڑا لفاظہ فوراً ہی تاڑ لیا تھا۔

”میری زندگی میں لو لیٹرز کی گنجائش کہاں۔ میرے لوگ کورے کاغذ بھیج کر ہمارے ساتھ مذاق کرتے ہیں۔ اس نے روشنائی اڑ جانے کے باعث بالکل کھرا ہو جانے والا کاغذ میڈم ایکس کے سامنے کیا۔

”یہ کیا ہے؟“ اس نے کاغذ ہاتھ میں لے کر اسے پلٹ کیا اور غجب سے پوچھا۔

”شاید کسی نے مذاق کیا ہے۔ آج کی ڈاک سے موصول ہوا ہے۔ نہ لفاظے پر بھیجے والے کا نام پتا ہے نہ ہی کاغذ پر کوئی تحریر۔“ اس نے شانے اچکاتے ہوئے جواب دیا۔

”لیکن یہ تمہارے نام ہے۔ اگر یہ مذاق بھی ہے سوچنے کی بات ہے کہ وہ کون ہے جسے تمہاری یہاں موجود کاغذ ہے۔“ اس کے شانے اچکانے سے میڈم ایکس بات کو ایسے ہی جانے نہیں دے سکتی تھی۔

”آپ جانتی ہیں میرے لوگوں سے ذاتی تعلقات نہیں ہیں اس لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ میرے کسی جانے والے کی حرکت ہو۔ ایسے میں، میں دو ہی باتیں سوچ سکتی ہوں۔ اول یہ کہ یہ کوئی ایسا شخص ہے جو میٹھی مجھے ڈسٹر ب کرنا چاہتا ہے یا پھر دوسری بات یہ کہ میری آزمائش سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔“ اس کے لہجے میں ہلکی سی ہنسی آئی تھی۔

”ایسا کچھ نہیں ہے۔ تم غلط سمت میں سوچ رہی ہو تمہیں اس انداز سے سوچنے کے بجائے غور کرنا چاہیے کہ کون ہے جو تمہاری یہاں موجودگی سے واقف ہے اور سمجھتا ہے سادہ خط بھیج کر یہ بات جتنا چاہتا ہے۔“ میڈم ایکس اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”مجھے تو جارج پر ہی شک ہے۔ وہ میرے ہاتھوں ماضی میں اٹھائی گئی ہزیمت کو بھول نہیں سکا ہے اور اب میرے لٹنے پر بدلہ لینے کی کوشش کر رہا ہے۔“ وہ اپنے موقف پر اڑی رہی۔

”ٹھیک ہے۔ میں جارج کو بھی چیک کر لوں گی لیکن دوسرے زاویے سے بھی تحقیق ضروری ہے۔ تم یہ میرے حوالے کر دو۔ میں اسے لیب میں چیک کر دلاؤں گی۔“ میڈم ایکس نے لفاظے سمیت خط اس سے لے لیا۔ یقیناً وہ یہ ٹریس کروانے کی بھی کوشش کرتی کہ یہ خط کس سے اور کس نے پوسٹ کیا ہے۔ سونیا کو اس طرف سے

میں ڈھال لیں گے۔“

”اس کوشش میں آپ لوگ پہلے ہی منہ کی کھا چکے ہیں۔“

”اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم نے اسے اچھا خاصا ٹرین کر لیا تھا لیکن تمہاری بے پروائی اور حماقت نے اسے ہمارے ہاتھوں سے ٹکڑا دیا۔“ میڈم ایکس نے جوابی طعنہ مارا۔

”مجھے موقع ملا تو اس غلطی کا مادا کر دوں گی لیکن کیا آپ اسے تلاش کرنے کے لیے مجھے پاکستان واپس جانے کی اجازت دیں گی؟“ وہ جاننا چاہتی تھی کہ جس طرح چینوں نے تہی کے معاملے میں پاکستان سے بالا ہی بالا اسرائیل کے ساتھ معاملات طے کر لیے ہیں، کیا وہ معاذ کے بارے میں بھی کوئی سن گن دے چکے ہیں اس لیے گھما پھرا کر ایسا سوال کیا جس سے اندازہ ہو سکے کہ میڈم ایکس کو معاذ کی موجودہ پوزیشن کا علم ہے یا نہیں۔

”تم نے تو اسے آخری بار چین میں دیکھا تھا پھر اسے ڈھونڈنے پاکستان کیوں جانا چاہتی ہو؟“ سوال کے جواب میں سوال آیا۔

”لازمی سی بات ہے، جس طرح چین نے پاکستان سے میرا تبادلہ کر لیا تھا ایسے ہی معاذ اور اس کے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ بھی کیا ہوگا۔ وہ لوگ چین کے بھلا کس کام کے تھے؟ ایسے میں چین کے لیے یہی بہتر ہوگا کہ ان قیدیوں کو پاکستان کے حوالے کر کے باہمی دوستی اور اعتماد کے رشتے کو مزید مضبوط کر لیا جائے۔“ اس کے پاس اپنے جواب کی منطق موجود تھی۔

”اچھا تجزیہ ہے لیکن فی الحال میں فوری طور پر یہ وعدہ پورا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ ملک بہت نازک صورت حال سے گزر رہا ہے اور ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اندرونی اور بیرونی دشمنوں سے پوری طرح چوکنے رہ کر اپنے دفاع پر توجہ مرکوز رکھیں۔ معاذ سمیت تیسری دنیا کے مسائل کو بعد میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔“ میڈم ایکس کے الفاظ اس کے لیے چونکا دینے والے تھے اس لیے فوراً پوچھا۔

”کیسی نازک صورت حال؟ مجھے تو سب کچھ پہلے ہی جیسا نظر آرہا ہے۔“

”نظر آنے اور ہونے میں فرق ہوتا ہے۔ ہمارے پاس اطلاعات ہیں کہ اندر ہی اندر کوئی مچھڑی پک رہی ہے۔ ہمارے اکابرین بھی بھرپور جواب دینے کے لیے تیاریوں میں مصروف ہیں۔ ایسے میں ہمارا چوکنا رہنا بہت ضروری ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی بات پر بھی نظر رکھنا پڑے گی۔“

فر نہیں تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اسے وہ خط بھیجنے والے بھی احمق نہیں تھے۔ انہوں نے بھی خود کو پوشیدہ رکھنے کے لیے پورا اہتمام کیا ہوگا۔

”پروفیسر کے ساتھ تمہارے معاملات کیسے چل رہے ہیں؟ وہ تم سے مطمئن ہے یا نہیں؟“ اب رائیل نے خود گفتگو کا رخ موڑ دیا۔

”وہ مجھ سے بہت خوش ہے اور ہماری بہت اچھی دوستی ہوئی ہے۔“ اس نے فخریہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

”مگذا مجھے معلوم تھا کہ تم میری بات سمجھ لوگی۔ پروفیسر اسرائیل کا سرمایہ ہے اور ہمارا فرض بنتا ہے کہ اس کی قربانیوں کے صلے میں اسے وہ سب دیں جس کی وہ خواہش رکھتا ہے۔“ اس کے جواب نے میڈم ایکس کو خوش کر دیا۔

”ہم بھی تو بچپن سے جان بھیلی پر لیے پھر رہے ہیں۔ ہمارے لیے کوئی صلہ نہیں ہے کیا؟“ سونیا کی زبان پر شکوہ آیا۔

”تمہیں دنیا کی ہر آسائش میسر ہے۔ اس کے سوا کیا صلہ چاہتی ہو؟“ رائیل نے اسے گھورا۔

”آسائش نہیں، خواہش کی بات ہو رہی ہے۔ آج تک کبھی کسی نے پوچھا ہی نہیں کہ تمہاری کوئی خواہش ہے یا نہیں۔“ ایک حسرت تھی جو لبوں پر آگئی تھی۔

”وہ لڑکا معاذ ہے نا تمہاری خواہش۔ میں جانتی ہوں کہ زبان سے لاکھ انکار کرنے کے باوجود تمہارے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ موجود ہے۔“ میڈم ایکس ذرا سا آگے کی طرف جھکی اور دونوں کہنیاں میز پر جمتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ سونیا جواب میں خاموش رہی۔

”میری طرف سے تمہیں اجازت ہے کہ اسے ڈھونڈ کر اپنا مطیع بنالو تو میری طرف سے تم پر کوئی پابندی نہیں ہوگی۔“

”باوجود یہ کہ وہ ایک مسلمان ہے؟“ اس نے بھی اس بار ماں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور چیخ کر نے والے انداز میں پوچھا۔

”ہاں، باوجود یہ کہ وہ ایک مسلمان ہے۔“

”اگر ایسی کوئی منجائش نکال سکتی تھی تو آپ نے میرے باپ کے لیے کیوں نہ نکالی؟“ رائیل کا اثباتی جواب اس کے لبوں پر سوال لے آیا۔

”اس لیے کہ وہ ایک دھوکے باز انسان تھا۔ اس نے مجھے پانے کے لیے سچ کو مجھ سے چھپائے رکھا۔ معاذ کا تو سب کچھ پہلے ہی ہم پر کھلا ہوا ہے۔ بس ایک بار وہ ہمارے آگے ہتھیار ڈال دے پھر ہم خود اسے اپنی پسند کے سانچے

”آپ تو ڈرانے والی باتیں کر رہی ہیں۔“
 ”ڈریں گے تب ہی تو لڑنے کی تیاری رکھیں گے۔“
 ”ہم اسرائیلیوں نے پیدا ہوتے ہی لڑنے کی تیاریوں کے سوا دیکھا ہی کیا ہے۔ ہم تو اسکولوں میں بھی اپنے بچوں کو ہتھیار چلانا سکھاتے ہیں۔“ سونیا آج کل بات بات پر تلخ ہونے لگی تھی۔

”لڑنا پڑتا ہے۔ انسان کو اپنے حقوق کے لیے لڑنا ہی پڑتا ہے۔“ میڈم انیس نے غصے سے میز پر ہاتھ مارا۔
 ”اور شاید دوسروں کے حقوق غصب کرنے کے لیے بھی۔“ سونیا زیر لب بڑبڑائی۔

”جو کہنا ہے زور سے کہو۔“ رائیل گرجی۔
 ”میں صرف یہ کہہ رہی ہوں کہ آخر ہم کب تک لڑتے رہیں گے؟“

”جب تک اپنے مقابل کو دیوار سے نہیں لگا دیتے بلکہ میں تو کہوں گی کہ جب تک زمین میں دفن نہیں کر دیتے۔ صرف اسی صورت میں ہم ایک مکمل پُر امن، خوشحال اور ترقی یافتہ اسرائیل کا خواب پورا کر سکیں گے۔“

”خوشحالی اور ترقی تو اب بھی ہے۔ امن کے لیے مقابلین سے صلح اور معاہدے کر لیں۔“ اس نے تجویز پیش کی جو میڈم انیس کو قطعاً پسند نہیں آئی اور ناک چڑھا کر بولی۔
 ”ہم پوری دنیا پر حکومت کرنے کا سوچ رہے ہیں اور تم ہمیں معمولی کیڑوں ٹکڑوں سے امن معاہدے کرنے کی تجویز دے رہی ہو۔ مجھے لگتا ہے تیسری دنیا کے ممالک میں طویل عرصہ رہنے سے تمہاری سوچ بھی تیسرے درجے کی ہو گئی ہے۔“

”میں نے صرف ایک رائے پیش کی تھی۔ یہاں کون سا میرے مشورے سے پالیسیز تیار کی جاتی ہیں۔“ سونیا نے منہ بتایا۔

”پالیسیز بنانے والے بڑے دماغ ہوتے ہیں۔ ہمیں صرف اپنے اپنے دائرہ کار میں رہ کر ان پالیسیز کو کامیاب بنانے کی کوشش کرنا چاہیے۔“ میڈم انیس نے اسے نصیحت کی۔ شاید وہ اور بھی کچھ کہتی لیکن پھر اس کے فون کی بجتی گھنٹی نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اس نے کال وصول کی اور دوسری طرف کی بات سننے لگی۔ درمیان میں ایک آدھ مختصر سوال بھی کیا جس سے سونیا صورت حال کا درست اندازہ نہیں لگا سکی۔ بس تاثرات ہے اتنی بات سمجھ آئی کہ کہیں کوئی مسئلہ ہو گیا ہے۔

”ٹھیک ہے، میں دیکھ لیتی ہوں اس مسئلے کو۔ ویسے

بھی میں یہاں دہلہ میں ہی ہوں۔“ اس نے کہہ کر فون بند کر دیا تو سونیا کو اپنی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پایا۔
 ”ہمارا ایک ایجنٹ ہے جی وا کر۔ یہ ان لوگوں میں سے ہے جو اسرائیل آنے والے غیر ملکیوں پر نظر رکھتے ہیں۔ جی بھی تانیہ اور سراد نامی ایک جوڑے کو چیز کر رہا تھا۔ جوڑے کا میزبان پروٹیکٹم کا ایک مجسٹر گھرانہ ہے اور ان کی سرکاریوں کے متعلق بھی یہی اطلاع ملی تھی کہ وہ اہم مقامات کی زیارت اور سیر و تفریح میں اپنا بیشتر وقت گزار رہے ہیں۔ جی کی رپورٹ کے بعد ایک طرح سے اس جوڑے کو کلیئر سمجھ لیا گیا تھا لیکن اب اطلاعات ہیں کہ جی ان کے پیچھے چھ آیا تھا۔ دو دن معمول کے مطابق اس نے اپنی خیریت کی اطلاع بھجوائی لیکن تیسرے دن اس کی طرف سے کوئی رپورٹ نہیں آئی ہے جس کی وجہ سے ہیڈ کوارٹر کو تشویش ہے۔“

میڈم انیس نے اسے جو تفصیل بتائی، اسے سن کر اس کا دل دھڑک اٹھا۔ تانیہ اور مراد اس کے لیے اجنبی کردار نہیں تھے اور ان کا اس طرح نظروں میں آ جانا اس کے لیے باعث تشویش تھا۔

”میں جہہ مختصر دورے پر آئی ہوں۔ پروفیسر اینڈریو کے علاوہ ایک آدھ مزید اہم افراد سے میٹنگ کر کے مجھے آج ہی واپس جانا ہے اس لیے خود اس معاملے کی نگرانی نہیں کر سکتی۔ تم چیک کر لو اس معاملے کو اور مجھے میری واپسی سے پہلے رپورٹ کرو۔“

”آپ فکر نہ کریں، میں دیکھ لوں گی اس معاملے کو۔“ وہ خوش ہو گئی کہ یہ معاملہ اس کے ہاتھ میں آ گیا ہے اور وہ بچت کی کوئی راہ نکال سکتی ہے۔

”میری اس وقت پروفیسر سے ملاقات طے ہے۔ تم انہیں اطلاع کر دو کہ میں پہنچ چکی ہوں۔“ اس کی یقین دہانی کے بعد رائیل نے اس موضوع پر مزید بات کرنے کے بجائے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا۔

”مجھے تو انہوں نے ایسی کوئی اطلاع نہیں دی۔“ سونیا حیران ہوئی۔

”مصرف وقت میں بھول گئے ہوں گے۔ تم یاد دلاؤ۔“ میڈم انیس نے جواب دیا۔

”جی ٹھیک ہے۔“ اس نے پروفیسر سے رابطہ کیا اور اس کی طرف سے تصدیق ہونے پر رائیل سے بولی۔

”ٹھیک ہے۔ آپ ملاقات کے لیے جاسکتی ہیں لیکن اس سے پہلے روز کے مطابق آپ کو اپنے پاس موجود ہتھیار

یا کوئی بھی ضرر رساں شے میرے حوالے کرنا ہوگی اور اسکیٹنگ سے بھی گزرنا پڑے گا۔“
یہ ایسے مطالبات تھے جن کو سن کر ایک ہل کے لیے رابیل کا چہرہ سرخ پڑ گیا لیکن پھر وہ مسکرائی اور اس کا شانہ چمک کر بولی۔

”مگذا! اچھے کام کے لیے اسی پروفیشنل ازم کی ضرورت ہوتی ہے۔“ سو نیا جواب صرف مسکرا کر رہ گئی۔

☆☆☆

”کون..... کون ہو تم اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“ جی نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے شخص کی طرف الجھن زدہ نظروں سے دیکھا اور کچھ نروس سے انداز میں سوال کیا۔

”تم اتنے دنوں سے ہمارے دوستوں کے پیچھے خوار ہو رہے تھے۔ ہم نے سوچا کہ تمہیں مزید زحمت سے بچالیں اور خود تمہیں اپنے پاس بلا کر وہ سب بتا دیں جو تم جاننے کے لیے مارے مارے پھر رہے ہو۔“ سامنے والے کا اطمینان قابل دید تھا۔

”میں سمجھا نہیں تمہاری بات۔ میں بھلا کیوں کسی کا پیچھا کروں گا؟ میں تو بس ایک عام ساسرکاری ملازم ہوں۔“ جی نے تجاہل سے کام لیا۔

”بالکل درست کہا تم نے مسٹر واکر! تم جیسے سرکاری ملازمین اسرائیل میں عام ہی ہیں۔ ایسے ملازمین رکھنا ان حکومتوں کی مجبوری بن جاتی ہے جو غاصب ہوں اور زبردستی کسی زمین پر قابض ہو کر بیٹھے ہوئے ہوں۔“ جی کے سامنے بیٹھے ہوئے جوان کی آنکھوں میں طنز تھا۔

”تم مجھ سے یہ سب کیوں کہہ رہے ہو؟ میں نے تمہیں یا کسی بھی دوسرے شخص کو نقصان نہیں پہنچایا ہے۔ الٹا مجھے ہی دھوکے سے یہاں لا کر اس حال کو پہنچا دیا گیا ہے۔“ اس نے اپنی کرسی کے ہتھوں اور پایوں سے بندھے ہوئے ہاتھ پیروں کی طرف اشارہ کیا۔

”ایسا صرف اس لیے ہوا ہے مسٹر واکر کہ ہم نے تمہیں اس کا موقع ہی نہیں دیا ورنہ تم تو مسلسل موقع کی تلاش میں تھے کہ ہمارے دوستوں کا کوئی کمزور پہلو ہاتھ لگے اور تم انہیں انویسٹیشن کے نام پر اپنے کسی نارجرسیل میں پہنچا دو۔“

”موجودہ صورت حال سے واضح ہو گیا ہے کہ تمہارے دوست سچ مچ مٹھوک کردار کے حامل ہیں۔ میں نے ان کے ساتھ ہمدردی کی اور انہوں نے مجھے یہاں پہنچا دیا۔“ جی کو تھوڑا سا طیش آ گیا۔

”اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ تم ایک اسرائیلی

جاسوس ہو جو اسرائیل آنے والے شریف لوگوں کو پریشان کرتے ہو۔ ویسے یہ تو بتاؤ کہ میرے دوستوں کو تم نے کس بنیاد پر مٹھوک پایا؟“

”اپنی چھٹی حس کے اشارے پر۔“ جی بے ساختہ ہی بول پڑا پھر غلطی کا احساس ہونے پر زبان دانتوں تلے دبالی۔
”جاسوسوں کی چھٹی حس عموماً بہت تیز ہوتی ہے۔ تم سچ مچ غلط نہیں تھے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ہمارا دادا پہلے چل گیا۔ نتیجتاً اب تم یہاں ہو۔“

”یہ سب تمہیں بہت مہنگا پڑے گا۔“ جی نے اسے دھمکایا۔
”ہم اس مٹھکے سودے کے لیے تیار ہیں۔“ وہ ذرا سا آگے جھکا اور جی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ جی نے اسے اپنے لیے چیلنج سمجھتے ہوئے خود بھی جواباً ایسا ہی کیا لیکن جلد ہی اسے ایسا لگنے لگا کہ مقابل کی آنکھوں کی چمک لیزر شعاعوں کی طرح اس کے اندر تک اترتی چلی جا رہی ہے۔ اس نے پلکیں جھپکا کر خود کو اس طلسم سے آزاد کروانے کی کوشش کی لیکن اسے تاخیر ہو چکی تھی اور وہ کسی حال میں آئی مچھلی کی طرح تڑپ کر رہ جانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

☆☆☆

’اتنی خوبصورت عورت کو تخلیق کرنے کے لیے خدا نے آخر کس جگہ کی مٹی کا انتخاب کیا ہوگا؟‘ سو نیا ملاقات کے لیے آئی بیٹھی تھی اور ماہ بانو اس کے بے مثال حسن کو دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں سوچ رہی تھی۔

”ہمارا ایک ساٹھی جی واکر کل سے غائب ہے جس پر یقیناً سخت تشویش محسوس کی جا رہی ہے اور میں اسی سلسلے میں آپ لوگوں سے معلومات حاصل کرنے آئی ہوں۔“ اس نے ان سے شناسائی کا اظہار کیے بغیر براہ راست گفتگو کا آغاز کیا۔ وہ جانتی تھی کہ یہاں دیواروں کے بھی کان ہیں اس لیے کسی چار دیواری کے اندر غیر محتاط گفتگو نہیں کر سکتی تھی۔

”مسٹر واکر کل ہمارے ساتھ ہی تھے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ہم ان کے ساتھ تھے۔ وہ کل ہمیں سچ پر لکلی وہی کا شو دکھانے لے گئے تھے۔ شو کے دوران میری مسز کی طبیعت خراب ہو گئی تو وہ ہمارے منع کرنے کے باوجود ہمیں اپنے ساتھ اپنی کار میں Rambam اسپتال تک لے گئے اور وہاں سے ہمیں یہاں ڈراپ کرنے بھی آئے تھے۔ ہمارے لیے یہ اطلاع حیرت انگیز ہے کہ وہ اب تک واپس نہیں پہنچے ہیں۔“ اسے جواب دینے کی ذمہ داری شہریار نے نبھائی۔

”آپ کون ہیں مسٹر واکر کی بیوی سے تو وہ بتا رہے

تھے کہ علیحدگی ہو چکی ہے۔“ ماہ بانو نے کسی عام گھریلو عورت کے سے تجسس کے ساتھ درمیان میں اپنا سوال داغا۔
 ”میں ان کی کوئی نہیں ہوں۔ میں صرف اپنی ڈیوٹی کر رہی ہوں۔“ سونیا نے ناگواری سے اسے جواب دیا اور پھر شہر یار کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولی۔
 ”ہمیں بیچ پر مسٹر واکر کی گاڑی کھڑی ملی ہے۔ گاڑی لاک تھی اور اس میں ان کے ریوالور سمیت ہر شے موجود ہے اس لیے یہ نہیں سوچا جاسکتا کہ وہ راہزنی کی کسی واردات کا شکار ہو گئے ہوں۔“
 ”ہو سکتا ہے وہ گاڑی بیچ پر کھڑی کر کے اپنی مرضی سے کہیں گئے ہوں۔“

”ایسی صورت میں بھی انہیں رابطہ تو کرنا چاہیے تھا۔ وہ ہر روز مخصوص اوقات میں مجھے کو اپنے بارے میں رپورٹ کرنے کے پابند ہیں۔“
 ”حیرت انگیز۔ پرانی اور یادگار عمارتوں کی دیکھ بھال کرنے والے سرکاری ادارے کے ملازمین پر ایسی سختی تو میں نے دنیا بھر میں کبھی نہیں سنی۔“ اس نے حیرت کا اظہار کیا۔

”یہ اسرائیل ہے مسٹر مراد! یہاں ہم ہر وقت حالت جنگ کی سی صورت حال سے دوچار رہتے ہیں اس لیے ہمیں اپنے شہریوں کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے۔“
 ”جان کر خوشی ہوئی لیکن افسوس کہ میں آپ کو جتنا بتا چکا ہوں، اس سے زیادہ آپ کی معلومات میں اضافہ نہیں کر سکتا۔“ اس نے بھی ہاتھ کھڑے کر لیے۔

”کل آپ لوگ Rambam اسپتال پہنچنے کے بعد اسپتال کے اندر کیوں نہیں گئے تھے حالانکہ مسٹر واکر کی گاڑی کافی دیر تک وہاں کھڑی رہی تھی؟“ اس نے نیا سوال داغا تو شہر یار کے چہرے پر شرمندگی اور ماہ بانو کے چہرے پر خجالت دکھائی دینے لگی۔ آخر شہر یار ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔

”اس کے پیچھے میری بیوی کا ہاتھ تھا۔ جس پیٹ درد کی وجہ سے یہ ہمیں نیلی وہبی کے شاندار شو سے اٹھا کر لائی تھی، وہ اسپتال کے قریب پہنچتے ہی ختم ہو گیا تھا۔ اسپتال کے سامنے کھڑے میں اور مسٹر واکر اسے اسی بات پر قائل کرنے کی کوشش کرتے رہے تھے کہ بے شک ابھی درد مچ ہو گیا ہے لیکن اسے اندر چل کر چیک اپ کروالینا چاہیے۔ بس اسی بحث مباحثے کی وجہ سے کافی وقت لگ گیا اور آخر کار ہم دو مردوں کو ایک ایسی خاتون سے شکست کھا کر

واپس کی راہ اختیار کرنا پڑی۔“

”سی سی ٹی وی کیمرے آپ کے بیان کی تصدیق کر رہے ہیں۔ یہ بھی اندازہ ہو رہا ہے کہ آپ لوگوں کو ڈراپ کرنے کے بعد مسٹر واکر دوبارہ شواہجائے کرنے پر چلے گئے تھے لیکن وہ شو میں نہیں پہنچے اور سوال یہی ہے کہ جب وہ وہاں نہیں پہنچے تو پھر کہاں گئے؟“

”آئی ایم سوری! ہم خود بھی مسٹر واکر کے لیے پریشانی محسوس کر رہے ہیں لیکن ہم اس سلسلے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔“ شہر یار نے جواب دیا لیکن اب وہ اس کے بجائے اپنے بچتے ہوئے فون کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔
 ”ہاں، میں نے ان میاں بیوی کو انویسٹی گیٹ کر لیا ہے۔ انہوں نے جی کی اسے ساتھ کل رات موجودگی کی تصدیق کی ہے لیکن مجھے یہ لوگ اس کے غیاب میں ملوث دکھائی نہیں دیتے۔ بیوی تو بلکہ کچھ اجتناب سے ہے۔“ وہ عبرانی میں گفتگو کر رہی تھی اس لیے آرام سے ماہ بانو کے بارے میں تبصرہ کر دیا تھا۔ اس تبصرے کے بعد اس نے خاموشی اختیار کی اور توجہ سے دوسری طرف کی بات سننے لگی۔

”یہ بالکل نان سیریس اور نان پروفیشنل رویہ ہے۔ جی کو اس کے لیے جوابدہ ہونا پڑے گا۔“ اس بار اس کے لہجے سے برہمی جھلکنے لگی تھی۔

”خواتنواہ اس کی وجہ سے میں شریف لوگوں کو پریشان کرتی پھر رہی ہوں۔ خیر، بند کرو۔ میں واپس آ کر دیکھتی ہوں۔“ اس نے سلسلہ منقطع کر دیا اور پھر ان دونوں کی طرف مسکراتے ہوئے کچھ شرمندہ سے لہجے میں بولی۔

”جی واکر واپس آ گیا ہے۔ اس کے مطابق وہ نیلی کے شو کے لیے واپس بیچ پر گیا تھا لیکن وہاں اسے اپنی گرل فرینڈ مل گئی۔ وہ اس کے ساتھ اس کے اپارٹمنٹ پر چلا گیا۔ وہاں انہوں نے بہت زیادہ پولی لی اس لیے اسے مقررہ وقت پر اپنے آفس رپورٹ کرنا یاد نہیں رہا۔ رت جکے اور کثرت شراب نوشی کے باعث وہ اور اس کی گرل فرینڈ دن بھر پڑے سوتے رہے۔ اب کہیں جا کر موصوف حواسوں میں واپس آئے ہیں تو آفس رپورٹ کی ہے۔ میں آپ دونوں سے معذرت خواہ ہوں کہ بلاوجہ آپ کو زحمت دی۔“

”اٹس اوکے۔ اس بہانے ہمیں ایک خوبصورت اور مہذب خاتون سے ملاقات کا موقع تول گیا۔“ بچان شہر یار بھی اسے چکا تھا اس لیے موقع ملنے پر جتا دیا۔ اصل میں سخت نگرانی کی وجہ سے سونیا کی حیثہ میں موجودگی کا علم ہونے کے باوجود ملاقات کی کوئی صورت ہی نہیں بن رہی

ہمارے مشن سے ہی ہے؟“
”براہ راست تو نہیں لیکن ہے بہر حال اہم بات۔
خصوصاً اس لیے بھی کہ تمہارا دوست ملک جس پر تم اندھا
اعتماد کرتے ہو، اس معاملے میں اسرائیل کے ساتھ مل کر کام
کر رہا ہے۔“ اس نے شہریار کے کانوں میں خطرے کی گھنٹی
بجائی اور ہاتھ ہلا کر اس گاڑی میں سوار ہو گئی جس کی
ڈرائیونگ سیٹ پر سادہ لباس میں بھی فوجی دکھائی دینے والا
بندہ موجود تھا۔ گاڑی وہاں سے چلی گئی لیکن پیچھے شہریار کے
ذہن میں کئی سوال زہ گئے۔

☆☆☆

”ہیلو کیلی اینڈ ٹیلی! یہ میری دوست سونیا ہے۔ سونیا
کو تم سے ملنے کا اشتیاق تھا اس لیے میں اسے یہاں لایا
ہوں۔“ آج پھر وہ اینڈریو کے ساتھ اس چھوٹے سے
مصنوعی برف زار میں کھڑی تھی اور اینڈریو مادہ جی سے اس
کا تعارف کروا رہا تھا۔ اس کا انداز بالکل ایسا تھا جیسے کسی
اپنے جیسے انسان سے مخاطب ہو۔ ان مادہ جی کے رد عمل نے
سونیا کی حیرت میں مزید اضافہ کر دیا۔ انہوں نے منہ سے
خونیا نے جیسی آوازیں نکالیں پھر منہ بناتے ہوئے اپنے
رخ ایسے موڑ لیے جیسے ناراضی کا اظہار کر رہی ہوں۔
”اوکے، اوکے۔ میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے ناراض
ہو اور جانتا چاہتی ہو کہ تمہارا دوست کب یہاں پہنچ رہا ہے۔
تو تمہارے لیے میرے پاس خوشخبری ہے کہ وہ روانہ ہو چکا
ہے اور کل یہاں تمہارے پاس ہوگا۔“ پروفیسر نے ہنستے
ہوئے انہیں اطلاع دی تو انہوں نے رخ بدل کر جلدی
سے یوں اس کی طرف دیکھا جیسے اس کا کہا ہر لفظ اچھی طرح
سن اور سمجھ چکی ہوں۔

”تم دونوں میری اتنی لاڈلی ہو، میں نے آج تک
تمہاری ہر ضرورت کا خیال رکھا ہے تو یہ کیسے ممکن تھا کہ تمہاری
زندگی کی اتنی اہم ضرورت سے غافل رہتا۔ مجھے کچھ وقت
لگ گیا لیکن دیکھو، میں نے تمہارا ساٹھی ڈھونڈ ہی نکالا۔ اب
تم دونوں اس کے ساتھ رہنا اور ڈھیروں ڈھیر بچے پیدا کرنا۔
ہم تمہارے بچوں کے پیارے پیارے نام رکھیں گے اور جو
کچھ تمہیں آتا ہے اس کے علاوہ بھی انہیں بہت کچھ سکھائیں
گے۔ مجھے یقین ہے کہ تمہاری آنے والی نسلیں انسان سے بھی
زیادہ ذہین، ماہر فنون اور طاقتور ہوں گی۔“ پروفیسر ایسے ان
کے سامنے بول رہا تھا جیسے کوئی مونیویشنل اسپیکر اپنے سامعین
کے سامنے تقریر کر رہا ہو اور حیرت انگیز طور پر وہ بھی اسی
طرح سن رہی تھیں جیسے سامعین اپنی تقدیر بدل جانے کی

تھی اور اب جی واکر کی وجہ سے یہ موقع مل گیا تھا۔
”تھینکس فار داکٹمنٹ! ویسے بیگم کی موجودگی میں
کسی دوسری خاتون کی تعریف کرنے کے لیے بڑے حوصلے
کی ضرورت ہوتی ہے۔“ سونیا نے پہلے اس کا شکریہ ادا کیا
پھر ماہ بانو کی طرف دیکھتے ہوئے شرارت سے بولی۔
”میری بیگم جانتی ہے کہ سامنے مس وزلڈ بھی کھڑی ہو
تو میں اس کی تعریف بالکل ویسے ہی کروں گا جیسے کسی حسین
منظر یا شاہکار پینٹنگ کو سراہا جاتا ہے۔ میرا اصل اور سچا
عشق صرف اور صرف یہی ہے۔“ شہریار نے ماہ بانو کے
شانے پر ہاتھ پھیلا کر بہت سچائی سے کہا۔

”اتنی انوسینٹ اور سادہ لڑکی اسی خلوص کی حق دار
ہے۔“ سونیا نے بھی جواباً محض لفاظی نہیں کی تھی۔
”تھینک یو سوچ۔“ ماہ بانو نے شرمیلی مسکراہٹ کے
ساتھ اس کا شکریہ ادا کیا۔

”مجھے آپ لوگوں سے مل کر بہت اچھا لگا۔ اگر
میرے پاس وقت ہوتا تو کچھ وقت مزید آپ کے ساتھ گپ
شب کر لیتی۔ فی الحال مجھے چانا ہوگا۔“ اس کے پاس مزید
وہاں رکنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی، سوا اجازت چاہی۔

”ہم کچھ دن مزید حیفہ میں ہی ہیں۔ یہاں سے
یہ دشلم اپنے میزبان کے پاس چلے جائیں گے۔ اس دوران
اگر آپ چاہیں تو ہم سے ملاقات کر سکتی ہیں۔“ اس بار ماہ
بانو نے اسے پیشکش کی۔

”اگر وقت ملا تو ضرور۔“ اس نے مسکراتے ہوئے
مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

”آئیں، میں آپ کو گاڑی تک چھوڑ آؤں۔“ کھلی
جگہ پر چند باتیں کرنے کے خیال سے شہریار اس کے ساتھ
ہولیا۔

”سنہری موم بتی کے روشن ہو جانے کے بعد میں
ایسے ہی کسی چٹکار کی امید رکھ سکتی تھی۔ تھینک گاڈ تم لوگ
ٹھیک کی زد میں آ کر بھی بچ گئے۔“

”سب کچھ سوچ سمجھ کر کیا گیا تھا۔ اب تمہارے علاوہ
جی واکر خود بھی اپنے دفتر کو ہمارے بارے میں یہی
رپورٹ دے گا کہ ہم ہر طرح سے کلینر ہیں۔“ شہریار نے
اس کے ساتھ ساتھ چلتے مسکرا کر جواب دیا۔

”میرے پاس کچھ بہت حیرت انگیز معلومات ہیں جو
میں فی الحال تو تمہیں نہیں دے سکتی لیکن جلد گولڈن کیڈل
تک پہنچا دوں گی۔“

”ہمیں انتظار رہے گا۔ ویسے کیا ان معلومات کا تعلق

امید کے ساتھ ایسی لفاظی کو سنتے ہیں۔

اور مڑ کر اپنے سہل کے پیچھے بنے اس سفید دروازے کو کھول کر نظروں سے اوجھل ہو گئیں جو سرسری نظر میں دکھائی بھی نہیں دیتا تھا۔

”ان کے لیے سن ہاتھ کیوں؟“ سونیا نے تعجب سے پوچھا۔
 ”وہ اس لیے کہ یہ بے شک بہت سرد ماحول میں رہتی ہیں لیکن اس ماحول میں انہیں قدرتی طور پر سورج کی روشنی بھی ملتی رہتی ہے۔ ہم یہاں اس جگہ تو ان کے لیے مستحق ایسا انتظام نہیں کر سکتے لیکن ایک ڈاکٹر کے مشورے سے دن میں کچھ دیر سن ہاتھ دینے کا انتظام کر دیا ہے۔ یہ اس روٹین کی عادی ہو چکی ہیں۔ اگر کبھی میں یا ان کا رکھوالا یہاں نہ آسکیں تو وقت پر اوپر سے ہی کھنی بجا کر انہیں اطلاع کر دی جاتی ہے اور یہ خود یہ کام کر لیتی ہیں۔“ پروفیسر اینڈریو نے اسے تفصیلاً آگاہ کیا۔

”ویسے آپ نے انہیں بہت زبردست ٹریننگ دی ہے۔ میں ششدر ہوں کہ وہ کیسے ہماری ایک ایک بات سن اور سمجھ رہی تھیں۔ ان کے ری ایکشنز..... مائی گاڈ! یہ بہترین تربیت یافتہ کتوں سے بھی بہت آگے ہیں۔“ اب وہ لوگ لفٹ کے ذریعے واپسی کا سفر شروع کر چکے تھے۔

”وہ اس لیے مائی ڈارلنگ کہ ایک تو یہ قدرتی طور پر ہی بہت ذہین اور انسانوں سے نزدیک تر ہیں۔ دوسرے میں نے اپنا ہنر آزما کر بھی ان کے دماغ کی ترقی پر بہت کام کیا ہے۔ آنے والے وقتوں میں یقیناً تم ان کی بولنے والی نسل بھی دیکھو گی۔“ اینڈریو نے دعویٰ کیا۔

”اور یقیناً یہ سائنس کی دنیا میں ایک انقلاب بلکہ معجزہ ہو گا۔“ سونیا نے اسے سراہا۔ وہ پروفیسر کی اس فطرت کو سمجھ چکی تھی کہ اسے اپنے کام کے بارے میں بات کرنے اور اسے سراہتے رہنا بہت پسند ہے۔

”انقلاب تو میں پہلے ہی بپا کر چکا ہوں۔ تم انہیں ہتھیاروں کو استعمال کرتے اور بالکل ٹارگٹ پر نشانہ لگانے ہوئے دیکھو گی تو مزید حیران رہ جاؤ گی۔“

”یعنی یہ گنز بھی چلانا جانتی ہیں؟“ سونیا نے سر پر موجود اونی ٹوپی اتارتے ہوئے قصدِ حیرت کا اظہار کیا۔ وہ دونوں اب چھٹنگ روم میں موجود تھے اور اس گرم لباس سے نجات حاصل کر رہے تھے جو کیلی، شیلی سے ملاقات کے لیے جاتے ہوئے لاڈا پہننا پڑتا تھا۔

”گنز.....!“ اینڈریو تقاضا سے ہنسا۔
 ”یہ ہینڈ گریینیڈ اور راکٹ لانچر بھی چلا سکتی ہیں۔ میں نے شاید تمہیں بتایا تھا کہ ایک بہترین کمانڈر کی عمرانی

”مجھے امید نہیں تھی کہ اتنی بڑی اطلاع پر تم دونوں کا رد عمل اتنا ٹھنڈا ہو گا۔ کچھ تو جوش دکھاؤ تاکہ میری دوست کا یہ شک دور ہو کہ میں نے تم دونوں کے متعلق سچی میں آکر ضرورت سے کچھ زیادہ ہی دعوے کر دیے تھے۔“ اینڈریو نے ان سے مطالبہ کیا تو انہوں نے پہلے قدرے ناراض نظروں سے سونیا کو دیکھا پھر اینڈریو کی طرف دیکھ کر مسکرانے کے انداز میں اپنی باجھیں پھیلائیں اور زور زور سے تالیاں بجانے لگیں۔ سونیا نے بھی بے ساختہ ان کے ساتھ تالیاں بجانا شروع کر دیں۔ کچھ بھی تھا، ایک غیر انسانی مخلوق کا اتنا بھرپور اظہار اور رد عمل قابلِ تحسین تھا۔

سونیا کو تالیاں بجاتے دیکھ کر وہ مزید خوش ہو گئیں اور جوش میں اچھل کود کرنے لگیں۔ ان کی اپنے بھاری جشوں کے ساتھ یہ اچھل کود برف کی موجودگی کے باوجود زمین میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی جسے سونیا اور اینڈریو اپنی جگہ کھڑے ہو کر بھی محسوس کر سکتے تھے۔

”بس، اب رک جاؤ۔ میری دوست کو یقین آ گیا ہے کہ واقعی تم دونوں بہت اہمارت ہو۔“ اینڈریو نے انہیں ہکا کر کہا تو ان کی حرکتوں سے محظوظ ہوتی سونیا نے یہ منظر دیکھا کہ وہ یکدم ایسی ساکت ہو گئیں جیسے کسی نے ان کا سوچ آف کر دیا ہو۔

”کیلی اور شیلی! تم دونوں تو واقعی بہت ذہین اور فرمانبردار ہو۔ میں اینڈریو سے ریکویسٹ کروں گی کہ وہ جب میرا دل چاہے، مجھے تم سے ملنے دے۔ کیا تم دونوں مجھ سے دوستی کرو گی؟“ ان دونوں کی تعریف کرتے کرتے اس نے ان سے پوچھا تو انہوں نے فوراً اپنے اپنے ہاتھ یوں سلاخوں کے درمیان سے نکال کر آگے بڑھا دیے جیسے دوستی کا آغاز کرنے کے لیے مصافحہ کرنا چاہتی ہوں۔ ان کے بالوں بھرے بڑے بڑے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے سونیا ذرا سے تذبذب کا شکار ہو گئی لیکن پھر خود بھی اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر پہلے کیلی اور پھر شیلی سے مصافحہ کیا۔ ان کے ہاتھ کھردرے اور سخت ضرور تھے لیکن انہوں نے سونیا کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ کی گرفت نرم ہی رکھی تھی۔

”ٹھیک ہے، پھر کل تمہارے دوست کے ساتھ تم دونوں سے ملاقات ہو گی۔ فی الحال تمہارے سن ہاتھ کا وقت ہو گیا ہے۔ تم دونوں اپنے سن ہاتھ والے چیمبر میں جاؤ اور سکون سے سن ہاتھ لو۔“ اینڈریو نے انہیں نئی ہدایت دی تو انہوں نے ”ہائے“ کہنے کے انداز میں اپنے ہاتھ ہلائے

میں یہ بے حد عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کر سکتی ہیں۔“
 ”حیرت انگیز بلکہ غیر یقینی۔“ سونیانے اپنا گرم لباس
 یہ کر کے الماری میں رکھتے ہوئے ایک بار پھر اپنی حیرت کا
 اظہار کیا۔ انہوں نے اپنے عام ملبوسات کے اوپر ہی یہ گرم
 لباس پہن لیے تھے اس لیے انہیں آرام سے وہیں کھڑے
 کھڑے اتار دیا تھا۔

”اتنا کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد بھی غیر
 یقینی کا شکار ہو؟“ پروفیسر مسکرایا۔

”حیرت کی انتہا پر ہوں کہ آپ نے کیا کمال دکھایا
 ہے۔“ سونیانے اسے خوش کرنے کے لیے مزید تعریف کی
 پھر کچھ خیال آنے پر پوچھا۔

”لیکن وہ جو نریتی چین سے لایا جا رہا ہے، وہ تو ہماری
 کیلی، شلی جتنا ذہین اور تربیت یافتہ نہیں ہوگا۔ تو کیا یہ خدشہ
 نہیں ہے آپ کے دل میں کہ اس کے ذریعے پیدا ہونے
 والی نسل اتنی ذہین نہیں ہوگی جتنی آپ توقع کر رہے ہیں۔“

”کم چین والوں کو بھی نہ سمجھو۔ ان کے پاس جو نریتی
 ہے، اس پر ڈاکٹر یوان منگ ذاتی طور پر بھی کچھ تجربات کرتا
 رہا ہے۔ کچھ ٹیس میں اسے بے کر آیا ہوں تو سمجھوتر پر بھی
 خاصا کام ہوا ہے۔ باقی ہم پریکٹس کے دوران فیس بر اور
 آفر ڈیلیوری بے بیز پر بھی کام کریں گے تو اچھے نتائج کی
 امید کی جاسکتی ہے۔“ پروفیسر بہت پُر امید تھا اور سونیانے اس
 کے بوڑھے وجود میں ایک خاص جوش اور توانائی محسوس
 کر رہی تھی۔ یقیناً نریتی کی آمد کی خبر میں اسے اپنا برسوں کا
 خواب پورا ہونے کی امید دکھائی دے رہی تھی۔

”اپنے حسین ہاتھوں سے ایک پیگ تو بنا کر پلا دو۔
 میں کچھ ٹھکن سی محسوس کر رہا ہوں اور آج اس خوشی کے موقع
 پر ٹھکن کو خود پر حاوی ہونے کا موقع دینے کے بجائے جشن
 منانا چاہتا ہوں۔“ باتیں کرتے کرتے وہ دونوں اینڈریو کی
 خواب گاہ میں پہنچ گئے تھے اور اینڈریو نے ایک آرام دہ
 صوفے میں دھنستے ہوئے اس سے یہ فرمائش کی تھی۔

”کیوں نہیں۔“ سونیانے اٹھلائی ہوئی کمرے کے کونے
 میں بنے بار کاؤنٹر کی طرف بڑھ گئی۔ اب اس کی اینڈریو کی
 طرف پیٹھ ہو چکی تھی۔ اس نے چپکے سے اپنی بیلٹ کے ساتھ
 لٹکتے بھجور پر ایک ٹن دبایا۔ یہ اس آدمی کے لیے اشارہ تھا
 جسے وہ یہاں آتے ہوئے کچھ ہدایات دے کر آئی تھی۔

”زحمت کے لیے معذرت چاہتا ہوں مادام لیکن
 یہاں فوری طور پر آپ کی ضرورت ہے۔“ وہ پیگ تیار
 کر کے پروفیسر کی طرف آ رہی تھی جب ایک پیپ کے ساتھ

یہ پیغام نشر ہوا۔ پروفیسر نے بھی یہ پیغام سنا اور بد مزہ سا
 ہو کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”یہ کیا بے ہودگی ہے؟“
 ”کوئی اہم وجہ ہوگی ورنہ وہ مجھے یوں ڈسٹرب کرنے
 کی ہمت نہیں کر سکتے۔“ سونیانے اسے بہلایا۔

”میں سمجھتا ہوں۔“ اس بار اینڈریو نے سمجھ داری
 سے سر ہلایا پھر جانے کیا خیال آنے پر بولا۔

”بھئی بھئی میرے دل میں خیال آتا ہے کہ اگر تم مجھے
 جوانی میں ملی ہو تیں اور میں تم سے شادی کر لیتا تو تمہارے
 حسن اور میری ذہانت سے مل کر کیا شاہکار اولاد جنم لیتی۔“

”ملی تو مگی میری ماں، ان سے کر لیتے۔“ سونیانے
 ”وہ خوب مگی پر تم خوب تر ہو۔“ اینڈریو سچ مچ اس
 پر عاشق ہو چکا تھا۔

”اب تو آپ کی ٹرین نکل چکی۔“ سونیانے ہنس کر کہا
 اور ہوا کے جھونکے کی طرح باہر نکل گئی۔ وہ باہر نہ نکلی تھی گویا
 چکنی پھولی کی طرح پروفیسر کے ہاتھ نے پھسل گئی تھی۔

☆☆☆

سرخ رنگ کی بایک بڑی روانی سے کارل پہاڑی
 کی چڑھائیوں پر دوڑتی جا رہی تھی۔ بایک پر دوسرا موجود
 تھے۔ آگے والے سوار نے سرخ ٹریک سوٹ پہن رکھا تھا
 اور اس کے سر پر سرخ اور سیاہ رنگ کا ہیلمٹ موجود تھا۔ یہ
 ہیلمٹ مکمل طور پر بند تھا اور اوپر کے حصے میں موجود شیشے
 سے صرف سوار کی آنکھیں اور ناک کا کچھ حصہ دکھائی دے
 رہا تھا۔ اس کے ہینڈل پر بنے ہاتھوں میں دستانے موجود
 تھے اور پیروں میں مضبوط جو گرز۔ دور سے دیکھنے پر کسی کو

بھی اس بایکر کے رنگ روپ، قومیت یا صنف کا اندازہ
 نہیں ہو سکتا تھا البتہ اس کے پیچھے نیلے ٹریک سوٹ میں
 موجود سوار کی شخصیت بالکل نمایاں تھی۔ وہ دراز قد کا مالک
 ایک دبلا پتلا آدمی تھا جس کی عمر لگ بھگ چھتیس سینتیس سال
 تھی۔ اس کی گندی رنگت، سیاہ بال اور مخصوص نین نقش
 گواہی دے رہے تھے کہ وہ اسی خطے سے تعلق رکھتا ہے۔

اس نے سر پر دھوپ سے بچنے کے لیے سرخ رنگ کی پلی
 کیپ لگا رکھی تھی اور اس کے شانے سے ایک بڑا رک سیک
 لٹک رہا تھا۔ ان دونوں کو دیکھ کر صاف اندازہ لگایا جاسکتا تھا
 کہ وہ ان منچلوں میں سے ہیں جو کارل کوست فاریسٹ
 (کارل کا ساحلی جنگل) میں کیسپنگ کا لطف اٹھانے کے
 لیے یہاں کارخ کرتے ہیں۔

”کیا کر رہی ہو امی! اگر تم اسی خطرناک طریقے سے

بڑی بے چارگی تھی۔

”زیادہ باتیں مت بناؤ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مجھے مگنی کی انگوٹھی پہناتے ہوئے تم نے صاف الفاظ میں مجھ سے کہا تھا کہ یاد رکھنا امی! میں تم سے محبت کی شادی ضرور کرنے جا رہا ہوں لیکن میرا پہلا حق میرا کام ہے۔ میرے لیے ایک تجربہ گاہ دنیا کی بہترین سے بہترین تفریح گاہ سے بھی زیادہ خوبصورت و خوش کن مقام ہے۔“

”وہ تو شادی سے پہلے کی بات ہے نا۔ یہ تو مجھے شادی کے بعد پتا چلا ہے کہ تم سے دور رہنا دنیا کا سب سے مشکل کام ہے۔“ وہ ہر مرد کی طرح اسے لفظوں کے جال میں الجھ کر رام کر لینا چاہتا تھا۔

”کتنا مشکل کام ہے، یہ تو مجھے تمہارے طرز عمل سے صاف پتا چلتا ہے۔ تم بے قرار ہو کر دن میں دسیوں بار مجھے کال کرتے ہو۔ اٹھتے، بیٹھتے، سوتے، جاگتے مجھے تمہارے میسجز موصول ہوتے ہیں اور چھٹی..... اس کا تو تم بہانہ تلاش کرتے ہو۔ تمہارے ادارے کے عملے میں تم ہی وہ شخص ہو جس کا نام چھٹیاں لینے والوں میں سرفہرست درج ہے۔“ آمنہ نے ایک کے بعد ایک ایسے طرز کے تیر چلائے کہ یک پی کیپ اتار کر خجالت سے اپنا سر کھجانے لگا۔ یہ حقیقت تھی کہ شادی کے بعد وہ اپنی پیشہ ورانہ مصروفیت کی وجہ سے آمنہ کو خاطر خواہ وقت دینے سے قاصر تھا۔ کارل کا یہ ٹرپ بھی آمنہ نے شادی کے اوائل دنوں میں پلان کیا تھا لیکن اسے اتنی ہمت ہی نہیں مل سکی تھی کہ اس کی یہ فرمائش پوری کر پاتا۔ وہ شادی کے بعد زیادہ تر آمنہ سے دور ہی رہا تھا۔ کبھی کبھی چھٹیوں پر گھر آتا تھا تو اتنا ٹکان زدہ ہوتا تھا کہ کہیں جانے کی ہمت نہیں ہوئی تھی لیکن اب آمنہ کے باقاعدہ ناراضی کے اظہار کے بعد وہ مجبور ہو گیا تھا کہ اوپر والوں سے بات کر کے کچھ دن کی چھٹیاں لے لے اور اپنی شادی کو ٹوٹنے سے بچائے۔

اس نے اپنی زندگی کے چھتیس سال کتابوں اور سائنسی آلات کے ساتھ بخوشی گزارے تھے۔ تقریباً آٹھ سال پہلے اس کی ماں اکلوتے بیٹے کی شادی کی خواہش دل میں لیے دنیا سے سدھار گئی تھیں لیکن اس نے شادی کے متعلق کچھ نہیں سوچا تھا۔ یہ صرف اور صرف آمنہ تھی جس نے اس کی سوچوں کا رخ اچانک بدل کر رکھ دیا تھا اور اس کے دل میں کسی کو اپنی زندگی میں شامل کرنے کی خواہش جاگی تھی۔

آمنہ سلا ایرانی تھی اور بہائی فرقے سے تعلق رکھتی تھی۔ آمنہ کا چچا احتشام برسوں سے جیل میں رہ رہا تھا اور

ہائیک چلائی رہی تو ہم اوپر کھینچنے کے بجائے پھسل کر سیدھے پہاڑ کے دامن میں جا کر رہ گئے اور اگر اس کے بعد زندہ بچ گئے تو ہماری ہڈیاں کئی حصوں میں تقسیم ہو چکی ہوں گی۔“ تیز رفتار ہائیک ایک مقام پر دور سے لہرائی تو پیچھے بیٹھا شخص جھج پڑا۔ جواب میں سرخ ٹریک والے سوار کے ہونٹوں سے ایک سرخ لہجہ نکل کر فضا میں بکھرا اور کم از کم اتنا کفرم ہو گیا کہ وہ ہائیکر اصل میں ایک منسوب نازک ہے۔

”میں تمہیں عقل کی بات سمجھا رہا ہوں اور تم ہنس رہی ہو۔“ مرد نے اس کو ڈپٹا لیا لیکن انداز ایسا تھا جیسے کوئی بزرگ بحالت مجبوری اپنے کسی لاڈلے بچے کو دل پر جبر کر کے سرزنش کر رہا ہو۔

”بے فکر ہو، میں ہرگز بھی تمہیں یہاں سے گر کر مرحوم نہیں ہونے دوں گی۔ تمہارے اس محض 550 میٹر بلندی والے پہاڑ سے گر کر مرنا اور مارنا آمنہ دی گریٹ کی اپنی بے عزتی ہے۔ میں تمہیں بھی کہیں سے لے کر گری بھی تو وہ جگہ ایورسٹ یا پھر کم سے کم کے ٹوکی چوٹی ہوگی۔“ لڑکی کے لہجے میں بے فکرگی اور شوخی تھی اور شاید اس رویتے کے پیچھے اس کی کم عمری کا دخل تھا۔ وہ محض اکیس سال کی تھی۔ اپنے سینتیس سالہ شوہر تک ابراہم سے پورے سولہ سال چھوٹی اور یہ عمروں کا تفاوت ہی تھا جو تک کو ضرورت سے زیادہ نرمی اور آمنہ کو مزید شوخی پر اکساتا تھا۔ ویسے بھی ابھی ان کی شادی کو ایک سال بھی پورا نہیں ہوا تھا اور وہ فی الحال کو برڈز بنے ایک دوسرے پر غبار ہوتے ہی دکھائی دیتے تھے۔

”ابھی ہم ساتھ مل کر جے ہی کتنے ہیں کہ تم مرنے مارنے کی باتیں کرنے لگیں۔“ تک نے ذرا سا آگے ہو کر کوئی شوخ جسارت کرنی چاہی لیکن کارل والے اپرا اور گردن کے اوپر جے ہیلنٹ نے اس کے لیے کہیں کوئی منجائش نہیں چھوڑی تھی۔ اس نے بد مزہ ہو کر سر پیچھے کر لیا۔ آمنہ سے یہ بات چھپی نہیں رہ سکی اور اس نے ایک اور سرخ لہجہ لگا دیا۔ پرندوں کی چھبھاہٹ میں ضم ہو کر اس قہقہے نے کارل کے سرور کو مزید بڑھا دیا۔ ویسے بھی سنا تھا کہ یہاں آس پاس بھی انگوروں کے باغات کی بہتات ہوتی تھی اور کارخانوں میں کثرت سے بہترین شراب کشید کی جاتی تھی۔ اس شراب کا نشہ اب بھی فضا میں بسا ہوا تھا۔

”قسمت تو مجھ بے چارے پر ہنسی ہی ہے، اب تم بھی ہنس لو۔ میرے سوا بھلا کون بد نصیب ہوگا جو اپنی اتنی حسین اور نئی نوعی دلہن کو چھوڑ کر تجربہ گاہوں کے خشک اور بور ماحول میں دن رات گزارتا ہو۔“ تک کے لہجے میں



ایک مرتبہ حضرت ابراہیم بن اہم حمزہ علیہ السلام نے ایک غلام خریدا مگر پہنچ کر اس غلام سے پوچھا: کیا کھاؤ گے؟

غلام نے جواب دیا: ”جو کھلاؤ گے۔“

پوچھا: ”کیا پہنوں گے؟“

جواب دیا: ”جو پہناؤ گے۔“

پوچھا: ”کیا نام ہے؟“

جواب دیا: ”جس نام سے بلاؤ گے۔“

پوچھا: ”کیا کام کرو گے؟“

جواب دیا: ”جو کام کراؤ گے۔“

پوچھا: ”کوئی درخواست؟“

جواب دیا: ”غلام کو درخواست سے کیا کام؟“

یہ سن کر حضرت ابراہیم بن اہم نے اپنا گریبان پھینک دیا اور اپنے آپ سے بولے: ”اے عاجز و کمزور! اپنی عمر میں تو بھی اپنے مالک رب رحیم و کریم سے اسی طرح پیش آ یا کہ جس طرح یہ غلام کرتا ہے۔“

مرسلہ: مستور افضل کرچی

چہرہ حسب معمول بغیر میک اپ کے بھی جگمگا رہا تھا۔ اس کے گہرے براؤن باب کٹ بال چہرے کی رنگت اور ساخت کے ساتھ بہت چمکتے تھے اور اس وقت تو وہ سرخ ٹریک سوٹ میں کارل کے سبزے کے پیش منظر میں کھڑی اور بھی رچ رہی تھی۔

”مجھے معلوم ہے کہ میں حسین ہوں لیکن اس وقت میرے حسن کے نظارے سے زیادہ خیمہ کھڑا کرنا ضروری ہے تاکہ ہم اپنا سامان سیٹ کرنے کے ساتھ ساتھ شب بصری کا معقول انتظام بھی کر سکیں۔“ اس نے تک کو اس کی محویت پر ٹوکا اور فلاسک سے کپ میں کافی انڈیل کر ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ گئی۔ نیچے قصبات وغیرہ میں کافی ریسٹوران اور کھانے پینے کی چیزوں کی کثیر اقسام مل جاتی تھیں لیکن اس مقام پر ایسی کوئی سہولت نہیں تھی اس لیے سیاحوں کو ہدایت دی جاتی تھی کہ وہ اپنے ساتھ کم سے کم دو لیٹر پانی، کھانے پینے کی وہ اشیاء جو دیر تک چل سکیں اور جلدی

تک کا اچھا دوست تھا۔ آمنہ کا باب ابتسام ان بہانیوں میں سے تھا جنہوں نے ایران میں مشکل حالات کے باوجود وطن سے ہجرت کرنا گوارا نہیں کیا تھا۔ آمنہ کی ماں اس وقت فوت ہو گئی تھی جب وہ محض سولہ سال کی تھی لیکن ابتسام جو شروع ہی سے ہر قدم پر اپنی اکلوتی بیٹی کی راہنمائی کرتا رہا تھا، اس مشکل وقت میں بیٹی کا سہارا بن گیا اور اسے ماں کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ آمنہ بیس سال کی تھی جب ابتسام کا بھی بلاوا آ گیا۔ یہ آمنہ کے لیے بہت بڑا صدمہ تھا اور ایران میں ایسا کوئی قریبی رشتے دار موجود نہیں تھا جو ان مشکل حالات میں اس کا ساتھ دیتا اور اس کی دلجوئی کی کوشش کرتا۔ احتشام نے ایسے وقت میں بھی کوتاہی چھوڑنا گوارا نہ کیا اور اپنی تمام تر توانائیاں خرچ کر کے اسے اپنے پاس حیفہ لے آیا۔ ابتدا میں تک کو آمنہ سے ہمدردی تھی لیکن یہ ہمدردی بہت تیزی سے محبت میں بدل گئی اور وہ آمنہ کو اپنی کہہ کر پکارنے لگا۔ شاید یہ باپ سے جدائی کا اثر تھا کہ آمنہ نے عمر کے بڑے فرق کے باوجود تک کی محبت کو قبول کیا اور خود پر چھائی اداسی کی دھند سے نکلنے میں کامیاب ہو گئی۔ مذہب کا فرق ڈسکس ہی نہیں ہوا کہ دونوں ہی زیادہ مذہبی رجحان رکھنے والے افراد نہیں تھے۔ احتشام مذہبی رسوم اور تقاریب میں شرکت کرنے والا انسان تھا لیکن اول تو اس کے فرقے میں دوسرے مذاہب کے لیے بہت زیادہ گنجائش موجود تھی، دوم وہ کسی کی شخصی آزادی میں مداخلت کا قائل نہیں تھا اس لیے بیٹی کے فیصلے پر بھی کوئی اعتراض نہ کیا۔

آمنہ اور تک کی شادی اچھی چل رہی تھی لیکن تک کی حد سے بڑھی ہوئی پیشہ ورانہ مصروفیات آمنہ کو بھی بیزار بھی کر دیتی تھیں اور اس کی طرف سے شدت سے تنہائی کا شکوہ ہونے لگتا تھا۔ اس مسئلے کا تک نے ایک حل تو یہ نکالا تھا کہ اس کی تعلیم کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا تھا۔ اس سے اسے مصروفیت بھی ملی تھی اور وقت گزارنے کے لیے اچھے دوست بھی لیکن بقول اس کے اس میں سے کچھ بھی تک کا نعم البدل نہیں تھا۔

”یہ لوجی، یہ ہم بچے گئے کیمپنگ سائٹ۔ تم خیمہ لگانے کی تیاری کرو تب تک میں ایک کپ کافی پی کر اپنی ٹھکن اتار لی ہوں۔“ تک آمنہ کے طنز کے بعد سارا راستہ اپنا محاسبہ ہی کرتا رہا تھا اس لیے اسے راستہ ختم ہونے کا پتا نہیں چل سکا تھا۔ آمنہ نے بایک روکتے ہوئے اسے مخاطب کیا تو وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے اپنا ہیلیمٹ اتار دیا تھا۔ اندر سے برآمد ہونے والا اس کا سرخ و سفید

غراب نہ ہوں، ضرور لے کر آئیں۔ ان چیزوں کے علاوہ سلیپنگ بیگز، سلیپنگ پیڈ اور ٹارچ وغیرہ بھی لے کر آنا ضروری تھا۔ وہ دونوں پوری تیاری سے آئے تھے۔

”تھیلے میں تمہارے پسندیدہ ڈشس بھی ہیں۔ چاہو تو کافی کے ساتھ وہ بھی لے سکتی ہو۔“ نک نے خیمہ لگانے کے لیے نظروں سے سطح زمین کے کٹڑے کا انتخاب کرتے ہوئے اسے اطلاع دی۔

”نہیں، فی الحال یہی کافی ہے۔“ اپنی کافی کے کپ کو دونوں ہاتھوں میں دبوچے اس نے جواب دیا۔

”میرے خیال میں یہ جگہ ٹھیک رہے گی۔“ نک نے آخر ایک جگہ منتخب کرتے ہوئے اس کی رائے بھی جاننا چاہی۔ اس نے محض سر کے اشارے سے تائید کی اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ وہ لوگ وہاں پہنچنے والوں میں سب سے پہلے تھے اس لیے اسے وہاں اپنے سوا کوئی خیمہ دکھائی دے رہا تھا نہ فرد۔ ویسے بھی آج منگل تھا۔ ایک ویک ڈے جس پر عموماً لوگ اپنی اپنی جائز یا تعلیمی اداروں وغیرہ میں مصروف ہوتے ہیں۔ جوم عموماً ویک اینڈز اور عام تعطیل کے دنوں میں دیکھنے میں آتا ہے۔

”کیا میں تمہاری مدد کرواؤں؟“ اس نے خیمے کے لیے منتخب کردہ زمین کے کٹڑے سے خشک ٹہنیاں، پتے اور دیگر جھاڑ جھنکار صاف کرتے نک کو دیکھ کر اس سے پوچھا۔

”تم اپنی کافی انجوائے کرو۔ مجھے مدد کی ضرورت ہوگی تو میں تمہیں بلا لوں گا۔“ نک نے خوشدلی سے اسے جواب دیا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اب وہ خیمہ نصب کرنے کے لیے زمین پر میخیں ٹھونک رہا تھا۔ اس نے اپنا زرد رنگ کا واٹر پروف خیمہ نکال کر زمین پر بچھا دیا تھا اور میخیں ٹھونکنے کے بعد خیمے کی رسیوں کے ساتھ الجھا ہوا تھا۔ آمنہ نے اپنی کافی ختم کر لی مگر چنانچہ مزید ایک جگہ جم کر بیٹھے رہنے کے بجائے اٹھ کھڑی ہوئی اور نک کا ہاتھ بٹانے لگی۔ جلد ان کا زرد خیمہ سبزے کے درمیان کسی بڑے سے خوش رنگ پھولوں کے سچ کی طرح بہار دکھانے لگا۔

”یہ لو بھی، ہمارا خوبصورت عارضی گھر تیار ہے۔ اب تم چاہو تو ملکہ بن کر اس میں بیٹھو اور مجھ پر حکم چلاؤ۔“ جدائی کے طویل وقفوں کی تلافی کے لیے نک اسے خوش کرنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔

”میں یہاں ٹینٹ میں بیٹھنے نہیں آئی ہوں۔ یہ تو بس اس وقت استعمال ہوگا جب ہم بری طرح تھک کر مزید تفریح کے قابل نہیں رہیں گے اور جسم کو تھوڑا آرام دینا ضروری

ہو جائے گا۔“

”اگر ایسا ہے تو کمر کس لو۔ میں جہیں اس جگہ کی بہت خاص جگہ دکھانے لے چلوں گا۔“

”فکر نہ کرو، میں کمر کس کر ہی یہاں آئی ہوں۔ تم مجھے کہیں پیچھے نہیں پاؤ گے۔“ آمنہ نے دعویٰ کیا۔

”چلو تو پہلے لٹچ کر لیتے ہیں پھر سیر پر چلیں گے۔“

نک نے صلاح دی تو وہ ساتھ لائے پیزا کے ڈبے نکالنے لگی۔ یہاں تک آنے اور خیمہ نصب کرنے میں جو وقت صرف ہوا تھا، اس میں پیزا ٹھنڈا ہو گیا تھا لیکن اس کی تازگی برقرار تھی۔ ان دونوں نے سوٹ ڈرنکس کے ٹن کھول کر مشروب کے ساتھ پیزا حلق سے نیچے اتارا پھر گتے کے خالی ڈبوں، ٹنز اور استعمال شدہ ٹشو پیپرز کو ایک پلاسٹک کے تھیلے میں بھر لیا۔ یہاں سے جاتے ہوئے انہیں اس کچرے کو اپنے ساتھ لے کر جانا تھا تاکہ حیاتیاتی ماحول پر ان کی یہاں آمد سے کوئی برا اثر مرتب نہ ہو۔

”چابی.....!“ اس کام سے فارغ ہو کر نک نے بائیک کی چابی کے لیے اس کے سامنے ہاتھ پھیلایا۔

”کیا میری رائڈنگ سے ڈر گئے ہو؟“ آمنہ نے ہنس کر پوچھا۔

”نہیں۔ مجھے تمہارا خیال ہے۔ مسلسل بائیک چلاتے رہنا تمہیں تھکن میں مبتلا کر دے گا۔“ نک نے معقولیت سے جواب دیا تو اس نے خاموشی سے چابی اس کے حوالے کر دی۔ وہ بائیک اسٹارٹ کر کے وہاں سے نکل رہے تھے تو تین بائیکس کیمپ سائٹ پر آ کر رکیں۔ دو بائیکس پر سینگل سوار موجود تھے جبکہ تیسری پر ایک جوڑا دکھائی دے رہا تھا۔ وہاں کیمپنگ کے اوقات دوپہر دو بجے سے اگلے دن صبح دس بجے تک تھے۔ اس حساب سے لیٹ ہو جانے کے باوجود اس گروپ کو وہاں گھومنے پھرنے کے لیے خاصا وقت مل سکتا تھا۔

”ہم جا کہاں رہے ہیں؟“ نک نے نئے آنے والوں کو ر کے بغیر دور سے ہی ہاتھ ہلایا اور بائیک آگے بڑھائی تو آمنہ نے اس سے پوچھا۔ اب اس نے سر پر ہیلمٹ کے بجائے پی کیب لگا رکھی تھی اور آنکھوں پر خوبصورت سن گلاسز تھے۔

”ہم جا کہاں رہے ہیں؟“ نک نے نئے آنے والوں کو ر کے بغیر دور سے ہی ہاتھ ہلایا اور بائیک آگے بڑھائی تو آمنہ نے اس سے پوچھا۔ اب اس نے سر پر ہیلمٹ کے بجائے پی کیب لگا رکھی تھی اور آنکھوں پر خوبصورت سن گلاسز تھے۔

”ہم جا کہاں رہے ہیں؟“ نک نے نئے آنے والوں کو ر کے بغیر دور سے ہی ہاتھ ہلایا اور بائیک آگے بڑھائی تو آمنہ نے اس سے پوچھا۔ اب اس نے سر پر ہیلمٹ کے بجائے پی کیب لگا رکھی تھی اور آنکھوں پر خوبصورت سن گلاسز تھے۔

”ہم جا کہاں رہے ہیں؟“ نک نے نئے آنے والوں کو ر کے بغیر دور سے ہی ہاتھ ہلایا اور بائیک آگے بڑھائی تو آمنہ نے اس سے پوچھا۔ اب اس نے سر پر ہیلمٹ کے بجائے پی کیب لگا رکھی تھی اور آنکھوں پر خوبصورت سن گلاسز تھے۔

”ہم جا کہاں رہے ہیں؟“ نک نے نئے آنے والوں کو ر کے بغیر دور سے ہی ہاتھ ہلایا اور بائیک آگے بڑھائی تو آمنہ نے اس سے پوچھا۔ اب اس نے سر پر ہیلمٹ کے بجائے پی کیب لگا رکھی تھی اور آنکھوں پر خوبصورت سن گلاسز تھے۔

”ہم جا کہاں رہے ہیں؟“ نک نے نئے آنے والوں کو ر کے بغیر دور سے ہی ہاتھ ہلایا اور بائیک آگے بڑھائی تو آمنہ نے اس سے پوچھا۔ اب اس نے سر پر ہیلمٹ کے بجائے پی کیب لگا رکھی تھی اور آنکھوں پر خوبصورت سن گلاسز تھے۔

”ہم جا کہاں رہے ہیں؟“ نک نے نئے آنے والوں کو ر کے بغیر دور سے ہی ہاتھ ہلایا اور بائیک آگے بڑھائی تو آمنہ نے اس سے پوچھا۔ اب اس نے سر پر ہیلمٹ کے بجائے پی کیب لگا رکھی تھی اور آنکھوں پر خوبصورت سن گلاسز تھے۔

”ہم جا کہاں رہے ہیں؟“ نک نے نئے آنے والوں کو ر کے بغیر دور سے ہی ہاتھ ہلایا اور بائیک آگے بڑھائی تو آمنہ نے اس سے پوچھا۔ اب اس نے سر پر ہیلمٹ کے بجائے پی کیب لگا رکھی تھی اور آنکھوں پر خوبصورت سن گلاسز تھے۔

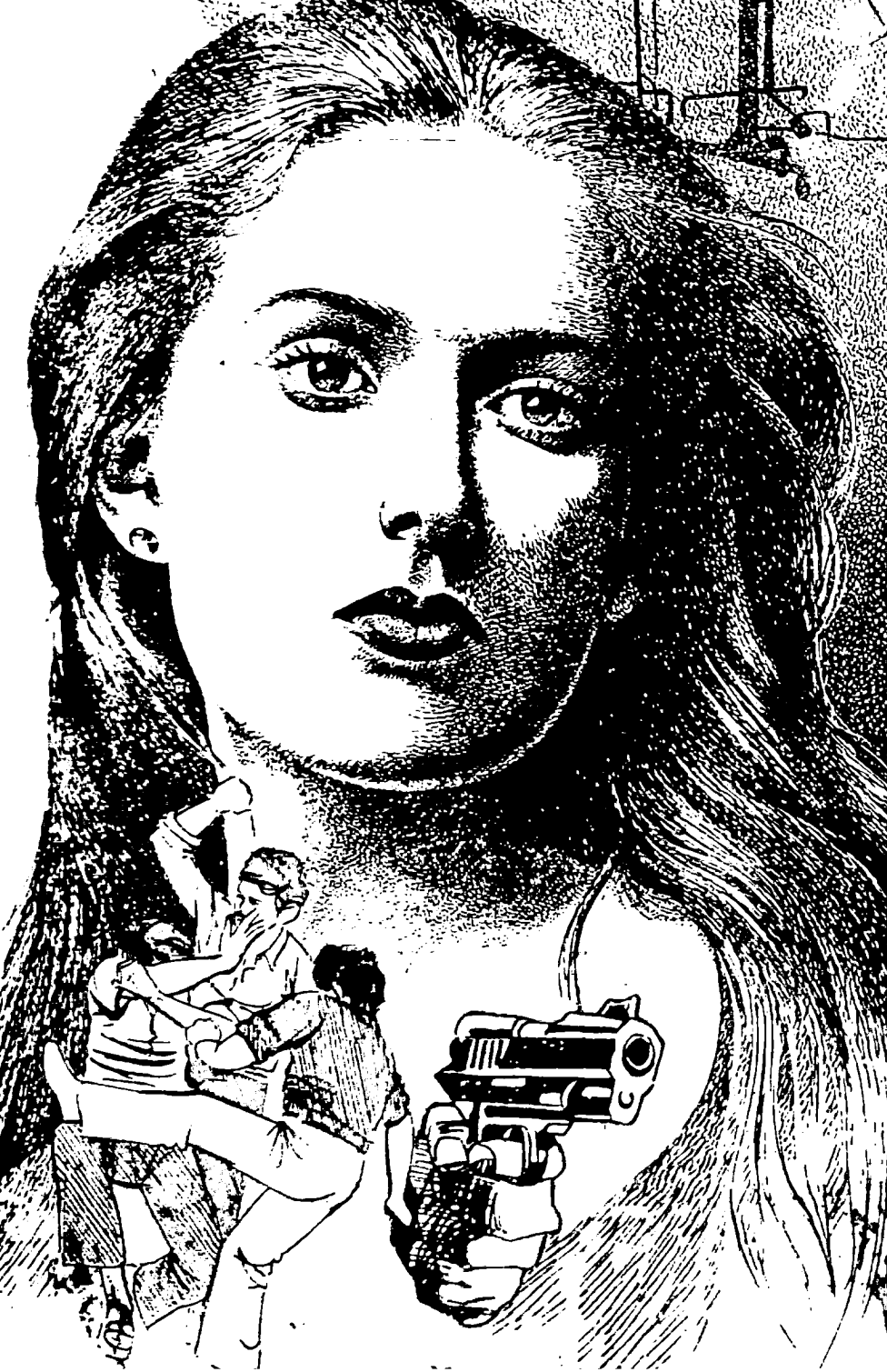
”ہم جا کہاں رہے ہیں؟“ نک نے نئے آنے والوں کو ر کے بغیر دور سے ہی ہاتھ ہلایا اور بائیک آگے بڑھائی تو آمنہ نے اس سے پوچھا۔ اب اس نے سر پر ہیلمٹ کے بجائے پی کیب لگا رکھی تھی اور آنکھوں پر خوبصورت سن گلاسز تھے۔

”ہم جا کہاں رہے ہیں؟“ نک نے نئے آنے والوں کو ر کے بغیر دور سے ہی ہاتھ ہلایا اور بائیک آگے بڑھائی تو آمنہ نے اس سے پوچھا۔ اب اس نے سر پر ہیلمٹ کے بجائے پی کیب لگا رکھی تھی اور آنکھوں پر خوبصورت سن گلاسز تھے۔



زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف، اثر و اتزان عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تند و تیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابل شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پر عزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جا رہے تھے... اس کی زندگی جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قراریوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تار عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ واردات قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہو سکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی قہر انگیز داستان



معاذ ایک ذہین لیکن مستون مزاج لڑکھو یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹس کیسے کاوش سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جہاں کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والدہ سرکاری انسر ہیں اور اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ انسٹی ٹیوٹ سے واپس آ رہا تھا تو دو چند لڑکوں کو سڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی غر فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشری نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بشری ماس کیونٹی کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم ڈیوٹر لکھتی ہے۔ معاذ بشری کو جھافت اس کے گھر پہنچاتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کر دیتا ہے لیکن جن رئیس زادوں سے اس نے ان کا شکار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ایک دن وہ معاذ کو بے خبری میں گھیر کر بری طرح زد و کوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دے دیتے ہیں۔ معاذ کے والدین نہ آنے پر انتقام کے افراد پولیس اور ریسک ڈرائیج کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو کوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جونی کی جونیئر میں پاتا ہے۔ جونی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ وہاں رہتے ہوئے جونی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے، جونی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نوازا کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے پراسرار علم سکھانے کی ہائی بھر لیتا ہے اور معاذ اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ادھر جانے خود سے ملنے والے معاذ کے کمرے سے جب تصویریں نکلوا لی جاتی ہیں تو ایک ایسی تصویر بشری کی نظر میں آ جاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانک رہا نظر آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان سکتی ہے۔ وہی لڑکا ہوتا ہے جس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پروجیکٹ کے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشری تحقیق کر رہی تھی۔ بشری کے اپنے والد جرنل ہوتے ہیں۔ اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشری کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ مدد سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باذل نامی شخص نے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشری انتقام لینے کی ضمان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دونوں میں ہی معاذ وہاں ہی کاراورد کرتا ہے تاہم ڈاکوؤں کے اتنے چہ چد جاتا ہے۔ لڑکا اسے پہچان کر اس کا سوداگران اشد اور بددلی سے کرتا چاہتے ہیں۔ معاذ کو قاتل نامی ایک لڑکا وہاں سے نکل لے جاتا ہے۔ ادھر باذل اچانک بشری کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر دیتا ہے۔ معاذ کو والدین لانے کے لیے اس کے بھائی کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری بارلی سے اس کا سودا کر کے اسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات کئے جاتے ہیں کہ اس کے بھائی کا ایک گروہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشری بھی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہو جاتی ہے۔ معاذ کے دوست عالم شاہ کے بہنوئی کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ کی خون میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے اپنا بڑا کر کے اس کے داغ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ لٹھو سے حاصل انوکھے علم کی بدولت ان کا معمول نہیں بننا۔ عالم شاہ اور اس کا نوکر سرد، ہازل کے اتنے چہ چد جاتے ہیں۔ عالم شاہ، باذل کی قید میں موجود ایک انجی ٹیم کی مدد سے وہاں سے فرار ہو جاتا ہے۔ ادھر بشری بھی پہنچ جاتی ہے۔ وہاں وہ قاتل اسے بارلی کے رعب میں پہچان لیتا ہے۔ وہ سلطان کو مارنا چاہتی ہے۔ ادھر عالم شاہ، باذل کی قید سے نکل کر اس کا پیچھا کرتا ہے۔ وہ وہاں معاذ کو دیکھتا ہے۔ معاذ کو اس کے گھر والوں سے ملنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ وہ ایک مشن پر سونیا کے ساتھ انٹر پاروانہ ہوتا ہے۔ عالم شاہ، جیس اور سرد بھی انٹر پاروانہ ہو جاتے ہیں۔ مگر پہنچنے پر پولیس کی ریڈ ہوتی ہے اور وہ عالم شاہ اور سرد کو لے جاتے ہیں۔ عالم شاہ اور سرد کو تشدد کا نشانہ بنا کر دیرانے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ واپس اپنے میز پاؤں کے ہاں پہنچ جاتے ہیں۔ انہیں پتا لگتا ہے کہ ان کے ساتھ جو کچھ وہاں میں اجالا اور اس کا عاشق شامل ہوتے ہیں۔ وہ چھپ کر ان کی باتیں سن رہا ہوتا ہے۔ تاہم وہاں مارا ماری ہوتی ہے اور اجالا کا عاشق مارا جاتا ہے۔ پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ ان کے گزن انہیں اپنے دوسرے خفیہ ہنگامے پر پہنچا دیتے ہیں۔ وہ وہاں سے بھجناقت نکل جاتے ہیں۔ ادھر معاذ ایک مشن میں ذبح ہو جاتا ہے اور اسے ہندو ساہواری اپنی گیمیں لے جاتا ہے۔ سونیا کے آدمی معاذ کو تلاش کرتے ہیں مگر کام ہو جاتا ہے۔ ادھر عالم شاہ اور سرد خفیہ رہتے سے بارلر پارک کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ ہرے جاتے ہیں اور ”را“ کی قید میں پہنچ جاتے ہیں۔ بشری باذل کو مارنے کی کوشش میں خود نشانہ بن جاتی ہے۔ معاذ ساہواری کی مدد سے ایک انٹر بین ہیروئن کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ وہیں اسے عالم اور سرد کی گرفتاری کا پتا چلتا ہے۔ معاذ ڈاکٹر فردوس سے ملتا ہے اور اسے عمل کی مدد کرنے کا کہتا ہے۔ عطیہ اور قاتل ڈیوٹر کو لارہ میٹلک سے باہر نکال دیتا ہے۔ فوٹیج پر عیزاب پھینک دیا جاتا ہے۔ قاتل، عطیہ اور اس کے گھر والوں کو مار دیا جاتا ہے۔ لاکٹر فردوس معاذ کو دیوانی انجی ٹیم سے مدد لینے کا کہتی ہے۔ معاذ اپنے گزن کو پاکستان کال کرتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ اس کے گھر والوں کو مار دیا گیا ہے۔ وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کی ضمان لیتا ہے۔ ادھر ڈاکٹر فردوس کو اس کے سرال والے عمل کو بھگانے کی ادائیگی میں تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ معاذ، عالم اور سرد کی رہائی کے لیے کارروائی کرتا ہے اور انہیں ”را“ کی قید سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن عالم اور سرد کو دیوانے کے آدمی کسی دوسری جگہ پہنچا دیتے ہیں۔ سونیا معاذ کو اصرار دیتی ہے کہ اس کا سبب ہو جالی

ہے۔ اھر باذل ایک جگہ لالہ بھٹی کی موجودگی پر کارروائی کرتا ہے تاہم لالہ خود کو کوئی مار کر ختم کر لیتا ہے ڈاکٹر فردوس کا انتقال ہو جاتا ہے۔ دیا ایک ڈاکٹر فردوس کی میت اٹھنے پر وہاں فائرنگ کر دیتے ہیں۔ پولیس دیا کو گھیر لیتی ہے۔ معاذ دیا اور اس کے آدیس کو کٹانے کے عوض عالم کا پتا معلوم کر لیتا ہے۔ سونا اور معاذ حیدر آباد نواب بدرالدین کی حویلی پہنچ جاتے ہیں۔ نواب صاحب کی حویلی میں عالم اور سرمد کی رہائی کے لیے کارروائی کر کے انہیں رہا کر لیتے ہیں۔ وہ لوگ نئے ٹھکانے پر پہنچتے ہیں تو وہاں معاذ نے سنے جہاد دینی شخص اس کے ساتھ تھے۔ قید سے نکال دیتا ہے۔ جہاد اور معاذ، محل سمیت اسپتال جاتے ہیں اور پیمانہ لیے جانے پر پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ پولیس سے مقابلے کے بعد وہ ایک ہسپتال میں پناہ کے لیے ٹھکس جاتے ہیں۔ اھر سونا معاذ کی تلاش میں نکلتی ہے اور اسے ہسپتال میں پہنچتے پر معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ معاذ اور جہاد وغیرہ انوپ نامی شخص کے ساتھ اس کے مالک کے ہنگامے میں قیام کرتے ہیں۔ سونا بھی مطوعات حاصل کرتی ہوئی مذکورہ ہنگامہ پہنچ جاتی ہے۔ عالم جہاد اور سرمد بھی سونا کا پیچھا کرتے ہوئے وہیں پہنچ جاتے ہیں۔ اھر لالہ وقاص، علینہ و دیگر لوگ زندہ ہوتے ہیں۔ وقاص علیہ بدل کر گھوکا باڈی چھڑ جاتا ہے۔ وہ معاذ کو تلاش کرنے کے لیے انڈیا روانہ ہوتا ہے۔ وہاں اس کی گل خان سے ملاقات ہوتی ہے اور معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ سونا معاذ اور دیگر ساتھیوں سے مل جاتی ہے تاہم وہ جس ہنگامے میں ہوتے ہیں وہ دشمن کا ہوتا ہے دشمن سب کو بے ہوش کر کے کھینچ لے جانے ہوتے ہیں کہہ کن کی گاڑی کو حادثہ پیش آ جاتا ہے۔ ان سب کو جینٹل مینکشی امداد دیتے ہیں اور ان سے پوچھ گچھ کی جاتی ہے۔ سب کی حالت تشویشناک ہوتی ہے اور اسے وہاں موجود ایک وید دیکھتا ہے۔ اھر لالہ واکس اپنے لوگوں میں پہنچ کر انکیشن میں آ جاتا ہے۔ باذل، معاذ کا پیچھا کرتا ہے اور جنینوں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ معاذ جنینوں کے ساتھ مل کر دشمنوں کے خلاف کارروائی کرتا ہے۔ اھر لالہ بھٹی، اعظم کو دشمن کی گرفت سے نکالنے کے لیے کارروائی کروا رہا ہے اور موسیٰ اور نیلی، اعظم کو نکالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ موسیٰ اور نیلی کی گاڑی پر حملہ ہوتا ہے تاہم ملہامہ کی کے بعد وہ مصداقت شاہ کے پاس پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اعظم کو وہاں سے نکال لیا جاتا ہے اور دوسری جگہ ٹھکس کر دیا جاتا ہے۔ اھر معاذ جینٹل مینکشی پہنچ جاتا ہے اور وہاں کے کراٹر ہارٹاؤں سے بات کر کے پاکستان پہنچنے کی اجازت چاہتا ہے۔ اھر موسیٰ اور نیلی کو پولیس گھیر لیتی ہے اور قریب ٹرک میں موسیٰ مانا جاتا ہے۔ وہ اعظم کو لے جاتے ہیں اور نیلی دشمنی حالت میں ان کے قبضے میں آ جاتی ہے۔ معاذ اور وہی وغیرہ پاکستان پہنچ جاتے ہیں اور اعظم کی بازیابی کے لیے منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ اھر باذل، لالہ کی قید سے بھاگ جاتا ہے۔ معاذ ڈی ایس پی تیسرے کے ہنگامے پر دھواں بھرتے ہیں اور ڈی ایس پی کو تھوکر مارنے کے بعد اس سے مطوعات لیتا ہے۔ باذل قید سے نکل کر مہماؤں کے پاس پہنچتا ہے اور اسے شہداء کا نشانہ بناتا ہے۔ نیلی قید میں موجود تیسرے کو نکالنے لگا دیتی ہے۔ بشری کو نوکرا لیا جاتا ہے۔ اھر معاذ سارے معاملوں کو جملہ مل کرنے کے لیے دشمن کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے مگر اس کے قریب خواہ اسے میڈم ایس کے قہقہے سے نکال لیتے ہیں اور اعظم کو بھی زیاں پڑ کر لیتے ہیں۔ زن ہوا اسے اپنے ساتھ لے جاتی ہے اور وہاں کرنل سندھ بخت سے ملاقات ہوتی ہے۔ معاذ انہیں دشمنوں کے خلاف کارروائی کرنے کا کہتا ہے۔ باذل، بشری کو لے کر انڈیا گراؤنڈ پر جاتا ہے۔ اھر وقاص باذل کا پتا چلانے کے لیے ایک کال کر لے سکی کہ مگر کارروائی کر کے باذل کے ٹھکانے پر پہنچ جاتا ہے۔ وہاں وہی کے ساتھی اور کوئی اور گروپ حملہ کر دیتے ہیں۔ وہی دشمنی ہو جاتا ہے۔ اھر باذل، عرفان اللہ کو مار دیتا ہے اور خود بھی شدید زخمی ہو جاتا ہے۔ باذل کے ساتھی اسے ایک اسپتال کے آگے چھوڑ دیتے ہیں۔ وہیں وہی اور بشری بھی داخل ہوتے ہیں۔ معاذ باذل کو پیمانہ کر اسے بھی وہیں ایڈمٹ کر دیتا ہے۔ عرفان اللہ جیل بحق ہو جاتا ہے۔ مصداقت شاہ اور ان کی اہلیہ محل کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ عالم، نیلی اور اعظم بھی وہیں ہوتے ہیں۔ محل اسپتال میں زیر علاج ہوتی ہے۔ باذل کو معذوری کی حالت میں ایک چوک پر بھیج دیا جاتا ہے۔ معاذ وقاص کے ساتھ طینے کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ اسے اگلے مہین پر جانا ہوتا ہے۔ سونا قانون کی قید سے بھاگ نکلتی ہے۔ محل کی طبیعت بگڑ جاتی ہے۔ یو این سنگ، اینڈریو کے ذریعے محل کے آپریشن کی تجویز دیتا ہے۔ محل کا آپریشن کامیاب رہتا ہے تاہم اس کا ایک ہاتھ اور پچھلا دھڑا کاٹا ہوا جاتا ہے۔ اھر معاذ کسمیر پہنچ جاتا ہے۔ ایک کسمیری لڑکی کی مدد کرنے کی پاداش میں بھارتی سپاہی اسے گرفتار کرنے۔ جہاں کی دکان پر یڈ کرتے ہیں۔ تاہم پوچھ گچھ کے بعد اسے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اھر محل کو خبر ملتی ہے کہ اس کی بہن کا پتہ کا آپریشن ہے۔ وہ سب وطن واپس آ جاتے ہیں۔ عالم اور سرمد کو محفوظ مقام پر منتقل کیا جا رہا ہوتا ہے کہ کچھ لوگ انہیں ریفرال بناتے ہیں۔ اھر سونا کی سچائی جانچنے کے لیے تنظیم کے نوک اسے مار چڑھتے ہیں تاہم وہ اس آزمائش میں پوری اترتی ہے۔ معاذ بری ڈش کے اہل خانہ کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے جہاد کے ساتھ منصوبہ بندی کرتا ہے اور وہ لوگ ہمنڈر سٹک کو قتل کر دیتے ہیں۔ عالم اور سرمد کو نوکرا کرنے والے انہیں انڈیا کے حوالے کرنا چاہتے ہیں۔ عالم اور سرمد وہاں سے لپٹنے کے لیے منصوبہ بناتے ہیں۔ وہاں قانون نافذ کرنے والے ادارے کی ریز ہوتی ہے۔ فائرنگ کے دوران سرمد جان سے جاتا ہے اور عالم شاہ دشمنی ہو جاتا ہے۔ اھر دشمن محل، مصداقت شاہ، ان کی بیگم اور قربان شاہ پر حملہ کرتے ہیں اور ان سب کو ختم کر دیا جاتا ہے۔ حویلی میں کھرا مچ جاتا ہے۔ معاذ جہاد کے ساتھ کسمیر کے وزیر کے خلاف اسٹیج پر حملہ کرتا ہے اور اسے جہنم واصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اب دوا سرانگل روانہ ہو جاتا ہے۔ اھر ڈاکٹر اینڈریو اپنی تجربہ گاہ میں جاتی پر کام کر رہا تھا۔ اس کے پاس دوا دہتی تھیں۔ زہری کے لیے ممکن سے بات ہوئی تھی۔ دوا دہتی مکمل سدا حل ہوئی تھیں اور سونا ان کی حرکات کو دیکھ کر دنگ تھی۔ آت اور تک تقریب کی غرض سے کارل کوسٹ فاریسٹ گئے تھے۔ اب وہ خیرا لگا کر مریا کے بارہ تھے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائے

آمنہ اور تک کارل کوست فاریسٹ میں چمک کے لیے گئے تھے۔ انہوں نے ایک جگہ رک کر خیرہ لگایا اور پھر آگے بڑھ گئے۔

دوپہر کا وقت ہونے کے باعث وہاں دھوپ تھی لیکن دیودار، بلوط، پائسن، زیتون وغیرہ کے درختوں اور سبزے کی بہتات کی وجہ سے دھوپ کا اثر بہت کم محسوس ہو رہا تھا۔ آمنہ میک اپ کی عادی نہیں تھی لیکن خواتین کے عمومی مزاج کے مطابق اسے اپنے حسن کی حفاظت کا خیال رہتا تھا۔ اب بھی اس نے اہتمام کیا تھا کہ دھوپ اس کی اجلی رنگت پر اثر انداز نہ ہو سکے۔

”ہم طبون کے غاروں (Tabun Caves) کی طرف جا رہے ہیں۔“ لیکن وہ تو شاید کافی دور ہیں۔“ تک کا جواب سن کر اس نے تشویش کا اظہار کیا۔

”میں آدھے گھنٹے میں تمہیں وہاں پہنچا دوں گا۔ زیادہ سے زیادہ بھی پون گھنٹہ لگ سکتا ہے۔“ تک نے اسے جواب دیا اور بایک کی رفتار بڑھادی۔ تیز رفتاری کے باوجود جھپٹے نہیں لگ رہے تھے جو اس کے اچھے رائڈر ہونے کی نشانی تھی۔ آمنہ اپنا موہاں نکال کر ارد گرد کے مناظر کی ویڈیو بنانے لگی۔

”وہ دیکھو، وہ..... اف مائی گاڈ! یہ کتنی ساری ہیں۔“ درختوں، پھولوں اور پودوں کی ویڈیو بناتے بناتے اسے ایک جگہ جھکی میسرزوں کا ریوڑ چھتا ہوا نظر آیا تو تک کا کندھا ہلانے کی جوش سے چھٹی۔

”اس میں ہزار ایکڑ کے پارک میں جانوروں اور پودوں کو تحفظ اور قدرتی ماحول فراہم کرنے کے لیے (The Israel nature & parks authority-INPA).....

نے سخت اقدامات کیے ہیں اس لیے یہاں اکثر ایسے مناظر دکھائی دے جاتے ہیں۔“ تک بچپن سے وہاں آ رہا تھا اس لیے وہ سب اس کے لیے تاحیرت انگیز نہیں تھا جتنا آمنہ کے لیے تھا۔ ”یہاں کوئی خطرناک جانور تو نہیں پایا جاتا ہے؟“ آمنہ کو خیال آیا تو پوچھا۔

”کیوں۔ کیا تمہیں ڈر ہے کہ رات کو سوتے میں کوئی شیر یا چیتا ہمارے خیمے میں گھس آئے گا اور تمہیں اٹھا کر لے جائے گا۔“ تک نے اسے میسرز۔

”تم اسے مجھے لے جانے دو گے کیا؟“ ”سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ میں اپنی جان لڑاؤں

گا۔“ تک نے سینہ پھلایا تو آمنہ ہنسنے لگی۔

”ویسے مذاق سے ہٹ کر یہاں سچ سچ کوئی خطرناک جانور نہیں پایا جاتا۔ بس سانپوں کی کچھ اقسام ہیں جن سے بچنے کے لیے کبھی گھاس میں چلتے وقت کچھ احتیاطی تدابیر اختیار کرنا پڑتی ہیں۔ باقی ہر لحاظ سے یہ جگہ بالکل محفوظ ہے۔“ اس کی تسلی کے لیے اس بار تک نے سنجیدگی سے معلومات فراہم کیں۔

پاتی کا راستہ انہوں نے اسی طرح گپ شپ لگاتے اور قدرتی مناظر سے لطف اٹھاتے ہوئے گزرا۔ ایک روشن چمکیلا دن، گلدگداتی خوشگوار ہوا اور آنکھوں کو تراوٹ بخشنے مناظر کے درمیان من پسند کے ساتھ گزرتا وقت..... کسی انسان کو اس سے بڑھ کر بھلا دنیا میں کیا چاہیے ہوتا ہے۔ وہ دونوں بھی ایک دوسرے میں مگن اور خوش تھے اور گویا پلک جھپکتے میں وہ پینتیس چالیس منٹ کا وقت گزر گیا تھا۔

”یہ غار آثار قدیمہ کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہاں انسانی ارتقاء کی ہزاروں سال پہلے کی تاریخ ملتی ہے۔ پتھر کے دور کے انسانوں کے ڈھانچے، ہتھیار اور بہت کچھ موجود ہے یہاں۔ یہاں وہ انسان رہتے تھے جو تباہیوں، جڑوں، بیجوں اور پھلوں پر گزارہ کرتے تھے یا پھر شکار کے لیے کھڑیاں اور کھیلے چوڑے کے ہتھرا استعمال کرتے تھے۔ ذرا سوچو کس قدر مختلف تھے وہ آج کے دور کے انسان سے۔“ اسے اپنے ساتھ لیے وہاں گھومتے پھرتے وہ روانی میں اسے بتاتا جا رہا تھا۔

”مجھے ماضی میں جینا پسند نہیں ہے تک امانی میں کیا تھا، اسے جاننے کے مقابلے میں، میں اس بات میں دلچسپی رکھتی ہوں کہ مستقبل میں کیا ہوگا اور کیا ہو سکتا ہے۔ جانے والے جانچنے لیکن اب تو ہمیں یہ سوچنا ہے کہ ہم آنے والے انسانوں کے لیے جن میں یقیناً ہماری اولاد بھی شامل ہوگی، کیسی دنیا تیار کر رہے ہیں۔“ آمنہ کی بوریہ حد سے بڑھی تو آخراے ٹوک بیٹھی۔

”ہماری اولاد کی فکر نہ کرو ڈارلنگ! ہماری اولاد یقیناً ان میں سے ہوگی جو اس دنیا پر حکمرانی کر رہے ہوں گے۔“ ”حکمرانی..... مطلب ظلم و جبر۔“ اس نے تک کا جواب سن کر ناک چڑھائی۔

”نہیں، ایسا کیوں ہوگا؟ کیا اس دنیا میں رحمت اور مہربان حکمران نہیں گزر رہے ہیں۔“

”میں گزر رہے ہوں پر تو بات ہی نہیں کر رہی ہوں۔ میں تو اس پر غور کر رہی ہوں کہ جب ہم آزاد لوگوں کو

”ہاں بالکل جلتے ہیں۔“ آمنت فوراً تیار ہوئی۔ اس بار انہیں نے اپنے ساتھ محض پانی کا فلاسک، چارج، چند چاکلیٹ بارز اور ایک وائٹ اسکری ریکی تھی۔ خوبصورت چمکندہ یوں سے گزرتے وہ پردوں کی چھچھاہٹ اور آنکھوں کو روشن کرتے مناظر سے ہوتے ہوئے آہستہ آہستہ قدرے کھٹے جنگل میں داخل ہو گئے۔ یہ دیکھنا جنگل نہیں تھا جیسے عموماً انسانی تصور میں موجود بڑے جنگلات ہوتے ہیں۔ یہاں بس درختوں اور جھاڑیوں کی زیادہ تعداد موجود تھی۔ ”وہاں۔۔۔ وہاں کچھ ہے۔“ اچانک آمنت جلتے جلتے رک گئی اور جھاڑیوں کے ایک جھنڈ کی طرف اشارہ کر کے سرگوشی میں بولی۔

”سمیں رکو، ہمیں دیکھنا ہو گا کہ وہاں کیا ہے۔“ تک خود بھی، اسی کے ساتھ جڑ کر کھڑا ہو گیا اور دونوں سانس روکے جھاڑیوں کی طرف دیکھنے لگے۔ جلد ہی جھاڑیوں میں سے ایک ہرن برآمد ہوا۔ اس کی سرخی مائل بھوری جلد پر سفید دھبے دکھائی دے رہے تھے اور پشت پر لمبی سیاہ پٹیاں تھیں۔ وہ اپنی سیاہ لائٹوں والی لمبی سفید دم کو قدرے اضطراب سے ہلاتا رہا تھا اور کیلے کان بھی دھیرے دھیرے مل رہے تھے۔ شاید وہ اپنے گروہ سے بچھڑ گیا تھا۔

”یہ Male fallow deer ہے۔ یہ جنگل ان ہرنوں کا ایک Habitat ہے۔ یہ یہاں سیکڑوں کی تعداد میں پائے جاتے ہیں اور بچوں وغیرہ کے پھیلاؤ میں حصہ لے کر جنگل کے ایک سسٹم میں نباتات کی تعداد بڑھانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔“ تک سرگوشی میں اسے بتانے لگا کہ کہیں اس کی آواز ہرن کو بدک کر وہاں سے بھاگنے پر مجبور نہ کر دے۔

”اس کی سسکولر باڈی اور چوڑا سینہ بتا رہا ہے کہ اس کے جسم میں نہایت لذیذ گوشت کا ذخیرہ موجود ہے۔ میرا دل چاہ رہا ہے کہ آج ڈنر میں اس گوشت کو بھون کر کھاؤں۔“ آمنت نے عجیب سے لہجے میں کہا اور اپنے ٹراڈز کی چپ میں ہاتھ ڈال کر باہر نکالا تو یہ دیکھ کر تک کی آنکھیں پھیل گئیں کہ اس کے ہاتھ میں چمکدار لمبے پھل والا چاقو دبایا ہوا تھا۔

”تو ایسی نو۔۔۔!“ اس نے ہڈیائی سے لہجے میں اسے پکارا۔

”انتقامیہ کی طرف سے جنگل کی حدود میں شکار کرنا سختی سے منع ہے اور بلا اجازت ایسا کرنے والوں کو دو ہزار سے پچاس ہزار شیکل (shekels) تک جرمانہ ادا کرنا پڑتا ہے۔“ وہ اسے قاعدے اور اصول بتاتا رہ گیا لیکن

محکم بنانے کی بات کرتے ہیں تو یہ کیسے سوچ لیتے ہیں کہ یہ کام بنا جبر کے فنی خوشی ہو جائے گا۔ کسی کو سونے کے بچرے میں ڈال کر لذیذ غذا میں فراہم کرنے کا نام مہربانی نہیں ہے۔ مہربانی یہ ہے کہ فرد اور اقوام کو ان کی مرضی اور شخص کے ساتھ زندہ رہنے دیا جائے۔“ وہ بولنے پر آئی تو ایک سانس میں بولتی چلی گئی۔

”تم تو ابھی خاصی ستر اور مصلح ہو۔ مجھے تمہاری اس خوبی کا پہلے علم نہیں تھا۔“ اس کی باتوں نے تک کو ذرا سا الجھا دیا تھا لیکن اس نے پھر بھی کوشش کی کہ کچھ پھلکے انداز میں بات کو ٹال دے۔

”ہم جب ایک دوسرے کی زندگیوں میں شامل ہوتے ہیں تو آہستہ آہستہ ایک دوسرے کے بارے میں ایسی بہت سی باتوں کا علم ہونا شروع ہو جاتا ہے جن کا پہلے گمان ہی نہیں گزرا ہوتا۔“ شوخ و شنگ آمنت کے چہرے پر اس وقت گہری سنجیدگی تھی۔

”کیا تم کسی الجھن کا شکار ہو؟“ تک نے اس کا ہاتھ تھاما اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دریافت کیا۔ جواب میں آمنت نے سر کو اٹھائی جنبش دی۔

”کل کر بات کرو۔“ تک نے اسے دعوت دی۔

”بعد میں کرتے ہیں۔ فی الحال یہاں سے چلو۔ مجھے اس جگہ الجھن ہو رہی ہے۔“ آمنت نے اسے ٹال دیا۔

واپسی کے سفر میں بھی وہی مناظر اور فضا میں تھیں لیکن ان دونوں کے ذہن ہی الجھ چکے تھے اس لیے کچھ بھی پہلے سا نہیں لگ رہا تھا۔

وہ یکپ سائٹ پہنچے تو دو چہرہ ڈھلنے کے قریب تھی۔ انہیں اپنے خیمے سے کچھ فاصلے پر نیلے رنگ کے دو خیمے نصب دکھائی دیے جو یقیناً ان کے بعد وہاں آنے والے گرد پ بھی کے تھے لیکن ان میں سے کوئی بھی خیموں کے آس پاس دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ یقیناً ان کی طرح وہ بھی کہیں گھومنے نکل گئے تھے۔ انہوں نے اپنے خیمے کے قریب کھلی فضا میں بیڑہ کر مشروبات اور کچھ پھلکے اسٹیکس کے ساتھ خود کو تازہ دم کیا اور کھلی پھلکی بات چیت سے حالات کو معمول پر لانے کی شعوری کوشش کرنے لگے۔

”میرے خیال میں ہم روشنی کی موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کچھ سیرا در کر لیتے ہیں۔ اندھیرا ہونے کے بعد نہ تو مناظر میں لطف رہے گا، نہ تو ہم یکپ سائٹ سے زیادہ دور جا سکیں گے۔“ تھوڑا سا سستے انداز میں اپنے نئے طبیعت کو بحال کیا تو تک نے صلاح دی۔

سونیا کے اندازے کی تصدیق کی۔
”مجھے اس بات کا بھی یقین ہے کہ دُہری شہریت کے

باد جو دم اب بھی اپنی بنیاد سے جڑے ہوئے ہوا اور اس بات کو کبھی فراموش نہیں کرتے کہ دراصل تم ایک چینی ہو۔“
”چینی ہونا فراموش کر سکتا ہوں لیکن بدھٹ ہونا

نہیں۔ امریکا میں رہ کر بھی میرے والدین نے مجھے پکا بدھٹ بنایا ہے۔“ جواب اس نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔
انہی چھوٹی موٹی باتوں میں باقی کا مختصر راستہ بھی گزر گیا اور وہ لوگ منزل مقصود پر پہنچ گئے۔
”تم.....؟“ وہ تاریخی رنگ کے بھکشوؤں والے

مخصوص لباس میں اپنے سامنے موجود مونے، لمبے زانگ تاؤ کو دیکھ کر ششدر رہ گئی۔
”اچھا شگون ہے کہ تم نے مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا

ورنہ بیکار میں سے برباد ہوتا۔“ وہ مسکرا کر بولا۔
”لیکن میں تمہیں یہاں دیکھ کر حیران ہوں۔ خصوصاً اس

لیے کہ تم مجھے اپنی حکومت سے مخالف کیمپ میں مل رہے ہو۔“
”تم کیسے کہہ سکتی ہو؟“
”اگر ایسا نہ ہوتا تو تم کبھی اس انداز میں مجھے نہ

بلواتے۔ تمہاری حکومت تو آج کل ہماری حکومت سے دوستی کی تمکینیں بڑھا رہی ہے۔ ڈاکٹر یو ان منگ اور پروفیسر اینڈریو کے درمیان باقاعدہ ذیل ہوئی ہے۔“

”جہاں دھرم کی بات آجائے وہاں ایسی ڈیلز پیچھے چلی جاتی ہیں۔ میں ہمیشہ اپنی سرکار کا وفا دار رہا ہوں لیکن ہم بھکشوؤں اور لامادوں کے بالکل الٹ چل کر ہماری سرکار جو کچھ کرنا چاہتی ہے، اس میں، میں ساتھ نہیں دے سکتا تھا کیونکہ مجھے شواہد سے ڈر لگتا ہے۔“ زانگ تاؤ کو شروع سے اس نے اچھی خاصی ہندی بولتے سنا تھا۔ شاید ایسا اس لیے تھا کہ اس نے اچھا خاصہ صحت ہندوستان میں گزرا تھا۔
”تم کس بارے میں بات کر رہے ہو؟“ سونیا نے اسے کھوجا۔

”اسی بارے میں جس کو انجام دینے کے لیے ہماری سرکار کی جانب سے آج تم لوگوں تک ایک بہت ہماری پارسل بھجوا یا گیا ہے۔ ہمارا ماننا ہے کہ وہ پارسل غلط پتے پر ڈلیوری ہو گیا ہے اور ہم اس غلطی کو سدھارنے کے لیے ہی یہاں موجود ہیں۔“ اس کا جواب واضح تھا۔
”کیا تمہیں یقین ہے کہ تم اپنی کوشش میں کامیاب

ہو جاؤ گے؟“
”تم نے ساتھ دیا تو کیوں نہیں۔“ وہ دانت نکال کر ہنسا۔
سپنس ڈائجسٹ 56 ستمبر 2024ء

”میں بھلا تمہارا ساتھ کیوں دوں گی؟“ سونیا نے حیرت کا اظہار کیا۔

”اگر سنہری موسمِ بقی کی سفارش ہو تو کیا پھر بھی نہیں ہوگی؟“ اس کے سوال نے سونیا کو ششدر کر دیا۔

”وہ ہم سے رابطے میں ہے اور اسی نے ہمیں یقین دہانی کروائی تھی کہ تم ہمارا ساتھ دو گی۔“ اس کی حیرت کو محسوس کر کے زانگ تاؤ نے وضاحت دی۔

”کیا کرنا چاہتے ہو؟“ وہ بہت تیزی سے اپنی کیفیت سے باہر نکل گیا اور اس سے ایک عزم سے پوچھا۔

”تم ساتھ دو تو بہت کچھ کر سکتے ہیں۔“ زانگ تاؤ کا جواب اگرچہ مبہم تھا لیکن اس کے پاس انکار کی گنجائش نہیں تھی کہ جو حوالہ دیا گیا تھا، وہ اس کے لیے بہت معتبر تھا۔

☆☆☆

تک ایک ہل کے لیے ساکت کھڑا درخت کے تنے میں گڑے تیز دھار چاقو کو دیکھتا رہا پھر آہستہ سے اپنی نظروں کا زاویہ تبدیل کیا۔ فلوڈیئر وہاں سے بھاگ چکا تھا اور اس کے پہلو میں کھڑی آمنہ دونوں ہاتھ سینے پر پھیلے یوں کھڑی تھی جیسے کچھ ہوائی نہ ہو۔

”یہ کیا تھا ایسی؟“ اس نے حیرت افزا سمجھی کی ٹلی جلی کیفیت میں پوچھا۔

”وہ آواز صحت مند، خوبصورت اور شاندار تھا کہ میرا دل اسے اپنے دستِ خوان پر دیکھنے کو مائل کیا۔“ آمنہ کا جواب اس کے لیے عجیب تھا۔ اس کا ایسا رویہ اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

”تمہیں معلوم ہے کہ اسے شکار کرنا قانوناً ممنوع ہے۔ اگر وہ تمہارے چاقو کی زد میں آجاتا تو اس وقت ہم بڑی مصیبت میں پھنس چکے ہوتے۔“ اس بار وہ تھوڑا سا جھنجھلا بھی گیا تھا۔

”ممنوع تو اس دنیا میں بہت کچھ ہوتا ہے تک لیکن ہم اپنے لالچ اور ہوس میں اسے اپنے لیے جائز سمجھ لیتے ہیں۔“ آمنہ کی کیفیت کھوئی کھوئی تھی۔

”تم کہنا کیا چاہتی ہو؟“ تک نے اسے ٹوٹی نظروں سے دیکھا۔

”یہ کائنات خدا نے بنائی ہے اور اس میں بسنے والی ساری مخلوق اسے پیار ہے۔ یقیناً وہ چاہتا ہوگا کہ اس کا تخلیق کردہ ہر ذی نفس اپنے اپنے ماحول میں امن اور سکون سے رہے۔ وہ اپنی ہر مخلوق کو اس کے حصے کا رزق پوری ذمہ داری سے فراہم کرتا ہے۔ کہیں کوئی کمی بیشی ہے تو اس

”خود کو کسی ایک قوم یا عقیدے کا فرد سمجھنے کے بجائے صرف اور صرف ایک انسان بن کر سوچو کہ کیا یہ سب کچھ جائز ہے؟ کیا تم اس بوجھ کے ساتھ سکون سے جی سکتے ہو کہ انسانوں کے کل عام میں تم بھی حصے دار تھے؟ کیا تم اس دنیا میں اپنی اولاد کو لانے کا تصور کر سکتے ہو جہاں کوئی بھی طاقتور کسی کو کمزور یا پاکر اس کا زخروہ ادھیڑ دیتا ہے۔ ترتیب اور توازن تو کبھی بھی تبدیل ہو سکتے ہیں۔ بہت پرانی بات تو نہیں کہ تمہاری نسلیں، نسل کے ہاتھوں مٹا دی جا رہی تھیں، پھر تمہیں عروج ملا۔ اس عروج میں اگر تم یونہی ظلم کا بازدار گرم کیے رکھو گے تو یاد رکھو، ترتیب ایک بار پھر بدلے گی اور تمہاری آنے والی نسلیں تمہاری یونہی ہوئی نسل کا نمٹیں گی۔ اس سلسلے کو روک دو! ختم کر دو ظلم کا یہ سلسلہ۔“ اسے سننے پر ہائل پاکر وہ ایک ہی سانس میں جذباتی لہجے میں بولی چلی جا رہی تھی۔

”کیسے روک دوں؟ میرے بس میں سے ہی کیا کہ میں ایسا کچھ کر سکوں۔“ اس بار اس نے شدید جھنجھلا کر دایم ہاتھ کا مگنا کر زور سے بائیں ہاتھ کی پھلی پر مارا۔

”میں زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہوں کہ اپنی جان چھوڑ دوں اور اس کام کو ترک کر دوں جس سے مجھے عیش۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑے گا؟ کام تو پھر بھی جاری رہے گا۔ میرے الگ ہو جانے سے ان کی منصوبہ بندی تو تباہ نہیں ہو جائے گی اور سچ کہوں تو الگ ہونا بھی اتنا آسان نہیں۔ سو وضاحتیں دینا پڑیں گی۔ ان شرائط کو پورا کرنا ہوگا جو اب جو ان کرتے وقت رکھی گئی تھیں۔ ہو سکتا ہے مجھ پر خفیہ نگاہ بھی رکھی جائے کہ میرے اس فیصلے کے پیچھے کیا سبب ہے۔“ اب وہ اسے اپنی مشکلات گنوار ہاتھا۔

”میں تم سے ایک دم یہ سب کرنے کا نہیں کہہ رہی ہوں تک! تم آہستہ آہستہ بھی یہ کوشش کر سکتے ہو۔“ اب کے آئندہ کا بچہ نرم تھا۔

”اور اس کے بعد میں کیا کروں گا؟“

”تم پڑھ لکھے قابل انسان ہو۔ تمہیں دنیا کے کسی بھی خطے میں اپنی فیلڈ میں کام کرنے کا موقع مل سکتا ہے۔ بس اس بار احتساب کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھنا کہ دنیا پر قبضہ کرنے اور اس کی خوبصورتی کو تباہ کرنے کے جنون میں جتنا لوگوں کا ساتھ نہ دو۔“ اسے نرم پاکر وہ اسے نصیحت کرتی جا رہی تھی۔

”تمہیں مجھے سوچنے کا موقع دینا ہوگا ایسا! اگرچہ تمہاری باتیں میرے دل کو لگ رہی ہیں لیکن یہ بھی اپنی جگہ

میں اس کا تصور نہیں بلکہ ان کی سستی اور بے ایمانی کا دخل ہے جنہیں اس نے تقسیم اور فراہمی کی ڈے داریاں سوئپ رکھی ہیں۔ فی الحال میں اس موضوع پر بات نہیں کر رہی۔ میں بات کرنا چاہتی ہوں ان کی جن کی آنکھوں پر بندھی لالچ و ہوس کی پٹی نے انہیں انسانیت کے درجے سے کرادیا ہے اور سب کچھ اپنے قبضے میں دیکھنے کی اندھی خواہش میں وہ خدا کی آزاد مخلوق کو اپنے بس میں کرنے کے درجے ہیں۔ انہیں اس بات سے کوئی غرض نہیں ہے کہ اس خواہش کو پورا کرتے کرتے کتنی معصوم جانیں سسک سسک کر دم توڑ دیں گی، کتنے بچے گمراہ اجڑ جائیں گے، کہاں کہاں بھوک کا وحشی رقص ہوگا اور کس طرح اس پوری دنیا کا نقشہ الٹ کر رہ جائے گا۔ خود کو تقسیم، خدا کے لاڈلے اور سب سے اعلیٰ ثابت کرنے کے جنون میں خدا کی بسائی ہوئی دنیا کا توازن برباد کر ڈالنا کہاں کی انسانیت ہے۔ تم اس چھوٹے سے جنگل میں نشوونما پانے والے ایک جانور کی جان لینے کو تو غیر قانونی سمجھتے ہو لیکن بڑی بڑی انسانی آبادیوں کو کس نہیں کر دیتے، ان کی بربادی اور موت کا تماشا دیکھنے کو اپنی کامیابی تصور کر کے خوشی سے جھومتے ہو۔ آخر کیسے تک.....؟ آخر کیسے تم یہ سب کر لیتے ہو؟“ آئندہ کی آنکھوں سے ایک سا کھجی آنسو پھسل گئے تھے۔

”تم اتنی سیٹیو کیوں ہو رہی ہو آئندہ؟“ تک نے پریشان سا ہو کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنے قریب کرنا چاہا۔

”مجھے یہ سوچ کر گھن آتی ہے کہ میرا شوہر تانکوں کے اس ٹولے کا مددگار ہے جن کا مقصد خدا کی بنائی اس خوبصورت دنیا کو اپنے قبضے میں لے لینا ہے۔ کیوں کرنا چاہتے ہو تم اس دنیا پر قبضہ؟ کیوں تم انسانوں کو ان کے بنیادی حقوق کے ساتھ جینے کی آزادی دینے کے لیے راضی نہیں ہو؟“ وہ تک کا ہاتھ جھٹک کر اس سے ٹھوڑی دور ہو گئی۔

”ایسا کچھ نہیں ہے ایسا! تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“ تک بولکھایا ہوا اسے صفائی پیش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے دہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ بہت خوشگوار موڈ میں شروع ہونے والے ان کے اس تفریحی دورے میں کوئی ایسا موڑ بھی آ سکتا ہے۔

”اگر میں غلط فہمی کا شکار ہوں تو تم انکار کر دو کہ دنیا کے ترقی پذیر خطوں میں ہونے والی غیر معمولی بارشوں اور خوفناک سیلابوں کے پیچھے تمہاری کسی ٹیکنالوجی کا کمال نہیں تھا۔“ وہ ترنٹ بولی تو تک کو چپ لگی۔

ایک حقیقت ہے کہ میں اسرائیل کی خدمت کا جذبہ اور خواب اپنے دل و دماغ میں بسا کر پروان چڑھا ہوں۔ میں نے آج تک جو کچھ کیا ہے، یہ سوچ کر کیا ہے کہ میں اپنے وطن اور قوم کی خدمت کر رہا ہوں۔ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ تمہاری خاطر ہی سہی، میں یوں اچانک اپنے وطن کو چھوڑنے کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔“ تک کارڈمیل غیر فطری نہیں تھا۔ آمنہ کچھ دیر تک اپنی جگہ کھڑی کچھ سوچتی رہی پھر ایک گہری سانس لے کر بولی۔

”ٹھیک ہے۔ تم اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ مجھے امید ہے کہ تم جیسا مہذب انسان کوئی بھی فیصلہ کرتے وقت پہلی ترجیح انسانیت کو دے گا۔“

”اگر میرا فیصلہ تمہاری امید کے خلاف ہوا تو؟“ تک نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”تو.....“ وہ گھم سے انداز میں بڑبڑائی۔

”میں جانتا چاہتا ہوں کہ اس صورت میں تمہارا فیصلہ کیا ہو گا؟“

”اس سوال کا جواب وقت پر چھوڑ دیتے ہیں۔“ وہ پیکا سا مسکرائی۔

”مجھے چھوڑنے کا فیصلہ کسی صورت نہیں کرنا ہی! میں تم سے جدا ہونے کا تصور بھی نہیں کرنا چاہتا۔“ تک نے اس سے التجائی۔

”فکرت کرو۔ میں اس کی نوبت ہی نہیں آنے دوں گی۔“ آمنہ نے مضبوط لہجے میں بولتے ہوئے اس کا ہاتھ تمام لیا۔

”آؤ، واپس چلتے ہیں۔ ہمارے خیمے ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔“

”ہاں، چلتے ہیں۔“ تک اس کے ساتھ چل پڑا۔ اب جھگ میں تاریکی اتر آئی تھی اس لیے وہ راستہ دیکھنے کے لیے مارج روشن کر چکے تھے۔ یکب سائڈ پر پہنچے تو وہاں اچھا خاصا بڑا الاؤ روشن تھا جو یقیناً ان کے بعد وہاں آکر

یکب لگانے والوں نے جلا یا تھا۔ چار افراد کا وہ گروپ الاؤ کے قریب بیٹھا خوش گپیاں کرتے ہوئے کچھ کھانے پینے میں مصروف تھا۔ ان دونوں کو آتے دیکھ کر ان لوگوں نے ہاتھ ہلائے جس کا مطلب تھا کہ وہ دوستانہ مزاج کے لوگ ہیں اور ان کی اپنے ساتھ وہاں موجودگی کو بہ خوشی قبول کر رہے ہیں۔

”چل کر ہیلو ہائے کر لیتے ہیں۔“ آمنہ نے تجویز پیش کی اور پھر اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر اس گروپ

کی طرف بڑھ گئی۔ تک کی طبیعت اگرچہ کافی پوجمل ہو رہی تھی اور آمنہ سے ہونے والی گفتگو کے نتیجے میں وہ خود کو کافی دباؤ میں محسوس کر رہا تھا پھر بھی صرف اور صرف اس کی خوشی کے لیے اس نے اس کی پیروی کی۔

”میں مراد ہوں اور یہ میری بیوی تانیہ۔ ہم سیاح ہیں اور دنیا گھومنا ہمارا شوق۔ یہ شوق ہمیں اس بار اسرائیل لے آیا ہے اور ہم خوش ہیں کہ ہم نے ایک بہترین جگہ کا انتخاب کیا ہے۔“ وہاں تعارف کا مرحلہ شروع ہو چکا تھا۔

”میں آمنہ ہوں اور یہ میرا شوہر تک۔ تک مقامی ہے جبکہ میں ایران سے ہجرت کر کے یہاں آئی ہوں۔ یہاں میری تک سے ملاقات ہوئی۔ ہم نے ایک دوسرے کو پسند کیا اور پھر شادی کر لی۔“ جو اب آمنہ نے بھی انہیں اپنا تعارف کروایا، ساتھ ساتھ اس کی نظریں ان کے باقی دو ساتھیوں کا بھی جا بڑھ لے رہی تھیں۔

”تم لوگوں سے مل کر خوش ہوئی۔ تم ایک خوبصورت کھیل ہو۔“ تانیہ جو اصل میں ماہ بالوں کی، اس سے مصافحہ کرتے ہوئے خوش دلی سے بولی۔ شہریار اور تک نے بھی رسمی سامعہ فرمایا۔

”یہ میرے دوست عمار اور ارتضیٰ ہیں۔ ارتضیٰ مقامی ہے جبکہ عمار بزنس کے سلسلے میں کشمیر سے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ ارتضیٰ، عمار کے مقامی آفس کوکب آفر کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ عمار کو جیل کی سیر کروانے کی بھی کوشش کر رہے ہیں۔ ہماری ان دونوں سے اس ٹرپ کے آغاز پر ہی ملاقات ہوئی ہے۔ ہمیں لگا کہ یہ اچھے ساتھی ثابت ہوں گے اس لیے ان کے ساتھ گروپ بنالیا۔ اب ہم مل کر انجوائے کر رہے ہیں۔ اگر آپ دونوں چاہیں تو ہمیں جوائن کر سکتے ہیں۔“ شہریار نے تعارف کا مرحلہ مکمل کرتے ہی انہیں پیشکش کر ڈالی۔

”بہت شکریہ، لیکن.....“ تک اسے انکار کرنا چاہتا تھا لیکن آمنہ نے اس کی بات کاٹ دی اور جوش سے بولی۔

”کیوں نہیں مسٹر مراد! ہمیں آپ کو جوائن کر کے بہت خوشی ہوگی۔ مجھے بہت شوق ہے دنیا کے مختلف حصوں سے تعلق رکھنے والوں سے ملنے اور ان کے متعلق جاننے کا۔“ پھر اس نے تک کی طرف اپنا رخ موڑا اور لاڈ سے بولی۔

”ڈارلنگ! کیا تم ڈنر کے لیے پیک کر دیا گیا کھانا اپنے خیمے سے نکال کر لے آؤ گے۔ ہم آپس میں شینر کر کے ڈنر کریں گے تو زیادہ لطف رہے گا۔“

”اوکے۔“ تک کو چار دن چار وہاں سے جانا پڑا۔

”میں چچا کی سفارش پر صرف اور صرف انسانیت کی خاطر اس کام کے لیے تیار ہوتی ہوں۔ تک کو دھوکا دینا مجھے اچھا نہیں لگ رہا لیکن چونکہ یہ لاکھوں انسانوں کی زندگی کا معاملہ ہے تو میں تم سے تعاون کے لیے مجبور ہوں اور اس تعاون کے بدلے میں صرف اور صرف تک کی سلامتی چاہتی ہوں۔“ اس کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہوگئی تھی اور وہ نہایت سنجیدہ لہجے میں ان چاروں سے بیک وقت مخاطب تھی۔

”آپ فکر نہ کریں خاتون! مسٹر تک پر کوئی آج نہیں آئے گی۔ ہم کچھ ضروری معلومات کے حصول کے سوا ان سے کسی چیز کے خواہاں نہیں ہیں۔“ عمار کے نام سے متعارف کروائے جانے والے معاذ نے اسے تسلی دی۔

”اس کی بات پر یقین کرلو پیاری! جس طرح تم انسانیت کے نام پر ہماری مدد کر رہی ہو، یہ بھی انسانیت کے لیے ہی بہت سی قربانیاں دے کر یہاں موجود ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی ایسا کچھ نہیں کرے گا جو تمہاری ہنسی کھینچتی زندگی کو برباد کر دے۔“ ماہ بانو نے بھی اس کا ہاتھ تمام کر اسے تسلی دی اور چمک کر آتا ہوا دیکھ کر ٹھوڑے فاصلے پر ہوگئی۔

”تمہیں مسٹر تک کو دیکھ کر کچھ سیکھنا چاہیے مراد! ایک فرمانبردار شوہر خوشگوار ازدواجی زندگی کے لیے بہت ضروری ہے۔“ تک نے کھانے کے باکسر لا کر آمنہ کے ہاتھ میں تھمائے تو ماہ بانو شرارت سے بولی۔

”تم بھول رہی ہو پیاری دانف! شادی کے ابتدائی عرصے میں، میں بھی ایسا ہی ہوا کرتا تھا۔ ان کی شادی کو بھی چند برس مزید گزرنے دو۔ مسٹر تک کی فرمانبرداری میں بھی فرق آجائے گا۔“ شہریار کے ترنت دیے جواب پر وہاں ایک زوردار تہقیر گونجا۔ تک نے بھی خود پر طاری ہنود کو ٹوٹا ہوا محسوس کیا اور دھیرے سے مسکرایا۔ اس کے بعد کا سارا وقت خوشگوار تھا۔ انہوں نے ساتھ مل کر ڈنر کرتے ہوئے آپس میں خوب باتیں کیں۔ آخر میں کافی کا دور چنا۔

”نیندیں محسوس ہو رہی ہے۔ میرے خیال میں اب سو جانا چاہیے تاکہ صبح اس جنگل پر سورج اترنے کا خوبصورت منظر دیکھ سکیں۔“ کافی پینے کے بعد سب سے پہلے شہریار نے اعلان کیا۔

”واقعی، میں بھی یہی کہنے والا تھا۔“ تک نے بھی جمائی روکتے ہوئے اس کی تائید کی اور پھر وہ ایک ایک کرتے ہوئے الا کے گرد سے اٹھنے لگے۔ اپنے خیمے کی طرف جاتے ہوئے آمنہ نے بطور خاص تک کی کمر کے گرد اپنا بازو محسوس کر دیا۔ اصل میں وہ خوف محسوس کر رہی تھی کہ نہیں نیند کی

”میں چچا کی سفارش پر صرف اور صرف انسانیت کی خاطر اس کام کے لیے تیار ہوتی ہوں۔ تک کو دھوکا دینا مجھے اچھا نہیں لگ رہا لیکن چونکہ یہ لاکھوں انسانوں کی زندگی کا معاملہ ہے تو میں تم سے تعاون کے لیے مجبور ہوں اور اس تعاون کے بدلے میں صرف اور صرف تک کی سلامتی چاہتی ہوں۔“ اس کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہوگئی تھی اور وہ نہایت سنجیدہ لہجے میں ان چاروں سے بیک وقت مخاطب تھی۔

”آپ فکر نہ کریں خاتون! مسٹر تک پر کوئی آج نہیں آئے گی۔ ہم کچھ ضروری معلومات کے حصول کے سوا ان سے کسی چیز کے خواہاں نہیں ہیں۔“ عمار کے نام سے متعارف کروائے جانے والے معاذ نے اسے تسلی دی۔

”اس کی بات پر یقین کرلو پیاری! جس طرح تم انسانیت کے نام پر ہماری مدد کر رہی ہو، یہ بھی انسانیت کے لیے ہی بہت سی قربانیاں دے کر یہاں موجود ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی ایسا کچھ نہیں کرے گا جو تمہاری ہنسی کھینچتی زندگی کو برباد کر دے۔“ ماہ بانو نے بھی اس کا ہاتھ تمام کر اسے تسلی دی اور چمک کر آتا ہوا دیکھ کر ٹھوڑے فاصلے پر ہوگئی۔

”تمہیں مسٹر تک کو دیکھ کر کچھ سیکھنا چاہیے مراد! ایک فرمانبردار شوہر خوشگوار ازدواجی زندگی کے لیے بہت ضروری ہے۔“ تک نے کھانے کے باکسر لا کر آمنہ کے ہاتھ میں تھمائے تو ماہ بانو شرارت سے بولی۔

”تم بھول رہی ہو پیاری دانف! شادی کے ابتدائی عرصے میں، میں بھی ایسا ہی ہوا کرتا تھا۔ ان کی شادی کو بھی چند برس مزید گزرنے دو۔ مسٹر تک کی فرمانبرداری میں بھی فرق آجائے گا۔“ شہریار کے ترنت دیے جواب پر وہاں ایک زوردار تہقیر گونجا۔

تک نے کھانے کے باکسر لا کر آمنہ کے ہاتھ میں تھمائے تو ماہ بانو شرارت سے بولی۔

”تم بھول رہی ہو پیاری دانف! شادی کے ابتدائی عرصے میں، میں بھی ایسا ہی ہوا کرتا تھا۔ ان کی شادی کو بھی چند برس مزید گزرنے دو۔ مسٹر تک کی فرمانبرداری میں بھی فرق آجائے گا۔“ شہریار کے ترنت دیے جواب پر وہاں ایک زوردار تہقیر گونجا۔

تک نے کھانے کے باکسر لا کر آمنہ کے ہاتھ میں تھمائے تو ماہ بانو شرارت سے بولی۔

تک نے کھانے کے باکسر لا کر آمنہ کے ہاتھ میں تھمائے تو ماہ بانو شرارت سے بولی۔

تک نے کھانے کے باکسر لا کر آمنہ کے ہاتھ میں تھمائے تو ماہ بانو شرارت سے بولی۔

تک نے کھانے کے باکسر لا کر آمنہ کے ہاتھ میں تھمائے تو ماہ بانو شرارت سے بولی۔

تک نے کھانے کے باکسر لا کر آمنہ کے ہاتھ میں تھمائے تو ماہ بانو شرارت سے بولی۔

تک نے کھانے کے باکسر لا کر آمنہ کے ہاتھ میں تھمائے تو ماہ بانو شرارت سے بولی۔

تک نے کھانے کے باکسر لا کر آمنہ کے ہاتھ میں تھمائے تو ماہ بانو شرارت سے بولی۔

شدت سے تک اپنا توازن کھو کر گر نہ پڑے۔ اسے معلوم تھا کہ کبک کے کافی کے کپ میں نشہ آور دوا شامل تھی۔

”گلتا ہے بوڑھا ہونے لگا ہوں جو ایک دن کی سیر اور تھوڑا سا جہوئی کھانا کھا کر ڈھیلا پڑ گیا ہوں۔“ طبیعت کا بوجھل پن محسوس کر کے کبک بڑبڑایا۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میری بھی کچھ تمہاری جیسی کیفیت ہے۔ آرام سے سو جاؤ، صبح اٹھو گے تو فریش ہو گے۔“ آئن نے اسے خیمے میں داخل ہو کر لیٹنے میں مدد دی۔ اس کا ذہن گہری نیند میں ڈوبنے لگا تھا جب کسی نے اس کا نام لے کر پکارا۔ اس نے چہ مشکل آنکھیں کھول کر پکارنے والے کو دیکھنے کی کوشش کی لیکن ذہن کو جکڑ لینے والی دوسرا آٹکھوں سے آگے کچھ نہ دیکھ سکا۔

”میری بات غور سے سنو کبک.....! اور میرے ہر سوال کا سوچ سمجھ کر جواب دو۔“ کیرتھر کی پہاڑیوں میں بسنے والے فیضو سے سیکھا گیا علم آج کارل کی پہاڑی پر تک پر آ کر آیا جا رہا تھا۔

☆☆☆

”وہ دیکھو، وہ ایلی ہے نا؟“ وہ دونوں سڑک کے کنارے چہل قدمی کر رہے تھے کہ ماہ بانو نے کچھ فاصلے پر جاتے ہو جان کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے اشارے پر شہریار نے دیکھا تو اسے بھی گندی رنگت والا لالکا لاکھ کوٹ میں لمبوس سر جھکائے دنیا دیا بیٹھا ہے بے خبر آہستہ روی سے آگے کی طرف جاتا ہوا دکھائی دیا۔

”اس نے اس موسم میں لالک کوٹ کیوں پکین رکھا ہے؟“

”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔“ اس نے ماہ بانو کے اچھ کر پوچھے گئے سوال کے جواب میں کہا۔

”مجھے تو کچھ عجیب لگ رہا ہے۔“

”مجھے بھی۔“ شہریار نے اس کی تائیدی۔ درحقیقت ایلاس حرف ایلی میں اس نے پہلی ملاقات سے ہی کچھ اگ، کچھ تعلق محسوس کیا تھا۔ اچھے ماحول میں پلے بڑھے آسودہ حال جوانوں کے انداز میں جو بے فکری اور خوش مزاجی کا عنصر ہوتا ہے، وہ ایلاس کی ذات میں مفقود تھا۔ اس کی بے چین آنکھیں، ماتھے پر بنتی بکڑتی ٹکٹیں اور بار بار کھٹکتی بند ہوتی انگلیاں گواہی دیتی تھیں کہ وہ اندر سے بے حد مضطرب اور بے سکون ہے۔

”کیا ہم اس کا چچا کریں؟“ ماہ بانو نے پوچھا۔

”ہموں کرنا تو نہیں چاہیے لیکن میرا دل کہتا ہے کہ ہمیں ایسا کر لینا چاہیے۔“

”تو بس ٹھیک ہے، پاسان عقل کوئی الحال ذرا سا سبز پر کرتے ہیں اور دل کی مانتے ہوئے اس کے پیچھے چل پڑتے ہیں۔“ ماہ بانو پر جوش ہوئی۔

تغائب کا یہ سلسلہ زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا۔ ایلی کی منزل قریبی بازار تھا۔ وہاں اس نے پہلے کتابوں کی ایک دکان کا رخ کیا۔ دکان پر وہ اطمینان سے کتابیں دیکھتا رہا۔ مجبوراً شہریار اور ماہ بانو کو بھی یہی کام کرنا پڑا۔ جب تک ایلی نے خوب چھان بین کر دوا انگریزی کتب منتخب کیں، ماہ بانو نے بھی ایک کتاب کا انتخاب کر لیا۔ بل جمع کروانے والوں کی قطار میں وہ اس کے بالکل پیچھے گھڑی تھی جبکہ شہریار ایک ستون سے ٹیک لگائے کھڑا دور سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ ابھی تک اس نے کوئی مشکوک حرکت نہیں کی تھی پھر بھی وہ اس کی طرف سے چوکتا تھا۔

”بہترین انتخاب۔ آپ کا انتخاب ہر بار مجھے متاثر کرتا ہے۔“ قیمت کی ادائیگی کے لیے ایلی نے کتابوں کو کاؤنٹر پر رکھا تو کاؤنٹر پر موجود نوجوان لڑکی نے مسکرا کر اسے سراہا۔ ایلی کے پیچھے گھڑی ماہ بانو نے بھی یہ الفاظ بہ خوبی سنے اور اسے اندازہ ہوا کہ وہ پہلے بھی کئی بار اس بک اسٹور پر آ چکا ہے۔

”انتخاب تو اس بک اسٹور کی انتظامیہ کا بھی بہت اچھا ہے۔ یہاں آنے والوں کو کتابوں کی اچھی ٹھیکشیں کے ساتھ ساتھ عمدہ اسٹاف کا تعاون بھی حاصل رہتا ہے۔“ ایلی کی جوابی تعریف کچھ معنی خیز تھی جسے سن کر کاؤنٹر گرل نے ایک ٹھکٹنا ہوا ہاتھ لگایا پھر شوش لہجے میں بولی۔

”کیا تم مجھے سے فلٹر کرنے کی کوشش کر رہے ہو؟“

”دیکھنا یہ ہے کہ اس کوشش میں کامیابی کب تک حاصل ہوتی ہے۔“

”اسٹور کی ساری کتابیں بکنے لگیں۔“ ایلی کے معنی خیز لہجے کے جواب میں لڑکی نے شوشی ہنسنے بے نیاز سے جواب دیا۔ اس دوران بل بننے اور رقم کی ادائیگی وغیرہ کا سلسلہ جاری رہا تھا چنانچہ جیسے ہی لڑکی نے کتب ایک کاغذی تحیلے میں ڈال کر ایلی کو تھمائیں، ایلی کاؤنٹر سے ہٹ گیا اور لڑکی ماہ بانو کا بل بنانے لگی۔ اگلی کتاب کی قیمت ادا کر کے بک اسٹور سے باہر نکلے میں اسے زیادہ وقت نہیں ملا اور فوراً ہی ایلی کے پیچھے باہر نکلنے والے شہریار سے جا ملی۔

”ایلی کہاں ہے؟“ اس نے دریافت کیا۔

”وہ رہا۔“ شہریار نے آنکھوں سے اشارہ کیا تو اس نے دیکھا کہ ایلی ایک اسٹال سے لافلاں خرید کر پلٹ

رہا ہے۔
”بظاہر یہ کاؤنٹر گرل کو شیشے میں اتارنے کے لیے
بک شاپ کے چکر لگا رہا ہے لیکن میری چھٹی حس مسلسل کسی
گزربڑ کا اشارہ دے رہی ہے۔“ اس نے شہریار کو اپنی
رائے سے آگاہ کیا۔

”وہ اس علاقے کی رہنمی کر رہا ہے۔ وہ یہاں کچھ
کرنا چاہتا ہے لیکن اس سے پہلے خود کو اس علاقے سے اچھی
طرح آشنا کرنے کے ساتھ ساتھ دوسروں کے لیے خود کو اس
عجب محلے کے ساتھ قابل قبول بنانا چاہتا ہے۔“ شہریار کے
سنجیدگی سے دیے جواب نے اسے ششدر کر دیا۔ اس کے
بعد بھی وہ قاصلے اور احتیاط سے اس کا جائزہ لیتے رہے۔ اس
نے ایک دودھری دکالوں سے بھی چھوٹی موٹی شاپنگ کی
اور پھر فلافل کا پیکنٹ لیے قریبی پارک میں ایک بیچ
پر جا بیٹھا۔ اب وہ کالوں میں بیٹھ فری ٹھونے فلافل کھانے
کے ساتھ ساتھ کسی سے ہلکی آواز میں بات کر رہا تھا۔ ماہ بانو
اور شہریار ٹھونے کے انداز میں اس کے قریب سے گزرے
لیکن انہیں کچھ سنائی نہیں دیا۔ وہ دونوں ایک نزدیکی بیچ پر
بیٹھ کر اسے دیکھنے لگے۔ انداز ایسا تھا کہ ان کا ”دیکھنا“
محسوس ہو رہا تھا۔ ایلنی نے بھی محسوس کیا اور کال بند کر کے ان
دونوں کی طرف متوجہ ہوا۔

”ایکسی کوئی! تم لپٹی وہی کے بیٹے الیاس ہوتا؟“
ماہ بانو نے بات کرنے میں پشیمانی۔

”ہاں ہوں، تو پھر.....؟“ اس نے سخت اور روکے
لہجے میں جواب دیا۔

”نہیں بس..... وہ اصل میں ہم دونوں میاں بیوی کو
لپٹی کی گانگی بہت پسند ہے۔ ہم یروٹلم میں ڈاکٹر سوسن اور
ڈاکٹر لیف کے ساتھ لپٹی سے ملنے گئے تھے تو تمہیں وہاں
دیکھا تھا بلکہ ہماری تم سے ملاقات ہوئی تھی۔“ ماہ بانو
کھینانے سے لہجہ میں وضاحت دینے کی کوشش کرنے لگی
کہ اس نے اسے کیوں غائب کیا ہے۔

”میری ماں کے بے شمار فخر ہیں جن میں سے کئی
روزانہ ان سے ملنے بھی پہنچ جاتے ہیں۔ بد قسمتی سے اگر
ایسے کسی موقع پر میں موجود ہوں تو ماں کی خاطر مجھے ہیلو
ہائے بھی کرنی پڑتی ہے لیکن ظاہر ہے کہ نہ میں ایسے لوگوں
کی خلیں غور سے دیکھتا ہوں اور نہ ہی ان میں سے کوئی مجھے
یاد رہتا ہے۔“ وہ بدلتی کی حد تک صاف گوئی کا مظاہرہ
کر رہا تھا۔

”سوری امیری وانف فین ایکساٹلمٹ کا فکار ہو کر

بھول گئی تھی کہ ہم آپ کی پرائیویسی میں غلطی ہو رہے ہیں۔
زمت کے لیے ایک بار بھر معذرت۔“ شہریار نے نرم لہجے
میں معذرت کی تو اس کے چہرے کے بڑے زاویے
قدرے بہتر ہوئے لیکن وہ اب بھی ان سے ٹکھو کرنے کے
مڑوں میں دکھائی نہ دیتا تھا۔

”ہم چلتے ہیں۔“ شہریار، ماہ بانو کا بازو تھام کر وہاں
سے اٹھ گیا۔

”وہ بھڑکا ہوا ہے اور لوگوں سے دور رہتا
چاہتا ہے۔“ قاصلے پر جا کر دی گئی شہریار کی اس رائے نے
ماہ بانو کو چوڑھ لکایا۔

”مطلب، وہ کچھ ٹھلا کرنے جا رہا ہے؟“

”مجھے ننانوے فیصد یقین ہے۔“

”ہم اس معاملے میں کیا کر سکتے ہیں؟“ ماہ بانو نے
بے چین ہو کر پوچھا۔ وہ ایک ماں تھی اور اس کے لیے یہ
تصور ہی محال تھا کہ لپٹی کی طرف سے کوئی دھچکا پہنچے۔
بے شک ایلنی، لپٹی کا لے پاگ بیٹا تھا لیکن ماں تو ماں ہوتی
ہے۔ جیسے وہ اپنے لے پاگ بیٹوں حبیب اور مصیب کو کوئی
نقصان پہنچنے کے تصور سے لرز جاتی تھی اسی طرح کچھ سکتی تھی
کہ لپٹی کے لیے ایلنی کے حوالے سے کوئی صدمہ برداشت
کرنا تکلیف دہ ہوگا۔

”میرا خیال ہے ہمیں سوسن اور لیف سے بات کرنی
چاہیے۔ لیف کی لپٹی سے اچھی دوستی ہے۔ وہ اسے متنبہ
نہیں کرے گا کہ اپنے بیٹے کو سنبھال سکتے ہیں تو سنبھال لے۔“
”لیکن ہمارے پاس توئی ثبوت نہیں ہے چین کرنے
کے لیے۔“ شہریار اس کا مشورہ سن کر حذبذب ہوا۔

”اس کی باڈی لینگویج چیخ چیخ کر کہہ رہی ہے کہ وہ
کچھ ٹھلا کرنے جا رہا ہے۔“

”اور ہم اس بات کو کیسے سمجھ سکتے ہیں؟“

”ہم سمجھ سکتے ہیں، ہم سیاح ہیں اور ہم نے ایک دنیا
دیکھ رکھی ہے۔“ ماہ بانو ہر حال میں ایلنی کو کچھ ٹھلا کرنے سے
روکنا چاہتی تھی اس لیے اسے دیکل سے قائل کرنے کی
کوشش کر رہی تھی۔

”اوکے، میں لیف کو کال کروں گا۔“ شہریار اس کی
کیفیت کو سمجھ رہا تھا اس لیے اسے اس سے وعدہ کرنا پڑا۔

”خدا کرے کہ ہم اسے بچا سکیں۔“ مضطرب سی ماہ
بانو نے دعا کی۔

☆☆☆

”آڈ آرنگ! آج بہت خاص موقع ہے اور میں

چاہتا ہوں کہ اس خاص موقع پر تم ہمارے ساتھ موجود رہو۔“ پروفیسر اینڈریو نے اپنی کال پر وہاں پہنچنے والی سونیا کو دیکھ کر لہک کر کہا اور پھر پہلے سے اپنے ساتھ موجود چینی باشندے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”کیوں مسٹر ڈاؤشوی! تمہیں اس موقع پر سونیا کی موجودگی پر اعتراض تو نہیں ہے نا؟“

”میزبان آپ ہیں اور اس جگہ کا کلی اختیار بھی آپ کے ہاتھ میں ہے تو ایسے میں، میں کون ہوتا ہوں کسی کی موجودگی یا غیر موجودگی پر اعتراض کرنے والا۔“ ڈاؤشوی کے نام سے پکارے جانے والے چینی شخص نے سپاٹ لہجے میں اینڈریو کی بات کا جواب دیا۔

”سونیا بہت سمجھ دار لڑکی ہے۔ اس کی موجودگی سے ہمارے کام میں کوئی حرج نہیں ہوگا۔ کیلی اور شیلی اس سے بالوس ہیں اور مجھے یقین ہے کہ شوٹنگ بھی اسے ناپسند نہیں کرے گا۔“ بوڈھے پروفیسر کی زندگی میں برسوں بعد سونیا کی شکل میں ایسی عورت آئی تھی جس کے حسن نے اسے تسخیر کر لیا تھا اور وہ موقع بے موقع اس کی اپنے قریب موجودگی کو پسند کرتا تھا۔

”شوٹنگ ہے تو پھر کام شروع کرتے ہیں۔“ ڈاؤشوی نے زیادہ طویل بات کرنے کا عادی نہیں دکھائی دیتا تھا۔ وہ زبردستی انسان کی آمد کے ساتھ ہی وہاں آیا تھا اور سونیا نے زیادہ تر اسے خاموش ہی دیکھا تھا۔

”اگر آپ میری موجودگی میں ستر نہیں نکل نہیں کرتے تو میں رگ جاتی ہوں۔“ سونیا نے جان بوجھ کر اسے مخاطب کیا۔

”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ اس نے سپاٹ تاثرات کے ساتھ اسے جواب دیا اور اینڈریو کی طرف ایسی نظروں سے دیکھنے لگا جیسے پوچھ رہا ہو کہ مزید کنواؤت برابرا کرنے کا ارادہ ہے۔

”اوکے، ہم کام شروع کرتے ہیں۔“ اینڈریو نے کہا اور ان دونوں کو اپنے ساتھ لیے اس راستے پر چل پڑا جو تھکانے تک جاتا تھا۔ حسب معمول لفٹ میں سوار ہونے سے پہلے انہوں نے اپنے عام لمبوسات کے اوپر گرم لباس پہنے اور پھر لفٹ کی مدد سے نیچے نکل گئے۔ نیچے پہنچتے ہی انہیں ایک زوردار دواڑستانی دی۔ یہ دواڑاں زبردستی انسان کی تھی جو کیلی، شیلی کے سامنے والے سیل میں ہی بند کیا گیا تھا۔ وہ کسی پھرے ہوئے سانڈ کی طرح سیل میں ادھر سے ادھر پھرا رہا تھا اور پھر لگاتے لگاتے جب اس سلاخوں

والے دروازے پر آکر کھڑا ہوتا تھا جس کے پار سے اسے سامنے والے سیل میں بند کیلی اور شیلی صاف دکھائی دیتی تھیں تو اس کے حلق سے ایک وحشیانہ آواز نکلتی تھی اور وہ سلاخوں کو یوں زور زور سے جھجھوٹا جیسے انہیں توڑ کر دوسری طرف پھینچا چاہتا ہو۔

”ہیلو شوٹنگ! کیا بات ہے، بہت غصے میں دکھائی دے رہے ہو۔ لگتا ہے تمہارے لیے صبر کرنا مشکل ہو رہا ہے لیکن یہ کوئی مہذب رویہ نہیں ہے دوست! تم اس طرح کے رویے کا اظہار کرو گے تو ہماری تربیت پر حرف آئے گا۔“ ڈاؤشوی لپک کر شوٹنگ کے سیل کی طرف گیا اور قدرے ناراض سے لہجے میں اس کی گوشائی کرنے لگا۔ سونیا نے دیکھا کہ اس ہلکی سی ڈانٹ کے نتیجے میں شوٹنگ کے رویے میں تبدیلی پیدا ہوئی اور وہ یوں سر جھکا کر کھڑا ہو گیا جیسے اپنے عمل پر شرمندگی کا اظہار کر رہا ہو۔ اس انوکھے منظر کو دیکھ کر سونیا نے ایک گہری سانس لی۔ صاف ظاہر تھا کہ جیسے کیلی اور شیلی پروفیسر کی سب باتیں سنتی اور سمجھتی تھیں، بالکل اسی طرز پر شوٹنگ کی بھی تربیت کی گئی تھی اور وہ بھی اپنے ٹرینر کی بات سمجھتا تھا۔ ڈاؤشوی کا جو تعارف انہیں کروایا گیا تھا، اس کے مطابق اس نے ڈاکٹر یوان منگ کے ساتھ مل کر شوٹنگ کی تربیت اور پرورش میں بھرپور حصہ لیا تھا اور وقت دراصل وہ یوان منگ ہی کی نمائندگی کر رہا تھا۔

”تم دونوں خوش ہو میری پیاریو! اونیکو، میں نے اپنا وعدہ پورا کیا ہے اور تمہارے لیے تمہارا سامی لے آیا ہوں۔“ پروفیسر اینڈریو شاید اپنی تربیت کی برتری جاننے کے لیے کیلی اور شیلی کے سیل کی طرف بڑھا اور بڑی محنت سے ان سے مخاطب ہوا۔ وہ دونوں جو پہلے ہی خوشی سے ہلکی آواز سے خوشیاں ہی تھیں، پروفیسر کے مخاطب کرنے پر تالیاں بجانے لگیں۔ بلاشبہ یہ ایک خوبصورت اور متاثر کن منظر تھا۔

”یاد ہے نا، شوٹنگ تم دونوں کا ہے لیکن پہلی بار یہ اس کے حصے میں آئے گا جسے یہ خود منتخب کر لے۔ امید ہے اس بات پر تم میں سے کوئی ہکا بکا نہیں کرے گا۔“ وہ کیلی اور شیلی سے یوں مخاطب تھا جیسے کوئی باپ اپنی بیٹیوں سے مخاطب ہو۔ جواب میں وہ بھی ایسی تیز اور فرمانبرداری کا مظاہرہ کر رہی تھیں جیسے وقت رخصت بیٹیاں باپ کی صحبت سنتی ہیں۔

”شوٹنگ ہے تو پھر انتظار ختم اور مکمل شروع۔“ پروفیسر اینڈریو نے اپنے ہاتھ میں تھامے ریوٹ کے ٹین باری باری دونوں سیلز کی طرف کر کے دبائے تو سلاخ وار

چلیں گے۔“

”آئی ایم سوری اینڈ ریو! میں تم لوگوں کو جو ان نہیں کر سکوں گی۔ مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ ویسے بھی میں کوئی سائنسٹ تو ہوں نہیں کہ کبھی اور شوٹنگ کے مشاہدے سے کسی قسم کے نتائج اخذ کر سکوں۔ اس لیے بہتر ہے کہ میں اپنا کام کروں اور تم اور شوٹی اپنا کام۔“ سونیا جو بادل ناخواستہ ہی اینڈ ریو کے بلا دے پر وہاں آئی تھی، موقع پاتے ہی بولی۔

”بات تو تمہاری تصحیح ہے۔ ٹھیک ہے، تم جاؤ۔“ اینڈ ریو نے اسے اجازت دے دی۔ وہ وہاں سے نکل کر سیدمی اس کمرے میں پہنچی جہاں بیٹھ کر وہ اور اس کا نائب اس عمارت کی سیکورٹی پر نظر رکھتے تھے۔ کمرے میں گلی بڑی سی اسکرین کئی حصوں میں منقسم اطراف کے مناظر کو دکھاتی رہتی تھی۔

”سب ٹھیک ہے؟“

”نیس نیم!“ نائب نے مستعدی سے اس کے سوال کا جواب دیا۔

”دیکھو، مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ تم ہر چیز پر اچھی طرح نظر رکھنا۔ کوئی معمولی سی بھی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔ معلوم ہے تاکہ آج کل معاملات کتنے حساس ہیں۔“ وہ اپنے ہینڈ بیگ میں رکھے سامان میں کی بیشی کرتے ہوئے اس سے مخاطب مگی۔

”آپ گھر نہ کریں نیم! میں خیال رکھوں گا۔“ نائب کو پتا بھی نہیں چلا کہ کب اس نے اپنا سلی فون بیگ سے نکال کر دراز میں ڈال دیا ہے۔

”گڈ! ٹھیک ہے، تو پھر میں چلتی ہوں۔“ وہ مطمئن سی باہر نکل گئی۔ ڈائنگ ٹاؤ نے اس ملاقات کے لیے سلی فون چھوڑ کر آنے کی خصوصی ہدایت کی تھی۔ اس روز بھی جب اسے اچانک ڈائنگ ٹاؤ کے پاس لے جایا گیا تھا تو لے جانے والے جینی ہاشدے نے راستے میں گاڑی بدلنے کے ساتھ ساتھ اس کا فون لے کر دوسری گاڑی میں سوار اپنے آڈی کے حوالے کر دیا تھا۔ فون واپسی میں اسے مل گیا تھا اور ساتھ ہی یہ اطلاع بھی کہ اس کے فون میں ٹریکر لگا ہوا ہے۔ یہی صورت حال گاڑی کی بھی تھی۔ اس کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ یہ کس کی حرکت ہے۔ اس حرکت کی وجہ بھی وہ جانتی تھی۔ ظاہراً اسے معاف کر کے اہم ذمے داریاں سونپنے کے باوجود اس پر مکمل بھروسہ نہیں کیا جا رہا تھا اور وہ اب تک زیر نگرانی تھی۔ اس نے موبائل سبیں چھوڑ

دروازے کھل گئے۔ دروازہ کھلنے پر شوٹنگ زور سے چوٹکا اور یوں لگا کہ دیوانہ وار باہر نکلے گا لیکن پھر اس نے خود پر قابو پایا اور اپنے بھاری بھر کم وجود کے ساتھ آہستہ آہستہ اپنے سبل سے باہر نکلا۔ اس موقع پر کبلی اور شلی کی خوشیاہٹ میں اضافہ ہو گیا اور واضح طور پر احساس ہونے لگا کہ وہ شوٹنگ کو اپنی اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ پروفیسر، ڈاڈا شوٹی اور سونیا نے ایک دیوار کے ساتھ سمٹ کر ان کے درمیان سے ہٹ جانا مناسب سمجھا۔ وہ تربیت یافتہ تھے لیکن یہ طے شدہ تھا کہ ان کے عظیم بچوں کے اندر موجود حیوانی طاقت اگر وحشیانہ رخ اختیار کر لیتی تو اچھی خاصی مشکل کھڑی ہو سکتی تھی۔ بے شک وہ جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے انہیں قابو کر سکتے تھے لیکن اس میں نقصان کا بھی احتمال تھا پھر بات ان خاص لمحات کی بھی تھی۔ انہیں دیکھنا تھا کہ شوٹنگ کے منتخب کرتا ہے اور کون سے ملک کے لیے اپنا گویہر مقصود پہلے پانے کے امکانات پیدا ہوتے ہیں۔ کبلی اور شلی اپنے بھاری وجودوں کے ساتھ حلق سے آوازیں نکالتی ہوئی رقص کے انداز میں شوٹنگ کے ارد گرد گھوم رہی تھیں اور وہ گردن موڑ کر باری باری یوں انہیں دیکھ رہا تھا جیسے جانچ رہا ہو کہ دونوں میں کون اس کے لیے زیادہ بہتر سامی ہے۔ آخر کار یہ ٹکٹلش ختم ہوئی اور اس نے کبلی کی طرف پیش قدمی کی۔ اس کی اس پیش قدمی پر شوٹی کے حلق سے پُرسرت آواز نکل جیکہ اینڈ ریو کے چہرے پر ایک سایہ سا لہر ا گیا۔ یہ شروع سے طے تھا کہ کبلی کے بطن سے جنم لینے والے بچے جین اور شلی کے بطن سے پیدا ہونے والے بچے اسرائیل کی ملکیت ہوں گے۔ شوٹنگ نے کبلی کو منتخب کر کے گویا جین کے حق میں فیصلہ دے دیا تھا۔ اس کے اس فیصلے پر شلی بھی مایوسی دو قدم پیچھے ہٹ گئی تھی اور کسی قسم کی ہنگامہ آرائی نہیں کی تھی۔

”اب ہمیں چلنا چاہیے۔ اپنی خلوت میں کسی اور کی موجودگی کو یہ انسانوں ہی کی طرح ناپسند کرتے ہیں۔“ اینڈ ریو نے اپنی مایوسی کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے ان لوگوں سے کہا تو وہ سر کو تنہی جنبش دیتے ہوئے لفٹ کی طرف بڑھ گئے۔ ”میں نے نیچے پر جگہ کیسزے لگوائے ہوئے ہیں۔ ان کیسروں کی مدد سے ہم اوپر بیٹھ کر بھی نیچے ہونے والی ساری کارروائی کو آرام سے دیکھ سکتے ہیں۔“ جب وہ لوگ لفٹ کے ذریعے اوپر پہنچ کر اپنے گرم کپڑوں سے نجات حاصل کر رہے تھے تو اینڈ ریو نے انہیں آگاہ کیا۔

”یہاں سے ہم سیدھے میرے خاص کمرے میں

دیا تھا اور گاڑی کا بندوبست بھی پہلے ہی طے ہو چکا تھا۔
 جلد کے ایک ریسٹورنٹ کی پارکنگ میں گاڑی روکے ہی ایک دوسری گاڑی اس کی گاڑی کے ساتھ آرکی تھی۔ اپنی گاڑی لاک کر کے اس گاڑی میں منتقل ہونے میں اسے چند منٹ ہی لگے۔ گاڑی نے وہاں سے نکل کر چند گز کا فاصلہ ہی طے کیا اور وہ پھر ایک دوسری گاڑی میں منتقل کر دی گئی۔ اس گاڑی کو اس دن والا چینی ہی چلا رہا تھا۔
 ”بہت زیادہ محتاط ہو تم لوگ۔“ گاڑی کے چلتے ہی سونیا نے تبصرہ کیا۔

”کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ہمارا واسطہ کس سے ہے۔“ وہ خفیف سا مسکرایا۔
 ”مناثر ہو ہمارے اداروں کی کارکردگی سے؟“ سونیا نے اسے چھیڑا۔

”معترف ہوں اور انسان کی کامیابی کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کی خوبیوں کو جانتا اور مانتا ہو۔ جو صرف اپنے آپ کو ہی اعلیٰ سمجھتا رہتا ہے، وہ ایک دن بری طرح ٹھوکر کھاتا ہے۔“ اس کے سادگی سے دیے جواب میں بہت بڑی حقیقت موجود تھی۔ تاریخ گواہ تھی کہ دنیا کی عظیم الشان قوتوں نے خود کو اعلیٰ اور دوسروں کو ادنیٰ سمجھنے کی غلطی کے ہاتھوں ہی اپنا زوال دیکھا تھا۔

راست تمام ہوا اور وہ ایک بار پھر ڈانگ تادی کے رو برو پہنچ گئی۔ ڈانگ نے مسکرا کر اس کا استقبال کیا اور کچھ چپکتے ہوئے لہجے میں بولا۔

”آج تمہاری دو اہم شخصیات سے ملاقات کروانی ہے۔ امید ہے کہ یہ ملاقات تمہارے لیے باعثِ مسرت ہوگی۔“
 ”ایسی کون سی باکمال شخصیات سے ملانے لگے ہو مجھے؟“ اس نے بظاہر بے نیازی سے لیکن دراصل دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

”یہ تو تمہیں ان کے روبرو ہو کر ہی اندازہ ہوگا۔“ ڈانگ کی مسکراہٹ پر اسرار ہو گئی اور واقعی جب وہ اسے ملاقات کے کمرے میں لے گیا تو وہ دم بخود رہ گئی۔ یہاں تک کہ اس کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ وہاں موجود دونوں شخصیات میں سے پہلے کس کی طرف توجہ دینی چاہیے۔

☆☆☆

”آپ کی ملازمت کی مجبوری نہ ہوتی تو ہم آپ سے امید کرتے کہ جب تک ہم جہد میں ہیں، آپ بھی یہیں ٹھہریں۔“ جی واکر سے الوداعی ملاقات کرتے ہوئے شہر یار اس سے بڑے بااخلاق لہجے میں مخاطب تھا۔

”واقعی، میں بھی مسز واکر جیسے شاندار فوٹو گرافر کی کمی شدت سے محسوس کروں گی۔“ ماہ بانو نے بھی گرہ لگائی۔ وہ دلوں میاں بیوی جانتے تھے کہ اپنے ساتھ اتنا سب کچھ ہو جانے کے باوجود واکر کا دماغ ایسی سختی کے مانند ہے جس پر درج ہر تحریر کو مٹا کر اپنی مرضی کی تحریر لکھ دی گئی ہے۔ اسے کئی دہائی کے شو سے واپسی میں اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات میں سے کچھ بھی یاد نہیں رہا تھا اور ذہن پر یہ بات نقش ہو چکی تھی کہ مراد اور تانیہ نامی جن دو مشکوک سیاحوں کی حقیقت کھوجنے لگتا تھا، وہ سچ بچے بے ضرر ثابت ہوئے تھے۔ ان کو بے ضرر سیاح تسلیم کر لینے کے بعد جی واکر کے پاس ان کا پیچھا کرتے رہنے کا کوئی جواز باقی نہ رہا تھا اس لیے اس نے یروٹلم واپس لوٹنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

”اگر ایسی بات ہے تو میرے ساتھ یروٹلم واپس چلو۔ ویسے بھی یروٹلم میں جہد کے مقابلے میں ایسے مقامات زیادہ ہیں جہاں یادگار تصویریں لی جاسکیں۔“ واکر نے خوشدلی سے اس کی بات کا جواب دیا۔

”یروٹلم کا کسی دوسرے شہر سے تقابل جتنا ہی نہیں ہے۔ یروٹلم، یروٹلم ہے اور ہمیں وہاں کچھ وقت مزید گزارنا ہے۔ بس ہم اپنے دوستوں ڈاکٹر سون اور ڈاکٹر لیف کی مصروفیت کم ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔ ویسے بھی ہمیں جہد پسند آیا ہے۔ یہاں کے ساحلوں سے لے کر کارل کے جنگلات تک سب کچھ بہت دل موہ لینے والا ہے۔“ جواب ماہ بانو کے بچاے شہر یار نے دیا۔

”مجھے خوشی ہے کہ تمہیں میرا وطن پسند آیا ہے اور تم اپنے ڈائریز کے بدلے میں یہاں سے بہت سی خوشگوار یادیں لے کر واپس جاؤ گے۔“ واکر خوشدلی سے بولا اور پھر رخصت کی اجازت چاہی۔

”چلو جی، اس سے تو جان چھوٹی۔“ اس کے جانے کے بعد ماہ بانو نے ہاتھ جھماڑے اور پھر پرتائش لہجے میں بولی۔
 ”ویسے بہت کمال کا لڑکا ہے معاذِ کیسے منوں میں سب کچھ کنٹرول میں کر لیتا ہے۔ واکر اور تک والے معاملات میرے سامنے پیش نہ آئے ہوتے تو میرے لیے تعین کرنا مشکل تھا کہ کوئی انسان اس طرح کسی دوسرے انسان کے دماغ پر مکمل قبضہ بھی کر سکتا ہے۔ میرے حساب سے تو ہٹا نرزم بس ایک طرح کا طریقہ علاج ہے جس میں دواؤں کے زیر اثر کسی حد تک معالج اپنے مریض کو واپس میں لے کر اس کے دماغ میں کچھ باتیں رائج کر سکتا ہے لیکن ایسے پورے کے پورے بندے کو اپنے اشاروں پر

نہایت تو کمال ہے یار! وہ معاذ سے بہت زیادہ متاثر نظر آرہی تھی۔

”معاذ میں کوئی کمال کی بات ہے جب ہی تو اسے اس مشن میں بنیادی حیثیت دی گئی ہے اور ہم شخص اس کے مددگار کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔“ شہر یار نے مسکرا کر اسے جواب دیا۔

”وہ واقعی ایک بہترین انتخاب ہے۔ اس کی صلاحیتوں کا کمال ہے کہ مشکل اور پیچیدہ معاملات چٹکیوں میں طے پار ہے ہیں۔“

”بے شک ایسا ہی ہے لیکن پیچھے سے بھی کوئی کم کام نہیں کیا گیا ہے۔ ایران سے کوئی شخص لے کر ہم آئیں گے چچا احتشام تک پہنچے تھے۔ یہ احتشام کا بی کا رتا ہے کہ اس نے آئینہ کی ذہن سازی کی اور اسے اس بات پر راضی کیا کہ وہ ہمارے ساتھ تعاون کرے۔ آئینہ کے تعاون کے بغیر یہ سب اتنا آسان نہیں تھا۔“

”نیم درک کی اہمیت سے تو انکار ممکن ہی نہیں ہے لیکن مجھے سچ میں معاذ نے متاثر کیا ہے۔ اپنی خاص صلاحیت کے علاوہ بھی وہ اچھا لڑکا ہے اور اس کے طور طریقے دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ کسی اچھے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔“

”واہ بھئی، چند کمینوں میں تم نے اس کے طور طریقوں کو بھی سچ کر لیا۔“ شہر یار نے جان بوجھ کر اسے چھیڑا۔
”اس کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے اس کی آنکھوں کی حیا ہی کافی تھی۔ میں نے خود پر اور آئینہ پر پڑنے والی اس کی نگاہوں کو شفاف پایا تھا۔ بلند کردار مرد ہی اعلیٰ اوصاف کے مالک ہوتے ہیں۔“ اس نے مضبوط لہجے میں دلیل دی تو شہر یار ہنس پڑا۔

”مان لیا جناب آپ کی بات کو۔ اب ذرا ریوٹ تو پکڑا، خبریں لگاتے ہیں تاکہ شہر کا کچھ حال احوال تو ملے۔“
”یہ کیوں نہیں کہتے کہ باقی مردوں کی طرح آپ کے ہاں بھی نی دی کا درجہ بیوی کے درجے سے بلند ہے۔“
ماہ ہالو نے مصنوعی ناراضی کا مظاہرہ ضرور کیا لیکن خود ہی ریوٹ اٹھا کر نی دی کھول دیا۔ کوئی یوز جیسٹ ہی لگا ہوا تھا۔ زبان سے آستانہ ہونے کے باعث ماہ ہالو دھچکی لینے کے بہانے ریوٹ شہر یار کو پکڑا کہ خود الماری کی طرف بڑھ گئی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس فرصت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنا کچھ سامان سمیٹ لیا جائے۔

”آپ نے لیف کو ایلی کے سلسلے میں کال کی تھی، کیا

جواب دیا لیف نے؟“ الماری میں سر ڈالے، خیال آنے پر اس نے وہیں سے شہر یار سے سوال کیا۔

”سن کر وہ بھی تیش میں جلا ہو گیا تھا اور کہہ رہا تھا کہ کوشش کروں گا جلد از جلد لیلی کو اس سلسلے میں خبردار کر دوں۔“ شہر یار نے اسے جواب دیا اور نی دی کی آواز ذرا سی بلند کر دی۔ ماہ ہالو نے پہلے یوز جیسٹ کی بجائی آواز سنی اور پھر شہر یار کی حیرت اور صدمے میں ڈوبی ہوئی بلند آواز۔
”اوہ میرے خدا یا..... ایہ کیا ہو گیا؟“

الفاظ اور لہجہ دونوں ایسے تھے جنہوں نے ماہ ہالو کو فوری طور پر پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ نظریں سیدھی نی دی کی اسکرین سے جا کر ٹکرائیں۔ زبان بے شک سمجھ نہیں آرہی تھی لیکن اینکر کا لہجہ اور اسکرین پر موجود شناسا علاقے کا انجنا م نظر بہت کچھ سمجھا رہا تھا۔ دکھ اور صدمے میں گھری وہ الماری کھلی چوڑی نو سٹر مٹونے پر آئی تھی۔ نظریں یوز اسکرین پر جچی تھیں اور آنکھوں سے خود بخود ہی چند آنسو پھسل کر رخسار پر بہتے چلے گئے تھے۔

☆☆☆

لائف کوٹ والے اس لڑکے کا چہرہ اب وہاں کسی کے لیے اجنبی نہیں رہا تھا۔ وہ اسے کئی دن سے بلاناغہ اپنے آس پاس دیکھ رہے تھے۔ کبھی وہ کتابوں کی دکان پر نظر آتا تو کبھی استعمال کی کوئی عام سی شے خریدتا۔ کسی اسٹور سے کوئی سوٹ ڈرنک لے کر بیٹیا کھانے کی کوئی چیز خرید کر بغل میں دبائے قریبی پارک میں چلے جاتا بھی اس کے معمولات میں شامل تھا لیکن یہ بات اس کے صورت شناس تقریباً ہر شخص نے نوٹ کی تھی کہ اس کا سب سے زیادہ وقت بک اسٹور پر گزرتا ہے۔ وہ جتنے انہماک سے جائزہ لینے کے بعد ہر روز وہاں سے چند ایک کتابیں خریدتا تھا، بھگتے..... کو سمجھا جاسکتا تھا کہ وہ کوئی کتابوں کا عاشق ہے لیکن دیکھنے والی نظریں دیکھ رہی تھیں کہ اس کی توجہ کا اصل مرکز وہ کاؤنٹر گرل ہے جس کے کاؤنٹر پر وہ دوسرا کاؤنٹر خالی ہونے کی صورت میں بھی قیام میں لگ کر مل جمع کر داتا تھا۔ مل کی ادائیگی کے دوران ان کے درمیان چند شوخ جملوں کا تبادلہ بھی ہو جاتا تھا لیکن لڑکا کچھ شرمیلا تھا یا تذبذب کا شکار کہ اس نے ابھی تک لڑکی سے مکمل کرنا تمنا نہیں کیا تھا۔ کاؤنٹر گرل ہنسنے رہے تھے کہ براہ راست انہماک نہ سہی، وہ اسے دوستی کی پیشکش تو ضرور کرے گا اور پھر دوستی کے نامے لکھ کر میرا تفریح کی دعوت.....

آج بھی وہ معمول کے مطابق بک اسٹور کے اندر

موجود تھا اور اسٹور کے ایک الگ گوشے میں کھڑا گھرے استغراق کے ساتھ کتابوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ متعلقہ کاؤنٹر کرل اپنے فرائض انجام دیتے ہوئے مجھ بھاگے اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھ لیتی تھی۔ کبھی کبھی اس کے ہونٹوں پر شوخ مسکراہٹ بھی چمک اٹھتی تھی لیکن لڑکانی الحال اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ لڑکی نے اپنے دل میں ٹھان لی تھی کہ اس شرمیلے بندے کی خاموشی توڑنے کے لیے آج خود سے کوئی چٹھرت کرے گی۔ اس کا خیال تھا کہ آج کے دور میں کسی بات کو اتنے عرصے لٹکائے رکھنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ بہتر تھا وہ اس سے واضح بات کرتا۔ وہ ایک دوسرے کے بارے میں جانتے اور پھر فیصلہ کیا جاتا کہ اس دوستی کو آگے لے کر چلنا ہے یا نہیں۔

ابھی وہ انہی سوچوں میں غلٹاں تھی کہ اسٹور کے باہر کچھ غیر معمولی لچل محسوس ہوئی اور اس سمیت کئی افراد کی توجہ اس طرف مبذول ہوئی۔ کتابوں کا جائزہ لیتے لڑکے نے بھی کن انکھیں سے اس طرف دیکھا لیکن اپنی جگہ سے ہلانہیں۔ نگاہیں پلٹنے سے پہلے وہ ان دو افراد کو اسٹور کے اندر آتا ہوا دیکھ چکا تھا جو میز کے باڈی گارڈز کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان دونوں نے اندر آتے ہی اسٹور پر رش کم کرنے کے لیے لوگوں کو وہاں سے نکالنا شروع کر دیا۔ وہ اس لیے کوٹ والے لڑکے کی طرف بھی بڑھے لیکن کاؤنٹر گرل کی آواز نے قدم روک لیے۔

”پلیز سر! یہ ہمارے مہذب اور ریگولر کسٹمر ہیں۔ ان کی ذات سے آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی۔“

”اوکے تمہاری سفارش پر ہم اسے رہنے دیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے میز کے ساتھ پہلی لینے کا سامن قہل جائے۔“

”تھینک یو سر!“ کاؤنٹر گرل کے الفاظ ابھی منہ میں ہی تھے کہ بظاہر دف سے چلے میں لیکن درحقیقت برانڈ ڈیوٹی شرٹ اور ٹراؤزر پہنے میز اندر داخل ہوا۔ وہ اپنے اگلے ایکشن کے لیے کھین چلا رہا تھا اور عوامی جگہوں پر بظاہر اچانک وارد ہو کر اور عوام میں مکمل ل کر اپنی مقبولیت بڑھانے کی کوششوں میں مصروف تھا۔ اس کی اس حقیقت سے واقف لیے کوٹ والا لڑکا اسے دیکھ کر حقارت سے مسکرایا لیکن فوراً ہی رخ موڑ لینے کی وجہ سے اس کی یہ مسکراہٹ کسی کی نظروں میں نہ آ سکی۔ درحقیقت اس وقت سب کی توجہ میز کی طرف مبذول تھی اور صرف اس کے گارڈز تھے جو اپنی عقابلی نظروں سے بک اسٹور کے چپے چپے کا جائزہ لے رہے تھے۔ ان میں سے ایک کو قدرے تاخیر سے خیال آیا

کہ ایک ایسے وقت میں جبکہ سب کی نظریں میز پر تکی ہیں، یہ لیے کوٹ والا لڑکا کون ہے جو میز سے منہ پھیر کے کتابوں کے شلف کی طرف رخ کیے کھڑا ہے۔ اس نے اس لڑکے کو چپک کرنے کے لیے قدم آگے بڑھایا ہی تھا کہ لڑکا پلٹا۔ اس کے ہاتھ میں ایک خطرناک گن تھی۔ گارڈ کی گن سیدھی ہوتی، اس سے قہل ہی لڑکے کی گن نے گولیاں اگلنا شروع کر دیں۔ پہلی گولی اس کاؤنٹر گرل کے سینے میں بیوست ہوئی جس کے بارے میں خیال کیا جا رہا تھا کہ وہ اس کی خاطر بک اسٹور کے چکر لگاتا ہے۔ لڑکی کے زدمیں آنے کی وجہ یہ تھی کہ جب پہلا برسٹ چلایا گیا تو وہ عین میز کے سامنے کھڑی اپنی دلواؤ مسکراہٹ کے ساتھ اس کا آٹو گراف وصول کر رہی تھی۔ لڑکی گولی کھا کر مری۔ اس کے دامن بائیں سے بھی چند چھین بلند ہوئیں۔ کچھ گارڈز نے لپک کر میز کو گور کیا اور کچھ نے لڑکے کو نشانہ بنانے کی کوشش کی۔ وہ تربیت یافتہ تھے۔ ان کا نشانہ چوکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بیک وقت تین گولیاں لیے کوٹ والے لڑکے کے جسم میں بیوست ہوئیں لیکن یہ سب ہونے سے پہلے ہی وہ گن چھینک کر اپنا ہاتھ اپنے لیے کوٹ کے گریباڑ میں ڈال چکا تھا۔ گولیوں نے اس کے جسم میں چھید کیے تو وہ تڑپ کر پیچھے نہیں گرا بلکہ اس کا جسم اچانک ہی زوردار دھماکے سے پھٹ پڑا۔ دھماکا اتنا زوردار تھا کہ بک اسٹور سے دور دور تک سنگا اور کئی چشم دید گواہوں نے بک اسٹور کی چھت کو اڑتے ہوئے دیکھا۔ آگ کے شعلے بھڑکے، چنچ و پکار بلند ہوئی، ایمر جنسی نمبر ڈائل کیے جانے لگے۔ ہوڑ بھائی گاڑیاں برقی رفتار سے جانے وقوع کی طرف لپکیں لیکن دھماکا جس شدت کا تھا اور وہاں جو قحامت ہوا ہو چکی تھی، اسے دیکھ کر یہ بات بہ آسانی سے بھی جاسکتی تھی کہ بک اسٹور کے اندر کسی جاندار یا بے جان کی سلامتی کی امید نہیں کی جاسکتی تھی۔

☆☆☆

”ہر مذہب کے اپنے مقدسات، رسم، رواج اور عقائد ہوتے ہیں اور کسی مذہب کے پیروکار اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ ان میں سے کسی کو پھینچا جائے یا ان کی خلاف ورزی کی جائے۔ ہر فانی انسان کا معاملہ بھی ہمارے لیے کچھ ایسا ہی ہے۔ ہم انہیں کائنات کے سربت رازوں میں سے ایک سمجھتے ہیں اور غلطی پسند نہیں کرتے کہ عام انسان ان کی تنہائی میں مداخلت کریں۔ وہ جو ہیں، جیسے ہیں، انہیں بغیر کسی مداخلت کے ویسا ہی رہنے دیا جائے۔ ہمارا بس اتنا

ہی مطالبہ ہے۔ "نارنجی لباس میں لمبوس سفید لمبے بالوں اور ڈاڑھی والا بوڑھا بوڑھا تھا تو اس کے چہرے کی جھریوں میں سے جھانکتی سرخی اس کے پیش میں ہونے کا پتا دیتی تھی۔

"کیا آپ نے اپنا یہ مطالبہ اپنی حکومت کے سامنے پیش کیا تھا؟" بوڑھے کے سامنے احترام سے بیٹھے معاذ نے اس سے سوال کیا۔ وہ بوڑھا اصل میں دلائی لاما تھا۔ عظیم مذہبی رہنما جو شوٹنگ کی آمد سے قبل ہی سرکاری طور پر اسرائیل پہنچ گیا تھا۔ بظاہر یہاں اسے چند ایسی اہم مذہبی تقریبات میں شرکت کرنا تھی جن کا شیڈول ایک عرصے سے طے تھا لیکن اسرائیلی حکومت کو دلائی لاما کی آمد کی اطلاع بہت تاخیر سے دی گئی تھی۔ اس تاخیر کے باوجود حکومتی سطح پر دلائی لاما کو پروٹوکول دیا گیا تھا اور حکومت اسرائیل کی طرف سے بھرپور مہمان نوازی کی پیشکش تھی لیکن دلائی لاما نے اس پیشکش کو قبول کرنے سے معذرت کر لی تھی۔ ان کا موقف تھا کہ وہ ایک مذہبی دورے پر آئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ وقت اپنے عقیدت مندوں کے درمیان روحانی برکتیں بانٹتے ہوئے گزاریں۔ انہوں نے سیکورٹی کے معاملے میں بھی اپنے عقیدت مندوں پر بھروسے کا اظہار کیا تھا لیکن اسرائیلی حکومت کے اصرار پر حکومتی سیکورٹی کو چند شرائط کے ساتھ قبول کر لیا تھا۔ سب سے بنیادی شرط یہ تھی کہ یہ سیکورٹی بیرونی حدود میں ہوگی اور کسی بھی حکومتی اہلکار کو بلا اجازت وہاں جاری مذہبی رسومات میں شمولیت کی اجازت نہیں ہوگی۔ دلائی لاما کی اس خواہش کو قبول کر لیا گیا تھا لیکن سرکاری اہلکار اور جاسوس ان کی رہائش گاہ کے ارد گرد اس طرح پھیلے ہوئے تھے کہ ان کی نظروں میں آئے بغیر کوئی چیز یا کچھ بھی اندر نہیں جاسکتا تھا۔ کوشش تو انہوں نے یہ بھی کی تھی کہ اپنے آلات جاسوسی کے ذریعے اندر ہونے والی کارروائیوں اور گفتگو سے آگاہ رہیں لیکن اس سے ابھی تک انہیں کچھ حاصل نہیں ہوا تھا۔ اندر کی جتنی بھی خبریں ان تک پہنچ رہی تھیں، ان سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہاں مذہبی تقریبات پورے زور و شور سے جاری ہیں اور دلائی لاما وقتاً فوقتاً اپنے عقیدت مندوں کو روحانی فیوض و برکات سے بہرہ مند کرتے رہتے ہیں۔ اس جاسوسی کے نتیجے میں انہیں یہ بھی پتا چلا تھا کہ دلائی لاما اپنا بیشتر وقت گوشہ نشینی میں مراقبہ اور عبادات کرتے ہوئے گزارتے ہیں اور عبادات میں شرکت کے مواقع کے علاوہ ان کا کسی بھی فرد سے بہت کم رہلہ مضبوط ہوتا ہے۔

اتنی تفصیلات سے باطلم ہونے کے بعد اسرائیلی خفیہ

اداروں کو یقین آنے لگا تھا کہ شوٹنگ کی آمد کے آس پاس دلائی لاما کی اسرائیل میں موجودگی محض ایک اتفاق ہے۔ البتہ انہیں اس بات کا علم نہیں تھا کہ انہیں یہ بات باور کروانے کے لیے پوری شعوری کوشش کی گئی ہے اور دلائی لاما مذہبی امور انجام دینے کے ساتھ ساتھ کئی، کئی سالوں کے معاملے کو بھی بھرپور طریقے سے دیکھ رہے ہیں۔ ان کی رہائش گاہ میں ان کے لیے شخص کراہر طرح سے محفوظ تھا۔ اس ساؤنڈ پروف کمرے کی کوئی آواز باہر نہیں جاتی تھی۔ باہرین کی ایک ٹیم دن میں تین سے چار بار کمرے کا جائزہ لیتی تھی کہ کہیں بے خبری میں وہاں کوئی خفیہ آلہ نہ فٹ کر دیا گیا ہو۔ رہائشی عمارت سے ایسی زیر زمین سرنگیں بھی خفیہ ٹھکانوں پر جا کر ملتی تھیں جن کے ذریعے دلائی لاما چاہے تو خود کہیں چلا جائے یا ان سرنگوں کے ذریعے کسی کو بھی خفیہ ملاقات کے لیے بلوالے، باہر والوں کو ان سب معاملات کی کالوں کا ان خبر نہیں ہو پاتی تھی اور دلائی لاما جس مقصد کے لیے وہاں آیا تھا، اس پر پورے زور و شور سے کام جاری تھا۔ معاذ سے ملاقات بھی اسی مشن کا ایک حصہ تھی۔

"ہمیں بتاتے ہوئے انہیں ہورہا ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ ہر مذہب کے پیروکاروں کے درمیان راسخ العقیدہ افراد کے ساتھ ساتھ کچھ بدعقیدہ، لٹھ اور باغی افراد بھی موجود ہوتے ہیں اور عموماً یہ افراد حکومتی حلقوں میں ہی ہوتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو ہماری عوامی قبولیت کی وجہ سے بظاہر ہمارے ساتھ بنا کر کھتے ہیں لیکن در پردہ ہماری مرضی کے خلاف کارروائیاں جاری رکھتے ہیں۔ دنیاوی ترقی اور عروج کی خواہش، مذہب سے زیادہ سائنس کو تسلیم کرنا اور ذاتی تکبران سے وہ کچھ کر دیتا ہے جو اس وقت تم ہماری حکومت کو کرتے ہوئے دیکھ رہے ہو۔ حکومت کی اس دھوکا دہی کے بعد ہم پر لازم ہو گیا تھا کہ ہم اپنی طرف سے جاری امن مشن کو فی الحال منقطع کر دیں اور اپنی مذہبی ملاقات کا بھرپور اظہار کریں۔ اسی لیے ہم یہاں موجود ہیں اور اسی لیے ہمیں تمہارا تعاون درکار ہے۔" انہوں نے خفیہ رنگ کے ذریعے خود تک پہنچائے جانے والے معاذ کے سوال کا مدلل جواب دیا۔

"میں آپ کے ساتھ ہر ممکن تعاون کرنے کو تیار ہوں لیکن احتیاطاً دامن نہیں چھوڑ سکتا کیونکہ یہ حقیقت آپ بھی جانتے ہیں کہ میری اور آپ کی حکومت کے کچھ مشترکہ مفادات ہیں جن پر کام کرنے کے لیے میں یہاں موجود ہوں اور یہاں کام کرنے کے لیے آپ کی حکومت مجھے بہت

کی سہولیات دے رہی ہے۔“ معاذ نے بڑا ناپ تول کر سیدھا اور صاف جواب دیا۔

”ہم یہ سب جانتے ہیں اور درحقیقت ہمیں براہ راست تمہاری مدد درکار بھی نہیں ہے۔ ہم تو اس لڑکی کا تعاون چاہتے ہیں جس کے بارے میں اطلاع ملی ہے کہ وہ تمہاری کوئی بات نہیں ٹال سکتی۔“

”سونیا.....!“ معاذ کی زبان سے سرسراتی ہوئی آواز میں نکلا۔

”بالکل وہی۔ ہم تمہارے نام پر پہلے ہی اس لڑکی کا تعاون طلب کر چکے ہیں لیکن مناسب سمجھتے ہیں کہ ایک بار براہ راست تمہارے سامنے بھی بات ہو جائے تو اس کے دل میں کوئی ابہام نہ رہے۔ اسی مقصد کے لیے ہم نے اسے بھی یہاں مدعو کیا ہے۔“ دلائی لاما کی بات ابھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ سونیا کی آمد کی اطلاع دی گئی اور معاذ نے ایک عرصے بعد اس پری پیکر کو اپنے روبرو دیکھا۔ اس کے دیکھنے کے انداز نے اسے بتا دیا کہ وہ اس کی یہاں آمد کے متعلق پہلے سے باخبر نہیں تھی اس لیے ٹھنک سی گئی تھی اور کچھ حذبذب بھی تھی۔ اس کے تذبذب کی وجہ سمجھتے ہوئے اس نے آنکھ کا خف سا اشارہ کرتے ہوئے سمجھا یا کہ پہلے دلائی لاما کو تعظیم دی جائے۔ سونیا اس کا اشارہ سمجھ گئی اور جلدی سے دلائی لاما کی طرف رخ کیا۔

”تمہارے پچھلے تمام گناہ بخشے جائیں اور دل ہمیشہ محبت کے نور سے چمکتا رہے۔“ اس کی تعظیم کے جواب میں دلائی لاما نے چینی زبان میں جو عادی تھی، اس کا مفہوم یہی بتا تھا۔

”بہت شکریہ بزرگوار!“ سونیا نے کسی عام لڑکی کی طرح لرزتی پلکوں کے ساتھ ان کا شکریہ ادا کیا۔

”محبت کے لیے منتخب کردہ دل بہت خاص ہوتے ہیں۔ جو لوگ اس نعمت کی اہمیت سمجھ لیتے ہیں پھر وہ سیدھے راستے سے نہیں بھٹکتے اور دل میں محبت کی شمع جلائے دنیا میں خیر بانٹتے چلے جاتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ تم خود کو ان خیر بانٹنے والوں میں ہی شامل رکھنا پسند کرو گی۔“

”بے شک۔“ سونیا کا جواب مختصر لیکن لہجہ ٹھوس تھا۔

”ہماری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ تم اور یہ لڑکا معاذ انسانوں کی اس قسم میں سے ہیں جنہیں قدرت بے شمار نعمتوں سے نوازا کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ عام انسانوں سے زیادہ خصوصیات اور نعمتوں کا مالک ہونا جہاں خوش قسمتی ہے، وہیں ایک آزمائش اور ذمے داری بھی۔ اس آزمائش

سے اسی طور کا میانی سے گزرنا جاسکتا ہے کہ خلق خدا کی بھلائی اور خیر خواہی کو اپنی ذمے داری بنالیا جائے اور جہاں تک طاقت اور اختیار ہو، ظلم کی راہ روک دی جائے۔“ وہ دیرے دیرے اپنے مدعے پر آ رہے تھے۔

”آپ مجھے ایسا ہی پانچم کہئے۔“ سونیا آج کوئی طویل جملہ ادا کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔

”معزز دلائی لاما تم سے اس بات کی تصدیق چاہتے ہیں کہ ڈانگ تاؤ کے ساتھ تمہاری جو گفتگو ہوئی ہے اور تم نے اسے اپنے تعاون کی جو یقین دہانی کروائی ہے، اس میں تم کسی قسم کے دباؤ کا شکار تو نہیں ہو یا کسی نکتے پر تمہارا ذہن ابھمن کا شکار تو نہیں ہے کہ عین وقت پر تم پیچھے ہٹ جاؤ اور سارا منصوبہ دھرا کا دھرا رہ جائے؟“ اس موقع پر معاذ نے گفتگو میں دخل دیا اور ذرا وضاحت سے مدعا سامنے رکھا۔

”نہیں، ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں کسی موقع پر پیچھے نہیں ہٹوں گی۔“ اس نے سادہ سے لہجے میں یقین دہانی کر وادی۔

”ہم بھی تمہارے تحفظ کا پورا پورا خیال رکھیں گے اور ہماری کوشش ہوگی کہ تم پر ذرا سی بھی آجھ نہ آئے۔“ دلائی لاما نے بھی اسے جوابی یقین دہانی کر وائی۔ جو اب سونیا کے لیوں پر ایک مبہم اور نہ سمجھ میں آنے والی مسکراہٹ ابھری اور محدود ہو گئی۔ اپنی اس مسکراہٹ کی وجہ وہ خود ہی جانتی تھی۔ جل کر خاک ہو جانے کا فیصلہ کر لینے والے بھلا ذرا سی آجھ آنے کی پروا کہاں کرتے ہیں۔ وہ اپنا تحفظ چاہتی تھی تو صرف اس لیے کہ اپنی ذات کو زیادہ سے زیادہ سودمند ثابت کر سکے اور آخری حد تک کام آتی رہے۔

”کیا اور کیسے کرتا ہے؟ اس کے لیے ڈانگ تاؤ تم سے رابطے میں رہے گا۔ ہم فقط تم سے ایک ملاقات چاہتے تھے۔ وہ ہو گئی اور ہمیں خوشی ہے کہ ہمارا وقت ضائع نہیں ہوا۔ اپنی خواہشات اور امیدیں پوری ہونا ایک طرف، انسان کے لیے یہ بھی کافی ہوتا ہے کہ اسے ایک بہتر انسان سے ملنے کا موقع مل جائے۔“ دلائی لاما نے بہت مکمل کر اس کی تعریف کی اور پھر یکدم ہی اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولے۔

”ہمارے مراقبے کا وقت ہو گیا ہے اس لیے ہم مزید یہاں نہیں رک سکتے البتہ ہماری طرف سے ہمارے دونوں معزز مہمانوں کو ان کی خواہش اور آسانی کے مطابق یہاں قیام کی اجازت ہے۔ آپ دونوں بے فکری سے یہاں رکھیں اور ہمارے عقیدت مندوں کی میزبانی کا لطف

ہے۔ اب تم مجھے اپنا غلام بھی بنا کر رکھنا چاہو گی تو مجھے اعتراض نہ ہوگا۔“

”لیکن میں جسہیں خریدنے کے لیے یہ سب نہیں کر رہی ہوں۔ میں ایسے شخص کو اپنا غلام بنا کر کیا کروں گی جو پہلے ہی اپنے دل کا سودا کر چکا ہے۔“ سونیا آج اس حیران کر دینے پر تلی ہوئی تھی۔ بے شک ماضی میں بھی اس نے اپنا وقار بلند رکھنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ ہمیشہ اس کی آنکھوں میں اپنی طلب دیکھتا رہا تھا۔ آج وہ طلب بھی معدوم ہو چکی تھی۔

”تم جانتی ہو کہ اس سودے میں کہیں وصل کی شق شامل نہیں ہے۔ کم از کم اس دنیا میں تو ایسا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے میرا یہ بادی وجود ہر پابندی سے آزاد ہے۔“

”کیا مطلب؟ کیا کہنا چاہتے ہو تم؟ کل ٹھیک تو ہے نا؟“ یہ عبت کی انتہائی تھی کہ جسے اسے اپنا رقیب سمجھتا چاہیے تھا، اس کے لیے تنویش میں مبتلا ہو گئی تھی۔

”میرے پاس کوئی حتی اطلاع نہیں ہے۔ بس دل کے کچھ اشارے ہیں جو کہتے ہیں کہ جیسے کچھ باتیں ہیں۔“

ضبط کی کوشش میں اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔

سونیا کا چہرہ بھی سرخ ہو گیا۔ کچھ دھندلے دھندلے سے واقعات یاد آئے۔ گڑ بڑ واقعی ہوئی تھی۔ بس ان دنوں وہ خود اتنی اذیت اور آزمائش سے گزری تھی کہ دماغ نے پوری طرح کسی خبر کو اپنے اندر محفوظ نہیں کیا تھا۔

”اب مجھ پر کل کے قرض کی ادائیگی بھی واجب ہو گئی ہے۔“ اس کی آواز دھیمی لیکن لہجہ آتشیں تھا۔ اپنی بات کہہ کر وہ حریف دہاں رکی نہیں تھی اور معاذ اپنی جگہ کھڑا خاموشی سے اسے جاتا ہوا دیکھتا رہ گیا تھا۔ وہ خدا کے بتائے خاص انسانوں میں سے تھے تو انہیں زندگی میں کچھ بھی معمول کے مطابق نہیں مل سکتا تھا۔ یہ طے تھا۔

☆☆☆

”تمہارے لیے ایک خبر ہے۔“

”کیسی خبر؟“ وہ جواب بھی تک معاذ سے ہونے والی ملاقات کے زیر اثر تھی، ڈرائیونگ کرتے چینی کے کہنے پر بے دھیانی سے ہی پوچھ گئی۔

”مین بازار میں بم بلاسٹ ہوا ہے۔ اس بلاسٹ میں میر سمیت کئی لوگ مارے گئے ہیں۔ ابھی نقصان کا مکمل اندازہ نہیں لگایا جا سکا لیکن جس بک اسٹور میں بم بلاسٹ ہوا ہے، اس سمیت ارد گرد کی کئی دوسری دکانیں بھی تباہ ہو گئی ہیں۔ کئی راہ چلتے افراد بھی نشانہ بنے ہیں۔ فی الحال اس

اٹھائیں۔“ وہ اپنے کمزور سے وجود کے ساتھ مضبوط قدم اٹھاتے ہوئے باہر نکل گئے۔ باقی افراد نے بھی ان کی پیروی کی اور ذرا سی دیر میں ان دونوں کے سوا وہاں کوئی موجود نہ رہا۔

”کیسی ہوسو نا؟“ معاذ نے مسکرا کر اس سے پوچھا۔

”جسہیں کیسی لگتی ہوں؟“ سوال کے جواب میں

سوال آیا۔

”حسین تو ہمیشہ جیسی ہو لیکن کچھ کمزور اور اداس دکھائی دیتی ہو۔ لگتا ہے یہاں آ کر کڑے حالات سے گزرنا پڑا ہے۔“

”ان حالات سے نہ گزرتی تو آنکھوں کے سامنے پڑے باقی پردے کیسے ہتے؟“ وہ تلخ مسکرائی اور بات کو جاری رکھتے ہوئے بولی۔

”وقت نے ثابت کر دیا ہے کہ اس ملک سے میرا کوئی مفاد وابستہ نہیں البتہ یہاں اپنے مفادات کے حصول کے لیے میرے وجود کو بے دریغ استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا جاتا۔ یہاں تک کہ یہاں موجود میرے واحد خونی رشتے کو بھی مجھ سے زیادہ اپنا یہ نام نہاد وطن جسے بزور بازو کمزوروں پر ظلم کر کے حاصل کیا گیا ہے، زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔“

”یہ بات تم ہمارے بارے میں بھی سوچ سکتی ہو۔ ابھی اس کمرے سے نکل جانے والے لوگ ہوں یا میں..... ہم سب بھی اپنے اپنے ایجنڈے پر کام کر رہے ہیں۔“ معاذ اس کے روبرو آکھڑا ہوا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

”میں اس بات کو جانتی ہوں لیکن دونوں باتوں میں ایک بنیادی فرق ہے۔ میری ماں اور اس کے ساتھی جو کچھ کر رہے ہیں اس کا مقصد دنیا پر اپنی اجارہ داری قائم کرنا اور پہلے ہی سے پسے ہوؤں کو مزید پیس کر رکھ دینا ہے جبکہ تم لوگ فقط دفاع کر رہے ہو اور چاہتے ہو کہ خدا کی مخلوق کو ضرر نہ پہنچے۔ میں اس وقت تم لوگوں کے ساتھ نہیں بلکہ خدا اور اس کی مظلوم مخلوق کے ساتھ کھڑی ہوں اور اپنی آخری سانس تک کھڑی رہوں گی۔“ سونیا کی آواز کا زبردست، ارادے کی پختگی اور آنکھوں کے تاثرات..... ایک ایک چیز ایسی تھی جس نے معاذ کو از حد متاثر کیا۔ اس نے بے ساختہ ہی سونیا کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے اور جذباتی لہجے میں بولا۔

”یقیناً کرو سونیا! تم نے یہ فیصلہ کر کے مجھے خرید لیا

علائے میں امدادی کارروائیاں جاری ہیں اور زخمیوں کے ساتھ ساتھ مرنے والوں کو بھی اسپتال منتقل کیا جا رہا ہے۔ جائے وقوعہ کو کبوتر کر لیا جائے پھر ہی حتمی اعداد و شمار سامنے آسکیں گے۔“ خبر قدرے تفصیل سے سنائی گئی تو اس کی ساری غائب و نامی اڑن چھو ہو گئی۔ شہر میں اتنا بڑا حادثہ پیش آ گیا تھا اور وہ نہ صرف منظر سے غائب بھی بلکہ اپنے ساتھ راپیلے گاڑی کوئی ذریعہ نہیں رکھا تھا۔

”دھماکا کس قسم کا تھا؟ اس سلسلے میں کوئی تفصیل ہے تمہارے پاس؟“ بے حد بے چینی سے سوال کیا۔
 ”ابھی کوئی حتمی خبر جاری نہیں کی گئی ہے لیکن مختلف ذرائع سے جو غیر تصدیق شدہ خبریں آئی ہیں، ان کے مطابق دھماکے سے پہلے بک اسٹور میں شدید فائرنگ کی آوازیں سنی گئی تھیں۔ بتایا جا رہا ہے کہ یہ ایک خودکش دھماکا ہے جس میں بہت بھاری مقدار میں دھماکا خیز مادے کا استعمال کیا گیا ہے۔“

”مائی گاڈ!“ سونیا نے سن کر سر قدام لیا پھر تیز لہجے میں بولی۔
 ”تم مجھے یہیں اتار دو۔ اپنی گاڑی تک میں خود چلی جاؤں گی۔“
 ”شہر؟“

”بالکل۔ موجودہ حالات میں میرے ساتھیوں نے مجھے تلاش کرنا شروع کر دیا ہوگا۔ بہت ممکن ہے کہ وہ اب تک میری گاڑی تک بھی پہنچ گئے ہوں اس لیے یہ مناسب نہیں ہوگا کہ میں تمہارے ساتھ وہاں تک جاؤں اور کوئی جنہیں دیکھ لے۔“ اس نے وجہ بیان کی تو چینی نے اس کی بات سمجھتے ہوئے گاڑی ایک سائڈ پروڈ کر لی۔

”اگر تم کہو تو آگے روڈ پر چھوڑ دوں۔ یہاں سے ٹیکسی ملنا ذرا مشکل ہوگی۔“ وہ اپنا پرس قدام کر اترنے لگی تو چینی نے پیشکش کی۔

”نہیں۔ میں یہاں سے پیدل چلی جاؤں گی۔ اچھا ہے کہ جہاں سے میں ٹیکسی لوں، وہاں بھی کوئی مجھے تمہاری گاڑی سے اترتا ہوا نہیں دیکھے۔ ہمارے لوگ کھوج لگانے پر آئیں تو پھر بہت دور تک چھان بین کرتے ہیں۔“ انکار کر کے وہ گاڑی سے اتر گئی اور تیز قدموں سے چلتے ہوئے اس سمت جانے لگی جہاں سموت سے ٹیکسی مل سکتی تھی۔ تیز رفتاری سے چلنے کی وجہ سے اسے چند منٹ سے زیادہ نہیں گئے۔ ٹیکسی بھی فوراً مل گئی اس لیے وہ مکث نہ کر سکی۔ کم وقت میں اس پارکنگ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی

جہاں اس کی گاڑی پارک تھی۔ ابھی وہ گاڑی کا لاک کھول ہی رہی تھی کہ ایک شخص لپک کر اس کے قریب آیا۔ اس نے اسے شناخت کر لیا۔ وہ اس کی ماتحت ٹیم کا حصہ تھا۔
 ”آپ کہاں چلی گئی تھیں میڈم! ہم کب سے آپ کو شہر میں تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ آپ کا سیل فون بھی آفس میں ہی موجود ہے ورنہ اس کے ذریعے آپ سے رابطہ کر لیا جاتا۔“ وہ جلدی جلدی بولتا اسے احساس دلار ہا تھا کہ اس کے لیے کتنی تک دردور چکا ہے۔

”سیل فون غلطی سے آفس میں ہی رہ گیا تھا ورنہ میں خود بے چین بھی تم لوگوں سے رابطہ کرنے کے لیے۔“ اس نے بات بنائی پھر اسے کوئی دوسری بات کرنے کا موقع دے بغیر پوچھا۔

”تم اکیلے ہو یا تمہارے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟“
 ”مائیک کے ساتھ ہوں۔ وہ ادھر گاڑی میں بیٹھا ہے۔“ اس نے ایک جانب اشارہ کیا۔

”ٹھیک ہے، تم بیٹھو میرے ساتھ اور مائیک سے پیچھے آنے کو کہو۔ ہم یہاں سے سیدھے بلاسٹ والے ایریا میں جا سکیں گے۔“ سونیا نے خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور اسے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ تو جیسے تیار ہی تھا۔ فوراً ہرجان ہو گیا لیکن پھر قدرے جھجکتے ہوئے بولا۔

”آئی ایم سوری میڈم! لیکن فی الحال ہم بلاسٹ والے ایریا میں نہیں جاسکتے۔ اوپر سے آرڈر ہے کہ جیسے ہی آپ ملیں، آپ کو وہاں پوائنٹ پر لایا جائے۔“
 ”اوپر سے آرڈر.....!“ وہ سن کر ہی ڈھکی پڑ گئی۔

وہی ہوا تھا جس کا اسے اندیشہ تھا۔ عام حالات میں شاید ماتحت عملہ اس کے اس طرح غائب ہوجانے کی خبر اوپر پہنچانے سے رک جاتا لیکن شہر میں ہونے والے بم بلاسٹ نے سارا معاملہ خراب کر دیا تھا۔

”ٹھیک ہے، پھر سیدھے ہی چلتے ہیں۔“ حکم آنے کے بعد اسے ٹالائیں جاسکتا تھا۔ اس نے گاڑی اشارت کی اور اینڈر پو والے ٹھکانے کی طرف چل پڑی۔ وہاں اس کا نائب بے چینی سے اس کا خنجر تھا۔

”میڈم راجنل آپ کے لیے بہت بے چین تھیں۔ اگر آپ آدھے گھنٹے پہلے آجاتیں تو ان سے آپ کی بات کر دیتا۔ اب وہ یہاں آنے کے لیے غلائٹ لے چکی ہیں۔ جیسے ہی پہنچتی ہیں، میں انہیں آپ کی آمد کی اطلاع دے دوں گا۔“

”تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے میرا کچھ دیر منظر سے

”اگر ایسا ہے تو اس کی ماں خطرے میں پڑ جائے گی۔ مجھے یقین ہے کہ اسے اپنے بیٹے کی ان ہر گریوں کا علم نہیں ہوگا لیکن یہاں پہلے ہی اس پر شک کیا جاتا ہے۔ جیسے ہی واضح ہوگا کہ اس دھماکے کے پیچھے اس کا بیٹا موجود ہے، اسے دھرنے میں ایک لمبے کی تاخیر نہیں کی جائے گی۔“ ماہ بانو نے اس تشویش کا اظہار لکھی وہی کے متعلق کیا تھا جسے سن کر شہزاد چوک گیا۔

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ ہمیں ان خاتون کے لیے کچھ کرنا چاہیے ورنہ وہ بہت بڑی مصیبت میں پھنس جائے گی۔“ بے چینی نے اسے اپنی جگہ پر بیٹھنے نہیں دیا۔

”تم نہیں روکو، میں باہر جا کر کچھ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔“ اس نے فوراً ہی فیصلہ کیا اور تیزی سے باہر جانے کی تیاری کرنے لگا۔ ماہ بانو نے نہ اسے روکا اور نہ ہی کوئی سوال کیا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ یہاں موجود اپنے رابطلوں کا استعمال کرے گا اور اس کے لیے بہتر تھا کہ اپنی ذاتی جگہ اور ذاتی رابطے کے آلات استعمال نہیں کیے جائیں۔ ان حالات میں انہیں خود کو محفوظ رکھنے کی بھی پوری فکر کرنا تھی۔

☆☆☆

”تم اپنا سیل فون یہاں چھوڑ کر کیوں گئی تھیں؟“ میڈم ایکس کی خشکیں نکلیں اس کے چہرے پر جی تھیں لیکن وہ کسی قسم کی گھبراہٹ کے بغیر بہت اطمینان سے بیٹھی ہوئی تھی۔

”چھوڑ کر نہیں گئی تھی، رہ گیا تھا۔“ لہجہ بھی پُر سکون تھا۔

”اور گاڑی..... کیا تمہاری گاڑی بھی اس ہوٹل کی پارکنگ میں رہ گئی تھی جس کے اندر تو کیا، آس پاس بھی تمہارا دور دور تک نام و نشان موجود نہیں تھا؟“ سوال کرنے والا لہجہ مزید ٹھیکسا ہوا۔

”گاڑی میں خود وہاں چھوڑ کر اپنے ذاتی کام سے گئی تھی۔“ وہ لہجے کے خشکے پن سے خائف نہیں ہوئی۔ میڈم ایکس اگرچہ کئی کھنکھنے والی جھنجھکی بھی تھی لیکن اسے اس سے یہ تفتیش کرنے کے لیے پہنچنے کا موقع بہت دیر سے ملا تھا۔ وہ اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریاں نبھانے کے بعد ہی بیٹی کے پاس آئی تھی۔

”کیسا ذاتی کام؟“ اس کا اطمینان میڈم ایکس کو چڑا رہا تھا۔

”ذاتی کام، ذاتی کام ہوتا ہے۔ شاید یہ کوئی ڈیٹ ہو لیکن ظاہر ہے کہ کوئی بھی شخص اپنی ذاتی نوعیت کی معلومات دوسروں کے ساتھ شیئر نہ کرنے کے سلسلے میں

غائب رہتا آج ہونے والے بلاسٹ سے زیادہ بڑا واقعہ ہو۔ میرا نہیں خیال کہ ہمیں فوری طور پر جانے وقوعہ پر پہنچنے کے بجائے ادھر ادھر کسی دوسرے معاملے میں الجھنا چاہیے۔“ وہ جو بیچ دھماکے کی ساری تفصیلات جاننے کے لیے بے چین تھی، اس کی بات سن کر جھجھلا گئی۔

”آپ سمیت ہم سب کی ڈیوٹی یہاں ہے میڈم! اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں کوئی ناحکم آنے تک نہیں موجود رہنا چاہیے۔“ نائب کا جواب بالکل واضح تھا۔

”ٹھیک ہے، پھر میڈم کے آنے تک بلاسٹ کی ساری تفصیلات جمع کر کے مجھے بتاؤ۔“ وہ اندر سے جتنی بھی جھجھلا سکتی تھی، فی الحال عمل کا مظاہرہ کرنا تھا اس لیے اس چھوٹے سے کمرے کے ذریعے اپنا پاس ہوتا جاتا اور بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے لیے مختص کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

ٹی وی اسکرین پر دھماکے کی خبریں اپنی پوری خوفناکی کے ساتھ دکھائی دے رہی تھیں اور وہ دونوں میاں بیوی متوحش سے ایک دوسرے کی خشکیں دیکھ رہے تھے۔

”کیا..... یہ ایلی.....!“ ماہ بانو اپنا جملہ مکمل نہیں کر سکی لیکن مفہوم تو مکمل ہی تھا۔

”وہی ہے۔“ مجھے تو بے فیصلہ یقین ہے کہ یہ وہی ہے۔ تم یہ جگہ دیکھو۔ یہاں، یہاں وہ بک اسٹور تھا جہاں ہم نے اسے آخری بار دیکھا تھا۔“ شہزاد نے انگلی سے اس تباہ شدہ مقام کی طرف اشارہ کیا جہاں اب آگ اور دھوئیں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

”ہوسکتا ہے یہ ہماری غلط فہمی ہو اور یہ سب اس نے نہ کیا ہو۔“ ماہ بانو کا ذہن ایک نوعمر لڑکے کے اتنے بڑے جرم کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہو رہا تھا حالانکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس قسم کے جرائم میں عموماً ایسے ہی نوجوانوں کو استعمال کیا جاتا ہے جن کی جذباتیت اور نوجوانی کی طاقت کو برین واشنگ کے ذریعے آسانی سے قابو میں کیا جاسکے۔

”اللہ کرے کہ وہ نہ ہو لیکن میں نے اس کی آنکھوں میں جو وحشت دیکھی تھی، میں اسے بھول نہیں سکتا۔ میری چھٹی حس کہتی ہے کہ اس سب کے پیچھے وہی ہے۔“ شہزاد نے ٹی وی اسکرین پر نظریں جمائے ہوئے جواب دیا۔ وہاں ابھی دھماکے سے متعلق تفصیلات نہیں دی جا رہی تھیں لیکن جتنا کچھ سامنے آیا تھا، وہ اسے یقین دلانے کے لیے کافی تھا کہ وہ ایک خودکش دھماکا ہے۔

آزاد ہوتا ہے۔“

”ہوئی گولڈن اسٹار کا ممبر نہیں ہوتا۔ ہم سب نے اپنی زندگیاں تنظیم اور مشن کے نام وقف کرنے کا عہد دے رکھا ہے اس لیے ہماری کوئی ذاتی زندگی نہیں ہے۔ ہم جو کچھ بھی کرتے ہیں، اس کا صرف اور صرف ایک مقصد ہوتا ہے، تنظیم کے مفادات کا تحفظ..... اور اگر ہمیں یہ خدشہ محسوس ہو کہ کوئی شخص ان مفادات کو ٹھیس پہنچا رہا ہے تو ہم اس سے باز پرس کا پورا پورا حق رکھتے ہیں۔“ اس کے جواب نے میڈم ایکس کے لہجے کی سختی کو بڑھا دیا۔

”تو سمجھیے آپ اپنا حق استعمال۔ بلائیے چارج کو کہ وہ ایک بار پھر مجھے آپ کے حکم پر ذہنی، جسمانی اور جنسی تشدد کا نشانہ بنائے لیکن یاد رکھیے گا کہ جیسے پہلے آپ مجھے کلین چٹ دینے پر مجبور ہوئی تھیں، ویسے ہی اب بھی آپ کو ایسا کچھ حاصل نہیں ہوگا جو مجھے مجرم ٹھہرانے میں مددگار ثابت ہو سکے۔“ وہ اپنے جرم کی نوعیت جانتی تھی لیکن یہ بھی بتاتا تھا کہ اس وقت صرف اور صرف خود اعتمادی کے سہارے ہی اس مشکل سے باہر آ سکتی ہے۔

”تم مجھے زنج کر رہی ہو سونیا!“

”میں ایسا کچھ نہیں کر رہی۔ میں بس آپ سے تھوڑی سی اسپیس مانگ رہی ہوں۔ موبائل اور گاڑی سمیت میری ذاتی استعمال کی ہر شے میں جاسوسی کے آلات نصب کر دے کہ آپ مجھ سے کیا حاصل کرنا چاہتی ہیں؟ آپ کو یہ بات سمجھنا چاہیے کہ اگر میں آپ کو دھوکا دینا چاہوں تو مجھے اپنے لیے اتنی راہیں نکالنا آتی ہیں کہ آپ کی ہر ترکیب ناکام کر سکتی ہوں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میں ایسا کروں گی ہی کیوں؟ اور پھر دھوکا دینا کس معاملے میں ہے؟ آپ نے مجھے ایک ذمے داری سونپی ہے اور میں اپنی ٹیم کے ساتھ مل کر وہ ذمے داری بہت اچھی طرح ادا کر رہی ہوں۔ کیا آپ کو اس سلسلے میں مجھ سے کوئی شکایت پیدا ہوئی ہے یا پروفیسر اینڈریو نے کبھی میرے سلسلے میں بے اطمینانی کا اظہار کیا ہے؟ اگر ایسا کچھ ہوا ہے تو آپ مجھے بتائیں۔“ اس کے لہجے میں احتجاج تھا۔

”ٹھیک ہے، ایسی کوئی شکایت نہیں ہے تمہارے خلاف لیکن غیر معمولی حالات میں تمہاری طرف سے جو غیر معمولی رویہ دیکھنے میں آیا ہے، اس کے بارے میں باز پرس تو ہوئی نا۔“

”کیوں ہوگی؟ کیا آپ کو لگتا ہے کہ جتنا عمر میں

آپ کے راڈار سے غائب رہی، ہونے والے ہم دھماکے کے لیے معاونت اور سہولت کاری فراہم کرتی رہی؟“ اس بار اس نے خاصا جارحانہ انداز اختیار کیا۔

”خیر..... ایسا تو کوئی شک نہیں کیا جا رہا ہے تم پر۔ یہ خود کش حملہ آور کی شناخت کر چکے ہیں اور اب اس کے ساتھیوں پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”کون ہے وہ؟“ اس نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔
”لیٹی ویبی کا بیٹا الیاس عرف ایلی!“
”لیٹی..... وی بیٹن الاقوامی شہرت یافتہ گلوکارہ جو

آج کل اسرائیل میں موجود ہے اور یہاں کے مختلف شہروں میں اپنے کنسرٹ کرتی پھر رہی ہے؟“ اس نے حیرت سے سوال کیا۔ اس موضوع کے چمڑنے کا ایک فائدہ یہ ہوا تھا کہ گفتگو کا رخ اس کی ذات پر سے ہٹ گیا تھا۔

”ہاں، وی بیٹن ویبی! عربوں سے اس کی ہمدردی کوئی دھکی چھپی نہیں ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ہم اب تک اس کا کوئی کرمبل ایکٹ پکڑ نہیں سکے ہیں اس لیے اس پر ہاتھ ڈالنے کا موقع بھی نہیں ملا ہے۔ اب ہم اس بم بلاسٹ میں اس کے بیٹے کا نام سامنے آنے پر اسے اریسٹ کر سکتے تھے لیکن وہ چالاک عورت پہلے ہی منظر سے غائب ہو چکی ہے اور کہیں اس کا کوئی پتا نہیں مل رہا ہے۔“

”کیا آپ کو شک ہے کہ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ اس جرم میں شریک ہوگی؟“

”یقین سے نہیں کہا جاسکتا لیکن اس کا یہ جرم بھی کوئی کم نہیں ہے کہ وہ ہمارے مقابلے میں ان حقیر عربوں کو ترجیح دیتی رہی ہے اور دنیا کے آگے ان کی مظلومیت کا راگ الاپتی ہے۔ وہ ہمارے ہاتھ آجائے تو ہم اسے نشانِ عبرت بنادیں گے اور دنیا کو باور کروائیں گے کہ لیٹی ویبی جیسے انسانیت کے علمبردار درحقیقت دہشت گردوں کے سرپرست ہیں۔“ وہاں پورا منسوبہ تیار تھا لیکن لیٹی کی خوش قسمتی تھی کہ وہ گرفتار ہونے سے بچ گئی تھی۔

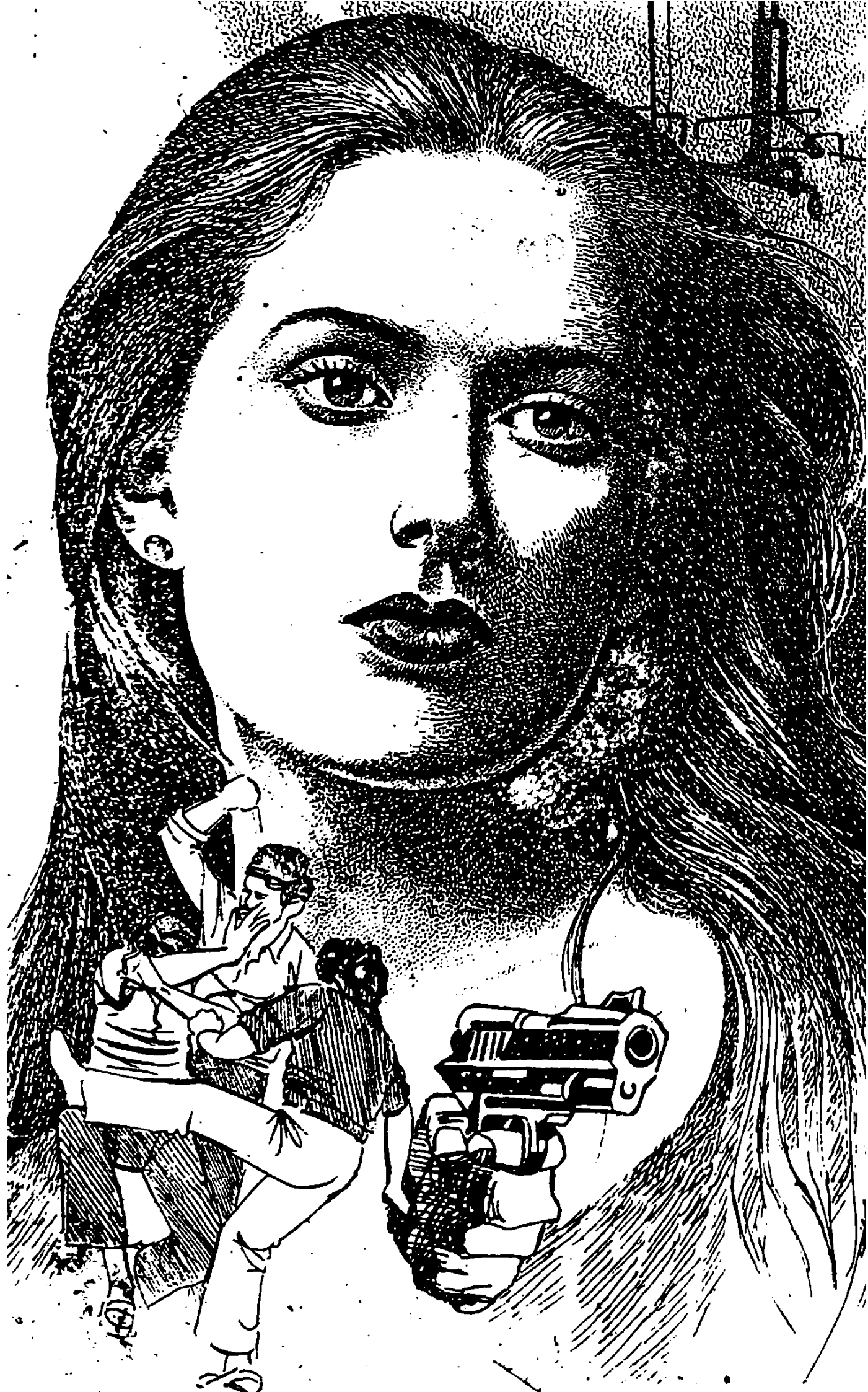
”جہاں تک مجھے یاد آ رہا ہے، وہ لڑکا لیٹی کا سگا بیٹا نہیں ہے۔ اس نے اس لڑکے کو ایڈاپٹ کیا تھا۔“ اسے خود پر سے توجہ ہٹائے رکھنا تھی اس لیے بات سے بات نکالتی جا رہی تھی۔

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نو جوان
کی داستان جو غلط کاروں کے لیے غضب
ناک تھا باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیے



زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تند و تیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابل شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پر عزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جا رہے تھے... اس کی زندگی جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قراریوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تار عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ واردات قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہوسکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تحریر انگیز داستان



معاذ ایک ذہین لیکن متکون مزاج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جوائن کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ انسٹی ٹیوٹ سے واپس آ رہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو سڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی غرض فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشری نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بشری ماس کمیونی کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم وغیرہ لکھتی ہے۔ معاذ بشری کو بہ حفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کر دیتا ہے لیکن جن رئیس زادوں سے اس نے ان کا شکار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ایک دن وہ معاذ کو بے خبری میں گھر کی بری طرح زد و کوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دے دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس نہ آنے پر انتظامیہ کے افراد، پولیس اور مسکوز ذرائع کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جگہ کی جمو پڑی میں پاتا ہے۔ جوگی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے، جوگی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن ان سے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نوازا کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے پراسرار علم سکھانے کی ہامی بھر لیتا ہے اور معاذ اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ادھر جائے وقوعہ سے نکلنے والے معاذ کے کمرے سے جب تصویریں نکلوائی جاتی ہیں تو ایک ایسی تصویر بشری کی نظر میں آ جاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانکنا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کرمان اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پروجیکٹ کے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشری تحقیق کر رہی تھی۔ بشری کے اپنے والد جرنلٹ ہوتے ہیں۔ اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشری کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ مدد سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باذل نامی غنڈے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشری انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دنوں میں ہی معاذ واپسی کا ارادہ کرتا ہے تاہم ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا عرفان اللہ اور یزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو دقاص نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باذل اچانک بشری کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر دیتا ہے۔ معاذ کو داپس لانے کے لیے اس کے بھائی کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کر کے اسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات کے نہ بتانے پر اس کے بھائی کا ایک گروہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشری بھی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہو جاتی ہے۔ معاذ کے دوست عالم شاہ کے جنونی کوئل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ کئی خون میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے پتہ چلتا ہے کہ اس کے دماغ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ فیضو سے حاصل انوکھے علم کی بدولت ان کا معمول نہیں جتا۔ عالم شاہ اور اس کا نوکر سرد باذل کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ عالم شاہ، باذل کی قید میں موجود ایک زخمی شخص کی مدد سے وہاں سے فرار ہو جاتا ہے۔ ادھر بشری دعئی پہنچ جاتی ہے۔ وہاں دقاص اسے باربی کے روپ میں پہچان لیتا ہے۔ وہ سلطان کو مارنا چاہتی ہے۔ ادھر عالم شاہ، باذل کی قید سے نکل کر اس کا پیچھا کرتا ہے۔ وہ وہاں معاذ کو دیکھتا ہے۔ معاذ کو اس کے گھر والوں سے ملنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ وہ ایک مشن پر سونیا کے ساتھ انڈیا روانہ ہوتا ہے۔ عالم شاہ، بھل اور سرد بھی انڈیا روانہ ہو جاتے ہیں۔ گھر پہنچنے پر پولیس کی ریڈ ہوتی ہے اور وہ عالم شاہ اور سرد کو لے جاتے ہیں۔ عالم شاہ اور سرد کو تشدد کا نشانہ بنا کر ویرانے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ واپس اپنے میزبانوں کے ہاں پہنچ جاتے ہیں۔ انہیں پتا لگتا ہے کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں اجالا اور اس کا عاشق شامل ہوتے ہیں۔ وہ چھپ کر ان کی باتیں سن رہا ہوتا ہے۔ تاہم وہاں مارا ماری ہوتی ہے اور اجالا کا عاشق مارا جاتا ہے۔ پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ ان کے کزن انہیں اپنے دوسرے خفیہ ہنگلے پر پہنچا دیتے ہیں۔ وہ وہاں سے بھگت لے جاتے ہیں۔ ادھر معاذ ایک مشن میں زخمی ہو جاتا ہے اور اسے ہندو سادھو اپنی کنیا میں لے جاتا ہے۔ سونیا کے آدمی معاذ کو تلاش کرتے ہیں مگر ناکام ہو جاتے ہیں۔ ادھر عالم شاہ اور سرد خفیہ ذریعے سے بارڈر پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ دھر لے جاتے ہیں اور ”را“ کی قید میں پہنچ جاتے ہیں۔ بشری باذل کو مارنے کی کوشش میں خود نشانہ بن جاتی ہے۔ معاذ سادھو کی مدد سے ایک انڈین ہیروئن کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ وہیں اسے عالم اور سرد کی گرفتاری کا پتا چلتا ہے۔ معاذ ڈاکٹر فردوس سے ملتا ہے اور اسے بھل کی مدد کرنے کا کہتا ہے۔ علیہ اور دقاص وغیرہ کو لالہ بھٹی ملک سے باہر نکال دیتا ہے۔ ٹوبہ پر تیزاب پھینک دیا جاتا ہے۔ دقاص، علیہ اور اس کے گھر والوں کو مار دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس معاذ کو دیوانی شخص سے مدد لینے کا کہتی ہے۔ معاذ اپنے کزن کو پاکستان کال کر رہا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ اس کے گھر والوں کو مار دیا گیا ہے۔ وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کی ٹھان لیتا ہے۔ ادھر ڈاکٹر فردوس کو اس کے سسرال والے بھل کو بھگانے کی پاداش میں تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ معاذ، عالم اور سرد کی رہائی کے لیے کارروائی کرتا ہے اور انہیں ”را“ کی قید سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتا

ہے لیکن عالم اور سرد کو دیو کے آدمی کسی دوسری جگہ پہنچا دیتے ہیں۔ سونیا محاذ کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ ادھر باذل ایک جگہ لالہ میسلی کی موجودگی پر کارروائی کرتا ہے تاہم لالہ خود کو گولی مار کر ختم کر لیتا ہے۔ سونیا اور محاذ حیدر آباد نواب بدر الدین کی حویلی پہنچ جاتے ہیں۔ وہ نواب صاحب کی حویلی میں عالم اور سرد کی دہائی کے لیے کارروائی کر کے انہیں رہا کر لیتے ہیں۔ وہ لوگ نئے ٹھکانے پر پہنچتے ہیں تو وہاں محاذ سے ملنے جا روٹا میسلی آتا ہے۔ اسے محاذ نے ”را“ کی قید سے نکالا ہوتا ہے۔ جا رو اور محاذ، مکمل سمیت اسپتال جاتے ہیں اور پہچان لیے جانے پر پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ پولیس سے مقابلے کے بعد وہ ایک ہسپتال میں پناہ کے لیے گھس جاتے ہیں۔ ادھر سونیا محاذ کی تلاش میں نکلتی ہے اور اسے ہسپتال میں پہنچنے پر محاذ کا سراغ ملتا ہے۔ محاذ اور جا رو وغیرہ انوب نامی شخص کے ساتھ اس کے مالک کے ہنگامے میں قیام کرتے ہیں۔ سونیا بھی معلومات حاصل کرتی ہوئی مذکورہ ہنگامے تک پہنچ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور سرد بھی سونیا کا پیچھا کرتے ہوئے وہیں پہنچ جاتے ہیں۔ ادھر لالہ، وقاص، علیہ وغیرہ لوگ زندہ ہوتے ہیں۔ وقاص علیہ بدل کر گلو کا باڈی کارڈ بناتا ہے۔ وہ محاذ کو تلاش کرنے کے لیے انڈیا روانہ ہوتا ہے۔ وہاں اس کی مگ خان سے ملاقات ہوتی ہے اور محاذ کا سراغ ملتا ہے۔ سونیا، محاذ اور دیگر ساتھیوں سے مل جاتی ہے تاہم وہ جس ہنگامے میں ہوتے ہیں وہ دشمن کا ہوتا ہے۔ دشمن سب کو بے ہوش کر کے کہیں لے جا رہے ہوتے ہیں کہ ان کی گاڑی کو حادثہ پیش آ جاتا ہے۔ ان سب کو چینی بمکشوٹلی امداد دیتے ہیں اور ان سے پوچھ گچھ کی جاتی ہے۔ مکمل کی حالت تشویشناک ہوتی ہے اور اسے وہاں موجود ایک دیدہ رکھتا ہے۔ ادھر لالہ وہاں اپنے لوگوں میں پہنچ کر ایکشن میں آ جاتا ہے۔ باذل، محاذ کا پیچھا کرتا ہے اور چیٹیوں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ محاذ چیٹیوں کے ساتھ مل کر دشمنوں کے خلاف کارروائی کرتا ہے۔ ادھر لالہ میسلی، اعظم کو دشمن کی گرفت سے نکالنے کے لیے کارروائی کرواتا ہے اور موسیٰ اور نیلی، اعظم کو نکالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ موسیٰ اور نیلی کی گاڑی پر حملہ ہوتا ہے تاہم مارا ماری کے بعد وہ صداقت شاہ کے پاس پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اعظم کو وہاں سے نکال لیا جاتا ہے اور دوسری جگہ منتقل کر دیا جاتا ہے۔ ادھر محاذ بیجنگ پہنچ جاتا ہے اور وہاں کے کرتا دھرتاؤں سے بات کر کے پاکستان پہنچنے کی اجازت چاہتا ہے۔ ادھر موسیٰ اور نیلی کو پولیس ٹھیکر لیتی ہے اور فائرنگ میں موسیٰ مارا جاتا ہے۔ وہ اعظم کو لے جاتے ہیں اور نیلی زخمی حالت میں ان کے قبضے میں آ جاتی ہے۔ محاذ اور وی وغیرہ پاکستان پہنچ جاتے ہیں اور اعظم کی بازیابی کے لیے منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ ادھر باذل، لالہ کی قید سے بھاگ جاتا ہے۔ محاذ، ڈی ایس پی ظہیر کے ہنگامے پر دھاوا بولتا ہے اور ڈی ایس پی کو قید کرنے کے بعد اس سے معلومات لیتا ہے۔ باذل قید سے نکل کر مہناز کے پاس پہنچتا ہے اور اسے تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ نیلی قید میں موجود ظہیر کو ٹھکانے لگا دیتی ہے۔ شرٹی کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ ادھر محاذ سارے معاملوں کو جلد حل کرنے کے لیے دشمن کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے مگر اس کے خیر خواہ اسے میڈم ایکس کے ہتھے سے نکال لیتے ہیں اور اعظم کو بھی بازیاپ کر لیتے ہیں۔ زن ہوا سے اپنے ساتھ لے جاتی ہے اور وہاں کرنل سکندر بخت سے ملاقات ہوتی ہے۔ محاذ انہیں دشمنوں کے خلاف کارروائی کرنے کا کہتا ہے۔ باذل، بشرٹی کو لے کر انڈیا گراؤنڈ ہو جاتا ہے۔ ادھر وقاص باذل کا پتا چلانے کے لیے ایک کال گرل سی کے گھر کارروائی کر کے باذل کے ٹھکانے پر پہنچ جاتا ہے۔ وہاں وی کے ساتھی اور کوئی اور گروپ حملہ کر دیتے ہیں۔ وی زخمی ہو جاتا ہے۔ ادھر باذل، عرفان اللہ کو گولی مار دیتا ہے اور خود بھی شدید زخمی ہو جاتا ہے۔ باذل کے ساتھی اسے ایک اسپتال کے آگے چھوڑ دیتے ہیں۔ وہیں وی اور بشرٹی بھی داخل ہوتے ہیں۔ محاذ باذل کو پہچان کر اسے بھی وہیں ایڈمٹ کر دیتا ہے۔ عرفان اللہ جاں بحق ہو جاتا ہے۔ صداقت شاہ اور ان کی اہلیہ مکمل کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ عالم، نیلی اور اعظم بھی وہیں ہوتے ہیں۔ مکمل اسپتال میں زیر علاج ہوتی ہے۔ باذل کو معذوری کی حالت میں ایک چوک پر بھیج دیا جاتا ہے۔ محاذ، وقاص کے ساتھ علیہ کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ اسے اگلے مشن پر جانا ہوتا ہے۔ سونیا قانون کی قید سے بھاگ نکلتی ہے۔ مکمل کی طبیعت بگڑ جاتی ہے۔ یو آن منگ، اینڈریو کے ذریعے مکمل کے آپریشن کی تجویز دیتا ہے۔ مکمل کا آپریشن کامیاب رہتا ہے تاہم اس کا ایک ہاتھ اور ٹیلا دھڑنا کارہ ہو جاتا ہے۔ ادھر محاذ کشمیر پہنچ جاتا ہے۔ ایک کشمیری لڑکی کی مدد کرنے کی پاداش میں بھارتی سپاہی اسے گرفتار کرنے بخاش کی دکان پر ریڈ کرتے ہیں۔ تاہم پوچھ گچھ کے بعد اسے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ادھر مکمل کو خبر ملتی ہے کہ اس کی بہن کا پتہ آپریشن ہے۔ وہ سب وطن واپس آ جاتے ہیں۔ عالم اور سرد کو محفوظ مقام پر منتقل کیا جا رہا ہوتا ہے کہ کچھ لوگ انہیں یرغمال بنا لیتے ہیں، ادھر سونیا کی سچاں جانچنے کے لیے تنظیم کے لوگ اسے تارچہ کرتے ہیں تاہم وہ اس آزمائش میں پوری اترتی ہے۔ محاذ پری دوش کے اہل خانہ کے گم ہونے کے لیے جا رو کے ساتھ منصوبہ بندی کرتا ہے اور وہ لوگ ہیندر سنگھ کو قتل کر دیتے ہیں۔ عالم اور سرد کو اغوا کرنے والے انہیں انڈیا کے حوالے کرنا چاہتے ہیں۔ عالم اور سرد وہاں سے نکلنے کے لیے منصوبہ بناتے ہیں۔ وہاں قانون نافذ کرنے والے ادارے کی ریڈ ہوتی ہے۔ فائرنگ کے دوران سرد جان سے جاتا ہے اور عالم شاہ زخمی ہو جاتا ہے۔ ادھر دشمن مکمل، صداقت شاہ، ان کی بیگم اور قربان شاہ پر حملہ کرتے ہیں اور ان سب کو ختم کر دیا جاتا ہے۔ حویلی میں کبرا مچ جاتا ہے۔ محاذ جا رو کے ساتھ کشمیر کے وزیر کے خلاف اساتذہ سے حملہ کرتا ہے اور اسے جہنم واصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اب وہ اسرائیل روانہ ہو جاتا ہے۔ ادھر ڈاکٹر اینڈریو اپنی تجربہ گاہ میں جی پر کام کر رہا تھا۔ اس کے پاس دو مادہ تھی جنہیں نے جہنم سے بات ہو گئی تھی۔ مادہ جی مکمل سدھائی ہوئی تھی۔ جہنم سے نریتی اسرائیل پہنچ جاتا ہے اور اسے ڈاکٹر اینڈریو کی تجربہ گاہ میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ ادھر گلوکارہ لیلیٰ وہی کا بیٹا ایک اسٹور میں بم بلاسٹ کرتا ہے اور میز سمیت کئی لوگ مارے جاتے ہیں۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائے

میڈم ایکس اور سونیا اسرائیل میں ہونے والے بم بلاسٹ کے بارے میں گفتگو کر رہی تھیں۔ میڈم ایکس کا خیال تھا کہ اس کارروائی میں لیلیٰ وہی کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔
 ”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تربیت تو اس کی لیلیٰ نے ہی کی ہے اس لیے اسے اس کے ہر عمل کا جواب دینا ہوگا۔“ میڈم ایکس نے جوش سے کہا۔
 ”ضرور لیجیے گا، اگر وہ آپ کے ہاتھ آگئی۔“ اس نے ماں کو چٹکی لی۔

”ہم اسے ڈھونڈ نکالیں گے۔ وہ اتنی آسانی سے ہم سے بچ کر نہیں نکل سکتی۔“ میڈم ایکس نے بھی گویا چیخ بول کر لیا لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ بروقت خطرے سے آگاہ ہو جانے کے باعث لیلیٰ کے ہمدردوں نے بہت تیزی سے حرکت کی تھی اور اب تک وہ اسرائیل کی حدود سے باہر نکل چکی تھی۔

”موجودہ حالات میں ہم سب کو ہی بہت زیادہ چوکنا اور محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اب مجھے تمہارے کسی ایڈوکیٹ کے متعلق کوئی اطلاع نہ ملے۔ نہ صرف اپنے فرائض پوری ذمہ داری سے ادا کرنے ہیں بلکہ اپنے بارے میں بھی اپنی ٹیم کو باخبر رکھنا ہے تاکہ غیر معمولی حالات میں ایک دوسرے سے رابطہ کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔“
 میڈم ایکس کے سیل فون پر کوئی پیغام آیا تھا جسے پڑھ کر اس پر وہاں سے روانگی کی غلط طاری ہو گئی تھی۔ اس لیے اس کی گوشمالی کا پروگرام مختصر کرتے ہوئے آخر میں محض ایک تنبیہ کی اور فوری طور پر وہاں سے روانہ ہو گئی۔ سونیا کرسی کی پشت سے ٹپک لگائے اسی اطمینان سے بیٹھی رہی۔ وہ اپنی راہ کا تعین کر چکی تھی اور اب اسے کسی بھی قسم کے متنازع کی کوئی پروا نہیں تھی۔

☆☆☆

”آئیے، آجایے معاذ بھائی! یہ ادھر سے دائیں طرف۔“ ارتضیٰ اس کے آگے آگے چلتا ہوا اس کی راہنمائی کرتا جا رہا تھا اور وہ نہایت دلچسپی سے زیر زمین واقع ان بھول بھلیوں جیسے راستے کو دیکھ رہا تھا جن سے گزر کر اسے ایک اہم ترین ملاقات کے لیے لے جایا جا رہا تھا۔ راستے میں کئی جگہ ان کا سب سے پہلے دروں سے بھی سامنا ہوا جو ارتضیٰ کی زبان سے محض ایک کوڈ ورڈ سن کر سکون سے پیچھے ہٹ جاتے تھے اور انہیں آگے جانے کا راستہ دے دیتے تھے۔
 ”یہ بہت شاندار انتظام ہے۔ مجھے یقین ہے کہ محض دو چار بار میں تو کسی کو یہ راستہ یاد بھی نہیں ہوتا ہوگا۔“ وہ

واقعی متاثر تھا اور اسے یقین تھا کہ ایسے راستے سے گزر کر خفیہ ٹھکانوں پر جیسے اہم افراد تک پہنچنا ہر کس و نا کس کے بس کی بات نہیں ہو سکتی۔

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ ارتضیٰ اس کی بات سن کر دیر سے سے ہنسا پھر بتانے لگا۔

”لیلیٰ ہمارے، جن بھی خاصا الجھ گیا تھا بلکہ کئی بار یہاں آئے تھے بعد میں کچھ سمجھ نہیں آئی تھی کہ کب کس سمت میں مڑوں گا تو اپنی منزل پر پہنچ جاؤں گا پھر یہاں موجود دوستوں نے مدد کی اور ان بھول بھلیوں سے گزر کر سیدھے منزل پر پہنچنے کی تکنیک سمجھائی۔ بس کچھ اشارے اور نشانیاں ہیں جنہیں ذرا حساب کتاب سے یاد رکھنا ہوتا ہے پھر بندہ بھٹکتا نہیں ہے لیکن آپ ان مسئلوں میں الجھ کر کیا کریں گے؟ آپ کو تو بس ایک ملاقات کرنا ہے، اپنا کام بتانا ہے اور بس اپنی راہ پکڑ لینی ہے۔ یہ سب تو ہم جیسوں کو یاد رکھنا ہوتا ہے جو مقامی سطح پر کام کرتے ہیں۔“ ارتضیٰ اس کا ایسا سا تھی تھا جس کا چین سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ درحقیقت اپنے دوست ملک کی طرف سے کچھ باتوں کو چھپائے جانے کی وجہ سے وہ ان کی طرف سے بھی احتیاط برت رہے تھے اور کچھ ضروری معاونت کے علاوہ ان سے سب کچھ شیر نہیں کر رہے تھے۔ دلائی لاما سے ربط ضبط بھی اسی پالیسی کا ایک حصہ تھا اور اب پھر وہ ایک اہم ملاقات کے لیے ایک انتہائی خفیہ مقام پر موجود تھا۔ یہ جگہ مرکزی شہر سے بہت دور تھی اور ارتضیٰ اسے سیر کر دانے کے بہانے یہاں لایا تھا۔

”مہمان۔“ بھول بھلیوں کے اختتام پر وہ ایک بھاری دروازے کے سامنے رکے تو ارتضیٰ نے دروازے کے آگے موجود پہریزاروں سے جو کچھ کہا اس میں سے اسے خود صرف یہی ایک لفظ سمجھ آیا۔ دروازہ البتہ کھل گیا۔ دروازہ کھلتے ہی شور و غل اور موسیقی کی آوازیں باہر کی طرف نکلیں۔ وہ ارتضیٰ کے پیچھے پیچھے کھلے دروازے سے اندر داخل ہوا تو کچھ لوجان لڑکوں کو نقص کے انداز میں جھوٹے اور گھوٹے ہوئے پایا۔ وہ سب ہرجوش اور خوش دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے ذرا دھیان لگا کر ان کے گائے جانے والے گیت کے بول سنے۔ وہ کسی کی جنت کی طرف روانگی اور مجرموں کو انجام تک پہنچا دینے کا قصہ تھا جسے بیان کرتے ہوئے عہد کیا جا رہا تھا کہ پیچھے رہ جانے والے بھی جلد اس راستے پر گامزن ہوں گے اور اپنے پیشرو کی طرح جنت کے باغوں میں حوروں کے سنگ موجود ہوں گے۔

”کیا یہ کسی قسم کا جشن منارہے ہیں؟“ اس نے

مرطے سے گزرنے کے بعد محاذ نے دلی جذبات کے ساتھ یہ جملہ ادا کیا۔

”میری خواہش ہے کہ یہاں سے واپسی تک یہ خوشی قائم رہے۔“ ابو حمزہ نے کہا اور ہاتھ تھام کر اسے اپنے ساتھ فرشی قالین پر بٹھالیا۔ بیٹھنے پر محاذ کو سکون سا محسوس ہوا۔ وہ جن راستوں سے گزر کر آیا تھا اور اب جس کمرے میں موجود تھا، ان سب جگہوں کی چھتیں بہت نیچی تھیں۔ اگرچہ اتنی نیچی نہیں تھیں کہ جھک کر چلنا پڑتا لیکن سر سے بس چھانچ ہی اوپر ہوں گی۔ لہٰذا ابھی قامت کی وجہ سے وہ ان چھتوں کے نیچے بلا وجہ ہی کاٹکٹیس ہوا جا رہا تھا۔

”جس دوست نے آپ کا حوالہ دیا تھا، اس نے بہت امید دلائی تھی کہ آپ مجھے انکار نہیں کریں گے۔ بقول اس کے انکار کا جواز ہی نہیں بننا۔ ہمارا دشمن بھی ایک ہے اور مقصد بھی۔“ اس نے وقت ضائع کیے بغیر اصل مدعے پر گفتگو شروع کر دی۔

”تھوڑا بہت مجھے بریف کیا گیا ہے۔ باقی تفصیل تم بتا دو۔“ ابو حمزہ نے فرمائش کی۔ ان کی اس گفتگو کے دوران ارتضیٰ ایک جانب سر جھکائے خاموشی سے بیٹھا ہوا تھا جبکہ خود ابو حمزہ کا ساتھی دروازے کے قریب موجود تھا۔ اپنے محفوظ ترین ٹھکانے پر ہوتے ہوئے بھی اس کی نظریں یوں ارد گرد منڈلا رہی تھیں جیسے کسی دشمن کو کھوج رہی ہوں۔ ہتھیار کے دستے پر جہا ہاتھ بھی کسی بھی لمحے قائرنگ کے لیے تیار تھا۔

”تفصیل زیادہ طویل نہیں۔ بات بس اتنی سی ہے کہ اسرائیل نے ضرورت سے زیادہ پر پرزے نکالنا شروع کر دیے ہیں۔ فلسطین پر قبضہ کرنے کے بعد اب یہ دنیا پر حکمرانی کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ ہمیں ان کے اس خواب کو سبوتاژ کرنا ہے اور انہیں ایسی زک پہنچانی ہے کہ ان کی کمر ٹوٹ جائے اور بہت طویل عرصے تک یہ اپنے ایسے کسی خواب کو تعبیر دینے کا سوچ بھی نہ سکیں۔ ہم اپنے منصوبے پر کام کرنے کے لیے بنیادی معلومات حاصل کر چکے ہیں اور اپنا لائحہ عمل بھی تیار کر لیا ہے لیکن اسلحہ، افرادی قوت اور دیگر کچھ معاملات میں ہمیں آپ کی مدد درکار ہے۔“ اس نے کچھ اور تفصیلات بھی ابو حمزہ کے گوش گزار کیں۔

”ہوں.....!“ سن کر اس نے ایک زوردار ہنکارا بھرا پھر عجیب سے لہجے میں بولا۔

”ہم جو ستر برس سے زیادہ عرصے سے اسرائیلی ظلم و جبر کی جلی میں پس رہے ہیں، اس سارے مدعے میں نہیں

اندازہ قائم کرتے ہوئے ارتضیٰ سے سوال کیا جس کے جواب میں اس نے محض گردن کو اثبات میں جنبش دی اور اس ہال نما کمرے کے دائیں گوشے میں موجود ایک دوسرے دروازے پر دستک دی۔ دستک کے ساتھ ہی اس نے بلند آواز میں اپنا تعارف بھی کر دیا۔ فوراً ہی دروازہ کھل گیا اور ایک باریش جوان کا چہرہ دکھائی دیا۔ اس جوان نے باری باری ان دونوں سے مصافحہ کیا اور پھر اطلاع دی۔

”ابو حمزہ ملاقات کے لیے خنجر ہیں۔“ یہ نام سن کر محاذ کے سارے جسم میں سنسنی سی پھیل گئی۔ وہ ابو حمزہ سے ملنے ہی یہاں تک آیا تھا لیکن اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ چند لمحوں میں وہ ایک ایسے شخص کے روبرو ہو گا جس کی شخصیت اسرائیل کے پردوں میں لپٹی ہوئی تھی۔ جسے سب جانتے تھے لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ مشکل سے ہی منظر عام پر آتا تھا۔ بس اہل کے پیغامات، تنبیہات، احتجاجی بیان یا دنیا کی غیرت کو چھوڑنے کی پکاریں ہی تھیں جن کی بازگشت دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ سے سنائی دیتی رہتی تھیں۔ وہ ایک چھلاوا تھا جسے گرفتار کرنے کی آرزو اسرائیل کے خفیہ اداروں سمیت ان کے بہت سے حواری اپنے دل میں لیے پھرتے تھے لیکن کامیابی نے آج تک کسی کے قدم نہیں چومے تھے۔ چنانچہ آج اگر اس شخص کے روبرو ہونے کے خیال سے اس کا دل دھڑک رہا تھا تو یہ کچھ انوکھا نہیں تھا۔

مصافحہ کرنے والا جوان انہیں اپنے سنگ ایک اور اندرونی کمرے میں لے گیا۔ یہاں ایک شخص فرشی میز کے پیچھے بیٹھا اپنے آگے ایک بڑا سا نقشہ پھیلائے ہوئے انتہاک ہے اس کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ آہٹ پر وہ ان کی طرف متوجہ ہوا اور خوشدلی سے مسکراتا ہوا اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ وہ دبلا چٹلا اور قدرے پست قد تھا اور اس کی عام سی شخصیت کو دیکھ کر یقین کرنا مشکل تھا کہ یہ وہ شخص ہے جس نے اسرائیل سمیت دنیا کی بڑی بڑی خفیہ ایجنسیوں کو مشکل میں ڈالا ہوا ہے۔

”السلام علیکم ا!“ اس نے سلام میں پہل کرتے ہوئے ان کی طرف مصالحتی کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ان کی نظریں براہ راست آپس میں ٹکرائیں اور محاذ نے ان نظروں کی تیزی و طراری کو محسوس کیا۔ یہ نظریں بتا رہی تھیں کہ وہ ایک بے پناہ انرجیٹک، ہوشیار، معاملہ فہم اور موقع شناس شخص ہے اور شاید اس شخص کی یہی خصوصیات تھیں جنہوں نے اسے ایک نمایاں مقام دلایا ہوا تھا۔

”آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔“ سلام دعا کے

دکھائی نہیں دے رہے۔ ہمارے لیے پریشانی کی بات یہ نہیں ہے کہ اسرائیل دنیا کے کس کس کو نے میں اپنے بچے گاڑ چکا ہے یا گاڑنے جا رہا ہے۔ ہمیں تو اپنے ان لوگوں کی فکر ہے جنہیں ان کے گھروں سے نکال کر ایک مختصر سی پٹی پر دھکیل دیا گیا ہے۔ ہمارے جوان آئے دن موت کی آغوش میں بھیج دیے جاتے ہیں۔ ہمارے بچوں کے پاس مکمل غذا اور تعلیم کی سہولت موجود نہیں ہے اور ہم سے انسانوں کے بجائے جانوروں کا سا سلوک کیا جاتا ہے اور اس سارے ظلم کے جواب میں تم سمیت دنیا بھر کے ممالک سے دے دے سے مذمتی بیانات کے سوا اور کچھ بھی نہیں کیا جاتا۔ ایسے میں تمہارے خیال میں ایسی کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ ہم تمہاری مدد کریں؟“ وہ ایک ایسی تلخ حقیقت بیان کر رہا تھا جس پر معاذ شرمندہ ہونے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن اس کے لیے اپنے مشن سے پیچھے ہٹنا بھی ممکن نہیں تھا اس لیے کچھ نہ کچھ تو بولنا ہی تھا چنانچہ شرمندگی سے بولا۔

”آپ کا ہر شکوہ بجا ہے۔ واقعی ہم نے مسئلہ فلسطین پر وہ کردار کبھی ادا نہیں کیا جو ہمیں ادا کرنا چاہیے تھا۔ ہم اپنی کمزور پالیسیوں، معاشی مسائل، سیاسی عدم استحکام اور غلط فیصلوں کے ہاتھوں ہمیشہ دوسروں کے ہاتھ کا کھلونا بنے رہے ہیں لیکن اب جبکہ ہم نے ہمت کی ہے اور ایک بڑے فتنے کا سد باب کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو ہمارا ساتھ دینا چاہیے کیونکہ اس سے آپ کو کوئی اور فائدہ ہو یا نہ ہو، یہ فائدہ تو ضرور ہوگا کہ آپ کے دشمن کو ایک زوردار زک پہنچے گی اور آپ اسے کمزور کر سکیں گے۔“ اس نے بڑی سادگی سے اپنی صفائی پیش کرنے کا فریضہ انجام دیا۔ ابو حمزہ اس کی بات سن کر مسکرایا اور خوشگوار موڈ میں بولا۔

”عام حالات میں شاید تمہارے دلائل مجھے قائل نہیں کر پاتے لیکن تمہاری خوش قسمتی ہے کہ آج یہاں خوشی کا موقع ہے اور ہم اپنی خوشی میں تمہیں شامل کرنے کے لیے تمہاری خواہش پوری کرنے کے لیے تیار ہیں۔ بس اس کے لیے تمہیں تمہارا سا انتظار کرنا پڑے گا۔ مناسب وقت پر سارا انتظام ہو جائے گا۔“ ابو حمزہ کا جواب اس کے لیے خاصا حوصلہ افزا تھا لیکن پھر بھی اس نے صورت حال کو واضح کرنا چاہا اور بولا۔

”آج یہاں خوشی منائی جا رہی ہے۔ اپنے دوست کے ساتھ یہاں سے کھانا کھا کر رخصت ہونا۔“ یہ جملہ ایک طرح سے ملاقات ختم ہو جانے کا بھی اشارہ تھا۔ وہ دونوں ابو حمزہ سے الوداعی مصافحہ کر کے واپس پلٹ گئے۔ اس بار ابو حمزہ کا ساتھی بھی ان کے ساتھ تھا۔

”یہاں کس چیز کا جشن منایا جا رہا ہے؟“ وہ جب واپس اس کمرے میں پہنچے جہاں نوجوان لڑکے گانے کے ساتھ ساتھ رقص بھی کر رہے تھے تو اس نے اپنے میزبان سے پوچھا۔

”آج ہمارا ایک مجاہد اپنے فرض کی ادائیگی میں سرخرو ہو کر جنت کی طرف گامزن ہو گیا ہے۔ ہم اس کی کامیابی کا جشن منا رہے ہیں۔“ زبان مختلف تھی لیکن وہ اس سے پہلے بھی اس سے ملتے جلتے الفاظ سن چکا تھا۔ اس کے دماغ میں بہت زور سے کچھ کلک ہوا۔

”کون؟ کس کی بات کر رہے ہو تم؟“ چونک کر پوچھا۔

”اسی کی جس نے جیل کو ہلا کر رکھ دیا ہے اور بڑے بڑے اسرائیلی عہدیداروں کی دوڑیں لگوا دی ہیں۔“

”تم شاید سب سے پہلے ایسا عرف ایل کی بات

دکھائی نہیں دے رہے۔ ہمارے لیے پریشانی کی بات یہ نہیں ہے کہ اسرائیل دنیا کے کس کس کو نے میں اپنے بچے گاڑ چکا ہے یا گاڑنے جا رہا ہے۔ ہمیں تو اپنے ان لوگوں کی فکر ہے جنہیں ان کے گھروں سے نکال کر ایک مختصر سی پٹی پر دھکیل دیا گیا ہے۔ ہمارے جوان آئے دن موت کی آغوش میں بھیج دیے جاتے ہیں۔ ہمارے بچوں کے پاس مکمل غذا اور تعلیم کی سہولت موجود نہیں ہے اور ہم سے انسانوں کے بجائے جانوروں کا سا سلوک کیا جاتا ہے اور اس سارے ظلم کے جواب میں تم سمیت دنیا بھر کے ممالک سے دے دے سے مذمتی بیانات کے سوا اور کچھ بھی نہیں کیا جاتا۔ ایسے میں تمہارے خیال میں ایسی کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ ہم تمہاری مدد کریں؟“ وہ ایک ایسی تلخ حقیقت بیان کر رہا تھا جس پر معاذ شرمندہ ہونے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن اس کے لیے اپنے مشن سے پیچھے ہٹنا بھی ممکن نہیں تھا اس لیے کچھ نہ کچھ تو بولنا ہی تھا چنانچہ شرمندگی سے بولا۔

”آپ کا ہر شکوہ بجا ہے۔ واقعی ہم نے مسئلہ فلسطین پر وہ کردار کبھی ادا نہیں کیا جو ہمیں ادا کرنا چاہیے تھا۔ ہم اپنی کمزور پالیسیوں، معاشی مسائل، سیاسی عدم استحکام اور غلط فیصلوں کے ہاتھوں ہمیشہ دوسروں کے ہاتھ کا کھلونا بنے رہے ہیں لیکن اب جبکہ ہم نے ہمت کی ہے اور ایک بڑے فتنے کا سد باب کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو ہمارا ساتھ دینا چاہیے کیونکہ اس سے آپ کو کوئی اور فائدہ ہو یا نہ ہو، یہ فائدہ تو ضرور ہوگا کہ آپ کے دشمن کو ایک زوردار زک پہنچے گی اور آپ اسے کمزور کر سکیں گے۔“ اس نے بڑی سادگی سے اپنی صفائی پیش کرنے کا فریضہ انجام دیا۔ ابو حمزہ اس کی بات سن کر مسکرایا اور خوشگوار موڈ میں بولا۔

”عام حالات میں شاید تمہارے دلائل مجھے قائل نہیں کر پاتے لیکن تمہاری خوش قسمتی ہے کہ آج یہاں خوشی کا موقع ہے اور ہم اپنی خوشی میں تمہیں شامل کرنے کے لیے تمہاری خواہش پوری کرنے کے لیے تیار ہیں۔ بس اس کے لیے تمہیں تمہارا سا انتظار کرنا پڑے گا۔ مناسب وقت پر سارا انتظام ہو جائے گا۔“ ابو حمزہ کا جواب اس کے لیے خاصا حوصلہ افزا تھا لیکن پھر بھی اس نے صورت حال کو واضح کرنا چاہا اور بولا۔

”آپ کے اس تعاون کے لیے میں بے حد شکر گزار ہوں لیکن میری خواہش ہے کہ آپ مجھے کوئی نہ کوئی ٹائم فریم ضرور دیں کیونکہ میرے لیے بھی لامحدود مدت کے لیے خود کو چھپا کر رکھنا ممکن نہیں ہے۔ اس سے قبل میری ذات پر شک

کر رہے ہو؟“ اسے اندازہ لگانے میں زیادہ وقت نہیں ہوئی۔
”وہ لیلیٰ وہی کا نہیں، فلسطین کا بیٹا تھا جس نے اپنی
جان قربان کر کے برسوں پہلے قتل ہونے والے اپنے
خاندان کا بدلہ لے لیا۔“

”لیلیٰ نے اسے بہت محبت اور محنت سے پالا تھا۔ مجھے
یقین ہے کہ وہ بچہ جسے وہ برسوں پہلے موت کے جنوں سے
نکال کر لے گئی تھی، خود کش دھماکے کے نتیجے میں کئی حصوں
میں تقسیم ہوا ہوگا تو لیلیٰ کا دل بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہوگا۔“
”یہ لیلیٰ کی خوش قسمتی تھی کہ اسے ایک مجاہد کی خدمت کا
موقع ملا۔ اب وہ مجاہد اپنی زندگی کا اصل مقصد پورا کر کے اللہ
کے حضور حاضر ہو گیا ہے تو لیلیٰ کا فرض ہے کہ خود پر تازہ کرے۔“
”وہ کیسے کر سکتی ہے؟ کیا اس سے پوچھا گیا تھا کہ اس
نے جس بچے کو اتنی محنت سے پالا تھا، اس کا جسم ایک خود کش
دھماکے میں فنا ہونے جا رہا ہے تو اسے کوئی اعتراض تو نہیں
ہے؟“ کوشش کے باوجود دیرے دیرے اس کے غصے کا
اظہار ہونے لگا تھا۔ ارنلٹی نے غیر محسوس طور پر اس کا ہاتھ
تھام کر آہستہ سے دبایا۔

”الیاس ایک بالغ جوان تھا۔ اس نے اپنی مرضی
سے اپنی راہ کا لہجہ کیا۔ اس لیے لیلیٰ سمیت کسی کے بھی اس
کے عمل پر اعتراض کی گنجائش نکلتی نہیں ہے۔“ اس شخص نے
ناگواری سے جواب دیا۔ معاذ اس کی اس بات کے جواب
میں بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن بس اتنا ہی کہہ سکا۔
”اس قسم کی کارروائی کے نتیجے میں بے گناہ افراد بھی
مارے جاتے ہیں۔ تم لوگوں کا اصل نشانہ میرا تھا لیکن ساتھ
میں بہت سے ایسے بچے، عورتیں اور بوڑھے بھی ہلاک
ہو گئے جن کا اس سب سے کوئی لینا دینا نہیں تھا اور وہ بے
ضرر اور بے گناہ لوگ تھے۔“

”نہیں تھے وہ بے گناہ۔ ان میں سے اکثریت وہ
تھی جنہوں نے خود یا ان کے آباء و اجداد نے ہماری زمینوں
سے ہمیں بے دخل کر کے بے گھر کرنے میں اہم کردار ادا کیا
تھا۔ وہ لوگ جو دوسروں کے گھروں پر قبضہ کر لیں اور ان کی
پلیٹ سے بے حسی سے کھاتے رہیں، ہرگز بھی بے گناہ اور
مظلوم نہیں ہو سکتے۔ اگر اتفاق سے کوئی مظلوم زد میں آیا بھی
ہے تو اللہ اس کے ساتھ انصاف کرے گا اور جنت کے
باغوں میں اس کی میزبانی ہوگی۔“ اس شخص کی بلند آواز اور
الفاظ اس ذہن سازی کا ثبوت تھے جو برسوں سے کی جاتی
رہی تھی۔ الیاس عرف ابلی بھی شاید ایسے ہی کسی گروپ کے
ہاتھ لگ گیا تھا پھر وہ تباہی ستم گزیدہ تو اس نے تیزی سے

اس سب کو قبول کیا ہوگا اور اپنی زندگی کی ساری نعمتوں کو بھلا
کر انتقام کی راہ پر چل نکلا ہوگا۔ حالانکہ اگر وہ اپنی تعلیم مکمل
کرتا اور بین الاقوامی فورم پر اپنی قوم کے لیے آواز اٹھاتا تو
خود کو ایک ہم دھماکے میں اڑا لینے سے زیادہ بہتر نتائج
حاصل کر سکتا تھا۔ جیسے کہ اس کی منہ بولی ماں لیلیٰ وہی اب
تک کرتی رہی تھی۔ اس نے ہمیشہ اپنی قوم کی بہت زیادہ مالی
اور اخلاقی مدد کی تھی اور ہر جگہ فلسطینیوں کے حق میں عمل کر
بولتی تھی۔ اس واقعے کے بعد لیلیٰ کی راہیں بند ہو گئی تھیں اور
وہ خود پر شک کی مہر لگوا کر آئندہ کچھ بھی کر سکنے کے قابل نہیں
رہی تھی بلکہ وہ تو شاید خود بھی محفوظ نہیں تھی۔

”لیلیٰ وہی کہاں ہے؟“ اس نے ہر بات کو چھوڑ کر
لیلیٰ کی خیریت جانتا چاہی۔

”الیاس کو پالنے کے صلے میں اسے بہ حفاظت یہاں
سے نکال دیا گیا۔ کچھ عرصہ اسے روپوش رہنا پڑے گا پھر
حالات سازگار ہونے پر منظر عام پر آ سکتی ہے۔“ اس نے
بتایا پھر ذرا طنزیہ لہجے میں بولا۔

”میرے خیال میں تم لوگ یہاں ہونے والی دعوت
میں شریک ہونا پسند نہیں کرو گے اس لیے تمہارے لیے اب
واپسی ہی بہتر ہے۔“

”ہمارے پیٹ بھرے ہوئے ہیں اور شہر کی فضا بھی
مخدوش ہے اس لیے بہتر یہی ہے کہ ہم جلد از جلد واپس اپنے
ٹھکانے پر پہنچ جائیں۔“ اس نے اپنے وطن میں جنت کے
لاٹج میں اتنے خود کش دھماکے دیکھے تھے کہ اب کسی بھی قسم کی
صورتو حال میں اس بارے میں سن کر مطمئن نہیں ہو پاتا تھا
لیکن یہاں اس موضوع پر اس سے زیادہ گفتگو ممکن نہیں تھی
اس لیے بہانہ بنا کر وہاں نہ رکنے کا جواز تلاش کر ہی لیا۔

”کچھ معاملات میں بحث مناسب نہیں ہوتی۔ آپ
ان جیسے حالات میں نہیں رہے، آپ نے ان کے جیسی
مشکلات نہیں دیکھیں، اس لیے آپ ان کے جذبات کو مکمل
طور پر نہیں سمجھ سکتے۔ جو معاملات مکمل طور پر سمجھ میں نہ
آئیں، ان میں خاموشی اختیار کر لینا ہی مناسب ہوتا ہے۔“
واپسی کے راستے میں ارنلٹی نے اسے ٹوکا۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں آئندہ احتیاط کروں
گا۔“ اس نے بغیر بحث کے اپنی غلطی مان لی اور خاموشی سے
چلتا رہا۔ کہنے کو وہ ایک کامیاب ملاقات کر کے وہاں سے
جار ہا تھا لیکن اس کے دل پر بوجھ سا آ گیا تھا۔

☆☆☆

”یہ..... یہ غلط ہے۔ یقیناً تم لوگوں نے کوئی بے

ایمانی کی ہے۔" یہ مسلسل تیسری بار تھا کہ شوٹنگ نے انتخاب کا موقع ملنے پر کیلی کو یہی چنا تھا اور پروفیسر اینڈریو کی برداشت جواب دے گئی تھی۔

"کیسی بے ایمانی؟ ہمارے درمیان شروع سے ہی یہ بات طے تھی کہ شوٹنگ کو ساتھی کے انتخاب کی آزادی حاصل ہوگی۔ اس نے ہم سب کی نظروں کے سامنے بغیر کسی دباؤ کے کیلی کو منتخب کیا ہے تو اسے کوئی بھی شخص بے ایمانی قرار نہیں دے سکتا۔" شوٹنگ کے رکھوالے ڈاڈ شوٹی نے پروفیسر کے احتجاج کا سرد لہجے میں جواب دیا۔

"نہیں، تم لوگوں نے کوئی نہ کوئی گڑبڑ کی ہے۔ شوٹنگ تمہارا تربیت یافتہ ہے۔ اسے تم لوگوں نے کسی طرح یہ ذہن نشین کروادیا ہوگا کہ وہ ساتھی کے طور پر کیلی ہی کا انتخاب کرے۔ ختم جانتے ہو کہ کیلی تمہاری ہے اور اگر وہ حاملہ ہوگئی تو اس سے تمہیں ہی فائدہ پہنچے گا۔" پروفیسر براہ فرودختہ ہو رہا تھا اور کچھ ایسی ہی کیفیت کی بھی تھی۔ ایک طرف ہر جانبدار کی طرح اس کے جسم کے فطری تقاضے تھے تو دوسری طرف عام حیوانات کے مقابلے میں ذہنی طور پر زیادہ ترقی یافتہ ہونے کی وجہ سے اس کے اندر بھی انسانوں والی وہ حس موجود تھی جو خود کو نظر انداز یا رد کیے جانے پر بے عزتی کے احساس سے دوچار کرتی ہے۔ شوٹنگ کے رویتے نے اسے مایوسی اور طیش، دونوں میں جھلا کر دیا تھا اور وہ اپنے لیے مختص سیل میں کسی پھری ہوئی شیرنی کی طرح دیوانہ وار ادھر سے ادھر چکر لگا رہی تھی۔ اگر سیل کا مضبوط دروازہ فوری طور پر بند نہ کر دیا گیا ہوتا تو ممکن تھا وہ احتجاجاً باہر آکر کسی سوتن کی طرح کیلی سے اپنے حق کے لیے بھڑجانی۔ فی الحال پروفیسر اینڈریو اور ڈاڈ شوٹی آپس میں الجھے ہوئے تھے۔

"تم ایک احقانہ بات کر رہے ہو۔ ہمارے پاس کیلی کا کسی قسم کا ڈیٹا، ڈی این اے یا کوئی بھی ایسی شے موجود نہیں جس کی مدد سے شوٹنگ کے اندر کوئی پروگرام فیڈ کیا جاتا۔ یہ صرف ایک فطری انتخاب ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے انسان کرتے ہیں۔ کیا تم نہیں جانتے کہ بے شمار مردوزن سے بھری اس دنیا میں بس کوئی دو افراد ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کے لیے ایسے دیوانے ہو جاتے ہیں کہ انہیں ایک دوسرے کے سوا کوئی اور دکھائی نہیں دیتا۔ شوٹنگ اور کیلی بھی اسی تجربے سے گزر رہے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آہستہ آہستہ اس رویتے میں تہدیلی آئے گی اور شوٹنگ کیلی کی طرف بھی توجہ دے گا۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو ہم کیلی کو منظر سے بھی ہٹا سکتے ہیں۔ کیلی سامنے نہیں ہوگی تو لازماً فطری تقاضا

شوٹنگ کو کیلی تک لے جائے گا۔" ڈاڈ شوٹی کا لہجہ سرد لیکن بات مدلل تھی۔ اینڈریو کو قائل ہونا پڑا لیکن یہ حقیقت تھی کہ ایک طرف اس کی انا کوٹھیں پہنچی تھی تو دوسری طرف اسے یہ غم کھائے جا رہا تھا کہ کیلی جو کہ اسرائیل کے حصے میں آئی تھی، شوٹنگ کی قربت سے محروم رہ جانے کے باعث بار آور بھی ثابت نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے اب تک جتنی تحقیق اور تجربات کیے تھے، ان کے مزید آگے بڑھنے کا دار و مدار ان بچوں کی آمد پر تھا جو کیلی کے بطن سے جنم لیتے لیکن یہاں حالات بتا رہے تھے کہ کیلی، کیلی پر سبقت لے جائے گی اور کیلی کے سبقت لے جانے کا مطلب تھا چین کا سبقت لے جانا جو اسے کسی طور منظور نہیں تھا۔ وہ بہت جھنجھلایا ہوا اپنی خواب گاہ میں واپس آیا لیکن ایسے میں نیند کے مہربان ہونے کا بھی کوئی امکان نہیں تھا۔ اس کا شاطر دماغ کوئی ترکیب لڑانے میں مصروف ہو گیا۔ آخر کار ایک حل بھائی دے ہی گیا۔

"کل کیلی اور کیلی کو کھانا فراہم کر دو تو کیلی کی غذا میں یہ اور کیلی کی غذا میں یہ دو شامل کر دینا۔" اس نے اپنی ترکیب پر تیزی سے عملدرآمد کے لیے اسی وقت نگران کو طلب کر لیا۔

"لیکن سر! ان دونوں کو تو ایک ساتھ کھانا فراہم کیا جاتا ہے۔" نگران نے یاد دلایا۔

"کل سے نہیں کیا جائے گا۔ کہہ دینا کہ ساتھ کھانے میں ایک مادہ کم جبکہ دوسری زیادہ غذا استعمال کر رہی ہے اس لیے آئندہ انہیں الگ الگ حساب کتاب سے کھانا دیا جائے گا۔" وہاں حل پہلے ہی سوچ لیا گیا تھا لیکن ایسی ترکیبیں اور تدبیریں لڑانے والوں کو اندازہ نہیں ہوتا کہ وقت کی بساط پر کچھ مہرے ان کی بے خبری میں بھی چلائے جا رہے ہوتے ہیں۔ دلائی لاما کی زیر سرپرستی وہ مہرے چلائے جا چکے تھے۔ نارنجی لباس والے بکشد دلائی لاما کی روحانی طاقت کے سائے میں پورے اسرائیل سے کل کر اور کچھ دنیا کے دوسرے خطوں سے بھی سفر کر کے اپنے مقدمات کے تحفظ کے لیے اکٹھے ہو چکے تھے اور آہستہ آہستہ اینڈریو کی اس راجدھانی میں نقب لگانے کے لیے آگے بڑھتے چلے آ رہے تھے۔

☆☆☆

لائگ اسکرٹ کے ساتھ سر پر اسکارف لیے بہائی گارڈن کی سبزیاں چڑھتی لڑکی کے ہازو کے ساتھ سہارے کے لیے اسٹک جڑی ہوئی تھی۔ اسٹک کو زمین پر

ہے۔ اس لیے میں نہ تو کسی سے مدد لینا پسند کرتی ہوں اور نہ ہی کسی سے ایسی امید رکھتی ہوں۔“ اس نے پلٹ کر اپنے انہی ہمدرد کو جواب دیا اور ایک قدم مزید اٹھایا۔
”لیکن یہ ایک اپنا رول رویت ہے۔“ وہ بھی اس کے پیچھے ایک اسٹیپ چڑھا۔

”میرا تمہاری سوچ سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے البتہ یہ ضروری ہے کہ میرے اٹکار کے بعد تم میرا پیچھا چھوڑ دو اور مجھے میری مرضی سے مکمل کرنے دو۔“ لڑکی نے چڑچڑ سے پن کا مظاہرہ کیا اور ذرا تیزی دکھاتے ہوئے جلدی چنیدی دو اسٹیپ طے کر گئی۔ اس کی ٹانگ کا نقص اس تیزی کا تسلسل نہ ہوسکا اور وہ ذرا سا لڑکھرائی۔ مرد پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک ہی جست میں اس کے قریب پہنچا اور دونوں بازو تمام کر اسے سہارا دیا لیکن اس کی گرفت میں کسی عام سہارا دینے والے شخص کی سی نرمی نہیں تھی۔ اس نے اتنی طاقت سے لڑکی کے بازوؤں کو تھاما تھا کہ اسے اس کی انگلیاں اپنے گوشت میں گزرتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔ اس نے متحسّس ہو کر خود کو اس کی گرفت سے آزاد کروانا چاہا لیکن اسے اس کا موقع نہیں دیا گیا اور اس کے بازو کے ساتھ بندھی اسٹک کو ایک جھٹکے سے بچھ لیا گیا۔ یہ ساری کارروائی چند سیکنڈوں میں ہی ہو گئی اور اس سے قبل کہ لڑکی چیخ چلاتی یا کوئی واضح رد عمل دیتی، آس پاس سے پانچ چھ مضبوط اور توانا مرد لپکتے ہوئے آئے اور اسے گھیرے میں لے کر سب سے پہلا کام اس کی پشت پر موجود بیگ کو جھینٹے کا کیا۔

اس سارے منظر نے وہاں موجود سیاحوں اور زائرین کو ٹھٹھکنے پر مجبور کر دیا۔ کچھ نے اسے ایک لڑکی کے ساتھ ہونے والی ہراسانی تصور کرتے ہوئے قہر اندازی کی کوشش بھی کی لیکن سب سے پہلے لڑکی سے مخاطب ہونے اور پھر اسے گرفت میں لینے والے نے ایک کارڈ نغماتیں لہرایا اور بلند آواز میں بولا۔

”پولیس۔ آپ سب لوگ دور رہیں۔ یہ آپ ہی کے تحفظ کے لیے کی جانے والی ایک کارروائی ہے۔“

”ہونہہ..... طاقت کے بل پر مجبوروں پر ظلم کرنے کو یہ لوگ سیکھ رہی کا نام دے کر دنیا کو دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔“ ہجوم میں موجود ایک فلسطینی عورت اس کی بات سن کر بڑبڑائی اور ہمدردی سے اس معذور لڑکی کو دیکھا جسے وہیں گھنٹوں اور کہنیوں کے بل بیٹھنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ اس عورت کے ساتھ ساتھ ہجوم میں شامل دوسرے بھی کئی افراد لڑکی کے ساتھ ہمدردی محسوس کر رہے تھے۔ عوامی

فیک کروہ جس آہستہ روی کے ساتھ ایک ایک سیڑھی چڑھ رہی تھی، اسے دیکھتے ہوئے اندازہ ہو رہا تھا کہ ٹانگ کے نقص یا کسی تکلیف کے باعث اسے چلنے میں دشواری کا سامنا ہے۔ وہ بھائی گارڈن کی خوبصورتی سے بے نیاز سیڑھیوں پر نظریں جمائے بے حد سنجیدگی کے ساتھ دھیمی رفتار لیکن مستقل مزاجی کے ساتھ سیڑھیاں طے کرتی جا رہی تھی۔ اس کی پشت پر دونوں شانوں سے لٹکا ایک ڈرمیانے سائز کا بیگ جھول رہا تھا۔ وہ واٹر پروف اور خاصی مضبوط سلائیوں والا بیگ تھا اور جس طرح لڑکی کے شانے آگے کی طرف قدرے جھکے ہوئے دکھائی دے رہے تھے اس سے بیگ کے وزنی ہونے کا بھی اندازہ ہو رہا تھا۔

”ایکسیکوڑی!“ اچانک ہی لڑکی کے عقب سے جست جیتز اور لی شرٹ میں بلبوس ایک جوان العبر آدمی نمودار ہوا اور اسے مہذبانہ لہجے میں مخاطب کیا۔
”ہیس!“ اپنی دھن میں چلتی لڑکی قدرے چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

”اگر آپ مناسب سمجھیں تو اپنا بیگ مجھے پکڑا سکتی ہیں۔“ مرد نے مسکرا کر اسے پیشکش کی۔

”آپ کا شکر یہ لیکن میرے خیال میں آپ کو اس زحمت کی ضرورت نہیں ہے۔“ لڑکی کے الفاظ مناسب لیکن لہجہ رد کھاسا تھا۔

”زحمت کی کوئی بات نہیں۔ میں بھی اوپر ہی جا رہا ہوں اور آپ کے اس بیگ کو بہت آسانی سے اوپر پہنچا سکتا ہوں۔“ اس کی رکھائی کے باوجود مرد کے ہونٹوں کی مسکراہٹ برقرار رہی۔

”میرے لیے بھی یہ کوئی خاص مشکل کام نہیں ہے۔ آپ شاید میری معذوری پر ترس کھا کر یہ پیشکش کر رہے ہیں لیکن یقیناً جانیں کہ مجھے خود پر ترس کھائے جانے سے شدید نفرت ہے۔“

”نہیں نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ میں تو بس انسانیت کے نامے آپ کی تھوڑی سی مدد کرنا چاہ رہا تھا۔ انسان کا انسان پر اتنا حق تو ہوتا ہے نا۔“ اس کی نرمی برقرار تھی۔

”میرا انسانیت پر سے یقین اٹھ چکا ہے۔“ مرد لہجے میں جواب دے کر لڑکی نے اپنا قدم اگلی سیڑھی پر رکھا۔
”لیکن کیوں؟“ پشت پر سے استفسار ہوا۔

”کیونکہ میں حقیقت پسند ہوں اور اس حقیقت کو بہت پہلے سمجھ چکی ہوں کہ انسانیت وغیرہ کسی چیز یا کام نہیں۔ یہاں ہر شخص کو اپنی زندگی خود جیتنا ہے اور اپنا بوجھ خود اٹھانا

باوجود امریکا میں اپنی بہترین ملازمت چھوڑ کر یہاں آ گیا۔ وہ ایک کوالیفائیڈ ڈاکٹر تھا جس نے اپنے پیشہ ورانہ فرائض انجام دیتے ہوئے ہر اس شخص کا علاج کیا جو اس تک پہنچا اور اس کی بھی فرض شناسی اس کا جرم ٹھہری۔ اس پر فلسطینی مجاہدین سے تعلق کا الزام لگا کر عین اس وقت گرفتار کر لیا گیا جب وہ طیبہ سے نکاح کے بندھن میں بندھنے جا رہا تھا۔ آپ تصور کریں، ماضی میں اپنے سینے پر اپنے پیاروں کی جدائی کے گہرے گھاؤ کھانے والی لڑکی کو ایک بار پھر خوشیوں کی راہ گزر پر قدم رکھنے سے محروم کرنے والوں کے لیے اس نے کتنی شدید نفرت محسوس کی ہوگی۔ اس نفرت میں مزید اضافہ اس وقت ہوا جب نیکی کی رہائی کے لیے کی گئی ہر کوشش بے سود ثابت ہوئی۔ اسے کسی عدالت میں پیش کر کے اس پر فرد جرم عائد کرنا تو دور کی بات، عالم اس کی گرفتاری سے ہی انکاری ہو گئے اور پھر.....! "ارنٹس نے جملہ مکمل کرنے کے بجائے ایک سرود آہ بھری۔

"اور پھر؟" معاذ نے سوال ضرور کیا لیکن اسے معلوم تھا کہ وہ اس سوال کا جواب جانتا ہے۔

"بس پھر ایک دن ڈاکٹر نیکی کی کئی پیشی تشدد شدہ لاش دریافت ہوئی اور طیبہ صدمے سے اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی۔ بہت دن بعد جب اس نے اپنے ساتھ ہونے والے ایسے کو قبول کر لیا تو وہ، وہ طیبہ نہیں رہی جو پہلے کسی ہوا کرتی تھی۔ اس نے قبول کر لیا کہ ہم فلسطینیوں کو اگر اسرائیلی ظلم و ستم سے بچنا ہے تو اینٹ کا جواب پتھر سے دینا ضروری ہے۔ میں نے اسے یہاں تک کہتے ہوئے سنا کہ اس روپے سے اور کوئی فائدہ ہونہ ہو، کم از کم سینے سے جلتی آگ پر پانی کے چند چھینٹے ضرور پڑ جاتے ہیں۔ اپنے سینے کی آگ پر پانی کے چھینٹے ڈالتے ڈالتے وہ اپنے دامن میں ہی آگ لگوا بیٹھی ہے لیکن ہم میں سے کوئی بھی اسے ڈاکٹر نیکی والے انجام تک پہنچتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتا۔ ہم نہیں چاہتے کہ ایک دن ہم ڈاکٹر نیکی کی طرح اس کی بھی کئی پیشی لاش وصول کریں بلکہ ایک عورت ہونے کے ناتے یتیم وہ ڈاکٹر نیکی سے بھی زیادہ سخت امتحان سے گزرے گی۔" "ارنٹس نے اس لمحے کی تکلیف کے تصور سے ہی آنکھیں میچ لیں۔ معاذ بھی کچھ لمحوں کے لیے بالکل خاموش ہو گیا۔ یہ ساری صورت حال اس کے لیے کچھ تھی تو نہیں تھی۔ وہ ابھی ماضی قریب میں کشمیر میں یہی سب کچھ دیکھ کر آیا تھا۔

"مظلوم..... وہ بھی ایسا مظلوم جس کے ارد گرد ظلم کا سلسلہ رکنے کا نام ہی نہ لے رہا ہو، مہتمم بن جائے تو اس میں

جذبات سے بے نیاز وہ سارے لڑکی کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے تھے اور ان کے ہتھیار ان کے ہاتھوں میں آچکے تھے۔ لڑکی سے چھینا گیا بیگ وہاں سے کافی دور لے جا کر کھولا جا رہا تھا اور ہم ڈسپوزل اسکوڈ کے دو افراد مخصوص لباس میں کسی بھی صورت حال سے نمٹنے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ اچانک ہی کسی گھوڑنے کی طرح ہنٹوں اور کہنیوں کے بل بے بس کمزری لڑکی کا توازن بگڑا اور وہ سیزیمیوں سے رول ہوتی ہوئی نیچے لڑھکتی چلی گئی۔ لڑھکتے ہوئے وہ اپنے راستے میں کھڑے ایک پولیس والے کو بھی ساتھ لے کر گری تھی۔ اس منظر کو دیکھ کر جہاں کئی لوگوں کے منہ سے چیخ نکلی، وہیں پولیس والے بل بھر کی حواس باختگی کے بعد تیزی سے اس کے پیچھے لپکے لیکن اگلے ہی لمحے گونجے والی کان بھاڑ دھماکے کی آواز ہر ایک شے پر حاوی ہو گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ دھماکا خیز مواد اسی بیگ میں تھا جسے زبردستی لڑکی سے چھینا گیا تھا۔

☆☆☆

"یہ مطالبہ میری سمجھ سے باہر ہے ارنٹس! مجھ سے ایک ایسی لڑکی کی رہائی کے لیے خود کو خطرے میں ڈالنے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے جو ایک دہشت گرد کا روزوائی کرنے کی کوشش میں رہے گا۔ ہاتھوں پکڑی گئی ہے۔ اسرائیلی تو اسے مجرم و کلبتر کر ہی رہے ہیں، میرے نزدیک بھی وہ بے قصور نہیں ہے۔" معاذ کے چہرے پر برسرِ غمی اور وہ قدرے تیز لہجے میں پیغام لے کر آنے والے ارنٹس سے بات کر رہا تھا۔

"اگر آپ طیبہ کے حالات و زندگی جان لیں تو اسے اس عمل میں اتنا غلط تصور نہیں کریں گے جتنا اس وقت محسوس کر رہے ہیں۔"

"وہ بھی سنا دوتا کہ میں مان سکوں کہ کسی پبلک پلیس پر بے قصور انسانوں کو پرچوں میں تبدیل کر دینے کا بھی کوئی جواز ہوتا ہے۔" معاذ کے انداز میں واضح بیزاری تھی۔

"طیبہ ایک پڑھی لکھی روشن خیال لڑکی تھی جس نے اسرائیلی جارحیت کے نتیجے میں ماں باپ اور اکلوتے بھائی سمیت پوری فیملی کو کھودینے کے باوجود خود کو بکھرے نہیں دیا تھا اور بڑی ہمت سے کام لیتے ہوئے بیروت یونیورسٹی سے گریجویشن کی ڈگری لے کر آئی تھی۔ وہ بے حد ہونہار طالبہ تھی جو اگر چاہتی تو اپنی قابلیت کے بل بوتے پر کسی مغربی ملک میں سہیل ہو سکتی تھی لیکن اس نے اپنے وطن میں رہنے اور ہم وطنوں کی خدمت کرنے کو ترجیح دی۔ یہ اسی کی خواہش تھی کہ اس کا مگیتر نیکی اپنے گھر والوں کے اصرار کے

کسی انجیے کی بات نہیں ہوتی۔ طیبہ کے ساتھ بھی بس ایسا ہی ہوا ہے۔“ ارتضیٰ کی طرف سے مسلسل طیبہ کی وکالت کا سلسلہ جاری تھا۔

”مجھے طیبہ کی کہانی سن کر اپنے دل میں اس کے لیے شدید دکھ محسوس ہو رہا ہے لیکن میں اب بھی اپنے اس موقف پر قائم ہوں کہ کسی بلیک پلیس پر عام لوگوں کو اپنے انتقام کی لپیٹ میں لے لینا کسی طور جائز تصور نہیں کیا جاسکتا۔“ جنازہ کی طرف سے سچائی کا مظاہرہ کیا گیا۔

”اس کا نشانہ عام لوگ نہیں تھے۔ وہ صرف اس عالم فحش کو کیفر کردار تک پہنچانے گئی تھی جس نے اس سے زندہ رہنے کی واحد وجہ چھین لی۔ وہ میجر اس روز بھائی گارڈن میں موجود تھا جن نے ڈاکٹر یحییٰ کو گرفتار کرنے کے بعد اسے بدترین تشدد کا نشانہ بنایا اور پھر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ پکڑے جانے پر جب طیبہ نے غصے میں بم بلاسٹ کیا تو وہ بلاسٹ بہت محدود تھا۔ یعنی اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتی تو مذکورہ میجر کے علاوہ کسی دوسرے فرد کو نقصان پہنچنے کا بہت ہی کم امکان تھا۔“ ارتضیٰ بہت مدلل طریقے سے طیبہ کا مقدمہ لڑ رہا تھا۔ اس بار معاذ کو بھی قائل ہونا پڑا۔

”یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو اور مجھے خوشی ہے جذبہ انتقام کے جنون کے باوجود طیبہ نے اس بات کا خیال رکھا۔“

”وہ بہت اچھی، بہت حساس لڑکی ہے اور ہم نہیں چاہتے کہ اس کے ساتھ جتنا برا ہو چکا ہے، اس کے بعد مزید بھی کچھ برا ہو۔ اسے ان بھیڑیوں کے زرخے سے نکالنا بہت ضروری ہے معاذ بھائی!“ اس کے روپے میں چلک دیکھ کر ارتضیٰ نے مزید زور لگایا پھر ذرا جھجکتے ہوئے بولا۔

”آپ یہ بھی تو غور کریں کہ آپ کو ابو حمزہ سے ایک بڑی مدد ملنی ہے اور ان حالات میں ہم انہیں انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔“

”ہوں۔“ معاذ نے ہنکارا بھرا۔ ”کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو۔ میں سوچتا ہوں اس پر۔“ اس کے لہجے میں موجود نیم رضامندی ارتضیٰ نے بھی محسوس کر لی۔

☆☆☆

”تم نے کبھی سوچا ہے تک کہ اگر ہمارے ہاں اولاد ہوئی تو تم اسے کیا نام دو گے؟“ وہ دونوں میاں بیوی بہت خوشگوار موڈ میں ساحل کے کنارے چہل قدمی کر رہے تھے جب آمنہ نے تک سے یہ سوال کیا۔

”نہیں، میں نے نہیں سوچا اور نہ ہی میں سوچنے کا

ارادہ رکھتا ہوں۔“ تک کا جواب آمنہ کے لیے بہت غیر متوقع تھا۔ وہ ہلے بھر کے لیے ششدر سی رہ گئی پھر پریشانی سے بولی۔

”کیوں؟ میرا مطلب ہے تم کیوں سوچنا نہیں چاہتے؟ کیا تمہیں بچوں کی خواہش نہیں ہے؟“

”اودہ لو۔ تم غلط سمجھ رہی ہو ایکی ڈارلنگ! مجھے تو بچے بہت پسند ہیں اور میں اس بات کا قائل ہوں کہ اس دنیا کی ساری رونق بچوں کے دم سے ہے۔ اگر بچوں کو مانس کر دیا جائے تو دنیا کے وجود کا کوئی جواز ہی باقی نہیں رہتا۔“

”تو پھر تم نے اپنے بچوں کے متعلق کیوں نہیں سوچا؟“ آمنہ نے نا سنجی سے استفسار کیا۔

”یہ کس نے کہا کہ بچوں کا نہیں سوچا؟ میں نے تو صرف نام کے بارے میں کہا ہے کہ نہ سوچا ہے اور نہ ہی سوچوں گا۔“

”وجہ؟“ اس بار آمنہ کے لہجے میں تجسس تھا۔

”وہ اس لیے مائی ڈارلنگ کہ.....“ تک نے اس کے دونوں شانوں کو اپنے مضبوط ہاتھوں کی گرفت میں لیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پیار سے بولا۔

”میں سمجھتا ہوں کہ بچے کی پیدائش اور پرورش کے لیے جتنی محنت ماں کرتی ہے، دنیا کا کوئی اور فرد نہیں کرتا اس لیے بچے پر سب سے زیادہ حق بھی ماں کا ہی ہوتا ہے۔ میں ماں کی اس عظمت کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے بچوں کے نام رکھنے کے سلسلے میں تمہارے حق میں دستبردار ہوتا ہوں۔“

”اودہ، تک! تم کتنے اچھے اور حساس انسان ہو۔“ آمنہ خوش ہو کر اس کے سینے سے لگ گئی۔

”مجھے لگتا ہے کہ تم نے ہمارے مستقبل کے بچوں کے کوئی نہ کوئی نام سوچ رکھے ہیں۔“ تک نے جوابی گرجبوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اعزازہ لگایا۔

”بچوں کے تو نہیں، بس ایک بچے کا نام سوچا ہے۔“ آمنہ نے دلکش انداز میں مسکراتے ہوئے اعتراف کیا۔

”ذیری گڈاؤرا مجھے بھی تو ہمارے کردہ نام کیا ہے اور بیٹے کے لیے سوچا گیا ہے یا بیٹی کے لیے؟“ تک نے دلچسپی سے پوچھا۔

”بیٹا ہو یا بیٹی، نام ایک ہی ہوگا۔“

”ایسا کون سا نام ہے؟“ آمنہ کے جواب نے تک کا تجسس بڑھایا۔

”امن..... بیٹی ہو یا بیٹا، میں اپنے پہلے بچے کا نام امن رکھوں گی۔ امن کا مطلب ہوتا ہے سلامتی، بے

خوفی..... میرا بچہ اس دنیا میں ایسا فرد بن کر آئے گا جس سے دنیا کے دوسرے انسانوں کو کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔“ آمنہ روانی میں بولتی جا رہی تھی لیکن پھر اسے احساس ہوا کہ تک کا چہرہ یکدم ہی بجھ گیا ہے۔

”کیا ہوا تک؟ کیا تمہیں یہ نام پسند نہیں آیا؟“

”جیس، ایسی تو کوئی بات نہیں۔ بہت اچھا نام ہے۔ بس.....“ تک نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور بچے ہوئے انداز میں مسکرایا۔

”کیا بس؟ پھیلیاں کیوں بھجوا رہے ہو؟“ آمنہ ہلکا سا جھنجھلائی۔

”کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا ہے کہ تم مجھے ایک عالم، جابر اور قاتل کے طور پر دیکھتی ہو۔“ تک نے اپنے دل کی بات بیان کر دی۔

”ایسا بالکل نہیں ہے تک۔ امیری نظر میں تم ایک بہت اچھے انسان ہو۔ اگر میں تمہیں غلط انسان سمجھتی تو کبھی تمہارے ساتھ شادی نہیں کرتی۔ مجھے بس تمہارے کام کی نوعیت کے حساب سے کچھ تحفظات تھے جنہیں میں تم سے ڈسکس کر چکی ہوں اور مجھے یقین ہے کہ تم اس بارے میں کوئی بہترین فیصلہ ہی لو گے اس لیے مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے کہ تمہیں کسی بہانے سے کچھ بھی بتاؤں۔“ آمنہ نے فوراً ہی وضاحت دی پھر اس کا ہاتھ تمام کر لاڈ سے بولی۔

”چھوڑو اس موضوع کو جس کی وجہ سے ہمارا اتنا خوبصورت وقت برباد ہو رہا ہے۔ جہنم میں جاؤ ایسے بچے جو میرے تک کو اداس کر دیں۔“

”خبردار! جو تم نے میرے بچوں کو جہنم میں ڈالنے کی بات کی۔ میں انہیں جنت جیسی زمین کی دینے کا سوچتا ہوں اور تم ہو کہ انہیں جہنم میں ڈالنے کی بات کر رہی ہو۔“ تک نے فوراً اسے ڈپٹا۔

”اللہ اللہ..... وہ بچے جن کا ابھی دور تک کوئی نام و نشان بھی نہیں ہے، ان کے لیے ایسی حساسیت کہ اپنی اتنی پیاری بیوی کو ڈانٹا جا رہا ہے۔“ آمنہ نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے اسے چھیڑا۔

”وہ اس لیے کہ مجھے یقین ہے کہ میرے بچے“ امیری اتنی پیاری بیوی“ جتنے ہی پیارے ہوں گے۔“ تک کے برجستہ جواب پر آمنہ ہنسکھلا کر ہنس پڑی۔ تک کی ہنسی بھی اس کی ہنسی کے ساتھ شامل ہو کر سائل پر دور تک بھٹکتی چلی گئی۔

☆☆☆

”بہت عجیب۔“ سونیا کی بات سن کر وہ قلم بھی دو

لفظ ادا کر سکا۔

”عجیب تو ہے پر حقیقت پر مبنی ہے اور ہماری مجبوری ہے کہ ہمیں یہی راستہ اختیار کرنا ہوگا کیونکہ یہ تو ہمارے بس میں نہیں ہے کہ ہم سخت سکیورٹی کو توڑ کر طیبہ کو وہاں سے نکال سکیں۔ یونہی کہ یہ کوئی انٹرین سوڈی نہیں ہے جس میں ہیرو آگ کے دریا میں سے گزر کر بھی ہیروئن کو نکال لاتا ہے۔ یہ حقیقی زندگی ہے اور تم اس وقت اسرائیل جیسے ملک میں موجود ہو جہاں کا سارا سسٹم بے حد جدید ہے۔ اس جدید سسٹم سے مقابلہ کرنے کے لیے جن وسائل کی ضرورت ہے، وہ ہمیں دستیاب نہیں ہیں اور نہ ہی ہمارے پاس اتنا وقت ہے کہ ہم ان وسائل کے حصول کی کوشش کر سکیں۔ اس لیے میں نے تمہیں سب سے زیادہ آسان راستے سے آگاہ کر دیا ہے۔“ سونیا نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے اسے حقائق سمجھانے کی کوشش کی۔

”قابل نفرت۔ میں نے تو کبھی خواتین کو بھی اس طرح استعمال کیا جانا پسند نہیں کیا چاہے جانیکہ خود اس گند میں اتر جاؤں۔“ معاذ نے منہ بتایا۔

”ضروری نہیں کہ گند میں اتر کر تم خود بھی گندگی میں لت پت ہو جاؤ۔ میں تمہیں کنول کے پھول والی پرانی مثال دوں گی کہ جیسے کنول کا پھول کچھڑ میں اگنے کے باوجود اپنی خوبصورتی اور پاکیزگی پر داغ نہیں لگنے دیتا، تم بھی خود کو محفوظ رکھ سکتے ہو۔“ سونیا اسے ہر حال میں قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”اچھا تو یہ بتاؤ کہ تمہاری اس کرل جیتھر تک رسائی کی ترکیب کا کیا ہوگا؟ اب یہ تو نہیں سکتا کہ میں جا کر اس کی ڈور تیل بجاؤں اور کہوں ہیلو میڈم! میں آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہوں۔ کیا آپ مجھے شرف قبولیت عطا کرنا پسند کریں گی؟“ وہ بکھٹا تھا کہ اگر کوئی اور راہ ہوتی تو سونیا اس کو اس کے مزاج کے برخلاف آئیڈیا پر گز بھی نہ دیتی اس لیے مجبوراً اس کے شورے پر عمل کرنے کے لیے راضی تو ہو گیا لیکن چڑھنے پر ہن کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکا۔

”میں نے سارا انتظام کر لیا ہے۔ اتفاق سے ایک موقع بھی نکل آیا ہے اور وہ ذریعہ بھی جو تمہیں کرل جیتھر تک پہنچا دے گا۔ آگے تمہاری قسمت اور کارکردگی دونوں پر ہے کہ تم اسے متاثر کرنے میں کامیاب ہو جاؤ۔“ سونیا نے اسے آگاہ کیا تو وہ بس منہ بنا کر رہ گیا۔ آگے راہ تو سچ کچ کوئی نہیں تھی۔

”ایزی معاذ! سب ٹھیک ہو جائے گا اور ایسا کچھ

پیشکش کے بعد یہ پروگرام بنایا ہے؟“ معاذ نے اس سے دریافت کیا۔

”تم یقیناً خوش قسمت ہوڑ کے کہ میرا آج کا جانا طے تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں سونیا کی طرف سے اتنی بڑی آخر کے باوجود کوئی رسک لینے سے پہلے سو بار سوچتی۔ دوسرا اتفاق یہ ہے کہ آج کے دن ایک ایسی سوشل گید رنگ بھی تھی جہاں جیتھر کو آنا تھا۔ بس اس گید رنگ کا دعوت نامہ حاصل کرنے کے لیے مجھے تھوڑے سے ہاتھ پیر چلانا پڑے۔ تو بھی جو کچھ سونیا نے مجھے آفر کیا تھا، اس کے لیے اتنی محنت کرنا تو جتنا تھا۔“ اپنی بات کے اختتام پر روزی نے ایک مسرت سے بھرپور قہقہہ لگایا۔

”اتنے بڑے عہدے پر فائز ہوتے ہوئے جیتھر عام سوشل گید رنگز میں شرکت کی فرصت کیسے نکالتی ہے؟“ معاذ نے حیرت کا اظہار کیا۔

”صرف فرصت نہیں نکالتی، تو اترے ایسی گید رنگز میں شرکت کرتی ہے۔“ روزی نے اسے اطلاع دی پھر ایک آنکھ کا کونہ دباتے ہوئے سچی خیر لہجے میں بولی۔ ”ایسی گید رنگز میں شکار آسانی سے مل جاتا ہے نا؟“ اس کی یہ بات سن کر معاذ کا چہرہ غجالت سے سرخ پڑ گیا۔

”خوبصورت اور جوان مردوں کا ہوکا ہے اس عورت کو۔ حالانکہ خود بڑھی گھوڑی ہو چکی ہے مگر لال لکام کا شوق ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا۔“ روزی نے ایک اور بلند قہقہہ لگایا لیکن معاذ سکرا بھی نہیں سکا اور موضوع بدلنے کے لیے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

”ہمیں حریذ شہزی در لگے کی منزل پر پہنچنے میں؟“ ”بس سمجھو پہنچ گئے۔“ روزی اس کی ناگہاری کو محسوس کرتے ہوئے سنجیدہ ہو گئی اور ایک موڑ کاٹتے ہوئے بتانے لگی۔ ”میں نے پارٹی ارجن کر کے والی خاتون کو بتا رکھا ہے کہ میں اپنے سنے یو اے فریڈ کے ساتھ پارٹی میں شرکت کروں گی۔ امید ہے کہ تم اس بات کا بُرا نہیں مانو گے کیونکہ تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کا اس کے علاوہ کوئی جواز نہیں ہو سکتا تھا۔“

”میں سمجھتا ہوں۔“ معاذ نے اس بار قدرے نرمی سے جواب دیا۔

”مجھے ہوتا تو پھر میرے ساتھ محفل میں شریک ہوتے ہوئے اسی طرح بی ہو کرنا جیسے ایک یو اے فریڈ کو کرنا چاہیے۔ میں تمہیں اس مفت مشورے سے صرف اس لیے نوازی رہی ہوں کہ سونیا نے مجھے بہت خطیر معاوضہ ادا کیا ہے

نہیں ہوگا جو تمہیں چہاری نظروں میں شرمندہ کر دے۔“ سونیا نے اس کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی تو وہ محض سر ہلا کر رہ گیا۔ سونیا جیسی آواز میں اسے اہم تفصیلات سے آگاہ کرنے لگی پھر استفسار کیا۔ ”کوئی سوال؟“

”نہیں۔“ معاذ نے ٹہنی میں سر ہلایا۔ ”اوکے، تو پھر میں چلتی ہوں۔ تمہیں معلوم ہے کہ موجودہ حالات میں میرے لیے اپنی جگہ چھوڑ کر ادھر ادھر جانا کتنا مشکل ہو چکا ہے۔ فوراً اوپر پرپورٹ کی جاتی ہے اور مجھے وضاحت پیش کرنا پڑتی ہے۔“

”شکریہ سونیا! مجھے اندازہ ہے کہ میری خاطر تمہیں بہت زیادہ آڈٹ آف داوے جا کر کام کرنا پڑتا ہے۔“ معاذ نے ممنونیت کا اظہار کیا۔

”ان فار ملیٹیو میں مت پڑو معاذ! مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ بھیگی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہہ کر اپنا ڈیڑھ بیگ اٹھا کر باہر نکل گئی اور معاذ بہت دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ ماضی کی سوتلیا اور موجودہ سونیا میں اتنا فرق آگیا تھا کہ کبھی کبھی حیرت ہوتی تھی کہ کیا یہ وہی خطرناک حسینہ ہے جو میڈیم ایکس کے حکم پر سردھڑکی بازی لگا دیتی تھی اور اس کے لیے دشمنوں کی صف میں شامل تھی۔ سونیا کی کا یا پلٹ اسے اللہ کا ایک احسان محسوس ہوتی تھی۔ وہی تو تھا جو اس طرح دلوں کے حال بدلنے پر قدرت رکھتا تھا کہ بدلنے والے کو خود پتا نہیں چل پاتا تھا کہ وہ کیسے بدل گیا ہے۔

☆☆☆

”میں نہیں جانتی کہ جیتھر تک پہنچنے کے پیچھے تمہارے کیا مقاصد ہیں۔ مجھے جاننے کی ضرورت بھی نہیں ہے اس لیے کہ مجھے تمہارے کسی بھی عمل سے زیادہ اس بیماری معاوضے سے غرض ہے جو سونیا نے اس کام کے بدلے میں میرے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کیا ہے۔ میں اس پارٹی میں تھوڑی دیر شرکت کرنے کے بعد سیدھی انٹرپورٹ جاؤں گی اور ہمیشہ کے لیے اس ملک کو چھوڑ دوں گی۔“ مختصر اے بالوں والی روزی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی اسے اپنے پروگرام سے آگاہ کر رہی تھی۔ وہ ایک فری لانس صحافی تھی جس کا سوشل گید رنگز میں شرکت کرنا ایک معمول تھا چنانچہ سونیا کی فرمائش پر اس نے پارٹی میں شرکت کی راہ ہموار کر لی تھی جس میں کرنل جیتھر نے شرکت کرنا بھی۔

”تمہارا ملک سے جانا طے تھا یا تم نے سونیا کی

اور میری دلی خواہش ہے کہ تمہارا جو بھی مقصد ہے، اس میں ناکام ہو کر اس کی رقم ضائع نہ کرو ورنہ میرا کیا ہے، میں تو جو حاصل کرنا تھا، حاصل کر چکی ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ جیسے تم کہو گی، میں ویسا ہی کروں گا۔“
”سب سے پہلے تو تھوڑا سا مسکرا دو۔“ اس نے گاڑی کو بریک لگاتے ہوئے کچھ ایسے انداز میں جواب دیا کہ اس کے ہونٹوں پر سچ مچ مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”گڈ بوائے! اب آؤ اور ذرا میری بانہوں میں بائیں ڈال کر اندر چلو۔“ اس نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا اور جیسے ہی معاذ دروازہ کھول کر باہر نکلا، خود ہی آگے بڑھ کر اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ اپنے کردار میں بنگ بھرنے کے لیے معاذ کو بھی طوفاؤں کا ہاس کی تھلید کرنا پڑی۔
”تھوڑا آخرہ ہے تم میں نیکن آئی سمجھ دار ہو۔“ روزی نے تبصرہ کیا جس کا جواب اس نے محض ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ دیا۔

وہ دونوں قدم سے قدم ملا کر چلتے ایک شاندار گھر میں داخل ہوئے۔ گھر کے گیٹ پر باوردی ملازمین نے ان کا استقبال کیا اور ایک بڑے سے ہال کی طرف راہنمائی کی۔ ہال سے باہر ہی تیز موسیقی کی آواز نے انہیں اندر کے ماحول سے آگاہ کر دیا۔ دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی رنگ و بو سے اٹی فضا نے ان کا استقبال کیا۔ بلند موسیقی کے ساتھ بلند آہنگ قہقہوں اور گفتگو کا احراج بھی تھا اور فضا میں نشہ آور اشیا کی بو بھی۔ اس لیے فضا خاصی کثیف تھی لیکن وہاں موجود افراد اس سب سے بے نیاز نظر آ رہے تھے۔

روزی اسے سب سے پہلے میزبان کے پاس لے گئی اور اس کا اپنے بوائے فرینڈ کی حیثیت سے تعارف کروایا۔ وہ کوشش کے باوجود اس بے تکلفی اور بے باکی کا مظاہرہ نہیں کر سکا جو روزی کے بوائے فرینڈ کی حیثیت سے اس کے روپے میں دکھائی دینی چاہیے تھی۔

”بڑا اثر میلا بے بی ہے۔“ میزبان نے اس کے رخسار پر چمکی کاٹتے ہوئے تبصرہ کیا تو اس کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔

”ہاؤ کیوٹ! اسے سنبھال کر دکھنا روزی اور نہ تمہیں پتا ہے کہ یہاں کچھ شکاری بھی گھوم رہے ہیں۔“ میزبان نے آگے کا کوننا دہاتے ہوئے روزی کو متنبہ کیا۔

”کوئی فرق نہیں پڑتا۔ روزی کو کون سا کوئی کمی ہے۔“ روزی نے بے نیازی کے اظہار کے لیے شانے اچکائے۔

”اس میں تو کوئی شک نہیں ہے۔“ میزبان نے

خوبصورت خند و خال والی روزی کو سراہتی نظروں سے دیکھا۔ عمر کی تین دہائیاں طے کر چکنے کے باوجود وہ سچ مچ خوبصورت تھی۔

”آؤ۔ میں تمہیں باقی لوگوں سے ملواتی ہوں۔“ روزی اس کا بازو تھام کر اسے دوسری طرف لے گئی۔

”وہ جو بار کاؤنٹر کے پاس گرے اینڈ ریڈ اسکرٹ میں لمبی سی عورت دکھائی دے رہی ہے، وہ جینتھر ہے۔“ اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے روزی نے آگے کے اشارے سے اسے بتایا۔ معاذ نے دیکھا کہ چالیس سال کے لگ بھگ والی اس عورت نے خود کو خوب سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ شکل و صورت کے معاملے میں تو وہ بس مناسب ہی تھی لیکن اس کا خاص سانچے میں ڈھلا اور زشی جسم اور لمبا قد اسے خاص کشش عطا کر رہا تھا۔

”اس کی طرف توجہ مت دینا۔ اس کی تم پر نظر پڑے گی تو خود ہی تمہاری طرف کھینچی چلی آئے گی۔“ روزی نے سرگوشی میں اسے ہدایت کی اور چند افراد سے ملاتی ہوئی ایک میز پر لے گئی۔

”ہائے روزی!“ انہیں وہاں بیٹھے چند لمحے ہی گزرے تھے کہ جینتھر آدھمکی۔

”اوہ ہیلو۔ آپ بھی ہیں یہاں۔ سوری! میں نے دیکھا نہیں تھا۔“ روزی نے چونکنے کی اداکاری کی۔

”جب انسان اپنی بغل میں ایسا پنڈ سم سائی لے پھر رہا ہو تو پھر کہیں اور دیکھنے کی فرصت کہاں ملتی ہے۔“ جینتھر نے معاذ کو بے باکی سے گھورتے ہوئے اسے جواب دیا تو روزی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ معاذ نے بھی کوشش کر کے اپنے ہونٹوں پر ایک دھیمی سی مسکراہٹ سجائی۔

”آپ کی تعریف میرے لیے سند کا درجہ رکھتی ہے۔ میں اپنے امیدواروں میں سے اسے فائل کرنے پر غور کروں گی۔“

”مجھے یقین نہیں آ رہا روزی کہ تم اتنی بد ذوق ہو کہ ایسے لاشک میں کو ابھی تک ”قابل خود“ کی لسٹ میں رکھا ہوا ہے۔ میں ہوتی تو اب تک سارے مراحل طے ہو چکے ہوتے۔“ جینتھر کی بے باکی معاذ کو جیننے پر مجبور کر رہی تھی۔ وہ جس ماحول میں مل بڑھ کر جوان ہوا تھا، وہاں تو مرد بھی اتنا کھلا اظہار نہیں کرتے تھے جہاں تک ایک عورت۔

”تعارف تو کرواؤ! اپنے پنڈ سم بوائے فرینڈ کا۔“ جینتھر نے اب اسی میز پر ایک کرسی سنبھال لی تھی اور معاذ پر نظریں جمائے روزی سے پوچھ رہی تھی۔

”تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن میں نے اس سے دوستی اس کی خوبصورتی کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے صحافی ہونے کی وجہ سے کی ہے۔“

”کیا تمہیں صحافی پسند ہیں؟“ معاذ کا جواب سن کر جیتھر نے پوچھا تو وہ ہنس پڑا۔

”ایسی کوئی بات نہیں۔ بات بس اتنی سی ہے کہ میں جانتا ہوں کہ صحافی خود چاہے کتنا بھی پھلچر ہو، اس کا اٹھنا بیٹھنا اونچے لوگوں میں ہوتا ہے۔ یہ سمجھ لو کہ میں اس کے ذریعے ہائی سوسائٹی میں جگہ بنانے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ معاذ نے ایسی وجہ بیان کی جس سے اس کا لالچی اور مطلب پرست ہونا ظاہر ہوا۔ اس نے دیکھا کہ یہ جواب سن کر جیتھر کی آنکھیں چمکنے لگی ہیں پھر بھی اس نے تباہی سے پوچھا۔

”تم ہائی سوسائٹی میں تعلقات کیوں بنانا چاہتے ہو؟“

”ظاہر سی بات ہے اپنی کلاس بدلنے کے لیے۔ ویسے بھی میں نے ایک چیز نوٹ کی ہے کہ ہائی سوسائٹی کی عورت بہت پُر اعتماد، ریفا سنڈ اور پچرڈ ہوتی ہے۔ مڈل کلاس کی عورت کو آپ جتنا چاہے پالش کر لیں، اس کی باڈی لینگویج بتا دیتی ہے کہ وہ کہاں سے ہے۔ میں اپنے لیے ایک شاندار عورت کا مستلاشی ہوں۔ اسی لیے روزی کو میز می بنایا ہے۔“ شاندار عورت کے الفاظ ادا کرتے ہوئے اس نے جیتھر کو بہت غور سے دیکھا تھا اور جیتھر نے اس کا دیکھنا محسوس کیا تھا اس لیے خاصی خوش نظر آ رہی تھی۔

”مجھے تمہاری صاف گوئی پسند آئی۔ یہاں بہت سے لوگ تمہارے انداز میں سوچتے ہیں لیکن اس بات کو دوسروں سے چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔“

”میں نہیں چھپاتا۔ میں روزی سے بھی کہہ چکا ہوں کہ ہماری ریلیشن شپ لاگ ٹرم ہونے کے امکانات کم ہیں اور جب بھی مجھے اس سے بہتر عورت ملی، میں اس سے الگ ہو جاؤں گا۔“

”واؤ..... امیزنگ۔“ جیتھر نے اسے سراہا پھر بولی۔

”مجھے عرصے بعد کوئی اپنا ہم خیال اور ہم مزاج شخص ملا ہے۔“

”اور یقیناً میری طرح تمہیں بھی اس ملاقات سے خوش ملی ہوگی۔“

”بالکل۔“ جیتھر نے کسی نوجوان لڑکی کی طرح کھلکھلاتے ہوئے تائید کی۔ اسی وقت روزی وہاں واپس لوٹ آئی۔

”ایسکویزی عمار! مجھے ایک ارجنٹ کام کے لیے

اس کی نظریں اور اطوار دیکھتے ہوئے سوئیا کی اس کے متعلق فراہم کردہ معلومات کی تصدیق ہو رہی تھی۔ جیتھر کو اگر ”مردوں کی شکاری“ کے نام سے پکارا جاتا تھا تو یقیناً یہ غلط نہیں تھا۔ خوبصورت اور اسرار مرقی اس کی کمزوری تھی جب ہی تو معاذ پر نظر پڑتے ہی وہ وہاں نازل ہو گئی تھی اور اس کے روزی کا بوائے فرینڈ ہونے کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اس میں اپنی بھرپور دلچسپی کا اظہار کر رہی تھی۔

”اس کا نام..... عم..... مار..... ہے۔“ روزی نے سنبھل کر قدرے مشکل کے ساتھ عمار لفظ کی ادائیگی کی۔

”یہ کشمیر، آئی مین ہندوستان سے آیا ہے اور کسی اسپانسر اور ڈرائی فرانس وغیرہ کے ایکسپورٹر کا نمائندہ ہے۔ میری اس سے چند دن پہلے ہی اتفاقات ہوئی تھی۔ اچھا لگا تو دوستوں کی لسٹ میں شامل کر لیا۔ ویسے بھی ایڈم کے جانے کے بعد اس کی جگہ خالی تھی۔“ روزی نے اپنے ساتھ بوائے فرینڈ کا حوالہ دیتے ہوئے بے نیازی سے بتایا۔

”گڈ!“ جیتھر نے سن کر مختصر تبصرہ کیا اور پھر براہ راست اسے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

”آپ کی رہائش کہاں ہے مسٹر عمار؟“ یہ وہ پہلا سوال تھا جس کے بعد وہ ایک کے بعد ایک کئی سوال کرتی چلی گئی۔ اس قسم کے عمومی سوالوں کے جواب معاذ نے بھارت کی سر زمین کو چھوڑتے ہوئے ہی سوچ لیے تھے اس لیے اسے کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔

”میں کرل جیتھر ہوں۔ میرے قادر اور گرینڈ قادر بھی آرمی میں تھے بلکہ بچا اور کزن بھی۔ یوں سمجھ لو کہ ہماری فیملی لسل در لسل عظیم اسرائیل کی خدمت گزار رہی ہے اور اس خدمت گزاری کی وجہ سے ہی ہماری ہر جگہ بے حد عزت کی جاتی ہے۔ میرا اپنا اکیڈمک اور دیگر ریکارڈ ہمیشہ شاندار رہا ہے اور میں نے اپنے کولیکچر کے مقابلے میں بہت تیزی سے ترقی کی منازل طے کی ہیں۔“

”ویری امپرینگ۔“ وہ اسے متاثر کرنے کی کوشش کر رہی تھی تو اس نے تسلیم کر لیا کہ وہ اس سے متاثر ہو رہا ہے۔

”تم دونوں ہائیں کرو، میں ذرا دوسرے دوستوں سے مل کر آتی ہوں۔“ روزی موقع دیکھ کر وہاں سے اٹھ گئی۔

”تمہیں اس بچے میں کیا پسند آگیا؟ صرف چہرہ خوبصورت ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ بھرپور جسم کے بغیر تو عورت اور مرد کا تعلق ہی بے لطف ہے۔“ روزی کے جانے کے بعد اس نے منہ بناتے ہوئے اس کے چھوٹے قد اور قدرے فرہ جسم کو تنقید کا نشانہ بنایا۔

فوری لکھتا ہوگا۔ تم اگر یہاں زکنا جاہو تو رک سکتے ہو لیکن پھر تمہیں کنوئیں پر اہم ہوگا۔“ وہ جگت میں دکھائی دے رہی تھی اور کچھ پریشانی سے یہ الفاظ ادا کیے تھے۔

”اوہ..... یہ تو بہت مسئلہ ہو جائے گا۔ میں یہاں انجوائے کر رہا تھا لیکن میرے خیال میں مجھے تمہارے ساتھ چلنا چاہیے۔“ وہ دونوں ہی اصل میں ایک طے شدہ اسکرپٹ کے مطابق اداکاری کر رہے تھے اور معاذ نے اپنے چہرے پر ایسے تاثرات سجالیے تھے جیسے وہ شدید مجبوری کی حالت میں یہ فیصلہ کر رہا ہو۔

”تم چاہو تو رک جاؤ، میں تمہیں ڈراپ کر دوں گی۔“ امیڈ کے عین مطابق جیتھر نے اسے پیشکش کر دی۔ ”اوٹھنکس ڈیز! یہ تو مسئلہ ہی حل ہو گیا۔“ روزی نے اس کا شکریہ ادا کیا پھر معاذ کی طرف دیکھتے ہوئے جگت میں بولی۔

”او کے ڈارلنگ..... سی یو لیٹر!“ اس نے معاذ کے رد عمل کا بھی انتظار نہیں کیا اور ہاتھ ہلاتے ہوئے وہاں سے نکلتی چلی گئی۔

”لگتا ہے قدرت مجھ پر مہربان ہے۔ میں نے جب تمہیں روزی کے ساتھ اس ٹیبل پر بیٹھے ہوئے دیکھا تھا تو سوچا تھا کہ اس پنڈم بوائے کو میرے ساتھ ہونا چاہیے اور دیکھو، قدرت نے خود ہی میری راہ کا کاغذ نکال دیا۔“ جیتھر کی خوشی چھپائے نہ چھپ رہی تھی۔

”یہ تو میری خوش قسمتی ہے کہ اتنی شاندار خاتون نے میرے ساتھ کی خواہش کی۔“ معاذ نے بھی اسے شیشے میں اتارنے کی کارروائی شروع کر دی۔

”یہ تو تم نے بالکل ٹھیک کہا۔ میں ایک بہت اعلیٰ اور صاحب اختیار خاندان کی فرد ہوں اور مجھ تک رسائی کی صرف ایک صورت ہے کہ میں خود اس شخص کو پسند کر لوں۔“ جیتھر کے لہجے میں ایک خاص احساسِ تفاخر تھا۔ اس احساسِ تفاخر میں ہر وہ یہودی جتنا نظر آتا تھا جسے اپنے اعلیٰ سل سے تعلق رکھنے کا زعم تھا۔ معاذ دل ہی دل میں اس کی سوچ پر لعنت بھیجتے ہوئے بظاہر خوشدلی سے اس کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف رہا۔ جیتھر کی فرمائش پر اسے اس کے ساتھ رقص بھی کرنا پڑا۔ کچھ مزید لوگوں سے ملاقات بھی ہوئی۔ اس نے نوٹ کیا کہ اس سارے عمل کے دوران جیتھر مختصر وقفوں کے ساتھ مسلسل بے نوشی میں مصروف رہی۔ اس بے نوشی سے وہ بالکل بھی تو نہیں لیکن سرور میں دکھائی دینے لگی۔ ساتھ چہرے پر ہلکی سی سرخی بھی جھلکنے لگی۔

”آج کی رات میرے ساتھ گزارو۔“ جب وہ اس

کی فرمائش پر دوسری بار ڈانٹک فلور پر موجود تھا تو جیتھر نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر جموتے ہوئے جذبات سے بوجھل لہجے میں اس کے کان میں سرکوشی کی۔ معاذ کو اس لمبے کا شدت سے انتظار تھا۔ اس کے باوجود اپنے اندر اٹھتی ناگواری کی لہر پر قابو پانے کے لیے خاصی جدوجہد کرنا پڑی اور دل پر جبر کرتے ہوئے بولا۔

”اگر ایسا ہوا تو میری رات امر ہو جائے گی۔“ ”بس تو پھر چلتے ہیں۔ ویسے بھی اب یہاں بوریت ہو رہی ہے۔“ اس نے فوراً وہاں سے روانگی کا فیصلہ کر لیا۔

”تم اپنے ساتھ سیکورٹی نہیں رکھتیں؟“ وہ جیتھر کے ساتھ اس کی شاندار گاڑی میں روانہ ہوئے تو آگے پیچھے کوئی دوسری گاڑی نہ دیکھ کر اس نے استفسار کیا۔

”مجھے اس کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ میں خالی ہاتھ بھی ہوں تو بڑے بڑوں کے ہوش ٹھکانے لگانے کی صلاحیت رکھتی ہوں لیکن پھر بھی احتیاطاً اپنے ساتھ اپنی یہ پیاری گن رکھتی ہوں جس نے کبھی کسی موقع پر مجھے دھوکا نہیں دیا۔“ اس نے گلوو کیپارٹمنٹ میں سے گلوک نکال کر اسے دکھایا پھر اسے واپس رکھتے ہوئے مزید بتانے لگی۔

”میری گاڑی بلٹ پروف ہے اس لیے اس بات کا بھی کوئی امکان نہیں کہ کوئی راستے میں مجھ پر حملہ کر کے مجھے نشانہ بنا سکے۔ اس سب کے باوجود میری سیکورٹی پر مامور عملہ ہر لمحے میری لوکیشن سے آگاہ رہتا ہے۔ میری یہ گھڑی دیکھ رہے ہو؟“ اس نے اپنی کلائی معاذ کے سامنے کی۔ ”اس پر ایک ایسا ٹین موجود ہے جسے دباتے ہی میرے سیکورٹی اسٹاف کو خطرے کا سگنل مل جائے گا اور وہ فوری طور پر حرکت میں آجائیں گے لیکن کیا تم یقین کرو گے کہ میری اب تک کی زندگی میں ایک بار بھی اس بات کی نوبت نہیں آئی ہے۔“ وہ بڑی ترنگ میں اسے سب کچھ بتاتی چلی جا رہی تھی۔

”پھر بھی محکمے کے اپنے پروٹوکولز تو ہوتے ہیں نا۔ تمہیں فوج سے کسی پابندی کا سامنا نہیں؟“

”اوہو۔ تم تو میری سیکورٹی کے مسائل میں ہی الجھ کر رہ گئے ہو۔ چھوڑو اس بورنگ ٹکٹو کو اور کچھ پیار محبت کی باتیں کرو۔“ وہ اسے ریشہ خلی ہونے والی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ سونیا نے جیتھر کے بارے میں اسے یہی بتایا تھا کہ وہ کسی آوارہ کتیا جیسی فطرت رکھنے والی عورت تھی جو ہر خوبصورت مرد کو دیکھ کر رال پکانے لگتی تھی اور اسے اپنے ساتھ خلوت میں لے جائے بغیر چین سے نہیں بیٹھتی تھی۔ اس

نے اس ہوٹل میں مستقل کمر ایک کروا رکھا ہے۔۔۔“ وہ ہوشیار کورت تھی جو اپنی گند اپنے گھر کے اندر نہیں لے کر جاتی تھی۔ معاذ کو بھی اس کے گھر سے کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ تو بس جلد از جلد اپنا کام نمٹا کر اس آوارہ عورت کی قربت سے دور ہو جانا چاہتا تھا۔ ابھی ہوٹل سوچوں کے ساتھ وہ اس کے ساتھ ہوٹل کے کمرے میں پہنچ گیا۔

”تم بے شک ساتھ نہ دو لیکن میرے لیے شراب کے بغیر سب کچھ بے لطف ہو جائے گا اس لیے میں تو دو تین جام ضرور لوں گی۔“ کمرے میں پہنچے ہی جینتھر نے اعلان کرنے والے انداز میں کہا اور فرنج کی طرف لپکی۔

”دو تین کیا، آٹھ دس جام لی لیتا۔ میں خود اپنے ہاتھ سے تمہیں جام بنا کر دوں گا۔“ معاذ نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے برف کی ٹرے لے لی اور کمرے میں موجود بار کاؤنٹر سے سب سے تیز شراب کی بوتل منتخب کر کے لے آیا۔

”اچھا آئیڈیا ہے۔ ویسے تو ایسے مواقع پر دنیا بھر میں عوام سائی گری کا فریضہ خواتین انجام دیتی ہیں لیکن مجھے بہت اچھا لگے گا کہ میرے لیے یہ کام ایک مرد انجام دے۔“ جینتھر کی حاکیت پسند طبیعت کو معاذ کی بات پسند آئی تھی۔ وہ بڑی لگاؤ سے معاذ کا ہاتھ تمام کر ایک ٹو سیٹر صوفے پر آ بیٹھی اور اپنا اچھا خاصا بوجھ اس پر ڈال دیا۔

معاذ ناگواری کے باوجود چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ سجائے اسے برداشت کرتا رہا اور پہلا جام تیار کر کے اس کے ہونٹوں سے لگایا۔ وہ بھی ترنگ میں آ کر کئی جام چڑھا گئی۔ جوں جوں نشہ بڑھتا گیا، اس کی وحشت میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا اور ایک مقام ایسا آیا کہ معاذ نے محسوس کیا کہ بات دست درازی سے بہت آگے نکلنے لگی ہے۔ اس نے فوراً ہی اپنی جون بدلی اور جینتھر کا سر اپنی مضبوط گرفت میں جکڑ کر انگوٹھوں کی مدد سے کنپٹیوں پر بخنخن موم انداز میں دباؤ ڈالا۔

وہ جو شراب نوشی کے باعث پہلے ہی جموم رہی تھی، نیم نشی کی کیفیت میں دکھائی دینے لگی۔ معاذ نے اسے ذرا سا ہلا کر اپنی طرف متوجہ کیا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وہ کام شروع کر دیا جسے انجام دینے کے لیے اب تک خلاف مزاج بہت کچھ برداشت کرتا رہا تھا۔

جینتھر کو ٹراپس میں لینے کا نتیجہ تھا کہ کچھ دیر میں وہ طبع کی رہائی کے لیے جانے کے لیے تیار تھے۔ بس روائی سے قبل اسے اس کا نشہ کم کرنے کے لیے کچھ ٹوٹکے آزمانے پڑے تھے۔ ان ٹوٹکوں کے اثر سے وہ کھڑی ہونے اور چننے پھرنے کے لائق تو ہو گئی تھی لیکن ذہن معاذ کے حکم کا

بے راہ روی کے باوجود اس کا سر دس ریکارڈ بے حد عمدہ تھا اس لیے حکمانہ سطح پر اس کی بہت عزت تھی۔ عمدہ سر دس ریکارڈ کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ وہ اس حد تک سفاک اور بے رحم تھی کہ اسرائیلی مفاد کے آگے انسانیت اور اخلاقیات کی دھجیاں اڑانے میں ذرا نہیں جھجکتی تھی۔

”ڈرائیونگ کے دوران پیار محبت کی باتیں شروع کر دیں تو حادثے کا خطرہ بڑھ جائے گا۔“ معاذ نے اسے طرح دی۔

”او مین..... تم ضرورت سے زیادہ محتاط ہو۔“ وہ لگاؤ سے بولی۔

”کیونکہ میں تم جیسی رفاقتوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے بہت لمبی عمر جیننا چاہتا ہوں۔“ معاذ نے برجستگی سے جواب دیا۔ وہ اس کی برجستگی سے لطف اندوز ہو کر زور سے ہنسی پھر بولی۔

”میرا دل چاہتا ہے کہ ہم کسی شراب خانے پر رک کر وہاں کے خوبصورت ماحول میں ساتھ مل کر بے لوثی کریں لیکن یہاں بھی تمہاری احتیاط پسندی آڑے آرہی ہے۔“ ”مجبوری ہے ڈارلنگ! میں نے تمہیں بتایا ہے تاکہ میرے ساتھ جگڑ کے کچھ مسائل چل رہے ہیں اور ڈاکٹر نے شراب نوشی پر پابندی لگا دی ہے۔ شراب نعمت ہے مگر صحت اور زندگی سے بڑھ کر تو نہیں۔“ اس نے پارٹی میں ہی شراب نوشی سے گریز کا بہانہ تراش لیا تھا۔

”مجھے اس جوانی میں تمہاری ایسی پھسکی سیٹھی زندگی پر افسوس ہو رہا ہے۔“ جینتھر نے افسوس کا اظہار کیا۔

”اب ایسی بھی پھسکی سیٹھی نہیں میری زندگی۔ شراب نہ سہی، شباب سے تو پوری طرح لطف اندوز ہو سکتا ہوں۔“ ”میرا وعدہ ہے کہ اس بار کا لطف تمہیں سارے پچھلے تجربے بھلا کر ایسی بھرپور یاد سے لوازے گا کہ آنے والی زندگی میں بھی تم کبھی اسے فراموش نہیں کر سکو گے۔“ جینتھر کی آنکھوں سے ایسی وحشت بھری ہوس نکلتی تھی جس نے معاذ کو کراہت کے احساس سے بھر دیا لیکن وہ مجبور تھا کہ اسے ابھی مزید کچھ وقت اس عورت کے ساتھ گزارنا تھا۔ فی الحال وہ خاموش بیٹھا رہا۔

”لو بیٹی، ہم پہنچ گئے اپنی منزل پر۔“ خاموشی کو جینتھر کی آواز ہی نے توڑا۔

”ہوٹل..... میں تو سمجھا کہ ہم تمہارے گھر جا رہے ہیں۔“ معاذ ہوٹل کی عمارت کو دیکھ کر چونکا۔

”اپنے خاص دوستوں کی مہمان لوانزی کے لیے میں

غلام تھا۔ اس غلام ذہن نے سلاخوں کے پیچھے قید طیبہ کو اپنے اختیار کے زور پر گرفتیش کے نام پر باہر نکالا اور گاڑی میں منتظر بیٹھے معاذ تک پہنچا دیا۔

”ہمارا تمہارا ساتھ بس یہیں تک تھا۔ آج کے بعد میں دوبارہ تمہاری مکروہ شکل دیکھنا پسند نہیں کروں گا۔“ معاذ نے کچھ دور ٹٹکنے کے بعد جیتھر سے یہ الفاظ کہے اور اس کی کپٹی پر اس زور کا مکار سید کیا کہ وہ تہور کر بے ہوش ہو گئی۔ طیبہ جواب تک ہتھکڑیوں میں جکڑی ہوئی تھی، حیرت سے یہ منظر دیکھتی رہ گئی۔

”آپ کے ہمدردوں نے آپ کی رہائی کے لیے مجھ سے یہ سارے پاپڑ بلوائے ہیں۔ جا کر آزادی کے مزے لو لیے لیکن یاد رکھیے گا کہ انسان، انسان ہوتا ہے اور رب کائنات نے ناحق کسی بھی انسان کا خون بہانے کی اجازت نہیں دی ہے۔ اتفاق الگ چیز ہے لیکن یہ بات تقریباً ہر شخص جانتا ہے کہ خود کش حملوں میں اصل ٹارگٹ کے ساتھ بہت سے بے گناہ بھی زد میں آ جاتے ہیں۔ آپ اپنوں کے بے گناہ مارے جانے کے درد کو جانتی ہیں اس لیے امید کرتا ہوں کہ آئندہ کسی اور کو اس تکلیف میں مبتلا نہیں کریں گی۔“ اس نے طیبہ کی حیرت دور کرنے کے ساتھ ساتھ اسے نصیحت بھی کر ڈالی۔ وہ کوئی جواب دیتی، اس سے ٹل ایک گاڑی ان کے قریب آرکی۔ اس نے طیبہ کی سیٹ کے ساتھ زنجیر کے ذریعے بندھی ہتھکڑی کو چابی کی مدد سے کھولا اور اسے نیچے اترنے کا اشارہ کر کے خود بھی گاڑی سے باہر نکل آیا۔ دوسری گاڑی میں ارتضیٰ ان کا منتظر تھا۔

”میں نے شرط پوری کر دی۔ امید ہے ابو حزرہ کو اب میرا ساتھ دینے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“ خلاف مزاج کام کرنے پر اس کا انداز کچھ اکھڑا ہوا تھا جسے ارتضیٰ نے بھی محسوس کر لیا اور وضاحت دینے والے انداز میں بولا۔

”ایسی بات نہیں ہے معاذ بھائی! آپ یہ کام نہ بھی کرتے تو ابو حزرہ آپ کا ساتھ دیتے لیکن ہماری مجبوری یہ تھی کہ ہم آپ کی طرح بغیر کسی ہنگامے کے یہ کام انجام نہیں دے سکتے تھے۔“

”میری بھی مجبوری ہے کہ میں اپنے وطن اور اپنے مسلمان بھائیوں کی خاطر جس کام کو انجام دینے نکلا ہوں، اسے انجام دیے بغیر واپس پلٹنے کا سوچ بھی نہیں سکتا اس لیے بہت کچھ طبیعت پر گراں گزرنے کے باوجود بھی برداشت کرتا جا رہا ہوں۔“ اس کے لہجے کی تکی ابھی تک قائم تھی۔ ارتضیٰ نے مزید کوئی وضاحت دینا مناسب نہ سمجھا اور طیبہ کو گاڑی

میں بیٹھنے میں مدد دینے لگا۔ وہ لنگڑا کر چل رہی تھی۔ گاڑی میں بٹھاتے ہوئے اندرونی روشنی کے سبب ارتضیٰ نے اس کی انگلیوں کے اکھڑے ہوئے ناخن بھی دیکھ لیے۔

”اپنی مظلوم بہن کو سفاک بھیڑیوں کے چنگل سے نکالنے کے بدلے اگر ہمیں کسی کا اس سے بھی زیادہ سخت لہجہ سننا پڑتا تو سن لیتے۔“

ارتضیٰ نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے بہت دھیمی آواز میں کہا تو معاذ جو کہ خود بھی یہ سب نوٹ کر چکا تھا، اپنی جگہ شرمندہ ہو کر رہ گیا۔ واقعی بعض جگہ حالات اتنے عجیب و غریب ہوتے ہیں کہ ان حالات میں سمجھنے لوگوں کے لیے صحیح اور غلط کے درمیان تفریق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس خطے کے لوگ بھی اسی کشمکش کا شکار تھے۔

☆☆☆

وہ ایک بہت بڑا چٹائی پتھر تھا جس پر اس وقت چھ نفوس دکھائی دے رہے تھے۔ ان چھ انسانوں میں بالغ انسان صرف اور صرف ایک تھا اور وہ ان پانچ عدد بچوں کی ماں تھی جن کی عمریں دس سال سے نیچے تھیں۔ لباس کی بنیاد پر شناخت کیا جاسکتا تھا کہ عورت کے اطراف موجود چار عدد بچوں میں سے دوڑکے اور دوڑکیاں تھیں البتہ پانچواں بچہ جسے اس کی ماں نے چھوٹی سی چادر میں لپیٹ کر اپنے سینے سے چمٹا رکھا تھا، اس کی جنس کا تعین کرنا ممکن نہیں تھا۔ وہ جتنا چھوٹا سا تھا، اسے دیکھ کر بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کی عمر چند دن یا زیادہ سے زیادہ چند ہفتے ہی تھی اور یقیناً یہی وجہ تھی کہ ان چھ عدد نفوس میں واحد وہ تھا جو پُر سکون دکھائی دے رہا تھا۔ باقی پانچ عدد اتنے متوحش اور خوفزدہ تھے کہ رونے کے ساتھ ساتھ ہاتھ اٹھا اٹھا کر بری طرح مدد کے لیے چلا رہے تھے لیکن ان کے اطراف میں انسانوں کا جم غفیر ہونے کے باوجود مدد نہیں نہیں تھی۔

ہاں، مدد نہیں تھی۔ باوجود اس کے کہ ہجوم میں موجود ہر فرد ان چھ عدد انسانی جانوں کو بچانے کے لیے اپنی اپنی جگہ بے قرار تھا، مدد موجود نہیں تھی۔ مدد کی ہی نہیں جاسکتی تھی کہ اس ہجوم اور پتھر پر موجود نفوس کے درمیان ٹھائیں مارتا پانی حائل تھا۔ پانی کی رفتار اتنی زیادہ تھی کہ کسی ماہر سے ماہر تیراک میں بھی اس کے اندر اترنے کی ہمت نہیں تھی۔ اگر رسی سے باندھ کر کسی شخص کو اس پانی میں اتارا بھی جاتا تو اس کی سلامتی مشکوک ہوتی کیونکہ اترنے والے کو صرف بہتے پانی کی تندی کا سامنا نہیں کرنا تھا بلکہ ان درختوں کے تنوں، ٹوٹی عمارتوں کے ٹکڑوں اور دیگر

لبے کی زد میں آنے کا بھی خطرہ تھا جسے جنوں خیر پانی اپنے ساتھ بہاتا ہوا لارہا تھا۔

کچھ لوگ کوشش کر رہے تھے کہ کسی طرح اس چٹانی پتھر پر پھنسے ماں اور بچوں تک رسی پھینکی جاسکے جس کے ساتھ باندھ کر سب کو نہ سہی، کسی کو تو زندہ سلامت کنارے کی طرف کھینچا جاسکے لیکن ایک تو فاصلہ زیادہ تھا، دوسرے ہوا بھی اتنی تیز چل رہی تھی کہ ان کی کسی کوشش کو کامیابی حاصل نہیں ہو پا رہی تھی۔ اس پرستم یہ تھا کہ پانی کی سطح مسلسل بلند ہوتی چلی جا رہی تھی اور اب یہ حال ہو چکا تھا کہ کوئی لہر پتھر سے ٹکراتی تھی تو اس پر پناہ لیے ہوئے ماں اور بچوں کو اڑنے والے چھینٹے بھگو ڈالتے تھے۔ اس لمحے ان کے حلق سے ایسی چیخیں بلند ہوتی تھیں کہ ویڈیو میوٹ ہونے کے باوجود تک کو اپنے کانوں میں ان کی گونج سنائی دیتی تھی۔ وہ اکڑے ہوئے جسم اور ساکت آنکھوں کے ساتھ سوشل میڈیا پر چلنے والی اس ویڈیو کو دیکھ رہا تھا جس نے یقیناً ہر صاحب دل انسان کو تڑپا کر رکھ دیا تھا۔

کمرے کی آنکھ اسے دکھا رہی تھی۔ ہجوم میں شامل افراد میں سے بھی کئی لوگ اب ان ماں اور بچوں کے ساتھ چیخ چیخ کر رو رہے تھے۔ کچھ نے تو اپنی آنکھیں ہی بند کر لی تھیں کہ ان میں اس دردناک منظر کو دیکھنے کی مزید تاب نہیں مگی لیکن کچھ تھے جو اب بھی کوششوں میں مصروف تھے۔ سیل فون کانوں سے لگائے شاید وہ کسی امدادی ادارے کو کال کرنے کی سعی لا حاصل میں مبتلا تھے۔ تیسری دنیا کے اس ملک کے ایک دور افتادہ علاقے میں جہاں عام دنوں میں بھی سہولیات کا فقدان تھا، اس آفت کے وقت جبکہ سارا انفراسٹرکچر ہی تباہ ہو چکا تھا، پتھر پر پھنسے ان چھ عام سے شہریوں تک کسی امداد کا پہنچنا دیوانے کا خواب ہی سمجھا جاسکتا تھا۔ اول تو سگنلز نہیں تھے۔ قسمت سے سگنلز مل جاتے تو ہیلپ لائنز پر اتار ش تھا کہ کال ملنا مشکل تھی۔ کال مل بھی جاتی تو امدادی ایلی کاپٹر کی دستیابی کا سوال نہ پیدا ہوتا تھا۔ ان چھ نفوس کا انجام وہ گویا ویڈیو ختم ہونے سے پہلے ہی دیکھ چکا تھا لیکن پھر بھی جب ایک تیز لہر آئی اور پتھر پر سے دو بچے ایک ساتھ غائب ہو گئے تو تک کے ہونٹوں سے ایک چیخ نکل گئی۔ اس کی چیخ سن کر بچن میں کام کرتی آمنہ دوڑ کر آئی لیکن وہ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔ وہ حرکت کرنے سے قاصر آئیں پھاڑے اسکرین پر چلتے منظر کو دیکھتا رہا۔

دو بچوں کے غائب ہو جانے کے بعد پتھر پر ماں کے ساتھ بچ جانے والے دونوں بچے اس کی ٹانگوں سے یوں لپٹ گئے تھے جیسے انہیں امید تھی کہ ماں انہیں اس ظالم پانی کے پھیڑوں سے بچا سکتی تھی۔ بے بس ماں نے اپنے بازوؤں میں موجود تیسرے بچے کو اس زور سے اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا تھا کہ لگتا تھا کہ اب موت بھی بچے کو اس سے جدا نہیں کر پائے گی لیکن موت کی سفاکی مستی کے پرچے اڑانے کی بھی صلاحیت رکھتی تھی۔ اگلی بار جو ریلآ آیا، وہ اتنا بلند اور تیز تھا کہ ان ماں اور بچوں سمیت وہ چٹانی پتھر بھی نظروں سے اوجھل ہو گیا جو نہ جانے کتنی دیر سے اس بد قسمت خاندان کو پناہ دیے ہوئے تھا۔ اس منظر کو دیکھتے ہی تک پیٹ کے بل دہرا ہو گیا اور اس زور سے سر کے بالوں کو مٹھی میں جکڑا کہ اس کے پیچھے ہی دم بخود کھڑی آمنہ کو لگا کہ بال جڑ سے اکھڑ جائیں گے۔ تک کو کسی قسم کی تسلی دینے سے پہلے وہ اسکرین کی طرف متوجہ ہوئی اور اس ویڈیو پر موجود تفصیلی کیپشن کو پڑھنے لگی۔

کیپشن کے مطابق پانچ بچوں اور ماں پر مشتمل وہ بے بس خاندان سیلابی پانی کے ریلے سے بچنے کے لیے اس پتھر پر پناہ گزین ہوا تھا لیکن سیلاب اتنا خطرناک تھا کہ وہ لمحوں میں ہی اس پتھر پر محصور ہو کر رہ گئے تھے اور بے بسی سے موت کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھتے رہے تھے۔ مزدوری کے لیے قریبی شہر جانے والے خاندان کے سربراہ کو اس سانحے کی خبر اس وقت ملی تھی جب سب ختم ہو چکا تھا اور اب وہ سوشل میڈیا کے ذریعے دہائیاں دیتا پھر رہا تھا کہ اس کے خاندان کو بچانے کے لیے امدادی اداروں کی طرف سے کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔

آمنہ یہ تفصیل پڑھ کر گہری سانس لیتے ہوئے تک کے قریب ہی بیٹھ گئی اور دھیرے سے اس کی پشت پر ہاتھ رکھا۔ اس کا لمس محسوس کر کے تک چونک کر سیدھا ہوا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

”ہمت سے کام لو تک! تم مجھ سے بہتر جانتے ہو کہ قدرتی آفات ایسے ہی سانحات کو جنم دیتی ہیں اور تیسری دنیا میں جہاں سہولیات کا فقدان ہے، ان حادثات اور سانحات کا تناسب بہت زیادہ ہوتا ہے۔“

”قدرتی آفات.....!“ تک اس کی بات سن کر زیر لب بڑبڑایا۔

”کوئی قدرتی آفت نہیں تھی یہ..... قلبی عام تھا..... انسانیت کا قلب عام۔“

”تمہارا مطلب ہے.....“ آمنہ اپنا جملہ مکمل نہ کر سکی۔

”ہاں، یہ ہمارا ہی کیا ہوا دار تھا۔ بڑوں کا خیال تھا کہ تیسری دنیا کا یہ ملک جس طرح اپنی حیثیت بھول کر ہمیں آنکھیں دکھاتا ہے اور کھلم کھلا ہمارے وجود کی مخالفت کرتا ہے، ہمارا حق بننا ہے کہ ہم اسے سبق سکھائیں۔ یہ سب جھپٹے ہی مینے کیا کیا تھا اور میں نے اس میں ایک ماہر کی حیثیت سے حصہ لیتے ہوئے صرف اس بات کا خیال رکھا تھا کہ موسم میں وہ تہہ کی پیدا کروں جو مطلوبہ شدت کی بارشوں اور سیلاب کا باعث بن سکے۔ مجھے اور میری ٹیم کو اس کام پر اوپر سے شاباش کے ساتھ ساتھ انعام کے طور پر تنخواہ میں وکٹش انکریمنٹ دیا گیا تھا۔ میں خوش تھا کہ میں نے اپنے وطن کی خدمت کی ہے لیکن میں نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی کہ اس سب کا نتیجہ کیا نکلا ہوگا۔“ تک جو اس وقت اصل میں آمنہ کا سوشل میڈیا اکاؤنٹ استعمال کر رہا تھا، کرب زدہ لہجے میں بولتا چلا گیا۔

”میں تمہیں یہی سب سمجھا رہی تھی تک! تم کیا سمجھتے ہو کہ یہ کل عام صرف ایک محدود وقت تک ہوا ہوگا؟ نہیں تک نہیں..... اس سیلاب کے متاثرین اب بھی بے گھر اور خالی پیٹ کھلے آسمان تلے بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کی حکومتیں ان کی تباہ حالی دکھا کر عالمی برادری سے امداد طلب کرتا تو جانتی ہیں لیکن ان کی دوبارہ آباد کاری جتنا مشکل کام ہے، تم سمجھ ہی نہیں سکتے۔“ آمنہ کے لہجے میں شدید دکھ تھا۔

”میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں خود کو گولی مار لوں۔“ تک نے بالوں کو منہ میں جکڑ کر زور سے کہنچا۔ کچھ دیر تک اس نے جو دیڑی بوندیں تھیں، وہ اتنی دردناک تھیں کہ وہ اندر سے لرز کر رہ گیا تھا۔

”یہ کوئی حل نہیں ہے تک! ایسا کرنے سے تم اپنا یا کسی دوسرے کا کوئی بھلا نہیں کر پاؤ گے۔ کرنا ہے تو کچھ ایسا کرو جس سے انسانیت کو کوئی فائدہ ہو سکے۔“ آمنہ نے اسے سمجھایا۔

”میں کیا کروں؟“ اس نے بچوں جیسی مصوہیت کے ساتھ پوچھا۔

”سب سے پہلے تو یہ فیصلہ کر لو کہ اب تمہیں کسی قلم میں حصے دار نہیں بننا ہے۔ جب یہ نیت کر لو گے تو آگے ازالے کے لیے مزید راہیں نکل ہی آئیں گی۔“ آمنہ نے رمان سے اسے مشورہ دیا تو وہ اثبات میں گردن ہلا کر رہ گیا۔ اس وقت اس کا ذہن گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

☆☆☆

”بہت افسوسناک۔“ سون اور لیف کے چہروں پر کچھ عرصے غم کے تاثرات تھے۔ وہ دونوں ایمر جنسی ڈیوٹی پر بروکھم سے جہد آئے تھے اور کئی گھنٹوں کی مسلسل ڈیوٹی انجام دینے کے باوجود ان دونوں سے ملاقات کا وقت نکال لیا تھا۔

”کاش، ہم اسے روک پاتے۔ مجھے اس کا رونا بہت دکھ ہے۔“ لیف نے کہا۔ ”اعزازہ نہیں تھا کہ وہ اتنی جلدی کوئی اتنا بڑا قدم اٹھا بیٹھے گا۔“ ایلی کی موت نے شہریار کو بھی افسردہ کر دیا تھا۔

”اگر میرے بس میں ہوتا تو میں ایلی کے جسم کے ٹکڑے جوڑ کر اسے دوبارہ زندہ کرتی اور اسپتال کے ان وارڈز کا وارڈ بن کر وہاں کئی بے قصور لوگ اس کی استہزا پسندی کے نتیجے میں بستروں پر پڑے سسک رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو ہماری سر توڑ کوشش کے باوجود زندہ نہیں بچ سکے۔ کچھ ہمیشہ کے لیے معذور ہو جائیں گے اور باقی جو جسمانی طور پر تندرست ہو جائیں گے، ان کے ذہنوں سے کبھی اس حادثے کی دہشت نہیں نکل سکے گی۔ میں اس سے پوچھوں گی کہ ایک ناپسندیدہ شخص کو انجام تک پہنچانے کے لیے اتنے سارے لوگوں کی زندگیاں تباہ کر دینے کی کون سا مذہب اجازت دیتا ہے۔“ سون کی آواز میں کمی تھی اور آنکھیں بے حد سرخ ہو رہی تھیں۔ اعزازہ ہورہا تھا کہ وہ روتی رہتی ہے۔

”ریٹیس ڈارلنگ! ایلی کو جو کرنا تھا، وہ کر چکا ہے۔ شاید ایک ذمہ خور وہ انسان بچلے اور بڑے بے میں اس طرح تیز کرنے کے لائق نہیں ہوتا جیسے ایک عام فرد اور عام انسان سوچ سکتا ہے۔“ لیف نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے سمجھایا۔

”میں جانتی ہوں کہ اس کے ساتھ بڑا ہوا تھا لیکن قدرت نے بہترین ازالہ بھی تو کر دیا تھا۔ لیلی وہی جیسی عورت کے بیٹے کی حیثیت سے زندگی گزارنے سے بڑی نعمت کیا ہو سکتی ہے۔ لوگ ترستے ہیں اتنی پُر آسائش زندگی کے لیے اور اس لڑکے نے اس زندگی کو ٹھوکر ماری۔“ سون جذباتی ہو رہی تھی۔

ظلم و جبر کی ساری ساری سہولتوں پر
کسی داستان جو غلطی کاروں کی ہے
ناک تہا باقی والہات آئندہ ماہ پڑھیں



آخری قسط

شہزادوں کا

استادری

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عقانہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تند و تیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابل شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پر عزم، توجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جا رہے تھے... اس کی زندگی جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قرار یوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تاریک بھوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ واردات قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہو سکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام لوجوان کی تحیر انگیز داستان

معاذ ایک ذہین لیکن متلون مزاج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جمان کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ انسٹی ٹیوٹ سے واپس آ رہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو سڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی نڈر نفرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشری نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بشری ماس کیونی کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم وغیرہ لکھتی ہے۔ معاذ بشری کو یہ حفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کر دیتا ہے لیکن جن ریکس زادوں سے اس نے ان کا شکار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ایک دن وہ معاذ کو بے خبری میں گھیر کر بری طرح زد و کوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دے دیتے ہیں۔ معاذ کے والدین نہ آنے پر انتقامیہ کے افراد، پولیس اور ریسیکيو ذرائع کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جگہ پر پڑا ہوا دیکھتا ہے۔ جگہ اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے، جوگی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نوازا کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے پراسرار علم سکھانے کی ہامی بھر لیتا ہے اور معاذ اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ادھر جانے دوسرے ملنے والے معاذ کے کمرے سے جب تصویریں نکلائی جاتی ہیں تو ایک ایسی تصویر بشری کی نظر میں آ جاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانک رہا نظر آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پروجیکٹ کے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشری تحقیق کر رہی تھی۔ بشری کے اپنے والد جرنلٹ ہوتے ہیں۔ اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشری کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ مدد سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باؤل نامی شخص نے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشری انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دنوں میں ہی معاذ واپسی کا ارادہ کرتا ہے تاہم ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا عرفان اللہ اور یزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو وقاص نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باؤل اچانک بشری کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر دیتا ہے۔ معاذ کو واپس لانے کے لیے اس کے بھائی کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کر کے اسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات کے نہ بتانے پر اس کے بھائی کا ایک گروہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشری بھی سوینا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہو جاتی ہے۔ معاذ کے دوست عالم شاہ کے بہنوئی کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ کئی فنون میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے پتہ چلتا ہے کہ اس کے داغ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ فیصلہ سے حاصل انوکھے علم کی بدولت ان کا معمول نہیں جتا۔ عالم شاہ اور اس کا نوکر سرد، باؤل کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ عالم شاہ، باؤل کی قید میں موجود ایک زخمی شخص کی مدد سے وہاں سے فرار ہو جاتا ہے۔ ادھر بشری بھی پہنچ جاتی ہے۔ وہاں وقاص اسے ہاربی کے روپ میں پہچان لیتا ہے۔ وہ سلطان کو مارنا چاہتی ہے۔ ادھر عالم شاہ، باؤل کی قید سے نکل کر اس کا پیچھا کرتا ہے۔ وہ وہاں معاذ کو دیکھتا ہے۔ معاذ کو اس کے گھر والوں سے ملنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ وہ ایک مشن پر سوینا کے ساتھ انڈیا روانہ ہوتا ہے۔ عالم شاہ، سبیل اور سرد بھی انڈیا روانہ ہو جاتے ہیں۔ گھر پہنچنے پر پولیس کی ریڈ ہوتی ہے اور وہ عالم شاہ اور سرد کو لے جاتے ہیں۔ عالم شاہ اور سرد کو تشدد کا نشانہ بنا کر دیرانے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ واپس اپنے میزبانوں کے ہاں پہنچ جاتے ہیں۔ انہیں پتا لگتا ہے کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں اجالا اور اس کا عاشق شامل ہوتے ہیں۔ وہ چھپ کر ان کی باتیں سن رہا ہوتا ہے۔ تاہم وہاں مارا ماری ہوتی ہے اور اجالا کا عاشق مارا جاتا ہے۔ پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ ان کے کزن انہیں اپنے دوسرے خفیہ ہنگامے پر پہنچا دیتے ہیں۔ وہ وہاں سے بحفاظت نکل جاتے ہیں۔ ادھر معاذ ایک مشن میں زخمی ہو جاتا ہے اور اسے ہندوستان واپس لے لیا جاتا ہے۔ سوینا کے آدمی معاذ کو تلاش کرتے ہیں مگر ناکام ہو جاتے ہیں۔ ادھر عالم شاہ اور سرد خفیہ ذریعے سے بارڈر پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ دھریے جاتے ہیں اور ”را“ کی قید میں پہنچ جاتے ہیں۔ بشری باؤل کو مارنے کی کوشش میں خود نشانہ بن جاتی ہے۔ معاذ سادھو کی مدد سے ایک انڈین ہیروئن کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ وہیں اسے عالم اور سرد کی گرفتاری کا پتا چلتا ہے۔ معاذ ڈاکٹر فردوس سے ملتا ہے اور اسے سب کی مدد کرنے کا کہتا ہے۔ علیہ اور وقاص وغیرہ کو لالہ عیسیٰ ملک سے باہر نکال دیتا ہے۔ ٹوبہ پر تیزاب پھینک دیا جاتا ہے۔ وقاص، علیہ اور اس کے گھر والوں کو مار دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس معاذ کو دیوانا کی شخصیت سے مدد لینے کا کہتی ہے۔ معاذ اپنے کزن کو پاکستان کا لے جاتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ اس کے گھر والوں کو مار دیا گیا ہے۔ وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کی ٹھان لیتا ہے۔ ادھر ڈاکٹر فردوس کو اس کے سسرال والے محل کو بھگانے کی پاداش میں تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ معاذ، عالم اور سرد کی رہائی کے لیے کارروائی کرتا ہے اور انہیں ”را“ کی قید سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن عالم اور سرد کو دیوانے کے آدمی کسی دوسری جگہ پہنچا دیتے ہیں۔ سوینا معاذ کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتی

ہے۔ ادھر ہازل ایک جگہ لالہ صیسی کی موجودگی پر کارروائی کرتا ہے تاہم لالہ خود کو کوئی مار کر قتل کر لیتا ہے۔ سونیا اور معاذ حیدر آباہو اب بدالہ دین کی حویلی پہنچ جاتے ہیں۔ وہ لوہا صاحب کی حویلی میں عالم اور سردار کی رہائی کے لیے کارروائی کر کے انہیں رہا کر لیتے ہیں۔ وہ لوگ نئے ٹھکانے پر پہنچتے ہیں تو وہیں معاذ سے ملنے جا رہا نامی شخص آتا ہے۔ اسے معاذ نے "را" کی قید سے نکالا ہوتا ہے۔ جاوہر اور معاذ، مکمل سمیت اسپتال جاتے ہیں اور وہیں پہلے جانے پر پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ پولیس سے مقابلے کے بعد وہ ایک ہسپتال میں پہنچ جاتے ہیں۔ ادھر سونیا معاذ کی تحریک میں ملتی ہے اور اسے ہسپتال میں پہنچنے پر معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ معاذ اور جاوہر وغیرہ انوپ نامی شخص کے ساتھ اس کے مالک کے کھانے میں قیام کرتے ہیں۔ سونیا بھی معلومات حاصل کرتی ہوئی مذکورہ جگہ تک پہنچ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور سردار بھی سونیا کا پیچھا کرتے ہوئے وہیں پہنچ جاتے ہیں۔ ادھر لالہ، وقص، علیہ وغیرہ لوگ زندہ ہوتے ہیں۔ وقص حلیہ بدل کر گلو کا ہاڈی کارڈ جاتا ہے۔ وہ معاذ کو تلاش کرنے کے لیے انڈیا روانہ ہوتا ہے۔ وہیں اس کی گل خان سے ملاقات ہوتی ہے اور معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ سونیا، معاذ اور دیگر ساتھیوں سے مل جاتی ہے تاہم وہ جس جگہ میں ہوتے ہیں وہ دشمن کا ہوتا ہے۔ دشمن سب کو بے ہوش کر کے کہیں لے جا رہے ہوتے ہیں کہ ان کی گاڑی کو حادثہ پیش آ جاتا ہے۔ ان سب کو چینی بحکشی طبی امداد دے دی جاتی ہے اور ان سے پوچھ گچھ کی جاتی ہے۔ مکمل کی حالت تشویشناک ہوتی ہے اور اسے وہاں موجود ایک ویدیک تھا ہے۔ ادھر لالہ وہیں اپنے لوگوں میں پہنچ کر ایکشن میں آ جاتا ہے۔ ہازل، معاذ کا پیچھا کرتا ہے اور چینیوں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ معاذ چینیوں کے ساتھ مل کر دشمنوں کے خلاف کارروائی کرتا ہے۔ ادھر لالہ صیسی، اعظم کو دشمن کی گرفت سے نکالنے کے لیے کارروائی کر داتا ہے اور موی اور نیلی، اعظم کو نکالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ موی اور نیلی کی گاڑی پر حملہ ہوتا ہے تاہم مارا ماری کے بعد وہ صداقت شاہ کے پاس پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اعظم کو وہاں سے نکال لیا جاتا ہے اور دوسری جگہ مکمل کر دیا جاتا ہے۔ ادھر معاذ بیچک پہنچ جاتا ہے اور وہاں کے گرتا دھرتاؤں سے بات کر کے پاکستان پہنچنے کی اجازت چاہتا ہے۔ ادھر موی اور نیلی کو پولیس گھیر لیتی ہے اور فائرنگ میں موی مارا جاتا ہے۔ وہ اعظم کو لے جاتے ہیں اور نیلی زخمی حالت میں ان کے قبضے میں آ جاتی ہے۔ معاذ اور دکی وغیرہ پاکستان پہنچ جاتے ہیں اور اعظم کی بازیابی کے لیے منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ ادھر ہازل، لالہ کی قید سے بھاگ جاتا ہے۔ معاذ بڑی ایس پی ظہیر کے ہنگلے پر دھارادپور ہے اور ڈی ایس پی کو قابو کرنے کے بعد اس سے معلومات لیتا ہے۔ ہازل قید سے نکل کر مہتا کے پاس پہنچتا ہے اور اسے تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ نیلی قید میں موجود ظہیر کو کھانے لگا دیتی ہے۔ بشری کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ ادھر معاذ سارے معاملوں کو جلد حل کرنے کے لیے دشمن کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے مگر اس کے خیر خواہ اسے میڈم ایکس کے فتنے سے نکال لیتے ہیں اور اعظم کو بھی بازیاب کر لیتے ہیں۔ زن ہوا سے اپنے ساتھ لے جاتی ہے اور وہاں کرل سکندر بخت سے ملاقات ہوتی ہے۔ معاذ انہیں دشمنوں کے خلاف کارروائی کرنے کا کہا ہے۔ ہازل، بشری کو لے کر انڈیا گراؤنڈ پر ہو جاتا ہے۔ ادھر وقص ہازل کا ہتھ چلانے کے لیے ایک کال گرل سیکی کے گھر کارروائی کر کے ہازل کے ٹھکانے پر پہنچ جاتا ہے۔ وہاں دکی کے ساتھی اور کوئی اور گروپ حملہ کر دیتے ہیں۔ دکی زخمی ہو جاتا ہے۔ ادھر ہازل، عرفان اللہ کو گولی مار دیتا ہے اور خود بھی شدید زخمی ہو جاتا ہے۔ ہازل کے ساتھی اسے ایک اسپتال کے آگے چھوڑ دیتے ہیں۔ وہیں دکی اور بشری بھی داخل ہوتے ہیں۔ معاذ ہازل کو پہنچ کر اسے بھی وہیں ایڈمٹ کر دیتا ہے۔ عرفان اللہ جاں بحق ہو جاتا ہے۔ صداقت شاہ اور ان کی اہلیہ مکمل کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ عالم، نیلی اور اعظم بھی وہیں ہوتے ہیں۔ مکمل اسپتال میں زیر علاج ہوتی ہے۔ ہازل کو معذوری کی حالت میں ایک چوک پر بھیج دیا جاتا ہے۔ معاذ وقص کے ساتھ علیہ کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ اسے اگلے مشن پر جانا ہوتا ہے۔ سونیا قانون کی قید سے بھاگ نکلتی ہے۔ مکمل کی طبیعت بگڑ جاتی ہے۔ یو آں سنگ، اینڈریو کے ذریعے مکمل کے آپریشن کی تجویز دیتا ہے۔ مکمل کا آپریشن کامیاب رہتا ہے تاہم اس کا ایک ہاتھ اور نچلا دھرتا کا رہ جاتا ہے۔ ادھر معاذ کشمیر پہنچ جاتا ہے۔ ایک کشمیری لڑکی کی مدد کرنے کی پاداش میں بھارتی سپاہی اسے گرفتار کرنے، بھاسن کی دکان پر ریڈ کرتے ہیں۔ تاہم پوچھ گچھ کے بعد اسے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ادھر مکمل کو خبر ملتی ہے کہ اس کی بہن کا پتہ کا آپریشن ہے۔ وہ سب وطن واپس آ جاتے ہیں۔ عالم اور سردار کو محفوظ مقام پر منتقل کیا جا رہا ہوتا ہے کہ کچھ لوگ انہیں یرغمال بنا لیتے ہیں، ادھر سونیا کی سچائی جانچنے کے لیے عظیم کے لوگ اسے مار چر کرتے ہیں تاہم وہ اس آزمائش میں پوری اترتی ہے۔ معاذ پری دیش کے اہل خانہ کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے جاوہر کے ساتھ منصوبہ بندی کرتا ہے اور وہ لوگ ہندو سنگھ کو قتل کر دیتے ہیں۔ عالم اور سردار کو اغوا کرنے والے انہیں انڈیا کے حوالے کرنا چاہتے ہیں۔ عالم اور سردار وہاں سے نکلنے کے لیے منصوبہ بناتے ہیں۔ وہاں قانون نافذ کرنے والے ادارے کی ریڈ ہوتی ہے۔ فائرنگ کے دوران سردار جان سے جاتا ہے اور عالم شاہ زخمی ہو جاتا ہے۔ ادھر دشمن مکمل، صداقت شاہ، ان کی بیگم اور قربان شاہ پر حملہ کرتے ہیں اور ان سب کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ حویلی میں کھرا مچ جاتا ہے۔ معاذ جاوہر کے ساتھ کشمیر کے وزیر کے خلاف سازش سے حملہ کرتا ہے اور اسے جہنم داخل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اب وہ اسراٹل روانہ ہو جاتا ہے۔ ادھر ڈاکٹر اینڈریو اپنی تجربہ گاہ میں جی پی کام کر رہا تھا۔ اس کے پاس دو مادہ جی تھیں۔ زہری کے لیے جین سے بات ہو گئی تھی۔ مادہ جی مکمل سدھائی ہوئی تھیں۔ جین سے زہری اسراٹل پہنچ جاتا ہے اور اسے ڈاکٹر اینڈریو کی تجربہ گاہ میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ ادھر گلوکارہ لیلی دہی کا بیٹا ایک اسٹور میں بم بلاسٹ کرتا ہے اور میٹر سمیت کئی لوگ مارے جاتے ہیں۔ ادھر زہری کو مادہ جی کے ساتھ چھوڑ دیا جاتا ہے اور وہ نتیجے کا انتظار کرتے ہیں۔ معاذ بم بلاسٹ میں ملوث ایک لڑکی کو اسراٹل قید سے نجات دلاتا ہے۔ سون اور لیف، مکمل واپس کے لیے کمر بند ہوتے ہیں۔ سون جذبائی ہو رہی تھی۔

ہر لمحے متحرک رہے تھے اور یہ سب کچھ انہوں نے سیاح کے روپ میں بہ خوبی انجام دیا تھا۔

”ہمیں افسوس ہے کہ آپ ہمارے ملک سے ناخوشگوار یادیں ساتھ لے کر جائیں گے۔“ ان دونوں میاں بیوی نے انہیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ پڑھے لکھے حساس لوگ تھے جن کے لیے انسانیت سب سے پہلے تھی۔

”افسوس ہمیں بھی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہمیں یہاں آکر کچھ حاصل نہیں ہوا ہے۔ ہمیں ناز ہے کہ ہمیں دنیا کے مقدس ترین مقامات پر سانس لینے کا اعزاز حاصل ہوا ہے۔ زندگی نے موقع دیا تو ہم دوبارہ بھی یہاں آنا پسند کریں گے۔“ ماہ بانو نے ان دونوں کی دلجوئی کے لیے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجالی۔ جو بھی تھا، یہ ملک ان کا وطن تھا اور وہ جانتی تھی کہ ہر شخص اپنے وطن کے معاملے میں حساس ہوتا ہے۔

”تمہیں دوبارہ یہاں دیکھ کر ہمیں خوشی ہوگی۔“ سون نے بھی جوابی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی لیکن اندر سے ان سبھی کے دل بچھے ہوئے تھے۔ ان بچھے ہوئے دلوں کے ساتھ ہی انہوں نے ایک دوسرے کو الوداع کیا۔

”اب.....؟“ ان کے رخصت ہونے کے بعد ماہ بانو نے سوالیہ نظروں سے شہر یار کی طرف دیکھا۔

”اب بس ایک آخری کام رہ گیا ہے۔ جاتے جاتے اسے نمنا کر جانا ہے۔“ شہر یار کی آنکھوں کا تاثر بڑا مجید بھرا تھا لیکن ماہ بانو کو اس کے سارے مجید پڑھنے آتے تھے۔

☆☆☆

”علینہ.....علینہ.....! کہاں ہو یا رتم؟“ ابھی آسمان پر سورج کی پہلی کرن ہی چمکی تھی کہ وقاص خوشی اور جوش سے تھمتاتا ہوا چہرہ لیے آوازیں دیتا ہوا اندر داخل ہوا۔

”شش.....!“ علینہ نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے مزید کچھ بولنے سے روکا پھر سوئے ہوئے پیچے کی طرف اشارہ کر کے سمجھایا کہ اس کی نیند خراب ہو جائے گی۔

”میرے ساتھ آؤ۔“ وہی جو کہ جوش میں بھول گیا تھا کہ صبح صبح نیند خراب ہو جانے کی صورت میں اس کا اکلوتا فرزند سخت چڑچڑا ہو جاتا ہے اور ماں کے علاوہ کسی کے سنبھالنے سے نہیں سنبھلتا، اس بار آواز کو بے حد پست کر کے سرگوشی میں بولا۔

”ایسا کون سا تیر مار لیا ہے جو اتنے ایکساٹڈ ہوئے جا رہے ہو؟“ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی لیکن اس کے پیچھے کمرے سے باہر بھی آگئی۔ کچھ دیر میں گھریلو امور کی انجام

سون لیف، شہر یار اور ماہ بانو لیلیٰ اور اس کے بیٹے ایل کے متعلق گفتگو کر رہے تھے۔ سون بہت جذباتی ہو رہی تھی۔

”لیلیٰ کے لیے مجھے بھی افسوس ہے۔ اس نے ایل کو حقیقی اولاد کی طرح ہی پیار دیا تھا اور وہ اس کی حقدار نہیں تھی کہ اسے اتنا بڑا صدمہ پہنچایا جائے۔ ایل کے جانے سے وہ اپنے بیٹے سے ہی محروم نہیں ہوئی اس عزت، دولت اور شہرت سے بھی محروم ہو گئی ہے جو اس نے کئی برس کی شبانہ روز محنت سے حاصل کی تھی۔ وہ اب دوبارہ منظر عام پر آئی بھی تو اسے سروائیول کی طویل اور سخت جنگ لڑنا پڑے گی۔“ لیف نے اپنی رائے کا اظہار کیا تو ماہ بانو نے بھی اس کی تائید کی اور بولی۔

”واقعی، اس سب میں سب سے بڑا نقصان لیلیٰ کا ہوا ہے اور ان فلسطینی خاندانوں کا بھی جن کو وہ معاشی طور پر سپورٹ کرتی تھی۔“

”اب ہم لیلیٰ کے لیے دعا کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ ہاں، آپ لوگ یہ کر سکتے ہیں کہ ہر مذہب کے اعتدال پسند لوگوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کریں اور ان کے ذریعے یہ پیغام عام کریں کہ انسانیت کو ہر شے پر مقدم رکھنا لازم ہے۔ ایک طرف سے ہونے والے غیر انسانی اقدامات دوسری طرف کے لوگوں کو بھی ویسا ہی رد عمل دینے پر مجبور کر دیتے ہیں۔“ شہر یار نے بہت سجاوے مشورہ دیا۔ سون اور لیف روشن خیال تھے لیکن بہر حال انہیں براہ راست یہ نہیں بتایا جاسکتا تھا کہ ان کی قوم کی طرف سے ہونے والی زیادتی ہی اس قسم کے واقعات کا اصل سبب ہے۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ہم پوری کوشش کریں گے کہ اس سلسلے میں کچھ کر سکیں۔“ سون نے اس کی تائید کی پھر موضوع بدلتے ہوئے بولی۔

”تم لوگوں کا آگے کیا پروگرام ہے؟ ابھی حیدہ میں مزید رکنا ہے یا بروشلم چلے جاؤ گے؟“

”اس واقعے نے دل اتنا برا کر دیا ہے کہ ہمارا تو اسرائیل سے ہی دل اٹھ گیا ہے۔ ہم اب بس واپسی پلان کر رہے ہیں۔“ شہر یار کو معاذ کی طرف سے پیغام مل گیا تھا کہ اب ان لوگوں کی مزید وہاں ضرورت نہیں ہے اس لیے اس نے واپسی کا پروگرام بنالیا تھا۔ بظاہر یہاں آکر اس نے اور ماہ بانو نے کوئی قابل ذکر کام نہیں کیا تھا لیکن حقیقتاً انہوں نے معاذ کے لیے میدان تیار کر دیا تھا۔ مختلف رابطوں کے ذریعے معلومات جمع کرنے سے لے کر ایرانی نژاد آمنہ کے چچا کے ذریعے اسے اپروچ کرنے تک وہ ہر

دی کے لیے اسے ویسے بھی اٹھانی تھا۔
 "تم کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی؟" جوش میں ہونے
 کے باوجود وہی نے اس کے اعزاز میں موجود دیداری اور بے
 دلی کو محسوس کر لیا۔

"ٹھیک ہوں لیکن جانے کیوں طبیعت کچھ بوجھل سی
 ہو رہی ہے۔ کسی کام میں دل نہیں لگ رہا۔" کوئی بہانہ
 بنانے کے بہانے اس نے سادگی سے اعتراف کر لیا۔
 "بہتر تو نہیں ہے، لانا ڈرا چیک کرواؤ۔" وہی نے
 اس کا ماتھا چھو کر دیا۔

"کہا ٹھیک ہوں۔ بس طبیعت بوجھل ہے۔"
 "کہیں کوئی دوسرا کا کا یا کا کی لانے کا تو پلان
 نہیں؟" وہی نے اس کی طرف جبکہ کشرارت سے پوچھا۔
 "منہ دھر رکھو۔ ڈاکٹر نے کہا تین سال سے پہلے نیا
 بچہ بالکل پلان نہ کرنا۔" اس نے آنکھیں نکالیں۔

"ڈاکٹر سمیت ہر ایک کی بات توجہ سے سنتی اور عمل
 کرتی ہو۔ بس ایک یہ غریب مسکین شوہر ہی ہے جو دل میں
 بیوی کی توجہ اور فرمانبرداری کی حسرت لیے پھرتا ہے۔" وہی
 نے مقنوم شکل بنائی۔

"زیادہ دور ایجننگ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔
 آپ جناب کی بھی خصوصیت ہے کہ بھولے بن کر اپنا
 مطلب پورا کر لیتے ہیں۔"

"شوہر کو مطلبی کہہ رہی ہو۔ پاپ لگے گا لڑکی! اس
 نے ڈرایا۔

"میرے خیال میں جناب نے ایسے ہی بہانے سے
 باتیں بکھارنے کے لیے مجھے یہاں بلا لیا ہے۔ میرے لیے
 بہتر ہے کہ میں یہاں وقت ضائع کرنے کے بجائے جا کر اپنا
 کام کاج دیکھوں۔" اسے وہی کی شوخی کچھ خاص نہیں بھائی۔

"اوہ خدا یا! تم نے باتوں میں لگا کر مجھے اصل بات
 ہی بھلا دی۔ میں تو تمہیں کچھ دکھانے لے جا رہا تھا۔" وہی
 نے الٹا اس پر الزام دھرا اور سر پر ہاتھ مار کر عورتوں کی طرح
 دہائی دی۔ اس سے قبل کہ علیینہ اس طرز عمل پر احتجاج کرتی،
 وہ اس کا ہاتھ تھام کر اپنے ساتھ کھینچتا ہوا گھر کے احاطے میں
 لے گیا۔ اس احاطے میں مرغیوں کا ڈربا، چار محفوظ کرنے
 کی جگہ، ملائے میں اگنے والی سبزیوں پر مشتمل کھاریاں اور
 بکریوں کے لیے بنایا گیا پھنڑ موجود تھا۔ وہ اسے بکریوں
 کے پھنڑ کی طرف لے گیا۔ یہاں تیز روشنی کا بلب جل رہا
 تھا۔ علیینہ کی نظر فوراً ہی سفید بکری اور اس کے قریب ہی
 موجود ٹوٹا ہوا پر پڑ گئی۔ بکری بڑی محبت سے اپنی زبان کے

ساتھ اس کا جسم چاٹ رہی تھی۔
 "بکری کب فارغ ہوئی؟" وہ بے قراری سے
 بکری اور اس کے بچے کی طرف دیکھی۔

"ابھی آدھا کھا رہی ہو ہے۔ میں وہاں دم جانے
 کے لیے اٹھا تھا تو اس کے بدن سے چپٹے چلانے کی آواز آئی۔
 میں نے آکر چیک کیا تو بے چاری بڑی تھیف میں تھی۔ میں
 نے جتنا ممکن ہوا، اس کی مدد کی۔ دیکھو، کتنا چھوٹا ہے اس کا
 بچہ؟" بکری کے جسم کو محبت سے سہلاتے وہی کی آنکھوں میں
 چمک تھی۔ اسے دیکھ کر کوئی جھین نہیں کر سکتا تھا کہ یہ دیوانہ
 ہے جو مہلک ہتھیاروں کو کھلونوں کی طرح استعمال کر رہا ہے
 تھا اور جس کی جرائم پیشہ حلقوں میں اپنی ایک پیمان تھی۔

"یہ سب تم نے کیا ہے؟ مجھے جھین نہیں آ رہا کہ تم یہ
 سب کر سکتے ہو۔" علیینہ بھی سن کر حیران تھی۔ "مجھے جگہ
 ہوتا، میں تمہاری مدد کر دیتی۔"

"تمہیں تو جیسے بڑا دایہ گیری کا تجربہ ہے۔" وہ ہنسا
 پھر قد رے افسردگی سے بولا۔

"کہاں مکیٹ لایا ہوں میں تمہیں۔ کہاں کاج میں
 پڑھنے والی نازک مزاج لڑکی اور کہاں اس پھاڑی زندگی
 میں منہ اندھیرے سے شروع ہو جانے والی صحت رہنمائی۔
 میں نے تمہیں چاہا تھا تو ساتھ میں یہ خواہش بھی کی تھی کہ
 تمہیں رانیوں کی طرح میٹھ و آرام سے رکھوں گا لیکن وقت
 نے مجھے موقع ہی نہیں دیا۔" وہ ہر وقت ہنسنے سکرانے اور
 شوخیاں دکھانے والا اس وقت اداس ہو گیا تھا۔

"کانٹوں پر تو بے رحم وقت نے تمہاری آمد سے قبل
 ہی مکیٹ لیا تھا۔ تم تو میرے اور میرے خاندان کے لیے
 مرہم بن کر میری زندگی میں آئے ہو۔ اگر تم اور لالہ نہیں
 ہوتے تو نہ آج میں اور اب یہاں سکون کی زندگی گزار رہے
 ہوتے، نہ ہی سعد بھائی اپنا تعلیم کا شوق پورا کر پاتے۔ میں
 اپنی موجودہ زندگی سے پوری طرح مطمئن ہوں۔ اب تو کوئی
 موقع بھی دے تو میں اس خوبصورت محلے سے نکل کر شہر کے
 ہنگاموں میں جانا پسند نہ کروں۔ اس زندگی میں سب کچھ ہے
 لیکن بس اکثر سینے سے ہوک اٹھتی ہے کہ کاش سناؤ بھائی بھی
 ہمارے ساتھ ہوتے۔ آج کل تو جانتا نہیں کیوں ان کی یاد
 بہت ہی زیادہ آ رہی ہے۔" اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی
 نمی چمکی اور اداسی کی وجہ بھی خود ہی لیں پر آ گئی۔

"ان کے لیے بس دعا کیا کرو کہ اللہ انہیں کامیابی اور
 سرخرو کی عطا کرے۔ وہ چنیدہ لوگوں میں سے ہیں اور ایسے
 لوگوں کے گھر والوں کو بہت ہمت اور حوصلے سے کام لینا

”اس خوشی میں منہ میٹھا کرنے کا کچھ انتظام کر لیتا بیٹا“
 سنا ہے میٹھا کھانے سے طبیعت پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ تمہارے
 ابو ایک دو دن سے بہت اداس ہیں۔ گوری کے بچے کی
 پیدائش کی خوشی اور میٹھا مل کر ان کی اداسی دور کر دیں گے۔“
 لالہ نے فرمائش کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی وجہ بھی بیان کی
 تو علینہ چونک کر باپ کی طرف دیکھنے لگی۔

”چلیں لالہ! کہیں جماعت نہ کھل جائے۔“ خاور
 احمد نے جلدی سے نظریں چرا کر لالہ سے کہا اور پھر انتظار
 کیے بغیر ہی قدم آگے بڑھا دیے۔ شاید وہ علینہ کے سوالوں
 سے ڈرتے تھے لیکن علینہ کو کسی سوال کی ضرورت ہی نہیں
 تھی۔ اس نے ایک نظر میں ہی خاور احمد کی آنکھوں میں وہ
 بے چینی پڑھ لی تھی جو آج کل اس کے اپنے دل کو بھی
 ہر وقت گھیرے رکھتی تھی۔

”میں نماز پڑھ کر ناشتا بناتی ہوں۔ آپ بھی یہاں
 سے فارغ ہو کر جلدی سے نماز پڑھ لو۔ کسی کو ہماری دعاؤں
 کی بہت ضرورت ہے۔“ وہ روتا نہیں چاہتی تھی لیکن پلکیں
 خود بخود ہی بھیگ رہی تھیں۔ اپنے بے قرار دل کو تھامنے کے
 لیے اسے اب نماز اور دعا ہی سے سہارا لیتا تھا۔

☆☆☆

”تمہیں کیا لگتا ہے ارتضیٰ! ابو حمزہ اور اس کے ساتھی
 جو کچھ کر رہے ہیں، وہ ٹھیک ہے؟“ وہ جب سے ابو حمزہ کے
 ٹھکانے سے ہو کر آیا تھا، الجھا ہوا تھا۔

”آپ نے بھی منہ زور سمندر کے بیچ پھنسا ہوا آدمی دیکھا
 ہے؟“ ارتضیٰ نے اس کے سوال کے جواب میں سوال کیا۔

”فلموں میں کئی بار اور حقیقی زندگی میں ایک بار دیکھ
 چکا ہوں۔“ اسے ماضی کا ایک واقعہ یاد آیا۔

”فلم اور حقیقت میں دیکھنے میں کیا فرق تھا؟“ ارتضیٰ
 کی طرف سے جھٹ سوال آیا۔

”فرق تو زمین آسمان کا تھا۔ فلم کا منظر محدود وقت
 کے لیے متاثر کرتا ہے جبکہ اصل زندگی میں پیش آنے والے
 واقعے کو میں کبھی نہیں بھول سکا۔ سچ کہوں تو وہ واقعہ میری
 پوری زندگی پر اثر انداز رہا۔“ معاذ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے ماضی
 میں جھانکنے لگا۔

”یہ میری اسکول لائف کا واقعہ ہے۔ ہم دسویں
 جماعت کے طالب علم تھے اور اسکول انتظامیہ کی طرف سے
 ہمیں پکنگ پرسی سائنڈ لے جایا گیا تھا۔ اساتذہ کی طرف
 سے ہمیں سخت ہدایات دی گئی تھیں اور لڑکوں کو اچھی طرح
 سمجھایا گیا تھا کہ ایسی کوئی حرکت نہ کریں جس سے اپنی یا

پڑتا ہے۔“ وہی نے اس کا ہاتھ تمام کرنزی سے سمجھایا۔
 ”خود کو یہ سبق روزانہ یاد دلاتی ہوں لیکن کبھی کبھی
 برداشت جواب دینے لگتی ہے۔ یہ خون کے رشتوں کی محبت
 بڑی ظالم ہوتی ہے وقاص! ان کی جدائی جگر کو چھلنی کر دیتی
 ہے۔“ اس بار آنسو پلکوں کی باز توڑ کر رخساروں پر پھسل گئے۔

”تم کیا سمجھتی ہو کہ میں اس درد سے واقف نہیں
 ہوں۔ وقت اتنا آگے نکل گیا ہے لیکن اپنی پھولوں جیسی بہن
 کی دردناک موت کا زخم میرے دل پر دیے کا ویسا ہی تازہ
 ہے۔ وہ اب بھی خوابوں میں آکر مجھے رونے پر مجبور کر دیتی
 ہے لیکن زندگی کو آگے بڑھانے کے لیے درد کو چھپا کر جینا
 پڑتا ہے اور اسی میں اللہ کی بھی خوشنودی ہے کیونکہ اس نے
 ہمیں صرف درد نہیں دیا، بے شمار نعمتیں بھی دی ہیں۔“ وہی کی
 اپنی آواز ذرا بھرائی لیکن پھر اس نے خود کو سنبھال لیا۔

”یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں اس گھر اور اس کے
 مکینوں کو دیکھتی ہوں تو میرا دل شکر گزاری سے بھر جاتا ہے
 کہ میرے رب نے مجھے کتنی نعمتوں سے نوازا ہے۔“ علینہ
 نے اعتراف کیا۔

”زندگی دکھ اور سکھ کے اسی امتزاج کا نام ہے۔ کتنے
 ہی حادثے گزریں، یہ زندگی چلتی رہتی ہے۔ مجھے دیکھو،

باں، باپ، بہن اور بھائیوں جیسے دوست موٹی کو کھو کر بھی جی
 رہا ہوں۔ نیلی جو کہ مومی کے بغیر ایک پل نہیں رہ سکتی تھی،
 اسے کھو کر بھی زندہ رہی۔ جو رب درد دیتا ہے، وہی اسے

سہنے کا حوصلہ بھی دیتا ہے۔ تم تو پھر خوش نصیب ہو کہ معاذ
 بھائی زندہ ہیں اور تم رب سے ان کی واپسی کی دعا مانگ سکتی
 ہو۔ دعا بڑی کرامتیں دکھاتی ہے علینہ! کیا پتا تمہاری

دعائیں بھی رنگ لائیں اور ایک روز تم معاذ بھائی کو اپنی
 نظروں کے سامنے دیکھو۔“ وقاص کے الفاظ ابھی ختم نہیں
 ہوئے تھے کہ فضا میں اذان کی آواز گونجنے لگی۔ وہ دونوں

بھی اذان کے احترام میں خاموش ہو گئے۔ ابھی اذان جاری
 تھی کہ لالہ اور خاور احمد نماز کے لیے تیار ایک ایک کر کے
 باہر نکلے اور ان دونوں کو چھوڑتے دیکھ کر وہیں چلے آئے۔

”تم دونوں میاں بیوی صبح صبح یہاں کیا کر رہے ہو؟“
 اذان ختم ہوئی تو خاور احمد نے سوال کرنے میں پہل کی۔

”ہم گوری کے بچے کو دیکھنے آئے ہیں۔ دیکھیں، ابو!
 کتنا پیارا ہے یہ۔“ علینہ نے بکری کے ننھے بچے کی طرف
 اشارہ کیا جواب ماں کے تھن کو منہ لگائے مزے سے دودھ

پی رہا تھا۔
 ”ماشاء اللہ!“ خاور احمد کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

اپنے دوست کے ڈوبنے کا تماشا دیکھتا رہا تھا۔ بہت دنوں تک میرا دل "کاش..... کاش" کی گردان کرتا رہا تھا اور میں یہ سوچتا رہا تھا کہ کاش مجھے تیرا آتا تو میں اپنے دوست کے لیے کچھ کر پاتا۔ اس "کاش" سے بچنے کے لیے بھر میں ساری زندگی دوڑتا ہی رہا اور مجھے ہوس سی ہو گئی کہ یہ بھی سیکھنا ہے اور وہ بھی..... اور یہ تو تم بھی سمجھتے ہو کہ کوئی ایک شخص دنیا کا ہر ہنر نہیں سیکھ سکتا۔ میں بھی ہر ہنر سیکھنے کے جنون میں ایک کوچھوڑ کر دوسرے کے پیچھے بھاگتا رہا اور ماں باپ سمیت سب نے یہی سمجھا کہ میں تنکون مزاج ہوں۔ تک کر کوئی ایک کام کر ہی نہیں سکتا۔ شاید میں فطرتاً قہوراً ہیبت ایسا تھا بھی لیکن میں جانتا ہوں کہ میری شخصیت سازی میں حادثہ کے ڈوب کر مرنے والے حادثے نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔" وہ اپنی کل داستان سنا کر یوں چپ ہو گیا جیسے کہنے کو کچھ رہا ہی نہ ہو۔

"بہت افسوسناک حادثہ ہے لیکن یہ بتائیں کہ کیا وہاں لائف گارڈز نہیں تھے جو آپ کے دوست کی جان بچا سکتے؟"

"ہمارے ہاں لائف سیونگ کے سارے کام بس پھرتی کے کپے جاتے ہیں۔ کراچی کی ساحلی پٹی پر نارنجی جیکٹس میں لائف گارڈز کے نام پر ایک مخلوق گھومتی پھرتی دکھائی تو دیتی ہے لیکن ان غریبوں کا بھی کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ ناکانی سہولیات کے ساتھ ڈیوٹی انجام دیتے وہ خود دنیا سے بیزار رہتے ہیں۔ اپنی کم تعداد کے ساتھ انہیں بہت بڑا ایریا کور کرنا ہوتا ہے اس لیے عموماً وہ لوگوں کو احتیاط کرنے کی نصیحت کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ حادثہ کی بد قسمتی تھی کہ حادثے کے وقت کوئی لائف گارڈ قرب و جوار میں موجود نہیں تھا اس لیے اسے بچانا تو دور، بچانے کی کوشش بھی نہیں کی جاسکی۔"

"کچھ ایسا ہی حال ہم فلسطینیوں کا بھی ہے۔ ہم بے رحم سمندر کی موجوں کے پیچھے کھائے کے لیے بالکل تنہا اور بے یار و مددگار ہیں اور خود کو بچانے کی جلی خواہش ہمیں اٹلے سیدھے ہاتھ پیر مارنے پر مجبور کرتی ہے۔ میں ابو حمزہ سمیت اپنے کسی بھی راہنما کی حمایت نہیں کر رہا لیکن تم سمیت پوری دنیا کو ایک ڈوبتے ہوئے شخص کو اس کی غلطیوں پر رعایت دینی پڑے گی۔ دنیا ہمیں بچانے کے لیے پسے ہاتھ آگے نہیں بڑھاتی اس لیے ہم اس دنیا کو خود پر انگلی اٹھانے کا حق بھی نہیں دے سکتے۔" ارنی نے چند جملوں میں اس پر اپنی پوزیشن واضح کر دی تو وہ اس کے آگے

کسی دوسرے کی زندگی خطرے میں پڑ جائے۔ ہم سب نے بہت وعدے و وعید بھی کیے تھے لیکن سمندر میں قدم رکھتے ہی مجھ سمیت سب اپنے وعدوں کو بھول گئے تھے۔ اسکول انتظامیہ ہمیں قابو میں رکھنے کے لیے ہر ممکنہ کوشش کر رہی تھی پھر بھی کوئی نہ کوئی لڑکا موقع ملنے پر انہیں جل دے کر گہرے پانی میں چلا جاتا تھا۔ حادثہ نامی میرا ایک کلاس فیلو جو بہت چلبلا تھا، اس کام میں سب سے پیش پیش تھا۔ ہم سب آتی جاتی لہروں کے ساتھ ساتھ حادثہ کی حرکتوں اور اساتذہ کی جھنجھلاہٹ کا خوب لطف اٹھا رہے تھے کہ اچانک ہی ایک ایسی منہ زور لہر آئی جس نے ہم سبھی کے قدم اکھاڑ دیے۔ ہم اس صورت حال پر گھبرا گئے اور جس سے جیسے بن پڑا، خود کو سنبھال کر ساحل کی طرف دوڑے۔ ساحل پر پہنچ کر جان بچنے پر میں دل میں اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا کہ احساس ہوا میرے ارد گرد بڑا شور مچا رہا اور چیخ و پکار کا سلسلہ جاری ہے۔ حواس مجتمع کر کے غور کیا تو اندازہ ہوا سب سمندر کی طرف رخ کیے چیخ چلا رہے ہیں۔ میں نے بھی اسی سمت دیکھا اور دور بہت دور موجوں کے گھیرے میں پٹنیاں کھاتے سبز اور سیاہ لباس کی جھلک دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ سیاہ ٹراڈز کے ساتھ سبزی ٹرٹ حادثہ نے پہنچی تھی۔ حادثہ جو میرا دوست تھا اور کلاس کا سب سے شوخ اور زندہ دل لڑکا تھا، بے رحم سمندر کی موجوں کے ساتھ اپنی زندگی کی جنگ لڑ رہا تھا اور اتنی دور سے بھی دکھائی دے رہا تھا کہ وہ یہ جنگ ہارتا جا رہا ہے۔ سمندر کی طاقت اور وسعت کے آگے اس پندرہ سالہ لڑکے کی جو یقیناً تیرنا بھی نہیں جانتا تھا، بھلا حیثیت ہی کیا تھی۔" وہ ارنی کی طرف متوجہ نہیں تھا لیکن ارنی اس کی آنکھوں میں موجود کرب کو دیکھ سکتا تھا۔ اس وقت اسے اپنے روبرو ایک ایسا جوان مرد دکھائی نہیں دے رہا تھا جو ہماری سمیت بے شمار صلاحیتوں سے مالا مال تھا۔ اسے اس وقت معاذ کے چہرے کے پیچھے سے جھانکتا وہ پندرہ سالہ لڑکا دکھائی دے رہا تھا جو سمندر کنارے کھڑا اپنے دوست کو ڈوبنے دیکھ کر تڑپ رہا تھا۔

"میں حادثہ کو بچانا چاہتا تھا۔ اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے میں نے سمندر کی طرف دوڑنا بھی چاہا تھا لیکن کچھ لوگوں نے زبردستی مجھے پکڑ لیا تھا اور پکڑ کر یہ حقیقت باور کروائی تھی کہ تم جو تیرنا نہیں جانتے، اپنے دوست کو بچانے کے لیے کچھ نہیں کر پاؤ گے۔ میں واقعی کچھ نہیں کر پایا تھا اور پچاسیوں دوسرے تماشاخیوں کی طرح

اگر آپ کو یہ خیال ہو کہ اسلام کے خلاف کسی کی سازش ہے تو اس کی تردید میں یہ کہنا چاہیے کہ اسلام کا مقصد دنیا کی فلاح ہے اور اس کے خلاف سازش کرنے والوں کو اسلام کا خلاف نہیں ہے بلکہ ان کی فلاح کے خلاف ہے۔ اسلام کا مقصد دنیا کی فلاح ہے اور اس کے خلاف سازش کرنے والوں کو اسلام کا خلاف نہیں ہے بلکہ ان کی فلاح کے خلاف ہے۔

”مجھ یاد آ، مجھ ابا۔ ضروری کام سے جانا تھا۔
مجھ دے میں واپس آ جاؤں گا۔ آج کو اگر باہر کا کوئی کام
ہو تا، یہ۔“ ہالے ارغلی کوئی بی بی میں جانا تھا یادہ اسے
شرم و دلہ کر مجھ دے نظروں کے سامنے سے اٹا چاہتا تھا۔

”خیر، کوئی کام نہیں۔ تم ہاں۔“ اس نے اسے ہاتھ سے ہالے کا اشارہ کیا اور خود کبھی سوچ میں ڈوب گیا۔ ابو حمزہ کی مدد سے وہ جو کچھ کرنا چاہتا تھا، اس سے پہلے بھی اسے ایک اہم کام انجام دینا تھا۔ وہ کام انجام دیے بغیر قرض چلتا پائیں جاسکتا تھا۔

☆☆☆

شوٹنگ حسب معمول آج بھی کیلی کی رفاقت کا متمنی تھا لیکن آج کیلی اسے لفٹ کروانے کے موڈ میں نہیں تھی۔ وہ کچھ ست اور بیز آرد کھائی دیتی تھی۔ شوٹنگ نے تھوڑی چھیڑ چھاڑ کی تو پہلے غصے سے غرا نے لگی پھر اٹھ کر اندرونی حصے میں چلی گئی۔ پیچھے شوٹنگ کسی ناکام و نامراد عاشق کی طرح منہ بتانے لگا۔

”لگتا ہے بڑھے نے کوئی چالاکی دکھا ہی دی۔“
شوٹنگ کا ٹریز منہ ہی منہ میں بڑبڑایا لیکن کسی قسم کی دخل
اندازی کے بغیر اپنی جگہ خاموشی سے کھڑا سب دیکھتا رہا۔
شیلی جو گزشتہ راتوں کی طرح آج بھی شوٹنگ کو اپنی
طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی، کیلی کے پیچھے ہٹنے
پر مزید جوش میں آگئی اور منہ سے آوازیں نکالنے کے ساتھ
ساتھ شوٹنگ کے ارد گرد رقص کے انداز میں اچھلنے کودنے
لگی۔ ایک طرف کیلی کی بے رخی تھی تو دوسری طرف شیلی کی
ہلادادتی ادائیگیں۔ آخر کار شوٹنگ کو اس کی طرف متوجہ ہونا
پڑا۔ شوٹنگ کی توجہ پا کر وہ گویا خوشی سے جھوم اٹھی اور
”لوں آپس میں چہلپیں کرنے لگے۔“

”میش کرو۔“ شوٹنگ کا فریزر شانے اچکا کر وہاں پہنچ گیا۔ تاکہ ایئر پگ جس کا چہرہ اپنی ترکیب کی کامیابی کی نشانی تھا۔ کھلا ہوا تھا۔ کچھ دیر مزید وہاں رکار ہا پھر واپس اپنے اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس وقت اس کا محض خاصا تیز ہوا تھا اور چہرہ خاص کیلیمیت میں تھما ہوا تھا۔ اس نے

مستحسن كذا الحديث

”یہ تم کس قسم کی باتیں کر رہی ہو؟“ اینڈریو کو اس کی گفتگو سے اس حد تک اذیت ہوئی کہ اس نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”جوج ہے، وہی کہہ رہی ہوں۔“ اس نے بلا جھجک

جواب دیا۔ ”تمہاری سوچ عظیم اسرائیل کے مفادات کے

خلاف ہے۔“ اور جو کچھ یہاں ہو رہا ہے، وہ انسانیت کے خلاف

ہے۔“ وہ دبدبو بولی۔

”مجھے اس سلسلے میں رائیل سے بات کرنا ہوگی۔“

اینڈریو نے اسے گھورا۔

”اگر موقع ملے تو کر لیتا۔ فی الحال تو میں یہ دیکھنے

جاری ہوں کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔“ وہ ایک جھٹکے سے کھڑکی

کی طرف بڑھی۔ اب اینڈریو کو بھی احساس ہو گیا کہ باہر

سے کچھ شور اندر آرہا ہے۔ وہ بھی اس کے پیچھے لپکا۔

”یہ سب کیا ہے؟“ سونیا کے پہلو میں آکھڑے

ہونے والے پروفیسر نے کھلی کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھا

اور دم بخود رہ گیا۔ باہر سڑک پر دور دور تک تاریخی لبادے

والے بھکشو پھیلے ہوئے تھے۔ ان سب کے ہاتھوں میں جلتی

شمعیں تھیں اور وہ کوز میں کچھ گا یا پڑھ رہے تھے۔

”یہ لوگ اتنی بڑی تعداد میں یہاں کیوں جمع ہو گئے

ہیں؟“ پروفیسر کے لیے باہر بھکشوؤں کی موجودگی سے زیادہ

یہ بات باعث اضطراب تھی کہ ان بھکشوؤں کا رخ اس

عمارت کی طرف تھا جس میں وہ موجود تھے۔

”میں معلوم کرتی ہوں۔“ سونیا اپنے نائب سے

رابطہ کرنے لگی۔

”تھینک گاڈ میم! آپ نے خود رابطہ کر لیا۔ میں آپ

کو کال کرنا چاہ رہا تھا لیکن پروفیسر صاحب کی ناراضگی کے

ڈر سے نہیں کر پا رہا تھا۔“

”میرے خیال میں ضرورت نہیں ہے۔ تمہارے

ساتھیوں میں اتنا تو دم ہو گا ہی کہ ہتھیاروں کے بغیر آنے

والے ان بھکشوؤں سے جو کہ باہر کھڑے مناجات پڑھنے

کے سوا کچھ نہیں کر رہے، نمٹ سکیں۔“ سونیا نے سر دلچہ میں

جواب دیتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔

”تمہارا رویہ بہت عجیب ہے۔“ اینڈریو کی آنکھوں

میں اس کے لیے جھٹک کی پرچھائیاں تھیں۔

”طاغوتی قوتیں جب حق اور سچ کا سامنا کریں تو

انہیں عجیب ہی لگتا ہے۔“

”میں..... میں رائیل کو کال کرتا ہوں۔“ اینڈریو کو

اس کی بے نیازی اور سرد مہری نے خوفزدہ کر دیا اور اس نے

ہڑ بڑا کر اپنا موبائل نکالا لیکن اگلا لمحہ مایوسی کا تھا۔

”اس پر تو سگنل ہی نہیں ہیں۔“

”کوشش جاری رکھو۔ شاید کامیابی مل جائے۔“ سونیا

نے استہزاء سے لہجے میں اسے جواب دیا اور ایک بار پھر کھڑکی

سے باہر جھانکنے لگی۔

”لیکن تم نے بھی تو ابھی اپنے اسٹنٹ سے بات کی

تھی۔“ اینڈریو کا اس پر جھٹک بڑھتا جا رہا تھا۔

”اب میرے موبائل پر بھی سگنل موجود نہیں ہیں۔“

سونیا نے اپنے موبائل کی اسکرین اس کے سامنے کی۔

”لینڈ لائن۔“ اینڈریو ایک طرف رکھے ٹیلی فون

سیٹ کی طرف لپکا لیکن وہاں بھی مردہ پڑی لائن مایوسی اور

خوف کو بڑھا رہی تھی۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ کیوں اور

کس لیے ہمیں یہاں محصور کر کے ہمارے رابطے کے

سارے ذریعے کاٹ دیے گئے ہیں؟“ اینڈریو اب

باقاعدہ سرپیٹ رہا تھا۔

”اتنا خوفزدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ ہم ایک

م محفوظ عمارت میں بیٹھے ہیں جس کے باہر کھڑے بھکشو بالکل

نبہت دکھائی دے رہے ہیں۔ انہوں نے اب تک ہماری

حدود میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کی ہے۔ کسی قسم کی

نعرے بازی یا دھونس دھمکی سے بھی کام نہیں لیا جا رہا پھر کیا

وجہ ہے اس طرح ڈرنے اور خوفزدہ ہونے کی؟“ بظاہر اس

کی آواز پست تھی لیکن لہجے کی کاٹ کو محسوس کیا جاسکتا تھا۔

”ان کی یہاں موجودگی ہی میرے اعصاب کو

توڑنے کے لیے کافی ہے۔ تم جاؤ اور انہیں اس عمارت سے

دور دفع کرو۔“

”میں نہیں کر سکتی۔ میں ایسا کر کے ان کی بددعاؤں کا

رخ اپنی طرف نہیں موڑ سکتی۔“

”بدو عاکیں..... کیسی بدو عاکیں؟“ اینڈریو چلا یا۔
”وہ مناجات کر رہے ہیں کہ خدا ایسے ہر شخص کو تباہ و
برباد کر دے جو طاقت کے نشے میں خدا کی بنا کی ہوئی دنیا کا
توازن خراب کرتے ہیں اور دوسرے انسانوں کے
جذبات اور عقائد کا خیال کیے بغیر ان کے مقدمات کی بے
ادبی کرتے ہیں۔“

”یہ سب کہنے کے لیے یہ یہاں کیوں آئے
ہیں؟“ جھنجھلائے ہوئے پروفیسر نے اس کے کندھے کے
پچھنے سے باہر جھانکا۔ اسے لگا کہ ہیکشوؤں کی تعداد پہلے سے
بھی زیادہ ہو گئی ہے۔

”شاید اس لیے کہ یہاں جی موجود ہیں۔ ان کے
مقدمات میں سے ایک۔ میری معلومات کے مطابق یہ ہیکشو
اور لاملاز توتی کی لاشوں اور باقیات کو بھی اس طرح سنبھال
کر رکھتے ہیں کہ کسی عام آدمی کو ان کا دیدار بھی نہیں کرنے
دیتے پھر یہاں تو تین عدد زندہ سلامت جی موجود ہیں جنہیں
ہم تجربہ بات سے گزار کر مستقبل کے حوالے سے کچھ ہولناک
منصوبے رکھتے ہیں۔ یہ ہیکشو اور لاملاز بہت امن پسند ہوتے
ہیں اور چاہتے ہیں کہ جس طرح وہ اس دنیا میں امن و امان
کے ساتھ رہتے ہیں، اسی طرح باقی لوگ بھی رہیں۔“ اس کی
فراہم کردہ معلومات پروفیسر اینڈریو کی پریشانی اور خوف
میں مزید اضافے کا باعث بن گئی اور وہ بڑی لجاجت سے
اس سے درخواست کرنے لگا۔

”پلیز! تم باہر جا کر انہیں سمجھاؤ کہ ہم یہاں ایسا کچھ
نہیں کر رہے۔ یہاں کوئی جی دلی موجود نہیں ہے۔“
”میرے سمجھانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ اگر وہ جی کی
وجہ سے یہاں آئے ہیں تو کہیں سے کئی خبر لے کر ہی آئے
ہوں گے اور ہونے کو تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میرے سارے
اندازے غلط ہوں اور انہیں سرے سے جیج کے بارے میں
کوئی علم ہی نہ ہو۔ ایسے میں خود سے جا کر انہیں چھیڑنا
معصیت کو آواز دینے کے مترادف ہوگا۔ اس لیے بہتر ہے کہ
تھوڑے صبر سے کام لیا جائے۔ ہو سکتا ہے یہ جس طرح جمع
ہوئے ہیں، اسی طرح خود بخود ہی منتشر ہو جائیں۔“ اس نے
اینڈریو کو خوب ڈرانے کے بعد تھوڑی سی سلی بھی دے ڈالی۔
”میں تمہارے اندازوں پر مطمئن نہیں ہو سکتا۔ تم
جاؤ اور اس معاملے کو دیکھو۔“ اینڈریو دھاڑا تو اس بار وہ
خاموشی سے باہر آگئی۔ باہر اس کا نائب بھی پروفیسر کی طرح
ہی پریشان تھا۔ اس نے اسے بھی تقریباً وہی جوابات دیے

جو پروفیسر کو دیے تھے۔

”میڈم! یہ ٹھیک ہے کہ ابھی تک انہوں نے ایسی
کوئی حرکت نہیں کی ہے جو ہمارے لیے باعث نقصان ہو
لیکن بہر حال یہ ایک تشویشناک صورت حال ہے۔ اتنے
سارے لوگ نہتے بھی ہوں تو کسی بھی لئے خطرے کا سبب
بن سکتے ہیں۔ آپ سوچیں کہ یہ اتنے سارے لوگ جن میں
میرے اندازے کے مطابق بہت سارے غیر ملکی بھی شامل
ہیں، اگر کسی قسم کا دامنفس کرتے ہیں تو ہمارے لیے ان پر
فائر کھول دینا آسان نہیں ہوگا۔ یہ کوئی فلسطینی نہیں ہیں جن
کے ساتھ ہم کچھ بھی کر جائیں اور عالمی برادری پڑی خواب
خرگوش کے مزے لیتی رہتی ہے۔“

”کہہ تو تم ٹھیک ہی رہے ہو۔“ سونیا کے ماتھے پر ہلکے
سے ٹپ پڑ گئے۔ وہ اس وقت بہترین اداکاری کر رہی تھی۔
”اور میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ یہ ہیکشو اتنے
سیدھے بھی نہیں ہیں جتنا آپ تصور کر رہی ہیں۔ میں نے دو
افراد کو ان کا گھیرا توڑ کر یہاں سے باہر بھیجنے کی کوشش کی تھی
لیکن انہوں نے انہیں راستہ نہیں دیا۔ طاقت کا استعمال بکس
میں چنگاری کے مانند ہوتا اس لیے وہ دونوں خاموشی سے
واپس لوٹ آئے۔“ یہ ایک اور اہم اطلاع اس کی منتظر تھی۔
”اچھا کیا۔ ہمیں ایسی کوئی حرکت نہیں کرنا ہے جو
انہیں اشتعال کا مظاہرہ کرنے کا جواز فراہم کر دے۔ جب
تک یہ ہماری حدود سے باہر اور غیر متشدد ہیں، ہم بھی ان
سے چھیڑ چھاڑ نہیں کریں گے۔“ اس نے ایک بار پھر اپنی
ہدایات دہرائیں۔

”وہ تو خیر ٹھیک ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ پروفیسر
صاحب اور ان کے مہمان کو لے کر خفیہ راستے سے یہاں سے
نکل جائیں تاکہ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو بھی جائے تو ہم ان
افراد کے تحفظ کی طرف سے بے فکر رہیں۔“ نائب نے وہی
مشورہ دیا جو ان حالات میں اسے دینا چاہیے تھا۔

”پروفیسر نہیں مانے گا۔“

”لیکن کیوں؟ یہ اس کی زندگی کا معاملہ ہے۔“

”جی کی وجہ سے۔ ہم ان تیز کو ایسے کھلے عام لے
کر نہیں نکل سکتے۔ انہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے
کے لیے خصوصی انتظامات کی ضرورت ہوتی ہے اور ظاہر ہے
بیرونی دنیا سے رابطے کے بغیر ہم یہ انتظامات نہیں کروا
سکتے۔“ اس نے وجہ بتائی تو نائب بھی ڈھیلا پڑ گیا اور
دیر سے اتنا ہی بولا۔

”پھر بھی آپ ان سے بات تو کر کے دیکھیں۔“

بار پھر کھڑکی سے باہر جھانکا اور بڑبڑایا۔ سونیا خاموش رہی۔ وہ جانتی تھی کہ انتظامیہ کو اس بارے میں آگاہ کیا گیا تھا کہ ایک بڑا جلوس اس سڑک سے ہوتا ہوا دلائی لاما کی موجودہ رہائش گاہ تک جائے گا۔ جلوس کی نگرانی اور سیکورٹی کی ہر طرح کی ذمہ داری جلوس منتظمین نے خود لی تھی اور شہری انتظامیہ سے دور رہنے کی درخواست کی تھی چنانچہ اب انتظامیہ جلوس کے ساتھ ساتھ موجود تو تھی لیکن فاصلے سے اور بہت کم تعداد میں۔ سونیا نے اس سلسلے میں آئینشی آنے والی ای میل کو ڈیلیٹ کر دیا تھا اس لیے پروفیسر اور اس کے نائب سمیت پوری ٹیم کو اس صورت حال کا علم نہیں تھا اور سب کچھ اچانک پیش آنے کی وجہ سے وہ زیادہ پریشان تھے۔

”میں سوچ رہی ہوں کہ ہمیں ڈاؤن شوکی کو اس صورت حال سے آگاہ کر دینا چاہیے تاکہ کسی ایمر جنسی کی صورت میں وہ تیار رہے۔“ صرف موضوع بدلنے کے لیے اس نے ایک بات کہی۔

”ایک طرف تم اور تمہارا نائب مجھے یقین دلارہے ہو کہ تشویش کی کوئی بات نہیں ہے اور دوسری طرف تم مجھ سے ایسی باتیں کر رہی ہو۔“ اینڈریو کو نرغہ آگیا۔

”میں صرف احتیاطاً کہہ رہی ہوں ورنہ واقعی تشویش کی کوئی بات نہیں ہے۔“

”بس تو پھر رہنے دو۔ وہ صبح بہت جلدی اٹھنے کا عادی ہے۔ بہتر ہے کہ اس کی نیند خراب نہ کی جائے۔“ اینڈریو نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ نائب کے پیچھے ہوئے دونوں آدمی دستک دے کر کمرے کے اندر آ گئے۔

”اب آپ کو زحمت کرنا ہوگی۔“ سونیا نے پروفیسر کی طرف دیکھا تو وہ سر ہلاتا ہوا کمرے سے باہر نکلنے کے لیے حرکت میں آ گیا۔ سونیا اور دونوں آدمی بھی اس کے پیچھے چل پڑے۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ سونیا کو اس عمارت میں بنائے گئے خفیہ راستے کے ایگزٹ اور انٹری پوائنٹس کا تو علم تھا لیکن اس راستے کو کھولنے کے کوڈز صرف پروفیسر کو ہی معلوم تھے اس لیے اسے راضی کرنا بہت ضروری تھا اور وہ یہ کام کر گزری تھی۔

”سب کلیئر ہے نا؟ کہیں کوئی کنفیوژن تو نہیں۔“ جب وہ طویل سرنگ نما راستے سے گزر کر ایگزٹ پوائنٹ پر پہنچے تو سونیا نے دونوں آدمیوں سے سوال کیا۔

”لو میم! کہیں کوئی کنفیوژن نہیں ہے۔“ انہوں نے اسے جواب دیا۔ اس دوران اینڈریو پاس دروازے کا رخ فیہ راستہ کھول چکا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ ہلا کر باہر نکل گئے۔ ان

”چلو، ساتھ چل کر کوشش کرتے ہیں بلکہ ایسا کرنا تم ہی پروفیسر کو سمجھانے کی کوشش کرنا۔“ وہ نائب کو ساتھ لیے پروفیسر کے کمرے میں پہنچ گئی۔ وہ آنکھوں میں وحشت لیے اس وقت کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ ان دونوں کو دیکھ کر اس کی نظروں میں سوال ابھرا۔

”حالات کنٹرول میں ہیں اور ابھی تک کوئی ایسا تشویشناک واقعہ پیش نہیں آیا جس کی وجہ سے پریشان ہوا جائے پھر بھی میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو اور غیر ملکی مہمان کو یہاں سے احتیاطاً کسی دوسرے محفوظ مقام پر منتقل کر دیا جائے۔ اس کے لیے آپ کو خفیہ راستے کا استعمال کرنا پڑے گا۔“

”سلی، سلی اور شوگ کا کیا ہوگا؟“ سونیا کے اندازے کے عین مطابق اینڈریو نے نائب کو گھورتے ہوئے سوال اٹھایا۔

”وہ یہاں محفوظ رہیں گے! ہم ان کی حفاظت کا پورا پورا خیال رکھیں گے۔“

”تو پھر ہماری حفاظت کا خیال کیوں نہیں رکھ سکتے؟“ پروفیسر کے سوال نے نائب کو بغلیں جھانکنے پر مجبور کر دیا۔ اس موقع پر سونیا ذرا سا کھٹکھٹا رہی پھر بولی۔

”میرے خیال میں فی الحال ہم سب یہیں رہتے ہیں لیکن دو افراد کو خفیہ راستے سے باہر بھجوا دیتے ہیں تاکہ باہر والوں کو ہماری پوزیشن کا اندازہ ہو سکے اور کسی بھی غیر معمولی صورت حال میں وہ ہماری مدد کر سکیں۔“

”یہ ایک اچھی تجویز ہے۔“ پروفیسر نے فوراً اس سے اتفاق کیا۔

”تم دو آدمیوں کو سلیکٹ کر کے اور اچھی طرح سب سمجھا کر یہاں بھیجو اور خود باہر کی صورت حال کو مانیٹر کرتے رہو۔ یہ نہ ہو کہ ہماری ذرا سی غفلت کسی بڑے نقصان کا سبب بن جائے۔“ اس نے نائب کو حکم دیا اور خود کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی۔ باہر کی صورت حال ہنوز وہی تھی اور بظاہر وہ سب ہر طرف سے بے خبر مناجات پڑھنے میں مصروف تھے لیکن وہ جانتی تھی کہ تیسری قطار میں کھڑا ایک شخص اس کی طرف سے اشارے کا منتظر گا ہے یہ گا ہے اس طرف نظر ڈال لیتا ہے۔ اس بار اس نے نظر ڈالی تو اسے اپنا مطلوبہ اشارہ مل گیا۔ وہ قطار چھوڑ کر آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔ سونیا بھی کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گئی۔

”اتنی بڑی ایکٹیوٹی گورنمنٹ کو اطلاع دیے بغیر انجام نہیں دی جاسکتی۔ اگر یہ ان کی کوئی مذہبی سرگرمی ہے تو بھی ہمیں اس کی اطلاع ہونی چاہیے تھی۔“ اینڈریو نے ایک

برقانی انسانوں تک بھی راہنمائی کر دوں گی۔“ سونیا کو بھی ذاتی طور پر پروڈیوسر کی موت پر کوئی افسوس نہیں تھا اس لیے اس کی خون آلود کھوپڑی کو بالکل ویسے ہی نظر انداز کر دیا جیسے لوگ سوک کنارے پڑی کسی کتے کی لاش کو نظر انداز کر کے اپنے معمولات میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

”اوکے۔“ معاذ نے اسے مختصر جواب دیا اور خود اپنے ساتھ آئے لوگوں کو ہدایات دینے لگا۔ جیسے ہی وہ لوگ سونیا کی راہنمائی میں پروڈیوسر کے رہائشی حصے میں پہنچے، سونیا کا نائب وہاں آدھکا۔

”وہ بھکشو چار ہے ہیں میم امیرے خیال میں اب رابرٹ اور ٹام کو کہیں جیجے کی ضرورت نہیں ہے۔“ مواصلاتی رابطے منقطع ہونے کے باعث وہ خود اطلاع دینے آیا تھا لیکن اگلا لمحہ اس کے لیے حیرت کا تھا۔ سونیا کے عقب سے نمودار ہوتے اٹھارہ بدست معاذ کو دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ جس عمارت کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ وہاں چڑیا بھی اس کی مرضی کے بغیر پر نہیں مار سکتی، وہاں پورا کا پورا بندہ دندنا تا پھر رہا تھا۔

”یہ..... یہ کون.....؟“ پورا سوال بھی لیوں سے برآمد نہیں ہوا تھا کہ ایک خاموش فائر نے اسے ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا۔ حقیقتاً اسے یہاں موت پہنچ کر لائی تھی ورنہ ان کا بیرونی حصے میں سیکورٹی پر مامور افراد سے چھیڑ چھاڑ کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔

”سارے داخلی راستے بند کر دو۔“ معاذ نے اپنے ساتھ آئے افراد میں سے ایک کو حکم دیا۔ اس کے بعد انہوں نے سارا کام بہت تیزی سے نمٹایا۔ ملازمین وغیرہ کا انتظام کرنے کے بعد وہ اس تہ خانے میں پہنچے جہاں برقانی انسانوں کے لیے ایک دنیا آباد کی گئی تھی۔ پہلے مرحلے میں انہیں برقانی انسانوں کو بے ہوش کرنا تھا اور اس موقع پر زیادہ بھیڑ بھاڑ مناسب نہیں تھی اس لیے ان دونوں کے ساتھ صرف دو مزید افراد مخصوص لباس میں تہ خانے میں پہنچے تھے۔ یہاں انہوں نے کیلی کو ایک سیل میں نیم خوابیدگی کی حالت میں دیکھا۔ وہ اپنے قریب چند اجنبیوں کو دیکھ کر چوکی اور اٹھ کر بیٹھنا چاہا لیکن معاذ نے اسے موقع نہیں دیا اور ڈاٹ گن کی مدد سے نچکے بعد دیگرے دو فائر کر ڈالے۔ کیلی جو پہلے ہی کھانے میں دی گئی دوا کی وجہ سے سست ہو رہی تھی، جسم میں داخل ہونے والی سرخ لاش دوا کی وجہ سے فوراً ہی بے ہوش ہو گئی۔ اب شوٹنگ اور شکاری کی باری تھی لیکن وہ دونوں کیلی کی طرح سامنے موجود نہیں تھے۔ ان تک پہنچنے کے لیے انہیں دوسرے سیل میں داخل

کے نکلنے ہی اینڈریو نے دوبارہ راستہ بند کرنا چاہا لیکن سونیا نے اچانک ہاتھ کھما کر اس کی گردن پر کھڑی پھیل کا ایسا وار کیا کہ پروڈیوسر خود کو سنبھال نہ سکا اور جھرا کر پھینک دیا۔ اس دوران اسے باہر بھی کچھ اہل محسوس ہوئی۔ پروڈیوسر کی طرف سے ممکن اس نے باہر بھاگنا تو کچھ دیر قبل باہر نکلنے والے دونوں آدمی ایک طرف بے ہوش پڑے دکھائی دیے۔ ان بے ہوش افراد کے آس پاس کچھ سائے حرکت کر رہے تھے جو اس کے ہاتھ لہرانے پر تیزی سے اندر آنے لگے۔

”سب ٹھیک ہے؟“ ایک سائے نے اس کے قریب رک کر پوچھا تو اس نے پہلے اثبات میں سر ہلایا پھر بتانے لگی۔

”تم لوگوں کو صرف چند ملازمین اور چینی فریئر ڈاڈ شوئی کا انتظام کرنا پڑے گا۔ یہ سب افراد سوئے ہوئے ہیں اس لیے اس کام میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ اصل کام برقانی انسانوں کو بے ہوش کرنے اور انہیں یہاں سے لے جانے کا ہے۔“

”وہ بھی ہو جائے گا۔ ہم ڈاٹ گنر ساتھ لائے ہیں۔ ان گنر کے ذریعے برقانی انسان آسانی سے بے ہوش ہو جائیں گے۔ اس سے آگے دلائی لاما کی بھیجی ہوئی ٹیم کی ذمہ داری ہوگی۔ وہ پوری تیاری سے آئے ہیں اس لیے امید ہے کہ سارا کام سکون سے ہو جائے گا۔“ پورے اعتماد سے اس کی بات کا جواب دیتا وہ شخص بھلا معاذ کے سوا کون ہو سکتا تھا۔

”اس کا فیصلہ تم خود کر لیتا۔“ سونیا نے بے ہوش پڑے اینڈریو کی طرف اشارہ کیا۔

”اس نے انسانیت کی جس طرح تذلیل کی ہے اور اللہ کی مخلوق کو جتنا ستایا ہے، حق تو یہ ہے کہ اس کے جسم کا ریشہ ریشہ بھی الگ کر دیا جائے تو اس کے ڈھائے ہوئے مظالم کا حساب برابر نہیں ہوگا لیکن مجبوری یہ ہے کہ ہمیں اتنی فرصت میسر نہیں اور میں اس شیطانی دماغ کو مزید اس روئے زمین پر زندہ دیکھنے کے حق میں نہیں اس لیے اسے اپنی خواہش کے خلاف آسان موت دیتا ہوں۔“ اس نے سائلٹر لگے پیل کارخ پروڈیوسر کے سر کی طرف کیا اور بلا جھجک کوئی چلا دی۔ یہ شاید زندگی میں پہلی بار تھا کہ اسے کسی انسان پر گولی چلاتے ہوئے بالکل بھی افسوس نہیں ہوا تھا بلکہ وہ ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے اس نے برف زار میں پروڈیوسر کے تجربوں کی بھینٹ چڑھنے والے سارے مظلوم انسانوں کی روح کو سکون پہنچایا ہو۔

”تم اپنے آدمیوں کو لے کر میرے ساتھ چلو۔ رہائشی حصے میں موجود افراد کا انتظام ہو جائے تو میں تم لوگوں کی

تان لیے تھے۔ وہ بلند آواز میں ”لو.....لو“ کہتی ہوئی انہیں ان کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن وہاں پھیل جانے والی افراتفری، شیلی کی حیوانی غرغراہٹ اور شوٹنگ کے جارحانہ تیوروں کے درمیان کسی کے پاس کچھ سمجھنے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ مشین پٹلو چلے اور ان سے ہیک وقت نکلنے والی کئی گولیوں نے شوٹنگ اور شیلی کے جسموں کو چھید کر رکھ دیا۔ وہ وحشیانہ انداز میں چیخے۔ شیلی نے درد کی شدت سے ترپتے ہوئے سونیا کو نیچے پٹھا۔ اگر معاذ آگے بڑھ کر اسے قتل نہ لیتا تو شاید اس کی ایک آدھ بڑی فریکچر ہو جاتی۔

”اومائی گاڈ..... اومائی گاڈ!“ سونیا اس کے ساتھ گلی مصنوعی برف پر گر کر کرلوٹ پوٹ ہوتے شیلی اور شوٹنگ کو دیکھ کر بس یہی کہہ پارہی تھی۔

”انہیں سر میں گولی مار کر ختم کر دو۔“ معاذ نے سرد لہجے میں ہتھیار بدست دونوں افراد کو حکم دیا تو انہوں نے اس کے حکم کی تعمیل کسی ریبوٹ کی طرح کی۔ سر میں گولیاں کھا کر وہ دونوں بھاری بھرکم وجود جن کے اندر بے پناہ حیوانی طاقت پوشیدہ تھی، ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے۔

”یہ کیا کیا تم نے؟ تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ تم نے کیا کر ڈالا ہے؟“ اس بار معاذ غصے میں بھرا اپنے ان دو ساتھیوں کی طرف بڑھا اور ایک کے گریبان کو پھینچوڑتے ہوئے تیز لہجے میں پوچھا۔

”سر! آپ نے ہی تو فائر کرنے کا کہا تھا۔“ وہ منمنایا۔
”تو ڈاٹ گنز کس لیے تھیں تمہارے ہاتھوں میں؟“
میں نے جہیں ان سے فائر کرنے کو کہا تھا اور تم نے لے کر یہ پٹلو نکال لیے۔“ وہ چلا یا۔

”سوری سزا گھبراہٹ میں ہم سے غلطی ہو گئی۔“
”انہیں چھوڑ دو معاذ! جو ہو چکا اسے بدلا نہیں جا سکتا۔ اب ہمیں آگے کے معاملات سنبھالنے ہیں۔“ سونیا نے آگے بڑھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے سمجھایا تو معاذ بھی ڈھیلا پڑ گیا۔ واقعی جو ہو چکا تھا، وہ ہو چکا تھا۔ اب انہیں اس صورت حال کو سنبھالنا تھا۔ اس مقصد کے لیے وہ باہر گیا اور اپنے ساتھ آئے دلائی لاما کے ان عقیدت مندوں کو حالات سے آگاہ کرنے لگا جنہیں یہاں موجود تینوں برقانی انسانوں کو یہاں سے اپنے ساتھ لے جانا تھا۔ شوٹنگ اور شیلی کی موت کی خبر یقیناً ان کے لیے ایک بڑا صدمہ تھی جس پر پیش اور دکھ دونوں کا اظہار کیا گیا لیکن وقت

ہونے کا رسک مول لینا پڑا۔ اصل میں یہ وہ سب تھا جہاں شیلی اور شیلی دونوں مل کر رہتی تھیں اور جس کا اندرونی حصہ اس طرح بنایا گیا تھا کہ وہ خود کو دوسروں کی نظروں سے اوجھل بھی کر سکتی تھیں۔ شوٹنگ اور شیلی اس وقت غلطی کا لطف اٹھانے اسی جے میں اوجھل تھے جبکہ شیلی خود شوٹنگ والے جے میں چلی گئی تھی۔ اس طرح کے روتیوں کا اظہار ایک طرح کا ثبوت تھا کہ وہ ارتقائی اعتبار سے انسانوں سے بہت زیادہ قریب ہیں۔

”یہاں کا کولنگ سسٹم آف کر کے باقی لوگوں کو بلوا لو تاکہ ان دونوں کی بے ہوشی کے بعد منتقلی کا کام تیزی سے نمٹایا جاسکے۔“ معاذ نے ایک ساٹھی کو سرگوشی میں ہدایت دی اور خود سونیا کے ساتھ دبے قدموں غلطی گاہ کی طرف بڑھا۔ ابھی وہ وہاں داخل نہیں ہوئے تھے کہ اندر سے ایک بگولا سا کھلا اور معاذ سے یوں لگرایا کہ اسے لگا کوئی چٹانی پتھر اس سے آکر ریا ہو۔ اپنی تمام تر پھرتی کے باوجود وہ بس اتنا کر سکا کہ اس چٹان کے نیچے دبے سے محفوظ رہا لیکن اس کا جسم کسی کاغذ کے پتے کی طرح اڑ کر سیل کی سلاخوں سے جا لکرایا۔ شیلی کا نشانہ سونیا تھی اور اس نے اسے کسی بے جان گڑیا کی طرح دونوں ہاتھوں میں دیونچ کر سر سے اوپر اٹھالیا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ دونوں اس وقت شدید غصے میں تھے۔ غصے کے باعث ان کے حلق سے حیوانی آوازیں بھی نکل رہی تھیں۔ یقیناً انہوں نے اپنی تیز حسیات کے باعث ان لوگوں کی وہاں موجودگی کو محسوس کر لیا تھا اور انہیں اپنا دشمن تصور کرتے ہوئے نہایت ہوشیاری سے گھات لگا کر بیٹھ گئے تھے۔ ان کے غیر متوقع حملے نے سونیا اور معاذ کو تو براہ راست نشانہ بنایا تھا سو بنایا تھا، ان کے ساتھ آئے دونوں افراد بھی حواس باختہ ہو گئے تھے اور خود کو بچانے کے لیے باہر کی طرف دوڑے۔

”فائر..... فائر!“ معاذ جو کھراؤ کے نتیجے میں اپنی ڈاٹ گنز سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا، زور سے چلا یا۔ اس کی آواز سن کر شوٹنگ جو ایک بھاگتے ہوئے آدمی کی طرف لپک رہا تھا، اس کی طرف پلٹا اور غراتا ہوا اس پر حملہ آور ہوا۔ معاذ جو اس دور ان اٹھ کھڑا ہوا تھا، اس کے خود پر چھلانگ لگاتے ہی سرعت سے ایک طرف ہٹ گیا۔ شوٹنگ اپنے ہی زور میں پوری قوت سے سلاخوں سے لکرایا۔ لکراؤ کی شدت سے اس کے حلق سے ایک بھیاںک چیخ برآمد ہوئی۔ اس چیخ میں سونیا کی چیخیں بھی شامل ہو گئیں۔ وہ شیلی کے ہاتھوں میں ابھی تک اس کے سر کے اوپر معلق تھی لیکن وہ اپنی کسی تکلیف پر نہیں چیخ رہی تھی۔ وہ ان دونوں افراد پر چیخ رہی تھی جنہوں نے ڈاٹ گنز چھوڑ کر اپنے مشین پٹلو نکال کر شوٹنگ اور شیلی کی طرف

کی قلت ایک ایسی حقیقت تھی کہ کسی بھی رد عمل کو بہت طول نہیں دیا جاسکتا تھا۔ چند فوری فیصلے کرنے ضروری تھے۔ سب سے پہلا فیصلہ بے ہوش سکی کی منتقلی کا کیا گیا۔ معاذ شونگ اور شکی کی لاشیں ساتھ لے جانے کے حق میں نہیں تھا لیکن دوسری طرف نے موقف اختیار کیا گیا کہ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو بعد میں ان لاشوں کی بے حرمتی کی جائے گی۔ پہلے سائنس دان ان کی چیر بھاڑ کریں گے اور پھر بعد میں تجسس بھر کر کسی میوزیم میں نمائش کے لیے رکھ دیا جائے گا۔ ان بنیاد پرست بھکشوؤں کو دونوں میں سے کوئی بھی صورت گوارا نہیں تھی اس لیے وہ لاشیں ساتھ لے گئے۔ مستقبل میں یقیناً ان لاشوں کو ان بھکشوؤں کی کسی قدیمی عبادت گاہ میں محفوظ رہنا تھا اور سکی کو اصل برف زاروں میں اپنے ہم نسلوں کے درمیان شونگ کے بچے کی پرورش کرنا تھی۔ نیچر سے جو لیا گیا تھا اسے واپس لوٹانے کے لیے ویسے ہی کنٹینرز کی جیفہ کی بندرگاہ سے روانگی کا پورا انتظام موجود تھا جیسے انہیں یہاں لایا گیا تھا۔ حکومتی اختیارات اور سائنس کی ہوشیار یوں سے بھکشوؤں کا عقیدہ جیت چکا تھا اور دلائی لاما کے بے شمار عقیدت مند ہر ناممکن کو ممکن بنانے کے لیے اپنی اپنی جگہ سہولت کاری کے لیے موجود تھے۔ دنیا کتنی بھی جدت پسند ہو چکی ہے، عقائد کا توڑ ابھی تک ایجاد نہیں ہوا ہے۔ ہر مذہب اور عقیدے کے ایسے پیروکار ہمیشہ موجود رہتے ہیں جو اپنی اعلیٰ تعلیم اور بڑے عہدوں کے باوجود اپنے مذہبی پیشواؤں کے آگے بے چون و چرا سر جھکا دیتے ہیں۔ دلائی لاما کے بھی ایسے چاہنے والوں کی کوئی کمی نہیں تھی اور یہی عقیدت مند تھے جو اسرائیل کی ناک کے نیچے سے برفانی انسانوں کو وہاں سے نکال کر لے جانے والے تھے۔

☆☆☆

رائیل عرف میڈم ایکس کسی بل کھائی ناگن کی طرح ادھر سے ادھر پھنکارتی پھر رہی تھی۔ واقعات کچھ اس طرح سے رونما ہوئے تھے اور سب کچھ اتنی پلاننگ سے کیا گیا تھا کہ سیکورٹی کے افراد کو علم ہونے تک اچھا خاصا وقت گزر گیا تھا۔ انہوں نے اوپر رابطہ کو کے اطلاع دی اور جب تک اوپر والے حرکت میں آتے، اتنی تاخیر ہو چکی تھی کہ کچھ کرنا سانپ نکلنے کے بعد لکیر پیٹنے والی بات تھی۔ رائیل کے لیے یہ سب زیادہ پریشان کن اس لیے تھا کہ وہ ایک عرصے سے مسلسل ذک اٹھارہ تھی۔ اس کے حصے میں پاکستان کا بنا بنایا سیٹ اپ بگڑنے کی شرمساری جو تھی، سو تھی، قابل افسوس یہ تھا کہ وہ اسرائیل آکر بھی کوئی قابل ذکر کارکردگی

نہیں دکھاسکی تھی۔ اب گزشتہ دنوں ایلی کے کیے گئے خود کش بم دھماکے کو بھی دیکھا جاتا جس میں میجر سمیت کئی شہریوں کی ہلاکتیں ہوئی تھیں۔ صورت حال یہ تھی کہ بہت ہاتھ مارنے کے باوجود وہ اصل مجرموں تک نہیں پہنچی تھی۔ ایک طرف لکٹی منظر سے غائب تھی تو دوسری طرف ایلی کے ان دوستوں کا بھی کچھ پتا نہیں چل سکا تھا جن کے ساتھ وہ گزشتہ دنوں دیکھا گیا تھا۔ اس کی ٹیم نے بہت تیر مارا تو بس اتنا کر سکی تھی کہ ان لڑکوں میں سے دو کے اہل خانہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ایک کے گھر میں صرف بوڑھے والدین تھے جن میں سے باپ اندھا تھا جبکہ دوسرے کا پورا خاندان پہلے ہی اسرائیلی فوج کے ہاتھوں ختم ہو چکا تھا۔ صرف ایک بھائی زندہ تھا جو بیرون ملک زیر تعلیم تھا۔ وہ زیر تعلیم لڑکا ان کی رسائی میں نہیں تھا اور بوڑھے جوڑے سے بھی کچھ حاصل نہیں ہوا تھا۔ الٹا فلسطینیوں کو موقع مل گیا تھا کہ سوشل میڈیا پر تصویریں وائرل کر کے داویلا کر سکیں کہ اسرائیل بوڑھے اور ننھے فلسطینیوں پر ظلم ڈھا رہا ہے۔ اگرچہ اسرائیل نے ایسے کسی داویلے پر دھیان نہ دینے کی قسم اٹھا رکھی تھی لیکن دوست ممالک کو تو کچھ نہ کچھ وضاحتیں دینا ہی پڑتی تھیں۔ وہ ابھی اس بم بلاسٹ والے واقعے کے دباؤ سے نہیں نکل سکی تھی کہ یہ واقعہ پیش آ گیا تھا اور سونیا جسے اس نے یہاں سیکورٹی انچارج بنا کر تعینات کیا تھا، منظر سے غائب تھی۔ یہاں آکر اسے جو تفصیلات حاصل ہوئی تھیں، ان سے اس نے اندازہ لگایا تھا کہ جو کچھ پیش آیا، اس میں سونیا کا کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی کردار ضرور تھا۔

بھکشوؤں کے مذہبی جلوس کے بارے میں سارے آفیشلو کو علم تھا۔ ان کے سرکل کی طرف سے اس جلوس کی باقاعدہ اجازت لی گئی تھی۔ جلوس بالکل پُر امن رہا تھا اور اس کے ساتھ چلنے والے پولیس کے اہلکاروں نے کسی قسم کی بد امنی کی شکایت نہیں کی تھی لیکن یہ طے تھا کہ جو کچھ ہوا، اسی عرصے میں ہوا تھا جب بھکشو اس عمارت کے سامنے موجود تھے۔ وہاں موجود اہلکاروں کے مطابق اس طرح اچانک اتنی بڑی تعداد میں بھکشوؤں کے وہاں جمع ہونے سے سب لوگ پریشان ہو گئے تھے۔ اس موقع پر سونیا کا فرض تھا کہ اول تو جلوس کے گزر جانے تک اپنے ماتحتوں کو پوری طرح چوکس رہنے کی ہدایت کرتی، دوم انہیں تسلی دیتی کہ کسی کو ہینک ہونے کی ضرورت نہیں ہے لیکن اس نے دوسرے سے آفیشل ای میل ہی ڈیلیٹ کر دی تھی اور یہ ایک چیز ہی اسے محکوک بنانے کے لیے کافی تھی۔ رہی سہی کسر اندر نصب

کی قلت ایک ایسی حقیقت تھی کہ کسی بھی رد عمل کو بہت طول نہیں دیا جاسکتا تھا۔ چند فوری فیصلے کرنے ضروری تھے۔ سب سے پہلا فیصلہ بے ہوش کیلی کی منتقلی کا کیا گیا۔ معاذ شوٹنگ اور شہر کی لاشیں ساتھ لے جانے کے حق میں نہیں تھا لیکن دوسری طرف سے موقف اختیار کیا گیا کہ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو بعد میں ان لاشوں کی بے حرمتی کی جائے گی۔ پہلے سائنس دان ان کی چیر بھائز کریں گے اور پھر بعد میں جیس بھر کر کسی میوزیم میں نمائش کے لیے رکھ دیا جائے گا۔ ان بنیاد پرست ہجکشوؤں کو دونوں میں سے کوئی بھی صورت گوارا نہیں تھی اس لیے وہ لاشیں ساتھ لے گئے۔ مستقبل میں یقیناً ان لاشوں کو ان ہجکشوؤں کی کسی قدیمی عبادت گاہ میں محفوظ رہنا تھا اور کیلی کو اصل برف زاروں میں اپنے ہم نسلوں کے درمیان شوٹنگ کے بچے کی پرورش کرنا تھی۔ پھر سے جو لیا گیا تھا اسے واپس لوٹانے کے لیے ویسے ہی کنٹینرز کی حیفہ کی بندرگاہ سے روانگی کا پورا انتظام موجود تھا جیسے انہیں یہاں لایا گیا تھا۔ حکومتی اختیارات اور سائنس کی ہوشیار یوں سے ہجکشوؤں کا عقیدہ جیت چکا تھا اور دلائی لاما کے بے شمار عقیدت مند ہر ناممکن کو ممکن بنانے کے لیے اپنی اپنی جگہ سہولت کاری کے لیے موجود تھے۔ دنیا کتنی بھی جدت پسند ہو چکی ہے، عقائد کا توڑ ابھی تک ایجاد نہیں ہوا ہے۔ ہر مذہب اور عقیدے کے ایسے پیروکار ہمیشہ موجود رہتے ہیں جو اپنی اعلیٰ تعلیم اور بڑے عہدوں کے باوجود اپنے مذہبی پیشواؤں کے آگے بے چون و چرا سر جھکا دیتے ہیں۔ دلائی لاما کے بھی ایسے چاہنے والوں کی کوئی کمی نہیں تھی اور یہی عقیدت مند تھے جو اسرائیل کی ناک کے نیچے سے برفانی انسانوں کو وہاں سے نکال کر لے جانے والے تھے۔

☆☆☆

رائیل عرف میڈم ایکسی کی بل کھائی ناگن کی طرح ادھر سے ادھر پھرنی پھر رہی تھی۔ واقعات کچھ اس طرح سے رونما ہوئے تھے اور سب کچھ اتنی پلاننگ سے کیا گیا تھا کہ سیکورٹی کے افراد کو علم ہونے تک اچھا خاصا وقت گزر گیا تھا۔ انہوں نے اوپر رابطہ کر کے اطلاع دی اور جب تک اوپر والے حرکت میں آتے، اتنی تاخیر ہو چکی تھی کہ کچھ کرنا سانپ نکلنے کے بعد لکیر پیٹنے والی بات تھی۔ رائیل کے لیے سب زیادہ پریشان کن اس لیے تھا کہ وہ ایک عرصے سے مسلسل زک اٹھار ہی تھی۔ اس کے حصے میں پاکستان کا بنا بنایا سیٹ اپ بگڑنے کی شرمساری جو تھی، سو تھی، قابل افسوس یہ تھا کہ وہ اسرائیل آکر بھی کوئی قابل ذکر کارکردگی

نہیں دکھاسکی تھی۔ اب گزشتہ دنوں ایلی کے کہے گئے خود کش بم دھماکے کو ہی دیکھا جاتا جس میں میر سیت کئی شہریوں کی ہلاکتیں ہوئی تھیں۔ صورت حال یہ تھی کہ بہت ہاتھ پیر مارنے کے باوجود وہ اصل مجرموں تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ ایک طرف لیٹی منظر سے غائب تھی تو دوسری طرف ایلی کے ان دوستوں کا بھی کچھ پتا نہیں چل سکا تھا جن کے ساتھ وہ گزشتہ دنوں دیکھا گیا تھا۔ اس کی ٹیم نے بہت تیر مارا تو بس اتنا کر سکی تھی کہ ان لڑکوں میں سے دو کے اہل خانہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ایک کے گھر میں صرف بوڑھے والدین تھے جن میں سے باپ اندھا تھا جبکہ دوسرے کا پورا خاندان پہلے ہی اسرائیلی فوج کے ہاتھوں ختم ہو چکا تھا۔ صرف ایک بھائی زندہ تھا جو بیرون ملک زیر تعلیم تھا۔ وہ زیر تعلیم لڑکا ان کی رسائی میں نہیں تھا اور بوڑھے جوڑے سے بھی کچھ حاصل نہیں ہوا تھا۔ الٹا فلسطینیوں کو موقع مل گیا تھا کہ سوشل میڈیا پر تصویریں وائرل کر کے واویلا کر سکیں کہ اسرائیل بوڑھے اور ننھے فلسطینیوں پر ظلم ڈھا رہا ہے۔ اگرچہ اسرائیل نے ایسے کسی واویلے پر دھیان نہ دینے کی قسم اٹھا رکھی تھی لیکن دوست ممالک کو تو کچھ نہ کچھ وضاحتیں دینا ہی پڑتی تھیں۔ وہ ابھی اس بم بلاسٹ والے واقعے کے دباؤ سے نہیں نکل سکی تھی کہ یہ واقعہ پیش آ گیا تھا اور سونیا جسے اس نے یہاں سیکورٹی انچارج بنا کر تعینات کیا تھا، منظر سے غائب تھی۔ یہاں آکر اسے جو تفصیلات حاصل ہوئی تھیں، ان سے اس نے اندازہ لگایا تھا کہ جو کچھ پیش آیا، اس میں سونیا کا کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی کردار ضرور تھا۔

ہجکشوؤں کے مذہبی جلوس کے بارے میں سارے آفیشلو کو علم تھا۔ ان کے سرکل کی طرف سے اس جلوس کی باقاعدہ اجازت لی گئی تھی۔ جلوس بالکل پُر امن رہا تھا اور اس کے ساتھ چلنے والے پولیس کے اہلکاروں نے کسی قسم کی بدامنی کی شکایت نہیں کی تھی لیکن یہ طے تھا کہ جو کچھ ہوا، اسی عرصے میں ہوا تھا جب ہجکشوؤں اس عمارت کے سامنے موجود تھے۔ وہاں موجود اہلکاروں کے مطابق اس طرح اچانک اتنی بڑی تعداد میں ہجکشوؤں کے وہاں جمع ہونے سے سب لوگ پریشان ہو گئے تھے۔ اس موقع پر سونیا کا فرض تھا کہ اول تو جلوس کے گزر جانے تک اپنے ماتحتوں کو پوری طرح چوکس رہنے کی ہدایت کرتی، دوم انہیں تسلی دیتی کہ کسی کو ہینک ہونے کی ضرورت نہیں ہے لیکن اس نے دوسرے نے آفیشل ای میل ہی ڈیلیٹ کر دی تھی اور یہ ایک چیز ہی اسے مشکوک بنانے کے لیے کافی تھی۔ رہی سہی کسر اندر نصب

”میں تمہارا بہت شکر گزار ہوں سو نیا! تم نے میرے لیے اتنا کچھ کیا ہے کہ میں خود کو تمہارا مقروض محسوس کرتا ہوں اور اب تم نے جو کچھ کیا ہے، وہ تو انتہا ہے۔ مجھے اندازہ ہے کہ آج کے بعد تم بھی اسرائیل کی سرزمین پر آزادانہ چل پھر نہیں سکو گی۔“ سو نیا کا انتہائی انکساری سے ہلکے یہ ادا کرتے ہوئے معاذ کو ابھی طرح یاد تھا کہ بھی وہ اس کے لیے اتنی قابلِ نفرت ہوتی تھی کہ شاید وہ اس کی زندگی میں آنے والی پہلی ہستی تھی جسے وہ دل میں قتل کر دینے کی خواہش رکھتا تھا۔ زندگی اور زندگی میں آنے والے لوگ ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔ کہیں بھی، کچھ بھی بدل سکتا ہے اور کبھی بھی آپ کو حیرت کا جھکا لگ سکتا ہے۔ چند برس قبل اس نے اسرائیل آنے کے متعلق سوچا بھی نہیں تھا لیکن اب وہ یہاں موجود تھا اور نہیں جانتا تھا کہ کبھی یہاں سے زندہ واپس لوٹ بھی سکے گا یا نہیں۔ جیسے اس کی زندگی بدل گئی تھی، ایسے ہی سو نیا کے لیے سوچ کا رخ بھی بدل گیا تھا۔

”تم میرا شکر یہ کیوں ادا کر رہے ہو معاذ؟ میں یہ بات تم سے پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ میں تمہارا ساتھ تمہاری خاطر نہیں بلکہ اپنے دل کے اطمینان کے لیے دے رہی ہوں۔ اتنی زندگی گزارنے اور زندگی میں بہت کچھ کر گزرنے کے بعد مجھے یہ احساس ہوا ہے کہ حق کے ساتھ کھڑے رہنے میں کیسا لطف ہوتا ہے۔“ وہ اسے جواب دیتے ہوئے ذرا سا مسکرائی پھر ذرا سا آگے کو جھکتے ہوئے بولی۔

”زندگی ہمیشہ خطرے میں ہوتی ہے اور زندہ رہنے کے آپشنز بھی ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ بات بس انسان کے پاس موجود مہلت کی ہوتی ہے۔ مہلت ختم ہو جائے تو سارے آپشنز ختم ہو جاتے ہیں، مہلت باقی ہو تو مواقع ہی مواقع ہوتے ہیں۔ آخر قسمت لکھی وہی کو بھی تو یہاں سے نکال کر لے گئی ہے نا۔ اگر میں چاہوں گی تو میرا بھی کوئی نہ کوئی انتظام ہو جائے گا۔“

”ہاں، کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو اور میں یہ بھی مان لیتا ہوں کہ تم نے میری خاطر کچھ نہیں کیا لیکن ایک عدد شکر یہ تو میرا فرض بنتا ہے کہ کسی بھی سوچ کے ساتھ سہی، تم میرے کام تو آئی ہو اور وہاں وہاں میرے لیے آسانیاں پیدا کی ہیں جہاں کوئی دوسرا شاید ہی میرا ساتھ دے پاتا۔“

”تمہاری زندگی کو کانٹوں پر کھینٹنے والوں میں بھی تو میرا نام سرِ لہرست ہے۔“ اس کی آنکھوں سے اداسی چھلکی۔

”گزری باتوں کو جانے دو۔ پہلے مجھے اس سب پر بہت غصہ آتا تھا لیکن اب میں سوچتا ہوں کہ قدرت نے

کیمروں کی فوجِ غائب ہونے سے پوری ہو گئی تھی۔ محسوس یوں ہو رہا تھا کہ سو نیا نے ہیکشورڈ کے جلوس کی اطلاع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کسی کے ساتھ مل کر ہورا منصوبہ تیار کیا تھا اور ایک ایسے وقت میں جبکہ سب کی توجہ مکمل طور پر باہر کی طرف مبذول تھی، اندر سے کارروائی کر ڈالی تھی۔

”دھوکے باز..... یہ سارا اثر اس بے وفا خون کا ہے جو تیری رگوں میں دوڑتا ہے۔“ تصور میں سو نیا کا چہرہ دیکھتی وہ تنفر سے سوچتے ہیں اس قدر رگن ہو گئی تھی کہ اپنے بچتے فون کا بھی ہوش نہیں تھا۔ آخر کار ایک اہلکار کو اسے توجہ دلانا پڑی۔ اس نے چونک کر کال ریسیو کی اور دوسری طرف کی بات سننے لگی۔

”لیکن سر.....!“ دوسری طرف سے اس کے سر پر جو بم پھوڑا گیا تھا، وہ غیر متوقع نہ ہونے کے باوجود اس کے لیے صدمے کا باعث تھا۔ شپٹا کر کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن آج اس کی مہلت ختم ہو گئی تھی۔ اسے بولنے کا موقع نہیں دیا گیا اور حکم سنا دیا گیا۔ وہ حکم ایسا تھا کہ وہ کال ختم ہونے کے بعد بھی اپنی جگہ ساکت کھڑی رہی۔ اس سکتے کو ہاتھ میں بریف کیس لیے اندر داخل ہونے والے اسٹارٹ سے آدی کی آہٹ نے توڑا۔

”میں جیمو ہوں۔ یقیناً اب تک آپ کو آرڈر زل گئے ہوں گے۔ کیا آپ مجھے چارج دینے کے لیے تیار ہیں؟“ آنکھوں پر پہنے سیاہ گلاسز اتارتے ہوئے وہ مہذب لہجے میں اس سے مخاطب ہوا۔ وہ کسی بھی چیز کے لیے تیار نہیں تھی۔ اسے اپنی جگہ چھوڑنا منظور نہیں تھا لیکن یہ بھی جانتی تھی کہ انکار کی گنجائش نہیں چنانچہ سستے ہوئے چہرے کے ساتھ بہ مشکل سرکواشات میں جنبش دی اور پرس میں ہاتھ ڈال کر ایک ڈبیا باہر نکالی۔ ڈبیا کھولنے پر اندر سے چھ کونوں والا گولڈن ہولی اسٹار برآمد ہوا۔ اس نے اپنی خدمات کے عوض بہت کم عمری میں یہ اسٹار حاصل کیا تھا لیکن اب وہ اس اسٹار سے محروم کی جا رہی تھی۔ اسٹار پر آخری حسرت زدہ نظر ڈال کر اس نے اسے جیمو کے حوالے کیا اور ایک جھٹکے سے باہر نکل گئی۔ وہ دکھ اور احساسِ توہین کی انتہا پر تھی اور بس نہیں چل رہا تھا کہ سو نیا سامنے ہو تو اس کا ریشہ ریشہ ادھیڑ ڈالے لیکن مسئلہ یہی تھا کہ نہ تو سو نیا سامنے تھی اور نہ ہی اپنا ایسا کوئی پتا نشان چھوڑ کر گئی تھی جس کے ذریعے اس تک پہنچا جاسکے۔ اسے تو یہ بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ بر فانی انسانوں کو غائب کرنے والے کون تھے اور سو نیا کا ان سے کیا تعلق تھا۔

☆☆☆

بات خاموشی سے سنی پھر ”اوسے“ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔
 ”مجھے ایک کام سے جانا ہے۔ تم جب تک آرام
 کرو۔“ سونیا کی سوالیہ نظروں کو خود پر مرکوز محسوس کر کے اس
 نے کہا۔

”کیا مجھے اس کام میں شامل نہیں کیا جاسکتا؟“
 ”نہیں۔ وہ ایسا کام نہیں ہے جس میں تمہاری
 شمولیت ضروری ہو۔ خواہ وہ باہر نکل کر خود کو خطرے میں
 ڈالنے کی کیا ضرورت ہے۔“ معاذ نے سرسری لہجے میں
 اسے جواب دیا لیکن اس پر جو عجلت طاری تھی، سونیا اسے
 محسوس کر سکتی تھی۔

☆☆☆

”آپ کو یقین ہے کہ وہ یہاں ضرور آئے گی؟“ وہ
 بہت دور سے اس عمارت پر نظر رکھے ہوئے تھے جسے اگر
 اینڈریو کی راجدھانی کہا جاتا تو غلط نہ ہوتا۔

”جو کچھ یہاں بیت چکا ہے، اس کے بعد ممکن ہی نہیں
 کہ وہ یہاں نہ آئے اور ہمیں اس تک رسائی کا اس سے سنہری
 موقع پھر کبھی ملنا مشکل ہوگا۔“ شہریار نے نظریں عمارت پر
 ہی مرکوز کیے اس کی بات کا جواب دیا۔ وہ آخری کام جسے
 انجام دینے کے لیے وہ وہاں رکا ہوا تھا، میڈم ایکس کو اس
 کے انجام تک پہنچانا ہی تھا۔ وہ اس کے وطن کو ناقابل تلافی
 نقصانات پہنچانے کی ذمے دار تھی اس لیے اس کے لیے
 معافی کی کوئی سنجائش نہیں تھی۔ اس جیسی عورت کو گھیرنا یا اس
 تک رسائی حاصل کرنا ظاہر ہے کوئی آسان بات نہیں تھی
 چنانچہ جیسے ہی اسے معاذ کے ہتھکڑوں کے ساتھ مل کر برفانی
 انسانوں کو نکال لے جانے والے منصوبے کا علم ہوا تھا، اس
 نے میڈم ایکس کو گھیرنے کا منصوبہ بھی ترتیب دے لیا تھا اور
 اب مذکورہ عمارت سے قریب ترین ہوٹل کے ایک کمرے کی
 کھڑکی سے دور بین کی مدد سے نگرانی کا فریضہ انجام دے رہا
 تھا۔ پیچھے ارتعشی اور اس کے ساتھیوں پر مشتمل ٹیم اس کی مدد
 کے لیے تیار تھی۔ جب سے ان پر یہ واضح ہوا تھا کہ چین نے
 بہت سے معاملات میں انہیں اندھیرے میں رکھا ہے، انہوں
 نے یہاں اپنے چینی روابط سے تعلق محدود کر لیا تھا۔ یہاں
 تک کہ معاذ تو منظر سے ہی غائب ہو گیا تھا۔ دلائی لاما کے
 کہنے پر ہتھکڑوں کا ساتھ دینے سے اسے ان کی حمایت
 حاصل ہو گئی تھی اور اب وہ ان کی پناہ میں تھا۔ اپنا آخری مشن
 انجام دینے تک اسے تمام سہولیات کی فراہمی کے وعدے
 کے ساتھ یہ پناہ عطا کی گئی تھی۔

”ویسے کافی وقت نہیں لگ گیا۔ سب کچھ گزرے اتنی

شاید سب کچھ اسی طرح ترتیب دیا تھا۔ اگر میری زندگی میں
 یہ سب نہ ہوتا تو میں بھی ان ہزاروں لاکھوں نوجوانوں کی
 طرح ڈگری مکمل کر کے جاب کرنے اور شادی کر کے بیوی
 بچوں کو پالنے جیسے عام سے کام کر کے مر کھپ جاتا۔ آج کم
 از کم میرے پاس کرنے کو کچھ ایسا تو ہے کہ مجھے لگتا ہے کہ
 جب میں اس دنیا سے جاؤں گا تو ایک بے مقصد زندگی گزار
 کر نہیں جاؤں گا۔“

”ہاں، یہ بھی ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔“ سونیا نے اس
 سے اتفاق کیا۔

”تمہارے لیے دلائی لاما کی طرف سے پیشکش ہے
 کہ اگر تم چاہو تو وہ آرام سے تمہیں یہاں سے نکال سکتے
 ہیں۔“ معاذ نے اسے بتایا۔

”میری طرف سے ان کا شکریہ ادا کرنا لیکن میں
 تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔“

”اس کے باوجود کہ میں ایک ایسا مرد ہوں جس کے
 دل پر کسی اور عورت کی حکمرانی ہے؟“ اس کے قطعیت سے
 کیے گئے انکار پر معاذ نے اس کی کچھ دن پہلے کہی گئی بات
 یاد دلایا کہ اسے چھیڑا۔

”ہاں، اس کے باوجود..... کیونکہ جو تمہارے دل پر
 حکمران ہے، وہ مجھے بھی پیاری ہے اور میں اپنا فرض سمجھتی
 ہوں کہ اس کی غیر موجودگی میں تمہارا خیال رکھوں۔ ہاں،
 جس دن وہ آگئی، تمہاری لگام اس کے ہاتھوں میں تھا کہ خود
 پیچھے ہٹ جاؤں گی۔“ سونیا نے اس کے چھیڑنے کا قطعی اثر
 نہیں لیا۔

”میں کوئی گھوڑا ہوں جس کی لگامیں کسی کو تمہاری
 جارہی ہیں؟“ معاذ نے مصنوعی ناراضگی کا اظہار کیا۔

”سنا ہے مرد سرکش گھوڑے کے مانند ہوتا ہے اور
 تمہیں تو میں نے واقعی ایسا پایا ہے۔ میری ماں نے کتنی
 کوشش کی تمہیں لگام ڈالنے کی لیکن نہیں ڈال سکی نا۔“

”وہ الگ بات تھی۔ جہاں جنگ لڑنا ہو، وہاں مرد
 ڈٹ جاتے ہیں لیکن بات محبت کی ہو تو سرنگوں کرنے میں بھی
 سرور ہوتا ہے۔“

”بہت باتیں بنانا سیکھ لی ہیں۔“ سونیا کی آنکھوں
 میں وہی رنگ اترے جنہیں وہ اس سے چھپانے کی کوشش
 کرتی تھی۔

”زندگی نے جہاں بہت کچھ سکھایا ہے، وہاں ایک
 ہنریہ بھی سہی۔“ معاذ ہنسا پھر اپنے فون کی بجٹی کھنٹی کی طرف
 متوجہ ہو گیا۔ ”ہیلو“ کہنے کے بعد اس نے دوسری طرف کی

جائے دیکھا۔ اس کے اندر جانے کے بعد مشکل سے چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ میڈم ایکس باہر آئی۔ اس کی ہاؤس لیکنج سے فکست خوردگی کا اظہار ہو رہا تھا۔

”آؤ چلیں۔“ شہزیار نے فوراً باہر کی طرف دوڑ لگائی۔ گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اس نے دیکھا کہ رائبل الحروف میڈم ایکس نے فلوئر کو دھکا چھوڑ دیا ہے اور خود رائیونگ سیٹ پر موجود ہے۔

”باپ رے۔“ اس کی گاڑی کو آندھی طوفان کی رفتار سے آگے بڑھتے دیکھ کر شہزیار کے منہ سے بے ساختہ ہی نکلا اور اس کی رفتار کا ساتھ دینے کے لیے اپنی گاڑی کی رفتار بھی بڑھائی۔ دوسری طرف ماہ بانو ساتھیوں سے رابطہ کر کے انہیں صورت حال سے آگاہ کر رہی تھی۔ مختصر اور مبہم الفاظ میں دی گئی اطلاع میں سب سے اہم وہ سمت تھی جس طرف میڈم ایکس کی گاڑی سڑک کر رہی تھی۔ اس سمت کو مد نظر رکھتے ہوئے ارتضیٰ کو اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس سے آگے رہنا تھا اور پھر ایسے مقام پر اسے روکنا تھا جہاں لوگوں کی آمد و رفت نہ ہو۔ ویسے بھی ابھی راستوں پر زیادہ رش نہیں ہوا تھا۔ ابھی دفتری اوقات شروع ہونے میں کچھ دیر تھی اس لیے اہل حیفہ کی بہت کم تعداد باہر نکلی تھی۔ سڑکوں پر کچھ گاڑیاں تھیں یا وہ صبح خیز افراد دکھائی دے رہے تھے جنہیں جاگنگ اور مارنگ واک کی عادت گھروں میں نکلنے نہیں دیتی تھی۔

”وہ پہاڑی کی طرف جانے والی روڈ پر چڑھنے والی ہے۔ یہ ایک بہترین پوائنٹ ہے۔ یہاں تمہیں ہر حال میں اس سے آگے رہنا ہوگا۔“

”ڈونٹ وری! ہم اس کے استقبال کے لیے موجود ہوں گے۔“ ارتضیٰ نے اسے تسلی دی۔ شہزیار نے جو پہلے ہی خاصے فاصلے سے تعاقب کر رہا تھا، درمیانی فاصلہ مزید بڑھا لیا۔ آگے بس چند لمحوں کا ہی مکمل تھا۔ سڑک پر کیلیں پھیلائی گئی تھیں یا ارتضیٰ نے کوئی اور ترکیب لڑائی تھی۔ انہوں نے بس ٹائبر برسٹ ہونے کی زوردار آواز کے ساتھ میڈم ایکس کی گاڑی کو لہراتے دیکھا۔ گاڑی کی رفتار اتنی زیادہ تھی کہ وہ اسے قابو نہیں کر سکی۔ گاڑی نے جھٹکا کھایا، لہرائی، پھسلئی اور دیکھتے ہی دیکھتے بے قابو ہو کر سڑک سے اتر کر دور تک لڑھکتی چلی گئی۔

”یا خدا.....!“ ماہ بانو کی زبان سے بس یہی دو لفظ نکل سکے۔ شہزیار پہلے ہی گاڑی کو بریک لگا چکا تھا لیکن وہ دونوں ہی فوری طور پر گاڑی سے نیچے نہیں اترے۔ انہوں

دیر ہو گئی ہے۔ اب تک کوئی پلٹل بچ جانی چاہیے تھی۔“ رات بھر تو وہ دونوں باری باری نگرانی کا فریضہ انجام دیتے رہے تھے کہ آرام کا بھی وقت مل جائے لیکن صبح سے دونوں ہی جاگ رہے تھے۔ ہلکا پھلکا ناشتا کرے میں ہی منگو کر کر لیا گیا تھا اور تمام واجبات کی ادائیگی کے ساتھ انتظامیہ کو یہ اطلاع بھی دے دی گئی تھی کہ وہ صبح میں کسی بھی وقت چیک آؤٹ کر جائیں گے۔ روانگی کے لیے پوری طرح تیار ماہ بانو کو اب مزید انتظار سے کوفت ہو رہی تھی۔

”لگتا ہے تمہاری بوریت دور ہونے کا وقت آ گیا ہے۔“ شہزیار نے صبح کے بلکے اجالے میں دو گاڑیوں کو آگے پیچھے زیر نگرانی عمارت کے آگے رکھتے دیکھا تو ماہ بانو کو اطلاع دی اور خود دور بین کو ایڈجسٹ کر کے توجہ سے گاڑی سے اترنے والوں کو دیکھنے لگا۔ لائک اسکرٹ اور بلاؤز میں ملبوس نہایت خوبصورت عورت کو میڈم ایکس کی حیثیت سے شناخت کرنے میں اسے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ شو فر کے ساتھ اپنی گاڑی میں اکیلی آئی تھی جبکہ اس کے پیچھے وہاں آکر رکنے والی گاڑی سے چار افراد برآمد ہوئے تھے۔ ان چاروں میں سے تین مرد اور ایک عورت سالہ عورت تھی۔ وہ سب ہی غلجٹ بھرے انداز میں تیز تیز قدموں سے عمارت میں داخل ہو گئے تھے۔

”انہیں جائے وقوعہ کا جائزہ لینے اور اس کے بعد کسی قسم کا لائحہ عمل طے کرنے میں کچھ وقت لگ سکتا ہے لیکن یہ طے ہے کہ وہ یہاں رکے گی نہیں۔ دیر سویر اس کی واپسی ضرور ہوگی اور بس وہی ہمارے ایکشن میں آنے کا وقت ہوگا۔“ اپنی نظریں عمارت پر ٹکائے وہ بولتا جا رہا تھا۔

”ہمیں یہاں سے چیک آؤٹ بھی تو کرنا ہے۔“ ماہ بانو نے یاد دلایا کہ اب وہ زیادہ دیر ہوٹل میں قیام نہیں کر سکتے۔

”یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اگر زیادہ وقت لگ گیا تو ہم ہوٹل انتظامیہ کو آگاہ کر دیں گے کہ ہمارا جس دوست کے ساتھ جانے کا پروگرام تھا، وہ اپنے کسی کام میں پھنس کر لیٹ ہو گیا ہے اس لیے ہم اپنا قیام بڑھا رہے ہیں۔“ شہزیار کے پاس مسئلے کا حل موجود تھا چنانچہ وہ بہت صبر سے اپنی جگہ جما نگرانی کا فریضہ انجام دیتا رہا۔ وقت آہستہ روی سے آگے بڑھا اور منظر میں بس اتنی تبدیلی آئی کہ ایک تیسری گاڑی عمارت کی پارکنگ میں آکر رکی۔ اس نے شاندار سی گاڑی سے شاندار شخصیت کے مالک شخص کو برآمد ہوتے اور اپنا برف کیس اٹھائے پُر وقار قدموں سے عمارت کی طرف

کا جسم آگے کی دونوں نشستوں کے درمیان پھنس کر عجیب تکلیف دہ زادے میں آکھتا تھا اور اندازہ ہو رہا تھا کہ جسم کی کئی ہڈیاں ٹوٹ چکی ہوں گی۔ اس سب کے باوجود وہ زندہ تھی اور ہوش میں تھی۔ انہیں اس کی ہلکی ہلکی کراہیں سنائی دے رہی تھیں۔

”رائیل... ا...“ معاذ نے پہلے دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن جب اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا تو کھڑکی میں جھک کر اسے پکارا۔ پکار کے جواب میں اس نے آنکھیں کھول کر معاذ کی طرف دیکھا۔ پورا جسم شدید اذیت میں ہونے کے باوجود اس کا دماغ کام کر رہا تھا۔ چنانچہ اس نے معاذ کو اس کے بدلے ہوئے حلیے کے باوجود شناخت کر لیا اور آنکھوں میں آشنائی کی چمک دکھائی دی۔

”یقین کرو، اپنی مرضی اور اختیار کا کسی دوسرے کے قبضے میں چلے جانا اس سے زیادہ ہی تکلیف دہ ہوتا ہے جتنی تکلیف تم اس وقت یہاں پھنس کر محسوس کر رہی ہو۔“ نظر سے نظر ملی تو معاذ نفرت اور انسو کی ملی جلی کیفیت میں اس سے مخاطب ہوا۔ شاید وہ جواب میں اس سے کچھ کہتی لیکن حادثے نے اسے اس لائق ہی نہیں رہنے دیا تھا کہ وہ اپنی زبان کو جنبش دے پاتی۔

”سوچ کر تو یہی آیا تھا کہ آج زمین کو تمہارے ناپاک بوجھ سے آزاد کر دوں گا لیکن تمہیں اس حالت میں پا کر تم پر ہتھیار اٹھانا اپنی مردانگی کی توہین محسوس ہو رہی ہے۔ میں تمہیں یہاں زندہ چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ تمہارا فیصلہ اب قدرت کے ہاتھ میں ہے۔“ وہ جو رائیل کو اپنے ہاتھوں انجام تک پہنچانے کی خواہش میں شہر یار سے اصرار کر کے اس مشن میں شامل ہوا تھا، اس کی موت کے فیصلے کو ٹال گیا۔

”یہاں ایک کار حادثہ ہو گیا ہے۔ خاتون ڈرائیور شدید زخمی حالت میں بری طرح کار میں پھنسی ہوئی ہے۔ برائے مہربانی مدد کے لیے تشریف لائیں۔“ وہ جب وہاں سے پلٹ رہا تھا تو اس نے شہر یار کو ریسکیو کے لیے کال کرتے ہوئے سنا اور شانے جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔ شہر یار نے اپنا سیاح والا کردار نبھاتے ہوئے ایک درست قدم اٹھایا تھا۔ آج رات کی فلائٹ سے اسے اور باہانوں کو واپس چلے جانا تھا چنانچہ چشم دید گواہ کی حیثیت سے ایک بیان ریکارڈ کر دینے سے زیادہ انہیں کچھ نہیں کرنا تھا۔ جو کچھ پیش آیا، اسے من و عن بیان کر کے وہ اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جاتے۔ باقی تفتیش کرنے والے تفتیش کرتے رہتے کہ حادثے کی کیا وجوہات تھیں۔

نے ارتعشی کے ساتھ معاذ کو میڈم ایکس کی حادثے کا شکار گاڑی کی طرف جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اگرچہ سڑک پر سے انہیں وہ گاڑی نظر نہیں آ رہی تھی لیکن حادثہ جس نوعیت کا ہوا تھا، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ بہت بری صورت حال پیش آئی ہوگی۔

”میرے خیال میں ہم بھی چل کر دیکھ لیتے ہیں۔“ ماہ بانو نے ایک نظر عقب سے نمودار ہوتی گاڑی پر ڈالی اور رائے دی۔

”ہوں۔“ شہر یار نے ہنگارا بھرا اور اپنی گاڑی سائڈ پر لگانے لگا۔ جب تک اس نے یہ کام نہ پایا، پیچھے سے آنے والی گاڑی انہیں کراس کر کے آگے بڑھ چکی تھی۔ جب وہ سڑک کے اس حصے سے جہاں میڈم ایکس کی گاڑی کو حادثہ پیش آیا تھا، بخیر وعافیت گزر گئی تو ماہ بانو نے سکون کا سانس لیا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر سڑک پر کیلیں ڈالی گئی ہوں گی تو گزرنے والی کوئی دوسری گاڑی بھی حادثے کا شکار ہو سکتی ہے لیکن ایسا نہیں ہوا تھا تو اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ ارتعشی اور اس کی ٹیم نے کوئی اور طریقہ استعمال کیا تھا۔

”بہت مشکل ہے کہ وہ بچ سکی ہو۔“ انہوں نے اوپر سڑک کے کنارے سے پہلو کے بل مری گاڑی کو دیکھا اور پھر دیکھ کر ماہ بانو نے تمبرہ کیا۔

”چل کر دیکھتے ہیں۔“ شہر یار نے گاڑی کے قریب موجود ارتعشی اور معاذ کی حرکات و سکنات سے اندازہ لگالیا تھا کہ وہ اندر پھنسی میڈم ایکس کو باہر نکالنے میں کامیاب نہیں ہو پارہے ہیں۔ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ والی سائڈ زمین سے لگی ہوئی تھی جبکہ دوسری جانب کے دروازے یقیناً جام ہو گئے تھے جو معاذ اور ارتعشی کی کوشش کے باوجود کھل کر نہیں دے رہے تھے۔ اس کوشش میں ناکام ہو کر انہوں نے گاڑی کو سیدھا کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ شہر یار بھی تیز جہز قدموں سے چلتا ہوا ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔

اتنی شاندار گھڑی گاڑی کا حشر نشر ہو گیا تھا۔ حادثہ جس نوعیت کا تھا، کوئی دوسری عام سی گاڑی ہوتی تو اس سے بھی بری حالت میں ہوتی۔ بہر حال وہ اس گھرے ہوئے ہاتھی کو کسی نہ کسی طرح سیدھا کھڑا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اندر میڈم ایکس بری حالت میں تھی۔ اس نے سیٹ بیلٹ باندھی ہوئی تو پھر بھی کچھ نہ کچھ بچت ہو جاتی لیکن اب تو حال برا ہو گیا تھا۔ وہ چہرہ جو بہت خوبصورت ہوا کرتا تھا، خون اور زخموں سے بھرا ہوا تھا۔ سامنے کے سارے دانت ٹوٹ گئے تھے۔ جڑائیڑھا ہو چکا تھا۔ اس

”کیا سوچ رہے ہیں آپ؟“ نیلی نے کھالے کی ڈے میز پر رکھی اور عالم شاہ کے مقابل بیٹھے ہوئے اس سے پوچھا۔

”سوچنا کیا ہے، بس بور ہو گیا ہوں اس یکساں اور محدود زندگی سے۔ کھانا، پینا، سونا..... بس یہی رہ گیا ہے میری زندگی میں۔“ وہ سخت جھنجھلایا ہوا اور بیزار تھا۔

”کرنے کو تو بہت کچھ ہے لیکن آپ نے خود اپنی زندگی کو محدود کر لیا ہے۔ آپ راضی ہو جائیں تو میں روزانہ آپ کو سیر کے لیے باہر لے جاؤں۔ آپ فزیو تھراپی کے سیشنز لیں، سوشل میڈیا پر ایکٹو ہوں، اپنے بزنس اور پراپرٹی کے معاملات دیکھیں۔ آج کل ایک جگہ بیٹھے بیٹھے آن لائن سب کچھ ہو جاتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ بندہ خود جینے کی کوشش کرے۔“

”تم نہیں سمجھو گی نیلو فرامیں نے اتنا کچھ کھویا ہے کہ میرا اب جینے میں دل ہی نہیں لگتا۔“

”میں اچھی طرح سمجھتی ہوں کیونکہ میں اس سب سے گزر چکی ہوں۔“ نیلی نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ پھر شکوہ کرنے والے انداز میں بولی۔

”کیا آپ کے لیے میرا ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا؟ ٹھیک ہے، میں آپ کو اپنے خونی رشتوں جتنی عزیز نہیں ہو سکتی لیکن کچھ نہ کچھ تو جگہ بھی آپ کے دل میں میرے لیے۔“

”جگہ تو آج بھی ہے لیکن دل اس بات کو گوارا نہیں کرتا کہ تمہاری زندگی کو اپنی معذوری کے ساتھ باندھ کر اسے برباد کر دوں۔“

”جو زندگی بامقصد ہو، وہ برباد نہیں ہوتی۔ آپ یقین کر لیں کہ آپ کے ساتھ بندھ کر میں کبھی کوئی پچھتاوا محسوس نہیں کروں گی۔ میں زندگی کے اس دور سے گزر گئی ہوں جس میں انسان کو سیر و تفریح، شاپنگ یا ہلا گلا ہی سب کچھ لگتا ہے۔ جب انسان صرف اور صرف اپنے لیے جیتا ہے۔ اب میں اپنی زندگی میں کچھ ایسا کرنا چاہتی ہوں جس سے انسانیت کو فائدہ ہو اور میرے دل کو سکون ملے۔ اگر آپ میرا ساتھ دیں تو میں یہ سب کر سکتی ہوں۔“ اب وہ گویا اس سے درخواست کر رہی تھی۔

”کیا چاہتی ہو؟“ عالم شاہ نے تجسس سے پوچھا۔

”سبکل کے خواب کی تعبیر حاصل کرنا۔ وہ اپنے لوگوں کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتی تھیں۔ آخری بار میری ان سے جو گفتگو ہوئی تھی، اس میں بھی انہوں نے یہی کہا تھا کہ وہ

اپنے گاؤں میں کالج بنانا چاہتی ہیں تاکہ گاؤں کے بچے بچوں کو اسکول سے آگے تعلیم حاصل کرنے میں پریشانی کا سامنا نہ ہوں۔“

”مجھے یقین ہے سبکل نے یہی سب کہا ہوگا۔ بہت حساس اور نرم دل تھی میری بہن۔“ عالم کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

”وہ بہن چلی گئی لیکن اس کے خواب زندہ ہیں، اس کا پینا آپ کی توجہ کا خنجر ہے اور مول بھی۔ گھر کی سب سے چھوٹی اور لاڈلی بیٹی کو اب صرف بڑے بھائی کی محبت نہیں چاہیے، اب آپ کو ان سارے رشتوں کا نعم البدل بننا ہوگا۔ ان کا خلا پُر کرنا ہوگا جنہیں وہ کھو چکی ہے۔“ آج موقع ملا تھا تو اس نے عالم شاہ کو ہر زاویے سے زندگی کی طرف پلٹانے کی کوشش شروع کر دی تھی۔

”شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“

”شاید نہیں، میں یقیناً ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ بیٹے امن

ہوتے ہیں اپنے خاندان کی عزت، روایات اور ذمہ داریوں کے۔ آپ کو بھی یہ سب کرنا ہوگا۔“ اس نے زور دیا۔

”اس ادھر رہے وجود کے ساتھ؟“ دھیل چیر پر بیٹھے عالم شاہ کے لہجے کی بے بسی اور کرب محسوس کن تھا۔

”آپ کے ادھر رہے پن کو میں اپنی ذات سے مکمل کر دوں گی۔“ اس نے یقین دلایا۔

”تھک تو نہیں جاؤ گی؟“

”کبھی گلے کہہ نہ سکتے تھے لگی ہوں تو اپنی محبت کا سہارا دے دیجیے گا۔“ وہ کچھ اس ادا سے بولی کہ عالم شاہ اس کی شکل بکتا رہ گیا۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہیں۔ کیا نہیں دیں گے سہارا؟“

نیلی نے شوخی سے پوچھا۔

”میں تو خود تمہارے سہارے جی رہا ہوں۔“

”بس تو پھر میری بات مان لیجیے۔“

”کون سی بات؟“

”زندگی کو جینا شروع کر دیں اور ترک وطن سے تاب ہو جائیں۔ ہمارا سب کچھ اپنے وطن میں ہے۔ ہم وطن میں رہ کر وطن کی خدمت کریں گے تو ہی سکون پائیں گے۔“

”سکون کی تو بہت ضرورت ہے مجھے۔“ عالم شاہ بڑبڑایا۔

”اماں، بابا سائیکس، سرمد اور سبکل..... سب میرے خوابوں میں آتے ہیں۔ ان کے چہروں پر اداسی اور انداز میں بے چینی ہوتی ہے۔“

”اس اداسی اور بے چینی کو دور کرنے کا تو بس ایک ہی

حقیقت کو بھلا نہیں جاسکتا تھا۔

”تمہاری مام کو ابھی تک ہوش نہیں آیا۔ اکثر دکھائی دے گا کہ ایک ہیڈنٹ کے بعد کسی لمحے ہونے والے برین ہمرج نے نقصان کو بہت بڑھا دیا ہے۔ انہیں اس بات کا امکان بہت کم دکھائی دے رہا ہے کہ مریمیں کی آنکھیں دوبارہ کبھی کھل سکیں۔“ ایک قلیل سے وقفے کے بعد اس نے موضوع بدل دیا۔

”یقیناً وہ اپنے مفکورہ شہر دن کی طرح اسرائیل کی دنیا پر حکمرانی کے خواب آنکھوں میں لیے عالم بے ہوشی میں ہی اس دنیا سے رخصت ہو جائے گی۔“ سونیا نے سن کر پٹا لہجہ میں تبصرہ کیا۔

”تمہیں اپنی ماں کی حالت پر کوئی دکھ نہیں ہے؟“ معاذ

نے حیرت سے پوچھا۔
”وہ ماں کہاں تھی؟ وہ تو بس میڈم ایکس تھی۔ ہولی کولڈن اسٹار کی رکن یا پھر رابیل تھی۔ اسرائیل کی دو وقار بیٹی جس نے غیر یہودی ہونے کے جرم میں اپنے شوہر کی جان لے لی تھی اور اس پر بھی اسے لگا تھا کہ کفارہ ادا نہیں ہو سکا تو اس شخص کی بیٹی کو اسرائیل کی خدمت گار بنا کر ساری عمر وہ قرض ادا کرواتی رہی جو مجھ پر واجب ہی نہیں تھا۔ تم ہی بتاؤ کہ میں اس عورت کے لیے دیکھی کیسے ہوں جس نے آنکھ کھولنے سے پہلے مجھ سے باپ کی شفقت تو چھینی ہی چھینی تھی، ساتھ ہیشتہ ماں کی آغوش کی گرمی سے بھی محروم رکھا تھا۔“ سونیا کے لہجہ میں ایسا کرب تھا کہ معاذ اس موضوع کو چھیڑنے پر ہی شرمندہ ہو گیا۔

”آئی ایم سوری!“

”اٹس اوکے..... لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک ایسے وقت میں جبکہ ہم ایک اہم ترین مشن کے لیے روانہ ہونے والے ہیں، ہم ایسے فضول موضوعات کو ڈسکس ہی کیوں کر رہے ہیں؟ ہمارا سارا فوکس تو اپنے مشن پر ہونا چاہیے نا؟“ سونیا نے تیزی سے اپنا موڈ تبدیل کر لیا۔

”ہمارا ہوم ورک مکمل ہے۔ سب کچھ ریڈی ہے۔ بس ابوجزہ کی طرف سے ملنے والے اشارے کا انتظار ہے اور کم از کم میں تو اسی انتظار کی کیفیت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے زحمت اُدھر کی ہانکنے میں مصروف ہوں۔“

”میں بھی ایسا ہی کچھ کر رہی ہوں۔“ سونیا ہنسی لیکن آج اس کی ہنسی میں وہ پہلے والی کھٹک نہیں تھی۔ مضبوط سے مضبوط انسان بھی جذبات سے مکمل طور پر عاری نہیں ہو سکتا۔ وہ بھی ایک طرف اپنے واحد خونی رشتے سے ملنے والے زخموں سے بڑھ چلا تھا تو دوسری طرف یہ ظاہر کرنے میں ہلکا ہوئی جارہی تھی کہ اسے اپنی بے درد ماں کے انجام پر کوئی دکھ نہیں ہے۔

طریقہ ہے کہ آپ ان لوگوں کی بہتری کے لیے کام کریں جن سے وہ محبت اور اسیبت رکھتے تھے۔ اسیبت کی صلاح کے لیے کیے گئے کام آپ کے دل کو بھی سکون دیں گے اور آپ کے پیاروں کے لیے بھی صدقہ جاریہ بنیں گے۔“ نیلی کا مشورہ اتنا پُر غور تھا کہ وہ اسے ماننے سے انکار کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کے ڈی این اے میں موجود نیکی اور راست ہاڑی نے ہمیشہ اسے حق کا ساتھ دینے پر مجبور کیا تھا۔ اسی فطرت کی وجہ سے اس نے معاذ کے ساتھ اپنی دوستی بھائی تھی اور اب وہی فطرت اسے ایک بار پھر میدانِ عمل میں اترنے پر راضی کر چکی تھی۔ کہنے کو وہ کچھ اچھا کرنے جا رہا تھا لیکن اسے معلوم تھا کہ وطن عزیز میں لوگوں کی فلاح کے لیے اٹھنے والے کو بھی کڑے امتحان سے گزرنا پڑتا ہے۔ وہ اپنی تمام تر جسمانی کمزوریوں کے باوجود اس امتحان سے گزرنے کے لیے تیار ہو گیا تھا کہ نیلی کا مضبوط جذباتی سہارا اس کی طاقت و ہمت قائم رکھنے کے لیے میسر آ گیا تھا۔ جیسے کے لیے ایسے سہارے میسر آ جائیں تو مشکل حالات میں بھی زندگی کو جاری رکھنے کے اسباب بن جاتے ہیں۔ اس کے لیے بھی قدرت نے اسباب پیدا کر دیے تھے۔

☆☆☆

”ماہ بانو اور شہریار واپس چلے گئے؟“

”ہاں، انہیں لوٹنا ہی تھا۔ وہ اپنے حصے کا کام انجام دے چکے تھے۔ ان کا ویزا بھی ختم ہونے والا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میرے منظر سے غائب ہونے کے بعد ان کے یہاں رہنے کا کوئی جواز ہی نہیں تھا۔ وہ صرف میری سپورٹ کے لیے یہاں موجود تھے اور اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔“ معاذ نے اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے بھی اس نقشے پر سے نظریں نہ ہٹائیں جو کارمل کی پہاڑیوں پر کیسپنگ والی رات اس نے تک کو پہنا تاؤ کر کے اس سے حاصل کردہ معلومات کی روشنی میں بنایا تھا۔

”نہیں اپنے دوست ملک سے الگ راہ اختیار کر کے تم لوگوں نے اپنے لیے کوئی مشکل تو کھڑی نہیں کر لی ہے۔ وہ تم لوگوں سے ناراض بھی ہو سکتے ہیں۔“

”ناراض ہونے کا حق تو ہمارا ہے کہ ہمیں بہت سارے معاملات میں اندھیرے میں رکھا گیا۔ دوستی کا احترام دونوں طرف سے رکھا جانا ضروری ہے۔ تم فکر نہ کرو، کوئی ناراضگی ہوگی بھی تو ہمارے اکابرین اسے بات چیت سے دور کر دیں گے۔“ اس نے سونیا کو تسلی دی۔

”مفادات کا معاملہ ہو تو ناراضگیاں بھلائی پڑتی ہیں۔“ سونیا کے لہجہ میں خفیف سا طنز تھا۔ معاذ چپ رہا۔

"زندگی"۔ یہ بحث بالکل بھینسا ہے لیکن میں خود کو خوش
 دیکھتا ہوں اور اس کے بجائے قدم قدم پر غلطیوں اور غلطیوں کا ساتھ میسر
 رہا ہے۔ وہ غلطیوں کا ساتھ بنفوں نے مشکل سے مشکل حالات
 میں مجھے نکال دیا ہے پھوٹا اور تم ان دو غلطیوں میں سے بھی وہ دو
 ہیں۔ خدا اور۔ غلطیوں پر میرے سامنے لانا رہا۔ تم نے میری
 ساری غلطیوں، غلطی، ہذا اعتمادی اور بے نیازی کے ہا وجود بھی
 میرا ساتھ کر لیں پھوٹا اور آج موت کے اس سفر پر بھی میری ہم
 قدم ہو۔ میں تمہارا بہت شکر گزار ہوں سوچنا "معاد نے جذباتی
 ہی کیفیت میں اس کے دونوں ہاتھ تمام لیے۔ سوچنا کے لیے تو
 شاید یہ لکھ اس کی پوری زندگی کا حاصل تھا۔ وہ اتنی جذباتی ہوئی
 کہ پھوٹا پھوٹ کر رو پڑی۔

”پلیز سونیا..... پلیز“ معاذ اس کے یوں رونے پر
 بوکھلا اٹھا اور بے ساختہ ہی اسے سینے سے لگا لیا۔ سونیا کے لیے تو
 پہلے زندگی کی سب سے بڑی نعمت تھا۔ اس نے تو کبھی سوچا ہی
 نہیں تھا کہ معاذ احمد بھی خود اپنی مرضی سے اسے اپنے سینے سے
 لگا سکتا ہے۔ اسے لگا کر خوشی کی انتہا پر اس کے جسم کا ہر خلیہ رقص
 کرنے کی خواہش میں بکھر کر رہ گیا ہو۔ وہ سنبھلتی تو کیا خاک،
 مزید یوں ٹوٹ کر روئی کہ معاذ شرمندہ ہو گیا اور سوچا۔

’میں اس عورت سے نفرت کرتا رہا جو آج تک خود کسی کے اشاروں پر راج رہی تھی۔ حسن، جوانی، ذہانت، پھرتی..... کون کون سے اوصاف نہیں تھے اس میں۔ خطروں سے کھیلنا اور مقابلے کو منٹوں میں چاروں شانے چت کر دینا تو گویا کوئی بات ہی نہیں تھی۔ چاہتی تو زمانے کو اپنے اشاروں پر بچا سکتی تھی لیکن اپنے دل کی ماننے پر اختیار نہیں رکھتی تھی۔ بہت کچھ ہوتے ہوئے بھی اندر سے وہی عام سی عورت تھی جس کے لیے اپنے محبوب کی ایک نظر دنیا کی ہر نعمت سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ وہ اسے سنبھالنے کی کوشش کرتا مسلسل سوچے جا رہا تھا۔ بڑی مشکل سے جا کر اس کے آنسو تھے تو اسے شالوں سے تمام کر ایک کرسی پر بٹھایا اور پینے کے لیے پانی دیا۔“

”شکریہ“ وہ پانی پی کر کچھ بہتر ہوئی تو قدرے شرمندگی سے بولی۔

”تم نے سمندر کے سفر سے قبل ہی میرے سامنے اپنے آنسوؤں کا سمندر کھڑا کر دیا۔“

”میں بس ایسے ہی خوا خواہ جذباتی ہو گئی تھی۔“ وہ اب کسمپالی سی ہونے لگی۔ بات ابھی مزید آگے بڑھتی کہ ارتضیٰ اجازت لے کر اعدا آگیا۔ اس کی صورت دیکھتے ہی وہ دونوں



رات گئے بارش کے ساتھ قے فراق دو سال کے
 ماہ اکتوبر 2024ء کے شمارے کے کمرے میں
اولین سوغات

قدم قدم پر حیرت، تجسس اور خوف کی لہروں میں
ڈوبتی ابھرتی خون آشام مہم کا سنسنی خیز ماجرا.....
فسوں ساز یعقوب بھٹی کے قلم سے
جنگل

جنگل کا قانون انسانی معاشرے میں در آئے تو پھر
تہذیب مری جاتی ہے۔ انسان اور انسانیت کی تذلیل
کرنے والے درندوں سے ٹکرا جانے والے لوجوان
کی داستان جدوجہد

قدم قدم پر بروستی مصیبتوں کا مقابلہ کرنے
والے ایک دلیر نوجوان کی کوحبہ گردی
حسام بٹ کے قلم سے سلسلے وار کہانی

سرواق کے رنگ
پہلا رنگ

خوابوں سے بے دل میں رہے
 قدموں داخل ہونے والے جرم کا خمیازہ
 — دوسرا رنگ —

اس جہان خواب میں بسا شہر
جس کا کوئی مکان تھانہ دروازہ

چینی نکتہ چینی

آپ کے تبرے... مشورے... محبتیں...
 دکھائیں... اور نئی دلچسپ باتیں... کھائیں

سمجھ گئے کہ مطلوبہ پیغام مل گیا ہے۔ تیار تو وہ تھے ہی۔ فوراً روانگی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ پون گھنٹے کے اندر وہ سہولیات سے لیس ایک کشتی پر سوار تھے۔ بظاہر وہ ایک تفریحی کشتی تھی لیکن وقت ضرورت اس پر اپنے دفاع کے سارے انتظامات موجود تھے۔ صبح کے دھندلکے میں انہوں نے عرثے پر کھڑے ہو کر ایک رومانوی جوڑے کی طرح سفر کا آغاز کیا۔ ارتضیٰ کیپٹن کے ساتھ نیچے کنٹرول روم میں تھا۔ عام حالات میں تفریح پر جانے والوں کے لیے ان کی ڈیمانڈ کے مطابق خدمت گار عملہ بھی موجود ہوتا تھا لیکن ابو حمزہ کے ان خاص مہمانوں کو کسی خدمت گار کی ضرورت نہیں تھی۔

”آؤ، نیچے چلتے ہیں۔“ صبح کا دھندلکا روشن دن کے آغاز میں تبدیل ہونے لگا تو معاذ نے سونیا سے کہا۔ نیچے جا کر وہ دونوں پوری سنجیدگی کے ساتھ اپنی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ کچھ دیر بعد وہ مکمل طور پر اسکو با ڈائیونگ کے لباس میں تیار تھے اور ان کی کشتی ایک خاص سمت میں بہہ رہی تھی۔ ”ذہر درست۔ کہیں کوئی کمی نہیں ہے۔“ ارتضیٰ کنٹرول روم سے نکل کر آیا تو ان کی تیاری دیکھ کر داد دی۔

”بس اب تو صرف تمہاری طرف سے اشارے کا انتظار ہے۔“ معاذ نے اسے باور کروایا۔ اصل میں ابو حمزہ کی طرف سے اسے پیغام بھجوایا گیا تھا کہ اگر وہ اس کی طرف سے بھیجے جانے والے اشارے کا انتظار کرے تو اسے اپنے کام کے لیے ایک ایسا آئیدیل لچہ میسر آجائے گا کہ اسرائیلی فورسز کو اس کی طرف توجہ دینے کی فرصت ہی میسر نہیں ہوگی۔ وہ ابو حمزہ سے اتنے بڑے دعوے کی وجہ دریافت نہیں کر سکتا تھا لیکن اس نے اس کی پیشکش کو قبول کر لیا تھا اور اس وقت ارتضیٰ سے اسی حوالے سے مخاطب تھا۔

”میں خود بھی منتظر ہوں۔“ ارتضیٰ کا جواب مختصر تھا۔

وقت آہستہ رومی سے مزید کچھ آگے بڑھا تو انہیں اپنا مطلوبہ اشارہ مل گیا۔ دونوں نے جس لمحے پشت پر بھاری واٹر پروف بیگ پہنے، جس لمحے سمندر میں چھلانگ لگائی، گھڑی کی سوئیاں ٹھیک ساڑھے آٹھ بج رہی تھیں اور یہ وہ وقت تھا جب جنوبی اسرائیل یکدم دھماکوں سے گونج اٹھا تھا۔ سمندر، فضا اور زمین سے بیگ وقت کیے گئے حملوں نے اسرائیل میں افراتفری مچا دی تھی۔

وہ دونوں اس سارے ہنگامے سے بے خبر گہرے سمندر میں تیرتے ہوئے اپنی منزل تک پہنچنے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ کلائی پر بندھا گھڑی نما واٹر پروف سمت پیمان کی بالکل ٹھیک ٹھیک راہنمائی کر رہا تھا۔ آخر کار انہوں نے اس مقام تک رسائی

حاصل کر لی جہاں تک کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق ان کے ریسرچ اینڈ آپریشن سینٹر سے ایک خفیہ راستہ براہ راست سمندر میں کھلتا تھا۔ اس راستے سے ضرورت پڑنے پر وہ آبدوز نمائندگی باہر نکالی جاتی تھی جو بے شمار سائنسی آلات سے لیس تھی۔ کشتی وہاں سے سفر کرتی ہوئی کھلے پانیوں میں نکلتی تھی اور مناسب مقام پر پہنچ کر آپریشن شروع کر دیا جاتا تھا۔ کشتی پر سے معنوی سیٹلائٹ تک اپنا مطلوبہ سکنل بھیجنے اور مخصوص نتائج حاصل کرنے تک اتنی پیچیدہ سائنسی اصطلاحات تھیں جنہیں سمجھنا عام آدمی کے بس کی بات نہیں تھی۔ انہیں یہ سب سمجھنا بھی نہیں تھا۔ انہیں بس اس مقام تک رسائی حاصل کرنا تھی جہاں سے طاقت اور اختیار کے خنوں میں انسانیت کا کل عام کیا جا رہا تھا۔

تک نے انہیں بتایا تھا کہ آبدوز نمائندگی کے اخلا کے اس راستے پر کسی خاص سکیورٹی کے انتظامات نہیں تھے اور بس اتنا مسئلہ تھا کہ وہ راستہ صرف اندر سے کھولا جاسکتا تھا۔ باہر سے اسے کھولنے کا کوئی طریقہ کار وضع نہیں کیا گیا تھا۔ ہاں، زور زبردستی یا قنب لگانے کی الگ بات تھی لیکن اس کے لیے سب سے پہلے تو سمندر کی گہرائی میں اتر کر پانی کا بے تحاشا دباؤ برداشت کرنا پڑتا پھر اس راستے کو تلاش کرنا پڑتا جو الگ سے دکھائی نہیں دیتا تھا۔ تک نے وہاں سکیورٹی کی کمروں کی تعصیب کا بھی ذکر کیا تھا اور اتنا خطرہ مول لیا تو لازم تھا چنانچہ ان دونوں نے اپنا سفر جاری رکھا اور آخر کار مطلوبہ مقام پر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس جگہ پہنچنے کے بعد سونیا نے اپنے بیگ میں ہاتھ ڈال کر ایک مستطیل ٹیلیٹ نما آلہ نکالا اور سمندر کی گہرائیوں میں گم ہوتی مضبوط دیوار پر جگہ جگہ رکھ کر چیک کرنے لگی۔

اس آلے کی مدد سے وہ دیوار کے پیچھے موجود خلا کو چیک کر رہی تھی۔ ظاہر ہے جہاں راستہ ہوتا ہے، وہاں ٹھوس دیوار کے بجائے خلا ہوتا ہے۔ وہی خلا جس سے عمارت کے اندر کشتی کی آمد و رفت ہوتی۔

”مل گیا۔“ آخر ایک مقام پر اسے اپنا مطلوبہ نتیجہ مل گیا تو اس نے زیر لب بڑبڑاتے ہوئے معاذ کو وکٹری کا نشان دکھایا۔ معاذ جو اس عرصے میں اپنے بیگ سے دو گن نما آلات نکال چکا تھا، تیزی سے اس مقام کے قریب آیا۔ پانی کے اندر رہ کر یہ سارے حرکات و سکنات انجام دینا زمین پر کچھ کرنے کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ مشکل تھا لیکن وہ کسی بھی مشکل کو خاطر میں لائے بغیر من کی بازی لگائے ہوئے تھے۔

راستے کا درست تعین ہونے کے بعد سونیا نے ٹیلیٹ نما آلہ چھوڑ کر معاذ کے ہاتھ سے ایک گن لے لی۔ یہ لیزر گن ٹائپ

”کوئی لیکن نہیں ایسی مشکل فیصلوں کے بعد لیکن کی گنجائش نہیں رہتی۔ میرے لیے خوشی کی بات یہ ہے کہ میرا بچہ جب اس دنیا میں آئے گا تو اس کے پاس اپنے باپ کے حوالے سے کوئی گلٹ نہیں ہوگا۔“

”تم..... تم نہیں آؤ گے ہمارے ساتھ؟“ آمنہ نے لرزتی آواز میں پوچھا۔

”میں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہی رہوں گا۔“ نک جانتا تھا کہ آنے والا وقت آمنہ کو اس کے ہر سوال کا جواب دے دے گا۔

”آئی کو یونک ا“ آمنہ بے قراری سے بولی۔

”آئی کو یو لو ڈارلنگ! بس اب میں فون بند کر رہا ہوں۔

تمہارے اور میرے دونوں کے پاس ہی وقت ختم ہو رہا ہے۔“

”نک.....!“ آمنہ نے تڑپ کر اسے پکارا۔ نک نے دل پر پتھر رکھتے ہوئے سلسلہ منقطع کر دیا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اس مصروفیت میں بھی اس کا ذہن آمنہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ تیار ہو رہی ہے، انٹرپورٹ کی طرف جارہی ہے، ڈیپارچر لاؤنچ میں بیٹھی ہے، جہاز میں سوار ہونے جارہی ہے۔ گھڑی کا ہر نئے ہندسے پر پہنچتا کاٹنا اسے بتاتا جا رہا تھا۔ کاٹنا جب ایک مخصوص ہندسے پر پہنچا تو اس نے صرف اپنے تصور پر اکتفا نہیں کیا اور انٹرپورٹ انکوائری پر فون کر کے تصدیق ضروری سمجھی کہ جس فلائٹ میں ایسی اور اس کے چاکی بیٹیں تک تھیں، وہ اپنے تمام مسافروں کے ساتھ اڑان

بھرنے لگی تھیں۔ تصدیق ہو چکنے کے بعد اس کے چہرے پر اطمینان اتر آیا۔ اب بس اسے پانچ منٹ کے وقفے سے اپنا کام شروع کر دینا تھا۔ ان پانچ منٹوں کے گزرنے میں تیس سیکنڈ رہ گئے تھے تو ایک دم ہی پوری عمارت میں ہلچل مچ گئی۔

”اسرائیل پر میزائلوں سے حملہ۔“ خبر نہیں، ہم تھا جس نے ہر طرف سراپسیکی پھیلا دی تھی۔ وہ بھی اس خبر کو سن کر بھونچکا رہ گیا لیکن فوراً ہی اس احساس نے اسے سنبھال لیا کہ یہ خبر اس کے کام کو سبیل بنانے میں اہم کردار ادا کرے گی۔ ایسا ہی ہوا۔

جیسے ہی اس کے ہاتھ نے الارم کے بٹن کو چھوا اور عمارت میں الارم کی آواز گونجی، پہلے سے بیٹھے ہوئے لوگوں نے تیزی سے باہر کا رخ شروع کر دیا۔ وہاں بہت زیادہ افراد کام نہیں کرتے تھے۔ تین منٹ کے اندر اندر پوری عمارت خالی ہو گئی۔ ایک گوشے میں چھپا تک عمارت خالی ہونے کے بعد

کنٹرول روم میں داخل ہوا اور کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ کر تیزی سے کی بورڈ پر انگلیاں چلانے لگا۔ ابھی اس نے اسکرین پر اس ایگزٹ ڈور کو جس سے آبدوز نمائشی سمندر میں داخل ہوئی تھی، فوکس ہی کیا تھا کہ ریڈ سسٹمز ملنا شروع ہو گئے۔ وہ جانتا تھا کہ یہ

ریڈ سسٹمز اس بات کی نشاندہی کے لیے ہیں کہ ایگزٹ ڈور کے ساتھ کوئی گزربڑ ہے اور ماہرین کو اسے چیک کر کے پیدا ہونے والی خامی کو دور کرنا چاہیے۔ وہ جب سے یہاں ملازمت کر رہا تھا، ایک بار بھی ایسی نوبت نہیں آئی تھی۔ مخصوص اوقات میں باقاعدگی سے کیا جانے والا ماہرین کا معائنہ اس کی نوبت ہی نہیں آنے دیتا تھا۔

”ادگا ڈا! سب ٹھیک رہے۔“ اس کے دل میں اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں پیدا ہونے والی گزربڑ ایسی نہ ہو کہ وہ اپنا کام ہی نہ کر سکے اس نے تڑپ کر دعا کی اور کی بورڈ پر دوبارہ انگلیاں چلانے لگا۔ جیسے ہی کمانڈ مکمل ہوئی، ایگزٹ ڈور ایک جھٹکے سے

کھلا۔ یہ غیر معمولی تھا۔ اس نے اپنی ملازمت کے طویل عرصے میں کبھی اس ڈور کو اس انداز سے کھلتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو یوں کھلا تھا جیسے بس کہیں پر ذرا سا انکا ہوا ہی تھا۔ ڈور کے کھلتے ہی وہ خود کار نظام کام کرنے لگا تھا جس کے تحت ایسا دباؤ پیدا ہوتا

تھا جو سمندری پانی کو اندر نہیں آنے دیتا تھا۔ اب بھی حسب معمول پانی اندر داخل نہیں ہوا لیکن اس نے اسکو با ڈائیونگ کے لباس میں دو افراد کو اس دروازے پر دیکھا۔ اسے حیرت کا

شدید جھٹکا لگا۔ وہ کون تھے اور کس مقصد کے لیے وہاں موجود تھے؟ اس کے پاس ان سوالوں کے جواب حاصل کرنے کی مہلت نہیں تھی۔ اس نے تو الارم تک بند کرنے کی زحمت نہیں کی تھی جسے لوگوں کے عمارت سے اخراج کے لیے بجایا گیا تھا۔

”چلے جاؤ یہاں سے۔ یہ میری جگہ ہے اور آج کے دن میں یہاں کسی کو اپنے ساتھ نہیں دیکھنا چاہتا۔“ وہ بڑبڑایا اور

کنٹرول بیٹل پر چند بیٹنوں کو دبایا۔ نتیجتاً دباؤ اتنا بڑھا کہ وہ دونوں افراد جو پہلے ہی بہ مشکل اس جگہ پر موجود تھے، خود کو مزید نہیں سنبھال سکے اور دباؤ نے انہیں باہر کی طرف دھکیل دیا۔ نک کو نہیں معلوم تھا کہ ان دونوں کا کیا انجام ہوگا۔ اسے

بس اپنا کام انجام دینا تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ دباؤ کو کم کرنا شروع کر دیا۔ جوں ہی دباؤ کم ہوا، سمندر کے پانی کو اندر گھسنے کا موقع مل گیا۔ وہ جانتا تھا سنوں کے حساب سے اندر داخل ہوتا

پانی چند لمحوں میں اس سمیت اس عمارت کو پوری طرح ڈبو دے گا اور یہاں تباہی کے سوا کچھ بھی باقی نہیں رہے گا لیکن پھر بھی وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ اس وقت اس کے تصور میں سیلابی پانی سے گھرے ایک چٹانی پتھر پر پناہ لیے وہ بے بس ماں اور بچے تھے جنہیں بظاہر سیلاب نے لیکن حقیقتاً اس کی قوم کے جوان حکمرانی نے غرقاب کر دیا تھا۔ اسے اپنی جان کی قربانی دے کر اس کا کفارہ ادا کرنا تھا جو وہ گزرا تھا۔ اس کے بعد ویسے بھی اس کے جینے کا کوئی امکان نہیں تھا، تو بہتر تھا کہ وہ اپنی پسند کی

”تہا یما۔ تہا یما۔“

پھولے، ٹولے سے چور پھرے تھے جو ہواؤں پر پلٹ کر
سکر اہٹ سہائے کلاخ کے بندھن میں بندھے والے جوڑے
کو بڑھ چڑھ کر مبارک باد دے رہے تھے۔ البتہ کسی ہار-بکار
کے سادہ سے ٹپے میں موجود جوڑا تین سی کراہٹ کے ساتھ
ان مبارک بادوں کو وصول کر رہا تھا۔ آخر کار مبارک باد دینے
والے ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے۔ وہاں کسی ٹوٹی کو
زیادہ دیر تک منانے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔

”تھینک یو سوچ معاذ“ سب کے جانے کے بعد بہن،
دلہا سے مخاطب ہوئی۔

”ہم دونوں ہی کو ایک دوسرے کی ضرورت تھی کہ ہماری
زندگیوں میں اب ایک دوسرے کے سوا کچھ بچا ہی نہیں ہے۔“
معاذ ادا اس سا سکرایا۔

”اور شاید ہم بھی ایک دوسرے کے لیے ہی بنے ہیں۔“
یہ جملہ ادا کرتے ہوئے سونیا کو سمندر کی گہرائی میں گزرے
ہولناک لمحات یاد آئے۔

وہ مرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو کر ہی سمندر میں
اترے تھے لیکن وہ لمحہ جب بے پناہ دباؤ نے انہیں دھکیل کر
بے رحم موجوں کے سپرد کیا تھا، بہت سخت تھا۔ زندہ رہنے کی جلی
خواہش انہیں ہاتھ پیر چلانے پر مجبور نہ کرتی تو شاید وہ لہروں
میں بننے والے بھنور سے بھی بچ کر نہیں نکل سکتے تھے۔ خوش
قسمتی یہ تھی کہ سطح پر آنے کے بعد وہ اس تفریحی کشتی تک بھی پہنچنے
میں کامیاب ہو گئے تھے جو پروگرام کے مطابق ان کے سمندر
میں چھلانگ لگاتے ہی وہاں سے ہٹ گئی تھی مگر کچھ فاصلے پر پہنچ
کر اس میں کوئی ایسی خرابی پیدا ہو گئی تھی جس کی وجہ سے سفر
روکنا پڑا تھا۔ کشتی کا رکنا ان کی جانیں بچا گیا تھا اور حیرت انگیز
طور پر ان کے کشتی میں سوار ہوتے ہی وہ خرابی بھی دور ہو گئی
تھی۔ بقول ارتضیٰ، یہ سب منجانب اللہ تھا اور جب اللہ نے
انہیں بچایا تھا تو انہوں نے بھی اللہ کی حمایت میں شامل ہونے
میں دیر نہیں کی تھی۔ اگرچہ معاذ کو اسرائیل پر کیے گئے حملے کے
حوالے سے کچھ تحفظات تھے لیکن موجودہ حالات میں یہ طے تھا
کہ اب وہ اس خطے سے نہیں نکل سکتے۔ جب رہنا وہیں تھا تو
اس گروہ کے ساتھ شامل ہو کر کیوں نہ رہا جاتا جو مظلوموں پر
مشتمل تھا۔ وہ ابو حمزہ کی جماعت میں شامل ہو کر مستقل طور پر
غزہ آگئے تھے اور اب دن رات غزہ کے جنگ زدہ علاقے
میں زنیوں، بوڑھوں اور بچوں کے لیے بھاگ دوڑ کرتے

”مجھے لگتا ہے ہماری زندگیوں میں اب ہمارے لیے ہمارے
میں ہی اس لیے کہ میں اس سر زمین پر ان مظلوموں کے لیے
لیے اکٹھے ہونا تھا۔ میں نہیں جانتی کہ ہم اب تک زندگی کے
ہمارا ساتھ کتنا طویل ہو گا لیکن یہ طے ہے کہ حالات کچھ بھی
ہوں، اب میں ان کا ساتھ نہیں چھوڑوں گی۔ نہ اب یا نہ اب
انہی کے ساتھ ہے۔“

”میرا بھی۔“ معاذ نے ابھی یہ الفاظ ادا کیے ہی تھے کہ
زوردار دھماکوں کی آواز کے ساتھ زمین لرز کر رہ گئی۔ وہ دونوں
سب کچھ بھول بھال کر تیزی سے باہر کی جانب بھاگے۔ یہ کچھ
کر ان کے ہونٹوں سے سرد آہ اکل گئی کہ وہ حادثی پناہ گاہ
جہاں کئی بے گھر ہو جانے والوں کو رکھا گیا تھا، بری طرح مہدم
ہوئی ہے۔ اسرائیل کی طرف سے دانے گئے میپائلوں نے
میرے ہڈوں کو مزید مارنے کا بندوبست کر دیا تھا لیکن شاہاش
تھی اس باہمت قوم کو بھی کہ ہر نئے زخم کے بعد بھی اٹھ کھڑے
ہوتے تھے۔ اس وقت بھی متاثرین کی مدد کرنے کا سلسلہ جاری
ہو گیا تھا۔ وہ دونوں بھی مدد کرنے والوں کے ساتھ شامل
ہو گئے۔

کتنی لاشیں اور زخمی بے تلے سے نکالے، معاذ کو یاد
نہیں رہا لیکن جب بے تلے دہلی اس گڑیا کو نکال کر اسے اپنے
منہ سے سانس دی اور اس کا تنفس بحال کرنے میں کامیاب ہوا
تو لگا ساری ٹھکن دور ہو گئی ہو۔ جان تو ایک دن جانی ہی تھی تو
کیا برا تھا کہ زندگی بچتے ہوئے چراخوں کو بچانے میں صرف
ہو جاتی۔ درحقیقت موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر زندگی
کے چراغ جلاتے چلے جانا ہی اصل شہدوری تھی۔

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر
نوجوان کی داستان جو غلط کاروں کے
لیے غضب ناک تھا کا اختتامی حصہ